قرآن کریم کی دو مستند اور مقبول تفسیریں

آسان بیان القرآن

مع

تفسیر عثمانی

سورۃ الفاتحہ تا سورۃ التوبہ

1

ترجمہ قرآن شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن رحمہ اللہ

خلاصہ تفسیر حکیم الامت مولانا محمد اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ

فوائد تفسیر شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ

تسہیل و ترتیب

عُمَر أنور بَدَخشَانی

استاذ جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

Banuri

بنوری

بسم الله الرحمن الرحيم

وقل رب زدني علماً

اللهم صل على سيدنا محمد وسلم

قرآن کریم کی دو مستند اور مقبول تفسیریں

آسان بیان القرآن

مع

تفسیر عثمانی

سورۃ الفاتحہ تا سورۃ التوبۃ

1

ترجمہ قرآن شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ

خلاصہ تفسیر حکیم الامت مولانا محمد اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

فوائد تفسیر شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ

تسہیل و ترتیب

عمر انور بدخشانی

استاذ جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

Banuri

بنوری

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

الحمدُ للہ ربّ العالمین ، والصّلاۃ والسّلام علیٰ خاتم الأنبیاء والمُرسلین ، وعلیٰ آلہٖ وصحبہٖ أجمعین ، وعلیٰ من تبعَھُم بإحسَانٍ إلیٰ یوم الدّین ، أمّا بعد:

اللہ تبارک وتعالیٰ کی توفیق اور والدین واساتذہ کی دعاؤں کی برکت ہے کہ بندہ ناچیز کو کلام الٰہی کی کسی درجہ میں خدمت کی سعادت حاصل ہوئی، اس پر اللہ تعالیٰ کا جتنا بھی شکر ادا کیا جائے وہ کم ہے، اُردو زبان کے تفسیری ذخیرے میں ''بیان القرآن'' اور ''تفسیر عثمانی'' کو بنیادی اور مرکزی ماخذ کی حیثیت حاصل ہے، یہ دونوں تفسیریں کسی تعارف کی محتاج نہیں، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کی تالیف کردہ تفسیر ''بیان القرآن'' پہلی بار ۱۳۲۵ھ میں شائع ہوئی، جبکہ ''تفسیر عثمانی'' کا پس منظر کچھ یوں ہے کہ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن رحمہ اللہ نے قرآن مجید کا ترجمہ ''موضح فرقان'' کے نام سے ۱۳۳۶ھ میں مکمل کرلیا تھا، اس کے بعد تفسیری فوائد تحریر کرنا شروع کیے، سورہ نساء تک پہنچے تھے کہ ۱۳۳۹ھ میں آپ کا انتقال ہوگیا، تفسیری فوائد کے باقی حصہ کی تکمیل کے لیے اللہ تعالیٰ نے آپ کے شاگرد رشید شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ کو منتخب فرمایا، انہوں نے اپنے استاذ کے اس ادھورے کام کی تکمیل کا ارادہ اور آغاز فرمایا جس کی تکمیل سے ۱۳۵۰ھ میں ہم کنار ہوئے اور فوائد عثمانی کی شکل میں تفسیری جامعیت کا منفرد شاہکار ۱۳۵۵ھ میں منصۂ شہود پر آیا، چونکہ تقریباً پچیس پاروں کے تفسیری فوائد حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ کے قلم سے تھے اس لیے یہ ''تفسیر عثمانی'' کے نام سے مشہور ومعروف ہوگئی۔

غرض اردو زبان کی مستند، مختصر اور جامع تفسیروں میں ''بیان القرآن'' اور ''تفسیر عثمانی'' دونوں کو امتیازی حیثیت حاصل ہے، اس کے بعد اردو زبان کی اکثر تفسیری خدمات خواہ قدیم ہوں یا جدید ان دونوں تفسیروں ہی کی خوشہ چین نظر آتی ہیں، چنانچہ مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ کی تفسیر ''معارف القرآن'' (۸ جلد)، حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمہ اللہ کی تفسیر ''معارف القرآن'' (۸ جلد) اور مولانا عبد الماجد دریا آبادی رحمہ اللہ کی ''تفسیر ماجدی'' (۶ جلد) یہ تینوں وہ مشہور تفسیریں ہیں جو دیگر امور کے ساتھ ساتھ حضرت تھانویؒ کی تفسیر بیان القرآن کی تسہیل وتشریح کے باعث وجود میں آئیں اور ان تفاسیر میں جا بجا ''تفسیر عثمانی'' سے بھی بھرپور استفادہ کیا گیا، چنانچہ مادر علمی جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی میں زمانہ طالب علمی کے دوران والد گرامی حضرت مولانا محمد انور بدخشانی صاحب زید مجدہم اور اپنے اساتذہ کرام سے بارہا یہ سنا کہ اردو تفسیروں میں بیان القرآن اور تفسیر عثمانی کو ہمیشہ مطالعہ میں شامل رکھنا چاہیے، ان دونوں کی اہمیت کا صحیح اندازہ بڑی تفسیروں کے مطالعہ کے بعد ہی ہوتا ہے، حضرت والد صاحب مدظلہ جس زمانہ میں قرآن

کریم کا فارسی ترجمہ (۱) وتفسیر تحریر فرمارہے تھے اس دوران بارہا ان سے یہ فرماتے سنا کہ قرآن کریم کے بہت سے مشکل مقامات پر کئی عربی تفسیروں کے مطالعہ کے بعد جب بیان القرآن یا تفسیر عثمانی کو دیکھتا ہوں تو ان میں بہت مختصر اور جامع تعبیر میں وہ بات مل جاتی ہے جو دیگر تفاسیر میں طویل عبارتوں میں بیان ہوتی ہے۔

بندہ کے اس کام کی ابتدا تفسیر عثمانی سے ہوئی تھی، ویسے تو طالب علمی کے زمانہ سے ہی ''تفسیر عثمانی'' سے استفادے کی کوشش رہی، لیکن بعد میں درس وتدریس کے دوران اس کی اہمیت مزید دل میں جاگزیں ہوگئی، مطالعہ کے دوران بارہا یہ خیال آتا کہ تفسیر عثمانی کو حواشی کے بجائے عام فہم اور آسان انداز میں مرتب کرکے پیش کیا جائے، تاکہ مطالعہ کرنے والے کو تفسیری فوائد وحواشی ڈھونڈنے کی دشواری نہ ہو اور آیت کے ترجمہ کے ساتھ ہی اس کے تفسیری فوائد درج ہوجائیں تاکہ یکسوئی کے ساتھ قرآن کریم کی آیات کے مطالب ذہن نشین ہوسکیں، یہی بات کئی اساتذہ کرام اور متعدد باذوق رفقاء درس سے بھی سننے کو ملتی رہی، چنانچہ اساتذہ کرام اور ساتھیوں سے مشورے کے بعد تقریباً چھ سال قبل یہ کام اللہ کا نام لے کر شروع کردیا، دیگر مصروفیات کے ساتھ جیسے جیسے موقع ملتا تھوڑا تھوڑا کرکے یہ کام از خود کمپیوٹر پر کرتا رہا، الحمد للہ! تقریباً تین ساڑھے تین سال کے عرصہ میں تفسیر عثمانی کی ترتیب نو کا کام اللہ تعالی نے مکمل کروادیا، اس کے بعد ساتھیوں کا اصرار رہا کہ اسے شائع کردیا جائے لیکن اللہ تعالی نے دل میں یہ بات ڈالی کہ تفسیر عثمانی کے ساتھ حضرت تھانویؒ کی شہرہ آفاق تفسیر ''بیان القرآن'' کے ترجمہ وتفسیری فوائد کو آسان زبان میں ڈھال کر ساتھ ہی شامل کردیا جائے، اس طرح اردو زبان کے دو مستند اور مقبول ترجموں اور تفسیروں سے ایک ساتھ استفادہ آسان ہوجائے گا، چونکہ تفسیر بیان القرآن کے متداول مطبوعہ نسخے عصر حاضر کے اشاعتی تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں، جس کی وجہ سے صحیح طور پر استفادہ مشکل ہوتا جارہا ہے، بیان القرآن کی اہمیت کے بارے میں شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم تحریر فرماتے ہیں:

> ''کہنے کو تو یہ ایک مختصر تفسیر ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ اپنے اختصار کے باوجود جامعیت اور حل قرآن میں اپنی مثل آپ ہے، اور اسے حضرت تھانوی قدس سرہ کے تدبر قرآن کا شاہکار کہنا چاہیے، اس تفسیر کی صحیح قدر ومنزلت اس وقت معلوم ہوتی ہے جب کسی آیت کی تفسیر میں عربی زبان کی مفصل تفاسیر کو چھاننے کے بعد اس کی طرف رجوع کیا جائے، اس وقت اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت نے حل قرآن کے سلسلے میں ان تمام تفاسیر کا عطر نکال کر رکھ دیا ہے اور وہ عظیم الشان اشکالات جن کا جواب بعض اوقات کئی کئی ضخیم تفسیروں کی مراجعت کے بعد بھی نہیں ملتا، حضرتؒ نے قوسین میں چند تشریحی الفاظ بڑھا کر حل فرمادیے ہیں''۔ [تبصرے، ص:۱۲۲]

چنانچہ دسمبر ۲۰۱۶ء میں مدینہ طیبہ میں بیان القرآن کے خلاصہ تفسیر کو آسان زبان میں منتقل کرنا شروع کردیا، یہاں یہ واضح رہے کہ اس اشاعت میں تفسیر عثمانی میں کسی بھی قسم کی لفظی تبدیلی یا کمی نہیں کی گئی بلکہ اسے مکمل شامل کیا ہے، البتہ بیان القرآن میں چونکہ بہت سے مقامات پر دقیق عربی الفاظ اور مختلف فنون کی علمی اصطلاحات زیر استعمال تھیں جن کی وجہ سے اب اس کا سمجھنا عام قارئین کے لیے مشکل ہوگیا تھا اس لیے اسے آسان اردو میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے، یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ اس اشاعت میں تفسیر بیان

---

(۱) والد صاحب مدظلہ کا فارسی زبان میں ترجمہ قرآن پہلی بار ۲۰۰۶ء میں شائع ہوا، اللہ تعالی نے اسے شرف قبولیت سے نوازا، فارسی زبان بولنے والے حضرات نے دنیا کے کئی ممالک سے اس کے حصول کے لیے رابطہ کیا، اب تک یہ ہزاروں کی تعداد میں شائع کیا جاچکا ہے، چنانچہ ۲۰۱۷ء سے مجمع ملک فہد مدینہ منورہ سعودی عرب سے حرمین شریفین اور زائرین حج وعمرہ کے لیے اسے شائع کیا جارہا ہے، فللہ الحمد ولہ الشکر۔

القرآن کے خاص اس حصہ کو مدنظر رکھا گیا ہے جس کا تعلق عوام سے ہے، کیونکہ اس تفسیر کا ایک بڑا حصہ وہ ہے جس کا تعلق خواص اہل علم اور علماء کرام سے ہے اور وہ عربی زبان میں ہے، چنانچہ حضرت تھانویؒ نے اپنے خطبہ تفسیر میں اس بات کو یوں تحریر فرمایا:

''چونکہ نفعِ عوام کے ساتھ افادۂ خواص کا بھی خیال آگیا اس لیے ان کے فائدہ کے واسطے ایک حاشیہ بڑھایا ہے۔۔۔۔۔۔اس حاشیہ کی عبارت عربی اس لیے تجویز کی ہے کہ عوام اس کے دیکھنے کی ہوس ہی نہ کریں، ورنہ جب زبان سمجھتے اور مضامین نہ سمجھتے تو بہت پریشان ہوتے''۔

چنانچہ حضرت تھانویؒ کے بیان کردہ مقصد اور عمومی نفع کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ''آسان بیان القرآن'' میں انہی حصوں کو شامل کیا گیا جن کا تعلق عام اُردُو دَان طبقہ سے ہے، اس تمہید و پس منظر کے بعد اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ اشاعت ''آسان بیان القرآن مع تفسیر عثمانی'' کی ترتیب بیان کر دی جائے جس کے ضمن میں بقیہ متعلقہ تفصیلات بھی سامنے آجائیں گی:

① قرآنی آیات کے متن کا ترجمہ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن رحمہ اللہ کا تحریر کردہ ہے۔

② ترجمہ کے بعد حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کی تفسیر بیان القرآن ہے، جس کا عنوان بندہ نے اپنے پرنانا اور صاحب معارف القرآن مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ کی اتباع میں ''خلاصہ تفسیر'' رکھا ہے، حضرت مفتی صاحب قدس سرہ تحریر فرماتے ہیں کہ: ''اس کا نام خلاصہ تفسیر رکھنا اس لیے موزوں ہوا کہ خود حضرتؒ نے خطبہ بیان القرآن میں اس کے متعلق فرمایا ہے کہ اس کو تفسیر مختصر یا ترجمہ مطول کہا جا سکتا ہے''۔

③ تفسیر بیان القرآن کا ایک خاص وصف سورتوں اور آیات کے درمیان نظم یعنی ربط و مناسبت کا اہتمام ہے، چنانچہ ''خلاصہ تفسیر'' کے عنوان کے بعد آیت کے ترجمہ و تفسیر سے پہلے اس آیت کا ماقبل سے ربط بھی آسان زبان میں بیان کر دیا گیا، ربط آیت کے علاوہ سورتوں کے درمیان ربط کا بھی حضرتؒ نے اکثر اہتمام فرمایا ہے، بقول پروفیسر مولانا عبدالباری ندویؒ ''بیان القرآن نے یہ خدمت بقدر ضرورت پوری فرما دی کہ ہر چھوٹا بڑا حصہ اور ہر چھوٹی بڑی آیت دوسری سے اس طرح مربوط ہو گئی ہے کہ ہر آیت کا قوسین کے ساتھ جو تفسیری ترجمہ فرما دیا گیا ہے اگر اس کو آدمی پڑھتا چلا جائے تو معلوم ہوگا کہ ایک بے تکلف مسلسل و مربوط کتاب پڑھ رہا ہے''۔

④ حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے ''تفسیر'' کے عنوان سے ایک خاص اسلوب میں قرآنی آیت کا ترجمہ و تشریح کا اہتمام فرمایا ہے، چونکہ قرآن کریم سمجھنے کے لیے بسا اوقات صرف ترجمہ کافی نہیں ہوتا اس لیے حضرت تھانویؒ نے ترجمہ کے ساتھ قوسین () میں کچھ تشریحی الفاظ یا جملے بڑھا کر قرآن کریم کے مضامین کی عمدہ وضاحت فرمائی، البتہ قرآنی آیت کے ترجمہ میں لازمی احتیاط اور امتیاز کے پیش نظر اسے خط کشیدہ Overline بھی کر رکھا تھا جو ترجمہ کے متن کی علامت ہے جس کا بندہ نے بھی اس اشاعت میں خاص طور پر اہتمام کیا ہے، چنانچہ خط کشیدہ الفاظ میں ترجمہ قرآن ہے اور بین القوسین اس کی تفسیر ہے۔

⑤ ترجمہ و تفسیر کے بعد جہاں کسی ضروری بحث کا بیان یا کسی شبہ کا ازالہ ضروری ہوا تو وہاں ترجمہ و تشریح کے بعد ''ف'' کا عنوان لگا کر حضرت تھانویؒ نے اس کو بھی مختصراً بیان فرما دیا، چنانچہ بندہ نے ان تفسیری فوائد کو بھی الفاظ و تعبیرات کی معمولی تبدیلی کے ذریعہ مختصر اور آسان زبان میں پیش کرنے کی حتی الامکان کوشش کی ہے، آیت کے جس حصے سے متعلق تفسیری فائدہ ہے وہاں ''فائدہ'' کے بجائے آیت کے اس حصہ کو عنوان بنا کر نشاندہی کی گئی ہے۔

⑥ تفسیر بیان القرآن میں ایک مستقل سلسلہ مسائل اخلاق و سلوک کا ہے، یعنی جن جن آیات سے تزکیہ و اخلاقیات کا کوئی مسئلہ

مستنبط ہوتا ہے وہاں اس کو حضرت تھانویؒ نے وجہ استنباط کے ساتھ ذکر فرمادیا ہے، اس اشاعت میں دیگر تفسیری فوائد کے ساتھ ساتھ تزکیہ واخلاق کے ان مسائل کو بھی آسان اور مختصر زبان میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

⑦ آیت کے خلاصہ تفسیر اور دیگر متعلقہ فوائد وتشریح کے بعد بیان القرآن کا حصہ پورا ہوجاتا ہے، اس کے بعد علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ کے تفسیری فوائد ذکر کیے گئے ہیں، درمیان میں امتیاز کے لیے ایک لمبی سرخ لکیر ڈال دی گئی ہے، تاکہ بیان القرآن اور تفسیر عثمانی میں امتیاز برقرار رہے، اور مطالعہ کرنے والا یہ بآسانی سمجھ سکے کہ اس امتیازی لکیر کے بعد اس مذکورہ آیت سے متعلق علامہ عثمانی رحمہ اللہ کے تفسیری فوائد شروع ہورہے ہیں۔

⑧ علامہ عثمانیؒ کے تفسیری فوائد عدد کی ترتیب کے اعتبار سے ہیں جس کی طرف اوپر آیت کے ترجمہ میں عدد کے ذریعے بھی نشاندہی کردی گئی ہے، البتہ جس آیت کے تحت فوائد عثمانی زیادہ یا تفصیلی تھے وہاں عدد کے ساتھ ساتھ آیت کے اس متعلقہ حصے کے ذریعہ بھی نشاندہی کردی گئی ہے۔

⑨ بیان القرآن کو آسان کرنے کے لیے دیگر تفاسیر کے ساتھ ساتھ درج ذیل تفسیروں سے بطور خاص مدد لی گئی:

① معارف القرآن: مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ ② تسہیل بیان القرآن: حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی صاحب رحمہ اللہ ③ معارف القرآن: حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی صاحب رحمہ اللہ ④ تفسیر ماجدی: حضرت مولانا عبد الماجد دریا آبادی صاحب رحمہ اللہ۔

اگر یہ کہا جائے تو شاید مبالغہ نہ ہوگا کہ یہ مجموعہ تفسیر ''آسان بیان القرآن مع تفسیر عثمانی'' اردو کی کئی ضخیم تفسیروں کا ایک قسم کا خلاصہ اور متن ہے، غرض اس مجموعہ میں برصغیر کے دو مستند مشہور ترجمے: ترجمہ حضرت شیخ الہندؒ اور ترجمہ حضرت تھانویؒ، اسی طرح دو مشہور تفسیریں: بیان القرآن اور تفسیر عثمانی یکجا ہوگئیں، ضخامت سے بچنے اور اس مجموعہ تفسیر کو تین جلدوں تک محدود رکھنے کے لیے ''آسان بیان القرآن'' میں کچھ امور فی الحال شمولیت سے رہ گئے، اس ارادے اور امید پر کہ ''آسان بیان القرآن'' کو مستقل طور پر بہت جلد علیحدہ بھی شائع کیا جائے گا تو اس میں وہ چیزیں بھی شامل کردی جائیں گی ان شاء اللہ۔

اللہ تعالی کے فضل وکرم سے یہ کام اب پایہ تکمیل کو پہنچا، تصحیح کی ہر ممکن کوشش کے باوجود اس کام میں بندہ سے نادانستہ طور پر غلطی ہوئی ہوگی، اس لیے درخواست ہے کہ مطالعہ کے دوران اگر ایسے مقامات سامنے آئیں تو ان مقامات کی نشاندہی کردی جائے تاکہ آئندہ طباعت میں اسے درست کرلیا جائے، والد گرامی حضرت مولانا محمد انور بدخشانی صاحب زید مجدہ، استاذ محترم حضرت مولانا سید سلیمان یوسف بنوری صاحب زید مجدہ اور استاذ محترم حضرت مولانا عمران عیسی صاحب زید مجدہ کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں کہ انہوں نے بندہ کی سرپرستی فرمائی اور اپنے قیمتی مشوروں سے نوازا، دعا ہے کہ اللہ تعالی اس خدمت کو نافع اور مفید بنائے اور شرف قبولیت عطا فرمائے، اور اس خدمت کو مرتب، اس کے والدین، اساتذہ کرام اور ان تمام احباب ومخلصین کے لیے صدقہ جاریہ بنائے جنھوں نے قرآن کریم کی اس خدمت میں تصحیح، تجویز مشورے اور کسی بھی درجہ میں معاونت فرمائی ہو، آمین یارب العالمین۔

محمد عمر انور

جامعہ علوم اسلامیہ، علامہ بنوری ٹاؤن، کراچی

جامع مسجد قبا، گلشن اقبال بلاک ۱ کراچی

۱۵؍رجب ۱۴۴۰ھ - 23 مارچ 2019ء

تاثرات

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب زید مجدہ

(نائب رئیس وشیخ الحدیث جامعہ دار العلوم کراچی)

الحمد لله رب العالمين ، والصلوة والسلام على سيدنا ومولانا محمد خاتم النبيين ، وعلى آله و أصحابه اجمعين ، وعلى كل من تبعهم بإحسان إلى يوم الدين ، أمّا بعد :

اردو تفاسیر میں حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی ''بیان القرآن'' اور شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی ''تفسیر عثمانی'' کی افادیت محتاج بیان نہیں، لیکن آج کل لوگوں کی اردو اور عالمانہ زبان کی استعداد اتنی پست ہوگئی ہے کہ ان تفسیروں سے استفادہ مشکل ہوگیا ہے، یا ان کے علمی انداز بیان کی وجہ سے یا ان کی ترتیب کی بنا پر۔

عزیز گرامی مولانا عمر انور بدخشانی (استاذ جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن) حفظہ اللہ نے بڑی محنت سے ان دونوں تفسیروں کو اس طرح جمع فرمایا ہے کہ آج کے عام آدمی کے لیے ان سے استفادہ آسان ہوگیا ہے، ''بیان القرآن'' میں جو دقیق علمی اصطلاحات تھیں ان کو آسان کر کے بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اور ''تفسیر عثمانی'' کو اس ترتیب کے ساتھ جمع کیا گیا ہے کہ اس سے مسلسل استفادہ آسان ہوگیا ہے۔

بندہ نے اس کتاب کا جستہ جستہ مطالعہ کیا اور الحمد للہ مفید پایا، دل سے دعا کرتا ہوں کہ اللہ تبارک وتعالی اس کام کو اپنی بارگاہ میں شرف قبول عطا فرمائے اور خواص وعوام کے لیے نافع ثابت ہو، آمین۔

بندہ

محمد تقی عثمانی

۲۹ صفر ۱۴۴۱ھ

تاثرات

حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر صاحب زید مجدہ

(مہتمم جامعۃ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی)

صدر وفاق المدارس العربیہ پاکستان، امیر عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت

الحمد لله وحده والصّلوٰة والسّلام على من لا نبي بعده ، أمّا بعد :

قرآن کریم اللہ تعالی کا معجز کلام ہے، اس کے معانی و مطالب کے حقائق و اسرار تک رسائی کا سفر ختم نہ ہونے والا سفر ہے، روز اول سے تاحال یہ سفر جاری ہے اور تا قیامت جاری رہے گا، اس راہ میں جتنی بھی کوششیں کی جائیں اسے حتمی کوشش نہیں کہا جاسکتا، البتہ قرآنی حقائق و اسرار کی تفہیم و تسہیل کے لیے بہتر سے بہتر کی کوشش کرتے رہنا بھی خود قرآن کریم کا اعجاز ہے ،جس کا اردو زبان میں بہترین مظہر حضرت تھانوی رحمہ اللہ کی ''بیان القرآن'' اور علامہ شبیر احمد عثانی رحمہ اللہ کی ''تفسیر عثانی'' بھی ہیں، جنہیں ندرت بیانی، جامعیت اور اختصار میں انفرادی مقام حاصل ہے۔

ان دونوں تفسیروں کا امتیازی مقام اس امر سے بھی واضح ہے کہ اردو زبان میں ہونے کے باوجود اردو زبان میں مخدوم تفسیریں چلی آرہی ہیں، ان دونوں تفسیروں کی اردو زبان میں خدمت کی نئی کاوش ہماری جامعہ کے استاذ عزیزم مولانا محمد عمر انور بن مولانا محمد انور بدخشانی۔سلّمہما۔نے انجام دی ہے، اس کام کا تعارف ابتدایے میں موجود ہے، اہل علم کی توثیقی و توصیفی تحریریں بھی سامنے ہیں، میں دعا گو ہوں کہ اللہ تعالی اس کاوش کو قبولیت تامہ اور مقبولیت عامہ نصیب فرمائے اور جامع و مرتب کو اس طرح کے علمی کاموں کے لیے توفیق مزید سے نوازے، آمین، وماذلك على الله بعزیز۔

وصلى الله وسلم على المرسلين وعلى آله وصحبه أجمعين

فقط والسلام

عبدالرزاق اسکندر

۲۲ ربیع الاول ۱۴۴۱ھ

تاثرات

حضرت مولانا ڈاکٹر محمد عبدالحلیم چشتی صاحب زید مجدہ

(شاگرد رشید: شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ)

رئیس شعبہ تخصص علوم حدیث: جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

الحمد للہ رب العالمین، والعاقبۃ للمتقین، أمّا بعد:

اللہ تبارک وتعالی اپنا خاص فضل جس پر فرماتے ہیں اسے قرآن وحدیث کی خدمت کے لیے چن لیتے ہیں، قرآن کریم کی جس انداز سے بھی خدمت کی جائے بہت بڑی سعادت کی بات ہے، حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ آخری دور میں اس بات پر زور دیا کرتے تھے کہ جیل میں رہ کر یہ بات سمجھ میں آئی کہ مسلمانوں کے زوال کے اسباب میں سے ایک سبب قرآن سے دوری بھی ہے، اسی فکر میں انہوں نے قرآن کریم کا ترجمہ کیا اور اپنے شاگردوں کو اس کی ترغیب بھی دی۔

زیر نظر کتاب انہی کے ترجمہ قرآن کی خدمت ہے جس میں مرتب کتاب نے حضرت شیخ الہندؒ کے ترجمہ قرآن، مولانا اشرف علی تھانوی کی تفسیر (بیان القرآن) اور حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کے فوائد تفسیریہ کی جمع وترتیب کی ہے، البتہ تسہیل کا کام صرف ''بیان القرآن'' سے متعلق ہے، ''بیان القرآن'' چونکہ حضرت تھانویؒ نے خواص کے لیے لکھی تھی، اس لحاظ سے انہوں نے اس کی تعبیرات بھی علمی اختیار کی تھیں، چنانچہ ''بیان القرآن'' کا ایک حصہ تو وہ ہے جو خالص عربی زبان میں ہے، جس سے فائدہ اہل علم تو اٹھا سکتے ہیں عام اردو خواں نہیں، جب کہ دوسرا حصہ اردو زبان میں ہے، البتہ اس کی تعبیر علمی ہے، مرتب نے اس دوسرے حصے کی تسہیل کا کام سرانجام دیا ہے، جبکہ پہلا حصہ انہوں نے حذف کر دیا ہے، البتہ تفسیر عثمانی کی تمام عبارات من وعن نقل کی ہیں۔

مرتب کے مذکورہ منہج کا خلاصہ درج ذیل ہے:

۱- آیات قرآنیہ کے ذیل میں ترجمہ حضرت شیخ الہندؒ اور اس کے ذیل میں ''خلاصہ تفسیر'' کے عنوان سے تفسیر ''بیان القرآن'' کو ذکر کیا ہے۔

۲- بیان القرآن کے بعد سرخ امتیازی لکیر ڈال کر ہر آیت کے ذیل میں حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے فوائد تفسیر کو ذکر کیا ہے۔

۳۔مؤلف کے اس طرزِ عمل سے تفسیر عثمانی اور تفسیر بیان القرآن یکجا ہو گئے، گویا کہ مرتب نے علماء دیو بند میں سے دو بڑے علماء کے تفسیری نکات کو جمع کر کے دار العلوم دیو بند کی تفسیری خدمات کو اجاگر کیا ہے۔

۴۔نیز عام طور پر طلبہ کرام بیان القرآن یا تفسیر عثمانی میں سے کسی ایک کا انتخاب کر کے اپنا مطالعہ اس ایک حد تک محدود کرتے ہیں، مرتب کی اس کاوش سے اب طلبہ کے لیے دونوں تفسیروں کو بیک وقت پڑھنا آسان ہوگا۔

مرتب حفظہ اللہ ایک باذوق اور سلیقہ مند شخصیت ہیں اس لیے انہوں نے کتاب کی تسہیل میں بقدر وسعت خوب کوشش کی ہے، تفسیر چونکہ خواص کے لیے ہے، خصوصا طلبہ مدارس کے لیے، اس لیے طلبہ کو اس کتاب سے استفادہ کرنا آسان ہوگا۔

اللہ تبارک وتعالی موصوف کی اس سعی کو قبول فرمائے، اور ان کی کتاب کو طلبہ دین کے لیے نافع بنائے، موصوف اور ان کے والدین کے لیے ذخیرہ آخرت بنائے اور ان کو مزید کام کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

وصلى الله وسلم على سيد المرسلين وعلى آله وصحبه وأمته أجمعين

د۔محمد عبد الحلیم چشتی

۷ ربیع الثانی ۱۴۴۱ھ

تاثرات

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب زید مجدہ

(نائب رئیس وشیخ الحدیث جامعہ دارالعلوم کراچی)

الحمد لله رب العالمين ، والصلوة والسلام على سيدنا ومولانا محمد خاتم النبيين ، وعلى آله و أصحابه اجمعين ، وعلى كل من تبعهم بإحسان إلى يوم الدين ، أمّا بعد :

اردو تفاسیر میں حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی "بیان القرآن" اور شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی "تفسیر عثمانی" کی افادیت محتاج بیان نہیں، لیکن آج کل لوگوں کی اردو اور عالمانہ زبان کی استعداد اتنی پست ہوگئی ہے کہ ان تفسیروں سے استفادہ مشکل ہوگیا ہے، یا ان کے علمی انداز بیان کی وجہ سے یا ان کی ترتیب کی بنا پر۔

عزیز گرامی مولانا عمر انور بدخشانی (استاذ جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن) حفظہ اللہ نے بڑی محنت سے ان دونوں تفسیروں کو اس طرح جمع فرمایا ہے کہ آج کے عام آدمی کے لیے ان سے استفادہ آسان ہوگیا ہے، "بیان القرآن" میں جو دقیق علمی اصطلاحات تھیں ان کو آسان کر کے بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اور "تفسیر عثمانی" کو اس ترتیب کے ساتھ جمع کیا گیا ہے کہ اس سے مسلسل استفادہ آسان ہوگیا ہے۔

بندہ نے اس کتاب کا جستہ جستہ مطالعہ کیا اور الحمد للہ مفید پایا، دل سے دعا کرتا ہوں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اس کام کو اپنی بارگاہ میں شرف قبول عطا فرمائے اور خواص وعوام کے لیے نافع ثابت ہو، آمین۔

بندہ

محمد تقی عثمانی

۲۹ صفر ۱۴۴۱ھ

تاثرات

حضرت مولانا ڈاکٹر عبد الرزّاق اسکندر صاحب زید مجدہ

(مہتمم جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی)

صدر وفاق المدارس العربیہ پاکستان، امیر عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت

الحمد لله وحده والصّلوٰة والسّلام علىٰ من لا نبي بعده ، أمّا بعد :

قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا معجز کلام ہے، اس کے معانی ومطالب کے حقائق واسرار تک رسائی کا سفر ختم نہ ہونے والا سفر ہے، روزِ اول سے تا حال یہ سفر جاری ہے اور تا قیامت جاری رہے گا، اس راہ میں جتنی بھی کوششیں کی جائیں اسے حتمی کوشش نہیں کہا جاسکتا، البتہ قرآنی حقائق واسرار کی تفہیم وتسہیل کے لیے بہتر سے بہتر کی کوشش کرتے رہنا بھی خود قرآن کریم کا اعجاز ہے، جس کا اردو زبان میں بہترین مظہر حضرت تھانوی رحمہ اللہ کی ''بیان القرآن'' اور علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ کی ''تفسیر عثمانی'' بھی ہیں، جنہیں ندرت بیانی، جامعیت اور اختصار میں انفرادی مقام حاصل ہے۔

ان دونوں تفسیروں کا امتیازی مقام اس امر سے بھی واضح ہے کہ اردو زبان میں ہونے کے باوجود اردو زبان میں مخدوم تفسیریں چلی آرہی ہیں، ان دونوں تفسیروں کی اردو زبان میں خدمت کی نئی کاوش ہماری جامعہ کے استاذ عزیزم مولانا محمد عمر انور بن مولانا محمد انور بدخشانی ۔سلّمہما۔ نے انجام دی ہے، اس کام کا تعارف ابتدایے میں موجود ہے، اہل علم کی توثیقی وتوصیفی تحریریں بھی سامنے ہیں، میں دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس کاوش کو قبولیت تامہ اور مقبولیت عامہ نصیب فرمائے اور جامع ومرتب کو اس طرح کے علمی کاموں کے لیے توفیق مزید سے نوازے، آمین، وماذلك على الله بعزيز۔

وصلى الله وسلم على المرسلين وعلى آله وصحبه أجمعين

فقط والسلام

عبد الرزاق اسکندر

۲۲ ربیع الاول ۱۴۴۱ھ

تاثرات

حضرت مولانا ڈاکٹر محمد عبد الحلیم چشتی صاحب زید مجدہ

(شاگرد رشید : شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ)

رئیس شعبہ تخصص علوم حدیث : جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

الحمد لله رب العالمين ، والعاقبة للمتقين، أمّا بعد :

اللہ تبارک وتعالی اپنا خاص فضل جس پر فرماتے ہیں اسے قرآن وحدیث کی خدمت کے لیے چن لیتے ہیں، قرآن کریم کی جس انداز سے بھی خدمت کی جائے بہت بڑی سعادت کی بات ہے، حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ آخری دور میں اس بات پر زور دیا کرتے تھے کہ جیل میں رہ کر یہ بات سمجھ میں آئی کہ مسلمانوں کے زوال کے اسباب میں سے ایک سبب قرآن سے دوری بھی ہے، اسی فکر میں انہوں نے قرآن کریم کا ترجمہ کیا اور اپنے شاگردوں کو اس کی ترغیب بھی دی۔

زیر نظر کتاب انہی کے ترجمہ قرآن کی خدمت ہے جس میں مرتب کتاب نے حضرت شیخ الہندؒ کے ترجمہ قرآن، مولانا اشرف علی تھانوی کی تفسیر (بیان القرآن) اور حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کے فوائد تفسیریہ کی جمع وترتیب کی ہے، البتہ تسہیل کا کام صرف ''بیان القرآن'' سے متعلق ہے، ''بیان القرآن'' چونکہ حضرت تھانویؒ نے خواص کے لیے لکھی تھی، اس لحاظ سے انہوں نے اس کی تعبیرات بھی علمی اختیار کی تھیں، چنانچہ ''بیان القرآن'' کا ایک حصہ تو وہ ہے جو خالص عربی زبان میں ہے، جس سے فائدہ اہل علم تو اٹھا سکتے ہیں عام اردو خواں نہیں، جب کہ دوسرا حصہ اردو زبان میں ہے، البتہ اس کی تعبیر علمی ہے، مرتب نے اس دوسرے حصے کی تسہیل کا کام سرانجام دیا ہے، جبکہ پہلا حصہ انہوں نے حذف کر دیا ہے، البتہ تفسیر عثمانی کی تمام عبارات من وعن نقل کی ہیں۔

مرتب کے مذکورہ منہج کا خلاصہ درج ذیل ہے:

۱۔ آیات قرآنیہ کے ذیل میں ترجمہ حضرت شیخ الہندؒ اور اس کے ذیل میں ''خلاصہ تفسیر'' کے عنوان سے تفسیر ''بیان القرآن'' کو ذکر کیا ہے۔

۲۔ بیان القرآن کے بعد سرخ امتیازی لکیر ڈال کر ہر آیت کے ذیل میں حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے فوائد تفسیر کو ذکر کیا ہے۔

۳۔مؤلف کے اس طرزِ عمل سے تفسیر عثمانی اور تفسیر بیان القرآن یکجا ہو گئے، گویا کہ مرتب نے علماء دیو بند میں سے دو بڑے علماء کے تفسیری نکات کو جمع کر کے دار العلوم دیو بند کی تفسیری خدمات کو اجاگر کیا ہے۔

۴۔نیز عام طور پر طلبہ کرام بیان القرآن یا تفسیر عثمانی میں سے کسی ایک کا انتخاب کر کے اپنا مطالعہ اس ایک حد تک محدود کرتے ہیں، مرتب کی اس کاوش سے اب طلبہ کے لیے دونوں تفسیروں کو بیک وقت پڑھنا آسان ہوگا۔

مرتب حفظہ اللہ ایک باذوق اور سلیقہ مند شخصیت ہیں اس لیے انہوں نے کتاب کی تسہیل میں بقدر وسعت خوب کوشش کی ہے، تفسیر چونکہ خواص کے لیے ہے، خصوصا طلبہ مدارس کے لیے، اس لیے طلبہ کو اس کتاب سے استفادہ کرنا آسان ہوگا۔

اللہ تبارک وتعالی موصوف کی اس سعی کو قبول فرمائے، اور ان کی کتاب کو طلبہ دین کے لیے نافع بنائے، موصوف اور ان کے والدین کے لیے ذخیرہ آخرت بنائے اور ان کو مزید کام کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

وصلی اللہ وسلم علی سید المرسلین وعلی آله وصحبه وأمته أجمعين

د۔محمد عبد الحلیم چشتی

۷ ربیع الثانی ۱۴۴۱ھ

تاثرات

حضرت مولانا محمد انور بدخشانی صاحب زید مجدہ

(اُستاذ حدیث جامعہ عُلوم اِسلامیہ علّامہ بنوری ٹاؤن کراچی)

نحمده ونُصلِّي ونُسلِّم على رسوله الكريم ، أمّا بعد :

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ کی تفسیر بیان القرآن اردو تفاسیر میں نمایاں اور امتیازی شان رکھتی ہے، کلامی، اصولی، فروعی اور سلوکی مسائل اور جدید عصری شبہات جیسے بڑے مباحث کو لطافت اور ندرت کے ساتھ مختصر الفاظ میں جس انداز سے جمع کرنے کی حضرت نے کوشش فرمائی ہے، یہ علمی اور معنوی گہرائی اردو کی کسی اور تفسیر میں شاید ہی ملے تفسیر قرآن کے دوران متعلقہ مباحث کی ہمہ گیری اور فنی وعلمی آراستگی کا امتیاز بھی حضرت ہی کا خاصہ ہے، چنانچہ بعض اہل علم کا یہ تبصرہ ہے کہ بیان القرآن اردو زبان کی تفسیر جلالین ہے، اسی لیے بیان القرآن کو پختہ اور ٹھوس علماء کے استفادے کی تفسیر قرار دیا جاتا ہے، اسے سمجھنے اور سمجھانے کے لیے پختہ علم اور وسیع مطالعہ کی ضرورت ہوتی ہے، اس تفسیر پر کام کرنے کے لیے علامہ شبیر احمد عثمانی، مفتی اعظم مولانا مفتی محمد شفیع، حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی اور مولانا عبد الماجد دریا آبادی رحمہم اللہ جیسے لوگ سامنے آئے تھے اور انہوں نے اپنے ادوار اور اپنے انداز میں حضرت تھانویؒ کی بیان القرآن کی تفہیم، تسہیل اور تعبیر نو کا کام کیا تھا جس میں سے ہر کام اپنی جگہ عظیم تر ہونے کے باوجود دوسرے سے مستغنی نہیں کرتا، اس بنا پر بیان القرآن کی اس جلالت شان کو دیکھتے ہوئے مجھے ذاتی، اصولی اور فنی لحاظ سے یہ تردد تھا کہ اس عظیم المرتبت تفسیری خدمت کے لیے فرزند عزیز مولوی عمر انور سلمہ کا کمر بستہ ہونا اور یہ کام انجام دینا شاید مشکل نہ ہو، اسی وجہ سے تاثرات رقم کرنے کے لیے عزیزم کی فرمائش پوری کرنے میں بھی مجھے قدرے تامل رہا، اس تامل سے خلاصی کے تین اسباب سامنے آئے جس کے نتیجے میں یہ سطور رقم کر رہا ہوں:

۱۔اللہ تعالی کے فضل وکرم سے قرآن کریم کی تفسیری خدمت میرا اپنا شغف اور شوق بھی ہے، عزیزم کے اس کام سے ان کے قرآن کریم کے ساتھ شوق وشغف کا اندازہ ہوا جو کہ قابل تشجیع ہے۔

۲۔عزیزم موصوف نے تفسیر قرآن جیسے نازک موضوع پر عصری آزادانہ محنت کے بجائے اکابر واسلاف کی تفسیری کاوشوں سے اپنا رشتہ اور تعلق جوڑنے کا مظاہرہ کیا جسے تفسیر قرآن کے میدان میں اتباع سلف کا شوق اور التزام سمجھتا ہوں، عصر حاضر میں اتباع سلف کا یہ التزام یقینا باعث سعادت ہے۔

۳۔عزیزم مرتب کے کام اور یہ تاثرات رقم کرنے پر سب سے زیادہ جس چیز نے مجھے آمادہ کیا وہ یہ کہ موصوف نے تفسیری

افادات کے جمع کرنے میں ابتداع کے بجائے نقل واتباع پر ہی اکتفا کیا ہے اوراس ترتیب نو میں بیان القرآن اور تفسیر عثمانی کو ایک جگہ جمع کرنے کی کوشش کی ہے، بحیثیت والد اور استاذ اگر چہ مجھے عزیزم مولوی عمر انور سلمہ کے فہم وذکاء پر کافی حد تک اطمینان ہے اور عزیز موصوف کے اساتذہ کرام بھی ان کے بارے میں حسن ظن اور حسن رائے رکھتے ہیں مگر اس کے باوجود عزیزم کے کام میں علم تفسیر کی نزاکت کا کتنا لحاظ ہو پایا ہے، مزید بہتری کی کتنی گنجائش ہے یہ موضوع اس میدان کے اہل علم کے سپرد کرتا ہوں، والد ہونے کی حیثیت سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا، البتہ اس مجموعہ تفسیر کے جائزے سے درجہ ذیل باتوں نے مجھے اپنی طرف متوجہ کیا:

ا۔ پہلی بات کہ یہ مجموعہ صرف تین جلدوں میں اردو زبان کی دو اہم اور مستند تفسیروں بیان القرآن اور تفسیر عثمانی پر مشتمل ہے۔

۲۔ دوسری بات یہ کہ اس میں شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسنؒ کا ترجمہ قرآن بھی مکمل شامل ہے، اور خلاصہ تفسیر میں حضرت تھانوی رحمہ اللہ کا ترجمہ قرآن بھی آگیا چنانچہ اب اس مجموعہ میں برصغیر کے دو مستند اور اہم ترجمہ وتفسیر شامل ہو گئے۔

۳۔ تیسری اور اصل بات یہ کہ اس میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی تفسیر بیان القرآن کو آسان الفاظ میں پیش کیا گیا ہے، یہ کام وقت کی انتہائی اہم ضرورت تھی، کیونکہ بیان القرآن جیسی گرانقدر علمی تفسیر سے کماحقہ استفادہ عوام تو عوام خواص کے لیے بھی اب مشکل ہوتا جا رہا ہے، چنانچہ ہمارے مدارس کے فضلاء وطلبہ بھی اب اس تفسیر سے اجنبیت محسوس کرنے لگے ہیں، تفسیر بیان القرآن ایک خاص حیثیت کی وجہ سے بھی اردو زبان کی دیگر تفسیروں میں نمایاں مقام رکھتی ہے کہ اس میں حضرت تھانویؒ نے تفسیر قرآن کریم کا مطالعہ کرتے ہوئے ذہن میں پیدا ہونے والے شکوک وشبہات کو دور کرنے کا خاصا اہتمام کیا ہے، اور ان کا جواب اس قدر سلیس، مختصر اور جامع دیتے ہیں کہ تمام شکوک کا بآسانی ازالہ ہو جاتا ہے، اگر چہ اردو زبان کی دیگر تفسیروں میں اس موضوع پر کچھ مواد تو ہے، مگر اس کے باوجود عصر حاضر کے کلامی شبہات کے لیے وہ تفسیریں مکمل طور پر کفایت نہیں کرتی، اس لیے موجودہ علم کلام کے لیے حضرت تھانویؒ کی تفسیر بیان القرآن عظیم اہمیت کی حامل ہے جس میں اختصار وجامعیت کے ساتھ ساتھ مسلک سلف کی پوری پوری وکالت ہے اور کلام خداوندی قرآن مجید کے اوپر وارد شدہ شبہات کا تحقیقی جواب بھی دیا گیا ہے۔

۴۔ چوتھی بات یہ کہ مرتب نے اس مجموعہ میں قرآن کریم کی دو تفسیروں کو ایک ساتھ جمع کر دیا لیکن امتیاز وفصل کو بھی برقرار رکھا، اور ساتھ ہی بیان القرآن کو آسان اردو میں ڈھالنے کی کوشش بھی فرمائی ہے، البتہ بیان القرآن اور تفسیر عثمانی کو یکجا شائع کرنے سے اگر چہ قارئین کو بہت سی جگہ تکرار محسوس ہوگا، لیکن یہ تکرار بھی یقینا فائدہ سے خالی نہیں، اور اسی وجہ سے اس مجموعہ کی افادیت مزید بڑھ گئی، چنانچہ تفسیر قرآن کا مطالعہ کرنے والے قارئین کے لیے یہ سہولت اور آسانی ہوگئی کہ انہیں دو ترجمے اور دو تفسیریں مطالعہ میں ایک ساتھ مل جائیں گی۔

دعا ہے کہ اللہ تعالی ان کی اس کوشش کو قبول فرمائے اور اس مجموعہ تفسیر کو قارئین کے لیے کلام الہی کے ساتھ ربط وتعلق، عمل صالح اور اخروی نجات کا ذریعہ بنائے، آمین۔

محمد انور بدخشانی

لیلۃ النصف من شعبان ۱۴۴۰ھ

فہرست

تمہید نظر ثانی از حضرت مفسر علام

از حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ

بعد الحمد والصلوۃ عرض ہے کہ احقر نے عرصہ ہوا قرآن شریف کی تفسیر مسمی بہ ''بیان القرآن'' لکھی تھی جو ۱۳۲۶ھ میں بحمد اللہ شائع بھی ہوگئی تھی، خدا کا شکر ہے کہ اس نے بہت زیادہ اس کو مفید و مقبول فرمایا، اس درمیان میں خود مجھے اس پر جا بجا سے بارہا نظر کرنے کا اتفاق ہوا، اور میرے، بہت سے احباب نے تو اس کا بالاستیعاب مطالعہ کیا، اس نظر اور مطالعہ کے درمیان خود مجھ کو بھی اور احباب کے تقریرا یا تحریرا، ابتداء یا استدعاء متنبہ کرنے سے بھی بعض مقامات قابل ترمیم واضافہ معلوم ہوئے اور مطبوعہ سابق میں حواشی وغیرہ کی طرز تحریر میں بھی بعض مقامات پر میری تجویز کے خلاف ترمیم کردی گئی تھی جو مجھ کو ناپسند تھی، بناء علیہ جی چاہتا تھا کہ یہ تفسیر مع ترمیم واضافہ کے اسی طرز پر جس پر میں نے اصل مسودہ لکھا تھا طبع ہو جائے، خدا کا شکر ہے کہ میری یہ تمنا بھی اس طرح پوری ہوئی کہ میرے برادر زادہ برخوردار مولوی شبیر علی سلمہ مالک اشرف المطابع تھانہ بھون نے اسی طرح اس کی طباعت کا قصد کیا اور قابل ترمیم واضافہ مقامات میں ترمیم واضافہ کرنے کی مجھ سے درخواست کی، میں نے اس درخواست کو بخوشی منظور کیا اور نظر ثانی اس طرح کی کہ مولوی عبد الکریم سلمہ گمتھلوی اول تفسیر کے ان مقامات کا جو اہل علم کے متوجہ کرنے سے مشورہ طلب ثابت ہوئے مطالعہ کر کے مقامات اشتباہ کو نوٹ کر لیتے تھے، پھر ان مقامات کو میرے سامنے پیش کرتے تھے، ان میں غور کر کے میں نے تفسیر میں جا بجا مناسب ترمیم کردی اور ان مقامات کا ایک معتد بہ حصہ وہ بھی ہے جو ''ترجیح الراجح'' کے سلسلہ میں شائع ہو چکا ہے، اور بعض اہل علم نے متعدد مقامات کے متعلق کچھ عبارتیں بطور حاشیہ لکھ کر پیش کیں، اب ان کو حاشیہ میں داخل کر دیا گیا، اور منہیات سے امتیاز کے لیے ان کے آخر میں ''محشی'' کا لفظ لکھ دیا گیا ہے، مزید نفع کے لیے میرے مؤلفہ اور دو مفید رسالے بھی جو قرآن کے متعلق تھے اس مرتبہ اس کے ساتھ شامل کیے گئے، ایک ''مسائل السلوک''، جس میں سلوک کے مسائل پر آیات قرآنی سے نصا یا استنباطا استدلال کیا گیا ہے، یہ تفسیر کے حاشیہ پر درج کیا گیا ہے، دوسرا ''وجوہ المثانی''، جس میں قراءات سبعہ کو ضبط کیا گیا ہے، اس رسالہ کا جس قدر مضمون جس جلد کے متعلق تھا اس کو ہر جلد کے آخر میں درج کر دیا گیا ہے، چونکہ اب یہ تفسیر بحمد اللہ بہمہ وجوہ مکمل ہوگی ہے اس لیے اس کا نام بھی ''مکمل بیان القرآن'' تجویز کرتا ہوں، حق تعالی برخوردار مذکور سلمہ کی اس سعی کو مشکور فرمائیں اور اس کار خیر میں اس کی امداد فرمائیں، اور اس سے اس کو دینی و دنیوی ہر قسم کا فائدہ عطا فرمائیں، اور عافیت و حسن و خوبی سے اس کار خیر کو انجام کو پہنچادیں، و باللہ التوفیق و ھو خیر رفیق۔

اشرف علی

۲۰ رشوال المکرم ۱۳۵۳

خطبہ تفسیر بیان القرآن

از حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ

الرَّحمٰن ، علّم القُرآن ، خلَقَ الإنسان ، علّمه البَيان ، هُو الّذى أرسَلَ رسُوله بالهُدٰى و دِين الحقّ ليُظهره على الدِّينِ كلّه ، وكفٰى باللّٰه شَهيدا ، محمّد رّسُولُ اللّٰه ، والّذين معَه أشِدّاء على الكُفّار رُحماءُ بينهم ، ترٰهم رُكّعًا سُجّدًا يبتغون فضلًا مِن اللّٰه و رِضْوَانا ، سِيماهم فى وُجُوهِم مِن أثر السُّجُود ، ذٰلك مثلهم فى التّوارة ومثلهم فى الإنجيل ، كزرْعٍ أخرج شَطأه فأزَرَهٗ فاستغلَظ فاستَوٰى علىٰ سُوقه يُعجبُ الزّراع ليَغيظ بهم الكُفّار ، وَعَدَ اللّٰه الّذِين آمنُوا وعملُوا الصّٰلحٰتِ مِنهم مّغفِرةً و أجرًا عَظِيما۔

امابعد! یہ ابجد خواں مکتب قرآنی مظہر مدعا ہے کہ بہت روز سے خود بھی اور احباب کے اصرار سے بھی گاہ گاہ خیال ہوا کرتا تھا کہ کوئی مختصر تفسیر قرآن مجید کی لکھی جائے جو ضروریات کو حاوی [مشتمل] اور زوائد سے خالی ہو، مگر تفاسیر و تراجم کی کثرت دیکھ کر اس کو امر زائد سمجھا جاتا تھا، اسی اثنا میں نئی حالت یہ پیش آئی کہ بعض لوگوں نے محض تجارت کی غرض سے نہایت بے احتیاطی سے قرآن کے ترجمہ شائع کرنے شروع کیے جن میں بکثرت مضامین خلاف قواعد شرعیہ بھر دیے، جن سے عام مسلمانوں کو بہت مضرت [نقصان] پہنچی، ہر چند کہ چھوٹے چھوٹے رسالوں سے ان کے مفاسد پر اطلاع دے کر ان مضرتوں [نقصانات] کی روک تھام کرنے کی کوشش کی گئی، مگر چونکہ کثرت سے ترجمہ بینی کا مذاق پھیل گیا ہے وہ رسالے اس غرض کی تکمیل کے لیے کافی ثابت نہ ہوئے تاوقتیکہ ابناء زمانہ کو کوئی ترجمہ بھی نہ بتلایا جائے جس میں مشغول ہو کر ان تراجم مبتدعہ مخترعہ سے بے التفات ہو جائیں، ہر چند کہ تراجم و تفاسیر محققین سابقین کے بالخصوص خاندان عزیزیہ کے ہر طرح کافی و وافی ہیں، مگر ناظرین کی حالت و طبیعت کو کیا جائے کہ بعض تفاسیر میں عربی یا فارسی نہ جاننے کی مجبوری، بعض تراجم میں اختصار یا زبان بدل جانے کا عذر مانع دل چسپی ہوا، تامل و مشورے سے یہی ضرورت ثابت ہوئی کہ ان لوگوں کو کوئی نیا ترجمہ دیا جائے جس کی زبان وطرز بیان و تقریر مضامین میں ان کے مذاق و ضرورت کا حتی الامکان پورا لحاظ رہے، اور ساتھ ہی اس کے کوئی ضروری مضمون خواہ جزو قرآن ہو یا اس کے متعلق ہو رہ نہ جائے، چند روز تک یہ رائے صورت تجویز و پیرایہ تذکرہ میں رہی، آخر جب احباب کا تقاضا زیادہ ہوا اور خود بھی اس کی ضرورت روزانہ مشاہدہ و معائنہ میں آنے لگی بنام خدا محض توکلاً علی اللہ پھر اس اطمینان پر کہ اگر میں کسی قابل نہیں ہوں تو کیا ہوا، بزرگان عصر اصلاح فرما کر اس کو دیکھنے کے قابل کر دیں گے، آخر ربیع الاول ۱۳۲۰ھ میں اس کو شروع کرتا ہوں اور اللہ تعالیٰ سے امید تمام اور نفع انام رکھتا ہوں، اب جن امور کی اس میں رعایت اور لحاظ کیا گیا ہے ان کو اختصار کے ساتھ عرض کرتا ہوں:

① اول: قرآن مجید کا آسان ترجمہ کیا ہے، جس میں قابل فہم ہونے کے ساتھ ساتھ تحت لفظی کی بھی رعایت ہے۔

② دوم: ترجمہ میں خالص محاورات استعمال نہیں کیے دو وجہ سے: اول تو میں قصباتی ہوں، محاورات پر عبور نہیں، دوسرے یہ کہ محاورات ہر مقام کے جدا جدا ہوتے ہیں، اگر دہلی کے محاورات لیے جاتے اہل لکھنؤ نہ سمجھتے، یہاں کے محاورات وہاں نہ سمجھتے، ان دونوں کے محاورے حیدر آباد اور مدراس والے نہ سمجھتے، غرض ایسے محاورات عام فہم نہیں ہوتے، اور اردو ترجمہ کم از کم ایسا تو ہو کہ قریب قریب ہندوستان کے سب حصے اس کو سمجھ جائیں اس لیے کتابی زبان لی ہے کہ فصاحت کے ساتھ ساتھ اس میں سلاست بھی ہے۔

③ سوم: نفس ترجمہ کے علاوہ جس مضمون کو بہت ضروری دیکھا کہ اس پر ترجمہ کی توضیح موقوف ہے یا کوئی شبہ خود قرآن کے مضمون سے ظاہراً پیدا ہوتا تھا اس کا جواب یا مضمون قرآنی کسی مشہور تحقیقات کے خلاف معلوم ہوتا تھا اس کی تحقیق، یا اسی قسم کی کوئی ضروری بات ہوئی اس کو "ف" بنا کر بڑھا دیا، باقی لطائف ونکات یا طویل عریض حکایات یا فضائل یا بہت سے مسائل وغیرہ سے تفسیر کو طویل نہیں کیا گیا، غرض یہ کہ مضامین کا جمع کرنا مقصود نہیں، بلکہ محض حل قرآن ورفع ضرورت لیکن باوجود اتنی رعایت کے بھی غیر علماء وطلبہ کے لیے بہت سے مقامات میں علماء سے استغنا نہیں ہوسکتا، بلکہ واجب یہ ہے کہ ایسے حضرات صرف اپنے مطالعہ وفہم پر اعتماد نہ فرمائیں، بلکہ حسب ضرورت علماء یا منتہی طلبہ سے اس کو سبقاً سبقاً سمجھ کر پڑھ لیں، ورنہ اقل درجہ اتنا تو ضرور ہے کہ مطالعہ کے وقت جہاں ذرہ برابر بھی اشتباہ رہے وہاں خود غور کر کے نہ نکالیں، بلکہ پنسل سے نشان کر کے علماء سے وہ عبارت دکھلا کر حل کر لیں اور بدوں اس کے احتمال بلکہ یقین غلط فہمی کا ہے۔

④ چہارم: جس آیت کی تفسیر میں بہت سے مفسرین کے اقوال ہیں ان میں سے جس کو ترجیح معلوم ہوئی صرف اس کو لے لیا، بقیہ سے تعرض نہیں کیا۔

⑤ پنجم: مطلب قرآنی کی تقریر کہیں تو اس طرح کی ہے کہ مضمون کا ارتباط خود ظاہر ہوجائے اور کہیں ایک سرخی ربط کی لکھ کر اس کی تقریر کر دی گئی ہے۔

⑥ ششم: اختلافیات کی تفسیر میں صرف مذہب حنفی کو لیا گیا ہے اور دوسرے مذاہب بشرط ضرورت حاشیہ میں لکھ دیے گئے۔

⑦ ہفتم: چونکہ نفع عوام کے ساتھ افادہ خواص کا بھی خیال آگیا اس لیے ان کے فائدہ کے واسطے ایک حاشیہ بڑھایا ہے جس میں مکیت ومدنیت سور وآیات وغیر مشہور لغات وضروری وجوہ بلاغت ومغلق ترکیب وخفی الاستنباط فقہیات وکلامیات واسباب نزول وروایات واختلاف قرأت مغیرہ ترکیب یا حکم وتوجیہ ترجمہ وتفسیر ایجاز کے ساتھ مذکور ہیں جس کو متوسط درجہ کا طالب علم بے تکلف سمجھ سکتا ہے، یہ حاشیہ درس وتدریس کے وقت بہت کام آسکتا ہے، اس حاشیہ کی عبارت عربی اس لیے تجویز کی ہے کہ عوام اس کے دیکھنے کی ہوس ہی نہ کریں، ورنہ جب زبان سمجھتے اور مضامین نہ سمجھتے بہت پریشان ہوتے، اب اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ یہ تفسیر مختصر یا ترجمہ مطول کہہ دیجیے عوام وخواص سب کے کام کا ہوگا، اور اگر اہل علم اول صرف قرآن کا مطالعہ کر کے بطور خود غور کریں اور اس میں جو امور ذہن میں مجمل رہیں یا جو اشکالات واقع ہوں ان کو مستحضر کر کے پھر اس تفسیر کا ملاحظہ فرمائیں تو ان شاء اللہ تعالیٰ دوبارہ لطف اور حظ حاصل ہو، ناظرین سے امید یہ ہے کہ اس کو مطالعہ فرما کر میرے واسطے مغفرت ورحمت کی دعا مانگیں کہ بڑا لالچ اس مشقت سے یہی ہے:

اے کہ بر میروی دامن کشاں　　　　از سر اخلاص الحمدے بخواں

اس تفسیر کی اصطلاحات یہ ہیں کہ جو عبارت خطوط ہلالیہ [قوسین] سے خارج ہے وہ ترجمہ ہے اور جو خطوط ہلالیہ [قوسین] کے اندر محصور ہے وہ ترجمہ سے زائد ہے، اور باوجود کافی ہونے اس فرق کے زیادہ احتیاط وتوضیح کے لیے ترجمہ پر خط کھینچ دیا ہے جو متن کی علامت ہے اور ترجمہ میں اسی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ اوپر جہاں قرآن لکھا ہے اس کے نیچے بھی ترجمہ لکھ دیا ہے، اور ایک التزام یہ بھی کیا گیا ہے کہ حاشیہ عربیہ میں جہاں کسی کتاب کی بعینہٖ عبارت لی گئی وہاں اس کتاب کا نام لکھ دیا ہے اور جہاں کچھ مناسب تصرف ہوا ہے وہاں نام کتاب کے قبل لفظ "من" بڑھا دیا ہے، جہاں "استاذی" لکھا ہے اس سے مراد حضرت مولانا یعقوب صاحب رحمہ اللہ ہیں، جہاں "مرشدی" لکھا ہے اس سے مقصود حضرت مولانا الحاج محمد امداد اللہ صاحب قدس سرہ ہیں، جہاں کوئی ماخذ نہیں لکھا وہ احقر نے اپنی رائے و یادداشت سے لکھ دیا ہے۔

سبحٰن ربک ربّ العزّة عما یصفون وسلام علی المرسلین والحمد للہ ربّ العالمین

فقط الراقم: محمد اشرف علی تھانوی عفی عنہ

ذکر بعضے امور مرعیہ ملتزمہ در تحریر تفسیر ہذا

[تفسیر بیان القرآن لکھنے کے دوران جن امور کی لازمی رعایت رکھی گئی]

از: حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ

ان میں بعض امور تو خطبہ تفسیر میں مذکور ہوئے ہیں اور بعض امور ان کے علاوہ ہیں:

① اس تفسیر کے لکھنے کے وقت یہ کتابیں میرے پاس رہتی تھیں: بیضاوی، جلالین، تفسیر رحمانی، اتقان، معالم التنزیل، روح المعانی، مدارک، خازن، تفسیر فتح المنان، تفسیر ابن کثیر، لباب، درمنثور، کشاف قاموس، بعض تراجم قرآن، ان میں سے بعض کتابیں اول سے پاس رہیں، اور بعض کچھ لکھنے کے بعد آئیں، اور بعض بالکل اخیر میں آئیں، چنانچہ حوالوں سے اس کی تفصیل و تعیین معلوم ہو سکتی ہے، اور ضرورت کے وقت کتب حدیث، فقہ اور سیر کی مراجعت بھی کی جاتی تھی۔

② قرآن مجید کے اول سے آخر تک ہر سورت اور ہر آیت کا ربط ما قبل کے ساتھ نہایت سہل اور قریب تقریر میں بالالتزام بیان کیا گیا، اور اکثر سورتوں کے شروع میں ان سورتوں کا خلاصہ بھی بیان کر دیا گیا۔

③ جتنی آیتوں کی تفسیر بوجہ اتحاد یا تقارب وتناسب مضامین کے ایک جگہ مجتمع کر کے لکھی گئی ہے ان کے اول میں ان مضامین کا ایک جامع عنوان بطور سرخی کے لکھ دیا گیا ہے جس سے اجمالاً ان تمام آیات کا خلاصہ ذہن میں مستحضر ہونے کے بعد مفصل تفسیر سے جو کچھ نفع اور حظ حاصل ہوگا اس کو ناظرین خود دیکھیں گے، پھر ان آیات کی تفسیر ایسے طور پر کی گئی ہے کہ سب ایک مسلسل تقریر معلوم ہوتی ہے۔

④ جن روایات پر تفسیر کو مبنی کیا ہے ان میں التزام کیا گیا ہے کہ وہ صحیح روایتیں ہوں، البتہ جہاں تفسیر کسی روایت پر مبنی نہ تھی اور لفظ قرآنی فی نفسہ بھی اس وجہ کو متحمل تھا تقویت احتمال کے لیے اشتراط صحت میں تسامح کیا گیا۔

⑤ شبہات کے جواب دینے میں صرف ان شبہات کو خاص کیا ہے جن کا منشا کوئی صحیح دلیل تھی، جیسے کوئی آیت یا کوئی حدیث یا کوئی امر ثابت بالعقل یا بالحس، اور جن کا منشا کوئی امر صحیح نہیں ہے، بلکہ وہ شبہ خود دعوی بلا دلیل ہے اس کے جواب میں چونکہ طلب دلیل کافی ہے اس لیے اس سے تعرض نہیں کیا گیا اور بہت سے شبہات نفس تقریر ترجمہ سے مندفع ہو گئے ہیں۔

⑥ کوئی مضمون ضرورت سے زائد نہیں لکھا، مگر شاذ و نادر کسی خاص فائدے کے لیے۔

⑦ ترجمہ میں ترکیب کی رعایت زیادہ کی گئی ہے بہ نسبت اتباع محاورہ کے۔

⑧ چونکہ احقر کو مباحث متعلقہ کتاب سماویہ سابقہ پر بالکل نظر نہیں ہے اس لیے ایسے مضامین میں تفسیر حقانی سے نقل کر دیا گیا ہے۔

⑨ غالباً تمام تفسیر میں دو یا تین مقام ایسے ہیں کہ وہاں جیسا جی چاہتا تھا ویسا شرح صدر نہیں ہوا، اس موقع پر احقر نے اس کی تصریح کر دی ہے، تاکہ اگر کسی کو اس سے اچھی تقریر و تفسیر میسر ہو جائے اسی کو راجح سمجھے۔

⑩ مسائل فقہیہ وکلامیہ کی ہر آیت کے متعلق اسی قدر تحقیق پر اکتفا کیا گیا ہے جس پر قرآن کی تفسیر موقوف تھی۔

⑪ جو مضامین زیادہ تفصیل و تحقیق کے قابل کئی جگہ آئے ہیں ان کو ایک جگہ مفصل لکھ کر دوسری جگہ اس پہلی جگہ کا حوالہ دے دیا

یا پہلی جگہ اس دوسری جگہ کا وعدہ کیا گیا ہے۔

⑫ تفسیر میں ہر جگہ سلف صالح کا اتباع کیا ہے، متاخرین کے اقوال کو جو سلف کے خلاف تھے نہیں لیا۔

⑬ جہاں مفسرین کے متعدد اقوال ہیں ان میں سے جس کو روایت یا ذوق عربیت سے راجح سمجھا صرف اسی کو اختیار کر لیا گیا، سب کو نقل نہیں کیا، البتہ کہیں کہیں اگر دونوں وجہیں متساوی معلوم ہوئیں دونوں کو نقل کر دیا ہے۔

⑭ تقریر مدلول آیات میں قواعد میزانیہ منطقیہ کی پوری طور سے مراعات کی گئی ہے جس کا لطف اذکیاء اور علماء کے جی سے پوچھنا چاہیے۔

⑮ مجھ کو معلوم ہے کہ کہیں کہیں تقریر کسی قدر تنگ ہے، لیکن اس کی کفایت میں کوئی خلل نہیں، البتہ کم استعداد لوگوں کو اہل علم سے اس کے حل اور توضیح کی حاجت ہوگی، اسی طرح بعض جگہ ایسے مضامین بھی آ گئے ہیں کہ ان کا سمجھنا اہل علم کے ساتھ مخصوص ہے، اسی لیے میرے نزدیک مطلقاً ضروری ہے کہ اس تفسیر کو اول سے آخر تک کسی عالم سے سبق کے طور پر پڑھ لیا جائے اور جو مضمون اس پر بھی سمجھ نہ آئے اس کو علوم درسیہ پر موقوف سمجھا جائے اور یہ امر یقینی ہے کہ اس سے پورا لطف حاصل ہونے کی شرط علوم متعارفہ میں مہارت اور اس میں بھی کسی مقام پر تحیر و مراجعت تفاسیر کے بعد اس تفسیر کو ملاحظہ کرنا ہے۔

⑯ اور بہت سے امور ضروریہ ولطیفہ ترجمہ وتفسیر میں ایسے ملیں گے جو بیان سے خیال میں نہیں آسکتے مطالعہ پر ان کا حوالہ کیا جاتا ہے۔

⑰ لطائف اور نکات جن کا تفسیر میں دخل نہ تھا، نہ وہ مقصود بالقرآن تھے بالکلیہ مہجور کر دیے گئے، مقصود اصلی حل قرآن کو رکھا گیا ہے۔

⑱ جن آیات کی تفسیر میں حدیث مرفوع آئی ہے اس کے مقابلہ میں کسی کا قول نہیں لیا گیا۔

⑲ چونکہ التزامات مذکورہ کی ضرورت خیال میں تدریجاً آتی رہی اس لیے ممکن ہے کہ اول کے اجزاء میں بعض التزامات کی رعایت متروک ہوگئی ہو، نیز چونکہ اس کی بارہ جلدوں میں سے جن میں ہر جلد ڈھائی پارہ کی ہے (اب جدید طباعت میں پوری تفسیر کو تین جلدوں میں تقسیم کیا گیا ہے) کہیں تحقیقاً کہیں بوجہ قرب سورت کے کسی قدر کم یا کسی قدر زیادہ اول جلد متصلاً نہیں لکھی گئی، بلکہ درمیان میں فترات ووقفات اتفاقیہ واقعہ ہوتے رہے، اس لیے خود اس کے اجزاء میں اور پھر اس میں اور بقیہ جلدوں میں طرز و وضع کے اعتبار سے کسی قدر تفاوت بھی ہے جو نظر غائر سے معلوم ہو سکتا ہے۔

⑳ باقی جو حواشی کے مضامین عربی میں لکھے ہیں وہ اہل علم کے ساتھ مخصوص ہیں، ان کے التزامات پر متنبہ کرنے کی اس مقام پر حاجت نہیں، باقی ان سب معروضات کے بعد جو ناظرین کی مصلحت سے ظاہر کیے گئے ہیں اپنی خاص حالت کے اعتبار سے یہ معروض ہے:

نہ بنقش بستہ مشوشم نہ بحرف ساختہ سرخوشم　　نفسے بیاد تو میکشم چہ عبارت وچہ معانیم

کتبہ: محمد اشرف علی عفی عنہ

مقدمہ ترجمہ

(از شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن رحمہ اللہ)

[یہ مقدمہ ترجمہ شیخ الہند کی اس اشاعت پر مبنی ہے جو ترجمۂ شیخ الہند کے ساتھ پہلی مرتبہ بجنور سے ۱۳۴۴ھ چھپا تھا مقدمۂ شیخ الہند کی یہی اشاعت معروف ہے، زیر نظر تفسیر میں اسی اشاعت کو سامنے رکھا ہے، مقدمہ ترجمۂ شیخ الہند کی بعد کی اشاعتوں میں اگر کوئی ترمیم وتغیر ہوا ہو تو ناچیز مرتب کو اس کا علم نہیں]۔

خدا! در انتظارِ حمد مانیست	محمد! چشم بر راہِ ثنا نیست
خدا! مدح آفرین مصطفی بس	محمد! حامد حمد خدا بس
مناجاتے اگر باید بیاں کرد	بہ بیتے ہم قناعت میتواں کرد
محمد از تو میخواہم، خدا را	خدایا! از تو عشقِ مصطفی را
دگر لب وا مکن مظہر فضولیست	سخن را حاجت افزوں تر فضولیست

امابعد! بندۂ آثم وعاجز، محمود ابن مولوی ذوالفقار علی دیوبند، ضلع سہارنپور کا رہنے والا، غفر اللہ تعالیٰ لہ ولوالدیہ! عرض کرتا ہے کہ بعض احباب اور مکرمین نے بندہ سے درخواست کی کہ قرآن شریف کا ترجمہ سلیس مطلب خیز اردو زبان میں، مناسب حال اہل زمانہ کیا جائے، جس سے دیکھنے والوں کو فائدہ پہنچے اور وہ نقصان اور خلل اور لفظی ومعنوی اغلاط، جو بعض آزادی پسند صاحبوں کے ترجمہ سے، لوگوں میں پھیل رہی ہیں، ان سے بچاؤ کی صورت نکل آئے، اس عاجز نے اس درخواست کے جواب میں اپنی بے بضاعتی کے علاوہ یہ عرض کیا کہ اول تو مقدسین اکابر کے فارسی اردو کے متعدد تراجم موجود ہیں اُس کے علاوہ علمائے متدینین زمانہ حال کے متعدد تراجم یکے بعد دیگرے بحمد اللہ شائع ہو چکے ہیں، جو لوگوں کو مذکورہ بالا خرابیوں سے بچانے کے لئے کافی ووافی وشافی ہیں، چنانچہ بندہ کے احباب میں بھی اول مولوی عاشق الٰہی صاحب سلمہ ساکن میرٹھ نے ترجمہ کیا، اس کے بعد مولانا اشرف علی صاحب سلمہ اللہ نے ترجمہ کیا، احقر نے دونوں ترجموں کو تفصیل سے دیکھا ہے، جو ان خرابیوں سے پاک صاف ہیں، اور عمدہ ترجمے ہیں، پھر اب کسی جدید اردو ترجمہ کی کیا حاجت ہے، بجز اس کے کہ اسمائے مترجمین میں ایک نام اور زیادہ ہو جائے اور کوئی نفع نہیں معلوم ہوتا، مگر مکرمین احباب نے اُس پر بھی بس نہ کی، اور اسی اصرار پر قائم رہے، تو مجبور ہو کر مجھ کو یہ عرض کرنا پڑا کہ اس وقت تک میرے خیال میں کوئی ایسا نفع نہیں آیا کہ جس کی وجہ سے جدید ترجمہ کی جرأت اور ہمت کروں، اب آپ کے اصرار پر احقر تراجم قدیمہ اور جدیدہ کو بنام خدا غور سے دیکھتا ہے، اس کے بعد اگر کوئی نفع سمجھ میں آیا تو اس کے موافق آپ صاحبوں کے فرمانے کی تعمیل کا ارادہ کروں گا ورنہ معذور ہوں، اس کے بعد حضرت مولانا شاہ ولی اللہ اور مولانا شاہ رفیع الدین اور مولانا شاہ عبدالقادر قدس اللہ تعالیٰ اسرارہم کے تراجم کو جو غور سے دیکھا تو یہ امر تو بے تامل معلوم ہو گیا، کہ اگر یہ مقدسین اکابر قرآن شریف کی اس ضروری خدمت کو انجام نہ دے جاتے تو اس شدت ضرورت کے وقت میں ترجمہ کرنا بہت دشوار

ہوتا، علماء کو صحیح اور معتبر ترجمہ کرنے کے لئے متعدد تفاسیر کا مطالعہ کرنا پڑتا اور بہت ہی فکر کرنا ہوتا اور ان دقتوں کے بعد بھی شاید ایسا ترجمہ نہ کر سکتے جیسا اب کر سکتے ہیں، پھر بھی کوئی اللہ کا بندہ ایسا ہوتا تو ہوتا کہ کمال علم وتدین کے ساتھ اس مشقت کو گوارا کر کے اس خدمت کو کما ینبغی انجام دینے کے لئے موفق ہوتا، حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھئے کہ اس بے نظیر علمی وعملی کمالات پر جو انہوں نے اپنے اوپر حق سبحانہ تعالیٰ کے انعامات متعدد رسالوں میں بیان فرمائے ہیں اُن انعامات عظیمہ میں یہ ترجمہ مسمّٰی بہ "فتح الرحمن" بھی داخل ہے ،اور عاجز نے اپنے بعض مرحوم بزرگواروں سے سنا ہے کہ مولانا شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ جب موضح قرآن لکھ چکے تو فارسی کا ایک شعر تھوڑا سا تصرف کر کے اس طرح پڑھتے تھے:

روز قیامت ہر کسے با خویش دارد نامہ　　　　من نیز حاضر میشوم تفسیر قرآن در بغل

اس سے ان حضرات مرحومین کا کمال علم وتدین تو معلوم ہوتا ہی ہے اسی کے ساتھ قرآن شریف کے صحیح تراجم کی عظمت اور ضرورت بھی ظاہر ہوتی ہے، بالجملہ اگر اکابر مرحومین ہماری ضرورت اور منفعت کو احساس فرما کر پہلے ہی سے اُس کا انتظام نہ کر جاتے تو آج اس کثرت اور سہولت کے ساتھ ہم کو تراجم کلام الٰہی اچھے سے اچھے ہرگز میسر نہ ہوتے، اور کچھ عجب نہ تھا کہ جیسے خود ہندوستان میں بہت سی زبانیں اور دیگر ممالک میں مسلمانوں کی بڑی بڑی قومیں اس نعمت اور عزت سے خالی یا مثل خالی کے ہیں ہم بھی اسی نکبت میں مبتلا ہوتے فجزاهم الله عنا وعن جميع المسلمين احسن الجزاء وافضل الجزاء والحمد لله، اسی کے ساتھ یہ بات بھی دلنشین ہوگئی کہ ہر چند ترجمہ تحت لفظی میں بعض خاص فائدے ہیں، مگر ترجمہ سے جو اصلی فائدہ اور بڑی غرض یہ ہے کہ ہندوستانیوں کو قرآن شریف کا سمجھنا آسان ہو جائے، یہ غرض جس قدر بامحاورہ ترجمہ سے حاصل ہو سکتی ہے تحت لفظی ترجمہ سے کسی طرح ممکن نہیں، چنانچہ حضرت شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ جو بامحاورہ ترجمہ کے بانی اور امام ہیں انہوں نے بامحاورہ ترجمہ کو اختیار فرمانے کی یہی وجہ بیان کی ہے، اور یہی وجہ ہے کہ جو اسلاف ممدوحین کے بعد اس زمانہ میں جس نے اس میدان میں قدم رکھا اس نے جناب شاہ صاحب ممدوح کا اتباع کیا اور بامحاورہ ترجمہ کرنے کو اختیار کیا جس پر کسی کا شعر یاد آتا ہے:

ہر مرغ کہ پر زد بہ تمنائے اسیری　　　　اول بشگون کرد طواف قفس ما

اور یہ امر بھی خوب معلوم ہو گیا کہ جیسے حضرت شاہ رفیع الدین رحمہ اللہ کا یہ کمال ہے کہ تحت لفظی ترجمہ کا التزام کر کے ایک ضروری حد تک سہولت اور مطلب خیزی کو بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا، ایسے ہی حضرت مولانا عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ کا یہ کمال ہے کہ بامحاورہ ترجمہ کا پورا پابند ہو کر پھر نظم وترتیب کلمات قرآنی اور معانی لغویہ کو اس حد تک نباہا ہے کہ زیادہ کہتے ہوئے تو ڈرتا ہوں مگر اتنا ضرور کہتا ہوں کہ ہم جیسوں کا ہرگز کام نہیں، اگر ہم ان کے کلام کی خوبیوں کو اور ان اغراض اور اشارات کو جو ان کے سیدھے سیدھے مختصر الفاظ میں ہیں سمجھ جائیں تو ہم جیسوں کے فخر کے لئے یہ امر بھی کافی ہے۔

اس کے بعد اب ہم کو ضرور ہوا کہ خاص طور پر حضرت شاہ مولانا عبدالقادر رحمہ اللہ کے ترجمہ بامحاورہ مسمّٰی بہ موضح قرآن کو دیکھ کر اول یہ سمجھیں کہ جناب شاہ صاحب ممدوح کا ترجمہ جس کا اپنی نوعیت میں اول وافضل ہونا جملہ اہل علم وفہم اور ارباب انصاف ودیانت کو مسلم ہے، اس میں ایسے امور کیا ہیں جن کی وجہ سے ہم کو دوسرے کسی ترجمہ کی ضرورت ہو، پھر یہ دیکھیں کہ جو تراجم جدیدہ اس زمانہ میں شائع ہو چکے ہیں اُن سے ہماری وہ ضرورت پوری ہو گئی یا اب تک کچھ باقی ہے کہ جس کے پورا کرنے کے لئے اور ترجمہ کی ابھی تک حاجت چلی جاتی ہے، امر اول کی بابت جہاں تک ہم نے ملاحظہ کیا اور دیگر حضرات نے بھی اس کی تصدیق فرمائی کل دو باتیں ایسی پائیں جس کی وجہ سے عام طور پر لوگ ترجمہ موصوف سے نفع اٹھانے میں قاصر ہیں، اول بعض کلمات اور محاورات کا اس زمانہ میں متروک یا قریب بمتروک ہو جانا،

دوسرے چونکہ حضرت شاہ صاحب مرحوم کلمات قرآنی کی موافقت اور مطابقت کا خیال زیادہ فرماتے ہیں اور شرائط ترجمہ کی پابندی بہت کرتے ہیں، اس لئے بعض مواقع میں بوجہ اختصار عبارت آج کل کی سہولت پسند طبائع کو مطلب سمجھنے میں بہت دقت معلوم ہوتی ہے، باقی رہا امر ثانی تو یہ بات توسب جانتے ہیں کہ اس زمانہ میں اردو بامحاورہ طرز پر بکثرت تراجم یکے بعد دیگرے شائع ہو چکے ہیں، سوان میں بالیقین بعض ایسے تراجم بھی ہیں جو علمائے معتبر اہل علم ودیانت کی لوجہ اللہ سعی کا نتیجہ ہے، اور بعض بعض کو ہم نے بھی تفصیلی نظر سے دیکھا ہے، ہمارے نزدیک وہ تراجم بے شک ہماری اُس حاجت کے پورا کرنے کے لئے کافی ہیں جو اس زمانہ میں حضرت شاہ صاحبؒ کے بےنظیر ترجمہ میں اہل زمانہ کو پیش آرہی تھی جزاھم اللہ سبحانہ عناوعن جمیع مسلمی الھند خیراً، اور اُن اغلاط ومفاسد سے بچانے کے لئے بھی مفید ہیں جو بعض آزادخیال صاحبوں کے تراجم میں موجود ہیں، اس لئے امر ثانی کی بابت اس عاجز کی یہ رائے ہے کہ وہ نزاکت ولطافت اور وہ ہرامر کی رعایت جو حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کے ترجمہ کے امتیازات اور خصوصیات میں شمار ہوتی ہیں ان کا توذکر نہیں، باقی وہ امر جو ترجمہ سے مقصود اصلی اور غرض ضروری ہے یعنی کلام الٰہی جل جلالہ کا صحیح مطلب سلف صالحین کے ارشادات کے موافق سہولت کے ساتھ مسلمانان ہند کی سمجھ میں آسکے، اس امر کے لئے تراجم جدیدہ جو اہل علم ودیانت کی توجہ سے شائع ہو چکے ہیں وہ بالکل کافی ودوانی ہیں، ہم کو کسی جدید ترجمہ کی اس وقت حاجت نہیں رہی شکر اللہ مساعیھم، ہم فخر ومسرت کے ساتھ حق سبحانہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہمارے معتبر علماء کی حسن سعی سے تراجم مفیدہ قدیمہ وجدیدہ اتنے شائع ہو چکے ہیں کہ ایسے اور اتنے تراجم ہم کو کسی عجمی زبان میں نظر نہیں آتے، ذٰلک من فضل اللہ علینا۔

اب اس کے بعد یہ بات تو بحمداللہ ہم کو خوب محقق اور منقح ہوگئی کہ تراجم موجودہ صحیحہ معتبرہ کے ہوتے ہمارا جدید ترجمہ کرنا لہولگا کر شہیدوں میں شامل ہونا ہے، جس سے نہ مسلمانوں کو کوئی نفع معتبر پہنچ سکتا ہے نہ ہم کو، بلکہ جب ہم یہ خیال کرتے ہیں کہ ہمارا جدید ترجمہ کرنا گویا زبان حال سے یہ کہنا ہے، کہ تراجم موجودہ میں کوئی خلل ہے جس کا تدارک کیا جاتا ہے، یہ ہمارے ترجمہ میں کوئی خوبی اور منفعت زائد ہے جس کی وجہ سے جدید ترجمہ کی حاجت ہوئی تو ہم کو جدید ترجمہ کرنا فضول سے بڑھ کر نہایت مذموم اور مکروہ تک نظر آتا ہے نعوذباللہ من شرورانفسنا۔

خیر یہ بات تو خوب دلنشین ہوگئی اور ظاہر ہے کہ اُس کا مقتضی یہ تھا کہ ترجمہ کلام الٰہی کے متعلق اب ہم کچھ ارادہ نہ کرتے مگر اس چھان بین اور دیکھ بھال میں تقدیر الٰہی سے یہ بات دل میں جم گئی کہ حضرت شاہ صاحب کا افضل ومقبول ومفید ترجمہ رفتہ رفتہ تقویم پارینہ ہوجائے، یہ کس قدر نا قدردانی اور بدقسمتی بلکہ کفران نعمت ہے، اور وہ بھی سرسری عذر کی وجہ سے اور عذر بھی وہ جس میں ترجمہ کا کوئی قصور نہیں، اگر قصور ہے تو لوگوں کی طلب کا قصور ہے، اگر دیکھنے والے غور سے دیکھیں اور جو غور کے بعد بھی سمجھ میں نہ آئے اس کو جاننے والوں سے دریافت کریں تو پھر سب کام سہل ہوجائے، چنانچہ حضرت ممدوح نے خود شروع میں لکھ دیا ہے کہ قرآن شریف کے معنی بغیر سند کے معتبر نہیں اور بغیر استاد کے معلوم نہیں ہوتے، علاوہ ازیں عوام کو یہ دشواری تو سب ترجموں میں پیش آتی ہے، حضرت شاہ صاحب کے ترجمہ میں کچھ زیادہ سہی۔

اس لئے اس ننگ خلائق کو یہ خیال ہوا کہ حضرت شاہ صاحب ممدوح کے مبارک مفید ترجمہ میں لوگوں کو جو کلی دو خلجان ہیں یعنی ایک بعض الفاظ ومحاورات کا متروک ہوجانا، دوسرے بعض بعض مواقع میں ترجمہ کے الفاظ کا مختصر ہونا، جو اصل میں تو ترجمہ کی خوبی تھی مگر ابنائے زمانہ کی سہولت پسندی اور مذاق طبیعت کی بدولت اب یہاں تک نوبت آگئی کہ جس سے ایسے مفید وقابل قدر ترجمہ کے متروک ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے، سو اگر غور واحتیاط کے ساتھ اُن الفاظ متروکہ کی جگہ الفاظ مستعملہ لے لئے جائیں اور اختصار واجمال کے موقعوں کو تدبر کے ساتھ کوئی لفظ مختصر زائد کر کے کچھ کھول دیا جائے تو پھر ان شاء اللہ حضرت شاہ صاحب کا یہ صدقہ فاضلہ بھی جاری رہ سکتا ہے

اور مسلمانان ہند بھی اُس کے فوائد مخصوصہ سے خالی نہ رہ جائیں گے، اس مضمون کو سوچ سمجھ کر جو اپنے مکرمین مخلصین کی خدمت میں پیش کیا تو ان حضرات نے بھی اس عاجز کی رائے سے اتفاق ظاہر فرمایا، اور یہی بات دلنشین ہوگئی کہ مستقل ترجمہ سے یہ امر زیادہ مناسب اور مفید ہے کہ موضح قرآن میں جو شکایت پیدا ہوگئی ہے اُس کے رفع کرنے میں کوشش کی جائے، جب یہاں تلک نوبت پہنچ چکی تو یہ عاجز بنام خدا اِس خدمت کے انجام دینے کے لئے تیار ہو بیٹھا گو یا دوشالہ میں کمبل سے جگہ جگہ رفو کرنے کا ارادہ کر دیا، جب ایک ثلث قرآن کا ترجمہ کر چکا تو بوجہ بعض عوارض ایسا طول طویل حرج پیش آیا کہ ترجمہ کی تکمیل کی توقع بھی دشوار ہوگئی، مگر بتوفیق الٰہی عین ایام حرج میں اتنا اطمینان نصیب ہوگیا کہ ترجمہ موصوف باطمینان ۱۳۳۶ھ میں پورا کرلیا اِنَّ ربی لطیف لمایشاء، والحمد للہ۔

اب حق تعالیٰ کو منظور ہے تو انہی احباب مکرمین کی خدمت میں اس ترجمہ کو پیش کر کر تفصیلی نظر کی درخواست کریں گے، اگر ہماری یہ پیوندکاری ان حضرات کے نزدیک مفید ومناسب سمجھی گئی تو انشاء اللہ شائع بھی ہو جاوے گا ورنہ مجبوراً جہاں ہے وہیں رہے گا:

گو نالہ نارسا ہو نہ ہو آہ میں اثر   میں نے تو در گزر نہ کی جو مجھ سے ہوسکا

اب اس کے بعد مناسب ہے کہ حضرت شاہ صاحب کے اصل ترجمہ کی بابت اور نیز اپنی ترمیم کے متعلق چند ضروری مفید باتیں عرض کردی جائیں، جن سے دیکھنے والوں کو بالاجمال دونوں ترجموں کی حالت اور کیفیت بھی معلوم ہو جائے، اور بعض شبہات جن کے پیش آنے کا کھٹکا ہوتا ہے وہ بھی دفع ہو جائیں، سو حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے شروع میں اپنے ترجمہ کی نسبت اتنا مضمون تو خود فرمادیا ہے کہ ہندی اور عربی زبان کا محاورہ ہرگز موافق نہیں، اس لئے اگر قرآن شریف کی ترتیب کے موافق ہر ہر لفظ کا جدا جدا ترجمہ کیا جائے یعنی تحت لفظی تو ہندیوں کی سمجھ میں آنا دشوار ہو اس لئے ہم نے مجموعۂ آیت کی پابندی کی ہے ہر ہر لفظ کی پابندی نہیں کی، یعنی ہندی محاورہ کے موافق ترجمہ کیا ہے، تحت لفظی نہیں کیا، یہ حضرت ممدوح کے ارشاد کا خلاصہ ہے، مگر اس میں اجمال بہت ہے، اس ارشاد سے تو یہ معلوم ہوگیا کہ حضرت ممدوح اپنے ترجمہ میں ہر ہر لفظ کی پابندی نہ کریں گے، ہاں آیت کی پابندی ضروری ہے مگر یہ معلوم نہیں ہوا کہ اس عدم پابندی کی کیا حد ہے، اور کہاں تک اس عدم پابندی کو حضرت ممدوح نے اپنے ترجمہ میں اختیار اور استعمال فرمایا ہے اور کتنی تقدیم وتاخیر کو جائز رکھا ہے، یعنی بقدر ضرورت وحاجت کسی لفظ کو آگے یا پیچھے کرلیا ہے یا صرف آیت کے احاطہ میں رہ کر پھر کسی تقدیم وتاخیر کی پرواہ نہیں کی، تھوڑی ہو یا زیادہ ضروری ہو یا غیر ضروری ایک تغیر ہو یا متعدد، اس کے سوا حضرت شاہ صاحب نے یہ امر اجمالاً بھی نہیں بیان کیا کہ ہم نے اپنے ترجمہ میں کس کس امر کا خیال رکھا ہے، اور اس میں کیا کیا خوبیاں اور فوائد ہیں، سو احقر ان دونوں باتوں کو مفید سمجھ کر ان کی نسبت کچھ کچھ عرض کرنا چاہتا ہے۔

سو یہ بات تو سب پر ظاہر ہے کہ احقر اس کے متعلق جو کچھ بھی عرض کرے گا وہ موضح قرآن ہی کی عبارت سے مستنبط ہوگا، اس کے سوا ہمارے لئے اور کیا امر ذریعہ علم ہوسکتا ہے، بعینہٖ جیسا کہ حضرات علمائے کرام نے امیر المؤمنین فی الحدیث امام بخاری رحمہ اللہ کی خود کتاب صحیح بخاری سے استنباط کر کے ان کی شروط وقیود واغراض کو بیان فرمادیا ہے۔

سو امر اول کی نسبت یہ عرض ہے کہ حضرت شاہ صاحب ترتیب قرآنی کا بہت خیال رکھتے ہیں اور اصل اور ترجمہ کی مطابقت میں بہت زیادہ سعی فرماتے ہیں، مگر چونکہ ترجمہ بامحاورہ کا التزام کیا ہے، اس لئے بضرورت توضیح وتسہیل بعض مواقع میں تقدیم وتاخیر لازم ہے، مگر جیسا کہ آٹے میں نمک، یہ نہیں کہ آخر کا ترجمہ اول اور اول کا آخر ہو جائے، الغرض فصل بعید سے احتراز رکھتے ہیں، الا ماشاء اللہ کسی خاص ضرورت کے وقت میں دو تین کلموں کا فصل ہو جائے اور وہ بھی النادر کالمعدوم، دیکھئے عربی زبان میں مضاف کو مقدم ذکر کرتے ہیں اور اردو کا محاورہ یہ ہے کہ مضاف الیہ کو مقدم کرتے ہیں، وہ "غلامُ زیدٍ" کہتے ہیں تو ان کے محاورہ میں زید کا غلام کہیں گے، سو ترتیب تو بدل گئی، مگر دونوں کلمے متصل ہی رہے فاصلہ اور فرق کچھ نہیں ہوا، اس لئے حاجت کے وقت یہ تغیر کچھ تغیر نہیں سمجھا جاتا، اس قسم کی مثالیں

شاہ صاحب کے ترجمہ میں کثرت سے ملیں گی، مثلاً علی قلوبھم وعلی سمعھم وعلی ابصارھم کا ترجمہ بامحاورہ کریں گے توان کے دل پر اوران کے کان پر اوران کی آنکھوں پر کیا جائے گا، اورترجمہ تحت لفظی میں اوپر دلوں ان کے کے اوراوپر کانوں ان کے کے اوراوپر آنکھوں ان کی کے کہنا پڑے گا، مگر سب جانتے ہیں کہ ایسے اختلافات جتنے بھی ہوں اُن میں کوئی حرج نہیں بلکہ ضروری ہیں، بامحاورہ ترجمہ کرنے والے کواس سے مفرنہیں، لیکن حضرت شاہ صاحب کی احتیاط قابل تحسین اورلائق قدر ہے کہ اس پر بھی ہرجگہ مضاف الیہ کومقدم نہیں کرتے بلکہ جہاں ترجمہ میں ذرا گنجائش مل جاتی ہے وہ اتنے قلیل تغیر کوبھی پسند نہیں کرتے، ترتیب قرآنی ہی کواختیار فرماتے ہیں دیکھو الحمدللہ رب العالمین میں چونکہ رب العالمین مضاف مضاف الیہ مل کرصفت واقع ہوئے ہیں اُس کے ترجمہ میں یہ گنجائش نکل آئی کہ ترجمہ محاورہ کے خلاف بھی نہ ہواورکلام الٰہی کی ترتیب بھی باقی رہے اس لئے رب العالمین کا ترجمہ اصلی ترتیب پر رکھا، اور مالك یوم الدین بھی صفت واقع ہواہے مگراس میں دواضافتیں مجتمع ہیں، اول اضافت میں اصلی ترتیب باقی رکھنے کی گنجائش ہے، دوسری اضافت میں نہیں اس لئے ترجمہ میں مالك کا ترجمہ اصل کے موافق مقدم رکھا اور یوم کے ترجمہ کومحاورہ اردو کے موافق ''دین'' سے مؤخر کردیا چنانچہ سب پر ظاہر ہے اس میں کسی کوتردد نہیں، صرف توضیح اورتسہیل کی غرض سے ہم نے عرض کردیا، لیکن بعض مقامات ایسے بھی ہیں کہ وہاں محاورہ اردو کے ساتھ ترتیب قرآنی کالحاظ رکھنا دشوار ہے، حضرت شاہ صاحب اُن مقامات میں بھی اپنی غائر اور باریک بیں نظر سے ایسا اسلوب اختیار فرماتے ہیں کہ محاورہ کی پابندی کے ساتھ ترتیب بھی باقی رہے یافرق آئے توخفیف ولطیف، بعینہٖ یہی حال ہے فعل اور فاعل اور مفعول اورجمیع متعلقات فعل کا اورصفت موصوف حال تمیز وغیرہ کا کہ اکثر مواقع میں ترتیب کی موافقت فرماتے ہیں اوربہت سے مواقع میں اسی تغیر لطیف مذکورۂ بالا سے کام لیتے ہیں۔

اورسنئے حروف روابط جن کو''حروف جر'' بھی کہتے ہیں جیسے: لام، با، علی، الی، مِن، عن، فی، بہت کثرت سے مستعمل ہیں، مگر کلام عرب میں یہ حروف ہمیشہ اپنے معمول پر مقدم ہوتے ہیں، اورہمارے محاورہ میں علی العموم مؤخر بولے جاتے ہیں، مگرشاذونادر، لیکن ان میں بعض تو ایسے ہیں کہ ان کا موخر ہونا ضروری ہے، ہماری زبان میں ان کو مقدم لانے کی کوئی صورت ہی نہیں، جیسے من اور عن سب کو معلوم ہے کہ ممّا رزقنھم کے ترجمہ میں اردوزبان کے اندر ممکن نہیں کہ من کا ترجمہ مقدم ہوسکے، اورترتیب قرآنی کی موافقت کی جاسکے، ایسے ہی لاتجزی نفس عن نفس کے ترجمہ میں کوئی صورت نہیں کہ عن کا ترجمہ نفس کے ترجمہ سے مقدم ہوسکے اسی وجہ سے تحت لفظی ترجمہ میں بھی یہ تغیر گوارا کرنا ہوتاہے، اوراس میں کسی کوتامل نہیں ہوسکتا، اوربعض ایسے ہیں کہ ان کومقدم کرنا تو درست ہے، مگر محاورہ کے خلاف ہے، سوتحت لفظی ترجمہ میں ان کونظم قرآنی کے موافق مقدم لاسکتے ہیں، مگر بامحاورہ ترجمہ کے لئے ان کوبھی مؤخر کرنا ضرور ہوگا جیسے: علی، الی وغیرہ حروف مذکورہ، دیکھئے ختم اللہ علی قلوبھم کے تحت لفظی ترجمہ میں ''مہر کردی اللہ نے اوپر دلوں ان کے کے'' کہنا مناسب ہوگا اور بامحاورہ ترجمہ میں ''مہر کردی اللہ نے ان کے دلوں پر'' کہنا ٹھیک سمجھا جائے گا پہلی صورت میں لفظ علی اپنی اصلی ترتیب پر رہا، دوسری صورت میں تھوڑا سا بقدر ضرورت اپنی جگہ سے ہٹ گیا اسی پر دیگر حروف کو قیاس فرمالیجئے سواول تو یہ حروف فی نفسہٖ غیر مستقل اوردوسروں کے تابع ہیں، اُن کا تقدم تاخر چنداں قابل اعتبار نہیں، دوسرے بے وجہ نہیں بلکہ ضرورت اورحاجت اورنفع کی وجہ سے کرنا ہوا، تیسرے اتنا لطیف وخفیف کہ ترجمہ تحت لفظی میں بھی بعض مواقع میں قابل قبول اورضروری سمجھا جاتاہے، ان سب کے بعد پھروہی بات ہے جو پہلے عرض کرچکا ہوں یعنی جہاں کچھ گنجائش نکل آتی ہے، وہاں حضرت شاہ صاحب علیہ الرحمہ اس خفیف قابل قبول تغیر کوبھی چھوڑ کر اصلی ترتیب کوقائم رکھتے ہیں، اورایسا ترجمہ کرتے ہیں جوترتیب قرآنی کی پابندی کے ساتھ محاورہ کے بھی مخالف نہ ہونے پائے اس کی مثالیں حروف مذکورہ کے متعلق جگہ جگہ موجود ہیں، مثلاً الاعلی الخاشعین کا ترجمہ یہ فرمایا ہے ''مگرانہی پر جن کے دل پگھلے ہیں'' یعنی اللہ

سے ڈرتے ہیں اور عاجزی کرتے ہیں دیکھ لیجئے لفظ علی کے ترجمہ کو مقدم رکھا خاشعین پر اور محاورہ کے مخالف بھی نہیں ہوا۔

الحاصل حضرت شاہ صاحب جگہ جگہ ترتیب میں تصرف کرتے ہیں، مگر جچا تلا بقدر ضرورت اور عندالحاجت نہایت غور اور احتیاط کے ساتھ جس کی وجہ سے حضرت ممدوح علیہ الرحمہ کا ترجمہ جیسے استعمال محاورات میں بے نظیر سمجھا جاتا ہے ویسا ہی باوجود پابندی محاورہ قلت تغیر اور خفت تبدل میں بھی بے مثل ہے فللّٰہ درہ ثم للہ درہ ،اس کے سوا بعض بعض تصرفات خفیفہ مفیدہ اور بھی کر جاتے مثلاً ترجمہ میں کوئی لفظ مختصر بڑھا دیتے ہیں جس سے مطلب واضح ہو جائے، یا مراد خداوندی معین ہو جائے سو یہ امر ایسا ہے کہ ترجمہ تحت لفظی میں بھی اس کی نظائر موجود ہیں، ایسا ہی ترجمہ میں بعض الفاظ کو چھوڑ بھی جاتے ہیں مثلاً بعض مواقع میں اِنّ کا ترجمہ نہیں کرتے یا آبت کے ترجمہ میں ''اے میرے باپ'' نہیں کہتے صرف ''اے باپ'' پر قناعت کر جاتے ہیں، یا بُنَیّ کا ترجمہ ''اے میرے چھوٹے بیٹے'' کی جگہ فقط ''اے بیٹے'' فرمایا ہے، ایسا ہی یارَبِّ کے ترجمہ ''اے رب'' متعدد مواقع میں اختیار فرمایا ہے، سو اس قسم کے تصرفات میں کچھ حرج نہیں ترجمہ لفظی تلک میں ان کی گنجائش ہے۔

اب باقی رہی دوسری بات کہ حضرت شاہ صاحب نے اپنے ترجمہ میں کن کن امور کا خیال رکھا ہے اور اس میں کیا کیا فائدے ہیں، سو یہ بات تو ظاہر نظر آتی ہے کہ حضرت ممدوح عامۃً چند باتوں کا بہت لحاظ رکھتے ہیں، ترجمہ میں اختصار و سہولت اور الفاظ قرآنی کی لفظی اور معنوی موافقت اور صرف لغوی معنی پر بس نہیں بلکہ معنیٰ مرادی اور غرض اصلی کا ہر موقع میں بہت لحاظ رکھتے ہیں، اور ترجمہ میں کبھی ایسا لفظ لاتے ہیں جس کی وجہ سے اگر کسی قسم کا اجمال اور اشکال ہو تو زائل ہو جاتا ہے، بسا اوقات ایک لفظ کا ترجمہ ایک جگہ کچھ فرماتے ہیں، دوسری جگہ کچھ اور حالانکہ معنی لغوی اس لفظ کے ایک ہی ہیں مگر ہر مقام کے مناسب جدا جدا عنوان سے بیان فرماتے ہیں، جس سے قرآن کی غرض اور مراد سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے، اسی سہولت اور وضاحت کی رعایت سے کبھی مضمون ایجابی کو عنوان سلبی میں ادا کرتے ہیں اور اکثر مواقع میں نفی اور استثنا کا جدا جدا ترجمہ نہیں کرتے، بلکہ حصر جو اس سے مقصود ہے اُس کو مختصر ہلکے لفظوں میں محاورہ کے موافق بیان کر جاتے ہیں، حال تمیز بدل وغیرہ حتی کہ مفعول مطلق کے عنوانات کی رعایت رکھتے ہیں، اور خوبی یہ ہے کہ اردو کے محاورہ کے موافق بالجملہ الفاظ اور معانی دونوں کے متعلق بوجوہ متعددہ بہت غور اور رعایت سے کام لیا گیا ہے، اور مطالب و مقاصد کی تسہیل اور توضیح میں پورے خوض اور احتیاط کو ملحوظ رکھا ہے، ہم نے بغرض تنبیہ یہ چند باتیں مختصر طور سے عرض کر دی ہیں، اہل فہم توجہ فرمائیں گے تو ان شاء اللہ ان کو ہماری عرض کی صداقت جگہ جگہ برابر ملے گی، ہم کو کسی طول کی حاجت نہیں اور حاشا و کلا ہمارا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ فوائد مذکورہ کا اور کسی نے خیال نہیں فرمایا، فضلائے معتبرین مشہورین وغیرہ علماء کے تراجم میں ہر ایک نے اس قسم کے فوائد کا اپنی اپنی فہم اور رائے اور مصلحت اور گنجائش کے موافق ضرور خیال فرمایا ہے مگر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شاہ صاحب ممدوح نے چونکہ ہر موقع پر ان چھوٹے بڑے فوائد متعددہ کی طرف پوری توجہ فرمائی ہے اور ترجمہ میں ہر موقع پر ان کا اہتمام رکھا ہے اس لئے کماً اور کیفاً دونوں طرح یہ امور موضح قرآن میں زائد ہیں، جن کی وجہ سے ترجمہ موصوف جملہ تراجم میں ممتاز اور مفید تر نظر آتا ہے، اور بنظر فہم و انصاف اس کا مستحق ہے کہ سہل ممتنع کے ساتھ ملقب ہو، یہ حضرت ممدوح کا کمال ہے کہ ہر موقع پر جملہ امور پیش نظر رہتے ہیں، اور ترجمہ میں حسب حاجت ان کی رعایت کرتے ہیں، اور اسی کے مطابق الفاظ بھی ان کو بسہولت مل جاتے ہیں، گویا محاورات و لغات اردو بھی سب سامنے رہتے ہیں جس کو مناسب سمجھا بے تکلف لے لیا، اور اس پر ترجمہ اپنے محدود احاطہ سے ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتا فبارك الله فی حسناته وافاض علینا من برکاته یہ بات کس قدر قابل قدر اور مفید ہے کہ حضرات مفسرین اور شراح حدیث کے مبسوط ارشادات کا خلاصہ بسہولت ہر درجہ کے مسلمانوں کو ایک لفظ سے

سمجھ میں آسکے، بلکہ بعض مواقع میں تو حضرت شاہ صاحب کا ایک دولفظ وہ کام دیتا ہے کہ مبسوط ارشادات سے احق بالقبول معلوم ہوتا ہے ان فی ذٰلك لاٰیٰت للغلمین، اس موقع پر ارشاد خداوندی: ففهّمنٰها سلیمن و کلّا اٰتینا حکما و علما کا نقشہ اور نمونہ ناخواستہ سامنے آ گیا، دیکھئے: حضرت سلیمان علیہ السلام لڑکے تھے مگر حق سبحانہ نے اپنی رحمت سے ان کو وہ بات سمجھا دی کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے بھی تسلیم فرمالیا اور اپنے حکم کو واپس کرلیا اور اس سے کسی کے علم وفہم میں کوئی نقصان اور اعتراض بھی نہ ہوا:

ایں سعادت بزور باز و نیست　　　　تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

حق تعالیٰ کے غیر متناہی خزانے ہیں جس کو جس میں سے چاہتے ہیں حصہ معین عنایت فرمادیتے ہیں وان من شی الا عندنا خزائنه وماننزله الا بقدر معلوم۔

اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جیسے یہ چند فوائد عرض کئے ہیں، ایسے ہی چند مثالیں بھی کسی موقع سے عرض کر دی جائیں جن سے ہمارے معروضات کی تصدیق ہوجائے اور ناظرین کے لئے تسکین اور اطمینان کا باعث ہو، سو اول ہی سے لیجئے، دیکھئے: بسم الله کا ترجمہ محاورہ کے موافق کیا، جس میں توضیح اور اختصار دونوں کی بقدر مناسب رعایت ہے، اس سے بہتر اور خوبصورت ترجمہ اردو میں سمجھ میں نہیں آتا اور رحمٰن اور رحیم جو مبالغہ کے صیغے ہیں ان کے مبالغہ کو بھی ظاہر فرمادیا اور لطیف اشارہ دونوں کے فرق مراتب کی طرف بھی کر گئے، جتنے تراجم سابقہ ہیں ان میں مبالغہ سے تعرض نہیں فرمایا، اس کے بعد سورۂ فاتحہ میں بھی رحمٰن اور رحیم کا ترجمہ ایسا ہی کیا گیا، یوم الدین کا ترجمہ جملہ حضرات نے ''روز جزا'' یا ''دن جزا'' کا فرمایا ہے، مگر حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے صاف لکھ دیا کہ میں نے عوام کی زبان میں ترجمہ کیا ہے اور عوام کے کلام میں جزا کا لفظ شائع اور مستعمل نہیں، دوسرے اہل لغت اور حضرات مفسرین نے دین کے معنی جزا اور حساب دونوں فرمائے ہیں ان وجوہ سے غالباً حضرت ممدوح نے جزا کے بدلے ''انصاف'' کا لفظ اختیار فرمایا کہ عوام میں بھی شائع ہے اور اس ایک لفظ میں جزا اور حساب دونوں آ گئے۔

اهدنا الصراط المستقیم: جملہ حضرات ''ہدایت'' کا ترجمہ کبھی تو لفظ ہدایت ہی سے کر جاتے ہیں، اس لئے کہ لفظ ہدایت فارسی اردو میں برابر مستعمل ہے، اور کبھی اپنی زبان میں ترجمہ کرتے ہیں تو ہدایت کا ترجمہ رستہ دکھانے اور ''راہ نمائی'' کے ساتھ کرتے ہیں، مگر حضرت ممدوح علی العموم ہدایت کا ترجمہ اپنی ہی زبان میں فرماتے ہیں، الا ماشاء اللہ، لیکن ہر موقع پر اس کا بھی لحاظ رکھتے ہیں، کہ ہدایت کے کونسے معنی اس موقع کے مناسب ہیں، کیونکہ ہدایت کے لغت عرب میں دو معنی ہیں، ایک صرف رستہ دکھلا دینا دوسرے مقصود تلک پہنچا دینا، اول کو ''اراءت'' دوسرے کو ''ایصال'' کہتے ہیں، اس لئے اوروں نے اِهدنا کا ترجمہ ''دکھا ہم کو'' فرمایا ہے اور شاہ صاحب ''چلا ہم کو'' فرماتے ہیں جس سے ایصال کی طرف اشارہ کرنا مفہوم ہوتا ہے۔

اسی طرح پر هدی للمتقین میں اور حضرات نے هدی کے ترجمہ میں ''رہنما'' یا ''راہ دکھاتی ہے'' فرمایا ہے اور حضرت ممدوح نے ''راہ بتاتی ہے'' فرمایا ہے چونکہ اهدنا میں ہدایت حق تعالیٰ کی صفت ہے تو وہاں چلانے کا لفظ لائے ہیں اور اس موقع میں ہدایت قرآن کی صفت ہے تو اس لئے راہ بتانے کا لفظ بیان فرمایا، ورنہ دونوں جگہ مقصود ایصال کی طرف اشارہ کرنا معلوم ہوتا ہے فرحمه الله ما ادق نظره وارق الفاظه۔

مُتّقِین میں ''تقویٰ'' کا ترجمہ سب حضرات مرحومین نے پرہیزگاری فرمایا ہے جو تفاسیر کثیرہ کے موافق ہے، پھر حضرات مفسرین نے اس پر شبہ کیا کہ ہدایت کے محتاج گمراہ ہیں نہ متقی اس لئے ''هُدی للضالین'' فرمانا چاہئے تھا، بعض حضرات نے مُتّقِین کے معنی ''صائرین الی التقویٰ'' کے لے کر جواب دیا، بعض نے دیگر جوابات دے کر شبہ کا قلع قمع کیا، حضرت شاہ صاحب کی طبع لطیف

اور باریک بین نظر اس طرف گئی کہ تقویٰ کا ترجمہ ''ڈر'' اور ''خوف'' کے ساتھ کرنا پسند کیا جو تقوی کے اصلی اور لغوی معنی ہیں، اور مُتقین سے وہ لوگ مراد لئے جن کے دل میں اللہ تعالیٰ کا ڈر ہے، اس لئے ھدی للمتقین کا ظاہر اور معروف ترجمہ یعنی ''راہ دکھاتی ہے پرہیز گاروں کو'' اس کو چھوڑ کر ''راہ بتاتی ہے ڈر والوں کو'' اختیار فرمایا جس سے شبہ مذکورہ کے خطور کا موقع ہی نہ رہا جو کسی جواب کی حاجت ہو، اور اگر ہدایت سے ایصال مراد لیں جیسا کہ ترجمہ میں اس کی طرف اشارہ مفہوم ہوتا ہے تو پھر تو شبہ کیا کسی وہمی کے توہم کی بھی گنجائش نہیں۔

آگے دیکھئے یؤمنون بالغیب کے ترجمہ میں اگر ''ایمان لاتے ہیں ساتھ غیب کے'' یا ''غیب پر'' کہا جائے تو بہت صحیح اور ظاہر کے موافق ترجمہ ہے، اور لفظ ایمان اور غیب دونوں ایسے مشہور ہیں کہ دوسرے لفظوں سے ان کے ترجمہ کرنے کی ضرورت نہیں، لیکن لفظ ایمان اصطلاح شرع میں دو معنی میں مستعمل ہوتا ہے ایک نفس تصدیق اور یقین قلبی جو ضروریات دین کے ساتھ متعلق ہو جس کو حقیقت ایمانی سے بھی تعبیر کرتے ہیں، اور معنی لغوی کے بالکل مطابق ہے دوسرے تصدیق اور اعمال ایمانی کا مجموعہ جس کو ایمان کامل بھی کہتے ہیں سو اول تو حضرت شاہ صاحب کی عام عادت ہے کہ حتی الوسع ترجمہ میں اردو کے لفظ کو اختیار فرماتے ہیں، دوسرے لفظ ایمان جب دو معنوں میں مستعمل ہے تو حضرت ممدوح کے اصول کے موافق ضرور ہوا کہ ترجمہ میں ایسا لفظ لائیں کہ ایمان کے جو معنی اس جگہ مراد ہیں ان کی تعیین ہو جائے، اور دوسرا احتمال نہ رہے علیٰ ہذا، لفظ غیب میں اجمال ہے معلوم نہیں کس چیز سے غائب ہونا مراد ہے ان وجوہ سے وہ صحیح اور ظاہر ترجمہ جس کا پہلے ذکر ہو چکا اس کو چھوڑ کر یہ ترجمہ اختیار فرمایا ''یقین کرتے ہیں بن دیکھے'' جس سے یہ معلوم ہو گیا کہ آیت میں ایمان کے اول معنی مراد ہیں نہ دوسرے، اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ غیب کے یہ معنی ہیں کہ جن چیزوں کو انہوں نے نہیں دیکھا اور ان کے علم وادراک سے غائب ہیں جیسے دوزخ، بہشت، پل صراط، وزن اعمال، عذاب قبر، فرشتے، جنات، سو وہ لوگ ان سب چیزوں کا اللہ اور رسول کے فرمانے سے یقین کرتے ہیں مع ہذا حضرات مفسرین رحمہم اللہ نے جو بالغیب میں چند احتمال ذکر فرمائے ہیں ان میں سے ایک معنی جو ظاہر اور راجح ہیں اس ترجمہ سے وہ بھی متعین ہو گئے جیسا کہ کتب تفسیر میں مذکور ہے۔

تنبیہ: ایمان کا ذکر قرآن شریف میں ماضی، مضارع، امر، اسم فاعل مختلف صیغوں کے ضمن میں بہت کثرت سے موجود ہے سو حضرات مترجمین تو اکثر مواقع میں اس کا حسب ظاہر ترجمہ ایمان یا اسلام سے فرماتے ہیں اور حضرت ممدوح ایمان، اسلام، یقین، ماننا جو لفظ جس موقع کے مناسب اور مفید سمجھتے ہیں، اس کو اختیار کرتے ہیں، اور اس کی وجہ سے ترجمہ کے متعلق کار آمد باتیں معلوم ہوتی ہیں جیسا کہ یؤمنون بالغیب کے ترجمہ میں ابھی عرض کر چکا ہوں اور انہی چھوٹے چھوٹے فرقوں اور ہلکی ہلکی رعایتوں کی وجہ سے بعض مواقع میں بڑے بڑے شبہے بسہولت دفع ہو جاتے ہیں، اور تحقیقی باتیں معلوم ہو جاتی ہیں۔ دیکھئے احادیث میں وارد ہے کہ جب آیت کریمہ: الذین آمنوا ولم یلبسوا ایمانھم بظلم اولئك الخ نازل ہوئی، تو حضرات صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو بہت ہی شاق گذرا، آخر آپ کی خدمت میں عرض کیا: ''اینا لم یظلم نفسه'' یعنی یا رسول اللہ! ہم میں ایسا کون ہے جس نے اپنے نفس پر ظلم یعنی گناہ نہ کیا ہو، تو پھر اب تو سب عذاب الٰہی سے غیر مامون اور ہدایت سے محروم ہو گئے، آپ نے فرمایا: ''لیس ذٰلك انما ھو الشرك، الم تسمعوا قول لقمان لابنه: یا بنی لاتشرك بالله اِن الشرك لظلم عظیم'' یعنی لم یلبسوا ایمانھم بظلم میں ظلم سے مراد شرک ہے، مطلق گناہ نہیں جو یہ دشواری پیش آئے، حضرات مفسرین اور شراح حدیث کے اقوال اس جواب کی تقریر میں مختلف ہو گئے جیسا کہ اہل علم کو معلوم ہے، سو ایک خلجان تو لم یلبسوا ایمانھم بظلم میں تھا جو حضرات صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم کو پیش آیا تھا دوسرا اختلاف خلجان مذکور کے جواب میں مفسرین وغیرہ علمائے کرام کو پیش آ گیا کہ جواب کا مقصد اور اس کا ماخذ کیا

ہے، سوخلجان معروضہ اصحاب کرام تو آپ کے ارشاد سے جاتا رہا، مگر آپ کے ارشاد کے مقصد وماخذ میں علماء کو جو اختلاف پیش آ گیا وہ موجود ہے اس پر حضرات مترجمین نے تو ان لمبی لمبی بحثوں کو دیکھا کہ ترجمہ ان کو متحمل نہیں ہوسکتا، اور نہ اس کے مناسب اس لئے ترجمہ میں اس سے قطع نظر کر کر ظاہر کے موافق صحیح ترجمہ فرمادیا اور لمبی بحثوں کے لئے دوسرا موقع ہے اور حضرت شاہ صاحب کے دقیق نظر نے دیکھا کہ جب ہم کو ترجمہ میں کوئی زیادتی اور طول کرنا نہیں پڑتا صرف ایک لفظ کی جگہ دوسرا ویسا ہی لفظ بول دینے سے سب امور طے ہوئے جاتے ہیں تو پھر اس میں کیوں کوتاہی کی جائے اور کام کی بات سے کیوں محروم رکھا جائے، تو انہوں نے اپنی عادت کے موافق یہ کیا کہ: الذین آمنوا ولم یلبسوا ایمانھم بظلم کے ترجمہ میں یہ الفاظ فرمائے، ''جو لوگ یقین لائے اور ملائی نہیں اپنے یقین میں کچھ تقصیر'' جس سے معلوم ہو گیا کہ ایمان سے حقیقت ایمانی یعنی تصدیق قلبی مراد ہے، حسب معروضہ سابق، جس کو ایمان بالمعنی الاول کہتے ہیں، اہل فہم وانصاف کو تو بس یہی کافی ہے، مگر اس پر اتنا اور کیا کہ ظلم کے ترجمہ میں لفظ ''تقصیر'' بیان فرمایا، جس سے اور بھی وضاحت اور تکمیل ہوگئی، اب اس میں غور کرنے سے نہ آیت میں کوئی خلجان ہوتا ہے نہ آپ کے ارشاد میں اختلاف باقی رہتا ہے، دو لفظوں میں ایسی تحقیق فرمادی کہ لمبی لمبی بحثوں کی ضرورت نہ رہی، اور طرفہ یہ کہ یہ تحقیق دو لفظی سب سے احق بالقبول معلوم ہوتی ہے، اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ حضرات صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے خلجان کا منشاء کیا تھا، اور ارشاد نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا منشاء کیا ہے، اور ترجمہ میں جو لفظ کچھ داخل فرمایا ہے جو اور ترجموں میں نہیں وہ یہ صاف بتلاتا ہے کہ حضرت شاہ صاحب اقوال علماء کو پیش نظر رکھ کر جو بات محقق اور راجح ہے اس کو بیان فرمانا چاہتے ہیں، یہاں تمثیلات کے ذیل میں یہ ذکر استطراداً آ گیا اس سے زائد بسط کا موقع نہیں اور حضرات اہل علم خود بھی جانتے ہیں البتہ سورۂ انعام میں اس آیت کے متعلق حاشیہ پر کچھ بسط سے عرض کر دیا جاوے گا، ان شاء اللہ۔

اس کے بعد ممّا رزقنٰھم کے ترجمہ میں ''من تبعیضیہ'' کا ترجمہ لفظ کچھ سے بیان فرما کر ممانعت اسراف کی طرف اشارہ کر دیا، جیسا کہ تفسیر بیضاوی وغیرہ میں مذکور ہے، یخادعون اللہ کے ترجمہ میں فرماتے ہیں ''دغابازی کرتے ہیں اللہ سے'' جو نہایت صاف اور مناسب ترجمہ ہے، اور کوئی خلجان اور وہم اس میں نہیں ہوسکتا، عذاب الیم کے ترجمہ میں ''دکھ کی مار'' فرما کر اشارہ کر دیا کہ فعیل بمعنی مفعول ہے، جو استعمال مفرد اور راجح ہے، اور محاورہ کے موافق، بما کانوا یکذبون میں یکذبون کا ترجمہ ظاہر کے خلاف ''جھوٹ کہتے تھے'' فرماتے ہیں ''جھوٹ بولتے تھے'' نہیں فرمایا جو سہل اور ظاہر کے موافق تھا سو اس کی وجہ ان شاء اللہ یہی ہے کہ جھوٹ بولتے تھے بظاہر اس سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ ان لوگوں کا کاذب ہونا بیان کرنا مقصود ہے، اور اس کی وجہ سے ان پر عذاب الیم ہوگا، حالانکہ یہ بات نہیں، بلکہ مقصود یہ ہے کہ وہ لوگ اٰمنا باللہ وبالیوم الاٰخر جھوٹ کہا کرتے تھے یعنی منافق تھے، اور عذاب الیم اس نفاق کے بدلے میں ہوگا فللّٰہ درہ ما الطف طبعہ واسلم ذوقہ واحدّ نظرہ۔

اور سنئے مایشعرون اور لایشعرون جو ان آیات میں مذکور ہیں، دونوں جگہ یشعرون ایک لفظ ہے کوئی فرق نہیں، اس لئے حضرات مترجمین دونوں کے ترجمہ میں کچھ فرق نہیں فرماتے، مگر حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ اول کا ترجمہ ''نہیں بوجھتے'' اور دوسرے کا ''نہیں سمجھتے'' فرماتے ہیں، فرق صرف اتنا ہے کہ جہاں تامل اور فکر کی حاجت ہوتی ہے اس کے سمجھنے کو ''بوجھنا'' کہتے ہیں، حضرت ممدوح کے اس فرق فرمانے سے ادھر اشارہ ہو گیا کہ امر اول یعنی منافقون کا اپنے نفسوں کو دھوکا دینا اس کے سمجھنے میں کچھ تامل کی حاجت ہے، اور امر ثانی یعنی منافقوں کا مفسد ہونا بالکل ایک امر ظاہر ہے، ادنیٰ تامل کی بھی حاجت نہیں، قاضی بیضاوی رحمہ اللہ نے اس موقع میں لایشعرون اور لایعلمون کا فرق بیان کیا ہے، شاہ صاحب نے یہ کیا کہ ایک لفظ یشعرون کو دو موقعوں میں لانے سے بوجہ اختلاف

محل جو باریک فرق نکلتا تھا اس کی طرف اشارہ فرما گئے۔

اس کے بعد عرض ہے کہ ہم نے یہ چند نظائر چھوٹی بڑی جو شروع قرآن مجید کے صفحہ ڈیڑھ صفحہ کے متعلق ہیں موضح القرآن سے بطور نمونہ اور تنبیہ عرض کر دیئے ہیں اس کو دیکھ کر ترجمہ موصوف کی خوبی اور کیفیت بالا جمال معلوم ہو سکتی ہے اور ہمارے معروضات سابقہ کی تصدیق کے لئے ان شاء اللہ کافی ہیں، اور ترجمہ مذکور کا اول سے آخر تلک یہی رنگ ہے، چنانچہ اہل علم پر واضح ہے مگر ہم اس امر سے معذور ہیں، کہ جیسا ہم نے بطور نمونہ اس مقام کے متعلق چند نظائر عرض کی ہیں، اسی طرح پر تمام ترجمہ کے نظائر اور فوائد کو بیان کریں، اور نہ اس کی حاجت البتہ جو بات قابل تنبیہ ہوگی اس کو اپنے اپنے موقع پر بالا جمال یا بالتفصیل حاشیہ پر فوائد کے ذیل میں ان شاء اللہ عرض کر دیں گے، اور اہل فہم کو ایک دو جزو غور سے سمجھ لینے کے بعد ان امور کے سمجھنے میں خود سہولت ہو جائے گی۔

یہ امر بھی عرض کر دینے کے قابل ہے کہ حضرت حجۃ اللہ علی العالمین شاہ ولی اللہ قدس سرہ نے جب اول قرآن شریف کا ترجمہ فرمایا تو حاشیہ پر ضروری فوائد بھی کچھ تحریر فرمائے، مگر نہایت مختصر اور مجمل اور بہت کم موقعوں پر جو عام مسلمانوں کو کسی مرتبہ میں بھی کافی نہیں ہو سکتے، اس کے بعد جب حضرت شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ نے ترجمہ فرمایا تو حضرت ممدوح نے فوائد کو بھی ایک مقدار کافی ضروری تک بڑھا دیا، جو نہایت مفید اور کارآمد ہیں مگر مختصر عبارت اور سادہ الفاظ میں کہ بعض مواقع میں ہر کوئی سہولت سے نہیں سمجھ سکتا۔

اب اصل ترجمہ کی کیفیت بیان کرنے کے بعد اپنی ترمیم کے متعلق عرض ہے کہ یہ تو پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ ترمیم صرف دو امر کے متعلق ہے: ① لفظ متروک کو بدل دینا ② اور کہیں کہیں حسب ضرورت اجمال کو کھول دینا، اس کے بعد اتنا اور عرض ہے کہ جس موقع پر ہم کو لفظ بدلنے کی نوبت آئی ہے وہاں ہم نے یہ نہیں کیا کہ اپنی طرف سے جو مناسب سمجھا بڑھا دیا، نہیں بلکہ حضرات اکابر کے تراجم میں سے لینے کی کوشش کی ہے، خود موضح القرآن میں دوسری جگہ کوئی لفظ مل گیا یا حضرت شاہ عبدالقادر صاحب کی اردو کی تفسیر میں یا حضرت مولانا رفیع الدین کے ترجمہ میں یا ''فتح الرحمن'' میں حتی الوسع ان میں سے لینے کو پسند کیا ہے، البتہ کچھ مواقع ایسے بھی نکلیں گے، جہاں کسی وجہ سے ہم نے اپنے خیال کے موافق کوئی لفظ داخل کر دیا ہے، اور جہاں ہم نے کوئی لفظ بدلا ہے وہاں دونوں باتوں کا خیال رکھا یعنی لفظ ہلکا سہل محاورہ کے موافق بھی اور مطابق غرض اور موافق مقام بھی پورا ہو، اور جس جگہ ایسا لفظ ہم کو نہیں ملا وہاں جانب معنی کو ترجیح دی ہے یعنی لفظ موافق مراد اور مناسب مقام کو اختیار کیا ہے، گو اس میں کسی قدر طول ہو یا لفظ بہت مشہور نہ ہو، اور ہم نے جس جگہ کسی مصلحت سے ترتیب کو بدلا ہے یا اور کوئی تغیر کیا ہے تو یہ ضرور لحاظ رکھا ہے کہ اس کی نظیر حضرات اکابر کے تراجم میں موجود ہونی چاہئے ایسا تغیر جس کی نظیر مقدس حضرات کے تراجم میں نہ ہو ہم نے کل ترجمہ میں جائز نہیں رکھا، اتفاق سے اگر کوئی موقع اس عرض کے خلاف ہو تو وہ یقینا ہمارا سہو ہے یا خطا، بالقصد جان بوجھ کر ہم نے ایسا کہیں نہیں کیا، حضرات علماء میں بعض کلمات قرآنی کے ترجمہ میں باہم کچھ خلاف ہوا ہے اور بعض آیات کے مطلب میں بھی کچھ نزاع ہے سو ایسے مواقع میں ہم نے حضرت شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ ہی کا اتباع کیا ہے الا ماشاء اللہ کہ کسی موقع پر حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ کی متابعت اختیار کی ہو۔

فوائد کے متعلق یہ عرض ہے کہ موضح القرآن کے جملہ فوائد کے لینے کا التزام کیا گیا ہے، مگر شاذ و نادر کہ کسی وجہ سے اس کے بیان کرنے کی حاجت نہیں سمجھی، اور فوائد میں چونکہ ہر طرح سے گنجائش اور وسعت ہے ترجمہ کی طرح قید اور تنگی نہیں، تو اس لئے ہم نے اکثر یہ کیا ہے کہ حضرت ممدوح کے فوائد کو اپنی عبارت میں بیان کیا ہے، اور تقدیم و تاخیر تغیر و تبدل اجمال و تفصیل وغیرہ امور سے احتراز نہیں کیا، اور بہت سے فوائد بالاستقلال مفید اور نافع سمجھ کر مختلف موقعوں سے لے کر اپنی رائے سے بڑھا دیے ہیں، اور حضرت شاہ صاحب کی تقلید کی وجہ سے ترجمہ میں اگر کسی جگہ قدرے تنگی رہ گئی تو اس کے بدلے میں مکافات سے بھی زائد فوائد میں اس کو واضح کر دیا گیا ہے، اور بغرض تشریح و تسہیل

وتکمیل فوائد کی تکثیر کو ہم نے اختیار کیا، فوائد میں طول ہوجانے کی ایک وجہ یہ بھی ہے، کہ جو کوئی مترجم فوائد لکھتا ہے وہ صرف کلام مجید کے متعلق لکھتا ہے، اور احقر کو اس کے علاوہ حضرت شاہ صاحب کے ترجمہ کے متعلق بھی بعض مواقع میں کچھ کچھ عرض کرنے کی نوبت آتی ہے، کیونکہ ہماری تمام سعی کا لب لباب دراصل ترجمہ موصوف کی خدمت گذاری ہے وبس چونکہ بعض بعض مقامات پر کچھ کچھ ترمیم کرنے سے حقیقت میں یہ دوسرا ترجمہ نہیں ہوگیا اس لئے اس کا کوئی نام مستقل مقرر کرنا بھی ٹھیک نہیں تھا مگر صرف دفع التباس اور رفع اشتباہ کی مصلحت سے مناسب معلوم ہوا کہ اگر اصل ترجمہ کے نام کے علاوہ اس کا بھی کچھ نام رکھ دیا جائے تو التباس واشتباہ سے پورا بچاؤ رہے گا، اُس کا نام ''موضح قرآن'' ہے اِس کا نام ''موضح فرقان'' بہت مناسب معلوم ہوتا ہے، ایک کے ہیں ایک اور ہیں دو کے دو، کہنے کو دو اور حقیقت میں ہیں ایک، مگر موضح قرآن میں یہ خوبی ہے کہ تاریخی بھی ہے، موضح فرقان تاریخی نہیں ہاں گھٹا بڑھا کر کچھ تکلف کے بعد تاریخی بھی ہوسکتا ہے:

یادگار شہ عبدالقادرؒ ☆ ترجمہ موضح قرآن مجید
وہ کہ آن معدن صد خوبی را ☆ کرد ترمیم اقل العبید
بے شش وپنج بکفتہ محمود ☆ سال او موضح فرقان حمید
۱۳۳۶ھ

اس کے بعد یہ عرض ہے کہ سب مسلمانوں پر فرض ہے کہ اپنے رب کو پہچانیں، اور اس کی صفات اور اس کے احکام کو معلوم کریں، اور تحقیق کریں کہ حق تعالیٰ کونسی باتوں سے خوش ہوتا ہے، اور کون سی باتوں سے غصہ ہوتا ہے، اور اس کی خوشی کے کاموں کو کرنا، اور اس کی ناخوشی کے کاموں سے بچنا اسی کا نام بندگی ہے اور جو بندگی نہ کرے وہ بندہ نہیں، اور سب کو معلوم ہے کہ آدمی جب پیدا ہوتا ہے سب چیزوں سے ناواقف اور محض انجان ہوتا ہے، پھر سکھلانے سے سب کچھ سیکھ لیتا ہے، اور بتلانے سے ہر چیز جان لیتا ہے، اسی طرح حق تعالیٰ کا پہچاننا اور اس کی صفات اور احکام کا جاننا بھی بتلانے اور سکھلانے سے آتا ہے، لیکن جیسا حق تعالیٰ نے ان باتوں کو قرآن شریف میں خود بتلایا ہے ویسا کوئی نہیں بتلاسکتا اور جو اثر اور برکت اور ہدایت خدائے تعالیٰ کے کلام پاک میں ہے وہ کسی کے کلام میں نہیں، اس لئے عام خاص جملہ اہل اسلام کو لازم ہے کہ اپنے اپنے درجہ کے موافق کلام اللہ کے سمجھنے میں غفلت اور کوتاہی نہ کریں، سو قرآن شریف کے اوپر کے درجہ کے مطالب اور خوبیاں تو عالموں کے سمجھنے کی بات ہے، مگر جو لوگ کہ علم عربی سے ناواقف ہیں ان کو بھی کم سے کم اتنا ضرور کرنا چاہئے کہ علماء دین نے جو سلیس ترجمے ان کی زبان میں عوام کی واقفیت اور ہدایت کے لئے کردیے ہیں، ان کے ذریعہ سے اپنے معبود حقیقی کے کلام کے سمجھنے میں ہرگز کاہلی نہ کریں، اور اس نعمت لازوال سے بالکل محروم نہ رہیں، کہ بہت بڑی بدبختی اور کم قسمتی ہے، مگر اس میں اتنا اندیشہ ضرور ہے کہ فارسی خواں یا اردو داں جو محاورات عرب سے ناواقف ہے، محض سلیس ترجمہ کو دیکھ کر کچھ کا کچھ سمجھ جائے گا، کیونکہ پچھلی بات کا پہلی بات سے ملنا یا جدا ہوجانا اکثر مواقع میں بدون بتلائے ناواقف کی سمجھ میں نہیں آتا اور کسی مضمون مجمل اور مبہم میں کچھ کا کچھ سمجھ جانا عوام سے کچھ بعید نہیں، یہاں تلک کہ بعض آیتوں میں ضمیر کے مرجع میں غلطی کھا کر خرابی میں پڑنے کا اندیشہ ہے، نیز یہ امر بھی ضروری ہے کہ کلام الٰہی کے معنی بلا سند معتبر نہیں، اور سلف صالحین کے مخالف کسی آیت کے معنی لینے جہل اور گمراہی ہے، بالخصوص موضح القرآن کے ان فوائد کو سمجھنا جو کہ جگہ جگہ حضرت شاہ صاحب نے اشارۃً ارشاد فرمائے ہیں، بدون بتلائے عالم واقف کے ممکن نہیں جیسا کہ ابھی معروض کر آیا ہوں، سوان وجوہ سے لازم ہے کہ استاد سے سیکھنے میں مسلمان کاہلی اور کوتاہی نہ کریں، اور محض اپنی رائے پر اعتماد کر کے ثواب کے بدلے اللہ کا غصہ نہ کماویں، واللہ الموفق وھو یھدی السبیل۔

یہ مضمون حضرت شاہ صاحب کا ہے جو تھوڑی سی تفصیل اور تغیر کے ساتھ ہم نے مفید سمجھ کر عرض کر دیا ہے، اگر کاش مسلمانان ہند اس مفید قابل اہتمام مضمون کی پابندی کرتے تو آج ترجمہ موضح القرآن کے سمجھ میں نہ آنے کی شکایت نہ کرتے، اور جو حضرات ترجمہ موصوف کے سمجھنے میں آج سست اور کاہل نظر آتے ہیں وہ دوسروں کے سمجھانے میں چست اور مستعد نظر آتے، حضرات علماء عام اہل اسلام کی بہبودی اور نفع رسانی کی غرض سے سہل سے سہل نئے نئے ترجمے شائع کرتے رہتے ہیں، مگر انصاف سے اس وقت تک نفع مذکور باوجود کثرت تراجم عام اور شائع طور پر اہل اسلام میں نہیں پھیلا، جب تلک خود اہل اسلام ترجمۂ قرآن شریف کو ضروری اور مفید سمجھ کر اپنے شوق اور توجہ سے سیکھنا اور سمجھنا نہ چاہیں گے، اس وقت تک صرف تکثیر تراجم سے عوام کو کیا نفع پہنچ سکتا ہے، شیخ علیہ الرحمہ نے کیا خوب فرمایا ہے:

فہم سخن تا نکند مستمع قوت طبع از متکلم مجوئے

فسحت میداں ارادت بیا تا بزند مرد سخن گوئے گوئے

حضرات علماء نے عوام کی بہبودی کی غرض سے جیسے سہل اور آسان متعدد ترجمے شائع فرمادئے ہیں، ایسے ہی اس کی بھی حاجت ہے کہ علی العموم مسلمانوں کو ان ترجموں کے سیکھنے اور ان کے سمجھنے کی طرف رغبت بھی دلائی جائے، علمائے کرام اہل اسلام کو خاص طور سے ترجموں کے سمجھنے اور پڑھنے کی ضرورت اور اس کی منفعت دل نشین کرنے میں کوتاہی نہ فرمائیں، بلکہ ترجمہ کی تعلیم کے لئے ایسے سلسلے بھی قائم فرمادیں کہ جو چاہے بسہولت اپنی حالت کے مناسب اور فرصت کے موافق حاصل کر سکے، واللہ الموفق والمعین۔

التماس اخیر: حضرت شاہ صاحب کے اصل ترجمہ کا احسن التراجم اور انفع التراجم ہونا تو ان شاء اللہ ایسا نہیں کہ اہل علم و دیانت میں کوئی اس کا منکر ہو، ہاں احقر نے جو اس کی خدمت اور ترمیم کی ہے اس کی نسبت ضرور ہم کو خلجان ہے، اس لئے اہل علم وانصاف کی خدمت میں التماس ہے کہ اگر یہ ترجمہ شائع ہو کر کسی وقت آپ حضرات تک پہنچے تو اس کی حاجت ہے کہ ایک نظر اس کو ملاحظہ فرما کر جو امور قابل اصلاح معلوم ہوں ان سے ہم کو مطلع فرمانے میں تامل نہ فرمائیں، اور اگر کوئی صاحب بالاستقلال ترمیم فرمانا زیادہ پسند کریں تو وہ بالاستقلال اس خدمت کو انجام دینے میں سعی فرمائیں، ہماری غرض صرف یہ ہے کہ یہ عمدہ اور مفید ترجمہ جو اہل علم اور عوام دونوں کو مفید ہے، ایک تھوڑے سے بہانہ سے نظروں سے نہ گر جائے اور ہم اس کے فیض سے محروم نہ رہ جائیں، اور ایک صدقہ جاریہ میں خلل اور نقصان نہ آجائے، جس طرح ہو اور جو کوئی اس کی تلافی اور تدارک بہتر سے بہتر کر سکے وہ اس میں کوتاہی نہ کرے:

صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لئے

[ضمیمہ] یادداشت بعض امور کی جو ترجمہ یا فوائد میں خیال کیے گئے:

(از شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن رحمہ اللہ)

[حضرت شیخ الہندؒ کی یہ مختصر یادداشت مسودات ترجمہ میں موجود تھی جس سے فوائد پر ایک روشنی پڑتی ہے، یہ تحریر مقدمہ شیخ الہند کا حصہ نہیں، شیخ الہند نے اس موضوع اور ڈپٹی صاحب نذیر احمدؒ کے ترجمہ پر مستقل تنقید لکھنی شروع فرمائی تھی، جو حواشی ترجمہ کی طرح ناتمام رہ گئی، یہ ناتمام تحریر بھی فوائد و نکات سے پر ہے اس لئے مقدمہ کے ضمیمہ کے طور پر یہاں شامل کی جارہی ہے]۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ: لغت میں یہ بات مسلم ہے کہ الرحمن میں بہ نسبت الرحیم مبالغہ زیادہ ہے، لیکن اس کے فرق کی طرف سوائے شاہ صاحب کسی نے اشارہ نہیں کیا، بعض مترجموں نے تو بالکل الٹا کر دیا، شاہ صاحب کا فرق ایسا دقیق تھا کہ اس کو کسی نے خیال نہیں کیا شاہ صاحب نے تحریر فرمایا ہے "جو بڑا مہربان نہایت رحم والا" ہمارے ترجمہ میں اس کو خوب کھول دیا گیا اور یہ ترجمہ کیا گیا" بے حد مہربان نہایت رحم کرنے والا" رحمٰن اور رحیم دونوں کے مبالغہ کو ظاہر کر دیا اور "بے حد" اور "نہایت" کے لفظ

نے باہمی فرق بھی بتلادیا۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ: الحمد کا ترجمہ مولوی نذیر احمد صاحب نے ''ہر ہر طرح کی تعریف'' کیا ہے لیکن اس ترجمہ میں نہایت باریک نقص تھا، کیونکہ اس سے مفہوم ہوتا ہے کہ ہر قسم کی تعریفیں اللہ کے واسطے ہیں، اس سے استغراق انواع ثابت ہوا نہ کہ استغراق افراد اور استغراق افرادی بڑھا ہوا ہوتا ہے اور وہی مراد بھی ہے، اس لئے اس ترجمہ کو چھوڑ کر یہ ترجمہ کیا گیا ''سب تعریفیں اللہ کے لئے'' اس ترجمہ اور شاہ صاحب کے ترجمہ میں صرف الفاظ کے کم وبیش کا فرق ہے، امر مذکور کے فائدہ میں مضمون کو کھول دیا ہے۔

مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ: مولوی نذیر احمد صاحب نے اس کا ترجمہ ''بادشاہ'' کا کیا ہے، اگرچہ یہ ترجمہ اس قرأت کے موافق درست ہو جس میں مَلِکِ یوم الدین ہے، مگر اس قرأۃ کے موافق درست نہیں ہے، اس کا خیال رکھنا چاہئے تھا۔

غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْہِمْ: اس آیت شریفہ کا ترجمہ نہایت غور طلب امر ہے، تمام تفاسیر میں لکھا ہے کہ غیر الذین کی صفت ہے یا بدل ہے لیکن تمام مترجموں نے اس کا خیال نہیں کیا بلکہ خلاف ترکیب لفظی یہ ترجمہ کیا ہے ''نہ اس کی راہ''، البتہ شاہ صاحب کے ترجمہ میں دونوں احتمال تھے، اس لئے تمام تراجم کے خلاف اس آیت کے ترجمہ کو تفاسیر کے موافق کر دیا، اور فائدہ میں اصل مدعا کو کھول دیا ہے۔

الٓمٓ: حروف مقطعات کے معانی میں مولوی نذیر احمد صاحب نے علماء کے اوپر شخصی رائے کا الزام لگایا تھا، جس کے جواب کی طرف فائدہ میں اشارہ کیا ہے۔

لَا رَیْبَ فِیْہِ: اس آیت کے فائدہ میں بہت سے شبہات اور اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے۔

دو جگہ لفظ یَشْعُرُوْنَ وارد ہوا ہے تمام مترجموں نے دونوں جگہ ایک ہی ترجمہ کیا ہے یعنی ''نہیں سمجھتے'' البتہ شاہ صاحب نے فرق کیا ہے جو نہایت باریک ہے وہ یہ کہ اول میں ''بوجھتے'' اور دوسرے میں ''سمجھتے'' لیکن یہ فرق بہت مخفی تھا اس کو ہمارے ترجمہ میں کھول دیا گیا ہے۔

وَلَہُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ بِمَا یَکْذِبُوْنَ: کا ترجمہ مولوی نذیر احمد صاحب وغیرہ نے ''جھوٹ بولتے تھے'' کیا ہے اور شاہ صاحب نے ''جھوٹ کہتے تھے''، لیکن صحیح ترجمہ یہی ہے جو شاہ صاحبؒ نے کیا ہے، کیونکہ یہ سزا مطلقاً جھوٹ بولنے کی عادت کی نہ تھی، بلکہ خاص اس جھوٹ کہنے کی کہ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ یعنی نفاق کی، بولنے اور کہنے میں باریک فرق ہے اور فائدہ میں اس کو واضح کر دیا ہے۔

یَمُدُّہُمْ فِیْ طُغْیَانِہِمْ: اس آیت کے ترجمہ میں نذیر احمد صاحب وغیرہ مترجموں نے سب نے غلطی کی ہے کہ فِیْ طُغْیَانِہِمْ کو یَعْمَہُوْنَ کے متعلق کیا ہے، حالانکہ اس سے معتزلہ کے مذہب کی تائید ہوتی ہے، صحیح ترجمہ یہ ہے کہ اس کو یَمُدُّ کے متعلق کیا جائے اور جو مذہب اہل سنت کا ہے اس کو ظاہر کر دیا جائے، شاہ صاحب کا ترجمہ اسی طرح پر ہے اور ہمارے ترجمہ میں اس کو واضح کر دیا ہے، دوسری بات یہ ہے کہ مولوی نذیر احمد صاحب نے عمی اور عمہ کے فرق کو بالکل اڑا کر بے موقع ترجمہ کیا ہے، دیکھنے سے یہ فرق معلوم ہوگا۔

فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُہُمْ الخ: اس کا ترجمہ غلط کیا ہے۔

ذَھَبَ اللّٰہُ بِنُوْرِہِمْ: مولوی نذیر احمد صاحب نے آنکھوں کا نور مراد لیا ہے، حالانکہ یہ درست نہیں ہے۔

فَلَمَّآ اَضَآءَتْ مَا حَوْلَہٗ: اس آیت میں فعل لازم کا ترجمہ کیا ہے، حالانکہ قرآن مجید میں ہماری قرأت فعل متعدی کی ہے۔

مِنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ: اس کے ترجمہ میں بلا داعی تقدیم وتاخیر ایسی کی کہ مطلب الٹا ہو گیا۔

وَاُتُوْا بِہٖ مُتَشَابِہًا: مولوی نذیر احمد صاحب نے اپنے ترجمہ میں جنت کے تمام پھلوں کو ہم شکل بتایا ہے یہ احتمال مرجوح ہے، اس آیت پر فائدہ میں خوب تشریح کر دی گئی ہے۔

فَیَعْلَمُوْنَ اَنَّہُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّہِمْ: اس کے ترجمہ میں من ربھم کو معطوف بنا دیا اور محض خبط کیا۔

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللهِ: اس کا ترجمہ سب کے خلاف اور غلط معلوم ہوتا ہے۔

وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ: ترجمہ زوجہ کا بی بی کیا ہے، آگے جا کر محصنہ کا یہی ترجمہ ہے۔

اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ: غائب کا ترجمہ مخاطب کیا ہے۔

مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ: اس کا ترجمہ عطف کے ساتھ کیا ہے۔

بِكْرٌ: کا ترجمہ بچھیا کیا ہے۔

اِلَّآ اَمَانِيَّ: کے معنی مخدوش اور مرجوح لئے۔

فَلَنْ يُّخْلِفَ اللهُ عَهْدَهٗ: میں فاء کا ترجمہ "اور" کیا ہے۔

قَالُوْا سَمِعْنَا: کا ترجمہ "ان لوگوں نے گویا زبان حال سے یہ کہا"۔۔۔۔الخ کیا ہے۔

فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللهِ مُصَدِّقًا: حال کا ترجمہ غلط کیا ہے۔

يٰبَنِيَّ اِنَّ اللهَ اصْطَفٰى: بنی کا ترجمہ مفرد کیا ہے۔

پارہ سیقول: لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ: کو ترجمہ نذیریہ میں بار بار حکم دینے کو استقبال کعبہ کی علت بنایا ہے جو غلط ہے۔

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا: فا کا ترجمہ غلط کیا ہے۔

وعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ: اس سے مسئلہ غلط بیان کیا ہے۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ: اس کا ترجمہ بہت بے موقع کیا ہے، مگر تفسیر کبیر کا حوالہ دیا ہے۔

اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ: الخ کا ترجمہ غلط کیا ہے۔

ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ: کا ترجمہ خراب کیا۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ: کا ترجمہ الٹا کیا۔

فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ: معہ کو امنوا کے متعلق کیا جاوزہ کے نہیں کیا۔

فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗ قَالَ اَعْلَمُ الخ: اس کے ترجمہ اور فائدہ میں اظہار خباثت معلوم ہوتا ہے۔

لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ: اس کے ترجمہ اور فائدہ میں تعارض ہے اور مذہب کے بھی خلاف ہے۔

تلك الرسل: اَوْ كَالَّذِيْ مَرَّ عَلٰى قَرْيَةٍ الخ: کا ترجمہ بے ڈھنگا خلاف محاورہ کیا ہے۔

فَخُذْ اَرْبَعَةً: اس کا ترجمہ بے موقع ہوا ہے۔

فَتَرَكَهٗ صَلْدًا: صَلْدًا: کا ترجمہ "سپاٹ" نادرست معلوم ہوتا ہے۔

وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللهِ: اس کا ترجمہ خبط سے خالی نہیں۔

ولو اننا: قُلْ هِيَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا: فِي الحيوة کو غلطی سے اٰمَنُوا کے متعلق کر دیا ہے۔

ایاتها ۷ | ۱ سُوْرَةُ الْفَاتِحَةِ مَكِّيَّةٌ ۵ | رکوعها ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

خلاصہ تفسیر: شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں۔

بعض لوگوں نے یہ شبہ لکھ کر بھیجا ہے کہ بسم اللہ وغیرہ کے ترجمہ میں ذات باری تعالی کی طرف جمع کی ضمیر کیوں لوٹائی گئی، حالانکہ ضروری ہے کہ خدا کا نام اس انداز سے لیا جائے کہ توحید پر دلالت ہو، اس کے جواب میں لکھا کہ اول تو جی یوں چاہا کہ خدا کا نام تعظیم سے لیا جائے، رہی توحید تو وہ اس قدر مسلم ہے کہ اپنے عنوانات میں ایسے امور کے ملحوظ رکھنے کی چنداں حاجت نہیں، دوسرے یہ کہ کلام مجید میں خدا تعالی نے اپنے لیے جگہ جگہ جمع کا صیغہ ارشاد فرمایا ہے، جیسے: انّا نحن نزّلنا الذّکر وانّا لہ لحافظون۔

* * *

فائدہ: رحمٰن اور رحیم دونوں مبالغہ کے صیغے ہیں اور رحمٰن میں رحیم سے زیادہ مبالغہ ہے ترجمہ میں ان سب باتوں کا لحاظ ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۱

سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں ۱ جو پالنے والا سارے جہان کا ۲

خلاصہ تفسیر: سب تعریفیں اللہ کو لائق ہیں، جو مربی ہیں ہر ہر عالم کے۔

مخلوقات کی الگ الگ جنس ایک ایک ''عالم'' کہلاتا ہے، مثلاً عالم ملائکہ، عالم انسان، عالم جن۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی سب تعریفیں عمدہ سے عمدہ اوّل سے آخر تک جو ہوئی ہیں اور جو ہوں گی خدا ہی کو لائق ہیں، کیونکہ ہر نعمت اور ہر چیز کا پیدا کرنے والا اور عطا کرنے والا وہی ہے، خواہ بلا واسطہ عطا فرمائے یا بواسطہ، جیسے دھوپ کی وجہ سے اگر کسی کو حرارت یا نور پہنچے تو حقیقت میں آفتاب کا فیض ہے:

حمد را با تو نسبتے ست درست — بر در ہر کہ رفت بر در تست

تو اب اس کا یہ ترجمہ کرنا کہ (ہر طرح کی تعریف خدا ہی کو سزاوار ہے) بڑی کوتاہی کی بات ہے جس کو اہل فہم خوب سمجھتے ہیں۔

فائدہ: ۲ مجموعہ مخلوقات کو ''عالم'' کہتے ہیں اور اسی لئے اس کی جمع نہیں لاتے، مگر آیت میں ''عالم'' سے مراد ہر ہر جنس (مثلاً عالم جن، عالم ملائکہ، عالم انس وغیرہ وغیرہ) ہیں، اس لیے جمع لائے تا کہ جملہ افراد عالم کا مخلوقِ جناب باری ہونا خوب ظاہر ہو جائے۔

الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝۲ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝۳

بے حد مہربان نہایت رحم والا، مالک روز جزا کا ۱

خلاصہ تفسیر: جو بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں، جو مالک ہیں روز جزا کے۔

''روز جزا'' سے مراد قیامت کا دن ہے، جس میں ہر شخص اپنے عمل کا بدلہ پائے گا۔

* * *

فائدہ: ۱ اس [روز جزا] کے خاص کرنے کی ① اول وجہ تو یہی ہے کہ اس دن بڑے بڑے امور پیش آئیں گے ایسا خوفناک روز جو نہ

پہلے ہوا، نہ آگے کو ہوگا ② دوسرے اس روز بجز ذات پاک حق تعالیٰ کے کسی کو ملک وحکومت ظاہری بھی تو نصیب نہ ہوگی: لمن الملك اليوم لله الواحد القهار۔

اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ④

تیری ہی ہم بندگی کرتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں

خلاصہ تفسیر: ہم آپ ہی کی عبادت کرتے ہیں اور آپ ہی سے درخواست اعانت کی کرتے ہیں (یہ بندے کی طرف سے جناب باری تعالیٰ میں خطاب ہے)۔

اِيَّاكَ نَعْبُدُ: ''بندگی'' کی نسبت سالک کے مقام کی انتہا ہوتی ہے اور کوئی مقام ودرجہ اس سے بلند تر نہیں (مطلب یہ کہ کامل بندہ ہو جانا انسانیت کی معراج ہے، یہی وجہ ہے کہ تمام انبیاء کو ''عباد اللہ'' یعنی اللہ کے بندے کہا گیا ہے) ''سالک'' اس شخص کو کہتے ہیں جو صراط مستقیم اختیار کر چکا ہو اور اس پر گامزن ہو، ''مقام'' درجے اور رتبے کو کہا جاتا ہے جو ایمانیات سے تعلق رکھتا ہے۔

وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ: بندگی کے اقرار کے بعد اللہ سے مدد طلبی کی درخواست کرنا سالک کا مقام تمکین ہے، یعنی اظہار بندگی کے بعد اس میں جماؤ، رسوخ وپختگی کی درخواست کرنا اور اس کا خواہش مند ہونا انسان کو درجہ تمکین میں داخل کر دیتا ہے۔

''تمکین'' نفس کی اس کیفیت کو کہتے ہیں جو مسلسل عبادت اور کثرت ذکر وفکر کی وجہ سے نفس میں پختہ ہو جاتی ہے، اس کیفیت کے حاصل ہو جانے کے بعد عبادات میں دوام اور اخلاص کی دولت نصیب رہتی ہے، ایسی کیفیت والے کو صاحب تمکین کہا جاتا ہے۔

* * *

فائدہ: اس آیت شریفہ سے معلوم ہوا کہ اس کی ذات پاک کے سوا کسی سے حقیقت میں مدد مانگنی بالکل ناجائز ہے، ہاں! اگر کسی مقبول بندہ کو محض ''واسطہ رحمت الٰہی'' اور ''غیر مستقل'' سمجھ کر استعانت ظاہری اس سے کرے تو یہ جائز ہے کہ یہ استعانت درحقیقت حق تعالیٰ ہی سے استعانت ہے۔

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ⑤

بتلا ہم کو راہ سیدھی

صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ⑦ ع

راہ ان لوگوں کی جن پر تو نے فضل فرمایا۔ جن پر نہ تیرا غصہ ہوا اور نہ وہ گمراہ ہوئے ۲۔

خلاصہ تفسیر: بتلا دیجیے ہم کو راستہ سیدھا (مراد دین کا راستہ ہے) راستہ ان لوگوں کا جن پر آپ نے انعام فرمایا (مراد دین کا انعام ہے) نہ راستہ ان لوگوں کا جن پر آپ کا غضب ہوا، اور نہ ان لوگوں کا جو راستہ سے گم ہو گئے۔

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ: اس سے بھی اسی تمکین یعنی رسوخ وپختگی کا طالب ہوا جس کی تفصیل گذشتہ آیت میں بیان ہو چکی۔

صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ: ان انعام والوں کا پتہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں دوسری جگہ بتلا دیا ہے کہ وہ انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین ہیں، وہ آیت یہ ہے: ومن يطع الله والرسول فأولئك مع الذين انعم الله عليهم۔

غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ: راہ ہدایت چھوڑنے کی دو وجہ ہوا کرتی ہیں: ① ایک تو یہ کہ اس کی پوری تحقیق ہی نہ کرے ضالین سے ایسے لوگ مراد ہیں ② دوسری وجہ یہ ہے کہ تحقیق پوری ہونے کے باوجود اس پر عمل نہ کرے مغضوب علیهم سے ایسے لوگ مراد ہیں،

کیونکہ جان بوجھ کر خلاف کرنا زیادہ ناراضگی کا سبب ہوتا ہے۔

غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ: مؤمن مقام تلوین سے پناہ چاہتا ہے (یعنی گمراہ اور بے دین لوگوں سے محفوظ رہے) ''تمکین'' کے بالمقابل ''تلوین'' کی کیفیت ہے، یعنی نفس کی وہ کیفیت جو غیر یقینی اور متزلزل سی رہا کرتی ہے کہ کبھی وہ عبادت میں مشغول رہتا ہے، کبھی غفلت ونسیان کا شکار ہوجاتا ہے، کبھی گناہ کر بیٹھتا ہے اور پھر نادم وشرمندہ ہوجاتا ہے۔

عرض کیا گیا کہ سورہ فاتحہ کی آیات میں ربط کی تقریر کیوں نہیں فرمائی گئی؟ اس سورت کی آیات میں ربط ظاہر بھی ہے، نیز تفسیر لکھتے وقت ابتداء میں ربط کی تقریر کا التزام بھی ذہن میں نہ تھا، جیسے دیگر التزامات بھی نہ تھے، جوں جوں تفسیر لکھتا گیا ضرورتیں محسوس ہوتی گئیں، التزامات بڑھتے گئے، چنانچہ تقریبا تمام التزامات کا اہتمام سورہ مائدہ سے شروع ہوا۔

* * *

فائدہ: ١ جن پر انعام کیا گیا وہ چار فرقے ہیں: ① نبیین ② صدیقین ③ شہداء ④ صالحین، کلام اللہ میں دوسرے موقع پر اس کی تصریح ہے۔ ''صراط مستقیم'' سے محرومی کل دو طرح پر ہوتی ہے: ① عدم علم ② یا جان بوجھ کر، کوئی فرقہ گمراہ اگلا پچھلا ان دو سے خارج نہیں ہوسکتا، سو نصاریٰ تو وجہ اول میں، اور یہودی دوسری میں ممتاز ہیں، المغضوب علیھم سے ''یہود'' اور ضالین سے ''نصاریٰ'' مراد ہیں، دیگر آیات وروایات اس پر شاہد ہیں۔

فائدہ: ٢ یہ سورت خدا تعالیٰ نے بندوں کی زبان سے فرمائی کہ جب ہمارے دربار میں حاضر ہو تو ہم سے یوں سوال کیا کرو اس لیے اس سورت کا ایک نام تعلیم مسئلہ بھی ہے، اس سورت کے ختم پر لفظ آمین کہنا مسنون ہے اور یہ لفظ قرآن شریف سے خارج ہے، معنی اس لفظ کے یہ ہیں کہ ''الٰہی ایسا ہی ہو'' یعنی مقبول بندوں کی پیروی اور نافرمانوں سے علیحدگی میسر ہو اس سورت کے اول نصف میں اللہ تعالیٰ کی ثنا وصفت اور دوسرے حصہ میں بندہ کے لیے دعا ہے۔

فائدہ: غیر المغضوب الخ الذین کا بدل ہے یا اس کی صفت ہے، اس لیے اس کے مناسب ترجمہ کیا گیا، بعض تراجم دہلویہ میں جو اس کا ترجمہ کیا ہے خلاف ترکیب وخلاف مقصود ہے۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

الٓمّٓ ۚ﴿۱﴾ ذٰلِكَ الۡكِتٰبُ لَا رَيۡبَ ۛۚ فِيۡهِ ۚ هُدًى لِّلۡمُتَّقِيۡنَ ۙ﴿۲﴾

الم ۱؎ اس کتاب میں کچھ شک نہیں ۲؎ راہ بتلاتی ہے ۳؎ ڈرنے والوں کو ۴؎

خلاصہ تفسیر: سورہ فاتحہ سے اس سورت کا ربط یہ ہے کہ اس میں راہ ہدایت کی درخواست کی گئی تھی اور اس سورت میں اس درخواست کی منظوری ہے کہ لو یہ کتاب ہدایت ہے اس پر چلو۔

الم، یہ کتاب ایسی ہے جس میں کوئی شبہ نہیں (یعنی قرآن کے من جانب اللہ ہونے میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں، اگر چہ کوئی نافہم اس میں شبہ رکھتا ہو، کیونکہ یقینی بات کسی کے شبہ کرنے سے بھی حقیقت میں یقینی ہی رہتی ہے) راہ بتلانے والی ہے خدا سے ڈرنے والوں کو (کیونکہ جسے خوف خدا نہ ہو وہ قرآن کا بتایا ہوا طریقہ نہیں دیکھتا)۔

الٓمّٓ: حروف مقطعات کے معانی کی عام لوگوں کو اطلاع نہیں دی گئی، شاید رسول اللہ ﷺ کو بتلا دیے گئے ہوں، کیونکہ اللہ و رسول ﷺ نے ہمیں اہتمام کے ساتھ وہی باتیں بتلائی ہیں جن کے نہ جاننے سے دین میں کوئی حرج واقع ہوتا ہو، چونکہ حروف مقطعات کے نہ جاننے سے کوئی حرج نہ تھا، اس لیے ہمیں بھی ایسے امور کی تفتیش نہیں کرنی چاہیے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ الٓمّٓ: ان حروف کو "مقطعات" کہتے ہیں ان کے اصلی معنی تک اوروں کی رسائی نہیں، بلکہ یہ بھید ہے اللہ اور رسول کے درمیان جو بوجہ مصلحت و حکمت ظاہر نہیں فرمایا، اور بعض اکابرؒ سے جو ان کے معنی منقول ہیں اس سے صرف تمثیل و تنبیہ و تسہیل مقصود ہے، یہ نہیں کہ مراد حق تعالیٰ یہ ہے، تو اب اس کو رائے شخصی کہہ کر تغلیط کرنا محض شخصی رائے ہے جو تحقیق علماء کے بالکل خلاف ہے۔

فائدہ: ۲؎ لَا رَيۡبَ فِيۡهِ: یعنی اس کے کلام الٰہی ہونے اور اس کے جملہ مضامین کے واقعی ہونے میں کچھ شبہ نہیں۔

جاننا چاہیے کہ کسی کلام میں اشتباہ ہونے کی دو صورتیں ہیں: ① یا تو خود اس کلام میں کوئی غلطی اور خرابی ہو ② یا سننے والے کے فہم میں خلل ہو، اوّل صورت میں محل ریب (اشتباہ) یہ کلام ہے اور دوسری صورت میں محل ریب (اشتباہ) حقیقت میں سمجھنے والے کا فہم ہے، کلام بالکل حق ہے، گو اس کو اپنی نافہمی سے وہ کلام محل ریب معلوم ہو، سو اس آیت میں ریب کی صورت اول کی نفی فرمائی ہے تو اب یہ شبہ کہ کلام اللہ کے کلام الٰہی اور حق ہونے میں تو سب کفار کو ریب و انکار تھا پھر اس نفی کے کیا معنی؟ بالکل جاتا رہا، باقی رہی صورت ثانی اس کو آگے چل کر فرما دیا گیا: **وان کنتم فی ریب مما نزلنا علی عبدنا** الخ (سورہ بقرہ: ۲۳)۔

فائدہ: ۳؎ هُدًى: یہاں سے اخیر قرآن تک جواب ہے **اهدنا الصراط المستقیم** کا جو سوال بندوں کی طرف سے ہوا تھا۔

فائدہ: ۴؎ لِّلۡمُتَّقِيۡنَ: یعنی جو بندے اپنے خدا سے ڈرتے ہیں، ان کو یہ کتاب راستہ بتلاتی ہے کیونکہ جو اپنے خدا سے خائف ہوگا اس کو امور مرضیہ اور غیر مرضیہ یعنی طاعت و معصیت کی ضرور تلاش ہوگی اور جس نافرمان کے دل میں خوف ہی نہیں، اس کو طاعت کی کیا فکر اور معصیت سے کیا اندیشہ!!۔

الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝۳

جو کہ یقین کرتے ہیں بے دیکھی چیزوں کا ۱ اور قائم رکھتے ہیں نماز کو ۲ اور جو ہم نے روزی دی ہے ان کو اس میں سے خرچ کرتے ہیں ۳

خلاصہ تفسیر: (مومنین کی صفات:) وہ خدا سے ڈرنے والے لوگ ایسے ہیں کہ یقین لاتے ہیں چھپی ہوئی چیزوں پر (یعنی جو چیزیں ان کے حواس وعقل سے پوشیدہ ہیں صرف اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمانے سے ان کو صحیح مان لیتے ہیں) اور قائم رکھتے ہیں نماز کو (''قائم'' رکھنا یہ ہے کہ اس کو اس پابندی کے ساتھ اس کے وقت میں پورے شرائط وارکان کے ساتھ ادا کریں) اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں (یعنی نیک کاموں میں)۔

الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ: غیب سے مراد ''ماغاب عنا'' ہے، یعنی جو چیزیں ہم سے چھپی ہوئی ہیں، اصطلاحی معنی مراد نہیں، کیونکہ اصطلاح میں ''غیب'' اس کو کہتے ہیں جس پر کوئی دلیل بھی قائم نہ ہو، اور ظاہر ہے کہ ایمان اسی چیز پر ہوگا جو کسی دلیل سے ثابت ہو۔

وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ: اس سے جس طرح مال خرچ کرنا ثابت ہو رہا ہے اسی طرح اس کے عموم میں یہ بھی داخل ہے کہ ہم نے اہل اللہ کو جو معرفت کا نور اور قلبی کیفیات عطا کیں ہیں یہ حضرات اس کا فیض دوسروں تک برابر پہنچاتے ہیں اور دوسروں کو اس میں شامل رکھتے ہیں۔

***

فائدہ: ۱ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ: یعنی جو چیزیں ان کے عقل وحواس سے مخفی ہیں (جیسے دوزخ، جنت، ملائکہ وغیرہ) ان سب کو اللہ اور رسول کے ارشاد کی وجہ سے حق اور یقینی سمجھتے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ ان امور غائبہ کا منکر ہدایت سے محروم ہے۔

فائدہ: ۲ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ: اقامت صلوٰۃ کا مطلب ہے کہ ہمیشہ حقوق کی رعایت کے ساتھ وقت پر ادا کرتے ہیں۔

فائدہ: ۳ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ: سب طاعتوں کی اصل تین ہیں: ① اول جو باتیں دل سے تعلق رکھتی ہیں ② دوسری بدن سے ③ تیسری مال سے، سو اس آیت میں ہر سہ (۳) اصول کو ترتیب وار لے لیا۔

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝۴

اور وہ لوگ جو ایمان لائے اس پر کہ جو کچھ نازل ہوا تیری طرف اور اس پر کہ جو کچھ نازل ہوا تجھ سے پہلے، اور آخرت کو وہ یقینی جانتے ہیں

خلاصہ تفسیر: اور وہ لوگ ایسے ہیں کہ یقین رکھتے ہیں اس کتاب پر بھی جو آپ کی طرف اتاری گئی ہے، اور ان کتابوں پر بھی جو آپ سے پہلے اتاری جا چکی ہیں (مطلب یہ ہے کہ ان کا ایمان قرآن پر بھی ہے اور پہلی کتابوں پر بھی جیسے تورات وانجیل) اور آخرت پر بھی وہ لوگ یقین رکھتے ہیں۔

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ: مطلب یہ کہ ان کا ایمان قرآن پر بھی ہے اور پہلی کتابوں پر بھی، مگر عمل صرف قرآن پر ہے، کیونکہ دوسری کتابیں منسوخ ہوگئی ہیں، ان پر عمل جائز نہیں، ''ایمان'' سچا سمجھنے کو کہتے ہیں، ''عمل کرنا'' دوسری بات ہے، پس جتنی کتابیں اللہ تعالیٰ نے پہلے انبیاء پر نازل فرمائی ہیں ان کو سچا سمجھنا فرض اور شرطِ ایمان ہے، یعنی یہ سمجھے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائی تھیں وہ صحیح ہیں، خود غرض لوگوں نے جو اس میں تبدیل وتحریف کی ہے وہ غلط ہے۔

يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ: اسی پر قیاس کیا جائے گا کہ اعتقاد تو تمام اہل حق سے ایسا ہی رکھنا چاہیے جیسا اپنے شیخ واستاذ سے رکھا جاتا ہے، البتہ اتباع وپیروی اپنے شیخ واستاذ کی کرنی چاہیے، جیسا کہ بعینہ یہی حکم انبیا کرام کے بارے میں آیا ہے، یعنی تصدیق وتعظیم تو تمام انبیا کرام کی یکساں رکھنی چاہیے، البتہ اطاعت وپیروی صرف خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی ہوگی۔

***

فائدہ: اس سے پہلی آیت میں ان لوگوں کا بیان تھا جن مشرکین نے ایمان قبول کیا (یعنی اہل مکہ) اور اس آیت میں ان کا بیان ہے جو اہل کتاب (یعنی یہود ونصاریٰ) مشرف با اسلام ہوئے۔

أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿٥﴾

وہی لوگ ہیں ہدایت پر اپنے پروردگار کی طرف سے، اور وہی ہیں مراد کو پہنچنے والے

خلاصہ تفسیر: بس یہ لوگ ہیں ٹھیک راہ پر جو ان کے پروردگار کی طرف سے ملی ہے، اور یہ لوگ ہیں پورے کامیاب (یعنی ایسے لوگوں کو دنیا میں تو یہ نعمت ملی کہ راہ حق ملی اور آخرت میں ہر طرح کی کامیابی ان کے لیے ہے)۔

* * *

فائدہ: یعنی اہل ایمان کے دونوں گروہ مذکورہ بالا دنیا میں ان کو ہدایت نصیب ہوئی اور آخرت میں ان کو ہر طرح کی مراد ملے گی، جس سے معلوم ہو گیا کہ جو نعمت ایمان اور اعمال حسنہ سے محروم رہے ان کی دنیا وآخرت دونوں برباد ہیں۔

ربط: اب ان دونوں فریق مومنین سے فارغ ہو کر اس کے آگے ''کفار'' کی حالت بیان کی جاتی ہے:

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿٦﴾

بے شک جو لوگ کافر ہو چکے برابر ہے ان کو تو ڈرائے یا نہ ڈرائے وہ ایمان نہ لائیں گے

خلاصہ تفسیر: نزول قرآن کے بعد لوگوں کی تین قسمیں ہو گئیں: ایک وہ جو دل اور زبان سے قرآن اور دین کو مانتے تھے، یہاں تک انہی کا ذکر تھا، اب دوسری قسم کا بیان ہے یہ وہ جو نہ زبان سے مانتے تھے، نہ دل سے، ایسے لوگ قرآن کی اصطلاح میں ''کافر'' کہلاتے ہیں۔

بیشک جو لوگ کافر ہو چکے ہیں، برابر ہے ان کے حق میں، خواہ آپ ان کو ڈرائیں یا نہ ڈرائیں، وہ ایمان نہ لائیں گے۔

سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ: اس آیت سے غرض نہیں کہ ان کو عذاب الٰہی سے ڈرانے اور احکام سنانے کی ضرورت نہیں، یہ تو رسول مقبول ﷺ کا خاص منصبی کام تھا، بلکہ مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ ان کے ایمان لانے کی فکر نہ کریں اور ان کے ایمان نہ لانے سے مغموم نہ ہوں، ان کے ایمان لانے کی امید نہیں، اور اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ پھر ایسوں کو احکام سنانا عبث (بیکار) ہوا، تو ایک عبث فعل رسول مقبول ﷺ کو کیوں سپرد ہوا؟ جواب یہ ہے کہ عبث اس کو کہتے ہیں جس میں کوئی بھی فائدہ نہ ہو، یہاں اگر ان لوگوں کو فائدہ نہ ہوگا نہ ہو، رسول مقبول ﷺ کو تو فائدہ ہوگا کہ ادائے تبلیغ و پیغام کا ثواب تو یقیناً ملے گا، یعنی یہ برابری کفار کے حق میں ہے، رسول اللہ ﷺ کے حق میں نہیں، بلکہ ان کو تو تبلیغ و تعلیم اور اصلاح خلق کی کوشش کا ثواب بہر حال ملے گا، اسی لئے پورے قرآن کریم کی کسی آیت میں رسول اللہ ﷺ کو ایسے لوگوں کو بھی دعوت ایمان دینے سے نہیں روکا گیا، اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص دعوت دین اور اصلاح کا کام کرتا ہے، خواہ مؤثر ہو یا نہ ہو، اس کو بہر حال اپنے عمل کا ثواب ملتا ہے۔

أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ: یعنی وہ ایمان نہیں لائیں گے، شبہ ہوتا ہے کہ بہت سے کافر تو ایمان بھی لے آتے ہیں؟ جواب یہ ہے کہ اس آیت میں ان سب کافروں کا بیان نہیں، بلکہ یہ بات خاص ان کافروں کے متعلق ہے جن کی نسبت خدا تعالیٰ کو معلوم ہے کہ ان کا خاتمہ کفر پر ہوگا، عام کافر مراد نہیں، ان میں بہت سے لوگ بعد میں مسلمان ہو گئے۔

سوال ہوتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ان کفار کی نسبت یہ خبر دے دی کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے تو اب ایمان نہ لانے میں انہیں معذور سمجھنا چاہیے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی خبر کے خلاف واقع ہونا تو محال ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا ایسا ہی ہے جیسے ماہر حکیم کسی مریض کے بارے میں کہے کہ اس کا مرض فلاں درجہ میں پہنچ گیا ہے، اب یہ تندرست نہیں ہوگا، سو ظاہر ہے کہ وہ بیمار اس حکیم کے کہنے سے اس انتہائی درجہ پر نہیں پہنچا، بیماری کی شدت تو اس کی اپنی کسی بے احتیاطی کے سبب

پہلے سے ہے، بلکہ حکیم کا یہ کہنا اس کے بیمار ہونے کی وجہ سے ہے، اسی طرح یہاں سمجھنا چاہیے کہ اس کافر کا نا قابل ایمان ہونا اللہ تعالیٰ کی اس خبر دینے سے نہیں ہوا، بلکہ خود اللہ تعالیٰ کا یہ خبر دینا اس کافر کے نا قابل ایمان ہونے کی وجہ سے ہے، اور نا قابل ایمان ہونے کی صفت خود اس کافر کی شرارت وعناد اور حق کی مخالفت کے سبب پیدا ہوئی، جیسا کہ مشاہدہ میں آتا ہے کہ جب آدمی کسی کی مخالفت پر آمادہ و کمر بستہ ہو جاتا ہے اور ہر وقت اسی کوشش میں لگا رہتا ہے تو موافقت اور مصالحت کی صلاحیت واستعداد گھٹتی جاتی ہے، حتیٰ کہ بالکل ختم ہو جاتی ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ہر شخص میں اس کی پیدائش کے ساتھ حق کے قبول کرنے کی استعداد رکھی ہے، مگر یہ شخص خود اپنی ہوائے نفسانی و خود غرضی کی وجہ سے حق کی مخالفت کرتا ہے، حتیٰ کہ ایک روز استعداد فنا ہو جاتی ہے، اس وقت وہ ایسی حالت میں ہوتا ہے کہ روحانی طبیب یوں کہہ سکے کہ اب یہ حق کو قبول نہ کرے گا، کیونکہ اس کی استعداد درست نہیں رہی۔

* * *

فائدہ: ان کفار سے خاص وہ لوگ مراد ہیں جن کے لئے کفر مقرر ہو چکا اور دولتِ ایمان سے ہمیشہ کے لئے محروم کر دیئے گئے (جیسے ابو جہل ابولہب وغیرہ) ورنہ ظاہر ہے کہ بہت سے لوگ جو کافر تھے مشرف با اسلام ہوئے اور ہوتے رہتے ہیں۔

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ؕ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ؗ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝٧ ع

مہر کر دی اللہ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر، اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے، اور ان کے لئے بڑا عذاب ہے

خلاصہ تفسیر: بند لگا دیا ہے اللہ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر اور انکی آنکھوں پر پردہ ہے، اور ان کیلئے سزا بڑی ہے۔

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ: اس پر یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ہی ان کے دلوں پر مہر کر دی اور حواس کو ماؤف کر دیا ہے تو یہ اپنے کفر میں معذور ہو گئے، پھر ان کو عذاب کیسا؟ جواب یہ ہے کہ اوپر بیان ہو چکا کہ ان لوگوں نے شرارت وعناد کر کے باختیار خود اپنی استعداد برباد کر لی ہے، اس لئے اس استعداد کی تباہی کے سبب وہ خود بنے، اور یہ ظاہر ہے کہ تمام افعال کا پیدا کرنے والا خدا تعالیٰ ہے، جب بندہ کوئی اچھا یا برا کام کرنا چاہتا ہے تو حق تعالیٰ اس کام کو پورا کر دیتے ہیں، اس لیے اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے خالق ہونے کا بیان فرمایا ہے کہ جب ان لوگوں نے قبول حق کی صلاحیت واستعداد کو اپنے اختیار سے تباہ کرنا چاہا تو سنت الٰہیہ کے مطابق ہم نے بھی وہ بد استعدادی کی کیفیت ان کے قلوب اور حواس میں پیدا کر دی، یعنی ان کا برا فعل اس مہر اور بند لگانے کا سبب ہوا، بند لگانے سے اسی بد استعدادی کا پیدا کرنا مراد ہے، سو یہاں بھی ان کا اپنا اختیاری فعل وارادہ اس مہر اور بند لگانے کا سبب ہوا، بد استعدادی کا سبب مہر لگانا نہیں، پس ان کی معذوری کی کوئی وجہ نہیں۔

اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کسی مہربان صاحب حیثیت امیر نے کسی غریب کا ہزار روپے عطیہ مقرر کر دیا ہو، مگر وہ غریب نا قدر شناس جب بھی عطیہ ملتا ہو فوراً ہی اسے کسی کنوئیں یا دریا میں پھینک آتا ہے، نہ اس کے کام آئے، نہ دوسروں کے، اس صاحب حیثیت نے چند بار اس نامعقول حرکت سے منع بھی کیا، مگر اس غریب نے ایک نہ سنی، اور نہ امید رہی کہ وہ مانے گا، چنانچہ اس صاحب حیثیت نے وہ عطیہ بند کر دیا، اور افسوس ہے کہ اس غریب کو اس عطیہ بند کرنے کا بھی کچھ غم وافسوس نہ ہوا، نہ اس نے کچھ معذرت کی، اس وقت وہ امیر اپنی رعایا کو اطلاع دینے کے لیے کہے کہ اس نمک حرام نے ہمارے عطیہ کی جب ایسی بے قدری کی تو ہم نے بھی وہ عطیہ بند کر دیا، ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ اس مثال میں قابل ملامت وہ نمک حرام ہوگا، نہ کہ وہ صاحب حیثیت امیر۔

* * *

فائدہ: ان کے دلوں پر مہر کر دی (یعنی حق بات کو نہیں سمجھتے) اور کانوں پر مہر کر دی (یعنی سچی بات کو متوجہ ہو کر نہیں سنتے) اور آنکھوں پر پردہ ہے (یعنی راہ حق کو نہیں دیکھتے)۔

ربط: کفار کا بیان ختم ہو گیا اب ''منافقوں'' کا حال اس کے بعد تیرہ آیتوں میں ذکر کیا جاتا ہے:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ⑧

اور لوگوں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں ہم ایمان لائے اللہ پر اور دن قیامت پر اور وہ ہرگز مومن نہیں ۱؎

يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ⑨

دغا بازی کرتے ہیں اللہ سے اور ایمان والوں سے، اور در اصل کسی کو دغا نہیں دیتے مگر اپنے آپ کو اور نہیں سوچتے ۲؎

خلاصہ تفسیر: اب یہاں سے تیسرے لوگوں کا بیان ہے جو کسی مصلحت اور دباؤ کے سبب زبان سے مانتے تھے، مگر دل سے بالکل نہ مانتے تھے، ایسے لوگوں کو شریعت کی اصطلاح میں ''منافق'' کہا جاتا ہے۔

اور لوگوں میں بعض ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں ہم ایمان لائے اللہ پر اور آخری دن پر حالانکہ وہ بالکل ایمان والے نہیں (بلکہ محض) چال بازی (کی راہ سے ایمان کا اظہار) کرتے ہیں اللہ سے، اور ان لوگوں سے جو ایمان لا چکے ہیں، اور واقع میں کسی کے ساتھ بھی چال بازی نہیں کرتے بجز اپنی ذات کے، اور وہ اس کا شعور نہیں رکھتے (یعنی اس چالبازی کا برا انجام خود اپنے ہی کو بھگتنا پڑے گا)۔

يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا: اس میں اشارہ ہے کہ اہل اللہ کے ساتھ ایسا کوئی معاملہ کرنا مثلاً دشمنی، دھوکہ، فریب وغیرہ کی شکل کا ایسا ہی ہے جیسے حق تعالیٰ اور رسول کے ساتھ فریب کرنا۔

فائدہ: ۱؎ یعنی دل سے ایمان نہیں لائے جو حقیقت میں ایمان ہے، صرف زبان سے فریب دینے کیلئے اظہار ایمان کرتے ہیں۔

فائدہ: ۲؎ یعنی ان کی فریب بازی نہ خدائے تعالیٰ کے اوپر چل سکتی ہے کہ وہ عالم الغیب ہے اور نہ مومنین پر کہ حق تعالیٰ مومنین کو بواسطہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر دلائل وقرائن کے منافقین کے فریب سے آگاہ فرما دیتا ہے، بلکہ ان کی فریب بازی کا وبال اور اس کی خرابی حقیقت میں ان ہی کو پہنچتی ہے، مگر وہ اس کو اپنی غفلت اور جہالت اور شرارت سے نہیں سوچتے اور نہیں سمجھتے، اگر غور کریں تو سمجھ لیں کہ اس فریب بازی سے مسلمانوں کو نقصان نہیں پہنچتا، بلکہ اس کا نتیجہ خراب ہم کو پہنچ رہا ہے، حضرت شاہ صاحب قدس سرہ (شاہ عبدالقادر صاحب رحمہ اللہ) کے فہم کی نزاکت ہے کہ یہاں **یشعرون** کا ظاہر ترجمہ چھوڑ کر اس کا ترجمہ ''بوجھنا'' یعنی سوچنا فرمایا۔

فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۢ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ⑩

ان کے دلوں میں بیماری ہے پھر بڑھا دی اللہ نے ان کی بیماری ۱؎ اور ان کے لئے عذاب دردناک ہے اس بات پر کہ جھوٹ کہتے تھے ۲؎

خلاصہ تفسیر: اُن کے دلوں میں بڑا مرض ہے، سو اور بھی بڑھا دیا اللہ نے اُن کا مرض (اس مرض میں اُن کی بداعتقادی وحسد اور ہر وقت اپنا کفر ظاہر ہو جانے کی فکر وخلجان سب داخل ہیں، چونکہ اسلام کو روز بروز ترقی ہوتی جاتی تھی اس لیے ان کے دلوں میں ساتھ ساتھ یہ امراض ترقی پاتے جاتے تھے) اور ان کے لئے سزائے دردناک ہے، اس وجہ سے کہ وہ جھوٹ بولا کرتے تھے (یعنی ایمان کا جھوٹا دعویٰ کیا کرتے تھے)۔

فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ: اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جیسے جسم کی بیماریاں ہیں دل (باطن) کے بھی امراض ہیں، تصوف میں دل کی بیماریوں کا ہی علاج کیا جاتا ہے، جیسے حسد، کینہ، بغض وعداوت، غضب وشہوت، کبر وعجب، ریا وتفاخر وغیرہ یہ سب قلبی باطنی امراض ہیں۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی ان کے دلوں میں نفاق اور دین اسلام سے نفرت اور مسلمانوں سے حسد اور عناد یہ مرض پہلے سے موجود تھے اب نزول قرآن اور ظہور شوکت اسلام اور ترقی ونصرت اہل اسلام کو دیکھ دیکھ کر ان کی وہ بیماری اور بڑھ گئی۔

فائدہ: ۲ اس جھوٹ کہنے سے وہی اسلام کا جھوٹا دعویٰ اٰمنا باللہ وبالیوم الاٰخر مراد ہے جو اوپر گزر چکا، یعنی عذاب الیم حقیقت میں ان کے نفاق کی سزا ہے، نہ مطلق جھوٹ بولنے کی، حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ علیہ کو اسی باریک فرق پر متنبہ فرمانا منظور ہے جو یکذبون کا ترجمہ جھوٹ بولنے کی جگہ ''جھوٹ کہنا'' فرماتے ہیں، فجزاہ اللہ ما ادق نظرہ۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ ۙ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ⑪

اور جب کہا جاتا ہے ان کو فساد نہ ڈالو ملک میں، تو کہتے ہیں ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں ۱

اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ⑫

جان لو وہی ہیں خرابی کرنے والے لیکن نہیں سمجھتے ۲

خلاصہ تفسیر: اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ مت فساد کرو زمین میں، تو کہتے ہیں ہم تو اصلاح ہی کرنے والے ہیں، یاد رکھو بیشک یہی لوگ مفسد ہیں لیکن وہ (اپنی جہالت یا شرارت کی وجہ سے) اس کا شعور نہیں رکھتے (ان لوگوں کی ایک جہالت تو اس سے معلوم ہوئی کہ اپنے عیب ہی کو ہنر سمجھتے ہیں کہ فساد کو اصلاح بتاتے ہیں)۔

اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ: منافقین کی دورخی روش سے جب فتنے فساد واقع ہونے لگے اور کسی خیر خواہ نے فہمائش کی کہ ایسی کاروائی موجب فساد ہوا کرتی ہے اس کو چھوڑ دو، تو اس کے جواب میں یہ اپنے آپ کو بجائے مفسد کے ''مصلح'' بتاتے ہیں یعنی اپنے فساد ہی کو اصلاح سمجھتے ہیں۔

* * *

فائدہ: ۱ خلاصہ یہ ہے کہ منافقین بچند وجوہ فساد پھیلاتے تھے: ① اول تو خواہشات نفسانیہ میں منہمک تھے اور احکام شرعیہ کی اطاعت سے کاہل اور متنفر تھے ② دوسرے مسلمانوں اور کافروں دونوں کے پاس آتے جاتے تھے اور اپنی قدر و منزلت بڑھانے کو ہر ایک کی باتیں دوسروں تک پہنچاتے رہتے تھے۔

③ تیسرے کفار سے نہایت مدارات و مخالطت سے پیش آتے تھے، اور امور دین کی مخالفت پر کفار سے اصلا مزاحمت نہ کرتے تھے اور کفار کے اعتراضات و شبہات کو جو دین کی باتوں پر ہوتے تھے مسلمانوں کے روبرو نقل کرتے تھے، تاکہ ضعیف الاعتقاد اور ضعیف الفہم احکام شرعیہ میں متردد ہو جائیں اور جب کوئی ان فسادات سے ان کو منع کرتا تو جواب دیتے تھے کہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں اور چاہتے ہیں کہ تمام قوم اور ملک مثل زمانہ سابق شیر و شکر ہو کر رہیں اور دین جدید کی وجہ سے جو مخالفت بڑھ گئی ہے بالکل جاتی رہے، چنانچہ ہر زمانہ میں دنیا طلب ہوا پرست ایسا ہی کہا کرتے ہیں۔

فائدہ: ۲ یعنی اصلاح تو حقیقت میں یہ ہے کہ دین حق جملہ ادیان پر غالب ہو اور جملہ اغراض و منافع دنیاوی سے احکام شرعیہ کی رعایت زیادہ کی جائے اور در بارہ دین کسی کی موافقت و مخالفت کی پروانہ ہو، ''خاک بر دلداری اغیار پاش'' منافقین بحیلہ مصالحت و مصلحت اندیشی جو کچھ کرتے ہیں وہ حقیقت میں فساد محض ہے مگر ان کو اس کا شعور نہیں۔

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْٓا اَ نُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ ؕ

اور جب کہا جاتا ہے ان کو ایمان لاؤ جس طرح ایمان لائے سب لوگ تو کہتے ہیں ۱ کیا ہم ایمان لائیں جس طرح ایمان لائے بیوقوف ۲

اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ ⑬

جان لو وہی ہیں بیوقوف لیکن نہیں جانتے ۳

خلاصہ تفسیر: (اب ان کی دوسری جہالت کا بیان ہے کہ دوسروں کے ہنر کو یعنی ایمان خالص کو عیب اور حقیر سمجھتے ہیں) اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم بھی ایسا ہی ایمان لے آؤ جیسا ایمان لائے ہیں اور لوگ، تو کہتے ہیں کہ کیا ہم ایمان لائیں گے جیسا ایمان لے آئے ہیں یہ بیوقوف، یاد رکھو کہ بیشک یہی ہیں بیوقوف، لیکن اس کا علم نہیں رکھتے۔

اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ: شبہ ہوتا ہے کہ منافقین تو اپنے کفر کو چھپاتے تھے، پھر ایسی کفر کی باتیں مسلمانوں سے کیونکر کر سکتے تھے؟ جواب یہ ہے کہ وہ ایسی بے باکانہ گفتگو غریب مسلمانوں کے سامنے کر گزرتے تھے جن سے ان کو کچھ اندیشہ نہ تھا، باوجاہت مسلمانوں کے سامنے تو وہی نفاق اور خوشامد کی باتیں کرتے رہتے تھے، یہ بھی احتمال ہے کہ ایسی بات اپنی ہی جماعت سے کرتے ہوں لیکن پہلی بات راجح ہے۔

* * *

فائدہ: ۱۔ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ: یعنی ① اپنے دلوں میں یہ کہتے تھے ② یا آپس میں ③ یا ان ضعفائے مسلمین سے جو کسی وجہ سے ان کے رازدار بن رہے تھے۔

فائدہ: ۲۔ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ: سفہاء کہا ''سچے مسلمانوں کو'' کہ احکام خداوندی پر دل سے ایسے فدا تھے کہ لوگوں کی مخالفت اور اس کے نتائج بد سے اور انقلاب زمانہ کے مضرات گوناگوں سے اپنا بچاؤ نہ کرتے تھے، بخلاف منافقین کے کہ مسلمان و کفار سب سے ظاہر بنا رکھا تھا اور اغراض نفسانی کے سبب آخرت کا کچھ فکر نہ تھا، مصلحت بینی اس درجہ غالب تھی کہ ایمان و پابندی احکام شرع کی ضرورت نہ سمجھتے تھے، فقط دعویٰ زبانی اور ضروری اعمال بہ مجبوری ادا کر لینے پر قناعت تھی۔

فائدہ: ۳۔ وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ: یعنی بیوقوف حقیقت میں منافقین ہی ہیں کہ مصالح واغراض دنیاوی یاد رہا کی وجہ سے آخرت کا خیال نہ کیا، فانی کو لینا اور باقی کو چھوڑنا کس قدر حماقت ہے اور مخلوقات سے ڈرنا کہ جن سے ہزار طرح اپنا بچاؤ کر سکتے ہیں اور علام الغیوب سے نہ ڈرنا کہ جہاں کسی طرح کوئی امر پیش ہی نہ کیا جا سکے کتنی جہالت ہے، اور صلح کل کیسے کہ جس میں احکم الحاکمین اور اسکے مقبول بندوں سے مخالفت کی جاتی ہے مگر منافقین اس درجہ بیوقوف ہیں کہ ایسی موٹی بات بھی نہیں سمجھتے۔

وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ

اور جب ملاقات کرتے ہیں مسلمانوں سے تو کہتے ہیں، ہم ایمان لے آئے ہیں، اور جب تنہا ہوتے ہیں اپنے شیطانوں کے پاس ۱

قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ⑭

تو کہتے ہیں کہ بیشک ہم تمہارے ساتھ ہیں ۲۔ ہم تو ہنسی کرتے ہیں (مسلمانوں سے) ۳۔

خلاصہ تفسیر: اور جب ملتے ہیں وہ منافقین ان لوگوں سے جو ایمان لائے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں، اور جب خلوت میں پہنچتے ہیں اپنے شریر سرداروں کے پاس تو کہتے ہیں کہ ہم بیشک تمہارے ساتھ ہیں، ہم تو (مسلمانوں سے) صرف استہزا کیا کرتے ہیں (یعنی ہم مسلمانوں سے بطور تمسخر کہہ دیتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں ورنہ ہم تو تمہارے ہم مشرب ہیں)۔

وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا: شبہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے منافقین کا یہ قول کہ ''ہم ایمان لائے'' پہلے آیت ۸ میں بھی نقل فرمایا ہے اور یہاں پھر نقل کیا تو تکرار لازم آتا ہے؟ جواب یہ ہے کہ اسے تکرار نہ سمجھیں، کیونکہ تکرار وہ ہوتا ہے کہ جہاں دوبارہ بیان کرنے میں کوئی نئی غرض یا نیا فائدہ نہ ہو، سو یہاں ایسا نہیں ہے، پہلے صرف ان کا عقیدہ بیان کرنا مقصود تھا کہ وہ حقیقت میں بے ایمان ہیں، اگرچہ زبان سے ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں مگر ان کے دل میں ایمان نہیں ہے، اور یہاں ان کا برتاؤ جو مسلمانوں کے ساتھ اور اپنی جماعت کے ساتھ تھا وہ بتلانا مقصود ہے، غرض پہلے ان کا

اعتقاد ذکر کیا گیا، اور یہاں ان کا عمل بیان ہوا، سو یہ تکرار نہ ہوا، تمام قرآن مجید میں جہاں جہاں تکرار معلوم ہوتا ہے وہاں اغراض و مقاصد میں ایسا ہی فرق ہوتا ہے یعنی کوئی نیا فائدہ یا نئی غرض ہوتی ہے، صرف ظاہر میں تکرار ہوتا ہے ورنہ حقیقت میں کوئی تکرار نہیں۔

* * *

فائدہ: ۱۔ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰی شَیٰطِیْنِهِمْ: شیاطین (یعنی شریر لوگ) مراد ان سے ① یا تو وہ کفار ہیں جو اپنے کفر کو سب پر ظاہر کرتے تھے ② یا وہ منافقین مراد ہیں جو ان میں رئیس سمجھے جاتے تھے۔

فائدہ: ۲۔ اِنَّا مَعَكُمْ: یعنی کفر و اعتقاد دین کے معاملہ میں ہم بالکل تمہارے ساتھ ہیں تم سے کسی حالت میں جدا نہیں ہوسکتے۔

فائدہ: ۳۔ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ: یعنی ظاہری موافقت جو ہم مسلمانوں سے کرتے ہیں اس سے یہ نہ سمجھنا کہ ہم واقع میں ان کے موافق ہیں، ہم تو ان سے تمسخر کرتے ہیں اور ان کی بیوقوفی سب پر ظاہر کرتے ہیں کہ باوجودیکہ ہمارے افعال ہمارے اقوال کے مخالف ہیں، مگر وہ اپنی بیوقوفی سے صرف ہماری زبانی باتوں پر ہم کو مسلمان سمجھ کر ہمارے مال اور اولاد پر ہاتھ نہیں ڈالتے اور مال غنیمت میں ہم کو شریک کر لیتے ہیں اور اپنی اولاد سے ہمارا نکاح کر دیتے ہیں اور ہم ان کے راز کی باتیں اُڑا لاتے ہیں، اور وہ اس پر بھی ہمارے فریب کو نہیں سمجھتے۔

اَللّٰهُ یَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَیَمُدُّهُمْ فِیْ طُغْیَانِهِمْ یَعْمَهُوْنَ ⑮

اللہ ہنسی کرتا ہے ان سے ۱۔ اور ترقی دیتا ہے ان کو ان کی سرکشی میں (اور) حالت یہ ہے کہ وہ عقل کے اندھے ہیں ۲۔

خلاصہ تفسیر: (ان کے استہزا کا جواب ہے کہ وہ بے چارے مسلمانوں سے کیا استہزا کرتے) اللہ تعالیٰ ہی استہزاء کر رہے ہیں ان کے ساتھ اور ڈھیل دیتے چلے جاتے ہیں ان کو کہ وہ اپنی سرکشی میں حیران و سرگرداں ہو رہے ہیں۔

اَللّٰهُ یَسْتَهْزِئُ بِهِمْ: اللہ کا استہزاء یہی ہے کہ ان کو مہلت دی جا رہی ہے کہ جب وہ کفر میں خوب کامل ہو جائیں اور جرم سنگین ہو جائے، اس وقت اچانک پکڑ لئے جائیں گے، حق تعالیٰ استہزا سے پاک ہیں مگر چونکہ یہ معاملہ منافقین کے استہزاء کے مقابلہ میں تھا اس لیے اس کو بھی ''استہزاء'' کے عنوان سے تعبیر کر دیا گیا۔

* * *

فائدہ: ۱۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے مومنین کو فرمایا کہ منافقین کے ساتھ مسلمانوں کا سا معاملہ کرو، ان کے جان و مال سے ہرگز تعرض نہ کرو، اس سے منافقین اپنی حماقت سے سمجھ گئے کہ ایمان لانے سے جو فائدہ مسلمانوں کو ہوا وہ سب فوائد ہم کو بھی صرف زبانی اظہار اسلام سے حاصل ہو گئے، اس وجہ سے بالکل مطمئن ہو گئے، حالانکہ انجام کار یہ امر منافقین کو سخت بلا میں پھنسانے والا ہے، اس کا انجام نہایت خراب ہے تو اب انصاف کیجیے کہ حقیقت میں تمسخر مسلمانوں کا ہوا یا منافقین کا؟؟، یا تمسخر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس تمسخر کا بدلہ اور سزا اُن کو دے گا۔

فائدہ: ۲۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو ڈھیل دی گئی، حتیٰ کہ انہوں نے سرکشی میں خوب ترقی کی اور ایسے بہکے کہ اس کا انجام کچھ نہ سوچا اور خوش ہوئے کہ ہم مسلمانوں سے ہنسی کرتے ہیں، حالانکہ معاملہ بالعکس تھا۔

جاننا چاہیے کہ آیت میں فی طغیانهم فعل یمدهم کے متعلق ہے، مگر تراجم دہلویہ جدیدہ میں اس کو یعمهون کے متعلق کر دیا (جس سے معنی بگڑ کر معتزلہ کے موافق اور اہل سنت کے خلاف اور استعمال اہل عرب کے مخالف ہو گئے) جو غلط ہے اور جاننے والے اس کو خوب جانتے ہیں۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰی فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِیْنَ ⑯

یہ وہی ہیں جنہوں نے مول لی گمراہی ہدایت کے بدلے، سو نافع نہ ہوئی ان کی سوداگری ۱۔ اور نہ ہوئے راہ پانے والے ۲۔

خلاصہ تفسیر: یہ وہ لوگ ہیں کہ انہوں نے گمراہی لے لی بجائے ہدایت کے تو نفع بخش نہ ہوئی ان کی یہ تجارت، اور نہ یہ ٹھیک

طریقہ پر چلے (یعنی ان کو تجارت کا سلیقہ نہ ہوا کہ ہدایت جیسی قیمتی چیز کے بدلہ میں گمراہی لے لی)۔

* * *

فائدہ:۱ "تجارت" سے مراد وہی گمراہی کا ہدایت کے بدلے مول لینا ہے جو اس سے پہلے مذکور ہے۔

فائدہ:۲ یعنی منافقین نے بظاہر ایمان قبول کیا اور دل میں کفر کو رکھا جس کی وجہ سے آخرت میں خراب اور دنیا میں خوار ہوئے کہ حق تعالیٰ نے اپنے کلام پاک میں ان کے احوال پر سب کو مطلع فرمادیا، ایمان لاتے تو دارین میں سرخرو ہوتے تو اب ان کی تجارت نے کوئی نفع ان کو نہ پہنچایا، نہ دنیا کا اور نہ آخرت کا، اور وہ کچھ نہ سمجھے کہ مجرد ایمان زبانی کو کافی اور نافع سمجھ کر اس خرابی اور رسوائی میں گرفتار ہوئے۔

ربط: اب ان منافقین کے مناسب حال دو مثالیں بیان فرمائی ہیں:

مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّا أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهُ ذَهَبَ اللَّهُ بِنُورِهِمْ

ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے آگ جلائی، پھر جب روشن کر دیا آگ نے اس کے آس پاس کو تو زائل کر دی اللہ نے ان کی روشنی

وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمَاتٍ لَا يُبْصِرُونَ ﴿١٧﴾ صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُونَ ﴿١٨﴾

اور چھوڑا اُن کو اندھیروں میں کہ کچھ نہیں دیکھتے ۱ بہرے ہیں گونگے ہیں اندھے ہیں سو وہ نہیں لوٹیں گے ۲

خلاصہ تفسیر: منافقین میں دو قسم کے لوگ تھے، بعض وہ تھے جو خوب دل کھول کر کفر پر جمے ہوئے تھے، کبھی ایمان کا دھیان بھی دل میں نہ آتا تھا، ایسے منافقین کی مثال بیان کی جارہی ہے:

اُن (منافقوں) کی حالت اس شخص کی حالت کے مشابہ ہے جس نے کہیں آگ جلائی ہو، پھر جب روشن کر دیا ہو اس آگ نے اس شخص کے گرداگرد کی سب چیزوں کو، ایسی حالت میں سلب کر لیا ہو اللہ تعالیٰ نے ان کی روشنی کو، اور چھوڑ دیا ہو ان کو اندھیروں میں کہ کچھ دیکھتے بھالتے نہ ہوں (تو جس طرح یہ شخص اور اس کے ساتھی روشنی کے بعد اندھیرے میں رہ گئے، اسی طرح منافقین حق واضح ہونے کے بعد گمراہی کے اندھیرے میں جا پھنسے، اور جس طرح آگ جلانے والوں کی آنکھ، کان، زبان، اندھیرے میں بیکار ہو گئے، اسی طرح گمراہی کے اندھیرے میں پھنس کر منافقین کی یہ حالت ہو گئی کہ گویا وہ) بہرے ہیں گونگے ہیں، اندھے ہیں، سو یہ اب رجوع نہ ہوں گے (کہ ان کے حواس حق کو دیکھنے سننے سمجھنے کے قابل نہ رہے)۔

* * *

فائدہ:۱ یعنی منافقوں کی مثال ایسی ہے کہ کوئی شخص اندھیری گھنگھور رات میں آگ روشن کرے جنگل میں راستہ دیکھنے کو اور جب آگ روشن ہو گئی اور راستہ نظر آنے کو ہوا تو خدا تعالیٰ نے اسکو بجھا دیا اور اندھیری رات میں جنگل میں کھڑا رہ گیا کہ کچھ نظر نہیں آتا، ایسے ہی منافقین نے مسلمانوں کے خوف سے کلمہ شہادت کی روشنی سے کام لینا چاہا، مگر سرِدست کچھ فائدہ حقیر (مثل حفظ جان و مال) اٹھانے پائے تھے کہ نور کلمہ شہادت اور منافع سب نیست و نابود ہو گئے اور مرتے ہی عذاب الیم میں مبتلا ہو گئے۔

فائدہ:۲ یعنی بہرے ہیں جو سچی بات نہیں سنتے، گونگے ہیں جو سچی بات نہیں کہتے، اندھے ہیں جو اپنے نفع و نقصان کو نہیں دیکھتے، سو جو شخص بہرا بھی ہو اور گونگا بھی ہو وہ کس طرح راہ پر آئے، صرف اندھا ہو تو کسی کو پکارے یا کسی کی بات سنے تو اب ان سے ہرگز توقع نہیں کہ گمراہی سے حق کی طرف لوٹیں۔

أَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِيهِ ظُلُمٰتٌ وَّرَعْدٌ وَّبَرْقٌ ۚ يَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ مِّنَ

یا ان کی مثال ایسی ہے جیسے زور سے مینہ پڑ رہا ہو آسمان سے اس میں اندھیرے ہیں اور گرج اور بجلی، دیتے ہیں انگلیاں اپنے کانوں میں

الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ؕ وَاللّٰهُ مُحِيْطٌ بِالْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۹﴾

مارے کڑک کے موت کے ڈر سے اور اللہ احاطہ کرنے والا ہے کافروں کا

خلاصہ تفسیر: اب منافقین کے اس دوسرے گروہ کی مثال ہے جو فی الواقع تردد میں تھے، کبھی کبھی اسلام کی حقانیت دیکھ کر اس کی طرف مائل ہونے لگتے، پھر جب اغراض نفسانی کا غلبہ ہوتا تو یہ میلان انکار سے بدل جاتا تھا۔

یا ان منافقوں کی ایسی مثال ہے جیسے آسمان کی طرف سے بارش ہو اس میں اندھیری بھی ہو اور رعد برق بھی ہو، جو لوگ اس بارش میں چل رہے ہیں وہ ٹھونسے لیتے ہیں اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں کڑک کے سبب اندیشہ موت سے، اور اللہ تعالیٰ احاطہ میں لئے ہوئے ہے کافروں کو۔

وَاللّٰهُ مُحِيْطٌ بِالْكٰفِرِيْنَ: اس میں صوفیاء کے اس قول کی دلیل ہے کہ حق تعالیٰ مخلوق کو اپنی ذات کے اعتبار سے محیط ہے کسی کیفیت اور اتصال کے بغیر، نہ کہ صرف علم سے، یعنی اس سے اللہ تعالیٰ کی ذات کا انسان کو گھیرا ہوا ہونا ثابت ہوتا ہے، لیکن وہ احاطہ بغیر کسی جسم کے ہے، کیونکہ اللہ کے لیے جسم کو ثابت کرنا کفر ہے، اور اس سے جسم کا محتاج ہونا لازم آتا ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ ہر قسم کی محتاجگی سے پاک ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا انسان کو گھیرا ہونا اپنی ذات کے ساتھ ہے نہ کہ صرف علم سے، اور یہ احاطہ جیسا کہ اس کی شان ہے اس کے موافق ہے، ہمارا ذہن و گمان اس تک نہیں پہنچ سکتا۔

* * *

فائدہ: دوسری مثل ان منافقین کی ان لوگوں کی سی ہے کہ ان پر آسمان سے مینہ شدت کے ساتھ پڑ رہا ہو اور کئی طرح کی تاریکی اس میں ہو، مثلاً بادل بھی تو برتو بہت غلیظ و کثیف ہے اور قطرات ابر کی بھی بہت کثرت اور ہجوم ہے اور رات بھی اندھیری ہے اور تاریکی شدید کے ساتھ بجلی کی کڑک اور چمک بھی ایسی ہولناک ہے کہ وہ لوگ موت کے خوف سے کانوں میں انگلیاں دیتے ہیں کہ آواز کی شدت سے دم نہ نکل جائے، اسی طرح پر منافقین تکالیف و تہدیدات شرعیہ کو سن کر اور اپنی خواری و رسوائی کو دیکھ کر اور اغراض و مصالح دنیوی کو خیال کر کر عجب کشمکش اور خوف و پریشانی میں مبتلا ہیں اور اپنی بے ہودہ تدبیروں سے اپنا بچاؤ کرنا چاہتے ہیں مگر حق تعالیٰ کی قدرت سب طرف سے کفار کا احاطہ کئے ہوئے ہے، اسکی گرفت و عذاب سے وہ کسی طرح بچ نہیں سکتے۔

يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ ؕ كُلَّمَآ اَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيْهِ ۙ وَاِذَآ اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا ؕ

قریب ہے کہ بجلی اچک لے انکی آنکھیں، جب چمکتی ہے ان پر تو چلنے لگتے ہیں اسکی روشنی میں، اور جب اندھیرا ہوتا ہے تو کھڑے رہ جاتے ہیں

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۰﴾ ع

اور اگر چاہے اللہ تو لے جائے ان کے کان اور آنکھیں، بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے

خلاصہ تفسیر: برق کی یہ حالت ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ ابھی ان کی بینائی اس نے لی، جہاں ذرا اُن کو بجلی کی چمک ہوئی تو اس کی روشنی میں چلنا شروع کر دیا، اور جب ان پر تاریکی ہوئی پھر کھڑے کے کھڑے رہ گئے، اور اگر اللہ تعالیٰ ارادہ کرتے تو ان کے کان اور آنکھ سب سلب کر لیتے، بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہیں۔

سو جس طرح یہ لوگ طوفان باد و باراں میں کبھی چلنے سے رہ جاتے ہیں، کبھی موقع پا کر آگے چلنے لگتے ہیں تو یہی حال ان متردد منافقین کا

ہے، کبھی نور اسلام کی جھلک دیکھ کر ادھر کو بڑھنے لگتے ہیں اور کبھی خود غرضی کی ظلمت میں پڑ کر پھر حق سے رک جاتے ہیں، مضمون کے ضمن میں اور اخیر میں گویا ان کو ایک دھمکی بھی دی گئی کہ اللہ تعالیٰ سب کو احاطہ قدرت میں لیے ہوئے ہیں، اوران کے چشم وگوش کے سلب کر لینے پر پوری قدرت ہے، سوحق چھوڑ کر ان کو مطمئن نہیں ہونا چاہیے۔

* * *

فائدہ: حاصل یہ ہے کہ منافقین اپنی ضلالت اور ظلماتی خیال میں مبتلا ہیں لیکن جب غلبہ نور اسلام اور ظہور معجزات کو یہ دیکھتے ہیں اور تاکید و تہدید شرعی سنتے ہیں تو متنبہ ہو کر ظاہر میں صراط مستقیم کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں اور جب کوئی اذیت ومشقت دنیوی نظر آتی ہے تو کفر پر اڑ جاتے ہیں، جیسے شدت باراں اور تاریکی میں بجلی چمکی تو قدم رکھ لیا، پھر کھڑے ہو گئے، مگر چونکہ اس کو سب کا علم ہے اور اس کی قدرت سے کوئی چیز باہر نہیں تو ایسے حیلوں اور تدبیروں سے کیا کام نکل سکتا ہے۔

سورۃ کے اول سے یہاں تک تین طرح کے لوگوں کا ذکر فرمایا: ① اول مومنوں کا ② پھر کافروں کا (جن کے دلوں پر مہر ہے کہ ہرگز ایمان نہ لائیں گے) ③ تیسرے منافقوں کا (جو دیکھنے میں مسلمان ہیں، مگر دل ان کا ایک طرف نہیں)۔

يَاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۲۱﴾

اے لوگوں بندگی کرو اپنے رب کی جس نے پیدا کیا تم کو اور ان کو جو تم سے پہلے تھے تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ

الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً ۪ وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ

جس نے بنایا واسطے تمہارے زمین کو بچھونا اور آسمان کو چھت، اور اتارا آسمان سے پانی پھر نکالے اس سے

مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۲﴾

میوے تمہارے کھانے کے واسطے، سو نہ ٹھہراؤ کسی کو اللہ کے مقابل اور تم تو جانتے ہو۔

خلاصہ تفسیر: یہاں تک تینوں قسم کی جماعت مؤمنین، کفار اور منافقین کا بیان ہو چکا، اب سب کو خطاب عام کر کے وہ کام بتایا جاتا ہے جس کے لیے یہ کتاب مقدس نازل کی گئی ہے، جس کے دو اصول ہیں: ① توحید ② تصدیق رسالت، پہلے توحید کی تعلیم فرماتے ہیں:

اے لوگو! عبادت اختیار کرو اپنے (اس) پروردگار کی جس نے تم کو پیدا کیا، اور ان لوگوں کو بھی جو تم سے پہلے گذر چکے ہیں، عجب نہیں [کیا عجب ہے] کہ تم دوزخ سے بچ جاؤ (شاہی محاورہ میں ''عجب نہیں'' کا لفظ وعدہ کے موقع پر بولا جاتا ہے) وہ ذات پاک ایسی ہے جس نے بنایا تمہارے لئے زمین کو فرش، اور آسمان کو چھت، اور برسایا آسمان سے پانی، پھر (پردہ عدم سے) نکالا بذریعہ اس پانی کے پھلوں سے غذا کو تم لوگوں کے واسطے، اب تو مت ٹھہراؤ اللہ پاک کے مقابل، اور تم تو جانتے بوجھتے ہو (یعنی یہ جانتے ہو کہ یہ تمام تصرفات خدا تعالیٰ کے سوا کوئی کرنے والا نہیں، پھر خدا کے مقابلہ میں دوسری چیزوں کو معبود بنانا کیسے درست ہو سکتا ہے)۔

* * *

فائدہ: لہٰ اب سب بندوں کو مومن ہوں یا کافر یا منافق خطاب فرما کر توحید جناب باری تعالیٰ سمجھائی جاتی ہے جو ایمان کے لئے اصل الاصول ہے خلاصہ معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو اور تم سے پہلوں کو سب کو پیدا کیا اور تمہاری ضروریات اور کل منافع کو بنایا، پھر اس کو چھوڑ کر کسی دوسرے کو معبود بنانا جو تم کو نہ نفع پہنچا سکے نہ مضرت (جیسے بت) کس قدر حماقت اور جہالت ہے حالانکہ تم یہ بھی جانتے ہو کہ اس جیسا کوئی نہیں۔

وَاِنۡ كُنۡتُمۡ فِىۡ رَيۡبٍ مِّمَّا نَزَّلۡنَا عَلٰى عَبۡدِنَا فَاۡتُوۡا بِسُوۡرَةٍ مِّنۡ مِّثۡلِهٖ وَادۡعُوۡا شُهَدَآءَكُمۡ

اور اگر تم شک میں ہو اس کلام سے جو اتارا ہم نے اپنے بندہ پر تو لے آؤ ایک سورت اس جیسی ۱ اور بلاؤ اس کو جو تمہارا مددگار ہو

مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ﴿۲۳﴾

اللہ کے سوا اگر تم سچے ہو ۲

خلاصہ تفسیر: اب رسالت کا مسئلہ بیان فرماتے ہیں، نبوت و رسالت کی صاف بے غبار دلیل ''معجزہ'' ہوا کرتا ہے، چنانچہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی بے شمار معجزے عطا ہوئے، جن میں سب سے بڑا معجزہ قرآن مجید ہے، اس کے معجزہ ہونے میں مخالفین کو شبہ تھا کہ شاید اسے رسول اللہ نے خود تصنیف کیا ہو، اس صورت میں اس کا معجزہ اور دلیل نبوت ہونا مشتبہ ہوگیا، اس لیے اللہ تعالیٰ اس اشتباہ کو دور فرماتے ہیں تا کہ قرآن کا معجزہ ہونا ثابت ہوجائے، پھر نبوت پر قطعی دلیل بن سکے۔

اگر تم لوگ کچھ خلجان میں ہو اس کتاب کی نسبت جو ہم نے نازل فرمائی ہے اپنے بندے خاص پر، تو اچھا پھر تم بنالاؤ ایک محدود ٹکڑا جو اس کا ہم پلہ ہو (کیونکہ تم بھی عربی زبان جانتے ہو اور اس کی نظم و نثر کے مشاق ہو، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی کوئی مشق بھی نہیں کی، اور جب اس کے باوجود تم قرآن کے ایک ٹکڑے کی بھی مثل نہ بناسکو تو بشرط انصاف بے تامل ثابت ہوجائے گا کہ یہ معجزہ من جانب اللہ ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے پیغمبر ہیں) اور بلالو اپنے حمایتیوں کو (جو) خدا سے الگ (الگ تجویز کر رکھے ہیں) اگر تم سچے ہو۔

* * *

فائدہ: ۱ یہ بات گزر چکی ہے کہ اس کلام پاک میں شبہ کی وجہ: ① یا یہ ہوسکتی تھی کہ اس کلام میں کوئی بات کھٹکنے کی ہو، سو اس کے دفعیہ کے لئے [شروع میں] لا ريب فيه فرما چکے ہیں ② اور یا یہ صورت ہوسکتی ہے کہ کسی کے دل میں اپنی کوتاہی فہم یا زیادت عناد سے شبہ پیدا ہو تو یہ صورت چونکہ ممکن بلکہ موجود تھی تو اس کے رفع کرنے کی عمدہ اور سہل صورت بیان فرمادی کہ اگر تم کو اس کلام کے کلام بشری ہونے کا خیال ہے تو تم بھی تو ایک سورۃ ایسی فصیح و بلیغ تین آیت کی مقدار بنا دیکھو اور جب تم باوجود کمال فصاحت و بلاغت چھوٹی سی سورۃ کے مقابلہ سے بھی عاجز ہوجاؤ تو پھر سمجھ لو کہ یہ اللہ کا کلام ہے کسی بندہ کا نہیں، اس آیت میں آپ کی نبوت کو مدلل فرمادیا۔

فائدہ: ۲ یعنی ① اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو کہ یہ بندے کا کلام ہے تو جس قدر قابل اور شاعر اور فصحاء و بلغاء موجود ہیں خدائے تعالیٰ کے سوا سب سے مدد لے کر ہی ایک چھوٹی سی سورۃ ایسی بنالاؤ ② یا یہ مطلب ہے کہ خداوند کریم کے سوا تمہارے جتنے معبود ہیں سب سے تضرع اور گریہ وزاری کے ساتھ دعا مانگو کہ اس مشکل بات میں تمہاری کچھ مدد کریں۔

فَاِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلُوۡا وَلَنۡ تَفۡعَلُوۡا فَاتَّقُوۡا النَّارَ الَّتِىۡ وَقُوۡدُهَا النَّاسُ وَالۡحِجَارَةُ ۖۚ اُعِدَّتۡ لِلۡكٰفِرِيۡنَ ﴿۲۴﴾

پھر اگر ایسا نہ کرسکو اور ہرگز نہ کرسکو گے تو پھر بچو اس آگ سے جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں، تیار کی ہوئی ہے کافروں کے واسطے

خلاصہ تفسیر: پھر اگر تم یہ کام نہ کرسکو اور قیامت تک بھی نہ کرسکو گے تو پھر ذرا بچتے رہو دوزخ سے جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں، تیار رکھی ہوئی ہے کافروں کے واسطے۔

فَاِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلُوۡا وَلَنۡ تَفۡعَلُوۡا: یہ سن کر کہ قیامت تک بھی نہ کرسکو گے کیسا کچھ جوش نہ آیا ہوگا، اور کوئی دقیقہ کوشش میں کیوں اٹھا رکھا ہوگا عاجز ہونے کی قطعی دلیل ہے، اور یہ بات عادتاً محال ہے کہ کسی نے کچھ لکھا ہو اور گم ہوگیا ہو، کیونکہ قرآن مجید کے حامیوں کی تعداد ہر زمانہ میں کم رہی ہے مخالف ہمیشہ زیادہ رہے ہیں، سو جب قرآن بعینہٖ محفوظ چلا آرہا ہے تو مخالفین کی وہ تحریر کیسے ضائع ہوسکتی تھی، اس لیے یہ احتمال بالکل لغو اور باطل ہے۔

* * *

فائدہ: پھراس پربھی اگرتم ایسی ایک سورۃ نہ بناسکواور یہ بات یقینی ہے کہ ہرگز نہ بناسکو گے تو پھر ڈرواور بچو نار دوزخ سے جو سب آگوں سے تیز ہے، اس کا ایندھن کافر اور پتھر ہیں، جن کی تم پرستش کرتے ہواور بچنے کی صورت یہی ہے کہ کلام الٰہی پر ایمان لاؤ اور وہ آگ کافروں کے واسطے تیار کی ہوئی ہے جو کہ قرآن شریف اور نبی کریم ﷺ کو جھوٹا بتلاتے ہیں۔

وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ كُلَّمَا رُزِقُوْا

اور خوشخبری دے ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے کہ ان کے واسطے باغ ہیں کہ بہتی ہیں ان کے نیچے نہریں، جب ملے گا ان کو

مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا هٰذَا الَّذِیْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۙ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ؕ

وہاں کا کوئی پھل کھانے کو تو کہیں گے یہ تو وہی ہے جو ملا تھا ہم کو اس سے پہلے، اور دیے جائیں گے ان کو پھل ایک صورت کے ۱ؕ

وَلَهُمْ فِیْهَاۤ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۙۗ وَّهُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۵﴾

اور ان کے لئے وہاں عورتیں ہوں گی پاکیزہ، اور وہ وہیں ہمیشہ رہیں گے ۲ؕ

خلاصہ تفسیر: گذشتہ آیت میں منکرین قرآن کے لیے عذاب کا ذکر تھا، اب ماننے والوں کو بشارت سناتے ہیں:

اور خوش خبری سنا دیجئے آپ اے پیغمبر! ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور کام کئے اچھے اس بات کی کہ بیشک ان کے واسطے بہشتیں ہیں کہ چلتی ہوں گی ان کے نیچے سے نہریں، جب کبھی دیئے جائیں گے وہ لوگ ان بہشتوں میں سے کسی پھل کی غذا تو ہر بار میں یہی کہیں گے کہ یہ تو وہی ہے جو ہم کو ملا تھا اس سے پہلے، اور ملے گا بھی ان کو دونوں بار کا پھل ملتا جلتا، اور ان کے واسطے ان بہشتوں میں بیویاں ہوں گی صاف پاک کی ہوئی، اور وہ لوگ ان بہشتوں میں ہمیشہ کو بسنے والے ہوں گے۔

وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا: یہ جو فرمایا کہ ہر بار میں ملتا جلتا پھل ملے گا سو اکثر لطف کے واسطے ایسا ہوگا کہ دونوں مرتبہ کے پھلوں کی صورت ایک سی ہوگی جس سے وہ یوں سمجھیں گے کہ یہ پہلی ہی قسم کا پھل ہے، مگر کھانے میں مزہ دوسرا ہوگا جس سے مزہ اور لطف دوبالا ہو جائے گا۔

* * *

فائدہ: ۱ؕ ① جنت کے میوے دنیا کے میووں سے شکل وصورت میں ملتے جلتے ہوں گے، مگر لذت میں زمین وآسمان کا فرق ہوگا ② یا جنت کے میوے باہم ایک شکل وصورت کے ہوں گے اور مزا جدا جدا، تو جب کسی میوے کو دیکھیں گے تو کہیں گے وہی قسم ہے جو پہلے دنیا میں یا جنت میں کھا چکے ہیں، اور چکھیں گے تو مزا اور ہی پائیں گے۔

فائدہ: ۲ؕ جنت کی عورتیں نجاسات ظاہرہ وباطنہ (اخلاق رذیلہ) سے سب سے پاک وصاف ہوں گی۔

فائدہ: یہاں تک تین چیزیں جن کا جاننا ضروری تھا بیان فرمائیں: ① اول مبدأ (یعنی ہم کہاں سے آئے اور کیا تھے) ② دوسرے معاش (کہ کیا کھائیں اور کہاں رہیں) ③ تیسرے معاد (کہ ہمارا انجام کیا ہے)۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا یَسْتَحْیٖۤ اَنْ یَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ؕ فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فَیَعْلَمُوْنَ

بے شک اللہ شرماتا نہیں اس بات سے کہ بیان کرے کوئی مثال مچھر کی یا اس چیز کی جو اس سے بڑھ کر ہے ۱ؕ سو جو لوگ مومن ہیں وہ یقیناً جانتے ہیں

اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَاَمَّا الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فَیَقُوْلُوْنَ مَاذَاۤ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۘ

کہ یہ مثال ٹھیک ہے جو نازل ہوئی ان کے رب کی طرف سے، اور جو کافر ہیں سو کہتے ہیں کیا مطلب تھا اللہ کا اس مثال سے

يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ؕ وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ﴿٢٦﴾

گمراہ کرتا ہے خدائے تعالیٰ اس مثال سے بہتیروں کو اور ہدایت کرتا ہے اس سے بہتیروں کو ۲ اور گمراہ نہیں کرتا اس مثال سے مگر بدکاروں کو

خلاصہ تفسیر: سمجھنا چاہیے کہ مدعی کے ذمہ دو حق ہوتے ہیں: ① ایک اپنے دعوی پر دلیل قائم کرنا ② دوسرے مخالف کی دلیل کا جواب دینا، سو پیچھے قرآن کے کلام الٰہی ہونے کا دعوی کیا اور اس پر دلیل تو قائم ہو چکی کہ تمام افراد بشر اس کے مقابلہ میں عاجز ہیں، اب بعض مخالفین قرآن کے کلام الٰہی نہ ہونے پر یوں استدلال کرتے تھے کہ اس میں بعض بہت ہی حقیر چیزوں کا ذکر ہے جیسے مکھی اور مکڑی وغیرہ، اگر یہ خدا کا کلام ہوتا تو ایسی حقیر چیزوں کا ذکر اس میں کیوں ہوتا، اور چونکہ وہ اعتراض اس عنوان سے کرتے تھے کہ (توبہ توبہ) محمد (ﷺ) کے خدا ایسی ایسی چیزوں کے ذکر سے شرماتے نہیں تو حق تعالیٰ نے بھی جواب اسی عنوان سے دیا ہے۔

ہاں! واقعی اللہ تعالیٰ تو نہیں شرماتے اس بات سے کہ بیان کر دیں کوئی مثال بھی، خواہ مچھر ہو، خواہ اس سے بھی بڑھی ہوئی ہو (یعنی حقیر ہونے میں مچھر سے بھی بڑھی ہوئی ہو) سو جو لوگ ایمان لائے ہوئے ہیں (خواہ کچھ ہی ہو) وہ تو یہی یقین کریں گے کہ بیشک یہ مثال بہت ہی موقع کی ہے ان کے رب کی جانب سے، اور رہ گئے وہ لوگ جو کافر ہو چکے ہیں (سو چاہے کچھ ہی ہو جائے) وہ یوں ہی کہتے رہیں گے کہ وہ کونسا مطلب ہوگا جس کا قصد کیا ہوگا اللہ تعالیٰ نے اس حقیر مثال سے؟ (اس کے جواب میں دوسرا طرز اختیار فرمایا جو ایسے ضدی معاند لوگوں کے مقابلہ میں مناسب ہے، سو فرماتے ہیں کہ تم یہ پوچھتے ہو کہ ایسی مثالوں کے بیان کرنے سے اللہ تعالیٰ کا کیا مطلب ہے؟ سو ہم سے مطلب سنو، وہ یہ ہے کہ) گمراہ کرتے ہیں اللہ تعالیٰ اس مثال کی وجہ سے بہتوں کو، اور ہدایت کرتے ہیں اس کی وجہ سے بہتوں کو، اور گمراہ نہیں کرتے اللہ تعالیٰ اس مثال سے کسی کو مگر صرف نافرمانی (بے حکمی) کرنے والوں کو (کہ بے حکمی کی نحوست سے حق طلبی کی عادت نہیں رہتی)۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ: وجہ اس کی ظاہر ہے کیونکہ مثال کو اس چیز سے مناسبت ہونی چاہیے جس کی وہ مثال ہے، مثال دینے والے سے مناسبت ضروری نہیں ہے، کیونکہ مثال سے کسی چیز کی حالت کی وضاحت غرض ہوا کرتی ہے، سو جب تک مثال اس چیز کے مناسب نہ ہوگی، اس کی حالت کی وضاحت کے لیے کافی نہ ہوگی، سو قرآن شریف میں جہاں مکھی مکڑی کا ذکر آیا ہے، وہاں بت پرستی کا لچر ہونا اور بتوں کا عاجز و کمزور ہونا بیان کیا ہے، سو اس کی مثال میں حقیر اور کمزور چیزوں کا لانا مناسب ہوگا یا ہاتھی و اونٹ کا لانا زیبا ہوگا؟ جس کو ذرا بھی عقل ہوگی اس کے نزدیک یہ بات واضح ہے۔

يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا: چونکہ وہ لوگ مثال کی حقیقت اور غرض سے ناواقف نہ تھے، یہ اعتراض محض شرارت اور تمسخر کی وجہ سے کرتے تھے، اس لیے حق تعالیٰ نے جواب میں مثال کی حکمت نہیں بیان فرمائی، کیونکہ وہ تو بدیہی تھی، بلکہ جواب میں دوسرا طرز اختیار فرمایا جو ایسے ضدی معاند لوگوں کے مقابلہ میں مناسب ہے، جیسے کوئی شخص جان بوجھ کر طبیب سے سوال کرنے کہ یہ عینکیں کس واسطے رکھی ہیں؟ ان سے کیا مطلب ہے؟ اور وہ حکیم یوں جواب دے کہ ان سے مقصود یہ ہے کہ تیری آنکھیں پھوٹ جائیں اور دوسروں کی نگاہیں تیز ہوں، ظاہر ہے کہ عینک سے آنکھ نہیں پھوٹتی، بلکہ روشنی ہی بڑھتی ہے، مگر بے وقوف ضدی کو کیا جواب دیا جائے، اسی طرح مقصود قرآن سے صرف ہدایت ہے، اس سے گمراہی نہیں ہو سکتی، مگر یہ دوسرا نتیجہ ان معاندوں کی ضد اور جہالت کا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا: اس میں صوفیاء کی اس عادت کی اصل ہے کہ وہ تذکیر و تفہیم کے لیے کوئی بھی مثال بیان کرنے میں عرفی شرم و عار کی پروا نہیں کرتے (مطلب یہ کہ کسی بھی کلام کا یہ مقصد ہوا کرتا ہے کہ وہ سننے والوں کو فائدہ پہنچائے، اب اسی غرض کے تحت جس مثال سے بھی یہ مقصد حاصل ہوگا اس کے بیان کرنے میں شرم و حیا کا لحاظ کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا)۔

* * *

فائدہ: ۱ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا: اس آیت میں اس معارضہ کا جواب دیا گیا جو کفار کی طرف سے پہلی آیت پر ہوا، خلاصہ اس کا

یہ ہے کہ جب چھوٹی سی سورت بھی اس کلام جیسی ان سے نہ ہو سکی، جس سے اس کا کلام الٰہی ہونا ثابت ہو چکا تو کفار نے کہا ہر چند ہم اس کلام کے مقابلہ سے عاجز ہیں، مگر ہم دوسری دلیل سے اس کا کلام الٰہی نہ ہونا اور کلام بشری ہونا ثابت کرتے ہیں، وہ یہ کہ بڑے بزرگ عظیم الشان اپنے کلام میں ذلیل وحقیر چیزوں کے ذکر سے اجتناب کیا کرتے ہیں، حق تعالیٰ جو سب بزرگوں سے برتر اور اعظم ہے اس نے کیسے اپنے کلام میں مکھی اور مکڑی کا ذکر فرمایا، اس معارضہ کا جواب دیا گیا کہ اس میں کوئی شرم اور عار کی بات نہیں کہ حق تعالیٰ مچھر یا اس سے بڑی چیز مثل مکھی اور مکڑی کی مثال بیان فرمائے، کیونکہ مثال سے توضیح وتفصیل ممثل لہ کی مطلوب ہوتی ہے، حقارت اور عظمت سے کیا بحث اور یہ مطلوب جبھی حاصل ہوگا کہ مثال اور ممثل لہ میں پوری مطابقت ہو، ممثل لہ حقیر ہوگا تو اس کی مثال بھی حقیر ہونی چاہیے، ورنہ تمثیل ہی بے ہودہ سمجھی جائے گی، ہاں! اگر تمثیل میں یہ ہوتا کہ مثال اور مثال دینے والے میں موافقت ضروری ہوتی تو بے وقوفوں کا یہ اعتراض چل سکتا، مگر اسکا تو کوئی بیوقوف بھی قائل نہ ہوگا اور تورات وانجیل وکلام حکماء وسلاطین میں ایسی مثالیں بکثرت موجود ہیں، اسکے خلاف کہنا کفار کی حماقت اور عناد کی بات ہے، **فما فوقھا** کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ مچھر سے حقارت اور چھوٹائی میں زیادہ ہو، جیسے مچھر کے بازو کہ بعض احادیث میں اس کو دنیا کی تمثیل میں ذکر فرمایا ہے۔

فائدہ:۲ یُضِلُّ بِهٖ كَثِیْرًا وَّیَهْدِیْ بِهٖ كَثِیْرًا: یعنی ایمان والے تو ان مثالوں کو حق اور مفید سمجھتے ہیں اور کفار بطور تحقیر کہتے ہیں کہ ایسی حقیر مثالوں سے خدا کی مراد اور غرض کیا ہوگی، جواب دیا گیا کہ اس کلام سراپا ہدایت سے بہتیروں کو گمراہی میں ڈالنا اور بہتیروں کو راہ راست دکھلانا منظور ہے (یعنی اہل حق اور اہل باطل میں تمیز تام منظور ہے جو نہایت مفید اور ضروری ہے)۔

الَّذِیْنَ یَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِیْثَاقِهٖ۪ وَیَقْطَعُوْنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنْ یُّوْصَلَ

جو توڑتے ہیں خدا کے معاہدہ کو مضبوط کرنے کے بعد، اور قطع کرتے ہیں اس چیز کو جس کو اللہ نے فرمایا ملانے کو ۱

وَیُفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِؕ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ۝۲۷

اور فساد کرتے ہیں ملک میں ۲ وہی ہیں ٹوٹے والے ۳

خلاصہ تفسیر: جو کہ توڑتے رہتے ہیں اس معاہدہ کو جو اللہ سے کر چکے تھے اس کے استحکام (مضبوط کرنے) کے بعد (یعنی عہد ازل، اس عہد کا ذکر قرآن مجید میں دوسری جگہ آیا ہے کہ آدم علیہ السلام کی پشت سے سب کو نکال کر فہم و گویائی عطا کر کے ان سے توحید کا اقرار لیا) اور قطع کرتے رہتے ہیں ان تعلقات کو کہ حکم دیا ہے اللہ تعالیٰ نے ان کو جوڑنے کا (اس میں تمام شرعی تعلقات داخل ہیں) اور فساد کرتے رہتے ہیں زمین میں (ظاہری فساد بھی کرتے تھے کسی پر ظلم کر گزرے، کسی کی بے آبروئی اور کسی کی حق تلفی کر دی، اور باطنی فساد میں تو تمام وقت ہی لگے رہتے تھے کفر کرنا، رسول ﷺ سے عداوت وحسد کرنا اور نو مسلموں کو بہکاتے رہنا) بس یہ لوگ ہیں پورے خسارہ میں پڑنے والے (کہ دنیا کی راحت اور آخرت کی نعمت سب ہاتھ سے دے بیٹھے، کیونکہ حاسد کی دنیوی زندگی بھی ہمیشہ تلخ ہی رہتی ہے، ہر وقت اسی ادھیڑ بن میں رہتا ہے کہ اپنے دشمن کو کسی طرح نقصان پہنچاؤں، اس کی ترقی کس طرح روکوں)۔

مَاۤ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنْ یُّوْصَلَ: اس میں تمام شرعی تعلقات داخل ہیں، خواہ وہ تعلقات جو بندہ اور خدا کے درمیان ہوں، یا باہم اقارب اور رشتہ داروں میں ہوں، یا عام اہل اسلام، یا بنی آدم سے ہوں، یا باہم انبیاء علیہم السلام میں ہیں جن کا اعتقاد رکھنا واجب ہے سب اس میں داخل ہو گئے۔

* * *

فائدہ:۱ جیسے قطع رحم کرنا، انبیاء اور علماء اور واعظین، اور مومنین اور نماز اور دیگر جملہ امور خیر سے اعراض کرنا۔

فائدہ:۲ فساد سے مراد یہ ہے کہ لوگوں کو ایمان سے نفرت دلاتے تھے اور مخالفان اسلام کو ورغلا کر مسلمانوں سے مقابلہ کراتے تھے اور

حضرات صحابہ کرامؓ اور صلحائے امت کے عیب نکال کر تشہیر کرتے تھے تاکہ آپ کی اور دین اسلام کی بے وقعتی لوگوں کے ذہن نشین ہو جائے اور مسلمانوں کا راز مخالفوں تک پہنچاتے تھے اور طرح طرح کی رسوم و بدعات خلاف طریقہ اسلام پھیلانے میں سعی کرتے تھے۔

فائدہ: ۳ مطلب یہ ہے کہ ان حرکات ناشائستہ سے اپنا ہی کچھ کھوتے ہیں، توہین اسلام اور تحقیر صلحائے امت کچھ بھی نہ ہو سکے گی۔

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ

کس طرح کافر ہوتے ہو خدائے تعالیٰ سے حالانکہ تم بے جان تھے ۱ پھر جلایا تم کو ۲ پھر مارے گا تم کو ۳ پھر جلائے گا تم کو ۴

ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۸﴾

پھر اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے ۵

خلاصہ تفسیر: یہاں تک کفار کے شبہ کا خوب صاف جواب دیا گیا جو وہ قرآن پر کرتے تھے، اب پھر پہلے مضمون یعنی توحید کے اثبات کی طرف رجوع فرماتے ہیں: جب اللہ تعالیٰ کا مربی اور خالق ہونا، رازق اور محسن ہونے میں یکتا و یگانہ ہونا تم کو دلائل سے ثابت ہو چکا تو پھر) بھلا کیوں کر ناشکری کرتے ہو اللہ کے ساتھ (کہ اس کے احسانات کو بھلا دیتے ہو اور غیروں کا کلمہ پڑھتے ہو) حالانکہ (صرف ایک اللہ کے مستحق عبادت ہونے پر دلائل قائم ہیں، مثلاً یہ کہ) تھے تم بے جان (یعنی نطفہ میں جان پڑنے سے پہلے) سو تم کو جاندار کیا، پھر تم کو موت دیں گے، پھر زندہ کریں گے (یعنی قیامت کے دن) پھر انہی کے پاس لے جائے جاؤ گے (یعنی میدان قیامت میں حساب کتاب کے لئے حاضر کئے جاؤ گے)۔

* * *

فائدہ: ۱ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا: یعنی اجسام بے جان کہ حس و حرکت کچھ نہ تھی، اول عناصر تھے اس کے بعد والدین کی غذا بنے، پھر نطفہ، پھر خون بستہ، پھر گوشت۔

فائدہ: ۲ فَاَحْيَاكُمْ: یعنی حالات سابقہ کے بعد نفخ روح کیا گیا، جس سے رحم مادر اور اس کے بعد دنیا میں زندہ رہے۔

فائدہ: ۳ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ: یعنی جب دنیا میں وقت مرنے کا آئے گا۔

فائدہ: ۴ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ: یعنی قیامت کو زندہ کئے جاؤ گے حساب لینے کے واسطے۔

فائدہ: ۵ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ: یعنی قبروں سے نکل کر اللہ تعالیٰ کے روبرو حساب و کتاب کے واسطے کھڑے کئے جاؤ گے، سو اب انصاف کرو کہ جب تم اول سے آخر تک اللہ تعالیٰ کے احسانات کے مرہون ہو اور ہر حالت اور حاجت میں اس کے محتاج اور اس کے متوقع ہو، پھر اس پر بھی کفر کرنا اور اس کی نافرمانی کرنا کس قدر تعجب خیز امر ہے۔

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۚ ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ

وہی ہے جس نے پیدا کیا تمہارے واسطے جو کچھ زمین میں ہے سب، پھر قصد کیا آسمان کی طرف سو ٹھیک کر دیا ان کو سات

سَمٰوٰتٍ ۭ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۹﴾

آسمان، اور خدائے تعالیٰ ہر چیز سے خبردار ہے

خلاصہ تفسیر: اس کے بعد کچھ اپنے انعام و احسان کا ذکر فرماتے ہیں کہ اگر دلائل سے کام نہیں لیتے تو خیر محسن کا حق ماننا تو طبعی امر ہے، یہی سمجھ کر خدا تعالیٰ کی رجوع ہو جاؤ، اس لیے اپنی عام اور خاص نعمتوں کو یاد دلاتے ہیں، سو عام نعمت تو یہ ہے کہ:

وہ ذات پاک ایسی ہے جس نے پیدا کیا تمہارے فائدہ کے لئے جو کچھ بھی زمین میں موجود ہے سب کا سب (یہ فائدہ عام ہے کھانے پینے کا ہو، یا پہننے اور برتنے کا، یا نگاہ اور روح کو تازگی بخشنے کا) پھر توجہ فرمائی آسمان کی طرف (یعنی اس کی تخلیق وتکمیل کی طرف) تو درست کر کے بنا دیئے ان کو سات آسمان، اور وہ تو سب چیزوں کے جاننے والے ہیں۔

خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا: اس سے معلوم ہوا کہ دنیا کی کوئی چیز ایسی نہیں جس سے انسان کو فائدہ نہ پہنچتا ہو، اور بالفرض اگر ہم کو فائدہ معلوم بھی نہ ہو تو کیا ہوا، معلوم نہ ہونے سے فائدہ کا نہ ہونا لازم نہیں آتا ممکن ہے کہ ہمیں معلوم نہ ہو، کسی دوسرے کو معلوم ہو، اور ممکن ہے کسی کو بھی معلوم نہ ہو اور حق تعالیٰ ہمارے علم میں لائے بغیر ہمیں اس سے فائدہ پہنچا رہے ہوں، کیا بچہ کو جن چیزوں سے فائدہ پہنچایا جاتا ہے تو اس بچہ کو سب کا معلوم ہونا کچھ ضروری ہے، ہرگز نہیں، اس پر کوئی یہ شبہ نہ کرے کہ پھر تو سب چیزیں حلال ہونی چاہئیں، کیونکہ سب میں کچھ نہ کچھ تو فائدہ ہے ہی، جواب یہ ہے کہ کسی بھی چیز کے صرف مفید ہونے سے اس چیز کا حلال یا قابل استعمال ہونا لازم نہیں آتا، جیسے حکماء اور اطباء کے نزدیک زہریلی مہلک چیزوں میں بھی کچھ نہ کچھ فائدہ تو ہوتا ہے لیکن پھر بھی ان کے استعمال سے روکا جاتا ہے، اسی طرح شریعت کی حرام کردہ چیزوں کو سمجھیے کہ اگرچہ ان میں کسی درجہ فائدہ نفع ہی سہی، مگر نقصان غالب ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ کا جاننا کافی ہے، ہمارے جاننے کی ضرورت نہیں، جس طرح مہلک چیزوں میں طبیب کا جاننا کافی ہے، عوام کا آگاہ ہونا ضروری نہیں۔

ثُمَّ اسْتَوَىٰ إِلَى السَّمَاءِ: یوں تو زمین وآسمان کی پیدائش کا ذکر مختصر ومفصل قرآن کریم میں سینکڑوں جگہ آیا ہے، مگر ان میں ترتیب کا بیان کہ پہلے کیا بنا بعد میں کیا بنا، یہ غالباً صرف تین ہی آیتوں میں آیا ہے، ایک سورہ بقرہ کی مذکورہ آیت، دوسری آیت حم سجدہ کی اور تیسری سورۃ نازعات کی آیات میں، اور سرسری نظر میں ان سب مضامین میں کچھ اختلاف سا بھی معلوم ہوتا ہے، کیونکہ سورۃ بقرہ اور سورۃ حم سجدہ کی آیت سے زمین کی پیدائش آسمان سے مقدم ہونا معلوم ہوتا ہے، اور سورۃ نازعات کی آیات سے اس کے برعکس بظاہر زمین کی پیدائش آسمان کے بعد معلوم ہوتی ہے، سب آیات میں غور کرنے سے میرے خیال میں تو یہ آتا ہے کہ یوں کہا جائے کہ اول زمین کا مادہ بنا اور ہنوز اس کی موجود ہیئت نہ بنی تھی کہ اسی حالت میں آسمان کا مادہ بنا جو دخان یعنی دھوئیں کی شکل میں تھا، اس کے بعد زمین موجودہ ہیئت پر پھیلا دی گئی، پھر اس پر پہاڑ اور درخت وغیرہ پیدا کئے گئے، پھر آسمان کے سیال دخانی مادہ کے ساتھ سات آسمان بنا دیئے، امید ہے کہ سب آیتیں اس تقریر پر منطبق ہو جائیں گی، آگے حقیقت حال سے اللہ تعالیٰ ہی خوب واقف ہیں۔

* * *

فائدہ: اس آیت میں دوسری نعمت بیان فرمائی، یعنی اللہ تعالیٰ نے تم کو پیدا کیا اور تمہاری بقاء اور انتفاع کے لئے زمین میں ہر طرح کی چیزیں بکثرت پیدا فرمائیں (مطعومات اور مشروبات اور ملبوسات اور ہر چیز کے لئے آلات وسامان) اس کے بعد متعدد آسمان بنائے گئے جس میں تمہارے لئے طرح طرح کے منافع ہیں۔

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً ۖ قَالُوا أَتَجْعَلُ فِيهَا

اور جب کہا تیرے رب نے فرشتوں کو کہ میں بنانے والا ہوں زمین میں ایک نائب [1] کہا فرشتوں نے کیا قائم کرتا ہے تو زمین میں اس کو

مَن يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ۖ

جو فساد کرے اس میں اور خون بہائے، اور ہم پڑھتے رہتے ہیں تیری خوبیاں اور یاد کرتے ہیں تیری پاک ذات کو [2]

قَالَ إِنِّي أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿٣٠﴾

فرمایا بیشک مجھ کو معلوم ہے جو تم نہیں جانتے [3]

خلاصہ تفسیر: نعمت دو قسم کی ہوتی ہے: ① ایک صوری وظاہری، یعنی محسوس جیسے کھانا، پینا، روپیہ، مکان جائیداد اور ② دوسری معنوی جیسے عزت وآبرو، مسرت علم، گذشتہ دو آیتوں میں صوری اور ظاہری نعمتوں کا ذکر تھا، اب یہاں سے آگے گیارہ آیتوں میں معنوی نعمتوں کا ذکر ہے کہ ہم نے تمہارے باپ آدم علیہ السلام کو دولت علم دی اور مسجود ملائکہ بنایا اور تم کو ان کی اولاد میں ہونے کا فخر عطا کیا۔

اور جس وقت ارشاد فرمایا آپ کے رب نے فرشتوں سے (تاکہ وہ اپنی رائے ظاہر کریں، جس میں ایک حکمت ومصلحت تھی، ورنہ اللہ تعالیٰ تو باطن کو بھی جانتے ہیں، اور ان سے مشورہ لینا بھی نہ تھا، کیونکہ مشورہ کی حاجت سے تو حق تعالیٰ بالا و برتر ہیں، غرض اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا کہ) ضرور میں بناؤں گا زمین میں ایک نائب (یعنی وہ میرا نائب ہوگا کہ اپنے احکام شرعیہ کے جاری ونافذ کرنے کی خدمت اس کے سپرد کروں گا، فرشتے) کہنے لگے کیا آپ پیدا کریں گے زمین میں ایسے لوگوں کو جو فساد کریں گے اس میں اور خوں ریزیاں کریں گے اور ہم برابر تسبیح کرتے رہتے ہیں بحمد اللہ اور آپ کی پاکی بیان کرتے رہتے ہیں (فرشتوں کی یہ عرض وگذارش اعتراض کے طور پر نہیں بلکہ اپنی نیازمندی اور فرمانبرداری کے اظہار کے لیے تھی، حق تعالیٰ نے) ارشاد فرمایا کہ میں جانتا ہوں اس بات کو جس کو تم نہیں جانتے (یعنی جو چیز تمہاری نظر میں بنی آدم کی تخلیق وخلافت میں رکاوٹ ہے کہ ان میں بعض فساد بھی پھیلائیں گے، درحقیقت وہی چیز بنی آدم کی تخلیق کا اصل سبب ہے)۔

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ: یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ حق تعالیٰ کا فرشتوں کی مجلس میں اس واقعہ کا اظہار کس حیثیت سے تھا؟ کیا ان سے مشورہ لینا مقصود تھا؟ یا محض ان کو اطلاع دینا پیش نظر تھا؟ یا فرشتوں کی زبان سے ان کی رائے کا اظہار کرانا اس کا منشأ تھا؟ سو یہ بات ظاہر ہے کہ مشورہ کی ضرورت تو وہاں پیش آتی ہے جہاں مسئلہ کے سب پہلو کسی پر روشن نہ ہوں اور اپنے علم وبصیرت پر مکمل اطمینان نہ ہو، اس لئے دوسرے عقلاء واہل دانش سے مشورہ کیا جاتا ہے یا ایسی صورت میں جہاں حقوق دوسروں کے بھی مساوی ہوں تو ان کی رائے لینے کے لئے مشورہ ہوتا ہے جیسے دنیا کی عام نسلوں میں رائج ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ یہاں دونوں صورتوں نہیں ہوسکتیں اللہ سبحانہ وتعالیٰ خالق کائنات ہیں ذرہ ذرہ کا علم رکھتے ہیں اور ظاہر وباطن ہر چیز ان کے علم وبصر کے سامنے برابر ہے ان کو کیا ضرورت کہ کسی سے مشورہ لیں؟ اسی طرح یہاں یہ بھی نہیں کہ کوئی پارلیمانی حکومت ہے جس میں تمام ارکان کے مساوی حقوق ہیں اور سب سے مشورہ لینا ضروری ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی سب کے خالق اور مالک ہیں فرشتے ہوں یا جن وانس سب ان کی مخلوق ومملوک ہیں کسی کو حق نہیں کہ ان کے کسی فعل کے متعلق سوال بھی کرسکے کہ آپ نے یہ کیوں کیا اور فلاں کام کیوں نہیں کیا، بات یہی ہے کہ درحقیقت یہاں مشورہ لینا مقصود نہیں اور نہ اس کی ضرورت ہے، چنانچہ فرشتوں کے سامنے ذکر کرنے کا فائدہ خود الفاظ قرآنی کے اشارہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی پیدائش سے پہلے فرشتے یہ سمجھتے تھے کہ ہم سے زیادہ افضل واعلم کوئی مخلوق اللہ تعالیٰ پیدا نہیں کریں گے، اور حضرت عبداللہ بن عباس سے روایت میں اس کی تصریح بھی ہے کہ خلقت آدم سے پہلے فرشتے آپس میں کہتے تھے کہ: اللہ تعالیٰ کوئی مخلوق ہم سے افضل اور اعلم پیدا نہ فرمائیں گے، حق تعالیٰ شانہ کے علم میں تھا کہ ایک ایسی مخلوق بھی پیدا کرنا ہے جو تمام مخلوقات سے زیادہ افضل واعلم ہوگی اور جس کو اپنی خلافت ونیابت کا خلعت عطا کیا جائے گا، اس لئے فرشتوں کی مجلس میں آدم علیہ السلام کو پیدا کرنے اور زمین کے نائب بنانے کا ذکر کیا گیا تاکہ وہ اپنے خیال کا اظہار کریں۔

قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا: مطلب یہ کہ ہم تو سب کے سب آپ کے مطیع وفرمانبردار ہیں، اور بنی آدم میں کوئی کوئی مفسد وسفاک بھی ہوگا، سو اگر یہ کام ہمارے سپرد کیا جائے تو ہم سب لگ کر اس کو انجام دیں گے، اور وہ لوگ سب اس کام کے نہ ہوں گے، البتہ جو مطیع ہوں گے وہ تو دل وجان سے اس میں لگ جائیں گے، مگر جو مفسد وظالم ہوں گے ان سے کیا امید ہے کہ وہ اس کو انجام دیں، خلاصہ یہ کہ جب کام کرنے والوں کا ایک گروہ موجود ہے تو ایک نئی مخلوق کو جن میں کوئی کام کا ہوگا کوئی نہ ہوگا اس خدمت کے لیے تجویز فرمانے کی کیا ضرورت ہے، اور فرشتوں کی یہ گذارش نہ بطور اعتراض تھی اور نہ اپنا استحقاق جتانے کے لئے تھی کہ ان مقدس خدمت گزاروں پر شبہات پیدا ہوں، بلکہ فرشتوں کو کسی طرح یہ معلوم ہوگیا تھا کہ جو نئی مخلوق زمین سے بنائی جائے گی ان میں نیک وبد ہر طرح کے لوگ ہوں گے، بعض لوگ اس نیابت کے کام کو اور زیادہ خراب کریں گے، اس لئے نیاز مندانہ عرض کیا کہ ہم سب کے سب ہر خدمت کے لئے حاضر ہیں، اور گروہ ملائکہ میں کوئی گناہ کرنے والا بھی نہیں، اس لئے کوئی نیا عملہ بڑھانے اور نئی

مخلوق پیدا کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے، یہ ایسی ہی بات ہے کہ کوئی بادشاہ و حاکم جب کوئی نیا کام تجویز کر کے اس کے لیے ایک مستقل عملہ بڑھانا چاہے اور اپنے قدیم عملہ سے اس کا اظہار کرے تو وہ لوگ اپنی جاں نثاری فرمانبرداری کی غرض سے عرض کریں کہ حضور جو لوگ اس نئے کام کے لیے تجویز ہوئے ہیں ہمیں کسی طرح معلوم ہوا ہے کہ بعض تو اس کو بخوبی انجام دے سکیں گے اور بعض بالکل ہی کام بگاڑ دیں گے جس سے آپ کا مزاج ناخوش ہوگا، آخر ہم کس مرض کی دوا ہیں، ہم ہر خدمت کے لئے حاضر ہیں، اور ہماری خدمت آپ کی مرضی کے مطابق ہی ہوگی، کبھی کسی خدمت سے ہم نے عذر نہیں کیا، اگر وہ نئی خدمت بھی ہمیں عنایت ہوگی تو ہم کو کیا عذر وانکار ہوگا اور آپ کی مرضی کے موافق اسے انجام دیں گے، اسی طرح فرشتوں کی عرض وگذارش نیازمندی کے اظہار کے لیے تھی۔

اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ: یعنی کیونکہ احکام وانتظام کا جاری کرنا تو جبھی وقوع میں آسکتا ہے جب کوئی اعتدال سے تجاوز کرنے والا بھی ہو، یہ مقصود تم فرمانبردار فرشتوں کے جمع ہونے سے پورا نہیں ہوسکتا، سوال ہوتا ہے کہ اعتدال سے تجاوز کر جانے والی ایک مخلوق جنات تو پہلے سے موجود تھی، ان میں نافرمان بھی تھے، ان سے یہ کام کیوں نہ لیا گیا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کام کے لئے موزوں وہ مخلوق ہوسکتی ہے جن میں شر وفساد کا عنصر موجود تو ہو مگر غالب نہ ہو، جنات میں یہ عنصر غالب تھا، نیز ملائکہ میں تو فساد ہی نہ تھا، اور جنوں میں اصلاح کی قابلیت کمزور تھی، انسان ایک ایسی چیز ہے جس میں فساد اور اصلاح تمام تر قابلیت کے ساتھ مناسب طور سے موجود ہیں، اس لیے اس مقصود کی تکمیل کے لیے تخلیق آدم کی تجویز فرمائی، ملائکہ اور جن ہر دو ناکافی قرار دیے گئے، غرض یہ بتلا دیا گیا کہ منشائے الٰہی یہ ہے کہ جس طرح اس نے ایک ایسی مقدس معصوم مخلوق فرشتے پیدا کر دیئے جس سے کسی گناہ خطاء کا صدور ہو ہی نہیں سکتا اور جس طرح اس نے شیاطین پیدا کر دیئے جن میں نیکی اور بھلائی کی صلاحیت نہیں، اسی طرح ایک ایسی مخلوق بھی پیدا کرنا منشاء خداوندی ہے جس میں خیر وشر، نیکی اور بدی کا مخلوط مجموعہ ہو، اور جس میں خیر وشر کے دونوں جذبات ہوں اور جو جذبات شر کو مغلوب کر کے خیر کے میدان میں آگے بڑھے اور رضائے خداوندی کا خلعت حاصل کرے۔

اب رہی یہ بات کہ خود ایسی اصلاح ہی کی کیا ضرورت ہے جو وجود فساد پر موقوف ہو؟ اس سوال کا حاصل تکوین کی حکمت کو دریافت کرنا ہے، سو یہ دریائے خون ہے، اس میں قدم رکھنا گویا اپنے آپ کو عظیم ہلاکت میں سپرد کرنا ہے، اس کی وجہ یہ نہ سمجھی جائے کہ اس میں کوئی معقول حکمت نہیں ہے، حکمت ضرور ہے اور بیشک ضرور ہے، مگر ہماری عقلیں اس کے ادراک سے عاجز ہیں: اس لیے:

بدریا در منافع بے شمار است | گر خواہی سلامت بر کنار است

اس لیے شریعت نے از راہ شفقت ایسے امور کی تفتیش سے روک دیا ہے اور ضروری کاموں میں لگا دیا ہے۔

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ: یہ اس بات کی دلیل ہے کہ انسان کی خلافت کا مدار علم وفہم پر رکھا گیا ہے بشرطیکہ بدعمل نہ ہو، محض مجاہدہ کافی نہیں ہے، علم وفہم نہیں تو وہ خلافت کے لیے کسی کام کا نہیں ہے، اسی بنیاد پر مشائخ نے خلافت دیتے وقت اس کی زیادہ رعایت رکھی ہے (مطلب یہ کہ خلیفہ اس شخص کو بنایا جائے گا جو علم وفہم، معاملہ فہمی، مزاج شناسی اور ماحول سازی کی صلاحیتیں رکھتا ہو، ان اوصاف کے علاوہ بدعمل یا بے عمل بھی نہ ہو)۔

* * *

فائدہ: ۱۔ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً: اب ایک بڑی نعمت کا ذکر کیا جاتا ہے جو جملہ بنی آدم پر کی گئی اور وہ حضرت آدم علیہ السلام کی آفرینش کا قصہ ہے جو تفصیل سے بیان کیا گیا اور ان کو خلیفۃ اللہ بنایا گیا، پہلی آیت میں جو خلق لکم ما فی الارض جمیعا فرمایا تھا، اس میں کسی کو انکار پیش آئے تو قصہ حضرت آدم سے اس کا جواب بھی بخوبی ہو گیا۔

فائدہ: ۲۔ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ: ملائکہ کو جب یہ خلجان ہوا کہ ایسی مخلوق کہ جس میں مفسد اور خون ریز تک ہوں گے ہم ایسے مطیع اور فرمانبردار کے ہوتے ان کو خلیفہ بنانا اس کی وجہ کیا ہوگی؟ تو بطریق استفادہ یہ سوال کیا، اعتراض ہرگز نہ تھا، رہا یہ امر کہ ملائکہ کو بنی آدم کا حال

کیونکر معلوم ہوا؟ اس میں بہت سے احتمال ہیں: ① جنات پر قیاس کیا ② یا حق تعالیٰ نے پہلے بتا دیا تھا ③ یا لوح محفوظ پر لکھا دیکھا ④ یا سمجھ گئے کہ حاکم و خلیفہ کی ضرورت جبھی ہوگی جب ظلم وفساد ہوگا ⑤ یا حضرت آدم علیہ السلام کے قالب کو دیکھ کر بطور قیافہ سمجھ گئے ہوں (جیسا ابلیس نے حضرت آدم علیہ السلام کو دیکھ کر کہا کہ بھکول ہوں گے) اور ایسا ہی ہوا۔

فائدہ: ۳ قَالَ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ: فرشتوں کو سر دست بالا جمال یہ جواب دیا گیا کہ ہم خوب جانتے ہیں، اس کے پیدا کرنے میں جو حکمتیں ہیں، تم کو ابھی تک وہ حکمتیں معلوم نہیں، ورنہ اس کی خلافت اور افضلیت میں شبہ نہ کرتے۔

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِىْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ

اور سکھلا دیے اللہ نے آدم کو نام سب چیزوں کے پھر سامنے کیا ان سب چیزوں کو فرشتوں کے، پھر فرمایا بتاؤ مجھ کو نام ان کے اگر

كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝۳۱

تم سچے ہو

خلاصہ تفسیر: (یہاں تک یہ تو معلوم ہوا کہ انسان کی تخلیق میں یہ حکمت ہے کہ ان کے ہونے سے اصلاح اور شریعت کا انتظام متحقق ہوگا، اب اس میں فرشتوں کی جانب سے اس احتمال کی گنجائش رہ گئی تھی کہ خیر انسان کو پیدا کر دیا جائے لیکن اس کی اصلاح کی خدمت ہم فرشتوں کو دے دی جائے، اس لیے اب اس بات کو ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ان آدمیوں کی اصلاح بھی آدمی ہی سے ہو سکتی ہے، کیونکہ مصلح کے لیے علم کی ضرورت ہے اور جس خاص علم کی ضرورت ہے وہ ملائکہ کی استعداد سے خارج ہے، گویا اسی حکمت الٰہیہ کی مزید توضیح اس طرح کی گئی کہ نیابت خداوندی کے لئے ایک خاص علم کی ضرورت ہے اور وہ علم ملائکہ کی استعداد سے خارج ہے، اس لئے فرمایا کہ) اور علم دے دیا اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو (پیدا کرکے) سب چیزوں کے اسماء کا (یعنی سب چیزوں کے نام اور ان کے خواص واثرات سب کا علم آدم کو دے دیا گیا) پھر وہ چیزیں فرشتوں کے روبرو کر دیں، پھر فرمایا کہ بتلاؤ مجھ کو اسماء ان چیزوں کے (یعنی مع ان کے اثرات وخواص کے) اگر تم سچے ہو (یعنی اپنے اس خیال میں اگر تم سچے ہو کہ ہم اصلاح اور شریعت کا انتظام یعنی خلافت ارضی کی خدمت جس کے لیے خلیفہ کی تجویز ہو رہی ہے انجام دے سکیں گے)۔

اس مقام کی تحقیق یہ ہے کہ ہر منتظم اور مصلح کے لیے ضروری ہے کہ جس چیز کا انتظام اور اصلاح کرنا چاہے اس کی اصل وحقیقت اور اس کے ہر قسم کے نشیب وفراز سے پورا واقف اور ماہر ہو، یہی وجہ ہے کہ اگر حاکم اپنی محکوم رعایا کی عادات، رسوم ومزاج اور ان کے مصالح اور نقصان سے واقف نہ ہو تو ایسے حاکم کے ہاتھوں کبھی ان کا انتظام درست نہیں ہو سکتا، اسی طرح یہاں خلیفہ خداوندی کو جب طبائع کی اصلاح کا کام کرنا پڑے گا تو ضروری ہے کہ طبائع کی کیفیات، خصوصیات اور ان کے تغیر وتبدیلی سے اس کو پورا آگاہ ہونا چاہیے، یہ تو باطنی انتظام ٹھہرا، اور شریعت کا ظاہری انتظام کہ فلاں چیز حلال ہے اور فلاں چیز حرام ہے اس میں بھی ان چیزوں کے بہت سے حالات، خواص، فوائد اور نقصانات جاننے کی ضرورت ہوگی مثلاً نشہ کی چیز حرام ہے، تو اب جو شخص نشہ کی حقیقت اور اثرات کو نہ جانتا ہوگا اس کے سامنے کوئی شراب پی کر بدمست بھی ہو جائے تو وہ اس کو زجر وتنبیہ اور نہی عن المنکر نہیں کر سکتا، کیونکہ وہ عذر کر سکتا ہے کہ مجھے نشہ ہی نہیں ہوا، اور یہ شخص اس کو جھٹلا نہیں سکتا، بخلاف اس شخص کے جو جانتا ہو کہ نشہ دار چیز کی کیا خاصیت ہے اور اس کے پینے سے کیا حالت ہو جاتی ہے تو یہ شخص اس پر احتساب واحتجاج کر سکتا ہے، یا مثلاً رسول مقبول ﷺ نے ابتدا میں جو برتن شراب رکھنے کے تھے ان میں شربت رکھنے کو بھی منع فرما دیا، کیونکہ آپ طبائع کی حالت جانتے تھے کہ بعض چالاک شربت کے بہانہ سے شراب پینے لگیں گے، پھر آپ کو جب اطمینان ہو گیا کہ اب لوگوں کے دلوں میں شراب سے نفرت ہو گئی ہے تو آپ نے اجازت دے دی، سو اگر آپ ﷺ طبائع کے ان خواص سے واقف نہ ہوتے تو ہرگز یہ خاص احکام صادرہ فرما سکتے تھے، اس سے ثابت ہو گیا کہ مصلح کو اس جماعت کے احوال سے پوری واقفیت ہونا ضروری ہے۔

اسی طرح زبان ومحاورات کی تبدیلی سے احکام میں فرق ہوجاتا ہے جس کی واقفیت کے لیے ان سے میل جول کی ضرورت ہے اور ظاہر ہے کہ انسانی احوال سے جس قدر انسان واقف ہوسکتا ہے فرشتے یا جن ہرگز واقف نہیں ہوسکتے ،فرشتے تو اس لیے کہ وہ خود طبیعت کے تغیر سے پاک ومنزہ ہیں وہ انسان کی تبدیلیوں سے کیونکر آگاہ ہوسکتے ہیں ،مثلاً فرشتہ کو جب بھوک نہیں لگتی تو وہ بھوک کی حقیقت وخاصیت کو کیسے جان سکتا ہے ،رہ گئے جن سو اگر چہ وہ تبدیل ہونے والی طبیعت تو رکھتے ہیں مگر چونکہ ان کی طبیعت میں شر غالب ہے اس لیے انسان میں جو قوی خیر کی طرف کھینچنے والے ہیں اس میں وہ انسان کے برابر ماہر نہیں ہوسکتے تو انسانی قوی کی تربیت اور ترقی کے متکفل وہ جن کب ہوسکتے ہیں ،اس لیے انسان کی کامل اصلاح انسان ہی کرسکتا ہے۔

اگر کوئی کہے کہ اگر فرشتے انسان کی اصلاح کے لیے کافی نہیں تو وحی کا لانا پھر ان کے ذمہ کیونکر کیا گیا؟ کیونکہ وحی تو اصلاح کا مبداء ہے ،جواب یہ ہے کہ یہ خاص علم یعنی مذکورہ مہارت تامہ اسی مصلح کے لیے ضروری ہے جو اتالیقی کی حالت رکھتا ہو ،جیسے حضرات انبیاء علیہم السلام کی شان ہے کہ اقوام کی اصلاح وتربیت ان کی رائے واجتہاد پر مبنی کی گئی ہے اور فرشتوں کی شان محض سفارت کی ہے کہ ایک معین عبارت یا خاص مضمون انبیاء علیہم السلام کو پہنچادیا ،اس میں مہارت کی ضرورت نہیں۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ جیسے جن اصلاح کے لیے کافی نہیں تو پھر انسان جن کی اصلاح کے لیے کیسے کافی ہوگا؟ جواب یہ ہے کہ انسان اور جن میں شر کی قوت تو مشترک ہے البتہ خیر کی قوت میں فرق ہے ،اس لیے جنوں کی طبیعت کے اثرات سے انسان واقف ہے ،انسان جنوں کی تربیت کرسکتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ فرشتوں کو تفصیلی علم کرانے کے لئے ایک خاص واقعہ کا اظہار کیا گیا کہ تمام کائنات عالم کے نام اور ان کے خواص وآثار جن کے علم کی صلاحیت صرف آدم علیہ السلام ہی میں ودیعت کی گئی تھی فرشتوں کی فطرت وجبلت اس کے مناسب نہ تھی وہ سب آدم علیہ السلام کو سکھائے اور بتلائے گئے تھے ،مثلاً دنیا کی نافع ومضر چیزیں اور ان کے خواص وآثار ،ہر جاندار اور ہر قوم کے مزاج وطبائع اور ان کے آثار ،ان چیزوں کے معلوم کرنے کے لئے طبیعت ملکی متحمل نہیں ،فرشتہ کیا جانے کہ پیاس کی تکلیف کیسی ہوتی ہے ،نفسانی جذبات کا کیا اثر ہوتا ہے ،سانپ اور بچھو کا زہر کس بدن پر کیا اثر کرتا ہے ،غرض زمینی مخلوقات کے نام اور خواص وآثار کی دریافت فرشتوں کے مزاج اور مخصوص طبیعت سے بالکل علیحدہ چیز تھی ،یہ علم صرف آدم ہی کو سکھلایا جاسکتا تھا انہی کو سکھلایا گیا ،پھر قرآن کی کسی تصریح یا اشارہ سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آدم علیہ السلام کو یہ تعلیم کسی تنہائی میں فرشتوں سے علیحدہ دی گئی ،اس لئے ہوسکتا ہے کہ تعلیم سب کے لئے عام ہی ہو ،مگر اس تعلیم سے فائدہ اٹھانا آدم علیہ السلام کی طبیعت میں تھا وہ سیکھ گئے ،فرشتوں کی فطرت میں نہ تھا وہ نہ سیکھ سکے ،اسی لئے یہاں تعلیم کو آدم کی طرف منسوب کیا گیا ،اگرچہ یہ تعلیم فی نفسہ عام تھی ،آدم اور ملائکہ دونوں کو شامل تھی ،اور یہ بھی ہوسکتا کہ ظاہری تعلیم کی صورت ہی عمل میں نہ آئی ہو ،بلکہ آدم علیہ السلام کی فطرت میں ان چیزوں کا علم ابتدائے آفرینش سے ودیعت کردیا گیا ہو ،جیسے بچہ ابتداء ولادت میں ماں کا دودھ پینا جانتا ہے ،بطخ کا بچہ تیرنا جانتا ہے ،اس میں کسی ظاہری تعلیم کی ضرورت نہیں ہوتی ،خلاصہ یہ ہے کہ زمینی مخلوقات کے اسماء اور ان کے خواص وآثار کا آدم علیہ السلام کو علم دیا گیا جو فرشتوں کے بس میں نہیں تھا ،اور پھر ان مخلوقات کو فرشتوں کے سامنے کرکے سوال کیا گیا کہ اگر تم اپنے اس خیال میں سچے ہو کہ ہم سے زیادہ کوئی مخلوق اعلم وافضل پیدا نہیں ہوگی یا یہ کہ زمین کی خلافت ونیابت کے لئے فرشتے بہ نسبت انسان کے زیادہ موزوں ہیں تو ان چیزوں کے نام اور خواص بتلاؤ جن پر خلیفہ زمین کو حکومت کرنا ہے۔

غرض اسی واقعہ سے حق تعالیٰ نے فرشتوں کو یہ بتلادیا کہ زمین کی نیابت کے لئے معصوم ہونے کو دیکھنا نہیں ،بلکہ اس کو دیکھنا ہے کہ وہ زمین کی چیزوں سے پورا واقف ہو ،ان کے استعمال کے طریقوں اور ان کے ثمرات کو جانتا ہو ،اگر تمہارا یہ خیال صحیح ہے کہ فرشتے اس خدمت کے لئے زیادہ موزوں ہیں تو ان چیزوں کے نام اور خواص بتلاؤ ،فرشتوں کا اظہار رائے چونکہ کسی اعتراض یا فخر وغرور یا اپنا استحقاق جتلانے کے لئے نہیں بلکہ محض اپنے خیال کا اظہار ایک نیاز مند خادم کی طرح اپنی خدمات پیش کرنے کے لئے تھا اس لئے فوراً بول اٹھے: قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ : ''پاک ہیں آپ ،ہم کو علم نہیں ،مگر وہی جو آپ نے عطا فرمایا ،بیشک آپ بڑے علم وحکمت والے ہیں'' جس کا حاصل

اپنے خیال سے رجوع اور اس کا اقرار تھا کہ زیادہ اعلم وافضل مخلوق بھی موجود ہے اور یہ کہ زمین کی نیابت کے لئے وہی موزوں ہیں۔

قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴿۳۲﴾

بولے پاک ہے تو، ہم کو معلوم نہیں مگر جتنا تو نے ہم کو سکھایا، بیشک تو ہی ہے اصل جاننے والا حکمت والا۔

خلاصہ تفسیر: (سوال ہوتا ہے کہ اس خاص علم کی استعداد فرشتوں کو کیوں نہ دے دی گئی؟ جواب یہ ہے کہ وہ استعداد بشریعنی بنی آدم کا خاصہ ہے، اگر ملائکہ میں وہ استعداد پیدا کر دی جاتی تو وہ فرشتے نہ رہتے، جیسے حس وحرکت حیوان کا خاصہ ہے، سو اللہ تعالیٰ کو یہ قدرت بھی ہے کہ جماد میں یہ صفت پیدا کر دیں، مگر یہ ظاہر ہے کہ وہ اس وقت جماد نہ رہے گا حیوان ہو جائے گا، پھر سوال کا حاصل تو گویا یہ ہوا کہ اللہ نے ان فرشتوں کو بشر کیوں نہ بنا دیا؟ سو ظاہر ہے کہ یہ سوال بالکل بے معنی ہے، اور اس کا جواب یہ ہے کہ اس صورت میں جو حکمت تخلیق ملائکہ میں ہے وہ معطل ہو جاتی، غرض فرشتے فرشتے ہی رہ کر اس علم کو حاصل نہیں کر سکتے، اسی وجہ سے) فرشتوں نے عرض کیا کہ آپ تو پاک ہیں (اس الزام سے کہ آدم علیہ السلام پر اس علم کو ظاہر فرما دیا، ہم سے پوشیدہ رکھا، آپ کی طرف سے تو کوئی اخفا یا گریز نہیں ہوا مگر) ہم کو ہی علم نہیں مگر وہی جو کچھ آپ نے ہم کو علم دیا (یعنی جس قدر ہماری پیدائش میں استعداد رکھی ہے اسی کے موافق ہمیں علم عنایت ہوا، اس کے سوا ہمیں دوسرے علم سمجھنے کی قوت نہیں ہے) بیشک آپ بڑے علم والے ہیں (کہ آپ کو سب علوم حاضر ہیں، ہماری اور انسانوں کی سب معلومات آپ پر منکشف ہیں) حکمت والے ہیں (کہ جس قدر جس کے لئے مصلحت جانا اسی قدر علم وفہم اس کو عطا فرمایا، اس سے فرشتوں کا یہ اعتراف تو ثابت ہو گیا کہ وہ اس کام سے عاجز ہیں جو نائب کے سپرد کرنا ہے)۔

لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا: اگر یہاں کسی کو شبہ ہو کہ جس طرح آدم علیہ السلام کو تعلیم دینے سے انہیں وہ خاص علم ہو گیا اور خلافت کی صلاحیت حاصل ہو گئی اگر فرشتوں کو تعلیم دے دی جاتی تو انہیں بھی وہ علم اور اس کے ساتھ خلافت کی صلاحیت میسر ہو جاتی، سو آدم علیہ السلام پر اس کا ظاہر کرنا اور فرشتوں سے پوشیدہ رکھنا آدم علیہ السلام کو ترجیح دینے کے لیے کافی نہیں ہو سکتا؟ جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو تو ہر چیز پر قدرت حاصل ہے، مگر عادت اللہ یوں جاری ہے کہ اکثر حوادث کو اسباب وشرائط کے ساتھ مربوط ومتعلق فرمایا ہے، سو جس علم کی یہاں بحث ہے اس کے حصول کے لیے ایک خاص استعداد کی ضرورت ہے، جیسا کہ ہر علم میں اس کا مشاہدہ ہوتا ہے، جیسے آنکھوں کے ذریعہ دیکھنے کے لیے بینائی کی استعداد شرط ہے، مادرزاد نابینا کو یہ حاصل ہو جانا عادۃً ممکن نہیں، اسی طرح اس خاص علم کی استعداد آدمی میں تو پیدا کی گئی اور فرشتوں میں پیدا نہیں کی گئی، جیسا اوپر اجمالاً اس کا بیان بھی ہوا ہے کہ انسانی (بشری) طبیعتوں کے احوال کے ادراک کے لیے انسانی طبیعت کا ہونا ضروری ہے جو کہ بشر کا خاصہ ہے اور فرشتوں میں یہ مفقود ہے، سو آدم علیہ السلام کی تعلیم کے وقت ملائکہ سے اس علم کے پوشیدہ کرنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں، نہ اس دعویٰ کی کوئی دلیل ہے، جب فرشتوں میں اس علم کی استعداد ہی نہیں، اگر تعلیم آدم کے وقت شروع سے آخر تک فرشتے حاضر بھی رہے ہوں تو انہیں اس کا حاصل ہونا کب ممکن ہے، اگر کسی طالب علم کو اقلیدس کی کوئی شکل سمجھائی جائے اور عام مجمع بھی موجود ہو تو جن کو اس فن سے مناسبت نہیں وہ اس تقریر سے کچھ بھی نہیں سمجھ سکتے۔

* * *

فائدہ: خلاصہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے حضرت آدم کو ہر ایک چیز کا نام مع اس کی حقیقت اور خاصیت کے اور نفع اور نقصان کے تعلیم فرما دیا اور یہ علم ان کے دل میں بلا واسطہ کلام القاء کر دیا، کیونکہ بدون اس کمال علمی کے خلافت اور دنیا پر حکومت کیونکر ممکن ہے، اس کے بعد ملائکہ کو اس حکمت پر مطلع کرنے کی وجہ سے ملائکہ سے امور مذکورہ کا سوال کیا گیا، اگر تم اپنی اس بات میں کہ تم کار خلافت انجام دے سکتے ہو سچے ہو تو ان چیزوں کے نام و احوال بتاؤ؟ لیکن انہوں نے اپنے عجز وقصور کا اقرار کیا اور خوب سمجھ گئے کہ بدون اس علم عام کے کوئی کار خلافت زمین میں نہیں کر سکتا اور اس علم عام سے قدر قلیل ہم کو اگر حاصل ہوا بھی تو اتنی بات سے ہم قابل خلافت نہیں ہو سکتے، یہ سمجھ کر کہہ اٹھے کہ تیرے علم وحکمت کو کوئی نہیں پہنچ سکتا۔

قَالَ يٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآىِٕهِمْ ۚ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآىِٕهِمْ ۙ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّىْٓ اَعْلَمُ

فرمایا اے آدم بتادے فرشتوں کو ان چیزوں کے نام، پھر جب بتادیے اس نے انکے نام، فرمایا کیا نہ کہا تھا میں نے تم کو کہ میں خوب جانتا ہوں

غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۙ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴿۳۳﴾

چھپی ہوئی چیزیں آسمانوں کی اور زمین کی، اور جانتا ہوں جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو چھپاتے ہو

خلاصہ تفسیر: (گذشتہ گفتگو سے فرشتوں کو اپنے عاجز ہونے کا مشاہدہ تو ہوگیا، اب حق تعالیٰ کو یہ منظور ہوا کہ آدم علیہ السلام میں اس علم خاص کی قوت و مناسبت کا ہونا فرشتے بھی عیاناً دیکھ لیں، اس لئے حق تعالیٰ نے) ارشاد فرمایا کہ اے آدم! تم بتلادو ان کو ان چیزوں کے اسماء (یعنی مع حالات و خواص کے، بتلا دینے سے یہ مراد ہے کہ ان کے روبرو اس کا اظہار کردو اگرچہ فرشتے مناسبت نہ ہونے کی وجہ سے سمجھ نہ سکیں گے مگر تقریر سن کر آدم کا عالم ہونا تو ان کو معلوم ہوجائے گا) سو جب بتلا دیئے ان کو آدم علیہ السلام نے ان چیزوں کے اسماء تو حق تعالیٰ نے فرمایا (دیکھو) میں تم سے نہ کہتا تھا کہ بیشک میں جانتا ہوں تمام پوشیدہ چیزیں آسمانوں کی اور زمین کی، اور جانتا ہوں جس بات کو ظاہر کردیتے ہو اور جس کو دل میں رکھتے ہو (کیونکہ ہر شخص کے تمام حالات انہی دو میں منحصر ہیں، مطلب یہ ہے کہ تمام حالات آفاقی و انفسی پر مجھے اطلاع ہے)۔

قَالَ يٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآىِٕهِمْ: شبہ ہوتا ہے کہ جب ملائکہ میں اس خاص علم کی مناسبت ہی نہ تھی تو فرشتوں کو بتلانے سے کیا فائدہ؟ اور اگر بتلانے سے وہ کچھ سمجھ سکتے ہیں تو یہ دعویٰ صحیح نہ رہا کہ فرشتوں کو اس خاص علم سے مناسبت نہ تھی؟ جواب یہ ہے کہ بعض اوقات خود تو آدمی ایک علم کو نہیں سمجھتا، مگر دوسرے کو تقریر کرتے ہوئے دیکھ کر قرائن مقام سے یہ یقیناً سمجھ لیتا ہے کہ یہ شخص واقعی اس علم میں بڑا ماہر ہے، مثلاً استاذ نے دو طالب علموں کے سامنے کسی دقیق مسئلہ کی تقریر کی، پھر دونوں کا امتحان لیا، ایک بیان نہ کرسکا، دوسرے نے فرفر تقریر شروع کردی، ممکن ہے کہ وہ دوسرا طالب علم باوجودیکہ اب بھی اس مسئلہ کو نہ سمجھا ہو، مگر اس طالب علم کے فوراً سنانے اور کہیں نہ رکنے سے یہ یقیناً سمجھ سکتا ہے کہ یہ اس مسئلہ کو واقعی خوب سمجھ گیا ہے، پس ''بتلادو'' کے معنی یہ نہیں کہ ''ان کے ذہن میں پہنچادو، ان کو سمجھادو''، بلکہ مراد یہ ہے کہ فرشتوں کے سامنے اس کا اظہار اور بیان کردو، اگرچہ مناسبت نہ ہونے کی وجہ سے ان کو سمجھ نہ سکیں، اب یہ شبہ جاتا رہا کہ اگر مناسبت نہ تھی تو بتلانے سے کیا فائدہ؟ سو ہم بھی کہیں گے کہ مناسبت تو نہ تھی، فائدہ تو یہ ہوا کہ ملائکہ اس قدر سمجھ گئے کہ آدم علیہ السلام ضرور ماہر ہوگئے۔

وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ: یعنی جانتا ہوں جس بات کو ظاہر کردیتے ہو اور جس کو دل میں رکھتے ہو، مثلاً فرشتوں کا یہ کہنا کہ: لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اور یہ کہنا کہ: اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ پس یہاں: اِنِّىْٓ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ میں یہ عنوان بدل کر اسی گزشتہ مضمون ہی کا اعادہ ہے جس کو پیچھے اِنِّىْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ کے عنوان سے ظاہر فرمایا تھا اور یہاں: وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ میں فرشتوں کے اس بیان کی تصدیق ہے کہ: لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا۔

* * *

فائدہ: اس کے بعد حضرت آدم سے جو تمام اشیائے عالم کی نسبت سوال ہوا تو فرفر سب امور ملائکہ کو بتادیئے کہ وہ بھی سب دنگ رہ گئے، اور حضرت آدم کے احاطۂ علمی پر عش عش کرگئے تو اللہ تعالیٰ نے ملائکہ سے فرمایا کہ کہو ہم نہ کہتے تھے کہ ہم جملہ مخفی امور آسمان و زمین کے جاننے والے ہیں اور تمہارے دل میں جو باتیں مکنون ہیں وہ بھی سب ہم کو معلوم ہیں۔

فائدہ: اس سے علم کی فضیلت عبادت پر ثابت ہوئی، دیکھئے! عبادت میں ملائکہ اس قدر بڑھے ہوئے ہیں کہ معصوم، مگر علم میں چونکہ انسان سے کم ہیں اس لئے مرتبہ خلافت انسان ہی کو عطا ہوا اور ملائکہ نے بھی اس کو تسلیم کرلیا اور ہونا بھی یوں ہی چاہیے، کیونکہ عبادت تو خاصہ مخلوقات ہے، خدا کی صفت نہیں، البتہ علم خدائے تعالیٰ کی صفتِ اعلیٰ ہے اس لئے قابل خلافت یہی ہوئے، کیونکہ ہر خلیفہ میں اپنے مستخلف عنہ کا کمال ہونا ضروری ہے۔

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ ۫

اور جب ہم نے حکم دیا فرشتوں کو کہ سجدہ کرو آدم کو تو سب سجدہ میں گر پڑے مگر شیطان ١؎ اس نے نہ مانا اور تکبر کیا

وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۴﴾

اور تھا وہ کافروں میں کا ٢؎

خلاصہ تفسیر: پچھلے واقعہ میں جب آدم کی فضیلت فرشتوں پر ظاہر ہو چکی اور دلائل سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ خلافت کی صلاحیت کے لئے جن علوم کی ضرورت ہے وہ آدم علیہ السلام میں سب جمع ہیں اور فرشتوں کو ان میں سے صرف بعض علوم حاصل ہیں اور جنوں کو تو ان علوم کا بہت ہی کم حصہ حاصل ہے، جیسا کہ پیچھے تفصیل سے گزر چکا ہے، چنانچہ خاص اس حیثیت سے کہ حضرت آدم ملائکہ و جن دونوں کے علوم کے جامع ہیں اس لیے آدم کا شرف ان دونوں گروہوں پر ظاہر کر دیا جائے، جس سے یہ ظاہر ہو کہ آدم علیہ السلام ان خاص علوم میں ملائکہ اور جن سے کامل اور دونوں کے علوم وقویٰ کو جامع ہیں، اب حق تعالیٰ کو منظور ہوا کہ ان غیر کاملوں سے اس کامل کی کوئی ایسی تعظیم کرائی جائے کہ عملاً بھی یہ بات ظاہر ہو جائے جبھی تو یہ دونوں آدم کی تعظیم کر رہے ہیں اور گویا بزبان حال کہہ رہے ہیں کہ جو اوصاف ہم میں الگ الگ ہیں، وہ آدم کے اندر یکجا ہیں، اس لئے جو تعظیمی عمل تجویز فرمایا گیا ہے اس کی حکایت ذکر فرماتے ہیں کہ:

اور جس وقت حکم دیا ہم نے سب فرشتوں کو (اور جنوں کو بھی، جیسا کہ بعض روایات میں ابن عباسؓ سے منقول ہے، غرض ان سب کو یہ حکم دیا گیا کہ) سجدہ میں گر جاؤ آدم کے سامنے، سو سب سجدہ میں گر پڑے، بجز ابلیس کے کہ اس نے کہنا نہ مانا اور غرور میں آ گیا، اور ہو گیا کافروں میں سے۔

فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ: غالباً فرشتوں کو بلا واسطہ حکم کیا ہوگا اور جنوں کو کسی فرشتہ وغیرہ کے ذریعہ سے کہا گیا ہوگا، اس آیت میں جو بات صراحۃً مذکور ہے وہ تو یہ ہے کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کا حکم فرشتوں کو دیا گیا، مگر آگے جب استثنا کر کے یہ بتلا دیا گیا کہ سب فرشتوں نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے نہیں کیا تو اس سے ثابت ہوا کہ سجدہ آدم کا حکم اس وقت کی تمام ذوی العقول مخلوقات کے لیے عام تھا جن میں فرشتے اور جنات سب داخل ہیں، مگر حکم میں صرف فرشتوں کے ذکر پر اس لئے اکتفا کیا گیا کہ وہ سب سے افضل اور اشرف تھے، جب آدم علیہ السلام کی تعظیم کا حکم ان کو دیا گیا تو جنات کا بدرجہ اولیٰ اس حکم میں شامل ہونا معلوم ہو گیا۔

وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ: اس پر کفر کا فتویٰ اس لیے دیا گیا کہ ابلیس نے حکم الٰہی کے مقابلہ میں تکبر اور اس کے قبول کرنے میں عار کیا، اور اس کو خلاف مصلحت ٹھہرایا، جیسا کہ دوسرے مقام پر اس کا قول مذکور ہے کہ میں آگ ہونے کی وجہ سے مٹی سے افضل ہوں اور افضل (آگ) سے مفضول (مٹی) کی تعظیم کرانا بے موقع ہے، چنانچہ ابلیس کا کفر محض عملی نافرمانی کا نتیجہ نہیں، کیونکہ کسی فرض کو عملاً ترک کر دینا اصول شریعت میں فسق و گناہ ہے کفر نہیں، ابلیس کے کفر کا اصل سبب حکم ربانی سے معارضہ اور مقابلہ کرنا ہے کہ آپ نے جس کو سجدہ کرنے کا مجھے حکم دیا ہے وہ اس قابل نہیں کہ میں اس کو سجدہ کروں یہ معارضہ بلاشبہ کفر ہے، جو شخص اس طرح شرعی حکم کے ساتھ رد و انکار سے پیش آئے وہ کافر ہے۔

* * *

فائدہ: ١؎ جب حضرت آدم کا خلیفہ ہونا مسلم ہو چکا تو فرشتوں کو اور ان کے ساتھ جنات کو حکم ہوا کہ حضرت آدم کی طرف سجدہ کریں اور ان کو قبلہ سجود بنائیں جیسا سلاطین اپنا اول ولی عہد مقرر کرتے ہیں، پھر ارکان دولت کو نذریں پیش کرنے کا حکم کرتے ہیں، تا کہ کسی کو سرتابی کی گنجائش نہ رہے، چنانچہ سب نے سجدہ مذکور ادا کیا، سوائے ابلیس کے کہ اصل سے جنات میں تھا اور ملائکہ کے ساتھ کمال اختلاط رکھتا تھا، اور سبب اس سرکشی کا یہ ہوا کہ جنات چند ہزار سال سے زمین میں متصرف تھے اور آسمان پر بھی جاتے تھے، جب ان کا فساد اور خون ریزی بڑھی تو ملائکہ نے بحکم الٰہی بعض کو قتل کیا اور بعض کو جنگل پہاڑ اور جزائر میں منتشر کر دیا، ابلیس ان میں بڑا عالم و عابد تھا، اس نے جنات کے فساد سے اپنی بے لوثی ظاہر کی، فرشتوں کی سفارش سے یہ بچ گیا اور ان ہی

میں رہنے لگا اور اس طمع میں کہ تمام جنات کی جگہ اب صرف میں زمین میں متصرف بنایا جاؤں عبادت میں بہت کوشش کرتا رہا اور خلافت ارض کا خیال پکا تا رہا، جب حکم الٰہی حضرت آدم کی نسبت خلافت کا ظاہر ہوا تو ابلیس مایوس ہوا اور عبادت ریائی کے رائگاں جانے پر جوش حسد میں سب کچھ کیا اور ملعون ہوا۔

فائدہ: ۲ یعنی علم الٰہی میں پہلے ہی کافر تھا، اوروں کو اب ظاہر ہوا، یا یوں کہو کہ اب کافر ہو گیا، اس وجہ سے کہ حکم الٰہی کا بوجہ تکبر انکار کیا اور حکم الٰہی کو خلاف حکمت و مصلحت اور موجب عار سمجھا، یہ نہیں کہ فقط سجدہ ہی نہیں کیا۔

وَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ۠ وَلَا تَقْرَبَا

اور ہم نے کہا اے آدم رہا کر تو اور تیری عورت جنت میں اور کھاؤ اس میں جو چاہو جہاں کہیں سے چاہو، اور پاس مت جانا

هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝۳۵

اس درخت کے پھر تم ہو جاؤ گے ظالم

خلاصہ تفسیر: اور ہم نے حکم دیا کہ اے آدم رہا کرو تم اور تمہاری بیوی (حوا جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے آدم علیہ السلام کی پسلی سے کوئی مادہ لے کر بنا دیا تھا) بہشت میں، پھر کھاؤ دونوں اس میں سے بافراغت جس جگہ سے چاہو، اور نزدیک نہ جانا اس درخت کے، ورنہ تم بھی انہی میں شمار ہو جاؤ گے جو اپنا نقصان کر بیٹھتے ہیں (خدا جانے وہ کیا درخت تھا، مگر اس کے کھانے سے منع فرما دیا اور آقا کو اختیار ہے کہ اپنی چیزوں میں سے غلام کو جس چیز کے برتنے کی چاہے اجازت دے دے اور جس چیز سے چاہے منع کر دے)۔

وَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ: یہ آدم علیہ السلام کے قصہ کا تکملہ ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ جب آدم علیہ السلام کی فضیلت اور خلافت ارضی کے لیے صلاحیت فرشتوں پر واضح کر دی گئی انہوں نے تسلیم کر لیا اور ابلیس اپنے تکبر اور معارضہ کی وجہ سے کافر ہو کر نکال دیا گیا تو آدم علیہ السلام اور ان کی زوجہ حوا کو یہ حکم ملا کہ تم دونوں جنت میں رہو اور اس کی نعمتوں سے فائدہ اٹھاؤ، مگر ایک معین درخت کے لئے یہ ہدایت کی کہ اس کے پاس نہ جانا ،یعنی اس کے کھانے سے مکمل پرہیز کرنا۔

يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ: یعنی ٹھہرو تم اور تمہاری زوجہ جنت میں، یہ واقعہ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق اور ملائکہ کے سجدہ کے بعد کا ہے، بعض حضرات نے اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہ تخلیق اور سجدہ کا واقعہ جنت سے باہر کہیں ہوا ہے اس کے بعد جنت میں داخل کیا گیا، لیکن ان الفاظ میں یہ مفہوم یقینی نہیں، بلکہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تخلیق بھی جنت میں ہوئی اور سجدے کا واقعہ بھی جنت میں پیش آیا، مگر اس وقت تک ان کو کوئی فیصلہ اس کے متعلق نہیں سنایا گیا تھا کہ آپ کا مسکن و مستقر کہاں ہو گا اس واقعہ کے بعد یہ فیصلہ سنایا گیا۔

وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ: یعنی اس درخت کے قریب بھی نہ جاؤ، ظاہر ہے کہ اصل مقصد تو یہ تھا کہ اس درخت یا اس کے پھل کو نہ کھاؤ، مگر احتیاطی حکم یہ دیا گیا کہ اس کے قریب بھی نہ جاؤ، اس سے اصول فقہ کا مسئلہ سدّ ذرائع ثابت ہوا، یعنی بعض چیزیں اپنی ذات میں ناجائز یا ممنوع نہیں ہوتیں لیکن جب یہ خطرہ ہو کہ ان چیزوں کے اختیار کرنے سے کسی حرام ناجائز کام میں مبتلا ہو جائے گا تو اس جائز چیز کو بھی روک دیا جاتا ہے، جیسے درخت کے قریب جانا ذریعہ بن سکتا تھا اس کے پھل پھول کھانے کا، اس ذریعہ کو بھی منع فرما دیا گیا، اسی کا نام اصول فقہ کی اصطلاح میں "سد ذرائع" ہے، اس میں مشائخ محققین کی اس عادت کی اصل ہے کہ بعض مباح اور جائز امور سے اس لیے روک دیتے ہیں کہ ناجائز اور غیر مباح کی طرف جانے کا سبب نہ بن جائے، چنانچہ فی نفسہ درخت کے قریب جانا ممنوع نہ تھا، صرف کھانا منع تھا، لیکن اس سے بچانے کے لیے درخت کے قریب جانے سے بھی منع کیا گیا۔

* * *

فائدہ: مشہور ہے کہ وہ درخت گیہوں کا تھا، یا بقول بعض انگور، یا انجیر، یا ترنج وغیرہ کا، واللہ اعلم۔

فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ۪ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ

پھر ہلا دیا انکو شیطان نے اس جگہ سے پھر نکالا انکو اس عزت و راحت سے کہ جس میں تھے اور ہم نے کہا تم سب اترو تم ایک دوسرے کے دشمن ہو گے

وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴿٣٦﴾

اور تمہارے واسطے زمین میں ٹھکانا ہے اور نفع اٹھانا ہے ایک وقت تک

خلاصہ تفسیر: پس لغزش دے دی آدم و حوا کو شیطان نے اس درخت کی وجہ سے، سو برطرف کر کے رہا ان کو اس عیش سے جس میں وہ تھے اور (ایک سزا تو ظاہری ہوئی کہ) ہم نے کہا کہ نیچے اترو (دوسری سزائے باطنی ہے کہ) تم میں سے بعضے بعضوں کے دشمن رہیں گے (جس سے زندگی کا لطف بہت کچھ کم ہو جائے گا) اور تم کو زمین پر کچھ عرصہ ٹھہرنا ہے اور کام چلانا ایک میعاد معین تک (یعنی وہاں جا کر بھی دوام نہ ملے گا، کچھ عرصہ کے بعد وہ گھر بھی چھوڑنا پڑے گا)۔

فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا: شیطان انکار سجدہ کے جرم میں ملعون و مردود ہو چکا تھا اور فرشتوں کی جماعت سے نکال دیا گیا تھا، چونکہ اس کو یہ زخم آدم علیہ السلام کی وجہ سے پہنچا تھا اس لیے ان کا جانی دشمن ہو گیا تھا، جب اس نے دیکھا کہ میں تو یوں مردود کر دیا گیا اور آدم کو خوب اعزاز حاصل ہوا، اب وہ اس فکر میں لگا کہ کسی طرح آدم اور ان کی بیوی کو اس عیش و عشرت سے جدا کرنا چاہیے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو بھی ابلیس کی دشمنی سے آگاہ فرما دیا تھا، غرض یہ آدم علیہ السلام کے پیچھے پڑا اور ان کو جس طرح بن پڑا بہکانا شروع کیا کہ اصل میں اس درخت کی خاصیت یہی ہے کہ اس کے کھانے سے حیات ابدی یا فرشتہ صفتی حاصل ہو جاتی ہے مگر جس وقت اللہ تعالیٰ نے تم کو منع کیا تھا اس وقت تمہاری حالت کے مناسب یہی تھا کہ اس کا ارتکاب نہ کیا جائے، اس وقت استعداد کمزور تھی، جیسا کہ بیمار کو معدہ کی کمزوری کی وجہ سے بہت سی چیزوں سے منع کر دیتے ہیں، صحت کے بعد وہ ممانعت نہیں رہتی، اب ماشاء اللہ تمہاری استعداد اپنی کمال قوت کو پہنچ گئی ہے، اب وہ ممانعت باقی نہ رہی، اور اس درخت کے کھانے سے حیات ابدی یا قوت ملائکہ حاصل ہو جاتی ہے اور اس مضمون پر اللہ کی قسمیں کھا گیا جس کے نام کو سن کر محبت والے تو گھل ہی جاتے ہیں، اور پھر ممکن ہے کہ اس موذی ظالم کو پہچانا بھی نہ ہو، کسی نئی شکل میں ملا ہو یا "عدو شود سبب خیر گر خدا خواہد" (اگر خدا چاہے تو دشمن بھی خیر کا سبب بن جاتا ہے) کو پیش نظر رکھ کر "انظر الی ما قال و لا تنظر الی من قال" کو دستور العمل بنایا ہو، اور اس نے ملے بغیر ہی اپنی جنّی قوت سے مسمریزم والوں کی طرح دور ہی سے اثر پہنچایا ہو جس سے آدم علیہ السلام کے خیال میں یہ بات پڑ گئی ہو اور یہ خدشہ بھی نہ ہوا ہو کہ یہ خیال کسی بدخواہ کا پہنچایا ہوا اثر ہے، غرض اسباب کچھ ایسے جمع ہو گئے کہ اس درخت کے کھانے کو اس وقت ممانعت سے خارج سمجھ گئے اور کھا لیا، اس کا کھانا تھا اور سب عیش و آرام کا رخصت ہونا تھا۔

اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ حضرت آدم علیہ السلام کو کسی خاص درخت کے کھانے سے منع فرمایا گیا تھا اور اس پر بھی متنبہ کر دیا گیا تھا کہ شیطان تمہارا دشمن ہے ایسا نہ ہو کہ وہ تمہیں گناہ میں مبتلا کر دے، اس کے باوجود حضرت آدم علیہ السلام نے اس درخت سے کھا لیا جو بظاہر گناہ ہے، حالانکہ انبیاء علیہم السلام گناہ سے معصوم ہوتے ہیں، تحقیق یہ ہے کہ انبیاء کی عصمت تمام گناہوں سے عقلاً اور نقلاً ثابت ہے، ائمہ اربعہ اور جمہور امت کا اس پر اتفاق ہے کہ انبیاء علیہم السلام تمام چھوٹے بڑے گناہوں سے معصوم و محفوظ ہوتے ہیں، وجہ یہ ہے کہ انبیاء کو لوگوں کا مقتدا بنا کر بھیجا جاتا ہے، اگر ان میں سے بھی کوئی کام اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف خواہ گناہ کبیرہ ہو یا صغیرہ صادر ہو سکے تو انبیاء کے اقوال و افعال سے امن اٹھ جائے گا اور وہ قابل اعتماد نہیں رہیں گے، جب انبیاء علیہم السلام ہی پر اعتماد و اطمینان نہ رہے تو دین کا کہاں ٹھکانہ ہے، البتہ قرآن کریم کی بہت سی آیات میں متعدد انبیاء کے متعلق ایسے واقعات مذکور ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سے گناہ سرزد ہوا، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر عتاب بھی ہوا، حضرت آدم علیہ السلام کا یہ قصہ بھی اسی میں داخل ہے، ایسے واقعات کا حاصل باتفاق امت یہ ہے کہ کسی غلط فہمی یا خطاء و نسیان کی وجہ سے ان کا صدور ہو جاتا ہے، کوئی پیغمبر جان بوجھ کر اللہ تعالیٰ

کے کسی حکم کے خلاف عمل نہیں کرتا، غلطی اجتہادی ہوتی ہے یا خطاء ونسیان کے سبب قابل معافی ہوتی ہے جس کو اصطلاح شرع میں گناہ نہیں کہا جاسکتا اور یہ سہو ونسیان کی غلطی ان سے ایسے کاموں میں نہیں ہوسکتی جن کا تعلق تبلیغ وتعلیم اور تشریع سے ہو، بلکہ ان سے ذاتی افعال اور اعمال میں ایسا سہو ونسیان ہوسکتا ہے، مگر چونکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک انبیاء علیہم السلام کا مقام نہایت بلند ہے اور بڑوں سے چھوٹی سی غلطی بھی ہوجائے تو بہت بڑی غلطی سمجھی جاتی ہے، اس لئے قرآن حکیم میں ایسے واقعات کو معصیت اور گناہ سے تعبیر کیا گیا ہے اور اس پر عتاب بھی کیا گیا ہے اگرچہ حقیقت کے اعتبار سے وہ گناہ ہی نہیں، حاصل یہ ہے کہ جان بوجھ کر نافرمانی کا صدور حضرت آدم علیہ السلام سے نہیں ہوا، بھول ہوگئی یا اجتہادی لغزش جو درحقیقت گناہ نہیں، مگر حضرت آدم علیہ السلام کی شان نبوت میں اور قرب خداوندی کے مقام عالی کے اعتبار سے یہ لغزش بھی بڑی سمجھی گئی اور قرآن میں اس کو معصیت کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا اور حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ واستغفار کے بعد معاف کرنے کا ذکر فرمایا گیا۔

یہاں ایک سوال یہ ہوتا ہے کہ جب شیطان کو سجدے سے انکار کی بنا پر پہلے ہی مردود کرکے جنت سے نکال دیا گیا تھا تو یہ آدم وحوا کو بہکانے کے لئے جنت میں کیسے پہنچا؟ اس کا بے غبار جواب یہ ہے کہ شیطان کے بہکانے اور وہاں تک پہنچنے کی بہت سی صورتیں ہوسکتی ہیں، یہ بھی ممکن ہے کہ بغیر ملاقات کے ان کے دل میں وسوسہ ڈالا ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ شیطان جنات میں سے ہے اور اللہ تعالیٰ نے جنات کو بہت سے ایسے تصرفات پر قدرت دی ہے جو عام طور پر انسان نہیں کرسکتے، ان کو مختلف شکلوں میں متشکل ہوجانے کی بھی قدرت دی ہے، ہوسکتا ہے کہ اپنی قوت جنیہ کے ذریعہ مسمریزم کی صورت سے آدم وحوا کے ذہن کو متاثر کیا ہو، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کسی دوسری شکل میں مثلاً سانپ وغیرہ کی شکل میں متشکل ہوکر جنت میں داخل ہوگیا ہو، اور شاید یہی سبب ہوا کہ آدم علیہ السلام کو اس کی دشمنی کی طرف دھیان نہ رہا، قرآن مجید کی آیت: وَقَاسَمَهُمَآ اِنِّيْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ شیطان نے صرف وسوسہ اور ذہنی اثر ڈالنے سے کام نہیں لیا، بلکہ آدم وحوا سے زبانی گفتگو کرکے اور قسمیں کھا کر متاثر کیا، درحقیقت یہ بحث فضول ہے کہ جب شیطان کو جنت سے مردود کرکے نکال دیا گیا تھا تو پھر وہ آدم علیہ السلام کو بہکانے کے لئے وہاں کس طرح پہنچا؟ کیونکہ شیطان کے بہکانے اور وسوسہ ڈالنے کے لئے ضروری نہیں کہ جنت میں داخل ہوکر ہی وسوسہ ڈالے، جنات وشیاطین کو حق تعالیٰ نے قدرت دی ہے کہ وہ دور سے بھی دل میں وسوسہ ڈال سکتے ہیں ، اور اگر داخل ہوکر بالمشافہ گفتگو ہی کو تسلیم کیا جائے تو اس کے بھی مختلف احتمالات ہوسکتے ہیں جس کی تحقیق میں پڑنا بے فائدہ اور لایعنی بحث ہے۔

اسی طرح یہ سوال کہ حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے پہلے یہ متنبہ کردیا تھا: اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ شیطان تمہارا دشمن ہے، ایسا نہ ہو کہ یہ کوئی ایسا کام کرادے جس کی وجہ سے تمہیں جنت سے نکلنا پڑے، پھر آدم علیہ السلام اس کے دھوکے میں کس طرح آگئے؟ اس کا جواب بھی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جنات وشیاطین کو مختلف شکلوں میں ظاہر ہونے کی قدرت عطا فرمائی ہے، ممکن ہے کہ وہ کسی ایسی صورت میں سامنے آیا ہو جس کی وجہ سے حضرت آدم علیہ السلام یہ نہ پہچان سکے کہ یہ شیطان ہے۔

وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ: اس حکم کے مخاطب حضرت آدم وحوا ہیں، اور اگر شیطان کو اس وقت تک آسمانوں سے باہر نہیں کیا گیا تھا تو وہ بھی اسی خطاب میں شامل ہے، اس صورت میں باہم عداوت ہونے کا مطلب یہ ہوگا کہ شیطان کے ساتھ تمہاری عداوت کا سلسلہ دنیا میں بھی جاری رہے گا، اور اگر بقول بعض اس واقعہ کے وقت سے پہلے ہی شیطان نکالا جاچکا تھا تو پھر اس کلام کا رخ آدم وحوا اور ان کی اولاد کی طرف ہوگا کہ ان کو بطور عتاب کے یہ جتلایا گیا کہ ایک سزا تو یہ ہے کہ جنت سے زمین پر اتارا گیا، دوسری سزا اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ آپ کی اولاد کے درمیان باہم عداوتیں بھی ہوں گی، اور ظاہر ہے کہ اولاد کے باہم عداوت ہونے سے والدین کا لطف زندگی بھی رخصت ہوجاتا ہے تو یہ بھی ایک قسم کی معنوی اور روحانی سزا ہوگی۔

اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ جو خطا اجتہادی ہو وہ اس قدر پکڑ اور مواخذہ کے قابل تو نہیں؟ جواب یہ ہے کہ جس قدر فہم وخصوصیت زیادہ ہوتی ہے، اس قدر ملامت بھی زیادہ ہوتی ہے اور اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ: "حسنات الأبرار سيّئات المقرّبين"، مقرباں را بیش بود حیرانی، حاصل اس کا یہ ہے کہ تم نے زیادہ غور سے کام کیوں نہیں لیا، یہ مواخذہ تو حضرت آدم علیہ السلام کے کمال اور مقبولیت کی عین دلیل ہے۔

فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا: جس طرح آدم علیہ السلام کامل ہونے کے باوجود خطا کر بیٹھے اسی طرح کوئی شخص جو قرب خداوندی حاصل

کر چکا ہو اس کا غلطی سے مامون و محفوظ ہونا بھی ضروری نہیں، سو اس میں دلیل ہے کہ کاملین بھی شیطان کے مکر سے مامون نہیں، چنانچہ آدم علیہ السلام کے اس وقت کامل ہونے میں کوئی شک نہیں، مگر باوجود ان کی اس خطا میں اور دوسروں میں دو فرق ہیں: ① ایک یہ کہ وہ کفر سے محفوظ تھے ② دوسرے یہ کہ ان کی غلطی دوسروں کی معصیت کے مثل نہیں، کیونکہ ان کو توبہ کے ایسے درجہ کی توفیق ہوئی جو دوسروں کو نہیں ہوتی۔

* * *

فائدہ: ۱۔ فَاَخۡرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيۡهِ: کہتے ہیں کہ حضرت آدم اور حوا بہشت میں رہنے لگے اور شیطان کو اس کی عزت کی جگہ سے نکال دیا، شیطان کو اور حسد بڑھا، بالآخر مور اور سانپ سے مل کر بہشت میں گیا اور بی بی حوا کو طرح طرح سے ایسا پھسلایا اور بہکایا کہ انہوں نے وہ درخت کھا لیا اور حضرت آدم کو بھی کھلایا اور ان کو یقین دلا دیا تھا کہ اس کے کھانے سے اللہ کے ہمیشہ کو مقرب ہو جاؤ گے اور حق تعالیٰ نے جو ممانعت فرمائی تھی اس کی توجیہ گھڑ دی، آئندہ یہ قصہ مفصل آئے گا۔

فائدہ: ۲۔ اهۡبِطُوۡا بَعۡضُكُمۡ لِبَعۡضٍ عَدُوٌّ: اس خطا کی سزا میں حضرت آدم علیہ السلام اور حوا اور جو اولاد پیدا ہونے والی تھی، سب کی نسبت یہ حکم ہوا کہ بہشت سے زمین پر جا کر رہو، باہم ایک دوسرے کے دشمن ہو گے، جس کی وجہ سے تکلیفیں پیش آئیں گی، بہشت دار العصیان اور دار العداوۃ نہیں، ان امور کے مناسب دار دنیا ہے، جو تمہارے امتحان کے لئے بنایا گیا ہے۔

فائدہ: ۳۔ مُسۡتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيۡنٍ: یعنی دنیا میں ہمیشہ نہ رہو گے، بلکہ ایک وقت معین تک وہاں رہو گے اور وہاں کی چیزوں سے بہرہ مند ہو گے اور پھر ہمارے ہی روبرو آؤ گے اور وہ وقت معین ہر ہر شخص کی نسبت تو اس کی موت کا وقت ہے، اور تمام عالم کے حق میں قیامت کا۔

فَتَلَقّٰۤى اٰدَمُ مِنۡ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيۡهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيۡمُ ﴿۳۷﴾

پھر سیکھ لیں آدم نے اپنے رب سے چند باتیں پھر متوجہ ہو گیا اللہ اس پر، بیشک وہی ہے توبہ قبول کرنے والا مہربان

خلاصہ تفسیر: آدم علیہ السلام نے یہ خطاب و عتاب کہاں سنے تھے، نہ ایسے سنگ دل تھے کہ اس کی سہار کر جاتے، بے چین ہو گئے اور فوراً ہی معافی کی التجا کرنے لگے، مگر پیغمبرانہ معرفت اور اس کی وجہ سے انتہائی ہیبت سے کوئی بات زبان سے نہ نکلتی تھی، یا اس خوف سے کہ معافی کی التجا کہیں خلاف شان ہو کر مزید عتاب کا سبب نہ بن جائے، زبان خاموش تھی، اللہ رب العزت دلوں کی بات سے واقف اور رحیم و کریم ہیں، یہ حالت دیکھ کر خود ہی معافی کے لئے کچھ کلمات ان کو سکھا دیئے، اور ایسے موقع پر کہ جب خطاوار اپنی خطا پر سخت نادم و بے چین ہو، معذرت کے الفاظ کا تلقین کر دینا دنیا میں رائج بھی ہے، چنانچہ اس کا بیان ان آیات میں ہے:

بعد ازاں حاصل کر لئے حضرت آدم علیہ السلام نے اپنے رب سے چند الفاظ (یعنی معذرت کے کلمات کہ وہ بھی اللہ تعالیٰ ہی سے حاصل ہوئے تھے، حضرت آدم علیہ السلام کی ندامت پر اللہ تعالیٰ کی رحمت متوجہ ہوئی اور خود ہی معذرت کے الفاظ تلقین فرما دیئے) تو اللہ تعالیٰ نے رحمت کے ساتھ توجہ فرمائی ان پر (ان کی توبہ قبول کر لی) بیشک وہی ہیں بڑے توبہ قبول کرنے والے بڑے مہربان (اور حضرت حوا کی توبہ کا بیان سورۃ اعراف میں ہے: قَالَا رَبَّنَا ظَلَمۡنَاۤ اَنۡفُسَنَا جس سے معلوم ہوا کہ وہ بھی توبہ اور قبول توبہ میں آدم علیہ السلام کے ساتھ شریک ہیں)۔

فَتَلَقّٰۤى اٰدَمُ مِنۡ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ: معذرت کے وہ کلمات بھی حق تعالیٰ ہی نے تعلیم فرمائے تھے جیسا کہ دنیا میں بھی دیکھا جاتا ہے کہ بعض دفعہ جب نوکر اپنی خطا پر نادم ہو کر ہاتھ جوڑ کر گردن جھکا کر آقا کے سامنے خاموش کھڑا ہو جاتا ہے اور ندامت و ہیبت کے مارے کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کہے، خدا جانے منہ سے کوئی ایسی غلط بات نہ نکل جائے جس سے اور زیادہ عتاب ہونے لگے یا اپنی غلطی کو اس قدر عظیم سمجھتا ہے کہ معذرت کے الفاظ اس کے لیے کافی نہیں ملتے، اس وقت آقا رحم کھا کر خود کلمات معذرت تلقین کرتا ہے کہ اچھا اقرار کرو کہ مجھ سے قصور ہوا، پھر ایسا نہ کروں گا، اس کے اس طرح کہہ دینے سے آقا معاف کر دیتا ہے۔

* * *

فائدہ: جب حضرت آدم علیہ السلام نے حق تعالیٰ کا حکم عتاب آمیز سنا اور جنت سے باہر آ گئے تو بحالت ندامت وانفعال گریہ وزاری میں مصروف تھے، اس حالت میں حق تعالیٰ نے اپنی رحمت سے چند کلمات ان کو القاء اور الہام کے طور پر بتلائے، جن سے ان کی توبہ قبول ہوئی، وہ کلمات یہ ہیں: ربنا ظلمنا انفسنا وان لم تغفر لنا وترحمنا لنکونن من الخاسرین آخر آیت تک۔

قُلۡنَا اهۡبِطُوۡا مِنۡهَا جَمِيۡعًا ۚ فَاِمَّا يَاۡتِيَنَّکُمۡ مِّنِّىۡ هُدًى فَمَنۡ تَبِعَ هُدَاىَ فَلَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ

ہم نے حکم دیا نیچے جاؤ یہاں سے تم سب [1] پھر اگر تم کو پہنچے میری طرف سے کوئی ہدایت تو جو چلا میری ہدایت پر نہ خوف ہوگا ان پر

وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ ﴿۳۸﴾

اور نہ وہ غمگین ہوں گے [2]

خلاصہ تفسیر: چونکہ روئے زمین پر آنے میں اور بھی ہزاروں حکمتیں اور مصلحتیں مضمر تھیں اس لیے خطا معاف فرمانے کے بعد بھی زمین پر جانے کے حکم کو منسوخ نہیں فرمایا، البتہ اس کا طرز بدل دیا کہ پہلا حکم حاکمانہ اور زمین پر اترنا بطور سزا کے تھا، اب یہ ارشاد حکیمانہ اور زمین پر آنا خلافت الہیہ کے اعزاز کے ساتھ ہوا، اس لیے اس کے فوراً بعد ان فرائض منصبی کا بیان ہے جو ایک خلیفۃ اللہ ہونے کی حیثیت سے ان پر عائد کیے گئے تھے، اسی لیے زمین پر اترنے کے حکم کو پھر مکرر بیان کر کے فرمایا کہ:

ہم نے حکم فرمایا نیچے جاؤ اس بہشت سے سب کے سب، پھر اگر آئے تمہارے پاس میری طرف سے کسی قسم کی ہدایت (یعنی احکام شرعیہ وحی کے ذریعہ سے) سو جو شخص پیروی کرے میری اس ہدایت کی تو نہ کچھ اندیشہ ہوگا ان پر، اور نہ ایسے لوگ غمگین ہوں گے (یعنی ان پر کوئی خوفناک واقعہ نہ پڑے گا اور قیامت کے ہولناک واقعات سے ان مقرب ومقبول بندوں کا بھی خوف زدہ ہونا اس کے خلاف نہیں، جیسا کہ احادیث صحیحہ میں سب پر ہول اور خوف کا عام ہونا معلوم ہوتا ہے)۔

قُلۡنَا اهۡبِطُوۡا مِنۡهَا جَمِيۡعًا: جنت سے زمین پر اترنے کا حکم اس سے پہلی آیت میں آ چکا ہے، اس جگہ پھر اس کو مکرر لانے میں غالباً حکمت یہ ہے کہ پہلی آیت میں زمین پر اتارنے کا ذکر بطور عتاب اور سزا کے آیا تھا، اسی لئے اس کے ساتھ انسانوں کی باہمی عداوت کا بھی ذکر کیا گیا، اور یہاں زمین پر اتارنے کا ذکر ایک خاص مقصد خلافت الہیہ کی تکمیل کے لئے اعزاز کے ساتھ ہے، اسی لئے اس کے ساتھ ہدایت بھیجنے کا ذکر ہے جو خلافت الہیہ کے فرائض منصبی میں سے ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اگرچہ زمین پر اترنے کا ابتدائی حکم بطور عتاب اور سزا کے تھا مگر بعد میں جب خطا معاف کر دی گئی تو دوسری مصالح اور حکمتوں کے پیش نظر زمین پر بھیجنے کے حکم کی حیثیت سے ہوا، اور یہ وہی حکمت ہے جس کا ذکر تخلیق آدم کے وقت ہی فرشتوں سے کیا جا چکا تھا کہ زمین کے لئے ان کو خلیفہ بنانا ہے، خلاصہ یہ کہ حضرت آدم علیہ السلام کا زمین پر اترنا سزا کے طور پر نہیں بلکہ ایک مقصد کی تکمیل کے لئے تھا۔

فَلَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ: یعنی نہ کچھ اندیشہ ہوگا ان پر، اور نہ ایسے لوگ غمگین ہوں گے، قیامت کے روز ان کو یہ ثمرہ ملے گا، یہ شبہ نہ ہو کہ احادیث سے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس روز بڑے بڑے مقبول ومقرب لوگ خوف زدہ ہوں گے، بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یوں نہیں فرمایا کہ وہ خوفناک نہ ہوں گے کہ اس شبہ کی گنجائش ہو، بلکہ اس طرح فرمایا ہے کہ ان پر کچھ اندیشہ وخوف نہ ہوگا، یعنی ان پر کوئی خوفناک واقعہ نہ پڑے گا، خود اپنے دل میں وہ کتنا ہی ڈرا کریں، اس کی ایسی مثال ہے کہ کسی شخص کا مقدمہ کسی حاکم کے اجلاس میں ہو اور وکیل قانون دان یوں کہے کہ اس مقدمہ میں کوئی خطرہ واندیشہ نہیں ہے تو مطلب یہی ہے کہ اس شخص پر کوئی آفت ایسی آنے والی نہیں جس کا اندیشہ ہو، ہرگز یہ مطلب نہیں ہوتا کہ خود اس کے دل میں طبعی خوف بھی نہیں ہے، اور چونکہ ان پر کوئی آفت وکلفت واقع نہ ہوگی اس لیے غم وحزن کی مطلق نفی فرما دی، کیونکہ حزن اسی کیفیت کو کہتے ہیں جو کسی نقصان کے واقع ہونے کے بعد دل میں پیدا ہوتی ہے، جبکہ خوف ہمیشہ نقصان کے وقوع سے پہلے ہوا کرتا ہے۔ اس سے یہ بھی لازم نہیں آتا کہ دنیا میں

جو چیزیں خوفناک سمجھی جاتی ہیں ان سے انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کرام کو بشری طور پر طبعی خوف نہ ہو، کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے جب لاٹھی کا سانپ بن گیا تو ان کا ڈر جانا قرآن مجید میں مذکور ہے: فَاَوْجَسَ فِیْ نَفْسِهٖ خِیْفَةً مُّوْسٰی ، کیونکہ یہ فطری اور طبعی خوف ابتداء حال میں تھا، جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لا تخف تو یہ ڈر بالکل نکل گیا، اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ خوف عام انسانوں کی طرح اس بنیاد پر نہ تھا کہ یہ سانپ ان کو تکلیف پہنچائے گا، بلکہ اس لئے تھا کہ بنی اسرائیل اس سے کہیں گمراہی میں نہ پڑ جائیں تو یہ خوف ایک قسم کا اخروی خوف تھا۔

* * *

فائدہ: ۱ مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ تو قبول فرمائی، مگر فی الفور جنت میں جانے کا حکم نہ فرمایا، بلکہ دنیا میں رہنے کا جو حکم ہوا تھا، اسی کو قائم رکھا، کیونکہ مقتضائے حکمت و مصلحت یہی تھا، ظاہر ہے کہ زمین کے لئے خلیفہ بنائے گئے تھے، نہ کہ جنت کے لئے، اور اللہ تعالیٰ نے یہ فرمادیا کہ جو ہمارے مطیع ہوں گے ان کو دنیا میں رہنا مضر نہ ہوگا بلکہ مفید، ہاں! جو نافرمان ہیں ان کے لئے جہنم ہے اور اس تفریق وامتحان کے لئے بھی دنیا ہی مناسب ہے۔

فائدہ: ۲ جو صدمہ اور اندیشہ کسی مصیبت پر اس کے ہونے سے پہلے ہوتا ہے اس کو "خوف" کہتے ہیں اور اس کے واقع ہو چکنے کے بعد جو غم ہوتا ہے اس کو "حزن" کہتے ہیں، مثلاً کسی مریض کے مرجانے کے خیال پر جو صدمہ ہے وہ "خوف" ہے اور مرجانے کے بعد جو صدمہ ہے وہ "حزن" ہے۔

اس آیت میں جو خوف وحزن کی نفی فرمائی اس سے اگر "خوف وحزن دنیاوی" مراد لیا جائے تو یہ معنی ہوں گے کہ جو لوگ ہماری ہدایت کے موافق چلیں گے، اس میں اس اندیشہ کی گنجائش نہیں کہ شاید یہ ہدایت حقہ نہ ہو، شیطان کی طرف سے دھوکہ اور مغالطہ ہو اور نہ وہ اس وجہ سے کہ ان کے باپ سے بالفعل بہشت چھوٹ گئی محزون ہوں گے، کیونکہ ہدایت والوں کو عنقریب جنت ملنے والی ہے، اور اگر "خوف وحزن آخرت" مراد ہو تو یہ مطلب ہوگا کہ قیامت کو اہل ہدایت کو نہ خوف ہوگا نہ حزن، مگر حزن کا نہ ہونا تو بیشک مسلم، لیکن خوف کی نفی فرمانے پر ضرور یہ خلجان ہوتا ہے کہ اس روز خوف تو حضرات انبیاء علیہم السلام تک کو ہوگا، کوئی بھی خوف سے خالی نہ ہوگا، تو بات یہ ہے کہ خوف دو طرح ہوتا ہے: ① کبھی تو خوف کا باعث اور مرجع خائف (یعنی ڈرنے والے) میں پایا جاتا ہے جیسے مجرم بادشاہی جو بادشاہ سے ڈرتا ہے تو موجب خوف جرم ہے، جو مجرم کی طرف رجوع ہوتا ہے ② اور کبھی مرجع خوف مخوف منہ یعنی جس سے ڈرتے ہیں، اس میں کوئی امر ہوتا ہے، مثلاً اگر کوئی شخص کسی بادشاہ صاحب جاہ وجلال کے روبرو یا شیر کے روبرو ہو تو اس کے خائف ہونے کی یہ وجہ نہیں کہ اس نے بادشاہ یا شیر کا جرم کیا ہے، بلکہ قہر وجلال سلطانی اور ہیبت اور غضب ودرندگی شیر موجب خوف ہے، جس کا مرجع ذات سلطانی اور خود شیر ہے، آیت سے پہلی قسم کی نفی ہوئی نہ دوسری قسم کی، شبہ تو جب ہو سکتا تھا کہ لاخوف علیہم کی جگہ لاخوف فیہم یالایخافون فرماتے۔

وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَآ اُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۳۹﴾ ع

اور جو لوگ منکر ہوئے اور جھٹلایا ہماری نشانیوں کو وہ ہیں دوزخ میں جانے والے، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے

خلاصہ تفسیر: پیچھے ان لوگوں کا حال بیان ہوا جو ہدایت کی پیروی کرنے والے ہوں گے، اب اس کے مقابلہ میں ان لوگوں کا حال بیان کیا جاتا ہے جو اس ہدایت کی پیروی نہیں کریں گے۔

اور جو لوگ کفر کریں گے اور تکذیب کریں گے ہمارے احکام کی، یہ لوگ ہوں گے دوزخ والے، وہ اس میں ہمیشہ کو رہیں گے۔

* * *

ربط: کفار کی دو جماعتیں جن کا ذکر اوپر آیا ہے: کھلے کافر اور منافق، ان دونوں میں دو طرح کے لوگ تھے: ① ایک تو بت پرست مشرکین، جو محض باپ دادوں کی رسوم کی پیروی کرتے تھے، کوئی علم قدیم یا جدید ان کے پاس نہ تھا، عام طور پر ان پڑھ امی تھے، جیسے عام اہل مکہ، اسی لئے قرآن میں ان لوگوں کو "امیین" کہا گیا ہے ② دوسرے "اہل کتاب" وہ لوگ تھے جو انبیاء علیہم السلام پر ایمان لائے اور پہلی کتابوں تورات وانجیل وغیرہ کا علم ان کے پاس تھا، لکھے پڑھے لوگ کہلاتے تھے، ان میں بعض حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان رکھتے تھے، عیسیٰ علیہ السلام پر نہیں، ان کو "یہود"

کہا جاتا تھا، اور بعض عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان رکھتے تھے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بحیثیت نبی معصوم نہیں مانتے تھے، یہ ''نصاریٰ'' کہلاتے تھے، ان دونوں کو قرآن میں اس بناء پر ''اہل کتاب'' کہا گیا ہے کہ یہ دونوں اللہ تعالیٰ کی آسمانی کتاب تورات یا انجیل پر ایمان رکھتے تھے، یہ لوگ لکھے پڑھے اہل علم ہونے کہ وجہ سے لوگوں کی نظر میں معزز اور قابل اعتماد مانے جاتے تھے، ان کی بات ان پر اثر انداز ہوتی تھی، یہ راستے پر آ جائیں تو دوسروں کے مسلمان ہونے کی توقع بڑی تھی، مدینہ طیبہ اور اس کے قرب وجوار میں ان لوگوں کی کثرت تھی۔

سورۃ بقرہ چونکہ مدنی سورت ہے اس لئے اس میں مشرکین ومنافقین کے بیان کے بعد ''اہل کتاب'' کو خصوصیت اور اہتمام کے ساتھ خطاب کیا گیا ہے، آگے چالیسویں آیت سے شروع ہو کر ایک سو تیئس آیات آخر پارہ تک انہیں لوگوں سے خطاب ہے، جس میں ان کو مانوس کرنے کے لئے اوّل ان کی خاندانی شرافت اور اس سے دنیا میں حاصل ہونے والے اعزاز کا، پھر اللہ تعالیٰ کی مسلسل نعمتوں کا ذکر کیا گیا ہے، پھر ان کی بے راہی اور غلط کاری پر متنبہ کیا گیا اور صحیح راستہ کی طرف دعوت دی گئی، ان میں سے پہلی سات آیتوں میں اجمالی خطاب ہے، جن میں دعوت ایمان اور اعمال صالحہ کی تلقین ہے، اس کے بعد بڑی تفصیل سے ان کو خطاب کیا گیا، خطاب کے شروع میں اور بالکل ختم پر اہتمام کے لئے یٰبَنِیٓ اِسۡرَآءِیۡلَ فرما کر انھیں الفاظ کا اعادہ کیا گیا ہے جن سے شروع کیا گیا تھا، جیسا کہ کلام کو موثر اور وقیع بنانے کے لئے ایسا کرنے کا دستور ہے۔

یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ اذۡکُرُوۡا نِعۡمَتِیَ الَّتِیۡۤ اَنۡعَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ وَاَوۡفُوۡا بِعَهۡدِیۡۤ اُوۡفِ بِعَهۡدِکُمۡ ۚ

اے بنی اسرائیل [1] یاد کرو میرے وہ احسان جو میں نے تم پر کئے [2] اور تم پورا کرو میرا اقرار تو میں پورا کروں تمہارا اقرار [3]

وَاِیَّایَ فَارۡهَبُوۡنِ ﴿۴۰﴾

اور مجھ ہی سے ڈرو [4]

خلاصہ تفسیر: یہاں تک معنوی نعمت عامہ کا بیان تھا جس کے ضمن میں حضرت آدم علیہ السلام کا پورا قصہ بیان فرمایا گیا، اب نعمت خاصہ کا بیان فرماتے ہیں جو خاص اس وقت کے اہل علم کو عطا ہو رہی تھی، مشرکین عرب میں تو اہل علم تھے نہیں، اہل کتاب میں پڑھے لکھے لوگ موجود تھے ان میں بھی بنی اسرائیل کی کثرت تھی، جن پر پشتوں سے انعام واحسان ہوتے آئے تھے اور انہیں حسب ونسب وریاست سب طرح کا فخر وامتیاز حاصل تھا، اس لیے انہی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور وہ نعمتیں ان کو یاد دلاتے ہیں تاکہ شرما کر ایمان لے آئیں اور چونکہ یہ اہل علم تھے ان کے ایمان لانے سے عوام پر اچھا اثر پڑے گا سو ان نعمتوں کو پہلے اجمالی یاد دلاتے ہیں، پھر اگلے رکوع سے تفصیلی، ان کا ذکر پارہ کے اختتام تک چلا جائے گا، اور انعامات کی فہرست کے اختتام پر بھی اسی قسم کی آیت ہوگی، کیونکہ قاعدہ ہے کہ جو اہم مقصود ہوتا ہے کلام کو شروع بھی اسی سے کرتے ہیں اور دلائل وغیرہ قائم کر کے پھر نتیجے کے طور پر اس کو ختم پر بھی لایا کرتے ہیں، سو ارشاد ہے:

اے بنی اسرائیل! (یعنی حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد) یاد کرو تم لوگ میرے ان احسانوں کو جو کئے ہیں میں نے تم پر (تاکہ ایمان لا کر اس نعمت کا حق ادا کرنا آسان ہو جائے، آگے اس یاد کرنے کی مراد بتلاتے ہیں) اور پورا کرو تم میرے عہد کو (یعنی تم نے جو تورات میں مجھ سے عہد کیا تھا، جس کا بیان قرآن کی اس آیت میں ہے: وَلَقَدۡ اَخَذَ اللّٰهُ مِیۡثَاقَ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ وَبَعَثۡنَا مِنۡهُمُ اثۡنَیۡ عَشَرَ نَقِیۡبًا) پورا کروں گا میں تمہارے عہد کو (یعنی میں نے جو عہد تم سے کیا تھا ایمان لانے پر، جیسا کہ آیت مذکورہ میں ہے: لَاُكَفِّرَنَّ عَنۡكُمۡ سَیِّاٰتِكُمۡ) اور صرف مجھ ہی سے ڈرو (اپنے عوام معتقدین سے مت ڈرو کہ ان کو اعتقاد نہ رہے گا ان سے آمدنی بند ہو جائے گی)۔

* * *

فائدہ: [1] یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ: اوّل یایها الناس اعبدوا خطاب عام تھا اور ان نعمتوں کا ذکر فرمایا تھا جو تمام بنی آدم پر عام تھیں، مثلاً زمین وآسمان وجملہ اشیاء کا پیدا کرنا، پھر حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کر کے ان کو خلیفہ بنانا اور بہشت میں داخل کرنا وغیرہ، اب ان میں سے خاص بنی

اسرائیل کو خطاب کیا گیا، اور خاص نعمتیں جو وقتاً فوقتاً پشت در پشت ان پر ہوتی چلی آئیں اور انہوں نے جو کفرانِ نعمت کیا، ان سب باتوں کو مفصل ذکر کیا جاتا ہے، کیونکہ بنی اسرائیل تمام فرقوں سے بنی آدم میں ممتاز اور اہلِ علم و کتاب و نبوت اور انبیاء کو پہچاننے والے سمجھے جاتے تھے، کیونکہ حضرت یعقوب علیہ السلام سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک چار ہزار نبی ان میں آ چکے تھے، تمام عرب کی نظریں ان کی طرف تھیں کہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی تصدیق کرتے ہیں یا نہیں؟ اس لئے ان انعامات اور خرابیوں کو بسط کے ساتھ ذکر فرمایا کہ شرما کر ایمان لائیں، ورنہ اور لوگ ان کی حرکات سے واقف ہو کر ان کی بات کا اعتبار نہ کریں، ''اسرائیل'' نام ہے حضرت یعقوب کا، اس کے معنی ہیں ''عبداللہ''۔

فائدہ: ۲۔ **اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ:** ہزاروں انبیاء ان میں بھیجے گئے، تورات وغیرہ کتابیں نازل فرمائیں، فرعون سے نجات دے کر ملک شام میں تسلط دیا، من وسلویٰ نازل ہوا، ایک پتھر سے بارہ چشمے جاری کئے جو نعمتیں اور خوارق عادات کسی فرقہ کو نصیب نہیں ہوئیں۔

فائدہ: ۳۔ **وَاَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ:** توریت میں یہ قرار کیا تھا کہ تم تورات کے حکم پر قائم رہو گے اور جس پیغمبر کو بھیجوں اس پر ایمان لا کر اس کے رفیق رہو گے تو ملک شام تمہارے قبضہ میں رہے گا (بنی اسرائیل نے اس کو قبول کر لیا تھا) مگر پھر قرار پر قائم نہ رہے، بدنیتی کی رشوت لے کے مسئلے غلط بتائے، حق کو چھپایا، اپنی ریاست جمائی، پیغمبر کی اطاعت نہ کی، بلکہ بعض پیغمبروں کو قتل کیا، تورات میں جہاں حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی صفت تھی اس کو بدل ڈالا، اس لئے گمراہ ہوئے۔

فائدہ: ۴۔ **وَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ:** یعنی منافع دنیاوی کے فوت ہونے سے مت ڈرو۔

وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ۠

اور مان لو اس کتاب کو جو میں نے اتاری ہے سچ بتانے والی ہے اس کتاب کو جو تمہارے پاس ہے ۱۔ اور مت ہو سب میں اوّل منکر اس کے ۲۔

وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۡ وَّاِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ ﴿۴۱﴾

اور نہ لو میری آیتوں پر مول تھوڑا، اور مجھ ہی سے بچتے رہو

خلاصہ تفسیر: (اب اس ایفاء عہد کا مطلب صاف لفظوں میں بیان فرماتے ہیں) اور ایمان لے آؤ اس کتاب پر جو میں نے نازل کی ہے (یعنی قرآن پر اور تم کو تو اس سے وحشت نہ ہونی چاہیے، کیونکہ اس کو تو نازل کیا ہے) ایسی حالت میں کہ وہ سچ بتلانے والی ہے اس کتاب کو جو تمہارے پاس ہے (یعنی تورات کے کتاب الٰہی ہونے کی تصدیق کرتی ہے، ہاں! جس قدر اس میں تحریفات کی گئی ہیں وہ خود تورات وانجیل ہونے ہی سے خارج ہیں، ان کی تصدیق اس سے لازم نہیں آتی) اور مت بنو تم سب میں پہلے انکار کرنے والے اس قرآن کے (یعنی تمہیں دیکھ کر جو دوسرے لوگ انکار کریں گے، ان سب میں کفر وانکار کے اول بانی تم ہو گے، تو قیامت تک ان کے کفر وانکار کا وبال تمہارے نامہ اعمال میں ہی درج ہوتا رہے گا) اور مت لو بمقابلہ میرے احکام کے معاوضہ حقیر کو، اور خاص مجھ ہی سے پورے طور پر ڈرو (یعنی میرے احکام چھوڑ کر یا ان کو بدل کر یا چھپا کر عوام الناس سے دنیائے ذلیل وقلیل کو وصول مت کرو جیسا کہ ان کی عادت تھی، جس کی اگلی آیت میں صراحت ہے)۔

* * *

فائدہ: ۱۔ توریت میں بتا دیا گیا تھا کہ جو نبی آئے، اگر تورات کی تصدیق کرے تو اس کو جانو سچا ہے، نہیں تو جھوٹا ہے، جاننا چاہیے کہ احکام قرآنی در بارہ اعتقادات اور اخبار انبیاء واحوالِ آخرت و اوامر ونواہی تورات وغیرہ کتب سابقہ کے موافق ہیں، ہاں! بعض اوامر ونواہی میں نسخ بھی کیا گیا ہے، مگر وہ تصدیق کے مخالف نہیں، تصدیق کے مخالف تکذیب ہے اور تکذیب کسی کتاب الٰہی کی ہو بالکل کفر ہے، منسوخ تو بعض آیات قرآنی بھی ہیں، مگر اس کو نعوذ باللہ کون تکذیب کہہ سکتا ہے۔

فائدہ: ۲۔ یعنی قرآن کی دیدہ و دانستہ تکذیب کرنے والوں میں اول مت ہو کہ قیامت تک کے منکرین کا وبال تمہاری گردن پر ہو، اور

مشرکین مکہ نے جو انکار کیا ہے وہ جہل اور بے خبری کے سبب کیا ہے، دیدہ و دانستہ ہرگز نہ تھا، اس میں تو اول تم ہی ہوگے اور یہ کفر پہلے کفر سے سخت تر ہے۔

وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿٤٢﴾

اور مت ملاؤ صحیح میں غلط اور مت چھپاؤ سچ کو جان بوجھ کر

خلاصہ تفسیر: اور مخلوط مت کرو حق کو ناحق کے ساتھ، اور پوشیدہ بھی مت کرو حق کو جس حالت میں کہ تم جانتے بھی ہو (کہ حق کو چھپانا بری بات ہے)۔

وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ: خود غرض لوگ احکام شرعیہ دو طرح سے تبدیل کیا کرتے ہیں: ① ایک تو یہ اگر قابو چلا تو اس کو ظاہر ہی نہ ہونے دیا، یہ ''کتمان'' ہے ② اگر ان کے چھپائے نہ چھپ سکا اور ظاہر ہی ہو گیا تو پھر اس میں خلط ملط کرنا چاہتے ہیں، کہیں سہو کاتب بتلا دیا، کہیں مجاز کا بہانہ پیش کر دیا، کہیں محذوف و مقدر نکال دیا، یہ ''لبس'' ہے، حق تعالیٰ نے دونوں سے منع فرما دیا۔

وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَارْكَعُوا مَعَ الرَّاكِعِينَ ﴿٤٣﴾

اور قائم رکھو نماز اور دیا کرو زکوٰۃ اور جھکو نماز میں جھکنے والوں کے ساتھ

خلاصہ تفسیر: یہاں تک تو ایمان لانے اور کفر کی باتیں چھوڑنے کا حکم تھا جو کہ بنیادی اصول ہے، اب عظیم الشان فروع اسلامیہ کا حکم فرماتے ہیں، تاکہ مجموعہ سے تکمیل اسلام کا مقصود و مامور بہ ہونا حاصل ہو جائے، گذشتہ آیتوں میں ایمان و عقائد سے متعلق ہدایات تھیں، اب اعمال صالحہ کی تلقین ہے اور ان میں جو اعمال سب سے زیادہ اہم ہیں ان کا ذکر ہے۔

اور قائم کرو تم لوگ نماز کو (یعنی مسلمان ہو کر) اور زکوٰۃ دو اور عاجزی کرو عاجزی کرنے والوں کے ساتھ۔

وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ: اعمال دو قسم کے ہیں: ① اعمال ظاہری ② اعمال باطنی، پھر اعمال ظاہری دو قسم کے ہیں: ① بدنی عبادت ② مالی عبادت، تو یہ تین کلیات ہوئیں، ان تینوں کلیات میں سے ایک ایک جزئی کو ذکر کر دیا ① نماز بدنی عبادت ہے ② زکوٰۃ مالی عبادت ہے ③ خشوع و خضوع باطنی عمل ہے، چونکہ باطنی تواضع میں اہل تواضع کی معیت کو بڑا دخل اور عظیم تاثیر ہے اس لیے مع الراکعین کا بڑھانا نہایت برمحل ہوا، یہ تینوں عمل عظیم الشان ہونے کے ساتھ ساتھ بنی اسرائیل کی حالت کے بہت مناسب تھے، اس لیے خاص ان کو ذکر فرمایا، کیونکہ نماز سے ان کی حب جاہ کم ہو گی، زکوٰۃ سے حب مال گھٹے گی، تواضع باطنی سے حسد وغیرہ میں کمی آئے گی اور یہی مرض ان میں زیادہ تھے، چنانچہ اس کا مستقل علاج بھی آگے اس آیت: وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ میں انہیں بتلا دیں گے۔

* * *

فائدہ: یعنی با جماعت نماز پڑھا کرو، پہلے کسی دین میں با جماعت نماز نہیں تھی اور یہود کی نماز میں رکوع نہ تھا، خلاصہ آیت کا یہ ہوا کہ صرف امور مذکورہ بالا نجات کے لئے تم کو کافی نہیں، بلکہ تمام اصول میں نبی آخر الزمان کی پیروی کرو، نماز بھی ان کے طور پر پڑھو، جس میں جماعت بھی ہو اور رکوع بھی۔

أَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ أَنْفُسَكُمْ وَأَنْتُمْ تَتْلُونَ الْكِتَابَ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿٤٤﴾

کیا حکم کرتے ہو لوگوں کو نیک کام کا اور بھولتے ہو اپنے آپ کو اور تم تو پڑھتے ہو کتاب، پھر کیوں نہیں سوچتے ہو

خلاصہ تفسیر: یہاں تک اسلامی اصول و فروع سب کی تاکید اور ترغیب انہیں دی گئی، اب ممکن تھا کہ کسی کو یہ خیال ہو کہ شاید مخاطبین کو حضور ﷺ کی نبوت و رسالت کا علم ہی نہ ہو اس لیے کسی درجہ میں معذور ہوں، اس خیال کو دور کرنے کے لیے بنی اسرائیل کا دعویٰ رسالت کی

سچائی سے واقف ہونا ظاہر فرماتے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ علماء بنی اسرائیل کے بعض اقارب مسلمان ہو گئے تھے، تو ان سے جب اس بارے میں گفتگو ہوتی تو خفیہ طور پر یہ علماء ان سے کہتے کہ بیشک محمد پیغمبر برحق ہیں، ہم لوگ تو کسی مصلحت سے اسلام قبول نہیں کر سکتے، مگر تم اس مذہب اسلام کو نہ چھوڑنا، اس سے صاف ثابت ہوا کہ یہ لوگ دعوی رسالت کی سچائی سے بخوبی آگاہ تھے، اسی بنا پر حق تعالیٰ فرماتے ہیں:

کیا غضب ہے کہ کہتے ہو اور لوگوں کو نیک کام کرنے کو (یعنی رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے اور آپ کی اطاعت کرنے کو) اور اپنی خبر نہیں لیتے، حالانکہ تم تلاوت کرتے رہتے ہو کتاب کی (یعنی تورات کی، جس میں جا بجا ایسے عالم بے عمل کی مذمتیں مذکور ہیں) تو پھر کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے (کہ ہم بھی ان مذمتوں کے مصداق بنے جاتے ہیں)۔

اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ: اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ بے عمل یا فاسق کے لیے دوسروں کو وعظ و نصیحت کرنا جائز نہیں، اور جو شخص کسی گناہ میں مبتلا ہو وہ دوسروں کو اس گناہ سے باز رہنے کی تلقین نہ کرے، کیونکہ کوئی اچھا عمل الگ نیکی ہے اور اس اچھے عمل کی تبلیغ دوسری مستقل نیکی ہے اور ظاہر ہے کہ ایک نیکی کو چھوڑنے سے یہ ضروری نہیں ہوتا کہ دوسری نیکی بھی چھوڑ دی جائے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ واعظ کو بے عمل نہیں ہونا چاہئے اور ان دونوں باتوں میں زمین اور آسمان کا فرق ہے، غرض یہ بات ثابت ہوگئی کہ ان کے پاس ایمان نہ لانے کے بارے میں کوئی معقول عذر نہیں ہے اور ایمان لانا بلاشبہ ان کے ذمہ واجب ہے۔

* * *

فائدہ: بعض علمائے یہود یہ کمال کرتے تھے کہ اپنے لوگوں سے کہتے تھے کہ یہ دین اسلام اچھا ہے اور خود مسلمان نہ ہوتے تھے اور نیز علمائے یہود بلکہ اکثر ظاہر بینوں کو اس موقع پر یہ شبہ پڑ جاتا ہے کہ جب ہم تعلیم احکام شریعت میں قصور نہیں کرتے اور حق پوشی بھی نہیں کرتے تو اس کی ضرورت نہیں کہ ہم خود بھی احکام پر عمل کریں، جب ہماری ہدایت کے موافق بہت سے آدمی اعمال شریعت بجالاتے ہیں تو بحکم قاعدہ "الدال علی الخير كفاعله" وہ ہمارے ہی اعمال ہیں تو اس آیت میں دونوں کا بطلان فرما دیا گیا۔

آیت سے مقصود یہ ہے کہ واعظ کو اپنے وعظ پر ضرور عمل کرنا چاہیے، یہ غرض نہیں کہ فاسق کسی کو نصیحت نہ کرے۔

وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۭ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَي الْخٰشِعِيْنَ ﴿45﴾

اور مدد چاہو صبر سے اور نماز سے اور البتہ وہ بھاری ہے مگر انہی عاجزوں پر

خلاصہ تفسیر: اب سمجھنا چاہیے کہ اگرچہ ان کے پاس کوئی قابل قبول عذر تو نہیں تھا مگر دو خصلتیں ان کو ایمان لانے نہیں دیتی تھیں:

① حب مال ② حب جاہ اور انہیں دو کی وجہ سے حسد بھی پیدا ہو گیا تھا، بار بار یہی خیال ہوتا تھا کہ اگر ہم نے رسول کا اتباع اختیار کر لیا سو یہ آسان ہے، کیونکہ اس میں کچھ نقصان نہیں، مگر اس کے بعد اس پر دوام بھی کرنا پڑے گا، سو یہ اس لیے مشکل ہے کہ اگر ایسا ہوا تو پھر کہاں تو یہ آمدنی اور کہاں یہ قدر و منزلت خود آپ کی غلامی کرنی پڑے گی اور چونکہ مال و جاہ کی محبت خوب دل میں گھس گئی تھی، آپ کے فتوحات و شوکت کی ترقی کو اپنے تنزل کا سبب سمجھ کر حسد کے مارے جلے جاتے تھے، غرض اصل مرض یہ دو تھے اور ان کی وجہ سے ایمان لانا دشوار ہو رہا تھا، اس لیے اللہ تعالیٰ اس مشکل کے آسان ہو جانے کا طریقہ بتلاتے ہیں:

اور مدد لو (یعنی اگر تم کو حب مال و حب جاہ کی وجہ سے ایمان لانا دشوار معلوم ہوتا ہو تو مدد لو) صبر اور نماز سے (یعنی ایمان لا کر صبر اور نماز کا التزام کرو تو یہ مال اور جاہ کی محبت دل سے نکل جائے گی، اب سمجھو کہ صبر میں تو بعض شہوات کو صرف چھوڑنا پڑتا ہے جبکہ نماز میں بہت سے افعال ہوتے ہیں جن کی پابندی بہت ہی گراں گذرتی ہیں اس لیے صبر میں تو چنداں مشقت نہ ہوگی، البتہ نماز میں ضرور دشواری ہوگی، سو اس دشواری کا کیا علاج ہونا چاہیے، سو اس کی نسبت فرماتے ہیں:) اور بیشک وہ نماز دشوار ضرور ہے مگر جن کے قلوب میں خشوع ہو ان پر کچھ بھی دشوار نہیں۔

وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ: صبر سے مال کی محبت گھٹ جائے گی، کیونکہ مال اسی وجہ سے محبوب ہے کہ وہ لذات وشہوات کے حصول کا ذریعہ ہے، جب انہی کو چھوڑنے کی ہمت باندھ لوگے تو مال بھی محبوب نہ رہے گا، اور نماز سے حب جاہ کم ہوگی، کیونکہ نماز میں ہر طرح کی پستی وخاکساری ہی ہے، جب یہ عادت پختہ ہوجائے گی تو حب جاہ گھٹے گی اور یہی فساد کا مادہ تھا، اس کی اصلاح سے اب ایمان میں دشواری معلوم نہ ہوگی۔

وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ: حاصل یہ ہے کہ نماز کی دشواری کا سبب یہ ہے کہ انسان کا قلب میدان خیال میں آزادانہ تخیلات وتفکرات کا عادی ہوتا ہے، اور اس کے اعضاء وجوارح قلب کے تابع ہوتے ہیں، تو وہ اعضاء کے آزاد رہنے کا بھی تقاضہ کرتا ہے، جبکہ نماز میں پوری پوری پابندی ہوتی ہے کہ نہ ہنسو، نہ بولو، نہ کھاؤ، نہ پیو، نہ چلو وغیرہ وغیرہ، ان پابندیوں سے پہلے اعضاء مقید ہوتے ہیں اور ان کی قید کا اثر قلب پر ہوتا ہے کہ وہ تنگ ہوتا ہے، اس لیے اس کو نماز کی پابندیاں گراں گزرتی ہیں اور قلبی خیال وفکر ایک قسم کی حرکت ہے تو اس کا علاج سکون سے کیا گیا جو اس کی ضد ہے، ''خشوع'' کے معنی سکون قلب ہی کے ہیں، مگر ظاہر ہے کہ دفعۃً قلب سے تمام تفکرات کو خالی کرنا بہت دشوار ہے، اس لیے اس کی صرف یہ تدبیر ہے کہ قلب کو کسی ایک خیال میں مستغرق کردیا جائے تو دوسرے خیالات از خود ختم ہوجائیں گے، جس سے حرکت منقطع ہوجائے گی تو سکون قلب نصیب ہوگا جو سبب ہوگا اس کے آسان ہونے اور ہمیشہ ادا ہوتے رہنے کا جس سے حب جاہ کم ہوکر ایمان کا مانع ختم ہوجائے گا اور اس مانع کے ختم ہونے سے ثبات علی الایمان کی توفیق مل جائے گی۔

* * *

فائدہ: ۱؎ علمائے اہل کتاب جو بعد وضوح حق بھی آپ پر ایمان نہ لاتے تھے، اس کی بڑی وجہ حب جاہ اور حب مال تھی، اللہ تعالیٰ نے دونوں کا علاج بتادیا، صبر سے مال کی طلب اور محبت جائے گی اور نماز سے عبودیت وتذلل آئے گا اور حب جاہ کم ہوگی۔

الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۴۶﴾ ع

جن کو خیال ہے کہ وہ روبرو ہونے والے ہیں اپنے رب کے اور یہ کہ ان کو اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے

خلاصہ تفسیر: (چنانچہ اب اس مذکورہ خیال کی تعیین فرماتے ہیں) وہ خاشعین وہ لوگ ہیں جو خیال رکھتے ہیں اس کا کہ وہ بیشک ملنے والے ہیں اپنے رب سے (تو اس وقت اس کا خوب انعام ملے گا) اور اس بات کا بھی خیال رکھتے ہیں کہ وہ اپنے رب کی طرف واپس جانے والے ہیں (تو اس وقت اس کا حساب کتاب بھی دینا ہوگا، ان دونوں خیالوں سے رغبت اور خوف پیدا ہوگا اور یہی دو چیزیں ہر عمل کی روح ہیں)۔

* * *

فائدہ: یعنی صبر اور نماز حضور دل سے بہت بھاری ہے، مگر ان پر آسان ہے جو عاجزی کرتے ہیں اور ڈرتے ہیں، جن کا خیال اور دھیان یہ ہے کہ ہم کو خدا کے روبرو ہونا اور اس کی طرف پھر جانا ہے (یعنی نماز میں خدا کا قرب اور گویا اس سے ملاقات ہے) یا قیامت میں حساب وکتاب کے لئے روبرو جانا ہے۔

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۷﴾

اے بنی اسرائیل یاد کرو میرے احسان جو میں نے تم پر کئے اور اس کو کہ میں نے تم کو بڑائی دی تمام عالم پر

خلاصہ تفسیر: اب تک اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو اجمالی انداز میں اپنی نعمتیں اور ان کی ناشکریاں بتلائیں، اب یہاں سے اسی کو خوب تفصیل سے بیان فرماتے ہیں، اس آیت میں اطاعت کی ترغیب ہے:

اے اولاد یعقوب (علیہ السلام) کی تم لوگ میری اس نعمت کو یاد کرو (تاکہ شکر اور اطاعت کی تحریک ہو) جو میں نے تم کو انعام میں دی تھی اور اس (بات) کو (یاد کرو) کہ میں نے تم کو (خاص خاص برتاؤ میں) تمام دنیا جہان والوں پر فوقیت دی تھی (اور ایک ترجمہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ''میں نے تم کو

ایک بڑے حصہ مخلوق پر فوقیت دی تھی''، مثلاً اس زمانہ کے لوگوں پر)۔

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ: اس خاص برتاؤ کا بیان ایک آیت کے بعد سے شروع ہوتا ہے، وہ خاص برتاؤ زیادہ تر اگرچہ ان مخاطبین کے باپ دادا کے ساتھ ہوا ہے، لیکن اس آیت میں خطاب چونکہ حضور اکرم ﷺ کے زمانہ کے یہودیوں کو ہے اور عموماً ایسا ہوتا ہے کہ باپ دادا پر جو احسان و اکرام کیا جائے اس سے اس کی اولاد بھی فائدہ حاصل کرتی ہے، جس کا عام طور پر مشاہدہ ہوتا رہتا ہے، اس لئے موجودہ یہودیوں کو بھی اس آیت میں مخاطب سمجھا جاسکتا ہے۔

* * *

فائدہ: چونکہ تقوی اور کمال ایمان کا حاصل کرنا، صبر و حضور استغراق عبادات کے ذریعہ سے دشوار تھا، اس لئے اس کا سہل طریقہ تعلیم فرماتے ہیں اور وہ شکر ہے، اس وجہ سے حق تعالیٰ اپنے احسانات و انعامات جو ان پر وقتاً فوقتاً ہوئے تھے، ان کو یاد دلاتا ہے اور ان کی بدکرداریاں بھی ظاہر فرماتا ہے، انسان بلکہ حیوانات تک میں یہ مضمون موجود ہے کہ اپنے منعم کی محبت اور اس کی اطاعت دل نشین ہوجاتی ہے اور چند رکوع میں اس مضمون کو شرح و بسط کے ساتھ بیان فرمایا گیا ہے۔

فائدہ: اہل عالم پر فضیلت کا یہ مطلب ہے کہ جس وقت سے بنی اسرائیل کا وجود ہوا تھا، اس وقت سے لے کر اس خطاب کے نزول تک تمام فرقوں سے افضل رہے، کوئی ان کا ہم پلہ نہ تھا، جب انہوں نے نبی آخر الزمان اور قرآن کا مقابلہ کیا تو وہ فضیلت بالکل جاتی رہی اور مغضوب علیہم اور ضلال کا لقب عنایت ہوا، اور حضور ﷺ کے متبعین کو کنتم خیر امۃ کا خلعت ملا۔

وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ

اور ڈرو اس دن سے کہ کام نہ آئے کوئی شخص کسی کے کچھ بھی اور قبول نہ ہو اس کی طرف سے سفارش اور نہ لیا جائے اس کی طرف سے بدلا

وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۴۸﴾

اور نہ ان کو مدد پہنچے

خلاصہ تفسیر: پیچھے اطاعت کی ترغیب تھی، اب اطاعت نہ کرنے پر ترہیب یعنی دھمکی بتلاتے ہیں:

اور ڈرو تم ایسے دن سے کہ (جس میں) نہ تو کوئی شخص کسی شخص کی طرف سے کچھ مطالبہ ادا کرسکتا ہے اور نہ کسی شخص کی طرف سے کوئی سفارش قبول ہوسکتی ہے (جبکہ خود اس شخص میں ایمان نہ ہو جس کی سفارش کرتا ہے) اور نہ کسی شخص کی طرف سے کوئی معاوضہ لیا جاسکتا ہے اور نہ ان لوگوں کی طرف داری چل سکے گی۔

وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِىْ: آیت میں جس ''یوم'' کا ذکر ہے اس سے قیامت کا دن مراد ہے، ''مطالبہ ادا کرنے'' کا مطلب یہ ہے کہ مثلاً کسی کے ذمہ نماز روزہ کا مطالبہ ہو اور دوسرا کہہ دے کہ میرا نماز روزہ لے کر اس کا حساب بے باق کردیا جائے اور ''معاوضہ'' یہ کہ کچھ مال وغیرہ داخل کرکے بچ جائے، سو دونوں باتیں نہ ہوں گی اور ''بغیر ایمان کے سفارش'' قبول نہ ہونے کی صورت دوسری آیات سے یہ معلوم ہوئی کہ کوئی ان کی سفارش ہی نہ کرے گا جو قبول کی گنجائش ہو، اور ''طرف داری'' کی صورت یہ ہوتی ہے کہ کوئی زوردار حمایت کرکے زبردستی نکال لائے، غرض یہ کہ دنیا میں مدد کرنے کے جتنے طریقے ہوتے ہیں بغیر ایمان کے وہاں کچھ بھی نہ ہوگا۔

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ (الی قولہ) وَاتَّقُوْا يَوْمًا: اس میں اس بات پر دلالت ہے کہ بغیر ایمان اور عمل صالح کے محض مقبولین کی طرف منسوب ہونا مفید نہیں، کیونکہ یہ (بنی اسرائیل) لوگ انبیاء علیہم السلام کی اولاد تھے، پھر دیکھیے ان پر کس قدر لتاڑ ہوئی ہے۔

* * *

فائدہ: جب کوئی کسی بلا میں مبتلا ہو جاتا ہے تو اس کے رفیق اکثر یہی کیا کرتے ہیں کہ:① اول تو اس کے ادائے حق لازم میں کوشش کرتے ہیں، یہ نہیں ہوسکتا تو ② سعی وسفارش سے، بچانے کی تدبیر کرتے ہیں، یہ بھی نہ ہو سکے تو پھر ③ تاوان وفدیہ دے کر چھڑاتے ہیں، اگر یہ بھی نہیں ہو سکتا تو ④ بالآخر اپنے مددگاروں کو جمع کر کے بزور پر خاش اس کی نجات کی فکر کرتے ہیں، حق تعالیٰ نے اسی ترتیب کے موافق ارشاد فرمایا کہ کوئی شخص گو کیسا ہی مقرب خداوندی ہو، مگر کسی نافرمان عدو اللہ کافر کو من جملہ چاروں صورتوں کے کسی صورت سے نفع نہیں پہنچا سکتا، بنی اسرائیل کہتے تھے کہ ہم کیسے ہی گناہ کریں ہم پر عذاب نہ ہوگا، ہمارے باپ دادا جو پیغمبر ہیں، ہمیں بخشوالیں گے، سوخدائے تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ خیال تمہارا غلط ہے، اس سے اس شفاعت کا انکار نہیں نکلتا جس کے اہل سنت قائل ہیں اور جو دیگر آیات میں مذکور ہے۔

وَاِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ

اور یاد کرو اس وقت کو جب کہ رہائی دی ہم نے تم کو فرعون کے لوگوں سے جو کرتے تھے تم پر بڑا عذاب ذبح کرتے تھے تمہارے بیٹوں کو

وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ۭ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَاۗءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ﴿٤٩﴾

اور زندہ چھوڑتے تھے تمہاری عورتوں کو ا۔ اور اس میں آزمائش تھی تمہارے رب کی طرف سے بڑی ۲۔

خلاصہ تفسیر: پیچھے جن خاص برتاؤں کا حوالہ دیا ہے، اب یہاں سے ان کی تفصیل شروع ہوتی ہے، پہلا معاملہ تو یہ ہے کہ:

اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب کہ رہائی دی ہم نے تم (لوگوں کے آباء واجداد) کو متعلقین فرعون سے، جو فکر میں لگے رہتے تھے تمہاری دل آزاری کے، گلے کاٹتے تھے تمہاری اولاد (لڑکوں) کے اور زندہ چھوڑ دیتے تھے تمہاری عورتوں کو (لڑکیوں کو کہ زندہ رہ کر بڑی عورتیں ہو جائیں) اور اس (واقعہ) میں تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارا ایک بڑا بھاری امتحان تھا۔

يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ: کسی نے فرعون سے پیشین گوئی کر دی تھی کہ بنی اسرائیل میں ایک ایسا لڑکا پیدا ہوگا جس کے ہاتھوں تیری سلطنت جاتی رہے گی، اس لیے اس نے نومولود لڑکوں کو قتل کرنا شروع کر دیا، چونکہ لڑکیوں سے کوئی اندیشہ نہ تھا اور ان سے خدمت لینا بھی مدنظر تھا اس لیے ان سے کوئی تعرض نہ کیا۔

وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَاۗءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ: اس واقعہ سے مراد یا تو ذبح اور قتل ہے، اور مصیبت میں صبر کا امتحان ہوتا ہے، یا رہائی دینا مراد ہے جو کہ ایک نعمت ہے اور نعمت میں شکر کا امتحان ہوتا ہے۔

* * *

فائدہ: ا فرعون نے خواب دیکھا تھا نجومیوں نے اس کی تعبیر دی کہ بنی اسرائیل میں ایک شخص پیدا ہوگا جو تیرے دین اور سلطنت کو غارت کر دے گا، فرعون نے حکم دیا کہ بنی اسرائیل میں جو بیٹا پیدا ہو اس کو مار ڈالو اور جو بیٹی ہو اس کو خدمت کے لئے زندہ رہنے دو، خدائے تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو پیدا کیا اور زندہ رکھا۔

فائدہ: ۲ "بلاء" کے چند معنی آتے ہیں اگر ذٰلِكُمْ کا اشارہ ذبح کی طرف لیا جائے تو اس کے معنی مصیبت کے ہوں گے اور اگر نجات کی طرف اشارہ ہے تو بلاء کے معنی نعمت کے ہوں گے اور مجموعہ کی طرف ہو تو امتحان کے معنی لئے جائیں گے۔

وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَيْنٰكُمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿٥٠﴾

اور جب پھاڑ دیا ہم نے تمہاری وجہ سے دریا کو پھر بچا دیا ہم نے تم کو اور ڈبا دیا فرعون کے لوگوں کو اور تم دیکھ رہے تھے

خلاصہ تفسیر: (دوسرا معاملہ) اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب کہ شق کر دیا ہم نے تمہارے (رستہ دینے کی) وجہ سے دریائے شور کو

، پھر ہم نے (ڈوبنے سے) بچالیا تم کو اور غرق کردیا متعلقین فرعون کو (مع فرعون کے) اور تم (اس کا) معائنہ کررہے تھے۔

یہ قصہ اس وقت ہوا جبکہ موسی علیہ السلام پیدا ہوکر پیغمبر ہوگئے اور مدتوں فرعون کو سمجھاتے رہے، جب وہ کسی طرح نہ مانا تو حکم ہوا کہ بنی اسرائیل کو خفیہ لے کر یہاں سے چلے جاؤ، راستہ میں سمندر ملا اور اسی وقت فرعون لشکر لے کر پیچھے سے آپہنچا، حق تعالی کے حکم سے دریا شق ہوگیا، موسی علیہ السلام اور بنی اسرائیل تو پار ہوگئے اور فرعون کے پہنچنے تک دریا اسی طرح رہا، وہ بھی تعاقب کرتا ہوا دریا میں گھس گیا، اس وقت سب طرف سے پانی سمٹ کر دریا اپنی سابقہ حالت پر ہوگیا، فرعون اور فرعونی سب ختم ہوگئے۔

* * *

فائدہ: یعنی یاد کرو اے بنی اسرائیل! اس نعمت عظیم کو کہ جب تمہارے باپ دادا فرعون کے ڈر سے بھاگے اور آگے دریا اور پیچھے فرعون کا لشکر تھا اور ہم نے تم کو بچالیا اور فرعون اور اس کے لشکر کو غرق کردیا، یہ قصہ آئندہ مفصل آئے گا۔

وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰٓى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿٥١﴾

اور جب ہم نے وعدہ کیا موسیٰ سے چالیس رات کا پھر تم نے بنالیا بچھڑا موسیٰ کے بعد اور تم ظالم تھے

خلاصہ تفسیر: (تیسرا معاملہ) اور (وہ زمانہ یاد کرو) جبکہ وعدہ کیا تھا ہم نے موسیٰ سے (تورات دینے کا ایک مدت گذرنے پر جس میں دس رات کا اضافہ ہوکر) چالیس رات کا (زمانہ ہوگیا تھا) پھر تم لوگوں نے (پرستش کے لئے) تجویز کرلیا گوسالہ کو موسیٰ کے (جانے کے) بعد اور تم نے (اس تجویز میں صریح) ظلم پر کمر باندھ رکھی تھی (کہ ایسی بے جابات کے قائل ہوگئے تھے)۔

وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰٓى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً: فرعون کے غرق ہونے کے بعد بنی اسرائیل نے موسی علیہ السلام سے عرض کیا کہ ہمارے لیے اگر کوئی شریعت مقرر ہوتو اس کو دستور العمل بنالیں، موسی علیہ السلام کے عرض کرنے سے حق تعالی نے وعدہ فرمایا کہ تم ایک ماہ کوہ طور پر آکر عبادت کرو تو ہم تم کو کتاب دیں گے، موسی علیہ السلام نے ایسا ہی کیا اور کتاب مل گئی، مگر کسی وجہ سے مزید دس دن روزہ رکھنے کا حکم ہوا، موسی تو یہیں رک گئے اور وہاں سامری نے چاندی یا سونے کی ایک بچھڑے کی مورت بنا کر اس میں جبریل کے گھوڑے کے قدم کے نیچے کی مٹی ڈال دی جو اس کے پاس تھی اس میں جان پڑگئی، بنی اسرائیل کے جاہلوں نے اس کی پرستش شروع کردی۔

اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً: یہ آیت اہل سلوک کے چلہ کی اصل ہے، اگرچہ یہ موسی علیہ السلام کا قصہ ہے لیکن جب اس کو نقل کرکے اس پر انکار نہیں کیا گیا تو یہ ہمارے لیے حجت ہوگیا، خصوصا جبکہ اس بارے میں حدیث بھی آئی ہے، حضرت ابن عباسؓ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص چالیس روز تک اللہ کے لیے خلوص (کے ساتھ عبادت) اختیار کرے تو علم کے چشمے اس کے قلب سے (جوش زن ہوکر) اس کی زبان سے ظاہر ہوتے ہیں۔

* * *

فائدہ: اور یہ قصہ اور احسان بھی یاد کرنے کے قابل ہے کہ ہم نے تورات عطا فرمانے کا وعدہ موسیٰ سے چالیس دن رات کا کیا اور ان کے طور پر تشریف لے جانے کے بعد بنی اسرائیل نے بچھڑے کی پرستش شروع کردی اور تم بڑے بے انصاف ہو کہ بچھڑے کو خدا بنالیا، مفصل یہ قصہ آئندہ آئے گا۔

ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿٥٢﴾

پھر معاف کیا ہم نے تم کو اس پر بھی تاکہ تم احسان مانو

خلاصہ تفسیر: (چوتھا معاملہ) پھر بھی ہم نے (تمہاری توبہ کرنے پر) درگذر کیا تم سے اتنی بڑی بات ہوئے پیچھے (ہونے کے بعد) اس توقع پر کہ تم احسان مانو گے (اس توبہ کا بیان آگے کی تیسری آیت میں مذکور ہے)۔

لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ: اللہ تعالیٰ کے اس توقع رکھنے کا مطلب نعوذ باللہ یہ نہیں کہ خدا تعالیٰ کو شک تھا، بلکہ مطلب یہ ہے کہ یہ معاف و درگزر کر دینا ایسی چیز ہے کہ جس سے ہر دیکھنے والے کو شکر گذاری کی توقع کا احتمال ہو سکتا ہے۔

* * *

فائدہ: مطلب یہ ہے کہ باوجود اس شرک جلی کے ہم نے تم سے درگزر فرمائی اور تمہاری توبہ منظور کی اور تم کو فی الفور ہلاک نہ کیا (جیسے آلِ فرعون کو اس سے کم قصور پر ہلاک کر دیا تھا) کہ تم ہمارا شکر ادا کرو اور احسان مانو۔

وَاِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۵۳﴾

اور جب ہم نے دی موسیٰ کو کتاب اور حق کو ناحق سے جدا کرنے والے احکام تا کہ تم سیدھی راہ پاؤ

خلاصہ تفسیر: (پانچواں معاملہ) اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب ہم نے موسیٰ کو کتاب (تورات) دی اور فیصلہ کی چیز اس توقع پر کہ تم راہ پر چلتے رہو۔

وَاِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ: "فیصلہ کی چیز" یا تو ان شرعی احکام کو کہا جو تورات میں لکھے ہیں، جن سے تمام تر عملی اور اعتقادی اختلافات کا فیصلہ ہو جاتا ہے، یا معجزوں کو کہا کہ ان سے سچے جھوٹے دعوی کا فیصلہ ہو جاتا ہے، یا خود تورات ہی کو فرمایا کہ اس میں کتاب ہونے کی صفت بھی ہے اور فیصلہ ہونے کی صفت بھی۔

* * *

فائدہ: "کتاب" تو "تورات" ہے اور "فرقان" فرمایا: ① ان "احکام شرعیہ" کو جن سے جائز ناجائز معلوم ہو ② یا "فرقان" کہا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزوں کو جن سے جھوٹے سچے اور کافر و مومن کی تمیز ہو ③ یا "تورات" ہی کو کہا کہ وہ کتاب بھی ہے اور اس سے حق اور ناحق بھی جدا ہوتا ہے۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْٓا

اور جب کہا موسیٰ نے اپنی قوم سے ۱ے اے قوم تم نے نقصان کیا اپنا یہ بچھڑا بنا کر سو اب توبہ کرو

اِلٰى بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ ۭ فَتَابَ عَلَيْكُمْ ۭ

اپنے پیدا کرنے والے کی طرف اور مار ڈالو اپنی اپنی جان ۲ے یہ بہتر ہے تمہارے لئے تمہارے خالق کے نزدیک پھر متوجہ ہوا تم پر ۳ے

اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۵۴﴾

بیشک وہی ہے معاف کرنے والا نہایت مہربان

خلاصہ تفسیر: (چھٹا معاملہ) اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب موسیٰ نے اپنی قوم سے فرمایا کہ اے میری قوم! بیشک تم نے اپنا بڑا نقصان کیا اس گوسالہ (پرستی) کی تجویز سے، سو تم اب اپنے خالق کی طرف متوجہ ہو، پھر بعض آدمی (جنہوں نے گوسالہ پرستی نہیں کی) بعض آدمیوں کو (جنہوں نے گوسالہ پرستی کی) قتل کرو، یہ (عمل درآمد) تمہارے لئے بہتر ہوگا تمہارے خالق کے نزدیک، پھر (اس عملدرآمد کرنے سے) حق تعالیٰ تمہارے حال پر (اپنی عنایت سے) متوجہ ہوئے، بیشک وہ تو ایسے ہی ہیں کہ توبہ قبول کر لیتے ہیں اور عنایت فرماتے ہیں۔

فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ: یہ اس طریقہ کا بیان ہے جو اس گناہ کی توبہ کے لئے تجویز ہوا، یعنی مجرم لوگ قتل کئے جائیں،

جیسا کہ ہماری شریعت میں بھی بعض گناہوں کی سزا باوجود توبہ کے بھی قتل مقرر ہے، مثلاً قتل عمد کے عوض قتل اور زنا کا جرم ثابت ہونے پر رجم، یہ سزائیں توبہ سے بھی ساقط نہیں ہوتیں، چنانچہ ان لوگوں نے اس پر عمل کیا، جس کی وجہ سے آخرت میں مورد رحمت وعنایت ہو گئے۔

* * *

فائدہ: ۱۔ وَاِذۡ قَالَ مُوۡسٰى لِقَوۡمِهٖ يٰقَوۡمِ: ''قوم'' سے مراد خاص وہ لوگ ہیں جنہوں نے بچھڑے کو سجدہ کیا۔

فائدہ: ۲۔ فَاقۡتُلُوۡۤا اَنۡفُسَكُمۡ: یعنی جنھوں نے بچھڑے کو سجدہ نہ کیا تھا وہ سجدہ کرنے والوں کو قتل کریں اور بعض کا قول ہے کہ بنی اسرائیل میں تین گروہ تھے: ① ایک وہ جنھوں نے گوسالہ پرستی نہ کی اور دوسروں کو بھی روکا ② دوسرے وہ جنھوں نے گوسالہ کو سجدہ کیا۔
③ تیسرے وہ جنھوں نے خود تو سجدہ نہ کیا مگر دوسروں کو منع بھی نہ کیا، فریق دوئم کو حکم ہوا کہ مقتول ہو جاؤ، تیسرے فریق کو حکم ہوا کہ ان کو قتل کرو تاکہ ان کے سکوت کرنے کی توبہ ہو جائے، اور فریق اول اس توبہ میں شریک نہیں ہوئے، کیونکہ ان کو توبہ کی حاجت نہ تھی۔

فائدہ: ۳۔ فَتَابَ عَلَيۡكُمۡ: علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ مقتول ہو جانا ہی توبہ تھی، یا توبہ کا تتمہ تھا، جیسا کہ ہماری شریعت میں قتل عمد کی توبہ کے مقبول ہونے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اپنے آپ کو وارثان مقتول کے حوالے کر دے، ان کو اختیار ہے بدلہ لیں، یا معاف کریں۔

وَاِذۡ قُلۡتُمۡ يٰمُوۡسٰى لَنۡ نُّؤۡمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهۡرَةً فَاَخَذَتۡكُمُ الصّٰعِقَةُ وَاَنۡتُمۡ تَنۡظُرُوۡنَ ﴿۵۵﴾

اور جب تم نے کہا اے موسیٰ ہم ہرگز یقین نہ کریں گے تیرا جب تک کہ نہ دیکھ لیں اللہ کو سامنے پھر آلیا تم کو بجلی نے اور تم دیکھ رہے تھے

ثُمَّ بَعَثۡنٰكُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ مَوۡتِكُمۡ لَعَلَّكُمۡ تَشۡكُرُوۡنَ ﴿۵۶﴾

پھر اٹھا کھڑا کیا ہم نے تم کو مر گئے پیچھے تاکہ تم احسان مانو۱

خلاصہ تفسیر: (ساتواں معاملہ) اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب تم لوگوں نے (یوں) کہا کہ اے موسیٰ ہم تمہارے کہنے سے ہرگز نہ مانیں گے (کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے) یہاں تک کہ ہم (خود) اللہ تعالیٰ کو علانیہ طور پر دیکھ لیں سو (اس گستاخی پر) آ پڑی تم پر کڑک بجلی اور تم (اس بجلی کا آنا) آنکھوں سے دیکھ رہے تھے (آٹھواں معاملہ) پھر ہم نے (موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے) تم کو زندہ کر اٹھایا تمہارے مر جانے کے بعد اس توقع پر کہ تم احسان مانو گے۔

يٰمُوۡسٰى لَنۡ نُّؤۡمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهۡرَةً: یہ قصہ اس طرح ہوا تھا کہ جب موسی علیہ السلام نے تورات لا کر پیش کی کہ یہ کتاب الٰہی ہے تو بعض گستاخوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ ہم سے خود فرما دیں کہ یہ کتاب ہماری ہے تو بے شک ہم کو یقین آ جائے، موسی علیہ السلام باذن الٰہی ستر آدمی ان میں سے لے کر کوہ طور پر چلے، وہاں انہوں نے کلام الٰہی خود سنا، پھر کہنے لگے کہ خدا جانے کون بول رہا ہے، اگر خدا کو دیکھ لیں تو بے شک مان لیں، چونکہ دنیا میں خدا کا دیدار محال ہے اس لیے اس گستاخی پر ان پر بجلی آن پڑی اور سب ہلاک ہو گئے۔

ثُمَّ بَعَثۡنٰكُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ مَوۡتِكُمۡ: ''موت'' کے لفظ سے ظاہراً معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ اس بجلی سے مر گئے تھے، ان کے دوبارہ زندہ کئے جانے کا قصہ یہ ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا کہ بنی اسرائیل یوں ہی بدگمان رہتے ہیں، اب وہ یہ سمجھیں گے کہ میں نے ان کو کہیں لے جا کر کسی تدبیر سے ان کا کام تمام کرا دیا ہوگا، مجھ کو اس تہمت سے محفوظ رکھئے، اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے ان کو پھر زندہ کر دیا۔

* * *

فائدہ: ۱۔ اس وقت کو بھی ضرور یاد کرو کہ باوجود اس قدر احسانات کے جب تم نے کہا تھا کہ اے موسیٰ ہم ہرگز تمہارا یقین نہ کریں گے کہ یہ اللہ کا کلام ہے جب تک آنکھوں سے صریحاً خدائے تعالیٰ کو نہ دیکھ لیں، اس پر بجلی نے تم کو ہلاک کیا اس کے بعد موسیٰ کی دعا سے ہم نے تم کو زندہ کیا اور یہ اس وقت کا حال ہے کہ حضرت موسیٰ ستر آدمیوں کو منتخب فرما کر کوہ طور پر کلام الٰہی سننے کی غرض سے لے گئے تھے، پھر جب انہوں نے کلام الٰہی کو سنا تو انہی

ستر نے کہا اے موسیٰ پردے میں سننے کا ہم اعتبار نہیں کرتے آنکھوں سے خدا کو دکھاؤ، اس پر ان ستر آدمیوں کو بجلی نے ہلاک کر دیا تھا۔

وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ؕ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا

اور سایہ کیا ہم نے تم پر اَبر کا اور اُتارا تم پر من اور سلویٰ لے کھاؤ پاکیزہ چیزیں جو

رَزَقْنٰكُمْ ؕ وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝

ہم نے تم کو دیں ۲ اور انہوں نے ہمارا کچھ نقصان نہ کیا بلکہ اپنا ہی نقصان کرتے رہے ۳

خلاصہ تفسیر: (نواں معاملہ) اور سایہ فگن کیا ہم نے تم پر ابر کو (میدان تیہ میں) اور (خزانہ غیب سے) پہنچایا ہم نے تمہارے پاس ترنجبین اور بٹیریں (اور تم کو اجازت دی کہ) کھاؤ نفیس چیزوں سے جو کہ ہم نے تم کو دی ہیں (مگر وہ لوگ اس میں بھی خلاف بات کر بیٹھے) اور (اس سے) انہوں نے ہمارا کوئی نقصان نہیں کیا، لیکن اپنا ہی نقصان کرتے تھے۔

یہ دونوں قصے وادی تیہ میں ہوئے، وادی تیہ کی حقیقت یہ ہے کہ بنی اسرائیل کا اصلی وطن ملک شام ہے، حضرت یوسف علیہ السلام کے وقت میں مصر آئے اور یہاں ہی رہ پڑے، ملک شام میں عمالقہ نامی قوم کا تسلط ہو گیا، فرعون جب غرق ہو گیا اور یہ لوگ مطمئن ہو گئے تو اللہ تعالیٰ کا ان کو حکم ہوا کہ عمالقہ سے جہاد کرو اور اپنی اصلی جگہ کو ان کے قبضہ سے چھڑا لو، بنی اسرائیل اس ارادہ پر مصر سے چلے، مگر اس میدان میں پہنچ کر صاف انکار کر دیا اور ہمت ہار بیٹھے، کیونکہ عمالقہ کے زور و قوت کی باتیں کچھ پتہ تھیں، اللہ تعالیٰ نے اس انکار پر ان کو یہ سزا دی کہ چالیس سال تک اسی میدان تیہ میں پریشان و سرگرداں پھرتے رہے، گھر بھی پہنچنا نصیب نہ ہوا، یہ میدان کچھ بہت بڑا رقبہ نہ تھا، بلکہ مصر اور شام کے درمیان پانچ چھ کوس یعنی تقریباً دس میل کا رقبہ تھا، روایت یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے وطن مصر جانے کے لئے دن بھر سفر کرتے اور رات کو کسی منزل پر اترتے صبح کو دیکھتے کہ جہاں سے چلے تھے وہیں ہیں، اسی طرح چالیس سال سرگرداں و پریشان اس میدان میں پھرتے رہے اسی لئے میدان کو "وادی تیہ" کہا جاتا ہے، "تیہ" کے معنی ہیں سرگردانی اور پریشانی کے۔

یہ وادی تیہ ایک کھلا میدان تھا نہ اس میں کوئی عمارت تھی نہ درخت جس کے نیچے دھوپ اور سردی اور گرمی سے بچا جا سکے اور نہ یہاں کوئی کھانے پینے کا سامان تھا نہ پہننے کے لئے لباس، مگر اللہ تعالیٰ نے معجزہ کے طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے اسی میدان میں ان کی تمام ضروریات کا انتظام فرما دیا، بنی اسرائیل نے دھوپ کی شکایت کی تو اللہ تعالیٰ نے ایک سفید رقیق ابر کا سایہ کر دیا اور بھوک کا تقاضا ہوا تو من و سلویٰ نازل فرمادیا یعنی درختوں پر ترنجبین جو ایک شیریں چیز ہے بکثرت پیدا کر دی، یہ لوگ اس کو جمع کر لیتے، اسی کو "من" کہا گیا ہے، اور بٹیریں ان کے پاس جمع ہو جاتیں ان سے بھاگتی نہ تھیں یہ ان کو پکڑ لیتے اور ذبح کر کے کھاتے اسی کو "سلویٰ" کہا گیا ہے یہ لوگ دونوں لطیف چیزوں سے پیٹ بھر لیتے، چونکہ ترنجبین کی کثرت معمول سے زائد تھی اور بٹیروں کا وحشت نہ کرنا یہ بھی معمول کے خلاف تھا لہٰذا اس حیثیت سے دونوں چیزیں "خزانہ غیب" سے قرار دی گئیں، اور ان لوگوں کو یہ بھی حکم ہوا تھا کہ بقدر خرچ لے لیا کریں، آئندہ کے لئے جمع کر کے نہ رکھیں، مگر ان لوگوں نے حرص کے مارے اس میں بھی خلاف کیا تو رکھا ہوا گوشت سڑنا شروع ہو گیا اسی کو فرمایا ہے کہ "اپنا ہی نقصان کرتے تھے"۔

وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ: اس میں دلیل ہے کہ باوجود گناہوں کے نعمتوں کا جاری رہنا یہ استدراج (ڈھیل) ہے اور خطرے کی بات ہے، بہت سے جاہل صوفی اس بارے میں دھوکہ میں ہیں کہ وہ کثرت مال اور جاہ و منصب کو مقبولیت کی علامت سمجھتے ہیں، جبکہ یہ مقبولیت کی علامت نہیں۔

❀ ❀ ❀

فائدہ: لے جب فرعون غرق ہو چکا اور بنی اسرائیل بحکم الٰہی مصر سے شام کو چلے، جنگل میں ان کے خیمے پھٹ گئے اور گرمی آفتاب کی ہوئی تو تمام دن ابر رہتا اور اناج نہ رہا تو من و سلویٰ کھانے کے لیے اترتا، "من" ایک چیز تھی شیریں دھنیے کے سے دانے ترنجبین کے مشابہ رات کو اوس میں برستے لشکر کے گرد ڈھیر لگ جاتے، صبح کو ہر ایک اپنی حاجت کے موافق اٹھا لیتا، اور "سلویٰ" ایک پرندہ ہے جس کو بٹیر کہتے ہیں، شام کو لشکر کے گرد

ہزاروں جمع ہوجاتے، اندھیرا ہوئے بعد پکڑ لاتے، کباب کر کے کھاتے، مدتوں تک یہی کھایا کیے۔

فائدہ:۲ یعنی اس لطیف ولذیذ غذا کو کھاؤ اور اس پر اکتفا کرو، نہ آگے کیلئے ذخیرہ جمع کر کے رکھو اور نہ دوسری غذا سے مبادلہ کی خواہش کرو۔

فائدہ:۳ ① اوّل ظلم یہ کیا کہ ذخیرہ کر کے رکھا تو گوشت سڑنا شروع ہوگیا۔

② دوسرے مبادلہ چاہا کہ مسور، گیہوں، ککڑی، پیاز وغیرہ ملے، جس سے طرح طرح کی تکلیف ومشقت میں مبتلا ہوئے۔

وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا

اور جب ہم نے کہا داخل ہو اس شہر میں ۱ اور کھاتے پھرو اس میں جہاں چاہو فراغت سے اور داخل ہو دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے ۲

وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ ۭ وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ۵۸

اور کہتے جاؤ بخش دے تو معاف کردیں گے ہم تمہارے قصور، اور زیادہ بھی دیں گے نیکی والوں کو ۳

خلاصہ تفسیر: (دسواں معاملہ) اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب ہم نے حکم کیا کہ تم لوگ اس آبادی کے اندر داخل ہو، پھر کھاؤ اس (کی چیزوں میں) سے، جس جگہ تم رغبت کرو بے تکلفی سے اور (یہ بھی حکم دیا کہ جب اندر جانے لگو تو) دروازہ میں داخل ہونا (عاجزی سے) جھکے جھکے اور (زبان سے یہ) کہتے جانا کہ توبہ ہے (توبہ ہے) ہم معاف کردیں گے تمہاری (پچھلی) خطائیں (تم سب کی) اور ابھی ابھی مزید برآں اور دیں گے دل سے نیک کام کرنے والوں کو۔

وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ: بقول شاہ عبد القادر صاحب رحمہ اللہ یہ قصہ بھی وادی تیہ کے زمانہ کا ہے کہ جب من وسلوی کھاتے کھاتے اکتا گئے اور اپنے معمولی کھانوں کی درخواست کی جیسا کہ آگے چوتھی آیت میں آئے گا، تو ان کو ایک شہر میں جانے کا حکم ہوا تھا کہ وہاں کھانے پینے کی اور معمولی چیزیں ملیں گی، سو یہ حکم اس شہر کے اندر جانے کے متعلق ہے، اس میں داخل ہونے کے متعلق قولی اور فعلی ادب تعلیم کیا گیا ہے اور اندر جا کر کھانے پینے میں وسعت کی گئی، اس قول پر بہت سے بہت یہ کہا جاسکے گا کہ بعد کا قصہ پہلے بیان ہوا، اور پہلے کا قصہ بعد میں بیان ہوا، اس میں اشکال اس وقت ہوتا ہے جبکہ قرآن مجید میں قصوں کا بیان بطور تاریخ کے اصلی مقصود ہوتا، اور جب نظر نتائج پر ہے تو اگر ایک قصہ کے بہت سے اجزاء میں ہر جز کا نتیجہ الگ ہو، اور ان نتائج کے کسی اثر کا لحاظ کر کے کسی جز کو مؤخر اور کسی جز کو مقدم کردیا جائے تو اس میں نہ کوئی مضائقہ ہے اور نہ کوئی اشکال، اور دوسرے مفسرین نے اس حکم کو اس شہر کے متعلق سمجھا ہے جس پر جہاد کرنے کا حکم ہوا تھا، اور وادی تیہ کی مدت کے بعد پھر اس پر جہاد ہوا، وہ فتح ہوا، اس وقت یوشع علیہ السلام نبی تھے، تو یہ حکم ان کی معرفت اس شہر کے بارے میں ہوا تھا تو کچھ بھی اشکال نہیں۔

پہلے قول کی بناء پر پچھلی خطاؤں میں وہ درخواست بھی داخل کرلینا مناسب ہے جو من وسلوی چھوڑ کر معمولی کھانوں کے متعلق کی گئی تھی، مطلب یہ ہوگا کہ درخواست تھی تو گستاخی، لیکن خیر اب اگر اس ادب اور حکم کو بجالائے تو اس کو معاف کردیں گے اور ہر قول پر یہ معافی تو سب کہنے والوں کے لئے عام ہوگی اور جو اخلاص سے اعمال صالحہ کریں گے ان کا انعام اس کے علاوہ ہے۔

* * *

فائدہ:۱ جب جنگل مذکورہ بالا میں پھرتے پھرتے تنگ آگئے اور من وسلوی کھاتے کھاتے اکتا گئے تو بنی اسرائیل کو ایک شہر میں داخل ہونے کا حکم ہوا، اس کا نام ''اریحا'' تھا اس میں قوم عمالقہ جو قوم عاد سے تھی مقیم تھی اور بعض نے بیت المقدس فرمایا ہے۔

فائدہ:۲ اس شہر کے دروازہ میں سے سجدہ شکر کرتے ہوئے جاؤ (اور یہ شکر بدنی ہوا) اور بعض فرماتے ہیں کہ براہ تواضع کمر کو جھکا کر جاؤ۔

فائدہ:۳ اور زبان سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہوئے جاؤ (یہ شکر زبانی ہوا) جو یہ دونوں باتیں کرے گا، اس کی خطائیں ہم معاف کردیں گے اور نیک بندوں کے لیے ثواب بڑھا دیں گے۔

فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا

پھر بدل ڈالا ظالموں نے بات کو خلاف اس کے جو کہہ دی گئی تھی ان سے پھر اتارا ہم نے ظالموں پر عذاب

مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۵۹﴾ ع۶

آسمان سے ان کی عدول حکمی پر

خلاصہ تفسیر: (گیارہواں معاملہ) سو بدل ڈالا ان ظالموں نے ایک اور کلمہ جو خلاف تھا اس کلمہ کے جس (کے کہنے) کی ان سے فرمائش کی گئی تھی، اس پر ہم نے نازل کی ان ظالموں پر ایک سماوی آفت، اس وجہ سے کہ وہ عدول حکمی کرتے تھے (یہ گذشتہ آیت کا تتمہ ہے)۔

قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ: اور وہ کلمہ خلاف یہ تھا کہ حطّۃ (بمعنی توبہ) کی جگہ تمسخر سے "حبة في شعيرة" کہنا شروع کیا، یعنی غلہ جو کے درمیان، اور وہ "آفت سماوی" طاعون تھا، جو احادیث کی رو سے نافرمانوں کے لئے عذاب اور فرمانبرداروں کے لئے رحمت ہے، اس شرارت کی ان کو یہ سزا ملی کہ ان میں طاعون پھوٹ پڑا، اور بہت سے آدمی فنا ہو گئے۔

* * *

فائدہ: تبدیلی یہ کی کہ بجائے حِطَّةٌ براہ تمسخر حِنْطَةٌ کہنے لگے (یعنی گیہوں) اور سجدہ کی جگہ اپنے سرینوں پر پھسلنا شروع کیا، جب شہر میں پہنچے تو ان پر طاعون پڑا دو پہر میں ستر ہزار یہود مر گئے۔

وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ؕ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ؕ

اور جب پانی مانگا موسیٰ نے اپنی قوم کے واسطے تو ہم نے کہا مار اپنے عصا کو پتھر پر، سو بہہ نکلے اس سے بارہ چشمے ۱؎

قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ؕ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿۶۰﴾

پہچان لیا ہر قوم نے اپنا گھاٹ، کھاؤ اور پیو اللہ کی روزی اور نہ پھرو ملک میں فساد مچاتے ۲؎

خلاصہ تفسیر: (بارہواں معاملہ) اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب (حضرت) موسیٰ نے پانی کی دعا مانگی اپنی قوم کے واسطے، اس پر ہم نے (موسیٰ کو) حکم دیا کہ اپنے اس عصا کو فلاں پتھر پر مارو (اس سے پانی نکل آئے گا) بس (عصا پتھر پر مارنے کی دیر تھی) فوراً اس سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے (اور بنی اسرائیل کے بھی بارہ ہی خاندان تھے، چنانچہ) ہر ہر شخص نے اپنے پانی پینے کا موقع معلوم کر لیا (اور ہم نے یہ نصیحت کی کہ کھانے کو) کھاؤ اور (پینے کو) پیو اللہ تعالیٰ کے رزق سے اور حد (اعتدال) سے مت نکلو، فساد (وفتنہ) کرتے ہوئے سرزمین میں۔

یہ قصہ بھی وادی تیہ کا ہے، وہاں پیاس لگی تو پانی مانگا، موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی، صرف عصا مارنے سے ایک خاص پتھر سے بارہ چشمے بقدرت خداوندی نکل پڑے اور ان کے بارہ خاندان اس طرح تھے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ فرزند تھے، ایک ایک کی اولاد ایک خاندان تھا، اور ان کو انتظامی معاملات میں علیحدہ علیحدہ ہی رکھا جاتا تھا اور سب کے افسر بھی جدا جدا تھے اس لیے چشمے بھی بارہ نکلے، اور کھانے سے مراد من وسلویٰ کا کھانا ہے اور پینے سے یہی پانی پینا، اور فتنہ و فساد سے مراد ہے ترک احکام یا نافرمانی۔

فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا: قاضی بیضاویؒ فرماتے ہیں کہ ایسے خوارق کا انکار کرنا بڑی غلطی ہے، جب بعض پتھروں میں خلاف عقل لوہے کو جذب کرنے کی تاثیر رکھی ہے تو اگر اس پتھر میں یہ تاثیر پیدا کر دی ہو کہ زمین سے پانی جذب کر لے اور اس سے پانی نکلنے لگے تو کیا

محال ہے، ہمارے زمانہ کے عقلاء کو اس تقریر سے فائدہ اٹھانا چاہیے اور یہ مثال بھی محض ظاہر بینوں کے لیے، ورنہ خود اگر اسی پتھر کے اجزاء میں سے پانی پیدا ہو گیا تو کون سا محال لازم آتا ہے، جو لوگ ایسے امور کو محال سمجھتے ہیں وہ بخدا محال کی حقیقت ہی نہیں سمجھتے۔

* * *

فائدہ: ۱ یہ قصہ بھی اسی جنگل کا ہے، پانی نہ ملا تو ایک پتھر پر عصا مارنے سے بارہ چشمے نکلے اور بنی اسرائیل کے قبیلے بھی بارہ ہی تھے، کسی قوم میں آدمی زیادہ، کسی میں کم، ہر قوم کے موافق ایک چشمہ تھا اور وجہ شناخت بھی یہی موافقت تھی، یا یہ مقرر کر رکھا تھا کہ پتھر کی فلاں جہت فلاں جانب سے جو چشمہ نکلے گا وہ فلاں قوم کا ہوگا، جو کوتاہ نظر ان معجزات کا انکار کرتے ہیں ''نیستند آدم غلاف آدم اند'' دیکھو! مقناطیس تو لوہے کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے اس پتھر نے پانی کھینچ لیا تو انکار کی کیا وجہ!!!۔

فائدہ: ۲ یعنی پھر فرمایا حق تعالیٰ نے کھاؤ من وسلویٰ اور پیو ان چشموں کا پانی اور عالم میں فساد مت پھیلاؤ۔

وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا

اور جب کہا تم نے اے موسیٰ ہم ہرگز صبر نہ کرینگے ایک ہی طرح کے کھانے پر سو دعا مانگ ہمارے واسطے اپنے پروردگار سے کہ نکال دے ہمارے

مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَفُوْمِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا ؕ قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ

واسطے جو اگتا ہے زمین سے ترکاری اور ککڑی اور گیہوں اور مسور اور پیاز۱ کہا موسیٰ نے کیا لینا چاہتے ہو

الَّذِیْ هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِیْ هُوَ خَيْرٌ ؕ اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ ؕ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ

وہ چیز جو ادنیٰ ہے اس کے بدلہ میں جو بہتر ہے۲ اترو کسی شہر میں تو تم کو ملے جو مانگتے ہو۳ اور ڈالی گئی ان پر

الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ ۗ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ

ذلت اور محتاجی، اور پھرے اللہ کا غصہ لے کر۴ یہ اس لئے ہوا کہ نہیں مانتے تھے احکام خداوندی کو

وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿٦١﴾ ع

اور خون کرتے تھے پیغمبروں کا ناحق، یہ اس لئے کہ نافرمان تھے اور حد پر نہ رہتے تھے۵

خلاصہ تفسیر: (تیرہواں معاملہ) اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب تم لوگوں نے (یوں) کہا کہ اے موسیٰ (روز کے روز) ہم ایک ہی قسم کے کھانے پر کبھی نہ رہیں گے (یعنی من وسلویٰ پر) آپ ہمارے واسطے اپنے پروردگار سے دعا کریں کہ وہ ہمارے لئے ایسی چیزیں پیدا کریں جو زمین میں اُگا کرتی ہیں (ساگ ہوا) ککڑی (ہوئی) گیہوں (ہوا) مسور (ہوئی) پیاز (ہوئی) آپ نے فرمایا کیا تم عوض میں لینا چاہتے ہو ادنیٰ درجہ کی چیزوں کو، ایسی چیز کے مقابلہ میں جو اعلیٰ درجہ کی ہے (اچھا! اگر نہیں مانتے تو) کسی شہر میں (جا کر) اترو (وہاں) البتہ تم کو وہ چیزیں ملیں گی جن کی تم درخواست کرتے ہو، اور (ایسی ایسی گستاخیوں سے ایک زمانہ میں جا کر نقش کی طرح) جم گئی ان پر ذلت (کہ دوسروں کی نگاہ میں قدر نہ رہی) اور پستی (کہ خود ان کے مزاج میں اولوالعزمی نہ رہی) اور مستحق ہو گئے غضب الٰہی کے (اور) یہ (ذلت وغضب) اس وجہ سے (ہوا) کہ وہ لوگ منکر ہو جاتے تھے احکام الٰہیہ کے اور قتل کر دیا کرتے تھے پیغمبروں کو (کہ وہ قتل خود ان کے نزدیک بھی) ناحق (ہوتا تھا) اور (نیز) یہ (ذلت وغضب) اس وجہ سے (ہوا) کہ ان لوگوں نے اطاعت نہ کی اور دائرہ (اطاعت) سے نکل نکل جاتے تھے۔

لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ (الی قولہ) وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ: عارف کو اس قصہ سے یہ سبق لینا چاہیے کہ ان لوگوں کے حال سے عبرت پکڑے جو اللہ کے فیصلے پر راضی نہیں ہوتے، اس کی نعمتوں پر شکر ادا نہیں کرتے اور مصائب پر صبر نہیں کرتے، جیسے بنی اسرائیل کے ساتھ ہوا، دیکھیے کس طرح ان لوگوں کے مقدر میں ذلت لکھ دی گئی، ان کے دلوں میں دنیا کی محبت جما دی گئی اور ان کو اونچے درجے سے نیچے گرا دیا۔

قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِيْ هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِيْ هُوَ خَيْرٌ: اس میں اس بات پر دلیل ہے کہ حق تعالیٰ کا معاملہ جو بندوں کے ساتھ ہوا کرتا ہے اسے بدلنا اور اپنی تجویز پر اصرار کرنا مناسب نہیں، مثلاً ایسا شخص جس کو اللہ پر توکل ہو اس کو کسب معاش کی تلاش میں بھاگتے پھرنا نہیں چاہیے، اسی طرح وہ شخص جس کے پاس ذریعہ معاش ہو وہ بلا کسی ضرورت کے اس کو ترک نہ کرے، یہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا سبب بن جاتا ہے، جیسا کہ بنی اسرائیل کو بلا محنت ومشقت رزق ملتا تھا مگر انہوں نے اسباب کو طلب کیا اور پھر ذلیل وخوار ہو گئے۔

وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ: ذلت ومسکنت میں سے یہ بھی ہے کہ قرب قیامت تک یہودیوں سے سلطنت چھین لی گئی، البتہ قیامت کے قریب چالیس دن کے لیے دجال یہودی کا لٹیروں کی طرح زور وشور ہوگا، اور اس کو کوئی عاقل سلطنت یا بادشاہت نہیں کہہ سکتا، ان کو موسیٰ علیہ السلام کی معرفت یہ بات بتلا دی گئی تھی کہ اگر بے حکمی کرو گے تو ہمیشہ دوسری قوموں کے محکوم رہو گے۔

وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ: یہودیوں کے ہاتھ سے مختلف اوقات میں بہت سے پیغمبر قتل ہوئے جس کو وہ خود بھی ناحق سمجھتے تھے، لیکن عناد اور ضد نے اندھا بنا رکھا تھا، نبی کا قتل تو ہمیشہ ناحق ہی ہوگا، نبی کے جائز قتل کی کوئی صورت ہی نہیں، چنانچہ یہاں لفظ ''ناحق'' کے اضافہ سے یہی تاکید مقصود ہے کہ خود ان قاتلوں کے معیار سے بھی یہ قتل ناحق وناجائز تھے، یہود کے جرم کی شدت بتانے کے لیے بِغَيْرِ الْحَقِّ کا لفظ ذکر کیا گیا، مراد اس سے ظلم اور تعدی ہے، یعنی سوائے ظلم اور تعدی اور سوائے جور وستم اور سوائے تمرد اور سرکشی کے اور کوئی امر انبیاء کے قتل کا باعث نہ تھا۔

ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ: لفظ ذلك سے کفر اور قتل انبیاء کی طرف اشارہ ہے، کسی بھی گناہ کو خفیف (ہلکا) نہیں سمجھنا چاہیے، ایک گناہ دوسرے گناہ کا سبب بن جاتا ہے یہاں تک کہ کفر لے آتا ہے، جیسا کہ بنی اسرائیل کی نافرمانی اور حدود سے تجاوز انہیں کفر اور قتل انبیاء تک لے آیا، علامہ بیضاویؒ نے بھی یہی لکھا ہے کہ جس طرح چھوٹی طاعت بڑی طاعت کی طرف لے جاتی ہے اسی طرح چھوٹی معصیت بھی بڑی معصیت تک پہنچا دیتی ہے، چنانچہ یہاں بھی نافرمانی کی عادت نے انہیں رفتہ رفتہ کفر اور قتل انبیاء تک پہنچا دیا۔

* * *

فائدہ: ۱۔ وَقِثَّآئِهَا وَفُوْمِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا: یہ قصہ بھی اسی جنگل کا ہے، بنی اسرائیل طعام آسمانی من وسلویٰ کھاتے کھاتے اکتا گئے تو کہنے لگے کہ ہم سے ایک طرح کے کھانے پر صبر نہیں ہو سکتا، ہم کو تو زمین کا اناج، ترکاری، ساگ، سبزی چاہیے۔

فائدہ: ۲۔ هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِيْ هُوَ خَيْرٌ: یعنی من وسلویٰ جو ہر طرح بہتر ہے، لہسن اور پیاز وغیرہ سے بدلتے ہو۔

فائدہ: ۳۔ فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ: اگر یہی جی چاہتا ہے تو کسی شہر میں جاؤ تمہاری مطلوب چیزیں تم کو سب ملیں گی، پھر ایسا ہی ہوا۔

فائدہ: ۴۔ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ: ذلت یہ کہ ہمیشہ مسلمان اور نصاریٰ کے محکوم اور رعیت رہتے ہیں، کسی کے پاس مال ہوا تو کیا! حکومت سے بالکل محروم ہو گئے، جو موجب عزت تھی، اور محتاجی یہ کہ اول تو یہود میں مال کی قلت، اور جن کے پاس مال ہو بھی تو حکام وغیرہ کے خوف سے اپنے آپ کو مفلس اور حاجت مند ہی ظاہر کرتے ہیں، شدت حرص اور بخل کے باعث محتاجوں سے بدتر نظر آتے ہیں اور یہ بھی درست ہے کہ ''توانگری بدل است نہ بمال'' اس لیے مالدار ہو کر بھی محتاج ہی رہے اور عظمت اور عزت جو اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی تھی اس سے رجوع کر کے اس کے غضب وقہر میں آ گئے۔

فائدہ: ۵۔ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ: یعنی اس ذلت اور مسکنت وغضب الٰہی کا باعث ان کا کفر اور انبیاء علیہم السلام کا قتل کرنا تھا اور اس کفر وقتل کا باعث احکام کی نافرمانی اور حدود شرع سے خروج تھا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِـِٕيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ

بے شک جولوگ مسلمان ہوئے اور جولوگ یہودی ہوئے اور نصاریٰ اور صائبین جو ایمان لایا (ان میں سے) اللہ پر اور روز قیامت پر اور کام

صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۶۲﴾

کیے نیک تو ان کے لئے ہے ان کا ثواب ان کے رب کے پاس، اور نہیں ان پر کچھ خوف اور نہ وہ غمگین ہوں گے

خلاصہ تفسیر : قانون: اس مقام پر یہود کی ان شرارتوں کا حال معلوم کر کے سامعین کو یا خود کسی یہودی کو یہ خیال گذر سکتا ہے کہ ان حالات میں اگر معذرت پیش کر کے ایمان لانا بھی چاہیں تو غالباً وہ اللہ کے نزدیک قبول نہ ہو، اس خیال کو دفع کرنے کے لئے اس آیت میں ایک قانون کلی اور ضابطہ ارشاد فرماتے ہیں کہ:

یہ تحقیقی بات ہے کہ مسلمان یہودی اور نصاریٰ اور فرقہ صائبین (ان سب میں) جو شخص یقین رکھتا ہو اللہ تعالیٰ (کی ذات وصفات) پر اور قیامت پر اور کارگزاری اچھی کرے (قانون شریعت کے موافق) ایسوں کے لئے ان کا حق الخدمت بھی ہے ان کے پروردگار کے پاس (پہنچ کر) اور (وہاں جا کر) کسی طرح کا اندیشہ بھی نہیں ان پر اور نہ وہ مغموم ہوں گے۔

مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا: قانون کا حاصل ظاہر ہے کہ ہمارے دربار میں کسی کی تخصیص نہیں، جو شخص اعتقاد اور اعمال میں پوری اطاعت اختیار کرے گا، خواہ وہ پہلے سے کیسا ہی ہو، ہمارے ہاں مقبول ہے اور اس کی خدمت مشکور ہے، اور ظاہر ہے کہ نزول قرآن کے بعد پوری اطاعت مسلمان ہونے میں منحصر ہے، مطلب یہ ہوا کہ جو مسلمان ہو جائے گا، اخروی نجات کا مستحق ہوگا، اس میں اس خیال کا جواب ہوگیا یعنی ان شرارتوں کے بعد بھی اگر مسلمان ہو جائیں تو ہم سب معاف کر دیں گے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا: مضمون پر نظر کرنے سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں مسلمانوں کا ذکر نہ ہونا چاہیے، کیونکہ وہ تو ایمان واطاعت کے اس مقام پر ہیں جو اس آیت میں مطلوب ہے، یہاں ذکر صرف ان لوگوں کا کرنا چاہئے جن کو اس مقام کی طرف بلانا ہے، مگر اس طرز خاص میں کہ مسلمانوں کا ذکر بھی ان کے ساتھ ملا دیا گیا ایک خاص بلاغت پیدا ہوگئی، اس کی ایسی مثال ہے کہ کوئی حاکم یا بادشاہ کسی ایسے موقع پر یوں کہے کہ ہمارا قانون عام ہے، خواہ کوئی موافق ہو یا مخالف جو شخص اطاعت کرے گا وہ مورد عنایت وانعام ہوگا، اب ظاہر ہے کہ موافق کو بھی ذکر کرنے میں حکمت یہ ہے کہ ہم کو جو موافقین کے ساتھ عنایت ہے وہ کسی نسبی یا قومی خصوصیت کی بناء پر نہیں، بلکہ ان کی صفت اطاعت پر تمام عنایت وانعام کا مدار ہے، اگر مخالف بھی اطاعت اختیار کرے گا وہ بھی اسی لطف وعنایت کا مستحق ہوگا۔

ایمان بالرسالت اور وحدت ادیان کا دھوکہ: چار قوموں کو خطاب کر کے جس امر کی ہدایت دی گئی اس کے تین جز ہیں:

① ایمان باللہ ② ایمان بالیوم الآخر ③ اور عمل صالح، ظاہر ہے کہ اس آیت میں تمام ایمانیات اور عقائد اسلام کی تفصیلات بیان کرنا منظور نہیں، نہ اس کا کوئی موقع ہے، اسلام کے چند بنیادی عقائد ذکر کر کے تمام اسلامی عقائد کی طرف اشارہ کرنا اور اس کی طرف دعوت دینا مقصود ہے اور نہ یہ کوئی ضروری بات ہے کہ ہر آیت میں جہاں ایمان کا ذکر آئے اس کی ساری تفصیلات وہیں ذکر کی جائیں اس لئے اس جگہ ایمان بالرسول صلی اللہ علیہ وسلم یا ایمان بالنبوة کا ذکر صراحۃً نہ ہونے سے کسی ادنیٰ فہم وعقل اور انصاف ودانش رکھنے والے کو کسی شبہ کی گنجائش نہ تھی، خصوصاً جبکہ پورا قرآن اور اس کی سینکڑوں آیتیں ایمان بالرسالت کی تصریحات سے لبریز ہیں جن میں یہ تصریحات موجود ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ارشادات رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر مکمل ایمان لائے بغیر نجات نہیں، اور کوئی ایمان وعمل بغیر اس کے مقبول ومعتبر نہیں، لیکن ملحدین کا ایک گروہ جو کسی نہ کسی طرح قرآن میں اپنے مکروہ نظریات کو ٹھونسنا چاہتا ہے اور انہوں نے اس آیت میں صراحۃً ذکر رسالت نہ ہونے سے ایک نیا نظریہ قائم کر لیا جو قرآن وسنت کی بیشمار تصریحات کے قطعاً خلاف ہے، وہ یہ کہ ہر شخص اپنے اپنے

مذہب یہودی، نصرانی یہاں تک کہ ہندو بت پرست رہتے ہوئے بھی اگر صرف اللہ پر اور روز قیامت پر ایمان رکھتا ہو اور نیک کام کرے تو نجات آخرت کا مستحق ہو سکتا ہے، نجات اخروی کے لئے اسلام میں داخل ہونا ضروری نہیں (نعوذ باللہ منہ)۔

جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے تلاوت قرآن کی توفیق اور اس پر صحیح ایمان عطا فرمایا ہے، ان کے لئے قرآنی تصریحات سے اس مغالطہ کا دور کر دینا کسی بڑے علم ونظر کا محتاج نہیں، قرآن کریم کا اردو ترجمہ جاننے والے حضرات بھی اس تخیل کی غلطی کو بآسانی سمجھ سکتے ہیں، چند آیات بطور مثال کے یہ ہیں: **کل اٰمن باللہ وملئکتہ وکتبہ ورسلہ لا نفرق بین احد من رسلہ** یعنی ''سب ایمان لائے اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر اس طرح کہ اس کے رسولوں کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتے''، اس آیت میں واضح طور پر ایمان کی جو تفصیلات بیان فرمائی ہیں ان میں یہ بھی واضح کر دیا کہ کسی ایک یا چند رسولوں پر ایمان لے آنا قطعاً نجات کے لئے کافی نہیں، بلکہ تمام رسولوں پر ایمان شرط ہے، اگر کسی ایک رسول پر بھی ایمان نہ لایا تو اس کا ایمان اللہ کے نزدیک معتبر اور مقبول نہیں، دوسری جگہ ارشاد ہے: **ان الذین یکفرون باللہ ورسلہ ویریدون ان یفرقوا بین اللہ ورسلہ ویقولون نؤمن ببعض ونکفر ببعض ویریدون ان یتخذوا بین ذلک سبیلا اولئك ھم الکفرون حقا** یعنی ''جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کا انکار کرتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان تفریق کر دیں (کہ اللہ پر تو ایمان لائیں مگر اس کے رسولوں پر ایمان نہ ہو) اور وہ کہتے ہیں کہ ہم مانتے ہیں بعضوں کو اور نہیں مانتے بعضوں کو اور وہ چاہتے ہیں کہ کفر واسلام کے بیچ بیچ کا ایک راستہ نکال لیں تو سمجھ لو کہ وہ ہی اصل میں کافر ہیں''۔

رسول کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''لو کان موسیٰ حیاً لما وسعہ الا اتباعی'' یعنی اگر بالفرض آج حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی زندہ ہوتے تو ان کو میرے اتباع کے سوا کوئی چارہ نہ ہوتا، تو اب کسی کا یہ کہنا کہ ہر مذہب والے اپنے اپنے مذہب پر عمل کریں تو بغیر آنحضرت ﷺ پر ایمان لائے اور بغیر مسلمان ہوئے وہ جنت اور فلاح آخرت پا سکتے ہیں قرآن کریم کی مذکورہ آیات کی کھلی مخالفت ہے، اس کے علاوہ اگر ہر مذہب وملت ایسی چیز ہے کہ اس پر ہر زمانہ میں عمل کر لینا نجات اور فلاح کے لئے کافی ہے تو پھر خاتم الانبیاء ﷺ کی بعثت اور نزول قرآن ہی بے معنی ہو جاتا ہے اور ایک شریعت کے بعد دوسری شریعت بھیجنا فضول ہو جاتا ہے، سب سے پہلا رسول ایک شریعت ایک کتاب لے آتا، وہ کافی تھی، دوسرے رسولوں، کتابوں شریعتوں کے بھیجنے کی کیا ضرورت تھی؟! زیادہ سے زیادہ ایسے لوگوں کا وجود کافی ہوتا جو اس شریعت و کتاب کو باقی رکھنے اور اس پر عمل کرنے اور کرانے کا اہتمام کرتے جو عام طور پر ہر امت کے علماء کا فریضہ رہا ہے اور اس صورت میں قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ: **لکل جعلنا منکم شرعۃ ومنھاجا**، یعنی ہم نے تم میں سے ہر امت کے لئے ایک خاص شریعت اور خاص راستہ بنایا ہے، یہ سب بے معنی ہو جاتا ہے، اور پھر اس کا کیا جواز رہ جاتا ہے، کہ رسول کریم ﷺ نے اپنے اوپر اور اپنی کتاب قرآن پر ایمان نہ رکھنے والے تمام یہود ونصاریٰ سے اور دوسری قوموں سے نہ صرف تبلیغی جہاد کیا، بلکہ قتل وقتال اور سیف وسنان کی جنگیں بھی لڑی اور اگر انسان کے مومن اور مقبول عند اللہ ہونے کے لئے صرف اللہ پر اور روز آخرت پر ایمان لے آنا کافی ہو تو بے چارہ ابلیس کس جرم میں مردود ہو گیا اس کو اللہ پر ایمان نہ تھا، یا وہ روز آخرت اور قیامت کا منکر تھا، اس نے تو عین حالت غضب میں بھی **الی یوم یبعثون** کہہ کر ایمان بالآخرت کا اقرار کیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ یہ مغالطہ صرف اس نظریہ کی پیداوار ہے کہ مذہب کو برادری کے نوتہ کی طرح کسی کو تحفہ میں دیا جا سکتا ہے اور اس کے ذریعہ دوسری قوموں سے رشتے جوڑے جا سکتے ہیں، حالانکہ قرآن کریم نے کھول کھول کر واضح کر دیا ہے کہ غیر مسلموں کے ساتھ رواداری ہمدردی، احسان وسلوک اور مروت سب کچھ کرنا چاہئے، لیکن مذہب کی حدود کی پوری حفاظت اور اس کی سرحدوں کی پوری نگرانی کے ساتھ۔

قرآن کریم کی مذکورہ آیت میں اگر بالفرض ایمان بالرسول ﷺ کا ذکر بالکل نہ ہوتا تو دوسری آیات قرآن جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے جن میں اس کی اشد تاکید موجود ہے وہ کافی تھیں، لیکن اگر غور کیا جائے تو خود اس آیت میں بھی ایمان بالرسول کی طرف واضح اشارہ ہے، کیونکہ اصطلاح قرآن میں ایمان باللہ وہی معتبر ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی بتلائی ہوئی ساری چیزوں پر ایمان ہو، قرآن میں کریم نے اپنی اس اصطلاح کو ان الفاظ میں واضح فرما دیا: **فان اٰمنوا بمثل ما اٰمنتم بہ فقد اھتدوا**، یعنی جس طرح کا ایمان صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا تھا صرف وہی ایمان باللہ کہلانے کا

مستحق ہے اور ظاہر ہے کہ ان کے ایمان کا بہت بڑا رکن ایمان بالرسول ﷺ تھا اس لئے مَنْ آمَنَ بِاللهِ کے لفظوں میں خود ایمان بالرسول داخل ہے۔

وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ: خلاصہ تفسیر میں ''وہاں جا کر'' کی جو قید ہے اس سے وہ شبہ ختم ہو گیا کہ مقبول بندے تو اکثر خائف وغمگین رہا کرتے ہیں، سو مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن ملائکہ کی بشارت کی وجہ سے حزن وغم نہ رہے گا جیسا کہ سورہ انبیاء میں ارشاد ہے: لا یحزنھم الفزع الاکبر وتتلقّٰھم الملائکۃ، سو اگر قیامت کے دن بشارت سے پہلے کسی وقت کچھ خوف وغیرہ ہو بھی جائے تو اشکال لازم نہیں آتا۔

***

فائدہ: یعنی کسی فرقہ خاص پر موقوف نہیں، یقین لانا شرط ہے اور عمل نیک، سو جس کو یہ نصیب ہوا، ثواب پایا، یہ اس واسطے فرمایا کہ بنی اسرائیل اس بات پر مغرور تھے کہ ہم پیغمبروں کی اولاد ہیں، ہم ہر طرح اللہ کے نزدیک بہتر ہیں۔

فائدہ: ''یہود'' کہتے ہیں حضرت موسیٰ کی امت کو، اور ''نصاریٰ'' حضرت عیسیٰ کی امت کو، ''صائبین'' ایک فرقہ ہے جس نے ہر ایک دین میں سے اچھا سمجھ کر کچھ اختیار کر لیا ہے اور حضرت ابراہیم کو مانتے ہیں اور فرشتوں کی بھی پرستش کرتے ہیں اور زبور پڑھتے ہیں اور کعبہ کی طرف نماز پڑھتے ہیں۔

وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ ؕ خُذُوا مَا آتَيْنَاكُمْ بِقُوَّةٍ وَاذْكُرُوا مَا فِيهِ

اور جب لیا ہم نے تم سے اقرار اور بلند کیا تمہارے اوپر کوہ طور کو، کہ پکڑو جو کتاب ہم نے تم کو دی زور سے اور یاد رکھو جو کچھ اس میں ہے

لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿٦٣﴾

تاکہ تم ڈرو

خلاصہ تفسیر: (چودھواں معاملہ) اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب ہم نے تم سے قول وقرار لیا (کہ توراۃ پر عمل کریں گے) اور (اس قول وقرار لینے کے لئے) ہم نے طور پہاڑ کو اٹھا کر تمہارے اوپر (محاذات میں) معلق کر دیا (اور اس وقت کہا) کہ (جلدی) قبول کرو جو کتاب ہم نے تم کو دی ہے (یعنی توراۃ) مضبوطی کے ساتھ اور یاد رکھو جو احکام اس (کتاب) میں ہیں جس سے توقع ہے کہ تم متقی بن جاؤ۔

وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ: جب موسیٰ علیہ السلام کو طور پر تورات عطا ہوئی اور آپ نے واپس تشریف لا کر بنی اسرائیل کو دکھلائی سنائی تو اس میں ذرا شدید احکام تھے اور ان لوگوں کی حالت کے مناسب بھی ایسے ہی احکام تھے، تو پہلے تو یہی کہا تھا کہ ہم سے خود اللہ تعالیٰ کہہ دیں کہ یہ میری کتاب ہے تب مانیں گے، جس کا قصہ پیچھے گذر چکا ہے کہ اس کام کے لیے ستر آدمی منتخب کیے گئے، غرض ان ستر آدمیوں نے جب شہادت دی، اگرچہ اس شہادت میں اتنی ملاوٹ بھی کر دی کہ اللہ تعالیٰ نے اخیر میں یہ بھی فرما دیا تھا کہ تم سے جس قدر عمل ہو سکے کرنا، جو نہ ہو سکے تو معاف ہے، سو کچھ تو اپنی فطری شرارت، کچھ احکام کی مشقت اور کچھ اس ملاوٹ سے انہیں حیلہ بہانہ مل گیا، غرض صاف کہہ دیا کہ ہم سے تو اس کتاب پر عمل نہیں ہوتا، حق تعالیٰ نے فرشتہ کو حکم دیا کہ طور پہاڑ کا ایک بڑا ٹکڑا اٹھا کر ان کے سروں پر معلق کر دو کہ یا تو مانو، ورنہ ابھی گرا، چنانچہ چار و ناچار ماننا پڑا۔

وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ: اس پر یہ شبہ نہ ہو کہ دین میں تو زبردستی نہیں، پھر یہاں بنی اسرائیل پر زبردستی یا اکراہ کیسے کیا گیا؟ جواب نہایت واضح ہے کہ دین میں اکراہ نہ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ عام کفار پر ابتداءً دین قبول کرنے کے لیے اکراہ وزبردستی نہ کریں گے، لیکن یہاں تو بنی اسرائیل پہلے بخوشی ایمان لا چکے تھے، سو ایسے شخص کو احکام کی بجا آوری پر ضرور مجبور کیا جائے گا جس کی نفی پر کوئی عقلی یا نقلی دلیل قائم نہیں، اور جہاد جو ہماری شریعت میں رکھا گیا ہے اس سے مقصود اسلام قبول کرنے پر مجبور کرنا نہیں ہے، کیونکہ جہاد میں ایک جز جزیہ کا بھی ہے جس کے قبول کرنے سے جہاد روک دیا جاتا ہے، بلکہ شرعی عدل کے قانون کی اطاعت مقصود ہے جو مؤمنین اور کفار سب کے حق میں عام ہے۔

***

فائدہ: کہتے ہیں کہ تورات نازل ہوئی تو بنی اسرائیل شرارت سے کہنے لگے کہ "توریت کے حکم تو مشکل اور بھاری ہیں، ہم سے نہیں ہو سکتے"، تب خدائے تعالیٰ نے ایک پہاڑ کو حکم کیا جو ان سب کے سروں پر آن کر اترنے لگا اور سامنے آگ پیدا ہوئی، گنجائش سرتابی اصلا نہ رہی، مجبوراً احکام تورات کو قبول کیا۔

باقی یہ شبہ کہ پہاڑ سروں پر معلق کر کے تسلیم کرانا تورات کا یہ صریح اجبار واکراہ ہے جو آیت لا اکراہ فی الدین اور نیز قاعدہ تکلیف کے بالکل خلاف ہے، کیونکہ بنائے تکلیف تو اختیار پر ہے اور اکراہ مناقض اختیار ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اکراہ در بارہ قبول دین ہرگز نہیں، دین تو بنی اسرائیل پہلے سے قبول کیے ہوئے تھے اور بار بار حضرت موسیٰ علیہ السلام سے تقاضا کرتے تھے کہ کوئی کتاب جو احکام پر مشتمل ہو ہم کو لاکر دو کہ اس پر عمل کریں اور اس پر معاہدہ کر چکے تھے، جب تورات ان کو دی گئی تو عہد شکنی پر کمربستہ ہوئے تو اب پہاڑ کا معلق کرنا نقض عہد سے روکنے کے لیے تھا نہ کہ قبول دین کیلئے۔

ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْ بَعْدِ ذٰلِكَ ۚ فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿٦٤﴾

پھر تم پھر گئے اس کے بعد، سو اگر نہ ہوتا اللہ کا فضل تم پر اور اس کی مہربانی تو ضرور تم تباہ ہوتے

خلاصہ تفسیر: (پندرہواں معاملہ) پھر تم اس قول وقرار کے بعد بھی (اس سے) پھر گئے، سو اگر تم لوگوں پر خدا تعالیٰ کا فضل اور رحم نہ ہوتا (تو اس عہد شکنی کا تقاضہ تو یہ تھا کہ) ضرور تم (فوراً) تباہ (اور ہلاک) ہو جاتے (مگر ہماری عنایت ورحمت عامہ ہے کہ حیات مستعار کے ختم ہونے تک مہلت دے رکھی ہے، لیکن کب تک؟ آخر مرنے کے بعد بدعملی کے وبال میں مبتلا ہو گے)۔

فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ: حق تعالیٰ کی "رحمت عامہ" دنیا میں مومن کافر سب پر ہے، جس کا اثر عافیت اور دنیوی راحت ہے، "رحمت خاصہ" جس کا اثر نجات اور قرب خداوندی ہے اس کا ظہور آخرت میں صرف مؤمنوں کے لیے ہوگا۔

اس آیت کے مخاطب بظاہر وہ یہودی ہیں جو زمانہ نبوی میں موجود تھے، چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ لانا بھی عہد شکنی ہے اس لیے ان کو بھی عہد توڑنے والوں میں داخل کر کے فرمایا گیا کہ اس پر بھی ہم نے تم پر دنیا میں کوئی ایسا عذاب نازل نہیں کیا جیسا پہلے بے ایمانوں پر ہوتا رہا ہے، یہ محض خدا کی رحمت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت ہے، اور چونکہ اب ایسے عذابوں کا نہ آنا از روئے حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت ہے، اس لیے بعض مفسرین نے اس آیت میں "فضل ورحمت" کی تفسیر "بعثت محمدیہ" سے کی ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی عہد ومیثاق کر کے پھر پھر گئے، سو اگر اللہ کا فضل نہ ہوتا تو بالکل تباہ ہو جاتے، یعنی اسی وقت ہلاک کر دیے جاتے، یا یہ کہ توبہ و استغفار بھی کرتے اور نبی آخر الزمان کی متابعت بھی کرتے تو بھی تمہاری تقصیرات معاف نہ کی جاتیں۔

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِئِيْنَ ﴿٦٥﴾

اور تم خوب جان چکے ہو جنہوں نے کہ تم میں سے زیادتی کی تھی ہفتہ کے دن میں تو ہم نے کہا ان سے ہو جاؤ بندر ذلیل ۱۔

فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿٦٦﴾

پھر کیا ہم نے اس واقعہ کو عبرت ان لوگوں کے لئے جو وہاں تھے اور جو پیچھے آنے والے تھے اور نصیحت ڈرنے والوں کے واسطے ۲۔

خلاصہ تفسیر: اوپر کی آیت کی تائید کے لیے گذشتہ بے ایمانوں کا ایک واقعہ بطور نظیر اس آیت میں پیش کیا جاتا ہے کہ عذاب آنے کو محال یا بعید نہ سمجھیں، ایسا پہلے ہو چکا ہے اور تم کو خبر ہے:

(سولہواں معاملہ) اور تم جانتے ہی ہو ان لوگوں کا حال جنہوں نے تم میں سے (حد شرع سے) تجاوز کیا تھا، در بارہ (اس حکم کے جو) ہفتہ

کے دن کے (متعلق تھا کہ وہ اس روز مچھلی کا شکار نہ کریں) سو ہم نے ان کو (اپنے حکم قہری تکوینی سے مسخ کرنے کے لئے) کہہ دیا کہ تم بندر ذلیل بن جاؤ (چنانچہ وہ بندروں کے قالب میں مسخ ہو گئے) پھر ہم نے اس کو ایک (واقعہ) عبرت (انگیز) بنا دیا، ان لوگوں کے لئے بھی جو اس قوم کے معاصر تھے اور ان لوگوں کے لئے بھی جو مابعد کے زمانے میں آتے رہے اور (نیز اس واقعہ کو) موجب نصیحت (بنایا، خدا سے) ڈرنے والوں کے لئے۔

الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ: بنی اسرائیل کا یہ واقعہ داود علیہ السلام کے زمانہ میں ہوا، یہ لوگ سمندر کے کنارہ پر آباد تھے اور مچھلی کے شکار کے شوقین تھے، ہفتہ کا دن معظم اور عبادت کے لیے مخصوص تھا، اس دن شکار سے منع کیا گیا، مگر یہ لوگ باز نہ آئے، اس لیے حق تعالیٰ نے ان کو مسخ کر دیا اور تین بعد سب مر گئے، اس مسخ کو محال سمجھنے والی کوئی بات نہیں، جب جدید فلاسفہ بندر کا ترقی کر کے آدمی بن جانا ممکن کہتے ہیں تو آدمی کا تنزل کر کے بندر بن جانا کیوں محال ہوگا۔

نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ: اس واقعہ کو دیکھنے اور سننے والے دو قسم کے لوگ تھے: ① فرمانبردار ② نافرمان، تو نافرمانوں کے لئے تو یہ واقعہ نافرمانی سے توبہ کرانے والا تھا اس لئے اس کو "نکال" فرمایا اور فرمانبرداروں کو یہ واقعہ فرمانبرداری پر قائم رکھنے والا تھا، اس لیے اس کو "موعظۃ" فرمایا۔

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا (الی قوله) وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ: اس قصہ سے یہ سمجھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح جو اعمال مقرر فرما دیے ہیں ان کو اسی طرح کرنا چاہیے تا کہ عبادتوں سے طبعی ظلمت اور سختی دور ہو، اور جن چیزوں سے روکا ہے ان سے رک جانا چاہیے ورنہ اطاعت و فرمانبرداری ختم ہوتی جائے گی، لہذا جو شخص اس کی رعایت نہیں کرتا اس کا نور ایمان ضائع ہو جاتا ہے اور وہ اصحاب سبت کی طرح معنوی طور پر مسخ کر دیا جاتا ہے، اگر چہ اس امت میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کی بدولت مسخ کا عذاب نہیں ہوگا، لیکن جس جانور کے اوصاف ان میں راسخ ہوں انہی کی طبیعت اس میں پیدا کر دی جاتی ہے، لہذا انسان کو عبادات کی مقررہ صورتیں اور شکلیں اور اوقات کا پاس و لحاظ رکھ کر اپنی انسانیت کو باقی رکھنے کی کوشش میں رہنا چاہیے۔

* * *

فائدہ: ۱ بنی اسرائیل کو تورات میں حکم ہوا تھا کہ "شنبہ کا دن خالص عبادت کے لیے مقرر ہے اس دن مچھلی کا شکار مت کرو"، وہ لوگ فریب اور حیلہ سے ہفتہ کے دن شکار کرنے لگے تو اللہ نے ان کو مسخ کر کے ان کی صورت بندر کی سی کر دی، فہم و شعور انسانی موجود تھا، ایک دوسرے کو دیکھتا تھا اور روتا تھا، مگر کلام نہیں کر سکتا تھا تین دن کے بعد سب مر گئے اور یہ واقعہ حضرت داؤد علیہ السلام کے عہد میں ہوا، مفصل سورۃ اعراف میں آئے گا۔

فائدہ: ۲ یعنی اس واقعہ اور اس عقوبت کو ہم نے باعث خوف و عبرت بنا دیا اگلے اور پچھلے لوگوں کے واسطے، یعنی جنھوں نے اس عذاب کا مشاہدہ کیا اور جو آئندہ پیدا ہوں گے، یا جو بستیاں شہر کے آگے اور اس کے پیچھے آباد تھیں۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖٓ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً ؕ قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ؕ

اور جب کہا موسیٰ نے اپنی قوم سے اللہ فرماتا ہے تم کو ذبح کرو ایک گائے ۱ وہ بولے کیا تو ہم سے ہنسی کرتا ہے ۲

قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ۝۶۷

کہا پناہ خدا کی کہ ہوں میں جاہلوں میں ۳

خلاصہ تفسیر: (سترہواں معاملہ) اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب (حضرت) موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا کہ حق تعالیٰ تم کو حکم دیتے ہیں کہ (اگر اس لاش کے قاتل کا پتہ لگانا چاہتے ہو تو) تم ایک بیل ذبح کرو، وہ لوگ کہنے لگے کہ آیا آپ ہم کو مسخرہ بناتے ہیں (کہاں قاتل کی تحقیق، کہاں جانور کا ذبح کرنا) موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا نعوذ باللہ جو میں ایسی جہالت والوں کا سا کام کروں (کہ احکام خداوندی میں تمسخر کرنے لگوں)۔

قصہ یہ ہوا کہ بنی اسرائیل میں ایک خون ہوگیا تھا، جس کی وجہ یہ لکھی ہے کہ کسی نے اس مقتول کی بیٹی سے نکاح کرنا چاہا تھا، مقتول نے انکار کر دیا تو اس کو مار ڈالا، لوگوں کو قاتل کا پتہ نہ چلا، بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام سے عرض کیا کہ ہم چاہتے ہیں کہ قاتل کا پتہ چل جائے، آپ نے بحکم خداوندی ایک بیل کے ذبح کرنے کا حکم فرمایا جس سے قاتل کے سراغ ملنے کا طریقہ آگے آیت میں آتا ہے، اس پر انہوں نے اپنی جبلت کے مطابق حجتیں نکالنا شروع کر دیں، یہ قصہ تورات کے نازل ہونے سے پہلے کا معلوم ہوتا ہے، اس وقت تک شرعی قاتل کے بارے میں کوئی قانون نازل نہ ہوا تھا۔

فائدہ: ۱ یعنی یاد کرو اس وقت کو کہ بنی اسرائیل میں ایک شخص ''عامیل'' نامی مارا گیا تھا اور اس کا قاتل معلوم نہ ہوتا تھا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: ''اللہ کا یہ حکم ہے کہ ایک گائے ذبح کر کے اس کا ایک ٹکڑا مردے پر مارو تو وہ جی اٹھے اور آپ اپنے قاتل کو بتا دے'' اللہ تعالیٰ نے اس طرح اس مردے کو جلایا اور اس نے قاتل کو بتا دیا کہ اس کے وارثوں نے ہی بطمع مال قتل کیا تھا۔

فائدہ: ۲ کیونکہ یہ تو دیکھا نہ سنا کہ گائے کے ٹکڑا مارنے سے مردہ زندہ ہو جائے۔

فائدہ: ۳ یعنی ٹھٹھا کرنا احمق جاہل کا کام ہے اور وہ بھی احکام شرعیہ میں پیغمبر سے یہ ہرگز ممکن نہیں۔

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّن لَّنَا مَا هِيَ ؕ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ ؕ

بولے کہ دعا کر ہمارے واسطے اپنے رب سے کہ بتا دے ہم کو کہ وہ گائے کیسی ہے ۱ کہا وہ فرماتا ہے کہ وہ گائے ہے نہ بوڑھی اور نہ بن بیاہی

عَوَانٌ بَيْنَ ذٰلِكَ ؕ فَافْعَلُوا مَا تُؤْمَرُونَ ﴿۶۸﴾

درمیان میں ہے بڑھاپے اور جوانی کے، اب کر ڈالو جو تم کو حکم ملا ہے ۲۔

خلاصہ تفسیر: (موسیٰ علیہ السلام نے بحکم خداوندی قاتل کا سراغ لگانے کے لیے ایک بیل کے ذبح کا حکم فرمایا، بنی اسرائیل نے اپنی جبلت کے موافق حجتیں نکالنا شروع کر دیں، چنانچہ ان آیات میں اسی کی تفصیل ہے) وہ لوگ کہنے لگے کہ آپ درخواست کیجئے ہمارے لیے اپنے رب سے ہم سے بیان کر دیں کہ اس (بیل) کے کیا اوصاف ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ وہ (میری درخواست کے جواب میں) یہ فرماتے ہیں کہ وہ ایسا بیل ہو کہ نہ بوڑھا ہو، نہ بہت بچہ ہو (بلکہ) پٹھا ہو، دونوں عمروں کے اوسط میں، سو اب (زیادہ حجت مت کرو، بلکہ) کر ڈالو جو کچھ تم کو حکم ملا ہے۔

فائدہ: ۱ یعنی اس کی عمر کتنی ہے اور اس کے حالات کیا ہیں نوعمر ہے یا بوڑھی۔

فائدہ: ۲ یعنی اس گائے کو ذبح کر ڈالو۔

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّن لَّنَا مَا لَوْنُهَا ؕ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَآءُ ۙ فَاقِعٌ

بولے کہ دعا کر ہمارے واسطے اپنے رب سے کہ بتا دے ہم کو کیسا ہے اس کا رنگ، کہا وہ فرماتا ہے کہ وہ ایک گائے ہے زرد، خوب گہری ہے اسکی

لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِينَ ﴿۶۹﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّن لَّنَا مَا هِيَ ۙ إِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ

زردی خوش آتی ہے دیکھنے والوں کو، بولے دعا کر ہمارے واسطے اپنے رب سے کہ بتا دے ہم کو کس قسم میں ہے وہ ۱ کیونکہ اس گائے میں شبہ

عَلَيْنَا ؕ وَإِنَّآ إِن شَآءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُونَ ﴿۷۰﴾

پڑا ہے ہم کو، اور ہم اگر اللہ نے چاہا تو ضرور راہ پالیں گے

خلاصہ تفسیر: کہنے لگے کہ (اچھا یہ بھی) درخواست کردیجئے ہمارے لئے اپنے رب سے ہم سے یہ (بھی) بیان کردیں کہ اس کا رنگ کیسا ہو؟ آپ نے فرمایا کہ (اس کے متعلق) حق تعالیٰ یہ فرماتے ہیں کہ وہ ایک زرد رنگ کا بیل ہو جس کا رنگ تیز زرد ہو کہ ناظرین (دیکھنے والوں کو) کو فرحت بخش ہو، کہنے لگے کہ (اب کی بار اور) ہماری خاطر اپنے رب سے دریافت کردیجئے کہ (پہلی بار کے سوال کا جواب ذرا واضح) ہم سے بیان کردیں کہ اس کے اوصاف کیا کیا ہوں؟ کیونکہ ہم کو اس بیل میں (قدرے) اشتباہ (یہ باقی) ہے (کہ وہ معمولی بیل ہوگا، یا کوئی اور عجیب و غریب جس میں تحقیق قاتل کا خاص اثر ہو) اور ہم ضرور ان شاء اللہ تعالیٰ (اب کی بار) ٹھیک سمجھ جائیں گے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی واضح کرکے بتادے کہ وہ گائے کس قسم اور کس کام کی ہے۔

قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْاَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ ۚ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيْهَا ؕ

کہا وہ فرماتا ہے کہ وہ ایک گائے ہے محنت کرنے والی نہیں کہ جوتتی ہو زمین کو یا پانی دیتی ہو کھیتی کو، بے عیب ہے کوئی داغ اس میں نہیں ۱؎

قَالُوا الْـٰٔنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ ؕ فَذَبَحُوْهَا وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿۷۱﴾ ع ۸

بولے اب لایا تو ٹھیک بات، پھر اس کو ذبح کیا اور وہ لگتے نہ تھے کہ ایسا کرلیں گے ۲؎

خلاصہ تفسیر: موسیٰ نے جواب دیا کہ حق تعالیٰ یوں فرماتے ہیں کہ وہ (کوئی عجیب و غریب جانور نہیں ہے، یہی معمولی بیل ہے، البتہ عمدہ ہونا چاہئے کہ مذکورہ اوصاف کے ساتھ) نہ تو ہل میں چلا ہوا ہو، جس سے زمین جوتی جائے، اور نہ (کنویں میں جوڑا گیا ہو کہ) اس سے زراعت کی آبپاشی کی جائے (غرض ہر قسم کے عیب سے) سالم ہو، اور اس میں (کسی طرح کا) کوئی داغ نہ ہو (یہ سن کر) کہنے لگے کہ (ہاں) اب آپ نے پوری (اور صاف) بات فرمائی (القصہ ایسا جانور تلاش کرکے خریدا) پھر اس کو ذبح کردیا، حالانکہ بظاہر کرتے ہوئے معلوم نہ ہوتے تھے (حدیث شریف میں ہے کہ اگر وہ یہ حجتیں نہ کرتے تو اتنی قیدیں ان کے ذمہ نہ ہوتیں، جو بھی گائے ذبح کردیتے کافی ہوجاتا)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی اس کے اعضا میں کوئی نقصان نہیں اور اس کے رنگ میں دوسرے رنگ کا داغ و نشان نہیں، بلکہ ساری زرد ہے۔

فائدہ: ۲؎ وہ گائے ایک شخص کی تھی، جو اپنی ماں کی خدمت بہت کرتا تھا اور نیک بخت تھا، اس شخص سے وہ گائے مول لی اتنے مال کو جتنا اس گائے کی کھال میں سونا بھر سکیں پھر اس کو ذبح کیا، اور ایسے لگتے نہ تھے کہ اتنی بڑی قیمت کو لے کر ذبح کریں گے۔

وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا ؕ وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴿۷۲﴾

اور جب مار ڈالا تھا تم نے ایک شخص کو پھر لگے ایک دوسرے پر دھرنے، اور اللہ کو ظاہر کرنا تھا جو تم چھپاتے تھے ۱؎

فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا ؕ كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى ۙ وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۷۳﴾

پھر ہم نے کہا مارو اس مردہ پر اس گائے کا ایک ٹکڑا ۲؎ اسی طرح زندہ کریگا اللہ مردوں کو، اور دکھاتا ہے تم کو اپنی قدرت کے نمونے تاکہ تم غور کرو ۳؎

خلاصہ تفسیر: (اٹھارواں معاملہ) اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب تم لوگوں (میں سے کسی) نے ایک آدمی کا خون کردیا، پھر (اپنی برات کے لئے) ایک دوسرے پر ڈالنے لگے، اور اللہ تعالیٰ کو اس امر کا ظاہر کرنا منظور تھا جس کو تم (میں مجرم و مشتبہ لوگ) مخفی رکھنا چاہتے تھے، اس لئے

(ذبح کے بعد) ہم نے حکم دیا کہ اس (مقتول کی لاش) کو اس (گائے) کے کوئی سے ٹکڑے سے چھوا دو (چنانچہ چھوانے سے وہ زندہ ہو گیا اور اپنے قاتل کا نام بتلا کر پھر فوراً مر گیا، آگے اللہ تعالیٰ منکرین قیامت کے مقابلہ میں اس قصہ سے استدلال اور نظیر کے طور پر فرماتے ہیں کہ) اسی طرح حق تعالیٰ (قیامت میں) مردوں کو زندہ کر دیں گے اور اللہ تعالیٰ اپنے نظائر (قدرت) تم کو دکھلاتے ہیں اس توقع پر کہ تم عقل سے کام لیا کرو (اور ایک نظیر سے دوسری نظیر کے انکار سے باز آؤ)۔

اس جگہ صرف مقتول کا بیان اس لئے کافی سمجھا گیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بذریعہ وحی معلوم ہو گیا تھا کہ یہ مقتول سچ اور واقع کے مطابق بولے گا، ورنہ صرف مقتول کے بیان سے بغیر شرعی شہادت کے کسی پر قتل کا ثبوت کافی نہیں ہوتا۔

كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى: جو شخص بے جان مضغہ میں جان پڑنے کے طریقہ میں غور کرے گا کہ اس کی کل حقیقت ایک لطیف بخار کا مضغہ سے چھو جانا اور متصل ہو جانا ہے، تو وہ اس قصہ کو کسی طرح قدرت حق سے بعید نہ سمجھے گا اور دونوں اتصالوں میں کوئی معقول فرق بیان نہ کر سکے گا۔

یہاں یہ شبہ کرنا بھی درست نہیں کہ حق تعالیٰ کو تو مردہ زندہ کرنے کی ویسی ہی قدرت تھی یا مقتول کو زندہ کئے بغیر قاتل کا نام بتایا جا سکتا تھا پھر اس سامان کی کیا ضرورت تھی؟ تو بات یہ ہے کہ حق تعالیٰ کا کوئی فعل ضرورت اور مجبوری کی وجہ سے تو ہوتا نہیں، بلکہ مصلحت اور حکمت کے لئے ہوتا ہے اور ہر واقعہ کی حکمت اللہ تعالیٰ ہی کے احاطہ علمی میں آسکتی ہے، نہ ہم اس کے مکلف ہیں کہ ہر واقعہ کی مصلحت معلوم کریں، اور نہ یہ ضروری ہے کہ ہر واقعہ کی حکمت ہماری سمجھ میں آ جائے، اس لئے اس کے پیچھے پڑ کر اپنی عمر عزیز ضائع کرنے کے بجائے بہتر طریقہ تسلیم و سکوت کا ہے۔

قصہ کی ترتیب بدلنے میں نکتہ یہ ہے کہ سننے والے سمجھ جائیں کہ قصہ کے دونوں جز مقصود ہیں، اگر دونوں مقصود نہ ہوتے تو ترتیب کیوں بدلی جاتی، اس واقعہ سے بنی اسرائیل کی دو بے عنوانیوں کا ذکر کرنا مقصود تھا: ① ایک قتل کر کے واردات کو چھپانے کی کوشش کرنا ② دوسرے احکام خداوندی میں خواہ مخواہ کی حجتیں نکالنا، اگر قصہ ترتیب وار بیان کیا جاتا تو ممکن تھا کہ ناظرین پہلے جز کو مقصود سمجھتے اور دوسرے جز کو محض قصہ کا تتمہ خیال کرتے۔

***

فائدہ: ۱ یعنی تمہارے اگلے بزرگوں نے "عامیل" کو مار ڈالا تھا، پھر ایک دوسرے پر دھرنے لگا اور تم جس چیز کو چھپاتے تھے (یعنی اپنی ضعف ایمانی یا قاتل کے حال کو) اللہ تعالیٰ اس کو ظاہر فرمانا چاہتا ہے۔

فائدہ: ۲ یعنی جب ایک ٹکڑا اس گائے کا اس کو مارا تو وہ بحکم الٰہی زندہ ہو گیا اور لہو زخم سے بہنے لگا اور اپنے قاتل کا نام بتا دیا جو اسی مقتول کے بھتیجے تھے، بطمع مال چچا کو جنگل میں لے جا کر مار ڈالا تھا، پھر وہ ان کا نام بتا کر گر پڑا اور مر گیا۔

فائدہ: ۳ یعنی اسی طرح زندہ کرے گا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن مردوں کو اپنی قدرت کاملہ سے اور اپنی قدرت کی نشانیاں تم کو دکھلاتا ہے کہ شاید تم غور کرو اور سمجھ لو کہ خدائے تعالیٰ مردوں کو زندہ کر سکتا ہے۔

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ؕ وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا

پھر تمہارے دل سخت ہو گئے اس سب کے بعد ۱ سو وہ ہو گئے جیسے پتھر یا ان سے بھی سخت، اور پتھروں میں تو ایسے بھی ہیں جن سے

يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ

جاری ہوتی ہیں نہریں، اور ان میں ایسے بھی ہیں جو پھٹ جاتے ہیں اور نکلتا ہے ان سے پانی، اور ان میں ایسے بھی ہیں جو گر پڑتے ہیں

مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۷۴﴾

اللہ کے ڈر سے، اور اللہ بے خبر نہیں تمہارے کاموں سے ۲

خلاصہ تفسیر: (اب ان واقعات سے متاثر نہ ہونے پر شکایت کے طور پر ارشاد ہوتا ہے:) ایسے ایسے واقعات کے بعد (چاہئے تھا کہ تمہارے دل بالکل نرم اور حق تعالیٰ کی عظمت سے پر ہوجاتے لیکن) تمہارے دل پھر بھی سخت ہی رہے تو (یوں کہنا چاہئے کہ) ان کی مثال پتھر کی سی ہے، یا (یوں کہئے کہ وہ) سختی میں ان سے (بھی) زیادہ (ہیں) اور (زیادہ سخت اس وجہ سے کہا جاتا ہے کہ) بعض پتھر تو ایسے ہیں جن سے (بڑی بڑی) نہریں پھوٹ کر چلتی ہیں، اور انہی پتھروں میں بعض ایسے ہیں کہ جوشق ہوجاتے ہیں، پھر ان سے (اگر زیادہ نہیں تو تھوڑا ہی) پانی نکل آتا ہے، اور ان ہی پتھروں میں بعض ایسے ہیں جو خدا تعالیٰ کے خوف سے اوپر سے نیچے لڑھک آتے ہیں (اور تمہارے دلوں میں کسی قسم کا اثر ہی نہیں ہوتا) اور (سخت دلی کی وجہ سے جو اعمال بد صادر ہوتے ہیں) حق تعالیٰ تمہارے (ان) اعمال سے بے خبر نہیں ہیں (بہت جلد تم کو سزا تک پہنچا دیں گے)۔

فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ أَوْ أَشَدُّ قَسْوَةً: اس مقام پر پتھروں کی ان تین اقسام کے ذکر میں ترتیب نہایت لطیف اور مقصود کے بیان میں نہایت بلیغ ہے، یعنی بعض پتھروں میں تاثر اتنا قوی ہے جس سے نہریں جاری ہوجاتی ہیں جن سے مخلوق خدا فائدہ اٹھاتی ہے، اور ان یہودیوں کے دل ایسے بھی نہیں کہ مخلوق خدا کی تکلیف و مصیبت میں پگھل جائیں، اور بعض پتھروں میں ان سے کم تاثر ہوتا ہے جس سے کم نفع پہنچتا ہے تو یہ پتھر بہ نسبت اول کے کم نرم ہوئے اور ان یہودیوں کے دل اس درجہ دوم کے پتھروں سے بھی سخت ہیں، اور بعض پتھروں میں اگرچہ اس درجہ کا اثر نہیں مگر پھر بھی ایک اثر تو ہے کہ خوف خدا سے نیچے گر آتے ہیں اگر چہ درجے میں پہلی دو قسموں سے یہ ضعیف تر ہیں، مگر ان یہودیوں کے دلوں میں تو کم درجہ اور ضعیف ترین جذبہ انفعال بھی نہیں ہے، یعنی ان کے دلوں میں اتنی بھی صلاحیت نہیں، سبحان اللہ! کیا عجیب ترتیب ہے۔

لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللهِ: یعنی جو اللہ کے خوف سے اوپر سے نیچے لڑھک آتے ہیں، یہ شبہ نہ کیا جائے کہ پتھروں میں تو عقل نہیں، ان میں خوف و خشیت خداوندی کیسے ہوسکتی ہے؟ جواب یہ ہے کہ خوف کے لیے عقل کی تو ضرورت نہیں، کیونکہ حیوانات میں خوف کا مشاہدہ کیا جاتا ہے، حالانکہ وہ بے عقل ہیں، البتہ حس کی ضرورت ہوتی ہے، اور جمادات میں حس نہ ہونے کی کوئی دلیل نہیں، کیونکہ حس حیات پر موقوف ہے، تو بہت ممکن ہے کہ ان میں ایسی لطیف حیات ہو جس کا ہمیں ادراک نہ ہوتا ہو، جیسا کہ جوہر دماغ کے احساس کا کسی کو ادراک نہیں ہوتا، مگر بہت سے عقلاء دلائل سے اس کے قائل ہوتے ہیں تو قرآنی آیت ان طبی دلائل سے قوت میں کم نہیں ہے، پھر ہمارا یہ دعویٰ بھی نہیں کہ ہمیشہ پتھر گرنے کی علت خوف ہی ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ بعض پتھر اس وجہ سے گر جاتے ہیں، سو بہت ممکن ہے کہ گرنے کے اسباب مختلف ہوں ان میں سے بعض طبعی ہوں اور ایک سبب خوف خدا بھی ہو، اس میں صوفیہ کے قول کی دلیل ہے کہ وہ جمادات کے لیے اتنا شعور ثابت کرتے ہیں جس سے وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتے ہیں۔

❋ ❋ ❋

فائدہ: ۱؎ یعنی ''عامیل کے جی اٹھنے کے بعد'' مطلب یہ کہ ایسی نشانی قدرت دیکھ کر بھی تمہارے دل نرم نہ ہوئے۔

فائدہ: ۲؎ یعنی بعض پتھروں سے بڑا نفع پہنچتا ہے کہ انہار اور پانی بکثرت ان سے جاری ہوتا ہے، اور بعض پتھروں سے پانی کم نکلتا ہے اور اوّل قسم کی نسبت نفع کم ہوتا ہے، اور بعض پتھروں سے گو کسی کو نفع نہ پہنچے، مگر خود ان میں ایک اثر اور تاثر تو موجود ہے، مگر ان [بنی اسرائیل] کے قلوب ان تینوں قسموں کے پتھر سے سخت تر ہیں، نہ ان سے کسی کو نفع اور نہ ان میں کوئی مضمون خیر موجود، اور اللہ اے یہودیو! تمہارے اعمال سے بے خبر ہرگز نہیں۔

أَفَتَطْمَعُونَ أَنْ يُؤْمِنُوا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيقٌ مِنْهُمْ يَسْمَعُونَ كَلَامَ اللهِ ثُمَّ يُحَرِّفُونَهُ

اب کیا تم اے مسلمانو توقع رکھتے ہو کہ وہ مانیں تمہاری بات اور ان میں ایک فرقہ تھا کہ سنتا تھا اللہ کا کلام پھر بدل ڈالتے تھے اس کو

مِنْ بَعْدِ مَا عَقَلُوهُ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿٧٥﴾

جان بوجھ کر اور وہ جانتے تھے

خلاصہ تفسیر: مسلمان یہودیوں کو مومن بنانے کی جو فکر و کوشش کر رہے تھے اور اس میں رنج و مشقت اٹھاتے تھے تو یہود کے

حالات دکھلا کر سنا کر مسلمانوں کی امید منقطع کر کے ان کی مشقت اس آیت کے ذریعہ دور فرماتے ہیں:

(انیسواں معاملہ: اے مسلمانو!) کیا (یہ سارے قصے سن کر) اب بھی تم توقع رکھتے ہو کہ یہ (یہودی) تمہارے کہنے سے ایمان لے آئیں گے، حالانکہ (ان سب مذکورہ قصوں سے بڑھ کر ایک اور بات بھی ان سے ہو چکی ہے کہ) ان میں کچھ لوگ ایسے گذرے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا کلام سنتے تھے اور اس کو کچھ کا کچھ کر ڈالتے تھے (اور) اس کو سمجھنے کے بعد (ایسا کرتے) اور (لطف یہ کہ یہ بھی) جانتے تھے (کہ ہم برا کر رہے ہیں، محض نفسانی اغراض اس کارروائی کا سبب ہوتیں، مطلب یہ کہ جو لوگ ایسے بے باک اور اغراض نفسانی کے اسیر ہوں وہ کسی کے کہنے سننے سے کب باز آنے والے ہیں، اور کسی کی کب سننے والے ہیں)۔

يَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ: ''کلام اللہ'' سے مراد یا تو تورات ہے اور ''سماع'' سے مراد انبیاء علیہم السلام کے واسطہ سے سننا ہے، اور ''تحریف'' سے مراد اس کے بعض کلمات یا تفاسیر یا دونوں بدل ڈالنا ہیں، اور یا ''کلام'' سے مراد وہ کلام ہے جو ان ستر آدمیوں نے موسیٰ علیہ السلام کی تصدیق کے مقدمہ میں کوہ طور پر سنا تھا، اس صورت میں ''سماع'' سے مراد بلا واسطہ سننا، اور ''تحریف'' سے مراد قوم سے یہ نقل کر دینا کہ اخیر میں اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرما دیا تھا کہ جو حکم تم سے ادا نہ ہو سکے وہ معاف ہے، جیسا کہ پیچھے آیت: وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ کی تفسیر میں بیان ہو چکا۔

اگرچہ ان میں سے بعض باتوں کا صدور ان یہودیوں سے نہ ہوا ہو جو آنحضرت ﷺ کے زمانے میں موجود تھے، لیکن چونکہ یہ لوگ بھی اپنے اسلاف کے ان اعمال پر انکار اور نفرت نہ رکھتے تھے اس لئے حکماً یہ بھی ویسے ہی ہوئے۔

***

فائدہ: ''فریق'' سے مراد وہ لوگ ہیں جو کوہ طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کلام الٰہی سننے کے لیے گئے تھے، انہوں نے وہاں سے آ کر یہ تحریف کی کہ بنی اسرائیل سے کہہ دیا کہ تمام کلام کے آخر میں ہم نے یہ بھی سنا کہ (کر سکو تو ان احکام کو کر لینا، ورنہ ان کے ترک کا بھی تم کو اختیار ہے) اور بعض نے فرمایا کہ ''کلام الٰہی'' سے مراد تورات ہے اور ''تحریف'' سے مراد یہ ہے کہ (اس کی آیات میں تحریف لفظی و معنوی کرتے تھے) کبھی آپ کی نعت کو بدلا، کبھی آیت رجم کو اڑا دیا وغیرہ۔

وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۖۚ وَاِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ قَالُوْٓا اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ

اور جب ملتے ہیں مسلمانوں سے کہتے ہیں ہم مسلمان ہوئے، اور جب تنہا ہوتے ہیں ایک دوسرے کے پاس تو کہتے ہیں تم کیوں کہہ دیتے ہو ان سے

بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَآجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝

جو ظاہر کیا ہے اللہ نے تم پر تاکہ جھٹلائیں تم کو اس سے تمہارے رب کے آگے، کیا تم نہیں سمجھتے

خلاصہ تفسیر: (بیسواں معاملہ:) اور جب ملتے ہیں (منافقین یہود) مسلمانوں سے تو (ان سے تو) کہتے ہیں کہ ہم (بھی) ایمان لے آئے ہیں، اور جب تنہائی میں جاتے ہیں یہ بعض (منافق یہودی) دوسرے بعض (علانیہ) یہودیوں کے پاس (تو ان سے ان کی معیت اور ان کے ہم مشرب ہونے کا دعوی کرتے ہیں، اس وقت) وہ (دوسرے یہودی) ان سے کہتے ہیں کہ تم (یہ) کیا (غضب کرتے ہو کہ) مسلمانوں کو (خوشامد میں) وہ باتیں بتلا دیتے ہو جو (ان کے مذہب کے لیے مفید ہیں اور) اللہ تعالیٰ نے (تورات میں) تم پر منکشف کر دی ہیں (مگر ہم مصلحت کی وجہ سے ان کو پوشیدہ رکھتے ہیں) نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ لوگ تم کو حجت میں مغلوب کر دیں گے کہ (دیکھو) یہ مضمون اللہ کے پاس (سے تمہاری کتاب میں آیا) ہے، کیا تم (اتنی موٹی سی بات) نہیں سمجھتے۔

قَالُوْٓا اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ: منافقین کبھی ایک آدھ بات خوشامد میں اپنے ایمان کی سچائی جتلانے کے لئے مسلمانوں

سے کہہ دیتے تھے کہ تورات میں رسول اللہ کے متعلق بشارت آئی ہے، یا قرآن مجید کے متعلق خبر آئی ہے وغیرہ وغیرہ، اس پر دوسرے لوگ ان کو ملامت کرتے تھے، مقصود یہ ہے کہ جو لوگ ایسے چالاک اور چاند پر خاک ڈالنے والے ہیں وہ تمہاری کیا مانیں گے، یہ شبہ نہ ہو کہ منافقین کا یہ قول تو پہلے بھی آچکا ہے دوبارہ کیوں بیان کیا گیا؟ جواب یہ ہے کہ وہاں ان کا برتاؤ مسلمانوں کے ساتھ بتلانا منظور تھا، یہاں ایمان کی امید قطع کرنا مقصود ہے، مقصود کے اختلاف سے تکرار کہاں رہا، اور قرآن میں اکثر جگہ مکررات اسی قبیل سے ہیں، اور اگر کہیں مقصود ایک بھی ہو جب بھی تاکید خود ایک نیا مقصود اور بلاغت میں مہتم بالشان چیز ہے۔

فائدہ: یہود میں جو لوگ منافق تھے وہ بطور خوشامد اپنی کتاب میں سے پیغمبر آخر الزمان کی باتیں مسلمانوں سے بیان کرتے، دوسرے لوگ ان میں سے ان کو اس بات پر ملامت کرتے کہ اپنی کتاب کی سند ان کے ہاتھ میں کیوں دیتے ہو، کیا تم نہیں جانتے کہ مسلمان تمہارے پروردگار کے آگے تمہاری خبر دی ہوئی باتوں سے تم پر الزام قائم کریں گے کہ پیغمبر آخر الزمان ﷺ کو سچ جان کر بھی ایمان نہ لائے اور تم کو لا جواب ہونا پڑے گا۔

اَوَلَا یَعۡلَمُوۡنَ اَنَّ اللّٰہَ یَعۡلَمُ مَا یُسِرُّوۡنَ وَمَا یُعۡلِنُوۡنَ ﴿۷۷﴾

کیا اتنا بھی نہیں جانتے کہ اللہ کو معلوم ہے جو کچھ چھپاتے ہیں اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں

خلاصہ تفسیر: (اللہ تعالیٰ ان منافقین اور ملامت کرنے والوں کی حماقت پر تنبیہ فرماتے ہیں:) کیا ان کو اس کا علم نہیں ہے کہ حق تعالیٰ کو سب خبر ہے ان چیزوں کی بھی جن کو وہ مخفی رکھتے ہیں، اور ان کی بھی جن کا وہ اظہار کرتے ہیں (تو اگر منافقین نے مسلمانوں سے اپنا کفر چھپایا تو کیا، اور ان ملامت گروں نے حضور ﷺ کی بشارت وغیرہ کے مضامین چھپائے تو کیا، اللہ تعالیٰ کو تو سب خبر ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں مضامین سے مسلمانوں کو جا بجا مطلع فرما دیا ہے)۔

فائدہ: یعنی اللہ کو تو ان کے سب امور ظاہر ہوں یا مخفی، بالکل معلوم ہیں، ان کی کتاب کی سب حجتوں کی خبر مسلمانوں کو دے سکتا ہے اور جا بجا مطلع فرما بھی دیا، آیت رجم کو انہوں نے چھپایا، مگر اللہ نے ظاہر فرما کر ان کو فضیحت کیا، یہ تو ان کے علماء کا حال ہوا جو عقلمندی اور کتاب دانی کے مدعی تھے۔

وَمِنۡہُمۡ اُمِّیُّوۡنَ لَا یَعۡلَمُوۡنَ الۡکِتٰبَ اِلَّاۤ اَمَانِیَّ وَاِنۡ ہُمۡ اِلَّا یَظُنُّوۡنَ ﴿۷۸﴾

اور بعض ان میں بے پڑھے ہیں کہ خبر نہیں رکھتے کتاب کی سوائے جھوٹی آرزوؤں کے اور ان کے پاس کچھ نہیں مگر خیالات

خلاصہ تفسیر: گذشتہ آیت میں تو یہودیوں کے پڑھے لکھے لوگوں کا ذکر تھا، اب ان کے اَن پڑھ لوگوں کا ذکر فرماتے ہیں:

اور ان (یہودیوں) میں بہت سے ناخواندہ (بھی) ہیں جو کتابی علم نہیں رکھتے، لیکن (بلاسند) دل خوش کن باتیں (بہت یاد ہیں) اور وہ لوگ کچھ اور نہیں (ویسے ہی بے بنیاد) خیالات پکا لیتے ہیں۔

لَا یَعۡلَمُوۡنَ الۡکِتٰبَ اِلَّاۤ اَمَانِیَّ: وجہ اس کی یہ ہے کہ کچھ تو ان کے علماء کی تعلیم ناقص اور گڑ بڑ تھی، پھر اوپر سے ان میں فہم کی کمی ہے، ایسی صورت میں بجز بے بنیاد خیالات کے سچے حقائق کی تحقیق کہاں نصیب ہو سکتی ہے، بقول شخصے ''کریلا اور نیم چڑھا'' اس میں مٹھاس کہاں!

فائدہ: اور جو جاہل ہیں ان کو تو کچھ بھی خبر نہیں کہ تورات میں کیا لکھا ہے، مگر چند آرزوئیں جو اپنے عالموں سے جھوٹی باتیں سن رکھی ہیں (مثلاً بہشت میں یہودیوں کے سوا کوئی نہ جائے گا اور ہمارے باپ دادا ہم کو ضرور بخشوا لیں گے) اور یہ ان کے خیالات بے اصل ہیں، جن کی کوئی دلیل ان کے پاس نہیں۔

فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ۗ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ

سو خرابی ہے ان کو جو لکھتے ہیں کتاب اپنے ہاتھ سے، پھر کہہ دیتے ہیں یہ خدا کی طرف سے ہے تا کہ لیں اس پر

ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ ﴿۷۹﴾

تھوڑا سا مول، سو خرابی ہے ان کو اپنے ہاتھوں کے لکھے سے اور خرابی ہے ان کو اپنی اس کمائی سے

خلاصہ تفسیر: چونکہ ان کی اس توہم پرستی کا بڑا سبب ان کے اہل علم حضرات کی خیانت تھی، اس جرم کی وجہ سے وہ اپنی عوام سے بھی زیادہ برے ہوئے، اسی کا بیان اب یہاں کرتے ہیں:

(جب ان کی عوام زجر کے قابل ہے اور عوام کے جہل کا اصلی سبب یہ اہل علم ہیں) تو بڑی خرابی ان کی ہوگی جو لکھتے ہیں (بدل سدل کر) کتاب (تورات) کو اپنے ہاتھوں سے (اور) پھر (عوام سے) کہہ دیتے ہیں کہ یہ (حکم) خدا کی طرف سے (یوں ہی آیا) ہے (اور) غرض (صرف) یہ ہوتی ہے کہ اس ذریعہ سے کچھ نقد قدرے قلیل وصول کرلیں، سو بڑی خرابی (پیش) آئے گی ان کو اس (تحریف کتاب) کی بدولت (بھی) جس کو ان کے ہاتھوں نے لکھا تھا، اور بڑی خرابی ہوگی ان کو اس (نقد) کی بدولت (بھی) جس کو وہ وصول کرلیا کرتے تھے۔

عوام کی رضا جوئی کے لئے غلط سلط مسئلے بتا دینے سے ان کو کچھ نقد وغیرہ بھی وصول ہوجاتا تھا اور عوام کی نظر میں وقعت اور وقار بھی رہتا تھا، اسی غرض سے تورات میں لفظی یا معنوی کچھ پھیر پھار بھی کر کے اپنی نفسانی اغراض پوری کرتے رہتے تھے، اس آیت میں اسی پر وعید سنائی گئی۔

* * *

فائدہ: یہ وہ لوگ ہیں جو ان عوام جاہلوں کے موافق باتیں اپنی طرف سے بنا کر لکھ دیتے تھے اور خدا کی طرف ان باتوں کو منسوب کرتے، مثلاً تورات میں لکھا تھا کہ پیغمبر آخر الزمان خوبصورت پیچواں بال، سیاہ آنکھیں، میانہ قد، گندم رنگ پیدا ہوں گے، انہوں نے پھیر کر یوں لکھا "لمبا قد، نیلی آنکھیں، سیدھے بال" تاکہ عوام آپ کی تصدیق نہ کرلیں اور ہمارے منافع دنیاوی میں خلل نہ آجائے۔

وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ؕ قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ

اور کہتے ہیں ہم کو ہرگز آگ نہ لگے گی مگر چند روز گنے چنے [1] کہہ دو کیا تم لے چکے ہو اللہ کے یہاں سے قرار کہ اب ہرگز خلاف نہ کریگا اللہ

عَهْدَهٗٓ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۰﴾

اپنے قرار کے یا جوڑتے ہو اللہ پر جو تم نہیں جانتے

خلاصہ تفسیر: (اکیسواں معاملہ:) اور یہودیوں نے (یہ بھی) کہا کہ ہرگز ہم کو آتش (دوزخ) چھوئے گی (بھی تو) نہیں (ہاں!) مگر (بہت) تھوڑے روز جو (انگلیوں پر) شمار کرلئے جاسکیں (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم!) آپ ان سے یوں فرما دیجئے کیا تم لوگوں نے حق تعالیٰ سے (اس کے متعلق) کوئی معاہدہ لے لیا ہے جس میں اللہ تعالیٰ اپنے معاہدہ کے خلاف نہ کریں گے یا (معاہدہ نہیں لیا، بلکہ ویسے ہی) اللہ تعالیٰ کے ذمہ ایسی بات لگا رہے ہو جس کی کوئی علمی سند اپنے پاس نہیں رکھتے۔

لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً: یہود کے دعوی کا حاصل یہ تھا کہ چونکہ دین موسوی ان کے زعم میں منسوخ نہیں ہے، اس لیے وہ مؤمن ہیں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضور مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے انکار سے وہ کافر نہیں ہوئے، اور مؤمن اگر دوزخ میں کسی وجہ سے ڈالے جائیں

گے تو صرف چندروز کے لیے ڈالے جائیں گے، چونکہ اس دعوی کی بنیاد ہی غلط ہے، کیونکہ شریعت موسوی منسوخ ہو چکی ہے، اس لیے عیسی علیہ السلام اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے انکار سے وہ کافر ہو گئے، اور کفار کے لیے دوزخ سے نجات پا جانا کسی بھی آسمانی کتاب میں نہیں، جس کو حق تعالی نے ''عہد'' سے تعبیر فرمایا، پس ثابت ہوا کہ ان کا دعوی بے دلیل بلکہ خلاف دلیل ہے۔

فائدہ: ۱؎ بعض نے کہا سات دن اور بعض نے چالیس دن (جتنے روز بچھڑے کی پوجا کی تھی) اور بعض نے چالیس سال (جتنی مدت تیہ میں سرگرداں رہے تھے) اور بعض نے کہا ہر ایک جتنی مدت دنیا میں زندہ رہا۔

بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓـئَتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۸۱﴾

کیوں نہیں ۱؎ جس نے کمایا گناہ اور گھیر لیا اس کو اس کے گناہ نے ۲؎ سو وہی ہیں دوزخ کے رہنے والے، وہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۸۲﴾ ع

اور جو ایمان لائے اور عمل کئے نیک وہی ہیں جنت کے رہنے والے، وہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے

خلاصہ تفسیر: اب رد کے ساتھ ایک ضابطہ کا بیان ہے جس کی رو سے یہودیوں کا ہمیشہ کے لیے جہنمی ہونا ثابت ہو جائے گا۔

(بجز چندروز کے تم کو آتش دوزخ) کیوں نہیں! (لگے گی، بلکہ ہمیشہ کے لیے اس میں رہنا ضروری ہے، کیونکہ ہمارا ضابطہ یہ ہے کہ) جو شخص قصداً بری باتیں کرتا رہے، اور اس کو اس کی خطا (وقصور اس طرح) احاطہ کرلے (کہ کہیں نیکی کا اثر تک نہ رہے) سو ایسے لوگ اہل دوزخ ہوتے ہیں، اور وہ اس میں ہمیشہ (ہمیشہ) رہیں گے، اور جو لوگ (اللہ ورسول پر) ایمان لائیں اور نیک کام کریں، ایسے لوگ اہل بہشت ہوتے ہیں (اور) وہ اس میں ہمیشہ (ہمیشہ) رہیں گے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ جب اس ضابطہ کی رو سے کافر کا ابدی جہنمی ہونا ثابت ہو گیا تو چونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام خاتم الانبیاء نہیں ہیں، آپ کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی نبی ہیں تو یہود ان دونوں کا انکار کر کے کافروں میں شامل ہو گئے، اس لئے اس ضابطہ کی رو سے وہ بھی ابدی جہنمی ہوں گے، تو ان کا مذکورہ دعویٰ دلیل قطعی سے باطل ٹھہرا۔

وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓـئَتُهٗ: خطاؤں کے احاطہ کے جو معنی اوپر ذکر کئے گئے ہیں اس قسم کا احاطہ اس معنی کے ساتھ کفار کے ساتھ مخصوص ہے، کیونکہ کفر کی وجہ سے کوئی بھی عمل صالح مقبول نہیں ہوتا، بلکہ کفر سے قبل اگر کچھ نیک اعمال کئے بھی ہوں تو وہ بھی ضائع اور ضبط ہو جاتے ہیں، اسی وجہ سے کفار میں سرتاپا بدی ہی بدی ہو گی جس کی جزا ابدی جہنم ہو گی بخلاف اہل ایمان کے کہ اول تو ان کا ایمان خود بہت بڑا عمل صالح ہے دوسرے اعمال فرعیہ بھی ان کے نامہ اعمال میں درج ہوتے ہیں اس لئے وہ نیکی کے اثر سے خالی نہیں پس احاطہ مذکور ان کی حالت پر صادق نہیں آتا۔

جاننا چاہیے کہ یہاں آیت میں کافر اور مؤمن صالح کے متعلق ضابطہ بیان ہوا ہے، مؤمن بدعمل کا ضابطہ دوسری آیات واحادیث میں ہے کہ بدعمل مؤمن ایمان ہونے کی وجہ سے گناہوں کی سزا بھگت کر کبھی نہ کبھی جنت میں داخل ہو جائے گا۔

فائدہ: ۱؎ یعنی یہ بات غلط ہے کہ یہودی ہمیشہ کے لیے دوزخ میں نہ رہیں گے، کیونکہ خلود فی النار اور خلود فی الجنۃ کا جو قاعدہ کلیہ آگے بیان فرمایا ہے، اسی کے مطابق سب سے معاملہ ہوگا، یہودی اس سے نکل نہیں سکتے۔

فائدہ: ۲؎ ''گناہ کسی کا احاطہ کرلیں''، اس کا یہ مطلب ہے کہ گناہ اس پر ایسا غلبہ کرلیں کہ کوئی جانب ایسی نہ ہو کہ گناہ کا غلبہ نہ ہو، حتیٰ کہ دل میں ایمان وتصدیق باقی ہو گی تو بھی احاطہ مذکور محقق نہ ہوگا، تو اب کافر ہی پر یہ صورت صادق آسکتی ہے۔

وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَاءِيلَ لَا تَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَذِي الْقُرْبَىٰ

اور جب ہم نے لیا قرار بنی اسرائیل سے کہ عبادت نہ کرنا مگر اللہ کی، اور ماں باپ سے سلوک نیک کرنا اور کنبہ والوں سے

وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ

اور یتیموں اور محتاجوں سے اور کہو سب لوگوں سے نیک بات اور قائم رکھو نماز اور دیتے رہو زکوٰۃ، پھر تم پھر گئے

إِلَّا قَلِيلًا مِّنكُمْ وَأَنتُم مُّعْرِضُونَ ﴿٨٣﴾

مگر تھوڑے سے تم میں اور تم ہو ہی پھرنے والے

خلاصہ تفسیر: (بائیسواں معاملہ:) اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب لیا ہم نے (تورات میں) قول و قرار بنی اسرائیل سے کہ عبادت مت کرنا (کسی کی) بجز اللہ کے، اور ماں باپ کی اچھی طرح خدمت گذاری کرنا، اور اہل قرابت کی بھی، اور بے باپ کے بچوں کی بھی، اور غریب محتاجوں کی بھی، اور عام لوگوں سے (جب کوئی) بات کہنا ہو تو اچھی طرح (خوش خلقی سے) کہنا، اور پابندی رکھنا نماز کی، اور ادا کرتے رہنا زکوٰۃ، پھر تم (قول و قرار کر کے) اس سے پھر گئے بجز معدودے چند کے، اور تمہاری تو معمولی عادت ہے اقرار کر کے ہٹ جانا (یہ معدودے چند وہ لوگ ہیں جو تورات کے پورے پابند رہے، تورات کے منسوخ ہونے سے قبل شریعت موسویہ کے پابند رہے، جب تورات منسوخ ہوگئی تو شریعت محمدیہ کے متبع ہوگئے)۔

ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ إِلَّا قَلِيلًا مِّنكُمْ: یہ معدودے چند وہ لوگ ہیں جو تورات کے پورے پابند رہے، تورات کے منسوخ ہونے سے پہلے شریعت موسویہ کے پابند رہے، جب تورات منسوخ ہوگئی تو شریعت محمدیہ کے متبع ہوگئے۔

* * *

فائدہ: یعنی احکام الٰہی سے اعراض کرنا تو تمہاری عادت بلکہ طبیعت ہوگئی ہے۔

وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُونَ دِمَاءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُونَ أَنفُسَكُم مِّن دِيَارِكُمْ ثُمَّ

اور جب لیا ہم نے وعدہ تمہارا کہ نہ کرو گے خون آپس میں اور نہ نکال دو گے اپنوں کو اپنے وطن سے پھر

أَقْرَرْتُمْ وَأَنتُمْ تَشْهَدُونَ ﴿٨٤﴾

تم نے اقرار کر لیا اور تم مانتے ہو

خلاصہ تفسیر: پیچھے جو عہد میثاق گذرا، اس آیت میں اس کا تتمہ بیان کیا گیا ہے، چنانچہ ارشاد ہے:

اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب ہم نے تم سے یہ قول و قرار (بھی) لیا کہ (خانہ جنگی کر کے) باہم خون ریزی مت کرنا، اور ایک دوسرے کو ترک وطن مت کرانا، پھر (ہمارے اس اقرار لینے پر) تم نے اقرار بھی کر لیا اور اقرار بھی (ضمناً نہیں، بلکہ) ایسا جیسے تم (اس پر) شہادت (بھی) دیتے ہو۔

وَلَا تُخْرِجُونَ أَنفُسَكُم مِّن دِيَارِكُمْ: ''ترک وطن'' کرانے کی ممانعت کا مطلب یہ ہے کہ کسی کو نقصان پہنچا کر اتنا تنگ مت کرنا کہ بے چارہ ترک وطن پر مجبور ہو جائے۔

ثُمَّ أَقْرَرْتُمْ وَأَنتُمْ تَشْهَدُونَ: بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کسی کی تقریر سے کسی بات کا اقرار مترشح ہوتا ہے اگرچہ صاف اقرار نہیں ہوتا، مگر عرفاً اور عقلاً اس کو اقرار ہی سمجھا جاتا ہے، لیکن یہاں تو ثُمَّ أَقْرَرْتُمْ سے اس شبہ کو بھی ختم کر دیا اور بتا دیا کہ یہ اقرار اتنا صریح اور واضح تھا

جیسے شہادت صاف اور واضح ہوا کرتی ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی نہ اپنی قوم کو قتل کرو اور نہ ان کو جلاوطن کرو۔

ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ ؗ تَظٰهَرُوْنَ

پھر تم وہ لوگ ہو کہ ویسے ہی خون کرتے ہو آپس میں اور نکال دیتے ہو اپنے ایک فرقہ کو ان کے وطن سے، چڑھائی کرتے ہو

عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ؕ وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ

ان پر گناہ اور ظلم سے [1] اور اگر وہی آئیں تمہارے پاس کسی کے قیدی ہو کر تو ان کا بدلہ دے کر چھڑاتے ہو حالانکہ حرام ہے تم پر

اِخْرَاجُهُمْ ؕ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ

ان کا نکال دینا بھی، تو کیا مانتے ہو بعض کتاب کو اور نہیں مانتے بعض کو [2] سو کوئی سزا نہیں اس کی جو تم میں یہ کام کرتا ہے

اِلَّا خِزْىٌ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ؕ

مگر رسوائی دنیا کی زندگی میں، اور قیامت کے دن پہنچائے جائیں سخت سے سخت عذاب میں

وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۸۵﴾

اور اللہ بے خبر نہیں تمہارے کاموں سے [3]

خلاصہ تفسیر: عہد و میثاق میں ان کو جو حکم دیا گیا اس کے متعلق ان کی عہد شکنی کا ذکر فرماتے ہیں:

پھر (اس صریح اقرار کے بعد) تم (جیسے ہو) یہ (آنکھوں کے سامنے) موجود (ہی) ہو کہ باہم قتل وقتال بھی کرتے ہو، اور ایک دوسرے کو ترک وطن بھی کراتے ہو (اس طور پر کہ) ان اپنوں کے مقابلہ میں (ان کی مخالف قوموں کی) امداد کرتے ہو، گناہ اور ظلم کے ساتھ (سو ان دونوں حکموں کو تو یوں غارت کیا) اور (ایک تیسرا حکم جو آسان سمجھا، اس پر عمل کرنے کو خوب تیار رہتے ہو کہ) اگر ان لوگوں میں سے کوئی گرفتار ہو کر تم تک پہنچ جاتا ہے تو ایسوں کو کچھ خرچ کرا کر رہا کرا دیتے ہو، حالانکہ یہ بات (بھی معلوم) ہے کہ تم کو ان کا ترک وطن کرا دینا (اور قتل تو اور بھی بدرجہ اولیٰ) نیز ممنوع ہے (آگے اس عہد شکنی پر ملامت وشکایت کے ساتھ ساتھ سزا کو بھی صراحت سے بیان فرماتے ہیں:) کیا تو (بس یوں کہو کہ) کتاب (تورات) کے بعض (احکام) پر تم ایمان رکھتے ہو اور بعض (احکام) پر ایمان نہیں رکھتے، تو اور کیا سزا ہو (نا چاہئے) ایسے شخص کی جو تم لوگوں میں سے ایسی حرکت کرے بجز رسوائی کے دنیوی زندگانی میں، اور روز قیامت کو بڑے سخت عذاب میں ڈال دیئے جائیں گے، اور اللہ تعالیٰ (کچھ) بے خبر نہیں ہیں تمہارے (برے) اعمال سے۔

تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا: اس باب میں ان پر تین حکم لازم تھے: (۱) اول قتل نہ کرنا (۲) دوم اخراج یعنی ترک وطن نہ کرانا (۳) سوم اپنی قوم میں سے کسی کو قید و بند میں گرفتار دیکھیں تو روپیہ خرچ کر کے چھڑا دینا تو ان لوگوں نے اول کے دو حکم کو تو چھوڑ دیا اور تیسرے حکم کو اہتمام کرنے لگے، اور صورت اس کی یہ ہوئی تھی کہ اہل مدینہ میں دو قومیں تھیں: (۱) اوس (۲) خزرج، اور ان میں باہم عداوت رہتی تھی اور کبھی کبھی قتال کی نوبت بھی آ جاتی تھی اور مدینہ کے گرد ونواح میں یہودیوں کی دو قومیں بنی قریظہ اور بنی نضیر آباد تھیں، بنی قریظہ کی اوس سے دوستی تھی، اور بنی نضیر کا خزرج کے ساتھ

یارانہ تھا، جب اوس وخزرج میں باہم لڑائی ہوتی تو دوستی کی بنا پر بنو قریظہ تو اوس کے مددگار ہوتے اور بنو نضیر خزرج کی طرفداری کرتے تو جہاں اوس و خزرج مارے جاتے اور خانماں آوارہ ہوتے ان کے دوستوں اور حامیوں کو بھی یہ مصیبت پیش آتی اور ظاہر ہے کہ بنو قریظہ کے قتل واخراج میں بنو نضیر کا بھی ہاتھ ہوتا اور ایسا ہی بالعکس، البتہ یہود کی دونوں جماعتوں میں سے اگر کوئی جنگ میں قید ہوجاتا تو ہر جماعت اپنے دوستوں کو مال پر راضی کرکے اس قیدی کو رہائی دلا دیتے اور کوئی پوچھتا کہ ایسا کیوں کرتے ہو تو اس کو جواب دیتے کہ قیدی کو رہا کرا دینا ہم پر واجب ہے، اور اگر کوئی قتل وقتال میں معین و مددگار بننے پر اعتراض کرتا تو کہتے کہ کیا کریں دوستوں کا ساتھ نہ دینے سے عار آتی ہے، اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اس کی شکایت فرمائی ہے اور ان کی حیلہ سازیوں کا پردہ چاک فرمایا ہے، اس آیت میں جن مخالف قوموں کی امداد کا ذکر ہے اس سے اوس وخزرج مراد ہیں کہ اوس بنی قریظہ کی موافقت میں بنی نضیر کے مخالف تھے اور خزرج بنی نضیر کی موافقت میں بنی قریظہ کے مخالف تھے، اسی لیے فرمایا کہ تم کو تین حکم دیے گئے تھے قتل نہ کرنا، اخراج وطن نہ کرنا، تیسرا قیدی کو رہا کرا دینا، تم نے پہلے دو حکم کو تو ضائع کر دیا، اور صرف تیسرے کا اہتمام کیا۔

بِالۡاِثۡمِ وَالۡعُدۡوَانِ: ''اثم وعدوان'' گناہ اور ظلم دو لفظ لانے سے اس طرف اشارہ ہوسکتا ہے کہ اس میں دو حق ضائع ہوتے ہیں: ① حکم الٰہی کی تعمیل نہ کرکے حق اللہ ضائع کیا ② دوسرے کو بلاوجہ آزار پہنچا کر حق العباد بھی ضائع کر دیا۔

اَفَتُؤۡمِنُوۡنَ بِبَعۡضِ الۡكِتٰبِ وَتَكۡفُرُوۡنَ بِبَعۡضٍ: ہرچند کہ وہ یہودی جن کا قصہ میں ذکر ہے نبی کریم ﷺ کی نبوت کا انکار کرنے کی بناء پر کافر ہی تھے، مگر یہاں ان کا یہ کفر مذکور نہیں، بلکہ بعض احکام پر عمل نہ کرنے کو ''کفر'' سے تعبیر فرمایا ہے، حالانکہ جب تک حرام کو حرام سمجھے آدمی کافر نہیں ہوتا، سو اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ جو گناہ بہت شدید ہوتا ہے اس پر شرعی محاورات میں اس کی شدت کے پیش نظر ''کفر'' کا اطلاق کر دیا جاتا ہے، ہم اپنے محاورات عرفیہ میں اس کی مثالیں دن رات دیکھتے ہیں، جیسے کسی ذلیل حرکت کرنے والے کو کہہ دیتے ہیں ''تو بالکل چمار ہے''، حالانکہ مخاطب چمار یقیناً نہیں ہے، اس سے مقصود شدت نفرت اور اس کام کی قباحت ظاہر کرنا ہوتا ہے اور یہی معنی ہوتے ہیں ایسی حدیثوں کے: ''من ترك الصلوة متعمدا فقد كفر''۔

اِلَّا خِزۡيٌ فِي الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا: اس مقام پر جن دو سزاؤں کا ذکر ہے ان میں سے پہلی سزا یعنی دنیا میں ذلت ورسوائی تو اس کا وقوع اس طرح ہوا کہ حضور ﷺ ہی کے زمانے میں مسلمانوں کے ساتھ معاہدے کی خلاف ورزی کرنے کے سبب بنی قریظہ قتل وقید کئے گئے، اور بنی نضیر ملک شام کی طرف بہزار ذلت وخواری نکال دیئے گئے، بنی قریظہ کا قصہ سورہ احزاب میں اور بنی نضیر کا قصہ سورہ حشر میں آئے گا۔

فائدہ: ۱ عَلَيۡهِمۡ بِالۡاِثۡمِ وَالۡعُدۡوَانِ: مدینہ میں دو فریق یہودیوں کے تھے ① ایک ''بنی قریظہ'' ② دوسرے ''بنی نضیر''، یہ دونوں آپس میں لڑا کرتے تھے، مشرکوں کے بھی مدینہ میں دو فرقے تھے ① ایک ''اوس'' ② دوسرے ''خزرج'' یہ دونوں بھی آپس میں دشمن تھے، بنی قریظہ تو اوس کے موافق ہوئے اور بنی نضیر نے خزرج سے دوستی کی تھی، لڑائی میں ہر کوئی اپنے موافقوں اور دوستوں کی حمایت کرتا جب ایک کو دوسرے پر غلبہ ہوتا تو کمزوروں کو جلاوطن کرتے ان کے گھر ڈھاتے اور اگر کوئی قید ہو کر پکڑا آتا تو سب رل مل کر مال جمع کرکے اس کا بدلہ دے کر قید سے اس کو چھڑاتے، جیسا کہ آئندہ آیت میں آتا ہے۔

فائدہ: ۲ وَتَكۡفُرُوۡنَ بِبَعۡضٍ: یعنی اپنی قوم غیر کے ہاتھ میں پھنستی تو چھڑانے کو مستعد اور خود ان کے ستانے اور گلا کاٹنے تک کو موجود، اگر خدا کے حکم پر چلتے ہو تو دونوں جگہ چلو۔

فائدہ: ۳ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ: ''ایسا کرے'' یعنی بعض احکام کو مانے اور بعض کا انکار کرے، اس لیے کہ ایمان کا تجزیہ تو ممکن نہیں تو اب بعض احکام کا انکار کرنے والا بھی کافر مطلق ہوگا، صرف بعض احکام پر ایمان لانے سے کچھ بھی ایمان نصیب نہ ہوگا، اس آیت سے صاف معلوم ہوگیا کہ اگر کوئی شخص بعض احکام شرعیہ کی تو متابعت کرے اور جو حکم کہ اس کی طبعیت یا عادت یا غرض کے خلاف ہو، اس کے قبول میں قصور کرے تو بعض احکام کی متابعت اس کو کچھ نفع نہیں دے سکتی۔

أُولَٰٓئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ۡ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۸۶﴾ ع

یہ وہی ہیں جنہوں نے مول لی دنیا کی زندگی آخرت کے بدلے، سو نہ ہلکا ہوگا ان پر عذاب اور نہ ان کو مدد پہنچے گی

خلاصہ تفسیر: (اور اس مذکورہ سزا کی وجہ یہ ہے کہ) یہ وہ لوگ ہیں کہ انہوں نے (احکام کی مخالفت کر کے) دنیاوی زندگانی (کے مزوں) کو لے لیا ہے بعوض (نجات) آخرت کے (جس کا ذریعہ اطاعت ہے) سو نہ تو (سزا دینے والے کی طرف سے) ان کی سزا میں (کچھ) تخفیف دی جائے گی اور نہ کوئی (وکیل مختار یا دوست رشتہ دار) ان کی طرف داری (پیروی) کرنے پائے گا۔

❋ ❋ ❋

فائدہ: یعنی مفاد دنیاوی کو آخرت کے مقابلہ میں قبول کیا اس لیے کہ جن لوگوں سے عہد کیا تھا اس کو دنیا کے خیال سے نبھایا اور اللہ کے جو احکام تھے ان کی پرواہ نہ کی تو پھر اللہ کے ہاں ایسوں کی کون سفارش یا حمایت کر سکتا ہے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَقَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ ۡ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ

اور بیشک دی ہم نے موسیٰ کو کتاب اور پے در پے بھیجے اس کے پیچھے رسول، اور دیئے ہم نے عیسیٰ مریم کے بیٹے کو

الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ

معجزے صریح اور قوت دی اس کو روح پاک سے [1] پھر بھلا کیا جب تمہارے پاس لایا کوئی رسول وہ حکم جو نہ بھایا تمہارے جی کو

اسْتَكْبَرْتُمْ ۚ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ ۡ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ ﴿۸۷﴾

تو تم تکبر کرنے لگے، پھر ایک جماعت کو جھٹلایا [2] اور ایک جماعت کو تم نے قتل کر دیا [3]

خلاصہ تفسیر: (تئیسواں معاملہ:) اور ہم نے (اے بنی اسرائیل! تمہاری ہدایت کے لئے ہمیشہ سے بڑے بڑے سامان کیے، سب سے پہلے) موسیٰ علیہ السلام کو کتاب (توراۃ) دی اور (پھر) ان کے بعد (درمیان میں) یکے بعد دیگرے (برابر مختلف) پیغمبروں کو بھیجتے رہے اور (پھر اس خاندان کے سلسلہ کے اخیر میں) ہم نے (حضرت) عیسیٰ بن مریم کو (نبوت کے) واضح دلائل (انجیل اور معجزات) عطا فرمائے، اور ہم نے ان کو روح القدس (یعنی جبرئیل علیہ السلام) سے (جو) تائید دی (سو الگ، جو بجائے خود ایک دلیل واضح تھی تو) کیا (تعجب کی بات نہیں کہ اس پر بھی تم سرکشی کرتے رہے اور) جب کبھی (بھی) کوئی پیغمبر تمہارے پاس ایسے احکام لائے جن کو تمہارا دل نہ چاہتا تھا (جب ہی) تم نے (ان پیغمبروں کی اطاعت سے) تکبر کرنا شروع کر دیا، سو (ان پیغمبروں میں سے) بعضوں کو تو (نعوذ باللہ) تم نے جھوٹا بتلایا اور بعضوں کو (بے دھڑک) قتل ہی کر ڈالتے تھے۔

وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ: قرآن وحدیث میں جابجا حضرت جبرئیل علیہ السلام کو "روح القدس" کہا گیا ہے، جیسے قرآن کی اس مذکورہ بالا آیت میں، نیز: قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ میں، اور حدیث میں حضرت حسان بن ثابتؓ کا یہ شعر:

وجبریل رسول اللہ فینا   وروح القدس لیس لہ کفاء

اور جبریل علیہ السلام کے واسطے سے عیسیٰ علیہ السلام کی تائید کئی طریقوں سے ہوئی: اول تو پیدائش کے وقت مس شیطان سے حفاظت کی گئی، پھر ان کے دم کرنے سے حمل عیسوی قرار پایا، پھر یہودی چونکہ کثرت سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مخالف تھے اس لئے جبرئیل علیہ السلام حفاظت کے

لئے ساتھ رہتے تھے، حتی کے آخر میں ان کے ذریعہ سے آسمان پر اٹھوالئے گئے، یہود نے بہت سے پیغمبروں کی تکذیب کی حتی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بھی تکذیب کی اور حضرت زکریا وحضرت یحییٰ علیہم السلام کو قتل بھی کیا۔

لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ: اس میں اس بات پر دلیل ہے کہ تکبر اکثر گناہوں کی جڑ ہے، چنانچہ یہاں اللہ تعالیٰ نے تکذیب اور قتل کا سبب تکبر پر ہی مرتب فرمایا ہے۔

فائدہ ۱: مردوں کا زندہ کرنا، اکمہ وابرص وغیرہ مریضوں کا صحت یاب ہونا، غیب کی خبریں بتانا یہ حضرت عیسیٰ کے کھلے معجزے ہیں، ''روح القدس'' کہتے ہیں: ① حضرت جبرائیل کو جو ہر وقت ان کے ساتھ رہتے تھے ② یا ''اسم اعظم'' کہ جس کی برکت سے مردوں کو زندہ کرتے تھے۔

فائدہ ۲: جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد ﷺ کو جھوٹا کہا۔

فائدہ ۳: جیسا کہ حضرت زکریا اور یحییٰ علیہما السلام کو قتل کیا۔

وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۸۸﴾

اور کہتے ہیں ہمارے دلوں پر غلاف ہے، بلکہ لعنت کی ہے اللہ نے ان کے کفر کے سبب سو بہت کم ایمان لاتے ہیں

خلاصہ تفسیر: (چوبیسواں معاملہ:) اور وہ (یہودی طنزیہ طور پر) کہتے ہیں کہ ہمارے قلوب (ایسے) محفوظ ہیں (کہ ان میں مخالف مذہب کا جو کہ اسلام ہے اثر ہی نہیں ہوتا تو ہم اپنے مذہب پر خوب پکے ہیں، حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ محفوظی اور پختگی نہیں ہے) بلکہ ان کے کفر کے سبب ان پر خدا کی مار ہے (کہ اسلام جو مذہب حق ہے اس سے نفرت اور منسوخ مذہب پر مصر ہیں) سو بہت ہی تھوڑا سا ایمان رکھتے ہیں (اور تھوڑا ایمان مقبول نہیں، پس وہ کافر ہی ٹھہرے)۔

فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ: اس ''تھوڑے ایمان'' کو لغت کے اعتبار سے ''ایمان'' کہہ دیا، جس کے معنی مطلق یقین کے ہیں، لغت میں ذرا سی تصدیق کو بھی ایمان کہہ سکتے ہیں، ورنہ شرعا اس کو ایمان نہیں کہتے، شرعی ایمان یہ ہے کہ تمام احکام شرعیہ کا یقین کیا جائے، ایک حکم کا بھی انکار ہو تو وہ ایمان نہیں کفر ہے، تو یہ لوگ خدا کے قائل تھے اور قیامت کے قائل تھے، اسی کو ''تھوڑا ایمان'' کہا گیا ہے، مگر نبوت محمدیہ اور قرآن کے کتاب الٰہی ہونے کے منکر تھے اس لیے پورا ایمان نہیں تھا، بلکہ شرعاً وہ لوگ کافر تھے۔

فائدہ: یہود اپنی تعریف میں کہتے تھے کہ ''ہمارے دل غلاف کے اندر محفوظ ہیں، بجز اپنے دین کے کسی کی بات ہم کو اثر نہیں کرتی، ہم کسی کی چاپلوسی، سحر بیانی یا کرشمے اور دھوکے کی وجہ سے ہرگز اس کی متابعت نہیں کر سکتے'' حق تعالیٰ نے فرمایا: ''وہ بالکل جھوٹے ہیں، بلکہ ان کے کفر کے باعث اللہ نے ان کو ملعون اور اپنی رحمت سے دور کر دیا ہے، اس لیے کسی طرح دین حق کو نہیں مانتے اور بہت کم دولت ایمان سے مشرف ہوتے ہیں''۔

وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ

اور جب پہنچی ان کے پاس کتاب اللہ کی طرف سے جو سچا بتاتی ہے اس کتاب کو جو ان کے پاس ہے، اور پہلے سے فتح مانگتے تھے

عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ۚ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۸۹﴾

کافروں پر، پھر جب پہنچا ان کو جس کو پہچان رکھا تھا تو اس سے منکر ہوگئے، سو لعنت ہے اللہ کی منکروں پر

خلاصہ تفسیر: (پچیسواں معاملہ:) اور جب ان کو (ایک) ایسی کتاب پہنچی (یعنی قرآن) جو من جانب اللہ ہے (اور) اس

(کتاب) کی (بھی) تصدیق کرنے والی ہے (جو پہلے سے) ان کے پاس ہے (یعنی توراۃ کی) حالانکہ اس کے قبل (خود) بیان کرتے تھے کفار سے (یعنی مشرکین عرب سے کہ ایک نبی آنے والے ہیں اور ایک کتاب لانے والے ہیں، مگر) پھر جب وہ چیز آ پہنچی جس کو وہ (خوب جانتے) پہچانتے ہیں تو اس کا (صاف) انکار کر بیٹھے سو (بس) خدا کی مار ہو ایسے منکروں پر (کہ جان بوجھ کر محض تعصب کے سبب انکار کریں)۔

مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ: قرآن کو جو مصدق توراۃ فرمایا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ توراۃ میں بعثت محمد یہ اور نزول قرآن کی جو پیشین گوئیاں تھیں قرآن کے نازل ہونے سے ان کا سچا ظاہر ہو گیا، سو توراۃ کا ماننے والا تو قرآن اور صاحب قرآن (ﷺ) کی تکذیب کر ہی نہیں سکتا ورنہ توراۃ کی تکذیب لازم آئے گی۔

اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ جب وہ قرآن کو اور رسول کو برحق جانتے تھے تو پھر ان کو مومن کہنا چاہئے کافر کیسے کہا گیا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ایمان صرف جاننے کا نام نہیں، بلکہ ماننے کا نام ہے، ورنہ یوں تو شیطان سب سے زیادہ حق کو حق جانتا ہے، مگر جاننے کے باوجود انکار کرنے کی وجہ سے اور بھی کفر میں شدت بڑھ گئی، اسی لئے اگلی آیت میں ان کے کفر کی وجہ ان کا حسد و عناد بتلایا گیا ہے، دوسرے ان کا یہ علم اضطراری تھا جس سے ان کا دل کراہت بھی کرتا تھا، اس کا نام ایمان نہیں، ایمان یہ ہے کہ اپنے اختیار سے بخوشی تصدیق کر کے تسلیم کیا جائے۔

❋ ❋ ❋

فائدہ: ان کے پاس جو کتاب آئی وہ قرآن ہے اور جو کتاب ان کے پاس پہلے سے تھی وہ تورات ہوئی، قرآن کے اترنے سے پہلے جب یہودی کافروں سے مغلوب ہوتے تو خدا سے دعا مانگتے کہ ہم کو نبی آخر الزماں اور جو کتاب ان پر نازل ہو گی ان کے طفیل سے کافروں پر غلبہ عطا فرما، جب حضور ﷺ پیدا ہوئے اور سب نشانیاں بھی دیکھ چکے تو منکر ہو گئے اور ملعون ہوئے۔

بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ

بری چیز ہے وہ جس کے بدلے بیچا انہوں نے اپنے آپ کو کہ منکر ہوئے اس چیز کے جو اتاری اللہ نے اس ضد پر کہ اتارے اللہ اپنے فضل سے

عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ۭ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۹۰﴾

جس پر چاہے اپنے بندوں میں سے[1] سو کما لائے غصہ پر غصہ[2] اور کافروں کے واسطے عذاب ہے ذلت کا[3]

خلاصہ تفسیر: اب اس کا بھی بیان ہے کہ ان یہودیوں کا جان بوجھ کر پھر امر واقعی کا انکار کرنے کی کیا وجہ ہے؟ حاصل جواب یہ ہے کہ اس کا سبب حسد ہے، چنانچہ ارشاد ہے:

وہ حالت (بہت ہی) بری ہے جس کو اختیار کر کے (وہ بزعم خود) اپنی جانوں کو (آخرت کے عذاب سے) چھڑانا چاہتے ہیں (اور وہ حالت) یہ (ہے) کہ کفر (انکار) کرتے ہیں ایسی چیز کا جو حق تعالیٰ نے (ایک سچے پیغمبر پر) نازل فرمائی (یعنی قرآن، اور وہ انکار بھی) محض (اس) ضد پر کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے جس بندہ پر اس کو منظور ہو (یعنی محمد ﷺ پر کیوں) نازل فرمائے، سو (اس حسد بالائے کفر سے) وہ لوگ غضب بالائے غضب کے مستحق ہو گئے، اور (آخرت میں) ان کفر کرنے والوں کو ایسی سزا ہو گی جس میں (تکلیف کے علاوہ) ذلت (بھی) ہے۔

فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ: ایک غضب کفر پر، دوسرا حسد پر، یوں "غضب بالائے غضب" فرمایا۔

وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ: عذاب کے ساتھ "مہین" یعنی ذلت کی قید سے بتانا یہ مقصود ہے کہ یہ عذاب کفار کے ساتھ خاص ہے، کیونکہ گناہگار مومن کو جو عذاب ہو گا وہ اس کو گناہوں سے پاک صاف کرنے کے لئے ہو گا، ذلت کے لئے نہیں ہو گا۔

يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ: اس میں اس بات پر دلیل ہے کہ وہبی احوال محض اللہ تعالیٰ کے فضل و مشیت سے

میسر ہوتے ہیں، ان میں مجاہدہ وریاضت کو کچھ دخل نہیں ہوتا، یعنی ایسے انعامات اور احسانات جو اللہ تعالیٰ بغیر کسی کسب کے کسی بندہ کو عطافرمادیتے ہیں اس میں مجاہدہ کو کوئی دخل نہیں ہوتا، اللہ تعالیٰ محض اپنے فضل وکرم سے جس کو چاہیں عنایت فرمائیں جس سے چاہیں روک لیں، وہ مالک ہیں۔

* * *

فائدہ: ۱ مِنۡ فَضۡلِهٖ عَلٰى مَنۡ يَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِهٖ: یعنی جس چیز کے بدلے انہوں نے اپنے آپ کو بیچا وہ کفر اور انکار ہے قرآن کا اور انکار بھی محض ضد اور حسد کے سبب۔

فائدہ: ۲ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ: ① ایک غضب تو یہ کہ قرآن بلکہ اس کے ساتھ اپنی کتاب کے بھی منکر ہو کر کافر ہوئے۔

② دوسرے محض حسد اور ضد سے پیغمبر وقت سے انحراف اور خلاف کیا۔

فائدہ: ۳ وَلِلۡكٰفِرِيۡنَ عَذَابٌ مُّهِيۡنٌ: اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر عذاب ذلت کے لیے نہیں ہوتا، بلکہ مسلمانوں کو جوان کے معاصی پر عذاب ہوگا، گناہوں سے پاک کرنے کے لیے ہوگا، نہ بغرض تذلیل، البتہ کافروں کو بغرض تذلیل عذاب دیا جائے گا۔

وَاِذَا قِيۡلَ لَهُمۡ اٰمِنُوۡا بِمَآ اَنۡزَلَ اللّٰهُ قَالُوۡا نُؤۡمِنُ بِمَآ اُنۡزِلَ عَلَيۡنَا وَيَكۡفُرُوۡنَ بِمَا وَرَآءَهٗ

اور جب کہا جاتا ہے ان سے مانو اس کو جو اللہ نے بھیجا ہے تو کہتے ہیں ہم مانتے ہیں جو اترا ہے ہم پر اور نہیں مانتے اس کو جو سوا اسکے ہے

وَهُوَ الۡحَـقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمۡ ؕ قُلۡ فَلِمَ تَقۡتُلُوۡنَ اَنۡۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنۡ قَبۡلُ

حالانکہ وہ کتاب سچی ہے تصدیق کرتی ہے اس کتاب کی جو انکے پاس ہے ۱ کہہ دو پھر کیوں قتل کرتے رہے ہو اللہ کے پیغمبروں کو پہلے سے

اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ ﴿۹۱﴾

اگر تم ایمان رکھتے تھے ۲

خلاصہ تفسیر: اب یہود کا ایک قول نقل فرماتے ہیں جس سے ان کا کفر بھی ثابت ہوتا ہے اور حسد بھی مترشح ہوتا ہے:

اور جب ان (یہودیوں) سے کہا جاتا ہے کہ تم ایمان لاؤ ان تمام کتابوں پر جو اللہ تعالیٰ نے (متعدد پیغمبروں پر) نازل فرمائی ہیں (اور ان تمام کتابوں میں قرآن بھی ہے) تو (جواب میں) کہتے ہیں کہ ہم (تو صرف) اس (ہی) کتاب پر ایمان لائیں گے جو ہم (لوگوں) پر (موسیٰ علیہ السلام کے واسطہ سے) نازل کی گئی ہے (یعنی توراۃ) اور (باقی) جتنی (کتابیں) اس کے علاوہ ہیں (جیسے انجیل اور قرآن) ان (سب) کا وہ انکار کرتے ہیں، حالانکہ وہ (توراۃ کے علاوہ کتابیں) بھی (فی نفسہ) حق (اور واقعی) ہیں، اور (فی نفسہ حق ہونے کے علاوہ) تصدیق کرنے والی بھی ہیں اس (کتاب) کی جو ان کے پاس ہے (یعنی توراۃ کی) آپ (یہ بھی) کہئے کہ (اچھا تو) پھر کیوں قتل کیا کرتے تھے اللہ کے پیغمبروں کو اس کے پہلے زمانہ میں اگر تم (توراۃ پر) ایمان رکھنے والے تھے۔

قَالُوۡا نُؤۡمِنُ بِمَآ اُنۡزِلَ عَلَيۡنَا: یہود نے جو یہ کہا کہ ''ہم صرف توراۃ پر ایمان لائیں گے دوسری کتب پر ایمان نہ لائیں گے'' تو ان کا یہ قول صریح کفر ہے اور اس کے ساتھ جو یہ کہا کہ ''(توراۃ) جو ہم پر نازل کی گئی ہے'' اس سے حسد مترشح ہوتا ہے، اس کا مفہوم صاف یہ ہے کہ اور کتابیں چونکہ ہم پر نازل نہیں کی گئیں اس لئے ان پر ایمان نہیں لائیں گے، اللہ تعالیٰ نے ان کے اس قول کو تین طرح رد فرمایا ہے:

① اول یہ کہ جب دیگر آسمانی کتابوں کا حق ہونا بھی قطعی دلیل سے ثابت ہے پھر اس کے انکار کی کیا وجہ ہے؟ ہاں اگر اس دلیل میں کوئی کلام تھا تو اس کو پیش کر کے تشفی کر لیتے انکار محض کی آخر کیا وجہ؟ ② دوسرے اور کتابیں مثلاً قرآن مجید جو توراۃ کا مصدق ہے تو اس کے انکار سے تو خود توراۃ کی تکذیب وانکار لازم آتا ہے ③ تیسرے یہ کہ انبیاء علیہم السلام کو قتل کرنا تمام آسمانی کتابوں کی رو سے کفر ہے پھر تمہارے گروہ کے لوگوں نے جو کئی نبیوں کو

قتل کیا جن کی تعلیم بھی توراۃ ہی کے احکام کے ساتھ خاص تھی اور تم ان قاتلین کو اپنا پیشوا اور مقتدا سمجھتے ہو تو براہ راست توراۃ کے ساتھ کفر کرتے ہو اس سے تو تمہارا توراۃ پر ایمان کا دعویٰ بھی غلط ٹھہرتا ہے، غرض ہر پہلو سے تمہارا تورات پر ایمان کا دعوی غلط ٹھہرتا ہے۔

فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ: یہاں اس شبہ کا جواب بھی ہوگیا کہ اگرچہ انبیاء کرام کا قتل تو ان کے بڑوں نے کیا تھا نزول قرآن کے وقت کے یہودیوں نے تو نہیں کیا تو پھر ان سے یہ کیوں کہا گیا؟ جواب یہ ہے کہ موجودہ یہودی انبیاء کے ناحق قتل کو غلط اور برا نہیں سمجھتے تھے، الٹا ان قاتلین کو اپنے مقتدا و پیشوا مانتے تھے اس لیے موجودہ یہودیوں کی طرف نسبت کردی کہ گویا تم بھی ان انبیاء کے قتل پر راضی ہو۔

* * *

فائدہ: لے "جو اللہ نے بھیجا" یعنی انجیل و قرآن اور "جو اترا ہم پر" یعنی تورات مطلب یہ ہوا کہ "بجز تورات اور کتابوں کا صاف انکار کرتے ہیں اور انجیل و قرآن کو نہیں مانتے"، حالانکہ وہ کتابیں بھی سچی اور تورات کی تصدیق کرنے والی ہیں۔

فائدہ: ۲ ان سے کہہ دو کہ اگر تم تورات پر ایمان رکھتے ہو تو پھر تم نے انبیاء کو کیوں قتل کیا؟ کیونکہ تورات میں یہ حکم ہے کہ جو نبی تورات کو سچا کہنے والا آئے، اس کی نصرت کرنا اور اس پر ضرور ایمان لانا اور قتل بھی ان انبیاء کو کیا جو پہلے گزر چکے ہیں (جیسے حضرت زکریا علیہ السلام اور حضرت یحییٰ علیہ السلام) جو احکام تورات پر عمل کرتے تھے اور اسی کی ترویج کے لیے مبعوث ہوئے تھے، ان کے مصدق تورات ہونے میں تو بے وقوف کو بھی تامل نہیں ہوسکتا (یہ بات لفظ "قبل" سے مفہوم ہوئی)۔

وَلَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۹۲﴾

اور آچکا تمہارے پاس موسیٰ صریح معجزے لے کر پھر بنا لیا تم نے بچھڑا اُس کے گئے پیچھے اور تم ظالم ہو

خلاصہ تفسیر: آگے حق تعالی یہود کے اسی قول کو بعض اور دلائل سے رد فرماتے ہیں، چنانچہ ارشاد ہے:

اور (حضرت) موسیٰ علیہ السلام تم لوگوں کے پاس صاف صاف دلیلیں (توحید و رسالت کی) لائے (مگر) اس پر بھی تم لوگوں نے گوسالہ کو (معبود) بنا لیا موسیٰ کے (طور پر جانے کے) بعد اور تم (اس تجویز میں) ستم ڈھا رہے تھے۔

بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ: "بینات" سے وہ دلائل مراد ہیں جو نزول تورات سے پہلے موسی علیہ السلام کی سچائی پر قائم ہو چکے تھے، مثلاً عصاء، ید بیضاء اور دریا کا پھٹنا وغیرہ، اور اگرچہ یہ گوسالہ پرستی وغیرہ کا قصہ پہلے بھی آچکا ہے مگر وہاں ان کے برے معاملات کا بتلانا مقصود تھا، اور یہاں ان کے دعوی ایمان کو جھٹلانا مقصود ہے، فائدہ بدل جانے سے تکرار نہ رہا۔

رد کی تقریر کا حاصل ظاہر ہے کہ تم دعویٰ تو ایمان کا کرتے ہو اور صریح شرک میں مبتلا ہو جس سے موسیٰ علیہ السلام بلکہ خدا تعالیٰ کی صریح تکذیب بھی لازم آتی ہے، گوسالہ کو معبود بنانے کا معاملہ اگرچہ ان یہودیوں کے ساتھ پیش نہیں آیا تھا جو حضور ﷺ کے زمانے میں نزول قرآن کے وقت موجود تھے، مگر چونکہ یہ لوگ اپنے اجداد کے حامی اور طرفدار رہتے تھے اس لئے فی الجملہ یہ بھی رد میں شامل ہیں، اور اسی سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ جن کے اسلاف نے موسیٰ علیہ السلام کی تکذیب کر کے کفر کیا وہ اگر محمد ﷺ کے انکار کے مرتکب ہوں تو چنداں عجیب نہیں۔

* * *

فائدہ: یعنی حضرت موسیٰ کہ جن کی شریعت پر قائم ہو اور ان کی شریعت کی وجہ سے اور شرائع حقہ کا انکار کرتے ہو، خود انہوں نے کھلے کھلے معجزے تم کو دکھائے (جیسے عصا، ید بیضا اور دریا کا پھاڑنا وغیرہ) مگر جب چند دن کے لیے کوہ طور پر گئے تو اتنے ہی میں بچھڑے کو تم نے خدا بنا لیا، حالانکہ موسیٰ علیہ السلام اپنے درجہ نبوت پر قائم زندہ موجود تھے تو اس وقت تمہارا حضرت موسیٰ اور ان کی شریعت پر ایمان کہاں جاتا رہا تھا اور رسول آخر الزماں کے بغض و حسد میں آج شریعت موسوی کو ایسا پکڑ رکھا ہے کہ خدا کا حکم بھی نہیں سنتے، بیشک تم ظالم تمہارے باپ دادا ظالم، یہ حال تو بنی اسرائیل کا حضرت موسیٰ کے ساتھ تھا۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاسْمَعُوْا ؕ

اور جب ہم نے لیا قرار تمہارا اور بلند کیا تمہارے اوپر کوہ طور کو، پکڑو جو ہم نے تم کو دیا زور سے اور سنو

قَالُوْا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا ۗ وَاُشْرِبُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ ؕ قُلْ بِئْسَمَا

بولے سنا ہم نے اور نہ مانا، اور پلائی گئی ان کے دلوں میں محبت اسی بچھڑے کی بسبب ان کے کفر کے لہ کہہ دے کہ بری باتیں

يَاْمُرُكُمْ بِهٖٓ اِيْمَانُكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۹۳﴾

سکھاتا ہے تم کو ایمان تمہارا اگر تم ایمان والے ہو

خلاصہ تفسیر: اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب ہم نے تمہارا قول وقرار لیا تھا، اور (اس قول وقرار لینے کے لئے) طور کو تمہارے (سروں کے) اوپر لا کھڑا کیا تھا (اور اس وقت حکم دیا تھا کہ) لو جو کچھ (احکام) ہم تم کو دیتے ہیں ہمت (اور پختگی) کے ساتھ لے لو اور (ان احکام کو دل سے) سنو (اس وقت) انہوں نے (ڈر کے مارے زبان سے تو) کہہ دیا کہ ہم نے (قبول کر لیا اور) سن لیا اور (چونکہ واقع میں یہ بات دل سے نہ تھی، اس لئے گویا بزبان حال یوں بھی کہہ رہے تھے کہ) ہم سے عمل نہ ہوگا، اور (ان کی اس بددلی کی وجہ یہ تھی کہ) ان کے قلوب (کے ریشہ ریشہ) میں وہی گوسالہ پیوست ہو گیا تھا، ان کے (سابقہ) کفر کی وجہ سے (جبکہ دریائے شور سے اتر کر انہوں نے ایک بت پرست قوم کو دیکھ کر درخواست کی تھی کہ ہمارے لئے بھی کوئی ایسا ہی مجسم معبود تجویز کر دیا جائے) آپ فرما دیجئے کہ (دیکھ لیا تم نے اپنے ایمان کے کرتوتوں کو، سو) یہ افعال تو بہت برے ہیں جن کی تعلیم تمہارا ایمان تم کو کر رہا ہے اگر تم (بزعم خود اب بھی) اہل ایمان ہو (یعنی یہ ایمان نہیں ہے)۔

اس آیت میں جو اسباب اور مسببات مذکور ہیں ان کی ترتیب کا حاصل یہ ہے کہ دریائے شور سے پار ہو کر ان سے ایک کلمہ کفر کا صادر ہوا، پھر اگرچہ موسیٰ علیہ السلام کی ڈانٹ ڈپٹ سے توبہ کر لی، لیکن توبہ کے مراتب بھی مختلف ہوتے ہیں، اعلیٰ درجہ کی توبہ نہ ہونے کے سبب اس کی کچھ ظلمت قلب میں باقی رہ گئی تھی وہ ترقی پا کر گوسالہ پرستی کا سبب بن گئی، پھر اس کی توبہ میں بعضوں کو قتل ہونا پڑا، اور بعض کو غالباً بلا قتل معافی ہوگئی جیسا کہ بعض مفسرین نے ذکر بھی کیا ہے تو ان کی توبہ بھی کچھ ضعیف ہوئی ہوگی، اور جو گوسالہ پرستی سے محفوظ رہے تھے ان کو بھی گوسالہ پرستوں سے اس قدر نفرت نہیں ہوئی جتنی کہ ہونی چاہیے تھی، اس میں کوتاہی ہونے سے ایک گونہ اثر اس شرکیہ معصیت کا ان کے قلب میں باقی تھا بہر حال ضعف توبہ یا کفر سے نفرت نہ ہونے کے آثار باقی رہنے نے ان کے دلوں میں دین سے سستی پیدا کر دی جس سے اخذ میثاق میں کوہ طور کو ان پر معلق کرنے کی نوبت آئی، اور قبول کے وقت زبان و دل موافق نہ ہوئے۔

* * *

فائدہ: لہ یعنی احکام تورات کی جو تکلیف دی گئی، اس کو پوری ہمت و استقلال سے مضبوط پکڑو، چونکہ پہاڑ سر پر معلق تھا، جان کے اندیشہ سے زبان سے (یا اس وقت) تو کہہ لیا سمعنا یعنی احکام تورات ہم نے سن لیے اور دل سے (یا بعد میں) کہا عصینا یعنی ہم نے قبول نہیں کیا احکام کو، اور وجہ اس کی یہ تھی کہ صورت پرستی ان کے دل میں راسخ ہو چکی تھی ان کے کفر کے باعث، وہ زنگ بالکل ان کے دل سے زائل نہیں ہوا، بلکہ رفتہ رفتہ بڑھتا گیا۔

قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ

کہہ دے کہ اگر ہے تمہارے واسطے آخرت کا گھر اللہ کے ہاں تنہا سوا اور لوگوں کے تو تم مرنے کی آرزو کرو

اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۹۴﴾ وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۹۵﴾

اگر تم سچ کہتے ہو۔اور ہرگز آرزو نہ کرینگے موت کی کبھی بسبب ان گناہوں کے کہ بھیج چکے ہیں انکے ہاتھ، اور اللہ خوب جانتا ہے گناہ گاروں کو

خلاصہ تفسیر: (چھبیسواں معاملہ: بعض یہودی دعویٰ کرتے تھے کہ آخرت کی نعمتیں خالص ہمارا ہی حق ہیں، حق تعالیٰ اس دعوی کو رد اور باطل کرنے کے لئے فرماتے ہیں کہ: اے محمد ﷺ!) آپ (ان لوگوں سے) کہہ دیجئے کہ اگر (بقول تمہارے) عالم آخرت محض تمہارے ہی لئے نافع ہے بلا شرکت غیرے تو تم (اس کی تصدیق کے لئے ذرا) موت کی تمنا کر کے دکھلا دو اگر تم (اس دعویٰ میں) سچے ہو، اور (ہم ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ) یہ لوگ ہرگز کبھی اس (موت) کی تمنا نہ کریں گے بوجہ (سزا کے خوف سے) ان اعمال (کفریہ) کے جو اپنے ہاتھوں سمیٹتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کو خوب اطلاع ہے ان ظالموں (کے حال) کی (جب مقدمہ کی تاریخ آئے گی فرد جرم سنا کر سزا کا حکم کر دیا جائے گا)۔

قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ: قرآن کریم کی بعض دیگر آیات سے بھی یہود کا یہ دعویٰ مختلف عنوانات سے بیان ہوا ہے، ایک عنوان یہ تھا: **وقالوا لن تمسنا النار** کہ اگر ہم دوزخ میں گئے بھی تو وہ جانا چندروز کے لیے ہوگا، دوسرا یہ: **وقالوا لن یدخل الجنة** کہ جنت میں صرف یہود ہی جائیں گے، تیسرا یہ: **نحن ابناء الله** کہ ہم خدا کی اولاد اور اس کے محبوب ہیں، حاصل ان سب کا یہ ہے کہ ہم دین حق پر ہیں، اس لیے آخرت میں ہم کو تو نجات ضرور ملے گی، ہم میں سے جو تائب، مرحوم یا مطیع ہیں وہ تو اولاد کی طرح محبوب و مقرب ہیں، ان کو تو ابتداء ہی سے جنت میں داخلہ مل جائے گا، اور جو گناہ گار ہیں ان کو کچھ روز دوزخ کی سزا بھگتنا پڑے گی، اور چند روزہ عذاب بھگت کر وہ بھی نجات پا جائیں گے، ان کے یہ سب دعوے فی نفسہ غلط ہیں، کیونکہ ان کا صحیح ہونا اس پر موقوف ہے کہ وہ دین حق پر قائم ہوں، مگر شریعت موسویہ کے منسوخ ہو جانے کی وجہ سے وہ ہرگز دین حق پر نہیں تھے، اس لیے اللہ نے جگہ جگہ مختلف طریقوں سے ان کی تکذیب فرمائی ہے۔

فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ: اس جگہ ایک عجیب طرز سے ان کا رد فرمایا ہے، وہ یہ کہ اگر تم عام عادت کے مطابق بحث اور دلائل سے فیصلہ نہیں کر سکتے تو آؤ ایک خرق عادت طریقہ سے فیصلہ کر لو، اس میں نہ زیادہ علم و فہم کی ضرورت ہے، نہ بہت زیادہ غور و فکر کی، صرف زبان ہلانے کی ضرورت ہے، مگر ہم پیشین گوئی کرتے ہیں کہ تم لوگ ہرگز زبان سے اتنا نہیں کہہ سکتے کہ ہم موت کی تمنا کرتے ہیں، کیونکہ اپنے حق پر ہونے کا خود ان کو بھی یقین نہیں، ورنہ اس کا راستہ اختیار کرنے سے جو کہ موت ہے ان کو وحشت نہ ہوتی، اگرچہ موت ایک ناگوار چیز ہے مگر جب طبعی وحشت پر دیگر شوقیہ اسباب کا غلبہ ہوتا ہے تو وہ وحشت زائل ہو جاتی ہے، اس پیشین گوئی کے بعد ہم کہتے ہیں کہ اگر تم اپنے دعوؤں میں سچے ہو تو یہ کلمہ کہہ دو، نہ کہا تو پھر تمہارا جھوٹا ہونا ثابت ہو جائے گا، ہم دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ ایسا نہ کہیں گے، چنانچہ وہ ایسا نہ کہہ سکے اور دیوار کی طرح ساکت خاموش رہ گئے؛ کیونکہ ان کو اپنا باطل اور کفر پر ہونا اور جناب رسول اللہ ﷺ اور مؤمنین کا حق پر ہونا ان پر خوب واضح و روشن تھا اس لئے یا تو ایسی ہیبت چھائی کہ زبان ہی نہ اٹھی، یا وہ ڈر گئے کہ نے یہ کلمہ منہ سے نکالا اور موت نے آ دبوچا اور پھر سیدھے جہنم رسید ہوئے، ورنہ ان کو حضور ﷺ جو عداوت و دشمنی تھی اس کے پیش نظر تو ان کو یہ سن کر جوش آ جانا چاہئے تھا اور یہ کلمات ضرور کہہ دینے چاہئے تھے، درحقیقت اسلام کی حقانیت کے ثبوت کے لئے یہ واقعہ بہت کافی ہے، یہاں دو باتیں اور قابل ذکر ہیں:

اول تو یہ کہ یہ استدلال ان یہودیوں کے ساتھ تھا جو نبی کریم ﷺ کے زمانے میں موجود تھے اور جنہوں نے آپ کو نبی پہچاننے کے بعد عناد و عداوت کی بناء پر آپ کا انکار کیا، ہر زمانے کے یہود سے یہ خطاب نہیں، دوسرے یہ شبہ بھی نہیں ہونا چاہئے کہ تمنا کرنا دل اور زبان دونوں سے ہوتا ہے،

ممکن ہے انہوں نے دل سے تمنا کی ہو، اول تو یہ اس لئے صحیح نہیں کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان: وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًا اس کی صاف تردید کررہا ہے، دوسرے اگر وہ دل سے تمنا کرتے تو زبان سے ضرور اس کا اظہار کرتے، کیونکہ اس میں تو ان کی جیت تھی اور نبی کریم ﷺ کو جھٹلانے کا اچھا موقعہ تھا۔

اور یہ شبہ بھی نہیں کرنا چاہئے کہ انہوں نے تمنا کی ہو مگر اس کی شہرت نہ ہوئی ہو، یہ اس لئے صحیح نہیں کہ اسلام کے ہمدرد و معاونین کی تعداد کے مقابلہ میں معاندین ومخالفین کی تعداد ہمیشہ زیادہ رہی، اگر ایسی بات ہوئی ہوتی تو وہ خود اس کو خوب خوب اچھالتے کہ لو دیکھو، تم نے جو معیار حق وصداقت مقرر کیا تھا اس پر بھی ہم پورے اترے۔

خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ: یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ موت کی محبت خواہ طبعی ہو یا عقلی ہو، ولایت (اہل اللہ) کی علامتوں میں سے ہے، حالات کے اعتبار سے طبعی یا عقلی طور پر اس کا اظہار ہوتا ہے، خدا کے عشق میں موت کی تمنا کرنا طبعی کی مثال ہے، آخرت کی نعمتوں اور دیدار خداوندی کا شوق پیدا ہونا عقلی کی مثال ہے اگرچہ دل موت کو نہ چاہتا ہو اور موت سے ڈر بھی لگتا ہو۔

* * *

فائدہ: یہود کہتے تھے کہ ''جنت میں ہمارے سوا کوئی نہ جائے گا اور ہم کو عذاب نہ ہوگا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر یقینی بہشتی ہو تو مرنے سے کیوں ڈرتے ہو''۔

وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ ۚ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ

اور تو دیکھے گا ان کو سب لوگوں سے زیادہ حریص زندگی پر، اور زیادہ حریص مشرکوں سے بھی، چاہتا ہے ایک ایک ان میں کا کہ عمر پاوے

اَلْفَ سَنَةٍ ۚ وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ يُّعَمَّرَ ۗ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿٩٦﴾ ع

ہزار برس، اور نہیں اس کو بچانے والا عذاب سے اس قدر جینا، اور اللہ دیکھتا ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں

خلاصہ تفسیر: اور (وہ لوگ موت کی تمنا کیا خاک کرتے) آپ (تو) ان کو حیات (دنیوی) کا حریص (اور عام) آدمیوں سے (بھی) بڑھ کر پائیں گے اور (اوروں کا تو کیا ذکر حیرت تو یہ ہے کہ بعض) مشرکین سے بھی (بڑھ کر آپ ان کو حیات کا حریص دیکھیں گے اور ان کی یہ کیفیت ہے کہ) ان میں کا ایک ایک (شخص) اس ہوس میں ہے کہ اس کی عمر ہزار برس کی ہوجائے اور (بھلا بالفرض اگر اتنی عمر بھی گئی تو کیا) یہ امر عذاب سے تو بچا نہیں سکتا کہ (کسی کی بڑی) عمر ہوجائے اور حق تعالیٰ کے سب پیش نظر ہیں ان کے اعمال (بدجس پر ان کو عذاب ہونے والا ہے)۔

اس میں حیرت اور استبعاد کی وجہ یہ ہے کہ مشرکین عرب تو آخرت کے منکر تھے، ان کی بہار اور عیش تو جو کچھ ہے دنیا ہی ہے، اس لئے وہ اگر لمبی زندگی کی تمنا کریں تو چنداں عجیب نہیں، مگر یہود تو آخرت کے قائل اور بزعم خود آخرت کی نعمتوں کا اپنے آپ ہی کو مستحق کہتے تھے پھر بھی وہ دنیا میں لمبا عرصہ رہنے کی تمنا کریں یہ ہے حیرت وتعجب کی بات، پس آخرت کے اعتقاد کے باوجود لمبی زندگی کی تمنا کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ آخرت کی نعمتوں کا اپنے آپ کو مستحق سمجھنے کا دعویٰ صرف دعویٰ ہی ہے، حقیقت جو ہے اس کو یہ بھی خوب جانتے ہیں کہ وہاں پہنچ کر جہنم ہی ٹھکانا بنے گا اس لئے جب تک بچے رہیں تب تک ہی سہی۔

* * *

فائدہ: یعنی یہود نے ایسے برے کام کیے ہیں کہ موت سے نہایت بچتے ہیں اور ڈرتے ہیں کہ مرتے ہی خیر نظر نہیں آتی حتیٰ کہ مشرکین سے بھی زیادہ جینے پر حریص ہیں، اس سے ان کے دعووں کی تغلیط خوب ہوگئی۔

قُلۡ مَنۡ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبۡرِيۡلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلۡبِكَ بِاِذۡنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيۡنَ يَدَيۡهِ

تو کہہ دے جو کوئی ہووے دشمن جبرائیل کا سو اس نے تو اتارا ہے یہ کلام تیرے دل پر اللہ کے حکم سے کہ سچا بتانے والا ہے اس کلام کو جو اسکے پہلے ہے

وَهُدًى وَّبُشۡرٰى لِلۡمُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۹۷﴾

اور راہ دکھاتا ہے اور خوشخبری سناتا ہے ایمان والوں کو

خلاصہ تفسیر: ستائیسواں معاملہ: بعض یہود نے یہ سن کر کہ جبرئیل علیہ السلام وحی لاتے ہیں حضور ﷺ سے کہا کہ ان سے تو ہماری دشمنی ہے، ہماری قوم پر دردناک واقعات اور سخت احکامات انہی کے ذریعے آتے رہے ہیں، میکائیل خوب ہیں کہ بارش اور رحمت ان کے متعلق ہے، اگر وہ وحی لایا کرتے تو ہم مان لیتے اس پر حق تعالیٰ رد فرماتے ہیں کہ اے محمد ﷺ!:

آپ (ان سے) یہ کہیئے کہ جو شخص جبرئیل سے عداوت رکھے (وہ جانے، لیکن اس بات کا قرآن کے نہ ماننے میں کیا دخل؟ کیونکہ اس میں تو وہ محض سفیر ہیں) سو (سفارت کے طور پر) انہوں نے یہ قرآن پاک آپ کے قلب تک پہنچا دیا ہے خداوندی حکم سے (تو لانے والے کی خصوصیت کیوں دیکھی جاتی ہے؟ البتہ خود قرآن کو دیکھو کہ کیسا ہے سو) اس کی (خود) یہ حالت ہے کہ تصدیق کر رہا ہے اپنے سے قبل والی (آسمانی) کتابوں کی اور رہنمائی کر رہا ہے (ضروری مصالح کی) اور خوشخبری سنا رہا ہے ایمان والوں کو (اور آسمانی کتب کی یہی شان ہوتی ہے، پس قرآن ہر حال میں آسمانی کتاب اور قابل اتباع ٹھہری، پھر جبریل علیہ السلام کی دشمنی سے اس کو نہ ماننا نری حماقت ہے)۔

سفارت کے سچا ہونے کے لیے سفیر میں دو صفتوں کا ہونا کافی ہے: ① ایک مامور ہونا ② دوسرے امین ہونا، سو امین ہونے سے تو یہود کو ظاہری انکار بھی نہ تھا، صرف مامور ہونے میں ظاہر میں عناد کی وجہ سے انکار کرتے تھے، اس لیے یہاں ان کے مامور من اللہ ہونے کو ہی ثابت کیا گیا۔

فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلۡبِكَ: اس سے یہ وسوسہ نہ کیا جائے کہ جب قرآن دل پر نازل ہوا ہے تو الفاظ قرآنی منزل من اللہ نہیں، صرف معانی ہی منزل ہیں، جواب یہ ہے کہ قلب جس طرح معانی کا ادراک کرتا ہے الفاظ کا بھی تو ادراک کرتا ہے، بلکہ حقیقت میں مدرک یہی ہے، کان اور آنکھ تو محض اس کے آلات ہیں، جیسے آنکھ کے سامنے عینک، کہ عینک دیکھنے میں مددگار تو ضرور ہے لیکن مدرک تو حقیقت میں آنکھ ہی ہے، چونکہ خواب اور بالخصوص حالت وحی میں جبکہ ظاہری حواس معطل ہوتے ہیں کان کے واسطہ کے بغیر الفاظ بھی دل ہی پر وارد ہوں گے، بلکہ بعض اوقات خواب میں ایسے الفاظ آتے ہیں جن سے کان کبھی آشنا نہ تھے، اور نہ ان کے معنی معلوم تھے تو وحی جس کی شان بہت ارفع ہے اور نہ ہم لوگ اس کی پوری حقیقت سمجھ سکتے ہیں اس کے متعلق ایسی بات کو جو نص سے ثابت ہو چکی ہے محض قیاس یا ناسمجھی کی وجہ سے انکار کرنا بڑی غلطی ہے، اور قرآن میں جا بجا نزول دل کے ساتھ "لسان عربی" کی قید مذکور ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ الفاظ عربی میں نازل ہوئے ہیں، اس لیے اس وسوسہ کی ہرگز گنجائش نہیں۔

مَنۡ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبۡرِيۡلَ وَمِيۡكٰلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلۡكٰفِرِيۡنَ ﴿۹۸﴾

جو کوئی ہووے دشمن اللہ کا اور اس کے فرشتوں کا اور اس کے پیغمبروں کا اور جبرائیل اور میکائیل کا تو اللہ دشمن ہے ان کافروں کا

خلاصہ تفسیر: اب رہا خود مسئلہ جبرئیل سے دشمنی کا، سو اس کا فیصلہ یہ ہے کہ فرشتوں یا رسولوں سے دشمنی وعداوت رکھنا یا خود جبرائیل ومیکائیل سے دشمنی کرنا خدا سے دشمنی کرنے کے ہم پلہ ہے، اور ان سب عداوتوں کا قانون یہ ہے کہ:

جو (کوئی) شخص خدا تعالیٰ کا دشمن ہو (تو) اور فرشتوں کا (ہو تو) اور پیغمبروں کا (ہو تو) اور جبریل کا (ہو تو) اور میکائیل کا (ہو) تو (ان سب کا وبال یہ ہے کہ) اللہ تعالیٰ دشمن ہے ایسے کافروں کا۔

فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلۡكٰفِرِيۡنَ: جبرائیل علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی طرف سے سفارت پر مامور تھے، چونکہ عرف میں مامور کے ساتھ کوئی معاملہ

کرنا آمر تک متعدی ہوتا ہے تو یہ بات اچھی طرح ثابت کردی کہ جبرائیل کے ساتھ دشمنی کرنے سے اللہ کے ساتھ دشمنی لازم آتی ہے۔

مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ (الی قوله) فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِیْنَ: اس میں دلالت ہے کہ اہل اللہ سے عداوت رکھنا خود اللہ تعالیٰ سے عداوت کا سبب بن جاتا ہے (فرشتے، جبرائیل، میکائیل اور انبیاء و رسل خاصان خدا ہیں، ان سے عداوت رکھنا اللہ سے عداوت کا سبب بن گیا)۔

* * *

فائدہ: یہود کہتے تھے کہ ''جبرائیل فرشتہ اس نبی کے پاس وحی لاتا ہے اور وہ ہمارا دشمن ہے، ہمارے اگلے بڑوں کو اس سے بہت تکلیفیں پہنچیں، اگر جبرائیل کے بدلے اور فرشتہ وحی لائے تو ہم محمد ﷺ پر ایمان لائیں''، اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ فرشتے جو کچھ کرتے ہیں اللہ کے حکم سے کرتے ہیں اپنی طرف سے کچھ نہیں کرتے جو ان کا دشمن ہے اللہ بیشک ان کا دشمن ہے۔

وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَیْكَ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ ۚ وَمَا یَكْفُرُ بِهَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ ﴿۹۹﴾

اور ہم نے اتاریں تیری طرف آیتیں روشن، اور انکار نہ کرینگے ان کا مگر وہی جو نافرمان ہیں

خلاصہ تفسیر: (اٹھائیسواں معاملہ: بعض یہود نے آنحضرت ﷺ سے کہا تھا کہ آپ پر کوئی ایسی واضح دلیل نازل نہ ہوئی جس کو ہم بھی جانتے پہچانتے، اس کے جواب میں فرمایا جاتا ہے کہ وہ تو ایک دلیل کو کہتے ہیں) اور ہم نے تو آپ کے پاس بہت سے دلائل واضحہ نازل کئے ہیں (جن کو وہ بھی خوب جانتے پہچانتے ہیں، سو ان کا انکار نہ جاننے کی بنا پر نہیں، بلکہ یہ انکار محض نافرمانی کی عادت کی وجہ سے ہے) اور (قاعدہ کلیہ ہے کہ) کوئی انکار نہیں کیا کرتا (ایسے دلائل کا) مگر صرف وہی لوگ جو عدول حکمی کے عادی ہیں۔

اَوَكُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِیْقٌ مِّنْهُمْ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰۰﴾

کیا جب کبھی باندھیں گے کوئی قرار تو پھینک دے گی اس کو ایک جماعت ان میں سے، بلکہ ان میں اکثر یقین نہیں کرتے

خلاصہ تفسیر: (انتیسواں معاملہ: بعض یہود کو جب وہ عہد یاد دلایا گیا جو رسول ﷺ پر ایمان لانے کی بابت ان سے تورات میں لیا گیا تھا تو انہوں نے عہد لیے جانے سے ہی صاف انکار کر دیا، اس کے متعلق ارشاد ہوتا ہے:) کیا (اس عہد لینے سے ان کو انکار ہے) اور (ان کی تو یہ حالت ہے کہ انہوں نے اپنے مسلّمہ عہدوں کو بھی کبھی پورا نہیں کیا، بلکہ) جب کبھی بھی ان لوگوں نے (دین کے متعلق) کوئی عہد کیا ہوگا (ضرور) اس کو ان میں سے کسی نہ کسی فریق نے نظر انداز کر دیا ہوگا، بلکہ ان (عہد کو پورا نہ کرنے والوں) میں زیادہ تو ایسے ہی نکلیں گے جو (سرے سے اس عہد کا) یقین ہی نہیں رکھتے (سو تعمیل نہ کرنا تو فسق تھا ہی، یہ یقین نہ کرنا اس سے بڑھ کر کفر ہے)۔

فَرِیْقٌ مِّنْهُمْ: ''ایک جماعت'' اس لیے کہا کہ ان میں سے بعض نے ان عہدوں کو پورا بھی کیا حتی کہ اخیر میں نبی ﷺ پر بھی ایمان لے آئے۔

* * *

فائدہ: یعنی ان کی عادت قدیم ہے کہ جب اللہ یا رسول یا کسی شخص سے کوئی عہد مقرر کرتے ہیں تو انہی میں کی ایک جماعت اس عہد کو پس پشت ڈال دیتی ہے بلکہ بہت یہودی ایسے ہیں جو تورات پر ایمان ہی نہیں رکھتے ایسوں کو عہد شکنی میں کیا باک ہوسکتا ہے۔

وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِیْقٌ مِّنَ

اور جب پہنچا ان کے پاس رسول اللہ کی طرف سے تصدیق کرنے والا اس کتاب کی جو ان کے پاس ہے تو پھینک دیا ایک جماعت نے

الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ۙ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۱﴾

اہل کتاب سے، کتاب اللہ کو اپنی پیٹھ کے پیچھے گویا کہ وہ جانتے ہی نہیں

خلاصہ تفسیر: اب ایک خاص عہد شکنی کا ذکر فرماتے ہیں جس میں اس جگہ کلام تھا یعنی رسول اللہ ﷺ پر ایمان نہ لانا:
اور جب ان کے پاس ایک (عظیم الشان) پیغمبر آئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو (رسول ہونے کے ساتھ) تصدیق بھی کر رہے ہیں اس کتاب کی جوان لوگوں کے پاس ہے (یعنی توراۃ کی، کیونکہ اس میں آپ کی نبوت کی خبر موجود ہے، تو اس حالت میں آپ پر ایمان لانا عین توراۃ پر عمل کرنا تھا، جس کو وہ بھی کتاب اللہ جانتے ہیں، مگر اس کے باوجود بھی) ان اہل کتاب میں کے ایک فریق نے خود اس کتاب اللہ ہی کو اس طرح پس پشت ڈال دیا جیسے ان کو (اس کے مضمون کا یا کتاب اللہ ہونے کا) گویا اصلاً علم ہی نہیں۔

* * *

فائدہ: ''رسول'' سے مراد حضرت محمد ﷺ اور ما معھم سے تورات اور کتاب اللہ سے بھی تورات مراد ہے، یعنی جب رسول اللہ ﷺ تشریف لائے حالانکہ وہ تورات وغیرہ کتب کے مصدق تھے تو یہود کی ایک جماعت نے خود تورات کو پس پشت ایسا ڈال دیا کہ گویا جانتے ہی نہیں کہ یہ کیا کتاب ہے اور اس میں کیا کیا حکم ہیں، سو ان کو جب اپنی ہی کتاب پر ایمان نہیں تو ان سے آگے کو کیا امید کی جائے۔

وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ۚ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ

اور پیچھے ہولئے اس علم کے جو پڑھتے تھے شیطان سلیمان کی بادشاہت کے وقت اور کفر نہیں کیا سلیمان نے لیکن شیطانوں نے

كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ۚ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ۭ

کفر کیا کہ سکھلاتے تھے لوگوں کو جادو، اور اس علم کے پیچھے ہولئے جو اترا دو فرشتوں پر شہر بابل میں جن کا نام ہاروت اور ماروت ہے

وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ۭ فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا

اور نہیں سکھاتے تھے وہ دونوں فرشتے کسی کو جب تک یہ نہ کہہ دیتے کہ ہم تو آزمائش کے لئے ہیں سو تو کافر مت ہو، پھر ان سے سیکھتے وہ جادو

يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ ۭ وَمَا هُمْ بِضَاۗرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَيَتَعَلَّمُوْنَ

جس سے جدائی ڈالتے ہیں مرد میں اور اس کی عورت میں، اور وہ اس سے نقصان نہیں کر سکتے کسی کا بغیر حکم اللہ کے، اور سیکھتے ہیں

مَا يَضُرُّھُمْ وَلَا يَنْفَعُھُمْ ۭ وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ڜ

وہ چیز جو نقصان کرے ان کا اور فائدہ نہ کرے، اور وہ خوب جان چکے ہیں کہ جس نے اختیار کیا جادو کو نہیں اس کے لئے آخرت میں کچھ حصہ

وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَھُمْ ۭ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ١٠٢

اور بہت ہی بری چیز ہے جس کے بدلے بیچا انہوں نے اپنے آپ کو، اگر ان کو سمجھ ہوتی

خلاصہ تفسیر: (چونکہ یہودیوں میں جادو کا بہت چرچا تھا، اس لیے ان آیتوں میں جادو اور یہودیوں کی برائی بیان کرنا مقصود ہے، بیوقوف یہودی حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف جادو کی نسبت کرتے تھے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے درمیان میں سلیمان علیہ السلام کی براءت بھی ظاہر فرمادی) اور (یہودی ایسے بے عقل ہیں کہ) انہوں نے (کتاب اللہ کا تو اتباع نہ کیا اور) ایسی چیز کا (یعنی سحر و جادو کا) اتباع (اختیار) کیا جس کا چرچا کیا کرتے تھے شیاطین (یعنی خبیث جن) حضرت سلیمان علیہ السلام کے (عہد) سلطنت میں اور (بعض بیوقوف جو حضرت سلیمان علیہ السلام پر

سحر کا گمان رکھتے ہیں بالکل ہی لغو بات ہے، کیونکہ سحر تو اعتقاداً یا عملاً کفر ہے اور) حضرت سلیمان علیہ السلام نے (نعوذ باللہ کبھی) کفر نہیں کیا مگر (ہاں) شیاطین (یعنی خبیث جن بیشک) کفر (کی باتیں اور کام یعنی جادو) کیا کرتے تھے، اور حالت یہ تھی کہ (خود تو کرتے ہی اور) آدمیوں کو بھی (اس) سحر کی تعلیم کیا کرتے تھے (سو وہی سحر یہود میں متوارث چلا آ رہا ہے اور اس کا اتباع یہ یہودی ہی کرتے ہیں)۔

اور (اسی طرح) اس (سحر) کا بھی (یہ لوگ اتباع کرتے ہیں) جو کہ ان دونوں فرشتوں پر (ایک خاص حکمت کے واسطے) نازل کیا گیا تھا (جو شہر) بابل میں (رہتے تھے) جن کا نام ہاروت و ماروت تھا، اور وہ دونوں (وہ سحر) کسی کو نہ بتلاتے جب تک (احتیاطاً پہلے) یہ (نہ) کہہ دیتے کہ ہمارا وجود بھی (لوگوں کے لئے) ایک امتحان (خداوندی) ہے (کہ ہماری زبان سے سحر پر مطلع ہو کر کون پھنستا ہے اور کون بچتا ہے) سو تو (اس پر مطلع ہو کر) کہیں کافر مت بن جائیو (کہ اس میں پھنس جاؤ) سو (بعض) لوگ ان دونوں (فرشتوں) سے اس قسم کا سحر سیکھ لیتے تھے جس کے ذریعہ سے (عمل کر کے) کسی مرد اور اس کی بیوی میں تفریق پیدا کر دیتے تھے۔

اور (اس سے کوئی وہم اور خوف میں نہ پھنس جائے کہ جادوگر جو چاہے کر سکتا ہے، کیونکہ یہ یقینی بات ہے کہ) یہ (ساحر) لوگ اس (سحر) کے ذریعے سے کسی کو (ذرہ برابر) بھی ضرر نہیں پہنچا سکتے مگر خدا ہی کے (تقدیری) حکم سے اور (ایسا سحر حاصل کر کے بس) ایسی چیزیں سیکھ لیتے ہیں جو (خود) ان کو (بوجہ گناہ کے) ضرر رساں ہیں اور (کسی قابل ذکر درجہ میں) ان کو نافع نہیں ہیں (تو یہودی بھی اتباع سحر سے بڑے نقصان میں ہوں گے) اور یہ (بات کچھ ہمارے ہی کہنے کی نہیں بلکہ) ضرور یہ (یہودی) بھی اتنا جانتے ہیں کہ جو شخص اس (سحر) کو (کتاب اللہ کے عوض) اختیار کرے ایسے شخص کا آخرت میں کوئی حصہ (باقی) نہیں، اور بیشک بری ہے وہ چیز (یعنی جادو و کفر) جس میں وہ لوگ اپنی جان دے رہے ہیں، کاش ان کو (اتنی) عقل ہوتی۔

وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ: اس مقام پر ایک مقدمہ سمجھ لینا چاہیے تاکہ تفسیر سمجھنے میں سہولت ہو، وہ یہ کہ ایک زمانے میں جس کی تعیین میں کوئی محققانہ رائے اس وقت سامنے نہیں تمام دنیا میں اور خصوصاً بابل میں جادو کا بہت چرچا تھا اور اس کے عجیب اثرات کو دیکھ کر جاہلوں کو اس کی حقیقت اور انبیاء کرام کے معجزات کی حقیقت میں اختلاط و اشتباہ ہونے لگا، بعض لوگ جادوگروں کو مقدس اور قابل اتباع سمجھنے لگے اور بعض لوگ جادو کو سیکھنے اور اس پر عمل کرنے لگے، جیسا موجودہ دور میں مسمریزم کے ساتھ لوگوں کا معاملہ ہو رہا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس اشتباہ اور غلطی کو دور کرنے کے لئے بابل میں ہاروت و ماروت نامی دو فرشتے اس کام کے لئے بھیجے کہ لوگوں کو سحر اور شعبدہ کی حقیقت سے مطلع کر دیں تاکہ اشتباہ ختم ہو جائے، اور جادو پر عمل کرنے نیز جادوگروں کی اتباع کرنے سے اجتناب کر سکیں اور جس طرح انبیاء علیہم السلام کی نبوت کو معجزات و دلائل سے ثابت کر دیا جاتا ہے اسی طرح ہاروت و ماروت کے فرشتہ ہونے پر بھی دلائل قائم کر دیئے گئے تاکہ ان کے احکامات وارشادات کی تعمیل واطاعت ممکن ہو، یہ کام انبیاء علیہم السلام سے اس لئے نہیں لیا گیا کہ اول تو انبیاء اور جادوگروں میں امتیاز و فصل کرنا مقصود تھا، ایک حیثیت سے گویا انبیاء کرام ایک فریق کا درجہ رکھتے تھے اس لئے حکم فریقین کے علاوہ کوئی اور تیسرا ہونا مناسب تھا۔

دوسرے اس مقصد کی تکمیل جادو کے الفاظ کی نقل و حکایت کے بغیر نہ ہو سکتی تھی، اگرچہ ''نقل کفر کفر نباشد'' کے عقلی و نقلی مسلمہ قاعدہ کے مطابق ایسا ہو سکتا تھا، مگر چونکہ حضرات انبیاء علیہم السلام ہدایت کا مظہر ہوتے تھے، اس لئے ان سے یہ کام لینا مناسب نہ سمجھا گیا، لہٰذا فرشتوں کو اس کام کے لئے تجویز کیا گیا، کیونکہ کارخانہ تکوین میں جو کہ خیر و شر سب پر مشتمل ہوتا ہے ان فرشتوں سے ایسے کام بھی لئے جاتے ہیں جو مجموعہ عالم کے اعتبار سے تو عام مصلحت کی وجہ سے خیر ہوں، لیکن فساد لازم آنے کی وجہ سے فی ذاتہ شر ہوتے ہیں، جیسے کسی ظالم و جابر یا موذی جانور وغیرہ کی نشو و نما اور غور و پرداخت جو کہ تکوینی اعتبار سے تو جائز و درست ہے لیکن تشریعی لحاظ سے نادرست اور مذموم ہے، بخلاف انبیاء علیہم السلام کے کہ ان سے خاص شریعت ہی کا کام لیا جاتا ہے جو ہر اعتبار سے خیر ہی خیر ہوتا ہے اور اگرچہ یہ جادو کی نقل و حکایت غرض اور مقصد کے لحاظ سے تو ایک تشریعی کام ہی تھا، لیکن پھر بھی یہ قریبی احتمال

تھا کہ کہیں یہ نقل وحکایت بھی جادو پر عمل کا سبب نہ بن جائے جیسا کہ واقع میں ہوا، تو انبیاء علیہم السلام کو اس کا سبب اور واسطہ بنانا بھی پسند نہیں کیا گیا۔

البتہ کلیات شرعیہ سے انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ بھی اس مقصود کی تکمیل کر دی گئی ،لیکن جزئی تفصیلات فتنہ کے احتمال کی وجہ سے انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ بیان نہیں کی گئیں، اس کی مثال ایسی ہے کہ مثلاً انبیاء نے یہ بتایا ہے کہ رشوت لینا حرام ہے اور اس کی حقیقت بھی بتلا دی ہے، لیکن یہ جزئیات نہیں بتائے کہ ایک طریقہ رشوت کا یہ ہے کہ صاحب معاملہ سے یوں چال کر کے فلاں بات کہے وغیرہ وغیرہ، کیونکہ اس طرح کی تفصیلات بیان کرنے سے تو لوگ اور ترکیبیں سیکھ سکتے ہیں، یا مثلاً اقسام سحر ہی میں مثال فرض کیجئے کہ قواعد کلیہ سے یہ بتلا دیا گیا ہے کہ دست غیب کا عمل جس میں تکیہ کے نیچے یا جیب میں رکھے ہوئے روپے مل جائیں ناجائز ہے، لیکن یہ نہیں بتلایا کہ فلاں عمل پڑھنے سے اس طرح روپیہ ملنے لگتے ہیں۔

حاصل کلام یہ کہ فرشتوں نے بابل میں آ کر اپنا کام شروع کر دیا، جادو کے اصول وفروع ظاہر کر کے لوگوں کو اس سے بچنے کی اور جادوگروں سے دوری اور نفرت رکھنے کی تائید کی، جیسے کوئی عالم دیکھے کہ اکثر جاہل لوگ نادانی سے کفریہ کلمات بک جاتے ہیں اس لئے وہ تحریری یا زبانی طور پر ایسے کلمات کو جمع کر کے عوام کو متنبہ کر دے کہ دیکھو یہ کلمات بچنے کے لائق ہیں ان سے احتیاط رکھنا۔

جب فرشتوں نے کام شروع کیا تو وقتاً فوقتاً مختلف لوگوں کی ان کے پاس آمد ورفت شروع ہوئی اور وہ درخواست کرنے لگے کہ ہمیں بھی جادو کے اصول وفروع سے مطلع کر دیجئے تا کہ ناواقفیت کی وجہ سے کسی اعتقادی یا عملی فساد میں مبتلا نہ ہو جائیں، اس وقت فرشتوں نے بطور احتیاط یہ التزام بھی کر لیا کہ جادو کے اصول وفروع بتانے سے سے پہلے یہ کہہ دیا کرتے تھے کہ دیکھو ہمارے اس بتانے کے ذریعہ سے خدا تعالیٰ کو بندوں کا امتحان بھی مقصود ہے کہ دیکھیں اس سے مطلع ہو کر کون اپنے دین کی حفاظت کرتا ہے کہ شر سے بچے اور کون اپنے دین کو خراب کرتا ہے کہ اس شر سے مطلع ہو کر خود اس پر عمل کرنے لگے جس کا انجام کفر ہے، خواہ کفر عملی ہو یا اعتقادی، دیکھو ہم تمہیں نصیحت کرتے ہیں، اچھی نیت سے جادو کی حقیقت دریافت کرنا، اور پھر اسی نیت پر ثابت قدم رہنا، ایسا نہ ہو کہ ہم سے تو یہ کہہ کر سیکھ لو کہ میں بچنے کے لئے پوچھ رہا ہوں اور پھر اس کی خرابی میں خود ہی مبتلا ہو جاؤ اور ایمان برباد کر لو، اب ظاہر ہے کہ وہ اس سے زیادہ خیر خواہی اور کیا کر سکتے تھے، غرض جو کوئی ان سے اس طرح عہد وپیمان کر لیتا وہ اس کے روبرو جادو کے سب اصول وفروع بیان کر دیتے تھے، کیونکہ ان کا کام ہی یہ تھا، اب اگر کوئی عہد شکنی کر کے اپنے ارادہ واختیار سے کافر وفاجر بنے وہ جانے، چنانچہ بعض اس عہد پر قائم نہ رہے اور اس جادو کو مخلوق کی ایذا رسانی کا ذریعہ بنا لیا جو فسق تو یقیناً ہے اور بعض طریقے اس کے استعمال کے کفر بھی ہیں اس طرح سے فاجر کافر بن گئے۔

فرشتوں کی اس تعلیم کی مثال اس طرح ہو سکتی ہے کہ کوئی شخص کسی جامع معقول ومنقول عالم باعمل کے پاس جائے کہ مجھ کو قدیم یا جدید فلسفہ پڑھا دیجئے تا کہ خود بھی ان شبہات سے محفوظ رہوں جو فلسفہ میں اسلام کے خلاف بیان کئے جاتے ہیں اور مخالفین کو بھی جواب دے سکوں اور اس عالم کو یہ احتمال ہو کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مجھ کو دھوکہ دے کر پڑھ لے اور پھر خود ہی خلاف شریعت باطل عقائد کو تقویت دینے میں اس کو استعمال کرنے لگے، اس احتمال کی وجہ سے اس کو نصیحت کرے کہ ایسا مت کرنا اور وہ وعدہ کر لے اور اس لئے اس کو پڑھا دیا جائے، لیکن وہ شخص فلسفہ کے خلاف اسلام نظریات وعقائد ہی کو صحیح سمجھنے لگے تو ظاہر ہے کہ اس کی اس حرکت سے اس معلم پر کوئی ملامت یا برائی عائد نہیں ہو سکتی، اس طرح اس اطلاع سحر سے ان فرشتوں پر بھی نہ کسی شبہ کی گنجائش ہے نہ وسوسہ کی، اس کام کے لیے فرشتے اس لیے تجویز کیے گئے کہ اگر انبیاء سے یہ کام لیا جاتا اور وہ خود جادو کے اصول وفروع کو عوام کے سامنے بیان کرتے تو لوگوں کا شبہ اور بڑھ جاتا، وہ سمجھتے کہ انبیاء بھی ضرور ساحر ہیں جبھی اس کے اصول وفروع سے خوب واقف ہیں، اور یہ ان کے منصب ہدایت کے لیے مضر ہوتا، اور اس فرض کی تکمیل کے بعد غالباً وہ فرشتے آسمان پر بلا لئے گئے ہوں گے، واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔

سحر کے فسق یا کفر وغیرہ ہونے میں تفصیل یہ ہے کہ اگر اس میں کفریہ کلمات ہوں مثلاً شیاطین یا کواکب سے استعانت وغیرہ تب تو کفر ہے خواہ اس سے کسی کو نقصان پہنچایا جائے یا نفع پہنچایا جائے، اور اگر اس میں کفریہ کلمات نہ ہوں تو کسی کو نقصان پہنچایا جائے یا کسی اور ناجائز غرض میں استعمال کیا جائے تو وہ فسق اور معصیت ہے، اور اگر نقصان نہ پہنچایا جائے، نہ کسی ناجائز غرض میں استعمال کیا جائے تو اسے عرف میں سحر نہیں کہتے، بلکہ عمل یا عزیمت یا تعویذ گنڈہ کہتے ہیں اور وہ مباح ہے، البتہ لغت میں لفظ سحر اس کو بھی شامل ہے، کیونکہ لغوی اعتبار سے ہر عجیب تصرف کو سحر کہا جاتا ہے، اور اگر کلمات

مشتبہ ہوں معنی معلوم نہ ہو تو کفریہ کلمات کا احتمال ہونے کی وجہ سے واجب الاحتراز ہے، اور یہی تفصیل ہے تمام تعویذ گنڈوں اور نقش وغیرہ میں کہ ان کے کلمات معلوم ہوں، غیر شرعی نہ ہوں اور ناجائز غرض میں استعمال نہ کیا جائے تو ان شرطوں کے ساتھ تعویذ گنڈہ اور نقش جائز ہے، اگر قرآن وحدیث کے کلمات ہی سے کام لیا جائے مگر ناجائز مقصد کے لئے استعمال کریں تو وہ بھی جائز نہیں، مثلاً کسی کو ناحق نقصان پہنچانے کے لئے کوئی تعویذ کیا جائے یاد ظیفہ پڑھا جائے اگر چہ وہ وظیفہ اسماء الہیہ یا آیات قرآنیہ ہی کا ہو تو وہ بھی حرام ہے، اور ہر ناجائز عمل پر کفر عملی کا اطلاق کرنا صحیح ہے۔

* * *

فائدہ: لہ یعنی ان احمقوں نے کتاب الٰہی تو پس پشت ڈالی اور شیطانوں سے جادو سیکھا اور اس کی متابعت کرنے لگے۔

وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ ؕ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۳﴾

اور اگر وہ ایمان لاتے اور تقویٰ کرتے تو بدلہ پاتے اللہ کے ہاں سے بہتر، اگر ان کو سمجھ ہوتی

خلاصہ تفسیر: اور اگر وہ لوگ (بجائے اس کفر و بدعملی کے) ایمان اور تقوی (اختیار) کرتے تو خدا تعالیٰ کے ہاں کا معاوضہ (اس بدعملی اور کفر سے ہزار درجہ) بہتر تھا، کاش! (اتنی) عقل ہوتی۔

لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ: یہود سب باتوں کو جاننے کے باوجود اپنے علم کے خلاف عمل کرتے تھے اور تدبر نہ کرتے تھے، اس لئے پہلے ان کے جاننے کی خبر دی: وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ لیکن پھر آخر میں یہ کہہ کر اس کی نفی بھی کر دی کہ کاش ان کو علم وعقل ہوتا، کیونکہ جس علم پر عمل نہ ہو اور تدبر نہ ہو تو وہ جہل ہی کی مانند ہے۔

* * *

فائدہ: خلاصہ یہ کہ یہود اپنے دین اور کتاب کا علم چھوڑ کر علم سحر کے تابع ہو گئے اور سحر لوگوں میں دو طرف سے پھیلا: ① ایک حضرت سلیمان علیہ السلام کے عہد میں چونکہ جنات اور آدمی ملے جلے رہتے تھے، تو آدمیوں نے شیطانوں سے سحر سیکھا، اور نسبت کر دیا حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف کہ ہم کو انہی سے پہنچا ہے اور ان کو حکم جن اور انس پر اسی کے زور سے تھا، سو اللہ تعالیٰ نے فرمادیا کہ یہ کام کفر کا ہے، سلیمان کا نہیں ② دوسرے پھیلا ہاروت ماروت کی طرف سے، وہ دو فرشتے تھے، شہر بابل میں بصورت آدمی رہتے تھے، ان کو علم سحر معلوم تھا، جو کوئی طالب اس کا جاتا، اول اس کو روک دیتے کہ اس میں ایمان جاتا رہے گا، اس پر بھی باز نہ آتا تو اس کو سکھا دیتے، اللہ تعالیٰ کو ان کے ذریعہ سے بندوں کی آزمائش منظور تھی، سو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ایسے علموں سے آخرت کا کچھ نفع نہیں، بلکہ سراسر نقصان ہے اور دنیا میں بھی ضرر ہے اور بغیر حکم خدا کے کچھ نہیں کر سکتے اور علم دین اور علم کتاب سیکھتے تو اللہ کے ہاں ثواب پاتے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوْا ؕ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۰۴﴾

اے ایمان والو تم نہ کہو راعنا اور کہو انظرنا اور سنتے رہو، اور کافروں کو عذاب ہے دردناک

خلاصہ تفسیر: بعض یہودیوں نے ایک شرارت ایجاد کی کہ لفظ راعنا سے آپ ﷺ کو خطاب کرتے، جس کے معنی ان کی عبرانی زبان میں ایک بدعا کے ہیں، عربی داں اس شرارت کو نہ سمجھ سکتے تھے اور بعض مسلمان بھی حضور ﷺ کو اس کلمہ سے خطاب کرنے لگے، اس سے ان شریروں کو گنجائش ملی، آپس میں بیٹھ کر ہنستے تھے کہ اب تک تو ہم ان کو خفیہ ہی برا کہتے تھے اب علانیہ کہنے کی ایسی تدبیر ہاتھ آ گئی کہ مسلمان بھی اس میں شریک ہو گئے، حق تعالیٰ نے اس گنجائش کو ختم کرنے کے لیے مسلمانوں کو حکم دیا کہ:

(تیسواں معاملہ:) اے ایمان والو تم (لفظ) راعنا مت کہا کرو اور (اس کی جگہ لفظ) انظرنا کہہ دیا کرو (کیونکہ لفظ انظرنا کے معنی اور راعنا کے معنی عربی زبان میں ایک ہی ہیں، "راعنا" کہنے میں یہودیوں کی شرارت چلتی ہے، اس لئے اس کو ترک کر کے دوسرا لفظ استعمال کرو) اور

(اس حکم کو اچھی طرح) سن لیجیو (اور یاد رکھیو) اور (ان) کافروں کو (تو) سزائے دردناک ہو (ہی) گی (جو پیغمبر ﷺ کی شان میں ایسی گستاخی اور وہ بھی چالاکی کے ساتھ کرتے ہیں)۔

اس آیت سے یہ مسئلہ معلوم ہوا کہ اگر اپنے کسی جائز فعل سے دوسروں کو ناجائز کاموں کی گنجائش ملتی معلوم ہو تو یہ جائز فعل بھی اس کے لئے جائز نہیں رہتا، جیسے اگر کسی عالم کے جائز فعل سے جاہلوں کو مغالطہ میں پڑنے اور ناجائز کاموں میں مبتلا ہونے کا خطرہ ہو تو اس عالم کا جائز فعل بھی ممنوع ہو جائے گا بشرطیکہ یہ فعل شرعاً ضروری اور مقاصد شرعیہ میں سے نہ ہو۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ لَا تَقُولُواْ رَٰعِنَا: اس آیت میں استاذ کے ادب کی تعلیم ہے کہ اگر کسی معاملہ سے اپنے شیخ کے ادب و احترام میں خلل پڑنے کا امکان ہو تو ایسے معاملہ سے اجتناب کرنا چاہیے، اسی طرح اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ جن الفاظ سے اہانت یا بے ادبی کا پہلو نکلتا ہو ایسے الفاظ کے استعمال سے پرہیز کرنا ضروری ہے۔

***

فائدہ: یہودی آکر آپ کی مجلس میں بیٹھتے اور حضرت کی باتیں سنتے، بعض بات جو اچھی طرح نہ سنتے اس کو مکرر تحقیق کرنا چاہتے تو کہتے راعنا یعنی ہماری طرف متوجہ ہو اور ہماری رعایت کرو، یہ کلمہ ان سے سن کر کبھی مسلمان بھی کہہ دیتے، اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا کہ یہ لفظ نہ کہو، اگر کہنا ہو تو انظرنا کہو، اس کے معنی بھی یہی ہیں اور ابتدا ہی سے متوجہ ہو کر سنتے رہو تو مکرر پوچھنا ہی نہ پڑے، یہود اس لفظ کو بدنیتی اور فریب سے کہتے تھے اس لفظ کو زبان دبا کر کہتے تو راعینا ہو جاتا (یعنی ہمارا چرواہا) اور یہود کی زبان میں راعنا احمق کو بھی کہتے ہیں۔

مَّا يَوَدُّ ٱلَّذِينَ كَفَرُواْ مِنْ أَهْلِ ٱلْكِتَٰبِ وَلَا ٱلْمُشْرِكِينَ أَن يُنَزَّلَ عَلَيْكُم مِّنْ خَيْرٍ

دل نہیں چاہتا ان لوگوں کا جو کافر ہیں اہل کتاب میں اور نہ مشرکوں میں اس بات کو کہ اترے تم پر کوئی نیک بات

مِّن رَّبِّكُمْ ۗ وَٱللَّهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهِۦ مَن يَشَآءُ ۚ وَٱللَّهُ ذُو ٱلْفَضْلِ ٱلْعَظِيمِ ﴿١٠٥﴾

تمہارے رب کی طرف سے، اور اللہ خاص کر لیتا ہے اپنی رحمت کے ساتھ جس کو چاہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے

خلاصہ تفسیر: اکتیسواں معاملہ: رسول اللہ ﷺ کے ساتھ یہود کا جو برتاؤ تھا، وہ اوپر کی آیت میں بیان کیا گیا، اب اس آیت میں یہود کا برتاؤ مسلمانوں کے ساتھ بیان کیا جا رہا ہے کہ بعض یہودی کچھ مسلمانوں سے کہنے لگے کہ بخدا ہم دل سے تمہارے خیر خواہ ہیں، اور ہزار جان سے پسند کرتے ہیں کہ تم کو ہمارے دینی احکام سے زیادہ بہتر دینی احکام عنایت ہوں تو ہم بھی ان کو قبول کریں، مگر کیا کیا جائے کہ تمہارا دین ہمارے دین سے اچھا ثابت نہیں ہوا، حق تعالیٰ اس دعویٰ خیر خواہی کی تکذیب فرماتے ہیں کہ:

ذرا بھی پسند نہیں کرتے کافر لوگ (خواہ) ان اہل کتاب میں سے (ہوں) اور (خواہ) مشرکین میں سے، اس امر کو کہ تم کو تمہارے پروردگار کی طرف سے کسی طرح کی بہتری (بھی) نصیب ہو اور (ان کے حسد سے کچھ بھی نہیں ہوتا، کیونکہ) اللہ تعالیٰ اپنی رحمت (و عنایت) کے ساتھ جس کو منظور ہوتا ہے مخصوص فرما لیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل (کرنے) والے ہیں۔

ان یہودیوں کے دو دعوے تھے: ① یہودیت کا اسلام سے بہتر ہونا ② دوسرے ان کا خیر خواہ ہونا، تو پہلے دعوی کو تو یہ ثابت نہیں کر سکے، نرے دعوی سے کیا ہوتا ہے اور پھر یہ دعویٰ ہے بھی فضول سی بات، کیونکہ جب ناسخ آتا ہے تو منسوخ ترک کر دیا جاتا ہے، افضل غیر افضل کے فرق پر موقوف نہیں رہتا، ظاہر اور کھلی بات ہونے کی وجہ سے اس کا جواب یہاں ذکر نہیں کیا گیا، صرف دوسرے دعویٰ خیر خواہی ہی پر کلام کیا گیا ہے، اور اہل کتاب کے ساتھ مشرکین کا ذکر مضمون کو قوی اور مؤکد کرنے کے لئے کیا گیا کہ جس طرح مشرکین یقیناً تمہارے خیر خواہ نہیں اسی طرح ان کو بھی سمجھو۔

***

فائدہ: یعنی کفار یہود ہوں یا مشرکین مکہ، قرآن کے نزول کو تم پر ہرگز پسند نہیں کرتے، بلکہ یہود تمنا کرتے ہیں کہ نبی آخر الزمان بنی اسرائیل میں پیدا ہو اور مشرکین مکہ چاہتے ہیں کہ ہماری قوم میں سے ہو، مگر یہ تو اللہ کے فضل کی بات ہے کہ اُمی لوگوں میں نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کو پیدا فرمایا۔

مَا نَنۡسَخۡ مِنۡ اٰيَةٍ اَوۡ نُنۡسِهَا نَاۡتِ بِخَيۡرٍ مِّنۡهَآ اَوۡ مِثۡلِهَا ؕ اَلَمۡ تَعۡلَمۡ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ﴿۱۰۶﴾

جو منسوخ کرتے ہیں ہم کوئی آیت یا بھلا دیتے ہیں تو بھیج دیتے ہیں اس سے بہتر یا اس کے برابر، کیا تجھ کو معلوم نہیں کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

اَلَمۡ تَعۡلَمۡ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلۡكُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ وَمَا لَـكُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ مِنۡ وَّلِىٍّ وَّلَا نَصِيۡرٍ ﴿۱۰۷﴾

کیا تجھ کو معلوم نہیں کہ اللہ ہی کے لئے ہے سلطنت آسمان اور زمین کی، اور نہیں تمہارے واسطے اللہ کے سوا کوئی حمایتی اور نہ مددگار۔

خلاصہ تفسیر: بتیسواں معاملہ: قبلہ کی تبدیلی کا واقعہ جب ہوا تو یہود نے اس پر طعن کیا اور مشرکین بھی بعض احکام کے منسوخ ہو جانے پر زبان درازی کرتے تھے، حق تعالیٰ ان کے طعن اور اعتراض کا جواب دیتے ہیں کہ:

ہم کسی آیت کا جو حکم موقوف کر دیتے ہیں (اگرچہ آیت قرآن میں یا ذہنوں میں باقی رہے) یا اس آیت (ہی) کو (ذہنوں سے) فراموش کر دیتے ہیں تو (یہ کوئی اعتراض کی بات نہیں، کیونکہ اس میں بھی مصلحت ہوتی ہے، چنانچہ) ہم اس آیت سے بہتر یا اس آیت ہی کے مثل (اس کے بجائے دوسری چیز) لے آتے ہیں (اے معترض!) کیا تجھ کو یہ معلوم نہیں کہ حق تعالیٰ ہر شے پر قدرت رکھتے ہیں (پس ایسے قادر کو مصالح کی رعایت کیا مشکل ہے، اور) کیا تجھ کو یہ معلوم نہیں کہ حق تعالیٰ ایسے ہیں کہ خاص انہی کی سلطنت آسمانوں اور زمین پر ہے (جب ان کی اس قدرت و سلطنت میں کوئی شریک نہیں تو ان مصلحتوں کی رعایت کر کے دوسرا حکم دے دینے میں کون مزاحمت کر سکتا ہے، غرض دوسرا حکم تجویز کرنے سے بھی کوئی مانع نہیں اور اس حکم کے جاری کر دینے میں بھی کوئی مانع نہیں) اور (یہ بھی سمجھ رکھو کہ) تمہارا حق تعالیٰ کے سوا کوئی یار و مددگار بھی نہیں (پس جب وہ ''دوست'' ہیں تو احکام میں مصلحت کی ضرور رعایت کریں گے، اور جب ''مددگار'' ہیں تو ان احکام پر عمل کرنے کے وقت مخالفین کی مزاحمت سے بھی ضرور محفوظ رکھیں گے، البتہ اگر اس نقصان سے بڑھ کر کوئی نفع اخروی ملنے والا ہو تو ظاہراً مخالف کا مسلط ہو جانا اور بات ہے)۔

مَا نَنۡسَخۡ مِنۡ اٰيَةٍ اَوۡ نُنۡسِهَا: دنیا کی حکومتوں اور اداروں میں کسی حکم کو منسوخ کر کے دوسرا حکم جاری کر دینا مشہور و معروف ہے لیکن انسانوں کے احکام میں نسخ کبھی اس لئے ہوتا ہے کہ پہلے کسی غلط فہمی سے ایک حکم جاری کر دیا، بعد میں حقیقت معلوم ہوئی تو حکم بدل دیا، کبھی اس لئے ہوتا ہے کہ جس وقت یہ حکم جاری کیا گیا اس وقت کے حالات کے مناسب تھا اور آگے آنے والے واقعات و حالات کا اندازہ نہ تھا، جب حالات بدلے تو حکم بھی بدلنا پڑا، یہ دونوں صورتیں احکام خداوندی میں نہیں ہو سکتی، ایک تیسری صورت یہ بھی ہوتی ہے کہ حکم دینے والے کو اول ہی سے یہ بھی معلوم تھا کہ حالات بدلیں گے اور اس وقت یہ حکم مناسب نہیں ہوگا دوسرا حکم دینا ہوگا، یہ جانتے ہوئے آج ایک حکم دے دیا اور جب اپنے علم کے مطابق حالات بدلے تو اپنی قرارداد سابق کے مطابق حکم بھی بدل دیا، اس کی مثال ایسی ہے کہ مریض کے موجودہ حالات کو دیکھ کر حکیم یا ڈاکٹر ایک دوا تجویز کرتا ہے اور وہ جانتا ہے کہ دو روز اس دوا کے استعمال کرنے کے بعد مریض کا حال بدلے گا اس وقت مجھے دوسری دوا تجویز کرنا ہوگی، یہ سب جانتے ہوئے وہ پہلے دن ایک دوا تجویز کرتا ہے جو اس دن کے مناسب ہے دو دن کے بعد حالات بدلنے پر دوسری دوا تجویز کرتا ہے، ماہر حکیم ڈاکٹر یہ بھی کر سکتا ہے کہ پہلے ہی دن پورے علاج کا نظام لکھ کر دیدے کہ دو روز تک یہ دوا استعمال کرو، پھر تین روز فلاں دوا، پھر ایک ہفتہ فلاں دوا، لیکن یہ مریض کی طبیعت پر بے وجہ کا ایک بار بھی ڈالنا ہے، اس میں غلط فہمی کی وجہ سے عملی خلل کا بھی خطرہ ہے، اس لئے وہ پہلے ہی سے سب تفصیلات نہیں بتلاتا۔

اللہ جل شانہ کے احکام میں اور اس کی نازل کی ہوئی کتابوں میں صرف یہی آخری صورت نسخ کی ہو سکتی ہے اور ہوتی رہی ہے، ہر آنے والی نبوت اور ہر نازل ہونے والی کتاب نے پچھلی نبوت اور کتاب کے بہت سے احکام کو منسوخ کر کے نئے احکام جاری کئے اور اسی طرح ایک ہی نبوت و

شریعت میں ایسا ہوتا رہا کہ کچھ عرصہ تک ایک حکم رہا، پھر بتقاضائے حکمت خداوندی اس کو بدل کر دوسرا حکم نافذ کر دیا گیا۔

دوسرے حکم کا مصلحت میں بہتر یا مثل ہونا کبھی ثواب کے اعتبار سے ہوتا ہے، کبھی آسانی کے اعتبار سے، اور کبھی دوسرا حکم یہی تجویز ہوتا ہے کہ بالکل ہی معاف کر دیا جائے، یہ بھی ایک حکم ہے، اگر حدیث سے کوئی قرآنی حکم منسوخ ہو تو وہ بھی خدا ہی کا حکم ہے، غرض نسخ کی سب قسمیں اس میں آ گئیں۔

دوسرے حکم کے لیے عقلاً یہ امور ضروری ہیں: ① اس کا قرین مصلحت ہونا ② حاکم کا قادر ہونا ③ دوسرے کسی کا مزاحم نہ ہوسکنا ④ حاکم کا محکومین کے لیے خیر خواہ ہونا ⑤ اگر کوئی ان سے مزاحمت کرے تو ان کی امداد کرنا، ان آیتوں میں حق تعالیٰ نے سب شرطوں کو جمع فرما دیا۔

مَا نَنۡسَخۡ مِنۡ اٰيَةٍ اَوۡ نُنۡسِهَا نَاۡتِ بِخَيۡرٍ مِّنۡهَآ اَوۡ مِثۡلِهَا: اس آیت سے اس طرف بھی اشارہ سمجھا جاتا ہے کہ کوئی بھی ظاہری یا باطنی کیفیت جب بندہ کے قصد وارادہ کے بغیر ختم یا کم ہو جائے تو اللہ تعالیٰ اس سے بہتر یا اس جیسا دوسرا حال عطا فرما دیتے ہیں اس لیے بندہ کو سابقہ کیفیت پر حسرت نہیں کرنی چاہیے کہ کاش وہ کیفیت حاصل ہو جائے۔

* * *

فائدہ: ۱ یہ بھی یہود کا طعن تھا کہ "تمہاری کتاب میں بعض آیات منسوخ ہوتی ہیں اگر یہ کتاب اللہ کی طرف سے ہوتی تو جس عیب کی وجہ سے اب منسوخ ہوئی اس عیب کی خبر کیا خدا کو پہلے سے نہ تھی"، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ عیب نہ پہلی بات میں تھا نہ پچھلی میں لیکن حاکم مناسب وقت دیکھ کر جو چاہے حکم کرے اس وقت وہی مناسب تھا اور اب دوسرا حکم مناسب ہے۔

فائدہ: ۲ یعنی ادھر تو اللہ کی قدرت وملکیت سب پر شامل، ادھر اس کی اپنے بندوں پر اعلیٰ درجہ کی عنایت، تو اب مصالح اور منافع بندوں کی اطلاع اور ان پر قدرت کس کو ہوسکتی ہے، اور اس کے برابر بندوں کی خیر خواہی کون کرسکتا ہے۔

اَمۡ تُرِيۡدُوۡنَ اَنۡ تَسۡـَٔلُوۡا رَسُوۡلَكُمۡ كَمَا سُئِلَ مُوۡسٰى مِنۡ قَبۡلُ ؕ وَمَنۡ يَّتَبَدَّلِ الۡكُفۡرَ

کیا تم مسلمان بھی چاہتے ہو کہ سوال کرو اپنے رسول سے جیسے سوال ہو چکے ہیں موسیٰ سے اس سے پہلے، اور جو کوئی کفر لیوے بدلے

بِالۡاِيۡمَانِ فَقَدۡ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيۡلِ ﴿۱۰۸﴾

ایمان کے تو وہ بہکا سیدھی راہ سے

خلاصہ تفسیر: تینتیسواں معاملہ: بعض یہود نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بطور عناد عرض کیا کہ جس طرح موسیٰ علیہ السلام پر تورات ایک ہی دفعہ میں نازل ہوئی، اسی طرح آپ قرآن مجموعی طور پر لائیے، اس پر ارشاد ہوتا ہے کہ:

ہاں! کیا تم یہ چاہتے ہو کہ اپنے رسول (وقت) سے (بے جا بے جا) درخواستیں کرو جیسا کہ اس کے قبل (تمہارے بزرگوں کی طرف سے حضرت) موسیٰ علیہ السلام سے بھی (ایسی ایسی) درخواستیں کی جا چکی ہیں (مثلاً خدا کو اعلانیہ دیکھنے کی درخواست کی تھی اور ایسی درخواستیں جو صرف رسول اللہ پر اعتراض کرنے اور حکمت الٰہیہ میں مزاحمت کرنے کے لیے ہوں، اور ایمان لانے کا پھر بھی ارادہ نہ ہو نری کفر کی باتیں ہیں، اور) جو شخص ایمان لانے کی بجائے کفر (کی باتیں) کرے، بلاشک وہ شخص راہ راست سے دور جا پڑا۔

اَمۡ تُرِيۡدُوۡنَ اَنۡ تَسۡـَٔلُوۡا: اس درخواست کو "بے جا" اس لئے فرمایا کہ ہر فعل میں اللہ تعالیٰ کی حکمتیں اور مصلحتیں جدا جدا ہوتی ہیں، بندے کو ان میں کوئی طریقہ معین کرنے کا کیا حق ہے کہ وہ کہے کہ یہ بات اس طرح ہو، اس طرح نہ ہو، اس کا کام تو بس بندگی اور اطاعت ہونی چاہئے۔

* * *

فائدہ: یعنی یہودیوں کی باتوں پر ہرگز اعتماد نہ کرنا، جس کسی کو یہودیوں کے شبہ ڈالنے سے شبہ پڑ گیا، وہ کافر ہوا، اس کی احتیاط رکھو اور یہود کے کہنے سے تم اپنے نبی کے پاس شبہے نہ لاؤ، جیسے وہ اپنے نبی کے پاس لاتے تھے۔

وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا ۚۖ حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ

دل چاہتا ہے بہت سے اہل کتاب کا کہ کسی طرح تم کو پھیر کر مسلمان ہوئے پیچھے کافر بنا دیں ،بسبب اپنے دلی حسد کے

مِّنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۚ فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ

بعد اس کے کہ ظاہر ہو چکا ان پر حق ۱؎ سو تم درگزر کرو اور خیال میں نہ لاؤ جب تک بھیجے اللہ اپنا حکم ۲؎

اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۰۹﴾

بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے ۳؎

خلاصہ تفسیر: چونتیسواں معاملہ: بعض یہود دن رات مختلف تدبیروں سے دوستی اور خیر خواہی کے پیرایہ میں مسلمانوں کو اسلام سے پھیرنے کی کوشش کیا کرتے تھے اور ناکامی کے باوجود اپنی دھن سے باز نہ آتے تھے، حق تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس پر متنبہ فرمادیا کہ:

ان اہل کتاب (یعنی یہود) میں بہتیرے دل سے یہ چاہتے ہیں کہ تم کو تمہارے ایمان لائے پیچھے (ایمان لانے کے بعد) پھر کافر کرڈالیں (اور یہ چاہنا کچھ خیر خواہی سے نہیں، جیسا کہ وہ اظہار کرتے ہیں، بلکہ) محض حسد کی وجہ سے جو کہ (تمہاری جانب سے کسی بات کے سبب پیدا نہیں ہوا، بلکہ) خود ان کے دلوں ہی سے (جوش مارتا) ہے (اور یہ بھی نہیں کہ ان کو حق واضح نہ ہوا ہو، بلکہ) حق واضح ہوئے پیچھے (ہونے کے بعد یہ حالت ہے، اب اس پر مسلمانوں کو ان پر غصہ آنے کا محل تھا، اس لئے ارشاد ہوتا ہے کہ) خیر (اب تو) معاف کرو اور درگذر کرو جب تک اللہ تعالیٰ (اس معاملہ کے متعلق) اپنا حکم (جدید قانون) بھیجیں (اشارۃ بتلادیا کہ ان کی شرارتوں کا علاج قانون انتظام امن عام یعنی قتل وجزیہ سے ہم جلد کرنے والے ہیں، اس پر مسلمانوں کو اپنی کمزوری اور ان کی قوت دیکھ کر اس قانون کے جاری ہونے کے متعلق تعجب ہوسکتا تھا، اس پر ارشاد ہوتا ہے کہ تم تعجب کیوں کرتے ہو) اللہ تعالیٰ ہر چیز پر (خواہ وہ معمولی ہو، خواہ عجیب ہو) قادر ہیں۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی بہت سے یہودیوں کو آرزو ہے کہ اسی طرح تم کو اے مسلمانوں پھیر کر پھر کافر بنادیں، حالانکہ ان کو واضح ہو چکا ہے کہ مسلمانوں کا دین، ان کی کتاب، ان کا نبی سب سچے ہیں۔

فائدہ: ۲؎ یعنی جب تک ہمارا حکم کوئی نہ آوے اس وقت تک یہود کی باتوں پر صبر کرو، سو آخر کو حکم آگیا کہ یہود کو مدینہ کے گرد سے نکال دو۔

فائدہ: ۳؎ یعنی اپنے ضعف سے تردد مت کرو اللہ تعالیٰ اپنی قدرت سے تم کو عزیز اور یہود کو ذلیل کریگا، یا یہ کہ تاخیر عجز کی وجہ سے نہیں کی جاتی۔

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ؕ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ

اور قائم رکھو نماز اور دیتے رہو زکوٰۃ ،اور جو کچھ آگے بھیج دو گے اپنے واسطے بھلائی پاؤ گے اس کو اللہ کے پاس

اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۱۰﴾

بیشک اللہ جو کچھ تم کرتے ہو سب دیکھتا ہے

خلاصہ تفسیر: اور (سردست صرف) نمازیں پابندی سے پڑھے جاؤ اور (جن پر زکوٰۃ فرض ہے) زکوٰۃ دیئے جاؤ (اور جب وہ قانون آجائے گا تو ان اعمال صالحہ کے ساتھ اس کا بھی اضافہ کرلینا) اور (یہ نہ سمجھو کہ جب تک جہاد کا حکم نہ آئے، صرف نماز روزہ سے کچھ ثواب میں کمی

رہے گی، نہیں! بلکہ) جو نیک کام بھی اپنی بھلائی کے واسطے جمع کرتے رہو گے، حق تعالیٰ کے پاس (پہنچ کر) اس کو (پورا پورا صلہ کے ساتھ) پالو گے کیونکہ اللہ تعالیٰ تمہارے سب کئے ہوئے کاموں کی دیکھ بھال کر رہے ہیں (ان میں ایک ذرہ بھی ضائع نہ ہونے پائے گا، اس وقت کی حالت کا یہی تقاضہ تھا، پھر حق تعالیٰ نے اس وعدے کو پورا فرمایا اور جہاد کی آیات نازل ہوئیں، جس کے بعد یہود کے ساتھ بھی وہ قانون برتا گیا اور ناشائستہ لوگوں کے ساتھ ان کے فساد کے مطابق قتل یا جلاوطنی یا جزیہ پر عملدرآمد کیا گیا)۔

***

فائدہ: یعنی ان کی ایذاء پر صبر کرو اور عبادات میں مشغول رہو، اور اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں سے غافل ہرگز نہیں، تمہاری کوئی نیک بات ضائع نہیں ہوسکتی۔

وَقَالُوا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ

اور کہتے ہیں کہ ہرگز نہ جاینگے جنت میں مگر جو ہوں گے یہودی یا نصرانی ۱؎ یہ آرزوئیں باندھ لی ہیں انہوں نے، کہہ دے لے آؤ سند اپنی

اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۱۱﴾ بَلٰى ۚ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗٓ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۪

اگر تم سچے ہو، کیوں نہیں جس نے تابع کر دیا منہ اپنا اللہ کے اور وہ نیک کام کرنے والا ہے تو اسی کیلئے ہے ثواب اس کا اپنے رب کے پاس

وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ ع

اور نہ ڈر ہے ان پر اور نہ وہ غمگین ہوں گے ۲؎

خلاصہ تفسیر: پینتیسواں معاملہ: اس مضمون میں یہود کے ساتھ نصاریٰ بھی شریک تھے، اس لیے ان کو بھی ذکر میں لے لیا گیا:

اور یہود نصاریٰ (یوں) کہتے ہیں کہ بہشت میں ہرگز کوئی نہ جانے پائے گا بجز ان لوگوں کے جو یہودی ہوں (یہ تو یہود کا قول ہے) یا ان لوگوں کے جو نصرانی ہوں (یہ نصاریٰ کا قول ہے، حق تعالیٰ ان دونوں کا رد فرماتے ہیں کہ) یہ (خالی) دل بہلانے کی باتیں ہیں (اور حقیقت کچھ بھی نہیں) آپ (ان سے یہ تو) کہیے کہ (اچھا) اپنی دلیل لاؤ اگر تم (اس دعوی میں) سچے ہو (سو وہ تو کیا دلیل لائیں گے، کیونکہ کوئی دلیل ہے ہی نہیں)۔

(اب ہم ان کے خلاف پہلے تو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ) ضرور دوسرے لوگ (بھی جنت میں) جائیں گے (پھر اس پر دلیل لاتے ہیں کہ ہمارا یہ قانون تمام آسمانی کتب میں باتفاق ثابت ہو چکا ہے کہ) جو کوئی شخص بھی اپنا رخ اللہ تعالیٰ کی طرف جھکا دے (یعنی فرمانبرداری اختیار کرے عقائد میں بھی، اعمال میں بھی) اور (اس کے ساتھ) وہ مخلص بھی ہو (کہ دل سے فرمانبرداری اختیار کرے، محض مصلحت سے ظاہرداری نہ ہو، "مخلص" کی قید سے منافقین نکل گئے، کیونکہ وہ شرعاً کافر اور جہنم کے مستحق ہیں) تو ایسے شخص کو اس (کی فرمانبرداری) کا عوض ملتا ہے پروردگار کے پاس پہنچ کر اور نہ ایسے لوگوں پر (قیامت میں) کوئی اندیشہ (ناک واقعہ پڑنے والا) ہے، اور نہ ایسے لوگ (اس روز) مغموم ہونے والے ہیں (کیونکہ فرشتے ان کو بشارتیں سنا کر بے فکر کر دیں گے)۔

استدلال کا حاصل یہ ہوا کہ جب یہ قانون مسلم ہے تو اب صرف یہ دیکھ لو کہ یہ بات کس پر صادق آتی ہے؟ سو ظاہر ہے کہ تم فرمانبردار نہیں ہو، کیونکہ منسوخ دین پر اصرار کیے ہوئے ہو، لہذا یہود و نصاریٰ فرمانبردار نہ ہوئے، بلکہ اب حکم ثانی پر عمل کرنا فرمانبرداری سمجھی جائے گی، اور پوری تابع داری یہ ہے کہ جس وقت بھی حکم ملے اس کو مان لیا جائے اور یہ شان مسلمانوں کی ہے کہ انہوں نے نبوت و شریعت محمدیہ کو قبول کیا، چنانچہ یہی جنت کے مستحق ہیں۔

وَقَالُوا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ (الی قولہ) بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ: اس سے پتہ چلتا ہے کہ فلاح و کامیابی کا تعلق محنت اور کوشش پر

ہے، محض نسبتوں پر نہیں کہ ہمارے باپ دادا یا پیر وغیرہ ہمیں بچالیں گے کیونکہ وہ نیک لوگ تھے، بلکہ جو جتنی محنت کرے گا اتنی بڑی کامیابی اس کو حاصل ہوگی، یہود و نصاریٰ دونوں فریقین کا بنیادی دعویٰ بھی محض نسبت کا ہی تھا۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی یہودی تو کہتے ہیں کہ بجز ہمارے کوئی جنت میں نہ جائے گا اور نصاریٰ کہتے تھے کہ بجز ہمارے کوئی بہشت میں نہ جائے گا۔

فائدہ: ۱؎ یعنی جس نے خدا کے احکام کو مانا اور اس کا اتباع کیا، وہ احکام خواہ کسی نبی کے ذریعہ سے معلوم ہوں، اور اپنی قومیت اور آئین پر تعصب نہ کیا، جیسا کہ یہود کرتے ہیں تو ان کے لئے اجر نیک ہے، اور نہ کوئی امر ان میں ایسا ہے جس کی وجہ سے خوف ہو، اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ ۠ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَيْءٍ ۙ

اور یہود تو کہتے ہیں کہ نصاریٰ نہیں کسی راہ پر، اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ یہود نہیں کسی راہ پر

وَّهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ۭ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ

باوجودیکہ وہ سب پڑھتے ہیں کتاب ۱؎ اسی طرح کہا ان لوگوں نے جو جاہل ہیں ان ہی کی سی بات، اب اللہ حکم کریگا ان میں

يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۱۳﴾

قیامت کے دن جس بات میں جھگڑتے تھے ۲؎

خلاصہ تفسیر: چھتیسواں معاملہ: ایک بار کچھ یہودی اور کچھ نصرانی جمع ہو کر مذہبی مباحثہ کرنے لگے تو یہود اپنے عقیدہ کے مطابق نصاریٰ کے دین کو باطل بتاتے اور عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت اور انجیل کے کتاب اللہ ہونے کا انکار کرتے تھے، نصاریٰ بھی ضد و تعصب میں آ کر یہود کے دین کو بے اصل و باطل کہنے لگے اور موسیٰ علیہ السلام کی رسالت اور توریت کے کتاب اللہ ہونے کا انکار کرنے لگے، اللہ تعالیٰ اس قصہ کو نقل فرما کر رد کرتے ہیں۔

اور یہود کہنے لگے کہ نصاریٰ (کا مذہب) کسی بنیاد پر (قائم) نہیں (یعنی سرے سے غلط ہے) اور اسی طرح نصاریٰ کہنے لگے کہ یہود (کا مذہب) کسی بنیاد پر (قائم) نہیں (یعنی سرے سے غلط ہے) حالانکہ یہ سب (فریقین کے لوگ آسمانی) کتابیں بھی پڑھتے (پڑھاتے) ہیں (یعنی یہودی تورات کو اور عیسائی انجیل کو پڑھتے دیکھتے ہیں اور دونوں کتابوں میں دونوں رسولوں اور دونوں کتابوں کی تصدیق موجود ہے جو کہ دونوں مذہبوں کی اصل بنیاد ہے، اگرچہ منسوخ ہو جانے کی بنا پر قابل عمل نہ ہو یہ اور بات ہے)۔

(اور اہل کتاب تو ایسے دعوے کرتے ہی تھے، ان کی دیکھا دیکھی مشرکین کو بھی جوش آیا اور) اسی طرح سے یہ لوگ (بھی) جو کہ (محض) بے علم ہیں، ان (ہی اہل کتاب) کا سا قول دہرانے لگے (کہ ان یہود و نصاریٰ سب کا دین بے بنیاد ہے، حق پر بس ہم ہی ہیں) سو (یہاں سب اپنی اپنی ہانک لیں) اللہ تعالیٰ ان سب کے درمیان (عملی) فیصلہ کر دیں گے قیامت کے دن ان تمام مقدمات میں جن میں وہ باہم اختلاف کر رہے تھے۔

فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ: وہ عملی فیصلہ یہ ہوگا کہ اہل حق کو جنت میں اور اہل باطل کو جہنم میں بھیج دیا جائے گا، ''عملی فیصلہ'' کی قید اس لئے لگائی کہ قولی اور برہانی فیصلہ تو عقلی اور نقلی دلائل کے ذریعہ دنیا میں بھی ہو چکا ہے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یہودیوں نے تورات پڑھ کر سمجھ لیا کہ جب نصرانیوں نے حضرت عیسیٰ کو خدا کا بیٹا کہا، تو بیشک وہ کافر ہو گئے اور نصرانیوں نے انجیل میں صاف دیکھ لیا کہ یہودی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کا انکار کر کے کافر ہو گئے۔

فائدہ: ۲؎ ان جاہلوں سے مشرکین عرب اور بت پرست مراد ہیں، یعنی جیسے یہود و نصاریٰ ایک دوسرے کو گمراہ جانتے ہیں، اسی طرح بت

پرست بھی اپنے سوا سب فرقوں کو گمراہ اور بے دین بتلاتے ہیں، سو دنیا میں کہتے جائیں قیامت کو فیصلہ ہو جائے گا۔

فائدہ: یہاں یہ شبہ ہوتا ہے کہ جب كَذٰلِكَ فرما دیا تو پھر مِثْلَ قَوْلِهِمْ فرمانے کی کیا حاجت؟ بعض مفسرین نے جواب دیا کہ مِثْلَ قَوْلِهِمْ توضیح اور تاکید ہے كَذٰلِكَ کے لئے، اور بعض کہتے ہیں کہ یہاں (۲) دو تشبیہ جدا جدا ہیں، اس لیے دو لفظ لائے: ① ایک تشبیہ سے تو یہ غرض ہے کہ ان کا اور ان کا مقولہ باہم مشابہ ہیں (یعنی جیسے وہ دوسروں کو گمراہ کہتے ہیں ایسا ہی یہ بھی) اور ② ایک تشبیہ سے یہ غرض ہے کہ جیسا اہل کتاب یہ دعویٰ بے دلیل اپنی ہوائے نفس اور عداوت سے کرتے تھے، ایسے ہی بت پرست بھی بے دلیل محض خواہش نفسانی سے ایسا دعویٰ کرتے ہیں۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِيْ خَرَابِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ

اور اس سے بڑا ظالم کون جس نے منع کیا اللہ کی مسجدوں میں کہ لیا جائے وہاں نام اسکا اور کوشش کی انکے اجاڑنے میں ۱؎ ایسوں کو لائق نہیں

اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَآئِفِيْنَ ؕ لَهُمْ فِى الدُّنْيَا خِزْىٌ وَّلَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۱۴﴾

کہ داخل ہوں ان میں مگر ڈرتے ہوئے ۲؎ ان کے لئے دنیا میں ذلت ہے ۳؎ اور ان کے لئے آخرت میں بڑا عذاب ہے

خلاصہ تفسیر: سینتیسواں معاملہ: یہود تو مساجد اور خصوصاً مسجد نبوی کی ویرانی میں اس طرح کوشاں ہوئے کہ قبلہ کا حکم بدلنے پر کم سمجھ لوگوں کو طرح طرح کے شبہات پیدا کر کے بہکانا چاہا، اگر ان کا اثر ہو جاتا تو اس کا لازمی نتیجہ انکار رسالت اور ترک نماز ہوتا، اور نصاریٰ مساجد کی ویرانی میں اس طرح ساعی ہوئے کہ کسی وقت میں نصاریٰ کے اسلاف میں سے ایک رومی بادشاہ نے جس کا نام طیطس تھا شام کے یہودیوں پر چڑھائی کی، قتل و قتال بھی ہوا، اس وقت بعض جہلاء کے ہاتھ سے بیت المقدس کی بے حرمتی ہوئی اور بدامنی کی وجہ سے نماز بھی بند رہی، اس طور پر نصاریٰ کے اسلاف ترک نماز اور ویرانی مسجد کے بانی ہوئے، اور نصاریٰ ان کی اس حرکت کا انکار بھی نہ کرتے تھے، وہ بادشاہ اگرچہ نصرانی نہ ہو مگر نصاریٰ کو اس واقعہ سے اس لیے خوشی ہوئی کہ یہود کی ذلت ہوئی، اور یہود سے ان کو دشمنی تھی، اور مشرکین مسجد حرام کی ویرانی میں اس طرح ساعی ہوئے کہ حضور ﷺ نے فتح مکہ سے قبل مکہ مکرمہ میں داخل ہو کر طواف کعبہ اور نماز ادا کرنا چاہی تو مشرکین نے آپ کو مکہ سے باہر ہی روک دیا، پھر اگلے سال صلح حدیبیہ کے بعد آپ نے عمرۃ القضاء کیا، حق تعالیٰ عموم کے ساتھ ان سب کی قباحت اور برائی ظاہر فرماتے ہیں۔

اور اس شخص سے زیادہ اور کون ظالم ہو گا جو خدا تعالیٰ کی مسجدوں میں (جس میں مکہ کی مسجد حرام، مدینہ کی مسجد، بیت المقدس کی مسجد اور تمام مسجدیں آگئیں) ان کا ذکر (اور عبادت) کئے جانے سے بندش کرے، اور ان (مساجد) کے ویران (اور معطل) ہونے (کے بارے) میں کوشش کرے، ان لوگوں کو تو کبھی بے ہیبت (اور بے باک) ہو کر ان (مساجد) میں قدم بھی نہ رکھنا چاہئے تھا (بلکہ جب جاتے تو نہایت عظمت، احترام اور ادب سے جاتے جب بے باک ہو کر اندر جانے تک کا حق نہیں تو اس کی ہتک حرمت کا حق کب حاصل ہے، اسی کو ظلم فرمایا گیا) ان لوگوں کو دنیا میں بھی رسوائی (نصیب) ہو گی اور ان کو آخرت میں بھی سزائے عظیم ہو گی۔

لَهُمْ فِى الدُّنْيَا خِزْىٌ: دنیا میں تو رسوائی یہ ہوئی کہ یہ سب قومیں اسلامی سلطنت کی رعایا اور باج گزار ہوئیں، اور آخرت کا عذاب تو کافر ہونے کی وجہ سے ظاہر ہی ہے، اور ویرانی مساجد میں کوشش کے سبب یہ عذاب اور بھی سخت و شدید ہو جائے گا، اور پیچھے آیت: وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَىْءٍ میں جو ان تینوں فرقوں کا حق پر ہونے کا دعویٰ بیان ہوا تھا اس ویرانی مساجد کے قصہ سے اس کے رد کا ایک گونہ مفہوم بھی نکل آیا کہ جن کے ایسے ایسے کرتوت ہوں اور وہ اہل حق ہونے کا دعویٰ کریں تو یہ بڑے شرم کی بات ہے۔

جن نصاریٰ نے بیت المقدس کی بے حرمتی میں حصہ لیا تھا وہ اگرچہ اس وقت موجود نہ تھے، مگر موجودہ نصاریٰ بھی اس فعل سے نفرت ظاہر نہ کرتے تھے، بلکہ یہود کی ذلت کی وجہ سے اس قصہ سے خوش تھے اس لیے ان کو بھی ظالم کہا گیا جو بالکل بجا اور برمحل ہے۔

✽ ✽ ✽

فائدہ: ۱؎ اس کے شان نزول نصاریٰ ہیں کہ انہوں نے یہود سے مقاتلہ کر کے تورات کو جلایا اور بیت المقدس کو خراب کیا، یا مشرکین مکہ کہ انہوں نے مسلمانوں کو محض تعصب وعناد سے حدیبیہ میں مسجد حرام (بیت اللہ) میں جانے سے روکا، باقی جو شخص کسی مسجد کو ویران یا خراب کرے وہ اسی حکم میں داخل ہے۔

فائدہ: ۲؎ یعنی ان کفار کو لائق یہی تھا کہ مساجد اللہ میں خوف وتواضع اور ادب وتعظیم کے ساتھ داخل ہوتے کفار نے جو وہاں کی بے حرمتی کی یہ صریح ظلم ہے، یا یہ مطلب ہے کہ اس ملک میں حکومت اور عزت کے ساتھ رہنے کے لائق نہیں، چنانچہ یہی ہوا کہ ملک شام اور مکہ اللہ نے مسلمانوں کو دلوادیا۔

فائدہ: ۳؎ یعنی دنیا میں مغلوب ہوئے، قید میں پڑے مسلمانوں کے باج گذار ہوئے۔

وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۱۵﴾

اور اللہ ہی کا ہے مشرق اور مغرب، سو جس طرف تم منہ کرو وہاں ہی متوجہ ہے اللہ ۱؎ بیشک اللہ بے انتہا بخشش کرنے والا سب کچھ جاننے والا ہے ۲؎

خلاصہ تفسیر: اڑتیسواں معاملہ: یہود نے تبدیل قبلہ کے حکم پر اعتراض کیا تھا کہ مسلمان اس جہت سے دوسری جہت کی طرف کیوں پھر گئے؟ اب اس کا جواب حق تعالیٰ دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

اور اللہ ہی کی مملوک ہیں (سب جہتیں) مشرق بھی اور مغرب بھی (پس جب وہ مالک ہیں، جس جہت کو چاہیں قبلہ مقرر کر دیں، کیونکہ قبلہ کی تعیین میں جو حکمت ہے مثلاً عبادت کرنے والوں کا ہیئت میں متفق ہونا اور اجتماع خاطر یہ حکمت ہر جہت سے حاصل ہوسکتی ہے، جس کا حکم دے دیں وہی متعین ہوجائے گی، ہاں! البتہ اگر معبود کی ذات نعوذ باللہ کسی جہت خاص کے ساتھ مقید ہوتی تو ضرورت کی وجہ سے قبلہ اسی جہت میں منحصر ہونا زیبا تھا، لیکن وہ ذات پاک کسی جہت کے ساتھ مقید ومحدود نہیں، جب یہ بات ہے) تو تم لوگ جس طرف منہ کرو ادھر (ہی) اللہ تعالیٰ کی (ذات پاک) کا رخ ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ (خود تمام جہات اور اشیاء کو) محیط ہیں (جس طرح کا احاطہ ان کی شان کے لائق ہے، لیکن باوجود محیط اور غیر محدود ہونے کے پھر بھی عبادت کی جہت کو اس لیے متعین فرمادیا کہ وہ) کامل العلم ہیں (ہر شے کے مصالح کو خوب جانتے ہیں، چونکہ ان کے علم میں یہ تعیین بعض مصالح سے تھی، اس لئے اس کا حکم دے دیا)۔

فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ: اس میں اس بات پر دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کسی جہت کے ساتھ مقید نہیں، یہ جو فرمایا: ''ادھر ہی اللہ کا رخ ہے'' اور اسی طرح یہ جو فرمایا کہ ''وہ محیط ہے'' اور ایسے ہی جو بھی مضامین ہوں، ان سب میں زیادہ کھود کرید نہیں کرنی چاہئے، کیونکہ جس طرح اللہ تعالیٰ کی ذات کا پورا ادراک کسی بندہ سے ممکن نہیں، اسی طرح ان کی صفات کی حقیقت بھی فہم سے خارج ہے، اجمالاً ان سب پر ایمان لے آئے، اس سے زیادہ کا انسان مکلف نہیں۔

تعیین قبلہ کی جو ایک حکمت بطور مثال اوپر بیان کی گئی، اس سے بعض مخالفین اسلام کا یہ اعتراض کہ ''مسلمان کعبہ پرست ہیں'' بالکل اٹھ گیا، جواب کا خلاصہ یہ ہوا کہ: ① عبادت و پرستش تو خدا تعالیٰ کی ہے، لیکن عبادت کے وقت یکسوئی قلب کی ضرورت ہے، نیز عابدین کی اجتماعی ہیئت کو بھی اس یکسوئی میں دخل ہے، چنانچہ یہ دونوں باتیں تجربہ ومشاہدہ سے ثابت ہیں، اس لئے اس یکسوئی اور اجتماع ہیئت حاصل کرنے میں تعیین جہت مشروع ہوئی، لہٰذا اس اعتراض وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں، اور اگر اس پر کوئی اپنی برات کے لئے یہ دعویٰ کرے کہ ہم بھی بتوں کو سامنے اسی قصد وغرض سے رکھتے ہیں، تو اول تو اپنی براءت کے دعوے سے مسلمانوں پر مذکورہ اعتراض نہیں لوٹتا، وہ بدستور مرتفع رہا، جو اس مقام پر مقصود اصلی ہے۔

② ثانیاً عام مسلمانوں اور عام کافروں کی حالت تفتیش کرنے سے عدم پرستش کے دعوے میں مسلمانوں کا سچا ہونا اور دوسروں کا جھوٹا ہونا ہر وقت ہر شخص کو معلوم ہوسکتا ہے۔

③ تیسرے علیٰ سبیل التنزل کہا جاتا ہے کہ اگر اس دعوے کی سچائی مان بھی لی جائے، پھر بھی اس تعیین اور تقیید کے لئے کسی غیر منسوخ شریعت

کا حکم پیش کرنا لازم ہے، اور یہ بجز اہل اسلام کے دوسروں کے پاس مفقود ہے۔

ترجمہ وتفسیر کے ضمن میں بیان حکمت کے لئے جو لفظ ''مثلاً'' اضافہ کیا گیا ہے، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ احکام خداوندی کی حکمتیں اور مصلحتیں انحصار اور استیعاب کے ساتھ کسی کے ادراک میں نہیں آسکتیں، سو اس حکم میں بھی ہزاروں حکمتیں ہوں گی، ایک دو کے سمجھ جانے سے ان میں انحصار اور دوسروں کی نفی نہیں ہوسکتی۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یہ بھی یہود و نصاریٰ کا جھگڑا تھا کہ ہر کوئی اپنے قبلہ کو بہتر بتاتا تھا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ''اللہ مخصوص کسی طرف نہیں، بلکہ تمام مکان اور جہت سے منزہ، البتہ اس کے حکم سے جس طرف منہ کرو گے، وہ متوجہ ہے، تمہاری عبادت قبول کرے گا''، بعض نے کہا سفر میں سواری پر نوافل پڑھنے کی بابت یہ آیت اتری، یا سفر میں قبلہ مشتبہ ہوگیا تھا جب اتری۔

فائدہ: ۲؎ یعنی اس کی رحمت سب جگہ عام ہے، ایک مکان کے ساتھ مخصوص نہیں اور بندوں کے مصالح اور ان کی نیتوں کو اور ان کے اعمال کو سب کو خوب جانتا ہے کہ بندوں کے حق میں کون سی شئ مفید ہے اور کون سی مضر، اسی کے موافق حکم دیتا ہے اور جو اس کی موافقت کرے گا اس کو جزا اور مخالف کو سزا دے گا۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ﴿۱۱۶﴾

اور کہتے ہیں کہ اللہ رکھتا ہے اولاد، وہ تو سب باتوں سے پاک ہے، بلکہ اسی کا ہے جو کچھ ہے آسمان اور زمین میں، سب اسی کے تابعدار ہیں

بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۱۱۷﴾

نیا پیدا کرنیوالا ہے آسمان اور زمین کا، اور جب حکم کرتا ہے کسی کام کو تو یہی فرماتا ہے اس کو کہ ہو جا پس وہ ہو جاتا ہے

خلاصہ تفسیر: انتالیسواں معاملہ: بعض یہودی حضرت عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہتے تھے، نصاریٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اور مشرکین عرب ملائکہ کو خدا کی بیٹیاں، جیسا مختلف آیات میں ان اقوال کی خبر دی گئی ہے، حق تعالیٰ اس قول کی قباحت اور باطل ہونا بیان فرماتے ہیں:

اور یہ لوگ (مختلف عنوان سے) کہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ اولاد رکھتا ہے، سبحان اللہ! (کیا مہمل بات ہے) بلکہ (ان کے تو اولاد ہونا عقلاً ممکن نہیں، کیونکہ اولاد ہونا دو حال سے خالی نہیں، یا تو اولاد غیر جنس ہوگی، یا ہم جنس ہوگی، اگر غیر جنس ہو تب تو ناجنس اولاد ہونا عیب ہے، اور حق تعالیٰ عیب سے پاک ہیں، عقلاً بھی مسلم ہے، اور نقلاً بھی جیسا سُبحٰنہ کا بھی مدلول ہے، اور اگر اولاد ہم جنس ہو تو اس لئے باطل ہے کہ حق تعالیٰ کا کوئی ہم جنس نہیں، کیونکہ جو صفات کمال واجب الوجود ذات کے لیے لازم ہیں وہ صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہیں اور غیر اللہ میں معدوم ہیں، کیونکہ اس کے لیے دوسرے ہم جنس کا ہونا ضروری ہے جس میں صفات کمال موجود ہوں، اور اللہ کے علاوہ ایسا کوئی نہیں، چنانچہ ہم جنس ہونا بھی باطل ہوگیا، اب صفات کمال کا حق تعالیٰ کے ساتھ خاص ہونا بیان فرماتے ہیں جس سے ہم جنس کا ممتنع ہونا اور اس سے نتیجہ کے طور پر اولاد کا محال ہونا ثابت ہوجائے گا، اول یہ کہ) خاص اللہ تعالیٰ کے مملوک ہیں جو کچھ بھی آسمانوں اور زمین میں (موجودات) ہیں (اور دوسرے یہ کہ مملوک ہونے کے ساتھ) سب ان کے محکوم (بھی) ہیں (بایں معنیٰ کہ ان کے تصرفات قدرت جیسے مارنا جلانا وغیرہ کو کوئی نہیں ہٹا سکتا، اگرچہ احکام شرعیہ کو کوئی ٹال دے)

(اور تیسرے یہ کہ حق تعالیٰ) موجد (بھی) ہیں آسمانوں اور زمین کے اور (چوتھے یہ ایجاد کی بھی قدرت ایسی عظیم وعجیب ہے کہ) جب کسی کام کا (مثلاً پیدا ہی کرنا ہے) پورا کرنا چاہتے ہیں تو بس (اتنی بات ہے کہ) اس کو (اتنا) فرما دیتے ہیں کہ ہو جا، بس وہ (اسی طرح) ہو جاتا ہے (ان کو آلات واسباب، کاریگروں اور مددگاروں کی ضرورت نہیں پڑتی، اور یہ چاروں باتیں حق تعالیٰ کے سوا کسی میں نہیں پائی جاتیں اور یہ اولاد کا دعویٰ کرنے

والوں کے بھی مسلمات میں سے تھا، پس دلیل سے مقدمہ اختصاص بھی ثابت ہو کر حجت تمام ہوگئی)۔

واضح رہے کہ خاص خاص کاموں پر خاص خاص ملائکہ کو مقرر کرنا، مثلاً بارش، رزق وغیرہ اور اسی طرح اسباب اور مواد اور قُویٰ سے کام لینا، یہ سب کسی حکمت خداوندی پر مبنی ہوتا ہے، اس لئے نہیں کہ لوگ انہیں اسباب وقوات کو حاجت روا مان کر استعانت و مدد کے طلب گار ہوں۔

يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ: یعنی عدم محض سے وجود میں آجا، نیست سے ہست ہوجا، یقول "فرمادیتے ہیں" کا مطلب یہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ ہماری آپ کی طرح یہ دو حرفی لفظ "کن" بولتا ہے، لفظ و حروف تو خود ہی حادث ہیں اور نہ حق تعالیٰ کا تلفظ زبان، ہونٹ یا اعصاب کا محتاج ہے، بندوں کی سمجھ کے لائق قریب سے قریب پیرایہ بیان اور اسلوب تعبیر اختیار کیا گیا، مقصود صرف اس قدر ہے کہ ادھر حق تعالیٰ کا ارادہ ہوا اور ادھر معا اور بلا توسط وتوقف اس کا ظہور عملاً ہوگیا، لہ میں ضمیر اس چیز کی جانب ہے جس کا وجود ابھی خارج میں ہوا لیکن علم الٰہی میں تو بہر حال موجود ہی ہے، اور امر الٰہی کے اعتبار سے مامور و موجود میں زمانی حیثیت سے کوئی فرق ہی نہیں، ہر مامور کے معنی موجود ہونے کے ہیں اور ہر موجود کے معنی مامور ہونے کے ہیں، کن فیکون کان یہاں تامہ ہے، ناقصہ نہیں، یعنی "ہوجا" وجود میں آجانے کے مرادف ہے، فلاں چیز ہوجا یا بن جا کے مرادف نہیں، یعنی بس وہ شے معا وجود میں آجاتی ہے، اس کے ہونے میں نہ کچھ دیر لگتی ہے نہ اس کے لیے کسی شریک کی اعانت وساطت کی ضرورت ہوتی ہے۔

* * *

فائدہ: یہود حضرت عزیر کو اور نصاریٰ حضرت عیسیٰ کو خدا کا بیٹا کہتے تھے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس کی ذات سب باتوں سے پاک ہے، بلکہ سب کے سب اس کے مملوک اور مطیع اور مخلوق ہیں۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْ لَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَآ اٰيَةٌ ۭ كَذٰلِكَ قَالَ

اور کہتے ہیں وہ لوگ جو کچھ نہیں جانتے کیوں نہیں بات کرتا ہم سے اللہ یا کیوں نہیں آتی ہمارے پاس کوئی آیت [1] اسی طرح کہہ چکے ہیں

الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ۭ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ ۭ قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿۱۱۸﴾

وہ لوگ جو ان سے پہلے تھے انہی کی سی بات، ایک سے ہیں دل انکے، بیشک ہم نے بیان کردیں نشانیاں ان لوگوں کے واسطے جو یقین لاتے ہیں [2]

خلاصہ تفسیر: (چالیسواں معاملہ:) اور (بعض) جاہل (یہود و نصاریٰ اور مشرکین رسول اللہ ﷺ کے مقابلہ میں) یوں کہتے ہیں کہ (خود) اللہ تعالیٰ ہم سے کلام کیوں نہیں فرماتے (خواہ فرشتوں کے بغیر، جیسے خود فرشتوں سے کلام فرماتے ہیں یا فرشتوں کے واسطے سے، جیسے پیغمبروں سے بطور وحی بات کرتے ہیں، اور اس کلام میں یا تو خود ہم کو احکام بتادیں کہ دوسرے رسول کی ہم کو ضرورت ہی نہ رہے، یا کم از کم اتنا ہی کہہ دیں کہ محمد ہمارے رسول ہیں، تو ہم ان کی رسالت کے قائل ہو کر ان کی اطاعت کرنے لگیں) یا (کلام نہیں کرتے تو) ہمارے پاس کوئی اور ہی دلیل (ثبوت رسالت کی) آجائے (حق تعالیٰ پہلے اس بات کا جاہلانہ رسم ہونا بتلاتے ہیں کہ) اس طرح وہ (جاہل) لوگ بھی کہتے چلے آئے ہیں جو ان سے پہلے ہو گذرے ہیں، ان ہی کا سا (جاہلانہ) قول (سو معلوم ہوا کہ یہ قول کوئی باوقعت اور باریک بینی پر مبنی نہیں، یوں ہی ہانک دیا جاتا ہے، پھر ثانیاً اس قول کا منشاء اور سبب بیان فرماتے ہیں کہ) ان سب (اگلے پچھلے جاہلوں) کے قلوب (کج فہمی میں) باہم ایک دوسرے کے مشابہ ہیں (اس لئے سب سے بات بھی ایک ہی سی پیدا ہوئی، پھر ثالثاً اس قول کا جواب دیتے ہیں اور چونکہ اس قول کا پہلا جز محض حماقت تھا کہ اپنے آپ کو اس لیاقت پر ملائکہ اور انبیاء کا ہم پلہ بنانا چاہتے تھے، جو بالکل ہی باطل ہے، اس لئے اس احمقانہ بات کو نظر انداز کرکے صرف دوسرے جز کا جواب ارشاد ہوتا ہے کہ تم ایک دلیل کو لئے پھرتے ہو) ہم نے تو بہت سی دلیلیں (رسالت محمدیہ کے ثبوت میں) صاف صاف بیان کردی ہیں (مگر وہ) ان لوگوں کے لئے (نافع و کافی ہوسکتی ہیں) جو یقین (اور اطمینان حاصل کرنا) چاہتے ہیں (اور چونکہ معترضین کو محض ضد اور کد ہی مقصود ہے اس لئے حق طلبی کی نظر سے ان کو تحقیق ہی منظور نہیں، سو

ایسوں کی تسلی وتشفی کا کون ذمہ دار بنے)۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ: یہود ونصاریٰ تو اہل کتاب تھے، ان میں اہل علم بھی تھے، اس کے باوجود جوان کو اللہ تعالیٰ نے ''جاہل'' فرمایا تو اس لئے کہ باوجودیکہ قطعی اور قوی دلائل کثرت سے قائم کردیئے گئے تھے، پھر بھی جو انکار کئے جارہے تھے تو یہ جہالت نہیں تو اور کیا تھا، اور یہ جاہلوں ہی کی سی بات کہلائے گی، لہذا اللہ تعالیٰ نے بھی ان کو جاہل فرمایا۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی اہل کتاب اور بت پرستوں میں جو جاہل ہیں وہ سب کہتے ہیں کہ: ''اللہ ہم سے بلا واسطہ بات کیوں نہیں کرتا یا کوئی نشانی کیوں نہیں بھیجتا کہ رسالت کی تصدیق کرلیں''۔

فائدہ: ۲ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ''پہلے لوگوں نے بھی ایسی ہی جہالت کی بات کہی تھی، یہ نئی بات نہیں اور جو یقین لانے والے ہیں ان کیلئے ہم نے نبی کے برحق ہونے کی نشانیاں بیان کردی ہیں، اور جو ضد اور عداوت پر اڑ رہے ہیں وہ انکار کریں تو یہ محض عناد ہے ان کا''۔

إِنَّآ أَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۙ وَّلَا تُسْـَٔلُ عَنْ أَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ ﴿١١٩﴾

بے شک ہم نے تجھ کو بھیجا ہے سچا دین دے کر خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا، اور تجھ سے پوچھ نہیں دوزخ میں رہنے والوں کی

خلاصہ تفسیر: چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان رحمۃ للعالمین کا تقاضا یہ ہوسکتا تھا کہ آپ کو اس جہالت اور عناد کی بدولت دل تنگی پیش آتی، اور ان کے ایمان نہ لانے کی کوئی صورت سمجھ میں نہ آنے کے سبب آپ صلی اللہ علیہ وسلم غمگین اور آزردہ خاطر ہوجاتے، اس لئے اللہ تعالیٰ آپ کی تسلی کے لئے ارشاد فرماتے ہیں کہ اے رسول!:

ہم نے آپ کو ایک سچا دین دے کر (مخلوق کی طرف) بھیجا ہے کہ (ماننے والوں کو) خوش خبری سناتے رہیئے اور (نہ ماننے والوں کو سزا سے) ڈراتے رہیئے، اور آپ سے دوزخ میں جانے والوں کی باز پرس نہ ہوگی (کہ ان لوگوں نے کیوں نہیں قبول کیا، اور کیوں دوزخ میں گئے، آپ اپنا کام کرتے رہیئے، آپ کو کسی کے ماننے یا نہ ماننے کی کوئی فکر نہیں کرنی چاہیئے)۔

وَّلَا تُسْـَٔلُ عَنْ أَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ: یہ آیت صوفیا حضرات کی اس عادت کی اصل ہے کہ جو شخص اپنی اصلاح نہ چاہے تو اس کے درپے نہیں ہوتے۔

* * *

فائدہ: یعنی تجھ پر الزام نہیں کہ ان کو مسلمان کیوں نہیں کیا۔

وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ؕ قُلْ إِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ؕ

اور ہرگز راضی نہ ہونگے تجھ سے یہود اور نہ نصاریٰ جب تک تو تابع نہ ہو انکے دین کا ۱ تو کہہ دے جو راہ اللہ بتلادے وہی راہ سیدھی ہے ۲

وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ أَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِيْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿١٢٠﴾ منزل

اور اگر بالفرض تو تابعداری کرے انکی خواہشوں کی بعد اس علم کے جو تجھ کو پہنچا تو تیرا کوئی نہیں اللہ کے ہاتھ سے حمایت کرنیوالا اور نہ مددگار ۳

خلاصہ تفسیر: یہاں تک یہود کی چالیس قباحتیں جن میں سے بعض میں نصاریٰ بھی شریک ہیں بیان فرمائی گئیں، آگے یہ بتلانا مقصود ہے کہ ایسے ہٹ دھرم لوگوں سے ایمان کی امید نہیں رکھنی چاہیے، گویا یہ مضمون گذشتہ تمام کا نتیجہ ہے جس سے ان کے مذکورہ قبائح کی اور تاکید ہوگئی اور اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فکر وغم کا ازالہ بھی ہے کہ جو لوگ ایسے کج طبع ہیں ان کی کجی بہت کم جاتی ہے، سو آپ ان کے عام طور پر ایمان لانے سے

ناامید ہوجایے، پریشانی اورکلفت کودل سے دور کیجیے، آپ کے اتباع کی ان کوتو کیا توفیق ہوتی وہ تو یہاں تک بلند پروازی کرتے ہیں کہ نعوذ باللہ آپ کو اپنی راہ پر چلانے کی فکر محال میں ہیں اوران کے قول وفعل سے بھی یہی کوشش ظاہر اور مفہوم ہوتی ہے، اور جناب رسول اللہ ﷺ پہلے پہلے بعض جائز امور میں اہل کتاب کی موافقت تالیف قلب اور ملاطفت کی غرض سے کرلیا کرتے تھے، اس میں اس پر بھی دلالت ہے کہ آپ اس قصہ کو جانے دیجیے، تاہم اس سے جوآپ کی غرض ہے کہ کچھ نرم ہوکر اسلام لے آئیں وہ بخیر ہے، بہرحال یہ آئندہ مضمون چندفوائد پر مشتمل ہے، اور قدر مشترک ان خاص لوگوں کے مسلمان ہونے سے مایوس کرنا ہے، پس ارشاد ہے:

اور کبھی خوش نہ ہوں گے آپ سے یہ یہود اور نہ یہ نصاریٰ جب تک کہ آپ (خدانخواستہ) ان کے مذہب کے (بالکل) پیرو نہ ہوجائیں (اور یہ محال ہے، پس ان کا راضی ہونا بھی محال ہے، اور اگر کبھی اس قسم کی بات ان کی زبان یا حال سے مترشح ہوتو) آپ (صاف) کہہ دیجئے کہ (بھائی) حقیقت میں ہدایت کا تو وہی راستہ ہے جس کو خدانے (ہدایت کا راستہ) بتلایا ہے (اور دلائل سے ایسا راستہ صرف ''اسلام'' ہونا ثابت ہوچکا ہے، پس راہ ہدایت وہی رہا) اور (یہ بات کہ نعوذ باللہ اگر آپ ان کے مذہب کے پیرو ہوجائیں محال اس لئے ہے کہ اس سے ایک دوسرا محال لازم آتا ہے، کیونکہ) اگر آپ ان کے غلط خیالات کا اتباع کرنے لگیں (تو جسے وہ اپنا مذہب سمجھتے ہیں وہ کچھ تحریف سے اور کچھ منسوخ ہوجانے سے اب محض چند غلط خیالات کا مجموعہ رہ گیا ہے، اور پھر اتباع بھی کیسی حالت میں کہ) علم (قطعی یعنی وحی) آچکنے کے بعد تو (ایسی حالت میں تو) آپ کا کوئی خدا سے بچانے والا نہ یار نکلے نہ مددگار (بلکہ توبہ توبہ پنجہ قہر میں گرفتار ہوجانا لازم آئے گا اور یہ لازم محال ہے، کیونکہ خدا کا ہمیشہ آپ سے راضی رہنا قطعی دلائل سے ثابت ہے، پس غضب محال ہے، سوآپ کا ان کے مذہب کا اتباع کرنا بھی محال ہے، اور بغیر اتباع کے ان کا راضی ہونا غیر ممکن ہے تو ایسی بات کی امید کرنے کی کوئی گنجائش نہیں، اس لئے اس سے دل کو خالی کرلینا چاہئے)۔

* * *

فائدہ: ۱۔ حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ: یعنی یہود اور نصاریٰ کو امر حق سے سروکار نہیں، اپنی ضد پر اڑ رہے ہیں، وہ کبھی تمہارا دین قبول نہ کریں گے، بالفرض اگر تم ہی ان کے تابع ہوجاؤ تو خوش ہوجاویں گے اور یہ ممکن نہیں تو اب ان سے موافقت کی امید نہ رکھنی چاہیے۔

فائدہ: ۲۔ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى: یعنی ہر زمانہ میں معتبر وہی ہدایت ہے جو اس زمانہ کا نبی لائے، سواب وہ طریقہ اسلام ہے، نہ کہ طریقہ یہود ونصاریٰ۔

فائدہ: ۳۔ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ: یہ بات بطریق فرض ہے، یعنی بالفرض اگر آپ ایسا کریں تو قہر الٰہی سے کوئی نہیں بچا سکتا، یا منظور تنبیہ ہے امت کو کہ اگر کوئی مسلمان ہوکر قرآن کو سمجھ کر دین سے پھرے گا تو اس کو عذاب سے کوئی نہ چھڑا سکے گا۔

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ

وہ لوگ جن کو دی ہم نے کتاب وہ اسکو پڑھتے ہیں جو حق ہے اسکے پڑھنے کا، وہی اس پر یقین لاتے ہیں، اور جو کوئی منکر ہوگا اس سے

فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۲۱﴾ ع

تو وہی لوگ نقصان پانے والے ہیں

خلاصہ تفسیر: یہاں تک معاندین یعنی اہل کتاب کا ذکر اور مخالفین کے ایمان سے کلی مایوسی کا بیان تھا، اب حسب عادت قرآن انصاف پسند اہل کتاب کا بیان ہے جنہوں نے حق واضح ہونے کے بعد رسول اللہ ﷺ کی تصدیق کی اور آپ کا اتباع اختیار کرلیا۔

جن لوگوں کو ہم نے کتاب (تورات وانجیل) دی، بشرطیکہ وہ اس کی تلاوت (اس طرح) کرتے رہے جس طرح تلاوت کا حق ہے (کہ

مضامین سمجھنے میں اپنی قوت علمیہ کو صرف کیا اور اتباع حق کا پختہ عزم کرنے میں قوت ارادی سے کام لیا) ایسے لوگ (البتہ آپ کے) اس (دین حق اور علم وحی) پر ایمان لے آتے ہیں، اور جو شخص نہ مانے گا (کس کا نقصان کرے گا؟!) خود ہی ایسے لوگ خسارہ میں رہیں گے (کہ ایمان پر جو ثمرات عطا ہوتے ہیں ان سے محروم رہیں گے)۔

* * *

فائدہ: یہود میں تھوڑے آدمی منصف بھی تھے کہ اپنی کتاب کو پڑھتے تھے سمجھ کر، وہ قرآن پر ایمان لائے (جیسے حضرت عبداللہ بن سلامؓ اور ان کے ساتھی) یہ آیت انہی لوگوں کے بارے میں ہے، یعنی انہوں نے تورات کو غور سے پڑھا، انہی کو ایمان نصیب ہوا اور جس نے انکار کیا کتاب کا ،یعنی اس میں تحریف کی، وہ خائب وخاسر ہوئے۔

يٰبَنِيٓ اِسۡرَآءِيۡلَ اذۡكُرُوۡا نِعۡمَتِيَ الَّتِيٓ اَنۡعَمۡتُ عَلَيۡكُمۡ وَاَنِّيۡ فَضَّلۡتُكُمۡ عَلَى الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۱۲۲﴾ وَاتَّقُوۡا يَوۡمًا

اے بنی اسرائیل یاد کرو احسان ہمارے جو ہم نے تم پر کئے اور اس کو کہ ہم نے تم کو بڑائی دی اہل عالم پر، اور ڈرو اس دن سے

لَّا تَجۡزِيۡ نَفۡسٌ عَنۡ نَّفۡسٍ شَيۡـًٔا وَّلَا يُقۡبَلُ مِنۡهَا عَدۡلٌ وَّلَا تَنۡفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمۡ يُنۡصَرُوۡنَ ﴿۱۲۳﴾

کہ نہ کام آئے کوئی شخص کسی کی طرف سے ذرا بھی اور نہ قبول کیا جاوے گا اسکی طرف سے بدلہ اور نہ کام آوے اسکو سفارش اور نہ انکو مدد پہنچے

خلاصہ تفسیر: اوپر کی آیت تک بنی اسرائیل کے متعلق جن خاص مضامین کا بیان کرنا مقصود تھا، وہ بیان ہو چکے، اب ان مضامین کی ابتدائی تمہید جس کے اجمال کی تفصیل یہ سارے مضامین تھے اس کو دوبارہ پھر بیان کرتے ہیں، جس کا مقصد یہ ہے کہ تمہید کا خاص مضمون یعنی ترغیب کے لئے انعام عام وخاص کا یاد دلانا اور ترہیب کے لیے قیامت کو پیش نظر کردینا تکرار کی وجہ سے خوب ذہن نشین ہو جائے، کیونکہ اصل مقصود کلیات ہوتے ہیں، جن کا استحضار ان کے مختصر ہونے کی وجہ سے سہل اور آسان ہوتا ہے اور جامع اور منطبق ہونے کی وجہ سے ان کے ذریعہ سے ان کی جزئیات کا محفوظ رکھنا آسان ہوتا ہے، اور محاورات میں یہ بلیغ طرز بھی اعلیٰ درجہ کا سمجھا جاتا ہے کہ مفصل اور طویل بات کرنے سے پہلے ایک مجمل عنوان سے اس کی تقریر کردی جائے، جس کا قدر مشترک تمام تفصیل کے سمجھنے میں معین و مددگار ہو، اور آخر میں بطور خلاصہ اور نتیجہ تفصیل اسی مجمل عنوان کا پھر اعادہ کر دیا جائے، مثلاً یہ کہا جائے کہ تکبر بڑی مضر خصلت ہے، اس میں ایک ضرر یہ، دوسرا یہ، تیسرا یہ، دس بیس مضرتیں گنوا کر پھر آخر میں کہہ دیا جائے کہ غرض تکبر بڑی مضر خصلت ہے، اسی طور پر اس آیت يٰبَنِيٓ اِسۡرَآءِيۡلَ کا اعادہ فرمایا گیا ہے۔

اے اولاد یعقوب علیہ السلام! میری ان نعمتوں کو یاد کرو جن کا میں نے تم پر (وقتاً فوقتاً) انعام کیا اور اس کو (بھی یاد کرو) کہ میں نے تم کو بہت لوگوں پر (بہت سی باتوں میں) فوقیت دی، اور تم ڈرو ایسے دن سے (یعنی روز قیامت سے) جس میں کوئی شخص کسی کی طرف سے نہ کوئی مطالبہ (اور حق واجب) ادا کرنے پائے گا، اور نہ کسی کی طرف سے کوئی معاوضہ (حق واجب کے بجائے) قبول کیا جائے گا، اور نہ کسی کی کوئی سفارش (جبکہ ایمان نہ ہو) مفید ہوگی اور نہ ان لوگوں کو کوئی (بزور) بچا سکے گا۔

اس کے متعلق مزید تحقیق پیچھے آیت ۴۷ میں گذر چکی ہے وہاں ملاحظہ فرمالیا جائے۔

* * *

فائدہ: بنی اسرائیل کو جو باتیں شروع میں یاد دلائی گئیں تھیں، اب ان کے سب حالات ذکر کرنے کے بعد پھر وہی امور بغرض تاکید وتنبیہ یاد دلائے گئے کہ خوب دل نشین ہو جائیں اور ہدایت قبول کرلیں اور معلوم ہو جائے کہ اصل مقصود اس قصہ سے یہ ہے۔

وَاِذِ ابۡتَلٰۤى اِبۡرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّىۡ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ

اور جب آزمایا ابراہیم کو اس کے رب نے کئی باتوں میں ۱؎ پھر اس نے وہ پوری کیں، تب فرمایا میں تجھ کو کروں گا سب لوگوں کا پیشوا ۲؎

قَالَ وَمِنۡ ذُرِّيَّتِىۡ ؕ قَالَ لَا يَنَالُ عَهۡدِى الظّٰلِمِيۡنَ ﴿۱۲۴﴾

بولا اور میری اولاد میں سے بھی، فرمایا نہیں پہنچے گا میرا اقرار ظالموں کو ۳؎

خلاصہ تفسیر: یہاں تک بنی اسرائیل کے قبائح اور بدعنوانیوں کا بیان تھا، جن میں سے ایک تحویل قبلہ پر ان کا اعتراض بھی تھا، چونکہ قبلہ کی تبدیلی کی بابت ان کی نکتہ چینی زیادہ تھی، نیز ضعیف الاعتقاد لوگوں پر اس مخالفت کا اثر ہو جانا بھی چنداں عجیب نہ تھا اور نماز خود اسلام کا رکن اعظم ہے، ان سب باتوں کا تقاضہ تھا کہ اس خاص باب میں کسی قدر مفصل کلام کیا جائے، وہ مفصل کلام یہاں سے شروع ہو کر تقریباً چار رکوع تک پھیلا ہوا ہے، پہلے بانی کعبہ کی فضیلت اور ان کا امام خلق ہونا بیان کیا، پھر کعبہ کی فضیلت اور اس کی تعمیر کا قصہ ذکر فرمایا، پھر حاکمانہ اختیار سے کعبہ کا قبلہ بنانا بیان کیا، ساتھ ہی امام القبلتین حضرت محمد ﷺ کا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ تعلق و خصوصیت اور آپ ﷺ کا تمام مخلوق کے لیے نعمت عظمیٰ ہونا بھی بتلا دیا گیا، تا کہ ہر پہلو سے مضمون مکمل ہو جائے۔

اور جس وقت امتحان کیا ابراہیم علیہ السلام کا ان کے پروردگار نے چند باتوں میں (اپنے احکام میں سے) اور وہ ان کو پورے طور سے بجا لائے (اس وقت) حق تعالیٰ نے (ان سے) فرمایا کہ میں تم کو (اس کے صلہ میں نبوت دے کر یا امت بڑھا کر) لوگوں کو مقتدا بناؤں گا، انہوں نے عرض کیا اور میری اولاد میں سے بھی کسی کو (نبوت دیجئے) ارشاد ہوا کہ (آپ کی درخواست منظور ہے، مگر اس کا ضابطہ سن لیجئے کہ) میرا (یہ) عہدہ (نبوت) خلاف ورزی (قانون) کرنے والوں کو نہ ملے گا (سو ایسے لوگوں کو تو صاف جواب ہے، البتہ اطاعت کرنے والوں میں سے بعض کو نبوت دی جائے گی)۔

وَاِذِ ابۡتَلٰۤى اِبۡرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ: امتحان دو غرض سے ہوتا ہے: ① کبھی تو اس وجہ سے کہ امتحان لینے والا خود اس شخص کی حالت ولیاقت دریافت کرنا چاہتا ہے، سو یہ امتحان لینا تو ذات باری کی طرف سے محال ہے، کیونکہ انہیں سب کچھ پہلے ہی معلوم ہے ② کبھی امتحان لینے والا خود تو جانتا ہے لیکن دوسرے دیکھنے والوں کی نظر میں اس کی حالت ولیاقت کا پیش کرنا منظور ہوتا ہے تا کہ امتحان دینے والے کی عظمت ثابت ہو جائے اور دوسروں کو محرومی یا ترجیح کی شکایت کا موقع نہ ملے، یا اگر کسی مجرم کا امتحان ہے تو خود وہ بھی اپنے دل میں انصاف کر لے اور دوسرے بھی ظلم و زیادتی کا شبہ نہ کر سکیں، تو ایسا امتحان لینا حق تعالیٰ کی شان کے خلاف نہیں، جہاں کہیں حق تعالیٰ کا بندوں کا امتحان لینا مذکور ہے وہاں یہی دوسری قسم مراد ہے، چنانچہ اس مقام پر بھی یہی دوسری قسم مراد ہے۔

اور ان ''احکام'' کی نسبت کتابوں میں مختلف اقوال لکھے ہیں جن میں ابراہیم علیہ السلام کا امتحان ہوا تھا، اگر یہ امتحان تبلیغ احکام سے پہلے تھا تو ''امامت'' کے معنی یہ ہوں گے کہ آپ کو احکام پہنچانے کا کام سپرد کیا جائے گا جو حاصل ہے نبوت کا، اس قول پر اس وقت تو وحی نازل ہو گئی تھی مگر ہنوز تبلیغ کا اثر نہ ہوا تھا، اور اگر یہ امتحان تبلیغ احکام شروع کر دینے کے بعد ہوا تو ''امامت'' کے معنی یہ ہوں گے کہ آپ کی امامت کو ترقی ہو گی، یا یہ کہ آپ کی شریعت آپ کے بعد بھی مدتوں تک رہے گی، جس سے آپ کا اجر و ثواب بڑھتا رہے گا۔

لَا يَنَالُ عَهۡدِى الظّٰلِمِيۡنَ: اس میں یہ قید لگانا کہ جسے نبوت ملے گی وہ ظالم نہ ہو، یہ حضرات انبیاء علیہم السلام کے معصوم اور بے گناہ ہونے کی دلیل ہے، کیونکہ ہر گناہ میں حکم کی خلاف ورزی ہے، اور ظلم کی حقیقت بھی یہی ہے تو ہر گناہ ظلم ہوا، اور نبی کے لیے ظالم نہ ہونے کی شرط صراحۃ ارشاد ہو چکی ہے، پس جو حضرات نبوت سے مشرف ہو چکے ہیں یقیناً وہ گناہ گار نہ تھے، نہ نبوت سے قبل اور نہ نبوت کے بعد، اور جن واقعات میں گناہ کا

شبہ ہوتا ہے ہر قصہ کے موقع پر اس کی تفسیر دیکھنے سے معلوم ہوسکتا ہے کہ وہ واقع میں گناہ نہیں ہیں، جن میں ایک قصہ حضرت آدم علیہ السلام کا پیچھے گذر چکا ہے وہاں دیکھ کر بھی اس کی تصدیق کی جاسکتی ہے، رہی یہ بات کہ لفظ ''عصیان'' یا ''ظلم'' وغیرہ جو کہیں وارد ہوا ہے تو اس کے مجازی معنی مراد ہیں، کیونکہ یہ قاعدہ مسلمہ ہے کہ جب حقیقی معنی کسی دلیل سے متعذر ثابت ہوں تو مجاز پر محمول کرنا واجب ہے، اور تعذر کی دلیل جس سے عصمت انبیاء علیہم السلام ثابت ہے ابھی یہیں بیان ہو چکی، خوب سمجھ لو۔

* * *

فائدہ: ۱۔ وَاِذِ ابۡتَلٰٓى اِبۡرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ: جیسے حج کے افعال اور ختنہ اور حجامت اور مسواک وغیرہ، سو حضرت ابراہیم علیہ السلام ان احکام کو اللہ کے ارشاد کے موافق اخلاص کے ساتھ بجالائے اور سب کو پوری طرح سے ادا کیا جس پر لوگوں کے پیشوا بنائے گئے۔

فائدہ: ۲۔ اِنِّىۡ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا: یعنی تمام انبیاء تیری متابعت پر چلیں گے۔

فائدہ: ۳۔ لَا يَنَالُ عَهۡدِى الظّٰلِمِيۡنَ: بنی اسرائیل اس پر بہت مغرور تھے کہ ہم اولاد ابراہیم میں ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے وعدہ کیا ہے کہ نبوت و بزرگی تیری اولاد میں رہے گی، اور ہم حضرت ابراہیم کے دین پر ہیں، اور ان کے دین کو سب مانتے ہیں، اب اللہ تعالیٰ ان کو سمجھاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا جو وعدہ تھا، وہ ان سے تھا، جو نیک راہ پر چلیں، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دو بیٹے تھے، ایک مدت تک حضرت اسحاق کی اولاد میں پیغمبری اور بزرگی رہی، اب حضرت اسماعیل کی اولاد میں پہنچی (اور انہوں نے دونوں بیٹوں کے حق میں دعا کی تھی) اور فرماتا ہے کہ دین اسلام ہمیشہ ایک ہے، سب پیغمبر اور سب امتیں اس پر گزریں (وہ یہ کہ جو حکم اللہ بھیجے پیغمبر کے ہاتھ، اس کو قبول کرنا) اب یہ طریقہ مسلمانوں کا ہے، اور تم اس سے پھرے ہوئے ہو، پہلی آیات میں اپنے انعامات بتلائے تھے، اب ان کے اس شبہ کو دفع کیا کہ بنی اسرائیل اپنے آپ کو سارے عالم کا امام اور متبوع اور سب سے افضل سمجھ کر کسی کا اتباع نہ کرتے تھے۔

ربط: بنی اسرائیل کے واقعات میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر اور ان کی منقبت مذکور ہوئی، اب ان کے ذکر کے ذیل میں خانہ کعبہ کی حالت اور فضیلت ان آیات میں ذکر فرمائی اور ان کے ضمن میں یہود و نصاریٰ پر الزامات بھی ہیں جیسا کہ مفسرین نے ذکر کیا۔

وَاِذۡ جَعَلۡنَا الۡبَيۡتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمۡنًا ؕ وَاتَّخِذُوۡا مِنۡ مَّقَامِ اِبۡرٰهٖمَ مُصَلًّى ؕ

اور جب مقرر کیا ہم نے خانہ کعبہ کو اجتماع کی جگہ لوگوں کے واسطے اور جگہ امن کی ۱ اور بناؤ ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ کو نماز کی جگہ ۲

وَعَهِدۡنَآ اِلٰٓى اِبۡرٰهٖمَ وَاِسۡمٰعِيۡلَ اَنۡ طَهِّرَا بَيۡتِىَ لِلطَّآئِفِيۡنَ وَالۡعٰكِفِيۡنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوۡدِ ﴿۱۲۵﴾

اور حکم کیا ہم نے ابراہیم اور اسماعیل کو کہ پاک رکھو میرے گھر کو ۳ واسطے طواف کرنیوالوں کے اور اعتکاف کرنیوالوں کے اور رکوع اور سجدہ کرنیوالوں کے

خلاصہ تفسیر: بانی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی فضیلت کے بعد اب بنا یعنی کعبہ کی فضیلت بیان فرماتے ہیں:

اور (وہ وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہے کہ) جس وقت ہم نے خانہ کعبہ کو لوگوں کا معبد اور (مقام) امن (ہمیشہ سے) مقرر رکھا، اور (آخر میں امت محمدیہ کو حکم دیا کہ برکت حاصل کرنے کے لئے) مقام ابراہیم کو (کبھی کبھی) نماز پڑھنے کی جگہ بنالیا کرو، اور ہم نے (بناء کعبہ کے وقت) ابراہیم و اسماعیل (علیہما السلام) کی طرف حکم بھیجا کہ میرے (اس) گھر کو خوب پاک (صاف) رکھا کرو بیرونی اور مقامی لوگوں (کی عبادت) کے واسطے، اور رکوع اور سجدہ کرنے والوں کے واسطے۔

مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمۡنًا: مقام امن دو وجہ سے فرمایا: ① ایک تو یہ کہ اس میں حج و عمرہ، نماز و طواف ادا کرنے سے عذاب دوزخ سے امن ہو جاتا ہے ② دوسرے یہ کہ اگر کوئی خونی حدود کعبہ یعنی حرم میں جا گھسے تو وہاں اس کو قتل نہ کیا جائے گا، البتہ کھانا پینا بند کر دیا جائے تا کہ باہر نکل آئے، خونی کے سوا دوسرے مجرموں کا اور حکم ہے، یہ مذہب امام ابوحنیفہ کا ہے، پس یہ قانون بتلایا گیا کہ حرم مکہ میں بدامنی نہیں کرنی چاہیے، یہ معنی نہیں کہ یہاں بدامنی

کبھی نہ ہوگی، اور مقام ابراہیم ایک پتھر ہے جس پر کھڑے ہوکر آپ نے عمارت کعبہ بنائی ہے۔

مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى: مقام ابراہیم کو چھوٹا ہونے کے باوجود مصلی فرمایا ہے سواس کا چھوٹا ہونا اس سے مانع نہیں ہے، کیونکہ اس پر صرف قدم رکھنے سے بھی مصلی ہونا صادق آتا ہے، باقی یہ بات کہ اب اس پر نماز نہیں پڑھی جاتی تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ اصل مقصود اسی کو محل نماز بنانا ہے باقی اس کے گردونواح کا محل بھی اسی کے تابع ہونے سے اسی کے حکم میں ہے جیسا مسجد حرام یا مسجد نبوی میں جو زائد اضافہ ہوا ہے وہ اس کے تابع ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی ہر سال بغرض حج وہاں لوگ مجتمع ہوتے ہیں اور جو وہاں جا کر ارکان حج بجالاتے ہیں، وہ عذاب دوزخ سے مامون ہو جاتے ہیں، یا وہاں کوئی کسی پر زیادتی نہیں کرتا۔

فائدہ: ۲ ''مقام ابراہیم'' وہ پتھر ہے جس پر کھڑے ہوکر خانہ کعبہ کو تعمیر کیا تھا، اس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قدموں کا نشان ہے اور اسی پتھر پر کھڑے ہوکر حج کی دعوت دی تھی اور وہ جنت سے لایا گیا تھا، جیسے حجر اسود، اب اس پتھر کے پاس نماز پڑھنے کا حکم ہے اور یہ حکم استحبابی ہے۔

فائدہ: ۳ یعنی وہاں برا کام نہ کرے اور ناپاک اسکا طواف نہ کرے اور تمام آلودگیوں سے صاف رکھا جائے۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ

اور جب کہا ابراہیم نے اے میرے رب بنا اسکو شہر امن کا ۱ اور روزی دے اسکے رہنے والوں کو میوے جو کوئی ان میں سے ایمان لاوے

بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗٓ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ۭ

اللہ پر اور قیامت کے دن پر ۲ فرمایا اور جو کفر کریں اس کو بھی نفع پہنچاؤں گا تھوڑے دنوں پھر اس کو جبرا بلاؤنگا دوزخ کے عذاب میں

وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿١٢٦﴾

اور وہ بری جگہ ہے رہنے کی ۳

خلاصہ تفسیر: اب حدود کعبہ یعنی حرم اور وہاں رہنے والوں کے لیے دعائے ابراہیمی کا ذکر ہے جو اس کی فضیلت کی دلیل ہے۔

اور (وہ وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہے) جس وقت ابراہیم علیہ السلام نے (دعا میں) عرض کیا کہ اے میرے پروردگار! اس (مقام) کو ایک (آباد) شہر بنا دیجئے (اور شہر بھی کیسا) امن (امان) والا، اور اس کے بسنے والوں کو پھلوں (کی قسم) سے بھی عنایت کیجئے (اور میں سب بسنے والوں کو نہیں کہتا، بلکہ خاص) ان کو (کہتا ہوں) جو ان میں اللہ تعالیٰ پر اور روز قیامت پر ایمان رکھتے ہوں (باقیوں کو آپ جانیں) حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا (کہ چونکہ رزق ہمارا خاص نہیں ہے، اس لئے ثمرات سب کو دوں گا، مومن کو بھی) اور اس شخص کو بھی جو کافر رہے (البتہ آخرت کی نجات چونکہ اہل ایمان کے ساتھ خاص ہے) سو (اس واسطے) ایسے شخص کو (جو کہ کافر رہے) تھوڑے روز (یعنی دنیا میں) تو خوب آرام برتاؤں گا (لیکن) پھر (مرنے کے بعد) اس کو کشاں کشاں عذاب دوزخ میں پہنچادوں گا، اور ایسی پہنچنے کی جگہ تو بہت بری ہے (اللہ بچائے، آمین)۔

* * *

فائدہ: ۱ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بوقت بنائے کعبہ یہ دعا کی کہ یہ میدان ایک شہر آباد اور با امن ہو، سو ایسا ہی ہوا۔

فائدہ: ۲ یعنی اس کے رہنے والے جو اہل ایمان ہوں ان کو روزی دے میووں کی اور کفار کے لئے دعا نہ کی، تا کہ وہ مقام لوث کفر سے پاک رہے۔

فائدہ: ۳ حق تعالیٰ نے فرمایا کہ دنیا میں کفار کو بھی رزق دیا جائیگا اور رزق کا حال امامت جیسا نہیں کہ اہل ایمان کے سوا کسی کو ملے ہی نہ سکے۔

وَاِذۡ یَرۡفَعُ اِبۡرٰہٖمُ الۡقَوَاعِدَ مِنَ الۡبَیۡتِ وَاِسۡمٰعِیۡلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ

اور یاد کر جب اٹھاتے تھے ابراہیم بنیادیں خانہ کعبہ کی اور اسماعیل، اور دعاء کرتے تھے اے پروردگار ہمارے قبول کر ہم سے

اِنَّکَ اَنۡتَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ﴿۱۲۷﴾

بیشک تو ہی ہے سننے والا جاننے والا

خلاصہ تفسیر: آگے بناء کعبہ اور اس بناء میں بانی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اخلاص اور اس کے ضمن میں جناب رسول اللہ ﷺ اور آپ کی امت کا بانی کعبہ کے ساتھ خاص تعلق کو بیان کرتے ہیں۔

اور (وہ وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہے) جبکہ اٹھا رہے تھے ابراہیم علیہ السلام دیواریں خانہ کعبہ کی اور (ان کے ساتھ) اسماعیل علیہ السلام بھی (اور یہ بھی کہتے جاتے تھے کہ) اے ہمارے پروردگار! (یہ خدمت) ہم سے قبول فرمائیے، بلاشبہ آپ خوب سننے والے جاننے والے ہیں (ہماری دعا کو سنتے ہیں، ہماری نیتوں کو جانتے ہیں)۔

* * *

فائدہ: قبول کر ہم سے اس کام کو (کہ تعمیر خانہ کعبہ ہے) تو سب کی دعا سنتا ہے اور نیت کو جانتا ہے۔

رَبَّنَا وَاجۡعَلۡنَا مُسۡلِمَیۡنِ لَکَ وَمِنۡ ذُرِّیَّتِنَاۤ اُمَّۃً مُّسۡلِمَۃً لَّکَ ۪ وَاَرِنَا مَنَاسِکَنَا

اے پروردگار ہمارے اور کر ہم کو حکم بردار اپنا اور ہماری اولاد میں بھی کر ایک جماعت فرمانبردار اپنی، اور بتلا ہم کو قاعدے حج کرنے کے

وَتُبۡ عَلَیۡنَا ۚ اِنَّکَ اَنۡتَ التَّوَّابُ الرَّحِیۡمُ ﴿۱۲۸﴾ رَبَّنَا وَابۡعَثۡ فِیۡہِمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡہُمۡ یَتۡلُوۡا

اور ہم کو معاف کر، بیشک تو ہی ہے توبہ قبول کرنے والا مہربان، اے پروردگار ہمارے اور بھیج ان میں ایک رسول انہی میں کا کہ پڑھے

عَلَیۡہِمۡ اٰیٰتِکَ وَیُعَلِّمُہُمُ الۡکِتٰبَ وَالۡحِکۡمَۃَ وَیُزَکِّیۡہِمۡ ؕ اِنَّکَ اَنۡتَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ ﴿۱۲۹﴾ ع ۱۵

ان پر تیری آیتیں اور سکھلاوے ان کو کتاب اور تہ کی باتیں اور پاک کرے ان کو، بیشک تو ہی ہے بہت زبردست بڑی حکمت والا

خلاصہ تفسیر: اے ہمارے پروردگار! اور (ہم دونوں یہ دعا بھی کرتے ہیں کہ) ہم کو اپنا اور زیادہ مطیع بنا لیجئے، اور ہماری اولاد میں سے بھی ایک ایسی جماعت پیدا کیجئے جو آپ کی مطیع ہو، اور (نیز) ہم کو ہمارے حج (وغیرہ) کے احکام بھی بتلا دیجئے، اور ہمارے حال پر (مہربانی کے ساتھ) توجہ رکھئے، اور فی الحقیقت آپ ہی ہیں توجہ فرمانے والے مہربانی کرنے والے۔

اے ہمارے پروردگار! اور (یہ بھی دعا ہے کہ) اس جماعت کے اندر (جس کے پیدا ہونے کی دعا اپنی اولاد میں سے کر رہے ہیں) انہی میں کا ایک ایسا پیغمبر بھی مقرر کیجئے جو ان لوگوں کو آپ کی آیات پڑھ کر سنایا کریں، اور ان کو (آسمانی) کتاب (کے مضامین) کی اور (اس میں) خوش فہمی (کا سلیقہ حاصل کرنے) کی تعلیم دیا کریں، اور ان کو (اس تعلیم وتلاوت کے ذریعہ جہالت کے خیالات اور اعمال سے) پاک کریں، بلاشبہ آپ ہی ہیں غالب القدرت (کہ سب درخواستیں پوری کر سکتے ہیں) کامل الانتظام (کہ جو کام کرتے ہیں اس میں کوئی غلطی نہیں ہوتی)۔

رَبَّنَا وَاجۡعَلۡنَا مُسۡلِمَیۡنِ لَکَ وَمِنۡ ذُرِّیَّتِنَاۤ اُمَّۃً: جس جماعت (امت) کا اس آیت میں ذکر ہے وہ صرف بنی اسماعیل ہیں جن میں جناب رسول اللہ ﷺ مبعوث ہوئے، سو یہاں جن پیغمبر کے لیے دعا ہے اس سے مراد بھی صرف آپ ﷺ ہوئے، کیونکہ یہ دعا دو انبیاء نے کی

ہے تو وہی جماعت مراد ہوسکتی ہے جو ان دونوں انبیاء کی اولاد میں ہو، اور پیغمبر کے ذکر میں کہا گیا کہ ''وہ اس جماعت میں سے ہوں'' تو وہ جماعت بنی اسماعیل ہوئی اور پیغمبر آپ ﷺ ہوئے جو کہ بنی اسماعیل میں سے ہیں، اسی واسطے صحیح حدیث میں ارشاد نبوی ہے کہ ''میں اپنے باپ ابراہیم علیہ السلام کی دعا کا ظہور ہوں''، اور یہ ''مسلم'' کا لقب اور صفت تمام امت محمدیہ کے لیے حاصل ہے جیسا مشاہد ہے اور سورہ انبیاء کے آخر میں: ھو سمّٰکم المسلمین کی توجیہ بھی یہی ہے، لیکن اولاد کی تخصیص اس لیے کی ہے کہ اور لوگوں میں یہ اسلام ان اولاد کی بدولت ہی پھیلے گا، اس طور پر اس صفت میں یہ اصل ہوئے، چنانچہ واقع بھی ایسا ہی ہوا کہ بنی اسماعیل سے اسلام کی اشاعت ہوئی، ان کی جانی کوشش سے بھی اور انتظامی تدبیر سے بھی، اور یہی حکمت ہے خلافت کے خاص قریش میں ہونے کی جو کہ بنی اسماعیل میں سے ہیں۔

وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ: پیغمبر کے لیے جو یہ تخصیص کی کہ ''ان ہی میں سے ہوں''، اس میں یہ حکمت معلوم ہوتی ہے کہ وہ لوگ بہ نسبت دوسرے خاندانوں کے اپنے خاندان میں پیدا ہونے والے پیغمبر کو زیادہ سمجھیں گے اور ان کے اتباع کو دوسروں کے اطمینان اور رفع خلجان میں زیادہ اثر اور دخل ہوگا، چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ عام عرب قریش کے ایمان کے منتظر تھے، ان کی اطاعت کے بعد لوگ جوق در جوق اسلام میں داخل ہونے لگے جس کی طرف سورہ نصر میں بھی اشارہ ہوا ہے۔

وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ: خلاصہ تفسیر میں ''حکمت'' کا ترجمہ ''خوش فہمی کا سلیقہ'' سے کیا، خوش فہمی کا سلیقہ یہ ہے کہ بات میں سے بات نکال لیں، اصل سے فرع کا حکم سمجھ لیں، صحیح اصولوں کی رعایت کرتے ہوئے ایک نظیر کو دوسری نظیر پر قیاس کرلیں، جسے اصطلاح میں اجتہاد اور تفقہ کہتے ہیں، چنانچہ امت محمدیہ میں بہت سے اکابر اس صفت سے ممتاز ہوئے اور ان کی برکات سے آج عام مسلمان دین میں فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ: اس میں اس بات کی اصل ہے جو بعض مشائخ سے منقول ہے کہ وہ اپنے بعد اپنے سلسلے کے باقی رہنے کی تمنا اور دعا کرتے ہیں۔

* * *

فائدہ: یہ دعا حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام دونوں نے مانگی کہ ہماری جماعت میں ایک جماعت فرمانبردار اپنی پیدا کر، اور ایک رسول ان میں بھیج جو ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور ایسا نبی جو ان دونوں کی اولاد میں ہو بجز سرور کائنات ﷺ کوئی نہیں آیا، اس کی وجہ سے یہود کے گذشتہ خیال کا پورا رد ہوگیا۔

علم ''کتاب'' سے مراد معانی و مطالب ضروریہ ہیں جو عبارت سے واضح ہوتے ہیں اور ''حکمت'' سے مراد اسرار مخفیہ اور رموز لطیفہ ہیں۔

وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ؕ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ

اور کون ہے جو پھرے ابراہیم کے مذہب سے مگر وہی کہ جس نے احمق بنایا اپنے آپ کو، اور بیشک ہم نے انکو منتخب کیا دنیا میں، اور وہ آخرت میں

لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۳۰﴾ اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۳۱﴾

نیکوں میں ہیں، یاد کرو جب اس کو کہا اس کے رب نے کہ حکم برداری کر، تو بولا کہ میں حکم بردار ہوں تمام عالم کے پروردگار کا

خلاصہ تفسیر: گذشتہ آیات سے ابراہیم علیہ السلام کا طریقہ بھی معلوم ہوگیا جو کہ اسلام اور اطاعت حق ہے جیسا کہ پیچھے: رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ میں منصوص ہے، اب جس زمانہ کے لیے جو احکام الٰہیہ بھی ہوں ان کا چھوڑنا ملت ابراہیمی سے منہ موڑنا ہے، کیونکہ ان کے طریقہ کا حاصل صرف یہی ہے کہ احکام الٰہیہ کی اطاعت کی جائے، اس مناسبت سے آئندہ آیت میں ان لوگوں کی غلط کاری بیان فرماتے ہیں جو ملت ابراہیمی کی اتباع کے دعوی کے باوجود جناب رسول اللہ ﷺ کی اتباع اختیار نہیں کرتے، جب سابقہ آسمانی کتب کی شہادت اور گذشتہ انبیاء کی وصیت اور عقلی دلائل و براہین سب رسالت محمدیہ کے ثبوت پر متفق ہیں تو ملت ابراہیمی کی اطاعت یہی تھی کہ حضور ﷺ کی اتباع اختیار کی جاتی، اس کے بعد بھی

جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع نہ کی تو ظاہر ہے کہ طریقہ ابراہیمی کی مخالفت لازم آگئی، چنانچہ اس آیت کا سبب نزول بھی ایسا ہی قصہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن سلامؓ نے جو کہ یہودی سے مسلمان ہوئے تھے اور بڑے عالم تھے، اپنے دو بھتیجوں سے جن کا نام سلمہ اور مہاجر تھا یہ فرمایا کہ تم کو خوب معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تورات میں فرمایا ہے کہ میں بنی اسماعیل سے ایک نبی برپا کرنے والا ہوں جن کا نام احمد ہوگا، اور جو شخص آپ پر ایمان لائے وہ راہ ہدایت پر ہوگا، اور جو ایمان نہ لائے گا وہ ملعون ہوگا، یہ سن کر سلمہ نے تو اسلام قبول کرلیا اور مہاجر نے انکار کردیا، اس بارے میں یہ آیت نازل ہوئی، سو اعتبار سے یہاں تک بھی یہود کے قبائح کا ذکر جاری ہے۔

اور ملت ابراہیمی سے تو وہی روگردانی کرے گا جو اپنی ذات ہی سے احمق ہو، اور (ایسی ملت کے تارک کو کیونکر احمق نہ کہا جائے جس کی یہ شان ہو کہ اسی کی بدولت) ہم نے ان (ابراہیم علیہ السلام) کو (عہدہ رسالت کے لئے) دنیا میں منتخب کیا اور (اسی کی بدولت) وہ آخرت میں بڑے لائق لوگوں میں شمار کئے جاتے ہیں (جن کے لئے سب ہی کچھ ہے، اور یہ انتخاب عہدہ رسالت کے لئے اس وقت ہوا تھا) جب کہ ان سے ان کے پروردگار نے (بطور الہام کے) فرمایا کہ تم (حق تعالیٰ کی) اطاعت اختیار کرو، انہوں نے عرض کیا کہ میں نے اطاعت اختیار کی رب العالمین کی (پس اسی اطاعت کے اختیار کرنے پر ہم نے ان شرف نبوت دے دیا، خواہ اسی وقت ہو، یا بعد چندے)۔

وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ ۭ يٰبَنِىَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ

اور یہی وصیت کر گیا ابراہیم اپنے بیٹوں کو اور یعقوب بھی، کہ اے بیٹو! بیشک اللہ نے چن کر دیا ہے تم کو دین سو تم ہرگز نہ مرنا

اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿١٣٢﴾ؕ

مگر مسلمان

خلاصہ تفسیر: (جس ملت کی فضیلت و شرف کا اوپر ذکر ہوا، اسی فضل و شرف کی تاکید کے لیے حضرت ابراہیم و حضرت یعقوب علیہما السلام نے اپنی اولاد کو اسی ملت کی وصیت فرمائی، اب ارشاد فرماتے ہیں جس میں خود یہودیوں کی ایک قباحت بھی ہے کہ تم ابراہیم کی مخالفت کے ساتھ ساتھ یعقوب کی وصیت کے بھی خلاف کر رہے ہو) اور اسی (ملت موصوفہ پر قائم رہنے) کا حکم کر گئے ہیں ابراہیم اپنے بیٹوں کو، اور (اسی طرح) یعقوب بھی (اپنے بیٹوں کو، جس کا یہ مضمون تھا کہ) میرے بیٹو! اللہ تعالیٰ نے اس دین (اسلام و اطاعت حق) کو تمہارے لئے منتخب فرمایا ہے، سو تم (مرتے دم تک اس کو مت چھوڑنا اور) بجز اسلام کے اور کسی حالت پر جان مت دینا۔

***

فائدہ: جس ملت و مذہب کا شرف مذکور ہو چکا، اسی ملت کی وصیت حضرت ابراہیم علیہ السلام و حضرت یعقوب نے اپنی اولاد کو فرمائی تو جو اس کو نہ مانے گا وہ ان کا بھی مخالف ہوا۔

ربط: یہود کہتے تھے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنی اولاد کو یہودیت کی وصیت فرمائی، سو وہ جھوٹے ہیں، جیسا اگلی آیت میں آتا ہے:

اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ ۙ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِىْ ۭ قَالُوْا

کیا تم موجود تھے جس وقت قریب آئی یعقوب کے موت، جب کہا اپنے بیٹوں کو تم کس کی عبادت کرو گے میرے بعد، بولے

نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚۖ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿١٣٣﴾

ہم بندگی کریں گے تیرے رب کی اور تیرے باپ دادوں کے رب کی جو کہ ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق ہیں وہی ایک معبود ہے، اور ہم سب اسی کے فرمانبردار ہیں

خلاصه تفسیر: پیچھے ثابت کیا کہ یعقوب علیہ السلام نے ابراہیم علیہ السلام کی طرح اپنے بیٹوں کو اسلام پر قائم رہنے کی وصیت فرمائی تھی، چونکہ یہود بلکہ نصاری بھی ان دونوں انبیاء اور ان کی اولاد کو یہودی یا نصرانی بتلاتے تھے، یہود ونصاری کا یہ دعوی آنے والی آیت میں مذکور وصیت کے خلاف تھا، اس لیے حق تعالی اس آیت میں اس کی نفی ایک خاص طرز سے فرماتے ہیں، اس آیت میں یعقوب علیہ السلام کا ذکر خصوصیت کے ساتھ اس وجہ سے ہے کہ بنی اسرائیل ان کی خاص اولاد ہیں، فرماتے ہیں:

کیا (تم لوگ کسی صحیح اور معتبر نقل سے مذکورہ دعویٰ کرتے ہو یا) تم خود (اس وقت) موجود تھے جس وقت یعقوب کا آخری وقت آیا (اور) جس وقت انہوں نے اپنے بیٹوں سے (تجدید عہد کے لئے) پوچھا کہ تم لوگ میرے (مرنے کے) بعد کس چیز کی پرستش کرو گے، انہوں نے (بالاتفاق) جواب دیا کہ ہم اس (ذات پاک) کی پرستش کریں گے، جس کی آپ اور آپ کے بزرگ (حضرات) ابراہیم و اسماعیل و اسحاق پرستش کرتے آئے ہیں، یعنی وہی معبود جو وحدہ لاشریک ہے، اور ہم (احکام میں) اسی کی اطاعت پر (قائم) رہیں گے۔

اَمۡ کُنۡتُمۡ شُهَدَآءَ: کسی منقول بات کے دعوی کا صحیح ہونا دو ہی طریقوں سے ہوسکتا ہے، یا صحیح نقل یا اپنا مشاہدہ، یہاں دونوں مفقود ہیں، تو یہ محض ایک دعوی ہے وہ بھی دلیل کے بغیر، بلکہ یہ تو دلیل عقلی ونقلی ہی کے خلاف ہے، عقلی دلیل کے خلاف تو اس وجہ سے کہ یہودیت اور نصرانیت حضرت موسی وحضرت عیسی علیہما السلام کے وقت سے شروع ہوئیں اور یہ انبیاء سابقین یعنی ابراہیم، اسماعیل، اسحاق اور یعقوب علیہم السلام ان دونوں انبیاء سے بہت پہلے گذرے ہیں، جیسا کہ آیت: یا اھل الکتٰب لم تحاجّون فی ابرٰھیم وما انزلت التوراۃ والانجیل میں یہی مضمون ہے، اور نقلی دلیل کے خلاف اس لیے کہ خبر صادق یعنی قرآن کے خلاف ہے، اور جو صادق کے خلاف ہو وہ کاذب ہے، چنانچہ آگے آیت: قل ء انتم اعلم ام اللہ میں یہی مضمون ہے۔

اگر کسی کو شبہ ہو کہ اسی طرح تو اسلام بھی رسول اللہ ﷺ کے وقت سے شروع ہوا ہے، اور آپ ﷺ ان حضرات انبیاء سے بہت بعد ہیں، پھر ان حضرات کا ملت اسلام پر ہونا کیسے ثابت ہوسکتا ہے؟ اس کا جواب اوپر جو اسلام کے معنی ''اطاعت حق'' سے کیے گئے ہیں اس سے ظاہر ہے، یعنی اسلام کے معنی حق کی اطاعت ہے، اس سے تمام انبیاء کا ملت اسلام پر ہونا ثابت ہے، بخلاف یہودیت یا نصرانیت کے کہ وہ خاص مذہب تورات یا مذہب انجیل کا نام ہے، خوب سمجھ لو، پس جو انبیاء تورات وانجیل کے نازل ہونے سے پہلے گزر چکے ہیں وہ یہودی یا نصرانی کیونکر ہوسکتے ہیں۔

* * *

فائدہ: یعنی تم حضرت یعقوب علیہ السلام کی وصیت کے وقت تو موجود بھی نہ تھے، انہوں نے تو ملت انبیائے موصوفین کا ارشاد فرمایا تھا، تم نے یہ کیا کہ یہود اپنے سوا سب کو اور نصاریٰ اپنے سوا سب کو بے دین بتلانے لگے (اور مذہب حق یعنی اسلام کے دونوں مخالف ہوگئے) یہ تمہارا افتراء ہے۔

تِلۡكَ اُمَّةٌ قَدۡ خَلَتۡ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتۡ وَلَكُمۡ مَّا كَسَبۡتُمۡ ۚ وَلَا تُسۡـَٔلُوۡنَ عَمَّا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۳۴﴾

وہ ایک جماعت تھی جو گزر چکی، ان کے واسطے ہے جو انہوں نے کیا اور تمہارے واسطے ہے جو تم نے کیا، اور تم سے پوچھ نہیں ان کے کاموں کی

خلاصہ تفسیر: پیچھے ان سب حضرات انبیاء کرام کا ملت اسلام پر ہونا اور یہود ونصاری کا اتباع محمدی ﷺ کے ترک کی وجہ سے ملت اسلام سے اعراض کرنا ثابت ہو چکا تو اس سے یہود ونصاری کا عند اللہ غیر مقبول ہونا لازم آ گیا، مگر یہود ونصاری کو انبیاء کی اولاد ہونے یا بطور مذہب ان انبیاء کی طرف نسبت کرنے کا زعم اور اس پر فخر تھا، اور اسی کو نجات کے لیے کافی سمجھتے ہوئے تھے، چنانچہ ان کے اس خیال کا غلط ہونا اور محض نسبت کا کافی نہ ہونا بیان فرماتے ہیں:

یہ (ان بزرگوں کی) ایک جماعت تھی جو (اپنے زمانہ میں) گذر چکی، ان کے کام ان کا کیا ہوا آئے گا، اور تمہارے کام تمہارا کیا ہوا آئے گا، اور تم سے ان کے کئے ہوئے کی پوچھ بھی تو نہ ہوگی (اور خالی تذکرہ بھی تو نہ ہوگا، رہا اس سے تم کو نفع پہنچنا یہ تو بڑی دور ہے)۔

لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ: مقبولین کے ساتھ نسبت اس شخص کے لیے نافع نہیں ہوتی جو عقائد قطعیہ میں ان مقبولین کا مخالف ہو، اگرچہ طبعاً ان حضرات سے محبت بھی رکھتا ہو، اور یہود و نصاریٰ ایسے ہی تھے کہ رسالت محمدیہ کے منکر تھے جو کہ عقائد قطعیہ میں سے ہے، حالانکہ گزشتہ انبیاء اس کے مصدّق تھے، اور اگر عقائد قطعیہ میں مخالفت نہ کی جائے تو کسی درجہ میں مقبولین کی نسبت نافع ہوگی، خواہ شفاعت سے، خواہ محبت سے یا معیت کی بنا پر، یہ صحیح نصوص سے ثابت ہے، حاصل یہ کہ نسبت مؤمنین کو نافع ہوگی، کفار کو نہیں، اور اسی معنی کے اعتبار سے نسب بھی نافع ہے، اب سب احادیث میں موافقت اور مطابقت ہو جائے گی، رہا دنیا میں نسب کی وجہ سے اپنے اثرات کے اعتبار سے فرق و تفاوت، تو بلاشبہ اس میں بہت سے مصالح بھی ہیں، لیکن نسب کی وجہ سے اپنا تفاخر اور دوسرے کی تحقیر حرام ہے۔

* * *

فائدہ: یہودیوں کو اور نصرانیوں کو یقین تھا کہ ماں باپ کے گناہوں میں اولاد گرفتار ہوگی اور ان کے ثواب میں بھی اولاد شریک ہوگی، سو یہ غلط ہے اپنا کیا اپنے آگے آئے گا، بھلا یا برا۔

وَقَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا ؕ قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِيْفًا ؕ

اور کہتے ہیں کہ ہو جاؤ یہودی یا نصرانی تو تم پالو گے راہ راست [1] کہہ دے کہ ہرگز نہیں بلکہ ہم نے اختیار کی راہ ابراہیم کی جو ایک ہی طرف کا تھا

وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿١٣٥﴾

اور نہ تھا شرک کرنے والوں میں [2]

خلاصہ تفسیر: پیچھے ملت اسلام کا حق ہونا اور نبوت محمدیہ کے زمانہ میں یہودیت و نصرانیت کا باعث نجات نہ ہونا بیان ہوا، اب ان آیات میں یہودیت و نصرانیت کی طرف بلانے والوں کے قول کا جواب ارشاد ہے:

اور یہ (یہودی و نصرانی) لوگ (مسلمانوں سے) کہتے ہیں کہ تم لوگ یہودی ہو جاؤ (یہ تو یہود نے کہا تھا) یا نصرانی ہو جاؤ (یہ نصاریٰ نے کہا تھا) تم بھی راہ (حق) پر پڑ جاؤ گے (اے محمد ﷺ!) آپ (جواب میں) کہہ دیجئے کہ ہم تو (یہودی یا نصرانی کبھی نہ ہوں گے، بلکہ) ملت ابراہیم (یعنی اسلام) پر رہیں گے، جس میں کجی کا نام نہیں (بخلاف یہودیت و نصرانیت کے جس میں محرف ہونے کے علاوہ اس کے منسوخ ہونے سبب اب اس میں کجی آگئی) اور ابراہیم علیہ السلام مشرک بھی نہ تھے۔

قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِيْفًا: شبہ ہوتا ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ تو مستقل نبی اور مستقل شریعت کے ساتھ مبعوث ہوئے، پھر آپ کے ملت ابراہیمی پر رہنے کے کیا معنی؟ اور اس سے بڑھ کر بعض آیات میں جو آپ ﷺ کو اتباع ابراہیم کا حکم دیا گیا ہے اس کے کیا معنی؟

جواب یہ ہے کہ ملت ابراہیمی کی تفسیر "اطاعت حق" اوپر آچکی ہے جو کہ تمام انبیاء میں ملت مشترکہ ہے اور اطاعت حق کی خصوصیات ہر جدید شریعت کے زمانہ میں بدلتی رہیں، حتیٰ کہ اب شریعت محمدیہ میں آکر منحصر ہو گئیں، پس "ملت ابراہیم" شریعت محمدیہ کا لقب ہے، سو یہ کہنا کہ "ہم ملت ابراہیم پر رہیں گے"، یا یہ کہنا کہ "تم ملت ابراہیم کی اتباع کرو" مرادف اور ہم معنی ہے اس کا کہ کہا جائے کہ "ہم شریعت محمدیہ پر رہیں گے اور تم شریعت محمدیہ کا اتباع کرو"، چنانچہ ایک آیت میں اسی توجیہ سے سب انبیاء کی اتباع کا حکم فرمایا: فبهداهم اقتده، سو کوئی اشکال نہ رہا۔

رہی یہ بات کہ جب "ملت ابراہیم"، یعنی اسلام تمام انبیاء میں ملت مشترکہ ہے تو اس کو ملت موسیٰ اور ملت عیسیٰ بھی کہا جا سکتا تھا، پھر ملت ابراہیم کی تخصیص کیوں کی گئی؟ سو اس کی دو وجہ ہیں: ① ایک یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہود اور نصاریٰ اور مشرکین سب مانتے تھے، دوسری تعبیر میں بعض کو وحشت ہوتی ② دوسری وجہ یہ کہ جناب رسول اللہ ﷺ و حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بہت سے فروع عملی میں بھی ایک سا طریقہ ہے، بخلاف اور شرائع کے کہ ان سے اصول و عقائد میں تو اتحاد ہے اور فروع میں اکثر فرق ہے، خوب سمجھ لو۔

وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ: اس اخیر جملہ سے یا تو یہ مقصود ہے کہ ابراہیم علیہ السلام خالص موحد تھے اور یہودیت ونصرانیت میں اب شرک کی آمیزش ہوگئی ہے، اس لیے بھی یہودیت ونصرانیت اختیار کرنے کے قابل نہیں رہی، اس صورت میں یہ جملہ خود ایک مستقل دعوی کی دلیل ہوجائے گا، یا اس جملہ سے مشرکین عرب پر رد کرنا مقصود ہے کہ تم چند کام ملت ابراہیم کے موافق کرکے اپنے آپ کو ملت ابراہیمی کا متبع سمجھتے ہو، حالانکہ تم میں اور ان میں زمین وآسمان کا فرق ہے کہ وہ موحد تھے اور تم مشرک ہو۔

* * *

فائدہ: ۱ مطلب یہ ہے کہ یہودی مسلمانوں کو کہتے ہیں کہ یہودی ہوجاؤ اور نصرانی کہتے کہ نصرانی ہوجاؤ تو تم کو ہدایت نصیب ہو۔

فائدہ: ۲ یعنی کہہ دو اے محمد ﷺ کہ تمہارا کہنا ہرگز منظور نہیں، بلکہ ہم موافق ہیں ملت ابراہیم علیہ السلام کے، جو سب برے مذہبوں سے علیحدہ ہے۔

''نہیں تھا وہ شرک کرنے والوں میں'' اشارہ ہے کہ تم دونوں فریق [یہود ونصاری] شرک میں مبتلا ہو، بلکہ مشرکین عرب بھی مذہب ابراہیمی کے مدعی تھے، مگر وہ بھی مشرک تھے تو اس میں ان پر بھی رد ہوگیا، اب ان فرقوں میں بروئے انصاف کوئی بھی ملت ابراہیمی پر نہ رہا، صرف اہل اسلام ملت ابراہیمی میں رہے۔

فائدہ: ہر شریعت میں تین باتیں ہوتی ہیں:

① اوّل عقائد (جیسے توحید ونبوت وغیرہ) سو اس میں تو سب دین والے شریک اور موافق ہیں اختلاف ممکن ہی نہیں ② دوسرے قواعد کلیہ شریعت کہ جن سے جزئیات وفروع مسائل حاصل ہوتے ہیں اور تمام جزئیات میں وہ کلیات ملحوظ رہتے ہیں اور ملت فی الحقیقت انہی اصول اور کلیات کا نام ہے اور ملت محمدی اور ملت ابراہیمی کا توافق واتحاد انہی کلیات میں ہے ③ تیسرے مجموعہ کلیات وجزئیات وجمیع اصول وفروع (جس کو ''شریعت'' کہتے ہیں) جس کا خلاصہ یہ ہوا کہ رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ملت ایک ہے اور شریعت جدا جدا۔

قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ

تم کہہ دو کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور جو اترا ہم پر اور جو اترا ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب

وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ

اور اس کی اولاد پر اور جو ملا موسیٰ کو اور عیسیٰ کو اور جو ملا دوسرے پیغمبروں کو ان کے رب کی طرف سے، ہم فرق نہیں کرتے

بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۖ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿١٣٦﴾

ان سب میں سے ایک میں بھی، اور ہم اسی پروردگار کے فرمانبردار ہیں

خلاصہ تفسیر: اب اس ملت ابراہیمی کا خلاصہ تسلیم (فرمانبرداری) کے عنوان سے ارشاد فرماتے ہیں:

(مسلمانو! یہود ونصاریٰ کے جواب میں جو تم نے اجمالاً کہا ہے کہ ہم ملت ابراہیمی پر رہیں گے، اس ملت کی تفصیل بیان کرنے کے لئے) کہہ دو کہ (اس ملت پر رہنے کا حاصل یہ ہے کہ) ہم ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور اس (حکم) پر بھی جو ہمارے پاس (رسول اللہ ﷺ کے واسطہ سے) بھیجا گیا، اور اس (حکم) پر بھی جو ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب (علیہم السلام) اور اولاد یعقوب (میں جو نبی گذرے ہیں ان) کی طرف (وحی کے واسطہ سے) بھیجا گیا، اور اس (حکم اور معجزہ) پر بھی جو موسیٰ اور عیسیٰ (علیہما السلام) کو دیا گیا، اور اس پر بھی جو کچھ اور انبیاء کو دیا گیا ان کے پروردگار کی طرف سے (سو ہم ان سب پر ایمان رکھتے ہیں اور ایمان بھی) اس کیفیت سے کہ ہم ان (حضرات) میں سے کسی ایک میں بھی (دوسرے

سے ایمان لانے میں) تفریق نہیں کرتے (کہ کسی پر ایمان رکھیں کسی پر نہ رکھیں) اور ہم تو اللہ تعالیٰ کے مطیع ہیں (انہوں نے ہم کو یہ دین بتلایا ہم نے اختیار کرلیا، پس یہ حاصل ہے اس ملت کا جس پر ہم قائم ہیں، جس میں کسی کو اصلاً انکار وسرتابی کی گنجائش نہیں)۔

مضمون کا حاصل یہ ہوا کہ دیکھو ہمارا دین کیسا انصاف اور حق کا ہے کہ سب انبیاء کو مانتے ہیں، سب کی کتابوں کو سچا جانتے ہیں، سب کے معجزات کو حق پہچانتے ہیں، اگرچہ اکثر احکام کے منسوخ ہونے کی وجہ سے دوسری مستقل شریعت محمدیہ پر عمل کرتے ہیں، لیکن انکار وتکذیب کسی کی نہیں، یہودیت ونصرانیت کے برخلاف کہ ان میں منسوخ ہونے کے علاوہ اب اس میں کسی کی تصدیق ہے اور کسی کی تکذیب ہے، اور آیت کے اخیر میں پھر اس ملت کے عنوان لقبی یعنی اسلام کی طرف اشارہ کر دیا کہ: وَنَحۡنُ لَهٗ مُسۡلِمُوۡنَ سو ایسے حق اور انصاف کا دین تو ہمارے مخاطبین کو بھی قبول کر لینا چاہیے۔

* * *

فائدہ: یعنی ہم سب رسولوں اور سب کتابوں پر ایمان لاتے ہیں، اور سب کو حق سمجھتے ہیں اور اپنے اپنے زمانہ میں سب واجب الاتباع ہیں اور ہم خدا کے فرمانبردار ہیں، جس وقت جو نبی ہوگا، اس کے ذریعہ سے جو احکام خداوندی پہنچیں گے، اس کا اتباع ضروری ہے، بخلاف اہل کتاب کے کہ اپنے دین کے سوا سب کی تکذیب کرتے ہیں، چاہے ان کا دین منسوخ ہی ہو چکا ہو اور انبیاء کے احکام کو جھٹلاتے ہیں جو خدا کے احکام ہیں۔

فَاِنۡ اٰمَنُوۡا بِمِثۡلِ مَاۤ اٰمَنۡتُمۡ بِهٖ فَقَدِ اهۡتَدَوۡا ۚ وَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَاِنَّمَا هُمۡ فِىۡ شِقَاقٍ ۚ

سو اگر وہ بھی ایمان لاویں جس طرح پر تم ایمان لائے ہدایت پائی انہوں نے بھی، اور اگر پھر جاویں تو پھر وہی ہیں ضد پر

فَسَيَكۡفِيۡكَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ ﴿۱۳۷﴾

سو اب کافی ہے تیری طرف سے ان کو اللہ، اور وہی ہے سننے والا جاننے والا

خلاصہ تفسیر: یہاں تک دین حق کا ملت ابراہیمی میں منحصر ہونا ثابت ہو چکا، آگے اس انحصار پر تفریع اور اس کے ساتھ فریق مخالف کے قبول حق نہ کرنے کی صورت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تسلی فرمائی جاتی ہے:

(جب اسلام میں دین حق کا منحصر ہونا ثابت ہو چکا) سو اگر وہ (یہود ونصاریٰ) بھی اسی طریقہ سے ایمان لے آئیں جس طریقہ سے تم (اہل اسلام) ایمان لائے ہو تب تو وہ بھی راہِ (حق) پر لگ جائیں گے، اور اگر وہ (اس سے) روگردانی کریں تو (تم ان کی روگردانی سے کچھ تعجب نہ کرو، کیونکہ) وہ لوگ تو (ہمیشہ سے) برسر مخالفت ہیں ہی (اور اگر ان کی مخالفت سے کچھ اندیشہ ہو) تو (سمجھ لیجئے کہ) آپ کی طرف سے عنقریب ہی نمٹ لیں گے ان سے اللہ تعالیٰ، اور اللہ تعالیٰ (تمہاری اور ان کی باتیں) سنتے ہیں (اور تمہارے اور ان کے برتاؤ) جانتے ہیں (تمہارے فکر وغم کی کوئی ضرورت نہیں، چنانچہ تھوڑے ہی دنوں میں یہود ونصاریٰ اور سب کفار کو مغلوب کر دیا جیسا کہ تواریخ متواترہ میں بھی منقول ہے)۔

* * *

فائدہ: یعنی ان کی دشمنی اور ضد سے خوف مت کرو، اللہ ان کے شر اور مضرت سے تمہارا محافظ ہے، وہ تمہارا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے، خدا سب کی باتوں کو سنتا اور سب کے حال اور نیت کو جانتا ہے۔

صِبۡغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنۡ اَحۡسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبۡغَةً ۫ وَّنَحۡنُ لَهٗ عٰبِدُوۡنَ ﴿۱۳۸﴾

ہم نے قبول کر لیا رنگ اللہ کا، اور کس کا رنگ بہتر ہے اللہ کے رنگ سے، اور ہم اسی کی بندگی کرتے ہیں

خلاصہ تفسیر: اس دین حق کا لقب پیچھے جو ''ملت ابراہیم'' آیا ہے، اس میں ایک نبی کی طرف نسبت ہے، آگے اسلام کا مزید شرف ظاہر کرنے کے لیے اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف فرمائی جاتی ہے، نیز اس میں توحید کا بھی زیادہ اہتمام ہے کہ دین کی حقیقی نسبت حق تعالیٰ ہی

ہیں اور نبی کی طرف نسبت مجازی کردی جاتی ہے واسطہ تبلیغ ہونے کی وجہ سے، چنانچہ فرمایا:

(اے مسلمانو! کہہ دو کہ ہم نے جو اوپر تم لوگوں کے جواب میں کہا ہے کہ ہم ملت ابراہیم پر رہیں گے، اس کلام کی حقیقت یہ ہے کہ:) ہم (دین کی) اس حالت پر رہیں گے جس میں (ہم کو) اللہ تعالیٰ نے رنگ دیا ہے (اور رنگ کی طرح ہمارے رگ وریشہ میں بھر دیا ہے) اور (دوسرا) کون ہے جس کے رنگ دینے کی حالت اللہ تعالیٰ (کے رنگ دینے کی حالت) سے خوب تر ہو (جب کوئی دوسرا ایسا نہیں تو ہم نے اور کسی کا دین بھی اختیار نہیں کیا) اور (اس لئے) ہم اس کی غلامی اختیار کئے ہوئے ہیں۔

* * *

فائدہ: یہودی ان آیتوں سے پھر گئے اور اسلام قبول نہ کیا، اور نصرانیوں نے بھی انکار کر دیا، اور شیخی میں آ کر کہنے لگے کہ ہمارے یہاں ایک رنگ ہے جو مسلمانوں کے پاس نہیں ہے، نصرانیوں نے ایک زرد رنگ بنا رکھا تھا اور یہ دستور تھا کہ جب ان کے بچہ پیدا ہوتا، یا کوئی ان کے دین میں آتا تو اس کو اس رنگ میں غوطہ دے کر کہتے کہ خاصہ پاکیزہ نصرانی ہو گیا، سو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: ''اے مسلمانو! کہو ہم نے خدا کا رنگ یعنی (دین حق) قبول کیا کہ اس دین میں آ کر سب طرح کی ناپاکی سے پاک ہوتا ہے''۔

قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِي اللّٰهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۚ وَلَنَآ اَعْمَالُنَا

کہہ دے کیا تم جھگڑا کرتے ہو ہم سے اللہ کی نسبت حالانکہ وہی ہے رب ہمارا اور رب تمہارا، اور ہمارے لئے ہیں عمل ہمارے

وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۚ وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ ﴿١٣٩﴾

اور تمہارے لئے ہیں عمل تمہارے، اور ہم تو خالص اسی کے ہیں

خلاصہ تفسیر: (اوپر کی آیتوں میں یہود ونصاریٰ پر پورے طور پر حجت قائم ہو چکی، پھر بھی وہ لوگ وہی دعویٰ بلا دلیل برابر کیے جاتے تھے کہ مسلمان باطل پر ہیں ان کو آخرت میں نجات نہ ہوگی، اور ہم حق پر ہیں، کیونکہ جس طریقے پر ہم ہیں سب انبیاء اسی پر تھے، حق تعالیٰ نے پہلے ان دونوں باتوں کی تحقیق فرما دی، اب پھر دوسرے طرز پر جواب کی تعلیم ہوتی ہے) آپ (ان یہود ونصاریٰ سے) فرما دیجئے کہ کیا تم لوگ (اب بھی) ہم سے حجت کئے جاتے ہو حق تعالیٰ کے معاملہ میں (کہ وہ ہم کو قیامت میں نہ بخشیں گے) حالانکہ وہ ہمارا اور تمہارا (سب کا) رب (اور مالک) ہے (سو ربوبیت میں تو تمہارے ساتھ کوئی خصوصیت نہیں، جیسا کہ تمہارے بعض دعووں سے مفہوم ہوتا ہے، جیسے نحن ابناء اللہ) اور ہم کو ہمارا کیا ہوا ملے گا اور تم کو تمہارا کیا ہوا ملے گا (یہاں تک تو تمہارے نزدیک بھی مسلم ہے) اور (اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ) ہم نے صرف حق تعالیٰ (کی خوشنودی) کے لئے اپنے (دین) کو (شرک وغیرہ سے) خالص کر رکھا ہے (بخلاف تمہارے موجودہ طریقہ کے جو کہ منسوخ ہونے کے علاوہ خود اس میں شرک ملا ہوا ہے جیسا ان کے قول ''عزیر ابن اللہ'' اور ''مسیح ابن اللہ'' سے ظاہر ہے، جب اس میں ہم کو اللہ نے ترجیح دی ہے، پھر ہم کو نجات نہ ہونے کے کیا معنی)۔

وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ: یہاں آخر میں اپنے اخلاص کی خبر دینے سے دعویٰ کمال مقصود نہیں ہے، بلکہ مخاطبین کو اپنے طریق دین کا اظہار مقصود ہے جو ضروری بات ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی اللہ تعالیٰ کی نسبت تمہارا نزاع کرنا اور تمہارا یہ سمجھنا کہ اس کی عنایت ورحمت کا ہمارے سوا کوئی مستحق نہیں، لغو بات ہے، وہ جیسا تمہارا رب ہے، ہمارا بھی رب ہے اور ہم جو کچھ اعمال کرتے ہیں، خالص اسی کے لئے کرتے ہیں، تمہاری طرح زعم آباواجداد اور تعصب ونفسانیت سے نہیں کرتے، پھر کیا وجہ کہ ہمارے اعمال وہ مقبول نہ فرمائے اور تمہارے اعمال مقبول ہوں۔

اَمْ تَقُوْلُوْنَ اِنَّ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطَ كَانُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ

کیا تم کہتے ہو کہ ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور اس کی اولاد تو یہودی تھے یا نصرانی

قُلْ ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ ؕ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ ؕ

کہہ دے کہ تم کو زیادہ خبر ہے یا اللہ کو، اور اس سے بڑا ظالم کون جس نے چھپائی وہ گواہی جو ثابت ہو چکی اس کو اللہ کی طرف سے

وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۰﴾

اور اللہ بے خبر نہیں تمہارے کاموں سے

خلاصہ تفسیر: یا (اب بھی اپنے حقانیت ثابت کرنے کو یہی) کہے جاتے ہو کہ ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور اولاد یعقوب (میں جو انبیاء گذرے ہیں یہ سب حضرات) یہود یا نصاریٰ تھے (اور تم اس موافقت کے واسطے سے اپنا حق پر ہونا ثابت کرتے ہو، سو اس کے جواب میں) اے محمد ﷺ! (ایک اتنی مختصر سی بات ان سے) کہہ دیجئے کہ (اچھا یہ بتلاؤ کہ) تم زیادہ واقف ہو یا حق تعالیٰ (اور ظاہر ہے کہ خدا ہی زیادہ واقف ہے اور وہ ان سب انبیاء کا ملت اسلام پر ہونا ثابت کر چکے ہیں، جیسا ابھی اوپر گذر چکا ہے) اور (جانتے ہیں یہ کافر بھی مگر چھپاتے ہیں سو) ایسے شخص سے زیادہ ظالم کون ہوگا، جو ایسی شہادت کا اخفا کرے، جو اس کے پاس من جانب اللہ پہنچی ہو اور (اے اہل کتاب) اللہ تعالیٰ تمہارے کئے ہوئے سے بے خبر نہیں ہیں (پس جب یہ حضرات یہود و نصاریٰ نہ تھے، سو تم دین میں ان کے موافق کب ہوئے، پھر تمہارا حق پر ہونا بھی ثابت نہ ہوا)۔

* * *

فائدہ: حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل اور دیگر انبیاء علیہم السلام کی بابت یہود اور نصاریٰ کا یہ دعویٰ کہ وہ یہودی یا نصرانی تھے دروغ صریح ہے علاوہ ازیں حق تعالیٰ تو فرماتا ہے: ما کان ابراھیم یہودیا ولا نصرانیا تو اب بتلاؤ تم کو علم زیادہ ہے یا اللہ تعالیٰ کو۔

تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۱﴾ ع

وہ ایک جماعت تھی جو گزر چکی، انکے واسطے ہے جو انہوں نے کیا اور تمہارے واسطے ہے جو تم نے کیا، اور تم سے کچھ پوچھ نہیں ان کے کاموں کی

خلاصہ تفسیر: پہلے یہود کے ایک فخر و زعم کے جواب میں جو نبی زادے ہونے کی وجہ سے کرتے تھے ایسی ہی ایک آیت پیچھے گذر چکی ہے، چونکہ یہاں ان کا فخر و زعم دوبارہ مذکور ہوا، اس لیے وہی آیت پھر مکرر لائی جاتی ہے، فرق یہ ہے کہ پیچھے ابتدائی جواب دینا مقصود تھا اور یہاں آخری جواب۔

یہ (ان بزرگوں کی) ایک جماعت تھی جو (اپنے زمانے میں) گذر گئی، ان کے کام ان کا کیا ہوا آئے گا، اور تمہارے کام تمہارا کیا ہوا آئے گا، اور تم سے ان کے کئے ہوئے کی پوچھ بھی تو نہ ہوگی (اور جب خالی تذکرہ بھی نہ ہوگا تو اس سے تم کو کچھ نفع پہنچنا تو درکنار)۔

* * *

فائدہ: یہی آیت عنقریب گزر چکی ہے، مگر چونکہ اہل کتاب کے دل میں اپنی بزرگ زادگی کی وجہ سے یہ خیال خوب جم رہا تھا کہ ہمارے اعمال کیسے ہی برے ہوں، بالآخر ہمارے باپ دادا ہم کو ضرور بخشوائیں گے، اس لئے اس بے ہودہ خیال کے روکنے کے لئے تاکیداً اس آیت کو مکرر بیان فرمایا، یا یوں کہو کہ پہلی آیت میں اہل کتاب کو خطاب تھا، اور اس آیت میں آپ کی امت کو ہے کہ اس بیہودہ خیال میں ان کا اتباع نہ کریں، کیونکہ ایسی توقع اپنے بزرگوں سے ہر کسی کے دل میں آ ہی جاتی ہے جو سراسر بے وقوفی ہے۔

سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا ؕ قُلْ لِّلّٰهِ

اب کہیں گے بیوقوف لوگ کہ کس چیز نے پھیر دیا مسلمانوں کو ان کے قبلہ سے جس پر وہ تھے [1] تو کہہ اللہ ہی کا ہے

الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ؕ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (۱۴۲)

مشرق اور مغرب، چلائے جس کو چاہے سیدھی راہ پر [2]

خلاصہ تفسیر: پیچھے بیان ہو چکا ہے کہ تحویل قبلہ پر اعتراض کا جواب چند اجزاء پر مشتمل ہے، ان میں سے ایک جز حاکمانہ جواب بھی ہے سو اب وہ بیان کیا جاتا ہے، اور جواب کی تمہید میں ان کے جاہلانہ قول کی بھی تصریح فرمادی ہے۔

(جب کعبہ قبلۂ نماز مقرر ہو کر یہود کا قبلہ متروک ہو گیا تو ناگوار ہونے کی وجہ سے) اب تو (یہ) بیوقوف لوگ ضرور ہی کہیں گے کہ ان (مسلمانوں) کو ان کے (سابق سمت) قبلہ سے (جو کہ بیت المقدس تھا) جس طرف پہلے متوجہ ہوا کرتے تھے، کس بات نے (دوسری سمت کی طرف) بدل دیا، آپ (جواب میں) فرما دیجئے کہ سب (سمتیں خواہ) مشرق (ہو) اور (خواہ) مغرب (ہو) اللہ ہی کے ملک ہیں (خدا تعالیٰ کو مالکانہ اختیار ہے جس سمت کو چاہیں مقرر فرما دیں، کسی کو علت دریافت کرنے کا منصب نہیں ہے اور احکام شرعیہ کے باب میں سیدھا طریقہ یہی اعتقاد ہے کہ احکام الٰہی کو بے چون و چرا قبول کر لیں، لیکن بعضوں کو اس راہ کے اختیار کرنے کی توفیق نہیں ہوتی، خواہ مخواہ علتیں ڈھونڈتے پھرا کرتے ہیں، البتہ) جس کو خدا ہی (اپنے فضل سے) چاہیں (یہ) سیدھا طریق بتلا دیتے ہیں۔

يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ: اس مقام پر جس اعتقاد (احکام الٰہی کو بے چون و چرا قبول کرنے) کو "صراط مستقیم" کہا گیا ہے، درحقیقت سلامتی اور امن اسی طریقہ میں ہی ہے، آج کل اکثر نوخیز طبائع نے اس "صراط مستقیم" کو چھوڑ دیا ہے اور شرعی احکام کی علتوں کی تفتیش میں لگ گئے ہیں، جن میں بعض کی غرض تو نعوذ باللہ شرعی احکام کی توہین یا تکذیب اور اس پر اعتراض کرنا ہوتا ہے، بعض کو اسی بہانہ عمل سے اپنی جان بچانا مقصود ہوتا ہے اور بعض کی اگرچہ فاسد غرض نہیں ہوتی، لیکن بلند فہمی اور باریک نگاہ نہ ہونے کی وجہ سے اکثر اس کا نتیجہ بددینی اور بداعتقادی ہوتا ہے۔

* * *

فائدہ: [1] حضرت ﷺ جب مکہ سے مدینہ میں تشریف لائے تو سولہ سترہ مہینے بیت المقدس ہی کی طرف نماز پڑھتے رہے، اس کے بعد کعبہ کی طرف منہ کرنے کا حکم آ گیا تو یہود اور مشرکین اور منافقین اور بعضے کچے مسلمان ان کے بہکانے سے شبہے ڈالنے لگے کہ یہ تو بیت المقدس کی طرف نماز پڑھا کرتے تھے جو قبلہ تھا پہلے انبیاء کا، اب انہیں کیا ہوا جو اس کو چھوڑ کر کعبہ کو منہ کرنے لگے، کسی نے کہا کہ یہود کی عداوت وحسد سے ایسا کیا، کسی نے کہا کہ یہ اپنے دین میں متردد اور متحیر ہیں جن سے ان کا نبی اللہ ہونا ظاہر نہیں ہوتا، مخالفوں کے اس اعتراض اور اسکے جواب کی جو آگے ہے اللہ نے اطلاع فرمادی کہ کسی کو اس وقت کوئی تردد نہ ہو اور جواب میں تامل نہ ہو۔

فائدہ: [2] یعنی اے محمد ﷺ! کہہ دو کہ نہ ہم نے یہود کے حسد سے اور نہ کسی نفسانی تعصب اور اپنی رائے کے اتباع سے قبلہ کو بدلا، بلکہ محض اتباع فرمان خداوندی سے جو کہ ہمارا اصل دین ہے ہم نے ایسا کیا، پہلے بیت المقدس کو منہ کرنے کا حکم تھا، اس کو ہم نے تسلیم کیا، اب کعبہ کی طرف منہ کرنے کا حکم آیا، اس کو دل سے قبول کیا، ہم سے اس کی وجہ پوچھنا اور ہم پر اعتراض کرنا سخت حماقت ہے۔ غلام تابعدار پر یہ اعتراض کرنا کہ تو پہلے وہ کام کرتا تھا، اب یہ کام کیوں کرنے لگا؟ عاقل کا کام نہیں اور اگر ان احکام مختلفہ کے اسرار دریافت کرتے ہو تو اس کے تمام اسرار کون سمجھے اور تم بیوقوفوں کو کون سمجھائے؟! البتہ اتنی بات ہر کوئی سمجھ سکتا ہے اور ہر ایک کو سمجھا سکتا ہے کہ قبلہ کا معین فرمانا تو طریقہ عبادت کو بتلانے کی غرض سے ہے، اصل عبادت ہرگز نہیں اور اس بارے میں حق تعالیٰ کا معاملہ جدا جدا ہے، کسی کو اپنی حکمت ورحمت کے مطابق ایک خاص راستہ بتلایا جاتا ہے، کسی کو دوسرا، تمام مواقع اور جملہ جہات کا وہ مالک ہے، جس کو جس وقت چاہتا ہے اس کو ایسا راستہ بتلا دیتا ہے، جو نہایت سیدھا اور سب راستوں سے مختصر اور

قریب تر ہو، چنانچہ ہم کو اس وقت اس قبلہ کی ہدایت فرمائی، جو سب قبلوں میں افضل اور بہتر ہے۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ

اور اسی طرح کیا ہم نے تم کو امت معتدل تاکہ تم ہو گواہ لوگوں پر اور ہو رسول تم پر گواہی دینے والا

خلاصہ تفسیر: احکام شرعیہ کو قبول کرنے کے بارے میں جس بات (احکام شرعیہ کو بلا چون وچرا تسلیم کرلینا) کو گذشتہ آیت میں ''صراط مستقیم'' فرمایا گیا، چونکہ امت محمدیہ نے اس کو بے چون وچرا اختیار کرلیا، اس لیے اس آیت میں بطور جملہ معترضہ کے امت محمدیہ کی مدح اور فضیلت بیان کرتے ہیں، اس کے بعد پھر اصل مطلب کی طرف رجوع فرمائیں گے۔

اور (اے متبعین محمد ﷺ!) اسی طرح ہم نے تم کو ایسی ہی ایک جماعت بنادی ہے جو (ہر پہلو سے) نہایت اعتدال پر ہے، تاکہ (دنیا میں شرف وامتیاز حاصل ہونے کے علاوہ آخرت میں بھی تمہارا بڑا شرف ظاہر ہو کہ) تم (ایک بڑے مقدمہ میں جس میں ایک فریق حضرات انبیاء علیہم السلام ہوں گے اور دوسرا فریق ان کی مخالف قومیں ہوں گی، ان مخالف) لوگوں کے مقابلہ میں گواہ (تجویز) ہو اور (شرف بالائے شرف یہ ہوا کہ) تمہارے (قابل شہادت اور معتبر ہونے کے) لئے رسول (اللہ ﷺ) گواہ ہوں (اور اس شہادت سے تمہاری شہادت معتبر ہونے کی تصدیق ہو، پھر تمہاری شہادت سے اس مقدمہ کا حضرات انبیاء علیہم السلام کے حق میں فیصلہ ہو اور مخالفین مجرم قرار پاکر سزایاب ہوں اور اس کا اعلیٰ درجہ کی عزت ہونا ظاہر ہے)۔

اُمَّةً وَّسَطًا: امت محمدیہ کو ''ہر پہلو سے معتدل'' جو کہا گیا اس کا مصداق اس حکم خاص تحویل قبلہ میں مثلاً یہ ہے کہ نہ ایسے عامی ہیں کہ اگر احکام کی حکمت بتلائی جائے تب بھی نہ سمجھیں، اور نہ ایسے فلسفی کہ اگر حکمت نہ بتلائی جائے تو اس کے بغیر حکم کو ہی نہ مانیں، چنانچہ یہاں حکمت نہیں بتائی ویسے ہی مان لیا، آگے بعض حکمتیں بتادیں ان کو جان لیا، جو شخص ایسا معتدل الطبع ہوگا وہ ضرور اچھا ہوگا، اس لیے دنیا وآخرت میں صاحب شرف ہوگا۔

لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ: احادیث میں اس کی بھی تفسیر آئی ہے کہ پہلی امتوں کے کافر حق تعالیٰ سے کہہ دیں گے کہ ہمیں آپ کے احکام ہی کی اطلاع نہیں ہوئی، انبیاء دعوی کریں گے کہ ہم نے اطلاع دے دی تھی، انبیاء سے گواہ لیے جائیں گے وہ امت محمدیہ کو اپنا گواہ بتلائیں گے، پھر اس امت کو بلاکر پوچھا جائے گا تو یہ انبیاء کے موافق گواہی دیں گے کہ ہمیں رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ سے اس واقعہ کا ثبوت قطعی دلائل سے پہنچا اس لیے ہمیں واقفیت تھی، پھر جرح بند کرنے کے لیے رسول اللہ ﷺ کو بلاکر ان گواہوں کے معتبر ہونے کے متعلق سوال ہوگا، آپ ان کے معتبر اور قابل شہادت ہونے کی تصدیق فرمائیں گے، اس پر احکم الحاکمین کی طرف سے فیصلہ کردیا جائے گا۔

① شبہ ہوتا ہے کہ امت محمدیہ انبیاء کرام سے تو زیادہ معتبر نہیں، پھر انبیاء کرام کی سچائی کو امت محمدیہ کی شہادت سے ثابت کرنے کا کیا مطلب ہوا؟ جواب یہ ہے کہ زیادہ معتبر تو وہی انبیاء حضرات ہی ہیں، لیکن چونکہ اس مقدمہ میں فریق ہوگئے، لہٰذا دوسرے گواہ درکار ہوں اگرچہ وہ ان سے ادنیٰ اور کم درجہ کے ہوں البتہ معتبر ہوں، چنانچہ دنیا کی عدالتوں میں شب وروز یہی قصہ ہوتا ہے، جیسے کہ جب کوئی اعلیٰ افسر کسی مقدمہ میں فریق ہوجاتا ہے تو وہ اپنے سے چھوٹے درجہ کے آدمیوں کو گواہی میں پیش کرسکتا ہے۔

② دوسرا شبہ یہ ہوتا ہے کہ وہ مخالف لوگ امت محمدیہ کی شہادت پر بھی تو کہہ سکتے ہیں کہ جب ہم انبیاء کو۔ نعوذ باللہ۔ سچا نہیں سمجھتے تو امت محمدیہ کو کیوں سچا سمجھیں گے؟ جواب یہ ہے کہ یہ امر بھی دنیوی عدالتوں کے معاملہ سے سمجھ میں آسکتا ہے کہ گواہوں پر ایسی اجمالی جرح کرنے کا مدعیٰ علیہ کو اختیار حاصل نہیں ہوتا، مثلاً گذشتہ مثال ہی میں دوسرے فریق کو یہ کہنے کا حق حاصل نہیں ہوگا کہ جب میں اعلیٰ افسر کو جھوٹا مانتا ہوں تو ادنیٰ درجہ کے گواہوں کی بات کیونکر مان لوں گا، مخالفین کو گواہوں پر یہ جرح کرنے کا حق نہیں کہ یہ تو ادنیٰ درجہ کے لوگ ہیں، بالخصوص اگر وہ گواہ بھی سرکاری ہو، جیسا کہ اس روز امت محمدیہ اسی حیثیت سے گواہی میں پیش کیے جائیں گے۔

③ تیسرا شبہ یہ ہے کہ جب امت محمدیہ نے اس واقعہ کا مشاہدہ ومعائنہ ہی نہیں کیا تو شہادت کیسے دیں گے؟ پھر اس پر مستزاد یہ کہ وہ اچھی خاصی جرح بھی کریں گے تو بغیر مشاہدہ کے جرح کیسے ممکن ہے؟ جواب یہ ہے کہ شہادت کے لیے درحقیقت ایسا قطعی یقینی علم کافی ہے جس سے یقین حاصل ہوجائے، چونکہ محسوسات (غیر ثابت بالوحی) میں یقین حاصل ہونا منحصر ہے مشاہدہ پر، لہٰذا المحسوسات میں تو شہادت کا مدار مشاہدہ پر ہی ہوگا، اور یہاں آیت میں اگرچہ یہ واقعہ محسوسات میں سے ہے لیکن وحی کے ذریعہ ثابت ہونے کی وجہ سے اس کا یقین حاصل ہے اور یہی یقین شہادت کا اصلی مدار ہے، کیونکہ نبی کی خبر مشاہدہ سے ہزار درجہ قطعی اور یقینی ہے، مشاہدہ میں غلطی کا امکان ہے نبی کی خبر میں غلطی کا امکان نہیں، اس لیے کہ نبی "نباء" سے مشتق ہے اور نباء لغت میں اس خبر کو کہتے ہیں کہ جو بالکل صحیح اور واقع کے مطابق ہو، مہتم بالشان بھی ہو، سو امت محمدیہ کی گواہی برمحل ہے، اس کی مثال ایسی ہی ہے کہ جیسے کسی مردہ کو جس کے بدن پر زخم وغیرہ کی کوئی ظاہری علامت نہ ہو کوئی ڈاکٹر دیکھ کر اپنی مہارت فن کے ذریعہ سے اظہار کردے کہ اس شخص کی موت کسی بیماری سے واقع نہیں ہوئی، بلکہ کسی شدید ضرب یا چوٹ کی وجہ سے مرا ہے، چنانچہ ڈاکٹر کی اس رپورٹ پر تحقیقات کا سرکاری حکم بھی جاری ہوجاتا ہے، سو اس موقع پر ڈاکٹر کی گواہی اگرچہ واقعہ کے معائنہ اور مشاہدہ کی بنیاد پر نہیں ہے لیکن چونکہ صحیح قواعد کے ذریعہ سے شدید ضرب کی تشخیص کی گئی، لہٰذا اس کا اعتبار کیا گیا، اس سے معلوم ہوا کہ شہادت کے لیے علم قطعی اور یقینی کافی ہے خاص مشاہدہ ضروری نہیں، چنانچہ اس وقت محمد رسول اللہ ﷺ کو بلایا جائے گا اور آپ سے آپ کی امت کی اس شہادت کے متعلق دریافت کیا جائے گا تو اس وقت رسول اللہ ﷺ تم پر گواہ ہوں گے اور تمہاری عدالت اور صداقت کی شہادت دیں گے اور پھر تمہاری شہادت کے مطابق حضرات انبیاء کے حق میں فیصلہ ہوگا اور کفار مجرم قرار دیے جائیں گے۔

* * *

فائدہ: لـہ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا: یعنی جیسا تمہارا قبلہ کعبہ ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ اور تمام قبلوں سے افضل ہے، ایسا ہی ہم نے تم کو سب امتوں سے افضل اور تمہارے پیغمبر کو سب پیغمبروں سے کامل اور برگزیدہ کیا، تاکہ اس فضیلت اور کمال کی وجہ سے تم تمام امتوں کے مقابلہ میں گواہ مقبول الشہادۃ قرار دیے جاؤ اور محمد رسول اللہ ﷺ تمہاری عدالت وصداقت کی گواہی دیں، جیسا کہ احادیث میں وارد ہے کہ جب پہلی امتوں کے کافر اپنے پیغمبروں کے دعوے کی تکذیب کرینگے اور کہیں گے کہ ہم کو تو کسی نے بھی دنیا میں ہدایت نہیں کی، اس وقت آپ کی امت انبیاء کے دعوے کی صداقت پر گواہی دے گی اور رسول اللہ ﷺ جو اپنے اُمتیوں کے حالات سے پورے واقف ہیں، ان کی صداقت وعدالت پر گواہ ہونگے، اسوقت وہ امتیں کہیں گی کہ انہوں نے تو نہ ہمارا زمانہ پایا، نہ ہم کو دیکھا، پھر گواہی کیسے مقبول ہوسکتی ہے، اس وقت آپ کی امت جواب دے گی کہ ہم کو خدا کی کتاب اور اس کے رسول کے بتلانے سے اس امر کا علم یقینی ہوا، اس کی وجہ سے ہم گواہی دیتے ہیں۔

فائدہ: "وسط" یعنی معتدل کا یہ مطلب ہے کہ یہ امت ٹھیک سیدھی راہ پر ہے جس میں کچھ بھی کجی کا شائبہ نہیں اور افراط وتفریط سے بالکل بری ہے۔

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّنْ يَنْقَلِبُ

اور نہیں مقرر کیا تھا ہم نے وہ قبلہ کہ جس پر تو پہلے تھا مگر اس واسطے کہ معلوم کریں کون تابع رہے گا رسول کا اور کون پھر جائیگا

عَلَى عَقِبَيْهِ ۚ وَإِنْ كَانَتْ لَكَبِيرَةً إِلَّا عَلَى الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ ۗ

الٹے پاؤں لـہ، اور بیشک یہ بات بھاری ہوئی مگر ان پر جن کو راہ دکھائی اللہ نے ٢

خلاصہ تفسیر: (اور اصل میں تو شریعت محمدیہ کے لئے ہم نے کعبہ ہی کو قبلہ تجویز کر رکھا تھا) اور جس سمت قبلہ پر آپ (چند روز قائم) رہ چکے ہیں (یعنی بیت المقدس) وہ تو محض اس (مصلحت کے) لئے تھا کہ ہم کو (ظاہری طور پر بھی) معلوم ہوجائے کہ (اس کے مقرر ہونے یا بدلنے سے یہود اور غیر یہود میں سے) کون تو رسول (اللہ ﷺ) کا اتباع اختیار کرتا ہے اور کون پیچھے کو ہٹتا جاتا ہے (اور نفرت اور مخالفت کرتا ہے،

اس امتحان کے لئے اس عارضی قبلہ کو مقرر کیا تھا، پھر اصلی قبلہ سے اس کو منسوخ کر دیا) اور یہ قبلہ کا بدلنا (منحرف لوگوں پر) ہوا بڑا ثقیل (ہاں!) مگر جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے (سیدھے راستہ کی) ہدایت فرمائی ہے (جس کا بیان پیچھے گزر چکا کہ احکام الٰہیہ کو بے چون و چرا قبول کر لینا، ان کو ذرا بھی گراں نہیں ہوا، جیسا پہلے اُس کو خدا کا حکم سمجھتے تھے اب اِس کو خدا کا حکم سمجھنے لگے)۔

* * *

فائدہ: مِمَّنۡ یَّنۡقَلِبُ عَلٰی عَقِبَیۡهِ: یعنی اصلی قبلہ تمہارا تو کعبہ ہی تھا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وقت سے چلا آتا ہے اور چند روز کے لئے جو بیت المقدس مقرر کر دیا تھا وہ تو صرف امتحان کے لئے تھا کہ کون تابعداری پر قائم رہتا ہے؟ اور کون دین سے پھر جاتا ہے؟ سو اس میں جو لوگ ایمان پر قائم رہے ان کا بڑا درجہ ہے۔

فائدہ: اس آیت میں **لنعلم** جو صیغہ استقبال ہے اور دیگر آیات میں جو **حتی نعلم** اور **فلیعلمن** اور **لما یعلم اللہ** اور **لنبلونکم** اور **الا لنعلم** وغیرہ کلمات موجود ہیں ان سب سے بظاہر یوں سمجھ میں آتا ہے کہ حق تعالیٰ کو نعوذ باللہ ان اشیاء کا علم بعد کو ہوا، ان چیزوں کے وجود سے پہلے علم نہ تھا، حالانکہ اس کا علم ہر چیز کے ساتھ قدیم ہے کَانَ اللّٰہُ بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمًا۔

علماء نے کئی طرح سے اس کا جواب دیا ہے: ① بعض نے ''علم'' سے متمیز اور جُدا جُدا کر دینا مراد لیا ہے ② بعض نے امتحان کے معنی لئے ③ کسی نے ''علم'' کو بمعنی روایت لیا ④ کسی نے مستقبل کو بمعنی ماضی فرمایا ⑤ بعض نے حدوث علم کو نبی اور مومنین کی طرف رجوع کیا، یا مخاطبین کی طرف لوٹایا ⑥ بعض اکابر محققین نے علم حالی جو بعد وجود معلوم متحقق ہوتا ہے جس پر جزا و سزا مدح و ذم مترتب ہوتی ہے مراد لیا اور اسی کو پسند فرمایا ⑦ بعض راسخین مدققین نے اس کے متعلق دو باتیں نہایت دقیق و انیق بیان فرمائیں:

۱۔ اول کا خلاصہ یہ ہے کہ حسب ارشاد **ان اللہ قد احاط بکل شیءٍ علما** تمام چیزیں اول سے آخر تک حقیر و عظیم قلیل و کثیر خدا کے سامنے ہیں اور سب کا علم اس کو ایک ساتھ ہے، اس کے علم میں تقدم و تاخر ہرگز نہیں، مگر آپس میں ایک دوسرے کی نسبت بیشک مقدم اور موخر گنی جاتی ہیں، سو علم خداوندی کے حساب سے سب کی سب بمنزلہ شیٔ واحد موجود ہیں، اس لئے وہاں ماضی حال استقبال نکالنا بالکل غلط ہوگا، البتہ تقدم و تاخر باہمی کی وجہ سے یہ تینوں زمانے بالبداہت جُدا جُدا نکلیں گے، سو جناب باری تعالیٰ:

① کبھی تو حسب موقع و حکمت اپنے معلوم ہونے کے لحاظ سے کلام فرماتے ہیں ② اور کبھی ان وقائع کے تقدم و تاخر کا لحاظ ہوتا ہے۔

پہلی صورت میں تو ہمیشہ بلحاظ ایک فرق دقیق کے ہمیشہ ماضی کا صیغہ یا حال کا صیغہ مستعمل ہوتا ہے، استقبال کا صیغہ مستعمل نہیں ہو سکتا اور دوسری صورت میں ماضی کے موقع میں ماضی اور حال کے موقع میں حال اور استقبال کی جگہ استقبال لایا جاتا ہے، سو جہاں کہیں واقعہ آئندہ کو ماضی کے الفاظ سے بیان فرمایا ہے، جیسا **ونادیٰ اصحٰب الجنّة** وغیرہ، تو وہاں اس کا لحاظ ہے کہ حق تعالیٰ کو سب مستحضر اور پیش نظر ہے اور جہاں امور گزشتہ کو صیغہ استقبال سے بیان فرمایا ہے، جیسا اسی آیت میں **الا لنعلم** ہے، یا اور اس کے سوا تو وہاں یہ مدنظر ہے کہ بہ نسبت اپنے ماقبل کے مستقبل ہے، علم الٰہی کے لحاظ سے استقبال نہیں جو اس کے علم میں حدوث کا وہم ہو۔

۲۔ دوسری تحقیق کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم کو علم اشیاء دو طریق سے حاصل ہوتا ہے، ایک تو بلا واسطہ، دوسرا بواسطہ، مثلاً آگ کو کبھی تو آنکھ سے مشاہدہ کرتے ہیں، اور کبھی آگ تو ہم سے کسی آڑ میں ہوتی ہے مگر دھوئیں کو دیکھ کر آگ کا یقین ہو جاتا ہے، اور بسا اوقات یہ دونوں علم ایک جگہ ایک ساتھ موجود ہوتے ہیں، مثلاً آگ کو پاس سے دیکھئے تو دُھواں بھی اس کے ساتھ نظر آئیگا۔ سو اس صورت میں آگ کا علم دونوں طرح حاصل ہوگا، ایک تو بلا واسطہ، کیونکہ آنکھ سے آگ کو دیکھ رہے ہیں، دوسرا بواسطہ، یعنی آگ کا علم دھوئیں کے واسطہ سے، اور یہ دونوں علم ہر چند ایک ساتھ ہیں، آگے پیچھے پیدا نہیں ہوئے، مگر علم بواسطہ علم بلا واسطہ میں ایسا محو ہوتا ہے کہ اس کا دھیان بھی نہیں گزرتا۔ علیٰ ہذا القیاس کبھی دو چیزوں کا علم بلا واسطہ بھی ایک ساتھ حاصل ہوتا ہے، مثلاً آگ اور دھوئیں کو ایک ساتھ دیکھئے، اسی طرح کبھی ایک شیٔ کا علم بلا واسطہ اور دوسری شیٔ کا علم پہلی شیٔ کے واسطہ سے ایک ساتھ حاصل ہوتے ہیں، مثلاً دھوئیں کا

علم بلاواسطہ اور آگ کا علم دھوئیں کے واسطہ سے، یا آگ کا علم بلاواسطہ اور دھوئیں کا علم آگ کے واسطہ سے دونوں ساتھ ہی پیدا ہوتے ہیں، مگر جیسا قلم کو ہاتھ میں لے کر لکھیں تو ہر چند ہاتھ اور قلم ساتھ ہی ہلتے ہیں، لیکن پھر یوں کہتے ہیں کہ ہاتھ پہلے ہلا تو قلم ہلا، اسی طرح پر عقل سلیم باوجود ایک ساتھ ہونے کے ایک شے کے علم بلاواسطہ کو دوسری شے کے علم بالواسطہ سے جو بواسطہ پہلی شے کے حاصل ہوا ہے ایک طرح پر ضرور مقدم سمجھتی ہے۔

جب یہ باتیں معلوم ہو چکیں تو اب سنیے کہ خداوند علیم کو بھی تمام اشیاء کا علم دونوں طرح پر ہے، بلاواسطہ اور بواسطہ دیگر، یعنی لوازم کا ملزومات سے اور ملزومات کا لوازم سے اور دونوں علم ازل سے برابر ساتھی ہیں، گو علم بواسطہ کسی چیز کا اس کے علم بلاواسطہ میں محو اور مضمحل ہو اور ایسا ہی ایک چیز کا علم بلاواسطہ اور دوسری چیز کا علم بالواسطہ برابر ساتھ ہے اور دونوں قدیم ہیں، گو علم بلاواسطہ کو بطریق مذکور مقدم اور علم بالواسطہ کو موخر کہیں، سو جہاں کہیں علم خداوندی کے ذکر میں صیغہ استقبال کا، یا معنی استقبال کے پائے جاتے ہیں وہ علم بالواسطہ کے لحاظ سے ہے، زمانہ کے اعتبار سے کچھ تفاوت نہیں، اور جہاں کہیں ماضی یا حال مستعمل ہے، وہاں علم بلاواسطہ مراد ہے، اور علم بالواسطہ کے اعتبار سے کلام فرمانے میں یہ حکمت ہے کہ کلام الٰہی کے مخاطب آدمی ہیں اور ان کو اکثر اشیاء کا علم بالواسطہ ہوتا ہے اور جہاں کہیں جناب باری تعالیٰ نے اپنے علم میں صیغہ استقبال استعمال فرمایا ہے وہ وہی امور ہیں جو بنی آدم کو بلاواسطہ معلوم نہیں ہو سکتے، اگر ایسے موقع میں بنی آدم سے باعتبار علم بلاواسطہ کلام کیا جاتا تو ان پر پورا الزام نہ ہوتا اور جہاں یہ مصلحت نہیں، وہاں باعتبار علم بلاواسطہ صیغہ ماضی یا حال کا استعمال کیا جاتا ہے، مگر بنی آدم کو چونکہ ان اشیاء کا علم بلاواسطہ ہو ہی نہیں سکتا اور ان واسطوں کا علم قبل ان کے وجود کے بنی آدم کو ممکن نہیں اور اس وجہ سے ان کے تمام علوم برابر حاصل نہیں ہوتے، تو وہ خدا کو اپنے اوپر قیاس کر کے صیغہ استقبال سے حدوث سمجھ جاتے ہیں اور حیران ہوتے ہیں کہ علم الٰہی میں حدوث ثابت ہو گیا مگر فہمیدہ اشخاص جو نکتہ مذکورہ سے واقف ہیں سب کو مطابق یک دگر سمجھتے ہیں، والحمد للہ۔

فائدہ: ۲ اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ: اول سے آپ کے لئے خانہ کعبہ قبلہ مقرر رہا تھا، بیچ میں چند عرصہ کے لئے امتحاناً بیت المقدس کو قبلہ مقرر فرمایا اور سب جانتے ہیں کہ امتحان اسی چیز میں ہوتا ہے جو نفس پر دشوار ہو، سو حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ بیشک بجائے کعبہ کے بیت المقدس کو قبلہ بنانا لوگوں کو بھاری معلوم ہوا، عوام مسلمین کو تو اس وجہ سے کہ وہ عموماً عرب اور قریش تھے اور کعبہ کی افضلیت کے معتقد تھے، ان کو اپنے خیال اور رسم وعادت کے خلاف کرنا پڑا، اور خواص کے گھبرانے کی یہ وجہ تھی کہ ملت ابراہیمی کے خلاف تھا، جس کی موافقت کے مامور تھے اور اخص الخواص جن کو ذوق سلیم اور تمیز مراتب کی لیاقت عطا ہوئی تھی، وہ کعبہ کے بعد بیت المقدس کی طرف متوجہ ہونے کو ترقی معکوس خیال کرتے تھے، مگر جن حضرات کو حکمت واسرار تک رسائی تھی اور حقیقت کعبہ اور حقیقت بیت المقدس کو بنور فراست جُدا جُدا معہ فرق مراتب سمجھتے تھے وہ جانتے تھے کہ جناب رسول اللہ ﷺ تمام انبیاء کے کمالات کے جامع اور آپ کی رسالت جملہ عالم اور تمام امتوں کے لئے شامل ہے، اس لئے ضرور ہے کہ استقبال بیت المقدس کی بھی نوبت آئے، یہی وجہ ہے کہ شب معراج میں تمام انبیاء سابقین سے ملاقات بھی ہوئی اور اس کے بعد استقبال بیت المقدس کا بھی حکم ہوا، واللہ اعلم۔

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۴۳﴾

اور اللہ ایسا نہیں کہ ضائع کرے تمہارا ایمان، بیشک اللہ لوگوں پر بہت شفیق نہایت مہربان ہے

خلاصہ تفسیر: اور (ہم نے جو کہا ہے کہ بیت المقدس قبلہ غیر اصلی تھا، اس سے کوئی شخص یہ وسوسہ نہ لائے کہ جتنی نمازیں بیت المقدس کی طرف منہ کر کے پڑھی ہیں ان میں ثواب بھی کم ملا ہوگا، کیونکہ اصلی قبلہ کی طرف نہ تھیں، سو اس وسوسہ کو دل میں نہ لانا، کیونکہ) اللہ تعالیٰ ایسے نہیں کہ تمہارے ایمان (کے متعلق اعمال مثلاً نماز کے ثواب) کو ضائع (اور ناقص) کر دیں (اور) واقعی اللہ تعالیٰ تو (ایسے) لوگوں پر بہت ہی شفیق (اور) مہربان ہیں (تو ایسے شفیق مہربان پر یہ گمان کب ہو سکتا ہے، کیونکہ کسی قبلہ کا اصلی یا غیر اصلی ہونا تو ہم ہی جانتے ہیں، تم نے تو دونوں کو ہمارا حکم سمجھ کر قبول کیا، اس لئے ثواب بھی کسی کا کم نہ ہوگا)۔

اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ: یہود نے کہا کہ کعبہ قبلہ اصلی ہے تو اتنی مدت کی نماز جو بیت المقدس کی طرف پڑھی تھی ضائع ہوئی

بعض مسلمانوں کو شبہ ہوا کہ بیت المقدس جب قبلہ اصلی نہ تھا تو جو مسلمان اسی حالت پر مر گئے ان کے ثواب میں نقصان رہا، باقی زندہ رہنے والے تو آئندہ کو مکافات اور اس کا تدارک کرلیں گے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ جب تم نے بیت المقدس کی طرف نماز محض مقتضائے ایمانی اور اطاعت حکم خداوندی کے سبب پڑھی تو تمہارے اجر وثواب میں کسی طرح کا نقصان نہ ڈالا جائے گا۔

قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ۠ فَوَلِّ وَجْهَكَ

بے شک ہم دیکھتے ہیں بار بار اٹھنا تیرے منہ کا آسمان کی طرف، سو البتہ پھیریں گے ہم تجھ کو جس قبلہ کی طرف تو راضی ہو[1] اب پھیر منہ اپنا

شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ؕ وَاِنَّ الَّذِيْنَ

طرف مسجد الحرام کے[2] اور جس جگہ تم ہوا کرو پھیرو منہ اسی طرف[3] اور جن کو

اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۴﴾

ملی ہے کتاب البتہ جانتے ہیں کہ یہی ٹھیک ہے ان کے رب کی طرف سے، اور اللہ بے خبر نہیں ان کاموں سے جو وہ کرتے ہیں[4]

خلاصہ تفسیر: حاکمانہ جواب کے بعد اب حکیمانہ جواب شروع ہوتا ہے، جس میں کئی حکمتوں کی طرف اشارہ ہے۔

(آپ ﷺ جو دل سے کعبہ کے قبلہ ہونے کی خواہش رکھتے ہیں اور وحی کے انتظار میں بار بار آسمان کی طرف نظر اٹھا کر بھی دیکھتے ہیں کہ شاید فرشتہ حکم لے آئے، سو) آپ کے منہ کا بار بار آسمان کی طرف اٹھنا ہم دیکھ رہے ہیں (اور چونکہ ہمیں آپ کی خوشی پوری کرنا منظور ہے) اس لئے ہم (وعدہ کرتے ہیں کہ) آپ کو اسی قبلہ کی طرف متوجہ کر دیں گے جو آپ کو پسند ہے (اور) پھر (ہم حکم دیئے دیتے ہیں کہ) اب سے اپنا چہرہ (نماز میں) مسجد حرام (کعبہ) کی طرف کیا کیجئے اور (یہ حکم صرف آپ کے لئے مخصوص نہیں، بلکہ سب کے لیے عام ہے پیغمبر بھی اور امتی بھی) جہاں کہیں موجود ہو (خواہ مدینہ منورہ میں یا اور جگہ، یہاں تک کہ خود بیت المقدس میں بھی) اپنے چہروں کو اسی (مسجد حرام) کی طرف کیا کرو (اور اس قبلہ کے مقرر ہونے کے متعلق) یہ اہل کتاب بھی (بالعموم اپنی کتابوں کی پیشین گوئی کی وجہ سے اس قبلہ کے متعلق خوب واقفیت رکھتے ہیں کہ نبی آخر الزماں ﷺ کا قبلہ اس طرح ہوگا) یقینا جانتے ہیں کہ یہ (حکم) بالکل ٹھیک ہے (اور) ان کے پروردگار ہی کی طرف سے (ہے مگر عنادا مانتے نہیں) اور اللہ تعالیٰ ان کی کارروائیوں سے کچھ بے خبر نہیں ہے۔

حکمت کا حاصل یہ ہوا کہ ہمیں آپ کی خوشی منظور تھی، اور آپ کی خوشی کعبہ کے قبلہ مقرر ہونے میں دیکھی اس لیے اسی کو قبلہ مقرر کر دیا، رہا یہ سوال کہ آپ کی خوشی اس میں کیوں تھی؟ وجہ اس کی یہ معلوم ہوتی ہے کہ آپ کی علامات نبوت میں علامت یہ بھی تھی کہ آپ کا قبلہ کعبہ ہوگا، اللہ تعالیٰ نے آپ کے نورانی قلب میں اسی کی خواہش پیدا فرما دی۔

فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا: ''اس لیے ہم آپ کو اسی قبلہ کی طرف متوجہ کر دیں گے جو آپ کو پسند ہے''، اس سے یہ بھی سمجھ میں آتا ہے کہ جب انسان اللہ کے قریب ہو جاتا ہے تو اس وقت اللہ تعالیٰ اس کی چاہت کے مطابق حکم صادر فرما دیتے ہیں، اس کو مقام مرادیت کہتے ہیں۔

* * *

فائدہ: [1] **فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا:** چونکہ آپ کا اصلی قبلہ اور آپ کے کمالات کے مناسب خانہ کعبہ تھا اور سب قبلوں سے افضل اور حضرات ابراہیم علیہ السلام کا بھی قبلہ وہی تھا، ادھر یہود طعن کرتے تھے کہ یہ نبی شریعت میں ہمارے مخالف اور ملت ابراہیمی کے موافق ہو کر ہمارا قبلہ کیوں اختیار کرتے ہیں؟ ان وجوہ سے جس زمانہ میں آپ بیت المقدس کی طرف نماز پڑھتے تھے تو دل یہی چاہتا تھا کہ کعبہ کی طرف منہ کرنے کا حکم

آ جائے اور اس شوق میں آسمان کی طرف منہ اٹھا کر ہر طرف کو دیکھتے تھے کہ شاید فرشتہ حکم لاتا ہو اس پر یہ آیت اتری اور استقبال کعبہ کا حکم آ گیا۔

فائدہ: ۲ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ: یعنی کعبہ کی طرف اور اس کو ''مسجد الحرام'' اس لئے کہتے ہیں کہ وہاں مقاتلہ کرنا اور شکار کرنا جانوروں کا اور درخت اور گھاس کا کاٹنا وغیرہ امور حرام ہیں اور کسی مسجد کی اتنی حُرمت وعزت نہیں جس قدر مسجد الحرام کی حُرمت ہے، جب تحویل قبلہ کا یہ حکم نازل ہوا تو آپ باجماعت مسجد بنی سلمہ میں ظہر کی نماز پڑھ رہے تھے، دو رکعت بیت المقدس کی طرف پڑھ چکے تھے نماز ہی میں آپ نے اور سب مقتدیوں نے کعبہ کی طرف منہ پھیر لیا اور باقی دو رکعتیں پوری کیں، اس مسجد کا نام ''مسجد القبلتین'' اور ''ذوقبلتین'' ہو گیا، یعنی دو قبلہ والی۔

فائدہ: ۳ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ: یعنی حضر میں یا سفر میں مدینہ میں یا دوسرے شہر میں جنگل میں یا دریا میں یا خود بیت المقدس میں جہاں کہیں ہو، کعبہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھو۔

فائدہ: ۴ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُونَ: یعنی اہل کتاب جو تحویل قبلہ کی نسبت اعتراض کریں، اس کی ہرگز پرواہ نہ کرنا، کیونکہ ان کو کتاب سے معلوم ہے کہ پیغمبر آخر الزماں بیت المقدس کی طرف کچھ دنوں نماز پڑھیں گے اور آخر کو کعبہ کی طرف پڑھیں گے اور یہ بھی ان کو معلوم ہے کہ اصلی اور دائمی قبلہ ان کا ملت ابراہیمی کے موافق ہوگا، اس لئے اس تحویل قبلہ کو وہ بھی حق سمجھتے ہیں، محض حسد سے جو چاہیں کہیں، سو حق تعالیٰ ان کی باتوں کو خوب جانتا ہے، جس کا نتیجہ ان کو ایک دن معلوم ہو جائے گا۔

وَلَئِنْ أَتَيْتَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰيَةٍ مَّا تَبِعُوا قِبْلَتَكَ ۚ وَمَا أَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ ۚ

اور اگر تو لائے اہل کتاب کے پاس ساری نشانیاں تو بھی نہ مانیں گے تیرے قبلہ کو، اور نہ تو مانے ان کا قبلہ

وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ ۗ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُمْ مِّنْ بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ

اور نہ ان میں ایک مانتا ہے دوسرے کا قبلہ ۱ اور اگر تو چلا ان کی خواہشوں پر بعد اس علم کے جو تجھ کو پہنچا

إِنَّكَ إِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِينَ ﴿۱۴۵﴾ وقف لازم

تو بیشک تو بھی ہوا بے انصافوں میں ۲

خلاصہ تفسیر: پیچھے فرمایا کہ اہل کتاب اس قبلہ کا حق اور منجانب اللہ ہونا جانتے ہیں، اب ان کا بطور عناد نہ ماننا بیان فرماتے ہیں:

اور (باجود ان لوگوں کے سب کچھ سمجھنے کے ان کی ضد کی یہ حالت ہے کہ) اگر آپ (ان) اہل کتاب کے سامنے تمام (دنیا بھر کی) دلیلیں (جمع کر کے) پیش کر دیں جب بھی یہ (کبھی) آپ کے قبلہ کو قبول نہ کریں اور (ان کی موافقت کی امید اس لئے نہیں رکھنی چاہئے کہ آپ کا قبلہ بھی منسوخ ہونے والا نہیں، اس لئے) آپ بھی ان کے قبلہ کو قبول نہیں کر سکتے (پس موافقت کی کوئی صورت باقی نہیں رہی) اور (جیسے ان اہل کتاب کو آپ سے ضد ہے، ان میں باہم بھی موافقت نہیں، کیونکہ) ان کا کوئی (فریق) بھی دوسرے (فریق) کے قبلہ کو قبول نہیں کرتا (مثلاً یہود نے بیت المقدس لے رکھا تھا، اور نصاریٰ نے مشرق کی سمت کو قبلہ بنا رکھا تھا) اور (خدانخواستہ آپ تو کسی طرح بھی ان کے قبلہ کو لے ہی نہیں سکتے، کیونکہ) اگر آپ ان کے (ان) نفسانی خیالات کو (اگرچہ وہ اصل میں حکم خداوندی رہے ہوں، لیکن اب منسوخ ہونے کی وجہ سے ان پر قائم رہنا محض نفسانی تعصب ہے، سو اگر آپ ایسے خیالات کو) اختیار کر لیں (اور وہ بھی) آپ کے پاس علم (قطعی یعنی وحی) آئے پیچھے (آنے کے بعد) تو یقیناً آپ (نعوذ باللہ) ظالموں میں شمار ہونے لگیں (اور آپ کا ظالم ہونا آپ کے معصوم ہونے کی وجہ سے محال ہے، اس لئے آپ کا ان کے خیالات کو قبول کرنا جن میں سے ان کا قبلہ بھی ہے اسے قبول کرنا بھی محال ہے)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی جب یہ بات ہے کہ اہل کتاب استقبال کعبہ کو حق جان کر بوجہ حسد وعناد حق پوشی کرتے ہیں، تو ان سے اپنے قبلہ کی موافقت کی ہرگز توقع مت رکھو، وہ تو ایسے متعصب ہیں کہ اگر ان کو تمام نشانیاں جو ممکن الوقوع ہیں دکھلا دو گے، جب بھی تمہارے قبلہ کو نہ مانیں گے، وہ تو اس ہوس میں ہیں کہ کسی طرح تم کو اپنا تابع بنالیں، اسی وجہ سے کہا کرتے تھے کہ ہمارے قبلہ پر قائم رہتے تو ہم سمجھتے کہ تم نبی موعود ہو کہ شاید پھر ہمارے قبلہ کی طرف رجوع کرلیں، سو یہ ان کا خیال باطل اور طمع خام ہے، تم کسی وقت میں بھی ان کے قبلہ کا اتباع نہیں کر سکتے، اب استقبال کعبہ کا حکم قیامت تک منسوخ نہیں ہوسکتا اور دوسروں کے تابع بنانے کا ارادہ تو بعد میں کریں، پہلے اہل کتاب تو آپس میں دربارہ امر قبلہ موافق ہو جائیں، یہود کا قبلہ صخرہ بیت المقدس ہے اور نصاریٰ کا قبلہ بیت المقدس کی شرقی جانب ہے، جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نفخ روح ہوا تھا، جب وہ ہی باہم موافق نہیں ہو سکتے تو پھر مسلمانوں سے اس متابعت نقیضین (متضاد قبلہ) کی توقع کرنی محض حماقت ہے۔

فائدہ: ۲؎ یعنی ان دلائل سے قطع نظر کر کے تھوڑی دیر کے لئے اگر مان بھی لیا جائے کہ آپ نعوذ باللہ اہل کتاب کے قبلہ کی متابعت نزول وحی اور علم یقینی کے خلاف کر بھی لیں تو اس تقدیر محال پر بیشک آپ بھی بے انصافوں میں شمار ہوں اور نبی سے یہ امر شنیع کسی طرح ممکن نہیں، تو معلوم ہو گیا کہ قبلہ اہل کتاب کی متابعت آپ سے ہرگز ممکن نہیں کہ سراسر علم کے خلاف یعنی جہل اور گمراہی ہے۔

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ؕ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ

جن کو ہم نے دی ہے کتاب پہچانتے ہیں اس کو جیسے پہچانتے ہیں اپنے بیٹوں کو، اور بیشک ایک فرقہ ان میں سے البتہ چھپاتے ہیں

الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۴۶﴾ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿۱۴۷﴾ وقف منزل ع

حق کو جان کر، حق وہی ہے جو تیرا رب کہے پھر تو نہ ہو شک لانے والا ۱؎

خلاصہ تفسیر: پیچھے یہ بیان تھا کہ اہل کتاب مسلمانوں کے قبلہ کو دل میں حق جانتے ہیں لیکن زبان سے نہیں مانتے، اب یہ ذکر ہے کہ اہل کتاب اسی طرح صاحب قبلہ یعنی جناب رسول اللہ ﷺ کو دل میں حق جانتے ہیں مگر زبان سے نہیں مانتے۔

جن لوگوں کو ہم نے کتاب (توراۃ وانجیل) دی ہے وہ لوگ رسول اللہ ﷺ کو (توراۃ وانجیل میں آئی ہوئی بشارت کی بناء پر بحیثیت رسالت) ایسا (بے شک وشبہ) پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو (ان کی صورت سے) پہچانتے ہیں (کہ بیٹے کی صورت دیکھ کر کبھی شبہ نہیں ہوتا کہ یہ کون شخص ہے، مگر پہچان کر بھی سب مسلمان نہیں ہوئے، بلکہ بعض تو ایمان لے آئے) اور بعض ان میں سے (ایسے ہیں کہ اس) امر واقعی کو باوجود یکہ خوب جانتے ہیں (مگر) اخفاء کرتے ہیں (حالانکہ) یہ امر واقعی من جانب اللہ (ثابت ہو چکا) ہے سو (ایسے امر واقعی میں جو اللہ کی طرف سے ثابت ہو ہر شخص کو کہا جاسکتا ہے کہ) ہرگز شک وشبہ لانے والوں میں شمار نہ ہونا۔

يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ: رسول اللہ ﷺ کے پہچاننے کو جو اولاد کے پہچاننے سے تشبیہ دی ہے اس کا مطلب بیان ہو چکا کہ مراد صورت کا پہچاننا ہے، یہاں بیٹوں کو بیٹا ہونے کی حیثیت سے پہچاننا مراد نہیں، کیونکہ بیٹے کا اپنا بیٹا ہونا تو بعض دفعہ انسان پر مشتبہ ہو جاتا ہے، کیونکہ اس میں بیوی کی خیانت کا احتمال ہوسکتا ہے کہ یہ بیٹا اپنا نہ ہو، بلکہ مراد ان کی شکل وصورت وغیرہ کا پہچاننا ہے کہ بیٹا فی الواقع اپنا ہو یا نہ ہو، مگر جس کو بیٹے کی حیثیت سے انسان پالتا ہے اس کی شکل وصورت کے پہچاننے میں کبھی اشتباہ نہیں ہوتا، تشبیہ میں بیٹے کا بیٹا ہونا ملحوظ نہیں، بلکہ بیٹے کی صورت ملحوظ ہے، چونکہ بیٹا گود میں پرورش پاتا ہے، آدمی ہر وقت اسے دیکھتا رہتا ہے، اس لیے اس کی صورت میں شبہ نہیں ہوتا کہ یہ فلاں لڑکا ہے یا فلاں لڑکا، چنانچہ خلاصہ تفسیر میں اس کی وضاحت بھی کر دی گئی، اور اسی نکتہ کی وجہ سے بیٹیوں کی پہچان سے تشبیہ نہیں دی، کیونکہ بیٹے کو باپ اپنے ساتھ زیادہ رکھتا ہے، اور اسی نکتہ کی وجہ سے یہ نہیں فرمایا کہ ''جیسے اپنی ذات کو جانتے ہیں''، کیونکہ انسان پر ایسا زمانہ آتا ہے جس میں اسے اپنی ذات کی معرفت حاصل نہیں ہوتی، جیسے بالکل

بے ہوشی کا زمانہ یا کم سنی کی عمر، بخلاف اپنے بیٹے کے کہ وہاں ایسی نوبت نہیں آتی۔

* * *

فائدہ: لے یعنی اگر تم کو یہ خیال ہو کہ کاش کعبہ کا مسلمانوں کے لئے قبلہ ہونا اہل کتاب بھی کسی طرح تسلیم کرلیں اور دوسرے لوگوں کو شبہ میں ڈالتے نہ پھریں، تو میرے نبی موعود ہونے میں خلجان باقی نہ رہے، تو جان لو کہ اہل کتاب کو تمہارا بہت پورا علم ہے، آپ کے نسب و قبیلہ و مولد و مسکن و صورت و شکل و اوصاف و احوال سب کو جانتے ہیں، جس کی وجہ سے ان کو آپ کا علم اور آپ کے نبی موعود ہونے کا ایسا یقین ہے جیسا بہت سے لڑکوں میں اپنے بیٹوں کو بلا تامل و تردد پہچانتے ہیں، مگر اس امر کو بعض تو ظاہر کرتے ہیں اور بعض دیدہ و دانستہ امر حق کو چھپاتے ہیں، لیکن ان کے چھپانے سے کیا ہوتا ہے، حق بات تو وہی ہے جو اللہ کی طرف سے ہو، اہل کتاب مانیں یا نہ مانیں، ان کی مخالفت سے کسی قسم کا تردد مت کرو۔

وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ۗ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يَاْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا ۭ

اور ہر کسی کے واسطے ایک جانب ہے یعنی قبلہ کہ وہ منہ کرتا ہے اس طرف سو تم سبقت کرو نیکیوں میں، جہاں کہیں تم ہو گے کر لائے گا تم کو اللہ اکٹھا

اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿١٤٨﴾ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۭ

بیشک اللہ ہر چیز کر سکتا ہے لے اور جس جگہ سے تو نکلے سو منہ کر اپنا مسجد الحرام کی طرف

وَاِنَّهٗ لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ ۭ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿١٤٩﴾

اور بیشک یہی حق ہے تیرے رب کی طرف سے، اور اللہ بے خبر نہیں تمہارے کاموں سے

خلاصہ تفسیر: اور (دوسری حکمت تحویل قبلہ میں یہ ہے کہ عادۃ اللہ جاری ہے کہ) ہر (مذہب والے) شخص کے واسطے ایک ایک قبلہ رہا ہے، جس کی طرف وہ (عبادت میں) منہ کرتا رہا ہے (چونکہ شریعت محمدیہ بھی ایک مستقل دین ہے، اس کا قبلہ بھی ایک خاص ہو گیا، جب حکمت سب پر ظاہر ہو چکی) سو (مسلمانوں) تم (اب اس بحث کو چھوڑ کر اپنے دین کے) نیک کاموں میں آگے بڑھنے کی کوشش کرو (کیونکہ ایک روز اپنے مالک سے سابقہ پڑنا ہے، چنانچہ) تم خواہ کہیں ہوگے (لیکن) اللہ تعالیٰ تم سب کو (اپنے اجلاس میں) حاضر کر دیں گے (اس وقت نیکیوں پر جزا اور برے اعمال پر سزا ہوگی اور) بالیقین اللہ تعالیٰ ہر امر پر پوری قدرت رکھتے ہیں۔

اور (اس حکمت کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ جس طرح حضر میں کعبہ کی طرف رخ ہوتا ہے، اسی طرح اگر مدینہ سے یا اور کہیں) جس جگہ سے بھی (کہیں سفر میں) آپ باہر جائیں تو (بھی) اپنا چہرہ (نماز میں) مسجد حرام (یعنی کعبہ) کی طرف رکھا کیجئے (غرض حضر و سفر سب حالتوں کا یہی قبلہ ہے) اور یہ (قبلہ کا عام حکم) بالکل حق (اور صحیح) ہے (اور) من جانب اللہ (ہے) اور اللہ تعالیٰ تمہارے کئے ہوئے کاموں سے ذرا بے خبر نہیں۔

* * *

فائدہ: لے یعنی اللہ نے ہر ایک امت کے لئے ایک ایک قبلہ کا حکم فرمایا، جس کی طرف بوقت عبادت اپنا منہ کیا کریں، یا ہر ایک قوم مسلمان کعبہ سے جدا جدا سمت میں واقع ہے، کوئی مشرق میں، کوئی مغرب میں، سو اس میں جھگڑنا فضول اور اپنے قبلہ یا اپنی سمت پر ضد کرنا عبث ہے، جو نیکیاں مقصود و مطلوب ہیں ان کی طرف البتہ پیش قدمی کرو اور اس بحث کو چھوڑو، جس جگہ اور جس قبلہ اور جس سمت کعبہ کی طرف تم ہو گے، لائے گا تم سب کو اللہ میدان حشر میں اور تمہاری نمازیں ایسی سمجھی جائیں گی گویا ایک ہی جہت کی طرف ہوئی ہیں، پھر ایسی بات میں کیوں جھگڑتے ہو۔

وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۖ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا

اور جہاں سے تو نکلے منہ کر اپنا مسجد الحرام کی طرف، اور جس جگہ تم ہوا کرو

وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ ۙ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ ۙ إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ ۚ

منہ کرو اسی کی طرف لہ تاکہ نہ رہے لوگوں کو تم سے جھگڑنے کا موقع مگر جو ان میں بے انصاف ہیں

فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِي ۚ وَلِأُتِمَّ نِعْمَتِي عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿١٥٠﴾

سوان سے (انکے اعتراضوں سے) نہ ڈرو اور مجھ سے ڈرو ۲ اور اس واسطے کہ کامل کروں تم پر فضل اپنا تا کہ تم پاؤ راہ سیدھی ۳

خلاصہ تفسیر: (تحویل قبلہ کی تیسری حکمت) اور (مکرر پھر کہا جاتا ہے کہ) آپ جس جگہ سے بھی (سفر میں) باہر جائیں (اور حضر میں تو بدرجہ اولیٰ) اپنا چہرہ (نماز میں) مسجد حرام کی طرف رکھئے، اور (اسی طرح سب مسلمان بھی سن لیں کہ) تم لوگ جہاں کہیں (موجود) ہو اپنا چہرہ (نماز میں) اسی (مسجد حرام) کی طرف رکھا کرو (اور یہ حکم اس لئے مقرر کیا جاتا ہے) تا کہ (ان مخالف) لوگوں کو تمہارے مقابلہ میں (اس) گفتگو (کی مجال) نہ رہے (کہ اگر محمد مصطفیٰ ﷺ وہی نبی موعود آخر الزماں ہوتے تو ان کی علامات میں تو یہ بھی ہے کہ ان کا اصلی قبلہ کعبہ ہوگا اور یہ تو بیت المقدس کی طرف نماز پڑھتے ہیں، اسی حکمت کے واسطے بھی ہم نے تحویل قبلہ کیا ہے، یہ تیسری حکمت ہے تحویل قبلہ کی، ہاں) مگر ان میں جو (بالکل ہی) بے انصاف ہیں (وہ اب بھی کچھ حجتی نکالیں گے کہ یہ کیسے نبی ہیں جو اتنے انبیاء کے خلاف کعبہ کی طرف نماز پڑھتے ہیں، لیکن ایسے مہمل اعتراضوں سے دین حق کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا) تو ایسے لوگوں سے (ذرا) اندیشہ نہ کرو (اور ان کے اعتراضوں کے جواب کی فکر میں مت پڑو) اور مجھ سے ڈرتے رہو (کہ میرے احکام کی مخالفت نہ ہونے پائے کہ یہی البتہ تمہیں مضر ہے) اور (ہم نے تم کو ان سب مذکورہ احکام پر عمل کرنے کی توفیق بھی دی) تا کہ تم پر جو (کچھ) میرا انعام (اکرام متوجہ) ہے (کہ تم کو آخرت میں داخل بہشت کر کے) اس کی تکمیل کر دوں اور تا کہ (دنیا میں) تم راہ (حق) پر (یعنی اسلام پر قائم رہنے والوں میں) رہو (جس پر وہ تکمیل نعمت مرتب ہوتی ہے)۔

فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۖ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا: چونکہ قبلہ کا معاملہ نہایت مہتم بالشان تھا اور نیز مخالفین کا اس میں شور وشغب بھی زیادہ تھا، خود مسلمانوں کے لئے بھی عبادات کا ایک عظیم انقلاب تھا، نیز بعض صورتوں کے احکام کی تعیین میں تردد بھی ہو سکتا تھا اس لیے کئی کئی پہلوؤں سے اس کو بیان کیا اور حکمتیں بھی کئی ارشاد ہوئیں، اس تکرار کی ایک عام وجہ تو یہ ہے کہ اگر یہ حکم تاکیدات کے ساتھ بتکرار نہ لایا جاتا تو قلوب کا اطمینان وسکون آسان نہ ہوتا، اس لئے اس حکم کو بار بار دہرایا گیا جس میں اس کی طرف بھی اشارہ کیا گیا کہ یہ تحویل آخری اور قطعی ہے اب اس کی تبدیلی کا کوئی امکان نہیں، چنانچہ مذکورہ آیات میں تحویل قبلہ کے لئے الفاظ: فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ تین مرتبہ اور: حَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ دو مرتبہ آئے ہیں۔

تفسیروں میں جو تطبیق کی صورت لکھی گئی ہے ان میں اس کی ایک ایسی تقریر نقل کی ہے جس سے تکرار محض نہ رہے، مثلاً فرمایا کہ پہلی مرتبہ جو حکم آیا فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ یہ حکم حالت حضر کا ہے کہ جب آپ اپنی جگہ مقیم ہیں تو آپ مسجد حرام کی طرف رخ کیا کریں اور پھر پوری امت کو اسی کا حکم دیا گیا، اور حَيْثُ مَا كُنْتُمْ کا مفہوم اس تقریر پر یہ ہوگا کہ اپنے وطن اور شہر میں جس جگہ بھی ہوں استقبال بیت اللہ ہی کا کرنا ہے یہ حکم صرف مسجد نبوی کے ساتھ مخصوص نہیں، پھر دوسری مرتبہ جو انہی الفاظ کے ساتھ حکم آیا اس سے پہلے: وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ کے الفاظ نے یہ واضح کر دیا کہ یہ حکم وطن سے نکلنے اور سفر کی حالت کے لئے ہے اور سفر کا موقع زیادہ شبہ کا تھا کہ شاید راستہ کا حکم

الگ ہواور منزل کا حکم الگ ہو، اور چونکہ سفر کے حالات بھی مختلف ہوتے ہیں، کبھی چندروز کے لئے کسی بستی میں قیام کیا جاتا ہے، کبھی سفر قطع کرنے کا سلسلہ ہوتا ہے، ان دونوں حالتوں کو عام کرنے لئے تیسری مرتبہ پھران الفاظ کے ساتھ اور: وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ کا اضافہ کر کے بتلادیا کہ سفر کی کوئی بھی حالت ہو ہر حال میں استقبال مسجد حرام ہی کا کرنا ہے، اس تیسری مرتبہ کے اعادہ کے ساتھ تحویل قبلہ کی ایک حکمت کا بھی جوڑ لگادیا گیا کہ مخالفین کو یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ نبی آخرالزماں کا قبلہ تو توراۃ وانجیل کی تصریحات کے مطابق کعبہ ہونا چاہئے اور یہ رسول اللہ (ﷺ) کعبہ کے بجائے بیت المقدس کا استقبال کرتے ہیں، پھر خطاب خاص حضور ﷺ کو الگ کیا، اور خطاب عام مسلمانوں کو الگ کیا، سفر کے متعلق بھی اور حضرت کی بابت بھی۔

پھر اس حکم کے حق ہونے کی شروع میں آیت: قد نریٰ کے اندر بھی صراحت کی، پھر رکوع کے ختم پر دوبارہ صراحت کی، پھر آیت: من حیث خرجت میں تیسری بار تصریح کی، اور اس حکم کے قبول کرنے والوں کو شروع میں بھی باہدایت فرمایا: یھدی من یشاء الی صراط مستقیم، اور اسی پر ختم بھی فرمایا۔

ولعلکم تھتدون اور فاستبقوا الخیرات اور لا تخشوھم میں جھگڑے اور نزاع سے یک سو اور بے فکر ہونے کی طرف اشارہ سے دلالت کر کے اس حکم کی وضاحت پر بھی دلالت فرمادی جیسا کہ تفسیر سے معلوم ہوا، اور اس کے ضمن میں یہ تعلیم بھی ہوگئی کہ جب معترض کا عناد قرائن سے معلوم ہو جائے تو پھر اس کا جواب دینا لاحاصل ہے، ہاں! اگر کسی طالب حق کو اعتراض سے شبہ ہو جائے تو اس کی اصلاح ضرور کردی جائے۔

وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ: اور تاکہ تم راہ پر رہو، آیت کے آخر میں ایسے لوگوں (صحابہ کرامؓ) کو یہ خطاب کرنا جو کہ پہلے سے ہدایت یافتہ ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ تعلق مع اللہ اور ترقی کی کوئی انتہا نہیں، انسان اچھے اخلاق سے متصف ہو جائے اور اعمال صالحہ اس کی طبیعت کا حصہ بن جائیں تو پھر بھی ترقی جاری رہتی ہے، اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کا انکشاف ہونے لگتا ہے، یعنی سیر الی اللہ کے بعد سیر فی اللہ ہے (مدارج قرب میں ترقی کی کوئی متعین حد نہیں ہے)۔

* * *

فائدہ: ۱۔ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ: تحویل قبلہ کا حکم مکرر سہ مکرر یا تو اس واسطے بیان فرمایا کہ اس کی علل متعدد تھیں، تو ہر علت کو بتلانے کے لئے اس حکم کا اعادہ فرمایا: قَدْ نَرَىٰ تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَاءِ سے معلوم ہوا کہ اپنے رسول کی رضا جوئی اور اظہار تکریم کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایسا کیا اور لِكُلٍّ وِجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا سے معلوم ہوا کہ عادت اللہ یہی ہے کہ ہر ملّت اور ہر ایک رُسول صاحب شریعت مستقل کے لئے اس کے مناسب ایک قبلہ مقرر ہونا چاہیے اور لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ سے معلوم ہوا کہ حکم مذکور کی علت یہ ہے کہ مخالف کا الزام عائد نہ ہو سکے، یا اس تکرار کی یہ وجہ ہے کہ اول تو قبلہ قابل اہتمام دوسرے احکام الٰہیہ میں نسخ ہونا بیوقوفوں کی سمجھ سے باہر، پھر تحویل قبلہ، اول (پہلا) نسخ ہے جو شریعت محمدی میں ظاہر ہوا، اس لئے اس کی تاکید در تاکید عین حکمت وبلاغت ہے، یا یہ وجہ ہے کہ اوّل آیت میں تعمیم احوال اور دوسری آیت میں تعمیم امکنہ اور تیسری میں تعمیم ازمنہ مراد ہے۔

فائدہ: ۲۔ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِي: یعنی کعبہ کو منہ کرنے کا حکم اس واسطے ہوا کہ تورات میں مذکور ہے کہ حضرت ابراہیم کا قبلہ خانہ کعبہ ہے اور نبی آخر الزماں کو بھی اسی کی طرف منہ پھیرنے کا حکم ہوجائیگا تو آپ کو تحویل الی الکعبہ کا حکم نہ ہوتا تو یہود ضرور الزام لگاتے، ادھر مشرکین مکہ یہ کہتے ہیں کہ حضرت ابراہیم کا قبلہ تو کعبہ تھا، یہ نبی ملّت ابراہیمی کا دعویٰ کر کے پھر قبلہ میں خلاف کیوں کرتے ہیں؟ تو اب دونوں کو حجۃ کرنے کا حق نہ رہا، مگر بے انصاف اب بھی کچھ نہ کچھ الزام لگائے ہی جائینگے، مثلاً قریش کہیں گے کہ ان کو ہمارے قبلہ کا حق ہونا اب معلوم ہوا، تو اس کا اختیار کیا، اسی طرح پر ہمارے اور احکام بھی رفتہ رفتہ منظور کرلیں گے اور یہود کہیں گے کہ ہمارے قبلہ کی حقانیت ظاہر ہونے اور تسلیم کر لینے کے بعد محض حسد اور نفسانیت کے باعث اپنی رائے اس کو چھوڑ دیا تو ایسے بے انصافوں کے اعتراض کی کچھ پرواہ مت کرو اور ہمارے حکم کے تابع رہو۔

فائدہ: ۳۔ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ: یعنی یہ قبلہ ہم نے تمہارے لئے اس واسطے مقرر فرمایا کہ دشمنوں کے طعن سے بچو اور اس کے سبب سے ہمارے انعام واکرام وبرکات وانوار اور ہدایت کے پورے مستحق ہو۔

كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ

جیسا کہ بھیجا ہم نے تم میں رسول تم ہی میں کا پڑھتا ہے تمہارے آگے آیتیں ہماری اور پاک کرتا ہے تم کو اور سکھلاتا ہے تم کو کتاب

وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۵۱﴾

اور اس کے اسرار اور سکھاتا ہے تم کو جو تم نہ جانتے تھے

خلاصہ تفسیر: اس مضمون تحویل قبلہ کی ابتدا میں بانی کعبہ ابراہیم علیہ السلام کی دعا مذکور ہوئی تھی جس میں رسول اللہ ﷺ کے اولاد ابراہیم میں ایک خاص شان کے ساتھ مبعوث ہونے کی درخواست تھی اس مضمون پر اس کو ختم کرتے ہیں، پس آغاز وانجام کے اتحاد سے اشارہ ہو گیا کہ ان پیغمبر کی شریعت میں کعبہ کا قبلہ مقرر ہونا تعجب یا انکار کی بات نہیں، کیونکہ کعبہ بناء ابراہیم ہے اور یہ نبی ابن ابراہیم ہیں، اور اس تعمیر و بناء کے قبول ہونے کی اور اس رسول کے مبعوث ہونے کی انہوں نے دعا بھی کی تھی، ہم نے ان کی دونوں دعائیں قبول فرمائیں اور کعبہ کو امت محمد یہ کا قبلہ قیامت تک کے لیے مقرر کر دیا جو اس تعمیر و بنا کی قبولیت کی بڑی علامت ہے۔

(یعنی ہم نے کعبہ کو قبلہ مقرر کر کے ابراہیم علیہ السلام کی ایک دعا جو تعمیر کعبہ کی مقبولیت کے بارے میں تھی اسی طرح قبول کی) جس طرح (ان کی دوسری دعا جو بعثت محمد یہ کے بارے میں تھی قبول کی کہ) تم لوگوں میں ہم نے ایک (عظیم الشان) رسول کو بھیجا (جو کہ) تم ہی میں سے (ہیں اور وہ) ہماری آیات (واحکام) پڑھ پڑھ کر تم کو سناتے ہیں اور (خیالات ورسوم جہالت سے) تمہاری صفائی کرتے رہتے ہیں، اور تم کو کتاب (الٰہی) اور فہم کی باتیں بتلاتے رہتے ہیں، اور تم کو ایسی (مفید) باتیں تعلیم کرتے ہیں جن کی تم کو خبر بھی نہ تھی (اور نہ کتب سابقہ یا عقل ان کے لئے کافی تھی، اور اس شان کے رسول کے مبعوث ہونے کی ابراہیم علیہ السلام نے دعا کی تھی، سو اس کا ظہور ہو گیا)۔

وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ: یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ کتاب وحکمت کی تعلیم کے بعد ایک قسم تعلیم کی اور بھی ضروری ہے جس کے بغیر صحیح فوائد حاصل نہیں ہو سکتے اور وہ تعلیم اللہ کے نیک بندوں کی صحبت پر موقوف ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی یہ اتمام نعمت اور تکمیل ہدایت تم پر ایسی ہوئی جیسی ابتداء میں تم پر یہ اتمام نعمت وہدایت ہو چکی ہے کہ تم میں ہی سے ایک رسول ایسا بھیجا جو تم کو احکام خداوندی سمجھا دے اور تم کو بری باتوں سے پاک کرے یعنی علماً اور عملاً تم کو کامل بنا دے۔

فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ ﴿۱۵۲﴾

ع ۱۸

سو تم یاد رکھو مجھ کو میں یاد رکھوں تم کو اور احسان مانو میرا اور ناشکری مت کرو

خلاصہ تفسیر: گذشتہ آیات میں حق تعالیٰ کی بڑی بڑی نعمتوں کا ذکر تھا، کعبہ کا قبلہ بنانا، اس وجہ سے ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ خاص تعلق ہونا، ملت میں ابراہیم علیہ السلام اور تمام انبیاء کے ساتھ موافقت ہونا، تحویل قبلہ کے وقت اطاعت پر ثابت رہنا، چنانچہ اب اپنے ذکر اور نعمت کے شکر کا حکم فرما کر اس گزشتہ مضمون کی احسن انداز سے تکمیل فرماتے ہیں

ان (مذکورہ) نعمتوں پر مجھ کو (منعم ہونے کی حیثیت سے) یاد کرو میں تم کو (عنایت سے) یاد رکھوں گا اور میری (نعمت کی) شکر گذاری کرو اور (نعمت کے انکار یا ترک اطاعت کر کے) میری ناسپاسی مت کرو۔

فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ: یہ ذکر اللہ کا اصلی ثمرہ ہے، اگر اسے مستحضر رکھا جائے تو کبھی تشویش و پریشانی نہ ہو (بندے کے ذکر الٰہی کا یہی ثمرہ اور انعام ہے کہ ابھی اس نے اللہ کا نام لیا ادھر سے سرفرازی شروع ہو گئی) اگر اس بات کو یاد رکھا جائے کہ جب میں اللہ کا ذکر کروں گا تو اللہ تعالیٰ بھی مجھے

یاد رکھیں گے، میری مشکلات کو آسان فرمائیں گے اور ثواب و مغفرت سے نوازیں گے تو بندہ کو اللہ کے یاد رکھنے سے کبھی پریشانی و گھبراہٹ نہ ہوگی۔

* * *

فائدہ: جب ہماری طرف سے تم پر اتمام نعمت مکرر ہو چکا تو اب تم کو لازمی ہے کہ ہم کو زبان سے دل سے فکر سے ہر طرح سے یاد کرو اور اطاعت کرو ہم تم کو یاد کریں گے یعنی نئی نئی رحمتیں اور عنایتیں تم پر ہوتی رہیں گی اور ہماری نعمتوں کا شکر خوب ادا کرتے رہو اور ہماری ناشکری اور معصیت سے بچتے رہو۔

يَاَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۵۳﴾

اے مسلمانو! مدد لو صبر اور نماز سے، بیشک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے

خلاصہ تفسیر: تحویل قبلہ میں جو مخالفین کی طرف سے اعتراض تھا اس کے دو اثر تھے: ① ایک مذہب اسلام پر کہ اعتراض سے مذہب کی حقانیت میں شبہ پیدا کیا جاتا ہے، چنانچہ گزشتہ آیتوں میں اس اعتراض کا جواب دے کر اس کا اثر ختم کرنا مقصود تھا ② دوسرا اثر مسلمانوں کی طبیعتوں پر وہ یہ کہ جواب دینے کے بعد بھی اعتراض پر بے جا اصرار کرنے سے قلب میں رنج اور صدمہ پیدا ہوتا ہے، آیت آئندہ میں غم ہلکا کرنے کا طریقہ جو کہ صبر و صلوۃ ہے بتلا کر اس دوسرے اثر کو زائل فرماتے ہیں۔

اے ایمان والو! (طبیعتوں میں غم ہلکا کرنے کے لیے) صبر اور نماز سے سہارا (اور مدد) حاصل کرو، بلاشبہ حق تعالیٰ (ہر طرح سے) صبر کرنے والوں کے ساتھ رہتے ہیں (اور نماز پڑھنے والوں کے ساتھ تو بدرجہ اولیٰ، وجہ یہ کہ نماز سب سے بڑی عبادت ہے، جب صبر میں یہ وعدہ ہے تو نماز جو اس سے بڑھ کر ہے اس میں تو بدرجہ اولیٰ یہ بشارت ہوگی)۔

* * *

فائدہ: چونکہ ذکر اور شکر اور ترک کفران جو پہلے مذکور ہوئے، تمام طاعات اور منہیات شرعیہ کو محیط ہیں، جن کا انجام دینا دشوار امر ہے، اس کی سہولت کیلئے یہ طریقہ بتلایا گیا کہ صبر اور صلوٰۃ سے مدد لو کہ ان کی مداومت سے تمام امور تم پر سہل کر دیئے جائیں گے اور اس آیت میں یہ اشارہ بھی ہے کہ جہاد میں محنت اٹھاؤ جس کا ذکر آگے آتا ہے کہ اس میں صبر اعلیٰ درجہ کا ہے۔

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ﴿۱۵۴﴾

اور نہ کہو ان کو جو مارے گئے خدا کی راہ میں کہ مردے ہیں، بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تم کو خبر نہیں

خلاصہ تفسیر: پیچھے ایک خاص ناگوار واقعہ میں صبر کی تعلیم اور صابرین کی فضیلت بیان ہوئی، اب بعض دیگر خلاف طبیعت واقعات کی تفصیل اور ان میں صبر کی ترغیب اور فضیلت بیان فرماتے ہیں، جس میں کفار کے ساتھ قتل و قتال کا مضمون مقدم فرماتے ہیں دو وجہ سے: ① ایک بوجہ اعظم ہونے کے کیونکہ بڑی بات پر صبر کرنے والا چھوٹی پر بدرجہ اولی صبر کرے گا ② دوسرے خاص طور پر مقام کی مناسبت کی وجہ سے، کیونکہ ان معترضین کے ساتھ یہ معاملہ پیش آتا تھا۔

اور جو لوگ اللہ کی راہ میں (یعنی دین کے واسطے) قتل کئے جاتے ہیں ان (کی ایسی فضیلت ہے کہ ان) کی نسبت یوں بھی مت کہو کہ وہ (معمولی مُردوں کی طرح) مُردے ہیں، بلکہ وہ لوگ (ایک ممتاز حیات کے ساتھ) زندہ ہیں لیکن تم (اپنے موجودہ) حواس سے (اس حیات کا) ادراک نہیں کر سکتے۔

بَلْ اَحْيَاۗءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ: یہ تو سب کو معلوم ہے کہ اسلامی روایات کی رو سے ہر مرنے والے کو برزخ میں ایک خاص قسم کی حیات ملتی ہے جس سے وہ قبر کے عذاب یا ثواب کو محسوس کرتا ہے، اس میں مومن و کافر یا صالح و فاسق میں کوئی تفریق نہیں، لیکن اس حیات برزخی کے مختلف درجات

ہیں، ایک درجہ تو سب کو عام اور شامل ہے، کچھ مخصوص درجے انبیاء وصالحین کے لئے مخصوص ہیں اور ان میں بھی باہمی تفاضل ہے، اس مسئلہ کی تحقیق پر علماء کے مقالات وتحقیقات بے شمار ہیں لیکن ان میں سے جو بات اقرب الی الکتاب والسنت ہے اور شبہات سے پاک ہے اس جگہ اسی کو نقل کرنا کافی معلوم ہوا۔

ایسے مقتول کو جو اللہ کی راہ میں قتل کیا جائے شہید کہتے ہیں اور اس کی نسبت اگر چہ یہ کہنا کہ وہ مر گیا صحیح اور جائز ہے، لیکن اس کی موت کو دوسرے مردوں کی سی موت سمجھنے کی ممانعت کی گئی ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ مرنے کے بعد اگر چہ برزخی حیات ہر شخص کی روح کو حاصل ہے اور اسی سے جزا وسزا کا ادراک ہوتا ہے، لیکن شہید کو اس حیات میں اور مردوں سے ایک گونہ امتیاز ہے اور وہ امتیاز یہ ہے کہ اس کی یہ حیات آثار میں اوروں سے قوی ہے، جیسے انگلیوں کے اگلے پورے اور ایڑی اگر چہ دونوں میں حیات ہے اور حیات کے آثار بھی دونوں میں موجود ہیں، لیکن انگلیوں کے پوروں میں حیات کے آثار احساس وغیرہ بہ نسبت ایڑی کے زیادہ ہیں، اسی طرح شہداء میں آثار حیات عام مردوں سے بہت زیادہ ہیں، حتیٰ کہ شہید کی اس حیات کی قوت کا ایک اثر برخلاف معمولی مردوں کے اس کے جسد ظاہری تک بھی پہنچا ہے کہ اس کا جسم باوجود مجموعہ گوشت و پوست ہونے کے خاک سے متاثر نہیں ہوتا اور مثل جسم زندہ کے صحیح سالم رہتا ہے، جیسا کہ احادیث اور مشاہدات شاہد ہیں، پس اس امتیاز کی وجہ سے شہداء کو ''احیاء'' کہا گیا اور ان کو دوسرے اموات کے برابر اموات کہنے کی ممانعت کی گئی، مگر احکام ظاہرہ میں وہ عام مردوں کی طرح ہیں، ان کی میراث تقسیم ہوتی ہے اور ان کی بیویاں دوسروں سے نکاح کر سکتی ہیں اور یہی حیات ہے جس میں حضرات انبیاء علیہم السلام شہداء سے بھی زیادہ امتیاز اور قوت رکھتے ہیں، یہاں تک کہ سلامت جسم کے علاوہ اس حیات برزخی کے کچھ آثار ظاہری احکام پر بھی پڑتے ہیں مثلاً ظاہری موت کے بعد ان کی میراث تقسیم نہیں ہوتی ان کی ازواج دوسروں کے نکاح میں نہیں آسکتیں، پس اس حیات میں سب سے قوی تر انبیاء علیہم السلام ہیں، پھر شہداء، پھر اور معمولی مردے، البتہ بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض اولیاء وصالحین بھی اس فضیلت میں شہداء کے ساتھ شریک ہیں، سو مجاہدہ نفس میں مرنے کو بھی معنی شہادت میں داخل سمجھیں گے اس طور پر وہ بھی شہداء ہو گئے، یا یوں کہا جائے کہ آیت میں شہداء کی تخصیص عام مردوں کے اعتبار سے ہے، شہداء کے ہم رتبہ دوسرے لوگ صالحین وصدیقین کے اعتبار سے نہیں۔

اور اگر کسی شخص نے کسی شہید کی لاش کو خاک خوردہ پایا ہو تو سمجھ لے کہ ممکن ہے اس کی نیت خالص نہ ہو جس پر شہادت کا مدار ہے، کیونکہ صرف قتل ہونے کا نام شہادت نہیں ہے، اور اگر بالفرض ایسا کوئی شہید خاک خوردہ پایا جائے جس کا قتل فی سبیل اللہ ہوا اور اس میں شہادت کی شرائط کا جمع ہونا دلیل قطعی تواتر وغیرہ سے ثابت ہو (جس کا شبہ صاحب روح المعانی کو ہو گیا ہے) تو اس کی وجہ میں کہا جائے گا کہ حدیث میں جس چیز کی تصریح ہے وہ یہ کہ انبیاء اور شہدا کے جسم کو زمین نہیں کھاتی، یعنی مٹی ان کے جسم کو خراب نہیں کر سکتی، زمین کے اجزاء میں مٹی وغیرہ کے علاوہ کسی دوسری چیز سے ان کے جسم کا متاثر ہو کر فنا ہو جانا پھر بھی ممکن ہے، کیونکہ زمین میں اور بھی بہت سی اقسام وانواع کی دھاتیں اور ان کے اجزاء اللہ تعالیٰ نے رکھ دیئے ہیں، اگر ان کی وجہ سے کسی شہید کا جسم متاثر ہو جائے تو اس آیت کے خلاف نہیں، چنانچہ دوسرے مرکب اجسام جیسے اسلحہ، دوائیں، غذائیں، اور بسیط اجسام جیسے پانی، آگ، ہوا کی تاثیر انبیاء کے اجساد میں بھی ثابت ہے، اور شہداء کی حیات بعد الممات انبیاء علیہم السلام کی حیات قبل الممات سے اقویٰ نہیں، اور بعض اوقات زمین میں بعض غیر زمینی اجزاء بھی شامل ہو جاتے ہیں، جس طرح دوسرے عناصر میں بھی مختلف عناصر شامل ہو جاتے ہیں، سو اگر ان غیر زمینی اجزاء سے ان کے اجساد متاثر ہو جائیں تو اس سے ان احادیث پر اشکال نہیں ہوتا جن میں زمین پر ان اجساد کی حرمت وارد ہے، اور ایک جواب یہ ہے کہ شہداء کے اجساد کے امتیاز کے لئے یہ بات کافی ہے کہ دوسری اموات سے زیادہ مدت تک ان کے اجساد خاک سے متاثر نہ ہوں، اگر چہ بعد میں کسی وقت ہو جائیں اور احادیث سے یہی امر مقصود کہا جائے کہ ان کے جسد کی حفاظت خارق (خلاف) عادت ہے، اور خرق عادت کی دونوں صورتیں ہیں: دائمی حفاظت اور طویل عرصہ تک حفاظت، اور چونکہ عالم برزخ کا ادراک ظاہری حواس یعنی آنکھ کان، ناک، ہاتھ وغیرہ سے نہیں ہوتا اس لئے **لا تشعرون** فرمایا گیا کہ تم ان کی حیات کی حقیقت کو نہیں سمجھ سکتے۔

فائدہ: یعنی جس نے اللہ کے لئے جان دی، وہ اس جہان میں جیتے ہیں، مگر تم کو ان کی زندگی کی خبر اور اس کی کیفیت معلوم نہیں اور یہ سب صبر کا نتیجہ ہے۔

وَلَنَبۡلُوَنَّكُمۡ بِشَيۡءٖ مِّنَ الۡخَوۡفِ وَالۡجُوۡعِ وَنَقۡصٖ مِّنَ الۡاَمۡوَالِ وَالۡاَنۡفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ

اور البتہ ہم آزمائیں گے تم کو تھوڑے سے ڈر سے اور تھوڑی سی بھوک سے اور نقصان سے مالوں کے اور جانوں کے اور میووں کے

وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيۡنَ ﴿۱۵۵﴾

اور خوش خبری دے ان صبر کرنے والوں کو

خلاصہ تفسیر: صبر کے مواقع میں سے بڑے موقع قتال کو بیان کر کے اس سے چھوٹے مواقع کا آگے بیان فرماتے ہیں، جس سے یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ دربار خداوندی میں صبر کی اعلیٰ قسم کی طرح اس سے ادنیٰ قسم کی بھی قدر ہے۔

اور (دیکھو) ہم (صفت رضا و تسلیم میں جو کہ ایمان کا تقاضہ اور مطالبہ ہے) تمہارا امتحان کریں گے کسی قدر خوف سے (جو کہ مخالفین کے ہجوم و کثرت یا حادثات اور سختیوں کی وجہ سے پیش آئے) اور (کسی قدر فقر و) فاقہ سے، اور (کسی قدر) مال اور جان اور پھلوں کی کمی سے (مثلاً مویشی مرگئے، یا کوئی آدمی مرگیا، یا بیمار ہوگیا، یا پھل اور کھیتی کی پیداوار ہلاک ضائع ہوگئی، پس تم صبر کرنا) اور (جو لوگ ان امتحانوں میں پورے اتریں اور ثابت قدم رہیں تو) آپ ایسے صابرین کو بشارت سنا دیجئے (یہ خطاب ساری امت کو ہے، تو سب کو سمجھ لینا چاہیے کہ دنیا دار الامتحان ہے، یہاں کے حوادث کو عجیب اور بعید نہ سمجھا جائے تو بے صبری نہ ہوگی)۔

وَلَنَبۡلُوَنَّكُمۡ بِشَيۡءٖ مِّنَ الۡخَوۡفِ: اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو بندوں کا امتحان ہوتا ہے اس کی حقیقت پیچھے آیت: وَاِذِ ابۡتَلٰٓى اِبۡرٰهٖمَ رَبُّهٗ کی تفسیر میں گذر چکی ہے، اور حوادث کے واقع ہونے سے پہلے ان کی خبر دے دینے میں یہ فائدہ ہوا کہ صبر آسان ہو جاتا ہے ورنہ اچانک کوئی صدمہ پڑنے سے زیادہ پریشانی ہوتی ہے، اور یہ خطاب ساری امت کو ہے تو سب کو سمجھ لینا چاہئے کہ دنیا دار الامتحان ہے (یعنی محنتوں اور تکلیفوں کی جگہ ہے) اس لئے یہاں کے حوادث کو عجیب اور بعید سمجھیں گے تو بے صبری نہ ہوگی، اور چونکہ یہ لوگ نفس صبر کے عمل میں تو سب مشترک ہیں اس لئے اس کا مشترک صلہ تو عام رحمت ہے جس کا نفس صبر پر سب کے لیے ہی وعدہ ہے، لیکن چونکہ مقدار، شان اور خصوصیت ہر صابر کے صبر کی جدا ہے، اس لئے خاص عنایتوں کا ہر شخص کے لیے الگ الگ وعدہ فرمایا، جیسے دنیا میں انعام کے موقع پر کھانے کی دعوت تو عام ہوتی پھر روپے اور جوڑے ہر ایک کو اس کی حیثیت اور خدمت کے مطابق دیئے جاتے ہیں۔

وَلَنَبۡلُوَنَّكُمۡ بِشَيۡءٖ مِّنَ الۡخَوۡفِ وَالۡجُوۡعِ: انسان کو کبھی اضطراری مجاہدہ بھی پیش آ سکتا ہے، جس میں اس کے عمل و نیت کو دخل نہیں ہوتا، لیکن ایسے اضطراری مجاہدہ سے بھی اسے نفع ہوا کرتا ہے (لہذا ایسے موقع پر صبر و استقامت کا مظاہرہ کرنا چاہیے)۔

* * *

فائدہ: پہلے تو ان کا ذکر تھا جنہوں نے صبر کا اعلیٰ مرتبہ حاصل کیا یعنی شہداء، اب فرماتے ہیں کہ تمہارا علی العموم تھوڑی تھوڑی تکلیف اور مصیبت میں وقتاً فوقتاً امتحان لیا جائیگا اور تمہارے صبر کو دیکھا جائیگا، صابرین میں داخل ہونا کچھ سہل نہیں، اسی واسطے پہلے سے متنبہ فرما دیا۔

الَّذِيۡنَ اِذَآ اَصَابَتۡهُمۡ مُّصِيۡبَةٌ ۙ قَالُوۡٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّـآ اِلَيۡهِ رٰجِعُوۡنَ ﴿۱۵۶﴾

کہ جب پہنچے ان کو کچھ مصیبت، تو کہیں ہم تو اللہ ہی کا مال ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹ کر جانیوالے ہیں

اُولٰٓئِكَ عَلَيۡهِمۡ صَلَوٰتٌ مِّنۡ رَّبِّهِمۡ وَرَحۡمَةٌ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُهۡتَدُوۡنَ ﴿۱۵۷﴾

ایسے ہی لوگوں پر عنایتیں ہیں اپنے رب کی اور مہربانی، اور وہی ہیں سیدھی راہ پر

خلاصہ تفسیر: (جن صابرین کی یہ عادت ہے) کہ ان پر جب کوئی مصیبت پڑتی ہے تو وہ (دل سے سمجھ کر یوں) کہتے ہیں کہ ہم

تو (یعنی ہمارے مال اور اولاد حقیقۃً) اللہ تعالیٰ ہی کی ملک ہیں (اور مالک حقیقی کو اپنی ملک میں ہر طرح کے تصرف کا اختیار حاصل ہے، اس سے غلام کا تنگ ہونا کیا معنی) اور ہم سب (دنیا سے) اللہ تعالیٰ ہی کے پاس جانے والے ہیں (سو یہاں کے نقصانات کا بدلہ وہاں جا کر مل جائے گا)۔

(اور بشارت کا جو مضمون ان کو سنایا جائے گا وہ یہ ہے کہ:) ان لوگوں پر (جدا جدا) خاص خاص رحمتیں بھی ان کے پروردگار کی طرف سے (عطا) ہوں گی اور (سب پر مشترکہ طور پر) عام رحمت بھی ہوگی، اور یہی لوگ ہیں جن کی (حقیقت حال تک) رسائی ہوگئی (کہ حق تعالیٰ کو ہر چیز کا مالک اور نقصان کا تدارک کر دینے والا سمجھ گئے)۔

صابرین کی طرف نسبت کر کے جو یہ فرمایا ہے کہ وہ مصیبت کے وقت انا للہ وانا الیہ راجعون کہا کرتے ہیں حقیقت میں مقصود اس کی تعلیم سے یہ ہے کہ مصیبت والوں کو ایسا کہنا چاہئے، کیونکہ ایسا کہنے میں ثواب بھی بہت ہے، اور اگر دل سے سمجھ کر یہ الفاظ کہے جائیں تو غم ورنج کے دور کرنے اور قلب کو تسلی دینے کے معاملہ میں بھی اکسیر کا حکم رکھتے ہیں۔

اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ: یہ کلمہ تمام مصیبتوں کا علاج ہے اور انہی آزمائشوں میں حالت قبض بھی داخل ہے جو اکثر پیش آیا کرتی ہے (قبض دراصل قلب کی اس مضمحل حالت کا نام ہے جس میں انسان کو خستگی، پستگی اور بے لطفی کی کیفیت محسوس ہوتی ہے، عبادتی ذوق وشوق، لطف ومسرت مغلوب ہوجاتے ہیں، لیکن یہ کیفیت عارضی ہوا کرتی ہے)۔

* * *

فائدہ: یعنی جن لوگوں نے ان مصائب پر صبر کیا اور کفران نعمت نہ کیا، بلکہ ان مصائب کو وسیلہ ذکر وشکر بنایا تو ان کو اے پیغمبر ہماری طرف سے بشارت سنا دو۔

اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ

بے شک صفا اور مروہ نشانیوں میں سے ہیں اللہ کی۔ سو جو کوئی حج کرے بیت اللہ کا یا عمرہ تو کچھ گناہ نہیں اس کو کہ طواف کرے

بِهِمَا ؕ وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۵۸﴾

ان دونوں میں، اور جو کوئی اپنی خوشی سے کرے کچھ نیکی تو اللہ قدرداں ہے سب کچھ جاننے والا۔

خلاصہ تفسیر: چند آیات قبل وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ سے دور تک خانہ کعبہ کا مفصل ذکر رہا، جس میں پہلے خانہ کعبہ کے جائے عبادت ہونے کا بیان تھا اور اس کے آگے دعائے ابراہیمی کی حکایت تھی کہ انہوں نے یہ درخواست کی تھی کہ ہمیں احکام مناسک سکھلا دیئے جائیں، اور مناسک میں حج وعمرہ بھی داخل ہے، اب اس کے مقصد حج وعمرہ بننے کے متعلق ایک مضمون کا بیان ہے، وہ یہ کہ صفا ومروہ مکہ میں دو پہاڑیاں ہیں، حج وعمرہ میں کعبہ کا طواف کر کے ان کے درمیان میں دوڑتے چلتے ہیں، جس کو "سعی" کہتے ہیں، چونکہ زمانہ جاہلیت میں بھی یہ سعی ہوتی تھی اور اس وقت صفا ومروہ پر کچھ مورتیاں رکھی تھیں، اس لئے بعض مسلمان کو شبہ پڑ گیا کہ شاید یہ رسوم جاہلیت سے ہو اور گناہ کا سبب ہو، اور بعض جاہلیت میں بھی اس کو گناہ سمجھتے تھے، ان کو یہ شبہ ہوا کہ شاید اسلام میں بھی گناہ ہو، اللہ تعالیٰ کو یہ شبہ دور کرنا مقصود ہے، پس گزشتہ مضمون میں کعبہ کے قبلہ نماز ہونے پر کفار کا اعتراض دور کرنا مقصود تھا، اور آنے والے مضمون میں کعبہ کے مقصد حج وعمرہ ہونے کے متعلق ایک امر یعنی صفا ومروہ کی سعی پر خود مسلمانوں کے شبہ کا ازالہ فرمانا مقصود ہے، یہ دونوں مضمونوں میں ربط کی وجہ ہے۔

(صفا ومروہ کی سعی میں کوئی شبہ نہ کرو، کیونکہ) تحقیقاً صفا اور مروہ (اور ان کے درمیان میں سعی کرنا) من جملہ یادگار (دین) خداوندی ہیں، سو جو شخص حج کرے بیت اللہ کا یا (اس کا) عمرہ کرے، اس پر ذرا بھی گناہ نہیں (جیسا تم کو شبہ ہوگیا) ان دونوں کے درمیان (سعی کے معروف طریقہ

کے مطابق) آمدورفت کرنے میں (جس کا نام سعی ہے، اور گناہ کیا بلکہ ثواب ہوتا ہے، کیونکہ یہ سعی تو شرعاً خیر کا کام ہے) اور (ہمارے یہاں کا ضابطہ ہے کہ) جو شخص خوشی سے کوئی امر خیر کرے تو حق تعالیٰ (اس کی بڑی) قدردانی کرتے ہیں (اور اس خیر کرنے والے کی نیت وخلوص) خوب جانتے ہیں (پس اس ضابطہ کی رو سے سعی کرنے والے کو اس کے خلوص کے بقدر ثواب عنایت ہوگا)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ پہلے ذکر تھا تحویل الی الکعبہ کا اور کعبہ کے سب قبلوں سے افضل ہونے کا، اب اس کے محل ادائے حج وعمرہ ہونے کو بیان فرماتے ہیں تا کہ **ولاتم نعمتی علیکم** کی تصدیق اور تکمیل خوب ہوجائے، یا یوں کہیے کہ اس سے پہلے صبر کی فضیلت مذکور تھی، اب یہ فرمایا کہ دیکھو صفا ومروہ جو شعائر اللہ میں داخل ہوئیں اور ان میں سعی کرنا حج وعمرہ میں ضروری ہوا، اس کی وجہ یہی تو ہے کہ یہ فعل صابرین یعنی حضرت ہاجرہ اور ان کے صاحبزادہ حضرت اسماعیل کے آثار میں سے ہے، حدیث وتفسیر وتاریخ میں یہ قصہ مصرح مذکور ومشہور ہے جس کے دیکھنے سے اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ کی تصدیق ہوتی ہے۔

فائدہ: ۲؎ صفا اور مروہ دو پہاڑیاں ہیں، مکہ میں اہل عرب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وقت سے ہمیشہ حج کرتے رہے اور حج کرتے تو ان دو پہاڑیوں کا بھی طواف کرتے، کفر کے زمانہ میں ان دو پہاڑیوں پر کفار نے دو بت رکھے تھے، ان کی تعظیم کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ یہ طواف ان دو بتوں کی تعظیم کے لئے ہے، جب لوگ مسلمان ہوئے اور بت پرستی سے تائب ہوئے تو خیال ہوا کہ صفا اور مروہ کا طواف تو ان بتوں کی تعظیم کے لئے تھا، جب بتوں کی تعظیم حرام ہوئی تو صفا اور مروہ کا طواف بھی ممنوع ہونا چاہیے، یہ ان کو معلوم نہ تھا کہ صفا اور مروہ کا طواف تو اصل میں حج کے لئے تھا، کفار نے اپنی جہالت سے بت رکھ چھوڑے تھے وہ دور ہوگئے اور انصار مدینہ چونکہ کفر کے زمانہ میں صفا اور مروہ کے طواف کو برا جانتے تھے تو اسلام کے بعد بھی ان کو اس طواف میں خلجان ہوا اور آپ سے عرض کیا کہ ہم پہلے سے اس کو مذموم جانتے ہیں، اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور فریق اول اور ثانی دونوں کو بتلا دیا گیا کہ صفا اور مروہ کے طواف میں کوئی گناہ اور خرابی نہیں، یہ تو اصل سے اللہ کی نشانیاں ہیں ان کا طواف کرنا چاہیے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِى الْكِتٰبِ ۙ

بے شک جو لوگ چھپاتے ہیں جو کچھ ہم نے اتارے صاف حکم اور ہدایت کی باتیں بعد اسکے کہ ہم انکو کھول چکے لوگوں کے واسطے کتاب میں ۱؎

اُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ ۙ﴿۱۵۹﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَبَيَّنُوْا فَاُولٰٓئِكَ

ان پر لعنت کرتا ہے اللہ اور لعنت کرتے ہیں ان پر لعنت کرنے والے ۲؎ مگر جنہوں نے توبہ کی اور درست کیا اپنے کام کو اور بیان کر دیا حق بات کو

اَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ۚ وَاَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۶۰﴾

تو ان کو معاف کرتا ہوں، اور میں ہوں بڑا معاف کرنے والا نہایت مہربان ۳؎

خلاصہ تفسیر: پیچھے قبلہ کی بحث کے ضمن میں صاحب قبلہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نبوت کے متعلق اہل کتاب کا حق چھپانے کا مضمون مذکور تھا: وان فریقا منھم لیکتمون الحق، اب یہاں اس مضمون کی تکمیل کے لیے حق کو چھپانے اور اس پر اصرار کرنے والوں کی وعید اور توبہ کرنے والوں کے لیے معافی کا وعدہ ارشاد فرماتے ہیں:

جو لوگ اخفاء کرتے [چھپاتے] ہیں ان مضامین کا جن کو ہم نے نازل کیا ہے جو کہ (اپنی ذات میں) واضح ہیں اور (دوسروں کے لئے) ہادی ہیں (اور چھپانا بھی) اس (حالت) کے بعد کہ ہم ان (مضامین) کو کتاب (الٰہی توراۃ وانجیل) میں (نازل فرما کر) عام لوگوں پر ظاہر کر چکے ہوں ایسے لوگوں پر اللہ تعالیٰ بھی لعنت فرماتے ہیں (کہ اپنی رحمت خاص سے ان کو دور کر دیتے ہیں) اور (دوسرے بہتیرے) لعنت کرنے والے بھی (جن کو اس فعل سے نفرت ہے) ان پر لعنت بھیجتے ہیں (کہ ان پر بددعا کرتے ہیں، ہاں!) مگر جو لوگ (ان چھپانے والوں میں اپنی اس حرکت سے)

توبہ (یعنی حق تعالیٰ کے روبرو گذشتہ سے معذرت) کرلیں اور (جو کچھ ان کے اس فعل سے خرابی ہوگئی تھی، آئندہ کے لئے اس کی) اصلاح کردیں (اور اصلاح کا طریقہ یہ ہے کہ ان چھپائے گئے مضامین کو عام طور پر) ظاہر کردیں (تاکہ سب کو اطلاع ہو جائے اور ان پر لوگوں کو گمراہ کرنے کا الزام نہ آئے، اور شریعت کے نزدیک معتبر اظہار یہ ہے کہ اسلام کو قبول کرلیں، کیونکہ اسلام نہ لانے میں نبوت محمدیہ کے متعلق عوام پر بھی حق مخفی رہے گا، وہ یہی سمجھیں گے کہ اگر نبوت حق ہوتی تو یہ کتاب جاننے والے اہل کتاب کیوں نہ ایمان لاتے، خلاصہ یہ کہ یہ لوگ مسلمان ہو جائیں) تو ایسے لوگوں (کے حال) پر میں (عنایت سے) متوجہ ہو جاتا ہوں (اور ان کی خطاء معاف کردیتا ہوں) اور میری تو بکثرت عادت ہے توبہ قبول کرلینا اور مہربانی فرمانا (کوئی توبہ کرنے والا ہونا چاہئے)۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا: اس میں اس شخص کی مذمت پر دلالت ہے جو اپنے خاص لوگوں کے علاوہ دوسروں سے علوم اور معاملہ کو چھپائے، کیونکہ یہ علوم بھی اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائے ہیں اور ما انزل اللہ میں داخل ہیں، البتہ علوم مکاشفہ کے چھپانے کا حکم کیا جائے گا، کیونکہ وہ نازل نہیں کیے گئے اور بعض اوقات ان کے اظہار میں فتنہ بھی ہو جاتا ہے۔

* * *

فائدہ: ۱۔ اس سے مراد ہیں یہود کہ تورات میں جو آپ کی تصدیق تھی اس کو اور تحویل قبلہ وغیرہ امور کو چھپاتے تھے اور جس نے غرض دنیا کے واسطے اللہ کے حکم کو چھپایا وہ سب اس میں داخل ہیں۔

فائدہ: ۲۔ لعنت کرنے والے، یعنی جن وانس وملائکہ بلکہ اور سب حیوانات، کیونکہ ان کی حق پوشی کے وبال میں جب عالم کے اندر قحط، وباء اور طرح طرح کی بلائیں پھیلتی ہیں تو حیوانات بلکہ جمادات تک کو تکلیف ہوتی ہے اور سب ان پر لعنت کرتے ہیں۔

فائدہ: ۳۔ یعنی اگرچہ ان کی حق پوشی کے باعث آدمی گمراہی میں پڑ گئے، لیکن جب انہوں نے حق پوشی سے توبہ کر کے اظہار حق پوری طرح کر دیا تو اب بجائے لعنت ہم ان پر رحمت نازل فرماتے ہیں، کیونکہ ہم تو اب ورحیم ہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۶۱﴾

بے شک جو لوگ کافر ہوئے اور مر گئے کافر ہی انہی پر لعنت ہے اللہ کی اور فرشتوں اور لوگوں کی سب کی ۱۔

خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۱۶۲﴾

ہمیشہ رہیں گے اسی لعنت میں، نہ ہلکا ہوگا ان پر سے عذاب اور نہ ان کو مہلت ملے گی ۲۔

خلاصہ تفسیر: البتہ جو لوگ (ان میں سے) اسلام نہ لائیں اور اسی حالت غیر اسلام پر مر جائیں ایسے لوگوں پر (وہ مذکورہ) لعنت اللہ تعالیٰ کی اور فرشتوں اور آدمیوں کی بھی سب کی (لعنت ایسے طور پر برسا کرے گی کہ) وہ ہمیشہ ہمیشہ کو اسی (لعنت) میں رہیں گے (حاصل یہ کہ وہ جہنم میں ہمیشہ کے لئے داخل ہوں گے، اور ہمیشہ کا جہنم میں رہنے والا ہمیشہ ہی خدا کی خاص رحمت سے دور بھی رہے گا، اور ہمیشہ ملعون رہنا یہی ہے، اور ہمیشہ کی لعنت کے ساتھ یہ بھی ہے کہ داخل ہونے کے بعد کسی وقت) ان (پر) سے (جہنم کا) عذاب ہلکا (بھی) نہ ہونے پائے گا اور نہ (داخل ہونے سے قبل) ان کو (کسی میعاد تک) مہلت دی جائے گی (کیونکہ میعاد یا مہلت اس وقت دی جاتی ہے جب کہ مقدمہ میں کچھ گنجائش ہو اور گنجائش نہ ہونے پر اول ہی پیشی میں سزا کا حکم ہو جاتا ہے)۔

* * *

فائدہ: ۱۔ یعنی جس نے خود حق پوشی کی، یا کسی دوسرے کی حق پوشی کے باعث گمراہ ہوا اور اخیر تک کافر ہی رہا اور توبہ نصیب نہ ہوئی تو وہ ہمیشہ کو ملعون اور جہنمی ہوا، مرنے کے بعد توبہ مقبول نہیں، بخلاف اول فریق مذکور سابق کے کہ توبہ نے انکی لعنت کو منقطع کر دیا کہ زندگی ہی میں تائب ہو گئے۔

فائدہ: ۲؎ یعنی ان پر عذاب یکساں اور متصل رہے گا، یہ نہ ہوگا کہ عذاب میں کسی قسم کی کمی ہو جائے، یا کسی وقت ان کو عذاب سے مہلت مل جائے۔

وَاِلٰـهُكُمْ اِلٰـهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ﴿١٦٣﴾

اور معبود تم سب کا ایک ہی معبود ہے، کوئی معبود نہیں اس کے سوا بڑا مہربان ہے نہایت رحم والا

خلاصہ تفسیر: چند آیات قبل مسئلہ رسالت کو ثابت کیا، چونکہ عقیدہ توحید اور عقیدہ رسالت دونوں شریعت میں لازم و ملزوم ہیں اس لیے اس آیت میں مسئلہ توحید کو بیان کیا جا رہا ہے۔

اور (ایسا معبود) جو تم سب کے معبود بننے کا مستحق وہ تو ایک ہی معبود (حقیقی) ہے، اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، وہی رحمٰن ہے، رحیم ہے (دوسرا کوئی ان صفات میں کامل نہیں، اور صفات کمال کے بغیر کوئی معبود نہیں ہوسکتا، پس بجز معبود حقیقی کے کوئی اور مستحق عبادت نہ ہوا)۔

* * *

فائدہ: یعنی معبود حقیقی تم سب کا ایک ہی ہے، اس میں تعدد کا احتمال بھی نہیں، سو اب جس نے اس کی نافرمانی کی بالکل مردود اور غارت ہوا، دوسرا معبود ہوتا تو ممکن تھا کہ اس سے نفع کی توقع باندھی جاتی، یہ آقائی اور پادشاہی اور استادی اور پیری نہیں کہ ایک جگہ موافقت نہ آئی تو دوسری جگہ چلے گئے، یہ تو معبودی اور خدائی ہے، نہ اس کے سوا کسی کو معبود بنا سکتے ہو اور نہ کسی سے اس کے علاوہ خیر کی توقع کر سکتے ہو۔

ربط: جب آیت والھکم الہ واحد نازل ہوئی تو کفار مکہ نے تعجب کیا کہ تمام عالم کو معبود اور سب کا کام بنانے والا ایک کیسے ہوسکتا ہے؟ اور اس کی دلیل کیا ہے؟ اس پر آیت اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ نازل ہوئی اور اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کی نشانیاں بیان فرمائیں۔

اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ

بیشک آسمان اور زمین کے پیدا کرنے میں اور رات اور دن کے بدلتے رہنے میں اور کشتیوں میں جو کہ لے کر چلتی ہیں دریا میں

بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ

لوگوں کے کام کی چیزیں اور پانی میں جس کو کہ اتارا اللہ نے آسمان سے پھر جلایا اس سے زمین کو اس کے مر گئے پیچھے اور پھیلائے

فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ۠ وَّتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ

اس میں سب قسم کے جانور، اور ہواؤں کے بدلنے میں اور بادل میں جو کہ تابعدار ہے اس کے حکم کا درمیان آسمان و زمین کے

لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿١٦٤﴾

بیشک ان سب چیزوں میں نشانیاں ہیں عقلمندوں کے لئے

خلاصہ تفسیر: مشرکین عرب نے جب آیت: وَاِلٰـهُكُمْ اِلٰـهٌ وَّاحِدٌ اپنے عقیدہ کے خلاف سنی تو تعجب سے کہنے لگے کہ کہیں سارے جہان کا ایک معبود بھی ہوسکتا ہے؟ اور اگر یہ دعویٰ صحیح ہے تو کوئی دلیل پیش کرنی چاہیے، حق تعالیٰ آگے دلیل توحید بیان فرماتے ہیں:

بلاشبہ آسمانوں کے اور زمین کے بنانے میں، اور یکے بعد دیگرے رات اور دن کے آنے میں، اور جہازوں (کے چلنے) میں جو کہ سمندر میں چلتے ہیں آدمیوں کے نفع کی چیزیں (اور اسباب) لے کر، اور (بارش کے) پانی میں جس کو اللہ تعالیٰ نے آسمان سے برسایا، پھر اس (پانی) سے زمین کو

تروتازہ کیا اس کے خشک ہوئے پیچھے (خشک ہونے کے بعد، یعنی اس میں نباتات پیدا کئے) اور (ان نباتات سے) ہر قسم کے حیوانات اس (زمین) میں پھیلا دیے (کیونکہ حیوانات کی زندگی اور توالد و تناسل اسی نباتاتی غذا کی بدولت ہے) اور ہواؤں کی (سمتیں اور کیفیتیں) بدلنے میں (کہ کبھی شرقی ہوا ہے، کبھی غربی، کبھی گرم ہے، کبھی سرد) اور ابر (کے وجود) میں جو زمین وآسمان کے درمیان مقید (اور معلق) رہتا ہے (ان تمام چیزوں میں توحید کے) دلائل (موجود ہیں) ان لوگوں کے (استدلال کے) لئے جو عقل (سلیم) رکھتے ہیں۔

اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ: اس عقلی استدلال کا خلاصہ یہ ہے کہ ان سب چیزوں کا وجود ممکن ہے، ضروری اور دائمی نہیں، کیونکہ بعض میں یہ مشاہدہ ہے کہ وہ پہلے معدوم تھیں پھر موجود ہوئیں اور بعض کے احوال بدلتے رہنے سے اس کا پتہ چلتا ہے، اور ان میں سے بعض مرکب ہیں جو اپنے اجزاء کی طرف محتاج ہیں اور وہ اجزاء کے مرکب ہونے سے پہلے معدوم تھیں، جب سب کا ممکن ہونا معلوم ہو گیا تو سمجھو کہ ممکن کا چونکہ وجود اور عدم دونوں برابر ہوتے ہیں تو اس کو اپنے وجود کے لیے کسی مرجح کی ضرورت ہوتی ہے، وہ مرجح اگر اس جیسا کوئی ممکن ہے تو اس کے لیے پھر مرجح کی ضرورت ہوگی تو اس محال سلسلہ لامتناہی کو ختم کرنے کے لیے ماننا پڑے گا کہ وجود کے لیے مرجح کوئی ایسی ذات ہے جس کا وجود خانہ زاد ہو کہ اس سے کبھی جدا نہ ہو سکتا ہو اور اسی کو واجب الوجود اور خدا کہتے ہیں، تو یہ صانع عالم کی ہستی کی دلیل ہے۔

رہا اس کا واحد ہونا اس کی تقریر یہ ہے کہ اگر نعوذ باللہ صانع عالم مثلاً دو ہیں تو یا تو دونوں قادر مطلق ہیں، یا ان میں سے کوئی عاجز بھی ہو سکتا ہے، یہ دوسری صورت تو غلط ہے، کیونکہ جو عاجز ہوگا وہ صانع عالم اور واجب الوجود نہیں ہو سکتا، پہلی صورت کہ دونوں قادر مطلق ہوں تو یہ بھی محال ہے، کیونکہ اس صورت میں یہ سوال ہوگا کہ اگر ان میں سے کسی نے ایک کام کا قصد کیا مثلاً زید کو پیدا کرنے کا، تو دوسرا اس کے خلاف کا قصد کر سکتا ہے یا نہیں، اگر کہو کہ دوسرا خلاف کا قصد نہیں کر سکتا تو عاجز ہونا لازم آ گیا اور جو عاجز ہو وہ خدا کب ہو سکتا ہے، اور اگر کہو کہ دوسرا خلاف کا قصد کر سکتا ہے تو اس صورت میں یا تو دونوں کا ارادہ پورا ہوگا یا ایک کا، اگر ایک کا ارادہ پورا ہوا ایک کا نہ ہوا تو دوسرا قادر مطلق نہ رہا، اور اگر دونوں کا ارادہ پورا ہوگا تو ضدین کا اجتماع ہوگا کہ زید موجود بھی ہو اور معدوم بھی ہو، تو یہ محال ہے، اس لیے دو کا قادر مطلق ہونا خود محال ہو گیا، پس قادر مطلق ایک ہی ہو سکتا ہے، یہی مقصود تھا، خوب سمجھ لو۔

وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ: آسمانوں کا وجود ثابت ہے، اور نفی کی کوئی دلیل کسی کے پاس نہیں، ہاں! یہ ممکن ہے کہ طلوع وغروب کے نظام میں آسمان کو دخل نہ ہو، لیکن اسے آسمان کے وجود کی نفی لازم نہیں آتی۔

لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ: میں اس طرف اشارہ ہے کہ اسلام کے اصول یعنی توحید و رسالت عقلی ہیں، جیسا یہاں آیت میں یعقلون سے اسی طرف اشارہ ہے، اور شرعی مسائل کا عقلی ہونا ضروری نہیں، ہاں یہ ضروری ہے کہ کسی دلیل عقلی قطعی کے خلاف نہ ہوں، افسوس ہے کہ آج کل نوخیز طبائع ان دونوں کو مخلوط کر کے عجب چکر میں پڑ جاتے ہیں، جس کا اخیر انجام بددینی ہے، خوب سمجھ لو۔

لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ: اس میں مراقبہ کی اصل ثابت ہوتی ہے (اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کا تصور اس غرض سے کرنا کہ اس کا دائمی استحضار ہو جائے، اصطلاح میں اسے مراقبہ کہا جاتا ہے، مراقبہ کا تعلق قلب کے عمل سے وابستہ ہے)۔

* * *

فائدہ: یعنی آسمان کے اس قدر وسیع اور اونچا اور بے ستون پیدا کرنے میں اور زمین کے اتنی وسیع اور مضبوط پیدا کرنے اور اسکے پانی پر پھیلانے میں اور رات اور دن کے بدلتے رہنے اور ان کے گھٹانے اور بڑھانے میں اور کشتیوں کے دریا میں چلنے اور آسمان سے پانی برسانے اور اس سے زمین کو سرسبز و تروتازہ کرنے میں جملہ حیوانات میں اس سے توالد و تناسل نشوونما ہونے میں اور جہاتِ مختلفہ سے ہواؤں کے چلانے میں اور بادلوں کو آسمان اور زمین میں معلق کرنے میں دلائل عظیمہ اور کثیرہ ہیں حق تعالیٰ کی وحدانیت اور اسکی قدرت اور حکمت اور رحمت پر ان کیلئے جو صاحب عقل اور فکر ہیں۔

فائدہ: لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ میں توحید ذات کا اور اَلرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ میں توحید صفات کا ثبوت تھا اور اِنَّ فِيْ خَلْقِ الخ میں توحید افعال کا ثبوت ہوا، جس سے مشرکین کے شبہات بالکلیہ مندفع ہو گئے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يَّتَّخِذُ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اَنۡدَادًا يُّحِبُّوۡنَهُمۡ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا

اور بعضے لوگ وہ ہیں جو بناتے ہیں اللہ کے برابر اوروں کو دوست ل ان کی محبت ایسی رکھتے ہیں جیسی محبت اللہ کی ۲ اور ایمان والوں کو

اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ وَلَوۡ يَرَى الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡۤا اِذۡ يَرَوۡنَ الۡعَذَابَ ۙ اَنَّ الۡقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيۡعًا ۙ

اس سے زیادہ تر ہے محبت اللہ کی ۳ اور اگر دیکھ لیں یہ ظالم اس وقت کو جب کہ دیکھیں گے عذاب کہ قوت ساری اللہ ہی کے لئے ہے

وَّاَنَّ اللّٰهَ شَدِيۡدُ الۡعَذَابِ ﴿۱۶۵﴾

اور یہ کہ اللہ کا عذاب سخت ہے ۴

خلاصہ تفسیر: گذشتہ آیات میں توحید کا اثبات تھا، آگے مشرکین کی غلطی اور وعید کا بیان فرماتے ہیں:

اور ایک آدمی وہ (بھی) ہیں جو علاوہ خدا تعالیٰ کے اوروں کو بھی شریک (خدائی) قرار دیتے ہیں (اور ان کو اپنا کارساز سمجھتے ہیں، اور) ان سے ایسی محبت رکھتے ہیں جیسی محبت اللہ سے (رکھنا) ضروری ہے (یہ حالت تو مشرکین کی ہے) اور جو مومن ہیں ان کو (صرف) اللہ تعالیٰ کے ساتھ نہایت قوی محبت ہے، اور کیا خوب ہوتا اگر یہ ظالم (مشرکین) جب (دنیا میں) کسی مصیبت کو دیکھتے تو (اس میں غور کرکے) یہ سمجھ لیا کرتے کہ سب قوت حق تعالیٰ ہی کو ہے (اور دوسرے سب اس کے سامنے عاجز ہیں، چنانچہ اس مصیبت کو نہ کوئی روک سکا نہ ٹال سکا، اور نہ ایسے وقت میں اور کوئی یاد رہا) اور (اس مصیبت کی شدت میں غور کرکے) یہ (سمجھ لیا کرتے) کہ اللہ تعالیٰ کا عذاب (آخرت میں جو کہ دار الجزاء ہے اور بھی) سخت ہوگا (تو اس طرح غور کرنے سے تراشیدہ معبودوں کا عاجز ہونا اور حق تعالیٰ کی عظمت اور قادر مطلق ہونا منکشف ہوکر توحید و ایمان اختیار کر لیتے)۔

وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ: یعنی جو مومن ہیں ان کو صرف اللہ کے ساتھ نہایت قوی محبت ہے، کیونکہ اگر کسی مشرک کو یہ ثابت ہو جائے کہ میرے معبود سے مجھے کوئی نقصان پہنچے گا تو فوراً محبت ختم ہو جائے، اور مومن باوجود اس کے کہ نافع وضار حق تعالیٰ ہی کو اعتقاد کرتا ہے، لیکن پھر بھی اس کی محبت ورضا باقی رہتی ہے، نیز اکثر مشرکین سخت مصیبت کے وقت اپنے من گھڑت معبودوں کو چھوڑ دیتے ہیں، اور مومن جو واقعی مومن ہیں مصیبت میں بھی خدا کو نہیں چھوڑتے، اور محاورات میں ایسا کلام غالب حال کے اعتبار سے بھی صادق ہوتا ہے۔

اس میں اس بات پر دلالت ہے کہ مطلق غیر اللہ کے ساتھ محبت، محبت الٰہیہ کے منافی نہیں، جیسا کہ لفظ ''اشد'' سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی درجے میں دوسرے کی بھی محبت ہے، یعنی اس بات کا خیال رہے کہ قوی محبت اللہ کے ساتھ ہو تھوڑی بہت غیر اللہ سے بھی ہو تو کوئی بات نہیں۔

وَلَوۡ يَرَى الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡۤا اِذۡ يَرَوۡنَ الۡعَذَابَ: یعنی اگر یہ ظالم جب کسی مصیبت کو دیکھتے تو اس میں غور کرکے یہ سمجھ لیا کرتے، یہاں غور کرنے کے لیے جو مصیبت کے وقت کو خاص کیا گیا، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ لوگ ایسے ہی وقت میں غیر اللہ کو چھوڑ کر خدا تعالیٰ کی طرف رجوع ہو جاتے تھے، اس لیے اس وقت کو یاد دلا کر متنبہ فرماتے ہیں کہ جیسے اس وقت کسی قدر راہ پر آجاتے ہو اگر کسی قدر صحیح نظر سے کام لو تو اس وقت توحید کا حق ہونا منکشف ہو جائے اور توحید پر پختگی نصیب ہو۔

* * *

فائدہ: ل مَنۡ يَّتَّخِذُ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اَنۡدَادًا: آدمیوں میں جو کہ شعور و عقل میں جمیع مخلوقات سے افضل ہیں، بعضے ایسے بھی ہیں کہ باوجود دلائل ظاہرہ سابقہ کے پھر غیر اللہ کو حق تعالیٰ کا شریک اور اس کے برابر بناتے ہیں۔

فائدہ: ۲ يُّحِبُّوۡنَهُمۡ كَحُبِّ اللّٰهِ: یعنی صرف اقوال و اعمال جزئیہ ہی میں ان کو اللہ تعالیٰ کے برابر نہیں مانتے، بلکہ محبت قلبی جو کہ صدور اعمال کی اصل ہے اس تک شرک اور مساوات کی نوبت پہنچا رکھی ہے، جو شرک کا اعلیٰ درجہ ہے اور شرک فی الاعمال اس کا خادم اور تابع ہے۔

فائدہ: ۳ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ: یعنی مشرکین کو جو اپنے معبودوں سے محبت ہے، مومنین کو اپنے اللہ سے اس سے بھی بہت زیادہ اور مستحکم محبت ہے، کیونکہ مصائب دنیا میں مشرکین کی محبت بسا اوقات زائل ہو جاتی ہے اور عذاب آخرت دیکھ کر تو بالکل تبرّی اور بیزاری ظاہر کریں گے، جیسا اگلی آیت میں آتا ہے بخلاف مومنین کے کہ ان کی محبت اپنے اللہ کے ساتھ ہر ایک رنج و راحت، مرض و صحت دنیا و آخرت میں برابر باقی اور پائیدار رہنے والی ہے اور نیز اہل ایمان کو جو اللہ سے محبت ہے وہ اس محبت سے بھی بہت زیادہ ہے جو محبت کہ اہل ایمان ماسوی اللہ یعنی انبیاء و اولیاء و ملائکہ و عباد و علماء یا اپنے آباؤ اجداد اور اولاد و مال وغیرہ سے رکھتے ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ سے تو اس کی عظمت شان کے موافق بالاصال اور بالاستقلال محبت رکھتے ہیں اور اوروں سے بالواسطہ اور حق تعالیٰ کے حکم کے موافق ہر ایک کے اندازہ کے مطابق محبت رکھتے ہیں ''گر فرق مراتب نہ کنی زندیقی'' خدا اور غیر خدا کو محبت میں برابر کر دینا خواہ وہ کوئی ہو، یہ مشرکین کا کام ہے۔

فائدہ: ۴ وَّاَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعَذَابِ: یعنی جن ظالموں نے خدا کے لئے شریک بنائے، اگر وہ اس آنے والے وقت کو دیکھ لیں کہ جس وقت ان کو عذاب الٰہی کا مشاہدہ ہوگا کہ زور سارا اللہ ہی کے لئے ہے، عذاب خداوندی سے کوئی نہیں بچا سکتا اور اللہ کا عذاب سخت ہے تو ہر گز اللہ کی عبادت کو چھوڑ کر دوسروں کی طرف متوجہ نہ ہوں اور نہ ان سے امید منفعت رکھیں۔

اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِيْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا وَرَاَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ ﴿۱۶۶﴾

جبکہ بیزار ہو جاویں گے وہ کہ جنکی پیروی کی تھی ان سے کہ جو انکے پیرو ہوئے تھے اور دیکھیں گے عذاب اور منقطع ہو جائیں گے انکے سب علاقے

خلاصہ تفسیر: پیچھے آخرت کے عذاب کو سخت فرمایا ہے، آگے اس سختی کی کیفیت بیان فرماتے ہیں۔

(وہ عذاب کی سختی اس وقت معلوم ہوگی) جبکہ (ان مشرکین میں سے) وہ (ذی اثر) لوگ جن کے کہنے پر دوسرے (عوام) چلتے تھے ان (عام) لوگوں سے صاف الگ ہو جائیں گے جو ان کے کہنے پر چلتے تھے اور سب (خواص و عوام) عذاب کا مشاہدہ کر لیں گے اور باہم ان میں جو تعلقات تھے (کہ ایک تابع جو کہ بت پرست مشرک تھا اور دوسرا متبوع جھوٹا خدا، بت تھا وغیرہ) اس وقت سب قطع ہو جائیں گے (جیسے دنیا میں بھی دیکھا جاتا ہے کہ ایک جرم میں سب شریک و متفق ہوتے ہیں اور تنقیح مقدمہ کے وقت سب الگ الگ بچنا چاہتے ہیں، حتیٰ کہ باہم دگر معرفت اور پہچان تک کے منکر ہو جاتے ہیں)۔

* * *

فائدہ: یعنی وہ وقت ایسا ہوگا کہ بیزار ہو جائیں گے متبوع اپنے تابعداروں سے اور بت پرست اور بتوں میں کوئی علاقہ باقی نہ رہے گا، ایک دوسرے کا دشمن ہو جائے گا عذاب الٰہی دیکھ کر۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا ؕ

اور کہیں گے پیرو کیا اچھا ہوتا جو ہم کو دنیا کی طرف لوٹ جانا مل جاتا تو پھر ہم بھی بیزار ہو جاتے ان سے جیسے یہ ہم سے بیزار ہو گئے ۱؎

كَذٰلِكَ يُرِيْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَيْهِمْ ؕ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ ﴿۱۶۷﴾ ع

اسی طرح پر دکھلائے گا اللہ ان کو ان کے کام حسرت دلانے کو، اور وہ ہرگز نکلنے والے نہیں نار سے ۲؎

خلاصہ تفسیر: اور (جب) یہ تابع [مشرکین] لوگ (متبوعین یعنی جھوٹے خداؤں کی یہ طوطا چشمی دیکھیں گے تو بڑے جھنجلائیں گے اور تو کچھ نہ ہو سکے گا مگر جھلا کر) یوں کہنے لگیں گے کسی طرح ہم سب کو (دنیا میں) بس ذرا ایک دفعہ جانا مل جائے تو ہم بھی ان سے (اتنا بدلہ تو لے لیں کہ اگر یہ پھر ہم کو اپنے تابع ہونے کی ترغیب دیں تو ہم بھی ان سے) صاف (ٹکا سا جواب دے کر) الگ ہو جائیں جیسا یہ ہم سے (اس

وقت) صاف الگ ہو بیٹھے (اور کہہ دیں کہ جناب آپ وہی ہیں کہ عین موقع پر بے رخی کی تھی، اب ہم سے کیا غرض، حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان تجویزوں اور سوچ بچاروں سے کیا ہاتھ آئے گا فقط) اللہ تعالیٰ یوں ہی ان کی بداعمالیوں کو خالی ارمان (کے پیرائے میں) کر کے ان کو دکھلا دیں گے اور ان (تابعین ومتبوعین سب) کو دوزخ سے نکلنا کبھی نصیب نہ ہوگا (کیونکہ شرک کی سزا خلود فی النار یعنی ہمیشہ کے لیے جہنم میں رہنا ہے)۔

اس عذاب میں کئی طرح کی سختی ثابت ہوئی، اول تو دوزخ کا عذاب خود بہت سخت ہے، دوسرے ان متبوعین یعنی جھوٹے خداؤں کے خشک جواب دے دینے سے اور تابعین کو غیض وغضب اور انتقام کی تمنا کے سوا کچھ نہ بن پڑنے سے اور بالعموم سب پر حسرت واقع ہونے سے جو روحانی عذاب ہے اس سے ظاہری وحسی عذاب میں اندرونی شدت مزید بڑھ گئی۔

* * *

فائدہ: ۱ اور مشرکین اس وقت کہیں گے کہ اگر کسی طرح ہم کو پھر دنیا میں لوٹ جانا نصیب ہو تو ہم بھی ان سے اپنا انتقام لیں اور جیسا یہ آج ہم سے جدا ہو گئے ہم بھی ان کو جواب دے کر جدا ہو جائیں لیکن اس آرزو محال سے بجز افسوس کچھ نفع نہ ہوگا۔

فائدہ: ۲ یعنی جیسے مشرکین کو عذاب الٰہی اور اپنے معبودوں کی بیزاری دیکھ کر سخت حسرت ہوگی اسی طرح پر ان کے جملہ اعمال کو حق تعالیٰ ان کے لئے موجب حسرت بنا دے گا کیونکہ حج وعمرہ اور صدقات وخیرات جو اچھی باتیں کی ہونگی وہ سب تو بسبب شرک مردود ہو جائیں گی اور شرک وگناہ جس قدر کئے ہونگے ان کا بدلہ عذاب ملے گا تو اب ان کے بھلے اور برے اعمال سب کے سب موجب حسرت ہونگے کسی عمل سے کچھ نفع نہ ہوگا اور ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے بخلاف موحدین اور اہل ایمان کے کہ اگر بسبب معاصی دوزخ میں جائیں گے تو انجام کار نجات پائیں گے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ

اے لوگوں کھاؤ زمین کی چیزوں میں سے حلال پاکیزہ ،اور پیروی نہ کرو شیطان کی ۱ بیشک وہ تمہارا

عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۶۸﴾ اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ وَالْفَحْشَآءِ وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۶۹﴾

دشمن ہے صریح وہ تو یہی حکم کرے گا تم کو کہ برے کام اور بے حیائی کرو اور جھوٹ لگاؤ اللہ پر وہ باتیں جن کو تم نہیں جانتے ۲

خلاصہ تفسیر: پیچھے اہل شرک کے عقیدہ کو باطل کیا، آگے اہل شرک کے بعض اعمال کے باطل ہونے کا بیان ہے، جیسے سانڈ کی تعظیم وغیرہ، بعض مشرکین بتوں کے نام پر جانور چھوڑتے تھے اور تعظیم کے اعتقاد سے ان جانوروں سے فائدہ اٹھانے کو حرام سمجھتے تھے، اور اپنے اس فعل کو حکم الٰہی اور موجب رضا وقرب حق بواسطہ شفاعت ان بتوں کے سمجھتے تھے، حق تعالیٰ اس بارہ میں خطاب فرماتے ہیں کہ:

اے لوگو! جو چیزیں زمین میں موجود ہیں ان میں سے (شرعی) حلال پاک چیزوں (کی نسبت اجازت ہے کہ ان) کو کھاؤ (برتو) اور (ان میں سے کسی حلال چیز سے یہ سمجھ کر پرہیز کرنا کہ اس سے اللہ راضی ہوگا، یہ سب شیطانی خیالات ہیں، تم) شیطان کے قدم بقدم مت چلو، فی الواقع وہ (شیطان) تمہارا صریح دشمن ہے (کہ ایسے ایسے خیالات وجہالات سے تم کو ابدی خسارے میں گرفتار کر رکھا ہے، اور شیطان دشمن ہونے کی وجہ سے) وہ تم کو انہی باتوں کی تعلیم کرے گا جو کہ (شرعا) بری اور گندی ہیں، اور یہ (بھی تعلیم کرے گا) کہ اللہ کے ذمہ وہ باتیں لگاؤ جن کی تم سند بھی نہیں رکھتے (مثلا یہی کہ ہمیں خدا تعالیٰ کا اس طرح حکم ہے)۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ: سانڈ وغیرہ جو بتوں کے نام پر چھوڑ دیئے جاتے ہیں یا اور کوئی جانور مرغا بکرا وغیرہ کسی بزرگ یا اور کسی غیر اللہ کے نامزد کر دیا جاتا ہے اس کا حرام ہونا ابھی چار آیتوں کے بعد وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ کے تحت آنے والا ہے، یہاں آیت يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ میں ایسے جانور کے حرام ہونے کی نفی کرنا منظور نہیں، جیسا کہ بعضوں کو شبہ ہو گیا بلکہ مقصد اس فعل کی حرمت وممانعت ہے کہ غیر اللہ کے تقرب کے لئے جانوروں کو چھوڑ دینا اور اس عمل کو موجب برکت وتقرب سمجھنا اور ان جانوروں کو اپنے اوپر حرام کر لینے کا معاہدہ کر لینا اس کو دائمی سمجھنا یہ سب

افعال ناجائز اور ان کا کرنا گناہ ہے، تو حاصل مطلب آیت کا یہ ہے کہ جن جانوروں کو اللہ تعالیٰ نے حلال بنایا ہے ان کو بتوں کے نام کر کے حرام نہ بناؤ، بلکہ اپنی حالت پر چھوڑ کر کھاؤ پیو، اور اگر ایسی حرکت جہالت سے ہو جائے تو اصلاح نیت کے ساتھ تجدید ایمان اور توبہ کر کے اس حرمت کو ختم کرو، اس طرح ان جانوروں کو تعظیماً حرام قرار دینا تو گناہ ہوا، مگر غیر اللہ کے نام پر کر دینے سے یہ مردار اور نجس کے حکم میں ہو گیا، نجاست کی وجہ سے حرمت ثابت ہو گئی، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر کسی شخص نے جہالت یا غفلت سے کسی جانور کو کسی غیر اللہ کے ساتھ نامزد کر کے چھوڑ دیا تو اس کی توبہ یہی ہے کہ اپنے اس خیال حرمت سے رجوع کرے اور اس فعل سے توبہ کرے تو پھر اس کا گوشت حلال ہو جائے گا، واللہ اعلم۔

كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا: اس میں مجاہدہ میں غلو و شدت کرنے کا باطل ہونا ثابت ہوتا ہے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ اہل عرب بت پرستی کرتے تھے اور بتوں کے نام پر سانڈ بھی چھوڑتے تھے اور ان جانوروں سے نفع اٹھانا حرام سمجھتے تھے اور یہ بھی ایک طرح کا شرک ہے، کیونکہ تحلیل و تحریم کا منصب اللہ کے سوا کسی کو نہیں، اس بارے میں کسی کی بات ماننی، گویا اس کو اللہ کا شریک بنانا ہے، اس لئے پہلی آیات میں شرک کی خرابی بیان فرما کر اب تحریم حلال سے ممانعت کی جاتی ہے۔

جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جو کچھ زمین میں پیدا ہوتا ہے اس میں سے کھاؤ، بشرطیکہ ① وہ شرعاً حلال و طیّب ہو ② نہ تو فی نفسہ حرام ہو جیسے مردار اور خنزیر اور وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ (جن جانوروں پر اللہ کے سوا کسی کا نام پکارا جائے اور ان جانوروں کے ذبح سے اسکی قربت مقصود ہو) ③ اور نہ کسی امر عارضی سے اس میں حرمت آ گئی ہو جیسے غصب، چوری رشوت سود کا مال کہ ان سب سے اجتناب ضروری ہے اور شیطان کی پیروی ہرگز نہ کرو کہ جس کو چاہا حرام کر لیا، جیسے بتوں کے نام کے سانڈ وغیرہ اور جس کو چاہا حلال کر لیا جیسے مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ وغیرہ۔

فائدہ: ۲؎ یعنی مسئلے اور احکام شرعیہ اپنی طرف سے بنا لو جیسا کہ بہت سے مواقع میں دیکھا جاتا ہے کہ مسائل جزئیہ سے گزر کر امور اعتقادیہ تک نصوص شرعیہ کو چھوڑ کر اپنی طرف سے احکام تراشے جاتے ہیں اور نصوص قطعیہ اور اقوال سلف کی تحریف اور تغلیط کرتے ہیں۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ

اور جب کوئی ان سے کہے کہ تابعداری کرو اس حکم کی جو کہ نازل فرمایا اللہ نے تو کہتے ہیں ہرگز نہیں ہم تو تابعداری کریں گے اس کی جس پر دیکھا ہم نے

اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ﴿۱۷۰﴾

اپنے باپ دادوں کو، بھلا اگرچہ ان کے باپ دادے نہ سمجھتے ہوں کچھ بھی اور نہ جانتے ہوں سیدھی راہ

خلاصہ تفسیر: گذشتہ آیت میں مشرکین کے طریقہ کے باطل ہونے کا بیان تھا، آگے اس باطل ہونے کی دلیل کا بیان ہے:

اور جب کوئی ان (مشرک) لوگوں سے کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو حکم (اپنے پیغمبر کے پاس) بھیجا ہے اس پر چلو تو (جواب میں) کہتے ہیں (کہ نہیں) بلکہ ہم تو اسی (طریقہ) پر چلیں گے جن پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے (کیونکہ وہ لوگ اس طریقہ کے اختیار کرنے میں اللہ کی طرف سے مامور تھے، حق تعالیٰ ان پر رد فرماتے ہیں) کیا (ہر حالت میں یہ لوگ اپنے باپ دادا ہی کے طریقہ پر چلیں گے) اگرچہ ان کے باپ دادا (دین کی) نہ کچھ سمجھ رکھتے ہوں، اور نہ (کسی آسمانی کتاب کی) ہدایت رکھتے ہوں (مطلب یہ ہے کہ خود ان کے باپ دادا ہی خدا کے حکم پر نہ چلتے تھے)۔

اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْـًٔا: خدا کے حکم پر چلنے کی دو صورتیں ہیں: ① یا تو کتاب الٰہی کے صریح الفاظ سے حکم معلوم کیا جائے جس کو یہاں ''ہدایت'' سے تعبیر کیا ② یا حکم قرآن کی علت سے قیاس کے ذریعہ معلوم کیا جائے جس کو یہاں ''عقل'' سے تعبیر فرمایا، سو وہ ان دونوں سے خالی تھے، پس ایسے شخص کی تقلید کی کب گنجائش ہے، اس سے یہ بھی سمجھ میں آیا کہ اگر کسی میں یہ دونوں باتیں موجود ہیں کہ وہ کتاب الٰہی کے صریح الفاظ سے احکام مستنبط کر کے بیان کرتا ہے یا صحیح قیاس کے ذریعہ حکم قرآن کی علت سے تو اس کی تقلید کرنا بجا ہے، مطلب یہ ہے کہ اس آیت سے

جس طرح باپ دادوں کی اندھی تقلید واتباع کی مذمت ثابت ہوئی، اسی طرح جائز تقلید واتباع کے شرائط اور ایک ضابطہ بھی معلوم ہو گیا جس کی طرف دو لفظوں میں اشارہ فرمایا ہے: لَا يَعْقِلُوْنَ اور لَا يَهْتَدُوْنَ کیونکہ اس سے معلوم ہوا کہ ان آباء واجداد کی تقلید واتباع کو اس لئے منع کیا گیا ہے کہ انھیں نہ ''عقل'' تھی نہ ''ہدایت''، ''ہدایت'' سے مراد وہ احکام ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے صریح طور پر نازل کئے گئے اور ''عقل'' سے مراد وہ احکام جو بذریعہ اجتہاد نصوص شرعیہ سے استنباط کئے گئے، تو وجہ ان کے اتباع وتقلید کے عدم جواز کی یہ ہے کہ نہ ان کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کئے ہوئے احکام ہیں اور نہ اس کی صلاحیت کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان سے احکام نکال سکیں۔

اس میں اشارہ پایا گیا کہ جس عالم کے متعلق یہ اطمینان ہو جائے کہ ان کے پاس قرآن وسنت کا علم ہے اور اس کو درجہ اجتہاد بھی حاصل ہے کہ جو احکام صراحۃ قرآن وسنت میں نہ ہوں، ان کو نصوص قرآن وسنت سے بذریعہ قیاس نکال سکتا ہے تو ایسے عالم مجتہد کی تقلید واتباع جائز ہے، نہ اس لئے کہ اس کا حکم ماننا اور اس کا اتباع کرنا ہے، بلکہ اس لئے کہ حکم اللہ کا ماننا اور اسی کا اتباع کرنا ہے، مگر چونکہ ہم براہ راست اللہ کے حکم سے واقف نہیں ہو سکتے، اس لئے کسی عالم مجتہد کا اتباع کرتے ہیں، تاکہ اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل ہو سکے، اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ مطلق ائمہ مجتہدین کی تقلید کے خلاف اس طرح کی آیات پڑھ دیتے ہیں وہ خود ان آیات کے صحیح مدلول سے واقف نہیں، بلکہ اس آیت سے مجتہدین فی الدین کی تقلید کی تائید اور تقویت ہوتی ہے، امام قرطبیؒ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ اس آیت میں تقلید آبائی کے ممنوع ہونے کا جو ذکر ہے اس سے مراد باطل عقائد واعمال میں آباء واجداد کی تقلید کرنا ہے، صحیح عقائد واعمال صالحہ میں تقلید کرنا اس میں داخل نہیں، یعنی آباء کی تقلید باطل میں حرام ہے، حق میں جائز بلکہ مستحسن ہے۔

اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْـًٔا: اس میں دلالت ہے کہ جس شخص کا صاحب عقل وہدایت ہونا اجمالاً بھی ثابت ہو جائے تو اس کی اتباع مطلقاً جائز ہے، اور یہ اصل ہے بلا تردد مشائخ وبزرگوں کی اتباع کی۔

* * *

فائدہ: یعنی حق تعالیٰ کے احکام کے مقابلہ میں اپنے باپ دادا کا اتباع کرتے ہیں اور یہ بھی شرک ہے، چنانچہ بعض جہال مسلمان بھی ترک نکاح بیوگاں وغیرہ رسوم باطلہ میں ایسی بات کہہ گزرتے ہیں اور بعض زبان سے گو نہ کہیں مگر عمل درآمد سے ان کے ایسا ہی مترشح ہوتا ہے سو یہ بات اسلام کے خلاف ہے۔

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّنِدَآءً ؕ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۱۷۱﴾

اور مثال ان کافروں کی ایسی ہے جیسے پکارے کوئی شخص ایک چیز کو جو کچھ نہ سنے سوا پکارنے اور چلانے کے[1] بہرے گونگے اندھے ہیں سو وہ کچھ نہیں سمجھتے[2]

خلاصہ تفسیر: پیچھے ان مشرکین کی بدفہمی کا بیان تھا جو کہ منشا ہے حق قبول نہ کرنے کا، آگے اس بدفہمی کے بارے میں ان کی ایک مثال ذکر کی جاتی ہے:

اور ان کافروں کی کیفیت (نافہمی میں) اس (جانور) کی کیفیت کے مثل ہے (جس کا ذکر اس مثال میں کیا جاتا ہے) کہ ایک شخص ہے وہ ایسے (جانور) کے پیچھے چلا رہا ہے جو بجز بلانے اور پکارنے کے کوئی (پر مضمون) بات نہیں سنتا (اسی طرح) یہ کفار (بھی ظاہری بات چیت تو سنتے ہیں لیکن کام کی بات سے بالکل) بہرے ہیں، گویا (سنا ہی نہیں) گونگے ہیں (کہ کبھی ایسی بات زبان ہی پر نہیں آتی) اندھے ہیں (کیونکہ نفع نقصان نظر ہی نہیں آتا) سو (جب سارے ہی حواس درہم برہم ہیں تو) سمجھتے (سمجھاتے) کچھ نہیں۔

* * *

فائدہ: ۱ے یعنی ان کافروں کو راہ ہدایت کی طرف بلانا ایسا ہے جیسا کوئی جنگل کے جانوروں کو بلائے کہ وہ سوائے آواز کے کچھ نہیں سمجھتے ،یہی حال ان لوگوں کا ہے جو خود علم نہ رکھیں اور نہ علم والوں کی بات قبول کریں۔

فائدہ: ۲ے یعنی یہ کفار گویا بہرے ہیں جو حق بات بالکل نہیں سنتے ،گونگے ہیں جو حق بات نہیں کہتے ،اندھے ہیں جو راہِ مستقیم نہیں دیکھتے ،سو وہ کچھ نہیں سمجھتے ،کیونکہ جب ان کے ہر سہ قویٰ مذکورہ فاسد ہو گئے تو تحصیل علم وفہم کی اب کیا صورت ہو سکتی ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ﴿۱۷۲﴾

اے ایمان والو کھاؤ پاکیزہ چیزیں جو روزی دی ہم نے تم کو اور شکر کرو اللہ کا اگر تم اسی کے بندے ہو

خلاصہ تفسیر: پیچھے اکل طیبات کے معاملہ میں مشرکین کی غلطی بتلا کر ان کی اصلاح مقصود تھی ،آگے اہل ایمان کو اس بات سے متنبہ کیا گیا ہے کہ وہ اس غلطی میں مشرکین کی موافقت نہ کریں ،اسی ضمن میں اہل ایمان پر اپنے انعامات کا ذکر اور اس پر ادائے شکر کا حکم بھی ہے۔

اے ایمان والو! (ہماری طرف سے تم کو اجازت ہے کہ) جو (شرع کی رو سے) پاک چیزیں ہم نے تم کو مرحمت فرمائی ہیں ان میں سے (جو چاہو) کھاؤ (برتو) اور (اس اجازت کے ساتھ یہ حکم ہے کہ) حق تعالیٰ کی شکر گذاری کرو (زبان سے بھی ،ہاتھ پاؤں سے خدمت وطاعت بجالا کر بھی ،اور دل سے ان نعمتوں کو خدا کی طرف سے سمجھ کر بھی) اگر تم خاص ان کے ساتھ غلامی کا تعلق رکھتے ہو (اور یہ تعلق ہونا مسلم اور ظاہر ہے ،پس شکر بھی واجب ہے)۔

كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ: اس میں اس بات پر دلالت ہے کہ حلال اشیاء کے کھانے سے بھی اللہ کی محبت اور شکر کی توفیق نصیب ہو جاتی ہے ،یعنی حلال پاکیزہ لذائذ کا استعمال تقوی اور زہد وقناعت کے خلاف نہیں ،بلکہ یہ عمل کبھی اللہ تعالیٰ کی محبت وشکر گذاری تک پہنچا دیتا ہے۔

* * *

فائدہ: ''اکل طیبات'' کا حکم اوپر گزر چکا تھا لیکن مشرکین چونکہ شیطان کی پیروی سے باز نہیں آتے اور احکام اپنی طرف سے بنا کر اللہ کے اوپر لگاتے ہیں اور اپنے رسوم باطلہ آبائی کو نہیں چھوڑتے اور حق بات سمجھنے کی ان میں گنجائش ہی نہیں تو اب ان سے اعراض فرما کر خاص مسلمانوں کو اکل طیبات کا حکم فرمایا گیا اور اپنا انعام ظاہر کر کے ادائے شکر کا امر کیا گیا ،اس میں اہل ایمان کے مقبول اور مطیع ہونے کی جانب اور مشرکین کے مردود ومعتوب ونافرمان ہونے کی طرف اشارہ ہو گیا۔

اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ۚ

اس نے تو تم پر یہی حرام کیا ہے مردہ جانور ۱ے اور لہو ۲ے اور گوشت سور کا ۳ے اور جس جانور پر نام پکارا جائے اللہ کے سوا کسی اور کا ۴ے

فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴿۱۷۳﴾

پھر جو کوئی بے اختیار ہو جائے نہ تو نافرمانی کرے اور نہ زیادتی تو اس پر کچھ گناہ نہیں ۵ے بیشک اللہ ہے بڑا بخشنے والا نہایت مہربان ۶ے

خلاصہ تفسیر: پیچھے تو اس کا بیان تھا کہ حلال کو حرام مت کرو ،آگے یہ مذکور ہے کہ حرام کو حلال مت سمجھو ،جیسا کہ مشرکین اس میں مبتلا تھے ،مثلاً مردار جانور اور غیر اللہ کے نام پر ذبح کو حلال سمجھتے تھے ،اس سے منع کیا گیا ،اور ان حرام چیزوں کے بیان سے پچھلے مضمون کی بھی تائید مقصود ہے کہ دیکھو حرام چیزیں یہ ہیں ،اپنی طرف سے حلال چیزوں کو حرام مت کرو۔

اللہ تعالیٰ نے تم پر صرف (ان چیزوں کو) حرام کیا ہے (نہ یہ کہ تم اپنی طرف سے حلال چیزوں کو حرام کر لو جیسا کہ گذرا ،یعنی) مردار (جانور)

کو (جو واجب الذبح ہونے کے باوجود بلا وجہ شرعی مرجائے) اور خون کو (جو بہتا ہو) اور خنزیر کے گوشت کو (اسی طرح اس کے سب اجزاء گوشت، کھال اور ہڈی حرام بھی ہیں اور ناپاک بھی) اور ایسے جانور کو جو غیر اللہ کے (تقرب کے قصد وارادہ سے) نامزد کر دیا گیا ہو (ان سب کو بیشک حرام کیا ہے) پھر بھی (اس میں اتنی آسانی رکھی ہے کہ) جو شخص (بھوک سے بہت ہی) بیتاب ہو جائے، بشرطیکہ نہ تو (کھانے میں) طالب لذت ہو، اور نہ (قدر ضرورت وحاجت سے) تجاوز کرنے والا ہو تو (اس حالت میں ان چیزوں سے کھانے میں بھی) اس شخص پر کچھ گناہ نہیں ہوتا، واقعی اللہ تعالیٰ ہیں بڑے غفور ورحیم (کہ ایسے وقت میں یہ رحمت فرمائی کہ گناہ کی چیز میں بھی گناہ اٹھا دیا)۔

اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ: اس پر اشکال یہ ہے کہ دوسری آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہ سے ان چند چیزوں کے علاوہ اور بھی بہت سی چیزوں کی حرمت ثابت ہے تو یہ حصر اور حرمت ماسویٰ کی نفی کیسے درست ہوگی؟ جواب یہ ہے کہ یہاں مطلق حلال وحرام کا بیان نہیں، بلکہ ان مخصوص جانوروں کی حلت وحرمت کا بیان ہے جن کے بارے میں مشرکین مکہ اپنے مشرکانہ عقائد کی غلطیاں کیا کرتے تھے، پچھلی آیت میں اس کی وضاحت آچکی ہے کہ بہت سے حلال جانوروں کو مشرکین حرام سمجھ لیتے تھے، یا اپنے اوپر حرام کر لیتے تھے، اس کی مخالفت کی گئی تھی، اس کے بالمقابل یہاں یہ بتلایا گیا کہ اللہ کے نزدیک فلاں فلاں جانور حرام ہیں جن سے تم اجتناب نہیں کرتے اور جو اللہ کے نزدیک حلال ہیں ان سے پرہیز کرتے ہو، اس لئے اس جگہ حصر مطلق نہیں بلکہ اضافی ہے مشرکانہ عقائد کے بالمقابل۔

اَلْمَيْتَةَ وَالدَّمَ: جس جانور کا ذبح کرنا ضروری نہیں ہے وہ دو طرح کے ہیں: ایک ٹڈی اور مچھلی، دوسرے وحشی جانور جبکہ اس کے ذبح پر قدرت نہ ہو، جیسے ہرن وغیرہ تو اس کو دور ہی سے تیر سے یا کسی اور تیز ہتھیار سے اگر بسم اللہ کہہ کر زخمی کیا اور زندہ نہ ملے تو حلال ہو جاتا ہے، البتہ بندوق کا شکار بغیر ذبح کیے حلال نہیں، کیونکہ اس میں دھار نہیں، اور جو خون بہتا نہیں اس سے دو چیزیں مراد ہیں: طحال اور جگر، یہ دونوں حلال ہیں۔

وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ: جس جانور کو غیر اللہ کے نامزد اس نیت سے کر دیا ہو کہ وہ ہم سے خوش ہوں گے اور ہمارا کام بن جائے گا جیسا کہ اس نیت سے بکرا مرغا وغیرہ نامزد کرنے کی عام جاہلوں میں رسم ہے وہ حرام ہو جاتا ہے، اگرچہ ذبح کے وقت اللہ تعالیٰ کا ہی نام لیا جائے، البتہ اگر اس طرح نامزد کرنے کے بعد اس نیت سے توبہ کر لے پھر وہ حلال ہو جاتا ہے، اس مسئلہ میں بعض پڑھے لکھے لوگوں کو غلطی ہوگئی اور غلطی کی وجہ دو ہیں:

① ایک وجہ غلطی کی یہ ہے کہ گزشتہ آیت کا شان نزول یہ لکھا ہے کہ جو لوگ سانڈ وغیرہ کی تحریم کرتے تھے ان کے رد میں یہ آیت نازل ہوئی، اس سے معلوم ہوا کہ سانڈ وغیرہ کی تحریم پر رد وانکار کیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسا کام کرنا جس سے حلال چیز حرام ہو جائے وہ برا ہے، اور یہاں جو اس کو حرام کہا گیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی ایسی حرکت کرے گا تو بے شک حرمت کا حکم ثابت ہو جائے گا تو اس تحریم میں جس کا یہاں انکار کیا گیا ہے اور اس تحریم میں جس کو یہاں ثابت کیا گیا ہے چند فرق ہیں: اول یہ کہ اس جگہ تحریم کے یہ معنی ہیں کہ ایسا فعل کرنا جس سے وہ حرام ہو جائے اور تحریم کو باعث قربت سمجھنا اور اس کو دائمی سمجھنا کہ اب وہ زائل ہی نہ ہو سکے غلط ہے، اور یہاں جو حرام کہا گیا ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ اس فعل بعد وہ حرام تو ہو جائے گی مگر یہ حرمت دائمی نہیں، نیت کی درستی کے بعد حرمت جاتی رہے گی، اور نیت کا درست کر لینا واجب بھی ہے تو جس تحریم کا انکار کیا گیا ہے وہ الگ ہے، اور جس تحریم کو ثابت کیا گیا ہے وہ الگ ہے، ایک کے انکار سے دوسرے کی نفی لازم نہیں آتی۔

② دوسری وجہ غلطی کی یہ ہے کہ اکثر مفسرین نے: مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ کی تفسیر یہ کی ہے کہ جس کو غیر اللہ کے نام سے ذبح کیا جائے، اس سے شبہ ہو گیا کہ غیر اللہ کے نامزد کرنے سے حرام نہیں ہوتا، بلکہ اس کا نام لے کر ذبح کرنے سے حرمت آتی ہے، جواب یہ ہے کہ الفاظ قرآن دونوں کو عام ہیں، نامزد کرنے کو بھی اور نام لے کر ذبح کرنے کو بھی، مفسرین نے صرف ایک صورت کی تفسیر کر دی ہے دوسری صورت سے سکوت کیا ہے، اور سکوت کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ نامزد کرنا حرام نہیں، اور اس سے جانور حرام نہ ہوگا، سورہ مائدہ میں حق تعالیٰ نے: ما اُهِلَّ کے بعد: ماذبح علی النصب جدا فرمایا ہے جس سے صاف معلوم ہوا کہ جس ذبح سے غیر اللہ کا تقرب وتعظیم مقصود ہو وہ حرام ہو جاتا ہے چاہے خدا کا نام لے کر ہی ذبح کیوں نہ کیا جائے۔

❋ ❋ ❋

فائدہ: ۱؎ حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ: ''مردار'' وہ ہے کہ خود بخود مر جائے اور ذبح کی نوبت نہ آئے، یا خلاف طریقہ شرعیہ اس کو ذبح یا شکار کیا جائے، مثلاً گلا گھونٹا جائے، یا زندہ جانور کا کوئی عضو کاٹ لیا جائے، یا لکڑی اور پتھر اور غلیل و بندوق سے مارا جائے، یا اوپر سے گر کر، یا کسی جانور کے سینگ مارنے سے مر جائے، یا درندہ پھاڑ ڈالے، یا ذبح کے وقت قصداً تکبیر کو ترک کیا جائے کہ یہ سب مردار اور حرام ہیں، البتہ دو جانور مردار بحکم حدیث شریف اس حرمت سے مستثنیٰ اور ہم کو حلال ہیں، مچھلی اور ٹڈی۔

فائدہ: ۲؎ وَالدَّمَ: اور ''خون'' سے مراد وہ خون ہے جو رگوں سے بہتا ہے اور ذبح کے وقت نکلتا ہے اور جو خون کہ گوشت پر لگا رہتا ہے وہ حلال اور پاک ہے، اگر گوشت کو بغیر دھوئے ہوئے پکا لیا جائے تو اس کا کھانا درست ہے، البتہ نظافت کے خلاف ہے اور کلیجی اور تلی کہ خون منجمد ہیں بحکم حدیث شریف حلال ہیں۔

فائدہ: ۳؎ وَلَحْمَ الْخِنْزِيرِ: اور ''خنزیر'' زندہ ہو یا مردہ، یا قاعدہ شریعت کے موافق ذبح کر لیا جائے، ہر حال میں حرام ہے اور اس کے تمام اجزاء گوشت پوست، چربی، ناخن، بال، ہڈی، پٹھا، ناپاک اور ان سے نفع اٹھانا اور کسی کام میں لانا حرام ہے، اس موقع پر چونکہ کھانے کی چیزوں کا ذکر ہے اس لئے فقط گوشت کا حکم بتلایا گیا، مگر اس پر سب کا اجماع ہے کہ خنزیر جو کہ بے غیرتی اور بے حیائی اور حرص اور رغبت الی النجاسات میں سب جانوروں میں بڑھا ہوا ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اس کی نسبت فَإِنَّهُ رِجْسٌ فرمایا، بلاشک نجس العین ہے، نہ اس کا کوئی جزو پاک اور نہ کسی قسم کا انتفاع اس سے جائز، جو لوگ کثرت سے اس کو کھاتے ہیں اور اس کے اجزاء سے نفع اٹھاتے ہیں ان تک میں اوصاف مذکورہ واضح طور پر مشاہدہ ہوتے ہیں۔

فائدہ: ۴؎ مَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللهِ: کا یہ مطلب ہے کہ ان جانوروں پر اللہ کے سوا بت وغیرہ کا نام پکارا جائے، یعنی اللہ کے سوا کسی بت، یا جن، یا کسی روح خبیث، یا پیر، یا پیغمبر کے نامزد کر کے اور اس جانور کی جان ان کی نذر کر کے ان کے تقرب یا رضا جوئی کی نیت سے ذبح کیا جائے اور محض ان کی خوشنودی کی غرض سے اس کی جان نکالنی مقصود ہو، ان سب جانوروں کا کھانا حرام ہے، گو بوقت ذبح تکبیر پڑھی ہو اور اللہ کا نام لیا ہو، کیونکہ جان کو جان آفرین کے سوا کسی دوسرے کے لئے نذر و نیاز کرنا ہرگز درست نہیں، اس لئے جس جانور کی جان غیر اللہ کی نذر کی جائے تو اس کی خباثت مردار کی خباثت سے بھی بڑھ جاتی ہے، کیونکہ مردار میں تو یہی خرابی تھی کہ اس کی جان اللہ کے نام پر نہیں نکلی، اور اس کی تو جان غیر اللہ کے نامزد کر دی گئی جو عین شرک ہے، سو جیسے خنزیر اور کتے پر بوقت ذبح تکبیر کہنے سے حلت نہیں آسکتی اور مردار پر اللہ کا نام لینے سے کوئی نفع نہیں ہو سکتا، ایسے ہی جس جانور کی جان غیر اللہ کی نذر اور ان کے نامزد کر دی ہو، اس پر ذبح کے وقت نام الٰہی لینے سے ہرگز ہرگز کوئی نفع اور حلّت اس میں نہیں آسکتی، البتہ اگر غیر اللہ کے نامزد کرنے کے بعد اپنی نیت سے ہی توبہ اور رجوع کر کے ذبح کریگا تو اس کے حلال ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

علماء نے تصریح فرما دی ہے کہ اگر کسی بادشاہ کے آنے پر اس کی تعظیم کی نیت سے جانور ذبح کیا جائے، یا کسی جن کی اذیت سے بچنے کے لئے اس کے نام کا جانور ذبح کیا جائے، یا توپ چلنے، یا اینٹوں کے پزاوہ کے پکنے کے لئے بطور بھینٹ جانور ذبح کیا جائے تو وہ جانور بالکل مردار اور حرام اور کرنے والا مشرک ہے، اگرچہ ذبح کے وقت خدا کا نام لیا جائے، حدیث شریف میں آیا ہے لَعَنَ اللهُ مَنْ ذَبَحَ لِغَيْرِ اللهِ یعنی جو غیر اللہ کے تقرب اور تعظیم کی نیت سے جانور کو ذبح کرے اس پر اللہ کی لعنت ہے، ذبح کے وقت اللہ کا نام پاک لے، یا نہ لے، البتہ اس میں کوئی حرج نہیں کہ جانور کو اللہ کے نام پر ذبح کر کے فقراء کو کھلائے اور اس کا ثواب کسی قریب یا پیر اور بزرگ کو پہنچا دے، یا کسی مردہ کی طرف سے قربانی کر کے اس کا ثواب اسکو دینا چاہے، کیونکہ یہ ذبح غیر اللہ کے لئے ہرگز نہیں، بعضے اپنی کجروی سے یہ حیلہ ایسے مواقع میں بیان کرتے ہیں کہ پیروں کی نیاز وغیرہ میں ہم کو تو یہی مقصود ہوتا ہے کہ کھانا پکا کر مردہ کے نام سے صدقہ کر دیا جائے، تو اول تو خوب سمجھ لیں کہ اللہ کے سامنے جھوٹے حیلوں سے بجز مضرت کوئی نفع حاصل نہیں ہو سکتا، دوسرے ان سے پوچھا جائے کہ جس جانور کی تم نے غیر خدا کے لئے نذر مانی ہے اگر اسی قدر گوشت اس جانور کے عوض خرید کر اور پکا کر فقیروں کو کھلا دو تو تمہارے نزدیک بے کھٹکے وہ نذر ادا ہو جاتی ہے یا نہیں؟ اگر بلا تامل تم اس کو کر سکتے ہو اور اپنی نذر میں کسی قسم کا خلل تمہارے دل میں نہیں رہتا، تو تم سچے، ورنہ تم جھوٹے اور تمہارا یہ فعل شرک اور وہ جانور مردار اور حرام۔

فائدہ: یہاں یہ شبہ ہوتا ہے کہ آیت میں حکم حرمت کو اشیاء مذکورہ میں منحصر کر کے بیان فرمایا ہے جس کا مطلب یہ سمجھا جاتا ہے کہ اشیائے مذکورہ کے سوا کوئی جانور حرام نہیں، حالانکہ جملہ درندے اور گدھا اور کتا وغیرہ سب کا کھانا حرام ہے۔

① اس کا جواب ایک تو یہ ہے کہ اس حصر سے حکم حرمت کو اشیائے مذکورہ میں منحصر کرنا ہرگز مراد نہیں کہ کسی کو اعتراض کی گنجائش ہو، بلکہ حکم حرمت کو صحت وصداقت کے ساتھ مخصوص فرما کر اس حکم کی جانب مخالف کا بطلان منظور ہے، یعنی بس بات یہی ہے کہ یہ چیزیں اللہ پاک نے تم پر حرام فرما دیں، اس میں دوسرا احتمال ہی نہیں، یعنی ان کا حلال سمجھنا بالکل باطل اور غلط ہے۔

② دوسرا جواب یہ ہے کہ حکم حرمت کو اشیائے مذکورہ ہی میں منحصر مانا جائے، مگر اس حصر کو اضافی، یعنی خاص انہی چیزوں کے لحاظ سے تسلیم کیا جائے جن کو مشرکین نے اپنی طرف سے حرام کر لیا تھا، جیسے بحیرہ اور سائبہ وغیرہ جن کا ذکر آئندہ آئیگا، مطلب یہ ہوا کہ ہم نے تو تم پر فقط میتہ اور خنزیر وغیرہ کو حرام کیا تھا، تم جو سانڈ وغیرہ کی تحریم اور تعظیم کے قائل ہو، یہ محض تمہارا افتراء ہے، باقی رہے درندے اور خبیث جانوران کے حرام ہونے میں مشرکین بھی نزاع نہ کرتے تھے، سو یہ حصر انہی جانوروں کے لحاظ سے ہے جن کو مشرکین نے خلاف حکم الٰہی اپنی طرف سے حرام ٹھہرا لیا تھا، تمام جہان کے جانوروں سے اس کو کیا تعلق جو اعتراض مذکور کی نوبت آئے۔

فائدہ: ۵ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ: یعنی اشیائے مذکورہ حرام ہیں، لیکن جب کوئی بھوک سے مرنے لگے تو اس کو لاچاری کی حالت میں کھا لینے کی اجازت ہے، بشرطیکہ نافرمانی اور زیادتی نہ کرے، نافرمانی یہ کہ مثلاً نوبت اضطرار کی نہ پہنچے اور کھانے لگے، اور زیادتی یہ کہ قدر ضرورت سے زائد خوب پیٹ بھر کر کھا لے، بس اتنا ہی کھائے جس سے مرے نہیں۔

فائدہ: ۶ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ: یعنی اللہ پاک تو بڑا بخشنے والا ہے، بندوں کے ہر قسم کے گناہوں کو بخش دیتا ہے، پھر ایسے لاچار اور مضطر کی بخشش کیسے نہ فرمائے گا اور اپنے بندوں پر بڑا ہی مہربان ہے کہ مجبوری کی حالت میں صاف اجازت دے دی کہ جس طرح بن پڑے اپنی جان بچا لو، اصلی حکم ممانعت کا لاچاری کی حالت میں تم پر سے اٹھا لیا گیا، ورنہ اس مالک الملک کا حق تھا کہ فرما دیتا تمہاری جان جائے یا رہے، مگر ہمارے حکم کے خلاف ہرگز نہ کرنا، ایک خلجان یہاں یہ بھی ہوتا تھا کہ بھوک سے مرتے ہوئے مضطر بدحواس کو یہ اندازہ کرنا کہ اتنے لقموں سے سد رمق ہو جائیگا اور اس سے زائد ایک لقمہ نہ کھائے محال نہیں تو دشوار تو بہت ہے، اس لئے اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ فرما کر اس میں سہولت کر دی۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَشْتَرُوْنَ بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۙ اُولٰٓئِكَ مَا يَاْكُلُوْنَ

بے شک جو لوگ چھپاتے ہیں جو کچھ نازل کی اللہ نے کتاب ۱ اور لیتے ہیں اس پر تھوڑا سا مول ۲ وہ نہیں بھرتے

فِيْ بُطُوْنِهِمْ اِلَّا النَّارَ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۴﴾

اپنے پیٹ میں مگر آگ ۳ اور نہ بات کریگا ان سے اللہ قیامت کے دن ۴ اور نہ پاک کریگا انکو ۵ اور انکے لئے ہے عذاب دردناک ۶

خلاصہ تفسیر: اس سے پہلی آیات میں ان حرام چیزوں کا ذکر تھا جو محسوسات میں سے ہیں، اگلی آیات میں ایسے حرام کاموں کا ذکر ہے جو محسوس نہیں، بلکہ وہ باطنی اعمال شر ہیں، مثلاً علمائے یہود میں یہ مرض تھا کہ عوام سے رشوت لے کر ان کے مطلب کے موافق غلط احکام بتایا کرتے تھے، اور توریت کی آیات میں تحریف کر کے ان کی مطلب کے موافق بناتے تھے، اس میں امت محمدیہ کے علماء کو بھی تنبیہ ہے کہ وہ ایسے افعال سے اجتناب کریں، کسی نفسانی غرض سے احکام حق کے اظہار میں کوتاہی نہ کریں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی کتاب (کے مضامین) کا اخفاء کرتے ہیں اور اس (خیانت) کے معاوضہ میں (دنیا کی) متاع قلیل وصول کرتے ہیں، ایسے لوگ اور کچھ نہیں اپنے پیٹ میں آگ (کے انگارے) بھر رہے ہیں، اور اللہ تعالیٰ ان سے نہ تو قیامت میں

(لطف کے ساتھ) کلام کریں گے، اور نہ (گناہ معاف کر کے) ان کی صفائی کریں گے، اور ان کو سزائے دردناک ہوگی۔

* * *

فائدہ: ۱۔ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ الْكِتٰبِ: یعنی اللہ نے جو کتاب آسمانی میں حلال و حرام کا حکم بھیجا، یہود نے اس کو چھپایا اور اپنی طرف سے بڑھایا گھٹایا، جیسا کہ پہلی آیت میں مذکور ہو چکا، ایسے ہی حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی صفات جو اس میں لکھی تھیں ان کو بھی چھپاتے اور بدلتے تھے اور یہ دونوں سخت گناہ ہیں، کیونکہ ان کا مطلب اور نتیجہ یہ ہے کہ ہدایت اور طریقہ حق کسی کو نصیب نہ ہو، سب گمراہ رہیں، حالانکہ حق تعالیٰ نے تو کتاب اور رسول کو ہدایت خلق کے لئے بھیجا تھا، سو انہوں نے خدا کے بھی خلاف کیا اور خلق اللہ کو بھی جاہل اور گمراہ بنانا چاہا۔

فائدہ: ۲۔ وَيَشْتَرُوْنَ بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا: یعنی اللہ کی نافرمانی اور خلق اللہ کی گمراہی پر بس نہیں کی، بلکہ اس حق پوشی کے عوض میں جن کو گمراہ کرتے تھے ان سے الٹا رشوت میں مال بھی لیتے تھے، جس کا نام ہدیہ اور نذرانہ اور شکرانہ رکھ چھوڑا تھا، حالانکہ یہ حرام خوری مردار اور خنزیر کے کھانے سے بھی بدتر ہے۔ اب ظاہر ہے کہ ایسی حرکاتِ شنیعہ کی سزا بھی سخت ہوگی جس کو آگے بتلایا جاتا ہے۔

فائدہ: ۳۔ مَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ اِلَّا النَّارَ: یعنی گو ظاہر نظر میں انکو وہ مال لذیذ اور نفیس معلوم ہو رہا ہے، مگر حقیقت میں وہ آگ ہے جس کو خوش ہو کر اپنے پیٹ میں بھر رہے ہیں، جیسا طعام لذیذ میں زہر قاتل ملا ہوا ہو کہ کھاتے وقت لذت معلوم ہوتی ہے اور پیٹ میں جا کر آگ لگا دے۔

فائدہ: ۴۔ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ: اس میں یہ شبہ کسی کو ہو سکتا ہے کہ دیگر آیات سے تو معلوم ہوتا ہے کہ جناب باری تعالیٰ قیامت کو ان سے خطاب فرمائے گا، سو "کلام نہ کرنے" کا یہ مطلب ہے کہ لطف و رحمت کے ساتھ ان سے کلام نہ کیا جائے اور بطور تخویف و تذلیل و تہدید و وعید جناب باری تعالیٰ ان سے کلام کریگا، جس سے ان کو سخت صدمہ اور غم ہوگا، یا یوں کہیے کہ بلا واسطہ ان سے کلام نہ کیا جائیگا اور کلام کرنے کا جو ذکر ہے وہ ملائکہ عذاب کی وساطت سے ہوگا۔

فائدہ: لَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ کی دھمکی سے یہ امر صاف معلوم ہوتا ہے کہ ہر کسی کے دل میں محبت الٰہی خوب راسخ ہے، اگر سرِ دست محسوس نہ ہو تو اس کو "ہم چو اخگر بزیر خاکستر" سمجھنا چاہیے، قیامت کو جب کل موانع دور ہونگے تو اس کا ظہور کامل ہوگا، کیونکہ اگر یہ نہ ہوتا تو پھر کفار کو یہ دھمکی ایسی ہوگی کہ کوئی اپنے دشمن کو ناخوشی اور اعراض سے ڈرانے لگے جو بالکل بے سود ہے، محبان جاں نثار اعراض محبوب کو درد جان گداز سمجھتے ہیں نہ اعداء، بس معلوم ہوا کہ قیامت کو ہر سینہ اللہ کی محبت سے ایسا لبریز ہوگا کہ یہ بے التفاتی عذاب دوزخ سے بھی بدرجہا زیادہ ان کو جانکاہ معلوم ہوگی۔

فائدہ: ۵۔ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ: یعنی اہل ایمان گو کتنے ہی گنہگار ہوں مگر دوزخ میں زمانہ معین تک رہ کر اور گناہوں سے پاک ہو کر جنت میں داخل کر دیے جائیں گے، بخلاف کفار کے کہ وہ ہمیشہ نار میں رہیں گے اور کبھی پاک ہو کر جنت میں جانے کے قابل نہ ہوں گے، امور شرکیہ نے ان کو بمنزلہ نجس العین کے بنا دیا ہے کہ نجاست ان کی کسی طرح دور نہیں ہو سکتی اور مسلمان عاصی کا حال ایسا سمجھیے کہ پاک چیز پر نجاست واقع ہوگئی نجاست زائل ہو کر پھر پاک ہو گیا۔

فائدہ: ۶۔ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ: واقعی اس سے زیادہ اور کیا عذاب الیم ہوگا کہ ظاہر بدن سے بڑھ کر ان کے باطن میں بھی آگ ہوگی اور محبوب حقیقی ان سے ناخوش ہوگا، پھر اس مصیبت جانکاہ سے کبھی نجات نہ ملے گی، نعوذ باللہ۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ ۚ فَمَآ اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ﴿۱۷۵﴾

یہی ہیں جنہوں نے خریدا گمراہی کو بدلے ہدایت کے اور عذاب بدلے بخشش کے ۱؎ سو کس قدر صبر کرنے والے ہیں وہ دوزخ پر ۲؎

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ ۗ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِى الْكِتٰبِ لَفِيْ شِقَاقٍۭ بَعِيْدٍ ﴿۱۷۶﴾ ع ۲۱

یہ اس واسطے کہ اللہ نے نازل فرمائی کتاب سچی، اور جنہوں نے اختلاف ڈالا کتاب میں وہ بیشک ضد میں دور جا پڑے ۳؎

خلاصہ تفسیر: یہ ایسے لوگ ہیں جنہوں نے (دنیا میں تو) ہدایت چھوڑ کر ضلالت اختیار کی، اور (آخرت میں) مغفرت چھوڑ کر عذاب (سر پر لیا) سو (شاباش ہے ان کی ہمت کو) دوزخ (میں جانے) کے لئے کیسے باہمت ہیں (اور) یہ (ساری مذکورہ) سزائیں (ان کو) اس وجہ سے ہیں کہ حق تعالیٰ نے (اس) کتاب کو ٹھیک ٹھیک بھیجا تھا، اور جو لوگ (ایسی ٹھیک ٹھیک بھیجی ہوئی) کتاب میں بے راہی (اختیار) کریں وہ ظاہر ہے کہ بڑی دور (و دراز) کی خلاف (ورزی) میں (مبتلا) ہوں گے (اور ایسی خلاف ورزی پر ضرور ایسی ہی سخت سزاؤں کے مستحق ہوں گے)۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی وہ لوگ بیشک اسی قابل ہیں کیونکہ انہوں نے خود سرمایہ نجات کو غارت کیا اور گمراہی کو ہدایت کے مقابلہ میں پسند اور اختیار کیا اور اسباب مغفرت کو چھوڑ کر اسباب عذاب کو منظور کیا۔

فائدہ: ۲ یعنی اپنی خوشی سے موجبات دخول نار کو اختیار کرتے ہیں گویا آگ ان کو نہایت مرغوب اور محبوب ہے کہ اپنی جان و مال کے بدلے اس کو خریدر ہے ہیں ورنہ سب جانتے ہیں کہ عذاب نار پر صبر کرنا کیسا ہے۔

فائدہ: ۳ یہ یعنی ضلالت کو ہدایت کے بدلے اور عذاب کو مغفرت کے بدلے خریدنے کی دلیل، یا ان پر عذابات مذکورہ سابقہ کے ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اللہ نے جو کتاب سچی نازل فرمائی، انہوں نے اس کے خلاف کیا اور طرح طرح کے اختلاف اس میں ڈالے اور خلاف اور دشمنی میں دور جا پڑے، یعنی بڑا خلاف کیا، یا طریقہ حق سے دور ہو گئے، ایک صورت یہ بھی ہے کہ ان کا صابر علی النار ہونا چونکہ بدیہی البطلان نظر آتا تھا، اس لئے لفظ ذٰلك سے اخیر تک اس کے جواب کی طرف اشارہ فرما دیا فافهم۔

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ

نیکی کچھ یہی نہیں کہ منہ کرو اپنا مشرق کی طرف یا مغرب کی ۱ لیکن بڑی نیکی تو یہ ہے جو کوئی ایمان لائے اللہ پر

وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى

اور قیامت کے دن پر اور فرشتوں پر اور سب کتابوں پر اور پیغمبروں پر، اور دے مال اس کی محبت پر رشتہ داروں کو اور یتیموں

وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ

کو اور محتاجوں کو اور مسافروں کو، اور مانگنے والوں کو اور گردنیں چھڑانے میں اور قائم رکھے نماز اور دیا کرے زکوٰۃ

وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ؕ

اور پورا کرنے والے اپنے اقرار کو جب عہد کریں، اور صبر کرنے والے سختی میں اور تکلیف میں اور لڑائی کے وقت ۲

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴿۱۷۷﴾

یہی لوگ ہیں سچے، اور یہی ہیں پرہیزگار ۳

خلاصہ تفسیر: شروع سورت سے یہاں تک تقریباً نصف سورۃ بقرہ ہے، زیادہ روئے سخن منکرین کی طرف تھا، اور ضمناً کوئی خطاب مسلمانوں کو ہو جانا اور بات ہے، اب آئندہ آیات میں جو کہ تقریباً سورۃ بقرہ کا بقیہ نصف ہے، زیادہ تر مقصود مسلمانوں کو بعض اصول و فروع کی تعلیم کرنا ہے، اگرچہ ضمناً غیر مسلمین کو بھی کوئی خطاب ہو جائے، اور یہ مضمون سورۃ کے ختم تک چلا گیا ہے، جس کو شروع کیا گیا ہے ایک مجمل عنوان ''بر''

سے لفظ بر بکسر الباء عربی زبان میں مطلق "خیر" کے معنی میں ہے، جو تمام ظاہری اور باطنی طاعات وخیرات کو جامع ہے، پہلی آیت میں جامع الفاظ سے ایک قانون کلی کی تعلیم کی گئی ہے، آگے اس "بر" کی تفصیل چلی ہے، جس میں سے بہت سے احکام وقت ومقام کے تقاضوں کے مطابق بقدر ضرورت بیان فرما کر بشارت ووعدہ رحمت ومغفرت پر ختم فرمادیا، سبحان اللہ! کیا بلیغ ترتیب ہے، پس چونکہ ان مضامین کا حاصل بر کا بیان ہے اجمالاً وتفصیلاً، اس لئے اگر اس مجموعہ کا لقب "ابواب البر" رکھا جائے تو نہایت زیبا ہے، واللہ الموفق۔

کچھ سارا کمال اسی میں نہیں (آگیا) کہ تم اپنا منہ مشرق کو کرلو، یا مغرب کو (کرلو) لیکن (اصلی) کمال تو یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ (کی ذات وصفات) پر یقین رکھے، اور (اسی طرح) قیامت کے دن (آنے) پر (بھی) اور فرشتوں پر (بھی کہ وہ اللہ کے فرمانبردار بندے ہیں، نور سے بنے ہیں، گناہ سے معصوم ہیں، کھانے پینے اور انسانی شہوات سے پاک ہیں) اور (سب) کتب (سماویہ) پر (بھی) اور (سب) پیغمبروں پر (بھی) اور (وہ شخص) مال دیتا ہو اللہ کی محبت میں (اپنے حاجت مند) رشتہ داروں کو اور (نادار) یتیموں کو (یعنی جن بچوں کو ان کا باپ نابالغ چھوڑ کر مرگیا ہو) اور (دوسرے غریب) محتاجوں کو (بھی) اور (بے خرچ) مسافروں کو اور (لاچاری میں) سوال کرنے والوں کو اور (قیدی اور غلاموں کی) گردن چھڑانے میں (بھی مال خرچ کرتا ہو) اور (وہ شخص) نماز کی پابندی (بھی) رکھتا ہو اور (مقررہ) زکوٰۃ بھی ادا کرتا ہو، اور جو اشخاص (کہ ان عقائد و اعمال کے ساتھ یہ اخلاق بھی رکھتے ہوں کہ) اپنے عہدوں کو پورا کرنے والے ہوں جب (کسی جائز بات کا) عہد کرلیں، اور (اس صفت کو خصوصیت کے ساتھ کہوں گا کہ) وہ لوگ (ان مواقع میں) مستقل (مزاج) رہنے والے ہوں (ایک تو) تنگدستی میں اور (دوسرے) بیماری میں اور (تیسرے معرکہ) قتال (کفار) میں (یعنی پریشان اور کم ہمت نہ ہوں، بس) یہ لوگ ہیں جو سچے (کمال کے ساتھ موصوف) ہیں، اور یہی لوگ ہیں جو (سچے) متقی (کہے جاسکتے) ہیں (غرض اصلی مقاصد اور کمالات دین کے یہ ہیں، نماز میں کسی سمت کو منہ کرنا، انہی کمالات مذکورہ میں سے ایک خاص کمال یعنی نماز پڑھنے کی شرائط میں سے ہے، اس کی خوبی سے اس میں بھی حسن آگیا، ورنہ اگر نماز نہ ہوتی تو کسی خاص سمت کی طرف منہ کرنا بھی عبادت نہ ہوتا)۔

اقامت صلوٰۃ کے توابع اور شرائط میں سے ہے، اور اس کے حُسن سے اس میں بھی حُسن آگیا، ورنہ اگر نماز نہ ہوتی تو کسی خاص سمت کو منہ کرنا بھی عبادت نہ ہوتا)۔

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ: بطور خاص سمت قبلہ کا یہاں ذکر اس لیے ہوا کہ تحویل قبلہ کے وقت یہود ونصاری کی تمام تر بحث وگفتگو اسی میں رہ گئی تھی، اس لیے متنبہ فرمایا کہ اس سے بڑھ کر کام دوسرے بھی ہیں ان کا اہتمام کرو۔

شریعت میں کل احکام کا حاصل تین چیزیں ہیں: ① عقائد ② اعمال ③ اخلاق، باقی تمام جزئیات انہی کلیات کے تحت داخل ہیں، اور اس آیت میں ان تینوں اقسام کے بڑے بڑے شعبے ارشاد فرمائے گئے ہیں، اس اعتبار سے یہ آیت من جملہ جوامع کلم کے ہے۔

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ: اس میں اس بات پر دلیل ہے کہ محض صورت بغیر معنی کے معتبر نہیں، یعنی صرف صورت کا بنانا کافی نہیں ہے جب تک کہ جس چیز کی صورت بنائی ہے اس کا معنی اندر نہ اتر جائے، جیسے شکل وصورت تو صلحاء والی ہو اور اندر سے صالح نہ ہو تو کافی نہیں، جیسے نماز کی مثال آیت میں آئی ہے کہ منہ مشرق یا مغرب کی طرف کرنے میں کوئی نیکی نہیں جب تک تمہارے اندر ایمان نہ آجائے، پھر جب ایمان آجائے تو جس طرف بھی تمہیں منہ کرنے کا حکم دیا جائے تمہارے لیے کافی ہوگا، اس لیے صورت اور اس کی حقیقت دونوں ضروری ہیں۔

وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ: اگر حبّہ میں ضمیر مال کی طرف راجع ہو تو آیت اس بات کی دلیل ہے کہ حب مال مطلقاً مضر نہیں، اور اگر حبّہ کی ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہو تو آیت عشاق کے طریقے پر دلیل ہے کہ وہ صرف حق تعالیٰ ہی سے محبت رکھتے ہیں، خرچ بھی صرف اسی کی محبت سے کرتے ہیں، غیر اللہ سے (بالذات) محبت نہیں کرتے اگرچہ وہ ثواب ہی ہو۔

❋ ❋ ❋

فائدہ: ۱؎ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ: جب آیات سابقہ اپنی برائی میں سنیں تو یہود و نصاریٰ کہنے لگے کہ ہم میں تو بہت سے اسباب و آثار ہدایت و مغفرت موجود ہیں، ایک کھلی بات یہی ہے کہ ہم جس قبلہ کی طرف منہ کرنے کے مامور ہیں اس کی طرف متوجہ ہو کر نماز جو افضل عبادت ہے اس کو اللہ کے حکم کے موافق ادا کرتے ہیں، پھر ان خرابیوں اور عذاب کے ہم کیسے مستحق ہو سکتے ہیں، اس خیال کی تردید میں فرمایا جاتا ہے کہ بڑی نیکی جو مغفرت و ہدایت کے لئے کافی ہو یہ نہیں کہ تم صرف اپنا منہ نماز میں مشرق یا مغرب کی طرف کرلیا کرو اور عقائد و اعمال ضروریہ کی پروا بھی نہ کرو۔

فائدہ: ۲؎ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ: یعنی نیکی اور بھلائی جو اثر ہدایت اور سبب مغفرت ہو یہ ہے کہ اللہ اور اور روز قیامت اور جملہ ملائکہ اور کتب آسمانی اور انبیاء پر دل سے ایمان لائے اور ان پر یقین کرے اور باوجود محبت اور رغبت کے اپنے مال کو علاوہ زکوۃ کے قریبوں اور یتیموں اور غریبوں اور مسافروں اور سائلوں کو جو کہ محتاج ہوں دے اور گردنیں چھڑانے میں یعنی مسلمان جس کو کفار نے ظلما قید کرلیا ہو اس کی رہائی میں یا مقروض کو قرض خواہ سے چھڑانے میں یا غلام کو آزاد کرانے میں یا غلام مکاتب کو خلاصی دلانے میں مال دیوے اور نماز کو خوب درستی کے ساتھ پڑھے اور چاندی اور سونے اور جملہ اموال تجارت میں سے زکوۃ دے اور اپنے عہد و قرار کو پورا کرے اور فقر و فاقہ اور بیماری اور تکلیف اور خوف کی حالت میں صبر و استقلال سے رہے اور یہود و نصاریٰ چونکہ ان عقائد اور اعمال و اخلاق میں قاصر اور ناقص تھے اور طرح طرح سے ان میں خلل اندازی کرتے تھے جیسا کہ آیات قرآنی میں اس کا ذکر ہے تو اب یہود یا نصاریٰ کا صرف اپنے استقبال قبلہ پر ناز کرنا اور اپنے آپ کو طریق ہدایت پر مستقیم سمجھنا اور مستحق مغفرت کہنا بیہودہ خیال ہے، تاوقتیکہ ان اعتقادات اور اخلاق و اعمال پر قائم نہ ہونگے جو اس آیہ کریمہ میں بالتفصیل مذکور ہیں، صرف استقبال قبلہ سے نہ ہدایت نصیب ہو سکتی ہے نہ عذاب الٰہی سے نجات مل سکتی ہے۔

فائدہ: ۳؎ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ: یعنی جو لوگ اعتقادات و اخلاق و اعمال مذکورہ کے ساتھ متصف ہیں، وہی لوگ سچے ہیں اعتقادات اور ایمان اور دین میں اپنے قول و قرار میں، اور وہی لوگ پرہیزگار اور متقی ہیں اپنے اخلاق اور اعمال میں یا بچنے والے ہیں گناہ اور بری باتوں سے یا عذاب الٰہی سے اہل کتاب کہ جن کو ان خوبیوں میں ایک بھی میسر نہیں ان کا اپنی نسبت ایسا خیال کرنا کیسے درست ہوسکتا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى ؕ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى

اے ایمان والو فرض ہوا تم پر (قصاص) برابری کرنا مقتولوں میں ۱؎ آزاد کے بدلے آزاد ۲؎ اور غلام کے بدلے غلام ۳؎ اور عورت کے بدلے

بِالْاُنْثٰى ؕ فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ ۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ؕ

عورت ۴؎ پھر جسکو معاف کیا جائے اسکے بھائی کی طرف سے کچھ بھی تو تابعداری کرنی چاہیے موافق دستور کے اور ادا کرنا چاہیے اسکو خوبی کے ساتھ ۵؎

ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ ؕ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۸﴾

یہ آسانی ہوئی تمہارے رب کی طرف سے اور مہربانی ۶؎ پھر جو زیادتی کرے اس فیصلہ کے بعد تو اس کے لئے ہے عذاب دردناک ہے

خلاصہ تفسیر: گذشتہ آیت میں اصول بر یعنی نیکی کے اصول اجمالی طور پر بیان ہوئے، آگے ان کی جزئی تفصیلات آئیں گی جن کو ''ابواب البر'' کہا جاسکتا ہے، اب انہی ابواب البر کے کچھ جزئی احکام کا بیان ہوتا ہے جو ضرورت اور حالات و واقعات کے تابع بیان ہوئے ہیں۔

اے ایمان والو تم پر (قانون) قصاص فرض کیا جاتا ہے، مقتولین (قتل عمد) کے بارے میں (یعنی ہر) آزاد آدمی (قتل کیا جائے ہر دوسرے) آزاد آدمی کے عوض میں، اور (اسی طرح ہر) غلام (دوسرے ہر) غلام کے عوض میں، اور (اسی طرح ہر) عورت (دوسری ہر) عورت کے عوض میں (اگرچہ یہ قاتلین بڑے درجہ کے اور مقتولین چھوٹے درجہ کے ہوں، جب بھی سب سے برابر قصاص لیا جائے گا، یعنی قاتل کو سزا میں قتل کیا جائے گا) ہاں! جس (قاتل) کو اس کے فریق (مقدمہ) کی طرف سے کچھ معافی ہوجائے (مگر پوری معاف نہ ہو) تو (اس سے سزائے قتل سے تو

بری ہوگیا،لیکن دیت یعنی خون بہا کے طور پر مال کی ایک معین مقدار قاتل کے ذمہ واجب ہوتی تو اس وقت فریقین کے ذمہ ان دو باتوں کی رعایت ضروری ہے، مدعی یعنی مقتول کے وارث کے ذمہ تو) معقول طور پر (اس مال کا) مطالبہ کرنا (کہ اس کو زیادہ تنگ نہ کرے) اور (مدعا علیہ یعنی قاتل کے ذمہ) خوبی کے ساتھ (اس مال کا) اس مدعی کے پاس پہنچا دینا (کہ مقدار میں کمی نہ کرے، اور خواہ مخواہ ٹالے نہیں) یہ (قانون دیت وعفو) تمہارے پروردگار کی طرف سے (سزا میں) تخفیف ہے اور (شاہانہ) ترحم ہے (ورنہ بجز سزائے قتل کے کوئی گنجائش ہی نہ ہوتی) پھر جو شخص اس (قانون) کے (مقرر ہونے کے) بعد تعدی کا مرتکب ہو (مثلاً کسی پر قتل کا جھوٹا الزام لگادے، یا شبہ سے قتل کا دعوی کردے، یا معاف کرکے پھر قتل کی پیروی کرے) تو اس شخص کو (آخرت میں) بڑا دردناک عذاب ہوگا۔

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَىٰ: قتل عمد یہ ہے کہ ارادہ کرکے کسی کو آہنی ہتھیار سے یا ایسی چیز سے جس سے گوشت پوست کٹ کر خون بہہ سکے قتل کیا جائے، ''قصاص'' یعنی جان کے بدلے جان لینا ایسے ہی قتل کے جرم کے ساتھ مخصوص ہے، ایسے قتل میں جیسے آزاد آدمی آزاد کے عوض میں قتل کیا جاتا ہے ایسے ہی غلام کے عوض میں بھی غلام اور جس طرح عورت کے عوض میں عورت ماری جاتی ہے اسی طرح مرد بھی عورت کے مقابلہ میں قتل کیا جاتا ہے، آیت میں آزاد کے مقابل آزاد اور عورت کے مقابل عورت کا جو ذکر آیا ہے یہ اس خاص واقعہ کی بناء پر ہے جس میں یہ آیت نازل ہوئی ہے۔

اگر قتل عمد میں قاتل کو پوری معافی دے دی جائے مثلاً مقتول کے وارث اس کے دو بیٹے تھے دونوں نے اپنا حق معاف کردیا تو قاتل پر کوئی مطالبہ نہیں رہا، اور اگر پوری معافی نہ ہو مثلاً مذکورہ صورت میں ایک بیٹے نے معاف کیا ایک نے نہیں کیا تو قتل کی سزا سے تو قاتل بری ہوگیا، لیکن معاف نہ کرنے والے کو آدھی دیت دلائی جائے گی۔

* * *

فائدہ: ۱؎ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَىٰ: زمانہ جاہلیت میں یہود اور اہل عرب نے یہ دستور کر رکھا تھا کہ شریف النسب لوگوں کے غلام کے بدلے رذیل لوگوں کے آزاد کو اور عورت کے بدلے مرد کو اور ایک آزاد کے بدلے دو کو قصاص میں قتل کرتے تھے، حق تعالیٰ نے اس آیت میں حکم دیا کہ اے ایمان والو ہم نے تم پر مقتولین میں برابری اور مساوات کو فرض کردیا، قصاص کے معنی لغت میں برابر اور مساوات کے ہیں، تم نے جو یہ دستور نکالا ہے کہ شریف اور رذیل میں امتیاز کرتے ہو یہ لغو ہے، جانیں سب کی برابر ہیں، غریب ہو یا امیر، شریف ہو یا رذیل، عالم وفاضل ہو یا جاہل، جوان ہو یا بوڑھا اور بچہ، تندرست ہو یا بیمار، قریب المرگ صحیح الاعضا ہو یا اندھا لنگڑا۔

فائدہ: پہلی آیت میں نیکی اور برّ کے اصول مذکور تھے جن پر مدار ہدایت ومغفرت تھا اور اس طرف بھی اشارہ تھا کہ اہل کتاب ان خوبیوں سے بے بہرہ ہیں اور بالتصریح فرمادیا تھا کہ دین میں سچا اور متقی بدون ان خوبیوں کے کوئی نہیں ہوسکتا، تو اب اہل اسلام کے سوا نہ اہل کتاب اس کے مصداق بن سکتے ہیں، نہ جہال عرب، اس لئے اب سب سے اعراض فرماکر خاص اہل ایمان کو مخاطب بنایا جاتا ہے اور نیکی اور برّ کے مختلف فروع عبادات جانی ومالی اور معاملات مختلفہ ان کو بتلاتے ہیں کہ ان فروع کو وہی کرسکتا ہے جو اصول مذکورہ سابقہ پر پختہ ہو، گویا اور لوگ اس خطاب کے قابل بھی نہ سمجھے گئے جو ان کو سخت عار کا باعث ہونا چاہیے، اب جو احکام فروعی بالتفصیل بیان کئے جاتے ہیں درحقیقت تو ان سے اہل ایمان کی ہدایت اور تعلیم مقصود ہے مگر ضمناً کہیں صاف کہیں تعریضاً دوسروں کی خرابی پر بھی متنبہ کیا جائیگا، مثلاً كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَىٰ میں اس کی طرف اشارہ ہے کہ یہود وغیرہ نے جو قصاص میں دستور کرلیا ہے یہ ان کا ایجاد بے بنیاد خلاف حکم الٰہی ہے، جس سے ظاہر ہوگیا کہ اصول فرمودہ سابقہ میں سے نہ ان کو ایمان بالکتاب صحیح طور پر حاصل ہے، نہ ایمان بالانبیاء، نہ عہد خداوندی کو انہوں نے وفا کیا اور نہ سختی اور مصیبت کی حالت میں انہوں نے صبر سے کام لیا ورنہ اپنے کسی عزیز وقریب کے مقتول ہوجانے پر اس قدر بے صبری اور نفسانیت نہ کرتے کہ فرمان خداوندی اور ارشاد انبیاء اور حکم کتاب سب کو چھوڑ کر بے گناہوں کو قتل کرنے کا حکم دیتے۔

فائدہ: ۲؎ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ: یہ توضیح ہے اس برابری کی جس کا حکم ہوا، مطلب یہ ہے کہ ہر مرد آزاد کے قصاص میں صرف وہی ایک آزاد مرد قتل

کیا جاسکتا ہے جو اس کا قاتل ہے، یہ نہیں کہ ایک کے عوض قاتل کے قبیلہ سے کیف ماتفق دو کو یا زیادہ کو قتل کرنے لگو۔

فائدہ:۳ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ: یعنی ہر غلام کے بدلے میں وہی غلام قتل کیا جائیگا جو قاتل ہے، یہ نہ ہوگا کہ کسی شریف کے غلام کے قصاص میں قاتل کو جو کہ غلام ہے اس کو چھوڑ کران رذیل لوگوں میں سے کہ جن کے غلام نے قتل کیا ہے کسی آزاد کو قتل کیا جائے۔

فائدہ:۴ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى: یعنی ہر ایک عورت کے قصاص میں صرف وہی عورت قتل کی جاسکتی ہے جس نے اسکو قتل کیا، یہ نہیں ہوسکتا کہ شریف النسب عورت کے قصاص میں رذیل عورت کو چھوڑ کر جو کہ قاتلہ ہے کسی مرد کوان میں سے قتل کرنے لگیں، خلاصہ یہ ہوا کہ ہر آزاد دوسرے آزاد کے اور ہر غلام دوسرے غلام کے برابر ہے، سو حکم قصاص میں مساوات چاہیے اور تعدی جو اہل کتاب اور جہال عرب کرتے تھے ممنوع ہے۔

فائدہ: اب باقی رہا یہ امر کہ آزاد کسی غلام کو یا مرد کسی عورت کو قتل کردے تو قصاص لیا جائیگا یا نہیں؟ سو یہ آیت کریمہ اس سے ساکت ہے اور آئمہ کا اس میں اختلاف ہے، امام ابوحنیفہؒ آیہ اِنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ اور حدیث المسلمون تتکافؤ دماؤھم سے اس کے قائل ہیں کہ ہر دو صورت مذکورہ میں قصاص ہوگا اور جیسے قوی اور ضعیف، صحیح اور مریض اور غیر معذور وغیرہ حکم قصاص میں برابر ہیں، ایسے ہی آزاد اور غلام مرد اور عورت کو امام ابوحنیفہؒ قصاص میں برابر فرماتے ہیں، بشرطیکہ غلام مقتول قاتل کا غلام نہ ہو کہ وہ حکم قصاص سے ان کے نزدیک مستثنیٰ ہے، اور اگر کوئی مسلمان کافر ذمی کو قتل کر ڈالے تو اس پر بھی قصاص ہوگا امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک، البتہ مسلمان اور کافر حربی میں کوئی قصاص کا قائل نہیں۔

فائدہ:۵ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَآءٌ اِلَیْهِ بِاِحْسَانٍ: یعنی مقتول کے وارثوں میں سے اگر بعض بھی خون کو معاف کردیں تو اب قاتل کو قصاص میں قتل تو نہیں کرسکتے بلکہ دیکھیں گے کہ ان وارثوں نے معاف کس طرح پر کیا ہے، بلا معاوضہ مالی محض ثواب کی غرض سے معاف کیا ہے، یا دیت شرعی اور بطور مصالحت کسی مقدار مال پر راضی ہو کر صرف قصاص سے دستبرداری کی ہے، اول صورت میں قاتل ان وارثوں کے مطالبہ سے بالکل سبکدوش ہو جائیگا اور دوسری صورت میں قاتل کو چاہیے کہ وہ معاوضہ اچھی طرح ممنونیت اور خوشدلی کے ساتھ ادا کرے۔

فائدہ:۶ تَخْفِیْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ: یہ اجازت کہ قتل عمد میں چاہو قصاص لو، چاہو دیت لو، چاہو معاف کرو، اللہ کی طرف سے سہولت اور مہربانی ہے قاتل اور وارثان مقتول دونوں پر جو پہلے لوگوں پر نہ ہوئی تھی کہ یہود پر خاص قصاص اور نصاریٰ پر دیت یا عفو مقرر تھا۔

فائدہ:۷ بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِیْمٌ: یعنی اس تخفیف اور رحمت کے بعد بھی اگر کوئی خلاف ورزی کریگا اور دستور جاہلیت پر چلے گا یا معافی اور دیت قبول کر لینے کے بعد قاتل کو قتل کرے گا تو اس کے لئے سخت عذاب ہے آخرت میں یا ابھی اس کو قتل کیا جائے گا۔

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۹﴾

اور تمہارے واسطے قصاص میں بڑی زندگی ہے اے عقلمندو۱ تاکہ تم بچتے رہو۲

خلاصہ تفسیر: اور فہیم لوگو (اس قانون) قصاص میں تمہاری جانوں کا بڑا بچاؤ ہے (کیونکہ اس قانون کے خوف سے لوگ قتل کے ارتکاب سے ڈریں گے تو کئی جانیں بچیں گی) ہم امید کرتے ہیں کہ تم لوگ (ایسے قانون امن کی خلاف ورزی سے) پرہیز رکھو گے۔

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ: بعض نے اس کی تفسیر حیات اخروی کے ساتھ کی ہے، پس معنی یہ ہوں گے کہ قاتل سے جب دنیا میں قصاص لے لیا جائے پھر اس سے مقتول کے حق کا آخرت میں مواخذہ نہ ہوگا جمہور کے نزدیک تو مطلقا اور حنفیہ کے نزدیک قاتل کے تسلیم نفس کے بعد، سو اس تفسیر پر یہ آیت دلیل ہوگی فنا کے اندر بقا ہونے پر (فنا میں بقا ہے) یعنی جب انسان اپنی خواہشات کو اللہ تعالی کی محبت میں ختم کردیتا ہے تو اللہ تعالی اس کو اپنی محبت کے اندر بقا نصیب فرماتے ہیں جس سے انسان کی دنیا و آخرت دونوں سدھر جاتی ہے۔

* * *

فائدہ:۱ یعنی حکم قصاص بظاہر نظر اگرچہ بھاری معلوم ہو، لیکن عقلمند سمجھ سکتے ہیں کہ یہ حکم بڑی زندگانی کا سبب ہے، کیونکہ قصاص کے خوف

سے ہر کوئی کسی کو قتل کرنے سے رُکے گا تو دونوں کی جان محفوظ رہے گی اور قصاص کے سبب قاتل اور مقتول دونوں کی جماعتیں بھی قتل سے محفوظ اور مطمئن رہیں گی، عرب میں ایسا ہوتا تھا کہ قاتل اور غیر قاتل کا لحاظ نہیں کرتے تھے، جو ہاتھ آجاتا مقتول کے وارث اس کو قتل کرڈالتے تھے اور فریقین میں اس کے باعث ایک خون کی وجہ سے ہزاروں جانیں ضائع ہونے کی نوبت آتی تھی، جب خاص قاتل ہی سے قصاص لیا گیا تو یہ تمام جانیں بچ گئیں اور یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں کہ قصاص قاتل کے حق میں باعث حیاتِ اخروی ہے۔

فائدہ: ۲؎ یعنی بچتے رہو قصاص کے خوف سے کسی کو قتل کرنے سے، یا بچو قصاص کے سبب عذاب آخرت سے، یا اس لئے کہ تم کو حکم قصاص کی حکمت معلوم ہوگئی ہے تو اس کی مخالفت یعنی ترک قصاص سے بچتے رہو۔

كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا ۖ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ

فرض کردیا گیا تم پر جب حاضر ہو کسی کو تم میں موت بشرطیکہ چھوڑے کچھ مال، وصیت کرنا ماں باپ کے واسطے اور رشتہ داروں کے لئے

بِالْمَعْرُوفِ ۖ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ ﴿١٨٠﴾ فَمَنْ بَدَّلَهُ بَعْدَمَا سَمِعَهُ فَإِنَّمَا إِثْمُهُ عَلَى الَّذِينَ يُبَدِّلُونَهُ ۚ

انصاف کیساتھ، یہ حکم لازم ہے پرہیزگاروں پر ۱؎ پھر جو کوئی بدل ڈالے وصیت کو بعد اسکے کہ جو سن چکا تو اسکا گناہ انہی پر ہے جنہوں نے اسکو بدلا

إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿١٨١﴾

بیشک اللہ سننے والا جاننے والا ہے ۲؎

خلاصہ تفسیر: شروع اسلام میں جب تک میراث کے حصے مقرر نہ ہوئے تھے یہ حکم تھا کہ ترکہ کے ایک تہائی میں مرنے والا اپنے والدین اور دوسرے رشتہ داروں کے لئے جتنا جتنا مناسب سمجھے وصیت کردے، اتنا تو ان لوگوں کو حق تھا، باقی جو کچھ رہتا وہ سب اولاد کا حق ہوتا تھا، اس آیت میں یہ حکم مذکور ہے۔

تم پر فرض کیا جاتا ہے کہ جب کسی کو (آثار سے) موت نزدیک معلوم ہونے لگے بشرطیکہ کچھ مال بھی ترکہ میں چھوڑا ہو تو (اپنے) والدین اور (دیگر) اقارب کے لئے معقول طور پر (کہ مجموعہ ایک تہائی سے زیادہ نہ ہو) کچھ کچھ بتلا جائے (اس کا نام وصیت ہے) جن کو خدا کا خوف ہے ان کے ذمہ یہ ضروری (کیا جاتا) ہے، پھر (جن لوگوں نے اس وصیت کو سنا ہے، ان میں سے) جو شخص بھی سن لینے کے بعد اس (کے مضمون) کو تبدیل کرے گا (اور باہمی تقسیم اور فیصلہ کے وقت غلط اظہار دے گا اور اس کے موافق فیصلہ ہونے سے کسی کا حق تلف ہوجائے گا) تو اس (حق تلفی) کا گناہ انہی لوگوں کو ہوگا جو اس (مضمون) کو تبدیل کریں گے (حاکم عدالت یا ثالث کو یا مرنے والے کو گناہ نہ ہوگا، کیونکہ) اللہ تعالیٰ تو یقیناً سنتے جانتے ہیں (تو تبدیل کرنے والے کے اظہار بھی سنتے ہیں اور حاکم کا بے خبر اور معذور ہونا بھی جانتے ہیں)۔

كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ: اس آیت میں جو وصیت کرنا اس مرنے والے پر فرض کیا ہے جو کچھ مال چھوڑ کر مر رہا ہو اس حکم کے تین جزء ہیں: ① ایک یہ کہ مرنے والے کے ترکہ میں اولاد کے سوا کسی دوسرے وارث کے حصے مقرر نہیں ہیں ان کے حصوں کا تعین مرنے والے کی وصیت کی بنیاد پر ہوگا، یہ حکم تو اکثر صحابہ کرام و تابعین کے نزدیک آیت میراث سے منسوخ ہوگیا، یعنی آیت میراث نے ان لوگوں کی وصیت کو منسوخ کردیا جن کا میراث میں حصہ مقرر ہے، دوسرے رشتہ دار جن کا میراث میں حصہ نہیں ان کے لئے حکم وصیت اب بھی باقی ہے، لیکن باجماع امت یہ ظاہر ہے کہ جن رشتہ داروں کا میراث میں کوئی حصہ مقرر نہیں، ان کے لئے میت پر وصیت کرنا کوئی فرض و لازم نہیں، اس لئے فرضیت وصیت ان کے حق میں بھی منسوخ ہی ہوگی، یعنی بشرط ضرورت صرف مستحب رہ جائے گی۔

④ دوسرا حکم یہ کہ ایسے اقارب کے لئے وصیت کرنا مرنے والے پر فرض ہے، یہ بھی باجماع امت منسوخ ہے اور ناسخ اس کا وہ حدیث متواتر ہے جس کا اعلان رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں تقریباً ڈیڑھ لاکھ صحابہ کے سامنے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر ایک حق والے کو اس کا حق خود دے دیا ہے، اس لئے اب کسی وارث کے لئے وصیت جائز نہیں۔

⑤ تیسرا حکم یہ کہ ایک تہائی مال سے زیادہ کی وصیت جائز نہیں، یہ باتفاق امت اب بھی باقی ہے، ہاں! وارثوں کی اجازت سے ایک تہائی سے زائد کی بلکہ پورے مال کی بھی وصیت جائز اور قابل قبول ہے۔

اِنۡ تَرَكَ خَيۡرَا ۖۚ اۨلۡوَصِيَّةُ: اس تعبیر میں اس بات پر دلالت ہے کہ اگر مال کے حقوق ادا ہوتے رہیں تو مال کا مالک ہونا کامل تقویٰ کے خلاف نہیں ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ پہلا حکم قصاص یعنی مردہ کی جان کے متعلق تھا، یہ دوسرا حکم اس کے مال کے متعلق اور کلیات مذکورہ سابقہ میں جو وَاٰتَى الۡمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الۡقُرۡبٰى ارشاد ہوا تھا اس کی تشریح ہے، لوگوں میں دستور تھا کہ مردہ کا تمام مال اس کی بیوی اور اولاد بلکہ خاص بیٹوں کو ملتا تھا، ماں باپ اور سب اقارب محروم رہتے تھے، اس آیت میں ارشاد ہوا کہ ماں باپ اور جملہ اقارب کو انصاف کے ساتھ دینا چاہیے، مرنے والے پر اسی کے موافق وصیت فرض ہوئی اور یہ وصیت اس وقت فرض تھی جس وقت تک آیت میراث نہیں اتری تھی، جب سورۃ نساء میں احکام میراث نازل ہوئے، سب کا حصہ خدا تعالیٰ نے آپ معین فرما دیا، اب ترکہ میّت میں وصیت فرض نہ رہی، اس کی حاجت ہی جاتی رہی، البتہ مستحب ہے، مگر وارث کے لئے وصیت جائز نہیں اور تہائی ترکہ سے زائد نہ ہو، ہاں! اگر کسی شخص کے متعلق دیون اور ودائع وغیرہ دادوستد [لین دین] کا جھگڑا ہو اس پر وصیت اب بھی فرض ہے۔

فائدہ: ۲ یعنی مردہ تو وصیت انصاف کے ساتھ کر مرا تھا، مگر دینے والوں نے اس کی تعمیل نہ کی تو مردہ پر کوئی گناہ نہیں، وہ اپنے فرض سے سبکدوش ہوا، وہی لوگ گنہگار ہونگے، بیشک حق تعالیٰ سب کی باتیں سُنتا ہے اور سب کی نیتوں کو جانتا ہے۔

فَمَنۡ خَافَ مِنۡ مُّوۡصٍ جَنَفًا اَوۡ اِثۡمًا فَاَصۡلَحَ بَيۡنَهُمۡ فَلَاۤ اِثۡمَ عَلَيۡهِ ؕ

پھر جو کوئی خوف کرے وصیت کرنے والے سے طرف داری کا یا گناہ کا پھر صلح کرادے ان میں باہم تو اس پر کچھ گناہ نہیں ۱

اِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۱۸۲﴾ ع ۲۲

بیشک اللہ بڑا بخشنے والا نہایت مہربان ہے ۲

خلاصہ تفسیر: ہاں! (ایک طرح کی تبدیلی کی اجازت بھی ہے وہ یہ کہ) جس شخص کو وصیت کرنے والے کی جانب سے (وصیت کے بارے میں) کسی غلطی کی یا (قصداً قانون وصیت کے کسی دفعہ کی خلاف ورزی کے) کسی جرم کے ارتکاب کی تحقیق ہوئی ہو (اور اس بے ضابطہ وصیت کی وجہ سے اس میت کے وارثوں میں نزاع کا اندیشہ ہو یا پیدا ہونے لگے) پھر یہ شخص ان میں باہم مصالحت کرادے (اگرچہ وہ مصالحت اس وصیت کے مضمون کے خلاف ہو جو ظاہر میں وصیت کی تبدیلی ہے) تو اس شخص پر کوئی (بار) گناہ نہیں ہے (اور) واقعی اللہ تعالیٰ تو (خود گناہوں کے) معاف فرمانے والے ہیں اور (گنہگاروں پر) رحم کرنے والے ہیں (اور اس شخص نے تو کوئی گناہ نہیں کیا، کیونکہ وصیت میں تبدیلی اصلاح کے لئے ہے تو اس پر کیوں نہ رحمت ہوگی)۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی اگر کسی کو مردہ کی طرف سے یہ اندیشہ یا علم ہوا کہ اس نے کسی وجہ سے غلطی کھائی اور کسی کی بے جا رعایت کی یا دیدہ و دانستہ خلاف حکم الٰہی دے گیا۔ پس اس شخص نے اہل وصیت اور وارثوں میں حکم شریعت کے موافق صلح کرا دی تو اس کو کچھ گناہ نہ ہوگا وصیت میں یہ تغیر

اور تبدل جائز اور بہتر ہے۔

فائدہ: ۲ یعنی حق تعالیٰ تو گنہگاروں کی بھی مغفرت فرماتا ہے تو جس نے اصلاح کی غرض سے ایک برائی سے سب کو ہٹایا، اس کی مغفرت تو ضرور فرمائے گا، یوں کہو کہ بخشنے والا ہے وصیت کرنے والے کو جس نے وصیت ناجائز کی تھی، مگر پھر سمجھ کر اس وصیت سے اپنی زندگی ہی میں پھر گیا۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۳﴾

اے ایمان والو فرض کیا گیا تم پر روزہ جیسے فرض کیا گیا تھا تم سے اگلوں پر ۱ تاکہ تم پرہیزگار ہو جاؤ ۲

خلاصہ تفسیر: اے ایمان والو تم پر روزہ فرض کیا گیا جس طرح تم سے پہلے (امتوں کے) لوگوں پر فرض کیا گیا تھا، اس توقع پر کہ تم (روزہ کی بدولت رفتہ رفتہ) متقی بن جاؤ (کیونکہ روزہ رکھنے سے نفس کو اس کے متعدد تقاضوں سے روکنے کی عادت پڑے گی اور اسی عادت کی پختگی تقویٰ کی بنیاد ہے)۔

كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ: پہلی امتوں میں سے نصاریٰ پر روزہ فرض ہونے کا بیان ایک حدیث میں اس طرح آیا ہے کہ نصاریٰ پر فقط ماہ رمضان کا فرض ہوا تھا، ان کا کوئی بادشاہ بیمار ہوا تو اس کی قوم نے نذر مانی کہ اگر بادشاہ کو شفا ہو جائے تو ہم دس روزے اور اضافہ کر دیں گے، پھر کوئی اور بادشاہ بیمار ہوا، اس کی صحت پر سات دن کا مزید اضافہ ہوا، پھر بادشاہ بیمار ہوا، اس نے تجویز کیا کہ پچاس میں تین ہی کی کسر رہ گئی ہے سو تین اور بڑھا لیں، اور سب روزے ایام ربیع میں رکھ لیا کریں گے۔

میں روزہ کی ایک حکمت کا بیان ہے جس کی تقریر خلاصہ تفسیر میں کر دی گئی ہے، لیکن حکمت کا اسی میں انحصار نہیں ہو گیا، خدا جانے اور کیا کیا ہزاروں حکمتیں ہوں گی، سو کسی کو یہ کہنے کی گنجائش نہیں کہ جب روزہ کا مقصد معلوم ہو گیا تو یہ مقصد اگر کسی دوسرے طریقے سے حاصل ہو جائے تو روزہ کی یا رمضان کی قید کی کیا ضرورت ہے؟ جواب یہ ہے کہ ممکن ہے کہ روزے میں کچھ خاص حکمتیں اور ثمرات ایسے ہوں کہ وہ ان خاص مقررہ شرعی قیود کے بغیر حاصل نہ ہو سکیں اور سب سے بڑھ کر رضائے الٰہی ہے وہ تو حکم کی بجا آوری ہی سے حاصل ہو سکے گی، اس کے بغیر نہیں ہو سکتی۔

لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ: اس میں مجاہدہ کے ثمرہ کا بیان ہے، اس میں دو مسئلے ہیں: ① ایک مجاہدہ کا مفید ہونا ② دوسرا اُس کے ثمرات و فوائد کے بیان کا جائز ہونا جیسا کہ شیوخ جب مصلحت دیکھتے ہیں تو احکام کے ثمرات و فوائد کو بیان کر دیتے ہیں۔

* * *

فائدہ: ۱ یہ حکم روزہ کے متعلق ہے جو ارکان اسلام میں داخل ہے اور نفس کے بندوں ہوا پرستوں کو نہایت ہی شاق ہوتا ہے، اس لئے تاکید اور اہتمام کے الفاظ سے بیان کیا گیا اور یہ حکم حضرت آدم علیہ السلام کے زمانہ سے اب تک برابر جاری رہا ہے، گو تعیین ایام میں اختلاف ہو، اور اصول مذکورہ سابقہ میں جو صبر کا حکم تھا، روزہ اس کا ایک بڑا رکن ہے، حدیث میں روزہ کو نصف صبر فرمایا ہے۔

فائدہ: ۲ یعنی روزہ سے نفس کو اس کی مرغوبات سے روکنے کی عادت پڑے گی تو پھر اس کو ان مرغوبات سے جو شرعاً حرام ہیں روک سکو گے اور روزہ سے نفس کی قوت و شہوت میں ضعف بھی آئے گا تو اب تم متقی ہو جاؤ گے، بڑی حکمت روزہ میں یہی ہے کہ نفس سرکش کی اصلاح ہو اور شریعت کے احکام جو نفس کو بھاری معلوم ہوتے ہیں ان کا کرنا سہل ہو جائے اور متقی بن جاؤ، جاننا چاہیے کہ یہود و نصاریٰ پر بھی رمضان کے روزے فرض ہوئے تھے، مگر انہوں نے اپنی خواہشات کے موافق ان میں اپنی رائے سے تغیر و تبدل کیا تو لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ میں ان پر تعریض ہے معنی یہ ہوں گے کہ: ''اے مسلمانو! تم نافرمانی سے بچو''، یعنی مثل یہود اور نصاریٰ کے اس حکم میں خلل نہ ڈالو۔

اَیَّامًا مَّعۡدُوۡدٰتٍ ؕ فَمَنۡ كَانَ مِنۡكُمۡ مَّرِيۡضًا اَوۡ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنۡ اَيَّامٍ اُخَرَ ؕ وَعَلَى الَّذِيۡنَ

چند روز ہیں گنتی کے ۱؎ پھر جو کوئی تم میں سے بیمار ہو یا مسافر تو اس پر ان کی گنتی ہے اور دِنوں سے ۲؎ اور جن کو

يُطِيۡقُوۡنَهٗ فِدۡيَةٌ طَعَامُ مِسۡكِيۡنٍ ؕ فَمَنۡ تَطَوَّعَ خَيۡرًا فَهُوَ خَيۡرٌ لَّهٗ ؕ وَاَنۡ تَصُوۡمُوۡا

طاقت ہے روزہ کی ان کے ذمہ بدلا ہے ایک فقیر کا کھانا ۳؎ پھر جو کوئی خوشی سے کرے نیکی تو اچھا ہے اس کے واسطے ۴؎ اور روزہ رکھو

خَيۡرٌ لَّكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۸۴﴾

تو بہتر ہے تمہارے لئے اگر تم سمجھ رکھتے ہو ۵؎

خلاصہ تفسیر: (سو) تھوڑے دنوں روزہ رکھ لیا کرو (ان دنوں سے مراد رمضان ہے، جیسا اگلی آیت میں آتا ہے) پھر (اس میں بھی اتنی آسانی ہے کہ) جو شخص تم میں (ایسا) بیمار ہو (جس کو روزہ رکھنا مشکل یا مضر ہو) یا (شرعی) سفر میں ہو تو (اس کو رمضان میں روزہ نہ رکھنے کی اجازت ہے، اور بجائے رمضان کے) دوسرے ایام کا (اتنا ہی) شمار (کر کے ان میں روزہ) رکھنا (اس پر واجب) ہے، اور (دوسری آسانی جو بعد میں منسوخ ہوگئی یہ ہے کہ) جو لوگ روزے کی طاقت رکھتے ہوں (اور پھر بھی روزہ نہ رکھنے کو دل چاہے تو) ان کے ذمہ (صرف روزے کا) فدیہ (یعنی بدلہ) ہے کہ وہ ایک غریب کا کھانا (کھلا دینا یا دے دینا) ہے، اور جو شخص خوشی سے (زیادہ) خیر (خیرات) کرے (کہ زیادہ فدیہ دیدے) تو یہ اس شخص کے لئے اور بہتر ہے، اور (اگرچہ ہم نے آسانی کے لئے ان حالتوں میں روزہ نہ رکھنے کی اجازت دے دی ہے، لیکن) تمہارا روزہ رکھنا (اس حالت میں بھی) زیادہ بہتر ہے اگر تم (کچھ روزے کی فضیلت کی) خبر رکھتے ہو۔

وَعَلَى الَّذِيۡنَ يُطِيۡقُوۡنَهٗ فِدۡيَةٌ طَعَامُ مِسۡكِيۡنٍ: شروع اسلام میں جب لوگوں کو روزہ کا عادی بنانا مقصود تھا یہ حکم ہوگیا تھا کہ اگر باوجود روزہ کی طاقت کے روزہ نہ رکھنے کو دل چاہے تو فدیہ دے دیں، اب یہ حکم منسوخ ہے، البتہ جو شخص بہت زیادہ بوڑھا یا ایسا بیمار ہو کہ اب صحت کی توقع نہیں رہی تو ایسوں کے لیے یہ حکم اب بھی ہے کہ فی روزہ یا تو ایک مسکین کو دو وقت پیٹ بھر کر کھانا کھلا دیں، یا خشک جنس دینا چاہیں تو فی روزہ اسی کے تول سے ایک مسکین کو پونے دو سیر گیہوں دے دیا کریں۔

* * *

فائدہ: ۱؎ اَیَّامًا مَّعۡدُوۡدٰتٍ: یعنی چند روز گنتی کے جو زیادہ نہیں روزہ رکھو اور اس سے رمضان کا مہینہ مراد ہے جیسا اگلی آیت میں آتا ہے۔

فائدہ: ۲؎ فَعِدَّةٌ مِّنۡ اَيَّامٍ اُخَرَ: پھر اس مدت قلیل میں بھی اتنی سہولت اور فرما دی گئی کہ جو بیمار ایسا ہو کہ روزہ رکھنا دشوار ہو، یا مسافر ہو تو اس کو اختیار ہے کہ روزے نہ رکھے اور جتنے روزے کھائے اتنے ہی رمضان کے سوا اور دنوں میں روزے رکھ لے، خواہ ایک ساتھ، یا متفرق کر کے۔

فائدہ: ۳؎ فِدۡيَةٌ طَعَامُ مِسۡكِيۡنٍ: مطلب یہ ہے کہ جو لوگ روزہ رکھتے ہیں مگر ابتداء میں چونکہ روزہ کی بالکل عادت نہ تھی اس لئے ایک ماہ کامل پے در پے روزے رکھنا ان کو نہایت شاق تھا، تو ان کے لئے یہ سہولت فرما دی گئی تھی کہ اگرچہ تم کو کوئی عذر مثل مرض یا سفر کے پیش نہ ہو، مگر صرف عادت نہ ہونے کے سبب روزہ تم کو دشوار ہو، تو اب تم کو اختیار ہے چاہو روزہ رکھو، چاہو روزہ کا بدلا دو، ایک روزہ کے بدلے ایک مسکین کو دو وقت پیٹ بھر کر کھانا کھلاؤ، کیونکہ جب اس نے ایک دن کا کھانا دوسرے کو دے دیا، تو گویا اپنے نفس کو ایک روز کے کھانے سے روک لیا اور فی الجملہ روزہ کی مشابہت ہوگئی، پھر جب وہ لوگ روزہ کے عادی ہوگئے تو یہ اجازت باقی نہ رہی، جس کا بیان اس سے اگلی آیت میں آتا ہے، اور بعض اکابر نے طعام مسکین سے صدقۃ الفطر بھی مراد لیا ہے، معنی یہ ہونگے کہ جو لوگ فدیہ دینے کی طاقت رکھتے ہیں وہ ایک مسکین کے کھانے کی مقدار اس کو دے دیں

جس کی مقدار شرع میں گیہوں کا آدھا صاع اور جَو کا پورا صاع ہے، تو اب یہ آیت منسوخ نہ ہوگی، اور جو لوگ اب بھی یہ کہتے ہیں کہ جس کا جی چاہے روزہ رمضان میں رکھ لے اور جس کا جی چاہے فدیہ پر قناعت کرے، خاص روزہ ہی ضرور رکھے یہ حکم نہیں، وہ یا جاہل ہیں، یا بے دین۔

فائدہ: ٤ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ: یعنی اگر ایک دن کے کھانے سے زیادہ ایک مسکین کو دے یا کئی مسکینوں کا پیٹ بھر دے تو سبحان اللہ بہت ہی بہتر ہے۔

فائدہ: ٥ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ: یعنی اگر تم کو روزہ کی فضیلت اور حکمت اور منافع معلوم ہوں تو جان لو کہ روزہ رکھنا فدیہ مذکورہ کے دینے سے بہتر ہے اور روزہ رکھنے میں کوتاہی نہ کرو۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ

مہینہ رمضان کا ہے جس میں نازل ہوا قرآن ہدایت ہے واسطے لوگوں کے اور دلیلیں روشن راہ پانے کی اور حق کو باطل سے جدا کرنے کی ١

خلاصہ تفسیر: (پیچھے ارشاد ہوا تھا کہ تھوڑے روزہ رکھ لیا کرو، اب ان تھوڑے دنوں کا بیان ہے، وہ تھوڑے ایام جن میں روزے کا حکم ہوا ہے) ماہ رمضان ہے جس میں (ایسی برکت ہے کہ اس کے ایک خاص حصہ یعنی شب قدر میں) قرآن مجید (لوح محفوظ سے آسمان دنیا پر) بھیجا گیا ہے، جس کا (ایک) وصف یہ ہے کہ لوگوں کے لئے (ذریعہ) ہدایت ہے اور (دوسرا وصف یہ ہے کہ ہدایت کے طریقے بتلانے میں اس کا جزو جزو) واضح الدلالۃ ہے (دلالت پر واضح ہے، اور ان دونوں وصفوں میں) من جملہ ان کتب (سماویہ) کے (ہے) جو کہ (انہی دو وصفوں سے موصوف ہیں، یعنی ذریعہ) ہدایت (بھی) ہیں اور (دلالت پر واضح ہونے کی وجہ سے حق و باطل کے درمیان) فیصلہ کرنے والی (بھی) ہیں۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ: قرآن مجید میں دوسری آیت میں آیا ہے کہ ہم نے قرآن مجید شب قدر میں نازل فرمایا، اور یہاں رمضان شریف میں نازل کرنا فرمایا ہے؟ سو وہ شب قدر رمضان کی تھی، اس لیے دونوں مضمون موافق ہوگئے، اور اگر یہ وسوسہ ہو کہ قرآن مجید تو کئی سال میں تھوڑا تھوڑا کر کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا ہے، پھر رمضان یا شب قدر میں نازل فرمانے کا کیا معنی؟ اس وسوسہ کے جواب کی طرف خلاصہ تفسیر میں اشارہ کر دیا ہے، یعنی لوح محفوظ سے آسمان دنیا پر دفعۃً رمضان کی شب قدر میں نازل ہو چکا تھا، پھر آسمان دنیا سے دنیا میں بتدریج کئی سال میں نازل ہوا، سو اس میں بھی تعارض نہ رہا۔

* * *

فائدہ: وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ: حدیث میں آیا ہے کہ صحف ابراہیمی اور تورات اور انجیل سب کا نزول رمضان ہی میں ہوا ہے اور قرآن شریف بھی رمضان کی چوبیسویں رات میں لوح محفوظ سے اول آسمان پر سب ایک ساتھ بھیجا گیا، پھر تھوڑا تھوڑا کر کے مناسب احوال آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوتا رہا اور ہر رمضان میں حضرت جبرائیل علیہ السلام قرآن نازل شدہ آپ کو مکرّر سناجاتے تھے، ان سب حالات سے مہینے رمضان کی فضیلت اور قرآن مجید کے ساتھ اس کی مناسبت اور خصوصیت خوب ظاہر ہوگئی، اس لئے اس مہینے میں تراویح مقرر ہوئی، پس قرآن کی خدمت اسی مہینے میں خوب اہتمام سے کرنی چاہیے کہ اسی واسطے مقرر اور معین ہوا ہے۔

فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۭ وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰي سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ۭ

سو جو کوئی پائے تم میں سے اس مہینہ کو تو ضرور روزے رکھے اسکے ١ اور جو کوئی ہو بیمار یا مسافر تو اس کو گنتی پوری کرنی چاہیے اور دنوں سے ٢

يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ۡ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰي مَا

اللہ چاہتا ہے تم پر آسانی اور نہیں چاہتا تم پر دشواری، اور اس واسطے کہ تم پوری کرو گنتی اور تاکہ بڑائی کرو اللہ کی اس بات پر

هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ﴿۱۸۵﴾

کہ تم کو ہدایت کی اور تا کہ تم احسان مانو۔

خلاصہ تفسیر: سو جو شخص اس ماہ میں موجود ہو اس کو ضرور اس میں روزہ رکھنا چاہئے (اور وہ فدیہ کی اجازت جو پیچھے مذکور تھی منسوخ وموقوف ہوئی) اور (مریض اور مسافر کے لئے جو پیچھے قانون تھا وہ البتہ اب بھی اسی طرح باقی ہے کہ) جو شخص (ایسا) بیمار ہو (جس میں روزہ رکھنا مشکل یا مضر ہو) یا (شرعی) سفر میں ہو تو (اس کو رمضان میں روزہ نہ رکھنے کی اجازت ہے اور بجائے ایام رمضان کے) دوسرے ایام کا (اتنا ہی) شمار (کر کے ان میں روزہ) رکھنا (اس پر واجب ہے)۔

اللہ تعالیٰ کو تمہارے ساتھ (احکام میں) آسانی (کی رعایت) کرنا منظور ہے (اس لئے ایسے احکام مقرر کئے جن کو تم آسانی سے بجالا سکو، چنانچہ سفر اور مرض میں کیسا آسان قانون مقرر کر دیا) اور تمہارے ساتھ (احکام وقوانین مقرر کرنے میں) دشواری منظور نہیں (کہ سخت احکام تجویز کر دیتے) اور (یہ احکام ہم نے خاص خاص مصلحتوں سے مقرر کئے، چنانچہ اولاً روزہ ادا رکھنے کا اور کسی شرعی عذر سے رہ جائے تو دوسرے ایام میں قضا کرنے کا حکم تو اسی لئے کیا) تا کہ تم لوگ (ایام ادا یا قضاء کی) شمار کی تکمیل کر لیا کرو (تا کہ ثواب میں کمی نہ رہے) اور (خود قضا رکھنے کا حکم اس لئے کیا) تا کہ تم لوگ اللہ تعالیٰ کی بزرگی (اور ثناء) بیان کیا کرو اس پر کہ تم کو (ایک ایسا) طریقہ بتلا دیا (جس سے تم رمضان کے روزوں کی برکات وثمرات سے محروم نہ رہو، ورنہ اگر قضا واجب نہ ہوتی تو کون اتنے روزے رکھ کر ثواب حاصل کرتا) اور (عذر کی وجہ سے خاص رمضان میں روزہ نہ رکھنے کی اجازت اس لئے دے دی) تا کہ تم لوگ (اس نعمت آسانی پر اللہ تعالیٰ کا) شکر ادا کیا کرو (ورنہ اگر یہ اجازت نہ ہوتی تو سخت مشقت ہو جاتی)۔

* * *

فائدہ: ۱ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ: یعنی جب اس ماہ مبارک کے فضائل مخصوصہ عظیمہ تم کو معلوم ہو چکے، تو اب جس کسی کو یہ مہینہ ملے، اس کو روزہ ضرور رکھنا چاہیے اور بغرض سہولت ابتدا میں جو فدیہ کی اجازت برائے چندے دی گئی تھی وہ موقوف ہو گئی۔

فائدہ: ۲ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ: اس حکم عام سے یہ سمجھ میں آتا تھا کہ شاید مریض اور مسافر کو بھی افطار وقضا کی اجازت باقی نہیں رہی اور جیسے روزہ کی طاقت رکھنے والوں کو اب افطار کی ممانعت کر دی گئی ایسے ہی مسافر اور مریض کو بھی ممانعت ہو گئی ہو، اس لئے مریض اور مسافر کی نسبت پھر صاف فرما دیا کہ انکو رمضان میں افطار کرنے اور اور دنوں میں اس کے قضا کر دینے کی اجازت اسی طرح باقی ہے جیسے تھی۔

فائدہ: ۳ مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ: مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو اول رمضان میں روزہ کا حکم فرمایا اور بوجہ عذر پھر مریض اور مسافر کو افطار کرنے کی اجازت دی اور دیگر اوقات میں ان دنوں کی شمار کے برابر روزوں کا قضا کرنا تم پر پھر واجب فرمایا، ایک ساتھ ہونے، یا متفرق ہونے کی ضرورت نہیں، تو اس میں اس کا لحاظ ہے کہ تم پر سہولت رہے، دشواری نہ ہو، اور یہ بھی منظور ہے کہ تم اپنے روزوں کی شمار پوری کر لیا کرو، ثواب میں کمی نہ آجائے اور یہ بھی مدنظر ہے کہ تم اس طریقہ سراسر خیر کی ہدایت پر اپنے اللہ کی بڑائی بیان کرو اور اس کو بزرگی سے یاد کرو اور یہ بھی مطلوب ہے کہ ان نعمتوں پر تم شکر کرو اور شکر کرنے والوں کی جماعت میں داخل ہو جاؤ، سبحان اللہ! روزہ جیسی مفید عبادت ہم پر واجب فرمائی اور مشقت اور تکلیف کی حالت میں سہولت بھی فرما دی اور فراغت کے وقت میں اس نقصان کے جبر کا طریقہ بھی بتلا دیا۔

وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ؕ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ

اور جب تجھ سے پوچھیں میرے بندے مجھ کو سو میں تو قریب ہوں ،قبول کرتا ہوں دعا مانگنے والے کی دعا کو جب مجھ سے دعا مانگے

فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ ﴿۱۸۶﴾

تو چاہیے کہ وہ حکم مانیں میرا اور یقین لائیں مجھ پر تا کہ نیک راہ پر آئیں

خلاصہ تفسیر: گذشتہ آیتوں میں روزہ اور رمضان کے احکام اور فضائل کا ذکر تھا، آگے بھی ایک آیت میں روزہ اور اعتکاف کے احکام کی تفصیل ہے، درمیان کی اس آیت میں بندوں کے حال پر حق تعالیٰ کی خاص عنایت کا ذکر فرما کر اطاعت احکام کی ترغیب دی گئی ہے، کیونکہ روزہ میں رخصتوں سہولتوں کے باوجود کسی قدر مشقت ہے، اس کو سہل کرنے کے لئے اپنی مخصوص عنایت کا ذکر فرمایا کہ میں اپنے بندوں سے قریب ہی ہوں جب بھی وہ دعاء مانگتے ہیں، میں ان کی دعائیں قبول کرتا ہوں، سو بندوں کو بھی چاہئے کہ میرے احکام کی تعمیل میں کچھ مشقت بھی ہو تو برداشت کریں۔

اور (اے محمد ﷺ) جب آپ سے میرے بندے میرے متعلق دریافت کریں (کہ میں ان سے قریب ہوں یا دور) تو (میری طرف سے ان سے فرما دیجئے کہ) میں قریب ہی ہوں (اور علاوہ نامناسب درخواست کے) منظور کر لیتا ہوں (ہر) عرضی درخواست کرنے والے کی جب کہ وہ میرے حضور میں درخواست دے، سو (جس طرح میں ان کی عرض معروض کو منظور کر لیتا ہوں) ان کو چاہئے کہ میرے احکام کو (بجا آوری کے ساتھ) قبول کیا کریں (اور چونکہ ان احکام میں کوئی نامناسب نہیں، اس لئے اس میں استثناء ممکن نہیں) اور مجھ پر یقین رکھیں (یعنی میری ہستی پر بھی، میرے حاکم ہونے پر بھی، میرے حکیم ہونے پر اور رعایت و مصالح پر بھی، اس طرح) امید ہے کہ وہ لوگ رشد (وفلاح) حاصل کر سکیں گے۔

فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ: اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ ''میں قریب ہی ہوں'' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احاطہ میں سب کچھ ہے اور اللہ تعالیٰ کا قرب ذاتی بندہ کو حاصل ہے۔

اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ: خلاصہ تفسیر میں ''علاوہ نامناسب درخواست'' کی قید ظاہر کر دی، اس سے دعا کی قبولیت کے متعلق وہ مشہور وسوسہ دور ہو گیا کہ بعض اوقات دیکھا جاتا ہے کہ ہماری دعا قبول نہیں ہوتی؟ جواب کا حاصل یہ ہے کہ وہ دعا اس شخص کے مناسب حال نہیں ہوتی، اسی لیے قبول نہیں ہوتی، اور یہ ضروری نہیں کہ جو چیز واقع میں نامناسب ہو اس کے نامناسب ہونے کی اطلاع خود اس شخص کو بھی ہو جایا کرے۔

کسی ملحد کو یہ شبہ نکالنے کی بھی گنجائش نہیں ہے کہ جیسے اللہ ہماری صرف بعض باتیں قبول کرتے ہیں اسی طرح ہم بھی ان کے صرف بعض احکام مان لیں گے، اس شبہ کی گنجائش نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ہماری تو بعض درخواستیں نامناسب بھی ہوتی ہیں اس لیے قبول نہیں ہوتیں جبکہ ان کے احکام تو سب کے سب مناسب ہیں، اس وجہ سے خلاصہ تفسیر میں بھی اس کو ظاہر کر دیا ہے۔

* * *

فائدہ: شروع میں یہ حکم تھا کہ رمضان میں اول شب میں کھانے پینے اور عورتوں کے پاس جانے کی اجازت تھی، مگر سو رہنے کے بعد ان چیزوں کی ممانعت تھی، بعض لوگوں نے اسکے خلاف کیا اور سونے کے بعد عورتوں سے قربت کی، پھر آپ ﷺ سے آ کر عرض کیا اور اپنے قصور کا اقرار اور ندامت کا اظہار کیا اور توبہ کی نسبت آپ ﷺ سے سوال کیا، تو اس پر یہ آیت اتری کہ تمہاری توبہ قبول کی گئی اور احکام خداوندی کی اطاعت کی تاکید فرما دی گئی اور حکم سابق منسوخ فرما کر آئندہ کو اجازت دے دی گئی کہ تمام شب رمضان میں صبح صادق سے پہلے کھانا وغیرہ تم کو حلال ہے، جس کا ذکر اس کے بعد کی آیت میں آتا ہے اور آیت سابقہ میں جو بندوں پر سہولت اور عنایت کا ذکر تھا، اس قرب و اجابت و اباحت سے اس کی بھی خوب تاکید ہو گئی۔ اور ایک تعلق کی وجہ یہ بھی ہے کہ پہلی آیت میں تکبیر اور اللہ کی بڑائی بیان کرنے کا حکم تھا۔

آپ ﷺ سے بعض نے پوچھا کہ ہمارا رب دور ہے تو ہم اسکو پکاریں، یا نزدیک ہے تو آہستہ بات کریں؟ اس پر یہ آیت اتری، یعنی وہ

قریب ہے، ہر ایک بات سنتا ہے، آہستہ ہو یا پکار کر اور جن موقعوں میں پکار کر تکبیر کہنے کا حکم ہے وہ دوسری وجہ سے ہے، یہ نہیں کہ وہ آہستہ بات کو نہیں سنتا۔

اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ ؕ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ؕ عَلِمَ اللّٰهُ

حلال ہوا تم کو روزہ کی رات میں بے حجاب ہونا اپنی عورتوں سے ۱؎ وہ پوشاک ہیں تمہاری اور تم پوشاک ہو انکی ۲؎ اللہ کو معلوم ہے

اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ ۚ فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَابْتَغُوْا مَا

کہ تم خیانت کرتے تھے اپنی جانوں سے ۳؎ سو معاف کیا تم کو اور درگزر کی تم سے، پھر ملو اپنی عورتوں سے اور طلب کرو اس کو جو

كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ ۪ وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۪

لکھ دیا ہے اللہ نے تمہارے لئے ۴؎ اور کھاؤ اور پیو جب تک کہ صاف نظر آئے تم کو دھاری سفید صبح کی جدا دھاری سیاہ سے ۵؎

ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ ۚ وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ ۙ فِى الْمَسٰجِدِ ؕ تِلْكَ حُدُوْدُ

پھر پورا کرو روزہ کو رات تک ۶؎ اور نہ ملو عورتوں سے جب تک کہ تم اعتکاف کرو مسجدوں میں ۷؎ یہ حدیں باندھی ہوئی ہیں

اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۷﴾

اللہ کی سو ان کے نزدیک نہ جاؤ، اسی طرح بیان فرماتا ہے اللہ اپنی آیتیں لوگوں کے واسطے تا کہ وہ بچتے رہیں ۸؎

خلاصہ تفسیر: (اس آیت میں روزہ کے بقیہ احکام کی کچھ تفسیر مذکور ہے) تم لوگوں کے واسطے روزہ کی شب میں اپنی بیویوں سے مشغول ہونا حلال کر دیا گیا (اور پہلے جو اس سے ممانعت تھی وہ ترک کی گئی) کیونکہ (قرب واتصال کی وجہ سے) وہ تمہارے (بجائے) اوڑھنے بچھونے (کے) ہیں اور تم ان کے (بجائے) اوڑھنے بچھونے (کے) ہو، خدا تعالیٰ کو اس کی خبر تھی کہ تم (اس حکم الٰہی میں) خیانت (کر) کے گناہ میں اپنے کو مبتلا کر رہے تھے (مگر) خیر (جب تم معذرت سے پیش آئے تو) اللہ تعالیٰ نے تم پر عنایت فرمائی اور تم سے گناہ کو دھو دیا، سو (جب اجازت ہوگئی تو) اب ان سے ملو ملاؤ اور جو (قانون اجازت) تمہارے لئے تجویز کر دیا ہے (بے تکلف) اس کا سامان کرو، اور (جس طرح رمضان کی رات میں بیوی سے ہم بستری کی اجازت ہے، اسی طرح یہ بھی اجازت ہے کہ تمام رات میں جب چاہو) کھاؤ (بھی) اور پیو (بھی) اس وقت تک کہ تم کو سفید خط (کہ وہ نور ہے) صبح (صادق کی روشنی) کا (جبکہ وہ بالکل شروع ہی شروع میں طلوع ہوتی ہے) متمیز ہو جائے سیاہ خط سے (یعنی رات کی تاریکی کی اس حد فاصل سے کہ جو خط نور صبح سے ملا ہوا محسوس ہوتا ہے) تو پھر (صبح صادق سے) رات (آنے) تک روزہ کو پورا کیا کرو (صبح کی سفیدی کا سفید خط رات کی تاریکی کے سیاہ خط سے متمیز ہو جانے سے مراد یہ ہے کہ صبح صادق یقینی طور سے ثابت ہو جائے)۔

اور ان بیویوں (کے بدن) سے اپنا بدن بھی (شہوت کے ساتھ) مت ملنے دو جس زمانے میں کہ تم لوگ اعتکاف والے ہو (جو کہ مسجدوں میں (ہوا کرتا ہے) یہ (سب احکام) خداوندی ضابطے ہیں، سو ان (ضابطوں) سے (نکلنا تو کیسا) نکلنے کے نزدیک بھی مت ہونا (اور جس طرح اللہ تعالیٰ نے یہ احکام بیان کئے ہیں) اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنے (اور) احکام (بھی) لوگوں (کی اصلاح) کے واسطے بیان فرمایا کرتے ہیں، اس امید پر کہ وہ لوگ (احکام پر مطلع ہو کر ان احکام کے خلاف کرنے سے) پرہیز رکھیں۔

اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ: شروع اسلام میں یہ حکم تھا کہ رات کو ایک دفعہ نیند سے آنکھ کھلنے کے بعد کھانا پینا

بیوی کے پاس جانا حرام ہوجاتا تھا، بعض صحابہ سے غلبہ میں اس حکم کی خلاف ورزی ہوگئی، انہوں نے نادم ہوکر حضور ﷺ کو اس کی اطلاع کی، ان کی ندامت و توبہ پر اللہ تعالیٰ نے رحمت فرمائی اور اس حکم کو منسوخ فرمادیا۔

حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ: احقر نے جو خط تاریکی اور خط نور کے ملنے کو محسوس ہونے سے تعبیر کیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ واقع میں وہ دو خط نہیں، بلکہ ایک ہی خط ہے جو سطح نور اور سطح ظلمت دونوں کا منتہا اور دونوں کے درمیان میں مشترک اور فاصل ہے، جیسا کہ اہل فن جانتے ہیں۔

* * *

فائدہ: ۱ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ: رمضان کی رات میں جو نیند کے بعد کھانا پینا عورت کے پاس جانا حرام تھا اس میں بھی سہولت کردی گئی، اب تمام رات میں جب چاہو عورتوں کے ساتھ اختلاط کرو۔

فائدہ: ۲ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ: لباس اور پوشاک سے غرض غایت اتصال واختلاط ہے، یعنی جس طرح بدن سے کپڑے لگے اور ملے ہوتے ہیں اسی طرح مرد وعورت آپس میں ملتے ہیں۔

فائدہ: ۳ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ: اپنے نفس کے ساتھ خیانت کرنے کا مطلب یہ ہے کہ سونے کے بعد عورتوں کے پاس جاکر بوجہ مخالفت حکم الٰہی تم اپنے آپ کو گنہگار بناتے ہو، جس سے تمہارے نفس مستحق عقاب ہوتے ہیں اور ان کے ثواب میں نقصان پڑتا ہے، سو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے تم کو معاف فرمایا اور آیندہ کو اجازت فرمادی۔

فائدہ: ۴ وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ: یعنی لوح محفوظ میں جو اولاد تمہارے لئے اللہ نے مقدر فرمادی ہے عورتوں کی مباشرت سے وہ مطلوب ہونی چاہیے، محض شہوت رانی مقصود نہ ہو اور اس میں عزل کی کراہت اور لواطت کی ممانعت کی طرف بھی اشارہ ہے۔

فائدہ: ۵ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ: یعنی جیسے رات بھر میں مجامعت کی اجازت دی گئی اسی طرح رمضان کی رات میں تم کو کھانے اور پینے کی بھی اجازت ہے صبح صادق تک۔

فائدہ: ۶ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ: یعنی طلوع صبح صادق سے رات تک روزہ کو پورا کرو، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کئی روزے متصل رکھنے اس طرح پر کہ رات کو بھی افطار کی نوبت نہ آئے مکروہ ہے۔

فائدہ: ۷ وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ فِي الْمَسٰجِدِ: یعنی روزہ میں تو رات کو مباشرت کی اجازت ہے، مگر اعتکاف میں رات دن کسی وقت عورت کے پاس نہ جائے۔

فائدہ: ۸ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ: روزہ اور اعتکاف کے متعلق جو حکم دوبارہ حلت وحرمت مذکور ہوئے، یہ قاعدے اللہ کے مقرر فرمائے ہوئے ہیں، ان سے ہرگز باہر نہ ہونا، بلکہ ان کے قریب بھی نہ جانا، یا یہ مطلب ہے کہ اپنی رائے یا کسی حجت سے ان میں سر مو تفاوت نہ کرنا۔

وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا

اور نہ کھاؤ مال ایک دوسرے کا آپس میں ناحق ۱ اور نہ پہنچاؤ ان کو حاکموں تک کہ کھا جاؤ کوئی حصہ

مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۸﴾ ع

لوگوں کے مال میں سے ظلم کر کے (ناحق) تم کو معلوم ہے ۲

خلاصہ تفسیر: پیچھے روزے کے احکام مذکور تھے، جس میں بعض حلال چیزوں کے استعمال کو ایک خاص زمانے اور خاص وقت میں حرام کردیا گیا، اب مال حرام حاصل کرنے اور اس کے استعمال کی ممانعت اسی مناسبت سے بیان کی جاتی ہے کہ روزہ کا اصل منشاء بھی ہے کہ انسان

کچھ عرصے حلال چیزوں سے بھی صبر کا خوگر ہوجائے گا تو حرام چیزوں سے بچنا آسان ہوجائے گا، نیز یہ مناسبت بھی ہے کہ جب روزہ ختم ہو، افطار کے لئے مال حلال مہیا کرنا چاہئے، جس نے دن بھر روزہ رکھا شام کو مال حرام سے افطار کیا، اس کا روزہ اللہ کے نزدیک قبول نہیں۔

اور آپس میں ایک دوسرے کے مال ناحق مت کھاؤ اور ان (کے جھوٹے مقدمہ) کو حکام کے یہاں اس غرض سے رجوع مت کرو کہ (اس کے ذریعہ سے) لوگوں کے مالوں کا ایک حصہ بطریق گناہ (یعنی ظلم) کے کھا جاؤ جبکہ تم کو (اپنے جھوٹ اور ظلم کا) علم بھی ہو۔

* * *

فائدہ: ۱ روزہ سے طہارت نفس مقصود تھی، اب تطہیر اموال کا ارشاد ہے اور معلوم ہوگیا کہ مال حلال تو صرف روزہ میں اس کا کھانا منع ہے اور مال حرام سے دوزہ مدت العمر کے لئے ہے، اس کے لئے کوئی حد نہیں، جیسے چوری یا خیانت یا دغابازی یا رشوت یا زبردستی یا قمار یا بیوع ناجائزہ یا سود وغیرہ ان ذریعوں سے مال کمانا بالکل حرام اور ناجائز ہے۔

فائدہ: ۲ ”نہ پہنچاؤ حاکموں تک“، یعنی ① کسی کے مال کی خبر نہ دو ظالم حاکموں کو ② یا اپنا مال بطریق رشوت حاکم تک نہ پہنچاؤ کہ حاکم کو موافق بنا کر کسی کا مال کھالو ③ یا جھوٹی گواہی دے کر، یا جھوٹی قسم کھا کر، یا جھوٹا دعویٰ کرکے کسی کا مال نہ کھاؤ اور تم کو اپنے ناحق پر ہونے کا علم بھی ہو۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ؕ قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ؕ وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا

تجھ سے پوچھتے ہیں حال نئے چاند کا ۱ کہہ دے کہ یہ اوقات مقررہ ہیں لوگوں کے واسطے اور حج کے واسطے ۲ اور نیکی یہ نہیں کہ آؤ

الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى ۚ وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ

گھروں میں ان کی پشت کی طرف سے اور لیکن نیکی یہ ہے کہ جو کوئی ڈرے اللہ سے، اور آؤ گھروں میں دروازوں سے، اور اللہ سے ڈرتے رہو

لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۸۹﴾

تاکہ تم اپنی مراد کو پہنچو ۳

خلاصہ تفسیر: آیت لَيْسَ الْبِرَّ کے تحت بیان ہو چکا ہے کہ اس کے بعد آخر سورۃ بقرہ تک ابواب البر کا بیان ہوگا، جو اہم احکام شرعیہ پر مشتمل ہیں، ان میں پہلا حکم قصاص کا، دوسرا وصیت کا، تیسرا اور چوتھا صوم اور اس کے متعلقہ مسائل کا، پانچواں اعتکاف کا، چھٹا مال حرام سے بچنے کا تھا، اب حج اور جہاد کے احکام کا بیان ہے اور حج کے حکم سے پہلے یہ بتلایا گیا کہ روزہ اور حج وغیرہ میں قمری مہینوں اور دنوں کا اعتبار ہوگا۔

(بعض آدمی) آپ سے (ان) چاندوں کے (ہر مہینہ گھٹنے بڑھنے کی) حالت (اور اس میں جو فائدہ ہے اس فائدہ) کی تحقیقات کرتے ہیں، آپ فرما دیجئے کہ (فائدہ اس کا یہ ہے کہ) وہ چاند (اپنے اس گھٹنے اور بڑھنے کے اعتبار سے لزوماً یا سہولۃ) آلہ شناخت اوقات ہیں لوگوں کے (اختیاری معاملات مثل عدت و مطالبہ حقوق کے) لئے اور (غیر اختیاری عبادات مثل) حج (زکوٰۃ اور روزہ وغیرہ) کے لئے۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ؕ قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ: مطلب یہ ہے کہ سورج کی شکل تو ہمیشہ ایک حالت پر رہتی ہے، لیکن وہ امر خفی ہے کہ ایک مدت تک اس کا فرق ظاہر نہیں ہوتا بخلاف چاند کے، چنانچہ صحابہ کرامؓ نے رسول اللہ ﷺ سے شروع مہینے کے چاند کے متعلق سوال کیا کہ اس کی صورت آفتاب سے مختلف ہے کہ وہ کبھی باریک ہلالی شکل میں ہوتا ہے، پھر آہستہ آہستہ بڑھتا ہے، پھر پورا دائرہ ہوجاتا ہے، پھر اس میں تدریجی کمی اسی طرح آتی ہے، اس کی حقیقت دریافت کی، یا حکمت و مصلحت کا سوال کیا؟ دونوں احتمال ہیں، مگر جو جواب دیا گیا اس میں حکمت و مصلحت کا بیان ہے، اگر سوال ہی یہ تھا کہ چاند کے گھٹنے بڑھنے میں حکمت و مصلحت کیا ہے تب تو جواب اس کے مطابق ہو ہی گیا، اور اگر سوال سے اس گھٹنے بڑھنے کی حقیقت دریافت کرنا مقصود تھا جو صحابہ کرام کی شان سے بعید ہے تو پھر جواب بجائے حقیقت کے حکمت و مصلحت بیان کرنے سے اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ

اجرام سماویہ کے حقائق دریافت کرنا انسان کے بس میں بھی نہیں، اور ان کا کوئی دینی یا دنیوی کام اس حقیقت کے علم پر موقوف بھی نہیں، اس لئے حقیقت کا سوال فضول ہے، پوچھنے اور بتلانے کی بات یہ ہے کہ چاند کے اس طرح گھٹنے بڑھنے چھپنے اور طلوع ہونے سے ہمارے کون سے مصالح وابستہ ہیں؟ اس لئے جواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرمایا کہ آپ ان سے کہہ دیں کہ تمہاری مصالح جو چاند سے وابستہ ہیں یہ ہیں کہ اس کے ذریعہ تمہیں اپنے معاملات اور معاہدوں کی میعاد مقرر کرنا اور حج کے ایام معلوم کرنا آسان ہوجائے گا۔

چاند کے معاملہ میں جو الفاظ قرآن کریم نے استعمال کئے ان سے واضح اشارہ اس طرف نکلتا ہے کہ شریعت اسلام میں حساب چاند ہی کا متعین ہے، خصوصاً ان عبادات میں جن کا تعلق کسی خاص مہینے اور اس کی تاریخوں سے ہے، جیسے روزہ، رمضان، حج کے مہینے، حج کے ایام، محرم، شب برأت وغیرہ سے جو احکام متعلق ہیں وہ سب رویت ہلال سے متعلق کئے گئے ہیں، کیونکہ اس آیت میں: هِيَ مَوَاقِيتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ فرما کر بتلادیا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک حساب چاند ہی کا معتبر ہے، اگرچہ یہ حساب آفتاب سے بھی معلوم ہوسکتا ہے۔

شریعت اسلام نے چاند کے حساب کو اس لئے اختیار فرمایا کہ اس کو ہر آنکھوں والا افق پر دیکھ کر معلوم کرسکتا ہے عالم، جاہل، دیہاتی، جزیروں، پہاڑوں کے رہنے والے جنگلی سب کو اس کا علم آسان ہے، بخلاف شمسی حساب کے کہ وہ آلات رصدیہ اور قواعد ریاضیہ پر موقوف ہے جس کو ہر شخص آسانی سے معلوم نہیں کرسکتا، پھر عبادات کے معاملہ میں تو قمری حساب کو بطور فرض متعین کردیا اور عام معاملات تجارت وغیرہ میں بھی اسی کو پسند کیا جو عبادت اسلامی کا ذریعہ ہے اور ایک طرح کا اسلامی شعار ہے اگرچہ شمسی حساب کو بھی ناجائز قرار نہیں دیا، شرط یہ ہے کہ اس کا رواج اتنا عام نہ ہوجائے کہ لوگ قمری حساب کو بالکل بھلادیں، کیونکہ ایسا کرنے میں عبادات روزہ وحج وغیرہ میں خلل لازم آتا ہے، جیسا اس زمانے میں عام دفتروں اور کاروباری اداروں بلکہ نجی اور شخصی خط وکتابت میں بھی شمسی حساب کا ایسا رواج ہوگیا ہے کہ بہت سے لوگوں کو اسلامی مہینے بھی پورے یاد نہیں رہے، یہ شرعی حیثیت کے علاوہ غیرت قومی وملی کا بھی دیوالیہ پن ہے، اگر دفتری معاملات میں جن کا تعلق غیر مسلموں سے بھی ہے ان میں صرف شمسی حساب رکھیں باقی نجی خط وکتابت اور روزمرہ کی ضروریات میں قمری اسلامی تاریخوں کا استعمال کریں تو اس میں فرض کفایہ کی ادائیگی کا ثواب بھی ہوگا اور اپنا قومی شعار بھی محفوظ رہے گا۔

يَسْئَلُونَكَ عَنِ الْأَهِلَّةِ ۖ قُلْ هِيَ مَوَاقِيتُ: اس میں فضول اور بے جا سوال سے اعراض کی دلیل ہے، اور اس بات پر بھی کہ استاذ اور شیخ کو حق ہے کہ بعض سوالات سے منع کردے، خواہ صریحاً، خواہ اس طرح سے کہ جو اس سے پوچھا گیا ہے اس کا جواب نہ دے، بلکہ دوسرا کوئی مفید جواب دےدے۔

* * *

فائدہ: ١۔ يَسْئَلُونَكَ عَنِ الْأَهِلَّةِ: آفتاب ہمیشہ ایک صورت ایک حالت پر رہتا ہے اور چاند کی صورت بدلتی اور اس کی مقدار بڑھتی رہتی ہے، اس لئے لوگوں نے چاند کے کم زیادہ ہونے کی وجہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھی، اس پر یہ آیت نازل ہوئی، پہلی آیات میں شہر رمضان اور روزہ کا ذکر تھا، اس آیت میں ہلال کا ذکر ہے اور روزہ اور رویت ہلال میں تعلق ظاہر ہے کہ ایک دوسرے پر موقوف ہے اور آگے چل کر حج اور اسکے احکام کا ذکر ہے، ذکر ہلال اس کے بھی مناسب ہے۔

فائدہ: ٢۔ قُلْ هِيَ مَوَاقِيتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ: یعنی ان سے کہہ دو کہ چاند کا اس طرح پر نکلنا اس سے لوگوں کے معاملات اور عبادات مثل قرض، اجارہ، عدت، مدت حمل ورضاعت، روزہ، زکوٰۃ وغیرہ کے اوقات ہر ایک کو بے تکلف معلوم ہوجاتے ہیں، بالخصوص حج کہ روزہ وغیرہ کی قضا تو ان کے غیر ایام میں ہوتی ہے، حج کی تو قضا بھی ایام مقررہ حج کے سوا دوسرے ایام میں نہیں کرسکتے اور حج کے خاص بیان فرمانے کی یہ بھی وجہ ہے کہ ذیقعدہ، ذی الحج، محرم، رجب یہ چار مہینے اشہر حرم تھے، ان میں لڑائی کرنا حرام تھا، اہل عرب کو اگر ان مہینوں میں لڑائی پیش آتی تو مہینوں کو مقدم موخر کرکے لڑائی کرتے، مثلاً ذی الحج یا محرم میں لڑائی پیش آتی تو اسکو تو صفر بنالیتے اور جب صفر آتا تو اس کو ذی الحج یا محرم ٹھہرالیتے، ان کے اس خیال کے ابطال کی غرض سے یہاں حج کی تصریح فرمائی کہ جو ایام حج کے لئے اللہ نے مقرر فرمائے، ان میں تقدم تأخر ہرگز جائز نہیں، اب یہاں سے حج کے متعلقات اور اسکے احکام دور تک ذکر ہوں گے۔

وَلَيْسَ الْبِرُّ بِأَنْ تَأْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى ۚ وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ

اور نیکی یہ نہیں کہ آؤ گھروں میں ان کی پشت کی طرف سے اور لیکن نیکی یہ ہے کہ جو کوئی ڈرے اللہ سے، اور آؤ گھروں میں

اَبْوَابِهَا ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۸۹﴾

دروازوں سے، اور اللہ سے ڈرتے رہو تا کہ تم اپنی مراد کو پہنچو۔

خلاصہ تفسیر: (اسلام سے قبل بعض لوگ اگر حج کا احرام باندھنے کے بعد کسی ضرورت سے گھر جانا چاہتے تھے تو دروازہ سے جانا ممنوع سمجھتے تھے، اس لئے پشت کی دیوار میں نقب دے کر اس میں سے اندر جاتے تھے اور اس عمل کو فضیلت سمجھتے تھے، حق تعالیٰ حج کے ذکر کے بعد اس کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں:) اور اس میں کوئی فضیلت نہیں کہ گھروں میں ان کی پشت کی طرف سے آیا کرو، ہاں لیکن فضیلت یہ ہے کہ کوئی شخص حرام (چیزوں) سے بچے اور (چونکہ گھروں میں دروازہ کی طرف سے آنا حرام نہیں ہے، اس لئے اس سے بچنا بھی ضروری نہیں، سو اگر آنا چاہو تو) گھروں میں ان کے دروازوں سے آؤ اور (اصل الاصول تو یہ ہے کہ) خدا تعالیٰ سے ڈرتے رہو (اس سے البتہ) امید ہے کہ تم (دارین میں) کامیاب ہو۔

وَلَيْسَ الْبِرُّ بِأَنْ تَأْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا: اس سے یہ مسئلہ بھی نکل آیا کہ جس چیز کو شریعت اسلام نے ضروری یا عبادت نہ سمجھا ہو، اس کو اپنی طرف سے ضروری اور عبادت سمجھ لینا جائز نہیں، اسی طرح جو چیز شرعاً جائز ہو، اس کو گناہ سمجھنا بھی گناہ ہے، ان لوگوں نے ایسا ہی کر رکھا تھا کہ گھر کے دروازوں سے داخل ہونا جو شرعاً جائز تھا، اس کو گناہ قرار دیا، اور مکان کی پشت سے دیوار توڑ کر آنا جو شرعاً ضروری نہیں تھا، اس کو ضروری سمجھا، اسی پر ان لوگوں کو تنبیہ کی گئی اور حق تعالیٰ نے ان پر رد فرمایا اور تقویٰ کو واجب کہا، اور ان کے اس عقیدہ کو خلاف تقویٰ فرما کر باطل کیا، بدعات کے ناجائز ہونے کی بڑی وجہ یہی ہے کہ غیر ضروری چیزوں کو فرض و واجب کی طرح ضروری سمجھ لیا جاتا ہے، یا بعض چیزوں کو حرام و ناجائز قرار دے دیا جاتا ہے، اس آیت سے ایسا کرنے کی ممانعت واضح طور پر ثابت ہوگئی، جس سے ہزاروں اعمال کا حکم معلوم ہوگیا۔

اس میں اہل باطل یعنی کفار و فساق کے ساتھ تشبہ کی بھی مذمت ہے، اگرچہ تشبہ رسوم و عادات ہی میں کیوں نہ ہو، یعنی رہن سہن، لباس، عادات و اطوار کے اندر ان لوگوں کی مشابہت اختیار کرنے سے بچنا چاہیے۔

* * *

فائدہ: ۱ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ: زمانہ جاہلیت کا ایک دستور یہ بھی تھا کہ جب گھر سے نکل کر حج کا احرام باندھتے، پھر کوئی ضرورت گھر میں جانے کی پیش آتی تو دروازہ سے نہ جاتے چھت پر چڑھ کر گھر کے اندر اترتے، یا گھر کی پشت کی جانب نقب دے کر گھستے اور اس کو نیکی کی بات سمجھتے، اللہ نے اس کو غلط فرمادیا۔

فائدہ: پہلے جملہ میں حج کا ذکر تھا اور یہ حکم بھی حج کے متعلق تھا، اس مناسبت سے اس حکم کو یہاں بیان فرمایا، اور بعض حضرات فرماتے ہیں کہ ظاہر یہ ہے کہ آیت میں اھلۃ سے مراد اشہر حج یعنی شوال اور ذیقعدہ اور دس راتیں ذی الحجہ کی ہیں کہ احرام حج ان میں ہونا چاہیے، لوگوں نے آپ ﷺ سے پوچھا کہ حج کے یہی ایام ہیں، یا اور ایام میں بھی حج ہوسکتا ہے؟ اللہ نے جواب دیا کہ حج کے لئے اشہر حج مقرر اور معین ہیں اور اسی کی مناسبت سے احرام کے اندر گھر میں جانے کی کیفیت ذکر فرمادی، اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اپنی طرف سے کسی جائز اور مباح امر کو نیکی بنالینا اور دین میں داخل کرلینا مذموم اور ممنوع ہے جس سے بہت سی باتوں کا بدعت اور مذموم ہونا معلوم ہوگیا۔

وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿۱۹۰﴾

اور لڑو اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جو لڑتے ہیں تم سے ۱ اور کسی پر زیادتی مت کرو ۲ بیشک اللہ تعالیٰ ناپسند کرتا ہے زیادتی کرنے والوں کو

خلاصہ تفسیر: ذیقعدہ ۶ ہجری میں حضور ﷺ عمرہ کی نیت سے مکہ تشریف لے گئے، اس وقت تک مکہ مشرکین کے قبضہ اور

حکومت میں تھا، ان لوگوں نے حضور ﷺ اور آپ کے صحابہ کو مکہ کے اندر جانے سے روک دیا اور عمرہ رہ گیا، آخر بڑی گفتگو کے بعد یہ قرار پایا کہ آئندہ سال آ کر عمرہ ادا فرمائیں، چنانچہ ذیقعدہ ۷ ہجری میں پھر آپ اسی نیت سے تشریف لے گئے لیکن اس کے ساتھ ہی مسلمانوں کو اندیشہ ہوا کہ شاید مشرکین اپنا معاہدہ پورا نہ کریں اور قتال و مقابلہ کے لیے آمادہ ہو جائیں تو ایسی حالت میں نہ تو سکوت مصلحت ہے، اور اگر قتال کیا جائے تو ذیقعدہ میں ہوگا، حالانکہ اس وقت تک ذیقعدہ، ذی الحجہ، محرم اور رجب میں قتل وقتال ممنوع تھا، اور اسی لیے یہ چار مہینے اشہر حرم کہلاتے تھے، مسلمان اس تردد سے پریشان تھے سو حق تعالیٰ نے یہ آیتیں نازل فرمائیں کہ:

(اگرچہ دوسرے کفار کی طرح ان خاص معاہدہ کرنے والے کفار کے ساتھ باہمی معاہدہ کی وجہ سے تمہیں اپنی جانب سے ابتداءً قتال کرنے کی اجازت نہیں، لیکن اگر وہ لوگ خود عہد شکنی کریں اور تم سے لڑنے کو آمادہ ہو جائیں تو اس وقت تم کسی طرح کا اندیشہ دل میں مت لاؤ) اور (بے تکلف) تم (بھی) لڑو اللہ کی راہ میں (یعنی اس نیت سے کہ یہ لوگ دین کی مخالفت کرتے ہیں) ان لوگوں کے ساتھ جو (عہد شکنی کر کے) تمہارے ساتھ لڑنے لگیں اور (ازخود) حد (معاہدہ) سے مت نکلو (کہ عہد شکنی کر کے لڑنے لگو) واقعی اللہ تعالیٰ حد (یعنی قانون شرعی) سے نکلنے والوں کو پسند نہیں کرتے۔

* * *

فائدہ: ۱ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وقت سے مکہ دارالامن تھا، کوئی اپنے دشمن کو بھی مکہ میں پاتا تو کچھ نہ کہتا اور اشہر حرام یعنی ذی القعدہ اور ذی الحجہ اور محرم اور رجب یہ چاروں مہینے بھی امن کے تھے، ان میں تمام ملک عرب میں لڑائی موقوف ہو جاتی اور کوئی کسی کو کچھ نہ کہتا، ذی القعدہ ۶ ہجری میں حضرت ﷺ جماعت صحابہ کے ہمراہ عمرہ کے قصد سے مکہ کی زیارت کو تشریف لائے، جب آپ مکہ کے نزدیک پہنچے تو مشرکین جمع ہو کر لڑنے کو تیار ہو گئے اور مسلمانوں کو روک دیا، آخر کو اس پر صلح ہوئی کہ اب تو بدون زیارت واپس ہو جائیں اور اگلے برس آ کر عمرہ کریں اور تین روز اطمینان سے مکہ میں رہیں، جب دوسرے برس ذی القعدہ ۷ ہجری میں آپ ﷺ نے مکہ کا قصد فرمایا تو آپ ﷺ کے اصحاب کو یہ اندیشہ تھا کہ اہل مکہ اگر اب بھی وعدہ خلافی کر کے لڑنے بھڑنے کو تیار ہو گئے تو پھر ہم کیا کریں گے؟ لڑیں تو شہر حرام اور حرم مکہ میں کیونکر لڑیں؟ اور نہ لڑیں تو عمرہ کیسے کریں؟ اس پر حکم الٰہی آیا کہ اگر وہ اس مہینہ حرام میں خلاف عہد تم سے لڑیں تو تم بھی بے تامل ان سے لڑو، ہاں! تمہاری طرف سے ابتداء اور زیادتی نہ ہونی چاہیے۔

حج کے ذیل میں عمرہ حدیبیہ کی مناسبت سے قتال کفار کا ذکر آیا، اس لئے جہاد کے بعض احکام و آداب مناسب مقام مذکور فرمائے جاتے ہیں اسکے بعد پھر حج کے احکام بیان ہوں گے۔

فائدہ: ۲ ''زیادتی مت کرو''، اس کے معنی یہ کہ لڑائی میں لڑکے اور عورتیں اور بوڑھے قصداً نہ مارے جائیں اور حرم کے اندر اپنی طرف سے لڑائی شروع نہ کی جائے۔

وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ

اور مار ڈالو ان کو جس جگہ پاؤ اور نکال دو ان کو جہاں سے انہوں نے تم کو نکالا ۱ اور دین سے بچلانا مار ڈالنے سے بھی زیادہ سخت ہے ۲

وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ ۚ فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ ۗ

اور نہ لڑو ان سے مسجد الحرام کے پاس جب تک کہ وہ نہ لڑیں تم سے اس جگہ، پھر اگر وہ خود ہی لڑیں تم سے تو ان کو مارو

كَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۹۱﴾ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۹۲﴾

یہی ہے سزا کافروں کی ۳ پھر اگر وہ باز آئیں تو بیشک اللہ بہت بخشنے والا نہایت مہربان ہے ۴

خلاصہ تفسیر: اور (جس حالت میں وہ خود عہد شکنی کریں تو اس وقت دل کھول کر خواہ) ان کو قتل کرو جہاں ان کو پاؤ، اور (خواہ) ان کو (مکہ سے) نکال باہر کرو، جہاں سے انہوں نے تم کو (تنگ کر کے اور ایذائیں پہنچا کر) نکلنے (اور ہجرت کرنے) پر مجبور کیا ہے، اور (تمہارے اس قتل واخراج کے بعد بھی عقلا الزام انہی پر ہے، کیونکہ عہد شکنی جوان سے واقع ہوگی بڑی شرارت کی بات ہے، اور ایسی) شرارت (نقصان میں) قتل (واخراج) سے بھی سخت تر ہے (کیونکہ ان کی شرارت ہی کی وجہ سے اس قتل واخراج کی نوبت آئی ہے کہ عہد شکنی کی، پس یہ شرارت اصل اور قتل واخراج اس کی فرع ہیں) اور (علاوہ معاہدہ کے ان کے ساتھ قتال شروع کرنے میں ایک اور بات بھی مانع ہے، وہ یہ کہ حرم شریف یعنی مکہ اور اس کا گردونواح ایک واجب الاحترام جگہ ہے، اس میں قتال کرنا اس کے احترام کے خلاف ہے، اس لئے بھی حکم دیا جاتا ہے کہ) ان کے ساتھ مسجد حرام کے قرب (ونواح) میں (جو حرم کہلاتا ہے) قتال مت کرو، جب تک کہ وہ لوگ وہاں تم سے خود نہ لڑیں، ہاں! اگر وہ (کفار) خود ہی لڑنے کا سامان کرنے لگیں تو (اس وقت پھر تم کو بھی اجازت ہے کہ) تم (بھی) ان کو مارو (دھاڑو) ایسے کافروں کی (جو حرم میں لڑنے لگیں) ایسی ہی سزا ہے، پھر اگر (قتال شروع ہونے کے بعد بھی) وہ لوگ (یعنی مشرکین مکہ اپنے کفر سے) باز آجائیں (اور اسلام قبول کرلیں) تو (ان کا اسلام بے قدر نہ سمجھا جائے گا، بلکہ) اللہ تعالیٰ (ان کے گذشتہ کفر کو) بخش دے گا اور (مغفرت کے علاوہ بے شمار نعمتیں دے کر ان پر) مہربانی (بھی) فرمائیں گے۔

* * *

فائدہ: ۱ وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ: ''جس جگہ پاؤ'' یعنی حرم میں ہوں خواہ غیر حرم میں جہاں سے تم کو نکالا یعنی مکہ سے۔

فائدہ: ۲ وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ: یعنی دین سے پھر جانا، یا دوسرے کو پھرانا، مہینہ حرام کے اندر مار ڈالنے سے بہت بڑا گناہ ہے، مطلب یہ کہ حرم مکہ میں کفار کا شرک کرنا اور کرانا زیادہ قبیح ہے حرم میں مقاتلہ کرنے سے، تو اب اے مسلمانو تم کچھ اندیشہ نہ کرو اور جواب ترکی بہ ترکی دو۔

فائدہ: ۳ كَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ: یعنی مکہ ضرور جائے امن ہے، لیکن جب انہوں نے ابتداء کی اور تم پر ظلم کیا اور ایمان لانے پر دشمنی کرنے لگے کہ یہ بات مار ڈالنے سے بھی سخت ہے تو اب ان کو امان نہ رہی، جہاں پاؤ مارو، آخر جب مکہ فتح ہوا تو آپ ﷺ نے یہی فرمادیا کہ جو ہتھیار سامنے کرے اسی کو مارو اور باقی سب کو امن دیا۔

فائدہ: ۴ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ: یعنی باوجود ان سب باتوں کے اگر اب بھی مسلمان ہوں اور شرک سے باز آئیں تو توبہ قبول ہے۔

وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ۭ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۹۳﴾

اور لڑو ان سے یہاں تک کہ نہ باقی رہے فساد اور حکم رہے خدا تعالیٰ ہی کا، پھر اگر وہ باز آئیں تو کسی پر زیادتی نہیں مگر ظالموں پر

خلاصہ تفسیر: اور (اگر وہ لوگ اسلام نہ لائیں تو اگرچہ دوسرے کفار کے لئے اسلامی قانون یہ ہے کہ وہ اپنے مذہب پر رہتے ہوئے بھی اگر اسلامی حکومت کی اطاعت اور جزیہ دینے کا اقرار کرلیں تو ان کا قتل جائز نہیں رہتا، بلکہ ان کے حقوق کی حفاظت اسلامی حکومت پر لازم ہوجاتی ہے، مگر یہ خاص کفار چونکہ اہل عرب ہیں، ان کے لئے قانون جزیہ نہیں، بلکہ ان کے لئے صرف دو راستے ہیں، اسلام یا قتل، اس واسطے) ان کے ساتھ اس حد تک لڑو کہ (ان میں) فساد عقیدہ (یعنی شرک) نہ رہے اور (ان کا) دین (خالص) اللہ ہی کا ہوجائے (اور کسی کا دین ومذہب کا خالص اللہ کے لئے ہوجانا قبول اسلام پر موقوف ہے، تو حاصل یہ ہوا کہ شرک چھوڑ کر اسلام اختیار کرلیں) اور اگر وہ لوگ (کفر سے) باز آجائیں (جس کا ذکر ابھی ہوا ہے) تو (آخرت میں مغفرت ورحمت کے مستحق ہونے کے ساتھ دنیا میں ان کے لئے تم کو یہ قانون بتلایا جاتا ہے کہ سزا کی) سختی کسی پر نہیں ہوا کرتی بجز بے انصافی کرنے والوں کے (جو براہ بے انصافی خدائی احسانات کو بھول کر کفر وشرک کرنے لگیں اور جب یہ لوگ اسلام لے آئے تو بے انصاف نہ رہے، لہٰذا ان پر سزائے قتل کی سختی بھی نہ رہی)۔

* * *

فائدہ: یعنی کافروں سے لڑائی اسی واسطے ہے کہ ظلم موقوف ہو اور کسی کو دین سے گمراہ نہ کرسکیں اور خاص اللہ ہی کا حکم جاری رہے، سو وہ جب شرک سے باز آجائیں تو زیادتی سوائے ظالموں کے اور کسی پر نہیں، یعنی جو بدی سے باز آگئے، وہ اب ظالم نہ رہے تو اب ان پر زیادتی بھی مت کرو ،ہاں! جو فتنہ سے باز نہ رہیں، ان کو شوق سے قتل کرو۔

اَلشَّهۡرُ الۡحَرَامُ بِالشَّهۡرِ الۡحَرَامِ وَالۡحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ؕ فَمَنِ اعۡتَدٰى عَلَيۡكُمۡ فَاعۡتَدُوۡا عَلَيۡهِ

حرمت والا مہینہ بدلا (مقابل) ہے حرمت والے مہینہ کا اور ادب رکھنے میں بدلہ ہے، پھر جس نے تم پر زیادتی کی تم اس پر زیادتی کرو

بِمِثۡلِ مَا اعۡتَدٰى عَلَيۡكُمۡ ۖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعۡلَمُوۡٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الۡمُتَّقِيۡنَ ﴿۱۹۴﴾

جیسی اس نے زیادتی کی تم پر، اور ڈرتے رہو اللہ سے اور جان لو کہ اللہ ساتھ ہے پرہیزگاروں کے

خلاصہ تفسیر: (اور مسلمانو! تم کو جو یہ خیال ہے کہ کفار مکہ اگر اپنے عہد پر قائم نہ رہے تو شہر حرام یعنی ذی قعدہ میں ان سے لڑنا پڑے گا، سو اس سے بھی بے فکر رہو، کیونکہ) حرمت والا مہینہ (تم کو قتال کفار سے مانع ہوسکتا) ہے بعوض (اس کے کہ اس) حرمت والے مہینہ کے (سبب وہ بھی تم سے قتال نہ کریں) اور وجہ یہ ہے کہ یہ حرمتیں تو عوض معاوضہ کی چیزیں ہیں (سو جو تمہارے ساتھ ان حرمتوں کی رعایت کرے تو تم بھی رعایت رکھو اور) جو تم پر (ایسی حرمتوں کی رعایت نہ کرکے) زیادتی کرے تو تم بھی اس پر زیادتی کرو، جیسی اس نے تم پر زیادتی کی ہے، اور (ان سب مذکورہ احکام کے برتاؤ میں) اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو (کہ کسی امر میں قانونی حد سے تجاوز نہ ہونے پائے) اور یقین کرلو کہ اللہ تعالیٰ (اپنی عنایت و رحمت سے) ان ڈرنے والوں کے ساتھ ہوتے ہیں۔

گذشتہ آیتوں کے متعلق چند مسائل ہیں:

مسئلہ: جن کفار سے معاہدہ ہو ان سے ابتداءً قتال شروع کرنا ناجائز ہے، البتہ اگر معاہدہ رکھنا مصلحت نہ ہو تو صاف اطلاع کردی جائے کہ ہم وہ معاہدہ باقی نہیں رکھتے، یا وہ خود معاہدہ توڑ دیں، ان دونوں صورتوں میں ابتداءً قتال کرنا درست ہے، چنانچہ جن لوگوں کے بارے میں یہ آیتیں نازل ہوئیں جب انہوں نے عہد شکنی کی تو ان سے یہاں تک قتل و قتال ہوا کہ مکہ فتح ہو کر دارالاسلام بن گیا، اور اگر معاہدہ نہ ہو تو ابتداءً قتال کرنا جائز ہے بشرطیکہ جواز کی شرائط موجود ہوں۔

مسئلہ: جزیرہ عرب کے اندر جس میں حرم بھی آگیا کفار کو وطن بنانے کی اجازت نہیں، اور اگر بزور لینا چاہیں تو حرم سے باہر تو قتال سے بھی دفع کردینا جائز ہے، اور حرم کے اندر پہلے قتال نہ کریں گے، بلکہ ان کو دوسری طرح تنگ کیا جائے تاکہ خود چھوڑ دیں، اور اگر کسی طرح نہ چھوڑیں اور دفع کردینے کی وجہ سے قتال کے لیے آمادہ ہوں تو اس وقت قتال جائز ہے، اور یہی حکم ہے قتل کرکے حرم میں گھس جانے والے کا، اور اس آیت میں جو عہد شکنی نہ کرنے کی صورت میں ان سے تعرض نہ کرنے کا حکم مفہوم ہوتا ہے تو اس وقت تک جزیرہ عرب میں کفار کے بسنے کی ممانعت نہ ہوئی تھی، پھر آخر میں یہ حکم مقرر ہوگیا۔

مسئلہ: اشہر حرم چار مہینے ہیں، ذیقعدہ، ذی الحجہ، محرم یہ تین ماہ تو مسلسل ہیں چوتھا مہینہ رجب کا ہے، اسلام سے پہلے بھی ان چار مہینوں میں جنگ کو حرام سمجھا جاتا تھا اور مشرکین مکہ بھی اس کے پابند تھے ابتداء اسلام میں بھی ۷ ہجری تک یہی قانون نافذ تھا، اسی لئے صحابہ کرام کو اشکال پیش آیا ،اس کے بعد یہ حرمت قتال منسوخ کرکے عام قتال کی اجازت باجماع امت دے دی گئی، مگر افضل اب بھی یہی ہے کہ ان چار مہینوں میں ابتداء بالقتال نہ کی جائے، صرف مدافعت کی ضرورت سے قتال کیا جائے، اس لحاظ سے یہ کہنا بھی فی الجملہ درست ہے کہ اشہر حرم کی حرمت منسوخ نہیں باقی ہے، جیسے حرم مکہ میں قتال کی اجازت بضرورت مدافعت دینے سے حرم مکہ کی حرمت منسوخ نہیں ہوئی، بلکہ صرف ایک استثنائی صورت پر عمل ہوا۔

* * *

فائدہ: حرمت کا مہینہ یعنی ذیقعدہ کہ جس میں عمرہ کی قضا کرنے جارہے ہو بدلہ ہے اس حرمت کے مہینہ یعنی ذیقعدہ کا کہ سال گزشتہ میں اسی مہینہ کے اندر کفار مکہ نے تم کو عمرہ سے روک دیا تھا اور مکہ میں جانے نہ دیا تھا، یعنی اب تم شوق سے ان سے بدلہ لو، کیونکہ ادب اور حرمت رکھنے میں تو برابری ہے، یعنی اگر کوئی کافر ماہ حرام کی حرمت کرے اور اس مہینہ میں تم سے نہ لڑے، تو تم بھی ایسا ہی کرو، مکہ والے جو سال گزشتہ میں تم پر ظلم کر چکے اور نہ ماہ حرام کی حرمت کی، نہ حرم مکہ کی، نہ تمہارے احرام کا لحاظ کیا اور تم نے اس پر بھی صبر کیا، اگر اس دفعہ بھی سب حرمتوں سے قطع نظر کر کے آمادہ جنگ ہوں تو تم بھی کسی حرمت کا خیال مت کرو، بلکہ اگلی پچھلی سب کسر مٹالو، مگر جو کرو خدا سے ڈر کر کرو، اس کے خلاف اجازت ہرگز نہ ہو اور اللہ تعالیٰ پرہیزگاروں کا بیشک ناصر و مددگار ہے۔

وَاَنۡفِقُوۡا فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ وَلَا تُلۡقُوۡا بِاَيۡدِيۡكُمۡ اِلَى التَّهۡلُكَةِ ۛۚ وَاَحۡسِنُوۡا ۛۚ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الۡمُحۡسِنِيۡنَ ﴿۱۹۵﴾

اور خرچ کر اللہ کی راہ میں اور نہ ڈالو اپنی جان کو ہلاکت میں اور نیکی کرو بیشک اللہ دوست رکھتا ہے نیکی کرنے والوں کو

خلاصہ تفسیر: اور تم لوگ (جان کے ساتھ مال بھی) خرچ کیا کرو اللہ کی راہ (یعنی جہاد) میں، اور اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں تباہی میں مت ڈالو (کہ ایسے مواقع میں جان و مال خرچ کرنے سے بزدلی یا بخل کرنے لگو، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم کمزور ہو جاؤ گے اور مخالف مضبوط جو کہ عین تباہی ہے) اور (جو) کام (کرو) اچھی طرح کیا کرو (مثلاً اس موقع پر خرچ کرنا ہے تو دل کھول کر خوشی سے اچھی نیت کے ساتھ خرچ کرو) بلاشبہ اللہ تعالیٰ پسند کرتے ہیں اچھی طرح کام کرنے والوں کو۔

وَلَا تُلۡقُوۡا بِاَيۡدِيۡكُمۡ اِلَى التَّهۡلُكَةِ: خلاصہ تفسیر میں جو فرمایا کہ "اپنے ہاتھوں" اس قید کا حاصل یہ ہے کہ اپنے اختیار سے کوئی کام خلاف حکم نہ کرے، اور جو کام بلا قصد و اختیار کچھ ہو جائے تو وہ معاف ہے۔

وَلَا تُلۡقُوۡا بِاَيۡدِيۡكُمۡ اِلَى التَّهۡلُكَةِ: اس کی تفسیر یہ بھی کی گئی ہے کہ غزوہ اور اس میں خرچ کرنا مت چھوڑو، ورنہ ہلاکت میں پڑ جاؤ گے، سو یہ اس بات پر دلیل ہے کہ معانی کے اعتبار کو ظاہری صورت پر ترجیح حاصل ہے کہ جو چیز ظاہراً اور صورتاً ہلاکت کی ضد ہے اس کے معنی کا اعتبار کر کے ہلاکت فرمایا گیا۔

* * *

فائدہ: مطلب یہ ہے کہ اللہ کی اطاعت میں، یعنی جہاد وغیرہ میں اپنے مال کو صرف کرو اور اپنی جان کو ہلاکت میں نہ ڈالو، یعنی جہاد کو چھوڑ بیٹھو، یا اپنے مال کو جہاد میں صرف نہ کرو کہ اس سے تم ضعیف اور دشمن قوی ہوگا۔

وَاَتِمُّوا الۡحَجَّ وَالۡعُمۡرَةَ لِلّٰهِ ؕ فَاِنۡ اُحۡصِرۡتُمۡ فَمَا اسۡتَيۡسَرَ مِنَ الۡهَدۡىِ ۚ وَلَا تَحۡلِقُوۡا رُءُوۡسَكُمۡ

اور پورا کرو حج اور عمرہ اللہ کے واسطے ۱؎ پھر اگر تم روک دیئے جاؤ تو تم پر ہے جو کچھ کہ میسر ہو قربانی سے، اور حجامت نہ کرو اپنے سروں کی

حَتّٰى يَبۡلُغَ الۡهَدۡىُ مَحِلَّهٗ ؕ فَمَنۡ كَانَ مِنۡكُمۡ مَّرِيۡضًا اَوۡ بِهٖۤ اَذًى مِّنۡ رَّاۡسِهٖ فَفِدۡيَةٌ مِّنۡ صِيَامٍ

جب تک پہنچ نہ چکے قربانی اپنے ٹھکانے پر ۲؎ پھر جو کوئی تم میں سے بیمار ہو یا اس کو تکلیف ہو سر کی تو بدلا دیوے روزے

اَوۡ صَدَقَةٍ اَوۡ نُسُكٍ ۚ

یا خیرات یا قربانی ۳؎

خلاصہ تفسیر: اور (جب حج یا عمرہ کرنا ہو تو اس) حج اور عمرہ کو اللہ تعالیٰ کے (راضی کرنے کے) واسطے پورا پورا ادا کیا کرو (کہ

اعمال وآداب بھی سب بجالاؤ اور نیت بھی خالص ثواب ہی کی ہو) پھر اگر (کسی دشمن کی جانب سے، یا کسی مرض کی وجہ سے حج وعمرہ کے پورا کرنے سے) روک دیئے جاؤ تو (اس حالت میں یہ حکم ہے کہ) قربانی کا جانور جو کچھ میسر ہو (ذبح کرے اور حج وعمرہ کی جو وضع اختیار کر رکھی تھی موقوف کرے، اس کو احرام کھولنا کہتے ہیں، اس کا طریقہ شریعت میں سر منڈانا ہے اور بال کٹا دینے کا بھی یہی اثر ہے) اور (یہ نہیں کہ فوراً روک ٹوک کے ساتھ ہی تم کو احرام کھولنا درست ہو جائے، بلکہ) اپنے سروں کو (احرام کھولنے کی غرض سے) اس وقت تک مت منڈاؤ جب تک کہ (وہ) قربانی (کا جانور جس کے ذبح کا اس حالت میں حکم تھا) اپنے موقع پر نہ پہنچ جائے (اور وہ موقع حرم ہے کہ اس قربانی کا جانور حدود حرم ہی میں ذبح کیا جاسکتا ہے، وہاں اگر خود نہ جاسکے تو کسی کے ہاتھ بھیج کر ذبح کرایا جائے، جب جانور ذبح ہو جائے، اس وقت احرام کھولنا جائز ہوگا) البتہ اگر کوئی تم میں سے (کچھ) بیمار ہو، یا اس کے سر میں کچھ (زخم یا درد یا جوؤں وغیرہ کی) تکلیف ہو (اور اس بیماری یا تکلیف کی وجہ سے پہلے ہی سر منڈانے کی ضرورت پڑے) تو (اس کو اجازت ہے کہ وہ سر منڈا کر) فدیہ (یعنی شرعی بدلہ) دے دے (یعنی خواہ تین) روزے سے، یا (چھ مسکینوں کو فی مسکین صدقہ فطر کے برابر یعنی نصف صاع گیہوں) خیرات (کے طور پر) دے دینے سے، یا (ایک بکری) ذبح کر دینے سے۔

وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ: جس شخص کے پاس مکہ پہنچنے کا سامان اور استطاعت ہو اس پر تو حج ابتداءً ہی فرض ہے، اور جس کو استطاعت نہ ہو اور وہ شروع کر دے، یعنی احرام باندھ لے اس پر حج کرنا فرض ہو جاتا ہے، اور عمرہ فرض وواجب نہیں، بلکہ سنت مؤکدہ ہے، البتہ شروع کرنے سے اس کا بھی پورا کرنا واجب ہو جاتا ہے، سورہ آل عمران میں حج کا فرض ہونا مذکور ہے، یہاں حج کے ساتھ عمرہ کا بھی ذکر ہے، سو اس میں اصل وجوب اور فرضیت کا بیان نہیں، بلکہ اس کا ذکر ہے کہ جب کوئی شخص حج یا عمرہ کو بذریعہ احرام شروع کر دے تو اس کا پورا کرنا واجب ہو جاتا ہے، جیسے عام نفلی نماز اور روزہ کا بھی یہی حکم ہے کہ شروع کرنے سے واجب ہو جاتے ہیں، اس لیے اس آیت سے یہ مسئلہ معلوم نہیں ہوتا کہ عمرہ واجب ہے یا نہیں، صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شروع کر دے تو اس کا پورا کرنا واجب ہے۔

فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ: آیت مذکورہ میں جب یہ بیان ہوا کہ حج یا عمرہ کا احرام باندھ لیں تو ان کا پورا کرنا واجب ہو جاتا ہے تو اب یہ سوال پیدا ہوا کہ اگر احرام باندھنے کے بعد کوئی مجبوری پیش آجائے حج وعمرہ ادا نہ کر سکیں تو کیا کریں اس کا بیان بعد کے جملہ میں **فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ** سے فرمادیا، یہ آیت چونکہ واقعہ حدیبیہ میں نازل ہوئی ہے جس میں آنحضرت ﷺ اور صحابہ کرام نے عمرہ کا احرام باندھا ہوا تھا کفار مکہ نے مکہ میں داخل ہونے اور عمرہ ادا کرنے سے روک دیا اس پر یہ حکم نازل ہوا کہ احرام کا فدیہ ایک قربانی دینا ہے بکری، گائے، اونٹ وغیرہ کی جو آسان ہو قربانی دے کر احرام کھول دیں مگر ساتھ ہی اگلے جملے **وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ** میں یہ بھی بتلادیا کہ احرام کھولنا جس کی شرعی صورت سر کے بال منڈوانا یا کٹوانا ہے اس وقت تک جائز نہیں جب تک محرم کی قربانی اپنے موقع پر پہنچ کر ذبح نہ ہو جائے، موقع پر پہنچنے سے مراد امام اعظم ابوحنیفہ کے نزدیک یہ ہے کہ حدود حرم میں پہنچ کر ذبح کی جائے، خود نہ کر سکیں تو کسی دوسرے سے کرادیں، اس آیت میں مجبوری کی یہ صورت کہ کوئی دشمن حائل ہو جائے صراحۃً مذکور ہے، امام اعظم ابوحنیفہ اور بعض دوسرے ائمہ نے بیماری وغیرہ کی مجبوری کو بھی اس میں باشتراک علت داخل قرار دیا ہے اور رسول اللہ ﷺ کے عملی بیان سے یہ امر بھی ثابت ہو گیا کہ مجبوری کی حالت میں قربانی دے کر احرام کھول دینا جائز ہے مگر بعد میں قضاء کرنا واجب ہے جیسا آنحضرت ﷺ اور صحابہ کرام نے اگلے سال عمرہ کی قضا کی ہے۔

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖٓ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ: اس آیت میں سر منڈانے کو احرام کھولنے کی علامت قرار دیا گیا جس سے ثابت ہوا کہ حالت احرام میں سر منڈانا یا بال کٹوانا ممنوع ہے اس کی مناسبت سے اگلا حکم یہ بتلایا گیا کہ جو شخص حج وعمرہ کے افعال ادا کرنے سے تو مجبور نہیں مگر حالت احرام میں کوئی مجبوری سر کے بال منڈانے یا کٹوانے کی پیش آجائے تو وہ کیا کرے، سو یہاں: **فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا** میں ارشاد فرمایا کہ اگر کسی بیماری کے سبب سر یا بدن کے کسی دوسرے حصہ کے بال منڈانے کی مجبوری ہو یا سر میں جوویں پیدا ہو کر تکلیف دے رہی ہوں تو ایسی صورت میں

بال منڈانا بقدر ضرورت جائز ہے مگر اس کا فدیہ اور بدلہ یہ ہے کہ روزے رکھے یا صدقہ دے یا قربانی کرے، قربانی کے لئے تو حدود حرم کی جگہ متعین ہے، روزے اور صدقہ کے لئے کوئی جگہ متعین نہیں ہر جگہ ادا کر سکتا ہے، قرآن کے الفاظ میں صیام کا کوئی عدد اور صدقہ کی کوئی مقدار مذکور نہیں ہے، مگر حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے حضرت کعب بن عجرہ صحابی کی ایسی ہی حالت میں یہ فرمایا کہ تین روزے رکھیں یا چھ مسکینوں کو آدھا صاع گندم کا بطور صدقہ دے دیں، آدھا صاع ہمارے اسی تولہ کے سیر کے حساب سے تقریباً پونے دو سیر گندم ہوتے ہیں ان کی قیمت صدقہ کر دینا بھی کافی ہے۔

* * *

فائدہ: ۱۔ وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ: حج کے ضمن میں جہاد کا ذکر جو مناسب تھا اسکو بیان فرما کر اب احکام حج و عمرہ بتلائے جاتے ہیں۔

فائدہ: ۲۔ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ: مطلب یہ ہے کہ جب کسی نے حج یا عمرہ شروع کیا، یعنی اس کا احرام باندھا، تو اس کو پورا کرنا لازم ہو گیا، بیچ میں چھوڑ بیٹھے اور احرام سے نکل جائے، یہ نہیں ہو سکتا، لیکن اگر کوئی دشمن یا مرض کی وجہ سے بیچ ہی میں رک گیا اور حج و عمرہ نہیں کر سکتا تو اس کے ذمہ پر ہے قربانی جو اس کو میسر آئے، جس کا ادنیٰ مرتبہ ایک بکری ہے، اس قربانی کو کسی کے ہاتھ مکہ کو بھیجے اور یہ مقرر کر دے کہ فلاں روز اس کو حرم مکہ میں پہنچ کر ذبح کر دینا اور جب اطمینان ہو جائے کہ اب اپنے ٹھکانے یعنی حرم میں پہنچ کر اس کی قربانی ہو چکی ہوگی، اس وقت سر کی حجامت کرا دے، اس سے پہلے ہرگز نہ کرائے، اس کو "دم احصار" کہتے ہیں کہ حج یا عمرہ سے رکنے کی وجہ سے لازم ہوتا ہے۔

فائدہ: ۳۔ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ: یعنی اگر حالت احرام میں کوئی بیمار ہو یا اس کے سر میں درد یا سر میں زخم ہو تو اس کو بضرورت حالت احرام میں حجامت کرنا سر کا جائز ہے مگر بدلا دینا پڑے گا، تین روزے، یا چھ محتاجوں کو کھانا کھلانا، یا ایک دُنبے، یا بکرے کی قربانی کرنا، یہ دم جنایت ہے کہ حالت احرام میں بضرورت مرض لاچار ہو کر امور مخالف احرام کرنے پڑے۔

فَاِذَآ اَمِنْتُمْ ۗ فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ

پھر جب تمہاری خاطر جمع ہو تو جو کوئی فائدہ اٹھائے عمرہ کو ملا کر حج کے ساتھ تو اس پر ہے جو کچھ میسر ہو قربانی سے ۱۔ پھر جس کو قربانی نہ ملے

فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِى الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ ۭ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ۭ ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ

تو روزے رکھے تین حج کے دنوں میں اور سات روزے جب لوٹو، یہ دس روزے ہوئے پورے ۲۔ یہ حکم اس کے لیے ہے

اَهْلُهٗ حَاضِرِى الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۱۹۶﴾ ع ۲۴/۸

جس کے گھر والے نہ رہتے ہوں مسجد الحرام کے پاس ۳۔ اور ڈرتے رہو اللہ سے اور جان لو کہ بیشک اللہ کا عذاب سخت ہے

خلاصہ تفسیر: پھر جب تم امن کی حالت میں ہو (خواہ تو پہلے ہی سے کوئی خوف و مزاحمت پیش نہیں آئی، یا آ کر ختم ہو گئی) تو (اس صورت میں حج و عمرہ کے متعلق قربانی کرنا ہر ایک کے ذمہ نہیں ہے، بلکہ خاص) جو شخص عمرہ سے اس کو حج کے ساتھ ملا کر منتفع ہوا ہو (یعنی ایام حج میں عمرہ بھی کیا ہو) تو (فقط اس پر واجب ہے کہ) جو کچھ قربانی میسر ہو (ذبح کرے، اور جس نے صرف عمرہ کیا ہو، یا صرف حج کیا ہو، اس پر حج یا عمرہ کے متعلق کوئی قربانی نہیں) پھر (ایام حج میں حج و عمرہ کو جمع کرنے والوں میں سے) جس شخص کو قربانی کا جانور میسر نہ ہو (مثلاً غریب ہے) تو (اس کے ذمہ قربانی کے بجائے) تین دن کے روزے ہیں (ایام) حج میں (کہ ان ایام کا آخر ذی الحجہ کی نویں تاریخ ہے) اور سات (دن کے روزے) ہیں جبکہ حج سے تمہارے لوٹنے کا وقت آ جائے (یعنی حج کر چکو، خواہ لوٹنا ہو یا وہیں رہنا ہو) یہ پورے دس (دن کے روزے) ہوئے (اور یہ بھی یاد رکھو کہ ابھی جو حج و عمرہ کے ملانے کا حکم ہوا ہے) یہ (ملانا ہر ایک کو درست نہیں، بلکہ خاص) اس شخص کے لئے (درست) ہے جس کے اہل (وعیال) مسجد حرام (یعنی کعبہ) کے قرب (نواح) میں نہ رہتے ہوں (یعنی حدود حرم میں ان کا وطن نہ ہو مطلب یہ کہ میقات کے اندر اس کا گھر نہ ہو) اور (ان سب احکام کی

بجا آوری میں) اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو (کہ کسی امر میں خلاف نہ ہوجائے) اور (خوب) جان لو کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ (بے باکی اور مخالفت کرنے والوں کو) سزائے سخت دیتے ہیں۔

فَمَنۡ تَمَتَّعَ بِالۡعُمۡرَةِ إِلَى الۡحَجِّ: اسلام سے پہلے عرب اہل جاہلیت کا خیال تھا کہ جب حج کے مہینے شروع ہوجائیں یعنی ماہ شوال شروع ہوجائے تو ان ایام میں حج وعمرہ کا جمع کرنا سخت گناہ ہے، اس آیت کے آخری حصے میں ان کے اس خیال کی اصلاح اس طرح کردی گئی کہ حدود میقات کے اندر رہنے والوں کے لئے تو حج وعمرہ دونوں کو اشہر حج میں جمع کرنا ممنوع رکھا گیا، کیونکہ ان کو اشہر حج کے بعد دوبارہ عمرہ کے لئے سفر کرنا مشکل نہیں لیکن حدود میقات کے باہر سے آنے والوں کے لئے جمع کرنے کو جائز قرار دیا کہ دور دراز سے عمرہ کے لئے مستقل سفر کرنا ان کے لئے آسان نہیں، میقات وہ معین مقامات ہیں جو اطراف عالم سے مکہ میں آنے والوں کے ہر راستہ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے متعین ہیں کہ جب بقصد مکہ آنے والا مسافر یہاں پہنچے تو یہاں سے حج یا عمرہ کی نیت سے احرام باندھنا لازم ہے بغیر احرام کے یہاں سے آگے بڑھنا جرم وگناہ ہے، یہاں لِمَنۡ لَّمۡ يَكُنۡ اَهۡلُهٗ حَاضِرِي الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ کا یہی مفہوم ہے کہ جس شخص کے اہل وعیال مسجد حرام کے قرب وجوار یعنی حدود میقات کے اندر نہیں رہتے، مقصد یہ ہے کہ اس کا وطن حدود میقات کے اندر نہیں ہے اس کیلئے حج وعمرہ کو اشہر حج میں جمع کرنا جائز ہے، البتہ جو لوگ حج وعمرہ کو اشہر حج میں جمع کریں ان پر واجب ہے کہ دونوں عبادتوں کو جمع کرنے کا شکرانہ ادا کریں وہ یہ ہے کہ جس کو قربانی دینے کی قدرت ہو وہ ایک قربانی دے دے بکری، گائے، اونٹ جو اس کے لئے آسان ہو، لیکن جس شخص کی مالی حیثیت قربانی ادا کرنے کے قابل نہیں اس پر دس روزے اس طرح واجب ہیں کہ تین روزے تو ایام حج کے اندر ہی رکھے یعنی نویں ذی الحجہ تک پورے کردے، باقی سات روزے حج سے فارغ ہوکر جہاں چاہے اور جب چاہے رکھے وہیں مکہ مکرمہ میں رہ کر پورے کرے یا گھر واپس آکر اختیار ہے، اگر کوئی شخص تین روزے ایام حج میں نہ رکھ سکا تو پھر امام اعظم ابوحنیفہ اور اکابر صحابہ کے نزدیک اس کے لئے قربانی کرنا ہی متعین ہے جب قدرت ہو کسی کے ذریعہ حرم میں قربانی کرادے۔

اشہر حج میں حج کے ساتھ عمرہ کو جمع کرنے کی دو صورتیں ہیں: ① ایک یہ کہ میقات سے ہی حج اور عمرہ دونوں کا احرام ایک ساتھ باندھ لے اس کو اصطلاح حدیث میں ''قران'' کہا گیا ہے، اس کا احرام حج کے احرام کے ساتھ کھلتا ہے، آخر ایام حج تک اس کو احرام ہی کی حالت میں رہنا پڑتا ہے، ② دوسرے یہ کہ میقات سے صرف عمرہ کا احرام باندھے اور مکہ مکرمہ پہنچ کر عمرہ کے افعال ادا کرکے احرام کھول دے، پھر آٹھویں ذی الحجہ کو منیٰ جانے کے وقت حج کا احرام حرم شریف کے اندر ہی باندھ لے اس کو اصطلاح میں ''تمتع'' کہا جاتا ہے اور لفظی معنی کے اعتبار سے لفظ تمتع دونوں صورتوں میں برابر ہے قرآن کی آیت مذکورہ میں فَمَنۡ تَمَتَّعَ اسی عام معنی میں ہے۔

ذٰلِكَ لِمَنۡ لَّمۡ يَكُنۡ اَهۡلُهٗ حَاضِرِي الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ ذٰلك کا مشار الیہ حنفیہ کے نزدیک تمتع ہے اور اسی کے حکم میں قران ہے، اہل مکہ کے لیے حج قران اور تمتع جائز نہیں ہے، یہ دونوں صرف آفاقی یعنی باہر والوں کے لیے جائز ہیں، بندہ کہتا ہے کہ اگر اس کی حکمت میں یہ کہا جائے کہ اگر مکہ والوں کو بھی اس کی اجازت ہوتی تو ہوسکتا ہے کہ باہر سے آنے والے یہ سعادت حاصل نہ کرسکتے، مکہ والے تو مکہ میں ہی رہتے ہیں، جب مرضی عمرہ کرسکتے ہیں، جبکہ آفاقی یعنی باہر والا بار بار آجا نہیں سکتا، اس لیے اس کے لیے تمتع وقران دو صورتیں پیدا کردی گئیں کہ عمرہ اور حج دونوں ساتھ ساتھ کرسکتا ہے، اس حکمت کی بنا پر یہ آیت اس پر دلالت کرے گی کہ جو لوگ شیخ اور استاذ کی خدمت میں پہلے سے حاضر ہیں ان کو چاہیے کہ ان مسافرین کی رعایت کریں جو شیخ کے پاس دور سے آتے ہیں ان کو ملنے کا موقع دیں، یہ نہ ہو کہ اس وقت بھی یہی آگے آگے رہیں اور دور سے آنے والا شخص اپنی حاجت اور ضرورت پوری نہ کرسکے اور اس کا جانے کا وقت آجائے۔

* * *

فائدہ: ۱۔ فَمَنۡ تَمَتَّعَ بِالۡعُمۡرَةِ إِلَى الۡحَجِّ فَمَا اسۡتَيۡسَرَ مِنَ الۡهَدۡيِ: یعنی جو محرم کہ دشمن کی طرف سے اور مرض سے مطمئن ہوخواہ اس کو کسی قسم کا اندیشہ پیش ہی نہ آیا یا دشمن کا خوف یا بیماری کا کھٹکا پیش تو آیا مگر جلد زائل ہوگیا احرام حج وعمرہ میں اس سے خلل نہ آنے پایا تو اس کو دیکھنا

چاہیے کہ اس نے حج اور عمرہ دونوں ادا کئے، یعنی قران میں تمتع کیا افراد نہیں کیا تو اس پر قربانی ایک بکرا، یا ساتواں حصہ اونٹ کا یا گائے کا لازم ہے اس کو دم قران اور دم تمتع کہتے ہیں امام ابوحنیفہ اس کو دم شکر کہتے ہیں اور اس کو اس میں سے کھانے کی اجازت دیتے ہیں اور امام شافعی اس کو دم جبر کہتے ہیں اور قربانی کرنے والے کو اس میں سے کھانے کی اجازت بھی نہیں دیتے۔

فائدہ: ۲۔ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ: یعنی جس نے قران یا تمتع کیا اور اسکو قربانی میسر نہ ہوئی تو اس کو چاہیے کہ تین روزے رکھے حج کے دنوں میں جو کہ یوم عرفہ یعنی نویں ذی الحجہ پر ختم ہوتے ہیں اور سات روزے جب رکھے کہ حج سے بالکل فارغ ہو جائے دونوں کا مجموعہ دس روزے ہو گیا۔

فائدہ: ۳۔ لِّمَنۡ لَّمۡ يَكُنۡ اَهۡلُهٗ حَاضِرِى الۡمَسۡجِدِ الۡحَـرَامِ: یعنی قران وتمتع اس کے لئے ہے جو مسجد حرام یعنی حرم مکہ کے اندر یا اس کے قریب نہ رہتا ہو بلکہ حل یعنی خارج از میقات کا رہنے والا ہو اور جو حرم مکہ کے رہنے والے ہیں وہ صرف افراد کریں۔

اَلۡحَجُّ اَشۡهُرٌ مَّعۡلُوۡمٰتٌ ۚ فَمَنۡ فَرَضَ فِيۡهِنَّ الۡحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوۡقَ ۙ وَلَا جِدَالَ فِى الۡحَجِّ ؕ

حج کے چند مہینے ہیں معلوم ۱۔ پھر جس نے لازم کر لیا ان میں حج تو بے حجاب ہونا جائز نہیں عورت سے اور نہ گناہ کرنا اور نہ جھگڑا کرنا حج کے زمانہ میں

وَمَا تَفۡعَلُوۡا مِنۡ خَيۡرٍ يَّعۡلَمۡهُ اللّٰهُ ؕ وَتَزَوَّدُوۡا فَاِنَّ خَيۡرَ الزَّادِ التَّقۡوٰى ۚ وَاتَّقُوۡنِ يٰٓاُولِى الۡاَلۡبَابِ ﴿۱۹۷﴾

اور جو کچھ تم کرتے ہو نیکی اللہ اس کو جانتا ہے ۲۔ اور زاد راہ لے لیا کرو کہ بیشک بہتر فائدہ زاد راہ کا بچنا ہے، مجھ سے ڈرتے رہو اے عقلمندو ۳۔

خلاصہ تفسیر: (زمانہ افعال) حج (کا) چند مہینے ہیں جو (مشہور و) معلوم ہیں (ایک شوال، دوسرا ذی قعدہ، تیسرا دس تاریخیں ذی الحجہ کی) سو جو شخص ان (ایام) میں (اپنے ذمہ) حج مقرر کرلے (کہ حج کا احرام باندھ لے) تو پھر (اس شخص کو) نہ کوئی فحش بات (جائز) ہے، اور نہ کوئی بے حکمی (درست) ہے، اور نہ کسی قسم کا نزاع (وتکرار) زیبا ہے (بلکہ اس کو چاہئے کہ ہر وقت نیک ہی کاموں میں لگا رہے) اور جو نیک کام کرو گے اللہ تعالیٰ کو اس کی اطلاع ہوتی ہے (سو اس کا ثمرہ تم کو عنایت ہوگا) اور (جب حج کو جانے لگو تو) خرچ ضرور (ساتھ) لے لیا کرو، سب سے بڑی بات (اور خوبی) خرچ میں (گداگری سے) بچا رہنا ہے، اور اے ذی عقل لوگو! (ان احکام کی تعمیل میں) مجھ سے ڈرتے رہو (اور کسی حکم کے خلاف مت کرو)۔

فَلَا رَفَثَ: فحش بات دو طرح کی ہے: ① ایک وہ جو پہلے ہی سے حرام ہے، وہ حج کی حالت میں اور بھی زیادہ حرام ہوگی ② دوسرے وہ جو پہلے سے حلال تھی جیسے اپنی بیوی سے بے حیائی اور بے حجابی کی باتیں کرنا، حج میں یہ بھی درست نہیں۔

وَلَا فُسُوۡقَ: اسی طرح بے حکمی بھی دو طرح کی ہے: ① ایک وہ جو پہلے سے بھی حرام ہے جیسے تمام گناہ، یہ حج کی حالت میں زیادہ حرام ہے ② دوسرے وہ امور جو خاص حج کی وجہ سے ممنوع ہو گئے، جیسے خوشبو لگانا، بال کٹانا وغیرہ، سو حج میں یہ امور نا جائز ہوتے ہیں۔

وَلَا جِدَالَ فِى الۡحَجِّ: اسی طرح رفیقوں سے لڑنا جھگڑنا ویسے بھی برا ہے مگر حج کی حالت میں اور زیادہ برا ہے۔

فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوۡقَ وَلَا جِدَالَ فِى الۡحَجِّ: اس میں اس بات پر دلالت ہے کہ خواص کے ذمہ بعض ایسی چیزیں لازم ہوتی ہیں جو عوام کے ذمہ نہیں ہوتیں، مثلاً سڑکوں پر بیٹھنا، لایعنی باتیں کرنا خواص سے مناسب نہیں سمجھا جاتا، جبکہ عوام کو کچھ نہیں کہا جاتا، اسی طرح حج میں بندہ اللہ سے بہت زیادہ قریب ہوتا ہے تو اس وقت گناہ یا لڑائی جھگڑا کا صادر ہونا اتنا برا ہے کہ غیر حج میں اتنا برا نہیں۔

وَاتَّقُوۡنِ يٰٓاُولِى الۡاَلۡبَابِ: یہ تقویٰ کا حکم ماقبل یعنی گذشتہ جملہ میں امر بالزاد کے لیے گویا مقدمہ ثانیہ ہے، اور تقریر یہ ہے کہ زاد راہ سبب ہے تقویٰ کا اور تقویٰ واجب ہے، نتیجہ یہ نکلا کہ زاد راہ سبب ہے واجب کا، سو زاد راہ بھی واجب ہے، یہ تصوف کے بہت سے مسائل کی اصل ہے جن کی طرف اہل ظاہر کی نظر اس لیے نہیں گئی کہ ان کی نظر دقیق نہیں ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ: شوال کے غرہ سے لے کر بقرعید کی صبح یعنی ذی الحجہ کی دسویں رات تک ان کا نام اشہر حج ہے، اس لئے کہ احرام حج ان کے اندر ہوتا ہے، اگر اس سے پہلے کوئی احرام حج کا باندھے گا تو وہ ناجائز یا مکروہ ہوگا، یعنی حج کے لئے چند مہینے مقرر ہیں اور سب کو معلوم ہیں، مشرکین عرب جو اپنی ضرورت میں ان میں تغیر تبدّل کرتے تھے، جس کو دوسری آیت میں اِنَّمَا النَّسِیْٓءُ زِیَادَةٌ فِی الْکُفْرِ (التوبہ: ۳۷) فرمایا گیا ہے، یہ بالکل بے اصل اور باطل ہے۔

فائدہ: ۲ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَیْرٍ یَّعْلَمْهُ اللّٰهُ: ''حج لازم کیا'' یعنی احرام حج کا باندھا اس طرح پر کہ دل سے نیت کی اور زبان سے تلبیہ پڑھا۔

فائدہ: ۳ وَاتَّقُوْنِ یٰٓاُولِی الْاَلْبَابِ: ایک غلط دستور کفر میں یہ بھی تھا کہ بغیر زادِ راہ خالی ہاتھ حج کو جانا ثواب سمجھتے اور اسکو توکل کہتے اور وہاں جا کر ہر ایک سے مانگتے پھرتے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جن کو مقدور ہو وہ خرچ ہمراہ لے جائیں تا کہ خود تو سوال سے بچیں اور لوگوں کو حیران نہ کریں۔

لَیْسَ عَلَیْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ

کچھ گناہ نہیں تم پر کہ تلاش کرو فضل اپنے رب کا ۱ پھر جب طواف کے لئے لوٹو عرفات سے تو یاد کرو اللہ کو

عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ۪ وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ ۚ وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّیْنَ ﴿۱۹۸﴾

نزدیک مشعر الحرام کے ۲ اور اس کو یاد کرو جس طرح تم کو سکھلایا، اور بیشک تم تھے اس سے پہلے ناواقف ۳

خلاصہ تفسیر: (اور اگر حج میں کچھ اسباب تجارت ہمراہ لے جانا مصلحت سمجھو تو) تم کو اس میں ذرا بھی گناہ نہیں کہ (حج میں) معاش کی تلاش کرو جو (تمہاری قسمت میں) تمہارے پروردگار کی طرف سے (لکھی) ہے، پھر جب تم لوگ عرفات (میں ٹھہر کر وہاں) سے واپس آنے لگو تو مشعر حرام کے پاس (یعنی مزدلفہ میں آکر شب کو وہاں قیام کر کے) خدا تعالیٰ کی یاد کرو، اور (یاد کرنے کے طریقہ میں اپنی رائے کو دخل مت دو، بلکہ) اس طرح یاد کرو جس طرح تم کو (اللہ تعالیٰ نے) بتلا رکھا ہے، اور حقیقت میں قبل اس (بتلانے) کے تم محض ہی ناواقف تھے۔

لَیْسَ عَلَیْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ: تجارت کی اجازت کی صراحت اس لیے فرمائی کہ اسلام سے قبل ان ایام میں تجارت کیا کرتے تھے، اسلام کے بعد شبہ ہوا کہ شاید گناہ ہو، اس لیے گناہ نہ ہونا بتلا دیا، الغرض اس آیت نے یہ واضح کر دیا کہ اگر کوئی شخص دوران حج میں کوئی بیع و شراء یا مزدوری کرے جس سے کچھ نفع ہو جائے تو اس میں کوئی گناہ نہیں، ہاں کفار عرب نے جو حج کو تجارت کی منڈی اور نمائش گاہ بنا لیا تھا اس کی اصلاح قرآن کے دو لفظوں سے کر دی گئی ایک تو یہ کہ جو کچھ کمائیں اس کو اللہ تعالیٰ کا فضل اور عطا سمجھ کر حاصل کریں شکر گذار ہوں، محض سرمایہ سمیٹنا مقصد نہ ہو فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ میں اسی کی طرف اشارہ ہے، دوسرے لَیْسَ عَلَیْكُمْ جُنَاحٌ کے لفظ نے یہ بتلا دیا کہ اس کمائی میں تم پر کوئی گناہ نہیں، جس میں ایک اشارہ اس طرف ہے کہ اگر اس سے بھی اجتناب کیا جائے تو بہتر ہے، کیونکہ اخلاص کامل میں فرق آتا ہے اور حقیقت مسئلہ کی یہ ہے کہ اس کا مدار اصل نیت پر ہے، اگر کسی شخص کی نیت اصل میں دنیوی نفع تجارت یا مزدوری ہے اور ضمنی طور پر حج کا بھی قصد کر لیا یا نفع تجارت اور قصد حج دونوں مساوی صورت میں ہیں تب تو یہ اخلاص کے خلاف ہے، حج کا ثواب اس سے کم ہو جائیگا اور برکات حج جیسی حاصل ہونی چاہیے وہ حاصل نہ ہوں گی، اور اگر اصل میں نیت حج کی ہے اسی کے شوق میں نکلا ہے، لیکن مصارف حج میں یا گھر کی ضرورت میں تنگی ہے اس کو پورا کرنے کے لئے کوئی معمولی تجارت یا مزدوری کر لی، یہ اخلاص کے بالکل منافی نہیں، ہاں! اس میں بھی بہتر یہ ہے کہ خاص ان پانچ ایام میں جن میں حج کے افعال ادا ہوتے ہیں ان میں کوئی مشغلہ تجارت و مزدوری کا نہ رکھے، بلکہ ان ایام کو خالص عبادت و ذکر میں گذارے، اسی وجہ سے بعض علماء نے خاص ان ایام میں تجارت و مزدوری کو ممنوع بھی فرمایا ہے۔

فَإِذَآ أَفَضۡتُم مِّنۡ عَرَفَٰتٖ فَٱذۡكُرُواْ ٱللَّهَ عِندَ ٱلۡمَشۡعَرِ ٱلۡحَرَامِ: حج کے لیے مکہ سے عرفات جا کر نویں ذی الحجہ کو وہاں ٹھہرتے ہیں، راستے میں منیٰ اور مزدلفہ پڑتے ہیں، پھر عرفات سے اسی راستہ سے لوٹتے ہیں، اور دسویں کی رات کو مزدلفہ ملتا ہے جہاں صبح تک ٹھہرتے ہیں، مزدلفہ میں مغرب اور عشاء دونوں نمازیں عشاء کے وقت اکٹھی پڑھتے ہیں، اور یہ نمازوں کا جمع کرنا واجب ہے، آیت میں جو ذکر کا حکم ہے اس میں یہ نمازیں بھی شامل ہیں، پس یہ ذکر تو واجب ہے، اور باقی جو کچھ ذکر کرے سب مستحب ہے، یہ جو فرمایا کہ ''جس طرح تم کو بتلا رکھا ہے اسی طرح یاد کرو''، اس سے یہ فائدہ ہے کہ مثلاً اسی نمازوں کے جمع کرنے میں کوئی شخص قیاس کو دخل دینے لگتا تو اس سے روک دیا، ''مشعر حرام'' مزدلفہ میں ایک پہاڑی ہے، اس کے آس پاس سے مراد سارا مزدلفہ ہے جہاں ٹھہر جائیں درست ہے سوائے وادی محسر کے، اس میں ٹھہرنا جائز نہیں۔

لَيۡسَ عَلَيۡكُمۡ جُنَاحٌ أَن تَبۡتَغُواْ: اس میں اس بات پر دلالت ہے کہ دنیا کے ذریعے دین پر استعانت لینا بھی طاعت ہے (یعنی دنیا کمانا تا کہ دین کے کاموں میں آسانی ہو اور دینی کاموں کے کرنے میں اسے مالی مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑے تو یہ بھی طاعت ہے، اس لیے کہ جو دنیا حصول دین کا ذریعہ بنے وہ بھی دین بن جاتی ہے، دنیا در اصل ہر اس معاملہ کو کہا جاتا ہے جو دین و آخرت سے غافل کر دے اور ایسی ہی دنیا کی مذمت بیان کی گئی ہے، ویسے اپنی ذات میں دنیا بری نہیں ہے)۔

* * *

فائدہ: ١۔ أَن تَبۡتَغُواْ فَضۡلٗا مِّن رَّبِّكُمۡ: حج کے سفر میں اگر سوداگری بھی کرو تو گناہ نہیں، بلکہ مباح ہے، لوگوں کو اس میں شبہ ہوا تھا کہ شاید تجارت کرنے سے حج میں نقصان آئے، اب جس کو مقصود اصلی حج ہو اور اس کے ذیل میں تجارت بھی کر لے تو اس کے ثواب میں نقصان نہ آئے گا۔

فائدہ: ٢۔ فَٱذۡكُرُواْ ٱللَّهَ عِندَ ٱلۡمَشۡعَرِ ٱلۡحَرَامِ: مشعر الحرام ایک پہاڑ کا نام ہے، جو مزدلفہ میں واقع ہے، جس پر امام وقوف کرتا ہے، اس پہاڑ پر قیام کرنا افضل ہے اور تمام مزدلفہ میں جہاں قیام کرے جائز ہے سوائے وادی مُحَسّر کے۔

فائدہ: ٣۔ وَإِن كُنتُم مِّن قَبۡلِهِۦ لَمِنَ ٱلضَّآلِّينَ: یعنی کفار بھی اللہ کا ذکر تو کرتے تھے مگر شرک کے ساتھ وہ ذکر نہ چاہیے بلکہ توحید کے ساتھ جس کی تم کو ہدایت فرمائی۔

ثُمَّ أَفِيضُواْ مِنۡ حَيۡثُ أَفَاضَ ٱلنَّاسُ وَٱسۡتَغۡفِرُواْ ٱللَّهَۚ إِنَّ ٱللَّهَ غَفُورٞ رَّحِيمٞ ﴿١٩٩﴾

پھر طواف کے لئے پھر و جہاں سے سب لوگ پھریں اور مغفرت چاہو اللہ سے، بیشک اللہ تعالیٰ بخشنے والا ہے مہربان

خلاصہ تفسیر: پھر (اس میں ایک بات اور بھی یاد رکھو کہ جیسا قریش نے دستور نکال رکھا تھا کہ تمام حجاج تو عرفات سے ہو کر پھر وہاں سے مزدلفہ آتے تھے اور قریش مزدلفہ ہی میں رہ جاتے تھے، عرفات نہ جاتے تھے، یہ جائز نہیں، بلکہ) تم سب کو (خواہ قریش ہوں یا غیر قریش) ضروری ہے کہ اسی جگہ ہو کر واپس آؤ، جہاں اور لوگ جا کر وہاں سے واپس آتے ہیں اور (احکام حج میں پرانی رسموں پر عمل کرنے سے) خدا تعالیٰ کے سامنے توبہ کرو، یقیناً اللہ تعالیٰ معاف کر دیں گے، اور مہربانی فرما دیں گے۔

ثُمَّ أَفِيضُواْ مِنۡ حَيۡثُ أَفَاضَ ٱلنَّاسُ: زمانہ جاہلیت میں قریش چونکہ خود کو حرم کا مجاور سمجھتے تھے اور مزدلفہ حرم میں ہے اور عرفات حرم سے باہر ہے، اس لیے یہ لوگ عرفات میں نہ جاتے تھے، مزدلفہ ہی میں ٹھہر کر وہاں سے لوٹ آتے تھے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ان احکام کا عام ہونا بتلا دیا۔

* * *

فائدہ: زمانہ کفر کی ایک غلطی یہ بھی تھی کہ مکہ کے لوگ عرفات تک نہ جاتے کہ عرفات حرم سے باہر ہے، بلکہ حرم کی حد یعنی مزدلفہ میں ٹھہر جاتے اور قریش مکہ کے سوا اور سب عرفات تک پہنچتے اور پھر وہاں سے طواف کے لئے مکہ کو واپس آتے، اس لئے فرمادیا کہ جہاں سے سب لوگ طواف کو آئیں، تم بھی وہیں سے جا کر لوٹو، یعنی عرفات سے اور اگلی تقصیر پر نادم ہو۔

فَإِذَا قَضَيْتُم مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَذِكْرِكُمْ آبَاءَكُمْ أَوْ أَشَدَّ ذِكْرًا ۗ فَمِنَ النَّاسِ

پھر جب پورے کر چکو اپنے حج کے کام کو تو یاد کرو اللہ کو جیسے تم یاد کرتے تھے اپنے باپ دادوں کو بلکہ اس سے بھی زیادہ یاد کرو۔ ا پھر کوئی آدمی

مَن يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ﴿٢٠٠﴾

تو کہتا ہے اے رب ہمارے دے ہم کو دنیا میں اور اس کے لئے آخرت میں کچھ حصہ نہیں

خلاصہ تفسیر: جاہلیت میں بعضوں کی تو یہ عادت تھی کہ حج سے فارغ ہو کر منی میں جمع ہو کر اپنے آباء واجداد کے مفاخر وفضائل بیان کیا کرتے، حق تعالیٰ اس بے ہودہ شغل کے بجائے اپنے ذکر کی تعلیم کے لئے فرماتے ہیں:

پھر جب تم اپنے اعمال حج پورے کر چکا کرو تو حق تعالیٰ کا (شکر وعظمت کے ساتھ) ذکر کیا کرو، جس طرح تم اپنے آباء (واجداد) کا ذکر کیا کرتے ہو، بلکہ یہ ذکر اس سے (بدر جہا) بڑھ کر ہو (نا چاہئے، اور بعضوں کی عادت تھی کہ حج میں ذکر تو اللہ تعالیٰ ہی کا کرتے تھے، لیکن چونکہ آخرت کے قائل نہ تھے، اس لیے ان کا تمام تر ذکر صرف دنیا کے لئے دعا مانگنا ہوتا تھا، حق تعالیٰ صرف دنیا طلبی سے منع فرما کر اس کے بجائے دونوں جہان کی فلاح طلب کرنے کی ترغیب دیتے ہیں) سو بعضے آدمی (جو کہ کافر ہیں) ایسے ہیں جو (دعا میں یوں) کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہم کو (جو کچھ دینا ہو) دنیا میں دے دیجئے (بس! سو ان کو جو کچھ ملنا ہوگا دنیا ہی میں مل رہے گا) اور ایسے شخص کو آخرت میں (آخرت کے انکار کی وجہ سے) کوئی حصہ نہ ملے گا۔

* * *

فائدہ: ا یعنی دسویں ذی الحجہ کو جب افعال حج رمی جمرہ اور ذبح قربانی اور سر منڈوانے اور طواف کعبہ اور سعی صفا مروہ سے فراغت پا چکو تو زمانہ قیام منیٰ میں اللہ کا ذکر کرو جیسے کفر کے زمانہ میں اپنے باپ دادوں کا ذکر کیا کرتے تھے بلکہ اس سے بھی زیادہ ذکر کرنا چاہیئے، ان کا قدیم دستور تھا کہ حج سے فارغ ہو کر منیٰ میں تین روز قیام کرتے اور بازار لگاتے اور اپنے باپ دادا کی بڑائی اور فضائل بیان کیا کرتے، سو اللہ تعالیٰ نے اس سے روکا اور فرما دیا کہ ان دنوں میں خدا تعالیٰ کی بڑائی بیان کرو۔

وَمِنْهُم مَّن يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿٢٠١﴾

اور کوئی ان میں کہتا ہے اے رب ہمارے دے ہم کو دنیا میں خوبی اور آخرت میں خوبی اور بچا ہم کو عذاب دوزخ سے

أُولَٰئِكَ لَهُمْ نَصِيبٌ مِّمَّا كَسَبُوا ۚ وَاللَّهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ ﴿٢٠٢﴾

انہی لوگوں کے واسطے حصہ ہے اپنی کمائی سے ا اور اللہ جلد حساب لینے والا ہے ۲

خلاصہ تفسیر: اور بعضے آدمی (جو کہ مومن ہیں) ایسے ہیں جو (دعا میں یوں) کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہم کو دنیا میں بھی بہتری عنایت کیجئے، اور آخرت میں بھی بہتری دیجئے، اور ہم کو عذاب دوزخ سے بچایئے (سو یہ لوگ اوپر کے لوگوں کی طرح بے بہرہ نہیں، بلکہ) ایسے لوگوں کو (دونوں جہان میں) بڑا حصہ ملے گا بدولت ان کے اس عمل (یعنی دونوں جہان کی فلاح طلب کرنے) کے اور اللہ تعالیٰ جلدی ہی حساب لینے والے ہیں (کیونکہ قیامت میں حساب ہوگا اور قیامت نزدیک آتی جاتی ہے، جب حساب جلدی ہونے والا ہے تو وہاں کی بہتری کو مت بھولو)۔

رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً: اس دعا سے آج کل کے طالب دنیا حضرات کو شبہ ہو گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں دنیا طلب کرنے والوں کی تعریف کی ہے جبکہ وہ آخرت کے بھی طالب ہوں، اس سے معلوم ہوا کہ طلب دنیا بری چیز نہیں، مگر یہ بڑی غلطی ہے، حقیقت میں یہاں ''حسنہ'' سے مراد ''اعمال حسنہ'' ہیں، اور حسنہ سے فقط دنیا یا دنیاوی خوش حالی مراد لینا اس لیے بھی غلط ہے کیونکہ آیت میں آتنا کا مفعول صرف حسنۃ ہے، یعنی

جس چیز کی طلب وتمنا کی جارہی ہے وہ "حسنہ" یعنی بہتری ہے، جبکہ فی الدینا اور فی الآخرۃ صرف ظرف یا محل ہیں، ترکیب میں یہ مفعول یا معنی کے لحاظ سے مطلوب ومقصود کسی طرح بھی نہیں ہوسکتے، بلکہ مطلوب صرف "حسنہ" ہے، کیونکہ آیت میں یہ فرمایا گیا ہے کہ بعض لوگ یوں دعا کرتے ہیں: رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً کہ اے پروردگار! ہم کو دنیا میں بہتری عنایت کیجیے، تو اس میں دنیا کی طلب نہیں، بلکہ "حسنہ" کی طلب ہے، یعنی وہ لوگ اس کے طالب ہیں کہ ہمیں دنیا میں رہتے ہوئے وہ حالت عنایت فرمایئے جو آپ کے نزدیک پسندیدہ اور مستحسن ہو، اور اصل پسندیدہ "اعمال حسنہ" ہیں، اور اسی دعا پر ان کی تعریف کی گئی ہے، اور مال، اولاد، صحت، اطمینان وغیرہ جو چیزیں بھی حسنہ اور خیر کے حصول میں معین ہوسکتی ہیں وہ سب اس حسنہ کے تابع ہوکر مومن کا مقصود تو بن سکتی ہیں، البتہ خود صرف دنیا ہرگز کسی مومن کا مدعا اور مقصود نہیں بن سکتی، موجودہ وقت کی تعلیم وطرز عمل کے خلاف کہ جس میں فقط دنیا مطلوب ہو اور آخرت کو محض برائے نام قرار دے دیا جائے، حاشا وکلا! ایسی طلب دنیا کو اس آیت سے کوئی مناسبت بھی نہیں، زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر طلب دنیا میں حلال وحرام کی حدود کو نہ توڑا جائے تو اباحت یعنی جواز کا حکم لگادیا جائے، لیکن شرعی طور پر جائز ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ شرعاً بھی وہ مطلوب ہو، خوب سمجھ لو۔

مراد محض یہ ہے کہ ہمیں تو آپ کے دربار سے صرف بھلائی یا بہتری درکار ہے، دنیا میں ہو تو بھی اور آخرت میں ہو تو بھی، مزید یہ کہ دنیا میں ہمیں اعمال خیر عنایت ہوں، اور آخرت میں ثمرات خیر، بعض نادان اور سطحی دماغ والے اہل قلم نے آیت سے یہ عجیب وغریب نتیجہ نکالا ہے کہ آخرت کی طرح دنیا بھی مومن کا مقصود بن سکتی ہے، بلکہ قرآن خود طلب دنیا کی تعلیم وترغیب دیتا ہے! تعالیٰ اللہ علوا کبیرا، مادہ پرست قوموں کی دنیا طلبی اور دنیا پسندی سے مرعوب ہوکر خود مسلمانوں کو طلب دنیا کی تعلیم دینا بلکہ اسے قرآنی تعلیم قرار دینا خدمت اسلام کی عجیب وغریب صورت ہے!۔

* * *

فائدہ: ۱ پہلے یہ فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو، اوروں کا مت کرو اب یہ بتلایا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والے اور اس سے دعا مانگنے والے بھی دو قسم کے ہیں: ① ایک وہ کہ جن کو مطلوب صرف دنیا ہے، ان کی دعا یہی ہے کہ ہم کو جو کچھ دولت عزت وغیرہ دی جائے دنیا ہی میں دے دی جائے، سو یہ لوگ تو آخرت کی نعمتوں سے بے بہرہ ہیں ② دوسرے وہ کہ طالب آخرت ہیں، جو دنیا کی خوبی یعنی توفیق بندگی وغیرہ اور آخرت کی خوبی یعنی ثواب اور رحمت وجنت دونوں کو طلب کرتے ہیں، سو ایسوں کو آخرت میں ان کے حج اور دعا جملہ حسنات سے پورا حصہ ملے گا۔

فائدہ: ۲ یعنی قیامت کو سب سے ایک دم میں حساب لے گا یا یوں کہو کہ قیامت کو دور نہ سمجھو بلکہ جلد آنے والی ہے اس سے کسی طرح بچاؤ ممکن نہیں اس کی فکر سے غافل مت ہو۔

وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ ۭ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۚ وَمَنْ تَاَخَّرَ

اور یاد کرو اللہ کو گنتی کے چند دنوں میں ۱ پھر جو کوئی جلدی چلا گیا دو ہی دن میں تو گناہ نہیں اس پر، اور جو کوئی رہ گیا

فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۙ لِمَنِ اتَّقٰى ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۝۲۰۳

تو اس پر بھی کچھ گناہ نہیں جو کہ ڈرتا ہے ۲ اور ڈرتے رہو اللہ سے اور جان لو بیشک تم سب اسی کے پاس جمع ہوگے ۳

خلاصہ تفسیر: اور (منیٰ میں خاص طریقہ سے بھی) اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو کئی روز تک (وہ خاص طریقہ کنکریوں کا خاص تین پتھروں پر مارنا ہے) پھر جو شخص (کنکریاں مار کر دسویں تاریخ کے بعد) دو دن میں (مکہ واپس آنے میں) تعجیل کرے اس پر بھی کچھ گناہ نہیں، اور جو شخص (ان) دو دن میں (مکہ واپسی میں) تاخیر کرے (یعنی بارہویں کو نہ آئے، بلکہ تیرہویں کو آئے) اس پر بھی کچھ گناہ نہیں (اور یہ سب باتیں) اس شخص کے واسطے (ہیں) جو (خدا سے) ڈرے (اور نہ ڈرنے والے کو گناہ ثواب ہی سے غرض نہیں) اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، اور خوب یقین رکھو کہ تم سب کو خدا ہی کے پاس جمع ہونا ہے۔

وَاذْكُرُوا اللهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ: وہ خاص طریقہ یہ ہے کہ تین معین پتھروں پر کنکریاں ماری جائیں، ہر کنکری کے ساتھ اللہ اکبر کہنا مستحب ہے، اور کئی روز سے مراد ذی الحجہ کی دسویں، گیارہویں اور بارہویں تاریخیں ہیں، تیرہویں بھی کہ اس میں کنکریاں مارنا مستحب ہے، حاصل یہ ہے کہ بارہویں تاریخ تک تو منیٰ کا قیام واجب ہے، اگر کوئی بارہویں ہی کو کنکریاں مار کر چلا آئے تو کچھ گناہ نہیں، مگر تیرہویں تاریخ کی رمی کر کے آنا زیادہ افضل ہے۔

وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ: اس میں رخصت کا عزیمت کے ساتھ مساوی یعنی برابر ہونا بیان کیا گیا ہے جب کہ اس میں کچھ مصلحت ہو، چنانچہ یہاں تعجیل (جلدی) و تاخیر میں مساوات یعنی برابری بیان فرمائی۔

* * *

فائدہ: ۱۔ ایام معدودات سے مراد ذی الحجہ کی گیارھویں، بارھویں، تیرھویں، تاریخیں ہیں جن میں حج سے فارغ ہو کر منیٰ میں قیام کا حکم ہے، ان دنوں میں رمی جمار یعنی کنکریوں کے مارنے کے وقت اور ہر نماز کے بعد تکبیر کہنے کا حکم ہے اور دیگر اوقات میں بھی ان دنوں میں چاہیے کہ تکبیر اور ذکر الٰہی کثرت سے کرے۔

فائدہ: ۲۔ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ لِمَنِ اتَّقٰى: یعنی گناہ تو یہ ہے کہ ممنوعاتِ شرعیہ سے پرہیز نہ کرے اور جو کوئی اللہ سے ڈرے اور زمانہ حج میں پرہیزگاری کرے تو پھر اس بات میں کچھ گناہ نہیں کہ منیٰ میں دو دن قیام کیا، یا تین دن کہ اللہ نے دونوں باتیں جائز رکھیں، گو افضل یہی ہے کہ تین روز قیام کرے۔

فائدہ: ۳۔ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ: یعنی حج کی خصوصیت نہیں بلکہ خدا تعالیٰ سے ہر کام میں اور ہر وقت ڈرتے رہو کہ تم سب کو قبروں سے اٹھ کر اس کے پاس جمع ہونا ہے حساب دینے کو۔

ربط: اب حج کا ذکر تو تمام ہو چکا، مگر حج کے ذیل میں جو لوگوں کی دو قسموں کا ذکر آ گیا تھا **فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ** اور **وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ** یعنی کافر اور مومن کا، تو اب اس کی مناسبت سے تیسری قسم یعنی "منافق" کا حال بھی بیان کیا جاتا ہے:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ ۙ وَهُوَ اَلَدُّ

اور بعض آدمی وہ ہے کہ پسند آتی ہے تجھ کو اس کی بات دنیا کی زندگانی کے کاموں میں اور گواہ کرتا ہے اللہ کو اپنے دل کی بات پر اور وہ سخت

الْخِصَامِ ﴿۲۰۴﴾ وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ۭ وَاللهُ لَا يُحِبُّ

جھگڑالو ہے، اور جب پھرے تیرے پاس سے تو دوڑتا پھرے ملک میں تا کہ اسمیں خرابی ڈالے اور تباہ کرے کھیتیاں اور جانیں، اور اللہ ناپسند کرتا ہے

الْفَسَادَ ﴿۲۰۵﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ ۭ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۲۰۶﴾

فساد کو، اور جب اس سے کہا جائے کہ اللہ سے ڈر تو آمادہ کرے اس کو غرور گناہ پر سو کافی ہے اس کو دوزخ، اور وہ بیشک برا ٹھکانا ہے

خلاصہ تفسیر: پیچھے دعا مانگنے والوں کی دو قسمیں بیان کی تھیں: ایک کافر جو کہ منکر آخرت ہے اس لیے صرف دنیا مانگتا ہے، دوسرا مؤمن جو کہ آخرت کا معتقد ہے اس لیے دنیا کی بھلائی کے ساتھ آخرت کی بھلائی بھی مانگتا ہے، اب اس آیت میں اسی طرح نفاق و اخلاص کے اعتبار سے تقسیم فرماتے ہیں کہ بعض منافق ہوتے ہیں اور بعض مخلص، ایک شخص تھا اخنس بن شریق بڑا فصیح و بلیغ، وہ حضور کی خدمت میں آ کر قسمیں کھا کر اسلام کا جھوٹا دعوی کیا کرتا تھا، مجلس سے اٹھ کر جاتا تو فساد، شرارت اور مخلوق کی ایذارسانی میں لگ جاتا، حق تعالیٰ اس کے بارے میں فرماتے ہیں:

اور بعض آدمی ایسا بھی ہے کہ آپ کو اس کی گفتگو جو محض دنیوی غرض سے ہوتی ہے (کہ اسلام کا اظہار کر کے مسلمانوں کی طرح مقرب و خاص

رہوں گا، اس کی فصاحت و بلاغت کی وجہ سے) مزہ دار معلوم ہوتی ہے اور وہ (اپنا اعتبار بڑھانے کو) اللہ تعالیٰ کو گواہ بناتا ہے اپنے دل کی سچائی پر، حالانکہ (بالکل جھوٹا ہے، کیونکہ واقع میں) وہ (آپ کی) مخالفت میں (نہایت) شدید ہے، اور (جس طرح آپ کا مخالف ہے، اسی طرح اور مسلمانوں کو بھی ایذا پہنچاتا ہے، چنانچہ) جب (آپ کی مجلس سے) پیٹھ پھیرتا ہے تو اس دوڑ دھوپ میں پھرتا رہتا ہے کہ شہر میں (کوئی) فساد کردے اور (کسی کی) کھیت اور مواشی کو تلف کردے (چنانچہ ایک مسلمان کا اس طرح نقصان کردیا تھا) اور اللہ تعالیٰ فساد (کی باتوں) کو پسند نہیں فرماتے، اور (اس مخالفت وایذاء کے ساتھ مغرور اس درجہ ہے کہ) جب اس سے کوئی کہتا ہے کہ خدا کا تو خوف کر (تو اس سے تکبر کرتا ہے اور وہ) غرور اس کو اس گناہ پر (اور زیادہ) آمادہ کردیتا ہے، سو ایسے شخص کی کافی سزا جہنم ہے، اور وہ بری ہی آرام گاہ ہے۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُ اتَّقِ اللَّهَ: اس میں اصل ہے متکبرین کو وعظ ونصیحت نہ کرنے کی۔

* * *

فائدہ: یہ حال ہے منافق کا ظاہر میں خوشامد کرے اور اللہ کو گواہ کرے کہ میں سچا ہوں اور میرے دل میں اسلام کی محبت ہے اور جھگڑے کے وقت کمی نہ کرے اور قابو پاوے تو لوٹ مار مچادے اور منع کرنے سے اس کو زیادہ ضد چڑھے اور گناہ میں ترقی کرے۔

کہتے ہیں ایک شخص اخنس ابن شریق تھا منافق فصیح وبلیغ جب آپ ﷺ کی خدمت میں آتا تو غایت اخلاص اور محبت اسلام ظاہر کرتا اور جب چلا جاتا تو کسی کی کھیتی جلا دیتا، کسی کے جانوروں کے پیر کاٹ ڈالتا، اس پر منافقین کی برائی میں یہ آیت نازل ہوئی۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۲۰۷﴾

اور لوگوں میں ایک شخص وہ ہے کہ بیچتا ہے اپنی جان کو اللہ کی رضا جوئی میں [1] اور اللہ نہایت مہربان ہے اپنے بندوں پر [2]

خلاصہ تفسیر: (مخلص کے بارے میں فرماتے ہیں) اور بعض آدمی ایسے بھی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے بدلہ میں اپنی جان تک بیچ ڈالتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ ایسے بندوں کے حال پر نہایت مہربان ہیں۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ: اس میں نفس کو فنا کرنے پر دلالت ہے، کیونکہ اس کا حاصل نفس کے داعیہ اور تقاضا کو ترک کرنا ہے، خواہشات نفسانی کو ترک کرنا یہ دلالت کرتا ہے کہ اس نے اپنے آپ کو محبت خداوندی میں فنا کردیا ہے (فناء نفس کا مطلب ہے کہ خواہشات نفسانی کا امالہ کردیا جائے، یعنی ناجائز خواہشات کا رخ جائز خواہشات کی طرف موڑ دیا جائے، ایسے طور پر کہ اب کوئی حرام خواہش پیدا ہی نہ ہو، نفس کی ایسی حالت کو ''فناء نفس'' کہا جاتا ہے)۔

* * *

فائدہ: [1] پہلی آیت میں اس منافق کا ذکر تھا جو دین کے بدلے دنیا لیتا تھا، اس کے مقابلہ میں اب اس آیت میں اس مخلص کامل الایمان کا ذکر ہے جو دنیا اور جان ومال کو طلب دین میں صرف کرتا ہے۔

کہتے ہیں حضرت صہیب رومی بارادہ ہجرت آپ ﷺ کی خدمت میں آتے تھے، راستہ میں مشرکین نے ان کو گھیر لیا، صہیب نے کہا کہ میں اپنا گھر اور تمام مال تم کو اس شرط پر دیتا ہوں کہ مجھ کو مدینہ جانے دو اور ہجرت سے نہ روکو، اس پر وہ راضی ہو گئے اور صہیب آپ ﷺ کی خدمت میں چلے گئے، اس پر یہ آیت مخلصین کی تعریف میں نازل ہوئی۔

فائدہ: [2] اس کی کتنی بڑی رحمت ہے کہ اپنے بندوں کو توفیق دی جو اسکی خوشی میں اپنی جان اور مال حاضر کر دیتے ہیں اور نیز ہر ایک کی جان ومال تو اللہ کی ملک ہے، پھر جنت کے بدلے اس کو خریدنا یہ محض اس کا احسان ہے۔

يَاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوا ادۡخُلُوۡا فِى السِّلۡمِ كَآفَّةً ۖ وَّلَا تَتَّبِعُوۡا خُطُوٰتِ الشَّيۡطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمۡ

اے ایمان والو داخل ہو جاؤ اسلام میں پورے لے اور مت چلو قدموں پر شیطان کے، بیشک وہ تمہارا

عَدُوٌّ مُّبِيۡنٌ ﴿۲۰۸﴾ فَاِنۡ زَلَلۡتُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَتۡكُمُ الۡبَيِّنٰتُ فَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ عَزِيۡزٌ حَكِيۡمٌ ﴿۲۰۹﴾

صریح دشمن ہے ۲ پھر اگر تم پھسلنے لگو بعد اس کے کہ پہنچ چکے تم کو صاف حکم تو جان رکھو کہ بیشک اللہ زبردست ہے حکمت والا ۳

خلاصہ تفسیر: پیچھے آیت میں مخلص کی مدح تھی، بعض اوقات اس اخلاص میں غلطی سے غلو اور افراط ہو جاتا ہے، یعنی قصد تو زیادہ اطاعت کا ہوتا ہے، مگر وہ اطاعت شریعت وسنت کی حد سے متجاوز ہو کر داخل بدعت ہو جاتی ہے، حق تعالی اس کی اصلاح کسی قدر اہتمام سے فرماتے ہیں، چنانچہ حضرت عبداللہ بن سلامؓ وغیرہ جو پہلے علماء یہود سے تھے اور یہود مذہب میں ہفتہ کا روز عظمت کا حامل تھا اور اونٹ کا گوشت حرام تھا، تو انہیں اسلام لانے کے بعد یہ خیال ہوا کہ شریعت موسوی میں ہفتہ کی تعظیم واجب تھی اور شریعت محمدیہ میں اس کی بے تعظیمی واجب نہیں، اسی طرح شریعت موسویہ میں اونٹ کا گوشت کھانا حرام تھا اور شریعت محمدیہ میں اس کا کھانا فرض نہیں، سو اگر ہم بدستور ہفتہ کی تعظیم کرتے رہیں اور اونٹ کا گوشت حلال سمجھنے کے باوجود صرف عملاً کھانا چھوڑ دیں تو شریعت موسویہ کی بھی رعایت ہو جائے گی اور شریعت محمدیہ کے بھی خلاف نہ ہوگا، اور اس میں خدا تعالی کی زیادہ اطاعت اور دین کی زیادہ رعایت معلوم ہوتی ہے، اللہ تعالی اس خیال کی اصلاح فرماتے ہیں جس کا حاصل یہ ہے کہ اسلام پر کامل ایمان لانا فرض ہے اور اس کا کامل ہونا جبھی ہے کہ جو امر اسلام میں قابل رعایت نہیں دین سمجھ کر اس کی رعایت نہ کی جائے، اور ایسی بات کو دین سمجھنا یہ شیطانی لغزش ہے، اور بہ نسبت ظاہری گناہوں کے یہ سخت گناہ ہے اس لیے اس میں عذاب کا سخت اندیشہ ہے اس سے بچو۔

اے ایمان والو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو (یہ نہیں کہ کچھ کچھ یہودیت کی بھی رعایت کرو) اور (فاسد خیالات میں پڑ کر) شیطان کے قدم بقدم مت چلو، واقعی وہ تمہارا کھلا دشمن ہے (کہ ایسے پٹی پڑھا دیتا ہے کہ ظاہر میں تو سراسر دین معلوم ہو اور فی الحقیقت وہ دین کے بالکل خلاف ہے) پھر اگر تم بعد اس کے کہ تم کو واضح دلیلیں (احکام وشرائع اسلام کی) پہنچ چکی ہیں (پھر بھی صراط مستقیم سے) لغزش کرنے لگو تو یقین رکھو کہ حق تعالی (بڑے) زبردست ہیں (سخت سزا دیں گے، اور کچھ دنوں تک سزا نہ دیں تو اس سے دھوکہ مت کھانا کیونکہ وہ) حکمت والے (بھی) ہیں (کسی حکمت ومصلحت سے کبھی سزا میں دیر بھی کر دیتے ہیں)۔

ادۡخُلُوۡا فِى السِّلۡمِ كَآفَّةً: آیت کی تفسیر سے معلوم ہوتا ہے کہ بدعت پر کس قدر ملامت اور کس درجہ مذمت، رد اور انکار فرمایا گیا ہے، اور احادیث میں اس سے زیادہ صاف الفاظ میں سخت سخت وعیدیں آئی ہیں، اور واقع میں اگر غور سے کام لیا جائے تو بدعت ایسی ہی مذموم ہونی چاہیے، کیونکہ بدعت کی حقیقت کا خلاصہ غیر شریعت کو شریعت بنانا ہے، اور شریعت من جانب اللہ ہوتی ہے، تو یہ شخص ایسی بات کو جو اللہ کی طرف سے نہیں ہے اپنے اعتقاد میں من جانب اللہ سمجھتا ہے اور دعوی سے من اللہ بتلاتا ہے جس کا حاصل خدا پر جھوٹ اور بہتان لگانا اور ایک گونہ نبوت کا دعوی ہے، سو اس کے مذموم ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے، یہ خرابی تو حقیقت کے لحاظ سے ہے، ظاہری اعتبار سے بھی خرابی یہ ہے کہ بدعت سے توبہ بہت کم نصیب ہوتی ہے، کیونکہ جب وہ اس کو مستحب سمجھ رہا ہے تو توبہ کیوں کرے گا، اگر اللہ تعالی اپنے طفیل سے اس عمل سے ہی نجات بخش دیں تو اور بات ہے کہ توبہ نصیب ہو جائے، افسوس ہے جہلائے صوفیا اس بدعت میں بکثرت مبتلا ہیں، بہت سے ان میں عابد، زاہد اور تارک الدنیا بھی ہیں، مگر سنت کی برکات سے محروم ہیں۔

وَّلَا تَتَّبِعُوۡا خُطُوٰتِ الشَّيۡطٰنِ: اس آیت کے سبب نزول کو مدنظر رکھتے ہوئے حضرات صوفیاء کرام جو گناہ کے راستے سے بھی منع کرنے میں زیادہ شدت کرتے ہیں اس کی اصل اس آیت سے ثابت ہے، جیسے بدنظری سے بہت زیادہ زور دے کر منع کرتے ہیں بہ نسبت زنا کے، کیونکہ بدنظری زنا کا سبب اور اصل ہے۔

❋ ❋ ❋

فائدہ: ۱؎ اُدْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً: پہلی آیت میں مومن مخلص کی مدح فرمائی تھی، جس سے نفاق کا ابطال منظور تھا، اب فرماتے ہیں کہ اسلام کو پورا پورا قبول کرو، یعنی ظاہر اور باطن اور عقیدہ اور عمل میں صرف احکام اسلام کا اتباع کرو، یہ نہ ہو کہ اپنی عقل یا کسی دوسرے کے کہنے سے کوئی حکم تسلیم کرلو، یا کوئی عمل کرنے لگو، سو اس سے ''بدعت'' کا قلع قمع مقصود ہے، کیونکہ ''بدعت'' کی حقیقت یہی ہے کہ کسی عقیدہ یا کسی عمل کو کسی وجہ سے مستحسن سمجھ کر اپنی طرف سے دین میں شمار کرلیا جائے، مثلاً نماز اور روزہ جو کہ افضل عبادات ہیں، اگر بدون حکم شریعت کوئی اپنی طرف سے مقرر کرنے لگے، جیسے عید کے دن عیدگاہ میں نوافل کا پڑھنا، یا ہزارہ روزہ رکھنا، یہ بدعت ہوگا، خلاصہ ان آیات کا یہ ہوا کہ اخلاص کے ساتھ ایمان لاؤ اور بدعات سے بچتے رہو، چند حضرات یہود سے مشرف بہ اسلام ہوئے، مگر احکام اسلام کے ساتھ احکام تورات کی بھی رعایت کرنی چاہتے تھے، مثلاً ہفتہ کے دن کو معظم سمجھنا اور اونٹ کے گوشت اور دودھ کو حرام ماننا اور تورات کی تلاوت کرنا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی جس سے بدعت کا انسداد کامل فرمایا گیا۔

فائدہ: ۲؎ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ: کہ اپنے وسوسہ سے بے اصل چیزوں کو تمہارے دلنشین کردیتا ہے اور دین میں بدعات کو شامل کرا کر تمہارے دین کو خراب کرتا ہے اور تم اس کو پسند کرتے ہو۔

فائدہ: ۳؎ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ: یعنی شریعت محمدی کے صاف صاف احکام معلوم ہونے کے بعد بھی اگر کوئی اس پر قائم نہ ہو، بلکہ دوسری طرف بھی نظر رکھے تو خوب سمجھ لو کہ اللہ سب پر غالب ہے، جس کو چاہے سزا دے، کوئی اس کے عذاب کو روک نہیں سکتا، بڑا حکمت والا ہے جو کرتا ہے حق اور مصلحت کے موافق کرتا ہے، خواہ عذاب دے یا کچھ ڈھیل دے، یعنی نہ جلد باز ہے، نہ بھولنے والا، نہ خلاف انصاف اور غیر مناسب امر کو کرنے والا۔

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ ؕ

کیا وہ اسی کی راہ دیکھتے ہیں کہ آوے ان پر اللہ ابر کے سائبانوں میں اور فرشتے اور طے ہو جاوے قصہ

وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۲۱۰﴾ ع ۲۵

اور اللہ ہی کی طرف لوٹیں گے سب کام

خلاصہ تفسیر: (معلوم ہوتا ہے) یہ لوگ (جو کہ حق کے دلائل واضح ہونے کے بعد کج راہی اختیار کرتے ہیں) صرف اس امر کے منتظر ہیں کہ حق تعالیٰ اور فرشتے بادل کے سائبانوں میں ان کے پاس (سزا دینے کے لئے) آئیں اور سارا قصہ ہی ختم ہو جائے (یعنی کیا اس وقت حق کو قبول کریں گے جس وقت کا قبول کرنا مقبول بھی نہ ہوگا) اور یہ سارے (جزاء و سزا کے) مقدمات اللہ تعالیٰ ہی کی طرف رجوع کئے جائیں گے (کوئی دوسرا صاحب اختیار نہ ہوگا، سوایسے زبردست کے ساتھ مخالفت کرنے کا انجام بجز خرابی کے کیا ہوسکتا ہے)۔

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ: اللہ تعالیٰ کے لیے آنا وغیرہ جہاں مذکور ہے اس کی حقیقت کی تفتیش کے درپے ہونا جائز نہیں، حق تعالیٰ کی ذات وصفات کی کنہ کسی کو معلوم نہیں ہوسکتی، کیفیت کی تعیین کے بغیر اجمالاً ایمان لے آنا چاہیے۔

فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ: عبداللہ بن مسعودؓ سے ابن مردویہ نے روایت کیا ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ تمام اولین وآخرین کو جمع فرمائیں گے اور سب حساب وکتاب کے منتظر ہوں گے، اللہ تعالیٰ ابر کے سائبانوں میں عرش سے تجلی فرمائیں گے، اور ابن عباسؓ کی روایت میں ہے کہ ان سائبانوں کے گرداگرد فرشتے ہوں گے، آیت میں اس قصے کی طرف اشارہ ہے، مطلب یہ ہے کہ قیامت کے منتظر ہیں، پھر اس وقت کیا ہوسکتا ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی جولوگ حق تعالیٰ کے صاف صاف احکام کے بعد بھی اپنی کج روی سے باز نہیں آتے تو ان کو رسول اور قرآن پر تو یقین اور اعتماد نہ ہوا، اب صرف اس کی کسر ہے کہ خدائے پاک خود اور اس کے فرشتے ان پر آئیں اور جزا اور سزا کا قصہ جو قیامت کو ہونے والا ہے آج ہی فیصل کیا جائے، سو آخر کار سب امور حساب اور عذاب وغیرہ کا مرجع اللہ ہی کی طرف ہے، تمام حکم اسی کے حضور سے صادر ہوں گے، اس میں کوئی تردد کی بات نہیں، گھبراتے کیوں ہو۔

سَلْ بَنِيٓ اِسْرَآءِيْلَ كَمْ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ اٰيَةٍۭ بَيِّنَةٍ ؕ وَمَنْ يُّبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا

پوچھ بنی اسرائیل سے کس قدر عنایت کیں ہم نے ان کو نشانیاں کھلی ہوئی ؏ اور جو کوئی بدل ڈالے اللہ کی نعمت بعد اس کے

جَآءَتْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۲۱۱﴾

کہ پہنچ چکی ہو وہ نعمت اس کو تو اللہ کا عذاب سخت ہے ؏

خلاصہ تفسیر: پیچھے فرمایا تھا کہ واضح دلائل آجانے کے بعد حق کی مخالفت کرنا موجب سزا ہے، اب اس کی دلیل بیان فرماتے ہیں کہ جیسے بنی اسرائیل میں ہوا ہے، بعض کو ایسی ہی مخالفت پر سزا دی گئی:

آپ (علماء) بنی اسرائیل سے (ذرا) پوچھئے (تو سہی) ہم نے ان کو (یعنی ان کے بزرگوں کو) کتنی واضح دلیلیں دی تھیں (مگر ان لوگوں نے بجائے اس کے کہ اس سے ہدایت حاصل کرتے اور الٹی گمراہی پر کمر باندھی، پھر دیکھو سزائیں بھی بھگتیں) اور (ہمارا قانون ہی یہ ہے کہ) جو شخص اللہ تعالیٰ کی (ایسی بڑی) نعمت (واضح دلائل) کو بدلتا ہے، اس کے پاس پہنچنے کے بعد (یعنی بجائے اس کے کہ اس سے ہدایت حاصل کرے اور الٹا گمراہ بنتا ہے) تو یقیناً حق تعالیٰ (ایسے شخص کو) سخت سزا دیتے ہیں (یہ سزا کبھی دنیا میں بھی ہو جاتی ہے، کبھی آخرت میں ہوگی)۔

كَمْ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ اٰيَةٍۭ بَيِّنَةٍ: یعنی ہم نے ان کو کتنی واضح دلیلیں دی تھیں، مثلاً توراۃ ملی، چاہئے تو یہ تھا کہ اس کو قبول کرتے، مگر انکار کیا، آخر کوہ طور گرانے کی ان کو دھمکی دی گئی اور مثلاً حق تعالیٰ کا کلام سننا چاہئے تھا، سر آنکھوں پر رکھتے، مگر شبہات نکالے، آخر بجلی سے ہلاک ہوئے اور مثلاً دریا میں شگاف کر کے فرعون سے نجات دی گئی، احسان تو کیا مانتے گوسالہ پرستی شروع کر دی، جس پر سزائے قتل دی گئی اور مثلاً من وسلویٰ نازل ہوا، شکر کرنا چاہئے تھا، حرص کے مارے جمع کرنے لگے اور نافرمانی کی سو، وہ سڑنے لگا اور اس سے نفرت ظاہر کی تو وہ موقوف ہو گیا، اور کھیتی کی مصیبت سر پر پڑی اور مثلاً انبیاء علیہم السلام کا سلسلہ ان میں جاری رہا، غنیمت سمجھتے، ان کو قتل کرنا شروع کر دیا، جس پر یہ سزا دی گئی کہ ان سے حکومت وسلطنت چھین لی گئی، اسی طرح بہت سے معاملات اسی سورۃ بقرہ کے شروع میں بھی مذکور ہو چکے ہیں۔

* * *

فائدہ: ؏ اس سے پہلے فرمایا تھا کہ حق تعالیٰ کے صاف حکم کے بعد اس کی مخالفت کرنا موجب عذاب ہے، اب اسی کی تائید میں فرماتے ہیں کہ خود بنی اسرائیل ہی سے پوچھو کہ ہم نے ان پر کتنی آیات واضحات اور صریح احکام بھیجے، جب ان سے انحراف کیا تو مبتلائے عذاب ہوئے، یہ نہیں کہ ہم نے اول ہی ان کو عذاب دیا ہو۔

فائدہ: ؏ یعنی یہ قاعدہ البتہ محقق ہے کہ جو کوئی اللہ کے احکام سراپا ہدایت کو بدلے اور اسکے انعامات اور احسانات کا کفران کرے تو پھر اسکا عذاب سخت ہے آیات کے بدلنے والے پر کہ دنیا میں مارا جائے اور لوٹا جائے یا جزیہ دے اور ذلیل ہو اور قیامت کو دوزخ میں جائے ہمیشہ کے لئے۔

فائدہ: نعمت کے پہنچ چکنے کا یہ مطلب کہ اس کا علم حاصل ہو جائے، یا بے تکلف حاصل ہو سکے۔

زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَيَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۘ وَالَّذِيْنَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ

فریفتہ کیا ہے کافروں کو دنیا کی زندگی پر اور ہنستے ہیں ایمان والوں کو۔[1] اور جو پرہیزگار ہیں وہ ان کافروں سے بالا تر ہوں گے

يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۲۱۲﴾

قیامت کے دن، اور اللہ روزی دیتا ہے جس کو چاہے بیشمار۔[2]

خلاصہ تفسیر: پیچھے حق کی مخالفت کا بیان تھا، اب اس کی اصلی علت بیان فرماتے ہیں کہ وہ دنیا کی محبت ہے، جس کے آثار میں سے اہل دین کو حقیر سمجھنا بھی ہے، کیونکہ جب دنیا کا غلبہ ہوتا ہے تو دین کی طلب نہیں رہتی، بلکہ جب دین کی وجہ سے دنیا کا خلل دیکھتا ہے تو دین کو چھوڑ دیتا ہے اور اہل دین پر ہنستا ہے کہ یہ کیسے میلے کچیلے رہتے ہیں کہ پاس بیٹھنے سے بھی عار آتا ہے، چنانچہ بنی اسرائیل کے بعض سردار اور مشرکین کے جہلاء غریب مسلمانوں کے ساتھ استہزا کرتے تھے ان لوگوں کا بیان فرماتے ہیں۔

دنیوی معاش کفار کو آراستہ پیراستہ معلوم ہوتی ہے اور (اسی وجہ سے) ان مسلمانوں سے تمسخر کرتے ہیں، حالانکہ یہ (مسلمان) جو کفر و شرک سے بچتے ہیں ان کافروں سے اعلیٰ درجہ (کی حالت) میں ہوں گے قیامت کے روز (کیونکہ کفار جہنم میں ہوں گے اور مسلمان جنت میں) اور (آدمی کو محض معاشی وسعت پر مغرور نہیں ہونا چاہئے، کیونکہ) روزی تو اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں بے انداز (یعنی بکثرت) دے دیتے ہیں (پس اس کا مدار قسمت پر ہے نہ کہ کمال اور مقبولیت پر، سو یہ ضروری نہیں کہ جو روزی میں بڑھا ہوا ہو وہ اللہ کے نزدیک بھی معزز ہو، اور بڑی عزت وہی ہے جو اللہ کے نزدیک معتبر ہو، پھر محض اس کی وجہ سے اپنے کو معزز اور دوسرے کو ادنی یا ذلیل سمجھنا بیوقوفی ہے)

***

فائدہ: [1] یعنی کافر جو اللہ کے صاف احکام اور اس کے پیغمبروں کی مخالفت کرتے ہیں جو اوپر مذکور ہو چکا، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی نظروں میں دنیا کی خوبی اور اس کی محبت ایسی سما گئی ہے کہ اس کے مقابلہ میں آخرت کے رنج اور راحت کو خیال ہی میں نہیں لاتے، بلکہ مسلمان جو فکر آخرت میں مصروف اور اللہ کے احکام کی تعمیل میں مشغول ہیں، الٹا ان کو ہنستے ہیں اور ذلیل سمجھتے ہیں، سو ایسے احمق نفس کے بندوں سے تعمیل احکام الٰہی ہو تو کیونکر ہو، روسائے مشرکین حضرت بلال اور عمار اور صہیب اور فقرائے مہاجرین کو دیکھ کر تمسخر کرتے کہ ان نادانوں نے آخرت کے خیال پر دنیا کی تکالیف اور مصائب کو اپنے سر لیا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو تو دیکھو کہ ان فقیروں محتاجوں کی امداد سے عرب کے سرداروں پر غالب آنا اور دنیا بھر کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں۔

فائدہ: [2] اللہ تعالیٰ ان کے جواب میں ارشاد فرماتا ہے کہ یہ ان کی جہالت اور خام خیالی ہے کہ دنیا پر ایسے غش ہیں وہ نہیں جانتے کہ یہی غرباء اور فقراء قیامت کو ان سے اعلیٰ اور برتر ہوں گے اور اللہ دنیا و آخرت میں جس کو چاہے بیشمار روزی عطا فرمائے، چنانچہ انہی غریبوں کو جن پر کافر ہنستے تھے اموال بنی قریظہ اور نضیر اور سلطنت فارس اور روم وغیرہ پر اللہ نے مسلط کر دیا۔

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۫ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۪ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ

تھے سب لوگ ایک دین پر، پھر بھیجے اللہ نے پیغمبر خوشخبری سنانے والے اور ڈرانے والے، اور اتاری ان کے ساتھ کتاب

بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ؕ وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ

سچی کہ فیصلہ کرے لوگوں میں جس بات میں وہ جھگڑا کریں، اور نہیں جھگڑا ڈالا کتاب میں مگر انہی لوگوں نے جن کو کتاب ملی تھی اس کے بعد

مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ ۚ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ

کہ ان کو پہنچ چکے صاف حکم آپس کی ضد سے، پھر اب ہدایت کی اللہ نے ایمان والوں کو اس سچی بات کی جس میں وہ جھگڑ رہے تھے

بِاِذْنِهٖ ؕ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۲۱۳﴾

اپنے حکم سے، اور اللہ بتلاتا ہے جس کو چاہے سیدھا راستہ

خلاصہ تفسیر: پیچھے دین حق کی مخالفت کی علت حب دنیا بتلائی گئی، اب اسی مضمون کی تائید فرماتے ہیں کہ مدت سے یہی قصہ چلا آرہا ہے کہ ہم واضح دلائل دین حق پر قائم کرتے ہیں اور طالبان دنیا اپنی دنیوی اغراض کے سبب اس کی مخالفت کرتے ہیں۔

(ایک زمانہ میں) سب آدمی ایک ہی طریق پر تھے (کیونکہ سب سے پہلے دنیا میں حضرت آدم علیہ السلام مع اپنی بیوی کے تشریف لائے اور جو اولاد ہوتی گئی ان کو دین حق کی تعلیم فرماتے رہے اور وہ ان کی تعلیم پر عمل کرتے رہے، ایک مدت ایسی حالت میں گذر گئی، پھر طبیعتوں کے اختلاف کی وجہ سے اغراض میں اختلاف ہونا شروع ہوا، حتی کہ ایک عرصہ کے بعد اعمال وعقائد میں اختلاف کی نوبت آ گئی)۔

پھر (اس اختلاف کے دور کرنے کو) اللہ تعالیٰ نے (مختلف) پیغمبروں کو بھیجا جو کہ (حق ماننے والوں کو) خوشی (کے وعدے) سناتے تھے اور (نہ ماننے والوں کو عذاب سے) ڈراتے تھے، اور ان (پیغمبروں کی مجموعی جماعت) کے ساتھ (آسمانی) کتابیں بھی ٹھیک طور پر نازل فرمائیں (اور ان پیغمبروں کا بھیجنا اور کتابوں کا نازل فرمانا) اس غرض سے (تھا) کہ اللہ تعالیٰ (ان انبیاء وکتب کے ذریعہ سے اختلاف کرنے والے) لوگوں میں ان کے امور اختلافی (مذہبی) میں فیصلہ فرما دیں (کیونکہ انبیاء وکتب امر واقعی کا اظہار کر دیتے ہیں اور امر واقعی کے متعین ہونے سے ظاہر ہے کہ غیر واقعی کا غلط ہونا معلوم ہو جاتا ہے، اور یہی فیصلہ ہے، اور ان پیغمبروں کے ساتھ کتاب اللہ آنے سے چاہئے تو یہ تھا کہ ان کتابوں کو مان کر اختلاف ختم کر دیتے، مگر بعضوں نے خود اس کتاب ہی کو نہ مانا اور کتابوں ہی میں اختلاف کرنا شروع کر دیا)۔

اور اس کتاب میں (یہ) اختلاف اور کسی نے نہیں کیا، مگر صرف ان لوگوں نے جن کو (اولا) وہ کتاب ملی تھی (یعنی اہل علم واہل فہم نے اختلاف کیا کہ اول مخاطب وہی ہوتے ہیں دوسرے عوام تو ان کے ساتھ لگ لیا کرتے ہیں، اور اختلاف بھی کیسے وقت کیا) بعد اس کے کہ ان کے پاس دلائل واضح پہنچ چکے تھے (یعنی ان کے ذہن نشین ہو چکے تھے، اور اختلاف کیا کس وجہ سے صرف) باہمی ضد اضدی کی وجہ سے (اور اصلی وجہ ضد اضدی کی حب دنیا ہوتی ہے، حب مال ہو یا حب جاہ، پس حق کی مخالفت کی علت وہی حب دنیا ٹھہری، اور اسی مضمون کو بیان کرنا تھا)

پھر (یہ کفار کا اختلاف کبھی اہل ایمان کو نقصان دہ نہیں ہوا، بلکہ) اللہ تعالیٰ نے (ہمیشہ) ایمان والوں کو وہ امر حق جس میں (اختلاف کرنے والے) اختلاف کیا کرتے تھے بفضلہ تعالیٰ (رسولوں اور کتابوں پر ایمان لانے کی بدولت) بتلا دیا، اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں اسی کو راہ راست بتلا دیتے ہیں۔

* * *

فائدہ: حضرت آدم علیہ السلام کے وقت سے ایک ہی سچا دین رہا ایک مدت تک، اس کے بعد دین میں لوگوں نے اختلاف ڈالا تو خدا تعالیٰ نے انبیاء کو بھیجا جو اہل ایمان وطاعت کو ثواب کی بشارت دیتے تھے اور اہل کفر ومعصیت کو عذاب سے ڈراتے تھے اور ان کے ساتھ سچی کتاب بھی بھیجی تاکہ لوگوں کا اختلاف اور نزاع دور ہو اور دین حق ان کے اختلافات سے محفوظ اور قائم رہے اور احکام الٰہی میں انہی لوگوں نے اختلاف ڈالا جن کو وہ کتاب ملی تھی، جیسے یہود ونصاریٰ تورات وانجیل میں اختلاف وتحریف کرتے تھے اور یہ نزاع بے سمجھی سے نہیں کرتے تھے، بلکہ خوب سمجھ کر محض حب دنیا اور ضد اور حسد سے ایسا کرتے تھے، سو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے اہل ایمان کو طریقہ حق کی ہدایت فرمائی اور گمراہوں کے اختلافات سے بچا لیا، جیسے

آپ کی امت کو ہر عقیدہ اور ہر عمل میں امر حق کی تعلیم فرمائی اور یہود و نصاریٰ کے اختلاف اور افراط و تفریط سے ان کو محفوظ رکھا۔

فائدہ: اس آیت سے دو باتیں معلوم ہوئیں:

① ایک تو یہ کہ اللہ نے جو کتابیں اور نبی متعدد بھیجے تو اس واسطے نہیں کہ ہر فرقہ کو جدا طریقہ بتلایا ہو بلکہ سب کے لیے اللہ نے اصل میں ایک ہی راستہ مقرر کیا، جس وقت اس راہ سے بہکے تو اللہ نے نبی کو بھیجا اور کتاب اتاری کہ اس کے موافق چلیں، اس کے بعد پھر بہکے تو دوسرا نبی اور کتاب اللہ پاک نے اسی ایک راہ کے قائم کرنے کو بھیجا، اس کی مثال ایسی ہے جیسے کہ تندرستی ایک ہے اور بیماریاں بے شمار، جب ایک مرض پیدا ہوا تو اس کے موافق دوا اور پرہیز فرمایا، جب دوسرا مرض پیدا ہوا تو دوسری دوا اور پرہیز اس کے موافق فرمایا، اب آخر میں ایسا طریقہ اور قاعدہ فرما دیا جو سب بیماریوں سے بچائے اور سب کے بدلے کفایت کرے اور وہ طریقہ اسلام ہے، جس کے لیے پیغمبر آخر الزمان ﷺ اور قرآن شریف بھیجے گئے۔

② دوسری بات یہ معلوم ہوگئی کہ سنت اللہ یہی جاری ہے کہ برے لوگ ہر نبی مبعوث کے خلاف ہر کتاب الٰہی میں اختلاف کو پسند کرتے رہے اور اس میں ساعی رہے تو اب اہل ایمان کو کفار کی بدسلوکی اور فساد سے تنگ دل ہونا نہ چاہیے۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ؕ مَسَّتْهُمُ

کیا تم کو یہ خیال ہے کہ جنت میں چلے جاؤ گے حالانکہ تم پر نہیں گزرے حالات ان لوگوں جیسے جو ہو چکے تم سے پہلے، کہ پہنچی ان کو

الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ؕ

سختی اور تکلیف اور جھڑ جھڑائے گئے یہاں تک کہ کہنے لگا رسول اور جو اس کے ساتھ ایمان لائے کب آوے گی اللہ کی مدد

اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ﴿۲۱۴﴾

سن رکھو اللہ کی مدد قریب ہے

خلاصہ تفسیر: گذشتہ آیت میں کفار کا ہمیشہ سے انبیاء اور مؤمنین کے ساتھ اختلاف و مخالفت کرتے رہنے کا ذکر تھا جس میں مسلمانوں کو ایک گونہ تسلی دینا بھی مقصود تھی کہ یہ مخالفت تمہارے ساتھ نئی نہیں ہے، ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے، چنانچہ اب ان تکالیف و شدائد کا بیان فرماتے ہیں جو انبیاء اور مؤمنین سابقین کو کفار سے پہنچیں، اس سے بھی مسلمانوں کی تسلی کرنا مقصود ہے کہ تم کو بھی کفار کی ایذاؤں پر صبر کرنا چاہیے، کیونکہ آخرت کی کامل راحت تو سخت اذیت ہی اٹھانے سے ہے۔

(دوسری بات سنو) کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ جنت میں (بے مشقت) جا داخل ہوگے، حالانکہ (ابھی کچھ مشقت تو اٹھائی ہی نہیں، کیونکہ) تم کو ہنوز اُن (مسلمان) لوگوں کا سا عجیب واقعہ پیش نہیں آیا جو تم سے پہلے ہو گذرے ہیں، ان پر (مخالفین کے سبب) ایسی ایسی تنگی اور سختی واقع ہوئی اور (مصائب سے) ان کو یہاں تک جنبشیں ہوئیں کہ (اس زمانہ کے) پیغمبر تک اور جو ان کے ہمراہ اہل ایمان تھے (بے قرار ہو کر) بول اٹھے کہ اللہ تعالیٰ کی امداد (موعود) کب ہوگی؟ (جس پر ان کو اس جواب سے تسلی کی گئی کہ) یاد رکھو بیشک اللہ تعالیٰ کی امداد (بہت) نزدیک (ہونے والی) ہے۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ: یہ جو فرمایا کہ کیا جنت میں بے مشقت چلے جاؤ گے، تو اس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ بغیر مشقت و محنت کے اور بغیر مصائب و آفات میں مبتلا ہوئے کوئی شخص جنت میں نہ جائے گا، حالانکہ ارشادات قرآنی اور ارشادات نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے کہ بہت سے گنہگار محض اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم اور مغفرت سے جنت میں داخل ہوں گے ان پر کوئی مشقت بھی نہ ہوگی، جواب یہ ہے کہ ان کو بھی تھوڑی بہت تو مشقت کرنا پڑی جو ادنی درجہ کی ہے، اور مشقت و محنت کے درجات مختلف ہیں، جس کا ادنی درجہ نفس و شیطان سے مقابلہ یا دین حق کے مخالفین کے ساتھ مخالفت کر کے اپنے عقائد کا درست کرنا ہے اور یہ ہر مومن کو حاصل ہے، آگے اوسط و اعلیٰ درجات ہیں جس درجہ کی محنت و مشقت ہوگی

اسی درجہ کا دخول جنت ہوگا، اس طرح محنت و مشقت سے خالی کوئی نہ رہا، البتہ صحابہ چونکہ درجات عالیہ کے طالب تھے اور ہر مسلمان کو ایسا ہی ہونا چاہیے اس لیے ان درجات کے لیے بڑی بڑی مصیبتیں جھیلنے کو شرط کہا گیا، ایک حدیث میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''سب سے زیادہ سخت بلائیں اور مصیبتیں انبیاء علیہم السلام کو پہنچتی ہیں ان کے بعد جو ان کے قریب تر ہیں''۔

حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ: یہاں قابل نظر یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام اور ان کے ساتھیوں کا یہ عرض کرنا کہ اللہ تعالیٰ کی مدد کب آئے گی؟ کسی شک وشبہ کی وجہ سے نہ تھا جو ان کی شان کے خلاف ہے، بلکہ اس سوال کا منشاء یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اگرچہ مدد اور غلبہ کا وعدہ فرمایا ہے، مگر اس کا وقت اور مقام متعین نہیں فرمایا، اس ابہام کی وجہ سے مخالفین کی زیادتیاں دن بدن دیکھ کر ان کو جلدی ہی امداد کا انتظار ہوتا تھا، جب انتظار سے تھک جاتے تو اس طرح عرض معروض کرنے لگتے کہ یا اللہ! وہ امداد کب ہوگی؟ یہ توکل یا منصب نبوت کے خلاف نہیں، اس سے ان کا مقصود الحاح وزاری کے ساتھ دعا کرنا تھا اور یہ کیفیت تسلیم ورضا کے خلاف بھی نہیں، بلکہ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ دعا میں الحاح کرنا حق تعالیٰ کو پسند ہے، تو الحاح عین رضا ہے، البتہ ناپسندیدہ اور خلاف رضا وہ دعا ہے جس کے قبول نہ ہونے سے دعا کرنے والا ناراض ہو، سو معاذ اللہ انبیاء اور کامل مؤمنین میں نہ اس کا ثبوت ہے نہ احتمال۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ: اس آیت میں اس طرف اشارہ ہے کہ لذات کو چھوڑے بغیر اور مجاہدات کو برداشت کیے بغیر بارگاہ قدس تک رسائی نہیں ہوسکتی، اور حدیث ''حفّت الجنّة بالمکارہ'' سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ: اس آیت میں اس بات پر دلالت ہے کہ طبعی امور جیسے درد، غم اور تکلیف وغیرہ کاملین میں بھی پائے جاتے ہیں جیسے انبیاء کا مدد کے جلدی آنے کو طلب کرنا اس آیت میں مذکور ہے تو یہ امور کامل ہونے کے خلاف نہیں۔

* * *

فائدہ: پہلے مذکور ہوا کہ دشمنوں کے ہاتھ سے انبیاء اور ان کی امتوں کو ہمیشہ ایذائیں ہوئیں تو اب اہل اسلام کو ارشاد ہے کہ کیا تم کو اس بات کی طمع ہے کہ جنت میں داخل ہو جاؤ، حالانکہ اگلی امتوں کو جو ایذائیں پیش آئیں وہ تم کو پیش نہیں آئیں کہ ان کو فقر وفاقہ اور مرض اور خوف کفار اس درجہ کو پیش آئے کہ مجبور اور عاجز ہو کر نبی اور ان کی امت بول اٹھی کہ دیکھیے اللہ نے جس مدد اور اعانت کا وعدہ فرمایا تھا وہ کب آئے گی؟ یعنی بتقضائے بشریت پریشانی کی حالت میں مایوسانہ کلمات سرزد ہونے لگے، انبیاء اور مومنین کا یہ کہنا کچھ شک کی وجہ سے نہ تھا، حضرت مولانا اسی کی بابت مثنوی میں فرماتے ہیں:

درگماں افتاد جان انبیاء زاتفاق منکری اشقیاء

بلکہ بحالت اضطرار بمقتضائے بشریت اسکی نوبت آئی جس میں کوئی ان پر الزام نہیں، جب نوبت یہاں تک پہنچی تو رحمت الٰہی متوجہ ہوئی اور ارشاد ہوا کہ ہوشیار ہو جاؤ، اللہ کی مدد آگئی، گھبراؤ نہیں، سوائے مسلمانو! تکالیف دنیاوی سے اور دشمنوں کے غلبہ سے گھبراؤ نہیں، تحمل کرو اور ثابت قدم رہو۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۭ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى

تجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا چیز خرچ کریں ؎ کہہ دو کہ جو کچھ تم خرچ کرو مال سو ماں باپ کے لئے اور قرابت والوں کے اور یتیموں کے

وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۭ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۲۱۵﴾

اور محتاجوں کے اور مسافروں کے، اور جو کچھ کرو گے تم بھلائی سو وہ بیشک اللہ کو خوب معلوم ہے ؎

خلاصہ تفسیر: (اب پھر احکام کا سلسلہ شروع ہوتا ہے) لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ (ثواب کے واسطے) کیا چیز خرچ کیا کریں (اور کس موقع پر صرف کیا کریں) آپ فرما دیجئے کہ جو مال تم کو صرف کرنا ہو سو (اس کی تعیین تو تمہاری ہمت پر ہے، مگر ہاں! موقع ہم بتلائے

دیتے ہیں کہ) ماں باپ کا حق ہے اور قرابت داروں اور بے باپ کے بچوں کا اور محتاجوں کا اور مسافر کا اور جو نسا نیک کام کرو گے (خواہ راہ خدا میں خرچ کرنا ہو یا اور کچھ ہو) سو اللہ تعالیٰ کو اس کی خوب خبر ہے (وہ اس پر ثواب دیں گے)۔

ماں باپ کو زکوۃ اور دوسرے صدقات واجبہ دینا درست نہیں، اس آیت میں صدقہ نافلہ کا بیان ہے وہ والدین کو دینا درست ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ آیات سابقہ میں کلیۃً یہ مضمون بہت تاکید سے بیان ہوا کہ کفر و نفاق کو چھوڑو اور اسلام میں پوری طرح داخل ہو، حکم الٰہی کے مقابل کسی کی مت سنو، اللہ کی خوشی میں جان و مال خرچ کرو اور ہر طرح کی شدت اور تکلیف پر تحمل کرو، اب یہاں سے اسی کلیہ کے متعلق جزئیات کی تفصیل بیان ہوتی ہے جو کہ مال اور جان اور دیگر معاملات مثل نکاح و طلاق وغیرہ کے متعلق ہیں، تا کہ اس کلیہ کی تحقیق و تاکید خوب ذہن نشین ہو جائے۔

فائدہ: ۲ بعض اصحاب جو مالدار تھے انہوں نے آپ ﷺ سے دریافت کیا تھا کہ مال میں سے کیا خرچ کریں اور کس پر خرچ کریں، اس پر یہ حکم ہوا کہ قلیل خواہ کثیر جو کچھ خدا کے لیے خرچ کرو وہ والدین اور اقارب اور یتیم محتاج اور مسافروں کے لیے ہے، یعنی حصول ثواب کے لیے خرچ کرنا چاہو تو جتنا چاہو کرو، اس کی کوئی تعیین و تحدید نہیں، البتہ یہ ضروری ہے کہ جو مواقع ہم نے بتلائے ان میں صرف کرو۔

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسَىٰ أَن تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۖ

فرض ہوئی تم پر لڑائی ۱ اور وہ بری لگتی ہے تم کو ۲ اور شاید کہ تم کو بری لگے ایک چیز اور وہ بہتر ہو تمہارے حق میں

وَعَسَىٰ أَن تُحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۗ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ﴿٢١٦﴾ ع

اور شاید تم کو بھلی لگے ایک چیز اور وہ بری ہو تمہارے حق میں، اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے ۳

خلاصہ تفسیر: جہاد کرنا تم پر فرض کیا گیا ہے اور وہ تم کو (طبعی طور پر) گراں (معلوم ہوتا) ہے، اور یہ بات ممکن ہے کہ تم کسی بات کو گراں سمجھو اور (واقع میں) وہ تمہارے حق میں خیر (اور مصلحت) ہو، اور یہ (بھی) ممکن ہے کہ تم کسی امر کو مرغوب سمجھو اور (واقع میں) وہ تمہارے حق میں خرابی (کا باعث) ہو اور (ہر شے کی حقیقت حال کو) اللہ تعالیٰ جانتے ہیں اور تم (پورا پورا) نہیں جانتے (اچھے برے کا فیصلہ اپنی خواہش کی بنیاد پر نہ کرو، جو کچھ اللہ کا حکم ہو جائے، اسی کو اجمالاً مصلحت سمجھ کر اس پر کاربند رہا کرو)۔

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ: یعنی جہاد تم فرض کیا گیا ہے اور وہ تم کو (طبعی طور پر) گراں ہے، یہاں "طبعی" کی قید اس لیے لگائی کہ مسلمان کو شرعی احکام میں عقلی طور پر ناگواری یا کراہت کبھی نہیں ہو سکتی۔

وَعَسَىٰ أَن تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ: اس میں لفظ شیئا انقباض کی کیفیت کو بھی شامل ہے، سو قبض کی کیفیت میں بھی فوائد و منافع ہوتے ہیں۔

وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ: یعنی اللہ تعالیٰ جانتے ہیں اور تم نہیں جانتے، اس آیت سے ہمارے نوخیز فلسفیوں کو سبق لینا چاہیے کہ اس کے مضمون سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ہر حکم کی مصلحت ہمارے احاطہ علمی سے خارج ہے اگرچہ واقع میں ضرور ہوتی ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ: یعنی دین کے دشمنوں سے لڑنا فرض ہوا۔

فائدہ: جب تک آپ ﷺ مکہ میں رہے آپ ﷺ کو مقاتلہ کی اجازت نہ ہوئی جب مدینہ کو ہجرت فرمائی تو مقابلہ کی اجازت ہوئی مگر صرف ان کفار سے کہ جو خود اہل اسلام سے مقاتلہ کریں اس کے بعد علی العموم کفار سے مقاتلہ کی اجازت ہوگئی اور جہاد فرض ہوا اگر دشمنان دین مسلمانوں پر چڑھائی کریں تو مسلمانوں پر جہاد فرض عین ہے ورنہ فرض کفایہ بشرطیکہ جملہ شرائط جہاد جو کتب فقہ میں مذکور ہیں پائی جائیں البتہ جن لوگوں

سے مسلمان مصالحت اور معاہدہ کرلیں یا ان کی امن اور حفاظت میں آجائیں تو ان سے لڑائی کرنا یا ان کے مقابلہ میں ان کے کسی مخالف کو مدد دینا ہرگز مسلمانوں کو جائز نہیں۔

فائدہ:۲ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ: برا لگنے کا مطلب یہ ہے کہ نفس کو دشوار اور گراں معلوم ہوتا ہے یہ نہیں کہ قابل رد و انکار نظر آئے اور مخالف حکمت و مصلحت سمجھا جائے اور موجب ناخوشی اور تنفر ہو سو اتنی بات میں کوئی الزام نہیں جب انسان کو بالطبع زندگی سے زیادہ کوئی چیز مرغوب نہیں تو ضرور مقاتلہ سے زیادہ دشوار کوئی شے نہ ہونی چاہیے۔

فائدہ:۳ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ: یعنی یہ بات ضروری نہیں کہ جس چیز کو تم اپنے حق میں نافع یا مضر سمجھو، وہ واقعہ میں بھی تمہارے حق میں ویسی ہی ہوا کرے، بلکہ ہوسکتا ہے کہ تم ایک چیز کو اپنے لیے مضر سمجھو اور وہ مفید ہو، اور کسی چیز کو مفید خیال کرلو اور وہ مضر ہو، تم نے تو سمجھ لیا کہ جہاد میں جان و مال سب کا نقصان ہے اور ترک جہاد میں دونوں کی حفاظت، اور یہ نہ جانا کہ جہاد میں دنیا اور آخرت کے کیا کیا منافع ہیں، اور اس کے ترک میں کیا کیا نقصان ہیں، تمہارے نفع نقصان کو خدا ہی خوب جانتا ہے، تم اسے نہیں جانتے، اس لیے وہ جو حکم دے اس کو حق سمجھو اور اپنے اس خیال کو چھوڑو۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ؕ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ ؕ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ

تجھ سے پوچھتے ہیں مہینہ حرام کو کہ اس میں لڑنا کیسا ۱ کہدے لڑائی اس میں بڑا گناہ ہے ۲ اور روکنا اللہ کی راہ سے

وَكُفْرٌۢ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۗ وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ

اور اس کو نہ ماننا اور مسجد الحرام سے روکنا، اور نکال دینا اس کے لوگوں کو وہاں سے اس سے بھی زیادہ گناہ ہے اللہ کے نزدیک ۳

وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ؕ وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ

اور لوگوں کو دین سے بچلانا قتل سے بھی بڑھ کر ہے ۴ اور کفار تو ہمیشہ تم سے لڑتے ہی رہیں گے یہاں تک کہ تم کو پھیر دیں تمہارے دین سے

اِنِ اسْتَطَاعُوْا ؕ وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ

اگر قابو پاویں ۵ اور جو کوئی پھرے تم میں سے اپنے دین سے پھر مر جاوے حالت کفر ہی میں تو ایسوں کے ضائع ہوئے عمل

فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۱۷﴾

دنیا اور آخرت میں، اور وہ لوگ رہنے والے ہیں دوزخ میں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے ۶

خلاصہ تفسیر: نبی اکرم ﷺ کے چند صحابہ کا ایک سفر میں اتفاق سے کفار کے ساتھ مقابلہ ہوگیا، ایک کافر ان کے ہاتھ سے مارا گیا اور جس دن یہ قصہ ہوا رجب کی پہلی تاریخ تھی، اور رجب حرمت کے مہینوں میں سے ہے، جن میں قتل و قتال پہلے منع تھا، مگر صحابہ اس کو جمادی الاخری کی تیس تاریخ سمجھ رہے تھے، کفار نے اس واقعہ پر طعن کیا کہ مسلمانوں نے شہر حرام کی حرمت کا بھی خیال نہ کیا، مسلمانوں کو اس کی فکر ہوئی اور نبی ﷺ سے پوچھا، اور بعض روایات میں ہے کہ خود بعض کفار قریش نے بھی حاضر ہو کر اعتراضا سوال کیا اس پر یہ آیت نازل ہوئی، خلاصہ جواب یہ ہے کہ اول تو مسلمانوں نے کوئی گناہ نہیں کیا اور بالفرض اگر کیا ہے تو معترضین اس سے بڑے بڑے گناہ یعنی کفر اور دین حق کی مخالفت میں مبتلا ہیں، پھر ان کو مسلمانوں پر اعتراض کرنے کا کب منصب ہے۔

لوگ آپ سے شہر حرام میں قتال کرنے کے متعلق سوال کرتے ہیں، آپ فرما دیجئے کہ اس میں خاص طور پر (یعنی عمدا) قتال کرنا جرم عظیم ہے (مگر مسلمانوں نے ایسا نہیں کیا، بلکہ تاریخ کی تحقیق نہ ہونے کے سبب غلطی سے ایسا ہوگیا، یہ تحقیقی جواب ہے) اور (الزامی جواب یہ ہے کہ کفار و مشرکین کا تو مسلمانوں پر اعتراض کرنے کا کسی طرح منہ ہی نہیں، کیونکہ اگرچہ شہر حرام میں لڑنا جرم عظیم ہے، لیکن ان کفار کی جو حرکتیں ہیں یعنی) اللہ تعالیٰ کی راہ (دین) سے (لوگوں کو) روک ٹوک کرنا (یعنی مسلمان ہونے پر تکلیفیں پہنچانا تاکہ ڈر کے مارے لوگ مسلمان نہ ہوں) اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کرنا، اور مسجد حرام (یعنی کعبہ) کے ساتھ کفر کرنا (کہ وہاں بت رکھ چھوڑے تھے اور بجائے خدا کی عبادت کے ان بتوں کی عبادت اور طواف کرتے تھے) اور جو لوگ مسجد حرام کے اہل تھے (یعنی رسول اللہ ﷺ اور دوسرے مؤمنین) ان کو (تنگ اور پریشان کرکے) اس (مسجد حرام) سے خارج (ہونے پر مجبور) کردینا (جس سے ہجرت یعنی ترک وطن کی نوبت پہنچی، سو یہ حرکتیں شہر حرام میں قتال کرنے سے بھی زیادہ) جرم عظیم ہیں اللہ تعالیٰ کے نزدیک (کیونکہ یہ حرکتیں دین حق کے اندر فتنہ پردازی کرنا ہے) اور (ایسی) فتنہ پردازی کرنا (اس) قتل (خاص) سے (جو مسلمانوں سے صادر ہوا) بدرجہا (قباحت میں) بڑھ کر ہے (کیونکہ اس قتل سے دین حق کو تو کوئی مضرت نہیں پہنچی، بہت سے بہت اگر کوئی جان کر ایسا کرے تو خود ہی گنہگار ہوگا اور ان حرکتوں سے تو دین حق کو نقصان پہنچتا ہے کہ اس کی ترقی رکتی ہے)

اور یہ کفار تمہارے ساتھ ہمیشہ جنگ (وجدال کا سلسلہ جاری ہی) رکھیں گے، اس غرض سے کہ اگر (خدانہ کرے) قابو پائیں تو تم کو تمہارے دین (اسلام) سے پھیر دیں (ان کے اس فعل سے دین کی مزاحمت ظاہر ہے)۔

(آگے مسلمانوں کو احتیاطا متنبہ فرماتے ہیں کہ یہ کفار جو دین حق کی مزاحمت میں کوشش کررہے ہیں، اگر اس سعی کا کوئی اتباع کر بیٹھے، یعنی دین حق سے پھر جائے تو اس کا کیا انجام ہے) اور جو شخص تم میں سے اپنے دین (اسلام) سے پھر جائے، پھر کافر ہی ہونے کی حالت میں مرجائے تو ایسے لوگوں کے (نیک) اعمال دنیا اور آخرت میں سب غارت ہوجاتے ہیں (اور) یہ لوگ دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے

حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ: دنیا میں اعمال کا ضائع ہونا یہ ہے کہ اسکی بیوی نکاح سے نکل جاتی ہے، اور اگر اسکا کوئی مسلمان عزیز مرے تو اس مرتد کو میراث کا حصہ نہیں ملتا، حالت اسلام میں نماز روزہ جو کچھ کیا تھا سب کالعدم ہوجاتا ہے، مرنے کے بعد جنازہ کی نماز نہیں پڑھی جاتی، مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہیں ہوتا، اور آخرت میں ضائع ہونا یہ ہے کہ عبادات کا ثواب نہیں ملتا اور ہمیشہ کیلئے دوزخ میں داخل ہوتا ہے۔

* * *

فائدہ: ا۔ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ: حضرت فخر عالم ﷺ نے اپنی ایک جماعت کافروں کے مقابلہ کو بھیجی، انہوں نے کافروں کو مارا اور مال لوٹ لائے، مسلمان تو جانتے تھے کہ وہ اخیر دن جمادی الثانی کا ہے اور وہ رجب کا غرہ تھا، جو کہ اشہر حرم میں داخل ہے، کافروں نے اس پر بہت طعن کیا کہ محمد ﷺ نے حرام مہینہ کو بھی حلال کردیا اور اپنے لوگوں کو حرام مہینہ میں لوٹ مار کی اجازت دے دی، مسلمانوں نے حاضر ہوکر آپ ﷺ سے پوچھا کہ ہم سے شبہ میں یہ کام ہوا، اس کا کیا حکم ہے؟ تب یہ آیت اتری۔

فائدہ: ۲۔ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ: یعنی شہر حرام میں قتال کرنا بیشک گناہ کی بات ہے، لیکن حضرات صحابہ نے تو اپنے علم کے موافق جمادی الثانی میں جہاد کیا تھا، شہر حرام یعنی رجب میں نہیں کیا، اس لیے مستحق عفو ہیں، ان پر الزام لگانا بے انصافی ہے۔

فائدہ: ۳۔ وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ: یعنی لوگوں کو اسلام لانے سے روکنا اور خود دین اسلام کو تسلیم نہ کرنا اور زیارت بیت اللہ سے لوگوں کو روکنا اور مکہ کے رہنے والوں کو وہاں سے نکالنا، یہ باتیں شہر حرام میں مقاتلہ کرنے سے بھی زیادہ گناہ ہیں اور کفار برابر یہ حرکات کرتے تھے، خلاصہ یہ کہ شہر حرام میں بلاوجہ اور ناحق لڑنا بیشک اشد گناہ ہے، مگر جو لوگ کہ حرم میں بھی کفر پھیلائیں اور بڑے بڑے فساد کریں اور اشہر حرم میں بھی مسلمانوں کے ستانے میں قصور نہ کریں، ان سے لڑنا منع نہیں، علاوہ ازیں جب مشرکین ایسے امور شنیعہ میں سرگرم ہیں تو ایک تھوڑے قصور پر مسلمانوں کی

نسبت طعن کرنا جوان سے بوجہ لاعلمی صادر ہوا بڑی شرم کی بات ہے۔

فائدہ: ۴. وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ: یعنی دین میں فتنہ اور فساد ڈالنا تا کہ لوگ دین حق کو قبول نہ کریں، اُس قتل سے بدر جہا مذموم ہے جو مسلمانوں سے شہر حرام میں واقع ہوا، مشرکین کی عادت تھی کہ دین اسلام کی باتوں میں طرح طرح سے خدشات کیا کرتے تھے تا کہ لوگ شبہ میں پڑ جائیں اور اسلام کو قبول نہ کریں، چنانچہ اسی قصہ میں کہ مسلمانوں سے شہر حرام میں بوجہ لاعلمی قتل واقع ہوا اس پر مشرکین نے جو زبان درازی کی تو اس سے مقصود یہی تھا کہ لوگ قبول اسلام سے متنفر ہو جائیں، تو خلاصہ یہ ہوا کہ مسلمانوں سے جو قتل صادر ہوا اس پر مشرکین کا طعن کرنا اس وجہ سے کہ لوگ دین حق سے بچ جائیں قتل مذکور سے بدر جہا مذموم و شنیع ہے۔

فائدہ: ۵. حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا: یعنی جب تک تم دین حق پر قائم رہو گے یہ مشرکین کسی حالت میں اور کسی موقع پر بھی تمہارے مقاتلہ اور مخالفت میں کمی نہیں کریں گے۔ حرم مکہ اور شہر حرام ہی کیوں نہ ہو، جیسا کہ عمرہ حدیبیہ میں پیش آیا، نہ حرم مکہ کی حرمت کی اور نہ شہر حرام کی، بلا وجہ محض عناد سے مارنے مرنے کو مستعد ہو گئے اور مسلمانوں کے مکہ میں جانے اور عمرہ کرنے کے روادار نہ ہوئے، پھر ایسے معاندین کے طعن تشنیع کی کیا پروا کی جائے اور ان سے مقاتلہ کرنے میں شہر حرام کی وجہ سے کیوں رکا جائے۔

فائدہ: ۶. هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ: یعنی دین اسلام سے پھر جانا اور اسی حالت پر اخیر تک قائم رہنا ایسی سخت بلا ہے کہ عمر بھر کے نیک کام ان کے ضائع ہو جاتے ہیں کہ کسی بھلائی کے مستحق نہیں رہتے، دنیا میں ان کی جان و مال محفوظ رہے نہ نکاح قائم رہے نہ انکو میراث ملے نہ آخرت میں ثواب ملے اور نہ کبھی جہنم سے نجات نصیب ہو، ہاں اگر پھر اسلام قبول کر لیا تو صرف اس اسلام کے بعد کے اعمال حسنہ کی جزا پوری ملے گی۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ ؕ

بے شک جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے ہجرت کی اور لڑے اللہ کی راہ میں، وہ امیدوار ہیں اللہ کی رحمت کے

وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۱۸﴾

اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے

خلاصہ تفسیر: شہر حرام میں قتال کرنے کے بارے میں مسلمانوں کو مذکورہ جواب سن کر گناہ نہ ہونے کا تو اطمینان ہو گیا تھا، مگر اس خیال سے دل شکستہ تھے کہ ثواب نہ ملا ہوگا، اب اس میں ان کی تسلی کی گئی:

حقیقۃً جو لوگ ایمان لائے ہوں، اور جن لوگوں نے راہ خدا میں ترک وطن کیا ہو، اور جہاد کیا ہو ایسے لوگ تو رحمت خداوندی کے امیدوار ہوا کرتے ہیں (اور تم لوگوں میں یہ سب صفات یا ان میں سے بعض ضرور موجود ہیں، چنانچہ ایمان اور ہجرت تو ظاہر ہے، رہا اس جہاد خاص میں شبہ ہو سکتا ہے، سو چونکہ تمہاری نیت تو جہاد ہی کی تھی، لہذا ہمارے نزدیک وہ بھی جہاد ہی میں شمار ہے، پھر ان صفات کے ہوتے ہوئے تم کیوں ناامید ہوتے ہو) اور اللہ تعالیٰ (اس غلطی کو) معاف کر دیں گے اور (ایمان، جہاد اور ہجرت کی وجہ سے تم پر) رحمت کریں گے۔

* * *

فائدہ: آیت سابقہ سے جماعت اصحاب مذکورہ بالا کو یہ تو معلوم ہو گیا کہ ہمارے اوپر اس بارے میں کوئی مواخذہ نہیں، مگر یہ تردد ان کو تھا کہ دیکھئے اس جہاد کا ثواب بھی ملتا ہے یا نہیں؟ اس پر یہ آیت اتری کہ جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کی اور اللہ کے واسطے اس کے دشمنوں سے لڑے، اپنی کوئی غرض اس لڑائی میں نہ تھی، وہ بیشک اللہ کی رحمت کے امیدوار اور اس کے مستحق رہیں، اور اللہ اپنے بندوں کی خطائیں بخشنے والا اور ان پر انعام فرمانے والا ہے، وہ ایسے تابعداروں کو محروم نہ کرے گا۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ؕ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۫ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ

تجھ سے پوچھتے ہیں حکم شراب کا اور جوئے کا، کہدے ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور فائدے بھی ہیں لوگوں کو اور ان کا گناہ بہت بڑا ہے

مِنْ نَّفْعِهِمَا ؕ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ؕ قُلِ الْعَفْوَ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ

انکے فائدہ سے اور تجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں، کہدے جو بچے اپنے خرچ سے اسی طرح بیان کرتا ہے اللہ تمہارے واسطے

الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۱۹﴾ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ؕ

حکم تا کہ تم فکر کرو، دنیا و آخرت کی باتوں میں

خلاصہ تفسیر: لوگ آپ سے شراب اور قمار کی نسبت دریافت کرتے ہیں، آپ فرما دیجئے کہ ان دونوں (چیزوں کے استعمال) میں گناہ کی بڑی بڑی باتیں بھی (پیدا ہوجاتی) ہیں اور لوگوں کو (بعض) فائدے بھی ہیں اور (وہ) گناہ کی باتیں ان فائدوں سے زیادہ بڑھی ہوئی ہیں (اس لئے دونوں قابل ترک ہیں) اور لوگ آپ سے دریافت کرتے ہیں کہ (خیر خیرات میں) کتنا خرچ کیا کریں؟ آپ فرما دیجئے کہ جتنا آسان ہو (کہ اس کے خرچ کرنے سے خود پریشان ہوکر دنیوی تکلیف میں، یا کسی کا حق ضائع کر کے اخروی تکلیف میں نہ پڑ جائیں) اللہ تعالیٰ اس طرح احکام کو صاف صاف بیان فرماتے ہیں تا کہ تم (کو ان احکام کا علم ہوجائے اور اس علم کی وجہ سے ہر عمل کرنے سے پہلے) دنیا و آخرت کے معاملات میں (ان احکام کو) سوچ لیا کرو (اور سوچ کر ہر معاملہ میں ان احکام کے موافق عمل کیا کرو)۔

قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ: اس آیت میں شراب اور قمار کے بعض فوائد کو تسلیم کرتے ہوئے ان سے رکنے کی ہدایت فرمائی گئی ہے، پہلے یہ دونوں چیزیں حلال تھیں، سب سے پہلی آیت شراب اور جوا کے متعلق یہ نازل ہوئی، اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ ان دونوں کا استعمال خود گناہ ہے، بلکہ مطلب یہ تھا کہ ان کے استعمال سے اکثر اوقات گناہ کی دوسری باتیں پیدا ہوجاتی ہیں، کیونکہ شراب سے عقل جاتی رہتی ہے اور عقل ہی سب گناہوں سے روکتی ہے، جوا سے مال کی حرص بڑھتی ہے اور حرص سے چوری وغیرہ کی عادت پیدا ہوجاتی ہے، تو اس آیت سے ان دونوں کی فی نفسہ حرمت کا بیان کرنا مقصود نہیں تھا، بلکہ بعض عوارض کی وجہ سے ان کو چھوڑنے کا مشورہ دیا تھا کہ ان میں نفع اتنا نہیں ہے جتنا نقصان ہوجاتا ہے، شراب کا نفع لذت کا نشہ، اور جوے کا نفع مال کا حصول ہے، مگر یہ نفع فوری ہے اور اپنی ہی ذات کو ہوتا ہے لیکن اس کا نقصان دیرپا ہے اور دوسروں تک پہنچتا ہے، یہی وجہ تھی کہ اس آیت کو سن کر بعض نے تو فوراً دونوں کو چھوڑ دیا، بعض نے کہا کہ جب حرام نہیں تو ان مفاسد کا ہم کچھ انتظام کر کے نفع حاصل کرنے کے لیے استعمال کر سکتے ہیں، اگر یہ آیت حرمت کے بیان کے لیے ہوتی تو اہل لسان بکثرت اتنی بڑی غلطی میں نہ پڑتے، پھر اس آیت کے بعد کسی صحابی نے شراب پی کر نماز پڑھی اور غلط پڑھی تو نماز کے اوقات میں پینا بالکل ممنوع ہوگیا، پھر کچھ عرصہ بعد مطلقاً حرام کر دی گئی اور یہی آخری حکم ہے جس نے پہلے احکام کو منسوخ کر دیا۔

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جلب منفعت سے دفع مضرت مقدم ہے، یعنی ایک کام کے ذریعے کچھ فائدہ بھی حاصل ہوتا ہے اور ساتھ ہی کوئی (نقصان) مضرت بھی پہنچتی ہے تو مضرت (نقصان) سے بچنے کے لئے اس منفعت (فائدہ) کو چھوڑ دینا ہی ضروری ہوتا ہے، یعنی ایسی منفعت کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے جو مضرت کے ساتھ حاصل ہو۔

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ: چند آیات قبل بھی ایک آیت میں اس قسم کا سوال آچکا ہے جس میں ضمناً یہ حکم بھی معلوم ہو چکا ہے کہ جو کچھ ہمت ہو خرچ کرو، اس میں یہ بات پوچھنے کے قابل تھی کہ اگر جوش میں آکر سب کچھ دینے کی ہمت ہو تو یہ ہمت معتبر ہے یا نہیں؟ اسکا جواب یہاں دیا گیا۔

قُلِ الْعَفْوَ: اس میں اصل ہے ذخیرہ نہ رکھنے کی، جیسا کہ بہت سے بزرگوں کی عادت رہی ہے کہ جو مال آتا ہے خرچ فرما دیتے ہیں۔

* * *

فائدہ: ۱۔ یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ: شراب اور جوئے کے حق میں کئی آیتیں اتریں، ہر ایک میں ان کی برائی ظاہر کی گئی، آخر سورۃ مائدہ کی آیت میں صاف ممانعت کر دی گئی، اب جو چیزیں نشہ لا دیں، وہ سب حرام ہیں۔

اور جو شرط باندھی جائے کسی چیز پر جس میں ہار اور جیت ہو، وہ محض حرام ہے، اور ایک طرف کی شرط حرام نہیں۔

فائدہ: ۲۔ وَاِثْمُهُمَآ اَکْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا: شراب پینے سے عقل جاتی رہتی ہے، جو تمام امور شنیعہ سے بچاتی ہے اور لڑائی اور قتل وغیرہ طرح طرح کی خرابیوں کی نوبت آتی ہے اور مختلف قسم کے امراض روحانی اور جسمانی پیدا ہوتے ہیں، جو بسا اوقات باعث ہلاکت ہوتے ہیں اور جوا کھیلنے میں حرام مال کا کھانا اور سرقہ اور تضییع مال اور عیال باہم دشمنی وغیرہ طرح طرح کے مفاسد ظاہری و باطنی پیش آتے ہیں، ہاں! ان میں سرسری نفع بھی ہے، مثلاً شراب پی کر لذت و سرور ہو گیا اور جوا کھیل کر بلا مشقت مال ہاتھ آ گیا۔

فائدہ: ۳۔ وَیَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ: لوگوں نے پوچھا تھا کہ مال اللہ کے واسطے کس قدر خرچ کریں؟ حکم ہوا کہ جو اپنے اخراجات ضروری سے افزود (زائد) ہو، کیونکہ جیسا آخرت کا فکر ضرور ہے، دنیا کا فکر بھی ضرور ہے، اگر سارا مال اٹھا ڈالو تو اپنی ضروریات کیونکر پوری کرو اور جو حقوق تم پر لازم ہیں ان کو کیونکر ادا کرو، معلوم نہیں کس کس خرابی دینی اور دنیاوی میں پھنسو۔

فائدہ: ۴۔ لَعَلَّکُمْ تَتَفَکَّرُوْنَ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ: یعنی دنیا فانی مگر محل حوائج ہے اور آخرت باقی اور دار ثواب ہے، اس لیے سوچ سمجھ کر ہر ایک امر میں اس کے مناسب حال خرچ کرنا چاہیے اور مصلحت دنیا اور آخرت دونوں کو پیش نظر رکھنا مناسب ہے اور احکام کو واضح طور پر بیان فرمانے سے یہی مطلوب ہے کہ تم کو فکر کرنے کا موقع ملے۔

وَیَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْیَتٰمٰی ؕ قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَیْرٌ ؕ وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُکُمْ ؕ وَاللّٰهُ

اور تجھ سے پوچھتے ہیں یتیموں کا حکم ۱؎ کہہ دے سنوارنا ان کے کام کا بہتر ہے، اور اگر ان کا خرچ ملا لو تو وہ تمہارے بھائی ہیں، اور اللہ

یَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَکُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ ﴿۲۲۰﴾

جانتا ہے خرابی کرنے والے اور سنوارنے والے کو ۲؎ اور اگر اللہ چاہتا تو تم پر مشقت ڈالتا ۳؎ بیشک اللہ زبردست ہے تدبیر والا ۴؎

خلاصہ تفسیر: ابتداء اسلام میں ہندوستان کی طرح عرب میں بھی یتیموں کا حق دینے میں پوری احتیاط نہ تھی، اس لئے یہ وعید سنائی گئی تھی کہ یتیموں کا مال کھانا ایسا ہے جیسا دوزخ کے انگارے پیٹ میں بھرنا، تو سننے والے ڈر کے مارے اتنی احتیاط کرنے لگے کہ ان کا کھانا بھی الگ ہی پکواتے اور الگ ہی رکھواتے اور اتفاقاً اگر بچہ کم کھاتا تو کھانا بچتا اور سڑتا اور پھینکنا پڑتا، کیونکہ اس کا استعمال نہ ان لوگوں کے لئے جائز تھا اور نہ یتیم کے مال کو صدقہ کر دینے کا اختیار تھا، اس طرح کرنے میں تکلیف بھی ہوتی اور یتیم کا مال ضائع بھی ہوتا، اس لئے یہ معاملہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں عرض کیا گیا، اس کے متعلق آیت میں یہ ارشاد آیا۔

اور لوگ آپ سے یتیم بچوں (کے خرچ علیحدہ یا شامل رکھنے) کا حکم پوچھتے ہیں، آپ فرما دیجئے کہ (ہمارا اصل مقصود ان کے اموال کھانے کی ممانعت سے یہ ہے کہ ان کی مصلحت کو ضائع نہ کیا جائے اور جب خرچ شامل رکھنے میں ان کی مصلحت ہے تو) ان کی مصلحت کی رعایت رکھنا (علیحدہ خرچ رکھنے سے جو خلاف مصلحت ہے) زیادہ بہتر ہے اور تم ان کے ساتھ خرچ شامل رکھو تو (کچھ ڈر کی بات نہیں، کیونکہ) وہ (بچے) تمہارے (دینی) بھائی ہیں (اور بھائی بھائی شامل ہی رہا کرتے ہیں) اور اللہ تعالیٰ مصلحت کے ضائع کرنے والے کو اور مصلحت کی رعایت رکھنے والے کو (الگ الگ) جانتے ہیں (پس اس طرح ان کے مال کو نہیں ملانا چاہیے جس میں یتیم کی مصلحت ضائع ہو جائے مثلاً تھوڑا سا برائے نام اپنا ملا دیا باقی سب یتیم ہی کا کھایا

تو جو ایسا کرے گا اللہ تعالیٰ سے اس کی بدنیتی چھپ نہیں سکتی، اور بلا علم و بلا قصد کچھ کمی بیشی ہو بھی جائے تو چونکہ اللہ تعالیٰ کو اس کی نیک نیتی معلوم ہے، اس لئے اس پر مواخذہ نہ ہوگا) اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتے تو (اس معاملہ میں سخت قانون مقرر کرکے) تم کو مصیبت میں ڈال دیتے (کیونکہ) اللہ تعالیٰ زبردست ہیں (مگر قانون سہل اس لئے مقرر فرمایا کہ وہ) حکمت والے (بھی) ہیں (ایسا حکم نہیں دیتے جو نہ ہو سکے)۔

وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ: چونکہ اس وقت اکثر مسلمانوں کے پاس مسلمان ہی یتیم تھے اس لیے یہاں اخوانکم کی قید اتفاقی فرمادی، ورنہ اگر دوسرے مذہب کا یتیم بچہ بھی اپنی تربیت میں ہو تو اس کا بھی بعینہ یہی حکم ہے۔

***

فائدہ: ۱ وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى: بعض لوگ یتیم کے مال میں احتیاط نہ کرتے تھے تو اس پر حکم ہوا تھا وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ (الانعام:۱۵۲) اور اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا (النساء:۱۰) اس پر جو لوگ یتیموں کی پرورش کرتے تھے وہ ڈر گئے اور یتیموں کے کھانے اور خرچ کو بالکل جدا کر دیا، کیونکہ شرکت کی حالت میں یتیم کا مال کھانا پڑتا تھا، اس میں یہ دشواری ہوئی کہ ایک چیز یتیم کے واسطے تیار کی، اب جو کچھ بچتی وہ خراب جاتی اور پھینکنی پڑتی، اس احتیاط میں یتیموں کا نقصان ہونے لگا تو آپ ﷺ سے عرض کیا تو اس پر اب یہ آیت نازل ہوئی۔

فائدہ: ۲ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ: یعنی مقصود تو صرف یہ بات ہے کہ یتیم کے مال کی درستی اور اصلاح ہو، سو جس موقع میں علیحدگی میں یتیم کا نفع ہو تو اس کو اختیار کرنا چاہیے اور جہاں شرکت میں بہتری نظر آئے تو ان کا خرچ شامل کر لو تو کچھ مضائقہ نہیں کہ ایک وقت ان کی چیز کھالی تو دوسرے وقت اپنی چیز ان کو کھلا دی، کیونکہ وہ یتیم بچے تمہارے دینی یا نسبی بھائی ہیں اور بھائیوں میں شرکت اور کھانا کھلانا بیجا نہیں، ہاں! یہ ضرور ہے کہ یتیموں کی اصلاح کی رعایت پوری رہے اور اللہ خوب جانتا ہے کہ اس شرکت سے کس کو خیانت اور افساد مال یتیم مقصود ہے اور کس کو یتیموں کی اصلاح اور ان کی نفع رسانی منظور ہے۔

فائدہ: ۳ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ: ''مشقت ڈالتا'' یعنی کھانا پینے میں یتیموں کی شرکت علیٰ وجہ الاصلاح بھی مباح نہ فرماتا، یا یہ کہ بلا علم و بلا قصد مجبوراً بھی اگر کچھ کمی یا بیشی ہو جاتی تو اس پر بھی مواخذہ کرتا۔

فائدہ: ۴ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ: یعنی بھاری سے بھاری حکم دے سکتا ہے، اس لیے کہ وہ زبردست ہے، لیکن ایسا نہ کیا، بلکہ سہولت کا حکم دیا، اس لیے کہ وہ حکمت اور مصلحت کے موافق کرنے والا ہے۔

وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ط وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ ج

اور نکاح مت کرو مشرک عورتوں سے جب تک ایمان نہ لے آئیں، اور البتہ لونڈی مسلمان بہتر ہے مشرک بی بی سے اگرچہ وہ تم کو بھلی لگے

وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا ط وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ ط

اور نکاح نہ کر دو مشرکین سے جب تک وہ ایمان نہ لے آویں، اور البتہ غلام مسلمان بہتر ہے مشرک سے اگرچہ وہ تم کو بھلا لگے ۱

اُولٰٓئِكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ۖ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ ج وَيُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ

وہ بلاتے ہیں دوزخ کی طرف ۲ اور اللہ بلاتا ہے جنت کی اور بخشش کی طرف اپنے حکم سے، اور بتلاتا ہے اپنے حکم لوگوں کو

لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۲۱﴾ ع

تاکہ وہ نصیحت قبول کریں

خلاصہ تفسیر: اور نکاح مت کرو کافر عورتوں کے ساتھ جب تک وہ مسلمان نہ ہو جائیں اور مسلمان عورت (چاہے) لونڈی (کیوں نہ ہو، وہ ہزار درجہ) بہتر ہے کافر عورت سے (چاہے وہ آزاد ہی کیوں نہ ہو) گو وہ (کافر عورت بوجہ مال یا جمال کے) تم کو اچھی معلوم ہو (مگر پھر بھی واقع میں مسلمان عورت ہی اس سے اچھی ہے) اور (اسی طرح اپنے اختیار کی) عورتوں کو کافر مردوں کے نکاح میں مت دو جب تک یہ مسلمان نہ ہو جائیں اور مسلمان مرد (چاہے) غلام (ہی کیوں نہ ہو، وہ ہزار درجہ) بہتر ہے کافر مرد سے (چاہے وہ آزاد ہی کیوں نہ ہو) گو وہ (کافر مرد بوجہ مال یا جاہ کے) تم کو اچھا ہی معلوم ہو (مگر پھر بھی واقع میں مسلمان ہی اس سے اچھا ہے، اور وجہ ان کافروں کے برا ہونے کی اور وہی ان سے نکاح کی ممانعت کا اصل سبب ہے، یہ ہے کہ) یہ (کافر) لوگ دوزخ (میں جانے) کی تحریک دیتے ہیں (کیونکہ کفر کی تحریک کرتے ہیں اور اس کا انجام جہنم ہے) اور اللہ تعالیٰ جنت اور مغفرت (کے حاصل کرنے) کی تحریک کرتے ہیں اپنے حکم سے (اور اس حکم کا ظہور اس طرح ہوا کہ کفار کے متعلق یہ حکم صادر فرمادیا کہ ان سے نکاح نہ کیا جائے، تاکہ ان کی تحریک کے اثر سے پوری حفاظت رہ سکے اور اس سے محفوظ رہ کر جنت اور مغفرت حاصل ہو جائے) اللہ تعالیٰ اس واسطے اپنے احکام بتلا دیتے ہیں تاکہ وہ لوگ نصیحت پر عمل کریں (اور جنت و مغفرت کے مستحق ہو جائیں)۔

وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ: اس آیت کے دو حکم ہیں: ① ایک یہ کہ مسلمان مرد کا نکاح کافر عورت سے نہ کیا جائے، اس حکم کے دو جزء ہیں: ایک یہ کہ وہ کافر عورت کتابیہ ہو، یعنی یہود یا نصاریٰ تو یہ جز سورہ مائدہ کی ایک آیت سے منسوخ ہو گیا جس کا مضمون یہ ہے کہ کتابی عورتوں سے نکاح درست ہے، اس لیے اب یہودیہ یا نصرانیہ عورت سے نکاح جائز ہے، بشرطیکہ اسلام سے مرتد ہو کر یہودی یا نصرانی نہ ہوئی ہوں، دوسرا جزیہ ہے کہ وہ کافر عورت کتابیہ نہ ہو کوئی اور کفریہ مذہب رکھتی ہو، اس جز میں اس آیت کا حکم باقی ہے، چنانچہ ہندو یا آتش پرست عورت سے مسلمان کا نکاح جائز نہیں ② دوسرا حکم آیت کا یہ ہے کہ کافر مردوں سے مسلمان عورت کا نکاح نہ کیا جائے، سو یہ حکم اپنے حال پر باقی ہے حتیٰ کہ مسلمان مرد اگر نعوذ باللہ کافر ہو جائے اور اس کے نکاح میں پہلے کوئی مسلمان عورت تھی تو نکاح فوراً ٹوٹ جائے گا اور یہ عورت عدت پوری کر کے دوسرے سے نکاح کر سکتی ہے۔

مسئلہ: اگرچہ کتابی عورت سے نکاح درست ہے، لیکن اچھا نہیں، حدیث میں دین دار عورت کے حاصل کرنے کا حکم ہے تو بد دین عورت کا حاصل کرنا اس درجہ میں ناپسند ہوگا، جو قوم اپنی وضع اور طرز سے اہل کتاب سمجھے جاتے ہوں، لیکن عقائد کی تحقیق کرنے سے کتابی ثابت نہ ہوں، اس قوم کی عورتوں سے نکاح درست نہیں، جیسے آج کل عموماً انگریزوں کو عام لوگ عیسائی سمجھتے ہیں، حالانکہ تحقیق سے ان کے بعض عقائد بالکل ملحدانہ ثابت ہوئے کہ نہ خدا کے قائل نہ عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کے معتقد، نہ انجیل کی نسبت آسمانی کتاب ہونے کا اعتقاد، سو ایسے لوگ عیسائی نہیں، ایسی جماعت میں جو عورت ہو، اس سے نکاح درست نہیں، لوگ بڑی غلطی کرتے ہیں کہ بلا تحقیق یورپ کی عورتیں بیاہ لاتے ہیں۔

مسئلہ: اس طرح جو مرد ظاہری حالت سے مسلمان سمجھا جائے، لیکن عقائد اس کے کفر تک پہنچے ہوں، اس سے مسلمان عورت کا نکاح درست نہیں اور اگر نکاح ہو جانے کے بعد ایسے عقائد خراب ہو جائیں تو نکاح ٹوٹ جاتا ہے، جیسے آج کل بہت سے آدمی اپنے مذہب سے ناواقف سائنس کے اثر سے اپنے عقائد تباہ کر لیتے ہیں، لڑکی والوں پر واجب ہے کہ پیام آنے کے وقت اول عقائد کی تحقیق کر لیا کریں تب زبان دیں اور عورتوں کو چاہیے کہ اگر نکاح کے بعد شوہر کے ایسے عقائد ثابت ہوں تو اس سے کنارہ کریں اور جس طرح بن پڑے اس کو ہم بستر نہ ہونے دیں اور سرپرستوں کو اس حالت میں عورتوں کو طلاق دلوانا واجب ہے۔

ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مسلم و کافر کے درمیان ازدواجی تعلقات کو حرام قرار دینے کی جو وجہ قرآن کریم میں بیان فرمائی گئی ہے کہ ان کے ساتھ ایسے قریبی تعلقات کفر و شرک میں مبتلا ہو جانے کا سبب بن سکتے ہیں، یہ بات تو بظاہر تمام غیر مسلم فرقوں میں مساوی ہے، پھر اہل کتاب کی عورتوں کی مستثنیٰ کرنے کی کیا وجہ ہے؟ کہ ان سے نکاح درست ہے اور اہل کتاب کے علاوہ دیگر کفار سے ناجائز؟

جواب ظاہر ہے کہ اہل کتاب کا اختلاف اسلام کے ساتھ بہ نسبت دوسرے غیر مسلموں کے کم اور ہلکا ہے، کیونکہ عقائد اسلام کے تین عمود

ہیں: ① توحید ② آخرت ③ رسالت، ان میں سے عقیدہ آخرت میں تو اہل کتاب یہود و نصاریٰ بھی اپنے اصل مذہب کے اعتبار سے مسلمانوں کے ساتھ متفق ہیں، اسی طرح خدا کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا، خود ان کے اصل مذہب میں بھی کفر ہے، یہ دوسری بات ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی عظمت و محبت کے غلو میں شرک تک جا پہنچے، اب بنیادی اختلاف صرف یہ رہ جاتا ہے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول نہیں مانتے اور اسلام میں یہ عقیدہ بھی بنیادی عقیدہ ہے، اس کے بغیر کوئی انسان مومن نہیں ہوسکتا، بہرحال دوسرے غیر مسلم فرقوں کی نسبت سے اہل کتاب کا اختلاف ہلکا اور کم ہے، اس لئے اس میں مفسدہ کا خطرہ زیادہ نہیں، اس پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب اہل کتاب کا اختلاف ہلکا قرار دے کر ان کی عورتوں سے نکاح مسلمان کا جائز ہوا، تو اس کے برعکس مسلمان عورتوں کا نکاح بھی غیر مسلم اہل کتاب سے جائز ہو جانا چاہئے، مگر ایسا نہیں؟

اس کا جواب ذرا غور کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ عورت کچھ فطرۃً ضعیف ہے اور پھر شوہر اس پر حاکم اور نگران بنایا گیا ہے، شوہر کے عقائد و نظریات سے عورت کا متاثر ہو جانا بعید نہیں، اس لئے اگر مسلمان عورت، غیر مسلم کتابی کے نکاح میں رہے تو اس کے عقائد خراب ہو جانے کا قوی اندیشہ ہے، بخلاف اس کے کہ غیر مسلم کتابی عورت، مسلمان کے نکاح میں رہے تو اس کے خیالات کا اثر شوہر پر پڑنا اصولاً بعید ہے، کوئی بے اصولی اور افراط کا شکار ہو جائے تو یہ اس کا اپنا قصور ہے۔

ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ ازدواجی تعلقات میں جو کچھ اثر ہوتا ہے، وہ طرفین (میاں بیوی) پر یکساں ہوتا ہے، اس لئے جیسے یہ اندیشہ ہے کہ مسلمان کے عقائد غیر مسلم سے متاثر ہو جائیں، اسی طرح یہ بھی تو احتمال ہے کہ معاملہ برعکس ہو، یعنی غیر مسلم کے عقائد مسلمان سے متاثر ہو جائیں، اور وہ ہی اسلام قبول کرلے تو اس کا تقاضا تو یہ ہے کہ مسلم و غیر مسلم کے ازدواجی تعلقات کو ممنوع نہ کیا جائے؟

جواب یہ ہے کہ جب کسی چیز میں ایک طرف نفع کی امید بھی ہو اور ساتھ ہی کسی ضرر کا خطرہ بھی ہو تو عقل سلیم کا تقاضا یہ ہے کہ ضرر سے بچنے کا اہتمام نفع کی فکر سے زیادہ ضروری ہے، فارسی کا ایک حکیمانہ مقولہ مشہور ہے کہ: ''عقل مند تریاق بیقین وزہر بگماں نخورد'' اس لئے اس نفع کی امید کو نظر انداز کیا گیا کہ شاید وہ غیر مسلم متاثر ہو کر اسلام قبول کرلے، بلکہ اہتمام اس کا کیا گیا کہ مسلمان متاثر ہو کر کفر میں مبتلا نہ ہو جائے۔

* * *

فائدہ: ۱ـ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ: پہلے مسلمان مرد اور کافر عورت اور اس کے برعکس دونوں صورتوں میں نکاح کی اجازت تھی، اس آیت سے اس کو منسوخ کر دیا گیا، اگر مرد یا عورت مشرک ہو تو اس کا نکاح مسلمان سے درست نہیں، یا نکاح کے بعد ایک مشرک ہو گیا تو نکاح سابق ٹوٹ جائے گا اور شرک یہ کہ علم یا قدرت یا کسی اور صفت خداوندی میں کسی کو خدا کا مماثل سمجھے، یا خدا کے مثل کسی کی تعظیم کرنے لگے، مثلاً کسی کو سجدہ کرے، یا کسی کو مختار سمجھ کر اس سے اپنی حاجت مانگے، باقی اتنی بات دیگر آیات سے معلوم ہوئی کہ یہود و نصاری کی عورتوں سے مسلمان مرد کا نکاح درست ہے، وہ ان مشرکین میں داخل نہیں، بشرطیکہ وہ اپنے دین پر قائم ہوں، دہریہ اور ملحد نہ ہوں، جیسے اکثر نصاری آجکل کے نظر آتے ہیں۔

خلاصہ تمام آیت کا یہ ہے کہ مسلمان مرد کو مشرک عورت سے نکاح کرنا درست نہیں تاوقتیکہ مسلمان نہ ہو جائے، بیشک لونڈی مسلمان' کافر عورت سے بہتر ہے، گو وہ آزاد بی بی ہی کیوں نہ ہو، اگرچہ مشرک بی بی بسبب مال اور جمال اور شرافت کے تم کو پسند آئے اور ایسے ہی مسلمان عورت کا نکاح مشرک مرد سے نہ کرو، مسلمان غلام بھی مشرک سے بہت بہتر ہے، گو وہ آزاد ہی کیوں نہ ہو، اگرچہ مشرک مرد بسبب صورت اور دولت کے تم کو پسند ہوں، یعنی مسلمان ادنی سے ادنی بھی مشرک سے بہت افضل ہے، گو وہ اعلی سے اعلی ہی کیوں نہ ہو۔

فائدہ: ۲ـ اُولٰٓئِكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ: یعنی مشرکین اور مشرکات جن کا ذکر ہوا، ان کے اقوال ان کے افعال ان کی محبت کے ساتھ اختلاط کرنا، شرک کی نفرت اور اس کی برائی کو دل سے کم کرتا ہے اور شرک کی طرف رغبت کا باعث ہوتا ہے، جس کا انجام دوزخ ہے، اس لیے ایسوں کے ساتھ نکاح کرنے سے اجتناب کلی لازم ہے۔

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ ؕ قُلْ هُوَ اَذًى ۙ فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي الْمَحِيْضِ ۙ وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ

اور تجھ سے پوچھتے ہیں حکم حیض کا، کہدے وہ گندگی ہے، سوتم الگ رہو عورتوں سے حیض کے وقت [1] اور نزدیک نہ ہو ان کے

حَتّٰى يَطْهُرْنَ ۚ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ

جب تک پاک نہ ہوویں [2] پھر جب خوب پاک ہو جاویں تو جاؤ ان کے پاس جہاں سے حکم دیا تم کو اللہ نے [3] بیشک اللہ کو پسند آتے ہیں

التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ﴿۲۲۲﴾

توبہ کرنے والے اور پسند آتے ہیں گندگی سے بچنے والے [4]

خلاصہ تفسیر: اور لوگ آپ سے حیض (کی حالت میں صحبت وغیرہ کرنے) کا حکم پوچھتے ہیں، آپ فرما دیجئے کہ وہ (حیض) گندگی کی چیز ہے، تو حالت حیض میں عورتوں (کے ساتھ صحبت کرنے) سے علیحدہ رہا کرو، اور (اس حالت میں) ان سے قربت مت کرو جب تک وہ (حیض سے) پاک نہ ہو جائیں، پھر جب وہ (عورتیں) اچھی طرح پاک ہو جائیں (کہ ناپاکی کا شک وشبہ نہ رہے) تو ان کے پاس آؤ جاؤ (یعنی ان سے صحبت کرو) جس جگہ سے تم کو خدا تعالیٰ نے اجازت دی ہے (یعنی آگے سے) یقیناً اللہ تعالیٰ محبت رکھتے ہیں توبہ کرنے والوں سے (مثلاً اتفاقاً یا بے احتیاطی سے حالت حیض میں صحبت کر بیٹھا، پھر متنبہ ہو کر توبہ کر لی) اور محبت رکھتے ہیں پاک صاف رہنے والوں سے (جو حالت حیض میں صحبت کرنے سے اور اسی طرح سب گناہوں سے بچتے ہیں)۔

* * *

فائدہ: [1] فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي الْمَحِيْضِ: حیض کہتے ہیں اس خون کو جو عورتوں کی عادت ہے، اس حالت میں مجامعت کرنا، نماز روزہ سب حرام ہیں اور خلاف عادت جو خون آئے وہ بیماری ہے، اس میں مجامعت، نماز، روزہ سب درست ہیں، اس کا حال ایسا ہے جیسا زخم یا فصد سے خون نکلنے کا، یہود اور مجوس حالت حیض میں عورت کے ساتھ کھانے اور ایک گھر میں رہنے کو بھی جائز نہ سمجھتے تھے اور نصاریٰ مجامعت سے بھی پرہیز نہ کرتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا تو اس پر یہ آیت اتری، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر صاف فرما دیا کہ مجامعت اس حالت میں حرام ہے اور ان کے ساتھ کھانا پینا رہنا سہنا سب درست ہیں، یہود کا افراط اور نصاریٰ کی تفریط دونوں مردود ہو گئیں۔

فائدہ: [2] وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ: پاک ہونے میں تفصیل ہے کہ اگر حیض اپنی پوری مدت یعنی دس دن پر موقوف ہو تو اسی وقت سے مجامعت درست ہے۔

اور اگر دس دن سے پہلے ختم ہو گیا، مثلاً چھ روز کے بعد اور عورت کی عادت بھی چھ روز کی تھی تو مجامعت خون کے موقوف ہوتے ہی درست نہیں، بلکہ جب عورت غسل کر لے، یا نماز کا وقت ختم ہو جائے اس کے بعد مجامعت درست ہوگی۔

اور اگر عورت کی عادت سات یا آٹھ دن کی تھی تو ان دنوں کے پورا کرنے کے بعد مجامعت درست ہوگی۔

فائدہ: [3] فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ: جس موقع سے مجامعت کی اجازت دی ہے، یعنی آگے کی راہ سے کہ جہاں سے بچہ پیدا ہوتا ہے، دوسرا موقع یعنی لواطت حرام ہے۔

فائدہ: [4] اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ: یعنی جو توبہ کرتے ہیں گناہ سے جو ان سے اتفاقیہ صادر ہوا، مثلاً حالت حیض میں وطی کا مرتکب ہوا، اور ناپاکی یعنی گناہوں اور وطی حالت حیض اور وطی موقع نجس سے احتراز کرتے ہیں۔

نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ وَقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ

تمہاری عورتیں تمہاری کھیتی ہیں، سو جاؤ اپنی کھیتی میں جہاں سے چاہو ۱ اور آگے کی تدبیر کرو اپنے واسطے ۲ اور ڈرتے رہو اللہ سے

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲۲۳﴾

اور جان رکھو کہ تم کو اس سے ملنا ہے، اور خوشخبری سنا ایمان والوں کو

خلاصہ تفسیر: (اور حالت پاکی میں صحبت کی اجازت دینا اور وہ بھی اس طرح کہ آگے کی طرف ہو، اس لئے ہے کہ) تمہاری بیویاں تمہارے لیے (بمنزلہ) کھیت (کے) ہیں (جس میں نطفہ بجائے تخم کے اور بچہ بجائے پیداوار کے ہے) سو اپنے کھیت میں جس طرف سے چاہو آؤ (یعنی جس طرح کھیتوں میں اجازت ہے اسی طرح بیویوں کے پاس پاکی میں ہر طرف سے آنے کی اجازت ہے، خواہ کروٹ سے ہو، یا پیچھے سے یا آگے بیٹھ کر ہو، یا اوپر یا نیچے لیٹ کر ہو، یا جس ہیئت سے ہو، مگر آنا ہر حال میں کھیت کے اندر ہو کہ وہ خاص آگے کا موقع ہے، کیونکہ پیچھے کا موقع کھیت کے مشابہ نہیں، اس میں صحبت نہ ہو اور ان لذات میں ایسے مشغول مت ہو جاؤ کہ آخرت ہی کو بھول جاؤ، بلکہ) آئندہ کے واسطے اپنے لئے کچھ (اعمال صالحہ) کرتے رہو، اور اللہ تعالیٰ سے (ہر حال میں) ڈرتے رہو، اور یہ یقین رکھو کہ بیشک تم اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونے والے ہو، اور (اے محمد ﷺ ایسے) ایمان داروں کو (جو نیک کام کریں، خدا سے ڈریں، خدا تعالیٰ کے سامنے جانے کا یقین رکھیں) خوشی کی خبر سنا دیجئے (کہ ان کو آخرت میں ہر طرح کی نعمتیں ملیں گی)۔

***

فائدہ: ۱ یہود عورت کی پشت کی طرف ہو کر وطی کرنے کو ممنوع کہتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ اس سے بچہ احول پیدا ہوتا ہے، آپ ﷺ سے پوچھا گیا تو اس پر یہ آیت اتری، یعنی تمہاری عورتیں تمہارے لیے بمنزلہ کھیتی کے ہیں، جس میں نطفہ بجائے تخم اور اولاد بمنزلہ پیداوار کے ہے، یعنی اس سے مقصود اصلی صرف نسل کا باقی رکھنا اور اولاد کا پیدا ہونا ہے، سو تم کو اختیار ہے آگے سے، یا کروٹ سے، یا پس پشت سے پڑ کر، یا بیٹھ کر، جس طرح چاہو مجامعت کرو، مگر یہ ضرور ہے کہ تخم ریزی اسی خاص موقع میں ہو جہاں پیداواری کی امید ہو، یعنی مجامعت خاص فرج ہی میں ہی ہو، لواطت ہرگز ہرگز نہ ہو، یہود کا خیال غلط ہے کہ اس سے بچہ احول پیدا ہوتا ہے۔

فائدہ: ۲ یعنی اعمال صالحہ اپنے لیے کرتے رہو، یا کہ وطی سے اولاد صالحہ مطلوب ہونی چاہیے، محض حظ نفس مقصود نہ ہو۔

وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ

اور مت بناؤ اللہ کے نام کو نشانہ اپنی قسمیں کھانے کے لئے کہ سلوک کرنے سے اور پرہیز گاری سے اور لوگوں میں صلح کرانے سے بچ جاؤ ۱

وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۲۴﴾

اور اللہ سب کچھ سنتا جانتا ہے ۲

خلاصہ تفسیر: اور اللہ کے نام کو اپنی قسموں کے ذریعے ان امور کا حجاب مت بناؤ کہ تم نیکی کے اور تقویٰ کے اور اصلاح فیما بین خلق کے کام کرو (یعنی اللہ کے نام لے کر یہ قسم نہ کھاؤ کہ ہم یہ نیک کام نہ کریں گے) اور اللہ تعالیٰ سب کچھ سنتے جانتے ہیں (تو زبان سنبھال کر بات کرو، اور دل میں برے خیالات مت لاؤ)۔

وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ: جس بات سے آدمی قسم کھالیتا ہے اس سے رک جاتا ہے، اور نیک کام کا چھوڑنا بغیر قسم کھائے بھی

براہے تو جب اس نے نیک کاموں سے رکنے کے لیے اللہ کی قسم کھائی تو گویا خدا کے نام کو ان کاموں کے لیے حجاب بنایا، حالانکہ اللہ کا نام لے کر تو نیک کام زیادہ کرنے چاہئیں، نہ کہ ایسا الٹا برتاؤ کیا جائے، اس لیے ایسی بات پر قسم کھانا اور بھی زیادہ برا ہوا۔

***

فائدہ: ۱ یعنی کسی اچھے کام نہ کرنے پر خدا کی قسم کھا بیٹھے، مثلاً ماں باپ سے نہ بولوں گا، یا فقیر کو کچھ نہ دوں گا، یا باہم کسی میں مصالحت نہ کراؤں گا، ایسی قسموں میں خدا کے نام کو برے کاموں کے لیے ذریعہ بنانا ہوا، سو ایسا ہر گز مت کرو اور اگر کسی نے ایسی قسم کھائی تو اس کا توڑنا اور کفارہ دینا واجب ہے۔

فائدہ: ۲ یعنی اگر کوئی قسم کھاتا ہے تو اللہ اس کو سنتا ہے اور اگر کوئی عظمت وجلال خداوندی کی وجہ سے قسم کھانے سے رکتا ہے تو اللہ اس کی نیت کو خوب جانتا ہے، تمہاری کوئی بات ظاہری اور باطنی اس سے مخفی نہیں، اس لیے نیت قلبی اور قول لسانی دونوں میں احتیاط لازم ہے۔

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ ط

نہیں پکڑتا تم کو اللہ بیہودہ قسموں پر تمہاری ۱ لیکن پکڑتا ہے تم کو ان قسموں پر کہ جن کا قصد کیا تمہارے دلوں نے ۲

وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۲۲۵﴾

اور اللہ بخشنے والا تحمل کرنے والا ہے ۳

خلاصہ تفسیر: اللہ تعالیٰ تم پر آخرت میں داروگیر نہ فرمائیں گے تمہاری قسموں میں ایسی بیہودہ قسم پر (جس میں بلا ارادہ جھوٹ بولا گیا) لیکن داروگیر فرمائیں گے اس جھوٹی قسم پر جس میں تمہارے دلوں نے (جھوٹ بولنے کا) ارادہ کیا ہے، اور اللہ تعالیٰ غفور ہیں (کہ ایسی بیہودہ قسم پر داروگیر نہ فرمائی) حلیم ہیں (کہ قصداً جھوٹی قسم کھانے کی سزا فوراً نہیں دیتے، بلکہ آخرت تک کی مہلت دے دی کہ شاید کبھی توبہ کر لے)۔

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ: لغو قسم کے دو معنی ہیں: ایک تو یہ کہ کسی گذری ہوئی بات پر جھوٹی قسم بلا ارادہ نکل گئی، یا نکلی تو ارادہ سے مگر وہ اسے اپنے گمان میں سچا سمجھتا ہے، جیسے زید واقع میں آیا تھا، مگر قسم کھانے والے کو خبر نہ تھی، اور قسم کھا بیٹھا کہ زید نہیں آیا تھا، یا آئندہ بات پر اس طرح قسم نکل گئی کہ کہنا چاہتا تھا کچھ، اور بے ارادہ منہ سے قسم نکل گئی، اس میں گناہ نہیں ہوتا، اسی وجہ سے اسے لغو کہتے ہیں، یعنی اخروی مواخذہ گناہ کے بارے میں یہ ساقط الاعتبار ہے، یہاں اس کے مقابلہ میں جس قسم پر گناہ اور مؤاخذہ ہونے کا ذکر فرمایا ہے یہ وہ قسم ہے جو قصداً جھوٹی سمجھ کر جان بوجھ کر کھائی ہو، اسے ''غموس'' کہتے ہیں، اس میں گناہ سخت ہوتا ہے، مگر امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اس میں کفارہ نہیں آتا، اور پہلی صورت میں جس کو ''لغو'' کہا جاتا ہے نہ گناہ ہے نہ کفارہ، اس آیت میں انہی دونوں کا بیان ہے۔

دوسرے معنی لغو کے یہ ہیں کہ جس میں کفارہ نہ ہو، اس معنی کے اعتبار سے لغو میں غموس بھی داخل ہے، کیونکہ اس میں بھی کفارہ نہیں اگرچہ گناہ ہے، اور اس کے مقابلہ میں وہ قسم ہے جس میں کفارہ آتا ہے جس کو ''منعقدہ'' کہتے ہیں، اس کی حقیقت یہ ہے کہ آئندہ کے متعلق ارادہ کر کے یوں قسم کھائی کہ میں فلاں کام کروں یا نہ کروں گا، اس میں قسم توڑنے سے کفارہ لازم آتا ہے، اس کا بیان آگے سورہ مائدہ میں آئے گا۔

***

فائدہ: ۱ لغو اور بیہودہ قسم وہ ہے کہ منہ سے عادت اور حرف کے موافق بے ساختہ اور ناخواستہ نکل جائے اور دل کو خبر تک نہ ہو، ایسی قسم کا نہ کفارہ ہے، نہ اس میں گناہ ہے، البتہ اگر کوئی بالقصد الفاظ قسم مثل ''واللہ'' اور ''باللہ'' کہے اور اس سے محض تاکید مقصود ہو، قسم کا قصد نہ ہو تو اس پر ضرور کفارہ لازم ہوگا اور کفارہ کا بیان آگے [سورہ مائدہ ساتویں پارہ کے شروع میں] آجائے گا۔

فائدہ: ۲ یعنی جو قسم جان بوجھ کر کھائے کہ جس میں دل بھی زبان کے موافق ہو، اس قسم کے توڑنے پر کفارہ لازم ہوگا۔

فائدہ: ۳؎ "غفور" ہے کہ لغو اور بیہودہ قسموں پر مواخذہ نہ فرمایا، "حلیم" ہے کہ مواخذہ میں جلدی نہیں فرماتا، شاید بندہ توبہ کرلے۔

لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ ۚ فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۲۶﴾

جو لوگ قسم کھا لیتے ہیں اپنی عورتوں کے پاس جانے سے ان کے لئے مہلت ہے چار ماہ کی، پھر اگر باہم مل گئے تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے

وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۲۷﴾

اور اگر ٹھہرا لیا چھوڑ دینے کو تو بیشک اللہ سننے والا جاننے والا ہے

خلاصہ تفسیر: جو لوگ (بلا قید مدت، یا چار ماہ یا زائد مدت کے لیے) قسم کھا بیٹھتے ہیں اپنی بیویوں کے پاس جانے سے، ان کے لیے چار مہینے تک کی مہلت ہے، سو اگر (ان چار مہینے کے اندر) یہ لوگ (اپنی قسم کو توڑ کر عورت کی طرف) رجوع کرلیں (تب تو نکاح باقی رہے گا، اور) اللہ تعالیٰ (ایسی قسم کو توڑنے کا گناہ کفارہ سے) معاف کردیں گے (اور چونکہ اب بیوی کے حقوق ادا کرنے لگا، اس پر) رحمت فرمادیں گے، اور اگر بالکل چھوڑ ہی دینے کا پختہ ارادہ کرلیا ہے (اور اس لئے چار ماہ کے اندر قسم توڑ کر رجوع نہیں کیا) تو (چار ماہ گذرتے ہی قطعی طلاق پڑ جائے گی اور) اللہ تعالیٰ (ان کی قسم کو بھی) سنتے ہیں (اور ان کے اس پختہ ارادے کو بھی) جانتے ہیں (اس لئے اس کے متعلق مناسب حکم ارشاد فرمایا)۔

فَاِنْ فَآءُوْ: اس سے نکاح کی طرف رجوع مراد ہے، سو یہ اس بات پر دلیل ہے کہ نکاح درویشی کے منافی نہیں ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی اگر کوئی قسم کھائے کہ میں اپنی عورت کے پاس نہ جاؤں گا تو اگر چار مہینے کے اندر عورت کے پاس گیا تو قسم کا کفارہ دے گا اور عورت اس کے نکاح میں رہے گی، اور اگر چار مہینے گزر گئے اور اس کے پاس نہ گیا تو عورت پر طلاق بائن ہو جائے گی۔

فائدہ: "ایلاء" شرع میں اس کو کہتے ہیں کہ عورت کے پاس جانے سے: ① چار مہینے ② یا زائد کے لیے ③ یا بلا قید مدت قسم کھالے (اور چار مہینے سے کم ایلاء نہ ہوگا) ایلاء کی تینوں صورتوں میں چار مہینے کے اندر عورت کے پاس جائے گا تو کفارہ قسم کا دینا پڑے گا، ورنہ چار ماہ کے ختم پر بلا طلاق دیئے عورت مطلقہ بائنہ ہو جائے گی۔

④ اور اگر چار مہینے سے کم پر قسم کھائے، مثلاً قسم کھائی کہ تین مہینے عورت کے پاس نہ جاؤں گا تو یہ ایلاء شرعی نہیں، اس کا یہ حکم ہے کہ اگر قسم کو توڑا، مثلاً صورت مذکورہ میں تین مہینے کے اندر عورت کے پاس گیا تو قسم کا کفارہ لازم ہوگا، اور اگر قسم کو پورا کیا، یعنی تین مہینے تک مثلاً اس کے پاس نہ گیا تو نہ عورت پر طلاق پڑے گی، نہ کفارہ لازم ہوگا۔

وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ؕ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ

اور طلاق والی عورتیں انتظار میں رکھیں اپنے آپ کو تین حیض تک، اور ان کو حلال نہیں کہ چھپا رکھیں جو پیدا کیا اللہ نے

فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ

ان کے پیٹ میں اگر وہ ایمان رکھتی ہیں اللہ پر اور پچھلے دن پر ۱؎ اور ان کے خاوند حق رکھتے ہیں ان کے لوٹا لینے کا اس مدت میں

اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا ؕ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۪ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ؕ

اگر چاہیں سلوک سے رہنا ۲؎ اور عورتوں کا بھی حق ہے جیسا کہ مردوں کا ان پر حق ہے دستور کے موافق اور مردوں کو عورتوں پر فضیلت ہے ۳؎

وَاللّٰهُ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ ﴿۲۲۸﴾

اور اللہ زبردست ہے تدبیر والا

خلاصہ تفسیر: اور طلاق دی ہوئی عورتیں (جن میں یہ صفتیں ہوں کہ خاوند نے ان سے صحبت یا خلوت صحیحہ کی ہو، ان کو حیض آتا ہو، آزاد ہوں، یعنی شرعی قاعدہ سے لونڈی نہ ہوں) اپنے آپ کو (نکاح سے) روکے رکھیں تین حیض (ختم ہونے) تک (اور اس کو 'عدت'' کہتے ہیں، عدت کے اندر دوسرے سے نکاح کرنا درست نہیں)۔

اور ان عورتوں کو یہ بات حلال نہیں کہ خدا تعالیٰ نے جو کچھ ان کے رحم (بچہ دانی) میں پیدا کیا ہو (خواہ حمل ہو یا حیض) اس کو پوشیدہ کریں (کیونکہ اس کے پوشیدہ کرنے سے عدت کا حساب غلط ہو جائے گا، مطلقہ پر اپنے حیض یا حمل ہونے کی حالت ظاہر کر دینا واجب ہے تاکہ اس کے موافق عدت کا حساب ہو) اگر وہ عورتیں اللہ تعالیٰ پر اور یوم آخرت پر یقین رکھتی ہیں (بوجہ اس کے کہ اس یقین کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ڈریں کہ قیامت میں نافرمانی پر سزا نہ ہو جائے)۔

اور ان عورتوں کے شوہر (جب کہ ان کو طلاق رجعی ملی ہو، جس کا بیان آگے آئے گا) ان کے (بلا تجدید نکاح) پھر لوٹا لینے کا حق رکھتے ہیں، اس عدت کے اندر (اور اس لوٹا لینے کو ''رجعت'' کہتے ہیں) بشرطیکہ (رجعت کرنے سے) اصلاح کا قصد رکھتے ہوں (ورنہ تنگ کرنے کے لئے رجعت کرنا لا حاصل ہے، اگرچہ رجعت تو ہو ہی جائے گی) اور (یہ حکم اصلاح کا اس لئے کیا گیا کہ) عورتوں کے بھی حقوق ہیں (مردوں پر) جو کہ (نفس وجوب میں) مثل انہی حقوق کے ہیں جو ان عورتوں پر ہیں (مردوں کے کہ ان کو) قاعدہ (شرعی) کے موافق (ادا کیا جائے)۔

اور (اتنی بات ضرور ہے کہ) مردوں کا ان کے مقابلہ میں کچھ درجہ بڑھا ہوا ہے (اس لئے مردوں کے حقوق کی نوعیت عورتوں کے حقوق کی نوعیت سے بڑھی ہوئی ہے اگرچہ لازم ہونے میں دونوں حق برابر ہیں) اور اللہ تعالیٰ زبردست (حاکم) ہیں (جو احکام چاہیں مقرر کرنے کا حق رکھتے ہیں، اور) حکیم (بھی) ہیں (کہ نہایت مصلحت کے ساتھ احکام مقرر فرماتے ہیں)۔

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَیْهِنَّ دَرَجَةٌ: اس آیت کے ضمن میں یہ معلوم ہوا کہ قرآن حکیم نے زوجین کو ان کے ذمہ عائد ہونے والے فرائض بتلائے کہ مردوں کے ذمہ عورتوں کے حقوق ادا کرنا ایسا ہی فرض ہے جیسے کہ عورتوں پر مردوں کے حقوق کا ادا کرنا فرض ہے، اس میں اشارہ ہے کہ ہر فریق کو اپنے حقوق کا مطالبہ کرنے کی بجائے اپنے فرائض پر نظر رکھنا چاہئے، اور اگر وہ ایسا کر لیں تو مطالبہ حقوق کا قضیہ ہی درمیان میں نہیں آئے گا، کیونکہ مرد کے فرائض ہی عورت کے حقوق ہیں جب فرائض اداء ہو گئے تو خود بخود حقوق ادا ہو جائیں گے، آج کل دنیا کے سارے جھگڑے یہاں سے چلتے ہیں کہ ہر شخص اپنے حقوق کا مطالبہ تو سامنے رکھتا ہے مگر اپنے فرائض کی ادائیگی سے غافل ہے، اس کا نتیجہ مطالبہ حقوق کی جنگ ہوتی ہے جو آج کل عام طور پر حکومتوں اور عوام میں زوجین میں اور دوسرے اہل معاملہ میں چلی ہوئی ہے۔

اس تمہید کے بعد اصل آیت کے الفاظ پر غور کیجئے ارشاد فرمایا: وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ یعنی ان کے حقوق مردوں کے ذمہ ہیں جیسے کہ ان کے ذمہ مردوں کے حقوق ہیں، اس میں عورتوں کے حقوق کا ذکر مردوں کے حقوق سے پہلے کیا، جس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ مرد تو اپنی قوت اور خداداد تفوق کی بناء پر عورت سے اپنے حقوق وصول کر ہی لیتا ہے، فکر عورتوں کے حقوق کی ہونی چاہئے کہ وہ عادۃً اپنے حقوق زبردستی وصول نہیں کر سکتیں، دوسرا اشارہ اس میں یہ بھی ہے کہ مردوں کو عورت کے حقوق ادا کرنے میں مسابقت کرنا چاہئے اور یہاں جو لفظ ''مثل'' کے ساتھ دونوں کے حقوق کی مثلیت اور مساوات کا ارشاد ہے اس کا یہ مطلب تو ہو ہی نہیں سکتا کہ جس طرح کے کام مرد کرے اسی طرح کے عورت بھی یا برعکس، کیونکہ مرد و عورت میں تقسیم کار اور ہر ایک کے فرائض فطرۃً جدا جدا ہیں، بلکہ مراد یہ ہے کہ دونوں کے حقوق کی ادائیگی یکساں طور پر واجب ہے اور اس میں کوتاہی اور

تقصیر کی سزا بھی یکساں ہے۔

یہاں یہ بات بھی قابل نظر ہے کہ قرآن کریم نے ایک مختصر سے جملے میں ایک عظیم الشان دفتر حقوق وفرائض کو کیسا سمویا ہے، کیونکہ مفہوم آیت میں عورتوں کے تمام حقوق مردوں پر اور مردوں کے تمام حقوق عورتوں پر داخل اور شامل ہیں، اس جملے کے آخر میں ایک لفظ **بالمعروف** اور بڑھا کر آپس میں پیش آنے والے جھگڑوں کا خاتمہ فرمادیا کہ حقوق کی ادائیگی معروف طریقے پر کی جائے، کیونکہ معروف کے معنی یہ ہیں کہ جو شرعاً بھی منکر و ناجائز نہ ہو اور عام عادات اور عرف کے لحاظ سے بھی اس میں کوئی تشدد اور زیادتی نہ ہو، اس کا حاصل یہ ہوا کہ زوجین کے حقوق اور ان کو اذیت سے بچانے کے معاملہ میں خالص ضابطہ پری کافی نہیں، بلکہ عام عرف وعادت کے اعتبار سے دیکھا جائے گا کہ اس معاملہ میں دوسرے کو کوئی ایذاء یا ضرر تو نہیں پہنچتا، جو چیزیں عرف وعادت کے اعتبار سے ایذاء اور اضرار کی قرار دی جائیں وہ ممنوع و ناجائز ہوں گی مثلاً بے رخی، بے التفاتی یا ایسے افعال اور حرکات جن سے دوسرے کو ایذاء پہنچے، یہ چیزیں قانونی دفعات میں تو نہیں آسکتیں، مگر **بالمعروف** کے لفظ نے ان کا احاطہ کرلیا۔

اس کے بعد فرمایا: **وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ** اس کا مشہور مطلب ومفہوم تو یہی ہے کہ حقوق طرفین مساوی ہونے کے باوجود حق تعالیٰ نے مردوں کو عورتوں پر ایک درجہ کا تفوق اور حاکمیت عطا فرمادی ہے اور اس میں بڑی حکمتیں ہیں جس کی طرف آیت کے الفاظ: **واللّٰهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ** میں اشارہ فرمادیا ہے اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے اس جملے کا مطلب یہ بھی بیان فرمایا ہے کہ مردوں کو اللہ تعالیٰ نے عورتوں کے مقابلہ میں بڑا درجہ دیا ہے، اس لیے ان کو زیادہ تحمل سے کام لینا چاہیے کہ اگر عورتوں کی طرف سے ان کے حقوق میں کوئی کوتاہی ہو بھی جائے تو ان کا درجہ یہ ہے کہ یہ اس کو برداشت کریں اور صبر سے کام لیں اور ان کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی نہ کریں۔

فائدہ: **ا۔ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ:** جب مرد نے عورت کو طلاق دی تو ابھی اس عورت کو کسی دوسرے سے نکاح روا نہیں، جب تک تین حیض پورے نہ ہوجائیں تاکہ حمل ہو تو معلوم ہوجائے اور کسی کی اولاد کسی کو نہ مل جائے، اس لیے عورت پر فرض ہے کہ جو ان کے پیٹ میں ہو اس کو ظاہر کردیں، خواہ حمل ہو یا حیض آتا ہو اور اس مدت کو ''عدت'' کہتے ہیں۔

فائدہ: معلوم کرنا چاہیے کہ یہاں **مطلقات** سے خاص وہ عورتیں مراد ہیں کہ ان سے نکاح کے بعد صحبت یا خلوت شرعیہ کی نوبت خاوند کو آچکی ہو اور ان عورتوں کو حیض بھی آتا ہو اور آزاد بھی ہوں کسی کی لونڈی نہ ہوں، کیونکہ جس عورت سے صحبت یا خلوت کی نوبت نہ آئے، اس کے اوپر طلاق کے بعد عدت بالکل نہیں، اور جس عورت کو حیض نہ آئے، مثلاً صغیر سن ہے یا بہت بوڑھی ہوگئی، یا اس کو حمل ہے، تو پہلی دونوں صورتوں میں اس کی عدت تین مہینے ہیں، اور حاملہ کی عدت وضع حمل ہے، اور جو عورت آزاد نہ ہو، بلکہ کسی کی شرعی قاعدہ کے موافق لونڈی ہو، اگر اس کو حیض آتا ہو تو اس کی عدت دو حیض، اور حیض نہ آئے تو اگر وہ صغیرہ یا بڑھیا ہے تو اس کی عدت ڈیڑھ مہینہ ہے، اور حاملہ ہے تو وہی وضع حمل ہے، دوسری آیتوں اور حدیثوں سے یہ تفصیل ثابت ہے۔

فائدہ: **۲۔ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا:** یعنی عدت کے اندر مرد چاہے تو عورت کو پھر رکھ لے، اگرچہ عورت کی خوشی نہ ہو، مگر اس لوٹانے سے مقصود سلوک اور اصلاح ہو، عورت کو ستانا یا اس دباؤ میں اس سے مہر کا معاف کرانا منظور نہ ہو، یہ ظلم ہے، اگر ایسا کرے گا گنہگار ہوگا، گو رجعت بھی صحیح ہوجائے گی۔

فائدہ: **۳۔ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ:** یعنی یہ امر تو حق ہے کہ جیسے مردوں کے حقوق عورتوں پر ہیں ایسے ہی عورتوں کے حقوق مردوں پر ہیں، جن کا قاعدہ کے موافق ادا کرنا ہر ایک پر ضروری ہے، تو اب مرد کو عورت کے ساتھ بدسلوکی اور اس کی ہر قسم کی حق تلفی ممنوع ہوگی، مگر یہ بھی ہے کہ مردوں کو عورتوں پر فضیلت اور فوقیت ہے تو اس لیے رجعت میں اختیار مرد کو ہی دیا گیا۔

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمۡسَاكٌۢ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ تَسۡرِيۡحٌۢ بِاِحۡسَانٍ ؕ وَلَا يَحِلُّ لَكُمۡ اَنۡ تَاۡخُذُوۡا

طلاق رجعی ہے دو بار تک، اس کے بعد رکھ لینا موافق دستور کے یا چھوڑ دینا بھلی طرح سے [1] اور تم کو روا نہیں کہ لے لو

مِمَّآ اٰتَيۡتُمُوۡهُنَّ شَيۡـًٔا اِلَّآ اَنۡ يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيۡمَا حُدُوۡدَ اللّٰهِ ؕ فَاِنۡ خِفۡتُمۡ

کچھ اپنا دیا ہوا عورتوں سے مگر جب کہ خاوند عورت دونوں ڈریں اس بات سے کہ قائم نہ رکھ سکیں گے حکم اللہ [2] پھر اگر تم لوگ ڈرو

اَلَّا يُقِيۡمَا حُدُوۡدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡهِمَا فِيۡمَا افۡتَدَتۡ بِهٖ ؕ تِلۡكَ حُدُوۡدُ اللّٰهِ

اس بات سے کہ وہ دونوں قائم نہ رکھ سکیں گے اللہ کا حکم، تو کچھ گناہ نہیں دونوں پر اسمیں کہ عورت بدلہ دیکر چھوٹ جاوے [3] یہ اللہ کی باندھی ہوئی حدیں ہیں

فَلَا تَعۡتَدُوۡهَا ۚ وَمَنۡ يَّتَعَدَّ حُدُوۡدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓـئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ ﴿۲۲۹﴾

سو ان سے آگے مت بڑھو، اور جو کوئی بڑھ چلے اللہ کی باندھی ہوئی حدوں سے سو وہی لوگ ہیں ظالم [4]

خلاصہ تفسیر: طلاق دو مرتبہ کی ہے، پھر (دو مرتبہ طلاق دینے کے بعد دو اختیار ہیں:) خواہ (یہ کہ رجوع کر کے عورت کو) قاعدہ کے مطابق رکھ لے، خواہ (یہ کہ رجوع نہ کرے، عدت پوری ہونے دے، اور اس طرح) اچھے طریقے سے اس کو چھوڑ دے، اور تمہارے لئے یہ بات حلال نہیں کہ (بیویوں کو چھوڑنے کے وقت ان سے) کچھ بھی لو (اگرچہ وہ لیا ہوا) اسی (مال) میں سے (کیوں نہ ہو) جو تم نے (ہی مہر میں) ان کو دیا تھا، مگر (ایک صورت البتہ حلال ہے، وہ) یہ کہ (کوئی) میاں بیوی (ایسے ہوں کہ) دونوں کو خطرہ ہو کہ (حقوق زوجیت کی ادائیگی میں) وہ اللہ تعالیٰ کے ضابطوں کو قائم نہ رکھ سکیں گے، سو اگر تم کو (یعنی میاں بیوی کو) یہ خطرہ ہو کہ وہ دونوں ضوابط خداوندی کو قائم نہ رکھ سکیں گے تو دونوں پر کوئی گناہ نہ ہوگا اس (مال کے لینے دینے) میں جس کو دے کر عورت اپنی جان چھڑائے (بشرطیکہ مہر سے زیادہ نہ ہو) یہ (سب احکام) خدائی ضابطے ہیں، تم ان سے باہر نہ نکلنا، اور جو شخص خدائی ضابطوں (کو توڑ کر) باہر نکل جائے تو ایسے لوگ اپنا ہی نقصان کرنے والے ہیں۔

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمۡسَاكٌۢ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ تَسۡرِيۡحٌۢ بِاِحۡسَانٍ: اس کو طلاق رجعی کہتے ہیں کہ دو مرتبہ سے زیادہ نہ ہو، یعنی طلاق دو ہی مرتبہ ہے، پھر ان دونوں مرتبہ کی طلاقوں میں یہ لچک رکھ دی کہ ان سے نکاح بالکل ختم نہیں ہوا، بلکہ عدت پوری ہونے تک مرد کو اختیار ہے کہ رجوع کر کے بیوی کو اپنے نکاح میں روک لے، یا پھر رجوع نہ کرے عدت پوری ہونے دے، عدت پوری ہونے پر نکاح کا تعلق ختم ہو جائے گا، اور رجوع کا طریقہ یہ ہے کہ عدت گزرنے سے پہلے شوہر زبان سے کہہ دے کہ میں نے تجھ سے رجعت کر لی، یا بیوی سے ہم بستری یا بوس وکنار کرے، تو اس رجوع سے پہلا نکاح برقرار رہتا ہے، رجوع سے مقصد یہ ہو کہ بیوی کے حقوق ادا کیے جائیں، یہ مقصود نہ ہو کہ بیوی رکھ کرے تنگ کرے گا، اسی مضمون کو ان الفاظ میں ارشاد فرمایا: فَاِمۡسَاكٌۢ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ تَسۡرِيۡحٌۢ بِاِحۡسَانٍ یعنی یا تو شرعی قاعدے کے مطابق رجوع کر کے بیوی کو اپنے نکاح میں روک لے، یا پھر خوب صورتی اور خوش معاملگی کے ساتھ اس کی عدت پوری ہونے دے تاکہ وہ آزاد ہو جائے، اور اس چھوڑنے میں نیت بھی اچھی ہونی چاہیے کہ نزاع ختم ہو جائے، بیوی کی دل شکنی اور ذلیل کرنا مقصود نہ ہو، اس لیے نرمی اور دل جوئی کی رعایت ضروری ہے۔

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ: أی مرة بعد مرة، اس میں اس بات پر دلالت ہے کہ ترک تعلقات میں جلدی کرنا مصلحت کے خلاف ہے، کیونکہ اس میں کبھی ندامت کا سامنا کرنا پڑ جاتا ہے۔

وَلَا يَحِلُّ لَكُمۡ اَنۡ تَاۡخُذُوۡا مِمَّآ اٰتَيۡتُمُوۡهُنَّ شَيۡـًٔا: ابھی تیسری طلاق کا ذکر نہیں آیا، درمیان میں ایک اور مسئلہ بیان فرما دیا جو ایسے

حالات میں عموماً زیر بحث آجاتا ہے، وہ یہ کہ بعض شوہر بیوی کو نہ رکھنا چاہتے ہیں، نہ اس کے حقوق کی فکر کرتے ہیں، نہ طلاق دیتے ہیں، بیوی تنگ ہوتی ہے، اس کی مجبوری سے یہ ناجائز فائدہ اٹھا کر طلاق دینے کے لئے اس سے کچھ مال کا یا کم از کم مہر کی معافی یا واپسی کا مطالبہ کرتے ہیں، قرآن کریم نے اس کو حرام قرار دیا ارشاد فرمایا: وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْـًٔا یعنی تمہارے لئے حلال نہیں کہ طلاق کے معاوضہ میں ان سے اپنا دیا ہوا مال اور مہر وغیرہ واپس لے لو، البتہ ایک صورت اس سے مستثنیٰ فرمادی کہ اس میں مہر کی واپسی یا معافی جائز کردی، وہ یہ کہ عورت بھی یہ محسوس کرے کہ طبیعتوں میں بعد و مخالفت کی وجہ سے میں شوہر کے حقوق ادا نہیں کرسکتی اور مرد بھی یہی سمجھے تو ایسی صورت میں یہ بھی جائز ہے کہ مہر کی واپسی یا معافی کے بدلے میں طلاق دی جائے اور لی جائے۔

واضح رہے کہ بیوی سے شوہر کو مال لینا جائز نہیں ہے، رہا یہ کہ شوہر کو عورت سے خلع یا طلاق میں مال لینا جائز ہے یا نہیں اس میں تفصیل ہے:
① ناموافقت میں اگر عورت کا قصور ہے اور اسی نے خلع کی درخواست کی ہے تو عورت گناہ گار ہوگی، مرد کو مال لینے میں گناہ نہ ہوگا، البتہ مہر سے زیادہ لینا مکروہ ہے ② اور اگر قصور مرد کا ہے تو مال لینا ہر حال میں گناہ ہے، خواہ مہر کے برابر ہو یا کم، مہر سے زیادہ ہو تو وہ بدرجہ اولی ناجائز ہے، اور عورت مال دینے میں یا خلع کی درخواست کرنے میں گناہ گار نہ ہوگی ③ اور اگر مرد عورت کا قصور سمجھتا ہے اور عورت مرد کا، یعنی ہر ایک اپنی رائے میں دوسرے کو ظالم اور اپنے کو مظلوم جانتا ہے تو عورت کو خلع کی درخواست میں گناہ نہ ہوگا، اور نہ مرد کو مال لینے میں گناہ ہوگا، بشرطیکہ مہر سے زیادہ نہ ہو، احقر کے نزدیک دونوں کے احتمال سے مراد اس آیت میں بھی یہی اخیر کی صورت ہے، اسی لیے فرمایا کہ دونوں کو گناہ نہ ہوگا، اور پہلی دو صورتوں میں ایک کو ضرور گناہ ہوگا جو اپنے کو قصور وار جانتا ہے، باقی خلع سب صورتوں میں صحیح و نافذ ہو جائے گی اگر چہ کسی صورت میں گناہ کے ساتھ سہی۔

* * *

فائدہ: ۱۔ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ: اسلام سے پہلے دستور تھا کہ دس بیس جتنی بار چاہتے زوجہ کو طلاق دیتے، مگر عدت کے ختم ہونے سے پہلے رجعت کر لیتے، پھر جب چاہتے طلاق دیتے اور رجعت کر لیتے اور اس صورت سے بعض شخص عورتوں کو اسی طرح بہت ستاتے، اس واسطے یہ آیت اتری کہ طلاق جس میں رجعت ہو سکے، کل دوبار ہے، ایک یا دو طلاق تک تو اختیار دیا گیا کہ عدت کے اندر مرد چاہے تو عورت کو پھر دستور کے موافق رکھ لے، یا بھلی طرح سے چھوڑ دے، پھر بعد عدت کے رجعت باقی نہیں رہتی، ہاں! اگر دونوں راضی ہوں تو دوبارہ نکاح کر سکتے ہیں اور اگر تیسری بار طلاق دے گا تو پھر ان میں نکاح بھی درست نہیں ہوگا، جب تک دوسرا خاوند اس سے نکاح کر کے صحبت نہ کر لیوے۔

فائدہ: امساك بمعروف اور **تسريح باحسان** سے غرض یہ ہے کہ رجعت کرے تو موافقت اور حسن معاشرت کے ساتھ رہے، عورت کو قید میں رکھنا اور ستانا مقصود نہ ہو، جیسا کہ ان میں دستور تھا ورنہ سہولت اور عمدگی کے ساتھ اس کو رخصت کرے۔

فائدہ: ۲۔ اِلَّآ اَنْ يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ: یعنی مردوں کو یہ روا نہیں کہ عورتوں کو جو مہر دیا ہے اس کو طلاق کے بدلہ میں واپس لینے لگیں، البتہ یہ جب روا ہے کہ ناچاری ہو اور کسی طرح دونوں میں موافقت نہ آئے اور ان کو اس بات کا اندیشہ ہو کہ بوجہ شدت مخالفت ہم احکام خداوندی کی پابندی معاشرت باہمی میں نہ کر سکیں گے اور مرد کی طرف سے ادائے حقوق زوجہ میں قصور بھی نہ ہو، ورنہ مال لینا زوج کو حرام ہے۔

فائدہ: ۳۔ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ: یعنی اے مسلمانو! اگر تم کو یہ ڈر ہو کہ خاوند اور بیوی میں ایسی بیزاری ہے کہ انکی گزران موافقت سے نہ ہوگی تو پھر ان دونوں پر کچھ گناہ نہیں کہ عورت مال دے کر اپنے آپ کو نکاح سے چھڑا لے اور مرد وہ مال لے لے، اس "کو خلع" کہتے ہیں اور جب اس ضرورت کی حالت میں زوجین کو خلع کرنا درست ہوا تو سب مسلمانوں کو اس میں سعی کرنی ضرور درست ہوگی۔

فائدہ: ایک عورت آپ ﷺ کی خدمت میں آئی اور عرض کیا کہ میں اپنے خاوند سے ناخوش ہوں، اس کے یہاں رہنا نہیں چاہتی، آپ ﷺ نے تحقیق کیا تو عورت نے کہا کہ وہ میرے حقوق میں کوتاہی نہیں کرتا اور نہ اس کے اخلاق و تدین پر مجھ کو اعتراض ہے، لیکن مجھ کو اس سے منافرت طبعی ہے، آپ ﷺ نے عورت سے مہر واپس کرادیا اور زوج سے طلاق دلوادی، اس پر یہ آیت اتری۔

فائدہ: وَمَنۡ يَّتَعَدَّ حُدُوۡدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓـئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ: یہ سب احکام مذکورہ یعنی طلاق اور رجعت اور خلع حدود اور قواعد مقرر فرمودہ حق تعالیٰ ہیں، ان کی پوری پابندی لازم ہے، کسی قسم کا خلاف اور تغیر اور کوتاہی ان میں نہ کرنی چاہیے۔

فَاِنۡ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنۡۢ بَعۡدُ حَتّٰى تَنۡكِحَ زَوۡجًا غَيۡرَهٗ ؕ

پھر اگر اس عورت کو طلاق دی یعنی تیسری بار تو اب حلال نہیں اسکو وہ عورت اسکے بعد جب تک نکاح نہ کرے کسی خاوند سے اس کے سوا

فَاِنۡ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡهِمَآ اَنۡ يَّتَرَاجَعَآ اِنۡ ظَنَّآ اَنۡ يُّقِيۡمَا حُدُوۡدَ اللّٰهِ ؕ

پھر اگر طلاق دے دے دوسرا خاوند تو کچھ گناہ نہیں ان دونوں پر کہ پھر باہم مل جاویں اگر خیال کریں کہ قائم رکھیں گے اللہ کا حکم

وَتِلۡكَ حُدُوۡدُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوۡمٍ يَّعۡلَمُوۡنَ ﴿۲۳۰﴾

اور یہ حدیں باندھی ہوئی ہیں اللہ بیان فرماتا ہے ان کو واسطے جاننے والوں کے

خلاصہ تفسیر: پھر اگر (دو طلاقوں کے بعد) کوئی (تیسری) طلاق (بھی) دے دے عورت کو تو پھر وہ (عورت) اس (تیسری طلاق دینے والے) کے لیے حلال نہ رہے گی اس کے بعد یہاں تک کہ وہ اس (شوہر) کے سوا ایک اور شوہر کے ساتھ (عدت کے بعد) نکاح کرے (اور اس سے صحبت یعنی ہم بستری بھی ہو) پھر اگر یہ (دوسرا شوہر) اس (عورت) کو طلاق دے دے (اور اس کی عدت بھی گذر جائے) تو ان دونوں پر اس میں کوئی گناہ نہیں کہ (دوبارہ آپس میں نکاح کر کے) بدستور پھر مل جائیں، بشرطیکہ دونوں غالب گمان رکھتے ہوں کہ (آئندہ) خداوندی ضابطوں کو قائم رکھیں گے (ورنہ پھر دوبارہ تنازع اور حق تلفی کے گناہ میں مبتلا ہونے کا کیا فائدہ) اور یہ خداوندی ضابطے ہیں، حق تعالیٰ ان کو بیان فرماتے ہیں ایسے (کارآمد) لوگوں کے لئے جو دانشمند ہیں (کیونکہ دانش مند ہی عمل کرتے ہیں، اور جو بے وقوفی سے عمل نہیں کرتے، ان کے لیے یہ قوانین الٹے ثبوت جرم کے دلائل بن جاتے ہیں)۔

فَاِنۡ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنۡۢ بَعۡدُ: اوپر مسئلہ ضمنی بیان فرمانے کے بعد پھر تیسری طلاق کا ذکر اس طرح فرمایا: فَاِنۡ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنۡۢ بَعۡدُ حَتّٰى تَنۡكِحَ زَوۡجًا یعنی اگر اس شخص نے تیسری طلاق بھی دے ڈالی (جو شرعاً پسندیدہ نہ تھی) تو اب نکاح کا معاملہ بالکلیہ ختم ہو گیا، اس کو رجعت کرنے کا کوئی اختیار نہ رہا اور چونکہ اس نے شرعی حدود سے تجاوز کیا کہ بلا وجہ تیسری طلاق دے دی تو اس کی سزا یہ ہے کہ اب اگر یہ دونوں راضی ہو کر پھر آپس میں نکاح کرنا چاہیں تو بھی نہیں کر سکتے، اب ان کے آپس میں دوبارہ نکاح کے لئے شرط یہ ہے کہ یہ عورت (عدت طلاق پوری کر کے) کسی دوسرے مرد سے نکاح کرے اور حقوق زوجیت ادا کر کے دوسرے شوہر کے ساتھ رہے، پھر اگر اتفاق سے وہ دوسرا شوہر بھی طلاق دیدے (یا مر جائے) تو اس کی عدت پوری کرنے کے بعد پہلے شوہر سے نکاح ہو سکتا ہے۔

یہاں قرآن کریم کے اسلوب بیان پر غور کرنے سے یہ بات پوری وضاحت کے ساتھ سامنے آجاتی ہے کہ طلاق دینے کا اصل شرعی طریقہ یہی ہے کہ زیادہ سے زیادہ دو طلاق تک پہنچا جائے، تیسری طلاق تک نوبت پہونچانا مناسب نہیں، الفاظ آیت: اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ کے بعد تیسری طلاق کو حرف اِنۡ کے ساتھ فَاِنۡ طَلَّقَهَا فرمانے میں اس کی طرف اشارہ موجود ہے، ورنہ سیدھی تعبیر یہ تھی کہ اَلطَّلَاقُ ثَلٰثٌ کہا جاتا، اس کو چھوڑ کر یہ تعبیر اختیار کرنے میں واضح اشارہ ہے کہ تیسری طلاق تک پہنچنا نہیں چاہئے، یہی وجہ ہے کہ امام مالک اور بہت سے فقہاء نے تیسری طلاق کی اجازت ہی نہیں دی، وہ اس کو "طلاق بدعت" کہتے ہیں، اور دوسرے فقہاء نے تین طلاق کو صرف اس شرط کے ساتھ جائز قرار دیا ہے کہ الگ الگ تین طہروں میں تین طلاقیں دی جائیں، ان فقہاء کی اصطلاح میں اس کو بھی "طلاق سنت" کے لفظ سے تعبیر کر دیا گیا ہے، مگر اس کا یہ مطلب کسی کے نزدیک نہیں ہے کہ اس طرح تین طلاقیں دینا

مسنون اور محبوب ہے، بلکہ ''طلاق بدعت'' کے مقابلے میں اس کو ''طلاق سنت'' اس معنی سے کہہ دیا گیا کہ یہ صورت بھی بدعت میں داخل نہیں۔

قرآن وسنت کے ارشادات اور تعامل صحابہ کرامؓ وتابعینؒ سے عدد طلاق کے متعلق جو کچھ ثابت ہوتا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جب طلاق دینے کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں رہے تو طلاق کا احسن طریقہ یہ ہے کہ صرف ایک طلاق حالت طہر میں دیدے جس میں مجامعت نہ کی ہو اور یہ ایک طلاق دے کر چھوڑ دے، عدت ختم ہونے کے ساتھ رشتہ نکاح خود ٹوٹ جائے گا، اس کو فقہاء نے ''طلاق احسن'' کہا ہے، اور حضرات صحابہ کرامؓ نے اسی کو طلاق کا بہتر طریق قرار دیا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ شریعت اسلام نے جو طلاق کے تین درجے تین طلاقوں کی صورت میں رکھے ہیں، اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ان تینوں درجوں کو عبور کرنا ضروری یا بہتر ہے، بلکہ منشاء شریعت کا تو یہ ہے کہ اول تو طلاق پر اقدام ہی ایک مبغوض ومکروہ فعل ہے، اگر بہ مجبوری اس اقدام کی نوبت آجائے تو اس کے کم سے کم درجے یعنی ایک طلاق پر اکتفاء کیا جائے اور عدت گذرنے دیں تو عدت ختم ہوتے ہی یہی ایک طلاق رشتہ زوجیت قطع کرنے کے لئے کافی ہوجائے گی اور عورت آزاد ہوکر دوسرے شخص سے نکاح کر سکے گی، یہی طریقہ ''طلاق احسن'' کہلاتا ہے، اس طریقہ میں یہ حکمت اور فائدہ بھی ہے کہ صریح الفاظ طلاق سے ایک طلاق دینے کی صورت میں طرفین کے لئے مصالحت کی راہیں کھلی رہیں گی، عدت ختم ہونے سے پہلے پہلے تو صرف طلاق سے رجوع کرلینا بقاء نکاح کے لئے کافی ہوگا اور عدت ختم ہوجانے کے بعد اگرچہ نکاح ٹوٹ چکے گا اور عورت آزاد ہوجائے گی، مگر پھر بھی یہ گنجائش باقی رہے گی کہ اگر دونوں میں اب مصالحت ہوجائے اور باہم نکاح کرنا چاہیں تو نکاح جدید اسی وقت ہوسکتا ہے، لیکن اگر کوئی شخص اس طلاق احسن کے طریقے پر اکتفاء نہ کرے، دوران عدت میں مزید ایک طلاق صریح اور صاف لفظوں میں دیدے تو اس نے قطع نکاح کے دو درجے طے کرلئے جس کی ضرورت نہ تھی اور ایسا کرنا شرعاً پسندیدہ بھی نہ تھا، مگر بہرحال دو درجے طے ہوگئے، مگر ان دو درجوں کے طے ہوجانے تک بھی بات وہیں رہی کہ دوران عدت میں رجعت کا اختیار باقی ہے اور عدت ختم ہوجانے کے بعد طرفین کی رضامندی سے نکاح جدید ہوسکتا ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ دو طلاق تک پہنچنے میں شوہر نے اپنے اختیارات کی ایک کڑی اور توڑ ڈالی اور اس سرحد پر پہنچ گیا کہ اگر اب ایک مرتبہ بھی طلاق دیدے تو معاملہ ہمیشہ کے لئے ختم ہوجائے، جس شخص نے یہ دو درجے طلاق کے طے کرلئے اس کے لئے آگے یہ ہدایت دی گئی: فَاِمۡسَاكٌۢ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ تَسۡرِيۡحٌۢ بِاِحۡسَانٍ اس میں فَاِمۡسَاكٌۢ بِمَعۡرُوۡفٍ کے لفظوں میں دو حکم بتلائے گئے:

① اول یہ کہ عدت کے دوران رجعت کرلینا نکاح جدید کا محتاج نہیں، بلکہ صرف امساک یعنی طلاق سے رجعت کرکے روک لینا کافی ہے، اگر ایسا کرلیا تو سابق نکاح ہی کی بنیاد پر تعلق زوجیت بحال ہوجائے گا۔

② دوسرے اس میں شوہر کو یہ ہدایت دی گئی کہ اگر اس کا ارادہ اصلاح حال اور صلح وصفائی کے ساتھ زندگی گذارنے کا ہے تب تو رجعت پر اقدام کرے، ورنہ چھوڑ دے کہ عدت گذر کر تعلق زوجیت ختم ہوجائے، ایسا نہ ہو کہ بغیر ارادہ اصلاح کے محض عورت کو پریشان کرنے کے لئے رجعت کرے، اسکے بالمقابل اَوۡ تَسۡرِيۡحٌۢ بِاِحۡسَانٍ فرمایا، ''تسریح'' کے معنی کھول دینے اور چھوڑ دینے کے ہیں، اس سے اشارہ کردیا کہ قطع تعلق کے لئے کسی مزید طلاق یا دوسرے کسی عمل کی ضرورت نہیں بغیر رجعت کے عدت ختم ہوجانا ہی تعلقات زوجیت ختم کرنے کے لئے کافی ہے۔

اور اگر اس نے اس پر بھی بس نہ کیا، بلکہ تیسری طلاق بھی دے ڈالی تو اب اس نے اپنے سارے اختیارات شریعت کی دی ہوئی آسانیوں کو نظرانداز کرکے بلاوجہ اور بلاضرورت ختم کردیئے تو اب اس کی سزا یہ ہے کہ نہ رجعت ہوسکے اور نہ بغیر دوسری شادی کے آپس میں نکاح ہوسکے۔

اگر کسی نے غیر مستحسن یا غیر مشروع طریقہ سے تین طلاق دے دی تو اس کا اثر کیا ہوگا؟ اس کا جواب عقلی اور عرفی طور پر تو یہی ہے کہ کسی فعل کا جرم وگناہ اس کے مؤثر ہونے میں کہیں بھی مانع نہیں ہوتا قتل ناحق جرم وگناہ ہے، مگر جس کو گولی یا تلوار مار کر قتل کیا گیا ہے وہ تو قتل ہو ہی جاتا ہے، اس کی موت تو اس کا انتظار نہیں کرتی کہ یہ گولی جائز طریقہ سے ماری گئی ہے یا ناجائز طریقہ سے؟! چوری کرنا باتفاق مذاہب جرم وگناہ ہے، مگر جو مال اس طرح غائب کردیا گیا وہ تو ہاتھ سے نکل ہی جاتا ہے، اسی طرح تمام معاصی اور جرائم کا یہی حال ہے کہ ان کا جرم وگناہ ہونا ان کے مؤثر ہونے میں مانع نہیں

ہوتا، اس اصول کا مقتضی یہی ہے کہ شریعت کی دی ہوئی آسانیوں کو نظر انداز کرنا اور بلا وجہ اپنے سارے اختیارات طلاق کو ختم کر کے تین طلاق تک پہنچنا اگر چہ رسول اللہ ﷺ کی ناراضی کا سبب ہے، اور اسی لئے جمہور امت کے نزدیک یہ فعل غیر مستحسن اور بعض کے نزدیک ناجائز ہے، مگر ان سب باتوں کے باوجود جب کسی نے ایسا اقدام کر لیا تو اس کا وہی اثر ہونا چاہئے جو جائز طلاق کا ہوتا، یعنی تین طلاق واقع ہو جائیں اور رجعت ہی کا اختیار نہیں، نکاح جدید کا اختیار بھی سلب ہو جائے، اور رسول اللہ ﷺ کا فیصلہ اس پر شاہد ہے کہ اظہار غضب کے باوجود آپ نے تینوں طلاقوں کو نافذ فرمایا جس کے بہت سے واقعات کتب حدیث میں مذکور ہیں اور جن علماء نے اس مسئلہ پر مستقل کتابیں لکھی ہیں ان میں ان واقعات کو جمع کر دیا ہے، الحاصل مذکورہ گفتگو سے یہ ثابت ہو گیا کہ اگر چہ تین طلاق بیک وقت رسول اللہ ﷺ کے نزدیک سخت ناراضی کا موجب تھیں مگر بہر حال اثر ان کا یہی ہوا کہ تینوں طلاقیں واقع قرار دی گئیں۔

❁ ❁ ❁

فائدہ: یعنی اگر زوج اپنی عورت کو تیسری بار طلاق دے گا تو پھر عورت اس کے لئے حلال نہ ہوگی، تاوقتیکہ وہ عورت دوسرے شخص سے نکاح نہ کرلے اور دوسرا خاوند اس سے صحبت کر کے اپنی خوشی سے طلاق نہ دیوے، اس کی عدت پوری کر کے پھر زوج اوّل سے نکاح جدید ہو سکتا ہے، اس کو "حلالہ" کہتے ہیں، اور حلالہ کے بعد زوج اول کے ساتھ نکاح ہونا جب ہی ہے کہ ان کو حکم خداوندی کے قائم رکھنے یعنی ایک دوسرے کے حقوق ادا کرنے کا خیال اور اس پر اعتماد ہو، ورنہ ضرور نزاع باہمی اور اتلاف حقوق کی نوبت آئے گی اور گناہ میں مبتلا ہوں گے۔

وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ سَرِّحُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ

اور جب طلاق دی تم نے عورتوں کو پھر پہنچیں اپنی عدت تک[1] تو رکھ لو ان کو موافق دستور کے یا چھوڑ دو ان کو بھلی طرح سے

وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوا ۚ وَمَن يَفْعَلْ ذَٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ ۚ وَلَا تَتَّخِذُوا

اور نہ روکے رکھو ان کو ستانے کے لئے تاکہ ان پر زیادتی کرو[2] اور جو ایسا کرے گا وہ بیشک اپنا ہی نقصان کرے گا، اور مت ٹھہراؤ

آيَاتِ اللَّهِ هُزُوًا ۚ وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَمَا أَنزَلَ عَلَيْكُم مِّنَ الْكِتَابِ وَالْحِكْمَةِ

اللہ کے احکام کو ہنسی اور یاد کرو اللہ کا احسان جو تم پر ہے اور اسکو کہ جو اتاری تم پر کتاب اور علم کی باتیں

يَعِظُكُم بِهِ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿٢٣١﴾

کہ تم کو نصیحت کرتا ہے اس کے ساتھ، اور ڈرتے رہو اللہ سے اور جان رکھو کہ اللہ سب کچھ جانتا ہے[3]

خلاصہ تفسیر: پیچھے آیت: اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ میں مطلقہ کے بارے میں باقاعدہ رجوع یا خوبی کے ساتھ الگ کرنے کا حکم تھا، اب اس آیت میں اس کو دوبارہ اس لیے ذکر فرماتے ہیں کہ ایام جاہلیت میں اس میں بہت کوتاہی کرتے تھے، پس تکرار سے اہتمام کا فائدہ حاصل ہوا، نیز پیچھے: فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ کا ذکر ضمنا تھا، وہاں اصل مقصود طلاق رجعی کا عدد بتانا تھا، اور یہاں اس جگہ اس کو اصلا اہتمام وتاکید اور مبالغہ کے ساتھ ذکر فرماتے ہیں اس لیے بھی تکرار لازم نہیں آیا، کیونکہ یہ مضمون مستقل بھی ہے اور پہلے کی تاکید بھی ہے۔

اور جب تم نے عورتوں کو (رجعی) طلاق دی ہو، پھر وہ اپنی عدت گزرنے کے قریب پہنچ جائیں (اور عدت ختم نہ ہوئی ہو) تو تم (پر واجب ہے کہ یا تو) ان کو قاعدہ کے موافق (رجعت کر کے) نکاح میں رہنے دو، یا قاعدے کے موافق ان کو رہائی دو، اور ان کو تکلیف پہنچانے کی غرض سے مت روکو، اس ارادہ سے کہ ان پر ظلم کیا کرو گے، اور جو شخص ایسا (برتاؤ) کرے گا تو وہ اپنا ہی نقصان کرے گا (کیونکہ ظلم کی سزا بھگتے گا)۔

اور حق تعالیٰ کے احکام کو کھیل نہ بناؤ (کہ جس طرح چاہا کرلیا، اور چاہا تو نہ کیا) اور حق تعالیٰ کی جو تم پر نعمتیں ہیں، ان کو یاد کرو، اور (خصوصاً) اس کتاب اور حکمت (کی باتوں) کو جو اللہ تعالیٰ نے تم پر اس حیثیت سے نازل فرمائی ہے کہ ان کے ذریعے تم کو نصیحت فرماتے ہیں (اور یہ سب سے بڑی نعمت ہے، سو ان نعمتوں کے یاد کرنے سے منعم یعنی اللہ کے احکام کی دل میں وقعت ہوگی) اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، اور یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جانتے ہیں (جب یہ خوف اور یقین ہوگا تو احکام پر عمل ہوگا)۔

فَاَمۡسِكُوۡهُنَّ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ سَرِّحُوۡهُنَّ بِمَعۡرُوۡفٍ: قاعدہ کے موافق رکھنے اور قاعدہ کے موافق چھوڑنے کا بیان پیچھے آیت: اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمۡسَاكٌۢ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ تَسۡرِيۡحٌۢ بِاِحۡسَانٍ کی تفسیر میں گزر چکا ہے وہاں ملاحظہ فرمالیا جائے۔

وَلَا تُمۡسِكُوۡهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعۡتَدُوۡا: اس میں اس بات پر دلالت ہے کہ جو کام برائی کی طرف لے جانے والا ہو وہ بھی برا ہے، چنانچہ یہاں زیادتی کی غرض سے روکنے سے منع فرمایا، اور یہ تصوف کی بہت سی فروع کی اصل ہے۔

وَلَا تَتَّخِذُوۡۤا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا: احکام الٰہی پر عمل نہ کرنے کو مجازاً کھیل کود بنانا فرمایا جو کہ صرف گناہ ہے اگرچہ شدید ہے، ورنہ حقیقۃً اگر کوئی شخص احکام الٰہیہ کے ساتھ تمسخر و استہزا کرے وہ کافر ہو جاتا ہے خواہ عقیدہ بھی فاسد ہو یا عقیدہ صحیح ہو، کیونکہ دین کی تحقیر تو دونوں حالتوں میں ہوئی اور یہی علت ہے کفر کی، بعض مفسرین نے اس کی یہ تفسیر کی ہے کہ جاہلیت میں بعض لوگ ایسا کرتے تھے کہ بیوی کو طلاق دے دی، پھر کہہ دیا کہ ہم نے تو یوں ہی دل لگی میں کہہ دیا تھا، اللہ تعالیٰ نے اس کی ممانعت فرمائی کہ یہ احکام مذاق کے محل نہیں، ان کو لہو و لعب اور دل لگی نہ بناؤ، حدیث میں اس کو زیادہ مفصل طریقے سے بیان کیا گیا ہے کہ اگر کوئی ہنسی دل لگی میں بھی طلاق دے دے گا تو سچ مچ طلاق پڑ جائے گی، اسی طرح اور بھی چند معاملات ہیں جن میں ہنسی دل لگی کو بھی سچ مچ سمجھا جائے گا، چنانچہ پھر بھی اگر طلاق کو غیر واقع سمجھا اور بدستور اس عورت سے تعلق رکھا تو گناہ ہوگا، اسی واسطے آگے اتقوا اللہ فرمایا۔

* * *

فائدہ: ۱ وَاِذَا طَلَّقۡتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغۡنَ اَجَلَهُنَّ: یعنی عدت ختم ہونے کو آئی۔

فائدہ: ۲ وَلَا تُمۡسِكُوۡهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعۡتَدُوۡا: یعنی عدت کے ختم ہونے تک خاوند کو اختیار ہے کہ اس عورت کو موافقت اور اتحاد کے ساتھ پھر ملالے، یا خوبی اور رضامندی کے ساتھ بالکل چھوڑ دے، یہ ہرگز نہیں کہ قید میں رکھ کر اس کو ستانے کے قصد سے رجعت کرے، جیسا کہ بعض اشخاص کیا کرتے تھے۔

فائدہ: آیت سابقہ یعنی الطلاق مرّتان الخ میں یہ بتلایا تھا کہ دو طلاق تک زوج کو اختیار ہے کہ عورت کو عمدگی سے پھر ملالے یا بالکل چھوڑ دے، اب اس آیت میں یہ ارشاد ہے کہ یہ اختیار صرف عدت تک ہے، عدت کے بعد زوج کو اختیار مذکور حاصل نہ ہوگا، اسلئے کوئی تکرار کا شبہ نہ کرے۔

فائدہ: ۳ اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَىۡءٍ عَلِيۡمٌ: نکاح طلاق ایلاء خلع رجعت حلالہ وغیرہ میں بڑی حکمتیں اور مصلحتیں ہیں، ان میں حیلے کرنے اور بیہودہ اغراض کو دخل دینا، مثلاً کوئی رجعت کرلے اور اس سے مقصود عورت کو تنگ کرنا ہے تو گویا اللہ کے احکام کے ساتھ ٹھٹھے بازی ٹھہری نعوذ باللہ من ذٰلک، اللہ کو سب کچھ روشن ہے، ایسے حیلوں سے بجز مضرت اور کیا حاصل ہوسکتا ہے۔

وَاِذَا طَلَّقۡتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغۡنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعۡضُلُوۡهُنَّ اَنۡ يَّنۡكِحۡنَ اَزۡوَاجَهُنَّ اِذَا

اور جب طلاق دی تم نے عورتوں کو پھر پورا کر چکیں اپنی عدت کو تو اب نہ روکو ان کو اس سے کہ نکاح کرلیں اپنے انہی خاوندوں سے جب کہ

تَرَاضَوۡا بَيۡنَهُمۡ بِالۡمَعۡرُوۡفِ ؕ ذٰلِكَ يُوۡعَظُ بِهٖ مَنۡ كَانَ مِنۡكُمۡ يُؤۡمِنُ بِاللّٰهِ وَالۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ ؕ

راضی ہوجاویں آپس میں موافق دستور کے ۱ یہ نصیحت اس کو کی جاتی ہے جو کہ تم میں سے ایمان رکھتا ہے اللہ پر اور قیامت کے دن پر ۲

ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۲﴾

اس میں تمہارے واسطے بڑی ستھرائی ہے اور بہت پاکیزگی، اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے ؂

خلاصہ تفسیر: اور جب تم اپنی عورتوں کو طلاق دے دو پھر وہ عورتیں اپنی میعاد (عدت) پوری کر چکیں (اور عدت پوری کر کے کسی سے نکاح کرنا چاہیں خواہ پہلے ہی شوہر سے یا کسی دوسری جگہ) تو تم ان کو اس امر سے مت روکو کہ وہ اپنے (تجویز کئے ہوئے) شوہروں سے نکاح کرلیں، جبکہ باہم سب رضامند ہو جائیں قاعدہ کے موافق، اس مضمون سے نصیحت کی جاتی ہے اس شخص کو جو تم میں سے اللہ تعالیٰ اور روز قیامت پر یقین رکھتا ہو (یعنی ماننے کی امید انہی سے ہے اور یوں تو نصیحت سبھی کو ہے) اس نصیحت کا قبول کرنا تمہارے لئے زیادہ صفائی اور زیادہ پاکی کی بات ہے، اور اللہ تعالیٰ (تمہاری مصلحتوں کو) جانتے ہیں اور تم نہیں جانتے (اس لیے اللہ تعالیٰ کے حکم کے سامنے اپنی رائے پر عمل مت کیا کرو)۔

فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ: بعض جگہ تو خود شوہر ہی طلاق دینے کے بعد جب وہ عورت کہیں دوسری جگہ نکاح کرنا چاہتی تو شوہر اپنی ذلت سمجھ کر نکاح نہ کرنے دیتا، اور بعض جگہ عورت کے دوسرے عزیز واقارب اپنی کسی دنیوی غرض سے اس کو نکاح نہ کرنے دیتے، اور ایک جگہ ایسا ہوا کہ مطلقہ عورت اور اس کا پہلا شوہر دونوں نکاح کرنے پر رضامند ہو گئے تھے مگر عورت کے بھائی نے غصہ میں آ کر روکا تھا، اس آیت میں یہ سب صورتیں داخل ہیں، اور ہر صورت میں روکنا ممنوع ہے۔

فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ: اس میں اس بات پر دلالت ہے کہ جائز کام سے منع کرنے میں سختی وتشدد نہ کیا جائے جبکہ اس جائز کام میں کوئی فساد نہ ہو اور خاص طور پر جب کہ اس کے ترک کرنے میں کوئی فساد ہو۔

ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ: اور یہ جو فرمایا کہ اس میں پاکی اور صفائی ہے تو اس کی عام وجہ تو یہ ہے کہ احکام الٰہی کا ماننا ہمیشہ گناہوں سے پاک صاف رہنے کا سبب ہوتا ہے، اور خاص وجہ یہ ہے کہ ایسے موقع پر جبکہ عورت و مرد باہم دگر ایک دوسرے کی طرف راغب ہوں، پاکی اور صفائی اسی میں ہے کہ انہیں نکاح سے نہ روکا جائے، ورنہ خرابی اور فتنہ وآلودگی کا اندیشہ ہے، البتہ اگر بے قاعدہ نکاح ہو اس سے روکنا نکاح سے روکنا نہیں، کیونکہ وہ نکاح ہی کہاں ہوا جب بے قاعدہ ہے۔

* * *

فائدہ: ؂ **اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ:** ایک عورت کو اس کے خاوند نے ایک یا دو طلاق دی اور پھر عدت میں رجعت بھی نہ کی، جب عدت ختم ہو چکی تو دوسرے لوگوں کے ساتھ زوج اول نے بھی نکاح کا پیغام دیا، عورت بھی اس پر راضی تھی، مگر عورت کے بھائی کو غصہ آیا اور نکاح کو روک دیا، اس پر یہ حکم اترا کہ عورت کی خوشنودی اور بہبودی کو ملحوظ رکھو، اسی کے موافق نکاح ہونا چاہیے، اپنے کسی خیال اور ناخوشی کو دخل مت دو اور یہ خطاب عام ہے نکاح سے روکنے والوں کو سب کو، خواہ زوج اول جس نے کہ طلاق دی ہے، وہ دوسری جگہ عورت کو نکاح کرنے سے روکے، یا عورت کے ولی اور وارث عورت کو پہلے خاوند سے یا کسی دوسری جگہ نکاح کرنے سے مانع ہوں، سب کو روکنے سے ممانعت آ گئی، ہاں! اگر خلاف قاعدہ کوئی بات ہو، مثلاً غیر کفو میں عورت نکاح کرنے لگے، یا پہلے خاوند کی عدت کے اندر کسی دوسرے سے نکاح کرنا چاہے تو بیشک ایسے نکاح سے روکنے کا حق ہے ''بالمعروف'' فرمانے کا یہی مطلب ہے۔

فائدہ: ؂ **مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ:** یعنی حکم جو مذکور ہوئے، ان سے اہل ایمان کو نصیحت دی جاتی ہے، کیونکہ اس نصیحت سے وہی منتفع ہوتے ہیں اور یوں تو نصیحت سبھی کے لئے ہے، کسی کی خصوصیت نہیں اور مومنین کے خاص کرنے سے دوسروں پر تہدید اور ان کی تحقیر بھی مفہوم ہوتی ہے، یعنی جو لوگ ان حکموں پر عمل نہیں کرتے، گویا ان کو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان ہی نہیں۔

فائدہ: ؂ **وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ:** یعنی عورت کو نکاح سے نہ روکنے اور اس کے نکاح ہو جانے میں وہ پاکیزگی ہے جو نکاح

سے روکنے میں ہرگز نہیں اور عورت جب کہ پہلے خاوند کی طرف راغب ہو تو اسی کے ساتھ نکاح ہو جانے میں وہ پاکیزگی ہے کہ دوسرے کے ساتھ نکاح کرنے میں ہرگز نہیں، اللہ تعالیٰ ان کے دلوں کی باتوں کو اور نفع نقصان آئندہ کو خوب جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ؕ

اور بچے والی عورتیں دودھ پلاویں اپنے بچوں کو دو برس پورے جو کوئی چاہے کہ پوری کرے دودھ کی مدت ۱؎

وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَا تُضَآرَّ

اور لڑکے والے یعنی باپ پر ہے کھانا اور کپڑا ان عورتوں کا موافق دستور کے، تکلیف نہیں دی جاتی کسی کو مگر اسکی گنجائش کے موافق، نہ نقصان دیا جاوے

وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ ۚ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ ۚ

ماں کو اس کے بچہ کی وجہ سے اور نہ اس کو کہ جس کا وہ بچہ ہے یعنی باپ کو اس کے بچہ کی وجہ سے ۲؎ اور وارثوں پر بھی یہی لازم ہے ۳؎

فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا ؕ وَاِنْ اَرَدْتُّمْ

پھر اگر ماں باپ چاہیں کہ دودھ چھڑالیں یعنی دو برس کے اندر ہی اپنی رضا اور مشورہ سے تو ان پر کچھ گناہ نہیں ۴؎ اور اگر تم لوگ چاہو

اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ

کہ دودھ پلواؤ کسی دایہ سے اپنی اولاد کو تو بھی تم پر کچھ گناہ نہیں جب کہ حوالہ کر دو جو تم نے دینا ٹھہرایا تھا موافق دستور کے ۵؎

وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۳۳﴾

اور ڈرو اللہ سے اور جان رکھو کہ اللہ تمہارے سب کاموں کو خوب دیکھتا ہے

خلاصہ تفسیر: اس آیت میں رضاعت یعنی بچوں کو دودھ پلانے کے متعلق احکام ہیں، اس سے پہلی اور بعد کی آیات میں طلاق کے احکام مذکور ہیں، درمیان میں دودھ پلانے کے احکام اس مناسبت سے ذکر کئے گئے ہیں کہ عموماً طلاق کے بعد بچوں کی پرورش اور دودھ پلانے یا پلوانے کے معاملات زیر نزاع آجاتے ہیں اور ان میں جھگڑے فساد ہوتے ہیں، اس لئے اس آیت میں ایسے معتدل احکام بیان فرمادیئے گئے ہیں جو عورت و مرد دونوں کے لئے سہل اور مناسب ہیں، ایک ایسا نظام بتادیا گیا جس سے جھگڑے فساد یا کسی فریق پر ظلم وتعدی کا راستہ نہ رہے۔

اور مائیں اپنی اولاد کو دوسال کامل دودھ پلایا کریں (خواہ نکاح باقی ہو یا طلاق ہو چکی ہو، یہ مدت) اس کے لئے ہے جو شیر خوارگی کی تکمیل کرنا چاہے (اور جو تکمیل نہ کرنا چاہے تو دوسال سے کم میں بھی چھڑا دینا درست ہے) اور جس کا بچہ ہے (یعنی باپ) اس کے ذمہ ہے ان (ماؤں) کا کھانا اور کپڑا قاعدہ کے موافق (جبکہ وہ نکاح یا عدت میں ہوں) کسی شخص کو (خدا کی طرف سے کوئی) کوئی حکم نہیں دیا جاتا مگر اس کی برداشت کے موافق (سو عورتوں کو دودھ پلانا سہل تھا، ان کو اس کا حکم دیا گیا، اور مردوں کو خرچ کرنا آسان ہے، اس لیے ان کو اس کا حکم دیا گیا)۔

کسی ماں کو تکلیف نہیں پہنچانا چاہئے اس کے بچے کی وجہ سے، اور نہ کسی کے باپ کو تکلیف دینی چاہئے اس کے بچہ کی وجہ سے (یعنی بچہ کے ماں باپ آپس میں کسی بات پر ضد اضدی نہ کریں) اور (اگر باپ زندہ نہ ہو تو) مثل طریق مذکور کے (بچے کی پرورش کا انتظام) اس (محرم قرابت دار) کے ذمہ ہے جو (شرعاً بچے کا) وارث (ہونے کا حق رکھتا) ہے۔

پھر (یہ سمجھ لو کہ) اگر دونوں (ماں اور باپ دو سال سے کم میں) دودھ چھڑانا چاہیں باہمی رضامندی اور مشورے سے تو (بھی) ان دونوں پر کسی قسم کا گناہ نہیں، اور اگر تم لوگ (ماں کے ہوتے ہوئے بھی کسی ضروری مصلحت سے مثلاً یہ کہ ماں کا دودھ اچھا نہیں، بچے کو نقصان ہوگا) اپنے بچوں کو کسی اور انا کا دودھ پلوانا چاہو، تب بھی تم پر کوئی گناہ نہیں جبکہ ان کے حوالے کردو (خواہ پہلے یا بعد میں) جو کچھ ان کو دینا طے کیا ہے قاعدہ کے موافق (اور اگر اجرت نہ پہلے دی نہ بعد میں، تو پھر اجرت نہ دینے کا گناہ ہوگا) اور حق تعالیٰ سے (ان سب احکام کے بارے میں) ڈرتے رہو، اور یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں کو خوب دیکھ رہے ہیں۔

وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ: اس سے ایک مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ دودھ پلانا دیانۃً ماں کے ذمہ واجب ہے، بلا عذر کسی ضد یا ناراضگی کے سبب دودھ نہ پلائے تو گنہگار ہوگی اور دودھ پلانے پر وہ شوہر سے کوئی اجرت ومعاوضہ نہیں لے سکتی جب تک وہ اس کے نکاح میں ہے کیونکہ وہ اس کا اپنا فرض ہے، دوسرا مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ پوری مدت رضاعت دو سال ہے جب تک کوئی خاص عذر مانع نہ ہو بچے کا حق ہے کہ یہ مدت پوری کی جائے، دوسرا مسئلہ یہ بھی معلوم ہوا کہ دودھ پلانے کے لئے پوری مدت دو سال دی گئی ہے اس کے بعد دودھ نہ پلایا جائے، البتہ بعض آیات قرآن اور احادیث کی بناء پر امام اعظم ابوحنیفہ کے نزدیک اگر تیس مہینے یعنی ڈھائی سال کے عرصہ میں بھی دودھ پلا دیا تو احکام رضاعت کے ثابت ہوجائیں گے اور اگر بچے کی کمزوری وغیرہ کے عذر سے ایسا کیا گیا تو گناہ بھی نہ ہوگا۔

وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ: یعنی باپ کے ذمہ ہے ماؤں کا کھانا اور کپڑا قاعدہ کے موافق، اس میں پہلی بات قابل غور یہ ہے کہ ماؤں کے لئے قرآن نے لفظ: اَلْوَالِدٰتُ استعمال کیا مگر باپ کے لئے مختصر لفظ وَالِد چھوڑ کر اَلْمَوْلُوْدِ لَهٗ اختیار فرمایا، حالانکہ قرآن میں دوسری جگہ لفظ ''والد'' بھی مذکور ہے لَا يَجْزِىْ وَالِدٌ عَنْ وَّلَدِهٖ مگر یہاں والد کی جگہ اَلْمَوْلُوْدِ لَهٗ کے اختیار کرنے میں ایک خاص راز ہے، وہ یہ کہ پورے قرآن کریم کا ایک خاص اسلوب اور طرز بیان ہے کہ وہ کسی قانون کو دنیا کی حکومتوں کی طرح بیان نہیں کرتا، بلکہ مربیانہ اور مشفقانہ طرز سے بیان کرتا ہے اور ایسے انداز سے بیان کرتا ہے جس کو قبول کرنا اور اس پر عمل کرنا انسان کے لئے آسان ہوجائے، یہاں بھی چونکہ بچہ کا نفقہ باپ کے ذمہ ڈالا گیا ہے، حالانکہ وہ ماں اور باپ کی متاع مشترک ہے تو ممکن تھا کہ باپ کو یہ حکم کچھ بھاری معلوم ہو اس لئے بجائے وَالِد کے اَلْمَوْلُوْدِ لَهٗ کا لفظ اختیار کیا (وہ شخص جس کا بچہ ہے) اس میں اس طرف اشارہ کر دیا کہ اگرچہ بچے کی تولید میں ماں اور باپ دونوں کی شرکت ضرور ہے، مگر بچہ باپ ہی کا کہلاتا ہے، نسب باپ ہی سے چلتا ہے اور جب بچہ اس کا ہوا تو خرچ کی ذمہ داری اس کو بھاری نہ معلوم ہونی چاہئے۔

اس سے تیسرا مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ اگرچہ دودھ پلانا ماں کے ذمہ ہے، لیکن ماں کا نان ونفقہ اور ضروریات زندگی باپ کے ذمہ ہیں اور یہ ذمہ داری جس وقت تک بچے کی ماں اس کے نکاح میں ہے یا عدت میں ہے اس وقت تک ہے اور طلاق اور عدت پوری ہونے کے بعد نفقہ زوجیت تو ختم ہوجائے گا، مگر بچے کو دودھ پلانے کا معاوضہ دینا باپ کے ذمہ پھر بھی لازم رہے گا۔

لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ: یعنی نہ تو کسی ماں کو اس کے بچے کی وجہ سے تکلیف میں ڈالنا جائز ہے اور نہ کسی باپ کو اس کے بچے کی وجہ سے، مطلب یہ ہے کہ بچے کے ماں باپ آپس میں ضد اضدی نہ کریں، مثلاً ماں دودھ پلانے سے معذور ہو اور باپ اس پر یہ سمجھ کر زبردستی کرے کہ آخر اس کا بھی تو بچہ ہے یہ مجبور ہوگی اور پلا دے گی، یا باپ مفلس ہے اور ماں کو کوئی معذوری بھی نہیں، پھر دودھ پلانے سے اس لئے انکار کرے کہ اس کا بھی تو بچہ ہے جھک مار کر کسی سے پلوائے گا تو یہ جائز نہیں، اس سے چوتھا مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ اگر بچہ کسی دوسری عورت کا دودھ نہیں لیتا نہ اوپر کا دودھ پیتا ہے تو ماں کو مجبور کیا جائے گا، اسی طرح اگر ماں دودھ پلانا چاہتی ہے اور اس کے دودھ میں کسی قسم کی خرابی بھی نہیں ہے تو باپ کے لیے جائز نہیں کہ ماں کو دودھ پلانے سے روکے اور دوسری انا کا دودھ پلوائے۔

پانچواں مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ اگر بچے کی ماں دودھ پلانے کی اجرت مانگتی ہے تو جب تک اس کے نکاح یا عدت کے اندر ہے اجرت کے مطالبہ کا حق نہیں، یہاں اس کا نان نفقہ جو باپ کے ذمہ ہے وہی کافی ہے، مزید اجرت کا مطالبہ باپ کو ضرر پہنچانا ہے اور اگر طلاق کی عدت گذر چکی اور نفقہ کی

ذمہ داری ختم ہو چکی ہے، اب اگر یہ مطلقہ بیوی اپنے بچے کو دودھ پلانے کا معاوضہ باپ سے طلب کرتی ہے تو باپ کو دینا پڑے گا، کیونکہ اس کے خلاف کرنے میں ماں کا نقصان ہے، شرط یہ ہے کہ یہ معاوضہ اتنا ہی طلب کرے کہ جتنا کوئی دوسری عورت لیتی ہے، زائد کا مطالبہ کرے گی تو باپ کو حق ہوگا کہ اس کی بجائے کسی انا کا دودھ پلوائے۔

وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ: باپ کے ہوتے ہوئے بچہ کی پرورش کا خرچ صرف باپ کے ذمہ ہے، اگر باپ زندہ نہ ہو تو اس میں تفصیل یہ ہے کہ اگر بچہ کو میراث وغیرہ میں مال ملا ہے اور وہ مال کا مالک ہے تب تو اسی مال سے اس پر خرچ ہوگا، اور اگر اس بچہ کی ملکیت میں مال نہیں ہے تو اس بچہ کو دودھ پلانے یا پلوانے کا انتظام اس شخص پر ہے جو بچے کا جائز وارث اور محرم ہو، یعنی اگر بچہ مرجائے تو جن کو اس کی وراثت پہنچتی ہے وہی باپ نہ ہونے کی حالت میں اس کے نفقہ کے ذمہ دار ہوں گے، اگر ایسے وارث کئی ہوں تو ہر ایک پر بقدر میراث اس کی ذمہ داری عائد ہوگی، مثلاً ایک ایسے بچہ کی ایک ماں ہے ایک دادا ہے تو اس بچہ کے خرچ کا ایک تہائی ماں کے ذمہ ہے اور دو تہائی دادا کے ذمہ، کیونکہ دونوں محرم بھی ہیں اور بچہ کی میراث اسی نسبت سے پا سکتے ہیں۔

وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ: اس سے چھٹا مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ اگر ماں دودھ پلانے پر رضامند ہے لیکن ماں کا دودھ بچہ کے لیے مضر ہے تو ایسی حالت میں باپ کو حق ہے کہ ماں کو دودھ پلانے سے روک دے اور کسی انا سے پلوائے۔

اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ: اس سے ایک بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ جس عورت کو دودھ پلانے پر رکھا جائے اس سے معاملہ تنخواہ یا اجرت کا پوری صفائی کے ساتھ طے کرلیا جائے کہ بعد میں جھگڑا نہ پڑے اور پھر وقت مقررہ پر یہ طے شدہ اجرت اس کو سپرد بھی کردے اس میں ٹال مٹول نہ کرے۔

* * *

فائدہ: ١ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ: یعنی ماں کو حکم ہے کہ اپنے بچہ کو دو برس تک دُودھ پلائے اور یہ مدت اس کے لئے ہے جو ماں باپ بچہ کے دُودھ پینے کی مدت کو پورا کرنا چاہیں، ورنہ اس میں کمی بھی جائز ہے، جیسا آیت کے اخیر میں آتا ہے اور اس حکم میں وہ مائیں بھی داخل ہیں جن کا نکاح باقی ہے اور وہ بھی جن کو طلاق مل چکی ہو، یا ان کی عدت بھی گزر چکی ہو، ہاں اتنا فرق ہوگا کہ کھانا کپڑا منکوحہ اور معتدہ کو تو دینا زوج کو ہر حال میں لازم ہے، دُودھ پلائے یا نہ پلائے، اور عدت ختم ہوچکے گی تو پھر صرف دُودھ پلانے کی وجہ سے دینا ہوگا، اور اس آیت سے یہ معلوم ہوا کہ دودھ کی مدت کو جس ماں سے پورا کرانا چاہیں، یا جس صورت میں باپ سے دودھ پلانے کی اُجرت ماں کو دلوانا چاہیں تو اس کی انتہاء ۲ دو برس کامل ہیں، یہ معلوم نہیں ہوا کہ علی العموم دُودھ پلانے کی مدت دو برس سے زیادہ نہیں۔

فائدہ: ٢ وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ: یعنی باپ کو بچہ کی ماں کو کھانا کپڑا ہر حال میں دینا پڑے گا، اوّل صورت میں تو اس لئے کہ وہ اس کے نکاح میں ہے، دوسری صورت میں عدت میں ہے اور تیسری صورت میں دُودھ پلانے کی اُجرت دینی ہوگی اور بچہ کے ماں باپ بچہ کی وجہ سے ایک دوسرے کو تکلیف نہ دیں، مثلاً ماں بلا وجہ دودھ پلانے سے انکار کرے، یا باپ بلا سبب ماں سے بچہ جُدا کر کے کسی اور سے دودھ پلوائے، یا کھانے کپڑے میں تنگی کرے۔

فائدہ: ٣ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ: یعنی اگر باپ مرجاوے تو بچہ کے وارثوں پر بھی یہی لازم ہے کہ دُودھ پلانے کی مدت میں اس کی ماں کے کھانے کپڑے کا خرچ اٹھائیں اور تکلیف نہ پہنچائیں، اور "وارث" سے مراد وہ وارث ہے جو محرم بھی ہو۔

فائدہ: ٤ وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا: یعنی اگر ماں باپ کسی مصلحت کی وجہ سے دو سال کے اندر ہی بچہ کی مصلحت کا لحاظ کر کے باہمی مشورہ اور رضامندی سے دُودھ چھڑانا چاہیں تو اس میں گناہ نہیں، مثلاً ماں کا دُودھ اچھا نہ ہو۔

فائدہ: ٥ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ: یعنی اے مردو! اگر تم کسی ضرورت و مصلحت سے ماں کے سوا کسی دوسری عورت سے دُودھ پلوانا چاہو تو اس میں بھی گناہ نہیں، مگر اس کی وجہ سے ماں کا کچھ حق نہ کاٹ رکھے، بلکہ دستور کے موافق جو ماں کو دینا ٹھہرایا تھا وہ دے دے اور یہ

مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ دُودھ پلانے والی کا حق نہ کاٹے۔

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا ۚ

اور جو لوگ مر جائیں تم میں سے اور چھوڑ جاویں اپنی عورتیں تو چاہیے کہ وہ عورتیں انتظار میں رکھیں اپنے آپ کو چار مہینے اور دس دن [1]

فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ط

پھر جب پورا کر چکیں اپنی عدت کو تو تم پر کچھ گناہ نہیں اس بات میں کہ کریں وہ اپنے حق میں قاعدہ کے موافق [2]

وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۲۳۴﴾

اور اللہ کو تمہارے تمام کاموں کی خبر ہے

خلاصہ تفسیر: اور جو لوگ تم میں وفات پا جاتے ہیں اور بیویاں چھوڑ جاتے ہیں وہ بیویاں اپنے آپ کو (نکاح وغیرہ سے) روکے رکھیں چار مہینے اور دس دن، پھر جب اپنی (عدت کی) میعاد ختم کرلیں تو تم کو (بھی) کچھ گناہ نہ ہوگا ایسی بات (کے جائز رکھنے) میں کہ وہ عورتیں اپنی ذات کے لئے کچھ کارروائی (نکاح کی) کریں قاعدہ کے موافق (البتہ اگر کوئی بات شریعت کے قاعدہ کے خلاف کریں اور تم روک سکنے کے باوجود نہ روکو تو تم بھی شریک گناہ ہوگے) اور اللہ تعالیٰ تمہارے تمام افعال کی خبر رکھتے ہیں۔

اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا: یہ عدت اس بیوہ کی ہے جس کو حمل نہ ہو، اور اگر حمل ہو تو بچہ پیدا ہونے تک اس کی عدت ہے، خواہ جنازہ لے جانے سے پہلے ہی بچہ پیدا ہو جائے یا چار ماہ دس دن سے بھی زیادہ میں پیدا ہو، یہ حکم سورہ طلاق میں آئے گا۔

جس کا خاوند مر جائے اس کو عدت کے اندر خوشبو لگانا، سنگھار کرنا، سرمہ اور تیل بلاضرورت مرض کے لگانا، مہندی لگانا، رنگین کپڑے پہننا درست نہیں، اور دوسرے نکاح کی صاف بات چیت کرنا بھی عدت کے اندر درست نہیں جیسا اگلی آیت میں آتا ہے، اور رات کو دوسرے گھر میں رہنا بھی درست نہیں ترجمہ میں نکاح کے ساتھ جو وغیرہ کہا گیا ہے اس سے یہی امور مراد ہیں اور یہی حکم ہے اس عورت کا جس پر طلاق بائن واقع ہوئی یعنی جس میں رجعت درست نہیں مگر اس کو شوہر کے گھر سے دن کو بھی بدون سخت مجبوری کے نکلنا درست نہیں۔

اگر شوہر کی وفات چاند رات کو ہوئی تب تو یہ عدت چاند کے حساب سے پوری کی جائے گی، ہر مہینہ چاہے انتیس کا ہو یا تیس کا، اور اگر چاند رات کے بعد وفات ہوئی ہے تو یہ سب مہینے تیس تیس دن کے حساب سے پورے کئے جائیں گے، پس کل ایک سو تیس دن پورے کریں گے، اس مسئلہ سے بہت لوگ غافل ہیں اور جس وقت وفات ہوئی تھی جب یہ مدت گزر کر وہی وقت آئے گا تب عدت ختم ہو جائے گی۔

فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ: یہ جو فرمایا کہ اگر عورتیں قاعدہ کے موافق کچھ کریں تو تم پر بھی گناہ نہ ہوگا اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص کوئی کام خلاف شرع کرے تو اوروں پر بھی واجب ہوتا ہے کہ بشرط قدرت اس کو روکیں ورنہ یہ لوگ بھی گنہگار ہوتے ہیں اور قاعدہ کے موافق سے یہ مراد ہے کہ جو نکاح تجویز ہو وہ شرعاً صحیح اور جائز ہو، یعنی حلت کی تمام شرائط وہاں جمع ہوں۔

* * *

فائدہ: [1] پہلے گزر چکا ہے کہ طلاق کی عدت میں تین حیض انتظار کرے، اب فرمایا کہ موت کی عدت میں چار مہینے دس دن انتظار کرے، سو اس مدت میں اگر معلوم ہو گیا کہ عورت کو حمل نہیں تو عورت کو نکاح کی اجازت ہوگی، ورنہ وضع حمل کے بعد اجازت ہوگی، اس کی تشریح سورۃ طلاق میں آئے گی، حقیقت میں تین حیض یا چار مہینے دس دن حمل کے انتظار اور اس کے دریافت کرنے کے لئے مقرر فرمائے۔

فائدہ: [2] جب بیوہ عورتیں اپنی عدت پوری کرلیں، یعنی غیر حاملہ چار ماہ دس روز اور حاملہ مدت حمل تو ان کو دستور شریعت کے موافق نکاح

کر لینے میں کچھ گناہ نہیں اور زینت اور خوشبو سب حلال ہیں۔

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا عَرَّضْتُمْ بِهِ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَاءِ أَوْ أَكْنَنْتُمْ فِي أَنْفُسِكُمْ ۚ عَلِمَ اللَّهُ

اور کچھ گناہ نہیں تم پر اس میں کہ اشارہ میں کہو پیغام نکاح ان عورتوں کا یا پوشیدہ رکھو اپنے دل میں، اللہ کو معلوم ہے

أَنَّكُمْ سَتَذْكُرُونَهُنَّ وَلَٰكِنْ لَا تُوَاعِدُوهُنَّ سِرًّا إِلَّا أَنْ تَقُولُوا قَوْلًا مَعْرُوفًا ۚ

کہ تم البتہ ان عورتوں کا ذکر کرو گے لیکن ان سے نکاح کا وعدہ نہ کر رکھو چھپ کر مگر یہی کہ کہہ دو کوئی بات رواج شریعت کے موافق

وَلَا تَعْزِمُوا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتَّىٰ يَبْلُغَ الْكِتَابُ أَجَلَهُ ۚ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا فِي أَنْفُسِكُمْ

اور نہ ارادہ کرو نکاح کا یہاں تک کہ پہنچ جائے عدت مقررہ اپنی انتہا کو۔ اور جان رکھو کہ اللہ کو معلوم ہے جو کچھ تمہارے دل میں ہے

فَاحْذَرُوهُ ۚ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ غَفُورٌ حَلِيمٌ ﴿٢٣٥﴾

ع ۱۴

سو اس سے ڈرتے رہو، اور جان رکھو کہ اللہ بخشنے والا اور تحمل کرنے والا ہے۔

خلاصہ تفسیر: اور تم پر کوئی گناہ نہیں ہوگا جو ان مذکورہ عورتوں کو (جو عدت وفات میں ہیں) پیغام (نکاح) دینے کے بارے میں کوئی بات اشارۃً کہہ دو (مثلاً یہ کہ مجھ کو ایک نیک عورت سے نکاح کی ضرورت ہے) یا اپنے دل میں (آئندہ نکاح کرنے کے ارادہ کو) پوشیدہ رکھو (جب بھی گناہ نہیں، اور اس اجازت کی وجہ یہ ہے کہ) اللہ تعالیٰ کو یہ بات معلوم ہے کہ تم ان عورتوں کا (ضرور) ذکر مذکور کرو گے (سو خیر اس طرح ذکر کرو) لیکن ان سے (صاف لفظوں میں) نکاح کا وعدہ (اور گفتگو) مت کرو، مگر یہ کہ کوئی بات قاعدہ کے موافق کہو (تو مضائقہ نہیں، اور قاعدہ کے موافق بات وہی ہے کہ اشارہ سے کہی جائے) اور تم (فی الحال) تعلق نکاح کا ارادہ بھی مت کرو یہاں تک کہ عدت اپنے مقررہ وقت پر ختم ہو جائے، اور یقین رکھو اس کا کہ اللہ کو اطلاع ہے تمہارے دلوں کی بات کی، سو اللہ سے ڈرتے رہا کرو (اور ناجائز کام کا دل میں ارادہ بھی مت کیا کرو) اور (یہ بھی) یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ معاف بھی کرنے والے ہیں (سو اگر کسی ناجائز کام کا ارادہ کیا تھا، پھر توبہ کرلی تو معاف کر دیتے ہیں) اور حلیم بھی ہیں (سو اگر توبہ نہ کرنے والے کو فوری سزا نہ دیں تو اس کی وجہ حلم سمجھو، دھوکہ مت کھاؤ)۔

وَلَٰكِنْ لَا تُوَاعِدُوهُنَّ سِرًّا: یہاں عدت کے اندر چار فعل مذکور ہیں، دو زبان کے، اور دو دل کے، اور ہر ایک کا حکم جدا ہے:

① زبان سے صراحۃً پیغام نکاح دینا، یہ حرام ہے **لاتواعدوھن سرًا** میں اس کا ذکر ہے۔

② زبان سے اشارۃً کہنا، یہ جائز ہے **لاجناح علیکم** اور **قولا معروفا** میں اس کا ذکر ہے۔

③ دل سے یہ ارادہ کرنا کہ ابھی یعنی عدت کے اندر نکاح کرلیں گے، یہ بھی حرام ہے، کیونکہ عدت کے اندر نکاح کرنا حرام ہے اور حرام کا ارادہ بھی حرام ہے، **لاتعزموا** میں اس کا ذکر ہے۔

④ دل سے یہ ارادہ کرنا کہ عدت کے بعد نکاح کریں گے، یہ جائز ہے، **اکننتم فی انفسکم** میں اس کا ذکر ہے۔

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا عَرَّضْتُمْ: اس میں اس پر دلالت ہے کہ جب کسی کو کوئی حکم دیا جائے اور کام کہا جائے تو اس کے اندر اس شخص کے ضعف کا خیال رکھنا چاہیے، جس حد تک وہ کر سکتا ہو اسی قدر اس کو وہ کام سپرد کرنا چاہیے، جیسے اللہ تعالیٰ نے عدت والی عورتوں کو نکاح کا صراحۃً پیغام دینے سے تو منع فرمایا، لیکن انسان کے ضعف کا خیال رکھتے ہوئے اس کے لیے دل کے اندر پکا ارادہ یا کنایات میں نکاح کا اشارہ دینے کو جائز قرار دیا۔

فائدہ: لہ خلاصہ آیت کا یہ ہوا کہ عورت خاوند کے نکاح سے جدا ہوئی تو جب تک عدت میں ہے تو کسی دوسرے کو جائز نہیں کہ اس سے نکاح کرلے، یا صاف وعدہ کرالے، یا صاف پیغام بھیجے، لیکن اگر دل میں نیت رکھے کہ بعد عدت میں اس سے نکاح کروں گا، یا اشارۃً اپنے مطلب کو اسے سنادے تاکہ کوئی دوسرا اس سے پہلے پیام نہ دے بیٹھے، مثلاً عورت کو سنادے کہ تجھ کو ہر کوئی عزیز رکھے گا، یا کہے کہ میرا ارادہ کہیں نکاح کرنے کا ہے تو کچھ گناہ نہیں، مگر صاف پیغام ہرگز نہ دے۔

فائدہ: ۲ یعنی حق تعالیٰ تمہارے جی کی باتیں جانتا ہے، سو ناجائز ارادہ سے بچتے رہو اور ناجائز ارادہ ہو گیا تو اس سے توبہ کرو، اللہ بخشنے والا ہے اور گنہگار پر عذاب نہ ہوا تو اس سے مطمئن نہ ہو جائے کیونکہ وہ حلیم ہے، عقوبت میں جلدی نہیں فرماتا۔

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ اَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً ۖ

کچھ گناہ نہیں تم پر اگر طلاق دو تم عورتوں کو اس وقت کہ ان کو ہاتھ بھی نہ لگایا ہو اور نہ مقرر کیا ہو ان کے لئے کچھ مہر

وَّمَتِّعُوْهُنَّ ۚ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ ۚ مَتَاعًۢا بِالْمَعْرُوْفِ ۚ

اور ان کو کچھ خرچ دو، مقدور والے پر اس کے موافق ہے اور تنگی والے پر اس کے موافق، جو خرچ کہ قاعدہ کے موافق ہے

حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۲۳۶﴾

لازم ہے نیکی کرنے والوں پر لہ

خلاصہ تفسیر: صحبت وخلوت سے پہلے طلاق کی دو صورتیں ہیں: ① یا تو نکاح کے وقت مہر کی مقدار متعین نہیں کی گئی ② یا مہر کی مقدار متعین کردی گئی، پہلی صورت کا حکم اولاً مذکور ہے:

تم پر (مہر کا) کچھ مواخذہ نہیں اگر بیویوں کو ایسی حالت میں طلاق دے دو کہ نہ ان کو تم نے ہاتھ لگایا ہے اور نہ ان کے لئے کچھ مہر مقرر کیا ہے (سو اس صورت میں مہر اپنے ذمہ مت سمجھو) اور (صرف) ان کو (ایک) فائدہ پہنچاؤ، صاحب وسعت کے ذمہ اس کی حیثیت کے موافق ہے، اور تنگدست کے ذمہ اس کی حیثیت کے موافق ہے، ایک خاص قسم کا فائدہ پہنچانا جو قاعدہ کے موافق واجب ہے خوش معاملہ لوگوں پر (یعنی سب مسلمانوں پر، کیونکہ خوش معاملگی کا سب ہی کو حکم ہے مراد اس سے ایک جوڑا کپڑوں کا دینا ہے)۔

اگر نکاح کے وقت مہر مقرر نہ کیا جائے تو نکاح ہو جاتا ہے، اگر ایسی عورت کو صحبت اور خلوت صحیحہ سے قبل طلاق دے دی تو کچھ مہر نہیں دینا پڑتا، بلکہ ایک جوڑا تین کپڑوں کا جس میں ایک کرتا ہو، ایک سربند اور ایک اتنی بڑی چادر جس میں سر سے پاؤں تک لپٹ سکے واجب ہوتا ہے، اور صحیح قول یہ ہے کہ اس جوڑا میں مرد کی حیثیت معتبر ہے، اور ایسی عورت کے لیے یہ جوڑا مہر کے قائم مقام ہے۔

فائدہ: لہ اگر نکاح کے وقت مہر کا ذکر نہ آیا اور بلا مہر ہی نکاح کرلیا تو بھی نکاح درست ہے، مہر بعد میں مقرر ہو رہے گا، لیکن اس صورت میں اگر ہاتھ لگانے سے پہلے یعنی مجامعت اور خلوت صحیحہ سے پہلے ہی طلاق دے دی تو مہر کچھ لازم نہ ہوگا لیکن زوج کو لازم ہے کہ اپنے پاس سے عورت کو کچھ دے دے کم سے کم یہی کہ تین کپڑے کرتہ، سربند، چادر اپنی حالت کے موافق اور خوشی سے دے دے۔

وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ

اور اگر طلاق دو ان کو ہاتھ لگانے سے پہلے اور ٹھہرا چکے تھے تم ان کے لئے مہر تو لازم ہو آدھا اس کا کہ تم مقرر کر چکے تھے

اِلَّآ اَنْ يَّعْفُوْنَ اَوْ يَعْفُوَا الَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ؕ وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ؕ

مگر یہ کہ درگزر کریں عورتیں یا درگزر کرے وہ شخص کہ اسے اختیار میں ہے گرہ نکاح کی یعنی خاوند، اور تم مرد درگزر کرو تو قریب ہے پرہیزگاری سے

وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۳۷﴾

اور نہ بھلا دو احسان کرنا آپس میں، بیشک اللہ جو کچھ تم کرتے ہو خوب دیکھتا ہے۔[1]

خلاصہ تفسیر: (اور دوسری صورت کا حکم یہ ہے:) اور اگر تم ان بیویوں کو طلاق دو قبل اس کے کہ ان کو ہاتھ لگاؤ اور ان کے لئے کچھ مہر بھی مقرر کر چکے تھے تو (اس صورت میں) جتنا مہر تم نے مقرر کیا ہو، اس کا نصف (واجب) ہے (اور نصف معاف ہے) مگر (دو صورتیں اس مجموعی حکم سے مستثنیٰ ہیں: ① ایک صورت تو) یہ کہ وہ عورتیں (اپنا نصف) بھی معاف کر دیں (تو اس صورت میں نصف بھی واجب نہ رہا) یا (② دوسری صورت) یہ (ہے) کہ وہ شخص رعایت کر دے جس کے ہاتھ میں نکاح کا تعلق (رکھنا اور توڑنا) ہے (یعنی خاوند پورا مہر ہی اس کو دے دے تو اس صورت میں خاوند کی مرضی سے پورا ہی مہر ادا کرنا ہوگا) اور (اے اہل حق!) تمہارا (اپنے حقوق کو) معاف کر دینا (بہ نسبت وصول کرنے کے) تقویٰ سے زیادہ قریب ہے (کیونکہ معاف کرنے سے ثواب ملتا ہے اور ثواب کا کام کرنا ظاہر ہے کہ تقویٰ کی بات ہے) اور آپس میں احسان (اور رعایت) کرنے سے غفلت مت کرو (بلکہ ہر شخص دوسرے کے ساتھ رعایت کرنے کا خیال رکھا کرے) بلا شبہ اللہ تعالیٰ تمہارے سب کاموں کو خوب دیکھتے ہیں (تو تم اگر کسی کے ساتھ رعایت واحسان کرو گے اللہ تعالیٰ اس کی جزائے خیر تم کو دیں گے)۔

جس عورت کا مہر نکاح کے وقت مقرر کیا ہوا ہو، اور اس کو صحبت اور خلوت صحیحہ سے قبل طلاق دے دی ہو تو مقرر کیے ہوئے مہر کا آدھا مرد کے ذمہ واجب ہوگا، البتہ اگر عورت معاف کر دے یا مرد پورا مہر دے دے تو اختیاری بات ہے۔

وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى: کسی کے ساتھ سلوک واحسان کی رعایت کرنا یا اپنا حق مہر معاف کر دینا اچھی بات ہے، اور اس کا موجب ثواب ہونا ظاہر اور معلوم ہے، لیکن کسی خاص وجہ سے کبھی معاف نہ کرنا اور رعایت نہ کرنا بہتر ہوتا ہے، مثلاً یہ کہ رعایت کرنے والا یا مہر معاف کرنے والی خود مفلس ہے اور معاف کرنے والی کو تنگ دستی پر صبر نہ ہو سکے گا اور خود کسی سوال وغیرہ کی معصیت میں مبتلا ہو جانے کا اندیشہ ہے ایسی صورت میں رعایت کرنا اور معاف کرنا جائز نہیں، عورتیں خصوصاً اس مسئلہ سے بہت غافل ہیں، ہر حالت میں مہر معاف کر دینے ہی کو ثواب سمجھتی ہیں، کسی چیز کا فی نفسہ اچھا ہونا اور کسی عارض کی وجہ سے اچھا نہ رہنا اس میں کچھ تعارض نہیں۔

اس میں بلند ہمتی اور ترک اشراف کی تعلیم بھی ہے، اشراف یہ کہ کسی کے پاس مال یا کوئی چیز دیکھ کر دل میں یہ انتظار اور امید رہنا کہ مجھے دے گا یا میرے ذمہ جو اس کے حقوق ہیں وہ معاف کر دے گا، چنانچہ یہاں آیت میں مردوں کو مہر کی تکمیل کی ترغیب دی اور یہ بھی کہ عورتوں کے معاف کرنے کا انتظار نہ کریں۔

* * *

فائدہ: [1] اگر نکاح کے وقت مہر مقرر ہو چکا تھا اور ہاتھ لگانے سے پہلے طلاق دے دی تو آدھا مہر دینا لازم ہے، مگر عورت یا مرد کہ جس کے اختیار میں ہے نکاح کا قائم رکھنا اور توڑنا اپنے حق سے درگزر کریں تو بہتر ہے، عورت کی تو درگزر یہ کہ آدھا بھی معاف کر دے اور مرد کی درگزر یہ کہ جو مہر مقرر ہوا تھا حوالہ کر دے، یا تمام مہر ادا کر چکا تھا تو آدھا نہ لوٹا دے بلکہ سب مہر چھوڑ دے، پھر فرمایا کہ مرد درگزر کرے تو تقوی کے زیادہ مناسب ہے

، کیونکہ اللہ نے اس کو بڑائی دی اور مختار کیا نکاح باقی رکھنے کا اور طلاق دینے کا، اور نفس نکاح سے تمام مہر لازم ہو جاتا ہے اور بدون ہاتھ لگائے طلاق دے کر زوج نصف مہر کو اپنے ذمہ سے ٹلاتا ہے، یہ تقویٰ کے مناسب نہیں اور زوجہ کی طرف سے کسی قسم کی کوتاہی نہیں ہوئی جو کچھ کیا زوج نے کیا ان وجوہ سے زوج کو زیادہ مناسب ہے کہ درگزر کرے۔

فائدہ: طلاق کی مہر اور وطی کے لحاظ سے چار صورتیں ہو سکتی ہیں: ① ایک تو یہ کہ نہ مہر ہو نہ وطی ② دوسری یہ کہ مہر تو مقرر ہو مگر وطی کی نوبت نہ آئے، ان دونوں صورتوں کا حکم دونوں آیتوں میں معلوم ہو چکا ہے ③ تیسری یہ مہر مقرر ہوا اور وطی کی نوبت آوے، اس میں جو مہر مقرر کیا ہے، پورا دینا ہوگا، یہ صورت کلام اللہ میں دوسرے موقع پر مذکور ہے ④ چوتھی یہ کہ مہر نہ ٹھہرایا تھا اور ہاتھ لگانے کے بعد طلاق دی، اس میں مہر مثل پورا دینا پڑیگا، یعنی جو اس عورت کی قوم میں رواج ہے۔

اور یہی چاروں صورتیں موت زوج میں نکلیں گی، مگر موت کا حکم طلاق کے حکم سے جدا ہے: ① اگر مہر مقرر نہ کیا تھا اور ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا کہ زوج مر گیا ② یا ہاتھ لگانے کے بعد مرا، ان دونوں صورتوں میں مہر مثل پورا لازم ہوگا ③ اگر مہر مقرر کیا اور ہاتھ لگایا ④ یا ہاتھ نہ لگایا تو ان دونوں صورتوں میں جو مہر مقرر ہوا تھا، وہ پورا دینا ہوگا۔

حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۗ وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ﴿٢٣٨﴾ فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا

خبردار رہو سب نمازوں سے اور بیچ والی نماز سے، اور کھڑے رہو اللہ کے آگے ادب سے ا۔ پھر اگر تم کو ڈر ہو کسی کا تو پیادہ پڑھ لو

اَوْ رُكْبَانًا ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿٢٣٩﴾

یا سوار، پھر جس وقت تم امن پاؤ تو یاد کرو اللہ کو جس طرح کہ تم کو سکھایا ہے جس کو تم نہ جانتے تھے ۲۔

خلاصہ تفسیر: اس آیت کے آگے اور پیچھے طلاق وغیرہ کے احکام ہیں، درمیان میں نماز کے احکام بیان فرمانے سے اس طرف اشارہ ہے کہ اصلی مقصود حق تعالیٰ کی طرف توجہ ہے، اور معاشرت و معاملات کے احکام سے بھی دیگر مصلحتوں کے علاوہ اس توجہ کی حفاظت اور ترقی بھی مقصود ہے، کیونکہ ان احکام میں حقوق العباد ادا کرنے کی تعلیم ہے، اور حقوق العباد تلف کرنے سے درگاہ الٰہی سے دوری ہو جاتی ہے، اور دوری کا یہ لازمی نتیجہ ہے کہ خدا کی اور بندہ کی دونوں کی طرف سے بے توجہی ہو جائے گی، چونکہ نماز میں یہ توجہ زیادہ ظاہر ہے، اس لئے درمیان میں اس کے لانے سے توجہ حق کے اصلی مقصود ہونے پر زیادہ دلالت ہوگئی تاکہ بندہ اس توجہ کو ہر وقت پیش نظر رکھے۔

محافظت کرو سب نمازوں کی (عموماً) اور درمیان والی نماز (یعنی عصر) کی (خصوصاً) اور (نماز) میں کھڑے ہوا کرو اللہ کے سامنے عاجز بنے ہوئے، پھر اگر تم کو (باقاعدہ نماز پڑھنے میں کسی دشمن وغیرہ کا) اندیشہ ہو تو کھڑے کھڑے یا سواری پر چڑھے چڑھے (جس طرح بھی بن سکے، خواہ قبلہ کی طرف منہ ہو یا نہ ہو، اور اگرچہ رکوع و سجود صرف اشارہ ہی سے ممکن ہو) پڑھ لیا کرو (اس حالت میں بھی نماز کی پابندی کرو، اس کو ترک مت کرو) پھر جب تم کو (بالکل) اطمینان ہو جائے (اور اندیشہ جاتا رہے) تو تم اللہ تعالیٰ کی یاد (یعنی ادائے نماز) اس طریق سے کرو جو تم کو (اطمینان کی حالت میں) سکھلایا ہے جس کو تم (پہلے سے) نہ جانتے تھے۔

وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى: بعض احادیث کی وجہ سے علماء کا قول یہ ہے کہ بیچ والی نماز عصر کی نماز ہے، کیونکہ اس کے ایک طرف دو نمازیں دن کی ہیں یعنی فجر و ظہر، اور ایک طرف دو نمازیں رات کی ہیں یعنی مغرب و عشاء، اس کی تاکید خصوصیت کے ساتھ اس لیے فرمائی ہے کہ یہ وقت اکثر لوگوں کے لیے کام کی بھیڑ بھاڑ کا ہوتا ہے۔

وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ: عاجزی کی تفسیر حدیث میں خاموشی سے آئی ہے، اسی آیت سے نماز میں باتیں کرنے کی ممانعت ہوئی۔

فَاِنۡ خِفۡتُمۡ فَرِجَالًا: کھڑے کھڑے نماز جب صحیح ہوگی جب ایک ہی جگہ کھڑا رہے اور سجدہ کا اشارہ ذرا زیادہ پست کرے، اور پیروں چلتے ہوئے نماز درست نہ ہوگی، البتہ جب ایک جگہ ٹھہرنا ممکن نہ ہو مثلاً عین لڑائی کا وقت ہے تو نماز کو قضا کر دیا جائے گا، دوسرے وقت پڑھ لیں گے۔

* * *

فائدہ: ۱ بیچ والی نماز سے مراد عصر کی نماز ہے کہ دن اور رات کے بیچ میں ہے، اس کی تاکید زیادہ فرمائی کہ اس وقت دنیا کا مشغلہ زیادہ ہوتا ہے اور فرمایا: ''کھڑے رہو ادب سے'': یعنی نماز میں ایسی حرکت نہ کرو کہ جس سے معلوم ہو جائے کہ نماز نہیں پڑھتے، ایسی باتوں سے نماز ٹوٹ جاتی ہے، جیسے کھانا پینا، یا کسی سے بات کرنا، یا ہنسنا۔

فائدہ: ۲ یعنی لڑائی اور دشمن سے خوف کا وقت ہو تو ناچاری کو سواری پر اور پیادہ بھی اشارہ سے نماز درست ہے گو قبلہ کی طرف بھی منہ نہ ہوا۔

فائدہ: طلاق کے حکموں میں نماز کے حکم کو بیان فرمانے کی یا یہ وجہ ہے کہ دنیا کے معاملات اور باہمی نزاعات میں پڑ کر کہیں خدا کی عبادت کو نہ بھلا دو اور یا یہ وجہ ہے کہ ہوا و ہوس کے بندوں کو بوجہ غلبہ حرص و بخل عدل کو پورا کرنا اور انصاف سے کام لینا اور وہ بھی رنج اور طلاق کی حالت میں بہت دشوار ہے پھر وَاَنۡ تَعۡفُوۡۤا اور لَا تَنۡسَوُا الۡفَضۡلَ پر اور اس حالت میں ان سے عمل کرنے کی توقع بیشک مستبعد نظر آتی تھی، سو اس کا علاج فرما دیا گیا کہ نماز کی محافظت اور اس کی پابندی اور اس کے حقوق کی رعایت عمدہ علاج ہے کہ نماز کو ازالہ رذائل اور تحصیل فواضل میں بڑا اثر ہے۔

وَالَّذِيۡنَ يُتَوَفَّوۡنَ مِنۡكُمۡ وَيَذَرُوۡنَ اَزۡوَاجًا ۖۚ وَّصِيَّةً لِّاَزۡوَاجِهِمۡ مَّتَاعًا اِلَى الۡحَـوۡلِ

اور جو لوگ تم میں سے مر جاویں اور چھوڑ جاویں اپنی عورتیں، تو وصیت کر دیں اپنی عورتوں کے واسطے خرچ دینا ایک برس تک

غَيۡرَ اِخۡرَاجٍ ۚ فَاِنۡ خَرَجۡنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡکُمۡ فِىۡ مَا فَعَلۡنَ فِىۡۤ اَنۡفُسِهِنَّ مِنۡ مَّعۡرُوۡفٍ ‌ؕ

بغیر نکالنے کے گھر سے ۱ پھر اگر وہ عورتیں آپ نکل جاویں تو کچھ گناہ نہیں تم پر اس میں کہ کریں وہ عورتیں اپنے حق میں بھلی بات

وَاللّٰهُ عَزِيۡزٌ حَكِيۡمٌ ﴿۲۴۰﴾

اور اللہ زبردست ہے حکمت والا ۲

خلاصہ تفسیر: اور جو لوگ وفات پا جاتے ہیں تم میں سے اور چھوڑ جاتے ہیں بیویوں کو (ان کے ذمہ لازم ہے کہ) وہ وصیت کر جایا کریں اپنی بیویوں کے واسطے ایک سال تک (نان ونفقہ اور گھر میں سکونت رکھنے سے) منتفع ہونے کی اس طور پر کہ وہ گھر سے نکالی نہ جائیں، ہاں! اگر (چار مہینے دس دن کے بعد یا وضع حمل کے بعد عدت گذار کر وہ) خود نکل جائیں تو تم کو کوئی گناہ نہیں اس قاعدہ کی بات میں جس کو اپنے بارے میں (تجویز) کریں (جیسے نکاح وغیرہ) اور اللہ تعالیٰ زبردست ہیں (ان کے خلاف حکم مت کرو) اور حکمت والے ہیں (کہ تمام احکام میں تمہاری مصلحتیں ملحوظ رکھی ہیں، اگرچہ تمہاری سمجھ میں نہ آسکیں)۔

وَّصِيَّةً لِّاَزۡوَاجِهِمۡ مَّتَاعًا اِلَى الۡحَـوۡلِ: جاہلیت میں شوہر کی وفات کی صورت میں عدت ایک سال تھی، اسلام میں بجائے ایک سال کے چار ماہ دس دن مقرر ہوئے جیسا کہ پیچھے آیت: يَّتَرَبَّصۡنَ بِاَنۡفُسِهِنَّ اَرۡبَعَةَ اَشۡهُرٍ وَّعَشۡرًا سے معلوم ہو چکا، مگر چونکہ اس وقت تک میراث کا حکم نازل نہ ہوا تھا اور بیوی کا کوئی حصہ میراث میں مقرر نہ ہوا تھا، بلکہ اولاد کے علاوہ باقی سب رشتہ داروں کے حقوق کا دارومدار مرنے والے کی وصیت پر تھا اس لیے عورت کی اتنی رعایت رکھی گئی تھی کہ اگر عورت اپنی مصلحت سے خاوند کے ترکہ کے گھر میں رہنا چاہے تو سال بھر تک اس کو رہنے کا حق حاصل ہے اور اسی کے ترکہ سے اس مدت میں اس کو نان نفقہ بھی دیا جائے اور خاوندوں کو حکم تھا کہ اس طرح کی وصیت کر جایا کریں، اس آیت میں اسی کا بیان ہے، اور چونکہ یہ حق عورت کا تھا اس کو اپنے حق کے وصول کرنے نہ کرنے کا پورا اختیار حاصل تھا اس لئے وارثوں کو گھر سے نکالنا جائز نہ تھا، لیکن خود عورت کو

جائز تھا کہ عدت پوری کر کے اس گھر میں نہ رہے اور اپنا حق ورثہ کو چھوڑ دے اور نکاح وغیرہ کر لے، قاعدہ کی بات سے یہی مراد ہے، البتہ عدت کے اندر نکلنا اور نکاح وغیرہ کرنا سب گناہ تھا، عورت کے لیے بھی اور جو منع کر سکے پھر بھی نہ روکے اس کے لیے بھی، پھر جب آیت میراث نازل کی گئی اور گھر بار ترکہ میں سے عورت کا حق ملنے لگا تو یہ آیت منسوخ ہوگئی، اب اگر وہ رہے تو اپنے حصہ میں رہے اور اپنے ہی حصہ سے خرچ کرے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یہ حکم اول تھا، اس کے بعد جب آیت میراث نازل ہوئی اور عورتوں کا حصہ بھی مقرر ہو چکا، ادھر عورت کی عدّت چار مہینے دس دن کی ٹھہرادی گئی تب سے اس آیت کا حکم موقوف ہوا۔

فائدہ: ۲؎ یعنی اگر وہ عورتیں اپنی خوشی سے سال کے ختم ہونے سے پہلے گھر سے نکلیں تو کچھ گناہ نہیں تم پر اے وارثو اس کام میں کہ کریں وہ عورتیں اپنے حق میں شریعت کے موافق، یعنی چاہیں خاوند کریں، یا اچھی پوشاک اور خوشبو کا استعمال کریں، کچھ حرج نہیں۔

وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ﴿۲۴۱﴾

اور طلاق دی ہوئی عورتوں کے واسطے خرچ دینا ہے قاعدہ کے موافق، لازم ہے پرہیز گاروں پر ۱؎

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۲۴۲﴾ ع

ع ۳۱ / ۱۵

اسی طرح بیان فرماتا ہے اللہ تمہارے واسطے اپنے حکم تا کہ تم سمجھ لو ۲؎

خلاصہ تفسیر: اور سب طلاق دی ہوئی عورتوں کے لئے کچھ کچھ فائدہ پہنچانا (کسی درجہ میں مقرر ہے) قاعدہ کے موافق (اور یہ) مقرر ہوا ہے ان پر جو (شرک وکفر سے) پرہیز کرتے ہیں (یعنی مسلمانوں پر، خواہ یہ مقرر ہونا وجوب کے درجہ میں ہو یا استحباب کے مرتبہ میں) اسی طرح حق تعالیٰ تمہارے (عمل کرنے کے) لئے اپنے احکام بیان فرماتے ہیں، اس توقع پر کہ تم (ان کو) سمجھو (اور عمل کرو)۔

مطلقات کی چار قسمیں ہیں: ① ایک وہ جس کو دخول سے قبل طلاق دی گئی ہو اور مہر مقرر نہ ہو، اس کو جوڑا دینا واجب ہے۔

② دوسری وہ جس کو دخول سے قبل طلاق دی گئی ہو اور مہر مقرر ہو اس کو آدھا مہر دینا واجب ہے، ان دونوں کا ذکر پیچھے آچکا ہے۔

③ تیسری وہ جس کو دخول کے بعد طلاق دی گئی ہو اور مہر مقرر ہو، اس کو مقررہ مہر پورا دینا واجب ہے۔

④ چوتھی وہ جس کو دخول کے بعد طلاق دی گئی ہو اور مہر مقرر نہ ہو، اس کو خاندانی مہر پورا دینا واجب ہے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ پہلے خرچ یعنی جوڑا دینے کا حکم اس طلاق پر آچکا ہے کہ نہ مہر ٹھہرا ہو، نہ زوج نے ہاتھ لگایا ہو، اب اس آیت میں وہ حکم سب کے لئے آگیا، مگر اتنا فرق ہے کہ سب طلاق والیوں کو جوڑا دینا مستحب ہے، ضروری نہیں، اور پہلی صورت میں ضروری ہے۔

فائدہ: ۲؎ یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ نے یہاں نکاح طلاق عدت کے احکام بیان فرمائے، ایسے ہی اپنے احکام وآیات کو واضح فرماتا ہے کہ تم سمجھ لو اور عمل کر سکو، یہاں نکاح وطلاق کے احکام ختم ہو چکے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ ۪ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ۟

کیا نہ دیکھا تو نے ان لوگوں کو جو کہ نکلے اپنے گھروں سے اور وہ ہزاروں تھے موت کے ڈر سے، پھر فرمایا ان کو اللہ نے کہ مر جاؤ

ثُمَّ اَحْيَاهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۲۴۳﴾

پھر ان کو زندہ کر دیا، بیشک اللہ فضل کرنے والا ہے لوگوں پر لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے ۱؎

وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿٢٤٤﴾

اور لڑو اللہ کی راہ میں اور جان لو کہ اللہ بیشک خوب سنتا جانتا ہے

خلاصہ تفسیر: چند آیات قبل قتال کا ذکر ہوا تھا، یہاں یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ جہاد وقتال سے خوف یا موت کے سبب پیچھے نہ ہٹیں اور موت وحیات سب قبضہ الٰہی میں سمجھیں، چنانچہ ارشاد ہے:

اے مخاطب!) کیا تجھ کو ان لوگوں کا قصہ تحقیق نہیں ہوا جو کہ اپنے گھروں سے نکل گئے، اور وہ لوگ ہزاروں ہی تھے، موت سے بچنے کے لئے، سو اللہ نے ان کے لئے (حکم) فرمادیا کہ مرجاؤ (سب مرگئے) پھر ان کو جلادیا، بیشک اللہ تعالیٰ بڑا فضل کرنے والے ہیں لوگوں (کے حال) پر، مگر اکثر شکر نہیں کرتے، اور (اس واقعہ پر غور کرکے) اللہ کی راہ میں قتال کرو، اور یقین رکھو اس بات کا کہ اللہ تعالیٰ خوب سننے والے اور خوب جاننے والے ہیں (جہاد کرنے اور نہ کرنے والوں کی باتیں سنتے اور ہر ایک کی نیت جانتے ہیں اور سب کو مناسب جزا دیں گے)۔

یہ قصہ پہلی امتوں میں سے کسی کا ہے، اور مشہور ہے کہ بنی اسرائیل کی ایک جماعت کا ہے جو کسی ایسے حادثے سے بھاگے تھے جس میں موت کا اندیشہ تھا، ان کو یہ بات دکھلادی کہ موت وحیات سب خدا کے قبضہ قدرت میں ہے، چنانچہ ان کو ایک دم سے موت آگئی، پھر حق تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے اور مشہور یہ ہے کہ پیغمبر حضرت حزقیل علیہ السلام کی دعا کے بعد ان کو زندہ کردیا تاکہ بلا سبب موت وحیات دونوں کا مشاہدہ کرلیں۔

* * *

فائدہ: یہ پہلی امت کا قصہ ہے کہ کئی ہزار شخص گھر بار کو ساتھ لے کر وطن سے بھاگے، ان کو ڈر ہوا تھا غنیمت کا اور لڑنے سے جی چھپایا، یا ڈر ہوا تھا وباء کا اور تقدیر پر توکل اور یقین نہ کیا، پھر ایک منزل پر پہنچ کر بحکم الٰہی سب مرگئے، پھر سات دن کے بعد پیغمبر کی دعا سے زندہ ہوئے کہ آگے کو توبہ کریں، اس حال کو یہاں اس واسطے ذکر فرمایا کہ کافروں سے لڑنے، یا فی سبیل اللہ مال خرچ کرنے میں جان اور مال کی محبت کے باعث دریغ نہ کریں اور جان لیویں کہ اللہ موت بھیجے تو چھٹکارے کی کوئی صورت نہیں اور زندگی چاہے تو مردہ کو دم کے دم میں زندہ کردے، زندہ کو موت سے بچالینا تو کوئی چیز ہی نہیں، پھر اس کی تعمیل حکم میں موت سے ڈر کر جہاد سے بچنا، یا افلاس سے بچ کر صدقہ اور دوسروں پر احسان یا عفو اور فضل سے رُکنا بددینی کے ساتھ حماقت بھی پوری ہے۔

مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗٓ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً ۭ وَاللّٰهُ يَقْبِضُ

کون شخص ہے ایسا جو کہ قرض دے اللہ کو اچھا قرض پھر دو گنا کر دے اللہ اس کو کئی گنا، اور اللہ ہی تنگی کر دیتا ہے

وَيَبْصُۜطُ ۠ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿٢٤٥﴾

اور وہی کشادہ کرتا ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے

خلاصہ تفسیر: جہاد میں جان خرچ کرنے کے ساتھ آگے مال خرچ کرنے کا بیان فرماتے ہیں، اور اگرچہ انفاق کا بیان پیچھے بھی آچکا ہے، اور آگے بھی آئے گا، لیکن ہر جگہ بیان سے الگ بات مقصود ہے، چنانچہ ذرا غور کرنے سے معلوم ہوسکتا ہے۔

کون شخص ہے (ایسا) جو اللہ تعالیٰ کو قرض دے اچھے طور پر قرض دینا (یعنی اخلاص کے ساتھ خرچ کرے) پھر اللہ تعالیٰ اس (قرض کے ثواب) کو بڑھا کر بہت سے حصے کردے، اور (اس کا اندیشہ مت کرو کہ خرچ کرنے سے مال کم ہوجائے گا، کیونکہ یہ تو) اللہ (ہی کے قبضہ میں ہے، وہی) کمی کرتے ہیں اور (وہی) فراخی کرتے ہیں (کچھ خرچ کرنے نہ کرنے پر اس کا اصلی مدار نہیں) اور تم اسی کی طرف (مرنے کے بعد) لے جائے جاؤ گے (سو اس وقت نیک کام میں خرچ کرنے کی جزاء اور ضروری موقع پر خرچ نہ کرنے کی سزا تم کو ملے گی)۔

يُقْرِضُ اللهَ قَرْضًا حَسَنًا :قرض مجاز افرمادیا، ورنہ حقیقت میں سب خدا ہی کی ملک ہے، مطلب یہ ہے کہ جیسے قرض کا عوض ضرور ہی دیا جاتا ہے، اسی طرح تمہارے خرچ کرنے کا عوض ضرور ملے گا۔

فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً :ثواب بڑھانے کا بیان ایک حدیث میں آیا ہے کہ اگر ایک چھوارہ اللہ کی راہ میں خرچ کیا جائے تو اللہ تعالیٰ اس کو اتنا بڑھا دیتے ہیں کہ وہ احد پہاڑ سے زیادہ ہوجاتا ہے، اور ہر شخص جانتا ہے کہ احد پہاڑ کے ٹکڑے چھواروں کے برابر کیے جائیں تو بے شمار ہوں گے، اس حساب سے معلوم ہوگیا کہ ثواب زیادہ ہونے کی حد سات سو تک نہیں رہی، بلکہ اس سے بھی زیادہ ملتا ہے، بشرطیکہ خلوص سے ہو، شان نزول سے بھی یہی بات معلوم ہوتی ہے، چنانچہ حدیث میں ہے کہ جب وہ سات سو والی آیت نازل ہوئی تو حضور ﷺ نے دعا کی کہ اے رب! میری امت کو اور زیادہ دیجیے اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

وَاللهُ يَقْبِضُ وَيَبْصُۜطُ :اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ طبیعت پر کبھی قبض (تنگی) کا ہونا اور کبھی بسط (کشادگی) کا ہونا دونوں حق تعالیٰ کی طرف سے ہیں اور دونوں میں مرجع حق تعالیٰ ہے، کیونکہ یہ دونوں اللہ کی طرف پہنچانے والے اور اس کی تجلیات کے ظہور کے آئینے ہیں، جیسے کبھی بندہ پر اللہ تعالیٰ اپنی طرف سے توجہ اور محبت کا دروازہ کھول دیتے ہیں تو اس سے وہ اللہ کے نزدیک ہوتا ہے، اور کبھی منقطع فرمادیتے ہیں تو وہ بندہ صبر کرتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ پھر مجھ پر بسط یعنی کشادگی طاری ہوجائے تو اس سے بھی وہ اللہ کے نزدیک ہوتا ہے سو دونوں پسندیدہ اور محمود ہیں۔

* * *

فائدہ: یعنی جب معلوم ہو چکا کہ اللہ کے حکم میں تمہاری جان اور مال ہے، تو اب تم کو چاہیے کہ لڑو کافروں سے اللہ کے واسطے دین کے لئے، جان لو کہ خدا تعالیٰ سنتا ہے بہانہ کرنے والوں کی باتیں، اور جانتا ہے ان کے منصوبوں کو، اور چاہیے کہ خرچ کرو اللہ کے راستہ میں مال، اور تنگی سے مت ڈرو کہ کشایش اور تنگی سب اس کے اختیار میں ہے، اور اسی کی طرف لوٹ کر سب کو جانا ہے۔

"قرض حسنہ" اسے کہتے ہیں جو قرض دے کر تقاضا نہ کرے اور اپنا احسان نہ رکھے اور بدلہ نہ چاہے اور اسے حقیر نہ سمجھے، اور خدا کو دینے سے جہاد میں خرچ کرنا مراد ہے، یا محتاجوں کو دینا۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاِ مِنْۢ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى ۘ اِذْ قَالُوْا لِنَبِیٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا (وقف لازم)

کیا نہ دیکھا تو نے ایک جماعت بنی اسرائیل کو موسیٰ کے بعد ۱؎ جب انہوں نے کہا اپنے نبی سے مقرر کر دو ہمارے لئے ایک بادشاہ

نُّقَاتِلْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ؕ قَالَ هَلْ عَسَیْتُمْ اِنْ كُتِبَ عَلَیْكُمُ الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْا ؕ

تاکہ ہم لڑیں اللہ کی راہ میں، پیغمبر نے کہا کیا تم سے یہ بھی توقع ہے کہ اگر حکم ہو تم کو لڑائی کا تو تم اس وقت نہ لڑو

قَالُوْا وَمَا لَنَاۤ اَلَّا نُقَاتِلَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِیَارِنَا وَاَبْنَآىِٕنَا ؕ فَلَمَّا كُتِبَ

وہ بولے ہم کو کیا ہوا کہ ہم نہ لڑیں اللہ کی راہ میں اور ہم تو نکال دیئے گئے اپنے گھروں سے اور بیٹوں سے، پھر جب حکم ہوا

عَلَیْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْهُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِیْمٌۢ بِالظّٰلِمِیْنَ ﴿۲۴۶﴾

ان کو لڑائی کا تو وہ سب پھر گئے مگر تھوڑے سے ان میں کے اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے گناہ گاروں کو ۲؎

خلاصہ تفسیر: اس مقام پر قتال کی ترغیب زیادہ مقصود ہے، اوپر کا قصہ اسی کی تمہید ہے، اور خرچ کرنے کا مضمون اسی کی تائید تھی، اب آگے طالوت و جالوت کا قصہ اسی کی تاکید ہے، نیز اللہ تعالیٰ نے اس قصے میں قبض و بسط کا بھی مشاہدہ کرا دیا جس کا ذکر ماقبل کی آیت: وَاللّٰهُ

یَقۡبِضُ وَیَبۡصُطُ میں آیا ہے کہ فقیر کو بادشاہ بنانا اور بادشاہ سے باداشاہت چھین لینا، سب اسی کے اختیار میں ہے۔

(اے مخاطب!) کیا تجھ کو بنی اسرائیل کی جماعت کا قصہ جو موسیٰ علیہ السلام کے بعد ہوا ہے، تحقیق نہیں ہوا (جبکہ ان پر کافر جالوت غالب آچکا تھا، اور ان کے کئی صوبے انہوں نے دبالئے تھے) جب کہ ان لوگوں نے اپنے ایک پیغمبر سے کہا کہ ہمارے لئے ایک بادشاہ مقرر کردیجئے کہ ہم (اس کے ساتھ ہوکر) اللہ تعالیٰ کی راہ میں (جالوت سے) قتال کریں، ان پیغمبر نے فرمایا کہ کیا یہ احتمال ہے اگر تم کو جہاد کا حکم دیا جائے کہ تم (اس وقت) جہاد نہ کرو، وہ لوگ کہنے لگے کہ ہمارے واسطے ایسا کونسا سبب ہوگا کہ ہم اللہ کی راہ میں جہاد نہ کریں، حالانکہ (جہاد کے لئے ایک قوی محرک بھی ہے، وہ یہ کہ) ہم (ان کافروں کے ہاتھوں) اپنی بستیوں اور اپنے فرزندوں سے بھی جدا کردیئے گئے ہیں (کیونکہ ان کی بعض بستیاں بھی کافروں نے دبالی تھیں، اور ان کی اولاد کو بھی قید کرلیا گیا تھا) پھر جب ان لوگوں کو جہاد کا حکم ہوا تو باستثناء ایک قلیل مقدار کے (باقی) سب پھر گئے (جیسا کہ آگے جہاد کی غرض سے بادشاہ کے مقرر ہونے کا اور ان لوگوں کے پھر جانے کا بیان تفصیلا آتا ہے) اور اللہ تعالیٰ ظالموں کو (یعنی خلاف حکم کرنے والوں کو) خوب جانتے ہیں (سب کو مناسب سزادیں گے)۔

ان بنی اسرائیل نے حق تعالیٰ کے احکام کو چھوڑ دیا تھا تو کفار عمالقہ ان پر مسلط کردیے گئے، اس وقت ان لوگوں کو اصلاح کی فکر ہوئی، ان پیغمبر کا نام حضرت شموئیل علیہ السلام مشہور ہے۔

* * *

فائدہ: 1 اس قصہ سے حق تعالیٰ کا بسط وقبض جو ابھی مذکور ہوا، خوب ثابت ہوتا ہے، یعنی فقیر کو بادشاہ بنانا اور بادشاہ سے بادشاہت چھین لینا اور ضعیف کو قوی اور قوی کو ضعیف کردینا۔

فائدہ: 2 حضرت موسیٰ کے بعد کچھ عرصہ تک بنی اسرائیل کا کام درست رہا، پھر جب ان کی نیت بگڑی تب ان پر ایک غنیم کافر بادشاہ جالوت نام مسلط ہوا، ان کو شہر سے نکال دیا اور لوٹا اور ان کو پکڑ کر بندہ بنایا، بنی اسرائیل بھاگ کر بیت المقدس میں جمع ہوئے، اس وقت حضرت شموئیل علیہ السلام پیغمبر تھے ان سے درخواست کی کہ کوئی بادشاہ ہم پر مقرر کرو کہ اس کے ساتھ ہوکر ہم جہاد کریں فی سبیل اللہ۔

وَقَالَ لَهُمۡ نَبِيُّهُمۡ اِنَّ اللّٰهَ قَدۡ بَعَثَ لَكُمۡ طَالُوۡتَ مَلِكًا ؕ قَالُوۡٓا اَنّٰى يَكُوۡنُ لَهُ الۡمُلۡكُ عَلَيۡنَا

اور فرمایا ان سے ان کے نبی نے بیشک اللہ نے مقرر فرمادیا تمہارے لئے طالوت کو بادشاہ، کہنے لگے کیونکر ہوسکتی ہے اس کی حکومت ہم پر

وَنَحۡنُ اَحَقُّ بِالۡمُلۡكِ مِنۡهُ وَلَمۡ يُؤۡتَ سَعَةً مِّنَ الۡمَالِ ؕ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصۡطَفٰٮهُ عَلَيۡكُمۡ

اور ہم زیادہ مستحق ہیں سلطنت کے اس سے اور اس کو نہیں ملی کشائش مال میں، پیغمبر نے کہا بیشک اللہ نے پسند فرمایا اس کو تم پر

وَزَادَهٗ بَسۡطَةً فِى الۡعِلۡمِ وَالۡجِسۡمِ ؕ وَاللّٰهُ يُؤۡتِىۡ مُلۡكَهٗ مَنۡ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيۡمٌ ﴿۲۴۷﴾

اور زیادہ فراخی دی اس کو علم اور جسم میں، اور اللہ دیتا ہے ملک اپنا جس کو چاہے، اور اللہ ہے فضل کرنے والا سب کچھ جاننے والا

خلاصہ تفسیر: اور ان لوگوں سے ان کے پیغمبر نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر طالوت کو بادشاہ مقرر فرمایا، کہنے لگے ان کو ہم پر حکمرانی کا کیسے حق حاصل ہوسکتا ہے، حالانکہ بہ نسبت ان کے ہم حکمرانی کے زیادہ مستحق ہیں، اور ان کو کچھ مالی وسعت بھی نہیں دی گئی (کیونکہ طالوت غریب آدمی تھے) ان پیغمبر نے (جواب میں) فرمایا کہ (اول تو) اللہ تعالیٰ نے تمہارے مقابلے میں ان کو منتخب فرمایا ہے (اور انتخاب کی مصلحتوں کو اللہ تعالیٰ ہی خوب جانتے ہیں) اور (دوسرے) علم (سیاست وحکمرانی) اور جسامت میں اس کو زیادتی دی ہے (اور بادشاہ ہونے کے لئے علم سیاست

کی بہت زیادہ ضرورت ہے، تاکہ ملکی انتظام پر قادر ہو، اور جسامت بھی اس وجہ سے مناسب ہے تاکہ موافق ومخالف ہر ایک کے دل میں وقعت وہیبت ہو) اور (تیسرے) اللہ تعالیٰ (مالک الملک ہیں) اپنا ملک جس کو چاہیں دیں (ان سے کوئی سوال کا منصب نہیں رکھتا) اور (چوتھے) اللہ تعالیٰ وسعت دینے والے ہیں (ان کو مال دے دینا کیا مشکل ہے، جس کی وجہ سے تم کو شبہ ہے، اور) جاننے والے ہیں (کہ کون سلطنت کی لیاقت رکھتا ہے)۔

* * *

فائدہ: طالوت کی قوم میں آگے سے سلطنت نہ تھی، غریب محنتی آدمی تھے، ان (بنی اسرائیل) کی نظر میں سلطنت کے قابل نظر نہ آئے، اور بوجہ مال و دولت اپنے آپ کو سلطنت کے لائق خیال کیا، نبی نے فرمایا کہ سلطنت کسی کا حق نہیں اور سلطنت کی بڑی لیاقت ہے عقل اور بدن میں زیادتی اور وسعت ہونی جس میں طالوت تم سے افضل ہے۔

فائدہ: بنی اسرائل نے جب یہ سنا تو پھر کہا پیغمبر سے کہ اس کے سوا کوئی اور دلیل بھی ان کی بادشاہت پر دکھلا دو تاکہ ہمارے دل میں کوئی اشتباہ نہ رہے، نبی نے دعا کی جناب الٰہی میں اور طالوت کی سلطنت کی دوسری نشانی بیان فرمادی گئی۔

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهٖٓ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ

اور کہا بنی اسرائیل سے ان کے نبی نے کہ طالوت کی سلطنت کی نشانی یہ ہے کہ آوے تمہارے پاس ایک صندوق کہ جس میں تسلی خاطر ہے

مِّنْ رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَاٰلُ هٰرُوْنَ تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ ؕ

تمہارے رب کی طرف سے اور کچھ بچی ہوئی چیزیں ہیں ان میں سے جو چھوڑ گئی تھی موسیٰ اور ہارون کی اولاد اٹھا لاویں گے اس صندوق کو فرشتے

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۴۸﴾ ع ۳۲/۱۶

بیشک اس میں پوری نشانی ہے تمہارے واسطے اگر تم یقین رکھتے ہو

خلاصہ تفسیر: اور (جب ان لوگوں نے پیغمبر سے یہ درخواست کی کہ اگر کوئی ظاہری حجت بھی ان کے من جانب اللہ بادشاہ ہونے کی ہم مشاہدہ کرلیں تو اور زیادہ اطمینان ہو جائے، اس وقت) ان سے ان کے پیغمبر نے فرمایا کہ ان کے (من جانب اللہ) بادشاہ ہونے کی یہ علامت ہے کہ تمہارے پاس وہ صندوق (بغیر تمہارے لائے ہوئے) آجائے گا جس میں تسکین (اور برکت) کی چیز ہے تمہارے رب کی طرف سے (یعنی تورات، اور تورات کا من جانب اللہ ہونا ظاہر ہے) اور کچھ بچی ہوئی چیزیں ہیں جن کو حضرت موسیٰ وحضرت ہارون علیہما السلام چھوڑ گئے ہیں (یعنی ان حضرات کے کچھ ملبوسات وغیرہ، غرض) اس صندوق کو فرشتے لے آئیں گے، اس (طرح کے صندوق کے آجانے) میں تم لوگوں کے واسطے پوری نشانی ہے اگر تم یقین لانے والے ہو۔

اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ: اس صندوق میں تبرکات تھے، جالوت جب بنی اسرائیل پر غالب آیا تھا تو یہ صندوق بھی لے گیا تھا، جب اللہ تعالیٰ کو اس کا پہنچانا منظور ہوا تو یہ سامان کیا کہ جہاں اس صندوق کو رکھتے وہیں سخت سخت بلائیں نازل ہوتیں، آخر ان لوگوں نے ایک گاڑی پر اس کو لاد کر بیلوں کو ہانک دیا، فرشتے ان کو ہانکتے ہوئے یہاں پہنچا گئے، جس سے بنی اسرائیل کو بڑی خوشی ہوئی اور طالوت بادشاہ تسلیم کرلیے گئے۔

فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ: اس میں اصل ہے آثار صالحین سے برکت حاصل کرنے کی، یعنی صلحاء کے تبرکات وغیرہ کو برکت کے لیے اپنے پاس رکھیں تو اس سے واقعی برکت ہوتی ہے۔

* * *

فائدہ: بنی اسرائیل میں ایک صندوق چلا آتا تھا، اس میں تبرکات تھے، حضرت موسیٰ علیہ السلام وغیرہ انبیائے بنی اسرائیل اس صندوق کو

لڑائی میں آگے رکھتے، اللہ اس کی برکت سے فتح دیتا، جب جالوت غالب آیا ان پر تو یہ صندوق بھی وہ لے گیا تھا، جب اللہ تعالیٰ کو صندوق کا پہنچانا منظور ہوا تو یہ کہا کہ وہ کافر جہاں صندوق رکھتے، وہیں وبا اور بلا آتی، پانچ شہر ویران ہوگئے، ناچار ہو کر دو بیلوں پر اس کو لاد کر ہانک دیا، فرشتے بیلوں کو ہانک کر طالوت کے دروازے پر پہنچا گئے، بنی اسرائیل اس نشانی کو دیکھ کر طالوت کی بادشاہت پر یقین لائے اور طالوت نے جالوت پر فوج کشی کی اور موسم نہایت گرم تھا۔

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوتُ بِالْجُنُودِ قَالَ إِنَّ اللَّهَ مُبْتَلِيكُمْ بِنَهَرٍ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّي

پھر جب باہر نکلا طالوت فوجیں لے کر کہا بیشک اللہ تمہاری آزمائش کرتا ہے ایک نہر سے، سو جس نے پانی پیا اس نہر کا تو وہ میرا نہیں

وَمَنْ لَمْ يَطْعَمْهُ فَإِنَّهُ مِنِّي إِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةً بِيَدِهِ فَشَرِبُوا مِنْهُ إِلَّا قَلِيلًا مِنْهُمْ

اور جس نے اسکو نہ چکھا تو وہ بیشک میرا ہے مگر جو کوئی بھرے ایک چلو اپنے ہاتھ سے، پھر پی لیا سب نے اسکا پانی مگر تھوڑوں نے ان میں سے

فَلَمَّا جَاوَزَهُ هُوَ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ قَالُوا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ

پھر جب پار ہوا طالوت اور ایمان والے ساتھ اس کے تو کہنے لگے طاقت نہیں ہم کو آج جالوت اور اس کے لشکروں سے لڑنے کی

قَالَ الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُمْ مُلَاقُو اللَّهِ كَمْ مِنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ

کہنے لگے وہ لوگ جن کو خیال تھا کہ ان کو اللہ سے ملنا ہے بارہا تھوڑی جماعت غالب ہوئی ہے بڑی جماعت پر اللہ کے حکم سے

وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ ﴿٢٤٩﴾

اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے

خلاصہ تفسیر: پھر جب (بنی اسرائیل نے طالوت کو بادشاہ تسلیم کرلیا اور جالوت کے مقابلے کے لئے جمع ہوگئے اور) طالوت فوجوں کو لے کر (اپنے مقام یعنی بیت المقدس سے عمالقہ کی طرف) چلے تو انہوں نے (اپنے ہمراہی پیغمبر کی وحی کے ذریعے دریافت کر کے ساتھیوں سے) کہا کہ اب حق تعالیٰ (استقلالی و بے استقلالی میں) تمہارا امتحان کریں گے ایک نہر کے ذریعے (جو راہ میں آئے گی، اور تم سخت پیاس کے وقت اس پر گذرو گے) سو جو شخص اس سے (افراط کے ساتھ) پانی پیے گا وہ تو میرے ساتھیوں میں نہیں، اور جو اس کو زبان پر بھی نہ رکھے (اور اصل حکم یہی تھا کہ بالکل نہ چکھو) وہ میرے ساتھیوں میں ہے، لیکن جو شخص اپنے ہاتھ سے ایک چلو بھر لے (تو اتنی اجازت ہے، یہ رخصت کے درجہ میں تھا، غرض وہ نہر راستے میں آئی، پیاس کی شدت تھی) سو سب نے اس سے (بے تحاشا) پینا شروع کر دیا، مگر تھوڑے سے آدمیوں نے ان میں سے (احتیاط کی، کسی نے بالکل نہ پیا ہوگا، کسی نے چلو سے زیادہ نہ پیا ہوگا)۔

سو جب طالوت اور جو مؤمنین ان کے ہمراہ تھے نہر سے پار اتر گئے (اور اپنے مجمع کو دیکھا تو تھوڑے سے آدمی رہ گئے، اس وقت بعض آدمی آپس میں) کہنے لگے کہ آج تو (ہمارا مجمع اتنا کم ہے کہ اس حالت سے) ہم میں جالوت اور اس کے لشکر کے مقابلے کی طاقت نہیں معلوم ہوتی (یہ سن کر) ایسے لوگ جن کو یہ خیال (پیش نظر) تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے روبرو پیش ہونے والے ہیں، کہنے لگے کہ کثرت سے (ایسے واقعات ہو چکے ہیں کہ) بہت سی چھوٹی چھوٹی جماعتیں بڑی بڑی جماعتوں پر خدا کے حکم سے غالب آگئی ہیں (دیکھو اصل چیز استقلال ہے) اور اللہ تعالیٰ استقلال والوں کا ساتھ دیتے

ہیں (فتح وشکست کا دارومدار فوج کی قلت اور کثرت ہی پر نہیں)۔

اِنَّ اللّٰهَ مُبۡتَلِيۡكُمۡ بِنَهَرٍ: اس امتحان کی حکمت اور توجیہ راقم کے ذوق میں یہ معلوم ہوتی ہے کہ ایسے مواقع پر جوش وخروش میں بھیڑ بھڑکا بہت ہوجایا کرتا ہے، لیکن وقت پر جمنے والے کم ہوتے ہیں اور اس وقت بزدلوں کا اکھڑ جانا باقی لوگوں کے پاوٴں بھی اکھاڑ دیتا ہے، اللہ کو ایسے لوگوں کا علیحدہ کرنا منظور تھا، اس لیے یہ امتحان مقرر کیا گیا جو کہ نہایت ہی مناسب ہے، کیونکہ قتال میں استقلال وجفاکشی کی ضرورت ہوتی ہے، سوشدت پیاس کے وقت بے منت پانی ملنے پر ضبط کرنا استقلال کی دلیل ہے، اور اندھے باؤلوں کی طرح جا گرنا بے استقلالی کی دلیل ہے، آگے خرق عادت ہوا کہ زیادہ پانی پینے والے غیبی طور پر بھی زیادہ بیکار اور از کار رفتہ ہو گئے۔

اس قصے میں جو احوال واقوال مذکور ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں تین قسم کے لوگ تھے: ① ناقص الایمان جو امتحان میں پورے نہ اترے اور ② اور کامل جو امتحان میں پورے اترے مگر اپنی قلت کی فکر ہوئی ③ اور تیسرے اکمل جن کو یہ بھی فکر نہیں ہوئی۔

* * *

فائدہ: ہوس سے طالوت کے ساتھ چلنے کو سب تیار ہو گئے، طالوت نے کہہ دیا کہ جو کوئی جوان زور آور اور بے فکر ہو وہ چلے، ایسے بھی اسی (۸۰) ہزار نکلے، پھر طالوت نے ان کو آزمانا چاہا، ایک منزل میں پانی نہ ملا، دوسری منزل میں ایک نہر ملی، طالوت نے حکم کر دیا جو ایک چلو سے زیادہ پانی پیوے وہ میرے ساتھ نہ چلے، صرف تین سو تیرہ ان کے ساتھ رہ گئے اور سب جدا ہو گئے، جنہوں نے ایک چلو سے زیادہ نہ پیا، ان کی پیاس بجھی اور جنہوں نے زیادہ پیا، ان کو اور پیاس زیادہ لگی اور آگے نہ چل سکے۔

وَلَمَّا بَرَزُوۡا لِجَالُوۡتَ وَجُنُوۡدِهٖ قَالُوۡا رَبَّنَآ اَفۡرِغۡ عَلَيۡنَا صَبۡرًا وَّثَبِّتۡ اَقۡدَامَنَا

اور جب سامنے ہوئے جالوت کے اور اسکی فوجوں کے تو بولے اے رب ہمارے ڈال دے ہمارے دلوں میں صبر اور جمائے رکھ ہمارے پاوٴں

وَانۡصُرۡنَا عَلَى الۡقَوۡمِ الۡكٰفِرِيۡنَ ﴿۲۵۰﴾ فَهَزَمُوۡهُمۡ بِاِذۡنِ اللّٰهِ ۙ وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوۡتَ وَاٰتٰٮهُ اللّٰهُ

اور مدد کر ہماری اس کافر قوم پر، پھر شکست دی مومنوں نے جالوت کے لشکر کو اللہ کے حکم سے، اور مار ڈالا داؤد نے جالوت کو اور دی اللہ نے

الۡمُلۡكَ وَالۡحِكۡمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ ؕ وَلَوۡلَا دَفۡعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعۡضَهُمۡ بِبَعۡضٍ ۙ لَّفَسَدَتِ

سلطنت اور حکمت اور سکھایا ان کو جو چاہا، اور اگر نہ ہوتا دفع کرا دینا اللہ کا ایک کو دوسرے سے تو خراب ہو جاتا

الۡاَرۡضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوۡ فَضۡلٍ عَلَى الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۲۵۱﴾

ملک لیکن اللہ بہت مہربان ہے جہان کے لوگوں پر

خلاصہ تفسیر: اور جب (دیار عمالقہ میں پہنچے اور) جالوت اور اس کی فوجوں کے سامنے میدان میں آ گئے تو (دعاء میں حق تعالیٰ سے) کہنے لگے کہ اے ہمارے پروردگار! ہم پر (یعنی ہمارے قلوب پر) استقلال (غیب سے) نازل فرمائیے اور (مقابلہ کے وقت) ہمارے قدم جمائے رکھئے اور ہم کو اس کافر قوم پر غالب کیجئے (اصل مقصود تو غلبہ تھا، مگر غلبہ کے لیے چونکہ ثابت قدمی کی ضرورت ہے، اس لیے پہلے اس کی دعا کی)۔

پھر طالوت والوں نے جالوت والوں کو اللہ تعالیٰ کے حکم سے شکست دے دی اور داؤد علیہ السلام نے (جو کہ اس وقت طالوت کے لشکر میں تھے، اور اس وقت تک نبوت وغیرہ نہ ملی تھی) جالوت کو قتل کر ڈالا (اور مظفر ومنصور واپس آئے) اور (اس کے بعد) ان کو (یعنی داؤد علیہ السلام کو) اللہ تعالیٰ نے سلطنت اور حکمت (یہاں حکمت سے مراد نبوت ہے) عطاء فرمائی، اور بھی جو منظور ہوا ان کو تعلیم فرمایا (جیسے بغیر آلات کے زرہ بنانا، اور

جانوروں کی بولی سمجھنا، آگے اس واقعہ کی جامع مصلحت بیان فرماتے ہیں) اور اگر یہ بات نہ ہوتی کہ اللہ تعالیٰ بعض آدمیوں کو (جو کہ مفسد ہوں) بعضوں کے ذریعے سے (جو کہ مصلح ہوں، وقتاً فوقتاً) دفع کرتے رہا کرتے ہیں (یعنی اگر مصلحین کو مفسدین پر غالب نہ کرتے رہتے) تو سرزمین (تمام تر) فساد سے پر ہو جاتی (اور کبھی جو اس کا عکس ہو جاتا ہے کہ مفسد لوگ اہل حق پر غالب ہو جاتے ہیں اس میں کچھ اور مصلحتیں ہوتی ہیں، لیکن حق تعالیٰ کا اصلی مقصود اہل حق کو غالب کرنا ہوتا ہے، چنانچہ آخر انجام اسی پر قرار پاتا ہے، جیسا کہ حدیث اور مشاہدہ دونوں اس پر شاہد ہیں) لیکن اللہ تعالیٰ بڑے فضل والے ہیں جہان والوں پر (اس لئے وقتاً فوقتاً اصلاح فرماتے رہتے ہیں)۔

رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا: اس دعا کی ترتیب بڑی پاکیزہ ہے کہ اصل مقصود تو غلبہ تھا، مگر غلبہ کے لیے چونکہ ثابت قدمی کی ضرورت ہے، اس لیے پہلے اس کی دعا کی، اور ثابت قدمی کا مدار ثبات قلبی پر ہے، اس لیے اس سے پہلے ثبات قلب کی دعا کی

* * *

فائدہ: ''جب سامنے ہوئے جالوت کے'' یعنی وہی تین سو تیرہ آدمی اور انہی تین سو تیرہ میں حضرت داؤد کے والد اور ان کے چھ بھائی اور خود حضرت داؤد بھی تھے، حضرت داؤد کو راہ میں تین پتھر ملے اور بولے کہ اٹھا لے ہم کو ہم جالوت کو قتل کریں گے، جب مقابلہ ہوا، جالوت خود باہر نکلا اور کہا میں اکیلا تم سب کو کافی ہوں، میرے سامنے آتے جاؤ، حضرت شموئیل نے حضرت داؤد کے باپ کو بلایا کہ اپنے بیٹے مجھ کو دکھلا، اس نے چھ بیٹے دکھائے جو قدآور تھے، حضرت داؤد کو نہیں دکھایا، ان کا قد چھوٹا تھا اور بکریاں چراتے تھے، پیغمبر نے ان کو بلوایا اور پوچھا کہ تو جالوت کو مارے گا؟ انہوں نے کہا ماروں گا، پھر جالوت کے سامنے گئے اور انہی تینوں پتھروں کو فلاخن میں رکھ کر مارا، جالوت کا صرف ماتھا کھلا تھا اور تمام بدن لوہے میں غرق تھا، تینوں پتھر اس کے ماتھے پر لگے اور پیچھے کو نکل گئے، جالوت کا لشکر بھاگا اور مسلمانوں کو فتح ہوئی، پھر طالوت نے حضرت داؤد سے اپنی بیٹی کا نکاح کر دیا اور طالوت کے بعد یہ بادشاہ ہوئے، اس سے معلوم ہو گیا کہ حکم جہاد ہمیشہ سے چلا آ رہا ہے اور اس میں اللہ کی بڑی رحمت اور احسان ہے، نادان کہتے ہیں کہ لڑائی نبیوں کا کام نہیں۔

تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ؕ وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۲۵۲﴾

یہ آیتیں اللہ کی ہیں، ہم تجھ کو سناتے ہیں ٹھیک ٹھیک، اور تو بیشک ہمارے رسولوں میں ہے

خلاصہ تفسیر: چونکہ قرآن کریم کے بڑے مقاصد میں سے ایک مقصد نبوت محمدیہ کو ثابت کرنا ہے اس لیے اکثر جس جگہ کسی مضمون کے ساتھ مناسب ہونے کی وجہ سے موقع ہوتا ہے وہاں اس کا اعادہ کیا جاتا ہے، چنانچہ اس مقام پر اس قصہ کی صحیح خبر دینا ایسے طور پر کہ نہ آپ نے کہیں پڑھا، نہ سنا، نہ آپ نے بچشم خود دیکھا ایک معجزہ ہے جو آپ کے دعوی نبوت کی صداقت کی صریح دلیل ہے، اس لیے اب رسول اللہ ﷺ کی نبوت پر استدلال فرماتے ہیں۔

یہ (آیتیں جن میں یہ قصہ مذکور ہوا) اللہ تعالیٰ کی آیتیں ہیں جو صحیح صحیح طور ہم تم کو پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں (اس سے ثابت ہوتا ہے کہ) آپ بلاشبہ پیغمبروں میں سے ہیں۔

* * *

فائدہ: یہ قصہ جو بنی اسرائیل کا گزرا، یعنی ہزاروں کا نکلنا اور ان کا دفعۃً مرنا اور جینا اور طالوت کا بادشاہ ہونا، یہ سب اللہ کی آیتیں ہیں جو تجھ کو سنائی جاتی ہیں اور تم بیشک اللہ کے رسولوں میں ہو، یعنی جیسے پہلے پیغمبر ہو چکے ہیں ویسے ہی تم بھی یقیناً رسول ہو کہ ان قصص قرون ماضیہ کو ٹھیک ٹھیک بیان کرتے ہو، حالانکہ نہ کسی کتاب میں آپ نے دیکھا اور نہ کسی آدمی سے سنا۔

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ؕ

یہ سب رسول فضیلت دی ہم نے ان میں بعض کو بعض سے، کوئی تو وہ ہے کہ کلام فرمایا اس سے اللہ نے اور بلند کئے بعضوں کے درجے

وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ

اور دیئے ہم نے عیسیٰ مریم کے بیٹے کو معجزے صریح اور قوت دی اس کو روح القدس یعنی جبرائیل سے۔ اور اگر اللہ چاہتا تو نہ لڑتے

الَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَلٰكِنِ اخْتَلَفُوْا فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ

وہ لوگ جو ہوئے ان پیغمبروں کے پیچھے بعد اسکے کہ پہنچ چکے ان کے پاس صاف حکم لیکن ان میں اختلاف پڑ گیا پھر کوئی تو ان میں ایمان لایا

وَمِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا ۟ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ﴿۲۵۳﴾

اور کوئی کافر ہوا، اور اگر چاہتا اللہ تو وہ باہم نہ لڑتے لیکن اللہ کرتا ہے جو چاہے۔

خلاصہ تفسیر: چونکہ اوپر کی آیت میں ضمناً پیغمبروں کا مجملاً ذکر آ گیا تھا، اس لیے اس آیت میں ان کے احوال وکمالات کی کسی قدر تفصیل مذکور ہے، اور انبیاء کی مناسبت سے ان کی امتوں کی ایک خاص حالت کا بیان اور اس خاص حالت کے واقع ہونے میں جو حکمتیں اور مصلحتیں ہیں ان کی طرف اشارہ فرماتے ہیں۔

یہ حضرات مرسلین (انبیاء، جن کا ذکر ابھی پیچھے وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ میں آیا ہے) ایسے ہیں کہ ہم نے ان میں سے بعضوں کو بعضوں پر فوقیت بخشی ہے (مثلاً) بعض ان میں سے وہ ہیں جن سے اللہ تعالیٰ (بلا واسطہ فرشتہ کے) ہم کلام ہوئے ہیں (مراد موسیٰ علیہ السلام) اور بعضوں کو ان میں بہت سے درجوں میں (اعلیٰ مقام سے) سرفراز کیا، اور ہم نے حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کو کھلے کھلے دلائل (یعنی معجزات) عطا فرمائے، اور ہم نے ان کی تائید روح القدس (یعنی جبرئیل علیہ السلام) سے فرمائی (ہر وقت یہود سے ان کی حفاظت کرنے کے لئے ساتھ رہتے تھے) اور اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا تو (امت کے) جو لوگ ان (پیغمبروں) کے بعد ہوئے ہیں (کبھی دین میں اختلاف کر کے) باہم قتل وقتال نہ کرتے بعد اس کے ان کے پاس (امر حق کے) دلائل (پیغمبروں کی معرفت) پہنچ چکے تھے (جن کا تقاضہ اور مطالبہ دین حق کے قبول پر متفق رہنا تھا) ولیکن (چونکہ اللہ تعالیٰ کو بعض حکمتیں منظور تھیں، اس لئے ان میں دینی مذہبی اتفاق پیدا نہیں کیا) وہ لوگ باہم (دین میں) مختلف ہوئے، سو ان میں کوئی تو ایمان لایا اور کوئی کافر رہا (پھر اس اختلاف میں قتل وقتال کی نوبت بھی پہنچ گئی) اور اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا تو وہ لوگ باہم قتل وقتال نہ کرتے، لیکن اللہ تعالیٰ (اپنی حکمت سے) جو چاہتے ہیں (اپنی قدرت سے) وہی کرتے ہیں۔

احقر کے ذوق میں اس مضمون سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک گونہ تسلی دینا مقصود ہے، یعنی جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت بہت سے دلائل سے ثابت تھی مگر پھر بھی منکرین نہ مانتے تھے تو اس سے آپ کو رنج وکلفت ہونے کا محل تھا، اس لیے اللہ نے یہ بات سنا دی کہ آپ سے پہلے اور بھی پیغمبر مختلف درجوں کے گزرے ہیں، لیکن ایمان کسی کی امت میں عام نہیں ہوا، کسی نے موافقت کی، کسی نے مخالفت، اس لیے کسی کے ایمان نہ لانے سے غمگین نہ ہوں، اور اس میں بھی اللہ تعالیٰ کی حکمتیں ہوتی ہیں، اگرچہ ہر شخص پر منکشف نہ ہوں، مگر اجمالاً اتنا عقیدہ ضروری ہے کہ کوئی حکمت ضرور ہے۔

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ: یہاں یہ اشکال پیش آ سکتا ہے کہ یہ آیت صراحۃً اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ بعض انبیاء علیہم السلام بعض سے افضل ہیں، حالانکہ حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "لا تفضلوا بين أنبياء الله" یعنی انبیاء کے درمیان تفضیل نہ کیا کرو، نیز فرمایا

:"لا تخیرونی علی موسیٰ"، یعنی مجھے موسیٰ پر فضیلت نہ دو، اور فرمایا:"لا اقول ان احداً افضل من یونس بن متّی"، یعنی میں نہیں کہہ سکتا کہ کوئی یونس بن متیٰ سے افضل ہے، ان احادیث میں بعض انبیاء علیہم السلام کی بعض پر فضیلت دینے کی ممانعت وارد ہوئی ہے؟ جواب یہ ہے کہ احادیث کا مطلب یہ ہے کہ دلیل کے بغیر اپنی رائے سے بعض کو بعض پر فضیلت نہ دو، اس لئے کہ کسی نبی کے افضل ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں ان کا مرتبہ بہت زیادہ ہے، اور ظاہر ہے کہ اس کا علم رائے اور قیاس سے حاصل نہیں ہوسکتا، لیکن قرآن وسنت کی کسی دلیل سے اگر بعض انبیاء علیہم السلام کی بعض پر فضیلت معلوم ہوگئی تو اس کے مطابق اعتقاد رکھا جائے گا، رہا آپ کا یہ ارشاد کہ:"لا اقول ان احداً افضل من یونس بن متّی" تو یہ اس وقت سے متعلق ہے جب کہ آپ کو یہ علم نہیں دیا گیا تھا کہ آپ تمام انبیاء علیہم السلام سے افضل ہیں، بعد میں بذریعہ وحی آپ کو یہ بات بتلادی گئی اور صحابہ کرام سے آپ نے اس کا اظہار بھی فرمادیا۔

مِنۡهُمۡ مَّنۡ كَلَّمَ اللّٰهُ: یہاں فرمایا کہ بعض ان پیغمبروں میں سے وہ ہیں جن سے اللہ تعالیٰ (بلاواسطہ فرشتہ کے) ہم کلام ہوئے ہیں، مراد موسیٰ علیہ السلام ہیں، جبکہ سورہ شوریٰ کی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ بشر سے بے حجاب کے کلام نہیں فرماتے: **وما کان لبشر ان یکلمه الله الا وحیا او من وراء حجاب**، جواب یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ہم کلامی اگرچہ فرشتہ کے واسطہ کے بغیر ہو مگر بے حجاب نہ تھی، پس سورہ شوریٰ کی اس آیت سے کچھ تعارض نہیں، البتہ موت کے بعد بے حجاب ہونا بھی شرعاً ممکن ہے، پس وہ آیت دنیا کے اعتبار سے ہے۔

تِلۡكَ الرُّسُلُ فَضَّلۡنَا بَعۡضَهُمۡ عَلٰى بَعۡضٍ: اس میں اس بات پر دلالت ہے کہ بعض اولیاء (اہل اللہ) کو بعض پر محض رائے سے ترجیح نہیں دینی چاہیے، البتہ ان کے واقعات ذکر کردینا جائز ہے، جیسا کہ یہاں پر مذکور ہے: **مِنۡهُمۡ مَّنۡ كَلَّمَ اللّٰهُ** الخ۔

* * *

فائدہ: ۱۔ وَاَيَّدۡنٰهُ بِرُوۡحِ الۡقُدُسِ: یہ پیغمبر جن کا ذکر ہوا، ان میں فضیلت دی ہم نے بعض کو بعض پر، بعضے ان میں ایسے ہیں کہ ان سے بات کی خدا تعالیٰ نے جیسے آدم اور موسیٰ علیہما السلام اور بلند کیا بعضوں کا درجہ، جیسے کوئی ایک قوم کا نبی، کوئی ایک گاؤں کا، کوئی ایک شہر کا، کوئی تمام جہان کا، جیسے محمد ﷺ اور عنایت ہوئے حضرت عیسیٰ کو کھلے معجزے جیسے احیائے موتی اور ابراء اکمہ اور ابرص وغیرہ اور قوت دی ان کو روح پاک یعنی حضرت جبرائیل کو ان کی مدد کو بھیج کر۔

فائدہ: ۲۔ وَلٰـكِنَّ اللّٰهَ يَفۡعَلُ مَا يُرِيۡدُ: جو لوگ ان انبیاء پر ایمان لے آئے اور صاف حکم اور روشن نشانیاں ہمارے پیغمبر ﷺ کے نبی ہونے کی دیکھ سن چکے، اگر خدا چاہتا تو یہ باہم نہ لڑتے اور مخالفت نہ کرتے اور کوئی ان میں مومن اور کوئی کافر نہ ہوتا، لیکن حق تعالیٰ مختار ہے، جو چاہتا ہے کرتا ہے، کوئی فعل اسکا حکمت سے خالی نہیں۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنۡفِقُوۡا مِمَّا رَزَقۡنٰكُمۡ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ يَّاۡتِىَ يَوۡمٌ لَّا بَيۡعٌ فِيۡهِ وَلَا خُلَّةٌ

اے ایمان والو خرچ کرو اس میں سے جو ہم نے تم کو روزی دی پہلے اس دن کے آنے سے کہ جس میں نہ خرید وفروخت ہے اور نہ آشنائی

وَّلَا شَفَاعَةٌ ؕ وَالۡكٰفِرُوۡنَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ ﴿۲۵۴﴾

اور نہ سفارش ۱ اور جو کافر ہیں وہی ہیں ظالم ۲

خلاصہ تفسیر: دو رکوع پیشتر یہ مضمون گزر چکا ہے کہ ابواب البر میں سے دو باتوں کا بیان زیادہ اہتمام سے ہوا، ایک جہاد جس کی تائید اور تقویت کے لیے پیچھے طالوت اور جالوت کا قصہ ذکر فرمایا، دوسرا اللہ کی راہ میں خرچ کرنا، چنانچہ اب اس دوسرے حکم کی تائید اور تقویت کے لیے کچھ اس جگہ، پھر ایک رکوع کے بعد، پھر اس سے آگے اسی کا بیان ہوا ہے، مگر مقصود ہر جگہ جدا ہے اس لیے تکرار کا شبہ نہیں ہوسکتا، چنانچہ یہاں طرز کلام میں غور کرنے سے زیادہ مقصود جلدی خرچ کرنے کی طرف رغبت دلانا ہے، غرض یہ بیان دور تک چلا گیا ہے۔

اے ایمان والو! خرچ کرلو ان چیزوں سے جو ہم نے تم کو دی ہیں، قبل اس کے کہ وہ دن آجائے (یعنی قیامت کا دن) جس میں (کوئی چیز اعمال خیر کا بدل نہ ہو سکے گی، کیونکہ اس میں) نہ تو خرید و فروخت ہوگی (کہ کوئی چیز دے کر اعمال خیر خرید لو) اور نہ (ایسی) دوستی ہوگی (کہ کوئی تم کو دوستی میں آکر اپنے اعمال خیر دے دے) اور نہ (خدا کی اجازت کے بغیر کسی کی) کوئی سفارش ہوگی (جس سے اعمال خیر کی تم کو حاجت ہی نہ رہے) اور کافر ہی لوگ ظلم کرتے ہیں (کہ اعمال اور مال کو بے موقع استعمال کرتے ہیں، اس طرح کہ بدنی و مالی طاعت کو چھوڑ دیتے ہیں اور بدنی و مالی معصیت کو اختیار کرتے ہیں، تم تو ایسے مت بنو)۔

يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ: مطلب آیت کا یہ ہے کہ جو نیک اعمال دنیا میں فوت ہو جائیں گے پھر وہاں ان کا کچھ بھی تدارک انسان کی قدرت سے باہر ہو جائے گا، کیونکہ تدارک کا طریقہ قدرت میں ہونے کے لیے تین باتیں ضروری ہیں: ① ایک یہ کہ اس طریقہ کا وجود تو ہو ② دوسرے وہ عام ہو، یعنی اس کا وجود بکثرت ہو ③ تیسرے اپنے اختیار میں ہو، اور یہاں تدارک کے جتنے طریقے ہیں تینوں باتیں کسی میں جمع نہیں، بیع کا تو وہاں سرے سے وجود ہی نہیں، دوستی کا وجود ہوگا مگر عام نہ ہوگا، شفاعت کسی کے اختیار میں نہیں، پس آخرت میں اپنی کوتاہیوں کا تدارک کرنا ہر طرح تمہارے اختیار سے باہر ہو جائے گا۔

اس آیت میں دوستی اور شفاعت کا مطلق انکار نہیں ہے، چنانچہ آیت: **الاخلاء یومئذ بعضهم لبعض الا المتقین** سے دوستی کا وجود، اور آیت الکرسی میں: **من ذا الذی یشفع عنده الا باذنه** سے سفارش کا وجود خود سمجھ میں آتا ہے، لیکن اس دوستی اور سفارش کے باوجود بھی اعمال صالحہ کی پھر بھی بہت ضرورت ہوگی، اقل درجہ میں ایمان درست ہونا تو لازمی ہے، خلاصہ یہ ہے کہ قیامت کے دن اعمال خیر کر کے ثمرات حاصل کرنا تمہاری قدرت سے باہر ہوگا، جو کرنا ہو تمہیں یہیں دنیا میں کر لینا چاہیے۔

بعض نے کہا ہے کہ یہاں انفاق چھوڑنے پر وعید سنانا مقصود ہے، کیونکہ ان کے نزدیک اس جگہ انفاق سے زکوۃ مراد ہے، اور فرض کو چھوڑنا موجب وعید ہے، اور تارک زکوۃ کو کافر کہنا زجر و تنبیہ کے طور پر ہے۔

❊ ❊ ❊

فائدہ: ۱ اس سورت میں عبادات و معاملات کے متعلق احکام کثیرہ بیان فرمائے، جن سب کی تعمیل نفس کو ناگوار اور بھاری ہے، اور تمام اعمال میں زیادہ دشوار انسان کو جان اور مال کا خرچ کرنا ہوتا ہے اور احکام الٰہی اکثر جو دیکھے جاتے ہیں: ① یا جان کے متعلق ہیں ② یا مال کے اور گناہ میں بندہ کو جان یا مال کی محبت اور رعایت ہی اکثر مبتلا کرتی ہے، گویا ان دونوں کی محبت گناہوں کی جڑ اور اس سے نجات جملہ طاعات کی سہولت کا منشاء ہے، اس لئے ان احکامات کو بیان فرما کر قتال اور انفاق کو بیان فرمانا مناسب ہوا **وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ** (البقرة: ۲۴۴) اول کا بیان تھا تو **مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗٓ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً** (البقرة: ۲۴۵) دوسرے کا ذکر ہے، اسکے بعد قصہ طالوت سے اول کی تاکید ہوئی، تو اب **اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ** الخ سے دوسرے کی تاکید منظور ہے اور چونکہ انفاق مال پر بہت سے امور عبادات و معاملات کے موقوف ہیں تو اس کے بیان میں زیادہ تفصیل اور تاکید سے کام لیا، چنانچہ اب جو رکوع آتے ہیں ان میں اکثروں میں امر ثانی یعنی انفاق مال کا ذکر ہے، خلاصہ معنی یہ ہوا کہ عمل کا وقت ابھی ہے، آخرت میں تو نہ عمل بکتے ہیں، نہ کوئی آشنائی سے دیتا ہے، نہ کوئی سفارش سے چھڑا سکتا ہے جب تک پکڑنے والا نہ چھوڑے۔

فائدہ: ۲ یعنی کفار نے آپ اپنے اوپر ظلم کیا جس کی شامت سے ایسے ہو گئے کہ آخرت میں نہ کسی کی دوستی سے ان کو نفع ہو سکے اور نہ سفارش سے۔

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ۭ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ

اللہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، زندہ ہے سب کا تھامنے والا۔ نہیں پکڑ سکتی اس کو اونگھ اور نہ نیند، اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے

مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۭ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ

ایسا کون ہے جو سفارش کرے اسکے پاس مگر اجازت سے، جانتا ہے جو کچھ خلقت کے روبرو ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے

وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَاۗءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ

اور وہ سب احاطہ نہیں کرسکتے کسی چیز کا اسکی معلومات میں سے مگر جتنا کہ وہی چاہے، گنجائش ہے اس کی کرسی میں تمام آسمانوں اور زمین کو

وَلَا يَـــــُٔـوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ۝255

اور گراں نہیں اس کو تھامنا ان کا، اور وہی ہے سب سے برتر عظمت والا۔

خلاصہ تفسیر: گذشتہ آیت میں بلا اجازت شفاعت کی نفی سے جس طرح قیامت کے دن اعمال خیر پر قدرت نہ ہونا ثابت ہوتا ہے، اسی طرح حق تعالیٰ کی عظمت شان بھی مفہوم ہوتی ہے کہ ان کے روبرو کسی کو دم مارنے کی مجال نہیں ہے، اس مناسبت سے اس آیت میں جسے آیت الکرسی کہا جاتا ہے توحید ذات وصفات کا ذکر فرماتے ہیں تاکہ عظمت شان کی خوب وضاحت وتاکید ہوجائے۔

اللہ تعالیٰ (ایسا ہے کہ) اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، زندہ ہے (جس کو کبھی موت نہیں آسکتی) سنبھالنے والا ہے (تمام عالم کا) نہ اس کو اونگھ دبا سکتی ہے اور نہ نیند (دبا سکتی ہے) اسی کے مملوک ہیں سب، جو کچھ (بھی) آسمانوں میں (موجودات) ہیں، اور جو کچھ زمین میں ہیں، ایسا کون شخص ہے جو اس کے پاس (کسی کی) سفارش کرسکے بدون اس کی اجازت کے، وہ جانتا ہے ان (تمام موجودات) کے تمام حاضر و غائب حالات کو، اور وہ موجودات اس کی معلومات میں سے کسی چیز کو اپنے احاطہ علمی میں نہیں لاسکتے مگر جس قدر (علم دینا وہی) چاہے، اس کی کرسی (اتنی بڑی ہے کہ اس) نے سب آسمانوں اور زمین کو اپنے اندر لے رکھا ہے، اور اللہ تعالیٰ کو ان دونوں (آسمان و زمین) کی حفاظت کچھ گراں نہیں گذرتی، اور وہ عالی شان عظیم الشان ہے۔

وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ: کرسی ایک جسم ہے عرش سے چھوٹا اور آسمانوں سے بڑا، جیسا کہ روح المعانی میں بروایت ابوذرؓ مروی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے کرسی کی نسبت پوچھا، آپ نے فرمایا کہ اے ابوذر! ساتوں آسمان اور زمین کرسی کے سامنے ایسے ہیں جیسے ایک چھلا ایک بڑے میدان میں پڑا ہو، اور عرش کرسی سے اتنا بڑا ہے جیسے وہ میدان اس چھلے سے بڑا ہے، اور ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے اس کی تفسیر پوچھی گئی تو آپ نے کرسی کو بتلا کر فرمایا کہ عرش کی کوئی حد ہی نہیں بتلا سکتا ہے۔

* * *

فائدہ: پہلی آیت سے حق سبحانہ کی عظمت شان بھی مفہوم ہوتی ہے، اب اس کے بعد اس آیت کو جس میں توحید ذات اور اس کا تقدس و جلال غایت عظمت و وضاحت کے ساتھ مذکور ہے نازل فرمائی اور اسی کا لقب "آیۃ الکرسی" ہے، اسی کو حدیث میں "اعظم آیات کتاب اللہ" فرمایا ہے اور بہت فضیلت اور ثواب منقول ہے، اصل بات یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اپنے کلام پاک میں رلا ملا کر تین قسم کے مضمون کو جگہ جگہ بیان فرمایا ہے: ① علم توحید وصفات ② علم احکام ③ علم قصص وحکایات سے بھی توحید وصفات کی تقریر و تائید مقصود ہوتی ہے، یا علم احکام کی تاکید و ضرورت، اور علم توحید و صفات اور علم احکام بھی باہم ایسے مربوط ہیں کہ ایک دوسرے کیلئے علت اور علامت ہے، صفات حق تعالیٰ احکام شرعیہ کے حق میں منشا اور اصل ہیں، تو

احکام شرعیہ صفات کیلئے بمنزلہ ثمرات اور فروع ہیں، تو اب ظاہر ہے کہ علم قصص اور علم احکام سے علم توحید کو ضرور اعانت اور تقویت پہنچے گی اور علم قصص اور علم توحید و صفات سے ضرور علم احکام کی تاکید اور اسکی ضرورت بلکہ حقیقت اور اصلیت ثابت ہوگی اور یہ طریقہ جو تین طریقوں سے مرکب ہے بغایت احسن اور اسہل اور قابل قبول ہے، اول تو اس وجہ سے کہ ایک طریقہ کی پابندی موجب ملال ہوتی ہے اور ایک علم سے دوسرے کی طرف منتقل ہوجانا ایسا ہو جاتا ہے جیسا ایک باغ کی سیر کر کے دوسرے باغ کی سیر کرنے لگے، دوسرے تینوں طریقوں سے مل کر حقیقت منشاء ثمرہ نتیجہ سب ہی معلوم ہوجائے گا اور اس میں تعمیل احکام نہایت شوق و مستعدی اور رغبت و بصیرت کے ساتھ ہوگی، اس لئے طریقہ مذکورہ بغایت عمدہ اور مفید اور قرآن مجید میں کثیر الاستعمال ہے، اسی جگہ دیکھ لیجئے کہ اول احکام کو کس کثرت و تفصیل سے بیان فرمایا، اسکے بعد بقدر مصلحت قصص کو بیان کر کے تمام احکامات مذکورہ کے فوائد و نتائج گویا ہم کو آنکھوں سے دکھلادیے، ان سب کے بعد آیۃ الکرسی جو کہ درباره توحید و صفات ممتاز آیت ہے اسکو بیان فرما کر جملہ احکامات کی جڑ کو دلوں میں ایسا مستحکم فرمادیا کہ اکھاڑے نہ اکھڑے۔

فائدہ: ۲ اس آیت میں توحید ذات اور عظمت صفات حق تعالیٰ کو بیان فرمایا کہ حق تعالیٰ موجود ہے ہمیشہ سے اور کوئی اس کا شریک نہیں، تمام مخلوقات کا موجد وہی ہے، تمام نقصان اور ہر طرح کے تبدل اور فتور سے منزہ ہے، سب چیزوں کا مالک ہے، تمام چیزوں کا کامل علم اور سب پر پوری قدرت اور اعلیٰ درجہ کی عظمت اسکو حاصل ہے، کسی کو نہ اتنا استحقاق نہ اتنی مجال کہ بغیر اسکے حکم کے کسی کی سفارش بھی اس سے کر سکے، کوئی امر ایسا نہیں جس کے کرنے میں اسکو دشواری اور گرانی ہوسکے، تمام چیزوں اور سب کی عقلوں سے برتر ہے، اس کے مقابلہ میں سب حقیر ہیں، اس سے دو مضمون اور خوب ذہن نشین ہوگئے: ① ایک تو حق تعالیٰ کی ربوبیت اور حکومت اور اپنی محکومیت اور عبدیت جس سے حق تعالیٰ کے تمام احکامات مذکورہ اور غیر مذکورہ کا بلا چون و چرا واجب التصدیق اور واجب التعمیل ہونا اور ان کے احکام میں کسی قسم کے شک و شبہ کا معتبر نہ ہونا معلوم ہوگیا۔

② دوسرے عبادات و معاملات کثیرہ مذکورہ سابقہ کو اور ان کے ساتھ تنعیم و تعذیب کو دیکھ کر کسی کو خلجان ہوسکتا تھا کہ ہر ہر فرد کے اس قدر معاملات و عبادات کثیرہ ہیں کہ جن کا مجموعہ اتنا ہوا جاتا ہے کہ ان کا ضبط اور حساب کتاب محال معلوم ہوتا ہے، پھر اسکے مقابلہ میں ثواب و عقاب یہ بھی عقل سے باہر غیر ممکن معلوم ہوتا ہے، سو اس آیت میں حق سبحانہ نے چند صفات مقدسہ اپنی ایسی ذکر فرمائیں کہ وہ تمام خیالات بسہولت دور ہوگئے، یعنی اس کا علم و قدرت ایسا کامل ہے کہ ایک چیز بھی ایسی نہیں جو اس سے باہر ہو، جس کا علم اور قدرت ایسا غیر متناہی اور ہمیشہ یکساں رہنے والا ہو، اس کو تمام جزئیات عالم کے ضبط رکھنے اور ان کا عوض عطا فرمانے میں کیا دقت ہوسکتی ہے۔

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۙ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ

زبردستی نہیں دین کے معاملہ میں، بیشک جدا ہو چکی ہے ہدایت گمراہی سے [1] اب جو کوئی نہ مانے گمراہ کرنے والوں کو اور یقین لاوے اللہ پر

فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۤ لَا انْفِصَامَ لَهَا ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝۲۵۶

تو اس نے پکڑ لیا حلقہ مضبوط، جو ٹوٹنے والا نہیں، اور اللہ سب کچھ سنتا جانتا ہے [2]

خلاصہ تفسیر: پیچھے رسالت کا اثبات تھا، اس کے بعد آیت الکرسی میں توحید حق سبحانہ وتعالیٰ مذکور ہوئی، اور یہ دونوں باتیں اسلام کی اصل الاصول ہیں، ان کے اثبات سے لازمی طور پر دین اسلام کی حقانیت بھی ثابت ہوگئی، اب ان دونوں باتوں کے نتیجہ کے طور پر اسلام کا محل اکراہ (جبر و زبردستی) کا نہ ہونا ارشاد فرماتے ہیں۔

دین (اسلام کے قبول کرنے) میں زبردستی (کا فی نفسہ کوئی موقع) نہیں (کیونکہ) ہدایت یقیناً گمراہی سے ممتاز ہو چکی ہے (یعنی اسلام کی خوبی قطعی دلائل سے ثابت ہو چکی ہے، اسلام ایک کھلی ہوئی چیز ہے، اس میں اکراہ و زبردستی کا موقع ہی کیا ہے، اکراہ تو غیر پسندیدہ چیز پر مجبور کرنے سے ہوتا ہے، اور جب اسلام کی خوبی یقیناً ثابت ہے) تو جو شخص شیطان سے بد اعتقاد ہو اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ خوش اعتقاد (یعنی اسلام قبول کرلے) تو اس

نے بڑا مضبوط حلقہ تھام لیا، جو کسی طرح ٹوٹ نہیں سکتا، اور اللہ تعالیٰ خوب سننے والے ہیں (اقوال ظاہری کے) اور خوب جاننے والے ہیں (احوال باطنی کے، سو اگر کوئی صرف زبان سے اسلام لے آئے گا اور دل میں کفر رکھے گا تو وہ ہم سے نہیں چھپ سکتا، ہم آپ ہی اس سے سمجھیں گے، اس لیے جو اسلام قبول کرے، صدق دل سے کرے)۔

لَاۤ اِكْرَاهَ فِی الدِّیْنِ: اس آیت کو دیکھتے ہوئے بعض لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ دین میں زبردستی نہیں ہے، حالانکہ اسلام میں جہاد اور قتال کی تعلیم اس کے معارض ہے؟ اگر ذرا غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ اعتراض صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ اسلام میں جہاد اور قتال کی تعلیم لوگوں کو قبول ایمان پر مجبور کرنے کے لیے نہیں ہے، ورنہ جزیہ لے کر کفار کو اپنی ذمہ داری میں رکھنے اور ان کی جان ومال وآبرو کی حفاظت کرنے کے اسلامی احکام کیسے جاری ہوتے، بلکہ قتال دفع فساد کے لئے ہے، کیونکہ فساد اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہے، جس کے درپے کافر رہتے ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: وَیَسْعَوْنَ فِی الْاَرْضِ فَسَادًا ؕ وَاللّٰهُ لَا یُحِبُّ الْمُفْسِدِیْنَ یہ لوگ زمین میں فساد کرتے پھرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ فساد کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے جہاد اور قتال کے ذریعے سے ان لوگوں کے فساد کو دور کرنے کا حکم دیا ہے۔

اسلام نے عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور اپاہج وغیرہ کے قتل کو عین میدان جہاد میں بھی سختی سے روکا ہے، کیونکہ وہ فساد کرنے پر قادر نہیں ہوتے، ایسے ہی ان لوگوں کے بھی قتل کرنے کو روکا ہے جو جزیہ ادا کرنے کا وعدہ کر کے قانون کے پابند ہو گئے ہوں، اسلام کے اس طرز عمل سے واضح ہو جاتا ہے کہ وہ جہاد اور قتال سے لوگوں کو ایمان قبول کرنے پر مجبور نہیں کرتا، بلکہ اس سے وہ دنیا میں ظلم وستم کو مٹا کر عدل وانصاف اور امن وامان قائم رکھنا چاہتا ہے، درحقیقت ایمان کے قبول پر جبر واکراہ ممکن بھی نہیں ہے، اس لئے کہ ایمان کا تعلق ظاہری اعضاء سے نہیں ہے، بلکہ قلب کے ساتھ ہے اور جبر واکراہ کا تعلق صرف ظاہری اعضاء سے ہوتا ہے اور جہاد وقتال سے صرف ظاہری اعضاء ہی متاثر ہو سکتے ہیں، لہذا اس کے ذریعہ سے ایمان کے قبول کرنے پر جبر ممکن ہی نہیں ہے، اس سے ثابت ہوا کہ آیات جہاد وقتال آیت لَاۤ اِكْرَاهَ فِی الدِّیْنِ کے معارض نہیں ہیں۔

لَا انْفِصَامَ لَهَا: اس میں دلیل ہے کہ جب انسان کی نسبت اللہ کے ساتھ ہو جاتی ہے تو پھر ختم نہیں ہوتی، یہ اس طرح جیسے کسی مضبوط حلقے کو تھام لے تو گرتا نہیں، اسی طرح یہ نسبت بھی ختم نہیں ہوتی۔

❋ ❋ ❋

فائدہ: ۱۔ قَدْ تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ: جب دلائل توحید بخوبی بیان فرما دیے گئے جس سے کافر کا کوئی عذر باقی نہ رہا، تو اب زور سے کسی کو مسلمان کرنے کی کیا حاجت ہو سکتی ہے؟ عقل والوں کو خود سمجھ لینا چاہیے اور نہ شریعت کا یہ حکم ہے کہ زبردستی کسی کو مسلمان بناؤ: اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰی یَكُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ (یونس:۹۹) خود نص موجود ہے، اور جو جزیہ کو قبول کرے گا، اسکا جان ومال محفوظ ہو جائے گا۔

فائدہ: ۲۔ وَاللّٰهُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ: یعنی جب ہدایت وگمراہی میں تمیز ہو گئی، تو اب جو کوئی گمراہی کو چھوڑ کر ہدایت کو منظور کرے گا، تو اس نے ایسی مضبوط چیز کو پکڑ لیا جس میں ٹوٹنے چھوٹنے کا ڈر نہیں اور حق تعالیٰ اقوال ظاہرہ کو خوب سنتا ہے اور نیت وحالت قلبی کو خوب جانتا ہے، اس سے کسی کی خیانت اور فساد نیت چھپا نہیں رہ سکتا۔

اَللّٰهُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ۙ یُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ ؕ۬ وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اَوْلِیٰٓـُٔهُمُ الطَّاغُوْتُ ۙ

اللہ مددگار ہے ایمان والوں کا، نکالتا ہے ان کو اندھیروں سے روشنی کی طرف، اور جو لوگ کافر ہوئے ان کے رفیق شیطان

یُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَی الظُّلُمٰتِ ؕ اُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ۝۲۵۷ ع

نکالتے ہیں ان کو روشنی سے اندھیروں کی طرف، یہی لوگ ہیں دوزخ میں رہنے والے، وہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے

خلاصہ تفسیر: گذشتہ آیت میں اسلام کے حق ہونے کا اور کفر کے باطل ہونے کا بیان تھا، اس آیت میں ایمان کا سب سے بڑی

نعمت اور کفر کا سب سے بڑی مصیبت ہونا بیان کیا جاتا ہے اور یہ کہ کافروں کی دوستی میں بھی ظلمت ہے۔

اللہ تعالیٰ ساتھی ہے ان لوگوں کا جو ایمان لائے، ان کو (کفر کی) تاریکیوں سے نکال کر یا بچا کر نور (اسلام) کی طرف لاتا ہے، اور جو لوگ کافر ہیں ان کے ساتھی شیاطین ہیں (انس یا جن) وہ ان کو نور (اسلام) سے نکال کر یا بچا کر (کفر کی) تاریکیوں کی طرف لے جاتے ہیں، ایسے لوگ (جو اسلام کو چھوڑ کر کفر اختیار کریں) دوزخ میں رہنے والے ہیں (اور) یہ لوگ اس میں ہمیشہ ہمیشہ کو رہیں گے۔

اس آیت سے عام ولایت کا ثبوت ملتا ہے جو ہر مسلمان کو حاصل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو ایمان کی توفیق دی، اور ایک ولایت خاصہ ہے جو یقین وایمان اور محبت الٰہی کا اعلیٰ درجہ ہے وہ ہر کسی کو حاصل نہیں ہوتی۔

اَلَمۡ تَرَ اِلَى الَّذِىۡ حَآجَّ اِبۡرٰهٖمَ فِىۡ رَبِّهٖۤ اَنۡ اٰتٰٮهُ اللّٰهُ الۡمُلۡكَ‌ۘ اِذۡ قَالَ اِبۡرٰهٖمُ رَبِّىَ

کیا نہ دیکھا تو نے اس شخص کو جس نے جھگڑا کیا ابراہیم سے اسکے رب کی بابت اسی وجہ سے کہ دی تھی اللہ نے اسکو سلطنت، جب کہا ابراہیم نے میرا رب

الَّذِىۡ يُحۡىٖ وَيُمِيۡتُۙ قَالَ اَنَا اُحۡىٖ وَاُمِيۡتُ‌ؕ قَالَ اِبۡرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ يَاۡتِىۡ بِالشَّمۡسِ مِنَ الۡمَشۡرِقِ

وہ ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے، وہ بولا میں بھی جلاتا اور مارتا ہوں، کہا ابراہیم نے کہ بیشک اللہ تو لاتا ہے سورج کو مشرق سے

فَاۡتِ بِهَا مِنَ الۡمَغۡرِبِ فَبُهِتَ الَّذِىۡ كَفَرَ‌ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهۡدِى الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِيۡنَ‌ۚ ﴿۲۵۸﴾

اب تو لے آ اس کو مغرب کی طرف سے تب حیران رہ گیا وہ کافر، اور اللہ سیدھی راہ نہیں دکھاتا بے انصافوں کو

خلاصہ تفسیر: پیچھے اہل ایمان کے نور اور اہل کفر کے ظلمات کا ذکر تھا، اب اس کی تائید اور نظیر میں تین قصے بیان فرماتے ہیں، پہلے قصہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ہدایت کا نور اور ایمان کی قوت عطا ہونا، اور نمرود کا کفر وگمراہی کی ظلمت میں گرفتار ہونا بیان کیا جاتا ہے۔

(پہلا قصہ: اے مخاطب!) کیا تجھ کو اس شخص کا قصہ تحقیق نہیں ہوا (یعنی نمرود کا) جس نے ابراہیم علیہ السلام سے مباحثہ کیا تھا اپنے پروردگار کے (وجود کے) بارے میں (یعنی توبہ توبہ، وہ خدا کے وجود ہی کا منکر تھا) اس وجہ سے کہ خدا تعالیٰ نے اس کو سلطنت دی تھی (یعنی چاہئے تو یہ تھا کہ سلطنت کی نعمت پر احسان مانتا اور ایمان لاتا، اس کے برعکس انکار اور کفر شروع کر دیا، اور یہ مباحثہ اس وقت شروع ہوا تھا) جب ابراہیم علیہ السلام نے (اس کے پوچھنے پر کہ خدا کیسا ہے؟ جواب میں) فرمایا کہ میرا پروردگار ایسا ہے کہ وہ جلاتا ہے اور مارتا ہے (یعنی زندہ کرنا اور مارنا اس کی قدرت میں ہے، وہ کوڑھ مغز جلانے مارنے کا مطلب تو سمجھا نہیں) کہنے لگا کہ (یہ کام تو میں بھی کر سکتا ہوں کہ) میں بھی جلاتا اور مارتا ہوں (چنانچہ جس کو چاہوں قتل کر دوں یہ تو مارنا ہے، اور جس کو چاہوں قتل سے معاف کر دوں یہ جلانا ہے) ابراہیم علیہ السلام نے (جب دیکھا کہ بالکل ہی بھدّی عقل کا ہے کہ قتل کرنے اور قتل سے معاف کرنے کو جلانا اور مارنا سمجھتا ہے، حالانکہ جلانے کی حقیقت یہ ہے کہ بے جان چیز میں جان ڈال دے، نہ یہ کہ زندہ چھوڑ دے، اور مارنے کی حقیقت یہ ہے کہ اس کی جان اپنے اختیار سے نکالے، نہ یہ کہ مار کر گردن ہی الگ کر دے، جب قرائن سے معلوم ہو گیا کہ یہ جلانے اور مارنے کی حقیقت تو سمجھے گا نہیں، اس ضرورت کی وجہ سے دوسرے جواب کی طرف متوجہ ہوئے اور) فرمایا کہ (اچھا) اللہ تعالیٰ آفتاب کو (روزانہ) مشرق سے نکالتا ہے، تو (ایک ہی دن) مغرب سے نکال (کر دکھلا) دے اس پر متحیر رہ گیا وہ کافر (اور کچھ جواب نہ بن پایا، اس کا تقاضا یہ تھا کہ وہ ہدایت کو قبول کرتا، مگر وہ اپنی گمراہی پر جما رہا، اس لئے ہدایت نہ ہوئی) اور اللہ تعالیٰ (کی عادت ہے کہ) ایسے بے جا راہ چلنے والوں کو ہدایت نہیں فرماتے (بلکہ عادت یہ ہے کہ پہلے کوئی حق قبول کرنے کا خود ارادہ کرے پھر وہ ہدایت کر دیتے ہیں اور اختیاری افعال میں اگر ارادہ نہ کیا جائے تو اللہ تعالیٰ اس فعل کو پیدا نہیں کرتے)۔

اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّيَ الَّذِيْ يُحْيٖ: اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دینی ضرورت کے وقت مناظرہ اور مباحثہ کرنا بھی جائز ہے تا کہ حق و باطل میں فرق ظاہر ہو جائے، خاص طور پر کاملین کے لیے یہ عمل تجرید (گوشہ نشینی) کے خلاف بھی نہیں ہے، دین میں مداہنت (اظہار حق سے چشم پوشی) درست نہیں ہے۔

فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِيْ كَفَرَ: بعض لوگوں کو یہ شبہ ہوا کہ نمرود کو دوسری دلیل پر یہ کہنے کی گنجائش تھی کہ اگر خدا موجود ہے تو وہی سورج کو مغرب سے نکال دیتے؟ اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ اس وقت اس کے دل میں بلا اختیار یہ ثابت پڑ گئی تھی کہ خدا ضرور ہے اور مشرق سے سورج کا طلوع ہونا اسی کا فعل ہے اور وہ مغرب سے بھی نکال سکتا ہے اور یہ شخص یعنی ابراہیم علیہ السلام پیغمبر ہے، ان کے کہنے سے ضرور ایسا ہو جائے گا اور اگر ایسا ہو گیا تو عالم میں انقلاب عظیم پیدا ہو جائے گا، کہیں اور لینے کے دینے نہ پڑ جائیں، مثلا لوگ اس معجزے کو دیکھ کر مجھ سے منحرف ہو کر ابراہیم کی راہ پر ہو لیں، ذرا سی حجت میں سلطنت جاتی رہے، یہ جواب تو اس لئے نہ دیا اور دوسرا کوئی جواب تھا ہی نہیں اس لئے حیران رہ گیا۔

وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ: اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ قبول حق کا ارادہ بھی تو اللہ ہی کے پیدا کرنے پر موقوف ہے؟ جواب یہ ہے کہ ارادہ میں بندہ مجبور محض نہیں، حق تعالیٰ اپنے بندہ کو دونوں راستے دکھلا دیتے ہیں، حق کا بھی باطل کا بھی، اور اس کو اختیار دے دیا ہے کہ جس کو چاہے لے لے، اب اپنے اختیار سے وہ جس کا قصد کرے حق تعالیٰ اس راہ پر اس کو چلا دیتا ہے۔

* * *

فائدہ: پہلی آیت میں اہل ایمان و اہل کفر اور ان کے نور ہدایت اور ظلمت کفر کا ذکر تھا، اب اس کی تائید میں چند نظائر بیان فرماتے ہیں، نظیر اول میں نمرود بادشاہ کا ذکر ہے، وہ اپنے آپ کو سلطنت کے غرور سے سجدہ کرواتا تھا، حضرت ابراہیم علیہ السلام اس کے سامنے آئے تو سجدہ نہ کیا، نمرود نے دریافت کیا تو فرمایا کہ میں اپنے رب کے سوا کسی کو سجدہ نہیں کرتا، اس نے کہا رب تو میں ہوں، انہوں نے جواب دیا کہ میں حاکم کو رب نہیں کہتا، رب وہ ہے جو جلاتا ہے اور مارتا ہے، نمرود نے دو قیدی منگا کر بے قصور کو مار ڈالا اور قصور وار کو چھوڑ دیا اور کہا کہ دیکھا میں جس کو چاہوں مارتا ہوں جس کو چاہوں نہیں مارتا، اس پر حضرت ابراہیم نے آفتاب کی دلیل پیش فرما کر اس مغرور احمق کو لاجواب کیا اور اس کو ہدایت نہ ہوئی یعنی لاجواب ہو کر بھی ارشاد ابراہیم علیہ السلام پر ایمان نہ لایا، یا یوں کہو کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دوسری بات کا کچھ جواب نہ دے سکا حالانکہ جیسا جواب پہلے ارشاد کا دیا تھا ویسا جواب دینے کی یہاں بھی گنجائش تھی۔

اَوْ كَالَّذِيْ مَرَّ عَلٰي قَرْيَةٍ وَّهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰي عُرُوْشِهَا ۚ قَالَ اَنّٰي يُحْيٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ

یا نہ دیکھا تو نے اس شخص کو کہ گزرا وہ ایک شہر پر اور وہ گرا پڑا تھا اپنی چھتوں پر، بولا کیونکر زندہ کرے گا اس کو اللہ مر گئے پیچھے

فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ۭ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ۭ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ۭ

پھر مردہ رکھا اس شخص کو اللہ نے سو برس پھر اٹھایا اس کو، کہا تو کتنی دیر یہاں رہا، بولا میں رہا ایک دن یا ایک دن سے کچھ کم،

قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ اِلٰي طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ ۚ وَانْظُرْ اِلٰي حِمَارِكَ

کہا نہیں تو رہا سو برس اب دیکھ اپنا کھانا اور پینا سڑ نہیں گیا، اور دیکھ اپنے گدھے کو

وَلِنَجْعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا ۭ

اور ہم نے تجھ کو نمونہ بنانا چاہا لوگوں کے واسطے اور دیکھ ہڈیوں کی طرف کہ ہم ان کو کس طرح ابھار کر جوڑ دیتے ہیں پھر ان پر پہناتے ہیں گوشت،

فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗ ۙ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۵۹﴾

پھر جب اس پر ظاہر ہوا یہ حال تو کہہ اٹھا کہ مجھ کو معلوم ہے کہ بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

خلاصہ تفسیر: (دوسرا قصہ:) کیا تم کو اس طرح کا قصہ بھی معلوم ہے، جیسے ایک شخص تھا کہ (چلتے چلتے) ایک بستی پر ایسی حالت میں اس کا گذر ہوا کہ اس کے مکانات اپنی چھتوں پر گر گئے تھے (یعنی پہلے چھتیں گریں، پھر ان پر دیواریں گر گئیں، مراد یہ ہے کہ کسی حادثہ سے وہ بستی ویران ہوگئی تھی، اور سب آدمی مر مرا گئے، وہ شخص یہ حالت دیکھ کر حیرت سے) کہنے لگا کہ (معلوم نہیں) اللہ تعالیٰ اس بستی کو (یعنی اس کے مردوں کو) اس کے مرنے کے بعد کس کیفیت سے (قیامت میں) زندہ کریں گے (یہ تو یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ میں مردوں کو ضرور زندہ کریں گے، مگر اس وقت زندہ کرنے کا جو خیال غالب ہوا تو اس کے عجیب ہونے کی وجہ سے ایک حیرت سی دل پر غالب ہوگئی، اور چونکہ خدا تعالیٰ ایک کام کو کئی طرح کر سکتے ہیں اس لئے طبیعت اس کی متلاشی ہوئی کہ خدا جانے زندہ کرنا کس صورت سے ہوگا؟ اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا کہ اس کا تماشا اس کو دنیا ہی میں دکھلا دیں تاکہ ایک نظیر واقع ہو جانے سے لوگوں کو زیادہ ہدایت ہو) سو (اس لئے) اللہ تعالیٰ نے اس شخص (کی جان قبض کر کے اس کو) سو برس تک مردہ رکھا، پھر (سو برس کے بعد) اس کو زندہ اٹھایا (اور پھر) پوچھا کہ تو کتنی مدت اس حالت میں رہا؟ اس شخص نے جواب دیا کہ ایک دن رہا ہوں گا، یا ایک دن سے بھی کم (کنایہ ہے کم مدت سے) اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ نہیں، بلکہ تو (اس حالت میں) سو برس رہا ہے (اور اگر اپنے بدن کے اندر تغیر نہ ہونے سے تعجب ہو) تو اپنے کھانے پینے (کی) چیز کو دیکھ لے کہ (ذرا) نہیں سڑی گلی (ایک قدرت تو ہماری یہ ہے) اور (دوسری قدرت دیکھنے کے واسطے) اپنے (سواری کے) گدھے کی طرف نظر کر (کہ گل سڑ کر کیا حال ہو گیا ہے، اور ہم عنقریب اس کو تیرے سامنے زندہ کئے دیتے ہیں) اور (ہم نے تجھ کو اس لئے مار کر زندہ کیا ہے) تاکہ ہم تجھ کو (اپنی قدرت کی) ایک نظیر لوگوں کے لئے بنا دیں (کہ اس نظیر سے بھی قیامت کے روز زندہ ہونے پر استدلال کر سکیں) اور (اب اس گدھے کی) ہڈیوں کی طرف نظر کر کہ ہم ان کو کس طرح ترکیب دیئے دیتے ہیں، پھر ان پر گوشت چڑھا دیتے ہیں (پھر اس میں جان ڈال دیتے ہیں، غرض یہ سب امور یوں ہی کر دیئے گئے) پھر جب یہ سب کیفیت اس شخص کو (مشاہدہ سے) واضح ہوگئی تو (بے اختیار جوش میں آ کر) کہہ اٹھا کہ میں (دل سے) یقین رکھتا ہوں کہ بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پوری قدرت رکھتے ہیں۔

قَالَ اَنّٰى يُحْيٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا: روح المعانی میں حضرت علیؓ و ابن عباسؓ وغیرہ سے نقل کیا ہے کہ یہ شخص حضرت عزیر علیہ السلام ہیں، اسی لئے احقر نے تصریح کر دی کہ ان کو قیامت میں زندہ ہونے کا یقین تھا اور اس حیرت کی وجہ بھی ظاہر کر دی کہ چونکہ یہ عجیب بات تھی، اس کی خاص کیفیت وہ معین نہ کر سکے۔

فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ: اس مجموعی کیفیت سے ان کی حیرت کا جواب دینا اس کی وجہ احقر کے ذوق میں یہ ہے کہ قیامت میں زندہ ہونا چند وجوہ سے محل حیرت ہے: ① خود انہیں زندہ کرنا، چنانچہ یہ بات خود ان کو زندہ کر کے اور ان کے گدھے میں جان ڈال کر بتلا دی گئی۔

② طویل مدت کے بعد زندہ کرنا، اسے ثابت کرنے کے لیے انہیں سو برس تک مردہ رکھا۔

③ خاص کیفیت سے زندہ کرنا، چنانچہ گدھا ان کے سامنے زندہ کر کے دکھا دیا۔

④ طویل مدت تک روح کا باقی رکھنا، اس کا نمونہ کھانے اور پینے کی چیزوں کا باقی رکھنے اور خود ان کے بدن کا باقی رکھنے سے دکھلا دیا جو روح کے باقی ہونے پر دلالت کرتا ہے، حالانکہ بدن، کھانا پینا عناصر سے مرکب ہونے کی وجہ سے تغیر اور فساد کے زیادہ قابل ہیں بہ نسبت روح کے۔

⑤ زندہ کیے جانے کے بعد برزخ میں رہنے کی مدت معلوم نہ ہونا، اس بات کے لیے خود ان کا یہ سمجھنا کہ میں ایک دن یا دو دن رہا ہوں دلیل ہو گیا کہ اسی طرح اہل محشر بھی زمانہ دراز کو بہت کم سمجھیں گے اور کہیں گے کہ ہم تو مرنے کے بعد بہت جلدی زندہ ہو گئے۔

رہی یہ بات کہ جب دوسروں نے دیکھا نہیں تو یہ واقعہ لوگوں کے لیے نمونہ قدرت کس طرح ہوگیا؟ وجہ اس کی یہ ہے کہ خارجی قرائن کی وجہ سے لوگوں کو ان کے بیان کے سچ بات ہونے کا یقین علم بدیہی کے طور پر ہوگیا تھا، جیسا کہ خود ان کو ایسے ہی قرائن کی وجہ سے نیز طویل مدت تک اپنا مردہ رہنا معلوم ہوگیا تھا۔

قَالَ اَعۡلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ: آخر میں جو کہا کہ میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کا یقین رکھتا ہوں، یہ ایک طبعی واضطراری حالت ہے کہ نئی بات کو دیکھ کر اقرار وقدرت کو تازہ کیا جاتا ہے، چنانچہ ہمارے محاورات میں بھی ''سبحان اللہ'' وغیرہ ایسے ایسے موقع پر کہہ اٹھتے ہیں، حالانکہ اس کا پہلے سے عقیدہ ہوتا ہے۔

* * *

فائدہ: ۱۔ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ: وہ شخص حضرت عزیر علیہ السلام پیغمبر تھے اور تمام تورات ان کو یاد تھی، بخت نصر کافر بادشاہ تھا، اس نے بیت المقدس کو ویران کیا اور بنی اسرائیل سے بہت لوگوں کو قید کر کے لے گیا، ان میں حضرت عزیر علیہ السلام بھی تھے، جب قید سے چھوٹ آئے تب حضرت عزیر نے راہ میں ایک شہر دیکھا ویران، اس کی عمارت گری ہوئی دیکھ کر اپنے جی میں کہا کہ یہاں کے ساکن سب مر گئے، کیونکر حق تعالیٰ ان کو جلاوے اور یہ شہر پھر آباد ہو، اسی جگہ ان کی روح قبض ہوئی اور ان کی سواری کا گدھا بھی مر گیا، سو برس تک اسی حال میں رہے اور کسی نے نہ ان کو وہاں آکر دیکھا، نہ ان کی خبر ہوئی، اس مدت میں بخت نصر بھی مر گیا اور کسی بادشاہ نے اس مدت میں بیت المقدس کو آباد کیا اور اس شہر کو بھی خوب آباد کیا، پھر سو برس کے بعد حضرت عزیر زندہ کئے گئے، ان کا کھانا اور پینا اسی طرح پاس دھرا ہوا تھا، ان کا گدھا جو مر چکا تھا اور اس کی بوسیدہ ہڈیاں اپنی حالت پر دھری تھیں، وہ انکے روبرو زندہ کیا گیا اور اس سو برس میں بنی اسرائیل قید سے خلاص ہوکر شہر میں آباد بھی ہو چکے تھے، حضرت عزیر نے زندہ ہوکر آباد ہی دیکھا۔

فائدہ: ۲۔ قَالَ لَبِثۡتُ يَوۡمًا اَوۡ بَعۡضَ يَوۡمٍ: جب حضرت عزیر مرے تھے اس وقت کچھ دن چڑھا تھا اور جب زندہ ہوئے تو ابھی شام نہ ہوئی تھی، تو یہ سمجھے کہ اگر میں یہاں کل آیا تھا تو ایک دن ہوا اور اگر آج ہی آیا تھا تو دن سے بھی کم رہا۔

فائدہ: ۳۔ كَيۡفَ نُنۡشِزُهَا ثُمَّ نَكۡسُوۡهَا لَحۡمًا: حضرت عزیر علیہ السلام کے سامنے وہ سب ہڈیاں موافق ترکیب بدن کے جمع کی گئیں، پھر ان پر گوشت پھیلایا گیا اور چمڑا درست ہوا، پھر خدا کی قدرت سے ایکبارگی اس میں جان آئی اور اٹھ کھڑا ہوا اور اپنی بولی بولا۔

فائدہ: ۴۔ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ: حضرت عزیر علیہ السلام نے اس تمام کیفیت کو ملاحظہ کرنے کے بعد فرمایا کہ مجھ کو خوب یقین ہوا کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے، یعنی میں جو جانتا تھا کہ مردہ کو جلانا خدا تعالیٰ کو آسان ہے، سو اب اپنی آنکھ سے دیکھ لیا، یہ مطلب نہیں کہ پہلے یقین میں کچھ کمی تھی، ہاں مشاہدہ نہ ہوا تھا، پھر حضرت عزیر یہاں سے اٹھ کر بیت المقدس میں پہنچے، کسی نے ان کو نہ پہچانا، کیونکہ یہ تو جوان رہے اور ان کے آگے کے بچے بوڑھے ہوگئے، جب انہوں نے تورات حفظ سنائی، تب لوگوں کو ان کا یقین آیا، بخت نصر بنی اسرائیل کی تمام کتابیں جلا گیا تھا جن میں تورات بھی تھی۔

وَاِذۡ قَالَ اِبۡرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِىۡ كَيۡفَ تُحۡىِ الۡمَوۡتٰى ؕ قَالَ اَوَلَمۡ تُؤۡمِنۡ ؕ قَالَ بَلٰى

اور یاد کر جب کہا ابراہیم نے اے پروردگار میرے دکھلا دے مجھ کو کہ کیونکر زندہ کریگا تو مردے، فرمایا کیا تو نے یقین نہیں کیا، کہا کیوں نہیں

وَلٰـكِنۡ لِّيَطۡمَٮِٕنَّ قَلۡبِىۡ ؕ قَالَ فَخُذۡ اَرۡبَعَةً مِّنَ الطَّيۡرِ فَصُرۡهُنَّ اِلَيۡكَ ثُمَّ اجۡعَلۡ

لیکن اس واسطے چاہتا ہوں کہ تسکین ہو جاوے میرے دل کو ۱ فرمایا تو پکڑ لے چار جانور اڑنے والے پھر انکو ہلا لے اپنے ساتھ پھر رکھ دے

عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنۡهُنَّ جُزۡءًا ثُمَّ ادۡعُهُنَّ يَاۡتِيۡنَكَ سَعۡيًا ؕ وَاعۡلَمۡ اَنَّ اللّٰهَ عَزِيۡزٌ حَكِيۡمٌ ۝۲۶۰

ہر پہاڑ پر ان کے بدن کا ایک ایک ٹکڑا پھر ان کو بلا چلے آویںگے تیرے پاس دوڑتے ۲ اور جان لے کہ بیشک اللہ زبردست حکمت والا ۳

خلاصہ تفسیر: (تیسرا قصہ:) اور اس وقت (کے واقعہ) کو یاد کرو جبکہ ابراہیم علیہ السلام نے (حق تعالیٰ سے) عرض کیا کہ اے میرے پروردگار! مجھ کو (یہ) دکھلا دیجئے کہ آپ مردوں کو (قیامت میں مثلاً) کس کیفیت سے زندہ کریں گے (یعنی زندہ کرنے کا تو یقین ہے، لیکن زندہ کرنے کی عقلاً مختلف صورتیں اور کیفیتیں ہوسکتی ہیں، وہ معلوم نہیں، اس لئے وہ معلوم کرنے کو دل چاہتا ہے، اس سوال سے کسی کم سمجھ آدمی کو اس بات کا شبہ ہوسکتا تھا کہ معاذ اللہ ابراہیم علیہ السلام کو مرنے کے بعد زندہ ہونے پر کامل ایمان ویقین نہیں، چنانچہ حق تعالیٰ نے خود ان سے اس کا سوال کر کے اور ان کا جواب نقل فرما کر اس کو صاف کردیا، حق تعالیٰ کا یہ سوال اس وجہ سے نہ تھا کہ معاذ اللہ ابراہیم علیہ السلام پر ایسا شبہ تھا، چنانچہ ابراہیم علیہ السلام سے اس سوال کے جواب میں اول) ارشاد فرمایا کہ کیا تم (اس پر) یقین نہیں لاتے؛ انہوں نے (جواب میں) عرض کیا کہ یقین کیوں نہ لاتا، لیکن اس غرض سے یہ درخواست کرتا ہوں تاکہ میرے قلب کو (زندہ کرنے کی معین کیفیت اور صورت مشاہدہ کرنے سے) سکون ہوجائے (ذہن دوسرے احتمالات سے چکر میں نہ پڑے) ارشاد ہوا کہ اچھا تو تم چار پرندے لو، پھر ان کو (پال کر) اپنے لئے ہلالو (تاکہ ان کی خوب شناخت ہوجائے) پھر (سب کو ذبح کر کے اور ہڈیوں پروں سمیت ان کا قیمہ سا کر کے اس کے کئی حصے کرو، اور چند پہاڑ اپنی مرضی سے انتخاب کر کے) ہر پہاڑ پر ان میں سے ایک ایک حصہ رکھ دو (اور) پھر ان سب کو بلاؤ (دیکھو) تمہارے پاس (زندہ ہوکر) دوڑے دوڑے چلے آئیں گے، اور خوب یقین رکھو اس بات کا کہ حق تعالیٰ زبردست (قدرت والے) ہیں (سب کچھ کرسکتے ہیں، پھر بھی بعض باتیں نہیں کرتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ) حکمت والے (بھی) ہیں (ہر کام حکمت ومصلحت کے مطابق کرتے ہیں، اس واقعہ کو دکھلا کر اللہ نے قیامت کے دن دوبارہ زندہ کرنے کی کیفیت بتلادی کہ اس طرح پہلے اجزاء جمع ہوکر اجساد تیار ہوں گے، پھر ان میں روح پڑ جائے گی)۔

رَبِّ اَرِنِیْ کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی: آیت متذکرہ بالا کے مضمون میں چند سوالات پیدا ہوتے ہیں:

① اول یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ سوال ہی کیوں پیدا ہوا جبکہ وہ حق تعالیٰ کی قدرت کاملہ پر ایمان لانے میں اس وقت کی ساری دنیا سے زیادہ یقین پر تھے؟ اس کا جواب اس تقریر کے ضمن میں آچکا ہے جو اوپر کی گئی ہے کہ درحقیقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کا سوال کسی شک وشبہ کی بناء پر تھا ہی نہیں، بلکہ سوال کا منشاء صرف یہ تھا کہ حق تعالیٰ قیامت میں مردوں کو زندہ کریں گے، ان کی قدرت کاملہ سے یہ کسی طرح بھی مستبعد یا حیرت انگیز نہیں بلکہ یقینی ہے، لیکن مردہ کو زندہ کرنے کا کام انسان کی طاقت سے باہر ہے، اس نے کبھی کسی مردہ کو زندہ ہوتے ہوئے دیکھا نہیں اور مردہ کو زندہ کرنے کی کیفیات اور صورتیں مختلف ہوسکتی ہیں، انسان کی فطرت ہے کہ جو چیز اس کے مشاہدہ میں نہ ہو اس کی کیفیات کی کھوج لگانے کی فکر میں رہا کرتا ہے، اس میں اس کا خیال مختلف راہوں پر چلتا ہے، جس میں ذہنی انتشار کی تکلیف بھی برداشت کرتا ہے، اس ذہنی انتشار کو رفع کر کے قلب کو سکون مل جانے ہی کا نام اطمینان ہے، اسی کے لئے حضرت خلیل اللہ نے یہ درخواست پیش فرمائی تھی، اسی سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ ایمان اور اطمینان میں کیا فرق ہے، ایمان اس اختیاری یقین کا نام ہے جو انسان کو رسول کے اعتماد پر کسی غیب کی بات کے متعلق حاصل ہوجائے اور اطمینان سکون قلب کا نام ہے بعض اوقات نظروں سے غائب کسی چیز پر یقین کامل تو ہوتا ہے مگر قلب کو سکون اس لئے نہیں ہوتا کہ اس کی کیفیات کا علم نہیں ہوتا، یہ سکون صرف مشاہدہ سے حاصل ہوسکتا ہے، حضرت خلیل اللہ کو بھی حیات بعد الموت پر تو کامل ایمان ویقین تھا سوال صرف کیفیت احیاء کے متعلق تھا۔

② دوسرا سوال یہ ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کا سوال زندہ کرنے کی کیفیت سے متعلق تھا، اصل حیات بعد الموت میں کوئی شک وشبہ نہ تھا تو پھر ارشاد ربانی: اَوَلَمْ تُؤْمِنْ یعنی کیا آپ کو یقین نہیں فرمانے کا کوئی موقع نہیں رہتا؟ جواب یہ ہے کہ جو سوال حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پیش فرمایا کہ اصل واقعہ میں کوئی شک نہیں، لیکن اس سوال کا ایک مفہوم تو یہی ہے کہ زندہ کرنے کی کیفیت دریافت کرنا منظور ہے، انہی الفاظ سوال کا ایک دوسرا مفہوم بھی ہوسکتا ہے جو اصل قدرت میں شبہ یا انکار سے پیدا ہوا کرتا ہے، جیسے آپ کسی بوجھ کے متعلق یہ یقین رکھتے ہیں کہ فلاں آدمی اس کو نہیں اٹھا سکتا اور آپ اس کا عاجز ہونا ظاہر کرنے کے لئے کہیں کہ دیکھیں تم کیسے اس بوجھ کو اٹھاتے ہو، چونکہ حضرت ابراہیم کے سوال کا یہ غلط مفہوم بھی کوئی لے سکتا

تھا؛ اس لئے حق تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس غلط بات سے بری ثابت کرنے کے لئے ہی یہ ارشاد فرمایا: **اَوَلَمْ تُؤْمِنْ** تا کہ حضرت ابراہیم اس کے جواب میں بلیٰ فرما کر افتراء پردازوں کی زد سے نکل جائیں۔

③ تیسرا سوال یہ ہے کہ اس سوال ابراہیمی سے کم از کم اتنا تو معلوم ہوا کہ ان کو حیات بعد الموت پر اطمینان حاصل نہ تھا، حالانکہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا کہ ''اگر عالم غیب سے پردہ اٹھادیا جائے تو میرے یقین واطمینان میں کوئی زیادتی نہ ہوگی کیونکہ مجھے ایمان بالغیب ہی سے اطمینان کامل حاصل ہے'' تو جب بعض امتیوں کو درجہ اطمینان حاصل ہے تو یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اللہ کے خلیل کو اطمینان کا درجہ حاصل نہ ہو؟ اس کے متعلق یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اطمینان کے بھی بہت سے درجات ہیں، ایک وہ اطمینان ہے جو اولیاء اللہ اور صدیقین کو حاصل ہوتا ہے اور ایک اس سے اعلیٰ مقام اطمینان ہے جو عام انبیاء کو حاصل ہوتا ہے اور ایک اس سے بھی مافوق ہے جو خاص خاص کو بصورت مشاہدہ عطا فرمایا جاتا ہے، حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو جو درجہ اطمینان کا حاصل تھا وہ بلاشبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حاصل تھا، بلکہ اس سے اعلیٰ درجہ اطمینان جو مقام نبوت کے ساتھ خاص ہے، اس اطمینان میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور سب امتیوں سے فائق تھے، پھر جس کو وہ طلب فرما رہے ہیں وہ سب سے اعلیٰ مقام اطمینان ہے جو خاص خاص انبیاء کو عطا فرمایا جاتا ہے، جیسے سرور کائنات سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو جنت و دوزخ کا مشاہدہ کرا کر اطمینان خاص بخشا گیا۔

الغرض اس سوال کی وجہ سے یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اطمینان حاصل نہ تھا، یہاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ اطمینان کامل جو (مشاہدہ) سے حاصل ہوا کرتا ہے وہ نہ تھا اسی کے لئے یہ درخواست فرمائی تھی۔

* * *

فائدہ: ۱۔ وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ: خلاصہ یہ ہوا کہ یقین پورا تھا، صرف عین الیقین کے خواستگار تھے جو مشاہدہ پر موقوف ہے۔

فائدہ: ۲۔ ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَأْتِيْنَكَ سَعْيًا: حضرت ابراہیم علیہ السلام حسب ارشاد الٰہی چار جانور لائے، ایک مور، ایک مرغ، ایک کوا، ایک کبوتر اور چاروں کو اپنے ساتھ ہلایا تا کہ پہچان رہے اور بلانے سے آنے لگیں، پھر چاروں کو ذبح کیا، پھر ایک پہاڑ پر چاروں کے سر رکھے، ایک پر پر رکھے، ایک پر سب کے دھڑ رکھے، ایک پر پاؤں رکھے، پہلے بیچ میں کھڑے ہوکر ایک کو پکارا، اس کا سر اٹھ کر ہوا میں کھڑا ہوا، پھر دھڑ ملا، پھر پر لگے، پھر پاؤں، وہ دوڑتا چلا آیا، پھر اسی طرح چاروں آگئے۔

فائدہ: ۳۔ وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ: یہاں دو خلجان گزرنے کا قوی احتمال ہے ① اول تو جسم بے جان متفرق الاجزاء کا زندہ ہونا قابل انکار ② دوسرے ان خصوصیات کو کہ وہ پرندے ہوں اور چار بھی ہوں اور چار بھی فلاں فلاں ہوں اور اس طرح انکے اجزاء کو متفرق کرکے بلایا جائے تو زندہ ہوکر دوڑتے ہوئے چلے آئیں گے اسکا کوئی دخل اور ان قیود کا کوئی نفع معلوم نہیں ہوتا، اس لئے اول خلجان کے جواب میں **عزیز** اور دوسرے کے جواب میں **حکیم** فرما کر دونوں شبہوں کا قلع قمع فرما دیا، یعنی اسکو خوب سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ زبردست قدرت والا ہے جو چاہے کرسکتا ہے اور اس کے ہر حکم میں اس قدر حکمتیں ہوتی ہیں کہ جن کا ادراک اور احاطہ اگر ہم کو نہ ہو تو یہ ہمارے نقصان علم کی بات ہے، اسکی حکمت کا انکار ایسے امور سے ہرگز ممکن نہیں، واللہ اعلم۔

ربط: آیۃ الکرسی میں علم وقدرت وغیرہ صفات الٰہی کو ذکر فرمایا، اس کے بعد یہ تین قصے بیان فرمائے کہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہے ہدایت کرسکتا ہے اور جس کو چاہے گمراہ کرسکتا ہے اور مارنا جلانا سب اس کے اختیار میں ہے، اب جہاد اور اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے کی فضیلت اور اسکے متعلق قیود و شرائط بیان فرماتے ہیں، جس کا ذکر کسی قدر گزر بھی چکا ہے، کیونکہ جہاد و انفاق مال میں جو موانع نظر آتے ہیں حق تعالیٰ کے علم وقدرت کے یقین کر لینے کے بعد اور اس کی عجائب قدرت کے حالات معلوم ہونے کے بعد ان کا ازالہ ہوگا ورنہ نقصان تو ان میں ضرور آنا چاہیے۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ

مثال ان لوگوں کی جو خرچ کرتے ہیں اپنے مال اللہ کی راہ میں ایسی ہے کہ جیسے ایک دانہ اس سے اگیں سات بالیں

فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۶۱﴾

ہر بال میں سو سو دانے، اور اللہ بڑھاتا ہے جس کے واسطے چاہے، اور اللہ نہایت بخشش کرنے والا ہے سب کچھ جانتا ہے

خلاصہ تفسیر: پارہ کے شروع میں اہل ایمان کو حکم دیا تھا کہ وقت کو غنیمت سمجھیں اور موت اور قیامت کے آنے سے پیشتر جو کچھ خدا کی راہ میں خرچ کر سکیں اس سے دریغ نہ کریں، اس کے بعد تین قصے ذکر فرمائے، اب پھر اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کا مضمون ہے:

جو لوگ اللہ کی راہ میں (یعنی خیر کے کاموں میں) اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں ان کے خرچ کئے ہوئے مالوں کی حالت (اللہ کے ہاں) ایسی ہے جیسے ایک دانہ کی حالت، جس سے (فرض کرو) سات بالیں جمیں (اور) ہر بالی کے اندر سو دانے ہوں (اسی طرح اللہ تعالیٰ ان کا ثواب سات سو حصہ تک بڑھاتا ہے) اور یہ افزونی اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے (اس کے اخلاص اور مشقت کے بقدر) عطا فرماتا ہے، اور خدا تعالیٰ بڑی وسعت والے ہیں (ان کے یہاں کسی چیز کی کمی نہیں، وہ سب کو یہ فراوانی دے سکتے ہیں، مگر ساتھ ہی) جاننے والے (بھی) ہیں (اس لئے اخلاص نیت وغیرہ کو دیکھ کر عطا فرماتے ہیں)۔

وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ: نیک کام میں خرچ کرنا باعتبار نیت کے تین قسم کا ہے: ① ایک نمائش کے ساتھ، اس کا کچھ ثواب نہیں ② دوسرے ادنیٰ درجہ کے اخلاص کے ساتھ، اس کا ثواب دس حصہ ملتا ہے ③ تیسرے زیادہ اخلاص یعنی ان کے اوسط یا اعلیٰ درجہ کے ساتھ، اس کے لیے اس آیت میں وعدہ ہے دس سے زیادہ سات سو تک علی حسب تفاوت المراتب، اور پیچھے ایک آیت مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ میں سات سو کے وعدہ کے بعد اور زیادہ کا بھی وعدہ کیا گیا ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی اللہ کی راہ میں تھوڑے سے مال کا بھی ثواب بہت ہے جیسا ایک دانہ سے سات سو دانے پیدا ہوں اور اللہ تعالیٰ بڑھائے جس کے واسطے چاہے اور سات سو سے سات ہزار اور اس سے بھی زیادہ کر دے اور اللہ بہت بخشش کرنے والا اور ہر ایک خرچ کرنے والے کی نیت اور اس کے خرچ کی مقدار اور مال کی کیفیت کو خوب جانتا ہے یعنی ہر ایک سے اسکے مناسب معاملہ فرماتا ہے۔

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذًى ۙ

جو لوگ خرچ کرتے ہیں اپنے مال اللہ کی راہ میں پھر خرچ کرنے کے بعد نہ احسان رکھتے ہیں اور نہ ستاتے ہیں

لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۶۲﴾

انہی کے لئے ہے ثواب ان کا اپنے رب کے یہاں، اور نہ ڈر ہے ان پر اور نہ وہ غمگین ہوں گے

خلاصہ تفسیر: (اب اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے کے مقبول ہونے اور اس کی بعض شرائط کا بیان فرماتے ہیں) جو لوگ اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں پھر خرچ کرنے کے بعد نہ تو (جس کو دیا ہے اس پر زبان سے) احسان جتلاتے ہیں، اور نہ (برتاؤ سے اس کو) آزار پہنچاتے ہیں (برتاؤ سے اذیت پہنچانا یہ کہ مثلاً اپنے احسان کی بنا پر اس کے ساتھ تحقیر سے پیش آئیں تو اس سے دوسرے شخص کو تکلیف ہوتی ہے) ان لوگوں کو ان (کے عمل) کا ثواب ملے گا ان کے پروردگار کے پاس (جاکر) اور نہ (قیامت کے دن) ان پر کوئی خطرہ ہوگا اور نہ یہ مغموم ہوں گے۔

* * *

فائدہ: جولوگ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور خرچ کئے پر نہ زبان سے احسان رکھتے ہیں اور نہ ستاتے ہیں طعن سے اور نہ خدمت لینے سے اور نہ تحقیر کرنے سے، انہی کیلئے ہے ثواب کامل اور نہ ڈر ہے ان کو ثواب کم ہونے کا اور نہ غمگین ہوں گے ثواب کے نقصان سے۔

قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى ؕ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ ﴿۲۶۳﴾

جواب دینا نرم اور درگزر کرنا بہتر ہے اس خیرات سے جس کے پیچھے ہو ستانا، اور اللہ بے پرواہ نہایت تحمل والا

خلاصہ تفسیر: (اب ایذا رسانی اور احسان جتانے کی مذمت بیان فرماتے ہیں کہ: ناداری کے وقت جواب میں معقول اور) مناسب بات کہہ دینا اور (اگر سائل بدتمیزی سے غصہ دلائے، یا اصرار سے تنگ کرے تو اس سے) درگذر کرنا (ہزار درجہ) بہتر ہے ایسی خیرات (دینے) سے جس کے بعد آزار پہنچایا جائے، اور اللہ تعالیٰ (خود) غنی ہیں (کسی کے مال کی ان کو حاجت نہیں، جو کوئی خرچ کرتا ہے اپنے واسطے کرتا ہے، پھر اذیت کس بناء پر پہنچائی جائے اور اذیت دینے پر جو فوراً سزا نہیں دیتے، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ) حلیم (بھی) ہیں۔

قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ: ''ناداری'' کی قید اس لیے لگائی کہ استطاعت کے وقت حاجت مند کی اعانت نہ کرنا تو خود برا ہے، اس کو بہتر کیوں کہا جاتا!!! البتہ ناداری کے وقت نرمی سے جواب دے دینا اور سائل کی سختی کو ٹال دینا چونکہ موجب ثواب ہے، اس لیے اس کو ''خیر'' فرمایا گیا، اذیت پہنچانا حرام اور موجب عذاب ہے، احسان جتلانا بھی اسی میں شامل ہے اور چونکہ اس صدقہ میں جو دل آزاری کے ساتھ دیا گیا ہو بظاہر اتنی خیر معلوم ہوتی ہے کہ صدقہ تو پایا گیا لیکن اس خیر کی نفی فرما دی گئی کہ اس میں کچھ بھلائی نہیں۔

* * *

فائدہ: یعنی مانگنے والے کو نرمی سے جواب دینا اور اس کے اصرار اور بدخوئی پر درگزر کرنا بہتر ہے اس خیرات سے کہ بار بار اسکو شرمائے یا احسان رکھے یا طعنہ دے اور اللہ غنی ہے کسی کے مال کی اس کو حاجت نہیں جو صدقہ اس کی راہ میں کرتا ہے اپنے واسطے کرتا ہے اور حلیم ہے کہ ستانے پر عذاب بھیجنے میں جلدی نہیں فرماتا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ۙ كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ

اے ایمان والو مت ضائع کرو اپنی خیرات احسان رکھ کر اور ایذاء دے کر، اس شخص کی طرح جو خرچ کرتا ہے اپنا مال لوگوں کے دکھانے کو

وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ

اور یقین نہیں رکھتا ہے اللہ پر اور قیامت کے دن پر، سو اسکی مثال ایسی ہے جیسے صاف پتھر کہ اس پر پڑی ہے کچھ مٹی پھر برسا اس پر زور کا مینہ

فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ؕ لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۶۴﴾

تو کر چھوڑا اُس کو بالکل صاف، کچھ ہاتھ نہیں لگتا ایسے لوگوں کے ثواب اس چیز کا جو انہوں نے کمایا، اور اللہ نہیں دکھاتا سیدھی راہ کافروں کو۔

خلاصہ تفسیر: اب ایذا رسانی، ریاکاری اور احسان جتا کر خرچ کرنے کے ثواب کا باطل ہونا ایک مثال کے ساتھ بیان فرماتے ہیں، جس سے مقصود ان باتوں سے منع کرنا ہے۔

اے ایمان والو! تم احسان جتلا کر یا ایذاء پہنچا کر اپنی خیرات (کے ثواب بڑھنے) کو برباد مت کرو، جس طرح وہ شخص (خود خیرات کے اصل ثواب ہی کو برباد کر دیتا ہے) جو اپنا مال خرچ کرتا ہے (محض) لوگوں کو دکھلانے کی غرض سے، اور ایمان نہیں رکھتا اللہ پر اور یوم قیامت پر (مراد اس سے منافق ہے ایمان کی نفی کا قرینہ ہونے کی وجہ سے) سو اس شخص کی حالت ایسی ہے جیسے ایک چکنا پتھر (فرض کرو اس پر) جب کچھ مٹی (آ گئی) ہو (اور اس مٹی میں کچھ گھاس پھونس جم آیا ہو) پھر اس پر زور کی بارش پڑ جائے، سو اس کو (جیسا تھا ویسا ہی) بالکل صاف کر دے (اسی طرح منافق کے

ہاتھ سے اللہ کی راہ میں کچھ خرچ ہوگیا، جو ظاہر میں ایک نیک عمل معلوم ہوتا ہے جس میں ثواب کی امید ہوتی ہے،لیکن اس کے نفاق نے اس شخص کو ویسا ہی کورا کا کورا ثواب سے خالی چھوڑ دیا، چنانچہ قیامت میں) ایسے لوگوں کو اپنی کمائی ذرا بھی ہاتھ نہ لگے گی (کیونکہ کمائی سے مراد نیک عمل ہے، اور اس کا ہاتھ لگنا ثواب کا ملنا ہے، اور ثواب ملنے کی شرط ایمان اور اخلاص ہے، اور ان لوگوں میں دونوں نہیں، کیونکہ ریا کار بھی ہیں اور کافر بھی) اور اللہ تعالیٰ کافر لوگوں کو (قیامت کے روز ثواب کے گھر یعنی جنت کا) راستہ نہ بتلائیں گے (کیونکہ کفر کی وجہ سے ان کا کوئی عمل مقبول نہیں ہوا، جس کا ثواب آخرت میں ذخیرہ ہوتا اور وہاں پہنچ کر اس کے صلہ میں جنت میں پہنچائے جاتے)۔

لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى: جس طرح نماز کے لیے دو قسم کی شرائط ہیں: ① ایک شرائط صحت، جیسے وضو اور طہارت ② دوسرے شرائط بقاء جیسے نماز میں کسی سے باتیں نہ کرنا اور کھانے پینے سے پرہیز کرنا، پس اگر وضو ہی نہ کرے تو سرے ہی سے نماز صحیح نہ ہوگی، اور اگر وضو اور طہارت کے بعد نماز شروع کی مگر ایک رکعت یا دو رکعت کے بعد نماز میں کھانا، پینا یا بولنا شروع کر دیا تو اس کی نماز باقی نہ رہی گی، اسی طرح صدقات اور خیرات کے لیے بھی دو قسم کی شرطیں ہیں: ایک شرائط صحت اور دوسری شرائط بقاء، اخلاص شرط صحت ہے، بغیر اخلاص کے صدقہ صحیح ہی نہیں ہوتا، لہٰذا جو صدقہ ریاء اور نفاق کے ساتھ دیا جائے وہ شریعت میں معتبر نہیں، اور من واذی یعنی احسان جتانے اور ایذا رسانی سے پرہیز شرط بقاء ہے، یعنی صدقہ اور خیرات اس وقت تک محفوظ اور باقی رہیں گے جب تک صدقہ دینے کے بعد نہ تو احسان جتایا جائے اور نہ سائل کو کسی قسم کی ایذاء پہنچائی جائے، اگر صدقہ دینے کے بعد احسان جتایا یا ستایا تو وہ صدقہ ضائع اور باطل ہو جاتا ہے، اس لیے کہ یہ دونوں چیزیں صدقہ اور خیرات کے مفسدات میں سے ہیں، جیسے کھانے اور پینے سے نماز باطل ہو جاتی ہے اس طرح احسان اور ایذا رسانی سے صدقہ باطل ہو جاتا ہے، چونکہ جو صدقہ نفاق اور ریاء سے دیا جائے اس کا باطل ہونا تو بالکل ظاہر ہے چنانچہ اس صدقہ کو جو احسان اور ایذا رسانی کی وجہ سے باطل ہوا اس کو اس صدقہ کے ساتھ تشبیہ دی جو کہ ریاء اور نفاق کی وجہ سے باطل ہو، اس لیے کہ ریاء اور نفاق کے ساتھ صدقہ تو ابتداء ہی سے باطل ہے، کیونکہ صحت کی شرط ہی مفقود ہے، احسان اور ایذا رسانی سے قبل فی نفسہ یہ صدقہ اصلا صحیح تھا، لیکن بعد میں احسان جتلانے اور اذیت دینے کی وجہ سے یہ صدقہ باطل ہو گیا کیونکہ بقا کی شرط نہیں پائی گئی اس لیے یہ صدقہ محفوظ اور باقی نہ رہا۔

اس تقریر کے بعد معتزلہ کا یہ شبہ کافور ہو گیا کہ جس طرح کفر اور ارتداد سے تمام اعمال حبط یعنی ضائع ہو جاتے ہیں اسی طرح ہر سیئہ اور ہر ہر معصیت کے ارتکاب سے گزشتہ تمام نیکیاں حبط (ضائع) ہو جاتی ہیں، چنانچہ صدقہ من اور اذی تو اس لیے باطل ہوا کہ صدقہ جو کہ ایک اطاعت تھا اس کی بقاء کی شرط نہیں پائی گئی، لیکن اس سے یہ بھی لازم نہیں آتا کہ مطلقا ہر گناہ کے ارتکاب سے گزشتہ تمام حسنات اور نیکیاں بھی ضائع ہو جائیں، جن آیات اور احادیث سے بظاہر یہ مفہوم ہوتا ہے کہ معاصی اور سیئات سے گزشتہ حسنات اور نیکیاں ضائع ہو جاتی ہیں تو ان کا مطلب یہ نہیں کہ معاصی اور سیئات کے ارتکاب سے گزشتہ طاعات باطل ہو جاتی ہیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ ان کے انوار و برکات جاتے رہتے ہیں، جیسے حدیث میں ہے: "اذا زنی العبد خرج منہ الایمان"، یعنی جب بندہ زنا کرتا ہے تو اس سے ایمان کا نور زائل ہو جاتا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ زنا کرنے سے کافر ہو جاتا ہے۔

* * *

فائدہ: 1. یعنی صدقہ دے کر محتاج کو ستانے اور اس پر احسان رکھنے سے صدقہ کا ثواب جاتا رہتا ہے، یا اوروں کو دکھا کر اس لئے صدقہ دیتا ہے کہ لوگ سخی جانیں، اس طرح کی بھی خیرات کا ثواب کچھ نہیں ہوتا، باقی یہ فرمانا کہ وہ یقین نہیں رکھتا ہے اللہ پر اور قیامت کے دن پر یہ ابطال صدقہ کے لئے قید و شرط نہیں ہیں، کیونکہ صدقہ تو صرف ریا سے ہی باطل ہو سکتا ہے، اگرچہ خرچ کرنیوالا مومن ہی کیوں نہ ہو، مگر اس قید کو صرف اس نفع کی غرض سے بڑھایا کہ یہ معلوم ہو جائے کہ ریا کاری مومن کی شان سے بعید ہے، بلکہ یہ امر منافقین کے مناسب حال ہے۔

فائدہ: 2. اوپر مثال بیان فرمائی تھی خیرات کی کہ ایسی ہے جیسے ایک دانہ بویا اور اس سے سات سو دانے پیدا ہو گئے، اب فرماتے ہیں کہ نیت شرط ہے، اگر کسی نے ریا اور دکھاوے کی نیت سے صدقہ کیا تو اس کی مثال ایسی سمجھو کہ کسی نے دانہ بویا ایسے پتھر پر کہ جس پر تھوڑی سی مٹی نظر آتی تھی، جب مینہ برسا تو بالکل صاف رہ گیا اب اس پر دانہ کیا اُگے گا ایسے ہی صدقات میں ریا کاروں کو کیا ثواب ملے گا۔

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ

اور مثال ان کی جو خرچ کرتے ہیں اپنے مال اللہ کی خوشی حاصل کرنے کو اور اپنے دلوں کو ثابت کر کر ایسی ہے

كَمَثَلِ جَنَّةٍۭ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ ۚ فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ؕ

جیسے ایک باغ ہے بلند زمین پر اس پر پڑا زور کا مینہ تو لایا وہ باغ اپنا پھل دوچند، اور اگر نہ پڑا اس پر مینہ تو پھوار ہی کافی ہے

وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۶۵﴾

اور اللہ تمہارے کاموں کو خوب دیکھتا ہے

خلاصہ تفسیر: باطل یعنی غیر مقبول صدقات کی مثال بیان فرما کر اب مقبول صدقات کی مثال بیان فرماتے ہیں:

اور ان لوگوں کے خرچ کیے ہوئے مال کی حالت جو اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کی غرض سے (جو کہ خاص اس عمل سے ہوگی) اور اس غرض سے کہ اپنے نفسوں (کو اس مشکل عمل کا عادی بنا کر ان) میں پختگی پیدا کریں (تا کہ دوسرے اعمال صالحہ سہولت سے صادر ہوا کریں پس ان لوگوں کے نفقات اور صدقات کی حالت) مثل حالت ایک باغ کے ہے جو کسی ٹیلے پر ہو کہ (اس جگہ کی ہوا لطیف اور بار آور ہوتی ہے اور) اس پر زور کی بارش پڑی ہو پھر وہ (باغ ہوا کی لطافت اور بارش کے سبب اور باغوں سے یا اور دفعوں سے) دونا (چوگنا) پھل لایا ہو، اور اگر ایسے زور کا مینہ نہ پڑے تو ہلکی پھوار (یعنی خفیف بارش) بھی اس کو کافی ہے (کیونکہ زمین اور موقع اس کا اچھا ہے) اور اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں کو خوب دیکھتے ہیں (اس لئے جب وہ اخلاص دیکھتے ہیں ثواب بڑھا دیتے ہیں)۔

ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ: ہر عمل میں اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کا مطلب تو ظاہر ہے، تثبیت کی وضاحت یہ ہے کہ یہ بات تجربہ سے ثابت ہوئی ہے اور اہل سلوک کے برتاؤ میں بھی ہے کہ جس کام میں نفس کو قدرے مشقت ہو اس کے بار بار کرنے سے نفس کے اندر عادت کی وجہ سے ایک ملکہ راسخہ پیدا ہو جاتا ہے، جس کی وجہ سے دوسرے اعمال میں بھی پس و پیش نہیں کرتا، اور نفس کی مزاحمت کی صفت مغلوب ہو جاتی ہے، تو یہاں آیت میں اس کی ترغیب ہے کہ ہر عمل میں یہ نیت بھی کر لینا اچھا ہے تا کہ دوسرے اعمال کے لیے نفس میں آمادگی ہو اور مجاہدہ کا بھی یہی حاصل ہوتا ہے، چنانچہ اس عمل انفاق کا بھی حاصل یہ ہے کہ جب اس سے وہ ملکہ پیدا ہوگا تو اس عمل کو جو کہ رضائے الٰہی کا سبب ہے بار بار کرے گا جس سے اسے ہمیشہ رضائے الٰہی حاصل ہوگی، پس حاصل اس نیت کا یہ ہوگا کہ اس وقت بھی اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہو اور ایسی عادت ہو جائے کہ آئندہ بھی ہمیشہ رضائے الٰہی حاصل کیا کریں، غرض دونوں نیتوں سے مقصود رضائے الٰہی کی طلب ہے، حال کے اعتبار سے بھی اور انجام کے اعتبار سے بھی، خوب سمجھ لو۔

وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ: یعنی اپنے نفس میں پختگی پیدا کریں، اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ اعمال صالحہ سے جس طرح اجر و ثواب مقصود ہوتا ہے اسی طرح نفس کی اصلاح بھی ان سے مقصود ہوتی ہے۔

اَصَابَهَا وَابِلٌ (الیٰ قولہ) فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ: یعنی زور کی بارش پڑی ہو، یا زور کی بارش نہ پڑے بلکہ ہلکی پھوار ہو، اس تشبیہ میں جو دو طرح کی بارش فرض کی گئی ہے اس سے اخلاص کے مراتب کا فرق اور تفاوت بیان کرنا مقصود ہے، چونکہ یہ خرچ کرنا ایمان کے ساتھ ملا ہوا ہے، احسان و ایذا رسانی سے پاک ہے، اخلاص اس میں موجود ہے تو ضرور مقبول ہو کر ثواب بڑھنے کا باعث ہوگا؛ خواہ اخلاص اعلیٰ درجہ کا ہو، یا اوسط درجہ کا یا ادنیٰ درجہ کا، نفس قبول و زیادت ثواب کے لیے کافی ہے، اگرچہ اخلاص کے مراتب کے فرق سے قبولیت کے مراتب میں بھی فرق ہوگا۔

اب اس پورے رکوع کی تمام آیات پر مکرر نظر ڈالئے تو ان سے انفاق فی سبیل اللہ اور صدقہ و خیرات کے اللہ کے نزدیک مقبول ہونے کی چھ شرائط معلوم ہوں گی: ① اول اس مال کا حلال ہونا جو اللہ کی راہ میں خرچ کیا جائے ② دوسرے طریق سنت کے مطابق خرچ کرنا ③ تیسرے صحیح مصرف

میں خرچ کرنا④ چوتھے خیرات دے کر احسان نہ جتلانا⑤ پانچویں ایسا کوئی معاملہ نہ کرنا جس سے ان لوگوں کی تحقیر ہو جن کو یہ مال دیا گیا ہے⑥ چھٹے جو کچھ خرچ کیا جائے اخلاص نیت کے ساتھ خالص اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لئے ہو نام و نمود کے لئے نہ ہو۔

فائدہ: ''زور کے مینہ'' سے مراد بہت مال خرچ کرنا اور ''پھوار'' سے مراد تھوڑا مال خرچ کرنا۔

اور ''دلوں کو ثابت کرنے'' سے مراد یہ ہے کہ ثابت کریں دلوں کو ثواب پانے میں، یعنی ان کو یقین ہے کہ خیرات کا ثواب ضرور ملے گا، سو اگر نیت درست ہے تو بہت خرچ کرنے میں بہت ثواب ملے گا اور تھوڑی خیرات میں بھی فائدہ ہوگا، جیسے خالص زمین پر باغ ہے تو جتنا مینہ برسے گا اتنا ہی باغ کو فائدہ پہنچے گا اور نیت درست نہیں تو جس قدر زیادہ خرچ کرے اتنا ہی مال ضائع ہوگا اور نقصان پہنچے گا، کیونکہ زیادہ مال دینے میں ریا اور دکھاوا بھی زیادہ ہوگا، جیسا پتھر پر دانہ اگے گا تو جتنا زور کا مینہ برسے گا اتنا ہی ضرر زیادہ ہوگا۔

اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ لَهٗ فِيْهَا مِنْ

کیا پسند آتا ہے تم میں سے کسی کو یہ کہ ہووے اس کا ایک باغ کھجور اور انگور کا بہتی نیچے اسکے نہریں، اس کو اس باغ میں اور بھی

كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۙ وَاَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهٗ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَآءُ ۖ فَاَصَابَهَآ اِعْصَارٌ فِيْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ ؕ

سب طرح کا میوہ حاصل ہو، اور آ گیا اس پر بڑھاپا اور اسکی اولاد ہیں ضعیف، تب آ پڑا اس باغ پر ایک بگولا جس میں آگ تھی جس سے وہ باغ جل گیا

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ۝٢٦٦

یوں سمجھاتا ہے تم کو اللہ آیتیں تاکہ تم غور کرو

خلاصہ تفسیر: اس مقام پر تین قسم کے صدقات کا بیان منظور ہے: ① ایک وہ جس میں ایمان و اخلاص کے ساتھ احسان و ایذا سے بچنا بھی موجود ہو، اس کا بیان پیچھے دو آیتوں میں دو مثالوں کے ضمن میں مذکور ہوا: کمثل حبۃ اور کمثل جنۃ بربوۃ ② دوسرے وہ جس میں ایمان واخلاص نہ پائے جائیں، خواہ دونوں نہ ہوں یا فقط ایک نہ ہو، اس کا بیان پیچھے آیت: کالذی ینفق مالہ میں اس مثال کے ساتھ ہوا: کمثل صفوان، ③ تیسرے وہ جس میں احسان و ایذا رسانی سے بچنا نہ پایا جائے اس کا بیان اس آیت میں ایک مثال کے ساتھ ہوتا ہے، چنانچہ اب صدقہ و خیرات میں مذکورہ شرائط کی خلاف ورزی کرنے پر صدقہ کے باطل و مردود ہونے کا بیان بھی ایک مثال کے ذریعے واضح فرماتے ہیں کہ:

بھلا تم میں سے کسی کو یہ بات پسند ہے کہ اس کا ایک باغ ہو کھجوروں کا اور انگوروں کا (یعنی اس میں زیادہ درخت ان دونوں کے ہوں اور) اس (باغ) کے (درختوں کے) نیچے نہریں چلتی ہوں (جس سے وہ خوب سرسبز و شاداب ہوں) اور اس شخص کے یہاں اس باغ میں (علاوہ کھجوروں اور انگوروں کے) اور بھی ہر قسم کے (مناسب) میوے ہوں، اور اس شخص کا بڑھاپا آ گیا ہو (جو کہ زیادہ محتاجگی کا زمانہ ہوتا ہے) اور اس کے اہل و عیال بھی ہوں جن میں (کمانے کی) قوت نہیں (اس صورت میں اہل و عیال سے بھی اس کی توقع خبر گیری کی نہیں ہوگی، بس معاش کا ذریعہ صرف وہی باغ ہوا) سو (ایسی حالت میں یہ قصہ ہو کہ) اس باغ پر ایک بگولہ آئے جس میں آگ (کا مادہ) ہو پھر (اس سے) وہ باغ جل جائے (ظاہر بات ہے کسی کو اپنے لئے یہ بات پسند نہیں آسکتی، پھر اسی کے مشابہ تو یہ بات بھی ہے کہ اول صدقہ دیا، یا کوئی اور نیک کام کیا، جس کے قیامت میں کارآمد ہونے کی امید ہو جو کہ انتہائی درجہ محتاجگی کا وقت ہوگا، اور قبولیت کا زیادہ مدار انہی نیکیوں پر ہوگا، پھر ایسے وقت میں معلوم ہوگا کہ ہمارے صدقات احسان جتلانے یا ایذاء رسانی کی وجہ سے غارت، یا دیگر معاصی کی وجہ سے ہماری طاعات باطل یا بے برکت ہو گئیں، اس وقت کیسی سخت حسرت ہوگی کہ کیسی کیسی آرزوؤں کا خون ہو گیا، پس جب تم اس مثال کے واقعہ کو پسند نہیں کرتے تو طاعات کو باطل کرنا کیسے گوارا کرتے ہو) اللہ تعالیٰ اسی طرح نظائر بیان فرماتے ہیں تمہارے

(سمجھانے کے) لئے تاکہ تم سوچا کرو (اور سوچ کر اس کے موافق عمل کیا کرو)۔

اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ: روح المعانی میں حضرت ابن عباسؓ سے اس آیت کی تفسیر میں ایک بات منقول ہے جس کو حضرت عمرؓ نے بھی پسند فرمایا وہ یہ کہ یہ آیت اپنے مضمون میں تمام طاعات (نیکیوں) کو عام ہے کہ جس نیکی کے بعد آدمی گناہ و نافرمانی میں منہمک ہو جائے تو وہ نیکی خراب ہو جائے گی، اور اس عموم میں نفقات یعنی اللہ کے لیے خرچ کرنا بھی شامل ہے، اس کی تحقیق جیسا کہ پیچھے اجمالا بیان کیا گیا ہے کہ نیک اعمال میں کچھ شرطیں ان کے انوار و برکات باقی رہنے کے لیے بھی ہوا کرتی ہیں، وہ شرط یہ ہے کہ طاعت یعنی نیکی کے بعد عموما سب گناہوں سے پرہیز رکھے، کیونکہ جب نیک عمل کے بعد گناہوں میں مشغول و منہمک ہوتا ہے تو ان کے انوار و برکات سلب ہو جاتے ہیں، جس کا اثر دنیا میں تو یہ ہوتا ہے کہ قلب میں جو حلاوت نیک عمل سے پیدا ہوئی تھی وہ زائل ہو جاتی ہے، اور پھر ایک نیک عمل سے جو دوسری نیکیوں کا سلسلہ چلا کرتا ہے اور ویسے ہی سامان جمع ہونے لگتے ہیں جس کا نام توفیق ہے تو وہ توفیق بند ہو جاتی ہے، بلکہ روزمرہ معمول کی نیکیوں میں بھی ناغہ، سستی اور کمی ہونے لگتی ہے، چنانچہ ان فوت شدہ نیکیوں پر جو ثمرات آخرت میں ملتے وہاں اس سے محروم رہے گا، یہ اثر عالم آخرت میں ہوگا، غرض اس نور و برکت کے سلب ہونے کو بھی کہیں کہیں آیات و احادیث میں حبط وغیرہ سے تعبیر فرمایا گیا ہے، مگر اس سے مراد حبط بمعنی مشہور نہیں کہ خود اس نیک عمل کا بھی ثواب نہ ملے اور وہ بالکل اکارت ہو جائے، اسے خوب سمجھ لو۔

* * *

فائدہ: یہ مثال ان کی ہے جو لوگوں کو دکھانے کو صدقہ خیرات کرتے ہیں، یا خیرات کر کے احسان رکھتے ہیں اور ایذاء پہنچاتے ہیں، یعنی جیسے کسی شخص نے جوانی اور قوت کے وقت باغ تیار کیا تاکہ ضعیفی اور بڑھاپے میں اس سے میوہ کھائے اور ضرورت کے وقت کام آئے، پھر جب بڑھاپا آیا اور میوے کی پوری حاجت ہوئی تب وہ باغ عین حالت احتیاج میں جل گیا، یعنی صدقہ مثل باغ میوہ دار کے ہے کہ اس کا میوہ آخرت میں کام آئے، جب کسی کی نیت بری ہے تو وہ باغ جل گیا، پھر اس کا میوہ جو ثواب ہے کیونکر نصیب ہو، حق سبحانہ، اسی طرح کھول کر سمجھاتا ہے تم کو آیتیں تاکہ غور کرو اور سمجھو۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۠

اے ایمان والو خرچ کرو ستھری چیزیں اپنی کمائی میں سے اور اس چیز میں سے کہ جو ہم نے پیدا کیا تمہارے واسطے زمین سے

وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ ۭ

اور قصد نہ کرو گندی چیز کا اس میں سے کہ اس کو خرچ کرو حالانکہ تم اس کو کبھی نہ لو گے مگر یہ کہ چشم پوشی کر جاؤ

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِىٌّ حَمِيْدٌ ۝

اور جان رکھو کہ اللہ بے پرواہ ہے خوبیوں والا

خلاصہ تفسیر: مال کے خرچ کرنے میں جن باتوں کی رعایت ضروری ہے، ان میں سے بعض تو ذکر ہو چکیں، جیسے ریاکاری، احسان جتلانا، اذیت دینا وغیرہ، ان میں ایک شرط یہ بھی ہے کہ وہ چیز ردی اور خراب نہ ہو، اب اس کو بیان فرماتے ہیں:

اے ایمان والو! (نیک کام میں) خرچ کرو عمدہ چیز کو اپنی کمائی میں سے اور (عمدہ چیز کو) اس میں سے جو کہ ہم نے تمہارے (کام میں لانے کے) لئے زمین سے پیدا کیا اور ردی (ناکارہ) چیز کی طرف نیت مت لے جایا کرو کہ اس میں سے خرچ کر دو، حالانکہ (ویسی ہی چیز اگر کوئی تمہیں تمہارے حق واجب کے عوض یا سوغات میں دینے لگے تو) تم کبھی اس کے لینے والے نہیں، ہاں! مگر چشم پوشی (اور رعایت) کر جاؤ (تو اور بات ہے) اور یہ یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ کسی کے محتاج نہیں (جو ایسی ناکارہ چیزوں سے خوش ہوں) تعریف کے لائق ہیں (یعنی ذات و صفات میں کامل ہیں تو ان کے دربار میں بھی ایسی چیز پیش کرنی چاہیے جو عمدہ اور قابل تعریف ہو)۔

اَنۡفِقُوۡا مِنۡ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبۡتُمۡ: شان نزول سے "طیب" کے معنی عمدہ کے لیے گئے، کیونکہ بعض لوگ خراب چیزیں لے آتے تھے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی تھی، بعض مفسرین نے عموم کا اعتبار کرتے ہوئے لفظ "طیب" کی تفسیر حلال سے کی ہے، کیونکہ پوری عمدہ اسی وقت ہوگی جب حلال بھی ہو، اس بنا پر آیت میں حلال کی بھی تاکید ہوگی، واضح رہے کہ یہ اس شخص کے لیے ہے جس کے پاس عمدہ چیز ہو اور پھر وہ بری اور نکمی چیز خرچ کرے، اور اگر کسی کے پاس اچھی چیز ہو ہی نہیں تو وہ اس ممانعت سے بَری ہے اور اس کی وہ بُری چیز بھی مقبول ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی عند اللہ صدقہ کے مقبول ہونے کی یہ بھی شرط ہے کہ مال حلال کمائی کا ہو، حرام کا مال اور شبہ کا مال نہ ہو اور اچھی سے اچھی چیز اللہ کی راہ میں دے، بری چیز خیرات میں نہ لگائے کہ اگر کوئی ایسی ویسی چیز دے تو جی نہ چاہے لینے کو مگر شرما شرمائی، پر خوشی سے ہرگز نہ لے، اور جان لو کہ اللہ بے پرواہ ہے، تمہارا محتاج نہیں اور خوبیوں والا ہے، اگر بہتر سے بہتر چیز دل کے شوق اور محبت سے دے تو پسند فرماتا ہے۔

اَلشَّيۡطٰنُ يَعِدُكُمُ الۡفَقۡرَ وَيَاۡمُرُكُمۡ بِالۡفَحۡشَآءِ ۚ وَاللّٰهُ يَعِدُكُمۡ مَّغۡفِرَةً مِّنۡهُ وَفَضۡلًا ؕ

شیطان وعدہ دیتا ہے تم کو تنگ دستی کا اور حکم کرتا ہے بےحیائی کا، اور اللہ وعدہ دیتا ہے تم کو اپنی بخشش اور فضل کا

وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيۡمٌ ۖ ۝٢٦٨

اور اللہ بہت کشائش والا ہے سب کچھ جانتا ہے

خلاصہ تفسیر: (اب متنبہ فرماتے ہیں کہ ہم نے جو تم کو خرچ کرنے کی اور اس میں عمدہ مال کی رعایت کرنے کی ترغیب دی ہے، اس میں شیطان گمراہ کیا کرتا ہے، تم اس پر عمل مت کرنا) شیطان تم کو محتاجی سے ڈراتا ہے (دور دراز کے وہموں میں مبتلا کر دیتا ہے کہ اگر خرچ کرو گے، یا اچھا مال خرچ کرو گے تو محتاج ہو جاؤ گے) اور تم کو بری بات (یعنی بخل) کا مشورہ دیتا ہے، اور اللہ تعالیٰ تم سے وعدہ کرتا ہے (خرچ کرنے پر اور اچھی چیز خرچ کرنے پر) اپنی طرف سے گناہ معاف کر دینے کا اور زیادہ دینے کا (یعنی چونکہ نیک جگہ خرچ کرنا طاعت ہے، اور طاعت سے گناہوں کا کفارہ ہو جاتا ہے، لہٰذا اس سے گناہ بھی معاف ہوتے ہیں، اور حق تعالیٰ کسی کو دنیا میں بھی اور آخرت میں تو سبھی کو خرچ کرنے کا عوض بھی زیادہ کر کے دیتے ہیں) اور اللہ تعالیٰ وسعت والے ہیں (وہ سب کچھ دے سکتے ہیں) خوب جاننے والے ہیں (نیت کے موافق ثمرہ دیتے ہیں)۔

اَلشَّيۡطٰنُ يَعِدُكُمُ الۡفَقۡرَ: یہاں شیطان کے ڈرانے سے مراد وہ دور دراز کے وہم ہیں جو نیک کام میں خرچ کرنے کے وقت گنجائش ہونے کے باوجود کبھی کبھی خیال میں آیا کرتے ہیں، اکثر بخیل لوگ ایسے وہم میں مبتلا رہتے ہیں، یہ شیطانی وسوسہ ہے، اس پر عمل کرنے کی ممانعت ہے، کیونکہ جب گنجائش ہے تو بقدر مناسب خرچ کرنے سے محتاجی کا احتمال ہی غلط ہے، پس آیت کا حاصل یہ ہوا کہ ایسے خرچ کرنے میں نقصان تو بالکل نہیں، نفع ہر طرح کا ہے کہ مغفرت بھی ملے اور فضل بھی، پس عقل کا تقاضہ یہی ہے کہ ایسی حالت میں شیطانی وسوسہ کو ہرگز قبول نہ کرے، البتہ اگر گنجائش نہ ہو اور ظاہری اسباب وقرائن سے محتاجی کا قوی اندیشہ ہو تو ایسے شخص کو صدقات وخیرات سے شریعت خود روکتی ہے اور اس کے خرچ نہ کرنے کو بخل بھی نہیں کہہ سکتے۔

* * *

فائدہ: جب کسی کے دل میں خیال آئے کہ اگر خیرات کروں گا تو مفلس رہ جاؤں گا اور حق تعالیٰ کی تاکید سن کر بھی یہی ہمت ہو اور دل چاہے کہ اپنا مال خرچ نہ کرے اور وعدہ الٰہی سے اعراض کر کے وعدہ شیطانی پر طبیعت کو میلان اور اعتماد ہو، اس کو یقین کر لینا چاہیے کہ یہ مضمون شیطان کی طرف سے ہے، یہ نہ کہے کہ "شیطان کی تو ہم نے کبھی صورت بھی نہیں دیکھی، حکم کرنا تو درکنار رہا"، اور اگر یہ خیال آوے کہ صدقہ خیرات سے گناہ بخشے جائیں گے اور مال میں بھی ترقی اور برکت ہوگی تو جان لیوے کہ یہ مضمون اللہ کی طرف سے آیا ہے اور خدا کا شکر کرے اور اللہ کے خزانہ میں کمی نہیں، سب کے ظاہر و باطن نیت عمل کو خوب جانتا ہے۔

يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ؕ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۲۶۹﴾

عنایت کرتا ہے سمجھ جس کسی کو چاہے، اور جس کو سمجھ ملی اس کو بڑی خوبی ملی، اور نصیحت وہی قبول کرتے ہیں جو عقل والے ہیں

خلاصہ تفسیر: (یہ سب مضامین بہت ظاہر ہیں، لیکن ان کو وہی سمجھتا ہے جس کو دین کا فہم ہو اور اللہ تعالیٰ) دین کا فہم جس کو چاہتے ہیں دے دیتے ہیں، اور (سچ تو یہ ہے کہ) جس کو دین کا فہم مل جائے اس کو بڑی خیر کی چیز مل گئی (کیونکہ دنیا کی کوئی نعمت اس کے برابر نافع نہیں) اور نصیحت وہی لوگ قبول کرتے ہیں جو عقل والے ہیں (یعنی جو عقل صحیح رکھتے ہیں)۔

دین کی فہم زیادہ نافع اس وجہ سے ہے کہ اس سے عقائد درست ہوتے ہیں، اعمال کی توفیق ہوتی ہے، اور عقائد واعمال پر آخرت میں نجات وثواب مرتب ہوگا اور دنیا کی کوئی نعمت ثواب ونجات کی برابری نہیں کر سکتی۔

اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ (الی قوله) وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ: اس میں بخل کا علاج علم سے بتایا گیا ہے اور گذشتہ آیت میں بخل کا علاج عمل سے بتایا گیا تھا، شیطان انسان کو اللہ کے راستے میں خرچ کرنے سے منع کرتا ہے اور فقر کا خیال ڈالتا ہے، حالانکہ فقر یہ نہیں کہ مال ودولت نہ ہو، بلکہ علم کا نہ ہونا فقر ہے، کیونکہ جس کو علم وحکمت دی گئی اس نے بڑی خیر والی دولت پائی جو باقی رہنے والی ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی جس کو چاہتا ہے دین کی باتوں میں دانائی اور خیرات کرنے میں سمجھ عنایت کرتا ہے کہ کس نیت سے اور کس مال سے اور کس کو اور کس طرح محتاج کو دینا چاہیے اور جس کو سمجھ عنایت ہوئی اس کو بڑی نعمت اور بڑی خوبی ملی۔

وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُهٗ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿۲۷۰﴾

اور جو خرچ کرو گے تم خیرات یا قبول کرو گے کوئی منت تو بیشک اللہ کو سب معلوم ہے، اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں

خلاصہ تفسیر: گذشتہ آیتوں میں خرچ کرنے کے متعلق جن شرائط کی رعایت کا حکم فرمایا ہے، اب اس رعایت کی تاکید ایک خاص پیرائے میں فرماتے ہیں کہ ہمیں سب خبر رہا کرتی ہے، سو ہر کام کو درستگی کے ساتھ کیا کرو۔

اور تم لوگ جو کسی قسم کا خرچ کرتے ہو، یا کسی طرح کی نذر مانتے ہو، سو حق تعالیٰ کو سب کی یقینا اطلاع ہے، اور بے جا کام کرنے والوں کا (قیامت میں) کوئی ہمراہی (حمایتی) نہ ہوگا۔

وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ: کسی قسم کا خرچ کرنے میں سب خرچ داخل ہو گئے، وہ بھی جن میں مذکورہ شرائط کی رعایت ہو، اور وہ بھی جن میں سب شرائط کی یا بعض کی رعایت نہ ہو، مثلاً نیک کام میں خرچ نہ کیا، یا ریا سے کیا ہو، یا عمدہ مال نہ ہو، یا احسان جتلایا ہو، ایذا رسانی کی ہو، اسی طرح نذر کرنے میں سب نذریں آگئیں، اور اس اطلاع سے مقصود یہ ہے کہ ہم سب کی جزا وسزا دیں گے، اس سے سننے والوں کو مذکورہ شرائط کی پابندی کا شوق ہوگا اور خلاف کرنے سے ڈریں گے۔

* * *

فائدہ: یعنی جو کچھ خیرات کی جائے تھوڑی یا بہت، بھلی نیت سے یا بری نیت سے، چھپا کر یا لوگوں کو دکھا کر، یا منت مانی جائے کسی طرح کی تو بیشک خدا تعالیٰ کو پورا علم ہے سب کا اور جو لوگ انفاق مال اور نذر میں حکم الٰہی کے خلاف کرتے ہیں ان کا کوئی مددگار نہیں، اللہ جو چاہے ان پر عذاب کرے، منت قبول کرنے سے واجب ہو جاتی ہے، اب اگر ادا نہ کی تو گنہگار ہوگا اور نذر اللہ کے سوا کسی کی جائز نہیں، مگر یہ کہے کہ اللہ کے واسطے فلانے شخص کو دونگا، یا اس نذر کا ثواب فلاں کو پہنچے تو کچھ مضائقہ نہیں۔

اِنۡ تُبۡدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِیَ ۚ وَاِنۡ تُخۡفُوۡهَا وَتُؤۡتُوۡهَا الۡفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيۡرٌ لَّکُمۡ ؕ

اگر ظاہر کر کے دو خیرات تو کیا اچھی بات ہے، اور اگر اس کو چھپاؤ اور فقیروں کو پہنچاؤ تو وہ بہتر ہے تمہارے حق میں

وَيُکَفِّرُ عَنۡکُمۡ مِّنۡ سَيِّاٰتِکُمۡ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِيۡرٌ ﴿۲۷۱﴾

اور دور کرے گا کچھ گناہ تمہارے، اور اللہ تمہارے کاموں سے خوب خبردار ہے

خلاصه تفسیر: (اب خرچ کرنے کے متعلق اس بات کی تحقیق ہے کہ اس کو ظاہر کرنا افضل ہے یا چھپانا؟) اگر تم ظاہر کر کے دو صدقات کو تب بھی اچھی بات ہے، اور اگر ان کا اخفاء کرو اور (اخفاء کے ساتھ) فقیروں کو دو تب اخفاء تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے، اور اللہ تعالیٰ (اس کی برکت سے) تمہارے کچھ گناہ بھی دور کر دیں گے، اور اللہ تعالیٰ تمہارے کئے ہوئے کاموں کی خوب خبر رکھتے ہیں۔

وَاِنۡ تُخۡفُوۡهَا وَتُؤۡتُوۡهَا الۡفُقَرَآءَ: حسن بصریؒ کا قول ہے کہ یہ آیت فرض اور نفل سب صدقات کو شامل ہے، اور سب میں اخفاء (چھپانا) ہی افضل ہے، اس میں دینی مصلحت بھی ہے کہ ریاء کاری سے دور رہتا ہے، لینے والا بھی نہیں شرماتا، اور دنیوی مصلحت بھی ہے کہ اپنے مال کی مقدار عام لوگوں پر ظاہر نہیں ہوتی، اور افضل ہونے سے مراد یہ ہے کہ اخفاء (چھپانا) فی نفسہ اپنی ذات کے اعتبار سے تو افضل ہے، لیکن اگر کسی مقام پر کسی عارض کی وجہ سے مثلاً تہمت دور کرنے یا دوسروں کو ترغیب دینے وغیرہ کی غرض سے اظہار کو ترجیح ہو جائے تو یہ فی نفسہ افضلیت کے خلاف نہیں۔

وَيُکَفِّرُ عَنۡکُمۡ مِّنۡ سَيِّاٰتِکُمۡ: کفارہ سیئات یعنی گناہوں کو دور کرنا اخفاء کے ساتھ ہی خاص نہیں، یہاں صرف اس بات پر تنبیہ کرنے کے لئے اخفاء کے ساتھ اس کا ذکر کیا ہے کہ اخفاء میں تمہیں اگر کوئی ظاہری فائدہ نظر نہ آئے تو منقبض نہیں ہونا چاہئے، اس لئے کہ تمہارے گناہ اللہ تعالیٰ معاف کرتا ہے اور یہ تمہارے لئے عظیم فائدہ ہے، اور خلاصہ تفسیر میں جو یہ کہا کہ "کچھ گناہ" تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسی نیکیوں سے صرف صغیرہ گناہ معاف ہوتے ہیں، اور کبیرہ گناہ کی معافی کے دو طریقے ہیں: ① ایک توبہ اپنی تمام شرائط کے ساتھ ② دوسرے اللہ کی فضل و رحمت۔

اِنۡ تُبۡدُوا الصَّدَقٰتِ (الی قوله) وَاِنۡ تُخۡفُوۡهَا وَتُؤۡتُوۡهَا الۡفُقَرَآءَ: اس میں یہ مسئلہ ہے کہ عمل کے ظاہر کرنے اور چھپانے میں اختیار ہے اور ساتھ ہی اخفاء (چھپانے) کا افضل ہونا بھی بیان کیا گیا ہے جبکہ اعلان میں کوئی خاص مصلحت نہ ہو۔

❋ ❋ ❋

فائدہ: اگر لوگوں کے دکھانے کی نیت نہ ہو تو خیرات کرنا لوگوں کے روبرو بھی بہتر ہے تاکہ اوروں کو بھی شوق اور رغبت ہو اور چھپا کر خیرات کرنا بھی بہتر ہے، تاکہ لینے والا نہ شرمائے، خلاصہ یہ کہ اظہار و اخفاء دونوں بہتر ہیں مگر ہر موقع اور مصلحت کا لحاظ ضروری بات ہے۔

لَيۡسَ عَلَيۡكَ هُدٰٮهُمۡ وَلٰـكِنَّ اللّٰهَ يَهۡدِىۡ مَنۡ يَّشَآءُ ؕ وَمَا تُنۡفِقُوۡا مِنۡ خَيۡرٍ فَلِاَنۡفُسِكُمۡ ؕ

تیرا ذمہ نہیں ان کو راہ پر لانا اور لیکن اللہ راہ پر لاوے جس کو چاہے، اور جو کچھ خرچ کرو گے تم مال سو اپنے ہی واسطے

وَمَا تُنۡفِقُوۡنَ اِلَّا ابۡتِغَآءَ وَجۡهِ اللّٰهِ ؕ وَمَا تُنۡفِقُوۡا مِنۡ خَيۡرٍ يُّوَفَّ اِلَيۡكُمۡ وَاَنۡتُمۡ لَا تُظۡلَمُوۡنَ ﴿۲۷۲﴾

جب تک کہ خرچ کرو گے اللہ ہی کی رضا جوئی میں، اور جو کچھ خرچ کرو گے خیرات سو پوری ملے گی تم کو اور تمہارا حق نہ رہے گا

خلاصه تفسیر: اب یہ بات بتاتے ہیں کہ صدقہ خیرات دینے میں کسی مسلمان کی تخصیص نہیں ہے، اگر کافر بھی حاجت مند ہو، اس کے ساتھ احسان کرنے سے دریغ مت کرو، بشرطیکہ کافر اہل اسلام کو نقصان پہنچانے پر آمادہ نہ رہتا ہو۔

(چونکہ بہت سے صحابہ کفار کو اس مصلحت خیرات نہ دیتے تھے کہ شاید اسی تدبیر سے کچھ لوگ مسلمان ہو جائیں اور رسول اللہ ﷺ نے بھی

یہی رائے دی تھی، اس لئے اس آیت میں دونوں طرح کے خطاب کرکے ارشاد فرماتے ہیں کہ اے محمد ﷺ ان (کافروں) کو ہدایت پر لے آنا کچھ آپ کے ذمہ (فرض واجب) نہیں (جس کے لئے اتنی دور دراز اہتمام کئے جائیں) لیکن (یہ تو) خدا تعالیٰ (کا کام ہے) جس کو چاہیں ہدایت پر لے آئیں (آپ کا کام صرف ہدایت کا پہنچا دینا ہے، خواہ کوئی ہدایت پر آئے یا نہ آئے، اور ہدایت کا پہنچا دینا کچھ اس ممانعت پر موقوف نہیں) اور (اے مسلمانو!) جو کچھ تم خرچ کرتے ہو اپنے فائدہ کی غرض سے کرتے ہو، اور (اس فائدہ کا بیان یہ ہے کہ) تم اور کسی غرض سے خرچ نہیں کرتے بجز رضا جوئی ذات پاک حق تعالیٰ کے (جس کا لازم ثواب ملنا ہے، اور یہ ہر حاجت مند کی ضرورت دور کرنے سے حاصل ہوتی ہے، پھر مسلمان فقیر کو خاص کیوں کیا جائے) اور (نیز) جو کچھ مال خرچ کر رہے ہو یہ سب (یعنی اس کا عوض اور ثواب) پورا پورا تم (ہی) کو (آخرت میں) مل جائے گا، اور تمہارے لئے اس میں ذرا کمی نہ کی جائے گی (سو تم کو اپنے عوض سے مطلب رکھنا چاہئے اور عوض ہر حال میں ملے گا، پھر تم کو اس سے کیا بحث کہ ہمارا صدقہ مسلمان ہی کو ملے کافر کو نہ ملے)۔

خلاصہ یہ کہ نیت بھی تمہاری اصل میں اپنے ہی نفع حاصل کرنے کی ہے اور واقع میں بھی حاصل خاص تم ہی کو ہوگا، پھر ان زوائد پر کیوں نظر کی جاتی ہے کہ یہ نفع خاص اسی طریق سے حاصل کیا جائے کہ مسلمان ہی کو صدقہ دیں اور کافر کو نہ دیں، یہاں یہ بات بھی سمجھ لیجئے کہ اس صدقہ سے مراد صدقہ نفلی ہے جس کا ذمی کافر کو بھی دینا جائز ہے زکوٰۃ مراد نہیں ہے، کیونکہ وہ سوائے مسلمان کے کسی دوسرے کو دینا جائز نہیں، جبکہ حربی کافر کو کسی قسم کا صدقہ وغیرہ دینا جائز نہیں، کافر ذمی یعنی غیر حربی کو صرف زکوٰۃ و عشر دینا جائز نہیں اور دوسرے صدقات واجبہ و نفلی دینا سب جائز ہیں اور آیت میں زکوٰۃ داخل نہیں، جاننا چاہیے کہ حدیث میں جو آیا کہ ''تمہارا کھانا خاص متقی کھایا کریں'' تو مراد اس حدیث سے دعوت کا کھانا ہے، اور یہاں آیت میں طعام حاجت (ضرورت مند کو کھلانا) مراد ہے، پس تعارض کا شبہ نہ کیا جائے۔

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ: اس میں اس پر دلالت ہے کہ کسی تعلیم و تبلیغ کے زیادہ درپے نہیں ہونا چاہیے، تدبیر میں بھی بہت زیادہ انہماک اور مبالغہ نہ رکھا جائے (یعنی دعوت و تبلیغ تو جاری رکھنی چاہیے، غم و فکر میں گھلنا نہیں چاہیے)۔

وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ: اس میں دلیل ہے اس پر کہ کسی بھی نیک عمل میں ثواب کی نیت کرنا اخلاص عمل کے خلاف نہیں، جیسا کہ بعض جہلا صوفیہ نے سمجھا ہے، چنانچہ آیت میں دونوں قصد کو جمع فرما دیا ہے۔

* * *

فائدہ: جب آپ نے صحابہ کو مسلمانوں کے سوا اوروں پر صدقہ کرنے سے روکا اور اس میں یہ مصلحت تھی کہ مال ہی کی غرض سے دین حق کی طرف راغب ہوں آگے یہ فرما دیا کہ یہ ثواب جب ہی تک ملے گا کہ اللہ کی خوشی مطلوب ہوگی تو یہ آیت نازل ہوئی اور اس میں عام حکم آ گیا کہ اللہ کی راہ میں جس کو مال دو گے، تم کو اس کا ثواب دیا جائے گا، مسلم غیر مسلم کسی کی تخصیص نہیں، یعنی جس پر صدقہ کرو، اس میں مسلم کی تخصیص نہیں، البتہ صدقہ میں یہ ضرور ہے کہ محض بوجہ اللہ ہو۔

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ ۫ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ

خیرات ان فقیروں کے لئے ہے جو رکے ہوئے ہیں اللہ کی راہ میں چل پھر نہیں سکتے ملک میں، سمجھے ان کو ناواقف مالدار

اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ۚ لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا

ان کے سوال نہ کرنے سے، تو پہچانتا ہے ان کو ان کے چہرہ سے نہیں سوال کرتے لوگوں سے لپٹ کر اور جو کچھ خرچ کرو گے

مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿٢٧٣﴾ ع

کام کی چیز وہ بیشک اللہ کو معلوم ہے۔

خلاصہ تفسیر: گذشتہ آیت میں صدقات میں مؤمن کی تخصیص نہ ہونے کا بیان تھا، اب اصل مستحق کا بیان فرماتے ہیں، یعنی حاجت کے وقت سب کو دینا چاہیے، لیکن اصل حق ان لوگوں کا ہے جن میں خاص صفتیں ہوں، یعنی اپنی طرف سے تو خاص مستحق ہی کو تفتیش کر کے دے، اور یوں بلا تفتیش جس کی حاجت ضرورت پر اطلاع ہو جائے اس کو دے دیا کریں، سو کچھ تعارض نہ رہا۔

(صدقات) اصل حق ان حاجت مندوں کا ہے جو مقید ہو گئے ہوں اللہ کی راہ (یعنی دین کی خدمت) میں (اور اسی خدمت دین میں مقید اور مشغول رہنے سے) وہ لوگ (طلب معاش کے لئے) کہیں ملک میں چلنے پھرنے کا (عادۃ) امکان نہیں رکھتے (اور) ناواقف ان کو مالدار خیال کرتا ہے ان کے سوال سے بچنے کے سبب سے (البتہ) تم ان لوگوں کو ان کے طرز (ہیئت) سے پہچان سکتے ہو (کیونکہ فقر و فاقہ سے چہرے اور بدن میں ایک گونہ اضمحلال ضرور آ جاتا ہے، اور یوں) وہ لوگوں سے لپٹ کر مانگتے نہیں پھرتے (جس سے کوئی ان کو حاجت مند سمجھے، مطلب یہ ہے کہ وہ بالکل مانگتے ہی نہیں، کیونکہ اکثر جو لوگ مانگنے کے عادی ہیں وہ لپٹ کر ہی مانگتے ہیں) اور (ان لوگوں کی خدمت کرنے کو) جو مال خرچ کرو گے بیشک حق تعالیٰ کو اس کی خوب اطلاع ہے (دوسروں کو دینے سے فی نفسہ ان کی خدمت کا ثواب زیادہ ملے گا)۔

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ: اس آیت کے سب سے زیادہ مصداق وہ حضرات ہیں جو دینی علوم کی خدمت و اشاعت میں مشغول ہیں، اس بنا پر سب سے اچھا مصرف طالب علم ٹھہرے، ان پر جو بعض ناتجربہ کاروں کا یہ طعنہ ہے کہ کیا ان سے کمایا نہیں جاتا، تو اس کا جواب قرآن کریم میں دے دیا گیا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ ایک شخص ایسے دو کام بیک وقت نہیں کر سکتا جن میں سے ہر ایک یا دونوں میں پوری مشغولی کی ضرورت ہو، اور جسے علم دین کا کچھ ذوق ہو گا وہ مشاہدہ سے سمجھ سکتا ہے کہ اس میں انتہائی مشغولی و انہماک کی ضرورت ہوتی ہے، اس لیے اس کے ساتھ مال کمانے کا شغل جمع نہیں ہو سکتا، کیونکہ پھر علم دین کی خدمت ناتمام رہ جاتی ہے، چنانچہ اس کی ہزاروں نظائر پیش نظر ہیں، پس دین کی حفاظت کے لیے ایک ایسی جماعت کی ضرورت ہے جو اسی میں منہمک رہیں اور ان کی خدمت کرنا مسلمانوں کے ذمہ فرض ہے۔

فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ: خلاصہ تفسیر کے آخر میں ''فی نفسہ'' کی قید لگانے کی وجہ یہ ہے کہ اصل میں تو زیادہ ثواب اسی میں ہے کہ دین کے خادموں کو دیا جائے، لیکن کسی عارض کی وجہ سے دوسروں کو دینے میں بھی زیادہ ثواب ہونا ممکن ہے، مثلاً دوسروں کو ان سے زیادہ حاجت ہو، یا خادمان دین کی خدمت کرنے والے اور لوگ بھی ہیں اور دوسرا کوئی محتاج ایسا ہے کہ اس کی خبر لینے والا کوئی نہیں، تو جہاں یہ عوارض نہ ہوں وہاں یہ لوگ خدمت کے لیے زیادہ افضل ہیں۔

اَلَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ: اس میں دلیل ہے کہ جن لوگوں کو دینی خدمات میں مشغول ہونے کے سبب طلب روزگار کی فرصت نہیں ملتی، انہیں اسباب معیشت کا ترک کرنا ہی افضل ہے، اگرچہ کسب معاش کا اختیار کرنے میں بھی منافات نہیں۔

يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ: اس میں اس بات کی اصل ہے کہ ایسی کوئی خاص وضع یا ہیئت نہ اختیار کی جائے جس کی وجہ سے عام لوگوں سے ممتاز ہو۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی ایسوں کا دینا بڑا ثواب ہے جو اللہ کی راہ اور اس کے دین کے کام میں مقید ہو کر چلنے پھرنے کھانے کمانے سے رک رہے ہیں اور کسی پر اپنی حاجت ظاہر نہیں کرتے، جیسے حضرت ﷺ کے اصحاب تھے، اہل صفہ نے گھر بار چھوڑ کر حضرت کی صحبت اختیار کی تھی علم دین سیکھنے کو اور مفسدین فتنہ پردازوں پر جہاد کرنے کو، اسی طرح اب بھی جو کوئی قرآن کو حفظ کرے، یا علم دین میں مشغول ہو تو لوگوں پر لازم ہے کہ ان کی مدد کریں، اور ''چہرہ سے ان کو پہچاننا'' اس کا مطلب یہ ہے کہ انکے چہرے زرد اور بدن دبلے ہو رہے ہیں اور آثار جد و جہد ان کی صورت سے نمودار ہیں۔

فائدہ: ۲ علی العموم اور خاص کر ایسے لوگوں پر جن کا ذکر ہوا۔

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ

لوگ خرچ کرتے ہیں اپنے مال اللہ کی راہ میں رات کو اور دن کو چھپا کر اور ظاہر میں تو ان کے لئے ہے ثواب ان کا اپنے رب کے پاس

وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿٢٧٤﴾

وقف منزل

اور نہ ڈر ہے ان پر اور نہ وہ غمگین ہوں گے

خلاصہ تفسیر: (اب یہ بتانا مقصود ہے کہ نیک کام میں خرچ کرنا کسی زمانہ اور کسی حالت کے ساتھ خاص نہیں، جب موقع ہو خرچ کرنا چاہیے، سب مقبول ہے) جو لوگ خرچ کرتے ہیں اپنے مالوں کو رات میں اور دن میں (یعنی اوقات کی تخصیص کے بغیر) پوشیدہ اور آشکارا (یعنی حالات کی تخصیص کے بغیر) سو ان لوگوں کو ان کا ثواب ملے گا (قیامت کے روز) ان کے رب کے پاس (جا کر) اور نہ (اس روز) ان پر کوئی خطرہ (واقع ہونے والا) ہے اور نہ وہ مغموم ہوں گے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جب موقع ہو اسی وقت خرچ کرنا چاہیے، اس عموم سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ پوشیدہ خرچ کرنا اسی وقت افضل ہے جبکہ ظاہر کر کے دینے کی ضرورت نہ ہو، اور اگر مثلاً مجمع عام میں ایک شخص کا بھوک سے دم نکلا جاتا ہے اور ہم اس کو نفع پہنچا سکتے ہیں تو اب وہاں یہ انتظار کرنا کہ جب سارے ہٹ جائیں اس وقت اس کی خبر گیری کریں گے تو یہ غلط ہے، اور اسی مثل کا مصداق ہے کہ ''تا تریاق از عراق آوردہ شود مار گزیدہ مردہ شود''، یعنی عراق سے تریاق جب تک آئے گا اس وقت تک تو سانپ کا ڈسا مر جائے گا۔

وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ: یہ جو کہا گیا کہ ان پر کوئی خطرہ واقع ہونے والا نہیں، اس سے یہ شبہ جاتا رہا کہ قیامت کے روز تو خاص بندے بھی بڑے خوف اور خطرے میں ہوں گے، جواب ظاہر ہے کہ اگر چہ انہیں خود خطرہ ہو مگر جس امر کا خطرہ ہے وہ انہیں پیش نہیں آئے گا۔

فائدہ: یہاں تک خیرات کا بیان اور اس کی فضیلت اور اسکی قیود و شرائط کا مذکور تھا اور چونکہ خیرات کرنے سے ادھر تو معاملات میں سہولت و تسہیل کی عادت ہوتی ہے اور بے مروتی وسخت گیری کی برائی دلنشین ہوتی ہے اور اُدھر یہ ہوتا ہے کہ معاملات و اعمال میں جو گناہ ہو جاتا ہے خیرات سے اس کا کفارہ کر دیا جاتا ہے اور نیز خیرات کرنے سے اخلاق و مروت وخیر اندیشی و نفع رسانی خلق اللہ میں ترقی ہوتی ہے تو ان وجوہ سے ان آیات متعددہ میں اس کا ذکر فرمایا گیا تھا۔

ربط: اب سود لینا چونکہ خیرات کی ضد ہے، وہاں مروت و نفع رسانی تھی تو سود میں محض بے مروتی اور ضرر رسانی اور ظلم ہے، اس لئے خیرات کی فضیلت کے بعد سود کی مذمت اور اس کی ممانعت کا ذکر بہت مناسب ہے، اور جس قدر خیرات میں بھلائی ہے اتنی ہی سود میں برائی ہونی ضروری بات ہے۔

اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ؕ

جو لوگ کھاتے ہیں سود وہ نہیں اٹھیں گے قیامت کو مگر جس طرح اٹھتا ہے وہ شخص کہ جس کے حواس کھو دیئے ہوں شیطان کے چھونے کی وجہ سے

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ؕ فَمَنْ جَآءَهٗ

وقف لازم

انہوں نے کہا کہ سوداگری بھی تو ایسی ہی ہے جیسے سود لینا، حالانکہ اللہ نے حلال کیا ہے سوداگری کو اور حرام کیا ہے سود کو ۱؎ پھر جس کو پہنچی

مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ؕ وَاَمْرُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ ؕ وَمَنْ عَادَ

نصیحت اپنے رب کی طرف سے اور وہ باز آ گیا تو اسکے واسطے ہے جو پہلے ہو چکا، اور معاملہ اسکا اللہ کے حوالہ ہے، اور جو کوئی پھر سود لیوے

فَاُولٰٓئِكَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ۚ هُمۡ فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۲۷۵﴾

تو وہی لوگ ہیں دوزخ والے، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے ۔

خلاصہ تفسیر: جو لوگ سود کھاتے ہیں (یعنی لیتے ہیں) نہیں کھڑے ہوں گے (قیامت میں قبروں سے) مگر جس طرح کھڑا ہوتا ہے ایسا شخص جس کو شیطان نے خبطی بنا دیا ہو لپٹ کر (یعنی حیران مدہوش) یہ سزا اس لئے ہوگی کہ ان (سود خور) لوگوں نے (سود کے حلال ہونے پر استدلال کرنے کے لئے) کہا تھا کہ بیع بھی تو مثل سود کے ہے (کیونکہ سود سے بھی نفع حاصل کرنا مقصود ہوتا ہے اور بیع سے بھی، جب بیع حلال ہے تو سود بھی حلال ہونا چاہیے جو کہ بیع کے مثل ہے) حالانکہ (دونوں میں کھلا فرق ہے کہ) اللہ تعالیٰ نے (جو کہ احکام کے مالک ہیں) بیع کو حلال فرمایا ہے اور سود کو حرام کر دیا ہے (اس سے زیادہ اور کیا فرق ہوگا) پھر جس شخص کو اس کے پروردگار کی طرف سے (اس بارہ میں) نصیحت پہنچی اور وہ (اس سود کے فعل یعنی سود لینے سے بھی اور اس کفر کے قول یعنی سود کو حلال کہنے سے) باز آ گیا (یعنی حرام سمجھنے لگا اور لینا بھی چھوڑ دیا) تو جو کچھ (اس حکم کے آنے سے) پہلے (لینا) ہو چکا ہے وہ اس کا رہا (یعنی ظاہر شرع میں اس کی توبہ قبول ہوگئی، اور پہلے لیا ہوا مال اسی کی ملک ہے) اور (باطنی) معاملہ اس کا (کہ وہ دل سے باز آیا ہے، یا منافقانہ توبہ کر لی ہے، یہ) خدا کے حوالے رہا (اگر دل سے توبہ کی ہوگی عند اللہ نافع ہوگی، ورنہ کالعدم ہوگی، تم کو بدگمانی کا کوئی حق نہیں) اور جو شخص (مذکورہ نصیحت سن کر بھی اسی قول اور اسی فعل کی طرف) پھر عود کرے تو (چونکہ ان کا یہ فعل خود گناہ کبیرہ ہے اس لیے) یہ لوگ دوزخ میں جائیں گے (اور اس وجہ سے کہ ان کا سود کو حلال کہنا کفر ہے، اس لئے) وہ اس (دوزخ) میں ہمیشہ رہیں گے۔

يَقُوۡمُ الَّذِىۡ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيۡطٰنُ مِنَ الۡمَسِّ: سود کے جرم کی مذکورہ سزا کے ساتھ مناسبت یہ ہے کہ سود خوروں کو خبطی بنا کر محشر میں اٹھانا شاید اس کا اظہار ہے کہ سود خور روپے پیسہ کی حرص میں اس قدر مدہوش ہوتا ہے کہ اس کو نہ کسی غریب پر رحم آتا ہے، نہ کسی کی شرم مانع ہوتی ہے، وہ چونکہ اپنی زندگی میں درحقیقت بے ہوش تھا، اس لئے محشر میں بھی اسی حالت میں اٹھایا گیا، یا یہ سزا اس لئے دی گئی کہ دنیا میں اس نے عقلی رنگ میں اپنی بے عقلی کو ظاہر کیا کہ بیع کو مثل سود قرار دیا، اس لئے اس کو بے عقل کر کے اٹھا دیا گیا، اسی طرح یہ فعل بھی خود بے عقلی کی دلیل ہے، کیونکہ جس علم پر عمل نہ ہو گویا وہ علم اور عقل ہی نہیں۔

قرآن سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آخرت میں جنون کی سی حالت ہونا سود لینے اور اسکو حلال سمجھنے کی وجہ سے ہوگی، مگر حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف سود لینے والے کی بھی ایسی ہی حالت ہوگی اگرچہ وہ حلال بھی نہ سمجھتا ہو، قرآن میں جو سود لینے والوں کی حالت کو اس شخص کی حالت سے تشبیہ دی گئی ہے جس کو شیطان نے لپٹ کر خبطی بنا دیا ہو، اس سے معلوم ہوا کہ آسیب کا لپٹ جانا ممکن ہے، جس کی حقیقت یہ ہے کہ بعض جنات جو خبیث ہوتے ہیں وہ آدمی پر مسلط ہو جاتے ہیں جس سے وہ بدحواس ہو جاتا ہے، نیز دیگر آیات سے بھی جنات کا ثبوت ہوتا ہے اور ان کے انگلی لگانے کے اثر سے بچہ کا رونا حدیث سے ثابت ہے، اس لیے آیت میں اس تاویل کی ضرورت نہیں جو بعض لوگوں نے کی ہے کہ یہ تشبیہ اہل عرب کے گمان کے موافق بیان کر دی گئی، اور قرآن میں یہ تو نہیں کہا گیا کہ بدحواسی ہمیشہ آسیب لگنے ہی سے ہوتی ہے، بلکہ آیت سے فقط اتنا معلوم ہوا کہ جنات کے اثر سے بھی بدحواسی ہو جاتی ہے تو اگر کبھی مرض کی وجہ سے بھی بدحواسی ہو جائے تو اس سے ہمیں انکار نہیں ہے، پس اس شبہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ بدحواسی اور جنون امراض کی قسم سے ہے، ہم کہہ سکتے ہیں کہ بیشک مرض کی وجہ سے بھی کبھی ایسا ہوتا ہے، اور آسیب کی وجہ سے بھی ہونا ممکن ہے تو اس میں اشکال کی کوئی وجہ نہیں، پس اس قسم کے آثار کا انکار کرنا نری دہریت اور الحاد ہے، بعض لوگوں کو ایک اور آیت: **وما کان لی علیکم من سلطٰن الا ان دعوتکم** سے شبہ ہوا ہے کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتے کہ وہ صرف برائی کی طرف بلاتے ہیں تو آسیب کا لپٹنا کوئی چیز نہیں ہے، جواب یہ ہے کہ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ شیاطین زور و جبر سے معصیت نہیں کرا سکتے، اس سے اثر کی نفی نہیں ہوتی جس میں یہاں گفتگو ہے، اس آیت

میں صرف معاصی کی بابت حصر کے طور پر کہا گیا ہے کہ شیطان کا گناہ کرانے میں کوئی دخل نہیں سوائے گناہ کی ترغیب دینے کے، اس سے دوسری باتوں کی نفی نہیں ہوتی، البتہ یہ اب تک ثابت نہیں کہ مُردوں کی روحیں آ کر ستاتی ہوں، بلکہ بظاہر یہ بات اس لیے بھی غلط معلوم ہوتی ہے کہ اگر وہ نیک روح ہے تو جنت کی آسائش چھوڑ کر اس کو یہاں ایذا رسانی کے لیے آنے کی کیا ضرورت؟ اور اگر وہ روح کسی برے انسان کی ہے تو اس کو عذاب سے کب مہلت!!!

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی ربوا کھانے والے قیامت کو قبروں سے ایسے اٹھیں گے جیسے آسیب زدہ اور مجنون اور یہ حالت اس واسطے ہوگی کہ انہوں نے حلال وحرام کو یکساں کر دیا اور صرف اس وجہ سے کہ دونوں میں نفع مقصود ہوتا ہے دونوں کو حلال کہا، حالانکہ بیع اور ربوا میں بڑا فرق ہے کہ بیع کو حق تعالیٰ نے حلال کیا ہے اور سود کو حرام۔

فائدہ: بیع میں جو نفع ہوتا ہے وہ مال کے مقابلہ میں ہوتا ہے، جیسا کسی نے ایک درہم کی قیمت کا کپڑا دو درہم کا فروخت کیا اور سود وہ ہوتا ہے جس میں نفع بلا عوض ہو، جیسے ایک درہم سے دو درہم خرید لیوے، اول صورت میں چونکہ کپڑا اور درہم دو جدا جدا قسم کی چیزیں ہیں اور نفع اور غرض ہر ایک کی دوسرے سے علیحدہ ہے اس لئے ان میں فی نفسہٖ موازنہ اور مساوات غیر ممکن ہے، بضرورت خرید وفروخت موازنہ کرنے کو کوئی صورت اپنی اپنی ضرورت اور حاجت کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتی اور ضرورت اور رغبت ہر ایک کی از حد مختلف ہوتی ہے، کسی کو ایک درہم کی اتنی حاجت ہوتی ہے کہ دس روپیہ کی قیمت کے کپڑے کی بھی اس قدر نہیں ہوتی اور کسی کو ایک کپڑے کی جو بازار میں ایک درہم کا شمار ہوتا ہے اتنی حاجت ہوسکتی ہے کہ دس درہم کی بھی اتنی احتیاج اور رغبت نہیں ہوتی تو اب ایک کپڑے کو ایک درہم میں کوئی خریدے گا تو اس میں سود یعنی نفع خالی عن العوض نہیں اور اگر بالفرض اسی کپڑے کو ایک ہزار درہم کا خریدے گا تو سود نہیں ہوسکتا، کیونکہ فی حد ذاتہٖ تو ان میں موازنہ اور مساوات ہو ہی نہیں سکتی اس کے لئے اگر پیمانہ ہے تو اپنی اپنی رغبت اور ضرورت اور اس میں اتنا تفاوت ہے کہ خدا کی پناہ تو سود متعین ہو تو کیونکر ہو اور ایک درہم کو دو درہم کے عوض فروخت کرے گا تو یہاں فی نفسہٖ مساوات ہوسکتی ہے جس کے باعث ایک درہم ایک درہم کے مقابلہ میں معین ہوگا اور دوسرا درہم خالی عن العوض ہو کر سود ہوگا اور شرعاً یہ معاملہ حرام ہوگا۔

فائدہ: ۲؎ یعنی سود کی حرمت سے پہلے جو تم نے سود لیا دنیا میں اس کو مالک کی طرف واپس کرنے کا حکم نہیں دیا جاتا، یعنی تم کو اس سے مطالبہ کا حق نہیں اور آخرت میں حق تعالیٰ کو اختیار ہے، چاہے اپنی رحمت سے اس کو بخش دے، لیکن حرمت کے بعد بھی اگر کوئی باز نہ آیا، بلکہ برابر سود لے گیا تو وہ دوزخی ہے اور خدا تعالیٰ کے حکم کے سامنے اپنی عقلی دلیلوں کو پیش کرنے کی سزا وہی سزا ہے جو فرمائی۔

يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ ﴿۲۷۶﴾

مٹاتا ہے اللہ سود کو اور بڑھاتا ہے خیرات کو ۱؎ اور اللہ خوش نہیں کسی ناشکر گناہ گار سے ۲؎

خلاصہ تفسیر: (اگرچہ سود لینے سے فی الحال مال بڑھتا نظر آتا ہے، لیکن انجام کار) اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتے ہیں (کبھی تو دنیا ہی میں سب برباد ہو جاتا ہے، ورنہ آخرت میں تو بربادی یقینی ہے، کیونکہ وہاں اس پر عذاب ہوگا) اور (برخلاف اس کے صدقہ دینے میں اگرچہ فی الحال مال گھٹتا معلوم ہوتا ہے، لیکن انجام کار اللہ تعالیٰ) صدقات کو بڑھاتے ہیں (کبھی تو دنیا میں بھی ترقی ظاہر ہوتی ہے، ورنہ آخرت میں تو یقینی ہے، کیونکہ وہاں اس کا ثواب بہت زیادہ ملے گا، جیسا کہ پیچھے آیات میں بیان ہو چکا) اور اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتا (بلکہ مبغوض رکھتے ہیں) کسی کفر کرنے والے کو (جو کہ مذکورہ بات کہ سود بیع کی طرح حلال ہے جیسے کفریہ کلمات منہ سے بکے، اور اسی طرح پسند نہیں کرتے) کسی گناہ کے کام کرنے والے کو (جو کہ مذکورہ فعل یعنی سود جیسے کبائر کا مرتکب ہو)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ اللہ سود کے مال کو مٹاتا ہے، یعنی اس میں برکت نہیں ہوتی، بلکہ اصل مال بھی ضائع ہو جاتا ہے، چنانچہ حدیث میں ارشاد ہے کہ سود کا مال کتنا ہی بڑھ جائے، انجام اس کا افلاس ہے اور خیرات کے مال کو بڑھانے سے یہ مطلب ہے کہ اس مال میں زیادتی ہوتی ہے اور اللہ برکت دیتا

ہے اور اس کا ثواب بڑھایا جاتا ہے چنانچہ احادیث میں وارد ہے۔

فائدہ: ۲ے مطلب یہ کہ سود لینے والے نے مالدار ہو کر اتنا بھی نہ کیا کہ محتاج کو قرض ہی بلا سود دے دیتا، چاہیے تو یہ تھا کہ بطریق خیرات حاجت مند کو دیتا تو اب اس سے زیادہ اللہ کی نعمت کی ناشکری کیا ہوگی۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ

جو لوگ ایمان لائے اور عمل نیک کئے اور قائم رکھا نماز کو اور دیتے رہے زکوٰۃ ان کے لئے ہے ثواب ان کا

عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۷۷﴾

اپنے رب کے پاس، اور نہ ان کو خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے ۱ے

خلاصہ تفسیر: (گذشتہ آیات میں سود کے بارے میں بداعتقاد اور بدعمل لوگوں کا ذکر تھا، اب حسب عادت قرآن خوش اعتقاد اور نیک عمل لوگوں کا ذکر فرماتے ہیں) بیشک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کئے اور (بالخصوص) نماز کی پابندی کی، اور زکوٰۃ دی، ان کے لئے ان کا ثواب ہوگا ان کے پروردگار کے نزدیک، اور (آخرت میں) ان پر کوئی خطرہ (واقع ہونے والا) نہیں ہوگا، اور نہ وہ (کسی مقصود کے فوت ہونے سے) مغموم ہوں گے۔

پیچھے کی آیت میں سود خوروں کا قول: انما البیع مثل الربوا ان کے کفر پر دلالت کرتا تھا، اس کے مقابلہ میں یہاں آیت میں: آمنوا لایا گیا، پیچھے ان کی سود کی بدعملی ذکر تھی، جس سے ان لوگوں کی دنیا کی طرف رغبت مفہوم ہوتی تھی، یہاں ان کی خوش عملی اجمالی طور پر: عملوا الصالحات سے، اور تفصیلی طور پر اللہ تعالی کی طرف رغبت ہونا: واقامو الصلوۃ سے بیان کی گئی، اور بجائے مال سود حاصل کرنے کے اس کے برعکس مال کا خرچ کرنا یہاں: آتوا الزکوۃ سے ذکر کیا، اور ظاہر ہے کہ ان مقابلوں کی رعایت سے کلام میں کس قدر حسن وخوبی آگئی۔

* * *

فائدہ: ۱ے اس آیت میں سود لینے والے کے مقابلہ میں اہل ایمان کے اوصاف اور ان کا انعام ذکر کر دیا جو سود خور کے اوصاف وحالات اور اس کے حکم کے خلاف اور ضد ہیں جس سے سود خور کی پوری تہدید وتشنیع بھی ظاہر ہوگئی۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۷۸﴾

اے ایمان والو ڈرو اللہ سے اور چھوڑ دو جو کچھ باقی رہ گیا ہے سود اگر تم کو یقین ہے اللہ کے فرمانے کا ۱ے

فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۚ

پھر اگر نہیں چھوڑتے تو تیار ہو جاؤ لڑنے کو اللہ سے اور اس کے رسول سے، اور اگر توبہ کرتے ہو تو تمہارے واسطے ہے اصل مال تمہارا

لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۷۹﴾

نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ کوئی تم پر ۲ے

خلاصہ تفسیر: گذشتہ آیات میں آئندہ سود لینے سے ممانعت تھی، اب پچھلا چڑھا ہوا سود وصول کرنے کا حکم بتاتے ہیں۔

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، اور جو کچھ سود کا بقایا ہے اس کو چھوڑ دو اگر تم ایمان والے ہو (کیونکہ ایمان کا تقاضا یہی ہے کہ اللہ کی اطاعت کی جائے) پھر اگر تم (اس پر عمل) نہ کرو گے تو اشتہار سن لو جنگ کا اللہ کی طرف سے اور اس کے رسول کی طرف سے (یعنی تمہارے خلاف جہاد ہوگا) اور

اگر تم توبہ کرلو گے تو تم کو تمہارے اصل اموال مل جائیں گے (اس قانون کے بعد) نہ تم کسی پر ظلم کرنے پاؤ گے (کہ تم اصل مال سے زیادہ لینے لگو) اور نہ تم پر کوئی ظلم کرنے پائے گا (کہ تمہارا اصل مال بھی نہ دلایا جائے)۔

فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِّنَ اللهِ وَرَسُوْلِهٖ: آیت میں جو جہاد کے لیے فرمایا ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ اگر سود کو حلال سمجھ کر نہ چھوڑے تو وہ کافر ہے، جیسے کفار کے ساتھ جہاد ہوتا ہے اسی طرح اس شخص پر ہوگا، اور اگر سود کو حرام سمجھے مگر لینے سے باز نہ آئے تو اس پر جبر کیا جائے گا، مگر جبر دو چار پر تو چل سکتا ہے، اگر وہ جبر کو نہ مانے بلکہ گروہ بندی کر کے مقابلہ سے پیش آئے تو ان کے خلاف بھی جہاد ہوگا، کیونکہ یہ قاعدہ کلیہ ہے کہ اگر مسلمان کسی خاص حکم شرعی کے چھوڑنے پر اتفاق کرلیں تو خواہ وہ سنت ہی کیوں نہ ان کے خلاف امام کو جہاد کرنا چاہیے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی ممانعت سے پہلے جو سود لے چکے سو لے چکے، لیکن ممانعت کے بعد جو چڑھا، اس کو ہرگز نہ مانگو۔

فائدہ: ۲؎ یعنی پہلے سود جو تم لے چکے ہو، اس کو اگر تمہارے اصل مال میں محسوب کریں اور اس میں سے کاٹ لیویں تو تم پر ظلم ہے، اور ممانعت کے بعد کا سود چڑھا ہوا اگر تم مانگو تو یہ تمہارا ظلم ہے۔

وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ؕ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸۰﴾

اور اگر ہے تنگ دست تو مہلت دینی چاہیے کشائش ہونے تک، اور بخش دو تو بہت بہتر ہے تمہارے لئے اگر تم کو سمجھ ہو ۱؎

وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ۗ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۲۸۱﴾

اور ڈرتے رہو اس دن سے کہ جس دن لوٹائے جاؤ گے اللہ کی طرف، پھر پورا دیا جائیگا ہر شخص کو جو کچھ اس نے کمایا اور ان پر ظلم نہ ہوگا ۲؎

خلاصہ تفسیر: (سود خوروں کا قاعدہ تھا کہ میعاد پر مطالبہ کرنے پر اگر مدیون یعنی قرض دار مہلت مانگتا تو مہلت کے عوض مزید سود لیتے تھے، اب اس آیت میں اس بری رسم کو بھی باطل کیا جاتا ہے) اور اگر (قرضدار) تنگ دست ہو (اور اس لئے میعاد پر نہ دے سکے) تو (اس کو) مہلت دینے کا حکم ہے آسودگی تک (یعنی جب اس کے پاس ادا کرنے کی گنجائش ہو) اور یہ (بات) کہ (بالکل) معاف ہی کر دو اور زیادہ بہتر ہے تمہارے لئے اگر تم کو (اس کے ثواب کی) خبر ہو۔

(پیچھے جو مالی احکام بیان ہوئے ان میں کسی قدر مالی نقصان ہے، اس لیے کچھ بعید نہیں کہ لوگ ان میں کوتاہی کریں، سو اب احکام میں کوتاہی کرنے پر دھمکی مناسب معلوم ہوئی جو اس آیت میں ارشاد فرمائی جاتی ہے) اور (مسلمانو) اس دن سے ڈرو جس میں تم (سب) اللہ تعالیٰ کی پیشی میں لائے جاؤ گے، پھر ہر شخص کو اس کا کیا ہوا (یعنی اس کا بدلہ) پورا پورا ملے گا، اور ان پر کسی قسم کا ظلم نہ ہوگا (تو تم پیشی کے لئے اپنی کارگزاری درست رکھو اور کسی قسم کی خلاف ورزی مت کرو)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی جب سود کی ممانعت آگئی اور اس کا لینا دینا موقوف ہوگیا تو اب تم مدیون مفلس سے تقاضا کرنے لگو یہ ہرگز نہ چاہیے بلکہ مفلس کو مہلت دو اور توفیق ہو تو بخش دو۔

فائدہ: ۲؎ یعنی قیامت کو تمام اعمال کی جزاء اور سزا ملے گی، تو اب ہر کوئی اپنا فکر کرلے، اچھے کام کرے یا برے، سود لے یا خیرات کرے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِذَا تَدَايَنۡتُمۡ بِدَيۡنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكۡتُبُوۡهُ ؕ وَلۡيَكۡتُبْ بَّيۡنَكُمۡ

اے ایمان والو جب تم آپس میں معاملہ کرو ادھار کا کسی وقت مقرر تک تو اس کو لکھ لیا کرو، اور چاہیے کہ لکھ دے تمہارے درمیان

كَاتِبٌۢ بِالۡعَدۡلِ ۚ وَلَا يَاۡبَ كَاتِبٌ اَنۡ يَّكۡتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلۡيَكۡتُبْ ۚ وَلۡيُمۡلِلِ

کوئی لکھنے والا انصاف سے، اور انکار نہ کرے لکھنے والا اس سے کہ لکھ دیوے جیسا سکھایا اسکو اللہ نے سو اسکو چاہیے کہ لکھ دے، اور بتلاتا جاوے

الَّذِىۡ عَلَيۡهِ الۡحَـقُّ وَلۡيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَا يَبۡخَسۡ مِنۡهُ شَيۡـئًا ؕ فَاِنۡ كَانَ الَّذِىۡ عَلَيۡهِ

وہ شخص کہ جس پر قرض ہے اور ڈرے اللہ سے جو اس کا رب ہے اور کم نہ کرے اس میں سے کچھ [1] پھر اگر وہ شخص کہ جس پر

الۡحَـقُّ سَفِيۡهًا اَوۡ ضَعِيۡفًا اَوۡ لَا يَسۡتَطِيۡعُ اَنۡ يُّمِلَّ هُوَ فَلۡيُمۡلِلۡ وَلِيُّهٗ بِالۡعَدۡلِ ؕ

قرض ہے بے عقل ہے یا ضعیف ہے یا آپ نہیں بتلا سکتا تو بتلاوے کارگزار اس کا انصاف سے [2]

خلاصہ تفسیر: اے ایمان والو! جب معاملہ کرنے لگو ادھار کا (خواہ دام ادھار ہوں، یا جو چیز خریدنا ہے وہ ادھار ہو، جیسے بیع سلم میں) ایک میعاد معین تک (کے لئے) تو اس (کی یادداشت ودستاویز) کو لکھ لیا کرو، اور یہ ضرور ہے کہ تمہارے آپس میں (جو) کوئی لکھنے والا (ہو وہ) انصاف کے ساتھ لکھے (یعنی کسی کی رعایت کر کے مضمون میں کمی بیشی نہ کرے) اور لکھنے والا لکھنے سے انکار بھی نہ کرے جیسا کہ خدا نے اس کو (لکھنا) سکھایا ہے، اس کو چاہئے کہ لکھ دیا کرے اور (کاتب کو) وہ شخص (بتلادے اور) لکھوادے جس کے ذمہ وہ حق واجب ہو (کیونکہ دستاویز کا حاصل حق کا اقرار کرنا ہے، تو جس کے ذمہ حق ہے اسی کا اقرار ضروری ٹھہرا) اور (لکھاتے وقت) اللہ تعالیٰ سے جو اس کا پروردگار ہے ڈرتا رہے، اور اس (حق) میں سے ذرہ برابر (بتلانے میں) کمی نہ کرے، پھر جس شخص کے ذمہ حق واجب تھا، وہ اگر ضعیف العقل (یعنی جس کی عقل خراب ہو، خواہ مجنون ہو یا بھولا بے وقوف) ہو، یا ضعیف البدن (یعنی نابالغ یا پیر فرتوت، معمر بہت بوڑھا) ہو یا (اور کسی اتفاقی امر سے) خود (بیان کرنے کی اور) لکھانے کی قدرت نہ رکھتا ہو (مثلاً گونگا ہے اور لکھنے والا اس کا اشارہ نہیں سمجھتا، یا مثلاً دوسرے ملک کا رہنے والا ہے اور لکھنے والا اس کی بولی نہیں سمجھتا) تو (ایسی حالت میں) اس کا کارکن ٹھیک طور پر لکھوادے۔

اِذَا تَدَايَنۡتُمۡ بِدَيۡنٍ: یعنی جب تم ادھار کا معاملہ کرنے لگو، خواہ قیمت ادھار ہوں جیسے پیسوں سے گیہوں یا ہزار روپیہ کا مکان خریدا، اور قیمت دینے کا وعدہ چھ مہینہ بعد ٹھہرایا، یا جو چیز خریدنی ہے وہ ادھار ہو جیسے کسی کو سو روپے دے دیے اور یہ معاہدہ ٹھہرا کہ چھ مہینہ کے بعد فلاں غلہ اس قدر لیں گے جس کو عام لوگ بدھنی اور شریعت میں ''بیع سلم'' کہتے ہیں، یہ دونوں صورتیں شرعاً جائز ہیں، البتہ ان کے لیے بہت سی شرطیں ہیں جو کتب فقہ میں مذکور ہیں، ان میں سے ایک شرط کی طرف یہاں آیت میں بھی اشارہ ہے کہ مدت میعاد ٹھیک طور سے معین کریں جس میں اختلاف کی گنجائش نہ ہو، مثلاً رمضان کی پندرہ تاریخ، اور یوں نہ کہے کہ جب فصل کٹنے لگے گی، کیونکہ فصل کٹنے کی ابتدا اور انتہا میں بہت فرق ہوتا ہے۔

فَاكۡتُبُوۡهُ ؕ وَلۡيَكۡتُبْ بَّيۡنَكُمۡ كَاتِبٌۢ: یہ لکھنا تمام علماء کے نزدیک مستحب ہے، اگر لکھے لکھائے نہیں تو گناہ گار نہیں، صرف مصلحت ہے تا کہ اختلاف کا احتمال بالکل نہ رہے، اسی لیے یہ لکھنا دین وقرض کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ اگر دونوں طرف سے لین دین نقد ہو پھر بھی لکھنا مصلحت ہو تو مضائقہ نہیں، کاتب کو لکھنے کا حکم اور انکار سے ممانعت یہ بھی مستحب ہے، اسی لیے اگر کاتب لکھنے پر اجرت لے تو جائز ہے،

اَوۡ لَا يَسۡتَطِيۡعُ اَنۡ يُّمِلَّ هُوَ فَلۡيُمۡلِلۡ وَلِيُّهٗ: یعنی خود لکھانے کی قدرت نہ رکھتا ہو تو اس کا کارکن ٹھیک طور پر لکھوادے، اس صورت

میں گونگے کا اشارہ سمجھنے والا اور غیر زبان کا جاننے والا جسے ترجمان کہتے ہیں کوئی معتبر آدمی ہونا چاہیے، پس یہاں لفظ ''ولی'' بمعنی کارکن شرعی وکیل اور ترجمان وغیرہ سب کو شامل ہے۔

اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ: اس میں اس بات کا ثبوت ہے کہ معاشرت وتمدن کے نظام کی اصلاح کرنا طریقت کے خلاف نہیں (جیسا کہ بعض غالی قسم کے صوفی اسے دنیاداری کہہ دیا کرتے ہیں)۔

* * *

فائدہ: ۱ پہلے صدقہ خیرات کی فضیلت اور اس کے احکام بیان فرمائے، اس کے بعد ربا اور اسکی حرمت اور برائی مذکور ہوئی، اب اس معاملہ کا ذکر ہے جس میں قرض ہو اور آیندہ کسی مدت کا وعدہ ہو، اسکی نسبت یہ معلوم ہوا کہ ایسا معاملہ جائز ہے، مگر چونکہ یہ معاملہ آئندہ مدت کے لئے ہوا ہے، بھول چوک خلاف ونزاع کا احتمال ہے، اس لئے یہ ضرور ہے کہ اس کا تعین اور اہتمام ایسا کیا جائے کہ آئندہ کوئی قضیہ اور خلاف نہ ہو، اس کی صورت یہی ہے کہ ایک کاغذ لکھو جس میں مدت کا تقرر ہو اور دونوں معاملہ والوں کا نام اور معاملہ کی تفصیل سب باتیں صاف صاف کھول کر لکھی جاویں، کاتب کو چاہیے بلا انکار جس طرح شرع کا حکم ہے اسکے موافق انصاف میں کوتاہی نہ کرے اور چاہیے کہ مدیون اپنے ہاتھ سے لکھے یا کاتب کو اپنی زبان سے بتلائے اور دوسرے کے حق میں ذرا نقصان نہ ڈالے۔

فائدہ: ۲ یعنی جو دیندار اور مدیون [مقروض] ہے وہ اگر بے عقل بھولا یا سست اور ضعیف ہے، مثلاً بچہ ہے، یا بہت بوڑھا ہے کہ معاملہ کے سمجھنے کی سمجھ ہی نہیں ہے، یا معاملہ کو کاتب کو بتلا نہیں سکتا تو ایسی صورتوں میں مدیون کے مختار اور وارث اور کارگذار کو چاہیے کہ معاملہ کو انصاف سے بلا کم وکاست لکھوا دے۔

وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ

اور گواہ کرو دو شاہد اپنے مردوں میں سے، پھر اگر نہ ہوں دو مرد تو ایک مرد اور دو عورتیں ان لوگوں میں سے کہ جن کو

تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى ؕ وَلَا يَاْبَ الشُّهَدَآءُ

تم پسند کرتے ہو گواہوں میں تا کہ اگر بھول جائے ایک ان میں سے تو یاد دلاوے اس کو وہ دوسری ۱ اور انکار نہ کریں گواہ

اِذَا مَا دُعُوْا ؕ وَلَا تَسْئَمُوْٓا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا اِلٰٓى اَجَلِهٖ ؕ

جس وقت بلائے جاویں، اور کاہلی نہ کرو اس کے لکھنے سے چھوٹا ہو معاملہ یا بڑا اس کی میعاد تک

خلاصہ تفسیر: اور دو شخصوں کو اپنے مردوں میں سے گواہ (بھی) کرلیا کرو (اور شرعاً دعوی کے ثبوت کا اصل مدار یہی گواہ ہیں، اگرچہ دستاویز نہ ہو، اور بغیر گواہوں کے خالی دستاویز ایسے معاملات میں حجت اور معتبر نہیں، دستاویز لکھنا صرف یادداشت کی آسانی کے لئے رہے تاکہ اس کا مضمون دیکھ کر اور سن کر طبعی طور پر اکثر تمام واقعہ یاد آجاتا ہے، جیسا عنقریب قرآن ہی میں آتا ہے) پھر اگر وہ دو گواہ مرد (میسر) نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں (گواہ بنالی جائیں) ایسے گواہوں میں سے جن کو تم (ان کے معتبر ہونے کی وجہ سے) پسند کرتے ہو (اور ایک مرد کی جگہ دو عورتیں اس لئے تجویز کی گئیں) تا کہ ان دونوں عورتوں میں سے کوئی ایک بھی (شہادت کے کسی حصہ کو خواہ ذہن سے یا شہادت کے وقت بیان کرنے سے) بھول جائے تو ان میں ایک دوسری کو یاد دلادے (اور یاد دلانے کے بعد شہادت کا مضمون مکمل ہوجائے)۔

اور گواہ بھی انکار نہ کیا کریں جب (گواہ بننے کے لئے) بلائے جایا کریں (کہ اس میں اپنے بھائی کی اعانت ہے، پس گواہ بننا تو مستحب ہے مگر بن جانے کے بعد بعض صورتوں میں فرض ہے جیسا کہ آگے آتا ہے) اور تم اس (دین یعنی ادھار یا قرض) کے (بار بار) لکھنے سے اکتایا مت کرو،

خواہ وہ (معاملہ دَین کا) چھوٹا ہو یا بڑا ہو۔

وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ: اس کے بعد ضابطہ شہادت کے چند اہم اصول بتلائے گئے مثلاً: ① گواہ دو مرد، یا ایک مرد، دو عورتیں ہونا ضروری ہیں، ایک اکیلا مرد یا صرف دو عورتیں عام معاملات کی گواہی کے لئے کافی نہیں ② دوسرے یہ کہ گواہ مسلمان ہوں، لفظ مِنْ رِّجَالِكُمْ میں اس کی طرف ہدایت کی گئی ہے ③ تیسرے یہ کہ گواہ ثقہ اور عادل ہوں، جن کے قول پر اعتماد کیا جاسکے، فاسق و فاجر نہ ہوں مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ میں یہ حکم مذکور ہے۔

* * *

فائدہ: اور تم کو چاہیے کہ اس معاملہ پر کم سے کم دو گواہ مردوں میں سے یا ایک مرد اور دو عورتیں گواہ بنائی جائیں اور گواہ قابل پسند یعنی لائق اعتبار اور اعتماد ہوں۔

ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَاَدْنٰٓى اَلَّا تَرْتَابُوْٓا اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً

اس میں پورا انصاف ہے اللہ کے نزدیک اور بہت درست رکھنے والا ہے گواہی کو اور نزدیک ہے کہ شبہ میں نہ پڑو مگر یہ کہ سودا ہو ہاتھوں ہاتھ

تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَلَّا تَكْتُبُوْهَا ؕ وَاَشْهِدُوْٓا اِذَا تَبَايَعْتُمْ ۪

لیتے دیتے ہو اس کو آپس میں تو تم پر کچھ گناہ نہیں اگر اس کو نہ لکھو، اور گواہ کر لیا کرو جب تم سودا کرو

وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ ؕ وَاِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌۢ بِكُمْ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ

اور نقصان نہ کرے لکھنے والا اور نہ گواہ اور اگر ایسا کرو تو یہ گناہ کی بات ہے تمہارے اندر، اور ڈرتے رہو اللہ سے

وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۸۲﴾

اور اللہ تم کو سکھلاتا ہے، اور اللہ ہر ایک چیز کو جانتا ہے

خلاصہ تفسیر: یہ لکھ لینا انصاف کا زیادہ قائم رکھنے والا ہے اللہ کے نزدیک اور شہادت کا زیادہ درست رکھنے والا ہے اور زیادہ سزا وار ہے اس بات کا کہ تم (معاملہ کے متعلق) کسی شبہ میں نہ پڑو (اس لئے لکھ ہی لینا اچھا ہے) مگر یہ کہ کوئی سودا دست بدست ہو جس کو باہم لیتے دیتے ہو تو اس کے نہ لکھنے میں تم پر کوئی الزام (اور نقصان) نہیں اور (اتنا اس میں بھی ضرور کیا کرو کہ اس کے) خرید و فروخت کے وقت گواہ کر لیا کرو (شاید آئندہ کوئی بات نکل آئے، مثلاً بیچنے والا کہنے لگے کہ مجھ کو قیمت ہی وصول نہیں ہوئی، یا یہ چیز میں نے فروخت ہی نہیں کی، یا خریدار کہنے لگے کہ میں نے تو واپسی کا اختیار بھی لے لیا تھا، یا کہے کہ ابھی تو مبیع پوری میری پاس نہیں پہنچی)۔

اور (جس طرح ہم نے پیچھے کاتب اور گواہ کو منع کیا ہے کہ لکھنے اور گواہی دینے سے انکار نہ کریں، اسی طرح ہم تم کو بھی تاکید کرتے ہیں کہ تمہاری طرف سے) کسی کاتب کو تکلیف نہ دی جائے، اور نہ کسی گواہ کو (مثلاً اپنی مصلحت کے لئے ان کی کسی مصلحت میں خلل ڈالا جائے) اور اگر تم ایسا کرو گے تو اس میں تم کو گناہ ہوگا، اور خدا تعالیٰ سے ڈرو (اور جن کاموں سے اس نے منع کیا ہے وہ مت کرو) اور اللہ تعالیٰ (کا تم پر احسان ہے کہ) تم کو (مفید احکام کی) تعلیم فرماتا ہے، اور اللہ تعالیٰ سب چیزوں کے جاننے والے ہیں (تو وہ مطیع اور عاصی کو بھی جانتے ہیں، ہر ایک کو مناسب جزاء دیں گے)۔

فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَلَّا تَكْتُبُوْهَا: یہ جو فرمایا کہ "نہ لکھنے میں الزام نہیں" تو مراد یہ ہے کہ دنیا کا نقصان نہیں، ورنہ گناہ تو کسی معاملہ کے نہ لکھنے میں بھی نہیں، اور نقد لین دین میں لکھنے کا اہتمام نہ فرمانا اس لیے ہے کہ ایسے معاملات بکثرت ہوتے ہیں اور دست بدست ہونے سے

جھگڑے اور اختلاف کا بہت کم اندیشہ ہے تو لکھنے میں حرج اور تنگی ہوگی، اس سے یہ بھی مستنبط ہوسکتا ہے کہ اگر کسی نقد لین دین میں بھی اس قسم کا احتمال ہو مثلاً یہ کہ بہت بڑا معاملہ ہے جو نادر الوقوع ہے اور آئندہ اختلاف کا احتمال ہے تو اس میں لکھ لینا مطلوب ہوگا، چنانچہ عادت بھی ہے کہ بڑے بڑے معاملات کی دستاویزات برابر لکھی جاتی ہیں اگرچہ ادھارہ ہو۔

حق تعالیٰ نے اس آیت میں معاملہ لکھنے میں تین فائدے بتلائے ہیں: ① اول کا حاصل یہ ہے کہ ایک کا حق دوسرے کے پاس نہ جائے گا اور نہ رہے گا تو حقوق العباد سے حفاظت رہے گی ② دوسرے کا حاصل یہ ہے کہ گواہوں کو آسانی ہوگی ③ تیسرے کا حاصل یہ ہے کہ اہل معاملہ کا دل صاف رہے گا، دل میں کدورت نہ وہوگی، تینوں فائدوں کا الگ الگ ہونا ظاہر ہے، اور ان فوائد کا اس طرح بیان کرنا کتابت اور شہادت کے مستحب ہونے کا قرینہ ہے، البتہ کاتب اور گواہوں کو نقصان پہنچانا حرام ہے، اور کاتب اگر اجرت مانگے یا گواہ کی آمد ورفت کے خرچ کی ضرورت ہو تو اس کو مفت کام کرنے پر مجبور کرنا یہ بھی حرام اور نقصان پہنچانے میں داخل ہے۔

فائدہ: لہ یعنی گواہ کو جس وقت گواہ بنانے کے لئے یا ادائے شہادت کے لئے بلائیں تو اس کو کنارہ یا انکار نہ چاہیے اور کاہلی اور سستی نہ کرو اس کے لکھنے لکھانے میں، معاملہ چھوٹا ہو یا بڑا کہ انصاف پورا اس میں ہے، اور گواہی پر بھی کامل اعتماد اسے لکھ لینے میں ہے، اور بھول چوک اور کسی کے حق ضائع ہونے سے اطمینان بھی اس میں ہے۔

فائدہ: ۲ یعنی اگر سوداگری کا معاملہ دست بدست ہو، جنس کے بدلے جنس یا نقد کی طرح معاملہ ہو، مگر ادھار کا قصہ نہ ہو، تو اب نہ لکھنے میں گناہ نہیں، مگر گواہ بنا لینا اس وقت بھی چاہیے کہ اس معاملہ کے متعلق کوئی نزاع آئندہ پیش آئے تو کام آئے اور لکھنے والا اور گواہ نقصان نہ کرے، یعنی مدعی اور مدعٰی علیہ میں سے کسی کا بھی نقصان نہ کرے بلکہ، جو حق واجبی ہو وہی ادا کریں۔

وَاِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ ؕ فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا

اور اگر تم سفر میں ہو اور نہ پاؤ کوئی لکھنے والا تو گرو ہاتھ میں رکھنی چاہیے، پھر اگر اعتبار کرے ایک دوسرے کا

فَلْيُؤَدِّ الَّذِى اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ ؕ وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ؕ

تو چاہیے کہ پورا ادا کرے وہ شخص کہ جس پر اعتبار کیا اپنی امانت کو اور ڈرتا رہے اللہ سے جو رب ہے اس کا، اور مت چھپاؤ گواہی کو

وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗۤ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ﴿۲۸۳﴾ ع

اور جو شخص اس کو چھپاوے تو بیشک گناہ گار ہے دل اس کا، اور اللہ تمہارے کاموں کو خوب جانتا ہے

خلاصہ تفسیر: اور اگر تم (دین یعنی قرض کا معاملہ کرانے کے وقت) کہیں سفر میں ہو اور (دستاویز لکھنے کے واسطے وہاں) کوئی کاتب نہ پاؤ، سو (ایسی حالت میں اطمینان کا ذریعہ) رہن رکھنے کی چیزیں (ہیں) جو (قرض دار یعنی مقروض کی طرف سے صاحب حق کے) قبضہ میں دے دی جائیں، اور اگر (ایسے وقت میں بھی) ایک دوسرے کا اعتبار کرتا ہو (اور اس لئے رہن کی ضرورت نہ سمجھے) تو جس شخص کا اعتبار کر لیا گیا ہے (یعنی قرض دار) اس کو چاہئے کہ دوسرے کا حق (پورا پورا) ادا کردے، اور اللہ تعالیٰ سے جو اس کا پروردگار ہے ڈرے (اور اس کا حق نہ مارے) اور شہادت کا اخفاء مت کرو (مت چھپاؤ) اور جو شخص اس کا اخفاء کرے گا اس کا قلب گنہگار ہوگا، اور اللہ تعالیٰ تمہارے کئے ہوئے کاموں کو خوب جانتے ہیں (سو اگر کوئی چھپائے گا، اللہ تعالیٰ کو اس کا علم ضرور ہے، سو وہ سزا دیں گے)۔

وَاِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ: جمہور علماء کا اتفاق ہے کہ جس طرح سفر میں رہن رکھنا جائز ہے حضر میں بھی جائز ہے، یہاں آیت میں سفر کو بطور

خاص ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ سفر میں اس کی ضرورت زیادہ پڑے گی، کیونکہ حضر میں اطمینان کے دیگر ذرائع بھی مل سکتے ہیں، جیسے لکھنا یا گواہ کر دینا جو سفر میں اکثر میسر نہیں ہوتے۔

وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ: شہادت کا چھپانا دو طرح سے ہے: ① ایک یہ کہ بالکل بیان نہ کرے ② دوسرے یہ کہ غلط بیان کرے، دونوں میں اصل واقعہ مخفی ہو گیا اور یہ دونوں صورتیں حرام ہیں، واضح رہے کہ گواہی دینا اس وقت فرض ہے جبکہ حق دار کا حق اس کی گواہی کے بغیر ضائع ہونے لگے، اور حق دار درخواست بھی کرے تو اس وقت شہادت دینے سے انکار کرنا حرام ہے، اور اگر صاحب واقعہ یعنی حق دار کو علم نہ ہو کہ اس شخص کو میرا واقعہ معلوم ہے تو حق ضائع ہونے کی صورت میں اس پر ظاہر کر دینا واجب ہے، اگر اس کے بعد بھی حق دار گواہی دینے کی درخواست نہ کرے تو اب یہ واجب نہیں کہ خود جا کر گواہی دیتے پھرو۔

فَاِنَّهٗۤ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ: دل کو اس لیے گناہ گار کہا کہ کوئی شخص اس کو خالی زبان ہی کا گناہ نہ سمجھے، کیونکہ ارادہ تو دل ہی سے ہوا ہے، چنانچہ اس میں دلالت ہے اس پر کہ اصل مدار قلب پر ہے، کیونکہ اول ارادہ دل سے ہی ہوتا ہے۔

❁ ❁ ❁

فائدہ: یعنی اگر سفر میں قرض اور ادھار کا معاملہ کرو اور دستاویز کے لئے کوئی کاتب نہ ملے تو قرض کے عوض کوئی چیز مدیون (مقروض) کو رہن رکھ دینی چاہیے۔

فائدہ: سفر میں رہن کی حاجت بہ نسبت حضر زیادہ ہوگی، کیونکہ حضر میں کتابت وشہادت سے بھی بسہولت صاحب دَین (قرض یا ادھار دینے والے) کا اطمینان ممکن ہے، اس لئے سفر میں رہن کا حکم ہوا، ورنہ حضر میں اور کاتب کی موجودگی میں بھی رہن درست ہے، جیسا کہ حدیث میں موجود ہے اور اگر صاحب دَین کو مدیون (مقروض) پر اعتماد اور اس کا اعتبار ہو اور اس لئے رہن کا طالب نہ ہو تو مدیون کو لازم ہے کہ صاحب دَین کا حق تمام وکامل ادا کر دے، اور خدا سے ڈرتا رہے صاحب حق کے حق میں امانت سے معاملہ کرے۔

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْۤ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ؕ

اللہ ہی کا ہے جو کچھ کہ آسمانوں اور زمین میں ہے، اور اگر ظاہر کرو گے اپنے جی کی بات یا چھپاؤ گے اس کو حساب لے گا اس کا تم سے اللہ

فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۸۴﴾

پھر بخشے گا جس کو چاہے اور عذاب کرے گا جس کو چاہے، اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے

خلاصہ تفسیر: گذشتہ آیات میں شہادت کے چھپانے کو دل کا گناہ بتلایا تھا، اب ان آیات میں اس امر کو بیان فرماتے ہیں کہ قلب کے کن افعال پر مواخذہ ہے اور کن پر نہیں؟ نیز گزشتہ آیات میں یہ حکم دیا تھا کہ امانت میں خیانت نہ کرو اور اللہ کا خوف دل میں رکھو اور اس کے عذاب اور مواخذہ سے ڈرتے رہو اب، ان آیات میں اللہ تعالیٰ کی مالکیت اور اس کی قدرت اور اس کے محاسبہ اور مواخذہ کو بیان فرماتے ہیں۔

اللہ ہی کی ملک میں ہیں سب (مخلوقات) جو کچھ آسمانوں میں ہیں اور جو کچھ زمین میں ہیں (جیسے خود زمین و آسمان بھی اسی کی ملک میں ہیں) اور (جب وہ مالک ہیں تو ان کو اپنی مملوکہ اشیاء میں ہر طرح قانون بنانے کا حق ہے، اس میں مجال کلام نہ ہونی چاہئے، جیسا کہ ایک قانون یہ ہے کہ) جو باتیں (عقائد فاسدہ یا اخلاق مذمومہ یا گناہوں پر پختہ عزم وارادہ کی) تمہارے نفسوں میں ہیں ان کو اگر تم (زبان وجوارح سے) ظاہر کرو گے (مثلاً زبان سے کلمہ کفر کہہ دیا، یا اپنے تکبر حسد وغیرہ کا خود اظہار کر دیا، یا کسی گناہ کا ارادہ تھا اسی کو کر ڈالا) یا کہ (دل ہی میں) پوشیدہ رکھو گے (دونوں حالتوں میں) حق تعالیٰ تم سے (دوسرے گناہوں کی طرح ان کا) حساب لیں گے، پھر (حساب لینے کے بعد بجز کفر وشرک کے) جس کے لئے (بخشنا) منظور ہوگا بخش دیں گے، اور جس کو (سزا دینا) منظور ہوگا سزا دیں گے، اور اللہ تعالیٰ ہر شے پر پوری قدرت رکھنے والے ہیں (تو دل کے اندر کی چھپی ہوئی

بات پر مطلع ہو کر اس پر حساب لینا کوئی تعجب کی بات نہیں)۔

وَاِنۡ تُبۡدُوۡا مَا فِیۡۤ اَنۡفُسِکُمۡ اَوۡ تُخۡفُوۡهُ: مافی انفسکم سے مراد اُمور قلبی اختیاری ہیں، یعنی دل کی وہ باتیں جو اپنے اختیار میں ہیں، پس جس طرح زبان اور تمام ظاہری اعضاء کے افعال دو قسم پر ہیں: ① ایک اختیاری جیسے ارادہ کر کے بولنا، قصد و ارادہ سے کسی کو مارنا ② غیر اختیاری جیسے کہنا کچھ چاہتا تھا اور زبان سے کچھ اور نکل گیا، یا رعشہ کی وجہ سے ہاتھ کی حرکت، ان میں افعال اختیاری پر ثواب اور عذاب ہوتا ہے، اور افعال غیر اختیاری پر ثواب و عذاب نہیں ہوتا، یہی حال قلبی افعال کا ہے کہ جو اختیاری ہیں جیسے کفر کا عقیدہ جمانا، یا قصداً اپنے کو بڑا سمجھنا، یا شراب و زنا وغیرہ کا پختہ ارادہ کرنا ان پر مواخذہ ہوگا، اور جو غیر اختیاری ہیں جیسے کفر و گناہ کے برے برے وسوسے جو بغیر ارادہ کے دل میں آئیں ان پر مواخذہ نہ ہوگا، اس کے متعلق مزید تفصیل آگے آ رہی ہے۔

یہاں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ حدیث میں رسول ﷺ کا ارشاد ہے: ''اللہ تعالیٰ نے میری امت کو معاف کر دیا ہے وہ جو اُن کے دل میں خیال آیا جب تک اس کو زبان سے نہ کہا یا عمل نہ کیا ہو''، مذکورہ آیت کے برخلاف اس حدیث سے تو بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ دل کے ارادہ پر کوئی عذاب و عتاب نہیں ہے، چنانچہ امام قرطبیؒ نے فرمایا کہ حدیث دنیاوی احکام کے متعلق ہے، جیسے طلاق، عتاق، بیع، ہبہ، وغیرہ محض دل میں ارادہ کر لینے سے منعقد نہیں ہو جاتے جب تک ان کو زبان سے یا عمل سے نہ کیا جائے اور یہاں آیت میں جو کچھ مذکور ہے وہ احکام آخرت سے متعلق ہے اس لئے کوئی تعارض نہیں، اور دوسرے حضرات علماء نے اس شبہ کا جواب یہ دیا ہے کہ جس حدیث میں دل کی چھپی ہوئی چیزوں کی معافی مذکور ہے اس سے مراد وہ وساوس اور غیر اختیاری خیالات ہیں جو انسان کے دل میں بغیر قصد اور ارادہ کے آ جاتے ہیں، بلکہ ان کے خلاف کا ارادہ کرنے پر بھی وہ آتے رہتے ہیں ایسے غیر اختیاری خیالات اور وساوس کو اس امت کے لئے حق تعالیٰ نے معاف کر دیا ہے اور آیت مذکور میں جس محاسبہ کا ذکر ہے اس سے مراد وہ ارادے اور نیتیں ہیں جو انسان اپنے قصد اور اختیار سے اپنے دل میں جماتا ہے اور اس کے عمل میں لانے کی کوشش بھی کرتا ہے، پھر اتفاق سے کچھ موانع پیش آ جانے کی بناء پر ان پر عمل نہیں کر سکتا، قیامت کے دن ان کا محاسبہ ہوگا، پھر حق تعالیٰ جس کو چاہیں اپنے فضل و کرم سے بخش دیں، جس کو چاہیں عذاب دیں۔

چونکہ آیت مذکورہ کے ظاہری الفاظ سے یہ سمجھا جاتا تھا کہ دونوں قسم کے خیالات اس میں داخل ہیں، خواہ اختیاری ہوں یا غیر اختیاری، اس لئے جب یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہ کرام کو سخت فکر و غم لاحق ہو گیا کہ اگر غیر اختیاری خیالات و وساوس پر بھی مواخذہ ہونے لگا تو کون نجات پائے گا؟ صحابہ کرامؓ نے اس فکر کو رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ: یا رسول اللہ! اب تک جن افعال کا ہم کو حکم دیا گیا وہ ہماری طاقت و اختیار میں تھے مگر اب جو آیت نازل ہوئی ہے یہ تو ہماری طاقت سے باہر ہے، یہ حکم سخت مشکل ہے، اختیاری امور سے تو بچ سکتے ہیں، مگر خطرات قلبی اور غیر اختیاری وسوسوں سے بچنا مشکل ہے، حضور ﷺ اس کا صحیح مطلب جانتے تھے، لیکن غایت خوف و خشیت کی وجہ سے آپ کی نظر بھی آیت کے عام الفاظ کی طرف پہنچی اور وحی کے بغیر از خود اختیار و غیر اختیار کی قید تفسیر میں ظاہر نہ فرمائی، بلکہ صحابہ کو ادب و اطاعت کی تعلیم کرتے ہوئے فرمایا کہ تم چاہتے ہو کہ اہل کتاب کی طرح: کہو، بلکہ یوں کہنا چاہیے: چنانچہ صحابہ نے یوں ہی کہا، مگر جو معنی وہ سمجھے ہوئے تھے اس کی بنا پر اطاعت کا عہد کرتے ہوئے زبان لڑکھڑاتی تھی، اس پر حق تعالیٰ نے اگلی دو آیتیں نازل فرمائیں، ایک میں مسلمانوں کی مدح اور دوسری میں مذکورہ بالا آیت کی تفسیر ہے، جس کو بعض روایتوں میں نسخ سے تعبیر کیا گیا ہے، سلف میں مراد کی وضاحت کو بھی نسخ کہہ دیا کرتے تھے، چنانچہ وہاں اچھی طرح وضاحت کر دی اور وہ شبہ بالکل زائل ہو گیا۔

وَاِنۡ تُبۡدُوۡا مَا فِیۡۤ اَنۡفُسِکُمۡ اَوۡ تُخۡفُوۡهُ: اس میں اعمال قلوب کے احکام کی بھی تحقیق ہے، یعنی جس طرح ظاہری اعمال اچھے یا برے ہوں گے تو ان کے مطابق آخرت میں ثواب و عقاب ہوگا اسی طرح دل کے اعمال جو اختیاری ہیں جیسے حسد، کینہ، بغض، ریا کاری اور کلمہ کفر کا دل میں جمانا وغیرہ ان پر پکڑ ہوگی اور ان کے بالمقابل تواضع، عجز، اخلاص، دین کے کلمہ کو جمانا وغیرہ ان پر اجر و ثواب ہوگا۔

* * *

فائدہ: اس سورت میں اصول و فروع عبادات و معاملات جانی و مالی ہر قسم کے احکامات بہت کثرت سے مذکور فرمائے اور شاید اس سورت

کے ''سنام القرآن'' فرمانے کی یہی وجہ ہو، اس لئے مناسب ہے کہ بندوں کو پوری تاکید وتہدید بھی ہر طرح سے فرمادی جائے تاکہ تعمیل احکام مذکورہ میں کوتاہی سے اجتناب کریں، سو اسی غرض کے لئے آخر سورت میں احکام کو بیان فرما کر اس آیت کو بطور تہدید وتنبیہ ارشاد فرما کر تمام احکام مذکورہ سابقہ کی پابندی پر سب کو مجبور کر دیا اور طلاق ونکاح قصاص وزکوۃ بیع ور بوا وغیرہ میں جو اکثر صاحب حیلوں اور اپنی ایجاد کردہ تدبیروں سے کام لیتے ہیں اور ناجائز امور کو جائز بنانے میں خودرائی اور سینہ زوری سے کام لیتے ہیں انکو بھی اس میں پوری تنبیہ ہوگئی۔

دیکھیئے: ① جس کو ہم پر استحقاق عبادت حاصل ہوگا اس کو مالک ہونا چاہیے اور ② جو ہماری ظاہری اور مخفی تمام اشیاء کا محاسبہ کر سکے اسکو تمام امور کا علم ہونا ضروری ہے اور ③ جو ہماری تمام چیزوں کا حساب لے سکے اور ہر ایک کے مقابلہ میں جزاء وسزا دے سکے اس کو تمام چیزوں پر قدرت ہونی ضروری ہے، سوانہی تین کمالات یعنی ملک اور علم اور قدرت کو یہاں بیان فرمایا اور انہی کا ''آیۃ الکرسی'' میں ارشاد ہو چکا ہے، مطلب یہی ہے کہ ذات پاک سبحانہ، تمام چیزوں کی مالک اور خالق اس کا علم سب کو محیط اسکی قدرت سب پر شامل ہے تو پھر اسکی نافرمانی کسی امر ظاہر یا مخفی میں کر کے بندہ کیونکر نجات پاسکتا ہے۔

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ

مان لیا رسول نے جو کچھ اترا اس پر اسکے رب کی طرف سے اور مسلمانوں نے بھی، سب نے مانا اللہ کو اور اسکے فرشتوں کو اور اس کی کتابوں کو

وَرُسُلِهٖ ۣ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۣ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۤ

اور اس کے رسولوں کو، کہتے ہیں کہ ہم جدا نہیں کرتے کسی کو اس کے پیغمبروں میں سے، اور کہہ اٹھے کہ ہم نے سنا اور قبول کیا

غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ﴿۲۸۵﴾

تیری بخشش چاہتے ہیں اے ہمارے رب اور تیری ہی طرف لوٹ کر جانا ہے

خلاصہ تفسیر: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کے شبہ کو سن کر انہیں ادب واطاعت کی تعلیم دی اور فرمایا کہ تم بنی اسرائیل کی طرح انکار مت کرو اور دل وجان سے اس کے حکم کو قبول کرو، یعنی اہل کتاب کی طرح سمعنا وعصینا نہ کہو بلکہ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا کہو اور اللہ تعالیٰ سے مدد مانگو، یعنی ہم نے حکم سن لیا اور تعمیل کی، صحابہ نے فوراً ہی سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا کہا، اللہ تعالیٰ کو صحابہ کی یہ بات پسند آئی اس پر یہ اور اگلی یعنی دو آیتیں نازل ہوئیں، صحابہ کرام کے دل میں جو شبہ پیدا ہو گیا تھا اس کے تفصیلی جواب سے قبل تمہید کے طور پر صحابہ کرام کی مدح اور تفصیل کے ساتھ ان کے ایمان اور ان کی اطاعت کو بیان فرمایا، تاکہ ان کے دلوں کو اطمینان ہو جائے اور عشاق اور محبین کے دلوں میں جو خلجان اور اضطراب تھا وہ دور ہو جائے، چنانچہ پہلی آیت میں اطاعت شعار مؤمنین کی مدح کی گئی جنہوں نے اللہ جل شانہ کے تمام احکام پر لبیک کہا اور تعمیل کے لئے تیار ہو گئے۔

اعتقاد رکھتے ہیں رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) اس چیز (کے حق ہونے) کا جو ان کے پاس ان کے رب کی طرف سے نازل کی گئی ہے (یعنی قرآن) اور (دوسرے) مؤمنین بھی (اس کا اعتقاد رکھتے ہیں، آگے قرآن پر اعتقاد رکھنے کی تفصیل ہے کہ کن کن چیزوں کے ماننے کو قرآن پر اعتقاد رکھنا کہا جائے گا) سب کے سب (رسول بھی اور دوسرے مؤمنین بھی) عقیدہ رکھتے ہیں اللہ کے ساتھ (کہ وہ موجود ہے اور واحد ہے اور ذات وصفات میں کامل ہے) اور اس کے فرشتوں کے ساتھ (کہ وہ موجود ہیں اور گناہوں سے پاک ہیں اور مختلف کاموں پر مقرر ہیں) اور اس کی کتابوں کے ساتھ (کہ اصل میں سب سچی ہیں) اور اس کے سب پیغمبروں میں سے کسی میں (عقیدہ رکھنے میں) تفریق نہیں کرتے (کہ کسی کو پیغمبر سمجھیں، کسی کو نہ سمجھیں) اور ان سب نے یوں کہا کہ ہم نے (آپ کا ارشاد) سنا (اور اس) کو خوشی سے مانا، ہم آپ سے بخشش چاہتے ہیں اے ہمارے پروردگار! اور آپ ہی کی

طرف (ہم سب کو) لوٹنا ہے۔

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ: یہاں مقصود صرف مؤمنین کی مدح فرمانا مقصود ہے، لیکن ان کی مدح کی تائید و تقویت کے لیے ان کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کے ایمان کو بھی شامل کر لیا، جس میں اس طرف اشارہ ہو گیا کہ رسول اللہ ﷺ کے ایمان کا کامل ہونا تو بلاشبہ یقینی ہے، اسی طرح صحابہ کرام کا ایمان بھی کامل ہونے کی وجہ سے اس قابل ہے کہ ایمانِ رسول کے ذیل میں اس کا ذکر کیا جائے، اگر چہ دونوں کا کامل ہونا ایک درجہ ومرتبہ میں نہ ہو، صحابہ کرام کا ایمان کامل ہے اور آپ ﷺ کا ایمان اکمل یعنی بہت ہی کامل ہے، ناقص کسی کا نہیں، یعنی اگر چہ نفس ایمان میں آنحضرت محمد ﷺ اور سب مسلمان شریک ہیں، لیکن درجات ایمان کے اعتبار سے ان دونوں میں بڑا فرق ہے، رسول اللہ ﷺ کا علم مشاہدہ اور سماع کی بناء پر ہے اور دوسرے مسلمانوں کا علم ایمان بالغیب آنحضرت محمد ﷺ کی رویت کی بناء پر۔

لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ: اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ جس طرح انبیاء میں تفریق مناسب نہیں اسی طرح اولیاء اللہ میں بھی تفریق نہ کرے کہ ایک سے تو اعتقاد رکھتا ہو اور دوسرے کو برا بھلا کہتا ہو، ایک کو افضل اور دوسرے کو مقبول کہتا ہو، یہ درست نہیں، بلکہ جو شریعت کے مطابق چل رہے ہوں ان سب کے بارے میں اچھا اعتقاد لازم ہے۔

* * *

فائدہ: پہلی [گذشتہ] آیت سے جب یہ معلوم ہوا کہ دل کے خیالات پر بھی حساب اور گرفت ہے تو اس پر حضرات صحابہ گھبرائے اور ڈرے اور ان کو اتنا صدمہ ہوا کہ کسی آیت پر نہ ہوا تھا، آپ سے شکایت کی تو آپ نے فرمایا قُوْلُوْا سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا یعنی اشکال نظر آئے یا دقت، مگر حق تعالیٰ کے ارشاد کی تسلیم میں ادنیٰ توقف بھی مت کرو اور سینہ ٹھوک کر سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا عرض کر دو، آپ کے ارشاد کی تعمیل کی تو انشراح کے ساتھ یہ کلمات زبان پر بے ساختہ جاری ہو گئے، مطلب ان کا یہ ہے کہ ہم ایمان لائے اور اللہ کے حکم کی اطاعت کی، یعنی اپنی دقت اور خلجان سب کو چھوڑ کر ارشاد کی تعمیل میں مستعدی اور آمادگی ظاہر کی، حق تعالیٰ کو یہ بات پسند ہوئی، تب یہ دونوں آیتیں اتریں، اول یعنی اٰمَنَ الرَّسُوْلُ الخ اس میں رسول کریم اور ان کے بعد صحابہ کہ جن کو اشکال مذکور پیش آیا تھا ان کے ایمان کی حق سبحانہ، نے تفصیل کے ساتھ مدح فرمائی، جس سے ان کے دلوں میں اطمینان ترقی پاوے اور خلجان سابق زائل ہو، اس کے بعد دوسری آیت لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا الخ میں فرما دیا کہ مقدور سے باہر کسی کو تکلیف نہیں دی جاتی، اب اگر کوئی دل میں گناہ کا خیال اور خطرہ پائے اور اس پر عمل نہ کرے تو کچھ گناہ نہیں اور بھول چوک بھی معاف ہے، غرض صاف فرما دیا کہ جن باتوں سے بچنا طاقت سے باہر ہے، جیسے برے کام کا خیال وخطرہ یا بھول چوک ان پر مواخذہ نہیں، ہاں! جو باتیں بندہ کے ارادے اور اختیار میں ہیں، ان پر مواخذہ ہوگا، اب آیت سابقہ کو سن کر جو صدمہ ہوا تھا، اس کے معنی بھی اسی پچھلے قاعدہ کے موافق لینے چاہئیں، چنانچہ ایسا ہی ہوا اور خلجان مذکور کا اب ایسا قلع قمع ہو گیا کہ سبحان اللہ!۔

فائدہ: ''جدا نہیں کرتے کسی کو اسکے پیغمبروں میں سے'' یعنی یہود اور نصاریٰ کی طرح نہیں کہ کسی پیغمبر کو مانا اور کسی پیغمبر کو نہ مانا۔

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ؕ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ؕ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ

اللہ تکلیف نہیں دیتا کسی کو مگر جس قدر اس کی گنجائش ہے، اسی کو ملتا ہے جو اس نے کمایا اور اسی پر پڑتا ہے جو اس نے کیا، اے رب ہمارے نہ پکڑ ہم کو

اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ

اگر ہم بھولیں یا چوکیں، اے رب ہمارے اور نہ رکھ ہم پر بوجھ بھاری جیسا رکھا تھا ہم سے اگلے لوگوں پر

رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا ۥ وَاغْفِرْ لَنَا ۥ وَارْحَمْنَا ۥ

اے رب ہمارے اور نہ اٹھوا ہم سے وہ بوجھ کہ جس کی ہم کو طاقت نہیں اور در گزر کر ہم سے، اور بخش ہم کو، اور رحم کر ہم پر

اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۸۶﴾

تو ہی ہمارا رب ہے مدد کر ہماری کافروں پر

خلاصہ تفسیر: صحابہ کرام اور مؤمنین کی مدح کے بعد اب اس قانون کی مزید تفسیر وتوضیح فرما کر صحابہ کرام کے اس شبہ کا جواب دیا جارہا ہے جو انہیں پیش آیا تھا:

(ہم نے جو پہلے کہا کہ نفوس کی پوشیدہ باتوں پر بھی محاسبہ ہوگا، اس سے غیر اختیاری امور مراد نہیں، بلکہ صرف اختیاری امور مراد ہیں، کیونکہ) اللہ تعالی کسی کو (احکام شرعیہ میں) مکلف نہیں بناتا (یعنی ان امور کو واجب یا حرام نہیں فرماتا) مگر اسی کا جو اس کی طاقت (اور اختیار) میں ہو، اس کو ثواب بھی اسی کا ہوتا ہے جو ارادہ سے کرے، اور اس پر عذاب بھی اسی کا ہوگا جو ارادہ سے کرے (اور جو وسعت سے باہر ہے، اس کا مکلف نہیں کیا گیا، اور جس کے ساتھ قصد اور ارادہ متعلق نہیں اس کا نہ ثواب ہے نہ عذاب، اور وساوس طاقت سے خارج ہیں تو ان کے آنے کو حرام، اور ان کے نہ آنے دینے کو واجب نہیں کیا، اور نہ ان پر عذاب رکھا)۔

اے ہمارے رب! ہم پر دارو گیر نہ فرمائیے اگر ہم بھول جائیں، یا چوک جائیں، اے ہمارے رب! (ہماری یہ بھی درخواست ہے کہ) ہم پر کوئی سخت حکم نہ بھیجئے جیسے ہم سے پہلے لوگوں پر آپ نے بھیجے تھے، اے ہمارے رب! اور (ہم یہ بھی درخواست کرتے ہیں کہ) ہم پر کوئی ایسا بار (تکلیف کا دنیا یا آخرت میں) نہ ڈالئے جس کی ہم کو سہار نہ ہو، اور درگزر کیجئے ہم سے، اور بخش دیجئے ہم کو، اور رحم کیجئے ہم پر، آپ ہمارے کارساز ہیں (اور کارساز طرف دار ہوتا ہے) سو آپ ہم کو کافر لوگوں پر غالب کیجئے۔

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا: اس سے گذشتہ مضمون کی اچھی طرح وضاحت ہوگئی اور وہ شبہ بالکل زائل ہوگیا جو صحابہ کرام کو گزشتہ آیت کے مضمون کو سن کر ہوا تھا، جیسا کہ پیچھے ذکر ہوا کہ: وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ یعنی جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے تم اسے ظاہر کرو یا چھپاؤ ہر حال میں اللہ تعالی تم سے اس کا حساب لیں گے، اس مضمون کے متعلق کچھ تفصیل پیچھے گزر چکی کہ آیت کی اصل مراد تو یہ تھی کہ اپنے اختیار و ارادہ سے جو کوئی عمل اپنے دل میں کرو گے اس کا حساب ہوگا، غیر اختیاری وسوسہ اور بھول چوک اس میں داخل ہی نہ تھی، لیکن آیت کے ظاہری الفاظ سے یہ سمجھا جاتا تھا کہ دونوں قسم کے خیالات اس میں داخل ہیں، خواہ اختیاری ہوں یا غیر اختیاری، اس لئے جب یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہ کرام کو سخت فکر وغم لاحق ہوگیا کہ اگر غیر اختیاری خیالات و وساوس پر بھی مواخذہ ہونے لگا تو کون نجات پائے گا، صحابہ کرامؓ نے اس فکر کو رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا: یا رسول اللہ! یہ حکم سخت مشکل ہے، اختیاری امور سے تو بچ سکتے ہیں، مگر خطرات قلبی اور غیر اختیاری وسوسوں سے بچنا مشکل ہے، لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا سے جواب ذکر فرمایا کہ جو چیز بندہ کی طاقت اور اختیار سے باہر ہے بندہ اس کا مکلف نہیں، لہذا دل میں جو گناہ کا خیال اور خطرہ آ جائے تو اس پر کوئی مواخذہ نہیں، جب تک خود اپنے اختیار اور ارادہ سے اس پر عمل نہ کرے یا زبان سے اس کا تکلم اور تلفظ نہ کرے اور اسی طرح بھول چوک پر بھی کوئی مواخذہ نہیں، البتہ جو باتیں بندہ کی قدرت اور اختیار میں ہیں ان پر مواخذہ ہوگا، اور حدیث سے اس کی اور توضیح ہوگئی، حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ حق تعالی نے میری امت سے ان باتوں کو درگزر فرمایا ہے جو دل میں خیالات پیدا ہوں جب تک عمل نہ کرے یا تکلم نہ کرے۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ جس طرح انسان کے اعمال و افعال جو ہاتھ، سر، آنکھ اور زبان وغیرہ سے تعلق رکھتے ہیں جن کو اعمال ظاہرہ کہا جاتا ہے ان کی دو قسمیں ہیں: ① ایک اختیاری جو ارادہ اور اختیار سے کئے جائیں جیسے ارادہ سے بولنا ارادہ سے کسی کو مارنا ② دوسرے غیر اختیاری جو بلا ارادہ سرزد ہو جائیں، جیسے زبان سے کہنا چاہتا تھا کچھ اور نکل گیا کچھ، یا رعشہ سے بلا اختیار ہاتھ کی حرکت ہوئی اس سے کسی کو تکلیف پہنچ گئی، ان میں سب کو معلوم ہے کہ حساب و کتاب اور جزاء و سزا افعال اختیاریہ کے ساتھ مخصوص ہیں، افعال غیر اختیاریہ کا نہ انسان مکلف ہے نہ ان پر اس کو ثواب یا عذاب ہوتا ہے، اسی طرح وہ افعال جن کا تعلق باطن یعنی دل کے ساتھ ہے ان کی بھی دو قسمیں ہیں: ① ایک اختیاری جیسے کفر و شرک کا عقیدہ جس کو قصد و اختیار کے ساتھ دل

میں جمایا ہے یا سوچ سمجھ کر ارادہ کے ساتھ اپنے آپ کو بڑا سمجھنا جس کو تکبر کہا جاتا ہے یا پختہ ارادہ کرنا کہ شراب پیوں گا ② دوسرے غیر اختیاری مثلاً بغیر قصد وارادہ کے دل میں کسی برے خیال کا آجانا، ان میں بھی حساب وکتاب اور مؤاخذہ صرف اختیاری افعال پر ہے غیر اختیاری پر نہیں، اس تفسیر سے جو خود قرآن نے بیان کردی صحابہ کرام اجمعین کو اطمینان ہوگیا کہ غیر اختیاری وساوس وخیالات کا حساب وکتاب اور ان پر عذاب وثواب نہ ہوگا۔

لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ: اسی مضمون کو آخر میں اور زیادہ واضح کرنے کے لئے فرمایا ہے لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ یعنی انسان کو ثواب بھی اس کام کا ہوتا ہے جو ارادہ سے کرے اور عذاب بھی اس کام پر ہوتا ہے جو ارادہ سے کرے، مراد یہ ہے کہ ابتداءً بلا واسطہ اس عمل کا ثواب یا عذاب ہوگا جو قصد وارادہ سے کرے، کسی ایسے عمل کا ثواب وعذاب بالواسطہ ہوجانا جس کا اس نے ارادہ نہیں کیا اس کے منافی نہیں، اس سے اس شبہ کا جواب ہوگیا کہ بعض اوقات آدمی کو بلا قصد وارادہ بھی ثواب یا عذاب ہوتا ہے جیسا کہ قرآن شریف کی دوسری آیات اور بہت سی روایات حدیث سے ثابت ہے کہ جو آدمی کوئی ایسا نیک کام کرے جس سے دوسرے لوگوں کو بھی اس نیکی کی توفیق ہوجائے تو جب تک لوگ یہ نیک کام کرتے رہیں گے اس کا ثواب اس پہلے والے کو بھی ملتا رہے، اسی طرح اگر کسی شخص نے کوئی طریقہ گناہ کا جاری کیا تو آئندہ جتنے لوگ اس گناہ میں مبتلا ہوں گے اس کا وبال اس شخص کو بھی پہنچے گا جس نے اول یہ برا طریقہ جاری کیا تھا، اسی طرح روایات حدیث سے ثابت ہے کہ کوئی شخص اپنے عمل کا ثواب دوسرے آدمی کو دینا چاہے تو اس کو یہ ثواب پہنچتا ہے۔ ان سب صورتوں میں بغیر قصد وارادہ کے انسان کو ثواب یا عذاب ہورہا ہے۔

اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ یہ ظاہر ہے کہ یہ ثواب وعذاب بلا واسطہ اس کو نہیں پہنچا، بلکہ دوسرے کے واسطے سے پہنچا ہے، اس کے علاوہ جو واسطہ بنا ہے اس میں اس کے اپنے عمل اور اختیار کو بھی دخل ضرور ہے، کیونکہ جس شخص نے کسی کا ایجاد کیا ہوا اچھا یا برا طریقہ اختیار کیا اس میں پہلے شخص کے عمل اختیاری کا دخل ضرور ہے اگرچہ اس نے اس خاص اثر کا ارادہ نہ کیا ہو، اس طرح کوئی کسی کو ایصال ثواب جبھی کرتا ہے جب اس نے اس پر کوئی احسان کیا ہو اس لحاظ سے یہ دوسرے کے عمل کا ثواب وعذاب بھی درحقیقت اپنے ہی عمل کا ثواب یا عذاب ہے۔

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا: اس آیت میں نسیان وخطا کا مضمون تو پچھلے مضمون کا تتمہ ہے، کیونکہ نسیان وخطا پر مواخذہ نہ ہونا تو قاعدہ کلیہ: لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ سے اجمالاً معلوم ہو چکا ہے۔

رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ: یہ جملہ کہ ''ہم پر کوئی سخت حکم نہ بھیجئے'' تامل سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سے معلوم ہو چکا ہے کہ حق تعالیٰ طاقت سے باہر کوئی حکم نہیں دیتے تو جو سخت احکام پہلی امتوں پر نازل کیے گئے تھے وہ یقیناً ان کی طاقت سے باہر نہ تھے، جب پہلی امتوں جیسے سخت احکام نازل نہ کرنے کی دعا سکھلائی تھی تو اس سے بدرجہ ان امور کے مکلف نہ بنانے کی بھی دعا ہوگئی جو انسانی طاقت سے باہر ہیں، یہاں تک تو تشریعیات یعنی شرعی تکالیف واحکام کے متعلق دعا تھی۔

رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ: یہ تکوینی تکالیف سے بچنے کی دعا ہے جس میں دنیا وآخرت کے سب مصائب اور عذاب داخل ہوگئے، یعنی تکوینی اور تقدیری طور پر ہم پر ایسی مصیبتیں اور بلائیں نازل نہ فرما جو کہ ہماری طاقت اور تحمل سے باہر ہوں، تشریعات اور تکوینیات میں فرق یہ ہے کہ انسان تشریعات کا مکلف ہے اور تکوینیات کا مکلف نہیں، مگر دعا کی تعلیم دونوں کے لیے کی گئی ہے، پھر اپنے ذاتی مصالح کے ختم کے بعد: فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ سے اپنے دشمنوں پر غلبہ کی دعا ہے جس پر سب معاملات کی درستی مکمل ہوگئی، یعنی محبوب کے ساتھ جو تعلق ہے وہ بھی درست ہوگیا اور دشمن کے ساتھ جو معاملہ ہے وہ بھی خاطر خواہ ہوگیا، حدیث میں ہے کہ یہ سب دعائیں قبول ہوئیں، بعض میں تو ظاہر ہے، اور بعض میں اگر شبہ ہو تو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ کسی وقت دعا قبول ہونے سے زیادہ دعا قبول نہ ہونے میں ظاہری اور باطنی مصلحتیں اور منافع ہوتے ہیں تو وہ قبول نہ ہونا بھی قبول ہے، کیونکہ قبول خود مقصود نہیں، بلکہ اصل مقصود مصلحت ہے۔

* * *

فائدہ: اول آیت پر حضرات صحابہ کو بڑی پریشانی ہوئی تھی، ان کی تسلی کے لئے یہ دو آیتیں اٰمن الرسول الخ اور لا یکلف اللہ نفسًا الخ نازل ہوئیں، اب اس کے بعد ربنا لا تؤاخذنا آخر سورت تک نازل فرما کر ایسا اطمینان دیا گیا کہ کسی صعوبت اور دشواری کا اندیشہ بھی باقی

نہ چھوڑا، کیونکہ جن دعاؤں کا ہم کو حکم ہوا ہے ان کا مقصود یہ ہے کہ بیشک ہر طرح کا حق حکومت اور استحقاق عبادت تجھ کو ہم پر ثابت ہے، مگر اے ہمارے رب! اپنی رحمت و کرم سے ہمارے لئے ایسے حکم بھیجے جائیں جن کے بجالانے میں ہم پر صعوبت اور بھاری مشقت نہ ہو، نہ بھول چوک میں ہم پکڑے جائیں، نہ مثل پہلی امتوں کے ہم پر شدید حکم اتارے جائیں، نہ ہماری طاقت سے باہر کوئی حکم ہم پر مقرر ہو، اس سہولت پر بھی ہم سے جو قصور ہو جائے اس سے درگزر اور معافی اور ہم پر رحم فرمایا جائے۔

حدیث میں ہے کہ یہ سب دعائیں مقبول ہوئیں اور جب اس دشواری کے بعد جو حضرات صحابہ کو پیش آچکی تھی اللہ کی رحمت سے اب ہر ایک دشواری سے ہم کو امن مل گیا تو اب اتنا اور بھی ہونا چاہیے کہ کفار پر ہم کو غلبہ عنایت ہو، ورنہ ان کی طرف سے مختلف وقتیں دینی اور دنیاوی ہر طرح کی مزاحمتیں پیش آکر جس صعوبت سے اللہ اللہ کر کے اللہ کے فضل سے جان بچی تھی کفار کے غلبہ کی حالت میں پھر وہی کھٹکا موجب بے اطمینانی ہوگا۔

اٰیاتھا ۲۰۰ ۳ سُورَۃُ اٰلِ عِمْرٰنَ مَدَنِیَّۃٌ ۸۹ رکوعاتھا ۲۰

خلاصہ تفسیر: سورۃ بقرہ میں اکثر احکامات شرعیہ کا اجمالی اور تفصیلی بیان آیا، جس کے ضمن میں جا بجا کفار کی مخالفت اور ان سے مقابلہ کا بھی ذکر آیا، آخر میں اس کو فانصرنا علی القوم الکافرین کے جملہ دعائیہ پر ختم کیا گیا تھا، جس کا حاصل کفار پر غلبہ پانے کی دعا تھا، میرے نزدیک سورہ آل عمران تمام اسی جملہ سے مرتبط ہے، کیونکہ اس سورت کے زیادہ حصہ میں کفار کے ساتھ جہاد کرنے کا ذکر ہے، خواہ زبان سے ہو خواہ تلوار سے، گویا یہ سورت اس دعا کی تشریح و تفصیل ہے، اور چونکہ جہاد کا منشا یہ تھا کہ وہ توحید کو نہ مانتے تھے اس لیے اس سورت کو توحید کے مضمون سے شروع کیا، سورہ بقرہ میں زیادہ تر گفتگو اور مباحثہ یہود سے تھا اور سورۃ آل عمران میں گفتگو و مباحثہ زیادہ تر نصاری سے ہے اور یہود چونکہ نصاری سے مقدم ہیں اس لیے سورۃ بقرہ کو سورۃ آل عمران سے پہلے لایا گیا۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

الٓمّٓ ﴿۱﴾ اللّٰہُ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ ۙ الۡحَیُّ الۡقَیُّوۡمُ ﴿۲﴾

الم، اللہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں زندہ ہے سب کا تھامنے والا

خلاصہ تفسیر: سورت کے آغاز میں اس مقصد عظیم کا ذکر ہے جس کی وجہ سے کفر و اسلام اور کافر و مومن کی تقسیم اور باہمی مقابلہ شروع ہوتا ہے، اور وہ اللہ جل شانہ کی توحید ہے، اس کے ماننے والے مومن اور نہ ماننے والے کافر و غیر مسلم کہلاتے ہیں، اس رکوع کی پہلی آیت میں توحید کی عقلی دلیل مذکور ہے۔

الٓمّٓ (یہ متشابہات قرآنیہ میں سے ہے، جس کے معنی اللہ ہی کو معلوم ہیں) اللہ تعالی ایسے ہیں کہ ان کے سوا کوئی قابل معبود بنانے کے نہیں، اور وہ زندہ (جاوید) ہیں، سب چیزوں کے سنبھالنے والے ہیں۔

اَلۡحَیُّ الۡقَیُّوۡمُ: ''حی و قیوم'' ان صفات کے لانے سے اشارتاً دلیل عقلی سے معبودان باطلہ کے معبود نہ ہونے کو ثابت کر دیا، کیونکہ ان میں یہ صفتیں نہیں ہیں، اور جو نہ ہمیشہ سے ہو اور نہ ہمیشہ رہے اور اپنی حفاظت میں خود دوسرے کی محتاج ہو وہ معبود بننے کے لائق نہیں ہوسکتی، کیونکہ عبادت انتہائی درجہ تذلل کو کہتے ہیں اور انتہائی درجہ تذلل اسی ذات کے سامنے ہونا چاہیے جسے انتہائی درجہ کی عزت حاصل ہو، اور انتہائی درجہ کی عزت اسی کو ہوسکتی ہے جو کہ انتہائی درجہ کامل ہو، اور جو حیات و بقا میں خود دوسرے کا محتاج ہو وہ تو انتہائی درجہ ناقص ہے، پس عبادت اس کا حق نہیں ہوسکتا۔

* * *

فائدہ: نجران کے ساتھ عیسائیوں کا ایک موقر و معزز وفد نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، اس میں تین شخص ① عبد المسیح عاقب

بحیثیت امارت وسیادت کے ② ایہم السید بلحاظ رائے وتدبیر کے اور ③ ابو حارثہ بن علقمہ باعتبار سب سے بڑے مذہبی عالم اور لاٹ پادری ہونے کے عام شہرت اور امتیاز رکھتے تھے، یہ تیسرا شخص اصل میں عرب کے مشہور قبیلہ ''بنی بکر بن وائل'' سے تعلق رکھتا تھا، پھر پکا نصرانی بن گیا، سلاطین روم نے اسکی مذہبی صلابت اور مجد وشرف کو دیکھتے ہوئے بڑی تعظیم وتکریم کی، علاوہ بیش قرار مالی امداد کے اسکے لئے گرجے تعمیر کئے اور امور مذہبی کے اعلیٰ منصب پر مامور کیا، یہ وفد بارگاہ رسالت میں بڑی آن بان سے حاضر ہوا اور متنازع فیہ مسائل میں حضور سے گفتگو کی، جس کی پوری تفصیل محمد بن اسحاق کی سیرۃ میں منقول ہے، سورۃ آل عمران کا ابتدائی حصہ تقریباً اسی نوے آیات تک اسی واقعہ میں نازل ہوا، عیسائیوں کا پہلا اور بنیادی عقیدہ یہ تھا کہ حضرت مسیح علیہ السلام بعینہ خدا یا خدا کے بیٹے یا تین خداؤں میں سے ایک ہیں۔

سورۃ ہذا کی پہلی آیت میں توحید خالص کا دعویٰ کرتے ہوئے خدا تعالیٰ کی جو صفات ''حيي قيوم'' بیان کی گئیں، وہ عیسائیوں کے اس دعوے کو صاف طور پر باطل ٹھہراتی ہیں، چنانچہ حضور ﷺ نے دوران مناظرہ میں ان سے فرمایا: کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ حیی (زندہ) ہے، جس پر کبھی موت طاری نہیں ہوسکتی، اسی نے تمام مخلوقات کو وجود عطا کیا اور سامان بقا پیدا کر کے ان کو اپنی قدرت کاملہ سے تھام رکھا ہے، برخلاف اس کے عیسیٰ علیہ السلام پر یقیناً موت وفنا آ کر رہے گی، اور ظاہر ہے جو شخص خود اپنی ہستی کو برقرار نہ رکھ سکے دوسری مخلوقات کی ہستی کیا برقرار رکھ سکتا ہے، ''نصاریٰ'' نے سن کر اقرار کیا (کہ بیشک صحیح ہے) شاید انہوں نے غنیمت سمجھا ہوگا کہ آپ اپنے اعتقاد کے موافق ''عيسىٰ ياتى عليه الفناء'' کا سوال کر رہے ہیں، یعنی عیسیٰ پر فنا ضرور آئے گی، اگر جواب نفی میں دیا تو آپ ہمارے عقیدہ کے موافق کہ حضرت عیسیٰ کو عرصہ ہوا موت آچکی ہے، ہم کو اور زیادہ صریح طور پر ملزم اور مفحم کر سکیں گے، اس لئے لفظی مناقشہ میں پڑنا مصلحت نہ سمجھا، اور ممکن ہے یہ لوگ ان فرقوں میں سے ہوں جو عقیدہ اسلام کے موافق مسیح علیہ السلام کے قتل وصلب کا قطعاً انکار کرتے تھے اور رفع جسمانی کے قائل تھے، جیسا کہ حافظ ابن تیمیہ نے ''الجواب الصحيح'' میں اور ''الفارق بين المخلوق و الخالق'' کے مصنف نے تصریح کی ہے کہ شام ومصر کے نصاریٰ عموماً اسی عقیدہ پر تھے مدت کے بعد پولوس نے عقیدہ صلب کی اشاعت کی، پھر یہ خیال یورپ سے مصر وشام وغیرہ پہنچا بہرحال نبی کریم ﷺ کا ''ان عيسىٰ اتى عليه الفناء'' کے بجائے: ''ياتى عليه الفناء'' فرمانا، درآں حالیکہ پہلے الفاظ تردید الوہیت مسیح کے موقع پر زیادہ صاف اور مسکت ہوتے، ظاہر کرتا ہے کہ موقع الزام میں بھی مسیح علیہ السلام پر موت سے پہلے لفظ کا اطلاق آپ نے پسند نہیں کیا۔

نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ③ مِنْ قَبْلُ

اتاری تجھ پر کتاب سچی ۱؎ تصدیق کرتی ہے اگلی کتابوں کی اور اتارا تورات اور انجیل کو، اس کتاب سے پہلے

هُدًى لِّلنَّاسِ وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ؕ

لوگوں کی ہدایت کے لئے ۲؎ اور اتارے فیصلے ۳؎ بیشک جو منکر ہوئے اللہ کی آیتوں سے ان کے واسطے سخت عذاب ہے

وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ④ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَخْفٰى عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ ⑤

اور اللہ زبردست ہے بدلہ لینے والا ۴؎ اللہ پر چھپی نہیں کوئی چیز زمین میں اور نہ آسمان میں ⑤

خلاصہ تفسیر: اب یہاں سے توحید کی دلیل نقلی ذکر فرماتے ہیں جس کا حاصل یہ ہے کہ تمام آسمانی کتب اور انبیاء کی باتیں توحید پر متفق ہیں، اور اس دلیل کے ضمن میں: نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ سے نبوت محمدیہ کی طرف بھی اشارہ فرما دیا۔

اللہ تعالیٰ نے آپ (ﷺ) کے پاس قرآن بھیجا ہے واقعیت کے ساتھ اس کیفیت سے کہ وہ تصدیق کرتا ہے ان (آسمانی) کتابوں کی جو اس سے پہلے ہو چکی ہیں، اور (اسی طرح) بھیجا تھا توریت اور انجیل کو، اس کے قبل لوگوں کی ہدایت کے واسطے (اور اسی سے قرآن کا ہدایت ہونا بھی

لازم آگیا، کیونکہ جو ہدایت کا مصدق ہے وہ بھی ہدایت ہے) اور اللہ تعالیٰ نے (انبیاء کی تصدیق کے واسطے) بھیجے معجزات (اب منکرین توحید کے بارے میں وعید ارشاد فرماتے ہیں کہ) بیشک جو لوگ منکر ہیں اللہ تعالیٰ کی (ان) آیتوں کے (جو توحید پر دلالت کرتی ہیں) ان کے لئے سزا سخت ہے، اور اللہ تعالیٰ غالب (اور قدرت) والے ہیں (کہ بدلہ لے سکتے ہیں اور) بدلہ لینے والے (بھی) ہیں (اب توحید کا تمہ ذکر فرماتے ہیں:) بیشک اللہ تعالیٰ سے کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں ہے (نہ کوئی چیز) زمین میں اور نہ (کوئی چیز) آسمان میں (پس ان کا علم بھی نہایت کامل ہے)۔

* * *

فائدہ: ۱۔ نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ: یعنی قرآن کریم جو عین حکمت کے موافق نہایت بروقت سچائی اور انصاف کو اپنی آغوش میں لے کر اترا۔

فائدہ: ۲۔ مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ: یعنی قرآن اگلی کتابوں کی تصدیق کرتا ہے اور اگلی کتابیں (تورات و انجیل وغیرہ) پہلے سے قرآن اور اسکے لانے والے کی طرف لوگوں کی راہنمائی کر رہی تھیں اور اپنے اپنے وقت میں مناسب احکام و ہدایات دیتی تھیں، گویا بتلا دیا کہ ''الوہیت'' یا ''ابنیت مسیح'' کا عقیدہ کسی آسمانی کتاب میں موجود نہ تھا، کیونکہ اصول دین کے اعتبار سے تمام کتب سماویہ متفق و متحد ہیں، مشرکانہ عقائد کی تعلیم کبھی نہیں دی گئی۔

فائدہ: ۳۔ وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ: یعنی ہر زمانہ کے مناسب ایسی چیزیں اتاریں جو حق و باطل، حلال و حرام اور جھوٹ سچ کے درمیان فیصلہ کرنے والی ہوں، اس میں قرآن کریم، کتب سماویہ، معجزات انبیاء سب داخل ہو گئے اور ادھر بھی اشارہ ہو گیا کہ جن مسائل میں یہود و نصاریٰ جھگڑتے چلے آرہے ہیں، ان اختلافات کا فیصلہ بھی قرآن کے ذریعہ سے کر دیا گیا۔

فائدہ: ۴۔ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ: یعنی ایسے مجرموں کو نہ سزا دیئے بغیر چھوڑے گا، نہ وہ اسکے زبردست اقتدار سے چھوٹ کر بھاگ سکیں گے، اس میں بھی الوہیت مسیح کے ابطال کی طرف لطیف اشارہ ہو گیا، کیونکہ جو اختیار و اقتدار کلی خدا کے لئے ثابت کیا گیا، ظاہر ہے وہ مسیح میں نہیں پایا جاتا، بلکہ نصاریٰ کے نزدیک حضرت مسیح کسی کو سزا تو کیا دے سکتے، خود اپنے کو باوجود سخت تضرع والحاح کے ظالموں کے پنجہ سے نہ چھڑا سکے، پھر خدا یا خدا کا بیٹا کیسے بن سکتے ہیں؟ بیٹا وہی کہلاتا ہے جو باپ کی نوع سے ہو، لہذا خدا کا بیٹا خدا ہی ہونا چاہیئے، ایک عاجز مخلوق کو حقیقۃً قادر مطلق کا بیٹا کہنا، باپ اور بیٹے دونوں پر سخت عیب لگانا ہے، العیاذ باللہ۔

فائدہ: ۵۔ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ: یعنی جس طرح اسکا اقتدار و اختیار کامل ہے، علم بھی محیط ہے، عالم کی کوئی چھوٹی بڑی چیز ایک سیکنڈ کے لئے اس سے غائب نہیں سب مجرم و بری، اور تمام جرموں کی نوعیت و مقدار اس کے علم میں ہے، مجرم بھاگ کر روپوش ہونا چاہے تو کہاں ہو سکتا ہے؟ یہیں سے تنبیہ کر دی گئی کہ مسیح علیہ السلام خدا نہیں ہو سکتے، کیونکہ ایسا علم محیط ان کو حاصل نہ تھا، وہ اسی قدر جانتے تھے جتنا حق تعالیٰ ان کو بتلا دیتا تھا، جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب میں خود نصاریٰ نجران نے اقرار کیا اور آج بھی اناجیل مروجہ سے ثابت ہے۔

هُوَ الَّذِيْ يُصَوِّرُكُمْ فِي الْاَرْحَامِ كَيْفَ يَشَآءُ ؕ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۶

وہی تمہارا نقشہ بناتا ہے ماں کے پیٹ میں جس طرح چاہے، کسی کی بندگی نہیں اس کے سوا زبردست ہے حکمت والا

خلاصہ تفسیر: وہ ایسی ذات (پاک) ہے کہ تمہاری صورت (شکل) بناتا ہے، جس طرح چاہتا ہے (کسی کی صورت کیسی ہے اور کسی کی کیسی، پس ان کی قدرت بھی کامل ہے، غرض حیات اور قومیت اور علم اور قدرت جو تمام صفات کاملہ کی اصل الاصول ہیں حق تعالیٰ میں کامل طور پر بلا شرکت غیرے موجود ہیں جس سے ثابت ہوا کہ) کوئی عبادت کے لائق نہیں، بجز اس (ذات پاک) کے (اور) وہ غلبہ والے ہیں (منکر توحید سے انتقام لے سکتے ہیں، لیکن) حکمت والے (بھی) ہیں (کہ مصلحت کی وجہ سے دنیا میں ڈھیل دے رکھی ہے)۔

روح المعانی میں ربیع سے منقول ہے کہ چند نصاریٰ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مذہبی گفتگو شروع کی، آپ نے اپنی مفصل

تقریر میں تثلیث کے باطل ہونے پر اللہ تعالیٰ کی صفت حیات دائمی اور قیومیت کاملہ اور علم محیط اور قدرت بے مثال سے اس کا یکتا ہونا ثابت فرمایا اور یہ مقدمات ان کو تسلیم کرنا پڑے اور مان گئے کہ عیسیٰ علیہ السلام میں یہ صفات موجود نہیں تو وہ خدا کے بیٹے اور شریک نہیں ہو سکتے، کیونکہ بیٹا اپنے باپ کا ہم جنس ہوا کرتا ہے، اور ناجنس اولاد پیدا ہونا خود مخلوق کے لیے عیب شمار ہوتا ہے، تو خالق کے لیے کیوں عیب نہ ہوگا تو عیسیٰ علیہ السلام جب خدا کے ہم جنس نہیں ہو سکتے تو ان کو خدا کا بیٹا کہنا بھی غلط ہو گیا، اخیر میں وہ لوگ کہنے لگے کہ اچھا آپ ان کو روح اللہ اور کلمۃ اللہ تو مانتے ہیں؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بیشک مانتے ہیں، کہنے لگے کہ بس ہم کو اتنا ہی کافی ہے، اس سے ہمارا مدعا ثابت ہو گیا اس کا جواب اگلی آیت میں آتا ہے۔

❀ ❀ ❀

فائدہ: یعنی اپنے علم وحکمت کے مطابق کمال قدرت سے جیسا اور جس طرح چاہا ماں کے پیٹ میں تمہارا نقشہ بنایا مذکر، مونث، خوبصورت، بدصورت، جیسا پیدا کرنا تھا کر دیا، ایک پانی کے قطرہ کو کتنی پلٹیاں دے کر آدمی کی صورت عطا فرمائی، جس کی قدرت وصنعت کا یہ حال ہے کیا اس کے علم میں کمی ہو سکتی ہے، یا کوئی انسان جو خود بھی بطن مادر کی تاریکیوں میں رہ کر آیا ہو اور عام بچوں کی طرح کھاتا پیتا، پیشاب پاخانہ کرتا ہو، اس خداوند قدوس کا بیٹا یا پوتا کہلایا جا سکتا ہے؟ كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ۭ اِنْ يَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا (الکہف:۵) عیسائیوں کا سوال تھا کہ جب مسیح کا ظاہری باپ کوئی نہیں تو بجز خدا کے کس کو باپ کہیں؟ هُوَ الَّذِيْ يُصَوِّرُكُمْ فِي الْاَرْحَامِ كَيْفَ يَشَاۗءُ میں اس کا جواب بھی ہو گیا، یعنی خدا کو قدرت ہے رحم میں جس طرح چاہے آدمی کا نقشہ تیار کر دے، خواہ ماں باپ کے ملنے سے یا صرف ماں کی قوت منفعلہ سے، اسی لئے آگے فرمایا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ یعنی زبردست ہے جس کی قدرت کو کوئی محدود نہیں کر سکتا، اور "حکیم" ہے جہاں جیسا مناسب جانتا ہے کرتا ہے، "حواء" کو بدون ماں کے "مسیح" کو بدون باپ کے، "آدم" کو بدون ماں باپ دونوں کے پیدا کر دیا، اس کی حکمتوں کا احاطہ کون کر سکے۔

هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ

وہی ہے جس نے اتاری تجھ پر کتاب اس میں بعض آیتیں ہیں محکم یعنی ان کے معنی واضح ہیں وہ اصل ہیں کتاب کی اور دوسری ہیں

مُتَشٰبِهٰتٌ ۭ فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاۗءَ الْفِتْنَةِ

مشابہ یعنی جن کے معنی معلوم یا معین نہیں، سو جن کے دلوں میں کجی ہے وہ پیروی کرتے ہیں متشابہات کی گمراہی پھیلانے کی غرض سے

وَابْتِغَاۗءَ تَاْوِيْلِهٖ ڤ وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ ڤ وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ

اور مطلب معلوم کرنے کی وجہ سے، اور ان کا مطلب کوئی نہیں جانتا سوا اللہ کے، اور مضبوط علم والے کہتے ہیں ہم اس پر یقین لائے

كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝

سب ہمارے رب کی طرف سے اتری ہیں، اور سمجھانے سے وہی سمجھتے ہیں جن کو عقل ہے

خلاصہ تفسیر: گذشتہ آیتوں میں توحید باری تعالیٰ کا اثبات تھا، اس آیت میں توحید کے خلاف بعض شبہات کا جواب ہے، جب توحید ثابت ہو گئی تو اسی سے عیسائیوں کے عقیدہ تثلیث کا باطل ہونا بھی ثابت ہو گیا، منکرین کا توحید کے خلاف بعض وہم میں ڈالنے والے کلمات یعنی "روح اللہ" اور "کلمۃ اللہ" سے استدلال ہو سکتا تھا، اللہ تعالیٰ نے یہاں ان شبہات کو ختم فرما دیا کہ یہ کلمات متشابہات ہیں، ان کے ظاہری معنی مراد نہیں ہوتے، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے درمیان راز ہیں، جن کی حقیقت پر عوام مطلع نہیں ہو سکتے، عوام کے لئے ان الفاظ کی تحقیق میں پڑنا بھی روا نہیں، ان پر اس طرح ایمان لانا ضروری ہے کہ جو کچھ ان سے اللہ تعالیٰ کی مراد ہے، وہ حق ہے، مزید تفتیش اور کھود کرید کرنے کی اجازت نہیں۔

وہ (اللہ تعالیٰ) ایسا ہے جس نے نازل کیا تم پر کتاب کو، جس کا ایک حصہ وہ آیتیں ہیں جو کہ اشتباہ مراد سے محفوظ ہیں (یعنی ان کا مطلب ظاہر ہے) اور یہی آیتیں اصلی مدار ہیں (اس) کتاب (یعنی قرآن) کا (یعنی جن کے معنی ظاہر نہ ہوں ان کو بھی انہی کے موافق بنایا جاتا ہے جن کے معنی واضح ہیں) اور دوسری آیتیں ایسی ہیں جو کہ مشتبہ المراد ہیں (یعنی ان کا مطلب خفی ہے، خواہ مجمل ہونے کی وجہ سے، یا اس وجہ سے کہ وہ کسی واضح اور ظاہر نص کے معارض ہے) سو جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے وہ تو اس کے اسی حصہ کے پیچھے ہو لیتے ہیں جو مشتبہ المراد ہے (دین میں) شورش ڈھونڈنے کی غرض سے اور اس (مشتبہ المراد یعنی جن کا مطلب خفی ہے) کے (غلط) مطلب ڈھونڈنے کی غرض سے (تاکہ اپنے غلط عقیدہ میں اس سے مدد حاصل کریں) حالانکہ اس کا (صحیح) مطلب بجز حق تعالیٰ کے کوئی اور نہیں جانتا (پھر اگر خود حق تعالیٰ نے قرآن یا حدیث کے ذریعہ سے صراحۃً یا اشارۃً بتلا دیا تو معلوم ہو گیا، جیسے لفظ ''صلوٰۃ'' کی مراد صراحۃً معلوم ہو گئی، اور ''استواء علی العرش'' وغیرہ کی تاویل بعض کی رائے پر قواعد کلیہ سے معلوم ہو گئی، تو بس اسی قدر دوسروں کو بھی خبر ہو سکتی ہے، اس سے زیادہ معلوم نہیں ہو سکتا، جیسے مقطعات قرآنیہ ''الف لام میم'' وغیرہ کے معنی کسی کو معلوم نہیں ہوئے، اور بعض کی رائے پر استواء علی العرش کے معنی بھی معلوم نہیں ہوئے)۔

اور (اسی واسطے) جو لوگ علم (دین) میں پختہ کار (اور فہیم) ہیں وہ (ایسی آیتوں کے متعلق) یوں کہتے ہیں کہ ہم اس پر (اجمالاً) یقین رکھتے ہیں (یہ) سب (آیتیں ظاہر المعنی بھی خفی المعنی بھی) ہمارے پروردگار کی طرف سے ہیں (پس ان کے جو کچھ معنی اور مراد واقع میں ہوں وہ حق ہیں) اور نصیحت (کی بات کو) وہی لوگ قبول کرتے ہیں جو کہ اہل عقل ہیں (یعنی عقل کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ مفید اور ضروری بات میں مشغول ہو مضر اور فضول قصہ میں نہ لگے)۔

فاما الذین فی قلوبھم زیغ (الی قولہ) کل من عند ربنا: اس آیت سے یہ معلوم ہو رہا ہے کہ اگر کوئی کلام ایسا ہو جس کے سچا ہونے میں کوئی شک نہ ہو، لیکن اس کی مراد واضح نہ ہو تو اس کا حکم یہ ہے کہ ایسے کلام کی اجمالاً تصدیق کی جائے، لیکن گہرائی میں جانے کی کوشش نہ کی جائے، محققین نے فرمایا ہے کہ اسی طرح بعض اہل اللہ جن کے کلام کا سچا ہونا تو ثابت ہو لیکن اس کی مراد معلوم نہ ہو تو سلامتی اسی میں ہے کہ ان کا انکار نہ کیا جائے اور نہ ظاہر پر محمول کیا جائے، بلکہ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔

* * *

فائدہ: نصاریٰ نجران نے تمام دلائل سے عاجز ہو کر بطور معارضہ کہا تھا کہ آخر آپ حضرت مسیح کو ''کلمۃ اللہ'' اور ''روح اللہ'' مانتے ہیں، بس ہمارے اثبات مدعا کیلئے یہ الفاظ کافی ہیں، یہاں اس کا تحقیقی جواب ایک عام اصول اور ضابطہ کی صورت میں دیا جس کے سمجھ لینے کے بعد ہزاروں نزاعات ومناقشات کا خاتمہ ہو سکتا ہے، اسکو یوں سمجھو کہ قرآن کریم بلکہ تمام کتب الٰہیہ میں دو قسم کی آیات پائی جاتی ہیں:

① ایک وہ جن کی مراد معلوم و متعین ہو، خواہ اس لئے کہ لغت و ترکیب وغیرہ کے لحاظ سے الفاظ میں کوئی ابہام واجمال نہیں، نہ عبارت کئی معنیٰ کا احتمال رکھتی ہے، نہ جو مدلول سمجھا گیا وہ عام قواعد مسلمہ کے مخالف ہے، اور یا اس لئے کہ عبارت والفاظ میں گو لغۃً کئی معنیٰ کا احتمال ہو سکتا تھا، لیکن شارع کی نصوص مستفیضہ یا اجماع معصوم یا مذہب کے عام اصول مسلمہ سے قطعاً متعین ہو چکا کہ متکلم کی مراد وہ معنیٰ نہیں، یہ ہے، ایسی آیات کو ''محکمات'' کہتے ہیں اور فی الحقیقت کتاب کی ساری تعلیمات کی جڑ اور اصل اصول یہ ہی آیات ہوتی ہیں۔

② دوسری قسم آیات کی ''متشابہات'' کہلاتی ہے، یعنی جن کی مراد معلوم و متعین کرنے میں کچھ اشتباہ والتباس واقع ہو جائے۔

صحیح طریقہ یہ ہے کہ اس دوسری قسم کی آیات کو پہلی قسم کی طرف راجع کر کے دیکھنا چاہیے، جو معنی اس کے خلاف پڑیں، ان کی قطعاً نفی کی جائے اور متکلم کی مراد وہ سمجھی جائے جو ''آیات محکمات'' کے مخالف نہ ہو، اگر باوجود اجتہاد وسعی بلیغ کے متکلم کی مراد کی پوری پوری تعیین نہ کر سکیں تو دعویٰ ہمہ دانی کر کے ہم کو حد سے گزرنا نہیں چاہیے، جہاں قلت علم اور قصور استعداد کی وجہ سے بہت سے حقائق پر ہم دسترس نہیں پا سکتے اس کو بھی اسی فہرست میں شامل کر لیں، مگر زنہار ایسی تاویلات اور ہیر پھیر نہ کریں جو مذہب کے اصول مسلمہ اور آیات محکمہ کے خلاف ہوں، مثلاً قرآن حکیم نے مسیح علیہ السلام

کی نسبت تصریح کردی: اِنۡ هُوَ اِلَّا عَبۡدٌ اَنۡعَمۡنَا عَلَیۡهِ (الزخرف:۵۹) یا: اِنَّ مَثَلَ عِیۡسٰی عِنۡدَ اللّٰهِ کَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَهٗ مِنۡ تُرَابٍ (آل عمران:۵۹) یا: ذٰلِكَ عِیۡسَی ابۡنُ مَرۡیَمَ ۚ قَوۡلَ الۡحَقِّ الَّذِیۡ فِیۡهِ یَمۡتَرُوۡنَ مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنۡ یَّتَّخِذَ مِنۡ وَّلَدٍ ۙ سُبۡحٰنَهٗ (مریم:۳۴-۳۵) اور جا بجا ان کی الوہیت وابنیت کا رد کیا، اب ایک شخص ان سب محکمات سے آنکھیں بند کر کے کَلِمَتُهٗ ۚ اَلۡقٰهَاۤ اِلٰی مَرۡیَمَ وَرُوۡحٌ مِّنۡهُ وغیرہ متشابہات کو لے دوڑے اور اسکے وہ معنی چھوڑ کر جو محکمات کے موافق ہوں، ایسے سطحی معنی لینے لگے جو کتاب کی عام تصریحات اور متواتر بیانات کے منافی ہوں، یہ کج روی اور ہٹ دھرمی نہیں تو اور کیا ہوگی، بعض قاسی القلب تو چاہتے ہیں کہ اس طرح مغالطہ دے کر لوگوں کو گمراہی میں پھنسا دیں اور بعض کمزور عقیدہ والے ڈھلمل یقین ایسے متشابہات سے اپنی رائے وہوا کے مطابق کھینچ تان کر مطلب نکالنا چاہتے ہیں، حالانکہ ان کا صحیح مطلب صرف اللہ ہی کو معلوم ہے، وہ ہی اپنے کرم سے جس کو جس قدر حصہ پر آگاہ کرنا چاہے کر دیتا ہے، جو لوگ مضبوط علم رکھتے ہیں وہ محکمات ومتشابہات سب کو حق جانتے ہیں، انہیں یقین ہے کہ دونوں قسم کی آیات ایک ہی سرچشمہ سے آئی ہیں، جن میں تناقض وتہافت کا امکان نہیں، اسی لئے وہ متشابہات کو محکمات کی طرف لوٹا کر مطلب سمجھتے ہیں، اور جو حصہ ان کے دائرہ فہم سے باہر ہوتا ہے، اسے اللہ پر چھوڑتے ہیں کہ وہ ہی بہتر جانے، ہم کو ایمان سے کام ہے۔

تنبیہ: بندہ کے نزدیک اس آیت کا مضمون سورہ حج کی آیت وَمَاۤ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ مِنۡ رَّسُوۡلٍ وَّلَا نَبِیٍّ اِلَّاۤ اِذَا تَمَنّٰۤی اَلۡقَی الشَّیۡطٰنُ فِیۡۤ اُمۡنِیَّتِهٖ ۚ فَیَنۡسَخُ اللّٰهُ مَا یُلۡقِی الشَّیۡطٰنُ ثُمَّ یُحۡكِمُ اللّٰهُ اٰیٰتِهٖ (الحج:۵۲) کے مضمون سے بے حد مشابہ ہے جسے ان شاء اللہ اس کے موقع پر بیان کیا جائے گا۔

رَبَّنَا لَا تُزِغۡ قُلُوۡبَنَا بَعۡدَ اِذۡ هَدَیۡتَنَا وَهَبۡ لَنَا مِنۡ لَّدُنۡكَ رَحۡمَةً ۚ اِنَّكَ اَنۡتَ الۡوَهَّابُ ⑧

اے رب! نہ پھیر ہمارے دلوں کو جب تو ہم کو ہدایت کر چکا اور عنایت کر ہم کو اپنے پاس سے رحمت، تو ہی ہے سب کچھ دینے والا[1]

رَبَّنَاۤ اِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِیَوۡمٍ لَّا رَیۡبَ فِیۡهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُخۡلِفُ الۡمِیۡعَادَ ⑨ ع

اے رب! تو جمع کرنے والا ہے لوگوں کو ایک دن جس میں کچھ شبہ نہیں، بیشک اللہ خلاف نہیں کرتا اپنا وعدہ[2]

خلاصہ تفسیر: پچھلی آیت میں حق پرستوں کے ایک کمال کا ذکر تھا کہ وہ باوجود علمی کمال رکھنے کے اس پر مغرور نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ سے استقامت کی دعا کرتے تھے، اگلی آیات میں اللہ تعالیٰ ان کے دوسرے کمال کو بیان فرما رہے ہیں۔

اے ہمارے پروردگار! ہمارے دلوں کو کج نہ کیجئے بعد اس کے کہ آپ ہم کو (حق کی طرف) ہدایت کر چکے ہیں اور ہم کو اپنے پاس سے رحمت (خاصہ) عطا فرمایئے (وہ رحمت یہ ہے کہ ہم راہ مستقیم پر قائم رہیں) بلاشبہ آپ بڑے عطا فرمانے والے ہیں۔

اے ہمارے پروردگار! (ہم کجی سے بچنے کی اور حق پر قائم رہنے کی یہ دعا کسی دنیاوی غرض سے نہیں مانگتے، بلکہ محض آخرت کی نجات کی غرض سے، کیونکہ ہمارا عقیدہ ہے کہ) آپ بلاشبہ تمام آدمیوں کو (میدان حشر میں) جمع کرنے والے ہیں، اس دن میں جس (کے آنے) میں ذرا شک نہیں (یعنی قیامت کے دن میں، اور شک نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس کے آنے کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے اور) بلاشبہ اللہ تعالیٰ خلاف نہیں کرتے وعدہ کو (اس لئے قیامت کا آنا ضرور ہے اور اس واسطے ہمیں اس کی فکر ہے)۔

* * *

فائدہ: [1] یعنی راسخین فی العلم اپنے کمال علمی اور قوت ایمانی پر مغرور ومطمئن نہیں ہوتے بلکہ ہمیشہ حق تعالیٰ سے استقامت اور مزید فضل وعنایت کے طلبگار رہتے ہیں تاکہ کمائی ہوئی پونجی ضائع نہ ہو جائے اور خدانکردہ دل سیدھے ہونے کے بعد کج نہ کر دیئے جائیں۔ حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم (امت کو سنانے کے لئے) اکثر یہ دعا کیا کرتے تھے یَا مُقَلِّبَ الۡقُلُوۡبِ ثَبِّتۡ قَلۡبِیۡ عَلٰی دِیۡنِكَ

فائدہ: [2] وہ دن ضرور آکر رہے گا اور ''زائغین'' (کج رو) جن مسائل میں جھگڑتے تھے سب کا دوٹوک فیصلہ ہو جائے گا، پھر ہر ایک مجرم

کو اپنی کج روی اور ہٹ دھرمی کی سزا بھگتنی پڑے گی، اسی خوف سے ہم ان کے راستہ سے بیزار اور آپ کی رحمت واستقامت کے طالب ہوتے ہیں، ہمارا ''زائغین'' کے خلاف راستہ اختیار کرنا کسی بدنیتی اور نفسانیت کی بنا پر نہیں محض اخروی فلاح مقصود ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمْ

بیشک جو لوگ کافر ہیں ہرگز کام نہ آویں گے ان کو ان کے مال اور نہ ان کی اولاد اللہ کے سامنے کچھ، اور وہی ہیں

وَقُوْدُ النَّارِ ⑩ كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ

ایندھن دوزخ کے ۱؎ جیسے دستور فرعون والوں کا اور جو ان سے پہلے تھے، جھٹلایا انہوں نے ہماری آیتوں کو، پھر پکڑا ان کو اللہ نے

بِذُنُوْبِهِمْ ؕ وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ⑪

ان کے گناہوں پر، اور اللہ کا عذاب سخت ہے ۲؎

خلاصہ تفسیر: بالیقین جو لوگ کفر کرتے ہیں ہرگز ان کے کام نہیں آسکتے، ان کے مال (دولت) اور نہ ان کی اولاد اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں ذرہ برابر بھی، ایسے لوگ جہنم کا ایندھن ہوں گے (ان لوگوں کا معاملہ ایسا ہے) جیسا معاملہ تھا فرعون والوں کا اور ان سے پہلے والے (کافر) لوگوں کا (وہ معاملہ یہ تھا) کہ انہوں نے ہماری آیتوں کو (یعنی اخبار واحکام کو) جھوٹا بتلایا، اس پر اللہ تعالیٰ نے ان پر دارو گیر فرمائی ان کے گناہوں کے سبب، اور اللہ تعالیٰ (کی دارو گیر بڑی سخت ہے، کیونکہ ان کی شان یہ ہے کہ وہ) سخت سزا دینے والے ہیں (ایسا ہی معاملہ ان لوگوں نے کیا کہ انہوں نے بھی ہماری آیتوں کو جھٹلایا، سو ان کو بھی ایسی ہی سزا ہوگی)۔

لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا: ''مقابلہ میں کام آنے'' کے دو معنی ہوسکتے ہیں: ① ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت وعنایت کی ضرورت نہ ہو، اس کے عوض صرف مال واولاد نافع اور کافی ہوجائے ② دوسرے یہ کہ مال واولاد کے ذریعہ سے خدا کا مقابلہ کر کے عذاب سے بچ جائیں، مقابلہ کا لفظ دونوں جگہ بولا جاتا ہے، سو آیت میں دونوں کی نفی کردی گئی۔

* * * *

فائدہ: ۱؎ قیامت کے ذکر کے ساتھ کافروں کا انجام بھی بتلا دیا کہ ان کو کوئی چیز دنیا وآخرت میں خدائی سزا سے نہیں بچاسکتی، جیسا کہ میں ابتداء سورۃ میں لکھ چکا ہوں، ان آیات میں اصلی خطاب وفد ''نجران'' کو تھا جسے عیسائی مذہب وقوم کی سب سے بڑی نمائندہ جماعت کہنا چاہیے، امام فخر الدین رازیؒ نے محمد بن اسحاق کی سیرت سے نقل کیا ہے کہ جس وقت یہ وفد ''نجران'' سے بقصد مدینہ روانہ ہوا تو ان کا بڑا پادری ابوحارثہ بن علقمہ خچر پر سوار تھا، خچر نے ٹھوکر کھائی تو اس کے بھائی کرز بن علقمہ کی زبان سے نکلا ''تعس الابعد'' (ابعد سے مراد محمد ﷺ تھے، العیاذ باللہ) ابوحارثہ نے کہا ''تعست امك'' کرز نے حیران ہوکر اس کلمہ کا سبب پوچھا، ابوحارثہ نے کہا: واللہ ہم خوب جانتے ہیں کہ یہ (محمد ﷺ) وہ ہی نبی منتظر ہیں جن کی بشارت ہماری کتابوں میں دی گئی تھی، کرز نے کہا پھر مانتے کیوں نہیں؟ بولا ''لأنّ هٰؤلاء الملوك اعطونا أموالا كثيرة وأكرمونا فلو أمنا بمحمد لاخذوا منا كل هذه الأشياء'' (اگر محمد پر ایمان لے آئے تو یہ بادشاہ جو بیشمار دولت ہم کو دے رہے ہیں اور اعزاز واکرام کر رہے ہیں سب واپس کرلیں گے) کرز نے اس کلمہ کو اپنے دل میں رکھا اور آخر کار یہ ہی کلمہ ان کے اسلام کا سبب ہوا (رضی اللہ عنہ وارضاہ)۔

میرے نزدیک ان آیات میں ابوحارثہ کے ان ہی کلمات کا جواب ہے، گویا دلائل عقلیہ ونقلیہ سے ان کے فاسد عقیدہ کا رد کر کے متنبہ فرما دیا کہ وضوح حق کے بعد جو لوگ محض دنیاوی متاع (اموال واولاد وغیرہ) کی خاطر ایمان نہیں لاتے وہ خوب سمجھ لیں کہ مال و دولت اور جتھے نہ ان کو دنیا میں خدائی سزا سے بچاسکتے ہیں نہ آخرت میں عذاب سے، چنانچہ اس کی تازہ مثال ابھی ''بدر'' کے موقع پر مسلمان اور مشرکین کی لڑائی میں دیکھ چکے ہو، دنیا

کی بہار محض چندروزہ ہے، مستقبل کی کامیابی ان ہی کے لئے ہے جو خدا سے ڈرتے اور تقویٰ اختیار کرتے ہیں، دور تک یہ مضمون چلا گیا ہے اور عموم الفاظ کے اعتبار سے یہود و مشرکین وغیرہ دوسرے کفار کو بھی خطاب میں لپیٹ لیا گیا، گو اصلی مخاطب نصاریٰ نجران تھے، واللہ اعلم۔

فائدہ: ۲ یعنی کسی کے ٹالے ٹل نہیں سکتا اور جس طرح وہ پکڑے گئے تم بھی خدا کی پکڑ میں آنے والے ہو۔

قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ وَتُحْشَرُوْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ ؕ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۱۲﴾

کہہ دے کافروں کو کہ اب تم مغلوب ہو گے اور ہانکے جاؤ گے دوزخ کی طرف، اور کیا برا ٹھکانا ہے

خلاصہ تفسیر: (اور) ان کفر کرنے والے لوگوں سے (یوں بھی) فرما دیجئے کہ (تم یہ نہ سمجھنا کہ یہ پکڑ دھکڑ صرف آخرت میں ہوگی، بلکہ یہاں اور وہاں دونوں جگہ ہوگی، چنانچہ دنیا میں) عنقریب تم (مسلمانوں کے ہاتھ سے) مغلوب کئے جاؤ گے، اور (آخرت میں) جہنم کی طرف جمع کر کے لے جائے جاؤ گے، اور وہ (جہنم) ہے برا ٹھکانا۔

قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ: ان کافروں سے مراد آیت میں خاص کافر ہیں، چنانچہ ان میں سے مشرکین پر قتل و قید کی مصیبت اور یہود پر قتل و قید کے ساتھ جزیہ اور جلاوطنی کی بھی سزا نازل ہوئی، پس کوئی اس آیت سے یہ شبہ نہ کرے کہ آیت سے تو معلوم ہوتا ہے کہ کفار مغلوب ہوں گے، حالانکہ دنیا کے سب کفار تو مغلوب نہیں ہیں؟ یہ شبہ اس لئے نہیں ہوسکتا کہ یہاں کفار سے تمام دنیا بھر کے کفار مراد نہیں ہیں، بلکہ اس وقت کے مشرکین اور یہود مراد ہیں، چنانچہ مشرکین کو قتل و قید اور یہود کو قتل و قید کے ساتھ ساتھ جزیہ اور جلاوطنی کے ذریعہ مغلوب کیا گیا تھا، رہی سزائے آخرت تو وہ سب کفار کو عام ہے۔

❋ ❋ ❋

فائدہ: یعنی وقت آ گیا ہے کہ تم سب کیا یہود، کیا نصاریٰ اور کیا مشرکین عنقریب خدائی لشکر کے سامنے مغلوب ہو کر ہتھیار ڈالو گے، یہ تو دنیا کی ذلت ہوئی اور آخرت میں جو گرم مکان تیار ہے وہ الگ رہا، بعض روایات میں ہے کہ "بدر" سے فاتحانہ واپسی کے بعد حضور ﷺ نے یہود کو فرمایا کہ تم حق کو قبول کر لو، ورنہ جو حال قریش کا ہوا، تمہارا ہوگا، کہنے لگے، اے محمد! اس دھوکہ میں نہ رہیئے کہ تم نے قریش کے چند ناتجربہ کاروں پر فتح حاصل کر لی، ہم سے مقابلہ ہوا تو پتہ لگ جائے گا کہ ہم (جنگ آزمودہ سپاہی اور بہادر) آدمی ہیں اس پر یہ آیتیں نازل ہوئیں، بعض کہتے ہیں کہ "بدر" کی فتح دیکھ کر "یہود" کچھ تصدیق کی طرف مائل ہونے لگے تھے، پھر کہا کہ جلدی مت کرو، دیکھو آئندہ کیا ہوتا ہے، دوسرے سال "احد" کی عارضی پسپائی دیکھ کر ان کے دل سخت ہو گئے اور حوصلے بڑھ گئے، حتیٰ کہ عہد شکنی کر کے مسلمانوں سے لڑائی کا سامان کیا، کعب بن اشرف ساٹھ سواروں کے ساتھ مکہ معظمہ جا کر ابوسفیان وغیرہ سرداران قریش سے ملا اور کہا ہم تم ایک ہیں، متحدہ محاذ قائم کر کے محمد ﷺ کا مقابلہ کرنا چاہیئے، اس پر یہ آیات نازل ہوئیں، واللہ اعلم۔

بہر حال! تھوڑے ہی دنوں بعد خدا نے دکھلا دیا کہ جزیرۃ العرب میں مشرک کا نام نہ رہا، "قریظہ" کے بدعہد یہود تلوار کے گھاٹ اتار دیئے گئے، "بنی نضیر" جلاوطن ہوئے، نجران کے عیسائیوں نے ذلیل ہو کر سالانہ جزیہ دینا قبول کیا، اور تقریباً ایک ہزار سال تک دنیا کی بڑی بڑی مغرور و متکبر قومیں مسلمانوں کی بلندی و برتری کا اعتراف کرتی رہیں، فالحمد للہ علیٰ ذٰلک۔

قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ فِيْ فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا ؕ فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاُخْرٰى كَافِرَةٌ يَّرَوْنَهُمْ

ابھی گزر چکا ہے تمہارے سامنے ایک نمونہ دو فوجوں میں جن میں مقابلہ ہوا، ایک فوج ہے کہ لڑتی ہے اللہ کی راہ میں اور دوسری فوج کافروں کی ہے دیکھتے ہیں

مِّثْلَيْهِمْ رَاْيَ الْعَيْنِ ؕ وَاللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ ﴿۱۳﴾

یہ ان کو اپنے سے دو چند صریح آنکھوں سے، اور اللہ زور دیتا ہے اپنی مدد کا جس کو چاہے، اسی میں عبرت ہے دیکھنے والوں کو

خلاصه تفسیر: پیچھے کفار کے مغلوب ہونے کی خبر دی گئی تھی اب اس کی ایک نظیر بطور دلیل کے بیان فرماتے ہیں:

بیشک تمہارے (استدلال کے) لئے بڑا نمونہ ہے دو گروہوں (کے واقعہ) میں جو کہ باہم (بدر کی لڑائی میں) ایک دوسرے سے مقابل ہوئے تھے، ایک گروہ تو (یعنی مسلمان) اللہ کی راہ میں لڑتے تھے اور دوسرا گروہ کافر لوگ تھے (اور کافر اس قدر زیادہ تھے کہ) یہ کافر اپنے (گروہ) کو دیکھ رہے تھے کہ ان مسلمانوں سے کئی حصے (زیادہ) ہیں (اور دیکھنا بھی کچھ وہم وخیال کا نہیں، بلکہ) کھلی آنکھوں دیکھنا (جس کے واقع ہونے میں شبہ نہیں تھا، لیکن کفار کے اس قدر زیادہ عدد ہونے کے باوجود پھر بھی اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو غالب کیا) اور (غالب اور مغلوب کرنا محض قبضہ خداوندی میں ہے) اللہ تعالیٰ اپنی امداد سے جس کو چاہتے ہیں قوت دے دیتے ہیں (سو) بلاشک اس (واقعہ) میں بڑی عبرت ہے (اور نمونہ) ہے دیکھنے والوں کیلئے۔

يَرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَأْيَ الْعَيْنِ: روایتوں میں آیا ہے کہ اس روز مسلمان تین سو تیرہ تھے اور کفار ایک ہزار تھے، گویا مسلمانوں سے تین حصے تھے، مگر پھر بھی انجام دیکھ لیا کہ مسلمان ہی غالب رہے، اس سے ہر عاقل منصف استدلال کر سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جب اپنے دین کو غالب کرنا چاہتے ہیں تو کفار کی کثرت اور ثروت اس کو روک نہیں سکتی، سورہ انفال میں یہ بھی ذکر ہے کہ پہلے حق تعالیٰ نے جناب رسول اللہ ﷺ کو خواب میں کفار کا عدد کم دکھلایا، تاکہ آپ مسلمانوں سے اپنا خواب بیان فرمائیں تو مقابلہ کی جرأت بڑھے، پھر جب دونوں گروہ مقابل ہوئے اس وقت مسلمانوں کو بھی کفار کم معلوم ہوئے تاکہ مقابلہ ہو جائے، پھر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو غالب کر دیا، اس پر یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ حضور ﷺ کا خواب خلاف واقعہ کیوں ہوا؟ کیونکہ کفار تو کم نہ تھے، ایسے ہی مسلمانوں نے بھی خلاف واقعہ کفار کو کم دیکھا جبکہ وہ تو بہت زیادہ تھے، تحقیق اس کی یہ ہے کہ خلاف واقعہ دیکھنا غلط دیکھنے کو کہتے ہیں، سو یہاں غلط دیکھنا نہیں پایا گیا، کیونکہ غلط دیکھنا اس کو کہتے ہیں کہ سامنے ہزار ہوں اور ان کو دو سو سمجھا جائے، اور اگر ہزار میں سے دو سو سامنے ہوں اور آٹھ سو پوشیدہ ہوں کہ نظر نہ آئیں تو اس کو خلاف واقعہ دیکھنا نہیں کہہ سکتے، یہاں ایسا ہی ہوا تھا کہ حق تعالیٰ نے حضور ﷺ اور مسلمانوں کو تھوڑے سے دکھلا دیے، اور باقی ان کی نظروں سے چھپا دیے تھے، اور سورہ انفال میں یہ تو فرمایا ہے کہ کفار مسلمانوں کو کم دیکھتے تھے، اور یہاں یہ فرمایا کہ کفار اپنی جماعت کو مسلمانوں سے کئی حصے زیادہ دیکھتے تھے، ان دونوں کا ایک ہی مطلب ہے، جب اپنی جماعت کو زیادہ دیکھا جائے گا تو دوسری جماعت لامحالہ کم نظر آئے گی۔

يَرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَأْيَ الْعَيْنِ: اس میں خوارق عادات کا اثبات ہے (کوئی بات یا عمل ایسا ہو جائے جو عام قانون فطرت کے خلاف ہو تو ایسے واقعات کو ''خارق عادت'' کہا جاتا ہے جو عام طور پر پیش نہیں آتے، چنانچہ بعض مرتبہ اللہ تعالیٰ عادت کے خلاف بھی فیصلہ فرما دیتے ہیں، عادت تو یہ تھی کہ جس کے لشکر میں زیادہ آدمی ہوں اس کا لشکر فتح یاب ہوگا، لیکن اللہ تعالیٰ نے خلاف عادت مسلمانوں کو فتح دی جو کہ جنگ بدر میں کفار کے مقابلہ میں بہت تھوڑے تھے)۔

* * *

فائدہ: جنگ بدر میں کفار تقریباً ایک ہزار تھے جن کے پاس سات سو اونٹ اور ایک سو گھوڑے تھے، دوسری طرف مسلمان مجاہدین تین سو سے کچھ اوپر تھے جن کے پاس کل ستر اُونٹ، دو گھوڑے، چھ زرہیں اور آٹھ تلواریں تھیں اور تماشہ یہ تھا کہ ایک فریق کو حریف مقابل اپنے سے دوگنا نظر آتا تھا، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ کفار کے دل مسلمانوں کی کثرت کا تصوّر کر کے مرعوب ہوتے تھے اور مسلمان اپنے سے دوگنی تعداد دیکھ کر اور زیادہ حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتے اور کامل توکّل واستقلال سے خدا کے وعدہ فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ (الانفال:٦٦) پر اعتماد کر کے فتح ونصرت کی امید رکھتے تھے، اگر ان کی پوری تعداد جو تگنی تھی منکشف ہوتی تو ممکن تھا خوف طاری ہو جاتا، اور یہ فریقین کا دوگنی تعداد دیکھنا بعض احوال میں تھا، ورنہ بعض احوال وہ تھے جب ہر ایک کو دوسرے فریق کی جمعیت کم محسوس ہوتی، جیسا کہ سورۃ انفال میں آئے گا، بہر حال ایک قلیل اور بے سروسامان جماعت کو ایسی مضبوط جمعیت کے مقابلہ میں ان پیشین گوئیوں کے موافق جو مکہ میں کی گئی تھیں، اس طرح مظفر ومنصور کرنا، آنکھیں رکھنے والوں کے لئے بہت بڑا عبرتناک واقعہ ہے۔

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ

فریفتہ کیا ہے لوگوں کو مرغوب چیزوں کی محبت نے جیسے عورتیں [1] اور بیٹے اور خزانے جمع کئے ہوئے سونے

وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ؕ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ

اور چاندی کے اور گھوڑے نشان لگائے ہوئے [2] اور مویشی اور کھیتی، یہ فائدہ اٹھانا ہے دنیا کی زندگی میں

وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ﴿۱۴﴾

اور اللہ کے پاس ہے اچھا ٹھکانا [3]

خلاصہ تفسیر: پیچھے مال واولاد کا آخرت میں کام نہ آنا بیان فرمایا تھا، جس سے ان چیزوں کا بے قدر ہونا لازم آیا، اب آگے اس بے قدری کو صراحۃً بیان فرماتے ہیں، اس کے بعد آخرت کی نعمتوں کا قابل قدر اور لائق رغبت ہونا اور ان نعمتوں کا تقوی کی بدولت حاصل ہونا بیان فرماتے ہیں، اس کے بعد کسی قدر تقوی کی تفصیل اور اس کے بعض شعبے مثلاً ایمان، مناجات، استغفار اور صبر وغیرہ ذکر ہوں گے۔

خوشنما معلوم ہوتی ہے (اکثر) لوگوں کو محبت مرغوب چیزوں کی (مثلاً) عورتیں ہوئیں، بیٹے ہوئے، لگے ہوئے ڈھیر ہوئے سونے اور چاندی کے، نشان لگے ہوئے گھوڑے ہوئے (یا دوسرے) مویشی ہوئے اور زراعت ہوئی (لیکن) یہ سب استعمالی چیزیں ہیں دنیوی زندگانی کی، اور انجام کار کی خوبی (کی چیز) تو اللہ ہی کے پاس ہے (جو موت کے بعد کام آئے گی جس کی تفصیل اگلی آیت میں آتی ہے)۔

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ: یہ جو فرمایا کہ ''ان چیزوں کی محبت خوشنما معلوم ہوتی ہے''، اس کا حاصل میرے ذوق میں یہ ہے کہ ان چیزوں کی محبت ومیلان غالب حالات میں موجب فتنہ ہوجانے کی وجہ سے ڈر کی چیز ہے، اس سے دین کا نقصان ہوتا ہے، مگر اکثر لوگ اس کو نقصان کا سبب نہیں سمجھتے، بلکہ اس محبت ومیلان کو مطلقاً اچھا سمجھتے ہیں، واللہ اعلم۔

* * *

فائدہ: [1] حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ: یعنی جب ان میں پھنس کر آدمی خدا سے غافل ہو جائے، اسی لئے حدیث میں فرمایا: ''ماتركتُ بعدی فتنةً اَضَرَّ عَلَى الرِّجَالِ مِنَ النِّسَاءِ'' (میرے بعد مردوں کے لئے کوئی ضرر رساں فتنہ عورتوں سے بڑھ کر نہیں) ہاں! اگر عورت سے مقصود اعفاف اور کثرت اولاد ہو، تو وہ مذموم نہیں، بلکہ مطلوب ومندوب ہے، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: دنیا کی بہترین متاع نیک بیوی ہے کہ اگر اس کی طرف دیکھے تو خوش ہو، حکم دے تو فرمانبردار پائے، کہیں غائب ہو تو پیٹھ پیچھے شوہر کے مال اور اپنی عصمت کے معاملہ میں اس کی حفاظت کرے، اسی طرح جتنی چیزیں آگے متاع دنیا کے سلسلہ میں بیان ہوئیں، سب کا محمود ومذموم ہونا نیت اور طریق کار کے تفاوت سے متفاوت ہوتا رہے گا، مگر چونکہ دنیا میں کثرت ایسے افراد کی ہے جو عیش وعشرت کے سامانوں میں پھنس کر خدا تعالیٰ کو اور اپنے انجام کو بھول جاتے ہیں، اس لئے زُيِّنَ لِلنَّاسِ میں سطح کلام کی عام رکھی گئی ہے۔

فائدہ: [2] وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ: یعنی جن پر نمبر یا نشان لگائے جائیں یا پانچ کلیان گھوڑے جن کے ہاتھ پاؤں اور پیشانی پر قدرتی نشان ہوتے ہیں یا جو گھوڑے چراگاہ میں چرنے کے لئے چھوڑے گئے ہوں۔

فائدہ: [3] وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ: یعنی ابدی فلاح ان چیزوں سے حاصل نہیں ہوتی محض دنیا میں چند روز فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے کامیاب مستقبل اور اچھا ٹھکانا چاہتے ہو تو خدا کے پاس ملے گا، اس کی خوشنودی اور قرب حاصل کرنے کی فکر کرو، اگلی آیت میں بتلاتے ہیں کہ وہ اچھا ٹھکانا کیا ہے اور کن لوگوں کو ملتا ہے۔

قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ ؕ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ

کہہ دے کیا بتاؤں میں تم کو اس سے بہتر، پرہیزگاروں کے لئے اپنے رب کے ہاں باغ ہیں جن کے نیچے جاری ہیں نہریں

خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۱۵﴾

ہمیشہ رہیں گے ان میں اور عورتیں ہیں ستھری ۱؎ اور رضامندی اللہ کی ۲؎ اور اللہ کی نگاہ میں ہیں بندے ۳؎

خلاصہ تفسیر: آپ (ان لوگوں سے یہ) فرما دیجئے کیا میں تم کو ایسی چیز بتلا دوں جو (بدرجہا) بہتر ہو ان (مذکورہ) چیزوں سے (سو سنو) ایسے لوگوں کے لئے جو (اللہ تعالیٰ سے) ڈرتے ہیں ان کے مالک (حقیقی) کے پاس ایسے باغ ہیں (یعنی بہشت) جن کی پائین میں نہریں جاری ہیں، ان (بہشتوں) میں ہمیشہ ہمیشہ کو رہیں گے (اور ان کیلئے) ایسی بیویاں ہیں جو (ہر طرح) صاف ستھری کی ہوئی ہیں، اور (ان کیلئے) خوشنودی ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے، اور اللہ تعالیٰ خوب دیکھتے (بھالتے) ہیں، بندوں (کے حال) کو (اس لئے ڈرنے والوں کو یہ نعمتیں دیں گے)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی ہر قسم کی صوری و معنوی گندگی سے پاک وصاف ہوں گی۔

فائدہ: ۲؎ کہ اس سے بڑھ کر کیا نعمت ہو سکتی ہے بلکہ جنت بھی فی الحقیقت اس لئے مطلوب ہے کہ وہ محل رضا ہے۔

فائدہ: ۳؎ بندوں کے تمام اعمال واحوال اس کے سامنے ہیں جو جس جزا و سزا کا مستحق ہوگا، بلا کم وکاست دی جائے گی، دنیا کی بہار پر مرنے والے اور اس کے فانی مزوں سے پرہیز کرنے والے سب اپنے اپنے ٹھکانے پر پہنچا دیئے جائیں گے، یا یہ مطلب لیا جائے کہ پرہیزگار بندوں پر خدا کی نگاہ لطف و کرم ہے جو دنیا کی ابلہ فریب سحر کاریوں سے ان کو محفوظ رکھتی ہے، چنانچہ حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب خدا کسی بندہ کو محبوب رکھتا ہے تو اسی طرح دنیا سے اس کا پرہیز کرا دیتا ہے جیسے تم اپنے مریض کو پانی (وغیرہ) سے پرہیز کراتے ہو۔

اَلَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اِنَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۶﴾

وہ جو کہتے ہیں اے رب ہمارے! ہم ایمان لائے ہیں سو بخش دے ہم کو گناہ ہمارے اور بچا ہم کو دوزخ کے عذاب سے ۱؎

اَلصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْمُنْفِقِيْنَ وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ ﴿۱۷﴾

وہ صبر کرنے والے ہیں اور سچے اور حکم بجالانے والے اور خرچ کرنے والے اور گناہ بخشوانے والے پچھلی رات میں ۲؎

خلاصہ تفسیر: (آگے ان ڈرنے والوں کے بعض تفصیلی حالات و اوصاف ذکر کیے جاتے ہیں کہ یہ) ایسے لوگ (ہیں) جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہم ایمان لے آئے، سو آپ ہمارے گناہوں کو معاف کر دیجئے، اور ہم کو عذاب دوزخ سے بچا لیجئے (اور وہ لوگ) صبر کرنے والے ہیں اور راست باز ہیں اور (اللہ تعالیٰ کے سامنے) فروتنی کرنے والے ہیں اور (نیک کاموں میں مال کے) خرچ کرنے والے ہیں اور اخیر شب میں (اٹھ اٹھ کر) گناہوں کی معافی چاہنے والے ہیں۔

رَبَّنَآ اِنَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا یہ جو کہا کہ ہم ایمان لے آئے سو آپ ہمارے گناہوں کو معاف کر دیجیے یہ اس وجہ سے کہ ایمان کے بغیر مغفرت نہیں ہو سکتی، پس حاصل یہ ہوا کہ کفر جو ہمیشہ کے لیے مغفرت سے مانع ہے اس کو تو ہم چھوڑ چکے، اب معاف کر دیجیے، اب چاہے بالکل معافی ہو جائے یا کچھ گناہوں کی سزا بھگتنی پڑے۔

وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ اخیر شب کو بطور خاص اس لیے ذکر کیا کیونکہ اس وقت اٹھنے میں مشقت بھی ہے اور وہ وقت قبولیت کا بھی ہے۔

اَلصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالْقٰنِتِيْنَ اس میں اولیاء اللہ (اہل اللہ) کی صفات کا بیان ہے۔

فائدہ: ۱ معلوم ہوا کہ گناہ معاف ہونے کے لئے ایمان لانا شرط ہے۔

فائدہ: ۲ یعنی اللہ کے راستہ میں بڑی بڑی تکلیفیں اٹھا کر بھی اس کی فرمانبرداری پر جمے رہتے اور معصیت سے رُکے رہتے ہیں، زبان کے، دل کے، نیت کے معاملہ کے سچے ہیں، پوری تسلیم وانقیاد کے ساتھ خدا کے احکام بجالاتے ہیں، خدا کی دی ہوئی دولت کو اس کے بتلائے ہوئے مواقع میں خرچ کرتے ہیں، اور پچھلی رات میں اٹھ کر (جو طمانیت واجابت کا وقت ہوتا ہے، لیکن اٹھنا اس وقت سہل نہیں ہوتا) اپنے رب سے گناہ اور تقصیرات معاف کراتے ہیں كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ (الذاریات: ۱۷-۱۸) یعنی اکثر رات عبادت میں گزارتے اور سحر کے وقت استغفار کرتے کہ خداوندا! عبادت میں جو تقصیر رہ گئی اپنے فضل سے معاف فرمانا۔

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ ؕ

اللہ نے گواہی دی کہ کسی کی بندگی نہیں اس کے سوا ۱ اور فرشتوں نے ۲ اور علم والوں نے بھی ۳ وہی حاکم انصاف کا ہے

لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۸﴾

النصف

کسی کی بندگی نہیں سوا اس کے زبردست حکمت والا ۴

خلاصہ تفسیر: سورت کے شروع میں نصاریٰ کے مناظرہ ومقابلہ میں توحید کو ثابت اور تثلیث کو باطل کیا گیا اور درمیان کے مضامین اسی کی مناسبت سے لائے گئے تھے، اب پھر اسی مضمون توحید کی طرف رجوع کرتے ہیں، اور ایک خاص انداز سے توحید کو ثابت کرتے ہیں کہ اس پر تین شہادتوں کا ذکر ہے: ① ایک خود اللہ جل شانہ کی شہادت ② دوسرے اس کے فرشتوں کی ③ تیسرے اہل علم کی، اللہ جل شانہ کی شہادت تو بطور مجاز ہے مراد یہ ہے کہ اللہ جل شانہ کی ذات وصفات اور اس کے تمام مظاہر ومصنوعات اللہ تعالیٰ کی توحید کی کھلی نشانیاں ہیں۔

گواہی دی ہے اللہ نے (کتب سماویہ میں) اس (مضمون) کی کہ بجز اس ذات (پاک) کے کوئی معبود ہونے کے لائق نہیں، اور فرشتوں نے بھی (اپنے ذکر وتسبیح میں اس کی گواہی دی ہے، کیونکہ ان کے اذکار توحید سے بھرے ہوئے ہیں) اور (دوسرے) اہل علم نے بھی (اپنی تقریرات وتحریرات میں اس کی گواہی دی ہے، جیسا کہ ظاہر ہے) اور معبود بھی وہ اس شان کے ہیں کہ (ہر چیز کا) اعتدال کے ساتھ انتظام رکھنے والے ہیں (اور پھر کہا جاتا ہے کہ) ان کے سوا کوئی معبود ہونے کے لائق نہیں وہ زبردست ہیں، حکمت والے ہیں۔

قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ: یعنی ہر چیز کا اعتدال کے ساتھ انتظام رکھنے والے ہیں، یہ صفت غالبا اس لیے بڑھادی کہ وہ ایسے نہیں کہ صرف اپنی عبادت وتعظیم ہی کراتے ہوں، بلکہ وہ سب کے کام بھی بناتے ہیں، یہاں یہ شبہ نہ کیا جائے کہ یہ دلیل تو نقلی ہے جو اس کو نہیں مانتے ان پر کس طرح حجت ہوگی؟ جواب یہ ہے کہ یہ دلیل خاص اہل کتاب کے مقابلہ میں ہے، وہ نقلی دلیل کے منکر نہیں تھے اور عقلی دلائل دوسرے مواقع میں موجود ہیں۔

فائدہ: ۱ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ: ابتداء میں نصاریٰ ''نجران'' سے خطاب تھا اور نہایت لطیف انداز سے الوہیت مسیح کے عقیدہ کا ابطال اور توحید خالص کا اعلان کر کے ایمان لانے کی ترغیب دی گئی تھی، درمیان میں ان موانع کا ذکر فرمایا جو انسان کو وضوح حق کے باوجود شرف ایمان سے محروم رکھتے ہیں، یعنی مال واولاد اور سامان عیش وعشرت، ان آیات میں مومنین کی صفات بیان کرنے کے بعد پھر اصل مضمون توحید وغیرہ کی طرف عود کیا گیا ہے، یعنی توحید خالص کے ماننے میں کیا تردد ہوسکتا ہے، جبکہ خود حق تعالیٰ اپنی تمام کتابوں میں برابر اس مضمون کی گواہی دیتا رہا ہے، اور اس کی فعلی کتاب (صحیفہ کائنات) کا ایک ایک ورق بلکہ ایک ایک نقطہ شہادت دیتا ہے کہ بندگی کے لائق رب العالمین کے سوا کوئی نہیں ہوسکتا:

وَفِيْ كُلِّ شَيْءٍ لَهٗ اٰيَةٌ تَدُلُّ عَلٰى اَنَّهٗ وَاحِدٌ

سَنُرِيۡهِمۡ اٰيٰتِنَا فِى الۡاٰفَاقِ وَفِىۡۤ اَنۡفُسِهِمۡ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمۡ اَنَّهُ الۡحَقُّ ؕ (نصلت:53)

فائدہ: ۲؎ وَالۡمَلٰٓئِكَةُ: ظاہر ہے فرشتوں کی گواہی خدا کی گواہی کے خلاف کیسے ہوسکتی ہے، فرشتہ تو نام ہی اس مخلوق کا ہے جو صدق وحق کے راستہ سے سرتابی نہ کر سکے، چنانچہ فرشتوں کی تسبیح وتحمید تمام تر توحید وتفرید باری پر مشتمل ہے۔

فائدہ: ۳؎ وَاُولُوا الۡعِلۡمِ: علم والے ہر زمانہ میں توحید کی شہادت دیتے رہے ہیں اور آج تو عام طور پر توحید کے خلاف ایک لفظ کہنا جہل محض کا مترادف سمجھا جاتا ہے، مشرکین بھی دل میں مانتے ہیں کہ علمی اصول کبھی مشرکانہ عقائد کی تائید نہیں کر سکتے۔

فائدہ: ۴؎ هُوَ الۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ: انصاف کرنے کے لئے دو باتیں ضروری ہیں: ① زبردست ہو کہ اس کے فیصلہ سے کوئی سرتابی نہ کر سکے اور ② حکیم ہو کہ حکمت ودانائی سے پوری طرح جانچ تول کر ٹھیک فیصلہ کرے، کوئی حکم بے موقع نہ دے، چونکہ حق تعالیٰ عزیز وحکیم ہے، لہذا اس کے منصف علی الاطلاق ہونے میں کیا شبہ ہوسکتا ہے۔

غالباً اس لفظ قائماً بالقسط میں عیسائیوں کے مسئلہ کفارہ کا بھی رد ہو گیا، بھلا یہ کہاں کا انصاف ہوگا کہ ساری دنیا کے جرائم ایک شخص پر لاد دیئے جائیں اور وہ تنہا سزا پا کر سب مجرموں کو ہمیشہ کے لئے بری اور پاک کردے، خدائے عادل وحکیم کی بارگاہ ایسی گستاخیوں سے کہیں بالا وبرتر ہے۔

اِنَّ الدِّيۡنَ عِنۡدَ اللّٰهِ الۡاِسۡلَامُ ۗ وَمَا اخۡتَلَفَ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ اِلَّا مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَهُمُ

بے شک دین جو ہے اللہ کے ہاں سو یہی مسلمانی حکم برداری ۱؎ اور مخالف نہیں ہوئے کتاب والے مگر جب ان کو

الۡعِلۡمُ بَغۡيًاۢ بَيۡنَهُمۡ ؕ وَمَنۡ يَّكۡفُرۡ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِيۡعُ الۡحِسَابِ ﴿۱۹﴾

معلوم ہو چکا آپس کی ضد اور حسد سے ۲؎ اور جو کوئی انکار کرے اللہ کے حکموں کا تو اللہ جلدی حساب لینے والا ہے ۳؎

خلاصہ تفسیر: توحید کو ثابت کرنے کے بعد اب دین اسلام کا حق ہونا بیان کرتے ہیں کہ اللہ کے نزدیک صرف دین اسلام مقبول ہے، اسکے سوا کوئی دین ومذہب مقبول نہیں، غرض اس بیان سے توحید کے مضمون کی تکمیل فرمائی، اور اختلاف کرنے والوں کی تباہ حالی بیان فرمائی:

بلاشبہ دین (حق اور مقبول) اللہ تعالیٰ کے نزدیک صرف اسلام ہی ہے، اور (اسکے حق ہونے میں اہل اسلام کے ساتھ) اہل کتاب نے جو اختلاف کیا (اس طرح سے کہ اسلام کو باطل کہا) تو ایسی حالت کے بعد کہ ان کو (اسلام کے حق ہونے کی) دلیل پہنچ چکی تھی محض ایک دوسرے سے بڑھنے کی وجہ سے (یعنی اسلام کے حق ہونے میں ان کو شبہ کی کوئی وجہ پیش نہیں آئی، بلکہ ان میں دوسروں سے بڑا بننے کا مادہ ہے، اور اسلام لانے میں یہ سرداری جو اُن کو ابھی عوام پر حاصل ہے وہ فوت ہوتی تھی، اس لئے اسلام کو قبول نہیں کیا، بلکہ الٹا اسکو باطل بتلانے لگے) اور جو شخص اللہ تعالیٰ کے احکام کا انکار کرے گا (جیسا ان لوگوں نے کیا) تو بلاشبہ اللہ تعالیٰ بہت جلد اس کا حساب لینے والے ہیں (اور ظاہر ہے کہ ایسے شخص کے حساب کا انجام عذاب ہوگا)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ اِنَّ الدِّيۡنَ عِنۡدَ اللّٰهِ الۡاِسۡلَامُ: ''اسلام'' کے اصلی معنی سونپ دینے کے ہیں، ''مذہب اسلام'' کو بھی اسی لحاظ سے ''اسلام'' کہا جاتا ہے کہ ایک مسلم اپنے کو ہمہ تن خدائے واحد کے سپرد کر دینے اور اس کے احکام کے سامنے گردن ڈال دینے کا اقرار کرتا ہے، گویا ''اسلام'' انقیاد وتسلیم کا اور ''مسلمانی'' حکم برداری کا دوسرا نام ہوا، یوں تو شروع سے اخیر تک تمام پیغمبر یہی مذہب اسلام لے کے آئے اور اپنے اپنے زمانہ میں اپنی اپنی قوم کو مناسب وقت احکام پہنچا کر طاعت وفرمانبرداری اور خالص خدائے واحد کی پرستش کی طرف بلاتے رہے ہیں، لیکن اس سلسلہ میں خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام دنیا کو جو اکمل، جامع ترین، عالمگیر اور ناقابل تنسیخ ہدایات دیں، وہ تمام شرائع سابقہ حقہ پر مع شیء زائد مشتمل ہونے کی وجہ سے خصوصی رنگ میں اسلام کے نام سے موسوم وملقب ہوئیں۔

بہر حال اس آیت میں نصاریٰ نجران کے سامنے خصوصاً اور تمام اقوام وملل کے سامنے عموماً اعلان کیا گیا ہے کہ دین ومذہب صرف ایک ہی چیز

کا نام ہوسکتا ہے وہ یہ کہ بندہ دل وجان سے اپنے کو خداوند قدوس کے سپرد کردے اور جس وقت جو حکم اس کی طرف سے پائے، بے چون وچرا گردن تسلیم جھکادے، اب جو لوگ خدا کے بیٹے، پوتے تجویز کریں، مسیح ومریم کی تصویروں اور صلیب کی لکڑی کو پوجیں، خنزیر کھائیں، آدمی کو خدا یا خدا کو آدمی بنادیں، انبیاء واولیاء کو قتل کرڈالنا معمولی بات سمجھیں، دین حق کو مٹانے کی ناپاک کوششوں میں لگے رہیں، موسیٰ ومسیح کی بشارات کے موافق جو پیغمبران دونوں سے بڑھ کر شان ونشان دکھلاتا ہوا آیا، جان بوجھ کر اس کی تکذیب اور اس کے لائے ہوئے کلام واحکام سے ٹھٹھا کریں، یا جو بیوقوف پتھروں، درختوں، ستاروں اور چاند سورج کے آگے سجدہ کریں اور حلال وحرام کا معیار محض ہوائے نفس کو ٹھہرالیں، کیا ان میں کوئی جماعت اس لائق ہے کہ اپنے کو مسلم اور ملت ابراہیمی کا پیرو کہہ سکے، العیاذ باللہ، "وفی روایۃ محمد بن اسحاق فقال رسول اللہ ﷺ اسلموا، فقالوا قد اسلمنا، فقال رسول اللہ ﷺ کذبتم کیف یصح اسلامکم و انتم تثبتون للہ ولدًا وتعبدون الصلیب وتاکلون الخنزیر (تفسیر کبیر)۔

فائدہ:۲ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ: یعنی اسلام ایک واضح اور روشن چیز ہے جس قسم کے دلائل سے موسیٰ ومسیح کی رسالت یا تورات وانجیل کا کتاب سماوی ہونا ثابت کیا جاسکتا ہے، اس سے بہتر، مضبوط اور زندہ دلائل محمد ﷺ کی رسالت اور قرآن کے کلام الٰہی ہونے کے موجود ہیں، بلکہ خود وہ کتابیں آپ کی حقانیت کی شہادت دے رہی ہیں، توحید خالص ایک صاف مضمون ہے جس کے خلاف باپ بیٹے کا نظریہ محض ایک بے معنی چیستاں ہوکر رہ جاتی ہے، جس کی کوئی علمی اصول تائید نہیں کرتا، اب جو اہل کتاب مخالف اسلام ہوکر ان روشن حقائق کو جھٹلائیں اور حق تعالیٰ کی حکمبرداری سے سرتابی کریں بجز اس کے کیا کہا جاسکتا ہے کہ محض ضد، حسد، عناد اور جاہ ومال کی حرص میں ایسا کررہے ہیں، جیسا کہ پہلے اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا (آل عمران:۱۰) کے فوائد میں خود ابوحارثہ بن علقمہ رئیس وفد نجران کا اقرار واعتراف نقل کیا جاچکا ہے اور یہ ان لوگوں کی قدیم عادت ہے، یہود ونصاریٰ کے باہم جو اختلافات ہوئے یا ہر ایک مذہب میں جو بہت سے فرقے بنے، پھر مخالفت باہمی خوفناک محاربات اور خونریزیوں پر منتہی ہوئی، تاریخ بتلاتی ہے کہ اس کا منشاء عموماً غلط فہمی یا جہل نہ تھا، بلکہ اکثر حالات میں محض سیم وزر کی محبت اور جاہ پرستی سے یہ فرقہ وارانہ اختلافات پیدا ہوئے۔

فائدہ:۳ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ: دنیا میں بھی، ورنہ آخرت میں تو ضرور ہے۔

فَاِنْ حَآجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ ؕ وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ

پھر بھی اگر تجھ سے جھگڑیں تو کہہ دے میں نے تابع کیا اپنا منہ اللہ کے حکم پر اور انہوں نے بھی کہ جو میرے ساتھ ہیں ۱ اور کہہ دے کتاب والوں کو

وَالْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ ؕ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ ؕ

اور ان پڑھوں کو کہ تم بھی تابع ہوتے ہو، پھر اگر وہ تابع ہوئے تو انہوں نے پائی راہ سیدھی، اور اگر منہ پھیریں تو تیرے ذمہ صرف پہنچادینا ہے

وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۲۰﴾ ع ۱۰

اور اللہ کی نگاہ میں ہیں بندے ۲

خلاصہ تفسیر: شروع سورت میں توحید کا اثبات اور تثلیث کا رد کیا گیا تھا، اب ان منکرین اہل کتاب اور ان کے ساتھ مشرکین عرب کے انکار ومباحثہ کا جواب دیتے ہیں اور ان کا یہ انکار ومباحثہ محض عناد کی وجہ سے تھا، چنانچہ فرمایا:

(اسلام کی حقانیت پر دلیل قائم ہونے کے بعد) پھر بھی اگر یہ لوگ آپ سے (خوانخواہ کی) حجتیں نکالیں تو آپ (جواب میں) فرمادیجئے کہ (تم مانو یا نہ مانو) میں تو اپنا رخ خاص اللہ کی طرف کرچکا اور جو میرے پیروکار تھے وہ بھی (اپنا رخ خاص اللہ کی طرف کرچکے، مراد یہ ہے کہ ہم سب اسلام اختیار کرچکے جس میں توحید کے اعتقاد کی وجہ سے دل کا رخ خاص اللہ ہی کی طرف ہوتا ہے، کیونکہ دوسرے مذاہب میں کچھ کچھ شرک مل گیا تھا)۔

اور (اس جواب کے بعد دریافت فرمانے کے طور پر) کہیے اہل کتاب سے اور (مشرکین) عرب سے کہ کیا تم بھی اسلام لاتے ہو، سو اگر وہ لوگ اسلام لے آئیں تو وہ لوگ بھی راہ (راست) پر آجائیں گے اور اگر وہ لوگ (اس سے بدستور) روگردانی رکھیں سو (آپ اس کا بھی غم نہ کیجیے، کیونکہ) آپ کے ذمہ صرف (احکام خداوندی کا) پہنچا دینا ہے اور (آگے) اللہ تعالیٰ خود دیکھ (اور سمجھ) لیں گے (اپنے) بندوں کو (آپ ﷺ سے کوئی باز پرس نہیں ہے)۔

فَاِنۡ حَآجُّوۡكَ فَقُلۡ اَسۡلَمۡتُ وَجۡهِىَ: شبہ ہوتا ہے کہ منکرین کے مقابلہ میں اتنا کہہ دینا کب کافی ہوسکتا ہے کہ تم مانو یا نہ مانو میں تو مان گیا ہوں؟ جواب یہ ہے کہ یہ ہر منکر کے مقابلہ میں نہیں فرمایا گیا، بلکہ یہ خاص ان منکرین یعنی یہود و نصاریٰ کے مقابلہ میں ہیں جن کا انکار کسی شبہ سے نہ تھا، بلکہ ان کا انکار دلائل قائم ہونے کے بعد محض عناد اور عداوت کی وجہ سے تھا، سو جب ان کو کوئی شبہ نہیں تو ان کے سامنے مکرر دلائل بیان کرنا بے کار ہے، اس وقت یہی آخری جواب ہے کہ خیر بھائی! تم مت مانو ہم تو مان چکے، یہود و نصاریٰ یہ جاننے کے باوجود کہ آپ ﷺ نبی برحق ہیں ایمان نہ لاتے تھے تو ان سے اعراض کا حکم دیا گیا۔

فَقُلۡ اَسۡلَمۡتُ وَجۡهِىَ لِلّٰهِ: اس میں اہل طریق کی اس عادت پر دلالت ہے کہ جب مخالف کے سامنے حق بالکل واضح ہو جائے مگر مخاطب کی حالت سے معلوم ہو کہ یہ قبول نہیں کرتا یا حیل وحجت کرتا ہے تو اس سے مباحثہ کو ترک کر دینا چاہیے اور اس سے یہ کہنا چاہیے کہ تم مانو یا نہ مانو میں تو مان چکا ہوں، لیکن یہ ان لوگوں کے بارے میں ہے جن کو حق کا پتہ لگ گیا پھر نہ مانیں، یہ استنباط اس آیت کی مشہور تفسیر پر ہے کہ یہ قول **اسلمت وجھی** مباحثہ سے اعراض ہے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ جیسا کہ دو فوائد پہلے نقل کیے جاچکے، وہ جھگڑتے تھے کہ ہم بھی مسلمان ہیں، یہاں ان کو بتلایا گیا کہ ایسا (فرضی) اسلام کس کام کا، آؤ دیکھو، اسلام اسے کہتے ہیں جو محمد ﷺ اور ان کے جاں نثار ساتھیوں کے پاس ہے، ابھی بیان ہو چکا کہ اسلام نام ہے تسلیم وانقیاد کا، یعنی بندہ ہمہ تن اپنے کو خدا کے ہاتھ میں دیدے، سو محمد ﷺ اور مہاجرین وانصار کو دیکھو کس طرح انہوں نے شرک، بت پرستی، بداخلاقی، فسق وفجور اور ظلم وعدوان کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنی جان، مال، وطن، کنبہ، بیوی بچے، غرض تمام مرغوب ومحبوب چیزیں حق تعالیٰ کی خوشنودی پر نثار کر دیں اور کس طرح ان کا چہرہ اور آنکھیں ہر وقت حکم الٰہی کی طرف لگی رہتی ہیں کہ اُدھر سے حکم آئے اور ہم تعمیل کریں، اس کے بالمقابل تم اپنا حال دیکھو کہ خود اپنی خلوتوں میں اقرار کرتے ہو کہ محمد ﷺ حق پر ہیں، مگر ان پر ایمان لائیں تو دنیا کا مال وجاہ چھنتا ہے، بہرحال باوجود وضوح حق کے اسلام کی طرف نہیں آتے، تم جانو، ہم تو اپنے کو ایک خدا کے سپرد کر چکے ہیں۔

فائدہ: ۲؎ یعنی سوچ لو، کیا تم بھی ہماری طرح خدا کے تابعدار بندے بنے ہو یا اب بنتے ہو، ایسا ہو تو سمجھ لو سیدھے راستہ پر لگ گئے اور ہمارے بھائی بن گئے ورنہ ہمارا کام سمجھا دینا اور نشیب وفراز بتلا دینا تھا، وہ کر چکے، آگے سب بندے اور ان کے اعمال ظاہری وباطنی خدا کی نظر میں ہیں، وہ ہر ایک کا بھگتان کر دے گا۔

تنبیہ: ''اَن پڑھ'' کہتے تھے عرب کے مشرکوں کو کہ ان کے پاس کتب سماویہ کا علم نہ تھا۔

اِنَّ الَّذِيۡنَ يَكۡفُرُوۡنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقۡتُلُوۡنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيۡرِ حَقٍّ ۙ وَّيَقۡتُلُوۡنَ الَّذِيۡنَ يَاۡمُرُوۡنَ

بے شک جو لوگ انکار کرتے ہیں اللہ کے حکموں کا اور قتل کرتے ہیں پیغمبروں کو ناحق، اور قتل کرتے ہیں ان کو جو حکم کرتے ہیں

بِالۡقِسۡطِ مِنَ النَّاسِ ۙ فَبَشِّرۡهُمۡ بِعَذَابٍ اَلِيۡمٍ ۝۲۱ اُولٰٓئِكَ الَّذِيۡنَ حَبِطَتۡ اَعۡمَالُهُمۡ

انصاف کرنے کا لوگوں میں سے، سو خوشخبری سنا دے ان کو عذاب دردناک کی، یہی ہیں جن کی محنت ضائع ہوئی

فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۫ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۲۲﴾

دنیا میں اور آخرت میں، اور کوئی نہیں ان کا مددگار

خلاصہ تفسیر: شروع سورۃ میں گفتگو کا زیادہ رخ نصاریٰ کی طرف تھا، پھر گذشتہ آیت کا عنوان یہود اور نصاریٰ دونوں کو شامل تھا، اب ان آیات میں یہود کے بعض خاص حالات بیان فرماتے ہیں، چنانچہ روح المعانی میں اس آیت کی تفسیر میں خود حضور ﷺ سے روایت نقل کی ہے کہ بنی اسرائیل نے ۴۳ نبیوں کو ایک وقت میں قتل کیا، ان کی نصیحت کے لیے ایک سو ستر بزرگ کھڑے ہوئے، اسی دن ان کا بھی کام تمام کیا۔

بیشک جو لوگ کفر کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کی آیات کے ساتھ (جیسے یہود جو کہ انجیل اور قرآن کو نہیں مانتے تھے) اور قتل کرتے ہیں پیغمبروں کو (اور وہ قتل کرنا خود ان کے خیال میں بھی) ناحق (ہوتا ہے) اور (نیز) قتل کرتے ہیں ایسے شخصوں کو جو (افعال و اخلاق کے) اعتدال کی تعلیم دیتے ہیں، سو ایسے لوگوں کو خبر سنا دیجیے سزائے دردناک کی (اور) یہ وہ لوگ ہیں کہ (مذکورہ افعال کے سبب) ان کے سب اعمال (صالحہ) غارت ہو گئے دنیا میں (بھی) اور آخرت میں (بھی) اور (سزا کے وقت) ان کا کوئی حامی و مددگار نہ ہوگا (دنیا میں غارت ہونا یہ کہ ان کے ساتھ اہل اسلام کا سا معاملہ نہ ہوگا، اور آخرت میں یہ کہ ان کی مغفرت نہ ہوگی)۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ: ہر چند کہ محض نصیحت کرنے والوں کا قتل کفر نہیں ہے جس سے اعمال اکارت ہوں، البتہ گناہ کبیرہ ضرور ہے، مگر چونکہ ناصحین کے ساتھ انبیاء کا قتل بھی ان سے سرزد ہوا، اس لیے مجموعہ پر حبط کا فرمانا صحیح ہوا، اور چونکہ زمانہ نبوت محمدیہ کے یہود اپنے پہلوں کے برے کاموں پر انکار نہ رکھتے تھے، اس لیے ان پر بھی یہ الزام صحیح ہوا۔

* * *

فائدہ: حدیث میں ہے کہ بنی اسرائیل نے ایک دن میں تینتالیس نبی اور ایک سو ستر یا ایک سو بارہ صالحین کو شہید کیا۔

یہاں نصاریٰ نجران اور دوسرے کفار کو سنایا جا رہا ہے کہ احکام الٰہی سے منکر ہو کر انبیاء اور انصاف پسند ناصحین سے مقابلہ کرنا اور پرلے درجہ کی شقاوت و سنگدلی سے ان کے خون میں ہاتھ رنگنا معمولی چیز نہیں، ایسے لوگ سخت دردناک عذاب کے مستحق اور دونوں جہان کی کامیابی سے محروم ہیں، ان کی محنت برباد اور ان کی کوششیں اکارت ہونگی اور دنیا و آخرت میں جب سزا ملے گی تو کوئی بچانے والا اور مدد کرنے والا نہ ملے گا۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُدْعَوْنَ اِلٰى كِتٰبِ اللّٰهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ

کیا نہ دیکھا تو نے ان لوگوں کو جن کو ملا کچھ ایک حصہ کتاب کا [1] ان کو بلاتے ہیں اللہ کی کتاب کی طرف تا کہ وہ کتاب انہیں حکم کرے

ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ وَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۲۳﴾

پھر منہ پھیرتے ہیں بعضے ان میں سے تغافل کر کے [2]

خلاصہ تفسیر: اب یہود کی ایک خاص حالت اور ایک خاص قول کی قباحت بیان فرماتے ہیں:

(اے محمد ﷺ) کیا آپ نے ایسے لوگ نہیں دیکھے جن کو کتاب (آسمانی یعنی توراۃ) کا ایک (کافی) حصہ دیا گیا (کہ اگر ہدایت کے طالب ہوتے تو وہ حصہ اس غرض کی تکمیل کے لئے کافی تھا) اور اسی کتاب اللہ کی طرف اس غرض سے ان کو بلایا بھی جاتا ہے کہ وہ ان کے درمیان (مذہبی اختلاف کا) فیصلہ کر دے، پھر (بھی) ان میں سے بعض لوگ انحراف کرتے ہیں بے رخی کرتے ہوئے۔

* * *

فائدہ: [1] یعنی تھوڑا بہت حصہ تورات اور انجیل وغیرہ کا جو ان کی تحریفات لفظی و معنوی سے بچ بچا کر رہ گیا ہے، یا جو تھوڑا بہت حصہ فہم

کتاب کا ملا۔

فائدہ: ۲ یعنی جب انہیں دعوت دی جاتی ہے کہ قرآن کریم کی طرف آ ؤ جو خود تمہاری تسلیم کردہ کتابوں کی بشارات کے موافق آیا اور تمہارے اختلافات کا ٹھیک فیصلہ کرنے والا ہے، تو ان کے علماء کا ایک فریق تغافل برت کر منہ پھیر لیتا ہے، حالانکہ قرآن کی طرف دعوت فی الحقیقت تورات و انجیل کی طرف دعوت دینا ہے، بلکہ کچھ بعید نہیں کہ اس جگہ کتاب اللہ سے مراد تورات وانجیل ہی ہو، یعنی لو ہم تمہارے نزاعات کا فیصلہ تمہاری ہی کتاب پر چھوڑتے ہیں، مگر غضب تو یہ ہے کہ وہ اپنی خواہشات اور پست اغراض کے سامنے خود اپنی کتاب کی ہدایات سے بھی منہ پھیر لیتے ہیں، نہ انکی بشارات سنتے ہیں، نہ احکام پر کان دھرتے ہیں، چنانچہ رجم زانی کے مسئلہ میں تورات کے حکم منصوص سے صریح رُوگردانی کی جیسا کہ آگے سورۃ مائدہ میں آئے گا۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ۪ وَغَرَّهُمْ فِيْ دِيْنِهِمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۲۴﴾

یہ اس واسطے کہ کہتے ہیں وہ ہم کو ہرگز نہ لگے گی آگ دوزخ کی مگر چند دن گنتی کے، اور بہکے ہیں اپنے دین میں اپنی بنائی باتوں پر

خلاصہ تفسیر: (اور) یہ (بے اعتنائی) اس سبب سے ہے کہ وہ لوگ یوں کہتے ہیں (اور یہی ان کا اعتقاد ہے) کہ ہمیں صرف گنتی کے تھوڑے دنوں تک دوزخ کی آگ لگے گی (پھر مغفرت ہوجائے گی) اور ان کو دھوکہ میں ڈال رکھا ہے ان کی تراشی ہوئی باتوں نے (جیسے اسی تراشے ہوئے عقیدہ نے ان کو دھوکہ دیا کہ ہم انبیاء کی اولاد ہیں، اس خاندانی بزرگی کی وجہ سے ہماری نجات ضرور ہوجائے گی، اس کے نتیجہ میں وہ کتاب اللہ سے اور بے اعتنائی کرنے لگے)۔

ان کے اس قول کی تحقیق پہلا پارہ سورہ بقرہ آیت ۸۰: وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا میں گزر چکی ہے وہاں ملاحظہ فرمایئے۔

* * *

فائدہ: یعنی ان کے تمرد وطغیان اور گناہوں پر جری ہونے کا سبب یہ ہے کہ سزا کی طرف سے بے خوف ہیں، ان کے بڑے جھوٹ بنا کر کہہ گئے کہ ہم میں اگر کوئی سخت گنہگار بھی ہوگا تو گنتی کے چند روز سے زیادہ عذاب نہ پائے گا، جیسا کہ سورۃ بقرہ میں گزر چکا اور اسی طرح کی بہت سی باتیں گھڑ رکھی ہیں، مثلاً کہتے تھے کہ ہم تو اللہ کے چہیتے بیٹے ہیں، یا انبیاء کی اولاد ہیں اور اللہ تعالیٰ یعقوب علیہ السلام سے وعدہ کر چکا ہے کہ ان کی اولاد کو سزا نہ دے گا مگر یونہی برائے نام قسم کھانے کو، اور نصاریٰ نے تو "کفارہ" کا مسئلہ نکال کر گناہ و معصیت کا سارا حساب ہی بیباق کر دیا، اَللّٰهُمَّ اَعِذْنَا مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا۔

فَكَيْفَ اِذَا جَمَعْنٰهُمْ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۣ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَھُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۲۵﴾

پھر کیا ہوگا حال جب ہم ان کو جمع کریں گے ایک دن کہ اس کے آنے میں کچھ شبہ نہیں اور پورا پاویگا ہر کوئی اپنا کیا ۱ اور ان کی حق تلفی نہ ہوگی ۲

خلاصہ تفسیر: سو (ان کفریہ احوال، افعال اور اقوال کے سبب) ان کا کیا (برا) حال ہوگا، جبکہ ہم ان کو اس تاریخ میں جمع کرلیں گے جس (کے آنے) میں ذرا شبہ نہیں اور (اس تاریخ میں) پورا پورا بدلہ مل جائے گا ہر شخص کو جو کچھ اس نے (دنیا میں) کیا تھا، اور ان شخصوں پر (بدلہ کے وقت اصلا) ظلم نہ کیا جائے گا (کہ بغیر جرم کے یا جرم سے زیادہ سزا ہوجائے)۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی اس وقت پتہ چلے گا کہ کس اندھیرے میں پڑے ہوئے تھے، جب محشر میں تمام اولین وآخرین اور خود اپنے بزرگوں کے سامنے رسوا ہوں گے اور ہر عمل کا پورا پورا بدلہ ملے گا، نہ کفارہ کا مسئلہ یاد آئے گا، نہ نسبی تعلقات اور من گھڑت عقیدے کام دینگے۔

فائدہ: ۲ یعنی فرضی جرائم پر سزا نہ ہوگی، ان کاموں پر ہوگی جن کا جرم ہونا خود تسلیم کرینگے اور جس قدر سزا کا استحقاق ہوگا، اس سے زیادہ نہ دی جائے گی نہ کسی کی ادنیٰ سے ادنیٰ نیکی ضائع ہوسکے گی۔

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِی الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ ۫ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ

تو کہہ یا اللہ مالک سلطنت کے تو سلطنت دیوے جس کو چاہے اور سلطنت چھین لیوے جس سے چاہے، اور عزت دیوے جس کو چاہے

وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ؕ بِیَدِكَ الْخَیْرُ ؕ اِنَّكَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۲۶﴾

اور ذلیل کرے جس کو چاہے، تیرے ہاتھ ہے سب خوبی، بیشک تو ہر چیز پر قادر ہے

خلاصہ تفسیر: گذشتہ آیتوں میں بعض مخالفین کے ساتھ مباحثہ ومناظرہ کا ذکر تھا، اب اسی کی مناسبت سے امت محمدیہ کو ایک دعا ومناجات کی تلقین اس انداز سے کی گئی ہے کہ اس کے ضمن میں امت محمدیہ کے کفار پر غلبہ پانے کی طرف اشارہ بھی ہے، جیسا کہ اس کے شان نزول سے ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے روم وفارس فتح ہوجانے کا وعدہ فرمایا تو منافقین ویہود نے استہزاء کیا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ (اللہ تعالیٰ سے) یوں کہیے کہ اے اللہ! مالک تمام ملک کے، آپ ملک (کا جتنا حصہ چاہیں) جس کو چاہیں دے دیتے ہیں اور جس (کے قبضہ) سے چاہیں ملک (کا حصہ) لے لیتے ہیں اور جس کو آپ چاہیں غالب کر دیتے ہیں اور جس کو آپ چاہیں پست کر دیتے ہیں، آپ ہی کے اختیار میں ہے سب بھلائی، بلاشبہ آپ ہر چیز پر پوری قدرت رکھنے والے ہیں (اس دعا میں مسلمانوں کی قوت وسلطنت کے امکان پر ایک قسم کا استدلال ہے، اور کفار نے جو اسے بعید سمجھا ان کے استہزاء کا جواب دیا)۔

اس دعا میں مسلمانوں کی بادشاہت اور غلبہ کے ممکن ہونے پر ایک قسم کا استدلال ہوگیا اور کفار جو اس کو بعید جانتے تھے اسے زائل کر دیا۔

بِیَدِكَ الْخَیْرُ: شروع آیت میں چونکہ حکومت دینے اور واپس لینے کا نیز عزت اور ذلت دونوں کا ذکر تھا، اس لئے بظاہر اس مقام کا تقاضا تو یہ تھا کہ اس جگہ بھی بیدك الخیر والشر کہا جاتا، یعنی ہر بھلائی اور برائی آپ کے ہاتھ میں ہے، لیکن یہاں صرف ''خیر'' ہی ذکر کیا گیا، سو اگر مراد کلام میں یہ ہو کہ ''والشر ایضا'' یعنی آپ کے قبضہ قدرت میں دونوں چیزیں ہیں تو اس صورت میں صرف ''خیر'' پر اکتفا کرنا ادب کی رعایت کی وجہ سے ہے، یا اس جگہ مقصود بھلائی مانگنا ہے تو اسی کا ذکر مناسب ہے، جیسے کوئی شخص نوکری کا امیدوار ہو اور وہ حاکم سے کہے کہ نوکر رکھنا آپ کے اختیار میں ہے جس کو آپ چاہیں نوکر رکھ لیں اگرچہ، نوکر کا موقوف کر دینا بھی حاکم ہی کے اختیار میں ہے، مگر امیدواری کے وقت اس کو ذکر نہیں کرتے کہ یہ اس کا موقع نہیں، یا صرف لفظ ''خیر'' لا کر ایک اہم حقیقت کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ جس چیز کو کوئی شخص یا کوئی قوم برائی یا مصیبت سمجھتی ہے اور وہ اس خاص قوم کے لئے اگرچہ تکلیف ومصیبت ہوتی ہے لیکن اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو مجموعہ عالم کے اعتبار سے وہ برائی نہیں ہوتی، قوموں کے عروج وزوال اور اس میں مصائب کے بعد فوائد کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو یہ ایک زندہ حقیقت بن کر سامنے آجاتا ہے کہ: ''ایک قوم کے مصائب دوسری قوم کے فوائد ہوتے ہیں''، مجموعہ عالم کے مصالح وفوائد پر نظر کرنے والا کسی نہ کسی درجہ میں اس حقیقت کو پا سکتا ہے کہ اس میں جتنی چیزیں خراب اور بری سمجھی جاتی ہیں، وہ اپنی ذات میں چاہے بری سمجھی جائیں، مگر پورے عالم کو اگر ایک جسم فرض کر لیا جائے تو وہ اس کے چہرہ کے خال اور بال ہیں، خال اور بال اگر بدن سے الگ کر کے دیکھے جائیں تو ان سے زیادہ خراب کوئی چیز نہیں، لیکن ایک حسین چہرہ کا جزء ہونے کی حالت میں یہی چیزیں رونق حسن ہوتی ہیں، خلاصہ یہ ہے کہ جن چیزوں کو ہم برا کہتے ہیں اور برا سمجھتے ہیں ان کی برائی جزوی ہے اور خالق کائنات اور رب العالمین کی نسبت اور مجموعہ عالم کی مصلحت کے اعتبار سے کوئی چیز شر یا خراب نہیں، اس لئے اس آیت کے ختم میں صرف لفظ ''خیر'' پر اکتفا کر کے فرمایا گیا: بیدك الخیر کیونکہ خالق کائنات کی حکمت اور حکومت اور مجموعہ عالم کی مصلحت کے لحاظ سے ہر چیز خیر ہی خیر ہے، سو اس صورت میں اس بات کی تعلیم ہے کہ جس کام میں بندے کے قصد واختیار کو مطلق دخل نہ ہو تو وہ خیر ہی خیر ہے، اسے ناگوار نہ سمجھے اور نہ عذاب ومصیبت سمجھے، اور پھر اس سے اپنی محرومی پر استدلال نہ کرے، جیسا کہ بہت سے لوگ جب ذرا اپنے احوال میں تغیر پاتے ہیں اگرچہ ان کے ذاتی فعل کو اس میں ذرا دخل نہ بھی ہو تو اپنی محرومی کا توہم کرنے لگتے ہیں۔

* * *

فائدہ: جیسا کہ پہلے نقل کیا جاچکا ہے وفد نجران کے رئیس ابوحارثہ بن علقمہ نے کہا تھا کہ ہم محمد ﷺ پر ایمان لائیں تو روم کے بادشاہ جو ہماری عزت اور مالی خدمت کرتے ہیں سب بند کرلیں گے، شاید یہاں دعا و مناجات کے رنگ میں اس کا جواب دیا کہ بادشاہوں کی سلطنت اور ان کی دی ہوئی عزتوں پر تم مفتون ہو رہے ہو، تو خوب سمجھ لو کہ کل سلطنت وعزت کا اصلی مالک خداوند قدوس ہے، اسی کے قبضہ قدرت میں ہے جس کو چاہے دے اور جس سے چاہے سلب کرلے، کیا یہ امکان نہیں کہ روم وفارس کی سلطنتیں اور عزتیں چھین کر مسلمانوں کو دے دی جائیں، بلکہ وعدہ ہے کہ ضرور دی جائینگی، آج مسلمانوں کی موجودہ بے سروسامانی اور دشمنوں کی طاقت کو دیکھتے ہوئے بیشک یہ چیز تمہاری سمجھ میں نہیں آسکتی، اسی لئے یہود و منافقین مذاق اڑاتے تھے کہ قریش کے حملہ سے ڈر کر مدینہ کے گرد خندق کھودنے والے مسلمان قیصر وکسریٰ کے تاج وتخت پر قبضہ پانے کے خواب دیکھتے ہیں، مگر حق تعالیٰ نے چند ہی سال میں دکھلا دیا کہ روم وفارس کے جن خزانوں کی کنجیاں اس نے اپنے پیغمبر کے ہاتھ میں دی تھیں، فاروق اعظم رضی اللہ کے زمانہ میں وہ کس طرح مجاہدینِ اسلام کے درمیان تقسیم ہوئے، اصل یہ ہے کہ یہ مادی سلطنت وعزت کیا چیز ہے جب خداوند قادر وحکیم نے رُوحانی سلطنت وعزت کا آخری مقام (یعنی منصب نبوت ورسالت) بنی اسرائیل سے منتقل کر کے بنی اسماعیل میں پہنچا دیا تو روم وعجم کی ظاہری سلطنت کا عرب کے خانہ بدوشوں کی طرف منتقل کر دینا کیا مُستبعد ہے، گویا یہ دعا ایک طرح کی پیشین گوئی تھی کہ عنقریب دنیا کی کایا پلٹ ہونیوالی ہے، جو قوم دنیا سے الگ تھلگ پڑی تھی عزتوں اور سلطنتوں کی مالک ہوگی، اور جو بادشاہت کر رہے تھے ان کو اپنی بداعمالیوں کی بدولت پستی وذلت کے غار میں گرایا جائے گا۔

تنبیہ: بِيَدِكَ الْخَيْرُ بیشک خدا کے ہاتھ میں ہر قسم کی خیر وخوبی ہے اور ''شر'' کا پیدا کرنا بھی اسکے اعتبار سے خیر ہی ہے، کیونکہ مجموعہ عالم کے اعتبار سے اس میں ہزار ہا حکمتیں پوشیدہ ہیں، فی الحدیث الصحیح الخیر کلہ فی یدیک و الشر لیس الیک۔

تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ز وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ

تو داخل کرتا ہے رات کو دن میں اور داخل کرے دن کو رات میں ۱؎ اور تو نکالے زندہ مردہ سے اور نکالے مردہ

مِنَ الْحَيِّ ز وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۲۷﴾

زندہ سے ۲؎ اور تو رزق دے جس کو چاہے بے شمار ۳؎

خلاصہ تفسیر: آپ (بعض موسموں میں) رات (کے اجزاء) کو دن میں داخل کر دیتے ہیں (جس سے دن بڑا ہونے لگتا ہے) اور (بعض موسموں میں) دن (کے اجزاء) کو رات میں داخل کر دیتے ہیں (جس سے رات بڑھنے لگتی ہے) اور آپ جان دار چیز کو بے جان سے نکال لیتے ہیں (جیسے انڈہ سے بچہ) اور بے جان چیز کو جان دار سے نکال لیتے ہیں (جیسے پرندے سے انڈہ) اور آپ جس کو چاہتے ہیں بے شمار رزق عطا فرماتے ہیں (یعنی آپ کو ہر طرح کی قدرت ہے، سو کمزوروں کو قوت وسلطنت دیدینا کیا مشکل ہے)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ یعنی کبھی رات کو گھٹا کر دن کو بڑھا دیتا ہے، کبھی اسکا عکس کرتا ہے، مثلاً ایک موسم میں ۱۴ گھنٹہ کی رات اور دس گھنٹہ کا دن ہے، چند ماہ بعد رات کے چار گھنٹہ کاٹ کر دن میں داخل کر دیئے، اب رات دس گھنٹہ کی رہ گئی اور دن ۱۴ گھنٹہ کا ہو گیا، یہ سب الٹ پھیر تیرے ہاتھ میں ہیں، کیونکہ شمس وقمر وغیرہ تمام سیارات بدون تیرے ارادہ کے ذرا حرکت نہیں کر سکتے، خلاصہ یہ ہوا کہ کبھی کے دن بڑے اور کبھی کی رات۔

فائدہ: ۲؎ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ یعنی بیضہ کو مرغی سے، مرغی کو بیضہ سے آدمی کو نطفہ سے نطفہ کو آدمی سے، جاہل کو عالم سے، عالم کو جاہل سے، کامل کو ناقص سے، ناقص کو کامل سے نکالنا تیری ہی قدرت کا کام ہے۔

فائدہ: ۳؎ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں ''یہود جانتے تھے کہ پہلے جو بزرگی ہم میں تھی وہ ہی ہمیشہ

رہے گی، اللہ کی قدرت سے غافل ہیں جس کو چاہے عزیز کرے اور سلطنت دے اور جس سے چاہے چھین لے اور ذلیل کر دے، اور جاہلوں میں کامل پیدا کرے (جیسے عرب کے اُمیوں میں سے کئے) اور کاملوں میں سے جاہل (جیسے بنی اسرائیل میں ہوا) اور جس کو چاہے (حسّی ومعنوی) رزق بے حساب دیوے''۔

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ

نہ بناویں مسلمان کافروں کو دوست مسلمانوں کو چھوڑ کر، اور جو کوئی یہ کام کرے تو نہیں اس کو

مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً ۭ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ﴿۲۸﴾

اللہ سے کوئی تعلق مگر اس حالت میں کہ کرنا چاہو تم ان سے بچاؤ ۱ اور اللہ تم کو ڈراتا ہے اپنے سے، اور اللہ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے ۲

خلاصہ تفسیر: پیچھے کفار کی مذمت تھی، اب نتیجہ کے طور پر مسلمانوں کو ان کے ساتھ دوستی کرنے کی ممانعت بیان فرماتے ہیں، حاصل یہ ہے کہ جب کفار کے برے افعال معلوم ہو چکے جیسے آیات کا انکار، خدا و رسول کے ساتھ دشمنی تو ایسے دشمنوں سے دوستی کب زیبا ہے، اور اس کی مخالفت کرنے والوں کے لئے سخت وعید ہے کہ جو ان کو دوست بنائے گا، اس کا اللہ تعالیٰ سے دوستی و محبت کا علاقہ قطع ہو جائے گا۔

مسلمانوں کو چاہئے کہ (ظاہری یا باطنی طور پر) کفار کو دوست نہ بنائیں مسلمانوں (کی دوستی) سے تجاوز کر کے (یہ تجاوز دو صورت سے ہوتا ہے: ① ایک یہ کہ مسلمانوں سے بالکل دوستی نہ کریں ② دوسرے یہ کہ مسلمانوں کے ساتھ بھی دوستی ہو اور کفار کے ساتھ بھی، دونوں صورتیں ممانعت میں داخل ہیں) اور جو شخص ایسا (کام) کرے گا سو وہ اللہ کے ساتھ دوستی رکھنے کے کسی شمار میں نہیں (کیونکہ جن دو شخصوں میں باہم دشمنی ہو، ایک سے دوستی کر کے دوسرے سے دوستی کا دعویٰ قابل اعتماد نہیں ہو سکتا) مگر ایسی صورت میں (ظاہری دوستی کی اجازت ہے) کہ تم اس سے کسی قسم کا (قوی) اندیشہ رکھتے ہو (وہاں دفع ضرر کی ضرورت ہے) اور اللہ تعالیٰ تم کو اپنی ذات (عظیم الشان سے) ڈراتا ہے (کہ اس کی ذات سے ڈر کر احکام کی مخالفت مت کرو) اور خدا ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے (اس وقت کی سزا کا خوف کرنا ضرور ہے، کافروں سے باطنی اور دلی دوستی تو مطلقاً حرام ہے، اور ظاہری دوستی معاملات کے درجہ میں اگرچہ جائز ہے، مگر بلا ضرورت وہ بھی پسند نہیں)۔

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ: اس آیت کے تحت اہل اللہ نے منکرین کے ساتھ دوستی رکھنے سے منع کیا ہے، کیونکہ انکار کی ظلمت و تاریکی کفر کی ظلمت و تاریکی سے مشابہت رکھتی ہے، اور بعض مرتبہ دونوں ظلمتیں (ظلمت کفر اور ظلمت انکار) جمع ہو کر مؤمن کے نور ایمان کو کمزور کر دیتی ہیں، البتہ اگر ان سے کچھ اندیشہ ہو تو ظاہراً دوستی کر لینا جائز ہے، لیکن یہ اجازت بھی ضعیف و کمزور ایمان والوں کو ہوگی، جو لوگ اللہ پر کامل یقین رکھتے ہیں انہیں اس ظاہری دوستی کی بھی اجازت نہیں ہوگی۔

دو شخصوں یا دو جماعتوں کے ساتھ تعلقات کے مختلف درجات ہوتے ہیں: ① ایک درجہ تعلق کا ''قلبی موالات'' یا ''دلی مودّت و محبت'' ہے، یہ صرف مومنین کے ساتھ مخصوص ہے، غیر مومن کے ساتھ مومن کا یہ تعلق کسی حال میں قطعاً جائز نہیں۔

② دوسرا درجہ ''مواسات'' کا ہے، جس کے معنی ہمدردی و خیر خواہی اور نفع رسانی کے ہیں، یہ بجز کفار اہل حرب کے جو مسلمانوں سے برسرِ پیکار ہیں، باقی سب غیر مسلموں کے ساتھ جائز ہے، سورۂ ممتحنہ کی آٹھویں آیت میں اس کی تفصیل بیان کی گئی ہے، جس میں ارشاد ہے: لا ینھکم اللہ عن الذین لم یقاتلو کم فی الدین ولم یخرجو کم من دیار کم ان تبروھم و تقسطوا الیھم یعنی اللہ تعالیٰ تم کو منع نہیں کرتا ان سے جو لڑتے نہیں تم سے دین پر اور نکالا نہیں تم کو تمہارے گھروں سے کہ ان کے ساتھ احسان اور انصاف کا سلوک کرو۔

③ تیسرا درجہ ''مدارات'' کا ہے، جس کے معنی ہیں ظاہری خوش خلقی اور دوستانہ برتاؤ کے، یہ بھی تمام غیر مسلموں کے ساتھ جائز ہے، جبکہ اس سے

مقصود ان کو دینی نفع پہنچانا ہو، یا وہ اپنے مہمان ہوں، یا ان کے شر اور ضرر رسانی سے اپنے آپ کو بچانا مقصود ہو، سورۃ آل عمران کی آیت مذکورہ میں: الا ان تتقوا منھم تُقٰۃ سے یہی درجہ ''مدارات'' کا مراد ہے، یعنی کافروں سے ''موالات'' جائز نہیں، مگر ایسی حالت میں جبکہ تم ان سے اپنا بچاؤ کرنا چاہو اور چونکہ مدارات میں بھی صورت موالات کی ہوتی ہے، اس لئے اس کو موالات سے مستثنیٰ قرار دے دیا گیا۔

④ چوتھا درجہ ''معاملات'' کا ہے کہ ان سے تجارت یا اجرت و ملازمت اور اور صنعت و حرفت کے معاملات کئے جائیں، یہ بھی تمام غیر مسلموں کے ساتھ جائز ہے، بجز ایسی حالت کے کہ ان معاملات سے عام مسلمانوں کو نقصان پہنچتا ہو، رسول کریم ﷺ اور خلفائے راشدینؓ اور دوسرے صحابہؓ کا تعامل اس پر شاہد ہے، فقہاء نے اسی بناء پر کفار اہل حرب کے ہاتھ اسلحہ فروخت کرنے کو ممنوع قرار دیا ہے، باقی تجارت وغیرہ کی اجازت دی ہے، اور ان کو اپنا ملازم رکھنا، یا خود ان کے کارخانوں اور اداروں میں ملازم ہونا یہ سب جائز ہے۔

اس تفصیل سے یہ معلوم ہو گیا کہ قلبی اور دلی دوستی و محبت تو کسی کافر کے ساتھ کسی حال میں جائز نہیں، اور احسان و ہمدردی و نفع رسانی بجز اہل حرب کے اور سب کے ساتھ جائز ہے، اسی طرح ظاہری خوش خلقی اور دوستانہ برتاؤ بھی سب کے ساتھ جائز ہے، جبکہ اس کا مقصد مہمان کی خاطر داری، یا غیر مسلموں کو اسلامی معلومات اور دینی نفع پہنچانا، یا اپنے آپ کو ان کے کسی نقصان و ضرر سے بچانا ہو، خلفائے راشدین اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے معاملات اس قسم کے واقعات سے بھرے ہوئے ہیں جن میں مواسات یا مدارات یا معاملات کی صورتیں تھیں، جس ''موالات'' سے منع کیا گیا وہ نہ تھی، اس تفصیل اور تشریح سے ایک طرف تو یہ معلوم ہو گیا کہ غیر مسلموں کے لئے اسلام میں کتنی رواداری اور حسن سلوک کی تعلیم ہے دوسری طرف جو ظاہری تعارض ترک موالات کی آیات سے محسوس ہوتا تھا وہ بھی رفع ہو گیا۔

اِلَّآ اَنۡ تَتَّقُوۡا مِنۡهُمۡ تُقٰىةً: یعنی مگر ایسی صورت میں (ظاہری دوستی کی اجازت ہے) کہ تم اس سے کسی قسم کا (قوی) اندیشہ رکھتے ہو، یہاں ''قوی'' کی قید اس لیے لگائی کہ محض توہم اور خیال کا اعتبار نہیں، چنانچہ ایک آیت: یقولون ان تصیبنا دائرۃ سے اس پر انکار کیا گیا ہے کہ محض وہمی اندیشہ کی وجہ سے کفار کے ساتھ میل جول نہیں ہونا چاہیے، البتہ نقصان کا قوی اندیشہ ہو تو اس صورت میں ظاہری دوستی یعنی مدارات جائز ہے۔

بعض لوگوں کو اس آیت میں تقیہ کے جواز کا شبہ ہو جاتا ہے، حالانکہ اس آیت کی تقیہ سے اصلاً کوئی مناسبت ہی نہیں، کیونکہ اس آیت میں خوف ضرر کے وقت دوستی ظاہر کرنے اور دشمنی چھپانے کا ذکر ہے، جبکہ تقیہ متعارف میں کفر ظاہر کرنا اور ایمان چھپانا جائز سمجھا جاتا ہے، اور اکراہ و جبر کی صورت میں جو شریعت نے کفر کا اظہار اور ایمان کا اخفاء جائز کیا ہے تو اس میں نقصان کا شدید ہونا اور خوف کا قوی ہونا شرط ہے، جبکہ اس کے برخلاف تقیہ کے لیے خفیف سا نقصان اور وہمی خوف بھی کافی سمجھا جاتا ہے، بلکہ جہاں نقصان کا اندیشہ بھی نہیں ہوتا وہاں فقط نفع کے حصول کے لیے بھی تقیہ کو جائز سمجھتے ہیں، خلاصہ یہ کہ تقیہ کا قرآن سے کوئی تعلق نہیں، نہ اس آیت سے اور نہ ہی اکراہ والی آیت سے، خوب سمجھ لو۔

* * *

فائدہ: اِلَّآ اَنۡ تَتَّقُوۡا مِنۡهُمۡ تُقٰىةً: یعنی جب حکومت و سلطنت، جاہ و عزت، اور ہر قسم کے تقلبات و تصرفات کی زمام اکیلے خداوند قدوس کے ہاتھ میں ہوئی تو مسلمانوں کو جو صحیح معنی میں اس پر یقین رکھتے ہیں، شایان نہیں کہ اپنے اسلامی بھائیوں کی اخوۃ و دوستی پر اکتفاء نہ کر کے خواہ مخواہ دشمنان خدا کی موالاۃ و مدارات کی طرف قدم بڑھائیں، خدا اور سول کے دشمن ان کے دوست کبھی نہیں بن سکتے، جو اس خبط میں پڑے گا سمجھ لو کہ خدا کی محبت و موالات سے اسے کچھ سروکار نہیں، ایک مسلمان کی سب اُمیدیں اور خوف صرف خداوند رب العزت سے وابستہ ہونے چاہئیں، اور اس کے اعتماد و وثوق اور محبت و مناصرت کے مستحق وہ ہی لوگ ہیں جو حق تعالیٰ سے اسی قسم کا تعلق رکھتے ہوں، ہاں! تدبیر و انتظام کے درجہ میں کفار کے ضرر عظیم سے اپنے ضروری بچاؤ کے پہلو اور حفاظت کی صورتیں معقول و مشروع طریقہ پر اختیار کرنا، ترک موالات کے حکم سے اسی طرح مستثنیٰ ہیں، جیسے سورۃ انفال میں: وَمَنۡ يُّوَلِّهِمۡ يَوۡمَئِذٍ دُبُرَهٗۤ سے مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوۡ مُتَحَيِّزًا اِلٰى فِئَةٍ (الانفال: ۱۶) کو مستثنیٰ کیا گیا ہے، جس طرح وہاں تحرف و تحیز کی حالت میں حقیقۃً فرار من الزحف نہیں ہوتا، محض صورۃً ہوتا ہے، یہاں بھی الا ان تتقوا منھم تقٰۃ کو حقیقت موالات نہیں، فقط صورت موالات سمجھنا چاہیے جس کو ہم ''مدارات'' کے نام سے موسوم کرتے ہیں اس مسئلہ کی مزید تفصیل سورۃ مائدہ کی آیت: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَتَّخِذُوا الۡيَهُوۡدَ

وَالنَّصٰرٰی اَوْلِیَاۗءَ ۘ بَعْضُھُمْ اَوْلِیَاۗءُ بَعْضٍ ۭ وَمَنْ یَّتَوَلَّھُمْ مِّنْکُمْ فَاِنَّهٗ مِنْھُمْ ۭ (المائدہ:۵۱) کے فوائد میں ملاحظہ کرلی جائے۔

فائدہ: ۲ وَاِلَی اللّٰهِ الْمَصِیْرُ: یعنی مومن کے دل میں اصلی ڈر خدا کا ہونا چاہیے، کوئی ایسی بات نہ کرے جو اس کی ناراضی کا سبب ہو، مثلاً جماعت اسلام سے تجاوز کر کے بے ضرورت کفار کے ساتھ ظاہری یا باطنی موالات کرے یا ضرورت کے وقت صورت موالات اختیار کرنے میں حدود شرع سے گزر جائے، یا محض موہوم وحقیر خطرات کو یقینی اور اہم خطرات ثابت کرنے لگے، اور اسی قسم کی مستثنیات یا شرعی رخصتوں کو ہوائے نفس کی پیروی کا حیلہ بنالے، اسے یاد رکھنا چاہیے کہ سب کو خداوند قدوس کی عدالت عالیہ میں حاضر ہونا ہے وہاں جھوٹے حیلے حوالے کچھ پیش نہ جائینگے، مومن قوی کی شان تو یہ ہونی چاہیے کہ رخصت سے گزر کر عزیمت پر عمل پیرا ہو، اور مخلوق سے زیادہ خالق سے خوف کھائے۔

قُلْ اِنْ تُخْفُوْا مَا فِیْ صُدُوْرِکُمْ اَوْ تُبْدُوْهُ یَعْلَمْهُ اللّٰهُ ۭ وَیَعْلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا

تو کہہ اگر تم چھپاؤ گے اپنے جی کی بات یا اسے ظاہر کرو گے جانتا ہے اس کو اللہ ۱ اور اس کو معلوم ہے جو کچھ کہ ہے آسمانوں میں اور جو کچھ ہے

فِی الْاَرْضِ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۲۹﴾

زمین میں، اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے ۲

خلاصہ تفسیر: گذشتہ آیت میں کفار کے ساتھ دوستی کرنے کی ممانعت فرمائی تھی، آگے اس ممانعت کو عام طور پر بیان فرماتے ہیں کہ دلی دوستی تو کسی صورت میں اصلاً جائز نہیں، اور بلاضرورت ظاہری دوستی بھی جائز نہیں، اور اس مضمون کو ایسے عام عنوان سے بیان فرمایا جس سے تمام ظاہری وباطنی گناہوں سے تنبیہ ہوجائے

آپ ﷺ (ان سے) فرما دیجیے کہ اگر تم (دل ہی دل میں) پوشیدہ رکھو گے اپنا مافی الضمیر یا اس کو (زبان اور اعضا سے) ظاہر کرو گے اللہ تعالیٰ اس کو (ہر حال میں) جانتے ہیں اور (اسی کی کیا تخصیص ہے) وہ تو سب کچھ جانتے ہیں، جو کچھ کہ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ کہ زمین میں ہے (کوئی چیز ان سے مخفی نہیں) اور (علم کے ساتھ) اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت بھی کامل رکھتے ہیں (سو اگر تم کسی قبیح کام کا ارتکاب کرو گے خواہ ظاہری ہو یا باطنی تو اللہ تعالیٰ تم کو سزا دے سکتے ہیں)۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی ممکن ہے آدمی اپنی نیت اور دل کی بات آدمیوں سے چھپالے، لیکن وہ اس طرح خدا کو فریب نہیں دے سکتا وَاللّٰهُ یَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ (البقرۃ:۲۲۰)

فائدہ: ۲ جب علم اس قدر محیط اور قدرت ایسی عام وتام ہے تو مجرم کے لئے اخفاء جرم یا سزا سے بچ کر بھاگ جانے کی کوئی صورت نہیں۔

یَوْمَ تَجِدُ کُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَیْرٍ مُّحْضَرًا ۚۖ وَّمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْۗءٍ ۚ تَوَدُّ لَوْ اَنَّ بَیْنَھَا

جس دن موجود پاویگا ہر شخص جو کچھ کہ کی ہے اس نے نیکی اپنے سامنے، اور جو کچھ کہ کی ہے اس نے برائی، آرزو کریگا کہ مجھ میں

وَبَیْنَهٗٓ اَمَدًۢا بَعِیْدًا ۭ وَیُحَذِّرُکُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ۭ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۳۰﴾　ع ۱۱

اور اس میں فرق پڑ جاوے دور کا ۱ اور اللہ ڈراتا ہے تم کو اپنے سے، اور اللہ بہت مہربان ہے بندوں پر ۲

خلاصہ تفسیر: اب مضمون بالا کی تاکید کے لیے قیامت کا آنا اور اس میں بلاتخصیص کسی عمل کے سب اعمال کا پیش نظر ہوجانا اور اس وقت گناہ گاروں کا پچھتانا بیان فرماتے ہیں:

جس روز (ایسا ہوگا) کہ ہر شخص اپنے اچھے کئے ہوئے کاموں کو سامنے لایا ہوا پائے گا، اور اپنے برے کئے ہوئے کاموں کو (بھی پائے گا، اس روز) اس بات کی تمنا کرے گا کہ کیا خوب ہوتا جو اس شخص کے اور اس روز کے درمیان دور دراز کی مسافت (حائل) ہوتی (تا کہ اپنے اعمال بد کا معائنہ نہ کرنا پڑتا) اور (تم سے پھر مکرر کہا جاتا ہے کہ) خدا تعالیٰ تم کو اپنی ذات (عظیم الشان) سے ڈراتے ہیں (اور یہ ڈرانا اس وجہ سے ہے کہ) اللہ تعالیٰ نہایت مہربان ہیں (اپنے) بندوں (کے حال) پر (اس مہربانی کی وجہ سے یوں چاہتے ہیں کہ تم سزائے آخرت سے بچے رہو، اور بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ برے اعمال کو ترک کردو، اور برے اعمال کا چھوڑنا عادۃً بغیر ڈرانے کے ہوتا نہیں اس لئے ڈراتے ہیں، پس یہ ڈرانا عین شفقت و رحمت ہے)۔

جن لوگوں کے اعمال اچھے اور برے دونوں قسم کے ہوں گے ان کی نسبت یہ فرمانا کہ وہ اس دن کے نہ آنے کی تمنا کریں گے یہ نہایت بلاغت ہے کہ باوجود اس کے کہ ان کے کچھ اعمال اچھے بھی ہوں گے مگر ان کے ہونے کی ذرا خوشی نہ ہوگی، اپنے برے اعمال سے انتہائی درجہ رنجیدہ ہوں گے تو جس کے پاس شر ہی شر ہو اس کا کیا پوچھنا، اور اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ جن کے اعمال سب نیک ہوں تو وہ بھی ایسی تمنا کریں گے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی قیامت کے دن ہر نیکی بدی آدمی کے سامنے حاضر ہوگی، عمر بھر کا اعمال نامہ ہاتھ میں پکڑا دیا جائے گا، اس وقت مجرمین آرزو کریں گے کہ کاش یہ دن ہم سے دور ہی رہتا، یا ہم میں اور ان برے اعمال میں بڑی دور کا فاصلہ ہوتا کہ ان کے قریب بھی نہ جاتے۔

فائدہ: ۲؎ یہ بھی اس کی مہربانی ہے کہ تم کو اس خوفناک دن کے آنے سے پہلے ڈراتا اور آگاہ کرتا ہے، تا کہ برائی کے طریقے خصوصاً موالات کفار ترک کر کے اور بھلائی کے راستہ پر چل کر اپنے خداوند قہار کے غصہ سے بچا لینے کا قبل از وقت انتظام کر رکھو، قرآن کریم کا یہ خاص طرز ہے کہ عموماً خوف کے ساتھ رجاء اور رجاء کے ساتھ خوف کا مضمون سناتا ہے، یہاں بھی مضامین ترہیب کو معتدل بنانے کے لئے اخیر میں **وَاللّٰہُ رَءُوۡفٌۢ بِالۡعِبَادِ** فرما دیا، یعنی خدا سے ڈر کر اگر برائی چھوڑ دو گے تو اس کی مہربانی پھر تمہارا استقبال کرنے کو تیار ہے ناامید ہونے کی کوئی وجہ نہیں، آؤ! تم کو ایسا دروازہ بتائیں جس سے داخل ہو کر مغفرت و رحمت کے پورے مستحق بلکہ خدا تعالیٰ کے محبوب بن سکتے ہو: **قُلۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ تُحِبُّوۡنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوۡنِىۡ يُحۡبِبۡكُمُ اللّٰهُ وَيَغۡفِرۡ لَكُمۡ ذُنُوۡبَكُمۡ‌ؕ وَاللّٰهُ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ**

قُلۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ تُحِبُّوۡنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوۡنِىۡ يُحۡبِبۡكُمُ اللّٰهُ وَيَغۡفِرۡ لَكُمۡ ذُنُوۡبَكُمۡ‌ؕ وَاللّٰهُ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۳۱﴾

تو کہہ اگر تم محبت رکھتے ہو اللہ کی تو میری راہ چلو تا کہ محبت کرے تم سے اللہ اور بخشے گناہ تمہارے، اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے

خلاصہ تفسیر: پیچھے توحید کا واجب ہونا اور کفر کا مذموم ہونا مذکور تھا، آگے رسالت کا اعتقاد اور رسول کا اتباع واجب ہونا بتلاتے ہیں تا کہ معلوم ہو جائے کہ جس طرح توحید کا انکار کفر ہے اسی طرح رسالت کا انکار بھی کفر ہے۔

آپ (ﷺ لوگوں سے) فرما دیجئے کہ اگر تم (بزعم خود) خدا تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو (اور محبت رکھنے کی وجہ سے یہ بھی چاہتے ہو کہ خدا تعالیٰ بھی تم سے محبت کرے) تو تم لوگ (اس مقصد کے حاصل کرنے کے طریقوں میں) میرا اتباع کرو (کیونکہ میں خاص اسی تعلیم کے لئے مبعوث ہوا ہوں، جب ایسا کرو گے) خدا تعالیٰ تم سے محبت کرنے لگیں گے اور تمہارے سب گناہوں کو معاف کر دیں گے (کیونکہ میں اس معافی کا طریقہ بھی تعلیم کرتا ہوں، اس پر عمل کرنے سے لامحالہ حسب وعدہ گناہ معاف ہو جائیں گے، مثلاً گناہوں سے توبہ، اللہ تعالیٰ کے حقوق جو فوت کئے ہیں ان کو پورا کرنا، حقوق العباد کا ادا کر لینا، یا معاف کرا لینا) اور اللہ تعالیٰ بڑے معاف کرنے والے اور بڑی عنایت فرمانے والے ہیں۔

اِنۡ كُنۡتُمۡ تُحِبُّوۡنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوۡنِىۡ جو شخص اللہ تعالیٰ سے محبت رکھنا چاہتا ہو اور یہ چاہتا ہو کہ اللہ تعالیٰ اس کو محبوب رکھیں تو یہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک اللہ کے محبوب حضرت محمد ﷺ کا اتباع نہ کرے۔

* * *

فائدہ: دشمنان خدا کی موالات و محبت سے منع کرنے کے بعد خدا سے محبت کرنے کا معیار بتلاتے ہیں، یعنی اگر دنیا میں آج کسی شخص کو اپنے

مالک حقیقی کی محبت کا دعوئی یا خیال ہوتو لازم ہے کہ اس کو اتباع محمدی ﷺ کی کسوٹی پر کس کر دیکھ لے، سب کھرا کھوٹا معلوم ہوجائے گا، جو شخص جس قدر حبیب خدا محمد رسول اللہ ﷺ کی راہ چلتا اور آپ ﷺ کی لائی ہوئی روشنی کو مشعل راہ بناتا ہے، اسی قدر سمجھنا چاہیے کہ خدا کی محبت کے دعوے میں سچا اور کھرا ہے، اور جتنا اس دعوے میں سچا ہوگا، اتنا ہی حضور ﷺ کی پیروی میں مضبوط و مستعد پایا جائے گا، جس کا پھل یہ ملے گا کہ حق تعالیٰ اس سے محبت کرنے لگے گا، اور اللہ کی محبت اور حضور ﷺ کے اتباع کی برکت سے پچھلے گناہ معاف ہوجائینگے اور آئندہ طرح طرح کی ظاہری و باطنی مہربانیاں مبذول ہونگی، گویا توحید وغیرہ کے بیان سے فارغ ہوکر یہاں سے نبوت کا بیان شروع کیا گیا اور پیغمبر آخر الزماں ﷺ کی اطاعت کی دعوت دی گئی۔

قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۲﴾

تو کہہ حکم مانو اللہ کا اور رسول کا، پھر اگر اعراض کریں تو اللہ کو محبت نہیں ہے کافروں سے

خلاصہ تفسیر: (اور) آپ یہ (بھی) فرما دیجیے کہ تم اطاعت کیا کرو اللہ تعالیٰ کی (کہ اصل مقصود تو وہی ہے) اور (اطاعت کیا کرو) رسول کی (یعنی میری اطاعت اس حیثیت سے ضروری ہے کہ میں اللہ کا رسول ہوں، میری معرفت حق تعالیٰ اپنی اطاعت کے طریقے بتلاتے ہیں) پھر (اس پر بھی) اگر وہ لوگ (آپ کی اطاعت سے کہ اس کا ادنیٰ اعتقادِ رسالت ہے) اعراض کریں سو (وہ لوگ سن رکھیں کہ) اللہ تعالیٰ کافروں سے محبت نہیں کرتے (اور اس صورت میں یہ لوگ کافر ہوں گے، سو ان کو اللہ سے دعوائے محبت کرنا یا محبوب خدا ہونے کی ہوس رکھنا محض حماقت ہے)۔

* * *

فائدہ: یہود و نصاریٰ کہتے تھے نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ (المائدہ:۱۸) (ہم خدا کے بیٹے اور محبوب ہیں) یہاں بتلادیا گیا کہ کافر کبھی خدا کا محبوب نہیں ہوسکتا، اگر واقعی محبوب بننا چاہتے ہو تو اسکے احکام کی تعمیل کرو، پیغمبر ﷺ کا کہا مانو اور خدا کے سب سے بڑے محبوب کے نقش قدم پر چلے آؤ، وفد نجران نے یہ بھی کہا تھا کہ ہم مسیح کی تعظیم و عبادت اللہ کی محبت و تعظیم کے لئے کرتے ہیں، اس کا بھی جواب ہوگیا۔

ربط: آگے خدا تعالیٰ کے چند محب و محبوب بندوں کا حال سنایا گیا اور وفد نجران کی رعایت سے حضرت مسیح علیہ السلام کی سوانح زیادہ شرح و بسط کے ساتھ بیان کی گئی ہے، جو تمہید ہے خاتم الانبیاء ﷺ کے ذکر مبارک کی، جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا۔

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰٓى اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۳۳﴾

بیشک اللہ نے پسند کیا آدم کو اور نوح کو اور ابراہیم کے گھر کو اور عمران کے گھر کو ۱ سارے جہان سے

ذُرِّيَّةًۢ بَعْضُهَا مِنْۢ بَعْضٍ ۗ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۳۴﴾

جو اولاد تھے ایک دوسرے کی ۱ اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے ۲

خلاصہ تفسیر: بعض معاندین مسئلہ رسالت میں عقلی و نقلی دلائل واضح ہونے کے باوجود انکار کرتے تھے اس لیے آئندہ آیات میں اس مسئلہ کی تاکید کے لیے اجمالا پہلے چند مشہور انبیاء کا مقبول و منتخب ہونا، پھر حضرت عیسی، حضرت زکریا اور حضرت یحییٰ علیہم السلام کا کسی قدر مفصل قصہ بیان فرماتے ہیں تاکہ ان نظائر سے وہ شبہات دور ہوجائیں، ان حضرات کی تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ ان کا زمانہ حضور ﷺ کے زمانہ سے قریب گزرا ہے، انبیاء سابقین کے تذکرہ میں حضرت آدم، نوح، آل ابراہیم، آل عمران علیہم السلام کا ذکر تو اجمال و اختصار کے ساتھ کردیا گیا ہے، اس کے بعد دراصل ذکر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا کرنا ہے، اس سے پہلے ان کی نانی اور والدہ کا بھی تفصیلی تذکرہ کیا گیا ہے۔

بیشک اللہ تعالیٰ نے (نبوت کے لئے) منتخب فرمایا ہے (حضرت) آدم (علیہ السلام) اور (حضرت) نوح (علیہ السلام) کو اور (حضرت) ابراہیم (علیہ السلام) کی اولاد (میں سے بعضوں) کو (جیسے حضرت اسماعیل، حضرت اسحاق، حضرت یعقوب علیہم السلام، اور تمام انبیاء بنی

اسرائیل جو کہ یعقوب علیہ السلام کی اولاد ہیں، اور ہمارے رسول ﷺ جو کہ اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں) اور عمران کی اولاد (میں سے بعضوں) کو (غرض ان حضرات کو نبوت کے لئے) تمام جہان (کی مخلوقات) پر (منتخب فرمایا ہے) بعضے ان میں بعضوں کی اولاد ہیں (جیسے حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد سب ہیں، اسی طرح نوح علیہ السلام کی اولاد سب ہیں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں اولادِ عمران بھی ہے) اور اللہ تعالیٰ خوب سننے والے ہیں خوب جاننے والے ہیں (کہ سب کے قول سنتے ہیں، سب کے احوال کو جانتے ہیں، پس جس کے اقوال و احوال شانِ نبوت کے مناسب دیکھے ان کو نبی بنا دیا)۔

وَاٰلَ عِمْرٰنَ: اگر یہ عمران حضرت موسیٰ علیہ السلام کے والد ہیں تو اولاد سے مراد حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام ہیں، اور اگر یہ عمران حضرت مریم علیہا السلام کے والد ہیں تو اولاد سے مراد حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام ہیں، یہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نبوت کا ذکر اس لیے نہیں کیا کہ ان کی نبوت تمام آسمانی مذاہب میں مشہور و مسلم تھی۔

ذُرِّيَّةً بَعْضُهَا مِنْۢ بَعْضٍ: یہ جو فرمایا کہ ''ایک دوسرے کی اولاد ہے'' شاید مقصود اس سے ان سب حضرات کا اتحاد یا شرف ذاتی کے ساتھ شرف نسبت کا بیان فرمانا ہو، اور اس امر کا جتلانا ہو کہ رسول اللہ ﷺ کے آباء و اجداد میں بھی نبوت رہی ہے، اگر آپ ﷺ کو نبوت مل گئی تو بعید کیا ہے، واللہ اعلم۔

* * *

فائدہ: ۱۔ وَاٰلَ عِمْرٰنَ: ''عمران'' دو ہیں ① ایک حضرت موسیٰ علیہ السلام کے والد ② دوسرے حضرت مریم کے والد، اکثر سلف و خلف نے یہاں عمران ثانی مراد لیا ہے کیونکہ آگے اذقالت امراة عمران الخ سے اسی دوسرے عمران کے گھرانے کا قصہ بیان ہوا ہے اور غالباً سورۃ کا نام ''آل عمران'' اسی بناء پر ہوا کہ اس میں عمران ثانی کے گھرانے (یعنی حضرت مریم و مسیح علیہ السلام) کا واقعہ بہت بسط و تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔

فائدہ: ۲۔ ذُرِّيَّةً بَعْضُهَا مِنْۢ بَعْضٍ: خدا کی مخلوقات میں زمین آسمان، چاند، سورج، ستارے، فرشتے، جن، شجر، حجر سب ہی شامل تھے، مگر اس نے اپنے علم محیط اور حکمت بالغہ سے ملکات روحانیہ اور کمالات جسمانیہ کا جو مجموعہ ابوالبشر آدم علیہ السلام میں ودیعت کیا وہ مخلوقات میں سے کسی کو نہ دیا، بلکہ آدم کو مسجود ملائکہ بنا کر ظاہر فرما دیا کہ آدم کا اعزاز و اکرام اس کی بارگاہ میں ہر مخلوق سے زیادہ ہے، آدم کا یہ انتخابی اور اصطفائی فضل و شرف جسے ہم ''نبوت'' سے تعبیر کرتے ہیں کچھ ان کی شخصیت پر محدود و مقصود نہ تھا، بلکہ منتقل ہو کر ان کی اولاد میں نوح علیہ السلام کو ملا، پھر منتقل ہوتا ہوا نوح علیہ السلام کی اولاد حضرت ابراہیم علیہ السلام تک پہنچا، یہاں سے ایک نئی صورت پیدا ہوگئی، آدم و نوح کے بعد جتنے انسان دنیا میں آباد رہے تھے، وہ سب ان دونوں کی نسل سے تھے، کوئی خاندان ان دونوں کی ذرّیت سے باہر نہ تھا، برخلاف اس کے ابراہیم علیہ السلام کے بعد ان کی نسل کے علاوہ دنیا میں دوسرے بہت خاندان موجود رہے، لیکن جس خدا نے اپنی بے شمار مخلوقات میں سے منصب نبوت کے لئے آدم کا انتخاب کیا تھا، اسی کے علم محیط اور اختیار کامل نے آئندہ کے لئے ہزاروں گھرانوں میں سے اس منصب جلیل کے واسطے ابراہیم علیہ السلام کے گھرانے کو مخصوص فرما دیا، جس قدر انبیاء و رسل ابراہیم علیہ السلام کے بعد آئے ان ہی کے دو صاحبزادوں اسحاق و اسماعیل کی نسل سے آئے۔

چونکہ عموماً نسب کا سلسلہ باپ کی طرف سے چلتا ہے اور حضرت مسیح علیہ السلام بن باپ کے پیدا ہوئے تھے، اس لحاظ سے وہم ہو سکتا تھا کہ ان کو نسل ابراہیمی سے مستثنیٰ کرنا پڑے گا، اس لئے حق تعالیٰ نے آل عمران اور ذریة بعضها من بعض فرما کر متنبہ کر دیا کہ حضرت مسیح جب صرف ماں سے پیدا ہوئے تو ان کا سلسلہ نسب بھی ماں ہی کی طرف سے لیا جائے گا نہ کہ معاذ اللہ خدا کی طرف سے، اور ظاہر ہے کہ ان کی والدہ مریم صدیقہ کے باپ عمران کا سلسلہ آخر حضرت ابراہیم علیہ السلام پر منتہی ہوتا ہے تو آل عمران، آل ابراہیم کی ایک شاخ ہوئی اور کوئی پیغمبر خاندان ابراہیمی سے باہر نہ ہوا۔

فائدہ: ۳۔ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ: سب کی دعاؤں اور باتوں کو سنتا اور سب کے ظاہری و باطنی احوال و استعداد کو جانتا ہے، لہٰذا یہ وہم نہ کرنا چاہیے کہ یوں ہی کیف ما اتفق انتخاب کر لیا ہوگا، وہاں کا ہر کام پورے علم و حکمت پر مبنی ہے۔

اِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ رَبِّ اِنِّیْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِیْ بَطْنِیْ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّیْ ۚ

جب کہا عمران کی عورت نے کہ اے رب میں نے نذر کیا تیرے جو کچھ میرے پیٹ میں ہے سب سے آزاد رکھ کر سو تو مجھ سے قبول کر

اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ﴿۳۵﴾

بیشک تو ہی ہے اصل سننے والا جاننے والا

خلاصہ تفسیر: (وہ وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہے) جبکہ عمران (مریم کے والد) کی بی بی نے (حالت حمل میں حق تعالیٰ سے) عرض کیا کہ اے میرے پروردگار! میں نے نذر (یعنی منت) مانی ہے آپ (کی عبادت) کے لئے اس بچے کی جو میرے شکم میں ہے کہ وہ (خانہ خدا کی خدمت کے واسطے) آزاد (فارغ) رکھا جائے گا (اور میں اس کو اپنے کام میں نہ لگاؤں گی) سو آپ (اس کو) مجھ سے قبول کر لیجیے، بیشک آپ خوب سننے والے خوب جاننے والے ہیں (کہ میری عرض کو سن رہے ہیں اور میری نیت کو جانتے ہیں)۔

اس زمانہ میں لڑکوں کے لیے ایسی نذر ماننا جائز تھی، انہوں نے اس گمان سے یہ نذر مانی تھی کہ شاید لڑکا پیدا ہو۔

* * *

فائدہ: عمران کی عورت کا نام ہے "حنہ بنت فاقوذا" اس نے اپنے زمانہ کے رواج کے موافق منت مانی تھی کہ خداوندا! جو بچہ میرے پیٹ میں ہے میں اسے محرّر (تیرے نام پر آزاد کرتی ہوں) اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ تمام دنیاوی مشاغل اور قید نکاح وغیرہ سے آزاد رہ کر ہمیشہ خدا کی عبادت اور کلیسا کی خدمت میں لگا رہے گا، اے اللہ! تو اپنی مہربانی سے میری نذر قبول فرما، تو میری عرض کو سنتا اور میری نیت واخلاص کو جانتا ہے، گویا لطیف طرز میں استدعا ہوئی کہ لڑکا پیدا ہو کیونکہ لڑکیاں اس خدمت کے لئے قبول نہیں کی جاتی تھیں۔

فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ اِنِّیْ وَضَعْتُهَاۤ اُنْثٰی ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ ؕ وَلَیْسَ الذَّكَرُ

پھر جب اس کو جنا بولی اے رب میں نے تو اس کو لڑکی جنی ۱۔ اور اللہ کو خوب معلوم ہے جو کچھ اس نے جنا، اور بیٹا نہ ہو

كَالْاُنْثٰی ۚ وَاِنِّیْ سَمَّیْتُهَا مَرْیَمَ وَاِنِّیْۤ اُعِیْذُهَا بِكَ وَذُرِّیَّتَهَا مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ﴿۳۶﴾

جیسی وہ بیٹی ۲ اور میں نے اس کا نام رکھا مریم اور میں تیری پناہ میں دیتی ہوں اس کو اور اس کی اولاد کو شیطان مردود سے ۳

خلاصہ تفسیر: پھر جب (ان بی بی نے) لڑکی جنی (تو ان کو رنج ہوا کہ یہ تو بیت المقدس کی خدمت کے لائق نہیں، یہ کام تو مردوں کا ہے، اس لئے حسرت سے) کہنے لگیں کہ اے میرے پروردگار! میں نے تو حمل لڑکی جنی (حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ وہ اپنے خیال سے حسرت کر رہی تھیں) حالانکہ اللہ تعالیٰ زیادہ جانتے ہیں (اس لڑکی کی شان) کو جو انہوں نے جنی اور (کسی طرح بھی) وہ لڑکا (جو انہوں نے چاہا تھا) اس لڑکی کے برابر نہیں (ہو سکتا تھا، بلکہ یہ لڑکی ہی افضل ہے کہ اس کے کمالات و برکات عجیب وغریب ہوں گے، یہ ارشاد خداوندی بطور جملہ معترضہ کے تھا، آگے پھر ان بی بی کا قول ہے) اور میں نے اس لڑکی کا نام مریم رکھا اور میں اس کو اور اس کی اولاد کو (اگر کبھی اولاد ہو) آپ کی پناہ (اور حفاظت) میں دیتی ہوں شیطان مردود سے۔

وَاِنِّیْ سَمَّیْتُهَا مَرْیَمَ: مریم کے معنی عابدہ کے ہیں، اس نام کے جتلانے میں یہ اشارہ ہے کہ میں اپنی نذر پر حتی الامکان اب بھی قائم ہوں کہ اس لڑکی کو بھی مسجد کے لیے فارغ کردوں گی اگر خدمت کے لیے نہیں تو عبادت ہی کے لیے سہی۔

وَاِنِّیْۤ اُعِیْذُهَا بِكَ وَذُرِّیَّتَهَا: یعنی میں مریم اور اس کی اولاد کو آپ کی پناہ میں دیتی ہوں شیطان مردود سے، چنانچہ ان کی یہ گزارش بھی

قبول ہوئی جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ ”ہر بچہ کو ولادت کے وقت شیطان چھیڑتا ہے اور اس کے چھیڑنے سے بچہ چیختا چلاتا ہے سوائے مریم اور عیسیٰ علیہما السلام کے“، اور چونکہ یہ دعا ولادت کے ساتھ ہی معا ہوئی تھی اس لیے اس وقت تک شیطان مس کرنے نہ پایا تھا، اور اس حدیث میں مریم و عیسیٰ علیہما السلام کا ذکر خاص طور پر اس لیے ہوا کہ ان کی والدہ سے صراحۃً دعا منقول ہے، حضور ﷺ نے بھی صراحۃً اس کے قبول ہونے کو ظاہر فرما دیا، پس یہ لازم نہیں آتا کہ دیگر انبیاء کو شیطان مس کرتا ہو، یہاں یہ شبہ فضول ہے کہ اگر شیطان کو ایسی قدرت ہو تو وہ تو سب کو ہلاک کر دے؟ جواب یہ ہے کہ شیطان کو جتنی قدرت دی گئی ہے وہ اس سے زیادہ نہیں کر سکتا، دوسری بات یہ کہ دیگر فرشتے بھی تو نگہبان ہیں۔

* * *

فائدہ: ۱ رَبِّ اِنِّیْ وَضَعْتُهَاۤ اُنْثٰى: یہ حسرت وافسوس سے کہا، کیونکہ خلاف توقع پیش آیا، اور لڑکی قبول کرنے کا دستور نہ تھا۔

فائدہ: ۲ وَلَیْسَ الذَّكَرُ كَالْاُنْثٰى: یہ درمیان میں بطور جملہ معترضہ حق تعالیٰ کا کلام ہے، یعنی اسے معلوم نہیں کیا چیز جنی، اس لڑکی کی قدر و قیمت کو خدا ہی جانتا ہے، جس طرح کے بیٹے کی اسے خواہش تھی وہ اس بیٹی کو کہاں پہنچ سکتا تھا، یہ بیٹی بذات خود مبارک و مسعود ہے اور اس کے وجود میں ایک عظیم الشان مبارک و مسعود بیٹے کا وجود منطوی ہے۔

فائدہ: ۳ وَذُرِّیَّتَهَا مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ: حق تعالیٰ نے یہ دعا قبول فرمائی، حدیث میں ہے کہ آدمی کے بچہ کو ولادت کے وقت جب ماں سے جدا ہو کر زمین پر آ رہا ہے، شیطان مس کرتا ہے، مگر عیسیٰ اور مریم مستثنیٰ ہیں، اس کا مطلب دوسری احادیث کے ملانے سے یہ ہوا کہ بچہ اصل فطرت صحیحہ پر پیدا کیا جاتا ہے جس کا ظہور بڑے ہو کر عقل و تمیز آنے کے بعد ہوگا، لیکن گرد و پیش کے حالات اور خارجی اثرات کے سامنے بسا اوقات اصل فطرت دب جاتی ہے جس کو حدیث میں: فَاَبَوَاهُ یهوِّدَانِهٖ اَوْ یُنَصِّرَانِهٖ سے تعبیر کیا ہے۔

پھر جس طرح ایمان وطاعت کا بیج اس کے جوہر فطرت میں غیر مرئی طور پر رکھ دیا گیا، حالانکہ اس وقت اس کو ایمان تو کیا موٹی موٹی محسوسات کا ادراک و شعور بھی نہیں تھا، اسی طرح خارجی اثر اندازی کی ابتداء بھی ولادت کے بعد ایک قسم کے مسِ شیطانی سے غیر محسوس طور پر ہوگئی، یہ ضروری نہیں کہ ہر شخص اس مس شیطانی کا اثر قبول کرے یا قبول کر لے تو آئندہ چل کر وہ برابر باقی رہے، تمام انبیاء علیہم السلام کی عصمت کا تکفل چونکہ حق تعالیٰ نے کیا ہے، اس لئے اگر فرض کرو ابتدائے ولادت میں یہ صورت ان کو پیش آئی ہو اور مریم و عیسیٰ کی طرح اس ضابطہ سے مستثنیٰ نہ ہوں تو اس میں پھر بھی کوئی شبہ نہیں کہ ان مقدس و معصوم بندوں پر شیطان کی اس حرکت کا کوئی مضر اثر قطعاً نہیں پڑ سکتا، فرق صرف اتنا ہوگا کہ مریم و عیسیٰ علیہ السلام کو کسی مصلحت سے یہ صورت سرے سے پیش ہی نہ آئی ہو، اوروں کو پیش آئی مگر اثر نہ ہوا، اس قسم کے جزئی امتیازات فضیلت کلی ثابت کرنے کا موجب نہیں ہو سکتے، حدیث میں ہے کہ دو بچیاں کچھ اشعار گا رہی تھیں، حضور ﷺ نے اُدھر سے منہ پھیر لیا، ابوبکر آئے مگر لڑکیاں بدستور مشغول رہیں، اسکے بعد حضرت عمرؓ آئے، لڑکیاں اٹھ کر بھاگ گئیں، حضور ﷺ نے فرمایا کہ ”عمر جس راستہ پر چلتا ہے شیطان وہ راستہ چھوڑ کر بھاگ جاتا ہے“ کیا اس سے کوئی خوش فہم یہ مطلب لے سکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ حضرت عمرؓ کو اپنے سے افضل ثابت کر رہے ہیں، ہاں! ابوہریرہؓ کا مسِ شیطان کی حدیث کو آیت ہذا کی تفسیر بنانا بظاہر چسپاں نہیں ہوتا، اِلا یہ کہ آیت وانی اعیذھا بك الخ میں واؤ عطف کو ترتیب کے لئے نہ سمجھا جائے، یا حدیث میں استثناء سے صرف مسیح کے مریم سے پیدا ہونے کا واقعہ مراد ہو، مریم و مسیح الگ الگ مراد نہ ہوں، چنانچہ بخاری کی ایک روایت میں صرف حضرت عیسیٰ کے ذکر پر اکتفاء کیا ہے، واللہ اعلم۔

فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ وَّاَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا ۙ وَّكَفَّلَهَا زَكَرِیَّا ۚ كُلَّمَا دَخَلَ عَلَیْهَا

پھر قبول کیا اس کو اس کے رب نے اچھی طرح کا قبول اور بڑھایا اس کو اچھی طرح بڑھانا اور سپرد کی زکریا کو ۱ جس وقت آتے اس کے پاس

زَكَرِیَّا الْمِحْرَابَ ۙ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا ۚ قَالَ یٰمَرْیَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا ؕ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ

زکریا حجرے میں پاتے اس کے پاس کچھ کھانا ۲ کہا اے مریم کہاں سے آیا تیرے پاس یہ، کہنے لگی یہ اللہ کے پاس سے آتا ہے

اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۳۷﴾

اللہ رزق دیتا ہے جس کو چاہے بے قیاس ۳۷

خلاصہ تفسیر: پس ان (مریم علیہا السلام) کو ان کے رب نے بطریق احسن قبول فرمالیا اور عمدہ طور پر ان کو نشوونما دیا، اور (حضرت) زکریا (علیہ السلام) کو ان کا سرپرست بنایا، جب کبھی (حضرت) زکریا ان کے پاس (اسی) عمدہ مکان میں (جس میں ان کو رکھا تھا) تشریف لاتے تو ان کے پاس کچھ کھانے پینے کی چیزیں پاتے (اور) یوں فرماتے کہ اے مریم! یہ چیزیں تمہارے واسطے کہاں سے آئیں؟ (جبکہ مکان کا تالا لگا ہے، باہر سے کسی کے آنے جانے کا امکان نہیں) وہ کہتیں کہ اللہ تعالیٰ کے پاس (جو خزانہ غیب ہے اس میں) سے آئیں، بیشک اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں بے استحقاق رزق عطا فرماتے ہیں (جیسا اس موقع پر محض فضل سے بے مشقت عطا فرمایا)۔

فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ: قبولیت کی ظاہری علامت یہ تھی کہ اس عجیب قرعہ میں جو کہ معجزہ کے طور پر تھا زکریا علیہ السلام غالب آئے، جس سے معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ کی یہ مرضی تھی کہ زکریا علیہ السلام کے پاس رہیں اور پلیں، اسی لیے قبولیت کو اور زکریا علیہ السلام کی کفالت کو اپنی طرف منسوب فرمایا کہ ہم نے ایسا کیا۔

وَّاَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا: یہ جو فرمایا کہ ''عمدہ طور پر ان کو نشوونما دیا'' تو اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں: ① ایک یہ کہ بچپن سے عبادت وطاعت میں مشغول رکھا، ② دوسرے یہ کہ اور بچوں کی معمولی نشوونما سے ان کا ظاہری نشوونما زیادہ رکھا۔

كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا: یہ حضرت مریم کی کرامت تھی، چنانچہ اس واقعہ سے کرامتوں کا ثبوت ملتا ہے، اور اہل سنت والجماعت کا مذہب ہے کہ کرامت اولیاء اللہ کے لیے ثابت ہے، اور سیدہ مریم اپنی ساری عظمت وجلالت شان کے باوجود نبی یا رسول نہیں تھیں، ولی اور صدیقہ تھیں، غیب سے ہر روز ان کے پاس تازہ تازہ پھل آجانا کرامت ہی کہا جائے گا۔

* * *

فائدہ: ۱- وَّكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا: یعنی گو لڑکی تھی مگر حق تعالیٰ نے لڑکے سے بڑھ کر اسے قبول فرمایا، بیت المقدس کے مجاورین کے دلوں میں ڈال دیا کہ عام دستور کے خلاف لڑکی کو قبول کرلیں، اور ویسے بھی مریم کو قبول صورت بنایا اور اپنے مقبول بندہ زکریا کی کفالت میں دیا اور اپنی بارگاہ میں حسن قبول سے سرفراز کیا، جسمانی، روحانی، علمی، اخلاقی ہر حیثیت سے غیر معمولی طور پر بڑھایا جب مجاورین میں اس کی پرورش کے متعلق اختلاف ہوا تو قرعہ انتخاب حضرت زکریا کے نام نکال دیا، تاکہ لڑکی اپنی خالہ کی آغوش شفقت میں تربیت پائے اور زکریا کے علم ودیانت سے مستفید ہو، زکریا علیہ السلام نے پوری مراعاۃ اور جدوجہد کی، جب مریم سیانی ہوئیں تو مسجد کے پاس ان کے لئے ایک حجرہ مخصوص کر دیا، مریم دن بھر وہاں عبادت وغیرہ میں مشغول رہتی اور رات اپنی خالہ کے گھر گزارتی۔

فائدہ: ۲- وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا: اکثر سلف کے نزدیک ''رزق'' سے مراد ظاہری کھانا ہے، کہتے ہیں مریم کے پاس بے موسم میوے آتے، گرمی کے پھل سردی میں، سردی کے گرمی میں، اور مجاہدؒ سے ایک روایت ہے کہ ''رزق'' سے مراد علمی صحیفے ہیں جن کو روحانی غذا کہنا چاہیے، بہرحال اب کھلم کھلا مریم کی برکات وکرامات اور غیر معمولی نشانات ظاہر ہونے شروع ہوئے جن کا بار بار مشاہدہ ہونے پر زکریا علیہ السلام سے نہ رہا گیا اور از راہ تعجب پوچھنے لگے کہ مریم! یہ چیزیں تم کو کہاں سے پہنچتی ہیں۔

فائدہ: ۳- يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ: یعنی خدا کی قدرت اسی طرح مجھ کو یہ چیزیں پہنچاتی ہے جو قیاس وگمان سے باہر ہے۔

هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهٗ ۚ قَالَ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ۚ اِنَّكَ سَمِيْعُ الدُّعَآءِ ﴿۳۸﴾

وہیں دعا کی زکریا نے اپنے رب سے، کہا اے رب میرے عطا کر مجھ کو اپنے پاس سے اولاد پاکیزہ، بیشک تو سننے والا ہے دعا کو

خلاصہ تفسیر: (حضرت زکریا علیہ السلام نے حضرت مریم علیہا السلام کی تربیت میں غیر معمولی نشانات قدرت دیکھ کر اپنے لئے بھی دعا فرمائی، جس کا بیان یہ ہے:) اُس موقع پر دعا کی (حضرت) زکریا (علیہ السلام) نے اپنے رب سے عرض کیا کہ اے میرے رب! عنایت کیجیے مجھ کو خاص اپنے سے کوئی اچھی اولاد (یعنی جو کہ بابرکت اور نیک کردار ہو) بیشک آپ بہت سننے والے ہیں دعا کے۔

هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهٗ: یعنی اس موقع پر دعا کی زکریا علیہ السلام نے اپنے رب سے، ''اُس موقع'' کا مطلب یہ ہے کہ جب زکریا علیہ السلام نے بے موسم پھل میوے آتے ہوئے دیکھے تو سمجھے کہ اگرچہ میں اور میری بیوی بظاہر اولاد کے قابل نہیں رہی، لیکن ان بے موسم پھل میووں کی طرح اگر میرے ہاں بھی خلاف عادت اولاد ہوجائے تو خدا کی قدرت سے کیا بعید ہے۔

اس میں دو مسئلے ہیں: ① اول یہ کہ اسباب بعیدہ سے سوال کرنا ادب کے خلاف نہیں ہے۔

② دوم یہ کہ اولاد کی خواہش کرنا زہد کے منافی نہیں، خصوصاً جبکہ کسی دینی غرض سے ہو، انبیا کرام سے ایسی خواہش کا اظہار ہوا ہے، جیسا زکریا علیہ السلام نے خود ہی فرمایا: وانی خفت الموالی من وراءی، اور اس سے ایک اور مسئلہ ماخوذ ہوتا ہے وہ یہ کہ اپنے سلسلہ کے بقا کی تمنا کرنا حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی سنن میں سے ہے، جیسا کہ روح المعانی میں بھی اس مسئلہ کو مستنبط کیا ہے کہ حضرت زکریا بوڑھے تھے، مگر لوگوں کے مرشد تھے، پس جب انہوں نے صورت حال دیکھی تو غیرت نبوت کو حرکت ہوئی اور اپنے رب تعالیٰ سے ایسے فرزند صدق کی درخواست کی جو لوگوں کی تربیت میں ان کے قائم مقام ہوسکے اور یہ دعا کی: رَبِّ هَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً، یعنی جو دیگر اشغال سے پاک اور شہوات سے مقدس ہو، ''طیبۃ'' کی قید کے ساتھ دعا کرنا اس پر دال ہے کہ خلیفہ بنانے کی شرائط میں یہ صفات بھی ملحوظ رہیں، نہ کہ محض اولاد یا مرید ہونے کی بنیاد پر خلیفہ بنا دینا، بعض بزرگوں سے جو اس تمنا کی ضد منقول ہے یا تو وہ غلبہ حال کی وجہ سے ہے، یا اگر عند اللہ مقدر نہ ہو تو اسے تفویض پر محمول کیا جائے گا۔

* * *

فائدہ: حضرت زکریا علیہ السلام بالکل بوڑھے ہوچکے تھے، ان کی بیوی بانجھ تھی، اولاد کی کوئی ظاہری امید نہ تھی، مریم کی نیکی و برکت اور یہ غیر معمولی خوراک دیکھ کر دفعۃً قلب میں ایک جوش اٹھا اور فوری تحریک ہوئی کہ میں بھی اولاد کی دعا کروں، امید ہے مجھے بھی بے موسم میوہ مل جائے، یعنی بڑھاپے میں اولاد مرحمت ہو۔

فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَهُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ ۙ اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى مُصَدِّقًۢا

پھر اس کو آواز دی فرشتوں نے جب وہ کھڑے تھے نماز میں حجرے کے اندر، کہ اللہ تجھ کو خوشخبری دیتا ہے یحییٰ کی[1] جو گواہی دیگا

بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا وَّنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۳۹﴾

اللہ کے ایک حکم کی[2] اور سردار ہوگا اور عورت کے پاس نہ جائیگا[3] اور نبی ہوگا صالحین سے[4]

خلاصہ تفسیر: پس پکار کر کہا اس سے فرشتوں نے جب کہ وہ کھڑے نماز پڑھ رہے تھے محراب میں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو بشارت دیتے ہیں یحییٰ (نام کا بیٹا عطا ہونے) کی، جن کے احوال یہ ہوں گے کہ وہ کلمۃ اللہ (یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت) کی تصدیق کرنے والے ہوں گے، اور (دوسرے دین کے) مقتدا ہوں گے، اور (تیسرے) اپنے نفس کو (لذات سے) بہت روکنے والے ہوں گے، اور (چوتھے) نبی بھی ہوں گے، اور (پانچویں) اعلیٰ درجہ کے شائستہ ہوں گے۔

يُصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ: ''محراب'' سے مراد یا تو مسجد بیت المقدس کی محراب ہے، یا مراد اس سے وہ مکان ہے جس میں حضرت مریم علیہا السلام کو رکھا کرتے تھے، کیونکہ اس جگہ محراب کے معنی ''عمدہ مکان'' کے ہیں۔

بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ: اس سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں، کیونکہ وہ محض خدا تعالیٰ کے حکم سے خلاف عادت بغیر باپ کے پیدا کیے گئے، یحییٰ علیہ السلام ان کی تصدیق کرنے والے تھے، دونوں پیغمبر ایک ہی زمانہ میں تھے، البتہ یحییٰ علیہ السلام ان سے کچھ بڑے تھے۔

وَحَصُوْرًا: حضرت یحییٰ علیہ السلام کی یہ تیسری صفت بیان کی گئی کہ وہ اپنے نفس کو لذات سے بہت روکنے والے تھے، اور لذات سے روکنے میں مباح خواہشوں سے بچنا بھی داخل ہے، مثلاً اچھا کھانا، اچھا پہننا اور نکاح وغیرہ کرنا، اس صفت کو موقع مدح میں فرمانے سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ افضل طریقہ یہی ہے، حالانکہ احادیث سے نکاح فضیلت ثابت ہے، تحقیق اس کی یہ ہے کہ جس شخص کی حالت حضرت یحییٰ علیہ السلام کی سی ہو کہ اس پر آخرت کا خیال اس قدر غالب ہو کہ اس کے غلبہ کی وجہ سے نہ بیوی کی ضرورت محسوس کرے اور نہ بیوی بچوں کے حقوق ادا کرنے کی فرصت ہو، ایسے شخص کے لئے یہی افضل ہے، اسی وجہ سے جن احادیث میں نکاح کی فضیلت آئی ہے ان میں یہ بھی قید مذکور ہے: ''من استطاع منکم الباءة'' یعنی جو آدمی نکاح کرنے کی قدرت رکھتا ہو، اور زوجیت کے حقوق ادا کرسکتا ہو تو اس کے لئے نکاح کرنا افضل ہے ورنہ نہیں۔

* * *

فائدہ: ۱۔ اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى: دعاء قبول ہوئی، بشارت ملی کہ لڑکا ہوگا، جس کا نام یحییٰ رکھا گیا۔

فائدہ: ۲۔ بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ: ''ایک حکم'' سے یہاں حضرت مسیح علیہ السلام مراد ہیں، جو خدا کے حکم سے بدون باپ کے پیدا ہوئے، حضرت یحییٰ لوگوں کو پہلے سے خبر دیتے تھے کہ مسیح پیدا ہونے والے ہیں۔

فائدہ: ۳۔ وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا: یعنی لذات وشہوات سے بہت زیادہ رکنے والا ہوگا، اللہ کی عبادت میں اس قدر مشغول رہے گا کہ عورت کی طرف التفات کرنے کی نوبت نہ آئے گی، یہ حضرت یحییٰ کا مخصوص حال تھا، جس سے اُمتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کوئی ضابطہ نہیں بن سکتا، ہمارے پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کا اعلیٰ امتیاز یہ ہے کہ کمال معاشرت کے ساتھ کمال عبادت کو جمع فرمایا۔

فائدہ: ۴۔ وَّنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ: یعنی صلاح ورشد کے اعلیٰ مرتبہ پر فائز ہوگا، جسے ''نبوت'' کہتے ہیں، یا ''صالح'' کے معنی ''شائستہ'' کے لئے جائیں، یعنی نہایت شائستہ ہوگا۔

قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّقَدْ بَلَغَنِيَ الْكِبَرُ وَامْرَاَتِيْ عَاقِرٌ ۭ قَالَ كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَاۗءُ ﴿۴۰﴾

کہا اے رب کہاں سے ہوگا میرے لڑکا اور پہنچ چکا مجھ کو بڑھاپا اور عورت میری بانجھ ہے، فرمایا اسی طرح اللہ کرتا ہے جو چاہے

خلاصہ تفسیر: (حضرت) زکریا (علیہ السلام) نے (جناب باری میں) عرض کیا کہ اے میرے پروردگار! میرے لڑکا کس طرح ہوگا، حالانکہ مجھ کو بڑھاپا آپہنچا، اور میری بیوی بھی (بڑھاپے کی وجہ سے) بچہ جننے کے قابل نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے (جواب میں) فرمایا کہ ایسی حالت میں ہی لڑکا ہوجائے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ جو کچھ ارادہ کریں کر دیتے ہیں۔

رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ: حضرت زکریا علیہ السلام باوجودیکہ قدرت خداوندی کے معتقد بھی تھے اور نمونہ قدرت کا مکرر مشاہدہ بھی کرچکے تھے اور خود ہی درخواست کی تھی اور قبولیت کا علم بھی ہوگیا تھا، پھر ان کا یہ کہنا کہ لڑکا کس طرح ہوگا؟ بات درحقیقت یہ ہے کہ آپ کا یہ سوال کرنا اللہ کی قدرت میں شک وشبہ کی وجہ سے نہیں تھا، بلکہ مقصود سوال سے کیفیت معلوم کرنا تھا کہ آیا ہم دونوں میاں بیوی اسی طرح بوڑھے رہیں گے جیسے اب ہیں اور اسی حال میں اولاد ہوجائے گی، یا ہماری حالت کچھ تبدیل کی جائے گی، اللہ تعالیٰ نے جواب میں فرمایا کہ نہیں تم بوڑھے ہی رہو گے، اور اسی حالت میں تمہارے اولاد ہوگی، اب اس میں کوئی اشکال نہ رہا اور لڑکا پیدا ہونا پہلے یحییٰ نام سن کر معلوم ہوگیا تھا۔

* * *

فائدہ: یعنی اس کی قدرت ومشیت سلسلہ اسباب کی پابند نہیں، گو اس عالم میں اس کی عادت یہ ہے کہ اسباب عادیہ سے مسببات کو پیدا کرے، لیکن کبھی کبھی اسباب عادیہ کے خلاف غیر معمولی طریقہ سے کسی چیز کا پیدا کر دینا بھی اس کی خاص عادت ہے، اصل یہ ہے کہ مریم صدیقہ کے پاس خارق عادت طریقہ سے رزق کا پہنچنا اور بہت سے غیر معمولی واقعات کا ظہور پذیر ہونا، یہ دیکھ کر مریم کے حجرہ میں بیساختہ حضرت زکریا کا دعا مانگنا ، پھر ان کو اور ان کی بانجھ عورت کو بڑھاپے میں غیر معتاد طور پر اولاد ملنا، ان سب نشانات کو قدرت کی طرف سے اس عظیم الشان آیت الٰہیہ کی تمہید سمجھنا چاہیے جو مریم کے وجود سے بدون قربان زوج مستقبل قریب میں ظاہر ہونے والی تھی ، گویا حضرت یحیٰی کی غیر معتاد ولادت پر کَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ فرمانا تمہید تھی كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ کی، جو آگے حضرت مسیح کی غیر معتاد ولادت کے سلسلہ میں آیا چاہتا ہے۔

قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْٓ اٰيَةً ؕ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا ؕ

کہا اے رب مقرر کر میرے لئے کچھ نشانی [1] فرمایا نشانی تیرے لئے یہ ہے کہ نہ بات کریگا تو لوگوں سے تین دن مگر اشارہ سے [2]

وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيْرًا وَّسَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ ﴿٤١﴾ ع ۱۲

اور یاد کر اپنے رب کو بہت اور تسبیح کر شام اور صبح [3]

خلاصہ تفسیر: انہوں نے عرض کیا کہ اے پروردگار! (تو پھر) میرے واسطے کوئی نشانی مقرر فرما دیجیے (جس سے مجھے معلوم ہو جائے کہ اب حمل ہو گیا) اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تمہاری نشانی یہی ہے کہ تم لوگوں سے تین روز تک باتیں نہ کر سکو گے بجز (ہاتھ یا سر وغیرہ کے) اشارہ کے (جب یہ نشانی دیکھو تو سمجھ جانا کہ اب گھر میں امید ہے) اور (اس زمانہ میں جب آدمیوں سے گفتگو کرنے کی قدرت نہ رہے ذکر اللہ پر قادر ہو گے، سو) اپنے رب کو (دل سے بھی) بکثرت یاد کیجیو اور (زبان سے بھی) تسبیح (تقدیس) کیجیو، دن ڈھلے بھی اور صبح کو بھی (کیونکہ ذکر اللہ کی قدرت اس وقت بھی پوری رہے گی)۔

رَبِّ اجْعَلْ لِّيْٓ اٰيَةً: نشانی مقرر کرنے کی درخواست اس لیے کہ تا کہ جلدی خوشی حاصل ہو جائے، دوسرے تا کہ پہلے ہی سے شکر میں مشغول ہو جائیں، یہ اس پر بھی دلالت کرتا ہے کہ طمانیت کے لیے سوال کرنا یقین کے منافی نہیں، جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا کی تھی کہ احیاء موتی کی کیفیت دکھلا دیجیے۔

اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ: جو نشانی مقرر کی گئی کہ آدمیوں کے ساتھ کلام کی قدرت نہ رہے گی، اس میں لطافت یہ ہے کہ نشانی سے جو ان کا مقصود تھا کہ شکر ادا کریں تو نشانی بھی ایسی تجویز کی گئی کہ اس مقصود کے سوا دوسرے کام کے ہی نہ رہیں، نشانی کی نشانی ہو گئی اور مقصود کا مقصود حاصل ہو گیا، اور یہ نہ بول سکنا اضطراری تھا کہ بات کر ہی نہیں سکتے تھے، اختیاری نہ تھا، کیونکہ اگر اختیاری ہوتا تو نشانی کیونکر ظاہر ہوتی، اور اس آیت میں تو تین روز کا ذکر ہے، دوسری آیت میں تین رات فرمایا ہے، تو مراد تین دن تین رات ہیں، پس دونوں آیتیں صحیح ہیں۔

* * *

فائدہ: [1] رَبِّ اجْعَلْ لِّيْٓ اٰيَةً: جس سے معلوم ہو جائے کہ اب حمل قرار پا گیا ہے، تا کہ قرب ولادت کے آثار دیکھ کر مسرت تازہ حاصل ہو، اور شکر نعمت میں بیش از بیش مشغول رہوں۔

فائدہ: [2] ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا: یعنی جب تجھ کو یہ حالت پیش آئے کہ تین دن رات لوگوں سے بجز اشارہ کے کوئی کلام نہ کر سکے اور تیری زبان خالص ذکر الٰہی کے لئے وقف ہو جائے تو سمجھ لینا کہ اب استقرار حمل ہو گیا، سبحان اللہ! نشانی بھی ایسی مقرر کی کہ نشانی کی نشانی ہو اور اطلاع پانے سے جو غرض تھی (شکر نعمت) وہ علیٰ وجہ الکمال حاصل ہو جائے، گویا خدا کے ذکر وشکر کے سوا چاہیں بھی تو زبان سے دوسری بات نہ کر سکیں۔

فائدہ: [3] وَسَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ: یعنی اس وقت خدا کو بہت کثرت سے یاد کرنا اور صبح وشام تسبیح وتہلیل میں لگے رہنا، معلوم ہوتا

ہے کہ آدمیوں سے کلام نہ کر سکنا گو اضطراری تھا، تا کہ ان دنوں میں محض ذکر و شکر کے لئے فارغ کر دیئے جائیں، لیکن خود ذکر میں مشغول رہنا اضطراری نہ تھا، اسی لئے اس کا امر فرمایا گیا۔

وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰىكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۲﴾

اور جب فرشتے بولے اے مریم اللہ نے تجھ کو پسند کیا اور ستھرا بنایا اور پسند کیا تجھ کو سب جہان کی عورتوں پر

خلاصہ تفسیر: (اور وہ وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہے) جبکہ فرشتوں نے (حضرت مریم علیہا السلام سے) کہا اے مریم! بلاشک اللہ تعالیٰ نے تم کو منتخب (یعنی مقبول) فرمایا ہے، اور (تمام ناپسندیدہ افعال و اخلاق سے) پاک بنایا ہے، اور (مقبول فرمانا کچھ ایک دو عورتوں کے اعتبار سے نہیں، بلکہ اس زمانہ کی) تمام جہان بھر کی بیبیوں کے مقابلہ میں منتخب فرمایا ہے۔

وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ: فرشتوں کے کلام سے کرنے سے حضرت مریم کی نبوت کا شبہ نہ کیا جائے، کیونکہ فرشتوں کا کلام کرنا نبوت کی خاصیت نہیں، چنانچہ صحیح مسلم میں حضرت عمران بن حصینؓ کو فرشتوں کا سلام کرنا منقول ہے، نبوت کا خاصہ وہ کلام ہے جو ایسے شخص سے کیا جائے جس کو احکام کی تبلیغ کا امر کیا گیا ہو، چنانچہ اس سے فرشتوں کا نبیوں کے علاوہ غیر نبیوں سے کلام کرنا بھی ثابت ہوتا ہے، حضرت مریم کے علاوہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ، سیدہ سارہ، سیدہ ہاجرہ وغیرہ سے فرشتوں کا کلام کرنا ثابت ہے، یہ سب مقدس خواتین تھیں، نبی یا رسول نہیں تھیں۔

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰىكِ: یہاں آیت میں ان کے منتخب ہونے کا ذکر دو بار فرمایا، چونکہ لفظ نساء عربی میں بالغہ جوان عورتوں کے ساتھ خاص ہے، اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ فرشتوں کا منتخب ہونے کا یہ دوسرا کلام حضرت مریم کے جوان ہونے کے بعد ہوا تھا، اس بنا پر منتخب ہونے کا بیان اس آیت میں دوبارہ اس لیے ہوا کہ پہلا انتخاب بچپن میں ہو چکا تھا، مثلاً نذر میں ان کا مقبول ہو جانا، بے موسم میووں کے آنے سے ان کی کرامت ظاہر ہونا وغیرہ، اور دوسرا انتخاب جوانی میں ہوا کہ فرشتوں نے ان سے کلام کیا، بغیر شوہر کے خدا نے بچہ دے کر ان کی کرامت ظاہر کی، پھر اس بچہ ہی کی زبان سے حضرت مریم کی براءت ثابت کی وغیرہ وغیرہ۔

❋ ❋ ❋

فائدہ: حضرت زکریا و یحییٰ علیہما السلام کا قصہ جو ضمنی مناسبات سے درمیان میں آ گیا تھا اور جس میں اصطفاء آل عمران کی تاکید اور حضرت مسیح علیہ السلام کے قصہ کی تمہید تھی، یہاں ختم کر کے پھر مریم و مسیح کے واقعات کی طرف کلام منتقل کیا گیا ہے، چنانچہ مسیح سے پہلے ان کی والدہ کا فضل و شرف ذکر فرماتے ہیں، یعنی فرشتوں نے مریم سے کہا کہ اللہ نے تجھے پہلے دن سے چھانٹ لیا کہ باوجود لڑکی ہونے کے اپنی نیاز میں قبول کیا، طرح طرح کے احوال رفیعہ اور کرامات سنیہ عنایت فرمائیں، ستھرے اخلاق، پاک طبیعت اور ظاہری و باطنی نزاہت عطا فرما کر اپنی مسجد کی خدمت کے لائق بنایا، اور جہان کی عورتوں پر تجھ کو بعض وجوہ سے فضیلت بخشی، مثلاً ایسی استعداد رکھی کہ بدون مس بشر تنہا اس کے وجود سے حضرت مسیح جیسے اولوالعزم پیغمبر پیدا ہوں، یہ امتیاز دنیا میں کسی عورت کو حاصل نہیں ہوا۔

يٰمَرْيَمُ اقْنُتِيْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِيْ وَارْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴿۴۳﴾

اے مریم بندگی کر اپنے رب کی اور سجدہ کر اور رکوع کر ساتھ رکوع کرنے والوں کے

خلاصہ تفسیر: (اور فرشتوں نے یہ بھی کہا کہ) اے مریم! اطاعت کرتی رہو اپنے پروردگار کی اور سجدہ (یعنی نماز ادا) کیا کرو اور (نماز میں) رکوع (بھی) کیا کرو ان لوگوں کے ساتھ جو رکوع کرنے والے ہیں۔

وَارْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ: بعض مفسرین نے نقل کیا ہے کہ بعض یہود نے نماز میں رکوع چھوڑ دیا تھا اور بعض رکوع کرتے تھے، اس لیے حق

تعالیٰ نے حکم فرمایا کہ نماز کے طریقہ میں ان لوگوں کے ساتھ رہنا جو رکوع بھی کیا کرتے ہیں، پس مقصود رکوع کا اہتمام ہے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی خدا نے جب ایسی عزت اور بلند مرتبہ تجھ کو عطا فرمایا تو چاہیے کہ ہمیشہ اخلاص و تذلل کے ساتھ اپنے پروردگار کے آگے جھکی رہے اور وظائف عبودیت کے انجام دینے میں بیش از بیش سرگرمی دکھلائے تا کہ حق تعالیٰ نے تجھے جس امر عظیم کے بروئے کار لانے کا ذریعہ تجویز کیا ہے وہ ظہور پذیر ہو۔

فائدہ: ۲؎ جیسے راکعین خدا کے آگے رکوع کرتے ہیں، تو بھی اسی طرح رکوع کرتی رہ، یا یہ مطلب ہے کہ جماعت کے ساتھ نماز ادا کر اور چونکہ کم از کم رکوع میں امام کے ساتھ شریک ہونے والا اس رکعت کو پانے والا سمجھا جاتا ہے، شاید اس لئے نماز کو بعنوان رکوع تعبیر کیا گیا ہے۔ کما یفھم من کلام ابن تیمیہ فی فتاواہ، واللہ اعلم، اس تقدیر پر اگر اقنتی میں ''قنوت'' سے قیام مراد لیں تو قیام، رکوع، سجود تینوں ہیئات صلوٰۃ کا ذکر آیت میں ہو جائے گا۔

تنبیہ: ممکن ہے اس وقت عورتوں کو عام طور پر جماعت میں شریک ہونا جائز یا خاص فتنہ سے مامون ہونے کی صورت میں اجازت ہو، یا مریم کی خصوصیت ہو، یا مریم اپنے حجرہ میں رہ کر تنہا یا دوسری عورتوں کے ہمراہ امام کی اقتداء کرتی ہوں، سب احتمالات ہیں، واللہ اعلم۔

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَیْبِ نُوْحِیْهِ اِلَیْكَ ؕ وَمَا كُنْتَ لَدَیْهِمْ اِذْ یُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَیُّهُمْ

یہ خبریں غیب کی ہیں جو ہم بھیجتے ہیں تجھ کو ۱؎ اور تو نہ تھا ان کے پاس جب ڈالنے لگے اپنے قلم کہ کون

یَكْفُلُ مَرْیَمَ ۪ وَمَا كُنْتَ لَدَیْهِمْ اِذْ یَخْتَصِمُوْنَ ﴿۴۴﴾

پرورش میں لے مریم کو، اور تو نہ تھا ان کے پاس جب وہ جھگڑتے تھے ۲؎

خلاصہ تفسیر: چونکہ ماضی کے واقعات کی اس طور پر خبر دینا کہ نہ کسی سے سنا ہو، نہ خود دیکھا ہو، نہ کسی کتاب میں پڑھا ہو، جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان تھی، خلاف عادت خوارق میں سے ہے جو کہ نبوت کی دلیل ہے، اس لیے اس آیت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر ان قصوں کے اخبار سے استدلال فرماتے ہیں: یہ قصے (جو اوپر بیان ہوئے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعتبار سے اس وجہ سے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ان کے معلوم کرنے کا کوئی ظاہری ذریعہ نہ تھا) من جملہ غیب کی خبروں کے ہیں جن کی وحی بھیجتے ہیں ہم آپ کے پاس (اس کے ذریعہ سے آپ یہ خبریں معلوم کر کے دوسروں کو بتلاتے ہیں) اور (ظاہر ہے کہ جو لوگ حضرت مریم علیہا السلام کے رکھنے میں اختلاف کر رہے تھے، جس کا فیصلہ اخیر میں قرعہ پر قرار پایا تھا) آپ ان لوگوں کے پاس نہ تو اس وقت موجود تھے جبکہ وہ (قرعہ کے طور پر) اپنے اپنے قلموں کو (پانی میں) ڈالتے تھے (اور قرعہ نکلنے کی صورت یہ قرار پائی تھی کہ جس کا قلم پانی کی حرکت کے خلاف الٹا بہہ جائے وہ مستحق سمجھا جائے گا، سو قرعہ سے غرض اس امر کا طے کرنا تھا) کہ ان سب میں کون شخص حضرت مریم کی کفالت (پرورش) کرے (پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم نہ تو اس وقت موجود تھے) اور نہ آپ ان کے پاس اس وقت موجود تھے جبکہ وہ لوگ (قرعہ سے قبل اس مقدمہ میں) باہم اختلاف کر رہے تھے (جسے دور کرنے کی ضرورت کے لئے یہ قرعہ قرار پایا، اور ان خبروں کے دریافت ہونے کے لئے دوسرے ذرائع کا نہ ہونا بھی یقیناً معلوم ہے، پس ایسی حالت میں یہ غیبی خبریں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی دلیل ہیں)۔

اِذْ یُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَیُّهُمْ یَكْفُلُ مَرْیَمَ: شریعت محمدیہ میں حنفیہ کے مسلک پر قرعہ کا یہ حکم ہے کہ جن حقوق کے اسباب شریعت میں معلوم و متعین ہیں ان میں قرعہ ناجائز اور قمار یعنی جوا کے حکم میں داخل ہے، مثلاً مشترک چیز میں جس کا نام نکل آئے وہ سب لے لے، یا جس بچے کے نسب میں اختلاف ہو، اس میں جس کا نام نکل آئے وہی باپ سمجھا جائے، اور جن حقوق کے اسباب رائے کے سپرد ہوں ان میں قرعہ جائز ہے، مثلاً مشترک

مکان کی تقسیم میں قرعہ سے زید کو شرقی حصہ دے دینا اور عمرو کو غربی حصہ دے دینا، یہ اس لیے جائز ہے کہ بلا قرعہ بھی ایسا کرنا شریکین کے اتفاق سے یا قضائے قاضی سے جائز تھا، یا یوں کہیے کہ جہاں سب شریکوں کے حقوق مساویانہ یعنی برابر ہوں، وہاں کوئی ایک جہت ایک شخص کے لیے متعین کرنے کے واسطے قرعہ اندازی جائز ہے۔

* * *

فائدہ: لے یعنی ظاہری حیثیت سے آپ کچھ پڑھے لکھے نہیں، پہلے سے اہل کتاب کی کوئی معتدبہ صحبت نہیں رہی جن سے واقعات ماضیہ کی ایسی تحقیقی معلومات ہوسکیں، اور صحبت رہتی بھی تو کیا تھا، وہ لوگ خود ہی اوہام وخرافات کی اندھیریوں میں پڑے بھٹک رہے تھے کسی نے عداوت میں اور کسی نے حد سے زیادہ محبت میں آکر صحیح واقعات کو مسخ کر رکھا تھا، پھر اندھے کی آنکھ سے روشنی حاصل ہونے کی کیا توقع ہوسکتی تھی، اندریں حالات ''مدنی'' اور ''مکی'' دونوں قسم کی سورتوں میں ان واقعات کو ایسی صحت اور بسط وتفصیل سے سنانا جو بڑے بڑے مدعیان علم کتاب کی آنکھوں میں چکا چوند کردیں اور کسی کو مجال انکار باقی نہ رہے اسکی کھلی دلیل ہے کہ بذریعہ وحی آپ کو یہ علم دیا گیا تھا کیونکہ آپ نے نہ بچشم خود ان حالات کا معائنہ کیا، اور نہ علم حاصل کرنے کا کوئی خارجی ذریعہ آپ کے پاس موجود تھا۔

فائدہ: ۲ے جب حضرت مریم نذر میں قبول کرلی گئیں تو مسجد کے مجاورین میں جھگڑا ہوا کہ انہیں کس کی پرورش میں رکھا جائے، آخر قرعہ اندازی کی نوبت آئی، سب نے اپنے اپنے قلم جن سے تورات لکھتے تھے چلتے پانی میں چھوڑ دیئے کہ جس کا قلم پانی کے بہاؤ پر نہ بہے بلکہ الٹا پھر جائے اسی کو حقدار سمجھیں، اس میں بھی قرعہ حضرت زکریا کے نام نکلا اور حق حقدار کو پہنچ گیا۔

إِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ إِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ ۖ اسْمُهُ الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ

جب کہا فرشتوں نے اے مریم اللہ تجھ کو بشارت دیتا ہے ایک اپنے حکم کی جس کا نام مسیح ہے عیسٰی مریم کا بیٹا

وَجِيهًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِينَ ﴿٤٥﴾

مرتبہ والا دنیا میں اور آخرت میں اور اللہ کے مقربوں میں

خلاصہ تفسیر: گذشتہ آیت جملہ معترضہ کے طور پر تھی جو نبوت محمد یہ ثابت کرنے کے لیے لائی گئی تھی، اب پھر حضرت مریم وحضرت عیسٰی علیہما السلام کا قصہ بیان کیا جاتا ہے جس میں زیادہ مقصود عیسٰی علیہ السلام کا قصہ بیان کرنا ہے۔

(اس وقت کو یاد کرو) جبکہ فرشتوں نے (حضرت مریم علیہا السلام سے یہ بھی) کہا کہ اے مریم! بیشک اللہ تعالٰی تم کو بشارت دیتے ہیں ایک کلمہ کی جو من جانب اللہ ہوگا (یعنی ایک بچہ پیدا ہونے کی بشارت دیتے ہیں جو بغیر باپ کے پیدا ہونے کی وجہ سے ''کلمۃ اللہ'' کہلائے گا) اس کا نام (و لقب) مسیح عیسٰی بن مریم ہوگا (ان کے یہ حالات ہوں گے کہ) باآبرو ہوں گے (اللہ تعالٰی کے نزدیک) دنیا میں (بھی کہ ان کو نبوت عطا ہوگی) اور آخرت میں (بھی کہ اپنی امت کے مومنین کے واسطے شفاعت کریں گے اور شفاعت قبول ہوگی) اور (جیسے ان میں نبوت وشفاعت کی صفت ہوگی جس کا تعلق دوسروں سے ہے، اسی طرح ذاتی کمال کے ساتھ بھی موصوف ہوں گے کہ) من جملہ مقربین (عند اللہ) ہوں گے۔

إِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ: یہ بشارت دینا آگے سورہ مریم میں جبریل علیہ السلام کی طرف منسوب کیا گیا ہے جبکہ یہاں فرشتوں کی طرف؟ اب یا تو یہاں فرشتوں سے مراد جبریل علیہ السلام ہی ہوں گے اور ان کو جمع کے لفظ سے تعبیر کرنا ایسا ہوگا جیسا کہ ہمارا محاورہ ہے کہ علماء کا اس مسئلہ میں یہ قول ہے، چاہے ایک ہی عالم سے سنا ہو، اور یہ بھی احتمال ہے کہ جبریل علیہ السلام کے ساتھ دیگر فرشتے بھی اس بشارت دینے میں شریک ہوں گے۔

* * *

فائدہ: حضرت مسیح علیہ السلام کو یہاں اور قرآن وحدیث میں کئی جگہ کلمۃ اللہ فرمایا ہے: إِنَّمَا الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ

رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ (النساء:١٧١) یوں تو اللہ کے کلمات بیشمار ہیں جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا: قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ (الکہف:١٠٩) لیکن بالتخصیص حضرت مسیح کو "کلمۃ اللہ" (اللہ کا حکم) کہنا اس حیثیت سے ہے کہ ان کی پیدائش باپ کے توسط کے بدون عام سلسلہ اسباب کے خلاف محض خدا کے حکم سے ہوئی، اور جو فعل عام اسباب عادیہ کے سلسلہ سے خارج ہو، عموماً اسکی نسبت براہ راست حق تعالیٰ کی طرف کردی جاتی ہے جیسے فرمایا: وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى (الانفال:١٧)

تنبیہ: "مسیح" اصل عبرانی میں "ماشیح" یا "مشیحا" تھا، جس کے معنی "مبارک" کے ہیں، معرّب ہوکر "مسیح" بن گیا، باقی دجال کو جو "مسیح" کہا جاتا ہے وہ بالا جماع عربی لفظ ہے جس کی وجہ تسمیہ اپنے موقع پر کئی طرح بیان کی گئی ہے، "مسیح" کا دوسرا نام یا لقب "عیسیٰ" ہے، یہ اصل عبرانی میں "ایشوع" تھا، معرّب ہوکر "عیسیٰ" بنا، جسکے معنی "سید" کے ہیں۔

یہ بات خاص طور پر قابلِ غور ہے کہ قرآن کریم نے یہاں "ابن مریم" کو حضرت مسیح کے لئے بطور جزءِ علَم کے استعمال کیا ہے، کیونکہ خود مریم کو بشارت سناتے وقت یہ کہنا کہ تجھے "کلمۃ اللہ" کی خوشخبری دی جاتی ہے، جس کا نام "مسیح عیسیٰ ابن مریم" ہوگا، عیسیٰ کا پتہ بتلانے کے لئے نہ تھا، بلکہ اس پر متنبہ کرنا تھا کہ باپ نہ ہونے کی وجہ سے اس کی نسبت صرف ماں ہی کی طرف ہوا کرے گی، حتیٰ کہ لوگوں کو خدا کی یہ آیت عجیبہ ہمیشہ یاد دلانے اور مریم کی بزرگی ظاہر کرنے کے لئے گویا نام کا جز بنادی گئی، ممکن تھا کہ حضرت مریم کو بمقتضائے بشریت یہ بشارت سُن کر تشویش ہو کہ دنیا کس طرح باور کرے گی کہ تنہا عورت سے لڑکا پیدا ہوجائے، ناچار مجھ پر تہمت رکھیں گے اور بچہ کو ہمیشہ برے لقب سے مشہور کرکے ایذا پہنچائینگے، میں کس طرح براءت کروں گی، اس لئے آگے وَجِيْهًا فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ کہہ کر اطمینان کردیا کہ خدا اس کو نہ صرف آخرت میں بلکہ دنیا میں بھی بڑی عزت و وجاہت عطا کرے گا اور دشمنوں کے سارے الزام جھوٹے ثابت کردے گا۔

"وجیہ" کا لفظ یہاں ایسا سمجھو جیسے موسیٰ علیہ السلام کے متعلق فرمایا: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اٰذَوْا مُوْسٰى فَبَرَّاَهُ اللّٰهُ مِمَّا قَالُوْا ۭ وَكَانَ عِنْدَ اللّٰهِ وَجِيْهًا (الاحزاب:٦٩) گویا جو لوگ "وجیہ" کہلاتے ہیں ان کو حق تعالیٰ خصوصی طور پر جھوٹے طعن وتشنیع یا الزامات سے بری کرتا ہے، حضرت مسیح علیہ السلام کے نسب پر جو خبیث باطن طعن کریں گے، یا خدا کو یا کسی انسان کو جھوٹ موٹ ان کا باپ بتلائیں گے، یا خلاف واقعہ ان کو مصلوب ومقتول یا بحالت زندگی مردہ کہیں گے، یا الوہیت وابنیت وغیرہ کے باطل عقائد کی مشرکانہ تعلیم ان کی طرف منسوب کریں گے، اس طرح کے تمام الزامات سے حق تعالیٰ دنیا اور آخرت میں اعلانیہ بری ظاہر کرکے ان کی وجاہت ونزاہت کا علیٰ رؤس الاشہاد اظہار فرمائے گا، جو وجاہت ان کو ولادت وبعثت کے بعد دنیا میں حاصل ہوئی اس کی پوری تکمیل نزول کے بعد ہوگی، جیسا کہ اہل اسلام کا اجماعی عقیدہ ہے، پھر آخرت میں خصوصیت کے ساتھ ان سے ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ اِلٰـهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ ۤ بِحَقٍّ ڲ اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ ۭ تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ وَلَآ اَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِكَ (المائدہ:١١٦) کا سوال کرکے اور انعامات خصوصی یاد دلاکر تمام اوّلین وآخرین کے روبرو وجاہت وکرامت کا اظہار ہوگا، جیسا کہ سورۂ مائدہ میں مذکور ہے اور نہ صرف یہ کہ دنیا وآخرت میں باوجاہت ہونگے بلکہ خدا تعالیٰ کے اخص خواص مقربین میں ان کا شمار ہوگا۔

وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَّمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝۴۶

اور باتیں کرے گا لوگوں سے جب کہ ماں کی گود میں ہوگا اور جب کہ پوری عمر کا ہوگا اور نیک بختوں میں ہے

خلاصہ تفسیر: اور (صاحب معجزہ بھی ہوں گے یعنی) آدمیوں سے (دونوں حالت میں یکساں) کلام کریں گے، گہوارہ میں (بالکل بچپن میں بھی) اور بڑی عمر میں (بھی، دونوں کلاموں میں فرق نہ ہوگا) اور (اعلیٰ درجہ کے) شائستہ لوگوں میں سے ہوں گے۔

وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا: یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ بچپن کی حالت میں کلام کرنا تو ایک معجزہ اور نشانی تھی اس کا ذکر تو اس

جگہ کرنا مناسب ہے، مگر ادھیڑ عمر میں لوگوں سے کلام کرنا تو ایک ایسی چیز ہے جو ہر انسان مومن، کافر، عالم، جاہل کیا ہی کرتا ہے، یہاں اس کو بطور وصف خاص ذکر کرنے کے کیا معنی ہو سکتے ہیں؟ اس سوال کا ایک جواب تو یہ ہے کہ مقصد اصل میں حالت بچپن ہی کے کلام کا بیان کرنا ہے، اس کے ساتھ بڑی عمر کے کلام کا ذکر اس غرض سے کیا گیا کہ ان کا بچپن کا کلام بھی ایسا نہیں ہوگا جیسے بچے ابتدا میں بولا کرتے ہیں بلکہ عاقلانہ، عالمانہ، فصیح و بلیغ کلام ہوگا، جیسے ادھیڑ عمر کے آدمی کیا کرتے ہیں۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے واقعہ اور اس کی پوری تاریخ پر غور کیا جائے تو اس جگہ ادھیڑ عمر میں کلام کرنے کا تذکرہ ایک مستقل عظیم فائدہ کے لئے ہو جاتا ہے، وہ یہ ہے کہ اسلامی اور قرآنی عقیدہ کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو زندہ آسمان پر اٹھالیا گیا ہے، روایات سے یہ ثابت ہے کہ ان کو اٹھانے کے وقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی عمر تقریباً تیس پینتیس سال کے درمیان تھی جو عین عنفوان شباب کا زمانہ تھا، ادھیڑ عمر جس کو عربی میں کہل کہتے ہیں وہ اس دنیا میں ان کی ہوئی ہی نہ تھی، اس لئے ادھیڑ عمر میں لوگوں سے کلام جب ہی ہو سکتا ہے جبکہ وہ پھر دنیا میں تشریف لائیں، اس لئے جس طرح ان کا بچپن کا کلام معجزہ تھا اسی طرح ادھیڑ عمر کا کلام بھی معجزہ ہی ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی نہایت شائستہ اور اعلیٰ درجہ کے نیک ہوں گے اور اول ماں کی گود میں، پھر بڑے ہو کر عجیب و غریب باتیں کریں گے، ان الفاظ سے فی الحقیقت مریم کی پوری تسکین کر دی گئی، گزشتہ بشارات سے ممکن تھا یہ خیال کرتیں کہ وجاہت تو جب کبھی حاصل ہوگی مگر یہاں تو ولادت کے بعد ہی طعن و تشنیع کا ہدف بننا پڑے گا، اس وقت براءت کی کیا صورت ہوگی، اس کا جواب دیدیا کہ گھبراؤ نہیں، تم کو زبان ہلانے کی ضرورت نہ پڑے گی، بلکہ تم کہہ دینا کہ میں نے آج روزہ رکھ چھوڑا ہے، کلام نہیں کر سکتی، بچہ خود جواب دہی کرے گا، جیسا کہ سورۃ مریم میں پوری تفصیل آئے گی۔

بعض محرفین نے کہا ہے کہ وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَ كَهْلًا وَّمِنَ الصّٰلِحِيْنَ سے صرف مریم کی تسلی کرنی تھی کہ لڑکا گونگا نہ ہوگا، تمام لڑکوں کی طرح بچپن اور کہولت میں کلام کرلے گا، لیکن عجیب بات ہے کہ محشر میں بھی لوگ حضرت عیسیٰ کو یوں خطاب کرینگے: "یا عیسیٰ انتَ رَسُولُ اللهِ وَكَلِمَتُه، اَلْقَاهَا اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوحٌ مِّنْهُ وَ كَلَّمْتَ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا" اور خود حق تعالیٰ بھی قیامت کے دن فرمائیں گے: يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِيْ عَلَيْكَ وَعَلٰى وَالِدَتِكَ ۘ اِذْ اَيَّدْتُّكَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ۣ تُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَ كَهْلًا (المائدہ:۱۱۰) کیا وہاں بھی اس خاص نشان کا بیان فرمانا اسی لئے ہے کہ مریم کو اطمینان ہو جائے کہ لڑکا گونگا نہیں عام لڑکوں کی طرح بولنے والا ہے، أعاذنا الله من الغواية والضلالة۔

قَالَتْ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ وَلَدٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ ؕ قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ

بولی اے رب کہاں سے ہوگا میرے لڑکا اور مجھ کو ہاتھ نہیں لگایا کسی آدمی نے ۱؎ فرمایا اسی طرح اللہ پیدا کرتا ہے جو چاہے

اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝۴۷

جب ارادہ کرتا ہے کسی کام کا تو یہی کہتا ہے اس کو کہ ہو جا سو وہ ہو جاتا ہے ۲؎

خلاصہ تفسیر: حضرت مریم بولیں اے میرے پروردگار! کس طرح ہوگا میرے بچہ حالانکہ مجھ کو کسی بشر نے (صحبت کے طور پر) ہاتھ نہیں لگایا (اور کوئی بچہ جائز طریقہ سے عادۃً بغیر مرد کے پیدا نہیں ہوتا، تو معلوم نہیں کہ مجھ کو نکاح کا حکم دیا جائے گا یا ویسے ہی محض قدرت خداوندی سے بچہ ہو جائے گا) اللہ تعالیٰ نے (جواب میں فرشتے کے واسطے سے) فرمایا ایسے ہی (بلا مرد کے) ہوگا (کیونکہ) اللہ تعالیٰ جو چاہیں پیدا کر دیتے ہیں (یعنی کسی چیز کے پیدا ہونے کے لئے صرف ان کا چاہنا کافی ہے، کسی واسطہ یا سبب خاص کی ان کو حاجت نہیں، اور ان کے چاہنے کا طریقہ یہ ہے کہ) جب کسی چیز کو پورا کرنا چاہتے ہیں تو اس کو کہہ دیتے ہیں کہ (موجود) ہو جا، بس وہ چیز (موجود) ہو جاتی ہے (پس اگر اسباب و ذرائع کے بعد موجود

ہونے کو فرمایا تو وہ اس طرح ہوجاتی ہے، اور اگر اسباب و ذرائع کے بغیر موجود ہونے کو کہہ دیا وہ ویسے ہوجاتی ہے)۔

اِذَا قَضٰۤى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ، واضح رہے کہ بغیر اسباب کے کسی چیز کا پیدا ہونا عقلی طور پر محال نہیں ہے، کیونکہ اگر بغیر اسباب کے کوئی چیز موجود نہ ہوسکے تو وہ اسباب بھی تو کوئی چیز ہیں، وہ کیسے بغیر اسباب کے موجود ہوں گے؟ اور اگر ان کے لیے بھی اسباب فرض کیے جائیں تو سلسلہ غیر متناہی چلا جائے گا جو کہ محال ہے، بالآخر ماننا پڑے گا کہ کوئی چیز اسباب کے بغیر بھی محض قدرت سے پیدا ہوسکتی ہے، اور اس میں اسباب وغیرہ سب برابر ہیں، تو ہر چیز اسباب کے بغیر موجود ہوسکتی ہے، یہ اسباب محض حکمت اور آزمائش کے لیے مقرر ہیں، پس عیسیٰ علیہ السلام کی عجیب پیدائش کا اعتقاد کرنا لازم ہوگا، کیونکہ عقلاً ایسا ہونا ممکن ہے اور مخبر صادق یعنی قرآن کریم اور پیغمبر نے اس کے واقع ہونے کی خبر دی ہے، پس انکار کی کوئی وجہ نہیں۔

* * *

فائدہ: ۱ معلوم ہوا کہ وہ بشارت سے یہ ہی سمجھیں کہ لڑکا بحالت موجودہ ہونیوالا ہے، ورنہ تعجب کا کیا موقع تھا۔

فائدہ: ۲ یعنی اسی طرح بدون مسِ بشر کے ہوجائے گا، خلاف عادت ہونے کی وجہ سے تعجب نہ کر حق تعالیٰ جو چاہے اور جس طرح چاہے پیدا کردے اسکی قدرت کی حد بندی نہیں ہوسکتی، ایک کام کا ارادہ کیا اور ہوگیا، نہ وہ مادہ کا محتاج نہ اسباب کا پابند۔

وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ﴿٤٨﴾

اور سکھادے گا اس کو کتاب اور تہ کی باتیں اور تورات اور انجیل

خلاصہ تفسیر: (اور اے مریم! اس مولود مسعود کی یہ فضیلتیں ہوں گی کہ) اللہ ان کو تعلیم فرمائیں گے (آسمانی) کتابیں اور سمجھ کی باتیں اور (بالخصوص) توریت اور انجیل۔

* * *

فائدہ: یعنی لکھنا سکھائے گا، یا عام کتب ہدایت کا عموماً اور تورات و انجیل کا خصوصاً علم عطا فرمائے گا اور بڑی گہری حکمت کی باتیں تلقین کرے گا، اور بندہ کے خیال میں ممکن ہے "کتاب و حکمت" سے مراد "قرآن و سنت" ہو، کیونکہ حضرت مسیح نزول کے بعد قرآن و سنت رسول اللہ ﷺ کے موافق حکم کریں گے اور یہ جب ہی ہوسکتا ہے کہ ان چیزوں کا علم دیا جائے، واللہ اعلم۔

وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ اَنِّىْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۙ اَنِّيْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ

اور کریگا اسکو پیغمبر بنی اسرائیل کی طرف، بیشک میں آیا ہوں تمہارے پاس نشانیاں لیکر تمہارے رب کی طرف سے ۱ کہ میں بنا دیتا ہوں تم کو

مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًاۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُبْرِئُ الْاَكْمَهَ

گارے سے پرندہ کی شکل پھر اس میں پھونک مارتا ہوں تو ہوجاتا ہے وہ اڑتا جانور اللہ کے حکم سے ۲ اور اچھا کرتا ہوں مادرزاد اندھے کو

وَالْاَبْرَصَ وَاُحْىِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ ۙ فِىْ بُيُوْتِكُمْ ۭ

اور کوڑھی کو اور جلاتا ہوں مردے اللہ کے حکم سے ۳ اور بتا دیتا ہوں تم کو جو کھا کر آؤ اور جو رکھ آؤ اپنے گھر میں ۴

اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿٤٩﴾

اس میں نشانی پوری ہے تم کو اگر تم یقین رکھتے ہو

خلاصہ تفسیر: اور ان کو (تمام) بنی اسرائیل کی طرف (پیغمبر بنا کر یہ مضمون دے کر) بھیجیں گے کہ (یہاں: انی جئتکم

سے آگے: مستقیم تک کا مضمون یعنی) میں تم لوگوں کے پاس (اپنی نبوت پر) کافی دلیل لے کر آیا ہوں وہ یہ ہے کہ میں تم لوگوں کے (یقین لانے کے) لئے گارے سے ایسی شکل بناتا ہوں جیسی پرندہ کی شکل ہوتی ہے، پھر اس (مصنوعی شکل) کے اندر پھونک ماردیتا ہوں جس سے وہ (سچ مچ کا جاندار) پرندہ بن جاتا ہے خدا کے حکم سے (ایک معجزہ تو یہ ہوا) اور میں اچھا کر دیتا ہوں مادرزاد اندھے کو، اور برص کے بیمار کو، اور زندہ کر دیتا ہوں مُردوں کو خدا کے حکم سے (یہ دوسرا، تیسرا معجزہ ہوا) اور میں تم کو بتلا دیتا ہوں جو کچھ اپنے گھروں میں کھا (کھا کر) آتے ہو اور جو (گھروں میں) رکھ آتے ہو (یہ چوتھا معجزہ ہوا) بلاشبہ ان (مذکورہ معجزات) میں (میرے نبی ہونے کی) کافی دلیل ہے تم لوگوں کے لئے اگر تم ایمان لانا چاہو۔

وَاُحۡیِ الۡمَوۡتٰی بِاِذۡنِ اللّٰهِ: اس میں ان اقوال کی اصل ہے جو بعض اہل اللہ سے غلبہ حال میں منقول ہیں، یعنی اس میں ان بزرگوں کے قول کی دلیل ہے جو اپنی طرف مجازاً کسی خدائی کام کی نسبت کرتے ہیں، مثلاً زندہ کرنے کو اپنی منسوب کرنا، حقیقت کے اعتبار سے زندہ اللہ تعالیٰ ہی کرتے ہیں، لیکن اپنے ولی کے ہاتھ سے ظاہر فرما دیتے ہیں، تو ولی اس کی نسبت مجازاً اپنی طرف کر لیتے ہیں، لیکن ان بزرگوں میں جو اہل ادب ہوتے ہیں وہ ہر حال میں اللہ کی مدد کی قید ضرور لگاتے ہیں جیسے یہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بِاِذۡنِ اللّٰهِ کی قید لگائی۔

پرندہ کی شکل بنانا تصویر تھا، جو اس شریعت میں جائز تھا، ہماری شریعت میں اس کا جواز منسوخ ہو گیا، اب بنانا جائز نہیں۔

* * *

فائدہ: ۱۔ قَدۡ جِئۡتُكُمۡ بِاٰيَةٍ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ: یعنی پیغمبر ہو کر اپنی قوم بنی اسرائیل سے یہ فرمائیں گے۔

فائدہ: ۲۔ فَيَكُوۡنُ طَيۡرًۢا بِاِذۡنِ اللّٰهِ: محض شکل وصورت بنانے کو "خلق" سے تعبیر کرنا صرف ظاہری حیثیت سے ہے، جیسے حدیث صحیح میں معمولی تصویر بنانے کو "خلق" سے تعبیر فرمایا "احیوا ما خلقتم" یا خدا کو احسن الخالقین فرما کر بتلا دیا کہ محض ظاہری صورت کے لحاظ سے غیر اللہ پر بھی یہ لفظ بولا جا سکتا ہے، اگرچہ حقیقت تخلیق کے لحاظ سے حق تعالیٰ کے سوا کوئی خالق نہیں کہلا سکتا، شاید اسی لئے یہاں یوں نہ فرمایا اَنِّیۡۤ اَخۡلُقُ لَكُمۡ مِّنَ الطِّيۡنِ طَيۡرًا (میں مٹی سے پرندہ بنا دیتا ہوں) یوں کہا کہ میں مٹی سے پرندہ کی شکل بنا کر اس میں پھونک مارتا ہوں، پھر وہ پرندہ اللہ کے حکم سے بن جاتا ہے، بہر حال یہ معجزہ آپ نے دکھلایا اور کہتے ہیں بچپن میں ہی بطور "ارہاص" آپ سے یہ خرق عادت ظاہر ہوا، تاکہ تہمت لگانے والوں کو ایک چھوٹا سا نمونہ قدرت خداوندی کا دکھلا دیں کہ جب میرے نفخہ (پھونکنے) پر خدا تعالیٰ مٹی کی بے جان صورت کو جاندار بنا دیتا ہے، اسی طرح اگر اس نے بدون مسِ بشر محض روح القدس کے نفخہ سے ایک برگزیدہ عورت کے پانی پر روح عیسوی فائض کر دی تو کیا تعجب ہے، بلکہ حضرت مسیح چونکہ نفخہ جبرئیلیہ سے پیدا ہوئے ہیں، اس مسیحائی نفخہ کو اسی نوعیت ولادت کا ایک اثر سمجھنا چاہیے، سورۃ مائدہ کے آخر میں حضرت مسیح علیہ السلام کے ان معجزات وخوارق پر دوسرے رنگ میں کلام کیا جائے گا، وہاں ملاحظہ کیا جائے۔

خلاصہ یہ کہ حضرت مسیح پر کمالات ملکیہ وروحیہ کا غلبہ تھا، اسی کے مناسب آثار ظاہر ہوتے تھے، لیکن اگر بشر کو ملک پر فضیلت حاصل ہے اور اگر ابو البشر کو مسجود ملائکہ بنایا گیا ہے تو کوئی شبہ نہیں کہ جس میں تمام کمالاتِ بشریہ (جو عبارت ہے مجموعہ کمالات روحانیہ وجسمانیہ سے) اعلیٰ درجہ پر ہوں گے اس کو حضرت مسیح سے افضل ماننا پڑے گا اور وہ ذات قدسی صفات محمد رسول اللہ ﷺ کی ہے۔

فائدہ: ۳۔ وَاُحۡیِ الۡمَوۡتٰی بِاِذۡنِ اللّٰهِ: اس زمانہ میں اطباء وحکماء کا زور تھا، حضرت مسیح کو ایسے معجزات مرحمت ہوئے جو لوگوں پر ان کے سب سے زیادہ مایہ ناز فن میں حضرت مسیح کا نمایاں تفوق ثابت کریں، بلاشبہ مردہ کو زندہ کرنا حق تعالیٰ کی صفت ہے، جیسا کہ باذن اللہ کی قید سے صاف ظاہر ہے، مگر مسیح اس کا ذریعہ ہونے کی وجہ سے توسعاً اپنی طرف نسبت کر رہے ہیں۔

یہ کہنا کہ "حق تعالیٰ قرآن کریم میں یا نبی کریم ﷺ احادیث میں اعلان کر چکے ہیں کہ ازل سے ابد تک کسی مردہ کو دنیا میں دوبارہ زندہ نہیں کیا جائے گا"، نرا دعویٰ ہے جس کا کوئی ثبوت نہیں، اگر اس نے قرآن میں فَيُمۡسِكُ الَّتِیۡ قَضٰی عَلَيۡهَا الۡمَوۡتَ فرما کر یہ بتلایا کہ مرنے والے کی روح خدا تعالیٰ روک لیتا ہے اور سونے والے کی اس طرح نہیں روکتا، تو یہ کب کہا ہے کہ اس روک لینے کے بعد دوبارہ اسے چھوڑ دینے کا اختیار نہیں رہتا،

یادرکھو! معجزہ وہی ہے جو حق تعالیٰ کی عام عادت کے خلاف مدعی نبوت کی تصدیق کے لئے ظاہر کیا جائے، پس ایسی نصوص کو لے کر جو کسی چیز کی نسبت خدا کی عام عادت بیان کرتی ہوں یہ استدلال کرنا کہ ان سے معجزات کی نفی ہوتی ہے، سرے سے معجزہ کے وجود کا انکار اور اپنی حماقت وغباوت کا اظہار ہے معجزہ اگر عام قانون عادت کے موافق آیا کرے تو اسے معجزہ کیوں کہیں گے، حضرت مسیح علیہ السلام کا بن باپ پیدا ہونا، یا ابراء اکمہ وابرص اور احیاء موتی وغیرہ معجزات دکھلانا، اہل اسلام میں تمام سلف وخلف کے نزدیک مسلم رہا ہے، صحابہ وتابعین میں ایک قول بھی اس کے انکار میں دکھلایا نہیں جاسکتا ،آج جو ملحد یہ دعویٰ کرے کہ ان خوارق کا ماننا محکمات قرآنی کے خلاف ہے، گویا وہ ایسی چیزوں کو "محکمات" بتلاتا ہے، جن کا صحیح مطلب سمجھنے سے تمام امت عاجز رہی؟ یا سب کے سب محکمات کو چھوڑ کر اور "متشابہات" کے پیچھے پڑ کر فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ کے مصداق بن گئے؟ آج کل کے ملحدین کے سوا "متشابہات" کو "محکمات" کی طرف لوٹانے کی کسی کو توفیق نہ ہوئی، العیاذ باللہ، حق یہ ہے کہ وہ آیات جن کے ظاہری معنیٰ کو ساری امت مانتی چلی آئی ہے، "محکمات" ہیں، اور ان کو توڑ مروڑ کر محض استعارات وتمثیلات پر حمل کرنا اور معجزات کی نفی پر عموم عادت سے دلیل لانا یہ ہی "زائغین" کا کام ہے، جن سے حذر کرنے کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت فرمائی ہے۔

فائدہ: ٤ وَمَا تَدَّخِرُونَ فِي بُيُوتِكُمْ: آئندہ کے لئے یعنی بعض مغیبات ماضیہ ومستقبلہ پر تم کو مطلع کر دیتا ہوں، عملی معجزات کے بعد یہ ایک علمی معجزہ ذکر کر دیا۔

وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَلِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ

اور سچا بتاتا ہوں اپنے سے پہلی کتاب کو جو توریت ہے اور اس واسطے کہ حلال کردوں تم کو بعضی وہ چیزیں جو حرام تھیں تم پر ١

وَجِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۣ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۝٥٠

اور آیا ہوں تمہارے پاس نشانی لے کر تمہارے رب کی، سو ڈرو اللہ سے اور میرا کہا مانو ٢

خلاصہ تفسیر: اور میں اس طور پر آیا ہوں کہ تصدیق کرتا ہوں اس کتاب کی جو مجھ سے پہلے (نازل ہوئی) تھی یعنی توراۃ کی، اور اس لئے آیا ہوں کہ تم لوگوں کے واسطے بعض ایسی چیزیں حلال کردوں جو (موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں) تم پر حرام کردی گئی تھیں (سو ان کی حرمت میری شریعت میں منسوخ ہوگی) اور (میرا یہ نسخ کا دعویٰ بلا دلیل نہیں ہے، بلکہ میں ثابت کرچکا ہوں کہ) میں تمہارے پاس (نبوت کی) دلیل لے کر آیا ہوں (اور صاحب نبوت کا قول نسخ کے دعویٰ میں حجت ہے) حاصل یہ کہ (جب میرا نبی ہونا دلائل سے ثابت ہو چکا تو میری تعلیم کے موافق) تم لوگ اللہ تعالیٰ (کے حکم کی مخالفت) سے ڈرو اور (دین کے باب میں) میرا کہنا مانو۔

* * *

فائدہ: ١ یعنی تورات کی تصدیق کرتا ہوں کہ خدا کی کتاب ہے اور اسکے عام اصول واحکام کو بحالہ قائم رکھتے ہوئے زمانہ کے مناسب حق تعالیٰ کے حکم سے چند جزئی وفرعی تغیرات کروں گا، مثلاً بعض احکام میں پہلے جو سختی تھی وہ اب اٹھادی جائے گی، اسکا نام خواہ "نسخ" رکھ لو یا "تکمیل" اختیار ہے۔

فائدہ: ٢ یعنی میری صداقت کے نشان جب دیکھ چکے تو اب خدا سے ڈر کر میری باتیں ماننی چاہئیں۔

اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ۭ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ۝٥١

بے شک اللہ ہے رب میرا اور رب تمہارا سو اس کی بندگی کرو، یہی راہ سیدھی ہے

خلاصہ تفسیر: (اور خلاصہ میری دینی تعلیم کا یہ ہے کہ) بیشک اللہ تعالیٰ میرے بھی رب ہیں اور تمہارے بھی رب ہیں (یہ تو حاصل ہے تکمیل عقیدہ کا) سو تم لوگ اس (رب) کی عبادت کرو (یہ حاصل ہوا تکمیل عمل کا) بس یہ ہے راہ راست (دین کی، جس میں عقائد واعمال

دونوں کی تکمیل ہو، اسی سے نجات و وصول الی اللہ میسر ہوتا ہے)۔

* * *

فائدہ: یعنی سب باتوں کی ایک بات ساری جڑوں کی اصل جڑ یہ ہے کہ حق تعالیٰ کو میرا اور اپنا دونوں کا یکساں رب سمجھو (باپ بیٹے کے رشتے قائم نہ کرو) اور اسی کی بندگی کرو، سیدھا راستہ رضائے الٰہی تک پہنچنے کا یہی توحید، تقویٰ اور اطاعت رسول ہے۔

فَلَمَّآ اَحَسَّ عِيْسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ

پھر جب معلوم کیا عیسیٰ نے بنی اسرائیل کا کفر[1] بولا کون ہے کہ میری مدد کرے اللہ کی راہ میں[2] کہا حواریوں نے ہم ہیں

اَنْصَارُ اللّٰهِ ۚ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ۚ وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴿۵۲﴾

مدد کرنے والے اللہ کے[3] ہم یقین لائے اللہ پر اور تو گواہ رہ کہ ہم نے حکم قبول کیا[4]

خلاصہ تفسیر: (غرض مذکورہ بشارت کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام اسی شان سے پیدا ہوئے، اور بنی اسرائیل سے مذکورہ مضمون کی گفتگو ہوئی اور معجزات ظاہر فرمائے، مگر بنی اسرائیل آپ کی نبوت کے منکر رہے) سو جب حضرت عیسیٰ نے ان سے انکار دیکھا (اور انکار کے ساتھ وہ ایذا پہنچانے کے بھی درپے تھے، اتفاقاً کچھ لوگ عیسیٰ علیہ السلام کو ایسے ملے جو ''حوارین'' کہلاتے تھے) تو (ان حوارین سے) آپ نے فرمایا کوئی ایسے آدمی بھی ہیں جو (مخالفین ومنکرین کے مقابلہ میں دین حق پر) میرے مددگار ہو جائیں اللہ کے واسطے (جس سے دعوت دین میں مجھے کوئی ایذاء نہ پہنچائے) حوارین بولے کہ ہم ہیں مددگار اللہ کے (دین کے) ہم اللہ تعالیٰ پر (حسب دعوت آپ کے) ایمان لائے اور آپ اس (بات) کے گواہ رہیے کہ ہم (اللہ تعالیٰ کے اور آپ کے) فرمانبردار ہیں۔

قَالَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ: یہاں ایک بات قابل تحقیق ہے، وہ یہ کہ پیچھے آیت: وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ سے معلوم ہوتا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کی طرف مبعوث ہوئے تھے اور یہاں اس آیت سے معلوم ہوا کہ آپ نے حوارین کو بھی ایمان کی دعوت دی، اس سے شبہ ہوتا ہے کہ آپ کی بعثت ونبوت عام تھی، کسی قوم کے ساتھ خاص نہیں تھی، حالانکہ بعثت عامہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص ہے، آپ کے سوا کسی کی نبوت ودعوت عام نہ تھی، جواب یہ ہے کہ اگر حوارین بھی بنی اسرائیل میں سے ہوں تب تو کچھ اشکال ہی نہیں، اور آیات وحدیث سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے، چنانچہ سورہ صف میں حوارین کے ایمان لانے کا بیان کر کے حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: **فامنت طائفة من بنی اسرائیل و کفرت طائفة**، یعنی بنی اسرائیل میں سے ایک جماعت ایمان لائی اور ایک جماعت نے کفر کیا، اس سے بظاہر یہی سمجھا جاتا ہے کہ حوارین جو کہ ایمان لائے تھے وہ بھی بنی اسرائیل میں سے تھے، اور ایک حدیث روح المعانی میں بروایت ابن عباسؓ سے منقول ہے جس کا مضمون یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے فرمایا کہ تیس روزے رکھ کر اللہ تعالیٰ سے جو درخواست کرو گے قبول ہوگی، انہوں نے روزے رکھ کر آسمان سے کھانے کا پکا ہوا خوان اترنے کی درخواست کی، اور قرآن میں صراحۃً یہ درخواست حوارین کی طرف منسوب کی ہے، اس مجموعہ سے معلوم ہوا کہ حوارین بنی اسرائیل میں سے تھے اس بنا پر تو اشکال کی اصل ہی منہدم ہوگئی، اور اگر مان بھی لیا جائے کہ حوارین بنی اسرائیل میں سے نہیں تھے تب بھی عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت عامہ ثابت نہیں، کیونکہ جن انبیاء علیہم السلام کی دعوت عام نہیں تھی ان کے زمانہ میں ان کی قوم کے علاوہ باقی لوگوں پر بھی بشرطیکہ ان کو خبر پہنچ جائے اصول دین میں اس نبی کا اتباع واجب ہوتا تھا، کیونکہ اصول تمام شرائع کے متحد ہیں، اور فروعات میں یہ تفصیل ہے کہ اگر ان بقایا آدمیوں میں کوئی دوسرے نبی مبعوث ہوئے ہوں تو ان پر فروعات میں صرف اپنے نبی کا اتباع واجب ہوتا تھا، اور جن کی طرف کوئی نبی مبعوث نہ ہو ان پر اس جدید نبی کا اتباع واجب تھا، پس حوارین کی طرف چونکہ کوئی خاص نبی مبعوث نہیں ہوئے تھے اس لیے عیسیٰ علیہ السلام کا اتباع ان پر واجب تھا، اس لیے ان کو دین کی دعوت دی، اس لیے عموم بعثت لازم نہیں آیا، کیونکہ عموم بعثت سے مراد یہ ہے کہ اصول وفروع سب میں کوئی شخص اس نبی کی دعوت سے مستثنیٰ نہ رہے، خواہ ان میں کوئی نبی

خاص طور پر آیا ہو یا نہ آیا ہو، ایسی دعوت عامہ سوائے نبی کریم ﷺ کے کسی کی نہیں ہوئی۔

حضرت نوح علیہ السلام کے زمانہ میں طوفان عام ہونے سے عموم بعثت کا شبہ نہ کیا جائے کہ اگر ان کی نبوت عام نہ ہوتی تو سارا عالم کیوں غرق ہوتا؟ نافرمانی کی وجہ سے صرف ان کی قوم غرق ہوتی؟ جواب یہ ہے کہ ابھی بیان کیا گیا ہے کہ اصول میں ہر نبی کا اتباع واجب ہے اور اس وقت تمام لوگ توحید میں خلاف کر رہے تھے جو اصل الاصول ہے اس لیے ان کو سزا دی گئی ہے، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ فروعات میں بھی تمام عالم پر نوح علیہ السلام کا اتباع فرض تھا پس ان کی نبوت بھی عام نہ تھی۔

قَالَ مَنْ اَنْصَارِیْۤ اِلَی اللّٰهِ: اس آیت میں دو مسئلے ہیں: ① پہلا مسئلہ یہ کہ اہل دین سے دین کی دعوت وتبلیغ کے لیے مدد طلب کرنا جائز ہے، اسے توکل کے خلاف نہیں سمجھنا چاہیے، کیونکہ وہ مدد طلب کرنا اس حیثیت سے ہوتا ہے کہ وہ نصرت الٰہیہ کے مظاہر ہیں۔

② دوسرا مسئلہ یہ کہ اہل اللہ کے ساتھ کوئی معاملہ کرنا ایسا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کرنا، چنانچہ عیسیٰ علیہ السلام کی پکار پر حواریوں نے کہا: **نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ** یعنی ہم اللہ کے مددگار ہیں، اصل جواب اس طرح ہونا چاہیے تھا: "نحن انصارك الى الله" یعنی ہم اللہ کے بارے میں آپ مددگار ہیں، تو اس سے معلوم ہوا کہ اہل اللہ کے ساتھ کوئی معاملہ کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ اللہ کے ساتھ معاملہ کرنا۔

* * *

فائدہ: ۱۔ **اَحَسَّ عِیْسٰی مِنْهُمُ الْكُفْرَ:** یعنی یہ میرا دین قبول نہ کریں گے، بلکہ دشمنی اور ایذاء رسانی کے در پے رہیں گے۔

فائدہ: ۲۔ **مَنْ اَنْصَارِیْۤ اِلَی اللّٰهِ:** یعنی میرا ساتھ دے اور دین الٰہی کو رواج دینے میں میری مدد کرے۔

فائدہ: ۳۔ **نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ:** اللہ کی مدد کرنا یہی ہے کہ اس کے دین و آئین اور پیغمبروں کی مدد کی جائے جس طرح انصار مدینہ نے اپنے پیغمبر ﷺ اور دین حق کی مدد کر کے دکھلائی۔

فائدہ: ۴۔ **وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ:** "حواری" کون لوگ تھے اور یہ لقب ان کا کس وجہ سے ہوا؟ اس میں علماء کے بہت اقوال ہیں مشہور یہ ہے کہ پہلے دو شخص جو حضرت عیسیٰ کے تابع ہوئے دھوبی تھے اور کپڑے صاف کرنے کی وجہ سے حواری کہلاتے تھے، حضرت عیسیٰ نے ان کو کہا کہ کپڑے کیا دھوتے ہو آؤ میں تم کو دل دھونے سکھا دوں، وہ ساتھ ہو لئے، پھر ایسے سب ساتھیوں کا یہی لقب پڑ گیا۔

رَبَّنَاۤ اٰمَنَّا بِمَاۤ اَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِیْنَ ﴿۵۳﴾

اے رب ہم نے یقین کیا اس چیز کا جو تو نے اتاری اور ہم تابع ہوئے رسول کے سو تو لکھ لے ہم کو ماننے والوں میں

خلاصہ تفسیر: (پھر مزید اہتمام وتوثیق کے لئے اللہ تعالیٰ سے مناجات کی کہ) اے ہمارے رب! ہم ایمان لائے ان چیزوں (یعنی ان احکام) پر جو آپ نے نازل فرمائیں اور پیروی اختیار کی ہم نے (ان) رسول کی، سو (ہمارا ایمان قبول فرما کر) ہم کو ان لوگوں کے ساتھ لکھ دیجیے جو (مذکورہ مضامین کی) تصدیق کرتے ہیں (یعنی مومنین کاملین کے زمرہ میں ہمارا بھی شمار فرمایے)۔

* * *

فائدہ: پیغمبر کے سامنے اقرار کرنے کے بعد پروردگار کے سامنے یہ اقرار کیا کہ ہم انجیل پر ایمان لا کر تیرے رسول کا اتباع کرتے ہیں، آپ اپنے فضل وتوفیق سے ہمارا نام ماننے والوں کی فہرست میں ثبت فرما دیں، گویا ایمان کی رجسٹری ہو جائے کہ پھر لوٹنے کا احتمال نہ رہے۔

وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ خَیْرُ الْمٰكِرِیْنَ ﴿۵۴﴾ ع

اور مکر کیا ان کافروں نے اور مکر کیا اللہ نے، اور اللہ کا داؤ سب سے بہتر ہے

خلاصہ تفسیر: اور ان لوگوں نے (جو کہ بنی اسرائیل میں سے آپ کی نبوت کے منکر تھے، آپ کو ہلاک کرنے اور ایذا پہنچانے

کے لئے) خفیہ تدبیر کی (چنانچہ مکر وحیلہ سے آپ کو گرفتار کر کے سولی دینے کا ارادہ کیا) اور اللہ تعالیٰ نے (آپ کو محفوظ رکھنے کے لئے) خفیہ تدبیر فرمائی (جس کی حقیقت کا ان لوگوں کو بھی پتہ نہ لگا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں مخالفین میں سے ایک شخص کو عیسیٰ علیہ السلام کا ہم شکل بنا دیا، اور عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر اٹھالیا، جس سے وہ محفوظ رہے، اور وہ ہم شکل سولی دیا گیا، ان لوگوں کو حق تعالیٰ کی تدبیر کا علم بھی پہلے سے نہ ہو سکا اس کو دفع تو کیا کرتے) اور اللہ تعالیٰ سب تدبیریں کرنے والوں سے اچھے ہیں (کیونکہ دوسروں کی تدبیریں کمزور ہوتی ہیں، اور کبھی بے ڈھنگی اور بے موقع بھی ہوتی ہیں، اور حق تعالیٰ کی تدبیریں قوی بھی ہوتی ہیں اور ہمیشہ خیر اور حکمت کے موافق ہوتی ہیں)۔

وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ: اس میں اس بات پر دلالت ہے کہ یہ بات ممکن ہے کہ ایک ہی کام حق تعالیٰ کے اعتبار سے تو حسن ہو اور بندوں کے اعتبار سے قبیح اور برا ہو، اس میں راز یہ ہے کہ بعض اشیا میں ذاتی طور پر قبح نہیں ہوتا، بلکہ کسی فساد کے سبب اور مصلحت سے خالی ہونے کی وجہ سے قبح اور برائی آجاتی ہے، تو ایسا کام جب بندہ سے صادر ہوتا ہے تو مصلحت سے خالی ہونے کی وجہ سے قبیح اور برا ہوتا ہے، لیکن جب حق تعالیٰ سے واقع ہوتا ہے تو اس میں حکمت اور مصلحت ہوتی ہے اس لیے حسن ہوتا ہے۔

* * *

فائدہ: ''مکر'' کہتے ہیں لطیف وخفیہ تدبیر کو، اگر وہ اچھے مقصد کے لئے ہو، اچھا ہے، اور برائی کے لئے تو برا ہے، اسی لئے **وَلَا يَحِيْقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ** میں ''مکر'' کے ساتھ ''سیئ'' کی قید لگائی، یہاں خدا کو خیر الماکرین کہا، مطلب یہ ہے کہ یہود نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خلاف طرح طرح کی سازشیں اور خفیہ تدبیریں شروع کر دیں، حتیٰ کہ بادشاہ کے کان بھر دیے کہ یہ شخص (معاذ اللہ) ملحد ہے، تورات کو بدلنا چاہتا ہے، سب کو بددین بنا کر چھوڑے گا، اس نے مسیح علیہ السلام کی گرفتاری کا حکم دے دیا، اُدھر یہ ہو رہا تھا اور اِدھر حق تعالیٰ کی لطیف وخفیہ تدبیر ان کے توڑ میں اپنا کام کر رہی تھی، جس کا ذکر آگے آتا ہے، بیشک خدا کی تدبیر سب سے بہتر اور مضبوط ہے جسے کوئی نہیں توڑ سکتا۔

اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰٓى اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَىَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ

جس وقت کہا اللہ نے اے عیسیٰ میں لے لونگا تجھ کو اور اٹھا لونگا اپنی طرف اور پاک کر دونگا تجھ کو کافروں سے اور رکھونگا ان کو جو

اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ اِلَىَّ مَرْجِعُكُمْ فَاَحْكُمُ بَيْنَكُمْ

تیرے تابع ہیں غالب ان لوگوں سے جو انکار کرتے ہیں قیامت کے دن تک، پھر میری طرف ہے تم سب کو پھر آنا پھر فیصلہ کر دونگا تم میں

فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿٥٥﴾

جس بات میں تم جھگڑتے تھے

خلاصہ تفسیر: (اور وہ تدبیر اللہ تعالیٰ نے اس وقت فرمائی) جبکہ اللہ تعالیٰ نے (عیسیٰ علیہ السلام سے جبکہ وہ گرفتاری کے وقت متردد اور پریشان ہوئے) فرمایا اے عیسیٰ! (کچھ غم نہ کرو) بیشک میں آپ کو (اپنے وقت موعود پر طبعی موت سے) وفات دینے والا ہوں (پس جب تمہارے لئے موت طبعی مقدر ہے تو ظاہر ہے کہ ان دشمنوں کے ہاتھوں دار پر جان دینے سے محفوظ رہو گے) اور (فی الحال) میں تم کو اپنے (عالم بالا کی) طرف اٹھائے لیتا ہوں، اور تم کو ان لوگوں (کی تہمت) سے پاک کرنے والا ہوں جو (تمہارے) منکر ہیں، اور جو لوگ تمہارا کہنا ماننے والے ہیں ان کو غالب رکھنے والا ہوں ان لوگوں پر جو کہ (تمہارے) منکر ہیں روز قیامت تک (اگرچہ اس وقت یہ منکرین غلبہ اور قدرت رکھتے ہیں) پھر (جب قیامت آجائے گی اس وقت) میری طرف ہوگی سب کی واپسی (دنیا و برزخ سے) سو میں (اس وقت) تمہارے (سب کے) درمیان (عملی) فیصلہ کر دوں گا ان امور میں جن میں تم باہم اختلاف کرتے تھے کہ (من جملہ ان امور کے عیسیٰ علیہ السلام کا مقدمہ بھی ہے)۔

إِنِّي مُتَوَفِّيكَ وَرَافِعُكَ إِلَيَّ وَمُطَهِّرُكَ: اس آیت میں حق تعالیٰ نے یہودیوں کے مقابلہ میں عیسیٰ علیہ السلام سے پانچ وعدے فرمائے:

① پہلا وعدہ: (إِنِّي مُتَوَفِّيكَ) یہ تھا کہ ان کی موت یہودیوں کے ہاتھوں قتل کے ذریعہ نہیں ہوگی، طبعی طور سے وقت موعود پر ہوگی، اور وہ وقت موعود قرب قیامت میں آئے گا جب عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے زمین پر نازل ہوں گے، جیسا کہ احادیث صحیحہ متواترہ میں اس کی تفصیل موجود ہے۔

لفظ ''متوفی'' کا مصدر ''توفی'' اور مادہ ''وفی'' ہے، اس کے اصل معنی عربی لغت کے اعتبار سے پورا پورا لینے کے ہیں، وفاء، ایفاء، استیفاء، اسی معنی کے لئے بولے جاتے ہیں، توفی کے بھی اصلی معنی پورا پورا لینے کے ہیں، عربی زبان کی تمام کتب لغت اس پر شاہد ہیں، اور چونکہ موت کے وقت انسان اپنی اجل مقدر پوری کر لیتا ہے، اور خدا کی دی ہوئی روح پوری لے لی جاتی ہے، اس کی مناسبت سے یہ لفظ بطور کنایہ موت کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، اور موت کا ایک ہلکا سا نمونہ روزانہ انسان کی نیند ہے، اس کے لئے بھی قرآن کریم میں اس لفظ کا استعمال ہوا ہے: **الله يتوفى الانفس حين موتها والتى لم تمت فى منامها** جس کا ترجمہ یہ ہے کہ ''اللہ لے لیتا ہے جانوں کو ان کی موت کے وقت، اور جن کی موت نہیں آتی ان کی نیند کے وقت''، اسی لئے آیت مذکورہ میں لفظ مُتَوَفِّيكَ کا ترجمہ اکثر حضرات نے پورا لینے سے کیا ہے، جیسا کہ ترجمہ شیخ الہندؒ میں مذکور ہے، اس ترجمہ کے لحاظ سے مطلب واضح ہے کہ ہم آپ کو یہودیوں کے ہاتھ میں نہ چھوڑیں گے، بلکہ خود آپ کو لے لیں گے، جس کی صورت یہ ہوگی کہ اپنی طرف آسمان پر چڑھا لیں گے، اور بعض حضرات نے اس کا ترجمہ موت دینے سے کیا ہے، جیسا کہ اوپر خلاصہ تفسیر میں مذکور ہے، اور یہی ترجمہ مفسر قرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے اسانید صحیحہ کے ساتھ منقول ہے، مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی منقول ہے کہ معنی آیت کے ہیں کہ حق تعالیٰ نے اس وقت جبکہ یہودی آپ کے قتل کے درپے تھے آپ کی تسلی کے لئے دو لفظ ارشاد فرمائے، ایک یہ کہ آپ کی موت ان کے ہاتھوں قتل کی صورت میں نہیں بلکہ طبعی موت کی صورت میں ہوگی، دوسرا یہ کہ اس وقت ان لوگوں کے نرغہ سے نجات دینے کی ہم یہ صورت کریں گے کہ آپ کو اپنی طرف اٹھا لیں گے، یہی تفسیر حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے، تفسیر درمنثور میں حضرت ابن عباسؓ کی یہ روایت اس طرح منقول ہے کہ ''میں آپ کو اپنی طرف اٹھا لوں گا، پھر آخر زمانہ میں آپ کو طبعی طور پر وفات دوں گا، مزید تفصیل آگے آرہی ہے۔

② دوسرا وعدہ: (وَرَافِعُكَ إِلَيَّ) فی الحال عالم بالا کی طرف اٹھا لینے کا تھا، یہ اسی وقت پورا کر دیا گیا، جس کے پورا کرنے کی خبر سورۃ نساء میں اس طرح دی گئی: **وما قتلوه يقينا بل رفعه الله اليه** (نساء: ۱۵۸) ''یقینا ان کو یہودیوں نے قتل نہیں کیا، بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف اٹھا لیا''، اگرچہ طبعی وفات دینے کا پہلا وعدہ بعد میں پورا ہوگا، لیکن اس کو یہاں پہلے اس لیے ذکر کیا گیا کہ وہ دوسرے وعدہ کے لیے یعنی عالم بالا کی طرف اٹھائے جانے کے لیے ایک گونہ دلیل ہے، اور دلیل کا رتبہ مقدم ہوتا ہے، واضح رہے کہ لفظ ''واؤ'' ترتیب کے لیے نہیں اس لیے اس تقدیم وتاخیر میں کوئی اشکال نہیں، تفسیر درمنثور میں حضرت ابن عباسؓ سے آیت: إِنِّي مُتَوَفِّيكَ وَرَافِعُكَ إِلَيَّ کی تفسیر میں یہ لفظ نقل کئے ہیں کہ میں آپ کو اپنی طرف اٹھا لوں گا، پھر آخر زمانہ میں آپ کو طبعی طور پر وفات دوں گا، اس تفسیر کا خلاصہ یہ ہے کہ ''توفی'' کے معنی موت ہی کے ہیں، مگر الفاظ میں تقدیم وتاخیر ہے (رَافِعُكَ) کا پہلے اور (مُتَوَفِّيكَ) کا وقوع بعد میں ہوگا، اور اس موقع پر مُتَوَفِّيكَ کو مقدم ذکر کرنے کی حکمت ومصلحت اس پورے معاملے کی طرف اشارہ کرنا ہے جو آگے ہونے والا ہے یعنی یہ اپنی طرف بلا لینا ہمیشہ کے لئے نہیں، چند روزہ ہوگا اور پھر آپ اس دنیا میں آئیں گے اور دشمنوں پر فتح پائیں گے، اور بعد میں طبعی طور پر آپ کی موت واقع ہوگی، اس طرح دوبارہ آسمان سے نازل ہونے اور دنیا پر فتح پانے کے بعد موت آنے کا واقعہ ایک معجزہ بھی تھا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اعزاز واکرام کی تکمیل بھی، نیز اس میں عیسائیوں کے عقیدہ الوہیت کا ابطال بھی تھا، ورنہ ان کے زندہ آسمان پر چلے جانے کے واقعہ سے ان کا یہ عقیدہ باطل اور پختہ ہو جاتا کہ وہ بھی اللہ تعالیٰ کی طرح حی وقیوم ہے، اس لئے پہلے مُتَوَفِّيكَ کا لفظ ارشاد فرما کر ان تمام خیالات کا ابطال کر دیا پھر اپنی طرف بلانے کا ذکر فرمایا، اس سے معلوم ہوا کہ اس آیت میں یہود کی تردید تو مقصود ہی ہے کہ یہود جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے اور سولی دینے کا عزم کر رہے تھے اللہ تعالیٰ نے ان کے عزائم کو خاک میں ملا دیا، اس تقدیم وتاخیر الفاظ کے ذریعہ اسی کے ساتھ نصاریٰ کی بھی تردید ہوگئی کہ وہ خدا نہیں جو موت سے بری ہوں، ایک وقت آئے گا جب ان کو بھی موت آئے گی، امام رازیؒ نے تفسیر کبیر میں فرمایا کہ قرآن کریم میں اس طرح کہ تقدیم وتاخیر اسی طرح کے

مصالح کے ماتحت بکثرت آئی ہے کہ جو واقعہ بعد میں ہونے والا تھا اس کو پہلے اور پہلے ہونے والے واقعہ کو بعد میں بیان فرمایا۔

وَرَافِعُكَ إِلَيَّ اس کا مفہوم ظاہر ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کو خطاب کر کے کہا گیا ہے کہ آپ کو اپنی طرف اٹھا لوں گا، اور سب جانتے ہیں کہ عیسیٰ صرف روح کا نام نہیں، بلکہ روح مع جسم کا ہے، تو رفع عیسیٰ کا یہ مفہوم لینا کہ صرف رفع روحانی ہوا جسمانی نہیں اٹھایا گیا بالکل غلط ہے، رہا یہ کہ لفظ رفع کبھی بلندی مرتبہ کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے جیسا کہ قرآن کریم میں رفع بعضكم فوق بعض درجات اور یرفع الله الذین امنوا منكم والذین اوتوا العلم وغیرہ آیات میں مذکور ہے، تو یہ ظاہر ہے کہ لفظ رفع کو رفع درجہ کے معنی میں استعمال کرنا ایک مجاز ہے جو قرائن کی بنا پر مذکورہ آیات میں ہوا ہے، یہاں حقیقی معنی چھوڑ کر مجازی لینے کی کوئی وجہ نہیں، اس کے علاوہ اس جگہ لفظ رفع کے ساتھ لفظ الیٰ استعمال فرما کر اس مجازی معنی کا احتمال بالکل ختم کر دیا گیا ہے، اس آیت میں رَافِعُكَ إِلَيَّ فرمایا، اور سورۃ نساء کی آیت میں بھی جہاں یہودیوں کے عقیدہ کا رد کیا گیا وہاں بھی یہی فرمایا: وما قتلوہ یقینا بل رفع الله الیہ یعنی یہودیوں نے یقینا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل نہیں کیا، بلکہ ان کو تو اللہ نے اپنی طرف اٹھا لیا، اپنی طرف اٹھا لینا روح مع جسد کے زندہ اٹھا لینے ہی کے لئے بولا جاتا ہے۔

③ تیسرا وعدہ: (وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا) ان کو دشمنوں کی تہمتوں سے پاک کرنے کا تھا، وہ اس طرح پورا ہوا کہ خاتم الانبیاء ﷺ تشریف لائے، اور یہود کے سب غلط الزامات کو صاف کر دیا، مثلاً یہود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بغیر باپ کے پیدا ہونے کی وجہ سے ان کے نسب کو مطعون کرتے تھے، اسی طرح یہودی حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر خدائی کے دعوے کا الزام لگاتے تھے، قرآن کریم نے ان تمام الزامات کا جا بجا واضح اور صاف جواب دیا جس سے آپ کے نسب وعقیدہ کی نزاہت ظاہر ہو گئی۔

④ چوتھا وعدہ: (وَجَاعِلُ الَّذِينَ اتَّبَعُوكَ فَوْقَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ) میں ہے کہ آپ کے متبعین کو آپ کے منکرین پر قیامت تک غالب رکھا جائے گا، یہ وعدہ اس طرح پورا ہوا کہ یہاں ''اتباع'' سے مراد عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کا اعتقاد اور اقرار مراد ہے، ان کے سب احکام پر ایمان واعتقاد کی شرط نہیں، تو اس طرح نصاریٰ اور اہل اسلام دونوں اس میں داخل ہو گئے کہ وہ عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت ورسالت کے معتقد ہیں، یہ دوسری بات ہے کہ صرف اتنا اعتقاد نجات آخرت کے لئے کافی نہیں، بلکہ نجات آخرت اس پر موقوف ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے تمام احکام پر اعتقاد و ایمان رکھے، اور عیسیٰ علیہ السلام کے قطعی اور ضروری احکام میں سے ایک یہ بھی تھا کہ ان کے بعد خاتم الانبیاء ﷺ پر بھی ایمان لائیں، نصاریٰ نے اس پر اعتقاد و ایمان اختیار نہ کیا، اس لئے نجات آخرت سے محروم رہے، مسلمانوں نے اس پر بھی عمل کیا، اس لئے نجات آخرت کے مستحق ہو گئے، اور ''منکرین'' سے مراد یہود ہیں، جو عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کے منکر تھے، پس حاصل آیت کا یہ ہوا کہ امت محمدیہ اور نصاریٰ ہمیشہ یہود پر حاکم اور غالب رہیں گے، چنانچہ جلدی یہ وعدہ پورا ہوا، یہود ذلیل وخوار ہوئے اور ان کی سلطنت برباد ہوئی، غرض دنیا میں یہودیوں پر غالب رہنے کا وعدہ صرف عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت پر موقوف تھا، وہ دنیا کا غلبہ نصاریٰ اور مسلمانوں کو بمقابلہ یہود ہمیشہ حاصل رہا اور یقینا قیامت تک رہے گا، جب سے اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ فرمایا تھا اس وقت سے آج تک ہمیشہ مشاہدہ یہی ہوتا چلا آیا ہے کہ یہود کے مقابلہ میں ہمیشہ نصاریٰ اور مسلمان غالب رہے، انہیں کی حکومتیں دنیا میں قائم ہوئیں اور رہیں، آج تک جہاں کہیں یہود ہیں یا تو نصاریٰ کی رعایا ہیں یا اہل اسلام کی اور قیامت کے قریب تک ایسے ہی رہے گا، صرف چالیس دن کے لیے دجال کا جو کہ یہود کا سرگروہ ہے ایک گونہ شر وفساد پھیلے گا لیکن اول تو وہ فورا مٹ جائے گا، پھر کوئی باضابطہ امن واطمینان سے حکومت نہ ہوگی اور محض ایسی عارضی شورش کو سلطنت نہیں کہہ سکتے، اسی طرح بعض نے جو مؤرخ مسعودیؒ سے بعض عباسیین کے زمانہ یہود کی کچھ چھوٹی چھوٹی حکومتیں نقل کی ہیں وہ مسلمانوں اور عیسائیوں کی سلطنتوں کے مقابلہ میں اس قابل نہیں کہ اس کو ان دونوں کے برابر یا ان پر غلبہ کہا جا سکے، بلکہ اس حالت میں ان دونوں کو غالب اور یہود کو مغلوب ہی کہا جائے گا جس کا اس آیت میں وعدہ کیا گیا ہے۔

اسرائیل کی موجودہ حکومت سے اس پر کوئی شبہ نہیں ہو سکتا، کیونکہ اول تو اس حکومت کی حقیقت اس کے سوا نہیں کہ وہ روس اور یورپ کے نصاریٰ کی مشترکہ چھاؤنی ہے، جو انہوں نے مسلمانوں کے خلاف قائم کر رکھی ہے، ایک دن کے لئے بھی اگر حکومت روس وامریکہ ودیگر ممالک یورپ اپنا

ہاتھ اس کے سر سے ہٹالیں تو دنیا کے نقشہ سے اس کا وجود مٹتا ہوا ساری دنیا مشاہدہ کر لے، اس لئے یہود یا اسرائیل کی یہ حکومت حقیقت شناس لوگوں کی نظر میں ایک مجاز تو ہو سکتا ہے، اس سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں اور بالفرض اس کو ان کی اپنی ہی حکومت تسلیم کر لیا جائے تو بھی نصاریٰ اور اہل اسلام کے مجموعہ کے مقابلہ میں اس کے مغلوب و مقہور ہونے سے کون سا صحیح العقل انسان انکار کر سکتا ہے، اس سے بھی قطع نظر کر و تو قریب قیامت میں چند روزہ یہود کے غلبہ کی خبر تو خود اسلام کی متواتر روایات میں موجود ہے، اگر اس دنیا کو اب زیادہ باقی رہنا نہیں، اور قیامت قریب آ چکی ہے تو اس کا ہونا بھی اسلامی روایات کے منافی نہیں اور ایسی چند روزہ شورش کو سلطنت یا حکومت نہیں کہہ سکتے۔

⑤ پانچواں وعدہ: (ثُمَّ اِلَیَّ مَرۡجِعُکُمۡ فَاَحۡکُمُ بَیۡنَکُمۡ) قیامت کے روز ان مذہبی اختلافات کا عملی فیصلہ فرمانے کا تو وہ وعدہ بھی اپنے وقت پر ضرور پورا ہوگا، سو قیامت آئے گی اور یہ واقع ہوگا جیسا کہ آیت میں ارشاد ہے: ثم الی مرجعکم فاحکم بینکم. عملی کی قید کا یہ فائدہ ہے کہ دلیل شرعی سے تو فیصلہ یہاں ہی ہو گیا ہے، چنانچہ دنیا میں یہود کہتے تھے کہ عیسیٰ علیہ السلام مقتول و مصلوب ہو کر دفن ہو گئے اور پھر زندہ نہیں ہوئے، اور ان کے اس خیال کی حقیقت قرآن کریم نے سورۃ نساء کی آیت میں واضح کر دی ہے، اور اس آیت: ومکروا ومکر اللہ میں بھی اس کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے کہ حق تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دشمنوں کے کید اور تدبیر کو خود انہی کی طرف لوٹا دیا کہ جو یہودی عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کے لئے مکان کے اندر گئے تھے، اللہ تعالیٰ نے انہی میں سے ایک شخص کی شکل و صورت تبدیل کر کے بالکل عیسیٰ علیہ السلام کی صورت میں ڈھال دیا، اور عیسیٰ علیہ السلام کو زندہ آسمان پر اٹھا لیا، آیت کے الفاظ یہ ہیں: وما قتلوہ وما صلبوہ ولکن شبہ لھم نہ انہوں نے عیسیٰ کو قتل کیا نہ سولی چڑھایا لیکن تدبیر حق نے ان کو شبہ میں ڈال دیا (کہ اپنے ہی آدمی کو قتل کر کے خوش ہو لئے) اس کی مزید تفصیل سورۃ نساء میں آئے گی۔

نصاریٰ کا کہنا یہ تھا کہ عیسیٰ علیہ السلام مقتول و مصلوب تو ہو گئے مگر پھر دوبارہ زندہ کر کے آسمان پر اٹھا لئے گئے، مذکورہ آیت نے ان کے اس غلط خیال کی بھی تردید کر دی، اور بتلا دیا کہ جیسے یہودی اپنے ہی آدمی کو قتل کر کے خوشیاں منا رہے تھے اس سے یہ دھوکہ عیسائیوں کو بھی لگ گیا کہ قتل ہونے والے عیسیٰ علیہ السلام ہیں اس لئے شبہ لھم کے مصداق یہود کی طرح نصاریٰ بھی ہو گئے، ان دونوں گروہوں کے بالمقابل اسلام کا وہ عقیدہ ہے جو اس آیت اور دوسری کئی آیتوں میں وضاحت سے بیان ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو یہودیوں کے ہاتھ سے نجات دینے کے لئے آسمان پر زندہ اٹھا لیا نہ ان کو قتل کیا جا سکا نہ سولی پر چڑھایا جا سکا، وہ زندہ آسمان پر موجود ہیں اور قرب قیامت میں آسمان سے نازل ہو کر یہودیوں پر فتح پائیں گے اور آخر میں طبعی موت سے وفات پائیں گے۔ اسی عقیدہ پر تمام امت مسلمہ کا اجماع و اتفاق ہے، اس تقریر سے بعض ان لوگوں کی غلطی ظاہر ہو گئی جو بلا دلیل غلط دعویٰ کرتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام کی وفات ہو گئی اور وہ مدفون ہو گئے اور قیامت کے قریب تشریف نہ لائیں گے اور اس بنا پر جو احادیث عیسیٰ علیہ السلام کی تشریف آوری کے متعلق آئی ہیں ان میں تحریف کی کہ اس سے "مثیل عیسیٰ" مراد ہے اور پھر اس مثیل کا مصداق اپنے آپ کو قرار دیا۔

قرآن مجید کی متعدد آیات اور حدیث کی متواتر روایات سے یہ عقیدہ اور اس پر اجماع امت سے ثابت ہے، یہاں اس کی پوری تفصیل کا موقع بھی نہیں اور ضرورت نہیں، کیونکہ علماء امت نے اس مسئلہ کو مستقل کتابوں اور رسالوں میں پورا پورا واضح فرما دیا ہے، اور منکرین کے جوابات تفصیل سے دیئے ہیں، ان کا مطالعہ کافی ہے، اور حافظ ابن کثیرؒ نے سورۃ زخرف کی آیت: وانہ لعلم للساعۃ کی تفسیر میں لکھا ہے: "وقد تواترت الاحادیث عن رسول اللہ ﷺ انہ اخبر بنزول عیسیٰ علیہ السلام قبل یوم القیامۃ اماما عادلا" الخ، یعنی رسول اللہ ﷺ کی احادیث اس معاملے میں متواتر ہیں کہ آپ ﷺ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قبل قیامت نازل ہونے کی خبر دی ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زندہ آسمان پر اٹھائے جانے اور زندہ رہنے پھر قرب قیامت میں نازل ہونے کا عقیدہ قرآن کریم کی نصوص قطعیہ اور احادیث متواترہ سے ثابت ہے جن کو علماء امت نے مستقل کتابوں، رسالوں کی صورت میں شائع کر دیا ہے، مسئلہ کی مکمل تحقیق کے لئے تو انہی کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔

* * *

فائدہ: بادشاہ نے لوگوں کو مامور کیا کہ مسیح علیہ السلام کو پکڑیں، صلیب (سُولی) پر چڑھائیں اور ایسی عبرتناک سزائیں دیں جسے دیکھ کر دوسرے لوگ اس کا اتباع کرنے سے رُک جائیں، فبعث فی طلبہ من یاخذہ و یصلبہ و ینکل بہ (ابن کثیر)۔

خداوند قدوس نے اس کے جواب میں مسیح علیہ السلام کو مطمئن فرما دیا کہ میں ان اشقیاء کے ارادوں اور منصوبوں کو خاک میں ملا دوں گا، یہ چاہتے ہیں کہ تجھے پکڑ کر قتل کر دیں اور پیدائش و بعثت سے جو مقصد ہے پورا نہ ہونے دیں اور اس طرح خدا کی نعمت عظیم کی بے قدری کریں، لیکن میں ان سے اپنی یہ نعمت لے لوں گا، تیری عمر مقدر اور جو مقصد عظیم اس سے متعلق ہے پورا کر کے رہوں گا، اور تجھ کو پورے کا پورا صحیح و سالم لے جاؤں گا کہ ذرا بھی تیرا بال بیگا نہ کر سکیں، بجائے اس کے کہ وہ لے جائیں، خدا تجھ کو اپنی پناہ میں لے جائے گا، وہ صلیب پر چڑھانا چاہتے ہیں، خدا تجھ کو آسمان پر چڑھائے گا، ان کا ارادہ ہے کہ رسوا کن اور عبرتناک سزائیں دے کر لوگوں کو تیرے اتباع سے روک دیں، لیکن خدا ان کے ناپاک ہاتھ تیرے تک نہ پہنچنے دے گا، بلکہ اس گندے اور نجس مجمع کے درمیان سے تجھ کو بالکل پاک و صاف اٹھالے گا اور اس کے بجائے کہ تیری بے عزتی ہو اور لوگ ڈر کر تیرے اتباع سے رُک جائیں، تیرا اتباع کرنے والوں اور نام لینے والوں کو قرب قیامت تک منکروں پر غالب و قاہر رکھے گا، جب تک تیرا انکار کرنے والے یہود اور اقرار کرنے والے مسلمان یا نصاریٰ دنیا میں رہیں گے ہمیشہ اقرار کرنے والے منکرین پر فائق و غالب رہیں گے، بعدہٗ ایک وقت آئے گا جب تجھ کو اور تیرے موافق و مخالف سب لوگوں کو میرے حکم کی طرف لوٹنا ہے، اس وقت میں تمہارے سب جھگڑوں کا دوٹوک فیصلہ کر دوں گا اور سب اختلافات ختم کر دیئے جائیں گے، یہ فیصلہ کب ہوگا؟ اس کی جو تفصیل اگلی آیت میں فَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَاُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ سے بیان کی گئی ہے، وہ بتلاتی ہے کہ آخرت سے پیشتر دنیا ہی میں اس کا نمونہ کر دیا جائے گا، یعنی اس وقت تمام کافر عذاب شدید کے نیچے ہوں گے، کوئی طاقت ان کی مدد اور فریاد کو نہ پہنچ سکے گی، اس کے بالمقابل جو ایمان والے رہیں گے ان کو دنیا و آخرت میں پورا پورا اجر دیا جائے گا اور بے انصاف ظالموں کی جڑ کاٹ دی جائے گی۔

امت مرحومہ کا اجماعی عقیدہ ہے کہ جب یہود نے اپنی ناپاک تدبیریں پختہ کر لیں تو حق تعالیٰ نے حضرت مسیح علیہ السلام کو زندہ آسمان پر اٹھا لیا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی متواتر احادیث کے موافق قیامت کے قریب جب دنیا کفر و ضلالت اور دجل و شیطنت سے بھر جائے گی، خدا تعالیٰ خاتم الانبیاء بنی اسرائیل (حضرت مسیح علیہ السلام) کو خاتم الانبیاء علی الاطلاق حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک نہایت وفادار جرنل کی حیثیت میں نازل کر کے دنیا کو دکھلا دے گا کہ انبیائے سابقین کو بارگاہ خاتم النبیین کے ساتھ کس قسم کا تعلق ہے، حضرت مسیح علیہ السلام دجال کو قتل کریں گے اور اس کے بعد یہود کو چن چن کر ماریں گے، کوئی یہودی جان نہ بچا سکے گا، شجر و حجر تک پکاریں گے کہ ہمارے پیچھے یہ یہودی کھڑا ہے قتل کرو! حضرت مسیح صلیب کو توڑیں گے، نصاریٰ کے باطل عقائد و خیالات کی اصلاح کر کے تمام دنیا کو ایمان کے راستہ پر ڈال دیں گے، اس وقت تمام جھگڑوں کا فیصلہ ہو کر اور مذہبی اختلافات مٹ مٹا کر ایک خدا کا سچا دین (اسلام) رہ جائے گا، اسی وقت کی نسبت فرمایا: وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ (النساء:۱۵۹) جس کی پوری تقریر اور رفع مسیح کی کیفیت سورۃ نساء میں آئے گی، بہر حال میرے نزدیک ثم الی مرجعکم الخ صرف آخرت سے متعلق نہیں، بلکہ دنیا و آخرت دونوں سے تعلق رکھتا ہے، جیسا کہ آگے تفصیل کے موقع پر فی الدنیا و الاخرۃ کا لفظ صاف شہادت دے رہا ہے، اور یہ اس کا قرینہ ہے کہ الی یوم القیامۃ کے معنی قرب قیامت کے ہیں، چنانچہ احادیث صحیحہ میں مُصرح ہے کہ قیامت سے پہلے ایک مبارک وقت ضرور آنے والا ہے جب سب اختلافات مٹ مٹا کر ایک دین باقی رہ جائے گا، وللہ الحمد اولاً و آخراً۔

چند امور اس آیت کے متعلق یاد رکھنے چاہئیں: لفظ توفی کے متعلق کلیات ابوالبقاء میں ہے: "التوفی الاماتۃ و قبض الروح، و علیہ استعمال العامۃ، أو الاستیفاء واخذ الحق، و علیہ استعمال البلغاء" الخ (توفی کا لفظ عوام کے یہاں موت دینے اور جان لینے کے لئے استعمال ہوتا ہے، لیکن بلغاء کے نزدیک اس کے معنی ہیں: پورا وصول کرنا اور ٹھیک لینا) گویا ان کے نزدیک موت پر بھی توفی کا اطلاق اسی حیثیت سے ہوا کہ موت میں کوئی عضو خاص نہیں، بلکہ خدا کی طرف سے پوری جان وصول کر لی جاتی ہے، اب اگر فرض کرو خدا تعالیٰ نے کسی کی جان بدن سمیت لے لی تو اسے بطریق اولیٰ توفی کہا جائے گا، جن اہل لغت نے توفی کے معنی قبض روح کے لکھے ہیں، انہوں نے یہ نہیں کہا کہ قبض روح مع البدن کو توفی نہیں کہتے، نہ کوئی ایسا ضابطہ بتایا ہے کہ جب توفی کا فاعل اللہ اور مفعول ذی روح ہو تو بجز موت کے کوئی معنی نہ ہو سکیں، ہاں! چونکہ عموماً

قبض روح کا وقوع بدن سے جدا کر کے ہوتا ہے، اس لئے کثرت وعادت کے لحاظ سے اکثر موت کا لفظ اس کے ساتھ لکھ دیتے ہیں، ورنہ لفظ کا لغوی مدلول قبض روح مع البدن کو شامل ہے، دیکھئے: اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا (الزمر:۴۲) میں توفی نفس (قبض روح) کی دو صورتیں بتلائیں: ① موت اور ② نیند، اس تقسیم سے نیز توفی کو انفس پر وارد کر کے اور حین موتھا کی قید لگا کر بتلا دیا کہ توفی اور موت دو الگ الگ چیزیں ہیں۔

اصل یہ ہے کہ قبض روح کے مختلف مدارج ہیں: ① ایک درجہ وہ ہے جو موت کی صورت میں پایا جائے ② دوسرا وہ جو نیند کی صورت میں ہو، قرآن کریم نے بتلا دیا کہ وہ دونوں پر توفی کا لفظ اطلاق کرتا ہے، کچھ موت کی تخصیص نہیں يَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ (الانعام:۶۰) اب جس طرح اس نے دو آیتوں میں نوم پر توفی کا اطلاق جائز رکھا حالانکہ نوم میں قبض روح بھی پورا نہیں ہوتا، اسی طرح اگر آل عمران اور مائدہ کی دو آیتوں میں توفی کا لفظ قبض روح مع البدن پر اطلاق کر دیا گیا تو کونسا استحالہ لازم آتا ہے، بالخصوص جب یہ دیکھا جائے کہ موت اور نوم میں لفظ توفی کا استعمال قرآن کریم ہی نے شروع کیا ہے، جاہلیت والے تو عموماً اس حقیقت سے ہی ناآشنا تھے کہ موت یا نوم میں خدا تعالیٰ کوئی چیز آدمی سے وصول کر لیتا ہے اسی لئے لفظ توفی کا استعمال موت اور نوم پر ان کے یہاں شائع نہ تھا، قرآن کریم نے موت وغیرہ کی حقیقت پر روشنی ڈالنے کے لئے اول اس لفظ کا استعمال شروع کیا، تو اسی کو حق ہے کہ موت و نوم کی طرح اخذ روح مع البدن کے نادر مواقع میں بھی اسے استعمال کر لے۔

بہر حال آیت حاضرہ میں جمہور کے نزدیک توفی سے موت مراد نہیں، اور ابن عباسؓ سے بھی صحیح ترین روایت یہ ہی ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام زندہ آسمان پر اٹھائے گئے کما فی روح المعانی وغیرہ، زندہ اٹھائے جانے یا دوبارہ نازل ہونے کا انکار سلف میں کسی سے منقول نہیں، بلکہ "تلخیص الحبیر" میں حافظ ابن حجرؒ نے اس پر اجماع نقل کیا ہے اور ابن کثیرؒ وغیرہ نے احادیث نزول کو متواتر کہا ہے اور "اکمال اکمال المعلم" میں امام مالکؒ سے اس کی تصریح نقل کی ہے۔

پھر جو معجزات حضرت مسیح علیہ السلام نے دکھلائے ان میں علاوہ دوسری حکمتوں کے ایک خاص مناسبت آپ کے رفع الی السماء کے ساتھ پائی جاتی ہے، آپ نے شروع ہی سے متنبہ کر دیا کہ جب ایک مٹی کا پتلا میرے پھونک مارنے سے باذن اللہ پرندہ بن کر اوپر اُڑا چلا جاتا ہے، کیا وہ بشر جس پر خدا نے روح اللہ کا لفظ اطلاق کیا اور روح القدس کے نفحہ سے پیدا ہوا، یہ ممکن نہیں کہ خدا کے حکم سے اُڑ کر آسمان تک چلا جائے، جس کے ہاتھ لگانے یا دو لفظ کہنے پر حق تعالیٰ کے حکم سے اندھے اور کوڑھی اچھے اور مردے زندہ ہو جائیں، اگر وہ اس موطن کون و فساد سے الگ ہو کر ہزاروں برس فرشتوں کی طرح آسمان پر زندہ اور تندرست رہے، تو کیا استبعاد ہے، قال قتادہ فطار مع الملائکۃ فھو معھم حول العرش وصار انسیا ملکیا سماو یا ارضیا (بغوی) اس موضوع پر مستقل رسالے اور کتابیں شائع ہو چکی ہیں، مگر میں اہل علم کو توجہ دلاتا ہوں کہ ہمارے مخدوم علامہ فقید النظیر مولانا سید محمد انور شاہ کشمیری اطال اللہ بقاہ، نے رسالہ "عقیدۃ الاسلام" میں جو علمی لعل وجواہر ودیعت کئے ہیں، ان سے متمتع ہونے کی ہمت کریں، میری نظر میں ایسی جامع کتاب اس موضوع پر نہیں لکھی گئی۔

فَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَاُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ز وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۵۶﴾

سو وہ لوگ جو کافر ہوئے ان کو عذاب کروں گا سخت عذاب دنیا میں اور آخرت میں، اور کوئی نہیں ان کا مددگار

وَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ط وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۷﴾

اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور کام نیک کئے سو ان کو پورا دے گا ان کا حق، اور اللہ کو خوش نہیں آتے بے انصاف

خلاصہ تفسیر: اوپر آیت میں مذکور تھا کہ: "میں ان اختلاف کرنے والوں کے درمیان قیامت کے روز عملی فیصلہ کروں گا"، اس آیت میں اس فیصلہ کا بیان ہے) تفصیل (فیصلہ کی) یہ ہے کہ جو لوگ (ان اختلاف کرنے والوں میں) کافر تھے سو ان کو (ان کے کفر پر) سخت سزا

دوں گا (دونوں جہان میں) دنیا میں بھی (کہ وہ تو ہو چکی) اور آخرت میں بھی (کہ وہ باقی رہی) اور ان لوگوں کا کوئی حامی (طرف دار) نہ ہوگا۔

اور جو لوگ مومن تھے، اور انہوں نے نیک کام کئے تھے، سو ان کو اللہ تعالیٰ ان کے (ایمان اور نیک کاموں کا) ثواب دیں گے اور (کافر کو سزا ملنے کی وجہ یہ ہے کہ) اللہ تعالیٰ محبت نہیں رکھتے (ایسے) ظلم کرنے والوں سے (جو اللہ تعالیٰ یا پیغمبروں کے منکر ہوں، یعنی چونکہ یہ ظلم عظیم ہے، معافی کے قابل نہیں، اس لئے شدید مبغوض ہو کر سزایاب ہو جاتا ہے)۔

فَاُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ: اس آیت کے مضمون پر ایک خفیف سا اشکال ہوتا ہے، کہ قیامت کے فیصلہ کے بیان میں اس کہنے کے کیا معنی کہ ''میں دنیا وآخرت میں سزا دوں گا''، کیونکہ اس وقت تو سزائے دنیوی نہیں ہوگی؟ حل اس کا یہ ہے کہ اس کہنے کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی حاکم کسی مجرم کو یہ کہے کہ اس وقت تو ایک سال کی قید کرتا ہوں، اگر جیل خانہ میں کوئی شرارت کی تو دو سال کی سزا کروں گا، فقط اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ دو سال آج کی تاریخ سے ہوں گے، پس اس بنا پر یقینی ہے کہ شرارت کے بعد دو سال کا حکم ہو جائے گا، حاصل یہ ہوتا ہے کہ شرارت پر اس مجموعہ کی تکمیل بطور انضمام ایک سال زائد کے مرتب ہو جائے گی۔

اسی طرح یہاں سمجھنا چاہئے کہ دنیا میں تو سزا ہو چکی، اس کے ساتھ سزائے آخرت منضم ہو کر مجموعہ قیامت کے روز تکمیل کر دیا جائے گا، یعنی سزائے دنیا کفارہ نہ ہوگا سزائے آخرت کے لئے، بخلاف اہل ایمان کے کہ اگر ان پر دنیا میں کوئی مصیبت وغیرہ آتی ہے تو گناہ معاف ہوتے ہیں اور عاقبت کی عقوبت خفیف یا دفع ہو جاتی ہے، اور اسی وجہ سے اس کی طرف لا یحب الظالمین میں اشارہ فرمایا گیا، یعنی اہل ایمان بسبب ایمان کے محبوب ہیں، محبوب کے ساتھ ایسے معاملات ہوا کرتے ہیں اور اہل کفر بسبب کفر کے مبغوض ہیں، مبغوض کے ساتھ ایسا معاملہ نہیں ہوتا۔

ذٰلِكَ نَتْلُوْهُ عَلَيْكَ مِنَ الْاٰيٰتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيْمِ ﴿٥٨﴾

یہ پڑھ سناتے ہیں ہم تجھ کو آیتیں اور بیان تحقیقی

خلاصہ تفسیر: (اوپر قصہ مکمل ہو گیا، اب اس قصہ کا خارق عادت ہونے کی وجہ سے نبوت محمدیہ کے لیے دلیل ہونا بیان فرماتے ہیں:) یہ (مذکورہ قصہ) ہم تم کو (بذریعہ وحی کے) پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں جو کہ (آپ کے) من جملہ دلائل (نبوت) کے ہے اور من جملہ حکمت آمیز مضامین کے ہے۔

یعنی فی نفسہ بھی علم وحکمت کی باتوں پر مشتمل ہے، کیونکہ قدرت الٰہیہ اور دیگر علوم پر دلیل ہے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعتبار سے بھی دلیل ہے صدق نبوت پر، کیونکہ آپ کو یہ قصہ ماضی کے دیگر قصوں کی طرح اور کسی ذریعہ سے دریافت نہیں ہوا، پس ایسی حالت میں خبر دینا خارق عادت ہے جو کہ دلائل نبوت کے ثبوت میں سے ہے۔

اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿٥٩﴾

بے شک عیسیٰ کی مثال اللہ کے نزدیک جیسے مثال آدم کی، بنایا اس کو مٹی سے پھر کہا اس کو کہ ہو جا وہ ہو گیا

خلاصہ تفسیر: (نصاریٰ کے شبہات میں سے ایک شبہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بغیر باپ کے پیدا ہونا تھا، جس سے ان کو آپ کی الوہیت یا ابن اللہ ہونے کا شبہ ہو گیا، سو اب اس استدلال کا کافی نہ ہونا بتلاتے ہیں:) بیشک حالت عجیبہ حضرت عیسیٰ کی اللہ تعالیٰ کے نزدیک (یعنی ان کی تجویز ازلی میں) مشابہ حالت عجیبہ حضرت آدم کے ہے کہ ان (آدم علیہ السلام) کو (یعنی ان کے قالب کو) مٹی سے بنایا، پھر ان (کے قالب) کو حکم دیا کہ (جاندار) ہو جا، پس وہ (جاندار) ہو گئے۔

اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ: ''تجویز ازلی'' کا مطلب یہ ہے کہ پیدا کرنے سے قبل علم الٰہی میں یوں ہی مقدر تھا کہ ان

حضرات کی پیدائش اس خاص کیفیت سے ہوگی، حاصل تقریر کا یہ ہوا کہ عیسی علیہ السلام کا بغیر باپ کے پیدا ہونا قدرت خداوندی سے کوئی بعید نہیں، چنانچہ ان سے پہلے آدم علیہ السلام بغیر باپ اور بغیر ماں کے محض مٹی ہی سے پیدا ہوئے، پس عیسی علیہ السلام کا صرف ماں کے خون سے بننا اتنا عجیب نہیں جتنا آدم علیہ السلام کا مٹی سے بننا عجیب تر ہے، پھر آدم علیہ السلام کو خدا یا خدا کا بیٹا کوئی نہیں مانتا تو عیسی علیہ السلام پر محض بغیر باپ کے پیدا ہونے سے یہ شبہ کیونکر ہو سکتا ہے۔

***

فائدہ: نصاریٰ اس بات پر حضرت سے بہت جھگڑے کہ عیسیٰ بندہ نہیں، اللہ کا بیٹا ہے، آخر کہنے لگے کہ وہ اللہ کا بیٹا نہیں تو تم بتاؤ کس کا بیٹا ہے؟ اس کے جواب میں یہ آیت اتری کہ آدم کے تو نہ باپ تھا نہ ماں، عیسیٰ کے باپ نہ ہو تو کیا عجب ہے (موضح القرآن) اس حساب سے تو آدم کو خدا کا بیٹا ثابت کرنے پر زیادہ زور دینا چاہیے، حالانکہ کوئی بھی اس کا قائل نہیں۔

اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿٦٠﴾

حق وہ ہے جو تیرا رب کہے پھر تو مت رہ شک لانے والوں سے

خلاصہ تفسیر: (اب مذکورہ مضمون کے حق ہونے کی مزید تاکید فرماتے ہیں:) یہ امر واقعی (جو اوپر مذکور ہوا) آپ کے پروردگار کی طرف سے (بتلایا گیا) ہے سو آپ شبہ کرنے والوں میں سے نہ ہو جایئے۔

فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ: اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ نعوذ باللہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم میں شک وشبہ کرنے کا احتمال تھا، بات یہ ہے کہ کسی مضمون کی تاکید کبھی تو اس لیے کیا کرتے ہیں کہ مخاطب کی جانب میں کوتاہی کرنے کا احتمال ہے، اور کبھی مضمون کی تاکید محض اس لیے کرتے ہیں کہ اس مضمون کا مہتم بالشان ہونا ظاہر ہو جائے، جیسے کوئی بادشاہ سفر کا ارادہ کرے تو اپنے وفادار وزیر سے کہتا ہے کہ دیکھو سب کام اسی طرح ہوتے رہیں گے ان میں کوتاہی نہ کرنا، تو اس کلام سے مقصود ان کاموں کے مہتم بالشان ہونے کو جتلانا ہے، اور یہ بادشاہ بھی جانتا ہے کہ وزیر سے اگر نہ بھی کہا جائے تب بھی وہ ایسا ہی کرے گا، اس میں کوتاہی کرنے کا احتمال بھی نہیں، اسی طرح یہاں سمجھو کہ حق تعالیٰ نے یہ تاکید محض اس لیے فرمائی کہ یہ مضمون خود اہتمام کے قابل ہے، یہ وجہ نہیں کہ معاذ اللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں کوتاہی کا احتمال ہے۔

***

فائدہ: یعنی مسیح علیہ السلام کے متعلق جو کچھ حق تعالیٰ نے فرمایا وہ ہی حق ہے، جس میں شک وشبہ کی قطعاً گنجائش نہیں، جو بات تھی بلا کم و کاست سمجھا دی گئی۔

فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ

پھر جو کوئی جھگڑا کرے تجھ سے اس قصہ میں بعد اس کے کہ آچکی تیرے پاس خبر سچی تو تو کہدے آؤ بلاویں ہم اپنے بیٹے اور تمہارے بیٹے

وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ ۣ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ ﴿٦١﴾

اور اپنی عورتیں اور تمہاری عورتیں اور اپنی جان اور تمہاری جان، پھر التجاء کریں ہم سب اور لعنت کریں اللہ کی ان پر کہ جو جھوٹے ہیں

خلاصہ تفسیر: اوپر کی تقریر تو طالبان حق کو سمجھانے کیلئے تھی، اب ہٹ دھرمی کرنے والوں کو خاموش کرانے کا طریقہ بتلاتے ہیں:

پس جو آپ سے عیسیٰ کے باب میں (اب بھی) حجت کرے آپ کے پاس علم (واقعی) آئے پیچھے (آنے کے بعد) تو آپ (جواب میں یوں) فرما دیجیے کہ (اچھا! اگر دلیل سے نہیں مانتے تو پھر) آ جاؤ ہم (اور تم) بلا (کر جمع کر) لیں اپنے بیٹوں کو اور تمہارے بیٹوں کو اور اپنی عورتوں کو اور تمہاری عورتوں کو اور خود اپنے تنوں کو اور تمہارے تنوں کو، پھر ہم (سب ملکر) خوب دل سے دعا کریں اس طور پر کہ اللہ کی لعنت بھیجیں ان پر جو (اس بحث

میں) ناحق پر ہوں۔

ثُمَّ نَبۡتَهِلۡ فَنَجۡعَلۡ لَّعۡنَتَ اللّٰهِ: خلاصہ یہ کہ اس طرح بددعا کریں کہ جھوٹے پر خدا کا قہر نازل ہو، اس طرح پر بددعا کرنے کو "مباہلہ" کہتے ہیں، اس سے مقصود زبانی گفتگو کا ختم کرنا ہوتا ہے، اور اکثر اس کا اثر جلدی ظاہر ہو جاتا ہے، جس سے جھوٹے اور سچے کی تعیین سب کے نزدیک واضح ہو جاتی ہے کہ جس پر قہر کا اثر ہو وہی جھوٹا ہے، اور اگر کبھی اثر ظاہر نہ ہو یا ظاہر ہونے میں دیر ہو تو شبہ نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ حق و باطل کا اصلی مدار شرعی دلائل ہیں جو کہ مباہلہ پر موقوف نہیں، مباہلہ کی غرض صرف بحث ومباحثہ کو ختم کرنا ہے۔

یہ آیت اس وقت نازل ہوئی تھی جب حضور ﷺ نے نجران کے نصاری کو دعوت اسلام کا فرمان لکھا تھا، خلاصہ اس کا یہ تھا کہ یا اسلام قبول کرو، یا جزیہ دو، یا جہاد کے لیے تیار رہو، انہوں نے مشورہ کر کے چند آدمیوں کو حضور ﷺ کی خدمت میں بھیجا، ان لوگوں سے آپ کی مذہبی گفتگو ہوئی، یہاں تک کہ عیسی علیہ السلام کے مقدمہ میں کلام کی نوبت آئی، اس وقت یہ آیت مباہلہ نازل ہوئی، آپ نے ان کو اس مضمون کی اطلاع دی اور خود حضرت فاطمہؓ وحضرت علیؓ وامام حسنؓ وامام حسینؓ کے ساتھ تشریف لا کر مباہلہ کے لیے مستعد ہوئے، ان میں ایک شخص شرحبیل تھا، اس نے یہ دیکھ کر اپنے ساتھیوں سے کہا تم کو ان کا نبی ہونا معلوم ہے، نبی سے مباہلہ کر کے فلاح نہیں ہوسکتی، ہم سب بلاشبہ ہلاک ہو جائیں گے، میری رائے یہ ہے کہ ان سے صلح کرلو، چنانچہ حضور سے عرض کیا، آپ نے ان پر جزیہ مقرر فرما دیا جس کو انہوں نے منظور کیا، حدیث میں آیا ہے کہ اگر وہ لوگ مباہلہ کر لیتے تو ان کے مال واولاد سب ہلاک ہو جاتے، اور ایک روایت میں ہے کہ جل جاتے، درالمختار وغیرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مباہلہ اب بھی بوقت حاجت جائز ہے، بشرطیکہ قطعی مسائل میں ہو، ظنی اختلافی مسائل میں جائز نہیں۔

* * *

فائدہ: اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا کہ نصاریٰ نجران اس قدر سمجھانے پر بھی اگر قائل نہ ہوں تو انکے ساتھ "مباہلہ" کرو جس کی زیادہ موثر اور مکمل صورت یہ تجویز کی گئی کہ دونوں فریق اپنی جان سے اور اولاد سے حاضر ہوں اور خوب گڑگڑا کر دعا کریں کہ جو کوئی ہم میں جھوٹا ہے، اس پر خدا کی لعنت اور عذاب پڑے، یہ "مباہلہ" کی صورت پہلے ہی قدم پر اس بات کا اظہار کر دے گی کہ کون فریق کس حد تک خود اپنے دل میں اپنی صداقت وحقانیت پر وثوق ویقین رکھتا ہے؟۔

چنانچہ دعوت مباہلہ سُن کر وفد نجران نے مہلت لی کہ ہم آپس میں مشورہ کر کے جواب دیں گے، آخر مجلس مشاورت میں ان کے ہوشمند تجربہ کار ذمہ داروں نے کہا کہ "اے گروہ نصاریٰ! تم یقیناً دلوں میں سمجھ چکے ہو کہ محمد ﷺ نبی مُرسل ہیں اور حضرت مسیح کے متعلق انہوں نے صاف صاف فیصلہ کُن باتیں کہی ہیں، تم کو معلوم ہے کہ اللہ نے بنی اسماعیل میں نبی بھیجنے کا وعدہ کیا تھا، کچھ بعید نہیں یہ وہی نبی ہوں، پس ایک نبی سے مباہلہ وملاعنہ کرنے کا نتیجہ کسی قوم کے حق میں یہی نکل سکتا ہے کہ ان کا کوئی چھوٹا بڑا ہلاکت یا عذاب الٰہی سے نہ بچے، اور پیغمبر کی لعنت کا اثر نسلوں تک پہنچ کر رہے، بہتر یہی ہے کہ ہم ان سے صلح کر کے اپنی بستیوں کی طرف روانہ ہو جائیں، کیونکہ سارے عرب سے لڑائی مول لینے کی طاقت ہم میں نہیں"، یہ ہی تجویز پاس کر کے حضور ﷺ کی خدمت میں پہنچے، آپ ﷺ حضرت حسن، حسین، فاطمہ، علی رضی اللہ عنہم کو ساتھ لئے باہر تشریف لا رہے تھے، یہ نورانی صورتیں دیکھ کر ان کے لاٹ پادری نے کہا کہ: "میں ایسے پاک چہرے دیکھ رہا ہوں جن کی دعا پہاڑوں کو ان کی جگہ سے سرکا سکتی ہے، ان سے مباہلہ کر کے ہلاک نہ ہو، ورنہ ایک نصرانی زمین پر باقی نہ رہے گا"، آخر انہوں نے مقابلہ چھوڑ کر سالانہ جزیہ دینا قبول کیا اور صلح کر کے واپس چلے گئے۔

حدیث میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اگر مباہلہ کرتے تو وادی آگ بن کر ان پر برستی اور خدا تعالیٰ نجران کا بالکل استیصال کر دیتا، ایک سال کے اندر اندر تمام نصاریٰ ہلاک ہو جاتے۔

تنبیہ: قرآن نے یہ نہیں بتلایا کہ مباہلہ کی صورت میں نبی کریم ﷺ کے بعد بھی اختیار کی جاسکتی ہے اور یہ کہ مباہلہ کا اثر کیا ہمیشہ وہ ہی ظاہر ہونا چاہیے جو آپ ﷺ کے مباہلہ میں ظاہر ہونے والا تھا؟ بعض سلف کے طریق عمل اور بعض فقہائے حنفیہ کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ مباہلہ کی مشروعیت اب بھی باقی ہے، مگر ان چیزوں میں جن کا ثبوت بالکل قطعی ہو، یہ ضروری نہیں کہ مباہلہ میں بچوں، عورتوں کو بھی شریک کیا جائے، نہ

مباہلین پر اس قسم کا عذاب آنا ضروری ہے جو پیغمبر ﷺ کے مباہلہ پر آتا، بلکہ ایک طرح کا اتمام حجت کر کے بحث وجدال سے الگ ہو جانا ہے۔

اور میرے خیال میں مباہلہ ہر ایک کاذب کے ساتھ نہیں صرف کاذب معاند کے ساتھ ہونا چاہیے، ابن کثیرؒ کہتے ہیں: ”ثم قال تعالیٰ أمراً رسوله ﷺ أن يباهل من عاند الحق فی أمر عیسیٰ بعد ظهور البیان“، والله اعلم۔

اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ ۚ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۶۲

بے شک یہی ہے بیان سچا اور کسی کی بندگی نہیں ہے سوا اللہ کے ۱؎ اور اللہ جو ہے وہی ہے زبردست حکمت والا ۲؎

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِالْمُفْسِدِيْنَ ۝۶۳ ع

پھر اگر قبول نہ کریں تو اللہ کو معلوم ہیں فساد کرنے والے ۳؎

خلاصہ تفسیر: پیچھے عیسیٰ علیہ السلام کا بغیر باپ کے ہونے سے ان کی الوہیت پر استدلال کا باطل ہونا ذکر ہوا، اب اہتمام کے لیے اس مضمون کا حق ہونا اور نتیجہ کے طور پر حق تعالیٰ کا واحد ہونا بیان فرماتے ہیں۔

بیشک یہ (جو کچھ) مذکور (ہوا) وہی ہے سچی بات، اور کوئی معبود ہونے کے لائق نہیں، بجز اللہ تعالیٰ کے (یہ توحید ذاتی ہوئی) اور بلاشک اللہ تعالیٰ ہی غلبہ والے حکمت والے ہیں (یہ توحید صفاتی ہوئی)۔

(اب فساد اور عناد کرنے والوں سے جو کہ اتنی حجتوں کے بعد بھی نہ مانیں گفتگو کرنے سے باز رکھتے ہیں اور ان کا معاملہ اپنے حوالہ ہونا بتلاتے ہیں:) پھر (ان سب حجتوں کے بعد بھی) اگر (حق قبول کرنے سے سرتابی کریں) تو (آپ ان کا معاملہ اللہ کے حوالہ کیجیے، کیونکہ) بیشک اللہ تعالیٰ خوب جاننے والے ہیں فساد کرنے والوں کو۔

* * *

فائدہ: ۱؎ دعوت مباہلہ کے ساتھ بتلادیا کہ مباہلہ اس پر کیا جاتا تھا کہ جو کچھ حضرت مسیح علیہ السلام کے متعلق قرآن میں بیان ہوا، وہ ہی سچا بیان ہے اور خدا کی بارگاہ ہر قسم کے شرک اور باپ بیٹے وغیرہ کے تعلقات سے پاک ہے۔

فائدہ: ۲؎ اپنی زبردست قدرت وحکمت سے جھوٹے اور سچے کے ساتھ وہ ہی معاملہ کرے گا جو اس کے حسب حال ہو۔

فائدہ: ۳؎ اگر نہ دلائل سے مانیں، نہ مباہلہ پر آمادہ ہوں تو سمجھ لو کہ احقاق حق مقصود نہیں، نہ دل میں اپنے عقائد کی صداقت پر وثوق ہے، محض فتنہ وفساد پھیلانا ہی پیش نظر ہے تو خوب سمجھ لیں کہ سب مفسدین اللہ کی نظر میں ہیں۔

قُلْ يٰٓاَھْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَاۗءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ

تو کہہ اے اہل کتاب آؤ ایک بات کی طرف جو برابر ہے ہم میں اور تم میں کہ بندگی نہ کریں ہم مگر اللہ کی اور شریک نہ ٹھہراویں اس کا

شَيْـــًٔـا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ۝۶۴

کسی کو اور نہ بناوے کوئی کسی کو رب سوا اللہ کے ۱؎ پھر اگر وہ قبول نہ کریں تو کہہ دو گواہ رہو کہ ہم تو حکم کے تابع ہیں ۲؎

خلاصہ تفسیر: پیچھے اہل کتاب سے گفتگو تھی جس کو خوبی کے ساتھ ختم کر دیا گیا، اب ملاطفت اور نرمی کے ساتھ پھر ان کو حق کی طرف بلاتے ہیں، پیچھے زیادہ روئے سخن نصاریٰ سے تھا، اب عام الفاظ میں یہود ونصاریٰ دونوں کو شامل کرتے ہیں۔

(اے محمد ﷺ!) آپ فرما دیجیے کہ اے اہل کتاب! آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو کہ ہمارے اور تمہارے درمیان (مسلم ہونے میں)

برابر ہے (وہ) یہ (ہے) کہ بجز اللہ تعالیٰ کے ہم کسی اور کی عبادت نہ کریں، اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں، اور ہم میں سے کوئی کسی دوسرے کو رب قرار نہ دے اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر، پھر اگر (اس کے بعد بھی) وہ لوگ (حق سے) اعراض کریں تو تم (مسلمان) لوگ کہہ دو کہ تم (ہمارے اس (اقرار) کے گواہ رہو کہ ہم تو (اس بات کے) ماننے والے ہیں (اگر تم نہ مانو تو تم جانو)۔

تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ: اس مضمون کو مسلَّم اس لیے کہا گیا کہ تمام شریعتوں میں اس کی تعلیم ہوئی ہے، اور اجمالا قاعدہ کلیہ کے طور پر اہل کتاب بھی اس کو مانتے تھے کہ توحید فرض ہے اور شرک کفر ہے اور کسی مخلوق کو رب قرار دینا شرک ہے، لیکن اس کے باوجود خدا کی بعض صفات میں جیسے کہ الوہیت ہے عیسیٰ علیہ السلام یا عزیر علیہ السلام کو شریک کرتے تھے، اسی طرح راہبوں اور پیشواوں کی مطلق اطاعت کرتے تھے کہ وہ جس چیز کو حلال کہہ دیں اس کو حلال اور جس کو حرام کہہ دیں اس کو حرام جانتے تھے، چاہے وہ کھلم کھلا حکم خداوندی کے خلاف ہی کیوں نہ ہو، حالانکہ مطلق اطاعت خدا تعالیٰ کے لیے خاص ہے، وہ لوگ اس کو شرک نہ سمجھتے تھے، حالانکہ شرک کی حقیقت یہی ہے کہ خدا تعالیٰ کی خاص صفات کو مخلوق کے لیے ثابت کیا جائے اور اس کے ساتھ وہ برتاؤ کیا جائے جو خدا کے ساتھ کرنا چاہیے تھا، اسی لیے فرمایا کہ خدا کو چھوڑ کر اپنے مذہبی پیشواوں اور راہبوں کو رب قرار نہ دو، کیونکہ احبار و رہبان کی ایسی اطاعت میں خدا تعالیٰ کے احکام متروک ہوئے جاتے تھے، حلال و حرام کر دینا ان کے قبضہ میں ہو گیا تھا، پس اس تقریر میں لطف یہ ہوا کہ ان کو قواعد کلیہ مسلمہ یاد دلا دیے، اس کے بعد ان باتوں کا اس میں داخل کرنا آسان کام رہ گیا جس میں وہ مبتلا تھے اور ان کو شرک نہ سمجھتے تھے۔

وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ: مذکورہ تقریر سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اماموں کی جو تقلید اہل اسلام میں معروف ہے وہ اس آیت کے مضمون میں داخل نہیں، کیونکہ وہ تقلید صریح قطعی مسائل میں نہیں ہوتی، بلکہ ظنی مسائل میں ہوتی ہے، وہ بھی اس شرط سے کہ کسی قطعی نص یا حدیث یا اجماع کی مخالفت نہ ہو جائے، اہل کتاب تو اپنے پیشواوں کی ایسی تقلید کرتے تھے کہ اگر وہ صریح حکم خداوندی میں بھی تصرف کرنا چاہیں تو ان کو کوئی نہ روکتا تھا، تو ایسی تقلید کو منع کیا گیا ہے کہ یہ شرک ہے، حاصل یہ کہ اس آیت سے ایسی تقلید باطل ہوتی ہے جیسی اہل کتاب کرتے تھے جس کا آیت میں بیان ہوا، ائمہ مجتہدین کی تقلید کو اس آیت سے کوئی تعلق نہیں اور نہ وہ اس آیت کے مضمون میں داخل ہیں، معاذ اللہ! کسی مسلمان کا یہ عقیدہ نہیں کہ نصوص شریعت سے قطع نظر کر کے ائمہ مجتہدین کو یہ اختیار ہے کہ جس چیز کو چاہیں حلال یا حرام کر دیں اور نہ معاذ اللہ کسی امام نے خدا کی حلال کردہ چیز کو حرام قرار دیا اور نہ خدا کی حرام کردہ چیز کو حلال بنایا، بلکہ ائمہ مجتہدین تو قانون شریعت کے بہترین شارح اور مفسر ہیں اور چونکہ امت میں ائمہ مجتہدین کا علم اور فہم اور ورع و تقویٰ مسلم ہے، اس لیے ان کے سمجھے ہوئے کے مطابق شریعت کا اتباع کرتے ہیں اور اپنے ناقص اور ناتمام علم اور کم عقلی اور کم فہمی اور صلاح و تقویٰ سے دوری کی وجہ سے اپنے سمجھے ہوئے پر اعتماد کو روا نہیں سمجھتے: " رای العلیل علیل "، نبی کریم اور صدیقین شہداء اور صالحین کے سمجھے ہوئے کے مطابق شریعت پر عمل کرنا ہی صراط مستقیم ہے۔

فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا: اس آیت میں جو یہ کہا گیا کہ "تم گواہ رہو"، اس سے تعلیم دی گئی ہے کہ جب دلائل واضح ہونے کے بعد بھی کوئی حق کو نہ مانے تو اتمام حجت کے لئے اپنا مسلک ظاہر کر کے کلام ختم کر دینا چاہئے، مزید بحث و تکرار کرنا مناسب نہیں ہے۔

* * *

فائدہ: ا۔ پہلے نقل کیا جا چکا ہے کہ حضور ﷺ نے جب وفد نجران کو کہا "اَسلموا" (مسلم بن جاؤ) تو کہنے لگے "اَسْلَمْنَا" (ہم مسلم ہیں) اس سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کی طرح ان کو بھی مسلم ہونے کا دعویٰ تھا، اسی طرح جب یہود و نصاریٰ کے سامنے توحید پیش کی جاتی تو کہتے کہ ہم بھی خدا کو ایک کہتے ہیں، بلکہ ہر مذہب والا کسی نہ کسی رنگ میں اوپر جا کر اقرار کرتا ہے کہ بڑا خدا ایک ہی ہے، یہاں اسی طرف توجہ دلائی گئی کہ بنیادی عقیدہ (خدا کا ایک ہونا اور اپنے کو مسلم ماننا) جس پر ہم دونوں متفق ہیں، ایسی چیز ہے جو ہم سب کو ایک کر سکتا ہے، بشرطیکہ آگے چل کر اپنے تصرف اور تحریف سے اس کی حقیقت بدل نہ ڈالیں، ضرورت اس کی ہے کہ جس طرح زبان سے مسلم و موحد کہتے ہو، حقیقۃً و عملاً بھی اپنے کو تنہا خدائے وحدہ لاشریک لہ، کے

سپرد کردو، نہ اس کے سوا کسی کی بندگی کرو، نہ اس کی صفات خاصہ میں کسی کو شریک ٹھہراؤ، نہ کسی اور عالم، فقیر، پیر، پیغمبر کے ساتھ وہ معاملہ کرو جو صرف رب قدیر کے ساتھ کیا جانا چاہیے، مثلاً کسی کو اس کا بیٹا پوتا بنانا، یا نصوص شریعت سے قطع نظر کر کے محض کسی کے حلال وحرام کر دینے پر اشیاء کی حلت وحرمت کا مدار رکھنا جیسا کہ: اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَھُمْ وَرُھْبَانَھُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ (التوبہ: ۳۱) کی تفسیر سے ظاہر ہوتا ہے، یہ سب امور دعوائے اسلام وتوحید کے منافی ہیں۔

فائدہ: ۲ یعنی تم دعوائے اسلام وتوحید کر کے پھر گئے، ہم بحمد اللہ اس پر قائم ہیں کہ اپنے کو محض خدائے واحد کے سپرد کر دیا ہے اور اسی کے تابع فرمان ہیں۔

يٰٓاَھْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تُحَاۗجُّوْنَ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمَآ اُنْزِلَتِ التَّوْرٰىةُ وَالْاِنْجِيْلُ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِهٖ ۭ

اے اہل کتاب کیوں جھگڑتے ہو ابراہیم کی بابت اور توراۃ اور انجیل تو اتریں اس کے بعد

اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ ھٰٓاَنْتُمْ ھٰٓؤُلَاۗءِ حَاجَجْتُمْ فِيْمَا لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ فَلِمَ تُحَاۗجُّوْنَ فِيْمَا

کیا تم کو عقل نہیں، سنتے ہو تم لوگ جھگڑ چکے جس بات میں تم کو کچھ خبر تھی اب کیوں جھگڑتے ہو جس بات میں

لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝

تم کو کچھ خبر نہیں، اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے

خلاصہ تفسیر: پیچھے نصاریٰ کے ان شبہات کا رد تھا جو عیسیٰ علیہ السلام کے بارہ میں ان کو پیش آ رہے تھے، اب آگے اس گفتگو کا رد ہے جو ابراہیم علیہ السلام کے بارہ میں انہوں نے حضور کے سامنے کی تھی، قصہ یہ ہوا کہ ایک بار نصاریٰ نجران اور کچھ علمائے یہود حضور کے پاس جمع تھے اور ہر فریق ابراہیم علیہ السلام کو اپنے طریقہ پر بتلانے لگا، جس سے ان کا مقصود اپنے طریقہ کی حقانیت ومشروعیت ثابت کرنا تھا اور اس سے ان کے زعم میں رسالت محمدیہ پر بھی قدح لازم آتا تھا، کیونکہ آپ ﷺ کی شریعت دوسرے طریقوں کو منسوخ بتلا رہی ہے، اور ناسخ ومنسوخ مشروعیت میں جمع نہیں ہو سکتے، اس لیے حق تعالیٰ ان کی تردید فرماتے ہیں، پیچھے گفتگو میں مسئلہ توحید کو ثابت کیا اور یہاں گفتگو میں مسئلہ رسالت محمدیہ کو ثابت کیا جاتا ہے۔

اے اہل کتاب! کیوں حجت کرتے ہو حضرت ابراہیم کے بارے میں (کہ وہ یہودی طریقہ پر تھے یا نصرانی طریقہ پر) حالانکہ نہیں نازل کی گئی توراۃ اور انجیل، مگر ان کے (زمانہ کے بہت) بعد (اور یہ دونوں طریقے ان دونوں کتابوں کے نازل ہونے کے بعد ظاہر ہوئے، پہلے سے ان کا وجود ہی نہ تھا، پھر ابراہیم علیہ السلام ان طریقوں پر کیسے ہو سکتے ہیں) کیا (ایسی خلاف عقل بات منہ سے نکالتے ہو اور) پھر سمجھتے نہیں ہو۔

ہاں! تم ایسے ہو کہ ایسی بات میں حجت کر ہی چکے تھے جس سے تم کو کسی قدر تو واقفیت تھی (اگرچہ اس میں ایک غلط مقدمہ لگا کر نتیجہ غلط نکالتے تھے، مراد اس سے عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات ہیں جو کہ ان کے نزدیک بھی واقع کے مطابق ہیں، البتہ اس میں یہ مقدمہ غلط ملا لیا گیا کہ ایسے معجزات والا خدا یا خدا کا بیٹا ہوگا، چونکہ اس میں ایک مقدمہ تو اشتباہ کا سبب تھا، اس لئے اس کو نا کافی واقفیت کہیں گے، جب اس میں تمہاری غلطی ظاہر ہو گئی) سو ایسی بات میں (پھر) کیوں حجت کرتے ہو جس سے تم کو اصلا واقفیت نہیں (کیونکہ اس دعوی کے لئے تو اشتباہ کا کوئی سبب بھی تمہارے پاس نہیں، کیونکہ ان کے اور ابراہیم علیہ السلام کے فروع شریعت میں موافقت بھی نہ تھی) اور اللہ تعالیٰ (ابراہیم علیہ السلام کے طریق کو خوب) جانتے ہیں تم نہیں جانتے۔

* * *

فائدہ: جیسے دعوائے اسلام وتوحید سب میں مشترک تھا اسی طرح حضرت ابراہیم خلیل اللہ کی تعظیم وتکریم میں بھی سب شریک تھے اور یہود

نصاریٰ میں سے ہر ایک فرقہ دعویٰ کرتا تھا کہ ابراہیم علیہ السلام ہمارے دین پر تھے، یعنی معاذ اللہ یہودی تھے یا نصرانی، اسکا جواب دیا کہ تورات وانجیل جن کے پیرو یہودی یا نصرانی کہلائے، ابراہیم علیہ السلام سے سینکڑوں برس بعد اتری، پھر ابراہیم علیہ السلام کو نصرانی یا یہودی کیسے کہہ سکتے ہیں؟ بلکہ جس طرح کے تم یہودی یا نصرانی ہو، اس معنی سے تو خود موسیٰ یا عیسیٰ علیہما السلام کو بھی یہودی یا نصرانی نہیں کہا جاسکتا، اور اگر یہ مطلب ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شریعت ہمارے مذہب سے زیادہ قریب تھی تو یہ بھی غلط ہے، اس کا علم تم کو کہاں سے ہوا؟ تمہاری کتابوں میں مذکور نہیں، نہ خدا نے خبر دی، نہ تم کوئی ثبوت پیش کر سکتے ہو، پھر ایسی بات میں جھگڑنا جس کا کچھ علم آدمی کو نہ ہو حماقت نہیں تو اور کیا ہے، جن چیزوں کی تمہیں کچھ تھوڑی، بہت خبر تھی، گو محض ناتمام اور سرسری تھی، مثلاً مسیح علیہ السلام کے واقعات یا نبی آخر الزماں کی بشارات وغیرہ ان میں تم جھگڑ چکے، لیکن جس چیز سے تمہیں بالکل مس نہیں، نہ اس کی کبھی ہوا لگی، اسے تو خدا کے سپرد کردو، وہ ہی جانتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کیا تھے اور آج دنیا میں کونسی جماعت کا مسلک اس سے قریب تر ہے۔

مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۶۷﴾

نہ تھا ابراہیم یہودی اور نہ تھا نصرانی لیکن تھا حنیف یعنی سب جھوٹے مذہبوں سے بیزار اور حکم بردار، اور نہ تھا مشرک [1]

اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۶۸﴾

بے شک لوگوں میں زیادہ مناسبت ابراہیم سے انکو تھی جو ساتھ اسکے تھے اور اس نبی کو اور جو ایمان لائے اس نبی پر [2] اور اللہ والی ہے مسلمانوں کا [3]

خلاصہ تفسیر: (جب تم ایسے بے سروپا دعوے کرتے ہو جس سے علم ہونا بھی علم نہ ہونے کی طرح سمجھا جاتا ہے، تو اب اللہ تعالیٰ سے ان کے طریقہ کو سنو کہ) ابراہیم علیہ السلام نہ تو یہودی تھے اور نہ نصرانی تھے، لیکن (البتہ) طریق مستقیم والے (یعنی) صاحب اسلام تھے، اور مشرکین میں سے (بھی) نہ تھے (سو یہود اور نصاریٰ کو تو مذہبی طریقہ کے اعتبار سے ان کے ساتھ کوئی مناسبت نہ ہوئی، ہاں!) بلاشبہ سب آدمیوں میں زیادہ خصوصیت رکھنے والے حضرت ابراہیم کے ساتھ البتہ وہ لوگ تھے جنہوں نے (ان کے وقت میں) ان کا اتباع کیا تھا، اور یہ نبی (محمد ﷺ) ہیں، اور یہ ایمان والے (جو نبی ﷺ کی امت ہیں) اور اللہ تعالیٰ حامی ہیں ایمان والوں کے (کہ ان کو ان کے ایمان کا ثواب دیں گے)۔

وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا: اس پر یہ شبہ ہوگا کہ "دین اسلام" بھی تو ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ سے مؤخر ہے،، پھر وہ صاحب اسلام کیسے ہوئے؟ اس کا جواب سورہ بقرہ آیت ۱۳۳-۱۳۵: **ام کنتم شھداء** میں مفصل گذر چکا ہے وہاں ملاحظہ فرمایئے۔

وَهٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا: یہاں جو رسول اللہ ﷺ اور آپ کی امت کی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ زیادہ خصوصیت ثابت کی گئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ اصول اور بہت سی فروع میں ان سے موافقت رکھتے ہیں، چنانچہ یہ مضمون بھی سورہ بقرہ آیت ۱۳۵: **وقالوا کونوا ھودا** کی تفسیر میں گذر چکا ہے اور وہیں یہ اشکال بھی دور کردیا گیا ہے کہ اس سے حضور ﷺ کے استقلال نبوت میں قدح نہیں پڑتا۔

* * *

فائدہ: [1] **وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ:** یعنی ابراہیم علیہ السلام نے اپنے تئیں "حنیف" یا "مسلم" کہا ہے، "حنیف" کے معنی "جو کوئی ایک راہ حق پکڑے اور سب باطل راہیں چھوڑ دے"، اور "مسلم" کے معنی "حکم بردار"، اب خود اندازہ کرلو کہ آج کس نے سب سے ٹوٹ کر خدا کی راہ پکڑی اور اپنے کو خالص اسی کے سپرد کردیا ہے، وہ ہی ابراہیم علیہ السلام سے زیادہ اقرب واشبہ ہوگا۔

تنبیہ: یہاں مسلمًا میں "اسلام" سے خاص شریعت محمدیہ مراد لینے کی ضرورت نہیں، بلکہ تسلیم وتفویض اور فرمانبرداری کے معنی ہیں جو تمام انبیاء کا دین رہا ہے اور ابراہیم علیہ السلام نے خصوصیت سے اس نام ولقب کو بہت زیادہ روشن کیا: **اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ** (البقرۃ: ۱۳۱) حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سوانح حیات کا ایک ایک حرف بتلاتا ہے کہ وہ ہمہ تن اسلام اور تسلیم ورضا کے پیکر مجسم تھے، ذبح

اسمٰعیل کے واقعہ میں: فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ (الصافات:۱۰۳) کا لفظ ان کی شان اسلام کو بہت وضاحت سے نمایاں کرتا ہے، صلی اللہ علیٰ نبینا و بارك وسلم۔

فائدہ: ۲ وَهٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا: اللہ تعالیٰ نے بتلا دیا کہ زیادہ مناسبت ابراہیم علیہ السلام سے اس وقت کی امت کو تھی، یا پچھلی امتوں میں اس نبی کی امت کو ہے، تو یہ امت نام میں بھی اور راہ میں بھی ابراہیم علیہ السلام سے مناسبت زیادہ رکھتی ہے اور اس امت کا پیغمبر خلقاً و خُلقاً صورۃً و سیرۃً حضرت ابراہیم سے اشبہ ہے اور ان کی دعا کے موافق آیا ہے، جیسا کہ سورۃ بقرہ میں گزرا: رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ (البقرۃ:۱۲۹) اسی لئے حبشہ کا نصرانی بادشاہ (نجاشی) مسلمان مہاجرین کو ”حزب ابراہیم علیہ السلام“ کہتا تھا، شاید اسی قسم کی مناسبات کی وجہ سے درود شریف میں کما صلیت علی ابراهیم فرمایا، یعنی اس نوعیت اور نمونہ کی صلوٰۃ نازل فرمائے جو ابراہیم علیہ السلام و آل ابراہیم پر کی تھی، جامع ترمذی میں حدیث ہے: اِنَّ لِكُلِّ نَبِيٍّ وُّلَاةً مِّنَ النَّبِيِّيْنَ وَاِنَّ وَلِيِّ اَبِي وَخَلِيْلُ رَبِّي اس مضمون کی تفصیل آئندہ کسی سورت میں آئے گی ان شاء اللہ۔

فائدہ: ۳ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ: یعنی اپنی راہ کے حق ہونے پر محض کسی کی موافقت و مشابہت سے دلیل جب پکڑے کہ اپنے او پر وحی نہ آتی ہو، سو اللہ والی ہے مسلمانوں کا کہ (یہ براہِ راست) اس کے حکم پر چلتے ہیں (موضح القرآن)۔

وَدَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يُضِلُّوْنَكُمْ ؕ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۶۹﴾

آرزو ہے بعضے اہل کتاب کو کہ کسی طرح گمراہ کریں تم کو اور گمراہ نہیں کرتے مگر اپنے آپ کو اور نہیں سمجھتے

خلاصہ تفسیر: پیچھے اہل کتاب کے ضلال یعنی گمراہی کا بیان تھا کہ حجت پورا ہونے کے باوجود حق کو قبول نہیں کرتے، اب ان کے اِضلال یعنی دوسروں کو گمراہ کرنے کا ذکر فرماتے ہیں یعنی خود تو گمراہ تھے، مزید یہ کہ اوروں کو بھی گمراہ کرنے کی فکر میں ہیں:

دل سے چاہتے ہیں بعض لوگ اہل کتاب میں سے اس امر کو کہ تم کو (دین حق سے) گمراہ کر دیں، گمراہ نہیں کر سکتے مگر خود اپنے آپ کو (گمراہ کرنے کے وبال میں گرفتار کر رہے ہیں) اور اس کی اطلاع نہیں رکھتے۔

لَوْ يُضِلُّوْنَكُمْ: اگر اس کے مخاطب خاص صحابہ ہیں تب تو یہ فرمانا کہ کسی کو گمراہ نہیں کر سکتے بالکل ظاہر ہے، کیونکہ یہاں بھی مراد یہی ہوگی کہ تم میں سے کسی کو گمراہ نہیں کر سکتے، سو بفضلہ تعالیٰ ان خاص حضرات میں سے کسی کو گمراہ نہ کر سکے، اور اگر مراد مطلق اہل اسلام ہیں تو اس فرمانے کے معنی یہ ہوں گے کہ یہ بات یعنی گمراہ کرنا اہل کتاب کے اختیار و قدرت سے باہر ہے، یوں خود کوئی مسلمان گمراہ ہونا چاہے تو وہ اور بات ہے۔

وَمَا يَشْعُرُوْنَ: یہ جو فرمایا کہ اس کی اطلاع نہیں رکھتے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی طرف التفات و توجہ نہیں کرتے، ورنہ اہل کتاب میں جو علماء تھے وہ چونکہ اسلام کی حقانیت کا علم رکھتے تھے جیسا کہ آگے دو آیتوں سے سمجھ آتا ہے، اس لیے گمراہ کرنے کے وبال سے بھی آگاہ تھے، مگر التفات نہ کرنے کے سبب ان کا جاننا نہ جاننے کی طرح ہی تھا، اور اگر جماعت سے جہلاء مراد ہوں تب تو اس میں کوئی اشکال نہیں کہ ان کو اپنے کرتوتوں کے انجام کی خبر نہیں۔

* * *

فائدہ: پہلے کہا تھا: وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ (آل عمران:۶۸) یہاں بتلایا کہ جب مومنین کا ولی اللہ ہے تو تمہارا داؤ ان پر کیا چل سکتا ہے، بیشک بعض اہل کتاب چاہتے ہیں کہ جس طرح خود گمراہ ہیں، مسلمانوں کو بھی راہِ حق سے ہٹا دیں، لیکن مسلمان تو ان کے جال میں پھنسنے والے نہیں، البتہ یہ لوگ اپنی گمراہی کے وبال میں مزید اضافہ کر رہے ہیں، ان کی مغویانہ کوششوں کا ضرر خود ان ہی کو پہنچے گا، جسے وہ فی الحال نہیں سمجھتے۔

يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ﴿۷۰﴾ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ

اے اہل کتاب ! کیوں انکار کرتے ہو اللہ کے کلام کا اور تم قائل ہو ۱ اے اہل کتاب ! کیوں ملاتے ہو سچ میں

بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۷۱﴾ ع ۱۵/۸

جھوٹ اور چھپاتے ہو سچی بات جان کر ۲

خلاصہ تفسیر: اب اہل کتاب کے گمراہ ہونے اور دوسروں کو گمراہ کرنے پر ان کو ملامت فرماتے ہیں:

اے اہل کتاب! کیوں کفر کرتے ہو اللہ تعالیٰ کی (ان) آیتوں کے ساتھ (جو کہ تورات وانجیل میں نبوت محمدیہ پر دلالت کرتی ہیں، کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا انکار کرنا ان آیات کی تکذیب کرنا ہے جو کہ کفر ہے) حالانکہ تم (اپنی زبان سے) اقرار کرتے ہو (کہ وہ آیات حق ہیں، یہ تو ان کے گمراہ ہونے پر ملامت ہوئی، اب دوسروں کو گمراہ کرنے پر ملامت فرماتے ہیں) اے اہل کتاب! کیوں مخلوط کرتے ہو واقعی (مضمون یعنی نبوت محمدیہ) کو غیر واقعی (یعنی تحریف شدہ عبارت، یا فاسد تفسیر) سے اور (کیوں) چھپاتے ہو واقعی بات کو حالانکہ تم جانتے ہو (کہ حق بات کو ہم چھپا رہے ہیں)۔

وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ: مذکورہ بالا دو آیتوں کے آخر میں انتم تشهدون اور انتم تعلمون کے الفاظ سے یہ شبہ نہ کیا جائے کہ اگر کوئی جانتا نہ ہو یا اقرار نہ کرتا ہو تو اس کے لیے کفر جائز ہو جائے گا، جواب یہ ہے کہ کفر تو کسی حال میں بھی جائز نہیں، مگر اقرار اور علم کے بعد کفر کرنا بہت زیادہ قبیح اور قابل ملامت ہے اس لیے یہاں: انتم تشهدون انتم تعلمون کے الفاظ زیادہ ملامت کرنے کے لیے بڑھا دیے۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی تم تورات وغیرہ کے قائل ہو جس میں پیغمبر عربی صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کریم کے متعلق بشارات موجود ہیں جن کو تمہارے دل سمجھتے ہیں اور اپنی خلوتوں میں ان چیزوں کا اقرار بھی کرتے ہو، پھر کھلم کھلا قرآن پر ایمان لانے اور خاتم الانبیاء کی صداقت کا اقرار کرنے سے کیا چیز مانع ہے، خوب سمجھ لو قرآن کا انکار کرنا تمام پچھلی کتب سماویہ کا انکار کرنا ہے۔

فائدہ: ۲ تورات کے بعض احکام تو اغراض دنیاوی کی خاطر سرے سے موقوف ہی کر ڈالے تھے، بعض آیات میں تحریف لفظی کی تھی، بعض کے معنی بدل دیئے تھے اور بعض چیزیں چھپا رکھی تھیں، ہر کسی کو خبر نہ کرتے تھے، جیسے بشارات پیغمبر آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی۔

وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِيْۤ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ

اور کہا بعضے اہل کتاب نے مان لو جو کچھ اترا مسلمانوں پر دن چڑھے

وَاكْفُرُوْۤا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۷۲﴾

اور منکر ہو جائے آخر دن میں شاید وہ پھر جاویں

خلاصہ تفسیر: پیچھے ذکر تھا کہ بعض اہل کتاب مسلمانوں کو گمراہ کرنے کی فکر میں ہیں، اب ان کی ایک چال کا ذکر ہے جو انہوں نے مسلمانوں کو بہکانے کے لیے چلی تھی۔

اور بعض لوگوں نے اہل کتاب میں سے (مشورہ کے طور پر ایک دوسرے سے کہا) کہا کہ (مسلمانوں کو گمراہ کرنے کی ایک تدبیر ہے کہ ظاہرا) ایمان لے آؤ اس (کتاب) پر جو نازل کی گئی ہے (رسول اللہ کے واسطہ سے) مسلمانوں پر (مراد یہ کہ قرآن پر ایمان لے آؤ) شروع دن میں (یعنی صبح کے وقت) اور (پھر) انکار کر بیٹھو آخر دن (یعنی شام کو) عجب کیا (اس تدبیر سے مسلمانوں کو بھی قرآن اور اسلام کے حق ہونے میں شبہ

پڑ جائے اور) وہ (اپنے دین سے) پھر جائیں (اور یہ خیال کریں کہ اہل کتاب علم والے ہیں اور بے تعصب بھی ہیں کہ اسلام قبول کرلیا، اس پر بھی جو وہ پھر گئے تو ضرور اسلام کا ناحق ہونا ان کو علمی دلائل سے ثابت ہوگیا ہوگا، اور ضرور انہوں نے اسلام میں کوئی خرابی دیکھی ہوگی جب ہی تو اس سے پھر گئے)۔

* * *

فائدہ: ان آیتوں میں اہل کتاب کی چالاکیاں اور خیانتیں ذکر کی جارہی ہیں، ان میں سے ایک یہ تھی کہ اپنے کچھ آدمی صبح کے وقت بظاہر مسلمان بن جائیں اور مسلمانوں کے ساتھ نماز پڑھیں اور شام کو یہ کہہ کر کہ ہم کو اپنے بڑے بڑے علماء سے تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ وہ نبی نہیں جن کی بشارت دی گئی تھی اور تجربہ سے ان کے حالات بھی اہل حق کی طرح کے ثابت نہ ہوئے اسلام سے پھر جایا کریں، نتیجہ یہ ہوگا کہ بہت سے ضعیف الایمان ہماری یہ حرکت دیکھ کر اسلام سے پھر جائیں گے، اور سمجھ لیں گے کہ مذہب اسلام میں ضرور کوئی عیب ونقص دیکھا ہوگا جو یہ لوگ داخل ہونے کے بعد اس سے نکلے، نیز عرب کے جاہلوں میں اہل کتاب کے علم وفضل کا چرچا تھا، اس بناء پر یہ خیال پیدا ہوجائے گا کہ یہ جدید مذہب اگر سچا ہوتا تو ایسے اہل علم اسے رَد نہ کرتے بلکہ سب سے آگے بڑھ کر قبول کرتے۔

وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ ۭ قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ ۙ اَنْ يُّؤْتٰٓى اَحَدٌ

اور نہ مانیو مگر اسی کی جو چلے تمہارے دین پر ۱؎ کہہ دے کہ بیشک ہدایت وہی ہے جو اللہ ہدایت کرے ۲؎ اور یہ سب کچھ اسلئے ہے کہ اور کسی کو بھی کیوں مل گیا

مِّثْلَ مَآ اُوْتِيْتُمْ اَوْ يُحَاۗجُّوْكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ ۭ قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ ۚ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ

جیسا کچھ تم کو ملا تھا یا وہ غالب کیوں آ گئے تم پر تمہارے رب کے آگے ۳؎ تو کہہ بڑائی اللہ کے ہاتھ میں ہے، دیتا ہے جس کو چاہے

وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۷۳﴾ يَّخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۷۴﴾

اور اللہ بہت گنجائش والا ہے خبردار، خاص کرتا ہے اپنی مہربانی جس پر چاہے، اور اللہ کا فضل بڑا ہے ۴؎

خلاصہ تفسیر: (اور اہل کتاب نے یہ بھی باہم کہا کہ مسلمانوں کے دکھلانے کو صرف ظاہری ایمان لانا) اور (صدق دل سے) کسی کے روبرو (دین کا) اقرار مت کرنا، مگر ایسے شخص کے روبرو جو تمہارے دین کا پیرو ہو (اس کے سامنے تمہیں اپنے قدیم دین کا اقرار خلوص دل سے کرنا چاہئے، باقی مسلمانوں کے سامنے ویسے ہی زبانی اسلام کا اقرار کرلینا، حق تعالیٰ ان کی تدبیر کے لچر ہونے کو ظاہر فرماتے ہیں کہ:) اے محمد ﷺ آپ کہہ دیجئے کہ (ان چالاکیوں سے کچھ نہیں ہوتا، کیونکہ) یقیناً ہدایت (جو بندوں کو ہوتی ہے وہ) ہدایت اللہ کی (طرف سے ہوتی) ہے (پس جب ہدایت قبضہ خداوندی میں ہے تو وہ جس کو ہدایت پر قائم رکھنا چاہیں اس کو کوئی کسی تدبیر سے گمراہ نہیں کرسکتا)۔

(آگے ان کے اس مشورہ وتدبیر کی علت بتلاتے ہیں کہ اے اہل کتاب! تم) ایسی باتیں اس لئے کرتے ہو کہ کسی اور کو بھی ایسی چیز مل رہی ہے جیسی تم کو ملی تھی (یعنی کتاب اور دین آسمانی) یا وہ اور لوگ تم پر غالب آجائیں (اس دین حق کی تعیین میں جو) تمہارے ربّ کے نزدیک (ہے، حاصل علت کا یہ ہوا کہ تم کو مسلمانوں پر یہ حسد ہے کہ ان کو آسمانی کتاب کیوں مل گئی، یا یہ لوگ ہم پر مذہبی مناظرہ میں کیوں غالب آجاتے ہیں، اس حسد کی وجہ سے اسلام اور اہل اسلام کے تنزل کی کوشش کررہے ہیں، آگے اس حسد کا رد ہے کہ) اے محمد ﷺ! آپ کہہ دیجئے کہ بیشک فضل تو خدا کے قبضہ میں ہے، وہ اس سے جسے چاہیں عطا فرمادیں اور اللہ تعالیٰ بڑی وسعت والے ہیں (ان کے یہاں فضل کی کمی نہیں، اور) خوب جاننے والے ہیں (کہ کس وقت کس کو دینا مناسب ہے، اس لئے) خاص کردیتے ہیں اپنی رحمت (وفضل) کے ساتھ جس کو چاہیں، اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل والے ہیں (پس اس وقت حکمت کی رعایت کرتے ہوئے مسلمانوں پر فضل ورحمت فرمادیا اس میں حسد کرنا فضول اور جہل ہے)۔

وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ: اسی کی نظیر ان جاہل لوگوں کا عمل ہے جو اپنے سلسلہ کی تعلیمات کو دوسروں سے چھپاتے ہیں تا کہ دوسروں کو پتہ نہ لگ جائے اور وہ فائدہ نہ اٹھالیں، اور صرف انہی لوگوں کو تعلیم وتلقین کرتے ہیں جو ان کے مسلک سے وابستہ ہیں، ان کا یہ فعل درست نہیں کہ دوسروں سے مخفی رکھیں۔

* * *

فائدہ: ۱۔ وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ: یعنی جو یہود مسلمانوں کے سامنے جا کر نفاق سے اپنے کو مسلمان ظاہر کریں، انہیں یہ برابر ملحوظ رہے کہ وہ سچ مچ مسلمان نہیں بن گئے، بلکہ بدستور یہودی ہیں، اور سچے دل سے انہی کی بات مان سکتے ہیں جو ان کے دین پر چلتا ہو اور شریعت موسوی کے اتباع کا دعویٰ رکھتا ہو، بعض نے ولا تؤمنوا الا لمن تبع دینکم کے یہ معنی کئے ہیں کہ ظاہری طور پر جو ایمان لاؤ اور اپنے کو مسلمان بتاؤ، وہ محض ان لوگوں کی وجہ سے جو تمہارے دین پر چلنے والے ہیں، یعنی اس تدبیر سے اپنے ہم مذہبوں کی حفاظت مقصود ہونی چاہیے کہ وہ مسلمان نہ بن جائیں، یا جو بن چکے ہیں اس تدبیر سے واپس آجائیں۔

فائدہ: ۲۔ قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ: یعنی ہدایت تو اللہ کے دینے سے ملتی ہے، جس کے دل میں خدا نے ہدایت کا نور ڈال دیا تمہاری ان پُرفریب چالبازیوں سے وہ گمراہ ہونے والا نہیں۔

فائدہ: ۳۔ مِّثْلَ مَآ اُوْتِيْتُمْ اَوْ يُحَآجُّوْكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ: یعنی یہ مکاریاں اور تدبیریں محض از راہ حسد اس جلن میں کی جاتی ہیں کہ دوسروں کو اس طرح کی شریعت اور نبوت ورسالت کیوں دی جارہی ہے جیسی پہلے تم کو دی گئی تھی، یا مذہبی ودینی جدوجہد میں دوسرے لوگ تم پر غالب آ کر کیوں آگے نکلے جارہے ہیں اور خدا کے آگے تمہیں ملزم گردان رہے ہیں۔

یہود ہمیشہ اس خیال کی اشاعت کرتے رہے تھے کہ دنیا میں تنہا ہماری ہی قوم علم شرعیات کی اجارہ دار ہے، تورات ہم پر اتری، موسیٰ جیسے اولوالعزم پیغمبر ہم میں آئے، پھر عرب کے اُمیوں کو اس فضل وکمال سے کیا واسطہ؟ لیکن تورات سفر استثناء کی عظیم الشان پیشین گوئی غلط نہیں ہوسکتی تھی جس میں بتایا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل کے بھائیوں (بنی اسماعیل) میں سے ایک موسیٰ جیسا (صاحب شریعت مستقلہ) نبی اٹھائے گا، اپنا کلام (قرآن کریم) اس کے منہ میں ڈالے گا: اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا (المزمل: ۱۵) چنانچہ بنی اسماعیل کو یہ دولت ملی اور وہ علم وفضل حجت وبرہان اور مذہبی جدوجہد کے میدان مقابلہ میں نہ صرف بنی اسرائیل بلکہ دنیا کی تمام اقوام سے گوئے سبقت لے گئے، فالحمد للہ علیٰ ذلک۔

تنبیہ: اس آیت کی تقریر کئی طرح سے کی گئی ہے، لیکن ہم نے وہ ہی تقریر اختیار کی جس کی طرف مترجم محقق قدس اللہ روحہ کے الفاظ اشارہ کررہے ہیں۔

فائدہ: ۴۔ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ: یعنی اللہ کے خزانوں میں کمی نہیں، اور اسی کو خبر ہے کہ کس کو کیا بڑائی ملنی چاہیے، نبوت، شریعت، ایمان واسلام اور ہر قسم کی مادی وروحانی فضائل وکمالات کا تقسیم کرنا اسی کے ہاتھ میں ہے، جس وقت جسے مناسب جانے عطا کرتا ہے: اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ۔

وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُّؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ

اور بعضے اہل کتاب میں وہ ہیں کہ اگر تو انکے پاس امانت رکھے ڈھیر مال کا تو ادا کردیں تجھ کو اور بعضے ان میں وہ ہیں کہ اگر تو انکے پاس امانت رکھے ایک اشرفی

لَّا يُؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِى الْاُمِّيّٖنَ

تو ادا نہ کریں تجھ کو مگر جب تک کہ تو رہے اس کے سر پر کھڑا ۱۔ یہ اس واسطے کہ انہوں نے کہہ رکھا ہے کہ نہیں ہے ہم پر اُمّی لوگوں کے حق لینے

سَبِيۡلٌ ۚ وَيَقُوۡلُوۡنَ عَلَى اللّٰهِ الۡكَذِبَ وَهُمۡ يَعۡلَمُوۡنَ۝

میں کچھ گناہ ۲؎ اور جھوٹ بولتے ہیں اللہ پر اور وہ جانتے ہیں ۳؎

خلاصہ تفسیر: پیچھے اہل کتاب کی دینی خیانت کا ذکر تھا، یعنی ان کا کفر کرنا، حق و باطل کا خلط کرنا، حق کو چھپانا اور مومنین کی گمراہی کی تدبیر کرنا، اب ان کی مالی خیانت کا ذکر ہے، اور چونکہ ان میں سے بعض امانت دار بھی تھے، اس لئے دونوں قسموں کو ذکر فرمایا۔

اور اہل کتاب میں سے بعض شخص ایسا ہے کہ (اے مخاطب!) اگر تم اس کے پاس انبار کا انبار مال بھی امانت رکھ دو تو وہ (مانگنے کے ساتھ ہی) اس کو تمہارے پاس لا رکھے، اور ان ہی میں سے بعض وہ شخص ہے کہ اگر تم اس کے پاس ایک دینار بھی امانت رکھ دو تو وہ بھی تم کو ادا نہ کرے (بلکہ امانت رکھانے کا بھی اقرار نہ کرے) مگر جب تک کہ تم (امانت رکھ کر) اس کے سر پر (برابر) کھڑے رہو (اس وقت تک تو خیر انکار نہ کرے، اور جہاں الگ ہوئے، پھر ادا کرنے کا تو کیا ذکر ہے، سرے سے امانت ہی سے مکر جائے) یہ (امانت کا ادا نہ کرنا) اس سبب سے ہے کہ وہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم پر غیر اہل کتاب کے (مال کے) بارے میں (اگر چوری چھپے لیا جائے مذہبا) کسی طرح کا الزام نہیں (یعنی جو اہل کتاب نہیں مثلاً قریش وغیرہ کا مال چرا لینا یا چھین لینا سب جائز ہے، اللہ تعالیٰ آگے ان کے اس دعوی کی تکذیب فرماتے ہیں) اور وہ لوگ اللہ تعالیٰ پر جھوٹ لگاتے ہیں (کہ اس فعل کو حلال سمجھتے ہیں) اور دل میں وہ بھی جانتے ہیں (اللہ تعالیٰ نے اس کو حلال نہیں کیا، محض من گھڑت دعوی ہے)

وَمِنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ مَنۡ اِنۡ تَاۡمَنۡهُ بِقِنۡطَارٍ: اس آیت میں جو بعض امانت داروں کی تعریف ہے اگر اس بعض سے مراد وہ اہل کتاب ہیں جو ایمان لا چکے تھے تو ان کی تعریف کرنے میں کوئی اشکال نہیں، لیکن اگر خاص مؤمن مراد نہ ہوں، بلکہ مطلقا اہل کتاب ہوں جن میں غیر مسلم بھی شامل ہیں تو اس صورت میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کافر کا کوئی عمل مقبول نہیں ہوتا تو پھر ان کی مدح سے کیا فائدہ؟ جواب یہ ہے کہ کسی چیز کا مقبول ہونا اور چیز ہے اور اس کی مدح کرنا اور چیز ہے، مدح کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ اللہ کے ہاں بھی مقبول ہو، چنانچہ یہ مدح اس وجہ سے نہیں کہ ان کا یہ عمل اللہ کے ہاں مقبول ہے اور اس کا وہاں ثواب ملے گا، کیونکہ کسی نیک عمل پر ثواب ایمان کے بغیر نہیں ہو سکتا، بلکہ تعریف اس وجہ سے ہے کہ اچھی بات اگرچہ کافر کی ہو وہ بھی کسی درجہ میں اچھی ہی ہے، جس کا فائدہ اس کو دنیا میں نیک نامی، اور آخرت میں عذاب کی کمی ہے، اس بیان سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام تعصب اور تنگ نظری سے کام نہیں لیتا، بلکہ وہ کھلے دل سے اپنے مخالف کے ہنر کی بھی اس کے مرتبہ کے مطابق داد دیتا ہے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ اِلَّا مَا دُمۡتَ عَلَيۡهِ قَآئِمًا: اہل کتاب کی دینی خیانت و نفاق کے سلسلہ میں دنیاوی خیانت کا ذکر آ گیا، جس سے اس پر روشنی پڑتی ہے کہ جو لوگ چار پیسہ پر نیت خراب کر لیں اور امانتداری نہ برت سکیں ان سے کیا توقع ہو سکتی ہے کہ دینی معاملات میں امین ثابت ہوں گے، چنانچہ ان میں بہت سے وہ ہیں جن کے پاس زیادہ تو کیا، ایک اشرفی بھی امانت رکھی جائے تو تھوڑی دیر بعد مکر جائیں، اور جب تک کوئی تقاضہ کے لئے ہر وقت ان کے سر پر کھڑا نہ رہے اور پیچھا کرنے والا نہ ہو، امانت ادا نہ کریں، بیشک ان میں سب کا حال ایسا نہیں، بعض ایسے بھی ہیں جن کے پاس اگر سونے کا ڈھیر رکھ دیا جائے تو ایک رتی خیانت نہ کریں، لیکن یہ ہی خوش معاملہ اور امین لوگ ہیں جو یہودیت سے بیزار ہو کر اسلام کے حلقہ بگوش بنتے جا رہے ہیں، مثلاً حضرت عبداللہ بن سلام وغیرہ رضی اللہ عنہ۔

فائدہ: ۲؎ لَيۡسَ عَلَيۡنَا فِى الۡاُمِّيّٖنَ سَبِيۡلٌ: یعنی پرایا حق کھانے کو یہ مسئلہ بنا لیا کہ عرب کے اُمی جو ہمارے مذہب پر نہیں، ان کا مال جس طرح ملے روا ہے، غیر مذہب والوں کی امانت میں خیانت کی جائے تو کچھ گناہ نہیں، خصوصاً وہ عرب جو اپنا آبائی دین چھوڑ کر مسلمان بن گئے ہیں، خدا نے ان کا مال ہمارے لئے حلال کر دیا ہے۔

فائدہ: ۳؎ وَيَقُوۡلُوۡنَ عَلَى اللّٰهِ الۡكَذِبَ وَهُمۡ يَعۡلَمُوۡنَ: یعنی جان بوجھ کر خدا کی طرف جھوٹی بات منسوب کر رہے ہیں، امانت میں

خیانت کرنے کی خدا نے ہرگز اجازت نہیں دی، آج بھی اسلامی فقہ کا مسئلہ یہ ہی ہے کہ مسلم ہو یا کافر، کسی کی امانت میں خیانت جائز نہیں۔

بَلٰى مَنۡ اَوۡفٰى بِعَهۡدِهٖ وَاتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الۡمُتَّقِيۡنَ ﴿۷۶﴾

کیوں نہیں جو کوئی پورا کرے اپنا قرار اور وہ پرہیز گار ہے تو اللہ کو محبت ہے پرہیز گاروں سے

خلاصہ تفسیر: (پیچھے اہل کتاب کے دعویٰ کی تکذیب تھی، آگے اسی تکذیب کی تاکید ہے، اور ایفاء عہد کی فضیلت اور بدعہدی کی مذمت صراحۃً بیان فرماتے ہیں: خائن پر) الزام کیوں نہ ہوگا (ضرور ہوگا، کیونکہ اس کے متعلق ہمارے دو قانون ہیں: ایک یہ کہ) جو شخص اپنے عہد کو (خواہ وہ عہد اللہ تعالیٰ سے ہو، یا مخلوق سے کوئی جائز عہد ہو) پورا کرے اور اللہ تعالیٰ سے ڈرے تو بیشک اللہ تعالیٰ محبوب رکھتے ہیں (ایسے) متقیوں کو۔

واضح رہے کہ اگر مخلوق سے کوئی ناجائز عہد کیا تو اس کا پورا کرنا حرام ہے۔

بَلٰى مَنۡ اَوۡفٰى بِعَهۡدِهٖ: یعنی جو شخص اپنے عہد کو پورا کرے، اس پر یہ شبہ نہ کیا جائے کہ فقط عہد کو پورا کرنے پر حق تعالیٰ نے اپنی محبت کی بشارت دی ہے اور اس میں ایمان کی شرط نہیں، جواب یہ ہے کہ اس عہد میں ایمان بھی داخل ہے اور پھر اسی آیت میں تقویٰ کی قید سے ایمان کا ضروری ہونا صراحۃً بیان فرمادیا، کیونکہ تقویٰ کا ادنیٰ مرتبہ یہ ہے کہ کفر سے بچے۔

* * *

فائدہ: یعنی خیانت و بدعہدی میں گناہ کیوں نہیں، جبکہ خدا تعالیٰ کا عام قانون یہ ہے کہ جو کوئی خدا کے اور بندوں کے جائز عہد پورے کرے اور خدا سے ڈر کر تقویٰ کی راہ چلے، یعنی فاسد خیالات، مذموم اعمال اور پست اخلاق سے پرہیز کرے، اسی سے خدا محبت کرتا ہے، اس میں امانتداری کی خصلت بھی آگئی۔

اِنَّ الَّذِيۡنَ يَشۡتَرُوۡنَ بِعَهۡدِ اللّٰهِ وَاَيۡمَانِهِمۡ ثَمَنًا قَلِيۡلًا اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمۡ فِى الۡاٰخِرَةِ

جو لوگ مول لیتے ہیں اللہ کے قرار پر اور اپنی قسموں پر تھوڑا سا مول ان کا کچھ حصہ نہیں آخرت میں

وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنۡظُرُ اِلَيۡهِمۡ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيۡهِمۡ وَلَهُمۡ عَذَابٌ اَلِيۡمٌ ﴿۷۷﴾

اور نہ بات کرے گا ان سے اللہ اور نہ نگاہ کریگا ان کی طرف قیامت کے دن اور نہ پاک کریگا ان کو اور ان کے واسطے عذاب ہے دردناک۔

خلاصہ تفسیر: (اور دوسرا قانون یہ ہے کہ) یقیناً جو لوگ معاوضہ (یعنی دنیوی نفع) لے لیتے ہیں بمقابلہ اس عہد کے جو (انہوں نے) اللہ تعالیٰ سے کیا ہے (مثلاً انبیاء پر ایمان لانا) اور (بمقابلہ) اپنی قسموں کے (مثلاً حقوق العباد اور معاملات کے باب میں قسم کھالینا) ان لوگوں کو کچھ حصہ آخرت میں (وہاں کی نعمت کا) نہ ملے گا، اور نہ اللہ تعالیٰ ان سے (لطف کا) کلام فرمائیں گے، اور نہ ان کی طرف (نظر محبت سے) دیکھیں گے قیامت کے روز، اور نہ ان کو (گناہوں سے) پاک کریں گے، اور ان کے لیے دردناک عذاب (تجویز) ہوگا۔

بِعَهۡدِ اللّٰهِ: خدائی عہد کی مثال میں بطور خاص انبیاء کرام پر ایمان لانے کو اس لیے ذکر کیا کہ یہود نبی کریم ﷺ کی رسالت کے منکر تھے، اسی طرح خدائی عہد میں سب احکام بھی آگئے جس کے عموم میں مالی عہد بھی داخل ہے۔

اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمۡ فِى الۡاٰخِرَةِ: اگر یہ آیت کفار کے حق میں لی جائے تب تو یہ سب وعیدیں ہمیشہ کے لیے ہیں، اور اگر فساق کے لیے بھی عام مانی جائیں تو معنی یہ ہوں گے کہ ایک زمانہ تک وہ ان نعمتوں کے مستحق نہ ہوں گے، اب چاہے حق تعالیٰ بغیر استحقاق کے اپنے فضل سے فوراً ہی عطا فرمادیں یا ایک مدت کے لیے ایسا ہو۔

اِنَّ الَّذِيۡنَ يَشۡتَرُوۡنَ بِعَهۡدِ اللّٰهِ وَاَيۡمَانِهِمۡ ثَمَنًا قَلِيۡلًا: اس میں اس شخص کی حالت کی طرف بھی اشارہ ہے جو دنیا کی زیب و

زینت کی طرف مائل ہو اور اسے ترجیح دیتا ہو، اور اپنے ظاہر کو متقیوں جیسا بنائے تا کہ لوگوں میں رتبہ اور مقام حاصل کرے اور لوگ اس کو بزرگ سمجھیں جبکہ دل میں اخلاص اور اللہ کی نسبت نہ ہو تو وہ اللہ سے ملاقات اور شرف خطاب پانے سے دنیا و آخرت دونوں میں ساقط ہو جائے گا، یعنی دنیا و آخرت دونوں جگہ خسارہ میں ہے۔

وَلَا یُزَکِّیۡہِمۡ: اس کا ایک ترجمہ اور بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی تعریف نہ کریں گے جیسے مؤمنین کی کریں گے۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی جو لوگ دنیا کی متاع قلیل لے کر خدا کے عہد اور آپس کی قسموں کو توڑ ڈالتے ہیں، نہ باہمی معاملات درست رکھتے ہیں نہ خدا سے جو قول و قرار کیا تھا اس پر قائم رہتے ہیں، بلکہ مال و جاہ کی حرص میں احکام شرعیہ کو بدلتے اور کتب سماویہ میں تحریف کرتے رہتے ہیں، ان کا انجام آگے مذکور ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''یہ یہود میں صفت تھی کہ اللہ نے ان سے اقرار لیا تھا اور قسمیں دی تھیں کہ ہر نبی کے مددگار رہیو، پھر غرض دنیا کے واسطے پھر گئے اور جو کوئی جھوٹی قسم کھائے دنیا لینے کے واسطے اس کا یہ ہی حال ہے''۔

فائدہ: ۲ اس قسم کی آیت سورۃ بقرہ کے اکیسویں رکوع میں گزر چکی، وہاں کے فوائد میں الفاظ کی تشریح دیکھ لی جائے۔

وَاِنَّ مِنۡهُمۡ لَفَرِيۡقًا يَّلۡوٗنَ اَلۡسِنَتَهُمۡ بِالۡكِتٰبِ لِتَحۡسَبُوۡهُ مِنَ الۡكِتٰبِ وَمَا هُوَ مِنَ الۡكِتٰبِ ۚ

اور بیشک ان میں ایک فریق ہے کہ زبان مروڑ کر پڑھتے ہیں کتاب تا کہ تم جانو کہ وہ کتب میں ہے اور وہ نہیں کتاب میں

وَيَقُوۡلُوۡنَ هُوَ مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ وَمَا هُوَ مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ ۚ وَيَقُوۡلُوۡنَ عَلَى اللّٰهِ الۡكَذِبَ وَهُمۡ يَعۡلَمُوۡنَ ۝۷۸

اور کہتے ہیں وہ اللہ کا کہا ہے اور وہ نہیں اللہ کا کہا ۱ اور اللہ پر جھوٹ بولتے ہیں جان کر

خلاصہ تفسیر: پیچھے خیانت کی مذمت کا بیان تھا، اب ان کی ایک خاص خیانت کی عادت بیان فرماتے ہیں کہ وہ کتاب اللہ میں خاص طریقہ سے تحریف کرتے تھے۔

اور بیشک ان میں سے بعض ایسے ہیں کہ کج کرتے ہیں اپنی زبانوں کو کتاب (پڑھنے) میں (یعنی ان میں کوئی لفظ یا کوئی تفسیر غلط ملا دیتے ہیں، اور غلط پڑھنا کج زبانی کہلاتا ہے) تا کہ تم لوگ (جو اس کو سنو تو) اس (ملائی ہوئی چیز) کو (بھی) کتاب کا جزو سمجھو، حالانکہ وہ کتاب کا جزو نہیں، اور (صرف دھوکہ دینے کے لئے اس عملی طریقہ پر اکتفا نہیں کرتے، بلکہ زبان سے بھی) کہتے ہیں کہ یہ (لفظ یا مطلب) اللہ تعالیٰ کے پاس سے (جو الفاظ یا قواعد نازل ہوئے ہیں ان سے ثابت) ہے، حالانکہ وہ (کسی طرح) اللہ تعالیٰ کے پاس سے نہیں (پس ان کا جھوٹا ہونا لازم آ گیا، آگے تاکید کے لئے اس کی پھر صراحت ہے) اور اللہ تعالیٰ پر جھوٹ بولتے ہیں اور (اپنا جھوٹا ہونا دل میں خود بھی) وہ جانتے ہیں۔

يَلۡوٗنَ اَلۡسِنَتَهُمۡ بِالۡكِتٰبِ: یعنی کج کرتے ہیں اپنی زبانوں کو کتاب میں، ممکن ہے کہ لفظی تحریف کرتے ہوں، یعنی کتاب اللہ کے الفاظ بدلتے ہوں، یا اپنی طرف سے ملاتے ہوں، اس صورت میں تو دعوی یہ ہوتا ہے کہ یہ لفظ ہی خدا کے نازل کیے ہوئے ہیں، اور ممکن ہے کہ تفسیر غلط بیان کرتے ہوں، اس صورت میں یہ دعوی ہوتا ہے کہ یہ تفسیر شرعی قواعد سے ثابت ہے، پہلی صورت میں تو صراحۃً اپنے کلام کو خدا کا کلام بنایا، دوسری صورت میں صراحۃً تو نہیں مگر در پردہ اپنی تفسیر کو خدا کے کلام میں داخل کیا کہ اس کو شرعی قواعد کے موافق ظاہر کیا، اور شرعی قواعد خدا کے نازل کیے ہوئے تھے تو گویا وہ تفسیر بھی کسی درجہ میں خدا کی طرف منسوب ہو گئی، اس لیے خلاصہ تفسیر میں دونوں احتمالوں کی رعایت رکھی گئی، یا یہ کہ اپنے ملائے ہوئے الفاظ کو بھی اسی طرح بنا بنا کے پڑھتے ہیں جیسے کلام الٰہی کو بنا کر پڑھتے ہیں اور اس کا کج زبانی ہونا تو ظاہر ہے، بد دینوں نے اس امت میں بھی حدیث کے اندر تو لفظی

اور معنوی دونوں طرح کی تحریف کی، اور قرآن میں لفظی تحریف تونہیں کر سکے کہ اس کی حفاظت کا وعدہ حق تعالیٰ نے فرمالیا ہے، البتہ معنوی تحریف قرآن میں بھی کی، خدا اُن کو ہدایت دے۔

* * *

فائدہ: لے یہ اہل کتاب کی تحریف کا حال بیان فرمایا، یعنی آسمانی کتاب میں کچھ چیزیں اپنی طرف سے بڑھا گھٹا کر ایسے انداز اور لہجہ میں پڑھتے ہیں کہ ناواقف سننے والا دھوکہ میں آجائے، اور یہ سمجھے کہ یہ بھی آسمانی کتاب کی عبارت ہے، یہ ہی نہیں بلکہ زبان سے دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ یہ سب اللہ کے پاس سے آیا ہوا ہے، حالانکہ نہ وہ مضمون کتاب میں موجود ہے اور نہ خدا کے پاس سے آیا ہے، بلکہ خود اس تحریف شدہ کتاب کو بھی بحیاتِ مجموعی خدا کی کتاب نہیں کہہ سکتے، کیونکہ اس میں طرح طرح کے تصرّفات اور جعلسازیاں کی گئی ہیں، آج بائبل کے جو نسخے دنیا میں موجود ہیں ان میں باہم شدید اختلاف پایا جاتا ہے اور بعض ایسے مضامین درج ہیں جو قطعاً خدا کی طرف سے نہیں ہوسکتے، اسکی کچھ تفصیل روح المعانی میں موجود ہے، اور اثبات تحریف پر ہمارے علماء نے مبسوط بحثیں کی ہیں، جزاہم اللہ احسن الجزاء۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ

کسی بشر کا کام نہیں کہ اللہ اس کو دیوے کتاب اور حکمت اور پیغمبر کرے پھر وہ کہے لوگوں کو کہ تم میرے بندے ہو جاؤ

مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ﴿۷۹﴾

اللہ کو چھوڑ کر لے لیکن یوں کہے کہ تم اللہ والے ہو جاؤ جیسے کہ تم سکھلاتے تھے کتاب اور جیسے کہ تم آپ بھی پڑھتے تھے اسے ۲

وَلَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا ؕ اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۸۰﴾ ع

اور نہ یہ کہے تم کو کہ ٹھہرا لو فرشتوں کو اور نبیوں کو رب ۳ کیا تم کو کفر سکھائے گا بعد اس کے کہ تم مسلمان ہو چکے ہو ۴

خلاصہ تفسیر: گذشتہ آیتوں میں اہل کتاب کے افعال واقوال پر اعتراض تھا، اب ان کے ایک لغو اعتراض کو باطل کرتے ہیں جو انہوں نے رسول اللہ ﷺ پر کیا تھا جیسا کہ لباب النقول میں ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ حضور اقدس کی خدمت میں ایک بار یہود اور نجران کے نصاریٰ جمع تھے تو آپ نے ان کو اسلام کی طرف بلایا تو ابورافع یہودی نے کہا کہ کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ ہم آپ کی عبادت کریں جیسے نصاریٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی عبادت کرتے ہیں آپ ﷺ نے فرمایا معاذ اللہ! اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

کسی بشر سے یہ بات نہیں ہوسکتی کہ اللہ تعالیٰ (تو) اس کو کتاب اور (دین کی) فہم اور نبوت عطا فرمادیں (جن میں ہر ایک کا مقتضا کفر و شرک سے منع کرنا ہے اور) پھر وہ لوگوں سے (یوں) کہنے لگے کہ میرے بندے (یعنی عبادت کرنے والے) بن جاؤ، اللہ تعالیٰ (کی توحید) کو چھوڑ کر (یعنی نبوت کے ساتھ شرک کا حکم دینا جمع نہیں ہوسکتے) ولیکن (وہ نبی یہ تو) کہے گا کہ تم لوگ اللہ والے بن جاؤ (یعنی صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو) بوجہ اس کے کہ تم کتاب (الٰہی اوروں کو بھی) سکھاتے ہو، اور بوجہ اس کے کہ (خود بھی اس کو) پڑھتے ہو (اور اس کتاب میں توحید کی تعلیم ہے)۔

اور نہ (وہ بشر جو نبوت کے ساتھ متصف ہو) یہ بات بتلائے گا کہ تم فرشتوں کو اور (یا دوسرے) نبیوں کو رب قرار دے لو، کیا (بھلا) وہ تم کو کفر کی بات بتلادے گا بعد اس کے کہ تم (اس عقیدہ خاص میں خواہ فی الواقع یا بزعم خود) مسلمان ہو۔

عبادت اور بندگی تو اللہ ہی کی ہے مگر اطاعت اور پیروی نبی کی بھی ضروری اور لازم ہے، شاید اس معترض نے عبادت اور اطاعت میں فرق نہ کیا اور براہ عناد اعتراض کر دیا کہ معاذ اللہ حضور ﷺ لوگوں سے اپنی بندگی چاہتے ہیں، یہ اعتراض بالکل لغو اور مہمل تھا، عبادت اور اطاعت میں زمین و آسمان کا فرق ہے، عبادت خالص اللہ کا حق ہے اور بے چون چرا اطاعت اور پیروی نبی کا حق ہے، اللہ تعالیٰ نے صراحۃً جواب میں ظاہر فرمادیا کہ نبی کا

خدا کے سوا کسی دوسرے کی عبادت کا حکم دینا محال ہے۔

وَلَا يَأْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ: اس میں ان لوگوں پر رد ہے جو مشائخ اور بزرگوں کی اطاعت و تعظیم میں غلو کرتے ہیں، اگرچہ یہ حضرات حق کے کامل مظہر ہوتے ہیں، یعنی ولی کو نبی اور نبی کو خدا کے مرتبہ تک نہیں پہنچانا چاہیے، چنانچہ ترمذی نے **قل یا اھل الکتب تعالوا** کی تفسیر میں روایت کیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو عدی بن ابی حاتمؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! ہم تو ان کی عبادت نہ کرتے تھے، آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیا یہ بات نہ تھی کہ وہ لوگ بغیر شرعی دلیل کے بہت سی اشیا کو تمہارے لیے حلال کر دیتے تھے اور بہت سی اشیا کو حرام کر دیا کرتے تھے، پھر تم ان کے قول کو قبول کرتے تھے''، عرض کیا: ہاں! یہ تو تھا، آپ ﷺ نے فرمایا: بس اس کا یہی مطلب ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ: وفد نجران کی موجودگی میں بعض یہود و نصاریٰ نے کہا تھا کہ اے محمد ﷺ! کیا تم یہ چاہتے ہو کہ ہم تمہاری اسی طرح پرستش کرنے لگیں، جیسے نصاریٰ عیسیٰ ابن مریم کو پوجتے ہیں، آپ نے فرمایا: ''معاذ اللہ کہ ہم غیر اللہ کی بندگی کریں، یا دوسروں کو اسکی دعوت دیں، حق تعالیٰ نے ہم کو اس کام کے لئے نہیں بھیجا''، اس پر یہ آیت نازل ہوئی، یعنی جس بشر کو حق تعالیٰ کتاب و حکمت اور قوت فیصلہ دیتا، اور پیغمبری کے منصبِ جلیل پر فائز کرتا ہے کہ وہ ٹھیک ٹھیک پیغامِ الٰہی پہنچا کر لوگوں کو اسکی بندگی اور وفاداری کی طرف متوجہ کرے، اس کا یہ کام کبھی نہیں ہو سکتا کہ ان کو خالص ایک خدا کی بندگی سے ہٹا کر خود اپنا یا کسی دوسری مخلوق کا بندہ بنانے لگے، اس کے تو یہ معنی ہوں گے کہ خداوند قدوس نے جس کو جس منصب کا اہل جان کر بھیجا تھا، فی الواقع وہ اس کا اہل نہ تھا۔

دنیا کی کوئی گورنمنٹ بھی اگر کسی شخص کو ایک ذمہ داری کے عہدہ پر مامور کرتی ہے تو پہلے دو باتیں سوچ لیتی ہے: ① یہ شخص گورنمنٹ کی پالیسی کو سمجھنے اور اپنے فرائض کو انجام دینے کی لیاقت رکھتا ہے یا نہیں ② گورنمنٹ کے احکام کی تعمیل کرنے اور رعایا کو جادہ وفاداری پر قائم رکھنے کی کہاں تک اس سے توقع کی جا سکتی ہے؟ کوئی بادشاہ یا پارلیمنٹ ایسے آدمی کو نائب السلطنت یا سفیر مقرر نہیں کر سکتی جس کی نسبت حکومت کے خلاف بغاوت پھیلانے یا اس کی پالیسی اور احکام سے انحراف کرنے کا ادنیٰ شبہ ہو، بیشک یہ ممکن ہے کہ ایک شخص کی قابلیت یا جذبہ وفاداری کا اندازہ حکومت صحیح طور پر نہ کر سکی ہو، لیکن خداوند قدوس کے یہاں یہ بھی احتمال نہیں، اگر فرد کی نسبت اس کو علم ہے کہ یہ میری وفاداری اور اطاعت شعاری سے بال برابر تجاوز نہ کرے گا تو محال ہے کہ وہ آگے چل کر اس کے خلاف ثابت ہو سکے، ورنہ علم الٰہی کا غلط ہونا لازم آتا ہے، العیاذ باللہ۔

یہیں سے عصمت انبیاء علیہم السلام کا مسئلہ سمجھ میں آ جاتا ہے (كما نبه عليه ابو حيان فی البحر و فصّله مولانا قاسم العلوم والخيرات فی تصانيفه) پھر جب انبیاء علیہم السلام ادنیٰ عصیان سے پاک ہیں تو شرک اور خدا کے مقابلہ میں بغاوت کرنے کا امکان کہاں باقی رہ سکتا ہے، اس میں نصاریٰ کے اس دعوے کا بھی رد ہو گیا جو کہتے تھے کہ ابنیت و الوہیت مسیح کا عقیدہ ہم کو خود مسیح علیہ السلام نے تعلیم فرمایا ہے اور ان مسلمانوں کو بھی نصیحت کر دی گئی جنہوں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا تھا کہ ہم سلام کی بجائے آپ ﷺ کو سجدہ کیا کریں تو کیا حرج ہے اور اہل کتاب پر بھی تعریض ہو گئی جنہوں نے اپنے احبار و رہبان کو خدائی کا درجہ دے رکھا تھے (العیاذ باللہ)۔

تنبیہ: مَا كَانَ لِبَشَرٍ الخ میں ابوحیان کے نزدیک اسی طرح کی نفی ہے جیسے: **مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا** (النمل: ۶۰) میں، یا: **وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ** (آل عمران: ۱۴۵) میں وهو اصوب عندی۔

فائدہ: ۲ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ: موضح القرآن میں ہے: جس کو اللہ نبی بنائے اور وہ لوگوں کو کفر و شرک سے نکال کر مسلمانی میں لائے، پھر کیونکر ان کو کفر سکھلائے گا، ہاں تم کو (اے اہل کتاب!) یہ کہتا ہے کہ تم میں جو آگے دینداری تھی، کتاب کا پڑھنا اور سکھانا وہ نہیں رہی، اب میری صحبت میں پھر وہی کمال حاصل کرو، اور عالم، حکیم، عارف، مدبر، متقی اور پکے خدا پرست بن جاؤ، اور یہ بات اب قرآن کریم پڑھنے پڑھانے اور سیکھنے سکھانے سے حاصل ہو سکتی ہے۔

فائدہ: ۳؎ اَنۡ تَتَّخِذُوا الۡمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرۡبَابًا: جیسے نصاریٰ نے مسیح روح القدس کو، بعض یہود نے عزیر کو، اور بعض مشرکین نے فرشتوں کو ٹھہرالیا تھا، جب فرشتے اور پیغمبر خدائی میں شریک نہیں ہوسکتے تو پتھر کے بت اور صلیب کی لکڑی تو کس شمار میں ہے۔

فائدہ: ۴؎ اَيَاۡمُرُكُمۡ بِالۡكُفۡرِ بَعۡدَ اِذۡ اَنۡتُمۡ مُّسۡلِمُوۡنَ: یعنی پہلے تو ''ربانی'' (اللہ والا) اور مسلم موحد بنانے میں کوشش کی، جب لوگوں نے قبول کرلیا تو کیا پھر انہیں شرک وکفر کی طرف لے جا کر اپنی ساری محنت اور کمائی اپنے ہاتھ سے برباد کردے گا؟ یہ بات سمجھ میں نہیں آسکتی۔

وَاِذۡ اَخَذَ اللّٰهُ مِيۡثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَاۤ اٰتَيۡتُكُمۡ مِّنۡ كِتٰبٍ وَّحِكۡمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمۡ رَسُوۡلٌ مُّصَدِّقٌ

اور جب لیا اللہ نے عہد نبیوں سے کہ جو کچھ میں نے تم کو دیا کتاب اور علم پھر آوے تمہارے پاس کوئی رسول کہ سچا بتادے

لِّمَا مَعَكُمۡ لَتُؤۡمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنۡصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ ءَاَقۡرَرۡتُمۡ وَاَخَذۡتُمۡ عَلٰى ذٰلِكُمۡ اِصۡرِىۡ ؕ

تمہارے پاس والی کتاب کو تو اس رسول پر ایمان لاؤ گے اور اس کی مدد کرو گے، فرمایا کہ کیا تم نے اقرار کیا اور اس شرط پر میرا عہد قبول کیا

قَالُوۡۤا اَقۡرَرۡنَا ؕ قَالَ فَاشۡهَدُوۡا وَاَنَا مَعَكُمۡ مِّنَ الشّٰهِدِيۡنَ ﴿۸۱﴾

بولے ہم نے اقرار کیا۔ فرمایا تو اب گواہ ہو اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہ ہوں ۱؎

خلاصہ تفسیر: پیچھے اہل کتاب کی ان نقصان دہ کارروائیوں کا ذکر تھا جو اسلام کے خلاف ان سے صادر ہوتی تھیں، آگے یہ بتلاتے ہیں کہ مخالفت وضرر رسانی کی تو ان کو کب اجازت ہوسکتی ہے، ان پر تو خود اسلام قبول کرنا واجب تھا، کیونکہ اس کا عہد سب انبیاء کرام تک سے لیا گیا ہے، سو ان کی امتوں پر تو بدرجہ اولیٰ واجب ہوگا۔

اور (وہ وقت بھی قابل ذکر ہے) جب کہ اللہ تعالیٰ نے عہد لیا (حضرات) انبیاء سے کہ جو کچھ تم کو کتاب اور علم (شریعت) دوں (اور) پھر تمہارے پاس کوئی (اور) پیغمبر آئے جو مصداق (اور موافق) ہو اس (علامت) کا جو تمہارے پاس (کی کتاب اور شریعت میں) ہے (یعنی شریعت کے معتبر دلائل سے اس کا رسول ہونا ثابت ہو) تو تم ضرور اس رسول (کی رسالت) پر (دل سے) اعتقاد بھی لانا اور (ہاتھ پاؤں سے) اس کی مدد بھی کرنا (پھر یہ عہد بیان کرکے ارشاد) فرمایا کہ آیا تم نے قرار کیا اور لیا اس (مضمون) پر میرا عہد (اور حکم قبول کیا) وہ بولے کہ ہم نے اقرار کیا، ارشاد فرمایا تو (اپنے اس اقرار پر) گواہ بھی رہنا (کیونکہ گواہی سے پھرنے کو ہر شخص ہر حال میں برا سمجھتا ہے، اور اقرار کرنے والا چونکہ صاحب غرض ہوتا ہے اس کا پھر جانا چنداں بعید نہیں ہوتا، اسی طرح تم صرف اقراری نہیں، بلکہ گواہ کی طرح اس پر قائم رہنا) اور میں (بھی) اس (مضمون) پر تمہارے ساتھ گواہوں میں سے (یعنی واقعہ کی اطلاع اور علم رکھنے والا) ہوں۔

وَاِذۡ اَخَذَ اللّٰهُ مِيۡثَاقَ النَّبِيّٖنَ: انبیاء کرام سے تو اس عہد کا لیا جانا قرآن مجید میں صراحت کے ساتھ موجود ہے، باقی ان کی امتوں سے ممکن ہے کہ اس وقت بھی لیا گیا ہو، ورنہ انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ سے تو ان سے عہد لیا جانا ظاہر ہے، تمام کتابوں میں یہ حکم تاکید کے ساتھ ہے کہ جس زمانہ میں جو رسول آئے اس کا اتباع کرنا چاہیے، یہاں تک کہ آخر میں جناب رسول اللہ ﷺ اس کے مصداق ہوئے، اسی لیے اہل کتاب کو یہ عہد یاد دلایا گیا کہ جب نبی ﷺ کی رسالت دلائل سے تم کو ثابت ہوچکی تو اس عہد کے مطابق تم اہل کتاب پر یقینا آپ ﷺ کی تصدیق اور نصرت فرض ہے، اور یہی حاصل ہے اسلام کا۔

اور یہ عہد یا تو عالم ارواح میں بھی لیا گیا ہو یا صرف دنیا میں وحی کے ذریعہ لیا گیا ہو، اس پر یہ شبہ ہوتا ہے کہ عالم ارواح کا عہد تو ہمیں یاد نہیں؟ جواب یہ ہے کہ اگر ہمیں کوئی بات یاد نہ رہے اور کوئی معتبر شخص بیان کردے کہ تم نے یہ عہد کیا تھا مگر تم بھول گئے تو اس کا بھی پورا کرنا اپنی ہی یاد کی

طرح واجب ہوتا ہے، چنانچہ یہ عہد قطعی دلائل سے، سچی وحی اور سچے رسول کی زبانی ہم کو یاد دلا دیا گیا۔

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ (الی قوله) لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ: اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ علماء اور بزرگوں پر لازم ہے کہ جو کوئی دین یا علم وعمل کے اندر ان سے بلند یا برابر بھی ہو تو بزرگ یا عالم کو اس سے شرم وحیا نہیں کرنی چاہیے، بلکہ اس کی تصدیق کرے اور اس سے مشورہ وغیرہ بھی لیتا رہے۔

* * *

فائدہ: [1] یعنی کوئی نبی اپنی بندگی کی تعلیم نہیں دے سکتا، بندگی صرف ایک خدا کی سکھائی جاتی ہے، البتہ انبیاء کا حق یہ ہے کہ لوگ ان پر ایمان لائیں، ان کا کہا مانیں، اور ہر قسم کی مدد کریں، عام لوگوں کا تو کیا ذکر ہے، حق تعالیٰ نے خود پیغمبروں سے بھی یہ پختہ عہد لے چھوڑا ہے کہ جب تم میں سے کسی نبی کے بعد دوسرا نبی آئے (جو یقیناً پہلے انبیاء اور ان کی کتابوں کی اجمالاً یا تفصیلاً تصدیق کرتا ہوا آئے گا) تو ضروری ہے کہ پہلا نبی پچھلے کی صداقت پر ایمان لائے اور اس کی مدد کرے، اگر اس کا زمانہ پائے تو بذات خود بھی اور نہ پائے تو اپنی امت کو پوری طرح ہدایت وتاکید کر جائے کہ بعد میں آنے والے پیغمبر پر ایمان لا کر اس کی اعانت ونُصرت کرنا، کہ یہ وصیت کر جانا بھی اس کی مدد کرنے میں داخل ہے، اس عام قاعدہ سے روز روشن کی طرح ظاہر ہے کہ خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے اور ان کی مدد کرنے کا عہد بلا استثناء تمام انبیائے سابقین سے لیا گیا ہوگا اور انہوں نے اپنی اپنی اُمتوں سے یہ ہی قول وقرار لئے ہوں گے، کیونکہ ایک آپ ﷺ ہی کی مخزن الکمالات ہستی تھی جو عالم غیب میں سب سے پہلے اور عالم شہادت میں سب انبیاء کے بعد جلوہ افروز ہونے والی تھی، اور جس کے بعد کوئی نبی آنے والا نہ تھا، اور آپ ہی کا وجود باوجود تمام انبیائے سابقین اور کتب سماویہ کی حقانیت پر مہر تصدیق ثبت کرنے والا تھا، چنانچہ حضرت علی رضی اللہ اور ابن عباس رضی اللہ وغیرہ سے منقول ہے کہ اس قسم کا عہد انبیاء سے لیا گیا، اور خود آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر آج موسیٰ علیہ السلام زندہ ہوتے تو ان کو میری اتباع کے بدون چارہ نہ ہوتا، اور فرمایا کہ عیسیٰ علیہ السلام جب نازل ہوں گے تو کتاب اللہ (قرآن کریم) اور تمہارے نبی کی سنت پر فیصلے کریں گے، محشر میں شفاعت کبریٰ کے لئے پیش قدمی کرنا اور تمام بنی آدم کا آپ کے جھنڈے تلے جمع ہونا اور شب معراج میں بیت المقدس کے اندر تمام انبیاء کی امامت کرانا حضور ﷺ کی اسی سیادت عامہ اور امامت عظمیٰ کے آثار میں سے ہے، اللّٰھم صل علی سیدنا محمد و علی آل سیدنا محمد و بارك و سلم۔

فائدہ: [2] یہ الفاظ محض عہد کی تاکید واہتمام کے لئے فرمائے، کیونکہ جس عہد نامہ پر خدا تعالیٰ اور پیغمبروں کی گواہی ہو، اس سے زیادہ پکی دستاویز کہاں ہوسکتی ہے۔

فَمَنْ تَوَلّٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۸۲﴾

پھر جو کوئی پھر جاوے اس کے بعد تو وہی لوگ ہیں نافرمان

خلاصہ تفسیر: پیچھے عہد کا بیان تھا، اب عہد کے توڑنے پر وعید بیان کی جاتی ہے:

سو جو شخص (امتوں میں سے) روگردانی کرے گا (اس عہد سے) بعد اس کے (کہ انبیاء تک سے عہد لیا گیا ہے اور امتیں تو کس شمار میں ہیں) تو ایسے ہی لوگ (پوری) نافرمانی کرنے والے (یعنی کافر) ہیں۔

چونکہ اس آیت میں انبیاء کو خطاب نہیں، اور روگردانی کرنے والے بھی امتوں ہی کے لوگ تھے، اس لیے آیت کو عام کرنے کی ضرورت نہیں، بلکہ یہ وعید صرف امتیوں کو سنانے کے لیے ہے، یعنی مومنوں میں جو کوئی اس عہد سے اعراض کرے گا، خود انبیاء معصومین سے تو اس کا احتمال ہی نہیں، اس لئے لامحالہ امت کے افراد مراد ہوں گے۔

* * *

فائدہ: جس چیز کا عہد خدا نے تمام انبیاء سے لیا اور انبیاء نے اپنی اپنی امتوں سے، اب اگر دنیا میں کوئی شخص اس سے رُوگردانی کرے

تو بلا شبہ پرلے درجہ کا بدعہد اور نافرمان ہوگا، بائبل، اعمال رسل، باب ۳، آیت ۲۱ میں ہے: ''ضرور ہے کہ آسمان اسے لئے رہے اس وقت تک کہ سب چیزیں جن کا ذکر خدا نے اپنے سب پاک نبیوں کی زبانی شروع سے کیا، اپنی حالت پر آویں کیونکہ موسیٰ علیہ السلام نے باپ دادوں سے کہا کہ خداوند جو تمہارا خدا ہے، تمہارے بھائیوں میں سے تمہارے لئے ایک نبی میری مانند اٹھائے گا، جو کچھ وہ تمہیں کہے اس کی سب سنو''۔

اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا

اب کوئی اور دین ڈھونڈتے ہیں سوا دین اللہ کے اور اسی کے حکم میں ہے جو کوئی آسمان اور زمین میں ہے خوشی سے یا لاچاری سے ۱

وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ﴿۸۳﴾

اور اسی کی طرف سب پھر جاویں گے ۲

خلاصه تفسیر: (پیچھے عہد اسلام کے پورا کرنے کا واجب ہونا اور اس عہد کے توڑنے کی حرمت مذکور تھی، اب اس عہد شکنی پر زجر کی جاتی ہے:) کیا (دین اسلام سے جس کا عہد لیا گیا ہے روگردانی کر کے) پھر (اس) دین خداوندی کے سوا اور کسی طریقہ کو چاہتے ہیں، حالانکہ حق تعالیٰ (کی یہ شان ہے کہ ان) کے (حکم کے) سامنے سب سرافگندہ ہیں جتنے آسمانوں میں (ہیں) اور (جتنے) زمین میں ہیں (بعض) خوشی (اور اختیار سے) اور (بعض) مجبوری سے، اور (اول تو اس عظمت ہی کا تقاضہ اور مطالبہ یہ تھا کہ کوئی ان کے عہد کی مخالفت نہ کرے، خاص کر جبکہ آئندہ سزا کا بھی ڈر ہو، چنانچہ) سب خدا ہی کی طرف (قیامت کے روز) لوٹائے (بھی) جائیں گے (اور اس وقت مخالفین کو سزا ہوگی)۔

طَوْعًا وَّكَرْهًا: یعنی خوشی اور مجبوری سے، حق تعالیٰ کے احکام دو قسم کے ہیں: ① تکوینی: یعنی جن کے آثار انسان کے اختیار میں نہیں، جیسے زندگی، موت اور بیماری وغیرہ، اس میں تو سب خدا کے مسخر اور بے اختیار ہیں ② تشریعی: یعنی جن کے آثار انسان کے اختیار میں ہیں، جیسے نماز پڑھنے کا حکم کہ اس کا اثر تعمیل یعنی نماز پڑھنا ہے جو بندہ کے اختیار میں ہے، حاصل مقام یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے تکوینی احکام کے تو سب ہی مسخر ہیں، کوئی اس کے خلاف کر ہی نہیں سکتا، کرھا سے یہی تسخیری اطاعت مراد ہے، اور طوعا سے تشریعی احکام کی اختیاری اطاعت مراد ہے، تو حکم کی پہلی قسم تکوینی تو سب ہی پر بلا اختیار جاری ہے، اور دوسری قسم تشریعی یعنی تمام شرعی احکام ان کو بھی بہت لوگ خوشی سے بجالاتے ہیں، جن میں فرشتے ہیں اور انسان و جنات میں سے ایمان والے لوگ ہیں، جس سے حق تعالیٰ کی عظمت نمایاں ہے، اب بعض لوگ جو احکام شرعیہ میں مخالفت کرتے ہیں تو کیا کوئی دوسرا اس عظمت کا مالک ہے جس کی موافقت کے لیے یہ لوگ خدا کی مخالفت کرتے ہیں۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی ہمیشہ سے خدا کا دین اسلام رہا ہے، جس کے معنی ہیں حکم برداری، مطلب یہ ہے جس وقت حق تعالیٰ کا جو حکم کسی راست باز اور صادق القول پیغمبر کے توسط سے پہنچے، اس کے سامنے گردن جھکا دو، پس آج جو احکام و ہدایات سید المرسلین خاتم الانبیاء لے کر آئے، وہ ہی خدا کا دین ہے، کیا اسے چھوڑ کر نجات و فلاح کا کوئی اور راستہ ڈھونڈتے ہیں؟ خوب سمجھ لیں کہ خدا کا دین چھوڑ کر کہیں ابدی نجات اور حقیقی کامیابی نہیں مل سکتی، آدمی کو سزاوار نہیں کہ اپنی خوشی اور شوق و رغبت سے اس خدا کی حکم برداری اختیار نہ کرے، جس کے حکم تکوینی کے نیچے تمام آسمان و زمین کی چیزیں ہیں، خواہ وہ حکم تکوینی ان کے ارادہ اور خوشی کے توسط سے ہو، جیسے فرشتے اور فرمانبردار بندوں کی اطاعت میں، یا مجبوری اور لاچاری سے، جیسے عالم کا ذرہ ذرہ ان آثار و حوادث میں جن کا وقوع و ظہور بدون مخلوق کی مشیت و ارادہ کے ہوتا ہے حق تعالیٰ کی مشیت و ارادہ کا تابع ہے۔

فائدہ: ۲ سب کو آخر کار جب وہیں لوٹ کر جانا ہے تو عقل مند کو چاہیے کہ پہلے سے تیاری کر رکھے، یہاں نافرمانیاں کیں تو وہاں کیا منہ دکھلائے گا۔

قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ

تو کہہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور جو کچھ اترا ہم پر اور جو کچھ اترا ابراہیم پر اور اسماعیل پر اور اسحاق پر اور یعقوب پر

وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِىَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۖ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۚ

اور اس کی اولاد پر اور جو ملا موسیٰ کو اور عیسیٰ کو اور جو ملا سب نبیوں کو ان کے پروردگار کی طرف سے، ہم جدا نہیں کرتے ان میں کسی کو

وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۸۴﴾

اور ہم اسی کے فرمانبردار ہیں

خلاصہ تفسیر: پیچھے اسلام کی حقانیت کا بیان تھا، اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اسلام کی حقیقت ظاہر کردینے کا ارشاد ہے:

(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم!) آپ (دین اسلام کے اظہار کے لئے خلاصہ کے طور پر یہ) فرمادیجیے کہ ہم ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور اس (حکم) پر جو ہمارے پاس بھیجا گیا، اور اس (حکم) پر جو (حضرت) ابراہیم واسماعیل ویعقوب (علیہم السلام) اور اولاد یعقوب (میں جو نبی گزرے ہیں ان) کی طرف بھیجا گیا، اور اس (حکم ومعجزہ) پر بھی جو (حضرت) موسیٰ وعیسیٰ (علیہما السلام) اور دوسرے نبیوں کو دیا گیا ان کے پروردگار کی طرف سے (سو ہم ان سب پر ایمان رکھتے ہیں، اور ایمان بھی) اس کیفیت سے کہ ہم ان (حضرات) میں سے کسی ایک میں بھی (ایمان لانے کے معاملہ میں) تفریق نہیں کرتے (کہ کسی پر ایمان رکھیں اور کسی پر نہ رکھیں) اور ہم تو اللہ ہی کے مطیع ہیں (اس نے ہی دین کا طریقہ ہم کو بتلایا ہم نے اختیار کرلیا)۔

* * *

فائدہ: یعنی جو کچھ جس زمانہ میں خدا کی طرف سے اترا، یا کسی پیغمبر کو دیا گیا، ہم بلاتفریق سب کو حق مانتے ہیں، ایک مسلم فرمانبردار کا یہ وتیرہ نہیں کہ خدا کے بعض پیغمبروں کو مانے، بعض کو نہ مانے، گویا اخیر میں ونحن له مسلمون کہہ کر اسلام کی حقیقت بتلادی اور آگاہ کردیا کہ اسلام کسی نبی برحق اور کسی آسمانی کتاب کی تکذیب کا روادار نہیں، اس کے نزدیک جس طرح قرآن کریم اور پیغمبر عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا نہ ماننا کفر ہے، ایسے ہی کسی ایک نبی یا کتاب سماوی کا انکار کرنے سے بھی انسان کافر ہوجاتا ہے، بیشک پیغمبر آخرالزمان کی یہی شان ہونی چاہیے کہ وہ تمام پہلی کتابوں اور نبوتوں کا مصدق ہو، اور اس طرح کی تمام اقوام کو جن کے پاس مقامی 'نذیر' و 'ہادی' آتے رہے تھے، جامعیت کبریٰ کے سب سے بڑے جھنڈے کے نیچے جمع ہونے کا راستہ بتلائے۔

تنبیہ: اسی قسم کی آیت پارہ 'الم' کے آخیر میں آچکی ہے، اس کے فوائد ملاحظہ کرلئے جائیں۔

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِى الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۸۵﴾

اور جو کوئی چاہے سوا دین اسلام کے اور کوئی دین سو اس سے ہرگز قبول نہ ہوگا[1] اور وہ آخرت میں خراب ہے[2]۔

خلاصہ تفسیر: اب دین اللہ یعنی اسلام کے علاوہ کسی دوسرے طریقے کا عنداللہ مقبول نہ ہونا بتلاتے ہیں:

اور جو شخص اسلام کے سوا کسی دوسرے دین کو طلب کرے گا تو وہ (دین) اس (شخص) سے (خدا تعالیٰ کے نزدیک) مقبول (ومنظور) نہ ہوگا، اور (وہ شخص) آخرت میں تباہ کاروں میں سے ہوگا (یعنی نجات نہ پائے گا)۔

* * *

فائدہ: [1] یعنی جب خدا کا دین (اسلام) اپنی مکمل صورت میں آپہنچا تو کوئی جھوٹا یا نامکمل دین قبول نہیں کیا جاسکتا، طلوع آفتاب کے بعد

مٹی کے چراغ جلانا یا گیس بجلی اور ستاروں کی روشنی تلاش کرنا محض لغو اور کھلی حماقت ہے، مقامی نبوتوں اور ہدایتوں کا عہد گزر چکا، اب سب سے بڑی آخری اور عالمگیر نبوت وہدایت سے ہی روشنی حاصل کرنی چاہیے کہ یہ ہی تمام روشنیوں کا خزانہ ہے جس میں پہلی تمام روشنیاں مدغم ہو چکی ہیں:

فانك شمس والملوك كواكب إذا طلعت لم يبد منهن كوكب

فائدہ: ۲ یعنی ثواب وکامیابی سے قطعاً محروم ہو، اس سے بڑا خسارہ کیا ہوگا کہ راس المال ہی کھو بیٹھا، حق تعالیٰ نے جس صحیح فطرت پر پیدا کیا تھا اپنے سوء اختیار اور غلط کاری سے اسے بھی تباہ کر ڈالا۔

كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَشَهِدُوْٓا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّجَآءَهُمُ

کیونکر راہ دے گا اللہ ایسے لوگوں کو کہ کافر ہو گئے ایمان لا کر اور گواہی دے کر کہ بیشک رسول سچا ہے اور آئیں ان کے پاس

الْبَيِّنٰتُ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۸۶﴾

نشانیاں روشن، اور اللہ راہ نہیں دیتا ظالم لوگوں کو

خلاصہ تفسیر: آگے اسلام سے اعراض کرنے والوں میں سے ان لوگوں کا بیان ہے جو اسلام قبول کر کے پھر اس سے پھر گئے، ان میں بھی دو طرح کے لوگ ہیں: ① بعض تو کفر ہی پر قائم رہے ② بعض پھر تائب ہو کر اسلام لے آئے، دونوں کا بیان آتا ہے، پہلے ان مرتد ہونے والوں کا ذکر ہے جو کفر ہی پر قائم رہے اور کفر کو ہدایت سمجھتے رہے، چونکہ ان کا یہ دعویٰ تھا کہ خدا نے اب ہمیں ہدایت نصیب کی ہے اس لیے ان کی مذمت کے ساتھ اس دعوی کی بھی نفی کرتے ہیں کہ:

(بھلا) اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو کیسے ہدایت کریں گے جو کافر ہو گئے (دل سے) ایمان لانے کے بعد اور (زبان سے) اپنے اس اقرار کے بعد کہ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم دعوی رسالت میں) سچے ہیں، اور بعد اس کے کہ ان کو واضح دلائل (اسلام کی حقانیت کے) پہنچ چکے تھے، اور اللہ تعالیٰ ایسے بے ڈھنگے لوگوں کو ہدایت نہیں کیا کرتے۔

كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ: اس آیت سے بظاہر یہ شبہ ہوتا ہے کہ کسی کو مرتد ہونے کے بعد ہدایت نصیب نہیں ہوتی، حالانکہ واقعہ اس کے خلاف ہے، کیونکہ بہت سے لوگ مرتد ہونے کے بعد ایمان قبول کر کے ہدایت یافتہ بن جاتے ہیں۔

جواب یہ ہے کہ یہاں جو ہدایت کی نفی کی گئی ہے، اس کی مثال ہمارے محاورات میں ایسی ہے جیسے کسی بدمعاش کو کوئی حاکم اپنے ہاتھ سے سزا دے اور وہ کہے کہ مجھ کو حاکم نے اپنے ہاتھ سے خصوصیت عنایت فرمائی ہے، اور اس کے جواب میں کہا جائے کہ ایسے بدمعاش کو ہم خصوصیت کیوں دینے لگے، یعنی یہ امر خصوصیت ہی نہیں، اور یہ مطلب نہیں ہوتا کہ ایسا شخص کسی طرح قابل خصوصیت نہیں ہو سکتا اگرچہ شائستہ بن جائے۔

وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ: یعنی اللہ تعالیٰ بے ڈھنگے لوگوں کو ہدایت نہیں کیا کرتے، یہ مطلب نہیں کہ ایسوں کو کبھی اسلام کی توفیق نہیں دیتے، بلکہ مقصود یہ ہے کہ وہ جو کافر ہونے کے بعد یہ کہتے ہیں کہ خدا نے اب ہم کو ہدایت نصیب کی تو خدا تعالیٰ ایسی بے ڈھنگی ہدایت کیوں کرنے لگے، یہ تو شیطانی ہدایت ہے کہ وہ لوگ کفر کا بے ڈھنگا راستہ اختیار کر کے اپنے کو ہدایت پر سمجھے ہوئے ہیں، خدا تعالیٰ کے نزدیک یہ لوگ یقیناً گمراہ ہیں، پس اس تقریر سے وہ اشکال جاتا رہا کہ مرتد ہونے کے بعد بھی بسا اوقات ہدایت ہو جاتی ہے، جواب یہ ہوا کہ یہاں ہدایت کرنے کی نفی نہیں، بلکہ وہ لوگ جو اپنے کو کفر کے بعد ہدایت پر سمجھتے تھے ان کے ہدایت پر ہونے کی نفی ہے خوب سمجھ لو۔

* * *

فائدہ: جن لوگوں نے وضوح حق کے بعد جان بوجھ کر کفر اختیار کیا، یعنی دل میں یقین رکھتے ہیں اور آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں بلکہ اپنی خاص مجلسوں میں اقرار کرتے ہیں کہ یہ رسول سچا ہے، اسکی حقانیت وصداقت کے روشن دلائل، کھلے نشانات اور صاف بشارات انکو پہنچ چکی ہیں، اس پر بھی کبر

وحسد اور حب جاہ و مال، اسلام قبول کرنے اور کفر و عدوان کے چھوڑنے سے مانع ہے جیسا کہ عموماً یہود و نصاریٰ کا حال تھا، ایسے ہٹ دھرم، ضدی معاندین کی نسبت کیونکر توقع کی جاسکتی ہے کہ باوجود اس طرح کا رویہ قائم رکھنے کے خدا تعالیٰ انکو نجات و فلاح اور اپنی خوشنودی کے راستہ پر لے جائے گا یا جنت تک پہنچنے کی راہ دے گا، اسکی عادت نہیں کہ ایسے بے انصاف متعصب ظالموں کو حقیقی کامیابی کی راہ دے، اسی پر ان بدبختوں کو قیاس کرلو جو قلبی معرفت و یقین کے درجہ سے بڑھکر ایک مرتبہ مسلمان بھی ہو چکے تھے، پھر دنیاوی اغراض اور شیطانی اغواء سے مرتد ہوگئے، یہ ان پہلوں سے زیادہ کج رو اور بے حیا واقع ہوئے، اس لئے ان سے بڑھ کر لعنت و عقوبت کے مستحق ہوں گے۔

أُولَٰئِكَ جَزَاؤُهُمْ أَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ﴿٨٧﴾

ایسے لوگوں کی سزا یہ ہے کہ ان پر لعنت ہے اللہ کی اور فرشتوں کی اور لوگوں کی سب کی ۱؎

خَالِدِينَ فِيهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُونَ ﴿٨٨﴾

ہمیشہ رہیں گے اس میں ۲؎ نہ ہلکا ہوگا ان سے عذاب اور نہ ان کو فرصت ملے ۳؎

خلاصہ تفسیر: (اور) ایسے لوگوں کی سزا یہ ہے کہ ان پر اللہ تعالیٰ کی بھی لعنت ہوتی ہے اور فرشتوں کی بھی اور (بہتیرے) آدمیوں کی بھی (غرض) سب کی (اور پھر وہ لعنت بھی ایسے طور پر رہے گی کہ) وہ ہمیشہ ہمیشہ کو اسی (لعنت) میں رہیں گے (اور چونکہ اس لعنت کا اثر جہنم ہے تو حاصل یہ ہوا کہ وہ جہنم میں ہمیشہ رہیں گے اور) ان پر سے عذاب ہلکا بھی نہ ہونا پائے گا اور نہ (داخل ہونے سے قبل) ان کو (کسی میعاد تک) مہلت ہی دی جائے گی۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی خدا، فرشتے اور مسلمان لوگ سب ان پر لعنت بھیجتے ہیں، بلکہ ہر انسان حتٰی کہ وہ خود بھی اپنے اوپر لعنت کرتے ہیں، جب کہتے ہیں کہ ظالموں اور جھوٹوں پر خدا کی لعنت، گو اس وقت سمجھتے نہیں کہ یہ لعنت خود ان ہی پر واقع ہو رہی ہے۔

فائدہ: ۲؎ یعنی اس لعنت کا اثر ہمیشہ رہے گا، دنیا میں پھٹکار اور آخرت میں خدا کی مار۔

فائدہ: ۳؎ یعنی انہیں نہ کسی وقت عذاب کی شدت میں کمی محسوس ہوگی اور نہ ذرا سی دیر کے لئے عذاب ملتوی کر کے آرام دیا جائے گا۔

إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا مِنْ بَعْدِ ذَٰلِكَ وَأَصْلَحُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿٨٩﴾

مگر جنہوں نے توبہ کی اس کے بعد اور نیک کام کئے، تو بیشک اللہ غفور رحیم ہے

خلاصہ تفسیر: (اب ان کا بیان ہے جو پھر مسلمان ہوگئے، ان کو اس حکم سے مستثنیٰ فرماتے ہیں یعنی) ہاں! مگر جو لوگ توبہ کرلیں اس (کفر) کے بعد (یعنی مسلمان ہو جائیں) اور اپنے (دل) کو (بھی) سنواریں (یعنی منافقانہ طور پر صرف زبان سے توبہ کافی نہیں) سو بیشک (ایسوں کے لئے) اللہ تعالیٰ بخش دینے والے رحمت کرنے والے ہیں۔

* * *

فائدہ: ایسے سخت بے حیا مجرموں اور شدید ترین باغیوں کو کون بادشاہ معافی دے سکتا ہے؟ لیکن یہ اس غفور رحیم ہی کی بارگاہ ہے کہ اس قدر شدید جرائم اور بغاوتوں کے بعد بھی اگر مجرم نادم ہو کر سچے دل سے توبہ اور نیک چال چلن اختیار کرلے تو سب گناہ یک قلم معاف کر دیئے جاتے ہیں، اللّٰهُمَّ اغْفِرْ ذُنُوبِي فَإِنَّكَ غَفُورٌ رَحِيمٌ، آمین۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ كَفَرُوۡا بَعۡدَ اِیۡمَانِهِمۡ ثُمَّ ازۡدَادُوۡا كُفۡرًا لَّنۡ تُقۡبَلَ تَوۡبَتُهُمۡ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الضَّآلُّوۡنَ ﴿۹۰﴾

بیشک جو لوگ منکر ہوئے مان کر پھر بڑھتے رہے انکار میں ہرگز قبول نہ ہوگی ان کی توبہ اور وہی ہیں گمراہ

خلاصہ تفسیر: پیچھے توبہ کرنے والوں کے لیے مغفرت اور رحمت کا وعدہ ہے، اور ظاہر ہے کہ اس خاص توبہ کی حقیقت یہ ہے کہ اسلام لے آئے، مگر احتمال تھا کہ شاید کوئی مرتد توبہ کا لفظ سن کر صرف برے کاموں سے توبہ کرنا سمجھے جن کو کافر بھی برا سمجھتے ہیں اور بغیر اسلام لائے گناہوں سے توبہ کر کے مغفرت ورحمت کا اپنے کو مستحق سمجھے، اس لیے اب صراحت فرماتے ہیں کہ بغیر اسلام کے محض گناہوں سے توبہ کرنا عنداللہ مقبول نہیں۔

بیشک جو لوگ کافر ہوئے اپنے ایمان لانے کے بعد پھر بڑھتے رہے کفر میں (یعنی کفر پر دوام رکھا، ایمان نہیں لائے) ان کی توبہ (جو کہ دوسرے گناہوں سے کرتے ہیں) ہرگز مقبول نہ ہوگی (کیونکہ گناہوں سے توبہ کرنا ایک طاعت ونیکی ہے، اور کوئی اطاعت ونیکی بغیر ایمان کے مقبول نہیں) اور ایسے لوگ (اس توبہ کے بعد بھی بدستور) پکے گمراہ ہیں۔

یہ حکم مرتد اور اصلی کافر کے لیے یکساں ہے کہ ایمان کے بغیر گناہوں سے توبہ کسی کی مقبول نہیں۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ كَفَرُوۡا بَعۡدَ اِیۡمَانِهِمۡ ثُمَّ ازۡدَادُوۡا كُفۡرًا: روح المعانی میں ہے کہ وہ توبہ ہی نہیں کرتے تا کہ قبول ہو، کیونکہ ان کو اس کی توفیق ہی نہیں، احقر کہتا ہے کہ یہی عادۃ اللہ ہے اس شخص کے بارے میں جو اہل اللہ کے طریق کی طرف متوجہ ہوا ہو، پھر تعطل یا انکار کی راہ سے اس سے اعراض کرلے تو پھر اکثر اس کی طرف لوٹنے کی اسے توفیق نہیں ہوتی، بلکہ وہ محروم (مخذول) رہتا ہے، پھر بعض اوقات یہ اس سے اشد کی طرف چلا جاتا ہے کہ اہل اللہ سے عداوت ونفرت رکھنے لگتا ہے، پھر وہ دین کے بڑے جز سے خارج ہو جاتا ہے، نعوذ باللہ منہ۔

* * *

فائدہ: یعنی جو لوگ حق کو مان کر اور سمجھ بوجھ کر منکر ہوئے، پھر اخیر تک انکار میں ترقی کرتے رہے، نہ کبھی کفر سے ہٹنے کا نام لیا، نہ حق اور اہل حق کی عداوت ترک کی، بلکہ حق پرستوں کے ساتھ بحث ومناظرہ اور جنگ وجدل کرتے رہے، جب مرنے کا وقت آیا اور فرشتے جان نکالنے لگے تو توبہ کی سوجھی، یا کبھی کسی مصلحت سے ظاہر طور پر رسمی الفاظ توبہ کہہ لئے، یا کفر پر برابر قائم رہتے ہوئے دوسرے اعمال سے توبہ کرلی جنہیں اپنے زعم میں گناہ سمجھ رہے تھے، یہ توبہ کسی کام کی نہیں، بارگاہ رب العزت میں اس کے قبول کی کوئی امید نہ رکھیں، ایسے لوگوں کو سچی توبہ نصیب ہی نہ ہوگی جو قبول ہو، ان کا کام ہمیشہ گمراہی کی وادیوں میں پڑے بھٹکتے رہنا ہے۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ كَفَرُوۡا وَمَاتُوۡا وَهُمۡ كُفَّارٌ فَلَنۡ یُّقۡبَلَ مِنۡ اَحَدِهِمۡ مِّلۡءُ الۡاَرۡضِ ذَهَبًا

بے شک جو لوگ کافر ہوئے اور مرگئے کافر ہی تو ہرگز قبول نہ ہوگا کسی ایسے سے زمین بھر کر سونا اور

وَّلَوِ افۡتَدٰى بِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ وَّمَا لَهُمۡ مِّنۡ نّٰصِرِیۡنَ ﴿۹۱﴾ ع ۱۷

اور اگرچہ بدلا دیوے اس قدر سونا ان کو عذاب دردناک ہے اور کوئی نہیں ان کا مددگار۔

خلاصہ تفسیر: گزشتہ آیت میں جو یہ فرمایا تھا کہ کافر ہونے کے بعد کفر میں بڑھتے رہے اس سے مراد یہ تھی کہ مرتے دم تک کافر رہے، چنانچہ اس آیت میں اس مراد کو صاف صاف بیان فرماتے ہیں، نیز گذشتہ آیت بظاہر تو مرتد کے بارے میں تھی، حالانکہ مذکورہ حکم عام ہے، چنانچہ اس آیت میں عام لفظوں میں اس کو بیان فرماتے ہیں، نیز گذشتہ آیت توبہ کی قبولیت کی نفی تھی، البتہ یہ احتمال باقی تھا کہ شاید خالی توبہ قبول نہ ہو، کچھ فدیہ یعنی معاوضہ منظور ہو جائے، چنانچہ اس آیت میں اس کی بھی نفی کردی:

بیشک جو لوگ کافر ہوئے اور وہ مر بھی گئے حالت کفر ہی میں، سو ان میں سے کسی کا (کفارہ کے طور پر) زمین بھر سونا بھی نہ لیا جائے گا اگرچہ

وہ معاوضہ میں اس کو دینا بھی چاہے (اور بے دیئے تو کون پوچھتا ہے) ان لوگوں کو سزائے دردناک ہوگی اور ان کے حامی (مددگار) بھی نہ ہوں گے۔

وَّلَوِ افْتَدٰى بِهٖ: یعنی اگرچہ وہ معاوضہ میں اس کو دینا بھی چاہے، مطلب یہ کہ خود درخواست کر کے دینے میں ایک گونہ معذرت وندامت بھی ہوتی ہے، جس میں عادۃً قبولیت کی امید ہوتی ہے، بخلاف اس صورت کے کہ جرمانہ کے طور پر جبراً لیا جائے تو جب درخواست کر کے دینے کی صورت میں قبولیت کی امید نہیں تو جرمانہ دے کر چھوٹ جانے کی تو کیا امید ہوسکتی ہے۔

* * *

فائدہ: ۱۔ یعنی دنیا کی حکومتوں کی طرح وہاں سونے چاندی کی رشوت نہ چلے گی، وہاں تو صرف دولت ایمان کام دے سکتی ہے، فرض کرو ایک کافر کے پاس اگر اتنا ڈھیر سونے کا ہو جس سے ساری زمین بھر جائے اور وہ سب کا سب پُن خیرات کر دے تو خدا کے یہاں اس کی ذرہ برابر وقعت نہیں، نہ آخرت میں یہ عمل کچھ کام دے گا، کیونکہ عمل کی روح ایمان ہے، جو عمل روح ایمان سے خالی ہو مردہ عمل ہوگا، جو آخرت کی ابدی زندگی میں کام نہیں دے سکتا۔

فائدہ: ۲۔ یعنی اگر فرض کرو کافر کے پاس وہاں اتنا مال ہوا، اور خود اپنی طرف سے درخواست کر کے بطور فدیہ پیش کرے کہ یہ لے کر مجھے چھوڑ دو تب بھی قبول نہیں کیا جاسکتا اور بدون پیش کئے تو پوچھتا ہی کون ہے، دوسری جگہ فرمایا: اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لِيَفْتَدُوْا بِهٖ مِنْ عَذَابِ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (المائدہ:۳۶)

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۹۲﴾

ہرگز نہ حاصل کرسکو گے نیکی میں کمال جب تک نہ خرچ کرو اپنی پیاری چیز سے کچھ، اور جو چیز خرچ کرو گے سو اللہ کو معلوم ہے

خلاصہ تفسیر: گزشتہ آیت میں بتایا کہ اگر قیامت کے دن کفار اپنی رہائی کے لیے روئے زمین کے برابر بھی سونا خرچ کریں تو ذرہ برابر مفید نہ ہوگا، اب بتلاتے ہیں کہ البتہ مؤمنین اگر دنیا میں فی سبیل اللہ کچھ خرچ کریں تو آخرت میں ان کے لیے نافع ہوسکتا ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ کفار اگر آخرت میں اپنے مال سے فائدہ اٹھانا چاہیں تو دنیا میں مسلمان ہو کر فی سبیل اللہ خرچ کریں۔

(اے مسلمانو!) تم خیر کامل (یعنی اعظم ثواب) کو کبھی حاصل نہ کرسکو گے یہاں تک کہ اپنی (بہت) پیاری چیز کو (اللہ کی راہ میں) خرچ نہ کرو گے اور (یوں) جو کچھ بھی خرچ کرو گے (اگرچہ غیر محبوب چیز ہو) اللہ تعالیٰ اس کو خوب جانتے ہیں (مطلق ثواب اس پر بھی دے دیں گے، لیکن کامل ثواب حاصل کرنے کا وہی طریقہ ہے کہ محبوب چیز خرچ کرو)۔

معلوم ہوا کہ ثواب تو ہر خرچ کرنے سے ہوتا ہے جو اللہ کی راہ میں کیا جائے مگر زیادہ ثواب محبوب چیز کے خرچ کرنے سے ہوتا ہے۔

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ: یعنی تم خیر کامل کو کبھی حاصل نہ کرسکو گے یہاں تک کہ اپنی پیاری چیز کو خرچ نہ کرو گے، اس کے ساتھ ایک اور بدیہی مقدمہ ملا لیا جائے اور وہ یہ کہ طبعی طور پر انسان کو سب سے زیادہ محبوب چیز اپنی جان ہے تو آیت میں اس بات پر دلالت ہوئی کہ برّ اور قرب الٰہی کا حصول اپنی ہستی کو محبوب حقیقی کے لیے قربان کرنے پر موقوف ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی اللہ کو معلوم ہے کہ کیسی چیز خرچ کی، کہاں خرچ کی اور کس کے لئے خرچ کی؟ جتنی محبوب اور پیاری چیز جس طرح کے مصرف میں جس قدر اخلاص وحسن نیت سے خرچ کرو گے، اسی کے موافق اللہ تعالیٰ کے یہاں سے بدلہ ملنے کی امید رکھو، اعلیٰ درجہ کی نیکی حاصل کرنا چاہو تو اپنی محبوب وعزیز ترین چیزوں میں سے کچھ خدا کے راستہ میں نکالو، حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں: ''یعنی جس چیز سے دل بہت لگا ہو، اس کے خرچ کرنے کا بڑا درجہ ہے، یوں ثواب ہر چیز میں ہے، شاید یہود ونصاریٰ کے ذکر میں یہ آیت اس واسطے نازل فرمائی کہ ان کو اپنی ریاست بہت عزیز تھی، جس کے تھامنے کو نبی ﷺ کے تابع نہ ہوتے تھے، تو جب تک وہ ہی اللہ کے راستہ میں نہ چھوڑیں درجہ ایمان نہ پائیں گے''۔

گذشتہ آیت سے یہ مناسبت ہوئی کہ وہاں کافر کا مال خرچ کرنا بے کار بتلایا تھا، اب اس کے بالمقابل بتلا دیا کہ مومن جو خرچ کرے، اس سے نیکی میں کمال حاصل ہوتا ہے۔

كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِيٓ اِسْرَآءِيْلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسْرَآءِيْلُ عَلٰى نَفْسِهٖ

سب کھانے کی چیزیں حلال تھیں بنی اسرائیل کو مگر وہ جو حرام کر لی تھی اسرائیل نے اپنے اوپر

مِنْ قَبْلِ اَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرٰىةُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِالتَّوْرٰىةِ فَاتْلُوْهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۹۳﴾

تورات نازل ہونے سے پہلے [۱] تو کہہ! لاؤ تورات اور پڑھو اگر سچے ہو [۲]

خلاصہ تفسیر: پیچھے آیتوں میں اہل کتاب سے گفتگو چلی آ رہی ہے، آگے بھی ایک خاص گفتگو کا بیان ہوتا ہے، جس کا قصہ روح المعانی میں یہ نقل کیا ہے کہ جب حضور ﷺ نے اپنا ملت ابراہیمی پر ہونا بیان فرمایا تو یہود نے اعتراض کیا کہ آپ اونٹ کا گوشت اور دودھ استعمال کرتے ہیں، حالانکہ ابراہیم علیہ السلام پر حرام تھا، اللہ تعالیٰ اس آیت میں ان کے اس قول کی تردید فرماتے ہیں۔

(جن کھانے کی چیزوں میں گفتگو ہے یہ) سب کھانے کی چیزیں (حضرت ابراہیم کے وقت سے ہرگز حرام نہیں چلی آ رہی، بلکہ یہ چیزیں) نزول توراۃ کے قبل باستثناء اس کے (یعنی اونٹ کے گوشت کے) جس کو حضرت یعقوب نے (ایک خاص وجہ سے) اپنے نفس پر حرام کر لیا تھا (اور پھر وہ ان کی اولاد میں بھی حرام چلا آیا، باقی سب چیزیں خود) بنی اسرائیل (تک) پر (بھی) حلال تھیں (تو ابراہیم علیہ السلام کے وقت سے ان کے حرام ہونے کا دعویٰ کب صحیح ہو سکتا ہے؟، اور اگر اب بھی یہود کا یہ چیزیں حرام ہونے کا دعویٰ ہے تو اے محمد ﷺ! ان سے) فرما دیجیے کہ (اچھا تو) پھر توراۃ لاؤ پھر اس کو (لا کر) پڑھو اگر تم (مذکورہ دعویٰ میں) سچے ہو (تو اس میں کوئی آیت وغیرہ اس مضمون کی نکال کر دکھا دو، کیونکہ نقلی گفتگو میں شرعی دلیل کی ضرورت ہے اور کوئی دلیل تو ایسی رہی نہیں جس کو تم مان لو، صرف توراۃ باقی ہے، سو اس میں دکھلا دو کہ اونٹ کا گوشت ہمیشہ سے حرام ہے)۔

مَا حَرَّمَ اِسْرَآءِيْلُ عَلٰى نَفْسِهٖ: حرام کرنے کی خاص وجہ یہ کہ یعقوب علیہ السلام کو عرق النسا کا مرض تھا، آپ نے نذر مانی تھی کہ اگر اللہ تعالیٰ اس سے شفا دیں تو سب سے زیادہ جو کھانا مجھ کو محبوب ہے اس کو چھوڑ دوں گا، ان کو شفا ہوگئی اور سب سے زیادہ محبوب ان کو اونٹ کا گوشت تھا، اس کو چھوڑ دیا، پھر ان کی اولاد میں بھی حرام چلا آیا، اور یہی حرمت جو کہ نذر کی وجہ سے ہوئی تھی بنی اسرائیل پر بھی وحی کے حکم سے برقرار رہی، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی شریعت میں نذر کی وجہ سے حلال چیز بھی حرام ہو جاتی تھی جیسا کہ ہماری شریعت میں مباح اور جائز کام نذر ماننے سے واجب ہو جاتا ہے لیکن اگر کوئی شخص حلال چیز کو اپنے اوپر حرام کرنے کی نذر مانے تو ہماری شریعت میں یہ نذر جائز نہیں، بلکہ اس نذر کو توڑنا اور کفارہ دینا واجب ہے۔

مِنْ قَبْلِ اَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرٰىةُ: یہاں ''نزول توراۃ کے قبل'' اس واسطے فرمایا کہ تورات نازل ہونے کے بعد ان مذکورہ حلال چیزوں میں سے بھی بہت سی چیزیں حرام ہو گئی تھیں، جس کی کچھ تفصیل سورۃ انعام کی اس آیت میں ہے: **وعلی الذین ھادوا حرمنا کل ذی ظفر۔**

* * *

فائدہ: [۱] یہود آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں سے کہتے تھے کہ تم اپنے کو دین ابراہیم پر کیسے بتلاتے ہو جبکہ وہ چیزیں کھاتے ہو جو اللہ تعالیٰ نے ابراہیم کے گھرانے پر حرام کی تھیں، جیسے اونٹ کا گوشت اور دودھ، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جتنی چیزیں اب لوگ کھاتے ہیں سب ابراہیم کے وقت میں حلال تھیں جب تک تورات نازل ہوئی، بیشک تورات میں خاص بنی اسرائیل پر بعض چیزیں حرام ہوئی ہیں، مگر ایک اونٹ تورات سے پہلے حضرت اسرائیل (یعقوب) علیہ السلام نے اسکے کھانے سے قسم کھائی تھی، ان کی پیروی میں ان کی اولاد نے بھی چھوڑ دیا تھا۔ اور اس قسم کا سبب یہ تھا کہ یعقوب علیہ السلام کو ''عرق النساء'' کا درد تھا، اس وقت نذر کی کہ اگر صحت پاؤں تو جو چیز میری رغبت کی ہے اسے چھوڑ دوں گا، ان کو یہ ہی اونٹ کا گوشت

اور دودھ بہت مرغوب تھا، سونذر کے سبب چھوڑ دیا، اس قسم کی نذر جو تحریم حلال (حلال کو حرام کرنے) پر مشتمل ہو ہماری شریعت میں روا نہیں، کما قال تعالیٰ: يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللهُ لَكَ (التحریم: ۱) اگر کر لی تو توڑ دے اور کفارہ ادا کرے۔

تنبیہ: پہلی آیت میں محبوب چیز کے خرچ کرنے کا ذکر تھا، اس آیت میں یعقوب کا ایک محبوب چیز کو چھوڑ دینا مذکور ہے، اس طرح دونوں آیتوں میں لطیف مناسبت ہوگئی، نیز ان آیات میں متنبہ کیا گیا ہے کہ پہلی شرائع میں نسخ واقع ہوا ہے، جو چیز ایک زمانہ میں حلال تھی بعد میں حرام ہوگئی، اگر اسی طرح اب شریعت محمدیہ ﷺ اور شرائع سابقہ میں حلال وحرام کے اعتبار سے تفاوت ہو تو انکار واستبعاد کی کوئی وجہ نہیں۔

فائدہ: ۲ یعنی اگر تم سچے ہو کہ یہ چیزیں ابراہیم کے زمانہ سے حرام تھیں تو لاؤ یہ مضمون خود اپنی مسلّم کتاب تورات میں دکھلا دو، اگر اس میں بھی نہ نکلا تو تمہارے کاذب ومفتری ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے!!

روایات میں ہے کہ یہود نے یہ زبردست چیلنج منظور نہ کیا اور اس طرح نبی اُمّی ﷺ کی صداقت پر ایک اور دلیل قائم ہوگئی۔

فَمَنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ مِن بَعْدِ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ﴿٩٤﴾

پھر جو کوئی جوڑے اللہ پر جھوٹ اس کے بعد تو وہی ہیں بڑے بے انصاف

خلاصہ تفسیر: (جب تورات میں نہ دکھلا سکے تو ان کا اس دعوے میں جھوٹا ہونا ثابت ہوگیا، چنانچہ اب اس پر مرتب کر کے فرماتے ہیں:) سو جو شخص اس (دلیل سے جھوٹ ظاہر ہونے) کے بعد (بھی) اللہ تعالیٰ پر جھوٹ بات کی تہمت لگائے (جائے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وقت سے اونٹ کے گوشت وغیرہ کو حرام فرمایا ہے) تو ایسے لوگ بڑے بے انصاف ہیں۔

* * *

فائدہ: یعنی بڑی بے انصافی ہوگی اگر اس کے بعد بھی وہی مرغے کی ایک ٹانگ گاتے رہو کہ نہیں!! یہ چیزیں ابراہیم کے زمانہ سے حرام ہیں اور دین ابراہیم کے اصلی پیرو ہم ہیں۔

قُلْ صَدَقَ اللَّهُ ۗ فَاتَّبِعُوا مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا ۖ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿٩٥﴾

تو کہہ سچ فرمایا اللہ نے، اب تابع ہو جاؤ دین ابراہیم کے جو ایک ہی کا ہو رہا تھا، اور نہ تھا شرک کرنے والا

خلاصہ تفسیر: گذشتہ آیت میں یہود کے ایک خاص دعویٰ کا جھوٹا ہونا ثابت ہوا، جس سے عقلاً قرآن کا سچا ہونا ثابت ہوگیا، اب اس آیت میں قرآن کی صداقت بیان کر کے ان کو اسلام کی طرف بلاتے ہیں۔

آپ کہہ دیجیے کہ اللہ تعالیٰ نے سچ کہہ دیا، سو (اب) تم (کو چاہیے کہ قرآن کی حقانیت ثابت ہونے کے بعد) ملت ابراہیم (یعنی اسلام) کا اتباع (اختیار) کرو جس میں ذرا کجی نہیں، اور وہ (ابراہیم علیہ السلام) مشرک نہ تھے۔

ایسی ہی ایک آیت سورہ بقرہ آیت ۱۳۵: قُلْ بَلْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا گذر چکی ہے اس کی تفسیر وہاں ملاحظہ فرمائی جائے۔

* * *

فائدہ: یعنی خدا تعالیٰ نے حلال وحرام کے متعلق نیز اسلام اور محمد ﷺ کے باب میں سچی سچی اور کھری کھری باتیں تم کو سنا دیں جن کو کوئی جھٹلا نہیں سکتا، اب چاہیے کہ تم بھی مسلمانوں کی طرح اصلی دین ابراہیم کی پیروی اور اس کے اصول کا اتباع کرنے لگو، جن میں سب سے بڑی چیز توحید خالص تھی، چاہیے کہ تم بھی عزیر ومسیح اور احبار ورہبان کی پرستش چھوڑ کر پکے موحد مسلم بن جاؤ۔

اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِیْنَ ﴿۹۶﴾

بے شک سب سے پہلا گھر جو مقرر ہوا لوگوں کے واسطے یہی ہے جو مکہ میں ہے۔۱؎ برکت والا اور ہدایت جہان کے لوگوں کو

خلاصہ تفسیر: یہودیوں کا ایک اعتراض یہ تھا کہ بیت المقدس خانہ کعبہ سے افضل ہے اور وہی تمام انبیاء کا قبلہ ہے تو اے مسلمانو! تمہارے نبی نے بیت المقدس کو چھوڑ کر خانہ کعبہ کو کیوں اپنا قبلہ بنایا؟ حق جل شانہ نے ان آیات میں یہ بتلایا کہ خانہ کعبہ بیت المقدس سے افضل اور اشرف ہے، لہذا اسی کو قبلہ بنانا بہتر ہے۔

یقیناً وہ مکان جو سب (عبادت کے مکانات) سے پہلے لوگوں (کی عبادت گاہ بننے) کے واسطے (اللہ کی طرف سے) مقرر کیا گیا وہ مکان ہے جو کہ (شہر) مکہ میں ہے (یعنی خانہ کعبہ) جس کی حالت یہ ہے کہ وہ برکت والا ہے (کیونکہ اس میں دینی نفع یعنی ثواب ہے) اور (خاص عبادت مثلاً نماز کا رخ بتلانے میں) جہان بھر کے لوگوں کا رہنما ہے (مطلب یہ ہے کہ وہاں حج ہوتا ہے اور مثلاً نماز کا ثواب وہاں بہت زیادہ ہوتا ہے، دینی برکت تو یہ ہوئی، اور جو لوگ وہاں نہیں ہیں ان کو کعبہ کے ذریعے سے نماز کا رخ یعنی قبلہ معلوم ہوتا ہے، یہ رہنمائی ہوئی)۔

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ خانہ کعبہ بیت المقدس سے بھی پہلے بنا ہے، چنانچہ صحیحین کی حدیث میں اس کی صراحت موجود ہے۔

❊ ❊ ❊

فائدہ:۱؎ مسلمانوں کے اس دعوے پر کہ ہم سب سے زیادہ ابراہیم سے اشبہ واقرب ہیں، یہود کو یہ بھی اعتراض تھا کہ ابراہیم علیہ السلام نے وطن اصلی (عراق) چھوڑ کر شام کو ہجرت کی، وہیں رہے وہیں وفات پائی، بعدہ، ان کی اولاد شام میں رہی، کتنے انبیاء اسی مقدس سرزمین میں مبعوث ہوئے، سب کا قبلہ بیت المقدس رہا کیا، پھر تم حجاز کے رہنے والے جنہوں نے بیت المقدس کو چھوڑ کر کعبہ کو اپنا قبلہ بنالیا ہے اور سرزمین شام سے دور ایک طرف پڑے ہو کس منہ سے دعویٰ کر سکتے ہو کہ ابراہیم وملت ابراہیم سے تم کو زیادہ قرب ومناسبت حاصل ہے؟ اس آیت میں معترضین کو بتلایا گیا کہ بیت المقدس وغیرہ مقامات مقدسہ تو بعد میں تعمیر ہوئے ہیں، دنیا میں سب سے پہلا متبرک گھر جو لوگوں کی توجہ الی اللہ کے لئے مقرر کیا گیا اور بطور ایک عبادت گاہ اور نشان ہدایت کے بنایا گیا، وہ یہی کعبہ شریف ہے جو اس مبارک شہر مکہ معظمہ میں واقع ہوا ہے۔

فِیْهِ اٰیٰتٌۢ بَیِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِیْمَ ۚ۬ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ؕ وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ

اس میں نشانیاں ہیں ظاہر جیسے مقام ابراہیم، اور جو اس کے اندر آیا اس کو امن ملا۔۱؎ اور اللہ کا حق ہے لوگوں پر حج کرنا اس گھر کا

مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْهِ سَبِیْلًا ؕ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۹۷﴾

جو شخص قدرت رکھتا ہو اس کی طرف راہ چلنے کی اور جو نہ مانے تو پھر اللہ پروا نہیں رکھتا جہان کے لوگوں کی ۲؎

خلاصہ تفسیر: اس میں (کچھ شرعی کچھ تکوینی) کھلی نشانیاں (اس کی افضلیت کی موجود) ہیں (چنانچہ شرعی نشانیوں میں اس کا مبارک اور سبب ہدایت ہونا پیچھے بیان ہو چکا اور کچھ آگے مذکور ہیں، یعنی اس میں داخل ہونے والے کا مستحق امن ہو جانا اور شرائط کے ساتھ اس کا حج فرض ہونا، یہ چار شرعی نشانیاں تو اس جگہ مذکور ہیں، اب درمیان میں تکوینی نشانی کا ذکر فرماتے ہیں کہ:) من جملہ ان (نشانیوں) کے ایک مقام ابراہیم (نشانی) ہے، اور (ایک شرعی نشانی یہ ہے کہ) جو شخص اس (کے متعلقہ حدود) میں داخل ہو جائے وہ (شرعاً) امن والا ہو جاتا ہے اور (ایک شرعی نشانی یہ ہے کہ) اللہ کے (خوش کرنے کے) واسطے لوگوں کے ذمہ اس مکان کا حج کرنا (فرض) ہے (مگر سب کے ذمہ نہیں، بلکہ خاص خاص لوگوں کے) یعنی اس شخص کے جو کہ طاقت رکھے وہاں تک (پہنچنے) کے سبیل کی، اور جو شخص (احکام خداوندی کا) منکر ہو تو (خدا تعالیٰ کا کیا نقصان، کیونکہ) اللہ تعالیٰ تمام

جہان والوں سے غنی ہیں (کسی کے ماننے پر ان کا کوئی کام اٹکا نہیں پڑا، بلکہ خود اس منکر ہی کا نقصان ہے)۔

ان نشانیوں میں مقام ابراہیم کا تو کھلا ہوا نشان ہونا ظاہر ہے، باقی جو شرعی نشانیاں بیان فرمائی ہیں وہ اگر چہ محسوس نہیں، مگر چونکہ قطعی دلیل سے ثابت ہیں اس لیے ان کو بھی کعبہ کے لیے نشان فضیلت بنانا ظاہر ہے، نیز اگر چہ یہ شرعی احکام ہیں مگر ان کا ظاہری اثر دلوں پر ایسا تھا کہ جاہلیت میں بھی یہ آثار موجود تھے، چنانچہ دور دراز سے حج کے لیے، طواف کرنا، حدود حرم میں امن قائم رکھنا قدیم سے چلا آرہا ہے، خلاصہ دلیل کا یہ ہوا کہ دیکھو یہ شرعی احکام اور ظاہری نشانات خانہ کعبہ کے متعلق ہیں اور ایسے احکام بیت المقدس کے متعلق بیان نہیں ہوئے، پس کعبہ کا افضل ہونا ثابت ہوگا۔

* * *

فائدہ: ۱۔ حق تعالیٰ نے شروع سے اس گھر کو ظاہری و باطنی، حسی و معنوی برکات سے معمور کیا اور سارے جہان کی ہدایت کا سرچشمہ ٹھہرایا ہے، روئے زمین پر جس کسی مکان میں برکت و ہدایت پائی جاتی ہے اسے بیت مقدس کا ایک عکس اور پرتو سمجھنا چاہیے، یہیں سے رسول الثقلین کو اٹھایا، مناسک حج ادا کرنے کے لئے سارے جہان کو اسی کی طرف دعوت دی، عالمگیر مذہب اسلام کے پیروؤں کو مشرق و مغرب میں اسی کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم ہوا، اس کے طواف کرنے والوں پر عجیب و غریب برکات و انوار کا افاضہ فرمایا، انبیائے سابقین بھی حج ادا کرنے کے لئے نہایت شوق و ذوق سے تلبیہ پکارتے ہوئے اسی شمع کے پروانے بنے اور طرح طرح کی ظاہر و باہر نشانیاں قدرت نے بیت اللہ کی برکت سے اس سرزمین میں رکھ دیں، اسی لئے ہر زمانہ میں مختلف مذاہب والے اسکی غیر معمولی تعظیم و احترام کرتے رہے اور ہمیشہ وہاں داخل ہونے والے کو مامون سمجھا گیا، اس کے پاس مقام ابراہیم کی موجودگی پتہ دے رہی ہے کہ یہاں ابراہیم کے قدم آئے ہیں اور اسکی تاریخ جو تمام عرب کے نزدیک بلانکیر مسلم چلی آرہی ہے بتلاتی ہے کہ یہ وہی پتھر ہے جس پر کھڑے ہو کر ابراہیم علیہ السلام نے کعبہ تعمیر کیا تھا اور خدا کی قدرت سے اس پتھر میں ابراہیم کے قدم کا نشان پڑ گیا تھا جو آج تک محفوظ چلا آتا ہے، گویا علاوہ تاریخی روایات کے اس مقدس پتھر کا وجود ایک ٹھوس دلیل اس کی ہے کہ یہ گھر طوفان نوح کی تباہی کے بعد حضرت ابراہیم کے پاک ہاتھوں سے تعمیر ہوا جن کی مدد کے لئے حضرت اسماعیل علیہ السلام شریکِ کار رہے جیسا کہ پارہ الم کے آخر میں گزر چکا۔

فائدہ: ۲۔ اس پاک گھر میں جمالِ خداوندی کی کوئی خاص تجلی ہے جس کی وجہ سے ادائے حج کے لئے اسے مخصوص کیا گیا، کیونکہ حج ایک ایسی عبادت ہے جس کی ہر ادا اس جمیل مطلق اور محبوب برحق کے عشق و محبت کے جذبہ کا اظہار کرتی ہے، پس ضروری ہے کہ جسے اس کی محبت کا دعویٰ ہو اور بدنی و مالی حیثیت سے بیت اللہ تک پہنچنے کی قدرت رکھتا ہو، کم از کم عمر میں ایک مرتبہ دیارِ محبوب میں حاضری دے اور دیوانہ وار وہاں کا چکر لگائے (اس مضمون کو حضرت مولانا محمد قاسم قدس اللہ سرہ، نے "قبلہ نما" میں بڑی شرح و بسط سے لکھا ہے) جو مدعی محبت اتنی تکلیف اٹھانے سے بھی انکار کرے سمجھ لو کہ جھوٹا عاشق ہے، اختیار ہے جہاں چاہے دھکے کھاتا پھرے، خود محروم و مہجور رہے گا، اس محبوب حقیقی کو کسی کی کیا پرواہ ہے کوئی یہودی ہو کر مرے یا نصرانی ہو کر، اس کا کیا بگڑتا ہے۔ (احکام حج کی تفصیل کتب فقہ میں دیکھنی چاہیے)۔

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۖ وَاللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا تَعْمَلُوْنَ ﴿٩٨﴾

تو کہہ اے اہل کتاب! کیوں منکر ہوتے ہو اللہ کے کلام سے، اور اللہ کے روبرو ہے جو تم کرتے ہو

خلاصہ تفسیر: پیچھے سے اہل کتاب کے فاسد عقائد اور ان کے شبہات پر کلام چل رہا ہے، آگے ان کے ایک فعل پر ملامت ہے جس کا قصہ یہ ہوا کہ ایک یہودی شاس بن قیس مسلمانوں سے بہت کینہ رکھتا تھا، اس نے ایک مجلس میں انصار کے دو قبیلوں اوس اور خزرج کو ایک جگہ مجتمع و متفق دیکھا تو حسد سے بے چین ہو گیا، اور ان میں تفریق ڈالنے کی فکر میں لگا، آخر یہ تجویز کی کہ ایک شخص سے کہا کہ ان دونوں قبیلوں میں اسلام سے پہلے جو ایک بڑی جنگ عرصہ دراز تک رہ چکی ہے، اور اس کے متعلق ہر فریق کے فخریہ اشعار ہیں وہ اشعار ان کی مجلس میں پڑھ دیئے جائیں، چنانچہ اشعار کا پڑھنا تھا کہ فوراً ایک آگ سی بھڑک اٹھی، اور آپس میں چناں چنیں ہونے لگی، یہاں تک کہ موقع اور وقت لڑائی کا پھر مقرر ہو گیا، حضور ﷺ کو خبر ہوئی تو آپ ﷺ ان کے پاس تشریف لائے اور فرمایا کہ اندھیر ہے، میرے ہوتے ہوئے پھر مسلمان ہونے اور باہم متفق و مانوس ہونے کے بعد یہ کیا

جہالت ہے، کیا تم اسی حالت میں کفر کی طرف عود کرنا چاہتے ہو؟ سب متنبہ ہوئے اور سمجھا کہ یہ شیطانی حرکت تھی اور ایک دوسرے کے گلے لگ کر بہت روئے اور توبہ کی، اس واقعہ میں یہ آیتیں نازل ہوئیں، یہ مضمون کئی آیتوں تک چلا گیا ہے، جس میں اول ان اہل کتاب پر ملامت ہے جنہوں نے یہ کارروائی کی تھی اور یہ ملامت بڑی بلاغت سے کی گئی کہ اس فعل پر ملامت سے پہلے ان کے کفر پر بھی ملامت کی، جس کا حاصل یہ ہوا کہ چاہئے تو یہ تھا کہ خود بھی مسلمان ہو جاتے، نہ یہ کہ دوسروں کو بہکاتے اور گمراہ کرتے ہو، پھر مسلمانوں کو خطاب فرما کر انہیں سمجھایا گیا۔

(اے محمد ﷺ!) آپ (ان اہل کتاب سے) فرما دیجیے کہ اے اہل کتاب! تم (اسلام کی حقانیت کی حجت ظاہر ہونے کے بعد) کیوں انکار کرتے ہو اللہ تعالیٰ کے احکام کا (اس میں اصول وفروع سب آگئے) حالانکہ اللہ تعالیٰ تمہارے سب کاموں کی اطلاع رکھتے ہیں (تم کو اس سے بھی ڈر نہیں لگتا!)۔

* * *

فائدہ: پہلے سے خطاب یہود ونصاریٰ کو کیا جا رہا تھا، درمیان میں ان کے بعض شبہات کا جواب دیا گیا، یہاں سے پھر ان کو تنبیہ وتوبیخ کی گئی، یعنی حق وصداقت کے واضح دلائل اور قرآن کریم کی ایسی سچی اور پکی باتیں سننے کے بعد بھی تمہیں کیا ہوا کہ باوجود اہل کتاب کہلانے کے برابر کلام اللہ اور اس کے لانے والے کے انکار پر تلے ہوئے ہو، یاد رکھو! تمہاری سب کاروائیاں خدا کے سامنے ہیں، تمہاری نیتوں اور تدبیروں کو وہ خوب جانتا ہے، جس وقت پکڑے گا، رتی رتی کا حساب لے کر چھوڑے گا۔

قُلۡ يٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ لِمَ تَصُدُّوۡنَ عَنۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ مَنۡ اٰمَنَ تَبۡغُوۡنَهَا عِوَجًا وَّاَنۡتُمۡ شُهَدَآءُ ؕ

تو کہہ اے اہل کتاب کیوں روکتے ہو اللہ کی راہ سے ایمان لانے والوں کو کہ ڈھونڈھتے ہو اس میں عیب اور تم خود جانتے ہو

وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۹۹﴾

اور اللہ بے خبر نہیں تمہارے کام سے

خلاصہ تفسیر: (اور اے محمد ﷺ! ان سے یہ بھی) فرما دیجیے کہ اے اہل کتاب! کیوں (ہٹانے کی کوشش کرتے) ہو اللہ کی راہ (یعنی اس کے دین حق) سے ایسے شخص کو جو (اس دین حق کے ہونے پر) ایمان لا چکا اس طور پر کہ کجی (کی باتیں) ڈھونڈتے ہو اس راہ کے (اندر پیدا کرنے کے) لئے (جیسا کہ مذکورہ قصہ میں کوشش کی تھی کہ اس کارروائی سے مسلمانوں کے دین میں خلل پڑ جائے، کیونکہ نااتفاقی گناہ بھی ہے اور اجتماعی قوت کی بربادی بھی اور یہ کہ ان بکھیڑوں میں پڑ کر وہ دین حق سے دور ہو جاتے) حالانکہ تم خود بھی (اس حرکت کے قبیح اور برا ہونے کی) اطلاع رکھتے ہو، اور اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں سے بے خبر نہیں (معین وقت پر اس کی سزا دیں گے)۔

يٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ لِمَ تَصُدُّوۡنَ عَنۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ: اللہ تعالیٰ کی راہ سے باز رکھنے کے مضمون میں ان لوگوں کا بشارات محمدیہ کو چھپانا یا بدلنا بھی داخل ہے، چنانچہ حسنؒ، قتادہؒ اور سدیؒ نے یہی تفسیر اختیار کی ہے، اگرچہ یہ آیتیں یہود کے بارہ میں نازل ہوئیں مگر الفاظ عام ہونے کی وجہ سے نصاریٰ بھی اس میں آگئے۔

* * *

فائدہ: یعنی نہ صرف یہ کہ خود ایمانی سعادت حاصل کرنے سے محروم ہو، دوسروں کو بھی چاہتے ہو کہ اللہ کے راستہ سے روک دو اور جو سعید روحیں مشرف بایمان ہو چکی ہیں ان کو اسلام کے فرضی عیب بتلا کر دین اسلام سے واپس لے آؤ، پھر یہ حرکتیں محض جہل وبے خبری سے نہیں کر رہے، بلکہ سمجھ بوجھ کر سیدھی باتوں کو ٹیڑھا ثابت کرنے کی فکر میں رہتے ہو، تمہارے اس ہیر پھیر سے خدا بے خبر نہیں، مناسب وقت پر اکھٹی سزا دے گا۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تُطِيْعُوْا فَرِيْقًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ يَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ كٰفِرِيْنَ ﴿۱۰۰﴾

اے ایمان والو اگر تم کہا مانو گے بعضے اہل کتاب کا تو پھر کر دینگے وہ تم کو ایمان لائے پیچھے کافر

خلاصہ تفسیر: (اب مذکورہ واقعہ کے متعلق مسلمانوں کو سمجھایا جارہا ہے کہ:) اے ایمان والو! اگر تم کہنا مانو گے کسی فرقہ کا ان لوگوں میں سے جن کو کتاب دی گئی ہے (یعنی اہل کتاب میں سے) تو وہ لوگ تمہارے ایمان لائے پیچھے (یعنی ایمان لانے کے بعد) کافر بنادیں گے (خواہ اعتقادا یا عملا، کیونکہ جنگ وجدال اگر کفر نہیں تو کفر کا کام ضرور ہے)۔

يَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ كٰفِرِيْنَ: ترجمہ میں کفر کی عمومیت بیان کرنے کے لیے جو "اعتقادا وعملا" کہا گیا، اس کا حاصل یہ ہے کہ کفر کے ایک معنی تو متعارف ہیں اور وہ کفر اعتقادی ہے، کفر کے ایک اور معنی یہ ہیں کہ اعتقادا تو مومن ہو، مگر کام کافروں جیسے کرے، اس کو بھی مجازا کفر کہہ دیتے ہیں، کفر عملی سے یہی مراد ہے، قرآن وحدیث میں اس کا استعمال بہت ہے، پس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اہل کتاب کی اطاعت سے کفر کا ڈر ہے، اگر اطاعت عقائد میں کی جائے تو کفر اعتقادی ہوگا، اور اگر اطاعت اعمال ومعاصی میں کی جائے جیسے ان کے اشتعال سے لڑنے کے لیے تیار ہو گئے تو یہ عمل کافروں کا سا ہوگا، معتزلہ اور خوارج نے اس کو نہیں سمجھا اور کفر کو حقیقی معنوں پر محمول کر کے حکم لگا دیا کہ گناہ کبیرہ کا ارتکاب حقیقت کفر ہے، یا گناہ کبیرہ کے ارتکاب سے حقیقتا ایمان سے خارج ہو جاتا ہے۔

* * *

فائدہ: پہلے اہل کتاب کو ڈانٹا گیا تھا کہ جان بوجھ کر کیوں لوگوں کو گمراہ کرتے پھرتے ہو، یہاں مسلمانوں کو نصیحت کی گئی کہ تم ان مفسدین کے بھرے میں نہ آنا، اگر ان کے اشاروں پر چلو گے تو اندیشہ ہے کہ آہستہ آہستہ نور ایمان سے نکل کر کفر کے تاریک گڑھے میں دوبارہ نہ جا گرو۔

وَكَيْفَ تَكْفُرُوْنَ وَاَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ اٰيٰتُ اللّٰهِ وَفِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ ؕ وَمَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ

اور تم کس طرح کافر ہوتے ہو اور تم پر پڑھی جاتی ہیں آیتیں اللہ کی اور تم میں اس کا رسول ہے، اور جو کوئی مضبوط پکڑے اللہ کو

فَقَدْ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۰۱﴾ ع

تو اس کو ہدایت ہوئی سیدھے راستہ کی

خلاصہ تفسیر: اور (بھلا) تم کفر کیسے کر سکتے ہو (یعنی تمہارے لئے کفر کا کام کب روا ہو سکتا ہے) حالانکہ (کفر سے روکنے کے اسباب پورے جمع ہیں، کیونکہ) تم کو اللہ تعالیٰ کے احکام (قرآن میں) پڑھ کر سنائے جاتے ہیں، اور (پھر) تم میں اللہ کے رسول ﷺ موجود ہیں (اور یہ دونوں ایمان پر قائم رہنے کے قوی ذرائع ہیں، پس تم کو چاہیے کہ ان دونوں کی تعلیم وتلقین کے مطابق ایمان اور ایمان کی باتوں پر قائم رہو) اور (یاد رکھو کہ) جو شخص اللہ تعالیٰ کو مضبوط پکڑتا ہے (یعنی ایمان پر پورا قائم رہتا ہے، کیونکہ اللہ کو مضبوط پکڑنا یہی ہے کہ اس کی ذات وصفات کی تصدیق کرے، اس کے احکام کو مضبوط پکڑے، کسی دوسرے مخالف کی موافقت نہ کرے) تو (ایسا شخص) ضرور راہ راست کی ہدایت کیا جاتا ہے (یعنی وہ راہ راست پر ہوتا ہے، اور راہ راست پر ہونا ہر صلاح وفلاح کا اصلی مدار ہے، پس اس میں ایسے شخص کے لئے ہر صلاح کی بشارت اور وعدہ ہے)۔

وَفِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ: اس آیت میں اگر خاص صحابہ کرام کو خطاب ہو جیسا کہ قصہ سے معلوم ہوتا ہے تب تو فیکم رسولہ میں کوئی تکلف نہیں، اور اگر خطاب عام ہو جیسا کہ مضمون کے عموم کا تقاضہ ہے تو آپ ﷺ کی نبوت کے آثار وشواہد قیامت تک موجود رہنا بمنزلہ آپ ہی کے تشریف رکھنے کے ہے، کیونکہ ظاہری رونق افزوی کے زمانہ میں بھی آپ ﷺ کا ہادی ہونا اسی وصف کے اعتبار سے تھا، چنانچہ وصف اصل مؤثر ٹھہرا۔

* * *

فائدہ: یعنی بہت بعید ہے کہ وہ قوم ایمان لائے پیچھے کافر بن جائے، یا کافروں جیسے کام کرنے لگے، جس کے درمیان خدا کا عظیم الشان پیغمبر جلوہ افروز ہو، جو شب و روز ان کو اللہ کا روح پرور کلام اور اس کی تازہ بتازہ آیتیں پڑھ کر سناتا رہتا ہے، سچ تو یہ ہے کہ جس نے ہر طرف سے قطع نظر کر کے ایک خدا کو مضبوط پکڑ لیا اور اسی پر دل سے اعتماد و توکل کیا اسے کوئی طاقت کامیابی کے سیدھے راستہ سے ادھر ادھر نہیں ہٹا سکتی۔

تنبیہ: انصار مدینہ کے دو خاندانوں اوس و خزرج کے باہم اسلام سے قبل سخت عداوت اور دشمنی تھی، ذرا ذرا بات پر لڑائی اور خونریزی کا بازار گرم ہو جاتا تھا جو برسوں تک سرد نہ ہوتا تھا۔ چنانچہ "بعاث" کی مشہور جنگ ایک سو بیس سال تک رہی، آخر پیغمبر عربی ﷺ کی ہجرت پر ان کی قسمت کا ستارہ چمکا اور اسلام کی تعلیم اور نبی کریم ﷺ کے فیض صحبت نے دونوں قبیلوں کو جو صدیوں سے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے رہتے تھے ملا کر شیر و شکر کر دیا اور نہایت مضبوط برادرانہ تعلقات قائم کر دیئے۔ یہود مدینہ کو ان دونوں حریف خاندانوں کا اس طرح مل بیٹھنا اور متفقہ طاقت سے اسلام کی خدمت و حمایت کرنا ایک آنکھ نہ بھاتا تھا، ایک اندھے یہودی شماس بن قیس نے کسی فتنہ پرداز شخص کو بھیجا کہ جس مجلس میں دونوں خاندان جمع ہوں وہاں کسی ترکیب سے بعاث کی لڑائی کا ذکر چھیڑ دے، چنانچہ اس نے مناسب موقع پا کر بعاث کی یاد تازہ کرنے والے اشعار سنانے شروع کر دیئے، اشعار کا سننا تھا کہ ایک مرتبہ بجھی ہوئی چنگاریاں پھر سلگ اٹھیں، زبانی جنگ سے گزر کر ہتھیاروں کی لڑائی شروع ہونے کو تھی کہ نبی کریم ﷺ جماعت مہاجرین کو ہمراہ لئے ہوئے موقع پر پہنچ گئے، آپ ﷺ نے فرمایا اے گروہ مسلمین! اللہ سے ڈرو، میں تم میں موجود ہوں، پھر یہ جاہلیت کی پکار کیسی؟ خدا نے تم کو ہدایت دی، اسلام سے مشرف کیا، جاہلیت کی تاریکیوں کو محو فرما دیا، کیا ان ہی کفریات کی طرف پھر الٹے پاؤں لوٹنا چاہتے ہو جن سے نکل کر آئے تھے؟! اس پیغمبرانہ آواز کا سننا تھا کہ شیطانی جال کے سب حلقے ایک ایک کر کے ٹوٹ گئے، اوس و خزرج نے ہتھیار پھینک دیئے اور ایک دوسرے سے گلے مل کر رونے لگے، سب نے سمجھ لیا کہ یہ سب ان کے دشمنوں کی فتنہ انگیزی تھی، جس سے آئندہ ہمیشہ ہوشیار رہنا چاہیے اسی واقعہ کے متعلق یہ کئی آیتیں نازل ہوئیں۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ ٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِۦ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنتُم مُّسْلِمُونَ ﴿١٠٢﴾

اے ایمان والو ڈرتے رہو اللہ سے جیسا چاہیے اس سے ڈرنا اور نہ مریو مگر مسلمان

خلاصہ تفسیر: سابقہ آیات میں مسلمانوں کو اس پر تنبیہ کی گئی تھی کہ اہل کتاب اور دوسرے لوگ جو تمہیں گمراہی میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں ان کی گمراہی سے باخبر رہ کر بچنے کا اہتمام کریں، اب مسلمانوں کی اجتماعی قوت کو مضبوط، ناقابل تسخیر بنانے کے دو اہم اصول بتائے جاتے ہیں: ① اول تقویٰ ② دوسرے باہمی اتفاق و اتحاد، اور تفرق و اختلاف سے بچنا۔

اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے (ایسا) ڈرا کرو (جیسا) ڈرنے کا حق ہے (کامل ڈرنے کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح شرک و کفر سے بچتے ہو، اسی طرح تمام گناہوں سے بھی بچو اور شرعی وجہ کے بغیر لڑنا معصیت ہے تو اس سے بچنا بھی فرض ہے) اور بجز اسلام (کامل) کے (اسلام کامل کا بھی وہی مطلب ہے جو کامل ڈرنے کا ہے) اور کسی حالت پر جان نہ دینا (یعنی اسی کامل تقویٰ اور کامل اسلام پر مرتے دم تک قائم رہنا)۔

اتَّقُوا اللهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ: ڈرنے کے حق کا یہ مطلب نہیں کہ جیسا حق تعالیٰ کی عظمت کا حق ہے، کیونکہ یہ تو کسی سے نہیں ہو سکتا، بلکہ مطلب یہ ہے کہ جتنا تمہارے ذمہ حق مقرر اور واجب ہے، جس کی تفسیر ترجمہ کے درمیان لکھ دی گئی، اس کے مقابل ایک تقویٰ ادنیٰ درجہ کا ہے، یعنی کفر و شرک سے بچ جانا اگرچہ گناہوں میں مبتلا رہے، پس آیت کا مطلب یہ ہے کہ ادنیٰ تقویٰ پر اکتفا مت کرو، بلکہ اعلیٰ اور کامل درجہ کا تقویٰ اختیار کرو، جس میں تمام گناہوں سے بھی بچنا آ گیا اور ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ شرک اور کفر سے تو بچے اگرچہ گناہوں میں مبتلا رہے۔

* * *

فائدہ: یعنی ہر مسلمان کے دل میں پورا ڈر خدا کا ہونا چاہیے کہ اپنے مقدور بھر پرہیزگاری و تقویٰ کی راہ سے نہ ہٹے اور ہمیشہ اس سے استقامت کا طالب رہے، شیاطین چاہتے ہیں کہ تمہارا قدم اسلام کے راستہ سے ڈگمگا دیں، تم کو چاہیے کہ انہیں مایوس کر دو اور مرتے دم تک کوئی حرکت

مسلمانی کے خلاف نہ کرو، تمہارا جینا و مرنا خالص اسلام پر ہونا چاہیے۔

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۠ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً

اور مضبوط پکڑو رسی اللہ کی سب مل کر اور پھوٹ نہ ڈالو اور یاد کرو احسان اللہ کا اپنے اوپر جب کہ تھے تم آپس میں دشمن

فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ

پھر الفت دی تمہارے دلوں میں اب ہوگئے اس کے فضل سے بھائی ۲ اور تم تھے کنارے پر ایک آگ کے گڑھے کے

فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۰۳﴾

پھر تم کو اس سے نجات دی ۳ اسی طرح کھولتا ہے اللہ تم پر آیتیں تا کہ تم راہ پاؤ ۴

خلاصہ تفسیر: اور مضبوط پکڑے رہو، اللہ تعالیٰ کے سلسلہ کو (یعنی اللہ تعالیٰ کے دین کو، جس میں اصول و فروع سب آ گئے) اس طور پر کہ باہم سب متفق بھی رہو (جس کی اسی دین میں تعلیم بھی ہے) اور باہم نا اتفاقی مت کرو (جس کی اسی دین میں ممانعت بھی ہے) اور تم پر جو اللہ تعالیٰ کا انعام (ہوا) ہے اسکو یاد کرو جبکہ تم (باہم) دشمن تھے (یعنی اسلام سے پہلے، چنانچہ اوس و خزرج کے دو قبیلوں میں طویل مدت سے جنگ چلی آتی تھی، اور اسلام سے پہلے عام طور پر اکثر عرب کے لوگوں کی یہی حالت تھی) پس اللہ تعالیٰ نے (اب) تمہارے قلوب میں (ایک دوسرے کی) الفت ڈال دی، سو تم اللہ تعالیٰ کے (اس) انعام (تالیف قلوب) سے (اب) آپس میں بھائی بھائی (کی طرح) ہو گئے۔

اور (دوسرا انعام جو کہ مذکورہ پہلے انعام کی بھی اصل ہے یہ فرمایا کہ:) تم لوگ (بالکل) دوزخ کے گڑھے کے کنارے (ہی) پر کھڑے تھے (یعنی کافر ہونے کی وجہ سے دوزخ کے اتنے قریب تھے کہ بس دوزخ میں جانے کے لئے صرف مرنے کی دیر تھی) سو اس (گڑھے) سے اللہ تعالیٰ نے تمہاری جان بچائی (یعنی اسلام نصیب کیا، جس کے سبب دوزخ میں جانے سے بچ گئے، سو ان انعاموں کی قدر پہچانو اور آپس کے جنگ و جدال سے اللہ کی ان نعمتوں کو ضائع نہ کرو جو کہ گناہ ہے، کیونکہ اس جنگ و جدال سے باہمی الفت کی نعمت تو بالکل ہی زائل ہو جائے گی اور نعمت اسلام میں بھی خلل اور نقصان پیدا ہو جائے گا کہ یہ بھی ایک گونہ اسلام کو ضائع کرنا ہے، اور جس طرح اللہ تعالیٰ نے یہ احکام واضح طور پر بیان فرمائے ہیں) اسی طرح اللہ تعالیٰ تم لوگوں کو اپنے (اور) احکام (بھی) بیان کر کے بتلاتے ہیں تا کہ تم لوگ راہ (راست) پر قائم رہو۔

* * *

فائدہ: ۱ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا: یعنی سب مل کر قرآن کو مضبوط تھامے رہو جو خدا کی مضبوط رسی ہے، یہ رسی ٹوٹ تو نہیں سکتی ہاں! چھوٹ سکتی ہے، اگر سب مل کر اس کو پوری قوت سے پکڑے رہو گے، کوئی شیطان شر انگیزی میں کامیاب نہ ہو سکے گا اور انفرادی زندگی کی طرح مسلم قوم کی اجتماعی قوت بھی غیر متزلزل اور نا قابل اختلال ہو جائے گی، قرآن کریم سے تمسک کرنا ہی وہ چیز ہے جس سے بکھری ہوئی قوتیں جمع ہوتی ہیں اور ایک مردہ قوم حیات تازہ حاصل کرتی ہے، لیکن تمسک بالقرآن کا یہ مطلب نہیں کہ قرآن کو اپنی آراء و اہواء کا تختہ مشق بنا لیا جائے، بلکہ قرآن کریم کا مطلب وہی معتبر ہوگا جو احادیث صحیحہ اور سلف صالحین کی متفقہ تصریحات کے خلاف نہ ہو۔

فائدہ: ۲ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا: یعنی صدیوں کی عداوتیں اور کینے نکال کر خدا نے نبی کریم ﷺ کی برکت سے تم کو بھائی بھائی بنا دیا، جس سے تمہارا دین اور دنیا دونوں درست ہوئے اور ایسی ساکھ قائم ہو گئی ہے جسے دیکھ کر تمہارے دشمن مرعوب ہوتے ہیں، یہ برادرانہ اتحاد خدا کی اتنی بڑی نعمت ہے جو روئے زمین کا خزانہ خرچ کر کے بھی میسر نہ آسکتی تھی۔

فائدہ: ۳ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا: یعنی کفر وعصیان کی بدولت دوزخ کے بالکل کنارے پر کھڑے تھے کہ موت آئی اور اس میں گرے، خدا نے تمہارا ہاتھ پکڑ کر اس سے بچالیا اور نبی کریم ﷺ کے ذریعہ سے ایمان وایقان کی روشنی سینوں میں ڈالی، حق تعالیٰ کے ان عظیم الشان دینی و دنیاوی احسانات کو یاد رکھو گے تو کبھی گمراہی کی طرف واپس نہ جاؤ گے۔

فائدہ: ۴ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ: یعنی یہ باتیں اس قدر کھول کھول کر سنانے سے مقصود یہ ہے کہ ہمیشہ ٹھیک راستہ پر چلتے رہو، ایسی مہلک وخطرناک غلطی کا پھر اعادہ نہ کرو اور کسی شیطان کے اغوا سے استقامت کی راہ نہ چھوڑو۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ

اور چاہیے کہ رہے تم میں ایک جماعت ایسی جو بلاتی رہے نیک کام کی طرف اور حکم کرتی رہے اچھے کاموں کا اور منع کریں برائی سے

وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۰۴﴾

اور وہی پہنچے اپنی مراد کو

خلاصہ تفسیر: گذشتہ آیات میں اہل کتاب کو اول خود ان کے گمراہ ہونے پر ملامت تھی، پھر دوسروں کو گمراہ کرنے کی برائی تھی، اس کے بعد بالمقابل مسلمانوں کو ہدایت پر قائم رہنے کا حکم دیا گیا تھا، اب مسلمانوں کو حکم دیا جا رہا ہے کہ دوسروں کو بھی خیر اور نیکی کی دعوت دو اور راہ راست پر لانے کی کوشش کرو، اس طرح انفرادی اصلاح کے ساتھ ساتھ خود بخود ایک اجتماعی قوت بھی مسلمانوں کو حاصل ہو جائے گی، یعنی مسلمان صرف اپنے اعمال وافعال کی اصلاح پر بس نہ کریں، بلکہ اپنے دوسرے بھائیوں کی اصلاح کی فکر بھی ساتھ ساتھ کریں۔

اور تم میں ایک جماعت ایسی ہونا ضروری ہے کہ (اور لوگوں کو بھی) خیر کی طرف بلایا کریں، اور نیک کاموں کے کرنے کو کہا کریں، اور برے کاموں سے روکا کریں، اور ایسے لوگ (آخرت میں ثواب سے) پورے کامیاب ہوں گے۔

وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ: امر بالمعروف اور نہی عن المنکر امت کے ہر فرد پر لازم ہے، البتہ تمام احکام شرعیہ کی طرح اس میں بھی ہر شخص کی قدرت واستطاعت پر احکام دائر ہوں گے، جس کو جتنی قدرت ہو اتنا ہی امر بالمعروف کا فریضہ اس پر عائد ہوگا، پھر ہر کام کی استطاعت وقدرت جدا جدا ہوتی ہے۔

① امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی قدرت پہلے تو اس پر موقوف ہے کہ وہ معروف ومنکر اس شخص کو پوری طرح صحیح صحیح معلوم ہو، جس کو خود ہی معروف ومنکر کی تمیز نہ ہو، یا اس مسئلہ کا پورا علم نہ ہو، وہ اگر دوسروں کو امر بالمعروف یا نہی عن المنکر کرنے لگے تو ظاہر ہے کہ بجائے اصلاح ہونے کے فساد ہوگا، اور بہت ممکن ہے کہ وہ اپنی ناواقفیت کی بناء پر کسی معروف کو منع کرنے لگے، یا منکر کا حکم کرنے لگے، اس لئے جو شخص خود معروف ومنکر سے واقف نہیں اس پر یہ فریضہ تو عائد ہے کہ واقفیت اور احکام شرعیہ کے معروف ومنکر کا علم حاصل کرلے، اور پھر اس کے مطابق امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی خدمت انجام دے، لیکن جب تک اس کو واقفیت نہیں، اس کا اس خدمت کے لئے کھڑا ہونا جائز نہیں جیسے اس زمانہ میں بہت سے جاہل وعظ کہنے کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں، نہ انہیں قرآن کا علم ہے نہ حدیث کا، یا بہت سے عوام سنی سنائی غلط باتوں کو لے کر لوگوں سے جھگڑنے لگتے ہیں کہ ایسا کرو ایسا نہ کرو، یہ طریق کار بجائے معاشرہ کے درست کرنے کے اور زیادہ ہلاکت اور جنگ وجدل کا سبب ہوتا ہے۔

② اسی طرح امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی قدرت میں یہ بھی داخل ہے کہ اپنے آپ کو کوئی نا قابل برداشت ضرر پہنچنے کا قوی خطرہ نہ ہو، اسی لئے حدیث میں ارشاد فرمایا گیا کہ گناہ کو ہاتھ اور قوت سے نہ روک سکے تو زبان سے روکے، اور زبان سے روکنے پر قدرت نہ ہو تو دل ہی سے برا سمجھے، ظاہر ہے کہ زبان سے روکنے پر قدرت نہ ہونے کے یہ معنی تو ہیں نہیں کہ اس کی زبان حرکت نہیں کر سکتی، بلکہ مراد یہی ہے کہ اس کو یہ خطرہ قوی ہے کہ اس

نے حق بات کی تلقین کی تو اس کی جان جائے گی، یا کوئی دوسرا شدید نقصان پہنچ جائے گا، ایسی حالت میں اس شخص کو قادر نہ سمجھا جائے گا، اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ترک پر اس کو گنہگار نہ کہا جائے گا، یہ دوسری بات ہے کہ اللہ کی راہ میں اپنی جان و مال کی پرواہ نہ کرے، اور نقصان برداشت کر کے بھی امر بالمعروف نہی عن المنکر کی خدمت انجام دے، جیسے بہت سے صحابہ و تابعین اور ائمہ اسلام کے واقعات منقول ہیں، یہ ان کی اولوا العزمی اور بڑی فضیلت ہے، جس سے ان کا مقام دنیا و آخرت میں بلند ہوا، مگر ان کے ذمہ ایسا کرنا فرض واجب نہ تھا۔

④ آیات قرآنی نیز احادیث مذکورہ سے امت کے ہر فرد پر اس کی قدرت کے مطابق امر بالمعروف اور نہی عن المنکر واجب کیا جارہا ہے، لیکن اس کے وجوب میں یہ تفصیل ہے کہ واجب امور میں معروف کا امر اور منکر سے نہی کرنا واجب، اور مستحب امور میں مستحب ہے، مثلاً پانچ وقت نماز فرض ہے تو ہر شخص پر واجب ہوگا کہ بے نمازی کو نصیحت کرے اور نوافل مستحب ہیں، تو نوافل کی نصیحت کرنا مستحب ہوگا۔

⑤ اس کے علاوہ ایک ضروری ادب یہ بھی پیش نظر رکھنا ہوگا کہ مستحبات میں مطلقاً نرمی سے اظہار کرے اور واجبات میں اولاً نرمی سے اور نہ ماننے پر سختی کی بھی گنجائش ہے، آج کل لوگ مستحبات میں یا مباحات میں تو سختی سے روک ٹوک کرتے ہیں، لیکن امور واجبہ اور فرائض کے ترک پر کوئی ملامت نہیں کرتے۔

⑤ نیز ہر شخص پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ اس وقت عائد ہوگا جبکہ وہ اپنے سامنے کسی منکر کو ہوتے ہوئے دیکھے، مثلاً ایک شخص دیکھ رہا ہے کہ کوئی مسلمان شراب پی رہا ہے یا چوری کر رہا ہے، یا کسی غیر عورت سے مجرمانہ اختلاط کر رہا ہے، تو اس کے ذمہ واجب ہوگا کہ اپنی استطاعت وقدرت کے مطابق اس کو روکے، اور اگر اس کے سامنے یہ سب کچھ نہیں ہو رہا ہے تو یہ فریضہ اس کے ذمہ نہیں، بلکہ اب یہ فریضہ اسلامی حکومت کا ہے کہ مجرم کے جرم کی تفتیش و تحقیق کر کے اس کو سزا دے۔

⑥ پھر امر بالمعروف و نہی عن المنکر پر قدرت رکھنے والے شخص کیلئے واجب امور میں یہ تفصیل ہے کہ اگر قدرت ہاتھ سے ہو تو ہاتھ سے اسکا انتظام واجب ہے، جیسے حکام محکومین کے اعتبار سے، یا ہر شخص اپنے اہل و عیال کے اعتبار سے، اور اگر صرف زبان سے قدرت ہو تو زبان سے کہنا واجب ہے، قدرت نہ رکھنے والے شخص کیلئے صرف اتنا کافی ہے کہ تارک واجبات و مرتکب محرمات سے دل سے نفرت کرے۔

⑦ پھر قدرت رکھنے والے کے ذمہ اس کا وجوب علی الکفایہ ہے، اگر اتنے آدمی اس کام کو کرتے ہوں کہ بقدر حاجت کام چل رہا ہو تو دوسرے اہل قدرت کے ذمہ سے ساقط ہو جائے گا۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ میں اشارہ ہے کہ اس جماعت کا وجود ضروری ہے، اگر کوئی حکومت یہ فریضہ انجام نہ دے تو تمام مسلمانوں پر فرض ہوگا کہ وہ ایسی جماعت قائم کریں، کیونکہ ان کی حیات ملی اسی وقت محفوظ رہے گی جب تک یہ جماعت باقی ہے، گویا امر بالمعروف کا دوسرا درجہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں سے ایک جماعت خاص دعوت و ارشاد ہی کے لئے قائم رہے، اس کا وظیفہ یہی ہو کہ اپنے قول و عمل سے لوگوں کو قرآن و سنت کی طرف بلائے، اور جب لوگوں کو اچھے کاموں میں سست یا برائیوں میں مبتلا دیکھے اس وقت بھلائی کی طرف متوجہ کرنے اور برائی سے روکنے کی اپنے مقدور کے موافق کوتاہی نہ کرے، چونکہ اس اہم فریضہ یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو پوری طرح اسی وقت ادا کیا جاسکتا ہے جب کہ اس کو مسائل کا پورا علم بھی ہو اور امر بالمعروف کو موثر بنانے کے آداب اور طریقے بھی سنت کے مطابق اس کو معلوم ہوں، اس لئے مکمل طور پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرنے کے لئے مسلمانوں میں سے ایک مخصوص جماعت کو اس منصب پر مامور کیا گیا، جو ہر طرح دعوت الی الخیر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی اہل ہو، چنانچہ اسی آیت میں ایسی جماعت کی ضرورت اور اہمیت کو اجاگر کیا۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ: اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جو حضرات دعوت و ارشاد یعنی نیکی کی طرف راستہ دکھلانے والے اور برائی سے روکنے والے ہوں وہ ان لوگوں سے افضل ہیں جو صرف اپنی عبادات وغیرہ میں لگے ہوئے ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہاں ایسے ہی لوگوں کے بارے میں هم المفلحون فرمایا ہے جو دعوت و ارشاد کے کام میں مشغول ہیں۔

* * *

فائدہ: یعنی تقویٰ، اعتصام بحبل اللہ، اتحاد واتفاق قومی زندگی، اسلامی مواخات، یہ سب چیزیں اس وقت باقی رہ سکتی ہیں جبکہ مسلمانوں میں ایک جماعت خاص دعوت وارشاد کے لئے قائم رہے، اس کا وظیفہ یہ ہی ہو کہ اپنے قول وعمل سے دنیا کو قرآن وسنت کی طرف بلائے اور جب لوگوں کو اچھے کاموں میں سست یا برائیوں میں مبتلا دیکھے، اس وقت بھلائی کی طرف متوجہ کرنے اور برائی سے روکنے میں اپنے مقدور کے موافق کوتاہی نہ کرے۔

ظاہر ہے کہ یہ کام وہ ہی حضرات کر سکتے ہیں جو معروف ومنکر کا علم رکھنے اور قرآن وسنت سے باخبر ہونے کے ساتھ ذی ہوش اور موقع شناس ہوں، ورنہ بہت ممکن ہے کہ ایک جاہل آدمی معروف کو منکر یا منکر کو معروف خیال کر کے بجائے اصلاح کے سارا نظام ہی مختل کر دے، یا ایک منکر کی اصلاح کا ایسا طریقہ اختیار کرے جو اس سے بھی زیادہ منکرات کے حدوث کا موجب ہو جائے، یا نرمی کی جگہ سختی اور سختی کے موقع میں نرمی برتنے لگے، شاید اسی لئے مسلمانوں میں سے ایک مخصوص جماعت کو اس منصب پر مامور کیا گیا جو ہر طرح دعوت الی الخیر، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی اہل ہو، حدیث میں ہے جب لوگ منکرات میں پھنس جائیں اور کوئی روکنے والا نہ ہو تو عام عذاب آنے کا اندیشہ ہے، باقی یہ کہ کن احوال واوقات میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے ترک میں آدمی معذور سمجھا جاسکتا ہے اور کن مواقع میں واجب یا مستحب ہے؟ اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، ابوبکر رازیؒ نے ''احکام القرآن'' میں اس پر نہایت مبسوط کلام کیا ہے، فلیراجع۔

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ط

اور مت ہو ان کی طرح جو متفرق ہو گئے اور اختلاف کرنے لگے بعد اس کے کہ پہنچ چکے ان کو حکم صاف

وَأُولٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿۱۰۵﴾

اور ان کو بڑا عذاب ہے

خلاصہ تفسیر: اوپر تقویٰ کے بعد باہمی اتفاق کا حکم تھا اور تفریق سے روکا گیا، اب اسی مضمون کی تفصیل بیان کی جاتی ہے:

اور تم لوگ ان لوگوں کی طرح مت ہو جانا جنہوں نے (دین میں) باہم تفریق کر لی اور (نفسانیت سے) باہم اختلاف کر لیا ان کے پاس واضح احکام پہنچنے کے بعد، اور ان لوگوں کے لئے سزائے عظیم ہوگی (یعنی قیامت کے روز)۔

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ: یعنی تم ان لوگوں کی طرح مت ہو جانا جنہوں نے باہم تفریق کر لی، مفسرین کے اس جگہ مختلف اقوال ہیں کہ ان تفریق واختلاف کرنے والوں سے کون لوگ مراد ہیں؟ جامع بات یہ ہے کہ کفر سے مراد اس جگہ عام معنی ہیں جو انکار توحید ورسالت اور بدعت کے اعتقاد سب کو شامل ہے کہ یہ سب اختلافات واضح دلائل پہنچ جانے کے بعد ہوئے، پس آیت میں کفار ومنافقین اور اہل بدعت سب کا اختلاف داخل ہے اور ہر ایک کا کفر اس کے درجہ کے مطابق ہوگا، کفار ومنافقین کا کفر اعتقادی ہے اور اہل بدعت کا کفر عملی ہے، ایسے ہی عذاب بھی ہر ایک کو اس کے کفر کے بقدر ہوگا، اعتقادی کفر کی سزا ہمیشہ کے لیے جہنم ہے، اور عملی کفر میں کسی وقت عذاب سے نجات ہو جائے گی، پس آیت کے معنی یہ ہوئے کہ اے مسلمانو! تم ان اختلافات کرنے والوں کے مشابہ نہ ہو جاؤ جنہوں نے ایمان کے بعد کفر کیا اور عذاب کے مستحق ہوئے، اتنا فرق ہے کہ مسلمانوں کا اختلاف عملی گناہ ہے، اور دوسروں کا اختلاف اعتقادی گناہ تھا، مگر تشبیہ وتمثیل کے لیے اتنی ہی مناسبت کافی ہوتی ہے، پوری مناسبت ہونا ضروری نہیں۔

تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا: آیت میں جس تفریق واختلاف کی مذمت ہے اس سے مراد وہ تفریق ہے جو اصول دین میں ہو، یا فرعی مسائل میں نفسانیت کے غلبہ کی وجہ سے ہو، چنانچہ آیت میں یہ قید کہ ''واضح احکام پہنچنے کے بعد'' اس امر پر واضح قرینہ ہے، کیونکہ اصول دین سب واضح ہوتے ہیں، اور فروع بھی بعض ایسے واضح ہوتے ہیں کہ اگر نفسانیت نہ ہو تو اختلاف کی گنجائش نہیں ہوتی، لیکن جو فروع کسی صریح نص نہ ہونے کی وجہ سے غیر واضح ہیں، یا بظاہر نصوص میں تعارض ہے اور تطبیق کا طریقہ واضح نہیں ایسے فروعی مسائل میں رائے واجتہاد سے جو اختلاف پیدا ہوتا ہے وہ اس آیت کے مفہوم میں داخل نہیں اور نہ وہ مذموم ہے، کیونکہ یہاں آیت میں اس اختلاف کی مذمت ہے جو واضح دلیل پہنچنے کے بعد ہو، اور وہ حدیث صحیح اس کی

اجازت کے لئے کافی ہے جس کو بخاری ومسلم نے مرفوعاً عمرو بن العاصؓ سے روایت کیا ہے کہ جب کوئی اجتہاد کرے اور وہ حکم ٹھیک ہو تو اس کو دو اجر ملتے ہیں اور جب اجتہاد میں غلطی کرے تو اس کو ایک اجر ملتا ہے، تو معلوم ہوا کہ جس اختلاف اجتہادی میں خطا ہونے پر بھی ایک ثواب ملتا ہے وہ مذموم نہیں ہو سکتا، لہٰذا وہ اجتہادی اختلاف جو صحابہ اور ائمہ مجتہدین میں ہوا ہے اس کو اس آیت مذکورہ سے کوئی تعلق نہیں، بقول حضرت قاسم بن محمد و حضرت عمر بن عبدالعزیز صحابہ کا اختلاف لوگوں کے لئے موجب رحمت ورخصت ہے۔

یہ تمام گفتگو اس اجتہاد میں ہے جو شریعت کے اصول اجتہاد کے ماتحت ہو جس کی پہلی شرط یہ ہے کہ اجتہاد صرف ان مسائل میں کیا جاسکتا ہے جن کے متعلق قرآن وحدیث میں کوئی فیصلہ موجود نہیں، یا ایسا مبہم ہے کہ اس کی تفسیریں مختلف ہو سکتی ہیں، یا چند آیات و روایات سے ظاہراً متضاد چیزیں سمجھی جاتی ہیں، ایسے مواقع میں صرف ان لوگوں کو اجتہاد کرنے کی اجازت ہے جن میں شرائط اجتہاد موجود ہیں، مثلاً قرآن وحدیث کے متعلق تمام علوم و فنون کی مکمل مہارت، عربی زبان کی مکمل مہارت، صحابہ و تابعین کے اقوال و آثار کی مکمل واقفیت وغیرہ، تو جو شخص کسی منصوص مسئلہ میں اپنی رائے چلائے وہ اجتہادی اختلاف نہیں، اسی طرح شرائط اجتہاد جس میں موجود نہیں اس کے اختلاف کو اجتہادی اختلاف نہیں کہا جاسکتا، اس کے قول کا مسئلہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا، جیسے آج کل بہت سے لکھے پڑھے لوگوں نے یہ سن لیا ہے کہ اسلام میں اجتہاد بھی ایک اصول ہے اور ان منصوصات شرعیہ میں رائے زنی کرنے لگے، جس میں کسی امام مجتہد کو بھی بولنے کا حق نہیں، اور یہاں تو شرائط اجتہاد کیا نفس علم دین سے بھی واقفیت نہیں ہوتی، العیاذ باللہ۔

* * *

فائدہ: یعنی یہود و نصاریٰ کی طرح مت بنو جو خدا تعالیٰ کے صاف احکام پہنچنے کے بعد محض اوہام و اہواء کی پیروی کر کے اصول شرع میں متفرق اور فروع میں مختلف ہو گئے، آخر فرقہ بندیوں نے انکے مذہب و قومیت کو تباہ کر ڈالا، اور سب کے سب عذاب الٰہی کے نیچے آ گئے۔

تنبیہ: اس آیت سے ان اختلافات اور فرقہ بندیوں کا مذموم و مہلک ہونا معلوم ہوا جو شریعت کے صاف احکام پر مطلع ہونے کے بعد پیدا کئے جائیں، افسوس ہے کہ آج مسلمان کہلانے والوں میں بھی سینکڑوں فرقے شریعت اسلامیہ کے صاف و صریح اور مسلَّم و محکم اصول سے الگ ہو کر اور ان میں اختلاف ڈال کر اس عذاب کے نیچے آئے ہوئے ہیں، تاہم اسی طوفان بے تمیزی میں اللہ و رسول کے وعدہ کے موافق ایک عظیم الشان جماعت بحمد اللہ خدا کی رسی کو مضبوط تھامے ہوئے مَا اَنَا عَلَیْهِ وَ اَصْحَابِیْ کے مسلک پر قائم ہے اور تاقیام قیامت قائم رہے گی، باقی فروعی اختلافات جو صحابہ رضی اللہ عنہم اور ائمہ مجتہدین میں ہوئے ہیں، ان کو آیت حاضرہ سے کوئی تعلق نہیں، اس فروعی اختلاف کے اسباب پر حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ، نے اپنی تصانیف میں کافی و شافی بحث کی ہے۔

يَّوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ ۚ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْهُهُمْ ۣ اَكَفَرْتُمْ

جس دن کہ سفید ہوں گے بعضے منہ ۱؎ اور سیاہ ہوں گے بعضے منہ، سو وہ لوگ کہ سیاہ ہوئے منہ ان کے ان سے کہا جائے گا کیا تم کافر ہوگئے

بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿١٠٦﴾ وَاَمَّا الَّذِيْنَ ابْيَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ

ایمان لا کر ۲؎ اب چکھو عذاب بدلہ اس کفر کرنے کا، اور وہ لوگ کہ سفید ہوئے منہ ان کے

فَفِيْ رَحْمَةِ اللّٰهِ ۭ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿١٠٧﴾

سو رحمت میں ہیں اللہ کی وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے ۳؎

خلاصہ تفسیر: اس روز (یعنی قیامت کے روز) کہ بعض چہرے سفید (روشن) ہو جائیں گے اور بعض چہرے سیاہ (اور تاریک) ہوں گے، سو جن کے چہرے سیاہ ہو گئے ہوں گے ان سے کہا جائے گا کیا تم (ہی) لوگ کافر ہوئے تھے اپنے ایمان لانے کے بعد؟ تو (اب)

سزا چکھو بسبب اپنے کفر کے، اور جن کے چہرے سفید ہوں گے وہ اللہ کی رحمت (جنت) میں (داخل) ہوں گے (اور) وہ اسمیں ہمیشہ رہیں گے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی بعضوں کے چہرہ پر ایمان وتقویٰ کا نور چمکتا ہوگا اور عزت و وقار کے ساتھ شاداں وفرحاں نظر آئیں گے۔ انکے برخلاف بعضوں کے منہ کفر ونفاق یا فسق وفجور سے کالے ہوں گے، صورت سے ذلت ورسوائی ٹپک رہی ہوگی۔ گویا ہر ایک کا ظاہر باطن کا آئینہ بن جائے گا۔

فائدہ: ۲؎ یہ الفاظ مرتدین، منافقین، اہل کتاب، عام کفار یا مبتدعین وفساق وفجار سب کو کہے جاسکتے ہیں، ''مرتد'' تو اسی کو کہتے ہیں جو ایمان لانے کے بعد کافر ہو جائے، ''منافق'' زبان سے اقرار کرنے کے بعد دل سے کافر رہتا ہے، ''اہل کتاب'' اپنے نبیوں اور کتابوں پر ایمان لانے کے مدعی ہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی سب بشارتوں کو جو نبی کریم ﷺ کے متعلق دی گئی تھیں تسلیم کریں اور ان کی ہدایات کے موافق حضور ﷺ پر ایمان لائیں، مگر وہ انکار میں سب سے آگے رہتے ہیں، گویا اپنے نبی اور کتاب پر ایمان لانے کے بعد کافر بن رہے ہیں، ''مبتدعین'' کا دعویٰ زبان سے یہ ہوتا ہے کہ ہم قرآن وسنت کے متبع ہیں اور نبی کریم ﷺ پر ایمان لا چکے ہیں، مگر اس کے بعد بہت سی بے اصل اور باطل چیزیں دین میں شامل کرکے یا بعض ضروریات دین کا انکار کرکے اصلی دین سے نکل جاتے ہیں، اس طرح وہ بھی ایک درجہ میں اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ کے مخاطب ہوئے۔

رہے ''فساق'' جن کا عقیدہ صحیح ہو، اگر ان سے خطاب ہوا تو یہ مطلب ہوگا کہ ایمان لانے کے بعد کافروں جیسے عمل کیوں کئے، گویا کفر سے عملی کفر مراد ہوگا اور اگر عام کفار کے حق میں یہ خطاب مانا جائے تو یہ حاصل ہے کہ خدا تعالیٰ نے سب کو دین فطرت پر پیدا کیا، اس فطرت ایمانی کو ضائع کرکے کافر کیوں بنے، باقی سیاق آیات سے ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کفر سے کفر فعلی یعنی اختلاف وتفریق مذموم مراد ہو، واللہ اعلم۔

فائدہ: ۳؎ یعنی جنت میں، کیونکہ جنت محض عمل سے نہیں ملتی عمل کے بعد خدا کی رحمت سے ملتی ہے، اور وہی جگہ ہے جہاں اللہ تعالیٰ نے ہر قسم کی رحمت کے سامان کئے ہیں: بہشت آنجا کہ آزارے نہ باشد

تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ؕ وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۸﴾

یہ حکم ہیں اللہ کے ہم سناتے ہیں تجھ کو ٹھیک، اور اللہ ظلم کرنا نہیں چاہتا خلقت پر ۱؎

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۱۰۹﴾ ع

اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ کہ ہے آسمانوں میں اور جو کچھ کہ ہے زمین میں، اور اللہ کی طرف رجوع ہے ہر کام کا ۲؎

خلاصہ تفسیر: پیچھے اہل رحمت واہل غضب کی جزا وسزا کا بیان تھا، آگے حق تعالیٰ اس خبر کا صحیح ہونا، جزا وسزا کا مناسب ہونا، سب لوگوں کا مملوک خداوندی ہونا اور کسی غیر کا بالکل اختیار نہ ہونا بیان کرتے ہیں، کیونکہ وعدہ اور وعید کا باقعت ہونا ان ہی باتوں پر موقوف ہوتا ہے۔

یہ (جو پیچھے بیان ہوئیں) اللہ تعالیٰ کی آیتیں ہیں جو صحیح صحیح طور پر ہم تم کو پڑھ کر سناتے ہیں (اس سے تو مضمون بالا کا صحیح ہونا معلوم ہوگیا) اور اللہ تعالیٰ مخلوقات پر ظلم کرنا نہیں چاہتے (پس جو کچھ کسی کے لئے جزا وسزا تجویز کی ہے، وہ بالکل مناسب ہے اس سے جزا وسزا کا مناسب ہونا معلوم ہوا) اور اللہ ہی کی ملک ہے جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے (پس جب سب ان کی ملکیت ہے تو ان سب کے ذمہ اطاعت واجب تھی، اس سے ان کا مملوک ہونا اور اطاعت کا واجب ہونا ثابت ہوا) اور اللہ ہی کی طرف سب مقدمات رجوع کئے جائیں گے (کوئی دوسرا صاحب اختیار نہ ہوگا)۔

وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعٰلَمِيْنَ: یعنی اللہ تعالیٰ مخلوقات پر ظلم کرنا نہیں چاہتے، مطلب یہ کہ جس کو تم عقلاً وشرعاً ظلم سمجھتے ہو ہم وہ بھی کرنا نہیں چاہتے، ورنہ حقیقت کے اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو حق تعالیٰ جو کچھ بھی کریں وہ ظلم ہو ہی نہیں سکتا، کیونکہ ظلم کہتے ہیں غیر کے حق میں دست اندازی کرنے کو، اور یہاں تو جو کچھ ہے سب خدا ہی کا ہے، وہ جو کچھ بھی کریں اپنی ہی چیزوں میں تصرف ہوگا، اور اپنی چیز میں تصرف کرنے کا ہر مالک کو ہر طرح اختیار ہوتا ہے، تو حق تعالیٰ اگر نیک آدمی کو جہنم میں بھیج دیں یا فاسق کو جنت میں بھیج دیں ہر صورت میں اپنی چیز میں تصرف ہے جس کو ہرگز ظلم نہیں

کہا جا سکتا، مگر اس جگہ ظلم کے حقیقی معنی مراد نہیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ اگر چہ ہم جو کچھ بھی کریں وہ کسی صورت میں ظلم نہیں، مگر جس کو تم بظاہر ظلم سمجھتے ہو ہم وہ بھی نہیں کرنا چاہتے، ہر شخص کے لیے جو سزا و جزا مقرر کی گئی ہے بالکل مناسب ہے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ حقیقی معنی میں ظلم تو وہاں ممکن ہی نہیں، لیکن ظاہری طور پر جسے تم ظلم کہہ سکتے ہو، اس کا صدور بھی خدا تعالیٰ سے نہیں ہوتا، مثلاً ایسے سخت احکام بندوں کو بھیجے جن سے غرض محض ستانا اور دق کرنا ہو، یا مستحق رحمت پر عذاب کرنے لگے، یا تھوڑی سزا کی جگہ زائد سزا جاری کر دے، یا کسی کی ادنیٰ ترین نیکی کا صلہ نہ دے وغیرہ ذالک، خوب سمجھ لو! اس کا جو حکم ہے خالص بندوں کی تربیت کے لئے اور جو معاملہ کسی کے ساتھ ہے عین حکمت و مصلحت کے موافق ہے۔

فائدہ: ۲؎ جب ہر چیز اللہ کی مخلوق و مملوک اور ہر کام کا انجام اسی کے ہاتھ میں ہے تو ظلم کیونکر اور کس لئے کیا جائے گا۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ

تم ہو بہتر سب امتوں سے جو بھیجی گئی عالم میں ۱؎ حکم کرتے ہو اچھے کاموں کا اور منع کرتے ہو برے کاموں سے ۲؎ اور ایمان لاتے ہو

بِاللّٰهِ ؕ وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَاَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۱۱۰﴾

اللہ پر ۳؎ اور اگر ایمان لاتے اہل کتاب تو ان کے لئے بہتر تھا، کچھ تو ان میں سے ہیں ایمان پر اور اکثر ان میں نافرمان ہیں ۴؎

خلاصہ تفسیر: گذشتہ آیات میں مسلمانوں کو ایمان پر ثابت قدمی اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرنے کا حکم تھا، آگے اسی کی مزید تاکید کے لیے بتلاتے ہیں کہ امت محمدیہ کو جو حق تعالیٰ نے تمام امتوں سے افضل و اعلیٰ اور خیر الامم قرار دیا ہے اسکی بڑی وجہ ان کی یہی صفات ہیں۔

(اے امت محمدیہ!) تم لوگ (سب اہل مذاہب سے) اچھی جماعت ہو کہ وہ جماعت (عام) لوگوں کے (نفع ہدایت پہنچانے کے لئے) ظاہر کی گئی ہے (اور نفع پہنچانا جو اس امت کے خیر اور افضل ہونے کی وجہ ہے، اس کی صورت یہ ہے کہ) تم لوگ (شریعت کے حکم کے مطابق زیادہ اہتمام کے ساتھ) نیک کاموں کو بتلاتے ہو اور بری باتوں سے روکتے ہو، اور (خود بھی) اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتے ہو (یعنی ایمان پر قائم رہتے ہو، یہاں اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے دین کی تمام باتوں پر ایمان لانا داخل ہے، کیونکہ وہ سب اللہ کی بتلائی ہوئی ہیں)۔

اور اگر اہل کتاب (بھی جو تم سے مخالفت کر رہے ہیں، تمہاری طرح) ایمان لے آتے تو ان کے لئے (اس موجودہ حالت سے) زیادہ اچھا ہوتا (کیونکہ پھر وہ بھی اسی بہترین امت میں داخل ہو جاتے، مگر افسوس کہ وہ سب مسلمان نہ ہوئے بلکہ) ان میں سے بعض تو مسلمان ہیں (جو رسول اللہ ﷺ پر ایمان لا کر اسلام میں داخل ہو گئے) اور زیادہ حصہ ان میں سے کافر ہیں (کہ خاتم الانبیاء ﷺ پر ایمان نہیں لائے اور ان کی بہترین امت میں شامل نہیں ہوئے اور طرفہ یہ کہ جو مسلمان ہو گئے ہیں ان کو بہکانے اور نقصان پہنچانے کی فکر میں ہیں)۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ: یہ خطاب تمام امت محمدیہ کو عام ہے، پھر ان میں سے صحابہ اولین مخاطب ہیں اور اس امت میں سب سے افضل ہیں، پس اوس و خزرج کے قصہ سے بھی مناسبت ظاہر ہو گئی۔

وتؤمنون باللہ: یہ اس امت کی دوسری امتیازی صفت بیان فرمائی ہے، یہاں یہ سوال ہوتا ہے کہ ایمان باللہ تو تمام انبیاء سابقین اور ان کی امتوں کا مشترک وصف ہے، پھر یہاں اس کو امتیازی وجہ کس بنا پر قرار دیا؟ جواب واضح ہے کہ اصل ایمان تو سب میں مشترک ہے، مگر کمال ایمان کے درجات مختلف ہیں، ان میں امت محمدیہ کو جو درجہ حاصل ہے وہ سابقہ امتوں کے مقابلہ میں خاص امتیاز رکھتا ہے۔

امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی شرائط پیچھے آیت ۱۰۴: وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ میں گذر چکی ہیں وہاں ملاحظہ فرمایئے۔

* * *

فائدہ: لہ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ: گزشتہ رکوع کے شروع میں فرمایا تھا: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (آل عمران:۱۰۲) درمیان میں اسی کے مناسب کچھ اوامر ونواہی اور وعدو عید آ گئی، یہاں سے پھر اسی اول مضمون کی تکمیل کی جاتی ہے، یعنی اے مسلمانو! خدا تعالیٰ نے تم کو تمام امتوں میں بہترین امت قرار دیا ہے، اس کے علم ازلی میں پہلے سے ہی یہ مقدر ہو چکا تھا جس کی خبر بعض انبیائے سابقین کو بھی دے دی گئی تھی کہ جس طرح نبی آخر الزماں محمد رسول اللہ ﷺ تمام نبیوں سے افضل ہوں گے، آپ کی امت بھی جملہ اُمم واقوام پر سبقت لے جائے گی، کیونکہ اس کو سب سے اشرف واکرم پیغمبر نصیب ہوگا ادوم واکمل شریعت ملے گی، علوم ومعارف کے دروازے اس پر کھول دیئے جائیں گے، ایمان وعمل تقویٰ کی تمام شاخیں اس کی محنت اور قربانیوں سے سرسبز وشاداب ہوں گی، وہ کسی خاص قوم ونسب یا مخصوص ملک و اقلیم میں محصور نہ ہوگی، بلکہ اس کا دائرہ عمل سارے عالم کو اور انسانی زندگی کے تمام شعبوں کو محیط ہوگا، گویا اس کا وجود ہی اس لئے ہوگا کہ دوسروں کی خیر خواہی کرے اور جہاں تک ممکن ہو انہیں جنت کے دروازوں پر لا کر کھڑا کر دے، اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ میں اسی طرف اشارہ ہے۔

تنبیہ: اس سورت کے نویں رکوع میں وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ (آل عمران:۸۱) سے نبی کریم ﷺ کی امامت وجامعیت کبریٰ کا بیان ہوا تھا، دسویں رکوع میں اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ (آل عمران:۹۶) سے اس امت کے قبلہ کی برتری دکھلائی گئی، گیارہویں رکوع میں وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا الخ سے اس امت کی کتاب وشریعت کی مضبوطی کا اظہار فرمایا، اب یہاں بارہویں رکوع کے آغاز سے خود امت مرحومہ کی فضیلت وعظمت کا اعلان کیا جارہا ہے۔

فائدہ: ۲ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ: ''منکر'' (بُرے کاموں) میں کفر، شرک، بدعات، رسوم قبیحہ، فسق وفجور اور ہر قسم کی بد اخلاقی اور نامعقول باتیں شامل ہیں، ان سے روکنا بھی کئی طرح ہوگا، کبھی زبان سے، کبھی ہاتھ سے کبھی قلم سے کبھی تلوار سے، غرض ہر قسم کا جہاد اس میں داخل ہوگیا، یہ صفت جس قدر عموم واہتمام سے اُمتِ محمدیہ میں پائی گئی، پہلی امتوں میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔

فائدہ: ۳ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ: اللہ پر ایمان لانے میں، اسکی توحید پر، اس کے رسولوں پر اور کتابوں پر ایمان لانا بھی داخل ہے اور سچ تو یہ ہے کہ توحید خالص وکامل کا اتنا شیوع واہتمام کبھی کسی امت میں نہیں رہا جو بحمد اللہ اس امت میں رہا ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا جو شخص تم میں سے چاہتا ہے کہ اس امت (خیر الامم) میں شامل ہو، چاہیے کہ اللہ کی شرط پوری کرے، یعنی امر بالمعروف ونہی عن المنکر اور ایمان باللہ، جس کا حاصل ہے خود درست ہو کر دوسروں کو درست کرنا جو شان حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کی تھی۔

فائدہ: ۴ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَاَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ: یعنی اہل کتاب اگر اکثر ایمان لے آتے تو وہ بھی اس خیر الامم میں شامل ہو سکتے تھے، جس سے دنیا میں عزت بڑھتی اور آخرت میں دوہرا اجر ملتا، مگر افسوس ہے ان میں چند افراد کے سوا (مثلاً عبد اللہ بن سلام ؓ یا نجاشی وغیرہ) کسی نے حق کو قبول نہ کیا، باوجود وضوح حق کے نافرمانی ہی پر اڑے رہے۔

لَنْ يَّضُرُّوْكُمْ اِلَّآ اَذًى ۭ وَاِنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ يُوَلُّوْكُمُ الْاَدْبَارَ ۣ ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ (۱۱۱)

وہ کچھ نہ بگاڑ سکیں گے تمہارا مگر ستانا زبان سے، اور اگر تم سے لڑیں گے تو پیٹھ دیں گے پھر ان کی مدد نہ ہوگی

خلاصہ تفسیر: پیچھے اہل کتاب کی مسلمانوں سے دشمنی اور انہیں دینی نقصان پہنچانے کی تدبیریں کرنا مذکور تھا، اب اہل کتاب کی مسلمانوں کے خلاف دنیوی نقصان کی تدبیریں کرنے کا ذکر ہے، اس کے ساتھ اہل کتاب کی ناکامی کی پیشین گوئی سے تسلی بھی دی گئی ہے۔

وہ (اہل کتاب) تم کو ہرگز کوئی ضرر نہ پہنچا سکیں گے مگر ذرا ہلکی سی اذیت (یعنی زبانی برا بھلا کہہ کر دل دکھانا، اس سے زیادہ ان کی ہمت نہ ہوگی) اور اگر وہ (اس سے زیادہ کی ہمت کریں اور) تم سے مقابلہ کریں تو تم کو پیٹھ دکھا کر بھاگ جائیں گے، پھر (اس سے بڑھ کر یہ ہوگا کہ) کسی طرف سے ان کی امداد بھی نہ ہوگی۔

ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ: یعنی پھر (اس سے بڑھ کر یہ ہوگا کہ) کسی طرف سے ان کی امداد بھی نہ ہوگی، ''بڑھ کر'' اس لیے کہا گیا کہ خالی حمایت اور طرف داری کیا جانا غالب آنے سے زیادہ آسان ہے، کیونکہ غالب آنے کے لیے بڑے سامان کی ضرورت ہے، اور خالی حمایت کے لیے صرف زبان ہلانا اور ذرا دوڑ دھوپ کرنی پڑتی ہے، مگر جب ان کا زبانی بھی کوئی ساتھ نہیں دیتا تو غالب آنا تو بدرجہ اولی ممکن نہیں، اس کی نفی تو خود ہی سمجھ میں آسکتی ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی اگر نافرمان ہیں تو ہونے دو، تم کو ان کی اکثریت یا مادی ساز و سامان سے خوف کھانے کی کوئی وجہ نہیں (اے خیر الامم!) خدا کا وعدہ ہے کہ یہ شیطانی لشکر تمہارا کچھ نہ بگاڑ سکے گا (بشرطیکہ تم اپنے کو خیر الامم ثابت کرو) بس یہ اتنا ہی کر سکتے ہیں کہ زبان سے گالی دیں اور نامردوں کی طرح تم کو برا بھلا کہتے پھریں، یا کوئی چھوٹی موٹی عارضی تکلیف پہنچائیں، باقی تم پر غالب و مسلط ہو جائیں، یا کوئی بڑا قومی نقصان پہنچا سکیں، یہ کبھی نہ ہوگا، اگر لڑائی میں تمہارے مقابلہ پر آئے تو پیٹھ دے کر بھاگیں گے اور کسی طرف سے انکو مدد نہ پہنچے گی جو ان کی ہزیمت کو روک سکے، یہ پیشین گوئی حرف بحرف پوری ہوئی، صحابہ رضی اللہ عنہم کے عہد میں اہل کتاب کا یہی حشر ہوا، اسلام اور مسلمانوں کی تباہی کے لئے انہوں نے ایڑی چوٹی کا زور خرچ کر دیا مگر بال بیکا نہ کر سکے، جہاں مقابلہ ہوا حمرٌ مستنفرہ کی طرح بھاگے، ہر موقع پر خدا کی نصرت و امداد خیر الامم کے شامل حال رہی اور دشمن بدحواسی اور بے کسی کی حالت میں مقہور و مخذول ہو کر بھاگے، یا قید ہوئے، یا رعیّت بن کر رہے، یا جہنم میں پہنچ گئے، فَلِلّٰہِ الحمد و المنّۃ۔

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ أَيْنَ مَا ثُقِفُوٓا إِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ

ماری گئی ان پر ذلت جہاں دیکھے جائیں سوائے دستاویز اللہ کے اور دستاویز لوگوں کے اور کمایا انہوں نے غصہ

مِّنَ اللهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ؕ ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللهِ وَيَقْتُلُوْنَ

اللہ کا اور لازم کر دی گئی ان کے اوپر حاجت مندی، یہ اس واسطے کہ وہ انکار کرتے رہے ہیں اللہ کی آیتوں سے اور قتل کرتے رہے ہیں

الْأَنْبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿۱۱۲﴾

پیغمبروں کو ناحق، یہ اس واسطے کہ نافرمانی کی انہوں نے اور حد سے نکل گئے ۔

خلاصہ تفسیر: (گذشتہ مضمون کا تکملہ ہے، سکہ کے نقش کی طرح) جما دی گئی ہے ان پر ذلت جہاں کہیں بھی پائے جائیں گے مگر ہاں! (دو ذریعوں سے وہ اس ذلت سے نجات پا سکتے ہیں) ایک تو ایسے ذریعہ کے سبب جو اللہ کی طرف سے ہے، اور ایک ایسے ذریعہ کے سبب جو آدمیوں کی طرف سے ہے اور مستحق ہو گئے (یہ لوگ) غضب الٰہی کے، اور جما دی گئی ان پر پستی (کہ ان کی طبیعت میں بھی اولوا العزمی نہ رہی، نیز جزیہ و خراج مسلمانوں کو ادا کر کے رہنا بھی پستی میں داخل ہے) یہ (ذلت و غضب) اس وجہ سے ہوا کہ وہ لوگ منکر ہو جاتے تھے احکام الٰہیہ سے، اور قتل کر دیا کرتے تھے پیغمبروں کو (اس طرح سے کہ وہ قتل خود ان کے نزدیک بھی) ناحق (ہوتا تھا) اور یہ ذلت و غضب اس وجہ سے بھی ہوا کہ انہوں نے اطاعت نہ کی اور دائرہ اطاعت سے نکل نکل جاتے تھے۔

اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللهِ: ''اللہ کی طرف سے ذریعہ'' تو یہ ہے کہ اگر کوئی کتابی غیر مسلم اللہ تعالیٰ کی عبادت میں اپنے طریق پر ایسا مشغول و معروف ہو کہ مسلمانوں سے لڑتا بھڑتا نہ ہو، اس کو جہاد میں قتل نہیں کیا جاتا اگرچہ اس کی کافرانہ عبادت آخرت میں اس کے کام نہ آئے گی، اسی طرح اللہ کی طرف کے ذریعہ میں یہ بھی آگیا کہ وہ کتابی نابالغ یا عورت ہو تو شریعت اسلام کی رو سے ان کو بھی جہاد میں قتل کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ: ''آدمیوں کی طرف سے ذریعہ'' سے مراد وہ معاہدہ اور صلح ہے جو مسلمانوں کے ساتھ ہو جائے، کیونکہ شریعت اسلام میں جس شخص سے کوئی صلح کا معاہدہ ہو جائے تو وہ بھی مامون ہے، اس کا قتل جائز نہیں، یا کسی قوم کا مسلمانوں سے لڑنے کا قصد نہ ہو جیسا کہ بعض

زمانوں میں واقع ہوا، یا آئندہ ایسا ہو، یہ صورت بھی آدمیوں کی طرف سے ان کے مامون کی ہے، باقی اور کسی کو امن نہیں۔

وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ: روح المعانی میں اس آیت کے ذیل میں لکھا ہے کہ اس پیشین گوئی میں رسول اللہ ﷺ کی نبوت کی دلیل ہے، چنانچہ یہود بنی قریظہ و بنی نضیر وخیبر وغیرہ مسلمانوں کے مقابلہ میں ناکام رہے اور پھر روز بروز ذلیل ہی ہوئے۔

* * *

فائدہ: ۱ یہ آیتیں اہل کتاب میں سے خاص یہود کے متعلق معلوم ہوتی ہیں جیسا کہ سیاق کلام اور قرآن کی دوسری آیات سے ظاہر ہے، یعنی یہود پر ہمیشہ کیلئے ذلت کی مہر کردی گئی، یہ بدبخت جہاں کہیں پائے جائیں، ذلت کا نقش ان سے محو نہیں ہوسکتا، بڑے بڑے کروڑ پتی یہود بھی آزادی و خودمختاری سے اپنے جان ومال کی حفاظت نہیں کرسکتے، کیونکہ ان کی آزاد حکومت کسی جگہ نہیں "سوائے دستاویز اللہ کے" یعنی بعض بچی کچھی رسمیں تورات کی عمل میں لاتے ہیں اسکے طفیل سے پڑے ہیں اور "سوائے دستاویز لوگوں کے" یعنی کسی کی رعیّت میں اس کی پناہ میں پڑے ہیں (کذافی الموضح)۔

بعض مفسرین نے حَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ سے اللہ کا ذمہ اور مسلمانوں کا عہد مراد لیا ہے، یعنی بجز اس کے کہ مسلمانوں سے عہد کرکے خدا کے ذمہ میں آجائیں، بعض کہتے ہیں کہ بحبل من اللہ سے اسلام مراد ہے، یعنی اسلام لاکر اس ذلت سے نکل سکتے ہیں، یا معاہد بن کے، کیونکہ معاہدہ بھی جان ومال کی طرف مامون کردیتا ہے۔ واللہ اعلم۔

فائدہ: ۲ یعنی نافرمانی کرتے کرتے حد سے نکل گئے، جس کا انتہائی اثر یہ تھا کہ اللہ کی صریح آیتوں کے انکار اور معصوم پیغمبروں کے قتل پر آمادہ ہوگئے، اسی مضمون کی آیت سورۃ بقرہ پارہ الم میں گزر چکی ہے، وہاں کے فوائد ملاحظہ کئے جائیں۔

لَيْسُوْا سَوَآءً ۭ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآىِٕمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَاۗءَ الَّيْلِ وَھُمْ يَسْجُدُوْنَ ﴿۱۱۳﴾

وہ سب برابر نہیں، اہل کتاب میں ایک فرقہ ہے سیدھی راہ پر پڑھتے ہیں آیتیں اللہ کی راتوں کے وقت اور وہ سجدے کرتے ہیں

خلاصہ تفسیر: (پیچھے اہل کتاب کے متعلق اجمالی بیان ہوا تھا کہ ان میں کچھ لوگ مسلمان بھی ہیں اور زیادہ کافر ہیں، اسی مضمون کی مزید تفصیل ان آیات میں ہے:) یہ (اہل کتاب) سب برابر نہیں (بلکہ) ان (ہی) اہل کتاب میں ایک جماعت وہ بھی ہے جو (دین حق پر) قائم ہیں (اور) اللہ کی آیتیں (یعنی قرآن) اوقات شب میں پڑھتے ہیں، اور وہ نماز بھی پڑھتے ہیں۔

يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ فِي

ایمان لاتے ہیں اللہ پر اور قیامت کے دن پر اور حکم کرتے ہیں اچھی بات کا اور منع کرتے ہیں برے کاموں سے اور دوڑتے ہیں نیک

الْخَيْرٰتِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۱۴﴾ وَمَا يَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۱۵﴾

کاموں پر، اور وہی لوگ نیک بخت ہیں ۱ اور جو کچھ کریں گے وہ لوگ نیک کام اسکی ہرگز ناقدری نہ ہوگی ۲ اور اللہ کو خبر ہے پرہیزگاروں کی ۳

خلاصہ تفسیر: (اور) اللہ پر اور قیامت والے دن پر (پورا پورا) ایمان رکھتے ہیں اور (دوسروں کو) نیک کام بتلاتے ہیں اور بری باتوں سے روکتے ہیں اور نیک کاموں میں دوڑتے ہیں اور یہ لوگ (اللہ کے نزدیک) شائستہ لوگوں میں (شمار کئے جاتے) ہیں، اور یہ لوگ جو نیک کام کریں گے اس (کے ثواب) سے محروم نہ کئے جائیں گے، اور (محروم ہونے کا احتمال ہی کب ہے، کیونکہ) اللہ تعالیٰ اہل تقوی کو خوب جانتے ہیں (اور یہ لوگ چونکہ اہل تقوی ہیں سو ان کے اعمال واخلاص کی اللہ تعالیٰ کو خوب اطلاع ہے تو وعدہ کے مطابق ثواب واجر کے مستحق ہیں، پس نہ یہ احتمال کہ خدا کو ان کی حالت کا علم نہ ہو، اور نہ یہ احتمال کہ وعدہ خلافی کریں)۔

مذکورہ بالا دو آیتوں میں جتنی باتیں مذکور ہیں یہ ضروری نہیں کہ سب فرض ہی ہوں، بلکہ ظاہر یہ ہے کہ بعض باتیں ان میں سے نفل بھی ہیں، جیسے

شب بیدار رہ کر قرآن کی تلاوت کرنا، یا تہجد پڑھنا، یہاں نوافل کے بیان کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ جب وہ لوگ نفل اعمال تک کے پابند ہیں تو فرض اعمال وعقائد کو کیوں ضائع کریں گے، حاصل آیت کا یہ ہے کہ ان لوگوں نے اُن صفات کو اختیار کیا ہے جو اس امت کے سب امتیوں میں افضل ہونے میں دخل رکھتی ہیں، اسی لیے ایمان اور امر بالمعروف کو خاص طور پر بیان کیا، ورنہ دین حق پر قائم ہونے کی صفت میں یہ بھی داخل ہو گئے۔

＊＊＊

فائدہ: ؁ وَاُولٰٓئِكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ: یعنی سب اہل کتاب کا حال یکساں نہیں، اتنے بروں میں کچھ اچھے بھی ہیں، ان ہی ممسوخ اشقیاء کے درمیان چند سعید روحیں ہیں جن کو حق تعالیٰ نے قبول حق کی توفیق دی اور وہ اسلام کی آغوش میں آ گئے اور جادہ حق پر ایسے مستقیم ہو گئے کہ کوئی طاقت ہلا نہیں سکتی، وہ رات کی تاریکی میں میٹھی نیند اور نرم بستر چھوڑ کر خدا کے سامنے کھڑے ہوتے ہیں، اپنے مالک کے سامنے خضوع وتذلل اختیار کرتے ہیں، جبین نیاز زمین پر رکھتے ہیں، نماز میں اس کا کلام پڑھتے ہیں، اللہ پر اور یوم آخرت پر ٹھیک ٹھیک ایمان لاتے ہیں، خالص توحید کے قائل ہیں، قیامت کے دن سے ڈرتے ہیں اور جب کسی نیک کام کی طرف پکارا جائے دوڑ کر دوسروں سے آگے نکلنا چاہتے ہیں، پھر نہ صرف یہ کہ خود راہِ راست پر ہیں، دوسروں کو بھی سیدھے راستے پر لانا چاہتے ہیں، بلاشبہ ان یہود میں سے یہ لوگ ہیں جن کو خدا نے نیک بختی اور صلاح ورُشد کا خاص حصہ عطا فرمایا ہے، یہ عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کا ذکر ہوا۔

فائدہ: ؂ وَمَا يَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ: بلکہ دُگنا اجر ملے گا، جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد ہوا: اُولٰٓئِكَ يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوْا (القصص: ۵۴) اور حدیث صحیح میں نبی کریم ﷺ نے اس کی تشریح فرمادی۔

فائدہ: ؃ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ: اسی لئے جب یہود کی برائیوں کا ذکر آتا ہے حق تعالیٰ ان پرہیزگاروں کو مستثنیٰ کر دیتا ہے اور پرہیزگاری کے موافق دنیا وآخرت میں ان کے ساتھ معاملہ بھی بالکل ممتاز کیا جائے گا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِيَ عَنْھُمْ اَمْوَالُھُمْ وَلَآ اَوْلَادُھُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـــًٔا ۭ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ

وہ لوگ جو کافر ہیں ہرگز کام نہ آوینگے ان کو ان کے مال اور نہ اولاد اللہ کے آگے کچھ، اور وہی لوگ رہنے والے ہیں آگ میں

النَّارِ ۚ ھُمْ فِيْھَا خٰلِدُوْنَ ﴿۱۱۶﴾

دوزخ کی، وہ اس آگ میں ہمیشہ رہیں گے

خلاصہ تفسیر: (اہل کتاب میں سے جو مسلمان ہو گئے تھے پیچھے ان کی مدح تھی، اب اہل کتاب میں سے جو مسلمان نہیں ہوئے ان کی مذمت بیان کی جاتی ہے) بیشک جو لوگ کافر رہے، ہرگز ان کے کام نہ آئیں گے ان کے مال اور نہ اولاد اللہ کے (عذاب کے) مقابلہ میں ذرا بھی، اور وہ لوگ دوزخ والے ہیں (اور) وہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے (اور کبھی نجات نہ ہوگی)۔

چونکہ آیت کے الفاظ عام ہیں اس لیے سب کفار کا یہی حکم ہے۔

مَثَلُ مَا يُنْفِقُوْنَ فِيْ ھٰذِهِ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَثَلِ رِيْحٍ فِيْھَا صِرٌّ اَصَابَتْ حَرْثَ قَوْمٍ

جو کچھ خرچ کرتے ہیں اس دنیا کی زندگی میں اس کی مثال جیسے ایک ہوا کہ اس میں ہو پالا جا لگی کھیتی کو اس قوم کی

ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَھُمْ فَاَھْلَكَتْهُ ۭ وَمَا ظَلَمَھُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ اَنْفُسَھُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۱۷﴾

کہ انہوں نے اپنے حق میں برا کیا تھا پھر اس کو نابود کر گئی ؁ اور اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا لیکن وہ اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں ؂

خلاصہ تفسیر: گذشتہ آیت میں بیان کیا کہ قیامت کے دن کافروں کے مال ان کے کچھ کام نہ آئیں گے، اس پر کسی کے دل

میں یہ شبہ گذر سکتا تھا کہ بعض اوقات کافر اپنے مال سے نیک کاموں میں محتاجوں اور یتیموں اور مظلوموں کی مدد کرتے ہیں، پُل، سرائے، کنواں بنواتے ہیں تو کیا اس قسم کے خرچوں سے کافروں کو قیامت کے دن کوئی نفع پہنچ سکتا ہے؟ اس آیت میں اس شبہ کا ازالہ فرماتے ہیں کہ اس قسم کے خرچوں سے بھی کافروں کو قیامت کے دن کوئی نفع نہیں پہنچ سکتا، چنانچہ فرماتے ہیں کہ:

وہ (کفار) جو کچھ خرچ کرتے ہیں اس دنیوی زندگانی میں اس کی حالت (برباد و ضائع ہونے میں) اس حالت کے مثل ہے کہ ایک ہوا ہو جس میں تیز سردی (یعنی پالا) ہو (اور) وہ لگ جائے ایسے لوگوں کی کھیتی کو جنہوں نے (بددینی سے) اپنا نقصان کر رکھا ہو، پس وہ (ہوا) اس (کھیتی) کو برباد کرڈالے (اسی طرح ان لوگوں کا خرچ کرنا آخرت میں سب ضائع ہے) اور (اس ضائع کرنے میں) اللہ تعالیٰ نے ان پر (کوئی) ظلم نہیں کیا، لیکن وہ خود ہی (کفر میں مبتلا ہیں جو قبولیت سے مانع ہے) اپنے آپ کو ضرر پہنچا رہے تھے (نہ وہ کفر کرتے، نہ ان کے سارے خرچ ضائع ہوتے)۔

كَمَثَلِ رِيۡحٍ فِيۡهَا صِرٌّ اَصَابَتۡ: اس مثال میں جو یہ فرمایا کہ پالا یعنی ٹھنڈی ہوا لگ جائے ایسے لوگوں کی کھیتی کو جنہوں نے بددینی سے اپنا نقصان کر رکھا ہو، اس پر بظاہر یہ شبہ ہوگا کہ پالے سے تو ہر ایک کی کاشت کو نقصان پہنچ سکتا ہے چاہے دین دار ہی کیوں نہ ہو، پھر یہاں بددین کو بطور خاص ذکر کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ تو نکتہ اس قید میں یہ ہے کہ یہاں کامل نقصان دکھلانا مقصود ہے، اور کامل نقصان پالے سے یا کسی بھی قسم کی آفت سے بددین ہی کو ہوتا ہے کہ دنیا میں مال ضائع ہوگیا اور آخرت میں کچھ بدلہ بھی نہ ملے گا، جبکہ دین دار مسلمان کے لیے اس کے برعکس معاملہ ہے، کیونکہ مسلمان کا دنیا میں جو کسی قسم کا نقصان ہوتا ہے، اس کو اس کے عوض ثواب اور گناہوں کی معافی عطا ہوتی ہے، جیسا کہ احادیث میں تصریح ہے، پس حقیقی اور کامل نقصان وہ ہے کہ جس کا کوئی بدل اور عوض نہ ہو، اور ظاہر ہے کہ مسلمان کسی مصیبت میں اجر و ثواب سے محروم نہیں رہتا، جبکہ کافر کا دنیا میں بھی ضائع ہوگیا اور آخرت میں کچھ بدلہ بھی نہیں ملے گا۔

كَمَثَلِ رِيۡحٍ فِيۡهَا (الی قولہ) ظَلَمُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ: روح المعانی میں ہے کہ: ظَلَمُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ کی قید اس لیے لگائی کہ کلام سے مقصود تو یہ بتلانا ہے کہ نہ دنیا میں فائدہ ہے نہ آخرت میں، سو یہ بات صرف کافر کے مال کے ہلاک ہونے میں ہے، رہا غیر کافر تو اسے صبر کی وجہ سے مال کے ہلاک ہونے پر اجر ملتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ مقبولین (اہل اللہ) کی مصیبت حقیقی مصیبت نہیں ہوتی، بلکہ محض صوری (ظاہری) مصیبت ہوتی ہے۔

* * *

فائدہ: لِـ ظَلَمُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ فَاَهۡلَكَتۡهُ: صالحین و متقین کے بالمقابل یہاں کافروں کے حال و انجام کا ذکر فرماتے ہیں، پہلے فرمایا تھا: وَمَا يَفۡعَلُوۡا مِنۡ خَيۡرٍ فَلَنۡ يُّكۡفَرُوۡهُ (آل عمران: ۱۱۵) کی ادنیٰ ترین نیکی بھی کام آئے گی، ان کے کسی بھلے کام کی بے قدری نہیں کی جائے گی، اس کے برخلاف کافر جو کچھ مال و قوت دنیا میں خرچ کرے، خواہ اپنے نزدیک بڑا ثواب اور خیرات کا کام سمجھ کر کرتا ہو، آخرت میں اس کی کوئی قدر و قیمت اور پرسش نہیں، کیونکہ ایمان و معرفت صحیحہ کی روح نہ ہونے سے اس کا ہر ایک عمل بے جان اور مردہ ہے، اس کی جزاء بھی ایسی ہی فانی و زائل اس دار فانی میں مل رہی ہے گی، عمل کی ابدی حفاظت کرنے والی چیز ایمان و ایقان ہے، اس کے بدون عمل کی مثال ایسی سمجھو جیسے کسی شریر ظالم نے کھیتی یا باغ لگایا، اور اس کو برف پالے سے بچانے کا کوئی انتظام نہ کیا، چند روز اس کی سرسبزی و شادابی کو دیکھ کر خوش ہوتا اور بہت کچھ امیدیں باندھتا رہا، یکایک اس کی شرارت و بدبختی سے سرد ہوا چلی، برف پالا اس قدر گرا کہ ایک دم میں ساری لہلہاتی کھیتی جلا کر رکھ دی، آخر اپنی کلی تباہی و بربادی پر کف افسوس ملتا رہ گیا، نہ امیدیں پوری ہوئیں، نہ احتیاج کے وقت اس کی پیداوار سے منتفع ہوا، اور چونکہ یہ تباہی ظلم و شرارت کی سزا تھی، اس لئے اس مصیبت پر کوئی اجر اخروی بھی نہ ملا، جیسا کہ مومنین کو ملتا ہے، بعینہ یہ مثال ان کفار کی ہے جو کفر و شرک پر قائم رہتے ہوئے اپنے خیال میں بہت پُن خیرات کرتے ہیں، باقی وہ بدبخت جن کا زور و قوت اور پیسہ حق اور اہل حق کی دشمنی یا فسق و فجور میں خرچ ہوتا ہو ان کا تو پوچھنا ہی کیا ہے، وہ نہ صرف بیکار خرچ کر رہے ہیں، بلکہ روپیہ خرچ کر کے اپنے لئے اور زیادہ وبال خرید رہے ہیں، ان سب کو یاد رکھنا چاہیے کہ مال ہو یا اولاد، کوئی چیز عذاب الٰہی سے نہ بچا سکے گی اور نہ متقین کے مقابلہ پر وہ اپنی توقعات میں کامیاب ہوں گے۔

تنبیہ: ریح کا لفظ مفرد قرآن میں عموماً عذاب کے موقع پر استعمال ہوا ہے: رِيۡحٌ فِيۡهَا عَذَابٌ اَلِيۡمٌ (الاحقاف: ۲۴) اور وَلَئِنۡ

اَرۡسَلۡنَا رِیۡحًا (الروم:۵۱) اور اِنَّآ اَرۡسَلۡنَا عَلَیۡهِمۡ رِیۡحًا صَرۡصَرًا (القمر:۱۹) اور رحمت کے موقع پر جمع کا لفظ ریاح لائے ہیں: یُّرۡسِلَ الرِّیَاحَ مُبَشِّرٰتٍ (الروم:۴۶) وَاَرۡسَلۡنَا الرِّیٰحَ لَوَاقِحَ (الحجر:۲۲) یُرۡسِلُ الرِّیٰحَ بُشۡرًا (الاعراف:۵۷) کذا ذکرہ ابوحیان۔

فائدہ: ۲ وَلٰکِنۡ اَنۡفُسَهُمۡ یَظۡلِمُوۡنَ: یہ نہ سمجھا جائے کہ کافر کی کوئی نیکی قبول نہیں کی جاتی تو اس پر معاذ اللہ خدا کی طرف سے ظلم ہوا، نہیں! یہ ظلم تو انہوں نے اپنی جانوں پر خود اپنے ہاتھوں سے کیا ہے، نہ کفر اختیار کرتے، نہ یہ روز بد دیکھنا پڑتا۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَتَّخِذُوۡا بِطَانَةً مِّنۡ دُوۡنِکُمۡ لَا یَاۡلُوۡنَکُمۡ خَبَالًا ؕ وَدُّوۡا مَا عَنِتُّمۡ ۚ

اے ایمان والو نہ بناؤ بھیدی کسی کو اپنوں کے سوا وہ کمی نہیں کرتے تمہاری خرابی میں، ان کی خوشی ہے تم جس قدر تکلیف میں رہو

قَدۡ بَدَتِ الۡبَغۡضَآءُ مِنۡ اَفۡوَاهِهِمۡ ۚۖ وَمَا تُخۡفِیۡ صُدُوۡرُهُمۡ اَکۡبَرُ ؕ قَدۡ بَیَّنَّا لَکُمُ الۡاٰیٰتِ

نکلی پڑتی ہے دشمنی ان کی زبان سے، اور جو کچھ مخفی ہے ان کے جی میں وہ اس سے بہت زیادہ ہے، ہم نے بتا دیئے تم کو پتے

اِنۡ کُنۡتُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۱۱۸﴾

اگر تم کو عقل ہے

خلاصہ تفسیر: گذشتہ آیات میں مسلمانوں کی صفات اور اہل کتاب خصوصاً یہودیوں کی مختلف برائیوں کا ذکر تھا، اب اہل ایمان کو خطاب کرتے ہیں کہ یہ جب ایسے ہیں تو ان سے دوستی یا دوستانہ برتاؤ مت رکھو۔

اے ایمان والو! اپنے (لوگوں کے) سوا (اور مذہب والوں میں سے) کسی کو (محبت میں برتاؤ میں) صاحب خصوصیت مت بناؤ (کیونکہ) وہ لوگ تمہارے ساتھ فساد کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے (اور دل سے بھی) تمہاری مضرت (یعنی دینی و دنیاوی نقصان) کی تمنا رکھتے ہیں (دلوں میں تمہاری طرف سے اس قدر بغض بھرا ہے کہ) واقعی (وہ) بغض (بعض اوقات) ان کے منہ سے (بے اختیار بات چیت میں) ظاہر ہو پڑتا ہے، اور جس قدر ان کے دلوں میں ہے وہ تو بہت کچھ ہے (چنانچہ) ہم (ان کی عداوت کے) علامات (اور قرائن) تمہارے سامنے ظاہر کر چکے اگر تم عقل رکھتے ہو (تو ان یقینی علامات سے دیکھ لو)۔

یہاں جو غیر مذہب والوں سے خصوصیت کی ممانعت فرمائی ہے اس میں یہ بھی داخل ہے کہ ان کو اپنا ہمراز بنایا جائے اور اس میں یہ بھی داخل ہے کہ اپنے خاص انتظامی امور میں ان کو شامل کیا جائے، یعنی نہ ان کو ہمراز بنایا جائے، نہ انتظامی امور میں شامل کیا جائے۔

* * *

فائدہ: یہ آیتیں بعض کہتے ہیں یہود کے متعلق نازل ہوئیں، کیونکہ بعض مسلمان جوار (ہمسائیگی) حلف (دوستانہ معاہدہ) وغیرہ کی بنا پر جو تعلقات قبل از اسلام ان سے رکھتے چلے آ رہے تھے، بعد از اسلام بھی بدستور ان پر قائم رہے اور دوستی پر اعتماد کر کے ان سے مسلمانوں کے بعض راز دارانہ مشوروں کے اخفاء کا بھی اہتمام نہ کیا۔

اور بعض کے نزدیک یہ آیتیں منافقین کے حق میں نازل ہوئیں، کیونکہ عام طور پر لوگ ظاہر میں مسلمان سمجھ کر ان سے پوری احتیاط نہ کرتے تھے، جس سے سخت نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا، حق تعالیٰ نے یہاں صاف صاف آگاہ کر دیا کہ مسلمان اپنے اسلامی بھائیوں کے سوا کسی کو بھیدی اور راز دار نہ بنائیں، کیونکہ یہود ہوں یا نصاریٰ، منافقین ہوں یا مشرکین، ان میں کوئی جماعت تمہاری حقیقی خیر خواہ نہیں، بلکہ ہمیشہ یہ لوگ اس کوشش میں رہتے ہیں کہ تمہیں پاگل بنا کر نقصان پہنچائیں اور دینی و دنیاوی خرابیوں میں مبتلا کریں، ان کی خواہش اسی میں ہے کہ تم تکلیف میں رہو اور کسی نہ کسی تدبیر سے تم کو دینی یا دنیاوی ضرر پہنچ جائے، جو دشمنی اور بغض ان کے دلوں میں ہے وہ تو بہت ہی زیادہ ہے، لیکن بسا اوقات عداوت وغیظ کے جذبات سے مغلوب ہو کر

کھلم کھلا ایسی باتیں کر گزرتے ہیں جو ان کی گہری دشمنی کا صاف پتہ دیتی ہیں، مارے دشمنی اور حسد کے ان کی زبان قابو میں نہیں رہتی، پس عقلمند آدمی کا کام نہیں کہ ایسے خبیث باطن دشمنوں کو اپنا راز دار بنائے، خدا تعالیٰ نے دوست و دشمن کے پتے اور موالات وغیرہ کے احکام کھول کر بتلادیئے ہیں جس میں عقل ہوگی ان سے کام لے گا (موالات کفار کے متعلق کچھ تفصیل پہلے اسی سورت میں گزر چکی اور کچھ ''مائدہ'' وغیرہ میں آئے گی)۔

هٰۤاَنۡتُمۡ اُولَاۤءِ تُحِبُّوۡنَهُمۡ وَلَا يُحِبُّوۡنَكُمۡ وَتُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡكِتٰبِ كُلِّهٖ ۚ وَاِذَا لَقُوۡكُمۡ قَالُوۡۤا اٰمَنَّا ۚ

سن لو تم لوگ انکے دوست ہو اور وہ تمہارے دوست نہیں اور تم سب کتابوں کو مانتے ہو ۱ اور جب تم سے ملتے ہیں کہتے ہیں ہم مسلمان ہیں ۲

وَاِذَا خَلَوۡا عَضُّوۡا عَلَيۡكُمُ الۡاَنَامِلَ مِنَ الۡغَيۡظِ ؕ قُلۡ مُوۡتُوۡا بِغَيۡظِكُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيۡمٌۢ

اور جب اکیلے ہوتے ہیں تو کاٹ کاٹ کھاتے ہیں تم پر انگلیاں غصہ سے ۳ تو کہہ! مرو تم اپنے غصہ میں ۴ اللہ کو خوب معلوم ہیں

بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ ﴿۱۱۹﴾

دلوں کی باتیں ۵

خلاصہ تفسیر: ہاں! (سمجھو) تم ایسے ہو کہ ان لوگوں سے محبت (کا برتاؤ) رکھتے ہو، اور یہ لوگ تم سے اصلا محبت نہیں رکھتے (نہ دل سے نہ برتاؤ سے) حالانکہ تم تمام (آسمانی) کتابوں پر ایمان رکھتے ہو (اس میں ان کی کتابیں بھی آ گئیں، اور وہ تمہاری کتاب یعنی قرآن پر ایمان نہیں رکھتے، مگر وہ تو تمہارے اس ایمان کے باوجود بھی تم سے محبت نہیں رکھتے اور تم ان کے قرآن جھٹلانے کے باوجود بھی ان سے محبت رکھتے ہو)۔

اور (تم ان کے ایمان کے ظاہری دعویٰ سے دھوکہ مت کھانا کہ وہ بھی تو ہماری کتاب پر ایمان رکھتے ہیں، کیونکہ) یہ لوگ جب تم سے ملتے ہیں (صرف تمہارے دکھانے کو منافقانہ طور پر) کہہ دیتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے، اور جب (تم سے) الگ ہوتے ہیں تو تم پر اپنی انگلیاں کاٹ کاٹ کھاتے ہیں مارے غیظ (وغضب) کے (یہ کنایہ ہے سخت غصہ کی حالت سے) آپ (ان سے) کہہ دیجیے کہ تم مر رہو اپنے غصہ میں (مراد یہ کہ اگر تم مر بھی جاؤ گے تب بھی تمہاری مراد پوری نہ ہوگی) بیشک اللہ تعالیٰ خوب جانتے ہیں دلوں کی باتوں کو (اسی لئے ان لوگوں کے دلوں میں جو رنج وغبار اور دشمنی تمہارے لیے بھری ہیں سب بتلادی)۔

قُلۡ مُوۡتُوۡا بِغَيۡظِكُمۡ: یعنی آپ کہہ دیجیے کہ تم اپنے غصہ میں مرے رہو، اس میں علم اخلاق کے ایک مسئلہ کی بھی تعلیم ہے جو ایک عظیم فائدہ ہے، وہ یہ کہ جب کسی ضروری مصلحت کی وجہ سے کسی سے قطع تعلق کرنا واجب ہو تو اس شخص سے کوئی دل خراش بات کہہ دینا قطع تعلق میں نہایت موثر ہوتا ہے، اس سے وہ شخص مایوس ہو کر خود تعلق ختم کر دیتا ہے، مگر یہ ایذا شرعی حد سے تجاوز نہ کرے۔

* * *

فائدہ: ۱ وَتُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡكِتٰبِ كُلِّهٖ: یعنی یہ کیسی بے موقع بات ہے کہ تم ان کی دوستی کا دم بھرتے ہو، اور وہ تمہارے دوست نہیں، بلکہ جڑ کاٹنے والے دشمن ہیں اور طرفہ یہ ہے کہ تم تمام آسمانی کتابوں کو مانتے ہو، خواہ وہ کسی قوم کی ہوں اور کسی زمانہ میں کسی پیغمبر پر نازل ہوئی ہوں (جن کے خدا نے نام بتلادیئے ان پر علی التعیین، اور جن کے نام نہیں بتلائے ان پر بالا جمال ایمان رکھتے ہو) اس کے برخلاف یہ لوگ تمہاری کتاب اور پیغمبر کو نہیں مانتے، بلکہ خود اپنی کتابوں پر بھی انکا ایمان صحیح نہیں، اس لحاظ سے چاہیے تھا کہ وہ تم سے قدرے محبت کرتے اور تم ان سے سخت نفور و بیزار رہتے، مگر یہاں معاملہ برعکس ہو رہا ہے۔

فائدہ: ۲ وَاِذَا لَقُوۡكُمۡ قَالُوۡۤا اٰمَنَّا: منافقین تو کہتے ہی تھے، عام یہود و نصاریٰ بھی بحث و گفتگو میں آمنّا (ہم مسلمان ہیں) کہہ کر یہ مطلب لے لیتے تھے کہ ہم اپنی کتابوں پر ایمان رکھتے ہیں اور ان کو تسلیم کرتے ہیں۔

فائدہ: ۳ عَضُّوْا عَلَيْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ: یعنی اسلام کا عروج اور مسلمانوں کی باہمی الفت ومحبت دیکھ کر یہ لوگ جلے مرتے ہیں اور چونکہ اس کے خلاف کچھ بس نہیں چلتا، اس لئے فرط غیظ وغضب سے دانت پیستے اور اپنی انگلیاں کاٹ کاٹ کھاتے ہیں۔

فائدہ: ۴ قُلْ مُوْتُوْا بِغَيْظِكُمْ: یعنی خدا تعالیٰ اسلام اور مسلمانوں کو اور زیادہ ترقیات وفتوحات عنایت فرمائے گا، تم غیظ کھا کھا کر مرتے رہو، اگر ایڑیاں رگڑ کر مر جاؤ گے تب بھی تمہاری آرزوئیں پوری نہ ہوں گی، خدا اسلام کو غالب اور سربلند کر کے رہے گا۔

فائدہ: ۵ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ: اسی لئے مسلمانوں کو ان شریروں کے باطنی حالات اور قلبی جذبات پر مطلع کر دیا اور سزا بھی ان کو ایسی دے گا جو اندرونی شرارتوں اور خفیہ عداوتوں کے مناسب ہو۔

اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۡ وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِهَا ؕ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا

اگر تم کو ملے کچھ بھلائی تو بری لگتی ہے ان کو، اور اگر تم پر پہنچے کوئی برائی تو خوش ہوں اس سے ۱ اور اگر تم صبر کرو اور بچتے رہو

لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ﴿۱۲۰﴾ ع

تو کچھ نہ بگڑے گا تمہارا ان کے فریب سے، بیشک جو کچھ وہ کرتے ہیں سب اللہ کے بس میں ہے ۲

خلاصہ تفسیر: (اور ان کا یہ حال ہے کہ) اگر تم کو کوئی اچھی حالت پیش آتی ہے (مثلاً تم میں باہم اتفاق ہو یا غیروں پر تم کو غلبہ ہو جائے) تو ان کیلئے موجب رنج ہوتی ہے (جس کا سبب انتہائی درجہ کا حسد ہے) اور اگر تم کو کوئی ناگوار حالت پیش آتی ہے تو اس سے (بڑے) خوش ہوتے ہیں (جس سے ان کی دشمنی اور شماتت ثابت ہے، سو ان کے جب یہ حالات ہیں تو وہ اس قابل کب ہیں کہ ان سے دوستی یا دوستی کا برتاؤ کیا جائے)۔

(یہ تقریر مسلمانوں کے دل سے ان کی دوستی کا خیال نکالنے کے لیے کافی ہے، لیکن ساتھ ہی ان کی مخالفت پر آگاہ ہو کر فکر میں پڑ جانے کا احتمال ہے کہ جب یہ ایسے دشمن ہیں تو کہیں ہمیں نقصان نہ پہنچائیں اس لیے اب مسلمانوں کی تسلی کے لیے فرماتے ہیں کہ) اور اگر تم استقلال اور تقوی کے ساتھ رہو تو ان لوگوں کی تدبیر تم کو ذرا بھی ضرر نہ پہنچا سکے گی (تم اس سے بےفکر رہو تو دنیا میں تو ان کو یہ ناکامی نصیب ہوگی اور آخرت میں دوزخ کی سزا ہوگی، کیونکہ) بلا شبہ اللہ تعالیٰ ان کے اعمال پر (علمی) احاطہ رکھتے ہیں (کوئی عمل اس کے علم سے مخفی اور باہر نہیں، اس لئے وہاں سزا سے بچنے کے لیے کسی حیلہ حوالہ کی گنجائش نہیں)۔

لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْـًٔا: اگر تم صبر اور تقوی کے ساتھ رہو تو ان لوگوں کی تدبیر تم کو ذرا بھی نقصان نہ پہنچا سکے گی، اگر یہ خطاب خاص ہی رکھا جائے تب تو کوئی اشکال نہیں، کیونکہ یہودی صحابہ کرام کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکے، اور اگر یہ خطاب سب مسلمانوں کو عام سمجھا جائے اور بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے تب بھی کوئی اشکال نہیں، کیونکہ وعدہ یہ ہے کہ اگر تم صبر وتقوی پر مستقل رہو تو تم کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکے گا، اور اکثر جب مخالفین کو مسلمانوں پر غلبہ ہوا تو صبر وتقوی کی کمی کی وجہ سے ہوا، اور اگر شاذ ونادر کبھی ایسا بھی ہو کہ صبر وتقوی کے باوجود کفار کو غلبہ ہو جائے تو سمجھ لینا چاہیے کہ وہاں حقیقی نقصان نہیں ہوتا، صرف ظاہری نقصان ہوتا ہے، کیونکہ اس وقت حق تعالیٰ اپنے بندوں کی آزمائش کیا کرتے ہیں جس میں توکل ورضا کی وجہ سے ان کے دل پریشان نہیں ہوتے، بلکہ اللہ والے امتحان کی تمام تکلیفوں کو راحت سمجھتے ہیں اور بزبان حال یوں کہتے ہیں:

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت   سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

تکلیف تو وہ ہوتی ہے جس سے دل کو تشویش ہو، اور جب دل کو راحت وخوشی نصیب ہو تو ظاہری تکلیف کا حقیقت کے مقابلہ میں اعتبار نہ کیا جائے گا، اس ظاہری شکست میں مسلمانوں کو باطنی فتح نصیب ہوتی ہے، وہ یہ کہ فتوحات اور غلبہ کی کثرت ہونے سے کبھی اپنی قوت پر نظر ہو جاتی ہے اور خدا پر توکل کم ہو جاتا ہے، کبھی شکست دے کر حق تعالیٰ ان کے اخلاق مہذب کر دیتے ہیں جس سے ثواب اور قرب ورضا میں ترقی ہو جاتی ہے،

اور مسلمان کا اصلی مقصد یہی ہے، اگر شکست میں خدا کا قرب و رضا زیادہ ہو تو وہ ہزار فتح سے بہتر ہے، خوب سمجھ لو!

* * *

فائدہ: ۱ اگر تمہاری ذرا سی بھلائی دیکھتے ہیں مثلاً مسلمانوں کا اتحاد و یکجہتی یا دشمنوں پر غلبہ تو حسد کی آگ میں بھننے لگتے ہیں اور جہاں تم پر کوئی مصیبت نظر آئی خوشی کے مارے پھولے نہیں سماتے، بھلا ایسی کمینہ قوم سے ہمدردی اور خیر خواہی کی کیا توقع ہو سکتی ہے، جو دوستی کا ہاتھ ان کی طرف بڑھایا جائے۔

فائدہ: ۲ ممکن تھا کسی کو یہ خیال گزرے کہ جب ہم ان سے دوستانہ تعلقات نہ رکھیں گے تو وہ زیادہ غیظ و غضب میں آ کر ہمارے خلاف تدبیریں کریں گے اور بیش از بیش نقصان پہنچانا چاہیں گے، اس کا جواب دیا کہ تم صبر و استقلال اور تقویٰ و طہارت پر ٹھیک قائم رہو گے تو ان کا کوئی داؤ فریب تم پر کارگر نہ ہوگا، جو کارروائیاں وہ کرتے ہیں سب خدا کے علم میں ہیں، اور اس کو ہر وقت قدرت حاصل ہے کہ ان کا تار پود بکھیر کر رکھ دے، تم اپنا معاملہ خدا سے صاف رکھو، پھر تمہارے راستہ سے سب کانٹے صاف کر دیئے جائیں گے۔

ربط: آگے غزوہ احد کا واقعہ یاد دلاتے ہیں کہ اس میں بعض مسلمان منافقین کی مغویانہ حرکات سے کچھ اثر پذیر ہو گئے تھے اور قریب تھا کہ مسلمانوں کے دو قبیلے صبر و تقویٰ کا دامن ہاتھ سے چھوڑ بیٹھیں جس سے منافقین کو خوش ہونے کا موقع ہاتھ آئے، مگر خدا نے دستگیری فرمائی اور ان قبیلوں کو سخت مہلک ٹھوکر سے بچا لیا۔

وَاِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۲۱﴾ اِذْ هَمَّتْ

اور جب صبح کو نکلا تو اپنے گھر سے بٹھلانے لگا مسلمانوں کو لڑائی کے ٹھکانوں پر، اور اللہ سب کچھ جانتا ہے، جب قصد کیا

طَّآئِفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا ۙ وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲۲﴾

دو فرقوں نے تم میں سے کہ نامردی کریں، اور اللہ مددگار تھا ان کا، اور اللہ ہی پر چاہیے بھروسہ کریں مسلمان

خلاصہ تفسیر: یہاں تک زبانی جہاد کا بیان تھا، اب آگے تلوار سے جہاد کا ذکر ہوتا ہے جس کے ضمن میں تین قصوں کی طرف اشارہ ہے: غزوہ بدر، غزوہ حمراء الاسد اور غزوہ احد، زیادہ بیان غزوہ احد کا ہے، اس مضمون کی گزشتہ آیات سے مناسبت یہ ہے کہ پیچھے فرمایا تھا کہ اگر تم صبر و تقوی پر مستقل رہو گے تو کفار تمہیں کچھ نقصان نہ پہنچا سکیں گے، آئندہ یہ تین قصے دلیل کے طور پر بیان فرماتے ہیں کہ دیکھ لو جہاں تم نے صبر و تقوی پورا کیا جیسے جنگ بدر وہاں تمہاری قلت اور کمزوری کے باوجود کفار تمہارا کچھ نہ بگاڑ سکے اور جہاں اس میں ذرا کمی آ گئی وہاں کفار غالب آ گئے جیسے غزوہ احد میں، پھر حمراء الاسد میں باوجودیکہ تم احد میں تازہ زخم کھائے ہوئے تھے لیکن صبر و استقلال و تقوی سے کام لیا پھر تم ہی غالب ہو گئے، اس سے گزشتہ مضمون کی پوری تائید ہو گئی۔

اور (وہ وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہے) جب کہ آپ صبح کے وقت (تاریخ قتال سے پہلے) اپنے گھر سے (اس غرض سے) نکلے (کہ) مسلمانوں کو (کفار سے) مقابلہ کرنے کے لیے (مناسب) مقامات پر جما (نے کے لئے آمادہ کر) رہے تھے (پھر اسی تجویز کے مطابق سب کو ان مقامات پر جما دیا) اور اللہ تعالیٰ (اس وقت کی باتیں) سب سن رہے تھے (اور اس وقت کے حالات) سب جان رہے تھے (اسی کے ساتھ یہ قصہ بھی ہوا کہ) تم (مسلمانوں) میں سے دو جماعتوں نے (جو کہ بنی سلمہ اور بنی حارثہ ہیں) دل میں خیال کیا کہ ہمت ہار دیں (اور ہم بھی عبداللہ بن ابی منافق کی طرح اپنے گھر جا بیٹھیں) اور اللہ تعالیٰ تو ان دونوں جماعتوں کا مددگار تھا (بھلا ان کو کب ہمت ہارنے دیتا، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس خیال پر عمل کرنے سے ان کو روک دیا اور محفوظ رکھا) اور (ہم آئندہ کے لئے ان جماعتوں اور سب کو نصیحت کرتے ہیں کہ جب تم مسلمان ہو) پس مسلمانوں کو تو اللہ تعالیٰ ہی پر اعتماد کرنا چاہیے (اور ایسی کم ہمتی کبھی نہ کرنا چاہیے)۔

اِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ مِنْكُمْ :روح المعانی میں ہے کہ مسلمانوں کے جن دوگروہوں میں جنگ احد سے واپس لوٹنے کا خیال ہوا تھا تو یہ ھمّ عزم وارادہ کے مرتبہ میں نہ تھا، بلکہ فقط ایک وسوسہ اور خیال کے درجے میں تھا، اللہ کے فضل نے دستگیری کی اور اس وسوسہ کو وسوسہ کے درجہ سے آگے نہ بڑھنے دیا اور یہ خیال بھی جو انہیں پیدا ہوا، اپنی قلت تعداد، قلت سامان اور مادی کمزوری کی بناء پر تھا، نہ کہ ضعف ایمان کی بناء پر، اور واللہ ولیھما کا جملہ خود ان کے ایمان کامل کی شہادت دے رہا ہے اس لئے ان دونوں قبیلوں کے بعض بزرگ فرمایا کرتے تھے کہ: ''اگر چہ اس آیت میں ہم پر کچھ عتاب بھی ہے لیکن واللہ ولیھما کی بشارت بھی ہمارے لئے آئی ہے''، سو اس میں دلالت ہے کہ وسوسوں کا آنا مقام ولایت کے خلاف نہیں ہے، کیونکہ ولی وہی ہوتا ہے جو گناہ کا پختہ عزم نہیں کرتا، بلکہ زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا ہے کہ ایک خیال آیا اور اس کو ترک کر دیا، پھر اللہ اس گناہ سے بچنے پر بھی اس کی مدد فرماتے ہیں۔

* * *

فائدہ: اس آیت میں جنگ احد کا واقعہ یاد دلایا ہے، صورت یہ ہوئی تھی کہ رمضان المبارک ۲ ہجری میں بدر کے مقام پر قریشی فوج اور مسلمان مجاہدین میں مڈبھیڑ ہوگئی، جس میں کفار مکہ کے ستر نامور اشخاص مارے گئے اور اسی قدر گرفتار ہوئے، اس تباہ کن اور ذلت آمیز شکست سے قریش کا شعلہ انتقام بھڑک اٹھا، جو سردار مارے گئے تھے ان کے اقارب نے تمام عرب کو غیرت دلائی اور اہل مکہ سے اپیل کی کہ تجارتی قافلہ جو مال شام سے لایا ہے (کہ وہ ہی باعث جنگ بدر کا ہوا تھا) سب اسی مہم کی نذر کر دیں، تا کہ ہم محمد ﷺ اور ان کے ساتھیوں سے اپنے مقتولین کا بدلہ لے سکیں، سب نے منظور کیا اور ۳ ہجری میں قریش کے ساتھ بہت سے دوسرے قبائل بھی مدینہ پر چڑھائی کرنے کی غرض سے نکل پڑے، حتیٰ کہ عورتیں بھی ساتھ آئیں ،تا کہ موقع پیش آنے پر مردوں کو غیرت دلا کر پسپائی سے روک سکیں، جس وقت یہ تین ہزار کا لشکر اسلحہ وغیرہ سے پوری طرح آراستہ ہو کر مدینہ سے تین چار میل ادھر جبل احد کے قریب خیمہ زن ہوا، تو نبی کریم ﷺ نے مسلمانوں سے مشورہ لیا، آپ ﷺ کی رائے مبارک یہ تھی کہ مدینہ کے اندر رہ کر دشمن کا مقابلہ بہت آسانی اور کامیابی کے ساتھ کیا جا سکتا ہے، اس کی تائید آپ کے ایک خواب سے ہوئی تھی، یہ پہلا موقع تھا کہ رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی سے بھی رائے لی گئی جو حضور ﷺ کی رائے سے موافق تھی، مگر بعض پر جوش مسلمان جنہیں بدر کی شرکت نصیب نہ ہوئی تھی اور شوق شہادت بے چین کر رہا تھا، مُصر ہوئے کہ ہم کو باہر نکل کر مقابلہ کرنا چاہیے، تا کہ دشمن ہماری بزدلی اور کمزوری کا گمان نہ کرے، کثرت رائے اسی طرف ہوگئی، اسی حیص و بیص میں آپ ﷺ مکان کے اندر تشریف لے گئے اور زرہ پہن کر باہر آئے، اس وقت بعض لوگوں کو خیال ہوا کہ ہم نے آپ ﷺ کی رائے کے خلاف مدینہ سے باہر لڑائی کرنے پر مجبور کیا، انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! اگر آپ ﷺ کا منشا نہ ہو تو یہیں تشریف رکھئے، فرمایا: ''ایک پیغمبر کو سزاوار نہیں کہ جب وہ زرہ پہن لے اور ہتھیار لگا لے پھر بدون قتال کئے بدن سے اتارے''۔

جب آپ ﷺ مدینہ سے باہر تشریف لے گئے تقریباً ایک ہزار آدمی آپ کے ساتھ تھے، مگر عبداللہ بن ابی تقریباً تین سو آدمیوں کو (جن میں بعض مسلمان بھی تھے) ساتھ لے کر راستہ سے یہ کہتا ہوا واپس ہو گیا کہ جب میرا مشورہ نہ مانا اور دوسروں کی رائے پر عمل کیا تو ہم کو لڑنے کی ضرورت نہیں، کیوں خواہ مخواہ اپنے کو ہلاکت میں ڈالیں، بعض بزرگوں نے سمجھایا بھی، مگر کچھ اثر نہیں ہوا، آخر آپ ﷺ کل سات سو سپاہیوں کی جمعیت لیکر میدان جنگ میں پہنچ گئے، آپ ﷺ نے بنفسِ نفیس فوجی قاعدہ سے صفیں ترتیب دیں، ہر ایک دستہ کو اس کے مناسب ٹھکانہ پر بٹھلایا، اور فرمایا جب تک میں حکم نہ دوں کوئی قتال نہ کرے، اسی اثناء میں عبداللہ بن ابی کی علٰیحدگی سے دو قبیلے بنو حارثہ اور بنو سلمہ کے دلوں میں کچھ کمزوری پیدا ہوئی، مسلمانوں کی قلیل جمعیت پر نظر کر کے دل چھوڑنے لگے اور خیال آیا کہ میدان سے سرک جائیں، مگر حق تعالیٰ نے ان کی مدد اور دستگیری فرمائی، دلوں کو مضبوط کر دیا اور سمجھا دیا کہ مسلمانوں کا بھروسہ تنہا خدائے واحد کی اعانت ونصرت پر ہونا چاہیے، تعداد اور سامان وغیرہ کوئی چیز نہیں، جب وہ مظفر ومنصور کرنا چاہے تو سب سامان رکھے رہ جاتے ہیں اور غیبی تائید سے فتح مبین حاصل ہو جاتی ہے، جیسے معرکہ بدر میں ہوا، پس مسلمانوں کو صرف اللہ سے ڈرنا چاہیے، تا کہ اس کی طرف سے مزید انعام واحسان ہو اور مزید شکر گذاری کا موقع ملے (غزوہ بدر کی پوری تفصیل سورۃ الانفال میں آئے گی، وہاں کے فوائد ملاحظہ کئے جائیں)۔

تنبیہ: ''دو فرقوں'' سے مراد وہی بنو سلمہ و بنو حارثہ ہیں، گو اس آیت میں ان پر چشمک کی گئی، لیکن ان میں کے بعض بزرگ فرمایا کرتے تھے کہ اس آیت کا نازل نہ ہونا ہم کو پسند نہ تھا کیونکہ وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا کی بشارت عتاب سے بڑھ کر ہے۔

وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾

اور تمہاری مدد کر چکا ہے اللہ بدر کی لڑائی میں اور تم کمزور تھے، سوڈرتے رہو اللہ سے تا کہ تم احسان مانو

اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِيْنَ ﴿۱۲۴﴾

جب تو کہنے لگا مسلمانوں کو کیا تم کو کافی نہیں کہ تمہاری مدد کو بھیجے رب تمہارا تین ہزار فرشتے آسمان سے اترنے والے

خلاصہ تفسیر: اب غزوہ بدر کی بے مثال فتح اور نصرت کا سبب بیان فرماتے ہیں کہ وہ صبر، تقوی اور توکل کی بدولت تھی۔

اور یہ بات محقق ہے کہ حق تعالیٰ نے تم کو (غزوہ) بدر میں منصور فرمایا، حالانکہ تم (محض) بے سروسامان تھے (کیونکہ مجمع بھی کفار کے مقابلہ میں کم تھا، وہ ایک ہزار تھے اور مسلمان تین سو تیرہ تھے اور ہتھیار وغیرہ بھی بہت کم تھے) سو (چونکہ یہ نصرت تقوی کی بدولت تھی، جس میں استقلال وصبر بھی داخل ہے تو تم پر لازم ہے کہ آئندہ بھی) اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہا کرو (اسی کا نام تقویٰ ہے) تا کہ تم (اس نصرت کی نعمت کے) شکر گزار رہو (کیونکہ شکر گزاری صرف زبان کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ پورا شکر یہ ہے کہ زبان اور قلب بھی مشغول ہو اور اطاعت کی بھی پابندی ہو، بالخصوص جبکہ اس اطاعت کا اس نعمت میں دخیل ہونا بھی ثابت ہو جائے)۔

(غزوہ بدر میں اللہ تعالیٰ کی یہ امداد اس وقت ہوئی تھی) جب آپ (اے محمد ﷺ!) مسلمانوں سے (جبکہ وہ یہ خبر سن کر پریشان ہو رہے تھے کہ مشرکین کی اور مدد آرہی ہے وحی الٰہی سے) یوں فرمار ہے تھے کہ کیا تم کو (دلی تقویت کے لئے) یہ امر کافی نہ ہوگا کہ تمہارا رب تمہاری امداد کرے تین ہزار فرشتوں کے ساتھ (جو اسی کام کے لئے آسمان سے) اتارے جائیں گے (جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بڑے درجے کے فرشتے ہوں گے، ورنہ جو فرشتے پہلے سے زمین پر موجود تھے ان سے بھی یہ کام لیا جاسکتا تھا)۔

اس سے پہلے مسلمانوں کی دعا اور فریاد پر ایک ہزار فرشتے بھیجنے کا وعدہ ہوا تھا جیسا کہ سورہ انفال میں ہے، پھر جب مشرکین کی امداد آنے کی خبر اڑی کہ کرز بن جابر محاربی مشرکین کا ساتھ دینا چاہتا ہے اس پر مزید تقویت قلب کے لیے یہاں تین ہزار کا وعدہ ہوا، پھر صبر وتقوی سے لڑائی کے وقت کام لینے پر پانچ ہزار کا وعدہ ہوا جو اگلی آیت میں آتا ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی جو آسمان سے خاص اسی کام کے لئے اتارے گئے ہوں، اکثر علماء کے نزدیک راجح یہ ہے کہ یہ واقعہ غزوہ بدر کا ہے جب کفار کی جمعیت اور تیاری دیکھ کر مسلمانوں کو تشویش ہوئی تو آپ ﷺ نے تسلی کے لئے ایسا فرمایا، چنانچہ فرشتوں کی کمک آسمان سے پہنچی، سورۃ الانفال میں اس کا مفصل بیان آئے گا، وہیں نزول ملائکہ کی حکمت اور عدد ملائکہ کے ظاہری تعارض پر کلام کیا جائے گا۔

بَلٰٓى ۙ اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا وَيَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ

البتہ اگر تم صبر کرو اور بچتے رہو اور وہ آئیں تم پر اسی دم تو مدد بھیجے تمہارا رب پانچ ہزار

مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ ﴿۱۲۵﴾

فرشتے نشان دار گھوڑوں پر

خلاصہ تفسیر: (پھر اوپر کے استفہام کا جواب خود اس طرح ارشاد فرمایا:) ہاں! کیوں نہیں (کافی ہوگا، اس کے بعد اس امداد میں مزید زیادتی کا وعدہ اس طرح فرمایا کہ مقابلہ کے وقت) اگر مستقل رہو گے اور تقوی پر قائم رہو گے (یعنی خلاف اطاعت کوئی کام نہ کرو گے) اور وہ

لوگ تم پر یکبارگی حملہ کردیں گے (کہ ایسے وقت میں عادۃ مخلوق سے مدد پہنچنا مشکل ہوتا ہے) تو تمہارا رب تمہاری امداد فرمائے گا پانچ ہزار فرشتوں سے جو ایک خاص وضع کے بنائے ہوں گے (جیسے عام جنگوں میں اپنی اپنی فوج کی پہچان کے لیے کوئی خاص وردی ہوتی ہے)۔

يُمۡدِدۡكُمۡ رَبُّكُمۡ بِخَمۡسَةِ اٰلٰفٍ: یہ تین وعدے ہوئے جن میں سے تیسرے وعدے کا سبب تو خود یہاں قرآن میں صاف مذکور ہے کہ صبر وتقوی سے کام لینا ہے، اور پہلے دو وعدوں کے سبب ظاہر میں دعا و پریشانی معلوم ہوتے ہیں، مگر اصلی سبب ان کا بھی وہی تقوی وصبر ہے، اسی کی برکت سے دعا بھی قبول ہوئی اور اسی کی بدولت قدم قدم پر رحمتیں متوجہ ہوئیں، پھر اس میں مفسرین کا اختلاف ہے کہ پانچ ہزار کا وعدہ بھی پورا ہوا یا نہیں؟ بعض نے کہا کہ نہیں ہوا، کیونکہ اس وعدہ کے لیے ایک شرط بھی تھی کہ کفار کی مدد آجائے اور وہ امداد نہیں آئی تھی، اس لیے فرشتے بھی پانچ ہزار نہیں آئے، صرف تین ہزار آئے، اس میں بھی اختلاف ہے کہ تین ہزار پہلے ایک ہزار کے علاوہ آئے یا ان سمیت، اور بعض کا قول ہے کہ تینوں وعدے پورے ہوئے۔

الۡمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيۡنَ: ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ فرشتوں کی وضع جنگ بدر میں سفید عمامے تھے جن کا شملہ کمر پر پڑا تھا، اور غزوہ حنین میں سرخ عمامے تھے، اس میں اشارہ ہے کہ وہ فرشتے خاص اسی کام کے لیے بھیجے جائیں گے، اس خبر دینے سے یہ فائدہ ہے کہ جو شخص خاص طور پر ایک کام کے لیے آتا ہے عادۃً اس کام کی اسی سے زیادہ امید ہوتی ہے، اس مکرر در مکرر وعدہ سے دلوں کی تقویت کا اور زیادہ فائدہ ہوا۔

قصہ احد کے درمیان میں قصہ بدر کا بیان کرنا اس میں مقابلہ کے طور پر اس طرف اشارہ ہے کہ احد میں جو امداد نہیں ہوئی اس کا سبب تقوی میں کوتاہی کرنا تھی، اور یہ کوتاہی لڑائی سے پہلے بھی ہوئی کہ غزوہ بدر میں کفار کو فدیہ لے کر چھوڑ دیا گیا تھا اس کی سزا ملی اور لڑائی کے وقت بھی ہوئی کہ مورچہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے خلاف ہٹ گئے اور غزوہ احد میں ملائکہ کا نازل ہونا کسی قوی دلیل سے ثابت نہیں۔

* * *

فائدہ: یعنی تین ہزار بیشک کافی ہیں، تاہم اگر تم نے صبر و استقلال کا ثبوت دیا اور تقویٰ اختیار کر کے نافرمانی سے بچتے رہے، اور کفار کی فوج ایک دم تم پر ٹوٹ پڑی تو تین ہزار کے بجائے پانچ ہزار فرشتے بھیج دیئے جائیں گے، جن کی خاص علامتیں ہوں گی اور ان کے گھوڑوں پر بھی خاص نشان ہوں گے، چونکہ بدر میں کفار کی تعداد ایک ہزار تھی، اولاً اس کے مناسب ایک ہزار فرشتوں کا وعدہ فرمایا جیسا کہ سورۃ انفال میں آئے گا، پھر مسلمانوں کی گھبراہٹ دور فرمانے کے لئے تعداد تگنی کر دی گئی، کیونکہ کفار کی تعداد مسلمانوں سے تگنی تھی، اس کے بعد شعبی کی روایت کے موافق جب مسلمانوں کو یہ خبر ملی کہ کُرز بن جابر بڑی کمک لے کر مشرکین کی مدد کے لئے آرہا ہے تو ایک جدید اضطراب پیدا ہوگیا، اس وقت مزید تسکین وتقویت کے لئے وعدہ فرمایا کہ اگر تم صبر وتقویٰ سے کام لوگے تو ہم پانچ ہزار فرشتے تمہاری مدد کو بھیج دیں گے، اگر مشرکین کی کمک بالکل ناگہانی طور پر آپہنچے تب بھی فکر مت کرو، خدا تعالیٰ بروقت تمہاری مدد کرے گا۔

شاید پانچ ہزار کا عدد اس لئے رکھا ہو کہ لشکر کے پانچ حصے ہوتے تھے، ہر ایک حصہ کو ایک ایک ہزار کی کمک پہنچادی جائے گی، چونکہ کُرز بن جابر کی مدد مشرکین کو نہ پہنچی، اس لئے بعض کہتے ہیں کہ پانچ ہزار کا وعدہ پورا نہیں کیا گیا، کیونکہ وہ وَيَاۡتُوۡكُمۡ مِّنۡ فَوۡرِهِمۡ هٰذَا پر معلق تھا، اور بعض کا قول ہے کہ پانچ ہزار فرشتے نازل ہوئے، واللہ اعلم۔ اس کا مزید بیان انفال میں دیکھو۔

وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشۡرٰى لَـكُمۡ وَلِتَطۡمَئِنَّ قُلُوۡبُكُمۡ بِهٖ‌ؕ وَمَا النَّصۡرُ اِلَّا مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ

اور یہ تو اللہ نے تمہارے دل کی خوشی کی اور تا کہ تسکین ہو تمہارے دلوں کو اس سے اور مدد ہے صرف اللہ ہی کی طرف سے

الۡعَزِيۡزِ الۡحَكِيۡمِ ﴿۱۲۶﴾

جو کہ زبردست ہے حکمت والا

خلاصہ تفسیر: (اب اس امداد ونصرت کی حکمت کا بیان ہے) اور اللہ تعالیٰ نے یہ امداد (جو کہ فرشتوں سے ہوئی) محض

اس (حکمت) کے لئے کی کہ تمہارے لئے (غلبہ اور فتح کی) بشارت ہو (یعنی غلبہ کی توقع سے خوشی ہو جائے) اور تمہارے دلوں کو اس سے قرار آئے (چونکہ طبعاً اسباب سے تسلی ہوتی ہے اس لیے اس سبب کا سامان کیا گیا) اور (واقع میں تو) نصرت (اور غلبہ) صرف اللہ کی طرف سے ہے جو کہ زبردست ہیں (کہ ویسے بھی غالب کر سکتے ہیں لیکن) حکیم (بھی) ہیں (تو جب وہ چاہیں اسباب پیدا کر کے غلبہ دے دیتے ہیں، یہ تو حکمت ہوئی فرشتوں کے ذریعہ مدد پہنچنے کی)۔

بُشْرٰی لَكُمْ وَلِتَطْمَىِٕنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ: یہاں طبعی طور پر ایک سوال یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتوں کو وہ طاقت بخشی ہے کہ ایک ہی فرشتہ پوری بستی کا تختہ الٹ سکتا ہے، جیسا کہ قوم لوط کی زمین تنہا جبرئیل امین نے الٹ دی تھی، تو پھر فرشتوں کا لشکر بھیجنے کی کیا ضرورت تھی، نیز یہ کہ جب فرشتے میدان میں آئے ہی تھے تو ایک کافر بھی بچنا نہیں چاہئے تھا؟ اس کا جواب خود قرآن کریم نے مذکورہ آیت میں دے دیا کہ فرشتوں کے بھیجنے میں درحقیقت ان سے کوئی میدان جنگ فتح کرانا مقصود نہ تھا، بلکہ مجاہدین مسلمین کی تسلی اور تقویت قلب اور بشارت فتح دینا مقصود تھا، جیسا کہ اس آیت کے الفاظ الا بشری اور لتطمئن قلوبکم سے واضح ہے، اور اس سے زیادہ صریح سورۃ انفال میں اسی واقعہ کے متعلق آئے ہوئے الفاظ ہیں: فثبتوا الذین امنوا، جس میں فرشتوں کو خطاب کر کے ان کے سپرد یہ خدمت کی گئی ہے کہ وہ مسلمانوں کے قلوب کو جمائے رکھیں، پریشان نہ ہونے دیں، اس تثبیت قلوب کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں، ایک یہ بھی ہے کہ اپنے تصرف کے ذریعہ ان کے قلوب کو مضبوط کر دیں، جیسا کہ مشائخ صوفیہ اہل تصرف کا معمول ہے، اور یہ بھی ہو سکتی ہے کہ مسلمانوں کو مختلف طریقوں سے یہ واضح کر دیں کہ اللہ کے فرشتے ان کی مدد پر کھڑے ہیں، کبھی سامنے ظاہر ہو کر، کبھی آواز سے، کبھی کسی اور طریق سے، جیسا کہ میدان بدر میں یہ سب طریقے استعمال کئے گئے، یہ سب مشاہدات اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں کہ ملائکۃ اللہ نے مسلمانوں کو اپنی نصرت کا یقین دلانے کے لئے کچھ کچھ کام ایسے بھی کئے ہیں کہ گویا وہ بھی قتال میں شریک ہیں، اور دراصل ان کا کام مسلمانوں کی تسلی اور تقویت قلب تھا، فرشتوں کے ذریعہ میدان جنگ فتح کرانا مقصود نہیں تھا، اس کی واضح دلیل یہ بھی ہے کہ اس دنیا میں جنگ و جہاد کے فرائض انسانوں پر عائد کئے گئے ہیں، اور اسی وجہ سے ان کو فضائل و درجات حاصل ہوتے ہیں، اگر اللہ تعالیٰ کی مشیت یہ ہوتی کہ فرشتوں کے لشکر سے ملک فتح کرائے جائیں تو دنیا میں کفر و کافر کا نام ہی نہ رہتا، حکومت و سلطنت کی تو کیا گنجائش تھی، مگر اس کارخانہ قدرت میں اللہ تعالیٰ کی یہ مشیت ہی نہیں، یہاں تو کفر و ایمان اور اطاعت و معصیت ملے جلے ہی چلتے رہیں گے، ان کے نکھار کے لئے حشر کا دن ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی یہ سب غیبی سامان غیر معمولی طور پر ظاہری اسباب کی صورت میں محض اس لئے مہیا کئے گئے کہ تمہارے دلوں سے اضطراب و ہراس دور ہو کر سکون و اطمینان نصیب ہو، ورنہ خدا کی مدد کچھ ان چیزوں پر محدود و مقصور نہیں، نہ اسباب کی پابند ہے، وہ چاہے تو محض اپنی زبردست قدرت سے بدون فرشتوں کے تمہارا کام بنا دے، یا بدون تمہارے توسط کے کفار کو خائب و خاسر کر دے، یا ایک فرشتہ سے وہ کام لے لے جو پانچ ہزار سے لیا جاتا ہے، فرشتے بھی جو امداد پہنچاتے ہیں وہ اسی خداوند قدیر کی قدرت و مشیت سے پہنچا سکتے ہیں، مستقل طاقت و اختیار کسی میں نہیں، آگے یہ اس کی حکمت ہے کہ کس موقع پر کس قسم کے اسباب و وسائط سے کام لینا مناسب ہے، تکوینیات کے رازوں کا کوئی احاطہ نہیں کر سکتا:

حدیث از مطرب و مے گو و راز دہر کمتر جو که کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معمارا

لِيَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْ يَكْبِتَهُمْ فَيَنْقَلِبُوْا خَآىِٕبِيْنَ ﴿١٢٧﴾

تا کہ ہلاک کرے بعضے کافروں کو یا ان کو ذلیل کرے تو پھر جاویں محروم ہو کر

خلاصہ تفسیر: (اب اس کی حکمت کا بیان ہے کہ یہ فتح و غلبہ تمہیں کیوں عطا کیا گیا، اس کے لئے ارشاد فرمایا گیا:) تا کہ کفار میں سے ایک گروہ کو ہلاک کر دے (چنانچہ کافروں کے ستر سردار رئیس مارے گئے) یا ان (میں سے بعض) کو ذلیل و خوار کر دے، پھر وہ ناکام لوٹ جائیں

(یعنی ان میں سے کوئی نہ کوئی بات ضرور ہوجائے، اور اگر دونوں ہوجائیں تو بہت ہی اچھا ہے، چنانچہ دونوں باتیں ہوئیں کہ ستر سردار مارے گئے، باقی ذلیل وخوار ہوکر بھاگ گئے، اور تیسری بات اور ہوئی کہ ستر آدمی قید ہوکر ذلیل ہوئے)۔

***

فائدہ: یعنی فرشتے بھیجنے سے مقصود تمہاری مدد کرنا تھا کہ تمہارے دل مضبوط ہوں اور خدا کی طرف سے بشارت وطمانینت پاکر پوری دل جمی اور پامردی کے ساتھ دشمن کا مقابلہ کرو، جس سے یہ غرض تھی کہ کافروں کا زور ٹوٹے، ان کا بازو کٹ جائے، پُرانے نامور مشرک کچھ مارے جائیں، کچھ ذلیل وخوار ہوں، اور بقیۃ السیف بہزار رسوائی وناکامی واپس ہوجائیں، چنانچہ ایسا ہی واقعہ ہوا، ستر سردار جن میں اس امت کا فرعون ابوجہل بھی تھا، مارے گئے، ستر قید ہوئے، اور نہایت ذلیل ونامراد ہوکر مکہ واپس جانا پڑا۔

لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ أَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَإِنَّهُمْ ظَالِمُونَ ﴿١٢٨﴾

تیرا اختیار کچھ نہیں یا ان کو توبہ دیوے خدا تعالیٰ یا ان کو عذاب کرے کہ وہ ناحق پر ہیں

خلاصہ تفسیر: درمیان میں مناسبت کی وجہ سے غزوہ بدر کا قصہ اجمالی طور پر ہوا، اب پھر قصہ احد کا بیان ہے، سبب نزول اس کا یہ ہے کہ جب غزوہ احد میں حضور ﷺ کا دندان مبارک شہید اور چہرہ اقدس زخمی ہوا تو آپ ﷺ نے یہ فرمایا کہ ایسی قوم کیا فلاح پائے گی جس نے اپنے نبی کے ساتھ ایسا برتاؤ کیا، حالانکہ وہ نبی ان کو خدا کی طرف بلا رہا ہے، بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے بعض کے حق میں بددعا بھی فرمائی، اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور وہ سب بعد میں اسلام لے آئے اور آپ کا بددعا فرمانا یا شکایت کرنا اجتہادی تھا، وحی سے ممانعت تھی نہ اجازت، پس عصمت کے متعلق کوئی اشکال لازم نہیں آتا۔

(اے محمد ﷺ) آپ کو (کسی کے مسلمان ہونے یا کافر رہنے کے متعلق خود) کوئی دخل نہیں (نہ علم کا دخل کہ کون ہدایت پائے گا، نہ قدرت کا دخل کہ آپ جس کو چاہیں ہدایت کردیں، بلکہ یہ سب اللہ تعالیٰ کے علم اور قبضہ میں ہے، آپ کو صبر کرنا چاہئے) یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ان پر یا تو (رحمت سے) متوجہ ہوجائیں (یعنی ان کو اسلام کی توفیق دے دیں تو اس وقت صبر خوشی سے بدل جائے گا) اور یا ان کو (دنیا ہی میں) کوئی سزا دیں (تو اس وقت صبر تسکین قلبی میں بدل جائے گا، اور سزا دینا کچھ بے جا بھی نہیں) کیونکہ وہ ظلم بھی بڑا کررہے ہیں (مراد اس ظلم سے کفر وشرک ہے)۔

***

فائدہ: احد میں ستر صحابہ شہید ہوئے تھے جن میں حضور ﷺ کے چچا سید الشہداء حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ بھی تھے، مشرکین نے نہایت وحشیانہ طور پر شہداء کا مثلہ کیا (ناک کان وغیرہ کاٹے) پیٹ چاک کئے، حتیٰ کہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا جگر نکال کر ہندہ نے چبایا، مفصل واقعہ آگے آئے گا، خلاصہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کو بھی اس لڑائی میں چشم زخم پہنچا، سامنے کے چار دانتوں میں سے نیچے کا دایاں دانت شہید ہوا، خود کی کڑیاں ٹوٹ کر رخسار مبارک میں گھس گئیں، پیشانی زخمی ہوئی اور بدن مبارک لہولہان تھا، اسی حالت میں آپ ﷺ کا پاؤں لڑکھڑایا اور زمین پر گر کر بیہوش ہوگئے، کفار نے مشہور کردیا: اِنَّ مُحَمَّدًا قَدْ قُتِلَ (محمد ﷺ مارے گئے) اس سے مجمع بدحواس ہوگیا، تھوڑی دیر کے بعد آپ ﷺ کو ہوش آیا، اس وقت زبان مبارک سے نکلا کہ "وہ قوم کیونکر فلاح پائے گی جس نے اپنے نبی کا چہرہ زخمی کیا جو ان کو خدا کی طرف بلاتا تھا"۔

مشرکین کے وحشیانہ شدائد ومظالم کو دیکھ کر آپ سے نہ رہا گیا اور ان میں سے چند نامور اشخاص کے حق میں آپ ﷺ نے بددعا کا ارادہ کیا، یا شروع کردی، جس میں ظاہر ہے آپ ﷺ ہر طرح حق بجانب تھے، مگر حق تعالیٰ کو منظور تھا کہ آپ اپنے منصب جلیل کے موافق اس سے بھی بلند مقام پر کھڑے ہوں، وہ ظلم کرتے جائیں آپ ﷺ خاموش رہیں، جتنی بات کا آپ کو حکم ہے (مثلاً دعوت وتبلیغ اور جہاد وغیرہ) اسے انجام دیتے رہیں، باقی ان کا انجام خدا کے حوالے کریں، اس کی جو حکمت ہوگی کرے گا، آپ کی بددعا سے وہ ہلاک کردیئے جائیں، کیا اسکی جگہ یہ بہتر نہیں کہ ان ہی دشمنوں کو اسلام کا محافظ اور آپ ﷺ کا جاں نثار عاشق بنادیا جائے؟ چنانچہ جن لوگوں کے حق میں آپ ﷺ بددعا کرتے تھے، چند روز کے بعد سب کو خدا

تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں پر لا ڈالا، اور اسلام کا جانباز سپاہی بنا دیا، غرض لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو متنبہ فرمایا کہ بندہ کو اختیار نہیں، نہ اس کا علم محیط ہے، اللہ تعالیٰ جو چاہے سو کرے، اگرچہ کافر تمہارے دشمن ہیں اور ظلم پر ہیں، لیکن چاہے وہ ان کو ہدایت دے چاہے عذاب کرے، تم اپنی طرف سے بددعا نہ کرو، بعض روایات سے ان آیات کی شان نزول کچھ اور معلوم ہوتی ہے، یہاں تفصیل کی گنجائش نہیں، فتح الباری میں کئی جگہ اس پر شافی کلام کیا ہے، فلیراجع۔

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ط يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ط

اور اللہ ہی کا مال ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے بخش دے جس کو چاہے اور عذاب کرے جس کو چاہے

وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲۹﴾ ع

اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے

خلاصہ تفسیر: (اب گذشتہ مضمون کی تاکید ہے) اور اللہ ہی کی ملک ہے جو کچھ بھی آسمانوں میں ہے اور جو کچھ کہ زمین میں ہے، وہ جس کو چاہیں بخش دیں (یعنی اسلام نصیب کر دیں جس سے مغفرت ہو جائے) اور جس کو چاہیں عذاب دیں (یعنی اسلام نصیب نہ ہو اور اس وجہ سے دائمی عذاب ہو) اور اللہ تعالیٰ تو بڑے مغفرت کرنے والے (اور) بڑے رحمت کرنے والے ہیں (تو بخشنے کا تو ذرا بھی تعجب نہیں، کیونکہ ان کی رحمت تو غضب سے بڑھی ہوئی ہے، رحمت تو بلا وجہ بھی فرما دیتے ہیں اور عذاب بلا وجہ نہیں دیتے، اسی لیے عذاب دینے کی وجہ تو گذشتہ آیت میں: فانھم ظلمون سے بیان فرمائی اور رحمت کی وجہ نہیں بیان فرمائی)۔

* * *

فائدہ: یعنی تمام زمین آسمان میں خدائے واحد کا اختیار چلتا ہے، سب اسی کی مملوک و مخلوق ہے، وہ جس کو مناسب جانے ایمان کی توفیق دے کر بخش دے اور جسے چاہے کفر کی سزا میں پکڑ لے۔

شاید اخیر میں وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ فرما کر اشارہ کر دیا کہ ان لوگوں کو جن کے حق میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم بددعا کرنا چاہتے تھے، ایمان دے کر مغفرت و رحمت کا مورد بنایا جائے گا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً ص وَّاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۳۰﴾ ع

اے ایمان والو مت کھاؤ سود[1] دونے پر دونا[2] اور ڈرو اللہ سے تاکہ تمہارا بھلا ہو[3]

خلاصہ تفسیر: پیچھے بیان کیا کہ غزوہ احد میں مدد نہ ہونے کی وجہ تقوی میں کوتاہی تھی، ایک کوتاہی واقعہ سے پہلے، ایک عین واقعہ میں، اس سے یہ معلوم ہوا کہ بعض دفعہ گذشتہ گناہ آئندہ کی نیکیوں میں خلل اندازی یا دوسرے گناہوں کے ارتکاب کا سبب ہو جاتے ہیں، چنانچہ اس کا تجربہ بھی ہے، اسی لیے آگے تقوی کی تاکید اور اس کی بعض ضروری فروع کی تصریح فرماتے ہیں، اور بعض بڑے گناہ جیسے سود سے بچنے کا حکم دیتے ہیں تاکہ شرعی حدود کے پابند رہیں، تو آئندہ پھر کسی موقع پر نقصان پیش نہ آئے۔

اے ایمان والو! سود مت کھاؤ (یعنی مت لو اصل سے) کئی حصے زائد (کر کے) اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو امید ہے کہ تم کامیاب ہو (یعنی جنت نصیب ہو اور دوزخ سے نجات ہو)۔

لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً: اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ دوگنے پر دوگنا یعنی بہت زیادہ سود نہ لیا جائے تو جائز ہے، سود چاہے

تھوڑا ہو چاہے بہت زیادہ سب حرام ہے، بلکہ اس زمانہ کا دستور اس طرح تھا کہ سود بالائے سود لیا کرتے تھے، اس لیے ان کے دستور کے مطابق یہ قید اتفاقی ہے، دوسری آیت میں: وحرم الربوا بغیر قید کے مطلقا بیان ہو چکا ہے، دونوں کے ملانے سے یہ معلوم ہوا کہ سود بالکل حرام ہے، جو صورت ان میں رائج تھی وہ بھی، اور جتنی صورتیں اس کے علاوہ ہوں وہ بھی، آج کل بعض ہوا پرست اس آیت سے عام مسلمانوں کو دھوکے میں ڈالنا چاہتے ہیں۔

* * *

فائدہ: ۱ لَا تَأْكُلُوا الرِّبٰوا: جنگ احد کے تذکرہ میں سود کی ممانعت کا ذکر بظاہر بے تعلق معلوم ہوتا ہے، مگر شاید یہ مناسبت ہو کہ اوپر اِذْ هَمَّتْ طَّآىِٕفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا (آل عمران: ۱۲۲) میں جہاد کے موقع پر نامردی دکھلانے کا ذکر ہوا تھا، اور سود کھانے سے نامردی پیدا ہوتی ہے دو سبب سے: ① ایک یہ کہ مال حرام کھانے سے توفیق طاعت کم ہوتی ہے اور بڑی طاعت جہاد ہے ② دوسرے یہ کہ سود لینا انتہائی بخل پر دلالت کرتا ہے، کیونکہ سود خور چاہتا ہے کہ اپنا مال جتنا دیا تھا لے لے اور بیچ میں کسی کا کام نکلا، یہ بھی مفت نہ چھوڑے، اس کا علیحدہ معاوضہ وصول کرے، تو جس کو مال میں اتنا بخل ہو کہ خدا کیلئے کسی کی ذرہ بھر ہمدردی نہ کر سکے وہ خدا کی راہ میں جان کب دے سکے گا۔

ابو حیان نے لکھا ہے کہ اس وقت یہود وغیرہ سے مسلمانوں کے سودی معاملات اکثر ہوتے رہتے تھے، اسی لئے ان سے تعلقات قطع کرنا مشکل تھا، چونکہ پہلے لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً کا حکم ہو چکا ہے، اور احد کے قصہ میں بھی منافقین یہود کی حرکات کو بہت دخل تھا، اس لئے متنبہ فرمایا کہ سودی لین دین ترک کرو، ورنہ اس کی وجہ سے خواہی نہ خواہی ان ملعونوں کے ساتھ تعلقات قائم رہیں گے جو آئندہ نقصان اٹھانے کا موجب ہوں گے۔

فائدہ: ۲ اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً: اس کا مطلب یہ نہیں کہ تھوڑا سود لے لیا کرو، دونے پر دونا مت لو، بات یہ ہے کہ جاہلیت میں سود اسی طرح لیا جاتا تھا جیسے ہمارے یہاں کے بنیے لیتے ہیں، سو روپے دیے اور سود در سود بڑھاتے چلے گئے، یہاں تک کہ سو روپے میں ہزاروں روپیہ کی جائیدادوں کے مالک بن بیٹھے، اسی صورت کو یہاں اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً سے تعبیر فرمایا، یعنی اول تو سود مطلقاً حرام وقبیح اور یہ صورت تو بہت ہی زیادہ شنیع وقبیح ہے، جیسے کوئی کہے میاں! مسجد میں گالیاں مت بکو، اس کا مطلب یہ نہیں کہ مسجد سے باہر بکنے کی اجازت ہے، بلکہ مزید تقبیح وتشنیع کے موقع پر ایسے الفاظ بولتے ہیں۔

فائدہ: ۳ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ: یعنی سود کھانے میں بھلا نہیں، بلکہ تمہارا بھلا اس میں ہے کہ خدا سے ڈر کر سود کھانا چھوڑ دو۔

وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْٓ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۳۱﴾ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾

اور بچو اس آگ سے جو تیار ہوئی کافروں کے واسطے ۱ اور حکم مانو اللہ کا اور رسول کا تاکہ تم پر رحم ہو ۲

خلاصہ تفسیر: اور اس آگ سے بچو جو (دراصل) کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے (اور آگ سے بچنے کی صورت یہ ہے کہ سود وغیرہ یعنی حرام امور سے بچو) اور خوشی سے کہا مانو اللہ کا اور (اس کے) رسول کا امید ہے کہ تم رحم کئے جاؤ گے (یعنی قیامت میں)۔

الَّتِيْٓ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ: جو (دراصل) کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے، یہاں "دراصل" کی قید اس لیے بڑھائی کہ گناہوں کی وجہ سے بعض مسلمان بھی دوزخ میں جائیں گے لیکن وہ ان کا اصلی ٹھکانا نہیں، یہی وجہ ہے کہ سزا کے بعد ایمان کی برکت سے اس سے نکل آئیں گے۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی سود کھانے والا دوزخ میں جاتا ہے جو اصل میں کافروں کے واسطے بنائی گئی تھی۔

فائدہ: ۲ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ماننا بھی فی الحقیقت خدا ہی کا حکم ماننا ہے کیونکہ اس نے حکم دیا ہے کہ ہم پیغمبر کا حکم مانیں اور ان کی پوری اطاعت کریں، جن احمقوں کو اطاعت اور عبادت میں فرق نظر نہ آیا، وہ اطاعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو شرک کہنے لگے، چونکہ جنگ احد میں رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی خلاف ورزی ہوئی تھی (جیسا کہ آگے آتا ہے) اس لئے آئندہ کے لئے ہوشیار کیا جاتا ہے، کہ خدا کی رحمت اور فلاح وکامیابی کی امید اسی وقت ہو سکتی ہے جب اللہ ورسول کے کہنے پر چلو۔

وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ۙ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۳۳﴾

اور دوڑو بخشش کی طرف اپنے رب کی اور جنت کی طرف ۱ جس کا عرض ہے آسمان اور زمین ۲ تیار ہوئی ہے واسطے پرہیزگاروں کے

خلاصہ تفسیر: (اب تقوی کے شعبوں کو حاصل کرنے کی ترغیب کے ساتھ ساتھ تقوی کا نتیجہ یعنی مغفرت اور جنت کو بیان کیا جارہا ہے، پس پیچھے دوزخ سے بچنے کا حکم تھا، آگے جنت لینے کا حکم ہے:) اور دوڑو طرف مغفرت کے جو تمہارے پروردگار کی طرف سے (نصیب) ہو اور (دوڑو) طرف جنت کے (مطلب یہ ہے کہ ایسے نیک کام اختیار کرو جس سے حق تعالی تمہاری مغفرت کردیں اور تم کو جنت عنایت ہو، اور وہ جنت ایسی ہے) جس کی وسعت ایسی (تو) ہے (ہی) جیسے سب آسمان اور زمین (اس سے زیادہ کی نفی نہیں، چنانچہ واقع میں اس سے زیادہ ہونا ثابت ہے، اور) وہ تیار کی گئی ہے خدا سے ڈرنے والوں کے لئے۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی ان اعمال واخلاق کی طرف جھپٹو جو حسب وعدہ خداوندی اس کی بخشش اور جنت کا مستحق بناتے ہیں۔

فائدہ: ۲ چونکہ آدمی کے دماغ میں آسمان وزمین کی وسعت سے زیادہ اور کوئی وسعت نہیں آسکتی تھی، اس لئے سمجھانے کیلئے جنت کے عرض کو اسی سے تشبیہ دی گئی، گویا بتلادیا کہ جنت کا عرض زیادہ سے زیادہ سمجھو، پھر جب عرض اتنا ہے تو طول کا حال خدا جانے کیا کچھ ہوگا۔

الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّاۗءِ وَالضَّرَّاۗءِ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ۭ

جو خرچ کئے جاتے ہیں خوشی میں اور تکلیف میں ۱ اور دبالیتے ہیں غصہ اور معاف کرتے ہیں لوگوں کو

وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۳۴﴾ۚ

اور اللہ چاہتا ہے نیکی کرنے والوں کو ۲

خلاصہ تفسیر: (اس جنت میں ایک تو اعلی درجہ کے مسلمان) ایسے لوگ (ہیں) جو کہ (نیک کاموں میں) خرچ کرتے ہیں (ہر حال میں) فراغت میں (بھی) اور تنگی میں (بھی) اور غصہ کے ضبط کرنے والے اور لوگوں (کی کوتاہیوں) سے درگزر کرنے والے، اور اللہ تعالی ایسے نیکوکاروں کو (جن میں یہ اوصاف ہوں اعلی درجہ) محبوب رکھتا ہے (اور عام محبت تو حق تعالی کو سب مسلمانوں سے ہے)۔

وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ: اس سے معلوم ہوا کہ طبعی غصہ آنا کمال کے خلاف نہیں ہے (مطلب یہ کہ کاملین اور اونچے درجے کے لوگوں کو بھی غصہ آسکتا ہے، یہ کوئی عیب نہیں ہے، البتہ اس کا بے جا اظہار عیب ہے)۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی نہ عیش وخوشی میں خدا کو بھولتے ہیں، نہ تنگی وتکلیف کے وقت خرچ کرنے سے جان چراتے ہیں، ہر موقع پر اور ہر حال میں حسب مقدرت خرچ کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں، سودخوروں کی طرح بخیل اور پیسہ کے پجاری نہیں، گویا جانی جہاد کے ساتھ مالی جہاد بھی کرتے ہیں۔

فائدہ: ۲ غصہ کو پی جانا ہی بڑا کمال ہے، اس پر مزید یہ کہ لوگوں کی زیادتی یا غلطیوں کو بالکل معاف کردیتے ہیں، اور نہ صرف معاف کرتے ہیں، بلکہ احسان اور نیکی سے پیش آتے ہیں۔

غالباً پہلے جن لوگوں کی نسبت بددعا کرنے سے روکا تھا، یہاں ان کے متعلق غصہ دبانے اور عفو ودرگزر سے کام لینے کی ترغیب دی گئی ہے، نیز جن بعض صحابہ نے جنگ احد میں عدول حکمی کی تھی، یا فرار اختیار کیا تھا، ان کی تقصیر معاف کرنے اور شان عفو واحسان اختیار کرنے کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔

وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ

اور وہ لوگ کہ جب کر بیٹھیں کچھ کھلا گناہ یا برا کام کریں اپنے حق میں ؎ تو یاد کریں اللہ کو اور بخشش مانگیں اپنے گناہوں کی

وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۪ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳۵﴾

اور کون ہے گناہ بخشنے والا سوا اللہ کے، اور اَڑتے نہیں اپنے کیے پر اور وہ جانتے ہیں

خلاصہ تفسیر: اور (اس جنت میں مذکورہ اوصاف کے اعتبار سے دوسرے درجہ کے مسلمان) ایسے لوگ (ہیں) کہ جب کوئی ایسا کام کرگزرتے ہیں جس میں (دوسروں پر) زیادتی ہو، یا (کوئی گناہ کر کے خاص) اپنی ذات کا نقصان کرتے ہیں تو (فورا) اللہ تعالیٰ (کی عظمت اور عذاب) کو یاد کر لیتے ہیں، پھر اپنے گناہوں کی معافی چاہتے ہیں (یعنی اس طریقہ سے جو معافی کے لئے مقرر ہے کہ اگر دوسروں پر زیادتی کی ہو تو ان سے بھی حقوق معاف کرائے اور جو خاص اپنی ذات تک گناہ ہو اس میں اس کی حاجت نہیں، اور اللہ تعالیٰ سے معاف کرانا دونوں صورتوں میں ضروری ہے) اور (واقعی) اللہ تعالیٰ کے سوا اور ہے کون جو گناہوں کو بخشتا ہو (رہے اہل حقوق یعنی بندے جو اپنے حقوق معاف کرتے ہیں سو وہ اس کا اختیار تو نہیں رکھتے کہ عذاب سے بھی بچالیں اور حقیقی بخشش اسی کا نام ہے) اور وہ لوگ اپنے فعل (بد) پر اصرار (اور ہٹ دھرمی) نہیں کرتے، اور وہ (ان باتوں کو) جانتے بھی ہیں (فلاں کام ہم نے گناہ کا کیا، اور یہ کہ توبہ ضروری ہے، اور یہ کہ اللہ تعالیٰ غفار ہے، مطلب یہ کہ اعمال کو بھی درست کر لیتے ہیں، اور عقائد بھی درست رکھتے ہیں)۔

گذشتہ دو آیتوں میں دو درجوں کے مسلمانوں کا بیان ہوا، پہلی آیت میں اعلیٰ درجہ کے، اور دوسری آیت میں اس سے کم درجہ کے، اور خدا سے ڈرنے والوں میں سب آگئے، کیونکہ توبہ بھی خدا کے ڈر سے ہی ہوتی ہے، نفس محبوبیت تو سب اہل اسلام میں مشترک ہے، البتہ اعلیٰ درجہ کے لوگوں کے لیے اکمل اور اعلیٰ درجہ کی محبوبیت خاص ہے۔

وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً (الی قولہ) وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا: روح المعانی میں ہے کہ حسن سے روایت ہے کہ یہ آیت بھی انہی محسنین کی صفات میں سے ہے جن کی صفت گذشتہ آیت میں الذین ینفقون فی السراء بیان ہوئی، تو اس سے معلوم ہوا کہ جب گناہ ہو جائے اور انسان توبہ کر لے اور گناہ پر اصرار نہ کرے تو یہ اس کے محسن ہونے کے خلاف نہیں، کیونکہ محسنین بھی انہیں کو فرمایا ہے۔

* * *

فائدہ: ؎ یعنی کھلم کھلا کوئی بے حیائی کا کام کر گزریں جس کا اثر دوسروں تک متعدی ہو، یا کسی اور بری حرکت کے مرتکب ہو جائیں جس کا ضرر ان ہی کی ذات تک محدود رہے۔

اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ مَّغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَجَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ

انہی کی جزا ہے بخشش ان کے رب کی اور باغ جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں ہمیشہ رہینگے وہ لوگ ان باغوں میں

وَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ﴿۱۳۶﴾ؕ

اور کیا خوب مزدوری ہے کام کرنے والوں کی

خلاصہ تفسیر: ان لوگوں کی جزاء بخشش ہے ان کے رب کی طرف سے، اور (جنت کے) ایسے باغ ہیں کہ ان کے (درختوں اور مکانوں کے) نیچے سے نہریں چلتی ہوں گی وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہنے والے ہوں گے (اور اسی مغفرت اور جنت کے حصول کا شروع آیتوں میں حکم تھا،

بیچ میں اس کا طریقہ بتلایا، ختم پر اس کا وعدہ فرمایا) اور (یہ) اچھا حق الخدمت ہے ان کام کرنے والوں کا (وہ کام استغفار اور حسن اعتقاد ہے، اور استغفار کا نتیجہ آئندہ اطاعت کی پابندی ہے جس پر ولم یصرّوا یعنی عدم اصرار دلالت کرتا ہے)۔

* * *

فائدہ: یعنی خدا کی عظمت وجلال، اس کے عذاب وثواب، اس کے حقوق واحکام، اس کی عدالت کی پیشی اور وعدوعید کو دل سے یاد کر کے زبان سے بھی اس کی یاد شروع کر دی، خوف زدہ اور مضطرب ہو کر اسے پکارا، اسکے سامنے سربسجود ہوئے (جیسا کہ ''صلوٰۃ التوبہ'' کی حدیث میں آیا ہے) پھر جو شرعی طریقہ گناہوں کے معاف کرانے کا ہے اس کے موافق معافی اور بخشش طلب کی، مثلاً اہل حقوق کے حقوق ادا کئے، یا ان سے معاف کرائے اور خدا کے سامنے توبہ واستغفار کیا (کیونکہ اصل بخشنے والا تو وہی ہے) جو گناہ بمقتضائے بشریت ہو گیا تھا اس پر اڑے نہیں، بلکہ یہ جان کر کہ حق تعالیٰ بندوں کی سچی توبہ قبول کرتا ہے، ندامت واقلاع کے ساتھ توبہ کرتے ہوئے اس کے حضور میں حاضر ہو گئے، یہ لوگ بھی دوسرے درجہ کے متقین میں ہیں جن کے لئے جنت تیار کی گئی ہے، حق تعالیٰ ان تائبین کے گناہ معاف کر کے اپنی جنت میں جگہ دے گا اور جو توبہ یا اور عمل نیک کئے ہوں گے، ان کا بہترین معاوضہ ملے گا۔

قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ ۙ فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۱۳۷﴾

ہو چکے ہیں تم سے پہلے واقعات سو پھرو زمین میں اور دیکھو کہ کیا ہوا انجام جھٹلانے والوں کا

خلاصہ تفسیر: اب پھر غزوہ احد کے متعلق مسلمانوں کو تسلی دینے کا مضمون ہے کہ ہمیشہ سے یہی طریقہ چلا آیا ہے کہ انجام کار کفار ہی خائب وخاسر ہوتے ہیں، سو اگر چہ تم اس وقت مغلوب ہو گئے، لیکن اگر ایمان وتقویٰ پر ثابت قدم رہے تو اخیر میں کفار ہی مغلوب ہوں گے۔

بالتحقیق تم سے قبل (زمانوں میں) مختلف طرق (کے لوگ) گزر چکے ہیں (جن میں مسلمان بھی تھے اور کفار بھی، اور ان میں باہم جنگ وجدال بھی ہوا، لیکن انجام کار کفار ہی ہلاک ہوئے، چنانچہ اگر تم آثار کا مشاہدہ کرنا چاہو) تو تم روئے زمین پر چلو پھرو، اور دیکھ لو کہ اخیر انجام تکذیب کرنے والوں کا (یعنی کفار کا) کیسا ہوا (یعنی ہلاک وبرباد ہوئے، چنانچہ ان کی ہلاکت کے آثار اس وقت تک بھی باقی تھے، جس کو دوسری آیات میں فرمایا ہے: فتلك بيوتهم خاوية، فتلك مساكنهم لم تسكن من بعدهم، فانتقمنا منهم وانهما لبامام مبين)۔

* * *

فائدہ: یعنی تم سے پہلے بہت قومیں اور ملتیں گزر چکیں، بڑے بڑے واقعات پیش آ چکے، خدا تعالیٰ کی عادت بھی بار بار معلوم کرا دی گئی کہ ان میں سے جنہوں نے انبیاء علیہم السلام کی عداوت اور حق کی تکذیب پر کمر باندھی اور خدا اور رسول کی تصدیق واطاعت سے منہ پھیر کر حرام خوری اور ظلم وعصیان پر اصرار کرتے رہے، ان کا کیسا برا انجام ہوا، یقین نہ ہو تو زمین میں چل پھر کر ان کی تباہی کے آثار دیکھ لو جو آج بھی تمہارے ملک کے قریب موجود ہیں، ان واقعات میں غور کرنے سے معرکہ احد کے دونوں حریفوں کو سبق لینا چاہیے، یعنی مشرکین جو پیغمبر خدا کی عداوت میں حق کو کچلنے کے لئے نکلے، اپنی تھوڑی سے عارضی کامیابی پر مغرور نہ ہوں کہ ان کا آخری انجام بجز ہلاکت وبربادی کے کچھ نہیں، اور مسلمان کفار کی سختیوں اور وحشیانہ دراز دستیوں یا اپنی ہنگامی پسپائی سے ملول ومایوس نہ ہوں کہ آخر حق غالب ومنصور ہو کر رہے گا، قدیم سے سنت اللہ یہ ہی ہے جو ٹل نہیں سکتی۔

هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۳۸﴾

یہ بیان ہے لوگوں کے واسطے اور ہدایت اور نصیحت ہے ڈرنے والوں کو

خلاصہ تفسیر: یہ (مذکورہ مضمون) بیان کافی ہے تمام لوگوں کے لئے (کہ اگر اس میں غور کریں تو عبرت حاصل کر سکتے ہیں) اور ہدایت اور نصیحت ہے خاص خدا سے ڈرنے والوں کے لئے (یعنی ہدایت اور نصیحت بھی یہی لوگ حاصل کرتے ہیں، ہدایت تو یہ کہ حق وباطل کو

سمجھیں، اور نصیحت یہ کہ اس کے موافق عمل کریں)۔

* * *

فائدہ: یعنی عام لوگوں کے کان کھولنے کے لئے قرآن میں یہ مضامین بیان کئے جا رہے ہیں، جن کو سن کر خدا سے ڈرنے والے ہدایت و نصیحت حاصل کرتے ہیں، باقی جس کے دل میں خدا کا خوف نہ ہو ناصحانہ تنبیہات سے کیا منتفع ہو سکتا ہے۔

وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳۹﴾

اور سست نہ ہو اور نہ غم کھاؤ اور تم ہی غالب رہو گے اگر تم ایمان رکھتے ہو

خلاصہ تفسیر: اور تم (اگر اس وقت مغلوب ہو گئے تو کیا ہوا) ہمت مت ہارو اور رنج مت کرو اور آخر تم ہی غالب رہو گے اگر تم پورے مومن رہے (یعنی اس کے تقاضوں پر ثابت قدم رہے)۔

* * *

فائدہ: یہ آیات جنگ احد کے بارے میں نازل ہوئیں، جب مسلمان مجاہدین زخموں سے چور چور ہو رہے تھے، ان کے بڑے بڑے بہادروں کی لاشیں آنکھوں کے سامنے مثلہ کی ہوئی پڑی تھیں، پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بھی اشقیاء نے مجروح کر دیا تھا اور بظاہر کامل ہزیمت کے سامان نظر آ رہے تھے، اس ہجوم شدائد و یاس میں خداوند قدوس کی آواز سنائی دی: وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ دیکھنا! سختیوں سے گھبرا کر دشمنان خدا کے مقابلہ میں نامردی اور سستی پاس نہ آنے پائے، پیش آمدہ حوادث و مصائب پر غمگین ہو کر بیٹھ رہنا مومن کا شیوہ نہیں، یاد رکھو! آج بھی تم ہی معزز و سربلند ہو کہ حق کی حمایت میں تکلیفیں اٹھا رہے ہو اور جانیں دے رہے ہو اور یقیناً آخری فتح بھی تمہاری ہے، انجام کار تم ہی غالب ہو کر رہو گے، بشرطیکہ ایمان و ایقان کے راستہ پر مستقیم رہو، اور حق تعالیٰ کے وعدوں پر کامل وثوق رکھتے ہوئے اطاعت رسول اور جہاد فی سبیل اللہ سے قدم پیچھے نہ ہٹاؤ، اس خدائی آواز نے ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑ دیا اور پژمردہ جسموں میں حیات تازہ پھونک دی، نتیجہ یہ ہوا کہ کفار جو بظاہر غالب آ چکے تھے، زخم خوردہ مجاہدین کے جوابی حملہ کی تاب نہ لا سکے، اور سر پر پاؤں رکھ کر میدان سے بھاگے۔

اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ ۭ وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ۚ

اگر پہنچا تم کو زخم تو پہنچ چکا ہے ان کو بھی زخم ایسا ہی اور یہ دن باری باری بدلتے رہتے ہیں ہم ان کو لوگوں میں [1]

وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَاۗءَ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۰﴾

اور اس لئے کہ معلوم کرے اللہ جن کو ایمان ہے [2] اور کرے تم میں سے شہید اور اللہ کو محبت نہیں ظلم کرنیوالوں سے [3]

خلاصہ تفسیر: اگر تم کو زخم (صدمہ) پہنچ جائے (جیسا کہ احد میں ہوا) تو (کوئی گھبرانے کی بات نہیں، کیونکہ اس میں بھی چند حکمتیں ہیں: ① ایک تو یہ کہ) اس قوم کو بھی (جو کہ تمہارے مقابل تھی یعنی کفار) ایسے ہی زخم (صدمہ) پہنچ چکا ہے (چنانچہ گزشتہ سال بدر میں وہ صدمہ اٹھا چکے ہیں) اور (ہمارا معمول ہے کہ) ہم ان ایام کو (یعنی غالب و مغلوب ہونے کے زمانہ کو) لوگوں کے درمیان ادلتے بدلتے رہتے ہیں (یعنی کبھی ایک قوم کو غالب اور دوسری کو مغلوب کر دیا، کبھی اس کا عکس کر دیا، سو اسی معمول کے مطابق گذشتہ سال وہ مغلوب ہوئے تھے، اس سال تم مغلوب ہو گئے، ایک حکمت تو یہ ہوئی) اور (② دوسری حکمت یہ ہے) تا کہ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو (ظاہری طور پر) جان لیں (یعنی اس کا جاننا سب کو معلوم ہو جائے، کیونکہ مصیبت کے وقت مخلص اور منافق کا امتحان ہو جاتا ہے) اور (③ تیسری حکمت یہ ہے کہ) تم میں سے بعض کو شہید بنانا تھا (بقیہ حکمتیں اگلی آیت میں آتی ہیں، درمیان میں جملہ معترضہ کے طور پر فرماتے ہیں:) اور اللہ تعالیٰ ظلم (کفر و شرک) کرنے والوں سے محبت نہیں رکھتے (پس اس کا احتمال نہ کیا

جائے کہ شاید کفار کو محبوب ہونے کی وجہ سے غالب فرمادیا ہو، ہرگز ایسا نہیں!)۔

وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ: یعنی غالب و مغلوب ہونے کے زمانہ کو ہم لوگوں کے درمیان ادلتے بدلتے رہتے ہیں، چنانچہ ایک بڑی مصلحت یہ ہے کہ اس عالم میں لوگوں کا ابتلا و امتحان باقی رہے، اگر مسلمان ہی ہمیشہ غالب ہوا کرتے تو یہ اس کی حقانیت کا کھلا نشان ہمیشہ کے لیے ہوتا، پھر کسی کے ایمان لانے میں کچھ کمال نہ ہوتا، اور اگر کفار کو ہمیشہ غلبہ ہوا کرتا تو ضعیف الایمان لوگ سخت فتنہ میں پڑ جاتے، اس لیے اکثر تو مسلمان ہی غالب ہوتے ہیں مگر کبھی مغلوب بھی ہو جاتے ہیں۔

* * *

فائدہ: ۱۔ وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ: مسلمانوں کو جنگ میں جو شدید نقصان اٹھانا پڑا تھا، اس سے سخت شکستہ خاطر تھے، مزید برآں منافقین اور دشمنوں کے طعنے سن کر اور زیادہ اذیت پہنچتی تھی، کیونکہ منافقین کہتے تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سچے پیغمبر ہوتے تو یہ نقصانات کیوں پہنچتے، یا تھوڑی دیر کے لئے بھی عارضی ہزیمت کیوں پیش آتی، حق تعالیٰ نے ان آیات میں مسلمانوں کو تسلی دی کہ اگر اس لڑائی میں تم کو زخم پہنچا، یا تکلیف اٹھانی پڑی تو اس طرح کے حوادث فریق مقابل کو پیش آچکے ہیں، احد میں تمہارے ستر آدمی شہید اور بہت سے زخمی ہوئے، تو ایک سال پہلے بدر میں ان کے ستر جہنم رسید اور بہت سے زخمی ہو چکے ہیں اور خود اس لڑائی میں بھی ابتداءً ان کے بہت آدمی مقتول و مجروح ہوئے جیسا کہ: وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ (آل عمران: ۱۵۲) کے الفاظ سے ظاہر ہے، پھر بدر میں ان کے ستر آدمی ذلت کے ساتھ قید ہوئے، تمہارے ایک فرد نے بھی یہ ذلت قبول نہ کی، بہر حال اپنے نقصان کا ان کے نقصان سے مقابلہ کرو تو غم و افسوس کا کوئی موقع نہیں، نہ ان کے لئے کبر و غرور سے سر اٹھانے کی جگہ ہے، باقی ہماری عادت ہمیشہ یہ رہی ہے کہ سختی نرمی، دکھ سکھ، تکلیف و راحت کے دنوں کو لوگوں میں ادل بدل کرتے رہتے ہیں، جس میں بہت سی حکمتیں مضمر ہیں، پھر جب وہ دکھ اٹھا کر باطل کی حمایت میں ہمت نہیں ہارے، تو تم حق کی حمایت میں کیونکر ہمت ہار سکتے ہو۔

فائدہ: ۲۔ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا: یعنی سچے ایمان والوں کو منافقوں سے الگ کر دے، دونوں کا رنگ صاف صاف اور جدا جدا نظر آنے لگے۔

فائدہ: ۳۔ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ: ظالمین سے مراد اگر مشرکین ہیں جو اُحد میں فریق مقابل تھے تو یہ مطلب ہوگا کہ ان کی عارضی کامیابی کا سبب یہ نہیں کہ خدا ان سے محبت کرتا ہے، بلکہ دوسرے اسباب ہیں، اور منافقین مراد ہوں جو عین موقع پر مسلمانوں سے الگ ہو گئے تھے، تو یہ بتلا دیا کہ خدا کے نزدیک مبغوض تھے، اس لئے ایمان و شہادت کے مقام سے انہیں دور پھینک دیا گیا۔

وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَمْحَقَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۴۱﴾

اور اس واسطے کہ پاک صاف کرے اللہ ایمان والوں کو اور مٹا دیوے کافروں کو

خلاصہ تفسیر: اور (۴ چوتھی حکمت یہ ہے) تا کہ (گناہوں کے) میل کچیل سے صاف کر دے ایمان والوں کو (کیونکہ مصیبت سے اخلاق و اعمال کا تصفیہ ہو جاتا ہے) اور (۵ پانچویں حکمت یہ ہے کہ) مٹا دے کافروں کو (اسکی دو صورتیں ہیں: ایک یہ کہ غالب آجانے سے ان کی ہمت بڑھے گی پھر مقابلہ میں آئیں گے اور ہلاک ہوں گے، دوسرے یہ کہ مسلمانوں پر ظلم کرنے سے قہر خداوندی میں مبتلا ہو کر ہلاک ہوں گے)۔

* * *

فائدہ: یعنی فتح اور شکست بدلتی چیز ہے اور مسلمانوں کو شہادت کا مقام بلند عطا فرمانا تھا، مومن و منافق کا پرکھنا، مسلمانوں کو سدھانا، یا ذنوب سے پاک کرنا اور کافروں کو آہستہ آہستہ مٹا دینا منظور تھا کہ جب وہ اپنے عارضی غلبہ اور وقتی کامیابی پر مسرور و مغرور ہو کر کفر و طغیان میں بیش از بیش غلو کریں گے، خدا کے قہر و غضب کے اور زیادہ مستحق ہوں گے، اس واسطے یہ عارضی ہزیمت مسلمانوں کو ہوئی، نہیں تو اللہ کافروں سے راضی نہیں ہے۔

اَمۡ حَسِبۡتُمۡ اَنۡ تَدۡخُلُوا الۡجَنَّةَ وَلَمَّا يَعۡلَمِ اللّٰهُ الَّذِيۡنَ جٰهَدُوۡا مِنۡكُمۡ وَيَعۡلَمَ الصّٰبِرِيۡنَ ﴿۱۴۲﴾

کیا تم کو خیال ہے کہ داخل ہو جاؤ گے جنت میں اور ابھی تک معلوم نہیں کیا اللہ نے جو لڑنے والے ہیں تم میں اور معلوم نہیں کیا ثابت قدم رہنے والوں کو

خلاصہ تفسیر: (پیچھے کی آیتوں میں گذشتہ مصائب کے بارے میں اہل ایمان کو تسلی تھی، اب آئندہ پیش آنے والی مشقتوں پر اہل ایمان کے قلوب کی تقویت کے لیے فرماتے ہیں:) ہاں اور سنو! کیا تم خیال کرتے ہو کہ جنت میں (خصوصیت کے ساتھ) جا داخل ہو گے، حالانکہ ہنوز اللہ تعالیٰ نے (ظاہری طور پر) ان لوگوں کو دیکھا ہی نہیں جنہوں نے تم میں سے (خوب) جہاد کیا ہو اور جو جہاد میں ثابت قدم رہنے والے ہوں۔

اَنۡ تَدۡخُلُوا الۡجَنَّةَ: یعنی جنت میں (خصوصیت کے ساتھ) جا داخل ہو گے، "خصوصیت" کے ساتھ داخل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ سب سے پہلے ہی چلا جائے، اور بلند درجات پر بھی پہنچ جائے تو یہ بغیر مشقت کے نہیں ہوتا جیسا کہ دوسری نصوص سے معلوم ہوتا ہے، اور یوں تو جنت میں بلا خصوصیت کے پہنچ جانا ہر مؤمن کے لیے محض فضل و کرم سے بھی ہو سکتا ہے۔

الَّذِيۡنَ جٰهَدُوۡا مِنۡكُمۡ: یعنی جنہوں نے تم میں سے خوب جہاد کیا ہو، یہاں "خوب" کی قید اس لیے بڑھادی کہ تھوڑا بہت جہاد تو غزوہ احد میں بھی ہوا تھا اگرچہ ناتمام رہا، مطلب یہ ہے کہ ابھی تمہاری ثابت قدمی اور جہاد کا امتحان بہت باقی ہے، آئندہ کے لیے اس میں کوشش کرنا ضروری ہے، کیونکہ جنت کے بلند درجات بغیر مشقت کے نہیں مل سکتے۔

* * *

فائدہ: یعنی جنت کے جن اعلیٰ مقامات اور بلند درجات پر خدا تم کو پہنچانا چاہتا ہے کیا تم سمجھتے ہو کہ بس یونہی آرام سے وہاں جا پہنچیں گے اور خدا تمہارا امتحان لے کر یہ نہ دیکھے گا کہ تم میں کتنے خدا کی راہ میں لڑنے والے اور کتنے لڑائی کے وقت ثابت قدم رہنے والے ہیں ایسا خیال نہ کرنا، مقامات عالیہ پر وہی لوگ فائز کئے جاتے ہیں جو خدا کے راستہ میں ہر طرح کی سختیاں جھیلنے اور قربانیاں پیش کرنے کے لئے تیار ہوں:

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

وَلَقَدۡ كُنۡتُمۡ تَمَنَّوۡنَ الۡمَوۡتَ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ تَلۡقَوۡهُ فَقَدۡ رَاَيۡتُمُوۡهُ وَاَنۡتُمۡ تَنۡظُرُوۡنَ ﴿۱۴۳﴾

اور تم تو آرزو کرتے تھے مرنے کی اس کی ملاقات سے پہلے سو اب دیکھ لیا تم نے اس کو آنکھوں کے سامنے

خلاصہ تفسیر: (اوپر نصیحت تھی، اب لڑائی سے بھاگنے پر ایک گونہ ملامت ہے) اور تم تو (شہید ہو کر) مرنے کی (بڑی) تمنا کیا کرتے تھے، موت کے سامنے آنے سے پہلے، سو (تمنا کے مطابق) اس (کے سامان) کو کھلی آنکھوں دیکھ لیا (پھر اس کو دیکھ کر کیوں بھاگنے لگے اور وہ تمنا کہاں بھول گئے)۔

اس آیت کا شان نزول یہ ہے کہ غزوہ احد سے پہلے بعض صحابہ کرام جنگ بدر میں شہید ہوئے اور ان کے بڑے بڑے فضائل قرآن وحدیث میں بیان ہوئے تو بعض نے تمنا کی کہ کاش! ہمیں بھی کوئی ایسا موقع پیش آئے کہ شہادت کی دولت سے مشرف ہوں، آخر غزوہ احد کا واقعہ ہوا تو بہت سوں کے پاؤں اکھڑ گئے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

وَلَقَدۡ كُنۡتُمۡ تَمَنَّوۡنَ الۡمَوۡتَ: اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اس پر انکار فرمایا کہ تم سے اس تمنا کے خلاف افعال کیوں سرزد ہوئے جس کی تمنا تم پہلے رکھتے تھے، تو یہاں نفس تمنا پر انکار نہیں فرمایا، اس سے معلوم ہوا کہ مطلق موت کی تمنا مذموم نہیں، بلکہ اگر موت کی تمنا اخروی سعادت کے اشتیاق کی وجہ سے ہو جس کی توقع شہادت میں ہوتی ہے تو یہ جائز ہے۔

* * *

فائدہ: جو صحابہ بدر کی شرکت سے محروم رہ گئے تھے شہدائے بدر کے فضائل سن سن کر تمنا کیا کرتے تھے کہ خدا پھر کوئی موقع لائے جو ہم بھی خدا کی راہ میں مارے جائیں اور شہادت کے مراتب حاصل کریں، انہی حضرات نے احد میں یہ مشورہ دیا تھا کہ مدینہ سے باہر نکل کر لڑنا چاہیے، ان کو فرمایا کہ جس چیز کی پہلے تمنا رکھتے تھے وہ تمہاری آنکھوں کے سامنے آچکی، اب آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے ہٹنا کیسا؟ حدیث میں ہے کہ لقاء عدو کی تمنا مت کرو اور جب ایسا موقع پیش آجائے تو ثابت قدم رہو۔

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَاۡىِٕنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى

اور محمد ﷺ تو ایک رسول ہے، ہو چکے اس سے پہلے بہت رسول، پھر کیا اگر وہ مر گیا یا مارا گیا تو تم پھر جاؤ گے

اَعْقَابِكُمْ ؕ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـًٔا ؕ وَسَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ۝

الٹے پاؤں، اور جو کوئی پھر جائے گا الٹے پاؤں تو ہرگز نہ بگاڑیگا اللہ کا کچھ، اور اللہ ثواب دے گا شکر گزاروں کو

خلاصہ تفسیر: جب غزوہ احد میں جناب رسول اللہ ﷺ کا دندان مبارک شہید اور سر مبارک زخمی ہوا، اس وقت کسی دشمن نے پکارا کہ محمد (ﷺ) قتل ہو گئے، مسلمان ایک تو لڑائی کا رنگ بدل جانے سے بدحواس و پریشان ہو ہی رہے تھے اس خبر سے رہی سہی کمر بھی ٹوٹ گئی، کسی نے تو یہ تجویز کیا کہ اب کفار سے امن لے لینا چاہیے، بعض ہمت ہار کر بیٹھ گئے، بعض بولے کہ جب آپ ﷺ ہی نہ رہے تو ہم رہ کر کیا کریں گے، جس پر آپ نے جان دی ہمیں بھی اسی پر جان دے دینی چاہیے، بعض بھاگ کھڑے ہوئے، بعض منافق بولے کہ اگر محمد ﷺ نہیں رہے تو پھر اپنا پہلا ہی دین کیوں نہ اختیار کرلیا جائے، بعض بولے کہ اگر نبی ہوتے تو کیوں قتل ہوتے، اس پریشانی میں اول آپ ﷺ کو حضرت کعب بن مالک ؓ نے دیکھا پہچانا اور پکار کر کہا کہ مسلمانو! یہ ہیں رسول اللہ ﷺ زندہ صحیح سلامت، پھر سب مسلمان جمع ہوئے، آپ نے اس بھاگنے پر ملامت فرمائی، عرض کیا کہ یا رسول اللہ! اس وحشت ناک خبر سے ہمارے دل بیٹھ گئے اس لیے پاؤں اکھڑ گئے، اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی۔

اور محمد ﷺ نرے رسول ہی تو ہیں (خدا تو نہیں، جس پر قتل یا موت ممکن نہ ہو) آپ سے پہلے بہت سے رسول گزر چکے ہیں (اسی طرح آپ بھی ایک روز گزر ہی جائیں گے) سو اگر آپ کا انتقال ہو جائے یا آپ شہید ہو جائیں تو کیا تم لوگ (جہاد یا اسلام سے) الٹے پھر جاؤ گے (جیسا کہ اس واقعہ میں بعض مسلمان میدان جنگ سے بھاگ پڑے تھے اور منافقین ارتداد کی ترغیب دے رہے تھے) اور جو شخص (جہاد یا اسلام سے) الٹا پھر جائے گا تو اللہ تعالیٰ کا کوئی نقصان نہ کرے گا (بلکہ اپنا ہی کچھ کھو دے گا) اور اللہ تعالیٰ جلد ہی (نیک) عوض دے گا حق شناس لوگوں کو (جو ایسے مواقع پر اللہ تعالیٰ کے انعامات کو یاد رکھ کر اس کی اطاعت پر جمے رہتے ہیں، اور قیامت میں عوض ملنا جلد ہی ملنا ہے، کیونکہ قیامت روزانہ قریب ہوتی جاتی ہے)۔

قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ یعنی آپ سے پہلے بہت سے رسول گزر چکے ہیں، اس سے عیسیٰ علیہ السلام کے انتقال پر استدلال کرنا محض باطل ہے، کیونکہ زندہ آسمان پر اٹھ جانا بھی دنیا سے گزر جانا ہے، رسول اللہ ﷺ اگر اس طرح بھی اٹھ جاتے تب بھی صحابہ کو موت ہی کا سا صدمہ ہوتا، پس تسلی میں مطلق گزر جانے کو بھی پورا دخل ہے خواہ موت سے ہو یا بغیر موت کے۔

اَفَاۡىِٕنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ یعنی کیا تم لوگ الٹے پھر جاؤ گے، ظاہر ہے کہ یہاں صحابہ سے پلٹنے (انْقَلَبْتُمْ) کا وقوع نہ ہوا تھا، البتہ پلٹنے والوں کا سا کچھ عمل ہو گیا تھا، جیسے ہزیمت اور جزع فزع، اس بنا پر اس سے معلوم ہوا کہ کسی بزرگ اور بڑے کی موت پر سخت رنج یا جزع فزع کرنا مناسب نہیں، جیسا کہ عوام بلکہ خواص معتقدین کا بھی یہ طرز مشاہدہ میں آتا ہے، اسی طرح کسی بڑے کی وفات کے بعد یہ خیال کرنا کہ اب کوئی دین کا حامی و خادم نہ رہا تو یہ بھی صحیح نہیں، روح المعانی میں ہے کہ اس میں اس شخص کے عتاب کی طرف اشارہ ہے جو درمیان میں واسطہ کے فوت ہونے کی وجہ سے متزلزل ہو جائے، کیونکہ یہ مشاہدہ حق کے منافی ہے۔

* * *

فائدہ: واقعہ یہ ہے کہ احد میں نبی کریم ﷺ نے بنفس نفیس نقشہ جنگ قائم کیا، تمام صفوف درست کرنے کے بعد پہاڑ کا ایک درّہ باقی رہ گیا جہاں سے اندیشہ تھا کہ دشمن لشکرِ اسلام کے عقب پر حملہ آور ہو جائے، اس پر آپ ﷺ نے پچاس تیر اندازوں کو جن کے سردار حضرت عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ تھے، مامور فرما کر تاکید کر دی کہ ہم خواہ کسی حالت میں ہوں تم یہاں سے مت ٹلنا، مسلمان غالب ہوں یا مغلوب، حتیٰ کہ اگر تم دیکھو کہ پرندے ان کا گوشت نوچ کر کھا رہے ہیں تب بھی اپنی جگہ مت چھوڑنا: وانا لن نزال غالبین ما ثبتم مکانکم (بغوی) ہم برابر اسوقت تک غالب رہیں گے جب تک تم اپنی جگہ قائم رہو گے، الغرض فوج کو پوری ہدایت دینے کے بعد جنگ شروع کی گئی، میدانِ کارزار گرم تھا، غازیانِ اسلام بڑھ بڑھ کر جوہر شجاعت دکھا رہے تھے، ابو دجانہ، علی مرتضیٰ اور دوسرے مجاہدین کی بسالت و بے جگری کے سامنے مشرکین قریش کی کمریں ٹوٹ چکی تھیں، ان کو راہِ فرار کے سوااب کوئی راستہ نظر نہ آتا تھا کہ حق تعالیٰ نے اپنا وعدہ پورا کر دکھایا، کفار کو شکست فاش ہوئی وہ بدحواس ہو کر بھاگے ان کی عورتیں جو غیرت دلانے کو آئی تھیں، پائنچے چڑھا کر اِدھر اُدھر بھاگتی نظر آئیں، مجاہدین نے مال غنیمت پر قبضہ کرنا شروع کر دیا، یہ منظر جب تیر اندازوں نے دیکھا تو سمجھے کہ اب فتح کامل ہو چکی، دشمن بھاگ رہا ہے، یہاں بیکار ٹھہرنا کیا، ضروری ہے چل کر دشمن کا تعاقب کریں اور غنیمت میں حصہ لیں، عبداللہ بن جبیرؓ نے رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ان کو یاد دلایا، وہ سمجھے کہ آپ ﷺ کے ارشاد کا اصلی منشا ہم پورا کر چکے ہیں، یہاں ٹھہرنے کی حاجت نہیں، یہ خیال کر کے سب غنیمت پر جا پڑے، صرف عبداللہ بن جبیرؓ اور ان کے گیارہ ساتھی درّہ کی حفاظت پر باقی رہ گئے، مشرکین کے سواروں کا رسالہ خالد بن ولید کے زیر کمان تھا (جو اس وقت تک "حضرت" اور "رضی اللہ عنہ" نہیں بنے تھے) انہوں نے پلٹ کر درّہ کی طرف سے حملہ کر دیا، دس بارہ تیر انداز ڈھائی سو سواروں کی یلغار کو کہاں روک سکتے تھے، تاہم عبداللہ بن جبیرؓ اور انکے رفقاء نے مدافعت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا اور اسی میں جان دیدی، مسلمان مجاہدین اپنے عقب سے مطمئن تھے کہ ناگہاں مشرکین کا رسالہ ان کے سروں پر جا پہنچا اور سامنے سے مشرکین کی فوج جو بھاگی جا رہی تھی، پیچھے پلٹ پڑی، مسلمان دونوں طرف سے گھر گئے اور بہت زور کا رن پڑا، کتنے ہی مسلمان شہید اور زخمی ہوئے، اسی افراتفری میں ابن قمیہ نے ایک بھاری پتھر نبی کریم ﷺ پر پھینکا جس سے دندان مبارک شہید اور چہرہ انور زخمی ہوا، ابن قمیہ نے چاہا کہ آپ ﷺ کو قتل کرے، مگر مصعب بن عمیرؓ نے (جن کے ہاتھ میں اسلام کا جھنڈا تھا) مدافعت کی، نبی کریم ﷺ زخم کی شدت سے زمین پر گرے، کسی شیطان نے آواز لگا دی کہ آپ ﷺ قتل کر دیئے گئے، یہ سنتے ہی مسلمانوں کے ہوش خطا ہو گئے، اور پاؤں اکھڑ گئے، بعض مسلمان ہاتھ پاؤں چھوڑ کر بیٹھ رہے، بعض ضعفاء کو خیال ہوا کہ مشرکین کے سردار ابو سفیان سے امن حاصل کر لیں، بعض منافقین کہنے لگے کہ جب محمد قتل کر دیئے گئے تو اسلام چھوڑ کر اپنے قدیم مذہب میں واپس چلے جانا چاہیئے، اس وقت انس بن مالکؓ کے چچا انس ابن النضر نے کہا کہ اگر محمد مقتول ہو گئے تو رب محمد ﷺ تو مقتول نہیں ہوا، حضور ﷺ کے بعد تمہارا زندہ رہنا کس کام کا ہے؟ جس چیز پر آپ ﷺ قتل ہوئے تم بھی اسی پر کٹ مرو، اور جس چیز پر آپ ﷺ نے جان دے دی ہے اسی پر تم بھی جان دے دو، یہ کہہ کر آگے بڑھے، حملہ کیا، لڑے اور مارے گئے رضی اللہ عنہ، اسی اثناء میں حضور ﷺ نے آواز دی اِلَیَّ عِبَادَ اللّٰہِ اَنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ (اللہ کے بندوں ادھر آؤ! میں خدا کا پیغمبر ہوں) کعب بن مالک آپ ﷺ کو پہچان کر چلائے یامعشر المسلمین! "مسلمانو! بشارت حاصل کرو! رسول اللہ یہاں موجود ہیں" آواز کا سننا تھا کہ مسلمان اُدھر ہی سمٹنا شروع ہو گئے، تیس صحابہ نے آپ ﷺ کے قریب ہو کر مدافعت کی اور مشرکین کی فوج کو منتشر کر دیا، اس موقع پر سعد بن ابی وقاص، طلحہ، ابو طلحہ اور قتادہ بن النعمان وغیرہ نے بڑی جانبازیاں دکھلائیں، آخر مشرکین میدان چھوڑ کر چلے جانے پر مجبور ہوئے اور یہ آیات نازل ہوئیں: وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ (آل عمران: ۱۴۴) یعنی محمد ﷺ بھی آخر خدا تو نہیں، ایک رسول ہیں، ان سے پہلے کتنے رسول گزر چکے، جن کے بعد ان کے متبعین نے دین کو سنبھالا اور جان و مال فدا کر کے قائم رکھا، آپ ﷺ کا اس دنیا سے گزرنا بھی کچھ اچنبھا نہیں، اس وقت نہ سہی، اگر کسی وقت آپ ﷺ کی وفات ہو گئی، یا شہید کر دیئے گئے، تو کیا تم دین کی خدمت و حفاظت کے راستہ سے الٹے پاؤں پھر جاؤ گے اور جہاد فی سبیل اللہ ترک کر دو گے (جیسے اس وقت محض خبر قتل سُن کر بہت سے لوگ حوصلہ چھوڑ کر بیٹھنے لگے تھے) یا منافقین کے مشورہ کے موافق العیاذ باللہ سرے سے دین کو خیرباد کہہ دو گے، تم سے ایسی امید ہرگز نہیں، اور کسی نے ایسا کیا تو اپنا ہی نقصان کرے گا، خُدا کا کیا بگاڑ سکتا ہے، وہ تمہاری مدد کا محتاج نہیں

بلکہ تم شکر کرو اگر اس نے اپنے دین کی خدمت میں لگالیا:

منت منہ کہ خدمت سلطاں ہمی کنم منت شناس ازو کہ بخدمت گذاشتت

اور شکر یہی ہے کہ ہم بیش از بیش خدمت دین میں مضبوط وثابت قدم ہوں، اس میں اشارہ نکلتا ہے حضرت کی وفات پر بعضے لوگ دین سے پھر جائیں گے اور جو قائم رہیں گے ان کو بڑا ثواب ہے، اسی طرح ہوا کہ بہت لوگ حضرت کے بعد مرتد ہوئے، صدیق اکبرؓ نے ان کو پھر مسلمان کیا اور بعض مارے گئے۔

تنبیہ: قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ میں خلت ''خلو'' سے مشتق ہے جس کے معنی ہو چکنے، گزرنے اور چھوڑ کر چلے جانے کے ہیں، اس کے لئے موت لازم نہیں جیسے فرمایا: وَإِذَا لَقُوكُمْ قَالُوٓا آمَنَّا وَإِذَا خَلَوْا عَضُّوا عَلَيْكُمُ الْأَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ (آل عمران: ۱۱۹) یعنی جب تمہیں چھوڑ کر علیحدہ ہوتے ہیں، نیز الرسل میں لام استغراق نہیں، لام جنس ہے، کیونکہ اثبات مدعا میں استغراق کو کوئی دخل نہیں، بعینہ اسی قسم کا جملہ حضرت مسیح کی نسبت فرمایا: مَا الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ (المائدہ: ۷۵) کیا لام استغراق لے کر اس کے یہ معنی ہوں گے کہ تمام پیغمبر مسیح سے پہلے گزر چکے، کوئی ان کے بعد آنے والا نہ رہا، لامحالہ لام جنس لینا ہوگا، وہ ہی یہاں لیا جائے، اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ عبداللہ بن مسعودؓ کے مصحف اور ابن عباسؓ کی قرات میں ''الرسل'' نہیں ''رسل'' نکرہ ہے۔

باقی ''خلو'' کی تفصیل میں صرف موت یا قتل کا ذکر اس لئے کیا کہ موت طبعی بہر حال آنے والی تھی اور قتل کی خبر اس وقت مشہور کی گئی تھی، اور چونکہ صورت موت کا وقوع میں آنا مقدر تھا اس لیے اس کو قتل پر مقدم کیا گیا، ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کی وفات کے بعد جب صحابہ کے مجمع میں یہ پوری آیۃ الشاکرین تک بلکہ آیت إِنَّكَ مَيِّتٌ وَإِنَّهُم مَّيِّتُونَ (الزمر: ۳۰) بھی پڑھی تو لوگ قد خلت اور افائن مات اور انک میت سے ''خلو'' اور ''موت'' کے جواز وعدم استبعاد پر متنبہ ہوگئے، جو صدیق اکبرؓ کی غرض تھی، موت کے واقع ہو چکنے پر نہ صدیق اکبرؓ نے اس سے استدلال کیا، نہ کسی اور نے سمجھا، اگر یہ الفاظ موت واقع ہو چکنے کی خبر دیتے تو چاہیے تھا کہ نزول آیت کے وقت یعنی وفات کے سات برس پہلے ہی سمجھ لیا جاتا کہ آپ کی وفات ہو چکی ہے، اس تقریر سے بعض محرفین کی سب تحریفات ہباءً منثوراً ہو جاتی ہیں، بخوف تطویل ہم زیادہ بسط نہیں کر سکتے، اہل علم کے لئے اشارے کر دیئے ہیں۔

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ أَنْ تَمُوتَ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ كِتَابًا مُؤَجَّلًا ۗ وَمَنْ يُرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهِ

اور کوئی مر نہیں سکتا بغیر حکم اللہ کے لکھا ہوا ہے ایک وقت مقرر[1] اور جو کوئی چاہے گا بدلہ دنیا کا دیویں گے ہم اس کو

مِنْهَا ۚ وَمَنْ يُرِدْ ثَوَابَ الْآخِرَةِ نُؤْتِهِ مِنْهَا ۚ وَسَنَجْزِي الشَّاكِرِينَ ﴿۱۴۵﴾

دنیا ہی سے[2] اور جو کوئی چاہے گا بدلہ آخرت کا اس میں سے دیویں گے ہم اس کو[3] اور ہم ثواب دینگے احسان ماننے والوں کو[4]

خلاصہ تفسیر: اور (نیز کسی کے مرنے سے اتنا گھبرانا بھی فضول ہے، کیونکہ اول تو) کسی شخص کو موت آنا ممکن نہیں (خواہ طبعی موت ہو یا قتال سے) بدون حکم خدا کے (پھر جب خدا کے حکم سے ہے تو اس پر راضی رہنا ضروری ہے، دوسرے یہ کہ جس کی موت آتی بھی ہے تو) اس طور سے کہ اس کی میعاد معین لکھی ہوئی رہتی ہے (جس میں تقدیم وتاخیر نہیں ہوسکتی، تو پھر ارمان اور حسرت محض بیکار ہے، تو وہ وقت پر ضرور ہوگی، اور وقت سے پہلے ہرگز نہ ہوگی) اور (پھر یہ کہ اس سے متوحش ہو کر بھاگنے کا آخر نتیجہ کیا، بجز اس کے کہ دنیا میں چندروز اور زندہ رہیں، سو ایسی تدبیر کا اثر سن لو کہ) جو شخص (اپنے اعمال وتدابیر میں) دنیوی نتیجہ چاہتا ہے تو ہم اس کو دنیا کا حصہ (اپنی مشیت کے مطابق) دے دیتے ہیں (اور آخرت میں اس کے لئے کچھ حصہ نہیں) اور جو شخص (اپنے اعمال وتدابیر میں) اخروی نتیجہ چاہتا ہے (مثلاً جہاد میں اس لئے ثابت قدم رہا کہ یہ آخرت کا ثواب ملنے کی ایک تدبیر

ہے) تو ہم اس کو آخرت کا (حصہ اور ذمہ کر کے) دیں گے، اور بہت جلد (نیک) عوض دیں گے (ایسے) حق شناسوں کو (جو اپنے اعمال وتدابیر میں آخرت کی نعمت چاہیں)۔

گذشتہ آیت میں نیک اعمال پر قائم رہنے کو "شکر" کہا تھا، یہاں آخرت کی نیت کرنے کو "شکر" کہا گیا تو کلام میں تکرار نہیں۔

* * *

فائدہ: ۱ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا: جب کوئی شخص بدون حکم الٰہی کے نہیں مرسکتا خواہ کتنے ہی اسباب موت کے جمع ہوں اور ہر ایک کی موت وقت مقرر پر آنی ضرور ہے، خواہ بیماری یا قتل سے، یا کسی اور سبب سے، تو خدا پر توکل کرنے والوں کو اس سے گھبرانا نہیں چاہیے، اور نہ کسی بڑے یا چھوٹے کی موت کو سُن کر مایوس و بددل ہو کر بیٹھ رہنا چاہیے۔

فائدہ: ۲ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا: یعنی اگر چاہیں كما قال: عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ (الاسراء: ۱۸)

فائدہ: ۳ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا: یعنی اس کو آخرت میں یقیناً بدلہ ملے گا، اس آیت کے پہلے جملہ میں ان لوگوں پر تعریض ہے جنھوں نے مال غنیمت کی طمع میں عدول حکمی کی، اور دوسرے میں ان کا ذکر ہے جو برابر فرمانبرداری پر ثابت قدم رہے۔

فائدہ: ۴ وَسَنَجْزِى الشّٰكِرِيْنَ: یعنی جو لوگ اس دین پر ثابت قدم رہیں گے ان کو دین بھی ملے گا اور دنیا بھی، لیکن جو کوئی اس نعمت کی قدر جانے (کذا فی الموضح)

وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ

اور بہت نبی ہیں جن کے ساتھ ہو کر لڑے ہیں بہت خدا کے طالب، پھر نہ ہارے ہیں کچھ تکلیف پہنچنے سے اللہ کی راہ میں

وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۴۶﴾

اور نہ سست ہوئے ہیں اور نہ دب گئے ہیں، اور اللہ محبت کرتا ہے ثابت قدم رہنے والوں سے

خلاصہ تفسیر: غزوہ احد میں پیش آنے والی بعض کوتاہیوں پر پیچھے مسلمانوں کو ملامت تھی، آگے بھی اسی کا تتمہ ہے، چنانچہ پچھلی امتوں کے مخلصین کا حال یاد دلاتے ہیں کہ دیکھو وہ کیسے میدان جنگ میں ثابت قدم اور مستقل رہے، تم کو بھی ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔

اور بہت نبی ہو چکے ہیں جن کے ساتھ ہو کر بہت بہت اللہ والے (کفار کے ساتھ) لڑے ہیں، نہ انہوں نے ہمت ہاری ان مصائب کی وجہ سے جو ان پر اللہ کی راہ میں واقع ہوئیں، اور نہ ان کے (قلب یا بدن) کا زور گھٹا، اور نہ وہ (دشمن کے سامنے) دبے (کہ ان سے عاجزی اور خوشامد کی باتیں کرنے لگے ہوں) اور اللہ تعالیٰ کو ایسے مستقل مزاجوں سے محبت ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی تم سے پہلے بہت اللہ والوں نے نبیوں کے ساتھ ہو کر کفار سے جنگ کی ہے، جس میں بہت تکلیفیں اور سختیاں اٹھائیں، لیکن ان شدائد و مصائب سے نہ ان کے ارادوں میں سُستی ہوئی، نہ ہمت ہارے، نہ کمزوری دکھائی، نہ دشمن کے سامنے دبے، اللہ تعالیٰ ایسے ثابت قدم رہنے والوں سے خاص محبت کرتا ہے۔

یہ ان مسلمانوں کو تنبیہ فرمائی اور غیرت دلائی جنہوں نے اُحد میں کمزوری دکھلائی تھی، حتیٰ کہ بعض نے یہ کہہ دیا تھا کہ کسی کو بیچ میں ڈال کر ابو سفیان سے امن حاصل کر لیا جائے، مطلب یہ ہے کہ جب پہلی امتوں کے حق پرستوں نے مصائب و شدائد میں اس قدر صبر و استقلال کا ثبوت دیا تو اس امت کو (جو خیر الامم ہے) ان سے بڑھ کر صبر و استقامت کا ثبوت دینا چاہیے۔

وَمَا كَانَ قَوۡلَهُمۡ اِلَّاۤ اَنۡ قَالُوۡا رَبَّنَا اغۡفِرۡ لَنَا ذُنُوۡبَنَا وَاِسۡرَافَنَا فِیۡۤ اَمۡرِنَا وَثَبِّتۡ اَقۡدَامَنَا

اور کچھ نہیں بولے مگر یہی کہا کہ اے رب ہمارے بخش ہمارے گناہ اور جو ہم سے زیادتی ہوئی ہمارے کام میں اور ثابت رکھ قدم ہمارے

وَانۡصُرۡنَا عَلَى الۡقَوۡمِ الۡكٰفِرِيۡنَ ﴿۱۴۷﴾ فَاٰتٰٮهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنۡيَا وَحُسۡنَ ثَوَابِ الۡاٰخِرَةِ‌ ؕ

اور مدد دے ہم کو قوم کفار پر ۱ پھر دیا اللہ نے ان کو ثواب دنیا کا اور خوب ثواب آخرت کا

وَاللّٰهُ يُحِبُّ الۡمُحۡسِنِيۡنَ ﴿۱۴۸﴾ ع

اور اللہ محبت رکھتا ہے نیک کام کرنے والوں سے ۲

خلاصہ تفسیر: اور (جو دین کے کام میں ایسے ثابت قدم رہیں ان کے افعال میں تو کیا لغزش ہوتی) ان کی زبان سے بھی تو اس کے سوا اور کچھ نہیں نکلا کہ انہوں نے (اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں) عرض کیا کہ اے ہمارے پروردگار! ہمارے گناہوں کو اور ہمارے کاموں کو حد سے آگے نکل جانے کو بخش دیجئے، اور ہم کو (کفار کے مقابلہ میں) ثابت قدم رکھئے، اور ہم کو کافر لوگوں پر غالب کیجئے، تو (گذشتہ استقلال اور دعا کی برکت سے) ان کو اللہ تعالیٰ نے دنیا کا بدلہ بھی دیا (یعنی فتح وظفر) اور آخرت کا بھی عمدہ بدلہ دیا (یعنی رضا اور جنت) اور اللہ تعالیٰ کو ایسے نیکوکاروں سے محبت ہے۔

رَبَّنَا اغۡفِرۡ لَنَا ذُنُوۡبَنَا وَاِسۡرَافَنَا فِیۡۤ اَمۡرِنَا: اس میں اس بات کی تعلیم ہے کہ مصیبت کے وقت ظاہری تدبیر کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے دعا اور استغفار بھی کرے کہ اکثر مصیبت کا سبب گناہ ہوتا ہے، اور اس میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ جنگ احد میں مصیبت اور آزمائش حکم عدولی کے سبب ہوئی، اگر اس پر یہ اشکال ہو کہ صحابہ تو اللہ والے تھے پھر ان کے کیا گناہ ہوں گے؟ جواب یہ ہے کہ اپنے اپنے مرتبہ کے مطابق کچھ نہ کچھ تو انسان سے ہو ہی جاتا ہے، مگر ایسے اتفاقیات سے ان کے اللہ والے ہونے میں کچھ فرق نہیں پڑتا، خصوصاً اس وجہ سے کہ وہ بہت جلد معذرت اور توبہ کر لیتے ہیں، اور دعا، توبہ و استغفار اور ثابت قدمی یہ بھی فتح وظفر کی تدابیر میں سے ہیں، اگر کبھی کسی عارضہ کی وجہ سے ان کے باوجود بھی شکست ہو تو کچھ اشکال نہیں۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی مصائب وشدائد کے ہجوم میں نہ گھبراہٹ کی کوئی بات کہی، نہ مقابلہ سے ہٹ جانے اور دشمن کی اطاعت قبول کرنے کا ایک لفظ زبان سے نکالا، بولے تو یہ ہی بولے کہ خداوندا! تو ہم سب کی تقصیرات اور زیادتیوں کو معاف فرما دے، ہمارے دلوں کو مضبوط و مستقل رکھ، تا کہ ہمارا قدم جادۂ حق سے نہ لڑکھڑائے اور ہم کو کافروں کے مقابلہ میں مدد پہنچا، وہ سمجھے کہ بسا اوقات مصیبت کے آنے میں لوگوں کے گناہوں اور کوتاہیوں کو دخل ہوتا ہے اور ہم میں کون دعویٰ کر سکتا ہے کہ اس سے کبھی کوئی تقصیر نہ ہوئی ہوگی، بہر حال بجائے اس کے کہ مصیبت سے گھبرا کر مخلوق کی طرف جھکتے اپنے خالق و مالک کی طرف جھکے۔

فائدہ: ۲ یعنی دنیا میں ان کی فتح وظفر کا سکہ بٹھا دیا، وجاہت وقبول عطا کیا اور آخرت کا جو بہترین ثواب ملا، اس کا تو پوچھنا ہی کیا ہے، دیکھو جو لوگ خدا تعالیٰ سے اپنا معاملہ ٹھیک رکھیں اور نیک کام کریں ان سے خدا ایسی محبت کرتا ہے اور ایسا پھل دیتا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنۡ تُطِيۡعُوا الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا يَرُدُّوۡكُمۡ عَلٰٓى اَعۡقَابِكُمۡ فَتَنۡقَلِبُوۡا خٰسِرِيۡنَ ﴿۱۴۹﴾

اے ایمان والو اگر تم کہا مانو گے کافروں کا تو وہ تم کو پھیر دیں گے الٹے پاؤں پھر جا پڑو گے تم نقصان میں ۱

بَلِ اللّٰهُ مَوۡلٰٮكُمۡ‌ ۚ وَهُوَ خَيۡرُ النّٰصِرِيۡنَ ﴿۱۵۰﴾

بلکہ اللہ تمہارا مددگار ہے اور اس کی مدد سب سے بہتر ہے ۲

خلاصہ تفسیر: چونکہ لڑائی بگڑنے کے وقت بعض منافقین مسلمانوں سے کہنے لگے تھے کہ جب حضور ہی نہ رہے تو اپنا پہلا دین ہی کیوں نہ اختیار کرلیا جائے، اس سے منافقین کی خباثت وبدخواہی ظاہر ہے، اس لیے اب مسلمانوں کو کسی بات میں ان کے مشورہ پر عمل کرنے سے ڈراتے ہیں، جیسا کہ پیچھے مخلصین کے اتباع کی رغبت دلائی تھی۔

اے ایمان والو! اگر تم کہنا مانو گے کافروں کا تو وہ تم کو (کفر کی طرف) الٹا پھیر دیں گے (مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کا اصل مقصد مسلمانوں کو ان کے دین سے ہٹانا اور بدگمان کرنا ہے، تاکہ رفتہ رفتہ ان کے دل سے اسلام کی عظمت ومحبت کم ہوتی چلی جائے) پھر تم (ہر طرح) ناکام ہو جاؤ گے (خلاصہ یہ کہ اگر وہ دوستی کا اظہار کریں تو وہ تمہارے دوست ہرگز نہیں) بلکہ اللہ تعالیٰ ہی تمہارا دوست ہے، اور وہ سب سے بہتر مدد کرنے والا ہے (اس لئے مسلمانوں کو چاہئے کہ صرف اللہ تعالیٰ پر اعتماد کریں، اسی کی مدد پر بھروسہ کریں، مخالفین اگر تمہاری نصرت وامداد کی کچھ تدبیریں بھی بتلائیں تو اللہ ورسول کے احکام کے خلاف ان پر عمل نہ کرو)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی جنگ اُحد میں مسلمانوں کے دل ٹوٹے تو کافروں اور منافقوں نے موقع پایا، بعض الزام اور طعنے دینے لگے، بعض خیر خواہی کے پردہ میں سمجھانے لگے تاکہ آیندہ لڑائی پر دلیری نہ کریں، حق تعالیٰ خبردار کرتا ہے کہ دشمن کا فریب مت کھاؤ اگر خدانکردہ ان کے چکموں میں آ گئے تو جس ظلمت سے خدا نے نکالا ہے پھر الٹے پاؤں اسی میں جا گرو گے اور رفتہ رفتہ دین حق کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جائے گا، جس کا نتیجہ دنیا وآخرت کے خسارے کے سوا کچھ نہیں، پہلے اللہ والوں کی راہ پر چلنے کی ترغیب دی تھی، یہاں بدباطن شریروں کا کہا ماننے سے منع کیا تاکہ مسلمان ہوشیار رہیں، اور اپنا نفع نقصان سمجھ سکیں۔

فائدہ: ۲؎ لہٰذا اسی کا کہنا ماننا چاہیے اور اسی کی مدد پر بھروسہ رکھنا چاہیے، جس کی مدد پر خدا ہو اس کو کیا حاجت ہے کہ دشمنانِ خدا کی مدد کا منتظر رہے، یا ان کے سامنے گردنِ اطاعت خم کرے، حدیث میں ہے کہ اُحد سے واپسی کے وقت ابوسفیان نے "ہُبل" کی جے پکاری اور کہا: "لنا العزیٰ ولا عزیٰ لکم" آپ ﷺ نے فرمایا جواب دو: "اللہ مولانا ولا مولیٰ لکم"۔

سَنُلْقِیْ فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَاۤ اَشْرَكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ یُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا ۚ

اب ڈالیں گے ہم کافروں کے دل میں ہیبت اس واسطے کہ انہوں نے شریک ٹھہرایا اللہ کا جس کی اس نے کوئی سند نہیں اتاری

وَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ ؕ وَبِئْسَ مَثْوَى الظّٰلِمِیْنَ ﴿۱۵۱﴾

اور ان کا ٹھکانا دوزخ ہے، اور وہ برا ٹھکانا ہے ظالموں کا

خلاصہ تفسیر: گذشتہ آیت میں اللہ تعالیٰ کا ناصر ومددگار ہونا مذکور تھا، اب نصرت الٰہی کے کچھ واقعات کا ذکر ہے۔

ہم ابھی ڈالے دیتے ہیں رعب (ہیبت) کافروں کے دلوں میں بسبب اس کے کہ انہوں نے اللہ کا شریک ایک ایسی چیز کو ٹھہرایا جس (کے قابل شرکت ہونے) پر اللہ تعالیٰ نے کوئی دلیل نازل نہیں فرمائی (نہ لفظی دلیل ہے اور نہ معنوی، یعنی ایسی دلیل جس کا شریعت میں اعتبار ہو، اس میں تمام عقلی قطعی دلائل داخل ہو گئے، مطلب یہ ہے کہ یوں تو ہر جاہل اپنی کوئی دلیل پیش کیا ہی کرتا ہے، مگر کوئی قابل اعتبار دلیل ان کے پاس نہیں) اور ان کی جگہ جہنم ہے اور وہ بری جگہ ہے ظالموں کی۔

سَنُلْقِیْ فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ: اس آیت میں کافر پر رعب وہیبت طاری کرنے کا جو وعدہ ہے اس کا ظہور اس طرح ہوا کہ اول تو باوجود اس کے کہ شکست مسلمانوں کو ہو رہی تھی، مشرکین عرب بلا کسی ظاہری سبب کے مکہ کی طرف لوٹ گئے، پھر جب کچھ راستہ طے کر چکے تو اپنی

حماقت پر افسوس کرنے لگے کہ جب مسلمان دم توڑ چکے تھے تو اس وقت وہاں سے ان کی جڑ کاٹے بغیر واپس آنا کوئی دانشمندی نہیں تھی اور پھر مدینہ کی طرف واپسی کا کچھ ارادہ کیا تو اللہ نے ان کے دلوں پر ایسا رعب ڈالا کہ مدینہ کی طرف بڑھنے کی ہمت نہ ہوئی، کسی راہ چلتے گاؤں والے سے کہہ دیا کہ ہم تجھے اتنا مال دیں گے، تم مدینہ جا کر مسلمانوں کو ڈرا دو کہ وہ پھر لوٹ کر آرہے ہیں، یہاں پر سارا واقعہ آنحضرت ﷺ کو بذریعہ وحی معلوم ہو گیا تو رسول اللہ ﷺ ان کے تعاقب کے لئے مقام حمراء الاسد تک پہنچے، مگر وہ بھاگ چکے تھے، یہ آیت اسی واقعہ کے متعلق نازل ہوئی۔

مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا: یعنی نہ ان کے پاس کوئی لفظی دلیل ہے، چنانچہ اس کا نہ ہونا تو ظاہر ہے، کیونکہ کسی آسمانی کتاب میں شرک کی اجازت نہیں، نہ کوئی معنوی دلیل ہے جس کو عقلا یا شرعا صحیح مانا جائے، چنانچہ شرک پر کوئی قطعی دلیل بھی نہیں تھی، بلکہ عقلی دلیل سے تو شرک کا محال ہونا ثابت ہوتا ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی یہ تو تمہارا امتحان تھا، اب ہم کافروں کے دلوں میں ایسی ہیبت اور رعب ڈال دیں گے کہ وہ باوجود تمہارے زخمی اور کمزور ہونے اور نقصان اٹھانے کے تم پر پلٹ کر حملہ کرنے کی جرات نہ کرسکیں، چنانچہ یہ ہی ہوا، ابوسفیان اپنی فوج لے کر بے نیل و مرام میدان سے بھاگا، راستہ میں ایک مرتبہ خیال بھی آیا کہ ایک تھکی ماندہ زخم خوردہ فوج کو ہم یوں ہی آزاد چھوڑ کر چلے آئے، چلو پھر واپس ہو کر ان کا کام تمام کردیں، مگر ہیبت حق اور رعب اسلام کے اثر سے ہمت نہ ہوئی کہ اس خیال کو عمل میں لاسکے، برخلاف اس کے مسلمان مجاہدین نے "حمراء الاسد" تک ان کا تعاقب کیا اور اس کے بعد کبھی موقع نہ دیا کہ اُحد کے واقعات کا اعادہ ہوسکے۔

تنبیہ: مشرک خواہ کتنا ہی زور دکھلائے اس کا دل کمزور ہوتا ہے، کیونکہ وہ کمزور مخلوق کی عبادت کرتا ہے، بس جیسا معبود ویسے عابد **ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ** (الحج: ۷۳) اور ویسے بھی اصلی زور وقوت تو فی الحقیقت خدا کی تائید و امداد سے ہے جس سے کفار مشرکین یقینا محروم ہیں، اسی لئے جب تک مسلمان، مسلمان رہے، ہمیشہ کفار ان سے خائف و مرعوب رہے، بلکہ ہم آج تک مشاہدہ کرتے ہیں کہ باوجود مسلمانوں کے سخت انتشار و تشتت اور ضعف و تنزل کے، دنیا کی تمام کافر طاقتیں اس سوئے ہوئے زخمی شیر سے ڈرتی رہتی ہیں، اور ہمیشہ فکر رکھتی ہیں کہ یہ قوم بیدار ہونے نہ پائے، علمی اور مذہبی مناظروں میں بھی اسلام کا یہ ہی رعب مشاہدہ کیا جاتا ہے، حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ میرا رعب ایک مہینہ کی مسافت سے دشمنوں کے دل میں ڈال دیا جاتا ہے، بیشک اسی کا اثر ہے جو امت مسلمہ کو ملا، فللّٰہ الحمد علی ذلك و له المنة۔

وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰٓى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ

اور اللہ تو سچا کر چکا تم سے اپنا وعدہ جب تم قتل کرنے لگے ان کو اس کے حکم سے ۱؎ یہاں تک کہ جب تم نے نامردی کی اور کام میں جھگڑا ڈالا

وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ۭ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ

اور نافرمانی کی ۲؎ بعد اس کے کہ تم کو دکھا چکا تمہاری خوشی کی چیز، کوئی تم میں سے چاہتا تھا دنیا اور کوئی تم میں سے چاہتا تھا آخرت ۳؎

ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ ۚ وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ۭ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١٥٢﴾

پھر تم کو الٹ دیا ان پر سے تاکہ تم کو آزماوے ۴؎ اور وہ تو تم کو معاف کر چکا ۵؎ اور اللہ کا فضل ہے ایمان والوں پر ۶؎

خلاصہ تفسیر: اب غزوہ احد میں مسلمانوں کی عارضی شکست اور مغلوبیت کی وجہ بیان فرماتے ہیں:

اور یقینا اللہ تعالیٰ نے تو تم سے اپنا وعدہ (نصرت) کو سچا کر دکھایا، جس وقت کہ تم (جنگ کی ابتداء میں) ان کفار کو بحکم خداوندی قتل کر رہے تھے (اور یہ تمہارا غلبہ آہستہ آہستہ بڑھتا گیا) یہاں تک کہ تم خود ہی (رائے میں) کمزور ہو گئے (اس طرح کہ جو تجویز رسول اللہ ﷺ نے فرمائی تھی

کہ مورچہ پر پچاس آدمی اور ایک افسر مستقل بیٹھے رہیں اس میں بعض کو غلط فہمی ہوگئی کہ مسلمان فتح پا چکے ہیں، اب یہاں بیٹھے رہنے کی ضرورت ختم ہوگئی، اس لئے ہمیں بھی کفار کا تعاقب کرنا چاہئے) اور باہم (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے) حکم میں اختلاف کرنے لگے (کہ بعض تو اسی جگہ جمے رہنے کی ہدایت پر قائم رہے، مگر بعض دوسروں نے دوسری تجویز پیش کردی، انکار و ملامت اسی دوسری تجویز پر ہے کہ) اور تم (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے) کہنے پر نہ چلے بعد اس کے کہ تم کو تمہاری دل خواہ بات (آنکھوں سے) دکھادی تھی (یعنی مسلمانوں کا غلبہ دکھلایا تھا اور اس وقت تمہاری یہ حالت تھی کہ) تم میں سے بعض تو وہ تھے جو دنیا (کا لینا) چاہتے تھے (یعنی کفار کا تعاقب کر کے مال غنیمت جمع کرنا چاہتے تھے) اور بعض تم میں وہ تھے جو (صرف) آخرت کے طلبگار تھے (اب چونکہ بعض سے رائے کی کمزوری اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے خلاف دوسری تجویز پیش کرنا اور آپ کہ کہنے پر نہ چلنا اور طلب دنیا جیسے بعض امور سرزد ہوگئے تو اللہ تعالیٰ نے آئندہ کے لئے اپنی نصرت کو بند کرلیا اور) پھر تم کو ان کفار (پر غالب آنے) سے ہٹادیا (باوجودیکہ یہ عارضی شکست تمہارے فعل کا نتیجہ تھی، مگر پھر بھی یہ بطور سزا کے نہیں ہوئی، بلکہ اس مصلحت سے ہوا) تاکہ اللہ تعالیٰ تمہاری آزمائش (ایمان کی) فرمادے (چنانچہ اس وقت منافقین کا نفاق کھل گیا اور مخلصین کی قدر بڑھ گئی) اور یقین سمجھو کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو معاف کردیا (اب آخرت میں مواخذہ نہ ہوگا) اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل والے ہیں مسلمانوں (کے حال) پر۔

مِنۡكُمۡ مَّنۡ يُّرِيۡدُ الدُّنۡيَا: یعنی تم میں سے بعض تو وہ تھے جو دنیا چاہتے تھے، اس سے یہ مراد نہیں کہ غنیمت جمع کرنے میں ان کو دنیاوی عوض ہی مقصود تھا، کیونکہ صحابہ کرام کی ایسی حالت نہ تھی، چونکہ ظاہر ہے کہ جو حضرات ایسی عنایات کے مورد و مستحق ہوں وہ محض دنیا کے طالب نہیں ہوسکتے، بلکہ ان کی نیت یہ تھی کہ مورچہ کی حفاظت کا ثواب حاصل کر کے اب کفار کو ڈرانے اور ان کو تباہ کرنے کا ثواب بھی حاصل کرلیں، تو مقصود اس میں بھی آخرت ہی تھی، اور اس پر عقلی قرینہ بھی ہے، کیونکہ اگر وہ مال غنیمت کو جمع نہ بھی کرتے تب بھی شرعی قانون کے اعتبار سے وہ یقیناً مال غنیمت کے مستحق اور اس میں شریک تھے، مگر چونکہ اس میں ایک گونہ دنیا کی بھی شرکت تھی اور ثواب کے حصول کا یہ طریقہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے خلاف تھا اس لیے پسند نہیں کیا گیا، مگر ان کی یہ خطا اجتہادی تھی اس لیے مخالفت کے مجرم نہ کہے جائیں گے۔

ثُمَّ صَرَفَكُمۡ عَنۡهُمۡ لِيَبۡتَلِيَكُمۡ: اس میں صحابہ کرام کے حال پر عنایت و مہربانی ظاہر ہوتی ہے کہ اس آزمائش سے ان کے اخلاق کی تربیت کرنا مقصود تھی، تاکہ ایسے مصائب و آزمائش کے عادی ہو کر استقلال و ثابت قدمی پیدا ہو، اور اللہ کے خاص بندوں پر جو مصائب آتے ہیں ان میں یہی حکمتیں ہوتی ہیں۔

وَلَقَدۡ عَفَا عَنۡكُمۡ: اس سے حق تعالیٰ کی صحابہ کرام کے حال پر بڑی عنایت معلوم ہوئی کہ عتاب میں بھی پے در پے چند تسلیاں فرمائیں، ایک یہ کہ یہ شکست سزا کی وجہ سے نہ تھی، بلکہ اس میں بھی تمہاری مصلحت تھی، پھر آخرت کے مواخذہ سے بھی بے فکر کردیا اور فضل و انعام کا امیدوار کردیا۔

* * *

فائدہ: ١۔ اِذۡ تَحُسُّوۡنَهُمۡ بِاِذۡنِهٖ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے ہی فرمادیا تھا کہ اگر صبر و استقلال سے کام لوگے، حق تعالیٰ تم کو غالب کرے گا، چنانچہ خدا نے اپنا وعدہ ابتدائے جنگ میں سچا کر دکھایا، انہوں نے خدا کے حکم سے کفار کو مار مار کر ڈھیر کردیا، سات یا نو آدمی جن کے ہاتھ میں مشرکین کا جھنڈا یکے بعد دیگرے دیا گیا تھا، سب وہیں کھیت ہوئے، آخر بدحواس ہو کر بھاگے، مسلمان فتح و کامرانی کا چہرہ صاف دیکھ رہے تھے اور اموال غنیمت ان کے سامنے پڑے تھے کہ تیراندازوں کی غلطی سے خالد بن الولید نے فائدہ اٹھایا اور یک بیک لڑائی کا نقشہ بدل دیا جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں۔

فائدہ: ٢۔ تَنَازَعۡتُمۡ فِى الۡاَمۡرِ وَعَصَيۡتُمۡ: یعنی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے جو حکم تیراندازوں کو دیا تھا اس کا خلاف کیا اور آپس میں جھگڑنے لگے، کوئی کہتا تھا کہ ہم کو یہیں جمے رہنا چاہیے، اکثر نے کہا اب یہاں ٹھہرنے کی ضرورت نہیں چل کر غنیمت حاصل کرنی چاہیے، آخر اکثر تیرانداز اپنی جگہ چھوڑ کر چلے گئے، مشرکین نے اسی راستہ سے دفعۃً حملہ کردیا، دوسری طرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کی خبر مشہور ہوگئی، ان چیزوں نے قلوب میں کمزوری پیدا کردی جس کا نتیجہ فشل و جبن کی صورت میں ظاہر ہوا، گویا فشل کا سبب تنازع اور تنازع کا سبب عصیان تھا۔

فائدہ: ۳ مِنكُم مَّن يُرِيدُ الدُّنْيَا: یعنی بعضے لوگ دنیاوی متاع (مال غنیمت) کی خوشی میں پھسل پڑے، جس کا خمیازہ سب کو بھگتنا پڑا، ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ اس آیت کے نزول سے پہلے میں نے کبھی محسوس نہ کیا تھا کہ ہم میں کوئی آدمی دنیا کا طالب بھی ہے۔

فائدہ: ۴ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ: یعنی یا تو وہ تمہارے سامنے سے بھاگ رہے تھے، اب تم ان کے آگے سے بھاگنے لگے، تمہاری غلطی اور کوتاہی سے معاملہ الٹا اور اس میں بھی تمہاری آزمائش تھی، تا کہ پکے اور کچے صاف ظاہر ہو جائیں۔

فائدہ: ۵ وَلَقَدْ عَفَا عَنكُمْ: یعنی جو غلطی ہوئی، خدا تعالیٰ اسے بالکل معاف کر چکا، اب کسی کو جائز نہیں کہ ان پر اس حرکت کی وجہ سے طعن و تشنیع کرے۔

فائدہ: ۶ ذُو فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ: کہ ان کی کوتاہیوں کو معاف کر دیتا ہے اور عتاب میں بھی لطف و شفقت کا پہلو ملحوظ رکھتا ہے۔

إِذْ تُصْعِدُونَ وَلَا تَلْوُونَ عَلَىٰ أَحَدٍ وَالرَّسُولُ يَدْعُوكُمْ فِي أُخْرَاكُمْ فَأَثَابَكُمْ غَمًّا بِغَمٍّ

جب تم چڑھے چلے جاتے تھے اور پیچھے پھر کر نہ دیکھتے تھے کسی کو اور رسول ﷺ پکارتا تھا تم کو تمہارے پیچھے سے ۱ پھر پہنچا تم کو غم عوض میں غم کے

لِّكَيْلَا تَحْزَنُوا عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَا أَصَابَكُمْ ۗ وَاللَّهُ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ﴿١٥٣﴾

تا کہ تم غم نہ کیا کرو اس پر جو ہاتھ سے نکل جاوے اور نہ اس پر کہ جو کچھ پیش آ جاوے ۲ اور اللہ کو خبر ہے تمہارے کام کی ۳

خلاصہ تفسیر: (اس آیت میں غزوہ احد کے واقعہ میں صحابہ کرام کو پیش آنے والے حزن و غم کا ذکر ہے) وہ وقت یاد کرو جب تم (بھاگتے ہوئے جنگل کو) چڑھے چلے جارہے تھے اور کسی کو مڑ کر بھی نہ دیکھتے تھے، اور رسول (ﷺ) تمہارے پیچھے کی جانب سے تم کو پکار رہے تھے (کہ ادھر آؤ ادھر آؤ، مگر تم نے سنا نہیں) سو اللہ نے اس کے بدلے میں غم دیا بسبب (تمہارے) غم دینے کے (رسول اللہ ﷺ کو) تا کہ (اس بدلہ اور مصیبت سے تم میں پختگی پیدا ہو جائے جس سے پھر) تم مغموم نہ ہوا کرو نہ اس چیز پر جو تمہارے ہاتھ سے نکل جائے، اور نہ اس پر جو تم پر مصیبت پڑے، اور اللہ تعالیٰ سب خبر رکھتے ہیں تمہارے سب کاموں کی (اس لئے تم جیسا کام کرتے ہو اس کے مناسب بدلہ تجویز فرماتے ہیں)۔

وَالرَّسُولُ يَدْعُوكُمْ فِي أُخْرَاكُمْ: یعنی رسول تمہارے پیچھے کی جانب سے تم کو پکار رہے تھے، اسی قصہ کے ضمن میں پیچھے یہ بیان کیا گیا ہے کہ حضرت کعب بن مالک نے مسلمانوں کو پکارا اور سب جمع ہو گئے، یہاں آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے پکارا تو ان دونوں میں کوئی تعارض نہیں، پہلے حضور ﷺ نے پکارا جو صحابہ نے نہ سنا، پھر کعب بن مالک نے پکارا تو سب جمع ہو گئے۔

* * *

فائدہ: ۱ وَالرَّسُولُ يَدْعُوكُمْ فِي أُخْرَاكُمْ: یعنی تم بھاگ کر پہاڑوں اور جنگلوں کو چڑھے جارہے تھے اور گھبراہٹ میں پیچھے مڑ کر بھی کسی کو نہ دیکھتے تھے، اس وقت خدا کا پیغمبر بدستور اپنی جگہ کھڑا ہوا تم کو اس قبیح حرکت سے روکتا تھا اور اپنی طرف بلا رہا تھا، مگر تم تشویش و اضطراب میں آواز کہاں سننے والے تھے، آخر جب کعب بن مالکؓ چلائے تب لوگوں نے سنا اور واپس آ کر اپنے نبی کے گرد جمع ہو گئے۔

فائدہ: ۲ عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَا أَصَابَكُمْ: یعنی تم نے رسول کا دل تنگ کیا، اس کے بدلے تم پر تنگی آئی، غم کا بدلہ غم ملا، تا کہ آگے کو یاد رکھو کہ ہر حالت میں رسول کے حکم پر چلنا چاہیے، خواہ کوئی نفع کی چیز مثلاً غنیمت وغیرہ ہاتھ سے جائے، یا کچھ بلا سامنے آئے۔

تنبیہ: اکثر مفسرین نے فَأَثَابَكُمْ غَمًّا بِغَمٍّ کے معنی یوں کئے ہیں کہ "خدا نے تم کو غم پر غم دیا"، یعنی ایک غم تو ابتدائی فتح و کامیابی کے فوت ہونے کا تھا، دوسرا اپنے آدمیوں کے مارے جانے اور زخمی ہونے اور نبی کریم ﷺ کی خبر شہادت مشہور ہونے سے پہنچا۔

بعض نے یہ مطلب لیا ہے کہ فتح و کامرانی کے فوت ہونے، غنیمت کے ہاتھ سے نکل جانے اور نقصان جانی و بدنی اٹھانے کا جو غم تھا، اس کے عوض میں ایک ایسا بڑا غم دے دیا گیا، جس نے پہلے سب غموں کو بھلا دیا، یعنی نبی کریم ﷺ کے مقتول ہونے کی افواہ، اسی غم کی شدت میں آگے پیچھے کا

کچھ ہوش نہ رہا، حتیٰ کہ حضور ﷺ کی آواز بھی نہ سنی، جیسا کہ ایک طرف ہمہ تن ملتفت ہونے کے وقت دوسری طرف ذہول وغفلت پیش آجاتی ہے۔

فائدہ: ۳ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ: یعنی تمہارے احوال اور نیتوں کو جانتا ہے اور اسی کے موافق معاملہ کرتا ہے۔

ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَةً نُّعَاسًا يَّغْشٰى طَآىِٕفَةً مِّنْكُمْ ۙ وَطَآىِٕفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ

پھر تم پر اتارا تنگی کے بعد امن کو جو اونگھ تھی کہ ڈھانک لیا اس اونگھ نے بعض کو تم میں سے ۱ بعضوں کو فکر پڑ رہا تھا

اَنْفُسُهُمْ يَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ ۭ يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ ۭ

اپنی جان کا ۲ خیال کرتے تھے اللہ پر جھوٹے خیال جاہلوں جیسے ۳ کہتے تھے کچھ بھی کام ہے ہمارے ہاتھ میں ۴

قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ ۭ يُخْفُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ مَّا لَا يُبْدُوْنَ لَكَ ۭ يَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ

تو کہہ سب کام ہے اللہ کے ہاتھ ۵ وہ اپنے جی میں چھپاتے ہیں جو تجھ سے ظاہر نہیں کرتے، کہتے ہیں اگر کچھ کام ہوتا ہمارے

الْاَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا ۭ

ہاتھ تو ہم مارے نہ جاتے اس جگہ ۶

خلاصہ تفسیر: پیچھے غم بیان ہوا تھا، اب اس غم کے ازالہ کا بیان ہے، ظاہرا بھی کہ اونگھ سے بدنی راحت حاصل ہوئی، اور باطنا بھی کہ معافی کی بشارت سے روحانی راحت حاصل ہوئی، اور اس کے ضمن میں منافقین کی بدحالی اور اس کی وجہ سے ان کا راحتوں سے محروم ہونا بیان کیا گیا۔

پھر اللہ تعالیٰ نے اس غم کے بعد تم پر چین (اور راحت) بھیج دی، یعنی اونگھ (جب کہ کفار میدان سے واپس ہوگئے اس وقت غیب سے مسلمانوں پر اونگھ غالب ہوئی، جس سے سب غم غلط ہوگیا) کہ تم میں سے ایک جماعت (یعنی مسلمانوں) پر تو نیند کا غلبہ ہو رہا تھا، اور ایک جماعت وہ تھی (یعنی منافقین کی) کہ ان کو اپنی جان ہی کی فکر پڑ رہی تھی (کہ دیکھئے یہاں سے بچ کر بھی جاتے ہیں) وہ لوگ اللہ تعالیٰ کے ساتھ خلاف واقع گمان کر رہے تھے جو محض حماقت کا خیال تھا (وہ خیال آگے ان کے قول سے اور اس کا حماقت وجہالت ہونا اس کے جواب سے معلوم ہوتا ہے)۔

(ان کا قول یہ تھا کہ:) وہ یوں کہہ رہے تھے کیا ہمارا اختیار کچھ چلتا ہے (مطلب یہ تھا کہ ہماری رائے کسی نے نہ سنی جو جنگ سے پہلے ہم نے دی تھی، خواہ مخواہ سب کو مصیبت میں پھنسا دیا) آپ فرما دیجئے کہ اختیار تو سب اللہ ہی کا (چلتا) ہے (مطلب یہ ہے کہ اگر تمہاری رائے پر عمل بھی ہوتا جب بھی قضاء الٰہی غالب رہتی اور جو افتاد آنے والی تھی وہ آکر رہتی، چنانچہ ان کے قول اور اس کے جواب کا مطلب آگے مفصل آتا ہے)۔

وہ لوگ اپنے دلوں میں ایسی بات پوشیدہ رکھتے ہیں جس کو آپ کے سامنے (صراحۃً) ظاہر نہیں کرتے (کیونکہ ظاہر میں ان کا یہ قول کہ ہمارا کیا اختیار ہے؟ اس کا یہ مطلب سمجھا جاسکتا ہے کہ تقدیر الٰہی کے سامنے بندہ کی کوئی تدبیر نہیں چلتی جو کہ عین ایمان کی بات ہے، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا جو لطیف جواب دیا گیا اس میں اس معنی کی تصدیق بھی ہے کہ واقعی اختیار اللہ ہی کا غالب ہے، مگر درحقیقت تمہاری یہ مراد نہیں، بلکہ وہ یہ بات اس معنی سے) کہتے ہیں کہ اگر ہمارا کچھ اختیار چلتا (یعنی ہمارے رائے پر عمل ہوتا) تو ہم (میں جو لوگ یہاں قتل ہوئے وہ) یہاں مقتول نہ ہوتے

فائدہ: ۱ نُّعَاسًا يَّغْشٰى طَآىِٕفَةً مِّنْكُمْ: یعنی اس جنگ میں جن کو شہید ہونا تھا ہو چکے اور جن کو ہٹنا تھا، ہٹ گئے اور جو میدان میں باقی رہے ان میں سے مخلص مسلمانوں پر حق تعالیٰ نے ایک دم غنودگی طاری کردی، لوگ کھڑے کھڑے اونگھنے لگے، حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ سے کئی مرتبہ تلوار چھوٹ کر زمین پر گری، یہ ایک حسی اثر اس باطنی سکون واطمینان کا تھا جو ایسے ہنگامہ رست خیز میں مومنین کے قلوب پر محض خدا کے فضل و

رحمت سے وارد ہوا، اس کے بعد دشمن کا خوف و ہراس سب کافور ہو گیا، یہ کیفیت عین اس وقت پیش آئی جب لشکرِ مجاہدین میں نظم وضبط قائم نہ رہا تھا، بیسیوں لاشیں خاک وخون میں تڑپ رہی تھیں، سپاہی زخموں سے چور ہو رہے تھے، حضور ﷺ کے قتل کی افواہ نے رہے سہے ہوش وحواس کھو دیے تھے، گویا یہ سونا بیدار ہونے کا پیام تھا، غنودگی طاری کر کے ان کی ساری تھکن دور کر دی گئی اور متنبہ فرما دیا کہ خوف و ہراس اور تشویش واضطراب کا وقت جا چکا، اب مامون ومطمئن ہو کر اپنا فرض انجام دو، فوراً صحابہ نے حضور ﷺ کے گرد جمع ہو کر لڑائی کا محاذ قائم کر دیا، تھوڑی دیر بعد مطلع صاف تھا، دشمن سامنے سے بھاگتا نظر آیا۔

تنبیہ: ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ عین لڑائی کے موقع پر نُعاس (اونگھ) کا طاری ہونا اللہ کی طرف سے (فتح وظفر کی علامت ہے) حضرت علی کی فوج کو "صفین" میں ایسا ہی واقعہ پیش آیا۔

فائدہ:۲ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ: یہ بزدل اور ڈرپوک منافقین ہیں جن کو نہ اسلام کی فکر تھی نہ نبی کریم ﷺ کی، محض اپنی جان بچانے کی فکر میں ڈوبے ہوئے تھے کہ کہیں ابوسفیان کی فوج نے دوبارہ حملہ کر دیا تو ہمارا کیا حشر ہوگا، اس خوف وفکر میں اُونگھ یا نیند کہاں۔

فائدہ:۳ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ: یعنی وہ اللہ کے وعدے کہاں گئے، معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کا قصہ تمام ہوا، اب پیغمبر اور مسلمان اپنے گھر واپس جانے والے نہیں سب یہیں کام آئیں گے، جیسے دوسری جگہ فرمایا: بَلْ ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ يَّنْقَلِبَ الرَّسُوْلُ وَالْمُؤْمِنُوْنَ اِلٰٓى اَهْلِيْهِمْ اَبَدًا (الفتح:۱۲)

فائدہ:۴ يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ: یعنی کچھ بھی ہمارا کام بنا رہے گا یا بالکل بگڑ چکا، یا یہ کہ ہم محمد ﷺ کا ساتھ دینے والوں کے ہاتھ میں کچھ بھی فتح وظفر آئی، یا یہ معنی کہ اللہ نے جو چاہا سو کیا، ہمارا یا کسی کا کیا اختیار؟ یہ تو الفاظ کے ظاہری معنی تھے لیکن جو دل میں نیت تھی وہ آگے آتی ہے۔

فائدہ:۵ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ: یعنی منافقین کا یہ قول: هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ "كلمة حق ار يدبها الباطل" ہے، بیشک یہ صحیح ہے کہ تمہارے ہاتھ میں کچھ نہیں، سب کام اللہ کے ہاتھ میں ہے جس کو چاہے بنائے یا بگاڑے، غالب کرے یا مغلوب، آفت بھیجے یا راحت، کامیاب کرے یا ناکام، ایک ہی واقعہ کو ایک قوم کے حق میں رحمت اور دوسری کے لئے نقمت [عذاب] بنا دے، سب اس کے قبضہ میں ہے، مگر تم اس قول سے اپنے دل میں جو معنی لے رہے ہو خدا تمہارے دل کے چور سے واقف ہے، جسے آگے بیان کیا جائے گا۔

فائدہ:۶ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا: اصل چور دل کا یہ تھا: هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ بول کر دل میں یہ مطلب لیتے تھے اور پکے مسلمانوں سے علیحدہ ہو کر آپس میں بھی کہتے ہوں گے کہ میاں شروع میں ہماری رائے نہ مانی، چند جوشیلے ناتجربہ کاروں کے کہنے پر مدینہ سے باہر لڑنے چلے گئے، آخر منہ کی کھائی، اگر کچھ کام ہمارے اختیار میں ہوتا اور ہمارے مشورہ پر عمل کیا جاتا تو اس قدر نقصان کیوں اٹھانا پڑتا، ہماری برادری کے اتنے آدمی مارے گئے، کیوں مارے جاتے، اکثر منافقین نسباً انصار مدینہ کی برادری میں شامل تھے، اس لئے ما قتلنا ھھُنا میں ان کے مارے جانے کو اپنا مارا جانا کہا، یا یہ مطلب ہے کہ اگر محمد ﷺ کے کہنے کے موافق فتح وظفر اور غلبہ مسلمانوں کے لئے ہوتا تو یہ قتل وجرح کی مصیبت ہم پر کیوں ٹوٹتی۔

تنبیہ: بظاہر یہ باتیں منافقین نے مدینہ میں کہیں، کیونکہ عبداللہ بن ابی جنگ شروع ہونے سے پیشتر اپنی جمعیت کو ساتھ لیکر واپس ہو گیا تھا، اس صورت میں ھٰھنا کا اشارہ قرب کی وجہ سے احد کی طرف ہوگا، لیکن بعض روایات سے ایک منافق معتب بن قشیر کا میدان جنگ میں یہ کلمات کہنا ثابت ہوتا ہے، تو شاید بعض منافقین عبداللہ بن ابی کے ہمراہ کسی مصلحت سے واپس نہ ہوئے ہوں گے، واللہ اعلم۔

قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ ۚ وَلِيَبْتَلِيَ

تو کہہ اگر تم ہوتے اپنے گھروں میں البتہ باہر نکلتے جن پر لکھ دیا تھا مارا جانا اپنے پڑاؤ پر ؎ اور اللہ کو

اللّٰهُ مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۱۵۴﴾

آزمانا تھا جو کچھ تمہارے جی میں ہے اور صاف کرنا تھا اس کا جو تمہارے دل میں ہے اور اللہ جانتا ہے دلوں کے بھید ؎

خلاصہ تفسیر: (ان کی بات کا حاصل یہ تھا کہ تقدیر کوئی چیز نہیں، اسی لئے اب ان کے اس قول کی تکذیب اس طرح کی گئی کہ:) آپ فرما دیجئے کہ اگر تم لوگ اپنے گھروں میں بھی رہتے تب بھی جن لوگوں کے لئے قتل مقدر ہو چکا تھا وہ لوگ ان مقامات کی طرف (آنے کے لئے) نکل پڑتے جہاں وہ (قتل ہو ہو کر) گرے ہیں (غرض یہ ہے کہ یہ ظاہری نقصان جس قدر ہوا وہ تو ٹلنے والا نہ تھا)۔

اور (اس کے فوائد و منافع بہت عظیم تھے، کیونکہ) جو کچھ ہوا اس لیے ہوا تاکہ اللہ تعالیٰ تمہارے باطن کی بات (یعنی ایمان) کی آزمائش کرے (کیونکہ اس مصیبت کے وقت منافقین کا نفاق کھل گیا اور مؤمنین کا ایمان اور زیادہ مؤکد اور ثابت ہو گیا) اور تاکہ تمہارے دلوں کی بات (یعنی اسی ایمان) کو (وساوس اور خطرات سے) صاف کر دے (کیونکہ مصیبت کے وقت مومن کی توجہ غیر اللہ سے ہٹ کر صرف اللہ کی طرف لگ جاتی ہے جس سے ایمان کو جلا اور قوت پہنچتی ہے) اور اللہ تعالیٰ سب باطن کی باتوں کو خوب جانتے ہیں (ان کو آزمائش کی حاجت نہیں، مگر اس لیے کہ عدالتی طریقہ سے مجرم کا جرم کھل کر سامنے آجائے یعنی سب کو عام طور پر اس کا انکشاف ہو جائے اس لیے ایسے امور واقع کئے جاتے ہیں)۔

وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ: اس سے معلوم ہوا کہ غزوہ احد میں جو مصائب اور تکالیف صحابہ کرام کو پیش آئیں وہ بطور سزا نہیں، بلکہ بطور آزمائش تھیں، اور جو لغزش بعض صحابہ کرام سے ہوئی وہ معاف کر دی گئی، اس امتحان کے ذریعہ مؤمنین، مخلصین اور منافقین میں فرق کا اظہار کرنا تھا، اور اثابکم غماً بغم کے الفاظ سے جو اس کا سزا ہونا معلوم ہوتا ہے اس کی تطبیق یہ ہے کہ صورت تو سزا ہی کی تھی، مگر یہ سزا مربیانہ اصلاح کے لئے تھی، جیسے کوئی باپ اپنے بیٹے کو، استاذ اپنے شاگرد کو کچھ سزا دیتا ہے تو عرف میں اس کو سزا بھی کہہ سکتے ہیں، مگر در حقیقت یہ تربیت اور اصلاح کی ایک صورت ہوتی ہے، جبکہ حاکمانہ سزا اس سے مختلف ہے۔

واقعہ احد میں مسلمانوں پر مصائب کے اسباب کیا تھے؟ آیت میں مذکور جملہ ولیبتلی سے آخر آیت تک جو ارشاد ہے اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ مصائب واقع ہونے کا سبب یہ ربانی حکمتیں تھیں، لیکن اگلی آیت میں: انما استزلهم الشيطان ببعض ما كسبوا سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات کی کوئی سابقہ لغزش اس شیطانی اثر کا سبب ہے؟ جواب یہ ہے کہ ظاہری سبب تو وہ لغزش ہی ہوئی کہ اس کی وجہ سے شیطان کو ان سے اور معصیت کرا دینے کی بھی طمع ہو گئی اور اتفاق سے اس کی وہ طمع پوری بھی ہو گئی، مگر اس لغزش اور اس کے پیچھے آنے والے نتائج میں وہ تکوینی حکمتیں پوشیدہ تھیں جن کو ولیبتلی اللہ میں بیان فرمایا ہے، روح المعانی میں زجاج سے نقل کیا ہے کہ شیطان نے ان کو بعض وہ گناہ یاد دلائے جن کو لے کر حق تعالیٰ سے ملنا ان کو اچھا معلوم نہ ہوا، اس لئے جہاد سے ہٹ گئے، تاکہ وہ اپنی حالت کو درست کر کے پھر پسندیدہ حالت پر جہاد کریں اور شہید ہو کر اللہ سے ملیں۔

وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ: یعنی تمہاری استعداد میں جو صدق، اخلاص اور توکل وغیرہ ہے اس کا اس طرح امتحان لے کہ اسے قوت سے فعل کی طرف لائے، اور دل میں جو کچھ نفسانی وساوس و خطرات کا میل کچیل ہے اسے دور کر دے، کیونکہ امتحان میں یہی خاصیت ہوتی ہے۔

* * *

فائدہ: ؎ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ: یعنی اس طعن و تشنیع یا حسرت و افسوس سے کچھ حاصل نہیں، اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کی جو اجل، موت کی جگہ سبب اور وقت لکھ دیا ہے کبھی ٹل نہیں سکتا، اگر تم گھروں میں گھسے بیٹھے رہتے اور فرض کرو تمہاری ہی رائے سنی جاتی تب بھی جن کی

قسمت میں احد کے قریب جس جس پڑاؤ پر مارا جانا لکھا جاچکا تھا وہ کسی نہ کسی سبب سے ضرور ادھر نکلتے اور وہیں مارے جاتے، یہ خدا کا انعام ہے کہ جہاں مارا جانا مقدر تھا مارے گئے، مگر اللہ کے راستہ میں خوشی کے ساتھ بہادروں کی موت شہید ہوئے، پھر اس پر پچھتانے اور افسوس کرنے کا کیا موقع ہے؟ مردان خدا کو اپنے پر قیاس مت کرو۔

فائدہ: ےوَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ: یعنی اللہ تعالیٰ تو دلوں کے پوشیدہ بھید جانتا ہے، اس سے کسی کی کوئی حالت پوشیدہ نہیں، مقصود یہ تھا کہ تم سب کو ایک آزمائش میں ڈالا جائے، تاکہ جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے وہ باہر نکل پڑے، امتحان کی بھٹی میں کھرا کھوٹا الگ ہو جائے، مخلصین کامیابی کا صلہ پائیں اور ان کے قلوب آئندہ کے لئے وساوس اور کمزوریوں سے پاک وصاف ہوں، منافقین کا اندرونی نفاق کھل جائے اور لوگ صاف طور پر ان کے خبث باطن کو سمجھنے لگیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ۙ اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا ۚ

جو لوگ تم میں سے ہٹ گئے جس دن لڑیں دو فوجیں، سو ان کو بہکا دیا شیطان نے ان کے گناہ کی شامت سے

وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ۝ ع

اور ان کو بخش چکا اللہ، اللہ بخشنے والا ہے تحمل کرنے والا

خلاصہ تفسیر: یقیناً تم میں جن لوگوں نے (میدان جنگ سے) پشت پھیر دی تھی جس روز کہ وہ دونوں جماعتیں (مسلمانوں اور کفار کی) باہم مقابل ہوئیں (یعنی احد کے روز اس کی وجہ) اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوئی کہ ان کو شیطان نے لغزش دے دی ان کے بعض اعمال (گزشتہ) کے سبب سے (یعنی ان سے کچھ خطا و قصور ایسے ہو گئے تھے جس سے شیطان کو ان سے اور بھی معصیت کرا دینے کی طمع ہو گئی اور اتفاق سے وہ طمع پوری بھی ہو گئی) اور یقین سمجھو کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو معاف فرما دیا، واقعی اللہ تعالیٰ بڑے مغفرت کرنے والے بڑے علم والے ہیں (کہ آخر میں بخش دیا اور خطا کرتے وقت بھی کوئی سزا نہیں دی)۔

اس آزمائش و معافی وغیرہ کا ذکر پیچھے مسلمانوں کی تسلی کے لیے ہوا تھا اور یہاں منافقین کے اس خیال کی تغلیط کے لیے ہوا کہ وہ کہتے تھے کہ ہماری رائے پر عمل نہ کرنے سے یہ نقصان ہوا تو بتلا دیا کہ نقصان میں اس قدر منافع تھے، رہا حقیقی نقصان جو گناہ کے سبب ہوا وہ معاف ہو گیا، پس غرض مختلف ہونے سے تکرار نہ رہا، شبہ ہوتا ہے کہ اس مصیبت کا سبب یہاں شیطانی لغزش کو بھی بتایا اور آزمائش وغیرہ کو بھی؟ جواب یہ ہے کہ آزمائش وغیرہ سبب نہیں ہیں، بلکہ حکمتیں ہیں، اور حکمت پیچھے ظاہر ہوا کرتی ہے اور سبب پہلے ظاہر ہوا کرتا ہے۔

اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ: یعنی ان کو شیطان نے لغزش دے دی ان کے بعض گزشتہ اعمال کے سبب، وجہ یہ ہے کہ گناہ (اللہ اور رسول کی مخالفت) کی وجہ سے دل میں ظلمت پیدا ہوتی ہے، اور شیطان کا قابو صرف انہی دلوں پر چلتا ہے جن میں ظلمت ہو، اور روح المعانی میں زجاج سے منقول ہے کہ شیطان نے انہیں بعض وہ گناہ یاد دلائے جنہیں لے کر حق تعالیٰ سے ملنا انہیں اچھا معلوم نہ ہوا، اس لیے وہ جہاد سے ہٹ گئے تاکہ وہ اپنی حالت درست کر کے پسندیدہ حالت میں جہاد کریں اور خدا تعالیٰ سے جا ملیں، احقر کہتا ہے کہ زجاج کی اس تفسیر پر یہ آیت اصل ہو گی شیخ اکبرؒ کے اس مقولہ کی کہ توبہ کی تکمیل کے بعد پھر گناہوں کو یاد کرنا مناسب نہیں، کیونکہ وہ بندہ کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان حجاب ہو جاتے ہیں۔

بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا: یعنی بعض گزشتہ اعمال کے سبب شیطان نے انہیں لغزش دے دی، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک گناہ سے دوسرا گناہ بھی پیدا ہو جاتا ہے جیسا کہ ایک طاعت سے دوسری طاعت کی توفیق بڑھتی جاتی ہے۔

وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ: بعض معاندین صحابہ نے اس واقعہ سے صحابہؓ پر طعن کیا ہے اور اس سے ان میں خلافت کی عدم صلاحیت مستنبط کی

ہے کہ وہ خلافت کے قابل نہ تھے، لیکن یہ محض مہمل بات ہے، جب اللہ تعالیٰ نے انہیں معاف کردیا اوران کی اس خطا میں بہت سی حکمتیں بھی بتلادیں تو اب دوسروں کو مواخذہ کرنے کا کوئی حق نہیں ہے، چنانچہ حضرت ابن عمرؓ نے ایک شخص کو یہی جواب دیا تھا، رہی خلافت کی بات سو اہل حق کے نزدیک خلافت کے لیے معصوم ہونا شرط نہیں ہے۔

* * *

فائدہ: مخلصین سے بھی بعض اوقات کوئی چھوٹا بڑا گناہ سرزد ہوجاتا ہے اور جس طرح ایک طاعت سے دوسری طاعت کی توفیق بڑھتی ہے ایک گناہ کی نحوست سے شیطان کو موقع ملتا ہے کہ دوسری غلطیوں اور لغزشوں کی طرف آمادہ کرے، جنگ احد میں بھی جو مخلص مسلمان ہٹ گئے تھے، کسی پچھلے گناہ کی شامت سے شیطان نے بہکا کر ان کا قدم ڈگمگادیا، چنانچہ ایک گناہ تو یہی تھا کہ تیر اندازوں کی بڑی تعداد نے نبی کریم ﷺ کے حکم کی پابندی نہ کی، مگر خدا کا فضل دیکھو کہ اس کی سزا میں کوئی تباہ کن شکست نہیں دی، بلکہ ان حضرات پر اب کوئی گناہ بھی نہیں رہا، حق تعالیٰ کلیۃ ان کی تقصیر معاف کرچکا ہے، کسی کو طعن وملامت کا حق نہیں۔

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَقَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ اِذَا ضَرَبُوْا فِي الْاَرْضِ

اے ایمان والو تم نہ ہو ان کی طرح جو کافر ہوئے[1] اور کہتے ہیں اپنے بھائیوں کو[2] جب وہ سفر کو نکلیں ملک میں

اَوْ كَانُوْا غُزًّى لَّوْ كَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا وَمَا قُتِلُوْا ۚ لِيَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسْرَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۭ

یا ہوں جہاد میں اگر رہتے ہمارے پاس تو نہ مرتے اور نہ مارے جاتے، تاکہ اللہ ڈالے اس گمان سے افسوس ان کے دلوں میں[3]

وَاللّٰهُ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿١٥٦﴾

اور اللہ ہی جلاتا ہے اور مارتا ہے[4] اور اللہ تمہارے سب کام دیکھتا ہے[5]

خلاصہ تفسیر: پچھلی آیتوں میں منافقین کا یہ قول بیان کیا گیا تھا کہ اگر ہمارا کچھ اختیار ہوتا اور ہماری رائے مانی جاتی تو ہم یہاں قتل نہ ہوتے اور یہ مصیبت نہ آتی، ایسے اقوال کے سننے سے یہ احتمال تھا کہ مخلص مسلمانوں کے دلوں میں کچھ شک وشبہات نہ پیدا ہوجائیں، اس لئے اب مسلمانوں کو ایسے اقوال واحوال سے پرہیز کرنے کی اور زندگی وموت کو صرف تقدیر کے تابع ہونے کی ہدایت دی گئی ہے۔

اے ایمان والو! تم ان لوگوں کی طرح مت ہوجانا جو (حقیقت میں) کافر ہیں (اگرچہ وہ ظاہر میں اسلام کا دعویٰ کرتے ہیں) اور کہتے ہیں اپنے (ہم نسب یا ہم مشرب) بھائیوں کی نسبت جبکہ وہ لوگ کسی سرزمین میں سفر کرتے ہیں (اور وہاں اتفاقاً مرجاتے ہیں) یا وہ لوگ کہیں غازی بنتے ہیں (اور اس میں تقدیر سے قتل ہوجاتے ہیں تو وہ منافق کہتے ہیں) کہ اگر یہ لوگ ہمارے پاس رہتے (سفر اور غزوہ میں نہ جاتے) تو نہ مرتے اور نہ مارے جاتے (یہ بات ان کے دل اور زبان پر اس لئے آتی ہے) تاکہ اللہ تعالیٰ اس بات کو ان کے قلوب کے لئے موجب حسرت کردیں (یعنی نتیجہ اس طرح کی باتوں میں حسرت کے سوا کچھ نہیں) اور مارتا جلاتا تو اللہ ہی ہے (خواہ سفر ہو یا حضر، خواہ جنگ ہو یا امن) اور اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کرتے ہو سب کچھ دیکھ رہے ہیں (تو اگر تم بھی ایسی باتیں کروگے یا ایسے خیالات میں مبتلا ہوگے تو وہ اللہ تعالیٰ سے پوشیدہ نہیں رہے گا)۔

وَقَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ: اس کے ترجمہ میں جو کہا گیا کہ ہم مشرب وہم نسب بھائی تو ان کے ہم مشرب تو منافقین ہیں، اور ہم نسب مسلمان بھی تھے، پس اگر بھائیوں سے مراد دوسری صورت ہے یعنی ہم نسب مسلمان تب تو ان کا سفر وجہاد دین کے لیے ہوتا اور اس پر وعدہ مغفرت ورحمت ظاہر ہے، البتہ یہ اشکال ہوگا کہ مسلمانوں کے مرنے یا مارے جانے سے منافقوں کو حسرت کیا ہوتی؟ تو جواب یہ ہے کہ آخر قرابت سے کچھ اضطراری تعلق تو ہوتا ہی ہے، یا یہ کہ اگرچہ اس خاص صورت میں دل سے حسرت نہ ہو، مگر چونکہ ان کے یہ خیالات ہمیشہ ان کے لیے باعث حسرت ہوتے ہیں تو مسلمانوں پر بھی

منافقانہ طور پر حسرت ظاہر کیا کرتے تھے، اور اگر ہم مشرب بھائی مراد ہیں تو حسرت ہونے میں تو شبہ نہیں، مگر پھر یہ شبہ ہوگا کہ ان کا سفر وجہاد اللہ کے واسطے کہاں ہوتا تھا، اور اس پر وعدہ مغفرت ورحمت کیسا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ کبھی وہ دبے دبائے دینی کاموں میں شریک ہوتے تھے اور اگر وہ نفاق چھوڑ دیتے تو ضرور ثواب کے بھی مستحق ہوتے، اور ظاہر میں چونکہ وہ بھی ایمان کے مدعی تھے اس بنا پر جواب دیا گیا کہ اگر وہ اللہ کے راستے میں ایسے کام کرتے ہیں جیسا کہ ان کا دعوی ہے تو پھر یہ حسرت کیسی، ان کو مغفرت ورحمت کے مقابلہ میں ان مصائب کی پرواہ نہیں کرنی چاہیے۔

* * *

فائدہ: ۱ لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا: یعنی تم ان کافر منافقوں کی طرح ایسے لغو خیالات کو زنہار دل میں جگہ نہ دینا کہ گھر میں بیٹھے رہتے تو نہ موت آتی، نہ مارے جاتے۔

فائدہ: ۲ وَقَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ: چونکہ منافقین ظاہر میں مسلمان بنے ہوئے تھے، اس لئے مسلمانوں کو اپنا بھائی کہا، یا اس لئے کہ نسبی طور پر وہ اور انصار مدینہ برادری کے بھائی بند تھے، اور چونکہ یہ بات خیر خواہی وہمدردی کے پیرایہ میں کہتے تھے اس لئے لفظ ''اخوان'' سے تعبیر کیا گیا۔

فائدہ: ۳ لِيَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسْرَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ: یعنی خواہ مخواہ باہر نکل کر مرے، ہمارے پاس اپنے گھر پڑے رہتے تو کیوں مرتے یا کیوں مارے جاتے، یہ کہنا اس غرض سے تھا کہ سننے والے مسلمانوں کے دل میں حسرت وافسوس پیدا ہو کہ واقعی بے سوچے سمجھے نکل کھڑے ہونے اور لڑائی کی آگ میں کود پڑنے کا یہ نتیجہ ہوا، گھر رہتے تو یہ مصیبت کیوں دیکھنی پڑتی، مگر مسلمان ایسے کچے نہ تھے جو ان چکموں میں آجاتے، ان باتوں سے الٹا منافقین کا بھرم کھل گیا۔

بعض مفسرین نے: لِيَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسْرَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ میں ''لام عاقبت'' لے کر یوں معنی کئے ہیں کہ منافقین کے زبان ودل پر یہ باتیں اس لئے جاری کی گئیں کہ خدا ان کو ہمیشہ اسی حسرت وافسوس کی آگ میں جلتا چھوڑ دے اور دوسری حسرت ان کو یہ رہے کہ مسلمان ہماری طرح نہ ہوئے اور ہماری باتوں پر کسی نے کان نہ دھرا، اس طرح لیجعل کا تعلق لا تکونوا الخ سے بھی ہوسکتا ہے۔

فائدہ: ۴ وَاللّٰهُ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ: یعنی مارنا جلانا اللہ کا کام ہے، بہتیرے آدمی عمر بھر سفر کرتے اور لڑائیوں میں جاتے ہیں، مگر موت گھر میں بستر پر آتی ہے اور کتنے ہی آدمی گھر کے کونے میں پڑے رہنے کے خوگر ہیں، لیکن اخیر میں خدا کوئی سبب کھڑا کر دیتا ہے کہ وہ باہر نکلیں اور وہیں مریں یا مارے جائیں، بندہ کی روک تھام سے یہ چیز ٹلنے اور بدلنے والی نہیں، حضرت خالد بن الولید رضی اللہ عنہ نے وفات کے وقت فرمایا کہ میرے بدن پر ایک بالشت جگہ تلوار یا نیزہ کے زخم سے خالی نہیں، مگر آج میں ایک اونٹ کی طرح (گھر میں) مر رہا ہوں فَلَا نَامَتْ اَعْيُنُ الْجُبَنَاءِ (خدا کرے یہ دیکھ کر نامردوں کی آنکھیں کھلیں)۔

فائدہ: ۵ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ: کہ منافقین وکفار کس راستہ پر جارہے ہیں اور مسلمان کہاں تک ان کے تشبہ اور پیروی سے علیحدہ رہتے ہیں، ہر ایک کو اس کی حالت کے مناسب بدلہ دیگا۔

وَلَئِنْ قُتِلْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَحْمَةٌ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ﴿۱۵۷﴾

اور اگر تم مارے گئے اللہ کی راہ میں یا مر گئے ۱ تو بخشش اللہ کی اور مہربانی اس کی بہتر ہے اس چیز سے جو وہ جمع کرتے ہیں

وَلَئِنْ مُّتُّمْ اَوْ قُتِلْتُمْ لَاِلَى اللّٰهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۱۵۸﴾

اور اگر تم مر گئے یا مارے گئے تو البتہ اللہ ہی کے آگے اکٹھے ہوگے تم سب ۲

خلاصہ تفسیر: اور اگر تم لوگ اللہ کی راہ میں مارے جاؤ یا کہ (اللہ کی راہ میں) مر جاؤ (تو یہ کوئی) خسارہ نہیں نفع ہی نفع ہے، کیونکہ بالضرور اللہ تعالیٰ کے پاس کی مغفرت اور رحمت (دنیا کی) ان چیزوں سے (بدر جہا) بہتر ہے جن کو یہ لوگ جمع کر رہے ہیں (اور اسی کی لالچ میں

زندگی کو محبوب رکھتے ہیں) اور اگر تم (ویسے بھی) مر گئے یا مارے گئے (تب بھی) بالضرور اللہ ہی کے پاس جمع کئے جاؤ گے (پس اول تو قضا ٹلتی نہیں اور دوسرے اللہ کے پاس جانے سے کسی حال بچ نہیں سکتے اور دین کی راہ میں مرنا یا مارا جانا تو مغفرت ورحمت کا سبب ہے تو پھر ویسے مرنے سے دین ہی کی راہ میں جان دینا بہتر ہے، اس لیے ایسی باتیں اور خیالات محض بیکار اور دنیا میں حسرت کا اور آخرت میں جہنم کا سبب ہیں، ان سے پرہیز لازم ہے)۔

وَلَئِنۡ قُتِلۡتُمۡ فِيۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ: میرے نزدیک اس آیت میں سفر سے مراد دینی کام میں سفر کرنا ہے، چنانچہ اس پر مغفرت ورحمت کا وعدہ فرمانا اس کا قرینہ ہے تو منافقین کے قول کے اس جگہ دو جواب مذکور ہوئے: ① ایک یہ کہ مارنا جلانا خدا کے قبضہ میں ہے، کوئی حالت اس کو روک نہیں سکتی ② دوسرے خدا کی راہ میں سفر کرنے یا جہاد کرنے کے مرنا یا مارا جانا بڑے ثواب کا سبب ہے۔

وَلَئِنۡ قُتِلۡتُمۡ فِيۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ اَوۡ مُتُّمۡ: اس پہلی آیت میں قتل وموت فی سبیل اللہ کی جزا میں مغفرت ورحمت کو بیان کیا گیا ہے اور دوسری آیت: وَلَئِنۡ مُّتُّمۡ اَوۡ قُتِلۡتُمۡ میں قتل وموت کی جزا میں حشر الی اللہ کو بیان کیا ہے، اس فرق کی وجہ بعض مفسرین نے بطریق تاویل یہ بیان کی ہے کہ پہلی آیت میں ان کا ذکر ہے جو جنت وجہنم کے سبب عبادت کرتے ہیں، اور دوسری آیت میں ان کا ذکر ہے جو خاص اس کی ذات ہی کو مقصود سمجھتے ہیں تو ان پر خاص تجلی ہوگی۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی اسی کی راہ میں۔

فائدہ: ۲ یعنی فرض کرو تم سفر یا جہاد میں نہ نکلے اور فی الحال موت سے بچ گئے، مگر ضروری ہے کہ کبھی نہ کبھی مرو گے یا مارے جاؤ گے، پھر بہرحال خدا کے سامنے سب کو جمع ہونا ہے، اس وقت پتہ چل جائے گا کہ جو خوش قسمت اللہ کی راہ میں نیک کام کرتے ہوئے مرے یا مارے گئے تھے ان کو خدا تعالیٰ کی بخشش ومہربانی سے کیسا وافر حصہ ملا، جس کے سامنے تمہاری دنیا کی کمائی اور جمع کی ہوئی دولت وثروت سب ہیچ ہے، الحاصل اگر منافقین ہی کا قول تسلیم کرلیا جائے کہ گھر سے نہ نکلتے تو نہ مارے جاتے، تب بھی سراسر خسارہ تھا، کیونکہ اس صورت میں اس موت سے محروم رہ جاتے جس پر ایسی ایسی لاکھوں زندگیاں قربان کی جاسکتی ہیں، بلکہ جو حقیقت میں موت نہیں حیات ابدی ہے فنا فی اللہ کی تہ میں بقاء کا راز مضمر ہے، جو جینا ہے تو مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔

فَبِمَا رَحۡمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنۡتَ لَهُمۡ ۚ وَلَوۡ كُنۡتَ فَظًّا غَلِيۡظَ الۡقَلۡبِ لَانۡفَضُّوۡا مِنۡ حَوۡلِكَ

سو کچھ اللہ ہی کی رحمت ہے جو تو نرم دل مل گیا ان کو، اور اگر تو ہوتا تند خو سخت دل تو متفرق ہو جاتے تیرے پاس سے

فَاعۡفُ عَنۡهُمۡ وَاسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ وَشَاوِرۡهُمۡ فِي الۡاَمۡرِ ۚ فَاِذَا عَزَمۡتَ فَتَوَكَّلۡ عَلَى اللّٰهِ ؕ

سو تو ان کو معاف کر اور ان کے واسطے بخشش مانگ اور ان سے مشورہ لے کام میں، پھر جب قصد کر چکا تو اس کام کا تو پھر بھروسہ کر اللہ پر

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الۡمُتَوَكِّلِيۡنَ ﴿۱۵۹﴾

اللہ کو محبت ہے توکل والوں سے

خلاصہ تفسیر: پیچھے ذکر ہو چکا کہ بعض مسلمانوں سے غزوہ احد میں لغزش صادر ہوگئی تھی کہ رسول اللہ ﷺ نے جہاں بٹھایا تھا وہاں سے ہٹ گئے، اس سے حضور ﷺ کو صدمہ ہوا اگرچہ آپ نے وسعت اخلاق کی بنا پر اکے ساتھ کوئی سختی اور ملامت کا معاملہ نہیں فرمایا، لیکن اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا کہ ان کی طرف سے حضور کے قلب مبارک پر بھی انقباض نہ رہے اور اپنے رسول کے ساتھیوں کی دلجوئی اور ان کے دلوں میں اس غلطی پر جو صدمہ اور اپنے قصور پر جو ندامت تھی یہ کلفت بھی ڈھل جائے اس لیے پہلے اپنی معافی کی بشارت سنا کر اب اس آیت میں حضور ﷺ کو مزید لطف و کرم کی ہدایت اور صحابہ کرام سے معاملات میں مشورہ لینے کا حکم دیا۔

بعد اس کے (کہ صحابہ کرام سے ایسی لغزش ہوئی جس پر آپ کو ملامت اور مواخذہ کرنے کا حق تھا) خدا ہی کی رحمت کے سبب (جو کہ آپ پر ہے) آپ ان کے ساتھ نرم رہے، اور اگر آپ (خدانخواستہ) تند خو سخت مزاج ہوتے تو یہ (بیچارے) آپ کے پاس سے سب منتشر ہو جاتے (پھر ان کو یہ فیوض برکات کہاں نصیب ہوتے) سو (جب آپ نے برتاؤ میں ایسی نرمی فرمائی تو ان سے آپ کے حکم کی تعمیل میں جو غلطی ہوگئی ہے اس کو دل سے بھی) ان کو معاف کر دیجئے (اور ان سے جو غلطی اللہ تعالیٰ کے حکم میں کوتاہی سے ہوئی اس کے لئے) آپ ان کے لئے استغفار کیجئے (اگرچہ اللہ تعالیٰ نے خود ان کی معافی اور مغفرت کا اعلان پہلے ہی فرما دیا تھا، مگر آپ کا ان کے لئے دعا مغفرت کرنا مزید ان کے لئے مفید اور موجب تسلی ہوگا) اور ان سے خاص خاص باتوں میں (بدستور) مشورہ لیتے رہا کیجئے (تا کہ اس خصوصی لطف سے ان کے دلوں سے غم ڈھل جائے) پھر (مشورہ لینے کے بعد) جب آپ (کسی ایک جانب) رائے پختہ کرلیں (خواہ وہ ان کے مشورہ کے موافق ہو یا مخالف) تو اللہ تعالیٰ پر اعتماد (کر کے اس کام کو کر ڈالا) کریں، بیشک اللہ تعالیٰ ایسے اعتماد کرنے والوں سے محبت رکھتے ہیں۔

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ: یہ جو کہا گیا کہ ''خاص خاص باتوں میں مشورہ''، اس سے مراد وہ امور ہیں جن میں آپ ﷺ پر وحی نازل نہ ہوئی ہو، ورنہ وحی کے بعد پھر مشورہ کی کوئی گنجائش نہیں، اس میں یہ اشکال ہے کہ آنحضرت ﷺ اللہ کے رسول اور صاحب وحی ہیں، آپ کو کسی سے مشورہ کی کیا حاجت ہے آپ کو ہر چیز حق تعالیٰ کی طرف سے بذریعہ وحی معلوم ہو سکتی ہے، اس لیے بعض علماء نے اس حکم مشورہ کو اس پر محمول کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ کو نہ مشورہ کی ضرورت تھی، نہ اس مشورہ پر آپ کے کسی کام کا مدار تھا، صرف صحابہ کرام کے اعزاز اور دل جوئی کے لئے مشورہ کا حکم آپ کو دیا گیا ہے، لیکن امام ابوبکر جصاصؒ نے فرمایا کہ یہ صحیح نہیں ہے، کیونکہ اگر یہ معلوم ہو کہ ہمارے مشورہ پر کوئی عمل نہیں ہوگا اور نہ مشورہ کا کسی کام پر کوئی اثر ہے تو پھر اس مشورہ پر کوئی دل جوئی اور اعزاز بھی نہیں رہتا، بلکہ حقیقت امر یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کو عام امور میں تو براہ راست حق تعالیٰ کی طرف سے بذریعہ وحی ایک طریق کار متعین کر دیا جاتا ہے، مگر بمقتضائے حکمت و رحمت بعض امور کو آنحضرت ﷺ کی رائے اور صوابدید پر چھوڑ دیا جاتا ہے، ایسے ہی امور میں مشورہ کی ضرورت ہوتی ہے اور اسی قسم کے امور میں مشورہ لینے کا آپ کو حکم دیا گیا، رسول کریم ﷺ کی مجالس مشاورت کی تاریخ بھی یہی بتلاتی ہے۔

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ: روح المعانی میں ہے کہ اس مشورہ لینے کا فائدہ ان کی رائے سے مدد اور قوت لینا ہے، اس بنا پر اس میں اس پر دلالت ہے کہ بعض اوقات چھوٹوں سے مشورہ لینا بھی بڑوں کو مفید ثابت ہوا ہے۔

فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ: اس جگہ تدبیر اور مشورہ کے احکام کے بعد یہ ہدایت دی گئی ہے کہ سب تدبیریں کرنے کے بعد بھی جب کام کرنے کا عزم کرو تو اپنی عقل و رائے اور تدبیروں پر بھروسہ نہ کرو، بلکہ بھروسہ صرف اللہ تعالیٰ پر کرو، کیونکہ یہ سب تدبیر مدبر الامور کے قبضہ قدرت میں ہیں، انسان کیا اور اس کی رائے و تدبیر کیا، ہر انسان اپنی عمر کو ہزاروں واقعات میں ان چیزوں کی رسوائی کا مشاہدہ کرتا رہتا ہے، اس سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ توکل ترک اسباب اور ترک تدبیر کا نام نہیں، بلکہ اسباب قریبہ کو چھوڑ کر توکل کرنا سنت انبیاء اور تعلیم قرآن کے خلاف ہے، ہاں! اسباب بعیدہ اور دور دراز کار فکروں میں پڑے رہنا یا صرف اسباب اور تدابیر ہی کو مؤثر سمجھ کر مسبب الاسباب اور مدبر الامور (اللہ تعالیٰ) سے غافل ہو جانا بیشک خلاف توکل ہے۔

* * *

فائدہ: مسلمانوں کو ان کی کوتاہیوں پر متنبہ فرمانے اور معافی کا اعلان سنانے کے بعد نصیحت کی تھی کہ آئندہ اس مار آستین جماعت کی باتوں سے فریب مت کھانا، اس آیت میں ان کے عفو تقصیر کی تکمیل کی گئی ہے، چونکہ جنگ احد میں سخت خوفناک غلطی اور زبردست کوتاہی مسلمانوں سے ہوئی تھی، شاید آپ ﷺ کا دل خفا ہوا ہوگا اور چاہا ہوگا کہ آئندہ ان سے مشورہ لے کر کام نہ کیا جائے، اس لئے حق تعالیٰ نے نہایت عجیب و غریب پیرایہ میں ان کی سفارش کی، اول اپنی طرف سے معافی کا اعلان کر دیا، کیونکہ خدا کو معلوم تھا کہ آپ ﷺ کا غصہ اور رنج خالص اپنے پروردگار کے لئے ہوتا ہے، پھر فرمایا: فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللهِ لِنْتَ لَهُمْ یعنی اللہ کی کتنی بڑی رحمت آپ پر اور ان پر ہے کہ آپ ﷺ کو اس قدر خوش اخلاق اور نرم خو بنا دیا، کوئی اور ہوتا تو خدا جانے ایسے سخت معاملہ میں کیا رویہ اختیار کرتا، یہ سب کچھ اللہ ہی کی مہربانی ہے کہ تجھ جیسا شفیق، نرم دل پیغمبر ان کو مل گیا، فرض کیجئے اگر

خدانہ کردہ آپ ﷺ کا دل سخت ہوتا اور مزاج میں شدت ہوتی تو یہ قوم آپ کے گرد کہاں جمع رہ سکتی تھی، ان سے کوئی غلطی ہوتی اور آپ سخت پکڑتے تو شرم ودہشت کے مارے پاس بھی نہ آسکتے اس طرح یہ لوگ بڑی خیر وسعادت سے محروم رہ جاتے اور جمعیت اسلامی کا شیرازہ بکھر جاتا، لیکن حق تعالیٰ نے آپ کو نرم دل اور نرم خو بنایا، آپ اصلاح کے ساتھ ان کی کوتاہیوں سے اغماض کرتے رہتے ہیں، سو یہ کوتاہی بھی جہاں تک آپ کے حقوق کا تعلق ہے معاف کردیجئے اور گوخدا اپنا حق معاف کرچکا ہے، تاہم ان کی مزید دلجوئی اور تطییب خاطر کے لئے ہم سے بھی ان کے لئے معافی طلب کریں تا کہ یہ شکستہ دل آپ کی خوشنودی اور انبساط محسوس کر کے بالکل مطمئن ومنشرح ہوجائیں اور صرف معاف کردینا ہی نہیں آیندہ بدستور ان سے معاملات میں مشورہ لیا کریں، مشاورت کے بعد جب ایک بات طے ہوجائے اور پختہ ارادہ کرلیا جائے، پھر خدا پر توکل کر کے اس کو بلا پس وپیش کر گزرے، خدا تعالیٰ متوکلین کو پسند کرتا اور ان کے کام بنادیتا ہے۔

تنبیه: حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ سے سوال کیا گیا ''عزم'' کیا ہے؟ فرمایا: مشاورة اهل الرأى ثم اتباعهم (ابن کثیر) اور مجمع الزوائد میں حضرت علیؓ کی حدیث ہے یارسول اللہ! جو بات ہم کتاب وسنت میں نہ پائیں اس میں کیا طریقہ استعمال کریں؟ فرمایا فقہاء عابدین (سمجھدار خدا پرستوں) سے مشورہ کرو و لاتمضوا فيه رأيا خاصّة (اور کسی اکیلے کی رائے مت جاری کرو)۔

اِنْ یَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۚ وَاِنْ یَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِیْ یَنْصُرُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ؕ

اگر اللہ تمہاری مدد کرے گا تو کوئی تم پر غالب نہ ہو سکے گا، اور اگر مدد نہ کرے تمہاری تو پھر ایسا کون ہے جو مدد کر سکے تمہاری اس کے بعد

وَعَلَى اللّٰهِ فَلْیَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۶۰﴾

اور اللہ ہی پر بھروسہ چاہیے مسلمانوں کو

خلاصه تفسیر: واقعہ احد میں عارضی شکست اور مسلمانوں کی پریشانی پر حضرات صحابہ کرام کی تسلی کے لئے حضور ﷺ کو چند امور کا حکم ہوا تھا جس سے رسول اللہ ﷺ کی ناراضی کا خطرہ تو زائل ہوگیا، لیکن ان صحابہ کو اس مغلوبیت کے واقعہ سے حسرت بھی تھی، اس لئے آگے ان کی مغلوبیت کی حسرت کو دل سے اتارتے ہیں۔

اگر حق تعالیٰ تمہارا ساتھ دیں تب تو تم سے کوئی نہیں جیت سکتا، اور اگر تمہارا ساتھ نہ دیں تو اس کے بعد ایسا کون ہے جو تمہارا ساتھ دے اور (اور تم کو غالب کردے) اور صرف اللہ تعالیٰ پر ایمان والوں کو اعتماد رکھنا چاہیے۔

اس تقریر سے حسرت اس طرح زائل ہوگئی کہ غالب ومغلوب کرنا خدا کے قبضہ میں ہے، یہ امر پورا تمہارے قبضہ میں نہیں تو اس کے پیچھے اپنے جی کو نہ ڈالو، جو ہوگیا سو ہوگیا، اس میں جو گناہ کی وجہ سے آفت آئی اس سے توبہ کرلو اور آئندہ کے لیے خدا پر نظر رکھو، یعنی اس سے گناہوں سے بچنے کی توفیق مانگو اور پھر جو مصیبت نازل ہو اس کو کارساز عالم کی طرف سے مصلحت اور بہتر سمجھو۔

* * *

فائده: پہلے آپ کو فرمایا تھا: ''بھروسہ کر اللہ پر'' یہاں بتلایا کہ بھروسہ کے لائق ایسی ہی ذات ہو سکتی ہے جو سب سے زبردست اور غالب ہو، سب مسلمانوں کو اس کی امداد پر توکل کرنا چاہئے، گویا مسلمانوں کی تقصیر خود معاف کرنے اور اپنے پیغمبر سے معاف کرادینے کے بعد ان کو نصیحت کی جاتی ہے کہ کسی کے کہنے سننے میں نہ آئیں، خالص خدا پر بھروسہ رکھیں، اس کی مدد ہوگی تو کوئی طاقت تم پر غالب نہیں آسکتی، جیسے بدر میں دیکھ چکے، اور کسی مصلحت سے وہ مدد نہ کرے تو پھر کوئی مدد نہیں کرسکتا جیسا کہ احد میں تجربہ ہوگیا۔

وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ ؕ وَمَنْ يَّغْلُلْ يَاْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ

اور نبی کا کام نہیں کہ کچھ چھپا رکھے، اور جو کوئی چھپائے گا وہ لائیگا اپنی چھپائی چیز دن قیامت کے، پھر پورا پائے گا ہر کوئی

مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿١٦١﴾

جو اس نے کمایا اور ان پر ظلم نہ ہوگا

خلاصہ تفسیر: پیچھے رسول اللہ ﷺ کی مخالفت کا باعث وبال ہونا بتلایا، آگے حضور ﷺ کا امین کامل ہونا بتلاتے ہیں تاکہ یہ بات ثابت ہوجائے کہ آپ جو کچھ حکم فرماتے ہیں اس میں آپ کی کوئی نفسانی غرض نہیں ہوتی، کیونکہ یہ ایک قسم کی خیانت ہے، اور آپ خیانت سے مبرا ہیں، پس آپ کے حکم کی مخالفت ضرور قابل مذمت اور وبال کا سبب ہوگی، اس آیت کا شان نزول ترمذی کی روایت کے مطابق اگرچہ ایک خاص واقعہ ہے، مگر چونکہ آیت کے الفاظ عام ہیں اس لیے پیچھے کی آیتوں سے اس کا تعلق ہماری تقریر کے مطابق بخوبی ظاہر ہوگیا، واقعہ یہ ہے کہ بدر کے روز مال غنیمت میں سے ایک چادر گم ہوگئی، بعض کم سمجھ یا منافق لوگوں نے کہا کہ شاید رسول اللہ ﷺ نے لے لی ہو، اس پر یہ آیت نازل ہوئی، خلاصہ یہ ہے کہ یہ کام حقیقت میں ہو یا ظاہر میں خیانت ہی ہے اور رسول کی شان ہر قسم کی خیانت سے منزہ ہے، وہ اپنی نفسانی غرض سے کوئی کام یا کوئی بات نہیں کرسکتے۔

اور نبی کی یہ شان نہیں کہ وہ (نعوذ باللہ) خیانت کرے، حالانکہ (خائن کی تو قیامت میں رسوائی اور فضیحت ہوگی، کیونکہ) جو شخص خیانت کرے گا وہ شخص اپنی اس خیانت کی ہوئی چیز کو قیامت کے دن (میدان حشر میں) حاضر کرے گا (تاکہ سب مخلوق مطلع ہوں اور سب کے روبرو فضیحت و رسوائی ہو) پھر (میدان قیامت کے بعد) ہر شخص کو (ان خائنوں میں سے) اس کے کئے کا (دوزخ میں) پورا عوض ملے گا اور ان پر بالکل ظلم نہ ہوگا (کہ جرم سے زائد سزا ہونے لگے)۔

وَمَنْ يَّغْلُلْ يَاْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ: یعنی جو شخص خیانت کرے گا وہ اپنی اس خیانت کی ہوئی چیز کو قیامت کے دن حاضر کرے گا، یہ جو فرمایا کہ خیانت کی چیز کو قیامت میں حاضر کرے گا تو اگر وہ چیز اجسام میں سے ہے جیسے کسی کی کوئی چیز لی تب تو وہ اس کی گردن پر لدی ہوگی جیسا کہ حدیث میں حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا دیکھو میں قیامت میں کسی کو اس حال میں نہ دیکھوں کہ اس کی گردن پر ایک اونٹ لدا ہوا بولتا ہو، اور میں صاف جواب دے دوں کہ میں کچھ نہیں کرسکتا، اور اگر وہ خیانت اجسام میں سے نہ ہو تو اس کے لانے کے معنی اس کی خبر لانے کے ہوسکتے ہیں، یا اس کے لیے بھی کوئی صورت اس عالم میں ہو جیسا کہ احادیث سے نیک اعمال کا حسین آدمی کی صورت میں آنا ثابت ہے۔

* * *

فائدہ: اس سے غرض یا تو مسلمانوں کی پوری طرح خاطر جمع کرنا ہے، تاکہ یہ وسوسہ نہ لائیں کہ شاید حضرت نے ہم کو بظاہر معاف کردیا اور دل میں خفا ہیں پھر کبھی خفگی نکالیں گے؟ یہ کام نبیوں کا نہیں کہ دل میں کچھ اور ظاہر میں کچھ۔

یا مسلمانوں کو سمجھانا ہے کہ حضرت کی عظمت اور عصمت و امانت کو پوری طرح مستحضر رکھیں، آپ ﷺ کی نسبت کبھی کوئی لغو اور بیہودہ خیال نہ لائیں، مثلاً یہ گمان نہ کریں کہ غنیمت کا کچھ مال چھپا رکھیں گے؟ (العیاذ باللہ) شاید یہ اس واسطے فرمایا کہ وہ تیرانداز غنیمت کے لئے مورچہ چھوڑ کر دوڑے تھے، کیا حضرت ﷺ ان کو حصہ نہ دیتے؟ یا بعضی چیزیں چھپا رکھتے؟

اور بعض روایات میں ہے کہ بدر کی لڑائی میں ایک چیز (چادر یا تلوار) غنیمت میں سے گم ہوگئی تھی، کسی نے کہا شاید حضرت نے اپنے واسطے رکھی ہوگی، اس پر یہ آیت نازل ہوئی، بہرحال مسلمانوں کو سمجھانا ہے کہ اگر حضور ﷺ اپنی نرم خوئی اور خوش خلقی سے تمہاری غلطیوں کو معاف کرتے ہیں تو تم کو حضور ﷺ کی عظمت شان اور عصمت و نزاہت کا بہت زیادہ پاس رکھنا چاہیے، کہ کسی قسم کا کمزور اور رکیک خیال مومنین کے پاس نہ آنے پائے، دوسری طرف چونکہ آپ کی شفقت و نرم دلی یاد دلا کر جنگ احد کے متعلق مسلمانوں کی کوتاہی کو معاف کرایا جارہا تھا، اسی ذیل میں ایک دوسری کوتاہی بھی

یاددلادی جو بدر سے متعلق تھی کہ آپ اپنی نرم خوئی سے اس پر بھی کچھ دھیان نہ کریں۔

تنبیہ: ''غلول'' کے اصل معنی غنیمت میں خیانت کرنے کے ہیں، لیکن کبھی مطلق خیانت کے معنی میں آتا ہے، بلکہ بعض اوقات محض ایک چیز کے چھپا لینے پر اس کا اطلاق ہوتا ہے، جیسے ابن مسعودؓ نے فرمایا: غلوا مَصاحِفَکُمْ۔

اَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰهِ كَمَنْۢ بَآءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۶۲﴾

کیا ایک شخص جو تابع ہے اللہ کی مرضی کا برابر ہوسکتا ہے اس کے جس نے کمایا غصہ اللہ کا اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے، اور کیا ہی بری جگہ پہنچا

هُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶۳﴾

لوگوں کے مختلف درجے ہیں اللہ کے ہاں، اور اللہ دیکھتا ہے جو کچھ کرتے ہیں

خلاصہ تفسیر: (غرض خیانت کرنے والے پر غضب نازل ہوگا اور وہ جہنم کا مستحق ہوگا اور انبیاء علیہم السلام قیامت میں رضائے حق کی وجہ سے سربلند ہوں گے، پس نبوت کے ساتھ خیانت جمع نہیں ہوسکتی، چنانچہ آگے ارشاد ہے:) سو ایسا شخص جو رضائے حق کا تابع ہو (جیسے نبی) کیا وہ اس شخص کے مثل ہوجائے گا جو کہ غضب الٰہی کا مستحق ہو اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہو (جیسے خائن) اور وہ جانے کی بری جگہ ہے (پس ہرگز دونوں برابر نہیں ہوں گے، بلکہ) یہ مذکورین (یعنی رضائے حق کا اتباع کرنے والے اور غضب الٰہی کے مستحق ہونے والے) درجات میں مختلف ہوں گے اللہ تعالیٰ کے نزدیک (کہ رضائے کا متبع محبوب اور جنتی ہوگا، اور خائن مغضوب اور دوزخی ہوگا) اور اللہ تعالیٰ خوب دیکھتے ہیں ان کے اعمال کو (اس لئے ہر ایک کے مناسب معاملہ فرمادیں گے، اس سے انبیاء علیہم السلام کا امین ہونا دلیل سے ثابت ہوگیا)۔

* * *

فائدہ: یعنی پیغمبر جو ہر حال میں خدا کی مرضی کا تابع، بلکہ دوسروں کو بھی اس کی مرضی کا تابع بنانا چاہتا ہے، کیا ان لوگوں کے ایسے کام کرسکتا ہے جو خدا کے غضب کے نیچے اور دوزخ کے مستحق ہیں؟ ممکن نہیں!!۔

فائدہ: یعنی نبی اور سب خلقت برابر نہیں، طمع وغیرہ کے پست اور ذلیل کام نبیوں سے نہیں ہوسکتے، حق تعالیٰ سب کو جانتا ہے کہ کون کس درجہ کا ہے اور سب کے کام دیکھتا ہے، کیا وہ ایسی پست طبیعت والوں کو منصب نبوت پر سرفراز فرمائیگا؟ العیاذ باللہ!۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ

اللہ نے احسان کیا ایمان والوں پر جو بھیجا ان میں رسول انہی میں کا، پڑھتا ہے ان پر آیتیں اس کی

وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۱۶۴﴾

اور پاک کرتا ہے ان کو (یعنی شرک وغیرہ سے) اور سکھلاتا ہے ان کو کتاب اور کام کی بات، اور وہ تو پہلے سے صریح گمراہی میں تھے ۲۔

خلاصہ تفسیر: پیچھے جناب رسول ﷺ کی منقبت امانت کا اور ایک خیال کے غلط ہونے کا بیان تھا، اب اس آیت میں حضور ﷺ کے وجود باجود کا نعمت عظمیٰ ہونا اور آپ کی بعثت کا انسانیت کے لئے احسان عظیم ہونا بیان کیا جاتا ہے، تاکہ اس نعمت کی قدر اور تعظیم کریں، دیگر کسی ایسی بات کا وسوسہ نہ لائیں جو حضور اقدس ﷺ کی شان رفیع کے مناسب نہ ہو۔

حقیقت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر (بڑا) احسان کیا، جب کہ ان میں انہی کی جنس (یعنی بنی آدم میں) سے ایک ایسے (عظیم الشان) پیغمبر کو بھیجا کہ وہ ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی آیتیں (اور احکام) پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں اور (ظاہری اور باطنی گندگیوں سے) ان لوگوں کی صفائی کرتے

رہتے ہیں اور ان کو کتاب (الٰہی) اور سمجھ کی باتیں بتلاتے رہتے ہیں اور بالیقین یہ لوگ (آپ کی بعثت کے) قبل سے صریح غلطی (یعنی شرک وکفر) میں (مبتلا) تھے۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ: یہاں مسلمانوں کو بطور خاص ذکر کرنے کی وجہ ظاہر ہے کہ بعثت سے فائدہ اٹھانے والے یہی لوگ تھے۔

اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ: یعنی انہی کی جنس یعنی بنی آدم میں سے ایک پیغمبر کو بھیجا، چونکہ فرشتہ اور جن کے بہ نسبت انسان کو انسان سے زیادہ اُنس وتعلق ہوتا ہے تو بنی آدم یعنی انسان سے علم کا فیض لینے میں زیادہ سہولت ہوئی، اور خلاف جنس ہونے میں وحشت کا احتمال تھا، اس پر اگر کسی کو شبہ ہو کہ پھر تو جنات کو آپ ﷺ سے فیض لینے میں دشواری ہوگی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ چونکہ انسان جامع ترین مخلوق ہے اس لیے انسان کو جن سے بھی مناسبت ہے، اس بنا پر انسان جن کو بسہولت فیض دے سکتا ہے، بخلاف جن کے کہ ان میں جامعیت نہیں ہے، اس لیے جن انسان کو بسہولت فیض نہیں دے سکتا، اس پر سوال ہوگا کہ جب انسان کو جن سے مناسبت ہے اور یہی مناسبت انسان کے جن سے استفادہ کے لیے بھی کافی ہو سکتی ہے تو جن اگر انسان کی طرف نبی بنا کر مبعوث کیا جائے تو کیا حرج ہے؟ جواب یہ ہے کہ انسان کے جن سے استفادہ حاصل کرنے کی صورت میں یہ مناسبت کافی نہیں، کیونکہ مفیض یعنی فیض دینے والا اقوی ہونا چاہیے مستفیض یعنی فیض لینے والے سے، سو انسان اقوی ہے جن سے، دوسرے اگر سہولت سے قطع نظر کیا جائے تب بھی انسانوں کے مصالح کو جن کے مصالح پر مقدم رکھنے میں کوئی حکمت ومصلحت ہوگی، پس اس صورت میں مؤمنین کو مؤمن انسان کے ساتھ خاص کہنا ہوگا، جیسے اکثر جگہ خطاب بنی آدم کو ہے، اور یہ عموم بعثت کے خلاف نہیں کیونکہ اس پر دوسرے دلائل قائم ہیں۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی انہی کی جنس اور قوم میں کا ایک آدمی رسول بنا کر بھیجا جس کے پاس بیٹھنا، بات چیت کرنا، زبان سمجھنا اور ہر قسم کے انوار و برکات کا استفادہ کرنا آسان ہے، اس کے احوال، اخلاق، سوانح زندگی، امانت ودیانت خدا ترسی اور پاکبازی سے وہ خوب طرح واقف ہیں اپنی ہی قوم اور کنبے کے آدمی سے جب معجزات ظاہر ہوتے دیکھتے ہیں تو یقین لانے میں زیادہ سہولت ہوتی ہے، فرض کرو کوئی جن یا فرشتہ رسول بنا کر بھیجا جاتا تو معجزات دیکھ کر یہ خیال کر لینا ممکن تھا کہ چونکہ جنس بشر سے جداگانہ مخلوق ہے، شاید یہ خوارق اس کی خاص صورت نوعیہ اور طبیعت ملکیہ وجنّیہ کا نتیجہ ہوں، ہمارا اس سے عاجز رہ جانا دلیل نبوت نہیں بن سکتا، بہر حال مومنین کو خدا کا احسان ماننا چاہیے کہ اس نے ایسا رسول بھیجا جس سے بے تکلف فیض حاصل کر سکتے ہیں اور وہ باوجود معزز ترین اور بلند ترین منصب پر فائز ہونے کے ان ہی کے مجمع میں نہایت نرم خوئی اور ملاطفت کے ساتھ گھلا ملا رہتا ہے ﷺ۔

فائدہ: ۲ اس مضمون کی آیت سورۂ بقرہ میں دو جگہ گزر چکی ہے، خلاصہ یہ ہے کہ حضور ﷺ کی چار شانیں بیان کی گئیں:

① ''تلاوت آیات'' (اللہ کی آیات پڑھ کر سنانا) جنکے ظاہری معنی وہ لوگ اہل زبان ہونے کی وجہ سے سمجھ لیتے تھے اور اس پر عمل کرتے تھے۔

② ''تزکیہ نفوس'' (نفسانی آلائشوں اور تمام مراتب شرک ومعصیت سے ان کو پاک کرنا اور دلوں کو مانجھ کر صیقل بنانا) یہ چیز آیات اللہ کے عام مضامین پر عمل کرنے، حضور ﷺ کی صحبت اور قلبی توجہ وتصرف سے باذن اللہ حاصل ہوتی تھی۔

③ ''تعلیم کتاب'' (کتاب اللہ کی مراد بتلانا) اس کی ضرورت خاص خاص مواقع میں پیش آتی تھی، مثلاً ایک لفظ کے کچھ معنی عام تبادر اور محاورہ کے لحاظ سے سمجھ کر صحابہ کو کوئی اشکال پیش آیا، اس وقت آپ کتاب اللہ کی اصلی مراد جو قرائن مقام سے متعین ہوتی تھی بیان فرما کر شبہات کا ازالہ فرما دیتے تھے، جیسے: اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ (الانعام: ۸۲) اور دوسرے مقامات میں ہوا۔

④ ''تعلیم حکمت'' (حکمت کی گہری باتیں سکھلانا) اور قرآن کریم کے غامض اسرار ولطائف اور شریعت کی دقیق وعمیق علل پر مطلع کرنا، خواہ تصریحاً یا اشارۃً، آپ ﷺ نے خدا کی توفیق واعانت سے علم وعمل کے ان اعلیٰ مراتب پر اس درماندہ قوم کو فائز کیا جو صدیوں سے انتہائی جہل وحیرت اور صریح گمراہی میں غرق تھی، آپ کی چند روزہ تعلیم وصحبت سے وہ ساری دنیا کے لئے ہادی ومعلم بن گئی، لہٰذا انہیں چاہیے کہ اس نعمت عظمیٰ کی قدر پہچانیں اور کبھی بھولے سے ایسی حرکت نہ کریں جس سے آپ کا دل متالم ہو۔

اَوَلَمَّآ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيبَةٌ قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا ۙ قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا ؕ قُلْ هُوَ مِنْ

کیا جس وقت پہنچی تم کو ایک تکلیف کہ تم پہنچا چکے ہو اس سے دو چند، تو کہتے ہو یہ کہاں سے آئی ا؎ تو کہہ دے یہ تکلیف تم کو پہنچی

عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۱۶۵﴾

تمہاری ہی طرف سے ۲؎ بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے

خلاصہ تفسیر: چونکہ مؤمنین کو احد کی شکست کی سخت کلفت تھی کہ باوجود مسلمان ہونے کے یہ مصیبت کیوں اور کدھر سے آ گئی؟ اس پر صحابہ کرام کو تعجب اور افسوس تھا، نیز منافقین کہا کرتے تھے کہ اگر یہ لوگ گھروں میں بیٹھے رہتے تو ہلاک نہ ہوتے اور ان شہداء کی موت کو بدنصیبی اور محرومی قرار دیتے تھے، اس لئے اب ان آیات کے اندر دوسرے عنوان سے اس عارضی مصیبت و تکلیف کی علت و حکمت واضح فرمائی گئی اور اس کے ضمن میں منافقین کی تردید بھی، اور ان کا غلط عقیدہ کہ گھروں میں بیٹھے رہنا ہلاکت سے نجات کا سبب ہے اس کی بھی تردید کر دی گئی۔

اور جب (احد میں) تمہاری ایسی ہار ہوئی جس سے دوگنا تم (بدر میں) جیت چکے تھے (کیونکہ احد میں ستر مسلمان شہید ہوئے قید کوئی نہیں ہوا، اور بدر میں ستر کافروں کو قید اور ستر کو قتل کیا تھا) تو کیا ایسے وقت میں تم (بطور اعتراض نہ سہی بطور تعجب کے) یوں کہتے ہو کہ (باوجود ہمارے مسلمان ہونے کے) یہ (ہار) کدھر سے ہوئی؟ (یعنی کیوں ہوئی؟) آپ فرما دیجئے کہ یہ ہار تمہاری طرف سے ہوئی (اگر آپ ﷺ کی رائے کے خلاف نہ کرتے تو نہ ہارتے، کیونکہ اس قید کے ساتھ وعدہ نصرت ہو چکا تھا) بیشک اللہ تعالیٰ کو ہر چیز پر پوری قدرت ہے (جب تم نے اطاعت کی تو اپنی قدرت سے تم کو غالب کر دیا اور جب مخالفت کی تو اپنی قدرت سے تم کو مغلوب کر دیا)۔

قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ: اس واقعہ ہزیمت میں جو صحابہ کرام کی عتاب کے بعد جگہ جگہ تسلی کی گئی اس سے نافرمانی کرنے والے دھوکہ نہ کھائیں کہ ہم سے جو گناہ ہوتے ہیں اس میں بھی خدا کی مشیت و حکمت ہوتی ہے، پھر غم کی کوئی بات نہیں، بات یہ ہے کہ اول تو صحابہ کرام سے یہ قصد و ارادہ سے نہ ہوا تھا بلکہ خطا سے ایسا ہوا، دوسرے ان پر ندامت اور غم کا بے انتہا غلبہ تھا جو توبہ کا اعلیٰ درجہ ہے، اس لیے ان کی تسلی کی گئی، اور جو شخص قصداً گناہ کرے، پھر اس پر جرات بھی کرے تو وہ تسلی کا مستحق نہیں بلکہ زجر و تخویف اور وعید کا مستحق ہے۔

* * *

فائدہ: ا؎ پہلے سے احد کا قصہ چلا آتا تھا، درمیان میں جو کوتاہی ہوئی تھی اس کے عفو کا ذکر رہا اور اسی کی مناسبت سے نبی کریم ﷺ کے اخلاق و حقوق یاد دلائے گئے، اب پھر احد کے قصہ کی طرف عود کیا جاتا ہے، یعنی جنگ احد میں جو تکلیف اور نقصان اٹھانا پڑا، کیا اس پر تم تعجب سے کہتے ہو کہ مصیبت کہاں آ گئی، ہم تو مسلمان مجاہد تھے جو خدا کے راستہ میں اس کے دشمنوں سے لڑنے کے لئے نکلے تھے، خدا تعالیٰ پیغمبر کی زبانی نصرت و امداد کا وعدہ فرما چکا، پھر یہ مصیبت ہم پر کیونکر اور کدھر سے نازل ہوئی، ایسا کہتے وقت سوچنا چاہیے کہ جس قدر تکلیف تم کو پہنچی اس سے دو چند تکلیف ان کو تم سے پہنچ چکی ہے، احد میں تمہارے تقریباً ستر آدمی شہید ہوئے، بدر میں ان کے ستر مارے جا چکے اور ستر تمہارے ہاتھ قید ہوئے جن پر تم کو پورا قابو حاصل تھا، چاہتے تو قتل کر ڈالتے، پھر احد میں بھی ابتداء ان کے بیس سے زائد قتل ہو چکے ہیں، اگر تھوڑی دیر کے لئے تم کو ہزیمت ہوئی تو بدر میں ان کو تباہ کن ہزیمت مل چکی اور احد میں بھی جب تم جم کر لڑے وہ منہزم ہوئے، پھر آخر میں میدان چھوڑ کر چلے گئے، ایسی صورت میں انصافاً تم کو اپنی تکلیف کا شکوہ کرنے اور زیادہ بددل ہونے کا موقع نہیں۔

فائدہ: ۲؎ اگر غور کرو تو تم خود ہی اس مصیبت کا سبب بنے ہو، تم نے جوش میں آ کر پیغمبر کی اور بہت سے تجربہ کاروں کی رائے قبول نہ کی، اپنی پسند اور اختیار سے مدینہ کے باہر محاذ جنگ قائم کیا، پھر باوجود نہی شدید کے تیر اندازوں نے اہم مورچہ چھوڑ کر مرکز خالی کر دیا اور ایک سال پہلے جب اساراء بدر کے متعلق تم کو اختیار دیا گیا تھا کہ یا انہیں قتل کر دو یا فدیہ لے کر چھوڑ دو، اس شرط پر کہ آئندہ اتنے ہی آدمی تم سے لیے جائیں گے تو تم نے فدیہ کی

صورت اختیار کی اور شرط کو قبول کرلیا، اب وہی شرط پوری کرائی گئی تو تعجب و انکار کا کیا موقع ہے، یہ چیز تو خود اپنی طرف سے تم قبول کر چکے تھے (اسارء بدر کا پورا قصہ سورۃ انفال میں آیگا)۔

وَمَآ اَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۶۶﴾ وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ

اور جو کچھ تم کو پیش آیا اس دن کہ ملیں دو فوجیں سو اللہ کے حکم سے اور اس واسطے کہ معلوم کرے ایمان والوں کو، اور تا کہ معلوم کرے ان کو جو

نَافَقُوْا ۖ وَقِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوِ ادْفَعُوْا ۭ قَالُوْا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا

منافق تھے ۱ اور کہا گیا ان کو کہ آؤ لڑو اللہ کی راہ میں یا دفع کرو دشمن کو ۲ بولے اگر ہم کو معلوم ہو لڑائی

لَّااتَّبَعْنٰكُمْ ۭ هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَىِٕذٍ اَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْاِيْمَانِ ۚ يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَّا لَيْسَ

تو البتہ تمہارے ساتھ ہیں ۳ وہ لوگ اس دن کفر کے قریب ہیں بہ نسبت ایمان کے ۴ کہتے ہیں اپنے منہ سے جو نہیں

فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۭ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يَكْتُمُوْنَ ﴿۱۶۷﴾

ان کے دل میں اور اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ چھپاتے ہیں ۵

خلاصہ تفسیر: اور جو مصیبت تم پر پڑی جس روز کہ دونوں گروہ (مسلمانوں اور کفار کے) باہم (لڑائی کے لیے) مقابل ہوئے (یعنی احد کے دن) سو (وہ مصیبت) اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہوئی (کیونکہ چند در چند حکمتیں تھیں جن کا بیان پیچھے بھی آچکا ہے) اور (ان میں سے ایک حکمت یہ ہے) تا کہ اللہ تعالیٰ مؤمنین کو بھی دیکھ لیں (کیونکہ مصیبت کے وقت اخلاص وغیر اخلاص ظاہر ہوجاتا ہے جیسا کہ گذر بھی چکا ہے)۔

اور ان لوگوں کو بھی دیکھ لیں جنہوں نے نفاق کا برتاؤ کیا، اور ان سے (شروع جنگ کے وقت جبکہ تین سو آدمیوں نے مسلمانوں کا ساتھ چھوڑ دیا تھا جیسا کہ پہلے آچکا ہے) یوں کہا گیا کہ (میدان جنگ میں) آؤ (پھر ہمت ہو تو) اللہ کی راہ میں لڑنا یا (ہمت نہ ہو تو گنتی ہی بڑھا کر) دشمنوں کی مدافعت کرنا (کیونکہ بہت سی بھیڑ دیکھ کر کچھ تو ان پر رعب ہوگا اور اسی سے شاید ہٹ جائیں) وہ بولے کہ اگر ہم ڈھنگ کی لڑائی دیکھتے تو ضرور تمہارے ساتھ ہو لیتے (لیکن یہ کوئی لڑائی ہے کہ وہ لوگ تم سے تین چار گنے زیادہ، پھر ان کے پاس سامان بھی زیادہ، ایسی حالت میں لڑنا ہلاکت میں پڑنا ہے، لڑائی اس کو نہیں کہتے، حق تعالیٰ اس پر فرماتے ہیں کہ:) یہ منافقین اس روز (جبکہ ایسا خشک جواب دیا تھا) کفر سے (ظاہراً بھی) نزدیک تر ہوگئے، بہ نسبت اس حالت کے کہ وہ (پہلے سے ظاہراً) ایمان سے (کسی قدر) نزدیک تھے (کیونکہ پہلے بھی اگرچہ وہ دل سے مومن نہ تھے، مگر مسلمانوں کے سامنے موافقت کی باتیں بناتے رہتے تھے، اس روز ایسی طوطا چشمی غالب ہوئی کہ کھلم کھلا مخالفت کی باتیں منہ سے نکلنے لگیں، اس لئے پہلے سے جو ظاہری قرب ایمان کے ساتھ تھا وہ کفر کے قرب میں تبدیل ہوگیا) یہ لوگ اپنے منہ سے ایسی باتیں کرتے ہیں جو ان کے دل میں نہیں (یعنی دل میں تو یہ ہے کہ ان مسلمانوں کا کبھی ساتھ نہ دیں گے، اگرچہ لڑائی ڈھنگ ہی کی کیوں نہ ہو) اور اللہ تعالیٰ خوب جانتے ہیں جو کچھ یہ اپنے دل میں رکھتے ہیں (اس لئے ان کے اس قول کا غلط ہونا اللہ تعالیٰ کو خوب معلوم ہے)۔

هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَىِٕذٍ اَقْرَبُ: یہ کفر سے زیادہ قریب اس لئے کہا کہ موافقت کی باتیں دل سے نہ تھیں، اس لئے زور دار نہ تھیں اور یہ مخالفت کی باتیں دل سے تھیں، اس لئے عبارت بھی زور دار تھی۔

* * *

فائدہ: ۱ وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ نَافَقُوْا: جس کو جب چاہے غالب اور جب چاہے مغلوب کر دے، مغلوب کرنا اس لئے نہیں کہ وہ اس وقت غالب کرنے پر قادر نہ تھا، بلکہ اس لئے ہے کہ تمہارے کسب و اختیار سے صورت حال ایسی پیدا ہوگئی کہ کلی غلبہ عطا کرنے میں مصلحت نہ تھی بہر حال جو کچھ ہوا اس کے حکم و مشیت سے ہوا جس کا سبب تم تھے اور حکمت یہ تھی کہ ایک طرف ہر مومن مخلص کے ایمان و اخلاص کا اور دوسری جانب ہر منافق کے نفاق کا درجہ ظاہر ہو جائے، کھرے کھوٹے اور کچے پکے میں کسی کو کچھ التباس نہ رہے۔

فائدہ: ۲ قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوِ ادْفَعُوْا: جنگ شروع ہونے سے پہلے جب رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی تین سو آدمیوں کو ساتھ لے کر واپس جانے لگا، اس وقت کہا گیا تھا کہ عین موقع پر کہاں بھاگتے ہو، آؤ اگر دعوائے اسلام میں سچے ہو تو اللہ کی راہ میں لڑو، ورنہ کم از کم دشمن کو دفع کرنے میں حصہ لو، یعنی مجمع میں شریک رہو تا کہ کثرت تعداد کا اثر دشمن پر پڑے، یا یہ کہ خدا کی راہ میں دین کی خاطر نہیں لڑتے تو حمیت وطنی و قومی یا اپنے اموال و اولاد کی حفاظت کے لئے دشمن کی مدافعت کرو، کیونکہ دشمن اگر کامیاب ہوا تو انتقام لینے میں مومنین و منافقین کی تمیز نہ کریگا، عام مسلمانوں کی طرح تم بھی نقصان اٹھاؤ گے، غرض ان پر ہر طرح ان کے مزاج کے موافق اتمام حجت کیا گیا، تا کہ جو کچھ دلوں میں ہے اعلانیہ ظاہر ہو جائے۔

فائدہ: ۳ لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّا اتَّبَعْنٰكُمْ: یعنی لڑائی ہوتی نظر نہیں آتی، خواہ مخواہ کا ڈھونگ ہے، اگر ہمیں معلوم ہوتا کہ واقعی لڑائی ہونے والی ہے تو ضرور تمہارے ساتھ چلتے، جب لڑائی دیکھیں گے شامل ہو جائیں گے۔

یا یہ مطلب تھا کہ کوئی ڈھنگ کا مقابلہ ہوتا تو ساتھ رہتے، بھلا یہ کوئی مقابلہ ہے کہ ایک طرف تین ہزار کا لشکر اور دوسری طرف صرف ایک ہزار بے سروسامان آدمی، یہ لڑائی کیا ہے محض اپنے کو ہلاکت میں ڈالنا ہے۔

یا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا سے یہ ظاہر کرتے تھے کہ صاحب! ہم فنون جنگ اور لڑائی کے قاعدوں سے واقف ہوتے تو آپ کے ساتھ رہتے، گویا دل میں طعنہ دیا کہ ہمارے مشورہ پر چلے نہیں اوروں کی رائے پر عمل کیا، تو ہم کو لڑائی کے قاعدوں سے ناواقف سمجھے اور آپ واقف بنے، پھر ہمیں ساتھ کیوں لیتے ہو؟ بہر حال جھوٹے حیلے حوالے کر کے چلے گئے۔

فائدہ: ۴ يَوْمَئِذٍ اَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْاِيْمَانِ: منافقین دل سے کافر اور زبان سے ایمان کا اظہار کرتے تھے اور اسی زبانی اسلام کی بناء پر مسلمانوں میں ملے جلے رہتے تھے، اس روز عین موقع پر پیغمبر ﷺ اور مسلمانوں کو چھوڑ کر چلے جانے اور جھوٹے حیلے تراشنے سے اچھی طرح نفاق کی قلعی کھل گئی، اب ظاہر میں بھی بہ نسبت ایمان کے کفر سے زیادہ قریب ہو گئے اور اپنے فعل سے مسلمانوں کو نقصان اور کافروں کو تقویت پہنچائی۔

فائدہ: ۵ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يَكْتُمُوْنَ: یعنی زبان سے قَالُوْا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّا اتَّبَعْنٰكُمْ کہتے ہیں اور جو دل میں ہے صاف نہیں کہتے، دل میں یہ تھا کہ اچھا ہے مسلمان مغلوب و ذلیل ہوں اور ہم خوشی سے بغلیں بجائیں۔

اَلَّذِيْنَ قَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ وَقَعَدُوْا لَوْ اَطَاعُوْنَا مَا قُتِلُوْا ؕ قُلْ فَادْرَءُوْا

وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں اپنے بھائیوں کو اور آپ بیٹھ رہے ہیں اگر وہ ہماری بات مانتے تو مارے نہ جاتے ۱ تو کہہ دے اب ہٹا دے

عَنْ اَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۶۸﴾

جو اپنے اوپر سے موت کو اگر تم سچے ہو ۲

خلاصہ تفسیر: یہ ایسے لوگ ہیں کہ (خود تو جہاد میں شریک نہ ہوئے اور) اپنے (ہم نسب) بھائیوں کی نسبت (جو کہ مقتول ہو گئے، گھروں میں) بیٹھے ہوئے باتیں بناتے ہیں کہ اگر ہمارا کہنا مانتے (یعنی ہمارے منع کرنے پر نہ جاتے) تو (بے فائدہ) قتل نہ کئے جاتے، آپ فرما دیجئے کہ اچھا تو اپنے اوپر سے موت کو ہٹاؤ اگر تم (اس خیال میں) سچے ہو (کہ میدان میں جانے سے ہی ہلاکت ہوتی ہو، کیونکہ قتل سے بچنا تو موت

ہی سے بچنے کے لیے ہوتا ہے، جب گھر بیٹھے بھی وقت معین پر موت آجاتی ہے تو قتل بھی جس کے مقدر میں ہے نہیں ٹل سکتا)۔

اَلَّذِيْنَ قَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ: اس جگہ بھائیوں سے مراد مسلمان لوگ ہیں، کیونکہ مسلمان اکثر ان کے ہم نسب تھے، کیونکہ آگے ان قتل ہونے والوں کی فضیلت ذکر کی گئی ہے جس سے معلوم ہوا کہ یہاں بھائیوں سے مراد ہم مشرب بھائی یعنی منافق مراد نہیں ہیں، پس یہاں ان کا یہ کہنا کہ بے فائدہ قتل نہ کیے جاتے حسرت کی وجہ سے نہ تھا، بلکہ ان کے نزدیک مسلمانوں کی حماقت ظاہر کرنے کے لیے تھا، کیونکہ اس آیت میں حسرت وغیرہ کا ذکر نہیں، اور پیچھے آیت :لیجعل اللہ ذلک حسرۃ فی قلوبھم میں ان کی حسرت کا ذکر تھا، اس لیے بھائیوں سے عام مراد لیا گیا، ہم مشرب منافق بھی اور ہم نسب مسلمان بھی جیسا کہ پیچھے بیان ہو چکا ہے، اور بعض مفسرین نے یہاں بھی عام معنی مراد لیے ہیں وہ اگلی آیت کو تعریض پر محمول کرتے ہیں کہ اگر تمہارے منافق بھائی اللہ کی راہ میں شہید ہوئے جیسا کہ تم ایمان کا دعوی کرتے ہو تو پھر ان کے قتل کو بے فائدہ کیوں بتلاتے ہو، شہداء کی تو بڑی فضیلت ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی خود نامرد بن کر بیٹھ رہے اور اپنی برادری کے بھائیوں (انصار مدینہ) کو کہتے ہیں کہ ہماری بات مان کر گھر میں بیٹھے رہتے تو مارے نہ جاتے۔

فائدہ: ۲ یعنی اگر گھر میں بیٹھ رہنے سے جان بچ سکتی ہے تو دیکھیں موت کو گھر میں کس طرح نہ آنے دینگے، اگر یہاں رہ کر بھی موت پیچھا نہیں چھوڑتی تو پھر بہادروں کی طرح میدان میں عزت کی موت کیوں نہ مریں۔

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ﴿۱۶۹﴾

اور تو نہ سمجھ ان لوگوں کو جو مارے گئے اللہ کی راہ میں مردے، بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے رب کے پاس کھاتے پیتے

فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰىھُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِھٖ ۙ وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِھِمْ مِّنْ خَلْفِھِمْ ۙ

خوشی کرتے ہیں اس پر جو دیا انکو اللہ نے اپنے فضل سے اور خوش وقت ہوتے ہیں انکی طرف سے جو ابھی تک نہیں پہنچے انکے پاس انکے پیچھے سے

اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْھِمْ وَلَا ھُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۱۷۰﴾ يَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ

اس واسطے کہ نہ ڈر ہے ان پر اور نہ ان کو غم، خوش وقت ہوتے ہیں اللہ کی نعمت اور فضل سے، اور اس بات سے کہ اللہ

لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۷۱﴾

ضائع نہیں کرتا مزدوری ایمان والوں کی

خلاصہ تفسیر: منافقین شہدا کی موت کو ناکامی و حرمان کا موجب سمجھتے تھے، اس کے جواب کے لیے اب ان آیات میں حضرات شہداء کرام کی اعلی درجہ کی کامیابی اور حیات حقیقی اور دائمی نعمتوں کا اثبات بیان کرتے ہیں۔

اور (اے مخاطب!) جو لوگ اللہ تعالیٰ کی راہ میں (یعنی دین کے واسطے) قتل کیے گئے ان کو (اور مُردوں کی طرح) مُردہ مت خیال کر، بلکہ وہ لوگ (ایک ممتاز حیات کے ساتھ) زندہ ہیں (اور) اپنے پروردگار کے مقرب (یعنی مقبول ہیں) ان کو رزق بھی ملتا ہے۔

(اور) وہ خوش ہیں اس چیز سے جو ان کو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل (و کرم) سے عطا فرمائی (مثلاً درجات قرب وغیرہ یعنی ان کو رزق ظاہری بھی ملتا ہے اور رزق باطنی یعنی مسرت بھی) اور (جس طرح وہ اپنے حال پر خوش ہیں اس طرح) جو لوگ (ابھی دنیا میں زندہ ہیں اور) ان کے پاس نہیں پہنچے (بلکہ) ان سے پیچھے رہ گئے ہیں ان کی بھی اس حالت پر وہ (شہداء) خوش ہوتے ہیں کہ (اگر وہ بھی شہید ہو جائیں تو ہماری طرح) ان پر بھی کسی طرح

کا خوف واقع ہونے والا نہیں، اور نہ وہ (کسی طرح) مغموم ہوں گے (غرض ان کو دو خوشیاں ہیں، ایک اپنی بھی، دوسرے اپنے تعلق والوں کی بھی، آگے ان دونوں خوشیوں کا سبب یہ بتلایا کہ:) وہ (اپنی حالت پر تو) خوش ہوتے ہیں بوجہ نعمت و فضل خداوندی کے (جس کا انہوں نے مشاہدہ کر لیا) اور (دوسروں کی حالت پر خوش ہوتے ہیں) اس وجہ سے کہ (وہاں جا کر مشاہدہ کر لیا کہ) اللہ تعالیٰ اہل ایمان (کے اعمال) کا اجر ضائع نہیں کرتے (بلکہ جس درجہ کا عمل ہوتا ہے اسی درجہ کا اجر دیتے ہیں، پس شہادت جو افضل اعمال ہے اس پر سب سے بہتر اجر ملے گا جس کے لوازم میں یہ ہے کہ ذرا بھی خوف و غم نہ ہوگا، غرض یہ کہ جو لوگ ان کے متعلقین پیچھے رہ گئے اور نیک اعمال جہاد وغیرہ میں لگے ہیں ان کو بھی ایسے ہی انعامات ملیں گے)۔

بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ: شہداء کی حیات کی تحقیق دوسرے پارے کے شروع سورہ بقرہ آیت ۱۵۴: وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ میں گزر چکی ہے وہاں ملاحظہ فرمایئے، اور رزق ملنے کی کیفیت صحیح احادیث میں وارد ہے کہ ان کی روحیں عرش کی قندیلوں میں رہتی ہیں اور جنت کی نہروں سے پانی پیتے ہیں اور اس کے پھل کھاتے ہیں، میں کہتا ہوں کہ یہ نہریں اور پھل جنت کے اندر ہونا ضروری نہیں، بلکہ ان کا تعلق جنت سے ہوگا، پس یہ اشکال نہ رہا کہ جنت میں جانے کے بعد وہاں سے قیامت میں باہر کیسے آئیں گے۔

* * *

فائدہ: یعنی گھر میں بیٹھے رہنے سے موت تو رک نہیں سکتی، ہاں! آدمی اس موت سے محروم رہتا ہے جس کو موت کے بجائے حیات جاودانی کہنا چاہئے، شہیدوں کو مرنے کے بعد ایک خاص طرح کی زندگی ملتی ہے جو اور مُردوں کو نہیں ملتی، ان کو حق تعالیٰ کا ممتاز قرب حاصل ہوتا ہے، بڑے عالی درجات و مقامات پر فائز ہوتے ہیں، جنت کا رزق آزادی سے پہنچتا ہے، جس طرح ہم اعلیٰ درجہ کے ہوائی جہازوں میں بیٹھ کر ذرا سی دیر میں جہاں چاہیں اڑے چلے جاتے ہیں، شہداء کی ارواح "حواصل طیور خضر" میں داخل ہو کر جنت کی سیر کرتی رہتی ہیں، ان "طیور خضر" کی کیفیت و کلانی کو اللہ ہی جانے، وہاں کی چیزیں ہمارے احاطہ خیال میں کہاں آسکتی ہیں، اس وقت شہداء بے حد مسرور و مبتہج ہوتے ہیں کہ اللہ نے اپنے فضل سے دولت شہادت عنایت فرمائی، اپنی عظیم نعمتوں سے نوازا اور اپنے فضل سے ہر آن مزید انعامات کا سلسلہ قائم کر دیا، جو وعدے شہیدوں کے لئے پیغمبر ﷺ کی زبانی کئے گئے تھے انہیں آنکھوں سے مشاہدہ کر کے بے انتہا خوش ہوتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کی محنت ضائع نہیں کرتا، بلکہ خیال و گمان سے بڑھ کر بدلہ دیتا ہے، پھر نہ صرف یہ کہ اپنی حالت پر شاداں و فرحاں ہوتے ہیں، بلکہ اپنے ان مسلمان بھائیوں کا تصور کر کے بھی انہیں ایک خاص خوشی حاصل ہوتی ہے جن کو اپنے پیچھے جہاد فی سبیل اللہ اور دوسرے امور خیر میں مشغول چھوڑ آئے ہیں کہ وہ بھی اگر ہماری طرح اللہ کی راہ میں مارے گئے، یا کم از کم ایمان پر مرے تو اپنی اپنی حیثیت کے موافق ایسی ہی پر لطف اور بے خوف زندگی کے مزے لوٹیں گے، نہ ان کو اپنے آگے کا ڈر ہوگا نہ پیچھے کا غم، مامون و مطمئن سیدھے خدا کی رحمت میں داخل ہو جائیں گے۔

بعض روایات میں ہے کہ شہدائے احد یا شہدائے بیر معونہ نے خدا کے ہاں پہنچ کر تمنا کی تھی کاش! ہمارے اس عیش و تنعم کی خبر کوئی ہمارے بھائیوں کو پہنچا دے تا کہ وہ بھی اس زندگی کی طرف جھپٹیں اور جہاد سے جان نہ چرائیں، حق تعالیٰ نے فرمایا کہ میں پہنچاتا ہوں، اس پر یہ آیات نازل کیں اور ان کو مطلع کر دیا گیا کہ ہم نے تمہاری تمنا کے موافق خبر پہنچا دی، اس پر وہ اور زیادہ خوش ہوئے۔

اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ۛؕ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ

جن لوگوں نے حکم مانا اللہ کا اور رسول ﷺ کا بعد اس کے کہ پہنچ چکے تھے ان کو زخم، جو اُن میں نیک ہیں

وَاتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۷۲﴾ اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ

اور پرہیزگار ان کو ثواب بڑا ہے، جن کو کہا لوگوں نے کہ مکہ والے آدمیوں نے جمع کیا ہے سامان تمہارے مقابلہ کو سو تم ان سے ڈرو

فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا ۖ وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ﴿۱۷۳﴾ فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ

تو اور زیادہ ہوا اُن کا ایمان، اور بولے کافی ہے ہم کو اللہ اور کیا خوب کارساز ہے ۔ل پھر چلے آئے مسلمان اللہ کے احسان اور فضل کے ساتھ

لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ ۙ وَّاتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۷۴﴾

کچھ نہ پہنچی ان کو برائی، اور تابع ہوئے اللہ کی مرضی کے، اور اللہ کا فضل بڑا ہے ۔۲

خلاصہ تفسیر: اوپر غزوہ احد کے قصہ کا ذکر تھا، مذکورہ آیات میں اسی غزوہ سے متعلق ایک دوسرے غزوہ کا ذکر ہے جو غزوہ حمراء الاسد کے نام سے مشہور ہے جس کی طرف کچھ اشارہ پیچھے آیت: سنلقی فی قلوب الذین کفروا الرعب میں ہو چکا ہے، وہ یہ کہ جب کفار میدان احد سے مکہ کو واپس ہوئے تو راستہ میں ان کو اس پر افسوس ہوا کہ ہم غالب ہونے کے باوجود ناحق لوٹ آئے، اب چل کر سب قلع قمع کر دینا چاہیے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کا ارادہ وحی سے معلوم ہو گیا، آپ ان کے تعاقب میں حمراء الاسد تک پہنچے جو مدینہ سے آٹھ میل کے فاصلہ پر ہے، وہاں آپ نے تین روز ۱۷، ۱۸، ۱۹ شوال پیر، منگل، بدھ تک قیام فرمایا، اللہ تعالیٰ نے کفار کے دلوں میں رعب ڈال دیا، وہ پھر مکہ ہی کی طرف ہو لیے، راستہ میں ان کی معبد خزاعی سے مقام روحاء میں ملاقات ہوئی جو حضور کی قیام گاہ سے ہو کر مکہ کی طرف جا رہے تھے، کفار نے ان سے مسلمانوں کی خبر پوچھی اگرچہ اس وقت تک وہ مسلمان نہ تھے مگر حضور کے خیر خواہ تھے، انہوں نے مسلمانوں کی خداداد شان و شوکت کو عمدہ الفاظ میں بیان کیا، اس سے کفار کے حوصلے بالکل پست ہو گئے اور بدستور مکہ جانے کا عزم پختہ کر لیا اور چل دیے۔

جن لوگوں نے اللہ و رسول کے کہنے کو (جبکہ کفار کے تعاقب کے لئے ان کو بلایا گیا) قبول کر لیا بعد اس کے کہ ان کو (ابھی تازہ) زخم (لڑائی میں) لگا تھا ان لوگوں میں جو نیک اور متقی ہیں (اور واقع میں سب ہی ایسے ہیں) ان کے لئے (آخرت میں) ثواب عظیم ہے، یہ ایسے (مخلص) لوگ ہیں کہ (بعض) لوگوں نے (یعنی عبدالقیس والوں نے جو) ان سے (آ کر) کہا کہ ان لوگوں (یعنی اہل مکہ نے) تمہارے (مقابلہ کے) لئے (بڑا) سامان جمع کیا ہے، سو تم کو ان سے اندیشہ کرنا چاہئے تو اس (خبر) نے ان کے (جوش) ایمان کو اور زیادہ کر دیا اور (نہایت استقلال سے یہ) کہہ (کر بات کو ختم کر) دیا کہ ہم کو حق تعالیٰ (مشکلات کے لئے) کافی ہے اور وہی سب کام سپرد کرنے کے لئے اچھا ہے (اسی سپرد کرنے کو توکل کہتے ہیں) پس یہ لوگ خدا کی نعمت اور فضل سے (یعنی ثواب اور نفع تجارت سے) بھرے ہوئے واپس آئے کہ ان کو کوئی ناگواری پیش نہیں آئی، اور وہ لوگ (اس واقعہ میں) رضائے حق کے تابع رہے (اس کی بدولت اپنی دنیوی نعمتوں سے سرفراز ہوئے) اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل والا ہے۔

لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا: یعنی ان لوگوں میں جو نیک اور متقی ہیں، مطلب یہ کہ واقع میں تو سب صحابہ ہی ایسے ہیں، یہاں اس سے مقصود ان کے اوصاف کا ظاہر کرنا اور اجر عظیم کے مستحق ہونے کی وجہ بتلانا ہے کہ ان باتوں کی وجہ سے وہ عظیم ثواب کے مستحق ہوئے، یہ مقصود نہیں کہ بعض ان میں سے اچھے کام کرنے والے یا تقوی کرنے والے نہیں بھی ہیں۔

* * *

فائدہ: ۔ل ابوسفیان جب احد سے مکہ کو واپس گیا تو راستہ میں خیال آیا کہ ہم نے بڑی غلطی کی، ہزیمت یافتہ اور زخم خوردہ مسلمانوں کو یونہی چھوڑ کر چلے آئے، مشورے ہونے لگے کہ پھر مدینہ واپس چل کر ان کا قصہ تمام کر دیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی تو اعلان فرمادیا کہ جو لوگ کل ہمارے ساتھ لڑائی میں حاضر تھے آج دشمن کا تعاقب کرنے کیلئے تیار ہو جائیں، مسلمان مجاہدین باوجودیکہ تازہ زخم کھائے ہوئے تھے، اللہ اور رسول کی پکار پر نکل پڑے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان مجاہدین کی جمعیت لے کر مقام حمراء الاسد تک (جو مدینہ سے آٹھ میل ہے) پہنچے، ابوسفیان کے دل میں یہ سن کر کہ مسلمان اس کے تعاقب میں چلے آ رہے ہیں، سخت رعب و دہشت طاری ہو گئی، دوبارہ حملہ کا ارادہ فسخ کر کے مکہ کی طرف بھاگا، عبدالقیس کا ایک تجارتی قافلہ مدینہ آ رہا

تھا، ابوسفیان نے ان لوگوں کو کچھ دے کر آمادہ کیا کہ وہ مدینہ پہنچ کر ایسی خبریں شائع کریں جن کو سن کر مسلمان ہماری طرف سے مرعوب وخوفزدہ ہوجائیں ،انہوں نے مدینہ پہنچ کر کہنا شروع کیا کہ مکہ والوں نے بڑا بھاری لشکر اور سامان مسلمانوں کے استیصال کی غرض سے تیار کیا ہے، یہ سن کر مسلمانوں کے دلوں میں خوف کی جگہ جوش ایمان بڑھ گیا اور کفار کی جمعیت کا حال سن کر کہنے لگے: حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ساری دنیا کے مقابلہ میں اکیلا خدا ہم کو کافی ہے، اسی پر یہ آیات نازل ہوئیں، بعض کہتے ہیں کہ جنگ احد تمام ہونے پر ابوسفیان نے اعلان کیا تھا کہ اگلے سال بدر پر پھر لڑائی ہے، حضرت ﷺ نے قبول کرلیا، جب اگلا سال آیا حضرت محمد ﷺ نے لوگوں کو حکم دیا کہ جہاد کیلئے چلو، اگر کوئی نہ جائے گا تب بھی اللہ کا رسول تنہا جائیگا، ادھر سے ابوسفیان فوج لے کر مکہ سے نکلا تھوڑی دور چل کر کمر ہمت ٹوٹ گئی، رعب چھا گیا، قحط سالی کا عذر کر کے چاہا مکہ واپس جائے، مگر صورت ایسی ہو کہ الزام مسلمانوں پر رہے، ایک شخص مدینہ جاتا تھا، اس کو کچھ دینا کیا کہ وہاں پہنچ کر اس طرف کی ایسی خبریں مشہور کرنا جن کو سن کر مسلمان خوف کھائیں اور جنگ کو نہ نکلیں وہ مدینہ پہنچ کر کہنے لگا کہ مکہ والوں نے بڑی بھاری جمعیت اکٹھی کی ہے، تم کو لڑنا بہتر نہیں، مسلمانوں کو حق تعالیٰ نے استقلال دیا، انہوں نے یہ ہی کہا کہ ہم کو اللہ کافی ہے، آخر مسلمان حسب وعدہ بدر پہنچے، وہاں بڑا بازار لگتا تھا، تین روز رہ کر تجارت کر کے خوب نفع کما کر مدینہ واپس آئے، اس غزوہ کو "بدر صغریٰ" کہتے ہیں، اس وقت جن لوگوں نے رفاقت کی اور تیار ہوئے ان کو بشارت ہے کہ احد میں زخم کھا کر اور نقصان اٹھا کر پھر ایسی جرات کی، مسلمانوں کی اس جرات و مستعدی کی خبر سن کر مشرکین راستہ سے لوٹ گئے، چنانچہ مکہ والوں نے اس مہم کا نام "جیش السویق" رکھ دیا، یعنی وہ لشکر جو محض ستو پینے گیا تھا، پی کر واپس آ گیا۔

تنبیہ: یہ جو فرمایا: لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا محض انکی مدح سرائی اور تنویہ شان کیلئے ہے، ورنہ وہ سب کے سب ایسے ہی تھے۔

فائدہ: ۲ یعنی اللہ کا فضل دیکھو، نہ کچھ لڑائی کرنی پڑی نہ کانٹا چبھا، مفت میں ثواب کمایا، تجارت میں نفع حاصل کر کے اور دشمنوں پر دھاک بٹھلا کر خدا تعالیٰ کی خوشنودی لیے ہوئے صحیح سلامت گھر واپس آ گئے۔

تنبیہ: بدر صغریٰ کی طرح غزوہ حمراء الاسد میں بھی ایک تجارتی قافلہ کے ساتھ سامان کی خرید وفروخت ہوئی تھی اور مسلمانوں نے بھاری نفع کمایا تھا، غالباً "فضل" سے یہ ہی مالی نفع مراد ہے۔

اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطٰنُ يُخَوِّفُ اَوْلِيَآءَهٗ ۪ فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَخَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۷۵﴾

یہ جو ہے سو شیطان ہے کہ ڈراتا ہے اپنے دوستوں سے، سو تم ان سے مت ڈرو اور مجھ سے ڈرو اگر ایمان رکھتے ہو

خلاصہ تفسیر: (مسلمانو!) اس سے زیادہ کوئی (قابل اندیشہ) بات نہیں کہ یہ مخبر (فعلاً) شیطان ہے کہ اپنے (ہم مذہب) دوستوں سے (تم کو) ڈرا (ناچاہ) تا ہے، سو تم ان سے کبھی مت ڈرنا، اور صرف مجھ ہی سے ڈرنا اگر تم ایمان والے ہو۔

اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطٰنُ يُخَوِّفُ اَوْلِيَآءَهٗ ۪ فَلَا تَخَافُوْهُمْ: اس میں اس مقولہ کی اصل ہے جو بعض بزرگوں سے منقول ہے کہ انہوں نے اعوذ باللہ پڑھی، پھر شیطان کو مخاطب کیا کہ تو میرے استعاذہ سے یہ نہ سمجھنا کہ میں تجھ سے ڈرتا ہوں، یا میں تجھے اپنے دل میں کچھ باوقعت سمجھتا ہوں، میں نے محض اللہ کے حکم کو بجالانے کے لیے استعاذہ پڑھا ہے ورنہ تو میری آنکھ میں اتنی قدر و اہمیت نہیں رکھتا کہ میں تجھ سے استعاذہ کروں۔

* * *

فائدہ: یعنی جو ادھر سے آکر مرعوب کن خبریں پھیلاتا ہے وہ شیطان ہے، یا شیطان کے اغواء سے ایسا کر رہا ہے، جس کی غرض یہ ہے کہ اپنے چیلے چانٹوں اور بھائی بندوں کا رعب تم پر بٹھلا کر خوفزدہ کر دے، سو تم اگر ایمان رکھتے ہو (اور ضرور رکھتے ہو جس کا ثبوت عملاً دے چکے) تو ان شیطانوں سے اصلاً مت ڈرو صرف مجھ سے ڈرتے رہو کہ:

هر که ترسید از حق و تقویٰ گزید ترسد ازوے جن و انس و هر که دید

وَلَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ ۚ اِنَّهُمْ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا ۗ يُرِيْدُ اللّٰهُ

اور غم میں نہ ڈالیں تجھ کو وہ لوگ جو دوڑتے ہیں کفر کی طرف، وہ نہ بگاڑیں گے اللہ کا کچھ، اللہ چاہتا ہے

اَلَّا يَجْعَلَ لَهُمْ حَظًّا فِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۷۶﴾

کہ ان کو فائدہ نہ دے آخرت میں، اور ان کے لئے عذاب ہے بڑا

خلاصہ تفسیر: گذشتہ آیات میں منافقین کی بے وفائی، بدخواہی کا ذکر تھا، اب رسول اللہ ﷺ کو تسلی ہے کہ آپ ان کفار کی حرکتوں سے رنجیدہ اور شکستہ خاطر نہ ہوں، وہ کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔

اور آپ کے لیے وہ لوگ موجب غم نہ ہونے چاہئیں جو جلدی سے کفر (کی باتوں) میں جا پڑتے ہیں (جیسے منافقین کہ ذرا مسلمانوں کا پلہ ہلکا دیکھا تو فوراً ہی کفر کی باتیں کھلم کھلا کرنے لگتے ہیں، جیسا کہ واقعات میں معلوم ہو چکا ہے) یقیناً وہ لوگ اللہ تعالیٰ (کے دین) کو ذرہ برابر بھی ضرر نہیں پہنچا سکتے (اس لئے آپ کو یہ غم تو ہونا نہیں چاہئے کہ ان کی حرکتوں سے اللہ کے دین کو نقصان پہنچ جائے گا، اور اگر آپ کو خود ان کافروں کا غم ہو کہ یہ بدنصیب کیوں جہنم کی طرف جا رہے ہیں تو بھی آپ غم نہ کریں) کیونکہ اللہ تعالیٰ کو (تکوینی طور پر) یہ منظور ہے کہ آخرت میں ان کو کوئی حصہ نہ دے (اس لئے ان سے موافقت کی امید رکھنا صحیح نہیں، اور رنج وہیں ہوتا ہے جہاں امید ہو، جب ان سے امید ہی نہ رکھی جائے تو پھر رنج بھی نہ ہوگا) اور (ان کے لئے صرف آخرت کی نعمتوں سے محرومی ہی نہیں، بلکہ) ان لوگوں کو سزائے عظیم بھی ہوگی۔

اس جگہ اگر کسی کے ذہن میں مسئلہ تقدیر کے متعلق خلجان ہو تو پہلے پارہ کے شروع میں آیت: **ان الذین کفروا سواء علیھم** اور آیت: **ختم اللہ علی قلوبھم** کی تفسیر دیکھ لے۔

* * *

فائدہ: یعنی شیطان کی دھمکیوں سے مومن نہیں ڈرتے، ہاں! منافق اس کی باتیں سن کر کفر کی طرف دوڑتے ہیں، آپ ان ملعون منافقوں کی حرکات سے کچھ غمگین اور فکرمند نہ ہوں، یہ اللہ کے دین اور اس کے پیغمبر کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، اپنا ہی نقصان کرتے ہیں، ان کا حد سے زیادہ نفاق و شقاق پتہ دے رہا ہے کہ حق تعالیٰ انہیں انجام کار حقیقی کامیابی اور فوائد سے محروم رکھے گا اور بہت سخت سزا دے گا، جو لوگ ایسے معاند اور شریر کج رو ہوں اللہ کی عادت ان کے ساتھ یہی ہے، ایسوں کے غم میں اپنے کو زیادہ گھلانے کی ضرورت نہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۷﴾

جنہوں نے مول لیا کفر کو ایمان کے بدلے وہ نہ بگاڑیں گے اللہ کا کچھ، اور ان کے لئے عذاب ہے دردناک

خلاصہ تفسیر: (اور جس طرح وہ لوگ دین اسلام کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے، اسی طرح) یقیناً جتنے لوگوں نے ایمان (کو چھوڑ کر اس) کی جگہ کفر کو اختیار کر رکھا ہے (خواہ منافق ہوں یا کھلے کافر اور خواہ پاس کے ہوں یا دور کے) یہ لوگ (بھی) اللہ تعالیٰ (کے دین) کو ذرہ برابر ضرر نہیں پہنچا سکتے، اور ان کو (بھی پہلے لوگوں کی طرح) دردناک سزا ہوگی۔

* * *

فائدہ: یعنی جنہوں نے ایمانی فطرت کو بدل کر کفر اختیار کیا، خواہ یہود و نصاریٰ ہوں یا مشرکین، یا منافقین، یا کوئی اور وہ سب مل کر بھی اللہ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، ہاں! اپنے پاؤں پر خود اپنے ہاتھ سے کلہاڑی مار رہے ہیں، جس کا نتیجہ دردناک عذاب کی صورت میں بھگتنا پڑیگا۔

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ خَيْرٌ لِّاَنْفُسِهِمْ ؕ اِنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ لِيَزْدَادُوْٓا اِثْمًا ۚ

اور یہ نہ سمجھیں کافر کہ ہم جو مہلت دیتے ہیں ان کو کچھ بھلا ہے ان کے حق میں، ہم تو مہلت دیتے ہیں ان کو تا کہ ترقی کریں وہ گناہ میں

وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۱۷۸﴾

اور ان کے لئے عذاب ہے خوار کرنیوالا

خلاصہ تفسیر: پیچھے کفار کو عظیم عذاب کا مستحق فرمایا، چونکہ وہ عذاب آخرت کے منکر تھے اور یہ استدلال کرتے تھے کہ جب ہم اس دنیا میں آرام وآسائش میں ہیں تو معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ ہم سے خوش ہیں، پھر اگر آخرت کوئی چیز ہے تو وہاں بھی آرام میں رہیں گے، یا اس خیال کا جواب ہے کہ بظاہر تو دنیا میں یہ کفار پھلتے پھولتے نظر آتے ہیں تو ان کو مقہور ومغضوب کیسے سمجھا جائے؟ اللہ تعالیٰ اس خیال کو باطل فرماتے ہیں کہ:

اور جو لوگ کفر کر رہے ہیں وہ یہ خیال ہرگز نہ کریں کہ ہمارا اُن کو (عذاب سے) مہلت دینا (کچھ) ان کے لئے بہتر (اور مفید) ہے (ہرگز نہیں! بلکہ) ہم ان کو اس لئے مہلت دے رہے ہیں (تاکہ زندگی اور عمر دراز ہونے کی وجہ سے) ان کو جرم میں اور ترقی ہو جائے (تاکہ یک بارگی پوری سزا ملے گی) اور (دنیا میں اگر سزا نہ ہوئی تو کیا ہے آخرت میں تو) ان کو توہین آمیز سزا ہو گی۔

یعنی کفار کی اس چند روزہ مہلت اور عیش وعشرت سے مسلمان پریشان نہ ہوں، کیونکہ باوجود کفر وعصیان کے انہیں دنیوی قوت، طاقت، سامان دینا یہ بھی ان کے عذاب ہی کی ایک صورت ہے جس کا احساس آج نہیں، دنیا سے جانے کے بعد ہوگا کہ یہ دنیا کا سامان راحت جو انہوں نے گناہوں میں خرچ کیا درحقیقت جہنم کے انگارے تھے، جیسا کئی آیتوں میں حق تعالیٰ نے فرمایا: انما یرید اللہ لیعذبھم بھا، یعنی کفار کے اموال اور عیش وعشرت ان کے لئے کوئی فخر کرنے کی چیز نہیں، یہ تو اللہ کی طرف سے عذاب ہی کی ایک قسط ہے، جو ان کے عذاب آخرت بڑھانے کا سبب ہے۔

اَنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ خَيْرٌ لِّاَنْفُسِهِمْ: مہلت کا مفید اور نافع نہ ہونا کفار کے ساتھ اس لیے مخصوص ہے کہ مسلمان کو جس قدر عمر ملتی ہے وہ اس کے لیے نافع ہے، کیونکہ اسلام کی وجہ سے زیادہ اطاعت اور نیکی کا موقع ملے گا اور زیادہ درجات ملیں گے، ہاں اگر اسلام کے مطابق عمل ہی نہ کیے تو اور بات ہے، اور کافر کے لیے زیادہ عمر ہونا کفر کی وجہ سے نقصان کا باعث ہے، ہاں اگر تائب ہو کر ایمان سے مشرف ہو جائے تو اور بات ہے۔

اِنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ لِيَزْدَادُوْٓا اِثْمًا: اس پر یہ شبہ نہ کیا جائے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ان کو اسی لیے مہلت دی ہے کہ وہ اور زیادہ جرم کریں تو پھر زیادہ جرم کرنے سے عذاب کیوں ہوگا؟ جواب یہ ہے کہ اس کلام کی اصل یہ تھی کہ ہم ان کو اس لیے مہلت دے رہے ہیں تاکہ ان کو زیادہ عذاب دیں، کیونکہ وہ مہلت دینے سے اور زیادہ جرم کریں گے، پس مہلت دینے کا اصلی سبب یہ ہے کہ زیادہ عذاب دینا منظور ہے، مہلت دینے کا سبب یہ نہیں کہ زیادہ جرم کریں، بلکہ یہ تو سبب کا سبب ہے، جس کو سبب کے قائم مقام بیان کیا گیا تاکہ معلوم ہو جائے کہ یہ کافر ایسے ناقدرے ہیں کہ جس قدر ان کو مہلت ملتی ہے اسی قدر جرم کرتے ہیں، اس کی مثال ایسی ہے کہ استاذ ایک شوخ لڑکے کو شرارت کرتے ہوئے دیکھے اور غصہ کو ضبط کر کے کہے کہ ابھی کچھ نہیں کہتا تاکہ تو خوب پیٹ بھر کر شرارتیں کر لے، اب یہ کون عقل مند سمجھ سکتا ہے کہ استاذ کا مقصود یہ ہے کہ شرارت زیادہ کرے، استاذ کا مقصود تو زیادہ سزا دینا ہے، مگر اس مقصود کی جگہ اس کی وجہ کو بیان کر دیتے ہیں۔

* * *

فائدہ: یعنی ممکن ہے کافروں کو اپنی لمبی عمریں خوشحالی اور دولت وثروت وغیرہ کی فراوانی دیکھ کر خیال گزرے کہ ایسے مغضوب ومطرود ہوتے تو ہم کو اتنی فراخی اور مہلت کیوں دی جاتی اور ایسی بھلی حالت میں کیوں رکھے جاتے؟ سو واضح رہے کہ یہ مہلت دینا ان کے حق میں کچھ بھلی بات نہیں، مہلت دینے کا نتیجہ تو یہ ہی ہوگا کہ جن کو گناہ سمیت کفر پر مرنا ہے وہ اپنے اختیار اور آزادی سے خوب جی بھر کر ارمان نکال لیں اور گناہوں کا ذخیرہ فراہم کر لیں، وہ سمجھتے رہیں کہ ہم بڑی عزت سے ہیں، حالانکہ ذلیل وخوار کرنے والا عذاب ان کے لئے تیار ہے، اب سوچ لیں کہ مہلت دینا ان جیسوں

کے حق میں بھلا ہوا یا برا، نعوذ باللہ من شرور انفسنا۔

مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ ؕ

اللہ وہ نہیں کہ چھوڑ دے مسلمانوں کو اس حالت پر جس پر تم ہو جب تک کہ جدا نہ کر دے ناپاک کو پاک سے

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۪ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ

اور اللہ نہیں ہے کہ تم کو خبر دے غیب کی لیکن اللہ چھانٹ لیتا ہے اپنے رسولوں میں جس کو چاہے ۔ سو تم یقین لاؤ اللہ پر

وَرُسُلِهٖ ۚ وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۷۹﴾

اور اس کے رسولوں پر، اور اگر تم یقین پر رہو اور پرہیزگاری پر تو تم کو بڑا ثواب ہے ۔

خلاصہ تفسیر: گذشتہ آیت میں اس شبہ کا جواب تھا کہ جب کفار اللہ تعالیٰ کے نزدیک مبغوض اور مردود ہیں تو دنیا میں ان کو مال اور عیش و عشرت کے سامان کیوں حاصل ہیں؟ مذکورہ آیت میں اس کے بالمقابل اس شبہ کا ازالہ ہے کہ مومن مسلمان جو اللہ کے مقبول بندے ہیں ان پر تکالیف و مصائب کیوں آتے ہیں؟ مقبولیت کا تقاضا تو یہ تھا کہ راحتیں اور سامان راحت ان کو ملتا۔

اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اس حالت پر رکھنا نہیں چاہتا جس پر تم اب ہو (کہ کفر و ایمان، حق و باطل اور مومن و منافق میں اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے دنیوی انعامات کے اعتبار سے کوئی امتیاز اور فرق نہیں، بلکہ مسلمانوں پر شدائد و مصائب کا نازل ہوتے رہنا اس وقت تک ضروری ہے) جب تک کہ ناپاک (یعنی منافق) کو پاک (یعنی مومن مخلص) سے ممتاز نہ کر دیا جائے (اور یہ امتیاز مشکلات کے پیش آنے پر ہی پوری طرح ہو سکتا ہے)۔

(اور اگر کسی کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ مومن و کافر اور حق و باطل میں امتیاز پیدا کرنے کے لئے کیا ضروری ہے کہ مصائب و حوادث ڈال کر ہی یہ امتیاز حاصل کیا جائے؟ اللہ تعالیٰ بذریعہ وحی اس کا اعلان فرما سکتے ہیں کہ فلاں مومن مخلص ہے اور فلاں منافق، اور فلاں چیز حلال ہے فلاں حرام، تو اس کا جواب یہ ہے کہ:) اللہ تعالیٰ (کی حکمت کا تقاضہ یہ ہے کہ) ایسے امور غیبیہ پر تم کو (ابتلاء و امتحان کے بغیر) مطلع نہیں کر (ناچاہ) تے، لیکن ہاں! جس کو (اس طرح مطلع کرنا) خود چاہیں، اور (ایسے حضرات) وہ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر ہیں ان کو (مصائب و حوادث کے بغیر بھی غیبی خبروں پر مطلع کرنے کے لئے اپنے بندوں میں سے) منتخب فرما لیتے ہیں (اور تم پیغمبر ہو نہیں، اس لئے ایسے امور کی اطلاع نہیں دی جا سکتی، البتہ ایسے حالات پیدا فرماتے ہیں کہ ان سے مخلص و منافق کا فرق خود بخود واضح ہو جائے)۔

(جب یہ ثابت ہو گیا کہ دنیا میں کافروں پر عذاب نازل نہ ہونا بلکہ عیش و عشرت ملنا، اور مسلمانوں پر بعض مصائب و مشکلات کا نازل ہونا عین تقاضائے حکمت ہے، یہ باتیں کسی کے مقبول یا مردود ہونے کی دلیل نہیں ہو سکتیں) پس اب تم (ایمان کے پسندیدہ اور کفر کے ناپسندیدہ ہونے میں کوئی شبہ نہ کرو، بلکہ) اللہ پر اور اس کے سب رسولوں پر ایمان لے آؤ، اور اگر تم ایمان لے آؤ اور (کفر و معاصی سے) پرہیز رکھو تو پھر تم کو اجر عظیم ملے۔

حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ: یہاں ایک حکمت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اگر مسلمانوں کو بذریعہ وحی بتلا دیا جائے کہ فلاں منافق ہے تو مسلمانوں کو اس سے قطع تعلق اور معاملات میں احتیاط کے لئے کوئی ایسی واضح حجت نہ ہوتی جس کو منافق بھی تسلیم کر لیں، وہ کہتے کہ تم غلط کہتے ہو، ہم تو پکے سچے مسلمان ہیں، بخلاف اس پر عملی امتیاز کے جو مصائب کے ابتلاء کے ذریعہ ہوا کہ منافق بھاگ کھڑے ہوئے عملی طور پر ان کا نفاق کھل گیا، اب ان کا یہ منہ نہیں رہا کہ مومن مخلص ہونے کا دعویٰ کریں، اور اس طرح نفاق کھل جانے کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ مسلمانوں کا ان کے ساتھ ظاہری اختلاط بھی قطع ہو، ورنہ دل میں اختلاف کے باوجود ظاہری اختلاط رہتا تو وہ بھی مضر ہی ہوتا۔

لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ: اس آیت سے معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ امور غیب پر بذریعہ وحی اطلاع ہر شخص کو نہیں دیتے، البتہ اپنے انبیاء کا انتخاب کرکے ان کو دیتے ہیں، اس سے یہ شبہ نہ کیا جائے کہ پھر تو انبیاء بھی علم غیب کے شریک اور عالم الغیب ہو گئے، کیونکہ وہ علم غیب جو حق تعالیٰ کی ذات کے ساتھ مخصوص ہے کسی مخلوق کو اس میں شریک قرار دینا شرک ہے، وہ دو چیزوں کے ساتھ مشروط ہے: ① ایک یہ کہ وہ علم ذاتی ہو، کسی دوسرے کا دیا ہوا نہ ہو ② دوسرے تمام کائنات ماضی و مستقبل کا علم محیط ہو، جس سے کسی ذرے کا علم بھی مخفی نہ ہو، حق تعالیٰ خود بذریعہ وحی اپنے انبیاء کو جو امور غیبیہ بتلاتے ہیں وہ حقیقۃً علم غیب نہیں ہے، بلکہ غیب کی خبریں ہیں جو انبیاء کو دی گئی ہیں، جن کو خود قرآن کریم نے کئی جگہ ''انباء الغیب'' کے لفظ سے تعبیر فرمایا: **ذلك من انبآء الغيب نوحيها اليك**۔

فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ: یہ جو آخر میں فرمایا کہ ''سب رسولوں پر ایمان لاؤ'' حالانکہ مقام کا تقاضا تو یہ ہے کہ محمد ﷺ پر ایمان لاؤ، وجہ اس کی یہ ہے کہ آپ ﷺ پر ایمان لانا اسی وقت صحیح ہو سکتا ہے جبکہ سب پیغمبروں پر ایمان لایا جائے، کیونکہ ایک پیغمبر کو جھٹلانا سب کو جھٹلانا ہے، اسی لیے فرمایا کہ سب رسولوں پر ایمان لاؤ۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی جس طرح خوشحالی اور مہلت دینا کفار کے حق میں مقبولیت کی دلیل نہیں، اسی طرح اگر مخلص مسلمانوں کو مصائب اور ناخوشگوار حوادث پیش آئیں (جیسے جنگ احد میں آئے) یہ اس کی دلیل نہیں کہ وہ اللہ کے نزدیک مغضوب ہیں، بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اس گول مول حالت پر چھوڑنا نہیں چاہتا جس پر اب تک رہے ہیں، یعنی بہت سے کافر ازراہِ نفاق کلمہ پڑھ کر دھوکہ دینے کے لئے ان میں ملے جلے رہتے تھے، جن کے ظاہر حال پر منافق کا لفظ کہنا مشکل تھا، لہٰذا ضروری ہے کہ خدا تعالیٰ ایسے واقعات وحالات بروئے کار لائے جو کھرے کو کھوٹے سے اور پاک کو ناپاک سے کھلے طور پر جدا کر دیں، بیشک خدا کو آسان تھا کہ تمام مسلمانوں کو بدون امتحان میں ڈالے منافقوں کے ناموں اور کاموں سے مطلع کر دیتا، لیکن اس کی حکمت و مصلحت مقتضی نہیں کہ سب لوگوں کو اس قسم کے غیوب سے آگاہ کر دیا کرے، ہاں! وہ اپنے رسولوں کا انتخاب کر کے جس قدر غیوب کی یقینی اطلاع دینا چاہے دے دیتا ہے، خلاصہ یہ ہوا کہ عام لوگوں کو بلا واسطہ کسی غیب کی یقینی اطلاع نہیں دی جاتی انبیاء علیہم السلام کو دی جاتی ہے، مگر جس قدر خدا چاہے۔

فائدہ: ۲ یعنی خدا کا جو خاص معاملہ پیغمبروں سے ہے اور پاک و ناپاک کو جدا کرنے کی نسبت جو عام عادت حق تعالیٰ کی رہی ہے، اس میں زیادہ کاوش کی ضرورت نہیں، تمہارا کام یہ ہے کہ اللہ و رسول کی باتوں پر یقین رکھو اور تقویٰ و پرہیزگاری پر قائم رہو، یہ کر لیا تو سب کچھ کما لیا۔

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ؕ

اور نہ خیال کریں وہ لوگ جو بخل کرتے ہیں اس چیز پر جو اللہ نے انکو دی ہے اپنے فضل سے کہ یہ بخل بہتر ہے انکے حق میں، بلکہ یہ بہت برا ہے انکے حق میں

سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ

طوق بنا کر ڈالا جائے گا ان کے گلوں میں وہ مال جس میں بخل کیا تھا قیامت کے دن ۱ اور اللہ وارث ہے آسمان اور زمین کا ۲

وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۱۸۰﴾ ع

اور اللہ جو کرتے ہو سو جانتا ہے ۳

خلاصہ تفسیر: سورہ آل عمران کے شروع میں یہودیوں کی بری خصلتوں اور شرارتوں کا ذکر تھا، یہاں سے پھر اسی کی طرف رجوع کیا گیا، مذکورہ اور آگے دیگر آیات سب اسی طرح کے مضامین پر مشتمل ہیں۔

اور ہرگز نہ خیال کریں ایسے لوگ جو (ضروری مواقع میں) ایسی چیز (کے خرچ کرنے) میں بخل کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے فضل سے دی ہے کہ یہ بات ان کے لئے کچھ اچھی ہوگی (ہرگز نہیں!) بلکہ یہ بات ان کے لئے بہت ہی بری ہے (کیونکہ انجام اس کا یہ ہوگا کہ) وہ لوگ قیامت کے روز طوق پہنائے جائیں گے اس (مال) کا (سانپ بنا کر) جس میں انہوں نے بخل کیا تھا، اور (بخل کرنا یوں بھی حماقت ہے کہ) اخیر میں (جب سب مرجائیں گے) سب آسمان وزمین (ور جو کائنات ان کے اندر ہیں سب) اللہ ہی کا رہ جائے گا (لیکن اس وقت یہ مال اللہ کے لئے ہوجانے سے تمہیں کوئی ثواب نہیں ملے گا، کیونکہ تم نے اپنے اختیار سے نہیں دیئے اور جب انجام کار سب اللہ ہی کا ہونا ہے تو عقل کی بات یہ ہے کہ ابھی اپنے اختیار سے دے دو تاکہ ثواب کے مستحق بنو) اور اللہ تمہارے سب اعمال کی پوری خبر رکھتے ہیں (اس لئے جو کچھ خرچ کرو اخلاص کے ساتھ اللہ کے لئے کرو)۔

سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ: اس کی کیفیت بخاری کی حدیث میں یہ آئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس کو خدا تعالیٰ مال دے اور اس کی زکوٰۃ نہ ادا کرے تو وہ مال قیامت کے روز ایک زہریلے سانپ کی شکل بنا کر اس کے گلے میں ڈال دیا جائے گا، وہ سانپ اس شخص کی باچھیں پکڑلے گا اور کہے گا کہ میں تیرا مال ہوں، تیرا سرمایہ ہوں، پھر حضور ﷺ نے مذکورہ بالا آیت پڑھی، مگر اس حدیث میں زکوٰۃ کا بیان مثال کے طور پر ہے، دوسری ایک حدیث میں ایسی ہی وعید رشتہ دار کو نہ دینے پر بھی آئی ہے، کیونکہ صاحب وسعت پر غریب رشتہ دار کی اعانت بھی واجب ہے، غرض جن ضروری موقعوں پر شریعت نے خرچ کرنے کا حکم کیا ہے وہاں بخل کرنے کی یہی سزا ہے۔

یہ آیت بظاہر عام معلوم ہوتی ہے، جو کوئی بخل کرے خواہ مسلمان ہو یا کافر اس کی یہی سزا ہے جو یہاں بیان ہوئی، مگر جو علماء یہ کہتے ہیں کہ کفار بجز ایمان کے اور کسی شرعی حکم کے مکلف نہیں ہیں وہ اس آیت کی توجیہ اس طرح کرتے ہیں کہ بخل کا منشا قیامت سے انکار کرنا اور خدا کی آیتوں کو جھٹلانا ہے، لہٰذا کفار کو بخل پر دھمکی دینا حقیقت میں کفر پر دھمکی دینا ہے، کیونکہ اگر وہ کفر پر قائم رہ کر خرچ بھی کریں تو عند اللہ قبول نہ ہوگا۔

* * *

فائدہ: ۱ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ: ابتدائے سورت کا بڑا حصہ اہل کتاب (یہود نصاریٰ) سے متعلق تھا، درمیان میں خاص مناسبات ووجوہ کی بنا پر غزوہ احد کی تفصیلات آگئیں، انہیں بقدر کفایت تمام کر کے یہاں سے پھر اہل کتاب کی شنائع بیان کی جاتی ہیں، چونکہ ان میں سے یہود کا معاملہ بہت مضرت رساں اور تکلیف دہ تھا، منافقین بھی اکثر ان ہی میں کے تھے، اور اوپر کی آیت میں آگاہ کیا گیا تھا کہ خدا تعالیٰ اب خبیث کو طیب سے جدا کر کے رہے گا، سو یہ جدائی جس طرح جانی وبدنی جہاد کے وقت ظاہر ہوتی تھی، اسی طرح مالی جہاد کے وقت بھی کھرا کھوٹا اور کچا پکا صاف طور پر الگ ہوجاتا تھا، اس لئے بتلادیا کہ یہود منافقین جیسے جہاد کے موقع سے بھاگتے ہیں، مال خرچ کرنے سے بھی جی چراتے ہیں، لیکن جس طرح جہاد سے بچ کر دنیا میں چند روز کی مہلت حاصل کرلینا ان کے حق میں کچھ بہتر نہیں، ایسے ہی بخل کر کے بہت مال اکٹھا کرلینا بھی کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا، اگر دنیا میں فرض کرو کوئی مصیبت پیش نہ بھی آئی تو قیامت کے دن یقیناً یہ جمع کیا ہوا مال عذاب کی صورت میں ان کے گلے کا ہار بن کر رہے گا، اس میں مسلمانوں کو بھی کھٹکا دیا کہ زکوٰۃ دینے اور ضروری مصارف میں خرچ کرنے سے کبھی جی نہ چرائیں، ورنہ جو شخص بخل وحرص وغیرہ رذیل خصلتوں میں یہود ومنافقین کی روش اختیار کرے گا اسے بھی اپنے درجہ کے موافق اسی طرح کی سزا کا منتظر رہنا چاہیئے، چنانچہ احادیث صحیحہ سے ثابت ہے، کہ مانعین زکوٰۃ کا مال سخت زہریلے اژدہے کی صورت میں متمثل کر کے ان کے گلے میں ڈالا جائیگا، نعوذ باللہ منہ۔

فائدہ: ۲ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ: یعنی آخر تم مرجاؤ گے اور سب مال اسی کا ہو رہے گا جس کا حقیقت میں پہلے سے تھا، انسان اپنے اختیار سے دے تو ثواب پائے۔

فائدہ: ۳ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ: یعنی بخل یا سخاوت جو کچھ کرو گے اور جیسی نیت کرو گے خدا تعالیٰ سب کی خبر رکھتا ہے اسی کے موافق بدلہ دے گا۔

لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِيَآءُ ۘ سَنَكْتُبُ مَا قَالُوْا وَقَتْلَهُمُ

بے شک اللہ نے سنی انکی بات جنہوں نے کہا کہ اللہ فقیر ہے اور ہم مالدار[1] اب لکھ رکھیں گے ہم ان کی بات اور جو خون کئے ہیں انہوں نے

الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّنَقُوْلُ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴿۱۸۱﴾ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ

انبیاء کے ناحق، اور کہیں گے چکھو عذاب جلتی آگ کا[2] یہ بدلہ اس کا ہے جو تم نے اپنے ہاتھوں آگے بھیجا اور اللہ

لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿۱۸۲﴾

ظلم نہیں کرتا بندوں پر[3]

خلاصہ تفسیر: گذشتہ تمہید کے بعد یہود کی گستاخی پر وعید بیان فرماتے ہیں۔

بیشک اللہ نے سن لیا ہے ان (گستاخ) لوگوں کا قول جنہوں نے (استہزاء کے طور پر) یوں کہا کہ (نعوذ باللہ) اللہ تعالیٰ مفلس ہے اور ہم مالدار ہیں (اور صرف اس سننے پر اکتفاء نہیں کیا جائے گا، بلکہ) ہم ان کے کہے ہوئے کو (ان کے نامہ اعمال میں) لکھ کر رہیں گے اور (اسی طرح) ان کا انبیاء (علیہم السلام) کو ناحق قتل کرنا بھی (ان کے نامہ اعمال میں لکھا جائے گا) اور ہم (ان پر سزا جاری کرنے کے وقت جتلانے کے لئے) کہیں گے کہ (لو) چکھو آگ کا عذاب (اور ان کو روحانی رنج دینے کے لئے اس وقت یہ بھی کہا جائے گا کہ) یہ (عذاب) ان اعمال (کفریہ) کی وجہ سے ہے جو تم نے اپنے ہاتھوں سمیٹے ہیں، اور یہ امر ثابت ہی ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں پر ظلم کرنے والے نہیں۔

قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِيَآءُ: بظاہر یہود کا اعتقاد اس قول کے مطابق نہ تھا، بلکہ ان کا مطلب یہ ہوگا کہ ان آیتوں کا مضمون اگر صحیح ہو تو اس سے خالق کا فقیر ہونا اور مخلوق کا غنی ہونا لازم آتا ہے اور یہ باطل ہے، تو ان آیتوں کا مضمون بھی صحیح نہیں، سو ان کا مقصود قرآن کی تکذیب کرنا تھا جس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی تکذیب لازم آگئی، چنانچہ آگے آیت: فان کذبوک اس کا قرینہ ہے، لیکن انہوں نے یہ بات استہزاء اور دل لگی کے طور پر کہی، پس اول تو قرآن کی تکذیب کفر ہے، پھر اس کے ساتھ استہزاء کرنا یہ خود مستقل کفر ہے، کیونکہ تکذیب کے بغیر بھی خدا کی آیات اور احکام سے استہزاء کرنا کفر ہے، پس ان دونوں کا جمع ہو جانا تو سخت ترین کفر ہوا اس لیے سخت وعید کے مستحق ہوئے، یہاں واضح رہے کہ مناظرہ کے وقت اہل اسلام جو کبھی یہود و نصاریٰ کے اعتقادات سے ان کے مذہب کے باطل ہونے پر استدلال کیا کرتے ہیں اس سے ان کا مقصود محض اس لغو اعتقاد پر اعتراض یا استہزاء ہوتا ہے، تورات یا انجیل پر اعتراض یا استہزاء مقصود نہیں ہوتا، کیونکہ یہ دونوں کتابیں جس طرح نازل ہوئی تھیں اہل اسلام کے نزدیک حق ہیں، البتہ ان میں جو تحریف و تغیر کیا گیا ہے وہ ہمارے نزدیک غلط ہے، اسی پر اعتراض بھی کیا جاتا ہے، پس اہل اسلام کتاب الٰہی پر ہرگز اعتراض یا استہزاء نہیں کرتے۔

سَنَكْتُبُ مَا قَالُوْا: یعنی ہم ان کے کہے ہوئے کو لکھ کر رہیں گے، اگرچہ اللہ تعالیٰ کو اس لکھنے کی ضرورت نہیں، لیکن نامہ اعمال میں درج کرا دینے میں یہ حکمت ہے کہ عادتاً مجرم پر تحریر زیادہ حجت ہوتی ہے، ورنہ اللہ تعالیٰ کو اس کی احتیاج نہیں ہے۔

وَقَتْلَهُمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ: انبیاء کے قتل کا مضمون اس کے ساتھ ذکر فرمانا اس بات کو بتلانے کے لیے ہے کہ اس قول میں تو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صرف تکذیب ہی کی ہے، یہ لوگ تو جرائم میں ایسے بے باک ہیں کہ تکذیب سے گذر کر انبیاء کو قتل تک کر چکے ہیں، پس اگر یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب یا استہزا کریں تو کیا تعجب ہے، اور یہ شبہ کہ قتل تو ان کے بڑوں نے کیا تھا انہوں نے تو نہیں کیا، اس کا جواب پہلے پارہ سورہ بقرہ آیت ۹۱: قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ میں گذر چکا ہے وہاں ملاحظہ فرمایئے۔

* * *

فائدہ: [1] قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِيَآءُ: یعنی محض اتنا ہی نہیں کہ یہود انتہائی بخل کی وجہ سے پیسہ خرچ کرنا نہیں جانتے، بلکہ

جب خدا کی راہ میں خرچ کرنے کا حکم سنتے ہیں تو مذاق اڑاتے ہیں اور حق تعالیٰ کی جناب میں گستاخانہ کلمات بکنے سے بھی نہیں شرماتے، چنانچہ جب آیت :مَنۡ ذَا الَّذِیۡ یُقۡرِضُ اللّٰہَ قَرۡضًا حَسَنًا (البقرۃ:۲۴۵) نازل ہوئی، کہنے لگے اللہ ہم سے قرض مانگتا ہے تو اللہ فقیر محتاج ہے اور ہم غنی مالدار ہیں، حالانکہ ایک غبی اور کوڑھ مغز بھی سمجھ سکتا ہے کہ انفاق فی وجوہ الخیر کو قرض سے تعبیر فرمانے میں انتہائی رحمت وشفقت کا اظہار تھا، ظاہر ہے کہ خدا اپنا دیا ہوا مال ہم سے ہماری مصالح میں ہمارے ہی دنیاوی واخروی فائدہ کے لئے خرچ کراتا ہے، اس کو ہمارے خرچ سے کوئی نفع نہیں پہنچ سکتا اور بفرض محال پہنچے بھی تو مال اور ہر چیز اسی کی مملوک ہے، پھر حقیقی معنی میں اس کو قرض کیسے کہہ سکتے ہیں؟ یہ اس کا کمال کرم واحسان ہے کہ اس خرچ کا بہترین معاوضہ دینا بھی اپنے ذمہ لازم کر لیا اور اس کو لفظ قرض سے ادا کر کے اس لزوم کو بے حد موکد ومسجل کر دیا، مگر یہود اپنی کورچشمی اور خبث باطن سے احسان ماننے کے بجائے ان لفظوں کی ہنسی اڑانے لگے اور اللہ تعالیٰ کی جانب رفیع میں مسخرا پن کرنے سے باز نہ رہے، اس کو فرمایا کہ اللہ نے تمہاری یہ باتیں سن لیں، اس پر جو کارروائی ہوگی اس کے منتظر رہو۔

فائدہ:۲ وَّنَقُوۡلُ ذُوۡقُوۡا عَذَابَ الۡحَرِیۡقِ: یعنی عام ضابطہ کے موافق یہ ملعون اور ناپاک اقوال تمہارے دفتر حسیئات میں درج کرائے دیتے ہیں، جہاں تمہاری قوم کے دوسرے ملعون اور ناپاک افعال درج ہیں، مثلاً معصوم نبیوں کا ناحق خون بہانا، کیونکہ جس طرح یہ نالائق جملہ ایک نمونہ ہے تمہاری خداشناسی کا، وہ نالائق کام نمونہ ہے تمہاری تعظیم انبیاء کا، جب یہ پوری مسل پیش ہوگی اس وقت کہا جائیگا کہ لو اپنی شرارتوں کا مزہ چکھو اور جس طرح تم نے طعن وتمسخر سے اولیاء اللہ کے دل جلائے تھے، اب عذاب الٰہی کی بھٹی میں جلتے رہو۔

فائدہ:۳ وَاَنَّ اللّٰہَ لَیۡسَ بِظَلَّامٍ لِّلۡعَبِیۡدِ: یعنی جو کمایا تھا سامنے آیا، خدا کے یہاں ذرہ برابر ظلم نہیں: اِنَّ اللّٰہَ لَا یَظۡلِمُ مِثۡقَالَ ذَرَّۃٍ (النساء:۴۰) اگر بفرض محال ظلم کرنا خدا کی صفت ہوتی تو اس کی دوسری صفات کی طرح وہ بھی کامل ہی ہوتی اس لئے اگر معاذ اللہ خدا کو ظالم فرض کیا جائے تو پھر "ظالم" کیا "ظلام" ہی کہنا پڑیگا، اس کا ایک رتی ظلم بھی پہاڑوں سے کم نہیں ہوسکتا، گویا "ظلام" کا صیغہ لا کر متنبہ کر دیا کہ اس کی بارگاہ میں ادنیٰ سے ادنیٰ ظلم تجویز کرنا، انتہائی ظالم قرار دینے کا مرادف ہے: وَتَعٰلٰی عَمَّا یَقُوۡلُوۡنَ عُلُوًّا کَبِیۡرًا (الاسراء:۴۳)۔

اَلَّذِیۡنَ قَالُوۡۤا اِنَّ اللّٰہَ عَہِدَ اِلَیۡنَاۤ اَلَّا نُؤۡمِنَ لِرَسُوۡلٍ حَتّٰی یَاۡتِیَنَا بِقُرۡبَانٍ تَاۡکُلُہُ النَّارُ ؕ

وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ اللہ نے ہم کو کہہ رکھا ہے کہ یقین نہ کریں کسی رسول کا جب تک نہ لاوے ہمارے پاس قربانی کہ کھا جائے اس کو آگ ؎۱

قُلۡ قَدۡ جَآءَکُمۡ رُسُلٌ مِّنۡ قَبۡلِیۡ بِالۡبَیِّنٰتِ وَبِالَّذِیۡ قُلۡتُمۡ فَلِمَ قَتَلۡتُمُوۡہُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ﴿۱۸۳﴾

تو کہہ تم میں آچکے کتنے رسول مجھ سے پہلے نشانیاں لے کر اور یہ بھی جو تم نے کہا پھر ان کو کیوں قتل کیا تم نے اگر تم سچے ہو ؎۲

خلاصہ تفسیر: وہ (یہود) ایسے لوگ ہیں کہ (بالکل جھوٹ تراش کر) کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو (گذشتہ انبیاء کے واسطے سے) حکم فرمایا تھا کہ ہم کسی پیغمبر (ی کے مدعی) پر (ان کے پیغمبر ہونے کا) اعتقاد نہ لائیں جب تک ہمارے سامنے معجزہ (خاص) نذر ونیاز خداوندی کا ظاہر نہ کرے کہ اس کو (آسمانی) آگ کھا جائے (پہلے انبیاء علیہم السلام کا یہ معجزہ تھا کہ کوئی چیز جاندار یا بے جان اللہ کے نام کی نکال کر کسی میدان یا پہاڑ پر رکھ دی، غیب سے ایک آگ نمودار ہوئی اور اس چیز کو جلا دیا تو یہ قبولیت کی علامت ہوتی تھی، مطلب یہ ہے کہ آپ نے یہ خاص معجزہ ظاہر نہیں فرمایا، اس لئے ہم آپ پر ایمان نہیں لاتے، حق تعالیٰ اس کا جواب تعلیم فرماتے ہیں کہ:) آپ فرما دیجئے کہ بالیقین بہت سے پیغمبر مجھ سے پہلے بہت سے دلائل (معجزات وغیرہ) لے کر آئے اور خود یہ معجزہ بھی جس کو تم کہہ رہے ہو، سو تم نے ان کو کیوں قتل کیا تھا اگر تم (اس امر میں) سچے ہو۔

یہود کے دو دعوی تھے: ایک تو یہ کہ حق تعالیٰ نے ہم سے ایسا عہد کیا ہے، اس کا جواب تو یہ ہے کہ یہ دعوی بلا دلیل ہے، اگر وہ دل سے یہ بات کہتے کہ اس معجزہ کے دیکھنے پر ہم ایمان لے آئیں گے تو یہ معجزہ بھی ظاہر ہو جاتا، یہ ان کا دوسرا دعوی تھا جس کا جواب فرمایا گیا ہے کہ جن پیغمبروں کا یہ معجزہ

تھا ان کی تکذیب کیوں کی بلکہ قتل کر ڈالا، معلوم ہوا کہ یہ سب باتیں ہی باتیں ہیں۔

اَلَّا نُؤْمِنَ لِرَسُوْلٍ حَتّٰى يَاْتِيَنَا بِقُرْبَانٍ: اس میں اس شخص پر بھی رد ہے جو کرامات کو قرب کا سبب سمجھتا ہے کہ اس شخص سے کرامات ظاہر ہوں تو اس سے تعلق قائم کروں گا اور اس کو بزرگ سمجھوں گا، وگرنہ یہ ولی اللہ نہیں ہوسکتا، یہ بات درست نہیں

حَتّٰى يَاْتِيَنَا بِقُرْبَانٍ تَاْكُلُهُ النَّارُ: یہاں یہ شبہ نہ کیا جائے کہ اگر چہ یہود کا یہ دعویٰ اور مطالبہ قطعاً غلط تھا، لیکن اگر آنحضرت ﷺ کے ہاتھ پر یہ معجزہ بھی ہو جاتا تو شاید ایمان لے آتے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا کہ یہ لوگ محض عناد اور ہٹ دھرمی سے یہ باتیں کہہ رہے ہیں، اگر ان کے کہنے کے مطابق معجزہ ہو بھی جاتا، جب بھی یہ ایمان نہ لاتے۔

* * *

فائدہ: ۱. بعضے رسولوں سے یہ معجزہ ظاہر ہوا تھا کہ قربانی یا کوئی چیز اللہ نام کی نیاز کی تو آسمان سے آگ آکر اس کو کھا گئی، یہ علامت تھی اس کے قبول ہونے کی، چنانچہ موجودہ بائبل میں بھی حضرت سلیمان علیہ السلام کے متعلق ایسا واقعہ مذکور ہے، اب یہود بہانہ پکڑتے تھے کہ ہم کو یہ حکم ہے کہ جس سے یہ معجزہ نہ دیکھیں اس پر یقین نہ لائیں اور یہ محض جھوٹے بہانے تھے اس قسم کا کوئی حکم ان کی کتابوں میں موجود نہ تھا، نہ آج موجود ہے اور نہ ہر ایک نبی کی نسبت یہ ثابت کیا جاسکتا ہے کہ اس کو یہ معجزہ ملا تھا، ہر پیغمبر کو حق تعالیٰ نے اوقات واحوال کے مناسب معجزات دیئے ہیں، لازم نہیں کہ ہر نبی ایک ہی معجزہ دکھلائے تو سچا ثابت ہو۔

فائدہ: ۲. یعنی اگر واقعی اپنے دعوے میں سچے ہو اور اسی خاص معجزہ کے دکھلانے پر تمہارا ایمان لانا موقوف ہے تو پہلے ایسے نبیوں کو تم نے کیوں قتل کیا جو اپنی صداقت کی کھلی نشانیوں کے ساتھ خاص یہ معجزہ بھی لیکر آئے تھے تمہارے اسلاف کا یہ فعل جس پر تم بھی آج تک راضی ہو، کیا اس کی دلیل نہیں کہ یہ سب تمہاری حیلہ سازی اور ہٹ دھرمی ہے کہ کوئی پیغمبر جب تک خاص یہ ہی معجزہ نہ دکھلائیگا ہم نہ مانیں گے۔

فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ جَآءُوْ بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ وَالْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ ﴿۱۸۴﴾

پھر اگر یہ تجھ کو جھٹلاویں تو پہلے تجھ سے جھٹلائے گئے بہت رسول جو لائے نشانیاں اور صحیفے اور کتاب روشن

خلاصہ تفسیر: اوپر یہود کے دو قول ذکر ہوئے جس سے انکا مقصود رسول اللہ ﷺ کی تکذیب کرنا تھا، جس سے آپ کو طبعاً رنج ہوتا تھا، دیگر کفار بھی اس تکذیب میں شریک تھے جس سے رنج اور بڑھتا تھا، اب اس آیت میں آپ ﷺ کی تسلی فرماتے ہیں۔

سو اگر یہ (کفار) لوگ آپ کی تکذیب کریں تو (غم نہ کیجئے، کیونکہ) بہت سے پیغمبروں کی جو آپ سے پہلے گذرے ہیں، تکذیب کی جاچکی ہے، جو معجزات لے کر آئے تھے اور (چھوٹے چھوٹے) صحیفے لے کر اور روشن کتاب لے کر (جب کفار کی یہ عادت ہی ہے کہ انبیاء کی تکذیب کیا کرتے ہیں تو پھر آپ کو کیا غم ہے)۔

جَآءُوْ بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ وَالْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ: انبیاء علیہم السلام میں سے بعض صرف معجزے لائے، بعضوں کو چھوٹی کتاب دی گئی اور بعضوں کو بڑی کتاب جیسے تورات وانجیل، چونکہ آیت میں کتاب سے بڑی کتاب مراد ہے اس لئے اس کی صفت میں ''منیر'' بمعنی روشن بڑھا دیا گیا کہ اس کے مضامین اور اس کی شان دونوں واضح ہوتے ہیں۔

* * *

فائدہ: آپ کو تسلی دی جاتی ہے کہ ان ملعونوں کی کج بحثی اور ہٹ دھرمی سے ملول ودلگیر نہ ہوں اور نہ دوسرے مکذبین کی پرواکریں، آپ سے پہلے کتنے رسول جھٹلائے جاچکے ہیں جو صاف نشانیاں (معجزات) چھوٹے صحیفے اور بڑی روشن کتابیں لے کر آئے تھے، انبیائے صادقین کی تکذیب معاندین کی قدیم عادت رہی ہے، آپ کو کچھ انوکھی بات پیش نہیں آئی۔

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ؕ وَاِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ

ہر جی کو چکھنی ہے موت، اور تم کو پورے بدلے ملیں گے قیامت کے دن ۱؎ پھر جو کوئی دور کیا گیا دوزخ سے

وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ؕ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ﴿۱۸۵﴾

اور داخل کیا گیا جنت میں اس کا کام تو بن گیا، اور نہیں زندگانی دنیا کی مگر پونجی دھوکے کی ۲؎

خلاصہ تفسیر: (پیچھے تکذیب کرنے والوں کا ذکر تھا، اب ایک عام عنوان سے سب پر وعید ہے جس میں تصدیق کرنے والوں کے لیے بشارت بھی آگئی، چنانچہ فرماتے ہیں: تم میں) ہر جان (دار) کو موت کا مزہ چکھنا ہے، اور (مرنے کے بعد) تم کو پوری پاداش تمہاری (بھلائی برائی کی) قیامت ہی کے روز ملے گی (اگر دنیا میں کافروں پر کسی سزا کا ظہور نہ ہوا تو اس سے جھٹلانے والے خوش نہ ہوں اور مسلمان مایوس نہ ہوں، آگے اس بدلہ کی تفصیل ہے) تو جو شخص دوزخ سے بچالیا گیا اور جنت میں داخل کیا گیا سو پورا کامیاب وہ ہوا (اسی طرح جو جنت سے جدا رہا اور دوزخ میں بھیجا گیا پورا ناکام وہ ہوا) اور دنیوی زندگی تو کچھ بھی نہیں صرف (ایسی چیز ہے جیسے) دھوکہ کا سودا (ہوتا) ہے (جس کی ظاہری آب و تاب کو دیکھ کر خریدار پھنس جاتا ہے، بعد میں اس کی قلعی کھل جاتی ہے تو افسوس کرتا ہے، اسی طرح دنیا کی ظاہری چمک دمک سے دھوکہ کھا کر آخرت سے غافل نہ ہونا چاہیے)۔

فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ: جان لینا چاہیے کہ یہ جو فرمایا ہے کہ جو شخص دوزخ سے بچالیا گیا اس سے مراد عام ہے خواہ بالکل بچالیا جائے، یا کسی قدر سزا کے بعد بچالیا جائے، اس میں سب مسلمان آگئے، اور ان کی پوری کامیابی کا مطلب یہ ہے کہ جنت میں ہمیشہ کے لیے ہر طرح کی نعمتیں پائیں گے، ایسے ہی اس کے مقابلہ میں جو جنت سے جدا رہا، اس سے مراد یہ ہوگی کہ ہمیشہ کے لیے جدا رہا اور ایسے لوگ صرف کفار ہیں۔

وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ: حق تعالیٰ نے کامیابی کا مدار جنت میں داخل ہونا فرمایا ہے، اس میں اس شخص کے باطل ہونے پر دلیل ہے جو جنت و جہنم سے استغنا کا دعویٰ کرے، جیسے بعض لوگوں کا یہ کہنا کہ ہمیں جنت نہیں چاہیے، صرف اللہ چاہیے درست نہیں، البتہ کوئی خدا کی محبت میں مغلوب ہو تو وہ معذور سمجھا جائے گا۔

وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ: دنیا کو دھوکے کا سودا کہا، اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ دنیوی زندگی سب کے لیے نقصان دہ ہے، بلکہ اس تشبیہ کا مطلب یہ ہے کہ دنیا اصلی مقصود بنانے کے قابل نہیں، بلکہ اگر کوئی یہ سودا عمدہ داموں خریدنے لگے تو اس سے محبت نہیں کرنی چاہیے، بلکہ غنیمت سمجھ کر بیچ ڈالنا چاہیے، چنانچہ اہل عقل اس حیات اور اس کی لذت کے عوض اللہ تعالیٰ سے اعمال صالحہ اور جنت عالیہ لے لیتے ہیں۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی موت کا مزہ سب کو چکھنا ہے، اس کے بعد قیامت کے دن ہر جھوٹے سچے اور مصدق و مکذب کو اپنے اپنے کئے کا پورا بدلہ مل رہیگا "پورے" کا یہ مطلب کہ کچھ تھوڑا سا ممکن ہے قیامت سے پہلے ہی مل جائے مثلاً دنیا میں یا قبر میں۔

فائدہ: ۲؎ یعنی دنیا کی عارضی بہار اور ظاہری ٹیپ ٹاپ، بہت دھوکہ میں ڈالنے والی چیز ہے، جس پر مفتون ہو کر اکثر بے وقوف آخرت سے غافل ہو جاتے ہیں، حالانکہ انسان کی اصلی کامیابی یہ ہے کہ یہاں رہ کر انجام کو سوچے اور وہ کام کرے جو عذاب الٰہی سے بچانے والا اور جنت تک پہنچانے والا ہو۔

تنبیہ: آیت میں ان بعض متصوفین کا بھی رد ہو گیا جو دعوے کیا کرتے ہیں کہ ہمیں نہ جنت کی طلب، نہ دوزخ کا ڈر، معلوم ہوا کہ دوزخ سے دور رہنا اور جنت میں داخل ہو جانا ہی اصل کامیابی ہے، کوئی اعلیٰ ترین کامیابی جنت سے باہر رہ کر نصیب نہیں ہو سکتی، وفی الحدیث وَحَوْلَهَا

نُذِندن اللہ تعالیٰ اپنے فضل ورحمت سے ہم کو بھی یہ کامیابی عنایت فرمائے، آمین۔

لَتُبْلَوُنَّ فِيٓ اَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ۣ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ

البتہ تمہاری آزمائش ہوگی مالوں میں اور جانوں میں، اور البتہ سنو گے تم اگلی کتاب والوں سے

وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَذًى كَثِيْرًا ۭ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۝

اور مشرکوں سے بدگوئی بہت، اور اگر تم صبر کرو اور پرہیزگاری کرو تو یہ ہمت کے کام ہیں

خلاصہ تفسیر: پیچھے یہودیوں کی ایک گستاخی کا بیان ہوا، اسی قسم کے چند واقعات اور بھی پیش آئے جس پر مسلمانوں کو صبر کی تعلیم دی گئی، چونکہ مسلمانوں کو تکلیف پہنچانے میں یہودیوں کے ساتھ مشرکین بھی شریک تھے اس لیے ان کا ذکر بھی بڑھا دیا، اور پھر صبر وثبات صرف ایذا ہی کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ تمام حوادث میں صبر کا حکم دیا گیا ہے، لہذا مالی وجانی نقصان کا ذکر بھی ملا دیا، اس میں بالخصوص اس لیے لطافت اور بڑھ گئی کہ واقعہ احد میں مسلمانوں کو جانی ومالی بہت نقصان پہنچا تھا اس کی طرف بھی اشارہ ہو گیا کہ صبر کرنا چاہیے۔

(صرف ابھی کیا) البتہ آگے (آگے) اور آزمائے جاؤ گے اپنے مالوں (کے نقصان) میں اپنی جانوں (کے نقصان) میں، اور البتہ آگے کو اور سنو گے بہت سی باتیں دل آزاری کی ان لوگوں سے (بھی) جو تم سے پہلے (آسمانی) کتاب دیئے گئے ہیں (یعنی اہل کتاب سے) اور ان لوگوں سے (بھی) جو کہ مشرک ہیں اور اگر (ان مواقع پر) صبر کرو گے (اور خلاف شروع امور سے) پرہیز رکھو گے تو (تمہارے لئے اچھا ہوگا، کیونکہ) یہ (صبر وتقویٰ) تاکیدی احکام میں سے ہے۔

لَتُبْلَوُنَّ فِيٓ اَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ: آزمانے کا مطلب یہ ہے کہ ایسے حوادث تم پر وقتاً فوقتاً واقع ہوا کریں گے، اس کو مجازاً آزمانا کہہ دیا، ورنہ اللہ تعالیٰ آزمانے کے حقیقی معنی سے پاک ہیں، کیونکہ وہ عالم الغیب ہیں، پہلے سے اس لیے خبر دے دی تاکہ آمادہ رہیں اور پریشان نہ ہوں۔

وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا: صبر کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ تدبیر نہ کرو، یا انتقام کے موقع پر بدلہ نہ لو، یا قتال کے موقع پر قتال نہ کرو، بلکہ یہ مطلب ہے کہ حوادث میں دل تنگ نہ ہو، کیونکہ اس میں تمہارے لیے منافع ومصالح ہیں اور تقوی سے مراد یہ ہے کہ خلاف شرع کاموں سے بچو اگرچہ تدبیر بھی کی جائے، پس یہ صبر کا حکم جہاد وقتال کی آیات کے معارض نہیں کہ نسخ کی ضرورت پڑے۔

* * *

فائدہ: یہ خطاب مسلمانوں کو ہے کہ آیندہ بھی جان ومال میں تمہاری آزمائش ہوگی اور ہر قسم کی قربانیاں کرنی پڑیں گی، قتل کیا جانا، زخمی ہونا، قید وبند کی تکلیف اٹھانا، بیمار پڑنا، اموال کا تلف ہونا اقارب کا چھوٹنا، اس طرح کی سختیاں پیش آئیں گی، نیز اہل کتاب اور مشرکین کی زبانوں سے بہت جگر خراش اور دل آزار باتیں سننا پڑیں گی، ان سب کا علاج صبر وتقویٰ ہے، اگر صبر واستقلال اور پرہیزگاری سے ان سختیوں کا مقابلہ کرو گے تو یہ بڑی ہمت اور اولوالعزمی کا کام ہوگا جس کی تاکید حق تعالیٰ نے فرمائی ہے۔

تنبیہ: بخاری کی ایک حدیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ آیت بدر سے پہلے نازل ہوئی، قتال کا حکم اس کے بعد ہوا، تاہم صبر وتقویٰ کا حکم مشروعیت قتال کے باوجود بھی فی الجملہ باقی ہے جس پر اخیر تک عمل ہوتا رہا ہے، ہاں! صبر وعفو اور تغلیظ وتشدید کے مواقع کا پہچاننا ضروری ہے جو نصوص شرعیہ سے معلوم ہو سکتے ہیں، اس آیت کو یہاں رکھنے سے شاید یہ غرض ہے کہ تم ان کفار ومنافقین کی گستاخیوں اور شرارتوں پر حد سے زیادہ طیش مت کھاؤ، ابھی بہت کچھ سننا پڑے گا، تکلیفیں اٹھانی پڑیں گی، صبر واستقلال سے ان کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار رہو، نیز دنیا کی زندگانی میں پڑ کر جو محض دھوکہ کی ٹٹی ہے، اس بات سے غافل نہ ہونا کہ خدا تعالیٰ جان اور مال دونوں میں تمہاری آزمائش کرنے والا ہے۔

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ ۡ فَنَبَذُوْهُ

اور جب اللہ نے عہد لیا کتاب والوں سے کہ اس کو بیان کرو گے لوگوں سے اور نہ چھپاؤ گے پھر پھینک دیا انہوں نے وہ عہد

وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ وَاشْتَرَوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ فَبِئْسَ مَا يَشْتَرُوْنَ ﴿۱۸۷﴾

اپنی پیٹھ کے پیچھے اور خرید لیا اس کے بدلے تھوڑا سا مول، سو کیا برا ہے جو خریدتے ہیں

خلاصہ تفسیر: پیچھے یہودیوں کی بری خصلتوں کا بیان تھا، آگے بھی ان کی ایک بری خصلت کا ذکر ہے کہ حق بات ظاہر کرنے کا معاہدہ کیا تھا، چونکہ اہل کتاب سے اللہ تعالیٰ نے یہ عہد لیا تھا کہ احکام الٰہی جو تورات میں آئے ہیں وہ ان کی اشاعت عام کریں گے اور کسی حکم کو اپنی نفسانی غرض سے چھپائیں گے نہیں، لیکن اہل کتاب نے یہ عہد توڑ دیا۔

(یہ حالت بھی قابل ذکر ہے) جبکہ اللہ تعالیٰ نے (کتب سابقہ میں) اہل کتاب سے یہ عہد لیا (یعنی ان کو حکم فرمایا اور انہوں نے قبول کرلیا) کہ اس کتاب کے (سب مضامین) عام لوگوں کے روبرو بیان کردینا اور اس (کے کسی مضمون) کو (دنیوی غرض سے) پوشیدہ نہ رکھنا، سو ان لوگوں نے اس (عہد) کو اپنے پس پشت پھینک دیا (یعنی اس پر عمل نہ کیا) اور اس کے مقابلہ میں (دنیا کا) کم حقیقت معاوضہ لے لیا، سو بری چیز ہے جس کو وہ لوگ لے رہے ہیں (کیونکہ انجام اس کا دوزخ کی سزا ہے)۔

لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ: معلوم ہوا کہ علم دین اور احکام خدا و رسول کو چھپانا حرام ہے، مگر یہ حرمت اسی طرح کے چھپانے کی ہے جو یہود کا عمل تھا کہ اپنی دنیوی اغرض سے احکام خداوندی کو چھپاتے تھے اور اس پر لوگوں سے مال وصول کرتے تھے اور اگر کسی دینی اور شرعی مصلحت سے کوئی حکم عوام پر ظاہر نہ کیا جائے تو وہ اس میں داخل نہیں، جیسا کہ امام بخاریؒ نے ایک مستقل باب میں اس مسئلہ کو بحوالہ احادیث بیان فرمایا ہے کہ بعض اوقات کسی حکم کے اظہار سے عوام کی غلط فہمی اور فتنہ میں مبتلا ہوجانے کا خطرہ ہوتا ہے، اس خطرہ کی بناء پر کوئی حکم پوشیدہ رکھا جائے تو مضائقہ نہیں، اور جن مضامین کو اہل کتاب چھپاتے تھے ان میں بڑا حصہ رسول اللہ ﷺ کی بابت پیشین گوئیوں اور بشاتوں کا تھا، چونکہ ان کو خود ایمان لانا منظور نہ تھا اس لیے دوسروں سے بھی چھپایا کرتے تھے۔

* * *

فائدہ: یعنی علمائے اہل کتاب سے عہد لیا گیا تھا کہ جو احکام و بشارات کتاب اللہ میں ہیں انہیں صاف صاف لوگوں کے سامنے بیان کرینگے اور کوئی بات نہیں چھپائیں گے نہ ہیر پھیر کرکے ان کے معنی بدلیں گے، مگر انہوں نے ذرہ برابر پروانہ کی اور دنیا کے تھوڑے سے نفع کی خاطر سب عہد و پیمان توڑ کر احکام شریعت بدل ڈالے آیات اللہ میں لفظی و معنوی تحریفات کیں جس چیز کا ظاہر کرنا سب سے زیادہ ضروری تھا یعنی پیغمبر آخر الزماں کی بشارت، اسی کو سب سے زیادہ چھپایا، جس قدر مال خرچ کرنے میں بخل کرتے اس سے بڑھ کر علم خرچ کرنے میں کنجوسی دکھائی۔ اور اس کنجوسی کا منشاء بھی مال و جاہ اور متاع دنیا کی محبت کے سوا کچھ نہ تھا، یہاں ضمناً مسلمان اہل علم کو متنبہ فرمادیا کہ تم دنیا کی محبت میں پھنس کر ایسا نہ کرنا۔

لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اَتَوْا وَّيُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ

تو نہ سمجھ کہ جو لوگ خوش ہوتے ہیں اپنے کئے پر اور تعریف چاہتے ہیں بن کئے پر سو مت سمجھ ان کو

بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۸۸﴾

کہ چھوٹ گئے عذاب سے، اور ان کے لئے عذاب ہے دردناک

خلاصہ تفسیر: اوپر یہودیوں کے کتمان حق کا بیان تھا، اور پھر دلیری یہ کہ اس بری حرکت پر ندامت کے بجائے خوشی اور فخر کا

اظہار کرتے اور اپنے اس فعل کو قابل تعریف قرار دیتے، اب اس کی وعید ذکر کرتے ہیں:

(اے مخاطب!) جو لوگ ایسے ہیں کہ اپنے کردار (بدیعنی حق کو چھپانے) پر خوش ہوتے ہیں اور جو (نیک) کام نہیں کیا اس پر چاہتے ہیں کہ ان کی تعریف ہو سوایسے شخصوں کو ہرگز ہرگز مت خیال کرو کہ وہ (دنیا میں) خاص طور کے عذاب سے بچاؤ اور (حفاظت) میں رہیں گے (ہرگز نہیں! بلکہ دنیا میں بھی کچھ سزا ہوگی) اور (آخرت میں بھی) ان کو دردناک سزا ہوگی۔

لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ: جو کام نہیں کیا اس سے مراد اظہار حق ہے جس کو وہ کرتے نہ تھے، مگر دوسروں کو یہ یقین دلانا چاہتے تھے کہ ہم حق کو ظاہر کرتے ہیں چھپاتے نہیں، تا کہ ان کا فریب معلوم نہ ہو، چنانچہ حضور ﷺ کے سامنے بھی یہود نے یہ حرکت کی تھی، نیز اکثر یہودی جو منافق تھے جہاد کے موقع پر جھوٹے عذر کرکے ایسا ہی فریب دینا چاہتے تھے اور چونکہ آیت کے الفاظ عام ہیں اس لیے دوسروں کو بھی شامل ہے جو ایسی حرکت کرے، اس خوشی سے مراد گناہ پر خوشی کرنا ہے، اور تعریف چاہنے سے مراد اس کا اہتمام کرنا ہے، کوئی نیک عمل کرنے کے بعد بھی اس پر مدح و تعریف کا انتظار و اہتمام کرے تو عمل کرنے کے باوجود بھی قواعد شرعیہ کی رو سے مذموم ہے اور نیک عمل نہ کرنے کی صورت میں تو اور بھی زیادہ مذموم ہے، اور طبعی طور پر یہ خواہش ہونا کہ میں بھی فلاں نیک کام کروں اور نیک نام ہو جاؤں تو وہ اس میں داخل نہیں، جبکہ اس نیک نامی کا اہتمام نہ کرے۔

اس میں ان لوگوں کی عادت کی مذمت بھی ہے جو اپنے تعریف کے مدعی ہوتے ہیں، اور ان کی مجلس محفل کے تذکروں کا زیادہ حصہ اپنی ایسی تعریف و کمالات پر مشتمل ہوتا ہے جن سے وہ کورے ہوتے ہیں، کمالات ہوں تب بھی اپنی تعریف بری ہے تو اگر کمالات نہ ہوں تو یہ زیادہ برا ہے۔

* * *

فائدہ: یہود مسئلے غلط بتاتے، رشوتیں کھاتے اور پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی صفات و بشارات جان بوجھ کر چھپاتے تھے پھر خوش ہوتے کہ ہماری چالاکیوں کو کوئی پکڑ نہیں سکتا اور امید رکھتے کہ لوگ ہماری تعریف کریں کہ بڑے عالم اور دیندار حق پرست ہیں، دوسری طرف منافقین کا حال بھی ان کے مشابہ تھا، جب جہاد کا موقع آتا گھر میں چھپ کر بیٹھ رہتے اور اپنی اس حرکت پر خوش ہوتے کہ دیکھو کیسے جان بچائی، جب حضور ﷺ جہاد سے واپس تشریف لاتے تو غیر حاضری کے جھوٹے عذر پیش کر کے چاہتے کہ آپ سے اپنی تعریف کرائیں، ان سب کو بتلا دیا گیا کہ یہ باتیں دنیا و آخرت میں خدا کے عذاب سے نہیں چھڑا سکتیں، اول تو ایسے لوگ دنیا ہی میں فضیحت ہوتے ہیں اور کسی وجہ سے یہاں بچ گئے تو وہاں کسی تدبیر سے نہیں چھوٹ سکتے۔

تنبیہ: آیت میں گو تذکرہ یہود یا منافقین کا ہے، لیکن مسلمانوں کو بھی سنانا ہے کہ برا کام کرکے خوش نہ ہوں، بھلا کرکے اترائیں نہیں اور جو اچھا کام کیا نہیں اس پر تعریف کے امیدوار نہ رہیں، بلکہ کرنے کے بعد بھی مدح سرائی کی ہوس نہ رکھیں۔

ع

وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۱۸۹ ع

اور اللہ ہی کے لئے ہے سلطنت آسمان اور زمین کی، اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے

خلاصہ تفسیر: اوپر اہل کفر کی سزا کا ذکر تھا، چونکہ سزا دینے کے لیے اختیار اور قدرت لازمی ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:

اور اللہ ہی کے لئے (خاص) ہے سلطنت آسمانوں کی اور زمین کی اور اللہ تعالیٰ ہر شئے پر پوری قدرت رکھتے ہیں۔

پس چونکہ وہ سلطان حقیقی ہیں سب پر ان کا حکم ماننا ضروری ہے اور نافرمانی جرم ہے، اور چونکہ وہ قادر ہیں اس لیے جرم کی سزا دے سکتے ہیں، اور چونکہ انہوں نے اس سزا کی خبر دی ہے اس لیے ضرور سزا دیں گے، اور چونکہ یہ صفات انہی کے ساتھ خاص ہیں، اس لیے ان کے سزا دیے ہوئے کو کوئی نہیں بچا سکتا، پس ان مقدمات سے پیچھے کے مضمون کی تاکید ہوگئی۔

* * *

فائدہ: جب آسمان و زمین میں اسی کی سلطنت ہے تو مجرم بھاگ کر پناہ کہاں لے سکتا ہے اور جو ہر چیز پر قادر ہے اس کے نفوذ و اختیار سے کون باہر ہو سکتا ہے۔

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۰﴾

بے شک آسمان اور زمین کا بنانا اور رات اور دن کا آنا جانا اس میں نشانیاں ہیں عقل والوں کو

خلاصہ تفسیر: پیچھے توحید بیان ہوئی، اگلی آیت میں توحید پر دلیل لاتے ہیں اور اس کے ساتھ توحید کے کامل تقاضوں پر عمل کرنے والوں کی فضیلت بیان فرماتے ہیں، جس میں اشارۃً دوسروں کو بھی ان تقاضوں پر عمل کرنے کی ترغیب ہے، نیز پیچھے جو کفار سے ایذائیں پہنچنے کا مضمون تھا اس آیت کو اُس سے بھی مناسبت ہے، اس طرح کہ مشرکین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بطور عناد یہ درخواست کی کہ صفاء پہاڑ کو سونے کا بنا دیں، اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ حق کے دلائل تو بہت ہیں، ان میں کیوں غور فکر نہیں کرتے، اور ان لوگوں کی یہ درخواست طلب حق کے لئے نہ تھی، بلکہ عناداً تھی، جس کی وجہ سے درخواست پورا ہونے پر بھی یہ لوگ ایمان نہ لاتے۔

بلاشبہ آسمانوں اور زمین کے بنانے میں اور یکے بعد دیگرے رات اور دن کے آنے جانے میں دلائل (توحید کے موجود) ہیں اہل عقل (سلیم) کے (استدلال کے) لئے جن کی حالت یہ ہے (جو آگے آتی ہے اور یہی حالت ان کے عقل مند ہونے کی علامت بھی ہے، کیونکہ عقل کا تقاضہ نقصان کو دور کرنا اور فوائد کو حاصل کرنا ہے، اس پر ان کی حالت کا مجموعہ دلالت کر رہا ہے)۔

* * *

فائدہ: یعنی عقلمند آدمی جب آسمان و زمین کی پیدائش اور ان کے عجیب وغریب احوال و روابط اور دن رات کے مضبوط ومحکم نظام میں غور کرتا ہے تو اس کو یقین کرنا پڑتا ہے کہ یہ سارا مرتب ومنظم سلسلہ ضرور کسی ایک مختار کل اور قادر مطلق فرمانروا کے ہاتھ میں ہے جس نے اپنی عظیم قدرت و اختیار سے ہر چھوٹی بڑی مخلوق کی حد بندی کر رکھی ہے، کسی چیز کی مجال نہیں کہ اپنے محدود وجود اور دائرہ عمل سے باہر قدم نکال سکے، اگر اس عظیم الشان مشین کا ایک پرزہ یا اس کارخانہ کا ایک مزدور بھی مالک علی الاطلاق کی قدرت واختیار سے باہر ہوتا تو مجموعہ عالم کا یہ مکمل ومحکم نظام ہرگز قائم نہ رہ سکتا۔

الَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَیَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

وہ جو یاد کرتے ہیں اللہ کو کھڑے اور بیٹھے اور کروٹ پر لیٹے اور فکر کرتے ہیں آسمان اور زمین کی پیدائش میں

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۹۱﴾

کہتے ہیں اے رب ہمارے تو نے یہ عبث نہیں بنایا، تو پاک ہے سب عیبوں سے سو ہم کو بچا دوزخ کے عذاب سے۔

خلاصہ تفسیر: (وہ حالت یہ ہے) کہ وہ لوگ (ہر حال میں دل سے بھی اور زبان سے بھی) اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں، کھڑے بھی بیٹھے بھی لیٹے بھی اور آسمانوں اور زمین کے پیدا ہونے میں (اپنی قوت عقلیہ سے) غور کرتے ہیں (اور غور کا جو نتیجہ ہوتا ہے یعنی ایمان کی تجدید وتقویت اس کو اس طرح ظاہر کرتے ہیں:) کہ اے ہمارے پروردگار! آپ نے اس (مخلوق) کو لایعنی پیدا نہیں کیا (بلکہ اس میں بہت سی حکمتیں رکھی ہیں، جن میں ایک بڑی حکمت یہ ہے کہ اس مخلوق سے خالق کی ہستی اور قدرت پر استدلال کیا جائے) ہم آپ کو (لایعنی پیدا کرنے سے) منزہ سمجھتے ہیں (اس لئے ہم نے استدلال کیا اور توحید کے قائل ہوئے) سو ہم کو (موحد ومومن ہونے کی وجہ سے) عذاب دوزخ سے بچا لیجئے (جیسا کہ شرعاً اس کا تقاضہ ہے اگرچہ کسی عارض کی وجہ سے یہ تقاضہ کمزور ہو جائے اور چندے عذاب ہونے لگے، چنانچہ ایک عرض تو ان لوگوں کی یہ تھی اور اسی ایمان کے مضمون کی مناسبت سے وہ اور گذارشات بھی کرتے ہیں جو آگے آرہی ہیں)۔

الَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ (الی قولہ) وَیَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ: اس میں دو مسئلے ہیں: ① ذکر کی طرح فکر بھی عبادت ہے ② فکر خالق کی ذات میں نہیں، بلکہ مخلوقات کی پیدائش اور اس کی حکمتوں میں کی جاتی ہے (ذات الٰہی میں بحث وغور وفکر کرنا ممنوع ہے)۔

* * *

فائدہ: ١ یعنی کسی حال خدا سے غافل نہیں ہوتے، اس کی یاد ہمہ وقت ان کے دل میں اور زبان پر جاری رہتی ہے، جیسے حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت عائشہ صدیقہؓ نے فرمایا: کَانَ یَذْکُرُ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ اَحْیَانِہٖ نماز بھی خدا کی بہت بڑی یاد ہے، اسی لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو کھڑا ہو کر نہ پڑھ سکے بیٹھ کر اور جو بیٹھ نہ سکے لیٹ کر پڑھ لے بعض روایات میں ہے کہ جس رات میں یہ آیات نازل ہوئیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے، بیٹھے، لیٹے، ہر حالت میں اللہ کو یاد کر کے روتے رہے۔

فائدہ: ٢ یعنی ذکر و فکر کے بعد کہتے ہیں کہ خداوندا! یہ عظیم الشان کارخانہ آپ نے بیکار پیدا نہیں کیا، جس کا کوئی مقصد نہ ہو، یقیناً ان عجیب و غریب حکیمانہ انتظامات کا سلسلہ کسی عظیم و جلیل نتیجہ پر منتہی ہونا چاہئے، گویا یہاں سے ان کا ذہن تصور آخرت کی طرف منتقل ہو گیا جو فی الحقیقت دنیا کی موجودہ زندگی کا آخری نتیجہ ہے، اسی لئے آگے دوزخ کے عذاب سے محفوظ رہنے کی دعاء کی، اور درمیان میں خدا تعالیٰ کی تسبیح و تنزیہ بیان کر کے اشارہ کر دیا کہ جو احمق قدرت کے ایسے صاف و صریح نشان دیکھتے ہوئے تجھ کو نہ پہچانیں یا تیری شان کو گھٹائیں یا کارخانہ عالم کو محض عبث و لعب سمجھیں، تیری بارگاہ ان سب کی ہزلیات و خرافات سے پاک ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ آسمان و زمین اور دیگر مصنوعات الٰہیہ میں غور و فکر کرنا وہی محمود ہو سکتا ہے جس کا نتیجہ خدا کی یاد اور آخرت کی طرف توجہ ہو، باقی جو مادہ پرست ان مصنوعات کے تاروں میں الجھ کر رہ جائیں اور صانع کی صحیح معرفت تک نہ پہنچ سکیں، خواہ دنیا انہیں بڑا محقق اور سائنسداں کہا کرے، مگر قرآن کی زبان میں وہ اولوا الالباب نہیں ہو سکتے، بلکہ پرلے درجہ کے جاہل و احمق ہیں۔

رَبَّنَآ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَیْتَهٗ ط وَمَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿۱۹۲﴾

اے رب ہمارے جسکو تو نے دوزخ میں ڈالا سو اس کو رسوا کر دیا ١ اور نہیں کوئی گنہگاروں کا مددگار ٢

خلاصہ تفسیر: اے ہمارے پروردگار! (ہم اس لئے عذاب دوزخ سے پناہ مانگتے ہیں کہ) بیشک آپ جس کو (بطور اصل جزاء کے) دوزخ میں داخل کریں اس کو واقعی رسوا ہی کر دیا (مراد اس سے کافر ہے، کیونکہ مسلمان کے لیے رسوا نہ کرنے کا وعدہ ہے) اور ایسے بے انصافوں کا (جن کی اصلی جزاء دوزخ تجویز کی جائے) کوئی بھی ساتھ دینے والا نہیں (اور آپ کا اہل ایمان کے لئے وعدہ ہے رسوا نہ کرنے کا بھی اور نصرت کرنے کا بھی، بس ایمان لا کر ہماری درخواست ہے کہ کفر کی اصلی جزاء سے بچایئے، ایمان کا اصلی مقتضٰی یعنی دوزخ سے نجات مرتب فرمایئے)۔

* * *

فائدہ: ١ جو شخص جتنی دیر دوزخ میں رہے گا اسی قدر رسوائی سمجھو، اس قاعدہ سے دائمی رسوائی صرف کفار کے لئے ہے، جن آیات میں عامہ مومنین سے خزی (رسوائی) کی نفی کی گئی ہے وہاں یہی معنی سمجھنے چاہئیں۔

فائدہ: ٢ یعنی جس کو خدا دوزخ میں ڈالنا چاہے، کوئی حمایت کر کے بچا نہیں سکتا، ہاں جن کو ابتداء میں یا آخر میں چھوڑنا اور معاف کر دینا ہی منظور ہو گا (جیسے عصاۃ مومنین) ان کے لئے شفعاء کو اجازت دی جائیگی کہ سفارش کر کے بخشوائیں، وہ اس کے مخالف نہیں، بلکہ آیات واحادیث صحیحہ سے ثابت ہے۔

رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِیًا یُّنَادِیْ لِلْاِیْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا ق

اے رب ہمارے ہم نے سنا کہ ایک پکارنے والا پکارتا ہے ایمان لانے کو کہ ایمان لاؤ اپنے رب پر ١ سو ہم ایمان لے آئے ٢

رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَیِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ ﴿۱۹۳﴾

اے رب ہمارے اب بخش دے گناہ ہمارے اور دور کر دے ہم سے برائیاں ہماری اور موت دے ہم کو نیک لوگوں کے ساتھ ٣

خلاصہ تفسیر: اے ہمارے پروردگار! ہم نے (جیسے مصنوعات کی دلالت سے عقلی استدلال کیا اسی طرح ہم نے) ایک (حق کی طرف) پکارنے والے کو (اس سے مراد حضور ﷺ ہیں بواسطہ یا بلا واسطہ) سنا کہ وہ ایمان لانے کے لیے اعلان کر رہے ہیں کہ (اے لوگو!) تم اپنے پروردگار (کی ذات وصفات) پر ایمان لاؤ، سو ہم (اس دلیل نقلی سے استدلال کر کے بھی) ایمان لے آئے (اس درخواست میں رسالت کا اعتقاد بھی ضمناً آ گیا، پس ایمان کے دونوں جز یعنی اعتقاد توحید اور اعتقاد رسالت کامل ہو گئے)۔

اے ہمارے پروردگار! پھر (اس کے بعد ہماری یہ درخواست ہے کہ) ہمارے (بڑے) گناہوں کو بھی معاف فرما دیجئے اور ہماری (چھوٹی) بدیوں کو ہم سے (معاف کر کے) زائل کر دیجئے (تا کہ عذاب سے بالکل بچے رہیں) اور (ہمارا خاتمہ اور انجام بھی درست کیجئے جس پر سارا مدار ہے، اور وہ اس طرح کہ) ہم کو نیک لوگوں کے ساتھ (شامل رکھ کر) موت دیجئے (یعنی نیکی پر خاتمہ ہو تا کہ نیک بندوں میں شامل ہوں)۔

سمعنا کے ترجمہ میں جو بواسطہ یا بلا واسطہ بڑھا دیا ہے وہ اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ کی ندا کو صحابہ کرام نے تو بلا واسطہ سنا اور ہم نے قرآن کریم کے واسطہ سے سنا، اور دعا کا مضمون سب مسلمانوں کو عام ہے اس لیے عموم کر دیا گیا۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی نبی کریم ﷺ جنہوں نے بڑی اونچی آواز سے دنیا کو پکارا، یا قرآن کریم جس کی آواز گھر گھر میں پہنچ گئی۔

فائدہ: ۲؎ پہلے ایمان عقلی کا ذکر تھا، یہ ایمان سمعی ہوا جس میں ایمان بالرسول اور ایمان بالقرآن بھی درج ہو گیا۔

فائدہ: ۳؎ یعنی ہمارے بڑے گناہ بخش دے، اور چھوٹی موٹی برائیوں پر پردہ ڈال دے اور جب اٹھانا ہو نیک بندوں کے زمرہ میں شامل کر کے دنیا سے اٹھالے۔

رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰى رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۗ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ﴿۱۹۴﴾

اے رب ہمارے اور دے ہم کو جو وعدہ کیا تو نے ہم سے اپنے رسولوں کے واسطہ سے اور رسوا نہ کر ہم کو قیامت کے دن ۱؎ بیشک تو وعدہ کے خلاف نہیں کرتا ۲؎

خلاصہ تفسیر: اے پروردگار! اور (جس طرح ہم نے اپنی مضرتوں سے محفوظ رہنے کی درخواست کی ہے جیسے دوزخ اور رسوائی اور ذنوب وسیئات، اسی طرح ہم اپنے منافع کی دعا کرتے ہیں کہ:) ہم کو وہ چیز (یعنی ثواب وجنت) بھی دیجئے، جس کا ہم سے اپنے پیغمبروں کی معرفت آپ نے وعدہ فرمایا ہے (کہ مومنین وابرار کو اجر عظیم ملے گا) اور (یہ ثواب وجنت ہم کو اس طرح دیجئے کہ ثواب ملنے سے پہلے بھی) ہم کو قیامت کے روز رسوا نہ کیجئے (جیسا کہ بعض لوگوں کو پہلے سزا ہو گی پھر جنت میں جائیں گے، مطلب یہ کہ اول ہی سے جنت میں داخل کر دیجئے، اور) یقیناً آپ (تو) وعدہ خلافی نہیں کرتے (لیکن ہم کو یہ خوف ہے کہ خدانخواستہ ہم ان صفات میں کوتاہی کر جائیں جن کی بنا پر یہ وعدہ ہے، پھر ہم اس وعدہ کے مستحق نہ رہیں اس لیے ہم آپ سے یہ التجا کرتے ہیں کہ ہم کو ایسا کر دیجئے اور ایسا ہی رکھیے جس سے ہم اس وعدہ کے پورے مستحق ہو جائیں)۔

مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰى رُسُلِكَ: یہاں یہ جو فرمایا کہ "پیغمبروں کی معرفت"، اگرچہ اس جگہ صرف رسول اللہ ﷺ کا ذکر کافی تھا مگر سب رسولوں کا ذکر اس لیے کیا گیا تا کہ معلوم ہو جائے کہ اس وعدہ میں سب انبیاء متفق ہیں، اس سے وعدہ کی تاکید ہو گئی، یعنی بار بار ہر زمانہ میں اس وعدہ کی تجدید ہوتی رہی تو یہ بڑا پختہ وعدہ ہے۔

مذکورہ دعاؤں کا مضمون تمام مقاصد کو جامع ہے، کیونکہ تمام مقاصد کا منتہی دو باتیں ہیں: ① جنت ملنا ② دوزخ سے بچنا، اور ان دونوں کے لیے دو شرطیں ہیں: ① طاعات کا ہونا ② معاصی سے بچنا، اور ان چاروں کی یہاں دعاؤں میں درخواست موجود ہے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی پیغمبروں کی زبانی، انکی تصدیق کرنے پر جو وعدے آپ نے کئے ہیں (مثلاً دنیا میں آخر کار اعداء اللہ پر غالب ومنصور کرنا اور آخرت میں جنت ورضوان سے سرفراز فرمانا) ان سے ہم کو اس طرح بہرہ اندوز کیجئے کہ قیامت کے دن ہماری کسی قسم کی ادنیٰ سے ادنیٰ رسوائی بھی نہ ہو۔

فائدہ: ۲ یعنی آپ کے ہاں تو وعدہ خلافی کا احتمال نہیں، ہم میں احتمال ہے کہ مبادا ایسی غلطی نہ کر بیٹھیں جو آپ کے وعدوں سے مستفید نہ ہوسکیں، اس لئے درخواست ہے کہ ہم کو ان اعمال پر مستقیم رہنے کی توفیق دیجئے جن کی آپ کے وعدوں سے متمتع ہونے کے لئے ضرورت ہے۔

فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّيْ لَآ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى ۚ بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ ۚ

پھر قبول کی ان کی دعا ان کے رب نے کہ میں ضائع نہیں کرتا محنت کسی محنت کرنے والے کی تم میں سے مرد ہو یا عورت، تم آپس میں ایک ہو ا

فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ

پھر وہ لوگ کہ ہجرت کی انہوں نے اور نکالے گئے اپنے گھروں سے اور ستائے گئے میری راہ میں اور لڑے اور مارے گئے البتہ دور کرونگا میں

عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ط

ان سے برائیاں ان کی اور داخل کرونگا ان کو باغوں میں جن کے نیچے بہتی ہیں نہریں ۲ یہ بدلہ ہے اللہ کے ہاں سے

وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ ﴿۱۹۵﴾

اور اللہ کے ہاں ہے اچھا بدلہ ۳

خلاصہ تفسیر: پیچھے مومنین صالحین کی چند دعاؤں کا ذکر تھا، اب ان دعاؤں کا قبول ہونا اور قبولیت کا سبب بطور قاعدہ کلیہ کے بتاتے ہیں، پھر اس قاعدہ پر ایک دوسرا مضمون مرتب فرماتے ہیں جو اس سورت کے مقصود سے مناسبت رکھتا ہے۔

سو قبول کرلیا ان کی دعاؤں کو ان کے رب نے اس وجہ سے (کہ میری دائمی عادت ہے کہ) میں کسی شخص کے (نیک) کام کو جو تم میں سے کام کرنے والا ہو اکارت نہیں کرتا (کہ اس کا بدلہ نہ دیا جائے) خواہ وہ (کام کرنے والا) مرد ہو یا عورت (دونوں کے لئے ایک ہی قانون ہے، کیونکہ) تم (دونوں) آپس میں ایک دوسرے کے جزو ہو (اس لئے حکم اور قانون بھی دونوں کا ایک سا ہے، پس جب انہوں نے ایمان لاکر ایک نیک عمل کیا اور اس کے ثمرات کی درخواست کی تو میں نے اپنی عادت کے مطابق ان کی دعاء کو منظور کرلیا)۔

(اور جب ہم ایمان پر ایسے ثمرات عطا فرماتے ہیں) تو جن لوگوں نے (ایمان کے ساتھ اور بھی مشقت کے عمل کئے جیسے ہجرت یعنی) ترک وطن کیا اور (وہ بھی ہنسی خوشی، سیر و سیاحت کے لئے نہیں، بلکہ اس طرح کہ) اپنے گھروں سے (تنگ کرکے) نکالے گئے اور (اس کے سوا طرح طرح کی) تکلیفیں (بھی) دیئے گئے (اور یہ کام یعنی ہجرت اور وطن سے نکالنا اور مختلف قسم کی ایذائیں سب) میری راہ میں (یعنی میرے دین کے سبب ان کو پیش آئیں اور ان سب کو انہوں نے برداشت کیا) اور (اس سے بڑھ کر انہوں نے یہ کام کیا کہ) جہاد (بھی) کیا اور (بہت سے ان میں سے) شہید (بھی) ہوگئے (اور آخر تک جہاد سے نہ ہٹے، تو ایسے محنت کے اعمال پر ثمرات اور نعمتیں کیوں نہ ملیں گی) ضرور ان لوگوں کی تمام خطائیں (جو میرے حقوق کے متعلق ہوں) معاف کردوں گا اور ضرور ان کو (بہشت کے) ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے (محلات کے) نیچے نہریں جاری ہوں گی (ان کو) یہ بدلہ ملے گا اللہ کے پاس سے اور اللہ ہی کے پاس (یعنی ان کے قبضہ قدرت میں) اچھا عوض ہے۔

لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ: ہجرت اور شہادت سے سب گناہ معاف ہوجاتے ہیں، مگر قرض وغیرہ حقوق العباد کی معافی کا وعدہ نہیں، چنانچہ لا کفرن عنهم سیاتهم کے تحت خلاصہ تفسیر میں قید لگائی گی ہے کہ اللہ کے حقوق میں جو کوتاہیاں اور گناہ ہوئے وہ معاف ہوں گے، اس کی وجہ یہ ہے کہ حدیث سے حقوق العباد کا اس وقت تک معاف نہ ہونا معلوم ہوتا ہے جب تک کہ صاحب حق خود معاف نہ کردے، یا حق ادا کردیا جائے، البتہ جہاد، ہجرت اور شہادت سے حقوق اللہ کے متعلق جس قدر گناہ ہوں وہ سب معاف ہوجاتے ہیں، اور توبہ و استغفار سے بھی ایسے تمام

گناہ معاف ہوجاتے ہیں، چنانچہ پیچھے تمام گناہوں کی معافی کی درخواست تھی اور اس آیت سے اس کا قبول ہونا معلوم ہوا، باقی اگر کسی شخص پر حق تعالیٰ خاص فضل فرمادیں اور صاحب حق کو اس سے راضی کر کے معاف کرادیں تو یہ اور بات ہے اور بعض کے ساتھ ایسا بھی ہوگا۔

****

فائدہ: ۱ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ: یعنی مرد ہو یا عورت، ہمارے ہاں کسی کی محنت ضائع نہیں جاتی، جو کام کرے گا اس کا پھل پائیگا، یہاں عمل شرط ہے، نیک عمل کر کے ایک عورت بھی اپنی استعداد کے موافق آخرت کے وہ درجات حاصل کرسکتی ہے جو مرد حاصل کرسکتے ہیں، جب تم مرد و عورت ایک نوع انسانی کے افراد ہو، ایک آدم سے پیدا ہوئے ہو، ایک رشتہ اسلامی میں منسلک ہو، ایک اجتماعی زندگی اور امور معاشرت میں شریک رہتے ہو تو اعمال اور ان کے ثمرات میں بھی اپنے کو ایک ہی سمجھو، روایت میں ہے کہ ام سلمہؓ نے عرض کیا تھا! یا رسول اللہ! قرآن میں کہیں ہم عورتوں کی ہجرت و غیرہ اعمال حسنہ کا بالتخصیص ذکر نہیں آتا؟ اس کا جواب اس آیت میں دیا گیا۔

فائدہ: ۲ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ: یعنی جب کسی عمل کرنے والے کا چھوٹا موٹا عمل بھی ضائع نہیں ہوتا، پھر ان مردان خدا کا تو پوچھنا ہی کیا ہے جنہوں نے کفر و عصیان چھوڑنے کے ساتھ دار الکفر بھی چھوڑ دیا، وطن، خویش و اقارب، اہل و عیال اور مال و منال سب کو خیر باد کہہ کر دار الاسلام کی طرف نکل کھڑے ہوئے کفار نے ان پر وہ ظلم و ستم توڑے کہ گھروں میں ٹھہرنا محال ہوگیا، وطن چھوڑنے اور گھر بار ترک کرنے پر بھی دشمنوں نے چین نہ لینے دیا، طرح طرح کی ایذائیں پہنچاتے رہے اور یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ وہ میرا نام لیتے تھے اور میرا کلمہ پڑھتے تھے يُخْرِجُوْنَ الرَّسُوْلَ وَاِيَّاكُمْ اَنْ تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ رَبِّكُمْ (الممتحنہ:۱) وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ (البروج:۸) آخر وہ میرے راستہ میں لڑے اور لڑ کر جان دے دی، یہ بندے ہیں جن کی تمام تقصیرات معاف کردی گئیں اور جنت ان کا انتظار کررہی ہے۔

فائدہ: ۳ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ: یعنی اچھا بدلہ تو خدا ہی کے پاس ہے اور کہیں سے نہیں مل سکتا، یا یہ مطلب ہو کہ اس بدلہ سے بھی اچھا بدلہ خدا کے پاس ہے، یعنی اس کا دیدار مبارک، رزقنا اللہ وسائر المومنین۔

لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِي الْبِلَادِ ﴿۱۹۶﴾ مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ثُمَّ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ

تجھ کو دھوکا نہ دے چلنا پھرنا کافروں کا شہروں میں، یہ فائدہ ہے تھوڑا سا، پھر ان کا ٹھکانا دوزخ ہے، اور وہ بہت برا

الْمِهَادُ ﴿۱۹۷﴾ لٰكِنِ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا

ٹھکانا ہے ۱ لیکن جو لوگ ڈرتے رہے اپنے رب سے ان کے لئے باغ ہیں جن کے نیچے بہتی ہیں نہریں ہمیشہ رہیں گے ان میں ۲

نُزُلًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّلْاَبْرَارِ ﴿۱۹۸﴾

مہمانی ہے اللہ کے ہاں سے ۳ اور جو اللہ کے ہاں ہے سو بہتر ہے نیک بختوں کے واسطے

خلاصہ تفسیر: پیچھے مسلمانوں کی تکلیفوں کا بیان اور ان کا نیک انجام مذکور تھا، اب کفار کا عیش و آرام اور اس کا برا انجام مذکور ہے تاکہ مسلمان کفار کے ظاہری عیش و آرام، مال و دولت سے دھوکہ میں نہ آئیں کہ وہ چند روزہ ہے اور پھر دائمی عذاب، پھر اس برے انجام کو معلوم کر کے کفار میں سے اگر کوئی توبہ کرے اور کفر و معاصی سے باز آجائے تو اس کو بھی نیک انجام نصیب ہوجانا ساتھ کے ساتھ بیان فرمایا۔

(اے طالب حق!) تجھ کو ان کافروں کا (کسب معاش یا تفریحات کے لئے) شہروں میں چلنا پھرنا مغالطہ میں نہ ڈال دے (کہ اس حالت کی کچھ وقعت کرنے لگو) یہ چند روزہ بہار ہے (کیونکہ مرتے ہی اس کا نام ونشان بھی نہ رہے گا، اور) پھر (انجام یہ ہوگا کہ) ان کا ٹھکانہ (ہمیشہ کے لئے) دوزخ ہوگا، اور وہ بری ہی آرام گاہ ہے، لیکن (ان میں سے بھی) جو لوگ خدا سے ڈریں (اور مسلمان و فرمانبردار ہوجائیں) ان کے لئے بہشتی باغات ہیں

جن کے (محلات کے) نیچے نہریں جاری ہوگی، وہ ان (باغوں) میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، یہ (ان کی) مہمانی ہوگی اللہ کی طرف سے اور جو چیزیں خدا کے پاس ہیں (جن کا ابھی ذکر ہوا یعنی بہشتی باغ اور نہریں وغیرہ) یہ نیک بندوں کے لئے بدر جہا بہتر ہیں (کفار کی چندروزہ عیش و مسرت سے)۔

***

فائدہ: ۱؎ یعنی کفار جو اِدھر اُدھر تجارت وغیرہ کر کے دولت کماتے اور اکڑتے پھرتے ہیں، مسلمان کو چاہیے کہ ان سے دھوکہ نہ کھائے یہ محض چندروز کی بہار ہے، اگر ایک شخص کو چار دن پلاؤ، قورمے کھلانے کے بعد پھانسی یا حبس دوام کی سزا دی جائے تو وہ کیا خوش عیش ہوا، خوش عیش وہ ہے جو تھوڑی سی محنت اور تکلیف اٹھا کر ہمیشہ کے لئے اعلیٰ درجہ کی راحت وآسائش کا سامان مہیا کرلے۔

فائدہ: ۲؎ اب اس عیش وکامیابی کا اس چندروزہ بہار سے مقابلہ کرو کہ یہ بہتر ہے یا وہ؟

فائدہ: ۳؎ ''مہمان'' اسلئے کہا کہ مہمان کو اپنے کھانے پینے کی کچھ فکر کرنی نہیں پڑتی، عزت اور آرام سے بیٹھے بٹھائے ہر چیز تیار ملتی ہے۔

وَاِنَّ مِنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ لَمَنۡ يُّؤۡمِنُ بِاللّٰهِ وَمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡكُمۡ وَمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡهِمۡ خٰشِعِيۡنَ لِلّٰهِ ۙ

اور کتاب والوں میں بعضے وہ بھی ہیں جو ایمان لاتے ہیں اللہ پر اور جو اترا تمہاری طرف اور جو اترا انکی طرف عاجزی کرتے ہیں اللہ کے آگے

لَا يَشۡتَرُوۡنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيۡلًا ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمۡ اَجۡرُهُمۡ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ ؕ

نہیں خریدتے اللہ کی آیتوں پر مول تھوڑا، یہی ہیں جن کے لئے مزدوری ہے ان کے رب کے ہاں ۱؎

اِنَّ اللّٰهَ سَرِيۡعُ الۡحِسَابِ ﴿۱۹۹﴾

بیشک اللہ جلد لیتا ہے حساب ۲؎

خلاصہ تفسیر: پیچھے دعاء کی آیتوں سے پہلے اہل کتاب کی برائیوں کا ذکر تھا، اب ان لوگوں کے اجر عظیم کا ذکر ہے جو اہل کتاب میں سے مسلمان ہوگئے، اس لئے قرآن کی عام عادت کے مطابق بدکرداروں کی برائیوں کے بعد نیکوکاروں کی مدح فرماتے ہیں، چنانچہ پہلے بھی آیت: لیسوا سواء میں ایسے لوگوں کی مدح آچکی ہے مگر وہ آیت نومسلم یہودیوں کے بارہ میں تھی، اور یہ آیت نومسلم نصاریٰ کے بارہ میں ہے، اور اس سورت میں ان ہی دونوں کی طرف روئے سخن زیادہ تھا، اور اگر دونوں آیتوں کا مصداق ایک ہی جماعت ہو تب بھی عنوان بدل جانے کی وجہ سے تکرار نہ ہوگا۔

اور بالیقین بعض لوگ اہل کتاب میں سے ایسے بھی ضرور ہیں جو اللہ پر اعتقاد رکھتے ہیں اور اس کتاب کے ساتھ بھی (اعتقاد رکھتے ہیں) جو تمہارے پاس بھیجی گئی (یعنی قرآن) اور اس کتاب کے ساتھ بھی (اعتقاد رکھتے ہیں) جو ان کے پاس بھیجی گئی (یعنی توراۃ، انجیل اور خدا پر جو اعتقاد رکھتے ہیں تو) اس طور پر کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے (بھی) ہیں (اس لئے اس اعتقاد میں شرعی حدود سے تجاوز نہیں کرتے جیسا کہ دوسرے اہل کتاب نعوذ باللہ خدا پر اولاد کی تہمت لگاتے ہیں، کہیں احکام الٰہی میں افتراء کرتے ہیں اور خدا کا خوف نہیں کرتے تو یہ لوگ ایسے نہیں، اسی طرح دوسرے اہل کتاب تورات وانجیل کے معاوضہ میں دنیا کماتے تھے یہ ایسا نہیں کرتے، بلکہ تورات وانجیل پر اس طرح اعتقاد رکھتے ہیں کہ) اللہ تعالیٰ کی آیات کے مقابلہ میں (دنیا کا) کم حقیقت معاوضہ نہیں لیتے، ایسے لوگوں کو ان کا نیک عوض ملے گا ان کے پروردگار کے پاس (اور اس میں کچھ دیر بھی نہ لگے گی، کیونکہ) بلاشبہ اللہ تعالیٰ جلد ہی حساب (کتاب) کردیں گے (اور حساب کتاب کرتے ہی سب کا دینا لینا بے باق کردیں گے)۔

اِنَّ اللّٰهَ سَرِيۡعُ الۡحِسَابِ: یعنی اللہ تعالیٰ جلد ہی حساب کردیں گے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان لوگوں سے بھی حساب کتاب ضرور ہوگا، کیونکہ حدیث سے بہت سے مقبول بندوں کا بلا حساب کتاب جنت میں جانا معلوم بات ہے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ جو جلدی حساب کتاب کردیتا ہے وہ جلدی ہی لینا دینا بھی بے باق کردیتا ہے تو سمجھ لو کہ ایمان واعمال صالحہ کا عوض بھی جلدی ہی مل جائے گا۔

***

فائدہ: ۱ اوپر عام متقین کا حال بیان ہوا تھا، اب اہل کتاب میں جو متقی ہوں انکا خصوصیت سے ذکر فرماتے ہیں، یعنی جو اہل کتاب اللہ پر ٹھیک ٹھیک ایمان لائے، قرآن کو مانا اور چونکہ خود قرآن تورات وانجیل کی تصدیق کرتا ہے انکو بھی مانا، مگر اس طرح نہیں، جیسے دنیا پرست احبار مانتے تھے کہ تھوڑے سے دنیاوی فائدہ کی خاطر آیات اللہ کو چھپالیا یا بدل ڈالا، بلکہ خدا کے آگے عاجزی اور اخلاص سے گرے اور جس طرح اس نے کتابیں اتاری تھیں ٹھیک ٹھیک اسی اصلی رنگ میں ان کو تسلیم کیا، نہ بشارات کو چھپایا، نہ احکام کو بدلا، ایسے پاکباز حق پرست اہل کتاب کے لیے اللہ کے ہاں مخصوص اجر ہے، چنانچہ قرآن وحدیث کی تصریحات سے ثابت ہے کہ ایسے اہل کتاب کو دوہرا اجر ملے گا۔

فائدہ: ۲ یعنی حساب کا دن کچھ دور نہیں، جلد آنے والا ہے اور جب حساب شروع ہوگا تمام دنیا کا پائی پائی حساب بہت جلد بے باق کردیا جائے گا۔

ع ۱۱ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اصْبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿٢٠٠﴾

اے ایمان والو صبر کرو اور مقابلہ میں مضبوط رہو اور لگے رہو، اور ڈرتے رہو اللہ سے تاکہ تم اپنی مراد کو پہنچو

خلاصہ تفسیر: اب اس آخری آیت میں چار اہم چیزوں کی وصیت مسلمانوں کو کی گئی ہے: ① صبر ② مصابرہ ③ مرابطہ ④ چوتھی چیز تقوی ہے جو ان تینوں کے ساتھ لازم ہے، گویا یہ احکامات پوری سورت کا خلاصہ ہیں۔

اے ایمان والو! (تکالیف پر) خود صبر کرو، اور (جب کفار سے لڑائی ہو تو) مقاتلہ میں صبر کرو، اور (قتال کے احتمال کے وقت) مقابلہ کے لئے مستعد رہو، اور (ہر حال میں) اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو (کہ شرعی حدود سے نہ نکلو) تاکہ تم پورے کامیاب ہو (آخرت میں تو ضرور ہی کامیابی ہوگی اور ان احکام کی بجا آوری سے اکثر دنیا میں بھی کامیابی ساتھ رہتی ہے)۔

اصْبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا: اس سورت کا اصل مضمون کفار کے ساتھ ہاتھ اور زبان سے ان کے مقابلہ میں جہاد کا بیان تھا، اس کے ضمن میں کفار کے بہت سے قولی وفعلی معاملات ایسے مذکور ہوئے جن سے مسلمانوں کو تکلیف پہنچتی تھی، ایسے مواقع پر چار قسم کے حالات پیش آتے، چنانچہ مسلمانوں کو ان احوال کی مناسبت سے چار بنیادی اور ضروری احکام بیان کیے گئے:

① محض ایذا رسانی: اس میں بطور خود صبر واستقلال کی ضرورت ہوتی ہے۔

② باہم قتل وقتال: اس میں "مصابرہ" یعنی سامنے والے کے مقابلے میں صبر وثابت قدمی کی حاجت ہوتی ہے۔

③ احتمال قتل وقتال: یعنی نہ صلح کا معاہدہ ہو اور نہ بالفعل مقاتلہ ہو، لیکن احتمال اور خطرہ ہو، اس میں "مرابطہ" یعنی مقابلہ کے لیے مستعد رہنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

④ مباحثہ: اس میں تقوی کی حاجت ہوتی ہے تاکہ جوش اور غصہ میں مخالف کے ساتھ شدت یا اس کی شان میں سوءادب نہ ہوجائے، جیسا کہ اکثر مناظروں میں دیکھا جاتا ہے، اور تقوی صرف مباحثہ کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ چاروں حالت میں اس کی ضرورت ہے، تاکہ کسی بھی حالت میں شرعی حدود سے تجاوز نہ ہوجائے، گویا تقوی ان سب کاموں کی روح اور قبولیت کا مدار ہے۔

اصْبِرُوا وَصَابِرُوا: "صبر" کے لفظی معنی روکنے اور باندھنے کے ہیں اور اصطلاح قرآن وسنت میں نفس کو خلاف طبع چیزوں پر جمائے رکھنے کو صبر کہا جاتا ہے، "مصابرت" اسی لفظ "صبر" سے ماخوذ ہے، اس کے معنی ہیں دشمن کے مقابلہ میں ثابت قدم رہنا۔

وَرَابِطُوا: "مرابطہ" یہ لفظ "ربط" سے بنا ہے، جس کے اصل معنی باندھنے کے ہیں اور اسی وجہ سے رباط اور مرابطہ کے معنے گھوڑے باندھنے اور جنگ کی تیاری کے لئے جاتے ہیں، اصطلاح قرآن وحدیث میں یہ لفظ دو معنی کے لئے استعمال کیا گیا ہے: ① اول اسلامی سرحدوں کی حفاظت جس کے لئے جنگی گھوڑوں اور جنگی سامان کے ساتھ مسلح رہنا لازمی ہے، تاکہ دشمن اسلامی سرحد کی طرف رخ کرنے کی جرأت نہ کرے ② دوسرے نماز باجماعت کی ایسی پابندی کہ ایک نماز کے بعد ہی دوسری نماز کے انتظار میں رہے، یہ دونوں چیزیں اسلام میں بڑی مقبول عبادت ہیں، جن کے بے شمار فضائل ہیں۔

یہاں دونوں معنوں کا احتمال ہے، یا تو پہلے معنی کے اعتبار سے تشبیہا اس کو رباط فرمادیا کہ یہ بھی نفس وشیطان کے مقابلہ میں مستعد رہنا ہے، یا دوسرے معنی کے اعتبار سے حقیقتاً فرمادیا ہے کہ یہ انتظام اور پابندی خود علامت ہے پابندی کی جیسا کہ ظاہر ہے۔

* * *

فائدہ: خاتمہ پر مسلمانوں کو ایک نہایت جامع ومانع نصیحت فرمادی، جو گویا ساری سورت کا ماحصل ہے، یعنی اگر کامیاب ہونا اور دنیا و آخرت میں مراد کو پہنچنا چاہتے ہو تو سختیاں اٹھا کر بھی طاعت پر جمے رہو، معصیت سے رکو، دشمن کے مقابلہ میں مضبوطی اور ثابت قدمی دکھلاؤ، اسلام اور حدود اسلام کی حفاظت میں لگے رہو، جہاں سے دشمن کے حملہ آور ہونے کا خطرہ ہو وہاں آہنی دیوار کی طرح سینہ سپر ہو کر ڈٹ جاؤ: **وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ** (الانفال: ٦٠) اور ہر وقت ہر کام میں خدا سے ڈرتے رہو، یہ کر لیا تو سمجھو کہ مراد کو پہنچ گئے: اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنَا مُفْلِحِيْنَ وَفَائِزِيْنَ بِفَضْلِكَ وَرَحْمَتِكَ فِي الدُّنْيَا وَ الْآخِرَةِ اٰمِيْن، حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تہجد کے لئے اٹھتے تو آسمان کی طرف نظر اٹھا کر یہ دس آیتیں ان فی خلق السمٰوٰت والارض سے ختم سورۃ تک تلاوت کرتے تھے۔

ایاتها ١٧٦ ◆ ٤ سُوْرَةُ النِّسَآءِ مَدَنِيَّةٌ ٩٢ ◆ ركوعاتها ٢٤

خلاصہ تفسیر: گذشتہ سورت تقویٰ کے مضمون پر ختم ہوئی، اس سورت کو اسی مضمون سے شروع کیا ہے لیکن پچھلی سورت میں تقویٰ کے محل میں زیادہ تر وہ معاملات بیان ہوئے تھے جو مخالفین کے ساتھ پیش آتے ہیں، وضاحت سے اس کی تفصیل گذر چکی ہے، اس سورت میں بھی ان معاملات کا بیان ہے، اس کے ساتھ باہمی معاملات اور دیانات یعنی اللہ اور بندے کے درمیان معاملات کا بیان ہے، غرض اس سورت میں تین قسم کے مضامین ہیں: ① باہمی معاملات جیسے یتیموں اور مسکینوں کے حقوق، والدین، رشتہ داروں اور بیویوں کے حقوق، میراث کے احکام، مسافر اور پڑوسیوں کے حقوق، عدل، امانت، ملاقات اور سفارش کے احکام وغیرہ ② دیانات یعنی اللہ تعالیٰ اور بندہ کے درمیان معاملات، جیسے نماز و توبہ کے احکام، طہارت یعنی وضو اور تیمم کے احکام اور ہجرت ③ مخالفین کے ساتھ معاملات، جیسے احکام جہاد، منافقین اور اہل کتاب کے احوال، مشرکین کے عقائد کا بطلان، یہ تمام مضامین ملا جلا کر بیان کیے گئے ہیں، اکثر ایک مضمون کے ضمن میں دوسرے مضامین آگئے ہیں، سب سے پہلے تقوی یعنی اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کا حکم فرماتے ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ

اے لوگوں ڈرتے رہو اپنے رب سے جس نے پیدا کیا تم کو ایک جان سے اور اسی سے پیدا کیا اس کا جوڑا اور پھیلائے

مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ۭ

ان دونوں سے بہت مرد اور عورتیں [1] اور ڈرتے رہو اللہ سے جس کے واسطہ سے سوال کرتے ہو آپس میں اور خبردار رہو قرابت والوں سے [2]

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا ①

بیشک اللہ تم پر نگہبان ہے [3]

خلاصہ تفسیر: اوپر کی سورت تقوی کے مضمون پر ختم ہوئی، اس سورت کو اسی مضمون سے شروع کیا، جس میں تقوی کے ساتھ ہی

اکثر باہمی انسانی حقوق وتعلقات کی رعایت کی طرف اشارہ ہے:

اے لوگو! اپنے پروردگار (کی مخالفت سے) ڈرو، جس نے تم کو ایک جاندار (یعنی آدم علیہ السلام) سے پیدا کیا (کیونکہ سب آدمیوں کی اصل وہی ہیں) اور اس (ہی) جاندار سے اس کا جوڑا (یعنی ان کی زوجہ حواء کو) پیدا کیا، اور (پھر) ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں (دنیا میں) پھیلائیں اور (تم سے دوبارہ تاکید کے لئے کہا جاتا ہے کہ) تم اللہ تعالیٰ سے ڈرو جس کے نام سے ایک دوسرے سے (اپنے حقوق کا) مطالبہ کیا کرتے ہو (یعنی دوسروں سے کہتے ہو کہ خدا سے ڈر کر میرا حق دے دو، سو جب دوسروں کو خدا کی مخالفت سے ڈراتے ہو تو تم خود بھی ڈرو) اور (یوں تو تمام احکام الہیہ میں مخالفت سے بچنا اور ڈرنا ضرور ہے، لیکن اس مقام پر ایک حکم خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے) کہ قرابت (کے حقوق ضائع کرنے) سے بھی ڈرو، بالیقین اللہ تعالیٰ تم سب (کے حالات) کی اطلاع رکھتے ہیں (اگر مخالفت کرو گے مستحق سزا ہو گے)۔

يَآيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ: اس سورت کے شروع میں اپنوں سے میل جول یعنی حقوق العباد سے متعلق احکام ہیں، مثلاً یتیموں کے حقوق، رشتہ داروں اور بیویوں کے حقوق وغیرہ، لیکن حقوق کچھ تو ایسے ہیں جو قانون انضباط میں آسکتے ہیں اور ان کی ادائیگی بزور قانون کرائی جاسکتی ہے، جیسے عام معاملات بیع وشراء اجارہ ومزدوری کے ذریعہ پیدا ہونے والے حقوق، جو باہمی معاہدات اور صلح کے ذریعہ طے ہو سکتے ہیں، اگر کوئی فریق مقررہ حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی کرے تو بزور حکومت بھی دلوائے جاسکتے ہیں، لیکن اولاد، والدین، شوہر اور بیوی ویتیم بچے جو اپنی تحویل میں ہوں اور دوسرے رشتہ داران کے باہمی حقوق جو ایک دوسرے پر عائد ہوتے ہیں، ان کی ادائیگی کا مدار، ادب، احترام، دلداری، ہمدردی اور قلبی خیر خواہی پر ہے اور یہ ایسی چیزیں ہیں جو کسی کانٹے میں تولی نہیں جاسکتیں اور معاہدات کے ذریعہ بھی ان کی پوری تعیین مشکل ہے، لہٰذا ان کی ادائیگی کے لئے بجز خوف خدا اور خوف آخرت کے کوئی دوسرا ذریعہ نہیں جسے ''تقویٰ'' سے تعبیر کیا جاتا ہے اور حقیقت میں یہ تقوی کی طاقت حکومت اور قانون کی طاقت سے کہیں زیادہ ہے، اس لئے اس سورت کو امر بالتقوی سے شروع فرمایا۔

خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ: اس آیت میں پیدائش کی تین صورتوں کا بیان ہے: ① ایک تو جاندار کا بے جان سے پیدا کرنا، جیسے آدم علیہ السلام مٹی سے پیدا ہوئے ② دوسرے جاندار کا جاندار سے مشہور طریقہ کے خلاف پیدا ہونا، جیسا کہ صحیح حدیث میں ہے کہ حضرت حوا حضرت آدم علیہما السلام کی پسلی سے پیدا ہوئی ③ تیسرے جاندار کا جاندار سے مشہور طریقہ پر پیدا ہونا، جیسا کہ آدم اور حوا سے اس وقت تک سب لوگ پیدا ہوتے آرہے ہیں، یہ سب طریقے فی نفسہ عجیب ہونے میں برابر ہیں، مگر قدرت کے نزدیک کوئی بھی عجیب نہیں، پس دلیل سے ثابت ہونے کے بعد کسی صورت کا محض توہم پرستی کی بنا پر انکار کرنا جیسا کہ بعض لوگ حوا علیہا السلام کے طریقہ پیدائش کے منکر ہیں نہایت ظلم ہے، اگر وہ یہ کہتے ہیں کہ پسلی سے پیدا ہونا عقل میں نہیں آتا تو ہم پوچھتے ہیں کہ نطفہ سے ہی انسان کا پیدا ہونا کب عقل میں آتا ہے، مگر چونکہ قدرت کے سامنے سب آسان ہے، اس لیے اس کا انکار نہیں کرتے تو پھر اور صورتوں کا کیوں انکار کیا جائے؟! رہا یہ سوال کہ پھر اس خاص صورت کے اختیار کرنے میں کیا فائدہ ہوا کہ پسلی سے ان کو پیدا کیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ پہلے تم اس مشہور ومتعارف طریقہ پیدائش کی بابت بیان کر دو کہ اس میں کیا اسرار وفوائد ہیں، جب یہ تم کو معلوم نہیں تو وہ بھی نہ سہی، نیز ممکن ہے کہ یہ حکمت بھی ہو کہ اللہ تعالیٰ کی ہر طریقہ پر پیدا کرنے کی قدرت محقق ہو جائے اور یہ حکمت واسرار بیان کرنے کے نہ ہم مدعی نہ اس کی ضرورت، کیونکہ یہ کوئی لازمی بات نہیں کہ اگر کسی بات کی حکمت نہ معلوم ہو تو وہ غلط ہی ہو، حق تعالیٰ کے افعال کے اسرار کا کون احاطہ کر سکتا ہے، اور اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ آدم علیہ السلام کی ایک ہڈی پسلی کی کم ہو گئی ہو، کیونکہ ممکن ہے کہ اس کے کسی خاص جز کو اصل قرار دے کر حق تعالیٰ نے اپنی قدرت سے اس کو بڑھا کر خاص صورت بنادی ہو، اور اگر مان بھی لیا جائے کہ ایک پسلی آدم علیہ السلام کے بدن سے کم ہو گئی تھی تو اس میں محال کیا ہے، یا یہ کہ اس کو نکالنے سے آدم علیہ السلام کو تکلیف ہو گئی ہو گی محض طفلانہ وہم ہے، حق تعالیٰ کو ہر طرح قدرت ہے۔

رحم کی حفاظت کا حکم خاص طور پر اس لیے بیان کیا گیا کہ آگے اس قسم کے احکام آتے ہیں گویا یہ اس کی تمہید ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ے مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً: یعنی حضرت آدم علیہ السلام سے اول تو حضرت حوا کو ان کی بائیں پسلی سے نکالا، پھر ان دونوں سے تمام مرد اور عورتوں کو پیدا کیا، اور دنیا میں پھیلایا تو حقیقت میں تمام آدمی ایک جان اور ایک شخص سے اللہ تعالیٰ نے پیدا کئے۔

مطلب یہ ہے کہ جب تم سب کو عدم سے وجود میں لانے والا اور پھر تم کو باقی اور قائم رکھنے والا وہی ہے تو اس سے ڈرنا اور اس کی فرمانبرداری ضروری بات ہے، اس سے اشارہ ہو گیا دو مضمونوں کی طرف ① : اول یہ کہ اللہ تعالیٰ تم سب کا خالق اور موجد ہے ② دوسرے یہ کہ تمام آدمیوں کے لئے سبب وجود کہ جس سے اللہ تعالیٰ نے سب کو پیدا فرمایا، ایک ہی جان یعنی ابو البشر آدم علیہ السلام ہے، جس سے معلوم ہو گیا کہ ہمارا اصلی تعلق تو اللہ سے ہے، کیونکہ علت نامہ اور اس کے معلول میں جس قدر تعلق اور قرب اور علاقہ احتیاج ہوتا ہے وہ کسی میں ممکن نہیں، اس کے بعد وہ تعلق اور قرب ہے جو افراد انسانی میں باہم پایا جاتا ہے، کیونکہ ان کا سبب وجود اور مخلوق منہ بالکل شے واحد ہے، جس سے معلوم ہو گیا کہ اول تو ہمارے ذمہ پر خدا تعالیٰ کی اطاعت لازم ہونی چاہیے کہ وہ ہمارا خالق ہے، اس کے بعد تمام مخلوقات میں خاص اپنے بنی نوع کی رعایت اور ان کے ساتھ حسن سلوک کرنا ہم پر ضروری ہونا چاہئے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہم سب کے لئے مخلوق منہ اور سبب وجود ایک چیز کو مقرر فرمایا تو جو قرب اور جو اتحاد افراد انسانی میں باہم موجود ہے وہ کسی دوسری چیز کے ساتھ حاصل نہیں، اسی وجہ سے شرعاً اور عقلاً آدمیوں میں باہم حسن سلوک ایسا ضروری اور بدسلوکی اس قدر مذموم ہے جو اوروں کے ساتھ نہیں، جس کی تفصیل نصوص اور احکام شرعیہ میں برابر موجود ہے۔ شیخ علیہ الرحمۃ نے اسی مضمون کو بیان کیا ہے:

بنی آدم اعضائے یک دیگر اند　　　که در آفرینش ز یک جوہر اند
چو عضوے بدرد آورد روزگار　　　دگر عضوہا را نماند قرار

تو اس موقع میں حق تعالیٰ نے اپنی خالقیت ظاہر فرما کر اپنی اطاعت کا حکم دیا اور بنی آدم کے اتحاد اصلی کو جتلا کر اس طرف اشارہ فرمایا کہ باہم ایک ہو کر رہو، چنانچہ آیت کے آئندہ حصہ میں اس اشارہ کو ظاہر کر دیا۔

فائدہ: ۲ے تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ: خالق اور رب یعنی موجد اور مبقی ہونے کے علاوہ اللہ سے ڈرنے اور اسکی اطاعت کے وجوب کی ایک یہ بھی وجہ ہے کہ تم اسکا واسطہ دیکر آپس میں ایک دوسرے سے اپنے حقوق اور فوائد طلب کرتے ہو اور آپس میں اسکی قسمیں دیتے ہو اور ان پر اطمینان حاصل کرتے کراتے ہو، یعنی اپنے باہمی معاملات اور حاجات عارضہ میں بھی اسی کا ذریعہ پکڑتے ہو، مطلب یہ ہوا کہ وجود اور بقا ہی میں احتیاج منحصر نہیں، بلکہ تمام حاجتوں اور کاموں میں بھی اس کے محتاج ہو، اس لئے اسکی اطاعت کا ضروری ہونا اور بھی محقق ہو گیا۔

اس کے بعد تم کو یہ حکم ہے کہ قرابت سے بھی ڈرو، یعنی اہل قرابت کے حقوق ادا کرتے رہو، اور قطع رحمی اور بدسلوکی سے بچو، بنی نوع یعنی تمام افراد انسانی کے ساتھ علی العموم سلوک کرنا تو آیت کے پہلے حصہ میں آ چکا تھا، اہل قرابت کے ساتھ چونکہ قرب واتحاد مخصوص اور بڑھا ہوا ہے، اس لئے ان کی بدسلوکی سے اب خاص طور پر ڈرایا گیا، کیونکہ ان کے حقوق دیگر افراد انسانی سے بڑھے ہوئے ہیں، چنانچہ حدیث قدسی: "قال الله تبارك وتعالىٰ انا الله وانا الرحمن خلقت الرحم وشققت لها من اسمى فمن وصلها وصلته ومن قطعها قطعته اور حدیث خلق الله الخلق فلما فرغ منه قامت الرحم فاخذت بحقوى الرحمن فقال مه قالت هذا مقام العائذ منك من القطيعة قال الا ترضين ان اصل من وصلك واقطع من قطعك قالت بلى يا رب قال فذاك" اور حدیث "الرحم شجنة من الرحمٰن فقال الله من وصلك وصلته ومن قطعك قطعته اور حديث الرحم معلقة بالعرش تقول من وصلنى وصله الله ومن قطعنى قطعه الله" اس پر شاہد ہیں اور رحم کے اختصاص مذکور اور تعلق کی طرف مشیر ہیں تو اب نتیجہ یہ نکلا کہ معدن وجود اور منشائے وجود کے اتحاد کے باعث تو تمام بنی آدم میں رعایت حقوق اور حسن سلوک ضروری ہے، اس کے بعد اگر کسی موقع میں کسی خصوصیت کی وجہ سے اتحاد میں زیادتی ہو جائے گی، جیسے اقارب میں یا کسی موقع میں شدت احتیاج پائی جائے گی، جیسے یتامیٰ اور مساکین وغیرہ تو وہاں رعایت حقوق میں بھی ترقی ہو جائے گی، ان کے علاوہ جب حکم خداوندی بھی صاف آ گیا کہ ارحام کے حقوق کی رعایت اور حفاظت رکھو تو اب تو اس کی تاکید انتہا کو پہنچ گئی، چنانچہ اس سورت میں اکثر احکام اسی تعلق عام اور دیگر تعلقات خاصہ کے متعلق مذکور ہیں، گویا وہ احکام اس امر کلی کی جو کہ یہاں مذکور ہوا تفصیل ہیں۔

فائدہ: ؎ **اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا:** یعنی تمہارے تمام احوال واعمال سے واقف ہے، اس کے حکم کی متابعت کروگے تو ثواب پاؤ گے، ورنہ مستحق عذاب ہوگے اور تمہارے تعلقات ارحام اور ان کے مراتب اور ہر ایک کے مناسب اس کے حقوق کو بھی خوب جانتا ہے، اس لئے اس کے متعلق جو تم کو حکم دے، اس کو حق سمجھو اور اس پر عمل کرو۔

وَاٰتُوا الْيَتٰمٰۤى اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ ۪ وَلَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَهُمْ

اور دے ڈالو یتیموں کو ان کا مال اور بدل نہ لو برے مال کو اچھے مال سے، اور نہ کھاؤ ان کے مال

اِلٰۤى اَمْوَالِكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا ﴿۲﴾

اپنے مالوں کے ساتھ، بیشک یہ ہے بڑا وبال

خلاصہ تفسیر: پیچھے تقوی کا حکم تھا اور اس ضمن میں انسانی حقوق کے ساتھ ساتھ صلہ رحمی کی رعایت کا بیان تھا، اب ان حقوق کو تفصیل سے بیان فرماتے ہیں جن کی بابت تقوی کا حکم دیا گیا، جن میں یتیموں کے حقوق کو ان کی بے کسی کی وجہ سے سب سے پہلے بیان فرمایا:

اور جن بچوں کا باپ مرجائے ان کے (مملوکہ) مال انہی کو پہنچاتے رہو (یعنی انہی کے خرچ میں لگاتے رہو) اور (جب تک تمہارے قبضہ میں ہو) تم (ان کے مال میں شامل کرنے کے لئے ان کی) اچھی چیز سے بری چیز کو مت بدلو (یعنی ایسا مت کرو کہ ان کی اچھی چیز تو نکال لی جائے اور بری چیز ان کے مال میں ملادی جائے) اور ان کے مال مت کھاؤ اپنے مالوں (کے رہنے) تک (البتہ جب تمہارے پاس کچھ نہ رہے تو بقدر حق الخدمت یعنی معاوضہ ان کے مال سے لینا درست ہے، جیسا کہ آگے آئے گا) ایسی کارروائی کرنا (کہ بری چیز ان کے مال میں شامل کردی یا بلا ضرورت ان کے مال سے فائدہ حاصل کیا) بڑا گناہ ہے (جس کی وعید آگے آئے گی)۔

***

فائدہ: یعنی یتیم بچے جن کا کہ باپ مرگیا ہو، ان کے متعلق ان کے ولی اور سرپرست کو یہ حکم ہے کہ جب وہ بالغ ہوجائیں تو ان کا مال ان کے سپرد کردے اور زمانہ تولیت میں یتیموں کی کسی اچھی چیز کو لیکر اس کے معاوضہ میں بری اور گھٹیا چیز ان کے مال میں شامل نہ کردے اور ان کے مال کو اپنے مال کے ساتھ ملا کر نہ کھائے، مثلاً ولی کو اجازت ہے کہ اپنا اور یتیم کا کھانا مشترک اور شامل رکھے، مگر یہ ضرور ہے کہ یتیم کا نقصان نہ ہونے پائے، یہ نہ ہو کہ اس شرکت کے بہانے سے یتیم کا مال کھا جاوے اور اپنا نفع کرلے، کیونکہ یتیم کا مال کھانا سخت گناہ ہے، احکام متعلقہ ارحام میں یتیموں کے حکم کو شاید اس لئے مقدم بیان فرمایا کہ یتیم اپنی بے سروسامانی اور مجبوری اور بیچارگی اور بے کسی کے باعث رعایت وحفاظت اور شفقت کا نہایت محتاج ہے اور اسی اہتمام کی وجہ سے تبدیل اور شرکت کے نقصان کی بھی کھول کر ممانعت فرمادی اور آئندہ متعدد آیات میں بھی یتیموں کے متعلق چند احکام ارشاد ہوئے جن سے اہتمام مذکور ظاہر وباہر معلوم ہوتا ہے اور یہ تمام احکام اور تاکیدات جملہ یتیموں کے حق میں ہیں، البتہ وہ یتیم جو قرابت دار ہیں ان کے بارے میں تاکید میں زیادہ شدت ہوگی اور وہی شان نزول اور سبب ربط بین الآیات ہیں اور عادت وعرف کے بھی موافق ہیں، کیونکہ یتیم بچہ کا ولی اکثر اس کا کوئی قریب ہی ہوتا ہے۔

وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ

اور اگر ڈرو کہ انصاف نہ کرسکو گے یتیم لڑکیوں کے حق میں تو نکاح کرلو اور جو عورتیں تم کو خوش آویں دو دو تین تین چار چار ؎

فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَلَّا تَعُوْلُوْا ﴿۳﴾

پھر اگر ڈرو کہ ان میں انصاف نہ کرسکو گے تو ایک ہی نکاح کرو یا لونڈی جو اپنا مال ہے ؎ اس میں امید ہے کہ ایک طرف نہ جھک پڑو گے ؎

خلاصہ تفسیر: ماقبل کی آیت میں یتیموں کی حق تلفی کی ممانعت تھی کہ ان کے مال خرد برد کرنا حرام ہے، اب ایک دوسرے عنوان سے اس حکم کا اعادہ ہے کہ جن لوگوں کی ولایت میں یتیم لڑکیاں ہیں، ان سے اس خیال سے نکاح نہ کریں کہ اپنے اختیار کی لڑکی ہے، جتنا چاہیں گے مہر مقرر کردیں گے، اور جو مال ان یتیم لڑکیوں کی ملک میں ہیں، وہ بھی اپنے قبضہ میں آجائیں گے، غرض قرآن کریم کی اس آیت نے صراحتاً بتلادیا کہ مال یتیم پر قبضہ کرنے کا ہر حیلہ اور بہانہ ناجائز ہے اور اولیاء کا فرض ہے کہ وہ دیانتداری سے ان کے حقوق کی نگہداشت کریں، چنانچہ فرمایا:

اور اگر تم کو اس بات کا احتمال (بھی) ہو (اور اگر یقین ہو تو بدرجہ اولی) کہ تم یتیم لڑکیوں کے بارے میں (ان کے مہر کی بابت) انصاف (کی رعایت) نہ کرسکو گے تو (ان سے نکاح مت کرو، بلکہ) اور (حلال) عورتوں سے جو تم کو (اپنی کسی مصلحت کے اعتبار سے) پسند ہوں نکاح کرلو (کیونکہ وہ یتیم لڑکیاں مجبور نہیں ہیں، آزادی سے اپنی رضاوخوشی ظاہر کرسکتی ہیں، اور یہ نکاح اس قید کے ساتھ ہو کہ جو ایک عورت سے زیادہ کرنا چاہے تو ان صورتوں میں سے کوئی صورت ہو، ایک صورت یہ کہ ایک ایک مرد) دو دو عورتوں سے (نکاح کرلے) اور (دوسری صورت یہ کہ ایک ایک مرد) تین تین عورتوں سے (نکاح کرلے) اور (تیسری صورت یہ کہ ایک ایک مرد) چار چار عورتوں سے (نکاح کرلے، بیک وقت چار سے زیادہ ایک مرد کے لیے جائز نہیں)۔

(آیت کے شروع میں کثرت نکاح کی اجازت دی جس کی وجہ یہی تھی کہ یتیموں کے حق میں عدل کے خلاف نہ ہو، چونکہ عدل ہر موقع میں واجب ہے اس لیے آگے اس صورت کا حکم فرماتے ہیں کہ جب کثرت نکاح میں عدل کے خلاف کا اندیشہ ہو)

پس اگر تم کو (غالب) احتمال اس کا ہو کہ (کئی بیویاں کرکے) عدل نہ رکھو گے (بلکہ کسی بیوی کے واجب حقوق ضائع ہوں گے) تو پھر ایک ہی بیوی پر بس کرو یا (اگر دیکھو کہ ایک کے حقوق بھی ادا نہ ہوں گے تو) جو لونڈی (شرعی قاعدہ کے مطابق) تمہاری ملک میں ہو وہی سہی، اس امر مذکور میں (یعنی ایک بیوی کے رکھنے یا صرف لونڈی پر بس کرنے میں) زیادتی (وبے انصافی) نہ ہونے کی توقع قریب تر ہے (کیونکہ صرف ایک بیوی کی صورت میں تو کوئی تعداد نہیں جس میں برابری کرنا پڑے، اور باندی کی صورت میں تو زیادتی وناانصافی کا اندیشہ اور کم ہے، کیونکہ باندی کے حقوق کم ہوتے ہیں، مثلاً مہر نہیں، صحبت کا حق نہیں)۔

وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا: بیویوں کے درمیان عدل وانصاف اور مساوات ان امور میں ضروری ہے جو انسان کے اختیار میں ہیں، مثلاً نفقہ میں برابری، شب باشی میں برابری، رہا وہ امر جو انسان کے اختیار میں نہیں، مثلاً قلب کا میلان کسی کی طرف زیادہ ہوجائے تو اس غیر اختیاری معاملہ میں اس پر کوئی مواخذہ نہیں، بشرطیکہ اس میلان کا اثر اختیاری معاملات پر نہ پڑے، رسول کریم ﷺ نے خود بھی اختیاری معاملات میں پوری مساوات قائم فرمانے کے ساتھ حق تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کیا: "یا اللہ یہ میری برابر والی تقسیم ہے ان چیزوں میں جو میرے اختیار میں ہیں، اب وہ چیز جو آپ کے قبضہ میں ہے میرے اختیار میں نہیں ہے، اس پر مجھ سے مواخذہ نہ کرنا۔"

فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ: ظاہر ہے کہ جس کام پر ایک رسول معصوم بھی قادر نہیں، اس پر کوئی دوسرا کیسے قادر ہوسکتا ہے، اس لئے قرآن کریم کی دوسری آیت میں اس غیر اختیاری معاملہ (قلبی میلان ومحبت) کا ذکر اس طرح فرمایا: **ولن تستطیعوا ان تعدلوا بین النساء ولو حرصتم** یعنی "عورتوں کے درمیان تم پوری برابری ہرگز نہ کرسکو گے"، جس میں بتلادیا کہ میلان قلب اور محبت ایک غیر اختیاری معاملہ ہے، اس میں برابری کرنا انسان کے بس میں نہیں، لیکن آگے اس غیر اختیاری معاملہ کی اصلاح کے لئے یہ بھی ارشاد فرمایا: **فلا تمیلوا کل المیل** یعنی اگر کسی ایک بیوی سے زیادہ محبت ہو تو اس میں تو تم معذور ہو، لیکن دوسری بیوی سے کلی بے اعتنائی اور بے توجہی اس حالت میں بھی جائز نہیں، چنانچہ یہاں اس آیت کے جملے **فان خفتم الا تعدلوا فواحدۃ** میں جس عدل ومساوات کا بیان ہے، یہ ان امور اختیاریہ کا عدل ہے کہ اس میں

بے اعتدالی گناہ عظیم ہے اور جس شخص کو اس گناہ میں مبتلا ہو جانے کا خطرہ ہو اس کو یہ ہدایت کی گئی کہ ایک سے زائد نکاح نہ کرے۔

فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً: مذکورہ بالا تفصیل وتشریح کو نظرانداز کردینے کی وجہ سے بعض لوگ سورۃ نساء کی مذکورہ آیت اور اس آیت (۱۲۹) کو ملانے سے ایک عجیب مغالطہ میں مبتلا ہو گئے، وہ یہ کہ آیت سورۃ نساء میں یہاں تو یہ حکم دیا گیا کہ اگر عدل ومساوات قائم نہ رکھنے کا خطرہ ہو تو پھر ایک ہی نکاح پر بس کرو اور اس دوسری آیت (۱۲۹) میں قطعی طور پر یہ واضح کردیا کہ عدل ومساوات ہو ہی نہیں سکتا، تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک سے زائد نکاح مطلقاً جائز نہ رہے، لیکن ان کو سوچنا چاہئے کہ اگر اللہ تعالیٰ جل شانہ کا مقصود ان تمام آیات میں ایک سے زائد نکاح کو روکنا ہی ہوتا تو بھی اس تفصیل میں جانے کی ضرورت ہی کیا تھی کہ: فانکحوا ماطاب لکم من النسآء مثنی وثلاث وربع (یعنی نکاح کرو جو پسند آئیں تم کو عورتیں دو دو تین تین چار چار) کیونکہ اس صورت میں تو بے انصافی یقینی ہے، پھر خطرہ ہونے کے کوئی معنی ہی باقی نہیں رہتے۔

اس کے علاوہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کا عملی اور قولی بیان اور مسلسل تعامل بھی اس پر شاہد ہے کہ ایک سے زائد نکاح کو کسی وقت اسلام میں نہیں روکا گیا، بات وہی ہے جو اوپر بیان ہو چکی ہے کہ سورۃ نساء کی مذکورہ پہلی آیت میں امور اختیاریہ کے عدل ومساوات کا ذکر ہے اور یہ انسان کی قدرت میں ہے، اسی لیے یہاں ایک اور زیادہ نکاح کرنے میں تفصیل فرمائی، اور آگے دوسری آیت میں محبت اور قلبی میلان میں عدم مساوات پر قدرت نہ ہونے کا بیان ہے، اور وہ انسان کی قدرت میں نہیں، اس لیے اس کی نفی فرمائی، چنانچہ دونوں آیتوں میں نہ کوئی تعارض ہے اور نہ ان آیات میں مطلقاً تعدد ازدواج کی ممانعت کی کوئی دلیل ہے۔

ذَٰلِكَ أَدْنَىٰ أَلَّا تَعُولُوا: آیت کے ختم پر ارشاد فرمایا: ذلك ادنی الا تعولوا، مطلب یہ ہے کہ اس آیت میں جو کچھ تم کو بتلایا گیا ہے (یعنی عدل نہ کرسکنے کی صورت میں ایک بیوی پر اکتفا کرنا، یا باندی کے ساتھ گذارہ کرلینا) یہ ایسی چیز ہے کہ اس کو اختیار کرنے اور اس پر عمل پیرا ہونے میں تم ظلم کرنے سے بچ سکو گے اور زیادتی وتعدی کے مواقع ختم ہو سکیں گے۔

یہاں ایک شبہ یہ ہے کہ جب ایک بیوی ہوگی تو ظلم کا بالکل کوئی موقع نہ ہوگا، پھر لفظ ''ادنی'' بڑھا کر یہ کیوں فرمایا کہ اس پر عمل پیرا ہونا اس بات کے قریب ہے کہ تم ظلم نہ کرو گے، بلکہ یہ فرمانا چاہئے کہ: ''تم بالکل اس ظلم سے بچ جاؤ گے''، اس کا جواب یہ ہے کہ یہ لفظ ''ادنی'' بڑھا کر اس طرف اشارہ فرمایا ہے کہ چونکہ بہت سے لوگ ایک بیوی کو بھی ظلم وستم کا تختہ بنائے رکھتے ہیں، اس لئے ظلم کا راستہ بند کرنے کے لئے صرف یہ کافی نہیں کہ ایک سے زائد نکاح نہ کرو، وہاں! یہ ضرور ہے کہ اس صورت میں ظلم کا خطرہ کم ہو جائے گا اور تم عدل کے قریب پہنچ جاؤ گے اور ظلم وجور سے مکمل رہائی اس وقت ہوگی جبکہ ایک بیوی کے حقوق پورے ادا کئے جائیں، اس کے ساتھ حسن سلوک کا معاملہ رہے، اس کی خامیوں سے درگزر اور اس کی کجی پر صبر کیا جائے۔

فَانكِحُوا مَا طَابَ لَكُم مِّنَ النِّسَاءِ: اس میں اس بات پر دلالت ہے کہ مباحات یعنی جائز چیزوں سے فائدہ اٹھانا اور اس میں کسی قدر کثرت بھی کرنا، اور اس میں سے اچھی اچھی چیزیں منتخب کرنا جب کہ افراط نہ ہو تو زہد وتقوی کے خلاف نہیں، البتہ جس شخص کو افراط یا تفریط کا اندیشہ ہو اس کے لیے بہتری اور اور سلامتی اسی میں ہے کہ بقدر ضرورت اکتفا کرے، اسی واسطے ایسے شخص کے لیے اکتفا کرنے کی طرف اس قول میں اشارہ فرمایا فَوَاحِدَةً اور ذَٰلِكَ أَدْنَىٰ أَلَّا تَعُولُوا میں اس کی حکمت کی طرف بھی اشارہ فرمادیا۔

* * *

فائدہ: مَثْنَىٰ وَثُلَاثَ وَرُبَاعَ: احادیث صحیحہ میں منقول ہے کہ یتیم لڑکیاں جو اپنے ولی کی تربیت میں ہوتی تھیں اور وہ لڑکی اس ولی کے مال اور باغ میں بوجہ قرابت باہمی شریک ہوتی تو اب دو صورتیں پیش آتیں: ① کبھی تو یہ ہوتا کہ ولی کو اس کا جمال اور مال دونوں مرغوب ہوتے تو وہ ولی اس سے تھوڑے سے مہر پر نکاح کرلیتا، کیونکہ دوسرا شخص اس لڑکی کا حق مانگنے والا تو کوئی ہے ہی نہیں ② اور کبھی یہ ہوتا کہ یتیم لڑکی کی صورت تو مرغوب نہ ہوتی، مگر ولی یہ خیال کرتا کہ دوسرے سے نکاح کردوں گا تو لڑکی کا مال میرے قبضہ سے نکل جائے گا اور میرے مال میں دوسرا شریک ہو جائے گا، اس مصلحت سے نکاح تو جوں توں کرلیتا، مگر منکوحہ سے کچھ رغبت نہ رکھتا، اس پر یہ آیت اتری اور اولیاء کو ارشاد ہوا کہ اگر تم کو اس بات کا ڈر ہے کہ تم یتیم

لڑکیوں کی بابت انصاف نہ کرسکو گے اوران کے مہراوران کے ساتھ حسن معاشرت میں تم سے کوتاہی ہوگی توتم ان سے نکاح مت کرو، بلکہ اور عورتیں جوتم کو مرغوب ہوں ان سے ایک چھوڑ چار تک کی تم کو اجازت ہے، قاعدہ شریعت کے موافق ان سے نکاح کرلو، تاکہ یتیم لڑکیوں کو بھی نقصان نہ پہنچے، کیونکہ تم ان کے حقوق کے حامی رہو گے اورتم بھی کسی خرابی اور گناہ میں نہ پڑو۔

جاننا چاہیے کہ مسلمان آزاد کے لئے زیادہ سے زیادہ چار نکاح تک اور غلام کے لئے دو تک کی اجازت ہے، اور حدیثوں میں بھی اس کی تصریح ہے اور آئمہ دین کا بھی اسی پر اجماع ہے اور تمام امت کے لئے یہی حکم ہے صرف رسول اللہ کی خصوصیت اور آپ ﷺ کا امتیاز ہے کہ اس سے زائد کی اجازت ہے۔

فائدہ: یتیم لڑکیوں کے نکاح کی تیسری صورت، یہ بھی ہے حدیث میں ہے کہ جس یتیم لڑکی کی طرف صورت اور مال دونوں وجہ سے بے رغبتی ہوتی تھی، اس کا نکاح ولی دوسری جگہ کردیتا تھا، مگر ظاہر ہے کہ اس آیت کو اس صورت سے تعلق نہیں۔

فائدہ: ۲۔ فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ: یعنی اگر تم کو اسکا ڈر ہو کہ کئی عورتوں میں انصاف اور مساوات کے مطابق معاملہ نہ کرسکو گے تو پھر ایک ہی نکاح پر قناعت کرو، یا صرف لونڈیوں پر ایک ہو یا زیادہ بس کرو، یا ایک منکوحہ کے ساتھ ایک یا چند لونڈیوں کو جمع کرلو۔

فائدہ: ۳۔ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَلَّا تَعُوْلُوْا: یعنی صرف ایک عورت سے نکاح کرنے میں، یا فقط اپنی لونڈی یا اپنی لونڈیوں پر قناعت کرنے میں، یا ایک نکاح کے ساتھ ایک لونڈی یا چند لونڈیوں کو جمع کرنے میں اس بات کی توقع ہے کہ تم بے انصافی اور خلاف عدل سے محفوظ رہو، کیونکہ زوجات کے جو حقوق ہیں وہ اپنی مملوکہ لونڈی کے نہیں کہ ان میں عدل نہ ہونے سے تم پر مواخذہ ہو، نہ ان کے لئے مہر ہے، نہ معاشرت کے لئے کوئی حد مقرر ہے۔

فائدہ: جس کی کئی عورتیں ہوں تو اس پر واجب ہے کہ کھانے پینے اور لینے دینے میں ان کو برابر رکھے اور رات کو ان کے پاس رہنے میں باری برابر باندھے، اگر برابری نہ کرے گا تو قیامت کو وہ مفلوج ہوگا، ایک کروٹ گھسٹتی چلے گی اور کسی کے نکاح میں ایک حرہ اور ایک لونڈی ہو تو لونڈی کو حرہ سے نصف باری ملے گی اور جو لونڈی اپنی ملک میں ہو، اس کا باری میں کوئی حق مقرر نہیں، مالک کی خوشی پر ہے۔

وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ؕ فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَیْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِیْٓــًٔا مَّرِیْٓــًٔا ④

اور دے ڈالو عورتوں کو مہر ان کے خوشی سے ۱۔ پھر اگر وہ اس میں سے کچھ چھوڑ دیں تم کو اپنی خوشی سے تو اس کو کھاؤ رچتا پچتا ۲۔

خلاصہ تفسیر: گزشتہ آیت میں کثرت ازدواج کی وجہ سے جو عورتوں پر ظلم ہوتا تھا اس کا ازالہ تھا، اس آیت میں عورتوں کے ایک خاص حق کا ذکر ہے اور اس میں جو ظلم ہوتا تھا اس کا ازالہ ہے اور وہ حق مہر ہے، کیونکہ اس کا دینا اکثر طبائع پر گراں ہوتا ہے:

تم لوگ بیویوں کو ان کے مہر خوش دلی سے دے دیا کرو، ہاں! اگر وہ بیویاں خوش دلی سے چھوڑ دیں تم کو اس مہر میں کا کوئی جزو (اور یہی حکم کل مہر کا بھی ہے) تو (اس حالت میں) تم اس کو کھاؤ (برتو) مزہ دار خوشگوار سمجھ کر۔

الفاظ کے عموم سے معلوم ہوا کہ عورت کے رشتہ دار بھی اس کی مرضی کے بغیر مہر میں تصرف نہیں کرسکتے۔

فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَیْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا: اس میں اس پر دلالت ہے کہ اپنے سے کم رتبہ شخص سے ہدیہ لینے سے عار نہ کرے۔

* * *

فائدہ: ۱۔ یعنی جن عورتوں سے نکاح کرو، ان کے مہر خوش دلی اور رغبت کے ساتھ خود ادا کردو، ان کا کوئی حامی اور تم سے تقاضا کرکے وصول کرنے والا ہو یا نہ ہو، ایسا کرو تو پھر یتیم لڑکیوں سے نکاح کرنے میں کوئی حرج ہی نہیں، حرج تو جب ہے کہ مہر دینے میں یا ان کے کسی حق کے ادا کرنے میں گرانی ہو۔

فائدہ: ۲۔ یعنی اگر عورت اپنی خوشی سے مہر میں سے کوئی مقدار زوج کو معاف کردے، یا لے کر پھر زوج کو ہبہ کردے تو اس میں کچھ حرج نہیں، زوج اس کو خوشی سے کھالے، جو کھانا لذیذ ہو اور طبیعت اس کو رغبت کے ساتھ قبول کرلے اس کو "هنیئ" کہتے ہیں اور جو کھانا ہضم ہو کر بخوبی جزو

بدن اور موجب صحت قوت ہو وہ "مریء" ہے۔

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِىْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا وَّارْزُقُوْهُمْ فِيْهَا وَاكْسُوْهُمْ

اور مت پکڑا دو بے عقلوں کو اپنے وہ مال جن کو بنایا ہے اللہ نے تمہارے گزران کا سبب اور ان کو اس میں سے کھلاتے اور پہناتے رہو

وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ⑤

اور کہو ان سے بات معقول

خلاصہ تفسیر: پیچھے یتیموں کا مال ان کو سپرد کرنے کا حکم گزرا جس سے بظاہر یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ یتیموں کا مال بہرحال ان کے حوالہ کر دینا چاہئے، خواہ ان کو معاملات کا سلیقہ بھی نہ ہو اور وہ اس کی حفاظت پر بھی قادر نہ ہوں، چنانچہ اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے اب یہ فرماتے ہیں کہ کم عقلوں کو مال سپرد نہ کرو۔

اور (اگر یتیم بالغ ہو جائیں جس کا تقاضہ ان کا مال ان کے سپرد کر دینا ہے، لیکن اگر وہ کم عقل ہوں تو) تم (ان) کم عقلوں کو اپنے (یعنی ان کے) وہ مال مت دو جن کو اللہ تعالیٰ نے (ایسے کام کا پیدا کیا ہے کہ ان کو) تمہارے (سب کے) لئے مایۂ زندگی بنایا ہے (مطلب یہ کہ مال قدر کی چیز ہے، ان کو ابھی مت دو کہ بے قدری کر کے اڑا دیں گے) اور ان مالوں میں (سے) ان کو کھلاتے رہو، پہناتے رہو، اور ان سے معقول بات کہتے رہو (یعنی ان کی تسلی کرتے رہو کہ مال تمہارا ہی ہے، مگر تمہاری خیر خواہی کی وجہ سے ابھی تمہارے ہاتھ میں نہیں دیا، ذرا سمجھ دار ہو جاؤ گے تو تم ہی کو دیا جائے گا)۔

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ: اس سے یہ قاعدہ مستنبط ہوتا ہے کہ کوئی چیز غیر اہل کو سپرد نہ کی جائے اور اموال ہی پر منصب اور عہدوں کو بھی قیاس کریں گے، اور من جملہ مناصب کے طالبین کی تعلیم و تربیت کی خدمت ہے، سو کسی کو خلیفہ بنانے یا کوئی عہدہ و منصب دینے میں نہایت احتیاط کرنی چاہیے اور جس طرح اموال کے بارے میں وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى میں امتحان لینے کا حکم ہے اسی پر قیاس کر کے اس کے منصب کے بارے میں بھی بدرجہ اولیٰ امتحان لینا ضروری ہوگا۔

❀ ❀ ❀

فائدہ: یعنی بے سمجھ لڑکوں کے ہاتھ میں ان کا وہ مال مت دے دو کہ جس کو اللہ تعالیٰ نے آدمیوں کے لئے سامان معیشت بنایا ہے، بلکہ اس کی پوری حفاظت رکھو اور اندیشہ ہلاکت سے بچاؤ اور جب تک ان کو نفع نقصان کا ہوش نہ آئے، اس وقت تک ان کو اس میں سے کھلاؤ پہناؤ اور تسلی کرتے رہو کہ یہ سب مال تمہارا ہی ہے، ہم تو تمہاری خیر خواہی کرتے ہیں، جب سمجھدار ہو جاؤ گے تم کو ہی دے دیں گے۔

وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰٓى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْٓا اِلَيْهِمْ

اور سدھاتے رہو یتیموں کو جب تک پہنچیں نکاح کی عمر کو، پھر اگر دیکھو ان میں ہوشیاری تو حوالہ کر دو ان کے

اَمْوَالَهُمْ ۚ وَلَا تَاْكُلُوْهَآ اِسْرَافًا وَّبِدَارًا اَنْ يَّكْبَرُوْا ۭ وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا

مال ان کا ۱ اور کھا نہ جاؤ یتیموں کا مال ضرورت سے زیادہ اور حاجت سے پہلے کہ یہ بڑے نہ ہو جائیں ۲ اور جس کو حاجت نہ ہو

فَلْيَسْتَعْفِفْ ۚ وَمَنْ كَانَ فَقِيْرًا فَلْيَاْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ فَاِذَا دَفَعْتُمْ اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ

تو مال یتیم سے بچتا رہے، اور جو کوئی محتاج ہو تو کھاوے موافق دستور کے ۳ پھر جب ان کو حوالہ کرو ان کے مال

فَاَشْهِدُوْا عَلَيْهِمْ ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا ۝

تو گواہ کرلو اس پر، اور اللہ کافی ہے حساب لینے کو۔

خلاصہ تفسیر: گذشتہ آیت میں یہ معلوم ہوگیا کہ جب تک معاملات میں نابالغوں کی ہوشیاری ثابت نہ ہوجائے اس وقت تک ان کو مال سپرد نہ کیا جائے، چنانچہ اب بچوں کی تعلیم وتربیت کا انتظام اور پھر امتحان کر کے ان کی صلاحیت معلوم کرنے کے احکام دیئے گئے کہ جب ان کے اندر مال کی حفاظت اور ان کے مصارف کی سوجھ بوجھ محسوس ہونے لگے تو پھر ان کے سپرد کردو۔

اور (جب مال سپرد کرنے کے لئے ہوشیاری دیکھنا ضروری ہے تو) تم یتیموں کو (بالغ ہونے سے پہلے ہوشیاری وتمیز داری کی باتوں میں) آزمالیا کرو (کیونکہ بالغ ہونے کا وقت تو مال سپرد کرنے کا وقت ہے، سو آزمائش پہلے سے ہونی چاہئے، مثلاً کچھ سودا سلف اس سے منگالیا اور دیکھا کہ کیسے سلیقہ سے خرید کرلائے، یا کوئی چیز فروخت کی دے دی اور دیکھا کہ اس کو کس طرح فروخت کیا) یہاں تک کہ (ان کو آزمایا جائے) کہ جب وہ نکاح (کی عمر) کو پہنچ جائیں (یعنی بالغ ہوجائیں، کیونکہ نکاح کی پوری قابلیت بلوغ سے ہوتی ہے) پھر (بلوغت وآزمائش کے بعد) اگر ان میں ایک گونہ تمیز دیکھو (یعنی اپنی مصلحت اور مال کی حفاظت کا سلیقہ اور انتظام ان میں پیدا ہوجائے) تو ان کے اموال ان کے حوالے کردو (اور اگر بالغ ہونے کے بعد بھی ایسا سلیقہ وانتظام ان میں نظر نہ آئے تو کچھ عرصے تک اور حوالہ نہ کیا جائے)۔

اور چونکہ اس جگہ یہ بھی خطرہ ہے کہ بعض لوگ یہ سمجھ کر کہ جب یتیم بالغ ہوجائیں گے تو ہمیں ان کا مال ان کو دینا ہوگا سو ان کے بالغ ہونے سے پہلے ہی صاف کردیں اس لئے کہا جاتا ہے کہ) ان اموال (یتامی) کو ضرورت سے زائد اٹھا کر اور اس خیال سے کہ یہ بالغ ہوجائیں گے (پھر ان کو حوالہ کرنا پڑے گا) جلدی جلدی اڑا کر مت کھا ڈالو (بلکہ مال کو ان کے بلوغ تک باقی رکھو) اور (یتیم کا مال اس طرح اڑا ڈالنا تو کسی حال میں جائز نہیں، اور اگر یتیم کے مال میں سے تھوڑا سا خرچ کرنا چاہیں تو اس کا قانون یہ ہے کہ) جو شخص (یتیم کے مال سے) مستغنی ہو (یعنی خود اس کے پاس بقدر کفایت موجود ہے اگرچہ صاحب نصاب نہ ہو) سو وہ تو اپنے کو بالکل (تھوڑا کھانے سے بھی) بچائے اور جو شخص حاجت مند ہو تو وہ مناسب مقدار سے (یعنی جس سے ضروری حاجات پوری ہوجائیں) کھالے (برت لے، حاجت ضروری سے زائد نہ ہو)۔

پھر جب (شرائط یعنی بلوغ اور سمجھ داری پائے جانے کے بعد) ان کے اموال ان کے حوالے کرنے لگو تو (بہتر ہے کہ) ان (کے مال ان کو دینے) پر گواہ بھی کرلیا کرو (شاید کسی وقت کچھ اختلاف واقع ہو تو گواہ کام آئیں) اور (یوں تو) اللہ تعالیٰ ہی حساب لینے والا کافی ہے (گواہوں کا ہونا صرف ظاہری مصلحت کے لیے مستحب ہے، ورنہ اگر خیانت نہ کی ہو تو گواہوں کا نہ ہونا بھی مضر نہیں، یعنی یہ گواہوں کا حکم تو دنیوی ضابطہ کی تکمیل کے لیے دیا جارہا ہے ورنہ حقیقۃً ہر خیانت اور ہر امانت کا علم تو اللہ تعالیٰ کو ہے، صرف ظاہری انتظام کے لئے گواہوں کا ہونا مصلحت ہے)۔

***

فائدہ: ۱۔ فَادْفَعُوْٓا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ: یعنی یتیموں کو سدھاتے اور آزماتے رہو، بلوغ کے وقت تک، پھر بلوغ کے بعد اگر ان میں اپنے نفع نقصان کی سمجھ اور حفاظت وانتظام مال کا سلیقہ پاؤ تو ان کا مال ان کے حوالے کردو۔

یتیموں کے سدھانے اور آزمانے کی عمدہ صورت یہی ہے کہ کم قیمت معمولی چیزوں کی ان سے خرید وفروخت کرائی جائے اور ان کا طریقہ ان کو بتایا جائے، اس سے معلوم ہوا کہ نابالغ کی بیع وشرا ولی کی اجازت سے جو ہوگی وہ درست ہوگی، امام ابوحنیفہ کا یہی مذہب ہے اور اگر بالغ ہو کر بھی اس میں ہشیاری نہ آئے تو امام ابوحنیفہ کا یہ مذہب ہے کہ پچیس برس کی عمر تک انتظار کرو، اس درمیان میں جب اس کو سمجھ آجائے، مال اس کے حوالے کردو، ورنہ پچیس سال پر ہر حال میں اس کا مال اس کو دے دو، پوری سمجھ آئے یا نہ آئے۔

فائدہ: ۲۔ اِسْرَافًا وَّبِدَارًا اَنْ يَّكْبَرُوْا: یعنی یتیم کے مال کو ضرورت سے زیادہ صرف کرنا منع ہے، مثلاً ایک پیسہ کی جگہ دو پیسے صرف

کردو، اور یہ بھی منع ہے کہ اس بات سے گھبرا کر کہ یتیم بڑے ہو کر اپنا مال ہم سے لے لیں گے خرچ کرنے میں جلدی کرنے لگو، خلاصہ یہ ہوا کہ یتیم کے مال کو بقدر ضرورت اور بوقت ضرورت صرف کرنا چاہیے۔

فائدہ: ۳۔ وَمَنْ كَانَ فَقِيْرًا فَلْيَأْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ: یعنی یتیم کا مال ولی اپنے خرچ میں نہ لائے، اور اگر یتیم کی پرورش کرنے والا محتاج ہو تو البتہ اپنی خدمت کرنے کے موافق یتیم کے مال میں سے تحقیق لے لیوے مگر غنی کو کچھ لینا ہرگز جائز نہیں۔

فائدہ: ۴۔ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا: جب کسی بچہ کا باپ مرجائے تو چاہیے کہ چند مسلمانوں کے روبرو یتیم کا مال لکھ کر امانتدار کو سونپ دیں، جب یتیم بالغ ہوشیار ہو جائے تو اس تحریر کے موافق اس کا مال اس کے حوالہ کر دیں اور جو کچھ خرچ ہوا ہو، وہ اس کو سمجھا دیں، اور جو کچھ یتیم کے حوالے کیا جائے شاہدوں کو دکھلا کر حوالہ کریں، شاید کسی وقت اختلاف ہو تو بسہولت طے ہو سکے اور اللہ تعالیٰ ہر ہر چیز کی حفاظت کرنے والا اور حساب سمجھنے والا کافی ہے، اس کو کسی حساب یا شہادت کی حاجت نہیں، یہ سب باتیں تمہاری سہولت اور صفائی کی وجہ سے مقرر فرمائیں۔

جاننا چاہیے کہ یتیم کا مال لینے اور دینے کے وقت گواہ کرنا اور اس کو لکھ لینا مستحب ہے۔

لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ۠ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ

مردوں کا بھی حصہ ہے اس میں جو چھوڑ مریں ماں باپ اور قرابت والے، اور عورتوں کا بھی حصہ ہے اس میں جو چھوڑ مریں ماں باپ

وَالْاَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ ؕ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا ۝

اور قرابت والے تھوڑا ہو یا بہت ہو، حصہ مقرر کیا ہوا ہے

خلاصہ تفسیر: پیچھے یتیموں کو نقصان پہنچانے سے ممانعت فرمائی، ایک نقصان یتیموں کو جاہلیت میں یہ بھی پہنچایا جاتا تھا کہ ان کو میراث میں مستحق نہ سمجھتے تھے، اس لیے اس آیت میں ایک قاعدہ کلیہ سے اس غلط رسم کا باطل ہونا بیان فرماتے ہیں:

مردوں کے لئے بھی (خواہ وہ چھوٹے ہوں یا بڑے) حصہ (مقرر) ہے اس چیز میں سے جس کو (ان مردوں کے) ماں باپ اور (دوسرے) بہت نزدیک کے قرابت دار (اپنے مرنے کے وقت) چھوڑ جائیں اور (اسی طرح) عورتوں کے لئے بھی (خواہ چھوٹی ہوں یا بڑی) حصہ (مقرر) ہے اس چیز میں سے جس کو (ان عورتوں کے) ماں باپ اور (یا دوسرے) بہت نزدیک کے قرابت دار (اپنے مرنے کے وقت) چھوڑ جائیں خواہ وہ (چھوڑی ہوئی) چیز قلیل ہو یا کثیر ہو (سب میں سے ملے گا، اور) حصہ (بھی ایسا جو) قطعی طور پر مقرر ہے۔

الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ: نزدیک کے رشتہ سے مطلب یہ ہے کہ شریعت نے جو ترتیب وارثوں کی مقرر کر دی ہے اس کے اعتبار سے نزدیک ہو، پھر جہاں شریعت نے سب کو نزدیک سمجھا ہے اگرچہ زیادہ کم کا فرق ہو وہاں سب کو وارث بنایا ہے اور جہاں کسی کو نزدیک کسی کو دور کا رشتہ دار سمجھا ہے وہاں نزدیک کے قرابت دار کو وارث سمجھا ہے، دور کے رشتہ دار کو نہیں، پس اس سے لازم آ گیا جو کہ رشتہ دار اقرب ہو گا وہ میراث پائے گا۔

حاصل یہ کہ لفظ الاقربون سے معلوم ہوا کہ مال وراثت کی تقسیم ضرورت کے معیار سے نہیں، بلکہ قرابت کے معیار سے ہے، اس لئے یہ ضروری نہیں کہ رشتہ داروں میں جو زیادہ غریب اور حاجت مند ہو اس کو زیادہ وراثت کا مستحق سمجھا جائے، بلکہ جو میت کے ساتھ رشتہ میں قریب تر ہو گا وہ بہ نسبت بعید کے زیادہ مستحق ہو گا، اگرچہ ضرورت اور حاجت بعید کو زیادہ ہو، اگر اقربیت کے ضابطہ کو چھوڑ کر بعض رشتہ داروں کے محتاج یا نافع ہونے کو معیار بنا لیا جائے تو نہ اس کا ضابطہ بن سکتا ہے اور نہ یہ ایک طے شدہ مستحکم قانون کی شکل اختیار کر سکتا ہے، کیونکہ اقربیت کے علاوہ دوسرا معیار لامحالہ وقتی اجتہادی ہو گا، کیونکہ فقر و حاجت کوئی دائمی چیز نہیں، اس لئے کہ حالات بھی بدلتے رہتے ہیں درجات بھی ایسی صورت میں استحقاق کے بہت سے دعویدار نکل آیا کریں گے اور فیصلہ کرنے والوں کو ان کا فیصلہ مشکل ہو گا۔

اگر اس قرآنی اصول کو سمجھ لیا جائے تو یتیم پوتے کی وراثت کا مسئلہ جو آج کل بلا وجہ ایک نزاعی مسئلہ بنا دیا گیا ہے، وہ خود بخود ایک قطعی فیصلہ کے ساتھ حل ہو جاتا ہے کہ اگر یتیم پوتا بہ نسبت بیٹے کے ضرورت مند زیادہ ہو، لیکن "اقربون" کے قانون کی رو سے وہ مستحق وراثت نہیں ہو سکتا، کیونکہ وہ بیٹے کی موجودگی میں اقرب نہیں، البتہ اس کی ضرورت رفع کرنے کے لئے دوسرے انتظامات کئے گئے ہیں جس میں سے ایک ایسا ہی انتظام اگلی آیت میں آرہا ہے، اس مسئلہ میں موجودہ دور کے مغرب زدہ مجددین کے علاوہ کسی نے بھی اختلاف نہیں کیا، ساری امت آج تک قرآن وحدیث کی تصریحات سے یہی سمجھتی آئی ہے کہ بیٹے کے ہوتے ہوئے پوتے کو میراث نہ ملے گی، خواہ اس کا باپ موجود ہو یا مر گیا ہو۔

* * *

فائدہ: حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے پہلے یہ رسم تھی کہ بیٹیوں کو چھوٹی ہوں یا بڑی میراث نہیں دیتے تھے اور بیٹے جو نابالغ ہوتے تھے ان کو بھی میراث نہیں ملتی تھی، صرف مردوں کو جو بڑے اور دشمنوں سے مقاتلہ کے کام کے ہوتے تھے، وہ وارث سمجھے جاتے تھے، جس کی وجہ سے یتیم بچوں کو میراث سے کچھ بھی نہ ملتا تھا، ان کے بارے میں یہ آیت اتری، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ماں باپ اور دیگر قرابت والوں کے مال متروکہ میں سے مردوں یعنی بیٹوں کو خواہ وہ بچے ہوں یا جوان ان کا حصہ ملے گا اور عورتوں یعنی بیٹیوں کو بھی بالغ ہوں یا نابالغ ماں باپ وغیرہ اقارب کے ترکہ میں سے ان کا حصہ دیا جائے گا اور یہ حصے مقرر کئے ہوئے ہیں، جن کا دینا ضروری ہے، خواہ مال تھوڑا ہو یا بہت، اس سے اہل جاہلیت کی رسم مذموم کا ابطال ہو گیا اور یتیموں وغیرہ کے حقوق کی حفاظت فرما کر ان کی حق تلفی کو روک دیا۔

فائدہ: اس آیت میں حق والوں کا حق اور اسکا تقرر اور تعین بالاجمال بتلایا گیا آئندہ رکوع میں وارثوں کے حصہ کی تفصیل آتی ہے۔

وَإِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ أُولُوا الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينُ فَارْزُقُوهُم مِّنْهُ وَقُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوفًا ﴿٨﴾

اور جب حاضر ہوں تقسیم کے وقت رشتہ دار اور یتیم اور محتاج تو ان کو کچھ کھلا دو اس میں سے اور کہہ دو ان کو بات معقول

خلاصہ تفسیر: پیچھے ورثہ کے مستحق ہونے کا بیان تھا، اب یہ بتلاتے ہیں کہ جو میراث کے مستحق نہیں ان کے ساتھ بھی رعایت کرنا مستحب ہے، اس سے مقصود حسن ادب کی تعلیم ہے۔

اور جب (وارثوں میں ترکہ کے) تقسیم ہونے کے وقت (یہ لوگ) موجود ہوں (یعنی دور کے) رشتہ دار (جن کا میراث میں حق نہیں) اور یتیم اور غریب لوگ (اس توقع سے کہ شاید ہم کو بھی کچھ مل جائے، رشتہ دار تو ممکن ہے کہ مستحق ہونے کے گمان سے آئیں گے، اور غریب ویتیم خیر خیرات کی امید سے آئیں گے) تو ان کو بھی اس (ترکہ) میں (جس قدر بالغوں کا ہے اس میں) سے کچھ دے دو، اور ان کے ساتھ خوبی (اور نرمی) سے بات کرو (وہ بات رشتہ داروں سے تو یہ ہے کہ انہیں سمجھا دو کہ تمہارا شرعی حصہ اس میں نہیں ہے، ہم زیادہ دینے سے معذور ہیں، اور غریبوں سے یہ کہ انہیں دے کر احسان نہ جتلاؤ)۔

یہاں "بالغوں" کی قید اس لیے لگائی کہ نابالغوں کے حصہ میں سے خیر خیرات یا کسی کی رعایت وخاطر بالکل جائز نہیں، اور یہ غیر مستحقین کو دینے کا حکم واجب نہیں، صرف مستحب ہے اور اگر شروع اسلام میں واجب ہوا ہو تو اب وجوب منسوخ ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی تقسیم میراث کے وقت برادری اور کنبہ کے لوگ جمع ہوں تو جو رشتہ دار ایسے ہوں جن کو میراث میں حصہ نہیں پہنچتا یا جو یتیم اور محتاج ہوں ان کو کچھ کھلا کر رخصت کرو، یا کوئی چیز ترکہ میں سے حسب موقع ان کو بھی دے دو کہ یہ سلوک کرنا مستحب ہے، اگر مال میراث میں سے کھلانے یا کچھ دینے کا موقع نہ ہو مثلاً وہ یتیموں کا مال ہے اور میت نے وصیت بھی نہیں کی تو ان لوگوں سے معقول بات کہہ کر رخصت کر دو، یعنی نرمی سے عذر کر دو کہ یہ مال یتیموں کا ہے اور میت نے وصیت بھی نہیں کی، اس لئے ہم مجبور ہیں۔

ابتدائے سورت میں بیان ہو چکا ہے کہ تمام قرابت والے درجہ بدرجہ سلوک اور مراعات کے مستحق ہیں اور یتامی اور مساکین بھی اور جو قریب

یتیم یا مسکین بھی ہو تو اس کی رعایت اور بھی زیادہ ہونی چاہیئے، اس لئے تقسیم میراث کے وقت ان کو حتی الوسع کچھ نہ کچھ دینا چاہیئے، اگر کسی وجہ سے وارث نہ ہو تو حسن سلوک سے محروم نہ رہیں۔

وَلْيَخْشَ الَّذِيْنَ لَوْ تَرَكُوْا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعٰفًا خَافُوْا عَلَيْهِمْ

اور چاہیے کہ ڈریں وہ لوگ کہ اگر چھوڑی ہے اپنے پیچھے اولاد ضعیف تو ان پر اندیشہ کریں یعنی ہمارے پیچھے ایسا ہی حال ان کا ہوگا

فَلْيَتَّقُوا اللّٰهَ وَلْيَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ﴿۹﴾

تو چاہیے کہ ڈریں اللہ سے اور کہیں بات سیدھی

خلاصہ تفسیر: یہاں تک اصل مضمون یتیموں کو نقصان نہ پہنچانے کا تھا دوسرے مضامین اس کی مناسبت سے درمیان میں ذکر ہوئے، اب اس اصل مضمون کی تاکید وتقویت کے لیے ایک دنیاوی بات بتاتے ہیں جس سے یتیموں کی ہمدردی پیدا ہو، اور ایک بات آخرت کے متعلق بتاتے ہیں تاکہ خوف پیدا ہو، اور دونوں باتوں میں غور وفکر کر کے یتیموں کو نقصان پہنچانے کی جرات نہ کریں۔

اور (یتیموں کے معاملہ میں) ایسے لوگوں کو ڈرنا چاہیئے کہ اگر اپنے بعد چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑ (کر مر) جائیں تو ان (بچوں) کی ان (لوگوں) کو فکر ہو (کہ دیکھئے ان کو کوئی تکلیف نہ پہنچائے، تو ایسا ہی دوسرے کے بچوں کے لئے بھی خیال رکھنا چاہیئے کہ ہم انہیں تکلیف نہ دیں) سو (اس بات کو سوچ کر) ان لوگوں کو چاہیئے کہ (یتیموں کے معاملہ میں) اللہ تعالیٰ (کے حکم کی مخالفت) سے ڈریں (یعنی اپنے کسی فعل سے انہیں تکلیف و نقصان نہ پہنچائیں) اور (زبانی بھی ان سے) موقع کی بات کہیں (اس میں تسلی اور دل جوئی کی بات بھی آگئی، اور تعلیم وتادیب کی بات بھی آگئی، غرض ان کے مال اور جان دونوں کی اصلاح رہے)۔

وَلْيَخْشَ الَّذِيْنَ لَوْ تَرَكُوْا مِنْ خَلْفِهِمْ: اس آیت سے اخلاق کے ایک بڑے قانون کا پتہ لگتا ہے کہ "آنچہ برخود نہ پسندی بردیگران مپسند"، یعنی جو تم اپنے لیے پسند نہیں کرتے دوسروں کے لیے بھی پسند مت کرو، جیسے ہر آدمی کی خواہش ہوتی ہے کہ میرے مرنے کے بعد میری اولاد سے برا سلوک نہ ہو تو اس کو چاہیے کہ کسی اور کی اولاد کے ساتھ بھی برا سلوک نہ کرے اور نہ چاہے۔

* * *

فائدہ: یہ ارشاد اصل میں تو یتیم کے ولی اور وصی کے لئے ہے درجہ بدرجہ اوروں کو بھی اس کا خیال رہے، مطلب یہ ہے کہ اپنے مرنے کے بعد جیسا ہر کوئی اس بات سے ڈرتا ہے کہ میری اولاد کے ساتھ سختی اور برائی سے معاملہ کیا جائے ایسا ہی تم کو بھی چاہیے کہ یتیم کے ساتھ وہ معاملہ کرو جو اپنے بعد اپنی اولاد کے ساتھ پسند کرتے ہو اور اللہ سے ڈرو اور یتیموں سے سیدھی اور اچھی بات کہو، یعنی جس سے ان کا دل نہ ٹوٹے اور ان کا نقصان نہ ہو، بلکہ ان کی اصلاح ہو۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ۭ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا ﴿۱۰﴾

جو لوگ کہ کھاتے ہیں مال یتیموں کا ناحق وہ لوگ اپنے پیٹوں میں آگ ہی بھر رہے ہیں اور عنقریب داخل ہوں گے آگ میں

خلاصہ تفسیر: بلاشبہ جو لوگ یتیموں کا مال بلا استحقاق کھاتے (برتتے) ہیں اور کچھ نہیں اپنے شکم میں (دوزخ کی) آگ (کے انگارے) بھر رہے ہیں (یعنی اس کھانے کا انجام یہ ہونے والا ہے) اور (اس انجام کے مرتب ہونے میں کچھ زیادہ دیر نہیں، کیونکہ) عنقریب (ہی دوزخ کی) جلتی (آگ) میں داخل ہوں گے (وہاں یہ انجام نظر آئے گا)۔

یہاں ''بلا استحقاق'' کی قید اس لیے لگائی کہ استحقاق سے کھانے کی بات پیچھے آیت: وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰٓى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ میں آچکی ہے اور جیسے یتیم کا مال خود کھانا حرام ہے، کسی کو کھلانا بھی حرام ہے اگر چہ خیر خیرات کے طور پر ہی کیوں نہ ہو۔

* * *

فائدہ: آیات متعددہ سابقہ میں یتیموں کے مال کے متعلق مختلف طرح سے احتیاط کرنے کا حکم تھا اور ان کے مال میں خیانت کو بڑا گناہ بتایا گیا ہے، اب اخیر میں مال یتیم میں خیانت کرنے پر وعید شدید بیان فرما کر اس حکم کو خوب مؤکد کر دیا کہ جو کوئی یتیم کا مال بلا استحقاق کھاتا ہے وہ اپنے پیٹ میں جہنم کی آگ بھر رہا ہے۔ یعنی اس کھانے کا یہ انجام ہوگا اور جملہء اخیر میں اس کو ظاہر کر دیا گیا۔

يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ ۤ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ۚ فَاِنْ كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ

حکم کرتا ہے تم کو اللہ تمہاری اولاد کے حق میں کہ ایک مرد کا حصہ ہے برابر دو عورتوں کے ۱؎ پھر اگر صرف عورتیں ہی ہوں دو سے زیادہ

فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ۚ وَاِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ ؕ

تو ان کیلئے ہے دو تہائی اس مال سے جو چھوڑ مرا، اور اگر ایک ہی ہو تو اس کیلئے آدھا ہے ۲؎

خلاصہ تفسیر: پیچھے ورثہ کا میراث میں مستحق ہونا اجمالا بیان ہوا، اب آگے مستحقین میراث کے حصوں کی تفصیل اور مختلف حالات کے اعتبار سے ان کے حصے بیان فرماتے ہیں، اس سلسلہ کی کچھ تفصیل اس سورت کے آخر میں بھی آرہی ہے اور باقی حصوں کو احادیث میں بیان کیا گیا ہے، یہاں ان کو خاص طور سے ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اولاد اور بھائی بہنوں کے متعلق سوال کیا گیا تھا۔

اللہ تعالیٰ تم کو حکم دیتا ہے تمہاری اولاد کے (میراث پانے) کے باب میں (وہ یہ کہ) لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر (یعنی جب اولاد میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں ہوں تو ان کے حصوں میں باہم یہ نسبت ہوگی کہ ہر لڑکے کو دوھرا، اور ہر لڑکی کو اکہرا)۔

اور اگر (اولاد میں) صرف لڑکیاں ہی ہوں، گو دو سے زیادہ ہوں تو ان لڑکیوں کو دو تہائی ملے گا اس مال کا جو کہ مورث چھوڑ مرا ہے (اور اگر دو لڑکیاں ہوں تب تو دو تہائی ملنا بہت ہی ظاہر ہے، کیونکہ اگر ان میں ایک لڑکی کی جگہ لڑکا ہوتا تو اس لڑکی کا حصہ باوجودیکہ بھائی سے کم ہے ایک تہائی سے کم نہ ہوتا، پس جب دوسری بھی لڑکی ہے، تب تو تہائی سے کسی طرح کم نہیں سکتا اور دونوں لڑکیاں یکساں حالت میں ہیں، پس اس کا بھی ایک تہائی ہوگا، اور دونوں کا مل کر دو تہائی ہوا، البتہ تین لڑکیوں میں شبہ تھا کہ شاید ان کو تین تہائی یعنی کل مل جایے، اس لئے فرمایا کہ اگر چہ لڑکیاں دو سے زیادہ ہوں گی مگر دو تہائی سے نہ بڑھے گا)۔

اور اگر ایک ہی لڑکی ہو تو اس کو (کل ترکہ کا) نصف ملے گا (اور پہلی صورت میں ایک ثلث بچا ہوا، اور دوسری صورت کا ایک نصف بچا ہوا دوسرے خاص خاص اقارب کا حق ہے، یا اگر کوئی نہ ہو تو پھر اسی کو دے دیا جائے گا، جیسا کہ کتب فرائض میں مذکور ہے)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ: اوپر اقارب میت کے وارث ہونے کا ذکر ہوا تھا اور ان کے حصوں کے تقرر اور تعین کی طرف اجمالی اشارہ فرما دیا تھا، اب اقارب اور ان کے حصوں کی تفصیل بتلائی جاتی ہے اور اس سے پہلے یتیموں کے حق میں تشدد اور تاکیدات کا ذکر چلا آرہا تھا، جس سے یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ اقارب میت میں اگر کوئی یتیم ہو تو اس کا حصہ دینے میں بہت ہی احتیاط اور اہتمام کرنا چاہیے، اہل عرب کی قدیم رسم کے موافق ان کو میراث سے محروم کر دینا سخت ظلم اور بڑا گناہ ہے، اب اقارب میں سب سے پہلے اولاد کے حصہ کو بیان فرمایا کہ اگر کسی میت کی اولاد بیٹا بیٹی دونوں ہوں تو ان کی میراث دینے کا یہ قاعدہ ہے کہ ایک بیٹا دو بیٹیوں کے برابر حصہ پائے گا، مثلاً اگر ایک بیٹا اور دو بیٹیاں ہوں تو نصف مال بیٹے کا اور نصف دونوں بیٹیوں کا ہوگا، اور اگر ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہوگی تو دو ثلث بیٹے کا اور ایک ثلث بیٹی کا ہوگا۔

فائدہ: میت کا مال اول اس کے کفن اور دفن کو لگایا جائے، جو اس سے بچے وہ اس کے قرض میں دیا جائے، پھر جو باقی رہے اس کو میت کی وصیت میں ایک تہائی تک صرف کیا جائے، اس کے بعد جو رہے وارثوں پر تقسیم کیا جائے۔

فائدہ:۲ وَاِنۡ كَانَتۡ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصۡفُ: یعنی اور اگر کسی میت نے اولاد میں صرف عورتیں یعنی بیٹیاں ہی چھوڑیں، بیٹا نہیں چھوڑا تو وہ اگر دو سے زیادہ ہوں تب بھی ان کو دو تہائی ملے گا اور اگر صرف ایک ہی بیٹی چھوڑی تو اس کو میت کے ترکہ کا نصف ملے گا۔

جاننا چاہیے کہ: لِلذَّكَرِ مِثۡلُ حَظِّ الۡاُنۡثَيَيۡنِ کے ذیل میں معلوم ہو چکا ہے کہ ایک بیٹی کو ایک بیٹے کے ساتھ ایک ثلث ملے گا تو اس سے معلوم ہو گیا کہ ایک بیٹی کو دوسری بیٹی کے ساتھ بطریق اولیٰ ایک ثلث ملے گا، کیونکہ بیٹے کا حصہ بیٹی سے زائد ہے تو جب بیٹے کی وجہ سے اس کا حصہ ایک ثلث سے کم نہیں ہوا تو دوسری بیٹی کی وجہ سے کیسے گھٹ سکتا ہے! سو دو بیٹیوں کا حکم چونکہ پہلی آیت سے معلوم ہو چکا تھا، اس لئے اس آیت میں دو بیٹیوں سے زائد کا حکم بتلا دیا، تا کہ کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ دو بیٹیوں کا حق جب ایک بیٹی سے زائد ہے تو شاید تین یا چار بیٹیوں کا حق دو بیٹیوں سے زائد ہو گا، سو یہ بات ہرگز نہیں، بلکہ بیٹیاں جب ایک سے زائد ہوں گی دو ہوں یا دس، ان کو دو ثلث ملے گا۔

فائدہ: اولاد کے وارث ہونے کی دو صورتیں آیت میں مذکور ہوئیں: ① اول یہ کہ لڑکا اور لڑکی دونوں طرح کی اولاد ہو ② دوسری یہ کہ صرف دختری اولاد ہو، اسکی دو صورتیں ہیں: ① ایک لڑکی ہو ② یا ایک سے زائد، تو اب صرف ایک صورت باقی رہ گئی، وہ یہ کہ صرف پسری اولاد ہو، سو اس کا حکم یہ ہے کہ تمام میراث اس کو مل جائے گی، خواہ ایک بیٹا ہو یا زائد۔

وَلِاَبَوَيۡهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنۡهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ اِنۡ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ ۚ فَاِنۡ لَّمۡ يَكُنۡ لَّهٗ وَلَدٌ

اور میت کے ماں باپ کو ہر ایک کیلئے دونوں میں سے چھٹا حصہ ہے اس مال سے جو کہ چھوڑ مرا اگر میت کے اولاد ہے ۱ اور اگر اس کے اولاد نہیں

وَّوَرِثَهٗۤ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ ۚ فَاِنۡ كَانَ لَهٗۤ اِخۡوَةٌ فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ مِنۡۢ بَعۡدِ وَصِيَّةٍ

اور وارث ہیں اس کے ماں باپ تو اس کی ماں کا ہے تہائی ۲ پھر اگر میت کے کئی بھائی ہیں تو اس کی ماں کا ہے چھٹا حصہ ۳ بعد وصیت کے

يُّوۡصِىۡ بِهَاۤ اَوۡ دَيۡنٍ ؕ

جو کر مرا، یا بعد ادائے قرض کے ۴

خلاصہ تفسیر: اور ماں باپ (کو میراث ملنے میں تین صورتیں ہیں: ① ایک صورت تو ان) کے لئے یعنی دونوں میں سے ہر ایک کے لئے میت کے ترکہ میں سے چھٹا چھٹا حصہ (مقرر) ہے، اگر میت کے کچھ اولاد ہو (خواہ لڑکی ہو یا لڑکا، خواہ ایک ہو یا زیادہ، اور بقیہ میراث اولاد کو اور دوسرے خاص خاص ورثہ کو ملے گی، اور پھر بھی بچ جائے تو پھر سب کو دی جائے گی)۔

(② دوسری صورت یہ ہے) اور اگر اس میت کے کچھ اولاد نہ ہو اور (صرف) اس کے ماں باپ ہی اس کے وارث ہوں ("صرف" اس لئے کہا کہ بھائی بہن بھی نہ ہو، جیسا کہ آگے آتا ہے) تو (اس صورت میں) اس کی ماں کا ایک تہائی ہے (اور باقی دو تہائی باپ کو ملے گا، اور چونکہ اس صورت میں یہ بات ظاہر تھی اس لئے تصریح کی ضرورت نہ ہوئی)۔

(③ تیسری صورت یہ ہے) اور اگر میت کے ایک سے زیادہ بھائی یا بہن (کسی قسم کے) ہوں (خواہ ماں باپ دونوں میں شریک جس کو "عینی" کہتے ہیں، خواہ باپ ایک اور ماں الگ الگ جس کو "علاتی" کہتے ہیں، خواہ ماں ایک اور باپ الگ الگ جس کو "اخیافی" کہتے ہیں، غرضیکہ کسی طرح کے بھائی بہن ایک سے زیادہ ہوں، اور میت کی اولاد نہ ہو، اور ماں باپ ہوں) تو (اس صورت میں) اس کی ماں کو (ترکہ کا) چھٹا حصہ ملے گا

(اور باقی باپ کو ملے گا، یہ سب حصے) وصیت (کے قدر مال) نکال لینے کے بعد کہ میت اس کی وصیت کر جائے یا دین (اگر ہو تو اس کو بھی نکال لینے) کے بعد (تقسیم ہوں گے، اس تیسری صورت میں ان بھائی بہنوں کی وجہ سے ماں کا حصہ بجائے تہائی کے چھٹا رہ گیا، مگر بھائی بہن کو کچھ بھی نہ ملے گا، کیونکہ باپ کے ہوتے ہوئے یہ سب محروم ہیں، باقی سب باپ کو مل جائے گا)۔

مِنۡۢ بَعۡدِ وَصِيَّةٍ يُّوۡصِىۡ بِهَآ اَوۡ دَيۡنٍ: یعنی یہ سب حصے وصیت اور قرض ادا کرنے کے بعد تقسیم ہوں گے اگر میت نے کچھ دین چھوڑا ہو یا وصیت کی ہو بشرطیکہ وصیت شریعت کے مطابق ہو، یعنی کسی وارث کے لیے وصیت نہ کی ہو ورنہ اس کا اعتبار نہ ہوگا، اسی طرح تجہیز و تکفین اور قرض و دیون کی ادائیگی کے بعد جو مال بچے اس کی تہائی سے زیادہ کی وصیت نہ ہو، جاننا چاہیے کہ سب سے مقدم تجہیز و تکفین ہے، پھر قرض اور وصیت میں قرض مقدم ہے، پھر وصیت، اس کے بعد جو مال بچے وہ ورثہ میں تقسیم ہوگا، یہاں قرآن میں جو وصیت کو قرض پر مقدم کیا گیا ہے حالانکہ ادا کرنے میں وصیت بعد میں ہے اس میں یہ نکتہ بیان کیا گیا ہے کہ دین کے مطالبہ کرنے والے تو آدمی ہیں، وہ خود ہی وصول کر لیں گے، اس میں کوتاہی کا احتمال کم ہے، اور وصیت چونکہ اصل میں تبرع اور ہدیہ ہے، اس میں کوتاہی کا احتمال زیادہ ہے، اس لیے اہتمام اور تاکید کی غرض سے وصیت کا ذکر پہلے کیا گیا، واللہ اعلم۔

* * *

فائدہ: ۱ مِمَّا تَرَكَ اِنۡ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ: اب ماں باپ کی میراث کی تین صورتیں بیان فرماتے ہیں: ① صورت اول کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر میت کی اولاد ہو، بیٹا یا بیٹی تو میت کے ماں باپ کو ترکہ میت میں سے ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا۔

فائدہ: ۲ وَّوَرِثَهٗۤ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ: ② دوسری صورت یہ ہے کہ اگر میت کی اولاد کچھ نہ ہو اور صرف ماں باپ ہی وارث ہوں تو اس کی ماں کو ایک ثلث ملے گا، یعنی باقی دو ثلث اس کے باپ کو ملیں گے۔

فائدہ: ۳ فَاِنۡ كَانَ لَهٗۤ اِخۡوَةٌ فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ: ③ تیسری صورت یہ ہے کہ اگر میت کے ایک سے زیادہ بھائی بہن ہوں، خواہ حقیقی ہوں، یا صرف باپ، یا صرف ماں میں شریک ہوں، اور اولاد کچھ بھی نہیں تو اب اس کی ماں کو چھٹا حصہ ملے گا، یعنی باقی سب اس کے باپ کو ملے گا، بھائی بہن کو کچھ نہ ملے گا، اور اگر صرف ایک بھائی یا ایک بہن ہوگی تو ماں کو ایک ثلث اور باپ کو دو ثلث ملیں گے، جیسا کہ دوسری صورت مذکورہ بالا میں تھا۔

فائدہ: ۴ مِنۡۢ بَعۡدِ وَصِيَّةٍ يُّوۡصِىۡ بِهَآ اَوۡ دَيۡنٍ: یعنی جس قدر وارثوں کے حصے گزر چکے، یہ سب میت کی وصیت اور اس کے قرض کو جدا کر لینے کے بعد وارثوں کو دیے جائیں گے، اور وارثوں کا مال وہی ہوگا جو مقدار وصیت و قرض کے نکال لینے کے بعد باقی رہے گا، اور نصف اور ثلث وغیرہ اسی کا مراد ہے، نہ تمام مال کا۔

اٰبَآؤُكُمۡ وَاَبۡنَآؤُكُمۡ لَا تَدۡرُوۡنَ اَيُّهُمۡ اَقۡرَبُ لَكُمۡ نَفۡعًا ؕ فَرِيۡضَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيۡمًا حَكِيۡمًا ⑪

تمہارے باپ اور بیٹے تم کو معلوم نہیں کون نفع پہنچائے تم کو زیادہ حصہ، مقرر کیا ہوا اللہ کا ہے، بیشک اللہ خبردار ہے حکمت والا ۱

خلاصہ تفسیر: (آگے اس کی حکمت بتلاتے ہیں کہ میراث کا قصہ میت کی رائے پر نہیں رکھا گیا، بلکہ خود حق تعالیٰ نے سب قواعد مقرر فرما دیے) تمہارے اصول و فروع جو ہیں تم (ان کے متعلق) پورے طور پر یہ نہیں جان سکتے ہو کہ ان میں کا کونسا شخص تم کو (دنیوی یا اخروی) نفع پہنچانے میں (توقع کے اعتبار سے) نزدیک تر ہے (یعنی اگر میراث کا معاملہ تمہاری رائے پر چھوڑ دیا جاتا تو غالب اوقات تقسیم میں تم ایک کو دوسرے پر نفع رسانی کی توقع پر ترجیح دیتے، مثلاً دنیوی نفع رسانی کی توقع پر کہ فلاں آدمی ہماری خوب خدمت کرے گا، لیکن اکثر اوقات وہ دغا دے جاتا ہے اور دوسرا مخلص محض ثواب سمجھ کر یا محبت سے زیادہ خدمت کرتا ہے، یا اخروی نفع کی توقع پر کہ یہ ہمیں ثواب بخشے گا یا آخرت میں شفاعت کرے گا، اس لیے اسے زیادہ دینا چاہیے، کبھی اس کے بھی خلاف ہوتا ہے، جب اس کے یقین کا تمہارے پاس کوئی ذریعہ نہیں تو اس پر مدار ٹھہرانا صحیح نہیں، اس لیے دوسری مصلحتوں پر مدار ٹھہرایا گیا اگرچہ وہ تمہارے ذہن میں نہ آئیں، سو) یہ حکم من جانب اللہ مقرر کر دیا گیا (اور یہ امر) بالیقین (مسلم ہے کہ) اللہ تعالیٰ بڑے علم والے اور حکمت والے ہیں (اس لیے جو حکمتیں خدا نے اپنے علم سے اس میں رکھی ہیں وہی قابل اعتبار ہیں، اس لئے تمہاری رائے پر نہیں رکھا)۔

لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا: یعنی اولاد اور ماں باپ کے یہ حصے خداوند عالم نے اپنے طور پر مقرر کر دیئے ہیں اور اللہ کو سب کچھ معلوم ہے اور وہ حکیم ہے جو حصے مقرر کئے گئے ہیں ان میں بڑی حکمتیں ہیں، اگر تمہاری رائے پر تقسیم میراث کا قصہ رکھا جاتا تو مدار تقسیم تم لوگ نفع رساں ہونے کو بناتے، لیکن نفع رساں کون ہوگا؟ اور سب سے زیادہ نفع کس سے پہنچ سکتا ہے؟ اس کا یقینی علم حاصل کرنا تمہارے لئے مشکل تھا، اس لئے بجائے نافع ہونے کے اقربیت کو مدار حکم بنایا، قرآن کریم کی اس آیت نے بتلا دیا کہ میراث کے جو حصے اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمائے ہیں وہ اس کا طے شدہ حکم ہے، اس میں کسی کو رائے زنی یا کمی بیشی کا کوئی حق نہیں اور تمہیں پورے اطمینان قلب کے ساتھ اسے قبول کرنا چاہئے، تمہارے خالق و مالک کا یہ حکم بہترین حکمت و مصلحت پر مبنی ہے، تمہارے نفع کا کوئی پہلو اس کے احاطہ علم سے باہر نہیں ہے اور جو کچھ حکم وہ کرتا ہے کسی حکمت سے خالی نہیں ہوتا، تمہیں خود اپنے نفع و نقصان کی حقیقی پہچان نہیں ہو سکتی، اگر تقسیم میراث کا مسئلہ خود تمہاری رائے پر چھوڑ دیا جاتا تو تم ضرور اپنی کم فہمی کی وجہ سے صحیح فیصلہ نہ کر پاتے اور میراث کی تقسیم میں بے اعتدالی ہو جاتی، اللہ جل شانہ نے یہ فریضہ اپنے ذمہ لے لیا، تاکہ مال کی تقسیم میں عدل و انصاف کی پوری پوری رعایت ہو اور میت کا سرمایہ منصفانہ طریقہ سے مختلف مستحقین کے ہاتھوں میں گردش کرے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ اوپر آیت میں دو میراث بیان فرمائیں: ① اولاد کی ② اور ماں باپ کی، اب فرماتے ہیں کہ چونکہ یہ بات تم کو معلوم نہیں کہ کس سے تم کو نفع پہنچے گا اور کتنا نفع پہنچے گا، اس لئے تم کو اس میں دخل نہ دینا چاہیے جو کچھ کسی کا حصہ حق تعالیٰ نے مقرر فرما دیا ہے، اس کی پابندی کرو کہ اس کو تمام چیزوں کی خبر بھی ہے اور بڑا حکمت والا ہے۔

وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ اَزْوَاجُكُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ

اور تمہارا ہے آدھا مال جو کہ چھوڑ مریں تمہاری عورتیں اگر نہ ہو ان کے اولاد، اور اگر ان کے اولاد ہے تو تمہارے واسطے چوتھائی ہے

مِمَّا تَرَكْنَ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْنَ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۭ وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ

اس میں سے جو چھوڑ گئیں بعد وصیت کے جو کر گئیں یا بعد قرض کے ۱؎ اور عورتوں کیلئے چوتھائی مال ہے اس میں سے جو چھوڑ مرو تم اگر نہ ہو تمہاری

وَلَدٌ ۚ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ مِّنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوْصُوْنَ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۭ

اولاد، اور اگر تمہاری اولاد ہے تو ان کے لئے آٹھواں حصہ ہے اس میں سے جو کچھ تم نے چھوڑا بعد وصیت کے جو تم کر مرو یا قرض کے ۲؎

خلاصہ تفسیر: یہاں تک ان مستحقین میراث کے حصص کا بیان تھا جن کا میت کے ساتھ نسب اور ولادت کا رشتہ تھا، مذکورہ آیت میں بعض دوسرے مستحقین کا ذکر ہے اور میت سے ان کا رشتہ نسب کا نہیں، بلکہ ازدواج کا ہے، جس کا بیان یہ ہے:

اور تم کو آدھا ملے گا اس ترکہ کا جو تمہاری بیویاں چھوڑ جائیں اگر ان کے کچھ اولاد نہ ہو (نہ لڑکی نہ لڑکا، نہ ایک نہ زیادہ) اور اگر ان بیویوں کے کچھ اولاد ہو (خواہ تم سے ہو یا پہلے شوہر سے) تو (اس صورت میں) تم کو ان کے ترکہ سے ایک چوتھائی ملے گا (یہ کل دو صورتیں ہوئیں اور دونوں صورتوں میں بقیہ دوسرے وارثوں کو ملے گا، لیکن ہر صورت میں یہ میراث) وصیت (کے قدر مال) نکالنے کے بعد کہ وہ اس کی وصیت کر جائیں یا دین (اگر ہو تو اس کے نکالنے) کے بعد (ملے گا)۔

اور بیویوں کو چوتھائی ملے گا اس ترکہ کا جس کو تم چھوڑ جاؤ (خواہ وہ ایک ہو یا کئی ہوں تو وہ چوتھائی سب میں برابر بٹ جائے گا) اگر تمہارے کچھ اولاد نہ ہو (نہ لڑکی نہ لڑکا، نہ ایک نہ زیادہ) اور اگر تمہاری کچھ اولاد ہو (خواہ ان ہی بیویوں سے یا اور کسی عورت سے) تو (اس صورت

میں) ان کو (خواہ وہ ایک ہو یا کئی) تمہارے ترکہ سے آٹھواں حصہ ملے گا (یہ بھی دو صورتیں ہوئیں اور دونوں صورتوں میں بقیہ دوسرے وارثوں کو ملے گا، لیکن یہ میراث) وصیت (کے قدر مال) نکالنے کے بعد کہ تم اس کی وصیت کر جاؤ یا دین (اگر ہو تو اس کے بھی نکالنے) کے بعد (ملے گی)۔

واضح رہے کہ عورت کا مہر میراث سے جدا ہے، وہ قرض میں داخل ہے، اس کے ادا کرنے کے بعد میراث کا حق جدا ملے گا۔

* * *

فائدہ: ۱ اب زوجین کی میراث کو بیان فرمایا جاتا ہے کہ ① مرد کو اس کی عورت کے مال میں سے آدھا مال ملے گا اگر عورت کے کچھ اولاد نہ ہو ② اور اگر عورت کے اولاد ہے، خواہ ایک ہی بیٹا یا بیٹی ہو اور اسی مرد سے ہو، یا دوسرے مرد سے تو مرد کو عورت کے مال میں سے ایک چوتھائی مال ملے گا قرض اور وصیت کے بعد۔

فائدہ: ۲ اور اسی طرح ① عورت کو اس کے خاوند کے مال میں سے چوتھائی حصہ ملے گا اگر مرد کی اولاد کچھ نہ ہو ② اور اگر مرد کے اولاد ہے، خواہ اسی عورت سے یا دوسری عورت سے تو عورت کو آٹھواں حصہ ملے گا خاوند کے اس مال میں سے جو وصیت اور قرض ادا کرنے کے بعد بچے گا، مال کی ہر قسم میں سے نقد ہو یا جنس، سلاح ہو یا زیور، حویلی ہو یا باغ، باقی رہا عورت کا مہر وہ میراث سے جدا ہے وہ قرض میں داخل ہے، یہ کل دو صورتیں ہوئیں، جیسا کہ مرد کی میراث میں بھی یہی دو صورتیں تھیں۔

وَإِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّورَثُ كَلٰلَةً اَوِ امْرَاَةٌ وَّلَهٗٓ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ ۚ

اور اگر وہ مرد کہ جسکی میراث ہے باپ بیٹا کچھ نہیں رکھتا یا عورت ہو ایسی ہی اور اس میت کے ایک بھائی ہو یا بہن ہو تو دونوں میں سے ہر ایک کا چھٹا حصہ ہے ۱

فَاِنْ كَانُوْٓا اَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَآءُ فِي الثُّلُثِ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۙ

اور اگر زیادہ ہوں اس سے تو سب شریک ہیں ایک تہائی میں بعد وصیت کے جو ہو چکی ہے یا قرض کے

غَيْرَ مُضَآرٍّ ۚ وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ⑫ؕ

جب اوروں کا نقصان نہ کیا ہو ۲ یہ حکم ہے اللہ کا، اور اللہ ہے سب کچھ جاننے والا تحمل کرنے والا ۳

خلاصہ تفسیر: (نسب اور ازدواج سے جو رشتے پیدا ہوتے ہیں ان کے مختصر حقوق بیان کرنے کے بعد اب ایسے میت کے ترکہ کا حکم بیان کیا جا رہا ہے جس نے اولاد یا والدین نہ چھوڑے ہوں) اور اگر کوئی میت جس کی میراث دوسروں کو ملے گی خواہ وہ میت مرد ہو یا عورت، ایسا ہو جس کے نہ اصول ہوں (یعنی باپ دادا) اور نہ فروع ہوں (یعنی اولاد اور بیٹے کی اولاد) اور اس (میت) کے ایک بھائی یا ایک بہن (اخیافی یعنی جن کی ماں ایک ہو اور باپ الگ الگ) ہو تو ان دونوں میں سے ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا، اور اگر یہ لوگ اس سے (یعنی ایک سے) زیادہ ہوں (مثلاً دو ہوں یا اور زیادہ) تو وہ سب تہائی میں (برابر کے) شریک ہوں گے (اور اخیافی یعنی ماں شریک بہن بھائی میں کسی کا دوہرا یا اکہرا حصہ نہیں ہوتا، مرد و عورت سب کا حصہ برابر ہے، اور بقیہ میراث دوسرے ورثہ کو، اور اگر کوئی دوسرا نہ ہو تو پھر انہی کو دی جائے گی، یہ دو صورتیں ہوئیں اور دونوں صورتوں میں یہ میراث) وصیت (کے قدر مال) نکالنے کے بعد جس کی وصیت کر دی جائے، یا (اگر) دین (ہو تو اس کے بھی نکالنے) کے بعد (ملے گی) بشرطیکہ (وصیت کرنے والا) کسی (وارث) کو ضرر نہ پہنچائے (نہ ظاہر میں، نہ ارادہ میں، ظاہر میں تو یہ کہ مثلاً تہائی سے زیادہ وصیت کرے، تو یہ وصیت میراث پر مقدم نہ ہوگی، ارادہ میں یہ کہ وصیت تو تہائی کی کرے، لیکن نیت یہ ہو کہ وارثوں کو کم ملے، یہ وصیت ظاہراً تو نافذ ہو جائے گی، لیکن گناہ ہوگا)۔

یہ (جس قدر یہاں تک مذکور ہوا) حکم کیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے، اور اللہ تعالیٰ خوب جاننے والے ہیں (کہ کون مانتا ہے کون نہیں

مانتا؟ اور نہ ماننے والوں کو جو فوراً سزا نہیں دیتے، تو وجہ یہ کہ) حلیم (بھی) ہیں۔

یُوْرَثُ کَلٰلَۃً: میت ایسی ہو جس کے نہ اصول ہوں یعنی باپ دادا نہ ہوں، باپ کے ساتھ دادا بھی اس شامل کیا گیا تو یہ تفسیر امام ابوحنیفہؒ کے مذہب پر ہے ان کے نزدیک دادا سے بھی سب طرح کے بہن بھائی میراث سے محروم ہو جاتے ہیں، دوسرے ائمہ کا اس میں اختلاف ہے اور یہ مسئلہ صحابہ کرام میں بھی مختلف فیہ تھا۔

وَّلَہٗۤ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ: اس پر امت کا اجماع ہے کہ اس جگہ بھائی بہن اخیافی مراد ہیں، یعنی جن کی ماں ایک ہو اور باپ الگ الگ، اور آیت میں بھی اس کا قرینہ موجود ہے کہ ان بھائی بہنوں کا حصہ وہی ٹھہرایا ہے جو پیچھے ماں کا گزر چکا ہے، یعنی تہائی اور چھٹا، حقیقی اور علاتی یعنی باپ شریک بھائی بہنوں کا حکم سورت کے اختتام پر آئے گا، بعض صحابہ اس آیت میں: وَّلَہٗۤ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ کے بعد "من الام" بھی بڑھاتے تھے، یعنی وہ بھائی بہن جو ماں شریک ہوں تو یہ تفسیر انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہوگی۔

فائدہ: ۱ فَلِکُلِّ وَاحِدٍ مِّنْھُمَا السُّدُسُ: یہاں سے اخیافی بھائی بہن کے میراث کا ذکر ہے جو کہ صرف ماں میں شریک ہوں سو جاننا چاہیے کہ باپ اور بیٹے کے ہوتے تو بھائی اور بہن کو کچھ نہیں پہنچتا، ہاں! اگر باپ اور بیٹا نہ ہوگا تو بھائی اور بہن کو میراث ملے گی، بھائی اور بہن تین طرح کے ہیں: ① سگے جو ماں باپ دونوں میں شریک ہوں جن کو "عینی" کہتے ہیں ② یا وہ سوتیلے جو صرف باپ میں شریک ہوں جن کو "علاتی" کہتے ہیں ③ یا وہ سوتیلے جو صرف ماں میں شریک ہوں جن کو "اخیافی" کہتے ہیں، اس آیت میں قسم اخیر کا ذکر ہے، چنانچہ متعدد صحابہ کی قرات میں **ولہ اخ او اخت** کے بعد **من الام** کا کلمہ صریح موجود ہے اور اس پر سب کا اجماع ہے۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ جس میت کے خواہ وہ مرد ہو یا عورت، ماں باپ بیٹا بیٹی کچھ نہ ہو اور اس کے ایک بھائی یا ایک بہن اخیافی ہو تو ان دونوں میں سے ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا اور مرد اور عورت یعنی اخیافی بھائی اور بہن کا برابر حصہ ہے کمی زیادتی نہیں۔

باقی رہے دو قسم کے بھائی بہن یعنی عینی اور علاتی سو ان دونوں قسموں کا حکم مثل اولاد کے ہے، بشرطیکہ میت کے باپ بیٹا کچھ نہ ہو، مقدم عینی ہے، وہ نہ ہو تو پھر علاتی، اس سورت کے اخیر میں ان دونوں کی میراث کا ذکر آئے گا۔

فائدہ: جاننا چاہیے کہ "کلالہ" کی تفسیر جو یہ کی گئی کہ اس کے باپ بیٹا نہ ہو یہ سب کو مسلم ہے، مگر امام ابوحنیفہ دادی اور پوتی کی بھی نفی کرتے ہیں اور جو حکم باپ بیٹے کا ہے وہی دادی اور پوتی کا فرماتے ہیں، اور حضرات صحابہ کے وقت سے یہ اختلاف علماء میں چلا آتا ہے۔

فائدہ: ۲ غَیْرَ مُضَآرٍّ: یعنی اگر اخیافی بھائی یا بہن ایک سے زیادہ ہوں تو ان سب کو ایک تہائی مال میراث میں ملے گا اور پہلی صورت میں سدس اور دوسری صورت میں ثلث جو دیا جائے گا تو وصیت اور دین کے بعد جو باقی رہے گا اس کا سدس اور ثلث دیا جائے گا اور وصیت میراث پر مقدم جب ہوگی جب اوروں کو نقصان نہ پہنچایا ہو اور نقصان کی دو صورتیں ہیں: ① ایک یہ کہ تہائی مال سے زیادہ کی وصیت ہو ② دوسری یہ کہ جس وارث کو میراث میں سے حصہ ملے گا اس کے لئے کچھ وصیت بھی کر جائے، یہ دونوں صورتیں درست نہیں، البتہ اگر سب وارث اس کو قبول کرلیں تو خیر، ورنہ یہ وصیتیں مردود ہیں۔

فائدہ: وارثوں سے چونکہ اندیشہ تھا کہ ترکہ میت میں سے میت کا دین اور وصیت ادا نہ کریں، بلکہ تمام مال آپ ہی رکھ لیں، اس لئے میراث کے ساتھ بار بار دین اور وصیت کا حکم تاکیداً بیان کیا گیا اور وصیت چونکہ تبرع اور احسان ہے اور بسا اوقات کوئی شخص معین اس کا مستحق نہیں ہوتا اور اس وجہ سے اس کے ضائع ہونے کا احتمال قوی تھا تو اس لئے بغرض اہتمام واحتیاط وصیت کو ہر جگہ دین سے پہلے ذکر فرمایا، حالانکہ وصیت کا درجہ دین کے بعد ہے، جیسا پہلے گزرا، نیز وصیت حق مورث ہے، جیسے تجہیز وتکفین، بخلاف وراثت اور دین کے کہ وہ دوسروں کا حق ہے تو اس حیثیت سے وصیت دین سے مقدم ہوگی، گو دوسری وجہ سے دین وصیت پر مقدم ہے۔

اور یہاں جو **غیر مضار** کی قید لگائی یہی قید مقامات سابقہ میں بھی معتبر ہوگی۔

فائدہ: ۔ــ وَاللّٰهُ عَلِیْمٌ حَلِیْمٌ: شروع رکوع سے یہاں تک جو میراثیں بیان فرمائیں وہ پانچ ہیں: ① بیٹا بیٹی اور ② اور ماں باپ ③ اور زوج ④ اور زوجہ ⑤ اور اخیافی بھائی بہن ان پانچوں کو ''ذوی الفروض'' اور حصہ دار کہتے ہیں، ان پانچوں میراث کو بیان فرما کر بطور تاکید فرمادیا کہ یہ حکم ہے اللہ کا اس کی تعمیل ضروری ہے اور اللہ تعالیٰ کو سب کچھ معلوم ہے کس نے اطاعت کی اور کس نے نافرمانی کی، کس نے میراث ووصیت ودین میں حق اور انصاف کے موافق کیا، کس نے بے انصافی کی اور ضرر پہنچایا۔ باقی ظلم و بے انصافی کی سزا میں تاخیر ہونے سے کوئی دھوکہ نہ کھائے کیونکہ حق تعالیٰ کا حلم بھی بہت کامل ہے۔

فائدہ: جاننا چاہیے کہ ذوی الفروض کے سوا کہ جن کا بیان اس رکوع میں گزرا ایک دوسری قسم کے وارث ہیں جن ''کو عصبہ'' کہتے ہیں۔ ان کے لئے کوئی حصہ مثل نصف ثلث وغیرہ کے مقرر نہیں، بلکہ ذوی الفروض سے جو فاضل ہوگا وہ ان کو ملے گا، مثلاً اگر کسی کے عصبہ ہو اور ذوی الفروض میں سے کوئی نہ ہو تو اس کا مال تمام عصبہ کو ملے گا اور جو دونوں ہوں تو ذوی الفروض کو دے کر جو مال بچے گا وہ عصبہ کو دیا جائے گا اور اگر کچھ نہ بچا تو عصبہ کو کچھ نہ ملے گا اور عصبہ اصل میں تو وہ ہے جو مرد ہو عورت نہ ہو اور اس میں میت میں اور عورت کا واسطہ بھی نہ ہو اور اس کے چار درجے ہیں: ① اول درجہ میں بیٹا اور پوتا ہے ② دوسرے درجہ میں باپ اور دادا ③ تیسرے درجہ میں بھائی اور بھتیجا ④ چوتھے درجہ میں چچا اور بیٹا یا اس کا پوتا۔ اگر کئی شخص ہوں تو جو میت سے قریب ہے وہ مقدم ہوگا جیسے پوتے سے بیٹا، بھتیجے سے بھائی مقدم ہے، پھر سوتیلے سے سگا مقدم ہے اور ان چاروں کے سوا اولاد میں اور بھائیوں میں مرد کے ساتھ عورت بھی عصبہ ہوتی ہے یعنی بیٹے کے ساتھ بیٹی اور بھائی کے ساتھ بہن بھی عصبہ ہوگی یہ عصبہ اصلی نہیں، بلکہ غیر اصلی ہیں اور اولاد اور بھائیوں کے سوا عورت عصبہ نہ ہوگی، مثلاً چچا کا بیٹا عصبہ ہے، مگر اس کے ساتھ ہو کر چچازاد بہن عصبہ نہیں ہوسکتی۔

فائدہ: ان دونوں قسم مذکورہ بالا یعنی ''ذوی الفروض'' اور ''عصبہ'' کے سوا امام ابوحنیفہ کے نزدیک وارث کی تیسری قسم ''ذوی الارحام'' ہیں یعنی ایسے قرابت والے کہ ان میں اور میت میں عورت کا واسطہ ہو اور ذوی الفروض میں نہ ہو اور عصبہ بھی نہ ہو جیسے نواسہ اور نانا اور بھانجا اور ماموں اور خالہ اور پھوپھی اور انکی اولاد، جب کسی میت کے ذوی الفروض اور عصبہ کوئی بھی نہ ہوگا تو اسکی میراث ''ذوی الارحام'' کو ملے گی تفصیل کتب فرائض میں مذکور ہے۔

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ؕ وَمَنْ یُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ یُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ

یہ حدیں باندھی ہوئی اللہ کی ہیں، اور جو کوئی حکم پر چلے اللہ کے اور رسول کے اسکو داخل کرے گا جنتوں میں جنکے نیچے بہتی ہیں نہریں ہمیشہ رہیں گے

فِیْهَا ؕ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ⑬ وَمَنْ یَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَیَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ یُدْخِلْهُ نَارًا

ان میں، اور یہی ہے بڑی مراد ملنی، اور جو کوئی نافرمانی کرے اللہ کی اور اسکے رسول کی اور نکل جاوے اسکی حدوں سے ڈالے گا اسکو آگ میں

خَالِدًا فِیْهَا ۪ وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِیْنٌ ⑭

ع ۱۲

ہمیشہ رہے گا اس میں، اور اس کے لئے ذلت کا عذاب ہے

خلاصہ تفسیر: میراث کے مذکورہ احکام بیان کرنے کے بعد ان دو آیتوں میں ان احکام میراث کو ماننے اور ان پر عمل کرنے کی فضیلت اور نہ ماننے پر وعید کا بیان ہے، جس سے میراث کے مذکورہ احکام کی اہمیت و تاکید مقصود ہے۔

یہ سب احکام مذکورہ (میراث کے متعلق ہوں یا یتیموں کے احکام کے) خداوندی ضابطے ہیں، اور جو شخص اللہ اور رسول کی پوری اطاعت کرے گا (یعنی ان ضابطوں کی پابندی کرے گا) اللہ تعالیٰ اس کو ایسی بہشتوں میں (فوراً) داخل کردیں گے جن کے (محلات کے) نیچے نہریں جاری ہوں گی، ہمیشہ ہمیشہ ان میں رہیں گے اور یہ بڑی کامیابی ہے، اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کا کہنا نہ مانے گا اور بالکل ہی اس کے ضابطوں سے نکل

جائے گا (یعنی احکام کی پابندی کو ضروری بھی نہ سمجھے اور یہ حالت کفر کی ہے) اس کو (دوزخ کی) آگ میں داخل کریں گے، اس طور سے کہ وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہے گا اور اس کو ایسی سزا ہوگی جس میں ذلت بھی ہے۔

يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ: یعنی ایسی بہشتوں میں فوراً داخل کر دیں گے، فوراً کے معنی یہ ہیں کہ بلا عذاب کے جنت میں جائے گا، کیونکہ پوری اطاعت کرنے والوں کو عذاب بالکل نہیں ہوگا۔

وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ: یعنی بالکل ہی اس کے ضابطوں سے نکل جائے گا، مطلب یہ کہ احکام کی پابندی کو ضروری بھی نہ سمجھے جو کہ کفر کی حالت ہے، تو جو لوگ شرعی احکام پر اعتقاد رکھیں گے مگر عمل میں کوتاہی کریں گے وہ شرعی ضابطوں سے بالکل خارج نہیں، کیونکہ اعتقاد بھی تو ایک ضابطہ ہے جس کو وہ تسلیم کیے ہوئے ہیں، بس بالکلیہ نکل جانا کافروں ہی پر صادق آ سکتا ہے۔

اس آیت میں دو قسم کے لوگوں کا ذکر ہے: ایک کامل مطیع، دوسرے کامل نافرمان، تیسری قسم کا اس میں ذکر نہیں جو اعتقاد سے تابع دار ہو اور عمل میں قصوروار ہو، اس کا حکم دوسری آیتوں میں موجود ہے کہ کچھ سزا کا مستحق ہے، لیکن اخیر میں نجات ہو جائے گی، اور یہاں بھی غور کرنے سے اس تیسری قسم کا حکم معلوم ہو سکتا ہے، کیونکہ جب اس کی حالت بین بین ہے تو اس کی جزا بھی بیچ بیچ ہوگی، یعنی کچھ عذاب کچھ ثواب، اور ظاہر ہے کہ یہ احتمال تو ہو نہیں سکتا کہ پہلے جنت میں جائے پھر جہنم میں، کیونکہ جنت میں جا کر پھر نکلنا ممکن نہیں، پس یہی صورت متعین ہوگی کہ پہلے عذاب ہو پھر آخر میں نجات ہو، اگر کوئی یہ کہے کہ ان تین کے علاوہ چوتھا احتمال یہ بھی تو ہے کہ کوئی عمل تو کرے اور اعتقاد نہ کرے، اس کو کچھ ثواب کچھ عذاب ہونا چاہیے، جواب یہ ہے کہ یہ احتمال باطل ہے، کیونکہ عمل قبول ہونے کے لیے اعتقاد شرط ہے، جب اعتقاد نہیں تو وہ عمل بھی کچھ نہیں، اس لیے یہ بھی بالکل نافرمان ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی تمام احکام مذکورہ سابقہ متعلق حقوق یتامی اور وصیت اور میراث اللہ کے مقرر فرمودہ ضابطے اور قاعدے ہیں، اور جو کوئی اطاعت کرے گا احکام الٰہی کی، جن میں حکم وصیت و میراث بھی داخل ہے، اس کے لئے ہمیشہ کو جنت ہے، اور جو کوئی نافرمانی کرے گا اور حدود خداوندی سے بالکل خارج ہو جائے گا، وہ ہمیشہ کو ذلت کے ساتھ عذاب جہنم میں گرفتار رہے گا۔

وَالّٰتِيْ يَاْتِيْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآىِٕكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَيْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا

اور جو کوئی بدکاری کرے تمہاری عورتوں میں سے تو گواہ لاؤ ان پر چار مرد اپنوں میں سے، پھر اگر وہ گواہی دیویں

فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِي الْبُيُوْتِ حَتّٰى يَتَوَفّٰىهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا ⑮

تو بند رکھو ان عورتوں کو گھروں میں یہاں تک کہ اٹھا لیوے ان کو موت یا مقرر کر دے اللہ ان کے لئے کوئی راہ

خلاصہ تفسیر: جس طرح جاہلیت میں یتیموں اور میراث کے معاملات میں بہت سی بے اعتدالیاں تھیں، اسی طرح عورتوں کے معاملہ میں بھی طرح طرح کی بے عنوانیاں تھیں، مثلاً ان کو اذیتیں پہنچاتے تنگ کرتے تھے، جن عورتوں سے نکاح حرام ہے ان سے نکاح لیا کرتے تھے، اب ان معاملات کی اصلاح فرماتے ہیں اور اگر کسی عورت سے کوئی ایسی خطا و قصور سرزد ہو جائے جو شرعاً معتبر ہو، اس پر اصلاح و تادیب کی اجازت دیتے ہیں، چنانچہ آگے آیت: الرجال قوّامون تک یہ مضمون چلا گیا ہے، تادیب ہی سے شروع ہوا اور تادیب ہی پر ختم ہوا۔

اور جو عورتیں بے حیائی کا کام (یعنی زنا) کریں تمہاری (منکوحہ) بیویوں میں سے، سو تم لوگ ان عورتوں (کے اس فعل) پر چار آدمی اپنوں میں سے (یعنی مسلمان، آزاد، عاقل، بالغ، مذکر) گواہ کر لو (تا کہ ان کی گواہی پر حکام سزا جاری کریں) سو اگر وہ گواہی دیدیں تو (ان کی سزا یہ ہے کہ) تم ان کو (حاکم کے حکم سے) گھروں کے اندر (سیاسۃً) مقید رکھو یہاں تک کہ (یا تو) موت ان کا خاتمہ کر دے (اور) یا اللہ تعالیٰ ان کے لئے کوئی اور راہ (یعنی کوئی دوسرا حکم) تجویز فرما دیں (چنانچہ بعد میں اللہ تعالیٰ نے دوسرا حکم تجویز فرما دیا)۔

فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَيْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ: یعنی ان عورتوں پر چار آدمی اپنوں می سے گواہ کرلو (تا کہ ان کی گواہی پر حکام سزا جاری کریں) اس سے معلوم ہوا کہ حاکم کے سوا کسی دوسرے کو سزا دینے کا اختیار نہیں، کیونکہ گواہ بنانے کی ضرورت تو حکام ہی کی اطلاع کے لیے ہے، ورنہ شوہر کو اگر اختیار ہوتا تو اس کے معائنہ کے بعد گواہوں کی کیا حاجت تھی۔

فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِي الْبُيُوْتِ: یعنی ان کو گھروں کے اندر (سیاسۃ) مقید رکھو، یہاں سیاسۃ کی قید بڑھانے سے یہ شبہ جاتا رہا کہ گھروں میں مقید رکھنا تو شوہر کا ویسے ہی حق ہے، یہ کیا سزا ہوئی؟ جواب یہ ہے کہ شوہر تو تعلق ومحبت کی وجہ سے مقید کرتا ہے، جبکہ یہ مقید رکھنا سزا کے طور پر ہے۔

اَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا: یا اللہ ان کے لیے کوئی اور راہ تجویز فرمادیں، چنانچہ بعد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالی نے وہ راہ بتلادی ہے تم لوگ سمجھ لو یاد کرلو کہ غیر شادی شدہ کے لیے سو درّے اور شادی شدہ کے لیے سنگساری، پس اس آیت کا حکم منسوخ ہوگیا۔

* * *

فائدہ: یتامیٰ اور مواریث کو بیان فرما کر اب دیگر احکام متعلقہ اقارب کو بتلایا جاتا ہے، پہلے عورتوں کے متعلق چند باتیں ارشاد ہوتی ہیں، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ عورتوں کی تادیب اور سیاست ضروری امر ہے اور ان پر کسی قسم کی تعدی اور ظلم بھی نہ کیا جائے، اہل جاہلیت کے یہاں عورتوں کی بابت دونوں باتوں میں بہت بے اعتدالیاں ہوتی تھیں اور اس آیت میں تادیب کے متعلق حکم ہے کہ اگر کسی کی زوجہ کا مرتکب زنا ہونا معلوم ہو تو ان کے لئے چار گواہ مسلمانوں میں سے عاقل بالغ آزاد قائم ہونے چاہئیں، اگر چار آدمی گواہی دیں تو اس عورت کو گھر میں مقید رکھنا چاہیے، گھر سے باہر جانا اور کسی سے ملنا انتظاماً بالکل روک دیا جائے، یہاں تک کہ وہ عورت مرجائے، یا اللہ تعالیٰ اس کے لئے کوئی حکم اور سزا مقرر فرمائے، اس وقت تک زانیہ کے لئے کوئی حد مقرر نہیں فرمائی، بلکہ اس کا وعدہ کیا، چنانچہ کچھ عرصہ کے بعد سورۃ نور میں اس کی حد نازل فرمادی کہ باکرہ کے لئے سو کوڑے اور ثیبہ کے واسطے سنگسار کرنا ہے۔

وَالَّذٰنِ يَاْتِيٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا ۚ فَاِنْ تَابَا وَاَصْلَحَا فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ

اور جو دو مرد کریں تم میں سے وہی بدکاری تو ان کو ایذا دو[1] پھر اگر وہ دونوں توبہ کریں اور اپنی اصلاح کرلیں تو ان کا خیال چھوڑ دو، بیشک اللہ

كَانَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ﴿۱۶﴾

توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے[2]

خلاصہ تفسیر: اور (زنا کی سزا میں منکوحہ عورت ہی کی کچھ تخصیص نہیں، بلکہ) جونسے دو شخص بھی وہ بے حیائی کا کام (یعنی زنا) کریں تم میں سے (یعنی بالغ عاقل مسلمانوں میں سے) تو ان دونوں کو اذیت پہنچاؤ، پھر (اذیت پہنچانے کے بعد) اگر وہ دونوں (گزشتہ سے) توبہ کرلیں اور (آئندہ کے لئے اپنی) اصلاح کرلیں (یعنی پھر ان سے ایسا فعل سرزد نہ ہو) تو ان دونوں سے کچھ تعرض نہ کرو (کیونکہ) بلاشبہ اللہ تعالیٰ توبہ قبول کرنے والے ہیں، رحمت والے ہیں (اس لئے اپنی رحمت سے اللہ تعالیٰ نے ان کی خطا معاف کردی، پھر تم کو بھی ان کے درپے آزار نہ ہونا چاہئے)۔

وَالَّذٰنِ يَاْتِيٰنِهَا مِنْكُمْ: یہ جو کہا گیا کہ "جونسے دو شخص بھی"، اس میں شادی شدہ، غیر شادی شدہ عورت، اور شادی شدہ اور غیر شادی شدہ مرد سب آگئے، پس چاروں کا حکم مذکور ہوگیا، ان کا یہ حکم ابتدا میں تھا کہ اذیت تو سب کو پہنچائی جائے، جس کا طریقہ صرف منکوحہ عورت کے لیے تو یہ بیان فرمایا کہ ان کو مقید رکھو اور باقیوں کے لیے طریقہ بیان نہیں فرمایا، ظاہر ہے کہ یہ حکام اسلامی کی رائے پر تھا کہ جس طریقہ سے بھی زجر وتنبیہ کی حاصل ہوجائے، خواہ زبان سے، یا ہاتھ سے، پھر وہ دوسرا حکم بعد میں نازل ہوا جس کو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح ارشاد فرمایا کہ "اللہ تعالی نے وہ سبیل ارشاد فرمادی ہے تو تم لوگ سمجھ لو یاد کرلو کہ غیر شادی شدہ کے لیے سو کوڑے اور شادی شدہ کے لیے سنگساری"، پس اس آیت کا حکم منسوخ ہے۔

فَاِنْ تَابَا وَاَصْلَحَا فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمَا: یہاں ان سے اعراض کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ سزا نہ دو، کیونکہ یہ توبہ سزا کے حکم کے بعد مذکور

ہے، بلکہ مراد یہ ہے کہ اگر توبہ کرلیں تو پھر سزا کے بعد ملامت نہ کرو، اور زیادہ سزا نہ دو، اور اگر توبہ نہ کریں تو ملامت کرنا درست ہے جیسا کہ سزا کے بعد دوبارہ اگر ایسا کریں تو پھر دوبارہ سزا ہے، اس میں اس پر بھی دلالت ہے کہ توبہ کرلینے والے پر طعن و تشنیع نہیں کرنی چاہیے کیونکہ یہ بلا ضرورت ایذا پہنچانا ہے، بلکہ اس طعن و تشنیع سے تو بسا اوقات شر کا دروازہ کھل جاتا ہے۔

* * *

فائدہ: ؀ یعنی وہ شخص خواہ وہ ایک مرد اور ایک عورت ہو، خواہ دونوں مرد ہوں، اگر فعل بد کریں تو ان کی سزا مجملا ایذا دینا ارشاد فرمایا، زبان سے، ہاتھ سے بقدر مناسب ان کو تنبیہ و تادیب کرنے کا حکم ہوا، اس سے معلوم ہوا کہ اس وقت زنا اور لواطت دونوں کا یہی حکم تھا کہ حاکم اور قاضی کے نزدیک زجر و عبرت کے لئے جتنی سزا اور شتم و ضرب مناسب ہو، اتنی سزا دی جائے اس کے بعد حسب وعدہ حد زنا جب نازل ہوئی تو لواطت کیلئے کوئی جدا حد بیان نہ فرمائی، اس میں علماء کا اختلاف رہا کہ لواطت کی بھی وہی حد ہے جو زنا کے لئے بیان ہوئی، یا لواطت کی وہی سزا باقی رہی جو پہلے تھی، یا اس کی سزا تلوار سے قتل کرنا، یا کسی دوسرے طریقہ سے مار ڈالنا ہے۔

فائدہ: اس آیت کو بہت سے علماء نے زنا پر حمل کیا ہے اور بعض نے لواطت پر اور بعض نے دونوں کو شامل رکھا ہے۔

فائدہ: ؁ یعنی اس کے بعد اگر وہ بدکاری سے توبہ کرلیں اور آئندہ کو اپنے اعمال کی درستی کرلیں تو اب ان کے پیچھے مت پڑو اور زجر و ملامت سے ستانا چھوڑ دو، اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی توبہ قبول کرنے والا ہے اور ان پر مہربانی فرمانے والا ہے تم کو بھی ایسا ہی کرنا چاہیے۔

إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ

توبہ قبول کرنی اللہ کو ضرور تو ان کی ہے جو کرتے ہیں برا کام جہالت سے پھر توبہ کرتے ہیں جلدی سے

فَأُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ۗ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿١٧﴾

تو ان کو اللہ معاف کر دیتا ہے، اور اللہ سب کچھ جاننے والا ہے حکمت والا

خلاصہ تفسیر: (گذشتہ آیت میں توبہ کا ذکر آیا تھا، اب ان دو آیتوں میں قبول توبہ کی شرائط اور اس کے قبول ہونے اور نہ ہونے کی صورتیں بتلاتے ہیں:) توبہ جس کا قبول کرنا (حسب وعدہ) اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے وہ تو انہی کی ہے، جو حماقت سے کوئی گناہ (صغیرہ ہو یا کبیرہ) کر بیٹھتے ہیں، پھر قریب ہی وقت میں (یعنی موت کے حاضر ہونے سے قبل جس کے معنی آگے آتے ہیں) توبہ کرلیتے ہیں، سو ایسوں پر تو اللہ تعالیٰ (قبول توبہ کے ساتھ) توجہ فرماتے ہیں (یعنی توبہ قبول کرلیتے ہیں) اور اللہ تعالیٰ خوب جانتے ہیں (کہ کس نے دل سے توبہ کی ہے) حکمت والے ہیں (کہ دل سے توبہ نہ کرنے والے کو اکثر رسوا نہیں کرتے)۔

يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ: یعنی جو حماقت سے کوئی گناہ کر بیٹھے ہوں، واضح رہے کہ گناہ ہمیشہ حماقت ہی سے ہوتا ہے جس کو اپنے نفع و نقصان کی پرواہ نہ ہو اس سے بڑھ کر کیا حماقت ہوگی، پس اس قید کا یہ مطلب نہیں کہ جو گناہ حماقت سے نہ ہو اس کی توبہ نہیں، کیونکہ بغیر حماقت کے گناہ ہوتا ہی نہیں، چاہے عالم کرے یا جاہل، چنانچہ اس میں صوفیہ کے نزدیک بھی بجهالة کی قید واقعی ہے احترازی نہیں، پس وہ فرماتے ہیں کہ جہالت کے بغیر کوئی گناہ ہو ہی نہیں سکتا، وہ گناہ عمد کو بھی جہالت ہی سے صادر ہونے والا سمجھتے ہیں، کیونکہ علم جو جہل کا مقابل ہے اس کی تعریف ان کے ہاں: "اعتقاد جازم مطابق للواقع مع غلبة الحال" ہے اور گناہ کرنے کے وقت غلبہ حال مفقود ہوتا ہے، اس لئے گناہ "جہل" ہی سے ہوگا، یعنی جس وقت گناہ کے انجام اور سزا کا کامل استحضار ہو اس وقت گناہ ہو ہی نہیں سکتا، "لا یزنی الزانی حین یزنی وھو مؤمن" میں ایمان کی نفی اسی حال کی نفی ہے، پس غلبہ حال ہی سے گناہ سے رک سکتے ہیں، پھر شبہ ہوتا ہے کہ یہ غلبہ حال تو اختیاری چیز نہیں ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ غلبہ مراقبہ اور استحضار کے تکرار سے

حاصل ہوجاتا ہے اور استحضار کا تکرار کرنا اختیاری عمل ہے، پس اس سے جو حال پیدا ہو وہ بھی اختیاری ہے، جیسا آنکھوں کا کھولنا تو اختیاری ہے اور نظر آنا فی نفسہ غیر اختیاری ہے مگر آنکھوں کو کھولنا اس کا سبب ہے جو کہ اختیاری ہے اس لئے نظر آنے کو بھی اختیاری ہی کہا جا سکتا ہے۔

ثُمَّ يَتُوبُونَ مِن قَرِيبٍ: موت کے قریب دو حالتیں پیش آتی ہیں: ① ایک تو یاس و ناامیدی کی جب کہ انسان ہر دوا و تدبیر سے عاجز ہو کر یہ سمجھ لے کہ اب موت آنے والی ہے، اس کو حالت یاس بالیاء سے تعبیر کیا گیا ہے ② دوسری حالت اس کے بعد کی ہے، جبکہ نزع روح شروع ہوجائے اور غرغرہ کا وقت آجائے، اس حالت کو باس بالباء کہا جاتا ہے، پہلی حالت یعنی حالت یاس تک تو من قریب کے مفہوم میں داخل ہے اور توبہ اس وقت کی قبول ہوتی ہے، مگر دوسری حالت یعنی حالت باس کی توبہ مقبول نہیں، جب کہ فرشتے اور عالم آخرت کی چیزیں انسان کے سامنے آجائیں، کیونکہ وہ من قریب کے مفہوم میں داخل نہیں، اس آیت میں من قریب کا لفظ بڑھا کر اس کی طرف اشارہ کر دیا گیا کہ انسان کی ساری عمر ہی ایک قلیل زمانہ ہے اور موت جس کو وہ بعید سمجھ رہا ہے اس کے بالکل قریب ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی توبہ تو بیشک ایسی چیز ہے کہ زنا اور لواطت جیسے سنگین جرم بھی اس سے اللہ تعالیٰ معاف فرما دیتا ہے، جیسا کہ آیت سابقہ سے مفہوم ہوا، لیکن اس کا بھی ضرور لحاظ رکھو کہ اللہ تعالیٰ نے جو اپنے فضل سے قبول توبہ کا ذمہ لے لیا ہے، وہ اصل میں ان لوگوں کے ساتھ مخصوص ہے جو ناواقفیت اور نادانی سے کوئی صغیرہ یا کبیرہ گناہ کر لیتے ہیں، مگر جب اپنی خرابی پر متنبہ اور مطلع ہوتے ہیں تو جب ہی نادم ہوتے ہیں اور توبہ کرتے ہیں، سو ایسوں کی خطائیں اللہ ضرور معاف فرما دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ سب کچھ جانتا ہے، اس کو معلوم ہے کس نے نادانی سے گناہ کیا اور کس نے اخلاص سے توبہ کی، اور حکمت والا ہے جس توبہ کا قبول کرنا موافق حکمت ہوتا ہے، اس کو قبول فرمالیتا ہے۔

فائدہ: قید ''جہالت'' اور قید ''قریب'' سے معلوم ہوگیا کہ جو شخص گناہ تو کرے نادانی سے اور تنبیہ کے بعد توبہ کرلے جلدی سے تو بقاعدہ عدل و حکمت اس کی توبہ مقبول ہونی ضروری ہے اور جس نے جان بوجھ کر دیدہ و دانستہ اللہ کی نافرمانی پر جرات کی، یا اطلاع کے بعد اس نے توبہ میں تاخیر کی اور پہلی ہی حالت پر قائم رہا تو بقاعدہ عدل و انصاف اس کی خطا اصل میں معافی کے قابل نہیں، اس کا قبول کرلینا اللہ تعالیٰ کا محض فضل ہے کہ اپنے فضل سے اللہ تعالیٰ ان دونوں کی توبہ کو بھی قبول کرلیتا ہے، یہ اس کا احسان ہے، مگر ذمہ داری صرف اول صورت میں ہے، باقی میں نہیں۔

وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ ۚ حَتَّىٰ إِذَا حَضَرَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ إِنِّي تُبْتُ

اور ایسوں کی توبہ نہیں جو کئے جاتے ہیں برے کام یہاں تک جب سامنے آجائے ان میں سے کسی کی موت تو کہنے لگا میں توبہ کرتا ہوں

الْآنَ وَلَا الَّذِينَ يَمُوتُونَ وَهُمْ كُفَّارٌ ۚ أُولَٰئِكَ أَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ⑱

اب اور نہ ایسوں کی توبہ جو مرتے ہیں حالت کفر میں، ان کے لئے تو ہم نے تیار کیا ہے عذاب دردناک

خلاصہ تفسیر: اور ایسے لوگوں کی توبہ (قبول) نہیں جو (برابر) گناہ کرتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کے سامنے موت ہی آ کھڑی ہوئی (موت آجانے کا مطلب یہ ہے کہ اس کو دوسرے عالم کی چیزیں نظر آنے لگیں) تو کہنے لگا کہ میں اب توبہ کرتا ہوں (پس نہ تو ایسوں کی توبہ قبول ہوگی) اور نہ ان لوگوں کی (توبہ یعنی ایمان لانا ایسے وقت کا مقبول نہ ہوگا) جن کو حالت کفر پر موت آجاتی ہے، ان (کافر) لوگوں کے لئے ہم نے ایک دردناک سزا (یعنی دوزخ کی سزا) تیار کر رکھی ہے۔

یہاں برابر گناہ کرتے رہنے کا یہ مطلب نہیں کہ بار بار گناہ کرتے رہتے ہیں، بلکہ اگر ایک بار بھی گناہ کر کے اس سے توبہ نہ کی تو برابر گناہ ہوتا رہے گا، کیونکہ معصیت پر جمے رہنا دوسرا گناہ ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی اور ایسے لوگوں کی توبہ قبول نہیں ہوتی جو برابر گناہ کئے جاتے ہیں اور باز نہیں آتے، یہاں تک کہ جب موت ہی نظر آ گئی تو اس وقت کہنے لگا کہ اب میں توبہ کرتا ہوں، اور نہ ان کی توبہ قبول ہوگی جو کفر پر مر گئے اور اس کے بعد عذاب اخروی کو دیکھ کر توبہ کریں، ایسے لوگوں کے واسطے عذاب شدید تیار ہے۔

جاننا چاہیے کہ یہ دونوں آیتیں جو در بارہ قبول توبہ اور عدم قبول توبہ یہاں مذکور ہیں، ہم نے جو ان کا مطلب بیان کیا، یہ بعض اکابر محققین کی تحقیق کے موافق ہے اور اس میں یہ خوبی ہے کہ قید ''جہالت'' اور لفظ ''قریب'' دونوں اپنے ظاہری معنی پر قائم رہے اور علی اللہ کے معنی بھی سہولت سے بن گئے، اور اس موقع پر قبول اور عدم قبول توبہ کے ذکر فرمانے سے جو مقصد ہے، یعنی توبہ کیف ما اتفق مقبول نہیں، اور توبہ کی چند صورتیں ہیں، اور ان کی مقبولیت میں باہم فرق ہے، تاکہ کوئی توبہ کے اعتماد پر معاصی پر جری نہ ہو جائے، یہ مقصد بھی اس صورت میں خوب حاصل ہو جاتا ہے، مگر مفسرین حضرات نے علی العموم جو ان آیتوں کا مطلب ارشاد فرمایا ہے تو قید ''جہالت'' کو احترازی اور شرطی نہیں لیتے، بلکہ قید واقعی فرماتے ہیں اور کہتے ہیں کہ گناہ ہمیشہ جہل اور حماقت سے ہوتا ہے اور ''قریب'' کے معنی یہ لیتے ہیں کہ حضور موت سے پہلے جس قدر وقت ہے وہ قریب ہی ہے، کیونکہ دنیا کی زندگی قلیل ہے، اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ اللہ کا توبہ قبول فرمانے کا وعدہ ان سے ہے کہ سفاہت اور عدم انجام بینی سے گناہ کر لیتے ہیں اور پھر موت کے آنے سے پہلے تائب ہو جاتے ہیں اور جو لوگ کہ موت کا مشاہدہ کر چکے اور نزع کی حالت کو پہنچ چکے، یا جو لوگ کہ کفر پر مر چکے، ان کی توبہ ہرگز قبول نہ ہوگی، اس تقریر کے موافق توبہ کرنے والوں کی وہ دو صورتیں ہیں جو تقریر اوّل میں مذکور ہوئیں شق اوّل یعنی قبول توبہ کے اندر شمار ہوں گی۔

فائدہ: جب موت کا یقین ہو چکے اور دوسرا عالم نظر آنے لگے تو اس وقت کی توبہ قبول نہیں اور عالم آخرت کے دیکھنے سے پہلے کی توبہ البتہ قبول ہوتی ہے، اتنا فرق ہے کہ حسب تقریر اوّل صورت اوّل میں تو قبول توبہ قاعدہ عدل وانصاف کے موافق ہے اور دوسری صورتوں میں قبول توبہ اس کا محض فضل ہے کما مر۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا ؕ وَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذْهَبُوْا

اے ایمان والو حلال نہیں تم کو کہ میراث میں لے لو عورتوں کو زبردستی، اور نہ روکے رکھو ان کو اس واسطے کہ لے لو ان سے

بِبَعْضِ مَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ۚ وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ

کچھ اپنا دیا ہوا مگر یہ کہ وہ کریں بے حیائی صریح اور گزران کرو عورتوں کے ساتھ اچھی طرح

فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا ⑲

پھر اگر وہ تم کو نہ بھاویں تو شاید تم کو پسند نہ آوے ایک چیز اور اللہ نے رکھی ہو اس میں بہت خوبی

خلاصہ تفسیر: گذشتہ آیات سے پہلے عورتوں سے متعلق احکام کا ذکر چل رہا تھا، ان آیات میں بھی عورتوں کے متعلق احکام ہیں، جاہلیت میں عورتوں پر ان کے شوہروں کی طرف سے بھی ظلم ہوتا تھا اور ان کے وارثوں کی طرف سے بھی، جب شوہر مر جاتا تو شوہر کے ورثاء اپنی من مانی کرتے، دل چاہتا تو اسی عورت کے ساتھ خود نکاح کر لیتے، یا دوسرے کے ساتھ کرا دیتے اور اگر رغبت نہ ہوئی تو نہ خود نکاح کریں اور نہ دوسرے سے نکاح کرنے دیں، بلکہ ان کو قیدی بنا کر رکھیں، تاکہ اس کو ذریعہ آمدنی بنا دیں، اس لئے کہ اس صورت میں اب وہ یا تو اپنا مال متاع ان کو دے کر اپنے آپ کو چھڑا لیتی اور یا یوں ہی اس کے گھر میں قید رہتی اور اسی حالت میں اس کو موت آ جاتی تھی، شوہر بھی اپنی بیویوں پر ظلم وستم کیا کرتے تھے، اگر رغبت نہ ہوتی تو نہ حقوق زوجیت ادا کرتے اور نہ اس کو طلاق دیتے، تاکہ وہ اپنا مال دے کر طلاق حاصل کر لے، ان آیات میں انہی مفاسد کا سد باب ہے:

اے ایمان والو! تم کو یہ بات حلال نہیں کہ عورتوں کے (مال یا جان کے) جبراً مالک ہو جاؤ۔

(''مال کا مالک'' ہونا تین طرح ہے: ① ایک یہ کہ عورت کا جو حق شرعی میراث میں ہے اس کو خود لے لیا جائے اس کو نہ دیا جائے ② دوسرے یہ کہ اس کو نکاح نہ کرنے دیا جائے، یہاں تک کہ وہ مرجائے تو اس کے مال پر قبضہ کرلیا جائے ③ تیسرے یہ کہ شوہر بیوی کو بلاوجہ مجبور کرے کہ اسے کچھ مال دے تب شوہر اس کو چھوڑے، پہلی اور تیسری صورت میں ''جبر'' کی قید سے یہ فائدہ ہے کہ اگر یہ امور بالکل عورت کی خوشی سے ہوں تو جائز اور حلال ہیں اور دوسری صورت میں یہ جبر واقع میں نکاح سے روکنے میں ہے، جس سے غرض مال لینا تھا، اس لئے لفظوں میں اس سے متعلق کردیا، اس سے بھی وہی فائدہ ہوا، یعنی اگر وہ اپنی خوشی سے نکاح نہ کرے تو ان لوگوں کو گناہ نہیں۔

''جان کا مالک'' ہونا اس طرح سے کہ مُردہ کی عورت کو میت کے مال کی طرح اپنی میراث سمجھتے تھے، اس صورت میں ''جبر'' کی قید واقعی یعنی بیان واقعہ کے لئے ہے کہ وہ ایسا کرتے تھے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ اگر عورت اپنی رضامندی سے اپنے آپ کو میت کے مال کی طرح ترکہ موروثہ بنانے پر راضی ہوجائے تو وہ سچ مچ میراث اور ملک ہوجائے گی، بلکہ مطلب یہ کہ یہ تو ہر حال میں جبر ہے، چاہے عورت راضی بھی ہو، اس سے وہ سچ مچ اس کی میراث اور ملک نہیں ہوسکتی، کیونکہ آزاد انسان کو اپنی ملک بنانا چاہے اس کی خوشی سے ہو یا ناخوشی سے صریح ظلم اور تعدی ہے)۔

اور ان عورتوں کو اس غرض سے مقید مت کرو کہ جو کچھ تم لوگوں نے (یعنی خود تم نے یا تمہارے عزیزوں نے) ان کو دیا ہے اس میں کا کوئی حصہ (بھی ان سے) وصول کرلو (اس مضمون میں بھی تین صورتیں آگئیں: ① ایک یہ کہ میت کا وارث اس میت کی بیوہ کو نکاح نہ کرنے دے تاکہ ہم کو یہ کچھ دے ② دوسرے یہ کہ خاوند اس کو مجبور کرے کہ مجھ کو کچھ دے تب چھوڑوں ③ تیسرے یہ کہ خاوند طلاق دینے کے بعد بھی اس سے کچھ لئے بغیر اس کو نکاح نہ کرنے دیتا) مگر (بعض صورتوں میں ان سے مال لینا یا ان کو مقید کرنا جائز ہے وہ) یہ کہ وہ عورتیں کوئی صریح ناشائستہ حرکت کریں

(اس میں بھی تین صورتیں آگئیں: ① ایک یہ کہ ناشائستہ حرکت شوہر کے ساتھ بدخلقی اور نافرمانی ہو تو خاوند کو جائز ہے کہ اس کو بغیر مال لئے ہوئے طلاق نہ دے، بشرطیکہ وہ مال مہر سے زیادہ نہ ہو ② دوسرے یہ کہ ناشائستہ حرکت زنا ہو تو شروع اسلام میں حد کا حکم نازل ہونے سے پہلے خاوند کو جائز تھا کہ اس جرمانہ میں اس سے اپنا دیا ہوا مال واپس لے کر اس کو نکال دے، مگر اب یہ حکم منسوخ ہے، زنا سے مہر کا وجوب ساقط نہیں ہوتا، اگر مہر دے چکا ہو تو واپس لینا اب جائز نہیں، اور نہ دیا ہو تو دینا واجب ہے، غرض ان دو صورتوں میں مال لیا جائے گا ③ تیسری صورت یہ کہ ناشائستہ حرکت زنا ہو تو شوہر کو اور نیز دوسرے ورثاء کو۔ جیسا کہ شروع رکوع میں ذکر ہوا۔ حاکم کے حکم سے سزا کے طور پر عورتوں کو گھروں میں مقید رکھنا جائز تھا، پھر یہ حکم بھی منسوخ ہوگیا، پس یہ مقید رکھنا بطور سزا کے ہوگا، مال وصول کرنے کی غرض سے نہ ہوگا)۔

(آگے خاص شوہروں کو حکم ہے) اور ان عورتوں کے ساتھ خوبی کے ساتھ گذرا کیا کرو (یعنی خوش اخلاقی اور نان ونفقہ کی خبرگیری سے) اور اگر (طبعاً) وہ تم کو ناپسند ہوں (مگر ان کی طرف سے کوئی ایسی بات بھی واقع نہ ہو جو ناپسندیدگی کا سبب ہو) تو (تم عقلاً یہ سمجھ کر برداشت کرو کہ) ممکن ہے کہ تم ایک شے کو ناپسند کرو، اور اللہ تعالیٰ اس کے اندر کوئی بڑی منفعت (دنیوی یا دینی) رکھ دے (مثلاً وہ تمہاری خدمت گزار، آرام رساں اور ہمدرد ہو، یہ دنیا کی منفعت ہے، یا اس سے کوئی اولاد صالح پیدا ہو جو ذخیرہ آخرت ہوجائے، یا اقل درجہ ناپسند چیز پر صبر کرنے کا ثواب وفضیلت تو ضرور ہی ملے گی)۔

فَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا: اس میں اصل ہے اس بات کی کہ حق تعالیٰ کی تجویز کے سامنے اپنی رائے کو فنا کردینا چاہیے۔

* * *

فائدہ: لِاِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ: حسب بیان سابق عورتوں کی بدافعالی کی بابت تادیب وسیاست کا حکم دے کر اب اہل جاہلیت کی اس ظلم وتعدی کو روکا جاتا ہے جو تعدی عورتوں پر وہ طرح طرح سے کیا کرتے تھے، سو من جملہ ان صورتوں کے ایک صورت یہ ہوتی تھی کہ جب کوئی مرجاتا تو اس کی عورت کو میت کا سوتیلا بیٹا یا بھائی یا اور کوئی وارث لے لیتا، پھر چاہتا تو اس سے نکاح کرلیتا، یا بغیر نکاح ہی اپنے گھر میں رکھتا، یا کسی دوسرے سے نکاح کر کے اس کا مہر کل یا بعض لے لیتا، یا ساری عمر اس کو اپنی قید میں رکھتا اور اس کے مال کا وارث ہوتا، اس کی بابت یہ آیت نازل ہوئی،

جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جب کوئی مرجائے تو اس کی عورت اپنے نکاح کی مختار ہے، میت کے بھائی اور اس کے کسی وارث کو یہ اختیار نہیں کہ زبردستی اپنے نکاح میں لے لے، نہ وہ عورت کو نکاح سے روک سکتے ہیں کہ وہ مجبور ہو کر خاوند کے ورثہ سے جو اس کو ملا تھا کچھ پھیر دے، ہاں! اگر صریح بدچلنی کریں تو ان کو روکنا چاہئے۔

فائدہ: ۲۔ وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا: یعنی عورتوں کے ساتھ گفتگو اور معاملات میں اخلاق اور سلوک سے معاملہ رکھو، جاہلیت میں جیسا ذلت اور سختی کا برتاؤ عورتوں کے ساتھ کیا جاتا تھا اس کو چھوڑ دو، پھر اگر تم کو کسی عورت کی کوئی خو اور عادت خوش نہ آئے تو صبر کرو، شاید اس میں کوئی خوبی بھی ہو، اور ممکن ہے کہ تم کو ناپسندیدہ ہو کوئی چیز اور اللہ تعالیٰ اس میں تمہارے لئے کوئی بڑی منفعت دینی یا دنیاوی رکھ دے، سو تم کو تحمل کرنا چاہیے اور بدخو کے ساتھ بدخوئی نہ چاہیے۔

وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ ۙ وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا

اور اگر بدلنا چاہو ایک عورت کی جگہ دوسری عورت کو اور دے چکے ہو ایک کو بہت سا مال تو مت پھیر لو

مِنْهُ شَيْـــًٔا ؕ اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ﴿۲۰﴾

اس میں سے کچھ، کیا لیا چاہتے ہو اس کو ناحق اور صریح گناہ سے

خلاصہ تفسیر: گزشتہ آیت سے معلوم ہو چکا کہ اگر عورت کی طرف سے کوئی بدخلقی وغیرہ کی خرابی ظاہر ہو تو چھوڑنے کے وقت اس سے مال لینا جائز ہے اس کے بغیر جائز نہیں، بعض لوگ یہ کرتے تھے کہ پہلی سے رغبت نہ رہی اور دوسری سے نکاح کرنا چاہا تو اس کو مہر دینے کی یہ تجویز سوچی کہ پہلی بیوی کو دیا ہوا روپیہ کسی طرح وصول کرلیں، اور نہ دیا ہو تو معاف کرا کر وہی روپیہ دوسری کو دے دیں، اس غرض کے حاصل کرنے کے لیے کبھی تو پہلی بیوی پر کچھ تہمت لگا دیتے یا ویسے ہی پریشان کرتے تاکہ اپنی جان چھڑانے کے لیے روپیہ دے دے یا معاف کردے، اب آگے اسی کی ممانعت ہے، تو یہ مضمون گویا ماقبل کی آیت کا تتمہ ہے۔

اور اگر تم (خود اپنی رغبت کی وجہ سے) بجائے ایک بیوی کے (یعنی پہلی کے) دوسری بیوی کرنا چاہو (اور پہلی بیوی کا کوئی قصور نہ ہو) اور تم اس ایک کو (مہر میں یا ویسے ہی بطور ہبہ وعطیہ کے) انبار کا انبار مال دے چکے ہو (خواہ اس کے ہاتھ میں دے چکے ہو، یا خاص مہر کے لئے صرف معاہدہ کر چکے ہو) تو تم اس (دیئے ہوئے، یا معاہدہ کئے ہوئے) میں سے (عورت کو تنگ کرکے) کچھ بھی (واپس) مت لو (اور تنگ کرکے معاف کرانا بھی واپس لینے کے حکم میں ہے) کیا تم اس کو (واپس) لیتے ہو (اس کی ذات پر نافرمانی یا بدکاری کا) بہتان رکھ کر اور (اس کے مال میں) صریح گناہ (یعنی ظلم) کے مرتکب ہو کر (خواہ بہتان صراحۃ ہو یا دلالۃ ہو)۔

وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا: اگر کسی کو شبہ ہو کہ حدیث میں تو مہر کم مقرر کرنے کی تاکید آئی ہے، اور اس آیت سے زیادہ کا جواز معلوم ہوتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن کی اس آیت میں جواز کا مفہوم بمعنی صحت ونفاذ ہے، یعنی اگر مہر بہت زیادہ ہو تو وہ نکاح صحیح اور نافذ ہوگا، اور حدیث میں جواز بمعنی اباحت مطلقہ وعدم کراہت کی نفی ہے، یعنی مہر اگر کم ہو تو وہ بھی جائز ہے اور اس میں کوئی کراہت نہیں، پس کچھ تعارض نہیں رہا اور حضرت عمرؓ کا ایک واقعہ میں زیادہ مہر کے جواب کو مان لینا اس لیے تھا کہ سامعین اس کو حرام نہ سمجھنے لگیں، پس اس سے کراہت کا عدم ثابت نہیں ہوتا، نہ حضرت عمرؓ پر کوئی اعتراض لازم آتا ہے۔

اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا: دلالۃ بہتان اس طرح کہ پیچھے تو صرف نافرمانی و بدکرداری کی صورت میں اس سے مال لینے کی اجازت تھی، پس جب اس سے بغیر کسی وجہ کے مال لیا تو گویا اس کو دوسروں کے ذہن میں نافرمان و بدکردار تصور کرایا اور مالی ظلم کی وجہ ظاہر ہے کہ عورت

نے بغیر خوش دلی کے دیا، اور ہبہ کی صورت میں یہ ظلم اس لئے ہے کہ زوجین آپس میں کوئی کسی کو ہدیہ دے دے تو اب اس سے واپس لینے کا شرعاً کوئی حق نہیں، واپس لے گا تو وہ ایک قسم کا غصب ہوگا، اور بہتان بھی اسی سے لازم آتا ہے، کیونکہ واپس لینا گویا یہ کہنا ہے کہ یہ میری زوجہ نہ تھی، اس کا بہتان ہونا ظاہر ہے، کیونکہ اس کو ازدواجی تعلق کے دعوی میں کاذبہ اور معاشرت میں فاسقہ ٹھہراتا ہے۔

* * *

فائدہ: اسلام سے پہلے یہ بھی ہوتا تھا کہ جب کوئی چاہتا کہ پہلی عورت کو چھوڑ کر دوسری عورت سے نکاح کرے تو پہلی عورت پر تہمت لگاتا اور مختلف طرح سے اس پر زیادتی اور سختی کرتا کہ مجبور ہو کر مہر واپس کر دے اور نکاح جدید میں کام آئے، یہ آیت اس کی ممانعت میں نازل ہوئی کہ جب پہلی عورت کو چھوڑ کر دوسری کر و اور پہلی عورت کو بہت سا مال دے چکے ہو تو اب اس میں سے کچھ بھی واپس مت لو، کیا تم بہتان باندھ کر اور صریح ظلم کر کے زوجہ اولیٰ سے وہ مال لینا چاہتے ہو یہ ہرگز جائز نہیں۔

وَكَيْفَ تَأْخُذُوْنَهٗ وَقَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ وَّاَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ﴿۲۱﴾

اور کیونکر اس کو لے سکتے ہو اور پہنچ چکا ہے تم میں کا ایک دوسرے تک اور لے چکیں وہ عورتیں تم سے عہد پختہ

خلاصہ تفسیر: اور تم اس (دیئے ہوئے مال) کو (حقیقتاً حکماً) کیسے لیتے ہو حالانکہ (بہتان وظلم کے علاوہ دو باتیں اس کے لینے سے اور بھی مانع ہیں: ① ایک یہ کہ) تم باہم ایک دوسرے سے بے حجابانہ مل چکے ہو (یعنی صحبت ہو چکی ہے، یا خلوت صحیحہ کہ وہ بھی صحبت کے حکم میں ہے، بہر حال انہوں نے اپنی ذات تمہارے تمتع وتلذذ کے لئے تمہارے سپرد کر دی ہے، اور مہر اسی سپردگی کا معاوضہ ہے، تو مدعا پورا کر کے معاوضہ واپس لے لینا یا نہ دینا عقل سلیم کے بالکل خلاف ہے، اور اگر وہ مال مہر نہیں بلکہ ہدیہ تحفہ تھا تو بھی اس کی واپسی ممکن نہیں، کیونکہ میاں بیوی جو ایک دوسرے کو ہبہ کریں اس کی واپسی نہ شرعاً جائز ہے اور نہ قانوناً) اور (② دوسرا مانع یہ کہ) وہ عورتیں تم سے ایک گاڑھا اقرار (یعنی مستحکم عہد) لے چکی ہیں (وہ عہد یہ ہے کہ نکاح کے وقت تم نے مہر اپنے ذمہ رکھا تھا اور عہد کی خلاف ورزی کرنا یہ بھی عقل کے نزدیک مذموم ہے، اور اگر وہ ہبہ اور عطیہ ہے تو ازدواجی عہد ومیثاق اور باہم بے حجابانہ ملنے کے بعد دیا ہوا مال واپس کرنے کے لیے عورت کو مجبور کرنا کھلا ہوا ظلم ہے، غرض چار موانع کے ہوتے ہوئے مال واپس لینا نہایت ہی مذموم ہے)۔

* * *

فائدہ: یعنی جب مرد اور عورت نکاح کے بعد مل چکے اور صحبت کی نوبت آچکی تو اس کے معاوضہ میں تمام مہر دینا مرد پر واجب ہو چکا تو اب کس وجہ سے اس مہر کو واپس لے سکتا ہے اور درصورت مہر ادا نہ کرنے کے کیسے اس کے مہر کو دبا سکتا ہے، اب تو بجز اس کے کہ عورت ہی اپنی خوشی سے معاف کر بیٹھے کوئی صورت رستگاری کی نہیں ہو سکتی اور وہ عورتیں تو بہت مضبوط اور گاڑھا اقرار تم سے لے چکیں، جس کی وجہ سے وہ تمہارے قبضہ اور تصرف میں آچکیں اور تم ان سے پورے منتفع ہو چکے، نہیں تو تم کو ان پر تصرف کا کیا اختیار تھا، اب اس قدر تکمیل اور قبضہ کامل اور تصرف تام کے بعد عورتوں کے مہر کو واپس لینا یا ان کا مہر نہ دینا کیسے ہو سکتا ہے۔

فائدہ: جاننا چاہیے کہ جیسا مجامعت کے بعد تمام مہر زوج کے ذمہ لازم ہو جاتا ہے، ایسا ہی اگر مجامعت کی تو نوبت نہ آئے، مگر خلوت صحیحہ ہو گئی تو بھی پورا مہر واجب الادا ہوگا، ہاں اگر خلوت صحیحہ کی بھی نوبت نہ آئی اور زوج نے طلاق دے دی تو پھر نصف مہر ادا کرنا ہوگا۔

وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ؕ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّمَقْتًا ؕ

اور نکاح میں نہ لاؤ جن عورتوں کو نکاح میں لائے تمہارے باپ مگر جو پہلے ہو چکا، یہ بے حیائی ہے اور کام ہے غضب کا

وَسَآءَ سَبِيْلًا ﴿۲۲﴾

اور برا چلن ہے

خلاصہ تفسیر: پیچھے سے جاہلیت کی بری اور غلط رسوم کا ذکر چلا آرہا ہے، ان میں سے ایک رسم یہ تھی کہ بعض لوگ حرام عورتوں سے نکاح کر لیا کرتے تھے، مثلاً اپنی سوتیلی ماں یعنی باپ کی بیوی سے، ایک بہن کے اپنے نکاح میں ہوتے ہوئے دوسری بہن سے، مقام کی مناسبت سے دوسری محرمات کی تفصیل بھی کی جائے گی، بعض لوگ حلال عورتوں کو حرام سمجھتے تھے جیسے لے پالک یعنی منہ بولے بیٹے کی بیوی سے نکاح کرنے کو حرام سمجھتے تھے اس کا بھی ابطال فرما دیا، نیز بعض حلال عورتوں میں مسلمانوں کو شبہ ہوا تھا، مثلاً باندی جو مسلمانوں کے قبضہ میں آگئی ہو اور اس کا پہلا شوہر دار الحرب میں زندہ موجود ہو اس کی حلت بھی بیان ہوگی، نیز نکاح کی بعض شرائط اور اس کے متعلقات مہر وغیرہ کے مسائل بھی بیان ہوں گے۔

اور تم ان عورتوں سے نکاح مت کرو جن سے تمہارے باپ (یا دادا یا نانا) نے نکاح کیا ہو، مگر (خیر) جو بات گذر گئی گذر گئی، (آئندہ کبھی ایسا نہ ہو) بیشک یہ (بات عقلاً بھی) بڑی بے حیائی ہے اور (اہل طبائع سلیمہ کے عرف میں بھی) نہایت نفرت کی بات ہے اور (شرعاً بھی) بہت برا طریقہ ہے۔

اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ: ''گذر گئی'' کا مطلب یہ کہ جاہلیت میں بعض لوگ ایسا کرتے تھے، مگر شائستہ لوگ اس زمانہ میں بھی اس کو برا جانتے تھے اور اس کو ''نکاح مقت'' کہتے تھے اور جو اولاد اس نکاح سے پیدا ہوتی اس کو ''مقتی'' کہا کرتے تھے، اس لیے احقر نے اس میں ''عرف'' کا لفظ بڑھا دیا، شرعاً اور عقلاً بے حیائی اور برا طریقہ ہونا تو ظاہر ہے، حتی کہ اگر کوئی ایجاب وقبول بھی کر لے وہ نکاح منعقد ہی نہ ہوگا محض باطل ہے اور دوسری محرمات کا نکاح بھی باطل ہے مگر اس کی اعلیٰ درجہ کی قباحت ظاہر کرنے کے لیے اس کی مذمت کی وجوہ یہاں بطور خاص الگ بیان فرمائیں۔

جس طرح باپ کی منکوحہ سے نکاح حرام ہے اگرچہ باپ نے اس سے صحبت بھی نہ کی ہو، اسی طرح اگر کسی عورت سے باپ نے بلا نکاح صحبت کر لی ہو اس سے بدرجہ اولیٰ نکاح حرام ہوگا، امام ابوحنیفہؒ کا یہی مذہب ہے، اسی طرح جہاں جہاں نکاح کی وجہ سے ہمیشہ کی حرمت ثابت ہو جاتی ہے زنا سے بھی ہو جاتی ہے، مثلاً کسی عورت سے نکاح کر لینے کے بعد اس کی ماں یعنی ساس سے نکاح حرام ہو جاتا ہے، اسی طرح کسی عورت سے اگر زنا کیا تو اس کی ماں سے نکاح حرام ہو جائے گا، اور شہوت سے بوسہ لینا چھونا وغیرہ بھی زنا کے حکم میں ہے، تفصیل کتب فقہ میں مذکور ہے۔

اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ: اہل تربیت کے اس طریقے کی اصل ہے کہ تائب کی توبہ کرنے کے بعد اس کی ماضی کی غلطی پر تشدد نہیں کرتے اور اس کی تحقیر نہیں کرتے اور اس غلطی کے ذکر کا اعادہ نہیں کرتے۔

* * *

فائدہ: جاہلیت والے اپنی سوتیلی، ماں اور بعض دیگر محرمات سے بھی نکاح کر لیتے تھے جس کا تذکرہ ابھی گزرا، اس کی ممانعت کی جاتی ہے کہ جن عورتوں سے تمہارے باپ نے نکاح کیا ہو، ان سے نکاح مت کرو، یہ بے حیائی اور اللہ کے غضب اور نفرت کرنے کی بات ہے اور بہت برا طریقہ ہے، زمانہ جاہلیت میں بھی سمجھ دار لوگ اس کو مذموم سمجھتے تھے اور اس نکاح کو ''نکاح مقت'' اور اس نکاح سے جو اولاد ہوتی اس کو ''مقتی'' کہتے تھے، سوا ایسے نکاح جو ہو چکے ہو چکے، آئندہ کو ہرگز ایسا نہ ہو۔

فائدہ: باپ کی منکوحہ کا جو حکم ہے اسی حکم میں دادے اور نانے کی منکوحہ بھی داخل ہے کتنا ہی اوپر کا دادا اور نانا کیوں نہ ہو۔

حُرِّمَتۡ عَلَيۡكُمۡ اُمَّهٰتُكُمۡ وَبَنٰتُكُمۡ وَاَخَوٰتُكُمۡ وَعَمّٰتُكُمۡ وَخٰلٰتُكُمۡ وَبَنٰتُ الۡاَخِ وَبَنٰتُ الۡاُخۡتِ

حرام ہوئی ہیں تم پر تمہاری مائیں اور بیٹیاں اور بہنیں اور پھوپھیاں اور خالائیں اور بیٹیاں بھائی کی اور بہن کی [1]

وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِىۡۤ اَرۡضَعۡنَكُمۡ وَاَخَوٰتُكُمۡ مِّنَ الرَّضَاعَةِ وَاُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمۡ وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِىۡ

اور جن ماؤں نے تم کو دودھ پلایا اور دودھ کی بہنیں [2] اور تمہاری عورتوں کی مائیں اور ان کی بیٹیاں جو

فِىۡ حُجُوۡرِكُمۡ مِّنۡ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِىۡ دَخَلۡتُمۡ بِهِنَّ فَاِنۡ لَّمۡ تَكُوۡنُوۡا دَخَلۡتُمۡ بِهِنَّ

تمہاری پرورش میں ہیں جن کو جنا ہے تمہاری ان عورتوں نے جن سے تم نے صحبت کی، اور اگر تم نے ان سے صحبت نہیں کی

فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡكُمۡ وَحَلَآئِلُ اَبۡنَآئِكُمُ الَّذِيۡنَ مِنۡ اَصۡلَابِكُمۡ وَاَنۡ تَجۡمَعُوۡا

تو تم پر کچھ گناہ نہیں اس نکاح میں، اور عورتیں تمہارے بیٹوں کی جو تمہاری پشت سے ہیں، اور یہ کہ اکٹھا کرو

بَيۡنَ الۡاُخۡتَيۡنِ اِلَّا مَا قَدۡ سَلَفَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوۡرًا رَّحِيۡمًا ﴿۲۳﴾

دو بہنوں کو مگر جو پہلے ہو چکا، بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ہے [3]

خلاصہ تفسیر: تم پر (یہ عورتیں) حرام کی گئی ہیں (یعنی ان سے نکاح کرنا حرام اور باطل ہے اور ان کی کئی قسمیں ہیں:

(۱) اول محرمات نسبی: وہ یہ ہیں) تمہاری مائیں اور تمہاری بیٹیاں (اور ان میں سب اصول و فروع خواہ بواسطہ ہوں یا بلاواسطہ سب داخل ہیں) اور تمہاری بہنیں (خواہ حقیقی ہوں یا علاتی یعنی باپ شریک، یا اخیافی یعنی ماں شریک) اور تمہاری پھوپھیاں (اس میں باپ دادا غرض جتنے اصول مرد ہیں سب کی تینوں قسم کی بہنیں آگئیں) اور تمہاری خالائیں (خواہ ماں کی بہن ہو یا نانی کی بہن اور جتنی عورتیں اصول کی جانب میں ہیں سب کی تینوں قسم کی بہنیں آگئیں) اور بھتیجیاں (اس میں تینوں قسموں کے بھائیوں کی اولاد بواسطہ ہوں یا بلاواسطہ سب داخل ہیں) اور بھانجیاں (اس میں تینوں قسموں کی بہنوں کی اولاد بواسطہ ہوں یا بلاواسطہ سب آگئیں)۔

اور ((۲) قسم دوم محرمات رضاعی: وہ یہ ہیں) تمہاری وہ مائیں جنہوں نے تم کو دودھ پلایا ہے (یعنی انا) اور تمہاری وہ بہنیں جو دودھ پینے کی وجہ سے بہن ہیں (یعنی تم نے ان کی حقیقی ماں یا رضاعی ماں کا دودھ پیا ہے، یا اس نے تمہاری حقیقی یا رضاعی ماں کا دودھ پیا ہے، اگرچہ مختلف وقت اور زمانہ میں پیا ہوا)۔

اور ((۳) قسم سوم محرمات بالمصاہرہ: یعنی جو نکاح کی وجہ سے حرام ہو جاتی ہیں وہ یہ ہیں) تمہاری بیویوں کی مائیں (اس میں بیوی کی ماں، اس کی ماں کی ماں سب مؤنث اصول آگئیں) اور تمہاری بیویوں کی بیٹیاں (اس میں بیوی کی سب مؤنث فروع داخل ہیں بواسطہ ہوں یا بلاواسطہ) جو کہ (عادۃ) تمہاری پرورش میں رہتی ہیں (مگر اس میں ایک قید بھی ہے، وہ یہ کہ وہ لڑکیاں) ان بیویوں سے (ہوں) کہ جن کے ساتھ تم نے صحبت کی ہو (یعنی کسی عورت کے ساتھ صرف نکاح یا تنہائی کرنے سے اس کی لڑکی حرام نہیں ہوتی، بلکہ جب اس عورت سے صحبت بھی ہو جائے تب لڑکی حرام ہوتی ہے، اور شہوت سے چھونا اور بوسہ لینا بھی صحبت ہی کی طرح ہے) اور اگر (اب تک) تم نے ان بیویوں سے صحبت نہ کی ہو (اگرچہ نکاح ہو چکا ہو) تو (ایسی بیوی کی لڑکی کے ساتھ نکاح کرنے میں) تم کو کوئی گناہ نہیں، اور تمہاری ان بیٹوں کی بیویاں (بھی حرام ہیں) جو کہ تمہاری نسل سے ہوں (اس میں

سب مذکر فروع کی بیویاں آگئیں) اور یہ (امر بھی حرام ہے) کہ تم دو بہنوں کو (خواہ رضاعی ہوں یا نسبی اپنے نکاح میں) ایک ساتھ رکھو، لیکن جو (اس حکم سے) پہلے ہو چکا (وہ معاف ہے) بیشک اللہ تعالیٰ بڑے بخشنے والے بڑے رحمت والے ہیں (کہ رحمت سے گناہ معاف کر دیتے ہیں)۔

اَبۡنَآىِٕكُمُ الَّذِیۡنَ مِنۡ اَصۡلَابِكُمۡ: یعنی جو تمہاری نسل سے ہوں، یہاں "نسل" کی قید کا یہ مطلب نہیں کہ رضاعی بیٹے کی بیوی حلال ہے، بلکہ اس سے قید سے متبنیٰ یعنی منہ بولے بیٹے کو جسے لے پالک کہتے ہیں خارج کرنا مقصود ہے، منہ بولے بیٹے کی بیوی سے موت یا طلاق کے بعد نکاح درست ہے، چونکہ اہل عرب کے نزدیک اس سے نکاح حرام تھا اس لیے یہ قید بڑھا دی گئی، باقی رضاعی بیٹے کی بہو سے نکاح حرام ہے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ وَبَنٰتُ الۡاَخِ وَبَنٰتُ الۡاُخۡتِ: سوتیلی ماں کی حرمت بیان فرما کر اب جن عورتوں سے نکاح جائز نہیں ان سب کو بیان فرماتے ہیں، وہ عورتیں چند قسم ہیں، اوّل ان کو بیان کیا جاتا ہے جو علاقہ نسب کی وجہ سے حرام ہیں اور وہ سات ہیں: ① ماں، ② بیٹی، ③ بہن، ④ پھوپھی، ⑤ خالہ، ⑥ بھتیجی، ⑦ بھانجی، ان میں سے کسی کے ساتھ کسی کو نکاح کرنا جائز نہیں۔

فائدہ: ماں کے حکم میں دادی، نانی، اوپر تک کی سب داخل ہیں ایسے ہی بیٹی میں پوتی اور نواسی نیچے تک کی سب داخل ہیں اور بہن میں عینی اور علاتی اور اخیافی سب داخل ہیں اور پھوپھی میں باپ دادا اور اوپر تک کی پشتوں کی بہن سگی ہو یا سوتیلی سب آگئیں اور خالہ میں ماں اور نانی اور نانی کی نانی سب کی بہن تینوں قسم کی داخل ہیں اور بھتیجی میں تینوں قسم کے بھائیوں کی اولاد اور اولاد الاولاد سب داخل ہیں اور بھانجی میں تینوں قسم کی بہنوں کی اولاد اور اولاد الاولاد داخل ہیں۔

فائدہ: ۲؎ وَاَخَوٰتُكُمۡ مِّنَ الرَّضَاعَةِ: محرمات نسبی کے بعد اب محرمات رضاعی کو بیان کیا جاتا ہے اور وہ دو ہیں، ماں اور بہن اور اس میں اشارہ ہے کہ ساتوں رشتے جو نسب میں بیان ہوئے، رضاعت میں بھی حرام ہیں، یعنی رضاعی بیٹی اور پھوپھی اور خالہ اور بھتیجی اور بھانجی بھی حرام ہیں، چنانچہ حدیثوں میں یہ حکم موجود ہے۔

فائدہ: ۳؎ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوۡرًا رَّحِیۡمًا: اب محرمات مصاہرت کا ذکر ہے، یعنی علاقہ نکاح کی وجہ سے جن سے نکاح حرام ہوتا ہے اور اس کی دو قسمیں ہیں:

① اول وہ کہ ان سے ہمیشہ کے لئے نکاح ناجائز ہے اور وہ زوجہ کی ماں اور اس زوجہ کی بیٹی ہے جس زوجہ سے کہ تم نے صحبت کی ہو، لیکن اگر صحبت سے پہلے کسی عورت کو طلاق دے دو تو اس کی بیٹی سے نکاح ہو سکتا ہے، اور تمہارے بیٹوں کی عورتیں ہیں اور اس میں نیچے تک کے پوتوں اور نواسوں کی عورتیں داخل ہیں کہ ان سے کبھی تمہارا نکاح درست نہیں ہو سکتا۔

② دوسری قسم وہ ہے کہ ان سے ہمیشہ کے لئے نکاح کی ممانعت نہ ہو، بلکہ جب تک کوئی عورت تمہارے نکاح میں رہے، اس وقت تک اس عورت کی ان قرابت والی عورتوں سے نکاح کی ممانعت رہی، جب اس عورت کو طلاق دے دی یا وہ مر گئی تو ان سے نکاح درست ہو جائے گا اور وہ زوجہ کی بہن ہے کہ زوجہ کی موجودگی میں تو اس سے نکاح نہیں ہو سکتا اور بعد میں درست ہے اور یہی حکم ہے زوجہ کی پھوپھی اور خالہ اور بھتیجی اور بھانجی کا۔

فائدہ: یہ جو فرمایا کہ "عورتیں تمہارے بیٹوں کی جو کہ تمہاری پشت سے ہیں"، اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے بیٹے یا پوتے نسبی ہوں، منہ بولے یعنی لے پالک نہ ہوں جس کو متبنیٰ کہتے ہیں، رضاعی سے احتراز نہیں۔

فِیۡ حُجُوۡرِكُمۡ فرمانے سے یہ مطلب ہے کہ جن کو تم اپنی گود میں پالتے ہو اور انکی پرورش کرتے ہو، یعنی اولاد جیسا ان سے معاملہ کرتے ہو اور گویا اولاد ہی سمجھتے ہو، اس سے انکے نکاح کی حرمت اور ظاہر ہو گئی، یہ مطلب نہیں کہ انکی حرمت کے لئے گود میں رکھنا ضروری ہے۔

اور اِلَّا مَا قَدۡ سَلَفَ کا یہ مطلب ہے کہ زمانہ جاہلیت میں اس حکم سے پہلے جو دو بہنوں کو جمع کر لیتے تھے وہ معاف ہے۔

وَّالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۚ كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ۚ

اور خاوند والی عورتیں مگر جن کے مالک ہوجائیں تمہارے ہاتھ، حکم ہوا اللہ کا تم پر ۱؎

خلاصہ تفسیر: اور (۴ چوتھی قسم) وہ عورتیں ہیں جو کہ شوہر والیاں ہیں مگر (اس قسم میں وہ مستثنیٰ ہیں) جو کہ (شرعاً) تمہاری مملوک ہوجائیں (اور ان کے حربی شوہر دار الحرب میں زندہ موجود ہوں اور وہ ایک حیض آجانے یا وضع حمل کے بعد حلال ہیں) اللہ تعالیٰ نے ان احکام کو تم پر فرض کر دیا ہے۔

پس شوہر والیوں میں سے مذکورہ ایک قسم مستثنیٰ ہے باقی سب حرام ہیں۔

وَّالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ: اس سے واضح طور پر معلوم ہوا کہ ایک عورت بیک وقت ایک سے زائد شوہر والی نہیں ہوسکتی ہے، اس دور کے بعض جاہل ملحد کہنے لگے ہیں کہ مردوں کو جب ایک سے زائد بیویوں کی اجازت ہے تو عورتوں کو بھی ایک سے زائد شوہروں سے متمتع ہونے کی اجازت ملنی چاہئے، یہ مطالبہ اس آیت شریفہ کے بالکل خلاف ہے، ایسی جاہلانہ باتیں کرنے والے لوگ یہ نہیں سمجھتے کہ مرد کے لئے کثرت تاریخ شاہد ہے، لیکن عورت کے لئے ایک وقت میں ایک سے زائد شوہر ہونا، اس عورت کے لئے بھی باعث مصیبت ہے اور جو دو مرد ایک عورت کے شوہر بن جائیں ان کے لئے بھی باعث ننگ و عار ہے اور سراسر بے شرمی ہے، نیز اس میں کسی بچہ کے ثابت النسب ہونے کا بھی کوئی راستہ باقی نہیں رہتا، جب کئی مرد کسی عورت سے استمتاع کریں گے تو پیدا ہونے والی اولاد کو ان میں سے کسی ایک کا بیٹا تجویز کرنے کا کوئی طریق باقی نہ رہے گا، اس طرح کا بدترین مطالبہ وہی لوگ کرسکتے ہیں جو انسانیت کے سراپا دشمن ہوں اور جن کی غیرت وحیا کا جنازہ نکل چکا ہو، ایسے لوگ اولاد اور والدین کے حقوق کی لائن سے وجود میں آنے والی رحمتوں سے پوری انسانیت کو محروم کرنے کی حمایت میں لگے ہوئے ہیں، جب نسب ثابت نہیں ہوگا تو باہمی حقوق وفرائض کی ذمہ داری کس پر عائد کی جائے گی؟ خالص طبعی اور عقلی اعتبار سے بھی اگر دیکھا جائے تو ایک عورت کے لئے متعدد شوہر ہونے کا کوئی جواز نظر نہیں آتا۔

شریعت اسلامیہ میں اس مسئلہ کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ نہ صرف کسی شخص کے نکاح میں ہوتے ہوئے عورت کے دوسرے نکاح کو حرام قرار دیا ہے بلکہ کسی عورت کا کوئی شوہر طلاق دیدے یا مرجائے تو اس کی عدت گزرنے تک بھی کسی دوسرے شخص سے اس عورت کا نکاح نہیں ہوسکتا۔

* * *

فائدہ: ۱؎ محرمات کو ذکر فرما کر اخیر میں اب ان عورتوں کی حرمت بیان فرمائی جو کسی کے نکاح میں ہوں، یعنی جو عورت کسی کے نکاح میں ہے، اس کا نکاح اور کسی سے نہیں ہوسکتا، تاوقتیکہ وہ بذریعہ طلاق یا وفات زوج نکاح سے جدا نہ ہوجائے اور عدت طلاق یا عدت وفات پوری نہ کرلے، اس وقت تک کوئی اس سے نکاح نہیں کرسکتا، لیکن اگر کوئی عورت خاوند والی تمہاری ملک میں آجائے تو وہ اس حکم حرمت سے مستثنیٰ ہے اور وہ تم پر حلال ہے، گو اس کا خاوند زندہ ہے اور اس نے طلاق بھی اس کو نہیں دی اور اس کی صورت یہ ہے کہ کافر مرد اور کافر عورت میں باہم نکاح ہوا اور مسلمان دار الحرب پر چڑھائی کر کے اس عورت کو قید کر کے دار الاسلام میں لے آئیں تو وہ عورت جس مسلمان کو ملے گی، اس کو حلال ہے، گو اس کا زوج دار الحرب میں زندہ موجود ہے اور اس نے طلاق بھی نہیں دی، اب سب محرمات کو بیان فرما کر اخیر میں تاکید فرمادی کہ یہ اللہ کا حکم ہے اس کی پابندی تم پر لازم ہے۔

فائدہ: جو عورت کافرہ دار الحرب سے پکڑی ہوئی آئے، اس کے حلال ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ایک حیض گزر جائے اور وہ عورت مشرک بت پرست نہ ہو، بلکہ اہل کتاب میں سے ہو۔

وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ ؕ فَمَا

اور حلال ہیں تم کو سب عورتیں انکے سوا بشرطیکہ طلب کرو انکو اپنے مال کے بدلے قید میں لانے کو نہ مستی نکالنے کو ۱؎ پھر جس کو

اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً ۭ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا تَرٰضَيْتُمْ بِهٖ

کام میں لائے تم ان عورتوں میں سے تو ان کو دو ان کے حق جو مقرر ہوئے ۲ۓ اور گناہ نہیں تم کو اس بات میں کہ ٹھہرا لو تم دونوں آپس کی رضا

مِنْۢ بَعْدِ الْفَرِيْضَةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۲۴﴾

سے مقرر کیے پیچھے، بیشک اللہ ہے خبر دار حکمت والا ۳ۓ

خلاصہ تفسیر: (یہاں تک محرمات کا بیان تھا، اب ان کے ماسوا کے ساتھ نکاح کی حلت اور اس کی شرائط کا بیان ہے) اور ان عورتوں کے سوا اور (باقی) عورتیں تمہارے لئے حلال کی گئی ہیں یعنی یہ کہ تم ان کو اپنے مالوں کے ذریعہ سے (نکاح میں لانا) چاہو (یعنی مہر ہونا نکاح میں ضروری ہے اور) اس طرح کہ تم (ان کو) بیوی بناؤ (جس کی شرطیں شریعت میں مشہور ہیں، مثلاً گواہ بھی ہوں، وہ نکاح وقتی بھی نہ ہو وغیرہ) صرف مستی نکالنا نہ ہو (اس کے عموم میں زنا اور متعہ سب داخل ہو گیا، اگرچہ اس میں بھی مال خرچ کیا جاتا ہے)۔

پھر (نکاح ہو جانے کے بعد معتبر شرعی طریقوں میں سے) جس طریق سے تم ان عورتوں سے متمتع ہوئے ہو، سو ان کو (ان کے عوض) ان کے مہر دو جو کچھ مقرر ہو چکے ہیں، اور (یہ نہ سمجھو کہ اس مقررہ مہر میں نماز روزہ کی طرح کمی بیشی ممکن نہ ہو، بلکہ) مقرر ہوئے بعد بھی جس (مقدار) پر تم (میاں بیوی) باہم رضامند ہو جاؤ اس میں تم پر کوئی گناہ نہیں (مثلاً خاوند نے اور مہر بڑھا دیا، یا عورت نے کم کر دیا، یا معاف ہی کر دیا، ہر طرح درست ہے) بلاشبہ اللہ تعالیٰ بڑے جاننے والے ہیں (تمہاری مصلحتوں کو خوب جانتے ہیں) بڑے حکمت والے ہیں (ان مصلحتوں کی رعایت سے احکام مقرر فرمائے ہیں، اگرچہ کہیں تمہاری سمجھ میں نہ آئے)۔

وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ: آیت میں مذکور محرمات کے سوا جو عورتیں حرام ہیں وہ اکثر ان ہی میں داخل ہیں جس کا بیان دقیق ہونے کی وجہ سے نہیں کیا گیا، اور بعض کی حرمت احادیث و آثار سے ثابت ہے، اور بعض کی حرمت پر اجماع ہے، مطلب یہ کہ حدیث و سنت سے جن دوسری عورتوں سے حرمت نکاح ثابت ہے مثلا رضاعی بہنوں کے ساتھ پھوپھی کا بھتیجی کے ساتھ یا خالہ کا بھانجی کے ساتھ جمع کرنا، یہ سب کنایۃً قرآن مجید کی آیات بالا میں آ گئیں، حدیث نے انہیں صرف کھول کر بیان کر دیا ہے، پس یہ اشکال نہ رہا کہ یہاں آیت میں تو ان کے سوا سب کو حلال کہا گیا ہے جیسا کہ: وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ سے معلوم ہوتا ہے، جواب یہ ہے کہ ان کے ماسوا جو عورتیں حرام ہیں اکثر کی حرمت تو ان سے ہی سمجھی گئی ہے وہ تو ماسوا ہی نہیں، اور جن کی حرمت ان سے نہیں سمجھی گئی وہ بے شک ماسوا میں داخل ہیں، لیکن چونکہ احادیث و آثار اور دیگر شرعی دلائل سے ان کی حرمت سمجھی گئی اس لیے کا لفظ بالکلیہ عام نہ ہوگا، بلکہ بعض صورتیں دیگر دلائل کی وجہ سے اس میں مستثنیٰ اور خاص کی جائیں گی، اور ایسا بکثرت ہوتا ہے کہ ایک لفظ بظاہر عام ہوتا ہے مگر حدیث یا اجماع کی وجہ سے بعض صورتیں اس میں سے مستثنیٰ کی جاتی ہیں، پس کوئی اشکال نہ رہا۔

مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ: اس آیت میں مسافحین کی تفسیر سے متعہ کا حرام ہونا بھی سمجھ آ گیا، کیونکہ متعہ میں صرف مستی نکالنا مد نظر ہوتا ہے، احادیث میں اس کی پوری تصریح ہے، خصوصا صحیح مسلم میں دائمی حرمت "الی یوم القیامۃ" کی تنصیص موجود ہے، البتہ اس دائمی حرمت سے پہلے حضور ﷺ کے عہد مبارک میں یہ خیبر سے پہلے حلال تھا، پھر خیبر میں حرام ہو گیا، پھر فتح مکہ کے زمانے میں یوم اوطاس کو دوبارہ حلال کیا گیا، پھر تین روز کے بعد ہمیشہ کے لیے حرام ہو گیا، بعض سلف سے جو حلت منقول ہے اس وقت تک ان کو نسخ کی خبر نہ پہنچی ہوگی، اور بعض سے جو اس آیت میں "الی اجل مسمی" منقول ہے وہ تفسیر کے طور پر ہے، جس کو قبل بلوغ نسخ کہہ دیا، اور حضرت عمرؓ کی طرف جو تحریم منسوب ہے وہ حرمت کے حکم کو ظاہر کرنے کے معنی میں ہے نہ کہ اثبات حرمت، اور ابن عباسؓ سے جو حلت منقول ہے اول تو وہ قول اضطرار اور مجبوری کے ساتھ مقید تھا، پھر خود ترمذیؒ نے ان سے مطلقا حرمت کی روایت نقل کی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے حلت سے بھی رجوع فرمایا، پھر اہل حق کا اس کی حرمت پر اب اجماع ہے۔

فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً: اس آیت میں مہر معین کے وجوب کی دو شرطیں بیان فرمائیں: ① ایک مہر مقرر ہونا ② دوسرے انتفاع حاصل کرنا، پس اگر ایک شرط بھی نہ ہو تو مہر معین واجب نہ ہوگا، مثلاً مہر مقرر ہوا اور انتفاع نہ ہوا ہو اور طلاق ہو جائے تو نصف مہر لازم ہے، اور مہر مقرر نہ ہوا اور انتفاع ہوا ہو تو مہر مثل لازم ہے، اور اگر نہ مہر مقرر ہو نہ انتفاع ہوا اور طلاق ہو جائے تو ایک جوڑا دینا پڑے گا جس کا بیان دوسرے پارہ کے آخر میں آچکا ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ: یعنی جن عورتوں کی حرمت بیان ہو چکی ان کے سوا سب حلال ہیں چار شرطوں کے ساتھ: ① اول یہ کہ طلب کرو، یعنی زبان سے ایجاب وقبول دونوں طرف سے ہو جائے ② دوسری یہ کہ مال یعنی مہر دینا قبول کرو ③ تیسری یہ کہ ان عورتوں کو قید میں لانا اور اپنے قبضہ میں رکھنا مقصود ہو، صرف مستی نکالنا اور شہوت رانی مقصود نہ ہو، جیسا کہ زنا میں ہوتا ہے، یعنی ہمیشہ کے لئے وہ اس کی زوجہ ہو جائے چھوڑے بغیر کبھی نہ چھوٹے، مطلب یہ کہ کوئی مدت مقرر نہ ہو، اس سے متعہ کا حرام ہونا معلوم ہو گیا جس پر اہل حق کا اجماع ہے ④ چوتھی شرط جو دوسری آیتوں میں مذکور ہے یہ ہے کہ مخفی طور پر دوستی نہ ہو، یعنی کم سے کم دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں اس معاملہ کی گواہ ہوں، اگر بدون دو گواہوں کے ایجاب وقبول ہوگا تو وہ نکاح درست نہ ہوگا، زنا سمجھا جائے گا۔

فائدہ: ۲ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً: یعنی جس عورت سے نکاح کیا اور اس کے بعد زوج نے اس سے کسی مدت معین قلیل یا طویل تک نفع بھی حاصل کر لیا، کم سے کم یہ کہ ایک ہی دفعہ وطی یا خلوت صحیحہ کی نوبت آئی تو اب اس عورت کا پورا مہر دینا لازم ہے، بدون عورت کے بخشے کسی طرح چھوٹ نہیں سکتا، البتہ جب تک عورت بالکل کام میں نہ آئے اور زوج طلاق دے دے تو مہر مقررہ کا آدھا دینا ہوگا اور اگر عورت نے انتفاع سے پہلے کوئی ایسی بات کی کہ نکاح ٹوٹ گیا تو زوج کے ذمہ سے سب مہر اتر جائے گا کچھ دینا نہ پڑے گا۔

فائدہ: ۳ مِنْۢ بَعْدِ الْفَرِيْضَةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا: یعنی اگر زوجین مہر مقرر کر لینے کے بعد کسی بات پر راضی ہو جائیں، مثلاً عورت اپنی خوشی سے مہر میں سے کچھ کم کر دے، یا مرد اپنی رضا سے مہر مقررہ سے کچھ زیادہ دے تو وہ مختار ہیں، اس میں کچھ گناہ نہیں، یہ نہیں کہ مہر مقررہ سے زوج کچھ کم دے یا عورت اس سے کچھ زیادہ لے تو ناجائز ہے، ہاں! رضائے باہمی ضرور ہونی چاہئے۔
اخیر میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تمہاری مصلحتوں اور ہر طرح کے نفع ونقصان کو خوب جانتا ہے اور جو حکم فرماتا ہے وہ سراسر حکمت آمیز ہوتا ہے، اس کی متابعت میں تمہارے لئے دارین کی خوبی اور بہبودی ہے اور مخالفت میں سراسر نقصان اور خرابی ہے۔

وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ

اور جو کوئی نہ رکھے تم میں مقدور اس کا کہ نکاح میں لائے بیبیاں مسلمان تو نکاح کر لے ان سے جو تمہارے ہاتھ کا مال ہیں

مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ۭ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ ۭ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ فَانْكِحُوْهُنَّ

جو تمہارے آپس کی لونڈیاں ہیں مسلمان ۱ اور اللہ کو خوب معلوم ہے تمہاری مسلمانی، تم آپس میں ایک ہو ۲ سو ان سے نکاح کرو

بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ ۚ

انکے مالکوں کی اجازت سے اور دو انکے مہر موافق دستور کے قید میں آنے والیاں ہوں نہ مستی نکالنے والیاں اور نہ چھپی یاری کرنے والیاں ۳

خلاصہ تفسیر: اوپر سے چونکہ نکاح کے احکام چلے آرہے ہیں، اس لئے اسی کے ذیل میں اب شرعی لونڈیوں کے ساتھ نکاح کرنے کا حکم بیان فرماتے ہیں۔

اور جو شخص تم میں پوری قدرت اور گنجائش نہ رکھتا ہو آزاد مسلمان عورتوں سے نکاح کرنے کی تو وہ اپنے آپس (والوں) کی مسلمان لونڈیوں سے جو کہ تم لوگوں کی (شرعاً) مملوکہ ہیں نکاح کر لے (کیونکہ اکثر لونڈیوں کا مہر وغیرہ کم ہوتا ہے اور ان کو غریب کے ساتھ بیاہ دینے میں عار بھی نہیں کرتے)

اور (لونڈی سے نکاح کرنے میں عار نہ کرے، کیونکہ دین کے اعتبار سے تو ممکن ہے کہ وہ تم سے بھی افضل ہوں، وجہ یہ کہ دین کا مدار افضلیت ایمان پر ہے اور) تمہارے ایمان کی پوری حالت اللہ ہی کو معلوم ہے (کہ اس میں کون اعلیٰ ہے کون ادنیٰ ہے، کیونکہ وہ دل سے متعلق ہے، جس کی پوری اطلاع اللہ ہی کو ہے اور دنیا کی رو سے عار کی زیادہ وجہ نسب کا فرق ہے، سو سب آدم وحوا علیہما السلام کی اولاد ہیں، اس مشارکت کے اعتبار سے) تم سب آپس میں ایک دوسرے کے برابر ہو (پھر عار کی کیا وجہ)۔

سو (جب عار نہ ہونے کی وجہ معلوم ہوگئی تو مذکورہ ضرورت کے وقت) ان سے نکاح کرلیا کرو (مگر شرط یہ بھی ہے کہ) ان کے مالکوں کی اجازت سے (ہو) اور ان (کے مالکوں) کو ان کے مہر قاعدہ (شرعیہ) کے موافق دے دیا کرو (اور یہ مہر دینا) اس طور پر (ہو) کہ وہ منکوحہ بنائی جائیں نہ تو علانیہ بدکاری کرنے والی ہوں اور نہ خفیہ آشنائی کرنے والی ہوں (یعنی وہ مہر بمقابلہ نکاح ہو، بطور زنا کی اجرت کے دینے سے وہ حلال نہ ہوگی)۔

فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ: باندی کے ساتھ نکاح کرنے میں دو قیدیں لگائیں: ① آزاد مسلمان عورت سے نکاح کرنے کی گنجائش نہ ہونا ② باندی کا مسلمان ہونا، امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ان دونوں کی رعایت رکھنا اولیٰ ہے، اگر آزاد عورت سے نکاح کی قدرت ہوتے ہوئے باندی سے نکاح کرلیا یا کتابیہ باندی سے نکاح کرلیا تو نکاح ہوجائے گا لیکن مکروہ ہے، اس کراہت کی وجہ یہ ہے کہ باندی سے جو اولاد پیدا ہو وہ اس شخص کی غلام ہوتی ہے جو باندی کا مالک ہے اور غیر مومن باندی سے جو اولاد ہوگی اندیشہ ہے کہ وہ ماں کے ڈھنگ پر غیر دین اختیار کریں اولاد کو غلامی سے بچانے اور مؤمن بنانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ بچوں کی ماں آزاد ہو اور اگر باندی ہو تو کم از کم مؤمنہ ضرور ہو، تاکہ بچہ کا ایمان محفوظ رہے، دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ باندی دوسرے کی مملوک ہے، ممکن ہے کسی وقت شوہر اس کو اپنے پاس رکھنا چاہے اور عین اسی وقت مالک اس باندی سے خدمت لینا چاہے تو ضرور بے لطفی ہوگی، یا مالک اس باندی کو کسی تیسرے کے ہاتھ فروخت کرڈالے تو اور مصیبت ہے، تیسری بات یہ بھی کہ باندی سے پورا پورا نباہ نہیں ہوسکتا، غیور آدمی کو اس سے بھی کوفت ہوگی، پھر غالباً باندی کو گھریلو امور کا نہ زیادہ سلیقہ ہوتا ہے اور نہ ہی شوہر کے گھر اور چیزوں کا درد ہوتا ہے، یہ وجوہات شرعاً کراہت کا سبب ہوسکتی ہیں، پس عرفی کراہیت یعنی عار کی وجہ سے باندی سے نکاح نہ کرنا اس کی تو ممانعت ہے، لیکن شرعی کراہیت جس کا ابھی بیان ہوا انہیں مدنظر رکھتے ہوئے بلاضرورت باندی سے نکاح نہ کرنا اولیٰ ہے، اور حضرت امام شافعی اور دیگر ائمہ کے نزدیک آزاد عورت سے نکاح کی قدرت ہوتے ہوئے باندی سے نکاح کرنا حرام ہے اور کتابیہ باندی سے نکاح کرنا مطلقاً جائز نہیں ہے۔

بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ: یعنی تم سب آپس میں ایک دوسرے کے برابر ہو، اس سے تکبر اور نخوت کی جڑ کاٹ دی گئی، اور صوفیاء کرام اس کا بہت اہتمام کرتے ہیں۔

* * *

فائدہ: ۱ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ: یعنی جس کو اس بات کا مقدور نہ ہو کہ آزاد عورت سے نکاح کر سکے اور اس کے مہر اور نفقہ کا تحمل کرسکے تو بہتر ہے کہ ایسا شخص آپس میں کسی کی مسلمان لونڈی سے نکاح کرلے کہ اس کا مہر کم ہوتا ہے اور نفقہ میں بھی یہ سہولت ہے کہ اگر مالک نے اس کو اپنے یہاں رکھا جیسا کہ اکثر ہوتا ہے تو زوج اس کے نفقہ سے فارغ البال رہے گا اور اگر زوج کے حوالہ کردیا تو بھی بہ نسبت نفقہ حرہ تخفیف ضرور رہے گی۔

فائدہ: جس کو آزاد عورت سے نکاح کرنے کی قدرت ہو، اس کو لونڈی سے نکاح کرنا امام شافعیؒ وغیرہ کے نزدیک حرام ہے اور امام ابوحنیفہؒ کے مذہب میں مکروہ تنزیہی ہے، ایسے ہی صحت نکاح کے لئے لونڈی کا مسلمان ہونا اکثر علماء کے نزدیک ضروری ہے اور امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک افضل ہے، اگر کتابیہ لونڈی سے نکاح کرلے گا تو وہ بھی امام صاحبؒ کے نزدیک جائز ہوگا، ہاں! اگر کسی کے نکاح میں آزاد عورت ہو تو اس کو لونڈی سے نکاح کرنا سب کے نزدیک حرام ہے۔

فائدہ: ۲ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ: یعنی اللہ تعالیٰ کو تم سب کے ایمان کی اصلی کیفیت معلوم ہے، تم کو تو ظاہر پر اکتفا کرنا چاہیے، یعنی لونڈی

کا ایمان اللہ کے نزدیک بعضی آزاد عورت کے ایمان سے بہتر اور افضل ہوسکتا ہے تو اب حیثیت ایمانی سے لونڈی کے ساتھ نکاح کر لینے میں قباحت اور انکار نہ ہونا چاہیے اور آپس میں تم سب ایک ہو، ایک اصل سے پیدا ہوئے ہو، ایک دین میں شریک ہو، پھر لونڈیوں سے نکاح کرنے کو کیوں معیوب اور ننگ و عار سمجھتے ہو، اس کلام سے لونڈیوں کے نکاح کی طرف توجہ دلانا اور ان سے نفرت کو دور کرنا مطلوب ہے۔

فائدہ: ۳۔ مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ: یعنی تو اب مناسب ہے کہ حسب بیان بالا ان لونڈیوں سے نکاح کر لیا کرو، ان کے مالکوں سے اجازت لے کر اور قاعدہ اور دستور کے موافق ان کا مہر دے دیا کرو، جب کہ وہ خوشی سے قید نکاح میں آئیں، مستی نکالنے والیاں اور چھپی اور مخفی یاری کرنے والیاں ہرگز نہ ہوں، یعنی زنا نہ ہو کہ اس میں مہر ہرگز لازم نہ ہوسکے گا، اس سے معلوم ہوگیا کہ زنا میں مہر لازم نہیں ہوتا اور نکاح کے لئے گواہوں کا ہونا ضروری ہے۔

فَاِذَآ اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ ؕ ذٰلِكَ

پھر جب وہ قید نکاح میں آ چکیں تو اگر کریں بے حیائی کا کام تو ان پر آدھی سزا ہے بیبیوں کی سزا سے ۱؎ یہ اس کے واسطے ہے

لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ ؕ وَاَنْ تَصْبِرُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۵﴾ ع

جو کوئی تم میں ڈرے تکلیف میں پڑنے سے اور صبر کرو تو بہتر ہے تمہارے حق میں اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے ۲؎

خلاصہ تفسیر: پیچھے باندیوں سے شادی کرنے کا ذکر تھا، اب ان کے متعلق زنا کی بابت ایک سیاسی حکم بتلاتے ہیں کہ باندی اور غلام کی حد آزاد مرد و عورت سے مختلف ہوتی ہے۔

پھر جب وہ لونڈیاں منکوحہ بنالی جائیں، پھر اگر وہ بڑی بے حیائی کا کام (یعنی زنا) کریں تو (ثبوت کے بعد بشرطیکہ مسلمان ہوں) ان پر اس سزا سے نصف سزا (جاری) ہوگی جو کہ (غیر منکوحہ) آزاد عورتوں پر ہوتی ہے (جیسا کہ نکاح کے قبل بھی لونڈیوں کی یہی سزا تھی اور اسی طرح غلاموں کی بھی) یہ (باندیوں سے نکاح کرنا) اس شخص کے لئے (مناسب) ہے جو تم میں (شہوت کے غلبہ اور آزاد عورت میسر نہ ہونے کی وجہ سے) زنا (میں مبتلا ہوجانے) کا اندیشہ رکھتا ہو (اور جس کو یہ اندیشہ نہ ہو اس کے لئے مناسب نہیں) اور (اگر اس اندیشہ کی حالت میں بھی اپنے نفس پر قادر ہو تو) تمہارا ضبط کرنا زیادہ بہتر ہے (بہ نسبت باندی کے ساتھ نکاح کرنے سے) اور (یوں) اللہ تعالیٰ بڑے بخشنے والے ہیں (اگر کراہت کی صورت میں بھی نکاح کر لیا تو ہم مواخذہ نہیں کریں گے اور) بڑی رحمت والے ہیں (کہ حرمت کا حکم نہیں فرمایا)۔

فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ: غیر شادی شدہ آزاد مرد و عورت کے لیے زنا کی سزا سو دُرّے ہیں جس کا ذکر آگے سورہ نور میں آئے گا، اور شادی شدہ آزاد مرد و عورت کے لیے زنا کی سزا چند دیگر شرائط کے ساتھ سنگساری ہے جو تواتر کے ساتھ احادیث سے ثابت ہے، اور غلام اور باندی چاہے شادی شدہ ہوں یا غیر شادی شدہ دونوں صورتوں میں ان کی سزا پچاس دُرّے ہیں، اس جگہ اگرچہ صرف شادی شدہ باندی کا حکم مذکور ہے، لیکن یہی حکم غلام کے لیے بھی دلالت النص اور اجماع سے ثابت ہے، اور نصف فرمانے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ غلام اور باندی کے لیے شادی شدہ ہونے کی صورت میں سنگساری کا حکم نہیں، کیونکہ سنگساری کی انتہا موت ہے اور اس میں تنصیف یعنی آدھا کرنا ممکن نہیں ہے۔

آیت میں مذکورہ حکم شادی شدہ غیر شادی شدہ غلام اور باندی سب کے لیے ہے، مگر یہاں شادی شدہ باندی کے لیے خاص طور پر اس لیے بیان فرمایا تاکہ معلوم ہوجائے کہ باندیوں سے نکاح کرنا اگرچہ جائز ہے مگر بلا ضرورت اس میں نہیں پڑنا چاہیے، چنانچہ اسی لیے دو قیدیں بیان کی گئی ہیں: ① آزاد مسلمان عورت سے نکاح کرنے کی گنجائش نہ ہونا ② باندی کا مسلمان ہونا، اسی غرض کے لیے زنا کا حکم خاص منکوحہ باندی کے بارے میں یہاں بیان فرمایا تاکہ بلا ضرورت باندی سے نکاح کرنے کی رغبت نہ ہو، جس سے اس بات کی طرف بھی اشارہ ہوتا ہے کہ بہ نسبت آزاد عورت کے باندی سے

ایسی حرکت نکاح کے بعد بھی چنداں بعید نہیں، کیونکہ اس کو مالک کی خدمت کے لیے بازار وغیرہ میں جانا پڑتا ہے یہ ایسے امور ہیں جن سے اس فعل کے واقع ہونے کا احتمال ہوسکتا ہے جو غیرت مند کے لیے کوفت کا سبب ہے، یہ نکتہ حق تعالیٰ نے اس احقر کے قلب پر القاء فرمایا ہے۔

آزاد اور غلام کی سزا میں فرق کرنے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ درجات کے فرق سے سیاست میں بھی فرق ہوجاتا ہے، یعنی فرق مراتب کا خیال رکھنا چاہیے، حکماء مصلحین کی یہی شان ہوتی ہے کہ ہرایک کے ساتھ اس کی خصوصیت کے مطابق معاملہ کرتے ہیں۔

وَاَنۡ تَصۡبِرُوۡا خَيۡرٌ لَّكُمۡ: یعنی کنیزوں کے ساتھ نکاح سے صبر کرنا بہتر ہے دو وجہ سے: ① ایک یہ کہ وہ آقا کی خدمت کی وجہ سے شوہر کے لیے یکسو نہیں ہوسکیں گی جو ایک قسم کی بے لطفی ہے ② دوسری وجہ یہ کہ اولاد غلام ہوگی، تو اس سے معلوم ہوا کہ اگر دینی مصلحت فوت نہ ہو تو دنیاوی مصالح کی رعایت کرنا زہد کے خلاف نہیں، عقل وشرع کے جامع محققین کا یہی مسلک ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ اس رعایت کا سبب حب مال وحب جاہ نہ ہو بلکہ صرف اصلح وانسب کا اختیار کرنا سبب ہو۔

وَاللّٰهُ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ: اگر کراہت کی صورت میں بھی نکاح کرلیا تو ہم مواخذہ نہیں کریں گے، ہر مکروہ تنزیہی کا یہی حکم ہے کہ اس میں مواخذہ نہ ہونے کا وعدہ ہے، البتہ مقربین کی شان کے ضرور خلاف ہے، پس باندی کے نکاح میں اس قید کی رعایت کرنا بھی اولیٰ ہے کہ اگر زنا میں پڑجانے کا اندیشہ ہو تو کیا جائے، ورنہ پیچھے بیان کردہ مصلحتوں کی وجہ سے بلاضرورت مکروہ ہے، غرض اللہ تعالیٰ نے ہماری مصلحت کے واسطے یہ مشورہ دیا ہے جس کو فقہ کی اصطلاح میں "امر ارشادی" کہتے ہیں، اور امام شافعیؒ کے نزدیک ان سب قیدوں کی رعایت واجب ہے، ان کے بغیر نکاح جائز نہ ہوگا۔

مذکورہ آیات کی تفسیر میں جو غلام و باندی کا ذکر آیا ہے ان سے شرعی غلام و باندی مراد ہیں جو کافر مرد وعورت جہاد کے موقع پر قید کرلئے جاتے تھے اور امیر المومنین ان کو مجاہدین میں تقسیم کردیتا تھا، یہ قیدی غلام باندی بن جاتے تھے، پھر ان کی نسل بھی غلام رہتی تھی (باستثناء بعض صورتوں کے) جن کا تفصیلی ذکر فقہ کی کتابوں میں ہے، موجودہ نوکر چاکر اور گھروں میں کام کرنے والی نوکرانیاں غلام باندی نہیں ہیں اس لئے کہ یہ آزاد ہیں، بعض علاقوں میں بچوں کو بیچ دیتے ہیں اور غلام بنالیتے ہیں، یہ سراسر حرام ہے اور ایسا کرنے سے یہ غلام باندی نہیں بن جاتے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ نِصۡفُ مَا عَلَى الۡمُحۡصَنٰتِ مِنَ الۡعَذَابِ: یعنی جو آزاد مرد یا عورت نکاح سے فائدہ اٹھا چکے، یعنی مجامعت کی نوبت آچکی ہو اور پھر وہ زنا کرے تو وہ سنگسار کیا جائے گا، اور اگر نکاح نہیں ہوا، بلکہ نکاح سے پہلے ہی زنا کیا تو اس کے لئے سو کوڑوں کا حکم ہے اور لونڈی اور غلام کے لئے قبل نکاح اور بعد نکاح ہر حالت میں صرف پچاس کوڑے ہیں، زیادہ نہیں۔

فائدہ: ۲؎ وَاَنۡ تَصۡبِرُوۡا خَيۡرٌ لَّكُمۡ وَاللّٰهُ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ: یعنی لونڈیوں سے نکاح کرنے کا ارشاد اور استحسان اسی کے حق میں ہے جو کوئی شخص تم میں ڈرتا ہو مشقت یعنی زنا میں مبتلا ہونے سے اور اگر تم صبر کرو اور باندیوں سے نکاح نہ کرو تو بہت اچھا ہے تمہارے حق میں، کیونکہ اولاد آزاد ہوگی، ہاں! جس کو صبر وتحمل میں کھٹکا ہو تو اسکو بہتر ہے کہ ایسی حالت میں کسی کی لونڈی سے نکاح کرلے اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے صبر کرنے والوں پر۔

يُرِيۡدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمۡ وَيَهۡدِيَكُمۡ سُنَنَ الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِكُمۡ وَيَتُوۡبَ عَلَيۡكُمۡ ط

اللہ چاہتا ہے کہ بیان کرے تمہارے واسطے اور چلائے تم کو پہلوں کی راہ اور معاف کرے تم کو

وَاللّٰهُ عَلِيۡمٌ حَكِيۡمٌ ﴿۲۶﴾

اور اللہ جاننے والا ہے حکمت والا

خلاصہ تفسیر: گذشتہ آیات میں مخصوص احکام کی تفصیل تھی، اب اللہ تعالیٰ اپنا انعام واحسان بتلاتے ہیں کہ ان احکام میں تمہارے ہی منافع ومصالح کی رعایت رکھی گئی ہے اگرچہ تم اس کی تفصیل کو نہ سمجھو، پھر اس کے ساتھ ہی ان احکام پر عمل کرنے کی ترغیب ہے اور گمراہوں

کے ناپاک ارادوں پر بھی متنبہ کیا گیا کہ یہ لوگ تمہارے بدخواہ ہیں جو تمہیں مستقیم راستہ سے بھٹکانا چاہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کو (ان مذکورہ مضامین کے ارشاد فرمانے سے، اسی طرح دوسرے مضامین سے اپنا کوئی نفع مقصود نہیں کہ یہ عقلی طور پر محال ہے، بلکہ تم کو نفع پہنچانے کے لئے) یہ منظور ہے کہ (احکام کی آیتوں میں تو) تم سے (تمہاری مصلحت کے احکام) بیان کردے اور (واقعات اور قصوں کی آیتوں میں) تم سے پہلے لوگوں کے احوال تم کو بتلادے (تاکہ تم کو اتباع کی رغبت اور مخالفت سے خوف ہو) اور (خلاصہ مشترک مقصود یہ ہے کہ) تم پر (رحمت کے ساتھ) توجہ فرمادے (اور وہ توجہ یہی بیان فرمانا اور بتلانا ہے جس میں سراسر بندوں ہی کا نفع ہے) اور اللہ تعالیٰ بڑے علم والے ہیں (کہ بندوں کی مصلحت جانتے ہیں) بڑے حکمت والے ہیں (کہ بلاوجوب ان مصلحتوں کی رعایت فرماتے ہیں)

* * *

فائدہ: یعنی اللہ تعالیٰ کو ان احکام کے ارشاد سے مطلوب یہی ہے کہ تم کو حلال اور حرام کا حال معلوم ہو جائے اور تم کو پہلے انبیاء کا راستہ نصیب ہو، جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام وغیرہ اور مغفرت کرے تمہاری، اور اللہ کو تمہارے مصالح اور تمام حالات کا پورا علم ہے، اور اسکے ہر حکم اور ہر تدبیر میں حکمت ہے تو اب اگر اسکے حکم کی اطاعت نہ کرو گے تو ہدایت سے بھی محروم اور پہلوں کے بھی مخالف اور اللہ کی رحمت اور مغفرت سے محروم رہو گے۔

فائدہ: پہلے سے زنا اور لواطت کی حرمت اور ان سے توبہ کرنا اور عورتوں کے متعلق بعضے احکام اور جن عورتوں سے نکاح حرام ہے، انکا ذکر اور نکاح کے متعلق مہر وغیرہ قیود و شرائط کا تذکرہ اور بدکاری سے ممانعت اور اس پر سزا کا ذکر تھا اور بچند وجوہ لوگوں کو ان حکموں کی اطاعت دشوار تھی، اس لئے اس آیت میں اور آئندہ کی دو آیتوں میں ان احکام کی پابندی کو خوب مؤکد اور مستحکم کر کے مخالفت سے روک دیا، واللہ اعلم۔

وَاللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْكُمْ ۣ وَيُرِيْدُ الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الشَّهَوٰتِ اَنْ تَمِيْلُوْا مَيْلًا عَظِيْمًا ﴿٢٧﴾

اور اللہ چاہتا ہے کہ تم پر متوجہ ہووے، اور چاہتے ہیں وہ لوگ جو لگے ہوئے ہیں اپنے مزوں کے پیچھے کہ تم پھر جاؤ راہ سے بہت دور

خلاصہ تفسیر: اور اللہ تعالیٰ کو تو (احکام و قصص کے بیان سے) تمہارے حال پر (رحمت کے ساتھ) توجہ فرمانا منظور ہے، اور جو لوگ (کفار و فجار میں سے) شہوت پرست ہیں وہ یوں چاہتے ہیں کہ تم (راہ راست سے) بڑی بھاری کجی میں پڑ جاؤ (اور انہی جیسے ہو جاؤ، چنانچہ وہ اپنے فاسد خیالات مسلمانوں کے کانوں میں ڈالتے رہتے تھے)۔

يَتَّبِعُوْنَ الشَّهَوٰتِ: جاننا چاہیے کہ یہاں شہوت پرستی کی مذمت میں جائز شہوات و خواہشات سے فائدہ اٹھانا داخل نہیں ہے، کیونکہ شہوت پرستی سے مراد وہ ہے جس سے خدا پرستی فوت ہو جائے، اور جائز خواہشات جبکہ وہ باذن خدا ہیں تو اس سے خدا پرستی فوت نہیں ہوتی تو یہ شہوت پرستی میں داخل نہیں۔

اَنْ تَمِيْلُوْا مَيْلًا عَظِيْمًا: یعنی تم بڑی بھاری کجی میں پڑ جاؤ، ''بڑی بھاری کجی'' کے دو مطلب ہیں: ① ایک یہ کہ بے باکانہ حرام کا مرتکب ہونا ② دوسرے یہ کہ حرام کو حلال سمجھ جانا، فساق پہلے امر کی کوشش کرتے ہوں گے، اور کفار دوسرے امر کی، جیسا کہ مشاہدہ ہے کہ بے راہ لوگ دوسروں کو بھی گمراہ کرنا چاہتے ہیں، اور اس کے مقابلہ میں ''ہلکی کجی'' یہ ہے کہ گناہ کو گناہ سمجھے اور اتفاقاً اس کا صدور ہو جائے، اس آیت میں اس میل غیر عظیم (ہلکی کجی) کی اجازت نہیں ہے، بلکہ ان بدخواہوں کے حال کا بیان کرنا ہے کہ وہ میل عظیم (بڑی بھاری کجی) کی کوشش میں ہیں۔

* * *

فائدہ: یعنی یہ مختلف قیدیں جو پہلے گزریں، اس سے مطلوب تم پر رحمت فرمانا ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان قیدوں کی نسبت حکم فرمایا اور جو لوگ اپنی شہوتوں پر فریفتہ ہیں وہ البتہ یہی چاہتے ہیں کہ تم سیدھے راستہ سے دور جا پڑو، یعنی انہی کی طرح تم بھی اپنی شہوات کا اتباع کرو اور گمراہ ہو جاؤ تو اب جو کچھ کرو سمجھ کر کرو۔

يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ ۚ وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا ﴿٢٨﴾

اللہ چاہتا ہے کہ تم سے بوجھ ہلکا کرے، اور انسان بنا ہے کمزور

خلاصہ تفسیر: (اللہ تعالیٰ کو احکام میں جس طرح تمہاری مصلحت پر نظر ہے، اسی طرح تمہاری آسانی پر بھی نظر ہے، جیسا ارشاد ہے کہ:) اللہ تعالیٰ کو (احکام میں) تمہارے ساتھ تخفیف (یعنی آسانی بھی) منظور ہے، اور (وجہ اس کی یہ ہے کہ) آدمی (بہ نسبت دیگر مکلفین یعنی جن اور ملائکہ کے بدن اور ہمت دونوں میں) کمزور پیدا کیا گیا ہے (اس لئے اس کے ضعف کے مناسب احکام مقرر فرمائے، ورنہ مصلحت کی رعایت کے اعتبار سے مشکل اور تکلیف دہ اعمال تجویز کیے جانے میں بھی مضائقہ نہ تھا، مگر ہم نے دونوں باتوں کا مجموعی اعتبار سے لحاظ فرمایا اور یہ بڑے علم وحکمت اور نیز رحمت وشفقت پر موقوف ہے)۔

يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ: اس میں مجاہدہ میں سختی وتشدد کا رد ہے، خاص طور پر جب اس کا منشا دعوائے قوت (اپنی قوت وطاقت پر زعم) ہو جس سے عجب پیدا ہوتا ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی انسان کو اللہ نے ضعیف بنایا ہے، اس کو خوب معلوم ہے کہ یہ اپنی شہوات ومرغوبات سے کہاں تک صبر کرسکتا ہے تو اس لئے ہر حکم میں تخفیف کا بھی لحاظ فرمایا گیا ہے، یہ نہیں ہوا کہ انسان کے حق میں جو مفید دیکھا، وہ اس کے ذمہ لگا دیا سہل ہو یا دشوار، مثلاً عورتوں اور شہوت سے صبر کرنا آدمی کو بہت دشوار تھا، اس لئے اس کی خواہش پورا کرنے کے لئے طریقے جائز اللہ نے بتلا دیے کہ اس سے اپنا مطلب حاصل کرسکے، یہ نہیں کہ قضائے شہوت سے بالکل روک دیا گیا ہو، حق تعالیٰ نے اپنی رحمت سے شریعت میں تنگی نہیں فرمائی کہ کوئی حلال کو چھوڑے اور حرام کی طرف دوڑے، خلاصہ ان آیتوں کا یہ نکلا کہ نفس کو شہوات سے بچانا اور ان تمام قیدوں کا پابند ہونا جو عورتوں کے بارے میں مذکور ہوئیں ہرگز دشوار امر نہیں اور ان کی پابندی نہایت ضروری اور سراسر مفید ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً

اے ایمان والو! نہ کھاؤ مال ایک دوسرے کے آپس میں ناحق مگر یہ کہ تجارت ہو

عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ ۣ وَلَا تَقْتُلُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ﴿٢٩﴾

آپس کی خوشی سے [1] اور نہ خون کرو آپس میں، بیشک اللہ تم پر مہربان ہے [2]

خلاصہ تفسیر: شروع سورۃ میں عام انسانوں کے حقوق کی حفاظت اور ان کی ادائیگی کی طرف اجمالی اشارہ فرمایا، پھر یتیموں، عورتوں اور پھر میراث کے احکام کا بیان ہوا، جس میں دیگر رشتہ داروں کے حقوق کی ادائیگی کی بھی تاکید آئی، اس کے بعد نکاح کے احکام آئے کہ کس عورت سے نکاح حلال ہے کس سے حرام، کیونکہ نکاح ایک ایسا معاملہ اور معاہدہ ہے جس سے عورت کی جان اور مال میں تصرف کرنے کا کسی کو حق ملتا ہے، اب یہاں عام انسانوں کے جان ومال کی حفاظت اور ان میں ہر ناجائز تصرف کرنے کی ممانعت کا بیان ہے، خواہ وہ انسان مرد ہوں یا عورتیں اور عزیز رشتہ دار ہوں یا غیر، یہاں تک کہ مسلم ہوں یا وہ غیر مسلم جن سے ترک جنگ کا کوئی معاہدہ ہو چکا ہو۔

اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کے مال ناحق (یعنی ناجائز) طور پر مت کھاؤ (برتو) لیکن (جائز طور پر ہو مثلاً) کوئی تجارت ہو جو باہمی رضامندی سے (واقع) ہو (بشرطیکہ اس میں دیگر سب شرعی شرائط بھی ہوں) تو مضائقہ نہیں (یہ تو مالی تصرف تھا، آگے جانی تصرف کو بیان فرماتے ہیں:) اور تم ایک دوسرے کو قتل بھی مت کرو، بلاشبہ اللہ تعالیٰ تم پر بڑے مہربان ہیں (اس لئے ضرر رسانی کی صورتوں کو منع فرما دیا، خصوصاً جس

میں یہ بھی اثر ہو کہ دوسرا شخص پھر تم کو نقصان پہنچائے گا، تو یہ اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہے کہ تم کو بھی نقصان سے بچالیا)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ مطلب یہ ہے کہ کسی کو کسی کا مال ناحق کھالینا، مثلاً جھوٹ بول کر یا دغا بازی سے، یا چوری سے ہرگز درست نہیں، ہاں! اگر سوداگری یعنی بیع وشراء کرو تم باہمی رضامندی سے تو اس میں کچھ حرج نہیں اس مال کو کھالو، جس کا خلاصہ یہی نکلا کہ جائز طریقہ سے لینے کی ممانعت نہیں جو مال کو ترک کرنا تم پر دشوار ہو۔

فائدہ: ۲؎ یعنی آپس میں ایک دوسرے کو قتل بھی مت کرو، بیشک اللہ تعالیٰ تم پر مہربان ہے کہ بلاوجہ کسی کے مال یا جان میں تصرف کرنے کو منع فرمادیا اور تم پر ایسے احکام بھیجے جن میں سراسر تمہارے لئے بہبودی اور خیریت ہے۔

وَمَنۡ يَّفۡعَلۡ ذٰلِكَ عُدۡوَانًا وَّظُلۡمًا فَسَوۡفَ نُصۡلِيۡهِ نَارًا ؕ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيۡرًا ۝۳۰

اور جو کوئی یہ کام کرے تعدی اور ظلم سے تو ہم اس کو ڈالیں گے آگ میں، اور یہ اللہ پر آسان ہے

خلاصہ تفسیر: اور (چونکہ قتل ان دونوں صورتوں میں زیادہ سخت ہے، اس لئے اس پر بالخصوص وعید سناتے ہیں کہ) جو شخص ایسا فعل (یعنی قتل) کرے گا اس طور پر کہ حد (شرع) سے گذر جائے اور (وہ حد سے گذرنا بھی خطاء اور بھول چوک سے نہ ہو، بلکہ) اس طور پر کہ (قصداً) ظلم کرے تو ہم عنقریب (یعنی موت کے بعد) اس کو (دوزخ کی) آگ میں داخل کریں گے، اور یہ امر (یعنی ایسی سزا دینا) اللہ تعالیٰ کو (بالکل) آسان ہے (کچھ اہتمام کی حاجت نہیں، جس میں اس احتمال کی گنجائش ہو کہ شاید کسی وقت اہتمام وسامان جمع نہ ہو تو سزا ٹل جائے گی)۔

عُدۡوَانًا وَّظُلۡمًا: یہاں آیت میں ''تعدی'' اور ''ظلم'' کی قید سے معلوم ہوا کہ اگر سہو ونسیان یا خطا سے ایسا ہو گیا تو وہ اس وعید میں داخل نہیں ہے، غرض عدوان اور ظلم جب دونوں جمع ہو جائیں تو اس وقت یہ وعید ہے، ''عدوان'' کے معنی زیادتی میں حد سے گذر جانا ہے، یعنی جو شخص واقع میں قتل کا مستحق نہ ہو اس کو قتل کیا جائے، اور ''ظلم'' کے معنی کسی کے حق میں ناحق دست درازی کرنا، یعنی غیر مستحق قتل کا قتل ہو جانا، یہ تین طور پر ہو سکتا ہے: ① گولی شکار پر چلائی اور وہ کسی آدمی کے لگ گئی ② حاکم یا قاضی کے پاس تنقیح مقدمہ کے بعد کسی شخص پر جرم کا ثبوت ہو گیا اور گواہوں کو اپنے نزدیک معتبر سمجھا جبکہ واقع میں وہ معتبر نہ تھے اور مجرم کے لیے قتل کا حکم دے دیا ③ تیسرے یہ کہ حقیقت حال یعنی اس کا غیر مستحق قتل ہونا معلوم ہے پھر بھی اس کو جان بوجھ کر قتل کر ڈالا، پس ''ظلم'' کہنے سے پہلی دو صورتیں خارج ہو گئیں کہ پہلی دو صورتوں پر یہ وعید نہیں، بلکہ دوسری صورت میں تو کچھ بھی گناہ نہیں، پہلی صورت میں کچھ گناہ ہے جس کا کفارہ آگے آئے گا، خلاصہ یہ کہ پہلی دو صورتیں تو عدوان میں داخل ہیں مگر ظلم میں داخل نہیں اس لیے ان پر یہ وعید مرتب نہ ہوگی، اور ''عدوان'' کی قید سے یہ معلوم ہو گیا کہ جو شخص واقعی قتل کا مستحق ہو اس کا قتل جائز ہے، چنانچہ مقتولی کے ولی کو قصاص کا حق ہے اور اس کی درخواست پر حاکم کے ذمہ قاتل سے قصاص لینا واجب ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی اور جو کوئی ظلم اور زیادتی سے باز نہ آئے، بلکہ ناحق اوروں کا مال کھائے، یا ظلماً کسی کو قتل کر ڈالے تو اسکا ٹھکانا دوزخ ہے اور ایسے ظالموں کو آگ میں ڈال دینا خدا تعالیٰ کو دشوار نہیں بالکل سہل اور آسان ہے تو اب کوئی یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ ہم تو مسلمان ہیں، دوزخ میں کیسے جاسکتے ہیں، اللہ تعالیٰ مالک ومختار ہے، اس کو عدل وانصاف سے کونسی چیز روک سکتی ہے۔

اِنۡ تَجۡتَنِبُوۡا كَبَآئِرَ مَا تُنۡهَوۡنَ عَنۡهُ نُكَفِّرۡ عَنۡكُمۡ سَيِّاٰتِكُمۡ وَنُدۡخِلۡكُمۡ مُّدۡخَلًا كَرِيۡمًا ۝۳۱

اگر تم بچتے رہو گے ان چیزوں سے جو گناہوں میں بڑی ہیں تو ہم معاف کرینگے تم سے چھوٹے گناہ تمہارے اور داخل کریں گے تم کو عزت کے مقام میں

خلاصہ تفسیر: پیچھے چند بڑے گناہ اور ان میں مبتلا ہونے والوں پر شدید عذاب کا بیان تھا، قرآن کا مخصوص انداز بیان یہ ہے کہ

جب کسی جرم پر سزا سے ڈرایا جاتا ہے جسے ''ترہیب'' کہتے ہیں تو اس کے ساتھ ''ترغیب'' کا پہلو بھی ذکر کیا جاتا ہے، چنانچہ آگے ان گناہوں سے بچنے کا ایک فائدہ بتاتے ہیں کہ اگر کبائر سے بچتے رہو گے تو تمہاری طاعات سے خفیف یعنی ہلکے گناہوں کا کفارہ کردیں گے، چونکہ سب کبائر یکساں ہیں اس لیے آیت میں عام لفظ سے تمام کبائر کو اس حکم میں شامل کیا گیا۔

جن کاموں سے تم کو (شرع میں) منع کیا جاتا ہے (یعنی گناہ کے کام) ان میں سے جو بھاری بھاری کام ہیں (یعنی بڑے بڑے گناہ ہیں) اگر تم ان سے بچتے رہو تو (اس بچنے پر ہم وعدہ کرتے ہیں کہ تمہارے اعمال حسنہ کے کرنے سے جب کہ وہ مقبول ہو جائیں) ہم تمہاری خفیف برائیاں (یعنی چھوٹے چھوٹے گناہ جو کہ دوزخ میں لے جاسکتے ہیں) تم سے دور (یعنی معاف) فرمادیں گے (پس دوزخ سے محفوظ رہو گے) اور ہم تم کو ایک معزز جگہ (یعنی جنت) میں داخل کردیں گے۔

اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ: گناہ کبیرہ کی تعریف قرآن وحدیث اور اقوال سلف کی تشریحات کے ماتحت یہ ہے کہ جس گناہ پر قرآن میں کوئی شرعی حد یعنی سزا دنیا میں مقرر کی گئی ہے، یا جس پر لعنت کے الفاظ وارد ہوئے ہیں، یا جس پر جہنم وغیرہ کی وعید آئی ہے، وہ سب گناہ کبیرہ ہیں، اسی طرح ہر وہ گناہ بھی کبیرہ میں داخل ہوگا جس کے مفاسد اور نتائج بد کسی کبیرہ گناہ کے برابر یا اس سے زائد ہوں، اسی طرح جو گناہ صغیرہ جرأت و بے باکی کے ساتھ کیا جائے، یا جس پر مداومت کی جائے تو وہ بھی کبیرہ میں داخل ہو جاتا ہے، اور اس کا مقابل صغیرہ ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف مقامات میں بہت سے گناہوں کا کبیرہ ہونا بیان فرمایا اور حالات کی مناسبت سے کہیں تین، کہیں چھ، کہیں سات، کہیں اس سے بھی زیادہ بیان فرمائے ہیں، اس سے علماء امت نے یہ سمجھا کہ کسی عدد میں انحصار کرنا مقصود نہیں، بلکہ مواقع اور حالات کے مناسب جتنا سمجھا گیا اتنا بیان کردیا گیا، گویا احادیث میں جو عدد وارد ہے، اس سے مقصود حصر نہیں، بلکہ مقتضائے وقت ان ہی کا ذکر ہوگا۔

صغائر صادر ہونے کے بعد اگر کبیرہ سے بچے اور طاعات ضروریہ کا پابند ہو، اس حالت میں وعدہ ہے کہ صغائر معاف ہو جائیں گے، کیونکہ اگر طاعات ضروریہ کی پابندی نہ کی مثلاً نماز چھوڑ دی تو کبائر سے بچنا کہاں پایا گیا، اور آیت میں یہی صورت مذکور ہے، واضح رہے کہ کبیرہ گناہ پر عتاب کے ساتھ ساتھ فضل کا احتمال اور صغیرہ گناہ پر معافی کے ساتھ ساتھ عتاب کا احتمال خاص اہل سنت والجماعت کا مذہب ہے یہ بخلاف معتزلہ کے جن کے نزدیک صغائر واجب المغفرۃ ہیں اور کبائر غیر مغفور ہیں۔

* * *

فائدہ: پہلی آیت میں مذکور تھا کہ جو کوئی ظلماً کسی کے مال یا جان کو نقصان پہنچائے گا تو اس کی سزا جہنم ہے، جس سے معلوم ہو گیا تھا کہ حق تعالیٰ کی نافرمانی بندہ کے لئے موجب عذاب ہے، اب اس آیت میں گناہوں سے بچنے کی ترغیب اور گناہوں سے اجتناب کرنے پر وعدہ مغفرت اور جنت کی توقع اور طمع دلائی جاتی ہے، تاکہ اس کو معلوم کرکے ہر ایک آدمی گناہوں سے احتراز کرنے میں کوشش کرے اور معلوم ہو جائے کہ جو کبیرہ گناہ مثلاً کسی کا مال غصب یا سرقہ کرنے یا کسی کو ظلماً قتل کرنے سے بچ گیا، جن کا ذکر ابھی گزرا تو اس کے وہ تمام صغیرہ گناہ بخشے جائیں گے جن کا مرتکب بغرض تحصیل وتکمیل سرقہ اور قتل ہوا تھا۔

اس آیت میں چند باتیں بحث طلب ہیں، مگر اصل سب کی یہی ہے کہ آیت کا اصلی اور عمدہ مطلب معلوم ہو جائے جس سے تمام امور کا جان لینا سہل ہو جائے، سو معتزلہ اور ان کے موافقین نے سرسری طور پر اس آیت کا یہ مضمون سمجھ لیا کہ: ① اگر کبیرہ گناہوں سے بچتے رہو گے، یعنی کبیرہ گناہ ایک بھی نہ کرو گے تو پھر محض صغیرہ گو کتنے ہی ہوں ضرور معاف کردیے جائیں گے ② اور اگر صغائر کے ساتھ کبیرہ کیف ما اتفق ایک یا دو بھی شامل ہو گئے تو اب معافی ممکن نہیں، بلکہ سب کی سزا ضروری ہوگئی، اہل سنت فرماتے ہیں کہ ان دونوں صورتوں میں اللہ تعالیٰ کو معافی اور مواخذہ کا اختیار بدستور محقق ہے، اول صورت میں معافی کا لازم ہونا اور دوسری صورت میں مواخذہ کو واجب سمجھنا معتزلہ کی بدفہمی اور کم فہمی ہے۔

اور اس آیت کے ظاہری الفاظ اور سرسری مضمون سے جو معتزلہ کا مذہب راجح نظر آتا ہے، اس کا جواب کسی نے تو یہ دیا کہ انتفاء شرط سے انتفاء

مشروط کوئی ضروری امر ہرگز نہیں، کسی نے یہ کہا کہ لفظ ''کبائر'' سے جو آیت میں مذکور ہے ''اکبرالکبائر'' یعنی خاص شرک مراد لے لیا، اور لفظ ''کبائر'' کی جمع لانے کی وجہ تعدادِ انواعِ شرک کو قرار دیا، اور اسی کے ذیل میں چند اور باتیں بھی زیرِ بحث آگئیں، مگر ہم ان سب امور کو نظرانداز کر کے صرف اس آیت کے محقق اور عمدہ معنی ایسے بیان کئے دیتے ہیں جو نصوص اور عقل کے مطابق، اور قواعد اور ارشادِ محققین کے موافق ہوں، اور بشرطِ فہم و انصاف معنی مذکور کے بعد تمام ضمنی باتیں خودبخود حل ہو جائیں، اور خلاف معتزلہ خودبخود مضمحل ہو کر معتزلہ کے عدمِ تدبر اور کم فہمی پر حجت قوی بن جائے، اور اہلِ حق کو اس کے ابطال و تردید کی طرف توجہ فرمانے کی حاجت ہی نہ رہے، سو غور سے سنیئے کہ یہ تو ظاہر ہے کہ ارشاد: ان تجتنبوا کبائر ما تنهون عنه نکفر عنکم سیاتکم جو کہ یہاں مذکور ہے اور ارشاد: اَلَّذِیْنَ یَجْتَنِبُوْنَ کَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ (النجم: ۳۲) میں موجود ہے، ان ہر دو ارشاد کا مدعیٰ ایک ہے، صرف لفظوں میں تھوڑا سا فرق ہے، تو اب جو مطلب ایک آیت کا ہوگا، وہی دوسری آیت کا لیا جائے گا۔

سو سورہ نجم کی آیت کی نسبت حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا ارشاد بخاری وغیرہ کتبِ حدیث میں صاف موجود ہے: عن ابن عباس قال: ما رأیت شیأ أشبه باللمم مما قال ابو هریرة عن النبی ﷺ: ان الله کتب علی ابن آدم حظه من الزنی، ادرك ذٰلك لا محالة، فزنا العین النظر، وزنا اللسان المنطق، والنفس تمنی و تشتهی، والفرج یصدق ذٰلك و یکذبه، انتهی۔ بشرطِ فہم اس حدیث سے ہر دو آیاتِ سابقہ کے واقعی اور تحقیقی مطلب کا پورا سراغ لگ گیا اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ حبر الامت اور لسان القرآن کے فرمانے سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ لمم اور علیٰ ہٰذا القیاس سیأٰت کے معنی اس سے بہتر نہیں ملے، تو اب اس مطلب کے مقابلہ میں کوئی دوسری تقریر مضمون آیت کے متعلق کیونکر قابلِ ترجیح اور لائق پسند ہو سکتی ہے، بالخصوص معتزلہ کی ہرزہ گوئی کیسے قابلِ التفات اور لائق جواب سمجھی جا سکتی ہے اور واقعی حدیث مذکور کا مطلب اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے جو اس سے بات نکالی ایسی عجیب اور قابلِ قبول تحقیق ہے کہ جس سے مضمون ہر دو آیت خوب محقق ہو گیا اور معتزلہ کے خرافات کی گنجائش اور اہلِ حق کو اس کی تردید کی ضرورت بھی نہ رہی اور ذیلی اور ضمنی اقوال و اختلافات بھی بہت خوبی سے طے ہو گئے، چنانچہ اہلِ فہم ادنیٰ تامل سے سمجھ سکتے ہیں، بغرضِ توضیح ہم بھی حدیث مذکور کا خلاصہ عرض کئے دیتے ہیں:

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آیت سورہ نجم میں جو لفظ لمم فرمایا گیا ہے، جس کی کہ معافی کا وعدہ کیا ہے، اس کی تعیین اور تحقیق کے متعلق حدیث ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے بہتر ہم کو کوئی چیز معلوم نہیں ہوئی، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے فرمایا کہ: اللہ نے ابن آدم کے ذمہ پر جو زنا کا حصہ مقرر فرما دیا ہے وہ ضرور اس کو عمل کر رہے گا، سو فعلِ زنا میں آنکھ کا حصہ تو دیکھنا ہے اور زبان کا حصہ یہ ہے کہ اس سے وہ باتیں کی جائیں جو فعلِ زنا کے لئے مقدمات اور اسباب ہوں اور نفس کا حصہ یہ ہے کہ زنا کی تمنا اور اس کی خواہش کرے، لیکن فعلِ زنا کا تحقق اور اس کا بطلان دراصل فرج یعنی شرمگاہ پر موقوف ہے، یعنی اگر فرج سے زنا کا صدور ہو گیا تو آنکھ زبان دل سب کا زانی ہونا محقق ہو گیا اور اگر باوجود تحصیل جملہ اسباب و ذرائع صرف فعل فرج کا تحقق نہ ہوا، بلکہ زنا سے توبہ اور اجتناب نصیب ہو گیا تو اب تمام وسائلِ زنا جو کہ فی نفسہ مباح تھے، فقط زنا کی تبعیت کے باعث گناہ قرار دیئے گئے تھے، وہ سب کے سب لائقِ مغفرت ہو گئے، یعنی ان کا زنا ہونا باطل ہو گیا اور گویا ان کا قلبِ ماہیت ہو کر بجائے زنا عبادت بن گئی، کیونکہ فی نفسہ تو وہ افعال نہ معصیت تھے نہ عبادت، بلکہ مباح تھے، صرف اس وجہ سے کہ وہ زنا کے لئے وسیلہ بنتے تھے معصیت میں داخل ہو گئے تھے، جب زنا کے لئے وسیلہ نہ رہے، بلکہ زنا ہی بوجہ اجتناب معدوم ہو چکا تو اب ان وسائل کا زنا کے ذیل میں شمار ہونا اور ان کو معصیت قرار دینا انصاف کے صریح مخالف ہے۔

مثلاً ایک شخص مسجد میں پہنچا چوری کے خیال سے، مگر وہاں جا کر عین موقع پر تنبہ پیش آیا اور چوری سے توبہ کی اور رات بھر اللہ کے واسطے نماز پڑھتا رہا تو ظاہر ہے کہ جو رفتار سرقہ کا ذریعہ نظر آتا تھا، وہ اب توبہ اور نماز کا ذریعہ ہو گیا تو اس حدیث ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو سن کر عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سمجھ گئے کہ لمم وہ باتیں ہیں جو دراصل گناہ نہیں، مگر گناہ کا سبب ہو کر گناہ بن جاتی ہیں، تو آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ لوگ بڑے گناہ اور کھلے گناہ سے تو بچتے ہیں، ہاں! صدورِ لمم کی نوبت آ جاتی ہے، مگر بڑے اور اصلی گناہ کے صدور سے پہلے ہی وہ اپنے قصور سے تائب اور مجتنب ہو جاتے ہیں تو اب ابن عباس رضی اللہ عنہ نے جیسے حدیث ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے آیت سورہ نجم کا مطلب سمجھ لیا، ہم کو چاہیے کہ وہی معنی حسبِ ارشاد ابن عباس رضی اللہ عنہ ہم آیت سورہ نساء کے بےتکلف سمجھ لیں، جس

کے بعد بحمد اللہ نہ ہم کو اس کی ضرورت ہوگی کہ اس آیت کی توضیح میں گناہ صغیرہ اور کبیرہ کی مختلف تفسیریں نقل کریں اور نہ معتزلہ کے استدلال کے جواب کا فکر ہوگا اور تکفیر سیآت کی وجہ اور دخول جنت کا سبب بھی بسہولت مطابق قواعد معلوم ہوجائے گا اور اجتناب کے معنی بھی ظاہر ہوجائیں گے اور چھوٹی چھوٹی باتیں ان شاء اللہ بشرط تدبر طے ہوجائیں گی۔

خلاصہ ہر دو آیت مذکور کا حسب ارشاد حدیث و بیان ابن عباسؓ یہ ہوا کہ جو لوگ ان گناہوں سے رکیں گے اور ان کے ارتکاب سے اپنے نفس کو ہٹاتے رہیں گے جو گناہ کہ گناہوں کے سلسلہ میں مقصود اور بڑے سمجھے جاتے ہیں تو اس اجتناب اور رک جانے کی وجہ سے ان کے وہ برے کام جو انہوں نے کسی بڑے گناہ کے حصول کی طمع میں کئے ہیں معاف کردیے جائیں گے اور حسب ارشاد: وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّہٖ وَنَھَی النَّفْسَ عَنِ الْھَوٰی فَاِنَّ الْجَنَّةَ ھِیَ الْمَاْوٰی (النازعات: ۴۰-۴۱) وہ لوگ جنت میں داخل ہوں گے، یہ مطلب نہیں کہ سلسلہ زنا کے صغائر کسی دوسرے سلسلہ کے بڑے گناہ مثلاً شراب خوری نہ کرنے سے فروگذاشت ہوجائیں گے، یا شراب خواری کی وجہ سے ان کا مواخذہ لازم اور واجب ہوجائے گا، واللہ اعلم۔

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰی بَعْضٍ ؕ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ؕ

اور ہوس مت کرو جس چیز میں بڑائی دی اللہ نے ایک کو ایک پر، مردوں کو حصہ ہے اپنی کمائی سے

وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ؕ وَسْئَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ﴿۳۲﴾

اور عورتوں کو حصہ ہے اپنی کمائی سے اور مانگو اللہ سے اس کا فضل، بیشک اللہ کو ہر چیز معلوم ہے ۝

خلاصہ تفسیر: ماقبل کی آیتوں میں میراث کے احکام گذرے، ان میں یہ بھی بتلایا گیا کہ میراث کی بعض صورتوں میں مرد کو عورت کی نسبت دوگنا حصہ ملے گا، اسی طرح اور فضائل بھی مردوں کے ثابت ہیں، حضرت ام سلمہؓ نے اس پر ایک دفعہ حضور اکرم ﷺ سے عرض کیا کہ ہم کو آدھی میراث ملتی ہے اور بھی فلاں فلاں فرق ہم میں اور مردوں میں ہیں، مقصد اعتراض کرنا نہیں تھا، بلکہ ان کی تمنا تھی کہ اگر ہم لوگ بھی مرد ہوتے تو مردوں کے فضائل ہمیں بھی حاصل ہوجاتے، مثلاً ہم مرد ہوتے تو جہاد میں حصہ لیتے اور جہاد کی فضیلت ہمیں حاصل ہوجاتی، اسی طرح ایک عورت نے حضور ﷺ سے یہ عرض کیا کہ مرد کو میراث میں دوگنا حصہ ملتا ہے اور عورت کی شہادت بھی مرد سے نصف ہے تو کیا عبادت اور اعمال میں بھی ہم کو نصف ہی ثواب ملے گا؟ اس پر یہ آیت نازل ہوئی، جس میں دونوں باتوں کا جواب دیا گیا ہے، حضرت ام سلمہؓ کے قول کا جواب ولا تتمنوا سے دیا گیا اور اس عورت کے قول کا جواب للرجال نصیب سے دیا گیا۔

اور تم (سب مردوں، عورتوں کو حکم ہوتا ہے کہ غیر اختیاری یعنی خداداد فضائل و کمالات میں سے) ایسے کسی امر کی تمنا مت کیا کرو جس میں اللہ تعالیٰ نے بعضوں کو (مثلاً مردوں کو) بعضوں پر (مثلاً عورتوں پر ان مردوں کے کسی عمل و اختیار کے بغیر) فوقیت بخشی ہے (جیسے مرد ہونا، یا مردوں کا دو حصہ ہونا، یا ان کی شہادت کا کامل ہونا وغیرہ ذلک، کیونکہ) مردوں کے لئے ان کے اعمال (کے ثواب) کا حصہ (آخرت میں) ثابت ہے، اور عورتوں کے لئے ان کے اعمال (کے ثواب) کا حصہ (آخرت میں) ثابت ہے (پس اپنے اختیاری عمل کے ذریعے فضل کو طلب کرو، اور نجات کا مدار قانوناً تمہارے یہی اختیاری اعمال ہیں، جن کا حصول تمہاری کوشش اور جدوجہد پر موقوف ہے، اور ان میں کسی کی تخصیص نہیں، تو اگر دوسروں سے فوقیت حاصل کرنے کا شوق ہے تو اعمال میں جو کہ اختیاری یعنی ذاتی محنت و کسب کا نتیجہ ہیں کوشش کرکے دوسروں سے زیادہ ثواب حاصل کرلو، اس پر قادر ہونے کے باوجود خاص خداداد وہبی فضائل و کمالات کی تمنا محض ہوس اور فضول ہے)۔

اور (اگر خداداد وہبی فضائل میں ایسے فضائل کی تمنا ہو جن میں تمہارے اعمال کو بھی دخل ہے، مثلاً باطنی احوال و کمالات وغیرہ تو مضائقہ نہیں، لیکن اس کا طریقہ بھی یہ نہیں کہ خالی تمنائیں کیا کرو، بلکہ یہ چاہئے کہ) اللہ تعالیٰ سے اس کے فضل (خاص) کی درخواست (یعنی دعاء) کیا کرو، بلاشبہ

اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جانتے ہیں (اس میں سب چیزیں آ گئیں، یعنی غیر اختیاری فضائل وہبی قسم اول کی تخصیص کی وجہ بھی، اور اختیاری فضائل کسبی پر ثواب دینا بھی، اور فضائل وہبی قسم دوم کی درخواست بھی، پس یہ جملہ سب کے متعلق ہے)۔

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ: فضائل وکمالات کی تین قسمیں ہیں:

① وہبی قسم اول: اس سے مراد وہ غیر اختیاری فضائل وکمالات ہیں جو وہبی یعنی محض اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہیں، انسان کے عمل کو اس میں دخل نہیں، جیسے مرد ہونا، نبی ہونا وغیرہ، اس آیت میں اس قسم کے امور خلقی اور وہبی کی تمنا اور آرزو کی ممانعت مراد ہے۔

② کسبی: یعنی وہ اختیاری فضائل وکمالات جن کا تعلق انسان کی سعی، جدوجہد اور کسب واکتساب پر موقوف ہے، انسان کو چاہیے کہ اپنی نظر اور فکر کو ان فضائل وکمالات کے حاصل کرنے کی طرف متوجہ کرے جس میں انسان کے عمل اور فعل کو دخل ہے۔

③ وہبی قسم دوم: یعنی وہ فضائل وکمالات جن میں عادۃً من جانب اللہ تغیر وتبدل ہوتا رہتا ہے، جیسے جاہ وجلال، امیری وفقیری، تو ایسے امور وہبی کی تمنا اور آرزو میں اس طرح کرنا جائز ہے کہ اول ان اعمال کو اختیار کرے جن پر حصولِ فضل کا ترتب عادۃً ہو جاتا ہے، پھر ایسے امور وہبی کے لیے دعا مانگے، یعنی غیر کے حصہ کی تمنا نہ کرے، بلکہ جو کچھ مانگنا ہے خدا کے فضل سے مانگے، اس کے خزانوں میں کوئی کمی نہیں، اس آیت میں **وَسْـَٔلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ** سے یہی مراد ہے۔

یہاں ایک مغالطہ بھی دور ہو گیا جس میں بہت سے ناواقف مبتلا ہوا کرتے ہیں بعض تو غیر اختیاری فضائل کی تمنا میں لگ کر اپنے عیش وآرام اور سکون واطمینان کو دنیا ہی میں برباد کر لیتے ہیں اور اگر نوبت حسد تک پہنچ گئی، یعنی دوسرے کی نعمت کے زوال کی تمنا ہونے لگی تو آخرت بھی برباد ہوئی، کیونکہ حسد کے گناہ عظیم کا ارتکاب ہوا، اور بعض وہ لوگ بھی ہیں جو اپنی سستی کم ہمتی بلکہ بے غیرتی سے اختیاری فضائل حاصل کرنے کی بھی کوشش نہیں کرتے اور کوئی کہے تو اپنی کم ہمتی اور بے عملی پر پردہ ڈالنے کے لئے قسمت وتقدیر کے حوالے دینے لگتے ہیں۔

اس آیت نے ایک حکیمانہ اور عادلانہ ضابطہ بتلا دیا کہ جو کمالات وفضائل غیر اختیاری ہیں اور ان میں انسان کا کسب وعمل موثر نہیں جیسے کسی کا عالی نسب یا حسین وخوبصورت صورت پیدا ہونا وغیرہ ایسے فضائل کو تو حوالہ تقدیر کر کے جس حالت میں کوئی ہے اسی پر اس کو راضی رہنا اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہئے، اس سے زائد کی تمنا بھی لغو، فضول اور نقد رنج وغم ہے، اور جو فضائل وکمالات اختیاری ہیں جو کسب وعمل سے حاصل ہو سکتے ہیں ان کی تمنا مفید ہے، بشرطیکہ تمنا کے ساتھ کسب وعمل اور جدوجہد بھی ہو اور اس میں اس آیت نے یہ بھی وعدہ کیا کہ سعی وعمل کرنے والے کی محنت ضائع نہ کی جائے گی، بلکہ ہر ایک کو بقدر محنت حصہ ملے گا مرد ہو یا عورت۔

* * *

فائدہ: ۱ **مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ**: یعنی حق تعالیٰ جو کسی کو کسی پر کسی امر میں شرافت وفضیلت اور اختصاص وامتیاز عنایت فرمائے تو تم اس کی ہوس اور حرص مت کرو، کیونکہ یہ بھی گویا ایسا ہی ہے کہ کسی کے خاص مال اور جان میں بلاوجہ دست اندازی کی جائے، جس کی حرمت ابھی گزر چکی اور نیز اس سے باہم تحاسد وتباغض پیدا ہوتا ہے اور حکمت الٰہی کی مخالفت بھی لازم آتی ہے۔

بعض عورتوں نے آپ کی خدمت میں عرض کیا کہ کیا سبب ہے کہ ہر جگہ حق تعالیٰ مردوں کو خطاب فرماتا ہے اور ان کو حکم کرتا ہے، عورتوں کا ذکر نہیں کیا جاتا اور میراث میں مرد کو دوہرا حصہ دیا جاتا ہے عورت سے، اس آیت میں ان سب کا جواب ہو گیا۔

فائدہ: ۲ **اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمًا**: یعنی مردوں اور عورتوں کیلئے حصہ مقرر ہے، جیسا کچھ وہ کام کرتے ہیں، خلاصہ یہ ہوا کہ ہر ایک کو اسکے عمل کا بدلہ پورا ملتا ہے، اس میں ہرگز کمی نہیں کی جاتی جو کسی کو شکایت کا موقع ملے، ہاں! یہ بات دوسری ہے کہ وہ اپنی حکمت اور رحمت کے مطابق کسی کو خاص بڑائی اور فضیلت عنایت کرے، اسکی حرص اور شکایت کرنی بے جا ہوس ہے، البتہ اپنے عمل کے معاوضہ سے اور زیادہ ثواب وانعام مانگو تو بہتر اور مناسب ہے، اس میں کچھ خرابی نہیں، تو اب جو فضل کا طالب ہو اسکو لازم ہے کہ عمل کے ذریعہ سے طلب کرے حسد اور تمنی سے فضل کا طالب نہ ہو۔

اور اللہ تعالیٰ کو ہر ایک چیز کا پورا علم ہے، ہر ایک کے درجے اور اس کے استحقاق کو خوب جانتا ہے اور ہر ایک کے مناسب شان اس سے معاملہ کرتا ہے تو اب جس کو فضیلت عطا کرتا ہے سراسر علم اور حکمت کے مطابق ہے، کوئی اپنی لاعلمی کی وجہ سے کیوں اس میں خلجان کرے۔

وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ؕ وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ

اور ہر کسی کے لئے ہم نے مقرر کردیئے ہیں وارث اس مال کے کہ چھوڑ مریں ماں باپ اور قرابت والے، اور جن سے معاہدہ ہوا تمہارا

فَاٰتُوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا ﴿۳۳﴾

ان کو دے دو ان کا حصہ، بیشک اللہ کے روبرو ہے ہر چیز

خلاصہ تفسیر: (گزشتہ آیت میں عورتوں کی اس تمنا کا جواب تھا کہ میراث میں مرد کو بہ نسبت عورت کے دوہرا حصہ دیا جاتا ہے، اب آگے بھی میراث کے متعلق حکم ارشاد فرماتے ہیں:) اور ہر ایسے مال کے لئے جس کو والدین اور (دوسرے) رشتہ دار لوگ (اپنے مرنے کے بعد) چھوڑ جائیں، ہم نے وارث مقرر کردیئے ہیں، اور جن لوگوں سے تمہارے عہد (پہلے سے) بندھے ہوئے ہیں (اسی کو ''مولی الموالات'' کہتے ہیں) ان کو (اب جبکہ شرع سے رشتہ دار لوگ وارث مقرر ہوگئے، ساری میراث مت دو، بلکہ صرف) ان کا حصہ (یعنی ایک ششم) دے دو، بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر مطلع ہیں (پس ان کو ساری میراث نہ دینے کی حکمت اور چھٹا حصہ مقرر کردینے کی مصلحت اور یہ کہ یہ چھٹا حصہ ان کو کون دیتا ہے کون نہیں دیتا، ان سب کی اللہ کو خبر ہے)۔

وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ: جن دو شخصوں میں باہم اس طرح قول و قرار ہوجائے کہ ہم ایک دوسرے کے اس طرح یار و مددگار رہیں گے کہ اگر ایک شخص کے ذمہ کوئی دیت لازم آئی تو دوسرا بھی اس کا متحمل ہو، اور جب وہ مرجائے تو دوسرا اس کی میراث لے، تو یہ عہد ''عقد موالات'' ہے اور ان میں سے ہر شخص ''مولی الموالات'' کہلاتا ہے، یہ رسم عرب میں اسلام سے پہلے بھی تھی، ابتداء اسلام میں جب تک کہ اکثر مسلمان نہ ہوئے تھے تو اسی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے باہم انصار و مہاجرین میں ''عقد اخوت'' جس کا اثر اسی ''موالات'' کا سا تھا منعقد فرما دیا تھا، یہاں آیت میں جو باہمی معاہدہ کی بناء پر حصہ دینا مذکور ہے، یہ ابتداء اسلام میں تھا، بعد میں سورہ انفال کی آیت: واولوا الارحام بعضھم اولی ببعض سے یہ منسوخ ہوگیا، اب اگر دوسرے ورثاء موجود ہوں تو دو شخصوں کے باہمی معاہدہ کا میراث پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔

* * *

فائدہ: یعنی مرد ہو یا عورت ہر ایک کے لئے تم سے اے مسلمانو! ہم نے وارث مقرر کردیے اس مال کے جس کو چھوڑ مریں والدین اور قرابت والے، کسی کو اس سے محروم نہیں رکھا اور جن لوگوں سے تمہارا معاہدہ ہوا ہے، ان کو ان کا حصہ ضرور پہنچا دو، اللہ تعالیٰ کو تمام امور کا علم ہے کہ وارثوں کا کیا حصہ ہونا چاہیے اور جن سے معاہدہ ہوا ہے، ان کو کیا ملنا چاہیے اور ہمارے ان احکام کو کون بجا لاتا ہے اور کون نافرمانی کرتا ہے۔

فائدہ: اکثر لوگ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اکیلے اکیلے مسلمان ہوگئے تھے اور ان کا سب کنبہ اور تمام اقربا کافر چلے آتے تھے تو اس وقت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے دو دو مسلمانوں کو آپس میں بھائی بھائی کردیا تھا، وہی دونوں آپس میں ایک دوسرے کے وارث ہوتے، جب ان کے اقربا بھی مسلمان ہوگئے تب یہ آیت اتری کہ میراث تو اقربا اور رشتہ داروں ہی کا حق ہے، اب رہ گئے وہ منہ بولے بھائی تو ان کے لئے میراث نہیں، ہاں! زندگی میں ان کے ساتھ سلوک ہے اور مرتے وقت کچھ وصیت کردے تو مناسب ہے، مگر میراث میں کوئی حصہ نہیں۔

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ

مرد حاکم ہیں عورتوں پر اس واسطے کہ بڑائی دی اللہ نے ایک کو ایک پر اور اس واسطے کہ خرچ کئے انہوں نے

اَمۡوَالِهِمۡ ؕ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلۡغَيۡبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ؕ وَالّٰتِیۡ تَخَافُوۡنَ نُشُوۡزَهُنَّ

اپنے مال[1] پھر جو عورتیں نیک ہیں سو تابعدار ہیں نگہبانی کرتی ہیں پیٹھ پیچھے اللہ کی حفاظت سے[2] اور جن کی بدخوئی کا ڈر ہو تم کو

فَعِظُوۡهُنَّ وَاهۡجُرُوۡهُنَّ فِی الۡمَضَاجِعِ وَاضۡرِبُوۡهُنَّ ۚ فَاِنۡ اَطَعۡنَكُمۡ فَلَا تَبۡغُوۡا عَلَيۡهِنَّ

تو ان کو سمجھاؤ اور جدا کرو سونے میں اور مارو[3] پھر اگر کہا مانیں تمہارا تو مت تلاش کرو ان پر

سَبِيۡلًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيۡرًا ﴿۳۴﴾

راہ الزام کی، بیشک اللہ ہے سب سے اوپر بڑا[4]

خلاصہ تفسیر: عورتوں کے متعلق جو احکام گذر چکے اس میں ان کی حق تلفی کی ممانعت بھی مذکور ہوئی، اب یہاں مردوں کے حقوق کا ذکر ہے اور ان کے مطالبہ اور ان کو فوت کرنے کی صورت میں تادیب کی اجازت بھی دی گئی ہے، اس کے ساتھ ہی اس بات کی بھی تصریح ہے کہ مردوں کا درجہ عورتوں سے بڑھا ہوا ہے، اس سے یہ جواب بھی نکل آیا کہ جب مرد، عورت کے مقابلہ میں افضل ہیں تو یہ اشکال نہیں ہونا چاہئے، کہ میراث میں ان کا حصہ عورتوں کی نسبت زیادہ کیوں ہے!!!

مرد حاکم ہیں عورتوں پر (دو وجہ سے: ① ایک تو) اس سبب سے کہ اللہ تعالیٰ نے بعضوں کو (یعنی مردوں کو) بعضوں پر (یعنی عورتوں پر قدرتی) فضیلت دی ہے (یہ تو غیر اختیاری وہبی بات ہے، یعنی اس فضیلت میں مردوں کو خود دخل نہیں محض خدا کا عطیہ ہے) اور (② دوسرے) اس سبب سے کہ مردوں نے (عورتوں پر) اپنے مال (مہر میں اور نان نفقہ میں) خرچ کئے ہیں (اور خرچ کرنے والوں کا ہاتھ اونچا اور بہتر ہوتا ہے اس سے کہ جس پر خرچ کیا جائے اور یہ بات اختیاری اور کسبی ہے، یعنی یہ فضیلت مرد کے عمل، کوشش اور اختیار سے متعلق ہے) سو جو عورتیں نیک ہیں (وہ مرد کے ان فضائل وحقوق کی وجہ سے) اطاعت کرتی ہیں (اور) مرد کی عدم موجودگی میں (بھی) بحفاظت (وتوفیق) الٰہی (اس کی آبرو و مال کی) نگہداشت کرتی ہیں۔

اور جو عورتیں (اس صفت کی نہ ہوں، بلکہ) ایسی ہوں کہ تم کو (قرائن سے) ان کی بد دماغی کا احتمال (قوی) ہو تو ان کو (① اول) زبانی نصیحت کرو اور (نہ مانیں تو ②) ان کو ان کے لیٹنے کی جگہوں میں تنہا چھوڑ دو (یعنی ان کے پاس مت لیٹو) اور (اس سے بھی نہ مانیں تو ③) ان کو (اعتدال کے ساتھ) مارو، پھر اگر وہ تمہاری اطاعت کرنا شروع کردیں تو ان پر (زیادتی کرنے کے لئے) بہانہ (اور موقع) مت ڈھونڈو (کیونکہ) بلاشبہ اللہ تعالیٰ بڑی رفعت اور عظمت والے ہیں (تو خدا سے ڈرنا چاہیے، ان کے حقوق بہت بڑے ہیں، اگر تم ایسا کرو گے تو پھر تم پر بھی عورتیں اپنے حقوق کے متعلق ہزاروں الزام قائم کرسکتی ہیں)۔

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوۡنَ عَلَى النِّسَآءِ: "قوّام، قیام، قیّم" عربی زبان میں اس شخص کو کہا جاتا ہے جو کسی کام یا نظام کا ذمہ دار اور چلانے والا ہو، اسی لئے اس آیت میں **قوّام** کا ترجمہ عموماً "حاکم" کیا گیا ہے، یعنی مرد عورتوں پر حاکم ہیں، مراد یہ ہے کہ ہر اجتماعی نظام کے لئے عقلاً اور عرفاً یہ ضروری ہوتا ہے کہ اس کا کوئی سربراہ یا امیر اور حاکم ہو تاکہ اختلاف کے وقت اس کے فیصلہ سے کام چل سکے، جس طرح ملک وسلطنت اور ریاست کے لئے اس کی ضرورت سب کے نزدیک مسلم ہے، اسی طرح قبائلی نظام میں بھی اس کی ضرورت ہمیشہ محسوس کی گئی اور کسی ایک شخص کو قبیلہ کا سردار اور حاکم مانا گیا ہے، اسی طرح اس عائلی نظام میں جس کو خانہ داری کہا جاتا ہے، اس میں بھی ایک امیر اور سربراہ کی ضرورت ہے، عورتوں اور بچوں کے مقابلہ میں اس کام کے لئے حق تعالیٰ نے مردوں کو منتخب فرمایا کہ ان کی علمی اور عملی قوتیں بہ نسبت عورتوں، بچوں کے زیادہ ہیں اور یہ ایسا بدیہی معاملہ ہے کہ کوئی سمجھدار عورت یا مرد اس کا انکار نہیں کرسکتا۔

بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا: مردوں کی حاکیت کے بیان کے لئے قرآن کریم نے عجیب اسلوب اختیار کیا:
① پہلی غیر اختیاری یعنی وہبی (جس میں کسی کے عمل کا دخل نہیں) وجہ کے بیان میں مختصر طریقہ یہ تھا کہ رجال اور نساء کی طرف ضمیریں عائد کر کے "فضلھم علیھن" فرمادیا جاتا، مگر قرآن کریم نے عنوان بدل کر بعضھم علی بعض کے الفاظ اختیار کئے، اس میں یہ حکمت ہے کہ عورتوں اور مردوں کوایک دوسرے کا بعض اور جزء قرار دے کر اس طرف اشارہ کر دیا کہ اگر کسی چیز میں مردوں کی فوقیت اور افضلیت ثابت بھی ہوجائے تو اس کی ایسی مثال ہے جیسے انسان کا سراس کے ہاتھ سے افضل، یا انسان کا دل اس کے معدہ سے افضل ہے، تو جس طرح سر کا ہاتھ سے افضل ہونا ہاتھ کے مقام اور اہمیت کو کم نہیں کرتا، اسی طرح مرد کا حاکم ہونا عورت کے درجہ کو نہیں گھٹاتا، کیونکہ یہ دونوں ایک دوسرے کے لئے مثل اعضاء واجزاء کے ہیں، مرد سر ہے تو عورت بدن، اور بعض مفسرین نے فرمایا کہ اس عنوان سے اس طرف بھی اشارہ کر دیا گیا ہے کہ یہ افضلیت جو مردوں کو عورتوں پر حاصل ہے یہ جنس اور مجموعہ کے اعتبار سے ہے، جہاں تک افراد کا تعلق ہے تو بہت ممکن ہے کہ کوئی عورت کمالات علمی وعملی میں کسی مرد سے بڑھ جائے اور صفت حاکیت میں بھی مرد سے فائق ہوجائے۔

② دوسری وجہ اختیاری یعنی کسبی (جو محنت وعمل کا اثر ہو) جو یہ بیان کی گئی ہے کہ مرد اپنے مال عورتوں پر خرچ کرتے ہیں، اس میں بھی چند اہم امور کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے، مثلاً ایک تو اس شبہ کا ازالہ ہے جو آیات میراث میں مردوں کا حصہ دوہرا اور عورتوں کا اکہرا ہونے سے پیدا ہوسکتا ہے، کیونکہ اس آیت نے اس کی بھی ایک وجہ بتلادی کہ مالی ذمہ داریاں تمام تر مردوں پر ہیں، عورتوں کا حال تو یہ ہے کہ شادی سے پہلے ان کے تمام مصارف کی ذمہ داری باپ پر ہے، اور شادی کے بعد شوہر پر، اس لئے اگر غور کیا جائے تو مرد کو دوہرا حصہ دینا اس کو کچھ زیادہ دینا نہیں ہے، وہ پھر لوٹ کر عورتوں ہی کو پہنچ جاتا ہے۔

دوسرا اشارہ ایک اہم اصول زندگی کے متعلق یہ بھی ہے کہ عورت اپنی خلقت اور فطرت کے اعتبار سے نہ اسکی متحمل ہے کہ اپنے مصارف خود کما کر پیدا کرے، نہ اسکے حالات اس کیلئے سازگار ہیں کہ وہ محنت، مزدوری اور دوسرے ذرائع کسب میں مردوں کی طرح دفتروں اور بازاروں میں پھرا کرے، اس لئے حق تعالیٰ نے اسکی پوری ذمہ داری مردوں پر ڈال دی، شادی سے پہلے باپ اسکا متکفل ہے اور شادی کے بعد شوہر، اسکے بالمقابل نسل بڑھانے کا ذریعہ عورت کو بنایا گیا ہے، بچوں کی اور امور خانہ داری کی ذمہ داری بھی اسی پر ڈال دی گئی ہے، جبکہ مردان امور کا متحمل نہیں ہوسکتا، اس لئے یہ نہیں سمجھا جاسکتا کہ عورت کو اپنے نفقات میں مرد کا محتاج کر کے اسکا رتبہ کم کر دیا گیا ہے، بلکہ تقسیم کار کے اصول پر ڈیوٹیاں تقسیم کردی گئی ہیں، ہاں! ڈیوٹیوں کے درمیان جو باہم تفاضل (فرق مراتب) ہوا کرتا ہے وہ یہاں بھی ہے، خلاصہ یہ ہے کہ ان دونوں وجہوں کے ذریعہ یہ بتلادیا گیا کہ مردوں کی حاکیت سے نہ عورتوں کا کوئی درجہ کم ہوتا ہے اور نہ ان کی اس میں کوئی منفعت ہے، بلکہ اسکا فائدہ بھی عورتوں ہی کی طرف عائد ہوتا ہے۔

وَالّٰتِيْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ: بیوی کی اصلاح وتنبیہ میں ابتدائی دوسزائیں تو شریفانہ ہیں، اس لئے انبیاء وصلحا سے قولاً بھی ان کی اجازت منقول ہے اور اس پر عمل بھی ثابت ہے، مگر تیسری سزا یعنی مار پیٹ کی، اگرچہ بدرجہ مجبوری ایک خاص انداز میں مرد کو اجازت دی گئی ہے، مگر اس کے ساتھ ہی حدیث میں یہ بھی ارشاد ہے: "ولن یضرب خیارکم"، یعنی اچھے مرد یہ مارنے کی سزا عورتوں کو نہ دیں گے، چنانچہ انبیاء علیہم السلام سے کہیں ایسا عمل منقول نہیں، اسی لیے اس تیسرے درجہ کی سزا کے استعمال کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پسند نہیں فرمایا، بلکہ ارشاد فرمایا کہ: "شریف اور بھلے لوگ ایسا نہیں کریں گے"۔

آیت سے بنیادی اصول کی حیثیت سے جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ اگرچہ پچھلی آیات کے ارشادات کے مطابق مردوں اور عورتوں کے حقوق باہم متماثل ہیں بلکہ عورتوں کے حقوق کی ادائیگی کا اس وجہ سے زیادہ اہتمام کیا گیا ہے کہ وہ بہ نسبت مرد کے ضعیف ہیں، اپنے حقوق اپنی قوت بازو کے ذریعہ مرد سے حاصل نہیں کرسکتیں، لیکن اس مساوات کے یہ معنی نہیں کہ عورت ومرد میں کوئی تفاضل یا درجہ کا کوئی فرق ہی نہ ہو، بلکہ بتقضائے حکمت وانصاف دو سبب سے مردوں کو عورتوں پر حاکم بنایا گیا ہے:

① اول: تو جنس مرد کو اپنے علمی اور عملی کمالات کے اعتبار سے عورت کی جنس پر ایک خداداد فضیلت اور فوقیت حاصل ہے، جس کا حصول جنس عورت کے لئے ممکن نہیں، افراد واحاد اور اتفاقی واقعات کا معاملہ الگ ہے۔

② دوسرے یہ کہ عورتوں کی تمام ضروریات کا تکفل مرد اپنی کمائی اور اپنے مال سے کرتے ہیں۔

پہلا سبب وہبی غیر اختیاری اور دوسرا کسبی اور اختیاری ہے اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ایک ہی ماں باپ کی اولاد میں سے بعض کو حاکم بعض کو محکوم بنانے کے لئے عقل وانصاف کی رو سے دو چیزیں ضروری تھیں: ① ایک جس کو حاکم بنایا جائے اس میں علم وعمل کے اعتبار سے حاکمیت کی صلاحیت ② دوسرے اس کی حاکمیت پر محکوم کی رضامندی، پہلا سبب مرد کی صلاحیت حاکمیت کو واضح کر رہا ہے اور دوسرا سبب محکوم کی رضامندی کو، کیونکہ بوقت نکاح جب عورت اپنے مہر اور نان نفقہ کے تکفل کی شرط پر نکاح کی اجازت دیتی ہے تو اس کی اس حاکمیت کو تسلیم اور منظور کرتی ہے، الغرض اس آیت کے پہلے جملہ میں خانگی اور عائلی نظام کا ایک بنیادی اصول بتلایا گیا ہے کہ اکثر چیزوں میں مساوات حقوق کے باوجود مرد کو عورت پر ایک فضیلت حاکمیت کی حاصل ہے اور عورت محکوم وتابع ہے۔

اس بنیادی اصول کے ماتحت عملی دنیا میں عورتوں کے دو طبقے ہو گئے: ① ایک وہ جنہوں نے اس بنیادی اصول اور اپنے معاہدہ کی پابندی کی اور مرد کی حاکمیت کو تسلیم کر کے اس کی اطاعت کی ② دوسرے وہ جو اس اصول پر پوری طرح قائم نہ رہا۔

پہلا طبقہ تو خانگی امن واطمینان کا خود ہی کفیل ہے، اس کو کسی اصلاح کی حاجت نہیں، دوسرے طبقہ کی اصلاح کے لئے آیت کے دوسرے جملہ میں ایک ایسا مرتب نظام بتلایا گیا کہ جس کے ذریعہ گھر کی اصلاح گھر کے اندر ہی ہو جائے اور میاں بیوی کا جھگڑا انہیں دونوں کے درمیان نمٹ جائے، کسی تیسرے کی مداخلت کی ضرورت نہ ہو، اس میں مردوں کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا گیا کہ اگر عورتوں سے نافرمانی یا اطاعت میں کچھ کمی محسوس کرو تو سب سے پہلا کام یہ کرو کہ سمجھا بجھا کر ان کی ذہنی اصلاح کرو، اس سے کام چل گیا تو معاملہ یہیں ختم ہو گیا عورت ہمیشہ کے لئے گناہ سے اور مرد قلبی اذیت سے اور دونوں رنج وغم سے بچ گئے اور اگر فہمائش سے کام نہ چلا تو دوسرا درجہ یہ ہے کہ ان کو تنبیہ کرنے اور اپنی ناراضی کا اظہار کرنے کے لئے خود علیحدہ بستر پر سو، یہ ایک معمولی سزا اور بہترین تنبیہ ہے، اس سے عورت متنبہ ہو گئی تو جھگڑا یہیں ختم ہو گیا اور اگر وہ اس شریفانہ سزا پر بھی اپنی نافرمانی اور کج روی سے باز نہ آئی تو تیسرے درجہ میں معمولی مار مارنے کی بھی اجازت دے دی گئی جس کی حد یہ ہے کہ بدن پر اس مار کا اثر وزخم نہ ہو۔

فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا: اس میں اس بات کی مذمت ہے کہ محض نفسانی بغض کی وجہ سے سزا دینے کے لیے کوئی حیلہ ڈھونڈا جائے جو کہ واقع میں سزا کا سبب نہ ہو (جیسا کہ بعض ذمہ دار لوگ اپنے ماتحتوں کو سزا دینے میں زیادتی کر دیتے ہیں)۔

* * *

فائدہ: وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ: پہلی آیتوں میں مذکور تھا کہ مرد اور عورتوں کے حقوق کی پوری رعایت فرمائی گئی، اگر رعایت حقوق میں فرق ہوتا تو عورتوں کو شکایت کا موقع ہوتا، اب اس آیت میں مرد اور عورت کے درجہ کو بتلاتے ہیں کہ مرد کا درجہ بڑھا ہوا ہے عورت کے درجہ سے، اس لئے فرق مدارج کے باعث جو احکام میں فرق ہوگا وہ سراسر حکمت اور قابل رعایت ہوگا، اس میں عورت اور مرد بقاعدہ حکمت ہرگز برابر نہیں ہو سکتے، عورتوں کو اس کی خواہش کرنی بالکل بے جا ہے، خلاصہ یہ ہوا کہ مردوں کو عورتوں پر اللہ تعالیٰ نے حاکم اور نگران حال بنایا دو وجہ سے:

① اول بڑی اور وہبی وجہ تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اصل سے بعضوں کو بعضوں پر، یعنی مردوں کو عورتوں پر علم وعمل میں کہ جن دونوں پر تمام کمالات کا مدار ہے، فضیلت اور بڑائی عطا فرمائی، جس کی تشریح احادیث میں موجود ہے۔

② دوسری وجہ جو کسبی ہے یہ ہے کہ مرد عورتوں پر اپنا مال خرچ کرتے ہیں اور مہر اور خوراک اور پوشاک جملہ ضروریات کا تکفل کرتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ عورتوں کو مردوں کی حکم برداری چاہئے۔

فائدہ: ایک صحابیہ نے اپنے خاوند کی نافرمانی بہت کی، آخر کو مرد نے ایک طمانچہ مارا، عورت نے اپنے باپ سے فریاد کی، عورت کے باپ

نے حضرت محمد ﷺ کی خدمت میں آکر احوال ظاہر کیا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ خاوند سے بدلہ لیوے، اتنے میں یہ آیت اتری اس پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہم نے کچھ چاہا، اور اللہ تعالیٰ نے کچھ اور چاہا، اور جو کچھ اللہ نے چاہا وہی خیر ہے۔

فائدہ: ۲ حٰفِظٰتٌ لِّلۡغَیۡبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰہُ: یعنی جو عورتیں نیک ہیں وہ مردوں کی تابعداری کرتی ہیں اور اللہ کے حکم کے موافق خاوند کے پیٹھ پیچھے اسکی رضا کے موافق اپنے نفس اور خاوند کے مال کی حفاظت کرتی ہیں، اپنے نفس اور مال زوج میں کسی قسم کی خیانت نہیں کرتیں۔

فائدہ: ۳ وَاهۡجُرُوۡهُنَّ فِی الۡمَضَاجِعِ وَاضۡرِبُوۡهُنَّ: یعنی اگر کوئی عورت خاوند سے بدخوئی کرے تو: ① پہلا درجہ تو یہ ہے کہ مرد اس کو زبانی فہمائش کرے اور سمجھائے اگر نہ مانے تو ② دوسرا درجہ یہ ہے کہ جدا سوئے، لیکن اسی گھر میں، اس پر بھی نہ مانے تو ③ آخری درجہ یہ ہے کہ اس کو مارے بھی، پر نہ ایسا کہ جس کا نشان باقی رہے، یا ہڈی ٹوٹے، ہر تقصیر کا ایک درجہ ہے، اسی کے موافق تادیب اور تنبیہ کی اجازت ہے، جس کے تین درجے ترتیب وار آیت میں مذکور ہیں، اور مارنا پیٹنا آخر کا درجہ ہے، سرسری قصور پر نہ مارے، ہاں! قصور زیادہ ہو پھر مارنے میں حرج نہیں، جس قدر مناسب ہو مارے پیٹے، مگر اس کا لحاظ رہے کہ ہڈی نہ ٹوٹے اور نہ ایسا زخم پہنچائے کہ جس کا نشان باقی رہ جائے۔

فائدہ: ۴ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلِیًّا کَبِیۡرًا: یعنی وہ عورتیں تمہاری نصیحت یا علیحدگی یا ضرب و تادیب کے بعد اگر بدخوئی اور نافرمانی سے باز آجائیں اور بظاہر مطیع ہو جائیں تو تم بھی بس کر جاؤ اور ان کے قصوروں کی کھود کرید مت کرو اور خواہ مخواہ ان کے ملزم بنانے میں خدا سے ڈرو، بیشک اللہ تم سب سے غالب اور سب پر حاکم ہے، نہ عورتوں کے معاملہ میں خواہ مخواہ کی بدگمانی سے کام لو اور نہ تھوڑے قصور پر اخیر کی سزا دینے لگو، بلکہ ہر قصور کی ایک حد ہے اور مارنا اخیر کا درجہ ہے۔

وَاِنۡ خِفۡتُمۡ شِقَاقَ بَیۡنِهِمَا فَابۡعَثُوۡا حَکَمًا مِّنۡ اَهۡلِهٖ وَحَکَمًا مِّنۡ اَهۡلِهَا ۚ

اور اگر تم ڈرو کہ وہ دونوں آپس میں ضد رکھتے ہیں تو کھڑا کرو ایک منصف مرد والوں میں سے اور ایک منصف عورت والوں میں سے ۱؎

اِنۡ یُّرِیۡدَاۤ اِصۡلَاحًا یُّوَفِّقِ اللّٰہُ بَیۡنَهُمَا ؕ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلِیۡمًا خَبِیۡرًا ﴿۳۵﴾

اگر یہ دونوں چاہیں گے کہ صلح کرادیں تو اللہ موافقت کردے گا ان دونوں میں، بیشک اللہ سب کچھ جاننے والا خبردار ہے ۲؎

خلاصہ تفسیر: گذشتہ آیت میں مردوں کے حقوق کا ذکر تھا، اب اس آیت میں زوجین کے درمیان حقوق میں اختلاف واقع ہونے کی صورت میں اس کے تصفیہ کا طریق اور حقوق ادا کرنے والوں کی فضیلت بیان کی جاتی ہے۔

اور اگر (قرائن سے) تم اوپر والوں کو ان دونوں میاں بیوی میں (ایسی کھینچا تانی کا) اندیشہ ہو (کہ جس کو وہ باہم نہ سلجھا سکیں گے) تو تم لوگ ایک آدمی جو تصفیہ کرنے کی لیاقت رکھتا ہو، مرد کے خاندان سے اور ایک آدمی جو (ایسا ہی) تصفیہ کرنے کی لیاقت رکھتا ہو عورت کے خاندان سے (تجویز کر کے اس کھینچا تانی کو ختم کرنے کے لئے ان کے پاس) بھیجو (کہ وہ جا کر تحقیق حال کریں، اور جو غلطی پر ہو، یا دونوں کا کچھ کچھ قصور ہو سمجھا دیں)۔

اگر ان دونوں آدمیوں کو (نیک نیتی اور سچے دل سے معاملہ کی) اصلاح منظور ہوگی تو اللہ تعالیٰ ان میاں بیوی میں (بشرطیکہ میاں بیوی ان دونوں کی رائے پر عمل بھی کریں) اتفاق فرمادیں گے، بلاشبہ اللہ تعالیٰ بڑے علم اور بڑے خبر والے ہیں (جس طریقہ سے ان میں باہم مصالحت ہو سکتی ہے اس کو جانتے ہیں، جب حکمین کی نیت ٹھیک دیکھیں گے تو وہ طریقہ ان کے دل میں القاء فرمادیں گے)۔

وَاِنۡ خِفۡتُمۡ شِقَاقَ بَیۡنِهِمَا: گذشتہ آیت میں وہ نظام بیان کیا تھا کہ جس کے ذریعہ گھر کا جھگڑا گھر ہی میں ختم ہو جائے، لیکن بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ جھگڑا طول پکڑ لیتا ہے، خواہ اس وجہ سے کہ عورت کی طبیعت میں تمرد و سرکشی ہو، یا اس بناء پر کہ مرد کا قصور اور اس کی طرف سے بے جا تشدد ہو، بہر حال اس صورت میں گھر کی بات کا باہر نکلنا تو لازمی ہے، لیکن عام عادت کے مطابق تو یہ ہوتا ہے کہ طرفین کے حامی ایک دوسرے کو برا

کہتے ہیں اور الزام لگاتے پھرتے ہیں، جس کا نتیجہ جانبین سے اشتعال اور پھر دو شخصوں کی لڑائی خاندانی جھگڑے کی صورت اختیار کر لیتی ہے، اب اس آیت میں قرآن کریم نے اس فساد عظیم کا دروازہ بند کرنے کے لئے حکام وقت، فریقین کے اولیاء اور حامیوں کو اور مسلمانوں کی جماعتوں کو خطاب کر کے ایک ایسا پاکیزہ طریقہ بتلایا جس سے فریقین کا اشتعال بھی ختم ہو جائے اور الزام تراشی کے راستے بھی بند ہو جائیں اور ان کے آپس میں مصالحت کی راہ نکل آئے اور گھر کا جھگڑا اگر گھر میں ختم نہیں ہوا تو کم از کم خاندان ہی میں ختم ہو جائے، عدالت میں مقدمہ کی صورت میں کوچہ و بازار میں یہ جھگڑا نہ چلے، وہ یہ کہ ارباب حکومت یا فریقین کے اولیاء یا مسلمان کی کوئی مقتدر جماعت یہ کام کرے کہ ان کے آپس میں مصالحت کرانے کے لیے دو حکم مقرر کریں: ① ایک مرد کے خاندان سے ② دوسرا عورت کے خاندان سے، اور ان دونوں جگہ لفظ حکم سے تعبیر کر کے قرآن کریم نے ان دونوں شخصوں کے ضروری اوصاف کو بھی متعین کر دیا کہ ان دونوں میں جھگڑوں کے فیصلہ کرنے کی صلاحیت موجود ہو اور یہ صلاحیت ظاہر ہے کہ اسی شخص میں ہو سکتی ہے جو ذی علم بھی ہو اور دیانتدار بھی، خلاصہ یہ ہے کہ ایک حکم مرد کے خاندان کا اور ایک عورت کے خاندان کا مقرر کر کے دونوں میاں بیوی کے پاس بھیجے جائیں، اب وہاں جا کر یہ دونوں کیا کام کریں اور ان کے اختیارات کیا ہیں؟! قرآن کریم نے اس کو متعین نہیں فرمایا، البتہ آخر میں ایک جملہ یہ ارشاد فرمایا کہ اگر یہ دونوں حکم اصلاح حال اور باہمی مصالحت کا ارادہ کریں گے تو اللہ تعالیٰ ان کے کام میں امداد فرما دیں گے اور میاں بیوی میں اتفاق پیدا کر دیں گے، اس جملہ سے دو باتیں مفہوم ہوئیں:

① اول تو یہ کہ مصالحت کرانے والے دونوں حکم اگر نیک نیت ہوں اور دل سے چاہیں کہ باہم صلح ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی غیبی امداد ہو گی، کہ یہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں گے اور ان کے ذریعہ دونوں میاں بیوی کے دلوں میں اللہ تعالیٰ اتفاق و محبت پیدا فرما دیں گے، اس کے نتیجہ سے یہ بھی سمجھا سکتا ہے کہ جہاں باہمی مصالحت نہیں ہو پاتی تو دونوں حکمین میں سے کسی جانب اخلاص کے ساتھ صلح جوئی میں کمی ہوتی ہے۔

② دوسری بات اس جملہ سے یہ بھی سمجھی جاتی ہے کہ ان دونوں حکمین کے بھیجنے کا مقصد میاں بیوی میں صلح کرانا ہے، اس سے زیادہ کوئی کام حکمین کے بھیجنے کے مقصد میں شامل نہیں، یہ دوسری بات ہے کہ فریقین رضامند ہو کر انہیں دونوں حکموں کو اپنا وکیل، مختار یا ثالث بنا دیں اور یہ تسلیم کر لیں کہ تم دونوں مل کر جو فیصلہ بھی ہمارے حق میں دو گے ہمیں منظور ہو گا، اس صورت میں یہ دونوں حکم کلی طور پر ان کے معاملہ کے فیصلہ میں مختار ہو جائیں گے، دونوں طلاق پر متفق ہو جائیں تو طلاق ہو جائے گی، دونوں مل کر خلع وغیرہ کی کوئی صورت طے کر دیں تو وہی فریقین اور مرد کی جانب سے دیئے ہوئے اختیار کی بنا پر عورت کو طلاق دیدیں تو فریقین کو ماننا پڑے گی، سلف میں حسن بصری اور امام ابوحنیفہ کی یہی تحقیق ہے۔

اِنۡ یُّرِیۡدَاۤ اِصۡلَاحًا یُّوَفِّقِ اللّٰہُ بَیۡنَہُمَا: یعنی اگر فیصلہ کرنے والوں کی نیت ٹھیک ہو گی تو وہ طریقہ ان کے دل میں القا فرما دیں گے جس سے میاں بیوی میں باہم مصالحت ہو سکے، بشرطیکہ میاں بیوی اس طریقہ پر عمل بھی کریں، یہ مطلب نہیں کہ فیصلہ کرنے والوں کی نیت ٹھیک ہونے سے خود بخود مصالحت ہو جائے گی، بلکہ مراد یہ ہے کہ ہم مصالحت کا طریقہ ان کے دل میں ڈال دیں گے کہ اگر میاں بیوی اس پر عمل کریں تو کھینچا تانی ختم ہو جائے، کیونکہ ظاہر ہے کہ فیصلہ کرنے والوں کی جو تجویز ہو گی وہ میاں بیوی کے اختیاری افعال سے متعلق ہو گی، اور اختیاری افعال کا نتیجہ ان پر عمل کرنے سے ہی ظاہر ہوا کرتا ہے، اور خدا تعالیٰ کی عادت ہے کہ جب کوئی شخص مصالحت اور اصلاح کا طالب ہو تو اس کا طریقہ ضرور اس کو سمجھا دیتے ہیں، اور اگر میاں بیوی فیصلہ کرنے والوں کو طلاق یا صلح کا حق بھی دے دیں تو بطور وکیل وہ اس کے بھی مختار ہو جائیں گے، مگر آیت میں اس سے تعرض نہیں، اور یہ فیصلہ کرنا حکام پر تو واجب ہے جبکہ میاں بیوی ان سے رجوع کریں اور دوسروں کے لیے مستحب ہے، اور فیصلہ کرنے والوں کا مرد و عورت کے خاندان سے ہونا ہر حال میں مستحب ہے۔

* * *

فائدہ: لہ حَکَمًا مِّنۡ اَہۡلِہٖ وَحَکَمًا مِّنۡ اَہۡلِہَا: یعنی اے مسلمانو! اگر تم کو اندیشہ ہو کہ خاوند اور عورت میں مخالفت اور ضد ہے، وہ اپنے باہمی نزاع کو خود نہ سلجھا سکیں گے تو تم کو چاہیے کہ ایک منصف مرد کے اقارب میں سے اور ایک منصف عورت کے اقارب میں سے مقرر کر کے

بغرض فیصلہ زوجین کے پاس بھیجو، کیونکہ اقارب کو ان کے حالات بھی زیادہ معلوم ہونگے اور ان سے خیر خواہی کی بھی زیادہ امید ہے، یہ دونوں منصف احوال کی تحقیق کریں گے اور جس کا جتنا قصور دیکھیں گے اس کو سمجھا کر باہم موافقت کرا دیں گے۔

فائدہ: ۲۔ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا خَبِيْرًا: یعنی اگر دونوں منصف اصلاح بین الزوجین کا قصد کریں گے تو اللہ تعالیٰ ان کی حسن نیت اور حسن سعی سے زوجین میں موافقت کرا دے گا، بیشک اللہ تعالیٰ کو تمام چیزوں کا علم اور اطلاع ہے، رفع نزاع اور حصول اتفاق کے اسباب اور کیفیات اس کو خوب معلوم ہیں، اس لئے نزاع زوجین کے رفع ہونے میں کوئی دشواری نہ ہوگی ان شاء اللہ۔

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ

اور بندگی کرو اللہ کی اور شریک نہ کرو اس کا کسی کو ۱ اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو اور قرابت والوں کے ساتھ اور یتیموں اور فقیروں

وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۭ

اور ہمسایہ قریب اور ہمسایہ اجنبی اور پاس بیٹھنے والے اور مسافر کے ساتھ، اور اپنے ہاتھ کے مال یعنی غلام باندیوں کے ساتھ

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرَا ۙ (۳۶)

بیشک اللہ کو پسند نہیں آتا اترانے والا بڑائی کرنے والا ۲۔

خلاصہ تفسیر: گذشتہ آیات میں یتیم، ورثاء اور زوجین کے حقوق کو بیان فرمایا، اب یہاں سے عام انسانوں کے حقوق بیان فرماتے ہیں کہ والدین اور اقارب کے ساتھ کیا معاملہ رکھنا چاہیے، سب سے پہلے حق تعالیٰ نے اپنے حق یعنی ایمان اور عبادت کو بیان فرمایا کہ خالق کا حق مخلوق کے حق سے مقدم ہے اور حقوق العباد بھی صحیح طور پر وہی شخص ادا کر سکتا ہے جو شخص اللہ اس کے رسول اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو، اس لیے سب سے پہلے ایمان کو بیان فرمایا، پھر اعمال صالحہ اور مکارم اخلاق کی تعلیم دی، پھر اخلاق ذمیمہ یعنی بخل، تکبر اور ریاء وغیرہ کی مذمت فرمائی، اس لیے کہ تکبر اور بخل حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی میں مانع اور رکاوٹ بنتے ہیں۔

اور تم اللہ کی عبادت اختیار کرو (اس میں توحید بھی آ گئی) اور اس کے ساتھ کسی چیز کو (خواہ وہ انسان ہو یا غیر انسان عبادت میں یا ان کی خاص صفات میں، اعتقاد میں) شریک مت کرو، اور (اپنے) والدین کے ساتھ اچھا معاملہ کرو، اور (دوسرے) اہل قرابت کے ساتھ بھی، اور یتیموں کے ساتھ بھی، اور غریب غرباء کے ساتھ بھی، اور پاس والے پڑوسی کے ساتھ بھی، اور دور والے پڑوسی کے ساتھ بھی، اور ہم مجلس کے ساتھ بھی (خواہ وہ مجلس دائمی ہو جیسے طویل سفر کی رفاقت، اور کسی مباح کام میں شرکت، یا مجلس عارضی ہو جیسے مختصر سفر، یا اتفاقی جلسہ میں شرکت) اور راہ گیر کے ساتھ بھی (خواہ وہ خاص تمہارا مہمان ہو یا نہ ہو) اور ان (غلام لونڈیوں) کے ساتھ بھی جو (شرعاً) تمہارے مالکانہ قبضہ میں ہیں۔

(غرض ان سب سے اچھا معاملہ کرو، جس کی تفصیل شریعت نے دوسرے موقع پر بتلا دی ہے، اور جو لوگ ان حقوق کو ادا نہیں کرتے، اکثر اس کے کئی سبب ہیں: ① یا تو ان کے مزاج میں تکبر ہے کہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتے اور کسی کی طرف التفات ہی نہیں کرتے ② یا ان کی طبیعت میں بخل غالب ہے کہ کسی کو دیتے دلاتے جان نکلتی ہے ③ یا ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اعتقاد نہیں کہ آپ کے احکام اور حقوق ادا کرنے یا نہ کرنے پر ثواب وعذاب کی وعیدوں کو صحیح نہیں سمجھتے جو کہ کفر ہے ④ یا ان کی عادت نمائش اور نام ونمود کی ہے، اس لئے جہاں نام ونمود ہوا گرچہ حق نہ ہو وہاں خرچ کرتے ہیں، اور جہاں نام ونمود نہ وہاں ہمت نہیں ہوتی اگرچہ حق ہو ⑤ یا ان کو سرے سے اللہ تعالیٰ ہی کے ساتھ اعتقاد نہیں ⑥ یا وہ قیامت کے قائل نہیں اور یہ بھی کفر ہے، اس لئے جو ان امور کا انفرادی یا اجتماعی ارتکاب کرتے ہیں ان کا حال بھی سن لو کہ) بیشک اللہ تعالیٰ ایسے شخصوں سے محبت نہیں رکھتے جو (دل

میں) اپنے کو بڑا سمجھتے ہوں (زبان سے) شیخی کی باتیں کرتے ہوں۔

مذکورہ اہل حقوق اگر کافر بھی ہوں تب بھی ان کے ساتھ احسان کرے، البتہ مسلمان کا حق اسلام کی وجہ سے ان سے زائد ہوگا۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا: اس کے عموم میں وہ شخص بھی داخل ہو گیا جو اپنی محنت و کوشش پر عجب اور اپنے احوال و مقامات پر فخر کرتا ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی عبادت اور نیک عمل خدا پر یقین کر کے اور ثواب آخرت کی توقع سے کرو، فخر اور ریا سے مال دینا یہ بھی شرک ہے، گو کم درجہ کا ہے۔

فائدہ: ۲ یتامی اور نساء اور ورثاء اور زوجین کے حقوق اور ان کے ساتھ حسن معاملہ کو بیان فرما کر اب یہ ارشاد ہے کہ ہر ایک کا حق درجہ بدرجہ تعلق کے موافق اور حاجت مندی کے مناسب ادا کرو، سب سے مقدم اللہ تعالیٰ کا حق ہے، پھر ماں باپ کا، پھر درجہ بدرجہ سب واسطہ داروں اور حاجت مندوں کا، ہمسایہ قریب اور غیر قریب سے مراد: ① قرب و بعد نسبی ہے ② یا قرب و بعد مکانی، صورت اولیٰ میں یہ مطلب ہوگا کہ ہمسایہ قرابتی کا حق ہمسایہ اجنبی سے زیادہ ہوگا، صورت ثانیہ کا مدعا یہ ہوگا کہ پاس کے ہمسایہ کا حق ہمسایہ بعید یعنی جو کہ فاصلہ سے رہتا ہے اس سے زیادہ ہے۔

''پاس بیٹھنے والے میں'' رفیق سفر اور پیشہ کے اور کام کے شریک، اور ایک آقا کے دو نوکر، اور ایک استاد کے دو شاگرد، اور دوست، اور شاگرد اور مرید وغیرہ سب داخل ہیں، اور ''مسافر'' میں مہمان غیر مہمان دونوں آ گئے اور ''مال مملوک'' غلام اور لونڈی کے علاوہ دیگر حیوانات کو بھی شامل ہے۔

آخر میں فرمادیا کہ جس کے مزاج میں تکبر اور خود پسندی ہوتی ہے کہ کسی کو اپنے برابر نہ سمجھے، اپنے مال پر مغرور اور عیش میں مشغول ہو وہ ان حقوق کو ادا نہیں کرتا سو اس سے احتراز رکھو اور حذر رہو۔

الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَأْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَيَكْتُمُوْنَ مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ط

وہ لوگ جو بخل کرتے ہیں اور سکھاتے ہیں لوگوں کو بخل اور چھپاتے ہیں جو ان کو دیا اللہ نے اپنے فضل سے

وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ۝۳۷

اور تیار کر رکھا ہے ہم نے کافروں کے لئے عذاب ذلت کا

خلاصہ تفسیر: جو کہ بخل کرتے ہوں اور دوسرے لوگوں کو بھی بخل کی تعلیم کرتے ہوں (خواہ زبان سے، یا اس طرح کہ ان کو دیکھ کر دوسرے بھی سیکھتے ہیں) اور وہ اس چیز کو پوشیدہ رکھتے ہوں جو اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے فضل سے دی ہے، اور ہم نے ایسے ناسپاسوں کے لئے (جو مال کی نعمت یا رسالت محمدیہ کی نعمت کا حق نہ پہچانیں) اہانت آمیز سزا تیار کر رکھی ہے۔

الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَأْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ: ''بخل'' سے مراد اس جگہ عام ہے خواہ مال و دولت میں بخل ہو، یا حق بات ظاہر کرنے میں بخل ہو، اس آیت کے متعدد شان نزول ہیں، بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ علماء یہود تورات کے مضامین ظاہر کرنے میں بخل کرتے تھے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی، ایک روایت میں ہے کہ بعض لوگ انصار کو خرچ کرنے سے روکتے اور سمجھاتے تھے اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

وَيَكْتُمُوْنَ مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ: ''فضل'' سے مراد یا تو مال و دولت ہے جب کہ کسی مصلحت کے بغیر صرف بخل کی وجہ سے چھپائے تاکہ اہل حقوق ان سے توقع ہی نہ کریں، یا مراد علم دین ہے جیسا کہ یہود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خبروں کو چھپایا کرتے تھے، پس بخل بھی عام ہو جائے گا، پس اس میں بخیلوں اور منکرین رسالت دونوں کی مذمت ہو گئی۔

* * *

فائدہ: یعنی اللہ تعالیٰ دوست نہیں رکھتا خود پسند اور تکبر کرنے والوں کو جو کہ بخل کرتے ہیں اور اپنے مال اور علم خداداد کو لوگوں سے چھپاتے ہیں، کسی کو نفع نہیں پہنچاتے اور قولاً اور عملاً دوسروں کو بھی بخل کی ترغیب دلاتے ہیں اور ان کافروں کیلئے ہم نے ذلت کا عذاب تیار کر رکھا ہے۔

فائدہ: یہ آیت یہودیوں کے بارے میں نازل ہوئی جو فی سبیل اللہ خرچ کرنے میں خود بھی بخل کرتے تھے اور مسلمانوں کو بھی روکنا چاہتے تھے اور رسول اللہ ﷺ کے اوصاف جو توریت میں مذکور تھے اور حقانیت اسلام کی آیات جو موجود تھیں ان کو چھپاتے تھے، سو مسلمانوں کو اس سے احتراز لازم ہے۔

وَالَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ

اور وہ لوگ جو خرچ کرتے ہیں اپنے مال لوگوں کے دکھانے کو اور ایمان نہیں لاتے اللہ پر اور نہ قیامت کے دن پر

وَمَنْ يَّكُنِ الشَّيْطٰنُ لَهٗ قَرِيْنًا فَسَآءَ قَرِيْنًا ﴿۳۸﴾

اور جس کا ساتھی ہوا شیطان تو وہ بہت برا ساتھی ہے

خلاصہ تفسیر: اور جو لوگ کہ اپنے مالوں کو لوگوں کے دکھلانے کے لئے خرچ کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ پر اور آخری دن (یعنی قیامت کے دن) پر اعتقاد نہیں رکھتے (ان کا بھی یہی حال ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ان سے محبت نہیں) اور (بات یہ ہے کہ) شیطان جس کا مصاحب ہو (جیسا ان مذکورہ لوگوں کا ہوا ہے) تو وہ اس کا برا مصاحب ہے (کیونکہ وہ ایسا مشورہ دیتا ہے جس میں انجام کار سخت نقصان ہو)۔

❊ ❊ ❊

فائدہ: اور خود پسند متکبر وہ لوگ ہیں کہ اپنا مال لوگوں کے دکھانے کو خرچ کرتے ہیں، یعنی اللہ کے لئے خرچ کرنے میں تو خود بھی بخل کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی بخل کی ترغیب دیتے ہیں، لیکن لوگوں کے دکھانے کو اپنا مال خرچ کرتے رہتے ہیں اور ان کو نہ اللہ پر ایمان ہے نہ قیامت کے دن پر کہ حصول رضائے حق تعالیٰ اور تحصیل ثواب اخروی ان کو مقصود ہو، اور اللہ کے یہاں مقبول اور پسندیدہ یہ ہے کہ ان حقداروں کو دیا جائے جن کا اول ذکر ہو چکا ہے اور دینے میں اللہ کی خوشنودی اور آخرت کے ثواب کی توقع ہو۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ اللہ کی راہ میں جیسا بخل کرنا برا ہے، ویسا ہی لوگوں کے دکھانے کو خرچ کرنا برا ہے، اور ایسا کام وہی کرتے ہیں جن کا رفیق شیطان ہے جو ان کو ایسے کام پر آمادہ کرتا ہے۔

وَمَاذَا عَلَيْهِمْ لَوْ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِهِمْ عَلِيْمًا ﴿۳۹﴾

اور کیا نقصان تھا انکا اگر ایمان لاتے اللہ پر اور قیامت کے دن پر اور خرچ کرتے اللہ کے دیئے ہوئے میں سے، اور اللہ کو انکی خوب خبر ہے

خلاصہ تفسیر: ماقبل کی آیات میں انکار خدا، انکار آخرت اور بخل وغیرہ کی مذمت مذکور تھی، اب آگے خدا اور آخرت پر ایمان لانے کی اور خرچ کرنے کی ترغیب دیتے ہیں، اگرچہ لفظاً صرف ایمان باللہ کا ذکر ہے مگر خدا پر ایمان لانا رسول پر ایمان لانے کو بھی مستلزم ہے، اور خرچ کرنے سے مراد لوجہ اللہ خرچ کرنا ہے جو کہ ریا کے مقابل ہے، اور اسی میں کبر کا بھی علاج ہے، کیونکہ کبر میں جاہ کی طلب ہوتی ہے، سو بتلا دیا کہ ہر کام میں خدا کی ذات مطلوب ہونی چاہیے نہ کہ جاہ وغیرہ، کیونکہ جاہ کا طالب خدا کا طالب نہیں ہوگا، پس یہ گذشتہ مضمون کا تتمہ ہے، وہاں انکار توحید و قیامت اور بخل، کبر اور ریا وغیرہ کی مذمت و ممانعت تھی یہاں ان کی اضداد کی ترغیب ہے۔

اور ان پر کیا مصیبت نازل ہو جائے گی اگر وہ لوگ اللہ تعالیٰ پر اور آخری دن (یعنی قیامت) پر ایمان لے آئیں، اور اللہ تعالیٰ نے جو ان کو دیا ہے اس میں سے کچھ (اخلاص کے ساتھ) خرچ کرتے رہا کریں (یعنی کچھ بھی نقصان نہیں، ہر طرح نفع ہی نفع ہے) اور اللہ تعالیٰ ان (کے نیک و بد) کو خوب جانتے ہیں (پس ایمان و انفاق پر ثواب دیں گے اور کفر وغیرہ پر عذاب)۔

❊ ❊ ❊

فائدہ: یعنی ان کافروں کا کچھ نقصان نہ تھا اگر وہ بجائے کفر اللہ اور دن قیامت پر ایمان لاتے، اور بجائے بخل وریا اللہ کی راہ میں مال کو خرچ کرتے، بلکہ ان کا سراسر نفع تھا، ضرر تو اس میں ہے جس کو وہ اختیار کر رہے ہیں اور اللہ خوب جانتا ہے کہ وہ کیا اور کس نیت سے کر رہے ہیں۔ اسی کا عوض ان کو ملے گا۔

پہلی آیت میں يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فرمایا تھا، مال کو ان کی طرف منسوب کیا تھا، اب وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ فرمایا، اس میں لطیف اشارہ ہے کہ وہ لوگ اپنا مال سمجھ کر جس طرح جی چاہتا ہے خرچ کرتے ہیں، ان کو چاہیے تھا کہ اللہ کا مال سمجھ کر اس کے حکم کے موافق خرچ کرتے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۚ وَاِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا وَيُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۴۰﴾

بے شک اللہ حق نہیں رکھتا کسی کا ایک ذرہ برابر، اور اگر نیکی ہو تو اس کو دونا کر دیتا ہے اور دیتا ہے اپنے پاس سے بڑا ثواب

خلاصہ تفسیر: بلاشبہ اللہ تعالیٰ ایک ذرہ برابر بھی ظلم نہ کریں گے (کہ کسی کا ثواب مار لیں، یا بے وجہ عذاب دینے لگیں جو کہ ظاہراً ظلم ہے) اور (بلکہ وہ تو ایسے رحیم ہیں کہ) اگر ایک نیکی ہوگی تو اس کو کئی گنا (کر کے ثواب دیں گے، جیسا کہ دوسری آیت میں وعدہ مذکور ہے) اور (اس وعدہ شدہ ثواب کے علاوہ) اپنے پاس سے (بلا معاوضہ عمل کے انعام اور) اجر عظیم (کے طور پر الگ) دیں گے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ: یعنی اللہ تعالیٰ ایک ذرہ برابر بھی ظلم نہ کریں گے کہ بغیر وجہ کے عذاب دینے لگیں جو کہ ظاہراً ظلم ہے، یہاں "ظاہراً" اس لیے کہا کہ اگر وہ ایسا بھی کریں یعنی بغیر وجہ کے عذاب دیں تو واقع میں وہ بھی ظلم نہ ہوتا، کیونکہ وہ مالک ہیں اور مالک جو کچھ بھی چاہے کرے اس کو ہر طرح حق ہے "ہر چہ آں خسرو کند شیریں بود"۔

وَيُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِيْمًا: یہ "اجر عظیم" باوجودیکہ مقررہ ثواب کے علاوہ ہوگا، مگر پھر بھی اس کو "اجر" اس لیے کہا کہ اگرچہ وہ عمل کے مقابلہ میں نہیں مگر عمل ہی کی وجہ سے ہے، کیونکہ عادتاً انعام بھی عمل کرنے والے کو ہی ملتا ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی اللہ تعالیٰ کسی کا حق ایک ذرہ برابر بھی ضائع نہیں فرماتا، سو ان کافروں پر جو عذاب ہوگا وہ عین انصاف اور انکی بداعمالی کا بدلہ ہے اور اگر ذرہ برابر بھی کسی کی نیکی ہوگی تو اضعاف مضاعف اسکا اجر دے گا اور اپنی طرف سے ثواب عظیم بطور انعام اسکو عنایت کریگا۔

فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَاۤءِ شَهِيْدًا ﴿۴۱﴾

پھر کیا حال ہوگا جب بلاویں گے ہم ہر امت میں سے احوال کہنے والا اور بلاویں گے تجھ کو ان لوگوں پر احوال بتانے والا

خلاصہ تفسیر: اب حشر کا بیان کر کے ان لوگوں کو انجام بد سے ڈرایا گیا ہے جو ایمان نہیں لاتے اور نہ نیک عمل کرتے ہیں:

سو اس وقت بھی کیا حال ہوگا جب کہ ہر ہر امت میں سے ایک ایک گواہ کو حاضر کریں گے اور آپ ﷺ کو ان لوگوں پر (جن کا آپ سے سابقہ پڑا ہے) گواہی دینے کے لئے حاضر لائیں گے (یعنی جن لوگوں نے خدائی احکام دنیا میں نہ مانے ہوں گے، ان کے مقدمہ کی پیشی کے وقت بطور سرکاری گواہ کے انبیاء علیہم السلام کے اظہار سنے جائیں گے، جو جو معاملات انبیاء کی موجودگی میں پیش آئے تھے وہ سب ظاہر کر دیں گے، اس شہادت کے بعد ان مخالفین پر جرم ثابت ہو کر سزا دی جائے گی)۔

جو جرائم انبیاء علیہم السلام کے پیچھے یا ان کی وفات کے بعد ہوئے ہوں ان کے ثابت کرنے کے لیے اگر انبیاء کی گواہی نہ ہوئی تو مقصود فوت نہ ہوگا، کیونکہ دوسرے طریقوں سے ان کو ثابت کیا جائے گا۔

* * *

فائدہ: یعنی ان کافروں کا کیا برا حال ہوگا جس وقت کہ بلائیں گے ہم ہر امت اور ہر قوم میں سے گواہ، ان کے حالات بیان کرنے والا

اوران کے واقعی معاملات ظاہر کرنے والا، اس سے مراد ہر امت کا نبی اور ہر عہد کے صالح اور معتبر لوگ ہیں کہ وہ قیامت کو نافرمانوں کی نافرمانی اور فرمانبرداروں کی فرمانبرداری بیان کریں گے اور سب کے حالات کی گواہی دیں گے اور تم کو اے محمد ﷺ! ان پر یعنی تمہاری امت پر مثل دیگر انبیاء علیہم السلام کے احوال بتانے والا اور گواہ بنا کر لاویں گے، اور یہ بھی احتمال ہے کہ ھٰؤلاء کا اشارہ ① انبیائے سابقین ② یا کفار مذکورہ بالا کی طرف ہو۔

اول صورت میں انبیاء مراد ہوں تو مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ انبیائے سابقین کی صداقت پر گواہی دیں گے جب کہ ان کی امتیں ان کی تکذیب کریں گی، اور دوسرے احتمال سے کفار مراد ہوں تو مطلب یہ ہے کہ انبیائے سابقین جیسا اپنی اپنی امت کے کفار فساق کے کفر وفسق کی گواہی دیں گے، تم بھی اے محمد ﷺ! ان سب کی بداعمالی پر گواہ ہو گے، جس سے ان کی خرابی اور برائی خوب محقق ہوگی۔

يَوْمَئِذٍ يَّوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَعَصَوُا الرَّسُوْلَ لَوْ تُسَوّٰى بِهِمُ الْاَرْضُ ؕ

اس دن آرزو کرینگے وہ لوگ جو کافر ہوئے تھے اور رسول کی نافرمانی کی تھی کاش برابر کئے جاویں وہ زمین میں

وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا ﴿۴۲﴾

اور نہ چھپا سکیں گے اللہ سے کوئی بات

خلاصہ تفسیر: (پیچھے فرمایا تھا کہ اس وقت کیا حال ہوگا، آگے اس حال کو خود بیان فرماتے ہیں کہ:) اس روز (یہ حال ہوگا کہ) جن لوگوں نے (دنیا میں) کفر کیا ہوگا اور رسول کا کہنا نہ مانا ہوگا وہ اس بات کی آرزو کریں گے کہ کاش! (اس وقت) ہم زمین کے پیوند ہو جائیں (تا کہ اس وقت کی رسوائی اور آفت سے محفوظ رہیں) اور (گواہی کے علاوہ خود وہ اقراری مجرم بھی ہوں گے، کیونکہ) اللہ تعالیٰ سے کسی بات کا (جو ان سے دنیا میں صادر ہوئی تھیں) اخفاء نہ کرسکیں گے (پس دونوں طریقوں سے ان پر جرم ثابت ہو جائے گا)۔

وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا: جاننا چاہیے کہ یہاں آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار اپنے جرم کا اقرار کرلیں گے، مگر دوسری جگہ یہ آچکا ہے کہ وہ قسم کھا کر کہیں گے: واللہ ربنا ما کنا مشرکین کہ خدا کی قسم ہم نے شرک نہیں کیا، تو بظاہر ان دونوں میں تعارض معلوم ہوتا ہے؟ جواب یہ ہے کہ جب شروع میں کفار یہ دیکھیں گے کہ مسلمانوں کے سوا جنت میں کوئی جاتا ہی نہیں تو وہ یہ طے کرلیں گے کہ ہمیں اپنے شرک اور اعمال بد کا انکار ہی کر دینا چاہیے، ہوسکتا ہے اس طرح ہم نجات پا جائیں، تو یہ انکار اس وقت کے اعتبار سے ہوگا، لیکن اس انکار کے بعد خود ان کے اعضاء ان کے خلاف گواہی دیں گے اور چھپانے کا جو مقصد انہوں نے بنایا تھا اس میں بالکل ناکام ہو جائیں گے، اور پھر اس وقت سب اقرار کرلیں گے، اس لئے فرمایا: ولا یکتمون اللہ حدیثا کچھ بھی نہیں چھپا سکیں گے، پس دونوں میں کوئی تعارض نہیں، حضرت ابن عباسؓ سے بھی بعینہ یہی مضمون منقول ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی جس دن ہر امت میں سے ان کے حالات بیان کرنے والا بلایا جائے گا، اس دن کافر اور نافرمان لوگ اس بات کی تمنا کریں گے کہ کاش ہم زمین میں ملا دیے جاتے اور مٹی میں مل کر نیست و نابود ہو جاتے، آج پیدا نہ ہوتے اور ہم سے حساب وکتاب نہ ہوتا اور وہ لوگ اللہ تعالیٰ سے کسی بات کا اخفا نہ کرسکیں گے اور ذرہ ذرہ کا حساب ہوگا۔

ربط: شروع سورت سے مسلمانوں کو اقارب اور زوجین وغیرہ کے ادائے حقوق کی تاکید اور کسی کی حق تلفی کرنے اور جانی ومالی نقصان پہنچانے کی ممانعت اور معاصی کی خرابی پر مطلع کر کے اس کے بعد وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا (النساء: ۳۶) فرما کر اقارب اور یتامی اور مساکین اور ہمسایوں وغیرہ کے ساتھ احسان وسلوک کرنے کا ارشاد کر کے اسی کے ذیل میں تکبر اور خود پسندی اور بخل وریا سے ڈرایا تھا جو ایسے عیب ہیں کہ دوسروں کے حق ادا کرنے اور کسی کے ساتھ سلوک کرنے سے روکتے بھی ہیں اور روپیہ پیسہ دینے والوں اور لوگوں کے ساتھ سلوک کرنے والوں کی طبیعت میں خواہ مخواہ آنے بھی لگتے ہیں۔

اب ان تمام حکموں کے آخر میں پھر مسلمانوں کو صریح خطاب فرما کر خاص نماز کی بابت جو سب عبادتوں میں اعلیٰ اور افضل ہے اور شریعت میں جس قدر اسکا اہتمام کیا ہے اور اسکے ارکان و شرائط و آداب وغیرہ کو مفصل بتلایا ہے کسی عبادت کا اس قدر اہتمام نہیں کیا۔

دو باتوں کی تاکید فرمائی جو امور متعلقہ صلوٰۃ میں سب سے اہم اور نفس پر شاق ہیں اور ارکان صلوٰۃ کی صحت اور خوبی کے لئے جسم اور جان ہیں: ① اول یہ کہ نشہ کی حالت میں نماز کے پاس نہ جاؤ تاوقتیکہ جو منہ سے نکلے اس کو سمجھ بھی لو ② جنابت میں بھی نماز سے دور رہو، یہاں تک کہ غسل کر کے تمام بدن کو خوب پاک کرلو، کیونکہ نماز میں دو امر مہتم بالشان ہیں: ① ایک حضور اور خشوع ② دوسرے طہارت اور نظافت اور جملہ امور متعلقہ صلوٰۃ میں یہی دو امر نفس پر شاق بھی ہیں اور نشہ خشوع اور حضور کے مخالف ہے تو جنابت طہارت اور نظافت کے منافی ہے، بلکہ نشہ چونکہ مثل نوم اور غشی ناقض وضو ہے تو اس لئے طہارت کے بھی مخالف ہے تو مطلب یہ ہوا کہ نماز کو پورے اہتمام سے پڑھو اور جملہ امور ظاہری اور باطنی کا لحاظ رکھو، گو نفس پر شاق ہو۔

باقی اس خاص موقع پر اس تاکید اور تقیید کے ارشاد فرمانے سے دو نفع معلوم ہوتے ہیں: ① اول یہ کہ احکام کثیرہ مذکورہ بالا جن میں حقوق اور معاملات باہمی اور عبادات جانی و مالی کا ذکر تھا، ان سب کو بجالانے کے ساتھ بخل اور ریا اور خود پسندی اور بڑائی سے بھی مجتنب رہنا چونکہ نفس پر شاق ہے اور سننے والوں کو خلجان کا موقع ہے تو اس دشواری اور خلجان کا علاج بتانا منظور ہے، یعنی نماز کو اس کی شرائط و آداب ظاہری و باطنی کے ساتھ ادا کرو گے تو جملہ اوامر و نواہی مذکورہ بالا کی تعمیل تم پر سہل ہو جائے گی، کیونکہ نماز کی وجہ سے جملہ اوامر و عبادات میں سہولت اور رغبت اور تمام منہیات اور معاصی سے نفرت پیدا ہو جاتی ہے، جیسا کہ دیگر آیات و احادیث میں مذکور ہے اور علمائے محققین نے تصریح فرمائی ہے۔

② دوسرے یہ کہ احکام کثیرہ سابقہ کو سن کر بعید نہیں جو کاہل کم ہمت اپنے آپ کو مجبور خیال کر کے ہمت ہار دیں اور اس کاہلی کا اثر نماز میں بھی ظاہر ہونے لگے جس کی شرائط و آداب بہت کچھ ہیں اور جو ہر وقت موجود ہے، اس لئے نماز کا اہتمام مناسب ہوا، الحاصل جو کوئی اقامت صلوٰۃ کا اہتمام اور التزام رکھے گا، اس کو دیگر احکام جانی و مالی میں بھی آسانی اور سہولت ہوگی اور جو کوئی دیگر احکام میں کاہلی اور بے پروائی کرتا ہے اس سے اقامت صلوٰۃ میں بھی کوتاہی کرنا بعید نہیں، واللہ اعلم۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ وَلَا جُنُبًا

اے ایمان والو! نزدیک نہ جاؤ نماز کے جس وقت کہ تم نشہ میں ہو یہاں تک کہ سمجھنے لگو جو کہتے ہو اور نہ اس وقت کہ غسل کی حاجت ہو

اِلَّا عَابِرِيْ سَبِيْلٍ حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا ؕ وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰۤى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ

مگر راہ چلتے ہوئے یہاں تک کہ غسل کرلو۱؎ اور اگر تم مریض ہو یا سفر میں یا آیا ہے کوئی شخص تم میں

مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا

جائے ضرورت سے یا پاس گئے ہو عورتوں کے پھر نہ ملا تم کو پانی تو ارادہ کرو زمین پاک کا پھر ملو

بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا ۝۴۳

اپنے منہ کو اور ہاتھوں کو۲؎ بیشک اللہ ہے معاف کرنے والا بخشنے والا۳؎

خلاصہ تفسیر: ترمذی میں حضرت علیؓ کا یہ واقعہ مذکور ہے کہ ابتدائے اسلام میں شراب کی حرمت سے پہلے ایک دفعہ حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ نے بعض صحابہ کرام کی دعوت کر رکھی تھی جس میں مے نوشی کا بھی انتظام تھا، جب یہ سب حضرات کھا پی چکے تو مغرب کی نماز کا وقت ہو گیا اور حضرت علیؓ کو امام بنا دیا گیا، ان سے نماز میں قل یایها الکفرون کی تلاوت میں بوجہ نشہ کے سخت غلطی ہو گئی اس پر یہ آیت نازل ہوئی جس میں تنبیہ کر دی گئی کہ نشہ کی حالت میں نماز نہ پڑھی جائے، اس مسئلہ کے ساتھ نماز کے متعلق دیگر مسائل بھی بیان فرما دیے۔

اے ایمان والو! تم نماز کے پاس بھی ایسی حالت میں مت جاؤ (یعنی ایسی حالت میں نماز مت پڑھو) کہ تم نشہ میں ہو، یہاں تک کہ تم سمجھنے لگو کہ منہ سے کیا کہتے ہو (اس وقت تک نماز مت پڑھو، مطلب یہ ہے کہ ادائے نماز تو اپنے اوقات میں فرض ہے، اور یہ حالت ادائے نماز کے خلاف ہے، پس اوقات صلوٰۃ میں نشہ کا استعمال مت کرو، کبھی تمہارے منہ سے نماز میں کوئی کلمہ خلاف نہ نکل جائے) اور حالت جنابت میں بھی (یعنی جبکہ غسل فرض ہو) باستثناء تمہارے مسافر ہونے کی حالت کے (کہ اس کا حکم عنقریب آتا ہے، نماز کے پاس مت جاؤ) یہاں تک کہ غسل کرلو (یعنی جنابت کے بعد غسل کرنا نماز کی صحت کے لیے شرط ہے، اور یہ حکم عذر نہ ہونے کی صورت میں ہے)۔

اور اگر تم (کچھ عذر رکھتے ہو مثلاً) بیمار ہو (اور پانی کا استعمال مضر ہو) یا حالت سفر میں ہو (اور پانی نہیں ملتا، جیسا آگے آتا ہے تو ان دونوں عذروں سے تیمم کی اجازت آتی ہے، اور تیمم کا جواز انہی مذکورہ عذروں یعنی سفر و بیماری کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ خواہ تم کو خاص یہ عذر ہوں) یا (یہ خاص عذر نہ ہوں، یعنی نہ تم بیمار ہو، نہ مسافر، بلکہ ویسے ہی کسی کا وضو یا غسل ٹوٹ جائے اس طرح سے کہ مثلاً) تم میں سے کوئی شخص (پیشاب یا پاخانہ کے استنجے سے (فارغ ہو کر) آیا ہو (جس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے) یا تم نے بیویوں سے قربت کی ہو (جس سے غسل ٹوٹ جاتا ہے اور) پھر (ان ساری صورتوں میں خواہ بیماری وسفر کے عذر کی صورت ہو، یا نہ بیماری ہو نہ سفر، ویسے وضو اور غسل کی ضرورت ہو) تم کو پانی (کے استعمال کا موقع) نہ ملے (خواہ تو اس وجہ سے کہ بیماری میں اس سے نقصان ہوتا ہو، خواہ اس لئے کہ وہاں پانی ہی موجود نہیں، خواہ سفر ہو یا نہ ہو) تو (ان سب حالتوں میں) تم پاک زمین سے تیمم کرلیا کرو (یعنی زمین پر دوبار ہاتھ مار کر) اپنے چہروں اور ہاتھوں پر (ہاتھ) پھیر لیا کرو، بلاشبہ اللہ تعالیٰ بڑے معاف کرنے والے بڑے بخشنے والے ہیں (اور جس کی ایسی عادت ہوتی ہے وہ آسان حکم دیا کرتا ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے ایسے آسان حکم دے کر تم کو تکلیف سے بچالیا)۔

اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا: اس میں ان لوگوں کا علاج بیان کیا جا رہا ہے جو ضعف و کمزوری کی وجہ سے عمل میں کمزور ہیں، یعنی جنہیں اپنے ضعف کی وجہ سے عمل کے کامل نہ کر سکنے کے سبب یہ وسوسہ ہوتا ہے کہ جب ہمارے عمل میں یہ ظاہری نقص ہے وہ تو مطلوب و مقصود کے لیے کافی نہ ہوگا، چنانچہ عَفُوًّا غَفُوْرًا فرما کر اس وسوسہ کو دور کرنے کی تدبیر کی طرف اشارہ کر دیا کہ یوں سوچ لیا کرو کہ اگر بالفرض وہ غیر کافی بھی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے نقص کو معاف فرما کر اسے کافی بنا دیں گے۔

* * *

فائدہ: اِلَّا عَابِرِيْ سَبِيْلٍ حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا: پہلی آیات میں مسلمانوں کو خطاب تھا **واعبدوا اللہ ولا تشرکوا بہ شیأ** الیٰ آخرہ الآیات اور اسی کے ذیل میں کفار کی مذمت بیان فرمائی تھی جو کہ امور مذکورہ سابقہ کی مخالفت کرتے تھے، اب اس کے بعد پھر مسلمانوں کو دربارہ صلوٰۃ بعض خاص ہدایتیں کی جاتی ہیں اور ان ہدایات کو ماقبل کے ساتھ یہ مناسبت ہے کہ اس سے پہلے کفار اور اہل کتاب کی دو خرابیوں کا خاص طور پر ذکر تھا: ① ایک اللہ پر ایمان نہ لانا ② دوسرے اپنا مال اللہ کے لئے خرچ نہ کرنا، بلکہ لوگوں کے دکھانے کو اور اپنی عزت بڑھانے کو مال خرچ کرنا اور ظاہر ہے کہ پہلی خرابی کا منشاء تو علم کا نقصان اور جہل کا غلبہ ہے اور دوسری خرابی کی وجہ ہوائے نفس اور اپنی خواہش ہے، جس سے معلوم ہوگیا کہ گمراہی کے بڑے سبب دو ہیں: ① اول جہل جس میں حق و باطل کی تمیز ہی نہیں ہوتی ② دوسرے خواہش و شہوت جس سے باوجود تمیز حق و باطل حق کے موافق عمل نہیں کر سکتا، کیونکہ شہوات سے قوت ملکی ضعیف اور قوت بہیمیہ قوی ہو جاتی ہے، جس کا نتیجہ ملائکہ سے بعد اور شیاطین سے قرب ہے، جو بہت سی خرابیوں کی جڑ ہے تو اب اس مناسبت سے حق تعالیٰ شانہ، نے مسلمانوں کو نشہ کی حالت میں نماز پڑھنے سے اول منع فرمایا کہ یہ جہل کی حالت ہے، اس کے بعد جنابت میں نماز پڑھنے سے روکا کہ یہ حالت ملائکہ سے بعد اور شیاطین سے قرب کی حالت ہے، حدیث میں وارد ہے کہ جہاں جنبی ہوتا ہے وہاں ملائکہ نہیں آتے۔ واللہ اعلم۔

اب آیت کا مطلب یہ ہوا کہ اے ایمان والو! جب تم کو کفر وریا کی خرابی معلوم ہو چکی اور ان کے اضداد کی خوبی واضح ہو چکی تو اس سے نشہ اور جنابت کی حالت میں نماز پڑھنے کی خرابی کو بھی خوب سمجھ لو کہ ان کا منشا بھی وہی ہے جو کفر وریا کا منشا تھا، اس لئے نشہ میں نماز کے نزدیک نہ جانا چاہیے، تاوقتیکہ تم کو اس قدر ہوش نہ آجائے کہ جو منہ سے کہو اس کو سمجھ بھی سکو، اور نہ حالت جنابت میں نماز کے نزدیک جانا چاہیے تاوقتیکہ غسل نہ کرلو، مگر حالت سفر

میں اس کا حکم آگے مذکور ہے۔

فائدہ: یہ حکم اس وقت تھا کہ نشہ اس وقت تک حرام نہ ہوا تھا، لیکن نشہ کی حالت میں نماز پڑھنے کی ممانعت کردی گئی تھی، روایات میں منقول ہے کہ ایک جماعت صحابہ کی دعوت میں جمع تھی، چونکہ شراب اس وقت تک حرام نہ ہوئی تھی، اس لئے انہوں نے شراب پی تھی، مغرب کا وقت آ گیا تو سب اسی حالت میں نماز کو کھڑے ہو گئے، امام نے سورہ قل یایھا الکفرون میں لا اعبد ما تعبدون کی جگہ اعبد ما تعبدون بیہوشی میں پڑھ دیا، جس سے معنی بالکل خلاف اور غلط ہو گئے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی، اب اگر نیند کے غلبہ یا بیماری کی وجہ سے کسی کا ایسا حال ہو جائے کہ اس کی خبر نہ رہے کہ میں نے کیا کہا تو ایسی حالت کی نماز بھی درست نہ ہوگی جب ہوش آئے تو اس کی قضا ضرور کرلے۔

فائدہ: ۲۔ فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ: یعنی حالت جنابت میں نماز کا نہ پڑھنا تاوقتیکہ غسل نہ کرلے، یہ حکم جب ہے کہ کوئی عذر نہ ہو، اور اگر کوئی ایسا عذر پیش آئے کہ پانی کے استعمال سے معذوری ہو اور طہارت کا حاصل کرنا ضروری ہو تو ایسے وقت میں زمین سے تیمم کرلینا کافی ہے، اب پانی کے استعمال سے معذوری کی تین صورتیں بتلائیں: ① ایک بیماری کہ اس میں پانی ضرر کرتا ہے ② دوسری یہ کہ سفر درپیش ہے اور پانی اتنا موجود ہے کہ وضو کرلے تو پیاس سے ہلاک ہونے کا اندیشہ ہے دور تک پانی نہ ملے گا ③ تیسری یہ کہ پانی بالکل موجود ہی نہیں، اس پانی موجود نہ ہونے کی صورت کے ساتھ دو صورتیں طہارت کی ضروری ہونے کی بیان فرمائیں: ① ایک یہ کہ کوئی جائے ضرور سے فارغ ہو کر آیا اس کو وضو کی حاجت ہے ② دوسری یہ کہ عورت سے صحبت کی ہو تو اس کو غسل کی ضرورت ہے۔

فائدہ: تیمم کی صورت یہ ہے کہ پاک زمین پر دونوں ہاتھ مارے پھر سارے منہ پر اچھی طرح مل لیوے، پھر دونوں ہاتھ زمین پر مار کر دونوں ہاتھوں کو کہنیوں تک مل لے، مٹی طاہر ہے اور بعض چیزوں کے لئے مثل پانی کے مطہر بھی ہے، مثلاً خف، تلوار، آئینہ وغیرہ اور جو نجاست زمین پر گر کر خاک ہو جاتی ہے وہ بھی پاک ہو جاتی ہے اور نیز ہاتھ اور چہرہ پر مٹی ملنے میں تذلل اور عجز بھی پورا ہے جو گناہوں سے معافی مانگنے کی اعلیٰ صورت ہے، سو جب مٹی ظاہری اور باطنی دونوں طرح کی نجاست کو زائل کرتی ہے تو اس لئے بوقت معذوری پانی کی قائم مقام کی گئی، اسکے سوا مقتضائے آسانی وسہولت جس پر حکم تیمم مبنی ہے یہ ہے کہ پانی کی قائم مقام ایسی چیز کی جائے جو پانی سے زیادہ سہل الوصول ہو، سو زمین کا ایسا ہونا ظاہر ہے، کیونکہ وہ سب جگہ موجود ہے، مع ہذا خاک انسان کی اصل ہے اور اپنی اصل کی طرف رجوع کرنے میں گناہوں اور خرابیوں سے بچاؤ ہے، کافر بھی آرزو کریں گے کہ کسی طرح خاک میں مل جائیں جیسا پہلی آیت میں مذکور ہوا۔

فائدہ: ۳۔ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا: یعنی اللہ تعالی نے ضرورت کے وقت تیمم کی اجازت دے دی اور مٹی کو پانی کے قائم مقام کردیا، اس لئے کہ وہ سہولت اور معافی دینے والا ہے اور بندوں کی خطائیں بخشنے والا ہے، اپنے بندوں کے نفع اور آسائش کو پسند فرماتا ہے، جس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نماز میں نشہ کی حالت میں جو کچھ کا کچھ پڑھا گیا تھا وہ بھی معاف کردیا گیا، جس سے یہ خلجان نہ رہا کہ آئندہ کو تو ایسی حالت میں نماز نہ پڑھیں گے، مگر جو پہلے غلطی ہو گئی شاید اس کی نسبت مواخذہ ہو۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يَشْتَرُوْنَ الضَّلٰلَةَ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ تَضِلُّوا

کیا تو نے نہ دیکھا ان کو جن کو ملا ہے کچھ حصہ کتاب سے خرید کرتے ہیں گمراہی اور چاہتے ہیں کہ تم بھی بہک جاؤ

السَّبِيْلَ ﴿۴۴﴾ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاَعْدَآئِكُمْ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَلِيًّا ۤ وَّكَفٰى بِاللّٰهِ نَصِيْرًا ﴿۴۵﴾

راہ سے، اور اللہ خوب جانتا ہے تمہارے دشمنوں کو، اور اللہ کافی ہے حمایتی اور اللہ کافی ہے مددگار

خلاصہ تفسیر: گذشتہ آیات میں مواقع تقویٰ کا بیان تھا، جس میں زیادہ تر باہمی معاملات کا ذکر تھا، درمیان میں کچھ احکام عبادت نماز اور متعلقات کے ذکر کیے گئے، اب یہاں سے مخالفین کے ساتھ معاملات کا ذکر فرمایا گیا ہے، جس میں یہود کی شرارت کا علاج اور مسلمانوں کو

الفاظ وعنوان میں بھی ادب کی رعایت کی تلقین کی گئی ہے۔

(اے مخاطب!) کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا (یعنی دیکھنے کے قابل ہیں، دیکھو تو تعجب کرو) جن کو کتاب (اللہ یعنی تورات کے علم) کا ایک بڑا حصہ ملا ہے (یعنی تورات کا علم رکھتے ہیں باوجود اس کے) کہ وہ لوگ گمراہی (یعنی کفر) کو اختیار کر رہے ہیں اور (خود تو گمراہ ہوئے ہی تھے، مگر وہ) یوں چاہتے ہیں کہ تم (بھی) راہ (راست) سے (علیحدہ ہو کر) بے راہ ہو جاؤ (یعنی طرح طرح کی تدبیریں اس کی کرتے ہیں، جیسا کہ تیسرے پارہ کے آخر اور چوتھے کے شروع میں کچھ ذکر ہو بھی چکا ہے) اور (تم کو اگر ان لوگوں کی اب تک خبر نہ ہو تو کیا ہوا) اللہ تعالیٰ (تو) تمہارے (ان) دشمنوں کو خوب جانتے ہیں (اس لئے تم کو بتلا دیا، سو تم ان سے بچتے رہو) اور (ان کی مخالف کا حال سن کر زیادہ فکر میں بھی نہ پڑ جانا، کیونکہ) اللہ تعالیٰ (تمہارا) کافی رفیق ہے (کہ تمہاری مصلحتوں کی رعایت رکھے گا) اور اللہ تعالیٰ (تمہارے لئے) کافی حامی ہے (کہ ان کی مضرتوں سے تمہاری حفاظت کرے گا)۔

وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاَعْدَآىِٕكُمْ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ وَلِيًّا: اعداء (دشمن) چونکہ شیاطین کو بھی عام ہے تو یہ آیت اس بات پر دلیل ہے کہ متوکلین کو شیطان سے خوف نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اعداء یعنی دشمنوں سے کفایت وحفاظت کا وعدہ فرمایا ہے۔

* * *

فائدہ: ان آیات میں یہود کے بعض قبائح اور ان کے مکر وفریب کا بیان ہے اور ان کی ضلالت اور کفر پر خود ان کو اور نیز دوسروں کو مطلع کرنا ہے تاکہ ان سے علیحدہ رہیں چنانچہ: اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا (النساء: ۳۶) سے لے کر يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى (النساء: ۴۳) تک یہود کے قبائح مذکور ہو چکے ہیں، بیچ میں ایک خاص مناسبت سے نشہ اور جنابت میں نماز سے ممانعت فرما کر پھر یہود کے قبائح کا بیان ہے۔

''یہود کو کتاب سے کچھ حصہ ملا''، یعنی لفظ پڑھنے کو ملے اور عمل کرنا جو اصل مقصود تھا نہیں ملا۔

''اور گمراہی خرید کرتے ہیں''، یعنی پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات اور اوصاف کو دنیا کی عزت اور رشوت کے واسطے چھپاتے ہیں اور جان بوجھ کر انکار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ مسلمان بھی دین سے پھر کر گمراہ ہو جائیں اور اللہ تعالیٰ اے مسلمانو! تمہارے دشمنوں کو خوب جانتا ہے، تم ایسا ہرگز نہیں جانتے، سو اللہ کے فرمانے پر اطمینان کرو اور ان سے بچو اور اللہ تعالیٰ تم کو نفع پہنچانے اور نقصان سے بچانے کے لئے کافی ہے، اس لئے دشمنوں سے اس قسم کا اندیشہ مت کرو اور دین پر قائم رہو۔

مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ

بعضے لوگ یہودی پھیرتے ہیں بات کو اس کے ٹھکانے سے ۱؎ اور کہتے ہیں ہم نے سنا اور نہ مانا ۲؎ اور کہتے ہیں کہ سن نہ سنایا جائیو ۳؎

وَّرَاعِنَا لَيًّا بِاَلْسِنَتِهِمْ وَطَعْنًا فِى الدِّيْنِ ؕ

اور کہتے ہیں راعنا ۴؎ موڑ کر اپنی زبان کو اور عیب لگانے کو دین میں ۵؎

خلاصہ تفسیر: (اور) یہ لوگ (جن کا ذکر ہو چکا ہے) یہودیوں میں سے ہیں (اور ان کا گمراہی کو اختیار کرنا جو پیچھے آچکا ہے یہ ہے کہ) کلام (الٰہی یعنی تورات) کو اس کے مواقع (اور محل) سے (لفظی یا معنوی طور پر) دوسری طرف پھیر دیتے ہیں، اور (ایک گمراہی ان کی جس میں دھوکہ سے دوسرے سادہ ذہن شخص کا پھنس جانا بھی ممکن ہے، یہ ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بات چیت کرتے وقت) یہ کلمات کہتے ہیں (کہ ان کلمات کے دو معنی ہیں، ایک اچھے اور ایک برے، وہ لوگ برا مطلب لیتے تھے اور دوسروں پر ظاہر کرتے تھے کہ ہم اچھے مطلب سے کہتے ہیں، ان کلمات میں سے ایک یہ ہے کہ) سمعنا وعصینا (اس کا ترجمہ تو یہ ہے کہ ''ہم نے سن لیا اور مانا نہیں''، اس کا اچھا مطلب تو یہ ہے کہ ''آپ کا ارشاد

ہم نے سن لیااور آپ کے مخالف کی بات نہیں مانتے''،اور برا مطلب ظاہر ہے کہ''ہم نے آپ کی بات کو سن تو لیا مگر عمل نہ کریں گے'') اور (دوسرا کلمہ یہ ہے) **اسمع غیر مسمع** (اس کا ترجمہ یہ ہے کہ''تم ہماری بات سنو اور خدا کرے تم کو کوئی بات سنائی نہ جائے''،اس کا اچھا مطلب تو یہ ہے کہ''خدا کرے آپ کو رنج کی بات کبھی نہ سنائی جائے،سب آپ کی باتوں کو منظور ہی کریں''،اور برا مطلب یہ ہے کہ''خدا کرے کبھی آپ کو خوشی کی بات نہ سنائی جائے،بلکہ آپ جو بات کہیں اس کا مخالف جواب ہی آپ کے کان میں پڑے'') اور (تیسرا کلمہ یہ ہے) **راعنا** (اس کے دونوں اچھے اور برے مطلب سورۃ بقرہ میں گزر چکے ہیں کہ اچھے معنی تو یہ ہیں کہ''ہماری رعایت کیجئے''،اور برے معنی لغت یہود میں گالی کے ہیں،غرض ان کلمات کو) اس طور پر (کہتے ہیں) کہ اپنی زبانوں کو (تحقیر کے لہجہ سے تعظیم کے لہجہ کی طرف) پھیر کر (جس سے ظاہر میں کسی کو تحقیر کا شبہ نہ ہو) اور (دل سے) دین میں طعنہ زنی (اور تحقیر ہی) کی نیت سے (وجہ یہ ہے کہ نبی کے ساتھ طعن واستہزاء بعینہ دین کے ساتھ طعن وتمسخر ہے)۔

مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ:یہودی لوگ رسول اللہ ﷺ سے بات چیت کرتے وقت ایسے الفاظ بولتے تھے جن سے اچھے اور برے دونوں معنی نکل سکتے ہیں،اور یہ لوگ برے معنی کا ہی قصد کرتے تھے مگر دوسروں پر اچھے مطلب کو ظاہر کرتے تھے،اس سے کسی مسلمان کا دھوکہ میں آکر ایسے الفاظ سے کسی وقت حضور ﷺ کو خطاب کرنا کچھ بعید نہ تھا،پس یہ بھی ان کا ایک طرح سے مسلمانوں کو گمراہی میں ڈالنا تھا اگرچہ صرف لفظوں ہی میں سہی،اسی لیے سورہ بقرہ میں مسلمانوں کو لفظ''راعنا'' بولنے کی ممانعت فرمادی۔

گذشتہ آیت میں: **الذین اوتوا نصیبا من الکتٰب** تھا یہاں اس کی تفصیل: **من الذین ھادوا** سے فرمادی،اسی طرح گذشتہ آیت میں: **یشترون الضّلٰلۃ** تھا،یہاں اس کا بیان اور تفصیل: **یحرّفون الکلم** سے کردی گئی،اسی طرح پچھلی آیت میں: **یریدون ان تضلوا السبیل** تھا،یہاں اس آیت میں اس گمراہی کو بھی کھول کر بیان کردیا۔

* * *

فائدہ:۱. يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ:یعنی یہود میں ایسے لوگ بھی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو تورات میں نازل فرمایا اس کو اپنے ٹھکانے سے پھیرتے اور بدلتے ہیں،یعنی تحریف لفظی اور معنوی کرتے ہیں۔

فائدہ:۲. وَيَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا:یعنی جب رسول اللہ ﷺ ان کو کوئی حکم سناتے تو یہود جواب میں کہتے ہم نے سن لیا،مطلب یہ ہوا کہ قبول کرلیا،لیکن آہستہ سے کہتے تھے کہ نہ مانا،یعنی ہم نے فقط کان سے سنا،دل سے نہیں مانا۔

فائدہ:۳. وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ:یعنی اور جب یہود حضرت ﷺ سے خطاب کرتے ہیں تو کہتے ہیں:''سن نہ سنایا جائیو تو''یعنی ایسے کلام بولتے جس کے دو معنی ہوں:① ایک معنی کے اعتبار سے دعاء یا تعظیم ہو تو② دوسرے معنی کی رو سے بد دعاء اور تحقیر ہوسکے،چنانچہ یہ کلام بظاہر دعائے خیر ہے،مطلب یہ کہ تو ہمیشہ غالب اور معزز رہے،کوئی تجھ کو بری اور خلاف بات نہ سنا سکے اور دل میں نیت یہ رکھے کہ تو بہرا ہو جائیو۔

فائدہ:۴. وَّرَاعِنَا لَيًّا بِاَلْسِنَتِهِمْ:یعنی حضرت کی خدمت میں آتے تو یہود رَاعِنَا کہتے،اس کے بھی دو معنی ہیں:ایک اچھے اور ایک برے،جن کا بیان سورہ بقرہ میں گزر چکا،اچھے معنی تو یہ کہ ہماری رعایت کرو اور شفقت کی نظر کرو کہ تمہارا مطلب سمجھ لیں اور جو پوچھنا ہو پوچھ سکیں اور برے معنی یہ کہ یہود کی زبان میں یہ کلمہ تحقیر کا ہے،یا زبان کو دبا کر رَاعِيْنَا کہتے،یعنی تو ہمارا چرواہا ہے اور یہ ان کی محض شرارت تھی،کیونکہ وہ خوب جانتے تھے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور دیگر پیغمبروں نے بھی بکریاں چرائی ہیں۔

فائدہ:۵. وَطَعْنًا فِي الدِّيْنِ:یعنی یہود ان کلمات کو اپنے کلام میں رلا ملا کر ایسے انداز سے کہتے کہ سننے والے اچھے ہی معنوں پر حمل کرتے اور برے معنوں کی طرف دھیان بھی نہ جاتا اور دل میں برے معنی مراد لیتے اور پھر دین میں یہ عیب لگاتے کہ اگر یہ شخص نبی ہوتا تو ہمارا فریب ضرور معلوم کرلیتا،سو اللہ تعالیٰ نے ان کے فریب کو خوب کھول دیا۔

وَلَوْ اَنَّهُمْ قَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا وَاسْمَعْ وَانْظُرْنَا لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَقْوَمَ ۙ

اور اگر وہ کہتے ہم نے سنا اور مانا اور سن اور ہم پر نظر کر تو بہتر ہوتا ان کے حق میں اور درست

وَلٰكِنْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۴۶﴾

لیکن لعنت کی ان پر اللہ نے ان کے کفر کے سبب سو وہ ایمان نہیں لاتے مگر بہت کم

خلاصہ تفسیر: اور اگر یہ لوگ (دو معنی دینے والے الفاظ کے بجائے) یہ کلمات کہتے (یعنی سمعنا وعصینا کے بجائے) سمعنا واطعنا (کہتے جس کے معنی یہ ہیں کہ "ہم نے سن لیا اور مان لیا") اور (اسمع غیر مسمع کے بجائے صرف) اسمع (کہتے جس کے معنی خالی یہ ہیں کہ "آپ سن لیجئے") اور (راعنا کے بجائے) انظرنا (کہتے جس کے معنی یہ ہیں کہ "ہماری مصلحت پر نظر فرمایئے"، اور یہ کلمات شرارت کے معنی سے پاک ہیں تو اگر یہ کلمات کہتے) تو یہ بات ان کے لئے بہتر (اور نافع بھی) ہوتی اور (حقیقت میں بھی) موقع کی بات تھی، مگر (انہوں نے تو ایسے نفع اور موقع کی بات نہ کہی، بلکہ وہی بیہودہ بات بکتے رہے، اس لئے ان کو یہ تکلیف پہنچی کہ) ان کو اللہ تعالیٰ نے ان کے کفر کے سبب (جس میں یہ کلمات بھی آ گئے، اور ان کے دیگر کفریہ اقوال وافعال بھی سب داخل ہو گئے، پس ان سب کفریات کے سبب اللہ تعالیٰ نے ان کو) اپنی رحمت (خاصہ) سے دور پھینک دیا، اب وہ ایمان نہ لائیں گے، ہاں! مگر تھوڑے سے آدمی (کہ وہ ایسی حرکتوں سے دور رہے، اور وہ خاص رحمت سے بھی دور نہیں، اور وہ ایمان بھی لے آئے، جیسے عبداللہ بن سلامؓ وغیرہ)۔

فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا: یعنی اب وہ ایمان نہ لائیں گے مگر تھوڑے سے آدمی، یہ ان لوگوں کے بارے میں فرمایا ہے جو علم الٰہی میں کفر پر مرنے والے تھے، پس نومسلموں کے ایمان لانے سے یہ شبہ نہیں ہو سکتا کہ یہ ایمان کیسے لے آئے۔

* * *

فائدہ: حق تعالیٰ یہود کے تین قول مذموم بیان فرما کر اب بطور ملامت وہدایت ارشاد کرتے ہیں کہ اگر یہود عَصَيْنَا کی جگہ اَطَعْنَا کہتے اور بجائے اِسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ کے صرف اِسْمَعْ کہتے اور رَاعِنَا کے عوض اُنْظُرْنَا کہتے تو ان کے حق میں بہتر ہوتا اور یہ بات درست اور سیدھی ہوتی اور اس بیہودگی اور شرارت کی گنجائش نہ ہوتی جو کلمات سابقہ سے یہود برے معنی اپنے دل میں مراد لیا کرتے تھے، لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو ان کے کفر کے باعث اپنی رحمت اور ہدایت سے دور کر دیا، اس لئے وہ مفید اور سیدھی باتوں کو نہیں سمجھتے اور ایمان نہیں لاتے مگر تھوڑے سے آدمی کہ وہ ان خباثتوں اور شرارتوں سے مجتنب رہے اور اس وجہ سے اللہ کی لعنت سے محفوظ رہے، جیسے حضرت عبداللہ بن سلامؓ اور ان کے ساتھی۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ

اے کتاب والو ایمان لاؤ اس پر جو ہم نے نازل کیا تصدیق کرتا ہے اس کتاب کی جو تمہارے پاس ہے پہلے اس سے کہ ہم مٹا ڈالیں

وُجُوْهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰۤى اَدْبَارِهَاۤ اَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّاۤ اَصْحٰبَ السَّبْتِ ۭ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ﴿۴۷﴾

بہت سے چہروں کو پھر الٹ دیں انکو پیٹھ کی طرف یا لعنت کریں ان پر جیسے ہم نے لعنت کی ہفتہ کے دن والوں پر، اور اللہ کا حکم تو ہو کر ہی رہتا ہے

خلاصہ تفسیر: اب رحمت عامہ اور شفقت تامہ کے تقاضہ کے سبب ان اہل کتاب کو اسلام اور ایمان کی دعوت دیتے ہیں اور بطور نصیحت تحریف، تکبر اور تمسخر کے برے انجام سے ڈراتے ہیں:

اے وہ لوگو! جو کتاب (تورات) دیئے گئے ہو، تم اس کتاب (یعنی قرآن) پر ایمان لاؤ جس کو ہم نے نازل فرمایا ہے (اور تم کو اس پر

ایمان لانے سے وحشت نہ ہونی چاہئے، کیونکہ ہم نے اس کو) ایسی حالت پر (نازل فرمایا) کہ وہ سچ بتلاتی ہے اس کتاب کو جو تمہارے پاس ہے (یعنی تمہاری اصل کتاب کے لئے وہ مصدق ہے، باقی تحریف کا حصہ اس سے الگ ہے، سوتم قرآن پر) اس (غیر یقینی بات کے ہونے) سے پہلے پہلے (ایمان لے آؤ) کہ ہم (تمہارے) چہروں (کے نقش ونگار یعنی آنکھ ناک وغیرہ) کو بالکل مٹاڈالیں اوران (چہروں) کو ان کی الٹی جانب (یعنی گدی) کی طرح (صفاچٹ) بنادیں، یا ان (ایمان نہ لانے والوں) پر ہم ایسی (خاص طور کی) لعنت کریں جیسی لعنت ان ہفتہ والوں پر کی تھی (جو یہود میں پہلے گزر چکے ہیں، جن کا ذکر سورۃ بقرہ میں آچکا، یعنی اُن کی طرح اِن کو بھی بندر کی شکل بنادیں) اور اللہ تعالیٰ کا (جو) حکم (صادر ہوجاتا ہے وہ) پورا ہی ہوکر رہتا ہے (سو اللہ تمہارے ایمان نہ لانے پر اگر اس مسخ کا حکم کردیں گے پھر یہ ضروری ہوجائے گا، لہٰذا تم کو ڈرنا چاہئے اور ایمان لے آنا چاہئے)۔

مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا: یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ طمس ومسخ کب ہوا؟ بعض نے کہا کہ یہ عذاب قیامت سے قبل یہود پر ہوگا، بعض نے کہا یہ عذاب اس لئے واقع نہیں ہوا کہ ان میں سے بعض لوگ ایمان لے آئے تھے، احقر کے نزدیک سرے سے وہ سوال ہی واقع نہیں ہوتا، کیونکہ قرآن میں کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جس سے معلوم ہوا کہ اگر ایمان نہ لاؤ گے تو طمس ومسخ کا عذاب ضرور واقع ہوگا، بلکہ احتمال ہے، یعنی اگر ان کے جرم کو دیکھا جائے تو وہ اس سزا کے مستحق ہیں، اور اگر عذاب نہ دیں تو یہ ان کی رحمت ہے۔

* * *

فائدہ: آیات سابقہ میں یہود کی ضلالت اور مختلف قبائح کا ذکر فرما کر اب ان کو بطور خطاب ایمان اور تصدیق قرآن کا حکم کیا جاتا ہے اور اسکی مخالفت سے ڈرایا جاتا ہے، مطلب یہ ہے کہ اے اہل کتاب! ایمان لاؤ قرآن پر، جس کے احکام مصدق اور موافق ہیں تورات کے۔

''ایمان لاؤ اس سے پہلے کہ مٹاڈالیں ہم تمہارے چہروں کے نشانات''، یعنی آنکھ ناک وغیرہ، مطلب یہ کہ تمہاری صورتیں بدل دی جائیں ''پھر الٹ دیں تمہارے چہروں کو پیٹھ کی طرف''، یعنی چہرہ کو مطموس اور ہموار کرکے پیچھے کی طرف اور گدی کو آگے کی طرف کردیں، یا ہفتہ کے دن والوں کی طرح تم کو مسخ کرکے جانور بنادیں، اصحاب سبت کا قصہ سورہ اعراف میں مذکور ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ

بے شک اللہ نہیں بخشتا اس کو جو اس کا شریک کرے اور بخشتا ہے اس سے نیچے کے گناہ جس کے چاہے، اور جس نے شریک ٹھہرایا اللہ کا

فَقَدِ افْتَرٰٓى اِثْمًا عَظِيْمًا ﴿۴۸﴾

اس نے بڑا طوفان باندھا

خلاصہ تفسیر: گزشتہ آیت میں ایمان نہ لانے پر وعید اور تہدید تھی، اب اس آیت میں یہ بتلاتے ہیں کہ یہود اور نصاری یہ خیال نہ کریں کہ کفر اور شرک بھی دوسرے گناہوں کی طرح ایک گناہ ہے جس کی معافی اور مغفرت ہوسکتی ہے، جیسا کہ یہود کا زعم تھا کہ سیغفر لنا کہ ہم جو گناہ کریں گے وہ معاف ہوجائے گا بلکہ کفر اور شرک کے متعلق قانون خداوندی یہ ہے کہ:

بیشک اللہ تعالیٰ اس بات کو (سزا دے کر بھی) نہ بخشیں گے کہ ان کے ساتھ کسی کو شریک قرار دیا جائے (بلکہ ہمیشہ دائمی سزا میں مبتلا رکھیں گے) اور اس کے سوا اور جتنے گناہ ہیں (خواہ صغیرہ ہوں یا کبیرہ) جس کے لئے منظور ہوگا (بلا سزا) وہ گناہ بخش دیں گے (البتہ اگر وہ مشرک مسلمان ہوجائے تو پھر مشرک ہی نہ رہا، اب وہ دائمی سزا بھی نہ رہے گی) اور (وجہ اس شرک کے نہ بخشنے کی یہ ہے کہ) جو شخص اللہ تعالیٰ کے ساتھ (کسی کو) شریک ٹھہراتا ہے وہ بڑے جرم کا مرتکب ہوا (جو اپنے عظیم جرم ہونے کی وجہ سے قابل مغفرت نہیں)۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ: قرآن وسنت اور اجماع امت سے یہ امر قطعا ثابت ہے کہ کفر اور شرک یعنی کافر اور مشرک دونوں ہی قابل مغفرت نہیں، مگر اس جگہ آیت میں شرک کا ذکر ہے، کفر کا نہیں اور بعض کافر ایسے بھی ہیں جو مشرک نہیں، بلکہ موحد ہیں، مگر اسلام کے قائل نہیں،

اس شبہ کے چند جواب ہیں:

① ایک جواب یہ ہے کہ اس آیت میں صرف شرک کا ذکر ہے اور دوسری آیات میں صرف کفر کا ذکر ہے، اور بعض آیات میں دونوں کا ذکر ہے، اور یہ ضروری نہیں کہ ہر آیت میں دونوں کا ساتھ ذکر ہو، پس مجموعہ آیات سے کفر اور شرک دونوں ہی کا غیر مغفور اور نا قابل مغفرت ہونا ثابت ہو گیا، اللہ کا ارشاد ہے: اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا اس آیت میں کافرین اہل کتاب اور مشرکین دونوں ہی کے لیے خلود فی النار کا ذکر فرمایا، جس سے معلوم ہوا کہ مشرکین کی طرح کافر کی مغفرت بھی نہیں ہو سکتی، دوسری جگہ ارشاد ہے: فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا قُطِّعَتْ لَهُمْ ثِيَابٌ مِّنْ نَّارٍ الی قوله كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ اُعِيْدُوْا فِيْهَا، ایک جگہ ارشاد ہے: اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ مَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ، ان آیات میں کافروں کے دائمی عذاب کا ہونا اور ان کی عدم مغفرت کا ذکر ہے، وقال تعالیٰ: اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَظَلَمُوْا لَمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ طَرِيْقًا اِلَّا طَرِيْقَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا، اس آیت میں کافروں اور ظالموں یعنی مشرکوں دونوں ہی کے متعلق فرمادیا کہ ان کی مغفرت نہیں ہو سکتی، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دوزخ میں رہیں گے۔

② دوسرا جواب یہ ہے کہ آیت میں شرک سے مطلق کفر مراد ہے، جیسا کہ روح المعانی میں عبداللہ بن عباسؓ سے منقول ہے، مطلب یہ کہ شرک کے دو معنی ہیں، ایک معنی کے اعتبار سے تو شرک اور کفر دو چیزیں ہیں، اور دوسرے معنی عام ہیں، جس میں کفر بھی داخل ہے، اور اس جگہ شرک کے دوسرے معنی مراد ہیں جو کفر کو بھی شامل ہے، پس دونوں کا ایک حکم اسی آیت سے معلوم ہو جائے گا، شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ بھی ترجمہ مشکوۃ میں یہی فرماتے ہیں کہ شرک سے مطلق کفر مراد ہے، خواہ وہ کسی قسم کا ہو، اور علامہ خیالی حاشیہ شرح عقائد میں فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے اس قول میں میں شرک سے مطلق کفر مراد ہے، اور کفر کو شرک کے ساتھ اس لیے تعبیر کیا کہ کفار عرب مشرک ہی تھے۔

③ تیسرا جواب یہ ہے کہ مشرک اس کو کہتے ہیں کہ اللہ کو تو مانتا ہو، مگر اس کے ساتھ کسی کو شریک گردانتا ہو، پس جب اس کی مغفرت نہیں تو جو سرے ہی سے خدا کا کافر اور منکر ہو اس کی تو بدرجہ اولیٰ مغفرت نہیں ہوگی۔

وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ: یعنی اگر منظور ہو گا تو اللہ تعالیٰ بلا سزا کے بھی بخش دیں گے، کیونکہ سزا کے بعد تو ہر مؤمن کے گناہوں کا بخشا جانا یقینی ہے جس کا وعدہ ہو چکا ہے، پس یہاں جو یقین کے ساتھ وعدہ نہیں فرمایا یہ اس کی دلیل ہے کہ بغیر سزا کے بخشا مراد ہے، کیونکہ اس کا وعدہ ہر ایک کے لیے نہیں، یہ مشیت ایزدی پر ہے کہ جس کو چاہیں بغیر عذاب کے بھی سب گناہ بخش دیں۔

* * *

فائدہ: یعنی مشرک کبھی نہیں بخشا جاتا، بلکہ اس کی سزا دائمی ہے، البتہ شرک سے نیچے جو گناہ ہیں صغیرہ ہوں یا کبیرہ، وہ سب قابل مغفرت ہیں، اللہ تعالیٰ جس کی مغفرت چاہے اس کے صغیرہ کبیرہ گناہ بخش دیتا ہے کچھ عذاب دے کر یا بلا عذاب دیے، اشارہ اس کی طرف ہے کہ یہود چونکہ کفر اور شرک میں مبتلا ہیں وہ مغفرت کی توقع نہ رکھیں۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ ط بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ وَلَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ﴿۴۹﴾

کیا تو نے نہ دیکھا ان کو جو اپنے آپ کو پاکیزہ کہتے ہیں، بلکہ اللہ ہی پاکیزہ کرتا ہے جس کو چاہے اور ان پر ظلم نہ ہوگا تاگے برابر

خلاصہ تفسیر: گذشتہ آیت میں یہود کا کفر اور اس پر مغفرت نہ ہونے کی وعید بیان ہوئی، چونکہ یہود اپنے کو اللہ کا مقبول، محبوب، خالص مؤمن اور بلا سزا مغفور ہونا بتلاتے تھے، جیسا کہ قرآن میں بھی ان کے ایسے اقوال مذکور ہیں، چنانچہ اب اس کا رد فرماتے ہیں:

(اے مخاطب!) کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا (یعنی تعجب کے قابل ہیں) جو اپنے کو مقدس بتلاتے ہیں (ان کے بتلانے سے کچھ نہیں ہوتا) بلکہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہیں مقدس بتلا دیں (یہ البتہ قابل اعتبار ہے، اور اللہ تعالیٰ قرآن میں مؤمن کو مقدس بتلایا ہے، جیسے سورۃ الاعلیٰ میں اشقی یعنی

کافر کے مقابلہ میں مؤمن کی نسبت فرمایا: قد افلح من تزکی پس وہی مقدس ہوگا، نہ کہ کفر کرنے والے جیسے یہود ہیں) اور (قیامت میں ان یہود کو اس جھوٹے دعوے کی۔جس کا سبب کفر کو ایمان سمجھنا ہے۔جو سزا ہوگی اس سزا میں) ان پر دھاگے برابر بھی ظلم نہ ہوگا (یعنی وہ سزا ان کے جرم سے زیادہ نہیں ہے، بلکہ ایسے جرم پر ایسی ہی سزا لائق ہے)۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ: اس آیت میں اپنے بارے میں تقدس و پاکیزگی کا دعویٰ کرنے کی مذمت نکلتی ہے، یعنی ان لوگوں پر رد ہے جو اپنے آپ کو گناہوں سے پاک سمجھتے ہیں، چنانچہ فرمایا کہ پاک تو وہی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ پاک بتائیں۔

اگر کسی کو شبہ ہو کہ جب مؤمن کو اللہ تعالیٰ نے مقدس بتلایا ہے تو پھر اپنے آپ کو یا کسی دوسرے کو حسن ظن کے طور پر مقدس کہنے سے شریعت میں کیوں ممانعت ہے؟ جواب یہ ہے کہ یہ ممانعت تین وجہ سے ہے:

① اپنی مدح کا سبب اکثر کبر ہوتا ہے، تو حقیقت میں ممانعت کبر سے ہوئی۔

② خاتمہ کا حال اللہ کو معلوم ہے کہ تقوی وطہارت پر ہوگا یا نہیں، اس لئے مطلقاً یہ دعوی کرنا خوف الٰہی کے خلاف ہے۔

③ ممانعت کی تیسری وجہ یہ ہے کہ اکثر اوقات سننے والے کو اس دعوی سے یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ تمام عیوب ونقائص سے بالکل پاک ہے اور ہر طرح سے اللہ کے ہاں مقبول ہے، حالانکہ اکثر بندہ دوسرے گناہوں میں گرفتار ہوتا ہے اور اسی قدر اس کے قرب وقبولیت میں عند اللہ کمی ہوتی ہے، بس جس دعوے سے ایسا وہم پیدا ہو وہ جھوٹ ہے اور دوسرے کو مقدس کہنے میں کبھی اس کو عجب بھی ہوتا ہے، اگر یہ سب باتیں نہ ہوں تو خدا کی نعمت بیان کرنے کی نیت سے ایسا کہنا جائز ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی یہود باوجود اس قدر خرابیوں کے پھر بھی اپنے آپ کو پاک صاف اور مقدس کہتے ہیں، حتی کہ اپنے آپ کو ''ابناء اللہ'' اور ''احباء اللہ'' بتلاتے ہیں جو بالکل لغو بات ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہے اس کو پاکیزہ اور مقدس کرتا ہے، یہود کے کہنے سے کچھ نہیں ہوسکتا اور ان جھوٹی شیخی کرنے والوں پر ادنیٰ سا ظلم بھی نہ ہوگا، یعنی یہ لوگ اپنے عذاب بے نہایت میں گرفتار ہونگے ان پر ناحق عذاب ہرگز نہ ہوگا۔

فائدہ: یہودی جو گوسالہ کو پوجتے تھے اور حضرت عزیر علیہ السلام کو ابن اللہ کہتے تھے، انہوں نے جب آیت سابقہ: اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ کو سنا تو کہنے لگے کہ ہم مشرک نہیں، بلکہ ہم تو خاص بندے اور پیغمبر زادے ہیں اور پیغمبری ہماری میراث ہے، خدا تعالیٰ کو ان کی یہ شیخی پسند نہ آئی، اس پر یہ آیت نازل فرمائی۔

اُنْظُرْ كَيْفَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ۭ وَكَفٰى بِهٖٓ اِثْمًا مُّبِيْنًا ۝۵۰ ع

دیکھ کیسا باندھتے ہیں اللہ پر جھوٹ، اور کافی ہے یہی گناہ صریح

خلاصہ تفسیر: (ذرا) دیکھ لو (اس دعویٰ میں) یہ لوگ اللہ پر کیسی جھوٹی تہمت لگاتے ہیں (کیونکہ جب وہ باوجود کفر کے اللہ کے ہاں اپنے مقبول ہونے کا دعوی کرتے ہیں تو اس سے لازم آتا ہے کہ شاید کفر اللہ کے ہاں پسندیدہ ہے، حالانکہ یہ محض تہمت ہے، اس لئے کہ تمام شریعتوں میں اللہ تعالیٰ نے اس کی تصریح فرمادی ہے کہ کفر ہمارے نزدیک سخت ناپسند اور مردود ہے) اور یہی بات (کہ خدا پر تہمت لگائی جائے) صریح مجرم ہونے کے لئے کافی ہے (پھر ایسی صریح گناہ کی بات پر ایسی سزا بالکل بھی ظلم وزیادتی نہیں)۔

* * *

فائدہ: یعنی کیسی تعجب کی بات ہے کہ اللہ پر کیسی جھوٹی تہمت لگاتے ہیں اور باوجود ارتکاب کفر اور شرک کے اپنے آپ کو اللہ کا دوست کہتے ہیں اور اللہ کے نزدیک مقبول ہونے کے مدعی ہیں اور ایسی سخت تہمت صریح گنہگار ہونے کے لئے بالکل کافی ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ وَيَقُوْلُوْنَ

کیا تو نے نہ دیکھا ان کو جن کو ملا ہے کچھ حصہ کتاب کا جو مانتے ہیں بتوں کو اور شیطان کو اور کہتے ہیں

لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰٓؤُلَاۗءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا ﴿۵۱﴾

کافروں کو کہ یہ لوگ زیادہ راہ راست پر ہیں مسلمانوں سے

خلاصہ تفسیر: (گذشتہ آیات سے یہود کی قبائح اور بری خصلتوں کا ذکر چل رہا ہے، ان آیات کا تعلق بھی انہی کے کرقبائح سے ہے: اے مخاطب!) کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن کو کتاب (الٰہی یعنی توراۃ کے علم) کا ایک حصہ ملا ہے (پھر اس کے باوجود) وہ بت اور شیطان کو مانتے ہیں (کیونکہ مشرکین کا دین بت پرستی اور شیطان کی پیروی تھا، جب ایسے دین کو اچھا بتلایا تو بت اور شیطان کی تصدیق لازم آئی) اور وہ لوگ (یعنی اہل کتاب) کفار (یعنی مشرکین) کی نسبت کہتے ہیں کہ یہ لوگ بہ نسبت ان مسلمانوں کے زیادہ راہ راست پر ہیں (یہ تو انہوں نے صراحۃً ہی کہا تھا)۔

* * *

فائدہ: اس آیت میں یہود کی شرارت اور خباثت کا اظہار ہے، قصہ یہ ہے کہ یہودیوں کو حضرت محمد ﷺ سے عداوت بڑھی تو مشرکین مکہ سے ملے اور ان سے متفق ہوئے اور ان کی خاطر داری کی ضرورت سے بتوں کی تعظیم کی اور کہا کہ تمہارا دین مسلمانوں کے دین سے بہتر ہے اور اس کی وجہ صرف حسد تھا اس پر کہ نبوت اور دین کی ریاست ہمارے سوا دوسروں کو کیوں مل گئی، اس پر اللہ تعالیٰ ان کو الزام دیتا ہے، ان آیات میں اسی کا مذکور ہے۔

اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ لَعَنَھُمُ اللّٰهُ ۭ وَمَنْ يَّلْعَنِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ نَصِيْرًا ﴿۵۲﴾

یہ وہی ہیں جن پر لعنت کی ہے اللہ نے، اور جس پر لعنت کرے اللہ نہ پاویگا تو اس کا کوئی مددگار

خلاصہ تفسیر: یہ لوگ (جنہوں نے کفر و شرک کے طریقہ کو اسلام سے افضل بتلایا) وہ ہیں جن کو خدا تعالیٰ نے ملعون بنایا ہے (اسی ملعون ہونے کا تو اثر ہے کہ ایسے بے باک ہو کر کفریات بک رہے ہیں) اور اللہ تعالیٰ جس کو ملعون بنا دے اس کا (عذاب کے وقت) کوئی حامی نہ پاؤ گے (مطلب یہ ہے کہ اس پر ان کو آخرت میں یا دنیا میں بھی سخت سزا ہوگی، چنانچہ دنیا میں بعض قتل، بعض قید، بعض ذلیل رعایا ہوئے اور آخرت میں جو ہونے والا ہے وہی ہوگا)۔

* * *

فائدہ: یعنی یہ لوگ جنہوں نے اہل کتاب ہو کر اغراض نفسانی کی وجہ سے بتوں کی تعظیم کی اور طریقۂ کفر کو طریقۂ اسلام سے افضل بتلایا، ان پر اللہ کی لعنت ہے اور جس پر لعنت کرے اللہ، اس کا دنیا اور آخرت میں کوئی حامی اور مددگار نہیں ہو سکتا، سو اب انہوں نے اپنی اعانت کی طمع میں جو مشرکین مکہ سے موافقت کی بالکل لغو ہے، چنانچہ دنیا میں یہود نے از حد ذلتیں اٹھائیں اور آخرت میں بھی عذاب میں مبتلا ہوں گے۔

اَمْ لَھُمْ نَصِيْبٌ مِّنَ الْمُلْكِ فَاِذًا لَّا يُؤْتُوْنَ النَّاسَ نَقِيْرًا ﴿۵۳﴾ اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰي مَآ

کیا ان کا کچھ حصہ ہے سلطنت میں پھر تو یہ نہ دیں گے لوگوں کو ایک تل برابر۔ یا حسد کرتے ہیں لوگوں کا اس پر

اٰتٰىھُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنٰھُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا ﴿۵۴﴾

جو دیا ہے ان کو اللہ نے اپنے فضل سے، سو ہم نے تو دی ہے ابراہیم کے خاندان میں کتاب اور علم اور ان کو دی ہے ہم نے بڑی سلطنت ۲

خلاصہ تفسیر: گذشتہ آیت میں یہود کے عیب بیان ہوئے، اب ان آیات میں یہود کے بخل اور حسد کو بیان فرماتے ہیں کہ یہ

لوگ محض حسد کی وجہ سے سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان نہیں لاتے کہ نبی آخر الزمان بنی اسماعیل میں سے کیوں ہوئے؟

ہاں! کیا ان کے پاس کوئی حصہ ہے سلطنت کا، سو ایسی حالت میں تو اور لوگوں کو ذرا سی چیز بھی نہ دیتے، یا دوسرے آدمیوں سے (جیسے رسول اللہ ﷺ سے) ان چیزوں پر جلتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنے فضل سے عطا فرمائی ہیں سو (آپ کو ایسی چیز مل جانا کوئی نئی بات نہیں، کیونکہ) ہم نے (پہلے سے) حضرت ابراہیم کے خاندان (والوں) کو کتاب (آسمانی) بھی دی ہے، اور علم بھی دیا ہے، اور ہم نے ان کو بڑی بھاری سلطنت بھی دی ہے (سو آپ ﷺ کو نبوت مل جانا کوئی نئی بات نہیں)۔

فَقَدۡ اٰتَيۡنَاۤ اٰلَ اِبۡرٰهِيۡمَ الۡـكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ: چنانچہ بنی اسرائیل میں بہت سے انبیاء گذرے ہیں، بعض انبیاء سلاطین بھی ہوئے، جیسے حضرت یوسف، حضرت داؤد، حضرت سلیمان علیہم السلام، اور حضرت داؤد وحضرت سلیمان کا کثیر الازدواج ہونا بھی معلوم ومشہور ہے، اور یہ سب اولاد ابراہیم میں ہیں، سو جبکہ رسول اللہ ﷺ بھی اولاد ابراہیم سے ہیں، تو آپ کو اگر یہ نعمتیں وعطیات مل گئے تو تعجب کی کیا بات ہے، پس اگر وہ اس بات پر حسد کرتے ہیں کہ ان کی سلطنت مسلمانوں میں شامل ہوگئی تب تو خدا نے ان کو ٹھکانے ہی سے رکھا کہ سلطنت نہ دی، ورنہ یہ کسی کو ایک کوڑی بھی نہ دیتے، اور اگر اس بات پر حسد ہے کہ ان کو کیوں مل گئی، ان کا سلطنت سے کیا تعلق؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بھی شاہی خاندان سے ہیں، کسی اجنبی جگہ کی سلطنت نہیں آئی، سو اس حسد کے نامعقول ہونے کی دو عقلی وجہ بتائیں ایک حسد کے ذکر سے پہلے اور ایک اس کے بعد۔

فَقَدۡ اٰتَيۡنَاۤ اٰلَ اِبۡرٰهِيۡمَ الۡـكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ وَاٰتَيۡنٰهُمۡ مُّلۡكًا عَظِيۡمًا: اس میں دلالت ہے کہ باطنی کمال کے ساتھ ظاہری سلطنت اور دنیاوی ثروت بھی مل سکتی ہے، اس میں کوئی منافات نہیں، یعنی یہ دونوں صفات ایک ساتھ ایک شخص میں جمع ہو سکتی ہیں، جیسے حضرت سلیمان علیہ السلام کو باطنی کمال کے ساتھ ساتھ دنیاوی اسباب ودولت بھی ملے ہوئے تھے۔

* * *

فائدہ: ۱۔ یہود اپنے خیال میں جانتے تھے کہ پیغمبری اور دین کی سرداری ہماری میراث ہے اور ہمیں کو لائق ہے، اس لئے عرب کے پیغمبر کی متابعت سے عار کرتے تھے اور کہتے تھے کہ آخر کو حکومت اور بادشاہت ہمیں کو پہنچ رہے گی، برائے چندے اوروں کو بھی مل جائے تو کچھ مضائقہ نہیں، اس پر یہ آیت نازل ہوئی، مطلب آیت کا یہ ہے کہ کیا یہود کا کچھ حصہ ہے سلطنت میں؟ یعنی ہرگز نہیں! اگر یہ حاکم ہو جائیں تو لوگوں کو تل برابر بھی نہ دیں، یعنی ایسے بخیل ہیں کہ بادشاہت میں فقیر کو تل برابر بھی نہ دیں۔

فائدہ: ۲۔ یعنی کیا یہود حضرت محمد ﷺ اور ان کے اصحاب پر اللہ کے فضل وانعام کو دیکھ کر حسد میں مرے جاتے ہیں، سو یہ تو بالکل ان کی بیہودگی ہے، کیونکہ ہم نے حضرت ابراہیم کے گھرانے میں کتاب اور علم اور سلطنت عظیم عنایت کی ہے، پھر یہود آپ کی نبوت اور عزت پر کیسے حسد اور انکار کرتے ہیں اب بھی تو ابراہیم ہی کے گھر میں ہے۔

فَمِنۡهُمۡ مَّنۡ اٰمَنَ بِهٖ وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ صَدَّ عَنۡهُ ؕ وَكَفٰى بِجَهَنَّمَ سَعِيۡرًا ﴿۵۵﴾

پھر ان میں سے کسی نے اس کو مانا اور کوئی اس سے ہٹا رہا، اور کافی ہے دوزخ کی بھڑکتی آگ

خلاصہ تفسیر: (اوپر یہود کے حسد کا ذکر تھا، چونکہ جس سے حسد کیا جائے اس کو طبعاً رنج بھی ہوتا ہے، اس لیے اب رسول اللہ ﷺ کی تسلی فرماتے ہیں) سو (ان انبیاء علیہم السلام کے زمانہ میں بھی جو کہ ابراہیم کے خاندان میں گذر چکے ہیں جو لوگ موجود تھے) ان میں سے بعض تو اس (کتاب وحکمت) پر ایمان لائے، اور بعض ایسے تھے کہ اس سے روگرداں ہی رہے (پس اگر آپ کی رسالت اور قرآن پر بھی آپ کے زمانہ کے بعض لوگ ایمان نہ لائیں تو کوئی رنج کی بات نہیں) اور (اگر ان اعتراض کرنے والوں اور کافروں کو دنیا میں سزا کم بھی ہو، یا نہ ہو تو کیا ہوا، ان کے لئے آخرت میں) دوزخ کی آتش سوزاں (سزا) کافی ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی حضرت ابراہیم کے گھرانے میں خدائے تعالیٰ نے ہمیشہ سے بزرگی دی ہے اور اب بھی اسی کے گھرانے میں ہے، سو جو کوئی بلاوجہ محض حسد سے اس کو نہ مانے، اس کے جلانے کے لئے دوزخ کی بھڑکتی آگ کافی ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا سَوْفَ نُصْلِيْهِمْ نَارًا ؕ كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ

بے شک جو منکر ہوئے ہماری آیتوں سے ان کو ہم ڈالیں گے آگ میں ۱؎ جس وقت جل جائے گی کھال ان کی تو ہم بدل دیویں گے

جُلُوْدًا غَيْرَهَا لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿۵۶﴾

ان کو اور کھال تا کہ چکھتے رہیں عذاب ۲؎ بیشک اللہ ہے زبردست حکمت والا ۳؎

خلاصہ تفسیر: (گذشتہ آیت یہود کے حق میں تھی، اب یہاں سے عام مؤمنین اور عام کفار کی جزاوسزا کا بطور قاعدہ کلیہ ذکر ہے، جس میں یہود بھی داخل ہیں) بلاشک جو لوگ ہماری آیات (واحکام) کے منکر ہوئے (ہم ان کو) عنقریب ایک سخت آگ میں داخل کریں گے (اور وہاں ان کی برابر یہ حالت رہے گی کہ) جب ایک دفعہ ان کی کھال (آگ سے) جل چکے گی تو ہم اس پہلی کھال کی جگہ فوراً دوسری (تازہ) کھال پیدا کر دیں گے تا کہ (ہمیشہ) عذاب ہی بھگتتے رہیں (کیونکہ پہلی کھال میں جلنے کے بعد شبہ ہو سکتا تھا کہ شاید اس میں ادراک واحساس نہ رہے، اس لئے شبہ ختم کرنے کے لیے یہ سنا دیا) بلاشک اللہ تعالیٰ زبردست ہیں (کہ وہ ایسی سزا دے سکتے ہیں، اور) حکمت والے ہیں (اس لئے باوجود قدرت کے جلی ہوئی کھال کو تکلیف پہنچا سکتے ہیں، پھر بھی کسی حکمت کی وجہ سے کھال کو بدل دیں گے جیسے کہ ایک حکمت کا بیان ابھی ہوا ہے)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ پہلی آیت میں مومن وکافر کا ذکر تھا، اب مطلق مومن اور کافر کی جزاوسزا بطور قاعدہ کلیہ کے ذکر فرماتے ہیں تا کہ ایمان کی طرف پوری ترغیب اور کفر سے پوری ترہیب ہو جائے۔

فائدہ: ۲؎ یعنی کافروں کے عذاب میں نقصان اور کمی نہ آنے کی غرض سے ان کی کھال کے جل جانے کے وقت دوسری کھال بدل دی جائے گی، مطلب یہ ہوا کہ کافر ہمیشہ عذاب میں یکساں مبتلا رہیں گے۔

فائدہ: ۳؎ یعنی اللہ تعالیٰ بیشک زبردست اور غالب ہے، کافروں کو ایسی سزا دینے میں کوئی دقت اور دشواری نہیں، اور حکمت والا ہے ، کافروں کو یہ سزا دینی عین حکمت کے موافق ہے۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ

اور جو لوگ ایمان لائے اور کام کئے نیک البتہ ان کو ہم داخل کرینگے باغوں میں جن کے نیچے بہتی ہیں نہریں رہا کریں ان میں

اَبَدًا ؕ لَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۟ وَّنُدْخِلُهُمْ ظِلًّا ظَلِيْلًا ﴿۵۷﴾

ہمیشہ، ان کیلئے وہاں عورتیں ہیں ستھری، اور ان کو ہم داخل کرینگے گھنی چھاؤں میں

خلاصہ تفسیر: اور جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کئے ہم ان کو عنقریب ایسے باغوں میں داخل کریں گے کہ ان کے (محلات) کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، ان کے واسطے ان (باغوں) میں پاک صاف بیویاں ہوں گی اور ہم ان کو نہایت گنجان سایہ (کی جگہ) میں داخل کریں گے۔

وَّنُدْخِلُهُمْ ظِلًّا ظَلِيْلًا: یعنی دنیا جیسا سایہ نہ ہوگا کہ خود سایہ کے اندر بھی دھوپ چھنتی ہے، بلکہ وہ متصل سایہ ہے، اس مقام پر لوگ یہ

اعتراض کیا کرتے ہیں کہ جب جنت میں سورج نہیں تو سایہ کیسا؟ کما قال تعالیٰ: لایرون فیھا شمسا ولا زمھریرا، جواب یہ ہے کہ سایہ کا وجود دھوپ پر موقوف نہیں، سایہ کے لیے نورانی جسم کا ہونا کافی ہے، ممکن ہے کہ کسی تیز نور کو لطیف بنایا جائے جیسے چاند پر رقیق بادل آجاتا ہے یا وہ سایہ خود بھی نور ہو جیسے گوہر شب چراغ (وہ لعل یا موتی جو رات کو روشنی دیتا ہے) کا سایہ، یا یوں کہا جائے کہ خالص سایہ ہو مگر اس میں ظلمت نہ ہو جیسے صبح صادق کے بعد سورج کے طلوع ہونے سے پہلے کا سماں ہوتا ہے، ایک آیت: الم تر الی ربک کیف مد الظل میں مشہور تفسیر کے مطابق اسی کو سایہ سے تعبیر کیا گیا ہے، خلاصہ یہ کہ روشنی اور دھوپ کے لیے خاص آفتاب کا وجود ضروری نہیں، اللہ تعالیٰ جس طرح چاہے نور اور تیز روشنی پیدا کردے، اخروی نعمتوں کو دنیاوی نعمتوں پر قیاس نہیں کرنا چاہیے، جس طرح وہ آخرت میں دودھ اور شہد ظاہری اسباب کے بغیر محض اپنی قدرت سے پیدا فرمائے گا اسی طرح وہ جنت میں روشنی اور سایہ بھی اپنی قدرت سے پیدا فرمادے گا۔

* * *

فائدہ: یعنی مومن ہمیشہ جنت میں رہیں گے اور ان کو عورتیں ایسی ملیں گی جو حیض اور دیگر آلائشوں سے پاک ہوں گی اور ان کو گہری اور گنجان چھاؤں میں داخل کریں گے جو آفتاب کی دھوپ سے بالکل محفوظ ہوگی۔

إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمٰنٰتِ إِلٰى أَهْلِهَا ۙ وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا

بیشک اللہ تم کو فرماتا ہے کہ پہنچا دو امانتیں امانت والوں کو، اور جب فیصلہ کرنے لگو لوگوں میں تو فیصلہ کرو

بِالْعَدْلِ ۚ إِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ ۗ إِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ﴿٥٨﴾

انصاف سے [1] بیشک اللہ اچھی نصیحت کرتا ہے تم کو، بیشک اللہ ہے سننے والا دیکھنے والا [2]

خلاصہ تفسیر: یہود کے قبائح کے بیان سے پہلے احکام کا بیان چلا آرہا ہے، باہمی معاملات کے احکام میں سے ایک حکم یہ ہے کہ حکام اپنے محکومین یعنی ماتحتوں سے عدل وامانت کا برتاؤ کریں اور محکومین حکام کی جائز باتوں میں اطاعت کریں، پھر دونوں کو اللہ ورسول کے حکم کو اصل سمجھنے کا حکم دیا، آگے ان ہی مضامین کا ذکر ہے، اس کے متصل منافقین کی مذمت ذکر فرمائی کہ وہ اللہ ورسول کے احکام کو دل سے پسند نہیں کرتے اور اس مضمون کو متصل مضمون سے بھی ربط ہے، کیونکہ یہود کے عوام وخواص کا دین میں خیانت کرنا اور ہوا پرستی کرنا قبائح کے ضمن میں پیچھے معلوم ہو چکا ہے۔

(اے اہل حکومت! خواہ تھوڑوں پر حکومت ہو، خواہ زیادہ پر) بیشک تم کو اللہ تعالیٰ اس بات کا حکم دیتے ہیں کہ اہل حقوق کو ان کے حقوق (جو تمہارے ذمہ ہیں) پہنچادیا کرو، اور (تم کو) یہ (بھی حکم دیتے ہیں) کہ جب (محکوم یعنی ماتحت) لوگوں کا تصفیہ کیا کرو (ایسے حقوق میں جو ان میں باہم ایک دوسرے کے ذمہ ہیں) تو عدل (انصاف) سے تصفیہ کیا کرو، بیشک اللہ تعالیٰ جس بات کی تم کو نصیحت کرتے ہیں وہ بات بہت اچھی ہے (دنیا کے اعتبار سے بھی کہ اس میں حکومت کی بقا اور استحکام ہے، اور آخرت کے اعتبار سے بھی کہ قرب وثواب کا سبب ہے) بلاشک اللہ تعالیٰ (تمہارے اقوال کو جو امانت وتصفیہ کے بارہ میں تم سے صادر ہوتے ہیں) خوب سنتے ہیں (اور تمہارے افعال کو جو اس بارہ میں تم سے واقع ہوتے ہیں) خوب دیکھتے ہیں (تو اگر کمی وکوتاہی کروگے تو ہم تم کو سزا دیں گے)۔

اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا: جاننا چاہیے کہ اس آیت کا شان نزول اگرچہ ایک خاص واقعہ ہے، وہ یہ کہ حضور ﷺ نے فتح مکہ کے روز عثمان بن ابی طلحہؓ سے خانہ کعبہ کی چابی لی تھی، کعبہ کی چابی انہی کے پاس ہوا کرتی تھی، حضرت عباسؓ نے درخواست کی کہ یہ اب مجھے دے دی جائے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی، مگر یہ اس دعویٰ کے خلاف نہیں کہ اس کے مخاطب حکام ہیں، کیونکہ آیت کے معنی عام ہیں جس میں یہ خاص واقعہ بھی شامل ہے، دوسری آسان بات یہ ہے کہ اس وقت رسول اللہ ﷺ حاکم ہونے کی وجہ سے اس کے مخاطب تھے، اور ''امانات'' تمام حقوق کو شامل ہے، جس میں اللہ کے حقوق بھی شامل ہیں، پس یہ شبہ نہ رہا کہ محکومین کو تو اطاعت خدا ورسول کا حکم فرمایا اور حکام کو نہیں فرمایا، کیونکہ جب حکام کو ادائے امانات کا حکم دیا گیا

اور امانات اللہ کے حقوق کو بھی شامل ہے تو اللہ ورسول کی اطاعت کا مضمون بھی اس میں ادا ہو گیا۔

* * *

فائدہ: ۱ یہود میں عادت تھی کہ امانت میں خیانت کرتے اور فصل خصومات میں رشوت وغیرہ کی وجہ سے کسی کی خاطر اور رعایت کر کے خلاف حق حکم دیتے، اس لئے مسلمانوں کو ان دونوں باتوں سے اس آیت میں روکا گیا، منقول ہے کہ فتح مکہ کے دن آپ ﷺ نے خانہ کعبہ کے اندر داخل ہونا چاہا تو عثمان بن طلحہ کلید بردار خانہ کعبہ نے کنجی دینے سے انکار کیا تو حضرت علیؓ نے اس سے چھین کر دروازہ کھول دیا، آپ ﷺ فارغ ہو کر جب باہر تشریف لائے تو حضرت عباسؓ نے آپ سے درخواست کی کہ یہ کنجی مجھ کو مل جائے، اس پر آیت نازل ہوئی اور کنجی عثمان بن طلحہ ہی کے حوالہ کی گئی۔

فائدہ: ۲ یعنی اللہ تعالیٰ جو تم کو ادائے امانت اور عدل کے موافق حکم دینے کا حکم فرماتا ہے تمہارے لئے سراسر مفید ہے اور اللہ تعالیٰ تمہاری کھلی اور چھپی اور موجودہ اور آئندہ باتوں کو خوب جانتا ہے تو اب اگر تم کو کہیں ادائے امانت یا عدل مفید معلوم نہ ہو تو حکم الٰہی کے مقابلہ میں اسکا اعتبار نہ ہوگا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ

اے ایمان والو! حکم مانو اللہ کا اور حکم مانو رسول کا اور حاکموں کا جو تم میں سے ہوں ۱ پھر اگر جھگڑ پڑو

فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ

کسی چیز میں تو اس کو رجوع کرو طرف اللہ کے اور رسول کے اگر یقین رکھتے ہو اللہ پر اور قیامت کے دن پر ۲

ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ۝۵۹ ع

یہ بات اچھی ہے اور بہت بہتر ہے اس کا انجام ۳

خلاصہ تفسیر: (گذشتہ آیت میں تو حکام کو خطاب ہوا، آگے محکومین یعنی ماتحتوں کو ارشاد ہے کہ:) اے ایمان والو! تم اللہ تعالیٰ کا کہنا مانو اور رسول ﷺ کا کہنا مانو (یہ حکم تو تمہارے اور حکام سب کے لئے عام ہے) اور تم (مسلمانوں) میں جو لوگ اہل حکومت ہیں ان کا بھی (کہنا مانو، یہ حکم محکومین یعنی ماتحتوں کے ساتھ خاص ہے) پھر (اگر جن احکام کے بارے میں حاکم ومحکوم دونوں کا اتفاق ہو کہ اللہ ورسول کے خلاف نہیں تو اس میں تو حکام کی اطاعت کرو گے ہی اور) اگر (ان احکام میں سے) کسی امر میں تم باہم اختلاف کرنے لگو (کہ یہ حکم اللہ ورسول کے فرمان کے خلاف ہے یا نہیں) تو (رسول اللہ ﷺ کی حیات میں تو آپ سے پوچھ کر اور آپ کی وفات کے بعد ائمہ مجتہدین وعلماء دین سے رجوع کر کے) اس امر کو (کتاب) اللہ اور (سنت) رسول ﷺ کی طرف حوالہ کر لیا کرو (اور ان حضرات سے جیسا فتویٰ ملے اس پر سب حکام ومحکومین عمل کر لیا کرو) اگر تم اللہ پر اور یوم قیامت پر ایمان رکھتے ہو (کیونکہ اس ایمان کا تقاضہ اور مطالبہ یہی ہے کہ یوم قیامت میں اللہ تعالیٰ کی دارو گیر اور پکڑ سے ڈریں جو کہ مخالفت کرنے پر ہونے والی ہے)۔

یہ امور (جو مذکور ہوئے یعنی اللہ ورسول اور حکام کی اطاعت اور متنازع امور کو کتاب وسنت کی طرف حوالہ کرنا) سب (دنیا میں بھی) بہتر ہیں اور (آخرت میں بھی) ان کا انجام خوش تر ہے (کیونکہ دنیا میں امن وراحت اور آخرت میں نجات وسعادت ہیں)۔

وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ: اولی الامر لغت میں ان لوگوں کو کہا جاتا ہے جن کے ہاتھ میں کسی چیز کا نظام وانتظام ہو، اسی لئے حضرت ابن عباسؓ، مجاہدؒ اور حسن بصریؒ وغیرہ مفسرین قرآن نے ''اولی الامر'' کا مصداق علماء وفقہاء کو قرار دیا ہے کہ وہ رسول کریم ﷺ کے نائب ہیں اور نظام دین ان کے ہاتھ میں ہے، اور ایک جماعت مفسرین نے جن میں حضرت ابو ہریرہؓ بھی شامل ہیں، فرمایا کہ ''اولی الامر'' سے مراد وہ حکام اور امراء ہیں

جن کے ہاتھ میں نظام حکومت ہے، تفسیر ابن کثیر اور تفسیر مظہری میں ہے کہ یہ لفظ دونوں طبقوں کو شامل ہے، یعنی علماء کو بھی اور حکام وامراء کو بھی، کیونکہ نظام امر انہیں دونوں کے ساتھ وابستہ ہے، نیز اگر ''اولوالامر'' کی تفسیر خاص حکام کے ساتھ ہی کی جائے جیسا کہ متبادر یہی ہے، اور علماء کو اس میں شامل نہ کیا جائے تب بھی دوسرے جز یعنی فردوہ الی اللہ والرسول میں علماء کے اتباع کا وجوب آ گیا، بلکہ حکام کی اطاعت سے بھی زیادہ، کیونکہ علماء کو خود حکام کا مقتدا و متبوع بھی قرار دیا ہے، اس صورت میں علماء متبوع المتبوع ہو گئے۔

فَرُدُّوْهُ إِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ: نیز کتاب وسنت کی طرف رجوع کرنے کی دو صورتیں ہیں: ① ایک یہ کہ کتاب وسنت کے احکام منصوصہ کی جانب رجوع کیا جائے ② دوسری صورت یہ ہے کہ اگر احکام منصوصہ موجود نہیں تو ان کے نظائر پر قیاس کر کے رجوع کیا جائے گا، فردوہ کے الفاظ عام ہیں جو دونوں صورتوں کو شامل ہیں۔

حکم اور اطاعت کی تین عملی صورتیں ہیں: ① ایک وہ جس چیز کا حکم صراحۃً خود حق تعالیٰ نے قرآن میں نازل فرما دیا اور اس میں کسی تفصیل و تشریح کی حاجت نہیں، جیسے شرک وکفر کا انتہائی جرم ہونا، ایک اللہ وحدہ کی عبادت کرنا اور آخرت پر یقین رکھنا اور محمد مصطفےٰ ﷺ کو اللہ کا آخری برحق رسول ماننا، نماز، روزہ، حج، زکوۃ کو فرض سمجھنا، یہ وہ چیزیں ہیں جو براہ راست احکام ربانی ہیں، ان کی تعمیل بلا واسطہ حق تعالیٰ کی اطاعت ہے۔

② دوسرا حصہ احکام کا وہ ہے جس میں تفصیلات وتشریحات کی ضرورت ہے، ان میں قرآن کریم اکثر ایک مجمل یا مبہم حکم دیتا ہے اور اس کی تشریح وتفصیل نبی کریم ﷺ کے حوالے کی جاتی ہے، پھر وہ تفصیل وتشریح جو آنحضرت ﷺ اپنی احادیث کے ذریعہ فرماتے ہیں وہ بھی ایک قسم کی وحی ہوتی ہے، اگر اس تفصیل وتشریح میں اجتہادی طور پر کوئی کمی یا کوتاہی رہ جاتی ہے تو بذریعہ وحی اس کی اصلاح فرما دی جاتی ہے اور بالآخر آنحضرت ﷺ کا قول وعمل جو آخر میں ہوتا ہے وہ حکم الٰہی کا ترجمان ہوتا ہے، اس قسم کے احکام کی اطاعت بھی اگرچہ درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی کی اطاعت ہے، لیکن ظاہری اعتبار سے چونکہ یہ احکام صریح طور پر قرآن نہیں، آنحضرت ﷺ کی زبان مبارک سے امت کو پہنچے ہیں، اس لئے ان کی اطاعت ظاہری اعتبار سے اطاعت رسول ہی کہلاتی ہے، جو حقیقت میں اطاعت الٰہی کے ساتھ متحد ہونے کے باوجود ظاہری اعتبار سے ایک جداگانہ حیثیت رکھتی ہے، اسی لئے پورے قرآن میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا حکم دینے کے ساتھ اطاعت رسول کا حکم مستقلاً مذکور ہے۔

③ تیسرا درجہ احکام کا وہ ہے جو نہ قرآن میں صراحۃً مذکور ہیں نہ حدیث میں، یا ذخیرہ احادیث میں اس کے متعلق متضاد روایات ملتی ہیں، ایسے احکام میں علماء مجتہدین قرآن وسنت کے منصوصات اور زیر غور مسئلہ کے نظائر میں غور وفکر کر کے ان کا حکم تلاش کرتے ہیں، ان احکام کی اطاعت بھی اگرچہ حقیقت کے اعتبار سے قرآن وسنت سے مستفاد ہونے کی وجہ سے اطاعت خداوندی ہی کی ایک فرد ہیں، مگر ظاہری سطح کے اعتبار سے یہ فقہی فتاوی کہلاتے ہیں اور علماء کی طرف منسوب ہیں۔

اسی تیسری قسم میں ایسے احکام بھی ہیں جن میں کتاب وسنت کی رو سے کوئی پابندی عائد نہیں، بلکہ ان میں عمل کرنے والوں کو اختیار ہے جس طرح چاہیں کریں، جن کو اصطلاح میں ''مباحات'' کہا جاتا ہے، ایسے احکام میں عملی انتظام حکام وامراء کے سپرد ہے کہ وہ حالات اور مصالح کے پیش نظر کوئی قانون بنا کر سب کو اس پر چلائیں، مثلاً شہر کراچی میں ڈاک خانے پچاس ہوں یا سو، پولیس اسٹیشن کتنے ہوں، ریلوے کا نظام کس طرح ہو، آباد کاری کا انتظام کن قواعد پر کیا جائے، یہ سب مباحات ہیں، ان کی کوئی جانب نہ واجب ہے نہ حرام، بلکہ اختیاری ہے، لیکن یہ اختیار عوام کو دے دیا جائے تو کوئی نظام نہیں چل سکتا، اس لئے نظام کی ذمہ داری حکومت پر ہے۔

آیت مذکورہ میں ''اولوالامر'' کی اطاعت سے علماء اور حکام دونوں کی اطاعت مراد ہے، اس لئے اس آیت کی رو سے فقہی تحقیقات میں فقہاء کی اطاعت اور انتظامی امور میں حکام وامراء کی اطاعت واجب ہوگئی، اور یہ اطاعت بھی درحقیقت اللہ جل شانہ کے احکام ہی کی اطاعت ہے، لیکن ظاہری سطح کے اعتبار سے یہ احکام نہ قرآن میں ہیں نہ سنت میں، بلکہ ان کا بیان یا علماء کی طرف سے ہو یا حکام کی طرف سے، اس لئے اس اطاعت کو تیسرا نمبر جداگانہ قرار دے کر ''اولی الامر'' کی اطاعت نام رکھا گیا اور جس طرح منصوصات قرآن میں قرآن کا اتباع اور منصوصات رسول میں رسول کا اتباع لازم وواجب ہے، اسی طرح غیر منصوص فقہی چیزوں میں فقہا کا اور انتظامی امور میں حکام وامراء کا اتباع واجب ہے، یہی مفہوم ہے اطاعت اولی الامر کا۔

یہ آیت مقلدین کے لئے حجت ہے جو کہ تقلید کو واجب کہتے ہیں، چونکہ کتاب وسنت کا یہ فیصلہ ہے کہ نہ جاننے والوں کو جاننے والوں کی بات ماننی چاہئے، ایسے ہی عمل کو تقلید کہتے ہیں، اگر وہ ایسا نہ کریں تو کتاب وسنت انہیں مجتہدین کے اتباع پر مجبور کرے گی اور مقلدین پر بحکم کتاب یہ لازم ہوگا، پس اس میں غیر مقلدین کے لئے کوئی حجت نہیں۔

***

فائدہ: ۱ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ: پہلی آیت میں حکام کو عدل کا حکم فرما کر اب اوروں کو حکام کی متابعت کا حکم دیا جاتا ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حکام کی اطاعت جب ہی واجب ہوگی جب وہ حق کی اطاعت کریں گے۔

فائدہ: حاکم اسلام بادشاہ یا اس کا صوبہ دار یا قاضی یا سردار لشکر اور جو کوئی کسی کام پر مقرر ہو، ان کے حکم کا ماننا ضروری ہے جب تک کہ وہ خدا اور رسول ﷺ کے خلاف حکم نہ دیں، اگر خدا اور رسول ﷺ کے حکم کے صریح خلاف کرے تو اس حکم کو ہرگز نہ مانے۔

فائدہ: ۲ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ: یعنی اور اگر تم میں اور اولوالامر میں باہم اختلاف ہوجائے کہ حاکم کا یہ حکم اللہ اور رسول ﷺ کے حکم کے موافق ہے یا مخالف؟ تو اس کو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کی طرف رجوع کر کے طے کرلیا کرو کہ وہ حکم فی الحقیقت اللہ اور رسول ﷺ کے حکم کے موافق ہے یا مخالف، اور جو بات محقق ہوجائے اسی کو بالاتفاق مسلم اور معمول بہ سمجھنا چاہیے اور اختلاف کو دور کر دینا چاہیے اگر تم کو اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان ہے، کیونکہ جس کو اللہ اور قیامت پر ایمان ہوگا وہ ضرور اختلاف کی صورت میں اللہ اور رسول ﷺ کے حکم کی طرف رجوع کرے گا، اور ان کے حکم کی مخالفت سے بے حد ڈرے گا، جس سے معلوم ہوگیا کہ جو اللہ اور رسول ﷺ کے حکم سے بھاگے گا وہ مسلمان نہیں، اس لئے اگر دو مسلمان آپس میں جھگڑیں ایک نے کہا چلو شرع کی طرف رجوع کریں، دوسرے نے کہا میں شرع کو نہیں سمجھتا یا مجھ کو شرع سے کام نہیں تو اس کو بیشک کافر کہیں گے۔

فائدہ: ۳ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا: یعنی اپنے متنازعات اور اختلافات کو اللہ اور رسول ﷺ کی طرف رجوع کرنا اور اللہ اور رسول کی فرمانبرداری کرنی مفید ہے، آپس میں جھگڑنے یا اپنی رائے کے موافق فیصلہ کرنے سے اس رجوع کا انجام بہتر ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ

کیا تو نے نہ دیکھا ان کو جو دعویٰ کرتے ہیں کہ ایمان لائے ہیں اس پر جو اترا تیری طرف اور جو اترا تجھ سے پہلے چاہتے ہیں

اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ ۭ وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ

کہ قضیہ لے جائیں شیطان کی طرف اور حکم ہو چکا ہے ان کو کہ اس کو نہ مانیں، اور چاہتا ہے شیطان

اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ۝۶۰

کہ ان کو بہکا کر دور جا ڈالے

خلاصہ تفسیر: گذشتہ آیت میں تمام معاملات میں اللہ اور رسول کے احکام کی طرف رجوع کرنے کا حکم تھا، اب ان آیات سے خلاف شرع قوانین کی طرف رجوع کرنے کی مذمت بیان کی گئی ہے اور منافقین کو ملامت کی گئی ہے کہ وہ ایسا کیا کرتے تھے۔

(اے محمد ﷺ!) کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو (زبان سے تو) دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ (یعنی ہم) اس کتاب پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو آپ کی طرف نازل کی گئی (یعنی قرآن) اور اس کتاب پر بھی جو آپ سے پہلے نازل کی گئی (یعنی تورات، کیونکہ اس میں منافقین کا بیان ہے، اور اکثر منافقین یہود میں سے تھے، مطلب یہ ہے کہ زبان سے دعویٰ کرتے ہیں کہ جس طرح ہم توریت کو مانتے ہیں اسی طرح قرآن کو بھی مانتے ہیں، یعنی

اسلام کے مدعی ہیں، پھر اس پر حالت یہ ہے کہ) اپنے مقدمے شیطان کے پاس لے جانا چاہتے ہیں (کیونکہ غیر شریعت کی طرف مقدمہ لے جانا گویا شیطان ہی کے پاس مقدمہ لے جانا ہے) حالانکہ (اس سے روکنے والے دو امر موجود ہیں: ① ایک یہ کہ) ان کو (شریعت کی جانب سے) یہ حکم ہوا کہ اس (شیطان) کو نہ مانیں (یعنی اعتقاد اور عمل دونوں سے اس کی مخالفت کریں) اور (② دوسرا مانع یہ کہ) شیطان (ان کا ایسا دشمن اور بدخواہ ہے کہ) ان کو (راہ حق سے) بھٹکا کر بہت دور لے جانا چاہتا ہے (پس باوجود ان دونوں باتوں کے جن کا تقاضا یہ ہے کہ شیطان کے کہنے پر عمل نہ کریں، پھر بھی اس کی موافقت کرتے ہیں)۔

يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ: مذکورہ اور آگے آنے والی آیات میں ایک خاص واقعہ کی طرف اشارہ ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ بشر نامی ایک منافق تھا، اس کا ایک یہودی کے ساتھ جھگڑا ہو گیا، یہودی نے کہا کہ چل محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس، ان سے فیصلہ کرائیں، مگر بشر منافق نے اس کو قبول نہ کیا، بلکہ کعب بن اشرف یہودی کے پاس جانے اور اس سے فیصلہ کرانے کی تجویز پیش کی، کعب بن اشرف یہودی کا ایک سردار اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کا سخت دشمن تھا، یہ عجیب بات تھی کہ یہودی تو اپنے سردار کو چھوڑ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ پسند کرے اور اپنے آپ کو مسلمان کہنے والا بشر آپ کی بجائے یہودی سردار کا فیصلہ اختیار کرے، مگر راز اس میں یہ تھا کہ ان دونوں کو اس پر یقین تھا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم حق و انصاف کا فیصلہ کریں گے، اس میں کسی کی رو و رعایت یا غلط فہمی کا اندیشہ نہیں اور چونکہ اس جھگڑے میں یہودی حق پر تھا، اس لئے اس کو اپنے سردار کعب بن اشرف سے زیادہ اعتماد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر تھا اور بشر منافق غلطی اور ناحق پر تھا، اس لئے جانتا تھا کہ آپ کا فیصلہ میرے خلاف ہوگا، اگرچہ میں مسلمان کہلاتا ہوں اور یہ یہودی ہے۔

ان دونوں میں باہمی گفتگو کے بعد یہ انجام ہوا کہ دونوں اسی پر راضی ہو گئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہو کر آپ ہی سے اپنے مقدمہ کا فیصلہ کرائیں، مقدمہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچا، آپ نے معاملہ کی تحقیق فرمائی، تو حق یہودی کا ثابت ہوا، اسی کے حق میں فیصلہ دے دیا اور بشر کو جو بظاہر مسلمان تھا ناکام کر دیا، اس لئے وہ اس فیصلہ پر راضی نہ ہوا اور ایک نئی راہ نکالی کہ کس طرح یہودی کو اس بات پر راضی کر لیا جائے کہ ہم حضرت عمر بن الخطابؓ کے پاس فیصل کرانے چلیں، یہودی نے اس کو قبول کر لیا، راز اس میں یہ تھا کہ بشر نے یہ سمجھا ہوا تھا کہ حضرت عمر کفار کے معاملہ میں سخت ہیں، وہ یہودی کے حق میں فیصلہ دینے کے بجائے میرے حق میں فیصلہ دیں گے۔

بہرکیف یہ دونوں اب حضرت فاروق اعظم کے پاس پہنچے، یہودی نے حضرت فاروق اعظم کے سامنے پورا واقعہ بیان کر دیا کہ اس مقدمہ کا فیصلہ حضرت محمد فرما چکے ہیں مگر یہ شخص اس پر مطمئن نہیں اور آپ کے پاس مقدمہ لایا ہے، حضرت عمرؓ نے بشر سے پوچھا کہ کیا یہی واقعہ ہے؟ اس نے اقرار کیا حضرت فارق اعظم نے فرمایا! اچھا ذرا ٹھہرو! میں آتا ہوں، گھر میں تشریف لے گئے اور ایک تلوار لے کر آئے اور اس منافق کا کام تمام کر دیا اور فرمایا: "جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ پر راضی نہ ہو اس کا یہی فیصلہ ہے"، یہ واقعہ روح المعانی میں بروایت ثعلبی و ابن ابی حاتم حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے منقول ہے، اور عامہ مفسرین نے اس میں یہ بھی لکھا ہے کہ اس کے بعد منافق مقتول کے وارثوں نے حضرت عمرؓ کے خلاف یہ دعویٰ بھی دائر کر دیا کہ انہوں نے ایک مسلمان کو بغیر دلیل شرعی کے مار ڈالا ہے اور اس کو مسلمان ثابت کرنے کے لئے اس کے کفر قولی و عملی کی تاویلیں پیش کیں، آیت متذکرہ میں اللہ تعالیٰ نے معاملہ کی اصل حقیقت اور اس شخص مقتول کا منافق ہونا ظاہر فرما کر حضرت عمرؓ کو بری کر دیا، اس سلسلہ میں اور بھی چند واقعات منقول ہیں، جن میں کچھ لوگوں نے شرعی فیصلہ چھوڑ کر کسی کاہن یا نجومی کا فیصلہ قبول کر لیا تھا، ہو سکتا ہے کہ آیت متذکرہ ان سب کے متعلق نازل ہوئی ہو۔

فائدہ: یہود فصل خصومات میں رعایت و رشوت کے عادی تھے، اس لئے جو لوگ جھوٹے اور منافق اور خائن ہوتے وہ اپنا معاملہ یہودیوں کے عالموں کے پاس لے جانا پسند کرتے کہ وہ خاطر کریں گے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایسے لوگ اپنا معاملہ لانا پسند نہ کرتے کہ آپ حق کی رعایت کریں گے اور کسی کی اصلاً رعایت نہ کریں گے، سو مدینے میں ایک یہودی اور ایک منافق کہ ظاہر میں مسلمان تھا کسی امر میں دونوں جھگڑ پڑے، یہودی جو

سچا تھا اس نے کہا کہ چل محمد ﷺ کے پاس اور منافق جو جھوٹا تھا اس نے کہا کہ چل کعب بن اشرف کے پاس جو یہودیوں میں عالم اور سردار تھا، آخر وہ دونوں آپ ﷺ کی خدمت میں جھگڑا لے کر آئے تو آپ ﷺ نے یہودی کا حق ثابت فرمایا، منافق جو باہر نکلا تو کہنے لگا کہ اچھا حضرت عمر رضی اللہ کے پاس چلو جو وہ فیصلہ کر دیں وہی منظور اور رسول اللہ ﷺ کے فیصلہ پر راضی نہ ہوا، غالباً یہ سمجھا ہوگا کہ میں مدعی اسلام ہوں، اس لئے یہودی کے مقابلہ میں میری رعایت کریں گے اور حضرت عمر رضی اللہ آپ ﷺ کے حکم سے مدینہ میں جھگڑے فیصل کیا کرتے تھے، چنانچہ وہ دونوں حضرت عمر رضی اللہ کے پاس آئے، جب حضرت عمر رضی اللہ نے یہ جھگڑا سنا اور یہودی کے بیان سے ان کو یہ بھی معلوم ہوگیا کہ یہ قضیہ آپ ﷺ کی خدمت میں جا چکا ہے اور آپ اس معاملہ میں یہودی کو سچا اور غالب کر چکے ہیں تو حضرت عمر رضی اللہ نے اس منافق کو قتل کر دیا اور فرمایا کہ جو کوئی ایسے قاضی کے فیصلہ کو نہ مانے اسکا فیصلہ یہی ہے، اس کے وارث حضرت محمد ﷺ کی خدمت میں آئے اور حضرت عمر رضی اللہ پر قتل کا دعویٰ کیا اور قسمیں کھانے لگے کہ حضرت عمر رضی اللہ کے پاس تو صرف اس وجہ سے گئے تھے کہ شاید وہ اس معاملہ میں باہم صلح کرا دیں، یہ وجہ نہ تھی کہ حضرت محمد ﷺ کے فیصلہ سے انکار تھا، اس پر یہ آیتیں نازل ہوئیں، ان آیات میں اصل حقیقت ظاہر فرما دی گئی اور حضرت عمر رضی اللہ کا لقب "فاروق" فرمایا۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلَىٰ مَا أَنزَلَ اللَّهُ وَإِلَى الرَّسُولِ رَأَيْتَ الْمُنَافِقِينَ يَصُدُّونَ عَنكَ صُدُودًا ﴿٦١﴾

اور جب ان کو کہیے کہ آؤ اللہ کے حکم کی طرف جو اس نے اتارا اور رسول ﷺ کی طرف تو دیکھے تو منافقوں کو کہ ہٹتے ہیں تجھ سے رک کر

خلاصہ تفسیر: اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اس حکم کی طرف جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا ہے اور (آؤ) رسول کی طرف (کہ آپ حکم الٰہی کے موافق فیصلہ فرما دیں) تو آپ (اس وقت) منافقین کی یہ حالت دیکھیں گے کہ آپ (کے پاس آنے) سے پہلوتہی کرتے ہیں۔

* * *

فائدہ: یعنی جب کسی جھگڑے میں منافقوں سے کہا جائے کہ اللہ نے جو حکم نازل فرمایا ہے اسکی طرف آؤ اور اس کے رسول ﷺ کے روبرو اپنے جھگڑے کو لاؤ تو ظاہر میں چونکہ مدعی اسلام ہیں، اس لئے صاف طور پر تو انکار نہیں کر سکتے، مگر آپ کے پاس آنے سے اور حکم الٰہی پر چلنے سے بچتے ہیں اور رکتے ہیں کہ کسی ترکیب سے جان بچ جائے اور رسول ﷺ کو چھوڑ کر جہاں ہمارا جی چاہے اپنا جھگڑا لے جائیں۔

فَكَيْفَ إِذَا أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌ بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ ثُمَّ جَاءُوكَ يَحْلِفُونَ بِاللَّهِ إِنْ أَرَدْنَا

پھر کیا ہو کہ جب ان کو پہنچے مصیبت اپنے ہاتھوں کے کئے ہوئے سے پھر آئیں تیرے پاس قسمیں کھاتے ہوئے اللہ کی ہم کو غرض نہ تھی

إِلَّا إِحْسَانًا وَتَوْفِيقًا ﴿٦٢﴾

مگر بھلائی اور ملاپ

خلاصہ تفسیر: پھر کیسی جان کو بنتی ہے جب ان پر کوئی مصیبت پڑتی ہے ان کی اس حرکت کی بدولت جو (اس مصیبت سے) پہلے کر چکے تھے (مراد اس حرکت سے شریعت کو چھوڑ کر دوسری جگہ مقدمہ لے جانا ہے، اور "مصیبت" سے مراد قتل ہونا، یا خیانت و نفاق کا کھل جانا اور باز پرس ہونا، یعنی اس وقت سوچ پڑتی ہے کہ اس حرکت کی کیا تاویل کریں جس سے سرخروئی نصیب ہو) پھر (تاویل سوچ کر) آپ کے پاس آتے ہیں، خدا کی قسمیں کھاتے ہیں کہ (ہم جو دوسری جگہ چلے گئے تھے) ہمارا اور کچھ مقصود نہ تھا سوا اس کے کہ (معاملہ کے دونوں فریق کی) کوئی بھلائی (کی صورت) نکل آئے اور (ان میں) باہم موافقت (مصالحت) ہو جائے۔

مطلب یہ کہ قانون تو شریعت ہی کا حق ہے، ہم دوسری جگہ شریعت کو ناحق سمجھ کر نہیں گئے تھے، بلکہ بات یہ ہے کہ قانونی فیصلہ میں تو صاحب حق کو حاکم رعایت کرنے کے لئے تو نہیں کہہ سکتا اور باہمی فیصلہ میں اکثر رعایت کرا دی جاتی ہے، یہ وجہ تھی ہمارے دوسری جگہ جانے کی، گویا اس قتل کے

قصہ میں اس مقتول کی اور اپنی براءت ظاہر کر کے اس کا ناحق مقتول ہونا بتلاتے ہیں یا حضرت عمرؓ پر قتل کا دعویٰ بھی مقصود ہوگا۔

فائدہ: یعنی یہ تو سب کچھ ہوا مگر یہ منافق لوگ اس وقت کیا کریں گے جس وقت پہنچنے لگے ان کو عذاب ان کے کرتوت کا یعنی فصل خصومات میں آپ کے پاس آنے سے جو رکتے اور بچتے ہیں جب اس کا عذاب ان پر آنے لگے تو پھر یہ منافق اس وقت کیا کر سکتے ہیں اس کے سواء کہ آئیں رسول ﷺ کی خدمت میں قسمیں کھاتے ہوئے کہ ہم تو حضرت عمر رضی اللہ کی خدمت میں صرف اس وجہ سے گئے تھے کہ شاید وہ باہم صلح اور ملاپ کرادیں، رسول ﷺ کے ارشاد سے اعراض کرنا اور جان بچانا ہرگز ہم کو منظور نہ تھا۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ يَعْلَمُ اللَّهُ مَا فِي قُلُوبِهِمْ فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُلْ لَهُمْ فِي أَنْفُسِهِمْ

یہ وہ لوگ ہیں کہ اللہ جانتا ہے جو ان کے دل میں ہے، سو تو ان سے تغافل کر اور ان کو نصیحت کر اور ان سے کہہ ان کے حق میں

قَوْلًا بَلِيغًا ﴿٦٣﴾

بات کام کی

خلاصہ تفسیر: (اللہ تعالیٰ ان کی اس تاویل کی تکذیب فرماتے ہیں کہ:) یہ وہ لوگ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے جو کچھ (نفاق وکفر) ان کے دلوں میں ہے (کہ اس کفر، نفاق اور شریعت کے حکم پر راضی نہ ہونے کی وجہ سے یہ لوگ دوسری جگہ مقدمہ لے جاتے ہیں تو معین وقت پر اس کی سزا بھی پالیں گے) سو (مصلحت یہی ہے کہ) آپ (علم خداوندی پر اکتفا فرما کر) ان سے تغافل کر جایا کیجئے (یعنی کچھ مواخذہ نہ فرمایئے، خداوندی مواخذہ کو کافی سمجھیے) اور (ویسے اپنے منصب رسالت کے تقاضہ کے مطابق) ان کو نصیحت فرماتے رہیے (کہ ان حرکتوں کو چھوڑ دو) اور ان سے خاص ان کی ذات (کی اصلاح) کے متعلق کافی مضمون کہہ دیجئے (تاکہ ان پر حجت الٰہی قائم اور تمام ہوجائے، پھر بھی نہ مانیں تو وہ جانیں)۔

فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ: اس اعراض وتغافل کے مصلحت ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ان منافقین کا کفر مشہور تو تھا نہیں، بلکہ ظاہر میں دیگر صحابہ کی طرح مسلمان معلوم ہوتے تھے، اگر ان کے ساتھ اسی طرح جہاد وغیرہ کیا جاتا جیسے کہ عام کفار کے ساتھ ہوتا ہے تو دور والے جن کو ان کی خفیہ شرارتوں کی اطلاع نہیں تھی یہ قتل وغارت سن کر کہتے کہ اسلام میں بہت سختی اور بدنظمی ہے کہ اپنے آدمیوں کو بھی قتل کر دیتے ہیں، اس خیال سے ایک گونہ اسلام سے وحشت ہوتی اور اسلام کی ترقی رک جاتی، ایک حدیث میں حضور ﷺ کا یہ ارشاد کہ "دعه فإن الناس يتحدثون ان محمدا يقتل اصحابه" او كما قال اسی مصلحت کی طرف اشارہ کرتا ہے، مگر اس واقعہ میں چونکہ حضرت عمرؓ کے ہاتھ سے وہ منافق قتل ہو چکا تھا اور حقیقت میں وہ کافر ہی تھا اس لیے اس کا خون معاف ہوگیا، حضرت عمرؓ کے ذمہ قصاص یا دیت یا تاوان کچھ نہیں ہوا، چنانچہ کسی روایت سے یہ ثابت بھی نہیں۔

اگر کسی کو شبہ ہو کہ حضرت عمرؓ کے ہاتھوں اس منافق کے قتل ہوجانے میں بھی اسلام کی بدنامی اور وحشت کا احتمال ہو سکتا ہے تو اس کا قطعی جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اختیار ہے کہ ایک عام قانون میں سے کسی خاص واقعہ کو مستثنیٰ کر دیں، اور جو حکمت عام قانون میں تھی اس خاص واقعہ میں اس سے زیادہ حکمت رکھ دیں، چنانچہ اس واقعہ میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ منافق چونکہ ظاہر میں مسلمان تھا اور اس کا معاملہ ایک مجاہر کافر کے ساتھ تھا، اس معاملہ میں اس منافق کو یہ سزا دی گئی اور اس کا خون معاف کیا گیا تو وہ یہودی اس قصہ کو اپنے لوگوں میں بیان کرے گا تو اہل عقل وانصاف اسلام کی حق پرستی کی اعلیٰ درجہ کی داد دے سکتے ہیں کہ غیر قوموں کے مقابلہ میں بھی اپنی قوم کو حق بات قبول کرنے پر ایسا مجبور کرتے ہیں کہ نہ ماننے پر ان کی جان کی بھی رعایت نہیں کرتے، واللہ اعلم باسرارہ۔

* * *

فائدہ: اس آیت میں حق تعالیٰ نے ان کی قسم اور ان کی معذرت سابقہ کی تکذیب فرمائی کہ منافقین جو کچھ زبانی باتیں بنائیں بنانے دو، اللہ

تعالیٰ کو انکے دل کی باتیں خوب معلوم ہیں، یعنی ان کے نفاق اور ان کے جھوٹ کو خوب جانتا ہے، سو آپ بھی علم خداوندی پر بس کر کے منافقوں کی بات سے تغافل کیجئے اور ان کی بات کی پروا نہ کیجئے، مگر ان کو نصیحت کرنے اور کام کی باتیں بتانے میں ہرگز کوتاہی نہ فرمائیں اور انکی ہدایت سے مایوس نہ ہوجیے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ

اور ہم نے کوئی رسول صلی اللہ علیہ وسلم نہیں بھیجا مگر اسی واسطے کہ اس کا حکم مانیں اللہ کے فرمانے سے، اور اگر وہ لوگ جس وقت انہوں نے اپنا برا کیا تھا

جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ﴿۶۴﴾

آتے تیرے پاس پھر اللہ سے معافی چاہتے اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان کو بخشواتا تو البتہ اللہ کو پاتے معاف کرنے والا مہربان

خلاصہ تفسیر: (پیچھے منافقین کے نامعقول عذر کا غلط ہونا بیان کیا، اب ارشاد فرماتے ہیں کہ اس باطل تاویل کے بجائے اگر ندامت و استغفار اختیار کرتے تو اس جرم کی تلافی ہوجاتی) اور ہم نے تمام پیغمبروں کو خاص اسی واسطے مبعوث فرمایا ہے کہ بحکم خداوندی (جو کہ پیغمبروں کی اطاعت کے بارہ میں فرمایا ہے کہ) ان کی اطاعت کی جائے (پس اول تو ان لوگوں کو شروع ہی سے اطاعت کرنا واجب تھی) اور اگر (خیر شامت نفس سے حماقت ہی ہوگئی تھی تو) جس وقت (یہ گناہ کر کے) اپنا نقصان کر بیٹھے تھے اس وقت (ندامت کے ساتھ) آپ کی خدمت میں حاضر ہوجاتے پھر (حاضر ہوکر) اللہ تعالیٰ سے (اپنے اس گناہ کی) معافی چاہتے اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم یعنی آپ بھی) ان کے لیے اللہ تعالیٰ سے معافی چاہتے تو ضرور اللہ تعالیٰ کو توبہ کا قبول کرنے والا اور رحمت کرنے والا پاتے (یعنی اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے توبہ قبول فرمالیتے)۔

جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ: یہ مطلب نہیں کہ منافق رہ کر توبہ کر لینا کافی تھا، کیونکہ خود توبہ کی قبولیت کے شرائط میں سے ایمان ہے، خلاصہ یہ ہوا کہ نفاق چھوڑ کر ایمان لے آئیں، کیونکہ استغفار موقوف ہے ایمان پر، استغفار کے لفظ میں خود ایمان کا مفہوم بھی شامل ہے، اس لیے ایمان کی صراحت کی حاجت نہ رہی، تقدیر کلام یوں سمجھی گئی ہے: "ثم جاءوك فامنوا واستغفروا" پس ان کی قبولیت توبہ کی ایک شرط تو استغفار بیان کی گئی، دو شرطیں اور بھی آیت میں مذکور ہیں: ① ایک تو خدمت نبوی میں حاضری ② دوسرے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی استغفار کرنا، حالانکہ ظاہرا توبہ کرنے یا مسلمان ہونے کے لیے صرف بندہ کا ذاتی توبہ اور استغفار کافی ہے، اس کے ساتھ کسی اور چیز کی ضرورت نہیں، لیکن اس آیت میں منافقین کی معافی کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے استغفار اور ان کی خدمت میں حاضری کو بھی شرط قرار دیا، اس کی کیا وجہ ہے؟ ایک وجہ تو یہ ہے کہ ایمان کا اظہار بھی ضروری ہے اور جو شخص آپ سے مکان کے اعتبار سے قریب ہو اس کے اظہار کا اس وقت یہی طریقہ تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر مسلمان ہوجائے، دوسری وجہ یہ کہ توبہ گناہ کے حساب سے ہوتی ہے، یعنی جو امر تدارک کے قابل ہو تو اس کا تدارک بھی اسی حساب سے ہوگا جس طرح غلطی ہوئی تھی، چنانچہ ترک نماز سے توبہ کے لیے ضروری ہے کہ قضا نمازیں پڑھے، چونکہ یہ گناہ غیر حاضری کا تھا اس لیے اس کا تدارک حاضری سے ہوگا اور جیسے گناہ کی اطلاع سب کو ہوئی تھی اس توبہ کا اظہار بھی ضروری ہے جس کا طریقہ اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری تھی، تیسری وجہ یہ کہ جو منافقین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ پر راضی نہ ہوئے اور طاغوت کے فیصلہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلہ پر ترجیح دی تو ان لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دل کو صدمہ اور ایذا پہنچائی، لہذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو راضی کیے بغیر ان کی توبہ قبول نہیں ہوسکتی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ان کی حاضری سے دلی رضا و خوشنودی حاصل ہوگی، اور اصل سوال کے جواب میں یہ بھی کہنا ممکن ہے کہ استغفار کے علاوہ دیگر امور کا توبہ کی شرائط کے طور پر بتلانا مقصود نہیں، بلکہ مکمل توبہ کہنا مقصود ہے، یعنی اس خاص طریقہ سے توبہ کریں تاکہ خوب کامل توبہ ہو، چنانچہ یہ نفس توبہ نہیں بلکہ کمال توبہ کا طریقہ بتایا ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی اللہ تعالیٰ جس رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے بندوں کی طرف بھیجتا ہے، سو اسی غرض کیلئے بھیجتا ہے کہ اللہ کے حکم کے موافق بندے ان کے کہنے کو مانیں تو اب ضرور تھا کہ یہ لوگ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کو بلا تامل پہلے ہی سے دل و جان سے تسلیم کرتے اور اگر گناہ اور برا کرنے کے بعد بھی

متنبہ ہوجاتے اور اللہ سے معافی چاہتے اور رسول ﷺ بھی ان کی معافی کی دعا کرتا تو پھر بھی حق تعالیٰ ان کی توبہ قبول فرمالیتا، مگر انہوں نے تو یہ غضب کیا کہ اول تو رسول اللہ ﷺ کے حکم سے جو بعینہٖ اللہ تعالیٰ کا حکم تھا ہٹے اور بچے، پھر جب اس کا وبال ان پر پڑا تو اب بھی متنبہ اور تائب نہ ہوئے، بلکہ لگے جھوٹی قسمیں کھانے اور تاویلیں گھڑنے، پھر ایسوں کی مغفرت ہو تو کیونکر ہو۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا

سو قسم ہے تیرے رب کی وہ مومن نہ ہونگے یہاں تک کہ تجھ کو ہی منصف جانیں اس جھگڑے میں جو ان میں اٹھے پھر نہ پائیں اپنے جی میں تنگی

مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ﴿٦٥﴾

تیرے فیصلہ سے اور قبول کریں خوشی سے

خلاصہ تفسیر: اوپر شریعت کی طرف رجوع کرنے کو واجب اور غیر شریعت کی طرف رجوع کرنے کو حرام فرمایا تھا، اب فرماتے ہیں کہ شریعت کی طرف محض ظاہری رجوع کرنا کافی نہیں، بلکہ باطنی طور پر بھی اس پر راضی ہونا ضروری ہے، یعنی کامل تسلیم ایمان کی شرط ہے۔

پھر قسم ہے آپ کے رب کی یہ لوگ (جو صرف زبانی ایمان ظاہر کرتے پھرتے ہیں اللہ کے نزدیک) ایمان دار نہ ہوں گے (یعنی ان کا ایمان مقبول نہ ہوگا) جب تک یہ بات نہ ہو کہ ان کے آپس میں جھگڑا واقع ہو، اس میں یہ لوگ آپ سے (اور اگر آپ نہ ہوں تو آپ کی شریعت سے) فیصلہ کرادیں، پھر (جب آپ ﷺ تصفیہ کردیں تو) اس آپ کے تصفیہ سے اپنے دلوں میں (انکار کی) تنگی نہ پائیں، اور (اس فیصلہ کو) پورا پورا (ظاہر سے باطن سے) تسلیم کرلیں۔

* * *

فائدہ: یعنی منافق لوگ کس بیہودہ خیال میں ہیں اور کیسے بیہودہ حیلوں سے کام نکالنا چاہتے ہیں، ان کو خوب سمجھ لینا چاہئے ہم قسم کھا کر کہتے ہیں کہ جب تک یہ لوگ تم کو اے رسول! اپنے تمام چھوٹے بڑے، مالی جانی نزاعات میں منصف اور حاکم نہ جان لیں گے کہ تمہارے فیصلہ اور حکم سے ان کے جی میں کچھ تنگی اور ناخوشی نہ آنے پائے اور تمہارے ہر ایک حکم کو خوشی کے ساتھ دل سے قبول نہ کرلیں گے، اس وقت تک ہرگز ان کو ایمان نصیب نہیں ہوسکتا، اب جو کرنا ہو سوچ سمجھ کر کریں۔

وَلَوْ اَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ اَنِ اقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اَوِ اخْرُجُوْا مِنْ دِيَارِكُمْ مَّا فَعَلُوْهُ اِلَّا قَلِيْلٌ

اور اگر ہم ان پر حکم کرتے کہ ہلاک کرو اپنی جان یا چھوڑ نکلو اپنے گھر تو ایسا نہ کرتے مگر تھوڑے

مِّنْهُمْ ؕ وَلَوْ اَنَّهُمْ فَعَلُوْا مَا يُوْعَظُوْنَ بِهٖ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَشَدَّ تَثْبِيْتًا ﴿٦٦﴾

ان میں سے، اور اگر یہ لوگ کریں وہ جو ان کو نصیحت کی جاتی ہے تو البتہ ان کے حق میں بہتر ہو اور زیادہ ثابت رکھنے والا ہو دین میں

وَّاِذًا لَّاٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ لَّدُنَّآ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿٦٧﴾ وَّلَهَدَيْنٰهُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ﴿٦٨﴾

اور اس وقت البتہ دیں ہم ان کو اپنے پاس سے بڑا ثواب، اور چلائیں ان کو سیدھی راہ۔

خلاصہ تفسیر: (پیچھے کامل اطاعت کا واجب ہونا ذکر کیا، اب اس کا خیر و نافع ہونا اور اس درجہ کی اطاعت کرنے والوں کا کم ہونا بیان کرتے ہیں) اور ہم اگر لوگوں پر یہ بات فرض کردیتے (یعنی اصل احکام کی طرح ان کو بھی مقصود بنادیتے) کہ تم خودکشی کیا کرو یا اپنے وطن سے بے وطن ہوجایا کرو تو بجز معدودے چند لوگوں کے (جو کامل مومن ہوتے) اس حکم کو کوئی بھی نہ بجالاتا (اس سے ثابت ہوا کہ کامل اطاعت کرنے والے کم

ہوتے ہیں) اور اگر یہ (منافق) لوگ جو کچھ ان کو (دل وجان سے اللہ ورسول کی اطاعت کرنے کی) نصیحت کی جاتی ہے اس پر عمل کیا کرتے تو ان کے لئے (دنیا میں تو ثواب کے مستحق ہونے کی وجہ سے) بہتر ہوتا اور (نیز تکمیل دین کے اعتبار سے ان کے) ایمان کو زیادہ پختہ کرنے والا ہوتا (کیونکہ تجربہ سے ثابت ہوا کہ دین کا کام کرنے سے خود اعتقاد اور یقین کی باطنی کیفیت کو بھی ترقی ہوتی رہتی ہے) اور اس حالت میں (جب کہ عمل سے بھلائی اور دین میں پختگی حاصل ہوجاتی تو آخرت میں) ہم ان کو خاص اپنے پاس سے اجر عظیم عنایت فرماتے، اور ہم ان کو (جنت کا) سیدھا راستہ بتلا دیتے (کہ بے روک ٹوک جنت میں داخل ہوں جو کہ عظیم اجر ملنے کا مقام ہے)۔

وَلَوْ اَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ: یعنی ہم اگر لوگوں پر یہ بات فرض کر دیتے یعنی اصل احکام کی طرح ان کو بھی مقصود بنا دیتے کہ تم خودکشی کیا کرو یا بے وطن ہوجایا کرو، یہاں جو احکام مقصودہ کی قید لگائی اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک معنی میں تو یہ دونوں حکم اب بھی موجود ہیں یعنی جہاد وقتال اور ترک وطن یا ہجرت اپنے اپنے موقع پر اور شرائط پائے جانے پر اب بھی واجب ہیں، یہاں مراد یہ ہے کہ اگر یہ احکام خود بھی مقصود بالذات ہوتے اور قتال وہجرت ہر حال میں فرض ہوتے لیکن ان دونوں سے اصل مقصود اعلاء کلمۃ اللہ اور دین اسلام کی حفاظت ہے، اگر یہ حاصل ہوجائے تو پھر ہجرت وقتال ختم ہوجاتا ہے۔

مَّا فَعَلُوْهُ اِلَّا قَلِيْلٌ مِّنْهُمْ: یعنی چند لوگوں کے سوا اس حکم کو کوئی بھی نہ بجالاتا، ان ''چند لوگوں'' میں تمام صحابہ اور مؤمنین کاملین داخل ہیں، جو کہ کفار ومنافقین کی کثرت تعداد کے مقابلہ میں تھوڑے ہی ہیں، یہ مطلب نہیں کہ اس وقت کے مؤمنین میں ایسے لوگ دو چار ہوتے، کیونکہ دلائل سے ثابت ہے کہ صحابہ سب ایسے ہی جاں نثار تھے، جب اس میں صحابہ اور کامل مؤمنین سب داخل ہیں تو اب بنی اسرائیل کا اس امت سے افضل ہونا لازم نہیں آتا۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی سب کی جانوں کا مالک چونکہ خدا تعالیٰ ہے، اس لئے اس کے حکم میں کسی کو جان سے بھی دریغ نہ کرنا چاہئے، سو اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کو کہیں اپنی جانوں کے ہلاک کر ڈالنے اور جلا وطن ہوجانے کا حکم فرما دیتا جیسے کہ بنی اسرائیل پر حکم کر دیا تھا تو بجا نہ لاتے اس حکم کو مگر گنے چنے صرف سچے اور پکے ایمان والے، یہ منافق ایسے حکم پر کیسے عمل کر سکتے تھے، اب ان کو سمجھنا چاہیے کہ ان کو ہم نے جو حکم دے رکھے ہیں وہ محض ان کی نصیحت اور خیر خواہی کے ہیں، نہ جان کی ہلاکت کا حکم دیا گیا، نہ جلا وطن ہونے کا، اگر انہی آسان اور سہل حکموں پر چلیں تو نفاق بالکل جاتا رہے اور خالص مسلمان ہوجائیں، مگر افسوس سمجھتے نہیں اور حالت موجودہ کو غنیمت نہیں سمجھتے کہ ذرا سی بات میں دین ودنیا دونوں درست ہوئے جاتے ہیں۔

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ

اور جو کوئی حکم مانے اللہ کا اور اس کے رسول ﷺ کا سو وہ ان کے ساتھ ہیں جن پر اللہ نے انعام کیا کہ وہ نبی اور صدیق

وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ﴿٦٩﴾ ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ عَلِيْمًا ﴿٧٠﴾

اور شہید اور نیک بخت ہیں، اور اچھی ہے ان کی رفاقت ۱؎ یہ فضل ہے اللہ کی طرف سے، اور اللہ کافی ہے جاننے والا ۲؎

خلاصہ تفسیر: پیچھے اللہ ورسول کی اطاعت پر خاص مخاطبین سے اجر عظیم کا وعدہ تھا، آگے بطور قاعدہ کلیہ کے اللہ اور رسول کی اطاعت پر عام وعدہ کا ذکر ہے جس میں ''عظیم اجر'' کی تفسیر بھی ہوجائے گی جس کا ذکر پیچھے آیا ہے۔

اور جو شخص (ضروری احکام میں بھی) اللہ ورسول کا کہنا مان لے گا (اگرچہ اطاعات کی کثرت سے کمال حاصل نہ کر سکے) تو ایسے اشخاص بھی (جنت میں) ان حضرات کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ تعالیٰ نے (کامل) انعام (دین وقرب وقبول کا) فرمایا ہے، یعنی انبیاء علیہم السلام اور صدیقین (جو کہ انبیاء کی امت میں سب سے زیادہ رتبہ کے ہوتے ہیں، جن میں کمال باطنی بھی ہوتا ہے، ان کو عرف میں ''اولیاء'' کہا جاتا ہے) اور شہداء (جنہوں

نے دین کی محبت میں اپنی جان تک دے دی) اور صلحاء (جو شریعت کے پورے متبع ہوتے ہیں واجبات میں بھی اور مستحبات میں بھی، جن کو نیک بخت دیندار کہا جاتا ہے) اور یہ حضرات (جس کے رفیق ہوں) بہت اچھے رفیق ہیں (اور اطاعت کرنے والوں کی ان کے ساتھ رفاقت ثابت ہے، پس حاصل یہ ہوا کہ اطاعت کا ثمرہ یہ ملے گا کہ اس کے رفیق ایسے لوگ ہوں گے) یہ (معیت اور رفاقت ان حضرات کے ساتھ محض) فضل ہے اللہ تعالیٰ کی جانب سے (یعنی عمل کا بدلہ نہیں ہے، کیونکہ ان کی اطاعت اس کے لیے کافی نہ تھی، کیونکہ عمل کا تقاضہ تو یہ تھا کہ جس درجہ کا عمل ہو وہاں سے آگے نہ جاسکے، پس یہ بطور انعام کے ہے) اور اللہ تعالیٰ کافی جاننے والے ہیں (ہر ایک کے عمل کو اور اس کے مقتضا کو اور اس مقتضا سے زائد مناسب انعام کی مقدار کو خوب جانتے ہیں، کیونکہ اس انعام میں بھی فرق ہوگا، کسی کو ان حضرات سے بار بار قرب ہوگا، کسی کو گاہ بگاہ وعلیٰ ہذا، واللہ اعلم)۔

وَمَنۡ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوۡلَ فَاُولٰٓئِكَ: ضروری احکام میں اطاعت کرنے کے بھی مختلف درجات اور مرتبے ہیں، ادنیٰ درجہ وہ ہے جس سے آدمی مؤمن ہوجاتا ہے، اس سے اعلیٰ درجہ وہ ہے جس سے عاصی کے لقب سے بچ جاتا ہے، اس جگہ اطاعت کے یہی دو درجے مراد ہیں، جس درجہ کی اطاعت ہے اسی کے موافق انبیاء علیہم السلام وغیرہ کی معیت ہوگی، اس سے اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ ظاہری و باطنی مستحبات کو بھی بجالائے، یہ درجہ صدیقین اور اولیاء کاملین کو نصیب ہوتا ہے، آیت میں اطاعت کا یہ درجہ اس لیے مراد نہیں کہ اس میں اطاعت کرنے والوں کو انبیاء، صدیقین اور اولیاء کی معیت کی بشارت دی گئی ہے، جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اطاعت کا وہ درجہ مراد ہے جو مرتبہ صدیقیت کی شہادت سے کم ہے، خلاصہ یہ کہ اس اطاعت کا تعلق ضروری احکام اور واجبات سے ہے، ورنہ اگر فرائض وواجبات کے علاوہ مستحبات، نوافل، تطوعات کا بھی اسی قدر اہتمام ہوجائے تو پھر درجہ ولایت خود ہی حاصل ہوجائے گا اور انعام کے طور پر رفاقت اولیاء نصیب ہونے کے کوئی معنی نہ رہیں گے۔

اس آیت میں باطنی مقامات کا اثبات ہے، اور اس پر بھی دلالت ہے کہ ان مقامات والوں میں ادنیٰ کو اعلیٰ کے ساتھ معیت ورفاقت ممکن ہے اور یہی حقیقت ہے اس کی جو بعض صوفیاء کو مکشوف ہوا ہے کہ وہ اعلیٰ کے مقام میں پہنچا ہے، تو یہ پہنچنا اصالتاً نہیں تبعاً ہوتا ہے، اور جس شخص کو یہ حقیقت معلوم نہیں ہوتی وہ دعوی نبوت وغیرہ کر کے گمراہی میں پڑ جاتا ہے، نعوذ باللہ۔

فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيۡنَ اَنۡعَمَ اللّٰهُ: جاننا چاہیے کہ ساتھ ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ سب ایک درجہ میں ہوں گے، کیونکہ یہ تو محال ہے، کیونکہ ایک اور جگہ ارشاد ہے: هم درجات عند الله، یعنی اللہ کے یہاں لوگوں کے درجے مختلف ہیں، کیونکہ فرق مراتب ضروری ہے، اور نہ صرف یہ مراد ہے کہ جنت میں چلے جائیں گے، کیونکہ اس سے کوئی بڑی فضیلت نہیں نکلتی، حالانکہ یہ تعریف کے مقام میں فرمایا گیا ہے، بلکہ ساتھ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ نیچے کے درجہ والے اوپر کے درجے والوں سے ملتے رہیں گے، ان کی زیارت وبرکات سے مشرف ہوا کریں گے، درجات اور مراتب کا فرق زیارت اور ملاقات میں رکاوٹ نہ ہوگا، جس طرح دنیا میں درجات کے فرق سے ملاقات میں رکاوٹ نہیں ہوتی اسی طرح آخرت میں بھی ہوگا۔

* * *

فائدہ: [1] ''نبی'' وہ ہیں جن پر اللہ کی طرف سے وحی آئے، یعنی فرشتہ ظاہر میں آکر پیغام کہہ جائے۔

''صدیق'' وہ کہ جو پیغام اور احکام خدا تعالیٰ کی طرف سے پیغمبروں کو آئے ان کا جی آپ ہی اس پر گواہی دے اور بلا دلیل اس کی تصدیق کرے، اور ''شہید'' وہ کہ پیغمبروں کے حکم پر جان دینے کو حاضر ہیں۔

''صالح اور نیک بخت'' وہ کہ جن کی طبیعت نیکی ہی پر پیدا ہوئی ہے اور بری باتوں سے اپنے نفس اور بدن کی اصلاح اور صفائی کر چکے ہیں، مطلب یہ ہے کہ یہ چار قسمیں مذکورہ جوامت کے باقی افراد سے افضل ہیں، ان کے ماسواء جو مسلمان ہیں اور درجہ میں ان کے برابر نہیں، لیکن اللہ اور رسول ﷺ کی فرمانبرداری میں مشغول ہیں، وہ لوگ بھی انہیں کی شمار اور ذیل میں لئے جائیں گے اور ان حضرات کی رفاقت بہت ہی خوبی اور فضیلت کی بات ہے، اس کو کوئی حقیر نہ سمجھے، اس آیت میں اشارہ ہو گیا کہ منافقین جن کا ذکر پہلے سے ہو رہا ہے وہ اس رفاقت اور معیت سے محروم ہیں۔

فائدہ: [2] یعنی اللہ اور رسول ﷺ کے حکم ماننے والوں کو انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صالحین کی رفاقت میسر آنی اللہ کا بڑا انعام اور

اس کا محض فضل ہے، ان کی اطاعت کا معاوضہ نہیں جس سے منافقین بالکل محروم ہیں، اور اللہ کافی ہے جاننے والا اور خبر رکھنے والا، وہ ہر ایک مخلص اور منافق اور ہر مطیع کی طاعت اور اس کے استحقاق اصلی اور مقدار فضل کو بالتفصیل جانتا ہے تو اب کسی کو ان امور کی تفاصیل کی وجہ سے وعدہ الٰہی کے پورا ہونے میں خلجان پیدا نہ ہو۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَكُمْ فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا جَمِيْعًا ﴿۷۱﴾

اے ایمان والو! لے لو اپنے ہتھیار پھر نکلو جدی جدی فوج ہو کر یا سب اکٹھے

خلاصہ تفسیر: پیچھے مخالفین کے معاملات میں سے ایک معاملہ یعنی کفار کی قباحتوں کا اظہار کئی رکوع میں بیان ہوا، درمیان میں مقابلہ کے لیے اہل ایمان کی فضیلت کا بھی ذکر ہو گیا، مخالفین کے معاملات میں سے ایک جہاد بھی ہے، اب اسی کا ذکر شروع ہو رہا ہے اور دور تک اسی کے متعلق مضامین ہیں۔

اے ایمان والو! (کافروں کے مقابلہ میں) اپنی تو احتیاط رکھو (یعنی ان کے داؤ گھات سے بھی ہوشیار رہو اور قتال کے وقت سامان، ہتھیار، ڈھال اور تلوار سے بھی درست رہو) پھر (ان سے قتال و لڑائی کے لئے) متفرق طور پر یا مجتمع طور پر (جیسا موقع ہو) نکلو۔

اس جگہ اصل مقصود تو جہاد کا حکم دینا ہے، مگر پہلے حفاظت اور احتیاط کا حکم دیا جو کہ رحمت و شفقت الٰہیہ کی دلیل ہے۔

* * *

فائدہ: یہاں سے جہاد کا ذکر ہے، اس سے پہلی آیت میں یہ ذکر تھا کہ جو اللہ اور رسول ﷺ کی فرمانبرداری کرے گا اس کو انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صالحین کی رفاقت انعام میں ملے گی اور احکام خداوندی میں حکم جہاد چونکہ شاق اور دشوار ہے خصوصاً منافقین پر جن کا ذکر اوپر سے آ رہا ہے، اس لئے جہاد کا حکم فرمایا کہ ہر کوئی حضرات انبیاء صدیقین وغیرہم کی رفاقت اور معیت کی امید نہ کرنے لگے۔

منقول ہے کہ شروع اسلام میں بہت سے ضعیف الاسلام بھی دعوت اسلامی کو قبول کر چکے تھے، پھر جب جہاد فرض ہو گیا تو بعض متزلزل ہو گئے اور بعض کفار کے ہم زبان ہو کر آپ کی مخالفت کرنے لگے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی، مطلب یہ ہے کہ اے مسلمانو! منافقوں کی کیفیت تو تم کو پہلے سے معلوم ہو چکی، اب خیر اسی میں ہے کہ تم اپنا ہر طرح سے بچاؤ اور اپنی خبرداری اور احتیاط کر لو، ہتھیاروں سے ہو یا تدبیر سے، عقل سے ہو یا سامان سے اور دشمنوں کے مقابلہ اور مقاتلہ کے لئے گھر سے باہر نکلو متفرق طور پر یا سب اکٹھے ہو کر جیسا موقع ہو۔

وَاِنَّ مِنْكُمْ لَمَنْ لَّيُبَطِّئَنَّ ۚ فَاِنْ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالَ قَدْ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيَّ

اور بیشک تم میں بعضا ایسا ہے کہ البتہ دیر لگائے گا۔ۡ پھر اگر تم کو کوئی مصیبت پہنچے تو کہے اللہ نے مجھ پر فضل کیا

اِذْ لَمْ اَكُنْ مَّعَهُمْ شَهِيْدًا ﴿۷۲﴾

کہ میں نہ ہوا ان کے ساتھ۔۲

خلاصہ تفسیر: اور تمہارے مجمع میں (جس میں بعض منافقین بھی شامل ہو رہے ہیں) کوئی شخص ایسا ہے (مراد اس سے منافق ہے) جو (جہاد سے) ہٹتا ہے (یعنی جہاد میں شریک نہیں ہوتا) پھر اگر تم کو کوئی حادثہ پہنچ گیا (جیسے شکست وغیرہ) تو (اپنے نہ جانے پر خوش ہو کر) کہتا ہے بیشک اللہ تعالیٰ نے مجھ پر بڑا فضل کیا کہ میں ان لوگوں کے ساتھ (لڑائی میں) حاضر نہیں ہوا (نہیں تو مجھ پر بھی مصیبت آتی)۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی اے مسلمانو! تمہاری جماعت میں بعضے ایسے بھی گھسے ہوئے ہیں کہ جہاد کو جانے میں دیر لگاتے ہیں اور رکتے ہیں اور حکم

خداوندی کی تعمیل نہیں کرتے، بلکہ نفع دنیاوی کو تکتے رہتے ہیں اوراس سے مراد منافق ہیں جیسے عبداللہ بن ابی اوراس کے ساتھی کہ یہ لوگ گو ظاہر میں اسلام قبول کر چکے تھے، مگران کو سب باتوں سے مقصود صرف دنیا کا نفع تھا حق تعالیٰ کی فرمانبرداری سے کوئی غرض ان کو نہ تھی۔

فائدہ: ؎ پہلے گزر چکا کہ منافق لوگ نکلنے میں دیر لگاتے ہیں اور جہاد میں جانے والوں کی حالت کو تکتے رہتے ہیں کہ کیا گزری، اب فرماتے ہیں کہ جانے کے بعد اگر مسلمانوں کو جہاد میں کوئی صدمہ پہنچ گیا، مثلاً مقتول ہوگئے یا شکست پیش آگئی تو منافق بہت خوش ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اللہ کا بڑا فضل ہوا کہ ہم لڑائی میں ان کے ساتھ نہ تھے، ورنہ ہماری بھی خیر نہ تھی، الحمدللہ! خوب بچے۔

وَلَئِنْ اَصَابَكُمْ فَضْلٌ مِّنَ اللّٰهِ لَيَقُوْلَنَّ كَاَنْ لَّمْ تَكُنْۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهٗ مَوَدَّةٌ يّٰلَيْتَنِيْ

اور اگر تم کو پہنچا فضل اللہ کی طرف سے تو اس طرح کہنے لگے گا کہ گویا نہ تھی تم میں اور اس میں کچھ دوستی اے کاش

كُنْتُ مَعَهُمْ فَاَفُوْزَ فَوْزًا عَظِيْمًا ﴿٧٣﴾

کہ میں ہوتا ان کے ساتھ تو پاتا بڑی مراد

خلاصہ تفسیر: اور اگر تم پر اللہ تعالیٰ کا فضل ہو جاتا ہے (یعنی فتح وغنیمت) تو ایسے طور پر (خودغرضی کے ساتھ) کہ گویا تم میں اوراس میں کچھ تعلق ہی نہیں (مال کے فوت ہونے پر افسوس کر کے) کہتا ہے ہائے! کیا خوب ہوتا کہ میں بھی لوگوں کا شریک حال ہوتا (یعنی جہاد میں جاتا) تو مجھ کو بھی بڑی کامیابی ہوتی (کہ مال ودولت لاتا، خودغرضی اور بے تعلقی اس کہنے سے ظاہر ہے، ورنہ جس سے تعلق ہوتا ہے اس کی کامیابی پر بھی تو خوش ہوتے ہیں، یہ نہیں کہ اپنا افسوس کرنے بیٹھ جائے اوراس کی خوشی کا نام بھی نہ لے)۔

* * *

فائدہ: یعنی اور اگر مسلمانوں پر اللہ کا فضل ہو گیا، مثلاً فتح ہوگئی یا مال غنیمت بہت سا ہاتھ آگیا تو منافق سخت پچھتاتے ہیں اور دشمنوں کی طرح غلبۂ حسد سے کہتے ہیں ہائے افسوس میں جہاد میں مسلمانوں کے ساتھ ہوتا تو مجھ کو بھی بڑی کامیابی نصیب ہوتی، یعنی لوٹ کا مال ہاتھ آتا، یعنی منافقوں کو فقط اپنی محرومی پر افسوس نہیں ہوتا، بلکہ اپنی محرومی سے زیادہ مسلمانوں کی کامیابی پر حسد اور قلق ہوتا ہے۔

فَلْيُقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يَشْرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ؕ وَمَنْ يُّقَاتِلْ

سو چاہیے لڑیں اللہ کی راہ میں وہ لوگ جو بیچتے ہیں دنیا کی زندگی آخرت کے بدلے، اور جو کوئی لڑے

فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿٧٤﴾

اللہ کی راہ میں پھر مارا جائے یا غالب ہووے تو ہم دیں گے اس کو بڑا ثواب

خلاصہ تفسیر: (اللہ تعالیٰ اس شخص کے بارے میں فرماتے ہیں کہ بڑی کامیابی مفت نہیں ملتی اگر اس کا طالب ہے) تو ہاں! اس شخص کو چاہئے کہ اللہ کی راہ میں (یعنی اعلاء کلمۃ اللہ کی نیت سے جو کہ موقوف ہے ایمان واخلاص پر، یعنی مسلمان ومخلص بن کر) ان (کافر) لوگوں سے لڑے جو آخرت (چھوڑ کر اس) کے بدلے دنیوی زندگی کو اختیار کئے ہوئے ہیں (یعنی اس شخص کو اگر فوز عظیم یعنی بڑی کامیابی کا شوق ہے تو دل درست کرلے، ہاتھ پاؤں ہلائے، مشقت جھیلے، تیغ وسنان کے سامنے سینہ سپر بنے، دیکھو فوز عظیم ہاتھ آتا ہے یا نہیں، اور یوں کیا کوئی دل لگی ہے، پھر جو شخص اتنی معیبت جھیلے سچی کامیابی اس کی ہے، کیونکہ دنیا کی کامیابی اول تو حقیر، پھر کبھی ہے کبھی نہیں، کیونکہ اگر غالب آگئے تو ہے ورنہ نہیں)۔

اور (آخرت کی کامیابی جس کا مخلص مؤمن کے لیے وعدہ ہے عظیم بھی ہے اور ہر حالت میں ہے، کیونکہ اس کا قانون یہ ہے کہ) جو شخص اللہ کی راہ میں لڑے گا، پھر خواہ (مغلوب ہو جائے حتی کہ) جان (ہی) سے مارا جائے یا غالب آجائے ہم (ہر حالت میں) اس کو (آخرت کا) اجر عظیم دیں گے (جو کہ فوز عظیم یعنی بڑی کامیابی کہنے کے لائق ہے)۔

فَسَوْفَ نُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا. دنیا و آخرت کی کامیابی میں یہ بھی فرق ہے کہ پہلی یعنی دنیا کی کامیابی کا وعدہ نہیں اور آخرت کی کامیابی کا وعدہ ہے، اسی لیے وہ یقینی ہونے کی وجہ سے اجرت یعنی بدلہ کے مشابہ ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی اگر منافق لوگ جہاد سے رکیں تو رکیں اور اپنے نشیب و فراز دنیاوی کو تکتے رہیں تو تکتے رہیں، مگر جو لوگ کہ آخرت کے مقابلہ میں دنیا پر لات مار چکے ہیں، ان کو چاہیے کہ اللہ کی راہ میں بے تامل لڑیں اور دنیا کی زندگی اور اس کے مال و دولت پر نظر نہ رکھیں اور سمجھ لیں کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور حکم برداری میں ہر طرح نفع ہے غالب ہوں یا مغلوب، مال ملے یا نہ ملے۔

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ

اور تم کو کیا ہوا کہ نہیں لڑتے اللہ کی راہ میں اور ان کے واسطے جو مغلوب ہیں مرد اور عورتیں اور بچے

الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هَٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ

جو کہتے ہیں اے رب ہمارے نکال ہم کو اس بستی سے کہ ظالم ہیں یہاں کے لوگ، اور کر دے ہمارے واسطے اپنے پاس سے

وَلِيًّا وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ نَصِيرًا ﴿٧٥﴾

کوئی حمایتی، اور کر دے ہمارے واسطے اپنے پاس سے مددگار

خلاصہ تفسیر: اب آگے بھی مکرر جہاد کی تاکید کرتے ہیں اور اس کا ایک سبب بیان کرتے ہیں، اور وہ کمزور مسلمانوں کا ستم رسیدہ ہونا ہے، ساتھ ہی مدد کے وعدہ کی طرف بھی اشارہ فرماتے ہیں، پس یہ ماقبل کے مضمون کا تتمہ ہے۔

اور تمہارے پاس کیا عذر ہے کہ تم جہاد نہ کرو (باوجودیکہ اس کا قوی داعی موجود ہے، ایک تو یہ کہ جہاد) اللہ کی راہ میں (ہوتا ہے، یعنی اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے ہے جس کا اہتمام ضروری ہے) اور (اس سربلندیٔ دین کے آثار میں سے ایک خاص اثر کی ضرورت بھی درپیش ہے، وہ یہ کہ) کمزور (ایمانداروں) کی خاطر سے (بھی لڑنا ضروری ہے، تاکہ وہ کفار کے پنجہ ستم سے رہائی پائیں) جن (بے چاروں) میں کچھ مرد ہیں اور کچھ عورتیں ہیں اور کچھ بچے ہیں جو (کفار سے تنگ و پریشان ہو کر) دعا کر رہے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہم کو (کسی طرح) اس بستی سے (یعنی مکہ سے جو ہمارے لیے جیل خانہ بنا ہوا ہے) باہر نکال، جس کے رہنے والے سخت ظالم ہیں (کہ ہم پر آفت ڈھا رکھی ہے) اور ہمارے لئے غیب سے کسی دوست کو کھڑا کیجئے اور ہمارے لئے غیب سے کسی حامی کو بھیجئے (کہ ہماری حمایت کر کے ان ظالموں کے پنجہ سے چھڑا دے)۔

وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ: مکہ مکرمہ میں ایسے کمزور مسلمان رہ گئے تھے جو اپنے جسمانی ضعف اور کم سامانی کی وجہ سے ہجرت نہ کر سکے، پھر کافروں نے بھی جانے نہ دیا اور ان کو بہت ستاتے تھے، چنانچہ احادیث و تفاسیر میں بعضوں کے نام بھی آئے ہیں، جیسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور ان کی والدہ، سلمۃ بن ہشام، ولید بن الولید اور ابو جندل بن سہیل، آخر حق تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی، بعضوں کی رہائی کا تو پہلے ہی سامان ہو گیا، پھر مکہ معظمہ فتح ہو گیا جس سے سب کو امن اور اعزاز حاصل ہو گیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر حضرت عتاب رضی اللہ عنہ بن اسید کو حاکم مقرر فرمایا،

وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ وَلِيًّا: پس یہاں آیت میں ''ولی اور نصیر'' کا مصداق خواہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کہا جائے اور یہی بہتر معلوم ہوتا

ہے، یا حضرت عتابؓ کو کہا جائے کہ انہوں نے اپنے زمانہ حکومت میں سب کو بہت آرام پہنچایا۔

*****

فائدہ: یعنی دو وجہ سے تم کو کافروں سے لڑنا ضروری ہے: ① ایک تو اللہ کے دین کو بلند اور غالب کرنے کی غرض سے۔
② دوسرے جو لوگ مظلوم مسلمان کافروں کے ہاتھ میں بے بس پڑے ہیں ان کو چھڑانے اور خلاصی دینے کی وجہ سے۔
مکہ میں بہت لوگ تھے کہ حضرت محمد ﷺ کے ساتھ ہجرت نہ کر سکے اور ان کے اقرباء ان کو ستانے لگے کہ پھر کافر ہو جائیں، سو خدا تعالیٰ نے مسلمانوں کو فرمایا کہ تم کو دو وجہ سے کافروں سے لڑنا ضرور ہے تاکہ اللہ کا دین بلند ہو اور مسلمان جو کہ مظلوم اور کمزور ہیں کفار مکہ کے ظلم سے نجات پائیں۔

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ

جو لوگ ایمان والے ہیں سو لڑتے ہیں اللہ کی راہ میں، اور جو کافر ہیں سو لڑتے ہیں شیطان کی راہ میں

فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِيَآءَ الشَّيْطٰنِ ۚ اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا ﴿٧٦﴾ ع

سو لڑو تم شیطان کے حمایتیوں سے، بیشک فریب شیطان کا سست ہے

خلاصہ تفسیر: جو لوگ پکے ایمان دار ہیں (وہ تو ان احکام کو سن کر) اللہ کی راہ میں (یعنی غلبہ اسلام کے قصد سے) جہاد کرتے ہیں، اور جو لوگ (ان کے مقابلہ میں) کافر ہیں وہ شیطان کی راہ میں (یعنی غلبہ کفر کے قصد سے) لڑتے ہیں (اور ظاہر ہے کہ ان دونوں میں اللہ کی مدد ونصرت ایمان داروں کے ساتھ ہوگی، جب ایمان داروں کے ساتھ اللہ کی مدد ہے) تو (اے ایماندارو!) تم شیطان کے ساتھیوں سے (یعنی کافروں سے جو کہ اللہ کی مدد سے محروم ہیں) جہاد کرو (اور اگر چہ وہ بھی غلبہ کی مختلف تدبیریں کرتے ہیں، لیکن) واقع میں (وہ شیطانی تدبیریں ہیں کہ شیطان ان کفریہ تدبیروں کا حکم کرتا ہے اور) شیطانی تدبیر (خود) لچر ہوتی ہے (کیونکہ اس میں غیبی امداد نہیں ہوتی اور کبھی چند روزہ غلبہ ہو جانا تو یہ ان کو چند روزہ مہلت اور ڈھیل دینا ہے، غیبی امداد جو مؤمنین کے ساتھ ہے وہ شیطانی تدبیریں اس کا کیا مقابلہ کر سکتی ہیں، خلاصہ یہ کہ جہاد کا داعی بھی موجود ہے اور مدد ونصرت کا وعدہ بھی ہے، پھر کیا عذر ہے؟ اس لئے مکرر تاکید کی گئی)۔

فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِيَآءَ الشَّيْطٰنِ: اگر کسی کو شبہ ہو کہ جب ان حضرات کی دعا کا قبول ہونا مقدر ہو چکا تھا تو پھر مسلمانوں کو اس حکم دینے کا کیا معنی کہ تم ان کی خاطر لڑو؟ کیونکہ خالق کی نصرت کے ہوتے ہوئے مخلوق کی نصرت کی کیا ضرورت ہے؟ جواب یہ ہے کہ ان آیتوں کا مطلب یہ ہے کہ ان کی دعا تو ہم ضرور قبول کریں گے، مسلمانوں کو جہاد کا حکم اس لیے نہیں دیا گیا کہ خدا کو ان کے جہاد کی ضرورت تھی، یا جہاد کے بغیر ان کی رہائی نہ ہو سکتی تھی، بلکہ جہاد کا حکم صرف اس لیے دیا گیا تاکہ مسلمان مفت کی دولت یعنی ثواب حاصل کر لیں، کیونکہ عالم اسباب میں حق تعالیٰ شانہ کوئی ظاہری سبب بھی پیدا کر دیتے ہیں، چنانچہ عالم اسباب میں کسی نہ کسی سے یہ کام لے لیں گے، خواہ تم کرو یا نہ کرو یہ کام تو ضرور ہو کر ہی رہے گا، لیکن تمہاری خیر خواہی سے کہتے ہیں کہ مفت کی دولت ہاتھ آتی ہے، اگر چہ تمہاری شرکت کی کوئی ضرورت تو ہے نہیں، لیکن شرکت کرو گے تو تم کو بھی ثواب مل جائے گا، تو ان کمزوروں کی حمایت کے لیے کسی نہ کسی کو مقرر فرمایا جاتا، اول مسلمانوں کو حکم دیا، اگر وہ سستی کرتے تو کسی دوسرے کو اس کام پر کھڑا کر دیتے، چنانچہ دوسری جگہ فرمادیا ہے: وان تتولوا یستبدل قومًا غیرکم، اگر تم پھر جاؤ گے تو ہم کسی دوسری قوم کو تمہاری جگہ قائم کر دیں گے، اور یہاں ایمان والوں سے جو نصرت کا وعدہ فرمایا اس کے معنی یہ ہیں کہ ایمان دار ہونے کا یہ تقاضہ اور مطالبہ ہے، ممکن ہے کہ کسی مانع کی وجہ سے کسی وقت یہ مؤثر نہ ہو، خواہ وہ مانع ابتلا ہو یا اطاعت میں خلل ہو، یا دونوں ہوں جیسا کہ غزوہ احد میں ہوا۔

*****

فائدہ: یعنی جب یہ بات ظاہر ہے کہ مسلمان اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں اور کافر لوگ شیطان کی راہ میں، سو پھر تو مسلمانوں کو شیطان کے

دوستوں یعنی کافروں کے ساتھ لڑنا بلا تامل ضروری ہوا، اللہ تعالیٰ ان کا مددگار ہے، کسی قسم کا تردد نہ چاہیے اور سمجھ لو کہ شیطان کا حیلہ اور فریب کمزور ہے مسلمانوں پر نہ چل سکے گا، اس سے مقصود مسلمانوں کو جہاد پر ترغیب دلانا اور ہمت بندھانا ہے، جس کا ذکر آیات آئندہ میں بالتصریح آتا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۚ فَلَمَّا كُتِبَ

کیا تو نے نہ دیکھا ان لوگوں کو جن کو حکم ہوا تھا کہ اپنے ہاتھ تھامے رکھو اور قائم رکھو نماز اور دیتے رہو زکوٰۃ ۱؎ پھر جب حکم ہوا

عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً ۚ وَقَالُوْا رَبَّنَا

ان پر لڑائی کا اسی وقت ان میں ایک جماعت ڈرنے لگی لوگوں سے جیسا ڈر ہو اللہ کا یا اس سے بھی زیادہ ڈر اور کہنے لگے اے رب ہمارے

لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ ۚ لَوْلَآ اَخَّرْتَنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۭ قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ ۚ

کیوں فرض کی ہم پر لڑائی، کیوں نہ چھوڑے رکھا ہم کو تھوڑی مدت تک ۲؎ کہہ دے کہ فائدہ دنیا کا تھوڑا ہے

وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى ۣ وَلَا تُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ﴿۷۷﴾

اور آخرت بہتر ہے پرہیزگار کو، اور تمہارا حق نہ رہے گا ایک تاگے برابر ۳؎

خلاصہ تفسیر: پیچھے جہاد کا وجوب اور اس کے فضائل بیان کر کے اسکی ترغیب تھی، اب دوسری طرح اسکی ترغیب دی جاتی ہے، ہجرت سے پہلے جب مکہ میں بہت سے مسلمان تھے اور کفار کی ایذا رسانی اپنی آنکھوں سے دیکھتے تھے تو ان کو طبعی جوش ہوتا تھا، حضور ﷺ سے اصرار کے ساتھ جہاد کی اجازت چاہتے تھے، مگر اس وقت درگزر اور صبر کرنے کا حکم تھا، پھر ہجرت کے بعد جو ان کو امن چین نصیب ہوا تو بعضوں کو اتنا جوش نہ رہا، کیونکہ قاعدہ ہے کہ آنکھوں کے سامنے ظلم ہوتا دیکھ کر زیادہ جوش ہوتا ہے، اور "آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل"، پھر جو جہاد کا حکم نازل ہوا تو طبعاً بعض کو دشوار معلوم ہوا، اس پر آئندہ آیت میں ایک لطف آمیز شکایت فرمائی گئی جو توبیخ اور دھمکی نہیں ہے، کیونکہ ان پر گرانی ایک طبعی قاعدہ کی بنا پر ہوئی تھی جیسا کہ ہم نے ابھی بتلایا ہے، انکار یا اعتراض کی وجہ سے نہیں ہوئی تھی، بلکہ تھوڑی مدت جہاد کا حکم نہ آنے کی محض تمنا تھی، چنانچہ حق تعالیٰ اس لطف آمیز شکایت کے ساتھ دنیا کی ناپائیداری اور آخرت کا باقی رہنا اور موت سے کسی حال میں نہ بچ سکنا بیان فرماتے ہیں اور ان باتوں کا ترغیب میں پورا دخل ہونا ظاہر ہے۔

(اے مخاطب!) کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا (کہ یا تو جہاد کا حکم آنے سے پہلے جنگ کا ایسا تقاضا تھا کہ) ان کو (منع کرنے کے لئے) یہ کہا گیا تھا کہ (ابھی) اپنے ہاتھوں کو (لڑنے سے) روکے رہو اور (جو حکم تم کو اس وقت تک دیے گئے ہیں بس ان میں لگے رہو، مثلاً) نمازوں کی پابندی رکھو اور زکوٰۃ دیتے رہو (یا تو یہ حالت تھی، اور یا) پھر ان پر جہاد کرنا فرض کر دیا گیا تو کیا حال ہوا کہ ان میں سے بعض بعض آدمی (مخالف) لوگوں سے (طبعاً) ایسا ڈرنے لگے (کہ ہم کو قتل کر دیں گے) جیسا (کوئی) اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہو، بلکہ اس سے بھی زیادہ ڈرنا (چونکہ یہ خوف طبعی تھا، اس لئے گناہ نہیں ہوا) اور (یا قتال کے حکم کو ملتوی کرنے کی تمنا میں) یوں کہنے لگے (خواہ زبان سے یا دل سے اور اللہ تعالیٰ کے علم میں قول نفسی قول لسانی کے برابر ہے) کہ اے ہمارے پروردگار! آپ نے (ابھی سے) ہم پر جہاد کیوں فرض کر دیا، ہم کو (اپنی عنایت سے) اور تھوڑی مدت مہلت دے دی ہوتی (ذرا بے فکری سے اپنی ضروریات پوری کر لیتے، اور چونکہ یہ کہنا بطور اعتراض یا انکار کے نہیں تھا، اس لئے گناہ نہیں ہوا، آگے جواب ارشاد ہے کہ اے محمد ﷺ) آپ فرما دیجئے کہ دنیا سے فائدہ اٹھانا (جس کے لئے تم مہلت کی تمنا کرتے ہو) محض چند روزہ ہے اور آخرت (جس کے حصول کا اعلیٰ ذریعہ جہاد ہے) ہر طرح سے بہتر ہے (مگر وہ) اس شخص کے لئے (ہے) جو اللہ تعالیٰ کی مخالفت سے بچے (کیونکہ مخالفت اگر کفر تک پہنچ گئی تب تو

آخرت میں بالکل ہی محرومی ہے، اور اگر مخالفت معصیت کی حد تک ہے تو اعلیٰ درجہ سے محروم رہے گا) اور تم پر ذرا بھی ظلم نہ کیا جائے گا (یعنی جتنے اعمال ہوں گے ان کا پورا پورا ثواب ملے گا، پھر جہاد جیسے عمل کے ثواب سے کیونکر خالی رہتے ہو)۔

كَخَشۡيَةِ اللّٰهِ اَوۡ اَشَدَّ خَشۡيَةً: یعنی جیسے کوئی اللہ سے ڈرتا ہو بلکہ اس سے بھی زیادہ ڈرنا، اس زیادہ ڈرنے کے دو معنی ہو سکتے ہیں: ① ایک یہ کہ اکثر اللہ تعالیٰ سے ڈرنا عقلاً ہوتا ہے اور دشمن کا ڈر طبعی ہوتا ہے، اور قاعدہ ہے کہ طبعی حالت عقلی حالت سے زیادہ سخت ہوتی ہے ② دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ سے جیسا خوف ہے ویسے ہی رحمت کی امید بھی تو ہے اور کافر دشمن سے تو نقصان کا خوف ہی خوف ہے اور چونکہ یہ فریق مؤمنین مخلصین میں سے تھا تو ان کا یہ خوف طبعی تھا، نہ کہ عقلی اس لیے گناہ نہیں۔

وَقَالُوۡا رَبَّنَا لِمَ كَتَبۡتَ عَلَيۡنَا الۡقِتَالَ لَوۡلَاۤ اَخَّرۡتَنَاۤ: جہاد کا حکم نازل ہونے پر مسلمانوں کی طرف سے التواءِ حکم کی تمنا کس وجہ سے ہوئی؟ حکم جہاد پر مسلمانوں کی طرف سے مہلت کی تمنا درحقیقت کوئی اعتراض نہ تھا، بلکہ ایک لطف آمیز شکایت تھی، جس کی وجہ یہ تھی کہ عادۃً ہوتا یہ ہے کہ جب آدمی کو انتہائی تنگی و تکلیف پہنچتی ہے تو اس کے جذبات بھڑک اٹھتے ہیں، اس لئے ایسے وقت میں انتقام لینا زیادہ آسان ہوتا ہے، لیکن آرام و راحت کے وقت اس کی طبیعت لڑائی کی طرف آمادہ نہیں ہوتی، یہ ایک بشری تقاضا ہے، چنانچہ یہ تھے، لیکن مدینہ میں آکر جب ان کو سکون و آرام نصیب ہوا تو ایسی صورت میں جب قتال کا حکم ہوا تو اس وقت ان کا پرانا جذبہ کم ہو چکا تھا اور ان کے دلوں میں وہ جوش و خروش باقی نہیں رہا تھا، اس لئے انہوں نے محض ایک تمنا کی کہ اگر اس وقت جہاد کا حکم نہ ہوتا تو بہتر تھا، اس تمنا کو اعتراض پر محمول کر کے ان مسلمانوں کی طرف معصیت کی نسبت کرنا صحیح نہیں ہے، یہ تقریر اس صورت میں ہے جب کہ انہوں نے شکایت کا اظہار زبان سے بھی کیا ہو، لیکن اگر زبان سے نہیں کیا محض ان کے دل میں یہ وسوسہ پیدا ہوا ہو تو وساوسِ قلبی کو شریعت نے معصیت ہی شمار نہیں کیا، یہاں یہ دونوں احتمال ہیں اور آیت کے لفظ: قالوا سے یہ شبہ نہ کیا جائے کہ انہوں نے زبان سے اظہار کر دیا تھا، کیونکہ اس کے یہ معنی ہو سکتے ہیں کہ انہوں نے اپنے دل میں کہا ہو، بعض مفسرین کے نزدیک آیات کا تعلق مؤمنین سے نہیں ہے بلکہ منافقین سے ہے، اس صورت میں کسی قسم کا اشکال نہیں۔

سو اس آیت میں اس پر بھی دلالت ہوئی کہ طبعی امور اور وسوسوں پر مواخذہ نہیں، کیونکہ یہ غیر اختیاری ہوتے ہیں۔

* * *

فائدہ: ۱۔ وَاَقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ: مکہ میں ہجرت کرنے سے پہلے کافر مسلمانوں کو بہت ستاتے تھے اور ان پر ظلم کرتے تھے، مسلمان آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر شکایت کرتے اور رخصت مانگتے کہ ہم کفار سے مقاتلہ کریں اور ان سے ظلم کا بدلہ لیں، آپ مسلمانوں کو لڑائی سے روکتے کہ مجھ کو مقاتلہ کا حکم نہیں ہوا، بلکہ صبر اور درگزر کرنے کا حکم ہے اور فرماتے کہ نماز اور زکوٰۃ کا جو حکم تم کو ہو چکا ہے اس کو برابر کئے جاؤ، کیونکہ جب تک آدمی اطاعت خداوندی میں اپنے نفس پر جہاد کرنے کا اور تکالیف جسمانی کا خوگر نہ ہو اور اپنے مال خرچ کرنے کا عادی نہ ہو تو اس کو جہاد کرنا اور اپنی جان کا دینا بہت دشوار ہے، اس بات کو مسلمانوں نے قبول کر لیا تھا۔

فائدہ: ۲۔ لَوۡلَاۤ اَخَّرۡتَنَاۤ اِلٰۤى اَجَلٍ قَرِيۡبٍ: یعنی ہجرت کرنے کے بعد جب مسلمانوں کو کافروں سے لڑنے کا حکم ہوا تو ان کو تو خوش ہونا چاہیے تھا کہ ہماری درخواست قبول ہوئی اور مراد ملی، مگر بعضے کچے مسلمان کافروں کے مقاتلہ سے ایسے ڈرنے لگے جیسا کہ اللہ کے عذاب سے ڈرنا چاہیے، یا اس سے بھی زیادہ اور آرزو کرنے لگے کہ تھوڑی مدت اور بھی قتال کا حکم نہ آتا اور ہم زندہ رہتے تو خوب ہوتا۔

فائدہ: ۳۔ وَلَا تُظۡلَمُوۡنَ فَتِيۡلًا: یعنی چونکہ حیات اور منافع دنیاوی کی رغبت کے باعث ان لوگوں کو حکم جہاد بھاری معلوم ہوا تو اس لئے حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ ان سے کہہ دو کہ دنیا کے تمام منافع حقیر اور سریع الزوال ہیں اور ثواب آخرت کا بہتر ہے ان کے لئے جو اللہ کی نافرمانی سے پرہیز کرتے ہیں، سو تم کو چاہیے کہ منافع دنیا کا لحاظ نہ کرو اور حق تعالیٰ کی فرمانبرداری میں کوتاہی نہ کرو اور جہاد کرنے سے نہ ڈرو اور اطمینان رکھو کہ تمہاری محنت اور جانفشانی کا ثواب ادنیٰ سا بھی ضائع نہ ہوگا، سو تم کو ہمت اور شوق کے ساتھ جہاد میں مصروف ہونا چاہیے۔

أَيْنَ مَا تَكُونُوا يُدْرِكْكُمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِي بُرُوجٍ مُشَيَّدَةٍ ۗ وَإِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ

جہاں کہیں تم ہو گے موت تم کو آ پکڑے گی اگرچہ تم ہو مضبوط قلعوں میں [1] اور اگر پہنچے لوگوں کو کچھ بھلائی

يَقُولُوا هَٰذِهِ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ ۖ وَإِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَقُولُوا هَٰذِهِ مِنْ عِنْدِكَ ۚ قُلْ كُلٌّ

تو کہیں یہ اللہ کی طرف سے ہے، اور اگر ان کو پہنچے کچھ برائی تو کہیں یہ تیری طرف سے ہے [2] کہہ دے کہ سب

مِنْ عِنْدِ اللَّهِ ۖ فَمَالِ هَٰؤُلَاءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُونَ يَفْقَهُونَ حَدِيثًا ﴿٧٨﴾

اللہ کی طرف سے ہے، سو کیا حال ہے ان لوگوں کا ہرگز نہیں لگتے کہ سمجھیں کوئی بات [3]

خلاصہ تفسیر: اور اگر جہاد بھی نہ کیا تو وقت معین پر موت سے بچ جاؤ گے؟ ہرگز نہیں! کیونکہ موت کی تو یہ حالت ہے کہ: تم چاہے کہیں بھی ہو وہاں موت آ دبائے گی اگرچہ پختہ مضبوط قلعوں ہی میں (کیوں نہ) ہو (غرض جب موت اپنے وقت پر ضرور آئے گی اور مر کر دنیا کو چھوڑنا ہی پڑے گا تو آخرت میں خالی ہاتھ کیوں جاؤ، بلکہ عقل کی بات یہ ہے کہ "چندروزے جہد کن باقی بخند")۔

(بعض منافقین جہاد میں جانے کو موت کا سبب اور نہ جانے کو حیات کا سبب سمجھتے تھے، چنانچہ اب منافقین کی اس بے ہودہ بات اور خام خیالی کا جواب دیتے ہیں) اور اگر ان (منافقین) کو کوئی اچھی حالت پیش آتی ہے (جیسے فتح و کامیابی) تو کہتے ہیں کہ یہ من جانب اللہ (اتفاقی بات) ہوگئی (ورنہ مسلمانوں کی بے تدبیری میں تو کوئی کسر تھی ہی نہیں) اور اگر ان کو کوئی بری حالت پیش آتی ہے (جیسے جہاد میں موت و قتل) تو (اے محمد ﷺ نعوذ باللہ آپ کی نسبت) کہتے ہیں کہ یہ آپ (کی اور مسلمانوں کی بے تدبیری) کے سبب سے ہے (ورنہ چین سے گھروں میں بیٹھے رہتے تو کیوں اس مصیبت میں پڑتے) آپ فرما دیجئے کہ (میرا تو اس میں ذرا بھی دخل نہیں، بلکہ) سب کچھ (نعمت و مصیبت) اللہ ہی کی طرف سے ہے (اگرچہ نعمت تو بلا واسطہ اور مصیبت بواسطہ، جس کا حاصل یہ ہے کہ نعمت تو محض اللہ کے فضل سے ہے، اعمال کو اس میں دخل نہیں، اور مصیبت اللہ کے عدل کی وجہ سے گناہوں کے سبب آتی ہے، پس تم جو مصیبت میں میرا دخل سمجھتے ہو، حقیقت میں لوگوں کے گناہوں کو اس میں دخل ہے، جیسا کہ غزوہ احد کے بیان میں شکست کے اسباب گزر چکے ہیں، اور یہ بات نہایت ہی ظاہر ہے، جب یہ ایسی ظاہر بات ہے) تو ان (حماقت شعار) لوگوں کو کیا ہوا کہ بات سمجھنے کے پاس کو بھی نہیں نکلتے (اور سمجھیں گے تو کیا ہوگا)۔

قُلْ كُلٌّ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ: یعنی آپ فرما دیجئے کہ سب کچھ (یعنی نعمت و مصیبت) اللہ ہی کی طرف سے ہے، اگرچہ نعمت تو بلا واسطہ اور مصیبت واسطہ کے ذریعہ، کیونکہ نعمت تو محض اللہ کے فضل سے ہے، اعمال کو اس میں دخل نہیں، کیونکہ جس عمل کو اس کا سبب سمجھا جائے اس سے پہلے بھی حق تعالیٰ کی اس قدر نعمتیں ہوں گی کہ ان ہی کی مکافات اس عمل سے نہیں ہو سکتی، چہ جائیکہ وہ دوسری نعمت کا سبب بنے، اور مصیبت حق تعالیٰ کے عدل کی وجہ سے بسبب گناہوں کے آتی ہے، پس تم جو مصیبت میں میرا دخل سمجھتے ہو حقیقت میں لوگوں کے گناہوں کو اس میں دخل ہے، جیسا کہ غزوہ احد کے بیان میں شکست کے اسباب گزر چکے ہیں، اور یہ بات نہایت ہی ظاہر ہے، اگر آدمی ذرا بھی غور کرے تو خوش حالی سے پہلے کوئی عمل اس درجہ کا نہ پائے گا جو اس کا سبب بن سکے، محض فضل الٰہی ہی معلوم ہوگا اور بدحالی سے پہلے ضرور کوئی برا عمل ہوگا جس کی سزا اس سے بھی زیادہ ہوتی۔

* * *

فائدہ: [1] وَلَوْ كُنْتُمْ فِي بُرُوجٍ مُشَيَّدَةٍ: یعنی کیسے ہی مضبوط اور محفوظ و مامون مکان میں رہو، مگر موت تم کو کسی طرح نہ چھوڑے گی، کیونکہ موت ہر ایک کے واسطے مقدر اور مقرر ہو چکی ہے، اپنے وقت پر ضرور آئے گی کہیں ہو، سو اگر جہاد میں نہ جاؤ گے تو بھی موت سے ہرگز نہیں بچ

سکتے تو اب جہاد سے گھبرانا اور موت سے ڈرنا اور کافروں کے مقابلہ سے خوف کرنا بالکل نادانی اور اسلام میں کچے ہونے کی بات ہے۔

فائدہ: ۲۔ يَقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ: یعنی ان منافقین کا اور عجیب حال سنو، اگر تدبیر لڑائی کی درست آئی اور فتح ہوئی اور غنیمت کا مال ہاتھ آ گیا تو کہتے ہیں یہ خدا کی طرف سے ہے، یعنی اتفاقی بات ہوگئی، رسول اللہ ﷺ کی تدبیر کے قائل نہ ہوتے اور اگر تدبیر بگڑ جاتی اور ہزیمت و نقصان پیش آ جاتا تو الزام رکھتے آپ ﷺ کی تدبیر پر۔

فائدہ: ۳۔ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے محمد ﷺ! ان کو جواب دے دو کہ بھلائی اور برائی سب اللہ کی طرف سے ہے، سب باتوں کا موجد اور خالق اللہ تعالیٰ ہے، اس میں کسی دوسرے کو دخل نہیں اور پیغمبر ﷺ کی تدبیر بھی اللہ ہی کی طرف سے ہے اور اللہ ہی کا الہام ہے، تمہارا الزام رکھنا نبی ﷺ پر غلط اور سراسر کم فہمی ہے اور بگڑی کو بگڑا نہ سمجھو، یہ اللہ کی حکمت ہے، وہ تم کو سدھاتا ہے اور آزماتا ہے تمہارے قصوروں پر، یہ جواب اجمالی ہوا منافقین کے الزام کا، اگلی آیت میں اس کی تفصیل آتی ہے:

مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ۫ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ ؕ وَاَرْسَلْنٰكَ

جو پہنچے تجھ کو کوئی بھلائی سو اللہ کی طرف سے ہے، اور جو پہنچے تجھ کو کوئی برائی سو تیرے نفس کی طرف سے ہے ۱؎ اور ہم نے تجھ کو بھیجا

لِلنَّاسِ رَسُوْلًا ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ﴿۷۹﴾

پیغام پہنچانے والا لوگوں کو، اور اللہ کافی ہے سامنے دیکھنے والا ۲؎

خلاصہ تفسیر: (جو اجمالی جواب پیچھے دیا گیا اس کی تفصیل یہ ہے کہ:) اے انسان! تجھ کو جو کوئی خوش حالی پیش آتی ہے وہ محض اللہ تعالیٰ کی جانب سے (فضل) ہے، اور جو کوئی بدحالی پیش آئے وہ تیرے ہی (برے اعمال کے) سبب سے ہے (پس اس بدحالی کو رسول کی طرف، یا حکم شرعی کی طرف نسبت کرنا پوری جہالت ہے جیسا کہ منافقین حضور ﷺ کی طرف اور جہاد کی طرف نسبت کرتے تھے)۔

(منافقین بدحالی کو نعوذ باللہ حضور ﷺ کی طرف بطور اعتراض منسوب کرتے تھے، جس سے رسالت کا انکار بھی لازم آتا تھا، چنانچہ اب آپ ﷺ کی رسالت کا اثبات ہے اور ساتھ ہی دلیل رسالت کی طرف اشارہ بھی) اور ہم نے آپ کو تمام لوگوں کی طرف پیغمبر بنا کر بھیجا ہے، اور (اگر کوئی منافق، کافر انکار کرے تو اس کے انکار سے نبوت کا انکار کب ہو سکتا ہے، کیونکہ) اللہ تعالیٰ (آپ کی رسالت کے) گواہ کافی ہیں (جنہوں نے قول اور فعل دونوں سے اس کی شہادت دی ہے، قولی تو مثلاً یہی کلمہ **وارسلنٰك** اور فعلی یہ کہ معجزات جو اثبات نبوت کی دلیل میں آپ کو عطا فرمائے)۔

مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ: انسان کو جو نعمت ملتی ہے وہ کوئی اس کا حق نہیں ہوتا، بلکہ محض اللہ کا فضل ہوتا ہے، انسان خواہ کتنی ہی عبادت کرے، اس سے وہ نعمت کا مستحق نہیں ہو سکتا، اس لئے کہ عبادت کی توفیق بھی تو اللہ ہی کی جانب سے ہوتی ہے، پھر اللہ کی نعمتیں تو بے حساب ہیں، ان کو محدود عبادات اور اطاعات سے کیسے حاصل کیا جا سکتا ہے؟ خصوصاً جب کہ ہماری عبادت بھی رب العالمین کی بادشاہت کے شایان شان نہ ہو۔

وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ: ''مصیبت'' انسان کے شامت اعمال کا نتیجہ ہے، مصیبت کی تخلیق اگرچہ اللہ ہی کرتا ہے، لیکن اس کا سبب خود انسان کے برے اعمال ہوتے ہیں، اب اگر یہ انسان کافر ہے تو اس کے لئے دنیا میں جو مصیبت پیش آتی ہے یہ اس کے لئے اس عذاب کا ایک معمولی سا نمونہ ہوتا ہے اور آخرت کا عذاب اس سے کہیں زیادہ ہے، اور اگر وہ مومن ہے تو اس کے لئے مصائب و تکالیف اس کے گناہوں کا کفارہ ہو کر نجات آخرت کا سبب ہو جاتی ہیں۔

اس تقریر سے معلوم ہو گیا کہ اس جگہ محض عدل اور فضل کا بیان کرنا مقصود ہے، خلق افعال کے مسئلہ سے اس آیت کا کوئی تعلق نہیں، بعض بد دین یہ سمجھے ہیں کہ اس آیت سے معلوم ہوا کہ نیک اعمال کا خالق خدا ہے اور برے اعمال کا خالق خود انسان ہے، آیت میں خالق ہونے یا نہ ہونے کا کوئی

ذکر نہیں، مقصود صرف اتنا ہے کہ نعمت محض فضل خداوندی کی وجہ سے ہوتی ہے، اور مصیبت بھی خدا خود ہی بھیجتے ہیں مگر انسان کے گناہوں کے سبب سے، اور یہ بھی جان لینا چاہیے کہ یہ حکم سب کے لیے نہیں، بلکہ بدعمل آدمی کے لیے ہے، باقی نیک بندوں پر جو حوادث اور آزمائشیں آتی ہیں وہ خود رحمت اور تربیت ہے، اگرچہ ظاہر میں مصیبت معلوم ہو، اور بعض جگہ جو خوش حالی وغیرہ کو اعمال حسنہ کا عوض اور بدلہ فرمایا گیا وہ محض صورتا ہے، ورنہ حقیقت میں اصلی سبب محض فضل الٰہی ہے۔

وارسلنك للناس رسولا: یعنی ہم نے آپ کو تمام لوگوں کی طرف پیغمبر بنا کر بھیجا ہے، اس میں جن وانس سب داخل ہیں، کیونکہ لفظ "الناس" کا اطلاق سب پر ہوتا ہے، اس سے ثابت ہوا کہ آنحضرت ﷺ کو تمام لوگوں کے لئے رسول بنا کر بھیجا گیا ہے، آپ محض عربوں کے لئے ہی رسول نہیں تھے، بلکہ آپ کی رسالت پورے عالم کے انسانوں کے لئے عام ہے، خواہ اس وقت موجود ہوں یا آئندہ تا قیامت پیدا ہوں۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی اصل بات یہ ہے کہ جملہ بھلائی اور برائی کا موجد ہر چند اللہ ہے، مگر بندہ کو چاہیے کہ نیکی اور بھلائی کو حق تعالیٰ کا فضل اور احسان سمجھے اور سختی اور برائی کو اپنے اعمال کی شامت جانے، اس کا الزام پیغمبر ﷺ پر نہ رکھے، پیغمبر ﷺ ان امور کے لئے نہ موجد ہے نہ سبب، بلکہ موجد یعنی ان باتوں کا پیدا کرنے والا تو اللہ ہے اور سبب تمہارے عمل۔

فائدہ: ۲ حق تعالیٰ رسول ﷺ سے منافقوں کے الزام کو دور فرما کر ارشاد کرتا ہے کہ ہم نے تم کو تمام لوگوں کیلئے رسول کر کے بھیجا اور ہم کو سب کچھ معلوم ہے، ہم سب کے اعمال کا بدلہ دے لیں گے، تم کسی کے بیہودہ انکار و الزام کی پرواہ نہ کرو، اپنا کار رسالت کیے جاؤ۔

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ وَمَنْ تَوَلّٰى فَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ۝

جس نے حکم مانا رسول ﷺ کا اس نے حکم مانا اللہ کا، اور جو الٹا پھرا تو ہم نے تجھ کو نہیں بھیجا ان پر نگہبان

خلاصہ تفسیر: اوپر آپ ﷺ کی رسالت کا اثبات تھا، اب رسالت کے حق کو ثابت کیا جاتا ہے جو کہ اطاعت رسول کا وجوب ہے، اور مخالفین کی عدم اطاعت پر آپ ﷺ کی تسلی بھی فرماتے ہیں۔

جس شخص نے رسول ﷺ کی اطاعت کی اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی (اور جس نے آپ کی نافرمانی کی اس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی، اور اللہ کی اطاعت عقلاً بھی واجب ہے، پس آپ کی اطاعت بھی واجب ہوئی) اور جو شخص (آپ کی اطاعت سے) روگردانی کرے سو (آپ کچھ غم نہ کیجئے، کیونکہ ہم نے) آپ کو (بطور ذمہ داری کے) ان کا نگران کر کے نہیں بھیجا (کہ آپ ان کو کفر نہ کرنے دیں، بلکہ آپ کا فرض پیغام پہنچا دینے سے پورا ہو جاتا ہے، اگر اس کے بعد بھی وہ کفر کریں تو آپ پر کسی باز پرس کا اندیشہ نہیں، آپ بےفکر رہیں)۔

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ: پہلا جملہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ مقبول و مقرب (اہل اللہ) کے ساتھ کوئی معاملہ کرنا ایسا ہے جیسے حق تعالیٰ کے ساتھ معاملہ کرنا، اور دوسرا جملہ: وَمَنْ تَوَلّٰى فَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ جس کی اصلاح کی توقع نہ ہو اس کے درپے نہ ہو۔

* * *

فائدہ: آپ ﷺ کی رسالت کو محقق فرما کر اب خدا تعالیٰ آپ کے متعلق یہ حکم سناتا ہے کہ جو ہمارے رسول اللہ ﷺ کی فرمانبرداری کرے گا وہ بیشک ہمارا تابعدار ہے اور جو اس سے روگردانی کرے گا تو ہم نے تجھ کو اے رسول ﷺ! ان لوگوں پر نگہبان بنا کر نہیں بھیجا کہ ان کو گناہ نہ کرنے دے، ہم ان کو دیکھ لیں گے، تیرا کام صرف پیغام پہنچانا ہے، آگے ثواب یا عقاب! یہ ہمارا کام ہے۔

وَيَقُولُونَ طَاعَةٌ ۡ فَإِذَا بَرَزُوا مِنْ عِنْدِكَ بَيَّتَ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ غَيْرَ الَّذِي تَقُولُ ۭ

اور کہتے ہیں کہ قبول ہے، پھر جب باہر گئے تیرے پاس سے تو مشورہ کرتے ہیں بعضے بعضے ان میں سے رات کو اسکے خلاف جو تجھ سے کہہ چکے تھے

وَاللّٰهُ يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُونَ ۚ فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيلًا ﴿٨١﴾

اور اللہ لکھتا ہے جو وہ مشورہ کرتے ہیں، سو تو تغافل کر ان سے اور بھروسہ کر اللہ پر، اور اللہ کافی ہے کارساز

خلاصہ تفسیر: پیچھے اطاعت رسول کا واجب ہونا مذکور تھا، اب بعض منافقین کا معاملہ بیان کیا جاتا ہے جو مخالفت کرتے تھے۔

اور یہ (منافق) لوگ (آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام سن کر آپ کے سامنے زبان سے تو) کہتے ہیں کہ ہمارا کام (آپ کی) اطاعت کرنا ہے، پھر جب آپ کے پاس سے (اٹھ کر) باہر جاتے ہیں تو شب کے وقت (پوشیدہ) مشورے کرتے ہیں ان میں کی ایک جماعت (یعنی ان کے سرداروں کی جماعت) برخلاف اس کے جو کچھ زبان سے کہہ چکے تھے (اور چونکہ وہ سردار ہیں، اصل مشورہ وہ کرتے ہیں، باقی ان کے تابع رہتے ہیں تو اس مخالفت میں سب کی ایک حالت ہے) اور اللہ تعالیٰ (سرکاری روزنامچہ میں) لکھتے جاتے ہیں جو کچھ وہ راتوں کو مشورے کیا کرتے ہیں (موقع پر سزا دیں گے) سو آپ ان کی (بیہودگی کی) طرف التفات (اور خیال) نہ کیجئے اور (نہ کچھ فکر کیجئے، بلکہ سارا قصہ) اللہ تعالیٰ کے حوالہ کیجئے اور اللہ تعالیٰ کافی کارساز ہیں (وہ خود مناسب طور پر اس کا دفعیہ فرمائیں گے، چنانچہ کبھی ان کی شرارت سے کوئی نقصان نہیں پہنچا)۔

* * *

فائدہ: ان منافقین کی اور مکاری سنو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو آ کر تو کہہ جاتے ہیں ہم نے قبول کیا حکم تیرا، اور باہر جا کر مشورہ کرتے ہیں اس کے خلاف، یعنی تیری نافرمانی اور مخالفت کا مشورہ کرتے ہیں اور اللہ کے یہاں ان کے سب مشورے لکھے جاتے ہیں ان کو سزا دینے کے لئے، سوائے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان سے منہ پھیر لے اور کسی بات کی پرواہ مت کر اور اپنے سب کام اللہ کے حوالے کر دے، وہ تیرے لئے کافی ہے۔

أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْاٰنَ ۭ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا ﴿٨٢﴾

کیا غور نہیں کرتے قرآن میں، اور اگر یہ ہوتا کسی اور کا سوا اللہ کے تو ضرور پاتے اس میں بہت تفاوت

خلاصہ تفسیر: پیچھے رسالت کا اثبات تھا، اب ایک خاص عجیب طرز سے قرآن کی حقانیت کا اثبات ہے جو کہ اس مقام کے نہایت مناسب ہے، کیونکہ رسالت کے دلائل میں سے سب سے بڑی دلیل قرآن ہے، انکار رسالت سے قرآن کا بھی انکار لازم آتا ہے۔

کیا یہ لوگ (قرآن کا اعجاز فصاحت و بلاغت میں، اور غیب کی صحیح صحیح خبریں دینے میں دیکھ رہے ہیں اور پھر) قرآن میں غور نہیں کرتے (تا کہ اس کا کلام الٰہی ہونا واضح ہو جائے) اور اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس (کے مضامین) میں (بوجہ ان کے کثیر ہونے کے) بکثرت تفاوت پاتے (کیونکہ اس کے اندر مضامین بہت زیادہ ہیں، انسان کا ہر ہر مضمون ایک ایک حالت کے مطابق ہوتا ہے جن میں اختلاف اور فرق بھی ہوتا ہے تو اتنے مضامین میں بہت زیادہ اختلاف پیدا ہو جاتا ہے، حالانکہ قرآن کے ایک مضمون میں بھی فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے فرق نہیں، نہ کسی غیبی خبر میں اس کے واقعی اور حقیقی ہونے سے اختلاف ہے، پس لامحالہ یہ غیر اللہ کا کلام نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے)۔

أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْاٰنَ: اس آیت سے معلوم ہوا کہ قرآن کا مطالبہ ہے کہ ہر انسان اس کے مطالب میں غور کرے، لہٰذا یہ سمجھنا کہ قرآن میں تدبر کرنا صرف اماموں اور مجتہدوں ہی کے لئے ہے صحیح نہیں ہے، البتہ تدبر اور تفکر کے درجات علم وفہم کے درجات کی طرح مختلف ہوں گے، ائمہ مجتہدین کا تفکر ایک ایک آیت سے ہزاروں مسائل نکالے گا، عام علماء کا تفکر ان مسائل کے سمجھنے تک پہنچے گا، عوام اگر قرآن کا ترجمہ اور تفسیر اپنی زبان میں

پڑھ کر تدبر کریں تو اس سے اللہ تعالیٰ کی عظمت ومحبت اور آخرت کی فکر پیدا ہوگی، جو کلید کامیابی ہے، البتہ عوام کے لئے غلط فہمی اور مغالطوں سے بچنے کے لئے بہتر یہ ہے کہ کسی عالم سے قرآن کو سبقاً سبقاً پڑھیں، یہ نہ ہوسکے تو کوئی مستند ومعتبر تفسیر کا مطالعہ کریں اور جہاں کوئی شبہ پیش آئے اپنی رائے سے فیصلہ نہ کریں اور ماہر علماء سے رجوع کریں، قرآن وسنت کی تفسیر وتشریح پر کسی جماعت یا فرد کی اجارہ داری نہیں ہے، لیکن اس کے لئے شرائط ہیں، آیت مذکورہ سے معلوم ہوا کہ ہر شخص کو یہ حق ہے کہ وہ قرآن میں تدبر وتفکر کرے، لیکن جیسا کہ ہم نے کہا ہی کہ تدبر کے درجات مختلف اور ہر ایک کا حکم الگ ہے، مجتہدانہ تدبر جس کے ذریعہ قرآن حکیم سے دوسرے مسائل کو معلوم کیا جاتا ہے، اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس کی مبادیات کو حاصل کرے، تاکہ وہ نتائج کو صحیح نکال سکے اور اگر اس نے مقدمات کو بالکل حاصل نہ کیا، یا اس نے ناقص حاصل کیا جن اوصاف وشرائط کی ایک مجتہد کو ضرورت ہوتی ہے وہ اس کے پاس نہیں ہیں تو ظاہر ہے وہ نتائج غلط نکالے گا، اب اگر علماء اس پر نکیر کریں تو حق ہے۔

لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا: یعنی اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بکثرت اختلاف پاتے، دلیل کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں کئی طرح سے اعجاز موجود ہے، ایک تو اسکا فصاحت وبلاغت میں بے مثل وبے نظیر ہونا جس کا ثبوت تمام فصحاء وبلغاء کے عاجز ہونے سے ظاہر ہوچکا ہے، اگر یہ غیر اللہ کا کلام ہوتا تو تمام بلغاء جو بلاغت وشاعری میں شہرہ آفاق تھے اس طرح اسکے مقابلہ سے عاجز نہ ہوتے، پھر انسان کا سارا کلام یکساں نہیں ہوسکتا کبھی تو کوئی مضمون فصاحت وبلاغت سے ضرور گرا ہوا ہوتا ہے، مگر قرآن باوجودیکہ اتنی بڑی کتاب ہے، کہیں کوئی آیت حد اعجاز سے گری ہوئی نہیں، کسی آیت کا مثل ونظیر کوئی شخص نہیں لاسکتا تو مخالفین میں جو مشرک ہیں ان کیلئے یہ فصاحت وبلاغت کا اعجاز قرآن کے کلام الٰہی ہونے پر بڑی دلیل ہے۔

اور جو اہل کتاب ہیں اور اکثر منافقین بھی ان میں ہی سے تھے ان کے لیے قرآن کی حقانیت پر کافی دلیل یہ ہے کہ قرآن میں غیب کی خبریں بکثرت موجود ہیں، اور رسول اللہ ﷺ کے پاس ان پر مطلع ہونے کا کوئی ذریعہ نہ تھا، نہ آپ نے کوئی کتاب پڑھی، نہ اہل کتاب کی صحبت میں رہے، پھر بغیر وحی الٰہی کے کیونکر اس کثرت سے قرآن میں پہلی خبریں بیان کی گئیں اس کو بھی جانے دو، منافقین اور ان کے سردار جو آپس میں خفیہ مشورہ کیا کرتے تھے سب کی اطلاع اور ان کے دلوں کی اطلاع اور بھیدوں کا اظہار قرآن میں بکثرت کیا گیا ہے، نیز آئندہ کی نسبت بہت سی پیشین گوئیاں کی گئی ہیں، اگر یہ کلام کسی انسان کا ہوتا تو کوئی خبر تو واقعیت سے ہٹی ہوئی ہوتی، بلکہ اتنی زیادہ خبروں میں تو واقعیت سے زیادہ اختلاف ہوتا، مگر قرآن میں زیادہ تو کیا ایک خبر کو بھی واقعیت کے خلاف کوئی نہ ثابت کرسکا، اہل کتاب بھی مان گئے کہ جتنی خبریں پہلے زمانہ کی قرآن میں ہیں سب سچ ہیں، منافقین کے دلوں کے بھید جب قرآن میں کھولے گئے سب سرنگوں ہوگئے اور حیران تھے کہ ہمارے خفیہ مشورے اور دلی راز قرآن میں کیسے ہو بہو ظاہر کردیے جاتے ہیں، باتیں کرتے ہوئے ڈرنے لگے اور آئندہ کی پیشین گوئیاں تو بعینہ سچ ہوتی ہوئی دنیا نے دیکھ لیں۔

اگر کوئی یہ کہے کہ ممکن ہے کہ حضور ﷺ کو کسی فن کی مشق ہو جس سے آپ کو کشف وغیرہ ہوتا ہو تو جواب یہ ہے کہ آپ کے زمانہ میں مخالفین بکثرت موجود تھے، اگر ایسا ہوتا تو ضرور کوئی دعویٰ کرکے اس کو ثابت کرتا، دوسرے کیسا ہی کوئی ماہر فن ہو غیب کی خبریں اس کثرت سے بعینہ صحیح بیان نہیں کرسکتا کہ کوئی بات بھی واقعیت سے نہ ہٹے، علاوہ ازیں اگر کوئی ایسے فن کا ماہر بھی ہو تو جھوٹا دعویٰ نبوت کرنے کے بعد اس کی ساری مہارت جاتی رہتی۔

* * *

فائدہ: پہلی آیات سے حضرت محمد ﷺ کا رسول اللہ ہونا اور ان کی اطاعت بعینہ خدا کی اطاعت ہونی اور ان کے نافرمانوں پر حق تعالیٰ کا عذاب ہونا تو خوب ظاہر ہوگیا، مگر منافق اور آپ کے مخالف یہ کہہ سکتے ہیں کہ خدا کی گواہی اور اس کے ارشادات کی تسلیم وتصدیق میں تو ہم کو تامل ہرگز نہیں، مگر یہ کیونکر معلوم ہو کہ یہ خدا کا کلام ہے بشر کا بنایا ہوا نہیں، تو حق تعالیٰ اس کا جواب دیتا ہے کہ یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے جس سے صاف معلوم ہوجائے کہ قرآن اللہ کا کلام ہے، دیکھو اگر قرآن اللہ کا کلام نہ ہوتا جیسا کہ تم گمان کرتے ہو تو ضرور قرآن میں بہت سے مواقع میں طرح طرح کے اختلافات ملتے، دیکھو آدمی ہر حالت میں اسی حالت کے موافق کلام کرتا ہے جو حالت پیش ہوتی ہے، دوسری حالت کا دھیان نہیں ہوتا، غصہ میں مہربانی والوں کا دھیان نہیں رہتا اور مہربانی میں غصہ والوں کا، دنیا کے بیان میں آخرت کا لحاظ نہ رہے اور آخرت کے بیان میں دنیا کا، بے پروائی میں عنایت کا ذکر نہیں اور عنایت میں بے پروائی کا، بالجملہ ایک حال کا کلام دوسرے حال کے کلام سے مختلف نظر آئے گا، لیکن قرآن شریف چونکہ خالق کا کلام ہے

،یہاں ہر چیز کے بیان میں دوسری جانب بھی نظر رہتی ہے۔
غور وفہم سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن میں ہر چیز کا بیان ہر مقام میں ایک انداز پر ہے، دیکھئے یہاں منافقوں کا مذکور تھا جو سخت عتاب کے مستحق ہیں، سو یہاں بھی ان کی باتوں پر اسی قدر الزام ہے جتنا چاہیے اور جو الزام ان کی ایک خاص جماعت پر تھا، وہ خاص انہی پر لگایا گیا اور فرمادیا کہ بعضے ان میں سے ایسا کرتے ہیں، یہ نہیں کہ غصہ وغیرہ کی حالت میں کلام اپنی حد سے نکل جائے اور دوسری حالت کے کلام سے مختلف نظر آئے، اور نیز یہ مطلب بھی ہے کہ ہم برابر دیکھتے ہیں کہ جب آدمی کوئی کلام طویل کرتا ہے تو وہ یکساں نہیں ہوتا، بلکہ کوئی جملہ فصیح کوئی غیر فصیح، کوئی صحیح، کوئی غلط، کوئی سچا، کوئی کاذب، کوئی موافق کوئی باہم متناقض ضرور معلوم ہوتا ہے، اور قرآن اتنی بڑی کتاب ان جملہ اختلافات سے پاک ہے جو طاقت بشر سے باہر ہے۔

فائدہ: اس میں اس کی طرف بھی اشارہ ہوگیا کہ جو تدبر اور فہم سے کام نہ لے وہ قرآن میں شبہات اور اختلافات کا وہم چلاسکتا ہے، مگر فہیم ایسا نہیں کرسکتا، دیکھو جو اسی مقام میں تدبر نہ کرے وہ کہہ سکتا ہے کہ اول تو فرمادیا: قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ (النساء:۷۸) پھر فرمادیا: وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ (النساء:۷۹) سو یہ تو تناقض اور اختلاف ہوگیا، واللہ اعلم۔

وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ۭ وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ

اور جب ان کے پاس پہنچتی ہے کوئی خبر امن کی یا ڈر کی تو اس کو مشہور کر دیتے ہیں [1] اور اگر اسکو پہنچا دیتے رسول ﷺ تک

وَاِلٰٓى اُولِي الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ ۭ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ

اور اپنے حاکموں تک تو تحقیق کرتے اس کو جو ان میں تحقیق کرنے والے ہیں اس کی [2] اور اگر نہ ہوتا فضل اللہ کا تم پر

وَرَحْمَتُهٗ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطٰنَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝۸۳

اور اس کی مہربانی تو البتہ تم پیچھے ہو لیتے شیطان کے مگر تھوڑے [3]

خلاصہ تفسیر: (پیچھے منافقین کی مذہبی بدعنوانی مذکور تھی، اب ان کی ایک انتظامی بدعنوانی بتائی جاتی ہے جس سے اہل اسلام کو نقصان پہنچتا تھا) اور جب ان کو کسی امر (نئی بات) کی خبر پہنچتی ہے خواہ (وہ بات سبب) امن ہو یا (سبب) خوف (مثلاً مسلمانوں کا کوئی لشکر کسی جگہ جہاد کے لئے گیا، اور ان کے غالب ہونے کی خبر آئی تو یہ امن کی خبر ہوئی، یا ان کے مغلوب ہونے کی خبر آئی، یہ خوف کی خبر ہے) تو اس (خبر) کو فوراً مشہور کر دیتے ہیں (حالانکہ بعض اوقات وہ غلط نکلتی ہے اور اگر صحیح بھی ہوئی تب بھی بعض اوقات اس کا مشہور کرنا انتظامی مصلحت کے خلاف ہوتا ہے)۔

اور اگر (خود مشہور کرنے کے بجائے) یہ لوگ اس (خبر) کو رسول ﷺ کے اور جو (حضرات اکابر صحابہ) ان میں ایسے امور کو سمجھتے ہیں ان (کی رائے) کے اوپر حوالہ رکھتے (اور خود کچھ دخل نہ دیتے) تو اس (خبر کے صحیح یا غلط اور قابل تشہیر ہونے نہ ہونے) کو وہ حضرات تو پہچان ہی لیتے جو ان میں اس کی تحقیق کرلیا کرتے ہیں (جیسے ہمیشہ پہچان ہی لیتے ہیں، پھر جیسا یہ حضرات عمل درآمد کرتے ویسا ہی ان خبر اڑانے والوں کو کرنا چاہئے تھا، منافقین کو دخل دینے کی کیا ضرورت ہوئی، اور نہ دخل دیتے تو کونسا کام اٹک رہا تھا؟)۔

(دنیوی واخروی مصالح پر مشتمل احکامات کے بعد اب بطور احسان کے مسلمانوں کو ارشاد ہے:) اور اگر تم لوگوں پر اللہ تعالیٰ کا (یہ خاص) فضل اور رحمت (کہ تم کو قرآن دیا، اپنا پیغمبر بھیجا، یہ اگر) نہ ہوتا تو تم سب کے سب (دنیوی واخروی نقصان اختیار کرکے) شیطان کے پیرو ہو جاتے بجز تھوڑے سے آدمیوں کے (جو خداداد عقل سلیم کی بدولت اس سے محفوظ رہتے اور یہ عقل سلیم بھی ایک خاص فضل ورحمت ہے، ورنہ زیادہ تباہی میں ہی پڑتے، پس تم کو ایسے پیغمبر اور ایسے قرآن کو بہت غنیمت سمجھنا چاہئے جن کی معرفت ایسے مصالح کے احکام آتے ہیں، اور پوری اطاعت کرنی چاہئے،

برخلاف مذکورہ منافقین کے)۔

وَاِلٰٓی اُولِی الْاَمْرِ مِنْھُمْ: اولی الامر کی تفصیل اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم کے تحت پیچھے گذر چکی ہے۔

لَعَلِمَہُ الَّذِیْنَ یَسْتَنْۢبِطُوْنَہٗ مِنْھُمْ: ''استنباط'' اصل میں کنوئیں کی تہہ سے پانی نکالنے کو کہتے ہیں، کنواں کھودنے میں جو پانی پہلی مرتبہ نکلتا ہے اس کو ماء مستنبط کہتے ہیں، مگر یہاں مراد یہ ہے کہ کسی بات کی تہہ تک پہنچ کر اس کی صحیح حقیقت معلوم کرنا، اس آیت سے معلوم ہوا کہ جن مسائل میں کوئی نص نہ ہو ان کے احکام اجتہاد و قیاس کے اصول پر قرآنی حیثیت سے نکالے جائیں، کیونکہ اس آیت میں اس بات کا حکم دیا گیا کہ مسائل جدیدہ کے حل میں اگر رسول کریم ﷺ موجود ہیں تو ان کی جانب رجوع کرو، اور اگر وہ موجود نہ ہوں تو علماء اور فقہاء کی طرف رجوع کرو، کیونکہ وہ احکام کو مستنبط کرنے کی صلاحیت تام رکھتے ہیں، گویا مسائل جدیدہ میں قیاس و اجتہاد، عوام کے لئے تقلید ائمہ کا ثبوت ہے، اس بیان سے چند امور مستفاد ہوئے ہیں:

① ایک یہ کہ فقہاء اور علماء کی جانب عدم نص کی صورت میں رجوع کیا جائے گا۔

② دوسرے یہ کہ احکام اللہ کی دو قسمیں ہیں: بعض وہ ہیں جو منصوص اور صریح ہیں اور بعض وہ ہیں جو غیر صریح اور مبہم ہیں جن کو آیات کی گہرائیوں میں اللہ تعالیٰ نے ودیعت کر رکھا ہے۔

③ تیسرے یہ کہ علماء کا یہ فریضہ ہے کہ وہ ایسے معانی کو اجتہاد اور قیاس کے ذریعے استنباط کریں۔

④ چوتھے یہ کہ عوام کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان مسائل میں علماء کی تقلید کریں۔

اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ اس آیت سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ دشمن سے امن اور خوف کے بارے میں تم خود بخود خبریں نہ اڑاؤ، بلکہ جو اہل علم اور ذی رائے ہیں ان کی طرف رجوع کرو، پھر وہ غور و فکر کر کے جو بات بتلائیں اس پر عمل کرو، ظاہر ہے کہ جدید مسائل سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے، جواب یہ ہے کہ آیت واذا جاءھم امر من الامن او الخوف میں دشمن کا کوئی ذکر نہیں ہے، لہٰذا امن اور خوف عام ہے، جس طرح ان کا تعلق دشمن سے ہے، اسی طرح مسائل حوادث سے بھی ہے، کیونکہ جب کوئی جدید مسئلہ عامی کے سامنے آتا ہے جس کی حلت اور حرمت کے بارے میں کوئی نص نہیں ہے، تو وہ فکر میں پڑ جاتا ہے کہ کونسا پہلو اختیار کرے اور دونوں صورتوں میں نفع، نقصان کا احتمال رہتا ہے تو اس کا بہترین حل شریعت نے یہ نکالا کہ تم اہل استنباط کی طرف رجوع کرو، وہ جو بات بتلائیں اس پر عمل کرو۔

* * *

فائدہ: ۱ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِہٖ: یعنی ان منافقوں اور کم سمجھ مسلمانوں کی ایک خرابی یہ ہے کہ جب کوئی بات امن کی پیش آتی، مثلاً رسول اللہ ﷺ کا کسی سے صلح کا قصد فرمانا، یا لشکر اسلام کی فتح کی خبر سننا، یا کوئی خبر خوفناک سن لیتے ہیں، جیسے دشمنوں کا کہیں جمع ہونا، یا مسلمانوں کی شکست کی خبر آنا تو ان کو بلا تحقیق کئے مشہور کرنے لگتے ہیں اور اس میں اکثر فساد و نقصان مسلمانوں کو پیش آ جاتا ہے، منافق ضرر رسانی کی غرض سے اور کم سمجھ مسلمان کم فہمی کی وجہ سے ایسا کرتے تھے۔

فائدہ: ۲ لَعَلِمَہُ الَّذِیْنَ یَسْتَنْۢبِطُوْنَہٗ مِنْھُمْ: یعنی کہیں سے کچھ خبر آئے تو چاہیے کہ اول پہنچائیں سردار تک اور اس کے نائبوں تک جب وہ اس خبر کو تحقیق اور تسلیم کر لیویں تو ان کے کہنے کے موافق اس کو کہیں نقل کریں اور اس پر عمل کریں۔

فائدہ: حضرت محمد ﷺ نے ایک شخص کو ایک قوم کے یہاں زکوٰۃ لینے کو بھیجا، وہ قوم اس کے استقبال کو باہر نکلی، اس نے خیال کیا کہ میرے مارنے کو آئے ہیں، لوٹ کر مدینہ میں آ گیا اور مشہور کر دیا کہ فلاں قوم مرتد ہو گئی، تمام شہر میں شہرت ہو گئی، آخر کو غلط نکلی۔

فائدہ: ۳ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّیْطٰنَ اِلَّا قَلِیْلًا: یعنی اگر اللہ اپنے فضل سے تمہاری اصلاح اور تربیت کے لئے احکام نہ بھیجتا اور تم کو وقتاً فوقتاً حسب ضرورت ہدایت اور تنبیہ نہ فرماتا رہتا جیسا کہ اس موقع پر رسول ﷺ اور سرداروں کی طرف رجوع کرنے کو فرمایا تو تم گمراہ ہو جاتے، مگر چند خواص جو کامل العقل اور کامل الایمان ہیں، ان تنبیہات کو اللہ تعالیٰ کا انعام سمجھو اور شکر کرو اور پوری تعمیل کرو۔

فَقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ لَا تُكَلَّفُ اِلَّا نَفْسَكَ وَحَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّكُفَّ

سو تو لڑ اللہ کی راہ میں ،تو ذمہ دار نہیں مگر اپنی جان کا اور تاکید کر مسلمانوں کو، قریب ہے کہ اللہ بند کر دے

بَاْسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ وَاللّٰهُ اَشَدُّ بَاْسًا وَّاَشَدُّ تَنْكِيْلًا ﴿۸۴﴾

لڑائی کافروں کی [1] اور اللہ بہت سخت ہے لڑائی میں اور بہت سخت ہے سزا دینے میں [2]

خلاصہ تفسیر: (پیچھے جہاد کا مضمون شروع ہوا تھا، درمیان میں اس کی مناسبت سے اور مضامین آگئے، اب پھر جہاد کے متعلق بیان فرماتے ہیں: جب جہاد کی ضرورت معلوم ہوگئی) پس آپ (اے محمد ﷺ!) اللہ کی راہ میں (کفار سے) قتال کیجئے (اور اگر بالفرض کوئی آپ کے ساتھ نہ ہو تو کچھ فکر نہ کیجئے، کیونکہ) آپ کو بجز آپ کے ذاتی فعل کے (دوسرے شخص کے فعل کا) کوئی حکم نہیں، اور (اس کے ساتھ) مسلمانوں کو (صرف) ترغیب دے دیجئے (پھر اگر کوئی ساتھ نہ دے تو آپ بری الذمہ ہیں، نہ تو باز پرس کی فکر کیجئے جس کی وجہ بیان ہو چکی اور نہ تنہا رہ جانے کا غم کیجئے، جس کی وجہ یہ ہے کہ) اللہ تعالیٰ سے امید ہے (اور یہ امید دلانا وعدہ ہے) کہ کافروں کے زور جنگ کو روک دیں گے (اور ان کو مغلوب کر دیں گے) اور (اگرچہ یہ بڑے زوردار نظر آتے ہیں، لیکن) اللہ تعالیٰ زور جنگ میں (ان سے بمدارج بے شمار) زیادہ شدید (اور قوی) ہیں اور (مخالف کو) سخت سزا دیتے ہیں (ممکن ہے اس آخری جملہ سے آخرت کی سزا مراد ہو اور پہلے جملہ سے دنیاوی سزا)۔

عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّكُفَّ بَاْسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا: اس پیشین گوئی کا واقع ہونا دونوں صورتوں میں ظاہر ہے، اگر خاص کفار قریش مراد ہوں جب بھی، اور اگر ساری دنیا کے کفار مراد ہوں جب بھی، کیونکہ چند ہی روز میں مسلمانوں نے تمام سلطنتیں فتح کر لیں۔

* * *

فائدہ: [1] یعنی اگر کافروں کی لڑائی سے یہ منافق اور کچے مسلمان جن کا ذکر اوپر گزرا ڈرتے ہیں تو اے رسول ﷺ! تو تنہا اپنی ذات سے جہاد کرنے میں توقف مت کر، اللہ تعالیٰ تیرا مددگار ہے اور مسلمانوں کو جہاد کی تاکید کر دے، جو ساتھ نہ دے اس کی پروا مت کر، امید ہے کہ اللہ تعالیٰ کافروں کی لڑائی کو روک دے گا۔

فائدہ: جب یہ آیت نازل ہوئی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں ضرور جہاد کیلئے جاتا ہوں اگرچہ ایک بھی میرے ساتھ نہ ہو اور کل ستر ہمراہیوں کے ساتھ بدر صغریٰ کو بغرض جہاد تشریف لے گئے، جس کا وعدہ ابوسفیان سے غزوہ احد کے بعد ہوا تھا، جس کا ذکر پہلی سورت میں گزر چکا ہے، حق تعالیٰ نے ابوسفیان اور کفار قریش کے دل میں رعب اور خوف ڈال دیا، کوئی مقابلہ میں نہ آیا اور وعدے سے جھوٹے ہوئے اور حق سبحانہ نے اپنے ارشاد کے موافق کافروں کی لڑائی کو بند کر دیا اور آپ ہمراہیوں سمیت خیر اور سلامتی کے ساتھ واپس تشریف لے آئے۔

فائدہ: [2] یعنی اللہ تعالیٰ کی لڑائی اور اس کا عذاب کافروں کے ساتھ لڑنے سے بہت سخت ہے، سو جو لوگ کافروں کے ساتھ لڑنے اور ان کو مارنے اور ان کے ہاتھ سے مارے جانے سے ڈرتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے غصہ اور اس کے عذاب کا کیونکر تحمل کر سکتے ہیں۔

مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ

جو کوئی سفارش کرے نیک بات میں اس کو بھی ملے گا اس میں سے ایک حصہ، اور جو کوئی سفارش کرے بری بات میں اس پر بھی ہے

كِفْلٌ مِّنْهَا ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقِيْتًا ﴿۸۵﴾

ایک بوجھ اس میں سے [1] اور اللہ ہے ہر چیز پر قدرت رکھنے والا [2]

خلاصہ تفسیر: پیچھے نبی کریم ﷺ کو حکم تھا کہ مسلمانوں کو جہاد کی ترغیب دیں، اب جائز کام میں سفارش کی فضیلت اس مناسبت سے بیان فرماتے ہیں کہ اس میں بھی ایک انسان کو ترغیب ہے کہ دوسرے کے ساتھ احسان کرے، گویا خیر کی ترغیب ماقبل سے مناسبت ہوئی۔

جو شخص اچھی سفارش کرے (یعنی سفارش کی غرض بھی جائز ہو اور سفارش کا طریقہ بھی شریعت کے مطابق ہو) اس کو اس (سفارش) کی وجہ سے (ثواب کا) حصہ ملے گا، اور جو شخص بری سفارش کرے (یعنی جس سفارش کی غرض یا سفارش کا طریقہ ناجائز ہو) اس کو اس (سفارش) کی وجہ سے (گناہ کا) حصہ ملے گا، اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھنے والے ہیں (وہ اپنی قدرت سے نیکی پر ثواب اور بدی پر عذاب دے سکتے ہیں)۔

* * *

فائدہ: ۱۔ یعنی اگر کوئی نیک کام میں سعی سفارش کرے، جیسا نبی علیہ السلام کا مسلمانوں کو جہاد کی تاکید فرمانا، یا کوئی بری بات میں ساعی ہو، جیسا منافق اور سست مسلمانوں کا جہاد سے ڈر کر دوسروں کو بھی ڈرانا تو اول صورت میں ثواب کا اور دوسری صورت میں گناہ کا حصہ ملے گا، ایسے ہی اگر کوئی محتاج کی سفارش کر کے دولت مند سے کچھ دلوادے تو یہ بھی خیرات کے ثواب میں شریک ہوگا اور جو کوئی کافر مفسد یا سارق کو سفارش کر کے چھڑا دے، پھر وہ فساد اور چوری کرے تو یہ بھی شریک ہوگا فساد اور چوری میں۔

فائدہ: ۲۔ یعنی خدا تعالیٰ تمام چیزوں پر قادر اور ہر چیز کا حصہ بانٹنے والا ہے تو نیکی اور بدی کے حصہ دینے میں اس کو کوئی دشواری نہیں۔

وَإِذَا حُيِّيتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوا بِأَحْسَنَ مِنْهَا أَوْ رُدُّوهَا ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ حَسِيبًا ﴿٨٦﴾

اور جب تم کو دعا دے کوئی تو تم بھی دعا دو اس سے بہتر یا وہی کہو الٹ کر، بیشک اللہ ہے ہر چیز کا حساب کرنے والا

خلاصہ تفسیر: پیچھے شفاعت حسنہ کا بیان تھا، اب سلام کے جواب دینے کا طریقہ اس مناسبت سے بیان فرماتے ہیں کہ دونوں میں دوسرے انسان کی تطییب قلب یعنی اس کو خوش کرنا پایا جاتا ہے۔

اور جب تم کو کوئی (جائز طریقہ پر) سلام کرے تو تم اس (سلام) سے اچھے الفاظ میں سلام کرو (یعنی جواب دو) یا (جواب میں) ایسے ہی الفاظ کہہ دو (تم کو دونوں اختیار دیئے جاتے ہیں) بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر (یعنی ہر عمل پر) حساب لیں گے (یعنی ان کا قانون یہی ہے اور یوں اپنے فضل سے معاف کر دیں تو وہ اور بات ہے)۔

وَإِذَا حُيِّيتُمْ بِتَحِيَّةٍ: یعنی جب تم کو کوئی (جائز طریقہ پر) سلام کرے، کیونکہ اگر ناجائز طریقہ پر سلام کرے مثلاً جو شخص نماز پڑھ رہا ہے اگر کوئی اس کو سلام کرے تو جواب دینا واجب نہیں بلکہ مفسد نماز ہے، اسی طرح جو شخص خطبہ دے رہا ہے یا قرآن مجید کی تلاوت میں مشغول ہے، یا اذان یا اقامت کہہ رہا ہے، یا دینی کتابوں کا درس دے رہا ہے، یا انسانی ضروریات استنجا وغیرہ میں مشغول ہے اس کو اس حالت میں سلام کرنا بھی جائز نہیں اور اس کے ذمہ جواب دینا بھی واجب نہیں، اس آیت میں مکارم اخلاق اور محاسن اعمال کی تعلیم ہے۔

فَحَيُّوا بِأَحْسَنَ مِنْهَا: سلام کا جواب دینا واجب علی الکفایہ ہے کہ اگر ایک جماعت میں سے ایک بھی جواب دے دے تو سب کے ذمہ سے اتر جائے گا، اور مطلق جواب دینا تو واجب ہے، باقی ویسے ہی الفاظ یا اس سے کم یا زیادہ اس کا اختیار ہے، ادنی لفظ تو السلام علیکم ہے، اس سے زیادہ السلام علیکم ورحمۃ اللہ ہے، اسی طرح جواب میں بھی وعلیکم السلام سے تو کم نہ ہو آگے اختیار ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی کسی مسلمان کو سلام کرنا یا دعا دینا درحقیقت اللہ سے اس کی شفاعت کرنا ہے تو حق تعالیٰ شفاعت حسنہ کی ایک خاص صورت کو جو مسلمانوں میں شائع ذائع ہے صراحت کے ساتھ بیان فرماتا ہے کہ جب کوئی اے مسلمانو! تم کو دعا دے یا سلام کرے تو تم کو بھی اس کا جواب ضرور دینا چاہیے، یا تو وہی کلمہ تم بھی اس کو کہو، یا اس سے بہتر، مثلاً اگر کسی نے کہا السلام علیکم تو واجب ہے تم پر کہ اس کے جواب میں وعلیکم السلام کہو اور زیادہ ثواب چاہو تو "ورحمۃ اللہ" بھی بڑھا دو اور اگر اس نے یہ لفظ بڑھایا ہو تو تم "وبرکاتہ" زیادہ کر دو، اللہ کے یہاں ہر ہر چیز کا حساب ہوگا اور اس کی جزا ملے گی، سلام

اوراس کا جواب بھی اس میں آ گیا۔

فائدہ: اس سے شفاعت حسنہ کی پوری ترغیب ہوگئی اور شفاعت سیئہ کی خرابی اور مضرت معلوم ہوگئی، کیونکہ جو شفاعت حسنہ کرے گا اس کو اللہ تعالیٰ ثواب دے گا اور جس کی شفاعت کی ہے اس پر اس کے ساتھ حسن سلوک اور مکافات کا حکم فرما دیا بخلاف شفاعت سیئہ کے کہ بجز معصیت اور محرومی کے کچھ نہ ملے گا۔

اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ ؕ لَیَجْمَعَنَّکُمْ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ لَا رَیْبَ فِیْہِ ؕ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰہِ حَدِیْثًا ﴿۸۷﴾ ع

اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہیں بیشک تم کو جمع کر یگا قیامت کے دن اس میں کچھ شبہ نہیں اور اللہ سے سچی کس کی بات

خلاصہ تفسیر: پیچھے بہت سے احکام بیان ہوئے، اب گذشتہ احکام کی تاکید واہتمام کے لیے اپنی عظمت اور قیامت کا ذکر فرماتے ہیں تا کہ حاکم کی عظمت سے اور ان کے دربار میں حاضری کے خوف عمل کا اہتمام زیادہ ہو

اللہ ایسے ہیں کہ ان کے سوا کوئی معبود ہونے کے قابل نہیں، وہ ضرور تم سب کو جمع کریں گے قیامت کے دن، اس میں کوئی شبہ نہیں اور اللہ تعالیٰ سے زیادہ کس کی بات سچی ہوگی (جب وہ خبر دے رہے ہیں تو بالکل ٹھیک ہی ہے)۔

وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰہِ حَدِیْثًا: یعنی مخلوق کی بات خدا سے زیادہ سچی نہیں ہو سکتی، اور محاورہ میں اس سے یہ بھی سمجھا جاتا ہے کہ برابر بھی نہیں ہو سکتی اور یہ ظاہر ہے، کیونکہ مخلوق کو علم غیب چونکہ نہیں، وہ اس پر مطلع نہیں ہو سکتے کہ واقع کے مطابق کونسی بات ہے کونسی نہیں اور سچائی کا مدار یہی ہے، نیز کیونکہ مخلوق کو کامل قدرت نہیں، وہ اپنے وعدہ کو پورا کر دینے پر بھی قادر نہیں، مگر یہ کہ خدا تعالیٰ بتلا دیں یا قدرت دیں تو اور بات ہے، تو چونکہ حق تعالیٰ میں یہ دونوں باتیں ہیں اس لیے ان کی ہر خبر بھی صادق ہے، اور وعدہ بھی سچا ہے، نیز مخلوق کے کلام کے لیے صدق ایسی صفت نہیں کہ کبھی جدا نہ ہو سکے، بخلاف حق تعالیٰ کے کلام کے لیے کہ اس سے سچائی کا جدا ہونا محال ہے، اس کے کلام کے لیے صدق ہمیشہ لازم ہے جو کبھی جدا نہیں ہو سکتا، یہ اور بات ہے کہ کذب پر بھی خدا تعالیٰ کو قدرت ہے، کیونکہ جب کلام پر قدرت ہے تو ہر قسم کے کلام پر قدرت ہوگی مگر حق تعالیٰ سے کبھی کذب کا وقوع نہیں ہو سکتا۔

* * *

فائدہ: یعنی قیامت کا آنا اور ثواب وعقاب کے سب وعدوں کا پورا ہونا سب سچ ہے، اس میں تخلف نہیں ہوگا، ان باتوں کو سرسری خیال نہ کرو۔

فَمَا لَکُمْ فِی الْمُنٰفِقِیْنَ فِئَتَیْنِ وَاللّٰہُ اَرْکَسَھُمْ بِمَا کَسَبُوْا ؕ اَتُرِیْدُوْنَ اَنْ تَھْدُوْا

پھر تم کو کیا ہوا کہ منافقوں کے معاملہ میں دو فریق ہو رہے ہو اور اللہ نے ان کو الٹ دیا بسبب ان کے اعمال کے، کیا تم چاہتے ہو کہ راہ پر لاؤ

مَنْ اَضَلَّ اللّٰہُ ؕ وَمَنْ یُّضْلِلِ اللّٰہُ فَلَنْ تَجِدَ لَہٗ سَبِیْلًا ﴿۸۸﴾

جس کو گمراہ کیا اللہ نے، اور جس کو گمراہ کرے اللہ ہرگز نہ پائے گا تو اس کے لئے کوئی راہ

خلاصہ تفسیر: پیچھے منافقین کے احوال اور جہاد کے احکام مذکور تھے، اب یہ بتلاتے ہیں کہ مسلمانوں کو منافقین کے ساتھ کیا معاملہ رکھنا چاہیے؟ حاصل حکم یہ ہے کہ منافقین کے ساتھ مسلمانوں جیسا معاملہ اس وقت تک کیا جائے گا کہ جب تک ان کا نفاق چھپا رہے اور جب ان کا کفر اور نفاق واضح اور ظاہر ہو جائے تو پھر ان کے ساتھ وہی معاملہ کیا جائے جو کفار کے ساتھ کیا جاتا ہے، شان نزول ان آیتوں کا جو کہ پورا ایک رکوع ہے چند واقعات ہیں، اول یہ کہ بعض مشرکین مکہ سے مدینہ آئے اور ظاہر کیا کہ ہم مسلمان اور مہاجر ہو کر آئے ہیں، پھر مرتد ہو گئے اور حضور ﷺ سے اسباب تجارت لانے کا بہانہ کر کے پھر مکہ چل دیئے اور پھر واپس نہ آئے، ان کے بارے میں مسلمانوں کی رائے مختلف ہوئی، بعض نے کہا یہ کافر ہیں، بعض نے حسن ظن کی بنا پر کہا یہ مومن ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کا منافق اور واجب القتل ہونا اس آیت میں بیان کر دیا، آگے چار آیات میں تین فرقوں کا بیان ہے جن

کے متعلق دو حکم مذکور ہیں۔

(① پہلا فرقہ: جب تم ان مرتدین کی حالت دیکھ چکے) پھر تم کو کیا ہوا کہ ان منافقین کے باب میں تم (اختلاف رائے کر کے) دو گروہ ہو گئے (کہ ایک گروہ ان کو اب بھی مسلمان کہتا ہے) حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو (ان کے علانیہ کفر کی طرف) الٹا پھیر دیا ان کے (برے) عمل کے سبب (وہ برا عمل دارالاسلام کو ارتداداً چھوڑ دینا ہے جو کہ اس وقت کفر کی علامت تھی، اور واقع میں تو وہ پہلے بھی مسلمان نہ ہوئے تھے اور اسی وجہ سے ان کو منافق کہا) کیا تم لوگ (اے وہ گروہ! جو دارالاسلام چھوڑ کر چلے جانے کو کفر کی علامت نہیں سمجھتے) اس کا ارادہ رکھتے ہو کہ ایسے لوگوں کو ہدایت کرو جن کو اللہ تعالیٰ نے (جبکہ انہوں نے خود گمراہی اختیار کی) گمراہی میں ڈال رکھا ہے (جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا قانون ہے کہ عزم فعل کے وقت اس فعل کو پیدا کر دیتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ غیر مؤمن گمراہ کو جو تم ہدایت یافتہ مؤمن کہتے ہو یہ تمہارے لئے جائز نہیں) اور جس کو اللہ تعالیٰ گمراہی میں ڈال دیں اس کے (مؤمن ہونے کے) لیے کوئی سبیل نہ پاؤ گے (پس ان لوگوں کو مؤمن نہیں کہنا چاہئے)۔

ان کو منافق کہنا بایں معنی ہے کہ جب اسلام کا دعویٰ کیا تھا جب بھی منافق تھے، دل سے ایمان نہ لائے تھے، اور منافقین اگرچہ قتل نہیں کئے جاتے تھے لیکن جب تک ہی کہ اپنا کفر چھپائے رکھیں اور ان لوگوں کا مرتد ہونا ظاہر ہو گیا تھا، اور جنہوں نے مسلمان کہا شاید حسن ظن کی وجہ سے کہا ہو، اور ان کے دلائل ارتداد میں کچھ تاویل کر لی ہوگی اور اس تاویل کی بنیاد محض رائے ہوگی، جس کی تائید دلیل شرعی سے نہ ہوگی، اس لئے معتبر نہیں سمجھی گئی، چنانچہ اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان کا کافر ہونا بیان کر دیا اور ان کے قتل کا حکم دے دیا۔

* * *

فائدہ: ان منافقوں میں وہ لوگ داخل ہیں جو ظاہر میں بھی ایمان نہ لائے تھے، بلکہ ظاہر و باطن کفر پر قائم تھے، لیکن حضرت محمد ﷺ اور مسلمانوں کے ساتھ ظاہری میل جول اور محبت کا معاملہ رکھتے تھے اور غرض ان کی یہ تھی کہ مسلمانوں کی فوج ہماری قوم پر چڑھائی کرے تو ہمارے جان و مال اس حیلہ سے محفوظ رہیں، جب مسلمانوں کو معلوم ہو گیا کہ ان کا آنا جانا اس غرض سے ہے، دل کی محبت سے نہیں تو بعض مسلمانوں نے کہا کہ ان شریروں سے ملنا ترک کر دینا چاہیے، تاکہ ہم سے جدا ہو جائیں اور بعضوں نے کہا ان سے ملے جائیے شاید ایمان لے آئیں، اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ ہدایت و گمراہی اللہ کے قبضہ میں ہے، تم اس کا ہرگز فکر مت کرو اور ان لوگوں سے بالاتفاق وہ معاملہ کرنا چاہیے جو آئندہ مذکور ہے دو فریق مت بنو۔

وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا

چاہتے ہیں کہ تم بھی کافر ہو جاؤ جیسے وہ کافر ہوئے تو پھر تم سب برابر ہو جاؤ سو تم ان میں سے کسی کو دوست مت بناؤ یہاں تک کہ وطن چھوڑ آئیں

فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ ۪ وَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ

اللہ کی راہ میں، پھر اگر اس کو قبول نہ کریں تو ان کو پکڑو اور مار ڈالو جہاں پاؤ، اور نہ بناؤ ان میں سے کسی کو

وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۸۹﴾

دوست اور نہ مددگار

خلاصہ تفسیر: (اور بھلا وہ خود کیا مؤمن ہوں گے ان کے کفر میں غلو کی تو یہ حالت ہے کہ) وہ اس تمنا میں ہیں کہ جیسے وہ کافر ہیں تم بھی (خدا نہ کرے) کافر بن جاؤ، جس میں تم اور وہ سب ایک طرح ہو جاؤ، سو (ان کی جب یہ حالت ہے تو) ان میں سے کسی کو دوست مت بنانا (یعنی کسی کے ساتھ مسلمانوں کا سا برتاؤ مت کرنا، کیونکہ دوستی جائز ہونے کے لیے اسلام شرط ہے) جب تک وہ اللہ کی راہ میں (یعنی تکمیل اسلام کے لیے) ہجرت نہ کریں (کیونکہ اس وقت ہجرت کا حکم فرض تھا) اور اگر وہ (اسلام سے) اعراض کریں (اور کافر ہی رہیں) تو ان کو پکڑو اور قتل کرو جس جگہ ان کو

پاؤ (یہ پکڑنا یا توقتل کے لئے ہے، یا غلام بنانے کے لئے) اور نہ ان میں کسی کو دوست بناؤ اور نہ مددگار بناؤ (مطلب یہ کہ کسی حالت میں ان سے کوئی تعلق نہ رکھو، نہ امن کی حالت میں ان سے دوستی کرو، نہ خوف کے وقت ان سے مدد لو، بلکہ الگ تھلگ رہو)۔

حَتّٰی یُهَاجِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ: یعنی جب تک وہ اللہ کی راہ میں ہجرت نہ کریں، کیونکہ اس وقت ہجرت بھی اسلام کے لئے اقرار شہادتین کی طرح لازمی تھی، اور ''تکمیل اسلام'' کی قید اس لیے ہے کہ خالی دارالاسلام میں آنا کافی نہیں، یوں تو کفار اہل تجارت بھی دارالاسلام آجاتے ہیں، بلکہ اسلامی حیثیت سے آئیں یعنی اسلام بھی ظاہر کریں، تاکہ اقرار و ہجرت کے جامع ہوجائیں، دنیا کے قانون میں اسلام کا ثبوت انہی ظاہری چیزوں سے ملتا ہے، اور رہی قلبی تصدیق تو اس کا علم صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہوسکتا ہے مسلمانوں کو اس کی تفتیش ضروری نہیں۔

* * *

فائدہ: یعنی یہ منافق لوگ تو کفر پر ایسے جمے ہوئے ہیں کہ خود تو اسلام کیا قبول کریں گے، وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ تم بھی ان کی مثل کافر ہوکر ان کے برابر ہوجاؤ، سو اب تم کو چاہیے کہ وہ جب تک ایمان قبول کر کے اپنا وطن چھوڑ کر تمہارے پاس نہ چلے آئیں اس وقت تک ان کو دوست نہ بناؤ، نہ اپنے کسی کام میں ان کو دخل دو اور نہ ان کی حمایت اور اعانت کرو اور اگر وہ لوگ ایمان اور ہجرت کو قبول نہ کریں تو ان کو قید کرو اور قتل کرو جہاں قابو پاؤ اور اجتناب کلی رکھو اور ان سے کوئی تعلق نہ رکھو۔

اِلَّا الَّذِیْنَ یَصِلُوْنَ اِلٰی قَوْمٍۭ بَیْنَكُمْ وَبَیْنَهُمْ مِّیْثَاقٌ اَوْ جَآءُوْكُمْ حَصِرَتْ صُدُوْرُهُمْ

مگر وہ لوگ جو ملاپ رکھتے ہیں ایک قوم سے کہ تم میں اور ان میں عہد ہے یا آئے ہیں تمہارے پاس کہ تنگ ہوگئے ہیں دل ان کے

اَنْ یُّقَاتِلُوْكُمْ اَوْ یُقَاتِلُوْا قَوْمَهُمْ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَسَلَّطَهُمْ عَلَیْكُمْ فَلَقٰتَلُوْكُمْ ۚ فَاِنِ

تمہاری لڑائی سے اور اپنی قوم کی لڑائی سے بھی، اور اگر اللہ چاہتا تو ان کو تم پر زور دے دیتا تو ضرور لڑتے تم سے، سو اگر

اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ یُقَاتِلُوْكُمْ وَاَلْقَوْا اِلَیْكُمُ السَّلَمَ ۙ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَیْهِمْ سَبِیْلًا ﴿۹۰﴾

یکسو رہیں وہ تم سے پھر تم سے نہ لڑیں اور پیش کریں تم پر صلح تو اللہ نے نہیں دی تم کو ان پر راہ

خلاصہ تفسیر: ابن ابی شیبہؒ نے حسنؒ سے روایت کیا کہ سراقہ بن مالک مدلجی نے واقعہ بدر و احد کے بعد رسول اللہ ﷺ کے حضور میں آکر درخواست کی کہ ہماری قوم بنی مدلج سے صلح کر لیجئے، آپ نے حضرت خالدؓ کو تکمیل صلح کے لئے وہاں بھیج دیا، مضمون صلح یہ تھا: "ہم رسول اللہ (ﷺ) کے خلاف کسی کی مدد نہ کریں گے اور قریش مسلمان ہوجائیں گے تو ہم بھی مسلمان ہوجائیں گے اور جو قومیں ہم سے متحد ہوں گی وہ بھی اس معاہدہ میں ہمارے شریک ہیں"، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

(۲ دوسرا فرقہ:) مگر (ان کفار میں) جو لوگ ایسے ہیں جو کہ (تمہارے ساتھ مصالحت سے رہنا چاہتے ہیں، جس کے دو طریقے ہیں:

۱ ایک تو یہ کہ صلح کے واسطہ سے ہو یعنی) ایسے لوگوں سے جا ملتے ہیں (یعنی ہم عہد ہوجاتے ہیں) کہ تمہارے اور ان کے درمیان عہد (صلح) ہے (جیسا کہ بنو مدلج نے مسلمانوں سے صلح کی تھی تو جتنی قومیں ان کی دوست اور ہم عہد ہوں گی وہ بھی اس استثناء میں داخل ہوگئیں اور بنو مدلج تو بدرجہ اولی مستثنیٰ ہوئے) یا (۲ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ بلا واسطہ صلح ہو اس طرح سے کہ) خود تمہارے پاس اس حال سے آئیں کہ ان کا دل تمہارے ساتھ اور نیز اپنی قوم کے ساتھ بھی لڑنے سے منقبض ہو (اس لئے نہ تو اپنی قوم کے ساتھ ہو کر تم سے لڑیں اور نہ تمہارے ساتھ ہو کر اپنی قوم سے لڑیں، بلکہ ان سے بھی صلح رکھیں اور تم سے بھی، پس دونوں طریقوں میں جس طریقہ سے کوئی مصالحت کرے وہ قتل وغیرہ کے حکم سے مستثنیٰ ہے) اور (تم اللہ کا احسان مانو کہ ان کے دل میں تمہاری ہیبت ڈال دی اور خود صلح کی درخواست کرنے آئے ورنہ) اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ان کو تم پر مسلط (اور دلیر) کر دیتا، پھر وہ تم سے لڑنے لگتے

(مگر اللہ تعالیٰ نے تم کو اس پریشانی سے بچالیا) پھر اگر (صلح کر کے) وہ تم سے کنارہ کش رہیں، یعنی تم سے نہ لڑیں اور تم سے معاملہ سلامت روی کا رکھیں (ان سب الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ صلح سے رہیں، کئی لفظ تاکید کے لئے فرما دیئے) تو (اس حالت صلح میں) اللہ تعالیٰ نے تم کو ان پر (قتل یا قید وغیرہ کی) کوئی راہ نہیں دی (یعنی اجازت نہیں دی)۔

اِلَّا الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ اِلٰى قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ: روح المعانی میں حضرت ابن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ صلح کا یہ حکم سورہ براءت کی آیت: فاذا انسلخ الاشهر الحرم سے منسوخ ہے، اس پر یہ شبہ ہوتا ہے کہ صلح والوں سے تو جنگ نہ کرنے کا حکم اب بھی باقی ہے، پھر نسخ کا کیا مطلب ہوا؟ جواب یہ ہے کہ اس وقت صلح چاہنے والوں کی درخواست منظور کرنا واجب ہوتا تھا، اب یہ وجوب منسوخ ہے، امام کو اختیار ہے کہ صلح مناسب سمجھے تو کرے ورنہ نہ کرے، اور ممکن ہے کہ اس وقت بھی صلح قبول کرنے کا اختیار ہی ہو، لیکن یہ بھی حکم ہے کہ اگر کسی وقت صلح کا باقی رکھنا مصلحت نہ ہو تو صلح کرنے والوں کو اطلاع کر دی جائے کہ ہم مصالحت توڑتے ہیں، چنانچہ سورہ براءت میں یہی صورت مذکور ہے کہ اشہر حرم کے بعد کسی سے صلح باقی نہ رہے گی تو ابن عباسؓ نے اس نقض صلح کے اعلان کو ظاہراً نسخ کہہ دیا ورنہ حقیقت میں یہ نسخ نہیں، خوب سمجھ لو۔

* * *

فائدہ: یعنی اس ظاہری ملنے جلنے سے ان کو قید اور قتل سے مت بچاؤ مگر کل دو طرح سے: ① ایک تو یہ کہ جن لوگوں سے تمہاری صلح ہے ان سے ان کا بھی معاہدہ اور مصالحت ہو تو وہ بھی صلح میں داخل ہو گئے ② دوسری طرح یہ کہ جو لوگ لڑائی سے عاجز ہو کر تم سے صلح کریں اور اس بات کا عہد کریں کہ نہ اپنی قوم کے طرفدار ہو کر تم سے لڑیں گے اور نہ تمہارے ساتھ ہو کر اپنی قوم سے لڑیں گے اور اس عہد پر قائم بھی رہیں تو ایسے لوگوں سے بھی مت لڑو اور ان کی مصالحت کو منظور کر لو اور اللہ تعالیٰ کا احسان سمجھو کہ تمہاری لڑائی سے باز آئے، اللہ چاہتا تو ان کو تم پر جری اور غالب تر کر دیتا۔

سَتَجِدُوْنَ اٰخَرِيْنَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّاْمَنُوْكُمْ وَيَاْمَنُوْا قَوْمَهُمْ ؕ كُلَّمَا رُدُّوْٓا اِلَى الْفِتْنَةِ

اب تم دیکھو گے ایک اور قوم کو جو چاہتے ہیں کہ امن میں رہیں تم سے بھی اور اپنی قوم سے بھی، جب کبھی لوٹائے جاتے ہیں وہ فساد کی طرف

اُرْكِسُوْا فِيْهَا ۚ فَاِنْ لَّمْ يَعْتَزِلُوْكُمْ وَيُلْقُوْٓا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ وَيَكُفُّوْٓا اَيْدِيَهُمْ فَخُذُوْهُمْ

تو اس کی طرف لوٹ جاتے ہیں، پھر اگر وہ تم سے یکسو نہ رہیں اور نہ پیش کریں تم پر صلح اور اپنے ہاتھ نہ روکیں تو ان کو پکڑو

وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ ؕ وَاُولٰٓئِكُمْ جَعَلْنَا لَكُمْ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿٩١﴾

اور مار ڈالو جہاں پاؤ، اور ان پر ہم نے تم کو دی ہے کھلی سند

خلاصہ تفسیر: حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ آیت ستجدون اخرین میں جن کا ذکر ہے ان سے مراد قبیلہ اسد اور غطفان ہیں، یہ لوگ مدینہ میں آ کر بظاہر اسلام کا دعویٰ کرتے اور اپنی قوم سے جا کر کہتے کہ ہم تو بندر اور بچھو پر ایمان لائے ہیں اور مسلمانوں سے آ کر کہتے کہ ہم تو تمہارے دین پر ہیں اور یہی حالت قبیلہ بنی عبدالدار کی تھی، احقر کہتا ہے کہ اس تیسرے فرقہ کی حالت پہلے فرقہ کی طرح ہے، کیونکہ دلیل سے ان کا پہلے ہی سے مسلمان نہ ہونا ثابت ہو گیا اس لیے ان کا حکم عام کفار کی طرح ہے، یعنی اگر صلح ہو جائے تو ان سے لڑائی نہ کی جائے اور صلح نہ ہو تو قتال کیا جائے۔

(③ تیسرا فرقہ:) بعضے ایسے بھی تم کو ضرور ملیں گے (یعنی ان کی یہ حالت معلوم ہو گی) کہ (مکر اور دھوکہ کی راہ سے) وہ یہ (بھی) چاہتے ہیں کہ تم سے بھی بے خطر ہو کر رہیں اور اپنی قوم سے بھی بے خطر ہو کر رہیں (تا کہ تم بھی ان کو اپنا سمجھو اور ان کی قوم بھی اپنا سمجھے، اور ساتھ ہی اس کے) جب کبھی ان کو (صریح مخالفین کی طرف سے) شرارت (وفساد) کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے (یعنی ان سے مسلمانوں کے ساتھ لڑنے کے لئے کہا جاتا ہے) تو وہ (فوراً) اس (شرارت) میں جا گرتے ہیں (یعنی مسلمانوں سے لڑنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور وہ دھوکہ کی صلح توڑ دیتے ہیں) سو یہ لوگ اگر

(صلح توڑ دیں اور) تم سے (یعنی تمہاری لڑائی سے) کنارہ کش نہ ہوں، اور نہ تم سے سلامت روی رکھیں، اور نہ اپنے ہاتھوں کو (تمہارے مقابلہ سے) روکیں (سب کا حاصل ایک ہی ہے کہ صلح توڑ دیں) تو تم (بھی) ان کو پکڑو اور قتل کرو جہاں کہیں ان کو پاؤ، اور ہم نے تم کو ان پر صاف حجت دی ہے (جس سے ان کا خون مباح ہونا ظاہر ہے اور وہ حجت ان کا عہد توڑنا ہے)۔

خلاصہ یہ کہ یہاں چار آیتوں میں تین فرقوں کا ذکر فرمایا گیا:

① جو شرطِ اسلام کے زمانہ میں باوجود قدرت کے ہجرت نہ کریں، یا ہجرت کرنے کے بعد دار الاسلام سے نکل کر دار الحرب میں چلے جائیں، ان کا حکم عام کفار کے مانند ہے یعنی ان کے ساتھ قتال کیا جائے گا۔

② مسلمانوں سے جنگ نہ کرنے کا معاہدہ خود کرلیں، یا ایسا معاہدہ کرنے والوں سے معاہدہ کرلیں، یہ فریق قتل اور پکڑ دھکڑ سے مستثنیٰ ہے۔

③ جو دفع الوقتی کی غرض سے صلح کرلیں اور جب مسلمانوں کے خلاف جنگ کی دعوت دی جائے تو اس میں شریک ہوجائیں اور اپنے عہد پر قائم نہ رہیں، یہ تیسرا فریق اسی سزا کا مستحق ہے جس کا پہلا فریق تھا، ان چار آیتوں کے کل دو حکم مذکور ہیں، یعنی عدم صلح کے وقت قتال اور مصالحت کے وقت قتال نہ کرنا۔

* * *

فائدہ: یعنی بعضے لوگ ایسے بھی ہیں کہ تم سے عہد کر جاتے ہیں کہ نہ تم سے لڑیں گے نہ اپنی قوم سے، تاکہ تم سے اور اپنی قوم دونوں سے امن میں رہیں، لیکن اس عہد پر قائم نہیں رہتے، بلکہ جب اپنی قوم کا غلبہ دیکھتے ہیں تو ان کے مددگار ہوجاتے ہیں تو ایسے لوگوں سے تم بھی درگزر مت کرو تمہارے ہاتھ تو صریح حجت آگئی کہ انہوں نے اپنا عہد خود توڑ ڈالا۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا ۚ وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَـًٔا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ

اور مسلمان کا کام نہیں کہ قتل کرے مسلمان کو مگر غلطی سے [1] اور جو قتل کرے مسلمان کو غلطی سے تو آزاد کرے گردن

مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا ؕ فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ

ایک مسلمان کی اور خون بہا پہنچائے اس کے گھر والوں کو مگر یہ کہ وہ معاف کردیں، پھر اگر مقتول تھا ایسی قوم میں سے کہ وہ تمہارے دشمن ہیں

وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ؕ وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ فَدِيَةٌ

اور خود وہ مسلمان تھا تو آزاد کرے گردن ایک مسلمان کی، اور اگر وہ تھا ایسی قوم میں سے کہ تم میں اور ان میں عہد ہے تو خون بہا

مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖ وَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ ۫

پہنچائے اس کے گھر والوں کو اور آزاد کرے گردن ایک مسلمان کی، پھر جس کو میسر نہ ہو تو روزے رکھے دو مہینے کے برابر

تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿٩٢﴾

گناہ بخشوانے کو اللہ سے، اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے [2]

خلاصہ تفسیر: گذشتہ آیات میں منافقین اور کفار کے ساتھ قتل وقتال کا ذکر چلا آرہا تھا، اب ان آیات میں مؤمنین کے قتل کی ممانعت کے ساتھ ساتھ مناسبت کی وجہ سے قتل کے دیگر احکام بھی بیان فرماتے ہیں۔

اور کسی مومن کی شان نہیں کہ وہ کسی مومن کو (ابتداءً) قتل کرے، لیکن غلطی سے (ہو جائے تو اور بات ہے) اور جو شخص کسی مومن کو غلطی سے قتل کر دے تو اس پر (شرعاً) ایک مسلمان غلام یا لونڈی کا آزاد کرنا (واجب) ہے اور خوں بہا (بھی واجب) ہے جو اس (مقتول) کے خاندان والوں کو (یعنی ان میں جو وارث ہیں ان کو میراث کے حصوں کے بقدر) حوالہ کر دی جائے (اور جس کے وارث نہ ہوں تو بیت المال ورثہ کے قائم مقام ہے) مگر یہ کہ وہ لوگ (اس خوں بہا کو) معاف کر دیں (خواہ پوری یا کچھ معاف کریں تو اتنی ہی معاف ہو جائے گی)۔

اور اگر وہ (مقتول خطا) ایسی قوم سے ہو جو تمہارے مخالف ہیں (یعنی کافر حربی ہیں اور وہ مسلمان کسی وجہ سے انہی میں رہتا تھا) اور وہ شخص خود مومن ہے تو (صرف) ایک غلام یا لونڈی مسلمان کا آزاد کرنا (پڑے گا، اس صورت میں دیت اس لئے نہیں کہ اگر اس مقتول کے ورثہ مسلمان ہیں تب تو وہ اسلامی حکومت کے ماتحت نہ ہونے کی وجہ سے مستحق نہیں، اور اگر کافر ہیں تو اس صورت میں دیت بیت المال کا حق ہوتی ہے اور دار الحرب سے دار الاسلام کے بیت المال میں ترکہ لایا نہیں جاتا)۔

اور اگر وہ (مقتول خطا) ایسی قوم سے ہو کہ تم میں اور ان میں معاہدہ (خواہ صلح کا ہو یا ذمہ کا) ہو (یعنی مقتول ذمی یا مصالح و مستامن ہو) تو خوں بہا (بھی واجب) ہے جو اس (مقتول) کے خاندان والوں کو (یعنی ان میں جو وارث ہیں) حوالہ کر دی جائے (کیونکہ کافر کا فر کا وارث ہوتا ہے اور دیت مسلمان اور ذمی کی برابر ہے) اور ایک غلام یا لونڈی مسلمان کا آزاد کرنا (پڑے گا)۔

پھر (جن صورتوں میں غلام لونڈی کا آزاد کرنا واجب ہے) جس شخص کو (غلام لونڈی) نہ ملے (اور نہ اتنے دام ہوں کہ خرید سکے) تو (اس کے ذمہ بجائے آزاد کرنے کے) متواتر (یعنی لگا تار) دو ماہ کے روزے ہیں (یہ آزاد کرنا اور وہ نہ ہو سکے تو روزے رکھنا) بطریق توبہ کے (ہے) جو اللہ کی طرف سے مقرر ہوئی ہے (یعنی اس کا یہ طریقہ مشروع ہوا ہے) اور اللہ تعالیٰ بڑے علم والے حکمت والے ہیں (اپنے علم و حکمت سے مصلحت کے مناسب احکام مقرر فرمائے ہیں، اگرچہ ہر جگہ حکمت بندہ کو معلوم نہ ہو)۔

وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَـًٔا: یعنی جو شخص کسی مؤمن کو غلطی سے قتل کر دے، غلطی خواہ گمان اور ارادہ میں ہو، مثلاً کسی مسلمان کو کافر حربی سمجھ کر قتل کر دیا، یا فعل میں غلطی ہو کہ شکار کو مارنا چاہا تھا اور آدمی کے جا لگا، یا کسی آدمی کو ارادہ سے مارا مگر دھاری دار ہتھیار سے نہیں مارا، لاٹھی وغیرہ سے مارا اور وہ جان سے مر گیا، یہ صورت بھی قتل خطا میں داخل ہے، اس کو ''شبہ عمد'' کہتے ہیں، کیونکہ لاٹھی وغیرہ سے اکثر جان سے مارنا مقصود نہیں ہوتا، تو گویا یہ قتل بھی خطا سے واقع ہو گیا اگرچہ قصداً ہی مارا ہو، قتل خطا کی سب صورتوں میں گناہ بھی ہے اور دیت بھی ہے، البتہ شبہ عمد میں گناہ زیادہ ہے، کیونکہ ارادہ سے قتل کیا ہے، اور پہلی یعنی قتل خطا کی صورت میں اس سے گناہ کم ہے، صرف بے احتیاطی کی وجہ سے گناہ ہوگا، آیت میں بیان کردہ دیت کی مقدار مرد کے لیے ہے، اگر عورت کو قتل کیا ہو تو اس کی دیت مرد سے آدھی ہے۔

جاننا چاہیے کہ کفارہ تو قاتل کے ذمہ خود واجب ہے کہ غلام آزاد کرے یا روزے رکھے، اور دیت قاتل کے اہل نصرت یعنی خاندان پر ہے جن کو شریعت کی اصطلاح میں ''عاقلہ'' کہتے ہیں، وہ چندہ کر کے ادا کریں اور چندہ میں قاتل کو بھی شریک کیا جائے گا، یہاں یہ شبہ نہ کیا جائے کہ قاتل کے جرم کا بوجھ اس کے اولیاء اور انصار پر کیوں ڈالا جاتا ہے کیونکہ وہ تو بے قصور ہیں؟ وجہ دراصل یہ ہے کہ قتل میں جیسے قاتل کی بے احتیاطی ہے اسی طرح قاتل کے اولیاء بھی قصوروار ہوتے ہیں، ان لوگوں کی بھی غفلت ہوتی ہے، کیونکہ انسان اپنے مددگاروں کے زور پر ہی ایسی بے احتیاطی کیا کرتا ہے، تو اتنی بڑی رقم تنہا قاتل کے ذمہ نہیں ڈالی گئی، خاندان والے بھی چندہ کر کے دیں تاکہ آئندہ وہ لوگ اپنے آدمیوں کی حفاظت میں کوتاہی نہ کریں۔

* * *

فائدہ: لٰہ اَنْ یَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا: اس موقع پر قتل خطا کے احکام بیان فرمائے جاتے ہیں اور یہ کہ کلمہ اسلام کہنے والے کو قتل کرنا گناہ عظیم ہے، ہاں! اگر غلطی سے مارا گیا تو مجبوری کی بات ہے اور اس کے احکام یہ ہیں اور اسی کے ذیل میں مجاہدین کی فضیلت اور دار کفر سے دار الاسلام

کی طرف ہجرت کرنے کی ضرورت اور سفر اور خوف کی نماز کی کیفیت بیان فرمائی جاتی ہے۔

فائدہ: قتل خطا یعنی مسلمان کو غلطی سے قتل کر دینے کی کئی صورتیں ہیں: مثلاً غلطی سے مسلمان کو شکار سمجھ کر مار ڈالا، یا تیر اور گولی شکار پر چلائی، چوک کر کسی مسلمان کے جا لگی، ایک صورت قتل خطا کی یہ بھی ہے کہ ایک مسلمان کافروں میں ہو اور اس کو کوئی مسلمان کافر سمجھ کر بوجہ لاعلمی قتل کر ڈالے اور یہاں اسی صورت کا بیان فرمانا مقصود ہے، مجاہدین کو یہ بات اکثر پیش آ جاتی ہے اور آیات سابقہ کے بھی مناسب ہے، گو قتل خطا کی اور صورتوں کا بھی حکم یہی ہے، وہ صورتیں بھی اس میں آ گئیں۔

فائدہ: ۲۔ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا: اس آیت میں قتل خطا کے دو حکم بتلائے گئے: ① ایک تو آزاد کرنا بردہ مسلمان کا اور اس کا مقدور نہ ہو تو دو مہینے متصل روزے رکھنا، یہ کفارہ ہے خدا تعالیٰ کی جناب میں اپنی خطا کا ② دوسرے اس مقتول کے وارثوں کو خون بہا دینا، یہ ان کا حق ہے، ان کے معاف کرنے سے معاف بھی ہو سکتا ہے اور کفارہ کسی کے معاف کرنے سے معاف نہیں ہو سکتا، اس کے متعلق تین صورتیں ہو سکتی ہیں کیونکہ جس مسلمان کو غلطی سے قتل کیا اس کے وارث مسلمان ہوں یا کافر، اگر کافر ہیں تو ان سے مصالحت ہے یا دشمنی، اول دونوں صورتوں میں مقتول کے وارثوں کو خون بہا دینا پڑے گا، تیسری صورت میں خون بہا لازم نہ ہوگا اور کفارہ سب صورتوں میں ادا کرنا ہوگا۔

فائدہ: خون بہا مذہب حنفی میں تخمیناً دو ہزار سات سو چالیس روپے ہوتے ہیں، یہ روپیہ قاتل کی برادری کو تین برس میں متفرق طور پر دینا ہوگا مقتول کے وارثوں کو۔

وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ

اور جو کوئی قتل کرے مسلمان کو جان کر تو اس کی سزا دوزخ ہے پڑا رہے گا اسی میں اور اللہ کا اس پر غضب ہوا اور اس کو لعنت کی

وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا ﴿۹۳﴾

اور اس کے واسطے تیار کیا بڑا عذاب

خلاصہ تفسیر: اور جو شخص کسی مسلمان کو قصداً قتل کر ڈالے تو اس کی (اصلی) سزا (تو) جہنم (میں اس طرح رہنا) ہے کہ ہمیشہ ہمیشہ کو اس میں رہنا (لیکن اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ یہ اصلی سزا جاری نہ ہوگی، بلکہ ایمان کی برکت سے آخر نجات ہو جائے گی) اور اس پر (ایک میعاد معین تک کے واسطے) اللہ تعالیٰ غضبناک ہوں گے اور اس کو اپنی رحمت (خاصہ) سے دور کریں گے، اور اس کے لئے بڑی سزا (یعنی دوزخ کی سزا) کا سامان کریں گے۔

فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا: تمام اہل حق متفق ہیں کہ کفر و شرک کے علاوہ کوئی امر بھی دائمی سزا کا موجب نہیں ہے، اس دعویٰ پر بے شمار آیات و احادیث دال ہیں، اس آیت کے بعض ظاہری لفظوں سے اس کے خلاف کا شبہ ہوتا تھا، لیکن اس کا صحیح مطلب خلاصہ تفسیر میں ظاہر ہونے کے بعد وہ شبہ دور ہو گیا۔

* * *

فائدہ: یعنی اگر ایک مسلمان دوسرے کو غلطی سے نہیں، بلکہ قصداً اور مسلمان معلوم کرنے کے بعد قتل کرے گا تو اس کے لئے آخرت میں جہنم اور لعنت اور عذاب عظیم ہے، کفارہ سے اس کی رہائی نہیں ہوگی، باقی رہی دنیاوی سزا وہ سورہ بقرہ میں گزر چکی۔

فائدہ: جمہور علماء کے نزدیک خلود اس کے لئے ہے جو مسلمان کے قتل کو حلال سمجھے، کیونکہ اس کے کفر میں شک نہیں، یا خلود سے مراد یہ ہے کہ مدت دراز تک جہنم میں رہے گا، یا وہ شخص مستحق تو اسی سزا کا ہے، آگے اللہ مالک ہے جو چاہے کرے، واللہ اعلم۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَتَبَيَّنُوْا وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰٓى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ

اے ایمان والو! جب سفر کرو اللہ کی راہ میں تو تحقیق کر لیا کرو اور مت کہو اس شخص کو جو تم سے سلام علیک کرے

لَسْتَ مُؤْمِنًا ۚ تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۡ فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ كَثِيْرَةٌ ۭ كَذٰلِكَ كُنْتُمْ

کہ تو مسلمان نہیں، تم چاہتے ہو اسباب دنیا کی زندگی کا، سو اللہ کے ہاں بہت غنیمتیں ہیں[1] تم بھی تو ایسے ہی تھے

مِّنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَتَبَيَّنُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ۝

اس سے پہلے پھر اللہ نے تم پر فضل کیا سو اب تحقیق کر لو[2] بیشک اللہ تمہارے کاموں سے خبردار ہے[3]

خلاصہ تفسیر: پچھلی آیات میں قتل مومن پر سخت وعید فرمائی، اب یہ فرماتے ہیں کہ احکام شرعیہ کے جاری ہونے میں مومن کے مومن ہونے کے لئے صرف ظاہری اسلام کافی ہے، جو شخص اسلام کا اظہار کرے، اس کے قتل سے ہاتھ روکنا واجب ہے اور محض شک و شبہ کی وجہ سے باطن کی تفتیش کرنا اور احکام اسلامیہ کے جاری کرنے میں اس کے یقینی ایمان کے ثبوت کا منتظر رہنا جائز نہیں، جیسا بعض صحابہ سے بعض غزوات میں اس قسم کی لغزش واقع ہوئی، اللہ تعالیٰ نے اس کا انسداد فرمایا اور چونکہ اس وقت تک صحابہ کو یہ مسئلہ واضح طور پر معلوم نہ تھا اس لیے صرف فہمائش پر اکتفا کیا اور اس فعل پر ان کے لئے کوئی وعید نازل نہیں فرمائی۔

اے ایمان والو! جب تم اللہ کی راہ میں (یعنی جہاد کے لئے) سفر کیا کرو تو ہر کام کو (خواہ قتل ہو یا کچھ اور ہو) تحقیق کر کے کیا کرو، اور ایسے شخص کو جو کہ تمہارے سامنے (علامات) اطاعت (کی) ظاہر کرے (جیسا کلمہ پڑھنا، یا مسلمانوں کے طرز پر سلام کرنا) یوں مت کہہ دیا کرو کہ تو (دل سے) مسلمان نہیں (محض اپنی جان بچانے کو جھوٹ موٹ اظہار اسلام کرتا ہے) اس طور پر کہ تم دنیوی زندگی کے سامان کی خواہش کرتے ہو، کیونکہ خدا کے پاس (یعنی ان کے علم وقدرت میں تمہارے لئے) بہت غنیمت کے مال ہیں (جو تم کو جائز طریقوں سے ملیں گے، اور یاد تو کرو کہ) پہلے (ایک زمانہ میں) تم بھی ایسے ہی تھے (کہ تمہارے اسلام کے قبول کا مدار صرف تمہارا دعویٰ و اظہار ہی تھا) پھر اللہ تعالیٰ نے تم پر احسان کیا (کہ اس ظاہری اسلام پر اکتفا کیا گیا اور باطنی جستجو پر موقوف نہ رکھا گیا) سو (ذرا) غور (تو) کرو، بیشک اللہ تمہارے اعمال کی پوری خبر رکھتے ہیں (کہ اس حکم کے بعد کون اس پر عمل کرتا ہے کون نہیں کرتا)۔

اِذَا ضَرَبْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ: اس میں سفر کی قید بھی اس وجہ سے ذکر کی گئی کہ یہ واقعات سفر ہی میں پیش آئے، یا اس وجہ سے کہ شبہات عموماً سفر میں پیش آتے ہیں، اپنے شہر میں ایک دوسرے کے حالات سے عموماً واقفیت ہوتی ہے، ورنہ اصل حکم عام ہے، سفر میں ہو یا حضر میں بغیر تحقیق کے کسی عمل پر اقدام جائز نہیں۔

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰٓى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ: اس آیت کریمہ نے یہ اہم مسئلہ معلوم ہوا کہ جو شخص اپنے آپ کو مسلمان بتلاتا ہو خواہ کلمہ پڑھ کر، یا کسی اور اسلامی شعار کا اظہار کر کے، مثلاً اذان، نماز وغیرہ میں شرکت کرے تو مسلمان پر لازم ہے کہ اس کو مسلمان سمجھیں اور اس کے ساتھ مسلمانوں کا سا معاملہ کریں، اس کا انتظار نہ کریں کہ وہ دل سے مسلمان ہوا ہے یا کسی مصلحت سے اسلام کا اظہار کیا ہے، نیز اس معاملہ میں اس کے اعمال پر بھی مدار نہ ہوگا، فرض کر لو کہ وہ نماز نہیں پڑھتا روزہ نہیں رکھتا اور ہر قسم کے گناہوں میں ملوث ہے، پھر بھی اس کو اسلام سے خارج کہنے کا یا اس کے ساتھ کافروں کا معاملہ کرنے کا کسی کو حق نہیں، اسی لئے امام اعظمؒ نے فرمایا: "لا نکفر اهل القبلة بذنب" یعنی ہم اہل قبلہ کو کسی گناہ کی وجہ سے کافر نہیں کہتے، بعض روایات حدیث میں بھی اسی قسم کے الفاظ مذکور ہیں کہ اہل قبلہ کو کافر نہ کہو، خواہ وہ کتنا ہی گنہگار یا بدعمل ہو۔

مگر یہاں ایک بات خاص طور پر سمجھنے اور یاد رکھنے کی ہے کہ قرآن وحدیث سے یہ ثابت ہے کہ جو شخص اپنے آپ کو مسلمان کہے اس کو کافر کہنا یا سمجھنا جائز نہیں، اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ جب تک اس سے کسی ایسے قول وفعل کا صدور نہ ہو جو کفر کی یقینی علامت ہے اس وقت تک اس کے اقرار اسلام کو صحیح قرار دے کر اس کو مسلمان کہا جائے گا اور اس کے ساتھ مسلمانوں کا سا معاملہ کیا جائے، اس کی قلبی کیفیات اخلاص یا نفاق سے بحث کرنے کا کسی کو حق نہ ہوگا، لیکن جو شخص اظہار اسلام اور اقرار ایمان کے ساتھ ساتھ کچھ کلمات کفر بھی بکتا ہے، یا کسی بت کو سجدہ کرتا ہے، یا اسلام کے کسی ایسے حکم کا انکار کرتا ہے جس کا اسلامی حکم ہونا قطعی اور بدیہی ہے یا کافروں کے کسی مذہبی شعار کو اختیار کرتا ہے، جیسے گلے میں زنار وغیرہ ڈالنا، وہ بلاشبہ اپنے اعمال کفریہ کے سبب کافر قرار دیا جائے گا، آیت مذکورہ میں لفظ فتبینوا سے اس کی طرف اشارہ موجود ہے، ورنہ یہود ونصاریٰ تو سب ہی اپنے آپ کو مومن مسلمان کہتے تھے اور مسیلمہ کذاب جس کو باجماع صحابہ کافر قرار دے کر قتل کیا گیا وہ تو صرف کلمہ اسلام کا اقرار ہی نہیں بلکہ اسلامی شعائر نماز اذان وغیرہ کا بھی پابند تھا، اپنی اذان میں اشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ کے ساتھ اشھد ان محمدا رسول اللّٰہ بھی کہلواتا تھا، مگر اس کے ساتھ وہ اپنے آپ کو بھی نبی اور رسول صاحب وحی کہتا تھا جو نصوص قرآن وسنت کا کھلا ہوا انکار تھا، اسی کی بناء پر اس کو مرتد قرار دیا گیا اور اس کے خلاف باجماع صحابہ جہاد کیا گیا۔

خلاصہ مسئلہ کا یہ ہوگیا کہ ہر کلمہ گو اہل قبلہ کو مسلمان سمجھو، اس کے باطن اور قلب میں کیا ہے؟ اس کی تفتیش انسان کا کام نہیں، اس کو اللہ تعالیٰ کے حوالہ کرو، البتہ اظہار ایمان کے ساتھ خلاف ایمان کوئی بات سرزد ہو تو اس کو مرتد سمجھو، بشرطیکہ اس کا خلاف ایمان ہونا قطعی اور یقینی ہو اور اس میں کوئی دوسرے احتمال یا تاویل کی راہ نہ ہو، اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ لفظ "کلمہ گو" یا "اہل قبلہ" یہ اصطلاحی الفاظ ہیں جن کا مصداق صرف وہ شخص ہے جو مدعی اسلام ہونے کے بعد کسی کافرانہ قول وفعل کا مرتکب نہ ہو۔

* * *

فائدہ: ۱۔ فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ كَثِيْرَةٌ: حضرت محمد ﷺ نے ایک فوج کو ایک قوم پر جہاد کے لئے بھیجا، اس قوم میں ایک شخص مسلمان تھا جو اپنا مال واسباب اور مویشی ان میں سے نکال کر علیحدہ کھڑا ہو گیا تھا، اس نے مسلمانوں کو دیکھ کر السلام علیکم کہا، مسلمانوں نے یہ سمجھا کہ یہ بھی کافر ہے، اپنی جان اور مال بچانے کی غرض سے اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرتا ہے اس لئے اس کو مار ڈالا اور اس کے مویشی اور اسباب سب لے لیا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور مسلمانوں کو تنبیہ اور تاکید فرمائی گئی کہ جب تم جہاد کے لئے سفر کرو تو تحقیق سے کام لو، بے سوچے سمجھے کام مت کرو، جو تمہارے سامنے اسلام ظاہر کرے اس کے مسلمان ہونے کا ہرگز انکار مت کرو، اللہ کے پاس بہت کچھ غنیمتیں ہیں ایسے حقیر سامان پر نظر نہ کرنی چاہئے۔

فائدہ: ۲۔ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَتَبَيَّنُوْا: "تم ایسے ہی تھے اس سے پہلے" یعنی اسلام سے پہلے دنیا کی غرض سے ناحق خون کیا کرتے تھے، لیکن اب مسلمان ہو کر ہرگز ایسا نہ کرنا چاہیے، بلکہ جس پر مسلمان ہونے کا احتمال بھی ہو تو اس کے قتل سے بچو۔

یا یہ مطلب ہے کہ اس سے پہلے شروع زمانۂ اسلام میں تم بھی کافروں کے شہر میں رہتے تھے، تمہاری مستقل حکومت اور مستقل بود وباش نہ تھی تو جیسا اس حالت میں تمہارا اسلام معتبر سمجھا گیا اور تمہارے جان ومال کی حفاظت ورعایت کی گئی، ایسا ہی اب تم کو بھی اس طرح کے مسلمانوں کی رعایت وحفاظت لازم ہے، بلا تحقیق ان کو قتل مت کرو، احتیاط اور غور سے کام کرنا چاہئے۔

فائدہ: ۳۔ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا: یعنی اللہ تعالیٰ تمہارے ظاہر اعمال اور دلی اغراض سب پر مطلع ہے تو اب جس کو قتل کرو محض اللہ کے حکم کے موافق قتل کرو، اپنی کسی غرض کا اصلا دخل نہ ہو اور یہ بھی مقصد ہے کہ اگر کوئی کافر فقط اپنے جان ومال کے خوف سے تمہارے روبرو اسلام ظاہر کرے اور دھوکا دے کر اپنی جان بچالے تو اللہ تعالیٰ کو سب کچھ معلوم ہے، اس کے عذاب سے نہیں بچ سکتا، مگر تم اس کو کچھ مت کہو، یہ تمہارے کرنے کی بات نہیں، ہم دیکھ لیں گے۔

لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجٰهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِأَمْوَالِهِمْ

برابر نہیں بیٹھ رہنے والے مسلمان جن کو کوئی عذر نہیں اور وہ مسلمان جو لڑنے والے ہیں اللہ کی راہ میں اپنے مال سے

وَأَنْفُسِهِمْ ۭ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً ۭ وَكُلًّا وَّعَدَ

اور جان سے، اللہ نے بڑھا دیا لڑنے والوں کا اپنے مال اور جان سے بیٹھ رہنے والوں پر درجہ، اور ہر ایک سے وعدہ کیا

اللّٰهُ الْحُسْنٰى ۭ وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ أَجْرًا عَظِيْمًا ﴿٩٥﴾ دَرَجٰتٍ مِّنْهُ وَمَغْفِرَةً

اللہ نے بھلائی کا، اور زیادہ کیا اللہ نے لڑنے والوں کو بیٹھ رہنے والوں سے اجر عظیم میں، جو کہ درجے ہیں اللہ کی طرف سے اور بخشش ہے

وَّرَحْمَةً ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿٩٦﴾ ع

اور مہربانی ہے ۱؎ اور اللہ ہے بخشنے والا مہربان ۲؎

خلاصہ تفسیر: پیچھے جہاد کی فضیلت تھی اب آئندہ آیات میں مجاہدین کے فضائل بیان کرتے ہیں کہ مبادا احتیاط میں غلو کی وجہ سے ایسا نہ کرنا کہ جہاد میں جانا ہی چھوڑ بیٹھو اور یہ خیال کرنے لگو کہ لاؤ گھر بیٹھے ہی عبادت کر لیا کریں گے، سو ارشاد فرماتے ہیں کہ:

(ثواب میں) برابر نہیں وہ مسلمان جو بلا کسی عذر کے گھر میں بیٹھے رہیں (یعنی جہاد میں نہ جائیں) اور وہ لوگ جو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور جانوں سے (یعنی مالوں کو خرچ کر کے اور جانوں کو حاضر کر کے) جہاد کریں (بلکہ) اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کا درجہ بہت زیادہ بنایا ہے جو اپنے مالوں اور جانوں سے جہاد کرتے ہیں بہ نسبت گھر میں بیٹھنے والوں کے، اور (یوں فرض عین نہ ہونے کی وجہ سے ان بیٹھنے والوں پر بھی گناہ نہیں، بلکہ ایمان اور دوسرے فرائض بجالانے کی وجہ سے) سب سے (یعنی مجاہدین سے بھی قاعدین سے بھی) اللہ تعالیٰ نے اچھے گھر کا (یعنی جنت کا آخرت میں) وعدہ کر رکھا ہے، اور (پیچھے جو اجمالاً کہا گیا ہے کہ مجاہدین کا بڑا درجہ ہے، اس کی تعیین یہ ہے کہ) اللہ تعالیٰ نے مجاہدین کو بمقابلہ گھر میں بیٹھنے والوں کے لیے بڑا اجر عظیم دیا ہے (وہ درجہ یہی اجر عظیم ہے، اب اس اجمال کی تفصیل فرماتے ہیں:) یعنی (مجاہد سے ثواب کے متعدد اعمال صادر ہوتے ہیں، چنانچہ ثواب کے) بہت سے درجے جو خدا کی طرف سے ملیں گے، اور (گناہوں کی) مغفرت اور رحمت (یہ سب اجر عظیم کی تفصیل ہوئی) اور اللہ تعالیٰ بڑے مغفرت والے بڑے رحمت والے ہیں۔

غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِ: یہاں ''بلا عذر'' کی قید اس لیے ہے کہ احادیث میں صراحت ہے کہ اگر نیک کام کا عزم ہو اور کسی عذر کی وجہ سے نہ کر سکے تو اس نیت کرنے والے کو بھی کرنے والے کے برابر ثواب ملتا ہے، اگرچہ یہ ممکن ہے کہ کیفیت میں کچھ فرق و تفاوت ہو۔

دَرَجٰتٍ مِّنْهُ وَمَغْفِرَةً وَّرَحْمَةً: یعنی (مجاہد سے ثواب کے متعدد اعمال صادر ہوتے ہیں، چنانچہ ثواب کے) بہت سے درجے جو خدا کی طرف سے ملیں گے، اور مغفرت اور رحمت، ثواب کے ان متعدد اعمال کی تفصیل سورہ براءت کی اس آیت میں مذکور ہے: ذلک بانھم لا یصیبھم ظما ولا نصب الخ، یعنی وہ اللہ کی راہ میں بھوک، پیاس اور تھکن وغیرہ برداشت کرتے ہیں تو ان کو ہر قدم پر، گھوڑے کی ہر ٹاپ پر نیکی ملتی ہے، حدیث میں ثواب کی تفصیل موجود ہے، اور مغفرت اس لیے کیونکہ جب اس سے عظیم اعمال صادر ہوئے تو گناہ بھی زیادہ معاف ہوئے، بلکہ کیا عجب ہے کہ قرض کے سوا سب معاف ہو جائیں، کیونکہ قاعدہ کلیہ ہے: ان الحسنات یذھبن السیئات کہ نیک کاموں سے گناہ دور ہو جاتے ہیں، اور رحمت کا سبب اس آیت میں ہے: ان رحمت اللہ قریب من المحسنین۔

لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِ: یہاں قاعدین یعنی بیٹھنے والوں کے ساتھ غیر اولی الضرر کی قید لگانا

اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ضعیف اور قوی انسان کے مجاہدوں میں فرق ہے، کمزور کے لیے قوی مجاہدہ سود مند نہیں، اور قوی کے لیے ضعیف مجاہدہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا، یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ کمزور انسان کو ضعیف مجاہدہ وہی فائدہ دیتا ہے جو طاقتور انسان کو قوی مجاہدہ نفع بخشتا ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ اس سے پہلے مسلمان کو نادانستگی اور چوک سے قتل کر دینے پر عتاب اور تنبیہ فرمائی تھی، اس لئے یہ احتمال تھا کہ کوئی جہاد کرنے سے رک جائے، کیونکہ مجاہدین کو ایسی صورت پیش آ ہی جاتی ہے، اس لئے مجاہدین کی فضیلت بیان فرما کر جہاد کی رغبت دلائی گئی۔

خلاصہ آیت کا یہ ہے کہ لنگڑے لنجے اندھے بیمار معذور لوگوں کو تو جہاد کرنے کا حکم نہیں، باقی سب مسلمانوں میں جہاد کرنے والوں کے بڑے درجے ہیں جو جہاد نہ کرنے والوں کے نہیں، اگرچہ جنتی وہ بھی ہیں جو جہاد نہیں کرتے، اس سے معلوم ہوگیا کہ جہاد فرض کفایہ ہے فرض عین نہیں، یعنی اگر مسلمانوں کی کافی تعداد اور ضرورت کے موافق جماعت جہاد کرتی رہے تو جہاد نہ کرنے والوں پر پھر کوئی گناہ نہیں، ورنہ سب گنہگار ہوں گے۔

فائدہ: ۲ یعنی حق تعالیٰ غفور و رحیم ہے، جہاد کرنے والوں کے بارے میں اجر و مغفرت و رحمت کے جو وعدے فرمائے ہیں وہ ضرور پورے فرمائے گا، یا یہ کہ مجاہد کے ہاتھ سے نادانستگی میں اگر کوئی مسلمان قتل ہوگیا تو حق تعالیٰ معاف فرما دے گا، اس اندیشہ سے جہاد سے مت رکو۔

إِنَّ الَّذِينَ تَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ ظَالِمِي أَنفُسِهِمْ قَالُوا فِيمَ كُنتُمْ ۖ

بے شک وہ لوگ کہ جن کی جان نکالتے ہیں فرشتے اس حالت میں کہ وہ برا کر رہے ہیں اپنا کہتے ہیں ان سے فرشتے تم کس حال میں تھے

قَالُوا كُنَّا مُسْتَضْعَفِينَ فِي الْأَرْضِ ۚ قَالُوا أَلَمْ تَكُنْ أَرْضُ اللَّهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوا فِيهَا ۚ

وہ کہتے ہیں ہم تھے بے بس اس ملک میں، کہتے ہیں فرشتے کیا نہ تھی زمین اللہ کی کشادہ جو چلے جاتے وطن چھوڑ کر وہاں

فَأُولَٰئِكَ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ ۖ وَسَاءَتْ مَصِيرًا ﴿٩٧﴾ إِلَّا الْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ

سو ایسوں کا ٹھکانا ہے دوزخ، اور وہ بہت بری جگہ پہنچے، مگر جو ہیں بے بس مردوں اور عورتوں

وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيعُونَ حِيلَةً وَلَا يَهْتَدُونَ سَبِيلًا ﴿٩٨﴾ فَأُولَٰئِكَ عَسَى اللَّهُ

اور بچوں میں سے جو نہیں کر سکتے کوئی تدبیر اور نہ جانتے ہیں کہیں کا راستہ، سو ایسوں کو امید ہے کہ اللہ

أَن يَعْفُوَ عَنْهُمْ ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَفُوًّا غَفُورًا ﴿٩٩﴾

معاف کرے اور اللہ ہے معاف کرنے والا بخشنے والا

خلاصہ تفسیر: پیچھے جہاد کے واجب ہونے کا حکم تھا، اب ہجرت کا وجوب بیان کرتے ہیں، مناسبت دونوں میں ظاہر ہے، کیونکہ دونوں سے مقصود کفار کے شر کو دفع کرنا ہے، جہاد میں عام مسلمانوں سے، اور ہجرت میں خاص اپنی ذات سے کفار کے شر کو دفع کیا جاتا ہے۔

بیشک جب ایسے لوگوں کی جان فرشتے قبض کرتے ہیں جنہوں نے (ہجرت پر قدرت کے باوجود پھر بھی ہجرت کے تارک ہو کر) اپنے کو گناہ گار کر رکھا تھا تو (اس وقت) وہ (فرشتے) ان سے کہتے ہیں کہ تم (دین کے) کس (کس) کام میں تھے (یعنی دین کے کیا کیا ضروری احکام بجالاتے تھے) وہ (جواب میں) کہتے ہیں کہ ہم (اپنی رہن سہن کی) سرزمین میں محض مغلوب تھے (اس لیے بہت سی ضروریات دین پر عمل نہ کر سکتے تھے، یعنی ان فرائض کے ترک میں معذور تھے) وہ (فرشتے) کہتے ہیں (اگر اس جگہ نہ کر سکتے تھے تو) کیا اللہ تعالیٰ کی زمین وسیع نہ تھی تم کو ترک وطن کر کے اس (سے کسی دوسرے حصہ) میں چلا جانا چاہیے تھا (اور وہاں جا کر فرائض کو ادا کر سکتے تھے، اس سے وہ لاجواب ہو جائیں گے اور ان کا جرم ثابت ہو جائے گا)

سوان لوگوں کا ٹھکانا جہنم ہے اور جانے کیلئے وہ بری جگہ ہے، لیکن جو مرد اور عورتیں اور بچے (واقع میں ہجرت پر بھی) قادر نہ ہوں کہ نہ کوئی تدبیر کر سکتے ہیں ، نہ راستہ سے واقف ہیں، سو ان کے لئے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ معاف کر دیں، اور اللہ تعالیٰ بڑے معاف کرنے والے بڑے مغفرت کرنے والے ہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ: جاننا چاہیے کہ روح قبض کرنا کسی جگہ حق تعالیٰ کی طرف منسوب کیا گیا ہے جیسے: اللہ یتوفی الانفس حین موتھا ، بعض جگہ ملک الموت کی طرف منسوب کیا گیا ہے جیسے: قل یتوفّٰکم ملک الموت ، یہاں آیت میں روح قبض کرنے کو فرشتوں کی طرف منسوب فرمایا، سو تطبیق اس طرح ہے کہ حقیقت میں تو اللہ تعالیٰ ہی جان قبض کرتے ہیں ، البتہ ظاہر میں ملک الموت اس کام پر مقرر ہے ، اور دوسرے فرشتے ان کے معین و مددگار ہیں۔

فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ : ابتداء اسلام میں ہجرت کا فرض ہونا گزر چکا ہے اور یہ دھمکی اور عذاب اسی فرض کے چھوڑنے کی وجہ سے ہے۔

اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ : یہاں شبہ ہوتا ہے کہ جب یہ مستثنٰی لوگ یعنی کمزور بے بس مرد، عورتیں اور بچے گناہ گار ہی نہیں تو پھر "معافی" کے کیا معنی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ہجرت نہ کرنا فی نفسہ تو فعل قبیح اور گناہ ہی ہے اگر چہ کسی خاص شخص کے حق میں عذر کی وجہ سے گناہ نہ لکھا جائے، تو اس گناہ نہ لکھنے کو کسی جگہ گناہ نہ ہونا قرار دے دیا، اور کہیں معافی کے لفظ سے فی نفسہ اس کا گناہ ہونا بتلا دیا، اس تقریر سے وہ شبہ بھی دور ہو گیا کہ بچوں کو تو گناہ نہیں ہوتا ان کی معافی کیسی؟ اور پھر بچوں کا یہاں کیوں ذکر کیا؟ اس کا بھی یہی جواب ہے کہ گناہ تو ان کو نہیں ہوتا لیکن یہ عمل اپنی ذات کی حد میں قبیح ہی ہے مطلب یہ کہ صورت گناہ کی ہے، بعض مفسرین نے کہا ہے کہ بچوں کو شامل کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اس بات کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ بچوں کی طرح عاجز ہوں تب معذور شمار ہوں گے، ورنہ بچوں کے ذکر کی ضرورت بظاہر نہ تھی، کیونکہ وہ تو گناہ گار نہیں ہو سکتے ، نیز یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ہجرت چھوڑنا چونکہ بڑا گناہ تھا اس لیے باوجود عذر ہونے اور گناہ نہ ہونے کے بھی معافی کے عنوان سے تعبیر کیا کہ گویا گناہ ہوا اور معاف ہو گیا۔

عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّعْفُوَ عَنْهُمْ : شبہ ہوتا ہے کہ معافی میں امید کیسی؟ اس سے تو تردد ظاہر ہوتا ہے؟ جواب یہ ہے کہ کریم کا امید دلانا بھی درحقیقت یقینی وعدہ ہی ہے، شاہی محاوروں میں "امیدوار باشید" ہزاروں قسموں سے بڑھ کر ہوتا ہے۔

❊ ❊ ❊

فائدہ: بعضے مسلمان ایسے بھی ہیں کہ دل سے تو سچے مسلمان ہیں، مگر کافروں کی حکومت میں ہیں اور ان سے مغلوب ہیں اور کافروں کے خوف سے اسلامی باتوں کو کھل کر نہیں کر سکتے ، نہ حکم جہاد کی تعمیل کر سکتے ہیں، سو ان پر فرض ہے کہ وہاں سے ہجرت کریں، اس رکوع میں اسی کا ذکر ہے۔

آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ جو لوگ اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں، یعنی کافروں کے ساتھ مل رہے ہیں اور ہجرت نہیں کرتے تو فرشتے ان سے مرنے کے وقت پوچھتے ہیں کہ تم کس دین پر تھے؟ وہ کہتے ہیں کہ ہم تو مسلمان تھے، مگر بوجہ ضعف و کمزوری کے دین کی باتیں نہ کر سکتے تھے، فرشتے کہتے ہیں کہ اللہ کی زمین تو بہت وسیع تھی، تم یہ تو کر سکتے تھے کہ وہاں سے ہجرت کر جاتے ، سو ایسوں کا ٹھکانہ جہنم ہے، البتہ جو لوگ ضعیف ہیں اور عورتیں اور بچے کہ نہ وہ ہجرت کی تدبیر کر سکتے ہیں، نہ ان کو کوئی ہجرت کا راستہ معلوم ہے وہ قابل معافی ہیں۔

فائدہ: اس سے معلوم ہو گیا کہ مسلمان جس ملک میں کھلا نہ رہ سکے وہاں سے ہجرت فرض ہے اور سوائے ان لوگوں کے جو بالکل معذور اور بے بس ہوں اور کسی کو وہاں پڑے رہنے کی اجازت نہیں۔

وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً ۭ وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا

اور جو کوئی وطن چھوڑے اللہ کی راہ میں پائے گا اس کے مقابلہ میں جگہ بہت اور کشایش ، اور جو کوئی نکلے اپنے گھر سے ہجرت کر کے

اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَي اللّٰهِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِـيْمًا ۝ ع

اللہ اور رسول کی طرف پھر آ پکڑے اس کو موت تو مقرر ہو چکا اس کا ثواب اللہ کے ہاں، اور ہے اللہ بخشنے والا مہربان

خلاصہ تفسیر: پیچھے ترک ہجرت پر وعید تھی، اب ہجرت کی ترغیب اور اس پر سعادت دارین کا وعدہ بیان فرماتے ہیں:

اور (جن لوگوں کے لئے ہجرت مشروع ہے ان میں سے) جو شخص اللہ تعالیٰ کی راہ میں (یعنی دین کے لئے) ہجرت کرے گا تو اس کو روئے زمین پر جانے کی بہت جگہ ملے گی، اور (اظہار دین کی) بہت گنجائش (ملے گی، پس اگر ایسی جگہ پہنچ گیا تو دنیا میں بھی اس سفر اور اظہار سے کامیابی ظاہر ہے) اور (اگر اتفاق سے دنیا میں یہ کامیابی نہ ہوئی تب بھی آخرت کی کامیابی میں تو کوئی تردد نہیں، کیونکہ ہمارا قانون ہے کہ) جو شخص اپنے گھر سے اس نیت سے نکل کھڑا ہو کہ اللہ و رسول (کے دین کو ظاہر کر سکنے کے موقع) کی طرف ہجرت کروں گا، پھر (مقصد کے حاصل کرنے سے پہلے) اس کو موت آ پکڑے، تب بھی اس کا ثواب (جس کا وعدہ ہجرت کرنے پر ہے) ثابت ہو گیا (جو وعدہ کی وجہ سے ایسا ہے جیسے) اللہ کے ذمہ (اگرچہ ابھی اس سفر کو ہجرت نہیں کہہ سکتے، لیکن صرف اچھی نیت سے اس کے شروع کرنے پر پورا صلہ عطا ہو گیا) اور اللہ تعالیٰ بڑے مغفرت کرنے والے ہیں (اس ہجرت کی برکت سے اگرچہ وہ ناتمام ہی رہے بہت سے گناہ معاف فرما دیں گے، جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ ہجرت سے سابقہ گناہ معاف ہو جاتے ہیں، اور) بڑے رحمت والے ہیں (کہ عمل کو اچھی نیت سے شروع کرنے سے ہی عمل کے پورا ہونے کے برابر ثواب عنایت فرماتے ہیں)۔

* * *

فائدہ: اس آیت میں ہجرت کی ترغیب ہے اور مہاجرین کو تسلی دی جاتی ہے، یعنی جو شخص اللہ کے واسطے ہجرت کرے گا اور اپنا وطن چھوڑے گا تو اس کو رہنے کے لئے بہت جگہ ملے گی اور اس کی روزی اور معیشت میں فراخی ہوگی تو ہجرت کرنے میں اس سے مت ڈرو کہ کہاں رہیں گے اور کیا کھائیں گے اور یہ بھی خطرہ نہ کرو کہ شاید راستہ میں موت آ جائے تو ادھر کے ہوں نہ ادھر کے، کیونکہ اس صورت میں بھی ہجرت کا پورا ثواب ملے گا اور موت تو اپنے وقت ہی پر آنی ہے، وقت مقرر سے پہلے نہیں آ سکتی۔

وَإِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَقْصُرُوا مِنَ الصَّلٰوةِ ۖ إِنْ خِفْتُمْ

اور جب تم سفر کرو ملک میں تو تم پر گناہ نہیں کہ کچھ کم کرو نماز میں سے، اگر تم کو ڈر ہو

أَنْ يَفْتِنَكُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا ۚ إِنَّ الْكٰفِرِينَ كَانُوا لَكُمْ عَدُوًّا مُّبِينًا ﴿١٠١﴾

کہ ستائیں گے تم کو کافر، البتہ کافر تمہارے صریح دشمن ہیں

خلاصہ تفسیر: پیچھے جہاد اور ہجرت کا ذکر تھا، چونکہ غالب احوال میں جہاد اور ہجرت کیلئے سفر کرنا پڑتا ہے، ایسے سفر میں مخالف کی طرف سے اندیشہ بھی اکثر ہوتا ہے اس لئے سفر اور خوف کی رعایت سے جو نماز میں بعض خاص سہولتیں اور تخفیف کی گئی، آگے ان کا ذکر فرماتے ہیں:

اور جب تم زمین میں سفر کرو (جس کی مقدار تین منزل یعنی ۴۸ میل ہو) سو تم کو اس میں کوئی گناہ نہ ہوگا (بلکہ ضروری ہے) کہ تم (ظہر اور عصر اور عشاء کے فرض) نماز (کی رکعات) کو کم کر دو (یعنی چار کی جگہ دو پڑھا کرو) اگر تم کو یہ اندیشہ ہو کہ تم کو کافر لوگ پریشان کریں گے (اور اس اندیشہ کی وجہ سے ایک جگہ زیادہ دیر تک ٹھہرنا خلاف مصلحت سمجھا جائے، کیونکہ) بلاشبہ کافر لوگ تمہارے صریح دشمن ہیں۔

فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَقْصُرُوا مِنَ الصَّلٰوةِ: قصر کے معنی یہ ہیں کہ چار رکعت والی فرض نماز کو دو رکعت پڑھنا، پس مغرب، فجر اور تمام سنتوں اور وتر میں قصر نہیں ہوتا، سفر کی حالت میں قصر واجب ہے، جو سفر تین منزل یعنی ۴۸ میل سے کم ہو اس سفر میں نماز پوری پڑھی جاتی ہے، آیت مجمل ہے، حدیث سے اس کی تفسیر ہو گئی ہے، یہاں جو اس طرح فرمایا گیا کہ "تم کو گناہ نہ ہوگا" جس سے شبہ ہوتا ہے کہ سفر میں قصر نہ کرنا بھی جائز ہے، اس کہنے کی وجہ یہ ہے کہ پوری نماز کی جگہ آدھی نماز پڑھنے سے بظاہر گناہ کا وسوسہ ہو سکتا تھا اس لیے گناہ کی نفی فرما دی، سو یہ نماز قصر کے واجب ہونے کے منافی نہیں جو کہ دوسری دلیل سے ثابت ہے۔

جو سفر تین منزل (۴۸ میل) سے کم ہو اس سفر میں نماز پوری پڑھی جاتی ہے، اور جب سفر ختم کر کے منزل پر جا پہنچے تو اگر وہاں پندرہ روز سے کم

ٹھہرنے کا ارادہ ہو تب تو وہ حکم سفر میں ہے، چار رکعت والی فرض نماز آدھی پڑھی جائے گی، اس کو "قصر" کہتے ہیں اور اگر پندرہ روز یا زیادہ کا رہنے کا ایک ہی بستی میں ارادہ ہو، تو وہ وطن اقامت ہو جائے گا، وہاں بھی وطن اصلی کی طرح قصر نہیں ہوگا، بلکہ نماز پوری پڑھی جائے گی۔

اِنْ خِفْتُمْ اَنْ یَّفْتِنَكُمُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا: سفر میں خوف نہ ہو تو بھی قصر نماز پڑھی جائے گی، بعض لوگوں کو پوری نماز کی جگہ قصر پڑھنے میں دل میں گناہ کا وسوسہ پیدا ہوتا ہے یہ صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ قصر بھی شریعت کا حکم ہے، جس کی تعمیل پر گناہ نہیں بلکہ ثواب ملتا ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی جب تم جہاد وغیرہ کے لئے سفر کرو اور کافروں سے جو کہ تمہارے صریح دشمن ہیں اس کا خوف ہو کہ وہ موقع پا کر ستائیں گے تو نماز کو مختصر رکھو یعنی جو نماز حضر میں چار رکعت کی ہو اس کی دو رکعت پڑھو۔

فائدہ: ہمارے یہاں سفر تین منزل (۴۸ میل) کا ہونا ضروری ہے، اس سے کم ہوگا تو قصر جائز نہ ہوگا اور کافروں کے ستانے کا ڈر اس وقت موجود تھا جب یہ حکم نازل ہوا، جب یہ ڈر جاتا رہا تو اس کے بعد بھی آپ ﷺ سفر میں دو رکعت ہی پڑھتے رہے اور صحابہ کو بھی اسی کی تاکید فرمائی، اب ہمیشہ سفر میں قصر کرنے کا حکم ہے خوف مذکور ہو یا نہ ہو اور یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے، شکریہ کے ساتھ قبول کرنا لازم ہے جیسا کہ حدیث میں ارشاد ہے۔

وَاِذَا كُنْتَ فِیْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ وَلْیَاْخُذُوْٓا

اور جب تو ان میں موجود ہو پھر نماز میں کھڑا کرے تو چاہیے ایک جماعت ان کی کھڑی ہو تیرے ساتھ اور ساتھ لے لیں

اَسْلِحَتَهُمْ ۟ فَاِذَا سَجَدُوْا فَلْیَكُوْنُوْا مِنْ وَّرَآئِكُمْ ۪ وَلْتَاْتِ طَآئِفَةٌ اُخْرٰى لَمْ یُصَلُّوْا

اپنے ہتھیار، پھر جب یہ سجدہ کریں تو ہٹ جاویں تیرے پاس سے، اور آئے دوسری جماعت جس نے نماز نہیں پڑھی

فَلْیُصَلُّوْا مَعَكَ وَلْیَاْخُذُوْا حِذْرَهُمْ وَاَسْلِحَتَهُمْ ۚ وَدَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَوْ تَغْفُلُوْنَ

وہ نماز پڑھیں تیرے ساتھ اور ساتھ لیں اپنا بچاؤ اور ہتھیار، کافر چاہتے ہیں کسی طرح تم بے خبر ہو

عَنْ اَسْلِحَتِكُمْ وَاَمْتِعَتِكُمْ فَیَمِیْلُوْنَ عَلَیْكُمْ مَّیْلَةً وَّاحِدَةً ؕ وَلَا جُنَاحَ عَلَیْكُمْ

اپنے ہتھیاروں سے اور اسباب سے تاکہ تم پر حملہ کریں یکبارگی۱ اور تم پر کچھ گناہ نہیں

اِنْ كَانَ بِكُمْ اَذًى مِّنْ مَّطَرٍ اَوْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَنْ تَضَعُوْٓا اَسْلِحَتَكُمْ ۚ وَخُذُوْا حِذْرَكُمْ ؕ

اگر تم کو تکلیف ہو مینہ سے یا تم بیمار ہو کہ اتار رکھو اپنے ہتھیار، اور ساتھ لے لو اپنا بچاؤ ۲

اِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْكٰفِرِیْنَ عَذَابًا مُّهِیْنًا ﴿۱۰۲﴾

بیشک اللہ نے تیار کر رکھا ہے کافروں کے واسطے عذاب ذلت کا ۳

خلاصہ تفسیر: (اب نماز خوف کا بیان ہے:) اور جب آپ ان میں تشریف رکھتے ہوں (اور اسی طرح آپ کے بعد جو امام ہو) پھر آپ ان کو نماز پڑھانا چاہیں (اور اندیشہ ہو کہ اگر سب نماز میں لگ جائیں گے تو کوئی دشمن موقع پا کر حملہ کر بیٹھے گا) تو (ایسی حالت میں) یوں چاہیے کہ (جماعت کے دو حصے کر لیے جائیں، پھر) ان میں سے ایک گروہ تو آپ کے ساتھ (نماز میں) کھڑے ہو جائیں (اور دوسرا گروہ نگہبانی کے لئے دشمن کے مقابل کھڑا رہے تاکہ دشمن کو دیکھتا رہے) اور وہ لوگ (جو آپ کے ساتھ نماز میں شامل ہیں وہ بھی مختصر) ہتھیار لے لیں (یعنی نماز سے پہلے

لے کر ہمراہ رکھیں، شاید مقابلہ کی ضرورت پڑ جائے تو ہتھیار لینے میں دیر نہ لگے، فوراً قتال کرنے لگیں، اگرچہ قتال سے نماز ٹوٹ جائے گی، لیکن گناہ نہیں) پھر جب یہ لوگ (آپ کے ساتھ) سجدہ کر چکیں (یعنی ایک رکعت پوری کر لیں) تو یہ لوگ (نگہبانی کے لئے) تمہارے پیچھے ہو جائیں (یعنی رسول اللہ ﷺ اور اُس دوسرے گروہ کے جواب آ کر نماز میں شامل ہوں گے، یہ پہلا گروہ ان سب کے پیچھے ہو جائے) اور دوسرا گروہ جنہوں نے ابھی نماز نہیں پڑھی (یعنی شروع بھی نہیں کی، وہ اس پہلے گروہ کی جگہ امام کے قریب) آجائے اور آپ کے ساتھ نماز (کی ایک رکعت جو باقی رہی ہے اس کو) پڑھ لیں اور یہ لوگ بھی اپنے بچاؤ کا سامان اور اپنے ہتھیار لے لیں۔

(سامان اور ہتھیار ہمراہ لینے کا اس لئے سب کو حکم کیا ہے کہ) کافر لوگ یوں چاہتے ہیں کہ اگر تم اپنے ہتھیاروں اور سامانوں سے (ذرا) غافل ہو جاؤ تو تم پر ایک بارگی حملہ کر بیٹھیں (سو ایسی حالت میں احتیاط ضروری ہے) اور اگر تم کو بارش (وغیرہ) کی وجہ سے (ہتھیار لے کر چلنے میں) تکلیف ہو یا تم بیمار ہو (اور اس وجہ سے ہتھیار باندھ نہیں سکتے) تو تم کو اس میں (بھی) کچھ گناہ نہیں کہ ہتھیار اتار رکھو اور (پھر بھی) اپنا بچاؤ (ضرور) لے لو (اور یہ خیال نہ کرو کہ کفار کی دشمنی کا صرف دنیا ہی میں علاج کیا گیا ہے، بلکہ آخرت میں اس سے بڑھ کر ان کا علاج ہوگا، کیونکہ) بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے کافروں کے لئے سزائے اہانت آمیز مہیا کر رکھی ہے۔

: وَإِذَا كُنتَ فِيهِمْ فَأَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلَوٰةَ: یعنی جب آپ ﷺ ان میں تشریف رکھتے ہوں، اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ اب صلوۃ خوف کا حکم باقی نہیں رہا، کیونکہ آپ ﷺ کی ذات بابرکات اب ہم میں موجود نہیں، اس لئے یہ شرط اس وقت کے اعتبار سے بیان کی گئی ہے، کیونکہ نبی کے ہوتے ہوئے کوئی دوسرا آدمی بلا عذر کے امام نہیں بن سکتا، عجب نہیں کہ حضور ﷺ کے تشریف فرما ہونے کی قید میں اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ جب امام ایسا ہو کہ جس کے پیچھے نماز پڑھنا سب کو محبوب ہو جیسا کہ حضور ﷺ کی شان تھی، ورنہ دونوں جماعتیں دو اماموں کے پیچھے الگ الگ پوری نماز پڑھ لیں، حاصل یہ کہ آپ ﷺ کے بعد اب جو امام ہو وہی آپ کے قائم مقام ہے اور وہی صلوۃ خوف پڑھائے گا، تمام ائمہ کے نزدیک صلوۃ خوف کا حکم آپ ﷺ کے بعد بھی جاری ہے منسوخ نہیں ہوا۔

آیت میں دونوں گروہ کے ایک ایک رکعت پڑھنے کا تو ذکر فرمایا، دوسری رکعت کا طریقہ حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جب دو رکعت پر سلام پھیر دیا تو دونوں گروہ نے اپنی ایک ایک رکعت بطور خود پڑھ لی، مزید تفصیل احادیث میں ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ فَيَمِيلُونَ عَلَيْكُم مَّيْلَةً وَاحِدَةً: پہلے نماز سفر کا بیان تھا، یہ نماز خوف کا بیان ہے، یعنی کافروں کی فوج مقابلہ میں ہو تو مسلمانوں کی فوج دو حصے ہو جائے، ایک حصہ امام کے ساتھ آدھی نماز پڑھ کر دشمن کے مقابلہ میں جا کر کھڑا ہو جائے، دوسرا حصہ آ کر امام کے ساتھ نصف باقی پڑھ لے، امام کے سلام کے بعد دونوں جماعتیں اپنی آدھی نماز رہی ہوئی جدا جدا پڑھ لیں، اگر مغرب کی نماز ہو تو اول جماعت دو رکعت اور دوسری جماعت ایک رکعت امام کے ساتھ پڑھے اور اس حالت میں نماز کے اندر آمد و رفت معاف ہے اور تلوار زرہ سپر وغیرہ کے اپنے ساتھ رکھنے کا بھی ارشاد فرمایا تاکہ کفار موقع پا کر یک بارگی حملہ نہ کر دیں۔

فائدہ: ۲ وَخُذُوا حِذْرَكُمْ: یعنی اگر بارش یا بیماری اور ضعف کی وجہ سے ہتھیار کا اٹھانا مشکل ہو تو ایسی حالت میں ہتھیار اتار کر رکھ دینے کی اجازت ہے، لیکن اپنا بچاؤ کر لینا چاہیے، مثلاً زرہ سپر خود ساتھ لے لو۔

فائدہ: اگر دشمنوں کے خوف سے اتنی مہلت بھی نہ ملے کہ نماز خوف بصورت مذکورہ ادا کر سکیں تو جماعت موقوف کر کے تنہا تنہا نماز پڑھ لیں، پیادہ ہو کر اور سواری سے اترنے کا بھی موقع نہ ملے تو سواری پر اشارہ سے نماز پڑھ لیں، اگر اسکی مہلت نہ ملے تو پھر نماز کو قضا کر دیں۔

فائدہ: ۳ إِنَّ اللَّهَ أَعَدَّ لِلْكَٰفِرِينَ عَذَابًا مُّهِينًا: یعنی اللہ تعالیٰ کے حکم کے موافق تدبیر اور احتیاط اور اہتمام کے ساتھ کام کرو اور اللہ کے فضل سے امید رکھو وہ کافروں کو تمہارے ہاتھ سے ذلیل و خوار کرا دے گا، کافروں سے خوف مت کرو۔

فَاِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِكُمْ ۚ فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ

پھر جب تم نماز پڑھ چکو تو یاد کرو اللہ کو کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے ؀ پھر جب خوف جاتا رہے

فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ۚ اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا ﴿۱۰۳﴾

تو درست کرو نماز کو، بیشک نماز مسلمانوں پر فرض ہے اپنے مقرر وقتوں میں ؀

خلاصہ تفسیر: پھر جب تم نماز (خوف) کو ادا کر چکو تو (بدستور) اللہ تعالیٰ کی یاد میں لگ جاؤ کھڑے بھی اور بیٹھے بھی اور لیٹے بھی (یعنی ہر حالت میں، حتیٰ کہ عین لڑائی کے وقت بھی اللہ کا ذکر جاری رکھو، دل سے بھی اور شریعت کے احکام کی اتباع سے بھی کہ وہ بھی ذکر میں داخل ہے، لڑائی میں خلاف شرع کوئی کارروائی کرنے سے پرہیز کرو، غرض نماز تو ختم ہوئی، ذکر ختم نہیں ہوتا، سفر یا خوف کی وجہ سے نماز میں تو تخفیف ہوگئی تھی، لیکن ذکر اپنی حالت پر بے حساب ضروری ہے) پھر جب تم مطمئن ہو جاؤ (یعنی سفر ختم کر کے مقیم ہو جاؤ یا خوف زائل ہونے کے بعد مامون ہو جاؤ) تو نماز کو (اصلی) قاعدہ کے موافق پڑھنے لگو (یعنی اب قصر کرنا اور نماز میں چلنا پھرنا چھوڑ دو، کیونکہ یہ باتیں ایک عارض کی وجہ سے جائز کی گئی تھیں) یقیناً نماز مسلمانوں پر فرض ہے اور وقت کے ساتھ محدود ہے (پس فرض ہونے کی وجہ سے اس کا ادا کرنا ضروری اور وقت مقرر ہونے کی وجہ سے وقت ہی میں ادا کرنا ضروری ہوا، اس لئے کچھ کچھ اس کی شکل وصورت میں آسانی کے لیے تبدیلی کردی گئی، ورنہ نماز کی صورت مقصودہ وہی اصلی صورت ہے، پس سبب کے ختم ہونے کے بعد نماز کی اصلی صورت کی حفاظت لازم ہوگی)۔

* * *

فائدہ: ؀ یعنی خوف کے وقت بوجہ تنگی اور بے اطمینانی اگر نماز میں کسی طرح کی کوتاہی ہوگئی تو نماز خوف سے فراغت کے بعد ہر وقت اور ہر حالت میں کھڑے ہو یا بیٹھے یا لیٹے اللہ کو یاد کرو، حتیٰ کہ عین ہجوم اور مقاتلہ کے وقت بھی، کیونکہ وقت کی تعیین اور دیگر قیود کی پابندی تو بحالت نماز تھی جن کی وجہ سے تنگی اور بے اطمینانی پیش آنے کا موقع ہے، اس کے سوا ہر حالت میں بلا دقت اللہ کو یاد کر سکتے ہو، کسی حالت میں اس کی یاد سے غافل نہ رہو، عبداللہ بن عباس ؓ نے اس آیت کے ذیل میں فرمایا کہ: ''صرف وہ شخص کہ جس کے عقل وحواس کسی وجہ سے مغلوب ہو جائیں البتہ معذور ہے، ورنہ کوئی شخص اللہ کی یاد نہ کرنے میں معذور نہیں''۔

فائدہ: ؀ یعنی جب خوف مذکور جاتا رہے اور خاطر جمع ہو جائے تو پھر جو نماز پڑھو اطمینان اور تعدیل ارکان اور رعایت شروط اور محافظت آداب کے ساتھ پڑھو جیسا کہ امن کی حالت میں پڑھنی چاہیے اور جن حرکات زائدہ کی اجازت دی گئی وہ حالت خوف کے ساتھ مخصوص ہیں، بیشک نماز فرض ہے وقت معین میں، سفر، حضر، اطمینان، خوف ہر حالت میں اسی وقت میں ادا کرنا ضروری ہے، یہ نہیں کہ جب چاہو پڑھ لو، یا یہ مطلب ہے کہ نماز کے متعلق حق تعالیٰ نے پورا ضبط اور تعین فرمادیا ہے کہ حضر میں کیا ہونا چاہیے اور سفر میں کیا، اطمینان میں کیا کرنا چاہیے اور خوف میں کیا، سو ہر حالت میں اس کی پابندی چاہیے۔

وَلَا تَهِنُوْا فِي ابْتِغَآءِ الْقَوْمِ ۭ اِنْ تَكُوْنُوْا تَاْلَمُوْنَ فَاِنَّھُمْ يَاْلَمُوْنَ كَمَا تَاْلَمُوْنَ ۚ

اور ہمت نہ ہارو ان کا پیچھا کرنے سے، اگر تم بے آرام ہوتے ہو تو وہ بھی بے آرام ہوتے ہیں جس طرح تم ہوتے ہو

وَتَرْجُوْنَ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا يَرْجُوْنَ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۰۴﴾ ع ۱۵

اور تم کو اللہ سے امید ہے جو ان کو نہیں، اور اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے

خلاصہ تفسیر: پیچھے اصل مقصود جہاد کا بیان تھا، درمیان میں دوسرے مضامین اسی مناسبت سے ذکر ہوئے، آگے پھر جہاد ہی کے متعلق ارشاد ہے کہ جہاد میں سستی ناجائز ہے، روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت کا نزول غزوہ حمراء الاسد میں ہوا تھا جس کا قصہ سورہ آل عمران میں آ چکا ہے۔

اور ہمت مت ہارو اس مخالف قوم کے تعاقب کرنے میں (جبکہ اس کی ضرورت ہے) اگر تم (زخموں سے) تکلیف میں مبتلا ہو تو (کیا ہوا) وہ بھی تو درد میں مبتلا ہیں جیسے تم درد میں مبتلا ہو (تو وہ تم سے زیادہ قوت نہیں رکھتے، پھر کاہے کو ڈرتے ہو) اور (تم میں ایک بات ان سے زیادہ یہ ہے کہ) تم اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسی چیزوں کی امید رکھتے ہو کہ وہ لوگ (ان کی) امید نہیں رکھتے (یعنی ثواب وغیرہ، تو دل کی قوت میں تم ان سے زیادہ ہوئے اور ضعف بدن میں دونوں برابر ہو، پس تم کو زیادہ مستعد اور چست رہنا چاہئے) اللہ تعالیٰ بڑے علم والے ہیں (ان کو کفار کا کمزور دل اور کمزور بدن کا حال معلوم ہے) بڑے حکمت والے ہیں (تمہاری قوت برداشت سے زیادہ حکم نہیں فرمایا)۔

* * *

فائدہ: یعنی کفار کی جستجو اور ان کے تعاقب میں ہمت سے کام لو اور کوتاہی نہ کرو، اگر تم کو ان کی لڑائی سے زخم اور درد پہنچا ہے تو اس تکلیف میں تو وہ بھی شریک ہیں اور آئندہ تم کو حق تعالیٰ سے وہ امیدیں ہیں جو ان کو نہیں، یعنی دنیا میں کفار پر غلبہ اور آخرت میں ثواب عظیم، اور اللہ تعالیٰ تمہارے مصالح اور تمہارے اعمال کو خوب جانتا ہے، اس کا جو حکم ہے اس میں تمہارے لئے بڑے منافع اور حکمتیں ہیں، دین اور دنیا دونوں کے لئے، سو اس کے امتثال کو غنیمت اور بڑی نعمت سمجھو۔

إِنَّآ أَنزَلۡنَآ إِلَيۡكَ ٱلۡكِتَٰبَ بِٱلۡحَقِّ لِتَحۡكُمَ بَيۡنَ ٱلنَّاسِ بِمَآ أَرَىٰكَ ٱللَّهُۚ

بے شک ہم نے اتاری تیری طرف کتاب سچی کہ تو انصاف کرے لوگوں میں جو کچھ سمجھاوے تجھ کو اللہ

وَلَا تَكُن لِّلۡخَآئِنِينَ خَصِيمٗا ﴿١٠٥﴾

اور تو مت ہو دغا بازوں کی طرف سے جھگڑنے والا

خلاصہ تفسیر: پیچھے کفار کے معاملات کے ضمن میں چند جگہ منافقین کا ذکر آیا کہ کفر دونوں میں یکساں ہے، آگے بھی منافقین کے ایک خاص قصہ کے متعلق مضمون بیان کیا جاتا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ بنوابیرق ایک خاندان تھا، اس میں بشیر نامی ایک منافق نے حضرت رفاعہؓ کی کوٹھری میں نقب لگا کر کچھ آٹا کچھ ہتھیار جو اس میں رکھے تھے چرا لیے، صبح کو پاس پڑوس میں تلاش کیا، اور بعض قوی قرائن سے بشیر منافق پر شبہ ہوا، بنوابیرق نے جو اس کے شریک حال تھے اپنی براءت کے لیے حضرت لبید کا نام لے دیا، بعض روایات میں ہے کہ بنوابیرق نے چوری ایک یہودی کے نام لگائی، حضرت رفاعہ نے اپنے بھتیجے حضرت قتادہؓ کو حضور ﷺ کی خدمت میں بھیج کر اس واقعہ کی اطلاع کی، آپ نے تحقیق کا وعدہ فرمایا، بنوابیرق کو جو یہ خبر ہوئی تو ایک شخص جس کا نام اسیر تھا اور اسی خاندان کا تھا اس کے پاس مشورہ کے لیے جمع ہو کر بعض اہل محلہ کے ساتھ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حضرت رفاعہ وقتادہ کی شکایت کی کہ بغیر گواہوں کے ایک مسلمان دین دار گھرانے پر چوری کی تہمت لگاتے ہیں، ان کا مقصد یہ تھا کہ اس مقدمہ میں حضور ان کی طرف داری کریں، آپ ﷺ نے یہ تو نہیں کیا، مگر اتنا ہوا کہ قتادہ جو پھر حضور کے پاس حاضر ہوئے تو آپ نے ان سے فرمایا کہ تم ایسے لوگوں پر بے سند کیوں تہمت لگاتے ہو؟ انہوں نے آکر اپنے چچا حضرت رفاعہ سے کہا، وہ اللہ پر بھروسہ کر کے خاموش ہو گئے، اس پر یہ آیات نازل ہوئیں، غرض چوری ثابت ہوئی، اور مال برآمد ہوا جو مالک کو دلا دیا گیا۔

بیشک ہم نے آپ کے پاس یہ کتاب بھیجی (جس سے) واقع کے موافق (حال معلوم ہوگا) تا کہ آپ (اس واقعہ میں) ان لوگوں کے درمیان اس کے موافق فیصلہ کریں جو کہ اللہ تعالیٰ نے (وحی کے ذریعہ سے) آپ کو (اصل حال) بتلا دیا ہے (وہ وحی یہ ہے کہ واقع میں بشیر منافق چور

ہے اور قبیلہ بنواُبیرق جو اس کے حامی ہیں جھوٹے ہیں) اور (جب اصل حال معلوم ہو گیا تو) آپ ان خائنوں کی طرف داری کی بات نہ کیجئے۔

وَلَا تَكُنۡ لِّلۡخَآئِنِيۡنَ خَصِيۡمًا: حضور نے اس واقعہ میں ان کی طرف داری نہیں کی تھی مگر بنواُبیرق کی خواہش بھی یہی تھی کہ آپ ان کی حمایت کریں، یہاں منع فرمانے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ فعل ماضی میں واقع ہو چکا ہو، بلکہ منع کا اصل فائدہ یہ ہے کہ آئندہ کے لئے حقیقت حال سے آگاہ کر کے اس سے روکتے ہیں، پس آپ کی حالت اور نہی کے مجموعہ کا حاصل یہ ہوگا کہ جیسے اب تک طرفداری نہیں کی آئندہ بھی نہ کیجئے گا اور یہ انتظامات بھی نبی کو مکمل معصوم رکھنے کے لئے ہیں، چنانچہ آگے دوسرے رکوع میں آیت: ولولا فضل اللہ علیك ورحمتہ لھمت طائفۃ الخ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اس پر عمل نہیں کیا تھا، کیونکہ اس آیت کا حاصل یہ ہے کہ فضل الٰہی نے غلطی سے بچالیا جس سے ہر غلطی کی نفی ہوگئی۔

وَلَا تَكُنۡ لِّلۡخَآئِنِيۡنَ خَصِيۡمًا: یہاں آیت میں سب کو خائن کہا، حالانکہ سب لوگ خائن نہ تھے، چونکہ جو لوگ خائن نہ تھے وہ بھی خائن کی اعانت کر رہے تھے اس لئے وہ بھی خائن ٹھہرے۔

* * *

فائدہ: منافق اور ضعیف الاسلام لوگوں میں جب کوئی کسی گناہ اور خرابی کا مرتکب ہوتا تو سزا اور بدنامی سے بچنے کے لئے حیلہ گھڑتے اور آپ کی خدمت میں ایسے انداز سے اس کا اظہار کرتے کہ آپ ان کو بری سمجھ جائیں، بلکہ کسی بری الذمہ کے ذمہ تہمت لگا کر اس کے مجرم بنانے میں سعی کرتے اور رل مل کر باہم مشورہ کرتے، چنانچہ ایک دفعہ یہ ہوا کہ ایک ایسے ہی مسلمان نے دوسرے مسلمان کے گھر میں نقب دیا ایک تھیلا آٹے کا اور اس کے ساتھ کچھ ہتھیار چرا کر لے گیا، اس تھیلے میں اتفاقاً سوراخ تھا، چور کے گھر تک راستہ میں آٹا گرتا گیا، چور نے یہ تدبیر کی کہ مال اپنے گھر میں نہ رکھا، بلکہ رات ہی میں وہ مال لے جا کر ایک یہودی کے پاس امانت رکھ آیا جو اس کا واقف تھا، صبح کو مالک نے آٹے کے سراغ پر چور کو جا پکڑا، مگر تلاشی پر اس کے گھر میں کچھ نہ نکلا، ادھر چور نے قسم کھالی کہ مجھ کو کچھ خبر نہیں، آٹے کا سراغ آگے کو چلتا نظر آیا تو مالک نے اسی سراغ پر یہودی کو جا پکڑا، اس نے مال کا اقرار کر لیا کہ میرے گھر میں موجود ہے، مگر میرے پاس تو رات فلاں شخص امانت رکھ گیا ہے، میں چور نہیں ہوں، مالک نے یہ قضیہ حضرت فخر عالم محمد ﷺ کی خدمت میں پہنچایا، چور کی قوم اور اس کی جماعت نے اتفاق کیا کہ جس طرح ہو سکے اس پر چوری ثابت نہ ہونے دو، یہودی کو چور بناؤ، چنانچہ یہودی سے جھگڑے اور آپ کی خدمت میں چور کی برات پر قسمیں کھائیں گواہی دی، قریب تھا کہ یہودی چور سمجھا جائے اور مجرم قرار دیا جائے، اس پر حق سبحانہ، نے متعدد آیتیں نازل فرمائیں اور حضرت محمد رسول مقبول ﷺ کو اور سب کو متنبہ فرما دیا کہ چور یہی مسلمان ہے، یہودی اس میں سچا اور بے قصور ہے اور ہمیشہ کے لئے ایسے لوگوں کی قلعی کھول کر سب کو متنبہ کر دیا۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ اے رسول ﷺ! ہم نے اپنی سچی کتاب تجھ پر اس لئے اتاری کہ ہمارے سمجھانے اور بتلانے کے موافق تمام لوگوں میں نیک ہوں یا بد، مومن ہوں یا کافر، حکم اور انصاف کیا جائے اور جو دغاباز ہیں ان کی بات کا اعتبار اور ان کی طرف داری ہرگز مت کرو اور ان کی قسم اور ان کی گواہی پر کسی بے قصور کو مجرم مت بناؤ، یعنی ان دغابازوں کے طرف ہو کر یہودی سے مت جھگڑو۔

وَّاسۡتَغۡفِرِ اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوۡرًا رَّحِيۡمًا ﴿۱۰۶﴾ وَلَا تُجَادِلۡ عَنِ الَّذِيۡنَ يَخۡتَانُوۡنَ اَنۡفُسَهُمۡ ؕ

اور بخشش مانگ اللہ سے، بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ اور مت جھگڑ ان کی طرف سے جو اپنے جی میں دغا رکھتے ہیں

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنۡ كَانَ خَوَّانًا اَثِيۡمًا ﴿۱۰۷﴾

بیشک اللہ کو پسند نہیں جو کوئی ہو دغاباز گنہگار

خلاصہ تفسیر: اور (لوگوں کے کہنے سے حسن ظن کے طور پر آپ ﷺ نے جو بنواُبیرق کو دیندار سمجھ لیا، اگرچہ ایسا سمجھنا گناہ تو نہیں، لیکن چونکہ اس میں یہ احتمال تھا کہ آپ کے اتنا فرما دینے سے بھی اہل حق اپنا حق چھوڑ دیں گے، چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ حضرت رفاعہؓ خاموش ہو کر بیٹھ

گئے ،لہذا ایہ کام نامناسب ہوا، اس لئے اس سے) آپ استغفار فرمائیے (کہ آپ کی شان عظیم ہے، اتنا امر بھی آپ کے لئے قابل استغفار ہے) بلاشبہ اللہ تعالیٰ بڑے مغفرت کرنے والے بڑے رحمت والے ہیں، اور آپ ان لوگوں کی طرف سے کوئی جواب دہی کی بات نہ کیجئے (جیسا کہ وہ لوگ آپ سے چاہتے تھے) جو کہ (لوگوں کے مال میں خیانت کر کے وبال کے اعتبار سے درحقیقت) اپنا ہی نقصان کر رہے ہیں، بلاشبہ اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو نہیں چاہتے (بلکہ اس کو مبغوض رکھتے ہیں) جو بڑا خیانت کرنے والا بڑا گناہ کرنے والا ہو (جیسا کہ تھوڑے خیانت کرنے والے کو بھی محبوب نہیں رکھتے لیکن چونکہ یہاں بشیر منافق کا بڑا خائن ہونا بتلانا مقصود ہے، اس لئے یہ صیغہ مبالغہ کا لایا گیا)۔

وَّاسْتَغْفِرِ اللّٰهَ: باوجود اس کے کہ حضور ﷺ سے کوئی ایسا کام صادر نہ ہوا جو ستغفار کا سبب ہوتا لیکن پھر بھی آپ کو استغفار کا حکم ہونا تو یہ اصل ہے اس قول کی کہ: "حسنات الابرار سیئات المقربین"، اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ خواہ کیسا ہی کمال حاصل ہو جائے مگر شرعی احکامات کسی سے کسی حال میں ساقط نہیں ہوتے۔

* * *

فائدہ: لے یعنی قبل تحقیق صرف ظاہر حال کو دیکھ کر چور کو بری اور یہودی مذکور کو چور خیال کر لینا تمہاری عصمت اور عظمت شان کے مناسب نہیں، اس سے استغفار چاہئے، اس میں کامل تنبیہ ہوگئی ان مخلصین صحابہ کو جو بوجہ تعلق اسلامی یا قومی وغیرہ چور پر حسن ظن کر کے یہودی کے چور بنانے میں ساعی ہوئے۔

يَّسْتَخْفُوْنَ مِنَ النَّاسِ وَلَا يَسْتَخْفُوْنَ مِنَ اللّٰهِ وَهُوَ مَعَهُمْ اِذْ يُبَيِّتُوْنَ

شرماتے ہیں لوگوں سے اور نہیں شرماتے اللہ سے اور وہ ان کے ساتھ ہے جب کہ مشورہ کرتے ہیں رات کو

مَا لَا يَرْضٰى مِنَ الْقَوْلِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطًا ﴿١٠٨﴾

اس بات کا جس سے اللہ راضی نہیں، اور جو کچھ وہ کرتے ہیں سب اللہ کے قابو میں ہے

خلاصہ تفسیر: جن لوگوں کی یہ کیفیت ہے کہ (اپنی خیانت کو) آدمیوں سے تو (شرما کر) چھپاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے نہیں شرماتے، حالانکہ وہ (ہر وقت کی طرح) اس وقت (بھی) ان کے پاس ہے جب کہ وہ اللہ کی مرضی کے خلاف گفتگو کے متعلق تدبیریں کیا کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کے سب اعمال کو اپنے (علمی) احاطہ میں لئے ہوئے ہیں۔

* * *

فائدہ: پہلی آیت میں جب ان لوگوں کی دغا اور برائی صاف بتلا دی گئی تو شاید رسول اللہ ﷺ نے بوجہ غلبہ شفقت جو آپ کو تمام خلق بالخصوص اپنی امت پر تھا حق تعالیٰ سے ان خطا واروں کی معافی چاہیے، اس پر ارشاد ہوا کہ ان دغا بازوں کی طرف ہو کر اللہ سے کیوں جھگڑتے ہو، ایسے لوگ اللہ کو خوش نہیں آتے، یہ تو لوگوں سے چھپ چھپ کر راتوں کو ناجائز مشورہ کرتے ہیں اور اللہ سے نہیں شرماتے جو ہر وقت ان کے ساتھ ہے اور ان کے تمام امور پر حاوی ہے اور اگر آپ نے ان کی معافی نہ بھی مانگی ہو تو آپ کی معافی مانگنے کا احتمال تو بالیقین موجود تھا، دیکھئے دوسری جگہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بابت يُجَادِلُنَا فِيْ قَوْمِ لُوْطٍ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَحَلِيْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ (ہود: ۷۴-۷۵) ارشاد صریح موجود ہے، سو اس کی پیش بندی کے لئے حق تعالیٰ نے یہ ارشاد فرما کر ان لوگوں کی سفارش سے آپ کو روک دیا، واللہ اعلم۔

هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَاۗءِ جٰدَلْتُمْ عَنْهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۣ فَمَنْ يُّجَادِلُ اللّٰهَ عَنْهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ

سنتے ہو تم لوگ جھگڑا کرتے ہو ان کی طرف سے دنیا کی زندگی میں، پھر کون جھگڑا کرے گا ان کے بدلے اللہ سے قیامت کے دن

اَمۡ مَّنۡ يَّكُوۡنُ عَلَيۡهِمۡ وَكِيۡلًا ﴿۱۰۹﴾

یا کون ہوگا ان کا کارساز

خلاصہ تفسیر: ہاں! (جو بشیر وغیرہ کی حمایت میں بعض اہل محلہ جمع ہو کر آئے تھے وہ سن لیں کہ) تم ایسے ہو کہ تم نے دنیوی زندگی میں تو ان کی طرف سے جواب دہی کی باتیں کرلیں سو (یہ بتلاؤ کہ) اللہ تعالیٰ کے روبرو قیامت کے دن ان کی طرف سے کون جوابدہی کرے گا یا وہ کون شخص ہوگا جو ان کا کام بنانے والا ہوگا (یعنی نہ کوئی زبانی جواب دہی کر سکے گا، نہ کوئی مقدمہ کی عملی درستگی کر سکے گا)۔

* * *

فائدہ: اس میں خطاب ہے چور کی قوم اور ان لوگوں کو جو چور کے طرف دار ہوئے تھے، یعنی اللہ تعالیٰ کو سب کچھ معلوم ہے اس بے جا حمایت سے چور کو قیامت میں کوئی نفع نہیں ہو سکتا۔

وَمَنۡ يَّعۡمَلۡ سُوۡٓءًا اَوۡ يَظۡلِمۡ نَفۡسَهٗ ثُمَّ يَسۡتَغۡفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوۡرًا رَّحِيۡمًا ﴿۱۱۰﴾

اور جو کوئی کرے گناہ یا اپنا برا کرے پھر اللہ سے بخشوا دے تو پائے اللہ کو بخشنے والا مہربان

خلاصہ تفسیر: اور (یہ خیانت کرنے والے اگر اب بھی شرعی قاعدہ کے مطابق توبہ کر لیتے تو معافی ہو جاتی، کیونکہ ہمارا قانون یہ ہے کہ) جو شخص کوئی (متعدی) برائی کرے (یعنی ایسا گناہ کرے جس کا اثر دوسروں کو پہنچتا ہو) یا (صرف) اپنی جان کا ضرر کرے (یعنی ایسا گناہ کرے جس کا اثر دوسروں تک نہیں پہنچتا اور) پھر اللہ تعالیٰ سے (شرعی قاعدہ کے مطابق) معافی چاہے (جس میں بندوں کے حقوق کو ادا کرنا، یا ان سے معاف کرانا بھی داخل ہے) تو وہ اللہ تعالیٰ کو بڑی مغفرت والا بڑی رحمت والا پائے گا۔

* * *

فائدہ: سوء اور ظلم سے بڑے اور چھوٹے گناہ مراد ہیں یا سوء سے وہ گناہ مراد ہے جس سے دوسرے کو درد پہنچے جیسے کسی پر تہمت لگانی اور ظلم وہ ہے کہ اس کی خرابی اپنے ہی نفس تک رہے یعنی گناہ کیسا ہی ہو اس کا علاج استغفار اور توبہ ہے، توبہ کے بعد اللہ تعالیٰ البتہ معاف فرما دیتا ہے، اگر آدمیوں نے جان بوجھ کر فریب سے کسی مجرم کی برات ثابت کر دی یا غلطی سے مجرم کو بے قصور سمجھ گئے تو اس سے اس کے جرم میں تخفیف بھی نہیں ہو سکتی، البتہ توبہ سے بالکل معاف ہو سکتا ہے، اس میں اس چور کو اور اس کے سب طرفداروں کو جو دیدہ دانستہ طرف دار بنے ہوں یا غلطی سے سبھی کو توبہ اور استغفار کا ارشاد ہو گیا اور اشارہ لطیف اس طرف بھی ہو گیا کہ اب بھی اگر کوئی اپنی بات پر جما رہے گا اور توبہ نہ کرے گا تو اللہ کی بخشش اور اس کی رحمت سے محروم ہوگا۔

وَمَنۡ يَّكۡسِبۡ اِثۡمًا فَاِنَّمَا يَكۡسِبُهٗ عَلٰى نَفۡسِهٖ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيۡمًا حَكِيۡمًا ﴿۱۱۱﴾

اور جو کوئی کرے گناہ سو کرتا ہے اپنے ہی حق میں، اور اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے

خلاصہ تفسیر: اور (گنہگاروں کو ضرور توبہ کی کوشش کرنی چاہئے، کیونکہ) جو شخص کچھ گناہ کا کام کرتا ہے تو وہ فقط اپنی ذات ہی کے لئے کرتا ہے، اور اللہ تعالیٰ بڑے علم والے ہیں (سب کے گناہوں کی ان کو خبر ہے) بڑے حکمت والے ہیں (مناسب سزا تجویز فرماتے ہیں)۔

* * *

فائدہ: یعنی جو اپنے قصد سے گناہ کرے گا اس کا وبال تو اسی پر پڑے گا اور اس کی سزا خاص اسی کو دی جائے گی کسی دوسرے کو سزا نہیں ہو سکتی کیونکہ ایسا تو وہ کر سکتا ہے جس کو واقعی بات کی خبر نہ ہو یا حکمت سے بے بہرہ ہو، مگر حق سبحانہ وتعالیٰ تو بلا مبالغہ بصیغہ مبالغہ علیم وحکیم ہے وہاں اس کی گنجائش کہاں تو اب خود چوری کر کے یہودی کے سر لگانے سے کیا نفع ہو سکتا ہے۔

وَمَنْ يَّكْسِبْ خَطِيْٓئَةً اَوْ اِثْمًا ثُمَّ يَرْمِ بِهٖ بَرِيْٓـئًا فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ﴿١١٢﴾ ع

اور جو کوئی کرے خطا یا گناہ پھر تہمت لگا دے کسی بے گناہ پر تو اس نے اپنے سر دھرا طوفان اور گناہ صریح

خلاصہ تفسیر: پیچھے خود گناہ کرنے کا انجام بیان ہوا، اور جو شخص خود گناہ کرے اور دوسروں پر تہمت لگائے اس کا حال سنو:

اور جو شخص کوئی چھوٹا گناہ کرے یا بڑا گناہ، پھر (بجائے اس کے کہ خود ہی توبہ کر لینی چاہئے تھی، اس نے یہ کام کیا کہ) اس (گناہ) کی تہمت کسی بے گناہ پر لگا دی، اس نے تو بڑا بھاری بہتان اور صریح گناہ اپنے (سر کے) اوپر لادلیا (جیسا بشیر منافق نے کیا کہ خود تو چوری کی اور ایک نیک بخت بے گناہ حضرت لبید کے ذمہ چوری کی تہمت رکھ دی)۔

* * *

فائدہ: یعنی جس نے چھوٹا یا بڑا گناہ کر کے کسی بے گناہ کے ذمہ لگایا تو اس پر تو دو گناہ لازم ہو گئے: ① ایک جھوٹی تہمت ② دوسرا وہ اصلی گناہ، تو ظاہر ہو گیا کہ خود چوری کر کے یہودی پر تہمت دھرنے سے اور وبال بڑھ گیا، نفع خاک بھی نہ ہوا، اور معلوم ہو گیا کہ گناہ چھوٹا ہو یا بڑا توبہ خالص کے سوا اس کا کوئی علاج نہیں۔

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ ؕ وَمَا يُضِلُّوْنَ

اور اگر نہ ہوتا تجھ پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت تو قصد کر ہی چکی تھی ان میں ایک جماعت کہ تجھ کو بہکا دیں، اور بہکا نہیں سکتے

اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَيْءٍ ؕ وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ

مگر اپنے آپ کو اور تیرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، اور اللہ نے اتاری تجھ پر کتاب اور حکمت اور تجھ کو سکھائیں

مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ؕ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا ﴿١١٣﴾

وہ باتیں جو تو نہ جانتا تھا، اور اللہ کا فضل تجھ پر بہت بڑا ہے

خلاصہ تفسیر: اور اگر (اس مقدمہ میں) آپ پر (اے محمد ﷺ!) اللہ کا فضل اور رحمت نہ ہو (جو کہ ہمیشہ آپ پر رہتا ہے) تو ان (چالاک) لوگوں میں سے ایک گروہ نے تو آپ کو غلطی ہی میں ڈال دینے کا ارادہ کر لیا تھا (لیکن خدا کے فضل سے ان کی رنگ آمیز باتوں کا آپ پر کوئی اثر نہیں ہوا اور آئندہ بھی نہ ہوگا، چنانچہ فرماتے ہیں:) اور وہ (کبھی آپ کو) غلطی میں نہیں ڈال سکتے لیکن (اس ارادہ سے) اپنی جانوں کو (گناہ میں مبتلا اور عذاب کا اہل بنا رہے ہیں) اور آپ کو ذرہ برابر (اس قسم کا) ضرر نہیں پہنچا سکتے، اور (آپ کو غلطی سے نقصان پہنچانا کب ممکن ہے جب کہ) اللہ تعالیٰ نے آپ پر کتاب اور علم کی باتیں نازل فرمائیں (جس کے ایک حصہ میں اس قصہ کی اطلاع بھی دے دی) اور آپ کو وہ (مفید اور عالی) باتیں بتلائی ہیں جو آپ (پہلے سے) نہ جانتے تھے، اور آپ پر اللہ کا بڑا فضل ہے۔

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ: اس پر دلالت کرتا ہے کہ کسی شخص کو اپنے علم یا عمل پر اعتماد جائز نہیں کہ میں بہت بڑا عالم یا متقی ہوں، بلکہ ہر وقت اللہ کے فضل و کرم پر نظر ہونی چاہیے کہ یہ سب اللہ کا فضل ہے ورنہ میں اس قابل کہاں کہ کوئی نیک کام یا علم حاصل کر سکوں۔

وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ: اس سے یہ ثابت ہوا کہ رسول ﷺ کو اللہ تعالیٰ کے برابر تمام کائنات کا علم محیط نہ تھا، جیسے بعض جاہل کہتے ہیں، بلکہ جتنا علم حق تعالیٰ عطا فرماتے وہ مل جاتا تھا، ہاں! اس میں کلام نہیں کہ آنحضرت ﷺ کو جو علم عطا ہوا وہ ساری مخلوقات کے علم سے زائد ہے۔

* * *

فائدہ: اس میں خطاب ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ الصلوۃ والتسلیم کی طرف، اور اظہار ہے ان خائنوں کے فریب کا، اور بیان ہے آپ کی

عظمت شان اور عصمت کا، اور اس کا کہ آپ کمال علمی میں جو کہ تمام کمالات سے افضل اور اول ہے سب سے فائق ہیں اور اللہ کا فضل آپ پر بے نہایت ہے جو ہمارے بیان اور ہماری سمجھ میں نہیں آسکتا، اور اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ آپ کو جو چور کی براءت کا خیال ہوا تھا وہ ظاہر حال کو دیکھ کر اور اقوال وشہادات کو سن کر اور اس کو سچ سمجھ کر ہوگیا تھا، میلان عن الحق یا مداہنت فی الحق ہرگز ہرگز اس کا باعث نہ تھا اور اتنی بات میں کچھ برائی نہ تھی، بلکہ یہی ہونا ضروری تھا، جب اللہ تعالیٰ کے فضل سے حقیقت الامر ظاہر ہوگئی، کوئی خلجان باقی نہ رہا، اور ان سب باتوں سے مقصود یہ ہے کہ آئندہ کو وہ فریب باز تو آپ کے بہکانے اور دھوکا دینے سے رک جائیں اور مایوس ہوجائیں اور آپ اپنی عظمت اور تقدس کے موافق غور اور احتیاط سے کام لیں، واللہ اعلم۔

لَا خَيْرَ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىهُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍۭ بَيْنَ النَّاسِ

کچھ اچھے نہیں ان کے اکثر مشورے مگر جو کوئی کہ کہے صدقہ کرنے کو یا نیک کام کو یا صلح کرانے کو لوگوں میں

وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۱۴﴾

اور جو کوئی یہ کام کرے اللہ کی خوشی کے لئے تو ہم اس کو دیں گے بڑا ثواب

خلاصہ تفسیر: عام لوگوں کی اکثر سرگوشیوں میں خیر (یعنی ثواب وبرکت) نہیں ہوتی (جیسا کہ اسیر کے پاس جمع ہو کر خفیہ مشورہ کیا گیا) ہاں! مگر جو لوگ ایسے ہیں کہ (خیر) خیرات کی یا اور کسی نیک کام کی یا لوگوں میں باہم اصلاح کر دینے کی ترغیب دیتے ہیں (اور اس تعلیم و ترغیب کی تکمیل وانتظام کے لئے خفیہ تدبیریں اور مشورے کرتے ہیں، یا خود صدقہ وغیرہ کی دوسروں کو خفیہ ترغیب دیتے ہیں، کیونکہ بعض اوقات خفیہ ہی کہنا مصلحت ہوتا ہے، ان کے مشوروں میں البتہ خیر یعنی ثواب اور برکت ہے) اور جو شخص یہ کام کرے گا (یعنی ان اعمال کی ترغیب دے گا) حق تعالیٰ کی رضا جوئی کے واسطے (نہ کہ جاہ وشہرت کی غرض سے) سو ہم اس کو عنقریب اجر عظیم عطاء فرمائیں گے۔

اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ: "معروف" یعنی نیک کام میں تمام جائز امور آگئے جو نافع ہوں، خواہ دینی ہوں یا دنیوی ہوں بشرطیکہ جائز بھی ہوں، اگرچہ صدقہ اور صلح بھی اس میں داخل تھے، مگر چند وجہ سے ان دونوں کو صراحت سے ذکر فرمایا، وہ یہ کہ صدقہ نفس پر زیادہ شاق ہوتا ہے اس لیے زیادہ اہتمام سے ذکر فرمایا، اور خاص اس مقام میں صدقہ کا ذکر بہت ہی مناسب ہوا کیونکہ بشیر نے چوری کر کے دوسرے کا مال لیا تھا، اس لیے مقابلہ میں اپنا مال غیر کو دینے کی فضیلت بیان فرمادی، اسی طرح لوگوں میں صلح کرا دینا بھی "معروف" میں داخل ہے، لیکن چونکہ نااتفاقی بہت بڑے نقصانوں کا سبب ہے اور اصلاح میں اس کا انسداد ہے، اس لیے اس کو بھی صراحتاً ذکر فرمایا، نیز یہ دونوں کام خدمت خلق کے اہم ابواب پر حاوی ہیں، ایک جلب منفعت یعنی خلق اللہ کو نفع پہنچانا، دوسرے دفع مضرت یعنی لوگوں کو تکلیف اور رنج سے بچانا، صدقہ نفع رسانی کا اہم عنوان ہے، اور لوگوں کے درمیان صلح خلق اللہ کو مضرت اور نقصان سے بچانے کا اہم عنوان ہے، جمہور علماء تفسیر کا قول ہے کہ اس جگہ صدقہ عام ہے جس میں زکوۃ، صدقات واجبہ بھی داخل ہیں اور نفلی صدقات بھی اور ہر نفع جو کسی کو پہنچایا جائے۔

لَا خَيْرَ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىهُمْ: جو مخفی تعلیم کتاب اللہ اور سنت رسول کے موافق نہ ہو جیسا کہ بعض جاہل صوفیوں کا نظریہ ہے کہ طریقت مفاد شریعت کی تعلیم سینہ بہ سینہ جاری ہے اور اسے حق سمجھتے ہیں تو یہ آیت اس کے باطل ہونے پر دلالت کرتی ہے۔

وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ: آیت کا منطوق اس پر دلالت کرتا ہے کہ جو مخلص اجر وثواب کا قصد نہ کرے، محض رضائے الٰہی کا قصد کرے اس کو ثواب بھی ملتا ہے، اور مفہوماً اس پر دلالت کرتی ہے کہ تمام اعمال کے ثمرات ونتائج رضائے الٰہی کے تابع ہیں، جب رضا کا قصد کرتا ہے تو دوسرے ثمرات بلا قصد ادا ہو جاتے ہیں۔

* * *

فائدہ: منافق اور حیلہ گر آ کر آپ سے کان میں باتیں کرتے تا کہ لوگوں میں اپنا اعتبار بڑھائیں اور مجلس میں بیٹھ کر آپس میں بیہودہ سرگوشی کیا کرتے کسی کی عیب جوئی، کسی کی غیبت، کسی کی شکایت کرتے، اس پر ارشاد ہوا کہ جو لوگ باہم کانوں میں مشاورت کرتے ہیں اکثر مشورے خیر سے خالی ہوتے ہیں، صاف اور سچی باتوں کو چھپانے کی حاجت نہیں، اس میں کوئی فریب ہوتا ہے، البتہ چھپاوے تو صدقہ اور خیرات کی بات کو چھپاوے تا کہ لینے والا شرمندہ نہ ہو، یا کسی ناواقف کو غلطی سے بچائے اور اس کو اچھی بات اور صحیح مسئلہ بتائے تو چھپا کر بتائے تا کہ اس کو ندامت نہ ہو، یا دو میں لڑائی ہو اور غصہ والا جوش میں صلح نہیں کرتا تو اول کوئی تدبیر بنا کر پھر اس کو سمجھائے، حتیٰ کہ توریہ کی بھی اجازت ہے۔

آخر میں فرما دیا کہ جو کوئی امور مذکور کو اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے لئے کرے گا اس کو بڑا عظیم الشان ثواب عنایت ہوگا، یعنی ریا کاری یا کسی اور غرض دنیاوی کے لئے نہ ہونا چاہئے۔

وَمَنۡ يُّشَاقِقِ الرَّسُوۡلَ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الۡهُدٰى وَيَتَّبِعۡ غَيۡرَ سَبِيۡلِ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ

اور جو کوئی مخالفت کرے رسول ﷺ کی جب کہ کھل چکی اس پر سیدھی راہ اور چلے سب مسلمانوں کے راستہ کے خلاف

نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصۡلِهٖ جَهَنَّمَ‌ؕ وَسَآءَتۡ مَصِيۡرًا ﴿۱۱۵﴾

تو ہم حوالہ کریں گے اسکو وہی طرف جو اس نے اختیار کی اور ڈالیں گے ہم اسکو دوزخ میں، اور وہ بہت بری جگہ پہنچا

خلاصہ تفسیر: چوری کے اس مقدمہ میں نبی کریم ﷺ کے حق فیصلہ پر بشیر منافق ناخوش ہو کر کھلم کھلا مرتد ہو گیا اور مکہ جا کر مشرکوں سے جا ملا اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

اور جو شخص رسول (مقبول ﷺ) کی مخالفت کرے گا بعد اس کے کہ حق کام ظاہر ہو چکا تھا اور مسلمانوں کا (دینی) راستہ چھوڑ کر دوسرے راستہ ہو لیا (جیسا کہ بشیر مرتد ہو گیا، حالانکہ اسلام کا حق ہونا اور نیز اس خاص واقعہ میں رسول اللہ ﷺ کے فیصلہ کا حق ہونا خود اس کے معائنہ میں بھی آ چکا ہے، پھر بھی اسے بدبختی نے گھیرا) تو ہم اس کو (دنیا میں) جو کچھ وہ کرتا ہے کرنے دیں گے، اور (آخرت میں) اس کو جہنم میں داخل کریں گے اور وہ بری جگہ ہے جانے کی۔

وَيَتَّبِعۡ غَيۡرَ سَبِيۡلِ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ: مخالفت رسول کا ذکر کرنے کے بعد یہ جو فرمایا کہ مسلمانوں کا راستہ چھوڑ کر دوسرے راستے پر ہو لیا، یہ مخالفت رسول ہی کی تفسیر ہے، یعنی رسول کی مخالفت یہ ہے کہ مسلمانوں کا طریقہ چھوڑ دے، کیونکہ خود رسول اللہ ﷺ کے طریقہ کو مشاہدہ سے معلوم کرنا ہر وقت ممکن نہیں، خود آپ ﷺ کی حیات میں بہت سے غائبین نے خود آپ کا طریقہ مشاہدہ سے معلوم نہیں کیا، اور وفات کے بعد تو سب کو دشوار ہو گیا، پس آپ کی موافقت و مخالفت، اتباع و عدم اتباع کا مدار مسلمانوں کا طریقہ چھوڑنے پر رہا، اس آیت میں اجماع کے معتبر ہونے کی دلیل ہے۔

اس آیت میں دو چیزوں کو جرم عظیم اور دخول جہنم کا سبب ہونا بیان فرمایا ہے: ① ایک مخالفت رسول اور یہ ظاہر ہے کہ مخالفت رسول کفر اور وبال عظیم ہے ② دوسرے جس کام پر سب مسلمان متفق ہوں اس کو چھوڑ کر ان کے خلاف کوئی راستہ اختیار کرنا، اس سے معلوم ہوا کہ اجماع امت حجت ہے، یعنی جس طرح قرآن و سنت کے بیان کردہ احکام پر عمل کرنا واجب ہوتا ہے، اسی طرح امت کا اتفاق جس چیز پر ہو جائے اس پر بھی عمل کرنا واجب ہے اور اس کی مخالفت گناہ عظیم ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی جب کسی کو حق بات واضح ہو چکے، پھر اس کے بعد بھی رسول اللہ ﷺ کے حکم کی مخالفت کرے اور سب مسلمانوں کو چھوڑ کر اپنی جدا راہ اختیار کرے تو اس کا ٹھکانا جہنم ہے، جیسا کہ اس چور نے کیا جس کا ذکر ہو چکا، بجائے اس کے کہ قصور کا اعتراف کر کے توبہ کرتا یہ کیا کہ ہاتھ کٹنے کے خوف سے مکہ بھاگ گیا اور مشرکین میں مل گیا۔

فائدہ: اکابر علماء نے اس آیت سے یہ مسئلہ بھی نکالا کہ اجماع امت کا مخالف اور منکر جہنمی ہے، یعنی اجماع امت کو ماننا فرض ہے حدیث میں وارد ہے کہ "اللہ کا ہاتھ ہے مسلمانوں کی جماعت پر، جس نے جدا راہ اختیار کی وہ دوزخ میں جا پڑا"۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ ۚ وَمَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ

بے شک اللہ نہیں بخشتا اس کو جو اس کا شریک کرے کسی کو اور بخشتا ہے اس کے سوا جس کو چاہے ۱؎ جس نے شریک ٹھہرایا اللہ کا

فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا بَعِيدًا ﴿۱۱۶﴾

وہ بہک کر دور جا پڑا ۲؎

خلاصہ تفسیر: پیچھے جہاد کے ذکر میں اگرچہ سب مخالفین اسلام داخل ہیں، مگر حالات زیادہ تر یہود اور منافقین کے بیان ہوئے، مخالفین میں ایک جماعت مشرکین کی سب سے بڑی تھی، آگے کچھ ان کے عقائد، طریقہ کی مذمت اور ان کی سزا کا ذکر ہے، اس مقام پر یہ اس لئے اور زیادہ مناسب ہو گیا کہ پیچھے اس چور کے مرتد ہونے کا بھی ذکر تھا، پس اس مضمون سے اس کی دائمی سزا کا حال معلوم ہو گیا، نیز پیچھے توبہ کی ترغیب تھی، یہاں شراب وکفر کے سوا تمام گناہوں کے معاف ہونے کے بیان سے توبہ کی زیادہ ترغیب ہو گئی۔

بیشک اللہ تعالیٰ اس بات کو (سزا دے کر بھی) نہ بخشیں گے کہ ان کے ساتھ کسی کو شریک قرار دیا جائے (بلکہ دائمی سزا میں بتلا رکھیں گے) اور اس کے سوا اور جتنے گناہ ہیں (خواہ صغیرہ ہوں یا کبیرہ) جس کے لئے منظور ہوگا (بلا سزا) وہ گناہ بخش دیں گے (البتہ اگر وہ مشرک مسلمان ہو جائے تو پھر مشرک ہی نہ رہا، اب وہ دائمی سزا بھی نہ رہی گی) اور (اس شرک کے نہ بخشنے کی وجہ یہ ہے کہ) جو شخص اللہ تعالیٰ کے ساتھ (کسی کو) شریک ٹھہراتا ہے وہ (امر حق سے) بڑی دور کی گمراہی میں جا پڑا (وہ امر حق توحید ہے، جو عقلاً بھی واجب ہے)۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ: صانع کی تعظیم کے حقوق میں سب سے بڑا حق توحید ہے، پس مشرک نے حضرت صانع کی اہانت کی، اس لئے ایسی سزا کا مستحق ہوگا، اور جو علت شرک کے نہ بخشے جانے کی ہے وہ کفر میں بھی مشترک ہے، کیونکہ اس میں بھی حق تعالیٰ کی کسی بتلائی ہوئی چیز کا انکار ہوتا ہے، تو وہ اس کی صفت صدق کا انکار کرتا ہے، اور بعض کافر خود ذات باری تعالیٰ کے بھی منکر ہیں، بعض کسی صفت کے منکر ہیں، بعض صفت اور ذات دونوں کے منکر ہیں، اور ذات وصفات میں سے جس کا بھی انکار ہو اس سے توحید کا انکار لازم آتا ہے، پس کفر وشرک دونوں کی مغفرت نہ ہوگی، بخلاف دوسرے گناہوں کے کہ اگرچہ ان میں بھی کچھ گمراہی تو ہے، مگر ان میں توحید کا انکار نہیں ہوتا اس لیے انہیں قابل مغفرت قرار دیا گیا۔

یہاں بعض لوگ یہ شبہ کرتے ہیں کہ سزا بقدر عمل ہونی چاہئے، چنانچہ مشرک اور کافر نے جو کفر اور شرک کا جرم کیا ہے، وہ محدود مدت عمر کے اندر کیا ہے تو اس کی سزا غیر محدود اور دائمی کیوں ہوئی؟ جواب یہ ہے کہ کفر وشرک کرنے والا چونکہ اس کو جرم ہی نہیں سمجھتا، بلکہ نیکی سمجھتا ہے، اس لئے اس کا عزم وقصد یہی ہوتا ہے کہ ہمیشہ اسی حال پر قائم رہے گا اور جب مرتے دم تک وہ اسی پر قائم رہا تو اپنے اختیار کی حد تک اس نے جرم دائمی کر لیا، اس لئے اس کی سزا بھی دائمی ہوئی۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی شرک سے نیچے کے گناہ جس کے چاہے گا اللہ بخش دے گا مگر شرک کو ہرگز نہیں بخشے گا۔ مشرک کے لئے عذاب ہی مقرر فرما چکا تو چوری کرنا اور تہمت جھوٹی لگانا اگرچہ کبیرہ گناہ تھے مگر یہ بھی احتمال تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اس چور کو بخش دیتا لیکن جب وہ چور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے بھاگا اور مشرکوں میں جا ملا تو اب اس کی مغفرت کا احتمال بھی نہ رہا۔

فائدہ: اس سے یہ معلوم ہوا کہ شرک یہی نہیں کہ اللہ کے سوا کسی کی پرستش کرے بلکہ اللہ کے حکم کے مقابلہ میں کسی کے حکم کو پسند کرنا یہ بھی شرک ہے۔

فائدہ: ۲؎ ''دور جا پڑا'' اس لئے کہ وہ شخص تو اللہ ہی سے صریح منحرف ہو گیا اور اللہ کے مقابلہ میں دوسرا معبود بنا کر شیطان کا پورا مطیع ہو چکا اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور اس کی رحمت سب سے مستغنی ہو بیٹھا اور جو اتنی دور جا پڑا تو اللہ کی رحمت اور مغفرت کا کیسے مستحق ہو سکتا ہے بلکہ ایسے شخص کی مغفرت تو خلاف حکمت ہونی چاہیئے یہی وجہ ہے کہ ایسے لوگوں کو مغفرت سے صاف مایوس فرما دیا گیا اور مسلمان کتنا ہی سخت گنہگار ہو چونکہ اس کی خرابی صرف اعمال تک ہے اس کا عقیدہ اور تعلق اور توقع سب جوں کی توں موجود ہیں اس کی مغفرت ضرور ہوگی جلدی یا دیر کے بعد اللہ جب چاہے گا بخش دے گا۔

إِن يَدْعُونَ مِن دُونِهِ إِلَّا إِنَاثًا ۚ وَإِن يَدْعُونَ إِلَّا شَيْطَانًا مَّرِيدًا ﴿١١٧﴾ لَّعَنَهُ اللَّهُ ۘ

اللہ کے سوا نہیں پکارتے مگر عورتوں کو، اور نہیں پکارتے مگر شیطان سرکش کو، جس پر لعنت کی اللہ نے ۱؎

وَقَالَ لَأَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا ﴿١١٨﴾

اور کہا شیطان نے کہ میں البتہ لوں گا تیرے بندوں سے حصہ مقررہ ۲؎

خلاصہ تفسیر: (اب مشرکین کے مذہبی طریقہ میں ان کی بیوقوفی بیان کرتے ہیں کہ:) یہ (مشرک) لوگ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر (ایک تو) صرف چند زنانی چیزوں کی عبادت کرتے ہیں اور (ایک) صرف شیطان کی عبادت کرتے ہیں جو کہ (خدا تعالیٰ کے) حکم سے باہر ہے (اور) جس کو (اس بے حکمی کی وجہ سے) اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت (خاصہ) سے دور ڈال رکھا ہے اور جس نے (اس وقت کہ رحمت خاصہ سے دور اور ملعون ہونے لگا) یوں کہا تھا (جس سے اس کی دشمنی صاف ظاہر معلوم ہو رہی تھی) کہ میں (پوری کوشش کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں کہ) ضرور تیرے بندوں سے اپنا مقرر حصہ اطاعت کا لوں گا۔

إِن يَدْعُونَ مِن دُونِهِ إِلَّا إِنَاثًا: ''زنانی چیزوں'' سے مراد بعض بت ہیں جن کے نام اور صورتیں عورتوں کی سی تھیں اور ان کو زیور وغیرہ بھی پہناتے تھے، جیسا کہ روح المعانی میں حسن سے منقول ہے کہ ہر قبیلہ میں ایسے بت تھے اور ان کو انثیٰ بنی فلاں کے لقب سے مشہور کرتے تھے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کے سوا اور کسی کی عبادت نہیں کرتے تھے، چنانچہ بعض بت نام اور شکل میں مردوں کی طرح بھی تھے، اور آگے جو یہ فرمایا ہے کہ شیطان کی عبادت کرتے ہیں، یہ ان کے سب معبودوں کو شامل ہے، کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ شیطان کے کہنے سے غیر اللہ کی عبادت کرتے ہیں تو گویا اسی کی عبادت کرتے ہیں، ان میں سب بتوں کی عبادت آ گئی، خواہ عورتوں کی شکل میں ہوں یا مردوں کی، مگر زنانی عورتوں کا ذکر صراحۃً فرمانا ان کی زیادہ حماقت ظاہر کرنے کے لیے ہے کہ ایسی ناقص الاوصاف کی بھی عبادت کرتے ہیں۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی ان مشرکوں نے اللہ کے سوا جو اپنا معبود بنایا تو ان بتوں کو جن کو عورتوں کے نام سے نامزد کر رکھا ہے، جیسے عزیٰ اور منات اور نائلہ وغیرہ اور حقیقۃ الامر دیکھئے تو یہ مشرکین شیطان سرکش ملعون الٰہی کی عبادت کرتے ہیں، اسی نے تو بہکا کر ایسا کرایا اور بت پرستی کرنے میں اس کی اطاعت اور اس کی عین خوشی ہے، اس سے مشرکین کی پرلے سرے کی ضلالت اور جہالت ظاہر فرمانی مقصود ہے۔

دیکھئے! اول تو اللہ کے سوا کسی کو معبود بنانا اس سے بڑھ کر ضلالت کیا ہو سکتی ہے! پھر بنایا تو کس کو؟ پتھروں کو! جن میں کسی قسم کی حس و حرکت بھی نہیں اور عورتوں کے نام سے موسوم ہیں اور کس کے بتلانے سے؟ شیطان مردود و ملعون خداوندی کے بہکانے سے! کیا اس ضلالت اور جہالت کی نظیر مل سکتی ہے اور کوئی احمق سے احمق بھی اس کو قبول کر سکتا ہے۔

فائدہ: ۲؎ یعنی جب شیطان سجدہ نہ کرنے پر ملعون اور مردود کیا گیا تو اس نے تو اسی وقت کہا تھا کہ میں تو غارت ہو ہی چکا، مگر میں بھی تیرے بندوں اور اولاد آدم میں سے اپنے لئے ایک مقدار معلوم اور بڑا حصہ لوں گا، یعنی ان کو گمراہ کر کے اپنے ساتھ جہنم میں لے جاؤں گا، جیسا کہ سورہ حجر

اور بنی اسرائیل وغیرہ میں مذکور ہے، مطلب یہ ہوا کہ متمرد اور ملعون ہونے کے علاوہ شیطان تو جملہ بنی آدم کا اول روز سے سخت دشمن اور بدخواہ ہے اور اس دشمنی کو صاف ظاہر کر چکا ہے تو اب یہ احتمال بھی نہ رہا کہ گو شیطان ہر طرح سے خبیث و گمراہ ہے، مگر شاید کسی کو خیر خواہانہ کوئی نفع کی بات بتلا دے، بلکہ یہ معلوم ہو گیا کہ وہ دشمن ازلی تو بنی آدم کو جو کچھ بتلائے گا ان کی گمراہی اور بربادی ہی کی بات بتلائے گا، پھر ایسے گمراہ اور بدخواہ کی اطاعت کرنی کس قدر جہالت اور نادانی ہے، "حصہ مقرر" لینے کے ایک معنی یہ بھی ہیں کہ تیرے بندے اپنے مال میں میرا حصہ ٹھہرائیں گے، جیسا کہ لوگ بت یا جن وغیرہ غیر اللہ کی نذر اور نیاز کرتے ہیں۔

وَّلَاُضِلَّنَّهُمْ وَلَاُمَنِّيَنَّهُمْ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ اٰذَانَ الْاَنْعَامِ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ

اور ان کو بہکاؤں گا اور ان کو امیدیں دلاؤں گا اور ان کو سکھلاؤں گا کہ چیریں جانوروں کے کان اور ان کو سکھلاؤں گا کہ بدلیں صورتیں

خَلْقَ اللّٰهِ ۭ وَمَنْ يَّتَّخِذِ الشَّيْطٰنَ وَلِيًّا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُّبِيْنًا ﴿۱۱۹﴾

بنائی ہوئی اللہ کی ؎ اور جو کوئی بنائے شیطان کو دوست اللہ کو چھوڑ کر تو وہ پڑا صریح نقصان میں

خلاصہ تفسیر: اور (اس حصہ کی تفصیل یہ ہے کہ:) میں ان کو (عقائد میں) گمراہ کروں گا اور میں ان کو (خیالات میں) ہوسیں دلاؤں گا (جس سے گناہ کی طرف میلان ہو اور اُن کا نقصان نظر میں نہ رہے) اور میں ان کو (برے اعمال کرنے کی) تعلیم دوں گا جس سے وہ (بتوں کے نام پر) چوپاؤں کے کانوں کو تراشا کریں گے (اور یہ اعمال کفریہ میں سے ہے) اور میں ان کو (اور بھی) تعلیم دوں گا جس سے وہ اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی صورت کو بگاڑا کریں گے (اور یہ اعمال فسق میں سے ہے، جیسے ڈاڑھی منڈانا، بدن گدوانا وغیرہ) اور جو شخص اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر شیطان کو اپنا رفیق بنا دے گا (یعنی اللہ کی اطاعت نہ کرے اور شیطان کی اطاعت کرے) وہ (شخص) صریح نقصان (وخسارے) میں واقع ہوگا (وہ نقصان جہنم میں جانا ہے)۔

وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ: مفسرین نے صورت بگاڑنے میں ڈاڑھی منڈانے کو بھی شامل کیا ہے، چنانچہ یہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ جس طریق میں ڈاڑھی منڈانا شعار ہو وہ شیطانی طریق ہے اگرچہ بعض جاہل صوفیا نے ڈاڑھی منڈانے کو طریق قلندریہ کہا ہے، لیکن مذکورہ آیت میں اسے شیطانی عمل قرار دیا ہے (اسی طرح مرد کو عورتوں کی شکل اختیار کرنا اور عورتوں کو مردوں کی نقل کرنا، لباس، چال ڈھال، وضع قطع میں یا آپریشن کروا کر جنس تبدیل کروا لینا وغیرہ سب اسی شیطانی عمل میں آجاتا ہے)۔

* * *

فائدہ: ؎ یعنی جو لوگ میرے حصہ میں آئیں گے ان کو طریق حق سے گمراہ کروں گا اور ان کو حیات دنیاوی اور خواہشات دنیاوی کے حصول کی اور قیامت اور حساب و کتاب امور اخروی کے نہ ہونے کی آرزو دلاؤں گا اور اس بات کی تعلیم دوں گا کہ جانوروں کے کان چیر کر بتوں کے نام پر ان کو چھوڑیں گے اور اللہ کی پیدا کی ہوئی صورتوں کو اور اس کی مقرر کی ہوئی باتوں کو بدل ڈالیں گے۔

فائدہ: کافروں کا دستور تھا گائے بکری اور اونٹ کا بچہ بت کے نام کر دیتے اور اس کا کان چیر کر یا اس کے کان میں نشانی ڈال کر چھوڑ دیتے اور صورت بدلنا جیسے خوجہ کرنا، یا بدن کو سوئی سے گود کر تل بنانا، یا نیلا داغ دینا، یا بچوں کے سر پر چوٹیاں رکھنا کسی کے نام کی، مسلمانوں کو ان کاموں سے بچنا ضرور ہے، داڑھی منڈوانا بھی اسی تغیر میں داخل ہے، اور اللہ کے جتنے احکام ہیں کسی میں تغیر کرنا بہت سخت بات ہے، جو چیز اس نے حلال کر دی اس کو حرام کرنا یا حرام کو حلال کرنا اسلام سے نکال دیتا ہے تو جو کوئی ان باتوں میں مبتلا ہو اس کو یقین کر لینا چاہیے کہ میں شیطان کے مقررہ حصہ میں داخل ہوں جس کا ذکر گزرا۔

يَعِدُهُمْ وَيُمَنِّيهِمْ ۖ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ﴿۱۲۰﴾ اُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۡ

ان کو وعدہ دیتا ہے اور ان کو امیدیں دلاتا ہے، اور جو کچھ وعدہ دیتا ہے ان کو شیطان سو سب فریب ہے، ایسوں کا ٹھکانا ہے دوزخ

وَلَا يَجِدُوْنَ عَنْهَا مَحِيْصًا ﴿۱۲۱﴾

اور نہ پائیں گے وہاں سے کہیں بھاگنے کو جگہ

خلاصہ تفسیر: شیطان ان لوگوں سے (عقائد کے متعلق جھوٹے) وعدے کیا کرتا ہے (کہ تم بےفکر رہو، نہ کہیں حساب ہے نہ کتاب ہے) اور (خیالات میں) ان کو ہوسیں دلاتا ہے (کہ اس گناہ میں ایسی لذت ہے، اس حرام ذریعہ میں ایسی آمدنی ہے اور شیطانی اعمال کا وجود اور لغویت اور نقصان خود ظاہر ہے) اور شیطان ان سے صرف جھوٹے (فریب آمیز) وعدے کرتا ہے (کیونکہ واقع میں حساب و کتاب حق ہے اور اس کی ہوسوں کا فریب ہونا تو بہت جلدی کھل جاتا ہے) ایسے لوگوں کا (جو کہ شیطان کی راہ پر چلتے ہیں) ٹھکانا جہنم ہے (اور وہ خسران مبین یہی ہے) اور اس (جہنم) سے کہیں بچنے کی جگہ نہ پائیں گے (کہ وہاں جا کر پناہ لیں)۔

پیچھے شیطان کی عبادت کرنے کا بیان ہوا، اس کے بعد شیطان کی چند صفات مقصود کی تاکید کے لیے بیان فرمائیں، یعنی ایسے شیطان کی عبادت کرتے ہیں جو اولاتو سرکش ہے، پھر سرکشی کی وجہ سے ملعون ہے، تیسرے انسان کا دشمن ہے، پھر اس کی دشمنی ظاہر کرنے کے لیے اس کی چند باتیں بیان فرمائیں، مگر یہ ضروری نہیں کہ جتنی باتیں یہاں مذکور ہیں وہ سب کفر و شرک ہی ہوں بلکہ بعض ان میں فسق اور معصیت ہیں۔

* * *

فائدہ: یعنی جب شیطان کی خباثت و شرارت اور اس کی عداوت کی کیفیت خوب معلوم ہو چکی تو اب اس میں کچھ شک نہ رہا کہ اپنے سچے معبود سے منحرف ہو کر جو کوئی اس کی موافقت کرے گا سخت نقصان میں پڑے گا، اس کے تمام وعدے اور امیدیں محض فریب ہیں، نتیجہ یہ ہوگا کہ ان سب کا ٹھکانا دوزخ ہے، اس سے نکلنے کی کوئی صورت نہ ہوگی۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ

اور جو لوگ ایمان لائے اور عمل کئے اچھے ان کو ہم داخل کرینگے باغوں میں کہ جن کے نیچے بہتی ہیں نہریں رہا کریں ان میں ہی

اَبَدًا ۖ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ۖ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا ﴿۱۲۲﴾

ہمیشہ، وعدہ ہے اللہ کا سچا، اور اللہ سے سچا کون

خلاصہ تفسیر: پیچھے کفار مشرکین کیلئے وعید تھی، اب مومنین کیلئے وعدہ اور بشارت ہے، جیسا کہ قرآن مجید کا طرز ہے۔

اور جو لوگ ایمان لائے اور (انہوں نے) اچھے کام کئے ہم ان کو عنقریب ایسے باغوں میں داخل کریں گے کہ ان کے (محلات کے) نیچے نہریں جاری ہوں گی، وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، اللہ تعالیٰ نے اسکا وعدہ فرمایا ہے اور سچا وعدہ فرمایا ہے اور اللہ تعالیٰ سے زیادہ کس کا کہنا صحیح ہوگا۔

وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا: اس کے متعلق کچھ باتیں اسی سورت کی آیت ۸۷: وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا میں گزر چکی ہیں وہاں ملاحظہ فرما لیا جائے۔

* * *

فائدہ: یعنی وہ لوگ جو شیطان کی خرابی سے محفوظ ہیں اور ارشاد خداوندی کے موافق ایمان لائے اور اچھے عمل کئے، وہ ہمیشہ کے لئے باغ و

بہار میں رہیں گے اور یہ اللہ کا وعدہ ہے جس سے سچی کسی کی بات نہیں ہو سکتی، پھر ایسے سچے وعدہ کو چھوڑ کر شیطان کی جھوٹی باتوں میں آنا کس قدر گمراہی اور کتنی بڑی مضرت کو سر پر لینا ہے۔

لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ ؕ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ ۙ وَلَا يَجِدْ لَهٗ

نہ تمہاری امیدوں پر مدار ہے اور نہ اہل کتاب کی امیدوں پر، جو کوئی برا کام کرے گا اس کی سزا پائے گا، اور نہ پائے گا

مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۱۲۳﴾ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ

اللہ کے سوا اپنا کوئی حمایتی اور نہ کوئی مددگار، اور جو کوئی کام کرے اچھے مرد ہو یا عورت اور وہ ایمان رکھتا ہو

فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا ﴿۱۲۴﴾

سو وہ لوگ داخل ہونگے جنت میں اور ان کا حق ضائع نہ ہوگا تل بھر

خلاصہ تفسیر: گذشتہ آیات میں جب معلوم ہو چکا تو تم کو چاہیے کہ اللہ کے وعدوں پر بھروسہ کر کے عمل کرو، شیطان کے جھوٹے وعدوں پر بھروسہ کر کے دھوکہ میں نہ آؤ، اصل اعتبار ایمان و عمل صالح کا ہے، آگے بھی یہی مضمون ہے، اہل کتاب کا ذکر اس میں اس لیے آیا کہ ان میں اور مسلمانوں میں ایک بار دین کے بارے میں تفاخر ہوا تھا۔

نہ تمہاری تمناؤں سے کام چلتا ہے اور نہ اہل کتاب کی تمناؤں سے (کہ خالی خولی زبان سے اپنے فضائل بیان کیا کریں، بلکہ اصل مدار اطاعت پر ہے، پس) جو شخص (اطاعت میں کمی کرے گا اور) کوئی برا کام کرے گا (خواہ وہ کمی عقائد میں ہو یا اعمال میں) وہ اس کے عوض میں سزا دیا جائے گا (اگر وہ برائی عقیدہ کفریہ تک ہے تب تو سزا دائمی اور یقینی، اور اگر اس سے کم ہے تو ہمیشہ کی سزا نہیں) اور اس شخص کو خدا کے سوا نہ کوئی یار ملے گا اور نہ مددگار ملے گا (کہ خدا کے عذاب سے اسے چھڑا لے) اور جو شخص کوئی نیک کام کرے گا خواہ وہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ مومن ہو، سو ایسے لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان پر ذرا بھی ظلم نہ ہوگا (کہ ان کی کوئی نیکی ضائع کر دی جائے)۔

خلاصہ یہ ہوا کہ نری تمناؤں سے کام نہیں چلتا، مگر مسلمان نری تمناؤں پر نہیں ہیں، بلکہ عمل کرتے ہیں، اور دوسرے فرقے جب اسلام نہ لائے جس پر سب کچھ موقوف ہے تو بس وہی نری تمناؤں پر رہ گئے۔

لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ: یہ اپنے مضمون کے عموم سے اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ بعض لوگ جو یہ دعویٰ کیا کرتے ہیں کہ چونکہ ہم اصحاب حال ہیں یا اہل کمال کی طرف منسوب ہیں تو ہم سے برے اعمال کا مواخذہ نہیں ہوگا، تو یہ دعویٰ محض باطل ہے، کیونکہ ایسے جھوٹے دعوے شریعت کے نزدیک مردود ہیں۔

* * *

فائدہ: کتاب والوں یعنی یہودیوں اور نصرانیوں کو خیال تھا کہ ہم خاص بندے ہیں جن گناہوں پر خلقت پکڑی جائے گی ہم نہ پکڑے جائیں گے، ہمارے پیغمبر حمایت کر کے ہم کو بچالیں گے اور نادان اہل اسلام بھی اپنے حق میں یہی خیال کر لیا کرتے ہیں، سو فرما دیا کہ نجات اور ثواب کسی کی امید اور خیال پر موقوف اور منحصر نہیں جو برا کرے گا پکڑا جائے گا، کوئی ہو، اللہ کے عذاب کے وقت کسی کی حمایت کام نہیں آسکتی، اللہ جس کو پکڑے وہی چھوڑے تو چھوٹے، دنیا کی مصیبت اور بیماری کو دھیان کر لو۔

اور جو کوئی عمل نیک کریگا بشرطیکہ ایمان بھی رکھتا ہو، سو ایسے لوگ جنت میں جائیں گے اور اپنی نیکیوں کا پورا ثواب پائیں گے، خلاصہ یہ کہ ثواب و عقاب کا تعلق اعمال سے ہے، کسی کی امید اور آرزو سے کچھ نہیں ہوتا، سو ان امیدوں پر لات مارو اور نیک کاموں میں ہمت کرو۔

وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَّاتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ؕ

اور اس سے بہتر کس کا دین ہوگا جس نے پیشانی رکھی اللہ کے حکم پر اور نیک کاموں میں لگا ہوا ہے اور چلا دین ابراہیم پر جو ایک ہی طرف کا تھا

وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا ﴿۱۲۵﴾

اور اللہ نے بنالیا ابراہیم کو خالص دوست

خلاصہ تفسیر: اور (گذشتہ آیت میں جو ''مؤمن'' کی قید لگائی گئی ہے اس کا مصداق ہر فرقہ نہیں، بلکہ صرف وہ فرقہ ہے جس کا دین اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول ہونے میں سب سے اچھا ہو، اور ایسا فرقہ صرف اہل اسلام ہیں، جس کی دلیل یہ ہے کہ ان میں یہ صفات ہیں: تکمیل اطاعت، اخلاص، ملت ابراہیم کی پیروی اور) ایسے شخص (کے دین) سے زیادہ بہتر کس کا دین ہوگا جو کہ اپنا رخ اللہ تعالیٰ کی طرف جھکا دے (یعنی فرمانبرداری اختیار کرے، عقائد میں بھی اعمال میں بھی) اور (اس کے ساتھ) وہ مخلص بھی ہو (کہ دل سے فرمانبرداری اختیار کی ہو، خالی مصلحت اور ظاہرداری نہ ہو) اور وہ ملت ابراہیم (یعنی اسلام) کا اتباع کرے جس میں کجی کا نام نہیں، اور (ملت ابراہیمی ضرور قابل اتباع ہے، کیونکہ) اللہ تعالیٰ نے ابراہیم کو اپنا خالص دوست بنایا تھا (تو ظاہر ہے کہ دوست کے طریقہ پر چلنے والا بھی محبوب و مقبول ہوگا، پس طریقہ اسلام مقبول ہوا، پس اہل اسلام ہی مومن کے لقب کے مصداق ٹھہرے اور دوسرے فرقوں نے ابراہیم کی پیروی کو چھوڑ دیا کہ اسلام نہ لائے، جس پر اصل مدار ہے، اس لئے صرف مسلمان ہی ایسے ثابت ہوئے کہ محض امانی یعنی تمناؤں پر ان کا سہارا نہیں، بلکہ اطاعت گذار ہیں، بس کام بھی انہی کا چلے گا)۔

وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ، صوفیہ (اہل اللہ) کے طریق کا حاصل یہ باتیں ہیں: ① انقیاد (اطاعت) ظاہری و باطنی جو کہ اسلام کی تفسیر ہے ② احسان جس کی تفسیر حدیث میں ہے: ''ان تعبد الله كانك تراه'' ③ حنیفیت یعنی غیر اللہ سے یکسو ہو کر اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ کرنا، آیت میں اس مجموعہ کو احسن طریق کہا گیا ہے، تو آیت اس پر دال ہوئی کہ صوفیہ کا طریق احسن طریق ہے۔

وَّاتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ، ملت ابراہیمی کی تحقیق اور اس کا مصداق اسلام ہونا اور اتباع کے معنی یہ سب پہلے پارہ کے آخر میں بیان ہو چکا ہے۔

وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا: ''خلیل'' ہونا اعلیٰ درجہ کا قرب ہے، حدیث میں ہے کہ ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی حق تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کی طرح خلیل بنایا ہے، اور اس سے بڑھ کر یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ''حبیب'' بھی بنایا ہے۔

* * *

فائدہ: پہلے معلوم ہو چکا کہ اللہ کے نزدیک اعمال کا اعتبار ہے، بیہودہ آرزو کا کوئی نتیجہ نہیں، اہل کتاب وغیرہ سب کے لئے یہی قاعدہ مقرر ہے جس میں اشارہ تھا اہل اسلام یعنی حضرات صحابہ کی تعریف اور فضیلت کی طرف اور اہل کتاب کی مذمت اور برائی کی طرف، اب کھول کر فرماتے ہیں کہ دینداری میں ایسے شخص کا مقابلہ کون کر سکتا ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے حکم پر سر رکھے ہوئے ہو اور نیک کاموں میں دل سے لگا ہوا ہو اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین کی سچی پیروی کرتا ہو جو سب کو چھوڑ کر اللہ کا ہو گیا تھا اور اس کو اللہ نے اپنا دوست بنا لیا، ظاہر ہے کہ یہ تینوں خوبیاں حضرات صحابہ میں علیٰ وجہ الکمال موجود تھیں نہ کہ اہل کتاب میں، اب اس سے اہل کتاب کی وہ آرزو جو پہلے گزری لغو محض اور باطل ہو گئی۔

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطًا ﴿۱۲۶﴾ ع ۱۸/۱۵

اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ ہے زمین میں، اور سب چیزیں اللہ کے قابو میں ہیں

خلاصہ تفسیر: اور (اللہ تعالیٰ کی مکمل فرمانبرداری کرنا تو ضروری ہے، کیونکہ ان کی سلطنت و قدرت اور ان کا علم محیط دونوں تام اور کامل ہیں اور یہی امور اطاعت واجب ہونے کا مدار ہیں، چنانچہ) انہی کی ملک ہے جو کچھ بھی آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے (یہ تو کمال

سلطنت ہوا) اور اللہ تعالیٰ تمام چیزوں کو (اپنی علم میں) احاطہ فرمائے ہوئے ہیں (یہ کمال علم ہوا)۔

* * *

فائدہ: یعنی زمین اور آسمان میں جو کچھ ہے سب اس کے بندے اور اس کی مخلوق اور مملوک ہیں اور اس کے قبضہ میں ہیں، اپنی رحمت اور حکمت سے جس کے ساتھ جیسا چاہے معاملہ کرے، اس کو کسی کی حاجت نہیں، "خلیل" بنانے سے کوئی دھوکا نہ کھائے اور اہل عالم کے جملہ اعمال خیر وشر کی جزا اور سزا میں تردد نہ کرے۔

وَيَسْتَفْتُونَكَ فِي النِّسَآءِ ؕ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيكُمْ فِيهِنَّ ۙ وَمَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ فِي يَتٰمَى

اور تجھ سے رخصت مانگتے ہیں عورتوں کے نکاح کی، کہہ دے اللہ تم کو اجازت دیتا ہے انکی، اور وہ جو تم کو سنایا جاتا ہے قرآن میں سو حکم ہے ان یتیم

النِّسَآءِ الّٰتِي لَا تُؤْتُونَهُنَّ مَا كُتِبَ لَهُنَّ وَتَرْغَبُونَ اَنْ تَنْكِحُوهُنَّ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ

عورتوں کا جن کو تم نہیں دیتے جو ان کے لئے مقرر کیا ہے اور چاہتے ہو کہ ان کو نکاح میں لے آؤ اور حکم ہے ناتوان

الْوِلْدَانِ ۙ وَاَنْ تَقُومُوا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ ؕ وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِهٖ عَلِيمًا ﴿۱۲۷﴾

لڑکوں کا، اور یہ کہ قائم رہو یتیموں کے حق میں انصاف پر، اور جو کرو گے بھلائی سو وہ اللہ کو معلوم ہے۔

خلاصہ تفسیر: شروع سورت میں یتیموں اور عورتوں کے احکام اور ان کے حقوق ادا کرنے کا حکم تھا، کیونکہ جاہلیت میں عورتوں کو میراث سے مختلف انداز سے محروم رکھا جاتا تھا، پیچھے ان سب کی ممانعت کردی گئی، اس پر مختلف واقعات پیش آئے، بعض کو تو یہ خیال ہوا کہ عورتیں اور بچے حقیقت میں میراث کے مستحق نہیں، کسی وقتی مصلحت سے یہ حکم چند لوگوں کے لئے ہوگیا ہے، امید ہے کہ پھر منسوخ ہوجائے گا، کچھ دن اس کے منتظر رہے جب نسخ نہ ہوا تو حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر پوچھا، بعض کو یہ اتفاق ہوا کہ ان کی پرورش میں بدصورت یتیم لڑکی تھی، بدصورتی کی وجہ سے خود تو نکاح نہیں کیا، اور دوسرے سے اس لیے نہ کیا کہ مال بھی اس کے ساتھ جائے گا، اس بارہ میں حضور سے سوال کیا، سوال سے غرض غالباً یہ ہوگی کہ کوئی آسان حکم آجائے، مثلاً یہی کہ اس شخص کو پرورش کے حق کی وجہ سے مال میں سے کچھ حصہ مل جائے، اس پر یہ آیتیں نازل ہوئیں، جن کا مطلب یہ ہے کہ جیسے ان کی بدصورتی میں فاسد غرض کی وجہ سے ان سے نکاح نہیں کیا کرتے تو ان کے مرغوب وزیبا ہونے کی صورت میں بھی کیوں نکاح کرتے ہو، ہاں پورا مہر دو تو مضائقہ نہیں، غرض مقصود یہ ہے کہ میراث کا حکم اب بھی اپنے حال پر باقی ہے، منسوخ نہیں کیا جائے گا۔

سو اس آیت کا ربط سورت کے شروع سے ہے، درمیان میں مختلف مضامین آتے گئے، تفسیر کبیر میں ہے کہ یہ طرز نہایت موثر اور قلوب میں بہت وقعت رکھتا ہے کہ یہ حکم دوبارہ ذکر کردیا، پھر وعدہ وعید کا ذکر آگیا، پھر عظمت الٰہی کا ذکر ہونے لگا، اس میں ساتھ ساتھ خوف ورغبت اور حاکم حقیقی کا مراقبہ بھی ہوتا رہتا ہے اور قرآن مجید کا یہی طرز ہے۔

اور لوگ آپ سے عورتوں (کی میراث اور مہر) کے باب میں حکم دریافت کرتے ہیں، آپ فرما دیجئے کہ اللہ تعالیٰ ان کے بارے میں تم کو (وہی سابق) حکم دیتے ہیں اور وہ آیات بھی (تم کو حکم دیتی ہیں) جو کہ (اس سے قبل نازل ہوچکی ہیں، اور) قرآن کے اندر تم کو پڑھ کر سنائی جایا کرتی ہیں (کیونکہ ظاہر ہے کہ قرآن کی تلاوت میں ان کی تلاوت بھی ہوا ہی کرتی تھی) جو کہ ان یتیم عورتوں کے باب میں (نازل ہوچکی) ہیں جن (کے ساتھ تمہارا یہ معاملہ ہے کہ اگر وہ مالدار اور صاحب جمال ہوئیں تو ان سے نکاح کرتے ہو، مگر ان) کو جو (شرع سے) ان کا حق (میراث اور مہر کا) مقرر ہے نہیں دیتے ہو، اور (اگر صاحب جمال نہ ہوئیں صرف مالدار ہوئیں تو) ان کے ساتھ (خوب صورت نہ ہونے کی وجہ سے) نکاح کرنے سے نفرت کرتے ہو (اور مال ہاتھ سے جانے کے خوف سے انہیں کسی اور سے بھی نکاح نہیں کرنے دیتے) اور (جو آیات کہ) کمزور بچوں کے باب میں (ہیں) اور (جو

آیات کہ) اس باب میں (ہیں) کہ یتیموں کی (تمام) کارگزاری (عام اس سے کہ مہر اور میراث کے متعلق ہو یا اور کچھ ہو) انصاف کے ساتھ کرو (یہ مضمون ہے ان سابقہ آیات کا، پس وہ آیتیں اپنا مضمون اب بھی تمہارے ذمہ واجب کر رہی ہیں اور ان کا حکم بعینہ باقی ہے، کوئی نیا حکم نہیں دیا جاتا تم انہی کے موافق عمل رکھو) اور جو نیک کام کرو گے (عورتوں اور یتیموں کے بارے میں، یا دیگر امور میں بھی) سو بلاشبہ اللہ تعالیٰ اس کو خوب جانتے ہیں (تم کو ان کی جزاء خیر دیں گے اور نیک کام کے علاوہ کو بھی جانتے ہیں، لیکن یہاں چونکہ خیر کی ترغیب دینا مقصود ہے اس لئے خاص اسی کا ذکر کیا گیا)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ اس سورت کے اول میں تاکید فرمائی تھی یتیموں کے حق ادا کرنے کی اور فرمایا تھا کہ یتیم لڑکی جس کا ولی مثلاً چچا کا بیٹا ہو اگر جانے کہ میں اس کا حق پورا ادا نہ کر سکوں گا تو خود اس لڑکی سے نکاح نہ کرے، بلکہ کسی اور سے اس کا نکاح کر دے اور آپ اس کا حمایتی بنا رہے، اس پر مسلمانوں نے ایسی عورتوں سے نکاح کرنا موقوف کر دیا تھا، مگر تجربہ سے معلوم ہوا کہ بعضی جگہ لڑکی کے حق میں یہی بہتر ہے کہ اس کا ولی ہی اپنے نکاح میں لائے جیسی رعایت وہ کرے گا غیر نہ کرے گا، تب مسلمانوں نے حضرت محمد ﷺ سے نکاح کی اجازت مانگی، اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور رخصت مل گئی اور فرمایا کہ وہ جو پہلی ممانعت سنائی گئی تھی وہ خاص اس صورت میں تھی کہ ان کا حق پورا ادا نہ کرو، اور یتیموں کے حق ادا کرنے کی تاکید کی گئی تھی اور جو یتیموں کے ساتھ سلوک اور بھلائی کرنے کے ارادہ سے ایسا نکاح کیا جائے تو اجازت ہے۔

فائدہ: عرب والے عورتوں بچوں یتیموں کو بعض حقوق میں محروم رکھتے تھے، میراث نہ دیتے تھے اور کہتے تھے کہ میراث اس کا حق ہے جو دشمنوں سے لڑائی کرے، یتیم لڑکیوں سے ان کے اولیاء نکاح کر کے نفقہ اور مہر میں کمی اور ان کے مال میں بیجا تصرف کرتے تھے، چنانچہ اس سورت کے اول میں ان باتوں کی تاکیدات گزر چکیں، اب اس موقع پر چند رکوع پہلے سے جو ارشاد چلا آ رہا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ واجب الاتباع حکم الٰہی ہے، کسی کی عقل، کسی کا دستور، کسی کا حکم، کسی کی آرزو اور قیاس قابل اعتبار نہیں ہو سکتا، اللہ تعالیٰ کے حکم کے سامنے کسی کی بات سننی اور اللہ کے حکم کو چھوڑ کر اس پر عمل کرنا صریح کفر اور گمراہی ہے اور اس مضمون کو طرح طرح سے تاکیدات بلیغہ کے ساتھ ظاہر کر کے دکھلایا ہے۔

اب اس کے بعد آیات سابقہ کا حوالہ دے کر بعضے اور مسائل عورتوں اور یتیم لڑکیوں کے نکاح کے متعلق بتلائے جاتے ہیں تاکہ ان تاکیدات کے بعد کسی کو عورتوں کے حقوق دینے میں کوئی بات باقی نہ رہے، روایت ہے کہ جب عورتوں کے متعلق حضرت محمد ﷺ نے حکم میراث ظاہر فرمایا تو عرب کے بعض سردار آپ کی خدمت میں آئے اور تعجب سے کہا کہ ہم نے سنا ہے کہ آپ بہن اور بیٹی کو میراث دلواتے ہیں، حالانکہ میراث تو ان کا حق ہے جو دشمنوں سے لڑیں اور غنیمت کا مال لائیں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ بیشک اللہ تعالیٰ کا یہی حکم ہے کہ ان کو میراث دی جائے، نیز اشارہ ہے اس طرف کہ ارشاد: وَمَنۡ اَحۡسَنُ دِيۡنًا مِّمَّنۡ اَسۡلَمَ وَجۡهَهٗ لِلّٰهِ (النساء: ۱۲۵) کے مصداق حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین ہیں کہ نکاح مہر نفقہ معاملات میں اپنے زیردستوں کی ادنیٰ حق تلفی روا نہیں رکھتے اور حکم خداوندی کے مقابلہ میں اپنے منافع اور اغراض ذاتی اور اپنی قوم کے رسم و رواج کی اصلاً پروا نہیں کرتے، یہی حکم الٰہی کی مخالفت کے احتمال سے بھی پرہیز کرتے ہیں جو کرتے ہیں صاف اجازت لینے کے بعد کرتے ہیں، واللہ اعلم۔

فائدہ: ۲؎ یعنی اللہ کو تمہاری ذرہ ذرہ بھلائی معلوم ہے، سو یتیموں اور عورتوں کے حق میں جو بھلائی کرو گے اسکا ثواب ضرور پاؤ گے۔

وَاِنِ امۡرَاَةٌ خَافَتۡ مِنۡۢ بَعۡلِهَا نُشُوۡزًا اَوۡ اِعۡرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡهِمَاۤ اَنۡ يُّصۡلِحَا بَيۡنَهُمَا

اور اگر کوئی عورت ڈرے اپنے خاوند کے لڑنے سے یا جی پھر جانے سے تو کچھ گناہ نہیں دونوں پر کہ کر لیں آپس میں

صُلۡحًا ؕ وَالصُّلۡحُ خَيۡرٌ ؕ وَاُحۡضِرَتِ الۡاَنۡفُسُ الشُّحَّ ؕ وَاِنۡ تُحۡسِنُوۡا وَتَتَّقُوۡا فَاِنَّ اللّٰهَ

کسی طرح صلح، اور صلح خوب چیز ہے ۱؎ اور دلوں کے سامنے موجود ہے حرص ۲؎ اور اگر تم نیکی کرو اور پرہیزگاری کرو تو اللہ کو

كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۱۲۸﴾

تمہارے سب کاموں کی خبر ہے۔

خلاصہ تفسیر: پیچھے گزشتہ احکام کی طرف رجوع کیا، جس میں عورتوں کے احکام بھی تھے، آگے بھی عورتوں کے بعض احکام کی طرف رجوع ہے جو شوہروں کے متعلق ہیں جس کا بیان پہلے بھی اصلاح کے عنوان سے آچکا ہے، پس گویا یہ اسی کا تتمہ ہے۔

اور اگر کسی عورت کو (قرائن سے) اپنے شوہر سے غالب احتمال بددماغی (اور بداخلاقی) یا بے پرواہی (اور بے رخی) کا ہو، سو (ایسی حالت میں) دونوں کو اس امر میں کوئی گناہ نہیں کہ دونوں باہم ایک خاص طور پر صلح کرلیں (یعنی عورت اگر ایسے شوہر کے پاس رہنا چاہے جو اس کے پورے حقوق ادا نہیں کرتا اس لئے اس کو چھوڑنا چاہتا ہے تو عورت کو جائز ہے کہ اپنے کچھ حقوق چھوڑ دے، مثلاً نان نفقہ معاف کردے، یا مقدار کم کردے، یا اپنی باری معاف کردے تاکہ وہ چھوڑے نہیں اور شوہر کو بھی جائز ہے کہ اس معافی کو قبول کرلے) اور (نزاع یا فراق سے تو) یہ صلح (ہی) بہتر ہے، اور (ایسی صلح ہوجانا کچھ بعید نہیں، کیونکہ) نفوس کو (طبعاً) حرص کے ساتھ اقتران (میلان و اتصال) ہوتا ہے (جب اس کی حرص پوری ہوجاتی ہے راضی ہوجاتا ہے، پس شوہر جب دیکھے گا کہ میری طبعی حرص یعنی میری مالی اور جانی آزادی میں کچھ خلل نہیں آتا اور مفت میں عورت ملتی ہے تو وہ اس بیوی کو نکاح میں رکھنے پر راضی ہوجائے گا، اور بیوی کی حرص نکاح میں رہنے پر خواہ کسی وجہ سے ہو ظاہر ہے جو کہ صلح کا سبب اصلی ہے، پس میاں بیوی دونوں کی خاص خاص حرص نے اس صلح کی تکمیل کردی) اور (اے مردوں!) اگر تم (خود عورتوں کے ساتھ) اچھا برتاؤ رکھو (اور ان سے حقوق معاف کرانے کے خواہاں نہ ہو) اور ان کے ساتھ (بداخلاقی اور بے رخی کرنے سے) احتیاط رکھو تو (تم کو بڑا ثواب ملے، کیونکہ) بلاشبہ حق تعالیٰ تمہارے اعمال کی پوری خبر رکھتے ہیں (اور نیک اعمال پر ثواب دیا کرتے ہیں)۔

وَأُحْضِرَتِ الْأَنْفُسُ الشُّحَّ: اس کی تقریر اس طرح بھی ہوسکتی ہے کہ: "اور (اگرچہ یہ صلح تو ہوگئی، لیکن اکثر ایسی صلح کم باقی رہ پاتی ہے، کیونکہ) نفوس کو حرص کے ساتھ اقتران (میلان) ہے (اس لیے عجب نہیں کہ کچھ عرصے بعد بیوی کو پھر اپنے حقوق کی حرص کا جوش اٹھے اور ادھر مرد کو اپنی آزادی کی حرص تو ہے ہی، اس لیے عورت پھر اپنے حقوق کا مطالبہ کرے، جیسا کہ اس کو شرعاً اجازت بھی ہے، اور مرد ادا نہ کرنا چاہے اور نزاع پیدا ہو جس کا انجام پھر وہی علیحدگی ہے)" حاصل یہ کہ بیوی کے لیے ان الفاظ میں صاف ترغیب ہے کہ وہ اپنے کچھ حقوق بلا سے چھوڑ ہی دے، نکاح تو قائم رہے، شوہر جب دیکھے گا کہ اس کے اپنے حقوق و منافع میں کچھ فرق نہیں آتا اور بیوی ہی اپنے بعض حقوق کا مطالبہ چھوڑ رہی ہے تو عجب نہیں کہ مصالحت پر جلد آمادہ ہوجائے۔

نان و نفقہ اور باری کی قبیل سے جو حقوق عورت نے معاف کیے ہیں، عورت کو ہر وقت اختیار ہے کہ آئندہ کے لیے پھر ان حقوق کا مطالبہ کرنے لگے، اگر شوہر نکاح میں رکھنا چاہے گا تو ان حقوق کا ادا کرنا واجب ہوگا، ماضی میں کسی حق کو ساقط کرنے سے مستقبل میں اس حق کا ساقط ہوجانا لازم نہیں۔

واحضرت الانفس الشح: "انفس" کے عموم سے آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ طبعی امور یا طبعی خصلتیں کاملین سے بھی زائل نہیں ہوتیں، سو اگر کسی کامل میں ان کے کچھ آثار لوٹ کر آئیں تو یہ کمال کے خلاف نہیں جبکہ اس پر اصرار نہ ہو، یعنی طبعی خصلتوں پر کنٹرول کرنے کے باوجود اگر کوئی خصلت جیسے حرص وغیرہ دوبارہ ظاہر ہوجائے تو یہ کمال کے خلاف نہیں، ہاں اس پر ہمیشگی نہ کرے، بلکہ جلد ترک کرنے کی کوشش کرے۔

* * *

فائدہ: ۱۔ **وَالصُّلْحُ خَيْرٌ:** یعنی اگر کوئی عورت خاوند کا دل اپنے سے پھرا دیکھے اور اس کو خوش اور متوجہ کرنے کو اپنے مہر یا نفقہ وغیرہ میں سے کچھ چھوڑ کر اس کو راضی کرلے تو اس مصالحت میں کسی کے ذمہ کچھ گناہ نہیں زوجین میں مصالحت اور موافقت بہت ہی اچھی بات ہے، البتہ بے وجہ عورت کو تنگ کرنا اور بلا رضا اس کے مال میں تصرف کرنا گناہ ہے۔

فائدہ: ۲۔ وَاُحۡضِرَتِ الۡاَنۡفُسُ الشُّحَّ: یعنی اپنے نفع اور مال کی حرص اور بخیلی ہر ایک کے جی میں گھسی ہوئی ہے، سو نظر بر مصلحت اگر عورت مرد کو کچھ نفع پہنچائے گی تو مرد خوش ہو جائے گا۔

فائدہ: ۳۔ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِيۡرًا: یعنی اگر عورتوں کے ساتھ سلوک نیک کرو گے اور بدسلوکی اور لڑائی سے پرہیز رکھو گے تو اللہ تعالیٰ تو تمہاری سب باتوں سے خبردار ہے اس نیکی کا ثواب ضرور عنایت کرے گا، ظاہر ہے کہ اس صورت میں نہ اعراض اور نہ خوشی کی نوبت آئے گی اور نہ راضی کرنے اور اپنے کسی حق کے چھوڑنے کی ضرورت ہوگی۔

وَلَنۡ تَسۡتَطِيۡعُوۡۤا اَنۡ تَعۡدِلُوۡا بَيۡنَ النِّسَآءِ وَلَوۡ حَرَصۡتُمۡ فَلَا تَمِيۡلُوۡا كُلَّ الۡمَيۡلِ فَتَذَرُوۡهَا

اور تم ہرگز برابر نہ رکھ سکو گے عورتوں کو اگرچہ اس کی حرص کرو سو بالکل پھر بھی نہ جاؤ کہ ڈال رکھو ایک عورت کو

كَالۡمُعَلَّقَةِ ؕ وَاِنۡ تُصۡلِحُوۡا وَتَتَّقُوۡا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوۡرًا رَّحِيۡمًا ﴿۱۲۹﴾

جیسے ادھر میں لٹکتی ۱؎ اور اگر اصلاح کرتے رہو اور پرہیزگاری کرتے رہو تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے ۲؎

خلاصہ تفسیر: پیچھے شوہر کی بے رخی اور بے پرواہی کا ذکر تھا، چونکہ اکثر بے رغبتی کا سبب دوسری بیوی کی محبت کا غلبہ ہوتا ہے، جو کہ غیر اختیاری بات ہے، لیکن ایسی صورت میں اختیاری حقوق ادا کرنا پھر بھی ضروری ہیں، چنانچہ فرماتے ہیں:

اور (عادتاً) تم سے یہ تو کبھی نہ ہو سکے گا کہ سب بیویوں میں (ہر طرح سے) برابری رکھو (حتی کہ قلبی محبت و رغبت میں بھی) گو (اگرچہ اس برابری کو) تمہارا کتنا ہی جی چاہے (اور تم کتنی ہی اس میں کوشش کرو، لیکن چونکہ قلب کا میلان غیر اختیاری ہے، اس لئے اس پر قدرت نہیں، اگرچہ اتفاقاً بلا اختیار کہیں برابری ہو بھی جائے تو آیت میں اس کا انکار مقصود نہیں، غرض جب اختیار میں نہیں تو تم اس کے مکلف نہیں، لیکن اس کے غیر اختیاری ہونے سے یہ تو لازم نہیں آتا کہ ظاہری حقوق بھی اختیاری نہ رہیں، بلکہ وہ تو اختیاری ہیں، جب وہ اختیاری ہیں) تو (تم پر واجب ہے کہ) تم بالکل ایک ہی طرف نہ ڈھل جاؤ (بالکل کا مطلب یہ کہ باطن سے بھی جس میں معذور تھے اور ظاہر سے بھی جس میں مختار ہو، یعنی شرعی حقوق میں ان سے نشوز و اعراض نہ کرو) جس سے اس (مظلومہ) کو ایسا کر دو جیسے کوئی اِدھر نہ اُدھر (یعنی بیچ میں) لٹکی ہو (یعنی نہ تو اس کے حقوق ادا کئے جائیں کہ خاوند والی سمجھی جائے اور نہ اس کو طلاق دی جائے کہ بے خاوند والی کہی جائے، بلکہ رکھو تو اچھی طرح رکھو) اور (رکھنے کی صورت میں جو زمانہ ماضی میں کچھ ناگوار معاملات ان سے کئے گئے) اگر (ان معاملات کی فی الحال) اصلاح کر لو اور (آئندہ زمانہ میں ایسے معاملات سے) احتیاط رکھو تو (وہ گزشتہ امور معاف کر دیئے جائیں گے، کیونکہ) بلاشبہ اللہ تعالیٰ بڑے مغفرت والے بڑی رحمت والے ہیں (چونکہ وہ گناہ جو حقوق العباد سے متعلق ہوں ان کی اصلاح خاص ان بندوں کے معاف کرنے سے ہوتی ہے، پس اصلاح میں یہ معافی بھی آگئی تو اس کے وقوع کے بعد توبہ شرعاً صحیح ہو گئی اس لئے مقبول ہو گئی)۔

وَلَنۡ تَسۡتَطِيۡعُوۡۤا اَنۡ تَعۡدِلُوۡا بَيۡنَ النِّسَآءِ: ازدواجی زندگی کو خوشگوار اور پائیدار بنانے کے لئے قرآن عظیم نے مذکورہ آیات میں جو ہدایتیں فریقین کو دی ہیں ان آیات میں ایک آیت یہ ہے جس میں فریقین کو ایک خاص ہدایت فرمائی، وہ یہ کہ ایک مرد کے نکاح میں ایک سے زائد عورتیں ہوں تو قرآن کریم نے سورۂ نساء کے شروع میں اس کو یہ ہدایت دی کہ سب بیویوں میں عدل و مساوات قائم رکھنا اس کے ذمہ فرض ہے اور جو خیال کرے کہ اس فرض کو میں ادا نہ کر سکوں گا تو اس کو چاہئے کہ ایک سے زائد بیویاں نہ کرے، ارشاد ہے: **فان خفتم الا تعدلوا فواحدۃ**، یعنی اگر تم کو یہ خطرہ ہو کہ دو بیویوں میں مساوات نہ کر سکو گے تو پھر ایک ہی پر اکتفا کرو"، اور رسول کریم ﷺ نے اپنے قول و عمل سے بیویوں میں عدل اور برابری کو نہایت تاکیدی حکم قرار دیا ہے اور اس کی خلاف ورزی پر سخت وعید سنائی ہے، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول کریم ﷺ اپنی ازواج مطہرات میں برابری اور عدل کا پورا اہتمام فرمایا کرتے تھے اور ساتھ ہی بارگاہ جل شانہ میں عرض کیا کرتے تھے: "اے اللہ: یہ میری منصفانہ تقسیم اور مساوات اس چیز

میں ہے جو میرے اختیار میں ہے، اس لئے جو چیز آپ کے اختیار میں ہے میرے اختیار میں نہیں، یعنی قلبی میلان اور رجحان اس میں مجھ سے مواخذہ نہ فرمائیے"، رسول کریم ﷺ سے زیادہ اپنے آپ پر قابو رکھنے والا کون ہوسکتا ہے؟ مگر قلبی میلان کو آپ نے بھی اپنے اختیار سے باہر قرار دیا اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عذر پیش کیا۔

سورۃ نساء کی شروع کی آیت کے ظاہری الفاظ سے بیویوں میں مطلقاً مساوات و برابری کا فرض ہونا معلوم ہوتا تھا، جس میں قلبی میلان میں بھی مساوات کرنا داخل ہے اور یہ معاملہ انسان کے اختیار میں نہیں، اس لئے سورۃ نساء کی اس آیت میں حقیقت حال کی وضاحت فرمادی کہ جن چیزوں پر تمہیں قدرت نہیں ہے ان میں مساوات فرض نہیں ہے، البتہ برابری اختیاری معاملات میں ہوگی، مثلاً شب باشی، طرز معاشرت اور نفقہ وغیرہ، اللہ تعالیٰ نے اس حکم کو اس عنوان سے بیان فرمایا، جس سے ایک شریف انسان عمل کرنے پر مجبور ہوجائے، فرمایا: ولن تستطیعوا ان تعدلوا بین النسآء ولو حرصتم الخ یعنی تمہیں معلوم ہے کہ تم سب بیویوں میں اگر کوشش بھی کرو تو قلبی میلان کے بارے میں مساوات نہیں کرسکتے، کیونکہ وہ تمہارے اختیار میں نہیں، تو پھر ایسا نہ کرو کہ پورے ہی ایک طرف ڈھل جاؤ، یعنی قلبی میلان تو اس طرف تھا ہی، اور اختیاری معاملات میں بھی اسی کو ترجیح دینے لگو، جس کا نتیجہ یہ ہوجائے کہ دوسری عورت لٹکی ہی رہ جائے، یعنی شوہر اس کے حقوق بھی ادا نہ کرے اور اس کو آزاد بھی نہ کرے۔

معلوم ہوا کہ اس آیت میں عدل پر کسی کی قدرت نہ ہونے کا جو ذکر ہے وہ قلبی میلان کی برابری ہے جو انسان کے اختیار میں نہیں اور اس آیت کے الفاظ: فلا تمیلوا کل المیل میں خود اس مفہوم کا قرینہ موجود ہے، کیونکہ معنی ان الفاظ کے یہ ہیں کہ اگرچہ قلبی میلان میں برابری تمہاری قدرت میں نہیں، مگر بالکل ایک ہی طرف کے نہ ہو رہو، کہ اختیاری معاملات میں بھی اس کو ترجیح دینے لگو، اس طرح یہاں یہ سورۃ نساء کی پہلی آیت کی تشریح بھی ہوگئی کہ اس کے ظاہری الفاظ سے قلبی میلان میں بھی مساوات کا فرض ہونا معلوم ہو رہا تھا، اس آیت نے اسے کھول دیا کہ یہ غیر اختیاری ہونے کی وجہ سے فرض نہیں، بلکہ اختیاری امور میں مساوات فرض ہے۔

اس آیت سے تعدد ازدواج کے خلاف استدلال قطعاً غلط ہے، مذکورہ تفصیل سے ان لوگوں کی غلط فہمی بھی واضح ہوگئی، جو ان دونوں آیتوں کو ملا کر یہ نتیجہ نکالنا چاہتے ہیں کہ شروع سورۃ نساء کی آیت نے یہ حکم دیا کہ اگر چند بیویوں میں مساوات نہ کرسکو تو پھر ایک ہی نکاح پر قناعت کرو، دوسرا نکاح نہ کرو، اور اس دوسری آیت نے یہ بتلادیا کہ دو بیویوں میں مساوات ممکن ہی نہیں، اس لئے نتیجہ یہ نکل آیا کہ دو بیویوں کو نکاح میں رکھنا ہی جائز نہیں اور عجب بات یہ ہے کہ اللہ جل شانہ نے خود ان دونوں آیتوں کے اندر اس غلط فہمی کے ازالہ کا سامان رکھ دیا ہے، دوسری آیت کا قرینہ ابھی گذر چکا ہے کہ فلا تمیلوا کل المیل کے الفاظ ہیں، اور پہلی آیت میں یہ فرمایا: فان خفتم الا تعدلوا فواحدۃ اس میں بطور شرط کے یہ فرمانا کہ "اگر تمہیں خطرہ ہو"، یہ لفظ کھلا ہوا قرینہ اس کا ہے کہ دو بیویوں میں عدل و برابری ناممکن یا اختیار سے خارج نہیں، ورنہ اس طویل عبارت کی اور پھر وہ بھی دو آیتوں میں کوئی ضرورت ہی نہ تھی، جیسے حرمت علیکم امھتکم وبنتکم والی آیت میں ان عورتوں کی تفصیل دی جن سے نکاح حرام ہے، اور وان تجمعوا بین الاختین فرما کر دو بہنوں کو نکاح میں جمع کرنے کی حرمت بتلائی گئی ہے، اسی طرح یہ بھی فرمادیا جاتا کہ ایک وقت میں ایک سے زائد بیویاں رکھنا حرام ہے اور پھر ان تجمعوا کے ساتھ بین الاختین کی قید فضول ہوجاتی، اسی ایک ہی جملہ میں یوں فرمادیا جاتا: و ان تجمعوا بین امراتین یعنی مطلقاً دو عورتوں کو نکاح میں جمع رکھنا حرام ہے، مگر قرآن کریم نے اس مختصر کلام کو چھوڑ کر نہ صرف ایک طویل عبارت اختیار کی، بلکہ دو آیتوں میں اس کی تفصیل بیان فرمائی، اب یہ بھی معلوم ہوا کہ آیت وان تجمعوا بین الاختین بھی ایک حیثیت سے اس کا جواز بتلا رہی ہے کہ ایک سے زائد عورتوں کو نکاح میں جمع رکھنا تو جائز ہے، مگر شرط یہ ہے کہ وہ دونوں آپس میں بہنیں نہ ہوں۔

ولن تستطیعوا ان تعدلوا بین النسآء: آیت سے معلوم ہوا کہ اگر کسی بھی عمل کے اعلیٰ درجہ پر قدرت نہ ہو تو اس کے ادنیٰ درجہ پر ہی عمل کرلے، اعلیٰ پر قادر ہونے کے انتظار میں نہ رہے، بعض لوگوں کی ساری عمر اسی انتظار میں ختم ہوجاتی ہے اور ادنیٰ سے بھی محروم رہتے ہیں (یہ نہ ہو کہ اعلیٰ درجہ کے کی امید میں ادنیٰ کو بھی ترک کردیا جائے)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی اگر کئی عورتیں نکاح میں ہوں تو یہ تو تم سے نہ ہو سکے گا کہ محبت قلبی اور ہر ہر امر میں بالکل مساوات اور برابری رکھو، مگر ایسا ظلم بھی نہ کرو کہ ایک طرف تو بالکل جھک جاؤ اور دوسری کو درمیان میں لٹکتی رکھو، نہ خود ہی آرام سے رکھو، نہ بالکل علیحدہ ہی کرد جو دوسرے سے نکاح کر سکے۔
فائدہ: ۲؎ یعنی اگر اصلاح اور مصالحت کا معاملہ کرو گے اور تعدی اور حق تلفی سے تابمقدور بچتے رہو گے تو اس کے بعد اللہ تعالیٰ معاف فرمانے والا ہے۔

وَاِنْ یَّتَفَرَّقَا یُغْنِ اللّٰهُ كُلًّا مِّنْ سَعَتِهٖ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ وَاسِعًا حَكِيْمًا ﴿۱۳۰﴾

اور اگر دونوں جدا ہو جائیں تو اللہ ہر ایک کو بے پروا کر دیگا اپنی کشایش سے، اور اللہ کشایش والا تدبیر جاننے والا ہے

خلاصہ تفسیر: اور اگر دونوں میاں بیوی (میں کسی طرح بھی موافقت نہ ہوئی اور دونوں) جدا ہو جائیں (یعنی خلع یا طلاق ہو جائے) تو (کوئی ان میں سے خواہ مرد اگر اس کی زیادتی ہے، یا عورت اگر اس کی کوتاہی ہے تو یوں نہ سمجھے کہ میرے بغیر اس دوسرے کا کام ہی نہ چلے گا، کیونکہ) اللہ تعالیٰ اپنی وسعت (قدرت) سے (دونوں میں سے) ہر ایک کو (دوسرے سے) بے احتیاج کر دیگا (یعنی ہر ایک کا مقدر کام دوسرے کے بغیر چل جائے گا) اور اللہ تعالیٰ بڑے وسعت والے اور بڑی حکمت والے ہیں (اپنی حکمت سے ہر ایک کے لیے مناسب سبیل نکال دیتے ہیں)۔

* * *

فائدہ: یعنی اگر زوجین جدائی ہی کو پسند کریں اور طلاق کی نوبت آئے تو کچھ حرج نہیں، اللہ تعالیٰ ہر ایک کا کارساز ہے اور سب کی حاجات کا پورا کرنے والا ہے، اس میں اشارہ ہے اس طرف کہ زوجہ کو راحت سے رکھے اور ایذا نہ دے اور اس پر قادر نہ ہو تو پھر طلاق دے دینا مناسب ہے، واللہ اعلم۔

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَلَقَدْ وَصَّيْنَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ

اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ ہے آسمانوں میں اور جو کچھ ہے زمین میں، اور ہم نے حکم دیا ہے پہلے کتاب والوں کو

وَاِيَّاكُمْ اَنِ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَاِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ

اور تم کو کہ ڈرتے رہو اللہ سے، اور اگر نہ مانو گے تو اللہ ہی کا ہے جو کچھ ہے آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں، اور ہے اللہ

غَنِيًّا حَمِيْدًا ﴿۱۳۱﴾ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۱۳۲﴾

بے پروا سب خوبیوں والا، اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ ہے آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں، اور اللہ کافی ہے کارساز

خلاصہ تفسیر: عورتوں اور یتیموں کے احکام بیان کرنے کے بعد قرآنی اسلوب کے مطابق پھر ترغیب و ترہیب کا مضمون ارشاد ہے جس سے ان احکام کی بجا آوری کی تاکید فرماتے ہیں۔

اور اللہ تعالیٰ کی ملک ہیں جو چیزیں کہ آسمان میں ہیں اور جو چیزیں کہ زمین میں ہیں (تو ایسے مالک کے احکام کا ماننا بہت ہی ضروری ہے) اور (احکام کے بجالانے کا خطاب خاص تم ہی کو نہیں ہوا، بلکہ) واقعی ہم نے ان لوگوں کو بھی حکم دیا تھا جن کو تم سے پہلے کتاب (آسمانی یعنی توراۃ و انجیل) ملی تھی اور تم کو بھی (حکم دیا ہے) کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرو (جس کو تقویٰ کہتے ہیں، جس میں تمام احکام کی موافقت داخل ہے، اسی لئے اس سورۃ کو تقویٰ سے شروع کر کے اس کی تفصیل میں مختلف احکام لائے ہیں، کیونکہ تقویٰ تمام احکام کی بجا آوری کا نام ہے) اور (یہ بھی ان کو اور تم کو سنایا گیا) کہ اگر تم ناشکری کرو گے (یعنی احکام الٰہیہ کی مخالفت کرو گے) تو (خدا تعالیٰ کا کوئی نقصان نہیں ہاں! تمہارا ہی نقصان ہے، کیونکہ) اللہ تعالیٰ کی (تو) ملک ہیں جو چیزیں کہ آسمانوں میں ہیں اور جو چیزیں کہ زمین میں ہیں (ایسے بڑے سلطان کا کیا نقصان ہوگا، البتہ ایسے بڑے سلطان کی مخالفت بلاشک مضر

ہے) اور اللہ تعالیٰ کسی (کی اطاعت) کے حاجت مند نہیں (اور) خود اپنی ذات میں محمود (کامل الصفات) ہیں (پس کسی کی مخالفت سے ان کی صفات میں کوئی نقص لازم نہیں آتا) اور اللہ تعالیٰ ہی کی ملک ہیں جو چیزیں کہ آسمان میں ہیں اور جو چیزیں کہ زمین میں ہیں اور (جب وہ ایسے قادر ومختار ہیں تو اپنے اطاعت گذار بندوں کے لیے وہ) اللہ تعالیٰ کافی کارساز ہیں (پس ان کی کارسازی کے ہوتے ان کی اطاعت کرنے والوں کو کون نقصان پہنچا سکتا ہے، پس خدا کے سوا کسی سے ڈرنا نہیں چاہیے)۔

* * *

فائدہ: اوپر سے ترغیب وترہیب کا ذکر چلا آتا تھا، یعنی حکم خداوندی کی اطاعت کرنا اور اس کی مخالفت سے بچنا سب کو ضرور ہے، اس کے ہوتے ہوئے کسی کی بات کی طرف کان رکھنا ہرگز جائز نہیں، بیچ میں چند حکم یتیموں اور عورتوں کے متعلق جن میں لوگ مبتلا تھے بیان فرما کر پھر اس ترغیب و ترہیب کا بیان ہے، ان دونوں آیتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ تم کو اور تم سے پہلوں کو سب کو یہ حکم سنا دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور اس کی نافرمانی نہ کرو تو اب اگر کوئی اس کے حکم کو نہ مانے تو وہ سب چیزوں کا مالک ہے، اس کو کسی کی پروا نہیں، یعنی اپنا ہی کچھ بگاڑے گا، اس کا کچھ نقصان نہیں اور فرمانبرداری کرو گے تو سمجھ لو کہ وہ تمام چیزوں کا مالک ہے، تمہارے سب کام بنا سکتا ہے۔

تین دفعہ فرمایا کہ اللہ کا ہے جو کچھ آسمان اور زمین میں ہے: ① اول سے کشائش اور وسعت مقصود ہے کہ اسکے یہاں کسی چیز کی کمی نہیں ② دوسری سے بے نیازی اور بے پروائی کا بیان مقصود ہے کہ اس کو کسی کی پرواہ نہیں اگر تم منکر ہو ③ تیسری دفعہ میں رحمت اور کارسازی کا اظہار ہے بشرطیکہ تقویٰ کرو۔

اِنْ یَّشَاْ یُذْهِبْكُمْ اَیُّهَا النَّاسُ وَیَاْتِ بِاٰخَرِیْنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰی ذٰلِكَ قَدِیْرًا ﴿۱۳۳﴾

اگر چاہے تو تم کو دور کر دے اے لوگوں اور لے آئے اور لوگوں کو، اور اللہ کو یہ قدرت ہے

خلاصہ تفسیر: (اور اللہ تعالیٰ جو تم کو دین کے کام بتلا رہے ہیں تو تمہاری ہی سعادت کے لئے، ورنہ وہ دوسروں سے بھی کام لے سکتے ہیں، کیونکہ ان کی ایسی قدرت ہے کہ) اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو اے لوگوں! تم سب کو فنا کر دیتا اور دوسروں کو موجود کر دیتا (اور ان سے کام لے لیتا، جیسا کہ دوسری آیت میں ہے: ان تتولوا یستبدل قوما غیرکم) اور اللہ اس پر پوری قدرت رکھتے ہیں (پھر ایسا جو نہیں کیا تو یہ ان کی عنایت ہے، اس لیے حکم کی اطاعت اور بجا آوری کو غنیمت سمجھ کر سعادت حاصل کرو)۔

* * *

فائدہ: یعنی اللہ تعالیٰ اس پر قادر ہے کہ تم سب کو فنا کر دے اور دنیا سے اٹھا لے اور دوسرے لوگ مطیع وفرمانبردار پیدا کر دے۔ اس سے بھی حق تعالیٰ کا استغنا اور بے نیازی خوب ظاہر ہو گئی اور نافرمانوں کو پوری تہدید اور تخویف بھی ہو گئی۔

مَنْ كَانَ یُرِیْدُ ثَوَابَ الدُّنْیَا فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِیْعًۢا بَصِیْرًا ﴿۱۳۴﴾

جو کوئی چاہتا ہو ثواب دنیا کا سو اللہ کے یہاں ہے ثواب دنیا کا اور آخرت کا۔ اور اللہ سب کچھ سنتا دیکھتا ہے۔

خلاصہ تفسیر: (اور دیکھو دین کے کام کا اصلی ثمرہ آخرت میں ہے، دنیا میں نہ ملنے سے بددل نہ ہونا، بلکہ) جو شخص (دین کے کام میں) دنیا کا معاوضہ چاہتا ہو تو (وہ بڑی غلطی میں ہے، کیونکہ) اللہ تعالیٰ کے پاس (یعنی ان کی قدرت میں) تو دنیا اور آخرت دونوں کا معاوضہ (موجود) ہے (جب ان کو اعلیٰ وادنیٰ دونوں پر قدرت ہے تو ادنیٰ کا مانگنا بڑی غلطی ہے، اعلیٰ چیز ہی کیوں نہ مانگی جائے) اور اللہ تعالیٰ بڑے سننے والے بڑے دیکھنے والے ہیں (سب کے اقوال اور درخواستوں کو خواہ وہ دنیا کی ہوں یا دین کی سنتے ہیں اور سب کی نیتوں کو دیکھتے ہیں، پس طالبان آخرت کو ثواب دیں گے اور طالبان دنیا کو آخرت میں محروم رکھیں گے، پس آخرت ہی کی نیت اور درخواست کرنی چاہیے، البتہ مستقل طور پر دنیا کی حاجات مانگنے میں مضائقہ نہیں، لیکن عبادات میں یہ قصد ونیت نہ کرے)۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی اگر اس کی تابعداری کرو تو تم کو دنیا بھی دے اور آخرت بھی، پھر صرف دنیا کے پیچھے پڑنا اور اس کی نافرمانی کر کے آخرت سے محروم رہنا بڑی نادانی ہے۔

فائدہ: ۲ یعنی اللہ تعالیٰ تمہارے سب کام دیکھتا ہے اور سب باتیں سنتا ہے جس کے طالب ہو گے وہی ملے گا۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ

اے ایمان والو! قائم رہو انصاف پر گواہی دو اللہ کی طرف کی اگرچہ نقصان ہو تمہارا یا ماں باپ کا

وَالْاَقْرَبِيْنَ ۚ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا ۫ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ

یا قرابت والوں کا ۱ اگر کوئی مالدار ہے یا محتاج ہے تو اللہ انکا خیر خواہ تم سے زیادہ ہے، سو تم پیروی نہ کرو دل کی خواہش کی انصاف کرنے میں ۲

وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۱۳۵﴾

اور اگر تم زبان ملو گے یا بچا جاؤ گے تو اللہ تمہارے سب کاموں سے واقف ہے ۳

خلاصہ تفسیر: پیچھے مختلف احکام کا ذکر ہوا، جن میں بعض معاملات بھی تھے، معاملات میں صاحب معاملہ اور دوسروں کے درمیان اگر اختلاف ہو جائے تو فیصلہ کرنے والے کو عدل کی رعایت اور دوسرے جو اس کی حقیقت سے واقف ہوں انہیں گواہی میں شہادت حق کا لحاظ ضروری ہے، اس لیے آگے قیام عدل اور شہادت حق کو واجب فرماتے ہیں، پس یہ مضمون گویا تمام سابقہ احکام کا تکملہ، تتمہ اور مؤکد ہے، اس کو یتیموں اور عورتوں کے احکام سے بھی تعلق ہے، اور بنی ابیرق کے قصہ میں بعض لوگوں کی ناحق طرف داری کا ذکر ہوا ہے اس سے بھی خاص مناسبت ہے، نیز اس میں اہل ایمان کو تنبیہ بھی ہے کہ تم اہل کتاب کی طرح حق کی شہادت کو مت چھپاؤ۔

اے ایمان والو! (تمام معاملات میں ادائے حق کے وقت بھی اور فیصلہ کے وقت بھی) انصاف پر خوب قائم رہنے والے (اور اقرار یا گواہی کی نوبت آئے تو) اللہ (کی خوشنودی) کے لئے (سچی) گواہی (اور اظہار) دینے والے رہو، اگرچہ (وہ گواہی اور اظہار) اپنی ہی ذات کے خلاف ہو (جس کو اقرار کہتے ہیں) یا کہ والدین اور دوسرے رشتہ داروں کے مقابلہ میں ہو (اور گواہی کے وقت یہ خیال نہ کرو کہ جس کے مقابلہ میں ہم گواہی دے رہے ہیں یہ امیر ہے اس کو نفع پہنچانا چاہئے، تا کہ اس سے بے مروتی نہ ہو، یا یہ کہ وہ غریب ہے، اس کا کیسے نقصان کر دیں، تم گواہی دینے میں کسی کی امیری غریبی یا نفع ونقصان کو نہ دیکھو، کیونکہ) وہ شخص (جس کے خلاف گواہی دینی پڑے گی) اگر امیر ہے تو، اور غریب ہے تو، دونوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو زیادہ تعلق ہے (اتنا تعلق تم کو نہیں، کیونکہ تمہارا تعلق جس قدر ہے وہ بھی خدا کا دیا ہوا ہے، اور اللہ تعالیٰ کا جو تعلق ہے وہ کسی کا دیا ہوا نہیں، پھر جب باوجود اس قوی تعلق کے اللہ تعالیٰ نے ان کی مصلحت اسی میں رکھی ہے کہ گواہی میں حق بات کہی جائے خواہ اس سے وقتی طور پر کچھ نقصان بھی پہنچ جائے تو تم کمزور تعلق کے باوجود اپنی گواہی میں ان کی ایک عارضی مصلحت کا کیوں خیال کرتے ہو)۔

سو تم (اس شہادت میں) خواہش نفس کا اتباع مت کرنا، کبھی تم حق سے ہٹ جاؤ، اور اگر تم کج بیانی کرو گے (یعنی غلط گواہی دو گے) یا پہلو تہی کرو گے (یعنی شہادت کو ٹال لو گے) تو (یاد رکھنا) بلاشبہ اللہ تعالیٰ تمہارے سب اعمال کی پوری خبر رکھتے ہیں۔

قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ: یہ حکم مطلق ہونے سے اس پر دلالت کرتا ہے کہ حق کے قبول کرنے اور اپنی غلطی کا اعتراف کرنے سے عار نہ کرے، اگرچہ اپنے سے کم رتبہ شخص کے متنبہ کرنے سے ہو، تصنع، دھوکہ اور تاویل نہ کرے کہ اس کا منشا کبر ہے۔

اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا: یہ اس شخص کے طرز وطریقہ پر بھی رد کرتی ہے جو مطلقاً فقیر کو غنی پر ترجیح دینے میں فخر کرتے ہیں، حالانکہ بہت سے غنی متواضع اور حق کے تابع ہوتے ہیں، اور بہت سے فقیر ظالم متکبر ہوتے ہیں، سو حق تعالیٰ دونوں کے بارے میں عدل ہی کو پسند

کرتے ہیں جیسا کہ ارشاد ہے: فلا تتبعوا الھوی ان تعدلوا۔

* * * *

فائدہ: ۱؎ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ: یعنی گواہی سچی اور اللہ کے حکم کے موافق دینی چاہیے، اگرچہ اس میں تمہارا یا تمہارے کسی عزیز قریب کا نقصان ہوتا ہو، جو حق ہو اس کو صاف ظاہر کر دینا چاہیے، دنیاوی نفع کے لئے آخرت کا نقصان نہ لو۔

فائدہ: ۲؎ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا: یعنی سچی گواہی دینے میں اپنی کسی نفسانی خواہش کی پیروی نہ کرو کہ مالدار کی رعایت کر کے یا محتاج پر ترس کھا کر سچ کو چھوڑ بیٹھو، جو حق ہو سو کہو، اللہ تعالیٰ تم سے زیادہ انکا خیر خواہ اور انکے مصالح سے واقف ہے اور اسکے یہاں کس چیز کی کمی ہے۔

فائدہ: ۳؎ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا: "زبان ملنا" یہ کہ سچی بات تو کہی مگر زبان داب کر اور پیچ سے کہ سننے والے کو شبہ پڑ جائے، یعنی صاف صاف سچ نہ بولا اور "بچا جانا" یہ کہ پوری بات نہ کہی بلکہ کچھ بات کام کی رکھ لی، سو ان دونوں صورتوں میں گو جھوٹ تو نہیں بولا، مگر بوجہ عدم اظہار حق گنہگار ہوگا، گواہی سچی اور صاف اور پوری دینی چاہئے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ

اے ایمان والو یقین لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول ﷺ پر اور اس کتاب پر جو نازل کی ہے اپنے رسول ﷺ پر اور اس کتاب پر

الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ

جو نازل کی تھی پہلے، اور جو کوئی یقین نہ رکھے اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور کتابوں پر اور رسولوں پر اور قیامت کے دن پر

فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا ﴿۱۳۶﴾

وہ بہک کر دور جا پڑا

خلاصہ تفسیر: پیچھے زیادہ حصہ فرعی احکام کا بیان ہوا، ایمان وکفر کی بحث کے مضامین کہیں کہیں مخالفین کے معاملات کے ضمن میں آگئے، اب آگے یہ مضامین کسی قدر تفصیل سے بیان کرتے ہیں جو سورت کے اختتام تک چلے گئے ہیں، ترتیب بیان میں پہلے اس کا بیان ہے کہ شریعت میں ایمان معتبر کیا ہے، پھر کفار کے مختلف فرقوں کی مذمت ہے عقائد میں بھی اور بعض اعمال میں بھی۔

اے ایمان والو! (یعنی جو لوگ اجمالی ایمان لا کر مؤمنین کی جماعت میں داخل ہو چکے ہیں) تم (ضروری عقائد کی تفصیل سن لو کہ) اعتقاد رکھو اللہ کی (ذات وصفات کے) ساتھ اور اس کے رسول (محمد ﷺ کی رسالت) کے ساتھ، اور اس کتاب (کے حق ہونے) کے ساتھ جو اس نے (یعنی اللہ نے) اپنے رسول (یعنی محمد ﷺ) پر نازل فرمائی، اور ان کتابوں (کے حق ہونے) کے ساتھ (بھی) جو کہ (رسول ﷺ سے) پہلے (اور نبیوں پر) نازل ہو چکی ہیں (اور رسول اللہ ﷺ اور کتب سابقہ پر ایمان لانے میں ملائکہ اور باقی انبیاء علیہم السلام اور یوم قیامت پر ایمان رکھنا بھی داخل ہو گیا)۔

اور جو شخص اللہ (کی ذات یا صفات) کا انکار کرے (اور اسی طرح جو) اس کے فرشتوں کا (انکار کرے) اور (اسی طرح جو) اس کی کتابوں کا (جس میں قرآن بھی آگیا انکار کرے) اور (اسی طرح جو) اس کے رسولوں کا (جن میں رسول اللہ ﷺ بھی داخل ہیں انکار کرے) اور (اسی طرح جو) روز قیامت کا (انکار کرے) تو وہ شخص گمراہی میں بڑی دور جا پڑا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ: اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ یقین کے مراتب لامتناہی اور لامحدود ہیں، ہر مرتبہ والا اس سے اگلے مرتبہ کے حصول کا مامور ہے۔

* * * *

فائدہ: یعنی جو اسلام قبول کرے اس کو ضرور ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تمام حکموں پر دل سے یقین لائے، اس کے ارشادات میں سے اگر کسی

ایک ارشاد پر بھی یقین نہ لائے گا تو وہ مسلمان نہیں، صرف ظاہری اور زبانی بات کا اعتبار نہیں ہے۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا ثُمَّ كَفَرُوۡا ثُمَّ اٰمَنُوۡا ثُمَّ كَفَرُوۡا ثُمَّ ازۡدَادُوۡا كُفۡرًا لَّمۡ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَـغۡفِرَ لَهُمۡ

جو لوگ مسلمان ہوئے پھر کافر ہو گئے پھر مسلمان ہوئے پھر کافر ہو گئے پھر بڑھتے رہے کفر میں تو اللہ ان کو ہرگز بخشنے والا نہیں

وَلَا لِيَـهۡدِيَهُمۡ سَبِيۡلًا ؕ﴿۱۳۷﴾

اور نہ دکھلائے ان کو راہ

خلاصہ تفسیر: گذشتہ آیت میں کفار کی مذمت اجمالاً بیان ہوئی، آگے تفصیل ہے، سو ان میں سے ایک خاص فرقہ مرتدین کا ہے جس کا پہلے بیان ہوتا ہے۔

بلاشبہ جو لوگ (پہلے تو) مسلمان ہوئے، پھر کافر ہو گئے، پھر مسلمان ہوئے (اور اس بار بھی اسلام پر قائم نہ رہے، ورنہ پہلا گناہ مرتد ہونے کا معاف ہو جاتا، بلکہ) پھر کافر ہو گئے، پھر (اس کے بعد مسلمان ہی نہ ہوئے، ورنہ پھر بھی ایمان مقبول ہو جاتا، بلکہ) کفر میں بڑھتے چلے گئے (یعنی مرتے دم تک کفر ہی پر ثابت اور قائم رہے) اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو ہرگز نہ بخشیں گے، اور نہ ان کو (منزل مقصود یعنی جنت کا) راستہ دکھائیں گے (کیونکہ مغفرت اور جنت کے لئے ایمان پر مرنا شرط ہے)۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا ثُمَّ كَفَرُوۡا ثُمَّ اٰمَنُوۡا ثُمَّ كَفَرُوۡا: شبہ ہوتا ہے کہ ایک شخص اگر اتنی مرتبہ مرتد نہ ہوا ہو جیسا کہ یہاں آیت میں ذکر کیا گیا، بلکہ ایک ہی بار مرتد ہو کر کافر مر جائے تو کیا اس کی مغفرت ہو جائے گی؟ جواب یہ ہے کہ یہاں آیت میں بار بار ارتداد کا ذکر بطور قید کے نہیں، بلکہ جن لوگوں کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی انہوں نے ایسا ہی کیا تھا، تو یہ قید صرف حکایت کے طور پر ہے، اس لیے اس عنوان سے ذکر کیا گیا، ورنہ صرف ایک بار مرتد ہو کر کفر پر مر جانے کا بھی یہی حکم ہے کہ وہ مغفرت اور جنت سے محروم رہے گا۔

لَّمۡ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَـغۡفِرَ لَهُمۡ وَلَا لِيَـهۡدِيَهُمۡ سَبِيۡلًا: اسی پر قیاس کیا جاتا ہے کہ جو شخص طریق قوم (جمہور) کو اختیار کر کے اس سے اعراض کرے، اور اس طرح بار بار اختیار اور اعراض کرتا رہے اور اس کو ایک کھیل بنا لے تو مشاہدہ میں آیا ہے کہ اکثر ایسے شخص کو خذلان (محرومی) کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور خیر و صلاح کی توفیق نہیں ہوتی، نعوذ باللہ من الحور بعد الکور۔

* * *

فائدہ: یعنی ظاہر میں تو مسلمان ہوئے اور دل میں مذبذب رہے اور آخر کو بے یقین لائے ہی مر گئے، ان کو نجات کا راستہ نہیں ملے گا، وہ کافر ہیں، ظاہری مسلمانی کچھ کام نہ آئے گی، اس سے مراد منافقین ہیں، اور بعض فرماتے ہیں کہ یہ آیت یہودیوں کی شان میں ہے کہ اول ایمان لائے، پھر گوسالہ کی عبادت کر کے کافر ہو گئے، پھر توبہ کر کے مومن ہوئے، پھر عیسیٰ علیہ السلام سے منکر ہو کر کافر ہوئے، اس کے بعد رسول اللہ ﷺ کی رسالت کا انکار کر کے کفر میں ترقی کر گئے۔

بَشِّرِ الۡمُنٰفِقِيۡنَ بِاَنَّ لَهُمۡ عَذَابًا اَلِيۡمَا ۙ ﴿۱۳۸﴾ الَّذِيۡنَ يَتَّخِذُوۡنَ الۡكٰفِرِيۡنَ اَوۡلِيَآءَ

خوشخبری سنا دے منافقوں کو کہ ان کے واسطے ہے عذاب دردناک، وہ جو بناتے ہیں کافروں کو اپنا رفیق

مِنۡ دُوۡنِ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ؕ اَيَبۡتَغُوۡنَ عِنۡدَهُمُ الۡعِزَّةَ فَاِنَّ الۡعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيۡعًا ؕ﴿۱۳۹﴾

مسلمانوں کو چھوڑ کر، کیا ڈھونڈتے ہیں ان کے پاس عزت سو عزت تو اللہ ہی کے واسطے ہے ساری

خلاصہ تفسیر: گذشتہ آیت میں مرتدین کا ذکر تھا، کفار میں ایک فرقہ منافقین کا بھی تھا، اب ان کا ذکر کیا جاتا ہے۔

منافقین کوخوش خبری سنا دیجئے اس امر کی کہ ان کے واسطے (آخرت میں) بڑی دردناک سزا (تجویز کی گئی) جن کی یہ حالت ہے کہ (عقائد تو اہل ایمان کے نہ رکھتے تھے، مگر وضع بھی اہل ایمان کی نہ رکھ سکے، چنانچہ) کافروں کو دوست بناتے ہیں مسلمانوں کو چھوڑ کر، کیا ان کے پاس (جا کر) عزت حاصل کرنا چاہتے ہیں، سو (خوب سمجھ لو کہ) عزت تو ساری اللہ تعالیٰ کے قبضہ میں ہے (وہ جس کو چاہیں عزت دیں، پس اگر اللہ تعالیٰ ان کو یا جن سے جا جا کر دوستی کرتے ہیں ان کو عزت نہ دیں تو کہاں سے معزز بن جائیں گے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے جلد ہی مسلمانوں کے ہاتھوں سب کو ذلیل وخوار کر دیا)۔

منافقین کا کفار سے ملنا اس غرض سے تھا کہ انہیں مسلمانوں کے اس طرح غالب آنے کی توقع نہ تھی، چنانچہ منافقین سوچتے تھے کہ ہمیشہ رہنا تو یہود ومشرکین کے ساتھ ہوگا پھر ان سے کیوں بگاڑی جائے۔

فَاِنَّ الۡعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِیۡعًا: یہاں عزت سے مراد اگر ہمیشہ قائم اور باقی رہنے والی آخرت کی عزت ہے تب تو دنیا میں اس کا مخصوص ہونا اللہ تعالیٰ کے رسول اور مؤمنین کے ساتھ واضح ہے کیونکہ آخرت کی عزت کسی کافر ومشرک کو قطعاً حاصل نہیں ہوسکتی، اور اگر مراد دنیا کی عزت لی جائے تو عبوری دور اور اتفاقی حوادث کو چھوڑ کر انجام کے اعتبار سے یہ عزت وغلبہ بالآخر اسلام اور مسلمانوں ہی کا حق ہے، جب تک مسلمان صحیح معنی میں مسلمان رہے، دنیا نے اس کا آنکھوں سے مشاہدہ کر لیا اور پھر آخر زمانہ میں جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی امامت وقیادت میں مسلمان صحیح اسلام پر قائم ہو جائیں گے تو پھر غلبہ انہی کا ہوگا، درمیانی اور عبوری دور میں مسلمانوں کے ضعف ایمان اور ابتلاء معاصی کی وجہ سے ان کا کمزور نظر آنا اس کے منافی نہیں۔

اَیَبۡتَغُوۡنَ عِنۡدَهُمُ الۡعِزَّةَ: اس میں شہرت اور طلب جاہ کے مذموم ہونے پر صریح دلالت ہے، یعنی نیک کام سے مقصود اگر شہرت اور نام وری ہو تو یہ مذموم ہے۔

✻ ✻ ✻

فائدہ: یعنی منافق لوگ جو مسلمانوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست بناتے ہیں ان کے لئے سخت عذاب ہے اور ان کا یہ خیال کہ کافروں کے پاس بیٹھ کر ہم کو دنیا میں عزت ملے گی بالکل غلط ہے، سب عزت اللہ تعالیٰ کے واسطے ہے، جو اس کی اطاعت کرے گا اس کو عزت ملے گی، خلاصہ یہ ہوا کہ ایسے لوگ دنیا اور آخرت دونوں میں ذلیل وخوار رہیں گے۔

وَقَدۡ نَزَّلَ عَلَیۡكُمۡ فِی الۡكِتٰبِ اَنۡ اِذَا سَمِعۡتُمۡ اٰیٰتِ اللّٰهِ یُكۡفَرُ بِهَا وَیُسۡتَهۡزَاُ بِهَا فَلَا تَقۡعُدُوۡا

اور حکم اتار چکا تم پر قرآن میں کہ جب سنو اللہ کی آیتوں پر انکار ہوتے اور ہنسی ہوتے تو نہ بیٹھو

مَعَهُمۡ حَتّٰی یَخُوۡضُوۡا فِیۡ حَدِیۡثٍ غَیۡرِهٖۤ ۖ اِنَّكُمۡ اِذًا مِّثۡلُهُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الۡمُنٰفِقِیۡنَ

ان کے ساتھ یہاں تک کہ مشغول ہوں کسی دوسری بات میں نہیں تو تم بھی انہی جیسے ہو گئے، اللہ اکٹھا کرے گا منافقوں کو

وَالۡكٰفِرِیۡنَ فِیۡ جَهَنَّمَ جَمِیۡعَا ﴿۱۴۰﴾

اور کافروں کو دوزخ میں ایک جگہ

خلاصہ تفسیر: گذشتہ آیت میں منافقین کا کفار سے دوستی کرنا ذکر ہوا تھا، اب مسلمانوں کو کفار کے ساتھ دوستی رکھنے اور ان کے کفریہ مشاغل کے وقت ان کے ساتھ بیٹھنے سے بھی منع فرماتے ہیں جو کہ زیادہ موجب معصیت ہے، مہاجرین کے ساتھ منافقین کو بھی اس میں شامل فرمایا، ساتھ ساتھ منافقین کے قبائح کا اظہار بھی کیا جاتا ہے۔

اور (اے مسلمانو! دیکھو تم منافقین کی طرح کفار کے ساتھ خصوصیت مت رکھنا، خاص کر جس وقت وہ کفریات کا تذکرہ کرتے ہوں، چنانچہ اس سورۃ مدنیہ سے قبل بھی) اللہ تعالیٰ تمہارے پاس یہ فرمان (واذا رایت الذین یخوضون سورۃ انعام آیت ۶۸ میں جو کہ مکی سورت ہے) بھیج چکا

ہے (جس کا حاصل یہ ہے) کہ جب (کسی مجمع میں) احکام الٰہیہ کے ساتھ استہزاء اور کفر ہوتا ہوا سنو تو ان لوگوں کے پاس مت بیٹھو جب تک کہ وہ کوئی اور بات شروع نہ کریں (سو یہ استہزاء کرنے والے مکہ میں مشرکین تھے، اور مدینہ میں یہود تو علانیہ، اور منافقین صرف غریب اور کمزور مسلمانوں کے سامنے، پس جیسے مکہ میں مشرکین کے پاس ایسے وقت بیٹھنے کی ممانعت تھی اسی طرح مدینہ میں یہود اور منافقین کے پاس بیٹھنے سے منع کیا گیا)۔

(اور یہ ممانعت ہم اس لئے کرتے ہیں) کہ اس حالت میں تم بھی (گناہ میں) انہی جیسے ہو جاؤ گے (اگرچہ دونوں کی نوعیت میں فرق ہو کہ ایک گناہ کفر کا ہے اور دوسرا فسق کا، اور اس ممانعت میں کفار اور منافقین سب برابر ہیں، کیونکہ اس کی علت کفر کی باتوں کا تذکرہ ہے جس کا منشاء کفر ہے، اور اس میں دونوں برابر ہیں، چنانچہ سزائے کفر یعنی دوزخ کا ایندھن ہونے میں بھی دونوں برابر ہوں گے، کیونکہ) یقیناً اللہ تعالیٰ منافقوں کو اور کافروں کو سب کو دوزخ میں جمع کر دیں گے۔

فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ: اہل باطل کے ساتھ میل جول اور ہم نشینی کی چند صورتیں ہیں:

① ان کی کفریات پر راضی ہو کر ملنا، یہ کفر ہے۔ ② اظہار کفریات کے وقت کراہت کے ساتھ بلا عذر ملنا یہ فسق ہے۔

③ کسی دنیوی ضرورت کیلئے ملنا یہ مباح ہے۔ ④ تبلیغ احکام کے لئے ملنا، یہ عبادت ہے۔

⑤ اضطرار یعنی مجبوری اور بے اختیاری کے ساتھ ملنا، اس میں معذور ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی اے مسلمانو! خدا تعالیٰ پہلے قرآن شریف میں تم پر حکم بھیج چکا ہے کہ جس مجلس میں احکام خداوندی کا انکار اور تمسخر کیا جاتا ہو وہاں ہرگز نہ بیٹھو ورنہ تم بھی ویسے ہی سمجھے جاؤ گے، البتہ جس وقت دوسری باتوں میں مشغول ہوں تو اس وقت ان کے ساتھ بیٹھنے کی ممانعت نہیں، منافقوں کی مجالس میں آیات و احکام الٰہی پر انکار و استہزاء ہوتا تھا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

اور یہ جو فرمایا کہ "حکم اتار چکا تم پر" یہ اشارہ ہے آیت: وَاِذَا رَاَیْتَ الَّذِیْنَ یَخُوْضُوْنَ فِیْٓ اٰیٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰی یَخُوْضُوْا فِیْ حَدِیْثٍ غَیْرِهٖ وَاِمَّا یُنْسِیَنَّكَ الشَّیْطٰنُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰی (الانعام:۶۸) کی طرف جو پہلے نازل ہو چکی تھی۔

فائدہ: اس سے معلوم ہو گیا کہ جو شخص مجلس میں اپنے دین پر طعنہ اور عیب سنے اور پھر انہی میں بیٹھا سنا کرے اگرچہ آپ کچھ نہ کہے وہ منافق ہے۔

الَّذِیْنَ یَتَرَبَّصُوْنَ بِكُمْ ۚ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ فَتْحٌ مِّنَ اللّٰهِ قَالُوْٓا اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ۖ

وہ منافق جو تمہاری تاک میں ہیں، پھر اگر تم کو فتح ملے اللہ کی طرف سے تو کہیں کیا ہم نہ تھے تمہارے ساتھ

وَاِنْ كَانَ لِلْكٰفِرِیْنَ نَصِیْبٌ ۙ قَالُوْٓا اَلَمْ نَسْتَحْوِذْ عَلَیْكُمْ وَنَمْنَعْكُمْ مِّنَ الْمُؤْمِنِیْنَ ؕ

اور اگر نصیب ہو کافروں کو تو کہیں کیا ہم نے گھیر نہ لیا تھا تم کو اور بچا دیا تم کو مسلمانوں سے

فَاللّٰهُ یَحْكُمُ بَیْنَكُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ وَلَنْ یَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِیْنَ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ سَبِیْلًا ﴿۱۴۱﴾ ع

سو اللہ فیصلہ کرے گا تم میں قیامت کے دن، اور ہرگز نہ دے گا اللہ کافروں کو مسلمانوں پر غلبہ کی راہ

خلاصہ تفسیر: (اور) وہ (منافقین) ایسے ہیں کہ تم پر افتاد پڑنے کے منتظر (اور آرزومند) رہتے ہیں، پھر (ان کے اس انتظار کے بعد) اگر تمہاری فتح من جانب اللہ ہو گئی تو (تم سے آ کر) باتیں بناتے ہیں کہ کیا ہم تمہارے ساتھ (جہاد میں شریک) نہ تھے (کیونکہ نام و نمود کو تو مسلمانوں میں گھسے ہی رہتے تھے، مطلب یہ کہ ہم کو بھی غنیمت کا حصہ دو) اور اگر کافروں کو (غلبہ کا) کچھ حصہ مل گیا (یعنی وہ اتفاق سے غالب آئے) تو (ان سے جا کر) باتیں بناتے ہیں کہ کیا ہم تم پر غالب نہ آنے لگے تھے (مگر ہم نے قصداً تمہیں مزید غالب کرنے کے لئے مسلمانوں کی مدد نہ کی اور

ایسی تدبیر کی کہ لڑائی بگڑ گئی) اور کیا ہم نے (جب تم مغلوب ہونے لگے تھے) تم کو مسلمانوں سے بچا نہیں لیا (اس طرح کہ ان کی مدد نہ کی، اور تدبیر سے لڑائی بگاڑ دی، مطلب یہ کہ ہمارا احسان مانو اور جو کچھ تمہارے ہاتھ آیا ہے ہم کو بھی کچھ حصہ دلواؤ، غرض دونوں طرف ہاتھ مارتے ہیں)۔

سو (دنیا میں اگر چہ اظہار اسلام کی برکت سے مسلمانوں کی طرح زندگی بسر کر رہے ہیں، لیکن) اللہ تعالیٰ تمہارا اور ان کا قیامت میں (عملی) فیصلہ فرمادیں گے، اور (اس فیصلہ میں) ہرگز اللہ تعالیٰ کافروں کو مسلمانوں کے مقابلہ میں غالب نہ فرمائیں گے (بلکہ کفار مجرم قرار پا کر دوزخ میں جائیں گے اور مسلمان اہل حق ثابت ہو کر جنت میں جائیں گے اور فیصلہ عملی یہی ہے)۔

فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ: یعنی اللہ تعالیٰ تمہارا اور ان کا قیامت میں (عملی) فیصلہ فرمادیں گے، اس کو فیصلہ اس لیے فرمایا (حالانکہ فیصلہ تو اختلاف کی صورت میں ہوا کرتا ہے) کہ منافقین کے عقائد اور ان کا مسلک تو مختلف تھا ہی اگر چہ نفاق کی وجہ سے بظاہر مخالف نہ معلوم ہوتے تھے اور ان کو اپنے مسلک پر اس لیے ناز تھا کہ جیسے دنیا میں امن سے رہے یہ سمجھتے تھے کہ آخرت میں بھی نجات پالیں گے، مگر وہاں اس کا عملی فیصلہ ہو جائے گا، اور "عملی" اس لیے کہا کہ دلائل سے تو دنیا میں حق و باطل کا فیصلہ ہو رہا ہے۔

وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ: یعنی (اس فیصلہ میں) ہرگز اللہ تعالیٰ کافروں کو مسلمانوں کے مقابلہ میں غالب نہ فرمائیں گے، یہاں یہ قید ظاہر کردی کہ "اس فیصلہ میں"، اس قید سے یہ شبہ دور ہو گیا کہ دنیا میں تو کفار کبھی مسلمانوں پر غالب ہو جاتے ہیں۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی یہ منافق وہ ہیں جو برابر تمہاری تاک اور انتظار میں لگے رہتے ہیں، پھر اگر تمہاری فتح ہو تو تم سے کہتے ہیں کہ کیا ہم تمہارے ساتھی نہیں؟ مال غنیمت میں ہم کو بھی شریک کرو، اور اگر کافروں کو لڑائی میں کچھ حصہ مل گیا، یعنی وہ غالب ہوئے تو ان سے کہتے ہیں کہ کیا ہم نے تم کو گھیر نہ لیا تھا اور تمہاری حفاظت نہیں کی اور ہم نے کیا تم کو مسلمانوں کے ضرر سے نہیں بچایا؟ لوٹ میں ہم کو بھی حصہ دو۔

فائدہ: اس سے معلوم ہوا کہ دین حق پر ہو کر گمراہوں سے بھی بنائے رکھنا یہ بھی نفاق کی بات ہے۔

فائدہ: ۲؎ یعنی اللہ تعالیٰ تم میں اور ان میں حکم فیصل فرمائے گا کہ تم کو جنت دے گا اور ان کو جہنم میں ڈالے گا، دنیا میں جو کچھ ان سے ہو سکے کر دیکھیں، مگر اہل ایمان کی بیخ کنی ہرگز نہ کر سکیں گے جو ان کی دلی تمنا ہے۔

اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ ۚ وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى ۙ

البتہ منافق دغا بازی کرتے ہیں اللہ سے اور وہی ان کو دغا دے گا ۱؎ اور جب کھڑے ہوں نماز کو تو کھڑے ہوں ہارے جی سے

يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۱۴۲﴾

لوگوں کے دکھانے کو اور یاد نہ کریں اللہ کو مگر تھوڑا سا ۲؎

خلاصہ تفسیر: بلاشبہ منافق لوگ (ایمان کے اظہار میں) چالبازی کرتے ہیں اللہ سے (اگر چہ ان کی چال اللہ تعالیٰ سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی اور اگر چہ ان کا اعتقاد اللہ کے ساتھ چالبازی کرنے کا نہ ہو، مگر ان کی یہ کارروائی اسی کے مشابہ ہے کہ جیسے یہی اعتقاد ہو) حالانکہ اللہ تعالیٰ اس چال کی سزا ان کو دینے والے ہیں، اور (چونکہ دل میں ایمان تو ہے نہیں اور اس لئے نماز کو فرض نہ سمجھیں نہ اس میں ثواب کا اعتقاد رکھیں، اس لئے) جب نماز کو کھڑے ہوتے ہیں تو بہت ہی کاہلی کے ساتھ کھڑے ہوتے ہیں (کیونکہ نشاط تو اعتقاد اور امید سے پیدا ہوتا ہے) صرف آدمیوں کو (اپنا نمازی ہونا) دکھلاتے ہیں (تاکہ مسلمان سمجھیں) اور (چونکہ محض نماز کا نام ہی کرنا ہے، اس لیے اس نماز میں) اللہ تعالیٰ کا ذکر (زبانی) بھی نہیں کرتے مگر بہت ہی مختصر (یعنی محض صورت نماز کی بنالیتے ہیں جس میں نماز کا نام ہو جائے اور عجب نہیں کہ صرف اٹھنا بیٹھنا ہی ہوتا ہو، کیونکہ جہر کی ضرورت تو بعض نمازوں

میں امام کو ہوتی ہے، امامت تو ان کو کہاں نصیب ہوتی، مقتدی ہونے کی حالت میں اگر کوئی بالکل نہ پڑھے فقط ہونٹ ہی ہلاتا رہے تو کسی کو کیا خبر ہو، تو ایسے بداعتقادوں سے کیا بعید ہے کہ زبان بھی نہ ہلتی ہو)۔

وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى: جس کسل (سستی وکاہلی) کی یہاں مذمت ہے وہ اعتقادی کسل ہے کہ دل میں اس کی وقعت اور احترام نہ ہو، اور اگر صحیح اعتقاد ہونے کے باوجود جو ظاہری کاہلی ہو تو وہ اس سے خارج ہے، پھر اگر کسی عذر سے ہو جیسے مرض، تھکن اور نیند کا غلبہ تب تو قابل ملامت بھی نہیں، اور اگر بغیر عذر ہو تو وہ قابل ملامت ہے۔

قَامُوْا كُسَالٰى يُرَآءُوْنَ النَّاسَ: یہاں کسل یعنی کاہلی وسستی کو ریا کے ساتھ مقید کرنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس سے مراد اعتقادی سستی ہے نہ کہ طبعی سستی، سو طبعی سستی پر ملامت نہیں، اور جسے اس کی تحقیق نہیں وہ تشویش وپریشانی بڑھالیتا ہے جس سے اسکے باطن کو نقصان پہنچتا ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی دل سے کافر ہیں اور ظاہر میں مسلمان، تاکہ دونوں طرف کی مضرت اور ایذا سے محفوظ رہیں اور دونوں سے فائدہ اٹھاتے رہیں، حق تعالیٰ نے ان کی اس دغابازی کی یہ سزادی کہ ان کی تمام شرارتوں اور مخفی خباثتوں کو اپنے نبی پر ظاہر فرما کر ایسا ذلیل کیا کہ کسی قابل نہ رہے اور سب دغابازی مسلمانوں پر کھل گئی اور آخرت میں جو اس کی سزا ملے گی وہ بھی ظاہر فرمادی، چنانچہ آیات آئندہ میں ذکر آتا ہے، خلاصہ یہ ہے کہ ان کی دھوکہ بازی سے تو کچھ نہ ہوا، اور اللہ نے ان کو ایسا دھوکہ میں ڈالا کہ دنیا اور آخرت دونوں غارت ہوئیں۔

فائدہ: ۲ یعنی نماز جو نہایت ضروری اور خالص عبادت ہے اور اس کے ادا کرنے میں جانی مالی کسی مضرت کا بھی اندیشہ نہیں منافق لوگ اس سے بھی جان چراتے ہیں، بمجبوری لوگوں کے دکھانے کو اور دھوکہ دینے کو پڑھ لیتے ہیں کہ ان کے کفر کی کسی کو اطلاع نہ ہو اور مسلمان سمجھے جائیں، پھر ایسوں سے اور کسی بات کی کیا توقع ہوسکتی ہے اور وہ کیسے مسلمان ہوسکتے ہیں۔

مُّذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ ۖ لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ ۗ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ﴿۱۴۳﴾

ادھر میں لٹکتے ہیں دونوں کے بیچ، نہ ان کی طرف اور نہ ان کی طرف، اور جس کو گمراہ کرے اللہ تو ہرگز نہ پائے گا تو اس کے واسطے کہیں راہ

خلاصہ تفسیر: معلق ہو رہے ہیں دونوں کے (یعنی کفار ومؤمنین کے) درمیان میں، نہ (پورے) اِدھر، نہ (پورے) اُدھر (کیونکہ ظاہر میں مومن تو کفار سے الگ اور باطن میں کافر، مؤمنین سے الگ) اور جس کو اللہ تعالیٰ گمراہی میں ڈال دیں (جیسا کہ ان کا قانون ہے کہ انسان جس کام کا قصد کرتا ہے وہ اس کو پورا کردیتے ہیں) ایسے شخص کے (مومن ہونے کے) لئے کوئی سبیل (یعنی راہ) نہ پاؤ گے (مطلب یہ کہ ان منافقین کے راہ پر آنے کی امید مت رکھو، اس میں منافقین کی تشنیع ہے اور مؤمنین کو تسلی کہ ان کی شرارتوں سے رنج نہ کریں)۔

* * *

فائدہ: یعنی منافقین تو بالکل تردّد اور حیرت میں گرفتار ہیں، نہ ان کو اسلام پر اطمینان ہے نہ کفر پر، سخت پریشانی میں مبتلا ہیں، کبھی ایک طرف جھکتے ہیں کبھی دوسری طرف، اور اللہ جس کو بھٹکانا اور گمراہ کرنا چاہے اس کو نجات کا راستہ کہاں مل سکتا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿۱۴۴﴾

اے ایمان والو نہ بناؤ کافروں کو اپنا رفیق مسلمانوں کو چھوڑ کر، کیا لیا چاہتے ہو اپنے اوپر اللہ کا الزام صریح

خلاصہ تفسیر: اب اس آیت میں کفار سے خصوصی تعلق ودوستی رکھنے کی ممانعت کے مضمون کا تتمہ وتکملہ ہے:

اے ایمان والو! تم مؤمنین کو چھوڑ کر کافروں کو (خواہ منافق ہوں خواہ مجاہر ہوں) دوست مت بناؤ (جیسا کہ منافقین کا شیوہ ہے، کیونکہ تم کو ان کی کفر وعداوت کی حالت معلوم ہو چکی) کیا تم (ان سے دوستی کر کے) یوں چاہتے ہو کہ اپنے اوپر (یعنی اپنے آپ کو مجرم اور عذاب کا مستحق ہونے پر) اللہ تعالیٰ کی حجت صریح قائم کرلو (اور صریح حجت یہی ہے کہ ہم نے جب منع کر دیا تھا پھر ایسا کیوں کیا؟!)۔

کفار کے ساتھ دوستی اور مدارات کے متعلق احکام سورہ آل عمران آیت ۲۸: لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ کے تحت گذر چکے ہیں، وہاں ملاحظہ فرمالیا جائے۔

✻ ✻ ✻

فائدہ: یعنی مسلمانوں کو چھوڑ کر کافروں سے دوستی کرنا دلیل ہے نفاق کی، جیسا کہ منافقین کرتے ہیں، سو تم اے مسلمانو! ایسا ہرگز مت کرنا، ورنہ خداوند تعالیٰ کا صریح الزام اور پوری حجت تم پر قائم ہو جائے گی کہ تم بھی منافق ہو۔

اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا ﴿۱۴۵﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا

بے شک منافق ہیں سب سے نیچے درجہ میں دوزخ کے، اور ہرگز نہ پائے گا تو ان کے واسطے کوئی مددگار[۱] مگر جنہوں نے توبہ کی

وَاَصْلَحُوْا وَاعْتَصَمُوْا بِاللّٰهِ وَاَخْلَصُوْا دِيْنَهُمْ لِلّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ وَسَوْفَ يُؤْتِ

اور اپنی اصلاح کی اور مضبوط پکڑا اللہ کو اور خالص حکم بردار ہوئے اللہ کے سو وہ ہیں ایمان والوں کے ساتھ، اور جلد دے گا

اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۴۶﴾

اللہ ایمان والوں کو بڑا ثواب[۲]

خلاصہ تفسیر: پیچھے منافقین کے قبائح کا بیان مقصود تھا جس کے ضمن میں ان کا جہنمی ہونا بھی بیان ہوا، آگے مستقل طور پر ان کی سزا کا بیان مقصود ہے، چونکہ سزا کے بیان کا اثر فی نفسہ یہ ہے کہ سلیم الطبع آدمی کو خوف پیدا ہوتا ہے جو توبہ کا سبب ہو جاتا ہے، چنانچہ اس سزا سے توبہ کرنے والوں کا استثنیٰ اور ان کی جزائے نیک کا بھی بیان فرمایا۔

بلاشبہ منافقین دوزخ کے سب سے نیچے کے طبقہ میں جائیں گے، اور (اے مخاطب!) تو ہرگز ان کا کوئی مددگار نہ پائے گا (جو ان کو اس سزا سے بچا سکے) لیکن (ان میں سے) جو لوگ (نفاق سے) توبہ کرلیں اور (مسلمانوں کے ساتھ جو ان کے ایذا رسانی کے معاملات تھے ان کی) اصلاح کرلیں (یعنی پھر ایسی باتیں نہ کریں) اور (کفار سے جو ان کی پناہ میں رہنے کی غرض سے دوستی کرتے ہیں اس کو چھوڑ کر) اللہ تعالیٰ پر وثوق (اور توکل) رکھیں، اور (ریاء کو چھوڑ کر) اپنے دین (یعنی سب اعمال) کو خالص اللہ ہی (کی رضا) کے لئے کیا کریں (غرض اپنے عقائد، معاملات، باطنی اخلاق، اور ظاہری اعمال سب کی درستگی کرلیں) تو یہ (تائب) لوگ (ان مؤمنین) کے ساتھ (درجات جنت میں) ہوں گے (جو کہ پہلے سے کامل ایمان رکھتے ہیں) اور (ان) مؤمنین کو اللہ تعالیٰ (آخرت میں) اجر عظیم عطا فرمائیں گے (پس جب یہ مومنین کے ساتھ ہوں گے تو ان کو بھی اجر عظیم ملے گا)۔

✻ ✻ ✻

فائدہ: [۱] منافقوں کے لئے دوزخ کا سب سے نیچا طبقہ مقرر ہے اور کوئی ان کا مددگار بھی نہیں ہو سکتا کہ اس طبقہ سے ان کو نکالے یا عذاب میں کچھ تخفیف کرادے، مسلمانوں کو ایسی بات سے دور رہنا چاہئے۔

فائدہ: [۲] یعنی جو منافق اپنے نفاق سے توبہ کرے اور اپنے اعمال کی درستی کرے اور اللہ کے پسندیدہ دین کو خوب مضبوط پکڑے اور اللہ پر توکل کرے اور ریا وغیرہ خرابیوں سے دین کو پاک وصاف رکھے تو وہ خالص مسلمان ہے، دین و دنیا میں ایمان والوں کے ساتھ ہوگا اور ایمان والوں کو بڑا ثواب ملنے والا ہے، ان کے ساتھ ان کو بھی ملے گا جنہوں نے نفاق سے سچی توبہ کی۔

مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا ﴿۱۴۷﴾

کیا کرے گا اللہ تم کو عذاب کر کے اگر تم حق کو مانو اور یقین رکھو، اور اللہ قدر دان ہے سب کچھ جاننے والا

خلاصہ تفسیر: (اور اے منافقو!) اللہ تعالیٰ تم کو سزا دے کر کیا کریں گے اگر تم (ان کی نعمتوں کی جو تم پر ہیں) سپاس گذاری کرو، اور (اس شکر گزاری کا طریقہ ہمارا پسندیدہ یہ ہے کہ تم) ایمان لے آؤ (یعنی اللہ تعالیٰ کا کوئی کام اٹکا نہیں پڑا جو تم کو سزا دینے سے چل جائے، صرف تمہارا کفر جو اشد درجہ کا کفران نعمت ہے تمہاری سزا کا سبب ہے، اگر کفر کو چھوڑ دو تو پھر رحمت ہی رحمت ہے) اور اللہ تعالیٰ (تو خدمت کی) بڑی قدر کرنے والے (اور خدمت گزاری کے خلوص وغیرہ کو) خوب جاننے والے ہیں (پس جو شخص اطاعت و اخلاص سے رہے، اس کو بہت کچھ دیتے ہیں)۔

* * *

فائدہ: یعنی اللہ تعالیٰ نیک کاموں کا قدرداں ہے اور بندوں کی سب باتوں کو خوب جانتا ہے، سو جو شخص اس کے حکم کو ممنونیت اور شکر گزاری کے ساتھ تسلیم کرتا ہے اور اس پر یقین رکھتا ہے تو اللہ تعالیٰ عادل رحیم کو ایسے شخص پر عذاب کرنے سے کوئی تعلق نہیں، یعنی ایسے شخص کو ہرگز عذاب نہ دے گا، وہ تو سرکش اور نافرمانوں کو عذاب دیتا ہے۔

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا ﴿۱۴۸﴾

اللہ کو پسند نہیں کسی کی بری بات کا ظاہر کرنا مگر جس پر ظلم ہوا ہو، اور اللہ ہے سننے والا جاننے والا

خلاصہ تفسیر: اوپر منافقین و کفار کا مسلمانوں کے ساتھ دشمنی کرنے کا ذکر تھا، چونکہ دشمنی میں اکثر ایذا رسانی کی نوبت بھی آتی رہتی ہے اور جسے ایذا پہنچتی ہے اکثر اس کی زبان سے شکایت و حکایت بھی نکل جاتی ہے، اس مناسبت سے آگے شکایت کے جواز اور عدم جواز کی تحقیق اور ساتھ ہی معاف کرنے کی فضیلت بیان فرماتے ہیں:

اللہ تعالیٰ بری بات زبان پر لانے کو (کسی کے لئے) پسند نہیں کرتے بجز مظلوم کے (کہ اپنے مظالم کی نسبت کچھ حکایت شکایت کرنے لگے تو وہ گناہ نہیں) اور اللہ تعالیٰ (مظلوم کی بات) خوب سنتے ہیں (اور ظالم کے ظلم کی حالت) خوب جانتے ہیں (اس میں اشارہ ہے کہ مظلوم کو بھی خلاف واقعہ کہنے کی اجازت نہیں)۔

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ: خلاصہ کلام یہ ہے کہ بغیر مصلحت و ضرورت کے کسی کی عیب جوئی جائز نہیں، یہ مطلب نہیں کہ ظالم کے سوا مطلقا کسی کی شکایت جائز نہیں، کیونکہ ظالم کے علاوہ بھی بعض کی برائی کا اظہار جائز ہے، مثلاً اگر کسی سے کوئی دینی یا دنیوی نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو تو اس کے حال سے لوگوں کو مطلع کر دینا درست بلکہ واجب ہے، پس یہاں حصر حقیقی نہیں بلکہ حصر اضافی ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی اگر کسی میں دین یا دنیا کا عیب معلوم ہو تو اس کو مشہور نہ کرنا چاہئے، خدا تعالیٰ سب کی بات سنتا ہے اور سب کے کام کو جانتا ہے، ہر ایک کو اس کے موافق جزا دے گا، اسی کو غیبت کہتے ہیں، البتہ مظلوم کو رخصت ہے کہ ظالم کا ظلم لوگوں سے بیان کرے، ایسے ہی بعض اور صورتوں میں بھی غیبت روا ہے اور یہ حکم یہاں شاید اس لئے فرمایا کہ مسلمان کو چاہیے کہ کسی منافق کا نام مشہور نہ کرے اور علی الاعلان اس کو بدنام نہ کرے، اس میں وہ بگڑ کر شاید بے باک ہو جائے، بلکہ مبہم نصیحت کرے، منافق آپ سمجھ لے گا یا تنہائی میں نصیحت کرے، اس طرح شاید ہدایت قبول کر لے، چنانچہ حضرت محمد ﷺ بھی ایسا ہی کرتے تھے، کسی کا نام لے کر مشہور نہیں فرماتے تھے۔

إِنْ تُبْدُوا خَيْرًا أَوْ تُخْفُوهُ أَوْ تَعْفُوا عَنْ سُوٓءٍ فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيرًا ﴿١٤٩﴾

اگر تم کھول کر کرو کوئی بھلائی یا اس کو چھپاؤ یا معاف کرو برائی کو تو اللہ بھی معاف کرنے والا بڑی قدرت والا ہے

خلاصہ تفسیر: (اور ہر چند کہ ایسی شکایت جائز تو ہے لیکن) اگر نیک کام اعلانیہ کرو یا اس کو خفیہ کرو (جس میں معاف کرنا بھی آگیا) یا (بالخصوص) کسی (کی) برائی کو معاف کر دو تو (زیادہ افضل ہے، کیونکہ) اللہ تعالیٰ (بھی) بڑے معاف کرنے والے ہیں (باوجودیکہ) پوری قدرت والے ہیں (کہ اپنے مجرموں سے ہر طرح انتقام لے سکتے ہیں، مگر پھر بھی اکثر معاف ہی کر دیتے ہیں، پس اگر تم بھی ایسا کرو تو اول تو اخلاق خداوندی کی اتباع ہے، دوسرے پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہارے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ کرنے کی امید ہوگی)۔

پہلی آیت لا یحب اللہ الجھر انتقام کے جواز پر دلالت کرتی ہے اور شکایت بھی اسی کی ایک فرد ہے، اس میں کمزور اور ضعیف لوگوں کی رعایت ہے، اور اس میں یہ مصلحت ہے کہ دل کینہ سے صاف ہو جاتا ہے، دوسری آیت ان تبدوا خیرا او تخفوہ صبر اور عفو کے پسندیدہ ہونے پر دلالت کرتی ہے، یہ ہمت والوں کی شان ہے اور اس میں فائدہ قرب کے اعلیٰ مرتبہ کا حصول ہے، خلاصہ یہ کہ پہلی آیت (ظلم کا بدلہ لینا) میں کمزور اور ضعیف لوگوں کی رعایت ہے، یہ دوسری آیت (معاف و درگذر کرنا) اہل ہمت لوگوں کے مناسب حال ہے۔

* * *

فائدہ: اس آیت میں مظلوم کو معافی کی رغبت دلانی منظور ہے کہ حق تعالیٰ زبردست اور قدرت والا ہو کر خطا والوں کی خطا بخشتا ہے، بندہ زیردست عاجز کو تو بطریق اولیٰ دوسروں کا قصور معاف کر دینا چاہئے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ مظلوم کو ظالم سے بدلہ لینا جائز ہے، مگر افضل یہ ہے کہ صبر کرے اور بخش دے، آیت میں اشارہ ہے اس طرف کہ منافقوں کی اصلاح چاہتے ہو تو ان کی ایذاء اور شرارت پر صبر کرو اور نرمی اور پردہ سے ان کو سمجھاؤ، ظاہر کی طعن اور لعن سے بچو اور کھلا مخالف مت بناؤ۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيُرِيدُونَ أَنْ يُفَرِّقُوا بَيْنَ اللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيَقُولُونَ نُؤْمِنُ

جو لوگ منکر ہیں اللہ سے اور اس کے رسولوں سے اور چاہتے ہیں کہ فرق نکالیں اللہ میں اور اس کے رسولوں میں اور کہتے ہیں ہم مانتے ہیں

بِبَعْضٍ وَنَكْفُرُ بِبَعْضٍ ۙ وَيُرِيدُونَ أَنْ يَتَّخِذُوا بَيْنَ ذَٰلِكَ سَبِيلًا ﴿١٥٠﴾ أُولَٰئِكَ هُمُ

بعضوں کو اور نہیں مانتے بعضوں کو، اور چاہتے ہیں کہ نکالیں اس کے بیچ میں ایک راہ، ایسے لوگ وہی ہیں

الْكَافِرُونَ حَقًّا ۚ وَأَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ عَذَابًا مُهِينًا ﴿١٥١﴾

اصل کافر، اور ہم نے تیار کر رکھا ہے کافروں کے واسطے ذلت کا عذاب

خلاصہ تفسیر: یہاں تک منافقین کا بیان ہو چکا، کفار میں ایک فرقہ یہودیوں کا بھی ہے، اب ان کا بیان ہوتا ہے۔

جو لوگ کفر کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کے ساتھ (جیسا ان کے عقیدہ اور قول سے جو آگے آتا ہے صاف طور پر لازم آتا ہے) اور (کفر کرتے ہیں) اس کے رسولوں کے ساتھ (یعنی بعض کے ساتھ تو صراحتاً، کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے منکر تھے اور سب کے ساتھ اسی سے کفر لازم آگیا) اور یوں چاہتے ہیں کہ اللہ کے اور اس کے رسولوں کے درمیان میں (ایمان لانے کے اعتبار سے) فرق رکھیں، اور (اپنے اس عقیدہ کو زبان سے بھی) کہتے ہیں کہ ہم (پیغمبروں میں سے) بعضوں پر تو ایمان لاتے ہیں اور بعضوں کے منکر ہیں (اس قول اور اس عقیدہ سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ بھی کفر لازم آگیا اور سب رسولوں کے ساتھ بھی، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اور ہر رسول نے سب رسولوں کو رسول کہا ہے، جب بعض کا انکار ہوا تو اللہ

تعالیٰ کی اور بقیہ رسولوں کی بھی تکذیب ہوگئی، جو کہ ایمان کی ضد ہے) اور یوں چاہتے ہیں کہ بین بین ایک راہ تجویز کریں (کہ نہ سب پر ایمان ہے جیسے مسلمان سب پر ایمان رکھتے ہیں، اور نہ سب کا انکار ہے جیسا کہ مشرکین کرتے تھے)۔

(سو) ایسے لوگ یقیناً کافر ہیں (کیونکہ بعض انبیاء کا انکار بھی کفر ہے اور ایمان اور کفر کے درمیان کوئی واسطہ نہیں ہے کہ اس کو آدھا ایمان اور آدھا کفر کہا جائے، بلکہ جب سب پر ایمان نہ ہوا تو وہ کفر ہی ہوا) اور کافروں کیلئے ہم نے اہانت آمیز سزا تیار کر رکھی ہے (وہی ان کے لئے بھی ہوگی)۔

اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا: اسلام ہی مدارِ نجات ہے کسی مخالف مذہب میں نجات نہیں ہو سکتی، قرآن حکیم کے اس واضح فیصلہ نے ان لوگوں کی بے راہی اور کج روی کو پوری طرح کھول دیا ہے، جو دوسرے اہل مذاہب کے ساتھ رواداری میں مذہب اور مذہبی عقلاء کو بطور نوتہ اور ہبہ کے پیش کرنا چاہتے ہیں اور قرآن وسنت کے کھلے ہوئے فیصلوں کے خلاف دوسرے مذہب والوں کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کے نزدیک نجات صرف اسلام میں منحصر نہیں، یہودی اپنے مذہب پر اور عیسائی اپنے مذہب پر رہتے ہوئے بھی نجات پا سکتا ہے، حالانکہ یہ لوگ سب رسولوں کے یا کم از کم بعض رسولوں کے منکر ہیں، جن کے کافر جہنمی ہونے کا اس آیت نے اعلان کر دیا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ اسلام غیر مسلموں کے ساتھ عدل وانصاف اور ہمدردی وخیر خواہی اور احسان ورواداری کے معاملہ میں اپنی مثال نہیں رکھتا، لیکن احسان وسلوک اپنے حقوق اور اپنی ملکیت میں ہوا کرتے ہیں، مذہبی اصول وعقائد ہماری ملکیت نہیں جو ہم کسی کو تحفہ میں پیش کر سکیں، اسلام جس طرح غیر مسلموں کے استہزا رواداری اور حسن سلوک کی تعلیم میں نہایت سخی اور فیاض ہے، اسی طرح وہ اپنی سرحدوں کی حفاظت میں نہایت محتاط اور سخت بھی ہے، وہ غیر مسلموں کے ساتھ ہمدردی خیر خواہی اور انتہائی رواداری کے ساتھ کفر اور رسوم کفر سے پوری طرح اعلان برات بھی کرتا ہے، مسلمانوں کو غیر مسلموں سے الگ ایک قوم بھی قرار دیتا ہے اور ان کے قومی شعائر کی پوری طرح حفاظت بھی کرتا ہے، وہ عبادت کی طرح مسلمانوں کی معاشرت کو بھی دوسروں سے ممتاز رکھنا چاہتا ہے جس کی بیشمار مثالیں قرآن وسنت میں موجود ہیں۔

اگر اسلام اور قرآن کا یہ عقیدہ ہوتا کہ ہر مذہب وملت میں نجات ہو سکتی ہے تو اس کو مذہب اسلام کی تبلیغ پر اتنا زور دینے کا کوئی حق نہ تھا، اور اس کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دینا اصولاً غلط اور خلاف عقل ہوتا، بلکہ اس صورت میں خود رسول کریم ﷺ کی بعثت اور قرآن حکیم کا نزول معاذ اللہ بیکار اور فضول ہو جاتا ہے اور رسول کریم ﷺ اور خلفائے راشدین کا سارا جہاد بے معنی بلکہ ملک گیری کی ہوس رہ جاتی ہے، اس معاملہ میں بعض لوگوں کو سورۃ بقرہ کی آیت نمبر ۶۲ سے شبہ ہوا ہے، جس میں ارشاد ہے: ان الذین امنوا والذین ھادوا والنصری والصابئین من امن باللہ والیوم الاخر وعمل صالحا فلھم اجرھم عند ربھم "یعنی وہ لوگ جو ایمان لائے اور وہ لوگ جو یہودی ہوئے اور نصاریٰ اور صابین ان میں جو بھی اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان لائے اور نیک عمل کرے تو ان کا اجر ان کے رب کے پاس محفوظ ہے، ان پر نہ کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔"

اس آیت میں چونکہ ایمانیات کی پوری تفصیل دینے کے بجائے صرف ایمان باللہ والیوم الآخر پر اکتفا کیا گیا ہے تو جو لوگ قرآن کو صرف ادھورے مطالعہ سے سمجھنا چاہتے ہیں، اس سے وہ یہ سمجھ بیٹھے کہ صرف اللہ تعالیٰ اور قیامت پر ایمان رکھنا نجات کیلئے کافی ہے، رسولوں پر ایمان شرط نجات نہیں اور یہ نہ سمجھ سکے کہ قرآن کی اصطلاح میں ایمان باللہ وہی معتبر ہے جو ایمان بالرسول کے ساتھ ہو، ورنہ محض خدا کے اقرار اور توحید کا تو شیطان بھی قائل ہے، قرآن کریم نے خود اس حقیقت کو ان الفاظ میں واضح فرما دیا ہے: فان امنوا بمثل ما امنتم بہ فقد اھتدوا وان تولوا فانما ھم فی شقاق فسیکفیکھم اللہ (البقرہ: ۱۳۷) "یعنی انکا ایمان اس وقت معتبر ہوگا جبکہ وہ عام مسلمانوں کی طرح ایمان اختیار کریں، جس میں ایمان باللہ کے ساتھ ایمان بالرسول لازم ہے، ورنہ پھر سمجھ لو کہ وہی لوگ تفرقہ اور اختلاف پیدا کرنا چاہتے ہیں، سو اللہ تعالیٰ آپ کی طرف سے ان کیلئے کافی ہے۔"

اور پیش نظر آیات میں تو اس سے بھی زیادہ وضاحت کے ساتھ بتلا دیا گیا ہے کہ جو شخص اللہ کے کسی ایک رسول کا بھی منکر ہو وہ کھلا کافر ہے اور اس کے لیے عذاب جہنم ہے، ایمان باللہ وہی معتبر ہے جو ایمان بالرسول کے ساتھ ہو، اس کے بغیر اس کو ایمان باللہ کہنا بھی صحیح نہیں ہے۔

* * *

فائدہ: یہاں سے ذکر ہے یہود کا، چونکہ یہود میں نفاق کا مضمون بہت تھا اور آپ کے زمانہ میں جو منافق تھے وہ یہود تھے یا یہودیوں سے

ربط اور محبت رکھنے والے اور ان کے مشورہ پر چلنے والے تھے، اس لئے قرآن شریف میں اکثر ان دونوں فریق کا ذکر اکٹھا فرمایا ہے، آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ جو لوگ اللہ سے اور اس کے رسولوں سے منکر ہیں اور اللہ اور اس کے رسولوں میں فرق کرنا چاہتے ہیں، یعنی اللہ پر ایمان لاتے ہیں اور رسولوں پر ایمان نہیں لاتے اور بعض رسولوں کو مانتے ہیں اور بعض کو نہیں مانتے، اور مطلب یہ ہے کہ اسلام اور کفر کے بیچ میں ایک نیا مذہب اپنے لئے نکالیں، ایسے ہی لوگ اصل اور ڈھیٹ کافر ہیں، ان کے لئے خواری اور ذلت کا عذاب تیار ہے۔

فائدہ: اللہ کا ماننا جب ہی معتبر ہے کہ اپنے زمانہ کے پیغمبر کی تصدیق کرے اور اس کا حکم مانے، بدون تصدیق نبی کے اللہ کا ماننا غلط ہے، اس کا اعتبار نہیں، بلکہ ایک نبی کی تکذیب اللہ کی اور تمام رسولوں کی تکذیب سمجھی جاتی ہے، یہود نے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کی تو حق تعالیٰ کی اور تمام انبیاء کی تکذیب کرنے والے قرار دیے گئے اور کٹے کافر سمجھے گئے۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَلَمْ يُفَرِّقُوْا بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ اُولٰٓئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيْهِمْ

اور جو لوگ ایمان لائے اللہ پر اور اس کے رسولوں پر اور جدا نہ کیا ان میں سے کسی کو ان کو جلد دے گا

اُجُوْرَهُمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۵۲﴾ ع ۲۱

ان کے ثواب، اور اللہ ہے بخشنے والا مہربان

خلاصہ تفسیر: اور جو لوگ اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہیں اور اس کے سب رسولوں پر بھی اور ان میں سے کسی میں (ایمان لانے کے اعتبار سے) فرق نہیں کرتے، ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ ضرور ان کا ثواب دیں گے اور (چونکہ) اللہ تعالیٰ بڑے مغفرت والے ہیں (اس لئے ایمان لانے سے پہلے جتنے گناہ ہو چکے ہیں، سب بخش دیں گے، اور چونکہ وہ) بڑے رحمت والے ہیں (اس لئے ایمان کی برکت سے ان کی نیکیوں کو بڑھا کر خوب ثواب دیں گے)۔

بعض مفسرین نے ان آیات کو یہود و نصاریٰ دونوں کی شان میں کہا ہے، کیونکہ نصاریٰ بھی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں مانتے، لیکن آگے پیچھے یہود کا ذکر ہونا اس بات کا تقاضہ کرتا ہے کہ ان آیات کا یہودیوں کے بارے میں ہونا زیادہ مہتم بالشان ہو، اگرچہ تبعاً نصاریٰ بھی آیت کے عام الفاظ میں شامل ہیں۔

❊ ❊ ❊

فائدہ: یعنی اور جن لوگوں نے کسی نبی کو جدا نہیں کیا، بلکہ ایمان لائے اللہ پر اور اس کے سب رسولوں پر، اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ان کو بڑے ثواب عطا فرمائے گا، اس سے مراد مسلمان ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سب پر ایمان لائے۔

يَسْئَلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَاۗءِ فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰٓى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ

تجھ سے درخواست کرتے ہیں اہل کتاب کہ تو ان پر اتار لائے لکھی ہوئی کتاب آسمان سے سو مانگ چکے ہیں موسیٰ سے اس سے بھی بڑی چیز

فَقَالُوْٓا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ ۚ ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ

اور کہا ہم کو دکھلا دے اللہ کو بالکل سامنے سو آپڑی ان پر بجلی ان کے گناہ کے باعث، پھر بنالیا بچھڑے کو

مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ فَعَفَوْنَا عَنْ ذٰلِكَ ۚ وَاٰتَيْنَا مُوْسٰى سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿۱۵۳﴾

بہت کچھ نشانیاں پہنچ چکنے کے بعد پھر ہم نے وہ بھی معاف کیا اور دیا ہم نے موسیٰ کو غلبہ صریح۔

خلاصہ تفسیر: گذشتہ آیات میں یہود کی بداعتقادیوں کا ذکر کر کے ان کی مذمت مذکور تھی، ان آیات میں بھی ان کی کچھ دوسری خراب حرکتوں کی ایک طویل فہرست اور ان قباحتوں کی بناء پر ان کے عذاب وسزا کا ذکر ہے اور یہ سلسلہ دور تک چلا گیا ہے۔

(اے محمد ﷺ!) آپ سے اہل کتاب (یہود) یہ درخواست کرتے ہیں کہ آپ ان کے پاس ایک خاص نوشتہ آسمان سے منگوا دیں، سو (آپ ﷺ ان لوگوں سے اس کو عجیب نہ سمجھئے، کیونکہ یہ فرقہ ایسا معاند ہے کہ) انہوں نے (یعنی اس فرقہ کے جو لوگ موسیٰ علیہ السلام کے وقت موجود تھے انہوں نے) موسیٰ سے اس سے بھی بڑی بات کی درخواست کی تھی اور یوں کہا تھا کہ ہم کو اللہ تعالیٰ کو کھلم کھلا (بلاحجاب) دکھلا دو جس پر ان کی گستاخی کے سبب ان پر کڑک بجلی کی آپڑی، پھر (اس سے بڑھ کر ان کی یہ حرکت ہو چکی ہے کہ) انہوں نے گوسالہ کو (پرستش) کے لئے تجویز کیا تھا بعد اس کے کہ بہت سے دلائل (حق وباطل کی تعیین کے) ان تک پہنچ چکے تھے (مراد ان دلائل سے موسیٰ علیہ السلام کے معجزات ہیں، جن میں سے فرعون کے غرق ہونے تک بہتوں کا مشاہدہ ہو چکا تھا) پھر ہم نے ان سے درگزر کر دیا تھا، اور موسیٰ کو ہم نے بڑا رعب دیا تھا (مگر اس رعب پر اور ہماری درگزر اور عنایت پر بھی ان لوگوں کی یہ کیفیت تھی کہ نہ عنایت سے متاثر ہوتے تھے نہ رعب سے)۔

یَسْـَٔلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ: یہود نے رسول ﷺ سے عناد کی وجہ سے یہ درخواست کی کہ اب ہم آپ سے جب بیعت کریں گے کہ ہمارے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہر ہر یہود کے پاس اس کے نام سے اس مضمون کا نوشتہ آئے کہ محمد اللہ کے رسول ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کی یہاں تسلی فرمائی کہ یہ لوگ ہمیشہ سے ایسی جہالت کی درخواستیں کرتے آئے ہیں، آپ اس کو عجیب نہ سمجھیں اور دل شکستہ نہ ہوں۔

فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰۤى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ: دیدار الٰہی کی درخواست آپ کو پیش کی جانے والی درخواست سے بڑھ کر اس لیے ہے کہ خدا کی کتابیں تو دنیا میں انسانوں پر نازل ہو سکتی ہیں اگرچہ انبیاء علیہم السلام کے علاوہ کسی اور پر نازل نہیں ہوئیں جیسا کہ وہ چاہتے تھے مگر دیدار الٰہی تو دنیا میں کسی کو کبھی واقع ہوا ہی نہیں، اور گوسالہ کی عبادت اس سے بڑھ کر ہے کہ دیدار الٰہی اگرچہ دنیا میں کسی کو نہیں ہوا، مگر آخرت میں تو بعض کو ہوگا، لیکن غیر خدا کا معبود بننے کے قابل ہونا یہ تو عقلاً محال ہے کہ کسی زمانہ میں کسی جگہ میں ہو ہی نہیں سکتا اور گوسالہ کی پرستش کا قصہ مشہور روایات میں درخواست دیدار سے پہلے ہو چکا تھا، پس یہاں لفظ ثُمَّ جس کا ترجمہ ''پھر'' ہے، اس سے مراد زمانہ کے اعتبار سے مؤخر ہونا نہیں ہے، بلکہ یہ بتلانا ہے کہ یہ حرکت پہلے سے بھی بڑھ کر ہے، چنانچہ ترجمہ میں بھی اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

یَسْـَٔلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَیْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ: یہودیوں نے پیغمبر ﷺ سے آسمانی نوشتہ نازل ہونے کی فرمائش کی تھی، اس میں قیاساً اس شخص کی مذمت پر بھی دلالت ہے جو آسمانی برکات کو شیخ، پیر یا کسی بڑے کے اختیار میں سمجھ کر اس سے درخواست کرے، ایسے لوگ غلطی پر ہیں۔

فَقَالُوْۤا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً: یہودیوں نے اپنی تمام تر سرکشی ونافرمانی کے باوجود اللہ کو دیکھنے کی درخواست کی تھی، چنانچہ اس میں اس شخص پر بھی رد ہے جو دنیاوی عیش وعشرت میں پڑا ہوا ہے اور یہ خیال رکھتا ہے کہ اسے خدا تعالیٰ کا دیدار نصیب ہو جائے گا، اس طرح نہ ہوگا، بلکہ زندگی اللہ کی اطاعت میں گذارے تو دیدار نصیب ہوگا۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یہودیوں کے چند سردار آپ ﷺ کی خدمت میں آئے اور کہا اگر تم سچے پیغمبر ہو تو ایک کتاب لکھی لکھائی یکبارگی آسمان سے لا دو جیسے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام تورات لائے تھے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور اس تمام رکوع میں الزامات کو ان کے جواب میں ذکر فرمایا ہے، اس کے بعد تحقیقی جواب دیا ہے، مطلب آیت کا یہ ہے کہ اے محمد ﷺ! یہودی جو تم سے عناداً ایسی کتاب طلب کرتے ہیں، ان کی یہ بے باکی اور سرکشی تعجب کی بات نہیں، ان کے بزرگوں نے تو اس سے بھی بڑی اور سخت بات اپنے نبی موسیٰ علیہ السلام سے طلب کی تھی کہ خداوند تعالیٰ کا آشکارا ہم کو دکھا دو، ورنہ ہم تمہارا یقین نہ کریں گے جیسا کہ سورہ بقرہ میں گزرا، اس پر یہ ہوا کہ ان کے کہنے والوں پر بجلی آپڑی اور سب مر گئے، پھر حق تعالیٰ نے حضرت موسیٰ

علیہ السلام کی دعا سے ان کو زندہ کر دیا، ایسی عظیم الشان نشانیاں دیکھ کر پھر یہ کیا کہ بچھڑے کو پوجنے لگے، بالآخر حق تعالیٰ نے اس سے بھی درگزر فرمائی، سورہ بقرہ میں کسی قدر تفصیل سے مذکور ہو چکا ہے۔

فائدہ: ۲ غلبہ یہ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس بچھڑے کو توذبح کر کے آگ میں جلا دیا اور اس کی راکھ ہوا میں دریا پر اڑا دی اور ستر ہزار آدمی بچھڑے کو سجدہ کرنے والے قتل کیے گئے۔

وَرَفَعْنَا فَوْقَهُمُ الطُّوْرَ بِمِيْثَاقِهِمْ وَقُلْنَا لَهُمُ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُلْنَا لَهُمْ

اور ہم نے اٹھایا ان پر پہاڑ قرار لینے کے واسطے ۱ اور ہم نے کہا داخل ہو دروازہ میں سجدہ کرتے ہوئے ۲ اور ہم نے کہا

لَا تَعْدُوْا فِي السَّبْتِ وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ﴿۱۵۴﴾

کہ زیادتی مت کرو ہفتہ کے دن میں اور ہم نے ان سے لیا قول مضبوط ۳

خلاصہ تفسیر: اور ہم نے ان لوگوں سے (توراۃ پر عمل کرنے کے) قول قرار لینے کے واسطے کوہ طور کو اٹھا کر ان کے اوپر (محاذات میں) معلق کر دیا تھا، اور ہم نے ان کو یہ حکم دیا تھا کہ دروازہ میں عاجزی سے داخل ہونا، اور ہم نے ان کو یہ حکم دیا تھا کہ یوم ہفتہ کے بارے میں (جو حکم تم کو ملا ہے کہ اس میں شکار نہ کریں، اس میں شریعت کی حد سے) تجاوز مت کرنا، اور (اس کے علاوہ اور بھی) ہم نے ان سے قول وقرار نہایت شدید لئے (جس کا بیان سورہ بقرہ میں گذر چکا ہے، لیکن ان لوگوں نے اس قدر اہتمام کے باوجود پھر اپنے عہدوں کو توڑ ڈالا)۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی جب یہود نے کہا تھا کہ تورات کے حکم سخت ہیں ہم نہیں مانتے تو اس وقت کوہ طور کو زمین سے اٹھا کر ان کے سروں پر معلق کر دیا تھا کہ ان حکموں کو قبول کرو اور مضبوطی سے پکڑو ورنہ پہاڑ ڈالا جاتا ہے۔

فائدہ: ۲ یہود کو حکم ہوا تھا کہ شہر میں داخل ہوں سجدہ کر کے اور سر جھکائے ہوئے، انہوں نے سجدہ کے بدلے سرین پر سرکنا اور پھسلنا شروع کیا، جب شہر میں پہنچے تو ان پر طاعون پڑا، دوپہر میں قریب ستر ہزار کے مر گئے۔

فائدہ: ۳ یہودیوں کو حکم تھا کہ ہفتہ کے دن مچھلی کا شکار نہ کریں اور سب دنوں سے زیادہ ہفتہ ہی کے دن مچھلیاں دریا میں بکثرت نظر آتیں، یہودیوں نے یہ حیلہ کیا کہ دریا کے پاس حوض بنائے، ہفتہ کے دن جب مچھلیاں دریا سے حوضوں میں آتیں تو ان کو بند کر رکھتے، پھر دوسرے دن حوضوں میں سے شکار کرتے، اس فریب اور عہد شکنی پر اللہ تعالیٰ نے ان کو بندر کر دیا جو جانوروں میں بہت خسیس اور مکار ہے۔

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ وَكُفْرِهِمْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَقَتْلِهِمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَّقَوْلِهِمْ

ان کو جو سزا ملی سو ان کی عہد شکنی پر اور منکر ہونے پر اللہ کی آیتوں سے اور خون کرنے پر پیغمبروں کا ناحق اور اس کہنے پر

قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۱۵۵﴾

کہ ہمارے دل پر غلاف ہے، سو یہ نہیں بلکہ اللہ نے مہر کر دی ان کے دل پر کفر کے سبب سو ایمان نہیں لاتے مگر کم

خلاصہ تفسیر: ماقبل کی آیات میں بھی یہود کی شرارتوں کا ذکر تھا جس کی وجہ سے ان پر لعن طعن اور سزا کا بیان ہوا، اب ان آیات میں بھی یہود پر لعنت وغیرہ ہونے کے اسباب بیان فرماتے ہیں اور اس کے ضمن میں عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق ان کے باطل خیال کی تردید بھی کی گئی ہے۔

سو ہم نے (ان کی حرکتوں کی وجہ سے) سزا (ئے لعنت وغضب وذلت ومسخ وغیرہ) میں مبتلا کیا (یعنی) ان کی عہد شکنی کی وجہ سے، اور ان

کے کفرو (انکار) کی وجہ سے احکام الٰہیہ کے ساتھ، اور ان کے قتل کرنے کی وجہ سے انبیاء کو (جوان کے نزدیک بھی) ناحق (تھا) اور ان کے اس مقولہ کی وجہ سے کہ ہمارے قلوب (ایسے) محفوظ ہیں (کہ ان میں مخالف مذہب یعنی اسلام کا اثر ہی نہیں ہوتا تو اپنے مذہب پر ہم خوب پختہ ہیں، حق تعالیٰ اس پر رد فرماتے ہیں کہ یہ مضبوطی اور پختگی نہیں ہے) بلکہ ان کے کفر کے سبب ان کے قلوب پر اللہ تعالیٰ نے بند لگا دیا ہے (کہ حق بات کا ان پر اثر نہیں ہوتا) سو ان میں ایمان نہیں مگر قدرے قلیل (اور قدرے قلیل ایمان مقبول نہیں، پس کافر ہی ٹھہرے)۔

عہد شکنی میں بعد کے سب مضامین آ گئے تھے، لیکن زیادہ تشنیع کے لیے سب معاملات کو الگ الگ بھی بیان فرما دیا کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان کا یہ معاملہ ہے کہ ان کے احکام کے منکر ہیں، انبیاء علیہم السلام کے ساتھ یہ برتاؤ ہے کہ تکذیب سے گذر کر ان کو قتل کرتے تھے، رسول اللہ ﷺ کے ساتھ یہ معاملہ ہے کہ آپ کے سامنے اپنے حق پر ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور یہ سب کفر ہی کی اقسام ہیں، اور ان سب قصوں کی تفصیل یعنی دیدار الٰہی کی درخواست کرنا، بچھڑے کی عبادت، اسی طرح طور کا اٹھایا جانا اور ہفتہ کے دن میں زیادتی کرنا وغیرہ پہلے پارہ میں بیان ہو چکی ہیں۔

* * *

فائدہ: یعنی یہود نے اس عہد کو توڑ دیا تو حق تعالیٰ نے ان کی اس عہد شکنی پر اور آیات الٰہی سے منکر ہونے پر اور انبیاء علیہم السلام کے ناحق قتل کرنے پر اور ان کے اس کہنے پر کہ ہمارے دل تو غلاف میں ہیں، ان پر سخت عذاب مسلط فرمائے، جب رسول اللہ ﷺ نے یہودیوں کو ہدایت کی تو کہنے لگے ہمارے دل پردہ میں ہیں، تمہاری بات وہاں تک پہنچ نہیں سکتی، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ بات نہیں، بلکہ کفر کے سبب ان کے دلوں پر اللہ تعالیٰ نے مہر لگا دی ہے جس کے باعث ان کو ایمان نصیب نہیں ہو سکتا مگر تھوڑے لوگ اس سے مستثنیٰ ہیں جیسے حضرت عبداللہ بن سلامؓ اور ان کے ساتھی۔

وَّبِكُفْرِهِمْ وَقَوْلِهِمْ عَلٰى مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيْمًا ﴿١٥٦﴾ وَّقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى

اور ان کے کفر پر اور مریم پر بڑا طوفان باندھنے پر، اور ان کے اس کہنے پر کہ ہم نے قتل کیا مسیح عیسیٰ

ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ۭ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا

مریم کے بیٹے کو جو رسول تھا اللہ کا ۱، اور انہوں نے نہ اسکو مارا اور نہ سولی پر چڑھایا لیکن وہی صورت بن گئی ان کے آگے، اور جو لوگ اسمیں مختلف

فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ ۭ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا ﴿١٥٧﴾

باتیں کرتے ہیں تو وہ لوگ اس جگہ شبہ میں پڑے ہوئے ہیں، کچھ نہیں انکو اسکی خبر صرف اٹکل پر چل رہے ہیں، اور اسکو قتل نہیں کیا بے شک

بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿١٥٨﴾

بلکہ اس کو اٹھا لیا اللہ نے اپنی طرف، اور اللہ ہے زبردست حکمت والا ۲۔

خلاصہ تفسیر: اور (ہم نے ان کو سزائے لعنت وغیرہ میں ان وجوہ سے بھی مبتلا کیا یعنی) ان کے (ایک خاص) کفر کی وجہ سے اور (تفصیل اس کی یہ ہے کہ) حضرت مریم علیہا السلام پر ان کے بڑا بھاری بہتان دھرنے کی وجہ سے (جس سے عیسیٰ علیہ السلام کو جھٹلانا بھی لازم آتا ہے، کیونکہ عیسیٰ علیہ السلام اپنے معجزہ سے ان کی برات ظاہر فرما چکے ہیں اور معجزہ یہی تھا کہ پیدا ہونے کے بعد ہی کلام کیا)۔

اور (نیز بطور تفاخر کے) ان کے اس کہنے کی وجہ سے کہ ہم نے مسیح عیسیٰ ابن مریم کو جو کہ رسول ہیں اللہ کے قتل کر دیا (یہ کہنا خود دلیل ہے عداوت کی اور انبیاء کے ساتھ عداوت کرنا کفر ہے، نیز اس میں قتل کا دعویٰ ہے، اور نبی کو قتل کرنا بھی کفر ہے اور کفر کا دعویٰ کرنا بھی کفر ہے) حالانکہ (یہ دعویٰ کفر ہونے کے علاوہ واقع میں بھی غلط ہے، کیونکہ) انہوں نے (یعنی یہود نے) نہ ان کو (یعنی عیسیٰ علیہ السلام کو) قتل کیا اور نہ ان کو سولی پر چڑھایا،

لیکن ان کو (یعنی یہود کو) اشتباہ ہوگیا اور جو لوگ (اہل کتاب میں سے) ان کے (یعنی عیسیٰ علیہ السلام کے) بارے میں اختلاف کرتے ہیں وہ غلط خیال میں (مبتلا) ہیں، ان کے پاس اس پر کوئی (صحیح) دلیل (وجود) نہیں، بجز تخمینی باتوں پر عمل کرنے کے، اور انہوں نے (یعنی یہود نے) ان کو (یعنی عیسیٰ علیہ السلام کو) یقینی بات ہے کہ قتل نہیں کیا (جس کا وہ دعویٰ کرتے ہیں) بلکہ ان کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف (یعنی آسمان پر) اٹھالیا (اور ایک شخص کو ان کا ہم شکل بنادیا اس کو سولی دی گئی، وہ مقتول ہوا، اسی وجہ سے یہودیوں کو اشتباہ ہوگیا، اسی اشتباہ سے اہل کتاب میں اختلاف پیدا ہوگیا) اور اللہ تعالیٰ بڑے زبردست (یعنی قدرت والے) حکمت والے ہیں (کہ اپنی قدرت وحکمت سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بچالیا اور آسمان پر اٹھالیا اور یہود کو اشتباہ کی وجہ سے پتہ بھی نہ لگا)۔

عِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ رَسُوْلَ اللّٰہِ: یہاں عیسی علیہ السلام کے نام کے ساتھ جو لفظ ''رسول اللہ'' آیا ہے، یہ یہود کا قول نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ نے بڑھادیا ہے کہ دیکھو ایسے پیغمبر کی نسبت ایسا کہتے ہیں، عیسی علیہ السلام کے آسمان پر اٹھائے جانے کے متعلق بحث تیسرا پارہ سورہ آل عمران آیت ۵۵: اِذْ قَالَ اللّٰہُ یٰعِیْسٰۤی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ وَرَافِعُكَ اِلَیَّ میں گذر چکی ہے وہاں ملاحظہ فرمایئے۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی اور نیز اس وجہ سے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے منکر ہوکر دوسرا کفر کمایا اور حضرت مریم پر طوفان عظیم باندھا اور ان کے اس قول پر کہ فخر سے کہتے تھے ہم نے مار ڈالا عیسیٰ مریم کے بیٹے کو جو رسول اللہ تھا، ان تمام وجوہ سے یہود پر عذاب اور مصیبتیں نازل ہوئیں۔

فائدہ: ۲ اللہ تعالیٰ ان کے قول کی تکذیب فرماتا ہے کہ یہودیوں نے نہ عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کیا نہ سولی چڑھایا، یہود جو مختلف باتیں اس بارے میں کہتے ہیں اپنی اپنی اٹکل سے کہتے ہیں، اللہ نے ان کو شبہ میں ڈال دیا، خبر کسی کو بھی نہیں، واقعی بات یہ ہے اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر اٹھالیا اور اللہ تعالیٰ سب چیزوں پر قادر ہے اور اس کے ہر کام میں حکمت ہے، قصہ یہ ہوا کہ جب یہودیوں نے حضرت مسیح کے قتل کا عزم کیا تو پہلے ایک آدمی ان کے گھر میں داخل ہوا، حق تعالیٰ نے ان کو تو آسمان پر اٹھالیا اور اس شخص کی صورت حضرت مسیح علیہ السلام کی صورت کے مشابہ کردی، جب باقی لوگ گھر میں گھسے تو اس کو مسیح سمجھ کر قتل کردیا، پھر خیال آیا تو کہنے لگے کہ اس کا چہرہ تو مسیح کے چہرہ کے مشابہ ہے اور باقی بدن ہمارے ساتھی کا معلوم ہوتا ہے، کسی نے کہا کہ یہ مقتول مسیح ہے تو ہمارا آدمی کہاں گیا؟ اور ہمارا آدمی ہے تو مسیح کہاں ہے؟ اب صرف اٹکل سے کسی نے کچھ کہا، علم کسی کو بھی نہیں، حق یہی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہرگز مقتول نہیں ہوئے، بلکہ آسمان پر اللہ نے اٹھالیا اور یہود کو شبہ میں ڈال دیا۔

وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا ﴿۱۵۹﴾

اور جتنے فرقے ہیں اہل کتاب کے سو عیسیٰ پر یقین لائیں گے اس کی موت سے پہلے، اور قیامت کے دن ہوگا ان پر گواہ

خلاصہ تفسیر: اور (یہود کو عیسی کی نبوت کے انکار اور قتل کے دعوی میں اپنا جھوٹا اور باطل ہونا بہت جلد دنیا ہی میں ظاہر ہوجائے گا، کیونکہ آیت کے وقت نزول سے لے کر کسی زمانہ میں) کوئی شخص اہل کتاب (یعنی یہود میں) سے (باقی) نہ رہے گا، مگر وہ عیسیٰ علیہ السلام (کی نبوت) کی اپنے مرنے سے (ذرا) پہلے (جب کہ عالم برزخ نظر آنے لگتا ہے) ضرور تصدیق کرلے گا (اگرچہ اس وقت کی تصدیق نافع نہیں، مگر ان کا جھوٹ ظاہر ہونے کے لئے تو کافی ہے تو اس سے پہلے اگر ابھی ایمان لے آئیں تو نافع ہوجائے) اور (جب عالم دنیا اور عالم برزخ دونوں ختم ہوچکیں گے یعنی) قیامت کے روز وہ (یعنی عیسیٰ علیہ السلام) ان (منکرین کے انکار) پر گواہی دیں گے۔

انبیاء کے گواہی دینے کے متعلق مزید تفصیل پانچواں پارہ سورہ نساء آیت ۴۱: فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ میں گذر چکی ہے وہاں ملاحظہ فرمایئے اور موت کے وقت ایمان لانے کے مفید اور نافع نہ ہونے کے متعلق کچھ تفصیل چوتھا پارہ سورہ نساء آیت ۱۸: وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ میں گذر چکی ہے وہاں ملاحظہ فرمایئے۔

وَاِنۡ مِّنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤۡمِنَنَّ بِهٖ قَبۡلَ مَوۡتِهٖ: اس آیت کی ① ایک تفسیر تو وہ ہے جو خلاصہ تفسیر میں گذری ہے کہ موتہ کی ضمیر اہل کتاب کی طرف راجع کی جائے اور آیت کا مطلب اس صورت میں یہ ہے کہ یہ یہود اپنی موت سے چند لمحے پیشتر جب عالم برزخ کو دیکھیں گے تو عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت پر ایمان لے آئیں گے، اگرچہ اس وقت کا ایمان ان کے حق میں نافع نہیں ہوگا، جس طرح کہ فرعون کو اس کے اس ایمان نے فائدہ نہیں دیا تھا جو وہ غرق ہونے کے وقت لایا تھا ② دوسری تفسیر جس کو صحابہ تابعین کی بڑی جماعت نے اختیار کیا ہے اور حدیث صحیح سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے یہ ہے کہ موتہ کی ضمیر حضرت مسیح علیہ السلام کی طرف راجع ہے اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ یہ اہل کتاب اگرچہ اس وقت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان نہیں لاتے، یہود تو انہیں نبی ہی تسلیم نہیں کرتے، بلکہ انہیں العیاذ باللہ مفتری اور کاذب قرار دیتے ہیں اور نصاریٰ اگرچہ ان پر ایمان لانے کا دعویٰ کرتے ہیں مگر بعض تو ان میں اپنی جہالت میں یہاں تک پہنچ گئے کہ یہود ہی کی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مقتول اور مصلوب ہونے کے قائل ہو گئے اور بعض اعتقاد کے غلو میں اس حد تک آگے نکل گئے کہ انہیں خدا اور خدا کا بیٹا سمجھ لیا، قرآن کریم کی اس آیت میں بتلایا گیا ہے کہ یہ لوگ اگرچہ اس وقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت پر صحیح ایمان نہیں رکھتے، لیکن جب وہ قیامت کے قریب اس زمین پر پھر نازل ہوں گے تو یہ سب اہل کتاب ان پر صحیح ایمان لے آئیں گے، نصاریٰ تو سب کے سب صحیح اعتقاد کے ساتھ مسلمان ہو جائیں گے، یہود میں جو مخالفت کریں گے قتل کر دیئے جائیں گے، باقی مسلمان ہو جائیں گے، اس وقت کفر اپنی تمام قسموں کے ساتھ دنیا سے فنا کر دیا جائے گا اور اس زمین پر صرف اسلام ہی کی حکمرانی ہوگی۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے ایک روایت منقول ہے: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عیسیٰ بن مریم ایک عادل حکمران بن کر ضرور نازل ہوں گے، وہ دجال اور خنزیر کو قتل کر دیں گے، صلیب کو توڑ ڈالیں گے اور اس وقت عبادت صرف پروردگار عالم کی ہوگی، اس کے بعد حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا اگر تم چاہو تو قرآن کریم کی یہ آیت: وَاِنۡ مِّنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤۡمِنَنَّ بِهٖ قَبۡلَ مَوۡتِهٖ بھی پڑھ لو جس میں اسی حقیت کا ذکر کیا گیا ہے کہ ''اہل کتاب میں سے کوئی بھی باقی نہیں رہے گا، مگر یہ کہ وہ ان پر ان کی موت سے پہلے ایمان لے آئے گا آپ نے فرمایا ''عیسیٰ علیہ السلام کی موت سے پہلے'' اور تین باران الفاظ کو دہرایا، آیت مذکورہ کی یہ تفسیر ایک جلیل القدر صحابی حضرت ابو ہریرہؓ سے بروایت صحیحہ ثابت ہے جس میں قبل موتہ سے مراد قبل موت عیسیٰ علیہ السلام قرار دیا ہے جس نے آیت کا مفہوم واضح طور پر متعین کر دیا کہ یہ آیت قرب قیامت میں حضرت عیسیٰ کے نازل ہونے کے متعلق ہے، اس تفسیر کی بناء پر یہ آیت ناطق ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات ابھی نہیں ہوئی، بلکہ قیامت کے قریب جب وہ آسمان سے نازل ہوں گے اور ان کے نزول سے اللہ جل شانہ کی جو حکمتیں وابستہ ہیں وہ حکمتیں پوری ہو جائیں گی، تب اس زمین پر ہی ان کی وفات ہوگی۔

اس کی تائید سورۃ زخرف کی اس آیت سے بھی ہوتی ہے: وانہ لعِلم للساعة فلا تمترن بها واتبعون، یعنی عیسیٰ علیہ السلام قیامت کی ایک نشانی ہیں، پس تم قیامت کے آنے میں شک مت کرو اور میرا کہا مانو، مفسرین کی ایک بڑی جماعت نے یہاں پر لکھا ہے کہ وانّہٗ کی ضمیر عیسیٰ علیہ السلام کی طرف راجع ہے، اور معنی یہ ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام قیامت کی ایک علامت ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ اس آیت میں حضرت مسیح علیہ السلام کے نزول کی خبر دی گئی ہے کہ وہ قیامت کے قریب نازل ہوں گے اور ان کا آنا قیامت کی علامات میں سے ہوگا، اس آیت میں ایک دوسری قراءت عَلَم بھی منقول ہے، اس سے یہ معنی زیادہ واضح ہو جاتے ہیں کیونکہ علم بفتح اللام کے معنی ''علامت'' کے ہیں، حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کی تفسیر بھی اسی کی موید ہے: حضرت ابن عباسؓ سے وانہ لعلم للساعة کے بارے میں منقول ہے کہ اس سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام مراد ہیں جو قیامت سے پہلے تشریف لائیں گے۔

خلاصہ یہ ہے کہ آیت مذکورہ قبل موتہ کے ساتھ جب حضرت ابو ہریرہ کی حدیث صحیح کے ساتھ تفسیر کو شامل کیا جائے تو اس سے واضح طور پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا زندہ ہونا اور پھر قرب قیامت میں نازل ہو کر یہود پر مکمل غلبہ پانا ثابت ہو جاتا ہے، اسی طرح آیت وانہ لعلم للساعة سے بھی حسب تفسیر ابن عباس یہ مضمون یقینی ہو جاتا ہے، امام تفسیر ابن کثیر نے آیت وانہ لعلم للساعة کی تفسیر میں لکھا ہے: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث اس معاملے میں متواتر ہیں کہ آپ نے قیامت سے پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دنیا میں نازل ہونے کی خبر دی ہے''۔

* * *

فائدہ: حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندہ موجود ہیں آسمان پر، جب دجال پیدا ہوگا تب اس جہان میں تشریف لاکر اسے قتل کریں گے اور یہود اور نصاریٰ ان پر ایمان لائیں گے کہ بیشک عیسیٰ زندہ ہیں مرے نہ تھے اور قیامت کے دن حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان کے حالات اور اعمال کو ظاہر کریں گے کہ یہود نے میری تکذیب اور مخالفت کی اور نصاریٰ نے مجھ کو خدا کا بیٹا کہا۔

فَبِظُلۡمٍ مِّنَ الَّذِيۡنَ هَادُوۡا حَرَّمۡنَا عَلَيۡهِمۡ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتۡ لَهُمۡ وَبِصَدِّهِمۡ عَنۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ

سو یہود کے گناہوں کی وجہ سے ہم نے حرام کیں ان پر بہت سی پاک چیزیں جو ان پر حلال تھیں اور اس وجہ سے کہ روکتے تھے اللہ کی راہ سے

كَثِيۡرًا ﴿۱۶۰﴾ وَّاَخۡذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدۡ نُهُوۡا عَنۡهُ وَاَكۡلِهِمۡ اَمۡوَالَ النَّاسِ بِالۡبَاطِلِ‌ؕ

بہت، اور اس وجہ سے کہ سود لیتے تھے اور ان کو اس کی ممانعت ہو چکی تھی اور اس وجہ سے کہ لوگوں کا مال کھاتے تھے ناحق

وَاَعۡتَدۡنَا لِلۡكٰفِرِيۡنَ مِنۡهُمۡ عَذَابًا اَلِيۡمًا ﴿۱۶۱﴾

اور تیار کر رکھا ہے ہم نے کافروں کے واسطے جو ان میں ہیں عذاب دردناک

خلاصہ تفسیر: گزشتہ آیات میں یہود کی شرارتوں کا اور ان شرارتوں کی وجہ سے ان کی سزا کا ذکر تھا، ان آیات میں بھی ان کی کچھ اور قباحتوں کا بیان ہے اور سزا کی ایک اور نوعیت کا بھی ذکر ہے، وہ یہ کہ قیامت میں تو انہیں عذاب ہوگا ہی، اس دنیا میں بھی ان کی گمراہی کا یہ نتیجہ ہوا کہ بہت سی پاکیزہ چیزیں جو پہلے سے حلال تھیں بطور سزا کے ان پر حرام کر دی گئی ہیں۔

سو یہود کے انہی بڑے بڑے جرائم کے سبب (جن میں سے بہت سے امور سورہ بقرہ میں ذکر کئے) ہم نے بہت سی پاکیزہ (یعنی حلال، نافع اور لذیذ) چیزیں جو (پہلے سے) ان کے لئے (بھی) حلال تھیں (جیسا آیت کل الطعام کان حلا لبنی اسرآئیل میں ہے) ان پر (شریعت موسویہ میں) حرام کر دیں (جن کا بیان سورہ انعام کی آیت: وعلی الذین ھادوا حرمنا کل ذی ظفر میں ہے اور وہاں بھی یہ بتلایا گیا ہے کہ ان حلال پاک چیزوں کو ان کی سرکشی اور نافرمانی کی وجہ سے حرام کیا تھا: ذلك جزینھم ببغیھم) اور (دیگر انبیاء کے زمانہ میں بھی وہ سب حرام ہی رہیں، کوئی حلال نہ ہوئی) بسبب اس کے کہ (وہ آئندہ بھی ایسی حرکتوں سے باز نہ آئے، مثلاً یہی کہ) وہ (احکام میں تحریف کر کے یا حکم خداوندی کو چھپا کر) بہت آدمیوں کو اللہ تعالیٰ کی راہ (یعنی دین حق کے قبول کرنے) سے مانع بن جاتے تھے (کیونکہ ان کی اس کارروائی سے عوام کو خواہ مخواہ دین حق میں خلط والتباس یعنی شبہ ہو جاتا تھا، اگرچہ طلب صادق اور پوری تحقیق سے وہ شبہ دور ہو جانا ممکن تھا)۔

اور بسبب اس کے کہ وہ سود لیا کرتے تھے، حالانکہ ان کو (توریت میں) اس سے ممانعت کی گئی تھی، اور بسبب اس کے کہ وہ لوگوں کے مال ناحق طریقہ (یعنی غیر مشروع ذریعہ) سے کھا جاتے تھے (پس ان وجوہ سے کہ وہ لوگ خدا کے دین سے مخلوق کو روکتے تھے اور سود لیتے اور ناحق مال کھاتے تھے شریعت موسویہ کے باقی رہنے تک کوئی تخفیف نہ ہوئی، البتہ شریعت عیسویہ میں کچھ احکام بدلے تھے، جیسا آیت: لاحل لکم بعض الذی حرم علیکم سے معلوم ہوتا ہے، اور شریعت محمدیہ میں بہت تخفیف ہوگئی، جیسا: یحل لھم الطیبت سے ثابت ہے، یہ تو دنیوی سزا تھی) اور (آخرت میں) ہم نے ان لوگوں کے لئے جو ان میں سے کافر ہیں دردناک سزا کا سامان کر رکھا ہے (البتہ جو قاعدہ شریعت کے موافق ایمان لے آئے اس کی پچھلی جنایتیں سب معاف ہو جائیں گی)۔

فَبِظُلۡمٍ مِّنَ الَّذِيۡنَ هَادُوۡا حَرَّمۡنَا عَلَيۡهِمۡ: جرائم اور گناہوں کی وجہ سے جو بعض پاکیزہ چیزیں یہود پر حرام ہوئیں ان کی تحریم سب کے لیے عام تھیں، اگرچہ بعض نیک لوگ جرائم سے محفوظ بھی تھے، کیونکہ بہت سی حکمتوں کی وجہ سے عادۃ اللہ یونہی جاری ہے، جیسا قرآن میں اس کی

طرف اشارہ بھی ہے: واتقوا فتنة لا تصیبن الذین ظلموا منکم خاصة، یعنی ایسے عذاب سے بچتے رہو جو تم میں سے فقط گناہ گاروں ہی کو نہ پہنچے گا (بلکہ سب کو عام ہو جائے گا) اور حدیث میں بھی آیا ہے کہ "بڑا مجرم وہ ہے کہ زمانہ وحی میں جس کے بے ضرورت سوال کرنے سے کوئی شے سب کے لیے حرام ہو جائے"، شریعت محمدیہ میں بھی بعض چیزیں حرام ہیں، لیکن وہ کسی جسمانی یا روحانی نقصان کی وجہ سے حرام ہیں کہ اس اعتبار سے وہ پاکیزہ اور طیب کہے جانے کے لائق نہیں ہیں، بخلاف یہود کے کہ ان پر جو حلال اور پاکیزہ چیزیں حرام کر دی گئی تھیں ان میں کوئی جسمانی یا روحانی ضرر نہیں تھا، بلکہ ان کی نافرمانیوں کی سزا کے طور پر حرام کر دی گئی تھیں، خلاصہ یہ کہ پاکیزہ نافع چیزوں کا حرام ہونا عذاب اور سیاست ہے، اور نقصان دہ چیزوں کا حرام ہونا رحمت اور حفاظت ہے۔

فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا: یہودیوں کے گناہوں کے سبب ان پر بعض حلال پاکیزہ چیزوں کی پابندی لگ گئی اور حرام کر دی گئیں، اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ گناہوں کے سبب انسان کے واردات قبض یعنی بند ہو جاتے ہیں (قلب کی ان کیفیات کو "واردات" کہا جاتا ہے جو علم ویقین، ذوق وشوق، محبت الٰہی اور لذت عبادات سے تعلق رکھتی ہیں) چنانچہ جب انسان گناہوں میں لگ جائے تو اس کے دل پر جو نیک اعمال کا ذوق وشوق آنا شروع ہو چکا ہوتا ہے اس کا انقطاع ہونا شروع ہو جاتا ہے۔

* * *

فائدہ: یہود کی اگلی پچھلی سخت شرارتیں ذکر فرما کر جس سے ان کی سرکشی اور ان کا گناہوں پر دلیر ہونا ظاہر ہو گیا، اب فرماتے ہیں کہ اسی واسطے ہم نے ان پر شریعت بھی سخت رکھی کہ ان کی سرکشی ٹوٹے تو اب یہ شبہ نہ رہا کہ تحریم طیبات تو ان پر تورات میں کی گئی تھی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے مخالفت کرنا اور حضرت مریم پر تہمت لگانا نزول تورات کے بہت بعد میں ہوا تو سزا جرم سے مقدم کیسے ہو گئی؟

اس تمام رکوع کا خلاصہ یہ ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ سے اہل کتاب برابر ایک سے ایک زائد شرارت اور نافرمانی اور عہد شکنی اور حضرات انبیاء کو ایذاء رسانی کرتے چلے آئے ہیں، اب اگر اے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! تم سے عناداً تورات جیسی کتاب دفعتاً واحدۃً طلب کریں اور قرآن شریف جو سب کتابوں سے افضل ہے اس پر کفایت نہ کریں تو ان متعصب نالائقوں سے کیا مستبعد ہے، ان کی اس قسم کی ناشائستہ حرکات سے تعجب مت کرو اور متحیر نہ ہو، ان کی تمام حرکات چھوٹی بڑی اگلی پچھلی ہم کو خوب معلوم ہیں، ہم نے بھی شریعت سخت ان کے لئے دنیا میں رکھی اور آخرت میں عذاب شدید ان کے واسطے تیار کر رکھا ہے۔

لٰكِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ مِنْهُمْ وَالْمُؤْمِنُوْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ

لیکن جو پختہ ہیں علم میں ان میں اور ایمان والے سو مانتے ہیں اس کو جو نازل ہوا تجھ پر اور جو نازل ہوا تجھ سے پہلے

وَالْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ وَالْمُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ط

اور آفریں ہے نماز پر قائم رہنے والوں کو اور جو دینے والے ہیں زکوٰۃ کے اور یقین رکھنے والے ہیں اللہ پر اور قیامت کے دن پر

اُولٰٓئِكَ سَنُؤْتِيْهِمْ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۶۲﴾ ع ۲۲

سو ایسوں کو ہم دیں گے بڑا ثواب

خلاصہ تفسیر: اوپر کی آیات میں ان یہود کا ذکر تھا جو کفر پر قائم تھے اور منکرات میں مبتلا تھے، اب ان حضرات کا بیان ہے جو اہل کتاب تھے اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی تو وہ صفات جو ان کی کتابوں میں خاتم النبین صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق موجود تھیں آپ میں پوری پوری دیکھیں تو ایمان لے آئے، جیسے حضرت عبداللہ بن سلامؓ واسیدؓ وثعلبہؓ، ان آیات میں انہی حضرات کی تعریف وتوصیف مذکور ہے۔

لیکن ان (یہود) میں جو لوگ علم (دین) میں پختہ (یعنی اس کے موافق عمل کرنے پر مضبوط) ہیں (اور اسی پختگی اور آمادگی نے ان پر حق کو

واضح اور حق بات قبول کر لینے کو آسان کر دیا جو آگے اصلاً دفر عاند کور ہے) اور جو (ان میں) ایمان لے آنے والے ہیں کہ اس کتاب پر بھی ایمان لاتے ہیں جو آپ کے پاس بھیجی گئی، اور اس کتاب پر بھی (ایمان رکھتے ہیں) جو آپ سے پہلے (نبیوں کے پاس) بھیجی گئی (جیسے توریت وانجیل) اور جو (ان میں) نماز کی پابندی کرنے والے ہیں، اور جو (ان میں) زکوۃ دینے والے ہیں، اور جو (ان میں) اللہ تعالیٰ پر اور قیامت کے دن پر اعتقاد رکھنے والے ہیں (سو) ایسے لوگوں کو ہم ضرور (آخرت میں) ثواب عظیم عطا فرمادیں گے۔

آیت میں جن حضرات کے لئے اجر کامل کا وعدہ ہے وہ ان کے ایمان اور اعمال صالحہ کے ساتھ متصف ہونے کی وجہ سے ہے، اور جہاں تک نفس نجات کا تعلق ہے تو وہ عقائد ضروریہ کی تصحیح پر موقوف ہے، بشرطیکہ خاتمہ بالا یمان کی سعادت نصیب ہو۔

❋ ❋ ❋

فائدہ: یعنی بنی اسرائیل میں جن کا علم مضبوط ہے جیسے عبداللہ بن سلامؓ اور ان کے ساتھی اور جو لوگ کہ صاحب ایمان ہیں وہ مانتے ہیں قرآن اور تورات وانجیل سب کو اور نماز کو قائم رکھنے والوں کا تو کیا کہنا ہے اور دینے والے زکوٰۃ کے اور ایمان رکھنے والے اللہ پر اور قیامت پر، ایسے لوگوں کو ہم دیں گے بڑا ثواب، بخلاف اول فریق کے کہ ان کے لئے عذاب سخت موجود ہے۔

إِنَّآ أَوْحَيْنَآ إِلَيْكَ كَمَآ أَوْحَيْنَآ إِلَىٰ نُوحٍ وَٱلنَّبِيِّـۧنَ مِنۢ بَعْدِهِۦ ۚ وَأَوْحَيْنَآ إِلَىٰٓ إِبْرَٰهِيمَ

ہم نے وحی بھیجی تیری طرف ۱؎ جیسے وحی بھیجی نوح پر اور ان نبیوں پر جو اس کے بعد ہوئے ۲؎ اور وحی بھیجی ابراہیم پر

وَإِسْمَٰعِيلَ وَإِسْحَٰقَ وَيَعْقُوبَ وَٱلْأَسْبَاطِ وَعِيسَىٰ وَأَيُّوبَ وَيُونُسَ وَهَٰرُونَ وَسُلَيْمَٰنَ ۚ

اور اسماعیل پر اور اسحاق پر اور یعقوب پر اور اس کی اولاد پر اور عیسیٰ پر اور ایوب پر اور یونس پر اور ہارون پر اور سلیمان پر

وَءَاتَيْنَا دَاوُۥدَ زَبُورًا ﴿١٦٣﴾ وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنَٰهُمْ عَلَيْكَ مِن قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ

اور ہم نے دی داؤد کو زبور، اور بھیجے ایسے رسول کہ جن کا احوال ہم نے سنایا تجھ کو اس سے پہلے اور ایسے رسول جن کا احوال نہیں سنایا

عَلَيْكَ ۚ وَكَلَّمَ ٱللَّهُ مُوسَىٰ تَكْلِيمًا ﴿١٦٤﴾

تجھ کو، اور باتیں کیں اللہ نے موسیٰ سے بول کر ۳؎

خلاصہ تفسیر: پیچھے یسئلک اھل الکتب سے یہودیوں کا ایک احمقانہ سوال نقل کر کے تفصیل سے اس کا الزامی جواب دیا، یہاں ایک دوسرے عنوان سے اسی سوال کو باطل کیا جا رہا ہے کہ تم جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کے لئے یہ شرط لگاتے ہو کہ آپ آسمان سے لکھی ہوئی کتاب لا کر دکھلائیں، جواب کا حاصل یہ ہے کہ ثبوت نبوت کے لیے یہ درخواست محض لغو ہے، کیونکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے اور بھی انبیاء گذرے جن کی نبوت تمہارے نزدیک بھی مسلم ہے، اگر ثبوت نبوت اسی پر موقوف ہے کہ ہر شخص کے پاس خدا کا لکھا ہوا حکم پہنچا کرے کہ فلاں شخص ہمارا رسول ہے تو سب انبیاء میں اس کا ثابت کرنا لازم ہوگا، حالانکہ ایسا کبھی نہیں ہوا، تو اس پر نبوت کا موقوف ہونا ہی غلط ہے، سو جیسی دلیل سے دوسروں کی نبوت ثابت ہے ویسی ہی دلیل یہاں بھی موجود ہے یعنی معجزات پھر ایسی فرمائش عناد نہیں تو اور کیا ہے۔

ہم نے (کچھ آپ کو انوکھا رسول نہیں بنایا جو ایسی واہی تباہی فرمائش کرتے ہیں، بلکہ) آپ کے پاس (بھی ایسی ہی) وحی بھیجی ہے جیسی نوح (علیہ السلام) کے پاس بھیجی تھی، اور ان کے بعد اور پیغمبروں کے پاس (بھیجی تھی) اور (ان میں سے بعضوں کے نام بھی بتلا دیتے ہیں کہ) ہم نے (حضرات) ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور اولاد یعقوب (میں جو نبی گذرے ہیں) اور عیسیٰ اور ایوب اور یونس اور ہارون اور سلیمان

(علیہم الصلوۃ والسلام) کے پاس وحی بھیجی تھی، اور (اسی طرح) ہم نے داؤد (علیہ السلام کے پاس بھی وحی بھیجی تھی، چنانچہ ان) کو (کتاب) زبور دی تھی، اور (ان کے علاوہ) اور (بعض) ایسے پیغمبروں کو (بھی) صاحب وحی بنایا جن کا حال اس کے قبل (سورہ انعام وغیرہ مکی سورتوں میں) ہم آپ سے بیان کر چکے ہیں، اور (بعض) ایسے پیغمبروں کو (صاحب وحی بنایا) جن کا حال (ابھی تک) ہم نے آپ سے بیان نہیں کیا، اور موسیٰ (علیہ السلام کو بھی صاحب وحی بنایا، چنانچہ ان) سے اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر کلام فرمایا۔

* * *

فائدہ: ۱۔ اِنَّاۤ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡكَ: اہل کتاب اور مشرکین مکہ جملہ کفار قرآن مجید کی حقانیت اور صداقت میں طرح طرح سے بیہودہ شبہ پیدا کرتے، دیکھئے! اس موقع میں یہی کہہ دیا کہ جیسے تورات سب کی سب ایک دفعہ اتری تھی، ایسے ہی تم بھی ایک کتاب آسمان سے لا دو تو ہم تم کو سچا جانیں، بقول شخصے: "خوئے بدرا بہانہ بسیار" سو حق تعالیٰ نے اس جگہ چند آیتیں نازل فرما کر اسکی حقیقت واضح کر دی اور وحی کی عظمت اور کفار کے سب خیالات اور شبہات بیہودہ کو رد کر دیا اور وحی الٰہی کی متابعت کو عامۃ اور قرآن مجید کی اطاعت کو تخصیص کے ساتھ بیان فرما کر بتلا دیا کہ حکم الٰہی کا ماننا سب پر فرض ہے، کسی کا کوئی عذر اس میں نہیں چل سکتا جو اسکے تسلیم کرنے میں تردد یا تامل یا انکار کرے وہ گمراہ اور بے دین ہے، اب یہاں سے تحقیقی جواب دیا جاتا ہے۔

فائدہ: ۲۔ وَّالنَّبِیّٖنَ مِنۡۢ بَعۡدِهٖ: اس سے معلوم ہو گیا کہ وحی خاص اللہ کا حکم اور اس کا پیام ہے جو پیغمبروں پر بھیجا جاتا ہے اور انبیائے سابقین پر جیسے وحی الٰہی نازل ہوئی ویسے ہی حضرت محمد رسول اللہ ﷺ پر اللہ تعالیٰ نے اپنی وحی بھیجی تو جس نے اس کو مانا اس کو بھی ضرور ماننا چاہیے اور جس نے اس کا انکار کیا گویا ان سب کا منکر ہو گیا۔

اور حضرت نوح علیہ السلام اور ان سے پچھلوں کے ساتھ مشابہت کی وجہ شاید یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے وقت سے جو وحی شروع ہوئی تو اس وقت بالکل ابتدائی حالت تھی، حضرت نوح علیہ السلام پر اس کی تکمیل ہو گئی، گویا اوّل حالت محض تعلیمی حالت تھی، حضرت نوح علیہ السلام کے زمانہ میں وہ حالت پوری ہو کر اس قابل ہو گئی کہ ان کا امتحان لیا جائے اور فرمانبرداروں کو انعام اور نافرمانوں کو سزا دی جائے، چنانچہ انبیائے اولوالعزم کا سلسلہ بھی حضرت نوح علیہ السلام سے ہی شروع ہوا اور وحی الٰہی سے سرتابی کرنے والوں پر بھی اوّل عذاب حضرت نوح علیہ السلام کے وقت سے شروع ہوا، خلاصہ یہ کہ پہلے حکم الٰہی اور انبیاء کی مخالفت پر عذاب نازل نہیں ہوتا تھا، بلکہ ان کو معذور سمجھ کر ان کو ڈھیل دی جاتی تھی اور سمجھانے ہی میں کوشش کی جاتی تھی، حضرت نوح علیہ السلام کے زمانہ میں جب مذہبی تعلیم خوب ظاہر ہو چکی اور لوگوں کو حکم خداوندی کی متابعت کرنے میں کوئی خفا باقی نہ رہا تو اب نافرمانوں پر عذاب نازل ہوا، اوّل حضرت نوح علیہ السلام کے زمانہ میں طوفان آیا، اس کے بعد حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت شعیب علیہم السلام وغیرہ کے زمانہ میں کافروں پر قسم قسم کے عذاب آئے تو آپ ﷺ کی وحی کو حضرت نوح علیہ السلام اور ان سے پچھلوں کی وحی کے ساتھ تشبیہ دینے میں اہل کتاب اور مشرکین مکہ کو پوری تنبیہ کر دی گئی کہ جو آپ کی وحی یعنی قرآن کو نہ مانے گا وہ عذاب عظیم کا مستحق ہوگا۔

فائدہ: ۳۔ وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوۡسٰى تَكۡلِيۡمًا: حضرت نوح علیہ السلام کے بعد جو انبیاء ہوئے ان سب کو بالا جمال ذکر فرما کر جو ان میں اولوالعزم ہیں اور جو مشہور اور جلیل القدر ہیں ان کو تخصیص اور تفصیل کے ساتھ ذکر فرما دیا، جس سے خوب معلوم ہو گیا کہ آپ کے اوپر جو وحی نازل ہوئی اس کا حق ہونا اور اس کا ماننا ایسا ہی ضروری ہے جیسا تمام اولوالعزم اور مشاہیر انبیاء کی وحی کو، اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ انبیاء پر جو وحی آتی ہے کبھی فرشتہ پیغام لے کر آتا ہے، کبھی کتاب لکھی ہوئی مل جاتی ہے، کبھی بغیر پیغام اور بدون واسطہ کے خود اللہ تعالیٰ اپنے رسول سے بات کرتا ہے، مگر ان سب صورتوں میں چونکہ وہ اللہ کا ہی حکم ہے، کسی دوسرے کا حکم نہیں تو بندوں پر اس کی اطاعت یکساں فرض ہے، بندوں تک پہنچنے کا طریقہ تحریر ہو خواہ تقریر ہو، خواہ پیغام ہو تو اب یہود کا یہ کہنا کہ تورات کی طرح پوری کتاب ایک دفعہ میں آسمان سے لاؤ گے تو ہم تم کو سچا جانیں گے، ورنہ نہیں! کتنی بے ایمانی اور حماقت ہے، جب وحی حکم الٰہی ہے اور اس کے نازل ہونے کی صورتیں البتہ متعدد ہیں تو پھر کسی صورت میں اس کے ماننے میں تردد اور انکار کرنا یا یہ کہنا کہ فلاں خاص طریقہ سے آئے گی تو مانوں گا، ورنہ نہیں! صریح کفر ہے اور کھلی حماقت۔

رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ۭ

بھیجے پیغمبر خوشخبری اور ڈر سنانے والے تا کہ باقی نہ رہے لوگوں کو اللہ پر الزام کا موقع رسولوں کے بعد

وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿۱۶۵﴾

اور اللہ زبردست ہے حکمت والا

خلاصہ تفسیر: اب آگے رسولوں کے بھیجنے کی حکمت اور اس کے ختم پر مقصود یعنی نبوت محمد یہ کا اثبات فرماتے ہیں جو کہ خلاصہ کلام اور نتیجہ مقام ہے، اس کے بعد ان لوگوں کی بدحالی مذکور ہے جو دلائل قائم ہونے اور حق واضح ہو جانے کے باوجود بھی انکار کرتے ہیں۔

(اور) ان سب کو (ایمان پر نجات کی) خوش خبری دینے والے اور (کفر پر عذاب کا) خوف سنانے والے پیغمبر بنا کر اس لئے بھیجا تا کہ لوگوں کے پاس اللہ تعالیٰ کے سامنے ان پیغمبروں کے (آنے کے) بعد کوئی عذر (ظاہراً بھی) باقی نہ رہے (ورنہ قیامت میں یوں کہتے کہ بہت سی چیزوں کا اچھا یا برا ہونا عقل سے معلوم نہ ہو سکتا تھا، پھر ہماری کیا خطا) اور (یوں) اللہ تعالیٰ پورے زور (اور اختیار) والے ہیں (کیونکہ وہ مالک حقیقی ہونے میں منفرد اور یکتا ہیں اس لیے پیغمبر بھیجے بغیر بھی سزا دیتے تو ظلم نہ ہوتا اور درحقیقت کسی کو عذر کا حق نہ تھا، لیکن چونکہ) بڑے حکمت والے (بھی) ہیں (اس لئے حکمت اسی کو مقتضی ہوئی کہ رسول بھیجے جائیں تا کہ ظاہری عذر بھی کسی کو نہ رہے)۔

* * *

فائدہ: اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کو برابر بھیجا کہ مومنوں کو خوشخبری سنائیں اور کافروں کو ڈرائیں، تا کہ لوگوں کو قیامت کے دن اس عذر کی جگہ نہ رہے کہ ہم کو تیری مرضی اور غیر مرضی معلوم نہ تھی، معلوم ہوتی تو ضرور اس پر چلتے، سو جب اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کو معجزے دے کر بھیجا اور پیغمبروں نے راہ حق بتلائی تو اب دین حق کے قبول نہ کرنے میں کسی کا کوئی عذر نہیں سنا جا سکتا، وحی الٰہی ایسی قطعی حجت ہے کہ اس کے روبرو کوئی حجت نہیں چل سکتی، بلکہ سب حجتیں قطع ہو جاتی ہیں اور یہ اللہ کی حکمت اور تدبیر ہے اور اگر زبردستی کرے تو کون روک سکتا ہے مگر اس کو پسند نہیں۔

لٰكِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ بِمَآ اَنْزَلَ اِلَيْكَ اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ ۚ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَشْهَدُوْنَ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ﴿۱۶۶﴾

لیکن اللہ شاہد ہے اس پر جو تجھ پر نازل کیا کہ یہ نازل کیا ہے اپنے علم کے ساتھ، اور فرشتے بھی گواہ ہیں، اور اللہ کافی ہے حق ظاہر کرنے والا

خلاصہ تفسیر: گذشتہ آیت میں رسولوں کے بھیجنے کی حکمت بیان کر کے اب نبوت محمدیہ کو ثابت فرما کر جواب کو مکمل فرماتے ہیں:

(یعنی اگر یہ لوگ اپنے اس شبہ کے دور ہونے پر بھی آپ کی نبوت کو تسلیم نہ کریں) لیکن (واقع میں تو وہ ثابت ہے اور اس کے ثبوت پر صحیح دلیل قائم ہے، چنانچہ) اللہ تعالیٰ بذریعہ اس کتاب کے جس کو آپ کے پاس بھیجا ہے، اور بھیجا بھی (کس طرح) اپنے علمی کمال کے ساتھ (جس سے وہ کتاب ایک بہت بڑا معجزہ بن گئی جو کہ ثبوت نبوت کے لیے قطعی دلیل ہے، ایسی معجز کتاب کے ذریعہ سے آپ کی نبوت کی) شہادت دے رہے ہیں (یعنی دلیل قائم کر رہے ہیں، پس واقع میں معجزہ اور دلیل سے نبوت کا ثبوت ہو چکا، رہا کسی کا ماننا نہ ماننا تو اول تو اس کا خیال ہی کیا) اور (اگر طبعاً اس کا بھی جی ہی چاہتا ہو تو ان سے بہتر مخلوق یعنی) فرشتے (آپ کی نبوت کی) تصدیق کر رہے ہیں (اور مسلمانوں کی تصدیق تو مشاہد ہی ہے، پس اگر چند احمقوں نے نہ مانا نہ سہی) اور (اصل بات تو وہی ہے کہ) اللہ تعالیٰ ہی کی شہادت (یعنی اللہ تعالیٰ کے دلیل قائم کر دینے کے بعد) کافی ہے (کسی کی تصدیق و تسلیم کی آپ کو حاجت ہی نہیں)۔

گویا بعثت انبیاء کی حکمت بیان کی گئی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے بتلا دیا گیا کہ یہ لوگ اگر آپ کی نبوت پر ایمان نہیں لاتے تو اپنا

انجام خراب کرتے ہیں، آپ کی نبوت پر تو خدا بھی گواہ ہے اور خدا کے فرشتے بھی اس کی گواہی دیتے ہیں۔

✻ ✻ ✻

فائدہ: یعنی وحی ہر پیغمبر کو آتی رہی، یہ کچھ نئی بات نہیں، سب کو معلوم ہے، لیکن اس قرآن میں اللہ نے اپنا خاص علم اتارا، اور اللہ اس حق کو ظاہر کردے گا، چنانچہ جاننے والے جانتے ہیں کہ جو علوم اور حقائق قرآن مجید میں سے حاصل ہوئے اور برابر حاصل ہوتے رہیں گے وہ کسی کتاب سے نہیں ہوئے اور جس قدر ہدایت لوگوں کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوئی اور کسی سے نہیں ہوئی۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ قَدْ ضَلُّوْا ضَلٰلًا بَعِيْدًا ﴿۱۶۷﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا

جو لوگ کافر ہوئے اور روکا اللہ کی راہ سے وہ بہک کر دور جا پڑے، جو لوگ کافر ہوئے

وَظَلَمُوْا لَمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ طَرِيْقًا ﴿۱۶۸﴾ اِلَّا طَرِيْقَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ

اور حق دبا رکھا ہرگز اللہ بخشنے والا نہیں ان کو اور نہ دکھلائے گا ان کو سیدھی راہ، مگر راہ دوزخ کی رہا کریں اس میں

اَبَدًا ؕ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ﴿۱۶۹﴾

ہمیشہ، اور یہ اللہ پر آسان ہے

خلاصہ تفسیر: جو لوگ (ان حجت و دلائل کے بعد بھی) منکر ہیں اور (طرہ یہ کہ اوروں کو بھی) خدائی دین سے مانع (روکتے) ہوتے ہیں (حق سے) بڑی دور کی گمراہی میں جا پڑے ہیں (یہ تو دنیا میں ان کے مذہب کا حاصل ہے)۔

(اور اس کا ثمرہ آخرت میں جو ہوگا وہ آگے سنو کہ:) بلاشبہ جو لوگ (حق کے) منکر ہیں اور (حق سے مانع رکاوٹ بن کر) دوسروں کا بھی نقصان کررہے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو کبھی نہ بخشیں گے اور نہ ان کو سوائے جہنم کی راہ کے اور کوئی راہ (یعنی جنت کی راہ) دکھلائیں گے، اس طرح پر کہ اس (جہنم) میں ہمیشہ ہمیشہ کو رہا کریں گے، اور اللہ کے نزدیک یہ سزا معمولی بات ہے (کچھ سامان نہیں کرنا پڑتا)۔

✻ ✻ ✻

فائدہ: قرآن مجید اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق اور توثیق کے بعد فرماتے ہیں کہ اب جو لوگ آپ سے منکر ہوئے اور تورات میں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف اور حالات موجود تھے ان کو چھپالیا اور لوگوں پر کچھ کا کچھ ظاہر کرکے ان کو بھی دین حق سے باز رکھا، سو ایسوں کو نہ مغفرت نصیب ہوئی نہ ہدایت، جس سے خوب واضح ہوگیا کہ ہدایت آپ کی متابعت میں منحصر ہے اور گمراہی آپ کی مخالفت کا نام ہے، جس سے یہود کو پوری سرزنش ہوگئی اور ان کے خیالات کی تغلیط واضح ہوگئی۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الرَّسُوْلُ بِالْحَقِّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَاٰمِنُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ؕ وَاِنْ تَكْفُرُوْا

اے لوگو تمہارے پاس رسول آچکا ٹھیک بات لے کر تمہارے رب کی سو مان لو تاکہ بھلا ہو تمہارا، اور اگر نہ مانو گے

فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۷۰﴾

تو اللہ ہی کا ہے جو کچھ ہے آسمانوں میں اور زمین میں، اور ہے اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا

خلاصہ تفسیر: پیچھے یہودیوں کے ایک شبہ کا جواب جو نبوت محمدیہ کے متعلق تھا نہایت بلاغت و وضاحت سے مذکور ہوچکا، اب تمام جہان کے انسانوں کو عام خطاب فرماتے ہیں کہ تمہاری نجات اسی میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر ایمان لے آؤ۔

اے تمام (جہان کے) لوگو! تمہارے پاس یہ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) سچی بات (یعنی سچا دعویٰ، سچی دلیل) لے کر تمہارے پروردگار کی طرف سے تشریف لائے ہیں سو (اس سچے دعویٰ اور سچی دلیل کا تقاضہ اور مطالبہ تو یہ ہے کہ) تم (ان پر اور جو احکام یہ بتلائیں سب پر) یقین رکھو (جو پہلے سے یقین لائے ہوئے ہیں وہ اس پر قائم رہیں، اور جو نہیں لائے اب اختیار کرلیں) یہ تمہارے لئے بہتر ہوگا (کیونکہ نجات اسی سے ہوگی) اور اگر تم منکر ہوگئے تو (تمہارا ہی نقصان ہے، اللہ تعالیٰ کا کوئی نقصان نہیں، کیونکہ) اللہ تعالیٰ کی (تو) ملک ہے یہ سب جو کچھ (بھی) آسمانوں میں اور زمین میں (موجود) ہے (تو ایسے بڑے عظیم الشان مالک، قادر کو کیا نقصان پہنچا سکتے ہو، مگر اپنی خیر منالو) اور اللہ تعالیٰ (سب کے ایمان و کفر کی) پوری اطلاع رکھتے ہیں (اور دنیا میں جو پوری سزا نہیں دیتے تو اس لئے کہ) کامل حکمت والے (بھی) ہیں (وہ حکمت اسی کا تقاضہ کرتی ہے)۔

❋ ❋ ❋

فائدہ: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کتاب کی تصدیق اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالفین یعنی اہل کتاب کی تغلیط اور تضلیل بیان فرما کر اب عام سب لوگوں کو منادی کی جاتی ہے کہ اے لوگوں! ہمارا رسول سچی کتاب اور سچا دین لے کر تمہارے پاس پہنچ چکا، اب تمہاری خیریت اسی میں ہے کہ اس کی بات مانو اور نہ مانو گے تو خوب سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ ہی کا ہے جو کچھ آسمان اور زمین میں ہے اور تمہارے تمام احوال اور افعال سے خبردار ہے، تمہارے اعمال کا پورا حساب و کتاب ہو کر اس کا بدلہ ملے گا۔

فائدہ: اس ارشاد سے بھی صاف معلوم ہوگیا کہ وحی جو پیغمبر پر نازل ہو اس کا ماننا فرض اور اس کا انکار کفر ہے۔

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ؕ اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى

اے کتاب والو مت مبالغہ کرو اپنے دین کی بات میں اور مت کہو اللہ کی شان میں مگر پکی بات، بیشک مسیح جو ہے عیسیٰ

ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ ۚ اَلْقٰهَآ اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ ۫ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۚ

مریم کا بیٹا وہ رسول ہے اللہ کا اور اس کا کلام ہے، جس کو ڈالا مریم کی طرف اور روح ہے اس کے ہاں کی، سو مانو اللہ کو اور اس کے رسولوں کو

وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ ؕ اِنْتَهُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ؕ اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ؕ سُبْحٰنَهٗٓ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ ۘ

اور نہ کہو کہ خدا تین ہیں، اس بات کو چھوڑو بہتر ہوگا تمہارے واسطے، بیشک اللہ معبود ہے اکیلا، اس کے لائق نہیں ہے کہ اس کے اولاد ہو،

لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۱۷۱﴾

اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، اور کافی ہے اللہ کارساز۔

خلاصہ تفسیر: ماقبل کی آیات میں یہود کو خطاب تھا اور انہی کی گمراہیوں کی تفصیل ذکر کی گئی، اب آگے نصاریٰ کو خطاب ہے، ان کی بداعتقادی، خدا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق ان کے باطل خیالات کی تردید کی گئی ہے۔

اے اہل کتاب (یعنی انجیل والو!) تم اپنے دین (کے بارہ) میں (عقیدہ حق کی) حد سے مت نکلو اور اللہ تعالیٰ کی شان میں غلط بات مت کہو (کہ نعوذ باللہ وہ صاحب اولاد ہے، جیسے بعض کہتے تھے: المسیح ابن اللہ کہ مسیح اللہ کے بیٹے ہیں، یا یہ کہ خدا تین معبودوں میں کا ایک ہے جیسے بعض کہتے تھے: ان اللہ ثالث ثلثۃ بقیہ دو معبود ایک عیسیٰ علیہ السلام کو کہتے تھے اور ایک جبرئیل علیہ السلام کو، جیسا آیت آئندہ میں ولا الملئکۃ المقربون کے بڑھانے سے معلوم ہوتا ہے، اور بعض حضرت مریم علیہا السلام کو جیسا اتخذونی وامی سے معلوم ہوتا ہے، یا یہ کہ خدا عین مسیح ہے جیسا کہ بعض کہتے تھے: ان اللہ ھو المسیح ابن مریم، غرض یہ سب عقیدے باطل ہیں)۔

مسیح عیسیٰ بن مریم تو اور کچھ بھی نہیں، البتہ اللہ کے رسول ہیں اور اللہ تعالیٰ کے ایک کلمہ (پیدائش) ہیں، جس کو اللہ تعالیٰ نے مریم تک (جبرئیل علیہ السلام کے واسطہ سے) پہنچایا تھا، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک جان (دار چیز) ہیں (کہ اس جان کو حضرت مریم کے جسم میں جبرئیل علیہ السلام کی پھونک کے ذریعہ سے پہنچایا گیا تھا باقی نہ وہ خدا کے بیٹے، نہ خود خدا ہیں، نہ تین میں کے ایک ہیں، جیسا کہ عقائد مذکورہ سے لازم آتا ہے)۔

سو (جب یہ سب باتیں غلط ہیں تو سب سے توبہ کرو اور) اللہ پر اور اس کے سب رسولوں پر (ان کی تعلیم کے مطابق) ایمان لاؤ (اور وہ توحید پر موقوف ہے، پس توحید کا عقیدہ رکھو) اور یوں مت کہو کہ (خدا) تین ہیں (مقصود شرک سے منع کرنا ہے اور شرک تمام اقوال مذکورہ میں مشترک ہے، اس شرک سے) باز آجاؤ تمہارے لئے بہتر ہوگا (اور توحید کے قائل ہو جاؤ، کیونکہ) معبود حقیقی تو ایک ہی معبود ہے (اور) وہ صاحب اولاد ہونے سے منزہ ہے، جو کچھ آسمانوں اور زمین میں موجودات ہیں سب اس کی ملک ہیں (اور خدا کا تمام عیبوں سے پاک ہونا اور علی الاطلاق سب کا مالک ہونا توحید کی دلیل ہے) اور (ایک دلیل یہ ہے کہ) اللہ تعالیٰ کارساز ہونے میں کافی ہیں (اور ان کے سوا سب کارسازی میں ناکافی اور دوسروں کے محتاج ہیں، اور ایک حد پر جا کر عاجز ہو جاتے ہیں، حالانکہ کارسازی میں یہ کفایت [کافی ہونا] بڑی کامل صفت ہے، اور خدا میں کامل صفات ہونا ضروری ہیں، سو جب خدا کے سوا کسی میں یہ صفت نہیں تو دوسرا کوئی معبود نہیں ہوسکتا، لہٰذا توحید ثابت ہے)۔

يَاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ: اس آیت میں اہل کتاب کو غلو فی الدین سے منع فرمایا گیا، غلو کے لفظی معنی حد سے نکل جانے کے ہیں اور امام جصاص نے احکام القرآن میں فرمایا: "یعنی دین کے بارے میں غلو یہ ہے کہ دین میں جس چیز کی جو حد مقرر کی گئی ہے اس سے آگے نکل جائے"، اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ دونوں کو اس حکم کا مخاطب اس لئے بنایا گیا کہ غلو فی الدین ان دونوں میں مشترک ہے اور یہ دونوں فرقے غلو فی الدین ہی کے شکار ہیں، یہود کا غلو ظاہری احکام میں باریک بینی اور تعمق تھا اور باطنی مسائل کی طرف سے اعراض تھا، اور نصاریٰ کا غلو باطنی مسائل میں باریک بینی اور تعمق تھا اور ظاہری احکام کی طرف سے اعراض تھا، جبکہ حق طریقہ ظاہر اور باطن دونوں کو جمع کرنا ہے، اسی طرح نصاریٰ نے تو عیسیٰ علیہ السلام کو ماننے اور ان کی تعظیم میں غلو کیا، ان کو خدا یا خدا کا بیٹا یا تیسرا خدا بنا دیا، اور یہود نے ان کے نہ ماننے اور رد کرنے میں غلو کیا کہ ان کو رسول بھی نہ مانا، بلکہ معاذ اللہ ان کی والدہ ماجدہ مریم پر تہمت لگائی اور ان کے نسب پر عیب لگایا، چونکہ غلو فی الدین کے سبب یہود و نصاریٰ کی گمراہی اور تباہی مشاہدہ میں آچکی تھی، اس لئے رسول اکرم ﷺ نے اپنی امت کو اس معاملہ میں پوری احتیاط کی تاکید فرمائی، مسند احمد میں حضرت فاروق اعظمؓ کی روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: "میری مدح وثناء میں ایسا مبالغہ نہ کر جیسا نصاریٰ نے عیسیٰ بن مریم کے معاملہ میں کیا ہے، خوب سمجھ لو کہ میں اللہ کا بندہ ہوں اس لئے تم مجھے اللہ کا بندہ اور رسول کہا کرو"۔ اس سے معلوم ہوا کہ غلو فی الدین وہ تباہ کن چیز ہے جس نے پچھلی امتوں کے دین کو دین ہی کے نام پر برباد کر دیا ہے، اسی لئے ہمارے آقا و مولا حضرت نبی کریم ﷺ نے اپنی امت کو اس وباء عظیم سے بچانے کے لئے مکمل تدبیریں فرمائیں۔

وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ: روح المعانی میں نصاریٰ کے تمام اقوال مع رد کے خوب تفصیل سے لکھے ہیں، اس میں یہ لکھا ہے کہ ان اقوال میں سے بعض کا اس وقت کے نصاریٰ کو انکار ہے، سو یا تو جن نصاریٰ کا یہ قول ہے وہ نزول قرآن کے وقت ہوں گے، پھر آگے ان کا سلسلہ منقطع ہو گیا، یا یہ مراد ہے کہ ان کے اقوال سے یہ عقائد لازم آتے ہیں اور جو بات صراحتاً لازم آئے وہ بھی مثل عقیدہ کے ہوتی ہے۔

وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ: حلول واتحاد کے باطل ہونے پر صریح دلالت کرتا ہے جس کے بعض جہلاء صوفیہ قائل اور معتقد ہیں۔

* * *

فائدہ: سُبْحٰنَهٗۤ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ: اہل کتاب اپنے انبیاء کی تعریف میں غلو سے کام لیتے اور حد سے نکل جاتے خدا اور خدا کا بیٹا کہنے لگتے، سو خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ دین کی بات میں مبالغہ مت کرو اور جس سے اعتقاد ہو اس کی تعریف میں حد سے نہ بڑھنا چاہئے، جتنی بات تحقیق ہو اس سے زیادہ نہ کہے اور حق تعالیٰ کی شان مقدس میں بھی وہی بات کہو جو سچی اور محقق ہو، اپنی طرف سے کچھ مت کہو، تم نے یہ کیا غضب کیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جو کہ رسول اللہ ہیں اور اللہ کے حکم سے پیدا ہوئے تھے ان کو وحی کے خلاف خدا کا بیٹا کہنے لگے اور تین خدا کے معتقد ہو گئے، ایک خدا، دوسرے

عیسیٰ، تیسرے حضرت مریم، ان باتوں سے باز آ ؤ اللہ تعالیٰ واحد اور یکتا ہے کوئی اس کا شریک نہیں اور نہ کوئی اس کا بیٹا ہوسکتا ہے، اس کی ذات پاک اور اس سے منزہ اور مقدس ہے، یہ تمام خرابی اس کی ہے کہ تم نے وحی کی اطاعت اور پابندی نہ کی، وحی کی متابعت کرتے تو خدا کے لئے بیٹا نہ مانتے اور تین خدا کے قائل ہوکر صریح مشرک نہ ہوتے اور محمد رسول اللہ سید الرسل اور قرآن مجید افضل الکتب کی تکذیب کرکے آج دوہرے کافر نہ بنتے۔

فائدہ: اہل کتاب کے ایک فریق نے تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو رسول بھی نہ مانا اور قتل کرنا پسند کیا، جن کا ذکر پہلے گزرا، دوسرے فریق نے ان کو خدا کا بیٹا کہا دونوں کافر ہوگئے، دونوں فریق کی گمراہی کا سبب یہی ہوا کہ وحی کے خلاف کیا، اس سے ظاہر ہوگیا کہ نجات وحی کی متابعت میں منحصر ہے۔

فائدہ: ۲ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا: یعنی آسمانوں اور زمین میں نیچے سے اوپر تک جو کچھ ہے سب اس کی مخلوق اور اس کی مملوک اور اس کے بندے ہیں، پھر کہیے اس کا شریک یا اس کا بیٹا کون اور کیونکر ہوسکتا ہے اور اللہ تعالیٰ سب کام بنانے والا ہے اور سب کی کارسازی کے لئے وہی کافی ہے اور کسی دوسرے کی حاجت نہیں، پھر بتلایئے اس کو شریک یا بیٹے کی حاجت کیسے ہوسکتی ہے، خلاصہ یہ ہوا کہ نہ کسی مخلوق میں اس کے شریک بننے کی قابلیت اور لیاقت اور نہ اس کی ذات پاک میں اس کی گنجائش اور نہ اس کو اس کی حاجت، جس سے معلوم ہوگیا کہ مخلوقات میں سے کسی کو خدا تعالیٰ کا شریک یا بیٹا کہنا اس کا کام ہے جو ایمان اور عقل دونوں سے محروم ہو۔

فائدہ: مضمون بالا سے یہ سمجھ میں آگیا کہ جو کوئی حق تعالیٰ کے لئے بیٹا یا کسی کو اس کا شریک مانتا ہے وہ حقیقت میں جمیع موجودات کو مخلوق باری اور باری تعالیٰ کو خالق جملہ موجودات نہیں مانتا اور نیز اللہ تعالیٰ کو سب کی حاجت براری اور کارسازی کے لئے کافی نہیں جانتا، گویا خدا کو خدائی سے نکال کر مخلوقات اور ممکنات میں داخل کردیا تو اب ارشاد سبحانہ ان یکون لہ ولد میں جس نا پاکی کی طرف اشارہ خفی تھا اس کا پتہ چل گیا اور فرزند حقیقی اور فرزند مجازی اور ظاہری دونوں میں وہ ناپاکی چونکہ برابر موجود ہے تو خوب سمجھ میں آگیا کہ اس کی ذات مقدس جیسے اس سے پاک ہے کہ اس کے بیٹا پیدا ہوا ایسا ہی اس سے بھی پاک اور برتر ہے کہ اپنی مخلوق میں سے کسی کو بیٹا بنائے۔

لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ ؕ وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ

مسیح کو اس سے ہرگز عار نہیں کہ وہ بندہ ہو اللہ کا اور نہ فرشتوں کو جو مقرب ہیں ۱ اور جس کو عار آئے

عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا ﴿۱۷۲﴾

اللہ کی بندگی سے اور تکبر کرے سو وہ جمع کرے گا ان سب کو اپنے پاس اکٹھا

خلاصہ تفسیر: گذشتہ آیت میں اللہ تعالیٰ کی تنزیہ یعنی پاکی کا اثبات اور عیسیٰ علیہ السلام کی خدائی کو باطل کیا، آگے اسی مضمون کی تاکید کے لیے خود عیسیٰ علیہ السلام اور ملائکہ کا عبدیت کا اقرار ذکر فرماتے ہیں، یعنی جن کو خدائی میں شریک کرتے ہو وہ بھی اپنی عبدیت اور غلامی کا اقرار کرتے ہیں، اس کے ساتھ منکرین کے لیے وعید اور مؤمنین کے لیے وعدہ بیان فرماتے ہیں۔

(نصاریٰ خواہ مخواہ عیسیٰ علیہ السلام کو خدا یا خدا کا بیٹا بنا رہے ہیں، حالانکہ خود حضرت) مسیح (علیہ السلام کی یہ کیفیت ہے کہ زمین پر رہنے کی حالت میں تو ان کا بندہ ہونے کا اقرار مشہور ہی ہے جس سے خدائی کا ابطال خود بخود ہوتا ہے، لیکن اب آسمان میں رہنے کی حالت میں بھی جو زمین میں رہنے کی حالت سے بہت بلند اور بالاتر حالت ہے اور اس میں بڑائی کا احتمال بھی ہوسکتا ہے، اب اس حالت میں بھی یا قیامت تک وہ جس حالت میں ہوں ان سے کوئی پوچھ کر دیکھے اس حالت میں بھی) ہرگز خدا کا بندہ بننے سے عار (اور انکار) نہیں کریں گے، اور نہ مقرب فرشتے (کبھی عار کریں گے، جن میں جبرئیل علیہ السلام بھی ہیں، جن کو تین خداؤں میں کا ایک خدا کہتے ہیں خود ان سے کوئی پوچھ کر دیکھے) اور (یہ لوگ بندگی سے عار کیسے کرسکتے ہیں؟ کیونکہ اس عار کرنے کا انجام ایسا برا ہے کہ) جو شخص اللہ تعالیٰ کی بندگی سے عار کرے گا اور تکبر کرے گا تو (اس کا انجام سن لو) اللہ تعالیٰ ضرور سب

لوگوں کو اپنے پاس (یعنی حساب کے موقع پر) جمع کریں گے۔

وَمَنۡ يَّسۡتَنۡكِفۡ عَنۡ عِبَادَتِهٖ: بظاہر شبہ ہوتا ہے کہ ان اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ کو خدا کی عبادت سے تو عار و تکبر نہ تھا، بلکہ قرآن کے من جانب اللہ ہونے اور حضور ﷺ کے رسول ہونے میں کلام تھا، جواب یہ ہے کہ ان لوگوں کے مجموعی حالات سے یہ ثابت ہے کہ ان پر حق واضح ہو گیا تھا، رسول اللہ ﷺ کو اپنی اولاد سے زیادہ پہچانتے تھے: یعرفونه کما یعرفون ابناءهم، مگر حضور ﷺ کی اتباع کرنا ان کو ناگوار تھا، اور آپ ﷺ کی اتباع فرض ہے اور ہر فرض عبادت ہے، پس آپ کی اتباع سے عار ہونا یقیناً عبادت الٰہی سے عار ہے۔

اَنۡ يَّكُوۡنَ عَبۡدًا لِّلّٰهِ: جیسا کہ سورہ مریم میں عیسیٰ علیہ السلام کا قول ہے: انی عبد الله، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بندگی و عبدیت یعنی اللہ تعالیٰ کا بندہ شرف و فضیلت کے مراتب میں سے اعلیٰ ترین مرتبہ ہے۔

* * *

فائدہ: لے یعنی اللہ کا بندہ ہونا اور اس کی عبادت کرنا اور اس کے حکموں کو بجالانا تو اعلیٰ درجہ کی شرافت اور عزت ہے حضرت مسیح علیہ السلام اور ملائکہ مقربین سے اس نعمت کی قدر اور ضرورت پوچھیے ان کو اس سے کیسے ننگ اور عار آسکتا ہے۔ البتہ ذلت اور غیرت تو اللہ کے سوا کسی دوسرے کی بندگی میں ہے جیسے نصاریٰ نے حضرت مسیح کو ابن اللہ اور معبود مان لیا اور مشرکین فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں مان کر ان کی اور بتوں کی عبادت کرنے لگے سو ان کے لئے ہمیشہ کا عذاب اور ذلت ہے۔

فَاَمَّا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيۡهِمۡ اُجُوۡرَهُمۡ وَيَزِيۡدُهُمۡ مِّنۡ فَضۡلِهٖ‌ۚ

پھر جو لوگ ایمان لائے اور عمل کئے انہوں نے اچھے تو ان کو پورا دے گا ان کا ثواب اور زیادہ دے گا اپنے فضل سے

وَاَمَّا الَّذِيۡنَ اسۡتَنۡكَفُوۡا وَاسۡتَكۡبَرُوۡا فَيُعَذِّبُهُمۡ عَذَابًا اَلِيۡمًا ۙ وَّلَا يَجِدُوۡنَ لَهُمۡ

اور جنہوں نے عار کی اور تکبر کیا سو ان کو عذاب دے گا عذاب دردناک، اور نہ پائیں گے اپنے واسطے

مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيۡرًا ﴿۱۷۳﴾

اللہ کے سوا کوئی حمایتی اور نہ مددگار

خلاصہ تفسیر: پھر جو لوگ (دنیا میں) ایمان لائے ہوں گے اور انہوں نے اچھے کام کئے ہوں گے (یعنی خدا کے بندے بنے رہے ہوں گے، کیونکہ عبدیت اور بندگی کا حاصل یہی ایمان اور اعمال ہیں) تو ان کو تو ان کا پورا ثواب (بھی) دیں گے (جو کہ ایمان اور اعمال پر منصوص ہے) اور (اس کے علاوہ) ان کو اپنے فضل سے اور زیادہ (بھی) دیں گے (جس کی تفصیل منصوص نہیں) اور جن لوگوں نے (اللہ کا بندہ بننے سے) عار کیا ہوگا اور تکبر کیا ہوگا تو ان کو سخت دردناک سزا دیں گے، اور وہ لوگ کسی غیر اللہ کو اپنا یار اور مددگار نہ پائیں گے۔

* * *

فائدہ: یعنی جو شخص اللہ تعالیٰ کی بندگی سے ناک چڑھائے گا اور سرکشی کرے گا تو وہ یونہی نہ چھوڑ دیا جائے گا بلکہ ایک روز سب کو اللہ کے سامنے جمع ہونا ہے اور حساب دینا ہے، سو جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کئے یعنی اللہ کی بندگی پوری بجالائے ان کو ان کے کاموں کا پورا ثواب ملے گا، بلکہ اللہ کے فضل سے بڑی بڑی نعمتیں ان کے ثواب سے زیادہ بھی ان کو عنایت ہوں گی، اور جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی بندگی سے ناک چڑھائی اور سرکشی کی وہ عذاب عظیم میں گرفتار ہوں گے اور کوئی ان کا خیر خواہ اور مددگار نہ ہوگا، جن کو اللہ کی بندگی میں شریک کر کے عذاب میں پڑے وہ بھی کام نہ آئیں گے، سو اب نصاریٰ خوب سمجھ لیں کہ ان دونوں صورتوں میں سے ان کے مناسب حال کیا ہے اور حضرت مسیح علیہ السلام کے موافق شان کیا ہے۔

يَاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا ﴿١٧٤﴾ فَاَمَّا الَّذِيْنَ

اے لوگوں تمہارے پاس پہنچ چکی تمہارے رب کی طرف سے سند اور اتاری ہم نے تم پر روشنی واضح، سو جو لوگ

اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَاعْتَصَمُوْا بِهٖ فَسَيُدْخِلُهُمْ فِيْ رَحْمَةٍ مِّنْهُ وَفَضْلٍ ۙ وَّيَهْدِيْهِمْ اِلَيْهِ

ایمان لائے اللہ پر اور اس کو مضبوط پکڑا تو ان کو داخل کرے گا اپنی رحمت اور فضل میں اور پہنچا دے گا ان کو اپنی طرف

صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ﴿١٧٥﴾

سیدھے راستہ پر

خلاصہ تفسیر: پیچھے نصاری کے عقائد کا باطل ہونا مع سزا و جزا کے ذکر ہوا، اب عام خطاب کے ذریعے ان مضامین کا اور ان کی تعلیم فرمانے والے رسول اور قرآن کا سچا ہونا اور تصدیق کرنے والوں یعنی مؤمنین کی فضیلت بیان فرماتے ہیں:

اے (تمام) لوگو! یقیناً تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے ایک (کافی) دلیل آچکی ہے (وہ دلیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک ہے) اور ہم نے تمہارے پاس ایک صاف نور بھیجا ہے (جو کہ قرآن مجید ہے پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کے ذریعہ سے جو کچھ تم کو بتلایا جاتا ہے وہ سب حق ہے جن میں مذکورہ مضامین بھی داخل ہیں)۔

سو جو لوگ اللہ پر ایمان لائے (جس کے لئے توحید و تنزیہ کا اعتقاد لازم ہے) اور انہوں نے اللہ (کے دین) کو (یعنی اسلام کو) مضبوط پکڑا (جس کے لئے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کی تصدیق لازم ہے) سو ایسوں کو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت میں (یعنی جنت میں) داخل کریں گے اور اپنے فضل میں (لے لیں گے، یعنی دخول جنت کے علاوہ اور بھی بڑی بڑی نعمتیں دیں گے جن میں دیدار الٰہی بھی داخل ہے) اور اپنے تک (پہنچنے کا) ان کو سیدھا راستہ بتلا دیں گے (یعنی دنیا میں ان کو اپنی رضا و خوشنودی کے طریقہ پر قائم و ثابت رکھیں گے، اور اسی سے ایمان و اعمال صالحہ کے تارک کی حالت معلوم ہوگئی کہ ان کو یہ ثمرات نہ ملیں گے)۔

اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ وہ خوشنودی کا طریقہ تو بعینہ ایمان اور اعمال صالحہ ہی ہیں پھر اس کے کیا معنی کہ ایمان و اعمال کی وجہ سے ایمان و اعمال ہی پر قائم رکھیں گے، یہ تو تحصیل حاصل ہے کہ ایک ہی چیز کے سبب وہی چیز حاصل ہوئی؟ جواب یہ ہے کہ گذشتہ ایمان و اعمال سبب ہیں، اور آئندہ ایمان و اعمال اس کا ثمرہ ہے، حاصل یہ ہے کہ اطاعت کی برکت سے اس پر جمے رہنے کی توفیق عطا ہوتی ہے۔

* * *

فائدہ: پہلے وحی الٰہی اور بالخصوص قرآن مجید کی عظمت اور اسکی حقانیت کا بیان اور اس کی متابعت اور اتباع کی تاکیدات کا ذکر تھا، اسی کے ذیل میں حضرت مسیح علیہ السلام کی الوہیت اور ان کے ابن اللہ ہونے کا ذکر کیا تھا جس کے قائل نصاری تھے، اس کی تردید اور ابطال کے بعد اب اخیر میں پھر اسی اصلی اور ضروری بات کی سب کو تاکید فرمائی جاتی ہے کہ اے لوگوں تمہارے پاس رب العالمین کی طرف سے حجت کامل اور نور روشن پہنچ چکا جو ہدایت کے لئے کافی اور وافی ہے یعنی قرآن مجید، اب کسی تامل اور تردد کی گنجائش نہیں، سو جو کوئی اللہ پر ایمان لائے گا اور اس مقدس کتاب کو مضبوط پکڑے گا وہ اللہ کی رحمت اور فضل میں داخل ہوگا اور براہ راست اس تک پہنچے گا اور جو اس کے خلاف کرے گا اس کی گمراہی اور خرابی اسی سے سمجھ لیجئے۔

يَسْتَفْتُوْنَكَ ۭ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِي الْكَلٰلَةِ ۭ اِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ لَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَهٗٓ اُخْتٌ

حکم پوچھتے ہیں تجھ سے سو کہہ دے اللہ حکم بتاتا ہے تم کو کلالہ کا، اگر کوئی مرد مر گیا اور اس کے بیٹا نہیں اور اس کے ایک بہن ہے

فَلَهَا نِصۡفُ مَا تَرَكَ ۚ وَهُوَ يَرِثُهَآ إِنۡ لَّمۡ يَكُنۡ لَّهَا وَلَدٌ ۚ فَإِنۡ كَانَتَا اثۡنَتَيۡنِ فَلَهُمَا

تو اس کو پہنچے آدھا اس کا جو چھوڑ مرا[2] اور وہ بھائی وارث ہے اس بہن کا اگر نہ ہو اس کے بیٹا[3] پھر اگر بہنیں دو ہوں تو ان کو پہنچے

الثُّلُثٰنِ مِمَّا تَرَكَ ۚ وَإِنۡ كَانُوٓا إِخۡوَةً رِّجَالًا وَّنِسَآءً فَلِلذَّكَرِ مِثۡلُ حَظِّ الۡأُنۡثَيَيۡنِ ۚ

دو تہائی اس مال کا جو چھوڑ مرا[4] اور اگر کئی شخص ہوں اسی رشتہ کے کچھ مرد اور کچھ عورتیں تو ایک مرد کا حصہ ہے برابر دو عورتوں کے[5]

يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمۡ أَنۡ تَضِلُّوا ۗ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيۡءٍ عَلِيمٌ ﴿١٧٦﴾

ع

بیان کرتا ہے اللہ تمہارے واسطے تا کہ تم گمراہ نہ ہو[6] اور اللہ ہر چیز سے واقف ہے[7]

خلاصہ تفسیر: شروع سورت کے ذرا بعد میراث کے احکام مذکور تھے، پھر وہاں سے تقریباً ایک پارہ کے بعد حکم میراث کی طرف پھر رجوع فرمایا تھا، اب ختم سورت پر پھر اسی کی طرف رجوع ہے، شاید اسے تین جگہ متفرق بیان کرنے میں یہ حکمت ہو کہ اسلام سے پہلے میراث کے بارہ میں بہت ظلم ہوتا تھا، پس سورت کے اول اور بیچ میں، اور آخر میں اس کے ذکر فرمانے سے سننے والوں کو معلوم ہوجائے گا کہ اس کا بہت اہتمام کرنا مقصود ہے، اس آیت کا شان نزول حضرت جابر بن عبداللہؓ کا استفتاء ہے کہ اس وقت صرف ان کی بہنیں وارث تھیں تو انہوں نے اپنی میراث کا حکم دریافت کیا تھا۔

لوگ آپ سے (میراث کلالہ کے بارے میں یعنی جس شخص کی نہ اولاد ہو نہ ماں باپ ہوں) حکم دریافت کرتے ہیں، آپ (جواب میں) فرما دیجئے کہ اللہ تعالیٰ تم کو کلالہ کے باب میں حکم دیتا ہے (وہ یہ ہے کہ) اگر کوئی شخص مرجائے جس کی اولاد نہ ہو (یعنی نہ مذکر نہ مونث اور نہ باپ ہو) اور اس کے ایک (حقیقی یا باپ شریک) بہن ہو تو اس (بہن) کو اس کے تمام ترکہ کا نصف ملے گا (یعنی ترتیب وار اولین حقوق کی ادائیگی کے بعد، اور بقیہ نصف اگر کوئی عصبہ ہوا اُس کو دیا جائے گا، ورنہ پھر اسی بہن کو مل جائے گا) اور وہ شخص اس (اپنی بہن) کا وارث (کل ترکہ کا) ہوگا، اگر (وہ بہن مر جائے اور) اس کے اولاد نہ ہو (اور والدین بھی نہ ہوں تو بھائی اس کے کل ترکہ کا وارث ہوگا)۔

اور اگر (ایسی) بہنیں دو (یا زیادہ) ہوں تو ان کو اس کے کل ترکہ میں سے دو تہائی ملیں گے (اور ایک تہائی عصبہ کو، ورنہ پھر واپس ہو کر انہی بہنوں کو مل جائے گا)۔

اور اگر (ایسی میت کے کہ جس کے نہ اولاد ہے نہ والدین خواہ وہ میت مرد ہو یا عورت) وارث چند (یعنی ایک سے زیادہ ایسے ہی) بھائی بہن ہوں مرد اور عورت تو (ترکہ اس طرح تقسیم ہوگا کہ) ایک مرد کو دو عورتوں کے حصہ کے برابر (یعنی بھائی کو دوہرا، بہن کو اکہرا، لیکن حقیقی بھائی سے باپ شریک بھائی بہن سب ساقط ہوجاتے ہیں، اور حقیقی بہن سے کبھی وہ ساقط ہوجاتے ہیں اور کبھی ان کا حصہ کم ہوجاتا ہے، جس کی تفصیل کتب فرائض میں ہے)۔

(چونکہ اس سورت میں یہاں تک بہت سے اصول و فروع کی تفصیل ہے، اس لیے آخر میں ایک مجمل عنوان سے تمام تر تفصیل کو مکرر یاد دلایا جاتا ہے، شریعت کے بیان وحکمت کی رعایت ذکر فرما کر اپنی منت اور احسان کو یاد دلا کر سورت کو ختم فرماتے ہیں) اللہ تعالیٰ تم سے (دین کی باتیں) اس لئے بیان کرتے ہیں کہ تم (ناواقفیت سے) گمراہی میں نہ پڑو (یہ تو احسان کی یاد دہانی ہے) اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جانتے ہیں (پس حق تعالیٰ احکام کی مصلحتوں پر بھی مطلع ہیں اور احکام میں ان کی رعایت کی جاتی ہے، یہ حکمت کا بیان ہے)۔

* * *

فائدہ: [1] قُلِ اللّٰهُ يُفۡتِيكُمۡ فِي الۡكَلٰلَةِ: شروع سورت میں آیت میراث میں کلالہ کی میراث کا ذکر گزر چکا ہے، اس کے بعد جو بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس کے متعلق زیادہ تفصیل پوچھنی چاہی تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی، "کلالہ" کے معنی ہیں کمزور اور ضعیف، یہاں وہ شخص مراد ہے

جس کے وارثوں میں باپ اور اولاد میں سے کوئی نہ ہو جیسا کہ پہلے بیان ہوا، کیونکہ اصلی وارث والد اور ولد ہی ہیں جس کے یہ نہیں تو اس کے حقیقی بھائی بہن کو بیٹا بیٹی کا حکم ہے، اور اگر حقیقی نہ ہوں تو یہی حکم سوتیلوں کا ہے جو کہ باپ میں شریک ہوں، ایک بہن ہو تو آدھا اور دو بہنیں ہوں تو دو تہائی، اور اگر بھائی اور بہن دونوں ہیں تو مرد کو دوہرا حصہ اور عورت کو اکہرا ملے گا اور اگر فقط بھائی ہوں بہن کوئی نہ ہو تو وہ بہن کے مال کے وارث ہوں گے، یعنی ان کا کوئی حصہ معین نہیں، کیونکہ وہ عصبہ ہیں جیسا کہ آیت میں آگے یہ سب صورتیں مذکور ہیں، اب باقی رہ گئے وہ بھائی بہن جو صرف ماں میں شریک ہوں جن کو "اخیافی" کہتے ہیں، سو ان کا حکم شروع سورت میں فرما دیا گیا ان کا حصہ معین ہے۔

فائدہ: ۲۔ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ: یعنی اگر کوئی مرد مر گیا اور اس نے ایک بہن چھوڑی، نہ بیٹا چھوڑا نہ باپ، تو اس کو میراث میں نصف مال ملے گا۔

فائدہ: ۳۔ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهَا وَلَدٌ: یعنی اور اگر اس کے برعکس ہو، یعنی کوئی عورت لاولد مر گئی اور اس نے بھائی اعیانی [حقیقی] یا علاتی [باپ شریک] چھوڑا تو وہ بہن کے مال کا وارث ہوگا، کیونکہ وہ عصبہ ہے، اور اگر اس نے لڑکا چھوڑا تو بھائی کو کچھ نہ ملے گا، اور لڑکی چھوڑی تو لڑکی سے جو بچے گا وہ اس بھائی کو ملے گا، اور بھائی یا بہن اخیافی [ماں شریک] چھوڑے گی تو اس کے لئے چھٹا حصہ معین ہے جیسا کہ ابتداء سورت میں ارشاد ہوا۔

فائدہ: ۴۔ فَلَهُمَا الثُّلُثٰنِ مِمَّا تَرَكَ: اور اگر دو سے زیادہ بہنیں چھوڑے تو ان کو بھی دو تہائی دیا جائیگا۔

فائدہ: ۵۔ فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ: کچھ مرد اور کچھ عورتیں یعنی کچھ بھائی اور کچھ بہنیں چھوڑیں تو بھائی کا دوہرا اور بہن کا اکہرا حصہ ہے جیسا کہ اولاد کا حکم ہے۔

فائدہ: ۶۔ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا: یعنی اللہ رحیم و کریم محض اپنے بندوں کی ہدایت کے لئے اور ان کو گمراہی سے بچانے کی غرض سے اپنے احکام حقہ صادقہ بیان فرماتا ہے جیسے یہاں میراث کلالہ کو بیان فرمادیا، اُس کی اِس میں کوئی غرض نہیں، وہ سب سے غنی اور بے نیاز ہے تو اب جو اس مہربانی کی قدر نہ کرے، بلکہ اس کے حکم سے انحراف کرے اس کی شقاوت کا کیا ٹھکانہ!! اس سے معلوم ہو گیا کہ بندہ کو جملہ احکام کی تابعداری لازم ہے، اگر ایک معمولی اور جزوی امر میں بھی خلاف کرے گا تو گمراہی ہے، پھر جو لوگ اس کی ذات پاک اور اس کی صفات کمال میں اس کے حکم کا خلاف کرتے ہیں اور اپنی عقل اور اپنی خواہش کو اس کے مقابلہ میں اپنا مقتدا بناتے ہیں ان کی ضلالت اور خباثت کو اسی سے سمجھ لیجئے کہ کس درجہ کی ہوگی۔

فائدہ: ۷۔ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ: اس سے پہلے معلوم ہوا تھا کہ حق سبحانہ اپنے بندوں کی ہدایت کو پسند فرماتا ہے، اب فرمایا کہ "اس کو سب چیزیں معلوم ہیں" تو مطلب یہ نکلا کہ مسائل دینیہ میں جو ضرورت پیش آئے اس کو پوچھ لو، سو اس ارشاد میں صحابہ نے جو کلالہ کے مسئلہ میں استفسار فرمایا تھا اس کی تحسین کی طرف اور آئندہ کو ایسے سوالات کرنے کی ترغیب کی طرف اشارہ سمجھ میں آتا ہے اور یہ بھی سمجھ میں آتا ہے کہ اللہ سب کچھ جانتا ہے، یعنی تم نہیں جانتے، تم تو یہ بھی نہیں بتلا سکتے کہ کلالہ اور اس کے سوا دیگر صورتوں میں جو حصہ مقرر فرمایا گیا اس کی وجہ حقیقت میں کیا ہے، پھر آدمی کی عقل اس قابل کب ہوسکتی ہے کہ اس کے بھروسے حق سبحانہ و تعالیٰ کی ذات و صفات میں وحی کے خلاف پر جرأت کرے جو اپنے تعلقات اور اپنے اقارب کے فرق اور امتیاز سے عاجز ہو وہ ذات بے چون و بے چگوں اور اس کی صفات کو بدون اس کے بتلائے کیا سمجھ سکتا ہے۔

فائدہ: اس جگہ کلالہ کے حکم اور اس کے سبب نزول کو بیان فرمانے سے چند باتیں معلوم ہوئیں:

① اوّل یہ کہ جیسے پہلے وَاِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ (النساء: ۱۳۱) فرما کر اس کے بعد بطریق تمثیل اہل کتاب کا حال ذکر فرمایا تھا ایسے ہی ارشاد فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَاعْتَصَمُوْا بِهٖ آخر الآیۃ (النساء: ۱۷۵) کے بعد اصحاب رسول اللہ ﷺ اجمعین کو بطریق تمثیل ذکر فرمایا تا کہ وحی سے انحراف کرنے والوں کی گمراہی اور برائی اور وحی کا اتباع کرنے والوں کی حقانیت اور بھلائی خوب سمجھ میں آجائے۔

② اسی کے ذیل میں دوسری بات یہ بھی ظاہر ہوگئی کہ اہل کتاب نے تو یہ غضب کیا کہ ذات اقدس سبحانہ و تعالیٰ کے لئے شریک اور اولاد جیسے شنیع امر کو اپنا ایمان بنالیا اور وحی الٰہی کا خم ٹھونک کر خلاف کیا، اور اصحاب رسول اللہ ﷺ کی یہ حالت ہے کہ اصول ایمان اور عبادات تو در کنار معاملات

جزئیہ اور معمولی مسائل متعلقہ میراث نکاح وغیرہ میں بھی وحی کے متجسس اور منتظر رہتے ہیں اور ہر امر میں رسول علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے منہ کو تکتے ہیں اپنی عقل اور خواہش کو حاکم نہیں سمجھتے، اگر ایک دفعہ میں تشفی نہ ہوئی تو مکرر حاضر خدمت ہو کر دریافت کرتے ہیں: ببیں تفاوت راہ از کجاست تا بکجا!۔

③ اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ حضرت سید المرسلین ﷺ بھی بلا حکم وحی اپنی طرف سے حکم نہ فرماتے تھے، اگر کسی امر میں حکم وحی موجود نہ ہوتا تو حکم فرمانے میں نزول وحی کا انتظار فرماتے، جب وحی آتی تب حکم فرماتے، اس سے صاف معلوم ہو گیا کہ ذات پاک وحدہ لاشریک لہ کے سوا کوئی حاکم نہیں، چنانچہ آیات متعددہ میں ان الحکم الا للہ وغیرہ صاف مذکور ہے، باقی جو ہیں وہ سب واسطہ ہیں، ان کے ذریعہ سے اوروں کو حکم الٰہی پہنچایا جاتا ہے، البتہ اتنا فرق ہے کوئی واسطہ قریب ہے کوئی بعید، جیسا حکم سلطانی پہنچانے کے لئے وزیر اعظم اور دیگر مقربین شاہی اور حکام اعلیٰ اور ادنیٰ درجہ بدرجہ سب واسطہ ہوتے ہیں، پھر اس سے زیادہ گمراہی کیا ہو گی کہ کسی امر میں وحی الٰہی کے مقابلہ میں کوئی گمراہ کسی کی بات سنے اور اس پر عمل کرے:

آنانکہ بجز روئے تو جائے نگرانند کو تہ نظرانند چہ کو تہ نظرانند

④ نیز اشارہ ہے اس طرف کہ ایک دفعہ تمام کتاب کے نازل ہونے میں جیسا کہ اہل کتاب درخواست کرتے ہیں وہ خوبی نہیں جو حسب حاجت اور حسب موقع متفرق نازل ہونے میں ہے، کیونکہ ہر کوئی اپنی ضرورت کے موافق اس صورت میں سوال کر سکتا ہے اور بذریعہ وحی متلو اس کو جواب مل سکتا ہے، جیسا کہ اس موقع میں اور قرآن مجید کے بہت سے مواقع میں موجود ہے، اور یہ صورت مفید تر ہونے کے علاوہ بوجہ شرافت ذکر خداوندی وعزت خطاب حق عز وجل ایسے فخر عظیم پر مشتمل ہے جو کسی امت کو نصیب نہیں ہوا، واللہ ذوالفضل العظیم۔جس صحابی کی بھلائی میں یا اس کے سوال کے جواب میں کوئی آیت نازل ہوئی وہ اس کے مناقب میں شمار ہوتی ہے، اور اختلاف کے موقع میں جس کی رائے یا جس کے قول کے موافق وحی متلو اُتری، قیامت تک ان کی خوبی اور نام نیک باقی رہے گا، سو کلالہ کے متعلق سوال وجواب کا ذکر فرما کر اس طرح کے بالعموم سوالات اور جوابات کی طرف اشارہ فرما دیا اور شاید اسی اشارہ کی غرض سے سوال کو مطلق رکھا، مسئول عنہ کو سوال کے ساتھ ذکر نہ فرمایا، بلکہ جواب میں اس کی تصریح فرمائی جس کی دوسری نظیر قرآن شریف میں نہیں اور نیز جواب کو بالتصریح حق تعالیٰ کی طرف منسوب فرمایا، واللہ اعلم، واللہ الھادی۔

الحاصل جملہ احکام کے لئے وحی الٰہی منشا اور اصل ہے اور ہدایت اسی کی متابعت پر موقوف ہے اور کفر وضلالت اسی کی مخالفت میں منحصر ہے اور چونکہ آپ کے زمانہ میں یہود ونصاریٰ اور جملہ مشرکین اور جملہ اہل ضلالت کی گمراہی کی جڑ یہی مخالفت تھی، اس لئے حق تعالیٰ نے اپنے کلام پاک میں بہت جگہ وحی کی متابعت کی خوبی اور اس کی مخالفت کی خرابی پر متنبہ فرمایا، بالخصوص اس موقع میں تو دو رکوع اس مہتم بالشان مضمون کے لئے نازل فرمائے اور تفصیل اور تمثیل کے ساتھ بیان فرمایا، شاید اسی وجہ سے امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی کتاب میں باب: "کَیْفَ کَانَ بَدْءُ الْوَحْیِ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ" منعقد فرما کر آیت: اِنَّآ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ کَمَآ اَوْحَیْنَآ اِلٰی نُوْحٍ وَّالنَّبِیّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ (النساء: ۱۶۳) کو ترجمۃ الباب میں داخل کیا اور ان دونوں رکوع کی طرف اشارہ کر گئے، گویا مطلب یہ ہے وقولہ تعالیٰ انا اوحینا الیک کما اوحینا الیٰ نوح والنبیین من بعدہ إلیٰ آخر مضمون الوحی، واللہ اعلم۔

اٰیاتھا ۱۲۰ ۵ سُوْرَۃُ الْمَآئِدَۃِ مَدَنِیَّۃٌ ۱۱۲ رکوعاتھا ۱۶

خلاصہ تفسیر: گذشتہ سورت کے اختتام پر فرمایا تھا کہ ہم احکام وشرائع کو تم سے بیان کرتے ہیں، اس سورت کے شروع میں اس بات کا حکم ہے کہ تم ہمارے ان بیان کیے ہوئے احکام وشرائع کی پوری پوری بجا آوری کرو، یہ مناسبت تو دونوں سورتوں کے انجام اور آغاز میں ہے، باقی مجموعی حیثیت سے بھی مناسبت ظاہر ہے، کیونکہ دونوں سورتوں میں احکام شرعیہ بکثرت بیان کیے ہیں، اور خود اس سورت کے اجزاء میں بھی ایک عجیب ارتباط ہے وہ یہ کہ اس کی پہلی آیت گویا متن ہے اور تمام سورت اس کی شرح ہے، کیونکہ لفظ "عقود" حضرت ابن عباسؓ کے بقول تمام معاملات اور احکام شرعیہ کو عام اور شامل ہے اور سورت میں ان ہی کی تفصیل ہے، چنانچہ پہلے اجمالی عنوان سے تمام احکام کی بجا آوری کا حکم فرماتے ہیں۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَوۡفُوۡا بِالۡعُقُوۡدِ ؕ اُحِلَّتۡ لَکُمۡ بَهِیۡمَةُ الۡاَنۡعَامِ اِلَّا مَا یُتۡلٰی عَلَیۡکُمۡ

اے ایمان والو پورا کرو عہدوں کو ۱؎ حلال ہوئے تمہارے لئے چوپائے مویشی ۲؎ سوائے ان کے جو تم کو آگے سنائے جاویں گے ۳؎

غَیۡرَ مُحِلِّی الصَّیۡدِ وَ اَنۡتُمۡ حُرُمٌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ یَحۡکُمُ مَا یُرِیۡدُ ①

مگر حلال نہ جانو شکار کو احرام کی حالت میں ۴؎ اللہ حکم کرتا ہے جو چاہے ۵؎

خلاصہ تفسیر: اے ایمان والو! (تمہارے ایمان کا تقاضا اور مطالبہ یہ ہے کہ) اپنے عہدوں کو (جو کہ ایمان کے ضمن میں تم نے خدا تعالیٰ سے کئے ہیں) پورا کرو (یعنی احکام شرعیہ کو بجالاؤ، کیونکہ ایمان لانے سے تم نے سب احکام اپنے اوپر لازم کر لیے اور التزام کا تقاضہ یہ ہے کہ اس کو پورا بھی کیا جائے)۔

(آیت کے پہلے جملے میں اجمالی اور کلی عنوان سے تمام احکام کی تعمیل و بجا آوری کا حکم تھا، اب آگے احکام کی جزئیات کی تفصیل ہے جس میں بعض فرعی احکام ہیں اور بعض مخالفین کے احوال پر مشتمل ہیں اور بعض ان کے مقدمات ہیں)۔

تمہارے لئے تمام چوپائے جو مشابہ (ان) انعام (یعنی اونٹ، بکری، گائے) کے ہوں (جن کی حلت اس آیت سے قبل سورۃ انعام میں معلوم ہو چکی ہے، پس ان کے مشابہ جتنے چوپائے ہیں سب) حلال کئے گئے ہیں (جیسے ہرن، نیل گائے وغیرہ جیسے چوپائے جو شکاری اور درندے نہ ہونے میں مویشیوں یعنی اونٹ، بکری اور گائے وغیرہ سے مشابہ ہیں، البتہ دیگر چوپائے جانور جیسے خچر، گدھے وغیرہ جن کی حرمت صحیح حدیث سے ثابت ہے اس قاعدہ سے مستثنیٰ ہیں، ان حرام کے علاوہ باقی سب اہلی و وحشی چوپائے جانور حلال ہیں) مگر جن کا ذکر آگے (آیت: حرمت علیکم المیتۃ میں) آتا ہے (کہ وہ بھیمۃ الانعام میں داخل ہونے کے باوجود حرام ہیں اور باقی تم کو حلال ہیں) لیکن (ان میں جو) شکار (ہیں ان) کو حلال مت سمجھنا جس حالت میں کہ تم احرام (یا حدود حرم) میں ہو (مثلاً حج و عمرہ کا احرام باندھے ہوا گرچہ تم حدود حرم سے خارج ہو، یا یہ کہ تم حدود حرم کے اندر ہو خواہ بلا احرام ہی سہی، کیونکہ حکم کا اصل مدار شکار کا حدود حرم کے اندر موجود ہونا ہے اگرچہ احرام نہ باندھے ہو، ان دونوں حالتوں میں بری و وحشی کا شکار حرام ہے) بیشک اللہ تعالیٰ جو چاہیں حکم کریں (یعنی وہی مصلحت ہوتا ہے، پس جس جانور کو چاہا ہمیشہ کیلئے [وقت اضطرار کے علاوہ] فی نفسہ حرام کر دیا جس کو چاہا ہمیشہ کیلئے حلال کر دیا، جس کو چاہا کسی حالت میں حلال کر دیا، کسی حالت میں حرام کر دیا، تم کو ہر حالت میں تعمیل واجب ہے)۔

غَیۡرَ مُحِلِّی الصَّیۡدِ وَ اَنۡتُمۡ حُرُمٌ: ''شکار'' سے یہاں مراد صرف ان جانوروں کا شکار ہے جن کا کھانا جائز ہے، باقی سانپ، بچھو وغیرہ موذی جانوروں کا اس ممانعت سے کوئی تعلق نہیں، اور نہ ان کے ہلاک کرنے پر شکار کا اطلاق ہوتا ہے، صید ہی کے لفظ نے اسے بھی واضح کر دیا کہ شکار ان جانوروں کا مراد ہے جو وحشی ہوتے ہیں، اور جن کے پکڑنے میں کسی تدبیر یا حیلہ کی ضرورت پڑتی ہے، عام گھریلو جانور بھیڑ، بکری، گائے، اونٹ وغیرہ جو عادۃً شکار کر کے نہیں لائے جاتے اور روزانہ محض ذبح کر کے کھانے کے کام میں لائے جاتے ہیں ان کے ذبح کی کوئی ممانعت نہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ یَحۡکُمُ مَا یُرِیۡدُ: بیشک اللہ تعالیٰ جو چاہیں حکم کریں، کہ وہی حکم ہمیشہ عین مطابق مصلحت ہوگا، ارادۂ الٰہی سے بالاتر کوئی قانون نہیں، اس میں احکام کے اسرار کی تفتیش کی ممانعت کی طرف اشارہ ہے، یعنی احکام خداوندی کی وجوہات اور پوشیدہ باتوں کی کھوج لگانے کی ممانعت ہے کہ انسان کو یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ نماز کیوں فرض ہے، اس میں رکوع اور سجدہ کیوں ہیں وغیرہ، بس اللہ کے احکام کو اس کا بندہ بنتے ہوئے عاجزی کے ساتھ پورا کرنا ہے کہ ہمیں تو صرف احکام بجالانے کا حکم ہے۔

❋ ❋ ❋

فائدہ: ۱ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَوۡفُوۡا بِالۡعُقُوۡدِ: ایمان شرعی دو چیزوں کا نام ہے صحیح معرفت اور تسلیم وانقیاد، یعنی خدا اور رسول کے جملہ ارشادات کو صحیح وصادق سمجھ کر تسلیم وقبول کے لئے اخلاص سے گردن جھکا دینا، اس تسلیمی جزء کے لحاظ سے ایمان فی الحقیقت تمام قوانین واحکام الٰہیہ کے ماننے اور جملہ حقوق ادا کرنے کا ایک مضبوط عہد واقرار ہے، گویا حق تعالیٰ کی ربوبیت کاملہ کا وہ اقرار جو عہد الست کے سلسلہ میں لیا گیا تھا، جس کا نمایاں اثر انسان کی فطرت اور سرشت میں آج تک موجود ہے، اسی کی تجدید وتشریح ایمان شرعی سے ہوتی ہے۔

پھر ایمان شرعی میں جو کچھ اجمالی عہد وپیمان تھا اسی کی تفصیل پورے قرآن وسنت میں دکھلائی گئی ہے، اس صورت میں دعویٰ ایمان کا مطلب یہ ہوا کہ بندہ تمام احکام الٰہیہ میں خواہ ان کا تعلق براہ راست خدا سے ہو یا بندوں سے جسمانی تربیت سے ہو یا روحانی اصلاح سے دنیاوی مفاد سے ہو یا اخروی فلاح سے شخصی زندگی سے ہو یا حیات اجتماعی سے، صلح سے ہو یا جنگ سے، اس کا عہد کرتا ہے کہ ہر نہج سے اپنے مالک کا وفادار رہے گا، نبی کریم ﷺ جو عہد وپیمان اسلام، جہاد، سمع وطاعت، یا دوسرے عمدہ خصال اور امور خیر کے متعلق صحابہ سے بشکل بیعت لیتے تھے وہ اسی عہد ایمانی کی ایک مخصوص صورت تھی، اور چونکہ ایمان کے ضمن میں بندہ کو حق تعالیٰ کے جلال وجبروت کی صحیح معرفت اور اس کی شان انصاف وانتقام اور وعدوں کی سچائی کا پورا پورا یقین بھی حاصل ہو چکا ہے، اس کا مقتضایہ ہے کہ وہ بدعہدی اور غداری کے مہلک عواقب سے ڈر کر اپنے تمام عہدوں کو جو خدا سے یا بندوں سے یا خود اپنے نفس سے کئے ہوں اس طرح پورا کرے کہ مالک حقیقی کی وفاداری میں کوئی فرق نہ آنے پائے، اس تقریر کے موافق ''عقود'' (عہدوں) کی تفسیر میں جو مختلف چیزیں سلف سے منقول ہیں ان سب میں تطبیق ہو جاتی ہے اور آیت میں ''ایمان والو!'' کے لفظ سے خطاب فرمانے کا لطف مزید حاصل ہوتا ہے۔

فائدہ: ۲ اُحِلَّتۡ لَکُمۡ بَهِیۡمَةُ الۡاَنۡعَامِ: سورہ نساء میں گزر چکا ہے کہ یہود کو ظلم وبدعہدی کی سزا میں بعض حلال وطیب چیزوں سے محروم کر دیا گیا تھا: فَبِظُلۡمٍ مِّنَ الَّذِیۡنَ هَادُوۡا حَرَّمۡنَا عَلَیۡهِمۡ طَیِّبٰتٍ (النساء:۱۶۰) جن کی تفصیل سورہ انعام میں ہے، اس امت مرحومہ کو ایفائے عہد کی ہدایت کے ساتھ ان چیزوں سے بھی منتفع ہونے کی اجازت دے دی گئی، یعنی اونٹ، گائے، بھیڑ، بکری، اور اسی جنس کے تمام اہلی اور وحشی (پالتو اور جنگلی) چوپائے مثلاً ہرن، نیل گائے وغیرہ تمہارے لیے ہر حالت میں حلال کئے گئے، بجز ان حیوانات یا حالات کے جن کے متعلق حق تعالیٰ نے قرآن کریم میں یا نبی کریم ﷺ کی زبانی تمہارے جسمانی یا روحانی یا اخلاقی مصلحت کے لئے ممانعت فرما دی ہے۔

فائدہ: ۳ اِلَّا مَا یُتۡلٰی عَلَیۡکُمۡ: غالباً اس سے مراد وہ چیزیں ہیں جو اسی رکوع کی تیسری آیت میں بیان کی گئی ہیں، یعنی حُرِّمَتۡ عَلَیۡکُمُ الۡمَیۡتَةُ سے ذٰلِکُمۡ فِسۡقٌ تک۔

فائدہ: ۴ غَیۡرَ مُحِلِّی الصَّیۡدِ وَاَنۡتُمۡ حُرُمٌ: محرم کو صرف خشکی کے جانور کا شکار جائز نہیں دریائی شکار کی اجازت ہے اور جب حالت احرام کی رعایت اس قدر ہے کہ اس میں شکار کرنا ممنوع ٹھہرا تو خود حرم شریف کی حرمت کا لحاظ اس سے کہیں زیادہ ہونا چاہئے، یعنی حرم کے جانور کا شکار محرم وغیر محرم سب کے لئے حرام ہو گا، جیسا کہ لَا تُحِلُّوۡا شَعَآئِرَ اللّٰهِ کے عموم سے مترشح ہوتا ہے۔

فائدہ: ۵ اِنَّ اللّٰهَ یَحۡکُمُ مَا یُرِیۡدُ: جس خدا نے تمام مخلوقات کو پیدا کیا، پھر کمال حکمت سے ان میں باہم فرق مراتب رکھا، ہر نوع میں اس کی استعداد کے موافق جدا جدا فطری خواص وقویٰ ودیعت کئے، زندگی اور موت کی مختلف صورتیں تجویز کیں، بلاشبہ اسی خدا کو اپنی مخلوقات میں یہ حق حاصل ہے کہ اپنے اختیار کامل علم محیط اور حکمت بالغہ کے اقتضا سے جس چیز کو جس کسی کے لئے جن حالات میں چاہے حلال یا حرام کر دے: لَا یُسۡـَٔلُ عَمَّا یَفۡعَلُ وَهُمۡ یُسۡـَٔلُوۡنَ۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تُحِلُّوۡا شَعَآئِرَ اللّٰهِ وَلَا الشَّهۡرَ الۡحَرَامَ وَلَا الۡهَدۡیَ

اے ایمان والو حلال نہ سمجھو اللہ کی نشانیوں کو۱ اور نہ ادب والے مہینہ کو۲ اور نہ اس جانور کو جو نیاز کعبہ کی ہو

وَلَا الۡقَلَآئِدَ وَلَاۤ آٰمِّیۡنَ الۡبَیۡتَ الۡحَرَامَ یَبۡتَغُوۡنَ فَضۡلًا مِّنۡ رَّبِّهِمۡ وَرِضۡوَانًا ؕ

اور نہ جنکے گلے پٹا ڈال کر لے جائیں کعبہ کو۳ اور نہ آنے والوں کو حرمت والے گھر کی طرف جو ڈھونڈتے ہیں فضل اپنے رب کا اور اسکی خوشی۴

وَإِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوا ۚ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ أَن صَدُّوكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ

اور جب احرام سے نکلو تو شکار کر لو ۵ اور باعث نہ ہو تم کو اس قوم کی دشمنی جو کہ تم کو روکتی تھی حرمت والی مسجد سے

أَن تَعْتَدُوا ۘ وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ ۖ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۚ

اس پر کہ زیادتی کرنے لگو ۶ اور آپس میں مدد کرو نیک کام پر، اور پرہیزگاری پر اور مدد نہ کرو گناہ پر اور ظلم پر ۷

وَاتَّقُوا اللَّهَ ۖ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ②

اور ڈرتے رہو اللہ سے، بیشک اللہ کا عذاب سخت ہے ۸

خلاصہ تفسیر: سورۃ مائدہ کی پہلی آیت میں معاہدات کے پورا کرنے کی تاکید تھی، ان معاہدات میں سے ایک معاہدہ یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ حلال وحرام کی پابندی کی جائے، اس دوسری آیت میں اس معاہدہ کی دو اہم دفعات کا بیان ہے، ایک شعائر اللہ کی تعظیم اور ان کی بے حرمتی سے بچنے کی ہدایت، دوسرے اپنے اور غیر، دوست اور دشمن سب کے ساتھ عدل وانصاف کا معاملہ اور ظلم کا بدلہ ظلم سے لینے کی ممانعت۔

اے ایمان والو! بے حرمتی نہ کرو خدا تعالیٰ (کے دین) کی نشانیوں کی (یعنی جن چیزوں کے ادب کی حفاظت کے لیے خدا نے کچھ احکام مقرر کئے ہیں ان کے خلاف کر کے بے ادبی نہ کرو، مثلاً حرم اور احرام کا یہ ادب مقرر کیا ہے کہ اس میں شکار نہ کرو تو شکار کرنا بے ادبی اور حرام ہوگا) اور نہ حرمت والے مہینے کی (بے ادبی کرو کہ اس میں کافروں سے لڑنے لگو) اور نہ حرم میں قربانی ہونے والے جانور کی (بے ادبی کرو کہ اس سے بری طرح پیش آؤ) اور نہ ان جانوروں کی (بے ادبی کرو) جن کے گلے میں (اس نشانی کے لئے) پٹے پڑے ہوں (کہ یہ اللہ کی نیاز ہیں حرم میں ذبح ہوں گے) اور نہ ان لوگوں کی (بے حرمتی کرو) جو کہ بیت الحرام (یعنی بیت اللہ) کے قصد سے جا رہے ہوں (اور) اپنے رب کے فضل اور رضامندی کے طالب ہوں (یعنی ان چیزوں کے ادب کی وجہ سے کافروں کے ساتھ بھی بری طرح مت پیش آؤ)۔

اور (پیچھے آیت میں جو احرام کی حالت میں شکار کو حرام فرمایا گیا ہے وہ احرام ہی تک ہے ورنہ) جس وقت تم احرام سے باہر آجاؤ تو (اجازت ہے کہ) شکار کیا کرو (بشرطیکہ وہ شکار حرم میں نہ ہو)۔

اور (اوپر جن چیزوں کے ساتھ بری طرح پیش آنے سے منع کیا گیا ہے اس میں) ایسا نہ ہو کہ تم کسی قوم سے جو اس سبب سے بغض ہے کہ انہوں نے (تم کو حدیبیہ کے سال) مسجد حرام (میں جانے) سے روک دیا تھا (مراد کفار قریش ہیں) وہ (بغض) تمہارے لئے اس کا باعث ہو جائے کہ تم (شریعت کی) حد سے نکل جاؤ (یعنی مذکورہ احکام کے خلاف کر بیٹھو، ایسا نہ کرنا) اور نیکی اور تقویٰ (کی باتوں میں) ایک دوسرے کی اعانت کرتے رہو (مثلاً یہی احکام ہیں کہ ان میں دوسروں کو بھی عمل کرنے کی ترغیب دو) اور گناہ اور زیادتی (کی باتوں میں) ایک دوسرے کی اعانت مت کرو (مثلاً یہی احکام ہیں اگر کوئی ان کے خلاف کرنے لگے تو تم اس کی اعانت مت کرو) اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو (کہ اس سے سب احکام کی پابندی آسان ہو جاتی ہے) بلاشبہ اللہ تعالیٰ (احکام کی مخالفت کرنے والے کو) سخت سزا دینے والے ہیں۔

ولا الھدی سے **ولا آمّین البیت الحرام** تک یہ احکام اس وقت تھے جب کفار حج وعمرہ کے لیے جایا کرتے تھے، اب ان کا حج وعمرہ کے لیے جانے دینا منسوخ ہے: **فلا یقربوا المسجد الحرام بعد عامھم ھذا**۔

يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِّن رَّبِّهِمْ: اس میں اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ رب العالمین ہے نہ کہ صرف رب المسلمین، پس اس میں اللہ کی رحمت کی وسعت کا بیان ہے۔

وَإِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوا: شکار کے مباح اور جائز ہونے کے باوجود اس میں صیغہ امر کا وارد ہونا اس پر دلالت کرتا ہے کہ جس مباح اور

جائز کام کے ترک سے بظاہر اس کے ممنوع ہونے کا شبہ ہونے لگے تو اس جائز کام کا کرنا پسندیدہ ہے، اس سے سمجھ لیا جائے کہ بعض شدت پسند جو بعض مباح اور جائز کے ترک میں حرام کی طرح مبالغہ وتشدد کرتے ہیں اس میں کیا طرز عمل ہونا چاہیے!!!۔

وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ: اس سے معلوم ہوا کہ اگر کسی سے بغض فی اللہ بھی ہو تب بھی اس کے ساتھ معاملات میں شرعی حدود سے تجاوز کرنا درست نہیں۔

* * *

فائدہ: ۱ لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰہِ: یعنی جو چیزیں حق تعالیٰ کی عظمت و معبودیت کے لئے علامات اور نشانات خاص قرار دی گئی ہیں ان کی بے حرمتی مت کرو، ان میں حرم محترم بیت اللہ شریف، جمرات، صفا و مروہ، ہدی، احرام، مساجد، کتب سماویہ وغیرہ تمامی حدود و فرائض اور احکام دینیہ شامل ہیں، آگے ان نشانیوں میں سے بعض مخصوص چیزوں کو جو مناسک سے متعلق ہیں ذکر فرماتے ہیں جیسا کہ اس سے پہلی آیت میں بھی محرم کے بعض احکام ذکر کئے گئے تھے۔

فائدہ: ۲ وَلَا الشَّھْرَ الْحَرَامَ: ادب والے مہینے چار ہیں مِنْھَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ① ذوالقعدہ ② ذی الحجہ ③ محرم ④ رجب، ان کی تعظیم واحترام یہ ہے کہ دوسرے مہینوں سے بڑھ کر ان میں نیکی اور تقویٰ کو لازم پکڑے اور شر و فساد سے بچنے کا اہتمام کیا جائے، خصوصاً حجاج کو ستا کر اور دق کر کے حج بیت اللہ سے نہ روکا جائے، گویا یہ امور سال کے بارہ مہینوں میں واجب العمل ہیں، لیکن ان محترم مہینوں میں بالخصوص بہت زیادہ مؤکد قرار دیے گئے، باقی دشمنان اسلام کے مقابلہ میں جارحانہ اقدام ہو تو جمہور کا مذہب یہ ہی ہے بلکہ ابن جریرؒ نے اس پر اجماع نقل کیا ہے کہ اس کی ان مہینوں میں ممانعت نہیں رہی، اس کا بیان سورہ توبہ میں آئے گا ان شاء اللہ۔

فائدہ: ۳ وَلَا الْقَلَآئِدَ وَلَآ آٰمِّیْنَ الْبَیْتَ الْحَرَامَ: ''قلائد'' قلادہ کی جمع ہے جس سے مراد وہ ہار یا پٹا ہے جو ہدی کے جانور کے گلے میں نشان کے طور پر ڈالتے تھے تا کہ ہدی کا جانور سمجھ کر اس سے تعرض نہ کیا جائے اور دیکھنے والوں کو اسی جیسا عمل کرنے کی ترغیب بھی ہو، قرآن کریم نے ان چیزوں کی تعظیم وحرمت کو باقی رکھا اور ہدی یا اس کی علامات سے تعرض کرنے کو ممنوع قرار دیا۔

فائدہ: ۴ یَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّھِمْ وَرِضْوَانًا: بظاہر یہ شان صرف مسلمانوں کی ہے، یعنی جو مخلص مسلمان حج وعمرہ کیلئے جائیں ان کی تعظیم واحترام کرو، اور ان کی راہ میں روڑے مت اٹکاؤ اور جو مشرکین حج بیت اللہ کیلئے آتے تھے اگر وہ بھی اس آیت کے عموم میں داخل ہوں کیونکہ وہ بھی اپنے زعم اور عقیدہ کے موافق خدا کے فضل وقرب اور خوشنودی کے طالب ہوتے تھے تو کہنا پڑے گا کہ یہ حکم اس وقت سے پہلے کا ہے جب کہ: اِنَّمَا الْمُشْرِکُوْنَ نَجَسٌ فَلَا یَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِھِمْ ھٰذَا (التوبہ:۱۶۰) کی منادی کرائی گئی۔

فائدہ: ۵ وَاِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا: یعنی حالت احرام میں شکار کی جو ممانعت کی گئی تھی وہ احرام کھول دینے کے بعد باقی نہیں رہی۔

فائدہ: ۶ اَنْ صَدُّوْکُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا: پچھلی آیت میں جن شعائر کو حق تعالیٰ نے معظم ومحترم قرار دیا تھا ۶ھ ہجری میں مشرکین مکہ نے ان سب کی اہانت کی، نبی کریم ﷺ اور تقریباً ڈیڑھ ہزار صحابہ ماہ ذیقعدہ میں محض عمرہ ادا کرنے کیلئے مدینہ طیبہ سے روانہ ہوئے، حدیبیہ کے مقام پر پہنچ کر مشرکین نے اس مذہبی وظیفہ کی بجا آوری سے روک دیا، نہ حالت احرام کا خیال کیا نہ کعبہ کی حرمت کا نہ محترم مہینہ کا نہ ہدی وقلائد کا، مسلمان شعائر اللہ کی اس توہین اور مذہبی فرائض سے روک دیے جانے پر ایسی ظالم اور وحشی قوم کے مقابلہ میں جس قدر بھی غیظ وغضب اور بغض وعداوت کا اظہار کرتے وہ حق بجانب تھے اور جوش انتقام سے برافروختہ ہو کر جو کاروائی بھی کر بیٹھتے وہ ممکن تھی، لیکن اسلام کی محبت وعداوت دونوں نپی تلی ہیں، قرآن کریم نے ایسے جابر و ظالم دشمن کے مقابلہ پر بھی اپنے جذبات کو قابو میں رکھنے کا حکم دیا، عموماً آدمی زیادہ محبت یا زیادہ عداوت کے جوش میں حد سے گزر جاتا ہے، اس لئے فرمایا کہ سخت سے سخت دشمنی تمہارے لئے اس کا باعث نہ ہو کہ تم زیادتی کر بیٹھو اور عدل وانصاف کو ہاتھ سے چھوڑ دو۔

فائدہ: ۷ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَی الْاِثْمِ: اگر کوئی شخص بالفرض جوش انتقام میں زیادتی کر بیٹھے تو اس کے روکنے کی تدبیر یہ ہے کہ جماعت اسلام اس کے ظلم وعدوان کی اعانت نہ کرے، بلکہ سب مل کر نیکی اور پرہیز گاری کا مظاہرہ کریں اور اشخاص کی زیادتیوں اور بے اعتدالیوں کو روکیں۔

فائدہ: ۸ اِنَّ اللّٰہَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ: یعنی حق پرستی، انصاف پسندی اور تمام عمدہ اخلاق کی جڑ خدا کا خوف ہے اور اگر خدا سے ڈر کر نیکی سے تعاون اور بدی سے ترک تعاون نہ کیا تو عام عذاب کا اندیشہ ہے۔

حُرِّمَتْ عَلَیْكُمُ الْمَیْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِیْرِ وَمَآ اُهِلَّ لِغَیْرِ اللّٰهِ بِهٖ وَالْمُنْخَنِقَةُ

حرام ہوا تم پر مردہ جانور ۱؎ اور لہو ۲؎ اور گوشت سور کا اور جس جانور پر نام پکارا جائے اللہ کے سوا کسی اور کا اور جو مر گیا ہو گلا گھونٹنے سے

وَالْمَوْقُوْذَةُ وَالْمُتَرَدِّیَةُ وَالنَّطِیْحَةُ وَمَآ اَكَلَ السَّبُعُ اِلَّا مَا ذَكَّیْتُمْ ۫ وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ

یا چوٹ سے یا اونچے سے گر کر یا سینگ مارنے سے اور جس کو کھایا ہو درندہ نے مگر جس کو تم نے ذبح کر لیا، اور حرام ہے جو ذبح ہوا کسی تھان پر ۳؎

وَاَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ ؕ ذٰلِكُمْ فِسْقٌ ؕ

اور یہ کہ تقسیم کرو جوئے کے تیروں سے ۴؎ یہ گناہ کا کام ہے

خلاصہ تفسیر: پیچھے الا ما یتلی علیکم میں اجمالاً بعض بہائم کا استثناء فرمایا تھا کہ وہ حلال نہیں، آگے ان کی تفصیل ہے:

تم پر (یہ جانور وغیرہ) حرام کئے گئے ہیں مردار (جانور جس کا ذبح واجب تھا لیکن شرعی ذبح کے بغیر مر جائے) اور خون (جو بہتا ہو) اور خنزیر کا گوشت (اسی طرح اس کے تمام اجزاء بھی حرام ہیں) اور جو جانور کہ (قربت کی نیت سے) غیر اللہ کے نامزد کر دیا گیا ہو، اور جو گلا گھٹنے سے مر جائے، اور جو کسی ضرب سے مر جائے، اور جو اونچے سے گر کر مر جائے (مثلاً پہاڑ سے یا کنوئیں میں) اور جو کسی کی ٹکر سے مر جائے، اور جس کو کوئی درندہ (پکڑ کر) کھانے لگے (اور اس کے صدمہ سے مر جائے) لیکن (منخنقة سے ما اکل السبع تک جن کا ذکر ہے ان میں سے) جس کو تم (دم نکلنے سے پہلے قاعدہ شرعیہ کے مطابق) ذبح کر ڈالو (وہ اس حرمت سے مستثنیٰ ہے وہ حلال ہو جائے گا)۔

اور (نیز) جو جانور (غیر اللہ کی) پرستش گاہوں پر ذبح کیا جائے (حرام ہے، اگرچہ زبان سے غیر اللہ کے نامزد نہ کرے، کیونکہ حرمت کا مدار نیت خبیثہ پر ہے، اس کا ظہور کبھی قول سے ہوتا ہے کہ زبان سے نامزد کر دے، کبھی فعل سے ہوتا ہے کہ ایسے مقامات پر ذبح کرا دے) اور یہ (بھی حرام ہے) کہ (گوشت وغیرہ) تقسیم کرو بذریعہ قرعہ کے تیروں کے، یہ سب گناہ (اور حرام) ہیں۔

اِلَّا مَا ذَكَّیْتُمْ: یہ استثناء شروع کی چار قسموں سے متعلق نہیں ہو سکتا، کیونکہ مردار اور خون میں تو اس کا امکان ہی نہیں، اور خنزیر اور ما اھل لغیر اللہ اپنی ذات سے حرام ہیں، ذبح کرنا نہ کرنا ان میں برابر ہے، اسی لئے حضرت علیؓ، ابن عباسؓ، حسن بصریؒ، قتادہؒ وغیرہ سلف صالحین کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ استثناء ابتدائی چار کے بعد یعنی منخنقه اور اس کے مابعد یعنی وما اکل السبع تک سے متعلق ہے، اس لئے مطلب اس کا یہ ہو گیا کہ ان تمام صورتوں میں اگر جانور زندہ پایا گیا، زندگی کی علامتیں محسوس کی گئیں اور اسی حالت میں اس کو اللہ کے نام پر ذبح کر دیا گیا تو وہ حلال ہے، خواہ وہ منخنقة ہو، یا موقوذة یا متردیة اور نطیحة، یا جس کو درندے نے پھاڑ ڈالا ہے، ان میں سے جس کو بھی آثار زندگی محسوس کرتے ہوئے ذبح کر لیا وہ حلال ہو گیا، ہرچند کہ ان صدمات سے مرنے والے جانور بھی مردار میں داخل تھے مگر ان کو جدا اس لیے بیان کیا گیا کہ زمانہ جاہلیت میں ان کے کھانے کی عادت تھی، یہاں اگرچہ ذکر بہائم کا ہے، لیکن گلا گھونٹے ہوئے جانور وغیرہ کی حرمت بہائم یعنی چوپایوں کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ گلا گھونٹا ہوا پرندہ بھی حرام ہے، کیونکہ اس استثناء میں چوپایہ ہونے کی صفت کو دخل نہیں، بلکہ یہ استثناء اس علت کی وجہ سے ہے کہ ان صورتوں میں بغیر ذبح شرعی کے گلا گھوٹنے وغیرہ سے موت ہوئی ہے۔

وَاَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ: یہ بھی اس وقت ایک رسم تھی کہ شرکت میں مثلاً ایک اونٹ خرید کر ذبح کیا، لیکن اس کے گوشت کو داموں کی

نسبت سے تقسیم نہ کرتے تھے، بلکہ دس عدد تیر اس غرض سے مقرر تھے کہ ان میں سے کچھ پر لکیریں بن ہوئی تھیں، بعض سادہ تھے، اور اس کے متعلق اپنی طرف سے کچھ اصطلاح اور مقدار ٹھہرا رکھی تھی کہ جس کے نام پر مثلاً سادہ تیر نکل آئے وہ محروم ہے اور جس کے نام پر لکیروں والا تیر نکل آئے تو اس کو اتنی مقدار میں گوشت دیا جائے، اسی طرح سب شرکاء کے واسطے یہی عمل کرتے تھے، چونکہ یہ صورت قمار یعنی جوے کی تھی اس لیے اس کی ممانعت کی گئی، جوے کی حرمت سورہ بقرہ آیت ۲۱۹: يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ میں گذر چکی ہے وہاں ملاحظہ فرمایئے، علماء نے فرمایا کہ آئندہ کے حالات اور غیب کی چیزیں معلوم کرنے کے جتنے طریقے رائج ہیں، خواہ اہل جفر کے ذریعہ یا ہاتھ کے نقوش دیکھ کر یا فال وغیرہ نکال کر یہ سب طریقے استقسام بالازلام کے حکم میں ہیں۔

اور ''استقسام بالازلام'' کا لفظ کبھی قمار یعنی جوئے کے لئے بھی بولا جاتا ہے، جس میں قرعہ اندازی یا لاٹری کے طریقوں سے حقوق کی تعیین کی جائے، یہ بھی بنص قرآن حرام ہے، جس کو قرآن کریم نے ''میسر'' کے نام سے ممنوع قرار دیا ہے، اور جو قرعہ اندازی شریعت میں جائز ہے وہ اس صورت میں ہے کہ جہاں بلا قرعہ بھی اس پر باہم اتفاق جائز ہو، جیسے مکان تقسیم کر کے یہ جائز ہے کہ دونوں اپنی رضامندی سے ایک شریک ایک طرف کا حصہ لے لے، دوسرا شریک دوسری طرف کا حصہ لے لے، تو اس میں قرعہ اندازی بھی جائز ہے، بخلاف اس صورت کے کئی شخص گوشت خریدنے کے لیے برابر پیسے دیں، پھر اتفاق کر لیں کہ ایک کو ایک تہائی گوشت دیا جائے، دوسرے کو دو تہائی، یہ حرام ہے اور سود ہے، پس یہ عمل اس صورت میں قرعہ اندازی کے ذریعے بھی حرام ہے۔

* * *

فائدہ:۱۔ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ: اس آیت سے جن چیزوں کا کھانا حرام ہوا ان میں اول ''میتۃ'' (مردار جانور) ہے جو واجب الذبح جانور ذبح کئے بدون خود اپنی موت سے مر جائے، اس کا خون اور حرارت غلیظہ یہ گوشت ہی میں مختقن اور جذب ہو کر رہ جاتی ہے جس کی سمیت اور گندگی سے کئی قسم کے بدنی اور دینی مضار لاحق ہوتے ہیں (ابن کثیر)، شاید اسی تعلیل پر متنبہ فرمانے کے لئے میتۃ (مردہ جانور) کے بعد دم (خون) کی حرمت مذکور ہوئی، اس کے بعد حیوانات کی ایک خاص نوع (خنزیر) کی تحریم کا ذکر کیا، جس کی بے انتہا نجاست خوری اور بے حیائی مشہور عام ہے، شاید اسی لئے شریعت حقہ نے دم (خون) کی طرح اس کو نجس العین قرار دیا، ان تین چیزوں کے ذکر کے بعد جن کی ذوات میں مادی گندگی اور خباثت پائی جاتی تھی، محرمات کی ایک اور قسم کا ذکر فرمایا یعنی وہ جانور جو اپنی ذات کے اعتبار سے حلال وطیب ہے، مگر مالک حقیقی کے سوا کسی اور کی نیاز کے طور پر نامزد کر دیا گیا ہو اس کا کھانا بھی نیت کی خباثت اور عقیدہ کی گندگی کی بنا پر حرام ہے، کسی جاندار کی جان صرف اسی مالک وخالق کے حکم اور نام پر لی جاسکتی ہے جس کے حکم اور ارادہ سے اس پر موت وحیات طاری ہوتی ہے، باقی مُنْخَنِقَه وغیرہ غیر مذبوح جانور سب ''میتۃ'' کے حکم میں داخل ہیں، جیسا کہ مَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ، مَا أُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ کے ساتھ ملحق ہے، جاہلیت میں ان سب چیزوں کے کھانے کی عادت تھی اس لئے اس قدر تفصیل سے ان کا بیان فرمایا۔

فائدہ:۲۔ وَالدَّمُ: یعنی بہتا ہوا خون أَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا (الانعام:۱۴۵)۔

فائدہ:۳۔ وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ: تھوڑا سا پہلے ہدی کے ادب واحترام کا ذکر فرمایا تھا، یعنی وہ جانور جو تقرب الی اللہ کی غرض سے خدائے واحد کی سب سے پہلی عبادت گاہ کی نیاز کے طور پر ذبح کیا جاتا ہے، اس کے بالمقابل اس جانور کا بیان فرمانا جسے خدا کے سوا کسی دوسرے کے نام پر یا خانہ خدا کے سوا کسی دوسرے مکان کی تعظیم کے لئے ذبح کیا جائے (موضح القرآن) اس دوسری صورت میں بھی فی الحقیقت نیت نذر غیر اللہ ہی کی ہوتی ہے، گو ذبح کے وقت زبان سے بسم اللہ اللہ اکبر کہا جائے، اس تقریر کے موافق مَا أُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ اور وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ کا فرق واضح ہو گیا (ابن کثیر)۔

فائدہ:۴۔ وَأَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْأَزْلَامِ: بعض مفسرین نے ''ازلام'' سے تقسیم کے تیر مراد لئے ہیں جو زمانہ جاہلیت میں لحم ذبیحہ وغیرہ کے بانٹنے میں استعمال ہوتے تھے، اور وہ ایک صورت قمار (جوئے) کی تھی جیسے آجکل چٹھی ڈالنے کی رسم ہے، لیکن حافظ عماد الدین ابن کثیرؒ وغیرہ محققین کے نزدیک راجح یہ ہے کہ ''ازلام'' سے مراد وہ تیر ہیں جن سے مشرکین مکہ کسی اشکال اور تردد کے وقت اپنے ارادوں اور کاموں کا فیصلہ کرتے تھے، یہ تیر خانہ کعبہ میں قریش کے سب سے بڑے بت ''ہبل'' کے پاس رکھتے تھے، ان میں سے کسی پر ''أمرنی ربی'' لکھا تھا (میرے پروردگار نے حکم دیا) کسی پر ''نہانی

ربی" اسی طرح ہر تیر پر یوں ہی اٹکل پچو باتیں لکھ چھوڑی تھیں، جب کسی کام میں تذبذب ہوا تو تیر نکال کر دیکھ لئے، اگر "أمرني ربي" والا تیر نکل آیا تو کام شروع کر دیا اور اس کے خلاف نکلا تو رک گئے وعلیٰ ہذا القیاس، گویا بتوں سے یہ ایک قسم کا مشورہ اور استعانت تھی، چونکہ اس رسم کا مبنیٰ خالص جہل، شرک، اوہام پرستی اور افتراء علی اللہ پر تھا، اس لئے قرآن کریم نے متعدد مواقع میں نہایت تغلیظ وتشدید کے ساتھ اس کی حرمت کو ظاہر فرمایا ہے، اس تقریر کے موافق "ازلام" کا ذکر "نصب" کی مناسبت سے ہوا اور مردار، خون، خنزیر وغیرہ نہایت ہی خبیث اور گندی چیزوں کی تحریم کے سلسلہ میں منسلک کر کے بتلا دیا کہ اس کی معنوی اور اعتقادی نجاست وخباثت ان چیزوں سے کم نہیں جیسا کہ ایک دوسری آیت میں "رجس" کے اطلاق سے ظاہر ہوتا ہے۔

اَلْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ ؕ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ

آج نا اُمید ہوگئے کافر تمہارے دین سے سو ان سے مت ڈرو اور مجھ سے ڈرو [1] آج میں پورا کر چکا تمہارے لئے

دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ؕ فَمَنِ اضْطُرَّ فِيْ مَخْمَصَةٍ

دین تمہارا [2] اور پورا کیا تم پر میں نے احسان اپنا [3] اور پسند کیا میں نے تمہارے واسطے اسلام کو دین [4] پھر جو کوئی لاچار ہو جاوے بھوک میں

غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ③

لیکن گناہ پر مائل نہ ہو تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے [5]

خلاصہ تفسیر: اوپر جن چیزوں کو حرام فرمایا، ان کا اضطراری (مجبوری) حالت میں حلال ہونا آگے بیان کیا جائیگا، درمیان میں بطور جملہ معترضہ کے دین کے کامل ہونے کی بشارت کے ذریعے گویا تمام اوامر ونواہی کی تعمیل کا حکم دیا جا رہا ہے جن میں یہ حرام وحلال بھی داخل ہیں۔

آج کے دن (یعنی اب) ناامید ہوگئے کافر لوگ تمہارے دین (کے مغلوب وگم ہو جانے) سے (کیونکہ ماشاء اللہ اسلام خوب پھیل گیا) سو ان (کفار) سے مت ڈرنا (کہ تمہارے دین کو گم کر سکیں) اور مجھ سے ڈرتے رہنا (یعنی میرے احکام کی مخالفت مت کرنا)۔

آج کے دن تمہارے لئے تمہارے دین کو میں نے (ہر طرح) کامل کر دیا (قوت میں بھی جس سے کفار کو مایوسی ہوئی اور احکام وقواعد میں بھی) اور (اس کمال سے) میں نے تم پر اپنا انعام تمام کر دیا (دینی انعام بھی کہ احکام کی تکمیل ہوئی اور دنیوی انعام بھی کہ قوت حاصل ہوئی، اکمال دین میں دونوں آ گئے) اور میں نے اسلام کو تمہارا دین بننے کے لئے (ہمیشہ کو) پسند کر لیا (یعنی قیامت تک تمہارا یہی دین رہے گا، اس کو منسوخ کر کے دوسرا دین تجویز نہ کیا جائے گا، پس تم کو چاہیے کہ میری نعمت کا شکر کر کے اس دین پر پورے پورے قائم رہو)۔

پھر (مذکورہ بالا اشیاء کی حرمت دریافت کر لینے کے بعد یہ بھی معلوم کر لو کہ) جو شخص شدت کی بھوک میں بیتاب ہو جائے (اور اس وجہ سے ان حرام چیزوں کو کھالے) بشرطیکہ کسی گناہ کی طرف اس کا میلان نہ ہو (یعنی نہ قدر ضرورت سے زیادہ کھائے اور نہ لذت مقصود ہو جس کو سورۃ بقرہ میں غیر باغ ولا عاد سے تعبیر فرمایا ہے) تو یقیناً اللہ تعالیٰ معاف کرنے والے ہیں (اگر قدر ضرورت کا پورا اندازہ نہ ہوا اور ایک آدھ لقمہ زیادہ بھی کھا گیا تو) رحمت والے ہیں (کہ ایسی حالت میں اجازت دے دی)۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ: اکمال دین یعنی دین کے کامل ہونے کے معنی ترجمان القرآن حضرت عبد اللہ بن عباسؓ وغیرہ نے یہ بیان فرمائے ہیں کہ آج دین حق کے تمام حدود وفرائض اور احکام وآداب مکمل کر دیے گئے ہیں، اب اس میں نہ کسی اضافہ اور زیادتی کی ضرورت باقی ہے اور نہ کمی کا احتمال، یہی وجہ ہے کہ اس کے بعد احکام اسلام میں سے کوئی نیا حکم نازل نہیں ہوا، جو چند آیتیں اس کے بعد نازل ہوئیں، ان میں یا تو ترغیب وترہیب کے مضامین ہیں، اور یا انھیں احکام کی تاکید جن کا بیان پہلے ہو چکا تھا۔

اور یہ بات اس کے منافی نہیں کہ اصول واجتہاد کے ماتحت ائمہ مجتہدین نئے نئے پیش آنے والے واقعات وحالات کے متعلق اپنے اجتہاد

سے احکام شرعیہ بیان کریں، کیونکہ قرآن کریم نے جس طرح احکام شرعیہ کے حدود و فرائض وغیرہ بیان فرمائے ہیں، اسی طرح اصول اجتہاد بھی قرآن ہی نے متعین فرمادیے ہیں، ان کے ذریعہ جو احکام قیامت تک نکالے جائیں، وہ سب ایک حیثیت سے قرآن ہی کے بیان کیے ہوئے احکام ہیں، کیونکہ ان اصول کے ماتحت ہیں جو قرآن نے بیان کیے، خلاصہ یہ ہے کہ ''اکمال دین'' کا مطلب حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی تفسیر کے مطابق یہ ہے کہ دین کے تمام احکام کو مکمل کردیا گیا، اب نہ اس میں کسی زیادتی کی ضرورت باقی ہے نہ منسوخ ہو کر کمی کا احتمال، کیونکہ اس کے بعد ہی متصل وحی کا سلسلہ وفات رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ منقطع ہونے والا تھا اور بغیر وحی الٰہی کے قرآن کا کوئی حکم منسوخ نہیں ہوسکتا، اور جو بظاہر احکام کی زیادتی اصول اجتہاد کے تحت فقہاء و مجتہدین کی طرف سے ہوئی، وہ درحقیقت زیادتی نہیں بلکہ احکام قرآنی کی توضیح و بیان ہے۔

اس تقریر سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ اکمال دین آج ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ پہلے انبیاء علیہم السلام کا دین ناقص تھا، بلکہ جیسا تفسیر محیط میں نقل کیا ہے کہ دین تو ہر نبی و رسول کا اس کے زمانہ کے اعتبار سے کامل و مکمل تھا، یعنی جس زمانہ میں جس پیغمبر پر کوئی شریعت و دین اللہ کی طرف سے نازل کیا گیا اس زمانہ اور اس قوم کے لحاظ سے وہی کامل و مکمل تھا، لیکن اللہ جل شانہ کے علم میں یہ تفصیل پہلے سے تھی کہ جو دین اس زمانہ اور اس قوم کے لئے مکمل ہے وہ اگلے زمانہ اور آنے والی قوموں کے لئے مکمل نہ ہوگا، بلکہ اس کو منسوخ کر کے دوسرا دین و شریعت نافذ کی جائے گی، بخلاف شریعت اسلام کے جو سب سے آخر میں نازل کی گئی کہ وہ ہر جہت اور ہر لحاظ سے کامل و مکمل ہے، نہ وہ کسی خاص زمانہ کے ساتھ مخصوص ہے اور نہ کسی خاص خطہ، ملک یا قوم کے ساتھ، بلکہ قیامت تک ہر زمانہ اور ہر خطہ اور ہر قوم کے لئے یہ شریعت کامل و مکمل ہے۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ الخ: اس میں اس پر بھی دلالت ہے کہ فقہا ظاہر و باطن نے نصوص سے جو استنباط کیا ہے وہ سب دین ہی ہے، ورنہ دین کے اکمال یعنی مکمل ہونے کے بعد اس کی اجازت نہ ہوتی کہ اس سے غیر دین کی اجازت دینا یا دین کا غیر مکمل ہونا لازم آتا، پس مجتہدین و مشائخ کے اتباع کے واجب ہونے پر آیت کی دلالت ہوئی۔

فَمَنِ اضْطُرَّ فِيْ مَخْمَصَةٍ: اس کی تفسیر دوسری آیتوں میں: غیر باغ ولا عاد آئی ہے، اور غیر باغ کی تفسیر غیر متناول للذة سے کی گئی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ جس حرام چیز کی ضرورت کی وجہ سے اجازت دی جائے اس میں حد سے تجاوز اور حظ نفس (لطف اندوزی) کا قصد جائز نہیں، جیسے ڈاکٹر و طبیب عورت کو یا اس کے بدن کو ضرورت کی وجہ سے دیکھنا یا چھونا پڑے تو بقصد شہوت دیکھنا یا چھونا حرام ہے، اور اس سے قلب کی حفاظت کا خاص اہتمام سمجھ میں آتا ہے۔

* * *

فائدہ: لہ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ: یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب کہ زندگی کے ہر شعبہ اور علوم ہدایت کے ہر باب کے متعلق اصول و قواعد ایسی طرح ممہد ہو چکے تھے اور فروع و جزئیات کا بیان بھی اتنی کافی تفصیل اور جامعیت سے کیا جا چکا تھا کہ پیروان اسلام کے لئے قیامت تک قانون الٰہی کے سوا کوئی دوسرا قانون قابل التفات نہیں رہا تھا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت سے ہزاروں سے متجاوز خدا پرست، جانباز اور سرفروش ہادیوں اور معلموں کی ایسی عظیم الشان جماعت تیار ہو چکی تھی جس کو قرآنی تعلیم کا مجسم نمونہ کہا جاسکتا تھا، مکہ معظمہ فتح ہو چکا تھا، صحابہ رضی اللہ عنہم کامل وفاداری کے ساتھ خدا سے عہد و پیمان پورے کررہے تھے، نہایت گندی غذائیں اور مردار کھانے والی قوم مادی اور روحانی طیبات کے ذائقہ سے لذت اندوز ہو رہی تھی، شعائر الٰہیہ کا ادب و احترام قلوب میں راسخ ہو چکا تھا، ظنون و اوہام اور انصاب و ازلام کا تار و پود بکھر چکا تھا، شیطان جزیرۃ العرب کی طرف سے ہمیشہ کے لئے مایوس کردیا گیا تھا کہ دوبارہ وہاں اس کی پرستش ہوسکے۔

ان حالات میں ارشاد ہوا: اَلْيَوْمَ يَىِٕسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ یعنی آج کفار اس بات سے مایوس ہو گئے ہیں کہ تم کو تمہارے دین قیم سے ہٹا کر پھر ''انصاب'' و ''ازلام'' وغیرہ کی طرف لے جائیں، یا دین اسلام کو مغلوب کرلینے کی توقعات باندھیں، یا احکام دینیہ میں کسی تحریف و تبدیل کی امید قائم کرسکیں، آج تم کو کامل و مکمل مذہب مل چکا، جس میں کسی ترمیم کا آئندہ امکان نہیں، خدا کا انعام تم پر پورا ہو چکا، جس کے بعد تمہاری جانب سے اس کے ضائع کردینے کا کوئی اندیشہ نہیں، خدا نے ابدی طور پر اسی دین اسلام کو تمہارے لئے پسند کرلیا، اس لئے اب

کسی ناسخ کے آنے کا بھی احتمال نہیں، ایسے حالات میں تم کو کفار سے خوف کھانے کی کوئی وجہ نہیں، وہ تمہارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے، البتہ اس محسن جلیل اور منعم حقیقی کی ناراضی سے ہمیشہ ڈرتے رہو جس کے ہاتھ میں تمہاری ساری نجاح وفلاح اور کل سود و زیاں ہے، گویا: فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ میں اس پر متنبہ فرمادیا کہ آئندہ مسلم قوم کو کفار سے اس وقت تک کوئی اندیشہ نہیں جب تک ان میں خشیت الٰہی اور تقویٰ کی شان موجود رہے۔

فائدہ:۲ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ: یعنی اس کے اخبار وقصص میں پوری سچائی بیان میں پوری تاثیر اور قوانین واحکام میں پورا توسط واعتدال موجود ہے، جو حقائق کتب سابقہ اور دوسرے ادیان سماویہ میں محدود و نا تمام تھے، ان کی تکمیل وتعمیم اس دین قیم سے کردی گئی، قرآن وسنت نے حلت وحرمت وغیرہ کے متعلق تنصیصاً یا تعلیلاً جو احکام دیے ان کا اظہار وایضاح تو ہمیشہ ہوتا رہے گا، لیکن اضافہ یا ترمیم کی مطلق گنجائش نہیں چھوڑی۔

فائدہ:۳ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ: سب سے بڑا احسان تو یہ ہی ہے کہ اسلام جیسا مکمل اور ابدی قانون اور خاتم الانبیاء ﷺ جیسا نبی تم کو مرحمت فرمایا، مزید برآں اطاعت اور استقامت کی توفیق بخشی، روحانی غذاؤں اور دنیاوی نعمتوں کا دسترخوان تمہارے لئے بچھا دیا، حفاظت قرآن، غلبہ اسلام اور اصلاح عالم کا سامان مہیا فرمادیا۔

فائدہ:۴ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا: یعنی اس عالمگیر اور مکمل دین کے بعد اب کسی اور دین کا انتظار کرنا سفاہت ہے، ''اسلام'' جو تفویض وتسلیم کا مرادف ہے اس کے سوا مقبولیت اور نجات کا کوئی دوسرا ذریعہ نہیں۔

تنبیہ: اس آیت اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ الخ کا نازل فرمانا بھی من جملہ نعمائے عظیمہ کے لیے ایک نعمت ہے، اسی لئے بعض یہود نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے عرض کیا کہ امیر المومنین! اگر یہ آیت ہم پر نازل کی جاتی تو ہم اس کے یوم نزول کو عید منایا کرتے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تجھے معلوم نہیں کہ جس روز یہ ہم پر نازل کی گئی مسلمانوں کی دو عیدیں جمع ہوگئی تھیں، یہ آیت ۱۰ ہجری میں حجۃ الوداع کے موقع پر عرفہ کے روز جمعہ کے دن عصر کے وقت نازل ہوئی، جب کہ میدان عرفات میں نبی کریم ﷺ کی اونٹنی کے گرد چالیس ہزار سے زائد اتقیا و ابرار رضی اللہ عنہم کا مجمع کثیر تھا، اس کے بعد صرف اکیاسی (۸۱) روز حضور ﷺ اس دنیا میں جلوہ افروز رہے۔

فائدہ:۵ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ: یعنی حلال وحرام کا قانون تو مکمل ہو چکا، اس میں اب کوئی تغیر وتبدل نہیں ہوسکتا، البتہ مضطر جو بھوک پیاس کی شدت سے بیتاب اور لاچار ہو، وہ اگر حرام چیز کھا پی کر جان بچالے بشرطیکہ مقدار ضرورت سے تجاوز نہ کرے اور لذت مقصود نہ ہو غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ تو حق تعالیٰ اس تناول محرم کو اپنی بخشش اور مہربانی سے معاف فرمادے گا، گویا وہ چیز تو حرام ہی رہی، مگر اسے کھا پی کر جان بچانے والا خدا کے نزدیک مجرم نہ رہا، یہ بھی اتمام نعمت کا ایک شعبہ ہے۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَآ اُحِلَّ لَهُمْ ۭ قُلْ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ۙ وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ

تجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا چیز ان کے لئے حلال ہے، کہہ دے تم کو حلال ہیں ستھری چیزیں ۱؎ اور جو سدھاؤ شکاری جانور شکار پر دوڑانے کو

تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ ۡ فَكُلُوْا مِمَّآ اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ وَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ ۠

کہ ان کو سکھاتے ہو اس میں جو اللہ نے تم کو سکھایا ہے، سو کھاؤ اس میں سے جو پکڑ رکھیں تمہارے واسطے اور اللہ کا نام لو اس پر ۲؎

وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝۴

اور ڈرتے رہو اللہ سے بیشک اللہ جلد لینے والا ہے حساب ۳؎

خلاصہ تفسیر: گذشتہ آیات میں حلال وحرام جانوروں کا ذکر تھا، اس آیت میں اسی کے متعلق ایک سوال کا جواب ہے، بعض صحابہ کرامؓ نے رسول اللہ ﷺ سے شکاری کتے اور باز سے شکار کرنے کا حکم دریافت کیا تھا، اس آیت میں اس کا جواب مذکور ہے۔

لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ (کتے اور باز کے شکار کئے ہوئے جانوروں میں سے) کیا کیا جانور ان کے لئے حلال کئے گئے ہیں (یعنی جتنے حلال شکار ذبح سے حلال ہوجاتے ہیں، کیا کتے اور باز کے ذریعہ شکار کرنے کے بعد بھی وہ سب حلال رہتے ہیں یا ان میں سے کچھ مخصوص جانور حلال ہوتے ہیں یا مطلقاً کوئی حلال نہیں ہوتا، اور جو حلال ہوتے ہیں تو کیا اسکے لئے کچھ شرط بھی ہے) آپ (جواب میں) فرمادیجئے کہ تمہارے لئے کل حلال جانور (جواز قسم شکار پہلے سے حلال ہیں، وہ سب کتے اور باز کے ذریعہ شکار کرنے سے بھی) حلال رکھے گئے ہیں (یہ تو سوال کے پہلے جز کا جواب ہے)۔

(اب دوسرے جز کا جواب یہ ہے کہ کتے اور باز کے شکار حلال ہونے کے لیے کچھ شرائط ہیں: ① ایک شرط یہ ہے کہ) جن شکاری جانوروں کو (مثلاً کتا، باز وغیرہ) تم (خاص طور پر) تعلیم دو (② دوسری شرط یہ ہے کہ) اور تم ان کو (شکار پر) چھوڑ بھی، اور ان کو (جو تعلیم دینا پیچھے ذکر کیا گیا ہے) اس طریقہ سے تعلیم دو جو تم کو اللہ نے (شریعت میں) تعلیم دی ہے (وہ طریقہ یہ ہے کہ کتے کو تو یہ تعلیم دی جائے کہ شکار پکڑ کر کھائے نہیں، اور باز کو یہ تعلیم دی جائے کہ جب اس کو بلاؤ اگر چہ وہ شکار کے پیچھے جا رہا ہو فوراً واپس آجائے یہ پہلی شرط کی مزید وضاحت ہے ③ تیسری شرط یہ ہے کہ) تو ایسے شکاری جانور جس شکار کو تمہارے لئے پکڑیں اس کو کھالو (جس کی علامت طریقہ تعلیم مین بیان ہو چکی ہے، سو اگر کتا اس شکار کو کھانے لگے یا باز بلانے سے واپس نہ آئے تو سمجھا جائے گا کہ جب یہ جانور مالک کے کہنے میں نہیں تو انہوں نے شکار بھی مالک کے لئے نہیں پکڑا، بلکہ خود اپنے لئے پکڑا ہے) اور (④ چوتھی شرط یہ ہے کہ جب شکار پر اس شکاری جانور کو چھوڑنے لگو تو) اس (جانور) پر (یعنی اس کے چھوڑنے کے وقت) اللہ کا نام بھی لیا کرو (یعنی بسم اللہ پڑھ کر چھوڑو) اور (تمام امور میں) اللہ سے ڈرتے رہا کرو (مثلاً شکار میں ایسے منہمک مت ہو کہ نماز وغیرہ سے غافل ہو جاؤ، یا اتنی حرص مت کرو کہ حلال ہونے کی شرائط کے بغیر بھی اس جانور کو کھا جاؤ) بیشک اللہ تعالیٰ جلدی حساب لینے والے ہیں۔

مسئلہ: ایک پانچویں شرط امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک یہ بھی ہے کہ وہ جانور اس شکار کو زخمی بھی کردے، قرآن میں لفظ ''جوارح'' اس کی دلیل ہے، جس کا مادہ جرح ہے بمعنی زخمی کرنا۔

مسئلہ: یہ حکم ان وحشی جانوروں کا ہے جو اپنے قبضہ میں نہ ہوں، اور اگر کسی وحشی جانور کو اپنے قابو میں کرلیا گیا ہے تو وہ بغیر باقاعدہ ذبح کے حلال نہیں ہوگا۔

* * *

فائدہ: ۱۔ اُحِلَّ لَکُمُ الطَّیِّبٰتُ: پچھلی آیات میں بہت سی حرام چیزوں کی فہرست دی گئی تو قدرتی طور پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ حلال چیزیں کیا کیا ہیں؟ اس کا جواب دے دیا کہ حلال کا دائرہ تو بہت وسیع ہے، چند چیزوں کو چھوڑ کر جن میں کوئی دینی یا بدنی نقصان تھا دنیا کی تمام ستھری اور پاکیزہ چیزیں حلال ہی ہیں اور چونکہ شکاری جانور سے شکار کرنے کے متعلق بعض لوگوں نے خصوصیت سے سوال کیا تھا، اس لئے آیت کے اگلے حصہ میں اس کو تفصیلاً بتلادیا گیا۔

فائدہ: ۲۔ وَاذْکُرُوا اسْمَ اللّٰہِ عَلَیْہِ: شکاری کتے یا باز وغیرہ سے شکار کیا ہوا جانور ان شروط سے حلال ہے: ① شکاری جانور سدھا ہوا ہو ② شکار پر چھوڑا جائے ③ اسے اس طریقہ سے تعلیم دی گئی ہو جس کو شریعت نے معتبر رکھا ہے یعنی کتے کو سکھلایا جائے کہ شکار کو پکڑ کر کھائے نہیں اور باز کو یہ تعلیم دی جائے کہ جب اس کو بلاؤ گو شکار کے پیچھے جا رہا ہو فوراً چلا آئے، اگر کتا شکار کو خود کھانے لگے یا باز بلانے سے نہ آئے تو سمجھا جائے گا کہ جب اس کے کہنے میں نہیں تو شکار بھی اس کے لئے نہیں پکڑا، بلکہ اپنے لئے پکڑا ہے، اسی کو حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ ''جب اس نے آدمی کی تعلیم سیکھی تو گویا آدمی نے ذبح کیا'' ④ چھوڑنے کے وقت اللہ کا نام لو یعنی بسم اللہ کہہ کر چھوڑو، ان چار شرطوں کی تصریح تو نص قرآنی میں ہوگئی ⑤ شرط جو امام ابوحنیفہ کے نزدیک معتبر ہے کہ شکاری جانور اگر چہ شکار کو زخمی بھی کردے کہ خون بہنے لگے، اس کی طرف لفظ ''جوارح'' اپنے مادہ ''جرح'' کے اعتبار سے مشعر ہے، ان میں سے اگر ایک شرط بھی مفقود ہوئی تو شکاری جانور کا مارا ہوا شکار حرام ہے، ہاں! اگر مرا نہ ہوا اور ذبح کرلیا جائے تو وَمَآ اَکَلَ السَّبُعُ اِلَّا مَا ذَکَّیْتُمْ کے قاعدہ سے حلال ہوگا۔

فائدہ: ۳ إِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ: یعنی ہر حالت میں خدا سے ڈرتے رہو، کہیں "طیبات" کے استعمال اور شکار وغیرہ سے متمتع ہونے میں حدود و قیود شرعیہ سے تجاوز نہ ہو جائے، عموماً آدمی دنیاوی لذتوں میں منہمک ہو کر اور شکار وغیرہ مشاغل میں پڑ کر خدا اور آخرت سے غافل ہو جاتا ہے اس لئے تنبیہ کی ضرورت تھی کہ خدا کو مت بھولو اور یاد رکھو کہ حساب ہونے والا ہے۔

اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ؕ وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ ۠ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ ۡ

آج حلال ہوئیں تم کو سب ستھری چیزیں ۱ اور اہل کتاب کا کھانا تم کو حلال ہے ۲ اور تمہارا کھانا ان کو حلال ہے ۳

خلاصہ تفسیر: گذشتہ آیت میں شکاری جانور کے شکار کا حلال ہونا مذکور تھا، اب اہل کتاب کے ذبیحہ کے حلال ہونے کا بیان ہے، ساتھ میں ایک دوسرا حکم بھی اہل کتاب کے متعلق ارشاد ہوتا ہے کہ کتابیہ عورت سے مسلمان کا نکاح درست ہے۔

آج (تم پر جیسے دینی ابدی انعام ہوا کہ اکمال دین سے مشرف کئے گئے، اسی طرح ایک بہت بڑا دنیوی ابدی انعام بھی ہوا کہ) تمہارے لئے حلال چیزیں (یعنی جو چیزیں پہلے سے حلال کر دی گئی تھیں وہ ہمیشہ کے لئے) حلال رکھی گئیں (کہ کبھی منسوخ نہ ہوں گی)۔

اور جو لوگ (تم سے پہلے آسمانی) کتاب دئے گئے ہیں (یعنی یہود و نصاریٰ) ان کا ذبیحہ (بھی) تم کو حلال ہے، اور (اس کا حلال ہونا ایسا ہی یقینی ہے جیسا) تمہارا ذبیحہ ان کو حلال ہے۔

اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ: اس جگہ چند مسائل قابل غور ہیں: اول یہ کہ اہل کتاب قرآن و سنت کی اصطلاح میں کون لوگ ہیں؟ کتاب سے کیا مراد؟ اور کیا اہل کتاب ہونے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ لوگ اپنی کتاب پر صحیح طور پر ایمان و عمل رکھتے ہوں؟ اس میں یہ تو ظاہر ہے کہ "کتاب" کے لغوی معنی یعنی ہر لکھا ہوا ورق تو مراد ہو نہیں سکتا وہ ہی کتاب مراد ہو سکتی ہے جو اللہ کی طرف سے آئی ہو، اس لئے باتفاق امت کتاب سے مراد وہ آسمانی کتاب مراد ہے جس کا کتاب اللہ ہونا بتصدیق قرآن یقینی ہو، جیسے تورات، انجیل، زبور، صحف موسیٰ و ابراہیم وغیرہ، اس لئے وہ قومیں جو کسی ایسی کتاب پر ایمان رکھتی اور اس کو وحی الٰہی قرار دیتی ہوں جس کا کتاب اللہ ہونا قرآن و سنت کے یقینی ذرائع سے ثابت نہیں وہ قومیں اہل کتاب میں داخل نہیں ہوں گی، جیسے مشرکین مکہ، مجوس، بت پرست ہندو، بدھ آریہ، سکھ وغیرہ، اس سے معلوم ہوا کہ یہود و نصاریٰ جو تورات و انجیل رکھنے والے ہیں وہ باصطلاح قرآن "اہل کتاب" میں داخل ہیں، تیسری ایک قوم جس کو صابئین کہتے ہیں ان کے حالات مشتبہ ہیں، جن حضرات کے نزدیک یہ لوگ زبور داؤد علیہ السلام پر ایمان رکھتے ہیں وہ ان کو بھی اہل کتاب میں شامل قرار دیتے ہیں، اور جن کو یہ تحقیق ہوا کہ زبور سے ان کا کوئی تعلق نہیں یہ نجوم پرست قوم ہیں، وہ ان کو بت پرستوں اور مجوس کے ساتھ شریک قرار دیتے ہیں، بہر حال یقینی طور پر جن کو باتفاق اہل کتاب کہا جاتا ہے وہ یہود و نصاریٰ ہیں تو قرآن حکیم کے اس حکم کا حاصل یہ ہوا کہ یہود و نصاریٰ کا ذبیحہ مسلمانوں کے لئے اور مسلمانوں کا ذبیحہ ان کے لئے حلال ہے۔

اب رہا یہ معاملہ کہ یہود و نصاریٰ کو اہل کتاب کہنے اور سمجھنے کے لئے کیا یہ شرط ہے کہ وہ صحیح طور پر اصلی تورات و انجیل پر عمل رکھتے ہوں؟ یا محرف تورات اور انجیل کا اتباع کرنے والے اور عیسیٰ و مریم علیہما السلام کو خدا کا شریک قرار دینے والے بھی اہل کتاب میں داخل ہیں؟ سو قرآن کریم کی بیشمار تصریحات سے واضح ہے کہ اہل کتاب ہونے کے لئے صرف اتنی بات کافی ہے کہ وہ کسی آسمانی کتاب کے قائل ہوں اور اس کی اتباع کرنے کے دعویدار ہوں، خواہ وہ اس کے اتباع میں کتنی گمراہیوں میں جا پڑے ہوں، قرآن کریم نے جن کو اہل کتاب کا لقب دیا انہیں کے بارے میں یہ بھی جا بجا ارشاد فرمایا کہ یہ لوگ اپنی آسمانی کتابوں میں تحریف کرتے ہیں: **یحرفون الکلم عن مواضعہ**، اور یہ بھی فرمایا کہ یہود نے حضرت عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا قرار دے دیا اور نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو: **وقالت الیھود عزیر ن ابن اللہ وقالت النصری المسیح ابن اللہ**، ان حالات و صفات کے باوجود جب قرآن نے ان کو اہل کتاب قرار دیا تو معلوم ہوا کہ یہود و نصاریٰ جب تک یہودیت و نصرانیت کو بالکل نہ چھوڑ دیں وہ اہل کتاب میں داخل ہیں، خواہ وہ کتنے ہی عقائد فاسدہ اور اعمال سیئہ میں مبتلا ہوں۔

صرف نام کے یہودی ونصرانی جو درحقیقت دہریے ہیں وہ اس میں داخل نہیں، آج کل یورپ کے عیسائی اور یہودیوں میں ایک بہت بڑی تعداد ایسے لوگوں کی بھی ہے جو اپنی مردم شماری کے اعتبار سے یہودی یا نصرانی کہلاتے ہیں مگر درحقیقت وہ خدا کے وجود اور کسی مذہب ہی کے قائل نہیں، نہ تورات وانجیل کو خدا کی کتاب مانتے ہیں اور نہ موسیٰ وعیسیٰ علیہما السلام کو اللہ کا نبی وپیغمبر تسلیم کرتے ہیں، یہ ظاہر ہے کہ وہ شخص مردم شماری کے نام کی وجہ سے اہل کتاب کے حکم میں داخل نہیں ہو سکتے، خلاصہ یہ ہے کہ جن نصرانیوں کے متعلق یہ بات یقینی طور پر معلوم ہو جائے کہ وہ خدا کے وجود ہی کو نہیں مانتے یا حضرت موسیٰ وعیسیٰ علیہما السلام کو اللہ کا نبی نہیں مانتے وہ اہل کتاب کے حکم میں نہیں۔

وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ: ''طعام اہل کتاب'' سے کیا مراد ہے؟ طعام کے لغوی معنی کھانے کی چیز کے ہیں جس میں ازروئے لغت عربی ہر قسم کی کھانے کی چیزیں داخل ہیں، لیکن جمہور امت کے نزدیک اس جگہ طعام سے مراد صرف اہل کتاب کے ذبائح کا گوشت ہے، کیونکہ گوشت کے سوا دوسری اشیاء خوردنی میں اہل کتاب اور دوسرے کفار میں کوئی امتیاز اور فرق نہیں، کھانے پینے کی خشک چیزیں، گیہوں، چنا، چاول اور پھل وغیرہ ہر کافر کے ہاتھ کا حلال وجائز ہے، اس میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں اور جس کھانے میں انسانی صنعت کو دخل ہے اس میں چونکہ کفار کے برتنوں اور ہاتھوں کی طہارت کا کوئی بھروسہ نہیں اس لئے احتیاط اس میں ہے کہ اس سے اجتناب کیا جائے، بلاضرورت شدیدہ استعمال نہ کریں، مگر اس میں جو حال مشرکین، بت پرستوں کا ہے، وہی اہل کتاب کا بھی ہے کہ نجاست کا احتمال دونوں میں برابر ہے، خلاصہ یہ ہے کہ اہل کتاب اور دوسرے کفار کے طعام میں جو فرق شرعاً ہو سکتا ہے وہ صرف ان کے ذبائح کے گوشت میں ہے، اس لئے آیت مذکورہ میں باتفاق امت ''طعام اہل کتاب'' سے مراد ان کے ''ذبائح'' ہیں، خلاصہ یہ ہے کہ طعام اہل کتاب سے مراد اس آیت میں باتفاق علماء تفسیر وہ طعام ہے جس کی حلت مذہب اور عقیدہ پر موقوف ہے یعنی ذبیحہ، اسی لئے اس طعام میں اہل کتاب کے ساتھ امتیازی معاملہ کیا گیا، کیونکہ وہ بھی اللہ کی بھیجی ہوئی کتابوں اور پیغمبروں پر ایمان کے مدعی ہیں، اگرچہ ان کی تحریفات نے ان کے دعویٰ کو مجروح کر دیا، یہاں تک کہ شرک وکفر میں مبتلا ہو گئے، بخلاف بت پرست مشرکین کے کہ وہ کسی آسمانی کتاب یا نبی یا رسول پر ایمان لانے کا دعویٰ بھی نہیں رکھتے اور جن کتابوں یا شخصیتوں پر ان کا ایمان ہے وہ نہ اللہ کی بھیجی ہوئی کتابیں ہیں اور نہ ان کا رسول ونبی ہونا اللہ کے کسی کلام سے ثابت ہے۔

یہ شبہ نہ کیا جائے کہ جب اہل کتاب کا ذبیحہ تک درست ہے اور ذبیحہ کے علاوہ اور کھانے دوسرے کفار کے بھی جائز ہیں تو کفار کے ساتھ مل کر کھانے پینے سے کیوں منع کیا جاتا ہے؟ سو اس کی وجہ دوسرے مفاسد اور نقصانات کا پیدا ہو جانا ہے۔

اہل کتاب کا ذبیحہ حلال ہونے کی حکمت اور وجہ کیا ہے؟ زیر بحث مسئلہ کا یہ تیسرا سوال ہے، اس کا جواب اکثر صحابہ وتابعین اور ائمہ تفسیر کی طرف سے یہ ہے کہ تمام کفار میں سے اہل کتاب یہود ونصاریٰ کا ذبیحہ اور ان کی عورتوں سے نکاح حلال قرار دینے کی وجہ یہ ہے کہ ان کے دین میں سینکڑوں تحریفات ہونے کے باوجود ان دو مسئلوں میں ان کا مذہب بھی اسلام کے بالکل مطابق ہے، یعنی وہ ذبیحہ پر اللہ کا نام لینا عقیدۃً ضروری سمجھتے ہیں، اس کے بغیر جانور کو مردار میتہ اور ناپاک وحرام قرار دیتے ہیں، اسی طرح مسئلہ نکاح میں جن عورتوں سے اسلام میں نکاح حرام ہے ان کے مذہب میں بھی حرام ہے، اور جس طرح اسلام میں نکاح کا اعلان اور گواہوں کے سامنے ہونا ضروری ہے اسی طرح ان کے موجودہ مذہب میں بھی یہی احکام ہیں۔

امام تفسیر حافظ ابن کثیرؒ نے بھی یہی قول اکثر صحابہ وتابعین کا نقل فرمایا ہے کہ ''انہوں نے طعام اہل کتاب کی تفسیر ان کے ذبائح کے ساتھ کی ہے، اور یہ مسئلہ مسلمانوں کے لئے یہاں اجماعی ہے کہ ان کے ذبیح مسلمانوں کے لئے حلال ہیں، کیونکہ وہ غیر اللہ کے لئے ذبح کرنے کو حرام سمجھتے ہیں اور اپنے ذبیحوں پر خدا کے سوا اور کسی کا نام نہیں لیتے، اگرچہ وہ اللہ کے بارے میں ایسی باتوں کے معتقد ہوں جن سے باری تعالیٰ پاک اور بلند وبالا ہے''، ابن کثیرؒ کے اس بیان میں ایک تو یہ بات معلوم ہوئی کہ حضرات صحابہ وتابعین کے نزدیک طعام اہل کتاب سے ان کے ذبائح مراد ہیں، اور ان کے حلال ہونے پر امت کا اجماع ہے، دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ ان سب حضرات کے نزدیک ذبائح اہل کتاب کے حلال ہونے کی وجہ یہ ہے کہ یہود ونصاریٰ کے مذہب میں بہت سی تحریفات کے باوجود ذبیحہ کا مسئلہ اسلامی شریعت کے مطابق باقی ہے کہ غیر اللہ کے نام پر ذبح کئے ہوئے جانور کو وہ بھی حرام کہتے

ہیں اور ذبیحہ پر اللہ کا نام لینا ضروری سمجھتے ہیں، یہ دوسری بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کی شان میں وہ تثلیث کے مشرکانہ عقیدہ کے قائل ہو گئے اور اللہ اور مسیح بن مریم کو ایک ہی کہنے لگے، جس کا قرآن کریم نے ان الفاظ میں ذکر فرمایا: **لقد کفر الذین قالو ان اللہ ھو المسیح ابن مریم** بیشک کافر ہو گئے وہ لوگ جنہوں نے کہا کہ اللہ تو مسیح بن مریم ہیں۔

ہاں! یہ ہوسکتا ہے کہ بعض جاہل عوام اپنے مذہب کے اس حکم کے خلاف کچھ عمل کرتے ہوں، جیسا کہ خود مسلمانوں کے جاہل عوام میں بھی بہت سی جاہلانہ رسمیں شامل ہوگئی ہیں مگر ان کو مذہب اسلام نہیں کہا جاسکتا، نصاریٰ کے جاہل عوام کے طرز عمل کو دیکھ کر ہی بعض حضرات تابعین نے یہ فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ نے طعام اہل کتاب کو حلال قرار دیا اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ وہ اپنے ذبائح کے ساتھ کیا معاملہ کرتے ہیں، کوئی اس پر مسیح یا عزیر کا نام لیتا ہے، کوئی بغیر تسمیہ کے ذبح کرتا ہے، تو معلوم ہوا کہ آیت مائدہ جس میں طعام اہل کتاب کو حلال قرار دیا ہے اس آیت نے اہل کتاب کے ذبائح کے حق میں سورۃ بقرہ اور سورۃ انعام کی ان آیتوں میں تخصیص یا ایک قسم کا نسخ قرار دیا ہے جن میں غیر اللہ کے نام پر ذبح کرنے کو یا بغیر اللہ کے نام کے ذبح کرنے کو حرام قرار دیا ہے، حاصل کلام یہ ہے کہ صحابہ و تابعین اور اسلاف امت کا اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ اہل کتاب کا اصل مذہب زمانہ نزول قرآن میں بھی یہی تھا کہ جس جانور پر غیر اللہ کا نام لیا جائے یا قصداً اللہ کا نام چھوڑا جائے وہ حرام ہے، اسی طرح نکاح کی حلت و حرمت میں بھی اہل کتاب کا اصل مذہب موجودہ زمانے تک اکثر چیزوں میں اسلامی شریعت کے مطابق ہے اس کے خلاف جو کچھ اہل کتاب میں پایا گیا، وہ جاہل عوام کے اغلاط ہیں ان کا مذہب نہیں ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ قرآن میں اہل کتاب کے ذبائح اور ان کی عورتوں سے نکاح کو حلال اور دوسرے کفار کے ذبائح اور نساء کو حرام قرار دینے کی وجہ ہی یہ ہے کہ ان دونوں مسئلوں میں اہل کتاب کا اصل مذہب آج تک بھی اسلامی قانون کے مطابق ہے اور جو کچھ اس کے خلاف ان کے عوام میں پایا جاتا ہے وہ جاہلوں کے اغلاط ہیں، ان کا مذہب نہیں ہے، اسی لئے جمہور صحابہ و تابعین اور ائمہ مجتہدین کے نزدیک سورۃ بقرہ، انعام اور مائدہ کی تمام آیات میں کوئی تضاد، یا نسخ، یا تخصیص نہیں ہے اور جن علماء و تابعین نے غلط کار عوام کے عمل کو بھی تبعاً اہل کتاب کے حکم میں شامل رکھا اور آیات بقرہ و انعام میں نسخ یا تخصیص کا قول اختیار کیا ہے اس کی بھی بنیاد یہ ہے کہ نصاریٰ جن کا قول یہ ہے کہ: **ان اللہ ھو المسیح ابن مریم** یعنی اللہ تو عیسیٰ بن مریم ہی ہیں، یہ لوگ اگر اللہ کا نام بھی لیں تو اس سے مراد عیسیٰ بن مریم ہی لیتے ہیں، اس لئے ان کے ذبیحہ میں اللہ کا نام لینا یا مسیح کا نام لینا برابر ہوگیا، اس بنا پر ان حضرات تابعین نے ذبائح اہل کتاب میں اس کی اجازت دے دی ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ اَلۡيَوۡمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ: یعنی جیسے آج دین کامل تم کو دیا گیا دنیا کی تمام پاکیزہ نعمتیں بھی تمہارے لئے دائمی طور پر حلال کر دی گئیں جو کبھی منسوخ نہ ہوں گی۔

فائدہ: ۲ وَطَعَامُ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمۡ: یہاں طعام (کھانے) سے مراد "ذبیحہ" ہے، یعنی کوئی یہودی یا نصرانی (بشرطیکہ اسلام سے مرتد ہو کر یہودی یا نصرانی نہ بنا ہو) اگر حلال جانور ذبح کرتے وقت غیر اللہ کا نام نہ لے تو اس کا کھانا مسلمان کو حلال ہے، مرتد کے احکام جداگانہ ہیں۔

فائدہ: ۳ وَطَعَامُكُمۡ حِلٌّ لَّهُمۡ: اس مقام پر اس کا ذکر بطور مجازات و مکافات کے استطراداً فرما دیا، یعنی بعض احادیث میں جو آیا ہے: "لَا يَاْكُلُ طَعَامَكَ اِلاَّ تَقِيٌّ" (تیرا کھانا نہ کھائے مگر پرہیزگار) اس کا مطلب یہ نہیں کہ غیر پرہیزگاروں کے لئے تمام کھانا حرام ہے، جب مسلمان کے لئے کافر کتابی کے ذبیحہ کی اجازت ہوگئی تو ایک موحد مسلم کا ذبیحہ اور کھانا دوسروں کیلئے کیوں حرام ہوگا۔

وَالۡمُحۡصَنٰتُ مِنَ الۡمُؤۡمِنٰتِ وَالۡمُحۡصَنٰتُ مِنَ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ مِنۡ قَبۡلِكُمۡ

اور حلال ہیں تم کو پاک دامن عورتیں مسلمان ۱ اور پاک دامن عورتیں ان میں سے جن کو دی گئی کتاب ۲ تم سے پہلے

إِذَآ ءَاتَيْتُمُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ مُحْصِنِينَ غَيْرَ مُسَٰفِحِينَ وَلَا مُتَّخِذِيٓ أَخْدَانٍ ؕ

جب دو ان کو مہر ان کے قید میں لانے کو نہ مستی نکالنے کو اور نہ چھپی آشنائی کرنے کو

خلاصہ تفسیر: اور پارسا عورتیں بھی جو مسلمان ہوں (تم کو حلال ہیں) اور (جیسا مسلمان عورتوں کا حلال ہونا یقینی ہے اسی طرح) پارسا عورتیں ان لوگوں میں سے بھی جو تم سے پہلے کتاب (آسمانی) دیئے گئے ہیں (تم کو حلال ہیں) جب تم ان کو ان کا معاوضہ دے دو (یعنی مہر دینا اگرچہ شرط نہیں مگر واجب ہے، اور عورتیں مذکورہ جو حلال کی گئی ہیں تو) اس طرح سے کہ تم (ان کو) بیوی بناؤ (یعنی نکاح میں لاؤ جن کی شرطیں شرع میں معلوم ہیں) نہ تو علانیہ بدکاری کرو اور نہ خفیہ آشنائی کرو (یہ سب احکام شرعیہ ہیں جن پر ایمان لانا فرض ہے)۔

وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ: جمہور علماء صحابہ و تابعین کے نزدیک اس جگہ محصنٰت کے معنی عفیف و پاکدامن عورتوں کے ہیں اور مراد آیت کی یہ ہے کہ جس طرح عفیف اور پاکدامن مسلمان عورتوں سے نکاح جائز ہے اسی طرح اہل کتاب کی عفیف و پاکدامن عورتوں سے بھی جائز ہے، اس جگہ عفیف و پاکدامن عورتوں کی قید کے یہ معنی نہیں کہ غیر عفیف عورتوں سے نکاح ہی حرام ہے، بلکہ اس قید کا فائدہ بہتر اور مناسب صورت کی ترغیب ہے کہ خواہ مسلمان عورت سے نکاح کرو یا اہل کتاب سے، بہرحال یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ پاکدامن عفیف عورت سے نکاح ہو، بدکار فاسق عورتوں سے نکاح کا رشتہ جوڑنا کسی شریف مسلمان کا کام نہیں، اس لئے خلاصہ مضمون اس جملہ کا یہ ہوا کہ مسلمان کے لئے حلال ہے کہ کسی مسلمان عورت سے نکاح کرے یا اہل کتاب کی عورت سے، البتہ دونوں صورتوں میں اس کا لحاظ رکھنا چاہیے کہ عفیف و پاکدامن عورت سے نکاح کرے، بدکار، ناقابل اعتبار عورت سے نکاح کا رشتہ جوڑنا دین و دنیا دونوں کی تباہی ہے، اس سے بچنا چاہیے، اس آیت میں اہل کتاب کی قید سے باجماع امت یہ ثابت ہوگیا کہ جو غیر مسلم اہل کتاب میں داخل نہیں، ان کی عورتوں سے نکاح حلال نہیں۔

سابقہ بیان میں یہ واضح ہو چکا کہ اس زمانہ میں جتنے فرقے اور جماعتیں غیر مسلموں کی موجود ہیں، ان میں صرف یہود و نصاریٰ ہی دو قومیں ہیں جو اہل کتاب میں شمار ہو سکتی ہیں، باقی موجودہ مذاہب میں سے کوئی بھی اہل کتاب میں داخل نہیں، آتش پرست یا بت پرست ہندو یا سکھ، آریہ، بدھ وغیرہ سب اسی عموم میں داخل ہیں، کیونکہ یہ بات بیان ہو چکی ہے کہ اہل کتاب سے مراد وہ لوگ ہیں جو کسی ایسی کتاب کے ماننے والے اور اس کے اتباع کے دعویدار ہوں جس کا آسمانی کتاب اور وحی الٰہی ہونا قرآن و سنت کی نصوص سے ثابت ہے اور ظاہر ہے کہ وہ تو تورات و انجیل ہی ہیں جن کی ماننے والی کچھ قومیں اس وقت دنیا میں موجود ہیں، باقی زبور اور صحف ابراہیم علیہ السلام نہ کہیں محفوظ و موجود ہیں، نہ کوئی قوم ان کے اتباع کی دعویدار ہے اور "وید" اور "گرنتھ" یا زردشت وغیرہ کتابیں جو دنیا میں مقدس کہی جاتی ہیں ان کے وحی الٰہی اور آسمانی کتاب ہونے کا کوئی ثبوت کسی شرعی دلیل سے نہیں ہے، اور صرف یہ امکان کہ شاید زبور اور صحف ابراہیم ہی کی مسخ شدہ وہ صورت ہو جس کو بدھ مت کی کتاب یا "وید" یا "گرنتھ" وغیرہ کے ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے امکان محض اور احتمال محض ہے جو ثبوت کے لئے کافی نہیں، اس لئے باجماع امت ثابت ہوگیا کہ موجودہ زمانہ کے مختلف مذاہب میں سے صرف یہود و نصاریٰ کی عورتوں سے مسلمانوں کا نکاح حلال ہے۔ اور کسی قوم کی عورت سے جب تک کہ وہ مسلمان نہ ہو جائے نکاح حرام ہے۔

آیت قرآن کریم ولا تنکحوا المشرکٰت حتی یؤمن اسی مضمون کے لئے آئی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ مشرک عورتوں سے اس وقت تک نکاح نہ کرو جب تک کہ وہ مسلمان نہ ہو جائیں اور اہل کتاب کے سوا دوسری قومیں سب مشرکات میں داخل ہیں، غرض قرآن مجید کی دو آیتیں اس مسئلہ میں وارد ہوئی ہیں، ایک میں یہ ہے کہ مشرک عورتوں سے اس وقت تک نکاح حلال نہیں جب تک کہ وہ مسلمان نہ ہو جائیں، دوسری یہ آیت سورۃ مائدہ کی جس سے معلوم ہوا کہ اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح جائز ہے، اس لئے جمہور علماء صحابہ و تابعین نے دونوں آیتوں کا مدلول و مفہوم یہ قرار دیا کہ اصولی طور پر غیر مسلم عورت سے مسلمان کا نکاح نہ ہونا چاہیے، لیکن سورۃ مائدہ کی اس آیت نے کہ اہل کتاب کی عورتوں کو اس عموم سے مستثنیٰ کر دیا ہے، اس لئے یہود و نصاریٰ کی عورتوں کے سوا کسی دوسری قوم کی عورت سے بغیر اسلام لائے ہوئے مسلمان کا نکاح نہیں ہو سکتا، جمہور صحابہ و تابعین کے نزدیک اگرچہ از روئے

قرآن اہل کتاب کی عورتوں سے فی نفسہ نکاح حلال ہے، لیکن ان سے نکاح کرنے پر جو دوسرے مفاسد اور خرابیاں اپنے لئے اور اپنی اولاد کے لئے بلکہ پوری امت اسلامیہ کے لئے ازروئے تجربہ لازمی طور سے پیدا ہوں گی ان کی بناء پر اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح کو وہ بھی مکروہ سمجھتے تھے۔

جصاصؒ نے احکام القرآن میں شقیق بن سلمہ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ حضرت حذیفہ بن یمانؓ جب مدائن پہنچے تو وہاں ایک یہودی عورت سے نکاح کر لیا، حضرت فاروق اعظمؓ کو اس کی اطلاع ملی تو ان کو خط لکھا کہ اس کو طلاق دیدو، حضرت حذیفہؓ نے جواب میں لکھا کہ کیا وہ میرے لئے حرام ہے؟ تو پھر امیر المؤمنین فاروق اعظمؓ نے جواب میں تحریر فرمایا کہ میں حرام نہیں کہتا، لیکن ان لوگوں کی عورتوں میں عام طور پر عفت و پاکدامنی نہیں ہے، اس لئے مجھے خطرہ ہے کہ آپ لوگوں کے گھرانہ میں اس راہ سے فحش و بدکاری داخل نہ ہو جائے، اور امام محمد بن حسن رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الآثار میں اس واقعہ کو بروایت امام ابوحنیفہ اس طرح نقل کیا ہے کہ دوسری مرتبہ فاروق اعظمؓ نے جب حضرت حذیفہؓ کو خط لکھا تو اس کے یہ الفاظ تھے: ''آپ کو قسم دیتا ہوں کہ میرا یہ خط اپنے ہاتھ سے رکھنے سے پہلے ہی اس کو طلاق دے کر آزاد کردو کیونکہ مجھے یہ خطرہ ہے کہ دوسرے مسلمان بھی آپ کی اقتداء کریں اور اہل ذمہ اہل کتاب کی عورتوں کو ان کے حسن و جمال کی وجہ سے مسلمان عورتوں پر ترجیح دینے لگیں تو مسلمان عورتوں کے لئے اس سے بڑی مصیبت کیا ہوگی''، اس واقعہ کو نقل کر کے حضرت محمد بن حسن رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ فقہائے حنفیہ اسی کو اختیار کرتے ہیں کہ اس نکاح کو حرام تو نہیں کہتے، لیکن دوسرے مفاسد اور خرابیوں کی وجہ سے مکروہ سمجھتے ہیں اور علامہ ابن ہمام نے فتح القدیر میں نقل کیا ہے کہ حذیفہؓ کے علاوہ طلحہ اور کعب بن مالک کو بھی ایسا ہی واقعہ پیش آیا کہ انہوں نے آیت مائدہ کی بناء پر اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح کر لیا تو جب فاروق اعظمؓ کو اس کی اطلاع ملی تو سخت ناراض ہوئے اور ان کو حکم دیا کہ طلاق دیدیں۔

فاروق اعظمؓ کا زمانہ خیر القرون کا زمانہ ہے، جب اس کا کوئی احتمال نہ تھا کہ کوئی یہودی، نصرانی عورت کسی مسلمان کی بیوی بن کر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کوئی سازش کر سکے، اس وقت تو صرف یہ خطرات سامنے تھے کہ کہیں ان میں بدکاری ہو تو ان کی وجہ سے ہمارے گھرانے گندے ہو جائیں یا ان کے حسن و جمال کی وجہ سے لوگ ان کو ترجیح دینے لگیں جس کا نتیجہ یہ ہو کہ مسلمان عورتیں تکلیف میں پڑ جائیں، مگر فاروقی نظر دوربین اتنے ہی مفاسد کو سامنے رکھ کر ان حضرات کو طلاق پر مجبور کرتی ہے، اگر آج کا نقشہ ان حضرات کے سامنے ہوتا تو اندازہ کیجئے کہ ان کا اس کے متعلق کیا عمل ہوتا، اول تو وہ لوگ جو آج اپنے نام کے ساتھ مردم شماری کے رجسٹروں میں یہودی یا نصرانی لکھواتے ہیں ان میں بہت سے وہ لوگ ہیں جو اپنے عقیدہ کی رو سے یہودیت و نصرانیت کو ایک لعنت سمجھتے ہیں، نہ ان کا تورات و انجیل پر عقیدہ ہے نہ حضرت موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام پر، وہ عقیدہ کے اعتبار سے بالکل لا مذہب اور دہریئے ہیں، محض قومی یا رسمی طور پر اپنے آپ کو یہودی اور نصرانی کہتے ہیں، ظاہر ہے کہ ان لوگوں کی عورتیں مسلمان کے لئے کسی طرح حلال نہیں، اور بالفرض اگر وہ اپنے مذہب کے پابند بھی ہوں تو ان کو کسی مسلمان گھرانہ میں جگہ دینا اپنے پورے خاندان کے لئے دینی اور دنیوی تباہی کو دعوت دینا ہے، اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جو سازشیں اس راہ سے اس آخری دور میں ہوئیں اور ہوتی رہتی ہیں، جن کے عبرت نامے روز آنکھوں کے سامنے آتے ہیں کہ ایک لڑکی نے پوری مسلم قوم اور سلطنت کو تباہ کر دیا، یہ ایسی چیزیں ہیں کہ حلال و حرام سے قطع نظر بھی کوئی ذی ہوش انسان اس کے قریب جانے کے لئے تیار نہیں ہو سکتا، الغرض قرآن و سنت اور اسوہ صحابہ کی رو سے مسلمانوں پر لازم ہے کہ آج کل کی کتابی عورتوں کو نکاح میں لانے سے کلی پرہیز کریں، آخر آیت میں یہ ہدایت بھی کر دی گئی ہے کہ اہل کتاب کی عورتوں کو اگر رکھنا ہی ہے تو باقاعدہ نکاح کر کے بیوی کی حیثیت سے رکھیں، ان کے حقوق مہر وغیرہ ادا کریں۔ ان کو داشتہ کے طور پر رکھنا اور کھلے طور پر بدکاری کرنا یہ سب چیزیں حرام ہیں۔

* * *

فائدہ: ۱ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ: ''پاک دامن'' کی قید شاید ترغیب کے لئے ہو یعنی ایک مسلمان کو چاہیے کہ نکاح کرتے وقت پہلی نظر عورت کی عفت اور پاک دامنی پر ڈالے، یہ مطلب نہیں کہ پاک دامن کے سوا کسی اور سے نکاح صحیح نہیں ہوگا۔

فائدہ: ۲ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ: اہل کتاب کے ایک مخصوص حکم کے ساتھ دوسرا مخصوص حکم بھی بیان فرما دیا، یعنی یہ

کہ کتابی عورت سے نکاح کرنا شریعت میں جائز ہے مشرکہ سے اجازت نہیں: وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ (البقرۃ:۲۲۱)۔

مگر یہ یاد رہے کہ ہمارے زمانہ کے ''نصاریٰ'' عموماً برائے نام نصاریٰ ہیں، ان میں بکثرت وہ ہیں جو نہ کسی کتاب آسمانی کے قائل ہیں، نہ مذہب کے، نہ خدا کے، ان پر اہل کتاب کا اطلاق نہیں ہوسکتا، لہذا ان کے ذبیحہ اور نساء کا حکم اہل کتاب کا سا نہ ہوگا۔

نیز یہ ملحوظ رہے کہ کسی چیز کے حلال ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اس میں فی حد ذاتہ کوئی تحریم کی وجہ نہیں، لیکن اگر خارجی اثرات وحالات ایسے ہوں کہ اس حلال سے متنفع ہونے میں بہت سے حرام کا ارتکاب کرنا پڑتا ہے، بلکہ کفر میں مبتلا ہونے کا احتمال ہو تو ایسے حلال سے انتفاع کی اجازت نہیں دی جائے گی، موجودہ زمانہ میں یہود ونصاریٰ کے ساتھ کھانا پینا، بے ضرورت اختلاط کرنا، ان کی عورتوں کے جال میں پھنسنا، یہ چیزیں جو خطرناک نتائج پیدا کرتی ہیں وہ مخفی نہیں، لہذا ابدی اور بد دینی کے اسباب وذرائع سے اجتناب ہی کرنا چاہئے۔

فائدہ: ۳ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِيْنَ: یعنی قید نکاح میں لانے کو، گویا اس طرف اشارہ ہوگیا کہ نکاح بظاہر قید ہے، لیکن یہ قید ان آزادیوں اور ہوس رانیوں سے بہتر ہے جن کی طلب میں انسان نما بہائم سلسلہ ازدواج ہی کو معدوم کردینا چاہتے ہیں۔

فائدہ: ۴ وَلَا مُتَّخِذِيْٓ اَخْدَانٍ: جس طرح پہلے عورت کی پاکدامنی کا ذکر کیا تھا، یہاں مرد کو پاک باز اور عفیف رہنے کی ہدایت فرمادی: وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبٰتِ (النور:۲۶) اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ کی نظر میں نکاح کی غرض گوہر عصمت کو محفوظ اور مقصد تزویج کو پورا کرنا ہے، شہوت رانی اور ہوا پرستی مقصود نہیں۔

وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ ۡ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝۵ ع ۵

اور جو منکر ہوا ایمان سے تو ضائع ہوئی محنت اس کی اور آخرت میں وہ ٹوٹے والوں میں ہے ۱؎

خلاصہ تفسیر: اور جو شخص ایمان (لانے کی چیزوں) کے ساتھ کفر کرے گا (مثلاً حلال قطعی کے حلال ہونے کا یا حرام قطعی کے حرام ہونے کا انکار کرے گا) تو اس شخص کا (ہر نیک) عمل غارت (اور اکارت) جائے گا، اور وہ شخص آخرت میں بالکل زیاں کار ہوگا (بس حلال کو حلال سمجھو اور حرام کو حرام سمجھو)۔

وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ: کا اس مقام پر ایک اور فائدہ بھی ہوسکتا ہے وہ یہ کہ اوپر کتابی مرد یا عورت کے ذبائح اور کتابیہ عورت کے نکاح کا حلال ہونا مذکور ہے، چونکہ بعض مسلمان یہودی یا نصرانی ہوجاتے ہیں تو شبہ ہوسکتا تھا کہ ان کا حکم بھی اہل کتاب کا سا ہوگا، اس لیے اس جملہ میں اس شبہ کو دور کرنے کی طرف اشارہ کردیا کہ جو شخص اپنے سابق ایمان کی حقیقت کا انکار کرے، یعنی اگر کوئی مسلمان معاذ اللہ مرتد ہوکر یہودی یا نصرانی بن جائے تو وہ اہل کتاب میں داخل نہیں، بلکہ وہ مرتد ہے، اس کا عمل مثلاً نکاح یا ذبح بے اثر ہوجائے گا، یعنی اس پر حلت مرتب نہ ہوگی اور آخرت کا خسارہ تو ظاہر ہی ہے، یعنی اس کے ساتھ نکاح اور اس کا ذبیحہ باجماع امت حرام ہے، اسی طرح جو مسلمان ضروریات اور قطعیات اسلام میں سے کسی چیز کا انکار کرنے کی وجہ سے مرتد ہوگیا ہے، اگرچہ وہ قرآن اور رسول کریم ﷺ کو ماننے کا دعویٰ بھی کرتا ہو وہ بھی مرتد ہے، اس کے ساتھ نکاح اور ذبیحہ حلال نہیں، محض قرآن پڑھنے یا قرآن پر عمل کرنے کا دعویٰ کرنے سے وہ اہل کتاب میں داخل نہیں ہوسکتا، ہاں! کسی دوسرے مذہب وملت کا آدمی اگر اپنا مذہب چھوڑ کر یہودی ونصرانی بن جائے تو وہ اہل کتاب میں شمار ہوگا، اور اس کے ساتھ نکاح یا اس کا ذبیحہ حلال قرار پائے گا۔

* * *

فائدہ: ۱ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ: جن کتابی عورتوں سے نکاح کی اجازت ہوئی، اس کا فائدہ یہ ہونا چاہیے کہ مومن قانت کی حقانیت عورت کے دل میں گھر کر جائے، نہ یہ کہ کتابیات پر مفتون ہوکر الٹا اپنی متاع ایمانی ہی کو گنوا بیٹھے اور خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ کا مصداق ہوکر رہ جائے، چونکہ کافر عورت سے نکاح کرنے میں اس فتنہ کا قوی احتمال ہوسکتا ہے اس لئے وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ کی تہدید نہایت ہی

برمحل ہے، یہ میرا خیال ہے، باقی حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ: ''اہل کتاب کو کفار سے دو حکم میں مخصوص کیا، یہ فقط دنیا میں ہے اور آخرت میں ہر کافر خراب ہے اگر عمل نیک بھی کرے تو قبول نہیں''۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَ اَیْدِیَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ

اے ایمان والو ۱؎ جب تم اٹھو ۲؎ نماز کو تو دھو لو اپنے منہ اور ہاتھ کہنیوں تک

وَ امْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَیْنِؕ وَ اِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْاؕ

اور مل لو اپنے سر کو ۳؎ اور پاؤں ٹخنوں تک ۴؎ اور اگر تم کو جنابت ہو تو خوب طرح پاک ہو ۵؎

خلاصہ تفسیر: پچھلی آیات میں کچھ احکام شرعیہ وہ ذکر کیے گئے جن کا تعلق انسان کی دنیوی زندگی اور کھانے پینے سے ہے، اس آیت میں چند احکام شرعیہ عبادات کے متعلق ذکر کئے گئے ہیں۔

اے ایمان والو! جب تم نماز کو اٹھنے لگو (یعنی نماز پڑھنے کا ارادہ کرو اور تم کو اس وقت وضو نہ ہو) تو (وضو کرلو، یعنی) اپنے چہروں کو دھوؤ اور اپنے ہاتھوں کو کہنیوں سمیت (دھوؤ) اور اپنے سروں پر (بھیگا) ہاتھ پھیرو، اور اپنے پیروں کو بھی ٹخنوں سمیت (دھوؤ) (پہلے وضو کی فرضیت ذکر کی، اب غسل کی فرضیت بیان کی جاتی ہے:) اور اگر تم جنابت کی حالت میں ہو تو (نماز سے پہلے) سارا بدن پاک کرلو۔

وضو میں یہ چار چیزیں فرض ہیں، باقی اور مسنون و مستحب ہیں جن کی تفصیل کتب فقہ میں ہے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا: امت محمدیہ پر جو عظیم الشان احسانات کئے گئے ان کا بیان سن کر ایک شریف اور حق شناس مومن کا دل شکر گزاری اور اظہار وفاداری کے جذبات سے لبریز ہوجائے گا اور فطری طور پر اس کی یہ خواہش ہوگی کہ اس منعم حقیقی کی بارگاہ رفیع میں دست بستہ حاضر ہو کر جبین نیاز خم کرے اور اپنی غلامانہ منت پذیری اور انتہائی عبودیت کا عملی ثبوت دے، اس لئے ارشاد ہوا کہ جب ہمارے دربار میں حاضری کا ارادہ کرو ،یعنی نماز کے لئے اٹھو تو پاک وصاف ہو کر آؤ، جن لذائذ دنیوی اور مرغوبات طبیعی سے متمتع ہونے کی آیت وضو سے پہلی آیت میں اجازت دی گئی (یعنی طیبات اور محصنات) وہ ایک حد تک انسان کو ملکوتی صفات سے دور اور بہیمیت سے نزدیک کرنے والی چیزیں ہیں اور کل احداث (موجبات وضو و غسل) ان ہی کے استعمال سے لازمی نتیجہ کے طور پر پیدا ہوتے ہیں، لہٰذا مرغوبات نفسانی سے یکسو ہو کر جب ہماری طرف آنے کا قصد کرو تو پہلے بہیمیت کے اثرات اور ''اکل وشرب'' وغیرہ کے پیدا کئے ہوئے تکدرات سے پاک ہو جاؤ، یہ پاکی ''وضو'' اور ''غسل'' سے حاصل ہوتی ہے، نہ صرف یہ کہ وضو کرنے سے مومن کا بدن پاک وصاف ہوجاتا ہے، بلکہ جب وضو باقاعدہ کیا جائے تو پانی کے قطرات کے ساتھ گناہ بھی جھڑتے جاتے ہیں۔

فائدہ: ۲؎ اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ: یعنی سو کر اٹھو یا دنیا کے مشاغل چھوڑ کر نماز کے لئے اٹھ کھڑے ہو تو پہلے وضو کرلو لیکن وضو کرنا ضروری اس وقت ہے جب کہ پیشتر سے باوضو نہ ہو، آیت کے آخر میں ان احکام کی جو غرض وغایت وَّ لٰكِنْ یُّرِیْدُ لِیُطَهِّرَكُمْ سے بیان فرمائی ہے، اس سے معلوم ہوگیا کہ ہاتھ منہ دھونے وغیرہ کا وجوب اسی لئے ہے کہ حق تعالیٰ تم کو پاک کرکے اپنے دربار میں جگہ دے، اگر یہ پاکی پہلے سے حاصل ہے اور کوئی ناقص وضو پیش نہیں آیا تو پاک کو پاک کرنے کی ضرورت نہیں، بلکہ اس کو ضروری قرار دینے سے امت ''حرج'' میں پڑتی ہے جس کی نفی مَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیَجْعَلَ عَلَیْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ میں کی گئی، ہاں! مزید نظافت، نورانیت اور نشاط حاصل کرنے کے لئے اگر تازہ وضو کرلیا جائے تو مستحب ہوگا، شاید اسی لئے اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ الآیہ میں سطح کلام کی ایسی رکھی ہے جس سے ہر مرتبہ نماز کی طرف جانے کے وقت تازہ وضو کی ترغیب ہوتی ہے۔

فائدہ: ۳؎ وَ امْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ: یعنی تر ہاتھ سر پر پھیرلو، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مدت العمر میں مقدار ناصیہ سے کم کا مسح ثابت نہیں

ہوتا "مقدار ناصیہ" چوتھائی سر کے قریب ہے، ابوحنیفہؒ اس قدر مسح کو فرض کہتے ہیں، باقی اختلافات اور دلائل کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔

فائدہ: ۴ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ: مترجم محقق نے پاؤں کے بعد لفظ "کو" نہ لکھ کر نہایت لطیف اشارہ فرمادیا کہ اَرْجُلَكُمْ کا عطف مغسولات پر ہے، یعنی جس طرح منہ، ہاتھ دھونے کا حکم ہے، پاؤں بھی ٹخنوں تک دھونے چاہئیں، سر کی طرح مسح کافی نہیں، چنانچہ اہلسنت والجماعت کا اس پر اجماع ہے اور احادیث کثیرہ سے یہ ہی ثابت ہوتا ہے کہ اگر پاؤں میں موزے نہ ہوں تو دھونا فرض ہے، ہاں! "موزوں" پر ان شرائط کے موافق جو کتب فقہ میں مذکور ہیں مقیم ایک دن رات اور مسافر تین دن تک مسح کرسکتا ہے۔

فائدہ: ۵ وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا: یعنی جنابت سے پاک ہونے میں صرف اعضائے اربعہ کا دھونا اور مسح کرنا کافی نہیں، سطح بدن کے جس حصہ تک پانی بدون تضرر کے پہنچ سکتا ہو وہاں تک پہنچانا ضروری ہے، اسی لئے حنفیہ غسل میں "مضمضہ" اور "استنشاق" (کلی کرنا اور ناک میں پانی ڈالنا) کو بھی ضروری کہتے ہیں، وضو میں ضروری نہیں سنت ہے۔

وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰۤى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا

اور اگر تم بیمار ہو یا سفر میں یا کوئی تم میں آیا ہے جائے ضرور سے یا پاس گئے ہو عورتوں کے پھر نہ پاؤ تم

مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ مِّنْهُ ؕ

پانی تو قصد کرو مٹی پاک کا اور مل لو اپنے منہ اور ہاتھ اس سے ۱ے

خلاصہ تفسیر: (وضو اور غسل کے بعد اب تیمم کا بیان ہے:) اور اگر تم بیمار ہو (اور پانی کا استعمال نقصان دہ ہو) یا حالت سفر میں ہو (اور پانی نہیں ملتا جیسا آگے آتا ہے، یہ تو عذر کی حالت ہوئی) یا (اگر مرض وسفر کا عذر بھی نہ ہو، بلکہ ویسے ہی وضو یا غسل ٹوٹ جائے، اس طرح سے کہ مثلاً) تم میں سے کوئی شخص (پیشاب یا پائخانہ کے) استنجے سے (فارغ ہو کر) آیا ہو (جس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے) یا تم نے بیویوں سے قربت کی ہو (جس سے غسل ٹوٹ گیا ہو اور) پھر (ان ساری صورتوں میں) تم کو پانی (کے استعمال کا موقع) نہ ملے (خواہ بوجہ نقصان کے یا پانی نہ ملنے کے) تو (ان سب حالتوں میں) تم پاک زمین سے تیمم کرلیا کرو، یعنی اپنے چہروں اور ہاتھوں پر پھیر لیا کرو، اس زمین (کی جنس) پر سے (ہاتھ مار کر)۔

اس جیسا مضمون سورہ نساء آیت ۴۳ میں بھی گذر چکا ہے، فرق یہ ہے کہ وہاں صرف غسل اور تیمم کا ذکر تھا، وضو کا ذکر نہ تھا اور یہاں وضو، غسل، اور تیمم سب کو ایک جگہ جمع کردیا گیا، تاکہ آئندہ جو احسان ظاہر کیا جاتا ہے اس کی قدر ہو، کیونکہ منت بقدر نعمت ہوتی ہے، یہ فرق ہے دونوں مقام میں، چنانچہ تکرار محض نہ ہوا۔

❋ ❋ ❋

فائدہ: ۱ے فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ: یعنی مرض کی وجہ سے پانی کا استعمال مضر ہو یا سفر میں پانی بقدر کفایت نہ ملے یا مثلاً کوئی قضائے حاجت کرکے آیا اور وضو کی ضرورت ہے یا جنابت کی وجہ سے غسل ناگزیر ہے مگر پانی کے حاصل کرنے یا استعمال کرنے پر کسی وجہ سے قادر نہیں تو ان صورتوں میں وضو یا غسل کی جگہ تیمم کرلے، وضو اور غسل دونوں کے تیمم کی مشروعیت سے جو غرض ہے وہ بہر صورت یکساں طور پر حاصل ہوتی ہے "تیمم" کے اسرار و مسائل اور اس آیت کے فوائد سورہ نساء کے ساتویں رکوع میں مفصل گزر چکے۔

تنبیہ: مترجم محقق قدس سرہ نے لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ کا جو ترجمہ کیا ہے "پاس گئے ہو عورتوں کے" وہ محاورہ کے اعتبار سے حالت جنابت ہی پر دلالت کرتا ہے، یہ ترجمہ ابن عباسؓ اور ابوموسیٰ اشعریؓ کی تفسیر کے موافق ہے جسے ابن مسعودؓ نے بھی سکوتاً تسلیم کیا ہے (کمافی البخاری) نیز مترجم علامؒ نے فَتَيَمَّمُوْا کے ترجمہ میں "قصد کرو" کہہ کر اشارہ فرمادیا کہ اصل لغت کے اعتبار سے "تیمم" کے معنی میں "قصد" معتبر ہے، اور اس لغوی معنی کی مناسبت کا خیال رکھتے ہوئے "تیمم شرعی" میں بھی قصد یعنی نیت کو علماء نے ضروری قرار دیا ہے۔

مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ

اللہ نہیں چاہتا کہ تم پر تنگی کرے ۱ لیکن چاہتا ہے کہ تم کو پاک کرے ۲ اور پورا کرے اپنا احسان تم پر

لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝۶

تا کہ تم احسان مانو ۳

خلاصہ تفسیر: پیچھے طہارت کے احکام بیان کیے جن میں بندوں کی سہولت اور مصلحت کی رعایت کی گئی ہے، اب اس پر اپنا احسان ظاہر فرماتے ہیں اور شکر کا حکم دیتے ہیں:

اللہ تعالیٰ کو (ان احکام کے مقرر فرمانے سے) یہ منظور نہیں کہ تم پر کوئی تنگی ڈالیں (یعنی یہ منظور ہے کہ تم پر کوئی تنگی نہ رہے، چنانچہ مذکورہ احکام میں خصوصاً اور تمام احکام شرعیہ میں عموماً سہولت و مصلحت کی رعایت ظاہر ہے) لیکن اللہ تعالیٰ کو یہ منظور ہے کہ تم کو پاک صاف رکھے (اس لئے طہارت کے قواعد اور طریقے مقرر کیے اور کسی ایک طریقہ پر اکتفا نہیں کیا گیا کہ اگر وہ نہ ہو تو طہارت ہی ممکن نہ ہو، مثلاً صرف پانی کو مطہر رکھا جاتا تو پانی نہ ہونے کے وقت طہارت حاصل نہ ہو سکتی، یہ بدن کی طہارت تو خاص انہی وضو اور غسل وغیرہ کے احکام سے ہوتی ہے، اور قلوب کی طہارت تمام اطاعات میں عام ہے، پس یہ طہارت ظاہری و باطنی دونوں کو شامل ہے اور اگر یہ احکام نہ ہوتے تو کوئی سی طہارت حاصل نہ ہوتی) اور یہ (منظور ہے) کہ تم پر اپنا انعام تام فرمادے (اس لئے احکام کی تکمیل فرمائی تا کہ ہر حال میں طہارت بدنی و قلبی حاصل کر سکو جس کا ثمرہ رضا و قرب خداوندی ہے جو سب سے بڑی نعمت ہے) تا کہ تم (ہماری اس عنایت کا) شکر ادا کرو (شکر میں احکام کی بجا آوری بھی داخل ہے، یعنی صرف یہی نہیں کہ زبان سے الحمد للہ، الشکر للہ کہا کرو، بلکہ احکام پر عمل کرنا بھی شکر میں ضروری ہے)۔

مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ: یعنی اللہ تعالیٰ کو یہ منظور نہیں کہ تم پر کوئی تنگی ڈالیں، اس سے معلوم ہوا کہ شرعی رخصتوں میں نقص و کمی کے شبہ سے تنگ دل ہونا اور اس پر نفس پرستی کا شبہ کرنا حق کی مزاحمت ہے (جو بڑی خطرناک حالت ہے، یعنی شریعت نے جن مسائل میں سہولت و نرمی دی ہے ان سے استفادہ نہ کرنا یا اس کو اچھا خیال نہ کرنا حق کی مخالفت جیسا عمل سمجھا جائے گا) اللہ تعالیٰ نے جن اعمال کے اندر اور جن اوقات میں رخصت دی ہے اس رخصت پر عمل کرنا چاہیے، اپنے آپ کو زیادہ دین دار سمجھ کر تنگ دل نہیں ہونا چاہیے، کہ یہ رخصت کیوں ہے؟ ہم تو اصل پر عمل کر سکتے ہیں، بلکہ محبت اسی میں ہے کہ جیسے جیسے حکم متوجہ ہوتے جائیں رخصت یا عزیمت پر عمل کرتے جائیں۔

وَّلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ: آیت میں لیطھرکم سے بطور عموم مجاز کے طہارت بدنی و قلبی دونوں مراد ہیں، کیونکہ اتمام نعمت کو تطہیر پر مرتب فرمایا ہے اور یہ اتمام نعمت اس وقت ہے کہ ظاہری بدن کے ساتھ قلب بھی پاک ہو، ورنہ نعمت تام نہ ہوگی، کیونکہ قلب کی آلودگی کے ساتھ رضا کا حصول ممکن نہیں، اور رضا کا حصول ہی بڑی نعمت ہے، اور جب یہ نہیں تو نعمت تام کہاں!!!۔

❊ ❊ ❊

فائدہ: ۱ مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ: اس لئے جو احداث کثیر الوقوع تھے ان میں سارے جسم کا دھونا ضروری نہ رکھا صرف اور اعضاء (منہ، ہاتھ، پاؤں، سر) جن کو اکثر بلاد متمدنہ کے رہنے والے عموماً کھلا رکھنے میں مضائقہ نہیں سمجھتے ان کا دھونا اور مسح کرنا ضروری بتلایا ، تا کہ کوئی تنگی اور دقت نہ ہو، ہاں! "حدث اکبر" بمعنی "جنابت" جو احیاناً پیش آتی ہے اور اس حالت میں نفس کو ملکوتی خصائل کی طرف ابھارنے کے لئے کسی غیر معمولی تنبیہ کی ضرورت ہے، اس کے ازالہ کے لئے تمام بدن کا دھونا فرض کیا، پھر "مرض" اور "سفر" وغیرہ حالات میں کس قدر آسانی فرمادی، اول تو پانی کی جگہ "مٹی" کو مطہر بنادیا، پھر اعضائے وضو میں سے نصف کی تخفیف اس طرح کردی کہ جہاں پہلے ہی سے تخفیف تھی، یعنی سر کا مسح اسے بالکل اڑادیا اور پاؤں کو شاید اس لئے ساقط کردیا کہ وہ عموماً مٹی میں یا مٹی کے قریب رہتے ہیں اور تمام اعضائے بدن کی نسبت سے گرد و غبار میں ان کا تلوث

شدید تر ہے، لہٰذا ان پر مٹی کا ہاتھ پھیرنا بیکار سا تھا، بس دو عضو رہ گئے "منہ" اور "ہاتھ" ان ہی کو ملنے سے وضو اور غسل دونوں کا "تیمم" ہو جاتا ہے۔

فائدہ: ۲ وَّلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ: کیونکہ وہ خود پاک ہے تو پاکی ہی پسند کرتا ہے۔

فائدہ: ۳ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ: پچھلے رکوع میں جو نعمائے عظیمہ بیان ہوئی تھیں ان کو سن کر بندہ کے دل میں جوش اٹھا کہ اس منعم حقیقی کی بندگی کے لئے فوراً کھڑا ہو جائے، اسے بتلا دیا کہ ہماری طرف آؤ تو کس طریقہ سے پاک ہو کر آؤ، یہ بتلانا خود ایک نعمت ہوئی اور بدن کی سطح ظاہر پر پانی ڈالنے یا مٹی ڈالنے یا مٹی لگانے سے اندرونی پاکی عطا فرما دینا یہ دوسری نعمت ہوئی، بندہ ابھی پچھلی نعمتوں کا شکر ادا نہیں کر سکا تھا قصد ہی کر رہا تھا کہ یہ جدید انعامات فائض ہو گئے، اس لئے ارشاد ہوا لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ یعنی ان پہلی نعمتوں کو یاد کرنے سے پہلے ان جدید نعمتوں کا جو "احکام وضو" وغیرہ کے ضمن میں مبذول ہوئیں شکر ادا کرنا چاہئے، شاید اسی لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ سے حضرت بلالؓ نے "تحیۃ الوضو" کا سراغ لگایا ہو۔

ربط: اس درمیانی نعمت کے شکریہ پر متوجہ کرنے کے بعد اگلی آیت میں ان سابق نعمتوں اور احسانات عظیمہ کو پھر اجمالاً یاد دلاتے ہیں جن کی شکر گزاری کے لئے بندہ اپنے مولا کے حضور میں کھڑا ہونا چاہتا تھا، چنانچہ فرماتے ہیں: وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ۔

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا

اور یاد کرو احسان اللہ کا اپنے اوپر اور عہد اس کا جو تم سے ٹھہرایا تھا جب تم نے کہا تھا کہ ہم نے سنا

وَاَطَعْنَا ۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ⑦

اور مانا ۱ اور ڈرتے رہو اللہ سے اللہ خوب جانتا ہے دلوں کی بات ۲

خلاصہ تفسیر: اوپر متعدد احکام کا مشروع ہونا اور ان کا نعمت ہونا بیان فرمایا، آگے چند طریقوں سے ان کی بجا آوری کی تاکید فرماتے ہیں: نعمتوں کی یاد دہانی، مخاطبین کو ان کا عہد یاد دلانا اور مخالفت سے ڈرانا۔

اور تم لوگ اللہ تعالیٰ کے انعام کو جو تم پر ہوا ہے یاد کرو (جس میں بڑا انعام یہ ہے کہ تمہاری فلاح کے طریقے تمہارے لئے مشروع کر دئے) اور اس کے اس عہد کو بھی (یاد کرو) جس کا تم سے معاہدہ کیا ہے جبکہ تم نے (اس کا التزام بھی کر لیا تھا کہ عہد لینے کے وقت تم نے) کہا تھا کہ ہم نے (ان احکام کو) سنا اور مان لیا (کیونکہ اسلام لانے کے وقت ہر شخص اسی مضمون کا عہد کرتا ہے، یہ ضروری نہیں ہے کہ لفظ سمعنا ہی کہا ہو، بلکہ اسلام لانا یہ خود سمعنا کہنا ہی ہے) اور اللہ تعالیٰ (کی مخالفت) سے ڈرو، بلاشبہ اللہ تعالیٰ دلوں کی باتوں کی پوری خبر رکھتے ہیں (اس لئے جو کام کرو اس میں اخلاص و اعتقاد بھی ہونا چاہیے، صرف منافقانہ بجا آوری کافی نہیں، مطلب یہ کہ ان احکام میں اول تو تمہارا ہی نفع ہے، پھر تم نے اپنے سر بھی رکھ لیا ہے، پھر مخالفت میں نقصان کا خوف ہے، ان وجوہ سے بجا آوری اور تعمیل ضروری ہے اور وہ بھی دل سے ہونی چاہیے ورنہ کالعدم ہے)۔

* * *

فائدہ: ۱ غالباً یہ عہد وہ ہی ہے جو سورہ بقرہ کے آخر میں مومنین کی زبان سے نقل فرمایا تھا: وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ (البقرۃ:۲۸۵) جب صحابہ رضی اللہ عنہم آنحضرت ﷺ کے دست مبارک پر بیعت کرتے تھے اس وقت بھی یہ اقرار کرتے تھے کہ ہم اپنی استطاعت کے موافق آپ کی ہر بات کو سنیں گے اور مانیں گے، خواہ ہمارے منشاء اور طبیعت کے موافق ہو یا خلاف، یہ تو عام عہد تھا، اس کے بعد بعض ارکان اسلام یا مناسب حال اہم چیزوں کے متعلق خصوصیت سے بھی عہد لیا جاتا تھا، گویا اس سورت کے شروع میں جو اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ فرمایا تھا، درمیان میں بہت سے احسانات کا ذکر کر کے جن کو سن کر ایفائے عہد کی مزید ترغیب ہوتی ہے پھر وہ ہی اصلی سبق یاد دلایا گیا۔

فائدہ: ۲ ایک شریف اور حیادار آدمی کی گردن اپنے محسن اعظم کے سامنے جھک جانی چاہئے، مروت و شرافت اور آئندہ مزید احسانات کی توقع اسی کو مقتضی ہے کہ بندہ اس منعم حقیقی کا بالکل تابع فرمان بن جائے، خصوصاً جب کہ زبان سے اطاعت و وفاداری کا پختہ عہد و اقرار بھی کر چکا ہے، ممکن

ہے حق تعالیٰ کی بے انتہا مہربانیاں دیکھ کر بندہ مغرور ہوجائے، اس کی نعمتوں کی قدر اور اپنے قول و قرار کی کوئی پروانہ کرے، اس لئے فرمایا: وَاتَّقُوا اللّٰہَ یعنی خدا سے ہمیشہ ڈرتے رہو، وہ ایک لحہ میں تم سے سب نعمتیں چھین سکتا ہے اور ناشکری اور بدعہدی کی سزا میں بہت سخت پکڑ سکتا ہے، بہر حال مروت، شرافت، امید اور خوف ہر چیز کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اس کی مخلصانہ اطاعت اور وفاداری میں پوری مستعدی دکھلائیں، آگے وہ عَلِیۡمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ ہے ہم جو کچھ کریں گے وہ ہمارے اخلاص یا نفاق، ریاکاری یا قلبی نیاز مندی کو خوب جانتا ہے، فقط زبان سے **سمعنا و اطعنا** کہنے یا شکر گزاری کی رسمی اور ظاہری نمایش سے ہم اس کو دھوکا نہیں دے سکتے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا كُوۡنُوۡا قَوّٰمِیۡنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالۡقِسۡطِ ۫ وَلَا یَجۡرِمَنَّكُمۡ شَنَاٰنُ قَوۡمٍ عَلٰۤی

اے ایمان والو کھڑے ہو جایا کرو اللہ کے واسطے گواہی دینے کو انصاف کی ۱؎ اور کسی قوم کی دشمنی کے باعث انصاف کو

اَلَّا تَعۡدِلُوۡا ؕ اِعۡدِلُوۡا ۟ هُوَ اَقۡرَبُ لِلتَّقۡوٰی ۫ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِیۡرٌۢ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ ⑧

ہرگز نہ چھوڑو ۲؎ عدل کرو، یہی بات زیادہ نزدیک ہے تقویٰ سے ۳؎ اور ڈرتے رہو اللہ سے، اللہ کو خوب خبر ہے جو تم کرتے ہو ۴؎

خلاصہ تفسیر: یہاں تک وہ احکام بیان کیے جن کا تعلق ہر شخص کی خاص ذات سے ہے، اب آگے آیات میں عدل و انصاف اور شہادت حق کا حکم بیان کرتے ہیں جس میں دوسروں سے بھی تعلق ہے، نظام عالم کا دارومدار عدل و انصاف اور سچی شہادت پر ہے، اس لیے کہ عدل و انصاف اور سچی شہادت سے تمام مظالم اور مفاسد کا دروازہ بند ہوجاتا ہے، پس عبادات و معاملات دونوں جمع کردیے گئے۔

اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ (کی خوشنودی) کے لئے (احکام کی) پوری پابندی کرنے والے (اور شہادت کی نوبت آئے تو) انصاف کی شہادت ادا کرنے والے رہو، اور کسی خاص گروہ کی عداوت تم کو اس پر باعث نہ ہوجائے کہ تم (ان کے معاملات میں) عدل نہ کرو (ضرور ہر معاملہ میں) عدل کیا کرو، وہ (یعنی عدل کرنا) تقویٰ سے زیادہ قریب ہے (یعنی عدل کرنے سے آدمی متقی کہلاتا ہے) اور (تقویٰ اختیار کرنا تم پر فرض ہے، چنانچہ حکم ہوا ہے کہ) اللہ تعالیٰ (کی مخالفت) سے ڈرو (یہی تقوی کی حقیقت ہے، پس عدل بھی فرض ہوگا کیونکہ اس پر تقوی موقوف ہے) بلاشبہ اللہ تعالیٰ کو تمہارے سب اعمال کی پوری اطلاع ہے (پس احکام کی مخالفت کرنے والوں کو سزا ہوجائے تو بعید نہیں)۔

كُوۡنُوۡا قَوّٰمِیۡنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالۡقِسۡطِ: اس آیت کا مضمون تقریباً ان ہی الفاظ کے ساتھ سورۃ نساء آیت ۱۳۵ میں بھی گذر چکا ہے، فرق اتنا ہے کہ وہاں: **کونوا قوامین بالقسط شہداء للہ** ارشاد ہوا تھا، اور یہاں **کونوا قوامین للہ شہداء بالقسط** فرمایا گیا ہے، ان دونوں آیتوں میں الفاظ کے تقدم اور تاخر کی ایک لطیف وجہ ابوحیان نے تفسیر بحر محیط میں ذکر کی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کو عدل و انصاف سے روکنے اور ظلم و جود میں مبتلا کرنے کے عادتاً دو سبب ہوا کرتے ہیں: ① ایک اپنے نفس یا اپنے دوستوں، عزیزوں کی طرف داری ② دوسرے کسی شخص کی دشمنی و عداوت، سورۃ نساء کی آیت کا روئے سخن پہلے مضمون کی طرف ہے اور سورۃ مائدہ کی اس آیت کا روئے سخن دوسرے مضمون کی طرف، اسی لئے سورۃ نساء میں اس کے بعد ارشاد ہے: **ولو علی انفسکم او الوالدین و الاقربین** یعنی عدل و انصاف پر قائم رہو، چاہے وہ عدل و انصاف کا حکم خود تمہارے نفوس یا تمہارے والدین اور عزیزوں و دوستوں کے خلاف پڑے اور سورۃ مائدہ کی اس آیت میں جملہ مذکور کے بعد یہ ارشاد ہے: **ولا یجرمنکم شنان قوم علی الا تعدلوا** یعنی کسی قوم کی عداوت و دشمنی تمہیں اس پر آمادہ نہ کردے کہ تم انصاف کے خلاف کرنے لگو۔

یہی وجہ ہے کہ سورۃ نساء کی آیت میں ''قسط'' یعنی انصاف کو مقدم کرکے ارشاد فرمایا: **کونوا قوامین بالقسط شہداء للہ** اور سورۃ مائدہ کی آیت میں ''للہ'' کو مقدم کرکے ارشاد فرمایا: **کونوا قوامین للہ شہداء بالقسط** اگرچہ انجام اور نتیجہ کے اعتبار سے یہ دونوں عنوان ایک ہی مقصد کو ادا کرتے ہیں، کیونکہ جو شخص انصاف پر کھڑا ہوگا، وہ اللہ ہی کے لئے کھڑا ہوگا، اور جو شخص اللہ ہی کے لئے کھڑا ہوا ہے وہ ضرور انصاف ہی کرے گا، لیکن اپنے نفس اور دوستوں عزیزوں کی رعایت کے مقام میں یہ خیال گزر سکتا ہے کہ ان تعلقات کی رعایت بھی تو اللہ ہی کے لئے ہے، اس لئے وہاں لفظ

''قسط'' کو مقدم لا کر اس کی طرف ہدایت کردی کہ وہ رعایت اللہ کے لئے نہیں ہوسکتی جو عدل وانصاف کے خلاف ہو، اور سورۂ مائدہ میں دشمنوں کے ساتھ عدل وانصاف برتنے کا حکم دینا تھا تو یہاں لفظ ''للہ'' کو مقدم لا کر انسانی فطرت کو جذبات میں مغلوب ہونے سے نکال دیا کہ تم لوگ اللہ کے لئے کھڑے ہو، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ دشمنوں کے ساتھ بھی انصاف کرو۔

خلاصہ یہ ہے کہ سورۂ نساء اور مائدہ کی دونوں آیتوں میں دو چیزوں کی طرف ہدایت ہے: ① ایک یہ کہ خواہ معاملہ دوستوں سے ہو یا دشمنوں سے عدل وانصاف کے حکم پر قائم رہو، نہ کسی تعلق کی رعایت سے اس میں کمزوری آنی چاہیے اور نہ کسی دشمنی وعداوت سے ② دوسری ہدایت ان دونوں آیتوں میں اس کی بھی ہے کہ سچی شہادت اور حق بات کے بیان کرنے سے پہلوتہی نہ کی جائے، تاکہ فیصلہ کرنے والوں کو حق اور صحیح فیصلہ کرنے میں دشواری پیش نہ آئے۔

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ: اس سے معلوم ہوا کہ معاملات میں اپنی طبیعتوں کے مطابق نہیں چلنا چاہیے، بلکہ عدل وانصاف سے کام لینا چاہیے اور یہ مجاہدہ ہے، یعنی معاملات میں اپنی طبیعت کے تقاضے کے خلاف کرنا ایک مجاہدہ ہے، اور یہاں اسی کی تعلیم دی جارہی ہے (یعنی شریعت کے منشاو مراد کو اپنی طبیعت کے تقاضوں کی وجہ سے ترک نہ کیا جائے)۔

* * *

فائدہ: ۱ قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ: اس سے پہلی آیت میں مومنین کو حق تعالیٰ کے احسانات اور اپنا عہد وپیمان یاد کرنے کا حکم دیا تھا، یہاں بتلادیا کہ صرف زبان سے یاد کرنا نہیں، بلکہ عملی رنگ میں ان سے اس کا ثبوت مطلوب ہے، اس آیت میں اسی پر تنبیہ کی گئی ہے کہ اگر تم نے خدا کے بیشمار احسانات اور اپنے عہد واقرار کو بھلا نہیں دیا تو لازم ہے کہ اس محسن حقیقی کے حقوق ادا کرنے اور اپنے عہد کو سچا کر دکھانے کے لئے ہر وقت کمر بستہ رہو اور جب کوئی حکم اپنے آقائے ولی نعمت کی طرف سے ملے فوراً تعمیل حکم کے لئے کھڑے ہوجاؤ اور خدا کے حقوق کے ساتھ مخلوق کے حقوق ادا کرنے میں بھی پوری جدوجہد اور اہتمام کرو، چنانچہ قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ میں ''حقوق اللہ کی'' اور شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ میں ''حقوق العباد'' کی طرف اشارہ ہے، اسی قسم کی آیت وَالْمُحْصَنٰتِ (پارہ پانچ) کے آخر میں گزر چکی ہے، صرف اس قدر فرق ہے وہاں بالقسط کی اور یہاں اللہ کی تقدیم مناسب ہوئی، نیز یہاں لحاق میں مبغوض دشمن سے معاملہ کرنے کا ذکر ہے جس کے ساتھ ''قسط'' کو یاد دلانے کی ضرورت ہے اور سورہ نساء کے لحاق میں محبوب چیزوں کا ذکر ہے اس لئے وہاں سب سے بڑے محبوب (اللہ) کو یاد دلایا گیا۔

فائدہ: ۲ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا: ''عدل'' کا مطلب ہے کسی شخص کے ساتھ بدون افراط وتفریط کے وہ معاملہ کرنا جس کا وہ واقعی مستحق ہے، عدل وانصاف کی ترازو ایسی صحیح اور برابر ہونی چاہیے کہ عمیق سے عمیق محبت اور شدید سے شدید عداوت بھی اسکے دونوں پلوں میں سے کسی پلہ کو جھکا نہ سکے۔

فائدہ: ۳ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى: جو چیزیں شرعاً مہلک یا کسی درجہ میں مضر ہیں اس سے بچاؤ کرتے رہنے سے جو ایک خاص نورانی کیفیت آدمی کے دل میں راسخ ہوجاتی ہے اس کا نام ''تقویٰ'' ہے، تحصیل تقویٰ کے اسباب قریبہ وبعیدہ بہت سے ہیں، تمام اعمال حسنہ اور خصائل خیر کو اس کے اسباب ومعدات میں شمار کیا جاسکتا ہے، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ''عدل وقسط'' یعنی دوست ودشمن کے ساتھ یکساں انصاف کرنا اور حق کے معاملہ میں جذبات محبت وعداوت سے قطعاً مغلوب نہ ہونا یہ خصلت حصول تقویٰ کے موثر ترین اور قریب ترین اسباب میں سے ہے، اسی لئے هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى فرمایا (یعنی یہ عدل جس کا حکم دیا گیا تقویٰ سے نزدیک تر ہے) کہ اس کی مزاولت کے بعد تقویٰ کی کیفیت بہت جلد حاصل ہوجاتی ہے۔

فائدہ: ۴ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ: یعنی ایسا عدل وانصاف جسے کوئی دوستی یا دشمنی نہ روک سکے اور جس کے اختیار کرنے سے آدمی کو متقی بننا سہل ہوجاتا ہے، اس کے حصول کا واحد ذریعہ خدا کا ڈر اور اس کی شان انتقام کا خوف ہے، اور یہ خوف اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ کے مضمون کا بار بار مراقبہ کرنے سے پیدا ہوتا ہے، جس کسی مومن کے دل میں یہ یقین مستحضر ہوگا کہ ہماری کوئی چھپی یا کھلی حرکت حق تعالیٰ سے پوشیدہ نہیں تو اس کا قلب خشیت الٰہی سے لرزنے لگے گا، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ تمام معاملات میں عدل وانصاف کا راستہ اختیار کرے گا، اور احکام الٰہیہ کے امتثال کے لئے غلامانہ تیار رہے گا، پھر اس نتیجہ پر ثمرہ وہ ملے گا جسے اگلی آیت میں بیان فرمایا ہے: وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِيْمٌ ⑨

وعدہ کیا اللہ نے ایمان والوں سے جو نیک عمل کرتے ہیں کہ ان کے واسطے بخشش اور بڑا ثواب ہے

خلاصہ تفسیر: اوپر احکام مذکور تھے، اب تعمیل کرنے والوں کیلئے وعدہ اور خلاف کرنے والوں کو وعید سناتے ہیں:

اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں سے جو ایمان لے آئے اور (انہوں نے) اچھے کام کئے وعدہ کیا ہے کہ ان کے لئے مغفرت اور ثواب عظیم ہے۔

***

فائدہ: یعنی نہ صرف یہ کہ ان کوتاہیوں کو معاف کردینگے جو بمقتضائے بشریت رہ جاتی ہیں، بلکہ عظیم الشان اجر وثواب بھی عطا فرمائیں گے۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ⑩

اور جن لوگوں نے کفر کیا اور جھٹلائیں ہماری آیتیں وہ ہیں دوزخ والے

خلاصہ تفسیر: اور جن لوگوں نے کفر کیا اور ہمارے احکام کو جھوٹا بتلایا ایسے لوگ دوزخ میں رہنے والے ہیں۔

اس آیت میں پوری مخالفت کرنے والوں کا حال ہے، اور جو تھوڑا اخلاف کرنے والے ہیں یعنی ایماندار ہیں مگر عمل اچھے نہیں، ان کا حال دوسری نصوص میں بیان کیا گیا ہے۔

***

فائدہ: یہ پہلے فریق کے بالمقابل اس جماعت کی سزا ذکر کی گئی جس نے قرآن کریم کے ان صاف وصریح حقائق کو جھٹلایا یا ان نشانات کی تکذیب کی جو سچائی کی طرف راہنمائی کرنے کے لئے خدا کی طرف سے دکھلائے جاتے ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ هَمَّ قَوْمٌ اَنْ يَّبْسُطُوْٓا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ

اے ایمان والو یاد رکھو احسان اللہ کا اپنے اوپر جب قصد کیا لوگوں نے کہ تم پر ہاتھ چلاویں

فَكَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ⑪ ع

پھر روک دیئے تم سے ان کے ہاتھ، اور ڈرتے رہو اللہ سے، اور اللہ ہی پر چاہیے بھروسہ ایمان والوں کو

خلاصہ تفسیر: پیچھے تین چار آیتوں میں احکام شرعیہ کا نعمت ہونا بیان کرکے بجا آوری کیلئے دینی نعمت کی یاددہانی فرمائی تھی، اب یہاں ایک دنیوی نعمت کی یاددہانی فرماتے ہیں اور اس سے مقصود بھی احکام بجالانے کی تاکید ہے، کیونکہ نعمت کا خیال کرنا منعم کی اطاعت کا محرک ہوتا ہے۔

اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ کے انعام کو یاد کرو جو تم پر ہوا ہے، جب کہ ایک قوم (یعنی کفار قریش ابتدائے اسلام میں جب کہ مسلمان کمزور تھے) اس فکر میں تھے کہ تم پر (اس طرح) دست درازی کریں (کہ تمہارا خاتمہ ہی کردیں) سو اللہ تعالیٰ نے ان کا قابو تم پر (اس قدر) نہ چلنے دیا (اور آخر میں تم کو غالب کردیا، پس اس نعمت کو یاد کرو) اللہ تعالیٰ سے ڈرو (کہ اس نعمت کا شکر یہی ہے) اور (احکام کے بجالانے میں) اور (آئندہ بھی) اہل ایمان کو حق تعالیٰ پر اعتماد رکھنا چاہیے (جس نے پہلے تمہارے سب کام بنائے ہیں آئندہ بھی آخرت تک اسی سے امید رکھو اتقوا اللہ میں خوف دلایا اور توکل کا حکم دے کر امید دلائی، اور یہی دو عمل احکامات کی تعمیل وبجا آوری میں مددگار ہیں)۔

اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ: اس آیت میں ان افراط پسند صوفیوں کی تردید ہے جو دنیا کی نعمتوں کو حقیر سمجھتے ہیں (نعمت خواہ آخرت کی ہو یا دنیا کی بہرحال وہ فضل الٰہی ہے)۔

فَكَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ: سو اللہ تعالیٰ نے ان کا قابو تم پر (اس قدر) نہ چلنے دیا، یہاں خلاصہ تفسیر میں قابو میں جو ''اس قدر'' کی قید لگائی مطلب یہ ہے کہ جیسا وہ چاہتے تھے اس قدر قابو نہ دیا، اگرچہ کچھ کچھ نقصان پہنچ جاتے تھے۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ: سورت کے شروع سے یہاں تک اکثر آیتوں میں حق تعالیٰ سے ڈرنے کا حکم فرمایا ہے، ایک جگہ لفظ ''خشیت'' سے، باقی جگہ لفظ ''تقویٰ'' سے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ احکامات کے بجالانے میں خوف وخشیت کا بہت دخل ہے، جیسا کہ ظاہر بھی ہے۔

* * *

فائدہ: عمومی احسانات یاد دلانے کے بعد بعض خصوصی احسان یاد دلاتے ہیں، یعنی قریش مکہ اور ان کے پٹھوؤں نے حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم کو صدمہ پہنچانے اور اسلام کو مٹانے کے لئے کس قدر ہاتھ پاؤں مارے مگر حق تعالیٰ کے فضل ورحمت نے انکا کوئی داؤ چلنے نہ دیا، اس احسان عظیم کا اثر یہ ہونا چاہیے کہ مسلمان غلبہ اور قابو حاصل کر لینے کے باوجود اپنے دشمنوں کو ہر قسم کے ظلم اور زیادتی سے محفوظ رکھیں اور جوش انتقام میں عدل وانصاف کا رشتہ ہاتھ سے نہ چھوڑیں جیسا کہ پچھلی آیات میں اس کی تاکید کی گئی ہے ممکن ہے کسی کو یہ شبہ گزرے کہ ایسے معاند دشمنوں کے حق میں اس قدر رواداری کی تعلیم کہیں اصول سیاست کے خلاف تو نہ ہوگی، کیونکہ ایسا نرم برتاؤ دیکھ کر مسلمانوں کے خلاف شریروں اور بدباطنوں کی جرأت بڑھ جانے کا قوی احتمال ہے اس کا ازالہ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ (المائدہ:۱۱) سے فرمادیا، یعنی مومن کی سب سے بڑی سیاست ''تقویٰ'' اور ''توکل علی اللہ'' (خدا سے ڈرنا اور اسی پر بھروسہ کرنا) ہے، خدا سے ڈرنے کا مطلب یہ ہے کہ ظاہر وباطن میں اس سے اپنا معاملہ صاف رکھو اور جو عہد واقرار کئے ہیں ان میں پوری وفاداری دکھلاتے رہو، پھر بحمد اللہ کسی سے کوئی خطرہ نہیں۔

ربط: اگلی آیت میں ہماری عبرت کے لئے ایک ایسی قوم کا ذکر فرمادیا جس نے خدا سے نڈر ہو کر بدعہدی اور غداری کی تھی وہ کس طرح ذلیل وخوار ہوئی۔

وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۚ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيْبًا ۭ وَقَالَ اللّٰهُ

اور لے چکا ہے اللہ عہد بنی اسرائیل سے ۱ اور مقرر کئے ہم نے ان میں بارہ سردار ۲ اور کہا اللہ نے

اِنِّىْ مَعَكُمْ ۭ لَىِٕنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِيْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ

میں تمہارے ساتھ ہوں ۳ اگر تم قائم رکھو گے نماز اور دیتے رہو گے زکوٰۃ اور یقین لاؤ گے میرے رسولوں پر اور مدد کرو گے ان کی ۴

وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ

اور قرض دو گے اللہ کو ۵ اچھی طرح کا قرض ۶ تو البتہ دور کروں گا میں تم سے گناہ تمہارے اور داخل کروں گا تم کو باغوں میں

تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاۗءَ السَّبِيْلِ ⑫

کہ جن کے نیچے بہتی ہیں نہریں ۷ پھر جو کوئی کافر ہوا تم میں سے اس کے بعد تو وہ بیشک گمراہ ہوا سیدھے راستہ سے ۸

خلاصہ تفسیر: چند آیات قبل معاہدہ ومیثاق یاد دلا کر گویا ایفاء عہد کا حکم دیا تھا، اب زیادہ اہتمام کیلئے بنی اسرائیل سے معاہدہ لینے کی اور ان کے عہد کو توڑنے سے جو ان کو وبال ونقصان پہنچا اسے بیان کرتے ہیں تاکہ اطاعت کی رغبت اور معصیت سے خوف زیادہ ہو۔

اور اللہ تعالیٰ نے (موسیٰ علیہ السلام کے واسطے سے) بنی اسرائیل سے (بھی) عہد لیا تھا (جس کا بیان عنقریب آتا ہے) اور (اس عہد کی تاکید کے لئے) ہم نے ان میں سے (ان کے قبائل کے عدد کے موافق) بارہ سردار مقرر کئے (کہ ہر ہر قبیلہ پر ایک ایک سردار رہے جو اپنے ماتحتوں کو

ہمیشہ عہد کو پورا کرنے کی تاکید کرتا رہے) اور (عہد کی مزید تاکید کے لئے ان سے) اللہ تعالیٰ نے یوں (بھی) فرما دیا کہ میں تمہارے پاس ہوں (تمہارے برے بھلے کی سب مجھے خبر رہے گی، مطلب یہ ہے کہ عہد لیا، پھر اس کی تاکید در تاکید فرمائی)۔

(اس عہد کا خلاصہ مضمون یہ تھا کہ:) اگر تم نماز کی پابندی رکھو گے اور زکوٰۃ ادا کرتے رہو گے اور میرے سب رسولوں پر (جو آئندہ بھی نئے نئے آتے رہیں گے) ایمان لاتے رہو گے اور (دشمنوں کے مقابلہ میں) ان کی مدد کرتے رہو گے اور (زکوٰۃ کے علاوہ اور مصارف خیر میں بھی خرچ کر کے) اللہ تعالیٰ کو اچھے طور پر (یعنی اخلاص کے ساتھ) قرض دیتے رہو گے تو میں ضرور تمہارے گناہ تم سے دور کردوں گا اور ضرور تم کو (بہشت کے) ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے (محلات کے) نیچے نہریں جاری ہوں گی اور جو شخص اس (عہد و پیمان لینے) کے بعد بھی کفر کرے گا تو وہ بیشک راہ راست سے دور جا پڑا۔

یہاں اس شخص کا حال بیان نہیں فرمایا جو کفر نہ کرے اور اعمال کی پوری پابندی بھی نہ کرے، اور قرآن مجید کا یہی طرز ہے کہ زیادہ ذکر پوری اطاعت کرنے والوں اور پوری مخالفت کرنے والوں کا کیا جاتا ہے، کیونکہ درمیان والوں کا حال طرفین کے حال سے عقل مند کو خود قیاس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ جو بیچ بیچ میں ہے اس کی نہ جزا ایسی ہوگی نہ سزا ایسی ہوگی، پھر احادیث سے مکمل تفصیل معلوم ہوگئی۔

وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِیْ: یعنی میرے سب رسولوں پر ایمان لاتے رہو گے، چونکہ بنی اسرائیل میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد بھی بہت انبیاء آنے والے تھے اس لیے وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِیْ خصوصیت کے ساتھ عہد میں ذکر کیا گیا۔

وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا: یعنی زکوٰۃ کے علاوہ دیگر خیر کے مصارف میں بھی اخلاص کے ساتھ خرچ کرتے رہو گے، خیرات میں خرچ کرنے کو مجازاً قرض اس لیے فرمایا کہ جس طرح قرض لازمی لوٹانا ہوتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ اس کا بدلہ ضرور دیں گے۔

* * *

فائدہ: ۱۔ مِیْثَاقَ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ: یعنی کچھ امت محمدیہ ہی کی خصوصیت نہیں پہلی امتوں سے بھی عہد لئے جا چکے ہیں۔

فائدہ: ۲۔ اثْنَیْ عَشَرَ نَقِیْبًا: بنی اسرائیل کے بارہ قبائل میں سے بارہ سردار حضرت موسیٰ علیہ السلام نے چن لئے تھے جن کے نام بھی مفسرین نے تورات سے نقل کئے ہیں، ان کا فرض یہ تھا کہ وہ اپنی قوم پر عہد پورا کرنے کی تاکید اور ان کے احوال کی نگرانی رکھیں، عجب اتفاق یہ ہے کہ ہجرت سے پہلے جب انصار نے ''لیلۃ العقبہ'' میں نبی کریم ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی تو ان میں سے بھی بارہ ہی ''نقیب'' نامزد ہوئے، ان ہی بارہ آدمیوں نے اپنی قوم کی طرف سے حضور ﷺ کے دست مبارک پر بیعت کی تھی، جابر بن سمرہؓ کی ایک حدیث میں نبی کریم ﷺ نے اس امت کے متعلق جو بارہ خلفاء کی پیشین گوئی فرمائی ان کا عدد بھی ''نقبائے بنی اسرائیل'' کے عدد کے موافق ہے اور مفسرین نے تورات سے نقل کیا ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام سے حق تعالیٰ نے فرمایا کہ ''میں تیری ذریت میں سے بارہ سردار پیدا کروں گا''، غالباً یہ وہی ''بارہ'' ہیں جن کا ذکر جابر بن سمرہ کی حدیث میں ہے۔

فائدہ: ۳۔ وَقَالَ اللّٰہُ اِنِّیْ مَعَکُمْ: یا تو یہ خطاب بارہ سرداروں کو ہے، یعنی تم اپنا فرض ادا کرو میری حمایت اور امداد تمہارے ساتھ ہے، یا سب بنی اسرائیل کو کہ میں تمہارے ساتھ ہوں، یعنی کسی وقت تم مجھے اپنے سے دور مت سمجھو، جو کچھ معاملہ تم سراً یا علانیۃً کرو گے وہ ہر جگہ اور ہر وقت میں دیکھ رہا اور سن رہا ہوں، اس لئے جو کچھ کرو خبردار ہو کر کرو۔

فائدہ: ۴۔ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِیْ وَعَزَّرْتُمُوْھُمْ: یعنی جو رسول حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد آتے رہیں گے ان سب کی تصدیق کرو گے اور دلی تعظیم سے پیش آؤ گے اور دشمنان حق کے مقابلہ پر ان کا پورا ساتھ دو گے، جان سے بھی اور مال سے بھی۔

فائدہ: ۵۔ وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰہَ: خدا کو قرض دینے سے مراد اس کے دین اور اس کے پیغمبروں کی حمایت میں مال خرچ کرنا ہے، جس طرح روپیہ قرض لینے والا اس امید پر دیتا ہے کہ اس کا روپیہ واپس مل جائے گا اور قرض لینے والا اس کے ادا کرنے کو اپنے ذمہ پر لازم کر لیتا ہے، اسی طرح خدا

ہی کی دی ہوئی جو چیز یہاں اسی کے راستہ میں خرچ کی جائے گی وہ ہرگز گم یا کم نہیں ہوگی، حق تعالیٰ نے کسی مجبوری سے نہیں محض اپنے فضل ورحمت سے اپنے ذمہ لازم کرلیا ہے کہ وہ چیز تم کو عظیم الشان نفع کی صورت میں واپس کردے۔

فائدہ: ۶ قَرْضًا حَسَنًا: اچھی طرح سے مراد یہ ہے کہ اخلاص سے دو اور اپنے محبوب ومرغوب اور پاک وصاف مال میں سے دو۔

فائدہ: ۷ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ. یعنی نیکیاں جب کثرت سے ہوں تو وہ برائیوں کو دبا لیتی ہیں، جب آدمی خدا کے عہد کو پورا کرنے کی کوشش میں لگا رہے تو حق تعالیٰ اس کی کمزوریوں کو دور کرکے اپنی خوشنودی اور قرب کے مکان میں جگہ دیتا ہے۔

فائدہ: ۸ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ: یعنی ایسے صاف اور پختہ عہد و پیمان کے بعد بھی جو شخص خدا کا وفادار ثابت نہ ہوا اور غدر وخیانت پر کمر بستہ ہوگیا تو سمجھ لو کہ اس نے کامیابی اور نجات کا سیدھا راستہ گم کردیا، نہیں کہا جاسکتا کہ وہ ہلاکت کے کس گڑھے میں جا کر گرے گا۔

بنی اسرائیل سے جن باتوں کے عہد لینے کا یہاں ذکر ہے وہ یہ ہیں: نماز، زکوٰۃ، پیغمبروں پر ایمان لانا، ان کی جان ومال سے مدد کرنا، ان میں سے پہلی عبادت بدنی ہے، دوسری عبادت مالی، تیسری قلبی مع لسانی، چوتھی فی الحقیقت تیسری کی اخلاقی تکمیل ہے، گویا ان چیزوں کو ذکر کرکے اشارہ فرمادیا کہ جان ومال اور قلب وقالب ہر چیز سے خدا کی اطاعت اور وفا شعاری کا اظہار کرو، لیکن بنی اسرائیل نے چن چن کر ایک ایک عہد کی خلاف ورزی کی، کسی قول وقرار پر قائم نہ رہے، ان عہد شکنیوں کا جو نتیجہ ہوا اسے اگلی آیت میں بیان فرماتے ہیں:

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً ۚ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ ۙ

سو ان کے عہد توڑنے پر ہم نے ان پر لعنت کی ۱؎ اور کردیا ہم نے ان کے دلوں کو سخت، پھیرتے ہیں کلام کو اس کے ٹھکانے سے ۲؎

وَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۚ وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰى خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ

اور بھول گئے نفع اٹھانا اس نصیحت سے جو ان کو کی گئی تھی ۳؎ اور ہمیشہ تو مطلع ہوتا رہتا ہے ان کی کسی دغا پر ۴؎ مگر تھوڑے لوگ ان میں سے ۵؎

فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ⑬

سو معاف کر اور درگزر کر ان سے، اللہ دوست رکھتا ہے احسان کرنے والوں کو ۶؎

خلاصہ تفسیر: پیچھے بنی اسرائیل کے عہد کا بیان تھا، آگے ان کا عہد توڑنا اور اس کے وبال کا بیان ہے۔

(لیکن بنی اسرائیل نے مذکورہ عہد کو توڑ ڈالا، اور توڑنے کے بعد طرح طرح کی سزاؤں میں گرفتار ہوئے جیسے مسخ اور ذلت وغیرہ، پس عنایات والطاف الٰہیہ سے یہ دوری اسی وجہ سے ہوئی) تو صرف ان کی عہد شکنی کی وجہ سے ہم نے ان کو اپنی رحمت (یعنی اس کے آثار) سے دور کردیا (اور یہی حقیقت ہے لعنت کی) اور (اسی لعنت کے آثار میں سے یہ ہے کہ) ہم نے ان کے قلوب کو سخت کردیا (کہ حق بات کا ان پر اثر ہی نہیں ہوتا اور اس سخت دلی کے آثار میں سے یہ ہے کہ) وہ لوگ (یعنی ان میں کے علماء) کلام (الٰہی یعنی توریت) کو اس کے (الفاظ یا مطالب کے) مواقع سے بدلتے ہیں (یعنی تحریف لفظی یا تحریف معنوی کرتے ہیں) اور (اس تحریف کا اثر یہ ہوا کہ) وہ لوگ جو کچھ ان کو (توریت میں) نصیحت کی گئی تھی اس میں سے اپنا ایک بڑا حصہ (نفع کا جو کہ ان کو تورات پر عمل کرنے سے نصیب ہوتا) فوت کر بیٹھے (کیونکہ ان کی اس تحریف کی زیادہ مشق ان مضامین پر تھی جو رسالت محمدیہ کی تصدیق کے متعلق تھے، تو حضور پر ایمان لانے سے محروم رہے اور ظاہر ہے کہ ایمان سے زیادہ بڑا نفع کیا ہوگا، غرض عہد توڑنے پر لعنت ہوئی اور لعنت سے قساوت قلبی وغیرہ پیدا ہوئی، اور قساوت پر تحریف مرتب ہوئی، اور تحریف پر یہ اثر مرتب ہوا کہ بڑے فائدہ سے محروم رہ گئے، اس ترتیب کی وجہ ظاہر ہی ہے)۔

اور (پھر یہ بھی تو نہیں کہ جتنا کر چکے اس پر بس کریں، بلکہ حالت یہ ہے کہ) آپ کو آئے دن (یعنی ہمیشہ دین کے بارے میں) کسی نہ کسی (نئی) خیانت کی اطلاع ہوتی رہتی ہے جو ان سے صادر ہوتی رہتی ہے۔ بجز ان کے معدودے چند شخصوں کے (جو کہ مسلمان ہو گئے تھے) سو آپ ان کو معاف کیجئے اور ان سے درگزر کیجئے (یعنی جب تک شرعی ضرورت نہ ہو ان کی خیانتوں کا اظہار اور ان کی رسوائی نہ کیجئے) بلاشبہ اللہ تعالیٰ خوش معاملہ لوگوں سے محبت کرتا ہے (اور بلاضرورت رسوا نہ کرنا بھی خوش معاملگی ہے)۔

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ: چونکہ کیفیتِ قبض کی بعض اقسام میں سے یہ قساوت (سنگدلی) بھی ہے، آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض گناہوں سے قبض طاری ہو جاتا ہے، اور يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ سے (جو کہ تحریف کی جرأت پر دلالت کرتا ہے) اور وَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ سے (جس کی تفسیر بعض نے یہ کی ہے کہ اس گناہ کی نحوست سے تورات کے بہت سے مضامین ان کے حافظے سے محو ہو گئے تھے) یہ معلوم ہوا کہ ایسے قبض سے گناہ بھی ہوتے ہیں، نیز جس طرح گناہوں سے قبض طاری ہو جاتا ہے اسی طرح قبض سے بھی گناہ پیدا ہو جاتے ہیں۔

وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰى خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ: یعنی ہمیشہ دین کے بارہ میں نئی نئی خیانتیں کرتے رہتے ہیں، نئی خیانت یہ کہ ایک بار مثلاً رجم کا حکم جو تورات میں موجود تھا چھپالیا، ایک بار نبی ﷺ کے دریافت فرمانے پر تورات کا ایک مضمون غلط بیان کر دیا جس پر آیت: لاتحسبن الذین یفرحون نازل ہوئی تھی اور جیسے ایک بار اونٹ وغیرہ کی حرمت قدیم ہونے کا غلط دعویٰ کیا تھا جس پر چوتھے پارے کے شروع میں آیت قل فاتو بالتوراۃ نازل ہوئی، اور ان کی تمام وہ غلط بیانیاں جو قرآن مجید میں جابجا مع ان کی تردید و بطلان کے ساتھ مذکور ہیں اس میں داخل ہیں، جیسے وہ کہا کرتے تھے: لن تمسنا النار کہ ہم کو چند دن سے زیادہ دوزخ کی آگ نہ چھو سکے گی اور: لن یدخل الجنۃ الا من کان ھودا او نصاریٰ کہ جنت میں یہود و نصاریٰ کے سوا کوئی نہ جائے گا، اور کہتے تھے نحن ابناء اللہ واحباؤہ کہ ہم اللہ کی اولاد اور محبوب ہیں اور اسی طرح دیگر کئی مثالیں۔

* * *

فائدہ: ۱۔ فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ: "لعن" کے معنی طرد و ابعاد کے ہیں، یعنی عہد شکنی اور غداری کی وجہ سے ہم نے اپنی رحمت سے انہیں دور پھینک دیا، اور ان کے دلوں کو سخت کر دیا، فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ کے لفظ سے ظاہر فرما دیا کہ ان کے ملعون اور سنگدل ہونے کا سبب عہد شکنی اور بے وفائی ہے جو خود انہی کا فعل ہے، اسباب پر مسبب کا مرتب کرنا چونکہ خدا ہی کا کام تھا، اس لحاظ سے وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً کی نسبت اسی کی طرف کی گئی۔

فائدہ: ۲۔ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ: یعنی خدا کے کلام میں تحریف کرتے ہیں کبھی اس کے الفاظ میں، کبھی معنی میں، کبھی تلاوت میں، تحریف کی یہ سب اقسام قرآن کریم اور کتب حدیث میں بیان کی گئی ہیں، جس کا قدرے اعتراف آج کل بعض یورپین عیسائیوں کو بھی کرنا پڑا ہے۔

فائدہ: ۳۔ وَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ: یعنی چاہیے تو یہ تھا کہ ان قیمتی نصیحتوں سے فائدہ اٹھاتے جو مثلاً نبی آخر الزمان کی آمد اور دوسرے مہمات دینیہ کے متعلق ان کی کتابوں میں موجود تھیں، مگر اپنی غفلتوں اور شرارتوں میں پھنس کر یہ سب بھول گئے، بلکہ نصیحتوں کا وہ ضروری حصہ ہی گم کر دیا اور اب بھی جو نصیحتیں اور مفید باتیں خاتم النبیین ﷺ کی زبان سے ان کو یاد دلائی جاتی ہیں ان کا کوئی اثر قبول نہیں کرتے، حافظ ابن رجب حنبلیؒ نے لکھا ہے کہ "نقض عہد" کے سبب سے ان میں دو باتیں آئیں: ① ملعونیت ② اور قسوت قلب، ان دونوں کا نتیجہ یہ دو چیزیں ہوئیں: ① تحریف کلام اللہ ② اور عدم انتفاع بالذکر، یعنی لعنت کے اثر سے ان کا دماغ ممسوخ ہو گیا حتیٰ کہ نہایت بے باکی اور بدعقلی سے کتب سماویہ کی تحریف پر آمادہ ہو گئے، دوسری طرف جب عہد شکنی کی نحوست سے دل سخت ہو گئے تو قبول حق اور نصیحت سے متاثر ہونے کا مادہ نہ رہا، اس طرح علمی اور عملی دونوں قسم کی قوتیں ضائع کر بیٹھے۔

فائدہ: ۴۔ تَطَّلِعُ عَلٰى خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ: یعنی دغابازی اور خیانت کا سلسلہ آج تک چل رہا ہے اور آئندہ بھی چلتا رہے گا، اسی لئے ہمیشہ ان کی کسی نہ کسی دغابازی اور مکر و فریب پر آپ مطلع ہوتے رہتے ہیں۔

فائدہ: ۵ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ: یعنی عبداللہ بن سلامؓ وغیرہ جو اسلام میں داخل ہو چکے۔

فائدہ: ٦ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ: یعنی جب انکی عادت قدیمہ ہی یہ ہے تو ایسے لوگوں سے ہر جزئی پر الجھنے اور ان کی ہر خیانت کا پردہ فاش کرنے کی ضرورت نہیں، انکو چھوڑ دیجئے اور درگزر کیجئے اور انکی برائی کا بدلہ عفو و احسان سے دیجئے شاید اسی سے کچھ متاثر ہوں۔

قتادہ وغیرہ نے کہا ہے یہ آیت منسوخ ہے قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (التوبہ:۲۹) سے، مگر اسکی کچھ حاجت نہیں، قتال کے حکم سے یہ لازم نہیں آتا کہ کسی وقت اور کسی موقع پر بھی ایسی قوم کے مقابلہ میں عفو و درگزر اور تالیف قلب سے کام نہ لیا جا سکے۔

وَمِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰٓى اَخَذْنَا مِيْثَاقَهُمْ فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۠ فَاَغْرَيْنَا

اور وہ جو کہتے ہیں اپنے کو نصاریٰ ۱ ان سے بھی لیا تھا ہم نے عہد انکا پھر بھول گئے نفع اٹھانا اس نصیحت سے جو انکو کی گئی تھی ۲ پھر ہم نے لگا دی

بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ؕ وَسَوْفَ يُنَبِّئُهُمُ اللّٰهُ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ﴿۱۴﴾

آپس میں ان کے دشمنی اور کینہ ۳ قیامت کے دن تک ۴ اور آخر جتاوے گا ان کو اللہ جو کچھ کرتے تھے ۵

خلاصہ تفسیر: (پیچھے یہود کا ذکر تھا، اب نصاریٰ کا کچھ حال بیان فرما رہے ہیں:) اور جو لوگ (دین کی نصرت کے دعوے سے) کہتے ہیں کہ ہم نصاریٰ ہیں، ہم نے ان سے بھی ان کا عہد (یہود کے عہد کی طرح) لیا تھا، سو وہ بھی جو کچھ ان کو (انجیل وغیرہ میں) نصیحت کی گئی تھی اس میں سے اپنا ایک بڑا حصہ (نفع کا جو کہ عمل کی بدولت ان کو حاصل ہوتا) فوت کر بیٹھے (کیونکہ وہ امر جس کو فوت کر بیٹھے توحید ہے اور جناب رسول اللہ ﷺ پر ایمان ہے جس کا حکم ان کو بھی ہوا تھا اور اس کا ''حظ عظیم'' یعنی عظیم فائدہ ہونا ظاہر ہے) (جب توحید کو چھوڑ بیٹھے) تو ہم نے ان میں باہم قیامت تک کے لئے بغض و عداوت ڈال دیا (کہ خود ان کے باطل مذہب کے بھی ان میں اختلاف ڈال کر ٹکڑے کر دیے، یہ تو دنیوی سزا ہوئی) اور عنقریب (آخرت میں) کہ وہ بھی قریب ہی ہے، ان کو اللہ تعالیٰ ان کا کیا ہوا جتلا دیں گے (پھر سزا دیں گے)۔

فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَاَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ: گناہ جس طرح عذاب آخرت کا سبب بنتے ہیں اسی طرح عذاب دنیا کا بھی سبب بن سکتے ہیں، خانہ جنگی بھی یقیناً دنیا کا عذاب ہے۔

فَاَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ: اس پر آج کل کے عیسائیوں کے حالات سے یہ شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ وہ تو سب باہم متحد نظر آتے ہیں؟ جواب یہ ہے کہ یہ حال ان لوگوں کا بیان کیا گیا ہے جو واقعی عیسائی ہیں اور عیسائی مذہب کے پابند ہیں، اور جو خود اپنے مذہب کو بھی چھوڑ کر دہریے بن گئے وہ درحقیقت عیسائیوں کی فہرست سے خارج ہیں چاہے وہ قومی طور پر اپنے آپ کو عیسائی کہتے ہوں، ایسے لوگوں میں اگر وہ مذہبی افتراق اور باہمی عداوت نہ ہو تو وہ اس آیت کے منافی نہیں، کیونکہ افتراق و اختلاف تو مذہب کی بنیاد پر تھا، جب مذہب ہی نہ رہا تو اختلاف بھی نہ رہا اور آیت میں بیان ان لوگوں کا ہے جو مذہباً نصاریٰ اور عیسائی ہیں ان کا اختلاف و افتراق مشہور و معروف ہے۔

نصاریٰ میں اصل تین فرقے تھے: ① ایک نسطوریہ جو عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہتے تھے ② دوسرا یعقوبیہ جو خود عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کے ساتھ متحد مانتے تھے ③ تیسرا ملکائیہ جو عیسیٰ علیہ السلام کو تین خداؤں میں سے ایک مانتے تھے اور ظاہر ہے کہ اتنے بڑے اختلاف عقائد کے ساتھ باہم عداوت ضروری ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰٓى: ''نصاریٰ'' کا ماخذ یا تو ''نصر'' ہے جس کے معنی مدد کرنے کے ہیں اور ''ناصرہ'' کی طرف نسبت ہے جو ملک شام میں اس بستی کا نام ہے جہاں حضرت مسیح علیہ السلام رہے تھے، اسی لئے ان کو ''مسیح ناصری'' کہتے ہیں، جو لوگ اپنے کو ''نصاریٰ'' کہتے تھے وہ گویا

اس بات کے مدعی تھے کہ ہم خدا کے سچے دین اور پیغمبروں کے حامی و ناصر اور حضرت مسیح ناصری کے متبع ہیں، اس زبانی دعوے اور لقبی تفاخر کے باوجود دین کے معاملہ میں جو روبیہ تھا وہ آگے ذکر کیا گیا ہے۔

فائدہ: ۲۔ فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ: یعنی یہود کی طرح ان سے بھی عہد لیا گیا، لیکن یہ بھی عہد شکنی اور بے وفائی میں اپنے پیشروؤں سے کچھ کم نہیں رہے، انہوں نے بھی ان بیش بہا نصائح سے جن پر نجات و فلاح ابدی کا مدار تھا کوئی فائدہ نہ اٹھایا، بلکہ بائبل میں نصیحتوں کا وہ حصہ باقی ہی نہ چھوڑا جو حقیقۃً مذہب کا مغز تھا۔

فائدہ: ۳۔ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ: یعنی باہم ''نصاریٰ'' میں یا ''یہود'' اور ''نصاریٰ'' دونوں میں عداوتیں اور جھگڑے ہمیشہ کے لئے قائم ہوگئے، آسمانی سبق کو ضائع کرنے اور بھلا دینے کا جو نتیجہ ہونا چاہیے تھا وہ ہوا، یعنی جب وحی الٰہی کی اصلی روشنی ان کے پاس نہ رہی تو اوہام واہوا کے اندھیریوں میں ایک دوسرے سے الجھنے لگے، مذہب تو نہ رہا پر مذہب کے جھگڑے رہ گئے، یہ ہی فرقے پیدا ہو کر اندھیرے میں ایک دوسرے سے ٹکرانے لگے، یہ ہی فرقہ وار تصادم آخر کار آپس کی شدید ترین عداوت و بغض پر منتہی ہوا، کوئی شبہ نہیں کہ آج مسلمانوں میں بھی بے حد تفرق و تشتت اور مذہبی تصادم موجود ہے، لیکن چونکہ ہمارے پاس وحی الٰہی اور قانون سماوی بحمد اللہ بلا کم وکاست محفوظ ہے، اس لئے اختلافات کی موجودگی میں بھی مسلمانوں کی بہت بڑی جماعت برابر مرکز حق و صداقت پر قائم رہی ہے اور رہے گی، اس کے برخلاف ''یہود'' و ''نصاریٰ'' کے اختلافات یا مثلاً ''پروٹسٹنٹ'' اور ''رومن کیتھولک'' وغیرہ فرقوں کی باہمی مخالفت میں کوئی ایک فریق بھی نہ آج شاہراہ حق و صداقت پر قائم ہے اور نہ قیامت تک ہو سکتا ہے، کیونکہ وہ وحی الٰہی کی روشنی کو جس کے بدون کوئی انسان خدا تعالیٰ اور اس کے قوانین کی صحیح معرفت حاصل نہیں کر سکتا اپنی بے اعتدالیوں اور غلط کاریوں سے ضائع کر چکے ہیں، اب جب تک وہ اس محرف بائبل کے دامن سے وابستہ رہیں گے محال ہے کہ قیامت تک ان کو رانہ اور محض بے اصول اختلافات اور فرقہ وار بغض وعناد کی ظلمت سے نکل کر حق کا راستہ دیکھ سکیں اور نجات ابدی کی شاہراہ پر چل سکیں۔

باقی جو لوگ آج نفس مذہب خصوصاً عیسائیت کا مذاق اڑاتے ہیں اور جنہوں نے لفظ ''مسیحیت'' یا موجودہ ''بائبل'' کو محض چند سیاسی ضرورتوں کے لئے رکھ چھوڑا ہے اس آیت میں ان ''نصاریٰ'' کا ذکر نہیں اور اگر مان لیا جائے کہ وہ بھی آیت کے تحت میں داخل ہیں تو ان کی باہمی عداوتیں اور ایک دوسرے کے خلاف خفیہ ریشہ دوانیاں اور اعلانیہ محاربات بھی باخبر اصحاب پر پوشیدہ نہیں ہیں۔

فائدہ: ۴۔ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ: یعنی جب تک وہ رہیں گے یہ اختلافات اور بغض وعناد بھی ہمیشہ رہے گا، یہاں ''قیامت تک'' کا لفظ ایسا ہے جیسے ہمارے محاورات میں کہہ دیتے ہیں کہ فلاں شخص تو قیامت تک بھی فلاں حرکت سے باز نہ آئے گا، اس کے یہ معنی نہیں ہوتے کہ وہ شخص قیامت تک زندہ رہے گا اور یہ حرکت کرتا رہے گا، مراد یہ ہے کہ اگر قیامت تک بھی زندہ رہے تو اس بات کو نہ چھوڑے گا، اسی طرح آیت میں اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ کا لفظ آنے سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہود و نصاریٰ کا وجود قیامت تک رہے جیسا کہ ہمارے زمانے کے بعض مبطلین نے اپنی تفسیر میں لکھ دیا ہے۔

فائدہ: ۵۔ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ: یعنی آخرت میں پوری طرح اور دنیا میں بھی بعض واقعات کے ذریعہ سے ان کو اپنی کرتوت کا نتیجہ معلوم ہو جائے گا۔

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَعْفُوْا

اے کتاب والو تحقیق آیا ہے تمہارے پاس رسول ہمارا ظاہر کرتا ہے تم پر بہت سی چیزیں جن کو تم چھپاتے تھے کتاب میں سے اور درگزر کرتا ہے

عَنْ كَثِيْرٍ ؕ قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۵﴾ يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ

بہت چیزوں سے ۱۔ بیشک تمہارے پاس آئی ہے اللہ کی طرف سے روشنی اور کتاب ظاہر کرنے والی، جس سے اللہ ہدایت کرتا ہے اس کو

مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ

جو تابع ہوا اُس کی رضا کا سلامتی کی راہیں اور ان کو نکالتا ہے اندھیروں سے روشنی میں اپنے حکم سے

وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۶﴾

اوران کو چلاتا ہے سیدھی راہ۔۲

خلاصہ تفسیر: پیچھے یہود ونصاریٰ کا الگ الگ ذکر تھا، اب دونوں کو جمع کر کے نصیحت کا خطاب فرماتے ہیں:

اے اہل کتاب! (یعنی یہود ونصاریٰ) تمہارے پاس ہمارے یہ رسول (محمد ﷺ) آئے ہیں (جن کے علمی کمال کا تو یہ حال ہے کہ) کتاب (کے مضامین) سے جن چیزوں کو تم چھپالیتے ہو، ان میں سے بہت سی باتوں کو (جن کے ظاہر کرنے میں کوئی شرعی مصلحت ہو، ظاہری طور پر تحصیل علم نہ ہونے کے باوجود محض وحی کے ذریعہ مطلع ہوکر) تمہارے سامنے صاف صاف کھول دیتے ہیں، اور (علمی واخلاقی کمال کا یہ عالم ہے کہ جن چیزوں کو تم نے چھپالیا تھا ان میں سے) بہت سے امور کو (جاننے اور باخبر ہونے کے باوجود اخلاقاً ان کو ظاہر کرنے سے) درگزر فرماتے ہیں (جبکہ ان کے ظاہر کرنے میں کوئی شرعی مصلحت نہیں ہوتی، صرف تمہاری رسوائی ہوتی ہو تو اطلاع کے باوجود ان کو ظاہر نہیں فرماتے، ظاہر ہے کہ ایسا علمی کمال نبوت کی دلیل ہے اور ایسی خوش اخلاقی اس دلیل کی مؤید اور مؤکد ہے، اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کے دوسرے معجزات کے علاوہ خود تمہاری دینی خیانتوں کے متعلق جو آپ ﷺ کا برتاؤ ہے وہی نبوت ثابت کرنے کے لئے کافی ہے، اور اسی رسول کے ذریعہ) تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک روشن چیز آئی ہے اور (وہ) ایک کتاب واضح (ہے یعنی قرآن مجید جو نبوت کی دلیل ہونے کے علاوہ خود ان ذاتی اوصاف سے موصوف ہے) کہ اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو جو رضائے حق کے طالب ہوں سلامتی کی راہیں بتلاتے ہیں (یعنی جنت میں جانے کے طریقے تعلیم فرماتے ہیں جو کہ خاص عقائد واعمال ہیں، کیونکہ درحقیقت مکمل سلامتی تو جنت ہی میں ہوسکتی ہے کہ نہ اس میں کوئی کمی ہوتی ہے اور نہ زوال کا خطرہ) اوران کو اپنی توفیق سے (کفر ومعصیت کی) تاریکیوں سے نکال کر (ایمان واطاعت کے) نور کی طرف لے آتے ہیں اوران کو (ہمیشہ) راہ راست پر قائم رکھتے ہیں۔

يَهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ: یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ اصل مقصود طلب رضا ہے اور دخول جنت اس کے تابع ہے۔

مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ: سلامتی کا راستہ قرآن مجید کے ذریعہ سے بتلانا سب کے لیے عام ہے مگر یہاں طالبان رضائے حق کا ذکر خاص طور پر اس لیے کیا گیا کہ اس سے منتفع وہی لوگ ہوتے ہیں۔

وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ: بروح المعانی میں اس کی تفسیر یہ کی ہے کہ تمہارے بہت سے مخفی کیے ہوئے مضامین کو ظاہر نہیں فرماتے، جب تک اس کا کوئی دینی قوی داعیہ نہ ہوتا کہ تمہاری رسوائی نہ ہو، اس سے معلوم ہوا کہ ایسی ہی کچھ عادت اہل اللہ کی رہی ہے جب تک کوئی دینی مصلحت نہ ہوا پنے غیظ وغضب پر عمل نہیں کرتے اور اگر کسی سے عداوت بھی کرتے ہیں تو اپنے نفس کی تسکین کے لیے نہیں کرتے (بلکہ اس کی اصلاح یا شعائر اسلامی کی سربلندی کے لیے کرتے ہیں)۔

* * *

فائدہ: ۱۔ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ: یہ سب یہود ونصاریٰ کو خطاب ہے کہ وہ نبی آخر الزمان ﷺ جن کی آمد کی بشارت تمہاری کتابوں میں اس قدر تحریف ہونے پر بھی کسی نہ کسی عنوان سے موجود ہیں تشریف لے آئے، جن کے منہ میں خدا نے اپنا کلام ڈالا ہے اور جنہوں نے ان حقائق کی تکمیل کی جو حضرت مسیح ناتمام چھوڑ گئے تھے، تورات وانجیل کی جن باتوں کو تم چھپاتے تھے اور بدل سدل کر بیان کرتے تھے ان میں ان کی سب ضروری باتیں اس نبی آخر الزمان نے ظاہر فرما دیں اور جن باتوں کی اب چنداں ضرورت نہ تھی ان سے درگزر کیا۔

فائدہ: ۲ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ: شاید "نور" سے خود نبی کریم ﷺ اور "کتاب مبین" سے قرآن کریم مراد ہے، یعنی یہود ونصاریٰ جو وحی الٰہی کی روشنی کو ضائع کر کے اہواء وآراء کی تاریکیوں اور باہمی خلاف وشقاق کے گڑھوں میں پڑے دھکے کھا رہے ہیں جس سے نکلنے کا بحالت موجودہ قیامت تک امکان نہیں ان سے کہہ دو کہ خدا کی سب سے بڑی روشنی آگئی، اگر نجات ابدی کے صحیح راستہ پر چلنا چاہتے ہو تو اس روشنی میں حق تعالیٰ کی رضا کے پیچھے چل پڑو، سلامتی کی راہیں کھلی پاؤ گے اور اندھیرے سے نکل کر اجالے میں بے کھٹکے چل سکو گے، اور جس کی رضا کے تابع ہو کر چل رہے ہو اسی کی دستگیری سے صراط مستقیم کو بے تکلف طے کر لو گے۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ؕ قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا

بے شک کافر ہوئے جنہوں نے کہا کہ اللہ تو وہی مسیح ہے مریم کا بیٹا ۱ تو کہہ دے پھر کس کا بس چل سکتا ہے اللہ کے آگے

اِنْ اَرَادَ اَنْ يُّهْلِكَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗ وَمَنْ فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا ؕ وَلِلّٰهِ مُلْكُ

اگر وہ چاہے کہ ہلاک کرے مسیح مریم کے بیٹے کو اور اس کی ماں کو اور جتنے لوگ ہیں زمین میں سب کو ۲ اور اللہ ہی کے لیے ہے سلطنت

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ؕ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۷﴾

آسمانوں اور زمین کی اور جو کچھ درمیان ان دونوں کے ہے پیدا کرتا ہے جو چاہے ۳ اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے ۴

خلاصہ تفسیر: اب اس آیت میں نصاریٰ کے عقیدہ الوہیت مسیح کا رد فرماتے ہیں:

بلاشبہ وہ لوگ کافر ہیں جو یوں کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ عین مسیح بن مریم ہے (یعنی دونوں میں اتحاد کے قائل ہیں، کفر کی وجہ ظاہر ہے کہ توحید کا صریح انکار ہے) آپ ان سے یوں پوچھئے کہ اگر ایسا ہے تو بتلاؤ کہ اگر اللہ تعالیٰ مسیح بن مریم (جن کو تم اللہ کا عین سمجھتے ہو) اور ان کی والدہ (حضرت مریم) کو اور (بلکہ) جتنے زمین میں (آباد) ہیں ان سب کو (موت سے) ہلاک کرنا چاہیں تو (کیا) کوئی شخص ایسا ہے جو خدا تعالیٰ سے ذرا بھی ان کو بچا سکے (یعنی اتنی بات کو تو تم بھی مانتے ہو کہ ان کو ہلاک کرنا اللہ تعالیٰ کی قدرت میں ہے، تو جس ذات کا ہلاک کرنا دوسرے کے قبضہ میں ہو وہ خدا کیسے ہو سکتا ہے، اس سے الوہیت مسیح کا عقیدہ باطل ہو گیا) اور (جو حقیقۃً خدا اور سب کا معبود ہے یعنی) اللہ تعالیٰ (اس کی یہ شان ہے کہ اس) ہی کے لئے خاص ہے حکومت آسمانوں پر اور زمین پر اور جتنی چیزیں ان دونوں کے درمیان ہیں ان پر، اور وہ جس چیز کو (جس طرح) چاہیں پیدا کر دیں اور اللہ تعالیٰ کو ہر چیز پر پوری قدرت ہے (اور یہ صفات کمال الوہیت اور خدائی کے خواص میں سے ہیں، پس حق تعالیٰ کی الوہیت یعنی خدائی ثابت ہے اور مسیح کی الوہیت پہلے ہی باطل ہو چکی تھی، اس مجموعہ سے توحید ثابت ہو گئی)۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا: اس آیت میں نصاریٰ کے ایک ہی قول کی تردید کی گئی ہے جو ان کے ایک فرقہ کا عقیدہ ہے، یعنی یہ کہ حضرت مسیح (معاذ اللہ) عین اللہ تعالیٰ ہیں، مگر تردید جس دلیل سے کی گئی ہے، وہ تمام فرقوں کے باطل عقائد پر حاوی ہے جو بھی توحید کے خلاف ہیں، خواہ وہ خدا کا بیٹا ہونے کا عقیدہ ہو یا تین خداؤں میں سے ایک خدا ہونے کا عقیدہ فاسدہ ہو، اس سے سب کا رد اور ابطال ہو گیا۔

هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ: اس جگہ حضرت مسیح علیہ السلام کی والدہ حضرت مریم کا ذکر فرمانے میں دو حکمتیں ہو سکتی ہیں: ① ایک تو یہ کہ حق تعالیٰ کے سامنے حضرت مسیح علیہ السلام کے عجز و کمزوری کی تاکید ہے کہ وہ نہ اپنے آپ کو اللہ سے بچا سکتے ہیں نہ اپنی ماں کو جن کی خدمت وحفاظت کو شریف بیٹا اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتا ہے اور ماں کی حمایت طبعی امر ہے ② دوسرے یہ کہ اس میں اس فرقہ کے خیال کی بھی تردید ہو گئی جو حضرت مریم کو تین خداؤں میں سے ایک خدا مانتے ہیں، ان کا ذکر بڑھانے سے ان کے قول کی بھی نفی ہو گئی۔

اِنۡ اَرَادَ اَنۡ یُّهۡلِكَ الۡمَسِیۡحَ ابۡنَ مَرۡیَمَ وَاُمَّهٗ: اس جگہ حضرت مریم علیہا السلام کی موت کو بطور فرض کے ذکر فرمایا ہے، حالانکہ نزول قرآن کے وقت حضرت مریم کی موت محض فرضی نہیں تھی بلکہ واقع ہو چکی تھی، پھر اس کے فرض کر لینے کے کیا معنی؟ جواب یہ ہے کہ اس سے مضمون کو مؤکد کرنا مقصود ہے کہ جن چیزوں کی ہلاکت فرض کی گئی ہے جب ان میں سے ایک کی ہلاکت کا واقع ہونا معلوم ہوگا تو سننے والے سمجھ جائیں کہ جیسے اس پر موت مسلط کر چکے ہیں اسی طرح اللہ تعالیٰ باقی لوگوں پر بھی موت مسلط کر سکتے ہیں، یعنی جس طرح حضرت مریم پر ہم موت مسلط کر چکے ہیں حضرت مسیح اور دوسری سب مخلوق پر بھی اسی طرح مسلط کر دینا ہمارے قبضہ میں ہے۔

وَمَنۡ فِی الۡاَرۡضِ جَمِیۡعًا: سب اہل زمین کے ذکر کی دو وجہ ہو سکتی ہیں: ① ایک تو یہ کہ عیسیٰ علیہ السلام کے عجز کی اور تاکید ہو جائے کہ وہ اور تمام عالم عاجز ہونے میں برابر ہیں، کچھ فرق نہیں ② دوسرے یہ کہ تمام عالم جن میں باطل معبود وغیرہ سب داخل ہیں سب عاجز ہیں۔

یَخۡلُقُ مَا یَشَآءُ: یعنی وہ جس چیز کو چاہیں پیدا کر دیں، یہاں یہ اس لیے بڑھا دیا کہ عیسائیوں کے اسی باطل عقیدہ کی منشاء کو باطل کرنا ہے، کیونکہ حضرت مسیح علیہ السلام کو خدا بنانے کا اصل منشاء ان کے یہاں یہ ہے کہ ان کی پیدائش ساری دنیا کے قاعدوں کے خلاف بغیر باپ کے صرف ماں سے ہوئی ہے، اگر وہ بھی انسان ہوتے تو قاعدہ کے مطابق ماں اور باپ دونوں کے ذریعہ پیدائش ہوتی، اس جملہ میں اس کا جواب دے دیا کہ اللہ تعالیٰ کو سب طرح قدرت کاملہ حاصل ہے کہ جو چاہے، جس طرح چاہے پیدا کر دے، جیسا کہ آیت: ان مثل عیسیٰ عند اللہ کمثل آدم میں اسی شبہ کا ازالہ فرمایا ہے کہ مسیح علیہ السلام کی تخلیق عام قانون قدرت سے الگ ہونا ان کی خدائی کی دلیل نہیں ہو سکتی، دیکھو آدم علیہ السلام کو تو حق تعالیٰ نے ماں اور باپ دونوں کے بغیر پیدا فرما دیا تھا، ان کو سب قدرت ہے، وہی خالق و مالک اور لائق عبادت ہیں، دوسرا کوئی انکا شریک نہیں ہو سکتا۔

* * *

فائدہ: ۱۔ لَقَدۡ كَفَرَ الَّذِیۡنَ قَالُوۡۤا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الۡمَسِیۡحُ ابۡنُ مَرۡیَمَ: یعنی مسیح کے علاوہ خدا کوئی اور چیز نہیں کہتے ہیں کہ یہ عقیدہ نصاریٰ میں سے ''فرقہ یعقوبیہ'' کا ہے جس کے نزدیک مسیح کے قالب میں خدا حلول کئے ہوئے ہے (معاذ اللہ) یا یوں کہا جائے کہ جب نصاریٰ حضرت مسیح کی نسبت الوہیت کے قائل ہیں اور ساتھ ہی توحید کا بھی زبان سے اقرار کرتے جاتے ہیں، یعنی خدا ایک ہی ہے تو ان دونوں دعووں کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ان کے نزدیک مسیح کے سوا کوئی خدا نہ ہو، بہر حال کوئی صورت لی جائے اس عقیدہ کے کفر صریح ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔

فائدہ: ۲۔ وَمَنۡ فِی الۡاَرۡضِ جَمِیۡعًا: یعنی اگر فرض کرو خدائے قادر وقہار یہ چاہے کہ حضرت مسیح اور مریم اور اگلے پچھلے کل زمین پر بسنے والوں کو اکٹھا کر کے ایک دم میں ہلاک کر دے، تو تم ہی بتلاؤ کہ اس کا ہاتھ کون پکڑ سکتا ہے، یعنی ازل و ابد کے سارے انسان بھی اگر فرض کرو مجتمع کر دیے جائیں اور خدا ایک آن میں سب کو ہلاک کرنا چاہے تو سب کی اجتماعی قوت بھی خدا کے ارادہ کو تھوڑی دیر کے لیے ملتوی نہیں کر سکتی، کیونکہ مخلوقات کی قدرت جو عطائی اور محدود ہے خدا کی ذاتی اور لامحدود قدرت کے مقابلہ میں عاجز محض ہے جس کا اعتراف خود وہ لوگ بھی کرتے ہیں جن کے رد میں یہ خطاب کیا جا رہا ہے، بلکہ خود مسیح ابن مریم بھی جن کو یہ لوگ خدا بنا رہے ہیں اسکے معترف ہیں، چنانچہ مرقس کی انجیل میں حضرت مسیح کا یہ مقولہ موجود ہے: ''اے باپ! ہر چیز تیری قدرت کے تحت میں ہے تو مجھ سے یہ (موت کا) پیالہ ٹلا دے اس طرح نہیں جو میں چاہتا ہوں بلکہ اس طرح جیسے تیرا ارادہ ہے''، پس جب حضرت مسیح علیہ السلام جن کو تم خدا کہتے ہو اور ان کی والدہ ماجدہ مریم صدیقہ جو تمہارے زعم میں خدا کی ماں ہوئیں، وہ دونوں بھی تمام من فی الارض کے ساتھ مل کر خدا کی مشیت و ارادہ کے سامنے عاجز ٹھہرے تو خود سوچ لو کہ ان کی یا ان کی والدہ یا کسی اور مخلوق کی نسبت خدائی کا دعویٰ کرنا کس قدر گستاخی اور شوخ چشمی ہوگی۔

آیت کی اس تقریر میں، ہم نے ''ہلاک'' کو ''موت'' کے معنی میں لیا ہے، مگر جمیعاً کے لفظ کی تھوڑی سی وضاحت کر دی جو مدلول لفظ جمیعا کا ہم نے بیان کیا وہ ائمہ عربیہ کی تصریحات کے عین موافق ہے، اس کے سوا یہ بھی ممکن ہے کہ آیت میں ''ہلاک'' کے معنی موت کے نہ لیے جائیں، جیسا کہ راغب نے لکھا ہے کبھی ''ہلاک'' کے معنی ہوتے ہیں ''کسی چیز کا مطلقاً فنا اور نیست و نابود ہو جانا'' كُلُّ شَیۡءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجۡهَهٗ (القصص: ۸۸) یعنی خدا کی ذات کے سوا ہر چیز نابود ہونے والی ہے، اس معنی پر آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ اگر خدائے قدیر حضرت مسیح اور ان کی والدہ اور تمام من فی الارض کو

قطعاً نیست ونابود اور بالکلیہ فنا کر ڈالنے کا ارادہ کرلے تو کون ہے جو اس کے ارادہ کو روک دے گا:

اوست سلطان ہر چہ خواہد آں کند عالمے را در دمے ویراں کند

حضرت شاہ صاحب تحریر فرماتے ہیں: "اللہ تعالیٰ کسی جگہ نبیوں کے حق میں ایسی بات فرماتے ہیں تا کہ ان کی امت بندگی کی حد سے زیادہ نہ چڑھادے والا نبی اس لائق کا ہے کو ہیں" کہ ان کے مرتبہ عالی اور وجاہت عند اللہ کا خیال کرتے ہوئے ایسا خطاب کیا جاتا۔

فائدہ: ۳ یَخۡلُقُ مَا یَشَآءُ: جو چاہے اور جس طرح چاہے، مثلاً حضرت مسیح کو بدون باپ کے حضرت حوا کو بدون ماں کے اور حضرت آدم علیہ السلام کو بدون ماں اور باپ کے پیدا کر دیا۔

فائدہ: ۴ وَاللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ: کسی کا زور اس کے سامنے نہیں چل سکتا، سب اخیار و ابرار بھی وہاں مجبور ہیں۔

وَقَالَتِ الۡیَہُوۡدُ وَالنَّصٰرٰی نَحۡنُ اَبۡنٰٓؤُا اللّٰہِ وَاَحِبَّآؤُہٗ ؕ قُلۡ فَلِمَ یُعَذِّبُکُمۡ بِذُنُوۡبِکُمۡ ؕ

اور کہتے ہیں یہود اور نصاریٰ ہم بیٹے ہیں اللہ کے اور اس کے پیارے ۱؎ تو کہہ پھر کیوں عذاب کرتا ہے تم کو تمہارے گناہوں پر ۲؎

بَلۡ اَنۡتُمۡ بَشَرٌ مِّمَّنۡ خَلَقَ ؕ یَغۡفِرُ لِمَنۡ یَّشَآءُ وَیُعَذِّبُ مَنۡ یَّشَآءُ ؕ وَلِلّٰہِ مُلۡکُ

کوئی نہیں بلکہ تم بھی ایک آدمی ہو اس کی مخلوق میں ۳؎ بخشے جس کو چاہے اور عذاب کرے جس کو چاہے ۴؎ اور اللہ ہی کے لیے ہے سلطنت

السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَمَا بَیۡنَہُمَا ۫ وَاِلَیۡہِ الۡمَصِیۡرُ ﴿۱۸﴾

آسمانوں اور زمین کی اور جو کچھ دونوں کے بیچ میں ہے، اور اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے ۵؎

خلاصہ تفسیر: پیچھے یہود و نصاریٰ کے بعض قبائح الگ الگ مذکور تھے، اب ایک اور قباحت ذکر فرماتے ہیں جو دونوں گروہ میں مشترک تھی، یعنی دونوں فریق کفر و معصیت کے باوجود اپنے مقرب اور عند اللہ مقبول ہونے کے دعوے دار تھے۔

اور یہود و نصاریٰ (دونوں فریق) دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم اللہ کے بیٹے ہیں اور اس کے محبوب ہیں (مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم چونکہ انبیاء کی اولاد اور ان کی خاص جماعت ہیں، اس لئے اللہ تعالیٰ کے یہاں ہماری ایک خصوصیت ہے کہ ہم گناہ بھی کریں تو اس پر اتنی ناراضی نہیں ہوتی جتنی دوسروں پر ہوتی ہے، جیسے باپ کو اپنے بیٹے کی نافرمانی پر اتنا اثر نہیں ہوتا جتنا کسی غیر آدمی کے ایسے ہی فعل پر ہوتا ہے، ان کے اس باطل خیال کے ابطال کے لئے آنحضرت ﷺ کو خطاب ہے کہ) آپ (ان سے) یہ پوچھئے کہ اچھا پھر تم کو تمہارے گناہوں کے عوض (آخرت میں) عذاب کیوں دیں گے (جس کے تم بھی قائل ہو جیسا کہ یہود کا قول تھا: لن تمسنا النار الا ایاما معدودۃ یعنی اگر ہمیں عذاب جہنم ہوا بھی تو چند روز ہی ہوگا اور خود حضرت مسیح علیہ السلام کا قول قرآن میں مذکور ہے: انہ من یشرك باللہ فقد حرم اللہ علیہ الجنۃ یعنی جس شخص نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا تو اللہ تعالیٰ اس پر جنت حرام کر دیتے ہیں اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے، یہ قول نصاریٰ بھی تسلیم کرتے ہیں)۔

(خلاصہ یہ ہے کہ آخرت کے عذاب کا جب تمہیں خود بھی اقرار ہے تو یہ بتلاؤ کہ کیا کوئی باپ اپنے بیٹے یا محبوب کو عذاب بھی دیا کرتا ہے، اس لئے اپنے آپ کو خدا کی اولاد کہنا باطل ہے) بلکہ تم بھی من جملہ دوسری مخلوقات کے ایک معمولی آدمی ہو (جیسے اور ہیں، اور بلا امتیاز تم سب اس ایک قاعدہ میں داخل ہو کہ) اللہ تعالیٰ جس کو چاہیں گے بخشیں گے جس کو چاہیں گے سزا دیں گے (اور آسمانی کتابوں سے مغفرت کے لیے ایمان کا شرط ہونا ثابت ہے اور کافر کو ابدی عذاب ہے، اور تم نبوت محمدیہ کی تکذیب کر کے کافر بن چکے تو ہمیشہ عذاب میں رہو گے) اور اللہ تعالیٰ ہی کی ہے سب حکومت آسمانوں میں بھی اور زمین میں بھی اور جو کچھ ان کے درمیان ان میں بھی (تو ان کو عذاب دینے سے کون روک سکتا ہے، جس کے لیے سزا تجویز کر لی ہے ضرور سزا دیں گے، پھر ایسی حالت میں ایسے بیہودہ دعوے عبث اور بے فائدہ ہیں) اور اللہ ہی کی طرف سب کو لوٹ کر جانا ہے (اس کے سوا کوئی پناہ نہیں)۔

فَلِمَ یُعَذِّبُکُمْ بِذُنُوْبِکُمْ: یہاں یہ شبہ نہیں کیا جاسکتا کہ بعض اوقات باپ بھی اپنی اولاد کی اصلاح وتربیت کے لئے تادیباً سزا دیتا ہے تو سزا ہونا بیٹا ہونے کے منافی نہیں ہے، کیونکہ باپ کی سزا تادیب کے لئے ہوئی ہے، تاکہ وہ آئندہ ایسا کام نہ کرے، جواب یہ ہے کہ آخرت میں یہ احتمال ہی نہیں کہ تادیب کے لیے سزا دی جائے، کیونکہ وہ دار العمل نہیں دار الجزاء ہے، وہاں آگے کوئی کام کرنے، یا کسی کام سے روکنے کا کوئی احتمال نہیں جس کو تادیب کہا جائے، اس لئے وہاں جو سزا ہوگی وہ خالص سزا اور تعذیب ہی ہوسکتی ہے جو اولاد یا محبوب ہونے کے قطعاً منافی ہے، اس سے ثابت ہوا کہ تمہارا یہ دعویٰ محض بیہودہ ہے، تم کو اللہ کے ہاں دوسروں کی نسبت کوئی امتیاز اور خصوصیت نہیں۔

* * *

فائدہ: ۱ نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ: شاید اپنے کو "بیٹے" یعنی اولاد اس لئے کہتے ہوں کہ ان کی بائبل میں خدا نے اسرائیل (یعقوب علیہ السلام) کو اپنا پہلوٹا بیٹا اور اپنے کو اس کا باپ کہا ہے، ادھر نصاریٰ حضرت مسیح علیہ السلام کو "ابن اللہ" مانتے ہیں تو اسرائیل کی اولاد اور حضرت مسیح کی امت ہونے کی وجہ سے غالباً ابناء اللہ کا لفظ اپنی نسبت استعمال کیا ہوگا اور یہ بھی ممکن ہے کہ "بیٹا" کہنے سے مراد یہ ہو کہ ہم خدا کے خواص اور محبوب ہونے کی وجہ سے گویا اولاد ہی جیسے ہیں، اس صورت میں "ابناء" کا حاصل وہ ہی ہوجائے گا جو لفظ "احباء" کا ہے۔

فائدہ: ۲ فَلِمَ یُعَذِّبُکُمْ بِذُنُوْبِکُمْ: چونکہ کسی مخلوق کا حقیقۃً "ابن اللہ" ہونا بالکل محال اور بدیہی البطلان ہے اور خدا کا محبوب بن جانا ممکن تھا یُحِبُّهُمْ وَیُحِبُّوْنَهٗٓ (المائدہ: ۵۴) اس لئے اس جملہ میں اول "محبوبیت" (پیارے ہونے) کے دعوے کا رد کیا گیا، یعنی جو قوم اعلانیہ بغاوتوں اور شدید ترین گناہوں کی بدولت یہاں بھی کئی طرح کی رسوائیوں اور عذاب میں گرفتار ہوچکی اور آخرت میں بھی حبس دوام کی سزا کا عقلاً ونقلاً استحقاق رکھتی ہے، کیا ایسی باغی وعاصی قوم کی نسبت ایک لمحہ کے لئے بھی کوئی ذی شعور یہ خیال کرسکتا ہے کہ وہ خدا کی محبوب اور پیاری ہوگی؟ خدا سے کسی کا نسبی رشتہ نہیں، اسکا پیار اور اس کی محبت صرف اطاعت اور حسن عمل سے حاصل ہوسکتی ہے، ایسے کٹر مجرموں کو جو سخت سزا کے مستحق اور مورد بن چکے ہوں، شرمانا چاہیے کہ وہ نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ (المائدہ: ۱۸) کا دعویٰ کریں، حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے کو باوجودیکہ انکا صلبی بیٹا تھا خدا نے فرمادیا: اِنَّهٗ لَیْسَ مِنْ اَهْلِكَ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَیْرُ صَالِحٍ (ہود: ۴۶)

فائدہ: ۳ بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ: "بشر" اصل لغت میں کھال کی اوپر والی سطح کو کہتے ہیں، تھوڑی سی مناسبت سے آدمی کو "بشر" کہنے لگے، شاید اس لفظ کے یہاں اختیار کرنے میں یہ نکتہ ہو کہ تم کو خدا کا بیٹا اور پیارا تو درکنار، شریف اور ممتاز انسان بھی نہیں کہا جاسکتا، صرف بشرہ اور شکل وصورت کے لحاظ سے خدا کے پیدا کئے ہوئے ایک معمولی آدمی کہلائے جاسکتے ہو جن کی پیدائش بھی اسی معتاد طریقہ سے ہوئی ہے جس طرح عام انسانوں کی ہوتی ہے، پھر بھلا "ابنیت" کا وہم کدھر سے راہ پاسکتا ہے۔

فائدہ: ۴ یَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ: کیونکہ وہ ہی جانتا ہے کہ کون بخشنے کے لائق ہے اور کسے سزا دی جائے۔

فائدہ: ۵ وَاِلَیْهِ الْمَصِیْرُ: تو جسے وہ اپنی رحمت اور حکمت سے معاف کرنا چاہے یا عدل وانصاف سے سزا دینا چاہے اس میں کون مزاحم ہوسکتا ہے نہ کسی مجرم کیلئے یہ گنجائش ہے کہ اس کے قلمرو آسمان وزمین سے باہر نکل جائے اور نہ یہ کہ مرنے کے بعد دوسری زندگی میں کہیں اور بھاگ جائے۔

یٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا یُبَیِّنُ لَكُمْ عَلٰی فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا جَآءَنَا

اے کتاب والو! آیا ہے تمہارے پاس رسول ہمارا کھولتا ہے تم پر ۱ رسولوں کے انقطاع کے بعد کبھی تم کہنے لگو کہ ہمارے پاس نہ آیا

مِنْۢ بَشِیْرٍ وَّلَا نَذِیْرٍ ۫ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَشِیْرٌ وَّنَذِیْرٌ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۱۹﴾ ع

کوئی خوشی یا ڈر سنانے والا، سو آچکا تمہارے پاس خوشی اور ڈر سنانے والا ۲ اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے ۳

خلاصہ تفسیر: پیچھے یہود ونصاریٰ کے طریقہ کو باطل ثابت کیا، اب اتمام حجت اور عذر کے خاتمے کیلئے دونوں فرقوں کو مخاطب بنا کر رسالت محمدیہ کا اظہار فرماتے ہیں، جیسے دو آیت پہلے بھی ایسا ہی خطاب تھا، اس دوسرے خطاب میں تاکید کے ساتھ عذر کے خاتمے کا عنوان زیادہ ہے۔

اے اہل کتاب! تمہارے پاس یہ ہمارے رسول (محمد ﷺ) آ پہنچے جو کہ تم کو (شریعت کی باتیں) صاف صاف بتلاتے ہیں، ایسے وقت میں کہ رسولوں (کے آنے کا) سلسلہ (مدت سے) موقوف تھا (اور سابقہ شریعتیں گم ہو چکی تھیں اور انبیاء کا سلسلہ عرصہ دراز تک بند رہنے سے ان گم شدہ شریعتوں کے دوبارہ دریافت ہونے کا امکان بھی نہ رہا تھا، اس لئے اب کسی رسول کے آنے کی ضرورت تھی تو ایسے وقت آپ کا تشریف لانا بڑی نعمت اور غنیمت سمجھنا چاہیے) تاکہ تم (قیامت میں) یوں نہ کہنے لگو (کہ دین کے معاملہ میں غلطی اور کوتاہی میں ہم اس لئے معذور ہیں کہ) ہمارے پاس (کوئی رسول جو کہ) بشیر اور نذیر (ہو جس سے ہم کو دین کا صحیح علم اور عمل پر ابھار پیدا ہوتا) نہیں آیا (اور پہلی شریعتیں ضائع ہو چکی تھیں، اس لیے ہم سے کوتاہیاں ہو گئیں) سو (اب اس عذر کی گنجائش نہیں رہی، کیونکہ) تمہارے پاس بشیر و نذیر (یعنی محمد ﷺ) آ چکے ہیں (اب نہ مانو تو اپنے انجام کو خود سمجھ لو) اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پوری قدرت رکھتے ہیں (کہ جب چاہیں رحمت سے اپنے انبیاء بھیج دیں، جب چاہیں حکمت سے ان کو روک لیں، اس لئے کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ جب مدت دراز سے انبیاء کا سلسلہ بند ہے تو اب کوئی رسول نہیں آ سکتا، کیونکہ یہ سلسلہ ایک مدت تک موقوف رکھنا حق تعالیٰ کی حکمت سے تھا، اس نے سلسلہ نبوت بند اور ختم کر دینے کا کوئی اعلان اس وقت تک نہیں کیا تھا، بلکہ پچھلے تمام انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ یہ خبریں بھی دے دی تھیں کہ آخر زمانے میں ایک خاص رسول خاص شان اور خاص صفات کے ساتھ آنے والے ہیں جن پر نبوت کا اختتام ہوگا، اس اعلان کے مطابق خاتم الانبیاء ﷺ تشریف لے آئے)۔

يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلَىٰ فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ: حضرت عیسیٰ اور حضور ﷺ کے درمیان جو زمانہ ہے وہ زمانہ ''فترت'' کا کہلاتا ہے، امام بخاریؒ نے حضرت سلمان فارسیؓ سے روایت کیا ہے کہ یہ زمانہ چھ سو سال کا ہے اور اس درمیان میں کوئی نبی مبعوث نہیں ہوئے۔

امام بخاریؒ نے حضرت سلمان فارسیؓ سے روایت کیا ہے کہ حضرت عیسیٰ اور خاتم الانبیاء (علیہما السلام) کے درمیان کا زمانہ چھ سو سال کا تھا اور اس پوری مدت میں کوئی نبی مبعوث نہیں ہوئے، جیسا کہ صحیح بخاری و مسلم کے حوالہ سے مشکوٰۃ شریف میں حدیث آئی ہے، جس میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''انا اولی الناس بعیسیٰ'' یعنی میں حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے ساتھ سب لوگوں سے زیادہ قریب ہوں اور اس کا مطلب آخر حدیث میں یہ بیان فرمایا: ''لیس بیننا نبی'' یعنی ہم دونوں کے درمیان کوئی نبی مبعوث نہیں ہوئے۔

اور سورۃ یٰسین میں جو تین رسولوں کا ذکر ہے وہ درحقیقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے فرستادہ قاصد تھے جن کو لغوی معنی کے اعتبار سے رسول کہا گیا ہے، اور خالد بن سنان عربی کا جو بعض نے اس زمانہ فترت میں ہونا بیان کیا ہے، اس کے متعلق تفسیر روح المعانی میں بحوالہ شہاب بیان کیا ہے کہ ان کا نبی ہونا تو صحیح ہے مگر ان کا زمانہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پہلے ہے بعد میں نہیں۔

زمانہ فترت کا حکم: آیت مذکورہ سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر بالفرض کوئی قوم ایسی ہو کہ ان کے پاس نہ کوئی رسول اور نہ کوئی پیغمبر آیا اور نہ ان کے نائبین پہنچے، اور نہ پچھلے انبیاء کی شریعت ان کے پاس محفوظ تھی تو یہ لوگ اگر شرک کے علاوہ کسی غلط کاری اور گمراہی میں مبتلا ہو جائیں تو وہ معذور سمجھے جائیں گے، وہ مستحق عذاب نہیں ہوں گے، اسی لئے حضرات فقہاء کا اہل فترت کے معاملہ میں اختلاف ہے کہ وہ بخشے جائیں گے یا نہیں؟ جمہور کا رجحان یہ ہے کہ امید ہے کہ وہ بخش دیئے جائیں گے جب کہ وہ اپنے اس مذہب کے پابند رہے ہوں جو غلط سلط ان کے پاس حضرت موسیٰ یا عیسیٰ علیہما السلام کی طرف منسوب ہو کر موجود تھا، بشرطیکہ وہ توحید کے مخالف اور شرک میں مبتلا نہ ہوں، کیونکہ مسئلہ توحید کسی نقل کا محتاج نہیں، وہ ہر انسان ذرا سا غور کرے تو اپنی ہی عقل سے معلوم کر سکتا ہے، مگر جب آپ ﷺ مبعوث ہو چکے اور شریعت کے احکام واجب ہو گئے تو اب قدرت کے باوجود شریعت کا ترک کرنا ہوا، اس لیے عذر کی گنجائش نہ رہی، اور اس شریعت کی حفاظت کا وعدہ خود قرآن و حدیث میں منصوص ہے، حوادث سے کبھی اس میں خلل نہیں آئے گا، اس لیے اب جدید نبی کی ضرورت نہیں۔

یہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ جن اہل کتاب یہود و نصاریٰ کو اس آیت میں خطاب ہے، ان کے لئے اگرچہ زمانہ فترت میں کوئی رسول نہیں پہنچا، مگر ان کے پاس تورات اور انجیل تو موجود تھی، ان کے علماء بھی تھے تو پھر قیامت میں ان کے لئے یہ عذر کرنے کا کیا موقع تھا کہ ہمارے پاس کوئی

ہدایت نہیں پہنچی تھی؟ جواب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کے عہد مبارک تک تورات وانجیل اصلی باقی نہیں رہی تھی، تحریفات ہو کر ان میں جھوٹے قصے کہانیاں داخل ہوگئیں تھیں، اس لئے ان کا وجود عدم برابر تھا اور اتفاق سے کہیں کوئی اصلی نسخہ کسی کے پاس گمنام جگہ میں محفوظ رہا بھی تو وہ اس کے منافی نہیں جیسا کہ بعض علماء ابن تیمیہ وغیرہ نے لکھا ہے کہ تورات وانجیل کے اصلی نسخے کہیں کہیں موجود تھے۔

* * *

فائدہ:۱ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ: یعنی ہمارے احکام وشرائع نہایت توضیح کے ساتھ کھول کھول کر بیان کرتے ہیں، اس رکوع کے شروع سے بنی اسرائیل (یہود ونصاریٰ) کے مختلف قسم کی شرارتوں اور حماقتوں کو بیان فرما کر یہ بتلایا تھا کہ اب ہمارا رسول تمہارے پاس آچکا جو تمہاری غلط کاریوں کو واضح کرتا ہے اور تم کو ظلمت سے نکال کر نور کی طرف لے جانا چاہتا ہے، اس کے بعد اس پر متنبہ فرمایا کہ اب نور ہدایت کی طرف جانا دو چیزوں پر موقوف ہے، ایک یہ کہ خدا تعالیٰ کی صحیح معرفت حاصل کرو اور مخلوق وخالق کے تعلق کے متعلق غلط عقیدے مت جماؤ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ (المائدہ:۱۷) سے یہاں تک اسی جزو کا بیان تھا، دوسری چیز یہ ہے کہ نبی الانبیاء ﷺ پر ایمان لاؤ جو تمام انبیائے سابقین کے کمالات کے جامع اور شرائع الٰہیہ کے سب سے بڑے اور آخری شارح ہیں، اس جزو کا بیان اس آیت قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلٰى فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ میں کیا گیا ہے۔

فائدہ:۲ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَشِيْرٌ وَّنَذِيْرٌ: حضرت مسیح علیہ السلام کے بعد تقریباً چھ سو برس سے انبیاء کی آمد کا سلسلہ منقطع ہو چکا تھا، ساری دنیا الا ماشاء اللہ جہل، غفلت اور اوہام واہواء کی تاریکیوں میں پڑی تھی، ہدایت کے چراغ گل ہو چکے تھے، ظلم وعدوان اور فساد والحاد کی گھٹا تمام آفاق پر چھا رہی تھی، اس وقت سارے جہان کی اصلاح کے لئے خدا نے سب سے بڑا "ہادی" اور "نذیر" و"بشیر" بھیجا، جو جاہلوں کو فلاح دارین کے راستے بتلائے، غافلوں کو اپنے انذار وتخویف سے بیدار کرے اور پست ہمتوں کو بشارتیں سنا کر ابھارے، اس طرح ساری مخلوق پر خدا کی حجت تمام ہوگئی، کوئی مانے یا نہ مانے۔

فائدہ:۳ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ: یعنی تم اگر اس پیغمبر کی بات نہ مانو گے تو خدا کو قدرت ہے کہ کوئی دوسری قوم کھڑی کر دے جو اس کے پیغام کو پوری طرح قبول کرے گی اور پیغمبر کا ساتھ دے گی خدا کا کام کچھ تم پر موقوف نہیں۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ وَجَعَلَكُمْ

اور جب کہا موسیٰ نے اپنی قوم کو اے قوم یاد کرو احسان اللہ کا اپنے اوپر۱ جب پیدا کئے تم میں نبی۲ اور کر دیا تم کو

مُّلُوْكًا ۖ وَّاٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۰﴾

بادشاہ۳ اور دیا تم کو جو نہیں دیا تھا کسی کو جہان میں۴

خلاصہ تفسیر: گزشتہ آیات میں اس عہد اور میثاق کا ذکر تھا جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوں کی اطاعت کے بارے میں بنی اسرائیل سے لیا گیا تھا اور اس کے ساتھ ان کی عام عہد شکنی، اور میثاق کی خلاف ورزی اور اس پر سزاؤں کا بیان تھا، اب یہاں سے ان کی عہد شکنی کا ایک خاص واقعہ بیان کیا جاتا ہے:

اور وہ وقت بھی ذکر کے قابل ہے جب موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنی قوم (یعنی بنی اسرائیل) سے (اول ترغیب جہاد کی تمہید کے طور پر یہ) فرمایا کہ اے میری قوم! تم اللہ تعالیٰ کے انعام کو جو کہ تم پر ہوا ہے یاد کرو جب کہ اللہ تعالیٰ نے تم میں بہت سے پیغمبر بنائے (جیسے حضرت یعقوب، حضرت یوسف اور خود حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام وغیرہ، اور کسی قوم میں پیغمبروں کا ہونا ان کا دنیوی اور دینی شرف ہے، یہ تو معنوی نعمت دی) اور (حسی نعمت یہ دی کہ) تم کو صاحب ملک بنایا (چنانچہ فرعون کے ملک پر ابھی قابض ہو چکے ہو) اور تم کو (بعض بعض) وہ چیزیں دی ہیں جو دنیا جہان

والوں میں سے کسی کو نہیں دیں (جیسا دریا میں راستہ دینا، دشمن کو عجیب طور پر غرق کرنا جس کے بعد تم دفعۃً انتہائی ذلت وزحمت سے انتہائی رفعت و راحت میں پہنچ گئے یعنی اس میں تم کو خاص امتیاز دیا)۔

يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ: اس سے سمجھ میں آتا ہے کسی شخص کا اہل اللہ کے خاندان میں سے ہونا بھی ایک نعمت ہے جس پر شکر واجب ہے، کیونکہ اس تعلق سے اس کے لیے دین پر عمل کرنا آسان ہو جاتا ہے، البتہ اس پر تفاخر وعجب جائز نہیں۔

وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا: یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ انبیاء کے معاملہ میں تو ارشاد ہوا کہ: جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ یعنی تمہاری قوم میں سے بہت سے لوگوں کو انبیاء بنا دیا گیا، جس کا مفہوم یہ ہے کہ پوری قوم انبیاء نہیں تھی اور یہی حقیقت بھی ہے کہ انبیاء معدودے چند ہوتے ہیں اور پوری قوم ان کی امت اور متبع ہوتی ہیں، اور جہاں دنیا کے ملک وسلطنت کا ذکر آیا تو وہاں فرمایا: وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا یعنی بنا دیا تم کو ملوک، جس کا ظاہری مفہوم یہی ہے کہ تم سب کو ملوک بنا دیا، لفظ ملوک ''ملک'' کی جمع ہے، جس کے معنی عرف عام میں بادشاہ کے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ جس طرح پوری قوم نبی اور پیغمبر نہیں ہوتی، اسی طرح کسی ملک میں پوری قوم بادشاہ بھی نہیں ہوتی، بلکہ قوم کا ایک فرد یا چند افراد حکمران ہوتے ہیں، باقی قوم ان کے تابع ہوتی ہے، لیکن قرآنی الفاظ نے ان سب کو ملوک قرار دیا۔

اس کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ عرف عام میں جس قوم کا بادشاہ ہوتا ہے اس کی سلطنت وحکومت کو اسی پوری قوم کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، جیسے اسلام کے قرون وسطیٰ میں بنی امیہ اور بنی عباس کی حکومت کہلاتی تھی، اسی طرح ہندوستان میں غزنوی اور غوریوں کی حکومت، پھر مغلوں کی حکومت، پھر انگریزوں کی حکومت پوری قوم کے افراد کی طرف منسوب کی جاتی تھی، اس لئے جس قوم کا ایک حکمران ہو وہ پوری قوم حکمران اور بادشاہ کہلاتی ہے، اس محاورہ کے مطابق پوری قوم بنی اسرائیل کو قرآن کریم نے ملوک قرار دیا، اس میں اشارہ اس طرف بھی ہوسکتا ہے کہ اسلامی حکومت درحقیقت عوامی حکومت ہوتی ہے، عوام ہی کو اپنا امیر وامام منتخب کرنے کا حق ہوتا ہے اور عوام ہی اپنی اجتماعی رائے سے اس کو معزول بھی کر سکتے ہیں، اس لئے صورۃً اگرچہ فرد واحد حکمران ہوتا ہے، مگر درحقیقت وہ حکومت عوام ہی کی ہوتی ہے، دوسری وجہ وہ ہے جو بعض سلف سے نقل کی گئی ہے کہ لفظ ''ملک'' بادشاہ کے مفہوم سے زیادہ عام ہے، ایسے شخص کو ''ملک'' کہہ دیا جاتا ہے جو آسودہ حال ہو، مکان، جائیداد، نوکر چاکر رکھتا ہو، اس مفہوم کے اعتبار سے اس وقت بنی اسرائیل سے ہر فرد ملک کا مصداق تھا، اس لئے ان سب کو ملوک فرمایا گیا۔

* * *

فائدہ: ۱۔ اِذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ: موضح القرآن میں ہے کہ: ''حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے باپ کا وطن چھوڑ نکلے اللہ کی راہ میں اور ملک شام میں آ کر ٹھہرے اور مدت تک ان کے اولاد نہ ہوئی، تب اللہ تعالیٰ نے بشارت دی کہ تیری اولاد بہت پھیلاؤں گا اور زمین شام ان کو دوں گا اور نبوت، دین، کتاب اور سلطنت ان میں رکھوں گا، پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وقت وہ وعدہ پورا کیا، بنی اسرائیل کو فرعون کی بیگار سے خلاص کیا اور اس کو غرق کیا اور ان کو فرمایا کہ جہاد کرو عمالقہ سے، ملک شام فتح کرلو، پھر ہمیشہ وہ ملک شام تمہارا ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بارہ شخص بارہ قبائل بنی اسرائیل پر سردار کئے تھے، ان کو بھیجا کہ اس ملک کی خبر لاویں وہ خبر لائے تو ملک شام کی بہت خوبیاں بیان کیں اور وہاں جو عمالقہ مسلط تھے ان کا زور وقوت بیان کیا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو کہا کہ تم قوم کے سامنے ملک کی خوبی بیان کرو اور دشمن کی قوت کا ذکر مت کرو، ان میں سے دو شخص اس حکم پر رہے اور دس نے خلاف کیا، قوم نے سنا تو نامردی کرنے لگی اور چاہا کہ پھر الٹے مصر چلے جائیں، اس تقصیر کی وجہ سے چالیس برس فتح میں دیر لگی، اس قدر مدت جنگلوں میں بھٹکتے پھرتے رہے، جب اس قرن کے لوگ مر چکے مگر وہ دو شخص کہ وہ ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد خلیفہ ہوئے ان کے ہاتھ سے فتح ہوئی''۔

فائدہ: ۲۔ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ: یعنی تمہارے جد اعلیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے لے کر آج تک کتنے نبی تم میں پیدا کئے، مثلاً حضرت اسماعیل، اسحاق، یعقوب، یوسف اور خود موسیٰ وہارون علیہم الصلوٰۃ والسلام پھر ان کے بعد بھی یہ ہی سلسلہ مدت دراز تک ان میں قائم رکھا۔

فائدہ: ۳ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا: یعنی فرعونیوں کی ذلیل ترین غلامی سے آزادی دلا کران کے اموال واملاک پر قبضہ کیا اور اس سے پہلے تم ہی میں سے حضرت یوسف علیہ السلام کو مصر کے خزائن اور سلطنت پر کیسا تسلط عطا فرمایا، پھر مستقبل میں بھی حضرت سلیمان علیہ السلام وغیرہ نبی اور بادشاہ پیدا کئے، گویا دین اور دنیا دونوں کی اعلیٰ نعمتوں سے تم کو سرفراز کیا، کیونکہ دینی مناصب میں سب سے بڑا منصب نبوت اور دنیاوی اقبال کی آخری حد آزادی اور بادشاہت ہے، یہ دونوں چیزیں مرحمت کی گئیں۔

فائدہ: ۴ وَّاٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ: یعنی اس وقت جب موسیٰ علیہ السلام کو یہ خطاب فرمارہے تھے بنی اسرائیل پر تمام دنیا کے لوگوں سے زیادہ خدا کی نوازشیں ہوئیں اور اگر اَحَدًا مِّنَ الْعَالَمِيْنَ کا عموم پر حمل کیا جائے تو یہ اس لئے صحیح نہیں کہ امت محمدیہ کی نسبت خود قرآن میں تصریح ہے: كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (آل عمران: ۱۱۰) اور: وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ (البقرۃ: ۱۴۳)۔

يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِيْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَرْتَدُّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِكُمْ

اے قوم داخل ہو زمین پاک میں جو مقرر کر دی ہے اللہ نے تمہارے واسطے ۱ اور نہ لوٹو اپنی پیٹھ کی طرف

فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ ﴿۲۱﴾

پھر جا پڑو گے نقصان میں ۲

خلاصہ تفسیر: (پھر اس تمہید کے بعد اصلی مقصود کے ساتھ ان کو خطاب فرمایا کہ:) اے قوم میری! (ان نعمتوں اور احسانوں کا تقاضا یہ ہے کہ تم کو جو اس جہاد کے متعلق حکم خداوندی ہوا ہے اس پر آمادہ رہو اور) اس متبرک ملک (یعنی شام کے دارالحکومت) میں (جہاں یہ عمالقہ حکمران ہیں جہاد کے ارادہ سے) داخل ہو کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے حصہ میں لکھ دیا ہے (اس لئے قصد کرتے ہی فتح ہوگی) اور پیچھے (وطن کی طرف واپس مت چلو کہ پھر بالکل خسارہ میں پڑ جاؤ گے (دنیا میں تو یہ خسارہ کہ توسیع ملک سے محروم رہو گے اور آخرت میں یہ کہ فریضہ جہاد کو چھوڑنے کی وجہ سے گنہگار ہو گے)۔

الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِيْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ: اس کے جو لوگ مخاطب تھے ان کو تو وہ ملک ملا ہی نہیں جیسا کہ اگلی آیات سے معلوم ہو جائے گا تو پھر یہ کیوں کہا گیا کہ اللہ نے تمہارے حصہ میں لکھ دیا ہے؟ اس سے تو وعدہ خداوندی کے خلاف ہونا لازم آتا ہے؟ جواب یہ ہے کہ اگر لکم میں مخاطب سے خاص اشخاص مراد لیے جائیں تو یہ وعدہ مشروط تھا جہاد کے ساتھ، جب وہ شرط ہی پوری نہ کی تو فتح بھی حاصل نہ ہوئی، کیونکہ جب تکوینی طور پر وہ تمہارے ہی لیے ہے تو صرف تمہارے ہاتھ پاؤں ہلانے کی دیر ہے، اور اگر لکم میں قوم کو مخاطب کہا جائے تو ان کی اولاد بھی قوم میں داخل ہے اور ان کو وہ ملک عنایت ہو گیا، پس وعدہ خلافی کسی صورت میں نہیں ہوئی، نیز كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ فرمانے سے بنی اسرائیل کی ہمت بڑھانا بھی مقصود ہے کہ دشمن سے ہار نہیں، وہ مقام تم کو ضرور ملے گا اور تم بہت جلد غالب آ ؤ گے۔

وَلَا تَرْتَدُّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ: اس سے معلوم ہوا کہ گناہ سے کبھی دنیوی مضرتیں اور نقصان بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی خدا نے پیشتر حضرت ابراہیم علیہ السلام سے وعدہ فرمایا تھا کہ تیری اولاد کو یہ ملک دونگا وہ وعدہ ضرور پورا ہونا ہے، خوش قسمت ہوں گے وہ لوگ جن کے ہاتھوں پر پورا ہو۔

فائدہ: ۲ یعنی جہاد فی سبیل اللہ میں بزدلی اور پست ہمتی دکھا کر غلامی کی زندگی کی طرف مت بھاگو۔

قَالُوْا یٰمُوْسٰۤى اِنَّ فِیْهَا قَوْمًا جَبَّارِیْنَ ۖۗ وَاِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا حَتّٰى یَخْرُجُوْا مِنْهَا ۚ فَاِنْ یَّخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنَّا دٰخِلُوْنَ ﴿۲۲﴾

بولے اے موسیٰ وہاں ایک قوم ہے زبردست ۱؎ اور ہم ہرگز وہاں نہ جائیں گے یہاں تک کہ وہ نکل جائیں اس میں سے پھر اگر وہ نکل جائینگے اس میں سے تو ہم ضرور داخل ہوں گے ۲؎

خلاصہ تفسیر: کہنے لگے اے موسیٰ! وہاں تو بڑے بڑے زبردست آدمی (رہتے) ہیں اور ہم تو وہاں پر ہرگز قدم نہ رکھیں گے جب تک کہ وہ (کسی طرح) وہاں سے نہ نکل جائیں، ہاں! اگر وہ وہاں سے کہیں چلے جائیں تو ہم بیشک جانے کو تیار ہیں۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی بہت قوی ہیکل تنومند اور پر رعب۔

فائدہ: ۲؎ یعنی مقابلہ کی ہمت ہم میں نہیں ہاں بدون ہاتھ پاؤں ہلائے پکی پکائی کھالیں گے آپ معجزہ کے زور سے انہیں نکال دیں۔

قَالَ رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِیْنَ یَخَافُوْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِمَا ادْخُلُوْا عَلَیْهِمُ الْبَابَ ۚ

کہا دو مردوں نے اللہ سے ڈرنے والوں میں سے کہ خدا کی نوازش تھی ان دو پر ۱؎ گھس جاؤ ان پر حملہ کرکے دروازہ میں

فَاِذَا دَخَلْتُمُوْهُ فَاِنَّكُمْ غٰلِبُوْنَ ۚ۬ وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْۤا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۲۳﴾

پھر جب تم اس میں گھس جاؤ گے تو تم ہی غالب ہوگے ۲؎ اور اللہ پر بھروسہ کرو اگر یقین رکھتے ہو ۳؎

خلاصہ تفسیر: (موسیٰ علیہ السلام کی بات کی تائید کے لئے) ان دو شخصوں نے (بھی) جو کہ (اللہ سے) ڈرنے والوں (یعنی متقیوں) میں سے تھے (اور) جن پر اللہ تعالیٰ نے فضل کیا تھا (کہ اپنے عہد پر ثابت رہے تھے ان کم ہمتوں کو سمجھانے کے طور پر) کہا کہ تم ان پر (چڑھائی کرکے اس شہر کے) دروازہ تک تو چلو، سو جس وقت تم دروازہ میں قدم رکھو گے اس وقت غالب آجاؤ گے (مطلب یہ ہے کہ جلدی فتح ہوجائے گا، خواہ رعب سے بھاگ جائیں یا تھوڑا ہی مقابلہ کرنا پڑے) اور اللہ تعالیٰ پر نظر رکھو اگر تم ایمان رکھتے ہو (یعنی تم ان کی تنومندی پر نظر مت کرو)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ دو شخص حضرت یوشع بن نون اور کالب بن یوحنا تھے جو خدا سے ڈرتے تھے اسی لئے عمالقہ وغیرہ کا کچھ ڈر ان کو نہ رہا:

ہر کہ ترسید از حق و تقویٰ گزید ترسد از وے جن و انس و ہر کہ دید

فائدہ: ۲؎ یعنی ہمت کرکے شہر کے پھاٹک تک تو چلو پھر خدا تم کو غالب کرے گا خدا اسی کی مدد کرتا ہے جو خود بھی اپنی مدد کرے۔

فائدہ: ۳؎ معلوم ہوا کہ اسباب مشروعہ کو ترک کرنا توکل نہیں، "توکل" یہ ہے کہ کسی نیک مقصد کے لئے انتہائی کوشش اور جہاد کرے پھر اسکے مثمر و منتج ہونے کیلئے خدا پر بھروسہ رکھے اپنی کوشش پر نازاں اور مغرور نہ ہو، باقی اسباب مشروعہ کو چھوڑ کر خالی امیدیں باندھتے رہنا توکل نہیں "تعطل" ہے۔

قَالُوْا یٰمُوْسٰۤى اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَاۤ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِیْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَاۤ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ﴿۲۴﴾

بولے اے موسیٰ ہم ہرگز نہ جائیں گے ساری عمر جب تک وہ رہیں گے اس میں سو تو جا اور تیرا رب اور تم دونوں لڑو ہم تو یہیں بیٹھے ہیں

خلاصہ تفسیر: (مگر ان لوگوں پر کسی کے سمجھانے کا کچھ اثر نہیں ہوا، بلکہ ان دو بزرگوں کو تو انہوں نے قابل خطاب بھی نہ سمجھا،

بلکہ موسیٰ علیہ السلام سے نہایت لا ابالی پن اور گستاخی کے ساتھ) کہنے لگے کہ اے موسیٰ! ہم تو (ایک بات کہہ چکے ہیں کہ ہم) ہرگز کبھی بھی وہاں قدم نہ رکھیں گے جب تک کہ وہ لوگ وہاں موجود ہیں (اگر ایسا ہی لڑنا ضرور ہے) تو آپ اور آپ کے اللہ میاں چلے جایئے اور دونوں (جا کر) لڑ بھڑ لیجئے ہم تو یہاں سے سرکتے نہیں۔

فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ: یعنی آپ اور آپ کے اللہ میاں ہی جا کر ان سے مقابلہ کر لیں، ہم تو یہیں بیٹھے رہیں گے، بنی اسرائیل کا یہ کلمہ اگر استہزاء کے طور پر ہوتا تو صریح کفر تھا اور اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ان کے ساتھ رہنا، ان کے لئے میدان تیہ میں دعائیں کرنا جس کا ذکر اگلی آیت میں آ رہا ہے، اس کا امکان نہ تھا، اس لئے ائمہ مفسرین نے اس کلمہ کا مطلب یہ قرار دیا کہ آپ جایئے اور ان سے مقابلہ کیجئے، آپ کا رب آپ کی مدد کرے گا، ہم تو مدد کرنے سے قاصر ہیں، حق تعالیٰ کی مدد کرنے کو مجازاً خدا کا جانا اور لڑنا کہہ دیا، اس تاویل اور معنی کے اعتبار سے یہ کلمہ کفر کی حد سے نکل گیا، اگرچہ یہ جواب نہایت بھونڈا اور دل آزار ہے، یہی وجہ ہے کہ بنی اسرائیل کا یہ کلمہ ضرب المثل بن گیا، البتہ اس جواب کا معصیت ہونا ظاہر ہے کہ حکم کی مخالفت کی گئی اور ہر حال میں غالباً ان سے توبہ بھی کرائی گئی ہوگی اگرچہ یہاں مذکور نہیں، باقی اس شریعت کے قواعد واحکام کا پورا احاطہ نہیں کہ اس کے مطابق کیا حکم ہوگا۔

* * *

فائدہ: یہ اس قوم کا مقولہ ہے جو نحن ابناء اللہ و احباؤہ کا دعویٰ رکھتی تھی، مگر یہ گستاخانہ کلمات ان کے مستمر تمرد وطغیان سے کچھ بھی مستبعد نہیں۔

قَالَ رَبِّ اِنِّيْ لَآ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِيْ وَاَخِيْ فَافْرُقْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۵﴾

بولا اے رب میرے میرے اختیار میں نہیں مگر میری جان اور میرا بھائی سو جدائی کر دے تو ہم میں اور اس نافرمان قوم میں

خلاصہ تفسیر: (موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کے جواب کو سن کر نہایت زچ اور پریشان ہوئے اور تنگ آ کر) دعا کرنے لگے کہ اے میرے پروردگار! (میں کیا کروں ان پر کچھ بس نہیں چلتا) ہاں! اپنی جان پر اور اپنے بھائی پر البتہ (پورا) اختیار رکھتا ہوں کہ آپ ہم دونوں (بھائیوں) کے اور اس بے حکم قوم کے درمیان (مناسب) فیصلہ فرما دیجئے (یعنی جس کی حالت کا جو تقاضہ ہو وہ ہر ایک کے لئے تجویز فرما دیجئے)۔

رَبِّ اِنِّيْ لَآ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِيْ وَاَخِيْ: یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے قوم بنی اسرائیل میں سے کم از کم دو سردار یوشع بن نون اور کالب بن یوحنا جنہوں نے پوری طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اتباع کا ثبوت دیا تھا اور قوم کو سمجھانے اور صحیح راستہ پر لانے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مسلسل کوشش کی تھی، اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کا بھی ذکر نہیں کیا، بلکہ صرف اپنا اور حضرت ہارون علیہ السلام کا تذکرہ فرمایا؟ حالانکہ وہ دو بزرگ بھی جو عہد پر قائم رہے تھے آپ کے پورے مطیع تھے ان کو مستثنیٰ نہ فرمایا؟ اس کی وجہ یا تو یہ ہے کہ یہ کلام تنگ دلی میں آپ نے فرمایا، اور ایسے وقت اکثر الفاظ تنگ اور مختصر ہوتے ہیں، یا یہ کہ اس کا سبب بنی اسرائیل کی عہد شکنی اور نافرمانی تھی کہ صرف حضرت ہارون علیہ السلام نبی وپیغمبر ہونے کی وجہ سے معصوم تھے اور ان کا طریق حق پر قائم رہنا یقینی تھا، کیونکہ نبی کے لیے عصمت ضروری ہے، باقی ان دونوں سردار پر ان کے معصوم نہ ہونے کی وجہ سے اس قدر بھروسہ نہ تھا، اس انتہائی غم وغصہ کے عالم میں صرف اس کا ذکر کیا جس کا حق پر قائم رہنا یقینی تھا، اس اظہار کے ساتھ کہ مجھے اپنی جان اور اپنے بھائی کے سوا کسی پر اختیار نہیں۔

* * *

فائدہ: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سخت دلگیر ہو کر یہ دعا فرمائی، چونکہ تمام قوم کی عدول حکمی اور بزدلانہ عصیان کو مشاہدہ فرما رہے تھے، اس لئے دعا میں بھی اپنے اور اپنے بھائی ہارون علیہ السلام کے سوا کہ وہ بھی نبی معصوم تھے اور کسی کا ذکر نہیں کیا، یوشع اور کالب بھی دونوں کے ساتھ تبعاً آ گئے۔

قَالَ فَإِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ أَرْبَعِينَ سَنَةً ۚ يَتِيهُونَ فِي الْأَرْضِ ۚ فَلَا تَأْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفَاسِقِينَ ﴿۲۶﴾

فرمایا تحقیق وہ زمین حرام کی گئی ہے ان پر چالیس برس، سر مارتے پھریں گے ملک میں، سو تو افسوس نہ کر نافرمان لوگوں پر

خلاصہ تفسیر: ارشاد ہوا (بہتر!) تو (ہم یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ) یہ ملک ان کے ہاتھ چالیس برس تک نہ لگے گا (اور گھر جانا بھی نصیب نہ ہوگا راستہ ہی نہ ملے گا) یوں ہی (چالیس برس تک) زمین میں سر مارتے پھریں گے (موسیٰ علیہ السلام نے جو یہ فیصلہ سنا جس کا گمان نہ تھا، خیال یہ تھا کہ کوئی معمولی تنبیہ ہوجائے گی تو طبعاً مغموم ہونے لگے، ارشاد ہوا کہ اے موسیٰ! جب ان سرکشوں کے لئے ہم نے یہ تجویز کیا تو یہی مناسب ہے) سو آپ اس بے حکم قوم (کی اس حالت زار) پر (ذرا) غم نہ کیجئے۔

فَإِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ أَرْبَعِينَ سَنَةً: چنانچہ چالیس برس تک اسی ایک محدود حصہ زمین میں حیران و پریشان پھرتے رہے حتیٰ کہ سب وہیں ختم ہو گئے، صحیح روایات کے مطابق اسی چالیس سالہ دور میں اول حضرت ہارون علیہ السلام کی وفات ہوگئی اور اس کے ایک سال یا چھ مہینہ بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات ہوگئی، ان کے بعد حضرت یوشع بن نون کو اللہ تعالیٰ نے نبی بنا کر بنی اسرائیل کی ہدایت کے لئے مامور فرمایا، اور چالیس سالہ قید ختم ہونے کے بعد بنی اسرائیل کی باقی ماندہ قوم حضرت یوشع بن نون کی قیادت میں جہاد بیت المقدس کے لئے روانہ ہوئی، اللہ تعالیٰ کے وعدہ کے مطابق ملک شام ان کے ہاتھوں فتح ہوا، اور اس ملک کی ناقابل قیاس دولت ان کے ہاتھ آئی۔

يَتِيهُونَ فِي الْأَرْضِ: سوال ہوتا ہے کہ جب اس وادی تیہ میں رہنا سزا تھا تو موسیٰ اور ہارون علیہما السلام اس میں کیوں رکھے گئے؟ خصوصاً دعائے فافرق بیننا وبین القوم الفاسقین کے بعد بھی؟ جواب یہ ہے کہ اصل سزا دل کی تنگی اور پریشانی تھی اور یہ بنی اسرائیل کے ساتھ خاص تھی، حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام اس سے محفوظ تھے، ان حضرات کا وہاں تشریف رکھنا قوم کی اصلاح و ہدایت کے لیے تھا جو کہ ان کا منصبی کام اور عین سرمایہ راحت تھا، جیسے دوزخ کے اندر دوزخیوں کا ہونا اور طور پر ہے اور عذاب کے فرشتوں کا ہونا اور طور پر، اسی طرح وادی تیہ میں حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام بھی اپنی قوم کے ساتھ تھے، مگر یہ وادی بنی اسرائیل کے لیے قید اور سزا تھی اور ان دونوں حضرات کے لیے نعمائے الٰہیہ کا مظہر تھی۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ یہ بات قیاس سے بعید ہے کہ دن میں سورج اور رات کو ستارے یہ علامات تو علوی یعنی آسمانی ہیں، اور خود زمین پر درخت اور پہاڑ وغیرہ سفلی علامات موجود ہوں اور پھر بھی بنی اسرائیل ان علامات کے باوجود نکلنے کی راہ نہ پا سکیں، اگر کسی ستارہ ہی کی سیدھ باندھ کر چلتے تو کبھی نہ کبھی نکل ہی جاتے؟ جواب یہ ہے کہ کسی علامت کا علامت ہونا اور کام دینا اس وقت ہوتا ہے جبکہ حواس اور قویٰ درست ہوں، بسا اوقات امراض کی وجہ سے قویٰ میں فتور بھی آجاتا ہے جیسا کہ مشاہدہ ہے، سو اگر قہر خداوندی سے ان کے حواس ہی ماؤف ہو گئے ہوں تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی جدائی کی دعا حسی اور ظاہری طور پر تو قبول نہ ہوئی، ہاں معناً جدائی ہوگئی کہ وہ سب تو عذاب الٰہی میں گرفتار ہو کر حیران و سرگرداں پھرتے تھے اور حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام پیغمبرانہ اطمینان اور پورے قلبی سکون کے ساتھ اپنے منصب ارشاد و اصلاح پر قائم رہے، جیسے کسی بستی میں عام وبا پھیل پڑے اور ہزاروں بیماروں کے مجمع میں دو چار تندرست اور قوی القلب ہوں جو ان کے معالجہ، چارہ سازی اور تفقد احوال میں مشغول رہیں، اگر فافرق بیننا کا ترجمہ "جدائی کردے" کی جگہ "فیصلہ کردے" ہوتا تو یہ مطلب زیادہ واضح ہوجاتا۔

حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ: "سب قصہ اہل کتاب کو سنایا اس پر کہ تم پیغمبر آخر الزمان کی رفاقت نہ کرو گے جیسے تمہارے اجداد نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی رفاقت چھوڑ دی تھی اور جہاد سے جان چرا بیٹھے تھے تو یہ نعمت اوروں کو نصیب ہوگی"، چنانچہ نصیب ہوئی۔

ایک لحہ کے لئے اس سارے رکوع کو سامنے رکھ کر امت محمدیہ کے احوال پر غور کیجئے ان پر خدا کے وہ انعامات ہوئے جو نہ پہلے کسی امت پر ہوئے نہ آئندہ ہوں گے، ان کے لئے خاتم الانبیاء سید الرسل ﷺ کو ابدی شریعت دیکر بھیجا، ان میں وہ علماء اور ائمہ پیدا کئے جو باوجود غیر نبی ہونے کے انبیاء کے وظائف کو نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیتے رہے، ایسے ایسے خلفاء نبی ﷺ کے بعد امت کے قائد بنے جنہوں نے سارے جہان کو

اخلاق اور اصول سیاست وغیرہ کی ہدایت کی، اس امت کو بھی جہاد کا حکم ہوا، عمالقہ کے مقابلہ میں نہیں روئے زمین کے تمام جبارین کے مقابلہ میں، محض سرزمین شام فتح کرنے کے لئے نہیں بلکہ شرق وغرب میں کلمۃ اللہ بلند کرنے اور فتنہ کی جڑ کاٹنے کے لئے بنی اسرائیل سے خدا نے ارض مقدسہ کا وعدہ کیا تھا لیکن اس امت سے یہ فرمایا: وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۠ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا (النور: ۵۵) اگر بنی اسرائیل کو موسیٰ علیہ السلام نے جہاد میں پیٹھ پھیرنے سے منع کیا تھا تو اس امت کو بھی خدا نے اس طرح خطاب کیا: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ (الانفال: ۱۵)

انجام یہ ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے رفقا تو عمالقہ سے ڈر کر یہاں تک کہہ گزرے کہ: فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ تم اور تمہارا پروردگار جا کر لڑلو ہم یہاں بیٹھے ہیں لیکن اصحاب محمد ﷺ نے یہ کہا کہ خدا کی قسم! اگر آپ سمندر کی موجوں میں گھس جانے کا حکم دیں گے تو ہم اسی میں کود پڑیں گے اور ایک شخص بھی ہم میں سے علیحدہ نہیں رہے گا، امید ہے کہ خدا آپ کو ہماری طرف سے وہ چیز دکھلائے گا جس سے آپ کی آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں گی، ہم اپنے پیغمبر کے ساتھ ہو کر اس کے دائیں اور بائیں آگے اور پیچھے ہر طرف جہاد کریں گے، خدا کے فضل سے ہم وہ نہیں ہیں جنہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے کہہ دیا تھا: فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ اسی کا نتیجہ ہے کہ جتنی مدت بنی اسرائیل فتوحات سے محروم ہو کر ''وادی تیہ'' میں بھٹکتے رہے اس سے کم مدت میں محمد رسول اللہ ﷺ کے اصحاب نے مشرق ومغرب میں ہدایت وارشاد کا جھنڈا گاڑ دیا رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ ذٰلك لمن خشی ربہ۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَيْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ ۘ اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ

اور سنا ان کو حال واقعی آدم کے دو بیٹوں کا [1] جب نیاز کی دونوں نے کچھ نیاز اور مقبول ہوئی ایک کی اور نہ مقبول ہوئی

مِنَ الْاٰخَرِ ۭ قَالَ لَاَقْتُلَنَّكَ ۭ قَالَ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ۝۲۷

دوسرے کی [2] کہا میں تجھ کو مار ڈالوں گا [3] وہ بولا اللہ قبول کرتا ہے تو پرہیزگاروں سے [4]

خلاصہ تفسیر: پیچھے اہل کتاب کا یہ قول نقل فرمایا تھا: نحن ابناء اللہ واحباؤہ کہ ہم اللہ کی اولاد اور اس کے محبوب ہیں، جس کا منشاء یہ تھا کہ وہ انبیاء کی اولاد ہونے کی وجہ سے فخر کرتے تھے، اللہ تعالیٰ اس گھمنڈ کے توڑنے کے لیے اب ہابیل وقابیل کا قصہ بیان فرماتے ہیں کہ وہ دونوں آدم علیہ السلام کے صلبی بیٹے ہونے میں ان لوگوں سے بڑھ کر اور باہم دونوں برابر تھے، مگر ان میں بھی مقبول وہی ہابیل ہوا جو حکم الٰہی کا مطیع رہا، اور دوسرے قابیل نے حکم عدولی کی تو وہ مردود ہو گیا اور آدم کا بیٹا ہونا کچھ کام نہ آیا۔

اور (اے محمد ﷺ!) آپ ان اہل کتاب کو آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں کا (یعنی ہابیل وقابیل کا) قصہ صحیح طور پر پڑھ کر سنائیے (تاکہ ان کو اولاد انبیاء کی نسبت کا گھمنڈ نہ رہے جس کا نحن ابناء اللہ واحباؤہ میں اظہار ہو رہا ہے)۔

(اور وہ قصہ اس وقت ہوا تھا) جبکہ دونوں نے (اللہ تعالیٰ کے نام کی) ایک ایک نیاز پیش کی، اور ان میں سے ایک کی (یعنی ہابیل کی) تو مقبول ہو گئی، اور دوسرے کی (یعنی قابیل کی) مقبول نہ ہوئی (کیونکہ جس معاملہ کے فیصلہ کے لئے یہ نیاز چڑھائی گئی تھی اس میں ہابیل حق پر تھا، اس لئے اس کی نیاز قبول ہو گئی اور قابیل حق پر نہ تھا اس کی قبول نہ ہوئی، ورنہ پھر فیصلہ نہ ہوتا، بلکہ اور خلط واشتباہ ہو جاتا، جب) وہ دوسرا (یعنی قابیل اس میں بھی ہار تو جھلا کر) کہنے لگا کہ میں تجھ کو ضرور قتل کروں گا، اس ایک نے (یعنی ہابیل نے) جواب دیا (کہ تیرا ہارنا تو تیری ہی ناحق پرستی کی وجہ سے ہے میری کیا خطا، کیونکہ) خدا تعالیٰ متقیوں ہی کا عمل قبول کرتے ہیں (میں نے تو تقویٰ اختیار کیا اور خدا کے حکم پر رہا، خدائے تعالیٰ نے میری نیاز قبول کی، تو نے تقویٰ چھوڑ دیا اور خدا کے حکم سے منہ موڑا، تیری نیاز قبول نہیں کی، سو اس میں تیری خطا ہے یا میری؟ انصاف کر!)۔

اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا: قصہ کا خلاصہ یہ ہے کہ آدم علیہ السلام کے ہاں جو لڑکا پیدا ہوتا اس کے ساتھ ایک لڑکی بھی پیدا ہوتی تھی، اور ایک بطن کا لڑکا دوسرے بطن کی لڑکی سے، اور دوسرے بطن کا لڑکا پہلے بطن کی لڑکی سے بیاہ دیا جاتا تھا، اس وقت ضرورت کی وجہ سے بطون کا اختلاف گویا کہ نسب کے اختلاف جیسا قرار دیا گیا تھا، اسی سلسلہ میں دو لڑکے پیدا ہوئے، ایک کا نام ہابیل رکھا اور دوسرے کا نام قابیل، ہابیل نے کسی بات پر اپنے بھائی قابیل سے اختلاف کیا، آدم علیہ السلام نے سمجھایا مگر اس نے نہ مانا، آخرکار آدم علیہ السلام نے یہ فیصلہ کیا کہ دونوں اللہ کے نام کی نیاز کرو، جس کی نیاز قبول ہوجائے گی فیصلہ اس کے حق میں ہوجائے گا، غرض ہابیل کی نیاز مقبول ہوئی کہ اس کو آسمان سے ایک آگ آ کر کھا گئی، قابیل ہار کر اس کی جان کا دشمن ہوا، موقع پا کر اس کو مار ڈالا۔

اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ: اس میں دلالت ہے کہ اپنے کسی دینی کمال کا اظہار کرنا شکر گذاری کے طور پر جائز ہے، فخر نہ ہو۔

* * *

فائدہ: ۱۔ نَبَاَ ابْنَيْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ: یعنی آدم کے دو صلبی بیٹوں قابیل و ہابیل کا قصہ ان کو سناؤ، کیونکہ اس قصہ میں ایک بھائی کے دوسرے بھائی کی مقبولیت اور تقویٰ پر حسد کرنے اور اسی غیظ میں اس کو ناحق قتل کر ڈالنے کا ذکر ہے اور ناحق خون کرنے کی عواقب بیان کئے ہیں، پچھلے رکوع میں یہ بتلایا تھا کہ بنی اسرائیل کو جب یہ حکم دیا گیا کہ ظالموں اور جابروں سے قتال کرو تو خوف زدہ ہو کر بھاگنے لگے، اب ہابیل و قابیل کا قصہ سنانا اس کی تمہید ہے کہ متقی اور مقبول بندوں کا قتل جو شدید ترین جرائم میں سے ہے اور جس سے ان لوگوں کو بے انتہا تہدید و تشدید کے ساتھ منع کیا گیا تھا اس کے لئے یہ ملعون ہمیشہ کیسے مستعد اور تیار نظر آتے ہیں، پہلے بھی کتنے نبیوں کو قتل کیا اور آج بھی خدا کے سب سے بڑے پیغمبر کے خلاف از راہ بغض و حسد کیسے کیسے منصوبے گانٹھتے رہتے ہیں، گویا ظالموں اور شریروں کے مقابلہ سے جان چرانا اور بے گناہ معصوم بندوں کے خلاف قتل و آسر کی سازشیں کرنا، یہ اس قوم کا شیوہ رہا ہے اور اس پر نحن ابنآء اللہ واحبآؤہ کا دعویٰ بھی رکھتے ہیں، اس تقریر کے موافق قابیل و ہابیل کا قصہ، پھر اس پر مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ کی تفریع، یہ سب تمہید ہوگی اس مضمون کی جو اس قصہ اور تفریع کے ختم پر فرمایا: وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ فِي الْاَرْضِ لَمُسْرِفُوْنَ (المائدہ: ۳۲)

فائدہ: ۲۔ وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ: یعنی آدم علیہ السلام دستور کے موافق جو لڑکی ہابیل کے نکاح میں دینا چاہتے تھے قابیل اس کا طلب گار ہوا، آخر حضرت آدم علیہ السلام کے اشارہ سے دونوں نے خدا کے لئے کچھ نیاز کی کہ جس کی نیاز مقبول ہوجائے لڑکی اسی کو دے دی جائے، آدم علیہ السلام کو غالباً یہ یقین تھا کہ ہابیل ہی کی نیاز مقبول ہوگی، چنانچہ ایسا ہی ہوا، آتش آسمانی ظاہر ہوئی اور ہابیل کی نیاز کو کھا گئی، یہی علامت اس وقت قبول عند اللہ کی تھی۔

فائدہ: ۳۔ قَالَ لَاَقْتُلَنَّكَ: قابیل یہ دیکھ کر آتش حسد میں جلنے لگا اور بجائے اس کے کہ مقبولیت کے وسائل اختیار کرتا غیظ و غضب میں اپنے حقیقی بھائی کو قتل کی دھمکیاں دینے لگا۔

فائدہ: ۴۔ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ: یعنی ہابیل نے کہا کہ میرا اس میں کیا قصور ہے خدا کے یہاں کسی کی زبردستی نہیں چلتی، تقویٰ چلتا ہے، گویا میری نیاز جو قبول کرلی گئی اس کا سبب تقویٰ ہے تو بھی اگر تقویٰ اختیار کرلے تو خدا کو تجھ سے کوئی ضد نہیں۔

لَئِنْۢ بَسَطْتَّ اِلَيَّ يَدَكَ لِتَقْتُلَنِيْ مَآ اَنَا بِبَاسِطٍ يَّدِيَ اِلَيْكَ لِاَقْتُلَكَ ۚ اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ

اگر تو ہاتھ چلائے گا مجھ پر مارنے میں نہ ہاتھ چلاؤں گا تجھ پر مارنے کو ۱۔ میں ڈرتا ہوں اللہ سے

رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۸﴾

جو پروردگار ہے سب جہان کا ۲۔

خلاصہ تفسیر: (لیکن اگر پھر بھی تیرا یہی ارادہ ہے تو تو جان، میں نے تو پختہ قصد کرلیا ہے) اگر تو مجھ پر میرے قتل کرنے کے لئے

دست درازی کرے تو تب بھی میں تجھ پر تیرے قتل کرنے کے لئے ہرگز دست درازی کرنے والا نہیں (کیونکہ) میں تو خدائے پروردگار عالم سے ڈرتا ہوں (کہ باوجودیکہ تیرے قتل کے جواز کا بظاہر ایک سبب موجود ہے، کیونکہ تو مجھ کو قتل کرنا چاہتا ہے، مگر اس وجہ سے کہ یہ جواز اب تک کسی صریح حکم سے مجھے ثابت نہیں ہوا اس لئے اس کے ارتکاب کو احتیاط کے خلاف سمجھتا ہوں، اور اس شبہ کی وجہ سے خدا سے ڈرتا ہوں، اور یہ ہمت تجھی کو ہے کہ باوجودیکہ میرے قتل کے جواز کا کوئی تقاضا نہیں بلکہ مانع موجود ہے، لیکن پھر بھی خدا سے نہیں ڈرتا)۔

لَئِنۡ بَسَطۡتَّ اِلَیَّ یَدَكَ لِتَقۡتُلَنِیۡ: چونکہ یہ واقعہ اس زمانے کا ہے جب کہ مدافعۃً قتل کرنے کی اجازت نازل نہیں ہوئی تھی لیکن ہابیل نے جواباً اپنے بھائی کے قتل سے احتیاط برتی، معلوم ہوا کہ شبہات سے احتیاط کرنا چاہیے۔

* * *

فائدہ: ۱ حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ: "اگر کوئی ناحق کسی کو مارنے لگے اس کو رخصت ہے کہ ظالم کو مارے اور اگر صبر کرے تو شہادت کا درجہ ہے"، اور یہ حکم اپنے مسلمان بھائی کے مقابلہ میں ہے ورنہ جہاں انتقام و مدافعت میں شرعی مصلحت و ضرورت ہو وہاں ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ رہنا جائز نہیں، مثلاً کافروں یا باغیوں سے قتال کرنا وَالَّذِیۡنَ اِذَاۤ اَصَابَهُمُ الۡبَغۡیُ هُمۡ یَنۡتَصِرُوۡنَ (الشوریٰ:۳۹)۔

فائدہ: ۲ یعنی میں تجھ سے ڈر کر نہیں، بلکہ خدا سے ڈر کر یہ چاہتا ہوں کہ جہاں تک شرعاً گنجائش ہے بھائی کے خون میں اپنے ہاتھ رنگین نہ کروں، ایوب سختیانیؒ فرماتے تھے کہ امت محمدیہ میں سے پہلا شخص جس نے اس آیت پر عمل کر کے دکھلایا حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ ہے (ابن کثیر) جنہوں نے اپنا گلا کٹوا دیا لیکن اپنی رضا سے کسی مسلمان کی انگلی نہ کٹنے دی۔

اِنِّیۡۤ اُرِیۡدُ اَنۡ تَبُوۡٓاَ بِاِثۡمِیۡ وَاِثۡمِكَ فَتَكُوۡنَ مِنۡ اَصۡحٰبِ النَّارِ ۚ وَذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۲۹﴾

میں چاہتا ہوں کہ تو حاصل کرے میرا گناہ اور اپنا گناہ ۱ پھر ہو جائے تو دوزخ والوں میں اور یہی ہے سزا ظالموں کی ۲

خلاصہ تفسیر: میں یوں چاہتا ہوں کہ (مجھ سے کوئی گناہ کا کام نہ ہو اگرچہ تو مجھ پر کتنا ہی ظلم کیوں نہ کرے جس سے کہ) تو میرے گناہ اور اپنے گناہ سب اپنے سر رکھ لے، پھر تو دوزخیوں میں شامل ہو جائے اور یہی سزا ہوتی ہے ظلم کرنے والوں کی (کیونکہ مظلوم کے گناہ ظالم کے سر ڈالے جاتے ہیں)۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی میرے قتل کا گناہ بھی اپنے دوسرے گناہوں کے ساتھ حاصل کرلے، ابن جریرؒ نے مفسرین کا اجماع نقل کیا ہے کہ باثمی کے معنی یہی ہیں، باقی جنہوں نے یہ لکھا ہے کہ قیامت میں مظلوم کے گناہ ظالم پر ڈالے جائیں گے وہ مضمون بھی ایک حیثیت سے صحیح ہے، مگر محققین کے نزدیک وہ اس آیت کی تفسیر نہیں۔

اب ہابیل کے کلام کا حاصل یہ ہوا کہ اگر تو نے یہ ہی ٹھان لی ہے کہ میرے قتل کا وبال اپنے سر رکھے تو میں نے بھی ارادہ کرلیا ہے کہ کوئی مدافعت اپنی جانب سے نہ کروں حتیٰ کہ ترک عزیمت کا حرف بھی مجھ پر نہ آنے پائے۔

فائدہ: ۲ یعنی تیرے عمر بھر کے گناہ تجھ پر ثابت رہیں اور میرے خون کا گناہ چڑھے اور مظلومیت کی وجہ سے میرے گناہ اتریں (موضح القرآن)۔

فَطَوَّعَتۡ لَهٗ نَفۡسُهٗ قَتۡلَ اَخِیۡهِ فَقَتَلَهٗ فَاَصۡبَحَ مِنَ الۡخٰسِرِیۡنَ ﴿۳۰﴾

پھر اس کو راضی کیا اس کے نفس نے خون پر اپنے بھائی کے ۱ پھر اس کو مار ڈالا سو ہو گیا نقصان اٹھانے والوں میں ۲

خلاصہ تفسیر: سو (یوں تو پہلے ہی سے قتل کا ارادہ کر چکا تھا، یہ جو سنا کہ مدافعت بھی نہ کرے گا، چاہیے تو تھا کہ نرم دل ہو جاتا مگر بے فکر ہو کر اور بھی) اس کے جی نے اس کو اپنے بھائی کے قتل پر آمادہ کر دیا (پھر) آخر اس کو قتل ہی کر ڈالا جس سے (کمبخت) بڑے نقصان اٹھانے

والوں میں شامل ہو گیا (دنیا میں تو یہ نقصان کہ اپنا قوت بازو اور راحت روح گم کر بیٹھا اور آخرت میں یہ نقصان کہ سخت عذاب میں مبتلا ہوگا)۔

* * *

فائدہ: ؁ شاید ابتدا میں کچھ جھجک ہوگی شدہ شدہ نفس امارہ نے خیال پختہ کر دیا اور یہی کیفیت عموماً معاصی کی ابتدا میں ہوتی ہے۔

فائدہ: ؂ ''دنیاوی خسران'' تو یہ کہ ایسا نیک بھائی جو قوت بازو بنا ہاتھ سے کھویا اور خود پاگل ہو کر مرا، حدیث میں ہے کہ ''ظلم'' اور ''قطع رحم'' دو گناہ ایسے ہیں جن کی سزا آخرت سے پہلے یہاں بھی ملتی ہے، اور ''اخروی خسران'' یہ کہ ظلم، قطع رحم، قتل عمد اور بدامنی کا دروازہ دنیا میں کھول دینے سے ان سب گناہوں کی سزا کا مستوجب ہوا اور آئندہ بھی جتنے اس نوعیت کے گناہ دنیا میں کئے جائیں گے سب میں بانی ہونے کی وجہ سے اس کی شرکت رہی جیسا کہ حدیث میں مصرح ہے۔

فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا يَّبْحَثُ فِي الْاَرْضِ لِيُرِيَهٗ كَيْفَ يُوَارِيْ سَوْءَةَ اَخِيْهِ ؕ قَالَ يٰوَيْلَتٰۤى اَعَجَزْتُ

پھر بھیجا اللہ نے ایک کوا جو کریدتا تھا زمین کو تا کہ اس کو دکھلائے کس طرح چھپاتا ہے لاش اپنے بھائی کی، بولا اے افسوس مجھ سے اتنا نہ ہو سکا

اَنْ اَكُوْنَ مِثْلَ هٰذَا الْغُرَابِ فَاُوَارِيَ سَوْءَةَ اَخِيْ ۚ فَاَصْبَحَ مِنَ النّٰدِمِيْنَ ﴿۳۱﴾

کہ ہوں برابر اس کوے کی کہ میں چھپاؤں لاش اپنے بھائی کی ؁ پھر لگا پچھتانے ؂

خلاصہ تفسیر: (اب جب قتل سے فارغ ہوا تو اب حیران ہے کہ لاش کو کیا کروں؟ جس سے یہ راز پوشیدہ رہے کچھ سمجھ میں نہ آیا تو) پھر (آخر) اللہ تعالیٰ نے ایک کوا (وہاں) بھیجا کہ وہ (چونچ اور پنجوں سے) زمین کو کھودتا تھا (اور کھود کر ایک دوسرے کوے کو کہ وہ مرا ہوا تھا اس گڑھے میں دھکیل کر اس پر مٹی ڈالتا تھا) تا کہ وہ (کوا) اس (قابیل) کو تعلیم کر دے کہ اپنے بھائی (ہابیل) کی لاش کو کس طریقہ سے چھپائے (قابیل یہ واقعہ دیکھ کر اپنے جی میں بڑا ذلیل ہوا کہ مجھ کو کوے کے برابر بھی فہم نہیں، اور انتہائی حسرت سے) کہنے لگا کہ افسوس میری حالت پر، کیا میں اس سے بھی گیا گزرا کہ اس کوے ہی کے برابر ہوتا اور اپنے بھائی کی لاش کو چھپا دیتا (سو اس بدحالی پر) بڑا شرمندہ ہوا۔

فَاَصْبَحَ مِنَ النّٰدِمِيْنَ: قابیل کی یہ ندامت قتل پر نہ تھی کہ توبہ کا شبہ ہو، بلکہ قتل پر جو نقصانات پیش آئے جیسے لاش کے دفن میں حیران رہنا، کوے کی تعلیم کا محتاج ہونا، بدن کا سیاہ ہونا، بدحواس ہو جانا اور آدم علیہ السلام کا ناراض ہو جانا وغیرہ اس پر نادم ہوا، احقر کہتا ہے کہ اگر قتل ہی پر ندامت ہو تب بھی توبہ کا شبہ نہیں ہو سکتا، کیونکہ ہر ندامت توبہ نہیں ہو سکتی، کیونکہ توبہ کی حقیقت میں ندامت و شرمندگی کے ساتھ معذرت اور تدارک کی فکر بھی شامل ہوتی ہے جو کہ قابیل سے ثابت نہیں، سو قابیل کی یہ ندامت طبعی تھی جو عقل سے پیدا ہو جاتی ہے، اس میں شرع اور تقویٰ کا کچھ دخل نہیں۔

* * *

فائدہ: ؁ چونکہ اس سے پہلے کوئی انسان مرا نہ تھا اس لئے قتل کے بعد اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ لاش کو کیا کرے، آخر ایک کوے کو دیکھا کہ زمین کرید رہا ہے یا دوسرے مردہ کوے کو مٹی ہٹا کر زمین میں چھپا رہا ہے اسے دیکھ کر کچھ عقل آئی کہ میں بھی اپنے بھائی کی لاش کو دفن کر دوں اور افسوس بھی ہوا کہ میں عقل و فہم اور بھائی کی ہمدردی میں اس جانور سے بھی گیا گزرا ہوا شاید اسی لئے حق تعالیٰ نے ایک ادنیٰ جانور کے ذریعہ سے اسے تنبیہ فرمائی کہ وہ اپنی وحشت اور حماقت پر کچھ شرمائے جانوروں میں کوے کی یہ خصوصیت ہے کہ اپنے بھائی کی لاش کو کھلا چھوڑ دینے پر بہت شور مچاتا ہے۔

فائدہ: ؂ پچھتانا وہ نافع ہے جس کے ساتھ گناہ سے معذرت و انکسار اور فکر و تدارک بھی ہو، اس موقع پر اس کا پچھتانا حق تعالیٰ کے عصیان پر نہیں بلکہ اپنی بدحالی پر تھا جو قتل کے بعد اسے لاحق ہوئی۔

مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ ۛ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا بِغَیْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ

اسی سبب سے لکھا ہم نے ۱ بنی اسرائیل پر کہ جو کوئی قتل کرے ایک جان کو بلا عوض جان کے یا بغیر فساد کرنے کے

فِی الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِیْعًا ؕ وَمَنْ اَحْیَاهَا فَكَاَنَّمَاۤ اَحْیَا النَّاسَ جَمِیْعًا ؕ

ملک میں ۲ تو گویا قتل کر ڈالا اس نے سب لوگوں کو، اور جس نے زندہ رکھا ایک جان کو تو گویا زندہ کر دیا سب لوگوں کو ۳

وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا بِالْبَیِّنٰتِ ؗ ثُمَّ اِنَّ كَثِیْرًا مِّنْهُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ فِی الْاَرْضِ لَمُسْرِفُوْنَ ﴿۳۲﴾

اور لا چکے ہیں ان کے پاس رسول ہمارے کھلے ہوئے حکم ۴ پھر بہت لوگ ان میں سے اس پر بھی ملک میں دست درازی کرتے ہیں ۵

خلاصہ تفسیر: گذشتہ قصہ سے ایک تو یہ بات معلوم ہوئی کہ قابیل باوجودیکہ نبی زادہ تھا مگر یہ نسبت اس کے کچھ کام نہ آئی، اس اعتبار سے تو یہ قصہ ماقبل کے مضمون: نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ کی دلیل ہے کہ بزرگوں اور پیغمبروں کی نسبت پر فقط قناعت کر لینا بیہودہ بات ہے، دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ ناحق خون کرنا بڑا جرم ہے جس سے قابیل کیسے کیسے نقصانات میں مبتلا ہوا، اب اس کی مناسبت سے آئندہ ایک مضمون بیان فرماتے ہیں جس کا حاصل یہ ہے کہ ناحق قتل کرنا نہایت مضر چیز ہے، اس لیے ہم نے اس کی ممانعت تمام شریعتوں میں بہت اہتمام سے کی ہے۔

اسی (واقعہ کی) وجہ سے (جس سے قتل ناحق کے مفاسد بخوبی ثابت ہو گئے) ہم نے (تمام مکلفین پر عموماً اور) بنی اسرائیل پر (خصوصاً) یہ (حکم) لکھ دیا (یعنی مقرر کر دیا) کہ (قتل ناحق اتنا بڑا گناہ ہے کہ) جو شخص کسی شخص کو بلا معاوضہ دوسرے شخص کے (جو ناحق مقتول ہوا ہو) یا بدون کسی (شرو) فساد کے جو زمین میں اس سے پھیلا ہو (خواہ مخواہ) قتل کر ڈالے تو (اس کو بعض اعتبار سے ایسا گناہ ہوگا کہ) گویا اس نے تمام آدمیوں کو قتل کر ڈالا (وہ بعض اعتبار یہ ہے کہ گناہ پر جرأت کی، خدائے تعالیٰ کی نافرمانی کی، خدائے تعالیٰ اس سے ناراض ہوئے، دنیا میں مستحق قصاص ہوا، آخرت میں مستحق دوزخ ہوا، یہ باتیں ایک کے اور ہزار کے قتل کرنے میں مشترک ہیں) اور (ہم نے یہ بھی لکھ دیا تھا کہ جیسا ناحق قتل کرنا گناہ عظیم ہے، اسی طرح کسی کو ناحق قتل سے بچا لینے میں ثواب بھی بہت بڑا ہے کہ) جو شخص کسی شخص کو بچا لے تو (اس کو ایسا ثواب ملے گا کہ) گویا اس نے تمام آدمیوں کو بچا لیا (''ناحق'' کی قید یہاں اس لئے لگائی کہ جس شخص کا قتل شرعاً واجب ہو مثلاً قصاص میں تو اس کی مدد یا سفارش حرام ہے، اور اس سے بھی ناحق قتل کرنے کی برائی خوب ظاہر ہو گئی کہ جب کسی کی زندگی کو بچانا ایسا محمود ہے تو ضرور قتل مذموم ہوگا)۔

اور بنی اسرائیل کے پاس (اس مضمون کے لکھ دینے کے بعد) ہمارے بہت سے پیغمبر بھی دلائل واضح (نبوت کے) لے کر آئے (اور وقتاً فوقتاً اس مضمون کی تاکید کرتے رہے) مگر پھر اس (تاکید و اہتمام) کے بعد بھی بہتیرے ان میں سے دنیا میں زیادتی کرنے والے ہی رہے (اور ان پر کچھ اثر نہ ہوا حتیٰ کہ بعض نے خود انبیاء ہی کو قتل کر دیا)۔

مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا بِغَیْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ: یعنی جو کوئی قتل کرے ایک جان کو بلا عوض جان کے یا بغیر فساد کرنے کے، یہ دو قیدیں اس لئے لگائیں کہ قصاص میں قتل کرنا جائز ہے، اسی طرح دیگر بعض وجوہ سے بھی قتل جائز ہے جس میں سے ڈاکہ زنی جس کا ذکر آگے آتا ہے، اور کافر حربی کے قتل کا حکم جہاد کے بیان میں آ چکا ہے، ان وجوہ قتل کرنا جائز بلکہ بعض صورتوں میں واجب ہے۔

فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِیْعًا: اس پر اشکال پیدا ہوتا ہے کہ ایک فرد کا قاتل اور ساری نوع انسانیت کا قاتل برابر کیسے ہو سکتے ہیں؟ یہ اشکال لفظ فکانما پر غور کرنے سے جاتا رہتا ہے، یہ ارشاد ہرگز نہیں ہو رہا کہ ایک کا قاتل اور سب کا قاتل قانون کی نظر میں یکساں ہوگا، قانون، عدالت، ضابطہ کی نظر میں دونوں کی مساوات کا یہاں مطلق ذکر نہیں، مقصود قاتل کی فطرت پر روشنی ڈالنا ہے، جو ظالم و فاجر ایک شخص کی بھی جان بلا وجہ اور

بے قصور لے ڈالنے میں نہیں ہچکچاتا، اس کی جسارت اور خبث نفس سے بعید کیا ہے، جو وہ چاہے تو سارے انسانوں کو تہ تیغ کر کے رکھ دے، اصل شے تو اس کی نظر میں قانون شریعت کی بے وقاری اور اس کے خلاف ورزی پر اس کی دلیری ہے، حدیث نبوی میں بھی یہ مضمون ایک جگہ آیا ہے کہ روئے زمین پر جو بھی قتل ناحق ہوتا ہے، اس کے وبال کا ایک حصہ قابیل کے نامہ اعمال میں لکھ دیا جاتا ہے کہ ظلم وستم کا بانی اول تو وہی ہے۔

وَمَنۡ اَحۡیَاهَا فَكَاَنَّمَاۤ اَحۡیَا النَّاسَ جَمِیۡعًا: اس کے مضمون سے شبہ ہوتا ہے کہ ایک کا بچانے والا اور ہزار کا بچانے والا برابر ہوا؟ جواب یہ ہے کہ جب ایک کے بچانے والے کو تمام عالم کے بچانے والے کا ثواب ملتا ہے تو ممکن ہے کہ ہزار کے بچانے والے کو ہزار مرتبہ تمام عالم کے بچانے کا ثواب ملے، کیونکہ نیکی کے بڑھنے سے کوئی دلیل مانع نہیں، ہاں! شرعاً گناہ میں زیادتی نہیں ہوسکتی، جتنا جرم ہوگا اتنا ہی گناہ ہوگا، اسی لیے اوپر جو کہا گیا تھا کہ ایک کا خون کرنا گویا تمام عالم کا خون کرنا ہے، وہاں بتلا دیا گیا کہ یہ بعض اعتبارات کی بنا پر فرمایا گیا ہے، ورنہ گناہ دونوں کا شرعاً برابر نہیں ہوسکتا، اور یہاں یہ کہنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ ایک شخص کے بچانے والے کو اگر تمام عالم کے بچانے کا ثواب مل جائے تو اس میں کیا حرج ہے، یہ خدا کا فضل ہے جس میں کوئی کمی نہیں۔

* * *

فائدہ: ۱ مِنۡ اَجۡلِ ذٰلِكَ: یعنی ناحق قتل میں جو دنیاوی اور اخروی خسران ہے اور جو بدنتائج اس پر مرتب ہوتے ہیں حتیٰ کہ خود قاتل بھی اس حرکت کے بعد بسا اوقات پچھتاتا اور کف افسوس ملتا ہے، اسی سبب سے ہم نے بنی اسرائیل کو یہ ہدایت کی۔ الخ۔

فائدہ: ۲ اَوۡ فَسَادٍ فِی الۡاَرۡضِ: ملک میں فساد کرنے کی بہت سی صورتیں ہیں، مثلاً اہل حق کو دین حق سے روکے یا پیغمبروں کی اہانت کرے یا العیاذ باللہ مرتد ہو کر اپنے وجود سے دوسروں کو مرتد ہونے کی ترغیب دے، وقس علیٰ ذلک۔

فائدہ: ۳ فَكَاَنَّمَاۤ اَحۡیَا النَّاسَ جَمِیۡعًا: یعنی اوّل روئے زمین پر بڑا گناہ یہی ہوا کہ قابیل نے ہابیل کو قتل کیا اس کے بعد رسم پڑ گئی، اسی سبب سے تورات میں اس طرح فرمایا کہ ''ایک کو مارا جیسے سب کو مارا'' یعنی ایک کے ناحق خون کرنے سے دوسرے بھی اس جرم پر دلیر ہوتے ہیں تو اس حیثیت سے جو شخص ایک کو قتل کر کے بدامنی کی جڑ قائم کرتا ہے گویا وہ سب انسانوں کو قتل اور عام بدامنی کا دروازہ کھول رہا ہے اور جو کسی ایک کو زندہ کرتا یعنی کسی کو ظالم قاتل کے ہاتھ سے بچاتا ہے گویا وہ اپنے عمل سے سارے انسانوں کو بچانے اور مامون کرنے کی دعوت دے رہا ہے۔

فائدہ: ۴ وَلَقَدۡ جَآءَتۡهُمۡ رُسُلُنَا بِالۡبَیِّنٰتِ: مترجم رحمہ اللہ نے ''بینات'' سے کھلے ہوئے حکم مراد لئے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ ''بینات'' سے وہ کھلے کھلے نشان مراد لئے جائیں جن سے کسی پیغمبر کے من عند اللہ ہونے کی تصدیق ہوتی ہو۔

فائدہ: ۵ بَعۡدَ ذٰلِكَ فِی الۡاَرۡضِ لَمُسۡرِفُوۡنَ: یعنی ''بنی اسرائیل'' کے بہت سے لوگ ایسے کھلے نشان دیکھ کر اور ایسے کھلے احکام سن کر بھی اپنے ظلم وطغیان اور دست درازیوں سے باز نہ آئے، انبیائے معصومین کو قتل اور آپس میں ناحق خون کرنا ان کا ہمیشہ سے وتیرہ رہا ہے اور آج بھی خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے (معاذ اللہ) قتل یا ایذاء رسانی اور مسلمانوں کی تذلیل کے لئے ہر قسم کی ناپاک سازشیں کرتے رہتے ہیں اور اتنا نہیں سمجھتے کہ جب حکم تورات کے موافق کیف ما اتفق کسی ایک آدمی کا ناحق مار ڈالنا اتنا بڑا جرم ہے کہ گویا اس کا قاتل تمام دنیا کے انسانوں کا قاتل ہے تو دنیا کے سب سے زیادہ کامل واکمل انسان اور سب سے زیادہ مقبول ومقدس جماعت کے قتل وایذاء رسانی کے درپے ہونا اور ان سے لڑائی اور مقابلہ کے لئے کمر باندھنا خدا کے نزدیک کتنا بھاری جرم ہوگا، خدا کے سفراء سے لڑائی تو درحقیقت خدا ہی سے لڑائی کرنا ہے۔

ربط: شاید اسی لئے اگلی آیت میں ان لوگوں کی دنیاوی اور اخروی سزا کا ذکر کیا گیا ہے جو خدا اور پیغمبر سے لڑائی کرتے ہیں یا دنیا میں طرح طرح کے فساد پھیلا کر مسرفون فی الارض کے مصداق بنتے ہیں۔

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیۡنَ یُحَارِبُوۡنَ اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ وَیَسۡعَوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ فَسَادًا اَنۡ یُّقَتَّلُوۡۤا

یہی سزا ہے ان کی جو لڑائی کرتے ہیں اللہ سے اور اس کے رسول سے اور دوڑتے ہیں ملک میں فساد کرنے کو ۱ کہ ان کو قتل کیا جائے

اَوۡ يُصَلَّبُوۡۤا اَوۡ تُقَطَّعَ اَيۡدِيۡهِمۡ وَاَرۡجُلُهُمۡ مِّنۡ خِلَافٍ اَوۡ يُنۡفَوۡا مِنَ الۡاَرۡضِ ؕ ذٰلِكَ لَهُمۡ

یا سولی چڑھائے جائیں یا کاٹے جائیں ان کے ہاتھ اور پاؤں مخالف جانب سے ۲ یا دور کر دیے جائیں اس جگہ سے ۳ یہ ان کی

خِزۡىٌ فِى الدُّنۡيَا وَلَهُمۡ فِى الۡاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيۡمٌ ۝۳۳

رسوائی ہے دنیا میں اور ان کے لیے آخرت میں بڑا عذاب ہے ۴

خلاصہ تفسیر: پیچھے قتل ناحق کی برائی اور ممانعت بیان فرمائی تھی، اب یہ بتلاتے ہیں کہ فساد پھیلانے اور جرم کرنے والوں کو قتل کرنا یا سزا دینا جائز ہے، بلکہ شریعت میں مطلوب ہے، اس لیے مذکورہ آیت میں اور اس کے بعد قتل وغارت گری، ڈاکہ زنی اور چوری کی شرعی سزاؤں کا بیان ہے، درمیان میں بعض مضامین خاص مناسبت سے لائے گئے ہیں۔

جو لوگ اللہ تعالیٰ سے اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) سے لڑتے ہیں اور (اس لڑنے کا مطلب یہ ہے کہ) ملک میں فساد (یعنی بدامنی) پھیلاتے پھرتے ہیں (اس سے مراد رہزنی یعنی ڈاکہ ڈالنا ہے ایسے شخص کی جان و مال پر جس کو قانون شرعی سے۔جس کا اظہار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے ہوا ہے۔امن دیا گیا ہو، یعنی مسلمان اور ذمی پر، اور اسی لئے اس کو اللہ اور رسول سے لڑنا کہا گیا ہے، کیونکہ اس نے اللہ کے دیئے ہوئے امن کو توڑا، اور چونکہ احکام خداوندی کا ظہور رسول کے ذریعہ سے ہوتا ہے، اس لئے رسول کا تعلق بھی بڑھا دیا، غرض جو لوگ ایسی حرکت کرتے ہیں) ان کی یہی سزا ہے کہ (۱ ایک حالت میں تو) قتل کئے جائیں (یہ اس صورت میں جبکہ ان رہزنوں نے صرف قتل کیا ہو اور مال لینے کی نوبت نہ آئی ہو) یا (اگر ۲ دوسری حالت ہوئی ہو تو) سولی دیئے جائیں (یہ وہ صورت ہے جبکہ انہوں نے مال بھی لیا ہو اور قتل بھی کیا ہو) یا (اگر ۳ تیسری حالت ہوئی ہو تو) ان کے ہاتھ اور پاؤں مخالف جانب سے (یعنی داہنا ہاتھ بایاں پاؤں) کاٹ دیئے جائیں (یہ وہ صورت ہے کہ صرف مال لیا قتل نہ کیا ہو) یا (اگر ۴ چوتھی حالت ہوئی ہو تو) زمین پر (آزادانہ آباد رہنے) سے نکال (کر جیل میں بھیج) دیئے جائیں (یہ حکم اس صورت میں ہے کہ نہ مال لیا ہو نہ قتل کیا ہو، بلکہ ڈاکہ ڈالنے کا قصد کیا تھا کہ اس کے بعد ہی گرفتار ہو گئے ہوں) یہ (مذکورہ سزائیں تو) ان کے لئے دنیا میں سخت رسوائی (اور ذلت) ہے، اور ان کو آخرت میں (جو) عذاب عظیم ہوگا (سو الگ)۔

ان چاروں صورتوں کی سزائیں حق اللہ ہیں اور حدود ہیں، اگر مال کا مالک یا مقتول کا ولی معاف بھی کر دے تو معاف نہیں ہو سکتیں۔

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيۡنَ يُحَارِبُوۡنَ اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ: یہاں رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے ساتھ لڑائی کو اللہ کے ساتھ لڑائی فرمانے سے اس بات پر دلالت ہوئی کہ اہل اللہ یعنی اللہ والوں کے ساتھ ایسا معاملہ کرنا گویا اللہ تعالیٰ کے ساتھ کرنا ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ وَيَسۡعَوۡنَ فِى الۡاَرۡضِ فَسَادًا: یعنی بدامنی کرنے کو اکثر مفسرین نے اس جگہ رہزنی اور ڈکیتی مراد لی ہے مگر الفاظ کو عموم پر رکھا جائے تو مضمون زیادہ وسیع ہو جاتا ہے آیت کا جو شان نزول احادیث صحیحہ میں بیان ہوا وہ بھی اسی کو مقتضی ہے کہ الفاظ کو ان کے عموم پر رکھا جائے "اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرنا" یا "زمین میں فساد اور بدامنی پھیلانا" یہ دو لفظ ایسے ہیں جن میں کفار کے حملے ارتداد کا فتنہ، رہزنی، ڈکیتی، ناحق قتل و نہب، مجرمانہ سازشیں اور مغویانہ پروپیگنڈا سب داخل ہو سکتے ہیں اور ان میں سے ہر جرم ایسا ہے جس کا ارتکاب کرنے والا ان چار سزاؤں میں سے جو آگے مذکور ہیں کسی نہ کسی سزا کا ضرور مستحق ٹھہرتا ہے۔

فائدہ: ۲ اَوۡ تُقَطَّعَ اَيۡدِيۡهِمۡ وَاَرۡجُلُهُمۡ مِّنۡ خِلَافٍ: یعنی داہنا ہاتھ اور بایاں پاؤں۔

فائدہ: ۳ اَوۡ يُنۡفَوۡا مِنَ الۡاَرۡضِ: کہیں اور لے جا کر انہیں قید کر دیں کما ھو مذھب الامام ابی حنیفہ رحمہ اللہ۔

فائدہ: وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ: ڈاکوؤں کے احوال چار ہو سکتے تھے: ① قتل کیا ہو مگر مال لینے کی نوبت نہ آئی۔ ② قتل بھی کیا اور مال بھی لیا ③ مال چھین لیا مگر قتل نہیں کیا ④ نہ مال چھین سکے نہ قتل کر سکے قصد اور تیاری کرنے کے بعد ہی گرفتار ہو گئے۔

چاروں حالتوں میں بالترتیب یہ ہی چار سزائیں ہیں جو بیان ہوئیں۔

اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهِمْ ۚ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۳۴﴾

مگر جنہوں نے توبہ کی تمہارے قابو پانے سے پہلے، تو جان لو کہ اللہ بخشنے والا مہربان ہے

خلاصہ تفسیر: ہاں! مگر جو لوگ قبل اس کے کہ تم ان کو گرفتار کرو توبہ کر لیں تو (اس حالت میں) جان لو کہ بیشک اللہ تعالیٰ (اپنے حقوق) بخش دیں گے (اور توبہ قبول کرنے میں) مہربانی فرما دیں گے۔

مطلب یہ کہ پیچھے جو سزائیں مذکور ہوئی ہے، وہ حد اور حق اللہ کے طور پر ہے جو کہ بندہ کے معاف کرنے سے معاف نہیں ہوتی، سو اگر گرفتاری سے قبل ان لوگوں کا تائب ہونا ثابت ہو جائے تو حد ساقط ہو جائے گی جو کہ حق اللہ تھا، البتہ حق العبد باقی رہے گا، پس اگر مال لیا ہوگا تو اس کا ضمان دینا ہوگا، اور اگر قتل کیا ہوگا تو اس کا قصاص لیا جائے گا، لیکن اس ضمان و قصاص کے معاف کرنے کا حق صاحب مال اور مقتول کے ولی کو حاصل ہوگا۔

جرم و سزا کے چند شرعی ضابطے: ڈاکہ اور چوری کی شرعی سزائیں جن کا ذکر آیات مذکورہ میں ہے ان سزاؤں سے متعلق شرعی اصطلاحات کی کچھ وضاحت کر دی جائے جن سے ناواقفیت کی وجہ سے بہت سے لکھے پڑھے لوگوں کو بھی اشکالات پیش آتے ہیں، دنیا کے عام قوانین میں جرائم کی تمام سزاؤں کو مطلقاً تعزیرات پاکستان کا نام دیا جاتا ہے، خواہ وہ کسی جرم سے متعلق ہو، تعزیرات ہند، تعزیرات پاکستان وغیرہ کے ناموں سے جو کتابیں شائع ہو رہی ہیں، وہ ہر قسم کے جرائم اور ہر طرح کی سزاؤں پر مشتمل ہیں، لیکن شریعت اسلام میں معاملہ ایسا نہیں، بلکہ جرائم کی سزاؤں کی تین قسمیں قرار دی گئیں: ① حدود ② قصاص ③ تعزیرات۔

ان تینوں قسموں کی تعریف اور مفہوم سمجھنے سے پہلے ایک یہ بات جان لینا ضروری ہے کہ جن جرائم سے کسی دوسرے انسان کو تکلیف یا نقصان پہنچتا ہے اس میں مخلوق پر بھی ظلم ہوتا ہے اور خالق کی بھی نافرمانی ہوتی ہے، اس لئے ہر ایسے جرم میں حق اللہ اور حق العبد دونوں شامل ہوتے ہیں، اور انسان دونوں کا مجرم بنتا ہے، لیکن بعض جرائم میں حق العبد کی حیثیت کو زیادہ اہمیت حاصل ہے اور بعض میں حق اللہ کی حیثیت زیادہ نمایاں ہے، اور احکام میں مدار کار اسی غالب حیثیت پر رکھا گیا ہے، دوسری بات یہ جاننا ضروری ہے کہ شریعت اسلام نے خاص خاص جرائم کے علاوہ باقی جرائم کی سزاؤں کے لئے کوئی پیمانہ متعین نہیں کیا، بلکہ قاضی کے اختیار میں دیا ہے کہ ہر زمانہ اور ہر مکان اور ہر ماحول کے لحاظ سے جیسی اور جتنی سزا انسداد جرم کے لئے ضروری سمجھے وہ جاری کرے، یہ بھی جائز ہے کہ ہر جگہ اور ہر زمانے کی اسلامی حکومت شرعی قواعد کا لحاظ رکھتے ہوئے قاضیوں کے اختیارات پر کوئی پابندی لگا دے اور جرائم کی سزاؤں کا کوئی خاص پیمانہ دے کر اس کا پابند کر دے، جیسا کہ قرون متاخرہ میں ایسا ہوتا رہا ہے اور اس وقت تمام ممالک میں تقریباً یہی صورت رائج ہے۔

اب سمجھئے کہ جن جرائم کی کوئی سزا قرآن و سنت نے متعین نہیں کی، بلکہ حکام کی صواب دید پر رکھا ہے، ان سزاؤں کو شرعی اصطلاح میں "تعزیرات" کہا جاتا ہے، اور جن جرائم کی سزائیں قرآن و سنت نے متعین کر دی ہیں وہ دو قسم پر ہیں: ① ایک وہ جن میں حق اللہ کو غالب قرار دیا گیا ہے ان کی سزا کو "حد" کہا جاتا ہے جس کی جمع "حدود" ہے ② دوسرے وہ جن میں حق العبد کو از روئے شرع غالب مانا گیا ہے، اس کی سزا کو "قصاص" کہا جاتا ہے، قرآن کریم نے حدود و قصاص کا بیان پوری تفصیل و تشریح کے ساتھ خود کر دیا ہے، باقی تعزیری جرائم کی تفصیلات کو بیان رسول ﷺ اور حکام وقت کی صواب دید پر چھوڑ دیا ہے، خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کریم نے جن جرائم کی سزا کو بطور حق اللہ متعین کر کے جاری کیا ہے ان کو "حدود" کہتے ہیں، اور جن کو بطور حق العبد جاری فرمایا ہے ان کو "قصاص" کہتے ہیں، اور جن جرائم کی سزا کا تعین نہیں فرمایا اس کو "تعزیر" کہتے ہیں، سزا کی ان تینوں قسموں کے احکام بہت سی چیزوں میں مختلف ہیں، جو لوگ اپنے عرف عام کی بناء پر ہر جرم کی سزا کو تعزیر کہتے ہیں اور شرعی اصطلاحات کے فرق پر نظر نہیں کرتے ان کو شرعی

احکام میں بکثرت مغالطے پیش آئے ہیں۔

''تعزیری سزائیں'' حالات کے ماتحت ہلکی سے ہلکی بھی کی جاسکتی ہیں، سخت سے سخت بھی اور معاف بھی کی جاسکتی ہیں، ان میں حکام کے اختیارات وسیع ہیں، اور ''حدود'' میں کسی حکومت یا کسی حاکم وامیر کو ادنیٰ تغیر وتبدل یا کمی بیشی کی اجازت نہیں ہے، اور نہ زمان ومکان کے بدلنے کا ان پر کوئی اثر پڑتا ہے، نہ کسی امیر وحاکم کو اس کے معاف کرنے کا حق ہے، شریعت اسلام میں حدود صرف پانچ ہیں: ① ڈاکہ ② چوری ③ زنا ④ تہمت زنا کی سزائیں، یہ سزائیں قرآن کریم میں منصوص ہیں ⑤ پانچویں شراب خوری کی حد ہے جو اجماع صحابہ کرام سے ثابت ہوئی ہے، اس طرح کل پانچ جرائم کی سزائیں معین ہوگئیں، جن کو ''حدود'' کہا جاتا ہے، ''ارتداد کی سزا کو ملا کر اکثر فقہاء نے حدود کی تعداد چھ بیان کی ہے، یہ سزائیں جس طرح کوئی حاکم وامیر کم یا معاف نہیں کرسکتا، اسی طرح توبہ کر لینے سے بھی دنیوی سزا کے حق میں معافی نہیں ہوتی، ہاں! آخرت کا گناہ مخلصانہ توبہ سے معاف ہوکر وہاں کا کھاتہ بے باق ہوجاتا ہے، ان میں سے صرف ڈاکہ کی سزا میں ایک استثناء ہے کہ ڈاکو اگر گرفتاری سے قبل توبہ کرے اور معاملات سے اس کی توبہ پر اطمینان ہوجائے تو بھی یہ حد ساقط ہوجائے گی، گرفتاری کے بعد کی توبہ معتبر نہیں، اس کے علاوہ دوسری حدود توبہ سے بھی دنیا کے حق میں معاف نہیں ہوتیں، خواہ یہ توبہ گرفتاری سے قبل ہو یا بعد میں، تمام تعزیری جرائم میں حق کے موافق سفارشات سنی جاسکتی ہیں، حدود اللہ میں سفارش کرنا بھی جائز نہیں، اور ان کا سننا بھی جائز نہیں، رسول کریم ﷺ نے اس کی سخت ممانعت فرمائی ہے، حدود کی سزائیں عام طور پر سخت ہیں، اور ان کے نفاذ کا قانون بھی سخت ہے کہ ان میں کسی کو کسی کمی بیشی کی کسی حال میں اجازت نہیں، نہ کوئی ان کو معاف کرسکتا ہے، جہاں سزا اور قانون کی سختی رکھی گئی ہے وہیں معاملہ کو معتدل کرنے کے لئے تکمیل جرم اور تکمیل ثبوت جرم کے لئے شرطیں بھی نہایت کڑی رکھی گئی ہیں، ان شرائط میں سے کوئی ایک شرط بھی مفقود ہو تو حد ساقط ہوجاتی ہے، بلکہ ادنیٰ سا شبہ بھی ثبوت میں پایا جائے تو حد ساقط ہوجاتی ہے، اسلام کا مسلم قانون اس میں یہ ہے کہ ''الحدود تندرء بالشبهات'' یعنی حدود کو ادنیٰ شبہ سے ساقط کردیا جاتا ہے۔

یہاں یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ جن صورتوں میں حد شرعی کسی شبہ یا کسی شرط کی کمی کی وجہ سے ساقط ہوجائے تو یہ ضروری نہیں کہ مجرم کو کھلی چھٹی مل جائے جس سے اس کو جرم پر اور جرأت پیدا ہو، بلکہ حاکم اس کے مناسب حال اس کو تعزیری سزا دے گا اور شریعت کی تعزیری سزائیں بھی عموماً بدنی اور جسمانی سزائیں ہیں، جن میں عبرت انگیز ہونے کی وجہ سے انسداد جرائم کا مکمل انتظام ہے، فرض کیجئے کہ زنا کے ثبوت پر صرف تین گواہ ملے، اور گواہ عادل ثقہ ہیں جن پر جھوٹ کا شبہ نہیں ہوسکتا، مگر از روئے قانون شرع چوتھا گواہ نہ ہونے کی وجہ سے اس پر حد شرعی جاری نہیں ہوگی، لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اس کو کھلی چھٹی دے دی جائے، بلکہ حاکم وقت اس کو مناسب تعزیری سزا دے گا جو کوڑے لگانے کی صورت میں ہوگی، یا چوری کے ثبوت کے لئے جو شرائط مقرر ہیں اس میں کوئی کمی یا شبہ پیدا ہونے کی وجہ سے اس پر حد شرعی ہاتھ کاٹنے کی جاری نہیں ہوسکتی، تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ بالکل آزاد ہوگیا، بلکہ اس کو دوسری تعزیری سزائیں حسب حال دی جائیں گی۔

قصاص کی سزا بھی حدود کی طرح قرآن میں متعین ہے، کہ جان کے بدلہ میں جان لی جائے، زخموں کے بدلہ میں مساوی زخم کی سزا دی جائے، لیکن فرق یہ ہے کہ حدود کو بحیثیت حق اللہ نافذ کیا گیا ہے، اگر صاحب حق انسان معاف بھی کرنا چاہے تو معاف نہ ہوگا، اور حد ساقط نہ ہوگی، مثلاً جس کا مال چوری کیا ہے وہ معاف بھی کردے تو چوری کی شرعی سزا معاف نہ ہوگی، بخلاف قصاص کے کہ اس میں حق العبد کی حیثیت کو قرآن وسنت نے غالب قرار دیا ہے، یہی وجہ ہے کہ قاتل پر جرم قتل ثابت ہوجانے کے بعد اس کو ولی مقتول کے حوالہ کردیا جاتا ہے وہ چاہے تو قصاص لے لے، اور اس کو قتل کرادے، اور چاہے معاف کردے، اسی طرح زخموں کے قصاص کا بھی یہی حال ہے، یہ بات آپ پہلے معلوم کرچکے ہیں کہ حدود یا قصاص کے ساقط ہوجانے سے یہ لازم نہیں آتا کہ مجرم کو کھلی چھٹی مل جائے، بلکہ حاکم وقت تعزیری سزا جتنی اور جیسی مناسب سمجھے دے سکتا ہے، اس لئے یہ شبہ نہ ہونا چاہیے کہ اگر خون کے مجرم کو اولیاء مقتول کے معاف کرنے پر چھوڑ دیا جائے تو قاتلوں کی جرأت بڑھ جائے گی اور قتل کی واردات عام ہوجائیں گی، کیونکہ اس شخص کی جان لینا تو ولی مقتول کا حق تھا وہ اس نے معاف کردیا، لیکن دوسرے لوگوں کی جانوں کی حفاظت حکومت کا حق ہے، وہ اس حق کے تحفظ کے لئے اس کو عمر قید کی یا دوسری قسم کی سزائیں دے کر اس خطرہ کا انسداد کرسکتی ہے، یہاں تک شرعی سزاؤں حدود، قصاص اور تعزیرات کی اصطلاحات شرعیہ اور

ان کے متعلق ضروری معلومات کا بیان ہوا، اب ان کے متعلق آیات کی تفسیر اور حدود کی تفصیل دیکھئے، پہلی آیت میں ان لوگوں کی سزا کا بیان ہے جو اللہ اور رسول ﷺ کے ساتھ مقابلہ اور محاربہ کرتے ہیں، اور زمین میں فساد مچاتے ہیں۔

یہاں پہلی بات قابل غور یہ ہے کہ اللہ و رسول ﷺ کے ساتھ محاربہ اور زمین میں فساد کا کیا مطلب ہے، اور کون لوگ اس کے مصداق ہیں، لفظ "محاربہ" حرب سے ماخوذ ہے، اور اس کے اصلی معنی سلب کرنے اور چھین لینے کے ہیں، اور محاورات میں یہ لفظ سَلْم کے بالمقابل استعمال ہوتا ہے، جس کے معنی امن و سلامتی کے ہیں تو معلوم ہوا کہ حرب کا مفہوم بدامنی پھیلانا ہے، اور ظاہر ہے کہ اِکّا دکا چوری یا قتل و غارت گری سے امن عامہ سلب نہیں ہوتا، بلکہ یہ صورت جبھی ہوتی ہے جبکہ کوئی طاقتور جماعت رہزنی اور قتل و غارت گری پر کھڑی ہو جائے، اس لئے حضرات فقہاء نے اس سزا کا مستحق صرف اس جماعت یا فرد کو قرار دیا ہے جو مسلح ہو کر عوام پر ڈاکے ڈالے، اور حکومت کے قانون کو قوت کے ساتھ توڑنا چاہے جس کو دوسرے لفظوں میں ڈاکو یا باغی کہا جا سکتا ہے، عام انفرادی جرائم کرنے والے چور گرہ کٹ وغیرہ اس میں داخل نہیں ہیں۔

دوسری بات یہاں یہ قابل غور ہے کہ اس آیت میں محاربہ کو اللہ اور رسول ﷺ کی طرف منسوب کیا ہے حالانکہ ڈاکو یا بغاوت کرنے والے جو مقابلہ یا محاربہ کرتے ہیں وہ انسانوں کے ساتھ ہوتا ہے، وجہ یہ ہے کہ کوئی طاقتور جماعت جب طاقت کے ساتھ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے قانون کو توڑنا چاہے تو اگرچہ ظاہر میں اس کا مقابلہ عوام اور انسانوں کے ساتھ ہوتا ہے لیکن درحقیقت اسکی جنگ حکومت کے ساتھ ہے اور اسلامی حکومت میں جب قانون اللہ اور رسول ﷺ کا نافذ ہو تو یہ محاربہ بھی اللہ و رسول ﷺ ہی کے مقابلہ میں کہا جائیگا۔

خلاصہ یہ ہے کہ پہلی آیت میں جس سزا کا ذکر ہے یہ ان ڈاکوؤں اور باغیوں پر عائد ہوتی ہے جو اجتماعی قوت کے ساتھ حملہ کر کے امن عامہ کو برباد کریں، اور قانون حکومت کو اعلانیہ توڑنے کی کوشش کریں اور ظاہر ہے کہ اس کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں، مال لوٹنے، آبرو پر حملہ کرنے سے لے کر قتل و خونریزی تک سب اس کے مفہوم میں شامل ہیں، اسی سے مقاتلہ اور محاربہ میں فرق معلوم ہو گیا کہ لفظ مقاتلہ خون ریز لڑائی کے لئے بولا جاتا ہے مگر کوئی قتل ہو یا نہ ہو، اور گو ضمناً مال بھی لوٹا جائے، اور لفظ محاربہ طاقت کے ساتھ بدامنی پھیلانے اور سلامتی کو سلب کرنے کے معنی میں ہے، اسی لئے یہ لفظ اجتماعی طاقت کے ساتھ عوام کی جان و مال و آبرو میں سے کسی چیز پر دست درازی کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے، جس کو رہزنی، ڈاکہ اور بغاوت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اس جرم کی سزا قرآن کریم نے خود متعین فرما دی اور بطور حق اللہ یعنی سرکاری جرم کے نافذ کیا، جس کو اصطلاح شرع میں حد کہا جاتا ہے، اب سنئے کہ ڈاکہ اور رہزنی کی شرعی سزا کیا ہے آیت مذکورہ میں، رہزنی کی چار سزائیں مذکور ہیں: ① یعنی اس کو قتل کیا جائے ② یا سولی چڑھایا جائے ③ یا ان کے ہاتھ اور پاؤں مختلف جانبوں سے کاٹ دیئے جائیں ④ یا ان کو زمین سے نکال دیا جائے"، اس میں سے پہلی سزاؤں میں مبالغہ کا لفظ باب تفعیل سے استعمال فرمایا جو تکرار فعل اور شدت پر دلالت کرتا ہے، اس میں صیغہ جمع استعمال فرما کر اس طرف بھی اشارہ فرما دیا کہ ان کا قتل یا سولی چڑھانا یا ہاتھ پاؤں کاٹنا عام سزاؤں کی طرح نہیں کہ جس فرد پر جرم ثابت ہو صرف اسی فرد پر سزا جاری کی جائے، بلکہ یہ جرم جماعت میں سے ایک فرد سے بھی صادر ہو گیا تو پوری جماعت کو قتل یا سولی یا ہاتھ پاؤں کاٹنے کی سزا دی جائے گی، نیز اس طرف بھی اشارہ کر دیا گیا کہ یہ قتل و صلب وغیرہ قصاص کے طور پر نہیں کہ اولیاء مقتول کے معاف کر دینے سے معاف ہو جائے، بلکہ یہ حد شرعی بحیثیت حق اللہ کے نافذ کی گئی ہے جن لوگوں کو نقصان پہنچا ہے وہ معاف بھی کر دیں تو شرعاً سزا معاف نہ ہوگی، یہ دونوں حکم بصیغہ تفعیل ذکر کرنے سے مستفاد ہوئے۔

* * *

فائدہ: یعنی مذکورہ بالا سزائیں جو حدود اور حق اللہ کے طور پر تھیں وہ گرفتاری سے قبل توبہ کر لینے سے معاف ہو جاتی ہیں، حقوق العباد معاف نہیں ہوں گے، مثلاً اگر کسی کا مال لیا تھا تو ضمان دینا ہوگا، قتل کیا تھا تو قصاص لیا جائے گا، ہاں! ان چیزوں کے معاف کرنے کا حق صاحب مال اور ولی مقتول کو حاصل ہے۔

تنبیہ: اس حد کے سوا باقی حدود مثلاً حد زنا، حد شرب خمر، حد سرقہ، حد قذف توبہ سے مطلقاً ساقط نہیں ہوتیں۔

يَٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ ءَامَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَابْتَغُوٓا إِلَيْهِ الْوَسِيلَةَ وَجَٰهِدُوا فِي سَبِيلِهِۦ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿٣٥﴾

اے ایمان والو ڈرتے رہو اللہ سے اور ڈھونڈو اس تک وسیلہ [1] اور جہاد کرو اس کی راہ میں تا کہ تمہارا بھلا ہو [2]

خلاصہ تفسیر: گذشتہ آیات میں ڈاکو اور بغاوت کی سزا اور اس کے احکام کی تفصیل تھی، تین آیتوں کے بعد چوری کی سزا کا بیان آنے والا ہے، اس کے درمیان تین آیتوں میں تقویٰ، اطاعت وعبادت، جہاد کی ترغیب اور کفر وعناد اور معصیت کی تباہ کاری کا بیان فرمایا گیا ہے، قرآن کریم کے اس طرز خاص میں غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ قرآن کریم کا عام اسلوب یہ ہے کہ وہ محض حاکمانہ طور پر تعزیر وسزا کا قانون بیان کر کے نہیں چھوڑ دیتا، بلکہ مربّیانہ انداز میں ذہنوں کو جرائم سے باز رہنے کے لیے ہموار بھی کرتا ہے، خدا تعالیٰ اور آخرت کے خوف اور جنت کی دائمی نعمتوں اور راحتوں کو مستحضر کر کے ان کے قلوب کو جرم سے متنفر بناتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اکثر قانون جرم وسزا کے پیچھے اتَّقُوا اللّٰهَ وغیرہ کا اعادہ کیا جاتا ہے۔

اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ (کے احکام کی مخالفت) سے ڈرو (یعنی معاصی چھوڑ دو) اور (اطاعت کے ذریعہ) خدا تعالیٰ کا قرب ڈھونڈو (یعنی اطاعات ضروریہ کے پابند رہو) اور (طاعات میں سے بالخصوص) اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کیا کرو، امید ہے کہ (اس طریق سے) تم (پورے) کامیاب ہو جاؤ گے (اور کامیابی اللہ تعالیٰ کی رضامندی کا حاصل ہونا اور دوزخ سے نجات ہے)۔

وَابْتَغُوٓا إِلَيْهِ الْوَسِيلَةَ: یہاں وسیلہ بمعنی تقرب ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کا قرب، طاعات کا کرنا اور معاصی کا چھوڑنا اللہ کے قرب کا ذریعہ ہے، توسل بالصالحین کے مسئلہ کا اس آیت سے کوئی تعلق نہیں۔

* * *

فائدہ: [1] ''وسیلہ'' کی تفسیر ابن عباس رضی اللہ عنہم، مجاہد، ابووائل، حسن وغیرہم اکابر سلف نے قربت سے کی ہے تو وسیلہ ڈھونڈھنے کے معنی یہ ہوں گے کہ اس کا قرب وصول تلاش کرو، قتادہؒ نے کہا: ''أي تقربو إليه بطاعته والعمل بما يرضيه'' خدا کی نزدیکی حاصل کرو اس کی فرمانبرداری اور پسندیدہ عمل کے ذریعہ سے ایک شاعر کہتا ہے:

اذا عفل الواشون عدنا لوصلنا وعاد التصافی بيننا والوسائل

اس میں یہ ہی معنی قرب واتصال کے مراد ہے اور جو حدیث میں آیا ہے کہ ''وسیلہ'' جنت میں ایک نہایت ہی اعلیٰ منزل ہے جو دنیا میں سے کسی ایک بندہ کو ملے گی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم اذان کے بعد میرے لئے خدا سے وہ ہی مقام طلب کیا کرو تو اس مقام کا نام بھی ''وسیلہ'' اسی لئے رکھا گیا کہ جنت کی تمام منزلوں میں وہ سب سے زیادہ عرش رحمان کے قریب ہے اور حق تعالیٰ کے مقامات قرب میں سب سے بلند واقع ہوا ہے، بہر حال پہلے فرمایا کہ ڈرتے رہو اللہ سے لیکن یہ ڈر ایسا نہیں جیسے آدمی سانپ بچھو یا شیر بھیڑیے سے ڈر کر دور بھاگتا ہے، بلکہ اس بات سے ڈرنا کہ کہیں اس کی خوشنودی اور رحمت سے دور نہ جا پڑو، اسی لئے اتقوا الله کے بعد وابتغوا اليه الوسيلة فرمایا، یعنی اس کی ناخوشی اور بعد وہجر سے ڈر کر قرب و وصول حاصل کرنے کی کوشش کرو اور ظاہر ہے کہ کسی چیز سے قریب ہم اسی وقت ہو سکتے ہیں جبکہ درمیانی راستہ قطع کر لیں جس پر چل کر اس کے پاس پہنچ سکتے ہوں، اسی کو فرمایا: وجاهدوا في سبيله جہاد کرو اس کی راہ میں یعنی اسی پر چلنے کی پوری پوری کوشش کرو لعلکم تفلحون تا کہ تم اس کی نزدیکی حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکو۔

فائدہ: [2] پچھلے رکوع کے آخر میں ان لوگوں کی دنیاوی واخروی سزا بیان فرمائی تھی جو خدا اور رسول سے جنگ کرتے اور ملک میں بدامنی اور فساد پھیلاتے ہیں، اس رکوع میں مسلمانوں کو ان سزاؤں سے ڈرا کر بتلایا گیا کہ جب شقی اور بدبخت لوگ خدا اور رسول سے جنگ کریں تو تم خدا اور رسول کی طرف ہو کر جہاد کرو، وہ اگر زمین پر فساد پھیلاتے ہیں تو تم اپنی کوشش اور حسن عمل سے امن وسکون قائم کرنے کی فکر کرو۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لِيَفْتَدُوْا بِهٖ مِنْ عَذَابِ يَوْمِ

جو لوگ کافر ہیں اگر ان کے پاس ہو جو کچھ زمین میں ہے سارا اور اس کے ساتھ اتنا ہی اور ہو تا کہ بدلہ میں دیں اپنے قیامت کے

الْقِيٰمَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۳۶﴾ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنَ النَّارِ وَمَا هُمْ

عذاب سے تو ان سے قبول نہ ہوگا، اور ان کے واسطے عذاب دردناک ہے۔ ۱ چاہیں گے کہ نکل جائیں آگ سے اور وہ

بِخٰرِجِيْنَ مِنْهَا ۫ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ﴿۳۷﴾

اس سے نکلنے والے نہیں، اور ان کے لیے عذاب دائمی ہے۔ ۲

خلاصہ تفسیر: پیچھے عام انداز سے طاعات میں سب سے بڑے عمل ایمان کا حکم اور معاصی میں سب سے بدترین عمل کفر سے نہی کا بیان گذرا، اب اہتمام شان کے لیے بطور خاص کفر کا نقصان بتاتے ہیں جس سے ایمان کا نافع ہونا بھی خود معلوم ہو جائے گا، نیز ان آیتوں سے یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ اصل وسیلہ طاعات ہیں، جس کے بغیر تمام دنیا بھر کے خزائن بھی وسیلہ نہیں بن سکتے۔

یقیناً جو لوگ کافر ہیں اگر (بالفرض) ان (میں سے ہر ایک) کے پاس دنیا بھر کی تمام چیزیں ہوں (جس میں تمام دفینے اور خزانے بھی آ گئے) اور (انہی چیزوں پر کیا منحصر ہے، بلکہ) ان چیزوں کے ساتھ اتنی ہی چیزیں اور بھی ہوں تا کہ وہ اس کو دے کر روز قیامت کے عذاب سے چھوٹ جائیں تب بھی وہ چیزیں ہرگز ان سے قبول نہ کی جائیں گی (اور عذاب سے نہ بچیں گے بلکہ) ان کو دردناک عذاب ہوگا (پھر عذاب میں داخل ہونے کے بعد) اس بات کی خواہش (وتمنا) کریں گے کہ دوزخ سے (کسی طرح) نکل آئیں اور (یہ خواہش کبھی پوری نہ ہوگی اور) وہ اس سے کبھی نہ نکلیں گے اور انکو عذاب دائمی ہوگا (یعنی کسی تدبیر سے نہ سزا ٹلے گی نہ سزا کا دوام ٹلے گا)۔

* * *

فائدہ: ۱ پچھلی آیت میں بتلایا تھا کہ انسان خدا سے ڈرنے اس کا قرب حاصل کرنے اور اس کی راہ میں جہاد کرنے ہی سے فلاح و کامیابی کی امید کر سکتا ہے، اس آیت میں متنبہ فرما دیا کہ جن لوگوں نے خدا سے روگردانی کی وہ آخرت میں اگر روئے زمین کے سارے خزانے بلکہ اس سے بھی زائد خرچ کر ڈالیں گے اور فدیہ دیکر عذاب الٰہی سے چھوٹنا چاہیں گے تو یہ ممکن نہ ہوگا، غرض وہاں کی کامیابی ''تقویٰ'' ''ابتغائے وسیلہ'' اور ''جہاد فی سبیل اللہ'' سے حاصل ہوتی ہے رشوت اور فدیہ سے نہیں ہو سکتی۔

فائدہ: ۲ احادیث کثیرہ سے ثابت ہے کہ بہت سے گنہگار مومنین ایک مدت تک دوزخ میں رہ کر پھر نکالے جائیں گے اور حق تعالیٰ اپنے فضل ورحمت سے جنت میں داخل کرے گا یہ آیت ان احادیث کے مخالف نہیں کیونکہ یہاں شروع آیت سے صرف کفارہ کا بیان کیا گیا ہے مومنین کے متعلق اس آیت میں کوئی حرف نہیں۔

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ ؕ

اور چوری کرنے والا مرد اور چوری کرنے والی عورت کاٹ ڈالو ان کے ہاتھ ۱ سزا میں ان کی کمائی کی تنبیہ ہے اللہ کی طرف سے ۲

وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۳۸﴾

اور اللہ غالب ہے حکمت والا ۳

خلاصہ تفسیر: دو آیت قبل ڈاکہ وراہزنی کی سزا کا بیان تھا جو کہ ''سرقہ کبریٰ'' کہلاتا ہے، اب ''سرقہ صغریٰ'' یعنی چھپ کر چوری

کرنے اوراس کی سزا کا بیان ہے:

اور جو مرد چوری کرے اور (اسی طرح) جو عورت چوری کرے سو (ان کا حکم یہ ہے کہ اے حکام!) ان دونوں کے داہنے ہاتھ (گٹے پر) سے کاٹ ڈالو، ان کے (اس) کردار کے عوض میں (اور یہ عوض) بطور سزا کے (ہے) اللہ کی طرف سے، اور اللہ تعالیٰ بڑی قوت والے ہیں (جو سزا چاہیں مقرر فرمادیں، اور) بڑی حکمت والے ہیں (کہ مناسب ہی سزا مقرر فرماتے ہیں)۔

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوٓا اَيْدِيَهُمَا: شرعی سزاؤں کی تین قسمیں جو پہلے بیان ہوچکی ہیں چوری کی سزا اُن کی قسم حدود میں داخل ہے، کیونکہ قرآن کریم نے اس سزا کو خود متعین فرمایا، حکام کی صوابدید پر نہیں چھوڑا اور بطور حق اللہ کے متعین فرمایا ہے، اس لئے اس کو حد سرقہ کہا جاتا ہے، یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ قرآنی احکام میں خطاب عام طور پر مردوں کو ہوتا ہے اور عورتیں بھی اس میں تبعاً شامل ہوتی ہیں، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور جملہ احکام میں قرآن وسنت کا یہی اصول ہے، لیکن چوری کی سزا اور زنا کی سزا میں صرف مردوں کے ذکر پر اکتفاء نہیں فرمایا، بلکہ دونوں صنفوں کو الگ الگ کرکے حکم دیا، اس کی وجہ یہ ہے کہ معاملہ حدود کا ہے جن میں ذرا سا بھی شبہ پڑ جائے تو ساقط ہوجاتی ہیں، اس لئے عورتوں کے لئے ضمنی خطاب پر کفایت نہیں فرمائی، بلکہ تصریح کے ساتھ ذکر فرمایا، دوسری بات اس جگہ قابل غور یہ ہے کہ لفظ سرقہ کا لغوی مفہوم اور شرعی تعریف کیا ہے؟ قاموس میں ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے کا مال کسی محفوظ جگہ سے بغیر اس کی اجازت کے چھپ کر لے لے، اس کو سرقہ کہتے ہیں، یہی اس کی شرعی تعریف ہے اور اس تعریف کی رو سے سرقہ ثابت ہونے کے لئے چند چیزیں ضروری ہوئیں:

① اول یہ کہ وہ مال کسی فرد یا جماعت کی ذاتی ملکیت ہو، چُرانے والے کی اس میں نہ ملکیت ہو نہ ملکیت کا شبہ ہو اور نہ ایسی چیزیں ہوں جس میں عوام کے حقوق مساوی ہیں، جیسے رفاہ عام کے ادارے اور ان کی اشیاء، اس سے معلوم ہوا کہ اگر کسی شخص نے کوئی ایسی چیز لے لی جس میں اس کی ملکیت یا ملکیت کا شبہ ہے یا جس میں عوام کے حقوق مساوی ہیں تو حد سرقہ اس پر جاری نہ کی جائے گی، حاکم اپنی صوابدید کے موافق تعزیری سزا جاری کرسکتا ہے۔

② دوسری چیز تعریف سرقہ میں مال محفوظ ہوتا ہے، یعنی مقفل مکان کے ذریعہ یا کسی نگران چوکیدار کے ذریعہ محفوظ ہونا، جو مال کسی محفوظ جگہ میں نہ ہو اس کو کوئی شخص اٹھالے تو وہ بھی حد سرقہ کا مستوجب نہیں ہوگا اور مال کے محفوظ ہونے میں شبہ بھی ہوجائے تو بھی حد ساقط ہوجائے گی، گناہ اور تعزیری سزا کا معاملہ جدا ہے۔

③ تیسری شرط بلا اجازت ہونا ہے، جس مال کے لینے یا اٹھا کر استعمال کرنے کی کسی کو اجازت دے رکھی ہو، وہ اس کو بالکل لے جائے تو حد سرقہ عائد نہیں ہوگی، اور اجازت کا شبہ بھی پیدا ہوجائے تو حد ساقط ہوجائے گی۔

④ چوتھی شرط چھپا کر لینا ہے، کیونکہ دوسرے کا مال اعلانیہ لوٹا جائے تو وہ سرقہ نہیں بلکہ ڈاکہ ہے، جس کی سزا پہلے بیان ہوچکی ہے، غرض خفیہ نہ ہو تو حد سرقہ اس پر جاری نہ ہوگی۔

ان تمام شرائط کی تفصیل سننے سے آپ کو یہ معلوم ہوگیا کہ ہمارے عرف میں جس کو چوری کہا جاتا ہے وہ ایک عام اور وسیع مفہوم ہے، اس کے تمام افراد پر حد سرقہ یعنی ہاتھ کاٹنے کی سزا شرعاً عائد نہیں ہے، بلکہ چوری کی صرف اس صورت پر یہ حد شرعی جاری ہوگی جس میں یہ تمام شرائط موجود ہوں، اس کے ساتھ ہی یہ بھی آپ معلوم کرچکے ہیں کہ جن صورتوں میں چوری کی حد شرعی ساقط ہوجاتی ہے، تو یہ لازم نہیں ہے کہ کھلی چھٹی مل جائے، بلکہ حاکم وقت اپنی صوابدید کے مطابق اس کو تعزیری سزا دے سکتا ہے جو جسمانی، کوڑوں کی سزا بھی ہوسکتی ہے، اسی طرح یہ بھی نہ سمجھا جائے کہ جن صورتوں میں سرقہ کی کوئی شرط مفقود ہونے کی وجہ سے حد شرعی جاری نہ ہو تو وہ شرعاً جائز وحلال ہے، کیونکہ اوپر بتلایا جاچکا ہے کہ یہاں گناہ اور عذاب آخرت کا ذکر نہیں، دنیوی سزا اور وہ بھی خاص قسم کی سزا کا ذکر ہے، ویسے کسی شخص کا مال بغیر اس کی خوش دلی کے کسی طرح بھی لے لیا جائے تو وہ حرام اور عذاب آخرت کا موجب ہے، جیسا کہ آیت قرآن کریم: لاتاکلوا اموالکم بینکم بالباطل میں اس کی تصریح موجود ہے۔

جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ: آیت مذکورہ کے الفاظ میں چوری کی شرعی سزا بیان کرنے کے بعد دو جملے ارشاد فرمائے ہیں: ① ایک

جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا یعنی یہ سزا بدلہ ہے ان کی بدکرداری کا۔ ② دوسرا جملہ فرمایا: نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ اس میں دو لفظ ہیں ''نکال'' اور ''من اللہ''

۱۔لفظ نکال کے معنے عربی لغت میں ایسی سزا کے ہیں جس کو دیکھ کر دوسروں کو بھی سبق ملے، اور اقدام جرم سے باز آجائیں، اس لئے ''نکال'' کا ترجمہ ہمارے محاورہ کے موافق عبرت خیز سزا کا ہوگیا۔ اس میں اشارہ ہے کہ ہاتھ کاٹنے کی سخت سزا خاص حکمت پر مبنی ہے کہ ایک پر سزا جاری ہوجائے، تو سب کے سب کانپ اٹھیں، اور اس جرم قبیح کا انسداد ہوجائے۔

۲۔دوسرا لفظ من اللہ کا بڑھا کر ایک اہم مضمون کی طرف اشارہ فرمایا جو یہ ہے کہ چوری کے جرم کی دو حیثیتیں ہیں: ① ایک یہ کہ اس نے کسی دوسرے انسان کا مال بغیر حق کے لے لیا جس سے اس پر ظلم ہوا ② دوسری یہ کہ اس نے اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی کی، پہلی حیثیت سے یہ سزا مظلوم کا حق ہے اور اس کا مقتضا یہ ہے کہ جس کا حق ہے اگر وہ سزا کو معاف کردے تو معاف ہوجائے گی، جیسا قصاص کے تمام مسائل میں یہی معمول ہے، دوسری حیثیت سے یہ سزا حق اللہ کی خلاف ورزی کرنے کی ہے، اس کا مقتضا یہ ہے کہ جس شخص کی چوری کی ہے اگر وہ معاف بھی کردے تو معاف نہ ہو جب تک خود اللہ تعالیٰ معاف نہ فرمادیں، جس کو اصطلاح شرع میں حد یا حدود کہا جاتا ہے، لفظ ''من اللہ'' سے اس دوسری حیثیت کو متعین کرکے اس طرف اشارہ فرمادیا کہ یہ سزا حد ہے قصاص نہیں ہے، یعنی سرکاری جرم کی حیثیت سے یہ سزا دی گئی ہے، اس لئے جس کی چوری کی ہے اس کے معاف کرنے سے بھی سزا ساقط نہیں ہوگی۔

* * *

فائدہ: ۱۔ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا: یعنی پہلی مرتبہ چوری کرے تو داہنا ہاتھ گٹے پر سے کاٹ دو، باقی تفاصیل کتب فقہ میں ملیں گی۔

پچھلے رکوع میں ڈکیتی وغیرہ سزا ذکر کی گئی تھی، درمیان میں بعض مناسبات کی وجہ سے جن کو ہم بیان کرچکے ہیں مومنین کو چند ضروری نصائح کی گئیں، اب پھر سے پچھلے مضمون کی تکمیل کی جاتی ہے، یعنی وہاں ڈکیتی کی سزا مذکور ہوئی تھی اس آیت میں چوری کی سزا بتلادی۔

فائدہ: ۲۔ جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ: یعنی جو سزا چور کو دی جارہی ہے وہ مال مسروق کا بدلہ نہیں بلکہ اسکے معل ''سرقہ'' کی سزا ہے تاکہ اسے اور دوسرے چوروں کو تنبیہ ہوجائے، بلاشبہ جہاں کہیں یہ حدود جاری ہوتی ہیں، دو چار ہی کی سزا یابی کے بعد چوری کا دروازہ قطعاً بند ہوجاتا ہے۔

آج کل مدعیان تہذیب اس قسم کی حدود کو وحشیانہ سزا سے موسوم کرتے ہیں، لیکن چوری کرنا اگر ان صاحبوں کے نزدیک کوئی مہذب فعل نہیں ہے تو یقیناً آپ کی مہذب سزا اس غیر مہذب دستبرد کے استیصال میں کامیاب نہیں ہوسکتی، اگر تھوڑی سی وحشت کا تحمل کرنے سے بہت سے چور مہذب بنائے جاسکتے ہوں تو حاملین تہذیب کو خوش ہونا چاہیے کہ ان کے ''تہذیبی مشن'' میں اس وحشت سے مدد مل رہی ہے، بعض نام نہاد مفسر بھی اس کوشش میں ہیں کہ ''قطع ید'' (ہاتھ کاٹنے) کی سزا کو چوری کی انتہائی سزا قرار دے کر اس سے ہلکی سزا دہی کا اختیار شریعت حقہ سے حاصل کرلیں، مگر مشکل یہ ہے کہ نہ تو چوری کی اس سے ہلکی سزا قرآن کریم میں کہیں موجود ہے اور نہ عہد نبوت یا عہد صحابہ میں اس کی کوئی نظیر پائی گئی، کیا کوئی شخص یہ دعویٰ کرسکتا ہے کہ اتنے طویل عرصہ میں جتنے چور پکڑے گئے ان میں ایک بھی ابتدائی چور نہ تھا جس پر کم از کم بیان جواز ہی کے طور پر ''قطع ید'' سے ہلکی کوئی ابتدائی سزا جاری کی جاتی، کسی ملحد نے پرانے زمانہ میں اس ''حد سرقہ'' پر یہ بھی شبہ کیا تھا کہ جب شریعت نے ایک ہاتھ کی دیت پانچ سو دینار رکھی ہے تو اتنا قیمتی ہاتھ جس کے کٹنے پر پانچ سو دینار واجب ہوں دس پانچ روپیہ کی چوری میں کس طرح کاٹا جاسکتا ہے، ایک عالم نے اس کے جواب میں کیا خوب فرمایا: ''انها لما كانت امينة كانت ثمينة ، فلما خانت هانت'' یعنی جو ہاتھ امین تھا وہ قیمتی تھا، جب (چوری کرکے) خائن ہوا تو ذلیل ہوا۔

فائدہ: ۳۔ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ: چونکہ غالب ہے، اس لئے اسے حق ہے کہ جو چاہے قانون نافذ کردے، کوئی چون و چرا نہیں کرسکتا، لیکن چونکہ حکمت والا بھی ہے، اس لئے یہ احتمال نہیں کہ محض اپنے اختیار کامل سے لے کر کوئی قانون بے موقع نافذ کرے، نیز وہ اپنے ناتواں بندوں کے اموال کی حفاظت کا کوئی انتظام نہ کرسکے، یہ اس کی عزت اور غلبہ کے منافی ہے اور چوروں ڈاکوؤں کو یونہی آزاد چھوڑ دے یہ اس کی حکمت کے خلاف ہے۔

فَمَنۡ تَابَ مِنۡۢ بَعۡدِ ظُلۡمِهٖ وَاَصۡلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوۡبُ عَلَيۡهِ‌ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۳۹﴾

پھر جس نے توبہ کی اپنے ظلم کے پیچھے اور اصلاح کی تو اللہ قبول کرتا ہے اس کی توبہ، بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ہے

خلاصہ تفسیر: گذشتہ آیت میں چوری کی دنیوی سزا کا بیان تھا، اب توبہ سے آخرت کی سزا سے بچ جانے کا ذکر فرماتے ہیں، جیسا کہ پیچھے ڈاکہ زنی میں بھی سزا کے بیان کے بعد توبہ کا ذکر آیا تھا۔

پھر جو شخص (قاعدہ شرعیہ کے موافق) توبہ کرلے اپنی اس زیادتی (یعنی چوری) کرنے کے بعد اور (آئندہ کے لئے) اعمال کی درستگی رکھے (یعنی چوری وغیرہ نہ کرے، اپنی توبہ پر قائم رہے) تو بیشک اللہ تعالیٰ اس (کے حال) پر (رحمت کے ساتھ) توجہ فرمائیں گے (کہ توبہ سے پچھلا گناہ معاف فرمادیں گے، اور آئندہ توبہ پر قائم رہنے کی توفیق مزید عنایت فرمادیں گے) بیشک خدا تعالیٰ بڑی مغفرت والے ہیں (کہ اس کا گناہ معاف کردیا) بڑی رحمت والے ہیں (کہ آئندہ بھی مزید عنایت کی)۔

فَمَنۡ تَابَ مِنۡۢ بَعۡدِ ظُلۡمِهٖ وَاَصۡلَحَ: خلاصہ تفسیر میں توبہ میں جو قید لگائی گئی کہ ”قاعدہ شریعت کے موافق“ تو اس میں یہ بات بھی آگئی کہ جو چیز چرائی ہے وہ مالک کو واپس کردے، اور اگر تلف ہوگئی ہو تو ضمان دے، اور اگر ضمان نہ دے سکے تو معاف کرائے کہ یہ بھی تکمیل توبہ کی شرائط میں سے ہے، یہاں آیت میں لفظ: اَصۡلَحَ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ توبہ کا معتبر ہونا اصلاح پر موقوف ہے، مثلاً چوری کی صورت میں مال واپس کردینا، ورنہ مالک سے معاف کرانا یا مالک معلوم نہ ہو تو ایسے موقع پر فی سبیل اللہ صدقہ کردینا۔

* * *

فائدہ: یعنی توبہ اگر ٹھیک ٹھیک ہو جس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ چوری کا مال مالک کو واپس کرے اور اگر تلف ہوگیا ہو تو ضمان دے اور ضمان نہ دے سکے تو معاف کرائے، اور اپنے فعل پر نادم ہوا اور آئندہ کے لئے اس سے مجتنب رہنے کا عزم رکھے تو اس طرح کی توبہ سے امید ہے کہ حق تعالیٰ اخروی عقوبت جس کے مقابلہ میں دنیاوی سزا کی کچھ حقیقت نہیں اس پر سے اٹھالے۔

اَلَمۡ تَعۡلَمۡ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلۡكُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ‌ؕ يُعَذِّبُ مَنۡ يَّشَآءُ وَيَغۡفِرُ لِمَنۡ يَّشَآءُ‌ؕ

تجھ کو معلوم نہیں کہ اللہ ہی کے واسطے ہے سلطنت آسمانوں اور زمین کی عذاب کرے جس کو چاہے اور بخشے جس کو چاہے

وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ﴿۴۰﴾

اور اللہ سب چیز پر قادر ہے

خلاصہ تفسیر: پیچھے ڈاکہ زنی اور چوری کی سزا میں جو قتل اور ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا گیا ہے تو اس کی حکمت پر نظر کرنے سے قبل یہ حکم بظاہر نوع انسانی کی شرافت سے ایک گونہ بعید معلوم ہوتا تھا، اس لیے اب حق تعالیٰ اپنا مالک حقیقی اور قادر ہونا بیان فرماتے ہیں اور درمیان میں عذاب ومغفرت کا ذکر فرما کر اپنے حکیم ہونے کی طرف بھی اشارہ فرماتے ہیں کہ ہم صرف عذاب ہی نہیں دیتے بلکہ معاف بھی کردیتے ہیں، مگر جو جس کے لائق ہو، اور لیاقت کا حال ان لوگوں کی حالت میں غور کرنے سے معلوم ہوسکتا ہے

(اے مخاطب!) کیا تم نہیں جانتے (یعنی سب جانتے ہیں) کہ اللہ ہی کے لئے ثابت ہے حکومت سب آسمانوں کی اور زمین کی، وہ جس کو چاہیں سزا دیں اور جس کو چاہیں معاف کردیں، اور اللہ تعالیٰ کو ہر چیز پر پوری قدرت ہے۔

چنانچہ چوری اور ڈکیتی کی سزا دنیا میں بھی دی اور اگر اس پر اصرار رہا تو آخرت میں بھی ہوگی اور توبہ کرنے سے آخرت میں دونوں کی معافی ہوجائے گی، اور ڈکیتی میں تو قید ہونے سے قبل توبہ کرنے سے دنیا میں بھی معافی ہوجاتی ہے۔

* * *

فائدہ: جب حقیقی سلطنت وحکومت اسی کی ہے تو بلاشبہ اسی کو یہ اختیار ہوگا کہ جسے مناسب جانے معاف کردے اور جسے اپنی حکمت وعدل کے موافق سزا دینا ہے سزا دے اور نہ صرف یہ کہ اسے معاف کرنے اور سزا دینے کے کلی اختیارات حاصل ہیں، بلکہ ان اختیارات کے استعمال سے کوئی روکنے والا بھی نہیں، کیونکہ ہر چیز پر وہ پوری قدرت رکھتا ہے۔

يَاَيُّهَا الرَّسُوْلُ لَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ مِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاَفْوَاهِهِمْ

اے رسول غم نہ کر ان کا جو دوڑ کر گرتے ہیں کفر میں ۱؎ وہ لوگ جو کہتے ہیں ہم مسلمان ہیں اپنے منہ سے

وَلَمْ تُؤْمِنْ قُلُوْبُهُمْ ۚ وَمِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا ۚ سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ سَمّٰعُوْنَ لِقَوْمٍ اٰخَرِيْنَ ۙ

اور ان کے دل مسلمان نہیں اور وہ جو یہودی ہیں ۲؎ جاسوسی کرتے ہیں جھوٹ بولنے کے لیے وہ جاسوس ہیں دوسری جماعت کے

لَمْ يَاْتُوْكَ ۭ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ مِنْۢ بَعْدِ مَوَاضِعِهٖ ۚ يَقُوْلُوْنَ اِنْ اُوْتِيْتُمْ هٰذَا فَخُذُوْهُ

جو تجھ تک نہیں آئے ۳؎ بدل ڈالتے ہیں بات کو اس کا ٹھکانا چھوڑ کر ۴؎ کہتے ہیں اگر تم کو یہ حکم ملے تو قبول کر لینا

وَاِنْ لَّمْ تُؤْتَوْهُ فَاحْذَرُوْا ۭ

اور اگر یہ حکم نہ ملے تو بچتے رہنا ۵؎

خلاصہ تفسیر: سورۂ مائدہ کے تیسرے رکوع میں اہل کتاب کا ذکر چلا آرہا تھا، درمیان میں بعض مضامین خاص مناسبت سے آگئے تھے، اب آگے پھر اہل کتاب ہی کا ذکر دور تک چلا گیا ہے، اہل کتاب میں یہود ونصاریٰ کے دو فرقے تو تھے ہی، ایک تیسرا فرقہ اور شامل ہوگیا تھا، جو حقیقت میں یہودی تھے، مگر منافقانہ طور پر مسلمان ہوگئے تھے، مسلمانوں کے سامنے اپنا اسلام ظاہر کرتے تھے اور اپنے ہم مذہب یہودیوں میں بیٹھتے تو اسلام اور مسلمانوں کا استہزاء کرتے تھے، مذکورہ تین آیتیں انہی تینوں فرقوں کے ایسے اعمال سے اور حالات سے متعلق ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے احکام اور ہدایات کے مقابلہ میں اپنی خواہشات اور رائے کو مقدم رکھتے ہیں اور احکام وہدایات میں تاویلیں کر کے اپنی خواہشات کے مطابق بنانے کی فکر میں رہتے ہیں، ان آیات میں ایسے لوگوں کی دنیا وآخرت میں رسوائی اور انجام بد کا بیان ہے، اس کے ضمن میں مسلمانوں کے لئے چند اصول ہدایات اور احکام شرعیہ کا بیان ہے۔

ان آیات کے شان نزول کا خلاصہ یہ ہے کہ یہود مدینہ کا ایک قبیلہ بنونضیر میں سے کسی کے ہاتھ سے دوسرا قبیلہ بنوقریظہ کے ایک آدمی کا قتل ہوگیا، بنونضیر قوت وشوکت اور دولت وعزت میں بنوقریظہ سے زیادہ تھے، یہ لوگ آئے دن بنوقریظہ پر ظلم کرتے رہتے تھے اور وہ چار وناچار اس کو سہتے تھے، یہاں تک کہ بنونضیر نے بنوقریظہ کو قصاص ودیت کے معاملہ میں انتہائی ذلت آمیز معاہدہ پر مجبور کیا ہوا تھا جس میں طاقت ور ہونے کی وجہ سے بنو نضیر ہی ہر طرح سے فائدے میں رہتے تھے اور بنوقریظہ کا ہر طرح سے نقصان تھا، چنانچہ اسی قدیم دستور کے مطابق بنونضیر نے خون بہا کم دینا چاہا، لیکن بنوقریظہ نے خون بہا کم لینے سے انکار کیا، کیونکہ وہ معاہدہ پہلے مجبوری کی وجہ سے ماننا پڑتا تھا، اب اسلامی سلطنت کی وجہ سے وہ مجبوری ختم ہوگئی تو مقتول کے قبیلہ بنوقریظہ نے حضور ﷺ کی طرف رجوع کیا، چونکہ قاتل کا قبیلہ یعنی بنونضیر جانتا تھا کہ آپ ﷺ حق فیصلہ کریں گے، اس لیے اس درخواست کے منظور کرنے سے پہلے چند منافقوں کو حضور کی خدمت میں تجسس کے لیے بھیجا تا کہ آپ کا نظریہ اور عندیہ معلوم کرلیں، اگر اپنے موافق فیصلہ ہوا تو فیصلہ کرالیں گے ورنہ نہیں، غرض وہ منافقین اس غرض سے یہاں حاضر ہوئے تھے۔

اسی طرح ایک دوسرا واقعہ زنا کا ہے جو کہ خیبر کے یہودیوں میں یہ واقعہ پیش آیا اور تورات کی مقرر کردہ سزا کے موافق ان دونوں کو سنگسار کرنا

لازم تھا، مگر یہ دونوں کسی بڑے خاندان کے آدمی تھے، یہودیوں نے اپنی قدیم عادت کے موافق یہ چاہا کہ ان کے لئے سزا میں نرمی کی جائے، اور ان کو یہ معلوم تھا کہ مذہب اسلام میں بڑی سہولتیں دی گئی ہیں، اس بناء پر اپنے نزدیک یہ سمجھا کہ اسلام میں اس سزا میں بھی تخفیف ہوگی، خیبر کے لوگوں نے اپنی برادری بنی قریظہ کے لوگوں کے پاس پیغام بھیجا کہ اس معاملہ کا فیصلہ محمد ﷺ سے کرادیں اور دونوں مجرموں کو بھی ساتھ بھیج دیا، منشاء ان کا بھی یہ تھا کہ اگر آپ ﷺ کوئی ہلکی سزا جاری کردیں تو مان لیا جائے ورنہ انکار کردیا جائے، غرض وہ یہود اسی غرض سے یہاں حاضر ہوئے تھے، ان واقعات کی اطلاع کے لیے یہ آیتیں نازل ہوئیں جن میں منافقین اور یہودیوں کی مذمت ہے، اور چونکہ یہ حرکتیں حضور ﷺ کو رنج دینے والی تھیں اس لیے وحی کے شروع میں تسلی بھی فرمادی۔

اے رسول ﷺ! جو لوگ کفر (کی باتوں) میں دوڑ دوڑ کر گرتے ہیں (یعنی بے تکلف رغبت سے ان باتوں کو کرتے ہیں) آپ کو وہ مغموم نہ کریں (یعنی آپ ان کے کفریات سے غمگین وافسردہ نہ ہوں) خواہ وہ ان لوگوں میں سے ہوں جو اپنے منہ سے تو (جھوٹ موٹ) کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اور ان کے دل یقین (یعنی ایمان) لائے نہیں (مراد منافقین ہیں جو کہ ایک واقعہ میں حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے) اور خواہ وہ ان لوگوں میں سے ہوں جو کہ یہودی ہیں (جیسا کہ دوسرے واقعہ زنا میں یہ لوگ حاضر ہوئے تھے)۔

یہ (دونوں قسم کے) لوگ (پہلے سے دین کے بارے میں اپنے علمائے محرفین سے) غلط باتیں سننے کے عادی ہیں (اور انہی غلط باتوں کی تائید کی جستجو میں یہاں آکر) آپ کی باتیں دوسری قوم کی خاطر سے کان دھر دھر کر سنتے ہیں، جس قوم کے یہ حالات ہیں کہ (ایک تو) وہ آپ کے پاس (فرط تکبر اور عداوت کی وجہ سے خود) نہیں آئے (بلکہ دوسروں کو بھیجا، اور دوسروں کو بھیجا بھی تو طلب حق کے لئے نہیں، بلکہ شاید اپنے محرف احکام کے موافق کوئی بات مل جائے، کیونکہ پہلے سے) کلام (الٰہی) بعد اس کے کہ وہ (کلام) اپنے (صحیح) مواقع پر (قائم) ہوتا ہے (کبھی لفظاً یا کبھی معناً یا کبھی دونوں طرح) بدلتے رہتے ہیں (غرض وہ پہلے سے کلام الٰہی کو محرف کرنے کے عادی ہیں، چنانچہ اسی عادت کے موافق خون بہا اور رجم کے حکم کو بھی اپنی ایجاد کردہ رسم سے بدل دیا، پھر اس رسم کے لیے سہارا ڈھونڈنے کو اپنے جاسوسوں کو یہاں بھیجا کہ شاید شریعت محمدیہ سے اس رسم کی تائید ہوجائے)۔

(تیسرے صرف یہی نہیں کہ اپنی ایجاد کی ہوئی رسم کی موافقت تلاش کرنے پر بس کرتے بلکہ مزید یہ ہے کہ جانے والوں سے) کہتے ہیں کہ اگر تم کو (وہاں جاکر) یہ حکم (محرف یعنی اگر ہمارے حکم کے موافق) ملے تب تو اس کو قبول کرلینا (یعنی اس کے موافق عملدرآمد کرنے کا اقرار کرلینا) اور اگر تم کو یہ حکم (محرف یعنی اگر ہمارے حکم کے موافق) نہ ملے تو (اس کے قبول کرنے سے) احتیاط رکھنا (پس اس بھیجنے والی قوم میں چند خرابیاں ہوئیں: ① اوّل تکبر و عداوت جس کی وجہ سے خود نہیں آئے ② دوسرے طلب حق نہ ہونا، بلکہ حق کو بدل کر اس کی تائید ڈھونڈنا ③ تیسرے دوسروں کو بھی قبول حق سے روکنا، یہاں تک آنے والوں اور بھیجنے والوں کی الگ الگ مذمت تھی)۔

غرض حضور ﷺ نے دوسرے واقعہ میں رجم کا حکم دیا، چنانچہ اس حکم کے بعد وہ رجم کیا گیا، اور یہ حکم آپ نے تورات کے مطابق دیا، کیونکہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے ان سے دریافت فرمایا کہ تورات میں اس کی بابت کیا حکم ہے؟ علماء یہود نے اپنا گھڑا ہوا حکم بیان کردیا، حضور ﷺ نے ان سے مناظرہ فرمایا اور ان کی جگہ پر بھی تشریف لے گئے، تورات منگوائی گئی تو اس میں رجم کا حکم موجود تھا، آپ نے وہی حکم دیا، ورنہ شریعت محمدیہ میں زنا کی وجہ سے کافر کو رجم نہیں کیا جاتا، کیونکہ رجم کے لیے محصن ہونا اجماعی شرط ہے، اور کافر محصن نہیں ہوتا، یہ امام ابوحنیفہؒ کا مذہب ہے جو حدیث اور اجماع سے مؤید ہے، پس یہ فیصلہ ان ہی کی مسلمہ شریعت کے مطابق کیا گیا، اس وقت آپ کو یہی حکم ہوا ہوگا کہ تورات کے مطابق حکم دیں جس کو وہ چھپاتے تھے یا اس واقعہ کی خصوصیت ہو۔

يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ لَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ: اس میں اہل طریق کی اس عادت کی اصل ہے کہ اعراض کرنے والوں کی بدحالی کا زیادہ اہتمام نہیں کرتے۔

یُحَرِّفُوْنَ الْکَلِمَ: روح المعانی میں ہے یعنی قوانین شریعت کو طبعی بناوٹ فریب سے بدل دیتے ہیں، جیسے کوئی قرآن وحدیث کے حکم کی اپنی نفسانی خواہش کے مطابق تاویل کرے، جبکہ صوفیاء محققین کی تاویل اس قبیل سے نہیں ہوتی، کیونکہ وہ ظاہر معنی کے مراد ہونے سے کبھی انکار نہیں کرتے جو کہ صریح کفر ہے، بلکہ ظاہر کے مراد ہوتے ہوئے اس میں اور اشارات بھی مانتے ہیں۔

یَقُوْلُوْنَ اِنْ اُوْتِیْتُمْ ھٰذَا فَخُذُوْہُ: اس میں اس شخص کی مذمت ہے جو علما کی طرف عمل کرنے کے لیے رجوع نہ کرے، بلکہ اس امید سے رجوع کرے کہ شاید اس کی غرض کے موافق کوئی بات نکل آئے تو ان کے قول کو بدنامی کا ذریعہ بنالے۔

* * *

فائدہ: ۱۔ الَّذِیْنَ یُسَارِعُوْنَ فِی الْکُفْرِ: پچھلی آیات میں ڈکیتی اور چوری وغیرہ کی حدود بیان کی گئی تھیں، اب بعض ان اقوام کا حال سناتے ہیں جنہوں نے ''حدود اللہ'' میں تحریف کر کے اپنے کو عذاب عظیم کا مستحق ٹھہرایا، ان کا مفصل واقعہ بغویؒ نے یہ لکھا ہے کہ خیبر کے ایک یہودی مرد اور عورت نے جو کنوارے نہ تھے زنا کیا، باوجودیکہ تورات میں اس جرم کی سزا ''رجم'' (سنگ سار کرنا) تھی، مگر ان دونوں کی بڑائی مانع تھی کہ یہ سزا جاری کی جائے، آپس میں یہ مشورہ ہوا کہ یہ شخص جو یثرب میں ہے (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم) ان کی کتاب میں زانی کے لئے رجم کا حکم نہیں، کوڑے مارنے کا ہے تو بنی قریظہ کے یہود میں سے کچھ آدمی ان کے پاس بھیجو، کیونکہ وہ ان کے ہمسایہ ہیں اور ان سے صلح کا معاہدہ بھی کر چکے ہیں، وہ ان کا خیال معلوم کرلیں گے، چنانچہ ایک جماعت اس کام کے لئے روانہ کی گئی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا عندیہ معلوم کرلے کہ ''زانی محض'' کی کیا سزا تجویز کرتے ہیں، اگر وہ کوڑے مارنے کا حکم دیں تو ان پر رکھ کر قبول کرلو، اور رجم کا حکم دیں تو مت مانو، ان کے دریافت کرنے پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میرے فیصلہ پر رضامند ہو گے؟ انہوں نے اقرار کرلیا، خدا کی طرف سے جبرائیل رجم کا حکم لے آئے، مگر وہ لوگ اپنے اقرار سے پھر گئے، آخر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ فدک کا رہنے والا ابن صوریا تم میں کیسا شخص ہے؟ سب نے کہا کہ آج روئے زمین پر ''شرائع موسویہ'' کا اس سے زیادہ جاننے والا کوئی نہیں، آپ نے اس کو بلوایا اور نہایت ہی شدید حلف دے کر پوچھا کہ ''تورات'' میں اس گناہ کی سزا کیا ہے؟ باوجودیکہ دوسرے یہود اس حکم کو چھپانے کی ہر ممکن کوشش کر رہے تھے جس کا پردہ حضرت عبداللہ بن سلامؓ کے ذریعہ سے فاش ہو چکا تھا، تاہم ابن صوریہ نے جو ان کا مسلم معتمد تھا کسی نہ کسی وجہ سے اس کا اقرار کرلیا کہ بیشک تورات میں اس جرم کی سزا رجم ہی ہے، بعدہ اس نے سب حقیقت ظاہر کی کہ کس طرح یہود نے رجم کو اڑا کر زنا کی سزا یہ رکھ دی کہ زانی کو کوڑے لگائے جائیں اور کالا منہ کر کے اور گدھے پر الٹا سوار کرا کر گشت کرایا جائے، الحاصل حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں مرد وعورت پر رجم کی سزا جاری کی اور فرمایا کہ اے اللہ! آج میں پہلا شخص ہوں جس نے تیرے حکم کو دنیا میں زندہ کیا اس کے بعد کہ وہ اسے مردہ کر چکے تھے، یہ واقعہ ہے۔

فائدہ: ۲۔ وَمِنَ الَّذِیْنَ ھَادُوْا: یعنی منافقین اور یہود بنی قریظہ۔

فائدہ: ۳۔ سَمّٰعُوْنَ لِقَوْمٍ اٰخَرِیْنَ لَمْ یَاْتُوْکَ: ''سماعون'' کے معنی ہیں بہت زیادہ سننے والے اور کان دھرنے والے، پھر ''بہت زیادہ سننا''، کبھی تو جاسوسی پر اطلاق کیا جاتا ہے اور کبھی اس کے معنی ہوتے ہیں ''بہت زیادہ قبول کرنے والا'' جیسے سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہٗ، میں سننے کے معنی قبول کرنے کے ہیں، مترجم رحمہ اللہ نے یہاں پہلے معنی مراد لئے ہیں، لیکن ابن جریر وغیرہ محققین نے دوسرے معنی پر حمل کیا ہے۔

سَمّٰعُوْنَ لِلْکَذِبِ: یعنی جھوٹ اور باطل کو بہت زیادہ ماننے اور قبول کرنے والے۔

سَمّٰعُوْنَ لِقَوْمٍ اٰخَرِیْنَ: یعنی دوسری جماعت جس نے ان کو بھیجا اور خود تمہارے پاس نہیں آئی ان کی بات بہت زیادہ ماننے والے۔

فائدہ: ۴۔ یُحَرِّفُوْنَ الْکَلِمَ مِنْۢ بَعْدِ مَوَاضِعِہٖ: یعنی خدا کے احکام میں تحریف کرتے ہیں یا کہیں لگا دیتے ہیں۔

فائدہ: ۵۔ وَاِنْ لَّمْ تُؤْتَوْہُ فَاحْذَرُوْا: یعنی اگر کوڑے لگانے کا حکم ملے تو قبول کرو ورنہ نہیں، گویا خدا کی شریعت کو اپنی ہوا کے تابع رکھنا چاہتے تھے۔

وَ مَنۡ یُّرِدِ اللّٰہُ فِتۡنَتَہٗ فَلَنۡ تَمۡلِکَ لَہٗ مِنَ اللّٰہِ شَیۡـًٔا ؕ اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ لَمۡ یُرِدِ اللّٰہُ

اور جس کو اللہ نے گمراہ کرنا چاہا سو تو اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتا اللہ کے ہاں ۱؎ یہ وہی لوگ ہیں جن کو اللہ نے نہ چاہا

اَنۡ یُّطَہِّرَ قُلُوۡبَہُمۡ ؕ لَہُمۡ فِی الدُّنۡیَا خِزۡیٌ ۚۖ وَّ لَہُمۡ فِی الۡاٰخِرَۃِ عَذَابٌ عَظِیۡمٌ ﴿۴۱﴾

کہ دل پاک کرے ان کے ۲؎ ان کو دنیا میں ذلت ہے اور ان کو آخرت میں بڑا عذاب ہے

خلاصہ تفسیر: (پیچھے آنے والوں اور بھیجنے والوں کی الگ الگ مذمت تھی، اب ان سب کی مذمت ہے) اور (اصل یہ ہے کہ) جس کا خراب (اور گمراہ) ہونا خدا ہی کو منظور ہو (اگرچہ خدا کی یہ منظوری اسی وقت ہوتی ہے جبکہ گمراہ خود گمراہ ہونے کا عزم اور قصد کرے تو حق تعالی بھی حسب عادت جب کوئی قصد کرتا ہے اس کو ویسا ہی کر دیتے ہیں) تو اس کے لئے اللہ سے (اے عام مخاطب!) تیرا کچھ زور نہیں چل سکتا (کہ اس گمراہی کو نہ پیدا ہونے دے، یہ تو ایک عام قاعدہ ہوا، اب یہ سمجھو کہ) یہ لوگ ایسے (ہی) ہیں خدا تعالیٰ کو ان کے دلوں کا (کفریات سے) پاک کرنا منظور نہیں ہوا (کیونکہ یہ خود پاک ہونے کا عزم ہی نہیں کرتے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے بھی ان میں پاکی پیدا نہیں فرمائی، خلاصہ یہ کہ جب وہ خود خراب رہنے کا قصد رکھتے ہیں تو حسب عادت ان کا خراب ہی ہونا منظور ہے، پس مذکورہ قاعدہ کے مطابق کوئی شخص ان کو ہدایت نہیں کر سکتا، مطلب یہ ہے کہ جب یہ خود خراب رہنے کا عزم رکھتے ہیں اور عزم کے بعد اس فعل کی تخلیق عادت الہیہ ہے، اور تخلیق الٰہی کو کوئی روک نہیں سکتا، پھر ان کے راہ پر آنے کی توقع کیا کی جائے، اس مضمون میں رسول اللہ ﷺ کو زیادہ تسلی ہے، جس سے کلام شروع بھی ہوا تھا، پس کلام کا آغاز وانجام تسلی کے مضمون سے ہوا)۔

(اب ان اعمال کا ثمرہ بیان فرماتے ہیں کہ) ان (سب) لوگوں کے لئے دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں ان (سب) کے لئے سزائے عظیم ہے (یعنی دوزخ، چنانچہ منافقین کی رسوائی تو یہ ہوئی کہ مسلمانوں کو ان کا نفاق معلوم ہو گیا اور سب ذلت سے دیکھتے تھے اور یہود کے قتل وقید و جلاوطنی کا ذکر روایات میں مشہور ہے، اور عذاب آخرت ظاہر ہی ہے۔

وَمَنۡ یُّرِدِ اللّٰہُ فِتۡنَتَہٗ: اس میں دلالت ہے کہ پیر اور شیخ کی شفقت اور توجہ بغیر اللہ کی توفیق وفضل کے کچھ نفع نہیں دیتی۔

* * *

فائدہ: ۱؎ فَلَنۡ تَمۡلِکَ لَہٗ مِنَ اللّٰہِ شَیۡـًٔا: ہدایت وضلالت، خیر وشر کوئی چیز بھی بدون ارادہ خداوندی کے عالم وجود میں نہیں آسکتی، یہ ایک ایسا اصول ہے کہ جس کا انکار کرنا اس کے تسلیم کرنے سے زیادہ مشکل ہے، فرض کرو کہ ایک شخص چوری کرنے کا ارادہ کرتا ہے، لیکن خدا کا ارادہ یہ ہے کہ چوری نہ کرے، اب وہ شخص اگر اپنے ارادہ میں کامیاب رہا تو لازم آتا ہے کہ خدا اس کے مقابلہ معاذ اللہ عاجز ہوا اور اگر خدا ہی کا ارادہ بندہ کے ارادہ پر غالب رہتا ہے تو لازم آتا ہے کہ دنیا میں کہیں چوری وغیرہ کسی شر کا وجود نہ رہے اور اگر خدا تعالیٰ خیر وشر میں سے کسی کا بھی ارادہ نہیں کرتا تو اس سے معاذ اللہ اس کا تعطل یا غفلت وسفاہت لازم آتی ہے۔ تعالیٰ اللہ عن کل الشرور و تقدس۔ ان تمام شقوق پر غور کرنے کے بعد ناچار وہ ہی ماننا پڑے گا کہ کوئی چیز بھی اس کے ارادہ تخلیق کے بدون موجود نہیں ہو سکتی، یہ مسئلہ نہایت مہم اور طویل الذیل ہے، ہمارا قصد ہے کہ اس قسم کے مسائل کے متعلق مستقل مضمون لکھ کر فوائد کے ساتھ ملحق کر دیا جائے، واللہ الموافق۔

فائدہ: ۲؎ لَمۡ یُرِدِ اللّٰہُ اَنۡ یُّطَہِّرَ قُلُوۡبَہُمۡ: اول منافقین اور یہود کا طرز عمل بیان فرمایا جس میں یہ چند اعمال بالخصوص ذکر کئے گئے: ① ہمیشہ جھوٹ اور باطل کی طرف جھکنا ② اہل حق کے خلاف جاسوسی کرنا ③ بد باطن اور شریر جماعتوں کو مدد پہنچانا ④ ہدایت کی باتوں کو تحریف کر کے بدل ڈالنا ⑤ اپنی خواہش اور مرضی کے خلاف کسی حق بات کو قبول نہ کرنا، جس قوم میں یہ خصال پائی جائیں اس کی مثال ایسے مریض کی سمجھو جو نہ دوا استعمال کرے، نہ مہلک اور مضر چیزوں سے پرہیز قائم رکھ سکے، اطباء اور ڈاکٹروں کا مذاق اڑائے، فہمایش کرنے والوں کو گالیاں دے، نسخہ پھاڑ کر پھینک دے یا اپنی رائے سے اس کے اجزاء بدل ڈالے اور یہ عہد بھی کرلے کہ جو دوا میری خواہش اور مذاق کے خلاف ہوگی کبھی استعمال نہ کروں گا، ان

حالات کی موجودگی میں کوئی ڈاکٹر یا طبیب خواہ اس کا باپ ہی کیوں نہ ہو، اگر معالجہ سے دست بردار ہو کر یہ ہی ارادہ کر لے کہ ایسے مریض کو اب اس کی بے اعتدالیوں، غلط کاریوں، ضد اور ہٹ کا خمیازہ بھگتنے دو تو کیا یہ طبیب کی بے رحمی یا بے اعتنائی کا ثبوت ہوگا یا خود مریض کی خودکشی سمجھی جائے گی؟

اب اگر مریض اس بیماری سے ہلاک ہو گیا تو طبیب کو مورد الزام نہیں ٹھہرا سکتے کہ اس نے علاج نہ کیا اور تندرست کرنا نہ چاہا، بلکہ بیمار خود ملزم ہے کہ اس نے اپنے ہاتھوں سے اپنے کو تباہ کیا اور طبیب کو موقع نہ دیا کہ وہ اس کی صحت واپس لانے کی کوشش کرتا، ٹھیک اسی طرح یہاں یہود کی شرارت ہوا پرستی، ضد اور ہٹ دھرمی کو بیان فرما کر جو یہ لفظ فرمائے: وَمَنْ یُّرِدِ اللّٰهُ فِتْنَتَهٗ (جس کو اللہ نے گمراہ کرنا چاہا) اور اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ لَمْ یُرِدِ اللّٰهُ اَنْ یُّطَهِّرَ قُلُوْبَهُمْ (یہ ہی وہ لوگ ہیں جن کو اللہ نے نہ چاہا کہ ان کے دلوں کو پاک کرے) اس کا یہ ہی مطلب ہے کہ خدا نے ان کی سوء استعداد اور بدکاریوں کی وجہ سے اپنی نظر لطف وعنایت ان پر سے اٹھالی، جس کے بعد ان کے راہ پر آنے اور پاکی قبول کرنے کی کوئی توقع نہیں رہی ہے، آپ ان کے غم میں اپنے کو نہ گھلائیں لقولہ تعالیٰ: لَا یَحْزُنْكَ الَّذِیْنَ الخ۔

باقی یہ شبہ کہ خدا تو اس پر بھی قادر تھا کہ ان کی سب شرارتوں اور غلط کاریوں کو جبراً روک دیتا اور مجبور کر دیتا کہ وہ کوئی ضد اور ہٹ کر ہی نہ سکیں، تو بیشک میں تسلیم کرتا ہوں کہ خدا کی قدرت کے سامنے یہ چیز کچھ مشکل نہ تھی: وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِی الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِیْعًا (یونس) لیکن اس دنیا کا سارا نظام ہی ایسا رکھا گیا ہے کہ بندوں کو خیر وشر کے اکتساب میں مجبور محض نہ بنایا جائے، اگر صرف خیر کے اختیار پر سب کو مجبور کر دیا جاتا تو تخلیق عالم کی حکمت ومصلحت پوری نہ ہوتی اور حق تعالیٰ کی بہت سی صفات ایسی رہ جاتیں کہ ان کے ظہور کے لئے کوئی محل نہ ملتا، مثلاً عفوٌ غفورٌ، حلیمٌ، منتقم، ذوالبطش الشدید، قائم بالقسط، مالك یوم الدین وغیرہ حالانکہ عالم کے پیدا کرنے سے غرض ہی یہ ہے کہ اس کی تمامی صفات کمالیہ کا مظاہرہ ہو، کوئی مذہب یا کوئی انسان جو خدا کو فاعل مختار مانتا ہے انجام کار اس کے سوا کوئی دوسری غرض نہیں بتلا سکا، لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (سورہ ملک) اس سے زائد تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں بلکہ اس قدر بھی ہمارے موضوع سے زائد ہی ہے۔

سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ ؕ فَاِنْ جَآءُوْكَ فَاحْكُمْ بَیْنَهُمْ اَوْ اَعْرِضْ عَنْهُمْ ۚ

جاسوسی کرنے والے جھوٹ بولنے کیلئے اور بڑے حرام کھانے والے، سو اگر آئیں وہ تیرے پاس تو فیصلہ کر دے ان میں یا منہ پھیر لے ان سے ؎

وَاِنْ تُعْرِضْ عَنْهُمْ فَلَنْ یَّضُرُّوْكَ شَیْـًٔا ؕ وَاِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَیْنَهُمْ بِالْقِسْطِ ؕ

اور اگر تو منہ پھیر لے گا ان سے تو وہ تیرا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے، اور اگر تو فیصلہ کرے تو فیصلہ کر ان میں انصاف سے

اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ ﴿۴۲﴾

بیشک اللہ دوست رکھتا ہے انصاف کرنے والوں کو ؎

خلاصہ تفسیر: یہ لوگ (دین کے بارے میں) غلط باتوں کے سننے کے عادی ہیں (جیسا پہلے آچکا) بڑے حرام (مال) کے کھانے والے ہیں (اسی حرص نے ان کو احکام میں غلط بیانی کا عادی کر دیا جس کے عوض کچھ نذرانہ وغیرہ ملتا ہے، جب ان لوگوں کی یہ حالت ہے) تو اگر یہ لوگ (اپنا کوئی مقدمہ لے کر) آپ کے پاس (فیصلہ کرانے) آئیں تو (آپ ﷺ مختار ہیں) خواہ آپ ان (کے معاملہ) میں فیصلہ کر دیجئے یا ان کو ٹال دیجئے اور اگر آپ (کی یہی رائے قرار پائے کہ آپ ﷺ) ان کو ٹال ہی دیں تو (یہ اندیشہ نہ کیجئے کہ شاید ناخوش ہو کر دشمنی نکالیں کیونکہ) ان کی مجال نہیں کہ آپ کو ذرا بھی ضرر پہنچا سکیں (کیونکہ اللہ تعالیٰ آپ کے نگہبان ہیں) اور اگر (فیصلہ کرنے پر رائے قرار پائے اور) آپ فیصلہ کریں تو ان میں عدل (یعنی قانون اسلام) کے موافق فیصلہ کیجئے، بیشک حق تعالیٰ عدل کرنے والوں سے محبت کرتے ہیں (اور اب وہ عدل منحصر ہو گیا ہے قانون اسلام میں، پس وہی لوگ محبوب ہوں گے جو اس قانون کے مطابق فیصلہ کریں)۔

* * *

فائدہ: ۱ ابن عباسؓ، مجاہدؒ اور عکرمہؒ وغیرہ اکابر سلف سے منقول ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اختیار ابتداء میں تھا، آخر میں جب اسلام کا تسلط اور نفوذ کامل ہوگیا تو ارشاد ہوا: وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ (المائدہ:۴۹) یعنی ان کے نزاعات کا فیصلہ قانون شریعت کے موافق کردیا کرو، مطلب یہ کہ اعراض اور کنارہ کشی کی ضرورت نہیں۔

فائدہ: ۲ قران کریم نے بار بار اس پر زور دیا ہے کہ کوئی شخص کتنا ہی شریر ظالم اور بدمعاش کیوں نہ ہو، مگر اس کے حق میں بھی تمہارا دامن عدالت ناانصافی کے چھینٹوں سے داغدار نہ ہونے پائے، یہ ہی وہ خصلت ہے جس کے سہارے زمین وآسمان کا نظام قائم رہ سکتا ہے۔

وَكَيْفَ يُحَكِّمُوْنَكَ وَعِنْدَهُمُ التَّوْرٰىةُ فِيْهَا حُكْمُ اللّٰهِ ثُمَّ يَتَوَلَّوْنَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ط

اور وہ تجھ کو کس طرح منصف بنائیں گے اور ان کے پاس تو تورات ہے جس میں حکم ہے اللہ کا پھر اس کے پیچھے پھرے جاتے ہیں

وَمَآ اُولٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۴۳﴾ ع

اور وہ ہرگز ماننے والے نہیں ہیں

خلاصہ تفسیر: پیچھے بیان ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس انکا کوئی مسئلہ یا فیصلہ لے کر آنا حق کی معرفت کی غرض سے نہیں، بلکہ اپنے مطلب کے موافق کوئی آسان بات تلاش کرنا مقصود ہے، اب یہی بات صیغہ تعجب سے استدلال کر کے بیان کرتے ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ حق کی تحقیق کیلئے نہیں آتے، بلکہ اپنا مطلب نکالنے کو پھرتے ہیں، جس کا کھلا قرینہ اپنا مطلب نہ نکلنے کی صورت میں اس شخص کے فتوے پر عمل نہ کرنا ہے:

اور (تعجب کی بات ہے کہ) وہ (دین کے معاملہ میں) آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیسے فیصلہ کراتے ہیں، حالانکہ ان کے پاس تورات (موجود) ہے جس میں اللہ کا حکم (لکھا) ہے (جس کے ماننے کا ان کو دعویٰ ہے، اول تو یہی بات بعید ہے) پھر (یہ تعجب اس سے مزید پختہ ہوگیا کہ) اس (فیصلہ لانے) کے بعد (جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ سنتے ہیں تو اس فیصلہ سے بھی) ہٹ جاتے ہیں (یعنی اول تو اس حالت میں فیصلہ لانے ہی سے تعجب ہوتا تھا، لیکن اس احتمال سے دور ہوسکتا تھا کہ شاید آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا حق پر ہونا ان پر واضح ہوگیا ہو اس لئے آگئے ہوں، لیکن جب اس فیصلہ کو نہ مانا تو وہ تعجب پھر تازہ ہوگیا کہ اب تو وہ احتمال بھی نہ رہا، پھر کیا بات ہوگی جس کے واسطے یہ فیصلہ لائے ہیں) اور (اسی سے ہر عاقل کو اندازہ ہوگیا کہ) یہ لوگ ہرگز اعتقاد والے نہیں (یہاں اعتقاد سے نہیں آئے اپنے مطلب کے لیے آئے تھے، اور جب نہ ماننا اعتقاد نہ ہونے کی دلیل ہے تو اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جیسے ان کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اعتقاد نہیں، اسی طرح اپنی کتاب تورات کے ساتھ بھی پورا اعتقاد نہیں ورنہ اس کو چھوڑ کر کیوں آتے؟! غرض دونوں طرف سے گئے کہ جس سے انکار ہے یعنی قرآن اس سے بھی اعتقاد نہیں اور جس سے اعتقاد کا دعویٰ ہے یعنی تورات اس سے بھی اعتقاد نہیں، نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے ہوئے)۔

فِيْهَا حُكْمُ اللّٰهِ: یعنی اس تورات میں اللہ کا حکم موجود ہے، اس سے شبہ ہوتا ہے کہ تورات محرف نہ ہوئی تھی جبھی قرآن کریم میں یہاں اس کا حوالہ دیا گیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ خلاصہ تفسیر میں اس کی وضاحت کردی گئی ہے کہ "جس کے ماننے کا ان کو دعویٰ ہے"، کیونکہ یہ گفتگو یہود کے زعم اور گمان پر کی جارہی ہے، یا یہ کہ خاص ان مذکورہ واقعات کے احکام تورات میں محفوظ ہوں اس لیے یہاں حوالہ دیا گیا۔

* * *

فائدہ: یعنی تعجب کی بات ہے کہ آپ کو حکم ٹھہراتے ہیں اور جس تورات کو کتاب آسمانی مانتے ہیں اس کے فیصلہ پر بھی راضی نہیں تو حقیقت میں ان کا ایمان کسی پر بھی نہیں، نہ قرآن پر نہ تورات پر۔

ربط: اگلے رکوع میں تورات وانجیل کی مدح فرما کر متنبہ کیا ہے کہ کیسی عمدہ کتاب اور کیسے علوم ہدایت تھے جن کی ان نالائقوں نے بے قدری کی اور انہیں ایسا ضائع کیا کہ آج اصل چیز کا پتہ لگانا بھی مشکل ہوگیا، آخر حق تعالیٰ نے اپنی رحمت کاملہ سے بالکل آخر میں وہ کتاب بھیجی جو ان سب پہلی کتابوں کے مطالب اصلیہ کی محافظ اور مصدق ہے اور جس کی ابدی حفاظت کا انتظام نازل کرنے والے نے خود اپنے ذمہ لیا ہے **فللّٰہ الحمد والمنۃ**۔

اِنَّآ اَنۡزَلۡنَا التَّوۡرٰىةَ فِيۡهَا هُدًى وَّنُوۡرٌ ۚ يَحۡكُمُ بِهَا النَّبِيُّوۡنَ الَّذِيۡنَ اَسۡلَمُوۡا لِلَّذِيۡنَ هَادُوۡا

ہم نے نازل کی تورات کہ اس میں ہدایت اور روشنی ہے ۱ اس پر حکم کرتے تھے پیغمبر جو کہ حکم بردار تھے اللہ کے یہود کو

وَالرَّبّٰنِيُّوۡنَ وَالۡاَحۡبَارُ بِمَا اسۡتُحۡفِظُوۡا مِنۡ كِتٰبِ اللّٰهِ وَكَانُوۡا عَلَيۡهِ شُهَدَآءَ ۚ

اور حکم کرتے تھے درویش اور عالم ۲ اس واسطے کہ وہ نگہبان ٹھرائے گئے تھے اللہ کی کتاب پر اور اس کی خبر گیری پر مقرر تھے ۳

فَلَا تَخۡشَوُا النَّاسَ وَاخۡشَوۡنِ وَلَا تَشۡتَرُوۡا بِاٰيٰتِىۡ ثَمَنًا قَلِيۡلًا ؕ وَمَنۡ لَّمۡ يَحۡكُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ

سوتم نہ ڈرو لوگوں سے اور مجھ سے ڈرو اور مت خریدو میری آیتوں پر مول تھوڑا ۴ اور جو کوئی حکم نہ کرے اس کے موافق جو کہ اللہ نے اتارا

فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡكٰفِرُوۡنَ ﴿۴۴﴾

سو وہی لوگ ہیں کافر ۵

خلاصہ تفسیر: پیچھے بہت سی آیتوں میں یہود ونصاری کا احکام الہیہ کو چھوڑ دینا اور اللہ سے کیے ہوئے عہد کو توڑ دینا بیان ہوا، اب یہ بیان فرماتے ہیں کہ ان احکام الہیہ پر ہر زمانہ میں عمل کرنا واجب ہے جو کبھی تورات کے واسطہ سے ظاہر ہوئے، کبھی انجیل کے اور اب قرآن مجید کے واسطہ سے ظاہر ہو رہے ہیں، اور تورات وانجیل پر عمل کرنے کا اس لیے حکم فرمایا تا کہ وہ رسالت محمدیہ کی تصدیق کا سبب ہو جائے، کیونکہ ان دونوں کتابوں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت موجود ہے اور تورات کے ذکر میں بعض قصص کے احکام شاید اس لیے ذکر فرما دیے ہوں کہ اوپر کی آیتوں کا سبب نزول قصاص کا ایک واقعہ بھی تھا جس کو یہود نے بدل دیا تھا۔

ہم نے (موسیٰ علیہ السلام پر) توریت نازل فرمائی تھی جس میں (صحیح عقائد کی بھی) ہدایت تھی اور (عملی احکام کا بھی) وضوح تھا، انبیاء (بنی اسرائیل) جو کہ (لاکھوں آدمیوں کے مقتداء ومطاع ہونے کے باوجود) اللہ تعالیٰ کے مطیع تھے اس (توراۃ) کے موافق یہود کو حکم دیا کرتے تھے اور (اسی طرح ان میں کے) اہل اللہ اور علماء بھی (اسی کے موافق حکم دیتے تھے کہ وہی اس وقت کی شریعت تھی) بوجہ اس کے کہ ان (اہل اللہ وعلماء) کو اس کتاب اللہ (پر عمل کرنے اور کرانے) کی نگہداشت کا حکم (حضرت انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ سے) دیا گیا تھا اور وہ اس کے (یعنی اس پر عمل کرنے کرانے کے) اقراری ہو گئے تھے (یعنی چونکہ ان کو اس کا حکم ہوا تھا اور انہوں نے اس حکم کو قبول کر لیا تھا، اس لئے ہمیشہ اس کے پابند رہے)۔

سو (اے اس زمانہ کے رؤسا وعلماء یہود! جب ہمیشہ سے تمہارے سب مقتداء توریت کو مانتے آئے ہیں تو) تم بھی (رسالت محمدیہ کی تصدیق کے بارے میں جس کا حکم توریت میں ہے) لوگوں سے (یہ) اندیشہ مت کرو (کہ اگر ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کر لیں گے تو عام لوگوں کی نظر میں ہماری جاہ کم ہو جائے گی) اور (صرف) مجھ سے ڈرو (کہ تصدیق نہ کرنے پر سزا دوں گا) اور میرے احکام کے بدلہ میں (دنیا کی) متاع قلیل (جو تم کو اپنے عوام سے وصول ہوتی ہے) مت لو (کہ یہی حب جاہ وحب مال تم کو تصدیق نہ کرنے کا سبب بنتی ہیں) اور (یاد رکھو کہ) جو شخص خدا تعالیٰ کے نازل کئے ہوئے کے موافق حکم نہ کرے (بلکہ غیر شرعی حکم کو جان بوجھ کر شرعی حکم بتلا کر اس کے مطابق حکم کرے) سو ایسے لوگ بالکل کافر ہیں (جیسا اے یہود! تم کر رہے ہو کہ عقائد میں بھی تحریف کی جیسے عقیدہ رسالت محمدیہ، اور اعمال میں بھی جیسے حکم رجم وغیرہ میں کہ اپنی من گھڑت باتوں کو حکم الہی بتلا کر خود بھی گمراہ ہو رہے ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کر رہے ہیں)۔

* * *

فائدہ: ۱ اِنَّآ اَنۡزَلۡنَا التَّوۡرٰىةَ فِيۡهَا هُدًى وَّنُوۡرٌ: یعنی وصول الی اللہ کے طالبین کے لئے ہدایت کا اور شبہات ومشکلات کی ظلمت

میں پھنس جانے والوں کے لئے روشنی کا کام دیتی ہے۔

فائدہ: ۲ لِلَّذِيْنَ هَادُوْا وَالرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ: یعنی تورات میں ایسا عظیم الشان دستور العمل اور عین ہدایت تھا کہ کثیر التعداد پیغمبر اور اہل اللہ اور علماء برابر اسی کے موافق حکم دیتے اور نزاعات کے فیصلے کرتے رہے۔

فائدہ: ۳ وَكَانُوْا عَلَيْهِ شُهَدَآءَ: یعنی تورات کی حفاظت کا ان کو ذمہ دار بنایا گیا تھا، قرآن کریم کی طرح انا لہ لحافظون کا وعدہ نہیں ہوا تو جب تک علماء واحبار نے اپنی ذمہ داری کا احساس کیا تورات محفوظ ومعمول رہی، آخر دنیا پرست علمائے سوء کے ہاتھوں سے تحریف ہو کر ضائع ہوئی۔

فائدہ: ۴ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا: یعنی لوگوں کے خوف یا دنیاوی طمع کی وجہ سے آسمانی کتاب میں تبدیل وتحریف مت کرو، اس کے احکام واخبار کو مت چھپاؤ اور خدا کی تعذیب وانتقام سے ڈرتے رہو، تورات کی عظمت شان اور مقبولیت جتلانے کے بعد یہ خطاب یا تو ان رؤساء علمائے یہود کو کیا گیا ہے جو نزول قرآن کے وقت موجود تھے، کیونکہ انہوں نے حکم رجم سے انکار کر دیا تھا اور نبی کریم ﷺ کے متعلق پیشین گوئیوں کو چھپاتے اور ان کے معنی میں عجیب طرح کے ہیر پھیر کرتے تھے اور یا درمیان میں امت مسلمہ کو نصیحت ہے کہ تم دوسری قوموں کی طرح کسی سے ڈر کر یا حب مال وجاہ میں پھنس کر اپنی آسمانی کتاب کو ضائع مت کرنا، چنانچہ اس امت نے بحمد اللہ ایک حرف بھی اپنی کتاب کا کم نہیں کیا اور آج تک اس کو مبطلین کی تغییر وتحریف سے محفوظ رکھنے میں کامیاب رہے اور ہمیشہ رہیں گے۔

فائدہ: ۵ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ: مآ انزل اللہ کے موافق حکم نہ کرنے سے غالباً یہ مراد ہے کہ منصوص حکم کے وجود ہی سے انکار کر دے اور اس کی جگہ دوسرے احکام اپنی رائے اور خواہش سے تصنیف کر لے، جیسا کہ یہود نے حکم رجم کے متعلق کیا تھا، تو ایسے لوگوں کے کافر ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے اور اگر مراد یہ ہو کہ مآ انزل اللہ کو عقیدۃ ثابت مان کر پھر فیصلہ عملاً اس کے خلاف کرے تو کافر سے مراد عملی کافر ہوگا، یعنی اس کی عملی حالت کافروں جیسی ہے۔

وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ ۙ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَالْاُذُنَ

اور لکھ دیا ہم نے ان پر اس کتاب میں کہ جی کے بدلے جی اور آنکھ کے بدلے آنکھ اور ناک کے بدلے ناک اور کان

بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ ۙ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ ۭ فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ ۭ

کے بدلے کان اور دانت کے بدلے دانت اور زخموں کے بدلہ ان کے برابر ۱، پھر جس نے معاف کر دیا تو وہ گناہ سے پاک ہو گیا ۲

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۴۵﴾

اور جو کوئی حکم نہ کرے اس کے موافق جو کہ اللہ نے اتارا سو وہی لوگ ہیں ظالم ۳

خلاصہ تفسیر: گذشتہ آیات میں حکم زنا میں یہود کی خیانت کا ذکر تھا، اب ان آیات میں یہودیوں کی حکم قصاص میں خیانت کا ذکر ہے اور مطلب یہ ہے کہ توریت اللہ کی اتاری ہوئی کتاب تھی جو سراپا نور اور ہدایت تھی اور تمام انبیاء اور علماء اس کے مطابق فیصلے کیا کرتے تھے اسی توریت میں قصاص کا بھی حکم دیا گیا تھا، مگر یہود نے جس طرح حکم رجم کو بدل ڈالا اسی طرح قصاص کے حکم میں بھی تحریف کر ڈالی، مدینہ منورہ میں یہود کے دو گروہ تھے بنی قریظہ اور بنی نضیر چونکہ بنی نضیر غالب تھے اس لیے دیت اور قصاص میں مساوات کے قائل نہ تھے، بلکہ بنو قریظہ کو اپنے سے کم دیت لینے پر مجبور کر رکھا تھا، اس آیت میں یہود کو اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ قانون کے خلاف اپنا قانون جاری کرنے پر سخت تنبیہ فرمائی اور ایسا کرنے والوں کو کافر اور ظالم قرار دیا۔

اور ہم نے ان (یہود) پر اس (توراۃ) میں یہ بات فرض کی تھی کہ (اگر کوئی کسی کو ناحق جان بوجھ کر قتل یا زخمی کرے اور صاحب حق دعویٰ

کرے تو) جان بدلے جان کے اور آنکھ بدلے آنکھ کے اور ناک بدلے ناک کے اور کان بدلے کان کے اور دانت بدلے دانت کے اور (اسی طرح دوسرے) خاص زخموں کا بھی بدلہ ہے، پھر جو شخص (اس قصاص یعنی بدلہ لینے کا مستحق ہو کر پھر بھی بدلہ نہ لے اور) اس (قصاص) کو معاف کر دے وہ (معاف کرنا) اس (معاف کرنے والے) کے لئے (اس کے گناہوں کا) کفارہ (یعنی گناہوں کے دور ہونے کا سبب) ہو جائے گا (یعنی معاف کرنا موجب ثواب ہے) اور (چونکہ یہود نے ان احکام کو چھوڑ رکھا تھا اس لئے دوبارہ وعید سناتے ہیں کہ) جو شخص خدا تعالیٰ کے نازل کئے ہوئے کے موافق حکم نہ کرے (جس کے معنی پیچھے گزر چکے) سو ایسے لوگ بالکل ستم ڈھا رہے ہیں (یعنی بہت برا کام کر رہے ہیں)۔

چونکہ اصول فقہ میں یہ قاعدہ ثابت ہو چکا ہے کہ پہلی شریعتوں کے احکام جب قرآن وحدیث میں بلا انکار کے مذکور ہوں تو وہ ہمارے لیے بھی حجت ہیں، اس لیے یہ مضمون ہماری شریعت کا بھی حکم ہے، باقی اس میں بعض صورتوں میں تفصیل ہے جو کتب فقہ سے معلوم ہو سکتی ہے۔

فَمَنۡ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ: حدیث مرفوع میں یہ تفسیر ہے کہ کسی کا دانت توڑ دیا جائے یا بدن میں زخم کر دیا جائے اور وہ معاف کر دے تو اس معاف کرنے کے بقدر اس معاف کرنے والے کے گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں، سو اس میں عفو و درگزر کی ترغیب ہے اور اس قسم کا عفو و درگزر اہل اللہ کے اخلاق میں سے ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ قصاص کا یہ حکم شریعت موسوی میں تھا، اور بہت سے علمائے اصول نے تصریح کی ہے کہ جو پچھلی شرائع قرآن کریم یا ہمارے پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے نقل فرمائیں بشرطیکہ ان کی نسبت کسی جگہ حضور نے کوئی انکار یا ترمیم نہ فرمائی ہو تو وہ اس امت کے حق میں بھی تسلیم کی جائیں گی، گویا بدون رد و انکار کے ان کو سنانا تلقی بالقبول کی دلیل ہے۔

فائدہ: ۲ یعنی جروح کے قصاص کو معاف کر دینا مجروح کے گناہوں کا کفارہ بن جاتا ہے، جیسا کہ بعض احادیث میں اسکی تصریح آئی ہے، اور بعض مفسرین نے اس آیت کو جارح کے حق میں رکھا ہے یعنی اگر مجروح نے جارح کو معافی دے دی تو اسکا گناہ معاف ہو جائے گا والراجح ھو الاول۔

فائدہ: ۳ یہود نے حکم قصاص کے خلاف بھی تعامل قائم کر لیا تھا، ان میں بنی نضیر جو زیادہ معزز اور قوی سمجھے جاتے تھے، بنو قریظہ سے پوری دیت وصول کرتے اور جب ان کو دینے کی نوبت آتی تو نصف دیت ادا کرتے، بنی قریظہ نے اپنی کمزوری کی وجہ سے ان سے اس طرح کا معاہدہ کر رکھا تھا اتفاقاً بنی قریظہ کے ہاتھ سے بنی نظیر کا آدمی مارا گیا، انہوں نے دستور سابق کے موافق ان سے پوری دیت طلب کی بنی قریظہ نے جواب دیا کہ جاؤ وہ زمانہ گیا جب ہم نے تمہاری قوت سے مجبور ہو کر یہ ظلم منظور کر لیا تھا، اب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں محال ہے کہ کوئی قوی ضعیف کو کچل سکے یا دبا سکے، کیونکہ سب کو یقین تھا کہ آپ ہر ضعیف و قوی کے ساتھ یکساں انصاف کرتے ہیں اور اقویاء کے مظالم کے مقابلہ میں ضعفاء کی دستگیری فرماتے ہیں، انجام کار یہ معاملہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت میں پیش ہوا اور بنی قریظہ نے جو خیال اس پیکر عدل وانصاف کی نسبت ظاہر کیا تھا بلا کم و کاست صحیح نکلا، حکم قصاص کے بعد وَمَنۡ لَّمۡ يَحۡكُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ الخ فرمانے سے اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے، اور چونکہ رجم کی طرح قصاص کے حکم شرعی ہونے سے صریحاً انکار نہیں کیا تھا بلکہ آپس کی مفاہمت سے خلاف حکم شرعی ایک دستور قائم کر لیا تھا تو قانون عدل کی یہ اعتقادی نہیں صرف عملی مخالفت ہوئی، اسی لئے یہاں کافرون کی جگہ ظٰلمون فرمایا، یعنی یہ ظلم صریح ہے کہ قوی سے کم اور ضعیف سے زیادہ دیت لی جائے۔

وَقَفَّيۡنَا عَلٰۤى اٰثَارِهِمۡ بِعِيۡسَى ابۡنِ مَرۡيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيۡنَ يَدَيۡهِ مِنَ التَّوۡرٰىةِ‌ وَاٰتَيۡنٰهُ

اور پیچھے بھیجا ہم نے انہی کے قدموں پر عیسیٰ مریم کے بیٹے کو ۱ تصدیق کرنے والا توارت کی جو آگے سے تھی، اور اس کو دی ہم نے

الۡاِنۡجِيۡلَ فِيۡهِ هُدًى وَّنُوۡرٌ ۙ وَّمُصَدِّقًا لِّمَا بَيۡنَ يَدَيۡهِ مِنَ التَّوۡرٰىةِ وَهُدًى وَّمَوۡعِظَةً لِّلۡمُتَّقِيۡنَ ۝٤٦

انجیل جس میں ہدایت اور روشنی تھی، اور تصدیق کرتی تھی اپنے سے اگلی کتاب توارت کی اور راہ بتلانے والی اور نصیحت تھی ڈرنے والوں کو ۲

خلاصہ تفسیر: پیچھے تورات کا اپنے زمانہ میں واجب العمل اور حجت ہونا مذکور تھا، اب انجیل کی یہی صفت بیان کی جاتی ہے، اور اہل انجیل یعنی نصاریٰ کو خطاب فرما کر اللہ کے نازل کئے ہوئے قانون کے خلاف کوئی قانون جاری کرنے پر سخت تنبیہ کی جاتی ہے۔

اور ہم نے ان (نبیوں) کے پیچھے (جن کا ذکر اوپر یحکم بھا النبیون میں آیا ہے) عیسیٰ بن مریم (علیہ السلام) کو اس حالت میں (پیغمبر بنا کر) بھیجا کہ وہ اپنے سے قبل کی کتاب یعنی توریت کی تصدیق فرماتے تھے (جو کہ رسالت کے لوازم میں سے ہے کہ تمام کتب الٰہیہ کی تصدیق کرے) اور ہم نے ان کو انجیل دی جس میں (توریت ہی کی طرح صحیح عقائد کی بھی) ہدایت تھی، اور (عملی احکام کا بھی) وضوح تھا، اور وہ (انجیل) اپنے سے قبل کی کتاب یعنی توریت کی تصدیق (بھی) کرتی تھی (کہ یہ بھی کتاب الٰہی کے لوازم میں سے ہے) اور وہ سراسر ہدایت اور نصیحت تھی خدا سے ڈرنے والوں کے لیے۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی ان کے نقش قدم پر یہ بھی چلتے تھے۔

فائدہ: ۲ یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام خود اپنی زبان سے تورات کی تصدیق فرماتے تھے اور جو کتاب (انجیل) ان کو دی گئی تھی وہ بھی تورات کی تصدیق کرتی تھی اور انجیل کی نوعیت بھی نور و ہدایت ہونے میں تورات کی طرح تھی، احکام و شرائع کے اعتبار سے دونوں میں بہت ہی قلیل فرق تھا، جیسا کہ وَلِاُحِلَّ لَکُمۡ بَعۡضَ الَّذِیۡ حُرِّمَ عَلَیۡکُمۡ (آل عمران: ۵۰) میں اشارہ کیا گیا ہے، اور یہ فرق تورات کی تصدیق کے منافی نہیں جیسے آج ہم قرآن کو ماننے اور صرف اسی کے احکام کو تسلیم کرنے کے باوجود بحمد اللہ تمام کتب سماویہ کے من عند اللہ ہونے کی تصدیق کرتے ہیں۔

وَلۡيَحۡكُمۡ اَهۡلُ الۡاِنۡجِيۡلِ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ فِيۡهِ‌ؕ وَمَنۡ لَّمۡ يَحۡكُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ

اور چاہیے کہ حکم کریں انجیل والے موافق اس کے جو کہ اتارا اللہ نے اس میں، اور جو کوئی حکم نہ کرے موافق اس کے جو کہ اتارا اللہ نے

فَاُولٰٓـئِكَ هُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ ﴿۴۷﴾

سو وہی لوگ ہیں نافرمان

خلاصہ تفسیر: اور (ہم نے انجیل دے کر حکم کیا تھا کہ) انجیل والوں کو چاہئے کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ اس میں نازل فرمایا ہے اس کے موافق حکم کیا کریں اور (اے اس زمانہ کے نصاریٰ! سن رکھو کہ) جو شخص خدا تعالیٰ کے نازل کئے ہوئے کے موافق حکم نہ کرے (اس کے معنی پیچھے گزر چکے ہیں) تو ایسے لوگ بالکل بے حکمی کرنے والے ہیں (اور انجیل رسالت محمدیہ کی خبر دے رہی ہے، تو تم اس کے خلاف کیوں چل رہے ہو)۔

* * *

فائدہ: یا تو عیسائی جو نزول انجیل کے وقت موجود تھے ان کو یہ حکم دیا گیا تھا اسی کو یہاں نقل فرما رہے ہیں، اور ہو سکتا ہے کہ نزول قرآن کے وقت جو عیسائی مخاطب تھے ان سے کہا گیا ہو کہ جو کچھ انجیل میں اللہ تعالیٰ نے اتارا ہے اس کے موافق ٹھیک ٹھیک حکم کریں، یعنی ان پیشین گوئیوں کو چھپانے یا لغو اور مہمل تاویلات سے بدلنے کی کوشش نہ کریں جو انجیل میں پیغمبر آخر الزمان اور مقدس ''فارقلیط'' کی نسبت حضرت مسیح کی زبانی کی گئی ہیں، یہ خدا تعالیٰ کی سخت نافرمانی ہوگی کہ جس ہادی جلیل اور مصلح عظیم کے متعلق حضرت مسیح یہ فرمائیں کہ ''جب وہ روح حق آئے گی تو تمہیں سچائی کی ساری راہیں بتائے گی''، اسی کی تکذیب پر کمر بستہ ہو کر اپنے لئے ابدی خسران قبول کرو، کیا مقدس مسیح اور اس کے پروردگار کی فرمانبرداری کے یہ ہی معنی ہیں،؟

وَاَنۡزَلۡنَاۤ اِلَيۡكَ الۡكِتٰبَ بِالۡحَـقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيۡنَ يَدَيۡهِ مِنَ الۡكِتٰبِ وَمُهَيۡمِنًا عَلَيۡهِ‌ فَاحۡكُمۡ

اور تجھ پر اتاری ہم نے کتاب سچی تصدیق کرنے والی سابقہ کتابوں کی اور ان کے مضامین پر نگہبان ۱ سو تو حکم کر

بَيۡنَهُم بِمَآ أَنزَلَ ٱللَّهُۖ وَلَا تَتَّبِعۡ أَهۡوَآءَهُمۡ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ ٱلۡحَقِّۚ

ان میں موافق اس کے جو کہ اتارا اللہ نے ۲ اور ان کی خوشی پر مت چل چھوڑ کر سیدھا راستہ جو تیرے پاس آیا ۳

خلاصہ تفسیر: پیچھے تورات و انجیل کا اپنے اپنے دور میں واجب العمل ہونا بیان کیا تھا، اب قرآن مجید کا اپنے دور میں جو کہ نازل ہونے کے وقت سے قیامت تک رہے گا واجب العمل ہونا بیان فرماتے ہیں، اس کے ضمن میں ایک اور اہم اصولی مسئلہ یہ بھی بیان فرما دیا کہ اگرچہ اصول عقائد اور اطاعت حق جل شانہ، کے معاملہ میں تمام انبیاء علیہم السلام ایک ہی عقیدہ اور ایک ہی طریقہ کے پابند ہیں، لیکن بہ تقاضائے حکمت ہر پیغمبر کو اس کے زمانہ کی مناسب شریعت دی گئی ہے جس میں بہت سے فروعی اور جزوی احکام مختلف ہیں، اور یہ بتلایا کہ ہر پیغمبر کو جو شریعت دی گئی، اس کے زمانہ میں وہی مقتضائے حکمت اور واجب الاتباع تھی، اور جب اس کو منسوخ کر کے دوسری شریعت لائی گئی تو اس وقت وہی عین حکمت و مصلحت اور واجب الاتباع ہوگئی، اس میں شریعتوں کے مختلف ہوتے رہنے اور بدلتے رہنے کی ایک خاص حکمت کی طرف بھی اشارہ فرما دیا۔

اور (توراۃ و انجیل کے بعد) ہم نے یہ کتاب (قرآن کے نام سے) آپ ﷺ کے پاس بھیجی ہے جو خود بھی صدق (وراستی) کے ساتھ موصوف ہے اور اس سے پہلے جو (آسمانی) کتابیں (آچکی) ہیں (جیسے توراۃ، انجیل و زبور) ان کی بھی تصدیق کرتی ہے (کہ وہ اللہ کی نازل کردہ ہیں) اور (چونکہ یہ کتاب قرآن قیامت تک محفوظ اور عمل میں رہے گی اور اس میں ان گذشتہ آسمانی کتب کی تصدیق موجود ہے اس لئے یہ کتاب قرآن) ان کتابوں (کے صادق ہونے کے مضمون) کی (ہمیشہ کے لئے) محافظ ہے (کیونکہ قرآن میں ہمیشہ یہ محفوظ رہے گا کہ وہ کتب بھی خدا کی طرف سے نازل ہوئی تھیں، جب قرآن ایسی کتاب ہے) تو ان (اہل کتاب) کے باہمی معاملات میں (جبکہ آپ کے اجلاس میں پیش ہوں) اسی بھیجی ہوئی کتاب (قرآن) کے موافق فیصلہ فرمایا کیجئے اور یہ جو سچی کتاب آپ کو ملی ہے اس سے دور ہو کر ان کی (شریعت کے خلاف) خواہشوں (اور فرمائشوں) پر (آئندہ بھی) عملدرآمد نہ کیجئے (جیسا اب تک ان کی درخواست والتماس کے باوجود آپ ﷺ نے صاف انکار فرمایا، یعنی یہ آپ کی رائے نہایت ہی درست ہے، اسی پر ہمیشہ قائم رہئے)۔

* * *

فائدہ: ۱ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيۡنَ يَدَيۡهِ مِنَ ٱلۡكِتَٰبِ وَمُهَيۡمِنًا عَلَيۡهِ: مھیمن کے کئی معنی بیان کئے گئے ہیں، امین، غالب، حاکم، محافظ و نگہبان اور ہر معنی کے اعتبار سے قرآن کریم کا کتب سابقہ کے لئے مھیمن ہونا صحیح ہے، خدا کی جو امانت تورات و انجیل وغیرہ کتب سماویہ میں ودیعت کی گئی تھی وہ مع شے زائد قرآن میں محفوظ ہے، جس میں کوئی خیانت نہیں ہوئی اور جو بعض فروعی چیزیں ان کتابوں میں اس زمانہ یا ان مخصوص مخاطبین کے حسب حال تھیں ان کو قرآن نے منسوخ کر دیا اور جو حقائق ناتمام تھیں ان کی پوری تکمیل فرما دی ہے اور جو حصہ اس وقت کے اعتبار سے غیر مبہم تھا اسے بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔

فائدہ: ۲ فَٱحۡكُم بَيۡنَهُم بِمَآ أَنزَلَ ٱللَّهُ: یہود میں باہم کچھ نزاع ہوگیا تھا، ایک فریق جس میں ان کے بڑے بڑے مشہور علماء اور مقتدا شامل تھے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور فصل نزاع کی درخواست کی اور یہ بھی کہا کہ آپ کو معلوم ہے کہ عموماً قوم یہود ہمارے اختیار اور اقتدار میں ہے اگر آپ فیصلہ ہمارے موافق کر دیں گے تو ہم مسلمان ہو جائیں گے اور ہمارے اسلام لانے سے جمہور یہود اسلام قبول کر لیں گے، نبی کریم ﷺ نے اس رشوتی اسلام کو منظور نہ کیا اور ان کی خواہشات کی پیروی سے صاف انکار فرما دیا، اس پر یہ آیات نازل ہوئیں۔ (ابن کثیر)

فائدہ: ۳ وَلَا تَتَّبِعۡ أَهۡوَآءَهُمۡ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ ٱلۡحَقِّ: گذشتہ فائدہ میں ان آیات کا جو شان نزول ہم لکھ چکے ہیں اس سے صاف عیاں ہے کہ آیت کا نزول، بعد اس کے ہوا کہ آپ ان کی خوشی اور خواہش پر چلنے سے انکار فرما چکے تھے، تو یہ آیات آپ کی استقامت کی تصویب اور آئندہ بھی ایسی ہی شان عصمت پر ثابت قدم رہنے کی تاکید کے لئے نازل ہوئیں، جو لوگ اس قسم کی آیات کو نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شان عصمت کے خلاف تصور کرتے ہیں وہ نہایت ہی قاصر الفہم ہیں، اول تو کسی چیز سے منع کرنا اس کی دلیل نہیں کہ جس کو منع کیا جا رہا ہے وہ اس ممنوع چیز کا ارتکاب کرتا

جاہتا تھا، دوسرے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی ''معصومیت'' کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی معصیت ان سے صادر نہیں ہو سکتی، یعنی کسی کام کو یہ سمجھتے ہوئے کہ خدا کو ناپسند ہے ہرگز اختیار نہیں کر سکتے، اور اگر اتفاقاً کسی وقت بھول چوک یا رائے و اجتہاد کی غلطی سے راجح و افضل کی جگہ مرجوح و مفضول کو اختیار کرلیں یا غیر مرضی کو مرضی سمجھ کر عمل کر گزریں جس کو اصطلاح میں ''زلّۃ'' کہتے ہیں، تو اس طرح کے واقعات مسئلہ عصمت کے منافی نہیں، جیسا کہ حضرت آدم اور بعض دیگر انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے واقعات شاہد ہیں۔

اس حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد وَلَا تَتَّبِعۡ اَهۡوَآءَهُمۡ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الۡحَقِّ (المائدہ:۴۸) اور وَاحۡذَرۡهُمۡ اَنۡ يَّفۡتِنُوۡكَ عَنۡۢ بَعۡضِ مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ اِلَيۡكَ (المائدہ:۴۹) اور اسی طرح کی دوسری آیات کا مطلب سمجھنے میں کوئی خلجان نہیں رہتا، کیونکہ ان میں صرف اس بات پر متنبہ کیا گیا ہے کہ آپ ان ملعونوں کی تلمیع اور سخن سازی سے قطعاً متاثر نہ ہوں اور کوئی ایسی رائے قائم نہ فرمالیں جس میں بلا قصد ان کی خواہشات کے اتباع کی صورت پیدا ہو جائے، مثلاً اسی قصہ میں جو ان آیات کی شان نزول ہے یہود نے کیسی عیارانہ اور پرفریب صورت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کی تھی کہ اگر آپ ان کے حسب منشاء فیصلہ کر دیں تو سب یہود مسلمان ہو جائیں گے، وہ جانتے تھے کہ اسلام سے بڑھ کر دنیا میں کوئی چیز آپ کے نزدیک محبوب اور عزیز نہیں، ایسے موقع پر امکان تھا کہ بڑے سے بڑا مستقیم انسان بھی رائے قائم کرلے کہ ان کی ایک چھوٹی سی خواہش کے قبول کر لینے میں جب کہ اتنی عظیم الشان دینی منفعت کی توقع ہو، کیا مضائقہ ہے، اس طرح کے خطرناک اور مزلۃ الاقدام موقع پر قرآن کریم پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو متنبہ کرتا ہے کہ دیکھو بھول کر بھی کوئی ایسی رائے قائم نہ کر لیجئے جو آپ کی شان رفیع کے مناسب نہ ہو، حضور کا کمال تقویٰ اور انتہائی فہم و تدبر تو نزول آیت سے پہلے ہی ان ملاعین کے مکر و فریب کو رد کر چکا تھا، لیکن فرض کیجئے اگر ایسا نہ ہو چکا ہوتا تب بھی آیت کا مضمون جیسا کہ ہم تقریر کر چکے ہیں حضور کی شان عصمت کے اصلاً مخالف نہیں۔

لِكُلٍّ جَعَلۡنَا مِنۡكُمۡ شِرۡعَةً وَّمِنۡهَاجًا ؕ وَلَوۡ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمۡ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنۡ لِّيَبۡلُوَكُمۡ فِیۡ

ہر ایک کو تم میں سے دیا ہم نے ایک دستور اور راہ لے اور اللہ چاہتا تو تم کو ایک دین پر کر دیتا لیکن تم کو آزمانا چاہتا ہے

مَاۤ اٰتٰٮكُمۡ فَاسۡتَبِقُوا الۡخَيۡرٰتِ ؕ اِلَى اللّٰهِ مَرۡجِعُكُمۡ جَمِيۡعًا فَيُنَبِّئُكُمۡ بِمَا كُنۡتُمۡ فِيۡهِ تَخۡتَلِفُوۡنَ ۙ‏ ﴿۴۸﴾

اپنے دیے ہوئے حکموں میں ۲؎ سو تم دوڑ کر لو خوبیاں ۳؎ اللہ کے پاس تم سب کو پہنچنا ہے پھر جتا دے گا جس بات میں تم کو اختلاف تھا ۴؎

خلاصہ تفسیر: (اور اے اہل کتاب! تم کو اس قرآن کے حق جاننے سے اور اس کے فیصلہ کو ماننے سے کیوں انکار ہے؟ کیا نئے دین کا آنا کچھ تعجب کی بات ہے؟ آخر) تم میں سے ہر ایک (امت) کے لئے (اس سے قبل) ہم نے خاص شریعت اور خاص طریقت تجویز کی تھی (مثلاً یہود کی شریعت و طریقت تو راۃ تھی، اور نصاریٰ کی شریعت اور طریقت انجیل تھی، پھر اگر امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے شریعت و طریقت قرآن مقرر کیا گیا، جس کا حق ہونا بھی دلائل سے ثابت ہے تو انکار کی کیا وجہ) اور اگر اللہ تعالیٰ کو (سب کا ایک ہی طریقہ رکھنا) منظور ہوتا تو (وہ اس پر بھی قدرت رکھتے تھے کہ) تم سب (یہود و نصاریٰ اور اہل اسلام) کو (ایک ہی شریعت دے کر) ایک ہی امت میں کر دیتے (اور جدید شریعت نہ آتی جس سے تم کو وحشت ہوتی ہے) لیکن (اپنی حکمت سے) ایسا نہیں کیا (بلکہ ہر امت کو جدا جدا طریقہ دیا) تا کہ جو دین تم کو (ہر زمانہ میں نیا نیا) دیا ہے اس میں تم سب کا (تمہاری اطاعت کے اظہار کے لئے) امتحان فرما دیں (کیونکہ طبعی بات ہے کہ اکثر نئے طریقہ سے وحشت اور مخالفت کی طرف حرکت ہوتی ہے، لیکن جو شخص صحیح عقل اور انصاف سے کام لیتا ہے، وہ اس حقیقت کے ظاہر ہونے کے بعد اپنی طبیعت کو موافقت پر مجبور کر دیتا ہے، یہ ایک عظیم امتحان ہے، پس اگر سب کی ایک ہی شریعت ہوتی تو اس شریعت کی ابتداء کے وقت جو لوگ ہوتے ان کا امتحان تو ہو جاتا، لیکن دوسرے لوگ جو ان کے مقلد اور اس طریقہ سے پہلے سے مانوس ہوتے ان کا امتحان نہ ہوتا، اور اب ہر امت کا امتحان ہو گیا، اور امتحان کی ایک صورت یہ ہوتی ہے کہ انسان کو جس چیز سے روکا جائے خواہ معمول ہو یا متروک اس پر حرص ہوتی ہے، اور شریعتوں کے مختلف ہونے میں امتحان زیادہ ہے کہ منسوخ سے روکا جاتا ہے، پس جب نئی

شریعت میں یہ حکمت ہے) تو (تعصب کو چھوڑ کر) مفید باتوں کی طرف (یعنی ان عقائد واعمال واحکام کی طرف جن پر قرآن مشتمل ہے) دوڑو (یعنی قرآن پر ایمان لا کر اس پر چلو، ایک روز) تم سب کو خدا ہی کے پاس جانا ہے پھر وہ تم سب کو جتلا دے گا جس میں تم (حق واضح ہونے کے باوجود دنیا میں خواہ مخواہ) اختلاف کیا کرتے تھے (اس لئے اس بے جا اختلاف کو چھوڑ کر حق کو قبول کر لو جو کہ اب قرآن میں منحصر ہے)۔

لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا: یعنی تم میں سے ہر ایک کے لیے ہم نے خاص شریعت اور خاص طریقت تجویز کی تھی، اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ اس سے تو یہ سمجھ میں آتا ہے کہ ہر امت کا طریقہ دین الگ اور جدا ہے اور جبکہ دوسری آیت سے تمام امتوں کا طریقہ دین ایک ہی ہونا معلوم ہوتا ہے جیسا کہ سورہ شوریٰ میں ہے: شرع لکم من الدین ما وصی بہ الخ، اس کا جواب یہ ہے کہ طریقہ دین کا جدا ہونا فروع واعمال کے اعتبار سے ہے اور طریقہ دین کا ایک ہونا اصول وعقائد کے اعتبار سے ہے، یعنی اصول وعقائد میں تو تمام شریعتیں متحد ہیں اور فروعی وجزئی اعتبار سے جدا جدا ہیں۔

* * *

فائدہ: ۱ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا: یعنی خدا نے ہر امت کا آئین اور طریق کار اس کے احوال واستعداد کے مناسب جداگانہ رکھا اور باوجودیکہ تمام انبیاء اور ملل سماویہ اصول دین اور مقاصد کلیہ میں جن پر نجات ابدی کا مدار ہے، باہم متحد اور ایک دوسرے کے مصدق رہے ہیں، پھر بھی جزئیات اور فروع کے لحاظ سے ہر امت کو ان کے ماحول اور مخصوص استعداد کے موافق خاص خاص احکام وہدایات دی گئیں، اس آیت میں اسی فروعی اختلاف کی طرف اشارہ ہے، صحیح بخاری کی ایک حدیث میں جو سب انبیاء علیہم السلام کو آپس میں علاتی بھائی فرمایا ہے جن کا باپ ایک ہو اور مائیں مختلف ہوں، اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ اصول سب کے ایک ہیں اور فروع میں اختلاف ہے، اور چونکہ بچہ کی تولید میں باپ فاعل ومفیض اور ماں قابل اور محل افاضہ بنتی ہے، اس سے نہایت لطیف اشارہ اس طرف بھی ہو گیا کہ شرائع سماویہ کا اختلاف مخاطبین کی قابلیت واستعداد پر مبنی ہے، ورنہ مبداء فیاض میں کوئی اختلاف وتعدد نہیں، سب شرائع وادیان سماویہ کا سرچشمہ ایک ہی ذات اور اس کا علم ازلی ہے۔

فائدہ: ۲ وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ: یعنی کون تم میں سے خدا کی مالکیت مطلقہ، علم محیط اور حکمت بالغہ پر یقین کر کے ہر نئے حکم کو حق وصواب سمجھ کر بطوع ورغبت قبول کرتا ہے اور ایک وفادار غلام کی طرح جدید حکم کے سامنے گردن جھکا دینے کے لئے تیار رہتا ہے۔

فائدہ: ۳ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ: یعنی شرائع کے اختلاف کو دیکھ کر خواہ مخواہ کی قیل وقال اور کج بحثیوں میں پڑ کر وقت نہ گنواؤ، وصول الی اللہ کا ارادہ کرنے والوں کو عملی زندگی میں اپنی دوڑ دھوپ رکھنی چاہیے اور جو عقائد، اخلاق اور اعمال کی خوبیاں شریعت سماویہ پیش کر رہی ہے ان کے لینے میں چستی دکھلانی چاہئے۔

فائدہ: ۴ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ: تو انجام کا خیال کر کے حسنات وخیرات کی تحصیل میں مستعدی دکھلاؤ، اختلافات کی سب حقیقت وہاں جا کر کھل جائے گی۔

وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ وَاحْذَرْهُمْ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ عَنْۢ بَعْضِ

اور یہ فرمایا کہ حکم کر ان میں موافق اس کے جو کہ اتارا اللہ نے اور مت چل ان کی خوشی پر اور بچتا رہ ان سے کہ تجھ کو بہکا نہ دیں کسی ایسے حکم سے

مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكَ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمْ اَنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّصِيْبَهُمْ بِبَعْضِ ذُنُوْبِهِمْ ؕ

جو اللہ نے اتارا تجھ پر ۱ پھر اگر نہ مانیں تو جان لے کہ اللہ نے یہی چاہا کہ پہنچاوے ان کو کچھ سزا ان کے گناہوں کی ۲

وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ لَفٰسِقُوْنَ ﴿۴۹﴾

اور لوگوں میں بہت ہیں نافرمان ۳

خلاصہ تفسیر: اب رسول کریم ﷺ کو مخاطب بنا کر مسلمانوں کو اسی مضمون کے متعلق ہدایات دیں گئیں کہ وہ اہل کتاب کی طرح اس بیماری میں مبتلا نہ ہوجائیں کہ جاہ و مال کے لالچ میں اللہ تعالیٰ کے احکام کو بدلنے لگیں، یا اس کے قانون کے خلاف کوئی قانون اپنی طرف سے جاری کرنے لگیں، اس آیت میں ایک قصہ کی طرف بھی اشارہ ہے کہ ایک بار یہود کے چند علماء اور سردار حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور درخواست کی کہ ہمارا اپنی قوم سے کچھ مقدمہ ہے، اگر آپ ہمارے موافق فیصلہ فرما دیں تو ہم آپ کی اتباع کرلیں گے، آپ نے صاف انکار فرما دیا جس پر آپ کی رائے کی تصویب اور درستگی کے لیے یہ آیت نازل ہوئی۔

اور (چونکہ ان اہل کتاب نے ایسی فتنہ پردازی کی کہ آپ سے اپنے موافق مقدمہ طے کرنے کی درخواست کرتے ہیں، جہاں اس کا احتمال بھی نہیں ہوسکتا، اس لئے آئندہ مضمون سنا کر ان کے حوصلے پست اور ہمیشہ کے لیے ان کے ناامید کردینے کو) ہم (دوبارہ) حکم دیتے ہیں کہ آپ ان (اہل کتاب) کے باہمی معاملات میں (جب کہ آپ ﷺ کے اجلاس میں پیش ہوں) اس بھیجی ہوئی کتاب کے موافق فیصلہ فرمایا کیجئے اور ان کی (شریعت کے خلاف) خواہشوں (اور فرمائشوں) پر (آئندہ بھی) عملدرآمد نہ کیجئے (جیسا اب تک بھی نہیں کیا) اور ان سے یعنی ان کی اس بات سے (آئندہ بھی پہلے کی طرح) احتیاط رکھئے کہ وہ آپ کو خدا تعالیٰ کے بھیجے ہوئے کسی حکم سے بھی بچلائیں (یعنی اگرچہ آپ کے معصوم ہونے کی وجہ سے اس کا احتمال نہیں، لیکن اس کا قصد بھی رہے تو موجب ثواب بھی ہے)۔

پھر (قرآن کے واضح حکم اور اس کے فیصلہ کے حق ہونے کے باوجود بھی) اگر یہ لوگ (قرآن سے اور آپ ﷺ کے فیصلہ سے جو قرآن کے موافق ہوگا) اعراض کریں تو یہ یقین کرلیجئے کہ بس خدا ہی کو منظور ہے کہ ان کے بعض جرموں پر (دنیا ہی میں) ان کو سزا دے دیں (جرموں سے مراد یہود کا فیصلے کو نہ ماننا ہے جو ان کے رعایا ہونے کی حیثیت سے ذمی ہونے کے خلاف ہے، اور حربیت یعنی فتنہ وفساد پھیلانے کی سزا دنیا ہی میں ہوتی ہے، اور دوسرا جرم قرآن کی حقانیت کو نہ ماننا یہ کفر ہے، کیونکہ یہ جرم ایمان کے خلاف ہے، اور کفر کی پوری سزا تو آخرت ہی میں ملے گی، لیکن دنیا میں فتنہ وفساد پھیلانے کی سزا دنیا میں ملتی ہے، چنانچہ یہود کی سرکشی اور عہد شکنی جب حد سے تجاوز ہوئی تو ان کو قتل اور قید اور اخراج وطن کی سزا دی گئی) اور (اے محمد ﷺ! ان کے یہ حالات سن کر آپ کو رنج ضرور ہوگا، لیکن آپ زیادہ غم نہ کیجئے، کیونکہ) زیادہ آدمی تو (دنیا میں ہمیشہ سے) بےحکمی ہوتے (آئے) ہیں۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی آپس کے اختلافات میں خواہ دنیا کیسی ہی دست وگریباں رہے آپ کو یہ ہی حکم ہے کہ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ کے موافق حکم دیتے رہیں، اور کسی کے کہنے سننے کی کوئی پروا نہ کریں۔

فائدہ: ۲ پوری سزا تو قیامت میں ملے گی لیکن کچھ تھوڑی سی سزا دیکر یہاں بھی مجرم کو یا دوسرے دیکھنے والوں کو ایک گونہ تنبیہ کردی جاتی ہے۔

فائدہ: ۳ یعنی آپ ان لوگوں کے اعراض وانحراف سے زیادہ ملول نہ ہوں دنیا میں فرمانبردار بندے ہمیشہ تھوڑے ہی ہوتے ہیں: وَمَآ اَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِيْنَ (یوسف: ۱۰۳)

اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ ؕ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿۵۰﴾

اب کیا حکم چاہتے ہیں کفر کے وقت کا، اور اللہ سے بہتر کون ہے حکم کرنے والا یقین کرنے والوں کے واسطے

خلاصہ تفسیر: یہ لوگ (قرآن کے فیصلہ کو چھوڑ کر جو کہ عین عدل ہے) پھر کیا زمانہ جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں (جس کو انہوں نے آسمانی شریعتوں کے برخلاف خود گھڑ لیا تھا، جس کا ذکر دو واقعوں کے ضمن میں اس رکوع سے پہلے یا ایہا الرسول کی تمہید میں گزر چکا ہے، حالانکہ وہ سراسر عدل اور دلیل کے خلاف ہے، یعنی اہل علم ہو کر علم سے اعراض کرنا اور جہل کا طالب ہونا عجب در عجب ہے) اور فیصلہ کرنے میں اللہ سے کون اچھا (فیصلہ کرنے والا) ہوگا (بلکہ کوئی خدا کے برابر بھی نہیں ہوسکتا، پس خدائی فیصلہ کو چھوڑ کر دوسرے کے فیصلہ کا طالب ہونا عین جہل نہیں تو کیا ہے، لیکن یہ بات

بھی) یقین (وایمان) رکھنے والوں (ہی) کے نزدیک (ہے کیونکہ اسکا سمجھنا بھی عقل کی سلامتی وصحت پر موقوف ہے اور وہ کفار اس سے بے نصیب ہیں)۔

***

فائدہ: یعنی جو لوگ خدا کی شہنشاہیت، رحمت کاملہ اور علم محیط پر یقین کامل رکھتے ہیں انکے نزدیک دنیا میں کسی کا حکم خدا کے حکم کے سامنے لائق التفات نہیں ہوسکتا، پھر کیا یہ لوگ احکام الٰہیہ کی روشنی آجانے کے بعد ظنون واہواء اور کفر وجاہلیت کے اندھیرے ہی کی طرف جانا پسند کرتے ہیں۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰۤى اَوْلِيَآءَ ۘ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ؕ

اے ایمان والو مت بناؤ یہود اور نصاریٰ کو دوست [1] وہ آپس میں دوست ہیں ایک دوسرے کے [2]

وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۱﴾

اور جو کوئی تم میں سے دوستی کرے ان سے تو وہ انہی میں ہے [3] اللہ ہدایت نہیں کرتا ظالم لوگوں کو [4]

خلاصہ تفسیر: اوپر یہود ونصاریٰ کے قبائح بیان ہوئے، بعض منافقین جو کہ ظاہری طور پر تو اسلام کے مدعی تھے لیکن اہل کتاب سے بعض وہمی مصلحتوں کی بنا پر دوستی رکھتے تھے، کیونکہ غزوہ احد میں جب اہل اسلام کو بظاہر شکست ہوئی تو منافقین سخت اندیشہ میں پڑے اور باہم مشورے کرنے لگے کہ مسلمانوں کے غالب آنے کی تو کچھ امید نہیں رہی، اپنی پناہ کہیں اور لگائے رکھنی چاہیے، چنانچہ کسی نے یہودی سے کسی نے نصرانی سے پناہ لے لی کہ وقت پر مدد مل جائے، منافقین کے سردار عبداللہ بن ابی نے یہود بنی قینقاع سے ساز باز کرلیا اور جب وہ مسلمانوں سے لڑائی کرنے پر آمادہ ہوئے تو ان کی حمایت میں کھڑا ہوا، حضرت عبادہ بن صامت بھی اس قوم کے حلیف اور ہم عہد تھے مگر جب انہوں نے مسلمانوں سے لڑنے کا ارادہ کیا تو عبادہ نے صاف قطع تعلق کرلیا، عبداللہ بن ابی نے کہا کہ مجھے زمانہ کی گردش کا اندیشہ ہے، میں ان سے قطع تعلق نہیں کرسکتا، اس لیے اب اہل ایمان کو ان کے ساتھ دوستی کرنے سے منع فرماتے ہیں کہ جب ان لوگوں کے یہ حالات ہیں تو اس کا تقاضا تو یہی ہے کہ یہود ونصاریٰ سے ان منافقوں کی طرح ہرگز دوستی مت کرو، پھر اہل ایمان کو منع کرنے کے بعد ان منافقین کی مذمت اور ان کی مصلحتوں کو باطل کرتے ہیں جس کی بنا پر وہ یہود وغیرہ سے دوستی کرتے تھے اور انجام کار ان کا ندامت اٹھانا پیشین گوئی کے طور پر ذکر فرماتے ہیں۔

اے ایمان والو! تم (منافقوں کی طرح) یہود ونصاریٰ کو (اپنا) دوست مت بنانا، وہ (خود ہی) ایک دوسرے کے دوست ہیں (یعنی یہودی یہودی آپس میں، اور نصرانی نصرانی آپس میں دوست ہیں، مطلب یہ ہے کہ دوستی مناسبت سے ہوتی ہے، سو ان میں تو باہم مناسبت ہے، مگر تم میں اور ان میں کیا مناسبت) اور (جب معلوم ہوگیا کہ دوستی مناسبت سے ہوتی ہے تو) جو شخص تم میں سے ان کے ساتھ دوستی کرے گا بیشک وہ (ضرور ان سے کوئی خاص مناسبت رکھتا ہوگا جس کے اعتبار سے وہ) ان ہی میں سے ہوگا (اگرچہ کافر نہ بھی ہو، اور یہ بات اگرچہ ظاہر ہے لیکن) یقیناً اللہ تعالیٰ (اس بات کی) سمجھ ہی نہیں دیتے ان لوگوں کو جو (کفار سے دوستی کرکے) اپنا نقصان کر رہے ہیں (یعنی دوستی میں منہمک ہونے کی وجہ سے یہ بات ان کی سمجھ ہی میں نہیں آتی)۔

***

فائدہ: [1] لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰۤى اَوْلِيَآءَ: ''اولیاء'' ولی کی جمع ہے ''ولی'' دوست کو بھی کہتے ہیں، قریب کو بھی، ناصر اور مددگار کو بھی، غرض یہ ہے کہ یہود ونصاریٰ بلکہ تمام کفار سے جیسا کہ سورہ نساء میں تصریح کی گئی ہے مسلمان دوستانہ تعلقات قائم نہ کریں۔

اس موقع پر یہ ملحوظ رکھنا چاہیے کہ موالات، مروت وحسن سلوک، مصالحت، رواداری اور عدل وانصاف یہ سب چیزیں الگ الگ ہیں، اہل اسلام اگر مصلحت سمجھیں تو ہر کافر سے صلح اور عہد وپیمان مشروع طریقہ پر کرسکتے ہیں: وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ (الانفال:۶۱) عدل وانصاف کا حکم جیسا کہ گذشتہ آیات سے معلوم ہوچکا، مسلم وکافر ہر فرد بشر کے حق میں ہے، ''مروت'' اور ''حسن سلوک'' یا ''رواداری'' کا برتاؤ ان کفار کے ساتھ ہوسکتا ہے جو جماعت اسلام کے مقابلہ میں دشمنی اور عناد کا مظاہرہ نہ کریں، جیسا کہ سورہ ممتحنہ میں تصریح ہے، باقی

موالات یعنی دوستانہ اعتماد اور برادرانہ مناصرت و معاونت، تو کسی مسلمان کا حق نہیں کہ یہ تعلق کسی غیر مسلم سے قائم کرے، البتہ صوری موالات جو اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً (آل عمران: ۲۸) کے تحت میں داخل ہو، اور عام تعاون جس کا اسلام اور مسلمانوں کی پوزیشن پر کوئی برا اثر نہ پڑے اس کی اجازت ہے، بعض خلفائے راشدینؓ سے اس بارے میں جو غیر معمولی تشدید و تضییق منقول ہے اس کو محض سد ذرائع اور مزید احتیاط پر مبنی سمجھنا چاہئے۔

فائدہ: ۲ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ: یعنی مذہبی فرقہ بندی اور اندرونی بغض و عداوت کے باوجود باہم ایک دوسرے سے دوستانہ تعلقات رکھتے ہیں، یہودی یہودی کا، نصرانی نصرانی کا دوست بن سکتا ہے اور جماعت اسلام کے مقابلہ میں سب کفار ایک دوسرے کے دوست اور معاون بن جاتے ہیں: اَلْكُفْرُ مِلَّةٌ وَّاحِدَةٌ.

فائدہ: ۳ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ: یعنی ان ہی کے زمرہ میں شامل ہے، یہ آیتیں رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی کے باب میں نازل ہوئی تھیں، یہود سے اس کا بہت دوستانہ تھا، اس کا گمان یہ تھا کہ اگر مسلمانوں پر کوئی افتاد پڑی اور پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی جماعت مغلوب ہوگئی تو یہود سے ہماری یہ دوستی کام آئے گی، اسی واقعہ کی طرف اگلی آیت میں اشارہ کیا گیا ہے، تو فی الحقیقت یہود کے ساتھ منافقین کی موالات کا اصلی منشاء یہ تھا کہ یہود جماعت اسلام کے مدمقابل اور مذہب اسلام کے بدترین دشمن تھے، ظاہر ہے کہ جو شخص یہود و نصاریٰ یا کسی جماعت کفار کے ساتھ اس نیت اور حیثیت سے موالات کرے کہ وہ دشمن اسلام ہے اس کے کفر میں کیا شبہ ہوسکتا ہے، منافقین میں کچھ لوگ اور بھی تھے جنہوں نے جنگ احد میں لڑائی کا پانسا بدلا ہوا دیکھ کر کہنا شروع کیا تھا کہ ہم تو اب فلاں یہودی یا فلاں نصرانی سے دوستانہ گانٹھیں گے اور ضرورت پیش آنے پر ان ہی کا مذہب اختیار کرلیں گے، اس قماش کے لوگوں کی نسبت بھی وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ کا ظاہری مدلول اعلانیہ صادق ہے، رہے وہ مسلمان جو اس قسم کی نیت اور منشاء سے خالی ہو کر یہود و نصاریٰ کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کریں، چونکہ ان کی نسبت بھی قوی خطرہ رہتا ہے کہ وہ کفار کی حد سے زیادہ ہم نشینی اور اختلاط سے متاثر ہو کر رفتہ رفتہ ان ہی کا مذہب اختیار کرلیں، یا کم از کم اور رسوم شعائر کفر اور رسوم شرکیہ سے کارہ اور نفور نہ رہیں، اس اعتبار سے فانہ منھم کا اطلاق ان کے حق میں بھی ہوسکتا ہے جیسا کہ حدیث: المرء مع من احب نے اس مضمون کی طرف توجہ دلائی ہے۔

فائدہ: ۴ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ: یعنی جو لوگ کہ دشمنان اسلام سے موالات کر کے خود اپنی جان پر اور مسلمانوں پر ظلم کرتے ہیں اور جماعت اسلام کے مغلوب و مقہور ہونے کا انتظار کر رہے ہیں، ایسی بدبخت، معاند اور دغا باز قوم کی نسبت یہ امید نہیں کی جاسکتی کہ وہ بھی راہ ہدایت پر آئے گی۔

فَتَرَى الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يُّسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ يَقُوْلُوْنَ نَخْشٰٓى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ ؕ

اب تو دیکھے گا ان کو جن کے دل میں بیماری ہے دوڑ کر ملتے ہیں ان میں کہتے ہیں کہ ہم کو ڈر ہے کہ نہ آجائے ہم پر گردش زمانہ کی ۱

فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ فَيُصْبِحُوْا عَلٰى مَآ اَسَرُّوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِيْنَ ﴿۵۲﴾

سو قریب ہے کہ اللہ جلد ظاہر فرما دے فتح یا کوئی حکم اپنے پاس سے تو لگیں اپنے جی کی چھپی بات پر پچھتانے ۲

خلاصہ تفسیر: (اور چونکہ ایسے لوگ اس بات کو نہیں سمجھتے) اسی لئے (اے دیکھنے والے!) تم ایسے لوگوں کو کہ جن کے دل میں (نفاق کا) مرض ہے دیکھتے ہو کہ دوڑ دوڑ کر ان (کفار) میں گھستے ہیں (اور کوئی ملامت کرے تو حیلہ بازی اور سخن سازی کے لئے یوں) کہتے ہیں کہ (ہمارا ان کے ساتھ ملنا دل سے نہیں، بلکہ دل سے تو تمہارے ساتھ ہیں، صرف ایک مصلحت سے ان کے ساتھ ملتے ہیں وہ یہ کہ) ہم کو اندیشہ ہے کہ (شاید انقلاب زمانہ سے) ہم پر کوئی حادثہ پڑ جائے (جیسے قحط اور تنگ دستی وغیرہ، اور یہ یہودی ہمارے ساہوکار ہیں، ان سے قرض ادھار مل جاتا ہے، اگر ظاہری میل جول قطع کردیں گے تو وقت پر ہم کو تکلیف ہوگی، مگر یہ مطلب ظاہری ہوتا تھا، لیکن دل میں اور مطلب لیتے کہ شاید آخر میں مسلمانوں پر کفار

کے غالب آجانے سے پھر ہم کو کفار کی احتیاج پڑے اس لئے ان سے دوستی رکھنا چاہئے)۔

سوقریب امید (یعنی وعدہ) ہے کہ اللہ تعالیٰ (مسلمانوں کی کامل) فتح (ان کفار کے مقابلہ میں جن سے یہ دوستی کر رہے ہیں) فرمادے (جس میں مسلمانوں کی کوشش کا بھی دخل ہوگا) یا کسی اور بات کا خاص اپنی طرف سے (ظہور فرمادے، یعنی وحی کے ذریعہ سے ان کا نفاق صاف بیان کر دیں جس میں مسلمانوں کی تدبیر کا کچھ دخل نہیں، مطلب یہ کہ مسلمانوں کی فتح اور ان کی پردہ دری دونوں باتیں قریب ہونے والی ہیں) پھر (اس وقت) اپنے (سابق) پوشیدہ دلی خیالات پر نادم ہوں گے (کہ ہم تو سمجھتے تھے کہ کفار غالب آئیں گے اور یہ کیا برعکس معاملہ ہوگیا؟!)۔

فَيُصْبِحُوْا عَلٰى مَآ اَسَرُّوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِيْنَ: ایک تو طبعی ندامت اپنے خیال کی غلطی ہوگی، دوسری ندامت اپنے نفاق کے کھلنے پر جس کی بدولت آج رسوا ہوئے مَآ اَسَرُّوْا میں یہ دونوں داخل ہیں، اور تیسری ندامت کفار سے دوستی کرنے پر ہوگی کہ وہ دوستی رائیگاں ہی گئی اور مسلمانوں سے بھی برے بنے، چونکہ دوستی مَآ اَسَرُّوْا پر مبنی تھی، لہٰذا پہلی دو ندامتوں کے ذکر سے یہ تیسری ندامت صریح کے بغیر خود مفہوم ہوگئی۔

یہاں یہ شبہ نہ کیا جائے کہ جب وہ لوگ اپنی حرکات پر نادم ہوئے تو ندامت توبہ ہے اور توبہ کرنے والے پر ملامت نہیں ہوتی تو پھر اگلی آیت میں اعمال کے ضیاع اور خسارہ کا ذکر کر کے ان پر ملامت کیوں کی گئی؟ جواب یہ ہے کہ ہر ندامت توبہ نہیں ہوتی، تائب ہوتے تو سچے دل سے مسلمان ہو جاتے، توبہ وہ ندامت ہوتی ہے جس کے بعد معذرت، خطا کا اقرار اور تلافی مافات کی کوشش ہو، اور یہ ندامت طبعی اور رسوائی کی وجہ سے تھی۔

* * *

فائدہ: ۱۔ یہ وہی لوگ ہیں جن کے دلوں میں شک اور نفاق کی بیماری ہے جن کو خدا کے وعدوں پر اعتماد اور مسلمانوں کی حقانیت پر یقین نہیں، اسی لئے دوڑ دوڑ کر کافروں کی آغوش میں پناہ لینا چاہتے ہیں، تاکہ ان کے موہوم غلبہ کے وقت ثمرات فتح سے متمتع ہوسکیں، اور ان کے زعم میں جو گردشیں اور آفات جماعت اسلام پر آنے والی تھیں ان سے محفوظ رہیں نَخْشٰٓى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ کے یہی معنی ان کے دلوں میں مکنون تھے، لیکن یہی الفاظ نَخْشٰٓى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور مخلص مسلمانوں کے سامنے یہود سے دوستانہ رکھنے کی معذرت میں کہتے تھے تو گردش زمانہ کا یہ مطلب ظاہر کرتے کہ یہود ہمارے ساہوکار ہیں ہم ان سے قرض و دام لے لیتے ہیں، اگر کوئی مصیبت قحط وغیرہ کی پڑی تو وہ ہمارے دوستانہ تعلقات کی وجہ سے آڑے وقت میں کام آجائیں گے ان ہی خیالات کا جواب آگے دیا گیا ہے۔

فائدہ: ۲۔ یعنی وہ وقت نزدیک ہے کہ حق تعالیٰ اپنے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو فیصلہ کن فتوحات اور غلبہ عطا فرمائے اور مکہ معظمہ میں بھی جو تمام عرب کا مسلمہ مرکز تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو فاتحانہ داخل کرے یا اس کے ماسوا اپنی قدرت اور حکم سے کچھ اور امور بروئے کار لائے جنہیں دیکھ کر ان منافقین کی ساری باطل توقعات کا خاتمہ ہو اور انہیں منکشف ہو جائے کہ دشمنان اسلام کی موالات کا نتیجہ دنیاوی ذلت و رسوائی اور اخروی عذاب الیم کے سوا کچھ نہیں، جب فضیحت و خسران کے یہ نتائج سامنے آجائیں گے اس وقت بجز پچھتانے اور کف افسوس ملنے کے کچھ حاصل نہ ہوگا "الآن قد ندمت و ما ینفع الندم" چنانچہ ایسا ہی ہوا اسلام کے عام غلبہ اور فتح مکہ وغیرہ کو دیکھ کر تمام اعدائے اسلام کے حوصلے پست ہو گئے بہت سے یہود مارے گئے، بہت سے جلاوطن ہوئے، منافقین کی ساری امیدوں پر پانی پھر گیا، مسلمانوں کے سامنے صریح طور پر جھوٹے ثابت ہوئے، موالات یہود میں جو کوششیں کی تھیں وہ اکارت گئیں اور خسران دنیاوی اور ہلاکت ابدی کا طوق گلے میں پڑا، اگلی آیت میں اسی مضمون کو بیان فرمایا ہے:

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَهٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ ۙ اِنَّهُمْ لَمَعَكُمْ ۭ

اور کہتے ہیں مسلمان کیا یہ وہی لوگ ہیں جو قسمیں کھاتے تھے اللہ کی تاکید سے کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں

حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَاَصْبَحُوْا خٰسِرِيْنَ ﴿۵۳﴾

برباد گئے ان کے عمل پھر رہ گئے نقصان میں

خلاصہ تفسیر: اور (جب اس زمانہ فتح میں ان لوگوں کا نفاق بھی کھل جائے گا تو آپس میں) مسلمان لوگ (تعجب سے) کہیں گے ارے! کیا یہ وہی لوگ ہیں کہ بڑے مبالغہ سے (ہمارے سامنے) قسمیں کھایا کرتے تھے کہ ہم (دل سے) تمہارے ساتھ ہیں (یہ تو کچھ اور ہی ثابت ہوا، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ) ان لوگوں کی ساری کارروائیاں (کہ دونوں فریق سے بھلا رہنا چاہتے تھے، سب) غارت گئیں جس سے (دونوں طرف سے) ناکام رہے (کیونکہ کفار تو خود مغلوب ہو گئے، ان کا ساتھ دینا محض بیکار ہے اور مسلمانوں کے سامنے قلعی کھل گئی، ان سے اب بھلا بننا دشوار، وہی مثل ہوگئی: ''ازیں سو راندہ ازاں سو ماندہ'' دھوبی کا کتا گھر کا نہ گھاٹ کا)۔

چنانچہ یہ پیشین گوئی سچی ہوئی، ان منافقوں کی زیادہ دوستی مدینہ کے یہود اور مکہ کے مشرکین سے تھی، سو مکہ فتح ہوگیا اور یہود خستہ وخراب ہوئے جس کا ذکر کئی بار آچکا ہے، یوں تو اکثر واقعات میں ان کا نفاق کھلتا رہتا تھا مگر عمومی فتوحات کے بعد صراحۃً معین طور پر معلوم ہوگیا۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ ۙ

اے ایمان والو جو کوئی تم میں پھرے گا اپنے دین سے تو اللہ عنقریب لائے گا ایسی قوم کو کہ اللہ ان کو چاہتا ہے اور وہ اس کو چاہتے ہیں

اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۡ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ

نرم دل ہیں مسلمانوں پر زبردست ہیں کافروں پر، لڑتے ہیں اللہ کی راہ میں اور ڈرتے نہیں

لَوْمَةَ لَاۗىِٕمٍ ۭ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿54﴾

کسی کے الزام سے[1] یہ فضل ہے اللہ کا دے گا جس کو چاہے، اور اللہ کشایش والا ہے خبردار[2]

خلاصہ تفسیر: پیچھے بیان فرمایا تھا کہ کفار سے دوستی کرنے میں خود ان ہی لوگوں کا نقصان ہے، اب فرماتے ہیں کہ اگر کسی وقت کسی جگہ مسلمان اسی بنیادی اصول سے ہٹ کر غیر مسلموں سے ایسا غلط ملط کرلیں تو یہ نہ سمجھیں کہ اس سے اسلام کو کوئی گزند اور نقصان پہنچے گا، کیونکہ اسلام کی حفاظت اور بقاء کی ذمہ داری حق تعالیٰ نے لی ہے، اس کو کوئی نہیں مٹا سکتا، اگر کوئی قوم بگڑ جائے اور حدود شرعیہ کو توڑ کر فرض کرلو کہ اسلام ہی کو چھوڑ بیٹھے تو اللہ تعالیٰ کسی دوسری قوم کو کھڑا کردیں گے جو اسلام کے اصول وقانون کو قائم کرے گی۔

اے ایمان والو! (یعنی جو لوگ اس آیت کے نزول کے وقت ایمان والے ہیں) جو شخص تم میں سے اپنے (اس) دین سے پھر جائے تو (اسلام کا کوئی نقصان نہیں، کیونکہ اسلامی خدمات انجام دینے کے لئے) اللہ تعالیٰ بہت جلد (ان کی جگہ) ایسی قوم کو پیدا کردے گا جن سے اللہ تعالیٰ کو محبت ہوگی اور ان کو اللہ تعالیٰ سے محبت ہوگی، مہربان ہوں گے وہ مسلمانوں پر، تیز ہوں گے کافروں پر (کہ ان سے) جہاد کرتے ہوں گے اللہ کی راہ میں، اور (دین اور جہاد کے مقدمہ میں) وہ لوگ کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کا اندیشہ نہ کریں گے (جیسا منافقین کا حال ہے کہ دبے دبائے جہاد کے لئے جاتے تھے، مگر اندیشہ لگا رہتا تھا کہ کفار جن سے دل میں دوستی ہے وہ ملامت کریں گے، یا اتفاق سے جن کے مقابلہ میں جہاد ہے وہی اپنے دوست اور عزیز ہوں تو سب دیکھتے سنتے طعن کریں گے کہ ایسوں کو مارنے گئے تھے) یہ (صفات مذکورہ) اللہ تعالیٰ کا فضل ہے، جس کو چاہیں عطا فرمادیں اور اللہ تعالیٰ بڑی وسعت والے ہیں (کہ اگر چاہیں تو سب کو یہ صفات دے سکتے ہیں لیکن) بڑے علم والے (بھی) ہیں (ان کے علم میں جس کو دینا مصلحت ہوتا ہے اس کو دیتے ہیں)۔

چنانچہ بعض لوگ مرتد ہوگئے تھے، لیکن خدا تعالیٰ نے اپنی اس پیشین گوئی کے مطابق مخلص مسلمانوں کے ہاتھ سے زمانہ خلافت صدیقی میں ان کا قلع قمع کردیا اور بعض نے توبہ کرلی تھی، بہرحال اسلام کو کوئی ضعف یا نقصان نہیں پہنچا۔

مَنۡ يَّرۡتَدَّ مِنۡكُمۡ عَنۡ دِيۡنِهٖ: اگر کسی کو شبہ ہو کہ ارتداد سے ایک صورت میں اسلام کو نقصان پہنچ سکتا ہے وہ یہ کہ خدانخواستہ سب مرتد ہوجائیں تو یہ حکم عام نہ رہا؟ جواب یہ ہے کہ اول تو ایسی صورت کا دوسری نصوص سے حال معلوم ہو چکا ہے کہ یہ محال ہے، کیونکہ قیامت تک اس دین کی حمایت کرنے والے رہیں گے، دوسرے بالفرض اگر ایسا ہو بھی جائے تب بھی اسلام کا کوئی حقیقی نقصان نہیں، کیونکہ اسلام کی مثال فن طب جیسی ہے، اگر تمام مریض متفق ہو کر دوا چھوڑ دیں تو دوا کا یا فن طب کا کیا نقصان ہے، طب اور دوا کا کمال یہ ہے کہ جو شخص اس کو استعمال کرے اس کو شفا اور فائدہ ہوتا ہے، اسی طرح اسلام کا کمال فی نفسہ یہ ہے کہ جو اس پر عمل کرے اس کو نجات ہو، پس بعض کے یا کل کے چھوڑ دینے سے خود ان چھوڑنے والوں کی نجات میں خلل پڑے گا، اسلام کا کیا بگڑ جائے گا۔

* * *

فائدہ: ۱۔ وَلَا يَخَافُوۡنَ لَوۡمَةَ لَآئِمٍ: اس آیت میں اسلام کی ابدی بقا اور حفاظت کے متعلق عظیم الشان پیشین گوئی کی گئی ہے، پچھلی آیات میں کفار کے موالات سے منع کیا گیا تھا، ممکن تھا کہ کوئی شخص یا قوم موالات کفار کی بدولت صریحاً اسلام سے پھر جائے، جیسا کہ: وَمَنۡ يَّتَوَلَّهُمۡ مِّنۡكُمۡ فَاِنَّهٗ مِنۡهُمۡ (المائدہ:۵۱) میں تنبیہ کی گئی ہے، قرآن کریم نے نہایت قوت اور صفائی سے آگاہ کر دیا کہ ایسے لوگ اسلام سے پھر کر کچھ اپنا ہی نقصان کریں گے، اسلام کو کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتے حق تعالیٰ مرتدین کے بدلے میں یا ان کے مقابلہ پر ایسی قوم لے آئے گا جن کو خدا کا عشق ہو اور خدا ان سے محبت کرے وہ مسلمانوں پر شفیق و مہربان اور دشمنان اسلام کے مقابلہ میں غالب اور زبردست ہوں گے یہ پیشین گوئی بحول اللہ وقوتہ ہر قرن میں پوری ہوتی رہی، ارتداد کا فتنہ نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد صدیق اکبرؓ کے عہد میں پھیلا، کئی طرح کے مرتدین اسلام کے مقابلہ میں کھڑے ہو گئے، مگر صدیق اکبرؓ کی ایمانی جرات اور اعلیٰ تدبر اور مخلص مسلمانوں کی سرفروشانہ اور عاشقانہ خدمات اسلام نے اس آگ کو بجھایا اور سارے عرب کو متحد کر کے از سر نو اخلاص و ایمان کے راستہ پر گامزن کر دیا، آج بھی ہم مشاہدہ کرتے رہتے ہیں کہ جب کبھی چند جاہل اور طامع افراد اسلام کے حلقہ سے نکلنے لگتے ہیں تو ان سے زیادہ اور ان سے بہتر تعلیم یافتہ اور محقق غیر مسلموں کو اسلام فطری کشش سے اپنی طرف جذب کر لیتا ہے اور مرتدین کی سرکوبی کے لئے خدا ایسے وفادار اور جاں نثار مسلمانوں کو کھڑا کر دیتا ہے جنہیں خدا کے راستہ میں کسی کی ملامت اور طعن و تشنیع کی پروا نہیں ہوتی۔

فائدہ: ۲۔ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيۡمٌ: انسان کی بڑی سعادت اور اس پر خدا کا بڑا فضل یہ ہے کہ وہ فتنہ کے وقت خود جادۂ حق پر ثابت قدم رہ کر دوسروں کو ہلاکت سے بچانے کی فکر کرے، خدا جن بندوں کو چاہے اس سعادت کبریٰ اور فضل عظیم سے حصہ وافر عطا فرماتا ہے، اس کا فضل غیر محدود ہے اور وہی خوب جانتا ہے کہ کونسا بندہ اس کا اہل اور مستحق ہے۔

اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوۡلُهٗ وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوا الَّذِيۡنَ يُقِيۡمُوۡنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤۡتُوۡنَ الزَّكٰوةَ وَهُمۡ رٰكِعُوۡنَ ﴿۵۵﴾

تمہارا رفیق تو وہی اللہ ہے اور اس کا رسول ﷺ اور جو ایمان والے ہیں جو کہ قائم ہیں نماز پر اور دیتے ہیں زکوٰۃ اور وہ عاجزی کرنے والے ہیں

خلاصہ تفسیر: پیچھے کفار سے دوستی کرنے کی ممانعت پھر مرتدین کے ذکر سے اس کی تائید معلوم ہو گئی، اب فرماتے ہیں کہ مسلمان کی گہری دوستی تو صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ اور ان پر ایمان لانے والوں ہی کے ساتھ ہو سکتی ہے۔

تمہارے دوست تو (جن سے تم کو دوستی رکھنی چاہئے) اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ اور ایماندار لوگ ہیں جو کہ اس حالت سے نماز کی پابندی رکھتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں کہ ان (کے دلوں) میں خشوع ہوتا ہے (یعنی عقائد، اخلاق و اعمال بدنی و مالی سب کے جامع ہیں)۔

* * *

فائدہ: پچھلی آیتوں میں یہود و نصاریٰ کی موالات اور رفاقت کن سے ہونے چاہئیں یہ بتایا، اب اس آیت میں بتلا دیا گیا کہ ان کا رفیق اصلی خدا اور پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام اور مخلص مسلمانوں کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا۔

وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿٥٦﴾ ع

اور جو کوئی دوست رکھے اللہ کو اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اور ایمان والوں کو تو اللہ کی جماعت وہی سب پر غالب ہے

خلاصہ تفسیر: اور جو شخص (مذکورہ مضمون کے موافق) اللہ سے دوستی رکھے گا اور اس کے رسول سے اور ایمان دار لوگوں سے سو (وہ اللہ کے گروہ میں داخل ہو گیا اور) اللہ کا گروہ بیشک غالب ہے (اور کفار مغلوب ہیں اور غالب کو مغلوب سے دوستی کی فکر کرنا محض نازیبا ہے)۔

فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ: اگر کسی کو شبہ ہو کہ ہم تو بعض اوقات مسلمانوں کو جو کہ اللہ کا گروہ ہیں کفار سے مغلوب دیکھتے ہیں تو ایسا کیوں؟ جواب یہ ہے کہ اس حکم کا مدار اللہ، رسول اور مومنین کاملین کے ساتھ تعلق ولایت کا ہے، سو اگر کہیں اسی تعلق میں کمی ہو، مثلاً اللہ ورسول کی کوئی نافرمانی سرزد ہوئی، یا امیر کی مخالفت کی ہو اور اکثر یہی ہوتا ہے تو اس صورت میں غلبہ کا وعدہ نہیں، اس لیے اس میں تو شبہ ہی کی گنجائش نہیں، یا یوں کہا جائے کہ یہاں مقصود اس عادت کا بیان کرنا ہے، اور عادت میں اکثر اسی طرح ہونا کافی ہے اور اس کا انکار نہیں ہو سکتا کبھی اگر اس کے خلاف ہوتا ہے تو اس میں مصلحتیں ہوتی ہیں جن کا بیان واقعہ احد کے قصہ میں ہو چکا ہے۔

اور جہاں یہ بات نہ ہو تو اس کا جواب ترجمہ کی تقریر سے ظاہر ہے، یعنی اس جگہ یہ بات بتلانی مقصود ہے کہ واقع میں مسلمان غالب و ارفع ہیں اور کفار واقع میں مغلوب و پست ہیں، کیونکہ دلیل سے مسلمان حق پر ہیں اور کفار باطل پر ہیں، اگر چہ کسی خاص وقت تک مسلمانوں کے غلبہ ورفعت کے آثار کسی خاص حکمت کی وجہ سے ظاہر نہ ہوں، مگر اس سے مسلمانوں کی واقعی رفعت و بلندی زائل نہیں ہو سکتی، اور اس کے آثار دوسرے وقت پر مثلاً آخرت میں جو کہ ان کے ظاہر ہونے کا اصلی وقت ہے، اور دنیا میں بھی کچھ عرصے بعد وہ رفعت کے آثار ظاہر ہوں گے، جیسے اگر کسی بڑے حاکم و افسر پر سفر میں کوئی ذلیل ڈاکو لوٹ مار کرنے لگے تو وہ افسر اپنی خداداد عالی دماغی کی وجہ سے ہرگز اس ذلیل ڈاکو کی خوشامد نہ کرے گا اور اس عارضی غلبہ سے اس ڈاکو کو حاکم اور حاکم کو محکوم نہیں کہہ سکتے، بلکہ اس مغلوبیت میں بھی حاکم معزز اور ڈاکو ذلیل ہی ہے اگر چہ حاکم کی رفعت اس وقت عارضی وجہ سے ظاہر نہیں ہوئی، جب وہ افسر اپنے خاص دارالحکومت پہنچے گا اس ڈاکو کو گرفتار کر کے سزا دے گا، اس وقت اس کی حکومت و رفعت ظاہر ہو جائے گی، اسی طرح یہاں سمجھو، اسی معنی کو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے ایک مختصر اور سلیس عنوان سے تعبیر فرمایا ہے: "إن لم ينصروا في الدنيا ينصروا في الآخرة"۔

اس وضاحت کے بعد اُن آیات میں بھی شبہ نہیں رہا جن میں دنیا میں غلبہ کی صراحت ہے جیسے آیت: انا لننصر رسلنا والذين امنوا في الحيوة الدنيا میں، کیونکہ اس مذکورہ معنی کے اعتبار سے دنیا میں ہمیشہ غلبہ حاصل ہے، اگر چہ خاص وقت تک اس غلبہ کا ظہور نہ ہو، پھر مجموعی قوم کے اعتبار سے تو دنیا میں بھی انجام کا ظہور ہوتا ہے اور ہر فرد کے اعتبار سے آخرت میں غلبہ کا ظہور ہوگا، جیسے کوئی یوں کہے کہ تحصیل دار سفر میں بھی تحصیل دار ہے معزول نہیں، اگر چہ سفر کے بعض خاص آثار نمایاں نہ ہوں، اور اسی کو دوسرے عنوان سے علماء نے تعبیر کیا ہے: "بالحجة والعواقب"، یعنی اصل حقیقت کے اعتبار سے مؤمنین ہی غالب ہیں اگر چہ بعض اوقات اس غلبہ کے آثار کسی حکمت و مصلحت کی بنا پر ظاہر نہ ہوں، جیسا تحصیل دار قانونی حجت سے حاکم ہی ہے اور عارضی حالتوں کے بعد وہ آثار اخیر میں ظاہر ہوتے ہیں اور دوسری قومیں چونکہ دلیل سے باطل پر ہیں وہ اس تقریر سے منتفع نہیں ہو سکتے، اگر اس "غلبہ" کی تفسیر "قوت قلب" سے کی جائے تو سمجھنے میں زیادہ آسان ہوگا، کیونکہ اہل اللہ پر مغلوبیت کے اسباب کا خواہ ظاہرا کتنا ہی ہجوم کیوں نہ ہو، مگر توکل اور تعلق مع اللہ کی وجہ سے ان کو کمزوری اور مغلوبیت نہیں ہوتی۔

فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ: اہل اللہ پر اسباب مغلوبیت کا بظاہر کتنا ہی ہجوم ہو لیکن توکل اور تعلق مع اللہ کی وجہ سے ان کے قلوب غالب اور پُر ہمت ہی رہتے ہیں۔

* * *

فائدہ: کفار کی کثرت اور مسلمانوں کی قلت عدد کو دیکھتے ہوئے ممکن تھا کہ کوئی ضعیف القلب اور ظاہر بین مسلمان اس تردد میں پڑ جاتا کہ

تمام دنیا سے موالات منقطع کرنے اور چند مسلمانوں کی رفاقت پر اکتفا کر لینے کے بعد غالب ہونا تو درکنار، کفار کے حملوں سے اپنی زندگی اور بقاء کی حفاظت بھی دشوار ہے، ایسے لوگوں کی تسلی کے لئے فرمایا کہ مسلمانوں کی قلت اور ظاہری بے سروسامانی پر نظر مت کرو، جس طرف خدا اور اس کا رسول اور سچے وفادار مسلمان ہوں گے، وہی پلہ بھاری رہے گا، یہ آیتیں خصوصیت سے حضرت عبادہ ابن صامت رضی اللہ عنہ کی منقبت میں نازل ہوئی ہیں، یہود بنی قینقاع سے ان کے بہت زیادہ دوستانہ تعلقات تھے، مگر خدا اور رسول کی موالات اور مومنین کی رفاقت کے سامنے انہوں نے اپنے سب تعلقات منقطع کر دیے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَكُمْ هُزُوًا وَّلَعِبًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ

اے ایمان والو مت بناؤ ان لوگوں کو جو ٹھہراتے ہیں تمہارے دین کو ہنسی اور کھیل وہ لوگ جو کتاب دیے گئے

مِنْ قَبْلِكُمْ وَالْكُفَّارَ اَوْلِيَآءَ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۵۷﴾

تم سے پہلے اور نہ کافروں کو ۱؎ اپنا دوست، اور ڈرو اللہ سے اگر ہو تم ایمان والے ۲؎

خلاصہ تفسیر: پیچھے یہود و نصاریٰ کے ساتھ دوستی کی ممانعت اس علت کی وجہ سے کی تھی کہ تم میں اور ان میں باہمی مناسبت نہیں، درمیان میں منافقین اور مرتدین کا ذکر آ گیا تھا، اب مشرکین کفار یہود و نصاریٰ سے مناسبت نہ ہونے کی ایک اور خاص دلیل بیان فرماتے ہیں کہ یہ لوگ تمہارے دین کے ساتھ استہزاء کرتے ہیں، گویا یہ ماقبل ہی کا تتمہ ہے:

اے ایمان والو! جن لوگوں کو تم سے پہلے کتاب (آسمانی یعنی تورات و انجیل) مل چکی ہے (مراد یہود و نصاریٰ) جو ایسے ہیں کہ انہوں نے تمہارے دین کو ہنسی کھیل بنا رکھا ہے (جو کہ جھٹلانے کی علامت ہے) ان کو اور (اسی طرح) دوسرے کفار کو (بھی جیسے مشرکین وغیرہ) دوست مت بناؤ (کیونکہ اصلی علت تو دوستی سے منع کی کفر و تکذیب ہے وہ سب میں مشترک ہے) اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو اگر تم ایمان دار ہو (یعنی ایمان دار تو ہو ہی، پس جس چیز سے اللہ تعالیٰ نے منع کیا ہے اس کو مت کرو)۔

لَا تَتَّخِذُوا الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَكُمْ هُزُوًا وَّلَعِبًا: اس میں ایسے شخص سے علیحدگی رکھنے پر دلالت ہے جو اہل اللہ اور ان کے طریق کے ساتھ تمسخر و استہزا کرے۔

❊ ❊ ❊

فائدہ: ۱؎ کفار سے مراد یہاں مشرکین ہیں جیسا کہ عطف سے ظاہر ہے۔

فائدہ: ۲؎ گزشتہ آیات میں مسلمانوں کو موالات کفار سے منع فرمایا تھا، اس آیت میں ایک خاص موثر عنوان سے اسی ممانعت کی تاکید کی گئی اور موالات سے نفرت دلائی گئی ہے، ایک مسلمان کی نظر میں کوئی چیز اپنے مذہب سے زیادہ معظم و محترم نہیں ہو سکتی، لہذا اسے بتایا گیا کہ یہود و نصاریٰ اور مشرکین تمہارے مذہب پر طعن و استہزاء کرتے ہیں اور شعائر اللہ (اذان وغیرہ) کا مذاق اڑاتے ہیں اور جو ان میں خاموش ہیں وہ بھی ان افعال شنیعہ کو دیکھ کر اظہار نفرت نہیں کرتے، بلکہ خوش ہوتے ہیں کفار کی ان احمقانہ اور کمینہ حرکات پر مطلع ہو کر کوئی فرد مسلم جس کے دل میں خشیت الٰہی اور غیرت ایمانی کا ذرا سا شائبہ ہو کیا ایسی قوم سے موالات اور دوستانہ راہ و رسم پیدا کرنے یا قائم رکھنے کو ایک منٹ کے لئے گوارا کرے گا؟! اگر ان کے کفر و عناد اور عداوت اسلام سے بھی قطع نظر کر لی جائے تو دین قیم کے ساتھ ان کا یہ تمسخر و استہزاء ہی علاوہ دوسرے اسباب کے ایک مستقل سبب ترک موالات کا ہے۔

وَاِذَا نَادَيْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ اتَّخَذُوْهَا هُزُوًا وَّلَعِبًا ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ ﴿۵۸﴾

اور جب تم پکارتے ہو نماز کے لیے تو وہ ٹھہراتے ہیں اس کو ہنسی اور کھیل، یہ اس واسطے کہ وہ لوگ بے عقل ہیں

خلاصہ تفسیر: اور (یہ لوگ جیسے اصول دین کے ساتھ استہزاء کرتے ہیں، اسی طرح فروع کے ساتھ بھی چنانچہ) جب تم نماز کے

لئے (اذان کے ذریعہ سے) اعلان کرتے ہو تو وہ لوگ (تمہاری) اس (عبادت) کے ساتھ (جس میں اذان اور نماز دونوں آگئیں) ہنسی اور کھیل کرتے ہیں (اور) یہ (حرکت) اس سبب سے ہے کہ وہ ایسے لوگ ہیں کہ بالکل عقل نہیں رکھتے (ورنہ امر حق کو سمجھتے اور اس کے ساتھ ہنسی نہ کرتے)۔

یہ دو قصوں کی طرف اشارہ ہے: ① ایک یہ کہ جب اذان ہوتی اور مسلمان نماز میں کھڑے ہوتے تو یہود کہتے کہ خدا کرے کبھی کھڑا ہونا نصیب نہ ہو ② دوسرا قصہ یہ ہے کہ مدینہ میں ایک نصرانی تھا، جب اذان میں ''اشہد ان محمدا رسول اللہ'' سنتا تو کہتا کہ خدا کرے جھوٹا جل جائے، ایک رات کو ایسا اتفاق ہوا کہ وہ اور اس کے سب اہل وعیال سو رہے تھے، کوئی نوکر گھر میں آگ لے کر گیا، ایک چنگاری گر پڑی اور گھر میں ایسی آگ لگی کہ وہ، اس کا گھر اور گھر والے سب جل گئے۔

***

فائدہ: یعنی جب اذان کہتے ہو تو اس سے جلتے ہیں اور ٹھٹھا کرتے ہیں جو ان کی کمال حماقت اور بے عقلی کی دلیل ہے، کلمات اذان میں خداوند قدوس کی عظمت و کبریاء کا اظہار، توحید کا اعلان، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو تمام انبیاء سابقین اور کتب سماویہ کے مصدق ہیں، ان کی رسالت کا اقرار، نماز جو تمام اوضاع عبودیت کو جامع اور غایت درجہ کی بندگی پر دال ہے، اس کی طرف دعوت، فلاح دارین اور اعلیٰ سے اعلیٰ کامیابی حاصل کرنے کے لئے بلاوا، ان چیزوں کے سوا اور کیا ہوتا ہے پھر اس میں کونسی چیز ہے جو ہنسی اڑانے کے قابل ہو ایسی نیکی اور حق وصداقت کی آواز پر مسخرا پن کرنا صرف اسی شخص کا کام ہو سکتا ہے جس کا دماغ عقل سے یکسر خالی ہو اور جسے نیک و بد کی قطعاً تمیز باقی نہ رہے۔

بعض روایات میں ہے کہ مدینہ میں ایک نصرانی جب اذان میں اشہد ان محمدًا رسول اللہ سنتا تو کہتا ''قد حرق الکاذب'' (جھوٹا جل گیا یا جل جائے) اس کی نیت تو ان الفاظ سے جو کچھ ہو، مگر یہ بات بالکل اس کے حسب حال تھی، کیونکہ وہ خبیث جھوٹا تھا اور اسلام کا عروج و شیوع دیکھ کر آتش حسد میں جلا جاتا تھا، اتفاقاً ایک شب میں کوئی چھوکری آگ لے کر اس کے گھر میں آئی، وہ اور اس کے اہل وعیال سو رہے تھے، ذرا سی چنگاری نادانستہ اس کے ہاتھ سے گر گئی جس سے سارا گھر مع سونے والوں کے جل گیا اور اس طرح خدا نے دکھلا دیا کہ جھوٹے لوگ دوزخ کی آگ سے پہلے ہی دنیا کی آگ میں کس طرح جل جاتے ہیں۔

اذان کے ساتھ استہزاء کرنے کا ایک اور واقعہ صحیح روایات میں منقول ہے وہ یہ کہ فتح مکہ کے بعد آپ حنین سے واپس ہو رہے تھے، راستہ میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے اذان کہی، چند نو عمر لڑکے جن میں ابو محذورہ بھی تھے، اذان کی ہنسی اور نقل کرنے لگے، آپ نے سب کو پکڑ بلوایا، آخر نتیجہ یہ ہوا کہ ابو محذورہ کے دل میں خدا نے اسلام ڈال دیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مکہ کا موذن مقرر فرما دیا، اس طرح خدا کی قدرت نقل سے اصل بن گئی۔

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ هَلْ تَنْقِمُوْنَ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلُ ۙ

تو کہہ اے کتاب والو! کیا ضد ہے تم کو ہم سے مگر یہی کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور جو نازل ہوا ہم پر اور جو نازل ہو چکا پہلے

وَاَنَّ اَكْثَرَكُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿٥٩﴾

اور یہی کہ تم میں اکثر نافرمان ہیں

خلاصہ تفسیر: اوپر کفار اہل کتاب کا اسلامی طریقہ کے ساتھ استہزا و تکذیب کا ذکر تھا، اب اسلامی طریقہ جس پر مومنین قائم تھے اور ان کے خود ساختہ من گھڑت طریقے میں موازنہ کر کے تنبیہ فرمانا مقصود ہے کہ استہزا و تکذیب کے لائق کونسا طریقہ ہے؟!!۔

آپ کہہ دیجئے کہ اے اہل کتاب! تم ہم میں کیا عیب پاتے ہو بجز اس کے کہ ہم ایمان لائے ہیں اللہ پر اور اس کتاب پر جو ہمارے پاس بھیجی گئی ہے (یعنی قرآن) اور اس کتاب پر (بھی) جو (ہم سے) پہلے بھیجی جا چکی ہے (یعنی تمہاری کتاب تورات وانجیل) باوجود اس کے کہ تم میں اکثر لوگ ایمان سے خارج ہیں (کہ نہ تمہارا قرآن پر ایمان ہے جس کا خود تم کو بھی اقرار ہے، اور نہ تورات وانجیل پر ایمان ہے، کیونکہ ان پر ایمان ہوتا تو

ان میں رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن پر ایمان لانے کی ہدایت موجود ہے اس پر بھی ضرور ایمان ہوتا، قرآن کا انکار اس پر شاہد ہے کہ تورات وانجیل پر بھی ان کا ایمان نہیں ہے، یہ حال تو تم لوگوں کا ہوا، اور ہم اس کے برعکس سب کتابوں پر ایمان رکھتے ہیں، حالانکہ واقع میں یہ تو ہماری خوبی اور تمہارا عیب ہے)۔

* * *

فائدہ: کسی کام پر طعن کرنا یا ہنسی اڑانا دو وجہ سے ہوسکتا ہے: ① یا تو وہ کام ہی قابل استہزاء ہو ② یا کام کرنے والے کی حالت تمسخر کے لائق ہو، پچھلی آیت میں بتلا دیا گیا کہ اذان کوئی ایسی چیز نہیں جس پر بجز پرلے درجہ کے احمق اور خفیف العقل کے کوئی شخص طعن یا استہزاء کر سکے، اس آیت میں اذان دینے والوں کے مقدس حالات پر بعنوان سوال متنبہ کیا گیا ہے، یعنی استہزاء کرنے والے جو خیر سے اہل کتاب اور عالم شرائع ہونے کا بھی دعویٰ رکھتے ہیں وہ ذرا سوچ کر انصاف سے بتائیں کہ مسلمانوں سے ان کو اتنی ضد کیوں ہے؟ اور کیا ایسی برائی وہ ہماری طرف دیکھتے ہیں جو ان کے زعم میں لائق استہزاء ہو بجز اس کے کہ ہم اس خدائے وحدہ لاشریک لہ، پر اور اس کی اتاری ہوئی تمام کتابوں اور اس کے بھیجے ہوئے تمام پیغمبروں پر صدق دل سے ایمان رکھتے ہیں، اور اس کے بالمقابل استہزاء کرنے والوں کا حال یہ ہے کہ نہ خدا کی سچی اور صحیح توحید پر قائم ہیں اور نہ تمام انبیاء ورسل کی تصدیق وتکریم کرتے ہیں، اب تم ہی انصاف سے کہو کہ انتہا درجہ کے نافرمان کو خدا کے فرمانبردار بندوں پر آوازہ کسنے اور طعن وتشنیع کرنے کا کہاں تک حق حاصل ہے۔

قُلْ هَلْ أُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكَ مَثُوبَةً عِنْدَ اللّٰهِ ط مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ

تو کہہ میں تم کو بتلاؤں ان میں کس کی بری جزا ہے اللہ کے ہاں، وہی جس پر اللہ نے لعنت کی اور اس پر غضب نازل کیا

وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيرَ وَعَبَدَ الطَّاغُوتَ ط أُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّأَضَلُّ

اور ان میں سے بعضوں کو بندر کر دیا اور بعض کو سور اور جنہوں نے بندگی کی شیطان کی، وہی لوگ بدتر ہیں درجہ میں اور بہت بہکے ہوئے ہیں

عَنْ سَوَآءِ السَّبِيلِ ﴿٦٠﴾

سیدھی راہ سے

خلاصہ تفسیر: آپ (صلی اللہ علیہ وسلم ان سے) کہہ دیجئے کہ (اگر اس پر بھی تم ہمارے طریقہ کو برا سمجھتے ہو تو آؤ) کیا میں (اچھے برے میں موازنہ کرنے کے لئے) تم کو ایسا طریقہ بتلاؤں جو (ہمارے) اس (طریقہ) سے بھی (جس کو تم برا سمجھ رہے ہو) خدا کے یہاں سزا ملنے میں زیادہ برا ہو، وہ ان اشخاص کا طریقہ ہے جن کو (اس طریقہ کی وجہ سے) اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے دور کر دیا ہو اور ان پر غضب فرمایا ہو اور ان کو بندر اور سور بنا دیا ہو اور انہوں نے شیطان کی پرستش کی ہو (اب دیکھ لو کہ ان میں کون سا طریقہ برا ہے، آیا وہ طریقہ جس میں غیر اللہ کی عبادت ہو اور اس پر یہ وبال نازل ہوں، یا وہ طریقہ جو سراسر توحید اور نبوت انبیاء کی تصدیق ہو، یقیناً موازنہ کا نتیجہ یہی ہوگا کہ) ایسے اشخاص (جن کا طریقہ ابھی ذکر کیا گیا ہے آخرت میں) مکان کے اعتبار سے بھی (جو ان کو سزا کے طور پر ملے گا) بہت برے ہیں (کیونکہ یہ مکان دوزخ ہے) اور (دنیا میں) راہ راست سے بھی بہت دور ہیں (اور تم بھی ان ہی کے طریقہ پر چل رہے ہو، پھر کیا منہ لے کر ہنستے ہو، حالانکہ استہزاء کے قابل تمہارا طریقہ ہے)۔

وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيرَ وَعَبَدَ الطَّاغُوتَ: اور یہ سب حالتیں یہود ونصاریٰ میں ہو چکی ہیں کہ یہود نے گوسالہ پرستی کی، نصاریٰ نے شیطان کے بہکانے سے حضرت مسیح علیہ السلام کو خدا بنا لیا، پھر اپنے راہبوں کو خدائی کے اختیارات سپرد کر دیئے، یہودیوں نے جب یوم سبت کے احکام کی خلاف ورزی کی تو اللہ کا عذاب آیا، وہ بندر بنا دیئے گئے، اور نصاریٰ کی درخواست پر آسمانی مائدہ نازل ہونے لگا، انہوں نے پھر بھی ناشکری کی تو ان کو بندر اور سور بنا دیا گیا اور ان کا ملعون ومغضوب ہونا جا بجا آیات واحادیث میں موجود ہے۔

مَنۡ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَيۡهِ: اس میں دلالت ہے کہ اگر کوئی دینی مصلحت ہو تو مخالف کی مذمت کو کھول کر ظاہر کر دیا جائے، یہ عمل صبر و حلم کے خلاف نہیں ہوگا۔

❁ ❁ ❁

فائدہ: یعنی اگر ایمان باللہ پر مستقیم ہونا اور ہر اس چیز کی جو خدا کی طرف سے کسی زمانہ میں نازل ہو سچے دل سے تصدیق کرنا ہی تمہارے زعم میں مسلمانوں کا سب سے بڑا جرم اور سب سے بڑی برائی ہے اور اسی وجہ سے تم ان کو مورد طعن و ملام بناتے ہو تو آؤ کہ میں تم کو ایک ایسی قوم کا پتہ بتلاؤں جو اپنی شرارت اور گندگی کی وجہ سے بدترین خلائق ہے، جن پر خدا کی لعنت اور غضب کا اثر آج بھی نمایاں طور پر آشکارا ہے، جس کے بہت سے افراد اپنی مکاری اور بے حیائی اور حرص دنیا کی سزا میں بندر اور سور بنائے جا چکے ہیں اور جس نے خدا کی بندگی سے نکل کر شیطان کی غلامی اختیار کر لی، اگر انصاف سے دیکھا جائے تو یہ بدترین خلائق اور گم کردہ راہ قوم ہی اصلی معنی میں تمہارے طعن و استہزاء کی مستحق ہو سکتی ہے اور وہ خود تم ہی ہو۔

وَإِذَا جَآءُوكُمۡ قَالُوٓاْ ءَامَنَّا وَقَد دَّخَلُواْ بِٱلۡكُفۡرِ وَهُمۡ قَدۡ خَرَجُواْ بِهِۦۚ وَٱللَّهُ أَعۡلَمُ

اور جب تمہارے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں ہم ایمان لائے اور حالت یہ ہے کہ کافر ہی آئے تھے اور کافر ہی چلے گئے اور اللہ خوب جانتا ہے

بِمَا كَانُواْ يَكۡتُمُونَ ﴿٦١﴾

جو کچھ چھپائے ہوئے تھے

خلاصہ تفسیر: پیچھے جن سے دوستی کرنے کی ممانعت فرمائی ان میں ایک خاص جماعت کا ذکر ہے جو منافق تھے کہ مسلمانوں کے سامنے اسلام کا اظہار کرتے تھے اور اندرونی طور پر یہودی ہی تھے، ان کی ایک خاص حالت بیان فرماتے ہیں:

اور جب یہ (منافق) لوگ تم لوگوں کے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں حالانکہ وہ کفر ہی کو لے کر (مسلمانوں کی مجلس میں) آئے تھے اور کفر ہی لے کر چلے گئے اور اللہ تعالیٰ تو خوب جانتے ہیں جس کو یہ (اپنے دل میں) چھپائے ہوئے ہیں (اس لئے ان کا نفاق اللہ تعالیٰ کے سامنے کام نہیں دے گا اور کفر کی بدترین سزا سے سابقہ پڑے گا)۔

❁ ❁ ❁

فائدہ: یہاں ان ہی استہزاء کرنے والوں کے بعض مخصوص افراد کا بیان ہے جو غائبانہ تو مذہب اسلام پر طعن و تشنیع کرتے اور مسلمانوں کا مذاق اڑاتے تھے، لیکن جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یا مخلص مسلمانوں سے ملتے تو از راہ نفاق اپنے کو مسلمان ظاہر کرتے، حالانکہ شروع سے آخر تک ایک منٹ کے لئے بھی انہیں اسلام سے تعلق نہیں ہوا، نہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ربانی وعظ و تذکیر کا کوئی اثر انہوں نے قبول کیا، کیا محض لفظ ایمان و اسلام زبان سے بول کر وہ خدا کو معاذ اللہ دھوکا دے سکتے ہیں؟! اگر اس عالم الغیب والشہادہ کی نسبت جو ہر قسم کے ضمائر و سرائر پر مطلع ہے ان کا گمان یہ ہو کہ محض لفظی ایمان سے اسے خوش کر لیں گے تو اس سے بڑھ کر کونسی حرکت قابل استہزاء و تمسخر ہو سکتی ہے! گویا اس آیت سے یہود نصاریٰ کے ان مضحکہ انگیز افعال و حرکات کا بیان شروع ہوا جن پر متنبہ کئے جانے کے بعد مسلمانوں کا استہزاء کرنے کے بجائے انہیں خود اپنا استہزاء کرنا چاہئے، اگلی آیات میں بھی اسی مضمون کی تتمیم و تکمیل ہے:

وَتَرَىٰ كَثِيرٗا مِّنۡهُمۡ يُسَٰرِعُونَ فِي ٱلۡإِثۡمِ وَٱلۡعُدۡوَٰنِ وَأَكۡلِهِمُ ٱلسُّحۡتَۚ لَبِئۡسَ مَا كَانُواْ يَعۡمَلُونَ ﴿٦٢﴾

اور تو دیکھے گا بہتوں کو ان میں سے کہ دوڑتے ہیں گناہ پر اور ظلم اور حرام کھانے پر، بہت برے کام ہیں جو کر رہے ہیں

خلاصہ تفسیر: پیچھے یہودیوں کے احوال بیان ہوئے تھے، اب پھر ان کے کچھ احوال بیان کیے جاتے ہیں۔

اور آپ ان (یہودیوں) میں بہت آدمی ایسے دیکھتے ہیں جو دوڑ دوڑ کر گناہ (یعنی جھوٹ) اور ظلم اور حرام (مال) کھانے پر گرتے ہیں،

واقعی ان کے یہ کام برے ہیں (یہ تو ان کی عوام کا حال تھا)۔

یُسَارِعُوْنَ فِی الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاَکْلِهِمُ السُّحْتَ: آیت میں تین گناہوں کا ذکر ہے: ① ''اثم'' ایک رذیلہ ہے جو قوت نطقیہ یعنی زبان کی قوت سے صادر ہوتا ہے ② ''عدوان'' بھی ایک رذیلہ ہے جو قوت غضبیہ یعنی غصہ سے پیدا ہوتا ہے ③ ''حرام خوری'' بھی ایک رذیلہ ہے جو قوت شہوانیہ سے پیدا ہوتی ہے، اس میں دلالت ہے کہ افعال کے مصادر ''ملکات'' ہوتے ہیں، علم تصوف میں ان قوتوں (قوت نطقیہ، قوت غضبیہ، قوت شہوانیہ) کو ''ملکات نفسیہ'' کہا جاتا ہے، ان تینوں کی اصلاح سے انسان کامل ہوتا ہے۔

* * *

فائدہ: غالباً ''اثم'' سے لازمی اور ''عدوان'' سے متعدی گناہ مراد ہیں، یعنی ان لوگوں کا حال یہ ہے کہ بہت شوق اور رغبت سے ہر قسم کے گناہوں کی طرف جھپٹتے ہیں، خواہ ان کا اثر اپنی ذات تک محدود ہو یا دوسروں تک پہنچے، جن کی اخلاقی حالت ایسی زبوں ہو اور حرام خوری ان کا شیوہ ٹھہر گیا ہو ان کی برائی میں کسے شبہ ہو سکتا ہے یہ تو ان کے عوام کا حال تھا آگے خواص کا بیان کیا گیا ہے۔

لَوْلَا یَنْهٰهُمُ الرَّبّٰنِیُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَکْلِهِمُ السُّحْتَ ط

کیوں نہیں منع کرتے ان کے درویش اور علماء گناہ کی بات کہنے سے اور حرام کھانے سے

لَبِئْسَ مَا کَانُوْا یَصْنَعُوْنَ ﴿۶۳﴾

بہت ہی برے عمل ہیں جو کر رہے ہیں

خلاصہ تفسیر: پیچھے عوام کا حال تھا، آگے خواص کا حال بیان فرماتے ہیں کہ وہ عوام کو نہیں روکتے۔

(اب خواص کا حال ہے کہ) ان کو مشائخ اور علماء گناہ کی بات کہنے سے (واقعہ کی اطلاع اور مسئلہ علم میں ہونے کے باوجود عوام کو) کیوں نہیں منع کرتے، واقعی ان کی یہ عادت بری ہے۔

لَبِئْسَ مَا کَانُوْا یَصْنَعُوْنَ: علماء مفسرین نے فرمایا کہ پہلی آیت جس میں عوام کی غلط کاریوں کا ذکر تھا، اس کے آخر میں تو لَبِئْسَ مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ارشاد فرمایا گیا، وجہ یہ ہے کہ عربی لغت کے اعتبار سے لفظ ''فعل'' تو ہر کام کو شامل ہے خواہ با قصد ہو یا بلا قصد، اور لفظ ''عمل'' صرف اس کام کے لئے بولا جاتا ہے جو قصد وارادہ سے کیا جائے، اور لفظ ''صنع'' اور ''صنعت'' کا ایسے کام کے لئے اطلاق کیا جاتا ہے جس میں قصد واختیار بھی ہو اور اس کو بار بار بطور عادت اور مقصد کے درست کر کے کیا جائے، اس لئے عوام کی بدعملی کے نتیجہ میں تو صرف لفظ ''عمل'' اختیار فرمایا یعنی: لَبِئْسَ مَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ، اور خواص مشائخ وعلما کی غلط کاری کے نتیجہ میں لفظ ''صنع'' اختیار فرمایا یعنی: لَبِئْسَ مَا کَانُوْا یَصْنَعُوْنَ، اس میں اس کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے کہ ان کے علماء ومشائخ کی یہ غلط روش کہ یہ جانتے بوجھتے ہوئے کہ اگر ہم ان کو منع کریں گے تو یہ ہمارا کہنا سنیں گے اور باز آجائیں گے، پھر بھی ان لوگوں کے نذرانوں کے لالچ یا بد اعتقاد ہو جانے کے خوف سے ان کے دلوں میں حمایتِ حق کا کوئی داعیہ پیدا نہیں ہوتا، یہ ان بدکاروں کے اعمال بد سے زیادہ اشد ہے، جس کا حاصل یہ ہوا کہ جس قوم کے لوگ جرائم اور گناہوں میں مبتلا ہوں گے اور ان کے مشائخ وعلماء کو یہ بھی اندازہ ہو کہ ہم ان کو روکیں گے تو یہ باز آجائیں گے، ایسے حالات میں اگر یہ کسی لالچ یا خوف کی وجہ سے ان جرائم اور گناہوں کو نہیں روکتے تو ان کا جرم اصل مجرموں، بدکاروں کے جرم سے بھی زیادہ اشد ہے، اس لئے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مشائخ وعلماء کے لئے پورے قرآن میں اس آیت سے زیادہ سخت تنبیہ کہیں نہیں، اور امام تفسیر ضحاک نے فرمایا کہ میرے نزدیک مشائخ وعلماء کے لئے یہ آیت سب سے زیادہ خوفناک ہے۔

وجہ یہ ہے کہ اس آیت کی رو سے ان کا جرم تمام چوروں، ڈاکوؤں اور ہر طرح کے بدکاروں کے جرم سے بھی زیادہ سخت ہو جاتا ہے (العیاذ باللہ) مگر یاد رہے کہ یہ شدت اور وعید اسی صورت میں ہیں جبکہ مشائخ وعلماء کو اندازہ بھی ہو کہ ان کی بات سنی اور مانی جائے گی اور جس جگہ قرائن یا تجربہ

سے یہ گمان غالب ہو کہ کوئی سنے گا نہیں، بلکہ اس کے مقابلہ میں ان کو ایذائیں دی جائیں گی تو وہاں حکم یہ ہے کہ ان کی ذمہ داری تو ساقط ہو جاتی ہے۔ لیکن افضل و اعلیٰ پھر بھی یہی رہتا ہے کہ کوئی مانے یا نہ مانے یہ حضرات اپنا فرض ادا کریں، اور اس میں کسی کی ملامت یا ایذاء کی فکر نہ کریں، جیسا کہ چند آیات میں پہلے اللہ تعالیٰ کے مقبول مجاہدین کی صفات میں گزر چکا ہے: **ولا یخافون لومۃ لآئم**، یعنی یہ لوگ اللہ کے راستہ میں اور حق ظاہر کرنے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پرواہ نہیں کرتے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جس جگہ بات سننے اور ماننے کا احتمال غالب ہو وہاں مشائخ و علماء پر بلکہ ہر مسلمان پر جس کو اس کام کا جرم و گناہ ہونا معلوم ہو فرض ہے کہ گناہ کو روکنے اور منع کرنے میں مقدور بھر کوشش کرے، خواہ ہاتھ سے یا زبان سے، یا کم از کم اپنے دل کی نفرت اور اعراض سے اور جس جگہ غالب گمان یہ ہو کہ اس کی بات نہ سنی جائے گی، یا یہ کہ اس کے خلاف دشمنی بھڑک اٹھے گی تو ایسی حالت میں منع کرنا اور روکنا فرض تو نہیں رہتا، مگر افضل و اعلیٰ بہر حال ہے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے متعلق یہ تفصیلات صحیح احادیث سے مستفاد ہیں، خود نیک عمل اختیار کرنے اور برے اعمال سے بچنے کے ساتھ دوسروں کو بھی نیکی کی طرف ہدایت اور برائی سے روکنے کا فریضہ عام مسلمانوں پر اور بالخصوص علماء و مشائخ پر ڈال کر اسلام نے دنیا میں امن و اطمینان پیدا کرنے کا ایک ایسا زریں اصول بنا دیا ہے کہ اس پر عمل ہونے لگے تو پوری قوم بہت آسانی کے ساتھ تمام برائیوں سے پاک ہو سکتی ہے۔

* * *

فائدہ: جب خدا کسی قوم کو تباہ کرتا ہے تو اس کی عوام گناہوں اور نافرمانیوں میں غرق ہو جاتے ہیں اور اس کے خواص یعنی درویش اور علماء گونگے شیطان بن جاتے ہیں۔ بنی اسرائیل کا حال یہ ہی ہوا کہ لوگ عموماً دنیاوی لذات و شہوات میں منہمک ہو کر خدا تعالیٰ کی عظمت و جلال اور اس کے قوانین و احکام کو بھلا بیٹھے۔ اور جو مشائخ اور علماء کہلاتے تھے انہوں نے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ ترک کر دیا۔ کیونکہ دنیا کی حرص اور اتباع شہوات میں وہ اپنے عوام سے بھی آگے تھے۔ مخلوق کا خوف یا دنیا کا لالچ حق کی آواز بلند کرنے سے مانع ہوتا تھا۔ اسی سکونت اور مداہنت سے پہلی قومیں تباہ ہوئیں۔ اسی لئے امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیم کو قرآن و حدیث کی بیشمار نصوص میں بہت ہی سخت تاکید و تہدید کی گئی ہے کہ کسی وقت اور کسی شخص کے مقابلہ میں اس فرض امر بالمعروف کے ادا کرنے سے تغافل نہ برتیں۔

وَقَالَتِ الْيَهُودُ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُولَةٌ ؕ غُلَّتْ اَيْدِيهِمْ وَلُعِنُوْا بِمَا قَالُوْا ۘ بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ ۙ

اور یہود کہتے ہیں اللہ کا ہاتھ بند ہو گیا[1] انہی کے ہاتھ بند ہو جائیں[2] اور لعنت ہے انکو اس کہنے پر، بلکہ اسکے تو دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں[3]

يُنْفِقُ كَيْفَ يَشَآءُ ؕ وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ؕ

خرچ کرتا ہے جس طرح چاہے[4] اور ان میں بہتوں کو بڑھے گی اس کلام سے جو تجھ پر اترا تیرے رب کی طرف سے شرارت اور انکار[5]

خلاصہ تفسیر: گزشتہ آیات میں یہود کے بعض احوال کا ذکر تھا، اب آگے بھی مزید بعض خاص حالات بیان کئے گئے ہیں، ایک قصہ یہ ہوا کہ نباش بن قیس، اور فخاص رئیس یہود قینقاع نے حق تعالیٰ کی جناب میں گستاخانہ الفاظ کہے تھے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

اور یہود نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کا ہاتھ بند ہو گیا ہے (یعنی نعوذ باللہ بخل کرنے لگا ہے، درحقیقت) انہی کے ہاتھ بند ہیں (یعنی واقع میں خود بخل کے مرض میں مبتلا ہیں، اور خدا پر عیب دھرتے ہیں) اور اپنے اس کہنے سے یہ رحمت (الٰہی) سے دور کر دیئے گئے (جس کا اثر دنیا میں ذلت اور قید اور قتل وغیرہ ہوا، اور آخرت میں عذاب جہنم، اور حاشا و کلا کہ خدا تعالیٰ میں اس کا احتمال بھی ہو) بلکہ ان کے دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں (یعنی بڑے جواد و کریم ہیں، لیکن چونکہ حکیم بھی ہیں اس لئے) جس طرح چاہتے ہیں خرچ کرتے ہیں (پس یہود پر جو تنگی ہوئی اس کی علت حکمت ہے کہ ان کے کفر کا وبال ان کو چکھانا مقصود ہے نہ یہ کہ بخل اس کی علت ہو) اور (یہود کے کفر اور سرکشی کی یہ حالت ہے کہ ان کو یہ توفیق نہ ہوگی کہ مثلاً اپنے قول کا باطل ہونا دلیل سے سن لیا تو اس سے توبہ کر لیں نہیں بلکہ) جو مضمون آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آپ کے پروردگار کی طرف سے بھیجا جاتا ہے، وہ ان میں سے بہتوں کی

سرکشی اور کفر کی ترقی کا سبب ہو جاتا ہے (اس طرح سے کہ وہ اس کا بھی انکار کرتے ہیں، تو کچھ تو پہلے سرکشی اور کفر تھا پھر اور بڑھ گیا)۔

❋ ❋ ❋

فائدہ: ۱۔ وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ: نبی کریم ﷺ کی بعثت کے وقت اہل کتاب کے قلوب ان کی شرارت، کفر وطغیان، بدکاری، حرام خوری وغیرہ کی ممارست سے اس قدر مسخ ہو گئے تھے کہ بارگاہ ربوبیت میں گستاخی کرنے سے بھی ان کو کچھ باک نہ ہوتا تھا خداوند قدوس کا رتبہ ان کے یہاں ایک معمولی انسان کی حیثیت سے زیادہ نہ رہا تھا حق تعالیٰ کی جناب میں بے تکلف ایسے ہی واہی تباہی کلمات بک دیتے تھے، جنہیں سن کر انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں، کبھی کہتے: اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِيَآءُ (آل عمران:۱۸۱) کبھی یہ الفاظ منہ سے نکالتے يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ (المائدہ:۶۴) (خدا کا ہاتھ بند ہو گیا) اس سے مراد یا تو وہ ہی ہو گی جو اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ سے تھی کہ خدا معاذ اللہ تنگ دست ہو گیا اس کے خزانہ میں کچھ رہا نہیں اور یا "غل ید" کنایہ بخل و امساک سے ہو، یعنی تنگ دست تو نہیں مگر آجکل بخل کرنے لگا ہے (العیاذ باللہ) بہر حال کوئی معنی لو، اس کلمہ کفر کا منشا یہ تھا کہ جب تمرد وطغیان کی پاداش میں حق تعالیٰ نے ان ملاعین پر ذلت ونکبت، ضیق عیش، بدحالی اور تنگ میدانی مسلط فرما دی تو بجائے اس کے کہ اپنی سیاہ کاریوں اور شرارتوں پر متنبہ اور نادم ہوتے، الٹے حق تعالیٰ کی جناب میں گستاخیاں کرنے لگے، شاید یہ خیال ہوا ہوگا کہ ہم تو پیغمبروں کی اولاد بلکہ خدا کے بیٹے اور اس کے پیارے تھے، پھر یہ کیا معاملہ ہونے لگا کہ آج بنی اسماعیل تو دنیا میں پھیلتے جا رہے ہیں، زمینی فتوحات اور آسمانی برکات تو ان پر کشادہ کر دی گئی ہیں اور ہم بنی اسرائیل کہ خدا صرف ہمارا اور ہم اس کے تھے، اس طرح ذلیل ومغلوب اور تنگ ہو کر در بدر بھٹکتے پھرتے ہیں، ہم تو وہ ہی اسرائیل کی اولاد اور نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ (المائدہ:۱۸) آج بھی ہیں جو پہلے تھے مگر معلوم ہوتا ہے کہ جس خدا کی ہم اولاد اور محبوب تھے (معاذ اللہ) اس کے خزانہ میں کمی آ گئی یا آج کل بخل وامساک نے اس کا ہاتھ بند کر دیا ہے، احمق اتنا نہ سمجھے کہ حق تعالیٰ کے خزائن تو لامحدود اور اس کے کمالات غیر متبدل اور غیر متناہی ہیں، اگر معاذ اللہ اس کے خزانہ میں کچھ نہ رہتا یا مخلوق کی تربیت واعانت سے وہ ہاتھ کھینچ لیتا تو دنیا کا نظام کس طرح قائم رہ سکتا تھا اور جو روز افزوں عروج وفروغ پیغمبر ﷺ اور ان کے رفقاء کا تم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو یہ کس کے خزانہ اور دست کرم کا رہین منت ہوتا، لہٰذا تم کو سمجھ لینا چاہیے کہ اس کا ہاتھ بند نہیں ہوا، البتہ گستاخیوں اور شرارتوں کی نحوست سے خدا کی جو لعنت اور پھٹکار تم پر پڑی ہے اس نے تمہارے حق میں خدا کی زمین باوجود وسعت کے تنگ کر دی ہے اور آئندہ اور زیادہ تنگ ہونے والی ہے اپنی تنگ حالی کو خدا کی تنگدستی سے منسوب کرنا تمہاری انتہائی سفاہت ہے۔

فائدہ: ۲۔ غُلَّتْ اَيْدِيْهِمْ: یہ دعا کے رنگ میں پیشین گوئی یا ان کی حالت واقع کی خبر دی گئی ہے چنانچہ واقعہ میں بخل وجبن نے ان کے ہاتھ بالکل بند کر دیے تھے۔

فائدہ: ۳۔ بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ: حق تعالیٰ کے لئے جہاں ہاتھ، پاؤں، آنکھ وغیرہ نعوت ذکر کئی گئی ہیں ان سے بھول کر بھی یہ وہم نہ ہونا چاہیے کہ وہ معاذ اللہ مخلوق کی طرح جسم اور اعضائے جسمانی رکھتا ہے بس جس طرح خدا کی ذات اور وجود، حیات، علم، وغیرہ تمامی صفات کی کوئی نظیر اور مثال اور کیفیت اس کے سوا بیان نہیں ہو سکتی:

اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وهم — وز هر چه گفته اند و شنیدیم و خوانده ایم
دفتر تمام گشت و بپایاں رسید عمر — ما همچناں در اول وصف تو مانده ایم

اسی طرح ان نعوت وصفات کو خیال کرو خلاصہ یہ کہ جیسے خدا کی ذات بے چون وبچگوں ہے اس کے سمع، بصر، ید وغیرہ نعوت وصفات کے معانی بھی اس کی ذات اور شان اقدس کے لائق اور ہمارے کیف وکم اور تعبیر وبیان کے احاطہ سے بالکل وراء الوراء ہیں لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ (الشوریٰ:۱۱) حضرت شاہ عبدالقادر نے ان آیات پر جو فائدہ لکھا ہے اس میں دو ہاتھوں سے مراد "مہر" کا اور "قہر" کا ہاتھ لیا ہے، یعنی آجکل خدا کے مہر کا ہاتھ امت محمدیہ پر اور قہر کا بنی اسرائیل پر کھلا ہوا ہے جیسا کہ اگلی آیتوں میں اشارہ فرمایا۔

فائدہ: ۴۔ يُنْفِقُ كَيْفَ يَشَآءُ: یعنی اس کو وہ ہی خوب جانتا ہے کہ کس وقت، کس پر، کس قدر خرچ کیا جائے، کبھی ایک وفادار کو امتحان یا اصلاح حال کی غرض سے تنگی اور عسرت میں مبتلا کر دیتا ہے اور کبھی اس کی وفاداری کے صلہ میں نعمائے آخرت سے پہلے دنیاوی برکات کے دروازے بھی

کھول دیتا ہے، اس کے بالمقابل ایک مجرم متمرد پر کبھی آخرت کی سزا سے پہلے تنگ حالی ضیق عیش اور مصائب آفات دنیاوی کی سزا بھیجتا ہے اور کسی وقت دنیاوی ساز وسامان کو فراخ کر کے مزید مہلت دیتا ہے کہ خدا کے احسانات سے متاثر ہو کر اپنے فسق وفجور پر کچھ شرمائے اور یا اپنی شقاوت کا پیمانہ پوری طرح لبریز کر کے انتہائی سزا کا مستحق ہو، ان مختلف احوال واغراض اور متنوع حکمتوں کی موجودگی میں کسی شخص کے مقبول ومردود ہونے کا فیصلہ خدا کی اطلاع یا قرائن واحوال خارجیہ کی بناء پر کیا جاسکتا ہے جس طرح ایک چور کا ہاتھ کاٹا جائے، یا ڈاکٹر کسی مریض کا ہاتھ کاٹے، دونوں کی نسبت ہم احوال خارجہ اور قرائن سے سمجھ لیتے ہیں کہ ایک بطور سزا اور دوسرا از راہ شفقت وعلاج کاٹا گیا ہے۔

فائدہ:۵ مَّآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْیَانًا وَّ كُفْرًا: ان کی گستاخی کا جواب دیا جا چکا ہے، لیکن قرآن کے ایسے حکیمانہ جوابات سے ان معاندین اور سفہاء کو تسکین نہیں ہوگی بلکہ کلام الٰہی سن کر شرارت اور انکار میں اور زیادہ ترقی کریں گے، اگر غذائے صالح ایک بیمار کے معدہ میں پہنچ کر اس کے مرض کو زیادہ کر دیتی ہے تو اس میں غذا کا قصور نہیں مریض کے مزاج کی خرابی ہے۔

وَاَلْقَیْنَا بَیْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ ؕ كُلَّمَآ اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ

اور ہم نے ڈال رکھی ہے ان میں دشمنی اور بیر قیامت کے دن تک[1] جب کبھی آگ سلگاتے ہیں لڑائی کے لیے

اَطْفَاَهَا اللّٰهُ ۙ وَیَسْعَوْنَ فِی الْاَرْضِ فَسَادًا ؕ وَاللّٰهُ لَا یُحِبُّ الْمُفْسِدِیْنَ ﴿۶۴﴾

اللہ اس کو بجھا دیتا ہے، اور دوڑتے ہیں ملک میں فساد کرتے ہوئے، اور اللہ پسند نہیں کرتا فساد کرنے والوں کو[2]

خلاصہ تفسیر: اور (ان کے کفر سے جوان پر لعنت یعنی رحمت سے دوری واقع کی گئی ہے اس کے دنیوی آثار میں سے ایک یہ ہے کہ) ہم نے ان میں باہم (دین کے باب میں) قیامت تک عداوت اور بغض ڈال دیا (چنانچہ ان میں مختلف فرقے ہیں، اور ہر فرقہ دوسرے کا دشمن، چنانچہ باہمی دشمنی اور بغض کی وجہ سے) جب کبھی (مسلمانوں کے ساتھ) لڑائی کی آگ بھڑکانا چاہتے ہیں (یعنی لڑنے کا ارادہ کرتے ہیں) حق تعالیٰ اس کو فرو کر دیتے ہیں (اور بجھا دیتے ہیں، یعنی مرعوب ہو جاتے ہیں، یا لڑ کر مغلوب ہو جاتے ہیں، یا آپس کے اختلاف کی وجہ سے اتفاق کی نوبت نہیں آتی) اور (جب لڑائی سے رہ جاتے ہیں تو اپنی دشمنی دوسری طرح نکالتے ہیں کہ) ملک میں (خفیہ) فساد کرتے پھرتے ہیں (جیسے نومسلموں کو بہکانا، لگائی بجھائی کرنا، عوام کو تورات کے محرف مضامین سنا کر اسلام سے روکنا) اور اللہ تعالیٰ (چونکہ) فساد کرنے والوں کو محبوب نہیں رکھتے (یعنی مبغوض رکھتے ہیں، اس لئے اس فساد کی ان کو خوب سزا ہوگی خواہ دنیا میں بھی ورنہ آخرت میں تو ضرور)۔

وَاَلْقَیْنَا بَیْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ: یعنی ہم نے ان میں آپس میں قیامت تک عداوت اور بغض ڈال دیا، سوال ہوتا ہے کہ اہل کتاب میں آج کل بظاہر بہت اتحاد اور اتفاق دیکھا جاتا ہے اس کو جھٹلایا تو نہیں جاسکتا، تو اس سے اس آیت میں شبہ ہو سکتا ہے، جواب یہ ہے کہ اس سے اوپر یہود کا ذکر ہے تو اول تو جب تک ان میں اتحاد ثابت نہ کیا جائے آیت کے مضمون پر کوئی شبہ نہیں، دوسرے اگر اس سے پہلے اہل کتاب کا ذکر ہونے کی وجہ سے مطلق اہل کتاب کی طرف بھی ضمیر کو راجع کیا جائے تو جواب یہ ہے کہ اس عدوات سے مراد مذہبی عداوت ہے اور اب جن لوگوں میں اتحاد دیکھا جاتا ہے وہ مذہب سے بالکل علیحدہ ہیں، ان میں جو اتحاد ہے وہ دنیاوی اغراض ہی میں ہے۔

جاننا چاہیے کہ یہاں کافر وملعون ہونے کے جو اثرات بیان کیے گئے ہیں مثلاً ذلیل وقید ہونا، اتفاق نہ ہونا، لڑائی میں ناکام رہنا یہ بطور واقعات کے ہیں، آیت میں یہ دعویٰ نہیں ہے کہ کفر ولعنت کے واسطے یہ باتیں لازم ہیں، نہ یہ دعویٰ ہے کہ یہ اثرات کفار ہی کے ساتھ خاص ہیں اور غیر کفار میں نہیں ہو سکتے، پس اگر کفار پر کبھی یہ اثرات مرتب نہ ہوں یا غیر کفار میں بھی پائے جائیں تو کوئی اشکال لازم نہیں آتا۔

* * *

فائدہ:[1] الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ: اگرچہ قریب میں خاص یہود کا مقولہ نقل کیا تھا، لیکن اَلْقَیْنَا بَیْنَهُمُ سے مراد

غالباً وہ اور ان کے بھائی بند سب ہیں، یعنی یہود و نصاریٰ سب اہل کتاب کا حال بیان فرمایا ہے جیسا کہ پہلے اسی سورۃ میں گزر چکا اور اگلی آیت میں بھی سب اہل کتاب کو خطاب فرمایا ہے، مطلب یہ ہوا کہ جوں جوں ان کی شرارت اور انکار کو ترقی ہوئی اسی قدر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازشیں اور منصوبے گانٹھیں گے اور لڑائی کی آگ سلگانے کے لئے تیار ہونگے، لیکن ان کے آپس میں پھوٹ پڑ چکی ہے جو مٹ نہیں سکتی، اس سبب سے اسلامی برادری کے خلاف ان کی جنگی تیاریاں کامیاب نہیں ہوئیں۔

فائدہ: ۲۔ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ: اس سے معلوم ہوا کہ اہل اسلام میں جب تک باہمی محبت اور اخوت مستحکم رہے گی اور رشد و صلاح کے طریق پر گامزن ہو کر فتنہ اور فساد سے مجتنب رہنے کا اہتمام رہے گا جیسا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم میں تھا اس وقت تک اہل کتاب کی سب کوششیں ان کے مقابلہ میں بیکار ثابت ہوں گی۔

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْكِتٰبِ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاَدْخَلْنٰهُمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴿۶۵﴾

اور اگر اہل کتاب ایمان لاتے اور ڈرتے تو ہم دور کر دیتے ان سے ان کی برائیاں اور ان کو داخل کرتے نعمت کے باغوں میں

خلاصہ تفسیر: پیچھے اہل کتاب کے کفریہ اقوال بیان ہوئے، اب یہود و نصاریٰ دونوں کو ایمان کی دنیوی و اخروی برکات سنا کر ایمان کی ترغیب دیتے ہیں، اور اس کے ضمن میں رزق کی تنگی کے سبب پر تنبیہ کرتے ہیں جس کی وجہ سے گستاخانہ کلمات ید اللہ مغلولۃ کہنے کی نوبت آئی کہ اس کا سبب احکام الٰہی کا چھوڑنا ہے۔

اور اگر یہ اہل کتاب (یہود و نصاریٰ جن حق باتوں کے منکر ہیں، جیسے رسالت محمدیہ اور قرآن کی حقانیت ان سب پر) ایمان لے آتے اور (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطہ سے جن امور کو کفر و معصیت ہونا بتلایا گیا ہے ان سب سے) تقویٰ (یعنی پرہیز) اختیار کرتے تو ہم ضرور ان کی تمام (گزشتہ) برائیاں (اس میں کفر، شرک اور معاصی سب داخل ہیں جن میں تمام اقوال و احوال آ گئے) معاف کر دیتے اور (معاف کر کے) ضرور ان کو چین (اور آرام) کے باغوں میں (یعنی بہشت میں) داخل کرتے (تو یہ آخرت کی برکتیں ہوئیں)۔

❁ ❁ ❁

فائدہ: یعنی باوجود ایسے شدید جرائم اور سخت شرارتوں کے اگر اب بھی اہل کتاب اپنے رویہ سے تائب ہو کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن پر ایمان لے آتے اور تقویٰ اختیار کر لیتے تو دروازہ توبہ کا بند نہیں ہوا، حق تعالیٰ کمال فضل و رحمت سے ان کو اخروی و دنیاوی نعمتوں سے سرفراز فرما دیتا اس کی رحمت بڑے سے بڑے مجرم کو بھی جب وہ شرمسار اور معترف ہو کر آئے مایوس نہیں کرتی۔

وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ

اور اگر وہ قائم رکھتے تورات اور انجیل کو اور اس کو جو کہ نازل ہوا ان پر ان کے رب کی طرف سے ۱ے تو کھاتے اپنے اوپر سے

وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ؕ مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ؕ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ سَآءَ مَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۶۶﴾ ع ۱۴

اور اپنے پاؤں کے نیچے سے ۲ے کچھ لوگ ان میں ہیں سیدھی راہ پر ۳ے اور بہت سے ان میں برے کام کر رہے ہیں

خلاصہ تفسیر: (اب ایمان و تقویٰ کی دنیوی برکتیں بیان فرماتے ہیں) اور اگر یہ لوگ (ایمان اور تقویٰ اختیار کرتے جس کو بعنوان دیگر یوں کہا جاتا ہے کہ) توریت کی اور انجیل کی اور جو کتاب ان کے پروردگار کی طرف سے (اب) ان کے پاس (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطہ سے) بھیجی گئی (یعنی قرآن) اس کی پوری پابندی کرتے (یعنی ان کتابوں میں جس جس بات پر عمل کرنے کو لکھا ہے سب پر پورا عمل کرتے، اس میں رسالت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق بھی آ گئی، اور منسوخ و محرف احکام اس سے نکل گئے، کیونکہ یہ سب کتابیں ان پر عمل کرنے سے روکتی ہیں) تو یہ لوگ

(بوجہ اس کے کہ) اوپر سے (یعنی آسمان سے پانی برستا) اور نیچے سے (یعنی زمین سے پیداوار ہوتی) خوب فراغت سے کھاتے (برتتے، یہ ایمان کی دنیوی برکات کا ذکر ہوا، لیکن اہل کتاب کفر پر جمے رہے، اس لئے تنگی میں پکڑے گئے، جس پر بعض نے حق تعالیٰ کی شان میں بخل کی نسبت کر کے گستاخی کی، مگر پھر بھی سب یہود و نصاریٰ برابر نہیں، چنانچہ) ان (ہی) میں ایک جماعت راہ راست پر چلنے والی (بھی) ہے (جیسے یہود میں حضرت عبداللہ بن سلامؓ اور ان کے ساتھی، اور نصاریٰ میں حضرت نجاشی اور ان کے ساتھی، لیکن ایسے تھوڑے ہی ہیں) اور (باقی) زیادہ ان میں ایسے ہی ہیں کہ ان کے کردار بہت برے ہیں (کیونکہ کفر و عناد سے بدتر کیا کردار ہوگا)۔

وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ: اس کے خلاصہ تفسیر کی تقریر سے یہ شبہ ختم ہوگیا کہ اب بھی پوری تورات وانجیل واجب العمل ہیں، چنانچہ یہاں ان کتابوں کی عدم تحریف اور ان کے غیر محرف احکام پر عمل مراد ہے، اس جگہ اگرچہ صرف قرآن کا ذکر کافی تھا مگر تورات وانجیل کا ذکر اس لیے بڑھا دیا گیا تاکہ اہل کتاب کو بتلا دیا جائے کہ محمد ﷺ کو جھٹلانے سے تورات وانجیل پر بھی عمل فوت ہوجاتا ہے اور آپ ﷺ کی تصدیق کرنا تورات وانجیل پر عمل کرنا ہے۔

لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ: یہ خاص وعدہ ان یہودیوں کے ساتھ کیا گیا تھا جو آنحضرت ﷺ کے عہد میں موجود اور آپ کے مخاطب تھے، وہ اگر ان احکام کو مان لیتے تو دنیا میں بھی ان کو ہر طرح کی نعمت و راحت دے دی جاتی، چنانچہ اس وقت جن حضرات نے ایمان اور عمل صالح اختیار کرلیا ان کو یہ نعمتیں پوری ملیں، جیسے نجاشی سلطان حبشہ اور عبداللہ بن سلامؓ، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ جب کوئی ایمان و عمل صالح کا پابند ہوجائے تو دنیا میں اس کے لئے رزق کی وسعت ضروری ہوگی، اور جو پابند نہ ہو تو اس کے لئے رزق کی تنگی ضروری ہوگی، کیونکہ یہاں کوئی عام قاعدہ ضابطہ بیان فرمانا مقصود نہیں، ایک خاص جماعت سے خاص حالات میں وعدہ کیا گیا ہے، البتہ ایمان اور عمل صالح پر عام قاعدہ اور ضابطہ کی صورت سے حیات طیبہ یعنی پاکیزہ زندگی عطا ہونے کا وعدہ عام ہے، مگر وہ وسعت رزق کی صورت میں بھی ہوسکتی ہے اور ظاہری تنگدستی کی صورت میں بھی، جیسا کہ انبیاء و اولیاء کے حالات اس پر شاہد ہیں کہ سب کو ہمیشہ وسعت رزق تو نہیں ملی، لیکن پاکیزہ زندگی سب کو عطا ہوئی۔

* * *

فائدہ: ۱۔ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ: یعنی قرآن کریم جو تورات وانجیل کے بعد ان کی تنبیہ اور ہدایت کے لئے نازل ہوا اس کو قائم کرتے، کیونکہ اس کے تسلیم کے بدون تورات وانجیل کی بھی صحیح معنی میں اقامت نہیں ہوسکتی، بلکہ تورات وانجیل اور جملہ کتب سماویہ کی اقامت کا مطلب ہی اب یہ ہوسکتا ہے کہ قرآن کریم اور پیغمبر آخر الزمان ﷺ جو کتب سابقہ کی پیشین گوئیوں کے مطابق بھیجے گئے ہیں ان کو قبول کیا جائے، گویا اقامت تورات وانجیل کا حوالہ دے کر آگاہ فرمادیا کہ اگر قرآن کو انہوں نے قبول نہ کیا تو اس کے معنی یہ ہی ہیں کہ اپنی کتابوں کے قبول کرنے سے بھی منکر ہوگئے۔

فائدہ: ۲۔ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ: یعنی تمام ارضی سماوی برکات سے ان کو متمتع کیا جاتا اور ذلت، بدحالی اور ضیق عیش کی جو سزا ان کے عصیان و تمرد پر دی گئی تھی وہ اٹھالی جاتی۔

فائدہ: ۳۔ مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ: یہ وہ معدود افراد ہیں جنہوں نے فطری سعادت سے توسط و اعتدال کی راہ اختیار کی اور حق کی آواز پر لبیک کہا، مثلاً عبداللہ بن سلام اور ملک حبشہ نجاشی وغیرہ رضی اللہ عنہم۔

يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۭ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ۭ

اے رسول پہنچا دے جو تجھ پر اترا تیرے رب کی طرف سے، اور اگر ایسا نہ کیا تو تو نے کچھ نہ پہنچایا اس کا پیغام

وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۶۷﴾

اور اللہ تجھ کو بچالے گا لوگوں سے، بیشک اللہ راستہ نہیں دکھلاتا قوم کفار کو

خلاصہ تفسیر: پیچھے کفار کی مذمت دور سے چلی آرہی ہے چونکہ کفار کی کثرت تھی اس لیے ان کی اعلانیہ مذمت کرنا بالخصوص ان کے منہ پر کرنا بعض اوقات خطرہ ونقصان کا سبب ہوسکتی تھی، اس لیے اب اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کو یہ تاکیدی حکم دیا جارہا ہے کہ جو کچھ آپ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کیا جائے وہ سب کا سب بغیر کسی جھجک کے آپ لوگوں کو پہنچادیں، کوئی برا مانے یا بھلا اور مخالفت کرے یا قبول کرے، اور ساتھ ہی رسول اللہ ﷺ کو یہ خوشخبری دے کر مطمئن بھی کردیا گیا کہ تبلیغ رسالت کے سلسلہ میں یہ کفار آپ کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے۔

اے رسول (ﷺ!) جو کچھ آپ کے رب کی جانب سے آپ پر نازل کیا گیا ہے آپ (لوگوں کو) سب پہنچا دیجئے اور اگر (بفرض محال) آپ ایسا نہ کریں گے تو (ایسا سمجھا جائے گا جیسے) آپ نے اللہ تعالیٰ کا پیغام بھی نہیں پہنچایا (کیونکہ اس مجموعہ کا پہنچانا فرض ہے، تو جیسے کل یعنی سب کے اخفاء سے یہ فرض فوت ہوتا ہے اس طرح بعض کے اخفاء سے بھی وہ فرض فوت ہوتا ہے) اور (تبلیغ کے باب میں کفار کا کچھ خوف نہ کیجئے، کیونکہ) اللہ تعالیٰ آپ کو لوگوں سے (یعنی اس سے کہ آپ ﷺ کے مقابل ہوکر آپ کو قتل وہلاک کرڈالیں) محفوظ رکھے گا (اور) یقیناً اللہ تعالیٰ کافر لوگوں کو (اس طرح قتل وہلاک کرڈالنے کے واسطے آپ ﷺ تک) راہ نہ دیں گے۔

وَاللّٰهُ يَعۡصِمُكَ مِنَ النَّاسِ: یعنی اللہ آپ کو لوگوں سے محفوظ رکھے گا، چنانچہ یہ وعدہ اسی طرح سچا ہوا، اگرچہ بعض غزوات میں آپ ﷺ زخمی بھی ہوئے اور یہود نے نامردوں کی طرح آپ کو زہر بھی دیا، مگر مجتمع ومقابل ہوکر کوئی قتل وہلاک نہ کرسکا اور اس پیشین گوئی کا سچا ہونا آپ ﷺ کا معجزہ اور دلیل نبوت ہے اور ترمذی میں ہے کہ پہلے حضور ﷺ کے پاس پہرہ دیا جاتا تھا جب یہ آیت نازل ہوئی تو آپ نے فرمایا کہ سب چلے جاؤ، اللہ تعالیٰ نے میری حفاظت کرلی، یہ بھی دلیل نبوت ہے، کیونکہ ایسا اعتماد بغیر وحی کے نہیں ہوسکتا۔

❋ ❋ ❋

فائدہ: پچھلی آیات میں اہل کتاب کی شرارت، کفر اور سیاہ کاریوں کا ذکر کرکے تورات، انجیل، قرآن اور کل کتب سماویہ کی اقامت کی ترغیب دی گئی تھی آئندہ قُلۡ يٰۤاَهۡلَ الۡكِتٰبِ لَسۡتُمۡ عَلٰى شَىۡءٍ سے اہل کتاب کے مجمع میں اعلان کرنا چاہتے ہیں کہ اس ''اقامت'' کے بدون تمہاری مذہبی زندگی بالکل صفر اور لاشے محض ہے يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوۡلُ بَلِّغۡ مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡكَ مِنۡ رَّبِّكَ میں اسی دوٹوک اعلان کے لئے حضور ﷺ کو تیار کیا گیا ہے، یعنی آپ پر جو کچھ پروردگار کی طرف سے اتارا جائے خصوصاً اس طرح کے فیصلہ کن اعلانات آپ بے خوف وخطر اور بلاتامل پہنچاتے رہیے، اگر بفرض محال کسی ایک چیز کی تبلیغ میں بھی آپ سے کوتاہی ہوئی تو بحیثیت رسول (خدائی پیغمبر) ہونے کے رسالت وپیغام رسانی کا جو منصب جلیل آپ کو تفویض ہوا ہے سمجھا جائے گا کہ آپ نے اس کا حق کچھ بھی ادا نہ کیا۔

بلاشبہ نبی کریم ﷺ کے حق میں فریضہ تبلیغ کی انجام دہی پر بیش از بیش ثابت قدم رکھنے کے لئے اس سے بڑھ کر کوئی موثر عنوان نہ ہوسکتا تھا، آپ ﷺ نے بیس بائیس سال تک جس بے نظیر اولوالعزمی، جانفشانی، مسلسل جدوجہد اور صبرواستقلال سے فرض رسالت وتبلیغ کو ادا کیا، وہ اس کی واضح دلیل تھی کہ آپ کو دنیا میں ہر چیز سے بڑھ کر اپنے فرض منصبی (رسالت وبلاغ) کی اہمیت کا احساس ہے، حضور ﷺ کے اس احساس قوی اور تبلیغی جہاد کو ملحوظ رکھتے ہوئے وظیفہ تبلیغ میں مزید استحکام ومثبتت کی تاکید کے موقع پر موثر ترین عنوان یہ ہی ہوسکتا تھا کہ حضور ﷺ کو يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوۡلُ سے خطاب کرکے صرف اتنا کہہ دیا جائے کہ اگر بفرض محال تبلیغ میں ادنیٰ سی کوتاہی ہوئی تو سمجھو کہ آپ اپنے فرض منصبی کے ادا کرنے میں کامیاب نہ ہوئے، اور ظاہر ہے کہ آپ ﷺ کی تمام تر کوششوں اور قربانیوں کا مقصد وحید ہی یہ تھا کہ آپ ﷺ خدا کے سامنے فرض رسالت کی انجام دہی میں اعلیٰ سے اعلیٰ کامیابی حاصل فرمائیں، لہٰذا یہ کسی طرح ممکن ہی نہیں کہ کسی ایک پیغام کے پہنچانے میں بھی ذراسی کوتاہی کریں۔

عموماً یہ تجربہ ہوا ہے کہ فریضہ تبلیغ ادا کرنے میں انسان چند وجہ سے مقصر رہتا ہے: ① یا تو اسے اپنے فرض کی اہمیت کا کافی احساس اور شغف نہ ہو ② یا لوگوں کی عام مخالفت سے نقصان شدید پہنچنے یا کم از کم بعض فوائد کے فوت ہونے کا خوف ہو اور ③ یا مخاطبین کے عام تمرد وطغیان کو دیکھتے ہوئے جیسا کہ پچھلی اور اگلی آیات میں اہل کتاب کی نسبت بتلایا گیا ہے، تبلیغ کے مثمر اور منتج ہونے سے مایوسی ہو پہلی وجہ کا جواب يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوۡلُ سے فَمَا بَلَّغۡتَ رِسَالَتَهٗ تک، دوسری کا وَاللّٰهُ يَعۡصِمُكَ مِنَ النَّاسِ میں، اور تیسری کا اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهۡدِى الۡقَوۡمَ الۡكٰفِرِيۡنَ میں دے دیا گیا، یعنی تم اپنا

فرض ادا کئے جاؤ خدا تعالیٰ آپ کی جان اور عزت وآبرو کی حفاظت فرمانے والا ہے وہ تمام روئے زمین کے دشمنوں کو بھی آپ کے مقابلہ پر کامیابی کی راہ نہ دکھلائے گا، باقی ہدایت وضلالت خدا کے ہاتھ میں ہے ایسی قوم جس نے کفر وانکار ہی پر کمر باندھ لی ہے اگر راہ راست پر نہ آئی تو تم غم نہ کرو اور نہ مایوس ہو کر اپنے فرض کو چھوڑو، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ہدایت ربانی اور آئین آسمانی کے موافق امت کو ہر چھوٹی بڑی چیز کی تبلیغ کی، نوع انسانی کے عوام وخواص میں سے جو ابات جس طبقہ کے لائق اور جس کی استعداد کے مطابق تھی، آپ نے بلاکم وکاست اور بےخوف وخطر پہنچا کر خدا کی حجت بندوں پر تمام کردی، اور وفات سے دو ڈھائی مہینے پہلے حجۃ الوداع کے موقع پر، جہاں چالیس ہزار سے زائد خادمان اسلام اور عاشقان تبلیغ کا اجتماع تھا، آپ نے علیٰ رؤس الاشہاد اعلان فرمایا کہ ''اے خدا تو گواہ رہ میں (تیری امانت) پہنچا چکا''۔

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ

کہہ دے اے کتاب والو تم کسی راہ پر نہیں جب تک نہ قائم کرو تورات اور انجیل کو اور جو تم پر اترا

مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ۚ

تمہارے رب کی طرف سے ۱؎ اور ان میں بہتوں کو بڑھے گی اس کلام سے جو تجھ پر اترا تیرے رب کی طرف سے شرارت اور کفر

فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۶۸﴾

سو تو افسوس نہ کر اس قوم کفار پر ۲؎

خلاصہ تفسیر: پیچھے اہل کتاب کو اسلام کی ترغیب تھی، اب ان کے موجودہ طریقہ کا۔ جس کے حق ہونے کے وہ مدعی تھے۔ خدا کے نزدیک ناکارہ اور نجات میں ناکافی ہونا اور نجات کا اسلام پر موقوف ہونا بیان فرماتے ہیں اور اس کے بعد بھی کفر پر اصرار کرنے کی صورت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دیتے ہیں، درمیان میں ایک خاص مناسبت اور ضرورت سے تبلیغ کا مضمون آ گیا تھا۔

آپ (صلی اللہ علیہ وسلم ان یہود ونصاریٰ سے) کہیے کہ اے اہل کتاب! تم کسی راہ پر بھی نہیں (کیونکہ غیر مقبول راہ پر ہونا بے راہ ہونے کے مثل ہے) جب تک کہ توریت کی اور انجیل کی اور جو کتاب (اب) تمہارے پاس (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطہ سے) تمہارے رب کی طرف سے بھیجی گئی ہے (یعنی قرآن) اس کی بھی پوری پابندی نہ کرو گے (جس کے معنی اور ترغیب اور برکات پیچھے بیان ہو چکے ہیں) اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! چونکہ ان میں اکثر لوگ بے جا تعصب میں مبتلا ہیں اس لئے یہ) ضرور (ہے کہ) جو مضمون آپ کے پاس آپ کے رب کی طرف سے بھیجا جاتا ہے وہ ان میں سے بہتوں کی سرکشی اور کفر کی ترقی کا سبب ہو جاتا ہے (جس سے ممکن ہے کہ آپ کو رنج وغم ہو، لیکن جب یہ معلوم ہو گیا کہ یہ لوگ متعصب ہیں) تو آپ ان کافر لوگوں (کی اس حالت) پر غم نہ کیا کیجئے۔

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ: اس سے معلوم ہوا کہ کوئی درویشی اور سلوک وطریقت، مجاہدات وریاضیات اور کشف والہام اس وقت تک اللہ کے نزدیک فضیلت اور نجات کی چیز نہیں جب تک کہ شریعت کی پوری اتباع اور پابندی نہ ہو۔

فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ: اس میں دلالت ہے کہ اعراض کرنے والے پر زیادہ قلق نہ کرے جیسے بعض شفقت میں مبالغہ کرنے والے کرتے ہیں، یعنی جو شخص ایسا ہو کہ اس کو دین کی اور اصلاح کی بات بتائی جائے تو وہ روگردانی کرے ایسے شخص کے بارے میں زیادہ غم اور فکر نہیں کرنا چاہیے، بس ہمارے ذمہ بتلا دینا اور سمجھا دینا ہے، باقی ہدایت ہمارے اختیار میں نہیں۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی کل کتب سماویہ جن کا خاتم اور مہیمن قرآن کریم ہے، پچھلے رکوع میں اس آیت کی تفسیر گزر چکی۔

فائدہ: ۲؎ یعنی اس غم اور افسوس میں پڑ کر تنگ دل نہ ہوں اپنا فرض امن واطمینان سے ادا فرماتے رہیں۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالصَّابِئُونَ وَالنَّصَارَىٰ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ

بیشک جو مسلمان ہیں اور جو یہودی ہیں اور فرقہ صابی اور نصاریٰ جو کوئی ایمان لاوے اللہ پر اور روز قیامت پر

وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿٦٩﴾

اور عمل کرے نیک نہ ان پر ڈر ہے نہ وہ غمگین ہوں گے

خلاصہ تفسیر: پیچھے اہل کتاب کو اسلام کی ترغیب تھی، اب ایک عام قانون کے ذریعے اسلام کی ترغیب دی جاتی ہے جو اہل کتاب وغیر اہل کتاب سب کو شامل ہے۔

یہ تحقیقی بات ہے کہ اور یہودی اور فرقہ صائبین اور نصاریٰ (ان سب میں) جو شخص یقین رکھتا ہو اللہ (کی ذات وصفات) پر اور قیامت پر، اور کارگزاری اچھی کرے (یعنی قانون شریعت کے موافق) ایسوں پر (آخرت میں) نہ کسی طرح کا اندیشہ ہے اور نہ وہ مغموم ہوں گے۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا: خلاصہ مضمون یہ ہے کہ ہمارے دربار میں کسی کی نسبی، وطنی اور قومی خصوصیت کچھ نہیں جو شخص پوری اطاعت اعتقاد اور عمل صالح اختیار کرے گا، خواہ وہ پہلے سے کیسا ہی ہو، ہمارے یہاں مقبول اور اس کی خدمت مشکور ہے اور یہ ظاہر ہے کہ بعد نزول قرآن کے پوری اطاعت مسلمان ہونے میں منحصر ہے، کیونکہ کتب سابقہ تورات وانجیل میں بھی اس کی ہدایات موجود ہیں، اور قرآن کریم تو سراسر اسی کے لئے نازل ہوا، اسی لئے نزول قرآن اور بعثت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد قرآن اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے بغیر نہ تورات وانجیل کا اتباع صحیح ہوسکتا ہے نہ زبور کا، تو مطلب آیت کا یہ ہوگا کہ ان تمام اقوام میں سے جو مسلمان ہوجائے گا آخرت میں نجات وثواب کا مستحق ہوگا، اس میں اس خیال کا جواب ہوگیا کہ یہ کفر ومعصیت اور اسلام اور مسلمانوں کے خلاف شرارتیں جواب تک کرتے رہے ہیں مسلمان ہوجانے کے بعد ان کا کیا انجام ہوگا، معلوم ہوا کہ پچھلے سب گناہ اور خطائیں معاف کردی جائیں گی اور آخرت میں نہ ان لوگوں کو اندیشہ رہے گا نہ کوئی غم ورنج پیش آئے گا۔

مضمون پر نظر کرنے سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں مسلمانوں کا ذکر نہ ہونا چاہیے کیونکہ وہ تو ایمان واطاعت کے اس مقام پر ہیں جو اس آیت میں مطلوب ہے، یہاں ذکر صرف ان لوگوں کا کرنا چاہیئے جن کو اس مقام کی طرف بلانا ہے، مگر اس طرز خاص میں کہ مسلمانوں کا ذکر بھی ان کے ساتھ ملا دیا گیا ایک خاص بلاغت پیدا ہوگئی، اس کی ایسی مثال ہے کہ کوئی حاکم یا بادشاہ کسی ایسے موقع پر یوں کہے کہ ہمارا قانون عام ہے، خواہ کوئی موافق ہو یا مخالف جو شخص اطاعت کرے گا وہ مورد عنایت وانعام ہوگا، اب ظاہر ہے کہ موافق کو بھی ذکر کرنے میں حکمت یہ ہے کہ ہم کو جو موافقین کے ساتھ عنایت ہے وہ کسی نسبی یا قومی خصوصیت کی بناء پر نہیں، بلکہ ان کی صفت اطاعت پر تمام عنایت وانعام کا مدار ہے، اگر مخالف بھی اطاعت اختیار کرے گا وہ بھی اسی لطف وعنایت کا مستحق ہوگا۔

مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ: اس آیت میں تمام ایمانیات اور عقائد اسلام کی تفصیلات بیان کرنا منظور نہیں، نہ اس کا کوئی موقع ہے، اسلام کے چند بنیادی عقائد ذکر کرکے تمام اسلامی عقائد کی طرف اشارہ کرنا اور اس کی طرف دعوت دینا مقصود ہے اور نہ یہ کوئی ضروری بات ہے کہ ہر آیت میں جہاں ایمان کا ذکر آئے اس کی ساری تفصیلات وہیں ذکر کی جائیں اس لئے اس جگہ ایمان بالرسول صلی اللہ علیہ وسلم یا ایمان بالنبوۃ کا ذکر صراحۃً نہ ہونے سے کسی ادنی فہم وعقل اور انصاف ودانش رکھنے والے کو کسی شبہ کی گنجائش نہ تھی، خصوصاً جبکہ پورا قرآن اور اس کی سینکڑوں آیتیں ایمان بالرسالت کی تصریحات سے لبریز ہیں جن میں یہ تصریحات موجود ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ارشادات رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر مکمل ایمان لائے بغیر نجات نہیں، اور کوئی ایمان وعمل بغیر اس کے مقبول ومعتبر نہیں، لیکن ملحدین کا ایک گروہ جو کسی نہ کسی طرح قرآن میں اپنے مکروہ نظریات کو ٹھونسنا چاہتا ہے اور انہوں نے اس آیت میں صراحۃً ذکر رسالت نہ ہونے سے ایک نیا نظریہ قائم کرلیا جو قرآن وسنت کی بیشمار تصریحات کے قطعاً خلاف ہے، وہ یہ کہ ہر شخص اپنے اپنے

مذہب یہودی، نصرانی یہاں تک کہ ہندو بت پرست رہتے ہوئے بھی اگر صرف اللہ پر اور روز قیامت پر ایمان رکھتا ہو اور نیک کام کرے تو نجات آخرت کا مستحق ہو سکتا ہے، نجات اخروی کے لئے اسلام میں داخل ہونا ضروری نہیں (نعوذ باللہ منہ)۔

جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے تلاوت قرآن کی توفیق اور اس پر صحیح ایمان عطا فرمایا ہے، ان کے لئے قرآنی تصریحات سے اس مغالطہ کا دور کر دینا کسی بڑے علم ونظر کا محتاج نہیں، قرآن کریم کا اردو ترجمہ جاننے والے حضرات بھی اس تخیل کی غلطی کو بآسانی سمجھ سکتے ہیں، چند آیات بطور مثال کے یہ ہیں: **کل امن باللہ وملئکتہ و کتبہ ورسلہ لا نفرق بین احد من رسلہ**، یعنی سب ایمان لائے اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر اس طرح کہ اس کے رسولوں کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتے، اس آیت میں واضح طور پر ایمان کی جو تفصیلات بیان فرمائی ہیں ان میں یہ بھی واضح کر دیا کہ کسی ایک یا چند رسولوں پر ایمان لے آنا قطعاً نجات کے لئے کافی نہیں بلکہ تمام رسولوں پر ایمان شرط ہے اگر کسی ایک رسول پر بھی ایمان نہ لایا تو اس کا ایمان اللہ کے نزدیک معتبر اور مقبول نہیں۔

دوسری جگہ ارشاد ہے: **ان الذین یکفرون باللہ ویریدون ان یفرقوا بین اللہ ورسلہ ویقولون نؤمن ببعض ونکفر ببعض ویریدون ان یتخذوا بین ذلک سبیلا اولئک ھم الکفرون حقا**، یعنی جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کا انکار کرتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان تفریق کر دیں (کہ اللہ پر تو ایمان لائیں مگر اس کے رسولوں پر ایمان نہ ہو) اور وہ کہتے ہیں کہ ہم مانتے ہیں بعضوں کو اور نہیں مانتے بعضوں کو اور وہ چاہیں کہ کفر واسلام کے بیچ بیچ کا ایک راستہ نکال لیں تو سمجھ لو کہ وہ ہی اصل میں کافر ہیں، رسول کریم ﷺ کا ارشاد ہے: " لو کان موسیٰ حیاً لما وسعہ الا اتباعی "، یعنی اگر بالفرض آج حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی زندہ ہوتے تو ان کو میرے اتباع کے سوا کوئی چارہ نہ ہوتا، تو اب کسی کا یہ کہنا کہ ہر مذہب والے اپنے اپنے مذہب پر عمل کریں تو بغیر آنحضرت ﷺ پر ایمان لائے اور بغیر مسلمان ہوئے وہ جنت اور فلاح آخرت پا سکتے ہیں قرآن کریم کی مذکورہ آیات کی کھلی مخالفت ہے۔

اس کے علاوہ اگر ہر مذہب وملت ایسی چیز ہے کہ اس پر ہر زمانہ میں عمل کر لینا نجات اور فلاح کے لئے کافی ہے تو پھر خاتم الانبیاء ﷺ کی بعثت اور نزول قرآن ہی بے معنی ہو جاتا ہے اور ایک شریعت کے بعد دوسری شریعت بھیجنا فضول ہو جاتا ہے، سب سے پہلا رسول ایک شریعت ایک کتاب لے آتا، وہ کافی تھی، دوسرے رسولوں، کتابوں شریعتوں کے بھیجنے کی کیا ضرورت تھی، زیادہ سے زیادہ ایسے لوگوں کا وجود کافی ہوتا جو اس شریعت و کتاب کو باقی رکھنے اور اس پر عمل کرنے اور کرانے کا اہتمام کرتے جو عام طور پر ہر امت کے علماء کا فریضہ رہا ہے اور اس صورت میں قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ: **لکل جعلنا منکم شرعۃ ومنھاجا**، یعنی ہم نے تم میں سے ہر امت کے لئے ایک خاص شریعت اور خاص راستہ بنایا ہے، یہ سب بے معنی ہو جاتا ہے، اور پھر اس کا کیا جواز رہ جاتا ہے کہ رسول کریم ﷺ نے اپنے اوپر اور اپنی کتاب قرآن پر ایمان نہ رکھنے والے تمام یہود ونصاریٰ سے اور دوسری قوموں سے نہ صرف تبلیغی جہاد کیا، بلکہ قتل وقتال اور سیف وسنان کی جنگیں بھی لڑی اور اگر انسان کے مومن اور مقبول عنداللہ ہونے کے لئے صرف اللہ پر اور روز آخرت پر ایمان لے آنا کافی ہوتو بیچارہ ابلیس کس جرم میں مردود ہوتا؟ کیا اس کو اللہ پر ایمان نہ تھا، یا وہ روز آخرت اور قیامت کا منکر تھا، اس نے تو عین حالت غضب میں بھی الی یوم یبعثون کہہ کر ایمان بالآخرت کا اقرار کیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ یہ مغالطہ صرف اس نظریہ کی پیداوار ہے کہ مذہب کو برادری کے نوتہ کی طرح کسی کو تحفہ میں دیا جا سکتا ہے اور اس کے ذریعہ دوسری قوموں سے رشتے جوڑے جا سکتے ہیں، حالانکہ قرآن کریم نے کھول کھول کر واضح کر دیا ہے کہ غیر مسلموں کے ساتھ رواداری ہمدردی، احسان وسلوک اور مروت سب کچھ کرنا چاہئے، لیکن مذہب کی حدود کی پوری حفاظت اور اس کی سرحدوں کی پوری نگرانی کے ساتھ۔

قرآن کریم کی مذکورہ آیت میں اگر بالفرض ایمان بالرسول ﷺ کا ذکر بالکل نہ ہوتا تو دوسری آیات قرآن جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے جن میں اس کی اشد تاکید موجود ہے وہ کافی تھیں، لیکن اگر غور کیا جائے تو خود اس آیت میں بھی ایمان بالرسول کی طرف واضح اشارہ ہے، کیونکہ اصطلاح قرآن میں ایمان باللہ وہی معتبر ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی بتلائی ہوئی ساری چیزوں پر ایمان ہو، قرآن میں کریم نے اپنی اس اصطلاح کو ان الفاظ میں واضح فرما دیا:

فان امنوا بمثل ما امنتم بہ فقد اھتدوا، یعنی جس طرح کا ایمان صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا تھا صرف وہی ایمان باللہ کہلانے کا مستحق ہے اور ظاہر ہے کہ ان کے ایمان کا بہت بڑا رکن ایمان بالرسول صلی اللہ علیہ وسلم تھا، اس لئے مَن آمَنَ باللہ کے لفظوں میں خود ایمان بالرسول داخل ہے۔

ایسی ہی ایک آیت سورہ بقرہ آیت ۶۲ میں گذر چکی ہے مزید کچھ تفصیل وہاں ملاحظہ فرمایئے۔

* * *

فائدہ: یعنی جو قوم مسلمان کہلاتی ہے یا یہود یا نصاریٰ یا صابی (یا اور کچھ تمثیلاً چند مشہور مذاہب کا ذکر کیا گیا ہے) کوئی شخص ان ناموں کی بدولت یا نسل، رنگ، پیشہ، وطن وغیرہ احوال وخصائص کے لحاظ سے حقیقی فلاح اور دائمی کامیابی حاصل نہیں کرسکتا، کامیاب اور مامون ومصؤن ہونے کا ایک اور صرف ایک معیار ہے یعنی ایمان وعمل صالح جس قوم کو اپنے مقرب الٰہی یا کامیاب ہونے کا دعویٰ ہو وہ اسی کسوٹی پر اپنے کو کس کر دیکھ لے، اگر اس میں کھری اترے تو بے خوف وخطر مفلح اور کامیاب ہے ورنہ ہر وقت اپنے کو خدا کے غضب وقہر کے نیچے سمجھے۔

پچھلی آیات میں خاص اہل کتاب کو تبلیغ تھی اس آیت میں تمام اقوام وملل کے سامنے بلا رورعایت ایسا عجیب وغریب معقول اور منصافانہ قانون پیش کیا گیا ہے جس کے بعد کسی سلیم الفطرت انسان کو اسلام کی صداقت اور ہمہ گیری میں شبہ نہیں رہ سکتا، ایک شخص جب تک خدا (یعنی اس کے وجود، وحدانیت، صفات کمالیہ، نشانہائے قدرت، تمام احکام وقوانین، کل نائبین وسفراء) پر اور روز جزاء پر ایمان نہ لائے اور نیکی اختیار نہ کرے، کیا عقل سلیم قبول کر سکتی ہے کہ وہ نعیم دائم، رضائے حق اور سرور ابدی سے ہمکنار ہوسکے گا، "ایمان باللہ" کے تحت میں یہ سب چیزیں داخل ہیں، فرض کرو ایک شخص روشن دلائل نبوت کی موجودگی میں کسی پیغمبر کی توہین کرتا ہے (اور اس کو دعویٰ نبوت میں جھوٹا کہنا بھی اس کی توہین ہے) تو کیا کسی حکومت کے سفیر کی توہین اور اس کے صاف وصریح اسناد سفارت کی تکذیب اس حکومت کی توہین وتکذیب نہیں؟ اسی طرح سمجھ لو کہ جو شخص کسی ایک سچے پیغمبر کی تکذیب کرتا ہے اور اس کو قبول نہیں کرتا وہ فی الحقیقت خدا کے ان صاف وصریح نشانات ودلائل کو جھٹلا رہا ہے جو اس نے تصدیق نبوت کے لئے اتارے تھے فَاِنَّھُمْ لَا یُکَذِّبُوْنَکَ وَلٰکِنَّ الظّٰلِمِیْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ یَجْحَدُوْنَ (الانعام: ۳۳) کیا اللہ کی آیات اور صریح واعلانیہ نشانات کو جھٹلانے کے بعد بھی "ایمان باللہ" کا دعویٰ رہ سکے گا، قرآن کریم نے جن تفصیلات کی طرف "ایمان باللہ وعمل صالح" کے اجمالی عنوان سے یہاں اشارہ فرمایا ہے، دوسرے مواضع میں وہ شرح وبسط سے مذکور ہیں۔

میرے نزدیک زیادہ صحیح اور قوی قول یہ ہے کہ صابئین عراق میں ایک فرقہ تھا جن کے مذہبی اصول عموماً حکمائے اشراقیین اور فلاسفہ طبیعیین کے اصول سے ماخوذ تھے، یہ لوگ روحانیات کے متعلق نہایت غلو رکھتے بلکہ ان کی پرستش کرتے تھے، ان کا خیال یہ تھا کہ ارواح مجردہ اور مدبرات فلکیہ وغیرہ کی استعانت واستمداد سے ہی ہم رب الارباب (یعنی بڑے معبود) تک پہنچ سکتے ہیں، اتباع انبیاء کی ضرورت نہیں، کواکب کی ارواح مدبرہ اور اسی طرح دوسری روحانیات کو اپنے سے خوش رکھنے کے لئے ہیاکل بناتے تھے اور انہی ارواح کے لئے نماز، روزہ اور قربانی وغیرہ کرتے تھے، خلاصہ یہ کہ حنفاء کے مقابلہ میں صابئین کی جماعت تھی، جن کا سب سے بڑا حملہ نبوت اور اس کے لوازم وخواص پر ہوتا تھا، حضرت ابراہیم حنیف علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بعثت کے وقت نمرود کی قوم صابی العقیدہ تھی جس کے رد وابطال میں خدا کے خلیل نے جانبازی دکھلائی۔

لَقَدْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ وَاَرْسَلْنَآ اِلَیْھِمْ رُسُلًا ؕ کُلَّمَا جَآءَھُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا

ہم نے لیا تھا پختہ قول بنی اسرائیل سے ۱؎ اور بھیجے ان کی طرف رسول، جب لایا ان کے پاس کوئی رسول وہ حکم جو

لَا تَھْوٰٓی اَنْفُسُھُمْ ۙ فَرِیْقًا کَذَّبُوْا وَفَرِیْقًا یَّقْتُلُوْنَ ۝۷۰

خوش نہ آیا ان کے جی کو تو بہتوں کو جھٹلایا اور بہتوں کو قتل کر ڈالتے تھے ۲؎

خلاصہ تفسیر: پیچھے سے اہل کتاب کے قبائح کا ذکر چلا آ رہا تھا، اب پھر اسی کی طرف رجوع فرماتے ہیں، پہلے یہود کا ذکر ہے کہ اس قسم کی تو ہمیشہ سے ایسی ہی عادت چلی آتی ہے جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بھی تسلی کا مضمون ہے، پھر اس کے بعد نصاریٰ کا ذکر ہے:

ہم نے بنی اسرائیل سے (اول تورات میں تمام پیغمبروں کی تصدیق و اطاعت کا) عہد لیا اور (اس عہد کے یاد دلانے کو) ہم نے ان کے پاس بہت پیغمبر بھیجے (لیکن ان کی یہ حالت تھی کہ) جب کبھی ان کے پاس کوئی پیغمبر ایسا حکم لایا جس کو ان کا جی نہ چاہتا تھا (تب ہی ان کے ساتھ مخالفت سے پیش آئے) سو بعضوں کو (تو) جھوٹا بتلایا اور بعضوں کو (بے دھڑک) قتل ہی کر ڈالتے تھے۔

ان رسولوں میں جن کی شریعت یا بعض احکام جدید تھے ان کا خواہش کے خلاف ہونا تو اعتقاد کے اعتبار سے بھی ممکن ہے، کیونکہ نئی بات سے اکثر وحشت ہوتی ہے اور جو رسول صرف تورات کے احکام کی بعینہ تعلیم کرتے تھے ان کا خلاف خواہش ہونا عمل کی ناگواری کی وجہ سے تھا جیسا کہ آج کل مسلمانوں میں بیوہ کے نکاح کا حال ہے کہ اعتقاداً سب جائز سمجھتے ہیں مگر عمل ناگوار ہو رہا ہے۔

كُلَّمَا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُهُمْ: اس پر دلالت کرتا ہے کہ تمام گناہوں کی بنیاد اتباع ہویٰ یعنی نفسانی خواہشات کی پیروی ہے، اسی لیے صوفیہ کرام اس کو ضعیف و کمزور کرنے کے لیے سخت کوشش کرتے ہیں، اور مجاہدات کی غرض و غایت بھی یہی ہوا کرتی ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ گذشتہ آیت میں جو معیار قبول عند اللہ کا بیان ہوا تھا یعنی ایمان اور عمل صالح یہاں یہ دکھلانا ہے کہ یہود اس معیار پر کہاں تک پورے اترتے ہیں۔

فائدہ: ۲ غلام کی وفاداری کا امتحان اس میں ہے کہ جس بات کو دل نہ چاہے آقا کے حکم سے کر گزرے اور اپنی رائے یا خواہش کو آقا کی مرضی کے تابع بنا دے، ورنہ صرف ان چیزوں کا مان لینا جو مرضی اور خواہش کے موافق ہوں یہ کونسا کمال ہے۔

وَحَسِبُوْٓا اَلَّا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ فَعَمُوْا وَصَمُّوْا ثُمَّ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ثُمَّ عَمُوْا وَصَمُّوْا

اور خیال کیا کہ کچھ خرابی نہ ہوگی سو اندھے ہو گئے اور بہرے پھر توبہ قبول کی اللہ نے ان کی پھر اندھے اور بہرے ہوئے

كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ ۭ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۷۱﴾

ان میں سے بہت ۱ اور اللہ دیکھتا ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں ۲

خلاصہ تفسیر: اور (ہمیشہ ہر شرارت پر جب سزا سے چند روز مہلت دی گئی) یہی گمان کیا کہ کچھ سزا نہ ہوگی، اس (گمان) سے اور بھی اندھے اور بہرے (کی طرح) بن گئے (کہ نہ انبیاء کی سچائی کے دلائل کو دیکھا نہ ان کے کلام کو سنا) پھر (ایک مدت کے بعد) اللہ تعالیٰ نے ان پر (رحمت کے ساتھ) توجہ فرمائی (کہ اور کسی پیغمبر کو بھیجا کہ اب بھی راہ پر آئیں مگر) پھر بھی (اسی طرح) اندھے اور بہرے بنے رہے یعنی (سب تو نہیں مگر) ان میں سے بہتیرے، اور اللہ تعالیٰ ان کے (ان) اعمال کو خوب دیکھنے والے ہیں (یعنی ان کا یہ گمان غلط تھا، چنانچہ وقتاً فوقتاً ان کو سزا بھی ہوتی رہی، کبھی طاعون، کبھی ذلت، کبھی قتل، کبھی مسخ وغیرہ مگر ان کا یہی شیوہ رہا، حتی کہ اب آپ ﷺ کے ساتھ بھی اسی طرح تکذیب و خلاف کا برتاؤ کیا)۔

وَحَسِبُوْٓا اَلَّا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ: اس میں دلالت ہے کہ معاصی اور گناہوں پر اصرار سے نیکی کی استعداد بالکل کمزور ہو جاتی ہے، اور اسی کو استعداد کا باطل ہونا کہہ دیتے ہیں کہ اب اس میں نیکی کی استعداد ہی نہیں رہی (یعنی گناہوں کو مسلسل کرتے رہنے سے حق قبول کرنے کی صلاحیت جو اللہ نے ہر انسان کے دل میں ودیعت رکھی ہے سست و کمزور ہو جاتی ہے، پھر نیکی اور سچائی کی طرف دل مائل نہیں ہوتا، صوفیہ کی اصطلاح میں اسی کو ''بطلان استعداد'' کہا جاتا ہے)۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی پختہ عہد و پیمان توڑ کر خدا سے غداری کی اس کے سفراء میں سے کسی کو قتل کیا یہ تو ان کے ''ایمان باللہ اور عمل صالح'' کا حال تھا، ''ایمان بالیوم الآخر'' کا اندازہ اس سے کر لو کہ اس قدر شدید مظالم اور باغیانہ جرائم کا ارتکاب کر کے بالکل بے فکر ہو بیٹھے، گویا ان حرکات کا

کوئی خمیازہ بھگتنا نہیں پڑے گا، اور ظلم و بغاوت کے خراب نتائج کبھی سامنے نہ آئیں گے، یہ خیال کر کے خدائی نشانات اور خدائی کلام کی طرف سے بالکل ہی اندھے اور بہرے ہوگئے اور جو نا کردنی کام تھے وہ کئے حتیٰ کہ بعض انبیاء کو قتل اور بعض کو قید کیا آخر خدا تعالیٰ نے ان پر بخت نصر کو مسلط فرمایا پھر ایک مدت دراز کے بعد بعض ملوک فارس نے بخت نصر کی قید ذلت و رسوائی سے چھڑا کر بابل سے بیت المقدس کو واپس کیا، اس وقت لوگوں نے توبہ کی اور اصلاح حال کی طرف متوجہ ہوئے، خدا نے توبہ قبول کی لیکن کچھ زمانے کے بعد پھر وہ ہی شرارتیں سوجھیں اور بالکل اندھے بہرے ہو کر حضرت زکریا اور حضرت یحییٰ علیہما السلام کے قتل کی جرات کی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل پر تیار ہو گئے۔

فائدہ: ۲ یعنی وہ اگرچہ خدا کے غضب و قہر کی طرف سے اندھے ہو گئے ہیں لیکن خدا ان کی تمام حرکات کو برابر دیکھتا رہا ہے، چنانچہ ان حرکات کی سزا اب امت محمدیہ کے ہاتھوں سے دلوا رہا ہے۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ؕ وَقَالَ الْمَسِيْحُ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ

بیشک کافر ہوئے جنہوں نے کہا اللہ وہی مسیح ہے مریم کا بیٹا، اور مسیح نے کہا ہے کہ اے بنی اسرائیل

اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ ؕ اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَاْوٰىهُ النَّارُ ؕ

بندگی کرو اللہ کی جو رب ہے میرا اور تمہارا، بیشک جس نے شریک ٹھہرایا اللہ کا سو حرام کی اللہ نے اس پر جنت اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے

وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿۷۲﴾

اور کوئی نہیں گناہ گاروں کی مدد کرنے والا

خلاصہ تفسیر: (پیچھے یہود کا ذکر تھا اب نصاریٰ کا بیان ہے) بیشک وہ لوگ کافر ہو چکے جنہوں نے یہ کہا کہ اللہ عین مسیح بن مریم ہے (یعنی دونوں میں اتحاد ہے) حالانکہ (حضرت) مسیح نے خود فرمایا تھا کہ اے بنی اسرائیل! تم اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے (اور اس قول میں عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے بندہ ہونے کی تصریح کر دی، پھر بھی ان کو معبود کہنا وہی بات ہے کہ مدعی سست گواہ چست) بیشک جو شخص اللہ تعالیٰ کے ساتھ (خدائی میں یا خدائی خصوصیات میں) شریک قرار دے گا سو اس پر اللہ تعالیٰ جنت کو حرام کر دے گا، اور اس کا ٹھکانا (ہمیشہ کے لئے) دوزخ ہے، اور ایسے ظالموں کا کوئی مددگار نہ ہوگا (کہ دوزخ سے بچا کر جنت میں پہنچا سکے)۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ: اس میں حلول و اتحاد کا کھلا رد ہے جیسا کہ بعض جاہل صوفیہ اس کے قائل رہے ہیں۔

جملہ: اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ اور جملہ: وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ممکن ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام ہی کے کلام کا تتمہ ہو اور موجودہ انجیلوں میں منقول نہ ہو، یا بقول تفسیر حقانی محفوظ نہ رہا ہو، یا اللہ تعالیٰ کا کلام ہو جو بقول مفسر حقانی انجیل کے بھی دوسرے مواضع سے ثابت ہے۔

* * *

فائدہ: یہاں سے نصاریٰ کے ایمان باللہ کی کیفیت دکھلائی گئی ہے کہ وہ کہاں تک حقانیت کے اس معیار پر پورے اترے، ان کے ایمان باللہ کا حال یہ ہے کہ عقل کے خلاف، فطرت سلیمہ کے خلاف اور خود حضرت مسیح کی تصریحات کے خلاف مسیح ابن مریم کو خدا بنا دیا، ''ایک تین اور تین ایک'' کی بھول بھلیاں تو محض برائے نام ہیں حقیقۃً سارا زور و قوت صرف حضرت مسیح کی الوہیت ثابت کرنے پر صرف کیا جاتا ہے، حالانکہ خود حضرت مسیح علیہ السلام خدا کے رب ہونے اور دوسرے آدمیوں کی طرح اپنے مربوب ہونے کا اعلانیہ اعتراف فرما رہے ہیں اور جس شرک میں ان کی امت مبتلا ہونے والی تھی اس کی برائی کس زور و شور سے بیان کر رہے ہیں، پھر بھی ان اندھوں کی عبرت نہیں ہوتی۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ ۘ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّآ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۭ وَاِنْ لَّمْ يَنْتَهُوْا

بے شک کافر ہوئے جنہوں نے کہا اللہ ہے تین میں کا ایک لے حالانکہ کوئی معبود نہیں بجز ایک معبود کے، اور اگر نہ باز آویں گے

عَمَّا يَقُوْلُوْنَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿73﴾

اس بات سے کہ کہتے ہیں تو بیشک پہنچے گا ان میں سے کفر پر قائم رہنے والوں کو عذاب دردناک

خلاصہ تفسیر: (جیسے اتحاد کا عقیدہ کفر ہے اسی طرح تثلیث کا عقیدہ بھی کفر ہے، پس) بلاشبہ وہ لوگ بھی کافر ہیں، جو کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ تین (معبودوں) میں کا ایک ہے، حالانکہ بجز ایک معبود (حق) کے اور کوئی معبود (حق) نہیں (نہ دو اور نہ تین، جب یہ عقیدہ بھی کفر و شرک ہے تو پیچھے اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ میں جو سزا مذکور ہے وہ اس پر بھی مرتب ہوگی) اور اگر یہ (دونوں عقیدہ کے) لوگ اپنے اقوال (کفریہ) سے باز نہ آئے تو (سمجھ رکھیں کہ) جو لوگ ان میں کافر رہیں گے ان پر (آخرت میں) دردناک عذاب واقع ہوگا۔

اس سورت کے تیسرے رکوع آیت ۱۴ میں نصاریٰ کے ان فرقوں کی تعیین کر دی گئی ہے۔

* * *

فائدہ: لے یعنی حضرت مسیح، روح القدس اور اللہ یا مسیح، مریم اور اللہ تینوں خدا ہیں (العیاذ باللہ) ان میں ہر ایک کا حصہ دار اللہ ہوا پھر وہ تینوں ایک اور وہ ایک تین ہیں، عیسائیوں کا عام عقیدہ یہی ہے اور اس خلاف عقل اور بداہت عقیدہ کو عجب گول مول اور پیچدار عبارتوں سے ادا کرتے ہیں اور جب کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تو اس کو ایک ماوراء العقل حقیقت قرار دیتے ہیں سچ ہے: لن يصلح العطار ما أفسده الدهر۔

اَفَلَا يَتُوْبُوْنَ اِلَى اللّٰهِ وَيَسْتَغْفِرُوْنَهٗ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿74﴾

کیوں نہیں توبہ کرتے اللہ کے آگے اور گناہ بخشواتے اس سے، اور اللہ ہے بخشنے والا مہربان

خلاصہ تفسیر: کیا (ان توحید و وعید کے مضامین کو سنکر) پھر بھی (اپنے ان باطل عقائد و اقوال سے) خدا تعالیٰ کے سامنے توبہ نہیں کرتے اور اس سے معافی نہیں چاہتے، حالانکہ اللہ تعالیٰ (جب کوئی توبہ کرتا ہے تو) بڑی مغفرت کرنے والے (اور) بڑی رحمت فرمانے والے ہیں۔

* * *

فائدہ: یہ اسی غفور رحیم کی شان ہے کہ ایسے ایسے باغی اور گستاخ مجرم بھی جب شرمندہ ہو کر اور اصلاح کا عزم کر کے حاضر ہوں تو ایک منٹ میں عمر بھر کے جرائم معاف فرما دیتا ہے۔

مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۭ وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ ۭ

نہیں ہے مسیح مریم کا بیٹا مگر رسول، گزر چکے اس سے پہلے بہت رسول لے اور اس کی ماں ولی ہے ۲ے

كَانَا يَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ ۭ اُنْظُرْ كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ انْظُرْ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴿75﴾

دونوں کھاتے تھے کھانا، دیکھ ہم کیسے بتلاتے ہیں ان کو دلیلیں پھر دیکھ وہ کہاں الٹے جا رہے ہیں ۳ے

خلاصہ تفسیر: پیچھے عیسیٰ علیہ السلام کے معبود ہونے کو ایک عام مضمون سے باطل فرمایا تھا، اب ایک خاص دلیل سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی الوہیت و خدائی کو باطل فرماتے ہیں:

(حضرت) مسیح ابن مریم (عین خدا یا جزو خدا) کچھ بھی نہیں، صرف ایک پیغمبر ہیں جس سے پہلے اور بھی پیغمبر (اہل معجزات) گزر چکے ہیں (جن کو عیسائی خدا نہیں مانتے، پس اگر پیغمبری یا معجزات خدائی کی دلیل ہیں تو سب پیغمبروں کو خدا ماننا چاہیے، اور اگر یہ خدائی کی دلیل نہیں ہے تو حضرت مسیح کو کیوں خدا کہا جائے، غرض جب اوروں کو خدا نہیں کہتے تو عیسیٰ علیہ السلام کو بھی مت کہو) اور (اسی طرح) ان کی والدہ (بھی خدا یا خدا کا جز نہیں، بلکہ وہ) ایک ولی بی بی ہیں (جیسی اور خواتین بھی ولی ہو چکی ہیں، اور ان دونوں کے خدا نہ ہونے کے دلائل میں سے ایک آسان دلیل یہ ہے کہ) دونوں (حضرات) کھانا کھایا کرتے تھے (اور جو شخص کھانا کھاتا ہے وہ اس کا محتاج ہوتا ہے، اور محتاج خدا نہیں ہو سکتا، اور کھانا کھانا مادی چیزوں کی خاصیت ہے) دیکھئے تو (سہی) ہم کیونکر صاف صاف دلائل ان سے بیان کر رہے ہیں، پھر دیکھئے وہ الٹے کدھر جا رہے ہیں۔

كَانَا يَأْكُلٰنِ الطَّعَامَ: کھانا کھانا مادی چیزوں کی خاصیت ہے تو مسیح علیہ السلام مادی ہوئے اور مادی چیز ممکن ہوتی ہے کہ اس کے لیے وجود لازمی نہیں ہوتا، معدوم بھی ہو سکتی ہے اور یہ خدائی کے منافی ہے، کیونکہ خدا کا واجب الوجود ہونا ضروری ہے کہ اس کا وجود کبھی فنا نہ ہو سکے، پس عیسیٰ علیہ السلام کی خدائی باطل ہے، اور اسی دلیل سے روح القدس کی مزعومہ خدائی بھی باطل ہوگئی، کیونکہ ان کا چلنا پھرنا آنا جانا مسلم ہے اور یہ بھی مادی چیزوں کے خواص میں سے ہے تو وہ بھی مادی ہوئے اور مادی چیز کے لیے وجود لازم نہیں ہوتا جو خدائی کے منافی ہے، اور چونکہ ان لوگوں سے ان ہی میں کلام تھا اس لیے غیر مادی چیزوں کے خدا نہ ہونے کے متعلق استدلال بیان کرنا یہاں ضروری نہ تھا، دوسری آیتوں میں عام طور پر مادی اور غیر مادی سب کی خدائی کے باطل ہونے پر استدلال مذکور ہے۔

* * *

فائدہ: ۱۔ یعنی اسی مقدس و معصوم جماعت کے یہ بھی ایک فرد ہیں، انہیں خدا بنا لینا تمہاری سفاہت ہے۔

فائدہ: ۲۔ جمہور امت کی تحقیق یہ ہی ہے کہ خواتین میں نبوت نہیں آئی یہ منصب رجال ہی کے لئے مخصوص رہا ہے وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى (یوسف:۱۰۹) حضرت مریم بتول بھی ایک ولی بی بی تھیں، نبی نہیں۔

فائدہ: ۳۔ غور کرنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ جو شخص کھانے پینے کا محتاج ہے وہ تقریباً دنیا کی ہر چیز کا محتاج ہے، زمین، ہوا، پانی، سورج، حیوانات حتیٰ کہ میلے اور کھاد سے بھی اسے استغنا نہیں ہو سکتا، غلہ کے پیٹ میں پہنچنے اور ہضم ہونے تک خیال کرو بالواسطہ یا بلاواسطہ کتنی چیزوں کی ضرورت ہے، پھر کھانے سے جو اثرات و نتائج پیدا ہونگے ان کا سلسلہ کہاں تک جاتا ہے، احتیاج و افتقار کے اس طویل الذیل سلسلہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہم الوہیت مسیح و مریم کے ابطال کو بشکل استدلال یوں بیان کر سکتے ہیں کہ مسیح و مریم اکل و شرب کی ضروریات سے مستغنی نہ تھے جو مشاہدہ اور تواتر سے ثابت ہے اور جو اکل و شرب سے مستغنی نہ ہو وہ دنیا کی کسی چیز سے مستغنی نہیں ہو سکتا، پھر تم ہی کہو کہ جو ذات تمام انسانوں کی طرح اپنی بقاء میں عالم اسباب سے مستغنی نہ ہو وہ خدا کیونکر بن سکتی ہے، یہ ایسی قوی اور واضح دلیل ہے جسے عالم و جاہل یکساں طور پر سمجھ سکتے ہیں یعنی کھانا پینا الوہیت کے منافی ہے اگر چہ نہ کھانا الوہیت کی دلیل نہیں ورنہ سارے فرشتے خدا بن جائیں معاذ اللہ۔

قُلْ اَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا ۭ وَاللّٰهُ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۷۶﴾

تو کہہ دے کیا تم ایسی چیز کی بندگی کرتے ہو اللہ کو چھوڑ کر جو مالک نہیں تمہارے برے کی اور نہ بھلے کی، اور اللہ وہی ہے سننے والا جاننے والا

خلاصہ تفسیر: پیچھے حضرت مسیح کی الوہیت کو باطل قرار دیا تھا، اب الوہیت کے قائلین کی سرزنش کی جاتی ہے۔

آپ (ﷺ ان سے) فرمائیے کیا خدا کے سوا ایسی (مخلوق) کی عبادت کرتے ہو جو نہ تم کو کوئی ضرر پہنچانے کا اختیار رکھتا ہو اور نہ نفع پہنچانے کا (اختیار رکھتا ہو اور عاجز ہونا خود خدائی کے منافی ہے) حالانکہ اللہ تعالیٰ سب سنتے ہیں جانتے ہیں (پھر بھی خدا سے نہیں ڈرتے اور اپنے کفر و شرک سے باز نہیں آتے)۔

یہ نصاریٰ یا تو عیسیٰ علیہ السلام کی بھی پرستش کرتے ہوں گے، یا یہ کہ عبادت میں سب سے بڑا درجہ خدائی کے اعتقاد کا ہے جب وہ عیسیٰ علیہ السلام کی خدائی کے معتقد ہوئے تو یقیناً ان کی عبادت کی۔

قُلْ اَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ: اس میں ان لوگوں کی بھی تردید ہے جو پیروں اور مشائخ کو مستقل متصرف اور انہیں اختیارات کا حامل سمجھتے ہیں، جیسے بعض لوگ کہتے ہیں کہ فلاں بزرگ اولاد دیتا ہے، فلاں روزی دیتا ہے تو یہ غلط بات ہے، بلکہ اگر بزرگوں کی دعاؤں سے کچھ ہوتا ہوا بھی نظر آئے تو یہ اللہ تعالیٰ عنایت فرماتے ہیں، بزرگ صرف واسطہ بنتے ہیں۔

* * *

فائدہ: یعنی جب مسیح کو خدا کہا تو لازم ہے کہ معبود بھی کہو، مگر معبود بننا صرف اسی ذات کے ساتھ مختص ہے جو ہر قسم کی نفع وضرر کا مالک اور پورا با اختیار ہو، کیونکہ عبادت انتہائی تذلل کا نام ہے اور انتہائی تذلل اسی کے سامنے اختیار کر سکتے ہیں جو انتہائی عزت اور غلبہ رکھنے والا ہر آن سب کی سننے والا اور سب کے احوال کا پوری طرح جاننے والا ہو، اس میں تثلیث کے عقیدہ شرکیہ کے ساتھ تمام مشرکین کا رد ہو گیا۔

قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوْۤا اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ

تو کہہ اے اہل کتاب مت مبالغہ کرو اپنے دین کی بات میں ناحق کا[1] اور مت چلو خیالات پر ان لوگوں کے جو گمراہ ہو چکے پہلے

وَاَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ ﴿۷۷﴾

اور گمراہ کر گئے بہتوں کو اور بہک گئے سیدھی راہ سے[2]

خلاصہ تفسیر: پیچھے نصاریٰ کے باطل عقائد کا ابطال تھا، چونکہ ایسے عقائد میں اکثر لوگوں کی عادت ہے کہ اپنے اسلاف کے طریقے سے استدلال کیا کرتے ہیں اس لیے اب ان لوگوں کو اس سے منع فرماتے ہیں۔

آپ (صلی اللہ علیہ وسلم ان نصاریٰ سے) فرمایئے کہ اے اہل کتاب! تم اپنے دین (کے معاملہ) میں ناحق کا غلو (یعنی اضافہ وزیادتی) مت کرو اور اس (افراط کے باب) میں ان لوگوں کے خیالات (یعنی بے سند باتوں) پر مت چلو جو (اس وقت سے) پہلے خود بھی غلطی میں پڑ چکے ہیں اور (اپنے ساتھ) اور بہتوں کو (لے کر ڈوبے ہیں اور) غلطی میں ڈال چکے ہیں اور (ان کی وہ غلطی اس وجہ سے نہیں ہوئی کہ حق گم ہو گیا ہو اور اس کا پتہ نہ لگتا ہو، بلکہ) وہ لوگ راہ راست (کے ہوتے ہوئے قصداً اس) سے دور (اور علیحدہ) ہو گئے تھے (یعنی جب ان کی غلطی دلائل سے ثابت ہو گئی پھر ان کا اتباع کیوں نہیں چھوڑتے)۔

لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ: ''غلو'' کے معنی حد سے نکل جانے کے ہیں، دین میں غلو کا مطلب یہ ہے کہ اعتقاد وعمل میں دین نے جو حدود مقرر کی ہیں ان سے آگے بڑھ جائیں، مثلاً انبیاء کی تعظیم کی حد یہ ہے کہ ان کو خلق خدا میں سب سے افضل جانے، اس حد سے آگے بڑھ کر انہی کو خدا یا خدا کا بیٹا کہہ دینا اعتقادی غلو ہے، اس سے واضح ہو گیا کہ دین اصل میں چند حدود وقیود ہی کا نام ہے، اس حدود کے اندر کوتاہی کرنا اور کمی کرنا جس طرح حرام ہے اسی طرح ان سے آگے بڑھنا اور زیادتی کرنا بھی جرم ہے، جس طرح رسولوں اور ان کے نائبوں کی بات نہ ماننا ان کی توہین کرنا گناہ عظیم ہے، اسی طرح ان کو اللہ تعالیٰ کی صفات مخصوصہ کا مالک یا مساوی سمجھنا اس سے زیادہ گناہ عظیم ہے۔

وَلَا تَتَّبِعُوْۤا اَهْوَآءَ قَوْمٍ: اس میں ان رسوم کا ابطال ہے جو شریعت کے خلاف ہیں اگرچہ مشائخ کی طرف منسوب ہوں، یعنی وہ رسوم جو شریعت کے خلاف ہوں وہ جائز نہیں ہیں اگرچہ وہ کسی بزرگ کی طرف منسوب ہوں، کیونکہ وہ بزرگ ہی نہیں جو دین کے خلاف رسوم پیدا کرے، اور اگر وہ مشائخ محققین ہیں تو ان کی طرف نسبت کی تکذیب کی جائے گی یا کسی صحیح عذر پر محمول کریں گے، یعنی اگر واقعی وہ صحیح بزرگ ہیں تو وہ رسم جو ان کی

طرف منسوب کی جارہی ہے اس کی تکذیب کی جائے گی کہ انہوں نے ایسا نہیں کیا، بلکہ ان کی طرف بہتان ہے، یا اس رسم کی صحیح وجہ اور عذر بیان کیا جائے گا کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا۔

* * *

فائدہ: ۱ عقیدہ کا مبالغہ یہ ہے کہ ایک مولود بشری کو خدا بنا دیا، اور عمل میں غلو وہ ہے جسے ''رہبانیت'' کہتے ہیں: وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ (الحدید:۲۷) یہود کی جو قبائح بیان کی جاچکیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ دنیا پرستی میں غرق ہونے کی وجہ سے دین اور دینداروں کی ان کے یہاں کوئی عظمت و وقعت نہ تھی حتیٰ کہ انبیاء علیہم السلام کی اہانت وقتل وغیرہ ان کا خاص شعار تھا، برخلاف اس کے نصاریٰ نے تعظیم انبیاء میں اس قدر غلو کیا کہ ان میں سے بعض کو خدا یا خدا کا بیٹا کہنے لگے اور ترک دنیا کر کے رہبانیت اختیار کر لی۔

فائدہ: ۲ یعنی اصل انجیل وغیرہ کتب سماویہ میں اس عقیدہ شرکیہ کا کہیں پتہ نہ تھا، بعد میں یونانی بت پرستوں کی تقلید میں پولوس نے ایجاد کیا اسی پر سب چل پڑے اور اسی پر جمے رہے ایسی اندھی تقلید سے نجات کی توقع رکھنا کسی عاقل کو زیبا نہیں۔

لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ؕ ذٰلِكَ بِمَا

ملعون ہوئے کافر بنی اسرائیل میں کے داؤد کی زبان پر اور عیسیٰ بیٹے مریم کی، یہ اس لیے کہ

عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۝۷۸

وہ نافرمان تھے اور حد سے گزر گئے تھے

خلاصہ تفسیر: پیچھے نصاریٰ کے ذکر سے پہلے یہود کا ذکر تھا، اب پھر یہود ہی کا ذکر ہے، اس کے بعد یہود کے سخت تعصب کے مقابلہ میں نصاریٰ کا عموماً کم تعصب والا ہونا اور ان میں سے ایک خاص نومسلم جماعت کا خصوصاً حق کا مطیع ہونا بیان فرما کر اس بحث کو اس مقام پر ختم کر کے دوسرے متعلقہ احکام بیان فرماتے ہیں، پھر نصاریٰ کے ساتھ کچھ بقیہ گفتگو آخر سورت میں لائیں گے۔

بنی اسرائیل میں جو لوگ کافر تھے ان پر (اللہ تعالیٰ کی طرف سے سخت) لعنت کی گئی تھی (زبور اور انجیل میں جس کا ظہور حضرت) داؤد اور (حضرت) عیسیٰ بن مریم (علیہما السلام) کی زبان سے (ہوا، یعنی زبور اور انجیل میں کافروں پر لعنت کی گئی تھی، جیسے قرآن مجید میں بھی ہے: فلعنة الله علیه الكفرین، چونکہ یہ کتابیں حضرت داؤد اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام پر نازل ہوئیں، اس لئے یہ مضمون ان کی زبان سے ظاہر ہوا، اور) یہ لعنت اس سبب سے ہوئی کہ انہوں نے حکم کی (اعتقادی) مخالفت کی (جو کہ کفر ہے) اور (اس مخالفت میں) حد سے (بہت دور) نکل گئے (یعنی کفر بھی شدید تھا، پھر شدید ہونے کے ساتھ مدید بھی تھا، یعنی اس کو دائم و قائم رکھا)۔

* * *

ربط: پچھلی آیات میں ان کی گذشتہ کفریات اور جرائم کو بیان کر کے غلو فی الدین اور گمراہوں کی کورانہ تقلید سے منع فرمایا تھا تا کہ اب بھی اپنی ملعون حرکات سے تائب ہو کر حق وصداقت کے راستہ پر چلنے کی کوشش کریں، اس رکوع میں ان کی موجودہ حالت پر متنبہ کرتے ہوئے بتلایا کہ جو لعنت داؤد اور مسیح علیہما السلام کی زبانی ہوئی تھی اس کے آثار آج تک موجود ہیں، اہل اللہ اور عارفین سے نفرت وعداوت اور جاہل مشرکوں سے محبت، یہ کھلی دلیل اس کی ہے کہ ان کے قلوب خدائی لعنت کے اثر سے بالکل مسوخ ہو چکے ہیں، اگر اب بھی انہوں نے اپنی حالت کو نہ سنبھالا اور حق کی طرف رجوع نہ کیا تو ایسی شدید لعنت کے مورد بنیں گے جو خدا تعالیٰ سید الانبیاء خاتم الرسل صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے ان پر بھیجے گا۔

فائدہ: یوں تو تمام کتب سماویہ میں کافروں پر لعنت کی گئی ہے لیکن بنی اسرائیل کے کافروں پر جب وہ عصیان وتمرد میں حد سے گزر گئے کہ نہ مجرم کسی طرح ارتکاب جرائم سے باز آتا تھا اور نہ غیر مجرم مجرم کو روکتا تھا بلکہ سب شیر وشکر ہو کر بے تکلف ایک دوسرے کے ہم پیالہ وہم نوالہ بنے ہوئے تھے،

منکرات وفواحش کا ارتکاب کرنے والوں پر کسی طرح کے انقباض، تکدر اور ترشروئی کا اظہار بھی نہ ہوتا تھا، تب خدا نے حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت مسیح علیہ السلام کی زبان سے ان پر لعنت کی، جیسے گناہوں پر ان کی جسارت حد سے گزر چکی تھی، یہ لعنت بھی جو ایسے جلیل القدر انبیاء کے توسط سے کی گئی، غیر معمولی طور پر تباہ کن ثابت ہوئی، غالباً اسی لعنت کے نتیجہ میں ان میں کے بہت سے افراد ظاہراً اور باطناً بندر اور خنزیر کی شکل میں مسخ کردیے گئے اور باطنی مسخ کا دائرہ تو اس قدر وسیع ہوا کہ ان کے بہت سے لوگ آج بھی ان مسلمانوں کو چھوڑ کر جو خدا کی تمام کتب سماویہ اور تمام انبیاء کی تصدیق وتعظیم کرتے ہیں، مشرکین مکہ سے جو خالص بت پرست اور نبوات وغیرہ سے جاہل محض ہیں، مسلمانوں کے خلاف دوستی گانٹھتے ہیں، اگر ان اہل کتاب کو خدا پر، نبی پر اور وحی الٰہی پر واقعی اعتقاد ہوتا تو کیا یہ ممکن تھا کہ اس قوم کی ضد میں جو ان تمام چیزوں کو مکمل طور پر مانتے ہیں بت پرستوں سے ساز باز کرتے، یہ بے حسی، بدمذاقی اور خدا پرستوں سے بھاگ کر بت پرستوں سے دوستی کرنا، اسی لعنت اور پھٹکار کا اثر ہے جس نے انہیں خدا کی رحمت عظیمہ سے کوسوں دور پھینک دیا ہے۔

كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿٧٩﴾

آپس میں منع نہ کرتے برے کام سے جو وہ کررہے تھے، کیا ہی برا کام ہے جو کرتے تھے

خلاصہ تفسیر: (چنانچہ) جو برا کام (یعنی کفر) انہوں نے (اختیار) کر رکھا تھا اس سے (آئندہ کو) باز نہ آتے تھے (بلکہ اس پر جمے رہے، پس ان کے شدید اور دائم وقائم کفر کے سبب ان پر شدید لعنت ہوئی) واقعی ان کا (یہ) فعل (مذکور یعنی کفر پھر وہ بھی شدید اور دائم وقائم) بیشک برا تھا (کہ اس پر یہ سزا مرتب ہوئی)۔

* * *

فائدہ: لَا يَتَنَاهَوْنَ کے دو معنی ہوسکتے ہیں: ① ''نہیں رکتے تھے'' کما فی روح المعانی ② ''نہیں روکتے تھے ایک دوسرے کو'' کما ہو المشہور، جب بدی کسی قوم میں پھیلے اور کوئی روکنے ٹوکنے والا بھی نہ ہو تو عذاب عام کا اندیشہ ہے۔

تَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يَتَوَلَّوْنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ اَنْ

تو دیکھتا ہے ان میں کہ بہت سے لوگ دوستی کرتے ہیں کافروں سے ۱؎ کیا ہی برا سامان بھیجا انہوں نے اپنے واسطے وہ یہ کہ

سَخِطَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَفِي الْعَذَابِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ﴿٨٠﴾

اللہ کا غضب ہوا ان پر اور وہ ہمیشہ عذاب میں رہنے والے ہیں ۲؎

خلاصہ تفسیر: پیچھے یہودیوں کے گذرے ہوئے لوگوں کا ذکر تھا، اب ان کے موجودہ لوگوں کا ذکر کیا جاتا ہے، ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تسلی دی جارہی ہے کہ آپ ان کی مخالفت کا غم نہ کیجیے، اس قوم کا مدت سے یہی شیوہ چلا آرہا ہے۔

آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ان (یہود) میں بہت سے آدمی دیکھیں گے کہ (مشرک) کافروں سے دوستی کرتے ہیں (چنانچہ یہود مدینہ اور مشرکین مکہ میں باہم خوب سازگاری تھی، جس کا منشا یہ تھا کہ مسلمانوں سے سب کو دشمنی تھی، گویا کفر میں متحد تھے) جو کام انہوں نے آگے (بھگتنے) کے لئے کیا ہے (یعنی کفر کہ وہی سبب تھا کفار سے دوستی اور مسلمانوں سے دشمنی کا) وہ بیشک برا ہے کہ (اس کے سبب) اللہ تعالیٰ ان پر (ہمیشہ کے لئے) ناخوش ہوا اور (اس ناخوشی دائمی کا ثمرہ یہ ہوگا کہ) یہ لوگ عذاب میں ہمیشہ رہیں گے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ کافروں سے مراد مشرکین ہیں اور ان آیات کا مصداق یہود مدینہ تھے، جنہوں نے مشرکین مکہ کے ساتھ سازش کرکے مسلمانوں سے لڑائی کی ٹھانی تھی۔

فائدہ: ۲ یعنی جوذخیرہ اعمال کا مرنے سے پہلے آخرت کیلئے بھیج رہے ہیں وہ ایسا ہے جوانکو غضب الٰہی اور عذاب ابدی کا مستحق بناتا ہے۔

وَلَوْ كَانُوْا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالنَّبِيِّ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوْهُمْ اَوْلِيَآءَ

اور اگر وہ یقین رکھتے اللہ پر اور نبی پر اور جو نبی پر اترا تو کافروں کو دوست نہ بناتے ۱

وَلٰكِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۸۱﴾

لیکن ان میں سے بہت سے لوگ نافرمان ہیں ۲

خلاصہ تفسیر: اور اگر یہ (یہودی) لوگ اللہ پر ایمان رکھتے اور پیغمبر (یعنی موسیٰ علیہ السلام) پر (ایمان رکھتے جس کا ان کو دعویٰ ہے) اور اس کتاب پر (ایمان رکھتے) جو ان (پیغمبر) کے پاس بھیجی گئی تھی (یعنی تورات) تو ان (مشرکین) کو دوست نہ بناتے لیکن ان میں زیادہ لوگ (دائرہ) ایمان سے خارج ہی ہیں (اس لئے کافروں کے ساتھ ان کا اتحاد اور دوستی ہوگئی، یہاں ''زیادہ'' کی قید اس لیے ہے بعض ان میں سے ایمان بھی لے آئے تھے جیسا کہ کئی بار پیچھے ذکر ہو چکا)۔

مَا اتَّخَذُوْهُمْ اَوْلِيَآءَ: یعنی یہودیوں کا واقعی ایمان ہوتا تو ان مشرکین کو اپنا دوست نہ بناتے، کیونکہ اگر ان کو اپنے نبی پر سچا ایمان ہوتا تو رسول اللہ ﷺ سے دوستی کرتے، کیونکہ آپ ﷺ کو موسیٰ علیہ السلام اور دیگر انبیاء سے نبوت وغیرہ میں مناسبت ہے اور یہود کے نزدیک بھی آپ کی نبوت ثابت ہے، نہ یہ کہ مشرکین سے محض اس مناسبت سے دوستی کا تعلق رکھیں کہ ان کو بھی اہل اسلام سے دشمنی ہے، اس سے ثابت ہوا کہ ان کو موسیٰ علیہ السلام اور توریت پر بھی ایمان نہیں، کیونکہ ظاہر ہے کہ جب ایک نبی کا بھی انکار کیا تو اللہ تعالیٰ اور سب انبیاء اور تمام آسمانی کتابوں کے ساتھ کفر ہو گیا۔

* * *

فائدہ: ۱ النبی سے بعض مفسرین نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اور بعض نے رسول کریم ﷺ کو مراد لیا ہے، مطلب یہ ہوا کہ اگر ان یہود کو واقعی یقین حضرت موسیٰ علیہ السلام کی صداقت اور تعلیمات پر ہوتا تو نبی آخر الزمان کے مقابلہ میں جن کی بشارت خود موسیٰ علیہ السلام دے چکے ہیں مشرکین سے دوستی نہ کرتے، یا یہ اگر نبی کریم ﷺ پر مخلصانہ ایمان لے آتے تو ایسی حرکت ان سے سرزد نہ ہوتی کہ دشمنان اسلام سے ساز باز کریں، اس دوسری تقدیر پر آیت منافقین یہود کے حق میں ہوگی۔

فائدہ: ۲ خدا کی اور خود اپنے تسلیم کردہ پیغمبر کی نافرمانی کرتے کرتے یہ حالت ہوگئی کہ اب موحدین پر مشرکین کو ترجیح دیتے ہیں، افسوس کہ آج ہم بہت سے نام نہاد مسلمانوں کی حالت بھی یہ ہی پاتے ہیں کہ مسلمان اور کفار کے مقابلہ کے وقت کافروں کو دوست بناتے اور انہی کی حمایت و وکالت کرتے ہیں، اَللّٰهُمَّ احْفَظْنَا مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا۔

لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ

تو پائے گا سب لوگوں سے زیادہ دشمن مسلمانوں کا یہودیوں کو اور مشرکوں کو، اور پائے گا سب سے نزدیک

مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا

محبت میں مسلمانوں کے ان لوگوں کے جو کہتے ہیں کہ ہم نصاریٰ ہیں، یہ اس واسطے کہ نصاریٰ میں عالم ہیں اور درویش ہیں

وَّاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۸۲﴾

اور اس واسطے کہ وہ تکبر نہیں کرتے

خلاصہ تفسیر: اوپر یہود کی مشرکین سے دوستی کا ذکر تھا، اب یہودیوں کا مشرکین کے ساتھ مل کر مسلمانوں سے عداوت رکھنا بیان کیا جاتا ہے جو اس دوستی کا اصلی سبب تھا اور چونکہ ہر معاملہ میں قرآن مجید عدل وانصاف کا سب سے بڑا داعی ہے، اس لیے یہود ونصاری میں بھی سب کو ایک درجہ میں شمار نہیں کیا، جس میں کوئی خوبی تھی اس کا بھی اظہار کیا گیا، مثلاً نصاری کی ایک خاص جماعت میں بہ نسبت ان یہود کے تعصب کا کم ہونا بیان کیا جاتا ہے۔

(غیر مؤمنین میں) تمام آدمیوں سے زیادہ مسلمانوں سے عداوت رکھنے والے آپ ان یہود اور ان مشرکین کو پائیں گے اور ان (غیر مومن آدمیوں) میں مسلمانوں کے ساتھ دوستی رکھنے کے قریب تر (بہ نسبت اوروں کے) ان لوگوں کو پائیں گے جو اپنے کو نصاریٰ کہتے ہیں (قریب تر کا یہ مطلب ہے کہ دوست تو وہ بھی نہیں، مگر دوسرے کفار سے غنیمت ہیں) یہ (دوستی کے قریب ہونا اور دشمنی میں کم ہونا) اس سبب سے ہے کہ ان (نصاریٰ) میں بہت سے علم دوست عالم ہیں، اور بہت سے تارک دنیا درویش ہیں (اور جب کسی قوم میں ایسے لوگ بکثرت ہوتے ہیں تو عوام میں بھی حق کے ساتھ زیادہ عناد نہیں رہتا، اگرچہ خواص وعوام حق کو قبول نہ بھی کریں) اور اس سبب سے ہے کہ یہ (نصاریٰ) لوگ متکبر نہیں ہیں (قسیسین ورہبان سے جلدی متاثر ہو جاتے ہیں، اور امر حق کے سامنے نرم ہو جانا تواضع کا خاصہ ہے، اس لئے ان کو دشمنی زیادہ نہیں، پس قسیس ورہبان یعنی علماء ومشائخ کا وجود اشارہ ہے علت فاعلہ کی طرف اور عدم استکبار قابلیت کی طرف، بخلاف یہود ومشرکین کے کہ محب دنیا اور متکبر ہیں، اور اگرچہ یہود میں بھی بعض علماء حقانی تھے جو مسلمان ہو گئے تھے، لیکن ان کی قلت کے سبب عوام میں اثر نہیں پہنچتا تھا، اس لئے ان میں عناد ہے جو دشمنی کی شدت کا سبب ہو جاتا ہے، اسی لئے یہود تو مومن ہی کم ہوئے اور مشرکین میں سے جب عناد نکل گیا تب مومن ہونا شروع ہوئے)۔

وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا: یہ صیغہ ماضی ہے، اس سے یہ فائدہ معلوم ہوا کہ یہ حکم تمام زمانوں کے اور ہر جگہ کے مشرکوں پر جاری ہونا ضروری نہیں، اور یہود کا الفت رکھنا اب تک نہیں سنا گیا اور اگر کہیں پائے جائیں تب بھی اشکال نہیں، کیونکہ یہاں خاص یہود کا ذکر ہے عام کا نہیں جیسا کہ خلاصہ تفسیر سے ظاہر ہے۔

وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى: خلاصہ کلام یہ ہوا کہ اس آیت میں نصاریٰ کی ایک خاص جماعت کی مدح فرمائی گئی ہے جو خدا ترسی اور حق پرستی کی حامل تھی، اس میں نجاشی اور اس کے اعوان وانصار بھی داخل ہیں اور دوسرے نصاریٰ بھی جو ان صفات کے حامل تھے، یا آئندہ زمانہ میں داخل ہوں، آیت میں جو اوصاف بیان کیے گئے ہیں وہ عہد نبوی کے عیسائیوں اور یہودیوں کے بیان کیے گئے، اس کے بعد جب کبھی اور جہاں کہیں جس مقدار میں یہ اوصاف موجود ہوں گے اسی نسبت سے اسلام اور مسلمانوں کی محبت اور عداوت میں قریب اور بعید ہوں گے، نبی ﷺ کے زمانہ میں جو نصاری تھے ان میں قبول حق اور سلامت روی کا مادہ اور قوموں سے زیادہ تھا، چنانچہ قیصر روم اور مقوقس شاہ مصر اور نجاشی شاہ حبشہ نے جو معاملہ آپ کے پیغام رسالت اور آپ کے صحابہ کے ساتھ کیا وہ اس کا شاہد عدل ہے بہ نسبت یہود کے نصاری نے زیادہ اسلام قبول کیا، لیکن اس کے یہ معنی نہ آیات سے نکلتے ہیں اور نہ ہو سکتے ہیں کہ نصاریٰ خواہ کیسے بھی گمراہ ہو جائیں اور اسلام دشمنی میں کتنے ہی سخت اقدام کریں ان کو بہر حال مسلمانوں کا دوست سمجھا جائے، اور مسلمان ان کی دوستی کی طرف ہاتھ بڑھائیں، کیونکہ یہ بداہۃً غلط اور واقعات کے قطعاً خلاف ہے، اس لئے امام ابوبکر جصاص رحمۃ اللہ علیہ نے احکام القرآن میں فرمایا کہ بعض جاہل جو یہ خیال کرتے ہیں کہ ان آیات میں مطلقاً نصاریٰ کی مدح ہے اور وہ علی الاطلاق یہود سے بہتر ہیں، یہ سراسر جہالت ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ آیت میں نصاری کی جو مدح کی گئی وہ علی الاطلاق نہیں، بلکہ وہ بمقابلہ یہود اور مشرکین ہے کہ ان سے غنیمت ہیں، یہ مطلب نہیں کہ نصاری تمہارے محب اور خیر خواہ ہیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ بہ نسبت یہود اور ہنود کے غنیمت ہیں اور پھر نصاری سے وہ نصاری مراد ہیں جو فی الحقیقت نصرانی ہوں اور کسی درجہ میں اوصاف مذکورہ کے ساتھ موصوف ہوں اور عابد وزاہد اور گوشہ نشین ہوں اور مغرور اور متکبر نہ ہوں اور نرم دل ہوں

اور سنگ دل نہ ہوں، وہ نصاریٰ مراد نہیں جو محض نام کے نصرانی ہیں اور در پردہ وہ دہریہ اور لامذہب ہیں، کیونکہ اگر عام طور پر دونوں جماعتوں کے مذہبی عقائد کا موازنہ کیا جائے تو نصاریٰ کا مشرک ہونا زیادہ واضح ہے اور مسلمانوں کے ساتھ معاملات کو دیکھا جائے تو آج کل کے عام نصاریٰ نے بھی اسلام دشمنی میں یہودیوں سے کم حصہ نہیں لیا، ہاں! یہ صحیح ہے کہ نصاریٰ میں ایسے لوگوں کی کثرت ہوئی ہے، جو خدا ترس اور حق پرست تھے، اسی کے نتیجہ میں ان کو قبول اسلام کی توفیق ہوئی اور یہ آیات ان دونوں جماعتوں کے مابین اسی فرق کو ظاہر کرنے کے لئے نازل ہوئی ہیں، خود اسی آیت کے آخر میں قرآن نے اس حقیقت کو ان الفاظ میں واضح فرمادیا ہے: ذٰلِكَ بِأَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيسِينَ یعنی جن نصاریٰ کی مدح ان آیات میں کی گئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں علماء اور خدا ترس، تارک الدنیا حضرات ہیں، اور ان میں تکبر نہیں کہ دوسروں کی بات پر غور کرنے کے لئے تیار نہ ہوں، مقابلہ سے معلوم ہوا کہ یہود کے یہ حالات نہ تھے، ان میں خدا ترسی اور حق پرستی نہ تھی، ان کے علماء نے بھی بجائے ترک دنیا کے اپنے علم کو صرف ذریعہ معاش بنالیا تھا اور طلب دنیا میں ایسے مست ہو گئے تھے کہ حق و ناحق اور حلال و حرام کی بھی پرواہ نہ رہی تھی۔

واضح رہے کہ یہاں نصاریٰ کے لیے مسلمانوں سے قرب و مودت کی خبر دی ہے، یہ نہیں کہ مسلمانوں کے لیے نصاریٰ سے قرب و مودت کی اجازت دی ہو۔

آیت مذکورہ کے بیان سے ایک اہم بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ قوم وملت کی اصلی روح حق پرست، خدا ترس علماء ومشائخ ہیں، ان کا وجود پوری قوم کی حیات ہے، جب تک کسی قوم میں ایسے علماء ومشائخ موجود ہوں جو دنیوی خواہشات کے پیچھے نہ چلیں، خدا ترسی ان کا مقام ہو تو وہ قوم خیر و برکت سے محروم نہیں ہوتی۔

ذٰلِكَ بِأَنَّ مِنْهُمْ: اس میں باء سببیت سے معلوم ہوتا ہے کہ علم واخلاق کو اعمال میں عظیم دخل ہے، اس لیے مشائخ طریقت نے علم واخلاق کا اہتمام عمل سے زائد رکھا ہے، یعنی علوم واخلاق کا اہتمام اعمال سے زیادہ ہونا چاہیے، یعنی علم کا سیکھنا اور اخلاق کا اپنانا زیادہ ہونا چاہیے، کیونکہ ان دونوں کا اعمال کے اندر دخل ہوتا ہے۔

* * *

فائدہ: ان آیات میں بتلایا گیا کہ یہود کا مشرکین سے دوستی کرنا محض اسلام اور مسلمانوں کی عداوت وبغض کی وجہ سے ہے، نبی کریم ﷺ کو جن اقوام سے زیادہ سابقہ پڑتا تھا ان میں یہ دونوں قومیں یہود اور مشرکین علی الترتیب اسلام ومسلمین کی شدید ترین دشمن تھیں، مشرکین مکہ کی ایذا رسانیاں تو اظہر من الشمس ہیں، لیکن ملعون یہود نے بھی کوئی کمینہ سے کمینہ حرکت اٹھا کر نہیں رکھی، حضور ﷺ کو بے خبری میں پتھر کی چٹان گرا کر شہید کرنا چاہا، کھانے میں زہر دینے کی کوشش کی، سحر اور ٹونکے کرائے، غرض غضب پر غضب اور لعنت پر لعنت حاصل کرتے رہے، اس کے بالمقابل نصاریٰ باوجودیکہ وہ بھی کفر میں مبتلا تھے، اسلام سے جلتے تھے، مسلمانوں کا عروج ان کو ایک نظر نہ بھاتا تھا، تاہم ان میں قبول حق کی استعداد ان دونوں گروہوں سے زیادہ تھی، ان کے دل اسلام اور مسلمانوں سے محبت کرنے کی طرف نسبتاً جلد مائل ہو جاتے تھے اس کا سبب یہ تھا کہ اس وقت تک عیسائیوں میں علم دین کا چرچا دوسری قوموں سے زائد تھا، اپنے طریقہ کے موافق ترک دنیا اور زاہدانہ زندگی اختیار کرنے والے ان میں بکثرت پائے جاتے تھے، نرم دلی اور تواضع ان کی خاص صفت تھی جس قوم میں یہ خصال کثرت سے پائی جائیں ان کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ اس میں قبول حق اور سلامت روی کا مادہ دوسری اقوام سے زیادہ ہو کیونکہ قبول حق سے عموماً تین چیزیں مانع ہوتی ہیں: ① جہل ② حب دنیا ③ یا حسد وتکبر وغیرہ، نصاریٰ میں قسیسین کا وجود جہل کو، رہبان کی کثرت حب دنیا کو، نرمی دل اور تواضع کی صفت کبر ونخوت وغیرہ کو کم کرتی تھی چنانچہ قیصر روم مقوقس مصر اور نجاشی ملک حبشہ نے جو کچھ برتاؤ نبی کریم ﷺ کے پیغام رسالت کے ساتھ کیا وہ اس کا شاہد ہے کہ اس وقت نصاریٰ میں قبول حق اور مودت مسلمین کی صلاحیت نسبتاً دوسری قوموں سے زائد تھی۔

وَ اِذَا سَمِعُوْا مَاۤ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰۤى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ

اور جب سنتے ہیں اس کو جو اترا رسول پر تو دیکھے تو ان کی آنکھوں کو کہ ابلتی ہیں آنسوؤں سے اس وجہ سے کہ انہوں نے پہچان لیا

الْحَقِّ ۚ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَاۤ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۸۳﴾ وَمَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَا

حق بات کو، کہتے ہیں اے رب ہمارے ہم ایمان لائے سو تو لکھ ہم کو ماننے والوں کیساتھ اور ہم کو کیا ہوا کہ یقین نہ لائیں اللہ پر اور اس

جَآءَنَا مِنَ الْحَقِّ ۙ وَنَطْمَعُ اَنْ يُّدْخِلَنَا رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۸۴﴾ فَاَثَابَهُمُ اللّٰهُ

چیز پر جو پہنچی ہم کو حق سے، اور توقع رکھیں اس کی کہ داخل کرے، ہم کو رب ہمارا ساتھ نیک بختوں کے، پھر ان کو بدلے میں دیئے اللہ نے

بِمَا قَالُوْا جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَذٰلِكَ جَزَآءُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۸۵﴾

اس کہنے پر ایسے باغ کہ جن کے نیچے بہتی ہیں نہریں رہا کریں ان میں ہی، اور یہ ہے بدلا نیکی کرنے والوں کا

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَاۤ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ﴿۸۶﴾ ع

اور جو لوگ منکر ہوئے اور جھٹلانے لگے ہماری آیتوں کو وہ ہیں دوزخ کے رہنے والے۔

خلاصہ تفسیر: پیچھے نصاری میں سے ایک خاص اوصاف کی جماعت کا ذکر تھا، اب آگے نصاری میں سے خاص اس جماعت کا ذکر ہے جنہوں نے حق قبول کرلیا تھا اور مسلمان ہوگئے تھے، نصاری کی وہ خاص جماعت حبشہ کے نصاریٰ کی ہے، جنہوں نے مسلمانوں کو جبکہ ہجرت مدینہ سے قبل وہ اپنا وطن مکہ چھوڑ کر حبشہ چلے گئے تھے، کچھ تکلیف نہیں دی اور جو اور نصرانی ایسا ہی ہو وہ بھی حکماً انہی میں داخل ہے، اور ان میں سے جنہوں نے حق قبول کرلیا تھا وہ نجاشی بادشاہ اور ان کے مصاحب ہیں کہ حبشہ میں قرآن سن کر روئے اور مسلمان ہوگئے، پھر تیس آدمی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور قرآن سن کر رودیے اور اسلام قبول کیا، یہی اس آیت کا شان نزول ہے۔

اور (بعض ان نصاری میں جو کہ آخر میں مسلمان ہوگئے تھے ایسے ہیں کہ) جب وہ اس (کلام) کو سنتے ہیں جو کہ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف بھیجا گیا ہے (یعنی قرآن) تو آپ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بہتی ہوئی دیکھتے ہیں، اس سبب سے کہ انہوں نے (دین) حق (یعنی اسلام) کو پہچان لیا (مطلب یہ کہ حق کو سن کر متاثر ہوتے ہیں اور) یوں کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہم مسلمان ہوگئے، تو ہم کو بھی ان لوگوں کے ساتھ لکھ لیجئے (یعنی ہم کو بھی ان میں شمار کرلیجئے) جو (محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اور قرآن کے حق ہونے کی) تصدیق کرتے ہیں۔

اور ہمارے پاس کونسا عذر ہے کہ اللہ تعالیٰ پر (شریعت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کے مطابق) اور جو (دین) حق ہم کو (اب) پہنچا ہے اس پر ایمان نہ لائیں اور (پھر) اس بات کی امید (بھی) رکھیں کہ ہمارا رب ہم کو نیک (مقبول) لوگوں کی معیت میں داخل کردے گا (بلکہ یہ امید اسلام پر موقوف ہے، اس لئے مسلمان ہونا ضروری ہے) سو ان (لوگوں) کو اللہ تعالیٰ ان کے (اس) قول (واعتقاد) کی پاداش میں ایسے باغ (بہشت کے) دیں گے جن کے (محلات کے) نیچے نہریں جاری ہوں گی (اور) یہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ کو رہیں گے، اور نیکوکاروں کی یہی جزا ہے، اور (ان کے برخلاف) جو لوگ کافر رہے اور ہماری آیات (واحکام) کو جھوٹا کہتے رہے وہ لوگ دوزخ (میں رہنے) والے ہیں۔

تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ: یعنی آپ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بہتی ہوئی دیکھتے ہیں، چنانچہ کلام حق سے متاثر ہو کر آبدیدہ ہونا اور گریہ طاری ہوجانا صالحین کی سنت ہے، اس سے وجد کا اثبات ہو رہا ہے، کیونکہ وجد کی حقیقت وہ پسندیدہ حالت ہے جو نادر اور غیر اختیاری طور پر بندہ پر وارد ہوتی ہے،

جیسے غم اور خوشی کی کیفیت، قرآن کی تلاوت سن کر آنکھوں سے آنسو جاری ہو جانا، جنت کے تذکرہ سے خوشی اور جہنم کے تذکرہ سے طبیعت کا غمگین ہو جانا، ذکر کے اندر حلاوت کا نصیب ہو جانا یہ سب پسندیدہ کیفیات ہیں، لیکن وجد کا مطلب رقص اور ناچ ہرگز نہیں ہے۔

وَمَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللّٰهِ: یعنی ہمارے پاس کونسا عذر ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ پر اور دین حق پر ایمان نہ لائیں اور پھر اس بات کی امید بھی رکھیں کہ ہمارا رب ہم کو نیک مقبول لوگوں کی معیت میں داخل کر دے گا، چنانچہ اس سے معلوم ہوا کہ عمل کے بغیر اس بات کی امید وطمع کرنا کہ اللہ ہمیں نیک لوگوں کے ساتھ شامل فرما دیں گے تو یہ درست نہیں یعنی عمل کے بغیر محض تمنا و آرزو مفید نہیں۔

* * *

فائدہ: ۱؎ مشرکین مکہ کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر جب ایک جماعت صحابہؓ نے حبشہ کو ہجرت کی اور مشرکین نے وہاں بھی ملک حبشہ کے دربار تک اپنا پروپیگنڈا نہ چھوڑا تو بادشاہ نے ایک روز مسلمانوں کو بلا کر کچھ سوالات کئے اور حضرت مسیح (علیہ السلام) کی نسبت بھی ان کا عقیدہ دریافت کیا، حضرت جعفر نے سورۃ مریم کی آیات پڑھیں اور اپنا عقیدہ صاف صاف بیان فرمایا، بادشاہ بے انتہا متاثر ہوا اور اقرار کیا کہ جو کچھ قرآن نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نسبت عقیدہ ظاہر کیا ہے وہ بلا کم و کاست صحیح ہے، اس نے کتب سابقہ کی بشارات کے موافق حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی آخر الزمان تسلیم کیا، قصہ طویل ہے انجام کار ہجرت کے کئی سال بعد ایک وفد جو ستر نومسلم عیسائیوں پر مشتمل تھا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں روانہ کیا، یہ لوگ جب مدینہ پہنچے اور قرآن کریم کے سماع سے لذت اندوز ہوئے تو کلام الٰہی سن کر وقف گریہ وبکا ہو گئے، آنکھوں سے آنسو اور زبان پر رَبَّنَا اٰمَنَّا الخ یہ کلمات جاری تھے، ان آیات میں اسی جماعت کا حال بیان فرمایا ہے، قیامت تک کے لئے کوئی خبر نہیں دی گئی کہ ہمیشہ عیسائیوں اور یہود و مشرکین وغیرہ کے تعلقات کی نوعیت اسلام و مسلمین کیساتھ یہ ہی رہے گی، آج جو لوگ عیسائی کہلاتے ہیں ان میں کتنے قسیس و رہبان اور متواضع و منکسر المزاج ہیں اور کتنے ہیں جن کی آنکھوں سے کلام الٰہی سن کر آنسو ٹپک پڑتے ہیں جب اقربھم مودۃ کی علت ہی جو ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا وَّاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ سے بیان کی گئی موجود نہیں تو معلول یعنی ''قرب مودت'' کیوں موجود ہوگا، بہر حال جو اوصاف عہد نبوی کے عیسائیوں اور یہود و مشرکین کے بیان ہوئے، وہ جب کبھی اور جہاں کہیں جس مقدار میں موجود ہونگے، اسی نسبت سے اسلام و مسلمین کی محبت و عداوت کو خیال کر لیا جائے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ

اے ایمان والو مت حرام ٹھہراؤ وہ لذیذ چیزیں جو اللہ نے تمہارے لئے حلال کردیں اور حد سے نہ بڑھو، بیشک اللہ پسند نہیں کرتا

الْمُعْتَدِيْنَ ﴿۸۷﴾ وَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ۪ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْۤ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ﴿۸۸﴾

حد سے بڑھنے والوں کو، اور کھاؤ اللہ کے دیئے ہوئے میں سے جو چیز حلال پاکیزہ ہو، اور ڈرتے رہو اللہ سے جس پر تم ایمان رکھتے ہو

خلاصہ تفسیر: یہاں تک اہل کتاب کے متعلق گفتگو تھی، اب پھر فرعی احکام کی طرف لوٹتے ہیں، جن کا کچھ ذکر سورت کے شروع میں اور کچھ درمیان میں بھی ہوا ہے، اور پیچھے کی آیتوں سے ایک خاص تعلق یہ ہے کہ پیچھے رہبانیت کا ذکر تعریف کے موقع پر آیا ہے، اگرچہ وہ تعریف رہبانیت کے صرف ایک خاص جز یعنی دنیا کی محبت کو ترک کرنے کے اعتبار سے ہے، لیکن یہ احتمال بھی ہوسکتا ہے کہ اس کی تمام خصوصیات کے اعتبار سے کوئی قابل تعریف سمجھ جائے اس لیے اس مقام پر اس تحریم حلال کی ممانعت زیادہ مناسب ہوئی کہ خدا کی حلال کی ہوئی چیزوں کو حرام نہ کرو جیسا کہ بعض صحابہ نے گوشت اور چکنائی، اور بعض نے عورتوں کو اپنے اوپر حرام کرنے کے قصد کیا تھا۔

اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں تمہارے واسطے حلال کی ہیں (خواہ وہ کھانے پینے کی قسم سے ہوں یا پہننے کی یا منکوحات کی قسم سے ہوں) ان میں لذیذ (اور مرغوب) چیزوں کو (قسم وعہد کر کے اپنے نفسوں پر) حرام مت کرو اور حدود (شرعیہ) سے (جو کہ حلال وحرام قرار دینے کے بارے میں مقرر ہیں) آگے مت نکلو، بیشک اللہ تعالیٰ حد (شرعی) سے نکلنے والوں کو پسند نہیں کرتے، اور خدا تعالیٰ نے جو چیزیں تم کو دی ہیں ان میں سے

حلال مرغوب چیزیں کھاؤ (برتو) اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو جس پر تم ایمان رکھتے ہو (یعنی حلال چیز کو حرام کرنا رضائے حق کے خلاف ہے، پس خدا سے ڈرو، اور ایسا مت کرو، ایک اور مطلب وَّاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْٓ کا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ضروری بات تو حرام اور معصیت سے بچنا ہے کہ یہ اصل تقویٰ ہے، حلال اشیاء سے بچنے پر تقویٰ موقوف نہیں، اس کی ضرورت نہیں)۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا: مذکورہ آیات میں یہ بتلایا ہے کہ اگرچہ ترک دنیا اور ترک شہوات ولذات ایک درجہ میں محبوب وپسندیدہ ہے مگر اس میں بھی حدود الٰہیہ سے تجاوز کرنا مذموم اور حرام ہے، جس کی تفصیل یہ ہے کہ کسی حلال چیز کو حرام قرار دینے کے تین درجے ہیں:

① ایک یہ کہ اعتقاداً اس کو حرام سمجھ لیا جائے، اس صورت میں اگر اس چیز کا حلال ہونا قطعی دلائل سے ثابت ہو تو اس کا حرام سمجھنے والا قانون الٰہی کی صریح مخالفت کی وجہ سے کافر ہوجائے گا۔

② دوسرے یہ کہ قولاً کسی چیز کو اپنے لئے حرام کرے، مثلاً قسم کھالے کہ ٹھنڈا پانی نہ پیوں گا یا فلاں قسم کا حلال کھانا نہ کھاؤں گا، یا فلاں جائز کام نہ کروں گا، اس دوسری صورت میں اگر الفاظ قسم کھا کر اس چیز کو اپنے اوپر حرام قرار دیا ہے، تو قسم ہوجائے گی، قسم کے الفاظ بہت ہیں، جو کتب فقہ میں مفصل مذکور ہیں، ان میں ایک مثال یہ ہے کہ صراحۃً کہے کہ اللہ کی قسم کھاتا ہوں کہ فلاں چیز نہ کھاؤں گا، یا فلاں کام نہ کروں گا، یا یہ کہے کہ میں فلاں چیز یا فلاں کام کو اپنے اوپر حرام کرتا ہوں، اس کا حکم یہ ہے کہ بلاضرورت ایسی قسم کھانا گناہ ہے اس پر لازم ہے کہ اس قسم کو توڑ دے اور کفارہ قسم ادا کرے جس کی تفصیل آگے آئے گی۔

③ تیسرے یہ کہ اعتقاد وقول تو کچھ نہ ہو محض عملاً ہمیشہ کے لئے کسی حلال چیز کو چھوڑ دینے کا عزم کرے، تیسری قسم جس میں اعتقاد اور قول سے کسی حلال کو حرام نہ کیا ہو، بلکہ عمل میں ایسا معاملہ کرے جیسا حرام کے ساتھ کیا جاتا ہے کہ دائمی طور پر اس کے چھوڑنے کا التزام کرے، اس کا حکم یہ ہے کہ اگر حلال کو چھوڑنا ثواب سمجھتا ہے تو یہ بدعت اور رہبانیت ہے، جس کا گناہ عظیم ہونا قرآن وسنت میں منصوص ہے، اس کے خلاف کرنا واجب ہے، اور ایسی پابندی پر قائم رہنا گناہ ہے، ہاں! اگر ایسی پابندی بہ نیت ثواب نہ ہو، بلکہ کسی دوسری وجہ سے ہو، مثلاً کسی جسمانی یا روحانی بیماری کے سبب سے کسی خاص چیز کو دائمی طور پر چھوڑ دے تو اس میں کوئی گناہ نہیں، بعض صوفیائے کرام اور بزرگوں سے حلال چیزوں کے چھوڑنے کی جو روایات منقول ہیں وہ سب اسی قسم میں داخل ہیں کہ انہوں نے اپنے نفس کے لئے ان چیزوں کو مضر سمجھا، یا کسی بزرگ نے مضر بتلایا، اس لئے بطور علاج چھوڑ دیا، اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

* * *

فائدہ: آغاز سورت میں ''ایفائے عہود'' کی تاکید کے بعد حلال وحرام کا بیان شروع ہوا تھا، اسی ضمن میں خاص خاص مناسبات سے جن کا ذکر موقع بہ موقع ہم کرچکے ہیں، دوسرے مفید مضامین کا سلسلہ شروع ہوگیا ''الشیء بالشیء یذکر'' بات میں سے بات نکلتی رہی تمام استطرادی مضامین کو تمام کرکے اس پارہ کے پہلے رکوع سے پھر اصل موضوع بحث کی طرف عود کیا گیا ہے اور لطف یہ ہے کہ اس رکوع سے متصل پہلے رکوع میں جو مضمون گزرا اس سے بھی رکوع حاضر کا مضمون پوری طرح مربوط ہے، کیونکہ پچھلے رکوع میں یہود ونصاریٰ کی جو فضائح بیان کی گئیں سمجھنے والوں کے نزدیک ان کا خلاصہ دو چیزیں تھیں: یعنی ① یہود کا لذات وشہوات دنیا اور حرام خوری میں انہماک جو ''تفریط فی الدین'' کا سبب ہوا، اور ② نصاریٰ کا دین میں غلو اور افراط جو آخر کار رہبانیت وغیرہ پر منتہی ہوا، بلاشبہ رہبانیت جسے دینداری یا روحانیت کا ہیضہ کہنا چاہئے، نیت اور منشائے اصلی کے اعتبار سے فی الجملہ محمود ہوسکتی تھی، اسی لئے ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا وَّاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ (المائدہ: ۸۲) کو من وجہ معرض مدح میں پیش کیا گیا، لیکن چونکہ اس طرح کا تجرد وترک دنیا، اس مقصد عظیم اور قانون قدرت کے راستہ میں حائل تھا جو فاطر عالم نے عالم کی تخلیق میں مرعی رکھا ہے اس لئے وہ عالمگیر مذہب جو ابدی طور پر تمام بنی نوع انسان کی فلاح دارین اور اصلاح معاش ومعاد کا متکفل ہوکر آیا ہے، ضروری تھا کہ اس طرح کے مبتدعانہ طریق عبادت پر سختی سے نکتہ چینی کرے، کوئی آسمانی کتاب آج تک ایسی جامع، معتدل، فطری تعلیم انسانی ترقیات کے ہر شعبہ کے متعلق پیش نہیں کرسکتی، جو قرآن کریم نے ان دو آیتوں میں پیش کی ہے۔

ان آیتوں میں حق تعالیٰ نے مسلمانوں کو صاف طور پر اس سے روک دیا کہ وہ کسی لذیذ حلال وطیب چیز کو اپنے اوپر عقیدۃ یا عملاً حرام ٹھہرالیں، نہ صرف یہ ہی بلکہ ان کو خدا کی پیدا کی ہوئی حلال وطیب نعمتوں سے متمتع ہونے کی ترغیب دی ہے مگر سلبی اور ایجابی دو شرطوں کے ساتھ: ① اعتداء نہ کریں (حد سے نہ بڑھیں) ② اور تقویٰ اختیار کریں (خدا سے ڈرتے رہیں) اعتداء کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: ① حلال چیزوں کے ساتھ حرام کا سا معاملہ کرنے لگیں اور نصاریٰ کی طرح رہبانیت میں مبتلا ہو جائیں ② یا لذائذ وطیبات سے تمتع کرنے میں حد اعتدال سے گزر جائیں حتیٰ کہ لذات وشہوات میں منہمک ہو کر یہود کی طرح حیات دنیا ہی کو اپنا مطمح نظر بنالیں، الغرض غلو و جفا اور افراط و تفریط کے درمیان متوسط و معتدل راستہ اختیار کرنا چاہئے، نہ تو لذائذ دنیاوی میں غرق ہونے کی اجازت ہے اور نہ ''از راہ رہبانیت'' مباحات وطیبات کو چھوڑنے کی، ''از راہ رہبانیت'' کی قید ہم نے اس لئے لگائی کہ بعض اوقات بدنی یا نفسی علاج کی غرض کسی مباح سے عارضی طور پر پرہیز کرنا ممانعت میں داخل نہیں، نیز مسلمان تقویٰ کے مامور ہیں جس کے معنی ہیں خدا سے ڈر کر ممنوعات سے اجتناب کرنا، اور تجربہ سے معلوم ہے کہ بعض مباحات کا استعمال بعض اوقات کسی حرام یا ممنوع کے ارتکاب کی طرف مفضی ہو جاتا ہے، ایسے مباحات کو عہد وقسم یا تقرب کے طور پر نہیں بلکہ بطریق احتیاط اگر کوئی شخص کسی وقت باوجود اعتقاد اباحت ترک کر دے تو یہ رہبانیت نہیں بلکہ ورع وتقویٰ میں شامل ہے حدیث میں ہے: ''لا یبلغ العبد ان یکون من المتقین حتّٰی یَدَعَ مَالَا بَاسَ به حذراً ممابه باس'' (ترمذی) الحاصل ترک اعتداء اور اختیار تقویٰ کی قید کو ملحوظ رکھ کر ہر قسم کے طیبات سے مومن مستفید ہو سکتا ہے اور زندگی کے ہر شعبہ میں ترقیات کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ ۚ

نہیں پکڑتا تم کو اللہ تمہاری بیہودہ قسموں پر ۱؎ لیکن پکڑتا ہے اس پر جس قسم کو تم نے مضبوط باندھا

فَكَفَّارَتُهٗٓ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ

سو اس کا کفارہ کھانا دینا ہے دس محتاجوں کو اوسط درجہ کا کھانا جو دیتے ہو اپنے گھر والوں کو ۲؎ یا کپڑا پہنا دینا دس محتاجوں کو ۳؎

اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ ۭ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ۭ ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ ۭ

یا ایک گردن آزاد کرنی ۴؎ پھر جس کو میسر نہ ہو تو روزے رکھنے ہیں تین دن کے ۵؎ یہ کفارہ ہے تمہاری قسموں کا جب قسم کھا بیٹھو

وَاحْفَظُوْٓا اَيْمَانَكُمْ ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۸۹﴾

اور حفاظت رکھو اپنی قسموں کی ۶؎ اسی طرح بیان کرتا ہے اللہ تمہارے لئے اپنے حکم تاکہ تم احسان مانو۔

خلاصہ تفسیر: (پیچھے حلال پاکیزہ چیزوں کو حرام کرنے کا ذکر تھا، چونکہ یہ حرام کرنا بعض اوقات قسم کے ذریعہ سے ہوتا ہے، اس لئے اب قسم کھانے کا حکم مذکور ہے:) اللہ تعالیٰ تم سے (دنیوی) مواخذہ نہیں فرماتے (یعنی کفارہ واجب نہیں کرتے) تمہاری قسموں میں لغو قسم (توڑنے) پر لیکن (ایسا) مواخذہ اس پر فرماتے ہیں کہ تم قسموں کو (آئندہ بات پر) مستحکم کردو (اور پھر اس کو توڑ دو) سو اس (قسم کے توڑنے) کا کفارہ (یہ ہے کہ) دس محتاجوں کو کھانا دینا اوسط درجہ کا جو اپنے گھر والوں کو (معمولی طور پر) کھانے کو دیا کرتے ہو یا ان (دس محتاجوں کو) کپڑا دینا (اوسط درجہ کا) یا غلام یا لونڈی آزاد کرنا (یعنی تینوں میں جس کو چاہے اختیار کرلے) اور جس کو (ان تینوں میں سے ایک کا بھی) مقدور نہ ہو تو (اس کا کفارہ) تین دن کے (متواتر) روزے ہیں، یہ (جو بیان ہوا) کفارہ ہے تمہاری (ایسی) قسموں کا جب کہ تم قسم کھالو (اور پھر اس کو توڑ دو) اور (چونکہ یہ کفارہ واجب ہے اس لیے) اپنی قسموں کا خیال رکھا کرو (کبھی ایسا نہ ہو کہ قسم کو توڑ دو اور کفارہ نہ دو، اور جس طرح اللہ تعالیٰ نے یہ حکم تمہاری دینی اور دنیاوی مصالح کی رعایت کرتے ہوئے بیان فرمایا ہے) اسی طرح اللہ تعالیٰ تمہارے واسطے اپنے (دوسرے) احکام (بھی) بیان فرماتے ہیں تاکہ تم

(اس نعمت یعنی مخلوق کی مصالح کی رعایت رکھنے کا) شکر کرو۔

وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ: اس آیت میں قسم کھانے کی چند صورتوں کا بیان ہے، بعض کا بیان سورۃ بقرہ میں بھی گزر چکا ہے اور خلاصہ سب کا یہ ہے کہ:

① اگر کسی گذشتہ واقعہ پر جان بوجھ کر جھوٹی قسم کھائے اس کو اصطلاح فقہاء میں ''یمین غموس'' کہتے ہیں، مثلاً ایک شخص نے کوئی کام کرلیا ہے، اور وہ جانتا ہے کہ میں نے یہ کام کیا ہے، اور پھر جان بوجھ کر قسم کھالے کہ میں نے یہ کام نہیں کیا، یہ جھوٹی قسم سخت گناہ کبیرہ اور موجب وبال دنیا و آخرت ہے، مگر اس پر کوئی کفارہ واجب نہیں ہوتا، توبہ و استغفار لازم ہے اسی لئے اس کو اصطلاح فقہاء میں ''یمین غموس'' کہا جاتا ہے، کیونکہ ''غموس'' کے معنی ڈوبا دینے والے کے ہیں، یہ قسم انسان کو گناہ اور وبال میں غرق کردینے والی ہے۔

② دوسری صورت یہ ہے کہ کسی گذشتہ واقعہ پر اپنے نزدیک سچا سمجھ کر قسم کھائے اور واقع میں وہ غلط ہو، مثلاً کسی ذریعہ سے یہ معلوم ہوا کہ فلاں شخص آگیا ہے، اس پر اعتماد کرکے اس نے قسم کھالی کہ وہ آگیا ہے، پھر معلوم ہوا کہ یہ واقعہ کے خلاف ہے، اس کو ''یمین لغو'' کہتے ہیں، اسی طرح بلا قصد زبان سے لفظ قسم نکل جائے تو اس کو بھی ''یمین لغو'' کہا جاتا ہے، اس کا حکم یہ ہے کہ نہ اس پر کفارہ ہے نہ گناہ، آیت میں ''لغو'' سے یہی مراد ہے۔

③ تیسری صورت قسم کی یہ ہے کہ آئندہ زمانے میں کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کی قسم کھائے اس کو ''یمین منعقدہ'' کہا جاتا ہے، اس کا حکم یہ ہے کہ اس قسم کو توڑنے کی صورت میں کفارہ واجب ہوتا ہے اور بعض صورتوں میں اس پر گناہ بھی ہوتا ہے، بعض میں نہیں ہوتا۔

اس جگہ قرآن کریم کی آیت مذکورہ میں بظاہر لغو سے وہی قسم مراد ہے جس پر کفارہ نہیں، خواہ گناہ ہو یا نہ ہو، کیونکہ اس کے مقابلہ میں **عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ** مذکور ہے، جس میں کفارہ آتا ہے اور یہ منعقدہ کہلاتی ہے، اور یہ بھی معلوم ہوا کہ یہاں مواخذہ سے مراد دنیا کا مواخذہ ہے، جو کفارہ کی صورت میں ہوتا ہے۔

سورۃ بقرہ کی آیت میں ارشاد ہے: **لا یؤاخذکم اللہ باللغو فی ایمانکم ولکن یؤاخذکم بما کسبت قلوبکم** اس میں ''لغو'' سے مراد وہ قسم ہے جو بلا قصد و ارادہ زبان سے نکل جائے، یا اپنے نزدیک سچی بات سمجھ کر قسم کھالے، مگر وہ واقع میں غلط نکلی، اس کے بالمقابل وہ قسم مذکور ہے جس میں قصداً جھوٹ بولا گیا ہو، جس کو ''یمین غموس'' کہتے ہیں، اس لئے اُس آیت کا حاصل یہ ہوا کہ یمین لغو پر تو کوئی گناہ نہیں، بلکہ گناہ یمین غموس پر ہے، جس میں قصد کرکے جھوٹ بولا گیا ہو تو سورۃ بقرہ میں حکم آخرت کے گناہ کا بیان ہے، اور یہاں سورۃ مائدہ کی مذکورہ آیت میں دنیوی حکم یعنی کفارہ کا بیان ہے، جس کا حاصل یہ ہوا کہ یمین لغو پر اللہ تعالیٰ تم سے مواخذہ نہیں کرتا، یعنی کفارہ واجب نہیں کرتا، بلکہ کفارہ صرف اس قسم پر لازم کرتا ہے، جو آئندہ زمانہ میں کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں منعقد کی ہو، اور پھر اس کو توڑ دیا ہو۔

* * *

فائدہ: ۱۔ لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ: یعنی ان پر دنیا میں کفارہ نہیں جیسا کہ ''یمین منعقدہ'' میں واجب ہے۔ ''لغو'' و بیہودہ قسم کی تفسیر پارہ سیقول کے اواخر میں گزر چکی) آیت نمبر ۲۲۵ میں موجود ہے، چونکہ اوپر تحریم طیبات کا ذکر تھا اور تحریم کی ایک قسم ''یمین'' بھی ہے اس لئے ''یمین'' کے احکام بیان کئے جاتے ہیں۔

فائدہ: ۲۔ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ: یعنی قسم توڑنے کے بعد یہ کفارہ دیا جائے گا، کھانا دینے میں اختیار ہے خواہ دس مساکین کو گھر بٹھلا کر کھانا کھلادے، یا صدقۂ فطر کے برابر ہر مسکین کو غلہ یا اس کی قیمت ادا کردے۔

فائدہ: ۳۔ اَوْ كِسْوَتُهُمْ: اس قدر جس سے بدن کا اکثر حصہ ڈھک جائے۔ مثلاً کرتہ اور پاجامہ یا لنگی اور چادر۔

فائدہ: ۴۔ اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ: یعنی ایک بردہ (غلام) آزاد کرنا اس میں مومن ہونا شرط نہیں۔

فائدہ: ۵۔ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ: یعنی متواتر روزے تین دن کے رکھے اور میسر نہ ہونے سے مراد یہ ہے کہ صاحب

نصاب نہ ہو کذا فی روح المعانی۔

فائدہ: ٦ وَاحْفَظُوْٓا اَيْمَانَكُمْ: قسموں کی حفاظت یہ ہے کہ بلاضرورت بات بات پر قسمیں نہ کھائے یہ عادت بھلی نہیں اور اگر قسم کھائی تو تا مقدور پوری کرے اور اگر کسی وجہ سے توڑے تو کفارہ ادا کرے، یہ سب چیزیں حفاظت یمین میں داخل ہیں۔

فائدہ: ٧ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ: کتنا بڑا احسان ہے کہ ہم نے طیبات سے گریز کیا تو اس گریز سے منع فرمایا اور اگر کسی نے غلطی سے طیبات کو اپنے اوپر حرام ہی کرلیا تو اس کو حفاظت یمین کے ساتھ اس سے حلال ہونے کا طریقہ بھی بتلا دیا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ

اے ایمان والوں یہ جو ہے شراب اور جوا اور بت اور پانسے ١ سب گندے کام ہیں

الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿٩٠﴾

شیطان کے سوان سے بچتے رہو تا کہ تم نجات پاؤ ٢

خلاصہ تفسیر: پیچھے حلال چیزوں کے ایک خاص طریقہ پر چھوڑنے کی ممانعت تھی، آگے بعض حرام چیزوں کے استعمال کی ممانعت بیان کی جاتی ہے۔

اے ایمان والو! بات یہی ہے کہ شراب اور جوا اور بت وغیرہ اور قرعہ کے تیر یہ سب گندی باتیں شیطانی کام ہیں، سو ان سے بالکل الگ رہو تا کہ تم کو (ان کے نقصانات سے بچنے کی وجہ سے) فلاح ہو (وہ نقصانات اگلی آیت میں بیان کیے جاتے ہیں)۔

وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ: ''ازلام'' کے متعلق اسی سورہ مائدہ میں آیت ٣: حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ میں ضروری بیان گزر چکا ہے، وہاں ملاحظہ فرمایئے، ''ازلام'' (پانسے قرعہ) کا ذکر اس جگہ اس لیے کیا گیا کہ وہ بھی جوئے میں داخل ہے، البتہ ''انصاب'' یعنی بتوں کے ذکر میں اس طرف اشارہ ہے کہ شراب و جوا اِس درجہ قبیح اور برے ہیں کہ اس قابل ہیں کہ ان کا ذکر بت پرستی کے ساتھ کیا جائے۔

* * *

فائدہ: ١ ''انصاب وازلام'' کی تفسیر اسی سورت کی ابتداء میں: وَ مَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ وَ اَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ (المائدہ: ٣) کے تحت میں گزر چکی۔

فائدہ: ٢ اس آیت سے پہلے بھی بعض آیات خمر (شراب) کے بارے میں نازل ہو چکی تھیں، اول یہ آیت نازل ہوئی: يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ۭ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۡ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا (البقرۃ: ٢١٩) گو اس سے نہایت واضح اشارہ تحریم خمر کی طرف کیا جا رہا تھا، مگر چونکہ صاف طور اس کے چھوڑنے کا حکم نہ تھا اس لئے حضرت عمرؓ نے سن کر کہا: ''اللھم بیّن لنا بیانا شافیا'' اس کے بعد دوسری آیت آئی: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى الخ (النساء: ٤٣) اس میں بھی تحریم خمر کی تصریح نہ تھی، گو نشہ کی حالت میں نماز کی ممانعت ہوئی اور یہ قرینہ اسی کا تھا کہ غالباً یہ چیز عنقریب کلیۃً حرام ہونے والی ہے، مگر چونکہ عرب میں شراب کا رواج انتہا کو پہنچ چکا تھا اور اس کا دفعتاً چھڑا دینا مخاطبین کے لحاظ سے سہل نہ تھا، اس لئے نہایت حکیمانہ تدریج سے اولاً قلوب میں اس کی نفرت بٹھلائی گئی اور آہستہ آہستہ حکم تحریم سے مانوس کیا گیا، چنانچہ حضرت عمرؓ نے اس دوسری آیت کو سن کر پھر وہ ہی لفظ کہے: ''اللّٰھم بیّن لنا بیانا شافیا'' آخر کار مائدہ کی یہ آیتیں جو اس وقت ہمارے سامنے ہیں: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاۗءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ جن میں صاف صاف بت پرستی کی طرح اس گندی چیز سے بھی اجتناب کرنے کی ہدایت تھی، چنانچہ حضرت عمرؓ فھل انتم منتھون سنتے ہی

چلا اٹھے: "انتھینا انتھینا" لوگوں نے شراب کے مٹکے توڑ ڈالے، خم خانے برباد کر دیئے، مدینہ کی گلی کوچوں میں شراب پانی کی طرح بہتی پھرتی تھی، سارا عرب اس گندی شراب کو چھوڑ کر معرفت ربانی اور محبت واطاعت نبوی کی شراب طہور سے مخمور ہو گیا اور ام الخبائث کے مقابلہ پر حضور ﷺ کا یہ جہاد ایسا کامیاب ہوا جس کی نظیر تاریخ میں نہیں مل سکتی، خدا کی قدرت دیکھو کہ جس چیز کو قرآن کریم نے اتنا پہلے اتنی شدت سے روکا تھا، آج سب سے بڑے شراب خوار ملک امریکہ وغیرہ اس کی خرابیوں اور نقصانات کو محسوس کر کے اس کے مٹا دینے پر تلے ہوئے ہیں، فللّٰہ الحمد والمنۃ۔

اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ

شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ ڈالے تم میں دشمنی اور بیر بذریعہ شراب اور جوئے کے

وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ﴿٩١﴾

اور روکے تم کو اللہ کی یاد سے اور نماز سے، سو اب بھی تم باز آؤ گے

خلاصہ تفسیر: (اور وہ نقصانات دنیوی بھی ہیں اور دینی بھی جن کا بیان یہ ہے کہ) شیطان تو یوں چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعہ تمہارے آپس میں (برتاؤ میں) عداوت اور (دلوں میں) بغض واقع کر دے (چنانچہ ظاہر ہے کہ شراب میں تو عقل ہی نہیں رہتی، گالی گلوچ دنگا فساد ہو جاتا ہے، جس سے بعد میں بھی طبعاً کدورت باقی رہتی ہے، اور جوئے میں جو شخص ہارتا ہے اس کو جیتنے والے پر شدید غصہ ہوتا ہے کہ میرا مال لے لیا، اور جب اس کو رنج ہو گا دوسرے پر بھی اس کا اثر پہنچے گا، یہ تو دنیوی نقصان ہوا) اور (شیطان یوں چاہتا ہے کہ اسی شراب اور جوئے کے ذریعہ سے) اللہ تعالیٰ کی یاد سے اور نماز سے (جو کہ اللہ کی یاد کا سب سے افضل طریقہ ہے) تم کو باز رکھے (چنانچہ یہ بھی ظاہر ہے، کیونکہ شراب میں تو اس کے ہوش ہی بجا نہیں ہوتے اور جوئے میں جیتنے والے کو تو اس درجہ سرور ونشاط ہوتا ہے کہ وہ اس میں غرق ہوتا ہے، اور ہارنے والے کو مغلوب ہونے کا رنج واضمحلال اور پھر جیتنے کی کوشش اس درجہ ہوتی ہے کہ اس سے فراغت نہیں ہوتی، یہ دینی نقصان ہوا، جب ایسی بری چیزیں ہیں) سو (بتلاؤ) اب بھی باز آؤ گے؟۔

وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ: حاصل یہ ہوا کہ شراب اور جوا بت پرستی اور کفر کے قریب قریب اس لیے ہیں کہ نماز سے روکتے ہیں جو کہ اسلام کا بڑا شعار اور ایمان کی بڑی علامت ہے، اور ظاہر ہے کہ جس درجہ ایمان سے دوری ہو گی اسی قدر کفر سے نزدیکی ہو گی، اور یہ حکمت جو کہ شراب وجوا کی حرمت میں بیان کی گئی ہے شطرنج وغیرہ میں بھی موجود ومشاہد ہے، اسی سے سمجھ لینا چاہیے کہ وہ جائز کیونکر ہو سکتا ہے، حدیث میں ہے کہ اس آیت کو سن کر صحابہ کرام نے فرمایا: "انتھینا" یعنی ہم باز آئے، اور جس قدر شرابیں اس وقت موجود تھیں سب پھینک دیں۔

یہاں صرف شراب اور جوے کے حرام ہونے کی حکمت بیان کی، کیونکہ اصل مقصود ان ہی کا ذکر کرنا ہے، اور "ازلام" جوے میں ہی داخل ہے، شراب اور جوئے کے متعلق کچھ تفصیل سورہ بقرہ آیت ۲۱۹: يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ میں گذر چکی ہے وہاں ملاحظہ فرمایئے۔

اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ: اس آیت میں شراب اور جوے کے دینی اور دنیاوی نقصانات بیان کیے گئے، اس میں دلالت ہے کہ گناہوں میں جیسے اخروی نقصانات ہیں اسی طرح دنیوی نقصانات بھی بہت ہیں۔

* * *

فائدہ: شراب پی کر جب عقل جاتی رہتی ہے تو بعض اوقات شرابی پاگل ہو کر آپس میں لڑ پڑتے ہیں کہ نشہ اترنے کے بعد بھی بعض دفعہ لڑائی کا اثر باقی رہتا ہے اور باہمی عداوتیں قائم ہو جاتی ہیں، یہی حال بلکہ کچھ بڑھ کر جوئے کا ہے، اس میں ہار جیت پر سخت جھگڑے اور فساد برپا ہوتے ہیں جس سے شیطان کو اودھم مچانے کا خوب موقع ملتا ہے، یہ تو ظاہری خرابی ہوئی اور باطنی نقصان یہ ہے کہ ان چیزوں میں مشغول ہو کر انسان خدا کی یاد اور عبادت الٰہی سے بالکل غافل ہو جاتا ہے، اس کی دلیل مشاہدہ اور تجربہ ہے، شطرنج کھیلنے والوں ہی کو دیکھ لو، نماز تو کیا، کھانے پینے اور گھر بار کی بھی خبر نہیں رہتی، جب یہ چیز اس قدر ظاہری وباطنی نقصانات پر مشتمل ہے تو کیا ایک مسلمان اتنا سن کر بھی باز نہ آئے گا۔

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاحْذَرُوْا ۚ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا

اور حکم مانو اللہ کا اور حکم مانو رسول کا اور بچتے رہو، پھر اگر تم پھر جاؤ گے تو جان لو کہ ہمارے رسول کا ذمہ

الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۹۲﴾

صرف پہنچا دینا ہے کھول کر

خلاصہ تفسیر: پیچھے ایک خاص حکم کے بجالانے کا امر فرمایا، اب تمام احکام میں اطاعت کرنے کا حکم دیا جاتا ہے۔

اور تم (تمام احکام میں) اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتے رہو اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت کرتے رہو اور (حکم کی مخالفت سے) احتیاط رکھو اور اگر (اطاعت سے) اعراض کرو گے تو یہ جان رکھو کہ ہمارے رسول کے ذمہ صرف صاف صاف (حکم کا) پہنچا دینا تھا (اور وہ اس کو بخوبی انجام دے چکے اور تم کو احکام پہنچا چکے، اب تمہارے پاس کسی عذر کی گنجائش نہیں رہی)۔

* * *

فائدہ: اگر کسی چیز کے منافع و مضار کا احاطہ نہ کر سکو تب بھی خدا اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے احکام کا امتثال کرو اور قانون کی خلاف ورزی سے بچتے رہو، اگر نہ بچو گے تو ہمارے پیغمبر تم کو قانون و احکام الٰہی کھول کر پہنچا چکے، نتیجہ خلاف ورزی کا خود سوچ لو کیا ہوگا۔

لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْٓا اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا

جو لوگ ایمان لائے اور کام نیک کئے ان پر گناہ نہیں اس میں جو کچھ پہلے کھا چکے جب کہ آیندہ کے لیے ڈر گئے اور ایمان لائے

وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاَحْسَنُوْا ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۹۳﴾

اور عمل نیک کئے پھر ڈرتے رہے اور یقین کیا پھر ڈرتے رہے اور نیکی کی، اور اللہ دوست رکھتا ہے نیکی کرنے والوں کو

خلاصہ تفسیر: حضرت ابو ہریرہؓ سے منقول ہے کہ جب اوپر کی آیت میں شراب اور جوے کی حرمت نازل ہو چکی تو بعض لوگوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! بہت سے آدمی جو کہ شراب پیتے تھے اور جوئے کا مال کھاتے تھے اس تحریم سے پہلے مر گئے، اب معلوم ہوا کہ وہ حرام ہے، ان کا کیا حال ہوگا؟ اس پر یہ آیت نازل ہوئی جس میں ان پر گناہ نہ ہونا مذکور ہے۔

ایسے لوگوں پر جو ایمان رکھتے ہوں اور نیک کام کرتے ہوں اس چیز میں کوئی گناہ نہیں جس کو وہ کھاتے پیتے ہوں (اور اُس وقت وہ حلال ہو گی بعد میں اگرچہ حرام ہو جائے، اور ان لوگوں کو گناہ کیسے ہو سکتا ہے) جبکہ (گناہ کا کوئی سبب ان میں نہیں، بلکہ ان میں گناہ سے روکنے والی ایک صفت موجود ہے، وہ یہ کہ) وہ لوگ (خدا کے خوف سے اُس وقت کی تمام ناجائز چیزوں سے) پرہیز رکھتے ہوں، اور (دلیل اس خوف کی یہ ہو کہ وہ لوگ) ایمان رکھتے ہوں (جو کہ خدا سے ڈرنے کا سبب ہے) اور نیک کام کرتے ہوں (جو کہ خوف خدا کی علامت ہے جس پر وہ عمر بھر قائم رہے، چنانچہ اگر وہ حلال چیز جس کو پہلے کھاتے پیتے تھے آگے کبھی چل کر حرام ہو جائے تو) پھر (اس سے بھی اسی خوف خدا کے سبب) پرہیز کرنے لگتے ہوں، اور (اس خوف کی دلیل بھی گذشتہ کی طرح یہی ہو کہ وہ لوگ) ایمان رکھتے ہوں اور خوب نیک عمل کرتے ہوں (کیونکہ نیک اعمال ایمان ہی پر موقوف ہیں، پس یہاں بھی خوف خدا کا سبب اور علامت دونوں جمع ہیں، مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کی حالت تھی کہ جب کسی چیز کی حرمت نازل ہوتی فوراً اس سے رک جاتے، پس ہمارے فضل سے بعید ہے کہ وہ گناہ گار ہوں) اور (ان کی اس خاص طریقہ کی نیکی سے گناہ تو کیا لازم بلکہ ان کے لیے ثواب اور ان کی محبوبیت کا تقاضا کرتی ہے، کیونکہ) اللہ تعالیٰ ایسے نیکوکاروں سے محبت رکھتے ہیں (پس ان کے گناہ گار رہونے کا احتمال کب ہو سکتا ہے، ان لوگوں کی

حالت تو بے گناہی سے محبوبیت کے درجہ تک پہنچ گئی ہے)۔

لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ: اس آیت میں تقوی اور ایمان کو مکرر لانے میں اس طرف اشارہ ہے کہ ان دونوں میں بہت سے درجات ہیں اور یہ درجات ایک دوسرے سے اوپر ہیں اور نیک مسلمان انہی میں ترقی کرتا رہتا ہے، ایک درجہ سے دوسرے درجہ میں، دوسرے سے تیسرے میں، اسی طرح ترقی کرتا رہتا ہے اور اس کی کوئی انتہا نہیں۔

* * *

فائدہ: نہایت صحیح اور قوی احادیث میں ہے کہ جب تحریم کی آیات نازل ہوئیں تو صحابہؓ نے سوال کیا کہ یا رسول اللہ (ﷺ) ان مسلمانوں کا کیا حال ہوگا جنہوں نے حکم تحریم آنے سے پہلے شراب پی اور اسی حالت میں انتقال کر گئے؟ مثلاً بعض صحابہ جو جنگ احد میں شراب پی کر شریک ہوئے اور اسی حالت میں شہید ہو گئے کہ پیٹ میں شراب موجود تھی، اس پر یہ آیات نازل ہوئیں، عموم الفاظ اور دوسری روایات کو دیکھتے ہوئے ان آیات کا مطلب یہ ہے کہ زندہ ہوں یا مردہ جو لوگ ایمان اور عمل صالح رکھتے ہیں ان کے لئے کسی مباح چیز کے بوقت اباحت کھا لینے میں کوئی مضائقہ نہیں، خصوصاً جب کہ وہ لوگ عام احوال میں تقویٰ اور ایمان کی خصال سے متصف ہوں، پھر ان خصال میں برابر ترقی کرتے رہے ہوں حتٰی کہ مدارج تقویٰ و ایمان میں ترقی کرتے کرتے مرتبہ احسان تک جا پہنچے ہوں جو ایک مومن کے لئے روحانی ترقیات کا انتہائی مقام ہو سکتا ہے، جہاں پہنچ کر حق تعالیٰ اپنے بندے کے ساتھ خصوصی محبت کرتا ہے، و فی حدیث جبریل ''اَلْاِحْسَانُ اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ'' پس جو پاک باز صحابہ ایمان وتقویٰ میں عمر گزار کر اور نسبت احسان حاصل کر کے خدا کی راہ میں شہید ہو چکے ان کی نسبت اس طرح کے خلجان اور توہمات پیدا کرنے کی قطعاً گنجائش نہیں کہ وہ ایک ایسی چیز کا استعمال کرتے ہوئے دنیا سے رخصت ہوئے ہیں جو اس وقت حرام نہیں تھی مگر بعد کو حرام ہوئی۔

محققین نے لکھا ہے کہ تقویٰ (یعنی مُضار دینی سے مجتنب ہونے کے) کئی درجے ہیں، اور ایمان ویقین کے مراتب بھی بلحاظ قوت وضعف متفاوت ہیں تجربہ اور نصوص شرعیہ سے ثابت ہے کہ جس قدر آدمی ذکر وفکر، عمل صالح اور جہاد فی سبیل اللہ میں ترقی کرتا ہے اسی قدر خدا کے خوف اور اس کی عظمت وجلال کے تصور سے قلب معمور اور ایمان ویقین مضبوط ومستحکم ہوتا رہتا ہے، مراتب سیر الی اللہ کی اسی ترقی وعروج کی طرف اس آیت میں تقویٰ اور ایمان کی تکرار سے اشارہ فرمایا اور سلوک کے آخری مقام ''احسان'' اور اس کے ثمرہ پر بھی تنبیہ فرما دی، اور جن حضرات صحابہ کے متعلق سوال کیا گیا تھا اس کا جواب ایک عام وتام ضابطہ بیان فرما کر ایسے عنوان سے دے دیا گیا جس میں ان مرحومین کی فضیلت ومنقبت کی طرف بھی لطیف اشارہ ہو گیا۔

ذخیرہ احادیث صحیحہ میں دو مواقع ایسے ہیں جہاں صحابہ نے اس قسم کا سوال کیا ہے: ① ایک موقع تو یہی ''تحریم خمر'' کے متعلق ہے ② اور دوسرا تحویل قبلہ کے وقت سوال کیا گیا تھا کہ یا رسول اللہ (ﷺ) جو لوگ حکم تحویل قبلہ سے پہلے وفات پا گئے اور ایک نماز بھی کعبہ کی طرف نہیں پڑھی ان کی نمازوں کا کیا حال ہوگا؟ اس پر آیت: وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (البقرۃ: ۱۴۳) نازل ہوئی۔

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہی دو مسئلے ایسے تھے جن میں صاف صاف دوٹوک حکم نازل ہونے سے پہلے نہایت ہی واضح آثار وقرائن ایسے موجود تھے جن کو دیکھ کر صحابہ ہر آن نزول حکم صریح کا انتظار کر رہے تھے، خمر کے متعلق تو ابھی چند فوائد پہلے ہم ایسی روایات نقل کر چکے ہیں جن سے ہمارے اس دعوے کا کافی زائد ثبوت ملتا ہے اور ''تحویل قبلہ'' کے باب میں قرآن کریم کی آیات: قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَاۗءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىھَا (البقرۃ: ۱۴۴) جو سیقول کے شروع میں گزریں خبر دے رہی ہیں کہ نبی کریم (ﷺ) ہر وقت منتظر تھے کہ کب تحویل قبلہ کا حکم نازل ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ ایسے واضح حالات صحابہ پر مخفی نہیں رہ سکتے تھے، اس لئے تحویل قبلہ کا حکم جب ایک آدمی نے کسی محلہ کی مسجد میں جا کر سنایا تو سارے نمازی محض خبر واحد سن کر بیت المقدس سے کعبہ کی طرف پھر گئے حالانکہ بیت المقدس کا استقبال قطعی طور پر انہیں معلوم تھا اور خبر واحد ظنی قطعی کے لئے ناسخ نہ ہو سکتی تھی اس لئے علمائے اصول نے تصریح کی ہے کہ یہ خبر واحد محفوف بالقرائن ہونے کی وجہ سے قطعی سمجھی گئی، پس جو قرائن و آثار حتمی طور پر خبر دے رہے تھے کہ ''تحریم خمر'' یا ''تحویل قبلہ'' کا حکم امروز وفردا میں پہنچنے والا ہے، گویا وہ ایک طرح سے صحابہ کو نزول حکم سے پہلے مرضی

الٰہی پر فی الجملہ مطلع کر رہے تھے، اسی لئے ان دو مسئلوں میں نزول حکم سے قبل کی حالت کے متعلق سوال کرنا محل استبعاد نہیں ہوسکتا، خصوصا خمر کی نسبت جس کی ممانعت کے نہایت واضح اشارات وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا (البقرۃ:۲۱۹) وغیرہ میں موجود تھے، واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَيَبْلُوَنَّكُمُ اللّٰهُ بِشَيْءٍ مِّنَ الصَّيْدِ تَنَالُهٗٓ اَيْدِيْكُمْ وَرِمَاحُكُمْ

اے ایمان والو البتہ تم کو آزمائے گا اللہ ایک بات سے اس شکار میں کہ جس پر پہنچتے ہیں ہاتھ تمہارے اور نیزے تمہارے ۱؎

لِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّخَافُهٗ بِالْغَيْبِ ۚ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۹۴﴾

تاکہ معلوم کرے اللہ کون اس سے ڈرتا ہے بن دیکھے ۲؎ پھر جس نے زیادتی کی اس کے بعد تو اس کے لئے عذاب دردناک ہے

خلاصہ تفسیر: سورت کے شروع میں اجمالا احرام کی حالت میں شکار کی ممانعت فرمائی تھی، اب اس کی قدرے تفصیل ہے، اس کے علاوہ ایک خاص ربط یہ بھی ہے کہ پیچھے پاکیزہ حلال چیزوں کو حرام کرنے کی ممانعت کا ذکر تھا، اب فرماتے ہیں کہ اللہ تعالی کو اس کا مکمل اختیار حاصل ہے کہ بعض خاص حالات میں طیبات کو بھی حرام قرار دے دیں۔

اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ قدرے شکار سے تمہارا امتحان کرے گا جن تک (تم سے دور نہ بھاگنے کی وجہ سے) تمہارے ہاتھ اور تمہارے نیزے پہنچ سکیں گے (مطلب امتحان کا یہ ہے کہ حالت احرام میں جانوروں کے شکار کرنے کو تم پر حرام کر کے ان جانوروں کو تمہارے آس پاس پھراتے رہیں گے) تاکہ اللہ تعالیٰ (ظاہر طور پر بھی) معلوم کرے کہ کون شخص اس سے (یعنی اس کے عذاب سے) بن دیکھے ڈرتا ہے (اور حرام کے ارتکاب سے بچتا ہے جو کہ عذاب کا سبب ہے، اسی سے التزاما یہ بھی معلوم ہو گیا کہ یہ شکار حرام ہے) سو جو شخص اس (حرمت) کے بعد حد (شرعی) سے نکلے گا (یعنی ممنوع شکار کا مرتکب ہوگا) اس کے واسطے دردناک سزا (مقرر) ہے (چنانچہ شکاری جانور اسی طرح آس پاس لگے پھرتے تھے، چونکہ صحابہ میں بہت سے شکار کے عادی تھے اس میں ان کی اطاعت کا امتحان ہو رہا تھا، جس میں وہ پورے اترے)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ پچھلے رکوع میں تحریم طیبات اور اعتداء سے منع فرما کر بعض چیزوں سے اجتناب کا حکم دیا تھا جو دائمی طور پر حرام ہیں، اس رکوع میں بعض ایسی اشیاء کے ارتکاب سے منع کیا گیا ہے جس کی حرمت دائمی نہیں، بلکہ بعض احوال واوضاع سے مخصوص ہے یعنی بحالت احرام شکار کرنا، مطلب یہ ہے کہ خدا کی طرف سے مطیع وفرمانبردار بندوں کا یہ امتحان ہے کہ وہ حالت احرام میں جب کہ شکار ان کے سامنے ہے اور بسہولت اس کے مارنے یا پکڑنے پر بھی قادر ہوں، کون ہے جو بن دیکھے خدا سے ڈر کر اس کے حکم کا امتثال کرتا اور اعتداء (احکام خداوندی سے تجاوز کرنے) کی خدائی سزا سے خوف کھاتا ہے۔

اصحاب سبت کا قصہ سورۃ بقرہ میں گزر چکا کہ ان کو حق تعالیٰ نے خاص شنبہ کے دن مچھلی کے شکار کی ممانعت فرمائی تھی، مگر انہوں نے مکاری اور حیلہ بازی سے اس حکم کی مخالفت کی اور حد سے تجاوز کر گئے، خدا نے ان پر نہایت رسوا کن عذاب نازل فرمایا، اسی طرح حق تعالیٰ نے امت محمدیہ کا تھوڑا سا امتحان اس مسئلہ میں لیا کہ حالت احرام میں شکار نہ کریں، حدیبیہ کے موقع پر جب یہ حکم بھیجا گیا تو شکار اس قدر کثیر اور قریب تھا کہ ہاتھوں اور نیزوں سے مار سکتے تھے، مگر اصحاب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ثابت کر دکھایا کہ خدا کے امتحان میں ان کے برابر دنیا کی کوئی قوم کامیاب نہیں ہوسکی۔

فائدہ: ۲؎ لیعلم اللہ کے لفظ سے جو حدوث علم باری کا وہم گزرتا ہے اس کے ازالہ کے لئے پارہ سیقول کے شروع میں الا لنعلم من یتبع الرسول کا فائدہ ملاحظہ کرو۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ ۭ وَمَنْ قَتَلَهٗ مِنْكُمْ مُّتَعَمِّدًا فَجَزَاۗءٌ

اے ایمان والو نہ مارو شکار جس وقت تم ہو احرام میں ۱ اور جو کوئی تم میں اسکو مارے جان کر ۲ تو اس پر بدلہ ہے اس

مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ يَحْكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ هَدْيًۢا بٰلِغَ الْكَعْبَةِ

مارے ہوئے کے برابر مویشی میں سے جو تجویز کریں دو آدمی معتبر تم میں سے اسطرح سے کہ وہ جانور بدلے کا بطور نیاز پہنچایا جائے کعبہ تک

اَوْ كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسٰكِيْنَ اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِيَامًا لِّيَذُوْقَ وَبَالَ اَمْرِهٖ ۭ عَفَا اللّٰهُ عَمَّا

یا اس پر کفارہ ہے چند محتاجوں کو کھلانا یا اس کے برابر روزے تاکہ چکھے سزا اپنے کام کی ۳ اللہ نے معاف کیا جو کچھ

سَلَفَ ۭ وَمَنْ عَادَ فَيَنْتَقِمُ اللّٰهُ مِنْهُ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ﴿۹۵﴾

ہو چکا ۴ اور جو کوئی پھر کرے گا اس سے بدلہ لے گا اللہ اور اللہ زبردست ہے بدلہ لینے والا ۵

خلاصہ تفسیر: (اب ممانعت کی زیادہ تصریح ہے کہ) اے ایمان والو! وحشی شکار کو (مگر جن کو شریعت نے مستثنیٰ کر دیا) قتل مت کرو، جبکہ تم حالت احرام میں ہو (اسی طرح جبکہ وہ شکار یعنی جانور زمین حرم میں ہو، اگرچہ شکاری احرام میں نہ ہو، اس کا بھی یہی حکم ہے) اور جو شخص تم میں اس کو جان بوجھ کر قتل کرے گا تو اس پر (اس کے فعل کی) پاداش (تلافی) واجب ہوگی جو کہ (قیمت کے اعتبار سے) مساوی ہوگی اس جانور کے جس کو اس نے قتل کیا ہے جس (کے اندازہ وتخمینہ) کا فیصلہ تم میں سے دو معتبر شخص کر دیں (جو دینداری میں بھی قابل اعتبار ہوں، اور تجربہ وبصیرت میں بھی، پھر اس قاتل کو قیمت کے اندازہ کے بعد چند باتوں کا اختیار ہے) خواہ (اس قیمت کا کوئی ایسا جانور خرید لے کہ) وہ پاداش (تلافی کا جانور) خاص چوپاؤں میں سے ہو (یعنی اونٹ، گائے، بھینس، بھیڑ، بکری، نر ہو یا مادہ ان میں سے اس قیمت کا کوئی جانور خریدے) بشرطیکہ نیاز کے طور پر کعبہ (کے پاس) تک (یعنی زمین حرم کے اندر) پہنچائی جائے اور خواہ (اس قیمت کے برابر غلہ بطور) کفارہ (کے) مساکین کو دے دیا جائے (یعنی ایک مسکین کو بقدر ایک صدقۃ الفطر کے دیا جائے) اور خواہ اس (غلہ) کے برابر روزے رکھ لئے جائیں (غلہ کے برابر روزہ رکھنے کی صورت یہ ہے کہ ہر مسکین کے حصہ یعنی فطرہ کے بدلے ایک روزہ، اور یہ تلافی اس لئے مقرر کی ہے) تاکہ اپنے کئے کی شامت کا مزہ چکھے (بخلاف اس شخص کے جس نے جان بوجھ کر شکار نہ کیا ہو بلکہ غلطی سے ایسا ہوا تو پھر اگرچہ یہی جزاء واجب ہے مگر وہ اس فعل کی سزا نہیں، بلکہ صرف اس شکار کے محترم ہو جانے کی وجہ سے اس کا ضمان ہے، خواہ شکار زمین حرم میں ہونے کی وجہ سے محترم ہو یا شکاری کے احرام میں ہونے کی وجہ سے محترم ہو گیا ہو، تو اس کا ضمان اور جزاء ہے اور اس جزاء کے ادا کر دینے سے) اللہ تعالیٰ نے گذشتہ کو معاف فرما دیا، اور جو شخص پھر ایسی ہی حرکت کرے گا (چونکہ دوبارہ کرنے میں اکثر ایک گونہ پہلی بار سے زیادہ جرأت ہوتی ہے) تو (اس وجہ سے مذکورہ جزاء کے علاوہ کہ وہ تو شکار کی جان کا عوض یا اس کے فعل کا تاوان ہے آخرت میں بھی) اللہ تعالیٰ اس سے (اس جرأت کا) انتقام لیں گے (البتہ اگر توبہ کر لے تو چونکہ جرأت نہیں رہی اور انتقام کا سبب بھی ختم ہو جائے گا) اور اللہ تعالیٰ زبردست ہیں انتقام لے سکتے ہیں۔

مسئلہ: جس شکار کا حرم اور احرام میں قتل کرنا حرام ہے وہ عام ہے، خواہ اس کا کھانا حلال ہو یا نہ ہو۔

مسئلہ: صید یعنی شکار ان جانوروں کو کہا جاتا ہے جو وحشی ہوں، عادۃً انسانوں کے پاس نہ رہتے ہوں، پس جو خلقۃً اہلی ہوں جیسے بھیڑ، بکری، گائے، اونٹ، ان کا ذبح کرنا اور کھانا درست ہے۔

مسئلہ: البتہ جو دلیل سے مستثنیٰ ہو گئے ہیں ان کو پکڑنا، قتل کرنا حلال ہے، جیسے دریائی جانور کا شکار، بقولہ تعالیٰ: اُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ

اور بعض خشکی کے جانور، جیسے کوا، چیل، بھیڑیا، سانپ، بچھو اور کاٹنے والا کتا، اسی طرح جو درندہ خود حملہ کرے اس کا قتل بھی جائز ہے، حدیث میں ان کا استثناء مذکور ہے، اس سے معلوم ہوا کہ الصید میں الف لام عہد کا ہے۔

مسئلہ: جو حلال شکار غیر احرام اور غیر حرم میں کیا جائے اس کا کھانا محرم کو جائز ہے، جب یہ اس کے قتل وغیرہ میں مددگار یا مشیر یا بتلانے والا نہ ہو، حدیث میں ایسا ہی ارشاد ہے، اور آیت کے الفاظ لَا تَقْتُلُوا میں بھی اس کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ یہاں لَا تَقْتُلُوا فرمایا ہے لا تاکلوا نہیں فرمایا۔

مسئلہ: شکار حرم کو جس طرح قصداً قتل کرنے پر جزاء واجب ہے، اسی طرح خطاء و نسیان میں بھی واجب ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَأَنْتُمْ حُرُمٌ: اس کے متعلق بعض احکام سورۃ مائدہ کے شروع میں گزر چکے۔

فائدہ: ۲ وَمَنْ قَتَلَهُ مِنْكُمْ مُتَعَمِّدًا: جان کر مارنے کا یہ مطلب ہے کہ اپنا محرم ہونا یاد ہو اور یہ بھی مستحضر ہو کہ حالت احرام میں شکار جائز نہیں، یہاں صرف ''متعمد'' کا حکم بیان فرمایا کہ اسکے فعل کی جزا یہ ہے اور خدا جو انتقام لے گا وہ الگ رہا جیسا کہ: ومن عاد فینتقم اللہ منہ سے تنبیہ فرمائی، اور اگر بھول کر شکار کیا تو جزاء تو یہی رہے گی یعنی ''ہدی'' یا ''طعام'' یا ''صیام'' البتہ خدا اس سے انتقامی سزا اٹھا لیگا۔

فائدہ: ۳ أَوْ عَدْلُ ذَلِكَ صِيَامًا لِيَذُوقَ وَبَالَ أَمْرِهِ: حنفیہ کے یہاں مسئلہ یہ ہے کہ اگر احرام میں شکار پکڑا تو فرض ہے کہ چھوڑ دے، اگر مار دیا تو صاحب بصیرت اور تجربہ کار معتبر آدمیوں سے اس جانور کی قیمت لگوائی اسی قدر قیمت کا مویشی میں سے ایک جانور لے کر (مثلاً بکری، گائے، اونٹ وغیرہ) کعبہ کے نزدیک یعنی حدود حرم میں پہنچا کر ذبح کرے، اور خود اس میں سے نہ کھائے یا اسی قیمت کا غلہ لے کر محتاجوں کو فی محتاج صدقۃ الفطر کی مقدار تقسیم کر دے یا جس قدر محتاجوں کو پہنچتا، اتنے ہی دنوں کے روزے رکھ لے۔

فائدہ: ۴ عَفَا اللَّهُ عَمَّا سَلَفَ: یعنی نزول حکم سے پہلے یا اسلام سے پہلے زمانہ جاہلیت میں کسی نے یہ حرکت کی تھی تو اس سے اب خدا تعرض نہیں کرتا، حالانکہ اسلام سے پہلے بھی عرب حالت احرام میں شکار کو نہایت برا جانتے تھے اس لئے اس پر مواخذہ ہونا بیجا نہ تھا کہ جو چیز تمہارے زعم کے موافق جرائم میں داخل تھی اس کا ارتکاب کیوں کیا گیا۔

فائدہ: ۵ وَاللَّهُ عَزِيزٌ ذُو انْتِقَامٍ: یعنی نہ کوئی مجرم اس کے قبضہ قدرت سے نکل کر بھاگ سکتا ہے اور یہ مقتضائے عدل و حکمت جو جرائم سزا دینے کے قابل ہیں نہ خدا ان سے درگزر کرنے والا ہے۔

أُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهُ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِلسَّيَّارَةِ ۖ وَحُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ

حلال ہوا تمہارے لئے دریا کا شکار اور دریا کا کھانا تمہارے فائدہ کے واسطے اور سب مسافروں کے، اور حرام ہوا تم پر جنگل کا شکار

مَا دُمْتُمْ حُرُمًا ۗ وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ﴿٩٦﴾

جب تک تم احرام میں رہو، اور ڈرتے رہو اللہ سے جس کے پاس تم جمع ہو گے

خلاصہ تفسیر: پیچھے حالت احرام میں مطلق شکار کی حرمت ذکر تھی، اب اس کی تعیین اور تخصیص فرماتے ہیں:

تمہارے لئے (حالت احرام میں) دریا (یعنی پانی) کا شکار پکڑنا اور اس کا کھانا (سب) حلال کیا گیا ہے تمہارے انتفاع کے واسطے (اور تمہارے) مسافروں کے (فائدے کے) واسطے (کہ سفر میں اسی کو توشہ بنا دیں) اور خشکی کا شکار (اگرچہ بعض صورتوں میں کھانا حلال ہے مگر) پکڑنا (یا اس میں مددگار ہونا) تمہارے لئے حرام کیا گیا ہے، جب تک تم حالت احرام میں رہو، اور اللہ تعالیٰ (کی مخالفت) سے ڈرو، جس کے پاس جمع (کر کے حاضر) کئے جاؤ گے۔

صَيْدُ الْبَحْرِ: دریائی جانور وہ ہے کہ اس کی پیدائش اور سکونت دونوں پانی میں ہو، ظاہر آیت میں اس سے مراد مچھلی ہے، پس بطخ ومرغابی وغیرہ اس سے خارج اور خشکی کے شکار میں داخل ہیں۔

اُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ: یعنی تمہارے لیے احرام کی حالت میں دریا کا شکار پکڑنا حلال ہے، اس میں دلالت ہے کہ زہد میں تعدیل رکھنی چاہیے، اس میں حد سے آگے نہیں گذرنا چاہیے، جیسے پانی کا شکار احرام کی حالت میں جائز ہے اور خشکی کا شکار نا جائز ہے، لیکن اگر ایک شخص پانی کا شکار بھی نہ کھائے کہ میں تقوی اختیار کر رہا ہوں تو یہ درست نہیں ہے، بلکہ جتنا حکم ہے اسی کے مطابق چلے، یہی زہد وتقوی ہے، غلو اور شدت سے بچنا ضروری ہے، زہد کے معنی یہ نہیں کہ ترک حیوانات، ترک لذات کر دیا جائے، بلکہ اس میں اعتدال رکھا جائے، نہ اسراف ہو، نہ بے جا خرچ ہو اور نہ نام ونمود وشہرت ہو۔

* * *

فائدہ: حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''احرام میں دریا کا شکار یعنی مچھلی حلال اور دریا کا کھانا یعنی جو مچھلی پانی سے جدا ہو کر مرگئی، اس نے نہیں پکڑی وہ بھی حلال ہے فرمادیا کہ یہ تمہارے فائدہ کو رخصت دی، پھر کوئی نہ سمجھے کہ حج کے طفیل سے حلال ہے فرمادیا کہ اور سب مسافروں کے فائدہ کو مچھلی اگر تالاب میں ہو وہ بھی شکار دریا ہے، یہ حکم شکار کا معلوم ہوا احرام کے اندر، اور احرام میں قصد ہے مکہ کا، اس شہر مکہ اور گرد وپیش میں ہمیشہ شکار مارنا حرام ہے بلکہ شکار کو ڈرانا اور بھگانا بھی''۔

جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ وَالشَّهْرَ الْحَرَامَ وَالْهَدْيَ

اللہ نے کردیا کعبہ کو جو کہ گھر ہے بزرگی والا قیام کا باعث لوگوں کے لئے اور بزرگی والے مہینوں کو اور قربانی کو جو نیاز کعبہ کی ہو

وَالْقَلَآئِدَ ؕ ذٰلِكَ لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ

اور جنکے گلے میں پٹہ ڈال کر لے جائیں کعبہ کو [1] یہ اس لئے کہ تم جان لو کہ بیشک اللہ کو معلوم ہے جو کچھ ہے آسمانوں اور زمین میں

وَاَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۹۷﴾

اور اللہ ہر چیز سے خوب واقف ہے [2]

خلاصہ تفسیر: احرام کی حالت میں شکار اس لیے حرام کیا گیا کہ محرم کا مقصد خانہ کعبہ کی زیارت ہے اور اللہ نے خانہ کعبہ کو محترم گھر لوگوں کے قائم اور باقی رہنے کا ذریعہ بنایا ہے، غرض یہ کہ خانہ کعبہ ایک محترم جگہ ہے جس کا ادب اور احترام فرض ہے، اس لیے حدود حرم میں اور حالت احرام میں شکار ممنوع قرار دیا گیا اور ماہ حرام کو، قربانی کو اور قربانی کے جانوروں کے گلے کے ہاروں کو بھی اللہ نے لوگوں کے قیام امن کا ذریعہ بنایا ہے، غرض خانہ کعبہ کی تعظیم واحترام کی وجہ سے ان سب چیزوں میں بھی عظمت وحرمت آگئی، احرام اور حرم میں شکار کی ممانعت کی بھی یہی بنیاد ہے، چونکہ محرم کا مقصد خانہ کعبہ کی زیارت ہے۔

خدا تعالیٰ نے کعبہ کو جو کہ ادب کا مکان ہے، لوگوں (کی مصلحت وفوائد) کے قائم رہنے کا سبب قرار دے دیا ہے (اس میں دینی اور دنیاوی برکتیں رکھیں) اور (اسی طرح) عزت والے مہینہ کو بھی، اور (اسی طرح) حرم میں قربانی ہونے والے جانور کو بھی، اور (اسی طرح) ان جانوروں کو بھی جن کے گلے میں (اس نشانی کے لئے) پٹے ہوں (کہ یہ اللہ کی نیاز ہیں اور حرم میں ذبح ہوں گے) یہ (قرار داد دیگر دنیاوی فوائد کے علاوہ) اس (دینی فائدہ کے) لئے (بھی) ہے تا کہ (تمہارا اعتقاد درست اور پختہ ہو اس طرح سے کہ تم ان مصالح سے استدلال کر کے) اس بات کا یقین کرلو کہ بیشک اللہ تعالیٰ تمام آسمانوں اور زمین کے اندر کی چیزوں کا علم (کامل) رکھتے ہیں (کیونکہ ایسا حکم مقرر کرنا جس میں آئندہ کے ایسے مصالح کی رعایت ہو کہ انسانی عقلیں ان کو نہ سوچ سکیں صفت علمی کے کامل ہونے کی دلیل ہے) اور (ان مذکورہ معلومات کے ساتھ علم کامل سے استدلال کر کے یقین کرلو کہ) بیشک اللہ

تعالیٰ سب چیزوں کو خوب جانتے ہیں (اوران کا علم ذاتی بھی ہے اور محیط وکامل بھی، کیونکہ ان معلومات کے علم پر کسی چیز نے مطلع نہیں کیا)۔

* * *

فائدہ: ۱ جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰمًا: کعبہ شریف دینی اور دنیاوی دونوں حیثیت سے لوگوں کے قیام کا باعث ہے، حج وعمرہ تو وہ عبادات ہیں جن کا ادا کرنا براہ راست کعبہ ہی سے متعلق ہے، لیکن نماز کے لئے بھی استقبال قبلہ شرط ہے، اس طرح کعبہ لوگوں کی دینی عبادات کے قیام کا سبب ہوگیا، پھر حج وغیرہ کے موقع پر تمام بلاد اسلامیہ سے لاکھوں مسلمان جب وہاں جمع ہوتے ہیں تو بیشمار تجارتی، سیاسی، اخلاقی، مذہبی اور روحانی فوائد حاصل کرسکتے ہیں، خدا نے اس جگہ کو "حرم اٰمن" بنایا، اس لئے انسانوں بلکہ بہت جانوروں تک کو وہاں رہ کر امن نصیب ہوتا ہے، عہد جاہلیت میں جب کہ ظلم وخونریزی اور فتنہ وفساد محض معمولی بات تھی ایک آدمی اپنے باپ کے قاتل سے بھی حرم شریف میں تعرض نہ کرسکتا تھا، مادی حیثیت سے انسان یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ جاتا ہے کہ اس وادی غیر ذی زرع میں اتنی افراط سے سامان خورد ونوش اور نفیس قسم کے پھل اور میوے کہاں سے کھنچے چلے آتے ہیں، یہ سب حیثیات قیاماً للناس میں معتبر ہوسکتی ہیں۔

اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ علم الٰہی میں پہلے ہی مقدر ہوچکا تھا کہ نوع انسان کے لئے اسی جگہ سے عالمگیر اور ابدی ہدایت کا چشمہ پھوٹے گا اور مصلح اعظم سید کائنات محمد ﷺ کے مولد ومسکن مبارک بننے کا شرف بھی سارے جہان میں سے اسی خاک پاک کو حاصل ہوگا، ان سب وجوہ سے کعبہ کو قیاماً للناس کہہ سکتے ہیں، کیونکہ کعبہ تمام روئے زمین کے انسانوں کے حق میں اصلاح اخلاق، تکمیل روحانیت اور علوم ہدایت کا مرکزی نقطہ ہے اور کسی چیز کا قیام اپنے مرکز کے بدون نہیں ہوسکتا۔

اس کے علاوہ محققین کے نزدیک قیاماً للناس کا مطلب یہ ہے کہ کعبہ شریف کا مبارک وجود کل عالم کے قیام اور بقا کا باعث ہے، دنیا کی آبادی اسی وقت تک ہے جب تک خانہ کعبہ اور اس کا احترام کرنے والی مخلوق موجود ہے، جس وقت خدا کا ارادہ یہ ہوگا کہ کارخانہ عالم کو ختم کیا جائے تو سب کاموں سے پہلے اسی مبارک مکان کو جسے "بیت اللہ شریف" کہتے ہیں اٹھالیا جائے گا، جیسا کہ بنانے کے وقت بھی زمین پر سب سے پہلا مکان یہی بنایا گیا تھا: إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ (آل عمران: ۹۶) بخاری کی حدیث میں ہے کہ ایک سیاہ فام حبشی (جسے ذوالسویقتین کے لقب سے ذکر فرمایا ہے) عمارت کعبہ کا ایک ایک پتھر اکھیڑ کر ڈال دے گا جب تک خدا کو اس دنیا کا نظام قائم رکھنا منظور ہے کوئی طاقتور سے طاقتور قوم جس کا مقصد کعبہ کو ہدم کرنا ہو، اپنے اس ناپاک ارادہ میں کامیاب نہیں ہوسکتی، اصحاب فیل کا قصہ تو ہر شخص نے سنا ہے لیکن ان کے بعد بھی ہر زمانہ میں کتنی قوموں اور شخصوں نے ایسے منصوبے باندھے ہیں اور باندھتے رہتے ہیں، یہ محض خدائی حفاظت اور اسلام کی صداقت کا عظیم الشان نشان ہے کہ باوجود سامان و اسباب ظاہرہ کے فقدان کے آج تک کوئی شخص اس ابلیسانہ مقصد میں کامیاب نہ ہوسکا اور نہ ہوسکے گا اور جب عمارت کعبہ کے گرادینے میں قدرت کی طرف سے مزاحمت نہ رہے گی تو سمجھ لو کہ عالم کی ویرانی کا حکم آن پہنچا، دنیا کی حکومتیں اپنے دار السلطنت اور قصر شاہی کی حفاظت کے لئے لاکھوں سپاہی کٹوا دیتی ہیں لیکن اگر کبھی خود ہی قصر شاہی کو کسی مصلحت سے تبدیل یا ترمیم کرنا چاہیں تو معمولی مزدوروں سے اس کے گرادینے کا کام لے لیا جاتا ہے، شاید اسی لئے امام بخاری نے "باب جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰمًا لِلنَّاسِ" میں ذوالسویقتین کی حدیث درج کرکے قیاماً للناس کے اسی مطلب کی طرف اشارہ کیا ہے جو ہم نقل کرچکے ہیں (نبّه علیه شیخنا المترجم قدس اللّٰه روحه فی دروس البخاری)۔

بہر حال آیت زیر بحث میں احکام "محرم" بیان فرمانے کے بعد کعبہ شریف کی عظمت وحرمت بیان کرنا مقصود ہے پھر کعبہ اور احرام کی مناسبت سے شہر حرام اور ہدی وقلائد کا بھی ذکر فرمادیا، جیسا کہ اسی سورت کے شروع میں: غَيْرَ مُحِلِّي الصَّيْدِ وَأَنْتُمْ حُرُمٌ (المائدہ: ۱) کے ساتھ: لَا تُحِلُّوا شَعَآئِرَ اللّٰهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَلَا الْهَدْيَ وَلَا الْقَلَآئِدَ (المائدہ: ۲) کو ملحق فرمایا تھا، واللہ اعلم۔

فائدہ: ۲ وَأَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ: یعنی کعبہ وغیرہ کے قیاماً للناس بنانے میں جن مصالح دینی ودنیاوی کی رعایت فرمائی اور بظاہر بالکل خلاف قیاس جو عظیم الشان پیشین گوئی کی گئی وہ اسکی دلیل ہے کہ آسمان وزمین کی کوئی چیز حق تعالیٰ کے غیر محدود علم کے احاطہ سے باہر نہیں ہوسکتی۔

اِعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيۡدُ الۡعِقَابِ وَاَنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۹۸﴾

جان لو کہ بیشک اللہ کا عذاب سخت ہے اور بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ہے

خلاصہ تفسیر: پیچھے مختلف احکام بیان ہوئے، اب ترغیب وترہیب سے ان کے بجالانے کی تاکید فرماتے ہیں۔
تم یقین سے جان لو کہ اللہ تعالیٰ سزا بھی سخت دینے والے ہیں اور اللہ تعالیٰ بڑی مغفرت اور رحمت والے بھی ہیں (تو ان کے احکام کی خلاف مت کیا کرو اور اگر کبھی خلاف ورزی ہوگئی ہو تو شرعی قاعدہ کے مطابق توبہ کرلو)۔

❊ ❊ ❊

فائدہ: یعنی جو احکام حالت احرام یا احترام کعبہ وغیرہ کے متعلق دیے گئے اگر ان کی عمداً خلاف ورزی کرو گے تو سمجھ لو کہ خدا کا عذاب بہت سخت ہے اور بھول چوک سے کچھ تقصیر ہو جائے پھر کفارہ وغیرہ سے اس کی تلافی کرلو تو بیشک وہ بڑا بخشنے والا اور مہربان بھی ہے۔

مَا عَلَى الرَّسُوۡلِ اِلَّا الۡبَلٰغُ‌ ؕ وَاللّٰهُ يَعۡلَمُ مَا تُبۡدُوۡنَ وَمَا تَكۡتُمُوۡنَ ﴿۹۹﴾

رسول کے ذمہ نہیں مگر پہنچا دینا، اور اللہ کو معلوم ہے جو تم ظاہر میں کرتے ہو اور جو چھپا کر کرتے ہو

خلاصہ تفسیر: رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ذمہ تو صرف پہنچانا ہے (سو وہ خوب پہنچا چکے، اب تمہارے پاس کوئی عذر وحیلہ نہیں رہا) اور اللہ تعالیٰ سب جانتے ہیں جو کچھ تم (زبان یا جوارح سے) ظاہر کرتے ہو اور جو کچھ (دل میں) پوشیدہ رکھتے ہو (سو تم کو چاہیے کہ ظاہر وباطن دونوں سے اطاعت کرو)۔

❊ ❊ ❊

فائدہ: پیغمبر (علیہ السلام) نے خدا کا قانون اور پیام پہنچا کر اپنا فرض ادا کردیا اور خدا کی حجت بندوں پر تمام ہوچکی اب ظاہر وباطن میں جیسا عمل کرو گے وہ سب خدا کے سامنے ہے۔ حساب وجزا کے وقت ذرہ ذرہ تمہارے سامنے رکھ دیا جائے گا۔

قُلۡ لَّا يَسۡتَوِى الۡخَبِيۡثُ وَالطَّيِّبُ وَلَوۡ اَعۡجَبَكَ كَثۡرَةُ الۡخَبِيۡثِ‌ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰۤاُولِى

تو کہہ دے کہ برابر نہیں ناپاک اور پاک اگرچہ تجھ کو بھلی لگے ناپاک کی کثرت، سو ڈرتے رہو اللہ سے اے

الۡاَلۡبَابِ لَعَلَّكُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ ﴿۱۰۰﴾

عقل مندو! تاکہ تمہاری نجات ہو

خلاصہ تفسیر: آپ (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! ان سے یہ بھی) فرما دیجئے کہ ناپاک اور پاک (یعنی گناہ اور اطاعت یا گناہ کرنے والا اور اطاعت کرنے والا) برابر نہیں (بلکہ خبیث مبغوض ہے اور طیب مقبول ہے، پس اطاعت کرکے مقبول بننا چاہئے، نافرمانی کرکے مبغوض نہ ہونا چاہئے) اگرچہ (اے دیکھنے والے!) تجھ کو ناپاک کی کثرت (جیسا اکثر دنیا میں یہی واقع ہوتا ہے) تعجب میں ڈالتی ہو (کہ ناپسندیدہ ہونے کے باوجود گناہ وغیرہ خبیث چیزوں کا وجود کیوں زیادہ ہے، جیسا کہ دنیا میں اکثر یہی واقع ہوتا ہے، مگر سمجھ لو کہ کثرت یعنی زیادہ ہونا اچھے اور پسندیدہ ہونے کی دلیل نہیں، وہ کسی حکمت کی وجہ سے ہے، جب کثرت پر مدار نہیں، یا یہ کہ جب اللہ تعالیٰ کے علم وعقاب پر بھی مطلع ہوگئے) تو (اس کو مت دیکھو، بلکہ) خدا تعالیٰ (کے خلاف حکم کرنے) سے ڈرتے رہو اے عقل مندو! تاکہ تم (پورے طور سے) کامیاب ہو (کہ وہ جنت اور رضائے حق ہے)۔

قُلۡ لَّا يَسۡتَوِى الۡخَبِيۡثُ وَالطَّيِّبُ: اعداد وشمار کی کمی زیادتی کوئی چیز نہیں، کثرت وقلت سے کسی چیز کی اچھائی یا برائی کو نہیں جانچا جاسکتا،

انسانوں کے سر پر ہاتھ شمار کر کے اکیاون (51) ہاتھوں کو انچاس (49) کے مقابلہ میں حق وصداقت کا معیار نہیں کہا جاسکتا، بلکہ اگر دنیا کے ہر طبقہ کے حالات پر ذرا بھی نظر ڈالی جائے تو سارے عالم میں بھلائی کی مقدار اور تعداد کم اور برائی کی تعداد میں کثرت نظر آئے گی، ایمان کے مقابلہ میں کفر، تقویٰ و طہارت اور دیانت وامانت کے مقابلہ میں فسق وفجور، عدل وانصاف کے مقابلہ میں ظلم وجور، علم کے مقابلہ میں جہل، عقل کے مقابلہ میں بے عقلی کی کثرت کا مشاہدہ ہوگا، جس سے اس کا یقین لازمی ہوجاتا ہے کہ کسی چیز یا کسی جماعت کی تعدادی کثرت اس کے اچھے یا حق پر ہونے کی قطعا دلیل نہیں ہوسکتی، بلکہ کسی چیز کی اچھائی اور بہتری اس چیز اور اس جماعت کے ذاتی حالات وکیفیات پر دائر ہوتی ہے، حالات وکیفیات اچھی ہیں تو وہ اچھی اور بری ہیں تو بری ہیں، قرآن کریم نے اسی حقیقت کو وَلَوْ اَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيْثِ کے الفاظ میں واضح فرمادیا ہے۔

ہاں! عددی کثرت کو اسلام نے بھی بعض مواقع میں فیصلہ کن قرار دیا ہے وہ اس جگہ جہاں قوت دلیل اور ذاتی خوبیوں کے موازنہ کا فیصلہ کرنے والا کوئی صاحب اقتدار حاکم نہ ہو، ایسے موقع پر عوام کا جھگڑا چکانے کے لئے عددی کثرت کو ترجیح دے دی جاتی ہے، جیسے نصب امام کا مسئلہ ہے، وہاں کوئی امام وامیر فیصلہ کرنے والا موجود نہیں، اس لئے کثرت رائے کو بعض دفعہ قطع نزاع کے لئے ترجیح دے دی گئی، یہ ہرگز نہیں کہ جس چیز کو زیادہ تعداد کے لوگوں نے اختیار کرلیا وہی چیز حلال اور جائز اور حق ہے، چنانچہ آخر آیت میں ارشاد فرمایا: فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰۤاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ یعنی اے عقل والو! اللہ سے ڈرو، جس میں اشارہ فرمادیا کہ کسی چیز کی تعدادی کثرت کا مرغوب ہونا یا کثرت کو بمقابلہ قلت کے حق وصحیح کا معیار قرار دینا عقلاء کا کام نہیں، اسی لئے عقلاء کو خطاب کر کے ان کو اس غلط رویہ سے روکنے کے لئے فاتقوا اللہ کا حکم دیا گیا۔

قُلْ لَّا يَسْتَوِي الْخَبِيْثُ وَالطَّيِّبُ: اس میں اس بات پر دلالت ہے کہ اہل حق کے مقابلہ میں اہل باطل کی کثرت ان کے حق پر ہونے کی دلیل نہیں، اس سے دھوکہ نہیں کھانا چاہیے، تعداد میں زیادتی حق پر ہونے کی دلیل نہیں، اللہ کی عادت یہی رہی ہے کہ اہل حق تعداد میں کم ہی رہے۔

* * *

فائدہ: اس رکوع سے پہلے رکوع میں فرمایا تھا کہ طیبات کو حرام مت ٹھہراؤ بلکہ ان سے اعتدال کے ساتھ تمتع کرو، اس مضمون کی تکمیل کے بعد خمر وغیرہ چند ناپاک اور خبیث چیزوں کی حرمت بیان فرمائی، اسی سلسلے میں محرم کے شکار کو حرام کیا، یعنی جس طرح خمر میتۃ وغیرہ خبیث چیزیں ہیں اسی طرح محرم کے شکار کو سمجھو محرم کی مناسبت سے چند ضمنی چیزوں کا بیان فرمانے کے بعد اب متنبہ فرماتے ہیں کہ طیب اور خبیث یکساں نہیں ہوسکتے، تھوڑی چیز اگر طیب وحلال ہو وہ بہت سی خبیث وحرام چیز سے بہتر ہے، عقلمند کو چاہیے کہ ہمیشہ طیب وحلال کو اختیار کرے، گندی اور خراب چیزوں کی طرف خواہ وہ دیکھنے میں کتنی ہی زیادہ ہوں اور بھلی لگیں نظر نہ اٹھائے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْـَٔلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ ۚ وَاِنْ تَسْـَٔلُوْا عَنْهَا

اے ایمان والو! مت پوچھو ایسی باتیں کہ اگر تم پر کھولی جائیں تو تم کو بری لگیں، اور اگر پوچھو گے یہ باتیں

حِيْنَ يُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ تُبْدَ لَكُمْ ؕ عَفَا اللّٰهُ عَنْهَا ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۰۱﴾

ایسے وقت میں کہ قرآن نازل ہو رہا ہے تو تم پر ظاہر کردی جائیں گی؎ اللہ نے ان سے درگزر کی ہے؎ اور اللہ بخشنے والا تحمل والا ہے

خلاصہ تفسیر: پیچھے نازل شدہ احکام میں مخالفت، غلو اور تساہل سے منع فرمایا تھا، اب غیر ضروری امور اور لایعنی سوالات کی بلاضرورت تفتیش اور کھود کرید کرنے کی ممانعت ہے جس میں غیر نازل شدہ احکام بھی داخل ہیں، پس اس مجموعہ سے اعتدال کے ساتھ اطاعت کرنے کا حکم نکل آیا کہ نہ اس قدر کوتاہی کرو کہ جن امور کا حکم ہوچکا ہے ان میں کوتاہی کرنے لگو، اور نہ اس قدر حد سے بڑھو کہ جن امور کا حکم نہیں ہوا اُس کے پیچھے پڑنے لگے، جیسے بعض لوگوں کی اب بھی عادت ہوتی ہے کہ دور از کار سوالات فرض کر کے علماء سے پوچھا کرتے ہیں۔

اے ایمان والو! ایسی (فضول) باتیں مت پوچھو (جن میں احتمال ہو کہ) اگر تم سے ظاہر کردی جائیں تو تمہاری ناگواری کا سبب ہو (یعنی یہ

احتمال ہو کہ جواب تمہاری منشاء کے خلاف آیا تو تمہیں ناگوار ہوگا) اور (جن میں یہ احتمال ہو کہ) اگر تم زمانہ نزول قرآن (اور وحی) میں ان باتوں کو پوچھو تو تم سے ظاہر کر دی جائیں (یعنی سوال کرنے میں تو یہ دوسرا احتمال ہو کہ جواب مل جائے لیکن جواب ملنے میں وہ پہلا احتمال ہو کہ ناگوار گذرے، اور یہ دونوں احتمال جو مجموعی طور پر سوال سے منع کرنے کی علت ہیں واقعی ہیں، پس ایسا سوال ممنوع ہے، خیر) سوالات گذشتہ (جو اس وقت تک کر چکے ہو وہ تو) اللہ تعالیٰ نے معاف کر دیئے (مگر آئندہ مت کرنا) اور اللہ تعالیٰ بڑی مغفرت والے ہیں (اس لئے گذشتہ سوالات معاف کر دیئے اور) بڑے حلم والے ہیں (اس لئے اگر آئندہ کی خلاف ورزی پر دنیا میں سزا نہ دے تو دھوکہ میں مت پڑ جانا کہ آگے بھی کوئی عذاب و سزا نہ ہوگی)۔

لَا تَسْـَٔلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ: سبب نزول اس آیت کا صحیحین میں چند واقعات ہیں کہ بعض نے آپ ﷺ سے پوچھا کہ میرا باپ کون ہے؟ اس شخص کے نسب میں لوگوں کو شبہ تھا، کسی نے پوچھا کہ میری اونٹنی گم ہوگئی ہے کہاں ہے؟ جب حضور ﷺ نے حج کی فرضیت بیان فرمائی تو ایک شخص نے پوچھا کیا ہر سال حج کرنا فرض ہے؟ حضور نے تین بار سکوت فرما کر ارشاد فرمایا کہ اگر میں ہاں کر دیتا تو ہر سال فرض ہو جاتا، پھر تم سے ہو نہ سکتا، پہلے لوگ یوں ہی ہلاک ہوئے کہ اپنے پیغمبروں سے پوچھ پاچھ زیادہ کی، پھر ان کے خلاف عمل کیا، میں جو بتلادوں کر لیا کرو، اور جس چیز سے منع کروں باز رہا کرو، یعنی جس معاملہ میں شبہ کی کوئی وجہ نہ ہو اس کو مت پوچھا کرو، کیونکہ ایک حدیث میں ہے کہ بڑا مجرم وہ شخص ہے کہ ایسی چیز کے متعلق سوال کیا جو حرام نہ تھی، پھر اس کے پوچھنے سے حرام ہوگئی، مثلاً جو معاملات احکام یعنی حلال و حرام کے متعلق ہیں ان میں گذشتہ حدیث کے مطابق جواب میں حرمت کا یا فرضیت کا احتمال ہے جس سے گرانی ہو سکتی ہے، اور جو معاملات واقعات کی قبیل سے ہیں ان میں مرضی کے خلاف جواب آنے کا احتمال ہے جیسے نسب کے بارے میں سوال کیا کہ میرا باپ کون ہے؟ ممکن ہے کہ جواب مرضی کے خلاف ملتا تو رسوائی ہوتی، پھر اس سوال پر ندامت اور جواب سے ناگواری ہوتی، اور واقعات کے بارے میں ایسے سوال کرنے سے اطاعت اور ادب میں بھی کمی ہو جاتی ہے، چنانچہ بخاری میں یہ بھی ہے کہ بعض استہزاء کے طور پر پوچھتے تھے، پس یہ آیت سوال اور جواب کی سب اقسام کو شامل ہے اور حضور ﷺ کے بعد علماء سے ایسے سوالات سے ممانعت کی وجہ وقت کا ضائع کرنا اور جواب دینے والے کو تنگی میں ڈالنا ہے، رہا یہ معاملہ کہ حضرات فقہاء نے خود ہی بہت سی مفروضہ صورتیں مسائل کی نکال کر اور سوالات قائم کر کے ان کے احکام بیان کر دیئے ہیں سو یہ بے ضرورت چیز نہ تھی، آنے والے واقعات نے بتلا دیا کہ آئندہ نسلوں کو ان کی ضرورت تھی، اس لئے وہ فضول اور لایعنی سوالات نہ تھے، اسلام کی تعلیمات میں یہ بھی ایک تعلیم ہے کہ علم ہو یا عمل کوئی کام ہو یا کلام جب تک اس میں کوئی دینی یا دنیوی فائدہ پیش نظر نہ ہو اس میں لگ کر وقت ضائع نہ کریں۔

یہاں آیت کے خلاصہ تفسیر میں ممنوعہ سوالات میں "فضول" کی اس لیے لگائی کہ ضرورت کی بات پوچھنے کا مضائقہ نہیں، مثلاً جب بعض عورتوں کی عدت کا حکم نازل ہوا اور بعض کا نہیں ہوا، تو صحابہ نے اس کے متعلق پوچھا تو بلا عتاب اس آیت میں جواب نازل ہوا: **واللائی یئسن من المحیض من نسائکم ان ارتبتم، الخ۔**

***

فائدہ: وَاِنْ تَسْـَٔلُوْا عَنْهَا حِيْنَ يُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ تُبْدَ لَكُمْ: پچھلے دو رکوع کا حاصل احکام دینیہ میں غلو اور تساہل سے روکنا تھا، یعنی جو طیبات خدا نے حلال کی ہیں ان کو اپنے اوپر حرام مت ٹھہراؤ اور جو چیزیں خبیث و حرام ہیں خواہ دائمی طور پر یا خاص احوال و اوقات میں ان سے پوری طرح اجتناب کرو، ان آیات میں تنبیہ فرما دی کہ جو چیزیں شارع نے تصریحاً بیان نہیں فرمائیں، ان کے متعلق فضول اور دور از کار سوالات مت کیا کرو، جس طرح تحلیل و تحریم کے سلسلہ میں شارع کا بیان موجب ہدایت و بصیرت ہے، اس کا سکوت بھی ذریعہ رحمت و سہولت ہے، خدا نے جس چیز کو کمال حکمت و عدل سے حلال یا حرام کر دیا وہ حلال یا حرام ہوگئی اور جس سے سکوت کیا اس میں گنجائش اور توسیع رہی، مجتہدین کو اجتہاد کا موقع ملا عمل کرنے والے اس کے فعل و ترک میں آزاد رہے، اب اگر ایسی چیزوں کی نسبت خواہ مخواہ کھود کرید اور بحث و سوال کا دروازہ کھولا جائے گا بحالیکہ قرآن شریف نازل ہو رہا ہے اور تشریع کا باب مفتوح ہے تو بہت ممکن ہے کہ سوالات کے جواب میں بعض ایسے احکام نازل ہو جائیں جن کے بعد تمہاری یہ آزادی اور گنجائش اجتہاد باقی نہ رہے، پھر یہ سخت شرم

کی بات ہوگی کہ جو چیز خود مانگ کر لی ہے اس کو نباہ نہ سکیں۔

سنت اللہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ جب کسی معاملہ میں بکثرت سوال اور کھود کرید کی جائے اور خواہ مخواہ شکوک اور احتمالات نکالے جائیں تو ادھر سے تشدید (سختی) بڑھتی جاتی ہے، کیونکہ اس طرح کے سوالات ظاہر کرتے ہیں کہ گویا سائلین کو اپنے نفس پر بھروسہ ہے اور جو حکم ملے گا اس کے اٹھانے کے لئے وہ بہمہ وجوہ تیار ہیں، اس قسم کا دعویٰ جو بندہ کے ضعف وافتقار کے مناسب نہیں مستحق بنا دیتا ہے کہ ادھر سے حکم میں کچھ سختی ہو اور جتنا یہ اپنے کو قابل ظاہر کرتا ہے اسی کے موافق امتحان بھی سخت ہو، چنانچہ بنی اسرائیل کے ''ذبح بقرہ'' والے قصہ میں ایسا ہی ہوا۔

حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اے لوگوں خدا نے تم پر حج فرض کیا ہے ایک شخص بول اٹھا کیا ہر سال یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) فرمایا اگر میں (ہاں) کہہ دیتا تو ہر سال واجب ہو جاتا پھر تم ادا نہ کر سکتے، جس چیز میں تم کو ''آزاد'' چھوڑوں تم بھی مجھ کو چھوڑ دو، ایک حدیث میں فرمایا کہ مسلمانوں میں وہ شخص بڑا مجرم ہے جس کے سوالات کی بدولت ایسی چیز حرام کی گئی جو حرام نہ تھی، بہرحال یہ آیت احکام شرعیہ کے باب میں اس طرح کے دوراز کار اور بے ضرورت سوالات کا دروازہ بند کرتی ہے، باقی بعض احادیث میں جو یہ مذکور ہے کہ کچھ لوگ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) سے جزئی واقعات کے متعلق لغو سوال کرتے تھے ان کو روکا گیا وہ ہماری تقریر کے مخالف نہیں، ہم لَا تَسْـَٔلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ میں اشیاء کو عام رکھتے ہیں جو واقعات واحکام دونوں کو شامل ہے اور تَسُؤْكُمْ میں بھی جو برا لگنے کے معنی پر مشتمل ہے تعمیم رکھی جائے، حاصل یہ ہوگا کہ نہ احکام کے باب میں فضول سوالات کیا کرو اور نہ واقعات کے سلسلہ میں، کیونکہ ممکن ہے جو جواب آئے وہ تم کو ناگوار ہو، مثلاً کوئی سخت حکم آیا یا کوئی قید بڑھ گئی، یا ایسے واقعہ کا اظہار ہوا جس سے تمہاری فضیحت ہو، یا بیہودہ سوالات پر ڈانٹ بتلائی گئی، یہ سب احتمالات تَسُؤْكُمْ کے تحت میں داخل ہیں، باقی ضروری بات پوچھنے یا شبہ ناشی عن دلیل کے رفع کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

فائدہ: ۲۔ عَفَا اللّٰهُ عَنْهَا: یا تو مراد یہ ہے کہ ان اشیاء سے درگزر کی، یعنی جب خدا نے ان کے متعلق کوئی حکم نہ دیا تو انسان ان کے بارے میں آزاد ہے خدا ایسی چیزوں پر گرفت نہ کرے گا، چنانچہ اسی سے بعض علمائے اصول نے یہ مسئلہ نکالا ہے کہ اصل اشیاء میں اباحت ہے اور یا یہ کہ ان فضول سوالات سے جو پہلے کر چکے ہو اللہ نے درگزر کی آئندہ احتیاط رکھو۔

قَدْ سَاَلَهَا قَوْمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ثُمَّ اَصْبَحُوْا بِهَا كٰفِرِيْنَ ﴿۱۰۲﴾

ایسی باتیں پوچھ چکی ہے ایک جماعت تم سے پہلے پھر ہو گئے ان باتوں سے منکر

خلاصہ تفسیر: ایسی باتیں تم سے پہلے (زمانہ میں) اور (امتوں کے) لوگوں نے بھی (اپنے پیغمبروں سے) پوچھی تھیں، پھر (ان کو جواب ملا تو) ان باتوں کا حق نہ بجالائے (یعنی ان جوابوں میں جو احکام کے متعلق تھے ان کے موافق عمل نہ کیا، اور جو واقعات کے متعلق تھے ان سے متاثر نہ ہوئے، پس کہیں تم کو بھی ایسی ہی نوبت نہ پیش آئے، اس لئے بہتری اسی میں ہے کہ ایسے سوالات چھوڑ دو)۔

روح المعانی میں منقول ہے کہ بنی اسرائیل انبیاء علیہم السلام سے بہت باتیں پوچھتے اور جب وہ بتلاتے تو ان کو جھٹلایا کرتے، جیسے گذشتہ آیت میں حدیث کا مضمون آیا ہے کہ انبیاء علیہم السلام سے بکثرت پوچھتے، پھر جواب ملنے پر اس کے خلاف کرتے۔

* * *

فائدہ: حدیث صحیح میں ہے کہ پہلی قومیں کثرت سوال اور انبیاء سے اختلاف کرنے کی بدولت ہلاک ہوئیں۔

مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْۢ بَحِيْرَةٍ وَّلَا سَآئِبَةٍ وَّلَا وَصِيْلَةٍ وَّلَا حَامٍ ۙ وَّلٰكِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا

نہیں مقرر کیا اللہ نے بحیرہ اور نہ سائبہ اور نہ وصیلہ اور نہ حامی لیکن کافر

يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ وَاَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۱۰۳﴾

باندھتے ہیں اللہ پر بہتان، اوران میں اکثروں کو عقل نہیں

خلاصہ تفسیر: پیچھے بعض اعمال کا گناہ و نافرمانی ہونا مذکور تھا، اب بعض اعمال کا کفر و شرک ہونا بیان کیا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے نہ بحیرہ کو مشروع کیا ہے اور نہ سائبہ کو اور نہ وصیلہ کو اور نہ حام کو لیکن جو لوگ کافر ہیں وہ (ان رسوم کے بارے میں) اللہ تعالیٰ پر جھوٹ لگاتے ہیں (کہ خدا تعالیٰ ان اعمال سے خوش ہیں) اور اکثر کافر (دین کی) عقل نہیں رکھتے، اور (اس سے کام نہیں لیتے، بلکہ محض اپنے بڑوں کی دیکھا دیکھی ایسی جہالتیں کرتے ہیں)۔

مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْۢ بَحِيْرَةٍ: یعنی ان چیزوں کو مشروع نہیں فرمایا، اس میں اہل جاہلیت کی اس بدعت کو باطل کیا گیا ہے کہ بعض چیزوں کو غیر اللہ کے نامزد کر دیتے ہیں، جیسا اب بھی بعض جہلاء ارواح طیبہ کے ساتھ تقرب حاصل کرنے کی نیت سے ایسا کرتے ہیں۔

* * *

فائدہ: بحیرہ، صائبہ، وسیلہ، حامی یہ سب زمانہ جاہلیت کے رسوم و شعائر سے متعلق ہیں، مفسرین نے ان کی تفسیر میں بہت اختلاف کیا ہے، ممکن ہے ان میں سے ہر ایک لفظ کا اطلاق مختلف صورتوں پر ہوتا ہو ہم صرف سعید بن المسیبؒ کی تفسیر صحیح بخاری سے نقل کرتے ہیں:

بحیرہ: جس جانور کا دودھ بتوں کے نام کر دیتے تھے کوئی اپنے کام میں نہ لاتا تھا۔

سائبہ: جو جانور بتوں کے نام پر ہمارے زمانے کے سانڈھ کی طرح چھوڑ دیا جاتا تھا۔

وصیلہ: جو اونٹنی مسلسل مادہ بچہ جنے درمیان میں نر بچہ پیدا نہ ہوا سے بھی بتوں کے نام پر چھوڑ دیتے تھے۔

حامی: نر اُونٹ جو ایک خاص عدد سے جفتی کر چکا ہوا سے بھی بتوں کے نام پر چھوڑتے تھے۔

علاوہ اس کے کہ یہ چیزیں شعائر شرک میں سے تھیں، جس جانور کے گوشت یا دودھ یا سواری وغیرہ سے منتفع ہونے کو حق تعالیٰ نے جائز رکھا اس کی حلت و حرمت پر اپنی طرف سے قیود لگانا، گویا اپنے لئے منصب تشریع کو تجویز کرنا تھا اور بڑی ستم ظریفی یہ تھی کہ اپنی ان مشرکانہ رسوم کو حق تعالیٰ کی خوشنودی اور قربت کا ذریعہ تصور کرتے تھے، اس کا جواب دیا گیا کہ اللہ نے ہرگز یہ رسوم مقرر نہیں کیں، ان کے بڑوں نے خدا پر یہ بہتان باندھا اور اکثر بے عقل عوام نے اسے قبول کر لیا، الغرض یہاں تنبیہ کی گئی کہ جس طرح فضول و بے کار سوالات کر کے احکام شرعیہ میں تنگی اور سختی کرانا جرم ہے اس سے کہیں بڑھ کر یہ جرم ہے کہ بدون حکم شارع کے محض اپنی آراء و اہواء سے حلال و حرام تجویز کر لئے جائیں۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ قَالُوْا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ

اور جب کہا جاتا ہے ان کو آؤ اس کی طرف جو کہ اللہ نے نازل کیا اور رسول کی طرف تو کہتے ہیں ہم کو کافی ہے وہ جس پر پایا ہم نے

اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ﴿۱۰۴﴾

اپنے باپ دادوں کو، بھلا اگر ان کے باپ دادے نہ کچھ علم رکھتے ہوں اور نہ راہ جانتے ہوں تو بھی ایسا ہی کریں گے

خلاصہ تفسیر: جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو احکام نازل فرمائے ہیں ان کی طرف اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف (جن پر وہ احکام نازل ہوئے ہیں) رجوع کرو (جو بات اس سے حق ثابت ہو حق سمجھو، جو باطل ہو باطل سمجھو) تو کہتے ہیں کہ ہم کو (ان احکام اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ضرورت نہیں، ہمیں) وہی (طریقہ) کافی ہے جس پر ہم نے اپنے بڑوں کو دیکھا ہے (حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ) کیا (وہ طریقہ ان کے لئے

ہر حال میں کافی ہے) اگر چہ ان کے بڑے (دین کی) نہ کچھ سمجھ رکھتے ہوں اور نہ (کسی آسمانی کتاب کی) ہدایت رکھتے ہوں۔

اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْئًا: اس آیت سے جس طرح باپ دادوں کی اندھی تقلید و اتباع کی مذمت ثابت ہوئی، اسی طرح جائز تقلید و اتباع کے شرائط اور ایک ضابطہ بھی معلوم ہو گیا جس کی طرف دو لفظوں میں اشارہ فرمایا ہے: لَا يَعْلَمُوْنَ اور لَا يَهْتَدُوْنَ، کیونکہ اس سے معلوم ہوا کہ ان آباء و اجداد کی تقلید و اتباع کو اس لئے منع کیا گیا ہے کہ ان کے پاس نہ "علم" تھا اور نہ "ہدایت"، جو لوگ فقہاء و ائمہ مجتہدین کی تقلید کے خلاف اس طرح کی آیات پڑھ دیتے ہیں وہ خود ان آیات کے صحیح مدلول سے واقف نہیں، بلکہ اس آیت سے فقہاء دین کی تقلید کی تائید اور تقویت ہوتی ہے، امام قرطبیؒ نے فرمایا ہے کہ ان جیسی آیات میں تقلید آبائی کے ممنوع ہونے کا جو ذکر ہے اس سے مراد باطل عقائد و اعمال میں آباء و اجداد کی تقلید کرنا ہے، صحیح عقائد و اعمال صالحہ میں تقلید کرنا اس میں داخل نہیں، یعنی آباء کی تقلید باطل کاموں میں حرام ہے، البتہ حق کاموں میں جائز بلکہ مستحسن ہے، ایسی ہی ایک آیت دوسرا پارہ میں سورہ بقرہ آیت ۱۷۰: وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ گزر چکی ہے جس میں ائمہ مجتہدین کی تقلید کی تحقیق ہے مزید تفصیل وہاں ملاحظہ فرما لیا جائے۔

* * *

فائدہ: جاہلوں کی سب سے بڑی حجت یہ ہی ہوتی ہے کہ جو کام باپ دادا سے ہوتا آیا ہے اس کا خلاف کیسے کریں، ان کو بتلایا گیا کہ اگر تمہارے اسلاف بے عقلی یا بے راہی سے قعر ہلاکت میں جا گرے ہوں تو کیا پھر بھی تم ان ہی کی راہ چلو گے؟ حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: "باپ کا حال معلوم ہو کہ حق کا تابع اور صاحب علم تھا تو اس کی راہ پکڑے نہیں تو عبث ہے" یعنی کیف ما اتفق ہر کسی کی کورانہ تقلید جائز نہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ ۚ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ ؕ

اے ایمان والو تم پر لازم ہے فکر اپنی جان کا، تمہارا کچھ نہیں بگاڑتا جو کوئی گمراہ ہوا جب کہ تم ہوئے راہ پر[1]

اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۰۵﴾

اللہ کے پاس لوٹ کر جانا ہے تم سب کو پھر وہ جتلائے گا تم کو جو کچھ تم کرتے تھے[2]

خلاصہ تفسیر: پیچھے کفار کی رسم پرستی اور جہالت کا ذکر تھا، اور ان کی ایسی جہالتیں بکثرت تھیں جن کو سن کر مؤمنین کو رنج اور افسوس ہوتا تھا، اس لئے آگے مؤمنین کو اس کے متعلق ارشاد ہے کہ تم کیوں اس غم میں پڑے ہو، تم کو اپنی اور دوسرے کی اصلاح میں بقدر وسعت و قدرت کوشش کرنے کا حکم ہے، باقی کوشش پر نتیجہ و ثمرہ مرتب ہونا تمہارے اختیار سے باہر ہے، اس لئے "کار خود کن، کار بیگانہ مکن" پر عمل کرو۔

اے ایمان والو! اپنی (اصلاح کی) فکر کرو (اصل کام تمہارے ذمہ یہی ہے، باقی دوسروں کی اصلاح کے متعلق یہ ہے کہ جب تم اپنی طرف سے اپنی قدرت کے مطابق اصلاح کی کوشش کر رہے ہو مگر دوسرے پر اثر نہیں ہوتا تو تم نتیجہ مرتب نہ ہونے کی فکر میں نہ پڑو کیونکہ) جب تم (دین کی) راہ پر چل رہے ہو (اور واجبات دین کو اس طرح ادا کر رہے ہو کہ اپنی بھی اصلاح کر رہے ہو اور دوسروں کی اصلاح میں بھی کوشش کر رہے ہو) تو جو شخص (باوجود تمہاری اصلاح کی کوشش کے بعد بھی) گمراہ رہے تو اس (کے گمراہ رہنے) سے تمہارا کوئی نقصان نہیں (اور جیسا کہ دوسروں کی اصلاح وغیرہ میں حد سے زیادہ فکر و غم سے منع کیا جاتا ہے اسی طرح ہدایت سے ناامید ہونے کی صورت میں غصہ میں آ کر یہ تمنا مت کرنا کہ دنیا ہی میں ان پر عذاب نازل ہو کر حق و باطل کا فیصلہ ہو جائے، کیونکہ یہ تو آخرت میں ہوگا، چنانچہ) اللہ ہی کے پاس تم سب کو جانا ہے پھر وہ تم سب کو بتلا دیں گے جو کچھ تم سب کیا کرتے تھے (اور جتلا کر حق پر ثواب اور باطل پر عذاب کا حکم نافذ فرما دیں گے)۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ: اس آیت کے ظاہری الفاظ سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ جو شخص خود دین پر عمل کرتا رہے اس کے ذمہ

دوسروں کو نیک کام کا حکم کرنا اور برے کاموں سے روکنا واجب نہیں، یعنی ہر انسان کو صرف اپنے عمل اور اپنی اصلاح کی فکر کافی ہے، دوسرے کچھ بھی کرتے رہیں اس پر دھیان دینے کی ضرورت نہیں، لیکن یہ بات قرآن کریم کی بیشمار تصریحات کے خلاف ہے، جن میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو اسلام کا اہم فریضہ اور اس امت کی امتیازی خصوصیات قرار دیا ہے، اسی لئے اس آیت کے نازل ہونے پر کچھ لوگوں کو شبہات پیش آئے، رسول کریم ﷺ سے سوالات کئے گئے، آپ ﷺ نے توضیح فرمائی کہ یہ آیت احکام امر بالمعروف کے منافی نہیں، امر بالمعروف کو چھوڑ دو گے تو مجرموں کے ساتھ تم بھی ماخوذ ہو گے، اسی لئے تفسیر بحر محیط میں حضرت سعید ابن جبیرؒ سے آیت کی یہ تفسیر نقل کی ہے کہ "تم اپنے واجبات شرعیہ کو ادا کرتے رہو، جن میں جہاد اور امر بالمعروف بھی داخل ہے، یہ سب کچھ کرنے کے بعد بھی جو لوگ گمراہ رہیں تو تم پر کوئی نقصان نہیں" یہاں قرآن کریم کے الفاظ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ میں غور کریں، تو یہ تفسیر خود واضح ہو جاتی ہے، کیونکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ جب تم راہ پر چل رہے ہو تو دوسروں کی گمراہی تمہارے لئے مضر نہیں، اور ظاہر ہے کہ جو شخص امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کو ترک کر دے وہ راہ پر نہیں چل رہا ہے۔

آیت کے ظاہری الفاظ سے سرسری نظر میں جو شبہ ہو سکتا تھا اسی کے پیش نظر حضرت صدیق اکبرؓ نے ایک خطبہ میں ارشاد فرمایا کہ تم لوگ اس آیت کو پڑھتے ہو اور اس کو بے موقع استعمال کرتے ہو کہ امر بالمعروف کی ضرورت نہیں، خوب سمجھ لو کہ میں نے خود رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ جو لوگ کوئی گناہ ہوتا ہوا دیکھیں اور (مقدور بھر) اس کو روکنے کی کوشش نہ کریں تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ مجرموں کے ساتھ ان دوسرے لوگوں کو بھی عذاب میں پکڑ لے، یہ روایت ترمذی، ابن ماجہ میں موجود ہے اور ابوداؤد کے الفاظ میں اس طرح ہے کہ جو لوگ کسی ظالم کو ظلم کرتے ہوئے دیکھیں اور اس کو ظلم سے (اپنی قدرت کے موافق) نہ روکیں تو اللہ تعالیٰ سب کو عذاب میں پکڑ لیں گے۔

لَا يَضُرُّكُمْ فرمایا، یعنی اس کی گمراہی سے تمہارا کوئی نقصان نہیں، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ صحابہ کو ضرر و نقصان کا احتمال تھا، کیونکہ آیت: لا تزر وازرۃ وزر اخرٰی کا مضمون صاف اور عقلی بھی ہے، بلکہ ان کے غم کو ہلکا کرنے کے لیے اس مضمون میں تامل اور اس سے استدلال کرنے کا حکم فرمانا مقصود ہے کہ جب یہ امر یقینی ہے تو تم کو چاہیے اس پر نظر کر کے بے غم رہو، اگرچہ ایسی حالت میں کسی کے غم میں پڑنا غیر نافع ہے لیکن ممانعت کیوں فرمائی؟ سو اس کی وجہ تو یہی کافی ہے کہ جب غیر نافع ہے تو لا یعنی ہوا، اور لا یعنی کا ترک مطلوب ہے، دوسرے تجربہ سے معلوم ہوا کہ ایسی فکروں میں پڑنے سے بعض اوقات اپنے ضروری اور مطلوبہ شرعی مقاصد میں خلل آجاتا ہے، واللہ اعلم۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ: بعض تفاسیر جیسے کہ روح المعانی میں ہے کہ اس میں کفار و فساق کی حالت پر زیادہ افسوس اور حسرت کرنے سے ایمان والوں کو منع کیا گیا ہے، اور یہی عارفین کا طریقہ ہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کر چکنے کے بعد کسی کے زیادہ پیچھے نہیں لگتے، چنانچہ کسی کو برائی میں دیکھ کر اس کو اچھائی کا حکم کر دینا اور برائی سے منع کر دینا کافی ہے، پیچھے پڑ جانا درست نہیں، ہماری ذمہ داری صحیح بات پہنچاتے رہنا ہے، کرنا یا نہ کرنا اس کے اختیار میں ہے۔

***

فائدہ: لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ: یعنی اگر کفار رسوم شرکیہ اور آباؤ اجداد کی اندھی تقلید سے باوجود اس قدر نصیحت و فہمائش کے باز نہیں آتے تو تم زیادہ اس غم میں مت پڑو، کسی کی گمراہی سے تمہارا کوئی نقصان نہیں بشرطیکہ تم سیدھی راہ پر چل رہے ہو، سیدھی راہ یہی ہے کہ آدمی ایمان و تقویٰ اختیار کرے، خود برائی سے رکے اور دوسروں کو روکنے کی امکانی کوشش کرے پھر بھی اگر لوگ برائی سے نہ رکیں تو اس کا کوئی نقصان نہیں۔

اس آیت سے یہ سمجھ لینا کہ جب ایک شخص اپنا نماز روزہ ٹھیک کر لے تو امر بالمعروف چھوڑ دینے سے اسے کوئی مضرت نہیں ہوتی، سخت غلطی ہے، لفظ اهتداء امر بالمعروف وغیرہ تمام وظائف ہدایت کو شامل ہے، اس آیت میں گو روئے سخن بظاہر مسلمانوں کی طرف ہے لیکن ان کفار کو بھی متنبہ کرنا ہے جو باپ دادا کی کورانہ تقلید پر اڑے ہوئے تھے، یعنی اگر تمہارے باپ دادا راہ حق سے بھٹک گئے تو ان کی تقلید میں اپنے کو جان بوجھ کر کیوں ہلاک کرتے ہو، انہیں چھوڑ کر تم اپنی عاقبت کی فکر کرو اور نفع و نقصان کو سمجھو، باپ دادا اگر گمراہ ہوں اور اولاد ان کے خلاف راہ حق پر چلنے لگے تو آباؤ اجداد کی یہ مخالفت اولاد کو قطعاً مضر نہیں، یہ خیالات محض جہالت کے ہیں کہ کسی حال میں بھی آدمی باپ دادا کے طریقہ سے قدم باہر نہ رکھے، رکھے گا تو ناک کٹ

جائے گی، عقلمند کو چاہیے کہ انجام کا خیال کرے، سب اگلے پچھلے جب خدا کے سامنے اکٹھے پیش ہوں گے تب ہر ایک کو اپنا عمل اور انجام نظر آ جائے گا۔

فائدہ: ۲ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ: یعنی جو گمراہ رہا اور جس نے راہ پائی سب کے نیک و بد اعمال اور انکے نتائج سامنے کر دیئے جائیں گے۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ حِينَ الْوَصِيَّةِ اثْنَانِ

اے ایمان والو گواہ درمیان تمہارے جب کہ پہنچے کسی کو تم میں موت وصیت کے وقت دو شخص

ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ أَوْ آخَرَانِ مِنْ غَيْرِكُمْ إِنْ أَنْتُمْ ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ فَأَصَابَتْكُمْ

معتبر ہونے چاہئیں ۱ تم میں سے ۲ یا دو شاہد اور ہوں تمہارے سوا ۳ اگر تم نے سفر کیا ہو ملک میں پھر پہنچے تم کو

مُّصِيبَةُ الْمَوْتِ ۚ تَحْبِسُونَهُمَا مِنْ بَعْدِ الصَّلَاةِ فَيُقْسِمَانِ بِاللَّهِ إِنِ ارْتَبْتُمْ لَا نَشْتَرِي

مصیبت موت کی تو کھڑا کرو ان دونوں کو بعد نماز کے ۴ وہ دونوں قسم کھاویں اللہ کی اگر تم کو شبہ پڑے کہیں کہ ہم نہیں لیتے

بِهِ ثَمَنًا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَىٰ ۙ وَلَا نَكْتُمُ شَهَادَةَ اللَّهِ إِنَّا إِذًا لَّمِنَ الْآثِمِينَ ﴿١٠٦﴾

قسم کے بدلے مال اگرچہ کسی کو ہم سے قرابت بھی ہو، اور ہم نہیں چھپاتے اللہ کی گواہی نہیں تو ہم بیشک گناہ گار ہیں ۵

خلاصہ تفسیر: پیچھے دینی مصلحت کے متعلق بعض احکام تھے، آگے دنیوی مصلحت کے متعلق بعض احکام ہیں، اور ان دونوں کو ساتھ ساتھ لانے سے دو باتوں پر اشارہ ہو گیا: ① ایک یہ کہ دونوں قسم کے احکام عمل کے واجب ہونے میں برابر ہیں ② دوسرے یہ کہ حق تعالیٰ اپنی رحمت سے اصلاح آخرت کی طرح اپنے بندوں کی معاش کی اصلاح بھی فرماتے ہیں، یعنی گذشتہ آیت میں حفاظت دین کا حکم تھا، اب حفاظت مال کا طریقہ تعلیم فرماتے ہیں، چنانچہ اس جگہ قانون وصیت و وراثت کا بیان مختلف پہلوؤں سے آ رہا ہے۔

مذکورہ آیت کے نزول کا واقعہ یہ ہے کہ ایک شخص "بدیل" نامی جو مسلمان تھا دو شخصوں تمیم وعدی کے ساتھ جو اس وقت نصرانی تھے تجارت کی غرض سے ملک شام کی طرف گیا، شام پہنچ کر بدیل بیمار ہو گیا، اس نے اپنے مال کی فہرست لکھ کر اسباب میں رکھ دی، اور اپنے دونوں رفیقوں کو اطلاع نہ کی، مرض جب زیادہ بڑھا، تو بدیل نے دونوں نصرانی رفقاء کو وصیت کی کہ میرا سب سامان میرے وارثوں کو پہنچا دینا، انہوں نے سب سامان لا کر وارثوں کے حوالہ کر دیا، مگر چاندی کا ایک پیالہ جس پر سونے کا ملمع یا نقش ونگار تھا اس میں سے نکال لیا، وارثوں کو سامان میں سے فہرست دستیاب ہوئی، انہوں نے اوصیاء سے پوچھا کہ میت نے کچھ مال فروخت کیا تھا یا کچھ زیادہ بیمار رہا کہ معالجہ وغیرہ میں خرچ ہوا ہو، ان دونوں نے اس کا جواب نفی میں دیا، آخر معاملہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت میں پیش ہوا، اس وقت مذکورہ بالا پہلی آیت: يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ نازل ہوئی۔

اے ایمان والو! تمہارے آپس (کے معاملات) میں (مثلاً ورثاء کو مال سپرد کرنے کے لئے بطور گواہی) دو شخص وصی ہونا مناسب ہے (اگرچہ بالکل وصی نہ بنانا بھی جائز ہے) جب تم میں سے کسی کو موت آنے لگے (یعنی) جب وصیت کرنے کا وقت ہو (اور) وہ دو شخص ایسے ہوں کہ دیندار ہوں، اور تم میں سے (یعنی مسلمانوں میں سے) ہوں، یا غیر قوم کے دو شخص ہوں، اگر (مسلمان نہ ملیں مثلاً) تم کہیں سفر میں گئے ہو پھر تم پر واقعہ موت کا پڑ جائے (پس تم ان دونوں کو وصیت کر کے ان کو اپنی وصیت پر گواہ بنا لیا کرو، اور یہ سب امور واجب نہیں، مگر مناسب اور بہتر ہیں، ورنہ جس طرح بالکل وصی نہ بنانا جائز ہے، اسی طرح اگر ایک وصی ہو یا عادل نہ ہو، یا حالت حضر میں غیر مسلم کو بنا دے تو یہ سب بھی جائز ہے)۔

(پھر جن دو آدمیوں کو وصی بنایا ہے ان کا یہ حکم ہے کہ) اگر (کسی وجہ سے ان پر) تم کو (اے ورثاء! خیانت کا) شبہ ہو تو (اے حکام مقدمہ! اس طرح فیصلہ کرو کہ پہلے ورثاء سے چونکہ وہ مدعی ہیں اس بات پر گواہ طلب کر لو کہ انہوں نے فلاں چیز مثلاً پیالہ لے لیا ہے، اور اگر وہ گواہ نہ لا سکیں تو ان

اوصیاء سے چونکہ وہ مدعا علیہ ہیں اس طرح قسم لو کہ) ان دونوں (وصیوں) کو بعد نماز (عصر مثلاً) روک لو (کیونکہ اکثر اس وقت مجمع زیادہ ہوتا ہے، تو جھوٹی قسم کھانے والا کچھ نہ کچھ شرماتا ہے، نیز وقت بھی معظم ہے کچھ اس کا بھی خیال ہوتا ہے، متبرک وقت اور لوگوں کی موجودگی سے قسم کی قوت اور اہمیت کو مزید بڑھا دینا ہے) پھر دونوں (اس طرح) خدا کی قسم کھائیں کہ (صیغہ حلف کے ساتھ یہ کہیں کہ) ہم اس قسم کے عوض کوئی (دنیا) کا نفع نہیں لینا چاہتے (کہ دنیا کا نفع حاصل کرنے کے لئے قسم میں سچ بولنے کو چھوڑ دیں) اگرچہ (اس واقعہ میں ہمارا) کوئی قرابت دار بھی (کیوں نہ) ہوتا (جس کے نفع کو اپنا نفع سمجھ کر ہم جھوٹی قسم کھاتے اور اب تو کوئی ایسا قریبی بھی نہیں، جب دوہری مصلحتوں کی وجہ سے بھی ہم جھوٹ نہ بولتے تو ایک مصلحت کے لئے ہم کیوں جھوٹ بولیں گے) اور اللہ کی (طرف سے جس) بات (کہنے کا حکم ہے اس) کو ہم پوشیدہ نہ کریں گے (ورنہ) ہم (اگر ایسا کریں تو) اس حالت میں سخت گنہگار ہوں گے (یہ قولی تاکید ہے جس سے سچ کے وجوب، جھوٹ کی حرمت اور عظمت الٰہیہ کا استحضار مقصود ہے جو جھوٹی قسم کھانے سے مانع ہو، اب ان دونوں تاکید کے بعد اگر حاکم کی رائے ہو تو بلا تاکید اصل مضمون کی قسم کھائیں، مثلاً ہم کو میت نے پیالہ نہیں دیا، اور اس پر مقدمہ کا فیصلہ کر دینا چاہئے، چنانچہ اس آیت کے واقعہ میں ایسا ہی ہوا، مزید واقعہ اگلی آیت میں آرہا ہے)۔

مسئلہ: میت جس شخص کو مال سپرد کر کے اس کے متعلق کسی کو دینے دلانے کیلئے کہہ جائے وہ ''وصی'' ہے، اور وصی ایک شخص بھی ہو سکتا ہے، اور زیادہ بھی۔

مسئلہ: وصی کا مسلمان اور عادل ہونا خواہ حالت سفر ہو یا حضر افضل ہے لازم نہیں۔

مسئلہ: تنازع میں جو امر زائد کا مثبت ہو وہ ''مدعی'' اور دوسرا ''مدعا علیہ'' کہلاتا ہے۔

مسئلہ: اوّل مدعی سے گواہ لئے جاتے ہیں، اگر شرعی ضابطہ کے موافق گواہ پیش کر دے تو مقدمہ کا فیصلہ اس کے حق میں جاتا ہے، اور اگر پیش نہ کر سکے تو مدعا علیہ سے قسم لی جاتی ہے اور مقدمہ وہ پاتا ہے، البتہ اگر قسم سے انکار کر جائے تو پھر مدعی مقدمہ پالیتا ہے۔

مسئلہ: قسم کی تاکید زمان یا مکان کے ساتھ جیسا کہ آیت مذکورہ میں کی گئی ہے، حاکم کی رائے پر ہے، لازم نہیں، اس آیت سے بھی لزوم ثابت نہیں ہوتا اور دوسری آیات و روایات سے اطلاق ثابت ہے۔

شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ: اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انتظام کی رعایت ہر کام میں ضروری ہے خواہ وہ دنیوی کام ہی کیوں نہ ہو، کیونکہ بد انتظامی سے اہل حقوق کے مصالح میں خلل پڑ جاتا ہے جو کہ معصیت ہے۔

* * *

فائدہ: ۱۔ اثْنَانِ ذَوَا عَدْلٍ: یعنی بہتر یہ ہے، باقی اگر دو نہ ہوں یا معتبر نہ ہوں تب بھی ''وصی'' بنا سکتا ہے اور ''گواہ'' سے مراد یہاں وصی ہے، اس کے اقرار و اظہار کو گواہی سے تعبیر فرمادیا۔

فائدہ: ۲۔ مِنْكُمْ: یعنی مسلمانوں میں سے۔

فائدہ: ۳۔ أَوْ آخَرَانِ مِنْ غَيْرِكُمْ: یعنی غیر مسلم۔

فائدہ: ۴۔ تَحْبِسُونَهُمَا مِنْ بَعْدِ الصَّلَاةِ: یعنی نماز عصر کے بعد کہ وہ وقت اجتماع اور قبول کا ہے شاید ڈر کر جھوٹی قسم نہ کھائیں، یا کسی نماز کے بعد، یا وصی جس مذہب کے ہوں ان کی نماز کے بعد۔

فائدہ: ۵۔ إِنَّا إِذًا لَّمِنَ الْآثِمِينَ: یعنی جب خدا کے پاس سب کو جانا ہے تو جانے سے پہلے سب کام ٹھیک کر لو، اسی میں سے ایک اہم کام ضروری امور کی وصیت اور اس کے متعلقات ہیں، ان آیات میں وصیت کا بہترین طریقہ تلقین فرمایا ہے، یعنی مسلمان اگر مرتے وقت کسی کو اپنا مال وغیرہ حوالہ کرے تو بہتر ہے کہ دو معتبر مسلمانوں کو گواہ کرے، مسلمان اگر نہ ملیں جیسے سفر وغیرہ میں اتفاق ہو جاتا ہے تو دو کافروں کو وصی بنائے پھر اگر وارثوں کو شبہ پڑ جائے کہ ان شخصوں نے کچھ مال چھپالیا اور وارث دعویٰ کر دیں اور دعوے کے ساتھ شاہد موجود نہ ہوں تو وہ دونوں شخص قسم کھائیں کہ ہم نے نہیں چھپایا اور ہم کسی طمع یا قرابت کی وجہ سے جھوٹ نہیں کہہ سکتے، اگر کہیں تو گنہگار ہیں۔

فَاِنْ عُثِرَ عَلٰۤى اَنَّهُمَا اسْتَحَقَّاۤ اِثْمًا فَاٰخَرٰنِ يَقُوْمٰنِ مَقَامَهُمَا مِنَ الَّذِيْنَ اسْتَحَقَّ

پھر اگر خبر ہو جاوے کہ وہ دونوں حق بات دبا گئے تو دو گواہ اور کھڑے ہوں ان کی جگہ ان میں سے کہ جن کا حق دبا ہے

عَلَيْهِمُ الْاَوْلَيٰنِ فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ لَشَهَادَتُنَاۤ اَحَقُّ مِنْ شَهَادَتِهِمَا وَمَا اعْتَدَيْنَاۤ

جو سب سے زیادہ قریب ہوں میت کے پھر قسم کھاویں اللہ کی کہ ہماری گواہی تحقیقی ہے پہلوں کی گواہی سے اور ہم نے زیادتی نہیں کی

اِنَّاۤ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۰۷﴾

نہیں تو ہم بیشک ظالم ہیں۔

خلاصہ تفسیر: آپ ﷺ نے ورثاء سے ان کے اس دعوے پر کہ ان دونوں وصی نے خیانت کی ہوگی گواہ طلب کیے، چونکہ وارثوں کے پاس گواہ نہ تھے تو ان دونوں نصرانیوں سے قسم لی گئی کہ ہم نے میت کے مال میں کسی طرح کی خیانت نہیں کی، نہ کوئی چیز اس کی چھپائی، آخر قسم پر فیصلہ ان کے حق میں کر دیا گیا، کچھ مدت کے بعد ظاہر ہوا کہ وہ پیالہ ان دونوں نے مکہ میں کسی سنار کے ہاتھ فروخت کیا ہے، جب سوال ہوا تو کہنے لگے کہ ہم نے میت سے خرید لیا تھا، چونکہ خریداری کے گواہ موجود نہ تھے اس لئے ہم نے پہلے اس کا ذکر نہیں کیا، مبادا ہماری تکذیب کر دی جائے، آخر میت کے وارثوں نے پھر نبی کریم ﷺ کی طرف رجوع کیا، اس وقت مذکورہ بالا آیت: فَاِنْ عُثِرَ عَلٰۤى اَنَّهُمَا اسْتَحَقَّاۤ نازل ہوئی، اب پہلی صورت کے برعکس وہ دونوں اوصیاء خریداری کے مدعی اور وارث منکر تھے، شہادت موجود نہ ہونے کی وجہ سے وارثوں میں سے دو شخصوں نے جو میت سے قریب تر تھے قسم کھائی کہ پیالہ میت کی ملک تھا، اور یہ دونوں نصرانی اپنی قسم میں جھوٹے ہیں، چنانچہ جس قیمت پر انہوں نے فروخت کیا تھا (ایک ہزار درہم پر) وہ وارثوں کو دلائی گئی۔

پھر (اس کے بعد) اگر (کسی طریقہ سے ظاہراً) اس کی اطلاع ہو کہ وہ دونوں وصی کسی گناہ کے مرتکب ہوئے ہیں (مثلاً واقعہ آیت میں جب پیالہ مکہ میں ملا اور دونوں وصیوں نے پوچھنے پر میت سے خریدنے کا دعویٰ کیا جس سے میت سے لے لینے کا اقرار لازم آتا ہے، اور یہ ان کی پہلی بات کے خلاف ہے جس میں انہوں نے مطلقاً پیالہ لینے ہی سے انکار کیا تھا، چونکہ اقرار بالمضر حجت ہے، اس لئے ظاہراً ان کا خائن اور جھوٹا ہونا معلوم ہوا) تو (ایسی صورت میں مقدمہ کا رخ بدل جائے گا، وصی جو کہ پہلے مدعا علیہ تھے اب خریدنے کے مدعی ہو گئے، اور ورثاء جو کہ پہلے اوصیاء کی خیانت کا دعویٰ لے کر آئے تھے اب مدعا علیہ ہو گئے، اس لئے اب فیصلہ کی یہ صورت ہوگی کہ اول وصیوں سے خریدنے کے گواہ طلب کئے جائیں، اور جب وہ گواہ پیش نہ کر سکیں تو) ان (وارث) لوگوں میں سے جن کے مقابلہ میں (ان دونوں اوصیاء کی طرف سے مذکورہ) گناہ کا ارتکاب ہوا تھا اور (جو کہ شرعاً مستحق میراث ہوں مثلاً مذکورہ آیت کے واقعہ میں) دو شخص (تھے) جو سب (ورثہ) میں باعتبار (میراث کے مستحق ہونے میں) قریب تر ہیں جہاں (حلف کے لئے) وہ دونوں (وصی پہلے) کھڑے ہوئے تھے (اب) یہ دونوں (وارث حلف کے لیے) کھڑے ہوں، پھر دونوں (اس طرح) خدا کی قسم کھائیں کہ (صیغہ حلف کے ساتھ یہ کہیں کہ) بالیقین ہماری یہ قسم (اشتباہ سے ظاہراً وحقیقۃً بالکل پاک ہے اس وجہ سے) ان دونوں (اوصیاء) کی اس قسم سے زیادہ راست ہے (کیونکہ اس کی حقیقت کا اگرچہ ہم کو علم نہیں، لیکن ظاہراً تو وہ مشتبہ ہوگئی) اور ہم نے (حق سے) ذرا تجاوز نہیں کیا (ورنہ) ہم (اگر ایسا کریں تو) اس حالت میں سخت ظالم ہوں گے (کیونکہ پرایا مال جان بوجھ کر بلا اجازت لے لینا ظلم ہے، یہ بھی تاکید ہے جو حاکم کی رائے پر ہے، پھر اصل مضمون پر قسم لی جائے، چونکہ یہ قسم دوسرے کے فعل پر ہے اس وجہ سے اس کے الفاظ یہ ہوں گے کہ "خدا کی قسم! ہمارے علم میں میت نے ان مدعیوں کے ہاتھ پیالہ فروخت نہیں کیا"، اور چونکہ معلومات کے واقع یا غیر واقع ہونے کی کوئی ظاہری سبیل نہیں ہوسکتی، اس لئے اس کی واقعیت پر

زیادہ موکد قسم لی گئی، جیسا کہ یہاں لفظ اَحَقُّ دال ہے، جس کا حاصل یہ ہوا کہ اسکا مدار چونکہ میرے ہی اوپر ہے اس لئے قسم کھاتا ہوں کہ جیسا اس میں ظاہری جھوٹ کا ثبوت نہیں ہوسکتا اسی طرح حقیقت میں جھوٹ بھی نہیں ہے، اور یہ قرینہ مفید ہے کہ یہاں قسم "علم" یعنی اپنی معلومات پر ہے، اور چونکہ اسکا جھوٹ بلا اقرار کبھی ثابت نہیں ہوسکتا، اس لئے اس میں جو حق تلفی ہوگی وہ اشد درجہ کا ظلم ہوگا، عجب نہیں کہ یہاں ظالمین اس لئے کہا گیا ہو)۔

* * *

فائدہ: [1] ایک ہو تب بھی مضائقہ نہیں۔

فائدہ: [2] یعنی اگر قرائن و آثار سے اوصیاء کی قسم کا جھوٹ معلوم ہو اور وہ بذریعہ شہادت شرعی اپنی سچائی ثابت نہ کرسکیں تو میت کے وارثوں کو قسم دی جائے گی کہ ان کو اوصیاء کے دعوے کی واقعیت کا کوئی علم نہیں اور یہ کہ ان کی گواہی اوصیاء کی گواہی سے زیادہ احق بالقبول ہے۔

ان آیات کی شان نزول یہ ہے کہ ایک شخص "بُدَیل" نامی جو مسلمان تھا دو شخصوں "تمیم و عدی" کے ساتھ جو اس وقت نصرانی تھے بغرض تجارت ملک شام کی طرف گیا، شام پہنچ کر بدیل بیمار پڑ گیا، اس نے اپنے مال کی فہرست لکھ کر اسباب میں رکھ دی اور اپنے دونوں رفیقوں کو اطلاع نہ کی، مرض جب زیادہ بڑھا تو اس نے دونوں نصرانی رفقاء کو وصیت کی کہ کل سامان میرے وارثوں کو پہنچا دینا، انہوں نے سب سامان لاکر وارثوں کے حوالہ کردیا، مگر چاندی کا ایک پیالہ جس پر سونے کا ملمع یا نقش و نگار تھے اس میں سے نکال لیا، وارثوں کو فہرست اسباب میں سے دستیاب ہوئی، انہوں نے اوصیاء سے پوچھا کہ میت نے کچھ مال فروخت کیا تھا یا کچھ زیادہ بیمار رہا کہ معالجہ وغیرہ میں کچھ خرچ ہوا ہو؟ ان دونوں نے اس کا جواب نفی میں دیا، آخر معاملہ نبی کریم ﷺ کی عدالت میں پیش ہوا، چونکہ وارثوں کے پاس گواہ نہ تھے، تو ان دونوں نصرانیوں سے قسم لی گئی کہ ہم نے میت کے مال میں کسی طرح کی خیانت نہیں کی، نہ کوئی چیز اس کی چھپائی، آخر قسم پر فیصلہ ان کے حق میں کردیا گیا، کچھ مدت کے بعد ظاہر ہوا کہ وہ پیالہ ان دونوں نے مکہ میں کسی سنار کے ہاتھ فروخت کیا ہے، جب سوال ہوا تو کہنے لگے کہ وہ ہم نے میت سے خرید لیا تھا، چونکہ خریداری کے گواہ موجود نہ تھے اس لئے ہم نے پہلے اس کا ذکر نہیں کیا مبادا ہماری تکذیب کردی جائے، میت کے وارثوں نے پھر نبی کریم ﷺ کی خدمت میں مرافعہ کیا، اب پہلی صورت کے برعکس اوصیاء خریداری کے مدعی اور وارث منکر تھے، شہادت موجود نہ ہونے کی وجہ سے وارثوں میں سے دو شخصوں نے جو میت سے قریب تر تھے قسم کھائی کہ پیالہ میت کے ملک تھا اور یہ دونوں نصرانی اپنی قسم میں جھوٹے ہیں، چنانچہ جس قیمت پر انہوں نے فروخت کیا تھا (ایک ہزار درہم) وہ وارثوں کو دلائی گئی۔

ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَنْ يَّاْتُوْا بِالشَّهَادَةِ عَلٰى وَجْهِهَاۤ اَوْ يَخَافُوْۤا اَنْ تُرَدَّ اَيْمَانٌۢ بَعْدَ اَيْمَانِهِمْ ؕ

اس میں امید ہے کہ ادا کریں شہادت کو ٹھیک طرح پر اور ڈریں کہ الٹی پڑے گی قسم ہماری ان کی قسم کے بعد [1]

وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاسْمَعُوْا ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۱۰۸﴾ ع

اور ڈرتے رہو اللہ سے اور سن رکھو، اور اللہ نہیں چلاتا سیدھی راہ پر نافرمانوں کو [2]

خلاصہ تفسیر: یہ (قانون جو گذشتہ دو آیتوں میں بیان ہوا) بہت قریب ذریعہ ہے اس امر کا کہ وہ (اوصیاء) لوگ واقعہ کو ٹھیک طور پر ظاہر کریں (اگر زائد مال کی سپردگی نہیں ہوئی تو قسم کھالیں، اور اگر ہوئی ہے تو گناہ سے ڈر کر انکار کردیں، یہ حکمت تو اوصیاء سے حلف اٹھوانے میں ہے) یا اس بات سے ڈر (کر قسم کھانے سے رک) جائیں کہ ان سے قسم لینے کے بعد (ورثاء پر) قسمیں متوجہ کی جائیں گی (پھر ہم کو خفت اٹھانی پڑے گی، یہ حکمت ورثاء سے حلف اٹھوانے میں ہے) اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو (اور معاملات و حقوق میں جھوٹ مت بولو) اور (ان کے احکام کو) سنو (یعنی مانو) اور (اگر خلاف کروگے تو فاسق ہوجاؤ گے) اللہ تعالیٰ فاسق لوگوں کو (قیامت کے روز فرمانبرداروں کے درجات کی طرف) رہنمائی نہ کریں گے (بلکہ نجات پانے کے وقت بھی ان سے کم رہیں گے تو ایسا خسارہ کیوں گوارا کرتے ہو)۔

ان سب صورتوں میں حق دار کو اس کا حق پہنچانا ہے جو کہ مشروع و مطلوب ہے، کیونکہ اگر اوصیاء سے قسم اٹھوانے کا حکم نہ ہوتا اور اوصیاء مال کے سپرد کرنے میں سچے ہوتے تو ان سے تہمت دور کرنے کا کوئی طریقہ نہ ہوتا، اور اگر وہ جھوٹے ہوتے تو ورثاء کے لیے حق ثابت کرنے کا کوئی طریقہ نہ ہوتا، اور اب اوصیاء کے سچے ہونے کی صورت میں قسم کھانے سے ان کی براءت ہو جاتی، اور اوصیاء جھوٹے ہونے کے وقت شاید جھوٹی قسم سے ڈر کر انکار کر جائیں تو ورثاء کا حق ثابت ہو جاتا ہے، اور اگر ورثاء سے قسم اٹھوانے کا حکم نہ ہوتا اور شرعاً ان کا حق ہوتا تو ان کا حق ثابت کرنے کی کوئی صورت نہ تھی، اور اگر شرعاً ان کا حق نہ ہوتا تو اوصیاء کے لیے حق ثابت کرنے کا کوئی طریقہ نہ تھا، اور اب ورثاء کا حق ہونے کے وقت ان کا اثباتِ حق ہو سکتا ہے، اور حق نہ ہونے کے وقت قسم کے انکار سے اوصیاء کا حق ثابت ہو جائے گا، پس دو صورتیں اوصیاء سے قسم لینے کی حکمت میں ہیں، اور: یاتوا بالشھادۃ دونوں کو شامل ہے اور دو صورتیں ورثاء سے قسم لینے کی حکمت میں ہیں، جن میں سے دوسری صورت تو اوصیاء سے قسم اٹھوانے کی پہلی صورت میں داخل ہے، اور پہلی صورت او یخافوا سے سمجھ آرہی ہے، پس دونوں سے قسم اٹھوانے کے مجموعہ سے مذکورہ سب صورتوں کی رعایت ہو گئی۔

* * *

فائدہ: لہ یعنی وارثوں کو شبہ پڑے تو قسم دینے کا حکم رکھا، اس لئے کہ قسم سے ڈر کر اول ہی جھوٹ نہ ظاہر کریں پھر اگر ان کی بات جھوٹ نکلے تو وارث قسم کھائیں، یہ بھی اسی واسطے کہ وہ قسم میں دغا نہ کریں، جانیں کہ آخر ہماری قسم الٹی پڑے گی، کذا فی موضح القرآن۔

فائدہ: ٢ہ خدا کی نافرمانی کرنے والا انجام کار رسوا اور ذلیل ہی ہوتا ہے حقیقی کامیابی کا چہرہ نہیں دیکھتا۔

يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ ؕ قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ

جس دن اللہ جمع کرے گا سب پیغمبروں کو پھر کہے گا تم کو کیا جواب ملا تھا لہ وہ کہیں گے ہم کو خبر نہیں ٢ہ تو ہی ہے

عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ﴿۱۰۹﴾

چھپی باتوں کو جاننے والا

خلاصہ تفسیر: پیچھے مختلف احکام کا ذکر ہوا، درمیان میں ان پر عمل کی ترغیب اور مخالفت پر ترہیب فرمائی گئی، اسی کی تاکید کیلئے اب اس آیت میں قیامت کے ہولناک واقعات یاد دلاتے ہیں، تاکہ اطاعت کا زیادہ باعث اور مخالفت سے زیادہ مانع ہو اور قرآن مجید کا اکثر طرز یہی ہے۔

(وہ حشر کا دن بھی کیسا ہولناک ہوگا) جس روز اللہ تعالیٰ تمام پیغمبروں کو (مع ان کی امتوں کے) جمع کریں گے، پھر (ان امتوں میں جو نافرمان ہوں گے ان کو بطور دھمکی کے سنانے کو ان پیغمبروں سے) ارشاد فرمائیں گے کہ تم کو (ان امتوں کی طرف سے) کیا جواب ملا تھا، وہ عرض کریں گے کہ (ظاہری جواب تو ہم کو معلوم ہے اور اس کو بیان بھی کر دیں گے، لیکن ان کے دل میں جو کچھ ہو اس کی) ہم کو کچھ خبر نہیں (اس کو آپ ہی جانتے ہیں کیونکہ) آپ بیشک پوشیدہ باتوں کے پورے جاننے والے ہیں (مطلب یہ کہ ایک دن ایسا ہوگا اور اعمال واحوال کی تفتیش ہوگی، اس لئے تم کو مخالفت و معصیت سے ڈرتے رہنا چاہیے)۔

بعض آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء کرام امتوں کے احوال پر گواہی دیں گے تو مذکورہ آیت ان کے معارض نہیں، کیونکہ یہاں دل کی باتوں کے متعلق گفتگو نہ کرنا مذکور ہے، اور دیگر آیتوں میں ظاہری باتوں پر گواہی دینا مذکور ہے، اور جو کفار انبیاء کے زمانہ کے بعد ہوں گے ان پر ملائکہ اور نامہ اعمال اور خود ان کے ہاتھ پاؤں گواہی دیں گے اور انبیاء سے یہ گفتگو گناہ گاروں کے سنانے کے واسطے ہوگی تاکہ ان پر دھمکی ظاہر ہو۔

* * *

فائدہ: لہ یہ سوال محشر میں امتوں کے روبرو پیغمبروں سے کیا جائے گا کہ دنیا میں جب تم ان کے پاس پیغام حق لے کر گئے تو انہوں نے کیا جواب دیا اور کہاں تک دعوت الٰہی کی اجابت کی؟ گزشتہ رکوع میں بتلایا تھا کہ خدا کے یہاں جانے سے پہلے بذریعہ وصیت وغیرہ یہاں کا انتظام ٹھیک

کرلو، اب متنبہ فرماتے ہیں کہ وہاں کی جواب دہی کے لئے تیار رہو۔

فائدہ: ۲؎ محشر کے ہولناک دن میں جب خدائے قہار کی شان جلالی کا انتہائی ظہور ہوگا، اکابر واعاظم کے بھی ہوش بجانہ رہیں گے، اولوالعزم انبیاء کی زبان پر نفسی نفسی ہوگا، اسی وقت انتہائی خوف وخشیت سے حق تعالیٰ کے سوال کا جواب لا علم لنا (ہمیں کچھ خبر نہیں) کے سوا نہ دے سکیں گے، پھر جب نبی کریم ﷺ کے طفیل میں سب کی طرف خدا کی نظر لطف ورحمت ہوگی تب کچھ عرض کرنے کی جرات کریں گے، حسنؒ ومجاہدؒ وغیرہ سے ایسا ہی منقول ہے، لیکن ابن عباسؓ کے نزدیک لا علم لنا کا مطلب یہ ہے کہ خداوندا! تیرے علم کامل ومحیط کے سامنے ہمارا علم کچھ بھی نہیں، گویا یہ الفاظ ''تادب مع اللہ'' کے طور پر کہے۔

ابن جریج کے نزدیک لا علم لنا سے یہ مراد ہے کہ ہم کو معلوم نہیں کہ ہمارے پیچھے انہوں نے کیا کچھ کیا، ہم صرف انہی افعال واحوال پر مطلع ہوسکتے ہیں جو ہمارے سامنے ظاہری طور پر پیش آئے تھے، بواطن وسرائر کا علم عالم الغیوب ہی کو ہے، آئندہ رکوع میں حضرت مسیح علیہ السلام کی زبانی جو جواب نقل فرمایا ہے: وَ كُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا الخ اس سے آخری معنی کی تائید ہوتی ہے، اور صحیح حدیث میں ہے کہ جب حوض پر بعض لوگوں کی نسبت حضور فرمائیں گے ''هٰؤُلاءِ اَصْحَابِي'' تو جواب ملے گا ''لَا تَدْرِي مَا اَحْدَثُوا بَعْدَكَ'' (الحدیث) یعنی آپ کو خبر نہیں کہ آپ کے پیچھے انہوں نے کیا حرکات کیں۔

اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِيْ عَلَيْكَ وَعَلٰى وَالِدَتِكَ ۘ اِذْ اَيَّدْتُّكَ بِرُوْحِ

جب کہے گا اللہ ۱؎ اے عیسیٰ مریم کے بیٹے یاد کر میرا احسان جو ہوا ہے تجھ پر اور تیری ماں پر ۲؎ جب مدد کی میں نے تیری روح

الْقُدُسِ ۣ تُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا ۚ وَاِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ

پاک سے، تو کلام کرتا تھا لوگوں سے گود میں اور بڑی عمر میں، اور جب سکھائی میں نے تجھ کو کتاب اور تہ کی باتیں اور توارت

وَالْاِنْجِيْلَ ۚ وَاِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ بِاِذْنِيْ فَتَنْفُخُ فِيْهَا فَتَكُوْنُ طَيْرًا

اور انجیل، اور جب تو بناتا تھا گارے سے جانور کی صورت میرے حکم سے پھر پھونک مارتا تھا اس میں تو ہوجاتا اڑنے والا میرے حکم سے

بِاِذْنِيْ وَتُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ بِاِذْنِيْ ۚ وَاِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتٰى بِاِذْنِيْ ۚ وَاِذْ كَفَفْتُ بَنِيْٓ

اور اچھا کرتا تھا مادر زاد اندھے کو اور کوڑھی کو میرے حکم سے، اور جب نکال کھڑا کرتا تھا مردوں کو میرے حکم سے ۳؎ اور جب روکا میں نے بنی

اِسْرَاۗءِيْلَ عَنْكَ اِذْ جِئْتَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۱۰﴾

اسرائیل کو تجھ سے جب تو لے کر آیا ان کے پاس نشانیاں تو کہنے لگے جو کافر تھے ان میں اور کچھ نہیں یہ تو جادو ہے صریح ۴؎

وَاِذْ اَوْحَيْتُ اِلَى الْحَوَارِيّٖنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِيْ وَبِرَسُوْلِيْ ۚ قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَاشْهَدْ بِاَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۱۱﴾

اور جب میں نے دل میں ڈال دیا حواریوں کے کہ ایمان لاؤ مجھ پر اور میرے رسول پر تو کہنے لگے ہم ایمان لائے اور تو گواہ رہ کہ ہم فرمانبردار ہیں

خلاصہ تفسیر: پیچھے متعدد آیات میں اہل کتاب سے گفتگو ہوئی، اب سورت کے اختتام کے قریب اسی مضمون کی طرف رجوع کرکے نصاریٰ کو عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق بعض مضامین سناتے ہیں، جن سے ان کی بندگی کا اثبات اور خدائی کا ابطال ہوتا ہے، کیونکہ حق تعالیٰ کی طرف سے ان پر انعامات ہونا اور تمام تصرفات میں خدا کا محتاج ہونا اور توحید کی طرف دعوت دینا اور آسمان سے دسترخوان کے نزول کی التجا وسوال کرنا اور خود

اپنی خدائی سے براءت کرنا یہ سب ان کی بندگی کے ثبوت اور خدائی کے ابطال کے لیے دلیل قطعی ہیں، اگر چہ عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ یہ گفتگو قیامت میں ہوگی، یہاں اس کے بیان کرنے سے مقصود یہ ہے کہ یہود و نصاری کی غلطی افراط و تفریط میں ظاہر ہو جائے، یہود ان کو رسول بھی نہ مانتے تھے، حالانکہ اس مضمون میں عیسیٰ علیہ السلام کے جو معجزات ذکر کیے گئے ہیں وہ ان کی رسالت کی بڑی دلیل ہیں اور دوسری طرف نصاری نے انہیں خدا بنا دیا۔

(اسی حشر کے روز عیسیٰ علیہ السلام سے ایک خاص گفتگو ہوگی) جبکہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائیں گے کہ اے عیسیٰ بن مریم! میرا انعام یاد کرو (تا کہ لذت تازہ ہو) جو تم پر اور تمہاری والدہ پر (مختلف اوقات میں مختلف صورتوں سے ہوا ہے مثلاً) جب کہ میں نے تم کو روح القدس (یعنی جبرئیل علیہ السلام) سے امداد اور تائید دی (اور) تم آدمیوں سے (دونوں حالتوں میں یکساں) کلام کرتے تھے (ماں کی) گود میں بھی اور بڑی عمر میں بھی (دونوں کلاموں میں کچھ فرق نہ تھا) اور جب کہ میں نے تم کو (آسمانی) کتابیں اور سمجھ کی باتیں اور (بالخصوص) توریت و انجیل تعلیم کیں، اور جب کہ تم گارے سے ایک شکل بناتے تھے، جیسے پرندہ کی شکل ہوتی ہے میرے حکم سے، پھر تم اس (مصنوعی ہیئت) کے اندر پھونک مار دیتے تھے جس سے وہ (سچ مچ کا جاندار) پرندہ بن جاتا تھا میرے حکم سے، اور تم اچھا کر دیتے تھے مادر زاد اندھے کو اور برص (جذام) کے بیمار کو میرے حکم سے، اور جب کہ تم مردوں کو (قبروں سے) نکال (اور جلا کر) کھڑا کر لیتے تھے میرے حکم سے اور جب کہ میں نے بنی اسرائیل (میں سے جو آپ کے مخالف تھے ان) کو تم سے (یعنی تمہارے قتل و اہلاک سے) سے باز رکھا جب (انہوں نے تم کو نقصان پہنچانا چاہا جبکہ) تم ان کے پاس (اپنی نبوت کی) دلیلیں (معجزات) لے کر آئے تھے پھر ان میں جو کافر تھے انہوں نے کہا تھا کہ یہ (معجزات) بجز کھلے جادو کے اور کچھ بھی نہیں، اور جب کہ میں نے حوارین کو (انجیل میں تمہاری زبانی) حکم دیا کہ تم مجھ پر اور میرے رسول (عیسیٰ علیہ السلام) پر ایمان لاؤ، انہوں نے (جواب میں تم سے) کہا کہ ہم (خدا اور رسول یعنی آپ پر) ایمان لائے اور آپ شاہد رہئے کہ ہم (خدا کے اور آپ کے) پورے فرمانبردار ہیں۔

اذْكُرْ نِعْمَتِي عَلَيْكَ وَعَلَىٰ وَالِدَتِكَ: ان سب باتوں کا عیسیٰ علیہ السلام پر انعام ہونا ظاہر ہے، اور حضرت مریم علیہا السلام پر انعام ہونا اس طرح ہے کہ ان سے آپ کا نبی ہونا ثابت ہوا تو ایسی اولاد عطا ہونا خود ایک انعام ہے، پھر آپ نے اپنی والدہ کی پاکی بیان کی اور نبی کی سب خبریں سچی ہوتی ہیں، پس ان کی پاک دامنی ثابت ہوگئی، یہ بڑا انعام ہے، والدہ مریم پر جو انعام ہوا ہے وہ عیسیٰ علیہ السلام کو اس لیے یاد دلایا گیا کہ اصول یعنی آباء و اجداد پر انعام ہونا ایک طرح سے فروع یعنی اولاد پر بھی انعام ہے کہ ایسے لوگوں کی اولاد ہے، باقی اجزاء کی تحقیق اور حوارین سے متعلق ایک بحث سورہ آل عمران میں آیت: ویعلمه الکتاب والحکمة الخ اور آیت: فلما احس عیسی منهم الکفر الخ میں گزر چکی ہے وہاں ملاحظہ فرما لیا جائے۔

يٰعِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِي: اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کسی کا اہل اللہ کی اولاد میں ہونا بھی ایک نعمت اور شرف ہے۔

* * *

فائدہ: ۱۔ إِذْ قَالَ اللَّهُ: غالباً یہ پورا رکوع آنے والے رکوع کی تمہید ہے، احسانات یاد دلا کر وہ سوال ہوگا جو آئندہ رکوع میں مذکور ہے۔

فائدہ: ۲۔ اذْكُرْ نِعْمَتِي عَلَيْكَ وَعَلَىٰ وَالِدَتِكَ: اول تو اولاد پر احسان کرنا من وجہ ماں پر احسان ہے، دوسرے ظالم لوگ جو تہمت مریم صدیقہ پر لگاتے تھے حق تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ان کی براءت و نزاہت کے لئے برہان مبین بنا دیا اور تولد مسیح سے پہلے اور بعد عجیب و غریب نشانات حضرت مریم کو دکھلائے جو ان کی تقویت و تسکین کا باعث ہوئے، یہ احسانات بالواسطہ ان پر تھے۔

فائدہ: ۳۔ وَإِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتَىٰ بِإِذْنِي: گود میں جو کلام کیا اس کا ذکر سورۃ مریم میں آئے گا: إِنِّي عَبْدُ اللَّهِ آتَانِيَ الْكِتَابَ (مریم: ۳۰) تعجب ہے کہ عیسائیوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کے ''تکلم فی المهد'' کا کچھ ذکر نہیں کیا، البتہ یہ لکھا ہے کہ بارہ برس کی عمر میں یہود کے سامنے انہوں نے ایسی حکیمانہ دلائل و براہین بیان فرمائیں کہ تمام علماء عاجز و مبہوت رہ گئے اور سامعین عش عش کرنے لگے، یوں تو ''روح القدس'' سے حسب مراتب سب انبیاء علیہم السلام بلکہ بعض مومنین کی بھی تائید ہوتی ہے، لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جن کا وجود ہی نفخہ جبریلیہ سے ہوا، کوئی خاص قسم کی فطری مناسبت اور تائید

حاصل ہے جسے تفضیل انبیاء کے صدد میں بیان فرمایا گیا: تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ (البقرة: ۲۵۳)

''روح القدس'' کی مثال ''عالم ارواح'' میں ایسی سمجھو جیسے عالم مادیات میں قوت کہربائیہ (بجلی) کا خزانہ، جس وقت اس خزانہ کا مدیر معین اصول کے موافق کرنٹ چھوڑتا اور جن اشیا میں بجلی کا اثر پہنچاتا ہے، ان کا کنکشن درست کر دیتا ہے تو فوراً خاموش اور ساکن مشینیں بڑے زور سے گھومنے لگتی ہیں، اگر کسی مریض پر بجلی کا عمل کیا گیا تو مشلول اعضاء اور بے حس ہو جانے والے اعصاب میں بجلی کے پہنچنے سے حس و حرکت پیدا ہو جاتی ہے، بعض اوقات ایسے بیمار کے حلقوم میں جس کی زبان بالکل بند ہوگئی ہو قوت کہربائیہ کے پہنچانے سے قوت گویائی واپس کی گئی ہے، حتیٰ کہ بعض غالی ڈاکٹروں نے تو یہ دعویٰ کر دیا کہ ہر قسم کی بیماری کا علاج قوت کہربائیہ سے کیا جا سکتا ہے (دائرۃ المعارف فرید وجدی) جب اس معمولی مادی کہربائیہ کا حال یہ ہے تو اندازہ کر لو کہ عالم ارواح کی کہربائیہ میں جس کا خزانہ روح القدس ہے کیا کچھ طاقت ہوگی، حق تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ذات گرامی کا تعلق روح القدس سے کسی ایسی خاص نوعیت اور اصول کے ماتحت رکھا ہے جس کا اثر کھلے ہوئے غلبہ روحیت، تجرد اور مخصوص آثار حیات کی شکل میں ظاہر ہوا، ان کا ''روح اللہ'' سے ملقب ہونا، بچپن، جوانی اور کہولت میں یکساں کلام کرنا، خدا کے حکم سے افاضہ حیات کے قابل کالبد خاکی تیار کر لینا، اس میں باذن اللہ روح حیات پھونکنا، مایوس العلاج مریضوں کی حیات کو باذن اللہ بدون توسط اسباب عادیہ کے کارآمد اور بے عیب بنا دینا، حتیٰ کہ مردہ لاشہ میں باذن اللہ دوبارہ روح حیات کو واپس لے آنا، بنی اسرائیل کے ناپاک منصوبوں کو خاک میں ملا کر آپ کا آسمان پر اٹھا لیا جانا، اور آپ کی حیات طیبہ پر اس قدر طول عمر کا کوئی اثر نہ ہونا، وغیرہ وغیرہ، یہ سب آثار اسی تعلق خصوصی سے پیدا ہوئے ہیں جو رب العزت نے کسی مخصوص نوعیت و اصول سے آپ کے اور روح القدس کے مابین قائم فرمایا ہے، ہر پیغمبر کے ساتھ کچھ امتیازی معاملات خدا تعالیٰ کے ہوتے ہیں، ان کے علل و اسرار کا احاطہ اسی علام الغیوب کو ہے، ان ہی امتیازات کو علماء کی اصطلاح میں ''فضائل جزئیہ'' کے نام سے موسوم کرتے ہیں، ایسی چیزوں سے کلی فضیلت ثابت نہیں ہوتی، چہ جائیکہ ''الوہیت'' ثابت ہو۔

واذ تخلق من الطین میں ''خلق'' کا لفظ محض صوری اور حسی لحاظ سے استعمال کیا گیا ہے ورنہ خالق حقیقی احسن الخالقین کے سوا کوئی نہیں، اسی لئے باذنی کا بار بار اعادہ کیا گیا اور آل عمران میں حضرت مسیح علیہ السلام کی زبان سے باذن اللہ کی تکرار کرائی گئی، بہر حال جو خوارق ان آیات میں اور ان سے پہلے آل عمران میں حضرت مسیح علیہ السلام کی طرف منسوب ہوئے ہیں، ان کا انکار یا تحریف صرف اسی ملحد کا کام ہو سکتا ہے جو آیات اللہ کو اپنی عقل شخصی کے تابع کرنا چاہے، باقی جو لوگ قانون قدرت کا نام لے کر معجزات و خوارق کا انکار کرنا چاہتے ہیں، ان کا جواب ہم نے ایک مستقل مضمون میں دیا ہے اس کے مطالعہ سے ان شاء اللہ تمام شکوک و شبہات کا ازالہ ہو سکے گا۔

فائدہ: ۴ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ: معجزات اور فوق العادت تصرفات کو جادو کہنے لگے اور انجام کار حضرت مسیح علیہ السلام کے قتل کے درپے ہوئے، حق تعالیٰ نے اپنے لطف و کرم سے حضرت مسیح کو آسمان پر اٹھا لیا، اس طرح یہود کو ان کے ناپاک مقصد میں کامیاب ہونے سے روک دیا گیا۔

اِذْ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ اَنْ يُّنَزِّلَ عَلَيْنَا مَآئِدَةً

جب کہا حواریوں نے اے عیسیٰ مریم کے بیٹے تیرا رب کر سکتا ہے ۱ کہ اتارے ہم پر خوان بھرا ہوا

مِّنَ السَّمَآءِ ؕ قَالَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۲﴾

آسمان سے ۲ بولا ڈرو اللہ سے اگر ہو تم ایمان والے ۳

خلاصہ تفسیر: وہ وقت یاد رکھنے کے قابل ہے جب کہ حواریین نے (حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے) عرض کیا کہ اے عیسیٰ ابن مریم (علیہما السلام!) کیا آپ کے رب ایسا کر سکتے ہیں (یعنی مثلاً کوئی بات خلاف حکمت ہونے وغیرہ کے اس سے مانع تو نہیں) کہ ہم پر آسمان سے کچھ

کھانا (پکاپکایا) نازل فرمادیں (حوارین کو خدا کی قدرت میں شبہ نہ تھا کیونکہ وہ مؤمن تھے) آپ نے فرمایا کہ خدا سے ڈرو اگر تم ایمان دار ہو (مطلب یہ کہ تم تو ایمان دار ہو اس لئے خدا سے ڈرو اور معجزات کی فرمائش سے بچو کہ غیر ضروری ہونے کی وجہ سے خلاف ادب ہے)۔

قَالَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ: یعنی ایسے معجزات کی فرمائشوں سے بچو، اس سے معلوم ہوا کہ ایمان دار بندہ کو لائق نہیں کہ وہ اس قسم کی فرمائشیں کر کے خدا کو آزمائے، اور اس سے خلاف عادت کی چیزوں کا مطالبہ کرے، بلکہ اس کو چاہئے کہ رزق وغیرہ کو انہی ذرائع سے طلب کرے جو قدرت نے مقرر کر رکھے ہیں، اولیاء اللہ سے خلاف عادت اشیاء یعنی کرامت وغیرہ کا طلب کرنا اسی قسم میں شمار ہوتا ہے، اس سے بچنا چاہیے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ ''کر سکتا ہے'' اس لئے کہا کہ آپ کی رعایت اور دعا سے ہمارے لئے بطور خرق عادت نہ معلوم ایسا کرے یا نہ کرے۔

فائدہ: ۲؎ یعنی آسمان کی طرف سے بے محنت روزی پہنچ جایا کرے، یہ ضرور نہیں کہ وہ خوان جنت ہی کا ہو۔

فائدہ: ۳؎ یعنی ایماندار بندہ کو لائق نہیں کہ ایسی غیر معمولی فرمائشیں کر کے خدا کو آزمائے، خواہ اس کی طرف سے کتنی ہی مہربانی کا اظہار ہو، روزی ان ہی ذرائع سے طلب کرنا چاہیے جو قدرت نے اس کی تحصیل کے لئے مقرر فرمادیئے ہیں، بندہ جب خدا سے ڈر کر تقویٰ اختیار کرے اور اسی پر ایمان واعتماد رکھے تو حق تعالیٰ ایسی جگہ سے اس کو رزق پہنچائے گا جہاں سے وہم وگمان بھی نہ ہوگا: وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ (الطلاق: ۲)

قَالُوْا نُرِيْدُ اَنْ نَّاْكُلَ مِنْهَا وَتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُنَا وَنَعْلَمَ اَنْ قَدْ صَدَقْتَنَا وَنَكُوْنَ عَلَيْهَا مِنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۱۱۳﴾

بولے کہ ہم چاہتے ہیں کہ کھائیں اس میں سے اور مطمئن ہو جائیں ہمارے دل اور ہم جان لیں کہ تو نے ہم سے سچ کہا اور رہیں ہم اس پر گواہ

خلاصہ تفسیر: وہ بولے کہ (ہمارا مقصود غیر ضروری فرمائش کرنا نہیں جو کہ خلاف ادب ہے، بلکہ چند مصلحتوں کی وجہ سے اس کی درخواست کرتے ہیں وہ یہ کہ) ہم (ایک تو) یہ چاہتے ہیں کہ (برکت حاصل کرنے کو) اس میں سے کھائیں، اور (دوسرے یہ چاہتے ہیں کہ) ہمارے دلوں کو (ایمان پر) پورا اطمینان ہو جائے، اور (مطلب اطمینان کا یہ ہے کہ) ہمارا یقین اور بڑھ جائے کہ آپ نے (رسالت کے دعویٰ میں) ہم سے سچ بولا ہے (کیونکہ جس قدر دلائل بڑھتے جاتے ہیں دعوی کا یقین بڑھتا جاتا ہے) اور (تیسرے یہ چاہتے ہیں کہ) ہم (ان لوگوں کے سامنے جنہوں نے یہ معجزہ نہیں دیکھا) گواہی دینے والوں میں سے ہو جائیں (کہ ہم نے ایسا معجزہ دیکھا ہے تاکہ ان کے سامنے رسالت کا اثبات کر سکیں، اور یہ ان کی ہدایت کا ذریعہ بن جائے)۔

حوارین دیگر معجزات کا مشاہدہ کر چکے تھے جیسے اندھے کوڑھی وغیرہ کو اچھا کرنا، مردوں کو زندہ کرنا، پھونک مار کر گارے سے پرندہ زندہ کر دینا وغیرہ، ان سب کے باوجود دستر خوان کے معجزہ کی درخواست کرنا شاید ایمان کی قوت وبرکت زیادہ حاصل کرنے اور زیادہ معجزات دیکھنے کیلئے کی ہو۔

* * *

فائدہ: یعنی آزمانے کو نہیں مانگتے بلکہ برکت کی امید پر مانگتے ہیں کہ غیب سے بے محنت روزی ملتی رہے تاکہ اطمینان قلب اور دلجمعی سے عبادت میں لگے رہیں، اور آپ نے جو غیبی خبریں نعمائے جنت وغیرہ کے متعلق دی ہیں، ایک چھوٹا سا نمونہ دیکھ کر ان کا بھی یقین کامل ہو جائے، اور ایک عینی شاہد کے طور پر ہم اس کی گواہی دیں جس سے یہ معجزہ ہمیشہ مشہور رہے، بعض مفسرین نے نقل کیا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے وعدہ فرمایا تھا کہ تم خدا کے لئے تیس دن کے روزے رکھ کر جو کچھ طلب کرو گے وہ دیا جائے گا، حوارین نے روزے رکھ لئے اور مائدہ طلب کیا وَنَعْلَمَ اَنْ قَدْ صَدَقْتَنَا سے یہی مراد ہے، واللہ اعلم۔

قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَآ اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ تَكُوْنُ لَنَا عِيْدًا

کہا عیسیٰ مریم کے بیٹے نے اے اللہ رب ہمارے اتار ہم پر خوان بھرا ہوا آسمان سے کہ وہ دن عید رہے

لِّاَوَّلِنَا وَاٰخِرِنَا وَاٰيَةً مِّنْكَ ۚ وَارْزُقْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴿۱۱۴﴾

ہماری پہلوں اور پچھلوں کے واسطے ۱؎ اور نشانی ہو تیری طرف سے ۲؎ اور روزی دے ہم کو اور تو ہی ہے سب سے بہتر روزی دینے والا ۳؎

خلاصہ تفسیر: عیسیٰ ابن مریم (علیہ السلام) نے (جب دیکھا کہ اس درخواست میں ان کی غرض صحیح ہے تو حقیقتاً اللہ تعالیٰ سے) دعا کی کہ اے اللہ ہمارے پروردگار! ہم پر آسمان سے کھانا نازل فرمایئے کہ وہ (مائدہ دسترخوان) ہمارے لئے یعنی ہم میں جو اوّل (یعنی موجودہ زمانہ میں) ہیں اور جو بعد (کے زمانہ میں آنے والے) ہیں، سب کے لئے ایک خوشی کی بات ہوجائے (حاضرین کی خوشی تو کھانے سے اور درخواست قبول ہونے سے اور بعد والوں کی خوشی اپنے سلف پر ایسا انعام ہونے سے، یہ فائدہ تو مؤمنین کے ساتھ خاص ہے) اور (میری پیغمبری پر) آپ کی طرف سے ایک نشان ہوجائے (کہ مؤمنین کو میری پیغمبری کا یقین بڑھ جائے اور منکرین حاضرین اور غائبین پر حجت ہوجائے، یہ مقصد مؤمنین وغیر مؤمن سب کے لئے عام ہے) اور آپ ہم کو (وہ دسترخوان) عطا فرمایئے، اور آپ سب عطا کرنے والوں سے اچھے ہیں (کیونکہ اور سب تو اپنے نفع کے لیے دیتے ہیں اور آپ کا دینا مخلوق ہی کے نفع کے لئے ہے، اس لئے ہم اپنے منافع کو پیش کرکے آپ سے مائدہ کی درخواست کرتے ہیں)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی وہ دن جس میں مائدہ آسمانی نازل ہو، ہمارے اگلے پچھلے لوگوں کے حق میں عید ہوجائے کہ ہمیشہ ہماری قوم اس دن کو بطور یادگار تہوار منایا کرے، اس تقریر کے موافق تکون لنا عیداً کا اطلاق ایسا ہوا جیسا کہ آیۃ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ کے متعلق بخاری میں یہود کا یہ مقولہ نقل کیا ہے: انکم تقرؤون اٰیۃ لَوْ نَزَلَتْ فِيْنَا لَاتَّخَذْنَاهَا عِيْدًا جس طرح آیۃ کو عید بنانے کا مطلب اس کے یوم نزول کو عید بنانا ہے (کما ھو مصرح فی الروایات الاخر) اسی پر مائدہ کے عید ہونے کو بھی قیاس کرلو۔

کہتے ہیں کہ وہ خوان اُترا اتوار کو جو نصاریٰ کے یہاں ہفتہ کی عید ہے جیسے مسلمانوں کے یہاں جمعہ۔

فائدہ: ۲؎ یعنی تیری قدرت کی اور میری نبوت وصداقت کی نشانی ہو۔

فائدہ: ۳؎ یعنی بدون تعب وکسب کے روزی عطا فرمائے، آپ کے یہاں کیا کمی ہے اور کیا مشکل ہے۔

قَالَ اللّٰهُ اِنِّيْ مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَاِنِّيْٓ اُعَذِّبُهٗ عَذَابًا

کہا اللہ نے میں بیشک اتاروں گا وہ خوان تم پر، پھر جو کوئی تم میں ناشکری کرے گا اس کے بعد تو میں اس کو وہ عذاب دوں گا

لَّآ اُعَذِّبُهٗٓ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۱۵﴾

جو کسی کو نہ دوں گا جہان میں

خلاصہ تفسیر: حق تعالیٰ نے (جواب میں) ارشاد فرمایا کہ (آپ لوگوں سے کہہ دیجئے کہ) میں وہ کھانا (آسمان سے) تم لوگوں پر نازل کرنے والا ہوں، پھر جو شخص تم میں سے اس کے بعد (اس کی) ناحق شناسی کرے گا (یعنی اس کے حقوق کو جو عقل وشرع سے واجب ہیں ادا نہ کرے گا) تو میں اس کو ایسی سزا دوں گا کہ وہ سزا (اس وقت کے) جہان والوں میں سے کسی کو نہ دوں گا۔

فَمَنْ يَّكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ: یعنی پھر اس کے بعد جو شخص تم میں سے اس کے حقوق ادا نہ کرے گا، مجموعہ ان حقوق کا یہ تھا کہ اس پر شکر کیا جائے جو کہ عقلاً بھی واجب ہے، اور اس میں خیانت نہ کریں اور اگلے دن کے لیے اٹھا نہ رکھیں، اس کا شرعاً انہیں حکم ہوا تھا، چنانچہ ترمذی کی حدیث میں عمار بن یاسرؓ سے منقول ہے اور اسی میں یہ بھی ہے کہ خوان آسمان سے نازل ہوا، اس میں روٹی اور گوشت تھا، اور اس حدیث میں یہ بھی ہے کہ ان لوگوں نے یعنی ان میں سے بعض نے خیانت کی اور اگلے دن کے لیے اٹھا کر رکھا، پس بندر اور خنزیر کی صورت میں مسخ ہو گئے (نعوذ باللہ من غضب اللہ)۔

* * *

فائدہ: جب نعمت غیر معمولی اور نرالی ہوگی تو اس کی شکر گزاری کی تاکید بھی معمول سے بہت بڑھ کر ہونی چاہئے، اور ناشکری پر عذاب بھی غیر معمولی اور نرالا آئے گا، موضح القرآن میں ہے: ''بعضے کہتے ہیں وہ خوان اترا چالیس روز تک، پھر بعضوں نے ناشکری کی، یعنی حکم ہوا تھا کہ فقیر اور مریض کھائیں، محظوظ اور چنگے بھی لگے کھانے، پھر قریب اسی آدمی کے سور اور بندر ہو گئے، یہ عذاب پہلے یہود میں ہوا تھا، پیچھے کسی کو نہیں ہوا، اور بعضے کہتے ہیں کہ نہیں اترا، یہ تہدید سن کر مانگنے والے ڈر گئے، نہ مانگا لیکن پیغمبر کی دعا عبث نہیں اور اس کلام میں نقل کرنا بے حکمت نہیں، شاید اس دعا کا اثر یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی امت میں آسودگی مال ہمیشہ رہی اور جو کوئی ان میں ناشکری کرے، یعنی دل کے اطمینان سے عبادت میں نہ لگے، بلکہ گناہ میں خرچ کرے تو شاید آخرت میں سب سے زیادہ عذاب پائے، اس میں مسلمان کو عبرت ہے کہ اپنا مدعا خرق عادت کی راہ سے نہ چاہے کہ پھر اس کی شکر گزاری بہت مشکل ہے، اسباب ظاہری پر قناعت کرے تو بہتر ہے، اس قصہ میں بھی ثابت ہوا کہ حق تعالیٰ کے آگے حمایت پیش نہیں جاتی''۔

وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ

اور جب کہے گا اللہ اے عیسیٰ مریم کے بیٹے تو نے کہا لوگوں کو کہ ٹھہرا لو مجھ کو اور میری ماں کو دو معبود سوا اللہ کے ؕ

قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ ۗ بِحَقٍّ ۗ اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ ؕ

کہا تو پاک ہے مجھ کو لائق نہیں کہ کہوں ایسی بات جس کا مجھ کو حق نہیں، اگر میں نے یہ کہا ہوگا تو تجھ کو ضرور معلوم ہوگا

تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ وَلَآ اَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِكَ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ﴿۱۱۶﴾

تو جانتا ہے جو میرے جی میں ہے اور میں نہیں جانتا جو تیرے جی میں ہے، بیشک تو ہی ہے جاننے والا چھپی باتوں کا۔

خلاصہ تفسیر: جیسے پیچھے آیت: اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ میں قیامت کی گفتگو کا ذکر ہے ایسے ہی اس آیت میں بھی ہے، درمیان میں نزول مائدہ کا قصہ جو کہ دنیا میں ہوا ہے شاید اس لیے لایا گیا ہو کہ اہل کتاب کو ان کی افراط وتفریط پر جو عذاب کی اطلاع دی گئی ہے اس قصہ سے اس کی تاکید ہو جائے کہ دیکھو جس طرح اصحاب مائدہ کو ایک معجزہ کے ساتھ کفر کرنے کی دنیا میں سزا دی گئی ہے اس طرح ان افراط وتفریط کرنے والوں کو آیات الٰہیہ کے ساتھ کفر کرنے کی آخرت میں بھی سزا دی جائے گی، واللہ اعلم۔

اور وہ وقت بھی قابل ذکر ہے جبکہ اللہ تعالیٰ (قیامت میں عیسیٰ علیہ السلام سے کفار نصاریٰ کے سنانے کے لئے) فرمائیں گے کہ اے عیسیٰ ابن مریم! (ان نصاری میں جو تثلیث کا عقیدہ تھا، یعنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مریم علیہا السلام کو شریک خدائی مانتے تھے تو) کیا تم نے ان لوگوں سے کہہ دیا تھا کہ مجھ کو (یعنی عیسیٰ علیہ السلام کو) اور میری ماں (حضرت مریم علیہا السلام) کو بھی علاوہ خدا کے معبود قرار دے دو تو عیسیٰ (علیہ السلام) عرض کریں گے کہ (توبہ توبہ) میں تو (خود اپنے عقیدہ میں) آپ کو (شریک سے) منزہ سمجھتا ہوں (جیسا کہ آپ واقع میں بھی اس سے منزہ اور پاک ہیں تو ایسی حالت میں) مجھ کو کسی طرح زیبا نہ تھا کہ میں ایسی بات کہتا جس کے کہنے کا مجھ کو کوئی حق نہیں (نہ عقیدہ کے اعتبار سے، کیونکہ میں موحد یعنی ایک خدا کا قائل ہوں اور نہ پیغام الٰہی پہنچانے کے اعتبار سے کیونکہ مجھ کو ایسا کوئی پیغام نہیں دیا گیا تھا، اور میرے اس نہ کہنے کی دلیل یہ ہے

کہ) اگر میں نے (واقع میں) کہا ہوگا تو آپ کو اس کا (یقیناً) علم ہوگا (مگر جب آپ کے علم میں بھی یہی ہے کہ میں نے نہیں کہا تو یہ سچ ہے کہ میں اس بات سے بری ہوں، اور کہنے کی صورت میں آپ کو اس کا علم ہونا اس لئے ضروری ہے کہ) آپ تو میرے دل کے اندر کی بات بھی جانتے ہیں (تو جو بات زبان سے کہتا اس کا علم آپ کو کیسے نہ ہوتا) اور میں (تو دیگر مخلوقات کی طرح اتنا عاجز ہوں کہ) آپ کے علم میں جو کچھ ہے اس کو (بغیر آپ کے بتلائے ہوئے) نہیں جانتا (جیسے دیگر مخلوقات کا بھی یہی حال ہے، پس) تمام غیبوں کے جاننے والے آپ ہی ہیں (سو جب اپنا اس قدر عاجز ہونا اور آپ کا اس قدر کامل ہونا مجھ کو معلوم ہے تو خدائی میں شرکت کا دعویٰ کیسے کر سکتا ہوں، یہاں تک تو اس بات کے کہنے کی نفی ہوئی)۔

* * *

فائدہ: ۱ پچھلا رکوع حقیقت میں اس رکوع کی تمہید تھی، پچھلے رکوع کی ابتدا میں: يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ ۭ قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ (المائدہ:۱۰۹) فرما کر آگاہ کیا تھا کہ قیامت کے دن تمام مرسلین سے ان کی امتوں کے مواجہ میں علی رؤس الاشہاد سوال و جواب ہوں گے پھر ان میں سے خاص حضرت مسیح (علیہ السلام) کا ذکر فرمایا جن کو کروڑوں آدمیوں نے خدائی کا درجہ دے رکھا ہے کہ ان سے بالخصوص اس عقیدہ باطلہ کی نسبت دریافت کیا جائے گا لیکن اول وہ عظیم الشان احسانات اور ممتاز انعامات یاد دلائیں گے جو ان پر اور ان کی والدہ ماجدہ پر فائض ہوئے، بعدہ ارشاد ہوگا: ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ (کیا تو نے لوگوں سے کہہ دیا تھا کہ مجھ کو اور میری ماں کو بھی خدا کے سوا معبود مانو) حضرت مسیح علیہ السلام اس سوال پر کانپ اٹھیں گے اور وہ عرض کریں گے جو آگے آتا ہے، آخر میں ارشاد ہوگا: هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ (المائدہ:۱۱۹) هٰذَا کا اشارہ اسی یوم کی طرف ہے جو يوم يجمع الله الرسل میں مذکور تھا، بہر حال یہ سب واقعہ روز قیامت کا ہے جسے متیقن الوقوع ہونے کی وجہ سے قرآن و حدیث میں بصیغہ ماضی (قال) تعبیر فرمایا ہے۔

فائدہ: ۲ یعنی میں ایسی گندی بات کیسے کہہ سکتا تھا، آپ کی ذات اس سے پاک ہے کہ الوہیت وغیرہ میں کسی کو اس کا شریک کیا جائے، اور جس کو آپ پیغمبری کا منصب جلیل عطا فرمائیں، اس کی یہ شان نہیں کہ کوئی ناحق بات منہ سے نکالے، پس آپ کی سبوحیت اور میری عصمت دونوں کا اقتضاء یہ ہے کہ میں ایسی ناپاک بات کبھی نہیں کہہ سکتا، اور سب دلائل کو چھوڑ کر آخری بات یہ ہے کہ آپ کے علم محیط سے کوئی چیز باہر نہیں ہو سکتی، اگر فی الواقع میں ایسا کہتا تو آپ کے علم میں ضرور موجود ہوتا، آپ خود جانتے ہیں کہ میں نے خفیہ یا اعلانیہ کوئی ایسا حرف منہ سے نہیں نکالا، بلکہ میرے دل میں اس طرح کے گندے خیال کا خطور بھی نہیں ہوا، آپ سے میرے یا کسی کے دل کے چھپے ہوئے ہوا جس و خواطر بھی پوشیدہ نہیں۔

مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَآ اَمَرْتَنِيْ بِهٖٓ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ ۚ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا

میں نے کچھ نہیں کہا ان کو مگر جو تو نے حکم کیا کہ بندگی کرو اللہ کی جو رب ہے میرا اور تمہارا ۱ اور میں ان سے خبردار تھا جب تک

دُمْتُ فِيْهِمْ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ ۭ وَاَنْتَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ﴿۱۱۷﴾

ان میں رہا، پھر جب تو نے مجھ کو اٹھا لیا تو تو ہی تھا خبر رکھنے والا ان کی، اور تو ہر چیز سے خبردار ہے ۲

خلاصہ تفسیر: (اب آگے یہ عرض کرتے ہیں کہ میں نے تو اس کے برعکس اپنے بندہ ہونے کا ان کے سامنے اقرار کیا تھا اور صرف آپ کی عبادت کا ان کو حکم دیا تھا) میں نے تو ان سے (اور کچھ نہیں کہا، صرف وہی بات) جو آپ نے مجھ سے کہنے کو فرمایا تھا کہ تم اللہ تعالیٰ کی بندگی اختیار کرو جو میرا بھی رب ہے، اور تمہارا بھی رب ہے (یہاں تک تو عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی حالت کے متعلق عرض کیا، آگے ان لوگوں کی حالت کے متعلق عرض کرتے ہیں، کیونکہ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ میں اگرچہ تصریحاً تو سوال اس کا ہے کہ آپ نے ایسا کلمہ کہا ہے یا نہیں؟ لیکن اشارۃً اسکا بھی سوال معلوم ہوتا ہے کہ یہ عقیدہ تثلیث کہاں سے پیدا ہوا؟ پس عیسیٰ علیہ السلام اس بارے میں یوں عرض کریں گے کہ:) اور میں ان (کی حالت) پر مطلع رہا

جب تک ان میں (موجود) رہا (سو اس وقت تک کا حال تو میں نے مشاہدہ کیا ہے اس کے متعلق بیان کر سکتا ہوں) پھر جب آپ نے مجھ کو اٹھا لیا (یعنی پہلی بار میں تو زندہ آسمان کی طرف اٹھایا اور دوسری بار طبعی موت کے طور پر) تو (اُس وقت صرف) آپ ان (کے احوال) پر مطلع رہے (اُس وقت کی مجھ کو خبر نہیں کہ ان کی گمراہی کا سبب کیا ہوا اور کیونکر ہوا) اور آپ ہر چیز کی پوری خبر رکھتے ہیں (یہاں تک تو اپنا اور ان کا معاملہ عرض کر دیا)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ میں نے آپ کے حکم سے سر مو تجاوز نہیں کیا، اپنی الوہیت کی تعلیم تو کیسے دے سکتا تھا اس کے بالمقابل میں نے ان کو صرف تیری بندگی کی طرف بلایا اور کھول کھول کر بتلا دیا کہ میرا اور تمہارا سب کا رب (پروردگار) وہ ہی ایک خدا ہے جو تنہا عبادت کے لائق ہے، چنانچہ آج بھی بائبل میں صریح نصوص اس مضمون کی بکثرت موجود ہیں۔

فائدہ: ۲؎ نہ صرف یہ کہ میں نے مخلوق کو تیری توحید اور عبودیت کی طرف دعوت دی، بلکہ جب تک انؑ کے اندر قیام پذیر رہا، برابر ان کے احوال کی نگرانی اور خبر گیری کرتا رہا کہ کوئی غلط عقیدہ یا بے موقع خیال قائم نہ کر لیں، البتہ ان میں قیام کرنے کی جو مدت آپ کے علم میں مقدر تھی، جب وہ پوری کر کے آپ نے مجھ کو ان میں سے اٹھا لیا (کما یظھر من مادۃ التو فی و مقابلۃ مادمت فیھم) تو پھر صرف آپ ہی ان کے احوال کے نگران اور خبر دار ہو سکتے تھے، میں اس کے متعلق کچھ عرض نہیں کر سکتا۔

تنبیہ: حضرت مسیح علیہ السلام کی موت یا رفع الی السماء وغیرہ کی بحث آل عمران میں زیر فائدہ اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ وَرَافِعُكَ اِلَیَّ (آل عمران :۵۵) ملاحظہ کیجئے، مترجم محقق قدس سرہ نے یہاں فلما توفیتنی کا جو ترجمہ "تو نے مجھ کو اٹھا لیا" سے کیا یہ باعتبار محاورات "موت" اور "رفع الی السماء" دونوں پر صادق آسکتا ہے، گویا متنبہ کر دیا کہ نہ لفظ "توفی" کیلئے موت لازم ہے اور نہ خاص توفی بصورت موت کو مضمون زیر بحث میں کسی قسم کا مدخل ہے۔

حدیث میں نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: کہ بعض لوگوں کی نسبت میں قیامت کے دن اسی طرح کہوں گا جس طرح بندہ صالح (عیسیٰ علیہ السلام) نے کہا: وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ ۚ وَاَنْتَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ (المائدہ: ۱۱۷) اس قسم کی تشبیہات سے یہ نکالنا کہ حضور ﷺ کی اور حضرت مسیح علیہ السلام کی "توفی" بھی بہمہ وجوہ یکساں اور ہم رنگ ہونی چاہئے، عربیت سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔

مشرکین مکہ ایک درخت "ذات انماط" پر ہتھیار لٹکایا کرتے تھے، صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ (ﷺ)! ہمارے لئے بھی "ذات انماط" مقرر کر دیجئے جیسے ان کے یہاں ہے، آپ نے فرمایا: "ھٰذا کما قال قوم موسیٰ اجعل لنا الھا کما لھم اٰلھۃ" (یہ تو ایسا ہوا جیسے موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے درخواست کی تھی کہ ہمارے لئے بھی ایسا معبود تجویز کر دو جیسا ان بت پرستوں کا ہے) کیا کوئی مسلمان اس تشبیہ کو سن کر یہ گمان کر سکتا ہے کہ صحابہ نے معاذ اللہ بت پرستی کی درخواست کی تھی؟ اس طرح کی تشبیہات سے نصوص محکمہ اور اجماع امت کے مخالف عقائد پر تمسک کرنا صرف اسی جماعت کا حصہ ہو سکتا ہے جن کی نسبت یہ ارشاد ہوا: فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ (آل عمران: ۷)

اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۱۸﴾

اگر تو ان کو عذاب دے تو وہ بندے ہیں تیرے، اور اگر تو ان کو معاف کر دے تو تو ہی ہے زبردست حکمت والا

خلاصہ تفسیر: یہاں تک اپنا اور ان کا معاملہ عرض کر کے آگے ان کے اور حق تعالیٰ کے معاملہ کی بابت عرض کرتے ہیں، کیونکہ اس سوال سے کہ "کیا تم نے نصاریٰ سے کہہ دیا تھا کہ تم کو اور تمہاری والدہ کو معبود بنائیں" طبعاً سامعین کا ذہن اس طرف منتقل ہو سکتا ہے کہ اس صورت میں امت الزام سے بری ہوگی، پس اس سوال سے یہ بات بھی مترشح ہو سکتی ہے کہ کیا آپ کے نزدیک یہ لوگ رہائی کے قابل ہیں؟ پس اس بارے میں یوں عرض کریں گے کہ:

اگر آپ ان کو (اس عقیدہ پر) سزا دیں تو (جب بھی آپ مختار ہیں، کیونکہ) یہ آپ کے بندے ہیں (اور آپ ان کے مالک، اور مالک کو حق ہے کہ بندوں کو ان کے جرائم پر سزا دے) اور اگر آپ ان کو معاف فرما دیں تو (جب بھی آپ مختار ہیں، کیونکہ) آپ زبردست (قدرت والے) ہیں (تو معافی پر بھی قادر ہیں اور) حکمت والے (بھی) ہیں (تو آپ کی معافی بھی حکمت کے موافق ہوگی، اس لئے اس میں بھی کوئی برائی نہیں ہوسکتی، مطلب یہ ہے کہ دونوں حال میں آپ مختار ہیں، میں کچھ دخل نہیں دیتا)۔

غرض عیسیٰ علیہ السلام نے پہلے :قَالَ سُبْحٰنَكَ الخ میں تثلیث کے عقیدے اور اس کی تعلیم سے اپنی براءت ظاہر کی، پھر دوسری عرض: وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ الخ میں ان کے اس عقیدہ کے مفصل سب جاننے سے اپنی براءت ظاہری، اور تیسری عرض: اِنْ تُعَذِّبْهُمْ الخ میں ان کے بارے میں کسی قسم کی کوئی تحریک کرنے تک اپنی براءت ظاہر کردی، اور حق تعالیٰ کا عیسیٰ علیہ السلام کے اس گفتگو سے یہی مقصود تھا کہ ان کفار کو اپنی نادانی پر پوری ڈانٹ اور سرزنش ہوجائے اور ناکامی پر کامل حسرت ہو۔

* * *

فائدہ: یعنی آپ اپنے بندوں پر ظلم اور بیجا سختی نہیں کر سکتے اس لئے اگر ان کو سزا دیں گے تو عین عدل وحکمت پر مبنی ہوگی اور فرض کیجئے معاف کردیں تو یہ معافی بھی از راہ عجز وسفہ نہ ہوگی، چونکہ آپ عزیز (زبردست اور غالب) ہیں اس لئے کوئی مجرم آپ کے قبضہ قدرت سے نکل کر بھاگ نہیں سکتا کہ آپ اس پر قابو نہ پاسکیں، اور چونکہ حکیم (حکمت والے) ہیں، اس لئے یہ بھی ممکن نہیں کہ کسی مجرم کو یونہی بے موقع چھوڑ دیں، بہر حال جو فیصلہ آپ ان مجرمین کے حق میں کریں گے وہ بالکل حکیمانہ اور قادرانہ ہوگا۔

حضرت مسیح علیہ السلام کا یہ کلام چونکہ محشر میں ہوگا جہاں کفار کے حق میں کوئی شفاعت اور استدعاء رحم وغیرہ نہیں ہوسکتی، اسی لئے حضرت مسیح نے عزیز حکیم کی جگہ غفور رحیم وغیرہ صفات کو اختیار نہیں فرمایا، برخلاف اس کے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دنیا میں اپنے پروردگار سے عرض کیا تھا: رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ ۚ فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ ۚ وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (ابراہیم: ۳٦) (اے پروردگار! ان بتوں نے بہت سے آدمیوں کو گمراہ کر دیا تو جو ان میں سے میرے تابع ہوا وہ میرا آدمی ہے اور جس نے میری نافرمانی کی تو پھر تو غفور رحیم ہے) یعنی ابھی موقع ہے کہ تو اپنی رحمت سے آئندہ ان کو توبہ اور رجوع الی الحق کی توفیق دے کر پچھلے گناہوں کو معاف فرما دے۔

قَالَ اللّٰهُ هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ صِدْقُهُمْ ؕ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ

فرمایا اللہ نے یہ دن ہے کہ کام آوے گا سچوں کے ان کا سچ ان کے لئے ہیں باغ جن کے نیچے بہتی ہیں نہریں رہا کریں گے

فِيْهَآ اَبَدًا ؕ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۱۹﴾

انہی میں ہمیشہ، اللہ راضی ہوا ان سے اور وہ راضی ہوئے اس سے، یہی ہے بڑی کامیابی۔

خلاصہ تفسیر: پیچھے دونوں رکوع میں قیامت کے دن اعمال واحوال کا حساب وکتاب اور سوال وجواب کا ذکر ہے، اب آگے اس تفتیش ومحاسبہ کا نتیجہ ذکر کیا جاتا ہے:

(مذکورہ تمام گفتگو کے بعد) اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائیں گے کہ یہ (قیامت کا دن) وہ دن ہے کہ جو لوگ (دنیا میں عقائد، اعمال اور اقوال کے اعتبار سے) سچے تھے (کہ وہ سچا ہونا اب ظاہر ہو رہا ہے، جن میں انبیاء اور مومنین جن کے ایمان کی انبیاء وملائکہ سب شہادت دیں گے، سب داخل ہیں، اور اس گفتگو میں تمام انبیاء اور عیسیٰ علیہ السلام کی تصدیق کی طرف اشارہ بھی ہوگیا، غرض یہ سب حضرات جو دنیا میں سچے تھے) ان کا سچا ہونا (آج) ان کے کام آئے گا (اور وہ کام آنا یہ ہے کہ) ان کو (جنت کے) باغ (رہنے کو) ملیں گے جن کے (محلات کے) نیچے نہریں جاری ہوں گی، جن میں وہ ہمیشہ ہمیشہ کو رہیں گے (اور یہ نعمتیں ان کو کیوں نہ ملیں، کیونکہ) اللہ تعالیٰ ان سے راضی اور خوش اور یہ اللہ تعالیٰ سے راضی اور خوش ہیں (اور جو شخص راضی

ومرضی ہو اس کو ایسی ہی نعمتیں ملتی ہیں) یہ (جو کچھ مذکور ہوا) بڑی بھاری کامیابی ہے (کہ دنیا کی کوئی کامیابی اس کے برابر نہیں ہوسکتی)۔

* * *

فائدہ: ۱ جو لوگ اعتقاداً اور قولاً وعملاً سچے رہے ہیں (جیسے حضرت مسیح علیہ السلام) ان کی سچائی کا پھل آج ملے گا۔

فائدہ: ۲ بڑی کامیابی حق تعالیٰ کی رضاء ہے اور جنت بھی اسی لئے مطلوب ہے کہ وہ محل رضائے الٰہی ہے۔

لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا فِيْهِنَّ ۭ وَهُوَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿١٢٠﴾

اللہ ہی کے لئے سلطنت ہے آسمانوں کی اور زمین کی اور جو کچھ ان کے بیچ میں ہے، اور وہ ہر چیز پر قادر ہے

خلاصہ تفسیر: (اب سورت ختم ہونے کو ہے، پوری سورت میں کچھ اصولی اور فروعی احکام بیان ہوئے ہیں، اس لئے آخر میں یہ بیان فرمایا گیا ہے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ پوری کائنات کا مالک ہے، اس لئے اسے یہ احکام دینے کا حق ہے اور بندوں کو یہ احکام پوری طرح ماننے چاہئیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھتے ہیں، وہ نافرمانی کی صورت میں سزا اور فرماں برداری کی صورت میں انعام دینے پر قادر ہیں، چنانچہ فرمایا گیا:) اللہ ہی کی ہے سلطنت آسمانوں کی اور زمین کی، اور ان چیزوں کی جو ان (آسمانوں اور زمین) میں موجود ہیں، اور وہ ہر شے پر پوری قدرت رکھتے ہیں۔

* * *

فائدہ: یعنی ہر وفادار اور مجرم کے ساتھ وہ ہی معاملہ ہوگا جو ایک شہنشاہ مطلق کی عظمت وجلال کے مناسب ہے۔

ایاتها ۱۶۵ • ٦ سُوْرَةُ الْاَنْعَامِ مَكِّيَّةٌ ٥٥ • رکوعاتها ۲۰

خلاصہ تفسیر: گذشتہ سورت کے اختتام اور اس سورت کے آغاز میں تو مناسبت یہ ہے کہ دونوں سورتیں شرک کے باطل اور توحید کو ثابت کرنے کے دلائل پر مشتمل ہیں، اور ان دونوں کے مجموعہ میں یہ مناسبت ہے کہ دونوں سورتیں بیان شرائع پر مشتمل ہیں، اگرچہ گذشتہ سورت میں شرائع میں سے فروع بھی اصول کی طرح بہت زیادہ ہیں، چنانچہ انکا شمار بیس تک پہنچا ہے اور تقریباً اس مکمل سورت میں اصول ہی زیادہ ہیں، فروع بہت کم ہیں۔

* * *

فائدہ: یہ سورت مکی ہے، صرف چند آیات کو بعض علماء نے مستثنیٰ کیا ہے، روایات میں ہے کہ پوری سورت بیک وقت بے شمار فرشتوں کے جلو میں نازل ہوئی، مگر ابن صلاح نے اپنے فتاویٰ میں ان روایات کی صحت سے انکار کیا ہے جو پوری سورت کے دفعۃً نزول پر دال ہیں، واللہ اعلم۔

ابو اسحاق اسفرائنی کہتے ہیں کہ توحید کے تمام اصول وقواعد پر یہ سورت مشتمل ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ ڛ ثُمَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ ﴿١﴾

سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جس نے پیدا کئے آسمان اور زمین اور بنایا اندھیرا اور اجالا، پھر بھی یہ کافر اپنے رب کے ساتھ اوروں کو برابر کئے دیتے ہیں

خلاصہ تفسیر: (سورت کا آغاز توحید کے بیان سے ہے) تمام تعریفیں اللہ ہی کے لائق ہیں جس نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا (جو کہ جواہر میں سے ہے) اور تاریکیوں اور روشنی کو بنایا (جو کہ اعراض میں سے ہے) پھر بھی کافر لوگ (عبادت میں دوسروں کو) اپنے رب کے

برابر قرار دیتے ہیں۔

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ الَّذِیۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ: حمد کو پہلے اسم ذات یعنی "اللہ" کے متعلق کرنا، پھر اس کو صفات خاصہ کے ساتھ موصوف کرنا اس طرف اشارہ ہے کہ حق تعالیٰ دو وجہ سے حمد کے مستحق ہیں: ① ذات کی حیثیت سے بھی ② صفات کی حیثیت سے بھی، اور من حیث الذات کے معنی صفات کی نفی نہیں، بلکہ معنی یہ ہیں کہ اس وقت صفات کی طرف نظر نہیں۔

* * *

فائدہ: "مجوس" دنیا کے لئے دو خالق مانتے ہیں: ① "یزدان" جو خالق خیر ہے اور ② "اہرمن" جو خالق شر ہے، اور دونوں کو نور و ظلمت سے ملقب کرتے ہیں، ہندوستان کے مشرک تینتیس کروڑ دیوتاؤں کے قائل ہیں، آریہ سماج باوجود ادعائے توحید "مادہ" اور "روح" کو خدا کی طرح غیر مخلوق اور انادی کہتے اور خدا کو اپنی صفت تکوین و تخلیق وغیرہ میں ان دونوں کا محتاج بتلاتے ہیں، عیسائیوں کو باپ بیٹے کا توازن و تناسب قائم رکھنے کے لئے آخر تین ایک اور ایک تین کا مشہور عقیدہ اختیار کرنا پڑا ہے، یہودیوں نے خدا تعالیٰ کے لئے وہ صفات تجویز کیں کہ ایک معمولی انسان بھی نہ صرف اس کا ہم سر بلکہ اس سے برتر ہو سکتا ہے، عرب کے مشرکین نے تو خدائی کی تقسیم میں یہاں تک سخاوت دکھلائی کہ شاید ان کے نزدیک پہاڑ کا ہر پتھر نوع انسانی کا معبود بننے کی صلاحیت رکھتا تھا، غرض آگ، پانی، سورج، ستارے، درخت، پتھر، حیوان کوئی چیز لوگوں نے نہ چھوڑی جسے خدائی کا کچھ حصہ نہ دیا اور عبادت و استعانت وغیرہ کے وقت اسے خدا کی برابر نہ بٹھایا ہو۔

حالانکہ وہ ذات پاک جو تمام صفات و کمال کی جامع اور ہر قسم کی خوبیوں کا منبع ہونے کی وجہ سے سب تعریفوں اور ہر طرح کی حمد وثناء کی بلا شرکت غیر مستحق ہے، جس نے آسمان و زمین یعنی کل علویات و سفلیات کو پیدا کیا اور رات دن اندھیرا اجالا علم وجہل ہدایت و ضلالت موت و حیات غرض متقابل کیفیات اور متضاد احوال ظاہر فرمائے، اسے اپنے افعال میں نہ کسی حصہ دار یا مددگار کی ضرورت ہو سکتی ہے نہ بیوی اور اولاد کی نہ اس کی معبودیت اور الوہیت میں کوئی شریک ہو سکتا ہے اور نہ ربوبیت میں نہ اس کے ارادہ پر کوئی غالب آ سکتا ہے اور نہ اس پر کسی کا دباؤ اور زور چل سکتا ہے، پھر تعجب ہے ان حقائق کو سمجھنے کے بعد بھی کس طرح لوگ کسی چیز کو خدائی کا مرتبہ دے دیتے ہیں۔

هُوَ الَّذِیۡ خَلَقَكُمۡ مِّنۡ طِیۡنٍ ثُمَّ قَضٰۤی اَجَلًا ؕ وَاَجَلٌ مُّسَمًّی عِنۡدَهٗ ثُمَّ اَنۡتُمۡ تَمۡتَرُوۡنَ ②

وہی ہے جس نے پیدا کیا تم کو مٹی سے پھر مقرر کر دیا ایک وقت اور ایک مدت مقرر ہے اللہ کے نزدیک پھر بھی تم شک کرتے ہو

خلاصہ تفسیر: وہ (اللہ) ایسا ہے جس نے تم (سب) کو (آدم علیہ السلام کے واسطہ سے) مٹی سے بنایا، پھر (تمہارے مرنے کا) ایک وقت معین کیا، اور دوسرا وقت معین (دوبارہ زندہ ہو کر اٹھنے کا) خاص اللہ ہی کے نزدیک (معلوم) ہے، پھر بھی تم (میں سے بعض) شک رکھتے ہو (کہ دوبارہ زندہ ہونے کو محال سمجھتے ہو، حالانکہ جس نے پہلی بار حیات بخشی اس کو دوبارہ دینا کیا مشکل ہے)۔

ثُمَّ قَضٰۤی اَجَلًا ؕ وَاَجَلٌ مُّسَمًّی عِنۡدَهٗ: حق تعالیٰ نے دوسرے وقت (اجل) کے علم کو اپنے ساتھ مخصوص فرمایا، کیونکہ پہلا وقت (اجل) یعنی موت کا علم ظنی طور پر علامات سے مخلوق کو بھی معلوم ہو سکتا ہے اگرچہ یقینی طور پر نہ سہی، لیکن قیامت کا علم کسی طرح بھی نہیں ہو سکتا۔

* * *

فائدہ: اوپر "عالم کبیر" کی پیدائش کا ذکر تھا، یہاں "عالم صغیر" (انسان) کی خلقت کو بیان فرماتے ہیں کہ دیکھو شروع میں بے جان مٹی سے آدم علیہ السلام کا پتلا تیار کر کے کس طرح حیات اور کمالات انسانی فائض کئے اور آج بھی مٹی سے غذائیں نکلتی ہیں، غذاؤں سے نطفہ اور نطفہ سے انسان بنتے رہتے ہیں، غرض اس طرح تم کو عدم سے وجود میں لائے، پھر ہر شخص کی موت کا ایک وقت مقرر کر دیا جبکہ آدمی دوبارہ اس مٹی میں جا ملتا ہے جس سے پیدا کیا گیا تھا، اسی پر قیاس کر سکتے ہو کہ "عالم کبیر" کی فنا کا بھی ایک وقت مقرر ہے جسے "قیامت کبریٰ" کہتے ہیں، "قیامت صغریٰ" یعنی شخصی موتیں چونکہ ہمیں پیش آتی رہتی ہیں، ان کا علم بھی لوگوں کو ہوتا رہتا ہے لیکن "قیامت کبریٰ" کی ٹھیک مدت کا علم صرف اللہ ہی کے پاس ہے، تعجب ہے کہ "عالم

صغیر"، یعنی انسانوں میں زندگی اور فنا کا سلسلہ دیکھتے ہوئے بھی "عالم کبیر" کی فنا میں کوئی آدمی تردّد کرتا ہے۔

وَهُوَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَفِي الْاَرْضِ ؕ يَعْلَمُ سِرَّكُمْ وَجَهْرَكُمْ وَيَعْلَمُ مَا تَكْسِبُوْنَ ﴿۳﴾

اور وہی ہے اللہ آسمانوں میں اور زمین میں [1] جانتا ہے تمہارا چھپا اور کھلا اور جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو [2]

خلاصہ تفسیر: اور وہی ہے معبود برحق آسمانوں میں بھی اور زمین میں بھی (یعنی دیگر سب معبود باطل ہیں) وہ تمہارے پوشیدہ حالات کو بھی اور تمہارے ظاہر حالات کو بھی (یکساں) جانتے ہیں اور (بالخصوص) تم جو کچھ (ظاہراً یا باطناً) عمل کرتے ہو (جس پر جزاء وسزاء کا مدار ہے) اس کو جانتے ہیں۔

سورت کی پہلی تینوں آیتوں میں مقصود مشترک توحید ثابت کرنا ہے کہ عبادت کے لائق وہی ہے جس میں یہ صفات ہوں کہ تمہاری ذات اور تمام عالم کا پیدا کرنے والا ہو اور ظاہر و باطن کا جاننے والا ہو، اور آخر کی دو آیتوں میں قیامت کی خبر اور اس کے محال سمجھنے کو دور کیا اور اعمال پر حساب ہونے کی تنبیہ ہے جس سے شرک پر وعید ثابت ہوگئی۔

* * *

فائدہ: [1] یعنی تمام آسمانوں اور زمینوں میں تنہا وہ ہی معبود، مالک، بادشاہ، متصرّف اور مدبّر ہے اور یہ نام مبارک (اللہ) بھی صرف اسی کی ذات متعالی الصفات کیلئے مخصوص رہا ہے، پھر اوروں کیلئے استحقاق معبودیت کہاں سے آیا۔

فائدہ: [2] جب تمام زمین و آسمان میں اسی کی حکومت ہے اور وہ بلا واسطہ ہر کھلی چھپی چیز اور انسان کے ظاہر و باطن اور چھوٹے بڑے عمل پر مطلع ہے تو عابد کو اپنی عبادت واستعانت وغیرہ میں کسی غیر اللہ کو شریک ٹھہرانے کی ضرورت نہیں رہتی، مشرکین جو مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى (الزمر: ۳) کہا کرتے تھے، یہ ان کا اور ان کے ہم نواؤں کا جواب ہوا، اور پہلے وَاَجَلٌ مُّسَمًّى عِنْدَهٗ سے جو قیامت کی طرف اشارہ کیا تھا، یہاں سلسلہ مجازات پر متنبہ فرمادیا کہ زمین و آسمان میں حکومت ہماری ہے اور تمہارے سب کھلے چھپے نیک و بد اعمال بھی ہمارے علم میں موجود ہیں، پھر کوئی وجہ نہیں کہ تم یونہی مہمل چھوڑ دیئے جاؤ۔

وَمَا تَاْتِيْهِمْ مِّنْ اٰيَةٍ مِّنْ اٰيٰتِ رَبِّهِمْ اِلَّا كَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ ﴿۴﴾

اور نہیں آتی ان کے پاس کوئی نشانی ان کے رب کی نشانیوں میں سے مگر کرتے ہیں اس سے تغافل

خلاصہ تفسیر: پیچھے دلائل توحید کا بیان تھا، اب کفار کا آیات الٰہیہ سے مطلقاً اعراض کرنا مع وعید کے بیان کیا جاتا ہے۔

اور ان (کفار) کے پاس کوئی نشانی بھی ان کے رب کی نشانیوں میں سے نہیں آئی، مگر وہ اس سے اعراض ہی کیا کرتے ہیں۔

* * *

فائدہ: "آیات" میں احتمال ہے کہ تکوینی آیات مراد ہوں یا تنزیلی۔

فَقَدْ كَذَّبُوْا بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ ؕ فَسَوْفَ يَاْتِيْهِمْ اَنْۢبٰٓؤُا مَا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۵﴾

سو بیشک جھٹلایا انہوں نے حق کو جب ان تک پہنچا سو اب آئی جاتی ہے ان کے آگے حقیقت اس بات کی جس پر ہنستے تھے

خلاصہ تفسیر: سو (چونکہ یہ ان کی عادت بنی ہوئی ہے) انہوں نے اس سچی کتاب (قرآن) کو جھوٹا بتلایا جبکہ وہ ان کے پاس پہنچی، سو (ان کی یہ تکذیب خالی نہ جائے گی، بلکہ) جلد ہی ان کو خبر مل جائے گی اس چیز کی جس کے ساتھ یہ لوگ استہزاء کیا کرتے تھے (مراد اس سے عذاب ہے جس کی خبر قرآن میں سن کر ہنستے تھے، اور اس کی خبر ملنے کا مطلب یہ ہے کہ جب عذاب نازل ہوگا تو اس وقت اس خبر کی تصدیق آنکھوں

سے دیکھ لیں گے)۔

* * *

فائدہ: ''حق'' سے مراد غالباً قرآن کریم ہے جونشانہائے قدرت سے تغافل برتنے والوں کی بدانجامی اور دنیاوی واُخروی سزا کو بیان کرتا ہے، اسے سن کر منکرین تکذیب واستہزاء کرتے تھے، انھیں جتلا دیا کہ جس بات پر تم ہنستے اور آوازیں کستے ہو وہ حقیقت ثابتہ بن کر عنقریب تمہارے سامنے آجائے گی۔

ربط: آگے ان اقوام کا حوالہ دیا ہے جو آیات اللہ کی تکذیب واستہزاء اور بداعمالیوں کی بدولت ہلاک کی گئیں۔

اَلَمْ يَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ قَرْنٍ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ مَا لَمْ نُمَكِّنْ لَّكُمْ وَاَرْسَلْنَا

کیا دیکھتے نہیں کہ کتنی ہلاک کردیں ہم نے ان سے پہلے امتیں جن کو جما دیا تھا ہم نے ملک میں اتنا کہ جتنا تم کو نہیں جمایا اور چھوڑ دیا ہم نے

السَّمَآءَ عَلَيْهِمْ مِّدْرَارًا ۪ وَّجَعَلْنَا الْاَنْهٰرَ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمْ فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَاَنْشَاْنَا

ان پر آسمان کو لگا تار برستا ہوا، اور بنادیں ہم نے نہریں بہتی ہوئی ان کے نیچے پھر ہلاک کیا ہم نے ان کو ان کے گناہوں پر اور پیدا کیا ہم نے

مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ ۝۶

ان کے بعد اور امتوں کو

خلاصہ تفسیر: (اور اگر وہ عذاب کو بعید سمجھتے ہیں تو یہ ان کی غلطی ہے) کیا انہوں نے دیکھا نہیں کہ ہم ان سے پہلے کتنی جماعتوں کو (عذاب سے) ہلاک کرچکے ہیں جن کو ہم نے دنیا میں ایسی قوت (جسمانی اور مالی) دی تھی کہ تم کو وہ قوت نہیں دی، اور ہم نے ان پر خوب بارشیں برسائیں، اور ہم نے ان کے (کھیت اور باغوں کے) نیچے سے نہریں جاری کیں (جس سے زراعت اور پھلوں کی خوب ترقی ہوئی اور وہ خوش حالی کی زندگی بسر کرنے لگے) پھر (اس قوت وقدرت اور سامان واسباب کے باوجود) ہم نے ان کو ان کے گناہوں کے سبب (انواع عذاب سے) ہلاک کر ڈالا، اور ان کے بعد دوسری جماعتوں کو پیدا کردیا (تو اگر تم پر بھی عذاب نازل کردیں تو تعجب کیا ہے)۔

اَلَمْ يَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ: ان ہلاک ہونے والی جماعتوں سے عاد وثمود وغیرہ مراد ہیں جو کہ قسم قسم کے عذابوں سے ہلاک کیے گئے اور ان کی ہلاکت کے آثار نمایاں تھے، ان آثار کے دیکھنے کو ہلاکت کا دیکھنا فرمایا، اور جس عذاب سے موجودہ کفار کو ڈرایا گیا ہے اس سے مراد یا تو دنیوی عذاب ہو، چنانچہ قتل وقید کیے گئے، یا عذاب آخرت مراد ہو کہ وہ بھی قریب ہے، کیونکہ موت کے ساتھ ہی اس کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی عاد وثمود وغیرہ جن کو تم سے بڑھ کر طاقت اور ساز وسامان دیا گیا تھا، بارشوں اور نہروں کی وجہ سے ان کے باغ اور کھیت شاداب تھے، عیش وخوشحالی کا دور دورہ تھا، جب انھوں نے بغاوت اور تکذیب پر کمر باندھی اور نشانہائے قدرت کی ہنسی اڑانے لگے، تو ہم نے ان کے جرموں کی پاداش میں ایسا پکڑا کہ نام ونشان بھی باقی نہ چھوڑا، پھر انکے بعد دوسری امتیں پیدا کیں اور منکرین ومکذبین کے ساتھ یہ ہی سلسلہ جاری رہا کیا، مجرمین تباہ ہوتے رہے اور دنیا کی آبادی میں کچھ خلل نہیں پڑا۔

وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتٰبًا فِیْ قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوْهُ بِاَيْدِيْهِمْ لَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا

اور اگر اتاریں ہم تجھ پر لکھا ہوا کاغذ میں پھر چھولیں وہ اس کو اپنے ہاتھوں سے البتہ کہیں گے کافر یہ نہیں ہے مگر

سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۷﴾

صریح جادو

خلاصہ تفسیر: کفار کے اعراض وتکذیب کو بیان فرما کر آگے اس تکذیب پر ان کے اصرار وعناد ذکر فرماتے ہیں جو کہ توحید وآیات الٰہی کے ساتھ رسالت کے بارے میں بھی تھا، اور یہ تینوں مضمون جس ترتیب کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں واقع میں بھی ان میں یہی ترتیب ہے، کیونکہ تکذیب تو اعراض سے سخت ہے، اور عناد تکذیب سے بڑھ کر ہے۔

(اور ان لوگوں کے عناد کی یہ حالت ہے کہ) اگر ہم کاغذ پر لکھا ہوا کوئی نوشتہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) پر نازل فرماتے، پھر اس کو یہ لوگ اپنے ہاتھ سے چھو بھی لیتے (جیسا کہ ان کا مطالبہ تھا کہ لکھی ہوئی کتاب آسمان سے آجائے اور ہاتھوں سے چھو لینے کا ذکر کر کے نظر بندی کے شبہ کو بھی دور کر دیا جاتا) تب بھی یہ کافر لوگ یہی کہتے کہ یہ کچھ بھی نہیں مگر صریح جادو ہے (کیونکہ جب بات ماننے کا ارادہ ہی نہیں تو ہر دلیل میں کوئی نہ کوئی نئی بات نکال لینا کیا مشکل ہے)۔

وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتٰبًا: اس میں معاندین کا حال بیان کیا جا رہا ہے کہ وہ کسی طرح سے فائدہ نہیں اٹھاتے، اسی وجہ سے اہل اللہ ایسے لوگوں کے زیادہ در پے نہیں ہوتے۔

* * *

فائدہ: بعض مشرکین مکہ نے کہا تھا کہ اگر آپ آسمان سے ایک لکھی لکھائی کتاب لے آئیں اور اسکے ساتھ چار فرشتے بھی ہوں جو ہمارے سامنے ہو کر گواہی دیں کہ بیشک یہ کتاب خدا کی بھیجی ہوئی ہے تو ہم ایمان لے آئیں گے، اس کا جواب دیا کہ جو لوگ بحالت موجودہ قرآن کو جادو اور اس کے لانے والے کو جادوگر بتلاتے ہیں اگر واقعی ہم ان پر کاغذ میں لکھی ہوئی کتاب بھی آسمان سے اتار دیں جسے یہ ہاتھوں سے چھو کر معلوم کر لیں کہ کوئی تخیل یا نظر بندی نہیں ہے، تب بھی یہ ہی کہیں گے کہ یہ تو صریح جادو ہے، جس بدبخت کے حصہ میں ہدایت نہیں ہوتی اس کا شبہ کبھی نہیں مٹتا۔

وَقَالُوْا لَوْلَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ ؕ وَلَوْ اَنْزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِیَ الْاَمْرُ ثُمَّ لَا يُنْظَرُوْنَ ﴿۸﴾

اور کہتے ہیں کیوں نہیں اترا اس پر کوئی فرشتہ ؎ اور اگر ہم اتاریں فرشتہ تو طے ہوجائے قصہ پھر ان کو مہلت بھی نہ ملے ؎

خلاصہ تفسیر: اور یہ لوگ یوں بھی کہتے ہیں کہ ان (پیغمبر) کے پاس کوئی فرشتہ (جس کو ہم دیکھیں اور باتیں سنیں) کیوں نہیں بھیجا گیا؟ (حق تعالیٰ جواب میں فرماتے ہیں) اور اگر ہم کوئی فرشتہ (اسی طرح) بھیج دیتے تو سارا قصہ ہی ختم ہو جاتا، پھر (نزول فرشتہ کے بعد) ان کو ذرا مہلت نہ دی جاتی (کیونکہ عادت الٰہیہ یہ ہے کہ جن لوگوں کو منہ مانگا معجزہ دکھلا دیا گیا اگر پھر بھی انہوں نے ایمان سے انکار کیا تو فوراً بلا مہلت کے عذاب سے ہلاک کر دیا جاتا ہے اور اب بھی اگرچہ نہ ماننے سے عذاب ہوگا مگر کچھ مہلت تو ہے جس میں اگر توبہ کرنا چاہیں تو ممکن ہے)۔

وَلَوْ اَنْزَلْنَا مَلَكًا: اس صورت میں ان کے ہلاک ہونے کی وجہ یہ ہوتی کہ ایسے خوارق یعنی خلاف عادت امور کے ظاہر ہونے سے ان پر حجت الٰہیہ تمام ہو جاتی، اس سے معلوم ہوا کہ سلامتی کا طریقہ خوارق کا ظاہر نہ ہونا ہی ہے۔

* * *

فائدہ: ؎ یعنی جو ہمارے روبرو ہو کر ان کے صدق کی گواہی دیتا

فائدہ: ۲۔ اگر فرشتہ اپنی اصلی صورت میں آئے تو یہ لوگ ایک منٹ کیلئے بھی اس کا تحمل نہ کر سکیں اس کے رعب وہیبت سے دم نکل جائے، یہ صرف انبیاء علیہم السلام ہی کا ظرف ہوتا ہے جو اصلی صورت میں فرشتہ کی رویت کا تحمل کر سکتے ہیں نبی کریم ﷺ نے عمر بھر میں دو مرتبہ حضرت جبرائیل کو اپنی اصلی صورت میں دیکھا ہے، اور کسی نبی کی نسبت ایک مرتبہ بھی ثابت نہیں، دوسرے اگر ان لوگوں کی ایسی عظیم الشان خارق عادت فرمائش پوری کردی جائے اور اس پر بھی نہ مانے جیسا کہ ان کے معاندانہ احوال واطوار سے ظاہر ہے تو سنت اللہ کے موافق پھر قطعاً مہلت نہ دی جائے گی اور ایسا عذاب آئے گا جو فرمائش کرنے والوں کو بالکل نیست ونابود کردے گا، اس لحاظ سے اس طرح کی فرمائشوں کا پورا نہ کرنا بھی عین رحمت سمجھنا چاہئے۔

وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا وَّلَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَّا يَلْبِسُوْنَ ⑨

اور اگر ہم رسول بنا کر بھیجتے کسی فرشتہ کو تو وہ بھی آدمی ہی کی صورت میں ہوتا اور ان کو اسی شبہ میں ڈالتے جس میں اب پڑ رہے ہیں

خلاصہ تفسیر: اور اگر (کسی کو یہ احتمال ہو کہ شاید فرشتہ کو دیکھنے اور اس کی باتیں سننے کے بعد یہ مان ہی لیتے تو یہ احتمال غلط ہے، کیونکہ) ہم اس (پیغام پہنچانے والے) کو فرشتہ تجویز کرتے تو (اس کو آدمی ہی کی شکل میں بھیجتے، کیونکہ اگر فرشتہ کو اصلی صورت میں بھیجتے تو اس کی ہیبت انسانوں سے برداشت نہ ہوتی، اس لئے) ہم اس (فرشتہ) کو (شکل کے اعتبار سے) آدمی ہی بناتے اور (جب وہ آدمی کی شکل پر ہوتا تو) ہمارے اس فعل سے (اُس وقت) پھر ان کو وہی اشکال (اور شبہ) ہوتا جو اَب اشکال (اور شبہ) کر رہے ہیں (یعنی اس فرشتہ کو آدمی سمجھ کر پھر یہی اعتراض کرتے کہ ہمارے پاس فرشتہ کو رسول بنا کر کیوں نہ بھیجا گیا)۔

وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا: غرض نزول فرشتہ جس کا یہ مطالبہ کرتے ہیں اگر اس کو پورا کر دیا جائے تو ان کو اس سے کوئی فائدہ تو اس لئے نہیں ہوسکتا کہ فرشتہ بشکل فرشتہ دیکھنے پر ان کو قدرت نہیں، اور انسان کی شکل میں بھیجنے سے ان کا شبہ دور نہیں ہوگا، اور دوسری طرف ان کو نقصان یہ پہنچے گا کہ نہ ماننے پر خود ہی عذاب کے مستحق ہو جائیں گے، خلاصہ یہ کہ انتہائی عناد کی وجہ سے ایسی باتیں نکالتے ہیں جو ہدایت اور حق کے واضح ہونے کا طریقہ نہیں، اور جو اس کا طریقہ ہے کہ آیات اور موجودہ معجزات میں غور کرنا تو اس سے کام نہیں لیتے۔

* * *

فائدہ: چونکہ فرشتہ کو اصلی صورت میں بھیجنے کی نفی تو پہلی آیت میں ہو چکی ہے، اب دوسرے احتمال کا جواب دیتے ہیں وہ یہ کہ فرشتہ آدمی کی صورت میں بھیجا جائے، کیونکہ اسی صورت میں مجانست صوری کی بناء پر لوگ اس کے نمونہ اور تعلیم سے منتفع ہو سکتے ہیں، لیکن اس تقدیر پر منکرین کے شبہات کا ازالہ نہیں ہوسکتا، جو شکوک وشبہات رسول کے بشر ہونے پر کرتے تھے وہ ملک کے بصورت بشر آنے پر بھی بدستور کرتے رہیں گے۔

وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِيْنَ سَخِرُوْا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ⑩ ع

اور بلاشبہ ہنسی کرتے رہے ہیں رسولوں سے تجھ سے پہلے پھر گھیر لیا ان سے ہنسی کرنے والوں کو اس چیز نے کہ جس پر ہنسا کرتے تھے

خلاصہ تفسیر: گذشتہ آیات میں کفار کے اعراض، تکذیب، استہزاء اور عناد کا ذکر تھا، چونکہ اس سے رسول اللہ ﷺ کو صدمہ پہنچتا تھا، اس لیے اب تسلی کا مضمون بیان فرماتے ہیں۔

اور (آپ ان کے بیہودہ مطالبات سے غم نہ کریں، کیونکہ) واقعی آپ سے پہلے جو پیغمبر ہوئے ہیں ان کے ساتھ بھی (مخالفین کی طرف سے) استہزاء کیا گیا ہے (جو لازم ہے جھٹلانے کو، سو یہ کوئی نئی بات نہیں) پھر (استہزا سے پیغمبروں کا کوئی نقصان نہ ہوا، بلکہ ان کفار ہی کو اس کا انجام بھگتنا پڑا، کیونکہ) جن لوگوں نے ان سے تمسخر کیا تھا ان کو اس عذاب نے آگھیرا جس کا تمسخر اڑاتے تھے (جس سے معلوم ہوا کہ ان کے اس طرز عمل سے انبیاء کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا، بلکہ یہ خود انہی کے لئے عذاب اور مصیبت ہے)۔

* * *

فائدہ: معاندین کی فرمائشوں کا جواب دینے کے بعد حضور کی تسلی کی جاتی ہے کہ آپ ان کے استہزاء اور تمسخر سے دل گیر نہ ہوں، یہ کوئی نئی بات نہیں انبیاء سابقین کو بھی ان ہی حالات سے دوچار ہونا پڑا ہے، پھر جو ان کے مکذبین اور دشمنوں کا حشر ہوا سب کے سامنے ہے، ان کو بھی خدا اسی طرح سزا دے سکتا ہے جو اگلے مجرموں کو دی گئی۔

قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ ثُمَّ انْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۱۱﴾

تو کہہ دے کہ سیر کرو ملک میں پھر دیکھو کیا انجام ہوا جھٹلانے والوں کا

خلاصہ تفسیر: (اور اگر یہ لوگ سابقہ امتوں پر عذاب کا انکار کرنے لگیں) تو آپ (ان سے) فرمادیجئے کہ ذرا زمین میں چلو پھرو، پھر دیکھو کہ تکذیب کرنے والوں کا کیا انجام ہوا (آثار کے ہوتے ہوئے کسی چیز کا انکار مشکل ہے)۔

* * *

فائدہ: یعنی ملک کی سیر و سیاحت اور تباہ شدہ اقوام کے آثار کا ملاحظہ کرنے کے بعد اگر نظر عبرت سے واقعات ماضیہ کو دیکھو گے تو انبیاء کی تکذیب کرنے والی قوموں کا جو انجام دنیا میں ہوا وہ صاف نظر آجائے گا، اسی سے قیاس کرلو کہ جب تکذیب کرنے والوں کا یہ حشر ہوا تو استہزاء کرنے والوں کا کیا حشر ہوگا۔

قُلْ لِّمَنْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ قُلْ لِّلّٰهِ ۭ كَتَبَ عَلٰي نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۭ لَيَجْمَعَنَّكُمْ

پوچھ کہ کس کا ہے جو کچھ کہ ہے آسمانوں اور زمین میں، کہہ دے اللہ کا ہے اس نے لکھی ہے اپنے ذمہ مہربانی، البتہ تم کو اکٹھا کردے گا

اِلٰي يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ۭ اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲﴾

قیامت کے دن تک کہ اس میں کچھ شک نہیں، جو لوگ نقصان میں ڈال چکے اپنی جانوں کو وہی ایمان نہیں لاتے

خلاصہ تفسیر: پیچھے جو توحید کا مضمون تھا اب پھر اسی کا بیان ہے اور اس کے ضمن میں معاد یعنی قیامت کا مضمون ہے تاکہ عقیدہ توحید کی رغبت اور شرک سے رہبت ہو۔

آپ (ﷺ ان مخالفین سے بطور الزام حجت کے) کہیے کہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں موجود ہے یہ سب کس کی ملک ہے؟ (اوّل تو وہ بھی یہی جواب دیں گے جس سے توحید ثابت ہوگی، اور اگر کسی وجہ سے جیسے مغلوبیت کے خوف کی وجہ سے جواب نہ دیں تو) آپ کہہ دیجئے کہ سب اللہ ہی کی ملک ہے (اور ان سے یہ بھی کہہ دیجئے کہ) اللہ تعالیٰ نے (اپنے فضل سے توبہ کرنے والوں کے ساتھ) مہربانی فرمانا اپنے ذمہ لازم فرمالیا ہے (پس جب توحید واقع میں بھی حق اور سبب رحمت ہے تو اسے اختیار کرلو، اور یہ بھی کہہ دیجئے کہ اگر تم نے توحید کو قبول نہ کیا تو پھر سزا بھی بھگتنا پڑے گی، کیونکہ) تم کو خدا تعالیٰ قیامت کے روز (قبروں سے زندہ اٹھا کر میدان حشر میں) جمع کریں گے (اور سب کا حساب کریں گے، پھر جیسا عمل ہوگا ویسا برتاؤ فرمائیں گے، اور قیامت کی حالت یہ ہے کہ) اس کے آنے میں کوئی شک نہیں (اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اگرچہ آپ توحید کا اثبات، وعدہ رحمت اور عذاب کی وعید کتنا ہی بیان کردیں مگر) جن لوگوں نے اپنے کو (یعنی اپنی صحیح عقل و نظر کو) ضائع (یعنی معطل) کرلیا ہے، سو وہ ایمان نہ لائیں گے (کیونکہ کسی مطلوب کو حاصل کرنے کے لیے فکری قوت کا استعمال ضروری ہے اور یہ اس سے کام نہیں لینا چاہتے، پھر ایمان کیونکر لائیں گے)۔

كَتَبَ عَلٰي نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ: اپنے اطلاق سے اس پر دلالت کرتا ہے کہ حق تعالیٰ کی رحمت سب کو عام اور شامل ہے، چنانچہ ادنیٰ غور و فکر سے معلوم ہوسکتا ہے کہ کوئی غضب ایسا نہیں جس میں کچھ رحمت نہ ملی ہو، اور بہت سی رحمتیں ایسی ہیں جن میں ذرا غضب نہیں، اور مومنین معذبین پر تو عین عذاب میں بھی رحمت ہونا ظاہر ہے کہ وہ تہذیب یعنی اصلاح کا ذریعہ ہے، اور تہذیب و اصلاح کے بعد بھی رحمت ہے کہ مغفرت ہوجائے گی، اور کفار

معذبین پر اس طرح کہ حق تعالیٰ نے اِس عذاب سے زیادہ سخت جو عذاب تھا اُس سے محفوظ رکھا۔

***

فائدہ: جب تمام آسمان وزمین میں اسی خدا کی حکومت ہے جیسا کہ مشرکین کو بھی اقرار تھا تو مکذبین ومستہزئین کو فوری سزا سے کہاں پناہ مل سکتی ہے؟ یہ صرف اس کی رحمت عامہ ہے کہ جرائم کو دیکھ کر فوری سزا جاری نہیں کرتا اور قیامت کے دن بھی جو بلاشبہ آنے والا ہے محض ان ہی بدبختوں کو بے ایمانی کی سزا دے گا جو باختیار خود جان بوجھ کر اپنے کو نقصان وہلاکت کے گڑھے میں ڈال چکے ہیں۔

وَلَهٗ مَا سَكَنَ فِي الَّيْلِ وَالنَّهَارِ ۭ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۳﴾

اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ کہ آرام پکڑتا ہے رات میں اور دن میں، اور وہی ہے سب کچھ سننے والا جاننے والا

خلاصہ تفسیر: اور (ان سے توحید کے اثبات اور اتمام حجت کے طور پر آپ ان سے دوبارہ یوں بھی کہئے کہ) اللہ ہی کے ملک میں ہے جو کچھ رات میں اور دن میں رہتے ہیں (یہ اور اس سے پہلی آیت: قُلْ لِّمَنْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کے مجموعہ کا حاصل یہ نکلا کہ جتنی چیزیں کسی مکان یا زمان میں ہیں سب اللہ کی مملوک ہیں) اور وہی سب سے بڑا سننے والا جاننے والا ہے۔

قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَتَّخِذُ وَلِيًّا فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ ۭ

تو کہہ دے کیا اور کسی کو بناؤں اپنا مددگار اللہ کے سوا جو بنانے والا ہے آسمانوں اور زمین کا[1] اور وہ سب کو کھلاتا ہے اور اسکو کوئی نہیں کھلاتا[2]

قُلْ اِنِّىْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۴﴾

کہہ دے مجھ کو حکم ہوا ہے کہ سب سے پہلے حکم مانوں[3] اور تو ہر گز نہ ہو شرک والا

خلاصہ تفسیر: (پھر توحید ثابت کرنے کے بعد ان سے) کہئے کہ کیا اللہ کے سوا جو کہ آسمان اور زمین کے پیدا کرنے والے ہیں اور جو (سب کو) کھانا کھلاتے ہیں اور ان کو کوئی نہیں کھلاتا (کیونکہ وہ کھانے پینے کی احتیاج سے بالاتر ہیں، تو کیا ایسے اللہ کے سوا) کسی کو اپنا معبود قرار دوں، آپ (اس استفہام انکاری کی تشریح میں خود) فرما دیجئے (کہ میں اللہ کے سوا کسی کو معبود کیسے قرار دے سکتا ہوں جو عقل ونقل کے خلاف ہے اور) مجھ کو یہ حکم ہوا ہے کہ (جتنے لوگوں کو قرآن کے ذریعہ سے توحید پہنچے گی ان میں) سب سے پہلے میں اسلام قبول کرلوں (جس میں عقیدہ توحید بھی آ گیا) اور (مجھے یہ کہا گیا کہ) تم مشرکین میں سے ہر گز نہ ہونا۔

وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ: یعنی تم مشرکین میں سے ہر گز نہ ہونا، پیغمبر سے تو شرک واقع ہونے کا احتمال ہی نہیں تھا مگر دوسروں کو سنانے کے لیے یہ کہا گیا تاکہ تنبیہ ہو جائے کہ جب پیغمبر معصوم کو یہ حکم ہے تو عام لوگوں کو تو بدرجہ اولیٰ یہ حکم ہوگا جہاں شرک کا احتمال بھی موجود ہے۔

قُلْ اِنِّىْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ: اس میں دلالت ہے کہ تکالیف شرعیہ یعنی شرعی احکامات وہدایات کی پابندی کسی سے ساقط نہیں ہوتی حتی کہ انبیاء سے بھی (زندگی کے آخری لمحہ تک وہ پابند شریعت ہی رہتے ہیں)۔

***

فائدہ: [1] قُلْ لِّمَنْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ میں مکان کی تعمیم تھی وَلَهٗ مَا سَكَنَ فِي الَّيْلِ وَالنَّهَارِ میں زمانہ کے اعتبار سے تعمیم ہے یعنی ہر جگہ اور ہر وقت اسی کی حکومت اور قبضہ واقتدار ہے، ہر وہ چیز جو رات میں یا دن میں آرام سے زندگی بسر کرتی اور کتنے معلوم ونامعلوم دشمنوں سے مامون ومحفوظ رہتی ہے، یہ اسی کی رحمت کاملہ کے آثار میں سے ہے: قُلْ مَنْ يَّكْلَؤُكُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ مِنَ الرَّحْمٰنِ (الانبیاء: ۴۲) وہ ہی ہے جو دن کے شور وغل اور رات کے اندھیرے اور سناٹے میں ہر ایک کی پکار سنتا ہے اور سب کی حوائج وضروریات کو بخوبی جانتا ہے، پھر تم ہی بتاؤ

کہ ایسے پروردگار کو چھوڑ کر کسی اور سے مدد طلب کرنا کہاں تک موزوں ہوگا۔

فائدہ:۲۔ وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ: کھلانا اشارہ ہے سامان بقاء کی طرف یعنی ایجاد و بقاء دونوں میں اسی کے سب محتاج ہیں، اس کو کسی ادنیٰ سے ادنیٰ چیز میں بھی ہماری احتیاج نہیں پھر اس سے علیحدہ ہو کر کسی کو مددگار بنانا انتہائی حماقت نہیں تو اور کیا ہے۔

فائدہ:۳۔ اَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ: ایسے پروردگار کے احکام کے سامنے جس کی صفات اوپر مذکور ہوئیں پہلے اس اکمل ترین بندہ کو انتہائی انقیاد و تسلیم کا حکم ہے جو تمام دنیا کیلئے نمونہ طاعت و عبودیت بنا کر بھیجا گیا تھا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)۔

قُلْ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۵﴾

تو کہہ میں ڈرتا ہوں اگر نافرمانی کروں اپنے رب کی ایک بڑے دن کے عذاب سے

خلاصہ تفسیر: آپ (اپنے اوپر رکھ کر انہیں شرک کا عذاب سنانے کے لیے) کہہ دیجئے کہ اگر میں اپنے رب کا کہنا نہ مانوں (کہ اسلام و ایمان کے حکم کی تعمیل نہ کروں یا شرک میں مبتلا ہو جاؤں) تو میں ایک بڑے دن (یعنی قیامت) کے عذاب سے ڈرتا ہوں (یہ ظاہر ہے کہ رسول کریم ﷺ معصوم ہیں، اسلام و ایمان کے خلاف شرک و معصیت کا صادر ہونا آپ ﷺ سے ممکن نہیں، مگر یہاں سنانا عام امت کو ہے کہ نبی معصوم بھی اللہ کے عذاب سے خوف رکھتے ہیں)۔

* * *

فائدہ: یہ آپ پر رکھ کر اوروں کو سنایا گیا ہے یعنی بفرض محال اگر خدا کے معصوم و برگزیدہ ترین بندے سے بھی کسی طرح کا عصیان سرزد ہو تو عذاب الٰہی کا اندیشہ ہوتا ہے پھر کسی دوسرے کو کب لائق ہے کہ باوجود شرک و کفر اور تکذیب انبیاء وغیرہ ہزاروں طرح کے جرائم میں مبتلاء ہونے کے عذاب الٰہی سے بے فکر اور مامون ہو کر بیٹھ رہیں۔

مَنْ يُّصْرَفْ عَنْهُ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمَهٗ ؕ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۶﴾

جس پر سے ٹل گیا وہ عذاب اس دن تو اس پر رحم کر دیا اللہ نے، یہی ہے بڑی کامیابی

خلاصہ تفسیر: (پھر فرمایا کہ وہ عذاب ایسا ہے کہ) جس شخص سے اس روز کا عذاب ہٹا دیا گیا اس پر اللہ تعالیٰ نے بڑا رحم کیا (یہ وہ شخص ہوگا جو کہ اسلام قبول کرنے اور شرک سے بچنے میں خدا کا کہنا مانے) اور یہ (عذاب کا ہٹ جانا اور اللہ کی رحمت کا متوجہ ہو جانا) صریح کامیابی ہے (عذاب کی اس کیفیت سے اس رحمت کا بیان بھی ہو گیا جس کا وعدہ توحید قبول کرنے والوں کے لیے پہلے کیا گیا ہے: كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ)۔

* * *

فائدہ: جنت اور رضائے الٰہی کے اعلیٰ مدارج کا حاصل کرنا تو بہت اونچا مقام ہے، اگر آدمی سے قیامت کے دن کا عذاب ٹل جائے تو یہ ہی بہت بڑی کامیابی سمجھو، کما قال عمر کفافا لا لی ولا علی۔

وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا هُوَ ؕ وَاِنْ يَّمْسَسْكَ بِخَيْرٍ فَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۷﴾

اور اگر پہنچا دے تجھ کو اللہ کچھ سختی تو کوئی اس کو دور کرنے والا نہیں سوا اس کے، اور اگر تجھ کو پہنچا دے بھلائی تو وہ ہر چیز پر قادر ہے

وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ ؕ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ ﴿۱۸﴾

اور اسی کا زور ہے اپنے بندوں پر، اور وہی ہے بڑی حکمت والا سب کی خبر رکھنے والا

خلاصہ تفسیر: آگے اپنی قدرت کاملہ ظاہر فرماتے ہیں تاکہ رحمت کے وعدہ اور عذاب کی وعید میں کسی کی مزاحمت اور مقابلہ کا احتمال نہ رہے۔

اور (آپ ﷺ ان کو یہ بھی سنا دیجئے کہ اے انسان!) اگر تجھ کو اللہ تعالیٰ کوئی تکلیف (دنیا یا آخرت میں) پہنچا دیں تو اس کا دور کرنے والا سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی نہیں (وہی چاہیں تو دور کریں یا نہ کریں اور جلد کریں یا دیر میں کریں) اور اگر تجھ کو (اسی طرح) کوئی نفع پہنچا دیں (تو اس کا بھی کوئی ہٹانے والا نہیں، جیسا کہ دوسری جگہ ہے: لا راد لفضله کیونکہ) وہ ہر چیز پر پوری قدرت رکھنے والے ہیں (اللہ کے مقابلہ میں کسی کو قدرت نہیں، اس لیے اللہ کے ارادے کو کوئی نہیں ہٹا سکتا، اور مذکورہ مضمون کی تاکید کے لئے یہ بھی فرما دیجئے کہ) وہی اللہ تعالیٰ (قدرت کے اعتبار سے) اپنے بندوں پر غالب اور برتر ہیں اور (علم کے اعتبار سے) وہی بڑی حکمت والے اور پوری خبر رکھنے والے ہیں (پس وہ علم سے سب کا حال جانتے ہیں اور قدرت سے سب کو جمع کر لیں گے اور حکمت سے مناسب جزاء وسزا دیں گے اس لیے اسلام قبول کرنا ضروری ہے)۔

وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ: اس میں غیر اللہ سے مستقل تصرف کی نفی ہے حتیٰ کہ مقبولین بارگاہ سے بھی، نیز اس میں رد ہے اس شخص پر جو غیر اللہ سے ضرر ونقصان کے ازالہ کی توقع رکھے۔

* * *

فائدہ: دنیا یا آخرت میں جو تکلیف یا راحت خدا کسی کو پہنچانا چاہے نہ کوئی مقابلہ کر کے روک سکتا ہے اور نہ اس کے غلبہ واقتدار کے نیچے سے نکل کر بھاگ سکتا ہے، وہ پوری طرح خبردار ہے کہ کس بندے کے کیا حالات ہیں اور ان حالات کے مناسب کس قسم کی کارروائی قرین حکمت ہوگی۔

قُلْ اَيُّ شَيْءٍ اَكْبَرُ شَهَادَةً ؕ قُلِ اللّٰهُ ۙ شَهِيْدٌۢ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ۚ وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ

تو پوچھ سب سے بڑا گواہ کون ہے، کہہ دے اللہ گواہ ہے میرے اور تمہارے درمیان ۔ اور اترا ہے مجھ پر یہ قرآن

لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ ؕ اَئِنَّكُمْ لَتَشْهَدُوْنَ اَنَّ مَعَ اللّٰهِ اٰلِهَةً اُخْرٰى ؕ قُلْ لَّاۤ اَشْهَدُ ۚ

تاکہ تم کو اس سے خبردار کروں اور جس کو یہ پہنچے، کیا تم گواہی دیتے ہو کہ اللہ کے ساتھ معبود اور بھی ہیں، تو کہہ دے میں تو گواہی نہ دوں گا

قُلْ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّاِنَّنِيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ﴿۱۹﴾

کہہ دے وہی ہے معبود ایک اور میں بیزار ہوں تمہارے شرک سے ۔

خلاصہ تفسیر: پیچھے توحید ورسالت کے بارے میں جدا جدا کلام ہوا ہے، آگے دونوں میں ایک ساتھ کلام ہے اور اس کا شان نزول بھی دو واقعے ہیں جو دونوں مسئلوں کے متعلق تھے، ایک بار کفار مکہ نے حضور ﷺ کی خدمت میں آ کر کہا خدا تعالیٰ کو آپ کے سوا کوئی رسول نہیں ملا، ہم تو نہیں سمجھتے کہ آپ کے دعویٰ کی کوئی تصدیق کر سکتا ہے، ہم نے تو یہود ونصاریٰ سے پوچھ کر دیکھ لیا، وہ تو یوں کہتے ہیں کہ ان کی کتابوں میں آپ کا ذکر ہی نہیں، سو ہم کو کوئی بتلائے جو اس بات کی گواہی دے کہ آپ اللہ کے رسول ہیں، اس پر یہ آیتیں نازل ہوئیں، اور ایک بار چند لوگوں نے آپ ﷺ کی خدمت میں آ کر کہا کہ کیا آپ کے علم میں اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں؟ آپ نے فرمایا کہ میرے علم میں کیا حقیقت میں بھی اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں، میں تو یہی دے کر بھیجا گیا ہوں اور اسی کی دعوت دیتا ہوں، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

آپ (ﷺ ان منکرین توحید ورسالت سے) کہئے کہ (اچھا یہ تو بتلاؤ کہ) سب سے بڑھ کر چیز گواہی دینے کے لئے کون ہے؟ (جس کی گواہی دینے پر سب کا اختلاف دور ہو جائے، اس کا جواب ظاہر ہے یہی ہوگا کہ اللہ تعالیٰ سب سے بڑھ کر ہیں، پھر) آپ (ﷺ) کہئے کہ میرے اور تمہارے درمیان (جس مسئلہ میں اختلاف ہے اس میں وہی) اللہ تعالیٰ گواہ ہے (جس کی گواہی سب سے بڑھ کر ہے) اور (خدا کی گواہی یہ ہے کہ)

میرے پاس یہ قرآن بطور وحی کے (اللہ کی طرف سے) بھیجا گیا ہے (جس کا اعلیٰ درجہ کا معجزہ ہونا ظاہر ہو چکا، پس قرآن اپنے اعجاز کی وجہ سے میرے رسول اللہ ہونے کی دلیل ہے) تا کہ میں اس قرآن کے ذریعہ تم کو اور جس جس کو یہ قرآن پہنچے ان سب کو (ان وعیدوں سے) ڈراؤں (جو توحید ورسالت کے انکار پر اس میں مذکور ہیں، کیونکہ قرآن مجید کے معجزہ ہونے سے رسول اللہ ﷺ کی سچائی پر اللہ تعالیٰ کی تکوینی شہادت ہوگئی اور مضامین قرآن سے اس کی تشریعی شہادت ہوگئی) کیا تم (اس شہادت کبریٰ کے بعد بھی جو کہ توحید کو شامل ہے) توحید کے بارے میں سچ مچ یہی گواہی دو گے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ (عبادت کے مستحق ہونے میں) کچھ اور معبود بھی (شریک) ہیں (اور اگر اس شہادت کبری کے بعد بھی ہٹ دھرمی سے وہ یہی کہیں کہ ہاں! ہم تو یہی گواہی دیں گے تو اس وقت ان سے بحث کرنا فضول ہے، بلکہ صرف) آپ (اپنے عقیدہ کو ظاہر کرنے کے لئے) کہہ دیجئے کہ میں تو اس کی گواہی نہیں دیتا (کیونکہ یہ بات باطل ہے اور) آپ (باطل کی نفی کر کے حق کو ثابت کرنے کے لیے) کہہ دیجیے کہ بس وہ تو ایک ہی معبود ہے اور بیشک میں تمہارے شرک سے بیزار ہوں۔

لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ: یعنی تا کہ میں اس قرآن کے ذریعہ تم کو اور جس جس کو یہ قرآن پہنچے ان سب کو ڈراؤں، اس میں حضور ﷺ کی رسالت کا تمام مخلوق کے لیے عام ہونا مذکور ہے، یعنی اس سے ثابت ہوا کہ نبی کریم ﷺ خاتم النبیین اور آخری پیغمبر ہیں اور قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے، قیامت تک اس کی تعلیم اور تلاوت باقی رہے گی اور لوگوں پر اس کا اتباع لازم رہے گا۔

* * *

فائدہ: ۱ے جب یہ فرمایا کہ خدا ہی سب نفع وضرر کا مالک، تمام بندوں پر غالب وقاہر اور رتی رتی سے خبردار ہے تو اس کی شہادت سے زبردست اور بے لوث شہادت کس کی ہوسکتی ہے، پس میں بھی اپنے تمہارے درمیان اسی کو گواہ ٹھہراتا ہوں، کیونکہ میں نے دعویٰ رسالت کر کے جو کچھ اس کے پیغامات تم کو پہنچائے اور جو کچھ تم نے اس کے جواب میں میرے ساتھ اور خود پیغام ربانی کے ساتھ برتاؤ کیا وہ سب اس کی آنکھ کے سامنے ہے، وہ خود اپنے علم محیط کے موافق میرا اور تمہارا فیصلہ کردے گا۔

فائدہ: ۲ے یعنی اگر سمجھو تو میرے صدق پر خدا کی یقینی اور کھلی ہوئی شہادت یہ قرآن موجود ہے جو اپنے کلام الٰہی ہونے پر خود ہی اپنی دلیل ہے: آفتاب آمد دلیل آفتاب، میرا کام یہ ہے کہ تم کو اور ہر اس شخص کو جسے یہ کلام پہنچے خدائی پیغام سے خبردار کردوں جس میں توحید ومعاد وغیرہ تمام اصول دین کی ہدایت کی گئی ہے کیا اس قدر اتمام حجت ہو چکنے اور ایسا قطعی اور صریح پیغام توحید سننے کے بعد بھی تم یہ ہی کہتے رہو گے کہ خدا کے سوا اور بھی معبود ہیں، تم کو اختیار ہے جو چاہو کہو، میں تو کبھی ایسا حرف زبان پر نہیں لاسکتا بلکہ صاف صاف بیان کرتا ہوں کہ لائق عبادت صرف وہ ہی ایک خدا ہے، باقی جو کچھ تم شرک کرتے ہو میں اس سے قطعاً بیزاری اور نفرت کا اظہار کرتا ہوں۔

تنبیہ: ومن بلغ نے بتلا دیا کہ نبی کریم ﷺ کی رسالت تمام جن وانس اور مشرق ومغرب کے لئے ہے۔

قف لازم اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ۘ اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ

جن کو ہم نے دی کتاب وہ پہچانتے ہیں اس کو جیسے پہچانتے ہیں اپنے بیٹوں کو، جو لوگ نقصان میں ڈال چکے اپنی جانوں کو

فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۲۰﴾ ع ۸

وہی ایمان نہیں لاتے

خلاصہ تفسیر: (اور آپ ﷺ کی رسالت کے بارے میں جو یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم نے یہود ونصاریٰ سے پوچھ کر دیکھ لیا تو اس معاملہ کی تحقیق یہ ہے کہ) جن لوگوں کو ہم نے کتاب (تورات وانجیل) دی ہے وہ سب لوگ رسول (ﷺ) کو (شروع سے بلا شک وشبہ ایسا) پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں (کہ بیٹے کی صورت دیکھ کر عادتاً کبھی شبہ نہیں ہوتا کہ یہ کون ہے؟ اگرچہ زبان سے انکار کرے اور

چھپائے، اسی طرح وہ حضور کو دل سے بلاشک وشبہ خوب پہچانتے ہیں کہ یہ رسول برحق ہیں اگرچہ انکار کریں اور چھپائیں، لیکن جب شہادت کبریٰ قرآن مجید اور دیگر معجزات موجود ہونے کی وجہ سے اہل کتاب کی شہادت پر مدار ہی نہیں تو اس کے نہ ہونے سے بھی کوئی استدلال نہیں کیا جاسکتا، اور ایسی شہادت کبریٰ کے ہوتے ہوئے بھی) جن لوگوں نے اپنے کو ضائع کرلیا ہے (یعنی اپنی عقل کو معطل کردیا اور عقل سے کام نہیں لیا خواہ وہ اہل کتاب ہوں یا غیر اہل کتاب) سو وہ ایمان نہ لائیں گے (اور رسالت کو نہ مانیں گے)۔

يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ: اس جگہ حق تعالیٰ نے تشبیہ کے موقع پر یہ ارشاد فرمایا کہ جیسے لوگ اپنے بچوں کو پہچانتے ہیں، یہ نہیں فرمایا کہ جیسے بچے اپنے ماں باپ کو پہچانتے ہیں، وجہ یہ ہے کہ ماں باپ کی پہچان اپنے بچوں کے لئے سب سے زیادہ تفصیلی اور یقینی ہوتی ہے، بچوں کے بدن کا ہر حصہ ماں باپ کے سامنے آتا رہتا ہے، وہ بچپن سے لے کر جوانی تک ان کے ہاتھوں اور گود میں پرورش پاتے ہیں، اس لئے وہ جتنا اپنی اولاد کو پہچان سکتے ہیں اتنا اولاد ان کو نہیں پہچان سکتی، اسکے متعلق بعض ضروری باتیں دوسرے پارہ کے شروع آیت ۱۴۶ میں گذر چکی ہیں وہاں ملاحظہ کرلیا جائے۔

اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ: یہ پیچھے آیت ۱۲ میں بھی گذرا ہے مگر وہاں توحید کے بارے میں تھا اور یہاں رسالت کے بارے میں ہے، سو تکرار لازم نہیں آیا، اگرچہ تاکید کے لیے بھی دوبارہ ایک مضمون کو لانا مستحسن ہوتا ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی اس کے علاوہ کہ میری صداقت کا خدا گواہ ہے اور قرآن کریم اس کی ناطق اور ناقابل تردید شہادت دے رہا ہے، وہ اہل کتاب (یہود ونصاریٰ) بھی جن کی طرف کتب سماویہ کا عالم سمجھ کر تم میرے معاملہ میں رجوع کرتے ہو، اپنے دلوں میں پورا یقین رکھتے ہیں کہ بلاشبہ میں ہی وہ نبی آخر الزماں ہوں جس کی بشارت انبیائے سابقین دیتے چلے آئے ہیں، ان کو جس طرح بہت سے بچوں میں سے اپنی اولاد کے شناخت کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی، ایسے ہی نبی کریم ﷺ اور قرآن کریم کی صداقت کے معلوم کرنے میں بھی کوئی شبہ اور دھوکہ نہیں ہے، البتہ حسد، کبر، تقلید آباء، اور حب جاہ ومال وغیرہ اجازت نہیں دیتے کہ مشرف بایمان ہوکر اپنی جانوں کو نقصان دائمی اور ہلاکت ابدی سے بچائیں۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۱﴾

اور اس سے زیادہ ظالم کون جو بہتان باندھے اللہ پر یا جھٹلاوے اس کی آیتوں کو، بلاشک بھلائی نصیب نہیں ہوتی ظالموں کو

خلاصہ تفسیر: اور (یہ منکرین توحید، رسالت کے مسئلہ میں عقلاً بھی نہایت بے انصافی سے کام لے رہے ہیں، کیونکہ) اس سے زیادہ کون ظالم ہوگا جو اللہ پر جھوٹ بہتان باندھے (جس کا حاصل یہ ہے کہ جن چیزوں کی خدا اور رسول نفی کرنا چاہتے تھے ان کو یہ لوگ ثابت کرتے ہیں، مثلاً اللہ کے ساتھ شریک قرار دے جیسا کہ مشرکین کرتے تھے، یا رسول اللہ ﷺ کے اوصاف کو بدل ڈالے جیسا کہ اہل کتاب کرتے تھے) یا اللہ تعالیٰ کی آیات کو جھوٹا بتائے (جس کا حاصل یہ ہے کہ جن چیزوں کو ماننا چاہیے تھا ان کا انکار کرتے ہیں، ظاہر ہے کہ یہ عقلاً بھی صریح ظلم اور بے انصافی ہے، اور) ایسے بے انصافوں کا (حال یہ ہوگا کہ) ان کو (قیامت کے دن) خلاصی نہ ہوگی (بلکہ دائمی عذاب میں گرفتار رہیں گے)۔

* * *

فائدہ: یعنی نبی نہ ہو اور خدا پر افتراء کر کے دعویٰ نبوت کر بیٹھے یا سچے نبی سے جس کی صداقت کے دلائل واضحہ موجود ہوں خدائی پیام سن کر تکذیب پر کمربستہ ہوجائے، ان دونوں سے بڑھ کر ظالم کوئی نہیں ہوسکتا اور سنت اللہ یہ ہے کہ ظالم کو انجام کار کامیابی اور بھلائی نصیب نہیں ہوتی، پس اگر فرض کرو معاذ اللہ میں مفتری ہوں تو ہرگز کامیاب نہ ہوں گا اور تم مکذب ہو جیسا کہ دلائل سے ظاہر ہے تو تمہاری خیریت نہیں، لہٰذا حالات میں غور کر کے اور انجام سوچ کر عاقبت کی فکر کرو، اور اس دن سے ڈرو جس کا ذکر آگے آتا ہے، ابن کثیر نے آیت کے یہی معنی لئے ہیں اور بعض مفسرین نے افترٰى على الله سے مشرکین کا شرک مراد لیا جیسا کہ آگے: وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ (القصص: ۷۵) میں اشارہ ہے، واللہ اعلم۔

وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ نَقُولُ لِلَّذِينَ أَشْرَكُوا أَيْنَ شُرَكَاؤُكُمُ الَّذِينَ كُنتُمْ تَزْعُمُونَ ﴿٢٢﴾

اور جس دن ہم جمع کریں گے ان سب کو پھر کہیں گے ان لوگوں کو جنہوں نے شرک کیا تھا کہاں ہیں شریک تمہارے جن کا تم کو دعویٰ تھا

خلاصہ تفسیر: پیچھے کفار کا فلاح نہ پانا مذکور تھا، اب اس فلاح نہ پانے کی کچھ کیفیت بیان کی جاتی ہے۔

اور وہ وقت بھی یاد رکھنے کے قابل ہے جس روز ہم تمام خلائق کو (میدان حشر میں) جمع کریں گے، پھر مشرکین سے (بواسطہ یا بلا واسطہ ڈانٹ اور دھمکی کے طور پر) کہیں گے کہ (بتلاؤ) تمہارے وہ شرکاء جن کے معبود ہونے کا تم دعویٰ کرتے تھے کہاں گئے؟ (کہ تمہاری سفارش نہیں کرتے جس پر تم کو بھروسہ تھا)۔

ثُمَّ نَقُولُ لِلَّذِينَ أَشْرَكُوا: سوال یہ ہوتا ہے کہ بعض آیات قرآنی سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ جل شانہ کفار و فجار سے کلام نہ فرمائیں گے، اور اس آیت سے صاف یہ معلوم ہو رہا ہے کہ ان سے خطاب اور کلام ہوگا؟! جواب یہ ہے کہ خطاب و کلام اکرام و اعزاز یا قبولیت دعاء کے طور پر نہ ہوگا، دھمکی اور ڈانٹ کے خطاب کی نفی اس آیت میں مراد نہیں، اسی لیے یہاں خلاصہ تفسیر میں "ڈانٹ اور دھمکی" کی قید بڑھا دی ہے، اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ یہ خطاب جو اس آیت میں مذکور ہے بواسطہ ملائکہ ہو، اور جس آیت میں خطاب و کلام الٰہی کی نفی کی گئی ہے اس میں بلا واسطہ کلام مراد ہے۔

ایک سوال یہ ہوتا ہے کہ مشرکین تو آخرت ہی کے قائل نہیں تھے پھر وہ بتوں کو قیامت کے دن شفیع یعنی سفارش کرنے والا کیسے سمجھتے تھے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ مشرکین دنیا میں سختی اور شدت کے وقت ان بتوں کی مطلق شفاعت کے تو قائل تھے اور اس قیامت کے دن کی سختی سے زیادہ کونسی سختی ہوگی، یا یوں کہا جائے کہ مشرکین بطور فرض کے یہ بھی کہتے تھے کہ اگر بالفرض قیامت ہوئی تو ایسا ہوگا ولئن رجعت الی ربی ان لی عندہ للحسنی۔

* * *

فائدہ: جن کی نسبت تم کو دعویٰ تھا کہ وہ خدائی کے حصہ دار اور شدائد میں تمہارے شفیع و مددگار ہیں، آج ایسی سختی اور مصیبت کے وقت کہاں چلے گئے کہ تمہارے کچھ بھی کام نہیں آتے۔

ثُمَّ لَمْ تَكُن فِتْنَتُهُمْ إِلَّا أَن قَالُوا وَاللَّهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِينَ ﴿٢٣﴾

پھر نہ رہے گا ان کے پاس کوئی فریب مگر یہی کہ کہیں گے قسم ہے اللہ کی جو ہمارا رب ہے ہم نہ تھے شرک کرنے والے

خلاصہ تفسیر: پھر ان کے شرک کا انجام اس کے سوا اور کچھ بھی (ظاہر) نہ ہوگا کہ وہ (اس شرک سے خود بیزاری اور نفرت کا اظہار کریں گے اور بدحواسی کے عالم میں) یوں کہیں گے قسم اللہ کی اپنے پروردگار کی کہ ہم مشرک نہیں تھے (یعنی جس کے حق ہونے کا زندگی میں دعوی تھا اس کا انجام یہ ہوگا کہ خود ہی اسے باطل سمجھنے لگیں گے)۔

وَاللَّهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِينَ: یعنی قسم ہے اللہ کی جو ہمارا رب ہے ہم شرک کرنے والے نہ تھے، سوال یہ ہوتا ہے کہ میدان قیامت کے ہولناک مناظر اور ربُّ الارباب کی قدرت کاملہ کے عجیب و غریب واقعات دیکھنے کے بعد ان کو یہ جرأت کیسے ہوگی کہ ربُّ العالمین کے سامنے کھڑے ہو کر جھوٹ بولیں اور وہ بھی اس شد و مد کے ساتھ کہ اسی کی ذات کبریاء کی قسم بھی کھا کر کہہ رہے ہیں کہ ہم مشرک نہیں تھے؟، عام مفسرین نے اس کے جواب میں فرمایا کہ ان کا یہ جواب کچھ عقل و ہوش اور انجام بینی پر مبنی نہیں، بلکہ فرط ہیبت سے بوکھلاہٹ کی بناء پر ہے اور ایسی حالت میں آدمی جو کچھ منہ میں آئے بولا کرتا ہے، لیکن میدان حشر کے عام واقعات و حالات میں غور کرنے کے بعد یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہی ان کی پوری کیفیت اور حالت کو سامنے لانے کے لئے ان کو یہ قدرت بھی دے دی کہ وہ آزادانہ جو چاہیں کہیں جس طرح دنیا میں کہا کرتے تھے، تاکہ کفر و شرک کے گناہ عظیم کے ساتھ ان کا یہ عیب بھی اہل محشر کے سامنے آجائے کہ یہ جھوٹ بولنے میں بھی یکتا ہیں کہ اس ہولناک موقع پر بھی جھوٹ بولنے سے نہیں جھجکتے، قرآن مجید کی ایک دوسری آیت: فیحلفون له کما یحلفون لکم سے اسی کی طرف اشارہ ہوتا ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ لوگ جس طرح مسلمانوں کے

سامنے جھوٹی قسمیں کھا جاتے ہیں اسی طرح خود رب العالمین کے سامنے بھی دروغ حلفی سے نہ چوکیں گے، غرض احکم الحاکمین کی عدالت میں مجرم کو اپنا بیان دینے کا پورا موقع آزادی کے ساتھ دیا جائے گا، اور جس طرح وہ دنیا میں جھوٹ بولتا تھا اس وقت بھی اس کا یہ اختیار سلب نہ ہوگا کیونکہ قادر مطلق اس کے جھوٹ کا پردہ خود اس کے ہاتھ پاؤں کے حوالہ سے چاک کر دیں گے۔

یہاں یہ شبہ بھی نہ کیا جائے کہ اس آیت میں شرک کا انجام اس قول میں منحصر کر دیا گیا ہے کہ بس شرک کا یہی انجام ہوگا کہ وہ یوں کہیں گے، حالانکہ دوزخ میں جانا بھی تو شرک کا انجام ہے، جواب یہ ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے شرک پر ذرا بھی نہ جمیں گے، بلکہ آخر کار اس کا انکار ہی کرتے بن پڑے گا، پس اس جگہ اقوال کے اعتبار سے حصر ہے کہ اس کے سوا کچھ بات نہ کریں گے، ہر اعتبار سے حصر مقصود نہیں۔

* * *

فائدہ: یعنی بجز انکار واقعات کے کچھ کرتے دھرتے نہ بن پڑے گی، باطل معبودین کی جس عقیدت و محبت میں مفتون ہو رہے تھے، اس کی حقیقت صرف اتنی رہ جائے گی کہ ساری عمر کے عقیدے اور تعلق سے بھی انکار کر بیٹھیں گے۔

اُنۡظُرۡ كَيۡفَ كَذَبُوۡا عَلٰٓى اَنۡفُسِهِمۡ وَضَلَّ عَنۡهُمۡ مَّا كَانُوۡا يَفۡتَرُوۡنَ ۝۲۴

دیکھو تو کیسا جھوٹ بولے اپنے اوپر اور کھوئی گئیں ان سے وہ باتیں جو بنایا کرتے تھے

خلاصہ تفسیر: (حق تعالیٰ نے تعجب کی نظر سے فرمایا:) ذرا دیکھو تو کس طرح (صریح) جھوٹ بولا اپنی جانوں پر (کہ جو شرک ان سے صادر ہوا تھا اس کی صاف نفی کر دی) اور جن چیزوں کو وہ جھوٹ موٹ تراشا کرتے تھے (یعنی ان کے بت اور جن کو وہ خدا کا شریک ٹھہراتے تھے) وہ سب غائب ہو گئے (یعنی ان کے کوئی کام نہ آئے گا)۔

وَضَلَّ عَنۡهُمۡ مَّا كَانُوۡا يَفۡتَرُوۡنَ: یعنی جن چیزوں کو وہ جھوٹ موٹ تراشا کرتے تھے وہ سب غائب ہو گئے، یہاں ایک سوال یہ ہے کہ اس آیت سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت یہ سوال و جواب ہوں گے معبودات باطلہ سب غائب ہوں گے، کوئی سامنے نہ ہوگا، اور قرآن مجید کی ایک آیت میں یہ ارشاد ہے: احشروا الذین ظلموا وازواجھم وما کانوا یعبدون، یعنی قیامت میں حق تعالیٰ کا حکم یہ ہوگا کہ جمع کردو ظالموں کو اور ان کے ساتھیوں کو اور ان کو جن کی یہ لوگ عبادت کیا کرتے تھے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ محشر میں معبودات باطلہ بھی حاضر و موجود ہوں گے۔

جواب یہ ہے کہ اس آیت میں ان کے غائب ہونے سے مراد یہ ہے کہ بحیثیت سہیم و شریک یا سفارش کرنے کے یہ غائب ہوں گے کہ ان لوگوں کو کوئی نفع نہ پہنچا سکیں گے، ویسے حاضر و موجود ہوں گے، اس طرح دونوں آیتوں میں کوئی تعارض نہ رہا، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک وقت میں یہ سب ایک جگہ جمع کر دیئے جائیں، پھر متفرق ہو جائیں، اور یہ سوال تفریق کے بعد کیا جائے۔

* * *

فائدہ: یعنی اس صریح جھوٹ سے مشرکین کی انتہائی بدحواسی اور شرکاء کی غایت بے چارگی اور درماندگی کا اظہار ہوگا، کاش! مشرکین اس رسوا کن انجام کو دنیا ہی میں سمجھ لیں۔

وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ يَّسۡتَمِعُ اِلَيۡكَ ۚ وَجَعَلۡنَا عَلٰى قُلُوۡبِهِمۡ اَكِنَّةً اَنۡ يَّفۡقَهُوۡهُ وَفِىۡۤ اٰذَانِهِمۡ وَقۡرًا ؕ

اور بعضے ان میں کان لگائے رہتے ہیں تیری طرف، اور ہم نے انکے دلوں پر ڈال رکھے ہیں پردے تاکہ اسکو نہ سمجھیں اور رکھ دیا انکے کانوں میں بوجھ

وَاِنۡ يَّرَوۡا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤۡمِنُوۡا بِهَا ؕ حَتّٰۤى اِذَا جَآءُوۡكَ يُجَادِلُوۡنَكَ يَقُوۡلُ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡۤا

اور اگر دیکھ لیں تمام نشانیاں تو بھی ایمان نہ لاویں ان پر۔ یہاں تک کہ جب آتے ہیں تیرے پاس تجھ سے جھگڑنے کو تو کہتے ہیں وہ کافر

اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۲۵﴾

نہیں ہے یہ مگر کہانیاں پہلے لوگوں کی

خلاصہ تفسیر: پیچھے توحید ورسالت کے انکار کی مذمت اور جزا کا بیان تھا، آگے قرآن کے انکار کی قباحت مذکور ہے۔

اور ان (مشرکین) میں بعض ایسے ہیں کہ (آپ ﷺ کے قرآن پڑھنے کے وقت اس کے سننے کے لئے) آپ کی طرف کان لگاتے ہیں اور (چونکہ یہ سننا طلب حق کیلئے نہیں محض تماشہ یا تمسخر کی نیت سے ہوتا ہے اس لئے اس سے ان کو کچھ نفع نہیں ہوتا، چنانچہ) ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال رکھے ہیں اس سے کہ وہ اس (قرآن کے مقصود) کو سمجھیں، اور ان کے کانوں میں بوجھ بھر دیا ہے (کہ وہ اس کو ہدایت کے لئے نہیں سنتے، یہ تو ان کے دلوں اور کانوں کی حالت تھی، آگے نگاہوں کا حال بتلاتے ہیں) اگر وہ لوگ (آپ ﷺ کی نبوت کی سچائی کے) تمام دلائل کو (بھی) دیکھ لیں ان پر بھی ایمان نہ لائیں (ان کے عناد کی نوبت) یہاں تک (پہنچی ہے) کہ جب یہ لوگ آپ کے پاس آتے ہیں تو آپ سے خواہ مخواہ جھگڑتے ہیں (اس طور پر کہ) یہ لوگ جو کافر ہیں یوں کہتے ہیں کہ یہ (قرآن) تو کچھ بھی نہیں صرف بے سند باتیں ہیں جو پچھلے لوگوں سے (منقول) چلی آرہی ہیں (یعنی تمام ادیان والے ایسی ہی باتیں کرتے چلے آئے ہیں کہ معبود ایک ہی ہے اور یہ کہ انسان خدا کا پیغمبر ہوسکتا ہے، قیامت میں پھر زندہ ہونا ہے، مطلب یہ ہے کہ عناد کی وجہ سے انکار سے گذر کر مباحثہ اور جدال تک ان کی نوبت پہنچ چکی ہے)۔

وَجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً: یہ جو فرمایا کہ ہم نے حجاب ڈال رکھے ہیں، یہ مثال کے طور پر فرمایا گیا ہے، یہ شبہ نہیں ہوسکتا کہ جب خدا نے ان کے دلوں پر پردہ ڈال دیا ہے تو وہ معذور ہوئے؟ جواب یہ ہے کہ یہ حجاب اس وقت پڑا جبکہ انہوں نے اپنے اختیار سے قرآن سے اعراض کیا اور عناد اختیار کیا، چنانچہ اللہ تعالی کی طرف اس کی نسبت ہونے سے نہ یہ معذور ہوسکتے ہیں اور نہ اللہ تعالی پر کوئی الزام آسکتا ہے، کیونکہ اس حجاب وغیرہ کا سبب ان کا اختیاری اعراض ہے، اور خدا تعالی کی طرف یہ نسبت بھی تخلیق کے اعتبار سے ہے جو حکمت پر مبنی ہے، اس کی تحقیق سورہ بقرہ آیت نمبر ۶، اور ۷ میں گذر چکی ہے وہاں ملاحظہ کرلیا جائے۔

وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا: اگر کسی کو شبہ ہو کہ یہاں وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا سے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی بھی دلیل پر ایمان نہیں لائیں گے، اور جبکہ سورہ شعراء کی آیت: ان نشا ننزل علیهم من السماء اية فظلت اعناقهم لها خاضعين سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض دلائل پر ضرور ایمان لانا پڑے گا؟! جواب یہ ہے کہ یہاں جس ایمان کی نفی کی گئی ہے وہ ایمان اختیاری ہے جو کہ شرعاً مطلوب ہے، مطلب یہ ہے کہ اپنے اختیار سے یہ لوگ کبھی ایمان قبول نہ کریں گے، یہ آیت خاص ان لوگوں کے بارے میں ہے جن کا خاتمہ علم الٰہی میں کفر پر ہونے والا تھا، اور سورہ شعراء میں جس ایمان کا اثبات کیا گیا ہے وہ ایمان اضطراری ہے یعنی مجبوری کی بنا پر جو شرعاً مقبول نہیں۔

* * *

فائدہ: ۱۔ یہ ان لوگوں کا ذکر ہے جو بغرض اعتراض وعیب جوئی قرآن کریم اور حضور ﷺ کی باتوں کی طرف کان لگاتے تھے ہدایت سے منتفع ہونا اور حق کو قبول کرنا مقصود نہ تھا، نصیحت وہدایت سے ممتد اعراض اور کانشنس (conscience) کی مسلسل تعطیل کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ قبول حق کے وسائل وقویٰ انجام کار ماؤف ہوکر رہ گئے، حق کے سمجھنے سے ان کے دل محروم کردیئے گئے، پیغام ہدایت کا سننا کانوں کو بھاری معلوم ہونے لگا، آنکھیں نظر عبرت سے ایسی خالی ہوگئیں کہ ہر قسم کے نشانات دیکھ کر بھی ایمان لانے کی توفیق نہیں ہوتی، اور لطف یہ ہے کہ اس حالت موت پر قانع ومسرور بھی ہیں بلکہ فخر کے لہجہ میں اسکا اعلان کرتے ہیں، سورہ حم السجدۃ میں ہے: فَاَعْرَضَ اَكْثَرُهُمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا فِيْٓ اَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ وَفِيْٓ اٰذَانِنَا وَقْرٌ وَّمِنْۢ بَيْنِنَا وَبَيْنِكَ حِجَابٌ فَاعْمَلْ اِنَّنَا عٰمِلُوْنَ (فصلت: ۴،۵)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ سماع آیات سے منتفع نہ ہونا اور دلوں پر پردہ پڑ جانا خود ان کے اعراض کا نتیجہ تھا اور یہ اعراض ہی اس کیفیت کے

حدوث کا سبب ہوا ہے: وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِ آيَاتُنَا وَلَّىٰ مُسْتَكْبِرًا كَأَن لَّمْ يَسْمَعْهَا كَأَنَّ فِي أُذُنَيْهِ وَقْرًا (لقمان: ۷) اسباب پر مسببات کا مرتب کرنا چونکہ خالق جل وعلا کے سوا کسی کا کام نہیں ہوسکتا، اسی لئے آیت حاضرہ: وَجَعَلْنَا عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ أَكِنَّةً أَن يَفْقَهُوهُ وَفِي آذَانِهِمْ وَقْرًا میں پردے وغیرہ ڈالنے کی نسبت حق تعالیٰ کی طرف کردی گئی۔

وَهُمْ يَنْهَوْنَ عَنْهُ وَيَنْأَوْنَ عَنْهُ ۖ وَإِن يُهْلِكُونَ إِلَّا أَنفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ ﴿٢٦﴾

اور یہ لوگ روکتے ہیں اس سے اور بھاگتے ہیں اس سے، اور نہیں ہلاک کرتے مگر اپنے آپ کو اور نہیں سمجھتے

خلاصہ تفسیر: اور (پھر اس سے ترقی کر کے دوسروں کو بھی گمراہ کرنے کی فکر میں ہیں، چنانچہ) یہ لوگ اس (قرآن) سے اوروں کو بھی روکتے ہیں اور خود بھی (اس سے نفرت ظاہر کرنے کے لئے) دُور دُور رہتے ہیں (تاکہ دوسروں پر زیادہ اثر ہو) اور (ان حرکتوں سے) یہ لوگ اپنے ہی کو تباہ کر رہے ہیں (نہ رسول کا کوئی نقصان ہے، نہ قرآن کا، رسول کو رسالت کا ثواب ہر حال میں ملے گا، کیونکہ وہ تو اپنا کام کر چکے، قرآن کا نور ہدایت کامل ہو کر رہے گا) اور (انتہائی بغض اور حماقت کی وجہ سے) کچھ خبر نہیں رکھتے (کہ ہم کس کا نقصان کر رہے ہیں، ہمارے اس فعل سے رسول اور قرآن کا تو اس سے کچھ بگڑتا نہیں)۔

وَهُمْ يَنْهَوْنَ عَنْهُ: بعض مفسرین کے نزدیک ان لوگوں سے مراد ابوطالب اور ان کے اتباع ہیں جو اوروں کے نقصان کو حضور ﷺ سے روکتے تھے، مگر خود آپ ﷺ پر ایمان لانے سے دور رہتے تھے، اس سے معلوم ہوا کہ اہل اللہ کے ساتھ طبعی محبت اور قومی نصرت بغیر عقلی محبت کے مفید نہیں، مطلب یہ کہ جب کسی سے طبعی محبت ہے تو اس کا اتباع کرنا چاہیے اور اس کی منشا و مراد کو بھی پورا کرنا چاہیے، محض رشتہ ناطہ آخرت کی نجات کے لیے کافی نہیں ہوتا، عقلی محبت یہ ہے کہ عقل سے کام لے اور ایمان قبول کرلے۔

* * *

فائدہ: یعنی ان میں نہ فہم رہا ہے نہ انصاف، ایمان لانا اور ہدایت ربانی سے منتفع ہونا تو کجا، ان کی غرض تو حضور ﷺ کی خدمت میں آنے سے صرف مجادلہ (جھگڑنا) اور پھبتیاں اڑانا ہے، چنانچہ قرآنی حقائق و بیانات کو معاذ اللہ "اساطیر الاولین" کہتے ہیں، پھر اس تکذیب اور جدل و تمسخر پر اکتفا نہیں، کوشش یہ ہے کہ دوسروں کی طرف بھی اپنی بیماری کا تعدیہ کریں، چنانچہ لوگوں کو حق سے روکتے ہیں اور خود بھی اس سے دور بھاگتے ہیں تاکہ انہیں دیکھ کر دوسرے قبول حق سے نفور و بیزار ہو جائیں، مگر ان تمام ناپاک کوششوں سے نہ بحمد اللہ دین حق کو کوئی نقصان پہنچ سکتا ہے وہ تو غالب ہو کر رہے گا اور نہ رسول اللہ ﷺ کو، کہ ان کی عصمت و رفعت کا تکفل حق تعالیٰ فرما چکا ہے، ہاں! یہ احمق خود اپنے لئے ہلاکت کا سامان فراہم کر رہے ہیں، اور سمجھتے بھی نہیں کہ ہم اپنے ہاتھ سے خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار رہے ہیں۔

وَلَوْ تَرَىٰ إِذْ وُقِفُوا عَلَى النَّارِ فَقَالُوا يَا لَيْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبَ بِآيَاتِ رَبِّنَا

اور اگر تو دیکھے جس وقت کہ کھڑے کئے جائیں گے وہ دوزخ پر پس کہیں گے اے کاش ہم پھر بھیج دیے جائیں اور ہم نہ جھٹلائیں اپنے رب کی آیتوں کو

وَنَكُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿٢٧﴾

اور ہو جائیں ہم ایمان والوں میں

خلاصہ تفسیر: پیچھے توحید و رسالت کے انکار پر ان کی سزا کا بیان تھا، اسی طرح اب قرآن کے انکار پر سزا کا بیان فرماتے ہیں۔

اور اگر آپ (ﷺ ان کو) اس وقت دیکھیں (تو بڑا ہولناک واقعہ نظر آئے) جب کہ یہ (منکرین) دوزخ کے پاس کھڑے کئے جائیں گے

(اور قریب ہوگا کہ جہنم میں ڈال دیئے جائیں) تو (ہزاروں تمناؤں کے ساتھ) کہیں گے ہائے کیا اچھی بات ہوتی کہ ہم (دنیا میں) پھر واپس بھیج دیئے جائیں اور اگر ایسا ہو جائے تو ہم (پھر) اپنے رب کی آیات (مثلاً قرآن وغیرہ) کو کبھی جھوٹا نہ بتائیں اور ہم (ضرور) ایمان والوں میں سے ہو جائیں۔ دنیا میں جا کر ایمان لانے کی تمنا اس لیے ہوگی کیونکہ دنیا کا ایمان ہی باعث نجات ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی آیات اللہ کی تکذیب واستہزاوغیرہ ساری فوں فاں اس وقت تک ہے جب تک خدائی سزا کا ہولناک وہوشربا منظر سامنے نہیں، جس وقت دوزخ کی ذرا سی ہوا بھی لگ جائے گی تو ساری شیخی کرکری ہو کر رہ جائے گی اور بہزار تمنا یہ درخواست کریں گے کہ ہم کو دنیا میں دوبارہ بھیج دیا جائے تا کہ آئندہ کبھی اپنے رب کی آیتوں کو نہ جھٹلائیں اور پکے ایماندار بن کر رہیں: "الان قد ندمت وما ينفع الندم"

بَلْ بَدَا لَهُمْ مَّا كَانُوْا يُخْفُوْنَ مِنْ قَبْلُ ۭ وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۲۸﴾

کوئی نہیں بلکہ ظاہر ہو گیا جو چھپاتے تھے پہلے [1] اور اگر پھر بھیجے جائیں تو پھر بھی وہی کام کریں جس سے منع کئے گئے تھے اور وہ بیشک جھوٹے ہیں [2]

خلاصہ تفسیر: (حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان کی یہ تمنا اور وعدہ سچی رغبت اور اطاعت کے قصد سے نہیں) بلکہ (اس وقت ایک مصیبت میں پھنس رہے ہیں کہ) جس چیز کو اس سے پہلے (دنیا میں) دبایا (اور مٹایا) کرتے تھے (اور اس کا اقرار نہ کرتے تھے) وہ آج ان کے سامنے آ گئی ہے (مراد اس چیز سے آخرت کا عذاب ہے جس کی وعید دنیا میں کفر و معصیت پر ان کو کی جاتی تھی، اور 'دبانے'' سے مراد انکار ہے، مطلب یہ ہے کہ اس وقت جان کو بن رہی ہے، اس لئے جان بچانے کو یہ سارے وعدے ہو رہے ہیں) اور (دل سے وعدہ پورا کرنے کا ہرگز ارادہ نہیں، یہاں تک کہ) اگر (بالفرض) یہ لوگ (ان کی تمنا کے مطابق دنیا میں) پھر واپس بھی بھیج دیئے جائیں تب بھی یہ وہی کام کریں جس سے ان کو منع کیا گیا تھا (یعنی کفر و نافرمانی) اور یقیناً یہ (ان وعدوں میں) بالکل جھوٹے ہیں (یعنی نہ اس وقت وعدہ پورا کرنے کا قصد ہے، نہ دنیا میں جا کر وعدہ پورا کرنے کا ان سے احتمال ہے)۔

وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ: یہاں ایک سوال یہ ہوتا ہے کہ جب قیامت میں دوبارہ زندہ ہونے کو اور پھر حساب کتاب وجزاء وسزاء کو آنکھوں سے دیکھ چکیں گے تو یہ کیسے ممکن ہوگا کہ پھر یہاں آ کر اس کا انکار کر دیں؟ جواب یہ ہے کہ انکار کرنے کے لئے یہ لازم نہیں ہے کہ واقع میں ان کو ان واقعات اور حقائق کا یقین نہ رہے، بلکہ جس طرح آج بہت سے کفار و مجرمین اسلامی حقائق کا پورا یقین رکھتے ہوئے محض عناد سے انکار و تکذیب پر جمے ہوئے ہیں، اسی طرح یہ لوگ دنیا میں واپس آنے کے بعد قیام قیامت اور دوبارہ زندگی اور آخرت کے تمام حالات کا پورا یقین رکھنے کے باوجود محض شرارت اور عناد سے پھر تکذیب پر اتر آئیں گے جیسا کہ قرآن کریم نے اسی موجودہ زندگی میں بعض کفار کے متعلق ارشاد فرمایا ہے: **وجحدوا بها واستيقنتها انفسهم ظلما وعلوا**، یعنی یہ لوگ ہماری آیات کا انکار تو کر رہے ہیں مگر ان کے دلوں میں اس کے حق ہونے کا پورا یقین ہے، جیسے یہود کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ وہ خاتم الانبیاء ﷺ کو اس طرح پہچانتے ہیں جیسے لوگ اپنے بیٹوں کا پہچانا کرتے ہیں، مگر اس کے باوجود آپ ﷺ کی مخالفت پر تلے ہوئے ہیں، خلاصہ یہ ہے کہ خالق کائنات اپنے علم ازلی سے جانتے ہیں کہ ان لوگوں کا یہ کہنا کہ دوبارہ دنیا میں بھیج دیئے جائیں تو مومن صالح ہو جائیں گے بالکل جھوٹ اور فریب ہے، اگر ان کے کہنے کے مطابق دوبارہ دنیا کو پیدا کر کے ان کو اس میں چھوڑ دیا جائے تو یہ پھر وہی سب کچھ کریں گے جو پہلی زندگی میں کیا تھا۔

* * *

فائدہ: [1] یعنی اب بھی دنیا میں واپس جانے کی تمنا عزم صحیح اور ایمانی رغبت وشوق سے نہیں، بلکہ جب مجازات ومکافات عمل کا وہ منظر سامنے آ گیا جسے باوجود وضوح ادلہ انکار کے پردہ میں چھپایا کرتے تھے، عذاب الٰہی کو آنکھوں سے دیکھ لیا، تمام اعمال شنیعہ کا جو چھپ چھپ کر کیے جاتے تھے راز فاش ہو گیا، ابھی ابھی جو وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ (الانعام: ۲۳) کہہ چکے تھے اس جھوٹ کی بھی قلعی کھل گئی، غرضیکہ بدی کے جو

اثرات مخفی اور غیر مرئی طور پر اندر ہی اندر ان نالائقوں کے دلوں میں پرورش پا رہے تھے وہ دردناک عذاب کی صورت میں ممثل ہو کر سامنے آ گئے، تو محض جان بچانے کیلئے دوبارہ دنیا میں جانے کی تمنا کرنے لگے۔

فائدہ: ۲۔ یعنی اب بھی جھوٹ کہتے ہیں کہ ہم دنیا میں واپس ہو کر پکے ایماندار بن جائیں گے اور ہرگز آیات اللہ کی تکذیب نہ کریں گے ، یہ اشقیاء اگر دنیا میں واپس کر دیئے جائیں تو بدی اور شرارت کی جو قوتیں ان میں رکھی ہیں پھر انھی کو کام میں لائیں گے اور جس مصیبت سے گھبرا کر جانے کی تمنا کر رہے ہیں اسے خواب و خیال کی طرح فراموش کر دیں گے، جیسا کہ بسا اوقات دنیاوی مصائب و مہالک میں پھنس کر آدمی انابت و توبہ اختیار کر لیتا ہے، پھر جہاں چند روز گزرے کچھ بھی یاد نہیں رکھتا کہ اس وقت کیا عہد و پیمان کئے تھے: كَاَنْ لَّمْ يَدْعُنَآ اِلٰى ضُرٍّ مَّسَّهٗ (یونس:۱۲)

وَقَالُوْٓا اِنْ هِىَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ ﴿۲۹﴾

اور کہتے ہیں ہمارے لئے زندگی نہیں مگر یہی دنیا کی اور ہم کو پھر نہیں زندہ ہونا

خلاصہ تفسیر: (گذشتہ آیات میں توحید، رسالت اور قرآن کے انکار پر سزاوں کا بیان تھا، اب قیامت کا انکار اور اس کی سزا کا بیان ہے) اور یہ (منکرین) کہتے ہیں کہ زندگی اور کہیں نہیں، بس یہی دنیا کی زندگی اور ہم (اس زندگی کے ختم ہونے کے بعد پھر) زندہ نہ کئے جائیں گے (جیسا کہ انبیاء علیہم السلام فرماتے ہیں)۔

* * *

فائدہ: یعنی خوب مزے اڑا لو، دنیاوی عیش کو خواہ مخواہ فکر آخرت سے منغص مت کرو، یہ ہی حال آجکل یورپ کے مادہ پرستوں کا ہے۔

وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ وُقِفُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ ؕ قَالَ اَلَيْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ ؕ قَالُوْا بَلٰى وَرَبِّنَا ؕ

اور کاش کے تو دیکھے جس وقت وہ کھڑے کئے جائیں گے اپنے رب کے سامنے، فرمائے گا کیا یہ سچ نہیں، کہیں گے کیوں نہیں قسم ہے اپنے رب کی

قَالَ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿۳۰﴾ ع

فرمائے گا تو چکھو عذاب بدلے میں اپنے کفر کے

خلاصہ تفسیر: (اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:) اور اگر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم ان کو) اس وقت دیکھیں (تو بڑا عجیب واقعہ نظر آئے) جب کہ یہ اپنے رب کے سامنے (حساب کے لئے) کھڑے کئے جائیں گے، اور اللہ تعالیٰ ان سے فرمائے گا کہ (کہو) کیا یہ (قیامت کے دن دوبارہ زندہ ہونا) امر واقعی نہیں (جیسے دنیا میں ہمیشہ اسے غیر واقعی کہتے رہے) وہ کہیں گے بیشک (واقعی ہے) قسم اپنے رب کی!، اللہ تعالیٰ فرمائے گا تو اب اپنے کفر (وانکار) کے عوض عذاب (کا مزہ) چکھو (اس کے بعد دوزخ میں بھیج دیئے جائیں گے)۔

اِذْ وُقِفُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ: پیچھے فرمایا تھا: اِذْ وُقِفُوْا عَلَى النَّارِ کہ دوزخ کے پاس کھڑے کیے جائیں گے، اور جبکہ یہاں فرمایا: اِذْ وُقِفُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ کہ اپنے رب کے سامنے کھڑے کیے جائیں گے، سو ان دونوں میں کچھ تعارض نہیں، کیونکہ یہ حساب کے لیے خدا کے سامنے کھڑا کیا جانا دوزخ ہی کے پاس ہوگا اور وہیں یہ دونوں واقعے ہوں گے۔

* * *

فائدہ: یعنی جب حقیقت آنکھوں کے سامنے آ جائے گی اور بعث بعد الموت وغیرہ کے اقرار سے چارہ نہ رہے گا، تب کہا جائے گا کہ انکار حقیقت اور "کفر بالمعاد" کا مزہ چکھو۔

قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ اللّٰهِ ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَتْهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً قَالُوْا يٰحَسْرَتَنَا

تباہ ہوئے وہ لوگ جنہوں نے جھوٹ جانا ملنا اللہ کا، یہاں تک کہ جب آپہنچے گی ان پر قیامت اچانک تو کہیں گے اے افسوس

عَلٰى مَا فَرَّطْنَا فِيْهَا ۙ وَهُمْ يَحْمِلُوْنَ اَوْزَارَهُمْ عَلٰى ظُهُوْرِهِمْ ؕ اَلَا سَآءَ مَا يَزِرُوْنَ ﴿۳۱﴾

کیسی کوتاہی ہم نے اس میں کی، اور وہ اٹھائیں گے اپنے بوجھ اپنی پیٹھوں پر، خبردار ہوجاؤ کہ برا بوجھ ہے جو وہ اٹھائیں گے

خلاصہ تفسیر: پیچھے قیامت کے منکروں پر وعید تھی آگے بھی اسی کا تتمہ ہے۔

بیشک (سخت) خسارے میں پڑے وہ لوگ جنہوں نے اللہ سے ملنے کی (یعنی قیامت کے روز زندہ ہوکر خدا تعالیٰ کے سامنے پیشی کی) تکذیب کی (اور یہ تکذیب تھوڑے دنوں رہے گی) یہاں تک کہ جب وہ معین وقت (یعنی قیامت کا دن مع مقدمات) ان پر دفعۃً (بلا اطلاع) آپہنچے گا (اس وقت سارے دعوے اور تکذیب ختم ہوجائیں گے اور) کہنے لگیں گے ہائے افسوس ہماری کوتاہی (اور غفلت) پر جو اس (قیامت) کے بارے میں (ہم سے) ہوئی (کوتاہی یہ ہے کہ قیامت کو جھٹلایا جس سے اس کے حقوق ضائع ہوئے) اور حالت ان کی یہ ہوگی کہ وہ اپنے (کفر و نافرمانی کا) بار اپنی کمر پر لادے ہوئے ہوں گے، خوب سن لو کہ بری ہوگی وہ چیز جس کو اپنے اوپر لادیں گے۔

حَتّٰٓى اِذَا جَآءَتْهُمُ السَّاعَةُ: یہ جھٹلانا اور تکذیب اگرچہ مرتے ہی ختم ہوجائے لیکن قیامت کو انتہا اس لیے قرار دیا کہ اس وقت پورا انکشاف ہوجائے گا، صاحب کشاف نے یہ کہا ہے کہ موت کا وقت بھی قیامت کا مقدمہ ہے اس لیے وہ بھی حکماً قیامت میں داخل ہے۔

* * *

فائدہ: انسان کی بڑی شقاوت اور بدبختی یہ ہے کہ لقاء اللہ سے انکار کرے اور زندگی کے اس بلند ترین مقصد کو جھوٹ سمجھے، یہاں تک کہ جب موت یا قیامت سر پر آکھڑی ہو تب بے فائدہ کف افسوس ملتارہ جائے کہ ہائے میں نے اپنی دنیاوی زندگی میں یا یوم قیامت کیلئے تیاری کرنے میں کیسی ناقابل تلافی کوتاہی کی اس وقت اس افسوس وحسرت سے کچھ نہ ہوگا، جرموں اور شرارتوں کے بار گراں کو جس سے اس کی پشت خمیدہ ہوگی، یہ ناوقت کا تأسف وتحسر ذرا بھی ہلکا نہ کرسکے گا۔

وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ ؕ وَلَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۳۲﴾

اور نہیں ہے زندگانی دنیا کی مگر کھیل اور جی بہلانا، اور آخرت کا گھر بہتر ہے پرہیزگاروں کے لئے، کیا تم نہیں سمجھتے

خلاصہ تفسیر: پیچھے کفار کے قول کا جواب اس طرح دیا تھا کہ بعث یعنی اخروی زندگی ثابت ہے، اب اس سے ترقی فرماتے ہیں کہ ثابت بھی ایسی ہے کہ اس کے سامنے دنیوی زندگی کچھ بھی نہیں ہے۔

اور دنیوی زندگانی تو کچھ بھی نہیں بجز لعب ولہو کے (غیر نافع اور غیر باقی ہونے کی وجہ سے) اور پچھلا گھر (یعنی آخرت جس کا کفار انکار کررہے ہیں باقی اور) پرہیزگاروں کے لئے بہتر ہے، کیا تم سوچتے سمجھتے نہیں ہو (کہ اس کو مان کر اس کے لیے سامان کرو)۔

وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ: اس آیت اور متعدد آیات قرآنیہ میں جو حیات دنیا کو لہو ولعب فرمایا، یا احادیث کثیرہ میں دنیا کی جو مذمت آئی ہے اس سے مراد حیات دنیا کے وہ لمحات وساعات ہیں جو اللہ تعالیٰ کے ذکر وفکر سے غفلت میں گزریں، ورنہ جو وقت اللہ تعالیٰ کی اطاعت و ذکر میں گزرتا ہے اس کے برابر دنیا کی کوئی نعمت و دولت نہیں، ایک حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے جس میں ارشاد ہے: الدنیا ملعون و ملعون مافیھا الا ذکر اللہ او عالم او متعلم، یعنی دنیا بھی ملعون ہے، اور جو کچھ اس میں ہے سب ملعون ہے، مگر اللہ کی یاد اور عالم یا طالب علم، اور اگر غور سے دیکھا جائے تو عالم اور طالب علم بھی ذکر اللہ ہی میں داخل ہوجاتے ہیں، کیونکہ علم سے وہی علم مراد ہے جو اللہ تعالیٰ کی رضا کا سبب بنے، تو

ایسے علم کو سیکھنا اور سکھانا دونوں ہی ذکر اللہ میں داخل ہیں، بلکہ امام جزری رحمۃ اللہ علیہ کی تصریح کے مطابق دنیا کا ہر وہ کام جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت یعنی احکام شریعت کی مطابقت میں کیا جائے وہ سب ذکر اللہ ہی میں داخل ہے، اس سے معلوم ہوا کہ دنیا کے سب ضروری کام، کسب معاش کے تمام جائز طریقے اور دوسری ضروریات جو حدود شریعت سے باہر نہ ہوں وہ سب ذکر اللہ میں داخل ہیں، اہل وعیال، اقرباء واحباب، پڑوسی اور مہمان وغیرہ کے حقوق کی ادائیگی کو احادیث صحیحہ میں صدقہ وعبادت سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔

* * *

فائدہ: کفار تو یہ کہتے تھے کہ دنیاوی زندگی کے سوا کوئی زندگی ہی نہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ فانی اور مکدر زندگانی حیات اخروی کے مقابلہ میں محض ہیچ اور بے حقیقت ہے، یہاں کی زندگی کے صرف انہی لمحات کو زندگی کہا جاسکتا ہے جو آخرت کی درستی میں خرچ کئے جائیں، بقیہ تمام اوقات جو آخرت کی فکر و تیاری سے خالی ہوں ایک عاقبت اندیش کے نزدیک لہو ولعب سے زائد وقعت نہیں رکھتے، پرہیزگار اور سمجھدار لوگ جانتے ہیں کہ انکا اصلی گھر آخرت کا گھر اور ان کی حقیقی زندگی آخرت کی زندگی ہے۔

قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِيْ يَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ

ہم کو معلوم ہے کہ تجھ کو غم میں ڈالتی ہیں ان کی باتیں سو وہ تجھ کو نہیں جھٹلاتے لیکن یہ ظالم تو اللہ کی آیتوں کا

يَجْحَدُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوْا عَلٰى مَا كُذِّبُوْا وَاُوْذُوْا حَتّٰٓى اَتٰىهُمْ

انکار کرتے ہیں، اور جھٹلائے گئے ہیں بہت سے رسول تجھ سے پہلے پس صبر کرتے رہے جھٹلانے پر اور ایذا پر یہاں تک کہ پہنچی ان کو

نَصْرُنَا ۚ وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۚ وَلَقَدْ جَآءَكَ مِنْ نَّبَاِی الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۳۴﴾

مدد ہماری، اور کوئی نہیں بدل سکتا اللہ کی باتیں، اور تجھ کو پہنچ چکے ہیں کچھ حالات رسولوں کے

خلاصہ تفسیر: پیچھے کفار کی مختلف کفریہ باتیں گذریں جنہیں سن کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو صدمہ اور رنج پہنچتا تھا، نیز ایک بار ابوجہل نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ ہم آپ کو جھوٹا نہیں سمجھتے، لیکن جو دین اور کتاب آپ لائے ہیں اس کو جھوٹا سمجھتے ہیں، اس سے بھی آپ کو بہت رنج پہنچا، اس پر حق تعالیٰ نے اگلی آیات نازل فرمائیں جن میں آپ کی تسلی فرماتے ہیں۔

ہم خوب جانتے ہیں کہ آپ کو ان (کفار) کے اقوال مغموم کرتے ہیں، سو (آپ صلی اللہ علیہ وسلم غم میں نہ پڑیئے، بلکہ ان کا معاملہ اللہ کے سپرد کیجئے، کیونکہ) یہ لوگ (براہ راست) آپ کو جھوٹا نہیں کہتے، لیکن یہ ظالم تو اللہ کی آیتوں کا (قصداً) انکار کرتے ہیں (اگر چہ اس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب بھی لازم آتی ہے، مگر ان کا اصل مقصود اللہ کی آیتوں کو جھٹلانا ہے، جیسا کہ ان میں بعض مثلاً ابوجہل اس کے اقراری بھی ہیں، اور جب ان کا اصل مقصد آیات اللہ کی تکذیب ہے تو ان کا یہ معاملہ خود اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہوا، سو ہم خود ہی ان کو سمجھ لیں گے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کیوں غم میں مبتلا ہوں)۔

اور (کفار کا یہ جھٹلانا کوئی نئی بات نہیں، بلکہ) بہت سے پیغمبر جو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے پہلے ہوئے ہیں ان کی بھی تکذیب کی جاچکی ہے، جس پر انہوں نے صبر ہی کیا کہ ان کی تکذیب کی گئی اور ان کو (طرح طرح) کی ایذائیں پہنچائی گئیں یہاں تک کہ ہماری امداد ان کو پہنچ گئی (جس سے وہ غالب اور مخالف مغلوب یا ہلاک ہوگئے، اس وقت تک وہ صبر ہی کرتے رہے) اور (اسی طرح صبر کرنے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی امداد الٰہی پہنچے گی، کیونکہ) اللہ تعالیٰ کی باتوں (یعنی وعدوں) کو کوئی بدلنے والا نہیں (کیونکہ رسولوں کی امداد کا وعدہ ہو چکا ہے، جیسا کہ فرمایا: لاغلبن انا ورسلی یعنی خدا نے یہ بات لکھ دی ہے کہ میں اور میرے رسول غالب آئیں گے) اور آپ کے پاس پیغمبروں کے بعض قصص (قرآن میں) پہنچ چکے ہیں (جن سے اس بات کی تصدیق ہو چکی ہے کہ ان کے پاس خدائی امداد پہنچی، پس یہ مضمون ہر طرح ثابت اور محقق ہے)۔

فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ: خلاصہ یہ کہ یہ لوگ جو آپ کو جھٹلاتے ہیں تو چونکہ آپ خدا کی طرف سے پہنچانے والے ہیں اس لیے درحقیقت یہ خدا تعالی کو جھٹلاتے ہیں، اپنے معاملہ میں خدا تعالی خود سمجھ لیں گے، اور رسولوں کی بابت خدا کی یہ عادت چلی آ رہی ہے کہ حق کو دنیا و آخرت میں غالب اور باطل کو مغلوب کرتے ہیں، اب بھی اس کا وعدہ ہے اور یہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصود تھا اس لیے پوری تسلی ہوگئی، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جو پہلی قوموں کی ہلاکت کی خبر سن کر تسلی ہوگئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی اپنی قوم کی ہلاکت چاہتے تھے اگرچہ اس کا مضائقہ بھی نہیں، مگر پھر بھی آپ پر شفقت ہی غالب تھی، آپ صرف دین حق کا غلبہ چاہتے تھے۔

* * *

فائدہ: خلائق کے حال پر شفقت و ہمدردی سارے جہان سے زیادہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں ڈالی گئی تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان بدبختوں کی تکذیب و اعراض، مستقبل کی تباہی اور مشرکانہ و ملحدانہ کلمات سے سخت رنج اور صدمہ محسوس فرماتے تھے، ان آیات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی اور ان اشقیاء کو دھمکی دی گئی ہے کہ آپ ان کے اعراض و تکذیب سے اس قدر دلگیر اور بے چین نہ ہوں، یہ لوگ جو تکذیب کر رہے ہیں فی الحقیقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں جھٹلاتے، کیونکہ آپ کو تو پہلے سے بالاتفاق صادق و امین سمجھتے تھے، بلکہ خدا کی آیات و نشانات کا جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق و تبلیغ کیلئے بھیجی گئی ہیں، جان بوجھ کر از راہ ظلم و عناد انکار کر رہے ہیں تو آپ بھی ان ظالموں کا معاملہ خدا کے سپرد کر کے مطمئن ہو جایئے، وہ خود ان کے ظلم اور آپ کے صبر کا پھل دینے والا ہے، انبیاء سابقین کے ساتھ بھی جن کے کچھ حالات آپ کو سنائے جا چکے ہیں ان کی قوموں نے تکذیب و ایذاء رسانی کا برتاؤ کیا جس پر خدا کے معصوم پیغمبر نہایت اولوالعزمی سے صبر کرتے رہے حتی کہ حسب وعدہ خدا کی مدد پہنچی اور بڑے زبردست متکبرین کے مقابلہ میں ان کو مظفر و منصور کیا گیا، آپ سے جو نصرت و ظفر کے وعدے کیے گئے ہیں ایک ایک کر کے پورے ہوں گے، پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل جائیں مگر خدا کا وعدہ نہیں ٹل سکتا، کس کی طاقت جو خدا کی باتوں کو بدل ڈالے یعنی جو اس نے کہا ہے اسے واقع نہ ہونے دے، مکذبین کو یاد رکھنا چاہیے کہ ان کی جنگ حقیقۃ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے نہیں بلکہ رب محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے جس نے ان کو اپنا سفیر اعظم اور معتمد بنا کر کھلے نشانات کے ساتھ بھیجا ہے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب ان خدائی نشانات کی تکذیب ہے۔

وَاِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ اِعْرَاضُهُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا

اور اگر تجھ پر گراں ہے ان کا منہ پھیرنا تو اگر تجھ سے ہو سکے کہ ڈھونڈھ نکالے کوئی سرنگ زمین میں یا کوئی سیڑھی

فِي السَّمَآءِ فَتَاْتِيَهُمْ بِاٰيَةٍ ۭ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿٣٥﴾

آسمان میں پھر لائے ان کے پاس ایک معجزہ، اور اگر اللہ چاہتا تو جمع کر دیتا سب کو سیدھی راہ پر سو تو مت ہو نادانوں میں

خلاصہ تفسیر: پیچھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کفار کے معاملات میں صبر کا حکم تھا، چونکہ آپ کو کمال شفقت سے ان کے ایمان لانے کی انتہائی درجہ حرص تھی اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم باوجود اس تسلی کے یہ چاہتے تھے کہ یہ مشرکین اگر موجودہ معجزات اور نبوت کے دلائل پر مطمئن ہو کر ایمان نہیں لاتے تو جس قسم کے معجزات کا یہ مطالبہ کرتے ہیں وہی معجزات واقع ہو جائیں تو شاید ایمان لے آئیں گے، آگے حق تعالی ان فرمائشوں کا پورا نہ ہونا سنا کر صبر کی تاکید فرماتے ہیں، نیز یہ کہ رسالت کا ثبوت ان فرمائشوں کے پورا ہونے پر موقوف نہیں:

اور اگر آپ کو (منکرین) کا اعراض (و انکار) گراں گزرتا ہے (اور اس لئے جی چاہتا ہے کہ ان کے فرمائشی معجزات ظاہر ہو جائیں) تو اگر آپ کو یہ قدرت ہے کہ زمین میں (جانے کو) کوئی سرنگ یا آسمان میں (جانے کو) کوئی سیڑھی ڈھونڈھ لو (پھر اس کے ذریعہ زمین یا آسمان میں جا کر وہاں سے) معجزہ (فرمائشی معجزوں میں سے) لے آؤ تو (بہتر ہے آپ ایسا) کر لو (یعنی ہم تو ان کی یہ فرمائشیں غیر ضروری بلکہ نقصان دہ ہونے کی وجہ سے پوری نہیں کرتے، نقصان کا بیان آگے آئے گا، سو اگر آپ یہی چاہتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح یہ مسلمان ہی ہو جائیں تو آپ خود اس کا انتظام کیجئے) اور اگر اللہ کو (تکوینا) منظور ہوتا تو ان سب کو راہ (راست) پر جمع کر دیتا (لیکن چونکہ یہ خود ہی اپنا بھلا نہیں چاہتے، اس لئے تکوینا اللہ تعالی کو بھی یہ منظور نہیں

ہوا، پھر آپ ﷺ کے چاہنے سے کیا ہوتا ہے) سو آپ (ﷺ اس فکر کو چھوڑ دیجئے اور) نادانوں میں سے نہ ہو جائیں۔

فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ: یعنی آپ نادانوں میں سے نہ ہو جائیں، آیت کے آخر میں یہ فرمانا محبت و شفقت کے طور پر ہے، جیسا کہ ہمارے محاورہ میں بھی محبوب کو کسی ضد پر کہہ دیا کرتے ہیں کہ ''بس زیادہ نادان نہ بنو ضد کو جانے دو''، چنانچہ لفظ ''جہالت'' عربی زبان میں اس معنی عام کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے بخلاف اردو زبان کے، اس لئے یہاں اس کا ترجمہ لفظ جہل یا جہالت سے کرنا ادب کے خلاف ہے۔

* * *

فائدہ: کفار کا مطالبہ یہ تھا کہ یہ نبی ہیں تو ان کے ساتھ ہمیشہ ایسا نشان رہنا چاہیے جسے ہر کوئی دیکھ کر یقین کر لے اور ایمان لانے پر مجبور ہو جایا کرے، آنحضرت ﷺ چونکہ تمام دنیا کی ہدایت پر حریص تھے، شاید آپ کے دل نے چاہا ہوگا کہ ان کا یہ مطالبہ پورا کر دیا جائے، اس لئے حق تعالیٰ نے یہ تربیت فرمائی کہ تکوینیات میں مشیت الٰہی کے تابع رہو، تکوینی مصالح اس کو مقتضی نہیں کہ ساری دنیا کو ایمان لانے پر مجبور کر دیا جائے ورنہ خدا تو اس پر بھی قادر تھا کہ بدون توسط پیغمبروں اور نشانوں کے شروع ہی سے سب کو سیدھی راہ پر جمع کر دیتا، جب خدا کی حکمت ایسے مجبور کن معجزات اور فرمائشی نشانات دکھلانے کو مقتضی نہیں تو مشیت الٰہی کے خلاف کسی کو یہ طاقت کہاں ہے کہ وہ زمین یا آسمان میں سے سرنگ یا سیڑھی لگا کر ایسا فرمائشی اور مجبور کن معجزہ نکال کر دکھلا دے، خدا کے قوانین حکمت و تدبیر کے خلاف کسی چیز کے وقوع کی امید رکھنا نادانوں کا کام ہے۔

وقف غفران | اِنَّمَا يَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ يَسْمَعُوْنَ ۘؕ وَالْمَوْتٰى يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ ثُمَّ اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ﴿۳۶﴾ | منزل

مانتے وہی ہیں جو سنتے ہیں، اور مردوں کو زندہ کرے گا اللہ پھر اس کی طرف لائے جائیں گے

خلاصہ تفسیر: (حق بات اور ہدایت کو تو) وہی لوگ قبول کرتے ہیں جو (حق بات کو طلب حق کے ارادہ سے) سنتے ہیں اور (اگر اس انکار و اعراض کی پوری سزا ان کو دنیا میں نہ ملی تو کیا ہوا آخر ایک دن) مردوں کو اللہ تعالیٰ قبروں سے زندہ کر کے اٹھائیں گے، پھر وہ سب اللہ ہی کی طرف (حساب کے لئے) لائے جائیں گے (اس وقت سب حقیقت کھل جائے گی اور پوری سزا تجویز ہو جائے گی)۔

* * *

فائدہ: یعنی سب سے توقع نہ رکھو کہ مانیں گے، جن کے دل کے کان بہرے ہو گئے وہ سنتے ہی نہیں، پھر مانیں کس طرح؟ ہاں یہ کافر جو قلبی و روحانی حیثیت سے مردوں کی طرح ہیں قیامت میں دیکھ کر یقین کریں گے اور ان چیزوں کو مانیں گے جن کا انکار کرتے تھے۔

وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ قَادِرٌ عَلٰٓى اَنْ يُّنَزِّلَ اٰيَةً وَّلٰكِنَّ

اور کہتے ہیں کیوں نہیں اتری اس پر کوئی نشانی اس کے رب کی طرف سے ۱؎ کہہ دے کہ اللہ کو قدرت ہے اس بات پر کہ اتارے نشانی لیکن

اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۷﴾

ان میں اکثر نہیں جانتے ۲؎

خلاصہ تفسیر: اور یہ (منکر) لوگ (براہ عناد) کہتے ہیں کہ اگر یہ نبی ہیں تو ان پر (ہمارے معجزات میں سے) کوئی معجزہ کیوں نہیں نازل کیا گیا، آپ فرما دیجئے کہ اللہ تعالیٰ کو بے شک پوری قدرت ہے اس پر کہ وہ (ایسا ہی) معجزہ نازل فرما دیں، لیکن ان میں اکثر (اس کے انجام سے) بے خبر ہیں (اس لئے ایسی درخواست کر رہے ہیں)۔

وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ: یعنی ان میں اکثر (انجام سے) بے خبر ہیں، وہ انجام یہ ہے کہ اگر پھر بھی ایمان نہ لائیں گے تو سب ہلاک کر دیئے جائیں گے، لقولہ تعالیٰ: ولو انزلنا ملکا لقضی الامر الخ، حاصل یہ ہے کہ ان کا فرمائشی معجزہ ظاہر کرنے کی ضرورت تو اس لئے نہیں کہ

پہلے معجزات کافی ہیں، لقولہ تعالیٰ: اولم یکفھم الخ اور ہم جانتے ہیں کہ جیسے موجودہ معجزات پر ایمان نہیں لائے فرمائشی معجزہ پورا ہونے کے بعد بھی ایمان نہ لائیں گے، جس سے نقصان یعنی عذاب کے مستحق ہو جائیں گے اس لئے حکمت کا تقاضا یہی ہے کہ ان کا فرمائشی معجزہ ظاہر نہ کیا جائے۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی ان نشانیوں میں سے کوئی نشانی کیوں نہ اتری جن کی وہ فرمائش کرتے تھے، کما فی قولہ تعالیٰ: وَقَالُوا لَن نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا (الاسراء: ۹۰ تا ۹۳) ورنہ آپ پر بیشمار علمی و عملی معجزات و نشانات بارش کی طرح اترتے رہتے تھے۔

فائدہ: ۲ یعنی خدا فرمائشی معجزات دکھلانے سے عاجز نہیں، لیکن جن قوانین حکمت و رحمت پر نظام تکوین کی بنیاد ہے تم میں کے اکثر ان کے سمجھنے سے قاصر ہیں ان قوانین کا اقتضاء یہی ہے کہ تمام فرمائشی معجزات نہ دکھلائے جائیں۔

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ ؕ مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ

اور نہیں ہے کوئی چلنے والا زمین میں اور نہ کوئی پرندہ کہ اڑتا ہے اپنے بازوؤں سے مگر ہر ایک امت ہے تمہاری طرح، ہم نے نہیں چھوڑی لکھنے میں

مِنْ شَيْءٍ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ يُحْشَرُوْنَ ﴿۳۸﴾

کوئی چیز پھر سب اپنے رب کے سامنے جمع ہوں گے

خلاصہ تفسیر: پیچھے صبر اور تسلی کی تاکید کے ضمن میں آیت: والموتی یبعثھم اللہ ثم الیہ میں قیامت کے دن مُردوں کے دوبارہ زندہ ہونے کا بیان فرمایا تھا، آگے اسی کی تاکید کے لیے جانوروں اور پرندوں کے آخرت میں دوبارہ زندہ ہونے کو بیان فرماتے ہیں، تاکید کا فائدہ ظاہر ہے کہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونا ایک ایسا امر ہے کہ قیامت کے دن جانور جو کہ غیر مکلف ہیں وہ بھی زندہ کیے جائیں گے اور ایک جانور کا دوسرے جانور سے قصاص لیا جائے گا تو انسان تو احکام الٰہیہ کا مکلف ہے اور مورد جزاء وسزا ہے اس کا حشر کیوں نہ ہوگا۔

اور جتنے قسم کے جاندار زمین پر (خواہ خشکی میں یا پانی میں) چلنے والے ہیں اور جتنی قسم کے پرند جانور ہیں کہ اپنے دونوں بازوؤں سے اڑتے ہیں ان میں کوئی قسم ایسی نہیں جو کہ (قیامت کے دن دوبارہ زندہ ہونے میں) تمہاری طرح کے گروہ نہ ہوں اور (اگرچہ یہ سب اپنی کثرت کی وجہ سے عرفاً بے انتہا ہوں، لیکن ہمارے حساب میں سب منضبط ہیں، کیونکہ) ہم نے (اپنے) دفتر (لوح محفوظ) میں کوئی چیز (جو قیامت تک ہونے والی ہے بے لکھے) نہیں چھوڑی (سب کو لکھ لیا ہے، اگرچہ اللہ تعالیٰ کو لکھنے کی کوئی ضرورت نہ تھی، ان کا علم ازلی اور محیط ہی کافی ہے لیکن لکھنے سے سب اشیاء کا منضبط ہونا جلد سمجھ میں آجاتا ہے، جب سب منضبط ہیں پھر سب کو قیامت میں جمع کر لینا کیا مشکل ہے، غرض پہلے سب کو حساب میں منضبط کر لیا گیا ہے) پھر (اس کے بعد اپنے وقت معین پر) سب (انسان اور جانور) اپنے پروردگار کے پاس جمع کئے جائیں گے۔

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ: اس سے معلوم ہوا کہ قیامت کے روز انسانوں کے ساتھ تمام جانور بھی زندہ کئے جائیں گے، حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے نقل کیا گیا ہے کہ قیامت کے روز تمام جانور، بہائم اور پرندے بھی دوبارہ زندہ کئے جائیں گے، اور اللہ تعالیٰ کا انصاف اس حد تک ہے کہ اگر کسی سینگ والے جانور نے بے سینگ کے جانور کو دنیا میں مارا تھا تو آج اس کا انتقام اس سے لیا جائے گا (اسی طرح دوسرے جانوروں کے باہمی مظالم کا انتقام لیا جائے گا) اس کے بعد ان کو حکم ہوگا کہ سب مٹی ہو جاؤ، یہی وہ وقت ہوگا جب کافر کہے گا: یٰلیتنی کنتُ ترابا، یعنی کاش میرا بھی یہی معاملہ ہو جاتا کہ مجھے مٹی بنا دیا جاتا، اور عذاب جہنم سے بچ جاتا۔

یہ سب کو معلوم ہے کہ جانور کسی شریعت اور احکام کے مکلف نہیں، ان کے مکلف صرف انسان اور جن ہیں اور ظاہر ہے کہ غیر مکلف سے جزاء وسزاء کا معاملہ نہیں ہوسکتا، اسی لئے علماء نے فرمایا ہے کہ محشر میں جانوروں کا انتقام ان کے مکلف ہونے کی وجہ سے نہیں، بلکہ رب العالمین کے غایت عدل وانصاف کی وجہ سے ہے کہ ایک جاندار کسی جاندار پر کوئی ظلم کرے تو اس کا بدلہ دلوایا جائے گا، باقی ان کے کسی اور عمل پر جزاء وسزاء نہ ہوگی، اس سے معلوم ہوا کہ خلق اللہ کے باہمی حقوق ومظالم کا معاملہ اتنا سنگین ہے کہ غیر مکلف جانوروں کو بھی اس سے آزاد نہیں کیا گیا، مگر افسوس ہے کہ بہت سے دیندار اور عبادت گزار آدمی بھی اس میں غفلت برتتے ہیں۔

* * *

فائدہ: ان آیات میں بعض حکمتوں پر متنبہ کیا گیا ہے جو فرمائشی نشانات نہ دکھلائے جانے میں مرعی ہیں، یعنی تمام حیوانات خواہ زمین پر رینگتے ہوں یا ہوا میں اڑتے ہوں، وہ بھی انسانوں کی طرح ایک امت ہیں، ان میں سے ہر نوع کو حق تعالیٰ نے ایک خاص وضع اور فطرت پر پیدا کیا جو ان کے معین خواص وافعال کے دائرہ میں کام کرتی ہے، کوئی جانور اپنے افعال وحرکات کے محدود حلقہ سے جو قدرت نے باعتبار اسکی فطرت واستعداد کے مشخص کردیئے ہیں، ایک قدم باہر نہیں نکال سکتا، چنانچہ ابتدائے آفرینش سے آج تک کسی حیوان نے اپنی نوع کے محدود دائرہ عمل میں کسی طرح کی ترقی نہیں کی، اسی طرح ہر چیز کی استعداد وفطرت کو خیال کر لیجئے، حق تعالیٰ کے علم قدیم اور لوح محفوظ میں تمام انواع واجناس کی تدبیر وتربیت کے اصول و فروغ منضبط ہیں، کوئی چیز نہ اس زندگی میں اور نہ مرنے کے بعد اس مکمل انضباط وانتظام سے باہر جاسکتی ہے، انسان جنس حیوان میں ''با اختیار اور ترقی کن'' حیوان ہے اسی کسب واختیار اور ترقی کن عقل وتمیز کی موجودگی نے اسکے ''نظام تکوینی اور قانون حیات'' کو دوسرے تمام حیوانات سے ایسا اعلیٰ اور ممتاز بنادیا ہے کہ اب اسے حیوان کہتے بھی شرم آتی ہے، وہ برخلاف باقی حیوانات کے دیکھنے، سننے اور پوچھنے سے نئی نئی معلومات حاصل کرتا اور قوۃ فکریہ سے ان کو ترتیب دیکر ''حیات جدید'' کی طرف ترقی کرتا رہتا ہے وہ نیک وبد میں تمیز کرنے، نافع وضار کے پہچاننے، آغاز وانجام سمجھنے پر قادر، اور کسی عمل کے کرنے یا چھوڑنے میں فی الجملہ آزاد ہے، اسی لئے اس کو خدا کی جانب سے ایسے نشانات دکھلائے جاتے ہیں جن میں غور وفکر کرنے کا موقع مل سکے اور فکر وکسب کی فطری آزادی کو سلب کرنے والے نہ ہوں، اور اگر وہ خدا کے دیئے ہوئے قوائے عقلیہ سے ٹھیک طور پر ان میں غور کرنے تو اسے حق وباطل اور نیک وبد کی تمیز کرنے میں کچھ دقت نہ ہو، پس ایسے فرمائشی نشانات ومعجزات کی درخواست کرنا جو بہمہ وجوہ ایمان لانے پر مجبور کردیں، انسان کی فطری آزادی اور اسکے نظام ترکیبی کو تباہ کرنے، بلکہ انسان کو عام حیوانات کی صف میں اتار لانے کا مرادف ہے، اور اگر فرمائشی نشان بہمہ وجوہ مجبور کن نہ ہوں تو انکا دکھلانا بیکار ہے کیونکہ ان میں بھی وہی غیر ناشی عن الدلیل شکوک وشبہات پیدا کر لئے جائیں گے جو ہزاروں غیر فرمائشی نشانات میں کئے جاچکے۔

وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا صُمٌّ وَّبُكْمٌ فِي الظُّلُمٰتِ ۭ مَنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يُضْلِلْهُ ۭ وَمَنْ يَّشَاْ يَجْعَلْهُ

اور جو جھٹلاتے ہیں ہماری آیتوں کو وہ بہرے اور گونگے ہیں اندھیروں میں [1] جس کو چاہے اللہ گمراہ کرے [2] اور جس کو چاہے ڈال دے

عَلٰي صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝۳۹

سیدھی راہ پر

خلاصہ تفسیر: پیچھے آیت: ولو شاء اللہ لجمعھم اور آیت: انما یستجیب الذین میں صبر وتسلی کا مضمون تھا، آگے پھر رسول اللہ ﷺ کی تسلی کا مضمون ہے۔

اور جو لوگ ہماری آیتوں کی تکذیب کرتے ہیں وہ تو (حق سننے سے) بہرے (جیسے) اور (حق کہنے سے) گونگے (جیسے) ہورہے ہیں (اور اس کی وجہ سے) طرح طرح کی ظلمتوں میں (گرفتار) ہیں (کیونکہ ہر کفر ایک ظلمت ہے اور ان میں مختلف قسم کے کفر جمع ہیں، پھر ان اقسام کفر کا بار بار تکرار الگ الگ ظلمتیں ہیں) اللہ تعالیٰ جس کو چاہیں (حق سے اعراض کرنے کی وجہ سے) بے راہ کردیں اور وہ جس کو چاہیں (اپنے فضل سے) سیدھی راہ

پرلگادیں (جیسا پیچھے بھی کہا گیا ہے: ولو شاء الله لجمعهم علی الهدی سوایسی حالت میں ان کی فکر میں پڑنا بے سود ہے، خدا کے سپرد کرنا چاہیے)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ نہ کہنے والے کی سنتے ہیں نہ خود دوسرے سے پوچھتے ہیں اور نہ اندھیرے میں کچھ دیکھ سکتے ہیں، جب سب قویٰ اپنی بے اعتدالیوں سے بیکار کر لئے تو حق کی تصدیق وقبول کا کیا ذریعہ ہو؟

فائدہ: ۲؎ گمراہ کرنا اسی کو چاہتا ہے جو خود ذرائع ہدایت کو اپنے اوپر مسدود کر لیتے ہیں: وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗۤ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ (الاعراف:۱۷۶)

قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ اَوْ اَتَتْكُمُ السَّاعَةُ اَغَيْرَ اللّٰهِ تَدْعُوْنَ ۚ اِنْ كُنْتُمْ

کہہ دیکھو تو اگر آئے تم پر عذاب اللہ کا یا آئے تم پر قیامت کیا اللہ کے سوا کسی اور کو پکارو گے بتاؤ اگر تم

صٰدِقِيْنَ ﴿۴۰﴾ بَلْ اِيَّاهُ تَدْعُوْنَ فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَيْهِ اِنْ شَآءَ وَتَنْسَوْنَ مَا تُشْرِكُوْنَ ﴿۴۱﴾

سچے ہو، بلکہ اسی کو پکارتے ہو پھر دور کر دیتا ہے اس مصیبت کو جس کیلئے اسکو پکارتے ہو اگر چاہتا ہے اور تم بھول جاتے ہو جنکو شریک کرتے تھے

خلاصہ تفسیر: سورت کے شروع میں توحید کا اثبات اور شرک کا ابطال تھا، آگے پھر اسی کی طرف ایک خاص طریقے سے رجوع ہے کہ خود مشرکین سے بعض سوالات کیے جاتے ہیں جن کے جواب سے شرک کا ابطال ہو جائے گا۔

آپ (ان مشرکین سے) کہئے کہ (اچھا) یہ تو بتاؤ کہ اگر تم پر خدا کا کوئی عذاب آپڑے (جیسا پہلی امتوں پر آیا تھا) یا تم پر قیامت ہی آپہنچے تو کیا (اس قیامت کے عذاب اور ہول کو ہٹانے کے واسطے) خدا کے سوا کسی اور کو پکارو گے اگر تم (شرک کے دعوے میں) سچے ہو (تو چاہئے اس وقت بھی غیر اللہ ہی کو پکارو، لیکن ایسا ہرگز نہ ہوگا) بلکہ (اس وقت تو) خاص اسی کو پکارنے لگو (جیسا کہ اس سے کم مصیبت میں روزانہ ہوتا ہے) پھر جس (آفت) کے (ہٹانے) کے لئے تم (اس کو) پکارو اگر وہ چاہے تو اس کو ہٹا بھی دے (اور نہ چاہے تو نہ بھی ہٹائے) اور جن کو تم (اب اللہ کا) شریک ٹھہراتے ہو (اس وقت) ان سب کو بھول بھال جاؤ (پس اسی سے سمجھ لو کہ خدا کے سوا جب کوئی قادر مختار نہیں تو مستحق عبادت بھی اس کے سوا کوئی نہیں ہوسکتا)۔

اَوْ اَتَتْكُمُ السَّاعَةُ: یعنی یا تم پر قیامت ہی آپہنچے، یہاں یہ شبہ ہوتا ہے کہ مباحثہ اور مناظرہ میں یہ ضروری ہے کہ دلیل کے سب مقدمات مسلمہ ہوں، اور یہ مشرکین تو قیامت ہی کے قائل نہ تھے؟ جواب یہ ہے کہ استدلال قیامت کے آنے سے نہیں کیا گیا، بلکہ اس کے آنے کو فرض کیا گیا ہے اور فرض کرنا ہر چیز کا ممکن ہے، اور ان کا دعویٰ باطل کرنے کے لیے یہ فرض کرنا بھی کافی ہے، کیونکہ جب وہ روزانہ ہلکی ہلکی آفتوں میں خدا ہی کو پکارتے تھے تو اس سوال کا وہ یہ جواب نہیں دے سکتے کہ ہاں قیامت کی مصیبتوں میں ہم غیر اللہ ہی کو پکاریں گے۔

فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَيْهِ اِنْ شَآءَ: یہ جو فرمایا کہ اگر وہ چاہے تو اس آفت کو ہٹا بھی دے تو دوسرے دلائل سے معلوم ہو گیا کہ عذاب دنیوی میں تو دونوں احتمال ہیں، اور قیامت کی آفتوں میں سے طویل موقف شفاعت کبریٰ کی دعا سے موقوف ہو جائے گا اور شفاعت کبریٰ ساری مخلوق کی درخواست پر ہوگی، اور ظاہر ہے کہ کسی سے یہ کہنا کہ ہمارے لیے خدا سے دعا کرو یہ بھی دعا کا ایک طریقہ ہے تو طول موقف کی مصیبت دفع ہونے میں ساری مخلوق کی دعا کا اثر ہوگا، باقی عذاب جہنم کفار سے نہ ٹلے گا کتنی ہی دعائیں کریں۔

* * *

فائدہ: جب اندھے بہرے گونگے ہو کر آیات اللہ کو جھٹلایا اور گمراہی کے عمیق غار میں جا پڑے، اس پر اگر دنیا میں یا قیامت میں خدا کا سخت عذاب نازل ہو تو سچ بتلاؤ کہ خدا کے سوا اس وقت کسے پکارو گے، دنیا کی چھوٹی چھوٹی مصیبتوں میں بھی جب گھر جاتے ہو تو مجبور ہو کر اسی خدائے

واحد کو پکارتے ہو اور سب شرکاء کو بھول جاتے ہو: فَإِذَا رَكِبُوا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ (العنکبوت:۶۵) جس پر اگر خدا چاہتا ہے تو اس مصیبت کو دور بھی کر دیتا ہے اسی سے اندازہ کرلو کہ نزول عذاب یا ہول قیامت سے بچانے والا بجز خدا کے اور کون ہوسکتا ہے پھر یہ کس قدر حماقت اور اندھاپن ہے کہ اس خدا کی عظمت و جلال کو فراموش کر کے اس کی نازل کی ہوئی آیات کی تکذیب اور فرمائشی آیات کا مطالبہ کرتے ہو۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَخَذْنٰهُمْ بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُوْنَ ﴿۴۲﴾

اور ہم نے رسول بھیجے تھے بہت سی امتوں پر تجھ سے پہلے پھر ان کو پکڑا ہم نے سختی میں اور تکلیف میں تاکہ وہ گڑ گڑاویں

فَلَوْلَآ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَا تَضَرَّعُوْا وَلٰكِنْ قَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۴۳﴾

پھر کیوں نہ گڑ گڑائے جب آیا ان پر عذاب ہمارا لیکن سخت ہو گئے دل ان کے اور بھلے کر دکھلائے ان کو شیطان نے جو کام وہ کر رہے تھے

فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ ط حَتّٰٓى اِذَا فَرِحُوْا

پھر جب وہ بھول گئے اس نصیحت کو جو انکو کی گئی تھی کھول دیے ہم نے ان پر دروازے ہر چیز کے، یہاں تک کہ جب وہ خوش ہوئے

بِمَآ اُوْتُوْٓا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ ﴿۴۴﴾

ان چیزوں پر جو انکو دی گئیں پکڑ لیا ہم نے انکو اچانک پس اس وقت وہ رہ گئے ناامید

خلاصہ تفسیر: گذشتہ آیات میں یہ بتلایا گیا کہ تمہارے کفر و شرک اور نافرمانی کی سزا میں تم پر اسی دنیا کی زندگی میں بھی عذاب آسکتا ہے اور بالفرض زندگی میں عذاب نہ آیا تو قیامت کا آنا تو یقینی ہے، آگے بتلاتے ہیں کہ اس فرضی بات کا واقع ہوجانا کچھ دشوار نہیں، تم سے پہلے بہت سی امتوں پر عذاب آچکا ہے، نیز یہ بھی بتلاتے ہیں کہ مصیبت آ آکر ٹل جانے سے یہ دھوکہ مت کھانا کہ یہ ہمارے اعمال کی سزا ہوتی تو کیوں ٹلتی، ہم تو اب بھی ویسے ہی سرکش ہیں، کیونکہ عذاب الہی اسی طرح آیا کرتا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں۔

اور ہم نے آپ سے پہلی امتوں کی طرف بھی پیغمبر بھیجے تھے (مگر انہوں نے پیغمبروں کو نہ مانا) تو ہم نے ان کو (اس جھٹلانے پر) تنگدستی اور بیماری سے پکڑا تاکہ وہ ڈھیلے پڑ جائیں (اور اپنے کفر و معصیت سے توبہ کرلیں) سو جب ان کو ہماری سزا پہنچی تھی وہ ڈھیلے کیوں نہ پڑے (کہ ان کا جرم معاف ہوجاتا) لیکن ان کے قلوب تو (ویسے ہی) سخت (کے سخت) رہے، اور شیطان ان کے اعمال بد کو اُن کے خیال میں (بدستور) آراستہ (و مستحسن) کر کے دکھاتا رہا۔

پھر جب وہ لوگ (بدستور) ان چیزوں کو بھولے (اور چھوڑے) رہے، جن کی ان کو (پیغمبروں کی طرف سے) نصیحت کی جاتی تھی (یعنی ایمان و اطاعت) تو ہم نے ان پر (عیش و عشرت کی) ہر چیز کے دروازے کھول دیئے (یعنی خوب نعمت و ثروت دی) یہاں تک کہ جب ان چیزوں پر جو کہ ان کو (اسباب نعمت میں سے) ملی تھیں وہ خوب اترا گئے (اور غفلت و مستی میں ان کا کفر اور بڑھ گیا، اس وقت) ہم نے ان کو دفعۃً (کہ ان کو گمان بھی نہ تھا عذاب میں) پکڑ لیا (اور عذاب شدید نازل کیا جس کا ذکر قرآن میں جا بجا آیا ہے) پھر تو وہ بالکل حیرت زدہ رہ گئے (کہ کیا ہوگا)۔

اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ: مطلب یہ کہ اسی طرح یہ مشرکین اپنی حالت پر مغرور اور بے فکر نہ رہیں، حق تعالیٰ کی یہی عادت ہے کہ پہلے کفر و معصیت پر کسی قدر عذاب نازل فرماتے ہیں تاکہ عاجزی و تضرع کریں، اگر اس سے تنبیہ نہ ہوں تو ڈھیل دینے کے لیے نعمتیں نازل فرماتے ہیں، پھر جب کفر و معصیت کی خوب ترقی ہوجاتی ہے اس وقت سخت عذاب دفعۃً نازل فرماتے ہیں، پس بعض بلاؤں کے ٹل جانے سے دھوکہ نہیں کھانا چاہیے۔

فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ: یعنی ان کو بطور ڈھیل نعمتیں عطا فرمائیں، ایسی ہی نظیر اس شخص کی ہے کہ گناہ اور غفلت کے باوجود اس کو عبادت میں لطف اور شوق باقی رہتا ہو اور دل میں خدا تعالیٰ کی یاد بھی رہتی ہو جس پر وہ فخر کرنے لگتا ہے کہ اب اللہ کا فضل و کرم شامل حال ہو گیا ہے، اللہ کے ساتھ نسبت قوی ہو گئی ہے، اب کوئی اندیشہ نہیں رہا، تو یہ کیفیت استدراج (ڈھیل) کہلاتی ہے۔

* * *

فائدہ: گزشتہ آیت میں عذاب آنے کا احتمال ہوا تھا، اب واقعات کا حوالہ دیتے ہیں کہ پہلے زمانے میں اس طرح کے عذاب آچکے ہیں، نیز متنبہ فرما دیا کہ جب مجرم کو ابتداءً ہلکی تنبیہ کی جائے تو اسکو معاً خدا کی طرف رجوع ہونا چاہیے، سخت دلی اور اغوائے شیطانی سے اسے ہلکا نہ سمجھے، موضح القرآن میں ہے کہ: ''گنہگار کو اللہ تعالیٰ تھوڑا سا پکڑتا ہے، اگر وہ گڑگڑایا تو بہ کی تو بچ گیا اور اگر اتنی پکڑ نہ مانی تو پھر بھلا وا دیا اور وسعت عیش کے دروازے کھولے، جب نعمتوں کی شکر گزاری اور انعام و احسان سے متاثر ہونے کے بجائے خوب گناہ میں غرق ہوا تو دفعۃً بے خبر پکڑا گیا، یہ ارشاد ہے کہ آدمی کو گناہ پر تنبیہ پہنچے تو شتاب تو بہ کرے، یہ راہ نہ دیکھے کہ اس سے زیادہ پہنچے تو یقین کروں''۔

فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ط وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۵﴾

پھر کٹ گئی جڑ ان ظالموں کی، اور سب تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں جو پالنے والا ہے سارے جہان کا

خلاصہ تفسیر: پھر (اس عذاب سے) ظالم لوگوں کی جڑ (تک) کٹ گئی (یعنی بالکل ہلاک ہو گئے) اور اللہ کا شکر ہے جو تمام عالم کا پروردگار ہے (کہ ایسے ظالموں کا پاپ کٹا جن کی وجہ سے دنیا میں نحوست پھیلی تھی، مطلب یہ کہ اسی طرح یہ مشرکین اپنی حالت پر مغرور ہو کر بے فکر نہ رہیں)۔

فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا: انہی آیات سے یہ شبہ بھی دور ہو گیا کہ یہ دنیا تو دار الجزاء نہیں بلکہ دار العمل ہے، یہاں تو نیک و بد اور خیر و شر ایک ہی پلڑے میں تلتے ہیں، بلکہ بدنیکوں سے اچھے رہتے ہیں، پھر اس دنیا میں سزا جاری ہونے کا کیا مطلب ہے؟ جواب واضح ہے کہ اصل جزاء وسزاء تو اسی روز قیامت میں ہوگی، جس کا نام ہی یوم الدین یعنی روز جزاء ہے، لیکن کچھ تکلیفیں بطور نمونہ عذاب کے، اور کچھ راحتیں بطور نمونہ ثواب کے اس دنیا میں بمقتضائے رحمت بھیج دی جاتی ہیں اور بعض عارفین نے تو یہ فرمایا ہے کہ دنیا کی جتنی لذتیں اور راحتیں ہیں، وہ بھی سب نمونہ ہیں جنت کی راحتوں کا، تا کہ انسان کو ان کی طرف رغبت پیدا ہو، اور جتنی تکالیف، پریشانیاں، رنج و غم اس دنیا میں ہیں وہ بھی سب کے سب نمونہ ہیں عذاب آخرت کے، تا کہ انسان کو ان سے بچنے کا اہتمام پیدا ہو، ورنہ بغیر کسی نمونہ کے نہ کسی چیز کی طرف کسی کو رغبت دلائی جاسکتی ہے اور نہ کسی چیز سے ڈرایا جاسکتا ہے، الغرض دنیا کی راحت و کلفت درحقیقت سزاء و جزاء کے نمونے ہیں، اور یہ پوری دنیا آخرت کا شوروم ہے جس میں تاجر اپنے مال کے نمونے دکھانے کے لئے دکان کے سامنے لگاتا ہے، کہ ان کو دیکھ کر خریدار کو رغبت پیدا ہو، معلوم ہوا کہ دنیا کا رنج و راحت درحقیقت سزاء و جزاء نہیں بلکہ خالق سے کٹی ہوئی مخلوق کا رشتہ پھر اپنے خالق سے جوڑنے کی ایک تدبیر ہے۔

خود آیت مذکورہ کے آخر میں بھی اس حکمت کا ذکر لعلهم یتضرعون کے جملہ میں فرمایا گیا ہے، یعنی ہم نے ان پر جو محنت و مصیبت دنیا میں ڈالی اس کا منشاء درحقیقت عذاب دینا نہ تھا، بلکہ یہ تھا کہ مصیبت میں طبعی طور پر شخص کو خدا یاد آیا کرتا ہے، اس لئے اس محنت میں ڈال کر اپنی طرف متوجہ کرنا مقصود تھا، اس سے معلوم ہوا کہ دنیا میں جو تکلیف و مصیبت بطور عذاب کے بھی کسی شخص یا جماعت پر آتی ہے اس میں بھی ایک پہلو سے رحمت الٰہی کارفرما ہوتی ہے۔

* * *

فائدہ: ظالموں کا استیصال بھی اسکی ربوبیت عامہ کا اثر اور مجموعہ عالم کیلئے رحمت عظیم ہے اسی لئے یہاں حمد و شکر کا اظہار فرمایا۔

قُلۡ اَرَءَيۡتُمۡ اِنۡ اَخَذَ اللّٰهُ سَمۡعَكُمۡ وَاَبۡصَارَكُمۡ وَخَتَمَ عَلٰى قُلُوۡبِكُمۡ مَّنۡ اِلٰهٌ غَيۡرُ اللّٰهِ

تو کہہ دیکھو تو اگر چھین لے اللہ تمہارے کان اور آنکھیں اور مہر کر دے تمہارے دلوں پر ۱؎ تو کون ایسا رب ہے اس کے سوا

يَاۡتِيۡكُمۡ بِهٖ ؕ اُنۡظُرۡ كَيۡفَ نُصَرِّفُ الۡاٰيٰتِ ثُمَّ هُمۡ يَصۡدِفُوۡنَ ﴿۴۶﴾

جوتم کو یہ چیزیں لادے ۲؎ دیکھ ہم کیونکر طرح طرح سے بیان کرتے ہیں باتیں پھر بھی وہ کنارہ کرتے ہیں

خلاصہ تفسیر: اب پھر دوبارہ شرک کو اسی طرز سے باطل کیا جاتا ہے کہ مشرکین سے کچھ سوالات کرتے ہیں جن کے جواب سے توحید ثابت ہو جائے گی۔

آپ (صلی اللہ علیہ وسلم ان سے یہ بھی) کہئے کہ یہ بتلاؤ اگر اللہ تعالیٰ (عذاب نازل نہ فرمائے، نہ سہی، لیکن) تمہاری شنوائی اور بینائی بالکل لے لے (کہ نہ تم کو کچھ سنائی دے، نہ دکھائی دے) اور تمہارے دلوں پر مہر لگا دے (کہ تم دل سے کسی چیز کو سمجھ نہ سکو) تو اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی معبود ہے کہ یہ (چیزیں) تم کو پھر دے دے؟ (جب تمہارے اقرار سے بھی خدا کے سوا کوئی ایسا نہیں پھر کسی اور کو عبادت کا مستحق کیسے سمجھتے ہو؟) آپ دیکھئے تو کہ ہم کس (کس) طرح دلائل کو مختلف پہلوؤں سے ظاہر کر رہے ہیں، پھر (بھی ان دلائل میں غور اور ان کے نتیجہ کو تسلیم کرنے سے) یہ اعراض (بے رخی) کرتے ہیں۔

* * *

فائدہ: ۱؎ کہ نہ تم سن سکو، نہ دیکھ سکو، نہ دل سے سمجھ سکو۔

فائدہ: ۲؎ حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں: ''یعنی توبہ میں دیر نہ کرے، جو کان اور آنکھ اور دل اس وقت ہے شاید پھر نہ ملے''، اور اس لئے توبہ واستغفار کی توفیق نہ ہو سکے۔

قُلۡ اَرَءَيۡتَكُمۡ اِنۡ اَتٰٮكُمۡ عَذَابُ اللّٰهِ بَغۡتَةً اَوۡ جَهۡرَةً هَلۡ يُهۡلَكُ اِلَّا الۡقَوۡمُ الظّٰلِمُوۡنَ ﴿۴۷﴾

تو کہہ دیکھو تو اگر آئے تم پر عذاب اللہ کا اچانک ۱؎ یا ظاہر ہو کر تو کون ہلاک ہوگا ظالم لوگوں کے سوا ۲؎

خلاصہ تفسیر: پیچھے پہلی امتوں کی ہلاکت کا بیان کفار کی تنبیہ کے لیے ہوا، آگے سوال وجواب کے طور پر اس ہلاکت کی علت بتلاتے ہیں جو کہ صرف کفر وشرک ہی تھی جس کو یہاں ''ظلم'' کے عنوان سے تعبیر کیا گیا ہے، نیز اس پر بھی تنبیہ ہے کہ یہ علت تمہارے اندر بھی موجود ہے، اس لیے اگر عذاب آئے گا تو صرف تمہارے ہی اوپر آئے گا، اس خیال سے خوش مت ہو جانا کہ عذاب آئے گا تو سب ہی ہلاک ہوں گے، مسلمان بھی اور ہم بھی، پھر کیا غم۔

آپ (صلی اللہ علیہ وسلم ان سے یہ بھی) کہئے کہ یہ بتلاؤ اگر تم پر اللہ کا عذاب آپڑے خواہ بے خبری میں یا ہوشیاری میں تو کیا بجز ظالم لوگوں کے (اس عذاب اور غضب سے) اور بھی کوئی ہلاک کیا جائے گا (کوئی نہیں، یعنی وہ عذاب ظلم کی وجہ سے آئے گا جیسا کہ پہلی امتوں پر بھی اسی وجہ سے آیا تھا، سو لامحالہ ظالموں ہی کے ساتھ خاص ہوگا اور ظالم تم ہو کہ شرک وکفر کرتے ہو تو خاص تمہارے ہی اوپر آئے گا اور مسلمان بچے رہیں گے، سو تم کو ہوش کرنا چاہے اور مرگ انبوہ جشنے دارد کا سہارا بھی بھول جانا چاہئے کہ اگر عذاب آ ہی گیا تو اس میں ہمارے ساتھ مسلمان بھی تو مبتلا ہوں گے)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ ''اچانک'' یعنی وہ عذاب جس کی کچھ علامات پہلے سے ظاہر نہ ہوں، لہٰذا جھرۃً سے مراد وہ عذاب ہوگا جس کے آنے سے قبل علامات ظاہر ہونے لگیں۔

فائدہ: ۲؎ یعنی توبہ میں دیر نہ کرنا چاہیے شاید اس دیر میں عذاب پہنچ جائے جس کا خمیازہ صرف ظالموں کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ اگر پہلے

ہی ظلم وعدوان سے توبہ کر چکا ہوگا تو اس عذاب سے بچ رہے گا۔

وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۚ فَمَنْ اٰمَنَ وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ

اور ہم رسول نہیں بھیجتے مگر خوشی اور ڈر سنانے کو، پھر جو کوئی ایمان لایا اور سنور گیا تو نہ ڈر ہے ان پر

وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿٤٨﴾ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا يَمَسُّهُمُ الْعَذَابُ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿٤٩﴾

اور نہ وہ غمگین ہوں، اور جنہوں نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو ان کو پہنچے گا عذاب اس لئے کہ وہ نافرمانی کرتے تھے

خلاصہ تفسیر: پیچھے کفار کے فرمائشی معجزات کے پورا کرنے کو غیر ضروری بتلاتے ہوئے اس کے ضمن میں رسالت کا اثبات بھی کر دیا گیا تھا کہ اس کے لیے معجزات کافی ہیں، جو ان کو نہیں مانتے وہ دوسروں کو بھی نہ مانیں گے، آگے بتلاتے ہیں کہ رسالت کے ثبوت کے بعد رسول پر تبلیغ لازم ہے، سب فرمائشوں کا پورا کرنا لازم نہیں، اس سے تمام مضمون کی کسی قدر تفصیل مقصود ہے۔

اور ہم پیغمبروں کو (جن کی پیغمبری قطعی دلائل سے ثابت کر چکے ہیں) صرف اس واسطے (امتوں کی طرف) بھیجا کرتے ہیں کہ وہ (ایمان اور اطاعت کرنے والوں کو رضائے الٰہی اور جنت کی نعمتوں کی) بشارت دیں اور (کفر و معصیت کرنے والوں کو اللہ کی ناراضی سے) ڈرائیں (پیغمبروں کو اس لیے نہیں بھیجا جاتا کہ جو کچھ بھی ان سے واہی تباہی فرمائشیں کی جائیں وہ سب کو پورا کریں جیسا کہ یہ منکرین محض عناد کی وجہ سے درخواست کرتے ہیں) پھر (ان پیغمبروں کی بشارت اور ڈرانے کے بعد) جو شخص ایمان لے آئے اور (اپنے عقائد و اعمال کی) اصلاح کرلے تو ان لوگوں پر (آخرت میں) کوئی اندیشہ نہیں (اگرچہ یہ لوگ ایمانی تقاضے کی وجہ سے خدا تعالیٰ سے ہمیشہ خوف کیا کرتے ہیں) اور نہ وہ (وہاں) مغموم ہوں گے، اور جو لوگ (اس خوش خبری اور ڈراوے کے بعد بھی) ہماری آیتوں کو جھوٹا بتلائیں ان کو (بعض اوقات تو دنیا میں بھی، ورنہ آخرت میں تو ضرور) عذاب لگتا ہے بوجہ اس کے کہ وہ دائرہ (ایمان) سے نکل جاتے ہیں (یعنی پیغمبروں کا اصل کام اور اس کا نتیجہ یہ ہے، نہ کہ تمام فرمائشوں کا پورا کرنا، پس اسی قاعدے کے مطابق یہ رسول بھی ہیں)۔

* * *

فائدہ: یعنی تم جو عذاب الٰہی سے نڈر اور بے فکر ہو کر بیہودہ فرمائشیں اور دور از کار سوالات کر کے پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام کو دق کرتے اور ان کی تصدیق کے لئے خود ساختہ معیار تراشتے ہو، خوب سمجھ لو کہ پیغمبر دنیا میں اس لئے نہیں بھیجے گئے کہ تمہاری ایسی واہی تباہی فرمائشیں پوری کرتے رہا کریں، ان کی بعثت کی غرض صرف "تبشیر و انذار" اور "تبلیغ و ارشاد" ہے، وہ خدا کی طرف سے اس لئے بھیجے جاتے ہیں کہ فرمانبرداروں کو بشارات سنائیں اور نافرمانوں کو ان کے انجام بد پر متنبہ کر دیں، آگے ہر شخص کی کمائی اس کے ساتھ ہے، جس نے انبیاء علیہم السلام کی باتوں پر یقین کیا اور اعتقاداً و عملاً اپنی حالت درست کرلی، حقیقی امن اور چین اس کو نصیب ہوا، اور جس نے خدا کی آیات کو جھٹلا کر ہدایت الٰہی سے روگردانی کی وہ نافرمانی اور بغاوت کی وجہ سے سخت تباہی اور عذاب عظیم کے نیچے آگیا، العیاذ باللہ

قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ ۚ

تو کہہ میں نہیں کہتا تم سے کہ میرے پاس ہیں خزانے اللہ کے اور نہ میں جانوں غیب کی بات اور نہ میں کہوں تم سے کہ میں فرشتہ ہوں [1]

اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۭ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ۭ اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿٥٠﴾

میں تو اسی پر چلتا ہوں جو میرے پاس اللہ کا حکم آتا ہے، تو کہہ دے کب برابر ہو سکتا ہے اندھا اور دیکھنے والا، سو کیا تم غور نہیں کرتے [2]

خلاصہ تفسیر: آپ (ﷺ ان معاند لوگوں سے یہ قاعدہ سنانے کے بعد) کہہ دیجئے کہ (میں جو رسالت کا دعویٰ کرتا ہوں تو

اسکے ساتھ) نہ تو میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ میرے پاس (یعنی میری قدرت میں) اللہ تعالیٰ کے تمام خزانے ہیں (کہ جب مجھ سے کسی چیز کی فرمائش کی جائے تو اسے اپنی قدرت سے پورا کردوں) اور نہ میں (یہ کہتا ہوں کہ) تمام غیب کی چیزوں کو (جو اللہ تعالیٰ کا خاصہ ہے) جانتا ہوں (جیسا کبھی کبھی عناد کی وجہ سے اس قسم کی باتیں مجھ سے پوچھتے ہو مثلاً قیامت کب آئے گی) اور نہ میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں (جیسا کبھی عناد کی وجہ سے یہ کہتے ہو کہ کیا خدا تعالیٰ نے بشر کو رسول بنا کر بھیجا ہے، رسول تو فرشتہ ہونا چاہیے، سو میں رسالت کے فرشتہ ہونے کا تو مدعی نہیں ہوں) میں تو صرف اس وحی کا اتباع کرتا ہوں جو میرے پاس آتی ہے (جس میں وحی پر خود عمل کرنا بھی داخل ہے اور دوسروں کو دعوت دینا بھی، جیسا کہ پچھلے تمام انبیاء علیہم السلام کا بھی یہی حال تھا، پھر ثبوت رسالت کے بعد جس کے لیے بہت سے دلائل قائم ہو چکے ہیں یہ مہمل فرمائشیں میرے سامنے کیوں پیش کی جاتی ہیں) آپ (ان سے) کہئے کہ (یہ تو ظاہر ہے کہ) اندھا اور بینا کہیں برابر ہوسکتا ہے (اور جب یہ بات سب کو مسلم ہے) تو کیا تم (آنکھوں والا بننا نہیں چاہتے اور اس مذکورہ تقریر میں کامل) غور (طلب حق کے ارادے سے) نہیں کرتے (کہ حق واضح ہو جائے اور تم بیناؤں میں داخل ہو جاؤ، ورنہ یاد رکھو کہ اندھے ہی بنے رہو گے)۔

یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ تم جو دور از کار فرمائشیں کر کے میری رسالت کو جھٹلاتے ہو یہ محض بے معنی ہے، کیونکہ اگر میں کسی عجیب و غریب بات کا دعویٰ کرتا جیسے خدائی خزانوں کا مالک ہونا، عالم الغیب ہونا یا فرشتہ ہونا تب تو تم کو ان دور دراز فرمائشوں کا حق بھی ہوتا، رسالت جس کا میں مدعی ہوں وہ تو کوئی عجیب و غریب بات نہیں ہے جو اس کو بعید یا محال سمجھ کر ایسی فرمائشوں سے اس کو جھٹلاتے ہو۔

* * *

فائدہ: ۱ اس آیت میں منصب رسالت پر روشنی ڈالی گئی ہے یعنی کوئی شخص جو مدعی نبوت ہو، اس کا دعویٰ یہ نہیں ہوتا کہ تمام مقدورات الٰہیہ کے خزانے اس کے قبضہ میں ہیں کہ اس سے کسی امر کی فرمائش کی جائے وہ ضرور ہی کر دکھلائے یا تمام معلومات غیبیہ وشہادیہ پر خواہ ان کا تعلق فرائض رسالت سے ہو یا نہ ہو، اس کو مطلع کر دیا گیا ہے کہ جو کچھ تم پوچھو، وہ فوراً ابتلا دیا کرے یا نوع بشر کے علاوہ وہ کوئی اور نوع ہے جو لوازم وخواص بشریہ سے اپنی برأت ونزہت کا ثبوت پیش کرے، جب ان باتوں میں سے وہ کسی چیز کا مدعی نہیں تو فرمائشی معجزات اس سے طلب کرنا یا ازراہ تعنت وعناد اس قسم کا سوال کرنا کہ ''قیامت کب آئے گی'' یا یہ کہنا کہ ''یہ رسول کیسے ہیں جو کھانا کھاتے اور بازاروں میں خرید وفروخت کیلئے جاتے ہیں'' اور انہی امور کو معیار تصدیق وتکذیب ٹھہرانا کہاں تک صحیح ہوسکتا ہے۔

فائدہ: ۲ یعنی اگرچہ پیغمبر نوع بشر سے علیحدہ کوئی دوسری نوع نہیں، لیکن اس کے اور باقی انسانوں کے درمیان زمین آسمان کا فرق ہے، انسانی قوتیں دو قسم کی ہیں علمی وعملی، قوت علمیہ کے اعتبار سے نبی کے دل کی آنکھیں ہر وقت مرضیات الٰہی اور تجلّیات ربانی کے دیکھنے کیلئے کھلی رہتی ہیں، جسکے بلاواسطہ مشاہدہ سے دوسرے انسان محروم ہیں اور قوت عملیہ کا حال یہ ہوتا ہے کہ پیغمبر اپنے قول وفعل اور ہر ایک حرکت وسکون میں رضائے الٰہی اور حکم خداوندی کے تابع ومنقاد ہوتے ہیں، وحی سماوی اور احکام الٰہیہ کے خلاف نہ کبھی ان کا قدم اٹھ سکتا ہے نہ زبان حرکت کر سکتی ہے، ان کی مقدس ہستی اخلاق واعمال اور کل واقعات زندگی میں تعلیمات ربانی اور مرضیات الٰہی کی روشن تصویر ہوتی ہے جسے دیکھ کر غور وفکر کرنے والوں کو ان کی صداقت اور مامور من اللہ ہونے میں ذرا بھی شبہ نہیں رہ سکتا۔

وَاَنۡذِرۡ بِهِ الَّذِيۡنَ يَخَافُوۡنَ اَنۡ يُّحۡشَرُوۡۤا اِلٰى رَبِّهِمۡ لَيۡسَ لَهُمۡ مِّنۡ دُوۡنِهٖ

اور خبردار کر دے اس قرآن سے لوگوں کو جن کو ڈر ہے اسکا کہ جو جمع ہوں گے اپنے رب کے سامنے اس طرح پر کہ اللہ کے سوا نہ کوئی انکا

وَلِىٌّ وَّلَا شَفِيۡعٌ لَّعَلَّهُمۡ يَتَّقُوۡنَ ﴿۵۱﴾

حمایتی ہوگا اور نہ سفارش کرنے والا ۱ تاکہ وہ بچتے رہیں ۲

خلاصہ تفسیر: (اور اگر اس پر بھی وہ عناد سے باز نہ آئیں تو ان سے بحث مباحثہ بند کر دیجئے اور آپ ﷺ کا جو اصلی کام تبلیغ

رسالت کا ہے اس میں مشغول ہو جائیے) اور ایسے لوگوں کو (کفر ومعصیت پر عذاب الٰہی سے خاص طور سے) ڈرائیے جو (اعتقادی طور پر یا کم از کم احتمال کے طور پر) اس بات سے اندیشہ رکھتے ہیں (کہ قیامت میں) اپنے رب کے پاس (قبروں سے زندہ کرنے کے بعد) ایسی حالت میں جمع کیے جائیں گے کہ اللہ کے سوا (جس جس کو مددگار یا سفارش کرنے والا کفار نے سمجھا تھا اس وقت ان میں سے) نہ کوئی ان کا مددگار ہوگا اور نہ کوئی (مستقل) شفاعت کرنے والا ہوگا (اور ایسے لوگوں کو) اس امید پر (ڈرایئے شاید) کہ وہ (عذاب سے) ڈر جائیں (اور کفر ومعصیت سے باز آجائیں، کیونکہ نہ ڈرنا کسی مددگار یا سفارشی کے بھروسہ پر ہوتا ہے اور وہ ہے نہیں)۔

وَاَنۡذِرۡ بِهِ الَّذِيۡنَ يَخَافُوۡنَ اَنۡ يُّحۡشَرُوۡۤا: قیامت کے متعلق تین طرح کے لوگ ہیں: ① ایک تو وہ جو یقین کے ساتھ اس کے منکر ہیں، ان لوگوں کا اس آیت میں ذکر نہیں ② دوسرے وہ جو یقین کے ساتھ اس کے معتقد ہیں ③ تیسرے وہ جن کو تردد ہے، آیت میں ان ہی دو قسموں کا ذکر ہے، کیونکہ ان کو ڈرانا مفید ہے، اور ان ہی دو طبقوں میں اثر قبول کرنے کی توقع زیادہ ہے، یہاں آیت میں مطلق ڈرانا مقصود نہیں، بلکہ ایسا ڈرانا مقصود ہے جس کا نفع بھی ہو اور نفع ان ہی دو قسم کے لوگوں کو ہوتا ہے، اس لیے یہ قید بڑھائی گئی کہ "ایسے لوگوں کو ڈرایئے" الخ، پہلی قسم کے لوگوں کو بھی اگرچہ تبلیغ کی جاتی ہے جیسا کہ دوسری آیتوں میں صراحۃً حکم ہے مگر وہ محض حجت پورا کرنے کے لیے، ان کے حال پر زیادہ توجہ نہیں کی جاتی، کیونکہ عناد کی وجہ سے وہ اس قابل نہیں۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی جو لوگ فرمائشی معجزات دکھلائے جانے پر اپنے ایمان کو موقوف رکھتے اور از راہ تعنت وعناد آیات اللہ کی تکذیب پر تلے ہوئے ہیں، ان سے قطع نظر کیجئے، کیونکہ تبلیغ کا فرض ادا ہو چکا اور ان کے راہ راست پر آنے کی توقع نہیں، اب وحی الٰہی (قرآن) کے ذریعہ سے ان لوگوں کو متنبہ کرنے کا مزید اہتمام فرمایئے جن کے دلوں میں محشر کا خوف اور عاقبت کی فکر ہے، کیونکہ ایسے ہی لوگوں سے امید ہو سکتی ہے کہ نصیحت سے متاثر اور ہدایت قرآنی سے منتفع ہوں۔

فائدہ: ۲ یعنی یہ سن کر گناہ سے بچتے رہیں۔

وَلَا تَطۡرُدِ الَّذِيۡنَ يَدۡعُوۡنَ رَبَّهُمۡ بِالۡغَدٰوةِ وَالۡعَشِىِّ يُرِيۡدُوۡنَ وَجۡهَهٗ ؕ مَا عَلَيۡكَ مِنۡ حِسَابِهِمۡ

اور مت دور کر ان لوگوں کو جو پکارتے ہیں اپنے رب کو صبح اور شام چاہتے ہیں اس کی رضا ۱ تجھ پر نہیں ہے ان کے حساب

مِّنۡ شَىۡءٍ وَّمَا مِنۡ حِسَابِكَ عَلَيۡهِمۡ مِّنۡ شَىۡءٍ فَتَطۡرُدَهُمۡ فَتَكُوۡنَ مِنَ الظّٰلِمِيۡنَ ﴿۵۲﴾

میں سے کچھ اور نہ تیرے حساب میں سے ان پر ہے کچھ کہ تو ان کو دور کرنے لگے پس ہو جاوے گا تو بے انصافوں میں ۲

خلاصہ تفسیر: گذشتہ آیت میں قیامت سے ڈرنے والوں کو خاص طور پر ڈرانے کا حکم تھا اور اس میں دو قسم کے لوگ تھے: ایک وہ جن کو قیامت کا یقین ہے، دوسرے وہ جن کو تردد ہے، آگے حکم ہوتا ہے کہ جن کو قیامت کا یقین ہے اور وہ خدا کے طالب ہیں ان پر سب سے زیادہ توجہ فرمایئے، پس معاندین کے لیے تو عام تبلیغ ہوئی کہ ان سے توحید ورسالت کے مضامین صرف زبانی کہہ دینا کافی ہے، اور تردد والوں کے لیے خاص تبلیغ، اور طالبین کے لیے اخص الخاص توجہ ہوئی، سبحان اللہ! کیا حکیمانہ انصاف ہے، اگلی آیتوں کا شان نزول یہ ہے کہ کفار قریش کے بعض سرداروں نے بعض غریب صحابہ کی نسبت حضور سے درخواست کی تھی کہ جس وقت ہم آیا کریں اس وقت یہ لوگ اٹھ جایا کریں، جب ہم چلے جائیں اس وقت آجایا کریں، اور یہ بھی کہا کہ اگر آپ ایسا کریں تو عجب نہیں ہم آپ کی اتباع کرلیں، ایک روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! ایسا بھی کر دکھلایئے، دیکھیں ان کا کیا مقصود ہے، راہ پر آتے ہیں یا نہیں؟ آپ ﷺ نے اس وقت درخواست کو قبول فرمالیا مگر عمل نہیں ہونے پایا کہ یہ آیتیں اس سے منع کرنے کے لیے نازل ہوئیں، اور حضرت عمرؓ نے اپنی رائے سے معذرت کی۔

اور ان لوگوں کو (اپنی مجلس سے) نہ نکالئے (یعنی اگرچہ آپ کی نیت نکالنے کی نہ ہو، مگر ان سرداروں کی درخواست پر توجہ کرنا بھی ایسا ہی

ناپسند ہے جیسے نکال دینا، سوان لوگوں کو علیحدہ نہ کیجیے) جو صبح وشام (یعنی مداومت اور ہمیشگی کے ساتھ) اپنے پروردگار کی عبادت کرتے ہیں، جس سے صرف اللہ کی رضا ہی کا مقصد رکھتے ہیں (اور جاہ و مال کی کوئی غرض نہیں، یعنی ان کی عبادت میں مداومت بھی ہے اور اخلاص بھی، اور اخلاص اگر چہ باطنی چیز ہے مگر آثار و علامات سے پہچانا بھی جاسکتا ہے، اور جب تک عدم اخلاص کی کوئی دلیل نہیں، اخلاص ہی کا گمان رکھنا چاہئے) اور ان (کے باطن) کا حساب (اور تفتیش) ذرا بھی آپ کے متعلق نہیں، اور (ان کے باطن کی تفتیش کا آپ سے متعلق نہ ہونا ایسا یقینی ہے جیسا کہ) آپ (کے باطن) کا حساب (اور تفتیش) ذرا بھی ان کے متعلق نہیں (غرض ان کے باطن کی تفتیش قطعاً آپ کے متعلق نہیں) کہ آپ ان کو نکال دیں (یعنی ان کی غربت تو ان کے نکالنے کا سبب نہیں ہوسکتی، اور دل کے حال کی نہ آپ کو خبر اور نہ آپ اس کے ذمہ دار، چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم امت کے مربی ہیں، اور مربی کے لئے اپنے ماتحتوں کے احوال کی تفتیش کرنے کا احتمال ہوسکتا تھا، مگر اس کا عکس کہ وہ لوگ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے باطنی احوال کی تفتیش کریں اس کا کوئی احتمال ہی نہیں، اس لئے وہ قطعاً منفی ہے، اس جگہ احتمالی بات کو یقینی بات کے ساتھ برابر قرار دے کر اس کی نفی کی گئی تا کہ اس کا منفی ہونا بھی یقینی ہوجائے) ورنہ (ایسی حالت میں ان کو نکالنے سے) آپ نامناسب کام کرنے والوں میں ہوجائیں گے۔

وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ: جاننا چاہیے کہ اس منظوری سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان عصمت پر کوئی حرف نہیں آتا، کیونکہ آپ کی منظوری ان غرباء کی تحقیر کی بنا پر نہ تھی، بلکہ صرف ہدایت کی امید پر ان سرداروں کی تالیف قلب منظور تھی، اور خود صحابہ کو بھی یہ بات معلوم تھی، اس لیے ان کی دل شکنی بھی نہیں ہوئی تھی، غرض یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اجتہاد تھا، مگر اللہ تعالی نے اس اجتہاد پر عمل کرنے کی اجازت نہیں دی، کیونکہ حق تعالی کو علم غیب ہے کہ یہ تدبیر نافع نہ ہوگی۔

یہاں ایک سوال یہ ہوتا ہے کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غریب مؤمنین کو نہیں ہٹایا اور نہ ارادہ فرمایا تو پھر یہاں آیت میں نہیں کیوں فرمائی؟ جواب یہ ہے کہ اس نہی سے اس کے واقع ہونے یا ارادہ کرنے کا شبہ نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ کسی کام کے واقع ہونے سے پہلے بھی اس سے روکا جاسکتا ہے، پھر سوال ہوتا ہے کہ جب ''طرد'' سے یہ مراد ہے تو یہ تو ظلم نہ تھا، پھر یہاں فتکون من الظالمین کیوں فرمایا؟ جواب یہ ہے کہ ظلم کے لغوی معنی ہیں: ''وضع الشیئ فی غیر محلہ''، اور ظلم کے یہ معنی خلاف اولی کو بھی شامل ہے، خلاصہ تفسیر میں ''نامناسب کام'' کے لفظ سے اسی طرف اشارہ ہے۔

* * *

فائدہ: ۱۔ یعنی رات دن اس کی عبادت میں حسن نیت اور اخلاص کے ساتھ مشغول رہتے ہیں۔

فائدہ: ۲۔ یعنی جب ان کا ظاہر حال یہ بتلا رہا ہے کہ شب و روز خدا کی عبادت اور رضا جوئی میں مشغول رہتے ہیں تو اسی کے مناسب ان سے معاملہ کیجئے ان کا باطنی حال کیا ہے یا آخری انجام کیا ہوگا، اسکی تفتیش و محاسبہ پر معاملات موقوف نہیں ہوسکتے، یہ حساب نہ آپ کا ان کے ذمے ہے نہ انکا آپ کے، لہذا اگر بالفرض آپ دولتمندوں کی ہدایت کی طمع میں ان غریب مخلصین کو اپنے پاس سے ہٹانے لگیں تو یہ بات بے انصافی کی ہوگی، موضح القرآن میں ہے: ''کافروں میں بعض سرداروں نے حضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے کہا کہ تمہاری بات سننے کو ہمارا دل چاہتا ہے، لیکن تمہارے پاس بیٹھتے ہیں رذیل لوگ، ہم ان کے برابر نہیں بیٹھ سکتے، اس پر یہ آیت اتری، یعنی خدا کے طالب اگر چہ غریب ہیں، ان ہی کی خاطر مقدم ہے''۔

وَكَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لِّيَقُوْلُوْٓا اَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا ۭ اَلَيْسَ اللّٰهُ

اور اسی طرح ہم نے آزمایا ہے بعضے لوگوں کو بعضوں سے تا کہ کہیں کیا یہی لوگ ہیں جن پر اللہ نے فضل کیا ہم سب میں، کیا نہیں ہے اللہ

بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ ﴿٥٣﴾

خوب جاننے والا شکر کرنے والوں کو

خلاصہ تفسیر: اور (ہم نے جو مؤمنوں کو غریب اور ان کافروں کو سردار بنا رکھا ہے جو بظاہر قیاس کے تقاضے سے بعید ہے) تو

(اس کی وجہ یہ ہے کہ) اسی طور پر ہم نے (ان میں سے) ایک (یعنی کفار) کو دوسروں (یعنی مؤمنوں) کے ذریعہ سے آزمائش میں ڈال رکھا ہے (یعنی اس طرز عمل میں کفار کا امتحان ہے) تاکہ یہ (کفار) لوگ (مؤمنوں کے متعلق) کہا کریں کیا یہی لوگ ہیں کہ ہم سب میں سے (انتخاب کر کے) ان پر اللہ تعالیٰ نے (اپنا) فضل کیا ہے (یعنی اپنے دین اسلام کے لئے منتخب کیا ہے، یعنی نہ اللہ نے ان پر فضل کیا اور نہ اسلام کوئی فضل کی چیز ہے، ورنہ ان پر کیوں ہوتا، اس کے مستحق ہم تھے کہ ہماری خوش حالی عند اللہ محبوب ہونے کی علامت ہے، کفار کا یہ غلط خیال مؤمنین کے فقر و فاقہ اور اپنی جاہ و ثروت سے پیدا ہوا، سو دونوں حالتوں کا کفار کے لیے سبب امتحان ہونا ظاہر ہو گیا، اور چونکہ اللہ تعالیٰ کو تو علم ہے ہی، سو اس کو امتحان دوسروں کے اعتبار سے کہہ دیا ، اب آگے ان کے اس طعن کا جواب ہے کہ:) کیا یہ بات نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ حق شناسوں کو خوب جانتا ہے (ان غریب لوگوں نے اپنے منعم حقیقی کا حق پہچانا، طلب حق میں لگ گئے، دین حق اور قبول عند اللہ سے مشرف کیے گئے، اور ان رؤسا نے ناشکری اور کفر کیا وہ اس نعمت سے محروم رہے، مدار کار اس پر ہے، اس میں غربت و ریاست کو کیا دخل!)۔

سوال ہوتا ہے کہ یہاں فَتَنَّا کی علت لِّيَقُوْلُوْٓا فرمائی تو کیا کفار کا ایسی بات کہنا اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقصود ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ہاں! یہ مقصود تکوینی ہے، کیونکہ قبائح میں بھی بے شمار حکمتیں ہوتی ہیں، چنانچہ اس مقام پر خود امتحان بھی ایک حکمت ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی دولت مندوں کو غریبوں سے آزمایا ہے کہ ان کو ذلیل دیکھتے ہیں اور تعجب کرتے ہیں کہ یہ کیا لائق ہیں اللہ ان کے دل دیکھتا ہے کہ اللہ کا حق مانتے ہیں۔

وَاِذَا جَآءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۙ

اور جب آئیں تیرے پاس ہماری آیتوں کے ماننے والے تو کہہ دے تو سلام ہے تم پر لکھ لیا ہے تمہارے رب نے اپنے اوپر رحمت کو

اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًۢا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَصْلَحَ ۙ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٥٤﴾

کہ جو کوئی کرے تم سے برائی ناواقفیت سے پھر اس کے بعد توبہ کر لے اور نیک ہو جائے تو بات یہ ہے کہ وہ ہے بخشنے والا مہربان

وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَلِتَسْتَبِيْنَ سَبِيْلُ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿٥٥﴾ ع ٦

اور اسی طرح ہم تفصیل سے بیان کرتے ہیں آیتوں کو اور تاکہ کھل جائے طریقہ گناہ گاروں کا

خلاصہ تفسیر: حضرت عمرؓ نے گذشتہ حکم: وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ نازل ہونے کے بعد اپنی رائے سے معذرت کی اس پر مذکورہ آیت نازل ہوئی جس میں ان کی توبہ قبول ہونے کی بشارت ہے، حضور ﷺ نے ان غرباء کو بلایا، جب حاضر ہوئے تو فرمایا: سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ۔

اور (اے محمد ﷺ! جب یہ غرباء ایسے ہیں کہ عابد بھی ہیں اور مخلص بھی ہیں تو) جب وہ لوگ آپ کے پاس آئیں جو کہ (مذکورہ بالا صفات کے ساتھ یہ صفت بھی رکھتے ہیں کہ) ہماری آیتوں پر ایمان بھی رکھتے ہیں تو آپ (ان کو بشارت سنانے کیلئے) یوں کہہ دیجئے کہ (ایک تو) تم پر (اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہر طرح کی آفات سے) سلامتی ہے (یعنی کفار پر جو ہر طرح کی آفات آخرت میں پڑیں گی ان سے تم محفوظ ہو، اور دوسرے یہ بھی کہ) تمہارے رب نے (اپنے فضل و کرم سے تمہارے حال پر) رحمت کرنا (اور تم کو نعمتیں دینا) اپنے ذمہ مقرر کر لیا ہے (اور وہ مہربانی یہ ہے کہ جو شخص پہلے سے فرماں بردار ہے وہ تو واضح ہی ہے، اللہ تعالیٰ کا یہاں تک فضل ہے) کہ جو شخص تم میں سے کوئی برا کام کر بیٹھے (جو کہ) جہالت سے (ہو جاتا ہے،

کیونکہ حکم کے خلاف کرنا عملی جہالت ہے مگر) پھر وہ اس کے بعد توبہ کرلے اور (آئندہ کو اپنے اعمال کی) اصلاح رکھے (اس میں یہ بھی آگیا کہ اگر وہ توبہ ٹوٹ جائے تو پھر توبہ کرلے) تو اللہ تعالیٰ کی یہ شان ہے کہ (اسکے لئے بھی) بڑی مغفرت کرنے والے ہیں (کہ گناہ کی سزا بھی معاف کردیں گے) اور بڑی رحمت کرنے والے ہیں (کہ طرح طرح کی نعمتیں بھی دیں گے) اور (جس طرح ہم نے اس مقام پر مؤمنین اور کفار کے حال و مستقبل کی تفصیل کردی) اسی طرح ہم آیات کی (جوکہ دونوں فریقوں کے حال و مستقبل پر مشتمل ہوں) تفصیل کرتے رہتے ہیں (تاکہ مؤمنین کا طریقہ بھی ظاہر ہوجائے) اور تاکہ مجرمین کا طریقہ (بھی) ظاہر کردیا جائے (اور حق و باطل کے واضح ہونے سے طالب حق کو معرفت حق آسان ہوجائے)۔

مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًۢا بِجَهَالَةٍ: اس آیت میں لفظ ''جہالت'' سے بظاہر کسی کو یہ خیال ہوسکتا ہے کہ گناہ کی معافی کا وعدہ صرف اس صورت میں ہے کہ ناواقفیت اور جہل کے سبب کوئی گناہ سرزد ہوجائے، جان بوجھ کر گناہ کرنے والا اس حکم میں داخل نہیں، لیکن حقیقت یہ نہیں، کیونکہ ''جہالت'' سے مراد اس جگہ عملی جہالت ہے، یعنی ایسا کام کر بیٹھے جیسا نتیجہ سے جاہل و بے خبر کیا کرتا ہے، یہ ضروری نہیں کہ وہ واقع میں جاہل ہو، اس کی تائید خود لفظ ''جہالت'' سے بھی ہوتی ہے کہ یہاں لفظ ''جہل'' کے بجائے ''جہالت'' کا لفظ شاید اسی کی طرف اشارہ کرنے کے لئے ہی استعمال کیا گیا ہے، کیونکہ جہل تو علم کا مقابل ہے، اور جہالت حلم و وقار کے مقابل ہے، یعنی لفظ جہالت محاورات میں بولا ہی جاتا ہے عملی جہالت کے لئے، اور غور کیا جائے تو گناہ بھی کسی سے سرزد ہوتا ہے تو اس عملی جہالت ہی کی وجہ سے ہوتا ہے، اسی لئے بعض بزرگوں کا قول ہے کہ جو شخص اللہ و رسول ﷺ کے کسی حکم کی خلاف ورزی کرتا ہے وہ جاہل ہے، مراد اس سے یہی عملی جہالت ہے، ناواقف اور بے علم ہونا ضروری نہیں، کیونکہ قرآن کریم اور احادیث صحیحہ کی بیشمار نصوص اس پر دلالت کرتی ہیں کہ توبہ کرنے سے ہر گناہ معاف ہوسکتا ہے، خواہ غفلت و جہل کی وجہ سے سرزد ہوا ہو، یا جان بوجھ کر شرارت نفس اور اتباع ہوی کی وجہ سے۔

* * *

فائدہ: پہلے فرمایا تھا کہ پیغمبر تبشیر و انذار کے لئے آتے ہیں، چنانچہ اس رکوع کے شروع میں وَاَنْذِرْ بِهِ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ الخ سے شان انذار کا استعمال تھا، اب مؤمنین کے حق میں شان تبشیر کا اظہار ہے یعنی مؤمنین کو کامل سلامتی اور رحمت و مغفرت کی بشارت سنا دیجئے تاکہ ان غریبوں کا دل بڑھے اور دولت مند متکبرین کے طعن و تشنیع اور تحقیر آمیز برتاؤ سے شکستہ خاطر نہ رہیں، اسی لئے ہم احکام و آیات تفصیل سے بیان کرتے ہیں نیز اس لئے کہ مؤمنین کے مقابلہ میں مجرمین کا طریقہ بھی واضح ہوجائے

تنبیہ: یہ جو فرمایا کہ ''جو کوئی کرے تم میں سے برائی ناواقفیت سے'' اس سے شاید یہ غرض ہو کہ مومن جو برائی یا معصیت کرتا ہے خواہ نادانستہ ہو یا جان بوجھ کر، وہ فی الحقیقت اس برائی اور گناہ کے انجام بد سے ایک حد تک ناواقف اور بے خبر ہی ہوکر کرتا ہے، اگر گناہ کے تباہ کن نتائج کا پوری طرح اندازہ اور استحضار ہو تو کون شخص ہے جو اس اقدام کی جرأت کرے گا۔

قُلْ اِنِّيْ نُهِيْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قُلْ لَّآ اَتَّبِعُ اَهْوَآءَكُمْ ۙ

تو کہہ دے مجھ کو روکا گیا ہے اس سے کہ بندگی کروں ان کی جن کو تم پکارتے ہو اللہ کے سوا، تو کہہ میں نہیں چلتا تمہاری خوشی پر

قَدْ ضَلَلْتُ اِذًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ ﴿۵۶﴾

بیشک اب تو میں بہک جاؤں گا اور نہ رہوں گا ہدایت پانے والوں میں

خلاصہ تفسیر: پیچھے قیامت سے ڈرنے والوں کے لیے تبلیغ خاص اور مؤمنین کے لیے اخص الخاص توجہ کا حکم ہوا ہے، آگے عناد والوں کے لیے عام تبلیغ یعنی صرف زبانی توحید و رسالت کا مضمون پہنچانے کا حکم ہے۔

آپ (ان معاندین سے) کہہ دیجئے کہ مجھ کو (حق تعالیٰ کی طرف سے) اس سے ممانعت کی گئی ہے کہ ان (معبودوں) کی عبادت کروں جن کی تم لوگ اللہ (کی توحید) کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہو (اور ان کے طریقہ شرک کی گمراہی ظاہر کرنے کے لئے) آپ (یہ بھی) کہہ دیجئے کہ میں

تمہارے (باطل) خیالات کا اتباع نہ کروں گا، کیونکہ (اگر نعوذ باللہ میں ایسا کروں تو) اس حالت میں بے راہ ہو جاؤں گا اور راہ (راست) پر چلنے والوں میں نہ رہوں گا۔

* * *

فائدہ: گزشتہ آیت میں وہ چیزیں بیان ہوئیں جو مومنین سے کہنے کے لائق ہیں، اس رکوع میں ان امور کا تذکرہ ہے جو مجرمین و مکذبین کے حق میں قابل خطاب ہیں، یعنی آپ فرما دیجئے کہ میرا ضمیر، میری فطرت، میری عقل، میرا نور وشہود اور وحی الٰہی جو مجھ پر اترتی ہے، یہ سب مجھ کو اس سے روکتے ہیں کہ میں توحید کامل کے جادہ سے ذرا بھی قدم ہٹاؤں، خواہ تم کتنے ہی حیلے اور تدبیریں کرو میں کبھی تمہاری خوشی اور خواہش کی پیروی نہیں کر سکتا، بفرض محال اگر پیغمبر کسی معاملہ میں وحی الٰہی کو چھوڑ کر عوام کی خواہشات کا اتباع کرنے لگیں تو خدا نے جنہیں ہادی بنا کر بھیجا تھا معاذ اللہ وہ ہی خود بہک گئے، پھر ہدایت کا بیج دنیا میں کہاں رہ سکتا ہے۔

قُلْ اِنِّیْ عَلٰی بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّیْ وَ كَذَّبْتُمْ بِهٖ ؕ مَا عِنْدِیْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ ؕ اِنِ الْحُكْمُ

تو کہہ دے کہ مجھ کو شہادت پہنچی میرے رب کی اور تم نے اس کو جھٹلایا۱ میرے پاس نہیں جس چیز کی تم جلدی کر رہے ہو۲ حکم کسی کا نہیں

اِلَّا لِلّٰهِ ؕ یَقُصُّ الْحَقَّ وَ هُوَ خَیْرُ الْفٰصِلِیْنَ ﴿۵۷﴾

سوا اللہ کے، بیان کرتا ہے حق بات اور وہ سب سے اچھا فیصلہ کرنے والا ہے

خلاصہ تفسیر: گذشتہ مضمون کا تو زیادہ تعلق توحید سے تھا، آگے کا مضمون رسالت سے زیادہ متعلق ہے، یعنی مذکورہ آیات میں کفار کی طرف سے نزول عذاب کی عاجلانہ فرمائش اور اس کا جواب یہاں خیر الفاصلین میں اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ تامہ کا ذکر آگے آیت: اعلم بالظالمین میں مذکور ہے۔

آپ (ان سے یہ بھی) کہہ دیجئے کہ میرے پاس تو (اس دین اسلام کے حق ہونے پر) ایک دلیل (کافی موجود) ہے جو میرے رب کی طرف سے (مجھ کو ملی) ہے (یعنی قرآن مجید جو کہ میرا معجزہ ہے، جس سے میری تصدیق ہوتی ہے) اور تم (بلاوجہ) اس کی تکذیب کرتے ہو (اور تم جو یہ کہتے ہو کہ اگر دین اسلام حق ہے تو ہمارے انکار پر آسمان سے پتھر برسیں یا کوئی اور عذاب سخت آئے، جیسا کہ دوسری جگہ ان الفاظ سے مذکور ہے: ان کان هذا هو الحق من عندك فامطر علینا حجارة من السماء، تو اس کا جواب یہ ہے کہ) جس چیز کا تم تقاضا کر رہے ہو (یعنی سخت عذاب) وہ میرے پاس (یعنی میری قدرت میں) نہیں، حکم کسی کا نہیں (چلتا) بجز اللہ کے (اور اللہ کا حکم عذاب کے نزول کا ہوا نہیں تو پھر میں کیسے عذاب دکھلا دوں) اللہ تعالیٰ حق بات کو (دلیل سے) بتلا دیتا ہے اور سب سے اچھا فیصلہ کرنے والا وہی ہے (کہ حکمت کے مطابق فیصلہ کرتا ہے، چونکہ ابھی نزول عذاب میں حکمت نہیں دیکھی اور نہ ہی رسالت کو ثابت کرنے کے لیے اس کی حاجت ہے، کیونکہ صحیح دلیل تو ایک بھی کافی ہوتی ہے، ورنہ کبھی دلائل کا خاتمہ ہی نہ ہو، اس لیے نزول عذاب سے ابھی فیصلہ نہیں فرمایا)۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی میرے پاس خدا کی صاف وصریح شہادت اور واضح دلائل پہنچ چکیں، جن کے قبول سے سرمو انحراف نہیں کر سکتا، تم اس کو جھٹلاتے ہو تو اسکا انجام سوچ لو۔

فائدہ: ۲ یعنی عذاب الٰہی کفار کہتے تھے: اَللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَیْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ (الانفال: ۳۲) (اگر یہ حق ہے جسکی ہم تکذیب کر رہے ہیں تو آپ آسمان سے ہم پر پتھروں کی بارش کر دیجئے یا ہم پر اور کوئی سخت عذاب بھیج دیجئے)۔

قُل لَّوْ أَنَّ عِندِي مَا تَسْتَعْجِلُونَ بِهِ لَقُضِيَ الْأَمْرُ بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ ۗ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِالظَّالِمِينَ ﴿٥٨﴾

تو کہہ اگر ہوتی میرے پاس وہ چیز جس کی تم جلدی کر رہے ہو تو طے ہو چکا ہوتا جھگڑا درمیان میرے اور درمیان تمہارے، اور اللہ خوب جانتا ہے ظالموں کو

خلاصہ تفسیر: آپ (ﷺ اس مضمون کی زیادہ وضاحت وتفصیل کے لیے یہ) کہہ دیجئے کہ اگر میرے پاس (یعنی میری قدرت میں) وہ چیز ہوتی (یعنی عذاب) جس کا تم تقاضا کر رہے ہو تو (اب تک) میرا اور تمہارا باہمی قضیہ (کبھی کا) فیصل ہو چکا ہوتا (اس لیے نہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو ان کا ہلاک ہونا خود مقصود تھا، بلکہ اس لیے کہ ان لوگوں کے نزدیک رسالت کا ثابت ہونا اسی پر موقوف ہو چکا تھا اس لیے عذاب نازل کر دیا جاتا) اور ظالموں کو اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے (کہ کس کے ساتھ کیا معاملہ کس وقت کیا جائے، ان کے علم میں جب مناسب ہوگا عذاب نازل کردیں گے، خواہ دنیا میں بھی جیسے بدر وغیرہ میں ہلاک کیے گئے اور خواہ آخرت میں کہ دوزخ میں جائیں گے، غرض نہ مجھے اس کی قدرت ہے نہ اس کے مناسب ہونے کا وقت مجھے معلوم ہے اور نہ اس کی حاجت ہے)۔

* * *

فائدہ: یعنی جس پر چاہے جب چاہے اور جس قسم کا چاہے عذاب بھیجے یا نہ بھیجے ویسے ہی توبہ کی توفیق مرحمت فرمادے، یہ سب اللہ کے قبضہ میں ہے، کسی کا حکم اور زور اس کے سوا نہیں چلتا، وہ دلائل وبراہین کے ساتھ حق کو بیان کر دیتا ہے، پھر جو نہ مانیں ان کے متعلق بہترین فیصلہ کرنے والا بھی وہ ہی ہے، اگر ان کا فیصلہ کرنا یا سزا دینا میرے قبضہ اختیار میں ہوتا اور یہ نزول عذاب میں جلدی چاہنے والے مجھ سے عذاب کا مطالبہ کرتے تو اب تک کبھی کا جھگڑا ختم ہو چکا ہوتا، یہ تو خدا ہی کے علم محیط، حلم عظیم، حکمت بالغہ اور قدرت کاملہ کا پرتو ہے کہ بیشمار مصالح وحکم کی رعایت کرتے ہوئے باوجود پوری طرح جاننے اور قدرت رکھنے کے ظالموں پر فوراً عذاب نازل نہیں کرتا۔

ربط: آئندہ آیات میں اس کے علم محیط اور قدرت کاملہ کا ذکر ہے تاکہ ثابت ہو کہ تاخیر عذاب جہل یا عجز کی بناء پر نہیں۔

وَعِندَهُ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَا إِلَّا هُوَ ۚ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۚ وَمَا تَسْقُطُ مِن وَرَقَةٍ

اور اسی کے پاس کنجیاں ہیں غیب کی کہ ان کو کوئی نہیں جانتا اس کے سوا، اور وہ جانتا ہے جو کچھ جنگل اور دریا میں ہے، اور نہیں جھڑتا کوئی پتا

إِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِي ظُلُمَاتِ الْأَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَلَا يَابِسٍ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُّبِينٍ ﴿٥٩﴾

مگر وہ جانتا ہے اس کو اور نہیں گرتا کوئی دانہ زمین کے اندھیروں میں اور نہ کوئی ہری چیز اور نہ کوئی سوکھی چیز مگر وہ سب کتاب مبین میں ہے

خلاصہ تفسیر: گذشتہ آیات میں کفار کی طرف سے نزول عذاب کی عاجلانہ فرمائش اور اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور علم تام کا حق تعالیٰ کے ساتھ خاص ہونا ان لوگوں کی حالت کے متعلق مذکور تھا، آگے تمام چیزوں کے اعتبار سے حق تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور علم کامل کا ذکر ہے جس سے توحید کو ثابت کرنا بھی ہے جو بڑا مقصود ہے۔

اور اللہ تعالیٰ کے پاس (یعنی اسی کی قدرت میں) ہیں خزانے تمام مخفی اشیاء (ممکنہ) کے (یعنی ان ممکنات میں سے جس چیز کو جس وقت اور جس قدر چاہیں ظاہر کر دیتے ہیں، ان اشیاء میں عذاب کی قسمیں بھی آ گئیں، مطلب یہ کہ اور کسی کو ان چیزوں پر قدرت نہیں اور جس طرح خدا کی قدرت کامل اسی طرح علم بھی کامل ہے، چنانچہ) ان (پوشیدہ خزانوں) کو کوئی نہیں جانتا بجز اللہ تعالیٰ کے، اور (اور اللہ تعالیٰ کا علم ایسا عام ہے کہ) وہ ان تمام چیزوں کو بھی جانتا ہے جو خشکی میں ہیں اور جو دریا میں ہیں، اور کوئی پتہ (تک درخت سے) نہیں گرتا مگر وہ اس کو بھی جانتا ہے، اور کوئی دانہ (تک) زمین کے تاریک حصوں میں نہیں پڑتا اور نہ کوئی تر اور خشک چیز (جیسے پھل وغیرہ) گرتی ہے، مگر یہ سب (علم الٰہی کے احاطہ کی وجہ سے) کتاب مبین (یعنی لوح محفوظ) میں (مرقوم) ہیں (یعنی لوح محفوظ میں ہر چیز جو قیامت تک ہونے والی ہے لکھی ہے اور ظاہر ہے کہ بدون علم کے لکھنا ممکن نہیں ہے، پس

حاصل یہ ہوا کہ سب چیزیں اللہ کے احاطہ علمی میں ہیں اور یہ نہ سمجھو کہ اللہ کی تمام معلومات لوح محفوظ ہی میں منحصر ہیں، بلکہ اس کی تو کہیں انتہا ہی نہیں)۔

وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ: مفاتح کا ترجمہ "کنجیاں" بھی کہہ سکتے ہیں، حاصل یہ ہوگا کہ غیب کی کنجیاں یعنی وہ اسباب جن سے ان مخفی چیزوں کو کھولتے اور ظاہر کرتے ہیں سب خدا کے قبضہ میں ہیں۔

وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ: یہ تمام عالم ظاہر (شہادت) کو شامل ہے، پس آیت کا پہلا اور دوسرا جملہ مل کر ثابت ہوگیا کہ خدا کا علم عالم غیب اور عالم ظاہر دونوں کو محیط ہے، عالم ظاہر (شہادت) یعنی: مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ میں پتہ، دانہ، خشک وتر سب کچھ آگیا تھا، مگر پتہ اور دانہ چھوٹی اور حقیر چیزوں میں سے ہے ان کو بطور خاص علیحدہ ذکر کرنے سے مبالغہ ہوگیا کہ ایسی حقیر اور چھوٹی چیزیں بھی علم الہی سے غائب نہیں، پھر آگے خشک وتر کا دوبارہ ذکر اس بات کو بتلانے کے لیے لایا گیا کہ حق تعالی کا علم ہر چھوٹی بڑی چیز کو عام ہے۔

وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا: یعنی جو پتہ بھی گرتا ہے اللہ اس کو جانتا ہے، ان اشیاء کے احوال میں سے صرف گرنے کی حالت کو بطور خاص ذکر کیا، اس میں وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ گرنے کی حالت اس چیز کی انتہائی حالت ہے، مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالی اخیر تک کا حال جانتے ہیں۔

* * *

فائدہ: یعنی لوح محفوظ میں ہے، لوح محفوظ میں جو چیز ہوگی وہ علم الہی میں پہلے ہوگی، اس اعتبار سے مضمون آیت کا حاصل یہ ہوا کہ عالم غیب وشہادت کی کوئی خشک وتر اور چھوٹی بڑی چیز حق تعالی کے علم ازلی محیط سے خارج نہیں ہوسکتی، اس بنا پر ان ظالموں کے ظاہری وباطنی احوال اور ان کی سزا دہی کے مناسب وقت ومحل کا پورا پورا علم اسی کو ہے۔

تنبیہ: مفاتیح کو جن علماء نے مَفتح بفتح المیم کی جمع قرار دیا ہے انہوں نے مفاتیح الغیب کا ترجمہ "غیب کے خزانوں" سے کیا اور جن کے نزدیک مِفتح بکسر المیم کی جمع ہے وہ مفاتیح الغیب کا ترجمہ مترجم رحمہ اللہ کے موافق کرتے ہیں، یعنی "غیب کی کنجیاں" مطلب یہ ہے کہ غیب کے خزانے اور ان کی کنجیاں صرف خدا کے ہاتھ میں ہیں، وہی ان میں سے جس خزانہ کو جس وقت اور جس قدر چاہے کسی پر کھول سکتا ہے کسی کو یہ قدرت نہیں کہ اپنے حواس وعقل وغیرہ آلات ادراک کے ذریعہ سے علوم غیبیہ تک رسائی پا سکے یا جتنے غیوب اس پر منکشف کر دیئے گئے ہیں ان میں از خود اضافہ کر لے کیونکہ علوم غیبیہ کی کنجیاں اس کے ہاتھ میں نہیں دی گئیں، خواہ لاکھوں کروڑوں جزئیات واقعات غیبیہ پر کسی بندے کو مطلع کر دیا گیا ہو، تاہم غیب کے اصول وکلیات کا علم جن کو مفاتیح غیب کہنا چاہئے، حق تعالی نے اپنے ہی لئے مخصوص رکھا ہے۔

وَهُوَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيْهِ لِيُقْضٰٓى

اور وہی ہے کہ قبضہ میں لے لیتا ہے تم کو رات میں [1] اور جانتا ہے جو کچھ کہ تم کر چکے ہو دن میں [2] پھر تم کو اٹھا دیتا ہے اس میں تا کہ پورا ہو

اَجَلٌ مُّسَمًّى ۚ ثُمَّ اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ ثُمَّ يُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۶۰﴾ ع ۱۴

وہ وعدہ جو مقرر ہو چکا ہے [3] پھر اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے پھر خبر دے گا تم کو اس کی جو کچھ تم کرتے ہو [4]

خلاصہ تفسیر: قدرت کاملہ اور احاطہ علمی کو ثابت کرنے کے بعد اب قیامت وآخرت کا ذکر فرماتے ہیں، کیونکہ ان دونوں کا قدرت اور علم کے ساتھ تعلق ہے، نیز پیچھے توحید ورسالت کا ذکر تھا، اور اکثر قیامت کا ذکر قرآن میں ان دونوں کے ساتھ ہے۔

اور وہ (اللہ تعالی) ایسا ہے کہ (اکثر) رات میں (سونے کے وقت) تمہاری روح (نفسانی) کو (جس سے احساس وادراک متعلق ہے) ایک گونہ قبض کر لیتا ہے (یعنی معطل کر دیتا ہے) اور جو کچھ تم دن میں کرتے ہو اس کو (دوامًا) جانتا ہے، پھر (اس سونے کے بعد) تم کو دن میں جگا اٹھاتا ہے تا کہ (اسی سونے جاگنے کے دورانیہ سے دنیوی زندگی کی) میعاد معین تمام کر دی جائے، پھر (اس میعاد کے ختم ہونے پر) اسی (اللہ) کی طرف (مرکز) تم کو جانا ہے، پھر (کچھ برزخ میں اور پورا پورا قیامت میں) تم کو بتلا دے گا جو کچھ تم (دنیا میں) کیا کرتے تھے (اور اس کے مناسب جزاء و

سزاء جاری کرے گا)۔

وَهُوَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّيْلِ: سونے کے وقت ''روح نفسانی'' جس سے احساس وادراک اور تمیز ہوتی ہے ایک گونہ قبض ہوجاتی ہے، یعنی کچھ دیر کے لیے معطل ہوجاتی ہے، اور ''روح حیوانی'' جس کے نکلنے سے موت آجاتی ہے وہ سوتے ہوئے قبض نہیں ہوتی، بلکہ جسم میں رہتی ہے، وہ موت کے وقت نکلتی ہے، اور قرآن میں دونوں کو ''نفس'' ہی سے تعبیر کیا گیا ہے، ابن عباسؓ نے روح نفسانی کو نفس تمیز اور روح حیوانی کو نفس حیاۃ کہا ہے، پس قرآن میں لفظ ''نفس'' کی ہر مقام کے مناسب تفسیر کی جائے گی اور سونے کے وقت روح نفسانی کو قبض کرکے جاگنے کے وقت پھر واپس دے دینے سے قیامت کے دن دوبارہ زندہ کرنے پر ایک نظیر قائم کردی جس سے قیامت کے دن دوبارہ زندہ ہونے کو بعید سمجھنے کا شبہ ختم کردیا، چونکہ جو روح نفسانی کو قبض کرکے پھر لوٹا دیتا ہے وہ روح حیوانی کو بھی قبض کرکے پھر دوبارہ بدن میں ڈال سکتا ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ يَتَوَفّٰىكُمْ بِالَّيْلِ: یعنی شب میں سوتے وقت ظاہری احساس وشعور باقی نہیں رہتا اور آدمی اپنے گردوپیش بلکہ اپنے جسم کے احوال تک سے بھی بے خبر ہوجاتا ہے گویا اس وقت یہ قوتیں اس سے لے لی گئیں

فائدہ: ۲ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ: یعنی دن میں جو کچھ چلنا پھرنا، نقل وحرکت اور کسب واکتساب واقع ہوتا ہے وہ سب کامل تفصیل کے ساتھ خدا کے علم میں موجود ہے۔

فائدہ: ۳ لِيُقْضٰٓى اَجَلٌ مُّسَمًّى: یعنی اگر وہ چاہتا تو تم سوتے کے سوتے رہ جاتے لیکن موت کا وعدہ پورا ہونے تک ہر نیند کے بعد تم کو بیدار کرتا رہتا ہے۔

فائدہ: ۴ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ: دن میں کاروبار کرکے رات کو سونا، پھر سوکر اٹھنا یہ روزمرہ کا سلسلہ ایک چھوٹا سا نمونہ ہے، دنیا کی زندگی پھر موت پھر دوبارہ زندہ کئے جانے کا، اسی لئے نیند اور بیداری کے تذکرہ کے ساتھ ''مسئلہ معاد'' پر متنبہ کردیا گیا۔

وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً ۭ حَتّٰٓي اِذَا جَاۗءَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ

اور وہی غالب ہے اپنے بندوں پر اور بھیجتا ہے تم پر نگہبان ۱ یہاں تک کہ جب آپہنچے تم میں سے کسی کو موت تو قبضہ میں لے لیتے ہیں

رُسُلُنَا وَهُمْ لَا يُفَرِّطُوْنَ ؀

ہمارے بھیجے ہوئے فرشتے ۲ اور وہ کوتاہی نہیں کرتے ۳

خلاصہ تفسیر: پیچھے قیامت میں زندہ ہونے کا امکان مذکور تھا، آگے بھی اسی کی تفصیل کے لیے پہلے قدرت کا، پھر موت کا، پھر قیامت میں زندہ کرنے کا، پھر حساب کا ذکر ہے۔

اور وہی (اللہ تعالیٰ قدرت سے) اپنے بندوں کے اوپر غالب ہیں برتر ہیں اور (اے بندو!) تم پر (تمہارے اعمال اور جان کی) نگرانی کرنے والے (فرشتے) بھیجتے ہیں (جو زندگی بھر تمہارے اعمال کو بھی دیکھتے ہیں اور تمہاری جان کی بھی حفاظت کرتے ہیں) یہاں تک کہ جب تم میں سے کسی کو موت آپہنچتی ہے تو (اس وقت) اس کی روح ہمارے (دوسرے) بھیجے ہوئے (فرشتے جو اس کام کے لیے مقرر ہیں) قبض کرلیتے ہیں اور وہ (ہمارے احکام کی بجاآوری میں) ذرا کوتاہی نہیں کرتے (بلکہ جس وقت حفاظت کا حکم تھا حفاظت کرتے رہے، جب موت کا حکم ہوگیا تو یہی محافظ فرشتے روح قبض کرنے والے فرشتوں کے ساتھ مل جاتے ہیں، غرض موت نہیں ٹلتی)۔

وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً: آیت میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے متعلق تین قسم کے فرشتے ہیں: ① ایک اعمال کے لکھنے والے ② دوسرے جن نقصانات سے حفاظت کرنے کا جب تک حکم ہے ان سے حفاظت کرنے والے ③ تیسرے جان نکالنے والے، مگر دوسری آیت

سے معلوم ہوتا ہے کہ جان نکالنے کا کام ملک الموت کے سپرد ہے تو دیگر فرشتے ان کے ساتھ مدد وغیرہ کے لیے رہتے ہوں گے، بطور مجاز ان کو بھی جان نکالنے والا کہہ دیا گیا ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی وہ فرشتے جو تمہاری اور تمہارے اعمال کی نگہداشت کرتے ہیں۔

فائدہ: ۲ یعنی جو فرشتے روح قبض کرنے کیلئے بھیجے جاتے ہیں۔

فائدہ: ۳ یعنی جس وقت اور جس طرح جان نکالنے کا حکم ہوتا ہے اس میں وہ کسی طرح کی رعایت یا کوتاہی نہیں کرتے۔

ثُمَّ رُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ ؕ اَلَا لَهُ الْحُكْمُ ۣ وَهُوَ اَسْرَعُ الْحٰسِبِيْنَ ﴿۶۲﴾

پھر پہنچائے جائیں گے اللہ کی طرف جو مالک ان کا ہے سچا، سن رکھو حکم اسی کا ہے، اور وہ بہت جلد حساب لینے والا ہے

خلاصہ تفسیر: پھر (مرنے کے بعد آخرت میں) سب اپنے مالک حقیقی کے پاس لائے جائیں گے، خوب سن لو (اس وقت) فیصلہ اللہ ہی کا ہوگا (اور کوئی دخل نہ دے سکے گا) اور وہ بہت جلد حساب لے لے گا (اور حساب لے کر جزا و سزا واقع کردے گا)۔

ثُمَّ رُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ: اس آیت سے معلوم ہوا کہ حق تعالی سب کے مولی ہیں، اور دوسری آیت میں کفار کے لیے فرمایا ہے: ولا مولی لهم کہ ان کا کوئی مولی نہیں بظاہر ان دونوں میں تعارض معلوم ہوتا ہے، جواب یہ ہے کہ دوسری جگہ مولی کے معنی مددگار ہیں، اور اس جگہ مولی کے معنی مالک کے ہیں، اس لیے کوئی اشکال نہیں، مالک سب کے ہیں، اور مددگار کافروں کے نہیں۔

* * *

فائدہ: یعنی ایک لحظہ میں آدمی کی عمر بھر کی بھلائی برائی واضح کردے۔

قُلْ مَنْ يُّنَجِّيْكُمْ مِّنْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ تَدْعُوْنَهٗ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ۚ لَئِنْ اَنْجٰنَا

تو کہہ کون تم کو بچا لاتا ہے جنگل کے اندھیروں سے اور دریا کے اندھیروں سے اس وقت میں کہ پکارتے ہو تم اسکو گڑگڑا کر اور چپکے سے کہ اگر ہم کو

مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۶۳﴾ قُلِ اللّٰهُ يُنَجِّيْكُمْ مِّنْهَا وَمِنْ كُلِّ كَرْبٍ

بچالیوے اس بلا سے تو البتہ ہم ضرور احسان مانیں گے، تو کہہ دے اللہ تم کو بچاتا ہے اس سے اور ہر سختی سے

ثُمَّ اَنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ ﴿۶۴﴾

پھر بھی تم شرک کرتے ہو۱

خلاصہ تفسیر: پیچھے قیامت کا ذکر تھا، اب قرآن کے طرز کے مطابق پھر توحید کی طرف رجوع ہے۔

آپ (صلی اللہ علیہ وسلم ان لوگوں سے) کہئے کہ وہ کون ہے جو تم کو خشکی اور دریا کی ظلمات (یعنی سختیوں) سے اس حالت میں نجات دے دیتا ہے کہ تم اس کو (نجات دینے کے لئے) پکارتے ہو (کبھی) تذلل ظاہر کر کے اور (کبھی) چپکے چپکے (اور یوں کہتے ہو) کہ (اے اللہ!) اگر آپ ہم کو ان (ظلمات اور سختیوں) سے (اب کے) نجات دے دیں تو (پھر) ہم ضرور حق شناسی (پر قائم رہنے) والوں میں سے ہو جائیں (یعنی آپ کی توحید کے قائل رہیں اور شرک سے باز آجائیں کہ بڑی حق شناسی یہی ہے، چونکہ اس سوال کا جواب متعین ہے اور وہ لوگ بھی کوئی دوسرا جواب نہ دیں گے اس لئے) آپ (ہی) کہہ دیجئے کہ اللہ ہی تم کو ان سے نجات دیتا ہے (جب کبھی نجات ملتی ہے) اور (ان مصیبتوں کی کیا تخصیص ہے بلکہ) ہر غم سے (وہی نجات دیتا ہے مگر) تم (ایسے ہو کہ) پھر بھی (نجات پانے کے بعد بدستور) شرک کرنے لگتے ہو (جو کہ اعلیٰ درجہ کی ناحق شناسی ہے، اور وعدہ کیا تھا حق شناسی

کا، غرض یہ کہ مصیبت کے وقت تمہارے ہی اقرار سے توحید کا حق ہونا ثابت ہو جاتا ہے، پھر انکار کب قابل توجہ ہے)۔

تَدْعُوْنَهٗ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً: مذکورہ آیت کے عموم سے ذکر الٰہی کی مختلف صورتیں مفہوم ہوتی ہیں: خفی، جلی، قلبی، لسانی، غرض آیت سے ہر قسم کے ذکر کی اجازت معلوم ہوتی ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی حق تعالیٰ باوجود علم محیط اور قدرت کاملہ کے جس کا بیان اوپر ہوا، تمہاری بداعمالیوں اور شرارتوں کی سزا فوراً نہیں دیتا، بلکہ جب مصائب وشدائد کی اندھیریوں میں پھنس کر تم اس کو عاجزی سے پکارتے ہو اور پختہ وعدے کرتے ہو کہ اس مصیبت سے نکلنے کے بعد کبھی شرارت نہ کریں گے اور ہمیشہ احسان کو یاد رکھیں گے، تو بسا اوقات تمہاری دستگیری کر کے ان مہالک اور ہر قسم کی سختیوں سے نجات دے دیتا ہے لیکن تم پھر بھی اپنے وعدہ پر قائم نہیں رہتے اور مصیبت سے آزاد ہوتے ہی بغاوت شروع کر دیتے ہو۔

قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰۤى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ اَوْ يَلْبِسَكُمْ

تو کہہ اسی کو قدرت ہے اس پر کہ بھیجے تم پر عذاب ۱ اوپر سے یا تمہارے پاؤں کے نیچے سے یا بھڑا دے تم کو

شِيَعًا وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ ؕ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ ﴿۶۵﴾

مختلف فرقے کر کے اور چکھا دے ایک کو لڑائی ایک کی ۲ دیکھ کس کس طرح سے ہم بیان کرتے ہیں آیتوں کو تا کہ وہ سمجھ جائیں ۳

خلاصہ تفسیر: آپ (صلی اللہ علیہ وسلم یہ بھی) کہئے کہ (جس طرح وہ نجات دینے پر قادر ہے اسی طرح) اس پر بھی وہی قادر ہے کہ تم پر (تمہارے کفر وشرک کی وجہ سے) کوئی عذاب تمہارے اوپر سے بھیج دے (جیسے پتھر یا ہوا یا بارش طوفانی) یا تمہارے پاؤں تلے (جو زمین ہے اس) سے (ظاہر کر دے، جیسے زلزلہ آجائے یا زمین پھٹ جائے، اور ان عذابوں کے اسباب تو اللہ کے سوا کسی کے اختیار میں نہیں، کبھی نہ کبھی ایسا ہوگا خواہ دنیا میں یا آخرت میں) یا کہ تم کو (اغراض کے اختلاف سے مختلف) گروہ گروہ کر کے سب کو (آپس میں) بھڑا دے (یعنی لڑوا دے) اور تمہارے ایک کو دوسرے کی لڑائی (کے ذریعے مزہ) چکھا دے (اور اس کا سبب اختیاری فعل ہے، یا سب آفتیں جمع کر دے، غرض نجات دینا اور عذاب میں مبتلا کرنا دونوں اسی کے قدرت میں ہیں، اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم!) آپ دیکھئے تو سہی ہم کس (کس) طرح دلائل (توحید) کو مختلف پہلوؤں سے بیان کرتے ہیں شاید وہ (لوگ) سمجھ جائیں۔

اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ: یا کہ تم کو گروہ گروہ کر کے سب کو آپس میں لڑوا دے اور تمہارے ایک کو دوسری کی لڑائی چکھا دے، اس جگہ یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ وہ اختلاف جس کو قرآن میں عذاب الٰہی اور رحمت خداوندی سے محرومی فرمایا گیا ہے وہ اختلاف ہے جو اصول اور عقائد میں ہو یا نفسانی اغراض واہواء کی وجہ سے ہو، اس میں وہ اختلاف رائے داخل نہیں جو قرآن وسنت کے بتلائے ہوئے اصول اجتہاد کے ماتحت فروعی مسائل میں فقہاء امت کے اندر قرن اول سے صحابہ وتابعین میں ہوتا چلا آیا ہے، جن میں فریقین کی حجت قرآن وسنت اور اجماع سے ہے، اور ہر ایک کی نیت قرآن وسنت کے احکام کی تعمیل ہے، مگر قرآن وسنت کے مجمل یا مبہم الفاظ کی تعبیر اور ان سے جزوی، فروعی مسائل کے استخراج میں اجتہاد اور رائے کا اختلاف ہے، ایسے ہی اختلاف کو ایک حدیث میں رحمت فرمایا گیا ہے کہ: "اختلاف امتی رحمۃ" میری امت کا اختلاف رحمت ہے، امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت اس لئے اختیار فرمائی گئی کہ اس امت کے علماء حق اور فقہاء متقین میں جو اختلاف ہوگا وہ ہمیشہ اصول قرآن وسنت کے ماتحت ہوگا، اور صدق نیت اور للّٰہیت سے ہوگا، کوئی نفسانی غرض جاہ ومال کی ان کے اختلاف کی متحرک نہ ہوگی، اس لئے وہ کسی سے جنگ وجدل کا سبب بھی نہ بنے گا۔

اس اجتہادی اختلاف کی مثال محسوسات میں ایسی ہے جیسے شہر کی بڑی سڑکوں کو چلنے والوں کی آسانی کے لئے مختلف حصوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے، ایک حصہ پر بسیں چلتی ہیں دوسرے پر دوسری گاڑیاں یا ٹرام، اسی طرح سائیکل سواروں اور پیادہ چلنے والوں کے لئے روڈ کا علیحدہ ایک حصہ ہوتا

ہے، ایک روڈ کی کئی حصوں میں یہ تقسیم بھی اگرچہ ظاہری طور پر ایک اختلاف کی صورت ہے، مگر چونکہ سب کا رخ ایک ہی سمت ہے اور ہر ایک پر چلنے والا ایک ہی منزل مقصود پر پہنچے گا، اس لئے راستوں کا یہ اختلاف بجائے مضر ہونے کے مفید اور چلنے والوں کے لئے وسعت و رحمت ہے، یہی وجہ ہے کہ ائمہ مجتہدین اور فقہاء امت کا اس پر اتفاق ہے کہ ان میں سے کسی کا مسلک باطل نہیں، اور جو لوگ اس کی پیروی کرتے ہیں، ان کو دوسروں کے نزدیک گنہگار کہنا جائز نہیں، ائمہ مجتہدین اور فقہاء امت کے مذاہب کے اختلاف کا حاصل اس سے زیادہ نہیں کہ ایک مجتہد نے جو مسلک اختیار کیا ہے وہ اس کے نزدیک راجح ہے مگر اس کے مقابل دوسرے مجتہد کے مسلک کو بھی وہ باطل نہیں کہتے، بلکہ ایک دوسرے کا پورا احترام کرتے ہیں، فقہاء صحابہ و تابعین اور ائمہ اربعہ کے بے شمار حالات و واقعات اس پر شاہد ہیں کہ فقہی مسلک بہت سے مسائل میں مختلف ہونے اور علمی بحثیں جاری رہنے کے باوجود ایک دوسرے کا مکمل اعتقاد و احترام کرتے تھے، جنگ وجدل اور خصومت و عداوت کا وہاں کوئی احتمال ہی نہ تھا، مذاہب فقہاء کے متبعین اور مقلدین میں بھی جہاں تک صحیح علم و دیانت رہے ان کے بھی باہمی معاملات ایسے ہی رہے۔

بہت سے لوگ جو اس حقیقت سے واقف نہیں وہ مذاہب فقہاء اور علماء حق کے فتوؤں میں اختلاف کو بھی حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں، ان کو یہ کہتے سنا جاتا ہے کہ علماء میں اختلاف ہے تو کدھر جائیں، حالانکہ بات بالکل صاف ہے کہ جس طرح کسی بیمار کے معاملہ میں ڈاکٹروں طبیبوں کا اختلاف رائے ہوتا ہے تو ہر شخص یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ ان میں سے فنی اعتبار سے زیادہ ماہر اور تجربہ کار کون ہے، بس اس کا علاج کرتے ہیں، دوسرے ڈاکٹروں کو برا نہیں کہتے، مقدمہ کے وکیلوں میں اختلاف ہو جاتا ہے، تو جس وکیل کو زیادہ قابل اور تجربہ کار جانتے ہیں اس کے کہنے پر عمل کرتے ہیں، دوسروں کی بدگوئی کرتے نہیں پھرتے، یہی اصول یہاں ہونا چاہئے، جب کسی مسئلہ میں علماء کے فتوے مختلف ہو جائیں تو مقدور بھر تحقیق کرنے کے بعد جس عالم کو علم اور تقویٰ میں دوسروں سے زیادہ اور افضل سمجھیں اس کا اتباع کریں اور دوسرے علماء کو برا بھلا کہتے نہ پھریں، خلاصہ کلام یہ ہے کہ نہ ہر اختلاف مطلقاً مذموم اور نہ ہر اتفاق مطلقاً محمود و مطلوب ہے، اگر چور، ڈاکو، باغی ایک جماعت بنا کر باہم متفق ہو جائیں تو کون نہیں جانتا کہ ان کا یہ اتفاق مذموم اور قوم کے لئے مہلک ہے اور اس کے خلاف جو سعی و عمل عوام یا پولیس وغیرہ کی طرف سے اس جماعت کی مخالفت میں ہوتا ہے وہ ہر عقلمند کی نظر میں اختلاف محمود و مفید ہے۔

معلوم ہوا کہ خرابی اختلاف رائے میں نہیں اور نہ کسی ایک رائے پر عمل کرنے میں ہے بلکہ ساری خرابیاں دوسروں کے متعلق بدگمانی اور بدزبانی سے پیش آتی ہیں جو علم و دیانت کی کمی اور اغراض و اہواء کی زیادتی کا نتیجہ ہوتا ہے، اور جب کسی قوم یا جماعت میں یہ صورت پیدا ہو جاتی ہے تو ان کے لئے یہ اختلاف رحمت بھی اختلاف عذاب کی صورت میں منتقل ہو جاتا ہے، اور مسلمانوں کی پارٹیاں بن کر ایک دوسرے کے خلاف جنگ وجدل اور بعض اوقات قتل و قتال تک میں مبتلا ہو جاتے ہیں، اور ایک دوسرے کے خلاف لعن طعن اور دل آزار کلمات کو تو مذہب کی حمایت سمجھ لیا جاتا ہے، حالانکہ مذہب کا اس غلو اور زیادتی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، بلکہ یہ وہی جدال ہے جس سے رسول کریم ﷺ نے شدت کے ساتھ منع فرمایا ہے، صحیح احادیث میں اس کو قوموں کی گمراہی کا سبب قرار دیا ہے (ترمذی، ابن ماجہ)۔

* * *

فائدہ: ۱ اَنۡ يَّبۡعَثَ عَلَيۡكُمۡ عَذَابًا مِّنۡ فَوۡقِكُمۡ: یعنی خدا کے امہال و درگزر کو دیکھ کر مامون اور بے فکر نہ ہونا چاہئے، جس طرح وہ شدائد و مصائب سے نجات دے سکتا ہے، اسے یہ بھی قدرت ہے کہ کسی قسم کا عذاب تم پر مسلط کر دے۔

فائدہ: ۲ وَّيُذِيۡقَ بَعۡضَكُمۡ بَاۡسَ بَعۡضٍ: اس میں عذاب کی تین قسمیں بیان فرمائیں: ① جو اوپر سے آئے، جیسے پتھر برسنا یا طوفانی ہوا اور بارش ② جو پاؤں کے نیچے سے آئے، جیسے زلزلہ یا سیلاب وغیرہ یہ دونوں خارجی اور بیرونی عذاب ہیں، جو اگلی قوموں پر مسلط کئے گئے، حضور (ﷺ) کی دعا سے اس امت کو اس قسم کے عام عذاب سے محفوظ کر دیا گیا ہے یعنی اس قسم کا عام عذاب جو گزشتہ اقوام کی طرح اس امت کا استیصال کر دے نازل نہ ہوگا، جزئی اور خصوصی واقعات اگر پیش آئیں تو اس کی نفی نہیں، ہاں تیسری قسم عذاب کی ③ جسے اندرونی اور داخلی عذاب کہنا چاہیے اس امت کے حق میں باقی رہی ہے اور وہ پارٹی بندی، باہمی جنگ وجدل اور آپس کی خونریزی کا عذاب ہے، موضح القرآن میں ہے کہ: ''قرآن شریف میں اکثر کافروں کو عذاب کا وعدہ دیا، یہاں کھول دیا کہ عذاب وہ بھی ہے جو اگلی امتوں پر آیا آسمان سے یا زمین سے اور یہ بھی ہے کہ آدمیوں کو آپس میں لڑا

دے اور انکو قتل یا قید یا ذلیل کرے، حضرت نے سمجھ لیا کہ اس امت پر یہ ہی عذاب ہوگا، اکثر عذاب الیم اور عذاب مھین اور عذاب شدید اور عذاب عظیم ان ہی باتوں کو فرمایا ہے آخرت کا عذاب بھی ہے ان پر جو کافر ہی مرے"۔

فائدہ: ۳۔ اُنظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ: یعنی قرآن کو یا عذاب کے آنے کو، کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ یہ سب جھوٹی دھمکیاں ہیں، عذاب وغیرہ کچھ نہیں آتا۔

وَ كَذَّبَ بِهٖ قَوْمُكَ وَهُوَ الْحَقُّ ؕ قُلْ لَّسْتُ عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ ﴿۶۶﴾

اور اس کو جھوٹ بتلایا تیری قوم نے حالانکہ وہ حق ہے، تو کہہ دے کہ میں نہیں تم پر داروغہ

لِكُلِّ نَبَاٍ مُّسْتَقَرٌّ ۫ وَّسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿۶۷﴾

ہر ایک خبر کا ایک وقت مقرر ہے اور قریب ہے کہ اس کو جان لوگے

خلاصہ تفسیر: اور (اللہ تعالیٰ کے عذاب دینے پر قادر ہونے اور کفر وشرک کو عذاب کا سبب جاننے کے باوجود) آپ کی قوم کے لوگ (قریش اور عرب بھی) اس (عذاب) کی تکذیب کرتے ہیں (اور اس کے واقع نہ ہونے کا عقیدہ رکھتے ہیں) حالانکہ وہ یقینی (واقع ہونے والا) ہے (اور اس کو سن کر وہ یوں کہہ سکتے ہیں کہ کب ہوگا؟ تو) آپ (یوں) کہہ دیجئے کہ میں تم پر (عذاب واقع کرنے کے لئے) تعینات نہیں کیا گیا ہوں (کہ مجھ کو مفصل اطلاع ہو یا میرے اختیار میں ہو، البتہ) ہر خبر کے (مدلول کے) وقوع کا ایک وقت (اللہ کے علم میں معین) ہے اور جلدی ہی تم کو معلوم ہوجائے گا (کہ یہ عذاب آیا)۔

قُلْ لَّسْتُ عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ: یعنی میں تم پر تعینات نہیں کیا گیا ہوں، یہاں یہ شبہ نہ کیا جائے کہ جب جہاد کا حکم ہوگیا تو پھر اس وقت تو آپ ان پر تعینات ہوگئے اس صورت میں یہ آیت منسوخ ماننا پڑے گی، جواب یہ ہے کہ جہاد اگر چہ کفار کے حق میں عذاب الٰہی ہو، مگر مسلمانوں کو کفار کے عذاب دینے کی غرض سے جہاد کا حکم نہیں، اسی وجہ سے اگر کفار جزیہ دینا قبول کرلیں تو جہاد موقوف ہوجاتا ہے، مسلمانوں کو تو جہاد کا حکم محض اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے ہے، تو حکم جہاد کے بعد بھی آپ ان کے عذاب پر مسلط وتعینات نہیں ہوئے، جہاد کے علاوہ عذاب کے دوسرے بھی بہت سے طریقے ہیں جو حضور کے علم واختیار سے باہر ہیں، پس مجموعہ عذاب کو آپ کے علم واختیار سے خارج کہنا ہر وقت صحیح ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی میرا یہ منصب نہیں کہ تمہاری تکذیب پر وہ عذاب نازل کردوں یا اس کے وقت اور نوعیت وغیرہ کی تفصیل بتلاؤں میرا کام صرف باخبر اور متنبہ کردینا ہے، آگے ہر چیز کے وقوع کا علم الٰہی میں ایک وقت مقرر ہے، جب وقت آجائے گا تم خود جان لوگے کہ میں جس چیز سے ڈراتا تھا وہ کہاں تک سچ ہے۔

وَاِذَا رَاَيْتَ الَّذِيْنَ يَخُوْضُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ ؕ

اور جب تو دیکھے ان لوگوں کو کہ جھگڑتے ہیں ہماری آیتوں میں تو ان سے کنارہ کر یہاں تک کہ مشغول ہوجائیں کسی اور بات میں

وَاِمَّا يُنْسِيَنَّكَ الشَّيْطٰنُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۶۸﴾

اور اگر بھلا دے تجھ کو شیطان تو مت بیٹھ یاد آجانے کے بعد ظالموں کے ساتھ

خلاصہ تفسیر: پیچھے کفار کی تکذیب کا ذکر اور ان کو احکام کی تبلیغ کا حکم تھا، آگے تبلیغ کی ضرورت کے بغیر ان کی مجالس میں جانے اور

بیٹھنے سے منع فرماتے ہیں۔

اور (اے مخاطب!) جب تو ان لوگوں کو دیکھے جو ہماری آیات (اور احکام) میں عیب جوئی کر رہے ہیں تو ان لوگوں (کے پاس بیٹھنے) سے کنارہ کش ہو جا، یہاں تک کہ وہ کسی اور بات میں لگ جائیں، اور اگر تجھ کو شیطان بھلا دے (یعنی ایسی مجلس میں بیٹھنے کی ممانعت یاد نہ رہے) تو (جب یاد آئے) یاد آنے کے بعد پھر ایسے ظالموں کے پاس مت بیٹھ (بلکہ فوراً اٹھ کھڑا ہو)۔

***

فائدہ: یعنی جو لوگ آیات اللہ پر طعن واستہزاء اور ناحق کی نکتہ چینی میں مشغول ہو کر اپنے کو مستحق عذاب بنا رہے ہیں تم ان سے خلط ملط نہ رکھو کہیں تم بھی ان کے زمرے میں داخل ہو کر مورد عذاب نہ بن جاؤ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا ہے: اِنَّكُمۡ اِذًا مِّثۡلُهُمۡ ایک مومن کی غیرت کا تقاضا یہ ہونا چاہیے کہ ایسی مجلس سے بیزار ہو کر کنارہ کرے اور کبھی بھول کر شریک ہو گیا تو یاد آنے کے بعد فوراً وہاں سے اٹھ جائے اس میں اپنی عاقبت کی درستی، دین کی سلامتی اور طعن واستہزاء کرنے والوں کے لئے عملی نصیحت اور تنبیہ ہے۔

وَمَا عَلَى الَّذِيۡنَ يَتَّقُوۡنَ مِنۡ حِسَابِهِمۡ مِّنۡ شَىۡءٍ وَّلٰكِنۡ ذِكۡرٰى لَعَلَّهُمۡ يَتَّقُوۡنَ ﴿۶۹﴾

اور پرہیزگاروں پر نہیں ہے جھگڑنے والوں کے حساب میں سے کوئی چیز لیکن ان کے ذمہ نصیحت کرنی ہے تاکہ وہ ڈریں

خلاصہ تفسیر: اور (اگر ایسی مجلس میں جانے کی واقعی کوئی دنیاوی یا دینی ضرورت ہو تو اس کا حکم یہ ہے کہ) جو لوگ (ممنوعات شرعیہ سے جن میں بلاضرورت ایسی مجلس میں جانا بھی داخل ہے) احتیاط رکھتے ہیں، ان پر ان (طعن واستہزا کرنے والوں) کی باز پرس (اور طعنہ کے گناہ) کا کوئی اثر نہ پہنچے گا (یعنی ضرورت کی وجہ سے وہاں جانے والے گنہگار نہ ہوں گے) لیکن ان (مسلمانوں) کے ذمہ (بشرط قدرت) نصیحت کر دینا ہے شاید وہ (طعنہ دینے والے) بھی (ان خرافات سے) احتیاط کرنے لگیں (یا تو اسلام قبول کرنے کی وجہ سے، یا ان نصیحت کرنے والوں کے لحاظ سے)۔

وَمَا عَلَى الَّذِيۡنَ يَتَّقُوۡنَ مِنۡ حِسَابِهِمۡ: ان مجالس میں جانے کی ضرورتیں اس قسم کی ہیں، مثلاً مسجد حرام میں نماز وطواف کے لیے گئے اور وہ کفار وہاں بھی یہی عیب جوئی اور بدگوئی کا شغل کر رہے ہیں، یا ان کو وعظ سنانے گئے اور وہ اسی میں مشغول ہیں، جب گذشتہ آیت میں ممانعت نازل ہوئی تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اگر ان کی مجلس میں جانے کی مطلقاً ممانعت رہی تو ہم مسجد حرام میں نماز اور طواف سے بھی محروم ہو جائیں گے، کیونکہ وہ لوگ تو ہمیشہ وہاں بیٹھے رہتے ہیں، (یہ واقعہ ہجرت اور فتح مکہ سے پہلے کا ہے) اور ان کا مشغلہ ہی عیب جوئی اور بدگوئی ہے، اس پر مذکورہ آیت نازل ہوئی کہ جو لوگ احتیاط رکھنے والے ہیں وہ اگر اپنے کام سے مسجد حرام میں جائیں تو ان شریر لوگوں کے اعمال بد کی ان پر کوئی ذمہ داری نہیں، ہاں اتنی بات ان کے ذمہ ہے کہ حق بات ان کو پہنچا دیں کہ شاید وہ اس سے نصیحت حاصل کر کے صحیح راستہ پر آ جائیں،، اور یہ نصیحت بشرط قدرت ہے، ورنہ یہ بھی ذمہ نہیں۔

***

فائدہ: اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں: ① یعنی اگر پرہیزگار لوگ جھگڑنے اور طعن کرنے والوں کی مجلس سے اٹھ کر چلے آئے تو طاعنین کے گمراہی میں پڑے رہنے کا کوئی مواخذہ اور ضرر ان متقین پر عائد نہیں ہو سکتا، ہاں ان کے ذمے بقدر استطاعت اور حسب موقع نصیحت کرتے رہنا ہے، شائد وہ بدبخت نصیحت سن کر اپنے انجام سے ڈر جائیں ② یا یہ مطلب ہے کہ پرہیزگار اور محتاط لوگوں کو اگر کسی واقعی معتد بہ دینی یا دنیاوی ضرورت سے ایسی مجلس میں جانے کا اتفاق ہو جائے تو ان کے حق میں طاعنین کے گناہ اور باز پرس کا کوئی اثر نہیں پہنچتا، ہاں ان کے ذمہ بشرط قدرت نصیحت کر دینا ہے، ممکن ہے کسی وقت ان پر بھی نصیحت کا اثر پڑ جائے۔

وَذَرِ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَعِبًا وَّلَهْوًا وَّغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَذَكِّرْ بِهٖٓ

اور چھوڑ دے انکو جنہوں نے بنا رکھا ہے اپنے دین کو کھیل اور تماشا ۱ اور دھوکا دیا انکو دنیا کی زندگانی نے ۲ اور نصیحت کر انکو قرآن سے

اَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌۢ بِمَا كَسَبَتْ ۖ لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيْعٌ ۚ وَاِنْ تَعْدِلْ

تاکہ گرفتار نہ ہو جائے کوئی اپنے کئے میں کہ نہ ہو اس کے لئے اللہ کے سوا کوئی حمایتی اور نہ سفارش کرنے والا، اور اگر بدلے میں دے

كُلَّ عَدْلٍ لَّا يُؤْخَذْ مِنْهَا ۗ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اُبْسِلُوْا بِمَا كَسَبُوْا ۚ لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيْمٍ

سارے بدلے تو قبول نہ ہوں اس سے ۳ وہی لوگ ہیں جو گرفتار ہوئے اپنے کئے میں، ان کو پینا ہے گرم پانی

وَّعَذَابٌ اَلِيْمٌۢ بِمَا كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ ﴿۷۰﴾ ع

اور عذاب ہے دردناک بدلے میں کفر کے ۴

خلاصہ تفسیر: اور (استہزا و تکذیب کرنے والوں ہی کی مجلس کی تخصیص نہیں، بلکہ) ایسے لوگوں سے بالکل کنارہ کش رہ جنہوں نے اپنے (اس) دین کو (جس کا ماننا ان کے ذمہ فرض تھا یعنی اسلام کو) لہو ولعب بنا رکھا ہے (کہ اس کے ساتھ تمسخر کرتے ہیں) اور دنیوی زندگی نے ان کو دھوکہ میں ڈال رکھا ہے (کہ اس کی لذات میں مشغول ہیں، اور آخرت کے منکر ہیں، اس لئے اس تمسخر کا انجام نظر نہیں آتا) اور (کنارہ کشی و ترک تعلقات کے ساتھ ایسے لوگوں کو) اس قرآن کے ذریعہ سے (جس سے یہ تمسخر کر رہے ہیں) نصیحت بھی کرتا رہ تا کہ کوئی شخص اپنے (برے) کردار کے سبب (عذاب میں) اس طرح نہ پھنس جائے کہ کوئی غیر اللہ نہ اس کا مددگار ہو اور نہ سفارشی ہو، اور یہ کیفیت ہو کہ اگر (بالفرض) دنیا بھر کا معاوضہ بھی دے ڈالے (کہ اس کو خرچ کر کے عذاب سے بچ جائے) تب بھی اس سے نہ لیا جائے (تو نصیحت سے یہ فائدہ ہے کہ برے اعمال کے انجام پر متنبہ ہو جاتا ہے، آگے ماننا نہ ماننا دوسرا جانے، چنانچہ) یہ (تمسخر کرنے والے) ایسے ہی ہیں کہ (نصیحت نہ مانی اور) اپنے (برے) کردار کے سبب (عذاب میں) پھنس گئے (جس کا آخرت میں اس طرح ظہور ہوگا کہ) ان کے لئے نہایت تیز (کھولتا ہوا پانی) پینے کے لئے ہوگا اور (اس کے علاوہ اور طرح بھی) دردناک سزا ہوگی اپنے کفر کے سبب (کہ برا کردار یہی ہے، جس کا ایک شعبہ تمسخر تھا)۔

وَذَرِ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ: یعنی ایسے لوگوں سے بالکل کنارہ کش رہ جنہوں نے اپنے دین کو کھیل بنا رکھا ہے، بعض نے کہا ہے کہ یہاں دین کے معنی عادۃ سے مراد عید معتاد ہے اور روح المعانی میں اس قول کو ابن عباسؓ کی طرف منسوب کیا ہے، پس اس میں کفار کی عیدوں پر رد ہے جن میں لہو ولعب ہوتا تھا، چنانچہ اس آیت کے عموم کے اندر وہ عرس بھی آ جاتے ہیں جن میں برائیاں، منکرات اور بدعات ہوتی ہیں، ایسی محفلوں سے کنارہ کش ہونے کا حکم ہے جس طرح کفار و مشرکین کی عیدوں سے کنارہ کش ہونے کا حکم تھا۔

* * *

فائدہ: ۱ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَعِبًا وَّلَهْوًا: یعنی اپنے اس دین کو جس کا قبول کرنا اسکے ذمہ فرض تھا اور وہ مذہب اسلام ہے۔

فائدہ: ۲ وَّغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا: دنیا کی لذتوں میں مست ہو کر عاقبت کو بھلا بیٹھے۔

فائدہ: ۳ وَاِنْ تَعْدِلْ كُلَّ عَدْلٍ لَّا يُؤْخَذْ مِنْهَا: یعنی ایسے لوگوں کو جو تکذیب و استہزاء کی کرتوت میں پکڑے گئے ہوں نہ کوئی حمایتی ملے گا جو مدد کر کے زبردستی عذاب الٰہی سے چھڑا لے اور نہ کوئی سفارش کرنے والا ہو گا جو سعی اور سفارش سے کام نکال دے اور نہ کسی قسم کا فدیہ اور معاوضہ قبول کیا جائے گا اگر بالفرض ایک مجرم دنیا بھر کے معاوضے دے کر چھوٹنا چاہے تو نہ چھوٹ سکے گا۔

فائدہ: ؏ وَّعَذَابٌ اَلِیْمٌۢ بِمَا کَانُوْا یَکْفُرُوْنَ: گزشتہ آیت میں خاص اس مجلس سے کنارہ کشی کا حکم تھا جہاں آیات اللہ کے متعلق طعن واستہزاء اور ناحق کے جھگڑے کئے جارہے ہوں اس آیت میں ایسے لوگوں کی عام مجالست وصحبت ترک کردینے کا ارشاد ہے مگر ساتھ ہی حکم ہے کہ ان کو نصیحت کردیا کرو تا کہ وہ اپنے کئے کے انجام سے آگاہ ہوجائیں۔

قُلْ اَنَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ مَا لَا یَنْفَعُنَا وَلَا یَضُرُّنَا وَنُرَدُّ عَلٰٓی اَعْقَابِنَا بَعْدَ اِذْ ھَدٰىنَا اللّٰہُ

تو کہہ دے کیا ہم پکاریں اللہ کے سوا اُنکو جو نہ نفع پہنچا سکیں ہم کو اور نہ نقصان اور کیا پھر جائیں ہم الٹے پاؤں اسکے بعد کہ اللہ سیدھی راہ دکھا چکا ہم کو

کَالَّذِی اسْتَھْوَتْہُ الشَّیٰطِیْنُ فِی الْاَرْضِ حَیْرَانَ ۠ لَہٗٓ اَصْحٰبٌ یَّدْعُوْنَہٗٓ اِلَی الْھُدَی

مثل اس شخص کے کہ راستہ بھلا دیا ہو اس کو جنوں نے جنگل میں جب کہ وہ حیران ہے، اس کے رفیق بلاتے ہیں اس کو راستہ کی طرف

ائْتِنَا ؕ قُلْ اِنَّ ھُدَی اللّٰہِ ھُوَ الْھُدٰی ؕ وَاُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۷۱﴾

کہ چلا آ ہمارے پاس ؏ تو کہہ دے کہ اللہ نے جو راہ بتلائی وہی سیدھی راہ ہے ؏ اور ہم کو حکم ہوا ہے کہ تابع رہیں پروردگار عالم کے

خلاصہ تفسیر: بعض روایات میں ہے کہ مشرکین نے مسلمانوں سے ترک اسلام کی درخواست بھی کی تھی، آیت میں اس کا جواب ہے، اس صورت میں ماقبل سے اس کو قوی مناسبت ہوگئی، کیونکہ پیچھے حکم تھا کہ مشرکین کو اسلام کی طرف بلائیں، یہاں کے ان کے ترک اسلام کی طرف بلانے کا جواب جس میں مستقل طور پر توحید کا ثابت ہونا اور شرک کا باطل ہونا مذکور ہے اور ضمناً قیامت کا بھی ذکر ہے۔

آپ (سب مسلمانوں کی طرف سے ان مشرکین سے) کہہ دیجئے کہ کیا ہم اللہ کے سوا (تمہاری مرضی کے موافق) ایسی چیز کی عبادت کریں کہ نہ وہ (اس کی عبادت کرنے کی صورت میں) ہم کو نفع پہنچانے پر قادر ہو اور نہ وہ (اسکی عبادت نہ کرنے کی صورت میں) ہم کو نقصان پہنچانے پر قادر ہو (مراد اس سے باطل معبود ہیں کہ بعض کو تو اصلاً قدرت نہیں اور جن کو کچھ ہے وہ خود نہیں، بلکہ خدا کی دی ہوئی ہے اور معبود میں کم از کم اپنے موافق اور مخالف کو نفع ونقصان پہنچانے کی قدرت ہونی چاہئے تو کیا ہم ایسوں کی عبادت کریں) اور کیا (معاذ اللہ) ہم (اسلام سے) الٹے پھر جائیں، بعد اس کے کہ ہم کو خدا تعالیٰ نے (طریقِ حق کی) ہدایت کردی ہے (یعنی اول تو شرک خود ہی بری چیز ہے، پھر خصوصاً اسلام کے اختیار کرنے کے بعد تو اور بھی زیادہ قبیح ہے ورنہ ہماری تو وہ مثال ہوجائے) جیسے کوئی شخص ہو کہ اس کو شیطانوں نے کہیں جنگل میں (بہکا کر راہ سے) بے راہ کردیا ہو اور وہ بھٹکتا پھرتا ہو (اور) اس کے کچھ ساتھی بھی تھے کہ وہ اس کو ٹھیک راستہ کی طرف (پکار پکار کر) بلاتے رہے ہیں کہ (ادھر) ہمارے پاس آ (مگر وہ غایت حیرت سے نہ سمجھتا ہے نہ آتا ہے، حاصل یہ کہ جیسا یہ شخص راہ پر تھا، لیکن اپنے رہبر ساتھیوں سے جدا ہو کر بے راہ ہوگیا اور وہ ساتھی اب بھی اس کو راہ پر لاتے ہیں مگر وہ نہیں آتا، ایسی ہی ہماری حالت ہوجائے کہ راہ اسلام پر ہو کر اپنے ہادی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے جدا ہوں، اور گمراہ کرنے والوں کے پنجہ میں گرفتار ہو کر گمراہ ہوجائیں اور وہ ہادی پھر بھی خیر خواہی سے دعوت اسلام کرتے رہیں اور ہم گمراہی کو نہ چھوڑیں، تو کیا تمہاری مرضی پر عمل کرکے ہم اپنی ایسی مثال بنالیں)۔

آپ (صلی اللہ علیہ وسلم ان سے) کہہ دیجئے کہ (جب اس مثال سے معلوم ہوا کہ راہ سے بے راہ ہونا برا ہے اور یہ) یقینی بات ہے کہ راہ راست وہ خاص اللہ ہی کی (بتلائی ہوئی) راہ ہے (اور وہ دین اسلام ہے، پس اس کا چھوڑنا یقیناً بے راہ ہونا ہے، پھر ہم اسے کب چھوڑ سکتے ہیں) اور (آپ صلی اللہ علیہ وسلم کہہ دیجئے کہ ہم شرک کیسے کرسکتے ہیں) ہم کو (تو) یہ حکم ہوا ہے کہ ہم پورے مطیع ہوجائیں پروردگار عالم کے (اور پوری اطاعت کا طریقہ اسلام ہی میں منحصر ہے تو ہم شرک کیونکر کرسکتے ہیں)۔

وَنُرَدُّ عَلٰٓی اَعْقَابِنَا بَعْدَ اِذْ ھَدٰىنَا اللّٰہُ: یعنی کیا ہم الٹے پھر جائیں بعد اس کے کہ ہمیں خدا تعالیٰ نے ہدایت کردی ہے، اسی طرح جو

ہدایت کے راستے پر آنے کے بعد اس سے نکل جائے وہ بھٹکتا پھرتا ہے چاہے توحید واسلام کے راستہ سے نکل جائے یا اسباب واعمال جو آخرت میں کامیابی دلانے والے ہیں ان سے نکل جائے، دونوں صورتوں میں اس کی کوئی منزل نہیں ہے۔

كَالَّذِي اسْتَهْوَتْهُ الشَّيٰطِيْنُ فِي الْاَرْضِ حَيْرَانَ: اس مثال میں جو شیطانوں کا راہ بھلا دینا مذکور ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ شیاطین اور خبیث جن بعض اوقات ایسے تصرفات وافعال کر سکتے ہیں، پس اس آیت میں تاویلات کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، اس کے متعلق مزید تحقیق سورہ بقرہ آیت ۲۷۵: اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ کے خلاصہ تفسیر میں گذر چکی ہے وہاں ملاحظہ فرمائیں۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی مسلمانوں کی شان یہ ہے کہ گمراہوں کو نصیحت کر کے سیدھی راہ پر لائے اور جو خدا سے بھاگ کر غیر اللہ کی چوکھٹ پر سر رکھے ہوئے ہیں ان کو خدائے واحد کے سامنے سربسجود کرنے کی فکر کرے، اس سے یہ توقع رکھنا فضول ہے کہ وہ خدا کے سوا کسی ایسی ہستی کے آگے سر جھکائے گا جس کے قبضے میں نہ نفع ہے نہ نقصان، یا اہل باطل کی صحبت میں رہ کر توحید وایمان کی صاف سڑک چھوڑ دے گا اور شرک کی بھول بھلیوں کی طرف الٹے پاؤں پھرے گا، اگر معاذ اللہ ایسا ہو تو اس کی مثال اس مسافر کی سی ہوگی جو اپنے راہ جاننے والے رفقاء کے ساتھ جنگل میں سفر کر رہا تھا کہ ناگاہ غول بیابانی (خبیث جنات) نے اسے بہکا کر راستے سے الگ کر دیا وہ چاروں طرف بھٹکتا پھرتا ہے اور اسکے رفقاء از راہ خیر خواہی اسے آوازیں دے رہے ہیں کہ ادھر آؤ راستہ اس طرف ہے مگر وہ حیران ومخبوط الحواس ہو کر نہ کچھ سمجھتا ہے اور نہ ادھر آتا ہے اسی طرح سمجھ لو کہ مسافر آخرت کیلئے سیدھی راہ اسلام وتوحید کی ہے اور جن کی رفاقت اور معیت میں یہ سفر طے ہوتا ہے وہ پیغمبر اور اسکے متبعین ہیں، جب یہ بدبخت شیاطین ومضلین کے پنجے میں پھنس کر صحرائے ضلالت میں بھٹکتا پھرتا ہے اسکے ہادی اور رفقاء از راہ ہمدردی جادہ حق کی طرف بلا رہے ہیں مگر یہ نہ کچھ سنتا ہے نہ سمجھتا ہے، تو اے گروہ اشرار! کیا تمہاری یہ غرض ہے کہ ہم اپنی ایسی مثالیں بنالیں، یہ آیت ان مشرکین کے جواب میں اتری ہے جنہوں نے مسلمانوں سے ترک اسلام کی درخواست کی تھی۔

فائدہ: ۲ ہم سے یہ امید مت رکھو کہ اسے چھوڑ کر ہم شیطان کی بتلائی ہوئی راہوں پر چلیں گے۔

وَاَنْ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّقُوْهُ ؕ وَهُوَ الَّذِيْٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۷۲﴾ وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ

اور یہ کہ قائم رکھو نماز کو اور ڈرتے رہو اللہ سے اور وہی ہے جس کے سامنے تم سب اکٹھے ہو گے، اور وہی ہے جس نے پیدا کیا آسمانوں

وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ وَيَوْمَ يَقُوْلُ كُنْ فَيَكُوْنُ ؕ قَوْلُهُ الْحَقُّ ؕ وَلَهُ الْمُلْكُ يَوْمَ يُنْفَخُ

اور زمین کو ٹھیک طور پر، اور جس دن کہے گا کہ ہو جا۱ تو وہ ہو جائے گا، اس کی بات سچی ہے، اور اسی کی سلطنت ہے جس دن پھونکا جائے گا

فِي الصُّوْرِ ؕ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ؕ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ ﴿۷۳﴾

صور ۲ جاننے والا چھپی اور کھلی باتوں کا، اور وہی ہے حکمت والا جاننے والا ۳

خلاصہ تفسیر: اور یہ (حکم ہوا ہے) کہ نماز کی پابندی کرو (جو کہ توحید پر ایمان کی ظاہر ترین علامت ہے) اور (یہ حکم ہوا ہے کہ) اس سے (یعنی اللہ سے) ڈرو (یعنی مخالفت نہ کرو، جس میں سب سے بڑھ کر شرک ہے) اور وہی (اللہ) ہے جس کے پاس تم سب (قیامت کے دن قبروں سے نکل کر حساب کے لئے) جمع کئے جاؤ گے (وہاں مشرکین کو اپنے شرک کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا)۔

اور وہی (اللہ) ہے جس نے آسمانوں کو اور زمین کو با فائدہ پیدا کیا (جس میں بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس سے خالق کے وجود اور توحید پر استدلال کیا جائے، پس یہ بھی توحید کی ایک دلیل ہے) اور (اوپر جو تحشرون میں حشر یعنی قیامت میں دوبارہ زندہ ہونے کی خبر دی ہے اس کو بھی کچھ بعید مت سمجھو، کیونکہ وہ قدرت الٰہیہ کے سامنے اس قدر آسان ہے کہ) جس وقت اللہ تعالیٰ اتنا کہہ دے گا کہ (حشر) تو ہو جا بس وہ (حشر فوراً) ہو پڑے گا، اس

کا (یہ) کہنا با اثر ہے (خالی نہیں جاتا) اور (حشر کے روز) جب کہ صور میں (بحکم الٰہی دوسری بار فرشتہ کی) پھونک ماری جائے گی، ساری حکومت (حقیقتاً بھی ظاہراً بھی) خاص اسی (اللہ) کی ہوگی (اور وہ اپنی حکومت سے موحدین ومشرکین کا فیصلہ فرمادیں گے) وہ (اللہ) جاننے والا ہے پوشیدہ چیزوں کا اور ظاہر چیزوں کا (پس مشرکین کے اعمال واحوال کا بھی اس کو علم ہے) اور وہی حکمت والا (اس لئے مناسب جزاء ہر ایک کو دے گا اور وہی ہے) پوری خبر رکھنے والا (اس لئے کسی بھی چیز کا چھپانا اس سے ممکن نہیں)۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی حشر ہوجا۔

فائدہ: ۲ یعنی اس روز ظاہری اور مجازی طور پر بھی خدا کے سوا کسی کی سلطنت نہ رہے گی: لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ۖ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ (غافر:۱۶)۔

فائدہ: ۳ جو خدا یہ صفات رکھتا ہے جن کا ذکر ان دو تین آیات میں ہوا، وہ ہی اسی لائق ہے کہ ہم اس کے تابع فرمان ہوں، اس کے سامنے انتہائی عبودیت اختیار کریں اور ہر آن اس سے ڈرتے رہیں، اسی کا ہم کو حکم ہوا ہے جس سے ہم کسی حال منہ نہیں موڑ سکتے۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ اٰزَرَ اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً ۚ اِنِّيْٓ اَرٰىكَ وَقَوْمَكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۷۴﴾

اور یاد کر جب کہا ابراہیم نے ۱ اپنے باپ آزر کو ۲ تو کیا مانتا ہے بتوں کو خدا میں دیکھتا ہوں کہ تو اور تیری قوم صریح گمراہ ہیں ۳

خلاصہ تفسیر: گذشتہ آیات میں رسول کریم ﷺ کا مشرکین عرب کو خطاب اور بت پرستی چھوڑ کر صرف خدا پرستی کی دعوت کا بیان تھا، آگے بھی اسی دعوت حق کی تائید ایک خاص انداز میں فرمائی گئی ہے، جو طبعی طور پر اہل عرب کے لئے دلنشین ہوسکتی ہے، وہ یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام تمام عرب کے جد امجد ہیں اور اسی لئے سارا عرب ان کی تعظیم پر ہمیشہ سے متفق چلا آیا ہے، ان آیات میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس مناظرہ کا ذکر کیا گیا ہے جو انہوں نے بت پرستی کے خلاف اپنی قوم کے ساتھ کیا تھا، اور پھر سب کو توحید حق کا سبق دیا تھا، نیز اس قصہ میں مسئلہ رسالت کی بھی تائید ہے کہ نبوت کوئی عجیب چیز یا نئی بات نہیں ہے پہلے بھی انبیاء ہوتے آئے ہیں، آیات کی تفسیر سے پہلے چند باتوں کا جاننا ضروری ہے:

① حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم کے قرآن میں مذکور احوال سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بت پرستی بھی کرتی تھی اور ستاروں کو بھی عالم میں متصرفات جانتی تھی، پس وہ دو طور پر مشرک تھی، اسی واسطے ابراہیم علیہ السلام کے مناظرہ میں دونوں پر کلام ہے۔

② ابراہیم علیہ السلام ہوش سنبھالنے ہی کے وقت سے توحید کے عارف ومحقق تھے، ہاں ایک عرصہ تک مناظرہ کا اتفاق نہیں ہوا تھا، پھر یا تو نبوت سے پہلے یا نبوت کے بعد قوم سے مناظرہ فرمایا، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جس رات کی آمد آگے آیت میں ذکر ہے اس کی کوئی دلیل نہیں کہ اس سے پہلے انہوں نے غار میں پرورش پانے کی وجہ سے کوئی رات نہیں دیکھی تھی، بلکہ یہ غار کا قصہ خود ثابت نہیں۔

③ آپ کی قوم خدا کی بھی قائل تھی یا نہیں؟ اس میں دونوں احتمال ہیں، البتہ نمرود کے طرز گفتگو سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود خالق ہی کا منکر تھا، لیکن یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس نے عناد اور سرکشی کی وجہ سے ایسی گفتگو کی ہو اور واقع میں وہ خالق کا قائل ہو، چنانچہ شاہ عبدالقادر صاحبؒ اسی کے قائل ہوئے ہیں کہ ان کی قوم خدا کی قائل تھی، اس احتمال پر آیات مناظرہ کی تفسیر زیادہ آسان ہوجائے گی۔

اور وہ وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہے جب ابراہیم (علیہ السلام) نے اپنے باپ آزر (نام) سے فرمایا کہ کیا تو بتوں کو معبود قرار دیتا ہے، بیشک میں تجھ کو اور تیری ساری قوم کو (جو اس اعتقاد میں تیرے شریک ہیں) صریح غلطی میں دیکھ رہا ہوں۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ: اس میں دلالت ہے کہ حق پر رہتے ہوئے اہل باطل کے ساتھ مناظرہ میں منافات نہیں ہے جب تک کہ حدود سے تجاوز نہ ہو، یعنی دین کے کام کو کرنا اور دین پر اعتراض کرنے والوں سے بحث ومکالمہ کرنا یہ دونوں دین کے کام ہیں اور دونوں ثواب کے کام ہیں،

ہاں! اس میں حدود سے باہر نہ نکلے کہ دل آزاری اور مذاق اڑانا مقصود نہ ہو، دوسری بات یہ کہ بعض اوقات نرمی پر سختی کو ترجیح ہوتی ہے۔

***

فائدہ: ۱ گزشتہ آیات میں جو توحید کا اثبات شرک کی نفی اور مسلمانوں کے ارتداد سے مایوس کیا گیا تھا، یہاں مؤحد اعظم حضرت ابراہیم کے واقعہ سے اسی کی تاکید مقصود ہے اور ضمناً مسلمانوں کو یہ بھی سمجھانا ہے کہ مکذبین و معاندین کو کس طرح نصیحت و فرمائش کی جائے، کس طرح ان سے علیحدگی اور بیزاری کا اظہار ہونا چاہیے اور کس طرح ایک مومن قانت کو خدا پر اور صرف خدا پر بھروسہ رکھنا اسی سے ڈرنا اور اسی کا تابع فرمان ہونا چاہیے۔

فائدہ: ۲ علمائے انساب نے حضرت ابراہیم کے باپ کا نام ''تارخ'' رکھا ہے، ممکن ہے ''تارخ'' نام اور ''آزر'' لقب ہو، ابن کثیر نے مجاہد وغیرہ سے نقل کیا ہے کہ ''آزر'' بت کا نام تھا، شاید اس بت کی خدمت میں زیادہ رہنے سے خود ان کا لقب آزر پڑ گیا ہو، واللہ اعلم

فائدہ: ۳ اس سے زیادہ صریح و صاف گمراہی کیا ہوگی کہ اکرم المخلوقات انسان اپنے ہاتھ سے تراشے پتھروں کو خدائی کا درجہ دے کر ان کے سامنے سربسجود ہو جائے اور انہی سے مرادیں مانگنے لگے۔

وَكَذٰلِكَ نُرِيٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ۝۷۵

اور اسی طرح ہم دکھانے لگے ابراہیم کو عجائبات آسمانوں اور زمین کے اور تاکہ اس کو یقین آجائے

خلاصہ تفسیر: ستاروں کے متعلق گفتگو آگے آئے گی، درمیان میں ابراہیم علیہ السلام کا صحت نظر کے ساتھ موصوف ہونا بیان فرماتے ہیں کہ گذشتہ اور آئندہ دونوں مضمونوں سے اس کا تعلق ہے:

اور ہم نے ایسے ہی (کامل) طور پر ابراہیم (علیہ السلام) کو آسمانوں اور زمین کی مخلوقات (معرفت کی نگاہ سے) دکھلائیں، تاکہ وہ (خالق کی ذات وصفات کے) عارف ہو جائیں اور تاکہ (معرفت کی ترقی اور اضافہ سے) کامل یقین کرنے والوں سے ہو جائیں۔

***

فائدہ: یعنی جس طرح بت پرستی کی شناعت وقبح ہم نے ابراہیم پر ظاہر کر کے اسکی قوم کو قائل کیا اسی طرح علویات وسفلیات کے نہایت محکم اور عجیب وغریب نظام ترکیبی کی گہرائیوں پر بھی اس کو مطلع کر دیا تاکہ اسے دیکھ کر اللہ تعالیٰ کے وجود و وحدانیت وغیرہ پر اور تمام مخلوقات سماوی وارضی کے محکومانہ عجز و بیچارگی پر استدلال اور اپنی قوم کے عقیدے کواکب پرستی و ہیاکل سازی کو علیٰ وجہ البصیرت رد کر سکے اور خود بھی حق الیقین کے اعلیٰ مرتبے پر فائز ہو۔

بلاشبہ عالم کا یہ اکمل و احکم اور بہترین نظم ونسق ہی ایسی چیز ہے جسے دیکھ کر بالبداہت اقرار کرنا پڑتا ہے کہ اس عظیم الشان مشین کا بنانے اور چلانے والا اس کے پرزوں کو نہایت مضبوط ترتیب وسلیقہ سے جوڑنے والا اور ہزاروں لاکھوں برس سے ایک ہی انداز پر اس کی حفاظت کرنے والا بڑا زبردست حکیم وقدیر صانع ہے جس کے حکیمانہ تصرف اور نفوذ واقتدار سے مشین کا کوئی چھوٹا بڑا پرزہ باہر نہیں جا سکتا، یہ کام یونہی بخت واتفاق یا بے شعور طبیعت یا اندھے بہرے مادہ سے نہیں ہو سکتا، یورپ کا مشہور ومعروف حکیم نیوٹن کہتا ہے کہ کواکب کی حرکات حالیہ ممکن نہیں کہ محض عام قوت جاذبہ کے فعل کا نتیجہ ہوں یہ قوت جاذبہ تو کواکب کو شمس کی طرف دھکیلتی ہے، اس لئے کواکب کو سورج کے گرد حرکت دینے والا ضروری ہے کہ خدائی ہاتھ ہو، جو باوجود قوت جاذبہ کی عام کشش کے ان کو اپنے مدارت پر قائم رکھ سکے، کوئی سبب طبعی ایسا نہیں بتلایا جا سکتا جس نے تمام کواکب کو کھلی فضا میں جکڑ بند کر دیا ہے کہ وہ سب سورج کے گرد چکر لگاتے وقت ہمیشہ معین مدارت پر اور ایک خاص جہت ہی میں حرکت کریں جس میں کبھی تخلف نہ ہو، پھر کواکب کی حرکات اور درجات سرعت میں ان کی اور سورج کی درمیانی مسافت کو ملحوظ رکھتے ہوئے جو دقیق تناسب اور عمیق توازن قائم رکھا گیا ہے کوئی سبب طبعی نہیں جس سے ہم ان منظم ومحفوظ نوامیس کو وابستہ کر سکیں۔

ناچار اقرار کرنا پڑتا ہے کہ یہ سارا نظام کسی ایسے زبردست حکیم وعلیم کے ماتحت ہے جو ان تمام اجرام سماویہ کے مواد اور ان کی کمیات سے پورا پورا واقف ہے وہ جانتا ہے کہ کس مادہ کی کس قدر مقدار سے کتنی قوت جاذبہ صادر ہوگی، اسی نے اپنے زبردست اندازے سے کواکب اور شمس کے درمیان مختلف مسافتیں اور حرکت کے مختلف مدارج مقرر کئے ہیں کہ ایک کا دوسرے سے تصادم وتزاحم نہ ہو اور عالم ٹکرا کر تباہ نہ ہو جائے، ہر چھوٹا بڑا سیارہ نہایت

مضبوط نظام کے ماتحت معین وقت پر طلوع وغروب ہوتا ہے جب کوئی سیارہ غروب ہو کر دنیا کو اپنے اس فیض وتاثیر سے محروم کر دے جو طلوع کے وقت حاصل تھا تو نہ اس ستارہ کی اور نہ کسی مخلوق کی قدرت میں ہے کہ ایک منٹ کے لئے اسے واپس لے آئے یا غروب سے روک دے، یہ رب العالمین ہی کی شان ہے کہ کسی وقت بھی کسی قسم کے افاضہ سے عاجز نہیں: وَالشَّمْسُ تَجْرِيْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ۭ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ۭ وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ (یس:۳۸تا۴۰) یہ علویات کا حال ہے تو سفلیات کا اسی سے اندازہ کر لو یہی تکوینی عجائب اور ملکوت السمٰوات والارض ہیں جن کے دیکھنے سے ابراہیم کی زبان پر: لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ (الانعام:۷۶) اور: اِنِّىْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (الانعام:۷۹) بے ساختہ جاری ہو گیا جو اگلی آیات میں مذکور ہے) کما تدل علی الفاء فی قول تعالیٰ: فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا ۚ قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ (الانعام:۷۶)

فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا ۚ قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ ۝۷۶

پھر جب اندھیرا کر لیا اس پر رات نے دیکھا اس نے ایک ستارہ بولا یہ ہے رب میرا پھر جب وہ غائب ہو گیا تو بولا میں پسند نہیں کرتا غائب ہو جانے والوں کو

خلاصہ تفسیر: (پیچھے بتوں کے متعلق گفتگو ہو چکی، اب ستاروں کے متعلق بیان ہے) پھر (خواہ اسی دن یا کسی اور دن) جب رات کی تاریکی ان پر (اور اسی طرح سب پر) چھا گئی تو انہوں نے ایک ستارہ دیکھا (کہ چمک رہا ہے) آپ نے (اپنی قوم سے مخاطب ہو کر) فرمایا کہ (تمہارے خیال کے مطابق) یہ میرا (اور تمہارا سب کا) رب (ہے اور سب کے احوال میں تصرف کرتا) ہے (بہت اچھا! اب تھوڑی دیر میں حقیقت معلوم ہوئی جاتی ہے، چنانچہ تھوڑے وقت کے بعد وہ افق میں جا چھپا) سو جب وہ غروب ہو گیا تو آپ نے فرمایا کہ میں غروب ہو جانے والوں سے محبت نہیں رکھتا (کیونکہ خدائی اور ربوبیت کے عقیدے کا لازمی تقاضا محبت ہے، پس حاصل یہ ہوا کہ میں رب نہیں سمجھتا، کیونکہ اس کے غروب ہو جانے کی صفت جو کہ متغیر اور بدلنے والی حالت ہے وہ خود بتلاتی ہے کہ وہ حادث ہے، اس کا وجود ایک حال پر قائم نہیں تو وہ خود کسی خالق کا محتاج ہے)۔

* * *

فائدہ: لے کہ انھیں اپنا رب بنالوں، کیا ایک مجبور قیدی اور بیگاری کو شہنشاہی کے تخت پر بٹھلانا کوئی پسند کر سکتا ہے۔

باقی ابراہیم کا ھٰذا ربی کہنا: ① یا تو استفہام انکاری کے لہجے میں ہے، یعنی کیا یہ ہے رب میرا؟ ② اور یا بطریق تہکم وتبکیت ہے، یعنی یہ ہے رب میرا تمہارے عقیدہ اور گمان کے موافق!! جیسے موسیٰ نے فرمایا: وَانْظُرْ اِلٰٓى اِلٰهِكَ الَّذِيْ ظَلْتَ عَلَيْهِ عَاكِفًا (طٰہٰ:۹۷) أي فِيْ زَعْمِكَ اس کے سوا مفسرین کے اور اقوال بھی ہیں، مگر ہمارے خیال میں یہی راجح ہے واللہ اعلم۔

فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَىِٕنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ

پھر جب دیکھا چاند چمکتا ہوا بولا یہ ہے رب میرا، پھر جب غائب ہو گیا بولا اگر نہ ہدایت کرے گا مجھ کو رب میرا تو بیشک میں رہوں گا

مِنَ الْقَوْمِ الضَّاۗلِّيْنَ ۝۷۷

گمراہ لوگوں میں

خلاصہ تفسیر: پھر (اسی رات یا کسی دوسری رات میں) جب چاند کو دیکھا (کہ) چمکتا ہوا (نکلا ہے) تو (پہلے ہی کی طرح) فرمایا کہ (تمہارے خیال کے مطابق) یہ میرا (اور تمہارا) رب (ہے اور سب کے احوال میں تصرف کرتا) ہے (بہتر! اب تھوڑی دیر میں اس کی کیفیت بھی دیکھنا، چنانچہ وہ بھی غروب ہو گیا) سو جب وہ غروب ہو گیا تو آپ نے فرمایا کہ اگر مجھ کو میرا رب (حقیقی) ہدایت نہ کرتا رہے (جیسا اب تک ہدایت

کرتا رہتا ہے) تو میں بھی (تمہاری طرح) گمراہ لوگوں میں شامل ہو جاؤں۔

فائدہ: چاند چونکہ بہت حسین اور چمکدار سیارہ ہے اگر خدا دستگیری نہ فرمائے تو بیشک انسان اسکی چمک دمک پر مفتون ہو کر رہ جائے۔

فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّیْ هٰذَآ اَكْبَرُ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَتْ قَالَ یٰقَوْمِ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ

پھر جب دیکھا سورج جھلکتا ہوا بولا یہ ہے رب میرا سب سے بڑا ہے ۱؎ پھر جب غائب ہو گیا بولا اے میری قوم میں بیزار ہوں

مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ﴿۷۸﴾

ان سے جن کو تم شریک کرتے ہو ۲؎

خلاصہ تفسیر: پھر (اگلی صبح یا اس کے علاوہ کسی اور رات کی صبح کو) جب آفتاب دیکھا (کہ بڑی آب و تاب سے) چمکتا ہوا (نکلا ہے) تو (پہلی دو بار کی طرح پھر) فرمایا کہ (تمہارے خیال کے مطابق) یہ میرا (اور تمہارا) رب (ہے اور سب کے احوال میں تصرف کرتا) ہے (اور) یہ تو سب (ستاروں) میں بڑا ہے (بس اس پر گفتگو کا خاتمہ ہو جائے گا، اگر اس کی ربوبیت باطل ہو گئی تو چھوٹوں کی بدرجہ اولیٰ باطل ہو جائے گی، غرض شام ہوئی تو وہ بھی غروب ہو گیا) سو جب وہ غروب ہو گیا تو آپ نے فرمایا کہ بیشک میں تمہارے شرک سے بیزار (اور نفرت کرتا) ہوں (یعنی بے زاری ظاہر کرتا ہوں، کیونکہ اعتقاداً تو ہمیشہ سے ہی بیزار تھے)۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس طرز مناظرہ سے علماء و مبلغین کے لئے یہ ہدایت حاصل ہوئی کہ قوموں کی تبلیغ و اصلاح میں نہ ہر جگہ سختی مناسب ہے نہ ہر جگہ نرمی، بلکہ ہر ایک کا ایک موقعہ اور ایک حد ہے، چنانچہ بت پرستی کے معاملہ میں حضرت خلیل اللہ نے سخت الفاظ استعمال فرمائے ہیں، کیونکہ اس کی گمراہی مشاہدہ میں آنے والی چیز ہے، اور نجوم پرستی کے معاملہ میں ایسے سخت الفاظ استعمال نہیں فرمائے، بلکہ ایک خاص تدابیر سے معاملہ کی حقیقت کو قوم کے ذہن نشین فرمایا، کیونکہ سیاروں اور ستاروں کا بے بس اور بے اختیار ہونا اتنا واضح اور کھلا ہوا نہیں تھا جتنا خود تراشیدہ بتوں کا، اس میں اگر اول ہی سے سختی اختیار کی جاتی تو ان کا غرور، عناد اور تکبر بڑھ جاتا، اس سے معلوم ہوا کہ نصیحت و ارشاد کے بارے میں مخاطب کے حال کی رعایت اور اس کی مصلحت کا لحاظ مناسب ہے اور حکماء و مصلحین کی یہی شان ہے۔

فائدہ: ۱؎ یعنی نظام فلکی میں سب سے بڑا اور سب سے زیادہ فیض رساں سیارہ ہے، شاید عالم مادی کی کوئی چیز اس کے بلا واسطہ یا بالواسطہ فیض تاثر سے مستغنی ہو۔

فائدہ: ۲؎ یہ تو سب خدا کے مزدور ہیں جو وقت معین پر آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں، ایک منٹ کی تقدیم و تاخیر پر قادر نہیں، پھر ان کو خدائی کے حقوق میں شریک کرنا کس قدر گستاخی اور قابل نفرت فعل ہے۔

اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ﴿۷۹﴾

میں نے متوجہ کر لیا اپنے منہ کو اسی کی طرف جس نے بنائے آسمان اور زمین سب سے یکسو ہو کر اور میں نہیں ہوں شرک کرنے والا

خلاصہ تفسیر: میں (سب طریقوں سے) یکسو ہو کر اپنا رخ (ظاہر کا اور دل کا) اس (ذات) کی طرف (کرنا تم سے ظاہر) کرتا ہوں جس نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا اور میں (تمہاری طرح) شرک کرنے والوں سے نہیں ہوں (نہ عقیدہ سے، نہ قول سے اور نہ عمل سے)۔

فائدہ: ۱؎ یعنی ساری مخلوق سے یکسو ہو کر صرف خالق جل وعلیٰ کا دروازہ پکڑ لیا ہے جس کے قبضہ اقتدار میں سب علویات و سفلیات ہیں۔

وَحَآجَّهٗ قَوْمُهٗ ؕ قَالَ اَتُحَآجُّوْٓنِّیْ فِی اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنِ ؕ وَلَآ اَخَافُ

اوراس سے جھگڑا کیا اسکی قوم نے، بولا کیا تم مجھ سے جھگڑا کرتے ہو اللہ کے ایک ہونے میں اور وہ مجھ کو سمجھا چکا[1] اور میں ڈرتا نہیں ہوں

مَا تُشْرِكُوْنَ بِهٖٓ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ رَبِّیْ شَیْـًٔا ؕ وَسِعَ رَبِّیْ كُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا ؕ

ان سے جن کو تم شریک کرتے ہو اس کا مگر میرا رب ہی کوئی تکلیف پہنچانی چاہے، احاطہ کرلیا ہے میرے رب کے علم نے سب چیزوں کا

اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ ۝۸۰

کیا تم نہیں سوچتے[2]

خلاصہ تفسیر: اور ان سے ان کی قوم نے (بیہودہ) حجت کرنا شروع کی (وہ یہ کہ: ① بتوں کی پرستش قدیم رسم ہے: **وجدنا اباءنالها عابدین**، ہمارے آباء واجداد ان کی پرستش کرتے آئے ہیں ② اور باطل معبودوں کے انکار پر ابراہیم علیہ السلام کو ڈرایا بھی کہ تم جو ہمارے معبودوں کا انکار کرتے ہو ہمیں خوف ہے کہ کہیں تم کو یہ کسی آفت میں نہ پھنسادیں، جیسا کہ آگے ابراہیم علیہ السلام کا جواب: **ولا اخاف** الخ اسی پر دلالت کرتا ہے) آپ نے (پہلی بات کے جواب میں تو یہ) فرمایا کہ کیا تم اللہ (کی توحید) کے معاملہ میں مجھ سے (باطل) حجت کرتے ہو، حالانکہ اس نے مجھ کو (صحیح استدلال کا) طریقہ بتلا دیا ہے (جس کو میں تمہارے روبرو پیش کر چکا ہوں، تو محض قدیم رسم ہونا اس دلیل کا جواب نہیں ہوسکتا، پھر اس سے استدلال تمہارے لئے بیکار اور میرے نزدیک قابل التفات نہیں) اور (دوسری بات کے جواب میں یہ فرمایا کہ) میں ان چیزوں سے جن کو تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ (عبادت کا مستحق ہونے میں) شریک بناتے ہو نہیں ڈرتا (کہ وہ مجھ کو کوئی صدمہ پہنچا سکتے ہیں، کیونکہ ان میں خود صفت قدرت ہی کی صفت نہیں، اور اگر کسی میں ہو بھی تو مستقل قدرت نہیں ہے) ہاں! لیکن اگر میرا پروردگار ہی کوئی امر چاہے (تو وہ دوسری بات ہے وہ پوری ہوجائے گی، اس لیے کہ انسان ہے حوادث بھی آتے رہتے ہیں لیکن اس سے ان باطل معبودوں کی قدرت کا ثبوت یا ان سے ڈرنے کی ضرورت کب لازم آئی، اور) میرا پروردگار (جس طرح قادر مطلق ہے جیسا ان اشیاء سے معلوم ہوا اسی طرح وہ) ہر چیز کو اپنے (احاطہ) علم میں (بھی) گھیرے ہوئے ہے (غرض قدرت وعلم دونوں اسی کے ساتھ مختص ہیں، اور تمہارے معبودوں کو نہ قدرت ہے نہ علم ہے) کیا تم (سنتے ہو اور) پھر (بھی) خیال نہیں کرتے۔

وَلَآ اَخَافُ مَا تُشْرِكُوْنَ بِهٖٓ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ رَبِّیْ: یعنی میں ان چیزوں سے نہیں ڈرتا جن کو تم اللہ کے ساتھ شریک بناتے ہو ہاں لیکن اگر میرا پروردگار ہی کوئی امر چاہے، یہ بات ابراہیم علیہ السلام نے اس لیے بیان فرمادی کہ آخر آدمی تھے، انسان پر حوادث بھی آتے رہتے ہیں تو شاید وہ جاہل ان حوادث سے استدلال کرتے کہ دیکھو یہ ہمارے معبودوں کو برا کہنے کا نتیجہ ہے اسی لیے آپ نے پیش بندی فرمادی کہ ان حوادث سے استدلال باطل ہے، کیونکہ وہ خدا کی طرف سے واقع ہوں گے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ قوم کی دھمکی پر ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: **وَلَآ اَخَافُ** یعنی میں ڈرتا نہیں ہوں، اس عنوان میں دعویٰ اور شان کا پہلو نکل سکتا تھا جو نبی ورسول سے ممکن نہیں، لیکن اس کے ساتھ **اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ رَبِّیْ** (البتہ میرا رب چاہے تو اور بات ہے) کہہ کر اپنے کلام سے صورتِ دعویٰ کو دور کر دیا، گفتگو اور بات چیت میں شان وفخر کا عنوان نہیں ہونا چاہیے، مطلب یہ کہ انسان کو دعویٰ کرنے سے بچنا چاہیے کہ میں ایسا ہوں، میں نے یہ کیا، میں کسی سے نہیں ڈرتا وغیرہ، ہاں اگر اللہ کا نام ساتھ لگادے کہ اگر اللہ چاہے تو میں ایسے کردوں گا، اگر اللہ نے چاہا تو میدان سے نہیں بھاگوں گا وغیرہ تو یہ درست ہے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی جس کو خدا سمجھا چکا اور ملکوت السمٰوٰت والارض کی علیٰ وجہ البصیرت سیر کرا چکا کیا اس سے یہ امید رکھتے ہو کہ وہ تمہارے جھگڑنے اور بیہودہ جدل و بحث کرنے سے بہک جائے گا، کبھی نہیں۔

فائدہ: ۲؎ حضرت ابراہیم کی قوم کہتی تھی کہ تم جو ہمارے معبودوں کی توہین کرتے ہو، ڈرتے رہو کہیں اسکے وبال میں تم معاذ اللہ مجنون اور پاگل نہ بن جاؤ یا کسی اور مصیبت میں گرفتار ہو جاؤ، اس کا جواب دیا کہ میں ان سے کیا ڈروں گا جن کے ہاتھ میں نفع ونقصان اور تکلیف وراحت کچھ بھی نہیں، ہاں میرا پروردگار کوئی تکلیف پہنچانا چاہے تو اس سے دنیا میں کون مستثنیٰ ہے وہ ہی اپنے علم محیط سے جانتا ہے کہ کس شخص کو کن حالات میں رکھنا مناسب ہوگا۔

وَكَيْفَ اَخَافُ مَآ اَشْرَكْتُمْ وَلَا تَخَافُوْنَ اَنَّكُمْ اَشْرَكْتُمْ بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ عَلَيْكُمْ

اور میں کیونکر ڈروں تمہارے شریکوں سے اور تم نہیں ڈرتے اس بات سے کہ شریک کرتے ہو اللہ کا ان کو جس کی نہیں اتاری اس نے تم پر

سُلْطٰنًا ؕ فَاَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ ۚ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۱﴾

وقف لازم

کوئی دلیل ۱؎ اب دونوں فرقوں میں کون مستحق ہے دلجمعی کا بولو اگر تم سمجھ رکھتے ہو

خلاصہ تفسیر: اور (جس طرح میرے نہ ڈرنے کی وجہ یہ ہے کہ تمہارے باطل معبود علم وقدرت سے بالکل خالی ہیں، اسی طرح یہ وجہ بھی ہے کہ میں نے کوئی ڈر کا کام بھی تو نہیں کیا تو پھر) میں ان چیزوں سے کیسے ڈروں جن کو تم نے (اللہ تعالیٰ کے ساتھ عبادت کا مستحق ہونے میں اور خدائی کے عقیدہ میں) شریک بنایا ہے، حالانکہ (ڈرنا تو تم کو چاہئے دو وجہ سے: ① اول تم نے ڈر کا کام یعنی شرک وکفر کیا ہے، جس پر عذاب مرتب ہوتا ہے ② دوسرے خدا کا عالم اور قادر ہونا معلوم ہو چکا ہے، مگر) تم اس بات (کے وبال) سے نہیں ڈرتے کہ تم نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایسی چیزوں کو شریک ٹھہرایا ہے جن (کے معبود ہونے) پر اللہ تعالیٰ نے تم پر کوئی دلیل (لفظاً یا معناً) نازل نہیں فرمائی (مطلب یہ کہ ڈرنا چاہئے تم کو، پھر الٹا مجھے ڈراتے ہو) سو (اس تقریر کے بعد انصاف سے سوچ کر بتلاؤ کہ) ان دو (مذکورہ) جماعتوں میں سے (یعنی مشرکین وموحدین میں سے) امن کا (یعنی اس کا کہ اس پر خوف واقع نہ ہو) زیادہ مستحق کون ہے (اور خوف بھی وہ جو واقع میں قابل اعتبار ہے یعنی آخرت کا خوف) اگر تم (کچھ) خبر رکھتے ہو۔

فَاَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ: باوجودیکہ یہاں احق بالامن متعین ہے کہ وہ موحدین اور مسلمان ہیں، مگر یوں نہیں فرمایا کہ: "فنحن أحق بالامن"، کیونکہ اس طرح کہنے میں سامنے والے مخاطب کے ساتھ ناانصافی ہے، اور استفہام یعنی سوال کرنے کے انداز میں اسے انصاف کی طرف مائل کرنا ہے اور اہل شفقت حضرات کا مخالفین کی ہدایت میں یہی طریقہ ہوتا ہے کہ وہ سوالیہ انداز میں سمجھاتے ہیں کہ اب تم فیصلہ کرلو کون حق پر ہے، اسی طرح یہاں بتوں کی بے بسی اور اللہ کی قدرت بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ موحدین اور مشرکین میں کونسا فریق ایسا ہے جو امن کا زیادہ مستحق ہے، تو اس سے بات واضح ہوگئی، جو سمجھدار ہوگا وہ صرف ایک اللہ ہی پر ایمان لائے گا۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی میں تمہارے معبودوں سے کیوں ڈروں حالانکہ نہ ان کے قبضہ میں نفع وضرر ہے اور نہ توحید کو اختیار کرنا کوئی جرم ہے، جس سے اندیشہ ہو ہاں تم خدا کے باغی اور مجرم بھی ہو اور خدا مالک نفع ضرر بھی ہے لہٰذا تم کو اپنے جرائم کی سزا سے ڈرنا چاہیے۔

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۸۲﴾

ع ۱۵

جو لوگ یقین لے آئے اور نہیں ملا دیا انہوں نے اپنے یقین میں کوئی نقصان انہی کے واسطے ہے دلجمعی اور وہی ہیں سیدھی راہ پر

خلاصہ تفسیر: جو لوگ (اللہ پر) ایمان رکھتے ہیں اور اپنے (اس) ایمان کو شرک کے ساتھ مخلوط نہیں کرتے، ایسوں ہی کے لئے (قیامت میں) امن ہے اور وہی (دنیا میں) راہ (راست) پر چل رہے ہیں (اور ایسے لوگ صرف موحدین ہیں، کیونکہ مشرکین بظاہر خدا پر ایمان لاتے

ہیں کہ خدا کے قائل ہیں، لیکن شرک بھی اس کے ساتھ ملاتے ہیں جس کی وجہ سے اللہ کے ہاں ان کا ایمان معتبر نہیں رہتا، جب موحدین امن کے قابل ہیں تو اس صورت میں تم خود ڈرو نہ کہ مجھے ڈراتے رہو، حالانکہ نہ تمہارے باطل معبود ڈرنے کے قابل، نہ میں نے کوئی کام ڈر کا کیا، نہ دنیا کا خوف اعتبار کے قابل، اور تمہاری حالت تینوں اعتبار سے خوف کے لائق ہے)۔

* * *

فائدہ: احادیث صحیحہ میں منقول ہے کہ نبی کریم (ﷺ) نے یہاں "ظلم" کی تفسیر "شرک" سے فرمائی، جیسا کہ سورۃ لقمان میں ہے: اِنَّ الشِّرۡكَ لَظُلۡمٌ عَظِيۡمٌ گویا ظلم کی تنوین تعظیم کے لئے ہوئی تو حاصل مضمون یہ ہوگا کہ مامون ومہتدی صرف وہ ہی لوگ ہو سکتے ہیں جو یقین لائے اس طرح کہ اس میں شرک کی ملاوٹ بالکل نہ ہو، اگر خدا پر یقین رکھنے کے باوجود شرک کو نہ چھوڑا تو وہ نہ ایمان شرعی ہے نہ اسکے ذریعہ سے امن و ہدایت نصیب ہو سکتی ہے: وَهُوَ كَمَا قَالَ: وَمَا يُؤۡمِنُ اَكۡثَرُهُمۡ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمۡ مُّشۡرِكُوۡنَ (یوسف:۱۰۶)۔

چونکہ ایمان شرک کا جمع ہونا بظاہر مستبعد تھا اس لئے مترجم محقق قدس سرہ نے بغرض تسہیل وتفہیم ایمان کا ترجمہ "یقین" سے اور ظلم کا "نقصان" سے کیا جو لغت عرب کے عین مطابق ہے، کما قولہ تعالیٰ: وَلَمۡ تَظۡلِمۡ مِّنۡهُ شَيۡـًٔا (الکہف:۳۳) اور اس نقصان سے مراد شرک ہی لیا جائے گا جیسا کہ احادیث میں تصریح ہو چکی اور خود نظم کلام میں لفظ لبس اسکا قرینہ ہے اسکی مفصل تحقیق خود مترجم رحمہ اللہ مقدمہ میں فرما چکے ہیں وہاں دیکھ لیا جائے۔

وَتِلۡكَ حُجَّتُنَاۤ اٰتَيۡنٰهَاۤ اِبۡرٰهِيۡمَ عَلٰى قَوۡمِهٖ ؕ نَرۡفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنۡ نَّشَآءُ ؕ

اور یہ ہماری دلیل ہے کہ ہم نے دی تھی ابراہیم کو اس کی قوم کے مقابلہ میں، درجے بلند کرتے ہیں ہم جس کے چاہیں

اِنَّ رَبَّكَ حَكِيۡمٌ عَلِيۡمٌ ﴿۸۳﴾

تیرا رب حکمت والا ہے جاننے والا

خلاصہ تفسیر: حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصہ سے توحید کا اثبات اور رسالت کی تائید ہوگئی، اب آگے ان دونوں مسئلوں کی مزید تائید کے لیے انبیاء علیہم السلام کا ایک اور مختصر تذکرہ کرتے ہیں جن کو ابراہیم علیہ السلام سے خاص خاص تعلقات بھی ہیں، کسی کو ولدیت کا، کسی کو نبوت کا، کسی کو اتباع کا، پس اس تذکرہ میں اہل عرب کو جو اپنے آپ کو ابراہیم کی طرف منسوب کرتے تھے تنبیہ ہے کہ ان کے متعلقین تو موحد تھے، پھر تم کیسی اولاد ہو کہ ان کے طریقہ کے خلاف کرتے ہو، نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ نبوت پہلے سے چلی آرہی ہے، پھر اس کو بعید کیوں سمجھا جاتا ہے، اور اس تمام تذکرہ سے ابراہیم علیہ السلام کی حجت کی تقویت بھی ہو جائے گی۔

اور یہ (حجت جو ابراہیم علیہ السلام نے توحید پر قائم کی تھی) ہماری (دی ہوئی) حجت تھی وہ ہم نے ابراہیم کو ان کی قوم کے مقابلہ میں دی تھی (جب ہماری دی ہوئی تھی تو یقیناً اعلیٰ درجہ کی تھی اور ابراہیم علیہ السلام کی کیا تخصیص ہے) ہم (تو) جس کو چاہتے ہیں (علمی وعملی) مرتبوں میں بڑھا دیتے ہیں (چنانچہ سب انبیاء کو یہ رفعت درجات عطا فرمائی) بیشک آپ کا رب بڑے علم والا بڑی حکمت والا ہے (کہ ہر ایک کا حال اور استعداد جانتا ہے اور ہر ایک کے مناسب اس کو کمال عطا فرماتا ہے)۔

* * *

فائدہ: یعنی ابراہیم کو ایسی دلائل قاہرہ دے کر ان کی قوم پر غالب فرمانا اور دنیا و آخرت میں سربلند کرنا اسی علیم وحکیم کا کام ہو سکتا ہے جو ہر شخص کی استعداد و قابلیت کو جانتا ہے اور اپنی حکمت سے ہر چیز کو اس کے مناسب موقع ومقام پر رکھتا ہے۔

وَوَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ؕ كُلًّا هَدَيْنَا ۚ وَنُوْحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهٖ

اور بخشا ہم نے ابراہیم کو اسحاق کو اور یعقوب سب کو ہم نے ہدایت دی ۱؎ اور نوح کو ہدایت کی ہم نے ان سب سے پہلے ۲؎ اور اسکی اولاد میں سے

دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ وَاَيُّوْبَ وَيُوْسُفَ وَمُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۸۴﴾

داؤد اور سلیمان کو اور ایوب اور یوسف کو اور موسیٰ اور ہارون کو ۳؎ اور ہم اسی طرح بدلہ دیا کرتے ہیں نیک کام والوں کو

خلاصہ تفسیر: اب حق تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل میں سترہ پیغمبروں کا ذکر کیا کہ جو سب توحید کی دعوت اور شرک کا رد کرتے رہے اور حضرت ابراہیم کے جدامجد حضرت نوح کا بھی ذکر کیا تا کہ اصول اور فروع دونوں اعتبار سے ابراہیم کی بزرگی اور خدا پرستی ثابت ہوجائے اور معلوم ہوجائے کہ یہ سب حضرات موحد اور توحید کے داعی اور شرک کا رد کرنے والے تھے۔

اور (ہم نے جیسا ابراہیم علیہ السلام کو ذاتی علم و عمل دیا، اسی طرح یہ فضیلت بھی دی گئی کہ ان کے اصول اور فروع میں بہتوں کو کمال نبوت دیا چنانچہ) ہم نے ان کو (ایک بیٹا) اسحاق دیا اور (ایک پوتا) یعقوب (دیا، اور دونوں میں سے) ہر ایک کو (حق کے طریق کی) ہم نے ہدایت کی، اور (ابراہیم سے) پہلے زمانہ میں ہم نے نوح (علیہ السلام) کو (جن کا ابراہیم کے اجداد میں ہونا مشہور ہے۔ اصل یعنی آباء واجداد کی فضیلت فرع یعنی اولاد میں بھی مؤثر ہوتی ہے۔ حق کے طریق کی) ہدایت کی اور ان (ابراہیم) کی اولاد (لغوی یا عرفی یا شرعی) میں سے (اخیر تک جتنے مذکور ہیں سب کو حق کے طریق کی ہدایت کی یعنی) داؤد کو اور (ان کے صاحبزادہ) سلیمان کو اور ایوب کو اور یوسف کو اور موسیٰ کو اور ہارون (علیہم السلام) کو (حق کے طریق کی ہدایت کی) اور (جب یہ سب ہدایت پر چلے تو خدا نے ان کو جزائے خیر بھی دی جیسے ثواب اور زیادہ قرب، اور جس طرح نیک کاموں پر ان کو جزاء دی) اسی طرح (ہماری عادت ہے کہ) ہم نیک کام کرنے والوں کو (مناسب) جزاء دیا کرتے ہیں۔

وَوَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ: یہاں حضرت اسحاق اور یعقوب علیہما السلام کے ذکر سے دوسری اولاد کا انکار لازم نہیں آتا، چنانچہ حضرت اسماعیل علیہ السلام بھی بلاواسطہ ان کی اولاد ہیں، ان کا ذکر بھی آگے آرہا ہے۔

وَكَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ: بعض مفسرین کا قول ہے کہ ہم محسنین کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں جیسی ابراہیم علیہ السلام کو جزا دی کہ ان کے درجات بلند کیے، ان کی اولاد میں ترقی دی، اولاد میں نبوت عطا فرمائی، اس میں دلالت ہے کہ اولاد کے صالح اور نیک ہونے میں آباء واجداد کی صلاح ونیکی کا بھی دخل ہے کہ ان کے محسن ہونے کا یہ صلہ ملتا ہے کہ ان کی اولاد میں بھی صلاحیت پیدا کی جاتی ہے، چنانچہ مشائخ کی اولاد میں مشاہدہ ہے کہ ان میں رشد کی ایک خاص شان ایسی ہوتی ہے جو دوسروں میں نہیں ہوتی بشرطیکہ کوئی معارض پیش نہ آئے، اگر کوئی معارض پیش آجائے مثلاً برائی میں پڑ جائیں یا کوئی غلط ماحول اور صحبت مل جائے تو اس کے خلاف بھی ہوسکتا ہے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی نہ صرف یہ کہ ہم نے ابراہیم کو ذاتی علم وفضل سے سرفراز کیا بلکہ بڑھاپے میں اسحاق جیسا بیٹا اور یعقوب جیسا پوتا عطا فرمایا، یعقوب وہ ہی اسرائیل ہیں جن کی طرف دنیا کی ایک عظیم الشان قوم بنی اسرائیل منسوب ہے جن میں سے ہزاروں نبی اٹھائے گئے بلکہ جیسا کہ قرآن میں دوسری جگہ مذکور ہے، ابراہیم کے بعد حق تعالیٰ نے ہمیشہ کے لئے ان ہی کی نسل میں نبوت اور پیغمبری رکھ دی۔

فائدہ: ۲؎ پہلے ابراہیم کے بعض فروع کا ذکر تھا اب بعض اصول کو ذکر فرمایا، کیونکہ نوح حضرت ابراہیم کے اجداد میں سے ہیں اور جس طرح حضرت ابراہیم کے بعد نبوت کتاب کا انحصار صرف ان کی ذریت میں کر دیا گیا تھا، اسی طرح نوع کے بعد نوح انسانی کا انحصار نوح کی نسل میں ہوگیا گویا طوفان کے بعد وہ دنیا کے لئے آدم ثانی ہوئے وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهٗ هُمُ الْبٰقِيْنَ (صفت: ۷۷)

فائدہ: ۳؎ ظاہری ملک وسلطنت کے اعتبار سے انبیاء میں داؤد اور سلیمان ہم رنگ ہیں مصائب وشدائد پر صبر کرنے کے لحاظ سے ایوب و

یوسف میں خاص مشابہت ہے، باقی موسیٰ اور ہارون کے قریبی تعلقات کی نسبت تو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، خود حضرت موسیٰ نے ہارون کو بطور اپنے وزیر کے حق تعالیٰ سے طلب کیا تھا، مترجم محقق قدس اللہ روحہ نے ان میں سے ہر دو ناموں کے بعد لفظ ''کو'' لا کر شائد اسی قسم کے لطائف پر متنبہ فرمایا ہے، واللہ اعلم

وَزَكَرِيَّا وَيَحْيٰى وَعِيسٰى وَإِلْيَاسَ ۚ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿٨٥﴾

اور زکریا اور یحییٰ اور عیسیٰ اور الیاس کو، سب ہیں نیک بختوں میں

وَإِسْمٰعِيْلَ وَالْيَسَعَ وَيُوْنُسَ وَلُوْطًا ۚ وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿٨٦﴾

اور اسماعیل اور الیسع کو اور یونس کو اور لوط کو، اور سب کو ہم نے بزرگی دی سارے جہان والوں پر

خلاصہ تفسیر: اور نیز (ہم نے حق کے طریق کی ہدایت کی) زکریا کو اور (ان کے صاحبزادہ) یحییٰ کو اور عیسیٰ کو اور الیاس (علیہم السلام) کو (اور یہ) سب (حضرات) پورے شائستہ لوگوں میں تھے، اور نیز (ہم نے حق کے طریق کی ہدایت کی) اسماعیل کو اور یسع کو اور یونس کو اور لوط (علیہم السلام) کو اور (ان میں سے) ہر ایک کو (ان زمانوں کے) تمام جہان والوں پر (نبوت سے) ہم نے فضیلت دی۔

* * *

فائدہ: یعنی اپنے اپنے زمانہ کے جہان والوں پر۔

وَمِنْ اٰبَآئِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ وَإِخْوَانِهِمْ ۚ وَاجْتَبَيْنٰهُمْ وَهَدَيْنٰهُمْ إِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿٨٧﴾

اور ہدایت کی ہم نے بعضوں کو انکے باپ داؤں میں سے اور انکی اولاد میں سے اور بھائیوں میں سے اور انکو ہم نے پسند کیا اور سیدھی راہ چلایا

ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ وَلَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿٨٨﴾

یہ اللہ کی ہدایت ہے اس پر چلاتا ہے جسکو چاہے اپنے بندوں میں سے [1] اور اگر یہ لوگ شرک کرتے تو البتہ ضائع ہو جاتا جو کچھ انہوں نے کیا تھا [2]

خلاصہ تفسیر: اور نیز ان (مذکورہ حضرات) کے کچھ باپ داداؤں کو اور کچھ اولاد کو اور کچھ بھائیوں کو (حق کے راستے کی ہم نے ہدایت کی) اور ہم نے ان (سب) کو مقبول بنایا، اور (جس ہدایت کا ذکر پیچھے مجمل آیا ہے اس کو سنو کہ وہ ہدایت کس چیز کی تھی، وہ یہ کہ) ہم نے ان (سب) کو راہ راست (یعنی دین حق) کی ہدایت کی (اور وہ دین جس کی ان سب کو ہدایت ہوئی تھی) اللہ کی (جانب سے جو) ہدایت (ہوتی ہے) وہ یہی (دین) ہے، اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے اس کی ہدایت (یعنی منزل پر پہنچانے کی صورت میں) کرتا ہے (چنانچہ اب جو لوگ موجود ہیں ان کو بھی اسی کی ہدایت اس معنی سے ہوئی کہ ان کو صحیح راستہ دکھا دیا، پھر منزل پر پہنچانا یا نہ پہنچانا ان کا کام ہے، مگر ان میں سے بعض نے اس کو چھوڑ کر شرک اختیار کر لیا) اور (شرک اس قدر ناپسند چیز ہے کہ غیر انبیاء تو کس شمار میں ہیں) اگر فرضاً یہ حضرات (مذکورہ انبیاء) بھی (نعوذ باللہ) شرک کرتے تو جو کچھ یہ (نیک) اعمال کیا کرتے تھے ان سے سب اکارت ہو جاتے۔

وَاجْتَبَيْنٰهُمْ وَهَدَيْنٰهُمْ: یعنی ہم نے ان کو مقبول بنایا اور ہم نے ان کو راہ راست کی ہدایت کی، ''اجتباء'' (مقبولیت) کا حاصل ''جذب'' ہے، اور ''ہدایت'' (رہنمائی) کا حاصل ''سلوک'' ہے، جذب و سلوک علم تصوف کی خاص اصطلاح ہیں، جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رہنمائی کے دو طریقے ہیں: ایک یہ کہ راہ کی نشاندہی کر دی جائے کہ اس پر چل کر بندہ اپنی منزل تک پہنچ جاتا ہے، اسے ''طریق سلوک'' کہا جاتا ہے، دوسری صورت یہ کہ اللہ تعالیٰ خود اپنے فضل و کرم سے کسی کو منزل تک پہنچا دیں، اسے ''طریق جذب'' کہا جاتا ہے، ہر دو طریق میں عبادت و ریاضت ضروری رہتی ہے، انبیاء کرام کو ''طریق جذب'' سے سرفراز کیا جاتا ہے اور غیر انبیاء کو دونوں طریق سے ہدایت نصیب کی جاتی ہے۔

وَلَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ: یعنی اگر بالفرض ومحال یہ حضرات شرک کرتے تو جو کچھ یہ اعمال کیا کرتے تھے ان سے سب اکارت ہوجاتے، تو جب شرک کرنے کی صورت میں انبیاء سے یہ معاملہ ہوتا تو غیر انبیاء تو کس شمار میں ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا ایسا کوئی خاص محبوب بندہ نہیں جس پر کسی بھی حال میں مواخذہ نہ ہوسکے، جیسا کہ بعض جاہل صوفی امت کے بعض اولیاء اللہ کو اللہ کا معشوق سمجھ کر ان کے بارے میں ایسا گمان رکھتے ہیں کہ ان سے مواخذہ نہیں ہوتا تو یہ درست نہیں۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی خالص توحید اور معرفت واطاعت خداوندی کا راستہ ہی وہ ہے، جس پر حق تعالیٰ اپنے فضل وتوفیق سے مقبول بندوں کو چلاتا ہے پھر اس کے صلہ میں حسب استعداد درجات بلند کرتا ہے۔

فائدہ: ۲ یہ ہم کو سنایا گیا کہ شرک انسان کے تمام اعمال کو حبط کردیتا ہے اور کسی کی تو حقیقت کیا ہے اگر بفضل محال انبیاء ومقربین سے معاذ اللہ ایسی حرکت سرزد ہو تو سارا کیا دھرا اکارت ہوجائے۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ۚ فَاِنْ يَّكْفُرْ بِهَا هٰٓؤُلَاۗءِ فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا

یہی لوگ تھے جن کو دی ہم نے کتاب اور شریعت اور نبوت، پھر اگر ان باتوں کو نہ مانیں مکہ والے تو ہم نے ان باتوں کے لئے مقرر کردیے ہیں

قَوْمًا لَّيْسُوْا بِهَا بِكٰفِرِيْنَ ﴿٨٩﴾

ایسے لوگ جو ان سے منکر نہیں

خلاصہ تفسیر: (اب مسئلہ نبوت کی طرف اشارہ ہے کہ) یہ (جتنے مذکور ہوئے) ایسے تھے کہ ہم نے ان (کے مجموعہ) کو کتاب (آسمانی) اور حکمت (کے علوم) اور نبوت عطاء کی تھی (تو نبوت کوئی عجیب چیز نہیں جو یہ کافر لوگ آپ کے منکر ہو رہے ہیں، کیونکہ بہت سے نظائر موجود ہیں) سو اگر (نظیر موجود ہونے پر بھی) یہ لوگ (آپ کی) نبوت کا انکار کریں تو (آپ غم نہ کیجئے کیونکہ) ہم نے اس کے (ماننے کے) لئے ایسے بہت لوگ مقرر کردیے ہیں (یعنی مہاجرین وانصار) جو اس کے منکر نہیں ہیں۔

* * *

فائدہ: اگر مکہ کے کافر یا دوسرے منکرین ان باتوں (کتاب، شریعت اور نبوت) سے انکار کریں تو خدا کا دین ان پر موقوف نہیں، ہم نے دوسری قوم یعنی مہاجرین اور انصار اور ان کے اتباع کو ان چیزوں کی تسلیم وقبول اور حفاظت وترویج کے لئے مسلط فرمادیا ہے، جو ہماری کسی بات سے بھی منہ موڑنے والے نہیں۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ ۭ قُلْ لَّآ اَسْـَٔــلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ۭ

یہ وہ لوگ تھے جن کو ہدایت کی اللہ نے سو تو چل ان کے طریقہ پر ۱ تو کہہ دے کہ میں نہیں مانگتا تم سے اس پر کچھ مزدوری

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٰي لِلْعٰلَمِيْنَ ﴿٩٠﴾

ع ۱۰

یہ تو محض نصیحت ہے جہان کے لوگوں کو ۲

خلاصہ تفسیر: (اور ہم جو غم نہ کرنے کو اور صبر کرنے کو کہتے ہیں تو وجہ یہ ہے کہ سب انبیاء نے ایسا ہی کیا ہے چنانچہ) یہ حضرات (مذکورہ انبیاء) ایسے تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے (اس صبر کی) ہدایت کی تھی سو (اس باب میں) آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بھی انہی کے طریق (صبر) پر چلئے (چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی اس کی ہدایت کی گئی ہے، کیونکہ ان لوگوں سے نہ آپ کو کوئی نفع نہ کوئی نقصان ہے جس کی وجہ سے غم اور بے صبری ہو اور اس

مضمون کے اظہار کے واسطے ان سے تبلیغ کے وقت) آپ (یہ بھی) کہہ دیجئے کہ میں تم سے (اس تبلیغ قرآن) پر کچھ معاوضہ نہیں چاہتا (جس کے ملنے سے نفع اور نہ ملنے سے نقصان ہو، بلکہ بے غرض نصیحت کرتا ہوں) یہ (قرآن) تو صرف تمام جہانوں کے واسطے ایک نصیحت ہے (جس کو ماننے سے تمہارا ہی نفع اور نہ ماننے سے تمہارا ہی نقصان ہے)۔

* * *

فائدہ: لے تمام انبیاء عقائد، اصول دین اور مقاصد کلیہ میں متحد ہیں، سب کا دستور اساسی ایک ہے ہر نبی کو اس پر چلنے کا حکم ہے آپ بھی اس طریق مستقیم پر چلتے رہنے کے مامور ہیں، گویا اس آیت میں متنبہ کر دیا کہ اصولی طور پر آپ کا راستہ انبیائے سابقین کے راستے سے جدا نہیں، رہا فروع کا اختلاف وہ ہر زمانہ کی مناسبت واستعداد کے اعتبار سے پہلے بھی واقع ہوتا رہا ہے اور اب بھی واقع ہو تو مضائقہ نہیں۔

فائدہ: علمائے اصول نے اس آیت کے عموم سے یہ مسئلہ نکالا ہے کہ اگر نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کسی معاملہ میں شرائع سابقہ کا ذکر فرمائیں تو اس امت کے حق میں بھی سند ہے بشرطیکہ شارع نے اس پر کلی یا جزوی طور پر انکار نہ فرمایا ہو۔

فائدہ: ۲ یعنی اگر تم نہیں مانتے تو میرا کوئی نفع فوت نہیں ہوتا کیونکہ میں تم سے کسی طرح کے اجر کا طالب نہیں، میرا اجر تو خدا کے یہاں ثابت ہے، ہاں تم نصیحت سے انحراف کر کے خود اپنا نقصان کرو گے سارے جہان میں سے ایک نہیں تو دوسرا نصیحت کو قبول کرے گا، جو انکار کرے گا اسے اپنی محرومی اور بدبختی کا ماتم کرنا چاہئے۔

وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدۡرِهٖۤ اِذۡ قَالُوۡا مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنۡ شَىۡءٍ ؕ قُلۡ مَنۡ اَنۡزَلَ الۡكِتٰبَ

اور نہیں پہچانا انہوں نے اللہ کو پورا پہچاننا جب کہنے لگے کہ نہیں اتاری اللہ نے کسی انسان پر کوئی چیز لے پوچھ تو کس نے اتاری وہ کتاب

الَّذِىۡ جَآءَ بِهٖ مُوۡسٰى نُوۡرًا وَّهُدًى لِّلنَّاسِ تَجۡعَلُوۡنَهٗ قَرَاطِيۡسَ تُبۡدُوۡنَهَا وَتُخۡفُوۡنَ كَثِيۡرًا ۚ

جو موسیٰ لے کر آیا تھا روشن تھی اور ہدایت تھی لوگوں کے واسطے جس کو تم نے ورق ورق کر کے لوگوں کو دکھلایا اور بہت سی باتوں کو تم نے چھپا رکھا

وَعُلِّمۡتُمۡ مَّا لَمۡ تَعۡلَمُوۡۤا اَنۡتُمۡ وَلَاۤ اٰبَآؤُكُمۡ ؕ قُلِ اللّٰهُ ۙ ثُمَّ ذَرۡهُمۡ فِىۡ خَوۡضِهِمۡ يَلۡعَبُوۡنَ ﴿۹۱﴾

اور تم کو سکھلا دیں جن کو نہ جانتے تھے تم اور نہ تمہارے باپ دادے ۲ تو کہہ دے کہ اللہ نے اتاری، پھر چھوڑ دے انکو اپنی خرافات میں کھیلتے رہیں ۳

خلاصہ تفسیر: پیچھے مسئلہ توحید کا ذکر تھا اگرچہ ضمن میں رسالت کی بھی تائید تھی، اب مسئلہ رسالت کا بالقصد ذکر کیا جاتا ہے، اس کے نزول کا سبب یہ ہوا تھا کہ ایک یہودی جس کا نام مالک بن الصیف تھا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر کچھ مذہبی گفتگو کی اور جوش میں آ کر اس قدر مبالغہ کیا کہ کہنے لگا کہ کسی بشر پر اللہ تعالی نے کوئی کتاب نازل نہیں کی، اور ایک روایت میں ہے کہ یہود نے کہا کہ واللہ آسمان سے کوئی کتاب اللہ تعالی نے نازل نہیں کی اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

اور ان (منکر) لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی جیسی قدر پہچاننا واجب تھی، ویسی قدر نہ پہچانی جبکہ (منہ بھر کر) یوں کہہ دیا کہ اللہ تعالیٰ نے کسی بشر پر کوئی چیز (یعنی کوئی کتاب) بھی نازل نہیں کی (اب بات میں ناقدر شناسی اس لئے ہے کہ اس سے مسئلہ نبوت کا انکار لازم آتا ہے، اور نبوت کا منکر اللہ کی تکذیب کرتا ہے، اور حق کی تصدیق واجب ہے، منکر نبوت اس واجب کو فوت کرتا ہے، یہ تو تحقیقی جواب تھا، اور الزامی مسکت جواب دینے کے لئے) آپ (ان سے) یہ کہئے کہ (یہ تو بتلاؤ کہ) وہ کتاب کس نے نازل کی ہے جس کو موسیٰ لائے تھے (یعنی توریت جس کو تم بھی مانتے ہو) جس کی یہ کیفیت ہے کہ وہ (خود) نور (کی طرح واضح) ہے اور (جن کی ہدایت کے لئے وہ آئی تھی ان) لوگوں کے لئے وہ (شریعت کا بیان ہونے کی وجہ سے ذریعہ) ہدایت ہے جس کو تم نے (اپنی اغراض نفسانیہ کے لئے) متفرق اوراق میں رکھ چھوڑا ہے جن (میں جتنے اوراق کو چاہا ان) کو ظاہر کر دیتے ہو (جس میں

تمہارے مطلب کے خلاف کوئی بات نہ ہوئی) اور بہت سی باتوں کو (جو اپنے مطلب کے خلاف ہیں، یعنی جن اوراق میں وہ لکھی ہوئی ہیں ان کو) چھپاتے ہو، اور (اس کتاب کی بدولت) تم کو بہت سی ایسی باتیں تعلیم کی گئیں جن کو (کتاب ملنے سے پہلے) نہ تم (یعنی قوم بنی اسرائیل جو کہ اس آیت کے نزول کے وقت موجود تھی) جانتے تھے اور نہ تمہارے (قریب سلسلہ کے) بڑے (جانتے تھے، مطلب یہ کہ جس توریت کی یہ حالت ہے کہ اس کو اولاً تو تم مانتے ہو، دوسرے نور و ہدایت ہونے کی وجہ سے وہ ماننے کے قابل بھی ہے، تیسرے ہر وقت تمہارے استعمال میں ہے، اگرچہ وہ استعمال شرمناک ہے، لیکن اس کی وجہ سے انکار کی گنجائش تو نہیں رہی، چوتھے تمہارے حق میں وہ بڑی نعمت کی چیز ہے کہ اسی کی بدولت آج عالم بنے بیٹھے ہو، اس حیثیت سے بھی اس میں انکار کی گنجائش نہیں، تو یہ بتلاؤ کہ اسکو کس نے نازل کیا ہے؟ اگر خدا نے کوئی کتاب نازل نہیں کی تو یہ کہاں سے آگئی؟ چونکہ اس سوال کا جواب ایسا متعین ہے کہ وہ لوگ بھی اس کے سوا کوئی جواب نہیں دے سکتے، اس لئے حضور ﷺ کو خود ہی جواب دینے کے لیے حکم ہے کہ) آپ کہہ دیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے (مذکورہ کتاب کو) نازل فرمایا ہے (اور اس سے ان کا عام دعویٰ باطل ہو گیا) پھر (یہ جواب سنا کر) ان کو ان کے مشغلہ میں بیہودگی کے ساتھ لگا رہنے دیجئے (یعنی آپ کا منصبی کام ختم ہو گیا، اس پر بھی نہ مانیں تو آپ ﷺ فکر میں نہ پڑیں، ہم خود ہی سمجھ لیں گے)۔

تَجۡعَلُوۡنَهٗ قَرَاطِيۡسَ: یعنی جس تورات کو تم نے متفرق اوراق میں رکھ چھوڑا ہے، اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں، ظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہر مضمون کے اوراق جدا کر رکھے تھے اور بعض کا ایسا کر لینا تعجب نہیں، اور غرض یہ تھی کہ جب ہر مضمون کے اوراق جدا ہوں گے تو ساری کتاب کے مضامین پر لوگوں کو اطلاع نہ ہوگی، جو چاہیں گے چھپا لیں گے، اور مجازاً یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ اپنے ذہن میں تورات کے مضامین کے مختلف حصے تجویز کر رکھتے تھے، بعض مضامین کو جیسے نعت محمد ﷺ کو چھپاتے تھے اور اس کی دوسری طرح تاویلیں کرتے تھے۔

* * *

فائدہ: ۱۔ مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنۡ شَىۡءٍ: پچھلے رکوع میں منصب نبوت اور بہت سے انبیاء کا نام بنام تذکرہ تھا اور یہ کہ نبی عربی (ﷺ) بھی توحید و معرفت کی اسی صراط مستقیم پر چلتے رہنے کے مامور ہیں جس پر انبیائے سابقین کو چلایا گیا تھا، پیغمبروں کا ہدایت خلق اللہ کے لئے بھیجنا حق تعالیٰ کی قدیم عادت رہی ہے آیات حاضرہ میں ان جاہلوں اور معاندوں کا رد کیا گیا ہے جو بدفہمی، جہل و غباوت یا نبی کریم (ﷺ) کی عداوت کے جوش اور غصہ میں بے قابو ہو کر حق تعالیٰ کی اس صفت کا ہی انکار کرنے لگے کہ وہ کسی انسان کو اپنی وحی و مکالمہ خاص سے مشرف فرمائے، گویا انزال کتب وارسال رسل کے سلسلہ ہی کی سرے سے نفی کر دی گئی۔

فائدہ: ۲۔ وَعُلِّمۡتُمۡ مَّا لَمۡ تَعۡلَمُوۡۤا اَنۡتُمۡ وَلَاۤ اٰبَآؤُكُمۡ: یعنی اگر واقعی خدا نے کسی انسان پر کوئی چیز نہیں اتاری تو ''تورات مقدس'' جیسی عظیم الشان کتاب جو احکام و مرضیات الٰہیہ پر بندوں کو مطلع کرتی اور رشد ہدایت کی عجیب و غریب روشنی اپنے اندر رکھتی اور ان چیزوں کا علم تم کو عطا کرتی تھی جنہیں تم اور تمہارے باپ دادا بلکہ کل بنی آدم بھی بدون اعلام الٰہی محض اپنی عقل و حواس سے دریافت نہیں کر سکتے تھے، وہ کہاں سے آگئی اور کس نے موسیٰ پر اتاری، مانا کہ آج تم اسے ورق ورق اور ٹکڑے ٹکڑے کر کے لوگوں کو اپنی خواہش کے موافق دکھلاتے اور اس کے بہت سے اخبار و احکام کو چھپائے بیٹھے ہو، اور اس طرح اس کی اصل روشنی تم نے باقی نہیں چھوڑی، تاہم جو حصہ آج باقی رہ گیا ہے وہ ہی پتہ دے رہا ہے کہ جس محل کے کھنڈرات یہ ہیں وہ اپنی زمانہ عروج میں کیسا عظیم الشان ہوگا۔

فائدہ: ۳۔ ثُمَّ ذَرۡهُمۡ فِىۡ خَوۡضِهِمۡ يَلۡعَبُوۡنَ: یعنی ایسا نور و ہدایت بجز خدا کے اور کس خزانہ سے آسکتا ہے؟ اگر ایسی صاف اور بدیہی چیز کو بھی لوگ نہیں مانتے تو آپ تبلیغ و تنبیہ کر کے سبکدوش ہو جائیے اور ان کو چھوڑ دیجئے کہ یہ اپنی خرافات اور لہو و لعب میں مشغول رہیں اور جب وقت آئے گا خدا خود ان کو بتلا دے گا۔

وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ مُّصَدِّقُ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَلِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى

اور یہ قرآن کتاب ہے جو کہ ہم نے اتاری برکت والی تصدیق کرنے والی ان کی جو اس سے پہلی ہیں ۱؎ اور تاکہ تو ڈراوے مکہ والوں کو

وَمَنْ حَوْلَهَا ؕ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَهُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ﴿۹۲﴾

اور اس کے آس پاس والوں کو ۲؎ اور جن کو یقین ہے آخرت کا وہ اس پر ایمان لاتے ہیں اور وہ ہیں اپنی نماز سے خبردار ۳؎

خلاصہ تفسیر: اور (جس طرح توریت ہماری نازل کی ہوئی کتاب تھی اسی طرح) یہ (قرآن) بھی (ہے، اور یہود کا اس بے ہودہ دعوی سے مقصود بھی اسی کو جھٹلانا ہے) ایسی ہی کتاب ہے جس کو ہم نے (آپ ﷺ پر) نازل کیا ہے جو بڑی (خیرو) برکت والی ہے (چنانچہ اس پر ایمان لانا اور عمل کرنا دونوں جہاں میں کامیابی کا سبب ہے اور) اپنے سے پہلے (نازل شدہ) کتابوں (کے اللہ کی طرف سے نازل ہونے) کی تصدیق کرنے والی ہے (سو ہم نے اس قرآن کو مخلوق کے نفع اور کتب آسمانی کی تصدیق کے لئے نازل فرمایا) اور (اس لئے نازل فرمایا) تاکہ آپ (اس کے ذریعہ سے) مکہ والوں کو اور آس پاس والوں کو (یعنی ان لوگوں کو خصوصیت کے ساتھ عذاب الٰہی سے جو کہ مخالفت پر نازل ہوگا) ڈرائیں (کیونکہ پیغمبر کو پہلے اپنے خاندان اور قوم کی اصلاح کا حکم ہوتا ہے، اور یوں عام طور پر تو سب کو ڈرانے کا آپ کو حکم ہے: لیکون للعالمین نذیرًا) اور (آپ کے ڈرانے کے بعد اگرچہ سب ایمان نہ لائیں لیکن) جو لوگ آخرت کا (پورا) یقین رکھتے ہیں (جس سے عذاب کا ڈر اور اس سے بچنے کی فکر پڑ جائے اور ہمیشہ نجات کا طریقہ معلوم کرنے اور راہ حق طلب کرنے کی دھن لگ جائے خواہ کسی بھی دلیل سے) ایسے لوگ (تو) اس (قرآن) پر ایمان لے (ہی) آتے ہیں اور (ایمان واعتقاد کے ساتھ اس کے اعمال کے بھی پابند ہوتے ہیں، کیونکہ عذاب سے نجات کا وعدہ کامل مجموعہ پر ہے، چنانچہ) وہ اپنی نماز پر مداومت رکھتے ہیں (جب نماز جیسی عبادت کی پابندی کرتے ہیں جو کہ دن میں پانچ بار مکرر ہونے کی وجہ سے بہت گراں ہے، تو دوسری عبادات جو کہ کبھی کبھی ہیں اور آسان بھی ہیں ان کے تو بدرجہ اولی پابند ہوں گے، حاصل یہ کہ کسی کے ماننے نہ ماننے کی فکر نہ کیجئے جو اپنا بھلا چاہیں گے مان لیں گے، جو نہ چاہیں گے نہ مانیں گے آپ ﷺ اپنا کام کیجئے)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی اگر خدا نے کوئی چیز نہیں اتاری تو یہ مبارک کتاب کہاں سے آئی جسکا نام قرآن ہے اور جو تمام پچھلی کتابوں کے مضامین کی تصدیق کرنے والی ہے، اگر یہ آسمانی کتاب نہیں تو بتلاؤ کس کی تصنیف ہے جسکا مثل لانے پر جن وانس قادر نہ ہوں کیا اسے ایک امی کی تصنیف کہہ سکتے ہیں۔

فائدہ: ۲؎ ''اُم القریٰ'' بستیوں کی اصل اور جڑ کو کہتے ہیں مکہ معظمہ تمام عرب کا دینی اور دنیاوی مرجع تھا اور جغرافیائی حیثیت میں بھی قدیم دنیا کے وسط میں مرکز کی طرف واقع ہے اور جدید دنیا (امریکہ) اس کے نیچے ہے اور روایات حدیثیہ کے موافق پانی سے زمین بنائی گئی تو اول یہی جگہ کھلی تھی، ان وجوہ سے مکہ کو ''اُم القریٰ'' فرمایا اور آس پاس سے مراد یا عرب ہے کیونکہ دنیا میں قرآن کے اول مخاطب وہی تھے، ان کے ذریعہ سے باقی دنیا کو خطاب ہوا اور یا سارا جہان مراد ہو جیسے فرمایا: لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا ۙ (الفرقان: ۱)

فائدہ: ۳؎ جسے آخرت کی زندگی پر یقین اور بعد الموت کا خیال ہوگا، اسی کو ہدایت اور طریق نجات کی تلاش ہوگی وہی پیغام الٰہی کو قبول اور نماز وغیرہ عبادات کی حفاظت کرے گا۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ قَالَ اُوْحِيَ اِلَيَّ وَلَمْ يُوْحَ اِلَيْهِ شَيْءٌ وَّمَنْ قَالَ

اور اس سے زیادہ ظالم کون جو باندھے اللہ پر بہتان یا کہے مجھ پر وحی اتری اور اس پر وحی نہیں اتری کچھ بھی اور جو کہے کہ

سَاُنْزِلُ مِثْلَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ ؕ وَلَوْ تَرٰى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِيْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ

میں بھی اتارتا ہوں مثل اس کے جو اللہ نے اتارا ۱؎ اور اگر تو دیکھے جس وقت کہ ظالم ہوں موت کی سختیوں میں ۲؎ اور فرشتے

بَاسِطُوْٓا اَيْدِيْهِمْ ۚ اَخْرِجُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ

اپنے ہاتھ بڑھا رہے ہیں کہ نکالو اپنی جانیں ۳؎ آج تم کو بدلے میں ملے گا ذلت کا عذاب ۴؎ اس سبب سے کہ تم کہتے تھے

عَلَى اللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ وَكُنْتُمْ عَنْ اٰيٰتِهٖ تَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۹۳﴾

اللہ پر جھوٹی باتیں اور اس کی آیتوں سے تکبر کرتے تھے ۵؎

خلاصہ تفسیر: پیچھے منکرین نبوت کی اقسام میں سے بعض کا رد تھا، آگے دوسری قسموں کی بھی مذمت: ① بعض وہ تھے کہ صرف آپ کی نبوت کا انکار کرتے تھے، مگر اپنے لیے بھی کوئی دعویٰ نہ کرتے تھے ② دوسرے وہ تھے جو اپنے لیے خود نبوت کے مدعی تھے جیسے مسیلمہ کذاب وغیرہ ③ تیسرے وہ جو قرآن کی طرح تصنیف کرنے کے مدعی تھے جیسے نضر بن حارث اور عبد اللہ بن ابی سرح وغیرہ، اب آگے ان سب کی مذمت ہے، اور چونکہ نضر بن حارث نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر مجھے عذاب ہونے لگا تو لات وعزیٰ شفاعت کردیں گے اس لیے اگلی آیت میں اس کا بھی جواب ہے۔

اور اس شخص سے زیادہ کون ظالم ہوگا جو اللہ پر جھوٹ تہمت لگائے (اور خاص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت یا مطلق نبوت کا منکر ہو، جیسا کہ پیچھے بعض کا قول آیا ہے: مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَيْءٍ اور بعض کا قول تھا: ابعث اللہ بشرا رسولاً) یا یوں کہے کہ مجھ پر وحی آتی ہے، حالانکہ اس کے پاس کسی بات کی بھی وحی نہیں آئی (یہ وہ لوگ ہیں جو خود مدعی نبوت ہیں، جیسے مسیلمہ وغیرہ) اور (اسی طرح اس سے بھی زیادہ ظالم کون ہوگا) جو شخص کہ یوں کہے کہ جیسا کلام اللہ تعالیٰ نے (رسول کے دعوے کے مطابق) نازل کیا ہے، اسی طرح کا میں بھی لا (کردکھا) تا ہوں (مگر آج تک کبھی اپنے دعوے کرکے نہ دکھلا سکے جیسا نضر یا عبد اللہ کہتا تھا، غرض یہ سب لوگ بڑے ظالم ہیں) اور (ظالموں کا حال یہ ہے کہ) اگر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم ان کو) اس وقت دیکھیں (تو بڑا ہولناک منظر دکھلائی دے) جبکہ یہ ظالم لوگ (جن کا ذکر ہوا) موت کی (روحانی) سختیوں میں (گرفتار) ہوں گے اور (موت کے) فرشتے (جو ملک الموت کے معاون ہیں ان کی روح نکالنے کے واسطے ان کی طرف) اپنے ہاتھ بڑھا رہے ہوں گے (اور شدت کے ظاہر کرنے کو یوں کہتے جاتے ہوں گے کہ) ہاں! (جلدی) اپنی جانیں نکالو (کہاں بچاتے پھرتے تھے، دیکھو) آج (مرنے کے ساتھ ہی) تم کو ذلت کی سزا دی جائے گی (یعنی جس میں جسمانی تکلیف بھی ہو اور روحانی ذلت بھی ہو) اس سبب سے کہ تم اللہ تعالیٰ کے ذمہ جھوٹی (جھوٹی) باتیں بکتے تھے (جیسے مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ اور اُوْحِيَ اِلَيَّ اور سَاُنْزِلُ وغیرہ) اور تم اللہ تعالیٰ کی آیات (کے قبول کرنے) سے (جو کہ ہدایت کا ذریعہ تھی) تکبر کرتے تھے (یہ کیفیت تو موت کے وقت ہوگی)۔

وَلَوْ تَرٰى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِيْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ: یہاں غمرٰت کی تفسیر ''روحانی سختیوں'' سے اس لیے کی گئی کہ نزع کی ظاہری شدت نہ کفار کے لیے ہمیشہ لازم ہے، نہ ان کے ساتھ خاص ہے، بلکہ کبھی مسلمانوں کو بھی ہوسکتی ہے، البتہ روحانی سختی کفار ہی کے لیے خاص ہے، مسلمان اکثر موت کے وقت خدا تعالیٰ سے ملنے کا مشتاق ہوجاتا ہے، اس اشتیاق میں وہ ایسا محو ہوجاتا ہے کہ نزع کی ظاہری شدت کی روح کو خبر بھی نہیں ہوتی۔

وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَاسِطُوْٓا اَيْدِيْهِمْ اَخْرِجُوْٓا اَنْفُسَكُمْ: یعنی فرشتے اپنے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہیں گے کہ ہاں! اپنی جانیں نکالو، فرشتے یہ بات محض شدت اور سختی ظاہر کرنے کے لیے کہیں گے، یہ وجہ نہ ہوگی کہ بغیر مانگے ان کی جان نہ نکلے گی، بلکہ فرشتے خود جان نکالتے جائیں گے اور دھمکی

کے طور پر یہ بات کہتے جائیں گے جیسے کوئی شخص چیز لے کر بھاگ جائے اور اس کو بغل میں چھپاتا پھرے، پھر جب اس کو پکڑ لیا جائے تو اس کے بغل میں ہاتھ ڈال کر اس چیز کو نکالتے ہوئے غصہ سے کہتے ہیں کہ نکال یہاں سے کہاں چھپائے پھرتا ہے، ظاہر ہے کہ اس کہنے سے مقصود صرف اس کو دھمکانا اور شرمندہ کرنا ہوتا ہے۔

بعض روایات میں سے معلوم ہوتا ہے کہ عبداللہ بن ابی سرح جو اپنے لیے وحی کا مدعی تھا پھر اس نے شرمندہ ہو کر توبہ کر لی اور اسلام لے آیا تو وہ اس وعید سے مستثنیٰ ہو جائے گا، کیونکہ وعید کی جو علت تھی جب وہ ختم ہو گئی تو پھر اس کے وعید بھی نہیں۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا: اگر کوئی خواب تراشے یا کسی وارد قلبی یا جھوٹے الہام کا دعویٰ کرے یا اپنے اوہام و خیالات کو فیضان غیبی ظاہر کرے یا مشیخت کا دعویٰ کرتے تو ایسا شخص بھی اس آیت کے مفہوم میں آ جاتا ہے۔

* * *

فائدہ: ١ سَاُنْزِلُ مِثْلَ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ: خدا پر بہتان باندھنے سے شاید یہ مراد ہے کہ خدا کی طرف ان باتوں کی نسبت کرے جو اس کی شان رفیع کے لائق نہیں، مثلاً کسی کو اس کا شریک ٹھہرائے یا بیوی بچے تجویز کرے یا یوں کہے: مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰی بَشَرٍ مِّنْ شَیْءٍ (الانعام:۹۱) یعنی اس نے بندوں کی ہدایت کا کوئی سامان نہیں کیا، ایسا کہنے والا سخت ظالم ہے اسی طرح جو شخص نبوت و پیغمبری کا جھوٹا دعویٰ کرے یا یہ ڈینگ مارے کہ خدا کے جیسا کلام تو میں لا سکتا ہوں جیسے بعض مشرکین کہتے تھے: لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَاۤ (الانفال ۳۱) یہ سب باتیں انتہائی ظلم اور دیدہ دلیری کی ہیں جس کی سزا کا تھوڑا سا حال آگے مذکور ہے۔

فائدہ: ٢ فِیْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ: یعنی موت کی باطنی اور روحانی سختیوں میں۔

فائدہ: ٣ اَخْرِجُوْۤا اَنْفُسَكُمْ: یعنی روح قبض کرنے اور سزا دینے کو ہاتھ بڑھا رہے ہیں اور مزید تشدید اور اظہار غیظ کے لئے کہتے جاتے ہیں کہ نکالو اپنی جانیں (جنہیں بہت دنوں سے بانواع حیل بچاتے پھرتے تھے)۔

فائدہ: ٤ اَلْیَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ: یعنی سخت تکلیف کے ساتھ ذلت و رسوائی بھی ہوگی۔

فائدہ: ٥ وَكُنْتُمْ عَنْ اٰیٰتِهٖ تَسْتَكْبِرُوْنَ: یعنی از راہ تکبر آیات اللہ کو جھٹلاتے تھے۔

وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰی كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّتَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ ۚ

اور البتہ تم ہمارے پاس آ گئے ایک ایک ہو کر جیسے ہم نے پیدا کیا تھا تم کو پہلی بار اور چھوڑ آئے تم جو کچھ اسباب ہم نے تم کو دیا تھا اپنی پیٹھ کے پیچھے ١

وَمَا نَرٰی مَعَكُمْ شُفَعَآءَكُمُ الَّذِیْنَ زَعَمْتُمْ اَنَّهُمْ فِیْكُمْ شُرَكٰٓؤُا ۭ لَقَدْ تَّقَطَّعَ بَیْنَكُمْ

اور ہم نہیں دیکھتے تمہارے ساتھ سفارش والوں کو جن کو تم بتلایا کرتے تھے کہ ان کا تم میں ساجھا ہے البتہ منقطع ہو گیا تمہارا علاقہ

وَضَلَّ عَنْكُمْ مَّا كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ﴿۹۴﴾ ع ۱۱/۱۷

اور جاتے رہے جو دعوے کہ تم کیا کرتے تھے ٢

خلاصہ تفسیر: (پیچھے موت کے وقت کی کیفیت بیان ہوئی) اور (جب قیامت کا دن ہوگا تو اللہ تعالیٰ فرما دیں گے) تم ہمارے پاس (یار و مددگار سے) تنہا تنہا (ہو کر) آ گئے (اور اس حالت سے آئے) جس طرح ہم نے اول بار (دنیا میں) تم کو پیدا کیا تھا (کہ نہ بدن پر کپڑا نہ پاؤں میں جوتا) اور جو کچھ ہم نے تم کو (دنیا میں ساز و سامان) دیا تھا (جس پر تم بھولے بیٹھے تھے) اس کو اپنے پیچھے ہی چھوڑ آئے (ساتھ کچھ نہ لا سکے، مطلب یہ کہ مال و دولت کے بھروسہ پر نہ رہنا، یہ سب یہاں ہی رہ جائے گا) اور (تم میں جو بعض کو اپنے باطل معبودوں کی شفاعت کا بھروسہ تھا سو) ہم تو تمہارے ہمراہ (اس وقت) تمہارے ان شفاعت کرنے والوں کو نہیں دیکھتے (جس سے ثابت ہوا کہ واقع میں بھی تمہارے ساتھ نہیں ہیں) جن کی

نسبت تم دعویٰ رکھتے تھے کہ وہ تمہارے معاملہ میں (ہمارے) شریک ہیں (کہ تمہارا جو عبادت کا معاملہ ہمارے ساتھ ہوتا تھا وہی ان کے ساتھ ہوتا تھا) واقعی تمہارے (اور ان کے) آپس میں تو قطع تعلق ہو گیا (کہ آج تم ان سے بیزار اور وہ تم سے بیزار، شفاعت کیا خاک کریں گے) اور وہ تمہارا دعویٰ (جو بیان ہوا) سب تم سے گیا گزرا ہوا (کچھ کام کا نہ نکلا تو اب پوری پوری مصیبت پڑے گی)۔

كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ: یعنی جس طرح ہم نے پہلی بار تمہیں پیدا کیا تھا، اہل محشر کا ننگے پاؤں ننگے بدن ہونا صحاح میں آیا ہے، اور بعض روایات میں جو مومنین کا کپڑا پہننا آیا ہے وہ اس کے معارض نہیں، برہنگی اصلی حالت ہوگی اور لباس اس کے بعد ملے گا، خواہ قبر سے نکلنے کے بعد ملے یا پہلے، واللہ اعلم۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی نہ سر پہ ٹوپی نہ پاؤں میں جوتی تہی دست چلے آرہے ہو اور جس ساز و سامان پر فخر و ناز تھا اسے ہمراہ نہیں لائے کہیں پیچھے چھوڑ آئے ہو۔

فائدہ: ۲؎ یعنی جن کو تم سمجھتے تھے کہ آڑے وقت میں ہمارا ہاتھ بٹائیں گے اور مصیبت میں ساتھ ہوں گے، وہ کہاں چلے گئے آج ہم ان کو تمہاری سفارش اور حمایت پر نہیں دیکھتے، حمایت و نصرت کے وہ علاقے آج ٹوٹ گئے اور جو لمبے چوڑے دعوے تم کیا کرتے تھے سب رفو چکر ہوئے۔

اِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰى ؕ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَمُخْرِجُ الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ﴿۹۵﴾

اللہ ہے کہ پھوڑ نکالتا ہے دانہ اور گٹھلی، نکالتا ہے مردہ سے زندہ اور نکالنے والا ہے زندہ سے مردہ، یہ ہے اللہ پھر تم کدھر بہکے جاتے ہو

خلاصہ تفسیر: پیچھے مسئلہ رسالت کی تحقیق تھی، اس سے پہلے مسئلہ توحید مذکور تھا، آگے پھر توحید کی طرف رجوع ہے اور استدلال میں اپنی نعمتوں کا ذکر کر کے اپنا منعم ہونا ثابت کرتے ہیں جس سے شرک کا طبعی طور پر بھی قبیح ہونا ظاہر ہو جائے گا۔

بیشک اللہ تعالیٰ پھاڑنے والا ہے دانہ کو اور گٹھلیوں کو (یعنی زمین میں دبانے کے بعد جو دانہ یا گٹھلی پھوٹتی ہے یہ اللہ ہی کا کام ہے) وہ جاندار (چیز) کو بے جان (چیز) سے نکال لاتا ہے (جیسے نطفہ سے آدمی پیدا ہوتا ہے) اور وہ بے جان (چیز) کو جاندار (چیز) سے نکالنے والا ہے (جیسے آدمی کے بدن سے نطفہ ظاہر ہوتا ہے) اللہ یہ ہے (جس کی ایسی قدرت ہے) سو تم (اس کی عبادت چھوڑ کر) کہاں (غیر اللہ کی عبادت کی طرف) الٹے چلے جا رہے ہو۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی زمین میں دبائے جانے کے بعد گٹھلی اور دانہ کو پھاڑ کر سبز پودہ اگانا یا جاندار کو بے جان اور بے جان کو جاندار سے نکالنا (مثلاً آدمی کو نطفہ سے، نطفہ کو آدمی سے پیدا کرنا) اسی خدا کا کام ہے، پھر اسے چھوڑ کر تم کدھر بہکے جا رہے ہو؟ کیا اور کوئی ہستی تمہیں ایسی مل سکتی ہے جو ان کاموں کو انجام دے سکے۔

فَالِقُ الْاِصْبَاحِ ۚ وَجَعَلَ الَّيْلَ سَكَنًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا ؕ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ﴿۹۶﴾

پھوڑ نکالنے والا صبح کی روشنی کا ۱؎ اور اس نے رات بنائی آرام کو اور سورج اور چاند حساب کے لئے، یہ اندازہ رکھا ہوا ہے زور آور خبردار کا ۲؎

خلاصہ تفسیر: وہ (اللہ تعالیٰ) صبح (صادق) کا (رات میں سے) نکالنے والا ہے (یعنی رات ختم ہو جاتی ہے اور صبح صادق ظاہر ہوتی ہے) اور اس نے رات کو راحت کی چیز بنائی ہے (کہ سب تھکے تھکائے سو کر آرام پاتے ہیں) اور سورج اور چاند (کی رفتار) کو حساب سے رکھا

ہے (یعنی ان کی رفتار منضبط ہے جس سے اوقات کے انضباط میں سہولت ہو) یہ (حساب سے ان کی رفتار) ٹھہرائی ہوئی بات ہے ایسی ذات کی جو کہ قادر (مطلق) ہے (کہ اس طرح حرکت پیدا کرنے پر اس کو قدرت ہے اور) بڑے علم والا ہے (کہ اس رفتار کی مصلحتیں اور حکمتیں جانتا تھا اس لئے اس خاص طرح پر ٹھہرا دیا)۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی رات کی تاریکی میں سے جو پہلی پھٹ کر صبح صادق نمودار ہوتی ہے اس کا نکالنے والا بھی وہی ہے۔

فائدہ: ۲ رات دن اور چاند سورج کا جو حکیمانہ نظام اور ان کی رفتار کا جو حساب مقرر فرما دیا اس میں ذرا بھی تخلف یا کم وبیش نہیں ہوتا۔

وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ النُّجُوْمَ لِتَهْتَدُوْا بِهَا فِیْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ؕ

اور اسی نے بنا دیئے تمہارے واسطے ستارے کہ انکے وسیلہ سے راستے معلوم کرو اندھیروں میں جنگل اور دریا کے ۱

قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ﴿۹۷﴾

البتہ ہم نے کھول کر بیان کر دیئے پتے ان لوگوں کیلئے جو جانتے ہیں

خلاصہ تفسیر: اور وہ (اللہ) ایسا ہے جس نے تمہارے (فائدہ کے) لئے ستاروں کو پیدا کیا (اور وہ فائدہ یہ ہے) تاکہ تم ان کے ذریعہ سے (رات کے) اندھیروں میں خشکی میں بھی اور دریا میں بھی راستہ معلوم کر سکو، بیشک ہم نے (یہ) دلائل (توحید وانعام کے) خوب کھول کھول کر بیان کر دیئے ہیں (اور یہ دلائل اگرچہ پہنچیں گے سب کو مگر مفید اور نافع) ان (ہی) لوگوں کے لیے (ہوں گے) جو (بھلے برے کی کچھ) خبر رکھتے ہیں (کیونکہ غور وفکر ایسے ہی لوگ کیا کرتے ہیں)۔

لِتَهْتَدُوْا بِهَا: یعنی ان ستاروں کے ذریعہ تم اندھیروں میں راستہ معلوم کر سکو، اس سے ثابت ہوا کہ جو اسباب اللہ تعالیٰ نے پیدا کیے ہیں ان کو اختیار کرنا جائز ہے اور ان سے فائدہ اٹھانا چاہیے، یہ توکل اور زہد کے خلاف نہیں۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی بلا واسطہ ان سے راستہ معلوم کر و یا بالواسطہ مثلاً قطب نما کے ذریعہ سے۔

وَهُوَ الَّذِیْٓ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ وَّمُسْتَوْدَعٌ ؕ

اور وہی ہے جس نے تم سب کو پیدا کیا ایک شخص سے ۱ پھر ایک تو تمہارا ٹھکانا ہے اور ایک امانت رکھے جانے کی جگہ ۲

قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّفْقَهُوْنَ﴿۹۸﴾

البتہ ہم نے کھول کر سنا دیئے پتے اس قوم کو جو سوچتے ہیں

خلاصہ تفسیر: اور وہ (اللہ) ایسا ہے جس نے تم (سب) کو (اصل میں) ایک شخص سے (جو کہ آدم علیہ السلام ہیں) پیدا کیا پھر (آگے توالد وتناسل کا سلسلہ اس طرح چلا آ رہا ہے کہ ہر شخص کے مادہ کے لیے) ایک جگہ زیادہ رہنے کی ہے (یعنی ماں کے رحم میں) اور ایک جگہ چندے رہنے کی (یعنی باپ کی پشت میں جیسا کہ ارشاد ہے: من بین الصلب) بیشک ہم نے (یہ) دلائل (بھی توحید وانعام کے) خوب کھول کھول کر بیان کر دیئے ہیں (عام طور پر مگر ان کا نفع بھی گذشتہ کی طرح) ان (ہی) لوگوں کے لئے (ہوگا) جو سمجھ بوجھ رکھتے ہیں (اس کلام سے: یُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ الخ کی تفصیل ہوگئی)۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی حضرت آدم (علیہ السلام) سے

فائدہ: ۲ **مستقر** ٹھہرنے کی جگہ جسے ٹھکانہ کہا، اور **مستودع** سپرد کئے جانے اور امانت رکھے جانے کی جگہ کو کہتے ہیں، یہ تو لغوی معنی ہوئے، آگے دونوں کے مصداق کی تعیین میں مفسرین کا اختلاف ہے حضرت شاہ صاحب نے موضح القران میں جو کچھ لکھا ہے وہ ہم کو پسند ہے: "یعنی اول سپرد ہوتا ہے ماں کے پیٹ میں کہ آہستہ آہستہ دنیا کے اثر پیدا کرے پھر آ کر ٹھہرتا ہے دنیا میں، پھر سپرد ہوگا قبر میں کہ آہستہ آہستہ اثر آخرت کے پیدا کرے پھر جا ٹھہرے گا جنت میں یا دوزخ میں"۔

وَهُوَ الَّذِيٓ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخۡرَجۡنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَيۡءٍ فَاَخۡرَجۡنَا مِنۡهُ خَضِرًا

اور اسی نے اتارا آسمان سے پانی پھر نکالی ہم نے اس سے اگنے والی ہر چیز ۱ پھر نکالی اس میں سے سبز کھیتی

نُّخۡرِجُ مِنۡهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا ۚ وَمِنَ النَّخۡلِ مِنۡ طَلۡعِهَا قِنۡوَانٌ دَانِيَةٌ وَّجَنّٰتٍ مِّنۡ اَعۡنَابٍ

جس سے ہم نکالتے ہیں دانے ایک پر ایک چڑھا ہوا، اور کھجور کے گابھے میں سے پھل کے گچھے جھکے ہوئے ۲ اور باغ انگور کے

وَّالزَّيۡتُوۡنَ وَالرُّمَّانَ مُشۡتَبِهًا وَّغَيۡرَ مُتَشَابِهٍ ؕ اُنۡظُرُوۡۤا اِلٰى ثَمَرِهٖۤ اِذَاۤ اَثۡمَرَ وَيَنۡعِهٖ ؕ

اور زیتون کے اور انار کے آپس میں ملتے جلتے اور جدا جدا بھی ۳ دیکھو ہر ایک درخت کے پھل کو جب وہ پھل لاتا ہے اور اس کے پکنے کو ۴

اِنَّ فِيۡ ذٰلِكُمۡ لَاٰيٰتٍ لِّقَوۡمٍ يُّؤۡمِنُوۡنَ ﴿۹۹﴾

ان چیزوں میں نشانیاں ہیں واسطے ایمان والوں کے ۵

خلاصہ تفسیر: اور وہ (اللہ) ایسا ہے جس نے آسمان (کی طرف) سے پانی برسایا، پھر ہم نے اس (ایک ہی پانی) کے ذریعہ سے ہر قسم کے (رنگ برنگ) نباتات کو (زمین سے) نکالا (یہ بھی عجیب بات ہے کہ ایک ہی پانی ایک ہی مٹی سے اتنی مختلف قسم کی نباتات جن کے رنگ وبو، ذائقہ، فوائد بے حد مختلف ہیں، کس قدر عجیب کرشمہ قدرت ہے) پھر ہم نے اس (کونپل) سے (جو اول زمین سے نکلتی ہے، جس کو بعض مقامات میں سوئی یا کھونٹی کہتے ہیں اور رنگ میں زرد ہوتی ہے) سبز شاخ نکالی کہ اس (شاخ) سے ہم اوپر تلے دانے چڑھے ہوئے نکالتے ہیں (یہ تو غلوں کی کیفیت ہے، جس کا ذکر پیچھے اجمالاً فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰی میں آیا تھا یہاں اس کی تفصیل ہوگئی، اور پھلوں میں کھجور کے درختوں سے) یعنی ان کے گچھے میں سے خوشے (نکلتے) ہیں جو (بوجھ کے مارے) نیچے کو لٹکے جاتے ہیں اور (اسی پانی سے ہم نے) انگوروں کے باغ (پیدا کئے) اور زیتون وانار (کے درخت پیدا کئے) جو کہ (بعض انار اور بعض زیتون پھل کی صورت شکل ومقدار ورنگ وغیرہ کے اعتبار سے) ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہوتے ہیں اور (بعض) ایک دوسرے سے ملتے جلتے نہیں ہوتے (ذرا) ہر ایک کے پھل کو تو دیکھو جب وہ پھلتا ہے (کہ اس وقت بالکل کچا بدمزہ ناقابل انتفاع ہوتا ہے) اور (پھر) اس کے پکنے کو دیکھو (کہ اس وقت سب اوصاف میں کیسا کامل ہوگیا، یہ بھی خدا کی قدرت کا ظہور ہے) ان (امور) میں (بھی) دلائل (توحید کے موجود) ہیں (اور گویا باعتبار تبلیغ کے سب کے لیے ہیں مگر فائدہ کے اعتبار سے) ان (ہی) لوگوں کے لیے (ہیں) جو ایمان (لانے کی فکر) رکھتے ہیں (یہ میووں اور پھلوں کا بیان ہوا جن کا ذکر پیچھے اجمالاً وَالنَّوٰی میں آیا تھا، یہاں اس کی تفصیل ہوگئی)۔

وَهُوَ الَّذِيٓ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ: ان مضامین میں ایک عجیب ترتیب کی رعایت فرمائی ہے وہ یہ کہ یہاں تین قسم کی کائنات مذکور ہے: ① کائنات زمین یعنی سفلیات ② کائنات آسمان یعنی علویات ③ کائنات جو، یعنی فضائے آسمانی میں پیدا ہونے والی اشیاء، پہلے کائنات زمین یعنی سفلیات کا ذکر کیا کہ وہ ہم سے زیادہ قریب ہیں، پھر اس کے دو حصے کیے: ایک زمین سے اگنے والی نباتات کا بیان دوسرے حیوانات اور انسانی

پیدائش کا بیان، نباتات کو پہلے بیان کیا، کیونکہ نطفہ کی حالت بدلنا اور اس کے تمام انقلابات کا علم اطباء کے ساتھ مخصوص ہے، بخلاف نباتات کے کہ ان کا بڑھنا، پھلنا پھولنا اور انقلابات کا عام طور سے مشاہدہ ہے، پھر کائنات جو یعنی فضا کو بیان فرمایا، یعنی رات اور صبح، پھر علویات یعنی کائنات آسمان کو ذکر سورج، چاند، ستارے، پھر چونکہ سفلیات یعنی زمین کی چیزوں کا زیادہ مشاہدہ ہوتا ہے اس کو دوبارہ لا کر اس پر بیان ختم کر دیا، مگر پہلے ان کا ذکر اجمالی تھا، دوبارہ تفصیل سے ذکر کیے گئے، لیکن تفصیل کے وقت ترتیب بدل دی گئی، اور انسانی پیدائش کا ذکر مقدم کیا گیا، شاید اس لیے کہ اس وقت نعمت کے اظہار کا عنوان اختیار کیا گیا ہے، اور انعام میں مقصود انسان ہی ہے، اور بارش کا ذکر درمیان میں آنا اس میں ایک لطیفہ بھی ہوسکتا ہے، وہ یہ کہ بارش میں کئی جہتیں ہیں، ابتداء کے اعتبار سے تو علوی ہے کہ آسمان کی طرف سے شروع ہوتی ہے اور انتہا کے اعتبار سے سفلی ہے کہ زمین پر پہنچتی ہے، اور مسافت کے اعتبار سے کائنات جو یعنی فضا میں سے، کیونکہ آسمان و زمین کے درمیان ہو کر آتی ہے۔

* * *

فائدہ: ۱۔ فَأَخْرَجْنَا بِهِ نَبَاتَ كُلِّ شَيْءٍ: یعنی آسمان کی طرف سے بادل برسایا جو سبب ہے نباتات کے اگانے کا۔

فائدہ: ۲۔ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ دَانِيَةٌ: یعنی بسبب بوجھل ہونے کے نیچے کو جھکے۔

فائدہ: ۳۔ مُشْتَبِهًا وَغَيْرَ مُتَشَابِهٍ: یعنی صورت شکل، مقدار، رنگ بو اور مزے کے اعتبار سے بعضے پھل ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں اور بعضے نہیں۔

فائدہ: ۴۔ إِذَا أَثْمَرَ وَيَنْعِهِ: یعنی ابتداً جب پھل آتا ہے تو کچا بدمزہ اور ناقابل انتفاع ہوتا ہے، پھر پکنے کے بعد کیسا لذیذ، خوش ذائقہ اور کارآمد بن جاتا ہے یہ سب خدا کی قدرت کا ظہور ہے۔

فائدہ: ۵۔ إِنَّ فِي ذَٰلِكُمْ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ: اس رکوع میں حق تعالیٰ کے جن افعال و صفات اور مظاہر قدرت کا بیان ہوا، ان سے خدا کے وجود و حدانیت اور کامل الصفات ہونے پر استدلال تو واضح ہے، لیکن غور کیا جائے تو وحی و نبوت کا مسئلہ بھی بڑی حد تک حل ہو جاتا ہے، کیونکہ جب حق تعالیٰ نے اپنے فضل و رحمت سے ہماری دنیاوی زندگی اور مادی حوائج کے انتظام و انصرام کے لئے اس قدر اسباب ارضی و سماوی مہیا فرمائے ہیں تو یہ کہنا کس قدر لغو اور غلط ہوگا کہ ہماری حیات اخروی اور روحانی ضروریات کے انجام پانے کا اس نے کوئی سامان نہیں کیا۔

یقیناً جس رب کریم نے ہماری جسمانی غذاؤں کی نشوونما کیلئے آسمان سے پانی اتارا ہے، ہمارے روحانی تغذیہ کے لئے بھی اسی نے سحابہائے نبوت سے وحی الہام کی بارش نازل فرمائی، جب وہ بر و بحر کی اندھیریوں میں ستاروں کے ذریعہ سے ظاہری راہنمائی کرتا ہے تو کیسے ممکن ہے کہ باطنی راہنمائی کے لئے اس نے ایک ستارہ بھی آسمان روحانیت پر روشن نہ کیا ہو، رات کی تاریکی کے بعد اس نے صبح صادق کا اجالا کیا اور مخلوق کو موقع دیا کہ وہ اپنے دنیاوی کاروبار میں چاند اور سورج کی روشنی سے ایک معین حساب کے ماتحت منتفع و مستفید ہوتی رہے، پھر کیسے کہا جا سکتا ہے کہ کفر و شرک، ظلم و عدوان اور فسق و فجور کی شب دیجور میں اسکی طرف سے کوئی چاند نہ چمکا، نہ صبح صادق کا نور پھیلا، نہ رات ختم ہو کر کوئی آفتاب طلوع ہوا، خدا کی ساری مخلوق ابدالآباد کے لئے جہل ضلالت کے گھٹاٹوپ اندھیرے میں پڑی چھوڑ دی گئی، کیا گیہوں کے دانے اور کھجور کی گٹھلی کو پھاڑ کر خدائے کریم سرسبز درخت اگاتا ہے پر انسان کے قلب میں معرفت ربانی کا استعداد کا جو بیج فطرۃً بکھیرا گیا ہو وہ یوں ہی بیکار ضائع کر دیا گیا کہ نہ ابھرا، نہ پھیلا، نہ پکا، نہ تیار ہوا، جب جسمانی حیثیت سے دنیا میں حی و میت کا سلسلہ قائم ہے، خدا زندہ سے مردہ کو مردہ سے زندہ کو نکالتا رہتا ہے تو روحانی نظام میں خدا کی اس عادت کا کیوں انکار کیا جائے، بیشک وہ روحانی طور پر بھی وہ بہت دفعہ ایک زندہ قوم سے مردہ اور مردہ قوم سے زندہ افراد پیدا کرتا ہے، اور جس طرح اس نے ہماری دنیاوی زندگی کے مستقر و مستودع کا حکیمانہ بندوبست کیا ہے حیات اخروی کے مستقر و مستودع کے سامان اس سے کہیں بڑھ کر مہیا فرمائے، فللہ الحمد والمنة وبه الثقة والعصمة۔

یہیں سے یہ بھی سمجھ میں آتا ہے کہ جس طرح ہم خدا تعالیٰ کو اس کے کاموں سے پہچانتے ہیں یعنی جو کام وہ اپنی قدرت کاملہ سے کرتا ہے، کسی مخلوق کی طاقت نہیں کہ ویسا کام کر سکے، ٹھیک اسی طرح اس کے کلام کو بھی ہم اسی معیار پر جانچ سکتے ہیں کہ خدا کا کلام وہی ہوسکتا ہے کہ اس جیسا کلام ساری مخلوق مل کر بھی نہ بنا سکے، پھر سانزل مثل ما انزل اللہ کا ادعاء کہاں تک صحیح ہوسکتا ہے، گویا اس رکوع میں حق تعالیٰ کی صفات و افعال بیان کر

کے ان تمام مسائل کی حقیقت پر متنبہ کر دیا گیا جن کی تغلیط گزشتہ رکوع میں کی گئی تھی۔

وَجَعَلُوا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ وَخَلَقَهُمْ وَخَرَقُوا لَهٗ بَنِيْنَ وَبَنٰتٍۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ

اور ٹھہراتے ہیں اللہ کے شریک جنوں کو حالانکہ اس نے انکو پیدا کیا ہے ۱؎ اور تراشتے ہیں اسکے واسطے بیٹے اور بیٹیاں جہالت سے ۲؎

سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿۱۰۰﴾

وہ پاک ہے اور بہت دور ہے ان باتوں سے جو یہ لوگ بیان کرتے ہیں ۳؎

خلاصہ تفسیر: پیچھے توحید کے دلائل مذکور تھے، آب آگے صراحۃ توحید کا ثابت ہونا اور شرک کا باطل ہونا بیان کرتے ہیں۔

اور (مشرک) لوگوں نے (اپنے اعتقاد میں) شیاطین کو (ایسے) اللہ کا (جس کے صفات وافعال پیچھے بیان ہوئے) شریک قرار دے رکھا ہے (کہ ان کے بہکانے سے شرک کرتے ہیں اور خدا کے مقابلہ میں ان کے کہنے پر چلتے ہیں) حالانکہ ان لوگوں کو (خود ان کے اقرار کے مطابق بھی) خدا (ہی) نے پیدا کیا ہے (جب خالق کوئی اور نہیں تو معبود بھی کوئی اور نہیں ہونا چاہئے) اور ان (مشرکین میں سے بعض) لوگوں نے اللہ کے حق میں بیٹے اور بیٹیاں (اپنے اعتقاد میں) محض بلا دلیل تراش رکھی ہیں (جیسے نصاریٰ حضرت مسیح کو اور بعض یہود حضرت عزیر کو خدا کا بیٹا اور مشرکین عرب فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے) وہ پاک اور برتر ہے ان باتوں سے جن کو یہ لوگ (خدا تعالیٰ کی شان میں) بیان کرتے ہیں (یعنی یہ کہ اس کا کوئی شریک ہو یا اس کے کوئی اولاد ہو)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یا تو ''جن'' سے مراد یہاں ''شیاطین'' ہیں چونکہ کفر وشرک کا ارتکاب شیطان کے اغوا سے ہوتا ہے اس لئے اس کے اغواء و اضلال سے غیر اللہ کی عبادت کرنا گویا اسی کی عبادت ہوئی، ابراہیم نے بت پرستی کا رد کرتے ہوئے فرمایا: یا ابت لَا تَعْبُدِ الشَّيْطٰنَ دوسری جگہ ارشاد ہے: اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ (یس: ۶۰) ملائکہ قیامت میں فرمائیں گے: سُبْحٰنَكَ اَنْتَ وَلِيُّنَا مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ بَلْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ ۚ اَكْثَرُهُمْ بِهِمْ مُّؤْمِنُوْنَ (سبا: ۴۱) اور یا ''جن'' سے مراد قوم جن لی جائے جن کے بعض سرداروں سے اہل جاہلیت استعانت وتعوذ کیا کرتے تھے: وَاَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوْهُمْ رَهَقًا (جن: ۶) بہرحال وہ خود ہماری طرح خدا کی عاجز مخلوق ہے، پھر مخلوق ہو کر خالق کا شریک کیسے ہو سکتا ہے۔

فائدہ: ۲؎ نصاریٰ حضرت مسیح کو بعض یہود حضرت عزیر کو خدا کا بیٹا اور مشرکین ملائکۃ اللہ کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے۔

فائدہ: ۳؎ یعنی پاک ہے شرکت سے، اسکی شان بہت بلند ہے ترکیب وتحلیل سے، پھر باپ بیٹے کا تصور وہاں کیسے ہو سکتا ہے۔

بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ ؕ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ ۚ

نئی طرح پر بنانے والا آسمانوں اور زمین کا ۱؎ کیونکر ہو سکتا ہے اس کے بیٹا حالانکہ اس کے کوئی عورت نہیں، اور اس نے بنائی ہر چیز

وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۱۰۱﴾

اور وہ ہر چیز سے واقف ہے ۲؎

خلاصہ تفسیر: وہ آسمانوں اور زمینوں کا موجد (یعنی نیست سے ہست کرنے والا) ہے (اور دوسرا کوئی موجد نہیں، پس معبود بھی کوئی اور نہ ہوگا، اس سے تو شریک کی نفی ہوئی، اور اولاد نہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اولاد کی حقیقت یہ ہے کہ میاں بیوی ہوں اور ان دونوں کے اجتماع سے

تیسری جان دار چیز پیدا ہوتو) اللہ کے اولاد کہاں ہوسکتی ہے، حالانکہ اس کی کوئی بیوی تو ہے نہیں (جس پر اولاد کا ہونا موقوف ہے، جب بیوی نہیں تو بدرجہ اولی خدا کے لیے اولاد نہیں ہوسکتی) اور اللہ تعالیٰ نے (جیسا ان لوگوں کو پیدا کیا، اور زمین و آسمان کو پیدا کیا، اسی طرح اس نے) ہر چیز کو پیدا کیا، اور (جس طرح وہ خالقیت میں یکتا ہے، اسی طرح اس صفت میں بھی یکتا ہے کہ) وہ ہر چیز کو خوب جانتا ہے (ازلاً بھی ابداً بھی اور اس وصف میں بھی اس کا کوئی شریک نہیں اور خالق ہونا بغیر علم کے ہو نہیں سکتا، اس سے بھی یہی ثابت ہوا کہ اور کوئی خالق نہیں)۔

* * *

فائدہ: ۱ جس نے تنہا تمام آسمان و زمین بدوں کسی نمونہ اور توسط آلات وغیرہ کے ایسے انوکھے طرز پر پیدا کر دیئے، آج اس کو شرکاء کی امداد اور بیٹے پوتے کا سہارا ڈھونڈھنے کی کیا ضرورت ہے۔

فائدہ: ۲ تعجب ہے کہ جب کسی مخلوق کو تم حقیقۃً خدا کی اولاد قرار دیتے ہو تو ان بچوں کی ماں کسے تجویز کرو گے اور اس ماں کا تعلق خدا کے ساتھ کس قسم کا مانو گے، عیسائی حضرت مسیح کو خدا کا بیٹا کہتے ہیں لیکن یہ جسارت وہ بھی نہیں کر سکے اور کہ مریم صدیقہ کو (العیاذ باللہ) خدا کی بیوی قرار دیکر زناشوی کے قائل ہو جائیں، جب ایسا نہیں تو مریم کے بطن سے پیدا ہونے والا خدا کا بیٹا کیونکر بن گیا، دنیا کے دوسرے بچوں کو بھی خدا تعالیٰ ماؤں کے پیٹ سے پیدا کرتا ہے اور وہ معاذ اللہ خدا کی نسلی اولاد نہیں کہلاتے۔

یہ فرق کہ کوئی بچہ محض نفخہ جبریلیہ سے بدوں توسط اسباب عادیہ کے پیدا کر دیا جائے اور دوسروں کو عام اسباب کے سلسلہ میں پیدا فرمائیں، ابوت و نبوت کے مسئلہ پر کچھ اثر انداز نہیں ہوسکتا، اسباب و مسببات ہوں یا خوارع عادات سب کو خدا ہی نے پیدا کیا ہے اور وہ ہی جانتا ہے کہ کس چیز کو کس وقت پیدا کرنا مصلحت و حکمت ہے۔

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوْهُ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ﴿۱۰۲﴾

یہی اللہ تمہارا رب ہے، نہیں ہے کوئی معبود سوا اس کے، پیدا کرنے والا ہر چیز کا سو تم اسی کی عبادت کرو، اور وہ ہر چیز پر کارساز ہے

خلاصہ تفسیر: یہ (ذات جس کے صفات کمال بیان کئے گئے یہ) ہے اللہ تمہارا رب، اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں ہر چیز کا پیدا کرنے والا (جیسا کہ پیچھے بیان ہوا، جب یہ صفات اللہ ہی میں ہیں) تو تم لوگ اس (ہی) کی عبادت کرو اور (پھر یہ کہ) وہ (ہی) ہر چیز کا کارساز (حقیقی) ہے (دوسرا کوئی کارساز بھی نہیں، پس خدا کی عبادت کرو گے تو وہ تم کو حقیقی نفع پہنچائے گا اور دوسرا کیا دے دے گا، غرض خالق بھی وہی ہے، علیم بھی وہی ہے، وکیل بھی وہی ہے، اور ان سب سے لازم آیا کہ معبود بھی وہی ہو)۔

* * *

فائدہ: اس کی عبادت اس لئے کرنی چاہیے کہ مذکورہ بالا صفات کی وجہ سے وہ ذاتی طور پر استحقاق معبود بننے کا رکھتا ہے اور اس لئے بھی کہ تمام مخلوق کی کارسازی اسی کے ہاتھ میں ہے۔

لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ۫ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ۚ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ﴿۱۰۳﴾

نہیں پاسکتیں اس کو آنکھیں، اور وہ پاسکتا ہے آنکھوں کو، اور وہ نہایت لطیف اور خبردار ہے

خلاصہ تفسیر: (خدا کے علم کے یکتا ہونے کی یہ کیفیت ہے کہ) اس کو تو کسی کی نگاہ محیط نہیں ہوسکتی (دنیا میں تو اس طرح کہ کوئی اس کو دیکھ ہی نہیں سکتا، اور آخرت میں اس طرح کہ اہل جنت اگرچہ دیکھیں گے لیکن احاطہ جب بھی محال رہے گا) اور وہ (یعنی اللہ تعالیٰ) سب نگاہوں کو (جو کہ اس کے احاطہ سے عاجز تھیں وجوباً) محیط ہو جاتا ہے (اسی طرح اور چیزوں کو بھی علماً محیط ہے: **وھو بکل شیء علیم**) اور (اس امر سے کہ وہ

سب محیط ہے اور اس کو کوئی محیط نہیں لازم آگیا کہ) وہی بڑا باریک بین باخبر ہے (اور کوئی دوسرا نہیں، اور یہ وہ کمال علم ہے جس میں اللہ تعالیٰ یکتا ہے)۔

لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ: یعنی نگاہ تو انسانی حواس میں سے ایک حاسہ ہے، جس سے صرف ''محسوس'' چیزوں کا علم حاصل ہوسکتا ہے، حق تعالیٰ کی ذات پاک تو عقل و وہم کے احاطہ سے بھی بالاتر ہے، اس کا علم اس حاسہ بصر سے بھلا کیسے حاصل ہوسکتا، خدا تعالیٰ کے سوا جتنی چیزیں نظر آسکتی ہیں خواہ وہ کتنی ہی بڑی ہوں نگاہ ان کا احاطہ کرسکتی ہے، مگر خدا تعالیٰ کے ظاہر کا احاطہ کسی طرح نہیں کرسکتی، اور یہاں ادراک سے مراد احاطہ ہی ہے، جب نگاہ سے اس کے ظاہر کا احاطہ محال ہے تو عقل سے اس کی باطنی حقیقت کا احاطہ بدرجہ اولیٰ محال ہوگا، کیونکہ ظاہر کے مقابلہ میں حقیقت کئی درجہ مخفی تر ہے، اور نگاہ کے مقابلہ میں عقلی ادراک بدرجہا غلطی کا زیادہ احتمال رکھتا ہے۔

انسان کو حق تعالیٰ کی زیارت ہوسکتی ہے یا نہیں؟ اس مسئلہ میں تمام علماء اہلسنت والجماعت کا عقیدہ یہ ہے کہ اس عالم دنیا میں حق تعالیٰ کی ذات کا مشاہدہ اور زیارت نہیں ہوسکتی، یہی وجہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب یہ درخواست کی کہ رَبِّ أَرِنِي ''اے میرے پروردگار مجھے اپنی زیارت کرا دیجئے''۔ تو جواب میں ارشاد ہوا کہ: لَنْ تَرَانِي ''آپ ہرگز مجھے نہیں دیکھ سکتے''، ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب یہ جواب ملتا ہے تو پھر اور کسی جن و بشر کی کیا مجال ہے، البتہ آخرت میں مؤمنین کو حق تعالیٰ کی زیارت ہونا صحیح و قوی احادیث متواترہ سے ثابت ہے، اور خود قرآن کریم میں موجود ہے، آخرت میں حق تعالیٰ کی زیارت مختلف مقامات پر ہوگی، عرصہ محشر میں بھی، اور جنت میں پہنچنے کے بعد بھی، اور اہل جنت کے لئے ساری نعمتوں سے بڑی نعمت حق تعالیٰ کی زیارت ہوگی، معتزلہ نے اس آیت سے اہل جنت کے دیدار کی نفی کی ہے، مگر خلاصہ تفسیر سے ظاہر ہے کہ اس سے مطلق دیدار کی نفی نہیں ہوسکتی، بلکہ احاطہ کی نفی ہوتی ہے، ائمہ لغت نے ادراک کے معنی احاطہ بیان کیے ہیں اور ابن عباسؓ نے اس جگہ ''ادراک'' کی تفسیر احاطہ ہی سے کی ہے، اور بہت سے شرعی دلائل سے اہل جنت کو خدا کا دیدار ہونا ثابت ہے جن کا انکار نہیں ہوسکتا۔

خلاصہ یہ ہے کہ دنیا میں کسی کو حق تعالیٰ کی زیارت نہیں ہوسکتی، اور آخرت میں سب اہل جنت کو ہوگی، اور رسول کریم ﷺ کو جو شب معراج میں زیارت ہوئی وہ بھی درحقیقت عالم آخرت ہی کی زیارت ہے، جیسا شیخ محی الدین ابن عربیؒ نے فرمایا کہ دنیا صرف اس جہان کا نام ہے جو آسمانوں کے اندر محصور ہے، آسمانوں سے اوپر آخرت کا مقام ہے، وہاں پہنچ کر جو زیارت ہوئی اس کو دنیا کی زیارت نہیں کہا جاسکتا، پس یہ نہیں کہہ سکتے کہ حضور ﷺ نے دنیا میں خدا کو دیکھا ہے اور جب حضور ﷺ سے سوال کیا گیا کہ آپ نے خدا کو دیکھا ہے تو آپ ﷺ سے دو جواب منقول ہیں: ① ایک یہ کہ وہ تو ایک نور ہے، میں اس کو کہاں دیکھ سکتا ہوں، اس جواب میں احاطہ مراد ہے، یعنی میں اس کا احاطہ کہاں کرسکتا ہوں ② دوسرا جواب آپ نے یہ دیا کہ میں نے ایک نور دیکھا، یہاں مطلق دیدار مراد ہے، غرض آپ نے خدا کو دیکھا مگر احاطہ نہ کرسکے، اور یہی حال جنت میں ہوگا۔

اب سوال یہ رہتا ہے کہ جب آیت قرآنی: لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ سے یہ معلوم ہوا کہ انسان کو اللہ تعالیٰ کی رویت ہو ہی نہیں سکتی تو پھر قیامت میں کیسے ہوگی؟ اس کا جواب کھلا ہوا یہ ہے کہ آیت قرآنی کے یہ معنی نہیں کہ انسان کے لئے حق تعالیٰ کی رویت وزیارت ناممکن ہے، بلکہ معنی آیت کے یہ ہیں کہ انسانی نگاہ اس کی ذات کا احاطہ نہیں کرسکتی، کیونکہ اس کی ذات غیر محدود اور انسان کی نظر محدود ہے، قیامت میں بھی جو زیارت ہوگی وہ اسی طرح ہوگی کہ نظر احاطہ نہیں کرسکے گی، اور دنیا میں انسان اور اس کی نظر میں اتنی قوت نہیں جو اس طرح کی رویت کو بھی برداشت کرسکے، اس لئے دنیا میں رویت مطلقاً نہیں ہوسکتی، اور آخرت میں قوت پیدا ہوجائے گی، تو رویت وزیارت ہوسکے گی، مگر نظر میں ذات حق کا احاطہ اس وقت بھی نہ ہوسکے گا۔

* * *

فائدہ: حضرت شاہ صاحبؒ نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ آنکھ میں یہ قوت نہیں کہ اس کو دیکھ لے، ہاں! وہ خود از راہ لطف کرم اپنے کو دکھانا چاہے تو آنکھوں میں ویسی قوت بھی فرما دے گا، مثلاً آخرت میں مومنین کو حسب مراتب رویت ہوگی جیسا کہ نصوص کتاب وسنت سے ثابت ہے، یا بعض روایات کے موافق نبی کریم ﷺ کو لیلۃ الاسراء میں رویت ہوئی علی اختلاف الاقوال، باقی مواضع میں چونکہ کوئی نص موجود نہیں، لہٰذا عام قاعدہ کی بناء پر نفی رویت ہی کا اعتقاد رکھا جائے گا۔

مفسرین سلف میں سے بعض نے ادراک کو "احاطہ" کے معانی میں لیا ہے یعنی نگاہیں کبھی اس کا احاطہ نہیں کرسکتیں، آخرت میں بھی رویت ہوگی احاطہ نہ ہوگا، ہاں اسکی شان یہ ہے کہ وہ تمام ابصار و مبصرات کا احاطہ کئے ہوئے ہے، اس وقت لطیف کا تعلق لا تدرکہ سے اور خبیر کا وھو یدرك سے ہوگا۔

قَدْ جَآءَكُمْ بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ عَمِيَ فَعَلَيْهَا ۭ

تمہارے پاس آچکیں نشانیاں تمہارے رب کی طرف سے، پھر جس نے دیکھ لیا سو اپنے واسطے، اور جو اندھا رہا سو اپنے نقصان کو

وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ ﴿۱۰۴﴾

اور میں نہیں تم پر نگہبان

خلاصہ تفسیر: توحید کے اثبات اور شرک کے باطل ہونے کے دلائل بیان کرنے کے بعد اب مسئلہ رسالت کے متعلق اس بات کا بیان ہے کہ آپ کے ذمہ رسالت کی حیثیت سے صرف ان مضامین کا پہنچانا اور عبدیت کے اعتبار سے خود عمل پر مستقیم رہنا ہے، نہ کہ ان کے فکر وغم میں پڑ جانا۔

(آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان لوگوں سے کہہ دیجئے کہ) اب بلاشبہ تمہارے پاس تمہارے رب کی جانب سے حق بینی کے ذرائع (یعنی توحید و رسالت کے حق ہونے کے عقلی و نقلی دلائل) پہنچ چکے ہیں سو جو شخص (ان کے ذریعہ سے حق کو) دیکھ لے گا وہ اپنا فائدہ کرے گا، اور جو شخص اندھا رہے گا وہ اپنا نقصان کرے گا اور میں تمہارا (یعنی تمہارے اعمال کا) نگران نہیں ہوں (یعنی جیسا نگرانی کرنے والے کے ذمہ ہوتا ہے کہ ناشائستہ حرکت نہ کرنے دے، یہ میرے ذمہ نہیں، میرا کام صرف تبلیغ ہے)۔

* * *

فائدہ: یعنی اگر چہ خدا ہمیں دکھائی نہیں دیتا مگر اس کے بصیرت افروز نشانات و دلائل ہمارے سامنے ہیں، جو آنکھ کھول کر دیکھے گا خدا کو پا لے گا، اور جو اندھا بن گیا اس نے اپنا نقصان کیا، میرے ذمے یہ نہیں کہ کسی کو دیکھنے پر مجبور کردوں۔

وَكَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ وَلِيَقُوْلُوْا دَرَسْتَ وَلِنُبَيِّنَهٗ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۵﴾

اور یوں طرح طرح سے سمجھاتے ہیں ہم آیتیں اور تاکہ وہ کہیں کہ تو نے کسی سے پڑھا ہے اور تاکہ واضح کردیں ہم اس کو واسطے سمجھ والوں کے

خلاصہ تفسیر: اور (دیکھئے) ہم اس (عمدہ) طور پر دلائل کو مختلف پہلوؤں سے بیان کرتے ہیں تاکہ آپ سب کو پہنچا دیں، اور تاکہ یہ (منکرین تعصب سے) یوں کہیں کہ آپ نے کسی سے (ان مضامین کو) پڑھ لیا ہے (مطلب یہ کہ تاکہ ان پر اور زیادہ الزام ہو کہ ہم تو اس طرح واضح کر کے حق کو ثابت کرتے تھے اور تم پھر لغو بہانے تراشتے تھے) کہ ہم اس (قرآن کے مضامین) کو دانشمندوں کے لئے خوب ظاہر کردیں (یعنی قرآن کے نازل کرنے کے تین فائدے ہیں: ① ایک یہ کہ آپ کو تبلیغ کا اجر و ثواب ملے ② دوسرے یہ کہ منکرین پر زیادہ جرم قائم ہو ③ تیسرے یہ کہ دانشمند اور طالبان حق کو حق ظاہر ہو جائے)۔

* * *

فائدہ: یعنی اپنی آیتوں کو مختلف پہلوؤں اور عجیب و غریب انداز سے اس لئے سمجھاتے ہیں کہ آپ سب لوگوں کو پہنچا دیں، اور ان میں استعداد و احوال کے اختلاف سے دو فریق ہو جائیں، ضدی اور بدفہم تو یہ کہیں کہ ایسے علوم و معارف اور موثر مضامین ایک اُمّی سے کیسے بن پڑتے تو ضرور مختلف اوقات میں کسی سے سیکھتے رہے ہوں گے، پھر پڑھ پڑھا کر ہمارے سامنے پیش کردیئے لیکن سمجھدار اور انصاف پسند لوگوں پر حق واضح ہو جائے

گا، اور شیطانی شکوک وشبہات زائل ہو جائیں گے۔

اِتَّبِعْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿١٠٦﴾

تو چل اس پر جو حکم تجھ کو آئے تیرے رب کا، کوئی معبود نہیں سوا اُس کے، اور منہ پھیر لے مشرکوں سے

خلاصہ تفسیر: (پس) آپ (یہ نہ دیکھئے کہ کون مانتا ہے اور کون نہیں مانتا) خود اس طریق پر چلتے رہئے جس (پر چلنے) کی وحی آپ کے رب کی طرف سے آپ کے پاس آئی ہے (اور اس طریق میں بڑی چیز یہ اعتقاد ہے کہ) اللہ کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں (اور اس طریق میں تبلیغ کا حکم بھی داخل ہے) اور (اس پر قائم رہ کر) مشرکین کی طرف خیال نہ کیجئے (کہ افسوس انہوں نے قبول کیوں نہ کیا)۔

* * *

فائدہ: آپ خدائے واحد پر بھروسہ کر کے اسکے حکم پر چلتے رہیں اور مشرکین کے جہل وعناد کی طرف خیال نہ فرمائیں کہ ایسے روشن دلائل و بیانات سننے کے بعد بھی راہ راست پر نہ آئے۔

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكُوْا ۭ وَمَا جَعَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ۚ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ ﴿١٠٧﴾

اور اگر اللہ چاہتا تو وہ لوگ شرک نہ کرتے ۱؎ اور ہم نے نہیں کیا تجھ کو ان پر نگہبان، اور نہیں ہے تو ان پر داروغہ ۲؎

خلاصہ تفسیر: اور (خیال نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ) اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا تو یہ شرک نہ کرتے (لیکن ان لوگوں کی بدعنوانیوں سے اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا کہ ان کو سزا دیں، اس لئے ایسا ہی سامان جمع کر دیا، پھر ان کو آپ کب مسلمان بنا سکتے ہیں) اور (آپ ﷺ اس فکر میں پڑے ہی کیوں) ہم نے آپ کو ان (کے اعمال) کا نگراں نہیں بنایا اور نہ آپ (ان اعمال پر عذاب دینے کے ہماری طرف سے) مختار ہیں (پس جب آپ ﷺ کے متعلق نہ ان کے جرائم کی تفتیش ہے اور نہ ان کی سزا کا حکم دیا گیا ہے، پھر آپ ﷺ کو کیوں تشویش ہے)۔

وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ: اس میں اہل طریق کے اس معمول پر دلالت ہے کہ وہ حق بیان کرتے ہیں لیکن کسی کے پیچھے نہیں لگتے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی حق تعالیٰ کی تکوینی حکمت اس کو مقتضی نہیں ہوئی کہ وہ ساری دنیا کو زبردستی مومن بنا دے، بیشک وہ چاہتا تو روئے زمین پر ایک مشرک کو باقی نہ چھوڑتا، لیکن شروع سے اس نے انسانی فطرت کا نظام ہی ایسا رکھا ہے کہ آدمی کوشش کرے تو یقیناً ہدایت قبول کر سکے تاہم قبول کرنے میں بالکل مجبور و مضطر نہ ہو پہلے اس مسئلہ کی تقریر گزر چکی۔

فائدہ: ۲؎ آپ کا فرض تبلیغ احکام الٰہی کا اتباع ہے ان کے اعمال کے ذمہ دار اور جوابدہ آپ نہیں ہیں۔

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًاۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۭ كَذٰلِكَ زَيَّنَّا

اور تم لوگ برا نہ کہو انکو جن کی یہ پرستش کرتے ہیں اللہ کے سوا پس وہ برا کہنے لگیں گے اللہ کو بے ادبی سے بدوں سمجھے ۱؎ اسی طرح ہم نے مزین کر دیا

لِكُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُمْ ۠ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ مَّرْجِعُهُمْ فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿١٠٨﴾

ہر ایک فرقہ کی نظر میں ان کے اعمال کو، پھر ان کو اپنے رب کے پاس پہنچنا ہے تب وہ جتلا دے گا ان کو جو کچھ وہ کرتے تھے ۲؎

خلاصہ تفسیر: پیچھے تبلیغ کا حکم تھا، آگے تبلیغ کے حدود قائم کرتے ہیں، جس کا حاصل یہ ہے کہ غیر قوم سے مناظرہ کرنا تو تبلیغ میں داخل ہے، لیکن گالی یا دل خراش الفاظ ان کے باطل معبودوں اور معظم لوگوں کی نسبت نہ کہو، کیونکہ پھر وہ تمہارے معبود یا رسول یا معظم لوگوں کی شان

میں گستاخی کریں گے جس کے سبب گویا تم ہوگے، اس وجہ سے اس کی ممانعت کی جاتی ہے۔

اور دشنام (گالی) مت دو ان (باطل معبودوں) کو جن کی یہ (مشرک) لوگ خدا (کی توحید) کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہیں، کیونکہ (تمہارے ایسا کرنے سے) پھر وہ براہ جہل حد سے گذر کر (یعنی غصہ میں آکر) اللہ تعالیٰ کی شان میں گستاخی کریں گے (اور اس کا تعجب نہ کیا جائے کہ ایسی گستاخی کرنے والوں کو ساتھ کے ساتھ سزا کیوں نہیں مل جاتی، کیونکہ) ہم نے (دنیا میں تو) اسی طرح (جیسا ہو رہا ہے) ہر طریقہ والوں کو ان کا عمل (بھلا ہو یا برا ہو) مرغوب بنا رکھا ہے (یعنی ایسے اسباب جمع ہوجاتے ہیں کہ ہر ایک کو اپنا طریقہ پسند ہوتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ یہ عالم اصل میں امتحان وابتلا کی جگہ ہے، پس اس میں سزا ضروری نہیں) پھر (البتہ اپنے وقت پر) اپنے رب ہی کے پاس ان (سب) کو جانا ہے، سو (اس وقت) وہ ان کو جتلا دے گا جو کچھ بھی وہ (دنیا میں) کیا کرتے تھے (اور مجرمین کو سزا دے دے گا)۔

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ: رہا یہ معاملہ کہ قرآن کریم کی بہت سی آیات میں بتوں کا تذکرہ سخت الفاظ میں آیا ہے، اور وہ آیات منسوخ بھی نہیں، ان کی تلاوت تو اب بھی ہوتی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ آیات قرآنی میں جہاں کہیں ایسے الفاظ آئے ہیں وہ بطور مناظرہ کسی حقیقت کو واضح کرنے کے لئے وارد ہوئے ہیں، وہاں کسی کی دل آزاری نہ پیش نظر ہے، اور نہ کوئی سمجھدار انسان ان سے یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ اس میں بتوں کو برا کہنا یا مشرکین کو چڑانا منظور ہے، اور یہ ایک ایسا کھلا ہوا فرق ہے جس کو ہر زبان کے اہل محاورہ بآسانی سمجھ سکتے ہیں کہ کبھی کسی شخص کا کوئی عیب یا برائی کسی مسئلہ کی تنقیح کے لئے ذکر کی جاتی ہے، جیسے عام طور پر عدالتوں میں ہر روز سامنے آتا رہتا ہے، لیکن عدالت کے سامنے ہونے والے بیان کو دنیا میں کوئی آدمی یہ نہیں کہتا کہ فلاں نے فلاں کو گالی دی ہے، اسی طرح ڈاکٹروں اور حکیموں کے سامنے انسان کے بہت سے ایسے عیب بیان کئے جاتے ہیں کہ ان کو دوسری جگہ اور دوسری طرح کوئی بیان کرے گا تو گالی سمجھی جائے، لیکن بغرض علاج ان کے بیان کرنے کو کوئی گالی دینا نہیں کہتا، اسی طرح قرآن کریم نے جابجا بتوں کے بے حس و بے شعور اور بے علم وقدرت اور بے بس ہونے کو اسی پیرایہ میں بیان فرمایا ہے کہ سمجھنے والے حقیقت کو سمجھ لیں، اور نہ سمجھنے والوں کی غلطی یا کوتاہ نظری واضح ہوجائے، کسی کو برا بھلا کہنا مقصود نہیں، گمراہی اور غلطی کا انجام بد بیان کرنا مقصود ہے، اور فقہاء رحمہم اللہ نے تصریح فرمائی ہے کہ اگر کوئی شخص اس آیت کو بھی مشرکین کو چڑانے کے سبب سے پڑھے تو اس کے لئے اس وقت یہ تلاوت کرنا بھی سبِّ ممنوع میں داخل اور ناجائز ہے، جیسے مواضع مکروہہ میں تلاوتِ قرآن کا ناجائز ہونا سب کو معلوم ہے، خلاصہ کلام یہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک اور قرآن کریم میں تو نہ پہلے کبھی ایسا کلام آیا تھا جس کو لوگ گالی سمجھیں، اور نہ آئندہ آنے کا کوئی خطرہ تھا، ہاں! مسلمانوں سے اس کا امکان تھا ان کو اس آیت نے ایسا کرنے سے روک دیا، اس قرآنی ہدایت نے ایک بڑے علم کا دروازہ کھول دیا، اور چند اصولی مسائل اس سے نکل آئے۔

کسی گناہ کا سبب بننا بھی گناہ ہے: مثلاً ایک اصول یہ نکل آیا کہ جو کام اپنی ذات کے اعتبار سے جائز بلکہ کسی درجہ میں محمود بھی ہو مگر اس کے کرنے سے کوئی فساد لازم آتا ہو، یا اس کے نتیجہ میں لوگ مبتلائے معصیت ہوتے ہوں وہ کام بھی ممنوع ہوجاتا ہے، کیونکہ معبودات باطلہ یعنی بتوں کو برا کہنا کم از کم جائز تو ضرور ہے، اور ایمانی غیرت کے تقاضہ سے کہا جائے تو شاید اپنی ذات میں ثواب اور محمود بھی ہو، مگر چونکہ اس کے نتیجہ میں یہ اندیشہ ہوگیا کہ لوگ اللہ جل شانہ کو برا کہیں گے تو بتوں کو برا کہنے والے اس برائی کا سبب بن جائیں گے، اس لئے اس جائز کام کو بھی منع کردیا گیا، اس کی ایک اور مثال بھی حدیث میں اس طرح آئی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو مخاطب کرکے فرمایا کہ کوئی شخص اپنے ماں باپ کو گالی نہ دے، صحابہ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ یہ تو کسی شخص سے ممکن ہی نہیں کہ اپنے ماں باپ کو گالی دے، فرمایا کہ ہاں! انسان خود تو ان کو گالی نہیں دیتا، لیکن جب وہ کسی دوسرے شخص کے ماں باپ کو گالی دے اور اس کے نتیجہ میں وہ دوسرا اس کے ماں باپ کو گالی دے، تو اس گالی دلوانے کا سبب یہ بیٹا بنا، تو یہ بھی ایسا ہی ہے جیسے اس نے خود گالی دی۔

لیکن اس پر ایک قوی اشکال ہے، جس کو روح المعانی میں ابو منصور سے نقل کیا ہے، وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر جہاد و قتال لازم فرمایا

ہے، حالانکہ قتال کا یہ لازمی نتیجہ ہے کہ مسلمان کسی غیر مسلم کو قتل کرنے کا ارادہ کرے گا تو وہ مسلمانوں کو قتل کریں گے، اور مسلمان کا قتل حرام ہے، تو اس اصول پر جہاد بھی ممنوع ہو جانا چاہئے، ایسے ہی ہماری تبلیغ اسلام اور تلاوت قرآن پر نیز اذان اور نماز پر بہت سے کفار مذاق اڑاتے اور مضحکہ بناتے ہیں، تو کیا ہم ان کے اس غلط رویہ کی بناء پر اپنی عبادات سے دستبردار ہو جائیں گے، اس کا جواب خود ابو منصور نے یہ دیا ہے کہ یہ اشکال ایک ضروری شرط کے نظر انداز کر دینے سے پیدا ہو گیا ہے، شرط یہ ہے کہ وہ جائز کام جس کو لزوم مفسدہ کی وجہ سے منع کر دیا گیا ہے اسلام کے مقاصد اور ضروری کاموں میں سے نہ ہو، جیسے معبودات باطلہ کو برا کہنا، اس سے اسلام کا کوئی مقصد متعلق نہیں، اس لئے جب اس پر کسی دینی مفسدہ کا خطرہ لاحق ہوا تو ان کاموں کو ترک کر دیا گیا، اور جو کام ایسے ہیں کہ اسلام میں خود مقصود ہیں، یا کوئی مقصد اسلامی اس پر موقوف ہے اگر دوسرے لوگوں کی غلط روی سے ان پر کوئی مفسدہ اور خرابی مرتب بھی ہوتی نظر آئے تو ان مقاصد کو ہرگز ترک نہ کیا جائے گا، بلکہ اس کی کوشش کی جائیگی کہ یہ کام تو اپنی جگہ جاری رہیں اور پیش آنے والے مفاسد جہاں تک ممکن ہو بند ہو جائیں۔

اس لئے خلاصہ اس اصول کا جو آیت مذکورہ سے نکلا ہے یہ ہو گیا کہ جو کام اپنی ذات میں جائز بلکہ اطاعت وثواب بھی ہو مگر مقاصد شرعیہ میں سے نہ ہو، اگر اس کے کرنے پر کچھ مفاسد لازم آجائیں تو وہ کام ترک کر دینا واجب ہو جاتا ہے، بخلاف مقاصد شرعیہ کے کہ وہ لزوم مفاسد کی وجہ سے ترک نہیں کئے جاسکتے، مگر جو کام مقاصد اسلامیہ میں داخل ہیں خواہ فرائض وواجبات ہوں یا سنن مؤکدہ یا دوسری قسم کے شعائر اسلامی، اگر ان کے ادا کرنے سے کچھ کم فہم لوگ غلطی میں مبتلا ہونے لگیں تو ان کاموں کو ہرگز نہ چھوڑا جائے گا، بلکہ دوسرے طریقوں سے لوگوں کی غلط فہمی اور غلط کاری کو دور کرنے کی کوشش کی جائے گی، ابتداء اسلام کے واقعات شاہد ہیں کہ نماز وتلاوت اور تبلیغ اسلام کی وجہ سے مشرکین مکہ کو اشتعال ہوتا تھا، مگر اس کی وجہ سے ان شعائر اسلام کو کبھی ترک نہیں کیا گیا، اس لئے اس مسئلہ کی تنقیح اس طرح ہو گئی کہ جو کام مقاصد اسلامیہ میں داخل ہیں اگر ان کے کرنے سے کچھ لوگ غلط فہمی یا غلط کاری کا شکار ہوتے ہوں تو ان کاموں کو ہرگز نہ چھوڑا جائے گا، ہاں! جو کام مقاصد اسلامیہ میں داخل نہیں، اور ان کے ترک کر دینے سے کوئی دینی مقصد فوت نہیں ہوتا ایسے کاموں کو دوسروں کی غلط فہمی یا غلط کاری کے اندیشہ کی وجہ سے چھوڑ دیا جائیگا، خلاصہ یہ کہ اگر جائز کام پر مفاسد مرتب ہونے لگیں تو اس جائز کام سے منع کیا جائے گا، اور اگر فرض یا واجب کام سے مفاسد پیدا ہوں تو اس کو ترک نہ کیا جائے گا، ان دونوں کے فرق میں علم عظیم ہے، بے شمار مسائل کا حکم اور فیصلہ ان سے معلوم ہو سکتا ہے۔

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ: اس میں دلالت ہے کہ اگر کوئی طاعت کسی گناہ کا سبب بن جائے اور وہ طاعت واجب نہ ہو تو اس طاعت کو ترک کر دیا جائے گا (جیسا کہ یہاں بتوں کو برا بھلا کہنا جائز تو تھا واجب نہیں، لیکن جب یہ برا بھلا کہنا اللہ ورسول کی بے ادبی وگستاخی کا ذریعہ بنا تو اب بتوں کو برا کہنا جائز نہ ہو گا)، اسی وجہ سے اہل ارشاد علماء کو دیکھا گیا ہے کہ وہ بعض دفعہ بہت سے ایسے امور سے منع کر دیتے ہیں جو بظاہر تو طاعت معلوم ہوتے ہیں (جس سے لوگوں کو شبہ ہو جاتا ہے) مگر ان کی نظر میں وہ مفاسد کی طرف لے جانے والے ہوتے ہیں جو دوسرے لوگ نہیں سمجھ پاتے۔

* * *

فائدہ: لے یعنی تم تبلیغ ونصیحت کر کے اپنے فرض سے سبکدوش ہو چکے، اب جو جو کفر وشرک یہ لوگ کریں اس کے ذمہ دار خود ہیں تم پر اس کی کچھ ذمہ داری نہیں، ہاں! یہ ضروری ہے کہ تم اپنی جانب سے بلا ضرورت ان کے مزید کفر وتعنت کا سبب نہ بنو، مثلاً فرض کیجیے ان کے مذہب کی تردید یا بحث ومناظرہ کے سلسلہ میں تم غصہ ہو کر ان کے معبودوں اور مقتداؤں کو سب وشتم کرنے لگو، جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ وہ جواب میں تمہارے معبود برحق اور محترم بزرگوں کی بے ادبی کریں گے، اور جہالت سے انہیں گالیاں دیں گے، اس صورت میں اپنے واجب التعظیم معبود اور قابل احترام بزرگوں کی اہانت کا سبب تم بنے، لہذا اس سے ہمیشہ احتراز کرنا چاہیے، کسی مذہب کے اصول وفروع کی معقول طریقے سے غلطیاں ظاہر کرنا یا اس کی کمزوری اور رکاکت پر تحقیقی والزامی طریقوں سے متنبہ کرنا جدا گانہ چیز ہے، لیکن کسی قوم کے پیشواؤں اور معبودوں کی نسبت بغرض تحقیر وتوہین دلخراش الفاظ نکالنا قرآن نے کسی وقت بھی جائز نہیں رکھا۔

فائدہ: ۲ یعنی دنیا چونکہ دار امتحان ہے، اسکا نظام ہم نے ایسا رکھا ہے اور ایسے اسباب جمع کر دیئے ہیں کہ یہاں ہر قوم اپنے اعمال اور طور و طریق پر نازاں رہتی ہے، انسانی دماغ کی ساخت ایسی نہیں بنائی کہ وہ صرف سچائی کے قبول اور پسند کرنے پر مجبور ہو، غلطی کی طرف جانے کی گنجائش ہی نہ رکھے، ہاں خدا کے ہاں جا کر جب تمام حقائق سامنے ہوں گے پتہ چل جائے گا کہ جو کام دنیا میں کرتے تھے وہ کیسے تھے۔

وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ لَّيُؤْمِنُنَّ بِهَا ۗ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ

اور وہ قسمیں کھاتے ہیں اللہ کی تاکید سے کہ اگر آئے ان کے پاس کوئی نشانی تو ضرور اس پر ایمان لائیں گے ۱ تو کہہ دے کہ نشانیاں

عِنْدَ اللّٰهِ وَمَا يُشْعِرُكُمْ ۙ اَنَّهَآ اِذَا جَآءَتْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰۹﴾

تو اللہ کے پاس ہیں اور تم کو اے مسلمانو کیا خبر ہے کہ جب وہ نشانیاں آئیں گی تو یہ لوگ ایمان لے آئیں گے ۲

خلاصہ تفسیر: گذشتہ آیات میں اس کا ذکر تھا کہ رسول کریم ﷺ کے کھلے ہوئے معجزات اور اللہ تعالیٰ کی روشن نشانیوں کے باجود ہٹ دھرم لوگوں نے ان سے فائدہ نہ اٹھایا، اپنے انکار اور ضد پر جمے رہے، اب ان آیات میں اس کا ذکر ہے کہ ان لوگوں نے اپنی ضد اور ہٹ دھری کا ایک نیا روپ یہ بدلا کہ آنحضرت ﷺ سے خاص خاص قسم کے معجزات دکھلانے کا مطالبہ کیا، جیسا کہ ابن جریر رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے کہ قریشی سرداروں نے مطالبہ کیا کہ اگر آپ ﷺ ہمیں یہ معجزہ دکھلا دیں کہ کوہ صفا پورا سونا ہو جائے تو ہم آپ ﷺ کی نبوت و رسالت کو مان لیں گے، اور مسلمان ہو جائیں گے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اچھا معاہدہ کرو کہ اگر یہ معجزہ ظاہر ہو گیا تو تم سب مسلمان ہو جاؤ گے، انہوں نے قسمیں کھالیں، آپ ﷺ اللہ تعالیٰ سے دعا کرنے کے لئے کھڑے ہو گئے کہ اس پہاڑ کو سونا بنا دیجئے، حضرت جبرئیل علیہ السلام وحی لے کر آئے کہ اگر آپ ﷺ چاہیں تو ہم ابھی اس پورے پہاڑ کو سونا بنا دیں، لیکن قانون الٰہی کے مطابق اس کا یہ نتیجہ ہوگا کہ اگر پھر بھی یہ ایمان نہ لائے تو سب پر عذاب عام نازل کر کے ہلاک کر دیا جائے گا، جیسی پچھلی قوموں میں ہمیشہ ہوتا رہا ہے، کہ انہوں نے کسی خاص معجزہ کا مطالبہ کیا، وہ دکھایا گیا، اور وہ پھر بھی منکر ہو گئے، تو ان پر خدا تعالیٰ کا قہر و عذاب نازل ہو گیا، رحمۃ اللعالمین ﷺ چونکہ ان لوگوں کی عادات اور ہٹ دھرمی سے واقف تھے، بمقتضائے شفقت آپ ﷺ نے فرمایا کہ اب میں اس معجزہ کی دعا نہیں کرتا، اس واقعہ پر یہ اور اگلی آیات نازل ہوئی۔

اور ان (منکر) لوگوں نے قسموں میں بڑا زور لگا کر اللہ کی قسم کھائی کہ اگر ان کے (یعنی ہمارے) پاس (یعنی ان کے فرمائشی نشانوں میں سے) کوئی نشان (یعنی معجزہ ظہور میں) آجائے تو وہ (یعنی ہم) ضرور ہی اس (نشان) پر ایمان لے آئیں گے (یعنی نشان ظاہر کرنے والے کی نبوت کو مان لیں گے) آپ (جواب میں) کہہ دیجئے کہ نشان سب خدا تعالیٰ کے قبضہ میں ہیں (وہ ان میں جس طرح چاہے تصرف فرمائے، کسی دوسرے کو دخل دینا اور فرمائش کرنا بے جا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو معلوم نہیں کہ کس کا ظاہر ہونا حکمت ہے اور کس کا ظاہر نہ ہونا حکمت ہے، البتہ بعثت رسل کے وقت مطلقاً کسی نشان کو ظاہر کر دینا اس میں حکمت یقینی ہے، سو اللہ تعالیٰ بہت سے نشان رسالت محمدیہ کے دعویٰ کی صداقت پر ظاہر فرما چکے ہیں جو کہ دلالت کے لئے کافی ہیں، بس یہ ان کی فرمائش کا جواب ہو گیا) اور (چونکہ مسلمانوں کے دل میں خیال تھا کہ ہو اگر یہ نشان ظاہر ہو جائیں تو اچھا ہوگا، شاید ایمان لے آئیں ان کو خطاب فرماتے ہیں کہ) تم کو اس کی کیا خبر (بلکہ ہم کو خبر ہے) کہ وہ (فرمائشی) نشان جس وقت (ظہور میں) آجائیں گے یہ لوگ (انتہائی عناد کی وجہ سے) جب بھی ایمان نہ لائیں گے۔

اس آیت سے یہ ثابت ہو گیا کہ جدید معجزات کی ضرورت نہ تھی، اب سوال ہوتا ہے کہ اگر معجزات ظاہر کر دیے جاتے تو کیا نقصان تھا؟ سو اس نقصان کا بیان دوسری آیات میں ہے، چنانچہ اسی سورت کے شروع میں آیت وقالوا لولا انزل علیہ ملك کی تفسیر میں گذر چکا ہے۔

وَاَقۡسَمُوۡا بِاللّٰهِ جَهۡدَ اَيۡمَانِهِمۡ: اس میں دلالت ہے کہ خارق عادت کے معائنہ سے فائدہ ہو یہ لازمی بات نہیں، سو ان کا معجزات طلب کرنا ہدایت کا طریقہ نہیں ہے، بلکہ اس کا طریقہ بینات (احکام) کی اتباع ہے، استاذ، شیخ، بزرگ میں بھی کرامات تلاش نہ کرے، اس کے کمال علم و عمل کی تحقیق کے بعد اس کا اتباع کرے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی بعض فرمائشی نشانیاں مثلاً کوہ صفا خالص سونے کا بن جائے۔

فائدہ: ۲؎ بعض مسلمانوں کو یہ خیال ہوا کہ اچھا ہوا گر ان کی یہ حجت بھی پوری کر دی جائے اس پر فرمادیا کہ تمہیں کیا خبر ہے کہ یہ سرکش ضدی لوگ فرمائشی نشان دیکھ کر بھی ایمان نہیں لائیں گے پھر سنت اللہ کے موافق اس کے مستحق ہوں گے کہ فوراً تباہ کر دیئے جائیں، جیسا کہ اسی سورت کے شروع میں ہم مفصل لکھ چکے ہیں۔

وَنُقَلِّبُ اَفۡـِٕدَتَهُمۡ وَاَبۡصَارَهُمۡ كَمَا لَمۡ يُؤۡمِنُوۡا بِهٖۤ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّنَذَرُهُمۡ

اور ہم الٹ دیں گے ان کے دل اور ان کی آنکھیں جیسے کہ ایمان نہیں لائے نشانیوں پر پہلی بار اور ہم چھوڑے رکھیں گے ان کو

فِىۡ طُغۡيَانِهِمۡ يَعۡمَهُوۡنَ ﴿۱۱۰﴾ ع ۱۳/۱۹

ان کی سرکشی میں بہکتے ہوئے

خلاصہ تفسیر: اور (ان کے ایمان نہ لانے کی وجہ سے) ہم بھی ان کے دلوں کو (حق طلبی کے قصد سے) اور ان کی نگاہوں کو (حق بینی کی نظر سے) پھیر دیں گے (اور ان کا یہ ایمان نہ لانا ایسا ہے) جیسا یہ لوگ اس (قرآن) پر (کہ عظیم معجزہ ہے) پہلی دفعہ (جبکہ وہ آیا) ایمان نہیں لائے (تو اب ایمان نہ لانے کو بعید مت سمجھو) اور (تقلیب ابصار یعنی نگاہوں کو بیکار کرنے کا مطلب ظاہری بیکار نہیں ہے، بلکہ مراد یہ ہے کہ) ہم ان کو ان کی سرکشی (وکفر) میں حیران (سرگرداں) رہنے دیں گے (ایمان کی توفیق نہ ہوگی کہ یہ معنوی تقلیب (خرابی) ہے)۔

وَنُقَلِّبُ اَفۡـِٕدَتَهُمۡ وَاَبۡصَارَهُمۡ: سوال ہوتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ ہی نے ان کو خراب کر دیا تو پھر مواخذہ والزام کیسا؟ اس کا جواب پیچھے چند مواقع پر گذر چکا ہے، یہاں بھی اجمالاً ترجمہ سے قبل اشارہ کر دیا گیا: ''ان کے ایمان نہ لانے کی وجہ سے''، اس خرابی کا سبب ان کا اعراض ہے، ایسا نہیں ہے کہ ان کے دل حق کی طرف پہلے سے متوجہ ہوں اور پھر خرابی واقع ہو، بلکہ توجہ کے ساتھ تو یہ وعدہ ہے کہ: والذین جاھدوا فینا لنھدینّھم سبلنا۔

* * *

فائدہ: یعنی جب کفر و سرکشی میں تمادی ہوگی تو نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم ان کے دل اور آنکھیں الٹ دیں گے، پھر حق کے سمجھنے اور دیکھنے کی توفیق نہ ملے گی، موضح القرآن میں ہے کہ: ''اللہ جن کو ہدایت دیتا ہے اول ہی حق سن کر انصاف سے قبول کرتے ہیں اور جس نے پہلے ہی ضد کی اگر نشانیاں بھی دیکھ لے تو کچھ حیلہ بنالے''۔

وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَآ اِلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا

اور اگر ہم اتاریں ان پر فرشتے اور باتیں کریں ان سے مردے اور زندہ کردیں ہم ہر چیز کو ان کے سامنے

مَّا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُوْنَ ﴿۱۱۱﴾

تو بھی یہ لوگ ہرگز ایمان لانے والے نہیں مگر یہ کہ چاہے اللہ لیکن ان میں اکثر جاہل ہیں

خلاصہ تفسیر: اور (ان کے عناد کی تو یہ کیفیت ہے کہ) اگر ہم (ایک فرمائشی نشان کیا، کئی کئی اور بڑے بڑے فرمائشی نشان بھی ظاہر کردیتے، مثلاً یہ کہ) ان کے پاس فرشتوں کو بھیج دیتے (جیسا وہ کہتے ہیں: لو لا انزل علینا الملائکۃ) اور ان سے مردے (زندہ ہوکر) باتیں کرنے لگتے (جیسا وہ کہتے ہیں: فاتوا بآبائنا) اور (یہ تو صرف اتنا ہی کہتے ہیں: تاتی باللہ والملائکۃ قبیلا) ہم (اسی پر اکتفاء نہ کرتے بلکہ) تمام موجودات (غیبیہ) کو (جس میں جنت و دوزخ سب کچھ آ گیا) ان کے پاس ان کی آنکھوں کے روبرو لاکر جمع کردیتے (کہ سب کو کھلم کھلا دیکھ لیتے) تب بھی یہ لوگ ہرگز ایمان نہ لاتے، ہاں مگر خدا ہی چاہے (اور ان کی تقدیر بدل دے) تو اور بات ہے (مگر چونکہ ان لوگوں کا خود ہی ایمان لانے کا ارادہ نہیں اس لیے خدا تعالیٰ نے بھی ان کی تقدیر کو نہ پلٹا، تو جب ان کے عناد و شرارت کی یہ کیفیت ہے اور خود بھی وہ جانتے ہیں کہ ہماری نیت کسی وقت بھی ایمان لانے کی نہیں تو ان کو نئے معجزات کی فرمائش بھی نہیں کرنی چاہیے تھی، کیونکہ محض بے کار ہے) لیکن ان میں زیادہ لوگ جہالت کی باتیں کرتے ہیں (کہ ایمان لانے کا تو ارادہ نہیں، پھر خواہ مخواہ کی فرمائشیں تو اس کا جہالت ہونا ظاہر ہے)۔

رہا یہ سوال کہ اگر ان کی یہ فرمائش پوری ہوجاتی تو کیا نقصان تھا؟ اس نقصان کا بیان دوسری آیتوں میں آچکا ہے، اور یہاں بھی ربط میں معلوم ہوچکا ہے کہ اس صورت میں ایمان نہ لانے سے فوری عذاب نازل ہوتا، حاصل جواب کا یہ ہوا کہ رسول مدعی نبوت ہے، اور عقلی قاعدہ کے مطابق مدعی کے ذمہ کسی مطلق دلیل کا قائم کرنا ضروری ہے، کسی خاص دلیل کا معین کرنا ضروری نہیں، اس لیے منکرین کو نئے معجزات کی فرمائش کا کوئی حق حاصل نہ تھا، کیونکہ بہت سے معجزات خارق عادت ظاہر ہوچکے تھے، ہاں! ان دلائل پر جرح قدح کریں گے تو اس کا جواب بے شک مدعی یا اس کے نائب کے ذمہ ضروری ہوگا جس کے لیے اسلام کی حقانیت کا ہر مدعی اب بھی آمادہ ہے، دیکھیے مقدمہ میں مدعی (فریادی) کے ذمہ گواہ لانا ضروری ہے، اور مدعا علیہ (مخالف) کو اختیار ہے کہ ان گواہوں کا مجروح ہونا ثابت کرے، لیکن اس کو یہ اختیار نہیں کہ بلا وجہ اور کسی جرح کے بغیر یہ کہنے لگے کہ "میں تو فلاں فلاں شخصوں کی گواہی کو مانوں گا، ان گواہوں کو نہیں مانتا"، حاکم عدالت اس بے ہودہ عذر کو ہرگز نہیں سن سکتا۔

وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَآ اِلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةَ: خوارق و کرامات کے معائنہ سے نفع ہونا لازمی نہیں، پس ان کا طلب کرنا ہدایت کا طریقہ نہیں ہے، بلکہ ہدایت کا طریقہ بینات کا اتباع ہے، سو اپنے شیخ میں بھی کشف و کرامات تلاش نہیں کرنی چاہیے، بلکہ اس کے کمال علم و عمل کی تحقیق کے بعد اس کا اتباع کیا جائے (تو ہدایت نصیب ہوجاتی ہے، کیونکہ کرامات کے دیکھنے سے ضروری نہیں نفع بھی ہوجائے جس طرح انبیاء کے معجزات دیکھ کر بھی لوگوں نے انکار کیا اور ان کو جادوگر کہا)۔

* * *

فائدہ: یعنی اگر ان کی فرمائش کے موافق بلکہ اس سے بھی بڑھ کر فرض کیجیے آسمان سے فرشتے اتر کر آپ کی تصدیق کریں اور مردے قبروں سے اٹھ کر ان سے باتیں کرنے لگیں اور تمام امتیں جو گزر چکی ہیں دوبارہ زندہ کر کے ان کے سامنے لاکھڑی کی جائیں تب بھی سوء استعداد اور تعنت و عناد کی وجہ سے یہ لوگ حق کو ماننے والے نہیں، بیشک اگر خدا چاہے تو زبردستی منوا سکتا ہے، لیکن ایسا چاہنا اس کی حکمت اور تکوینی نظام کے خلاف ہے، جس کو ان میں کے اکثر لوگ اپنے جہل کی وجہ سے نہیں سمجھتے، اس کی تشریح پچھلے فوائد میں گزر چکی۔

وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ

اور اسی طرح کر دیا ہم نے ؎۱ ہر نبی کے لیے دشمن شریر آدمیوں کو اور جنوں کو جو کہ سکھلاتے ہیں ایک دوسرے کو

زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ؕ وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ ﴿۱۱۲﴾

ملمع کی ہوئی باتیں فریب دینے کیلئے، اور اگر تیرا رب چاہتا تو وہ لوگ یہ کام نہ کرتے سو تو چھوڑ دے وہ جانیں اور ان کا جھوٹ ؎۲

خلاصہ تفسیر: پیچھے کفار کے عناد و دشمنی کا ذکر تھا، اب آنحضرت ﷺ کو تسلی دی جارہی ہے کہ یہ لوگ اگر آپ سے عداوت کرتے ہیں تو کچھ تعجب کی بات نہیں، پچھلے تمام انبیاء کے بھی دشمن ہوتے چلے آئے ہیں۔

اور (یہ لوگ جو آپ سے عداوت کرتے ہیں یہ کوئی نئی بات آپ ﷺ ہی کے لئے نہیں ہوتی، بلکہ جس طرح یہ آپ سے عداوت رکھتے ہیں) اسی طرح ہم نے ہر نبی کے دشمن بہت سے شیطان پیدا کئے تھے، کچھ آدمی (جن سے اصل معاملہ تھا) اور کچھ جن (ابلیس اور اس کی اولاد) جن میں سے بعض (یعنی ابلیس اور اس کا لشکر) دوسرے بعضوں کو (یعنی کافر آدمیوں کو) چکنی چپڑی باتوں کا وسوسہ ڈالتے رہتے تھے تاکہ ان کو دھوکہ میں ڈال دیں (ان سے مراد کفر و مخالفت کی باتیں ہیں کہ ظاہر میں نفس کو بھلی معلوم ہوتی تھیں، اور حقیقت میں مہلک تھیں، اور یہی دھوکہ ہے، تو جب یہ کوئی نئی بات نہیں تو آپ اس کا غم نہ کیجئے کہ آپ کے ساتھ یہ لوگ ایسے معاملات کیوں کرتے ہیں، اصل یہ ہے کہ اس میں بعض حکمتیں ہیں، اس وجہ سے ان کو ایسے امور پر قدرت بھی ہوگئی ہے) اور اگر اللہ تعالیٰ (یہ) چاہتا (کہ یہ لوگ ایسے امور پر قادر نہ رہیں) تو (پھر) یہ ایسے کام نہ کرسکتے (مگر بعض حکمتوں سے ان کو قدرت دے دی ہے) سو (جب اس میں حکمتیں ہیں تو) ان لوگوں کو اور جو کچھ یہ (دین کے بارہ میں) افتراء پردازی کررہے ہیں (جیسے انکار نبوت جس کا نتیجہ دشمنی ہے) اس کو آپ رہنے دیجئے (اس کی فکر و غم میں نہ پڑیئے، ہم خود متعین وقت پر مناسب سزاء دیں گے)۔

لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ: یہاں شیطان سے بطور مجاز عام معنی مراد لیے گئے جو انسان و جنات دونوں کو شامل ہیں، مگر اس جگہ مجازی معنی مراد لینے سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہر جگہ شیطان سے یہی معنی مراد ہوں، یہاں تک کہ اصلی شیطان کا انکار کیا جائے، دوسرے اس جگہ شیطان کی ایک قسم جن بھی بتلائی گئی ہے پس اس سے تو حقیقی شیطان کا وجود خود ثابت ہوگیا تو اس مجازی معنی سے جنوں کے وجود کے انکار کی گنجائش نہیں ہوسکتی۔

يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ: کافر شیطان کے وسوسوں کی طرف میلان اور ان کا قصد کرکے ان پر عمل کرتے ہیں اسی لیے ان کی مذمت کرتے ہیں، ورنہ محض وسوسہ اگر اس پر قصد و ارادہ نہ ہو نقصان دہ نہیں، البتہ وسوسہ ڈالنے والے کو تو ہر حالت میں گناہ ہوگا، کیونکہ اس نے گمراہ کرنے کا ارادہ کر ہی لیا۔

* * *

فائدہ: ؎۱ یعنی پیدا کر دیا ہم نے۔

فائدہ: ؎۲ چونکہ خدا کی حکمت بالغہ تکویناً اسی کو مقتضی ہے کہ نظام عالم کو جب تک قائم رکھنا منظور ہے خیر و شر کی قوتوں میں سے کوئی قوت بھی بالکل مجبور اور نیست و نابود نہ ہو، اس لئے نیکی و بدی اور ہدایت و ضلالت کی حریفانہ جنگ ہمیشہ سے قائم رہی ہے، جس طرح آج یہ مشرکین و معاندین آپ کو بیہودہ فرمائشوں سے دق کرتے اور بانواع حیل لوگوں کو جادہ حق سے ڈگمگانا چاہتے ہیں، اسی طرح ہر پیغمبر کے مقابل شیطانی قوتیں کام کرتی رہی ہیں کہ پیغمبروں کو ان کے پاک مقصد (ہدایت خلق اللہ) میں کامیاب نہ ہونے دیں، اسی غرض فاسد کے لئے شیاطین الجن اور شیاطین الانس باہم تعاون کرتے، اور ایک دوسرے کو فریب دہی اور ملمع سازی کی چکنی چپڑی باتیں سکھاتے ہیں اور ان کی یہ عارضی آزادی اسی عام حکمت اور نظام تکوینی کے ماتحت ہے جو تخلیق عالم میں حق تعالیٰ نے مرعی رکھی ہے، اس لئے آپ اعداء اللہ کی فتنہ پردازی اور مغویانہ فریب دہی سے زیادہ فکر و غم میں نہ پڑیں، ان سے اور

ان کے کذب وافتراء سے قطع نظر کر کے معاملہ خدا کے سپرد کیجئے۔

وَلِتَصْغٰٓى اِلَيْهِ اَفْـِٕدَةُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَلِيَرْضَوْهُ وَلِيَقْتَرِفُوْا مَا هُمْ مُّقْتَرِفُوْنَ ﴿۱۱۳﴾

اور اس لئے کہ مائل ہوں ان ملمع کی باتوں کی طرف ان لوگوں کے دل جنکو یقین نہیں آخرت کا اور وہ اسکو پسند بھی کرلیں اور کیے جائیں جو کچھ برے کام کر رہے ہیں

خلاصہ تفسیر: (ان حکمتوں میں سے ایک یہ بھی ہے) اور (وہ شیاطین ان کافر آدمیوں کو اس لئے وسوسہ میں ڈالتے تھے) تاکہ اس (فریب آمیز بات) کی طرف ان لوگوں کے قلوب مائل ہو جائیں جو آخرت پر یقین نہیں رکھتے (جیسا یقین مطلوب ہے، مراد کافر لوگ ہیں، اگرچہ اہل کتاب ہی ہوں، کیونکہ قیامت پر جیسا یقین چاہئے ان کو بھی نہ تھا، ورنہ انکار نبوت پر جرأت نہ کرتے جس کی وجہ سے قیامت میں سزاء ہوگی) اور تاکہ (میلان نفسانی کے بعد) اس کو (اعتقاد قلبی سے بھی) پسند کرلیں اور تاکہ (اعتقاد کے بعد) مرتکب (بھی) ہو جائیں ان امور کے جن کے وہ مرتکب ہوتے تھے۔

الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ: چونکہ مخالفت سے بچنے میں خوف عذاب کو زیادہ دخل ہے اس لیے یہاں آخرت کا ذکر خاص طور پر کیا گیا، کیونکہ اگر کوئی خدا کا قائل ہو مگر آخرت کا منکر ہو تو اس کو گناہ سے بچنا بہت مشکل ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی شیاطین ایک دوسرے کو ملمع کی ہوئی فریب کی باتیں اس لئے سکھلاتے ہیں کہ انھیں سن کر جو لوگ دنیا کی زندگی میں غرق ہیں اور دوسری زندگی کا یقین نہیں رکھتے ان ابلہ فریب باتوں کی طرف مائل ہو جائیں اور ان کو دل سے پسند کرنے لگیں، اور پھر کبھی برے کاموں اور کفر وفسق کی دلدل سے نکلنے نہ پائیں۔

اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا ۭ وَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ

کیا اب اللہ کے سوا کسی اور کو منصف بناؤں حالانکہ اسی نے اتاری تم پر کتاب واضح، اور جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے

يَعْلَمُوْنَ اَنَّهٗ مُنَزَّلٌ مِّنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿۱۱۴﴾ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ

وہ جانتے ہیں کہ یہ نازل ہوئی ہے تیرے رب کی طرف سے ٹھیک سو تو مت ہو شک کرنے والوں میں سے، اور تیرے رب کی بات پوری

صِدْقًا وَّعَدْلًا ۭ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۱۵﴾

سچی ہے اور انصاف کی، کوئی بدلنے والا نہیں اس کی بات کو، اور وہی ہے سننے والا جاننے والا۔

خلاصہ تفسیر: پیچھے ثابت کیا گیا کہ نبوت پر جدید دلائل قائم کرنے کی ضرورت نہیں، اب اس دلیل یعنی قرآن کے بارے میں بتلاتے ہیں جو اس بارہ میں کافی وشافی ہے، نیز اس کے ماننے نہ ماننے والوں کی حالت بیان فرماتے ہیں:

(آپ صلی اللہ علیہ وسلم کہہ دیجئے کہ میرے تمہارے درمیان جو مقدمہ رسالت میں اختلاف ہے کہ میں بحکم سرکاری اس کا مدعی ہوں اور تم منکر، اور یہ مقدمہ احکم الحاکمین کی جانب سے میرے حق میں اس طرح طے اور فیصل ہو چکا ہے کہ میرے اس دعوے پر کافی ثبوت اور دلیل یعنی قرآن معجز خود قائم فرما دیا ہے اور تم پھر بھی نہیں مانتے) تو کیا (تم یہ چاہتے ہو کہ اس خدائی فیصلہ کو کافی نہ قرار دوں اور) اللہ کے سوا کسی اور فیصلہ کرنے والے کو تلاش کروں، حالانکہ وہ ایسا (کامل فیصلہ کر چکا) ہے کہ اس نے ایک کتاب (جو اپنے اعجاز میں) کامل (ہے) تمہارے پاس بھیج دی ہے (جو اپنے اعجاز کی وجہ سے نبوت کی کافی دلیل ہے، پس اس کے دو کمال تو یہ ہیں: معجزہ ہونا اور اللہ کی طرف سے نازل ہونا، اس کے علاوہ اور وجوہ سے بھی کامل ہے، اور اس سے

ہدایت وتعلیم کے جو مقاصد متعلق ہیں ان کے لئے کافی ہے، چنانچہ) اس کی (تیسری کمال کی) حالت یہ ہے کہ اس کے مضامین (جو دین کے باب میں ضروری ہیں) خوب صاف صاف بیان کئے گئے ہیں اور (چوتھا وصف کمال اس کا یہ ہے کہ کتب سابقہ میں اس کی خبر دی گئی ہے جو اس کے مہتم بالشان ہونے کی علامت ہے، چنانچہ) جن لوگوں کو ہم نے کتاب (یعنی تورات وانجیل) دی ہے وہ اس کو یقین کے ساتھ جانتے ہیں کہ یہ (قرآن) آپ (ﷺ) کے رب کی طرف سے واقعیت کے ساتھ بھیجا گیا ہے (اس کو جانتے تو سب ہیں، پھر جن اہل کتاب میں حق گوئی کی صفت تھی، انہوں نے ظاہر بھی کردیا، اور جو معاند تھے وہ ظاہر نہ کرتے تھے) سو آپ (ﷺ) شبہ کرنے والوں میں نہ ہوں، اور (پانچواں وصف کمال اس کا یہ ہے کہ) آپ کے رب کا (یہ) کلام واقعیت اور اعتدال کے اعتبار سے (بھی) کامل ہے (یعنی اس میں واقعی علوم اور سچے عقائد ہیں، اور اعمال ظاہری اور باطنی میں اعتدال کی رعایت ہے، اور چھٹا وصف کمال اس کا یہ ہے کہ) اس کے (اس) کلام کا کوئی بدلنے والا نہیں (یعنی کسی کی تحریف وتغیر سے اس کا اللہ محافظ ہے: وانا لہ لحفظون) اور (ایسی کامل دلیل پر بھی جو لوگ دلی وزبانی تکذیب سے پیش آئیں) وہ (یعنی اللہ تعالیٰ ان کے اقوال کو) خوب سن رہے ہیں (اور ان کے عقائد کو) خوب جان رہے ہیں (اپنے وقت پر ان کو کافی سزا دیں گے)۔

وَهُوَ الَّذِيٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا: یہاں قرآن کریم کے چھ خصوصی کمالات کا بیان ہے جو قرآن کے کلام الٰہی ہونے کا کافی ثبوت ہیں: ① اول یہ کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کیا ہوا ہے ② دوسرے یہ کہ وہ ایک کامل کتاب ہے جو ایسا معجزہ ہے کہ سارا جہان اس کے مقابلہ سے عاجز ہے ③ تیسرے یہ کہ دین کی اہم اور ضروری باتیں اس میں بہت مفصل واضح بیان ہوئی ہیں ④ چوتھے یہ کہ قرآن کریم سے پہلے اہل کتاب یہود ونصاریٰ بھی یقین کے ساتھ جانتے ہیں کہ قرآن اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کیا ہوا کلام حق ہے، پھر جن میں کوئی سچائی اور حق گوئی کی صفت تھی، انہوں نے اس کو ظاہر بھی کردیا، اور جو لوگ معاند تھے وہ باوجود یقین کے اس کا اظہار نہ کرتے تھے ⑤ پانچویں یہ کہ اس میں واقعیت، انصاف، سچائی، اور اعتدال کی پوری رعایت ہے ⑥ اس کے کلام کو کوئی بدلنے والا نہیں، تحریف اور تغیر سے خدا اس کا حافظ اور نگہبان ہے۔

اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا: کیا میں اللہ کے سوا کسی اور فیصلہ کرنے والوں کو تلاش کروں، یہاں ظاہری طور پر نسبت آپ ﷺ کی طرف ہے لیکن مقصود اوروں کو سنانا ہے، مطلب یہ ہے کہ کیا تم اللہ کے سوا کسی دوسرے کا فیصلہ چاہتے ہو، مناظرہ اور گفتگو میں ایسی باتوں کو اپنی طرف نسبت کرنے سے مخاطب پر زیادہ اثر ہوتا ہے اس لیے نرمی وملاطفت کے طور پر ظاہر میں آپ کی طرف نسبت کردی گئی، یہ انداز دعوت وتبلیغ میں زیادہ مفید ہوتا ہے۔

فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ: یعنی ان واضح دلائل کے بعد آپ ﷺ شبہ کرنے والوں میں نہ ہوں، یہ ظاہر ہے کہ رسول کریم ﷺ تو کسی وقت بھی شبہ کرنے والوں میں نہ تھے نہ ہوسکتے تھے، جیسا کہ خود آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ "نہ میں نے کبھی شک کیا اور نہ کبھی سوال کیا"، معلوم ہوا کہ یہاں اگرچہ لفظوں میں خطاب حضور ﷺ کو ہے، لیکن درحقیقت سنانا دوسروں کو مقصود ہے، اور آپ کی طرف اسناد کرنے سے مبالغہ اور تاکید کرنا منظور ہے کہ جب آنحضرت ﷺ کو ایسا کہا گیا تو دوسروں کی کیا ہستی ہے جو کوئی شک کرسکیں۔

* * *

فائدہ: [1] یعنی شیاطین الانس والجن کی تلبیس وتلمیع پر بدعقیدہ اور جاہل ہی کان دھر سکتے ہیں، ایک پیغمبر یا اس کے متبعین جو ہر مسئلہ اور ہر معاملہ میں خدائے واحد ہی کو اپنا منصف اور حکم مان چکے ہیں کیا ان سے یہ ممکن ہے کہ وہ خدا کو چھوڑ کر کسی دوسرے کی چکنی چپڑی باتوں کی طرف کان لگائیں، یا معاذ اللہ غیر اللہ کے فیصلہ کے آگے گردن جھکادیں، حالانکہ ان کے پاس خدا کی طرف سے ایسی معجز اور کامل کتاب آچکی جس میں تمام اصولی چیزوں کی ضروری توضیح وتفصیل موجود ہے، جس کی نسبت علمائے اہل کتاب بھی کتب سابقہ کی بشارات کی بناء پر خوب جانتے ہیں کہ یقیناً یہ آسمانی کتاب ہے جس کی تمام خبریں سچی اور تمام احکام معتدل اور منصفانہ ہیں جن میں کسی کی طاقت نہیں کہ موجودگی میں کیسے کوئی مسلمان وساوس واوہام یا محض عقلی قیاسات اور مغویانہ مغالطات کا شکار ہوسکتا ہے جبکہ وہ جانتا ہے کہ خدا تعالیٰ جس کو ہم نے اپنا حکم اور جس کی کتاب مبین کو دستور العمل تسلیم کیا ہے وہ ہماری ہر بات کو سننے والا اور ہر قسم کے مواقع واحوال اور ان کے مناسب احکام ونتائج کی موزونیت کو پوری طرح جاننے والا ہے۔

وَإِنْ تُطِعْ أَكْثَرَ مَنْ فِي الْأَرْضِ يُضِلُّوكَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ ۚ إِنْ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ

اور اگر تو کہنا مانے گا اکثر لوگوں کا جو دنیا میں ہیں تو تجھ کو بہکا دیں گے اللہ کی راہ سے، وہ سب تو چلتے ہیں اپنے خیال پر

وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ ﴿١١٦﴾

اور سب اٹکل ہی دوڑاتے ہیں

خلاصہ تفسیر: اور (واضح دلائل ہونے کے باوجود) دنیا میں زیادہ لوگ ایسے (منکر اور گمراہ ہی) ہیں کہ اگر (بالفرض) آپ ان کا کہنا ماننے لگیں تو وہ آپ کو اللہ کی راہ (راست) سے بے راہ کر دیں (کیونکہ وہ خود گمراہ ہیں، چنانچہ عقائد میں) وہ محض بے اصل خیالات پر چلتے ہیں اور (اقوال میں) بالکل قیاسی باتیں کرتے ہیں۔

وَإِنْ تُطِعْ أَكْثَرَ مَنْ فِي الْأَرْضِ: جاننا چاہیے کہ اس جگہ جو حضور ﷺ کو خطاب فرمایا گیا ہے کہ: إِنْ تُطِعْ أَكْثَرَ مَنْ یعنی اگر آپ ان کا کہنا ماننے لگیں، اسی طرح پچھلی آیت میں جو فرمایا گیا ہے کہ: فلا تکونن من الممترین یعنی آپ شبہ کرنے والوں میں نہ ہوں، یہاں فعل کی نسبت جناب رسول اللہ ﷺ کی طرف کی گئی ہے لیکن اس سے دوسروں کو سنانا مقصود ہے، اور حضور ﷺ کو خطاب فرمانے سے مبالغہ ہو گیا کہ جب آپ کو ایسا کہا گیا حالانکہ آپ ﷺ کی ذات سے اس قسم کا احتمال بھی نہیں تو دوسروں کی کیا ہستی ہے۔

إِنْ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ: اس ظن سے مراد وہ ظن ہے جو کسی شرعی دلیل کی بنیاد پر نہ ہو، اس سے معلوم ہوا کہ احکام کے بارے میں کشف یا الہام حجت و دلیل نہیں بنتے، خاص کر ان کا جزم و یقین کرنا تو بالکل باطل ہے۔

❋ ❋ ❋

فائدہ: مشاہدہ اور تاریخ بتلاتے ہیں کہ دنیا میں ہمیشہ فہیم، محقق اور با اصول آدمی تھوڑے رہے ہیں، اکثریت ان ہی لوگوں کی ہوتی ہے جو محض خیالی، بے اصول اور اٹکل پچو باتوں کی پیروی کرنے والے ہوں، اگر تم اسی اکثریت کا کہنا ماننے لگو اور بے اصول باتوں پر چلنا شروع کر دو تو خدا کی بتلائی ہوئی سیدھی راہ سے یقیناً بہک جاؤ گے، یہ آپ پر رکھ کر دوسروں کو سنایا، جاہل عوام کی ان ہی بے اصول اور اٹکل پچو باتوں میں سے ایک وہ تھی جو انہوں نے ذبیحہ کے مسئلہ پر نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا تھا کہ جو جانور طبعی موت سے مرجائے (یعنی میتہ، مردار) اسے مسلمان حرام کہتے ہیں حالانکہ وہ خدا کا مارا ہوا ہے اور جو خود ان کے ہاتھ کا مارا ہوا اسے حلال سمجھتے ہیں، یہ عجیب بات ہے، اس کا جواب اگلی آیتوں میں فَكُلُوا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللَّهِ سے دیا گیا۔

حضرت شاہ صاحبؒ موضح القرآن میں فرماتے ہیں کہ: ''یہ کئی آیتیں اس پر اتریں کہ کافر کہنے لگے مسلمان اپنا مارا کھاتے ہیں اور اللہ کا مارا نہیں کھاتے، فرمایا کہ ایسی ملمع فریب کی باتیں انسانوں کو شبہ میں ڈالنے کے لئے شیطان سکھاتے ہیں، خوب سمجھ لو حلال و حرام وغیرہ میں حکم اللہ کا چلتا ہے، محض عقلی ڈھکوسلوں کا اعتبار نہیں، آگے کھول کر سمجھا دیا کہ مارنے والا سب کا اللہ ہے لیکن اس کے نام کو برکت ہے جو اس کے نام پر ذبح ہوا سو حلال ہے جو بغیر اس کے مر گیا سو مردار''۔ بتغییر یسیر۔

إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ مَنْ يَضِلُّ عَنْ سَبِيلِهِ ۖ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ ﴿١١٧﴾

تیرا رب خوب جاننے والا ہے اس کو جو بہکتا ہے اس کی راہ سے، اور وہی خوب جاننے والا ہے ان کو جو اس کی راہ پر ہیں

خلاصہ تفسیر: (ان گذشتہ لوگوں کے مقابلہ میں بعض بندگان خدا راہ پر بھی ہیں) بالیقین آپ کا رب ان کو (بھی) خوب جانتا ہے جو اس کی (بتلائی ہوئی) راہ (راست) سے بے راہ ہو جاتا ہے اور وہ (ہی) ان کو بھی خوب جانتا ہے جو اس کی (بتلائی ہوئی) راہ پر چلتے ہیں (پس گمراہوں کو سزا ملے گی، راہ والوں کا انعام و اکرام ہوگا)۔

فَكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ بِاٰيٰتِهٖ مُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۸﴾

سوتم کھاؤ اس جانور میں سے جس پر نام لیا گیا ہے اللہ کا اگر تم کو اس کے حکموں پر ایمان ہے

خلاصہ تفسیر: پیچھے وَاِنْ تُطِعْ کے الفاظ میں گمراہوں کی اتباع سے مطلقاً منع فرمایا تھا، اب ایک واقعہ کی وجہ سے ایک خاص معاملہ میں اتباع کرنے سے منع فرماتے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ کفار نے مسلمانوں کو شبہ میں ڈالنا چاہا کہ تم اللہ کے مارے ہوئے جانور کو (جو ذبح کیے بغیر مرجائے) تو کھاتے نہیں ہو اور اپنے مارے ہوئے جانور کو جس کو تم ذبح کر و کھاتے ہو، چنانچہ بعض مسلمانوں نے حضور ﷺ کی خدمت میں یہ شبہ نقل کیا، اس پر یہ آیتیں آگے اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ تک نازل ہوئیں۔

(جب پیچھے کفار کی اتباع کا مذموم ہونا معلوم ہو گیا) سو جس (حلال) جانور پر (ذبح کے وقت) اللہ کا نام (بلا شرکت) لیا جائے اس میں سے (بے تکلف) کھاؤ (اور اس کو مباح اور حلال سمجھو) اگر تم اس کے احکام پر ایمان رکھتے ہو (کیونکہ حلال کو حرام جاننا خلاف ایمان ہے)۔

* * *

فائدہ: جب دلائل صحیحہ کی بنا پر تم نے رسول اللہ ﷺ کی نبوت اور قرآن کریم کی حقانیت کو تسلیم کر لیا اور کلی طور پر اس کے احکام پر ایمان لا چکے تو اب فروع وجزئیات کی صحت کو تسلیم کرنا ناگزیر ہے، اگر ہر اصل وفرع اور کلی وجزئی کا قبول کرنا ہمارے عقلی قیاسات پر موقوف ہو تو وحی اور نبوت کی ضرورت ہی نہ رہے۔

وَمَا لَكُمْ اَلَّا تَاْكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ

اور کیا سبب کہ تم نہیں کھاتے اس جانور میں سے کہ جس پر نام لیا گیا ہے اللہ کا اور وہ واضح کر چکا ہے جو کچھ کہ اس نے تم پر حرام کیا ہے

اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ اِلَيْهِ ؕ وَاِنَّ كَثِيْرًا لَّيُضِلُّوْنَ بِاَهْوَآئِهِمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ

مگر جب کہ مجبور ہو جاؤ اس کے کھانے پر۱ اور بہت لوگ بہکاتے پھرتے ہیں اپنے خیالات پر بغیر تحقیق، تیرا رب ہی

اَعْلَمُ بِالْمُعْتَدِيْنَ ﴿۱۱۹﴾

خوب جانتا ہے حد سے بڑھنے والوں کو۲

خلاصہ تفسیر: اور تم کو کون امر (عقیدہ کی قبیل سے) اس کا باعث ہو سکتا ہے کہ تم ایسے جانور میں سے نہ کھاؤ جس پر (ذبح کے وقت) اللہ کا نام (بلا شرکت) لیا گیا ہو، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے (دوسری آیت میں) ان سب جانوروں کی تفصیل بتلا دی ہے، جن کو تم پر حرام کیا ہے، مگر وہ بھی جب تم کو سخت ضرورت پڑ جائے تو حلال ہیں (اور اس تفصیل میں وہ ذبیحہ داخل نہیں جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو، پھر اس کے کھانے میں اعتقاداً کیوں انقباض ہو) اور (ان لوگوں کے شبہات کی طرف اصلاً التفات نہ کرو، کیونکہ) یہ یقینی بات ہے کہ بہت سے آدمی (کہ ان ہی میں سے یہ بھی ہیں اپنے ساتھ دوسروں کو بھی) اپنے غلط خیالات (کی بنا پر) بلا کسی سند کے گمراہ کرتے (پھرتے) ہیں (لیکن آخر کہاں تک خیر منائیں گے) اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ حد (ایمان) سے نکل جانے والوں کو (جن میں یہ بھی ہیں) خوب جانتا ہے (پس یک بارگی سزا دے گا)۔

وَمَا لَكُمْ اَلَّا تَاْكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ: حاصل جواب کا یہ ہے کہ تم مسلمان ہو، اللہ کے احکام کو ماننے والے ہو، اور خدا نے حرام وحلال کی تفصیل بتلا دی ہے، اس پر چلتے رہو، حرام پر حلال ہونے اور حلال پر حرام ہونے کا شبہ مت کرو، مشرکین کے وسوسوں کی طرف توجہ نہ کرو، ان کو محض جھگڑنا ہی مقصود ہے، طلب حق منظور نہیں۔

وَمَا لَكُمْ اَلَّا تَاْكُلُوْا: روح المعانی میں امام ابو منصورؒ سے منقول ہے کہ بعض مسلمان زہد و قناعت میں سختی اور شدت کے سبب بعض حلال طیبات کو نہیں کھاتے تھے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی، زہد و قناعت اگرچہ اعلیٰ صفات ہیں، لیکن اس میں غلو کرنا درست نہیں جیسا کہ بعض جاہل صوفیا کیا کرتے ہیں۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی اضطرار اور مجبوری کی حالت کو مستثنیٰ کر کے جو چیزیں حرام ہیں ان کی تفصیل کی جا چکی، ان میں وہ حلال جانور داخل نہیں جو اللہ کے نام پر ذبح کیا جائے، پھر اس کے نہ کھانے کی کیا وجہ؟

فائدہ: ۲؎ مسلمان کا عقیدہ یہ ہے کہ ہر چیز کو بالواسطہ یا بلا واسطہ خدا ہی پیدا کرتا اور خدا ہی مارتا ہے، پھر جس طرح اس کی پیدا کی ہوئی چیزوں میں بعض کا کھانا ہم کو مرغوب اور مفید ہے جیسے سیب انگور وغیرہ اور بعض چیزوں سے ہم نفرت کرتے ہیں یا مضر سمجھتے ہیں جیسے ناپاک گندی چیزیں اور سنکھیا وغیرہ، اسی طرح اس کی ماری ہوئی چیزیں بھی دو قسم کی ہیں: ① ایک وہ جن سے فطرت سلیمہ نفرت کرے، یا ان کا کھانا ہماری بدنی یا روحی صحت کیلئے خدا کے نزدیک مضر ہو، مثلاً وہ حیوان دموی جو اپنی طبعی موت سے مرے اور اس کا خون وغیرہ گوشت میں جذب ہو کر رہ جائے ② دوسرے وہ حلال وطیب جانور جو باقاعدہ خدا کے نام پر ذبح ہو، یہ بھی خدا ہی کا مارا ہوا ہے، جس پر مسلمان کی چھری کے توسط سے اس نے موت طاری کی، مگر عمل ذبح اور خدا کے نام کی برکت سے اس کا گوشت پاک وصاف ہو گیا، پس جو شخص دونوں قسموں کو ایک کرنا چاہے وہ معتدی (حد سے بڑھنے والا) ہوگا۔

وَذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَهٗ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْسِبُوْنَ الْاِثْمَ سَيُجْزَوْنَ بِمَا كَانُوْا يَقْتَرِفُوْنَ ﴿۱۲۰﴾

اور چھوڑ دو کھلا ہوا گناہ اور چھپا ہوا، جو لوگ گناہ کرتے ہیں عنقریب سزا پاویں گے اپنے کیے کی

خلاصہ تفسیر: اور تم ظاہری گناہ کو بھی چھوڑ دو اور باطنی گناہ کو بھی چھوڑ دو (مثلاً حلال کو حرام اعتقاد کرنا باطنی گناہ ہے جیسا کہ اس کا عکس بھی گناہ ہے) بلاشبہ جو لوگ گناہ کر رہے ہیں ان کو ان کے کئے کی عنقریب (قیامت میں) سزا ملے گی۔

وَذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَهٗ: اس سے معلوم ہوا کہ گناہ جس طرح اعضاء و جوارح سے ہوتے ہیں اسی طرح بعض گناہ قلب سے بھی سرزد ہوتے ہیں۔

* * *

فائدہ: یعنی کافروں کے بہکانے پر نہ ظاہر میں عمل کرو نہ دل میں شبہ رکھو، کذا فی موضح القرآن۔

وَلَا تَاْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَاِنَّهٗ لَفِسْقٌ ؕ وَاِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰٓى اَوْلِيٰٓـئِهِمْ

اور اس میں سے نہ کھاؤ جس پر نام نہیں لیا گیا اللہ کا ۱؎ اور یہ کھانا گناہ ہے، اور شیطان دل میں ڈالتے ہیں اپنے رفیقوں کے

لِيُجَادِلُوْكُمْ ۚ وَاِنْ اَطَعْتُمُوْهُمْ اِنَّكُمْ لَمُشْرِكُوْنَ ﴿۱۲۱﴾ ع

تاکہ وہ تم سے جھگڑا کریں، اور اگر تم نے ان کا کہا مانا تو تم بھی مشرک ہوئے ۲؎

خلاصہ تفسیر: اور ایسے جانوروں میں سے مت کھاؤ جن پر (مذکورہ طریقہ سے) اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو (جیسا کہ مشرکین ایسے جانوروں کو کھاتے ہیں) اور یہ امر (یعنی جس پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو اس کا کھانا) بے حکمی ہے (غرض نہ ترک میں ان کا اتباع کرو اور نہ فعل میں) اور (ان لوگوں کے شبہات اس لئے قابل التفات نہیں کہ) یقیناً شیاطین (جن) اپنے (ان) دوستوں (اور پیروکاروں) کو (یہ شبہات) تعلیم کر رہے ہیں تاکہ یہ تم سے (بیکار) جدال کریں (یعنی اول تو یہ شبہات نص کے خلاف، دوسرے غرض محض جدال اس لئے قابل التفات نہیں) اور اگر تم (خدانخواستہ)

ان لوگوں کی اطاعت (عقائد یا افعال میں) کرنے لگو تو یقیناً تم مشرک ہو جاؤ (کہ خدا کی تعلیم پر دوسرے کی تعلیم کو ترجیح دو جہاں برابر سمجھنا بھی شرک ہے، یعنی ان کی اطاعت ایسی بری چیز ہے، اس لئے اس کے مقدمات یعنی التفات سے بھی بچنا چاہئے)۔

اس جگہ مشرکین کے شبہ کا جواب صراحۃً مذکور نہیں، وجہ یہ ہے کہ اصول مذہب ثابت کرنے کے لیے تو عقلی دلائل کی ضرورت ہوتی ہے، اور اصول ثابت ہو جانے کے بعد فرعی مسائل میں صرف نقلی دلائل کافی ہوتے ہیں، عقلی دلیل کی ضرورت نہیں ہوتی، بلکہ بعض اوقات تو عقلی دلیل نقصان دہ ہے کہ اس سے شبہات کے دروازے کھلتے ہیں، البتہ اگر کوئی طالب حق ہو تو اس کی تسلی کے لیے فرعی مسائل میں بھی اطمینان بخش جواب دے دینے میں حرج نہیں، لیکن جب یہ صورت بھی نہ ہو بلکہ محض مجادلہ ہو تو اپنے کام میں لگے رہنا چاہئے اور معترض کی طرف توجہ نہیں کرنی چاہئے، ہاں! اگر کوئی مخالف کسی اسلامی فرعی مسئلہ کا عقلی قطعی دلیل سے مخالف ہونا ثابت کرے تو مدعی حق کے ذمہ اس کا جواب دینا ضروری ہوگا، مگر یہاں مشرکین کے شبہ میں ان دونوں باتوں کا احتمال ہی نہیں، اس لیے جواب میں صرف مسلمانوں کو مذکورہ قاعدہ کی رو سے خطاب ہے کہ ایسی خرافات پر نظر مت کرو، حق کے معتقد اور عامل رہو، چنانچہ مشرکین کو صراحۃً جواب تو نہیں دیا گیا، مگر پھر بھی جواب کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے، کیونکہ جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو اسے حلال، اور جس پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو اسے حرام بتلایا، جہاں کُلُوا میں ذُکِرَ اسْمُ اللّٰہِ اور لَا تَاْکُلُوْا میں لَمْ یُذْکَرِ اسْمُ اللّٰہِ مذکور ہے۔

پس جواب کا حاصل یہ ہوا کہ جانور حلال ہونے کا مدار دو باتوں پر ہے: ① ایک تو ذبح کرنا، کیونکہ بغیر ذبح کے ناپاک خون بدن میں سے نہیں نکل سکتا ② دوسرے اللہ کا نام لینا جو کہ مفید برکت ہے، اسی وجہ سے خون والے جانوروں کے حلال ہونے کے لیے ذبح کے وقت خدا کا نام لینا شرط ہے، اس لیے مذبوحہ جانور حلال ہے اور غیر مذبوحہ حرام ہے، ہاں! جن جانوروں میں خون نہیں، چونکہ وہ ناپاکی سے خالی ہیں وہ بغیر ذبح کے بھی حلال ہیں، جیسے مچھلی ٹڈی وغیرہ۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی نہ حقیقۃً نہ حکماً، حنفیہ متروک تسمیہ سہواً (جس پر بسم اللہ پڑھنا بھول جائے) کے مسئلہ میں ذکر حکمی کا دعویٰ کرتے ہیں۔

فائدہ: ۲ یعنی شرک فقط یہ ہی نہیں کہ کسی کو سوائے خدا کے پوجے، بلکہ شرک کے حکم میں یہ بھی ہے کہ کسی چیز کی تحلیل وتحریم میں مستند شرعی کو چھوڑ کر محض آراء واہوا کا تابع ہو جائے، جیسا کہ: اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (التوبہ: ۳۱) کی تفسیر میں مرفوعاً منقول ہے کہ اہل کتاب نے وحی الٰہی کو چھوڑ کر صرف احبار ورہبان ہی پر تحلیل وتحریم کا مدار رکھ چھوڑا تھا۔

اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ

بھلا ایک شخص جو کہ مردہ تھا پھر ہم نے اس کو زندہ کر دیا اور ہم نے اس کو دی روشنی کہ لیے پھرتا ہے اس کو لوگوں میں برابر ہو سکتا ہے اس کے

فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا ؕ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْكٰفِرِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۲﴾

کہ جس کا حال یہ ہے کہ پڑا ہے اندھیروں میں وہاں سے نکل نہیں سکتا، اسی طرح مزین کر دیئے کافروں کی نگاہ میں ان کے کام

خلاصہ تفسیر: گذشتہ آیتوں میں قرآن نے بتلایا کہ اگر یہ لوگ واقعی حق طلب ہوتے تو جو معجزات ان کے سامنے آچکے ہیں وہ ان کو راہ حق دکھانے کے لئے کافی سے بھی زیادہ تھے، پھر ان معجزات کا بیان آیا، مذکورہ آیت میں رسول کریم ﷺ اور قرآن پر ایمان لانے والوں اور کفر وانکار کرنے والوں کے کچھ حالات وخیالات اور دونوں کے نیک وبد انجام کا بیان اور مومن وکافر اور ایمان وکفر کی حقیقت کو مثالوں میں سمجھایا گیا ہے، مومن اور کافر کی مثال زندہ اور مردہ سے اور ایمان وکفر کی مثال روشنی اور اندھیرے سے دی گئی ہے۔

ایسا شخص جو کہ پہلے مردہ (یعنی گمراہ) تھا ہم نے اس کو زندہ (یعنی مسلمان) بنا دیا اور ہم نے اس کو ایک ایسا نور (یعنی ایمان) دے دیا کہ وہ اس کو لئے ہوئے آدمیوں میں چلتا پھرتا ہے (یعنی وہ نور ہر وقت اس کے ساتھ رہتا ہے، جس سے وہ سب نقصانات مثلاً گمراہی وغیرہ سے محفوظ اور مامون

و بے فکر پھرتا ہے تو) کیا ایسا شخص (بدحالی میں) اس شخص کی طرح ہوسکتا ہے جس کی حالت یہ ہو کہ وہ (گمراہی کی) تاریکیوں میں (گمراہوا) ہے (اور) ان سے نکلنے ہی نہیں پاتا (مراد وہ شخص ہے جو مسلمان نہیں ہوا، اور اس کا تعجب نہ کیا جائے کہ کفر کے ظلمت ہونے کے باوجود وہ کیوں اس پر قائم رہا؟ وجہ یہ کہ جس طرح مومنین کو ان کا ایمان اچھا معلوم ہوتا ہے) اسی طرح کافروں کو ان کے اعمال (کفر وغیرہ) مستحسن معلوم ہوا کرتے ہیں (چنانچہ اسی وجہ سے یہ روسائے مکہ جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مہمل فرمائشیں اور شبہات پیش کرتے رہتے ہیں اپنے کفر کو اچھا سمجھ کر ہی اس پر جمے ہوئے ہیں)۔

* * *

فائدہ: پہلے فرمایا کہ شیاطین اپنے رفقاء کے دل میں ڈالتے ہیں کہ وہ مسلمانوں سے جھگڑا کریں، یعنی بحث وجدل، تلبیس وتلمیع اور وسوسہ اندازی کرکے ان کو طریق حق سے ہٹادیں، لیکن ان کو یہ ہوس خام اپنے دلوں سے نکال دینا چاہئے، وہ گروہ یا وہ شخص جو جہل وضلال کی موت سے مرچکا تھا، پھر اس کو حق تعالیٰ نے ایمان وعرفان کی روح سے زندہ کیا اور قرآن کی روشنی عطا فرمائی جسے لے کر وہ لوگوں کے ہجوم میں بے تکلف راہ راست پر چل رہا ہے، کیا اس کا حال اغواء شیطانی کے قبول کرنے میں ان اولیاء الشیطان جیسا ہوسکتا ہے جو جہالت وضلالت کی اندھیروں میں پڑے ٹھوکریں کھا رہے ہیں جس سے نکلنے کی کوئی راہ نہیں پاتے، کیونکہ اسی ظلمت کو نور اور برائی کو بھلائی سمجھتے ہیں، ایسا کبھی نہیں ہوسکتا۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ اَكٰبِرَ مُجْرِمِيْهَا لِيَمْكُرُوْا فِيْهَا ؕ وَمَا يَمْكُرُوْنَ اِلَّا بِاَنْفُسِهِمْ

اور اسی طرح کیے ہیں ہم نے ہر بستی میں گناہ گاروں کے سردار کہ حیلے کیا کریں وہاں اور جو حیلے کرتے ہیں سو اپنی ہی جان پر

وَمَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾

اور نہیں سوچتے

خلاصہ تفسیر: اور (یہ کوئی نئی بات نہیں، جس طرح مکہ کے سرداران جرائم کے مرتکب ہورہے ہیں اور ان کے اثر سے دوسرے لوگ شامل ہوجاتے ہیں) اسی طرح ہم نے (پہلی امتوں میں بھی) ہر بستی میں وہاں کے رئیس ہی کو (اول) جرائم کا مرتکب بنایا (پھر ان کے اثر سے اور عوام بھی ان سے مل گئے) تاکہ وہ لوگ وہاں (انبیاء کو ضرر پہنچانے کے لئے) شرارتیں کیا کریں (جن سے ان کا مستحق سزا ہونا خوب ثابت ہوجائے) اور وہ لوگ (اگرچہ اپنے خیال میں دوسروں کو نقصان پہنچاتے ہیں لیکن واقع میں) اپنے ہی ساتھ شرارت کررہے ہیں (کیونکہ اس کا وبال تو انہی کو بھگتنا پڑے گا) اور (انتہائی جہل کی وجہ سے) ان کو (اس کی) ذرا خبر نہیں۔

* * *

فائدہ: یعنی کچھ آج روسائے مکہ ہی نہیں ہمیشہ کافروں کے سردار حیلے نکالتے رہے ہیں تاکہ عوام الناس پیغمبروں کے مطیع نہ ہوجائیں جیسے فرعون نے معجزہ دیکھا تو حیلہ نکالا کہ سحر کے زور سے سلطنت لیا چاہتا ہے لیکن ان کے یہ حیلے اور داؤ پیچ بحمد اللہ پکے ایمانداروں پر نہیں چلتے۔ حیلہ کرنے والے اپنی عاقبت خراب کرکے خود اپنا ہی نقصان کرتے ہیں جس کا احساس انھیں اس وقت نہیں ہوتا۔

وَاِذَا جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰى نُؤْتٰى مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ رُسُلُ اللّٰهِ ؔ

وقف منزل / وقف لازم

اور جب آتی ہے انکے پاس کوئی آیت تو کہتے ہیں کہ ہم ہرگز نہ مانیں گے جب تک کہ نہ دیا جائے ہم کو جیسا کچھ کہ دیا گیا ہے اللہ کے رسولوں کو

اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ ؕ سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا صَغَارٌ عِنْدَ اللّٰهِ

اللہ خوب جانتا ہے اس موقع کو کہ جہاں بھیجے اپنے پیغام، عنقریب پہنچے گی گناہ گاروں کو ذلت اللہ کے ہاں

وَعَذَابٌ شَدِيدٌۢ بِمَا كَانُوا يَمْكُرُونَ ﴿۱۲۴﴾

اور عذاب سخت اس وجہ سے کہ وہ مکر کرتے تھے

خلاصہ تفسیر: اور (ان کفار مکہ کا جرم یہاں تک بڑھ گیا ہے کہ) جب ان کو کوئی آیت پہنچتی ہے تو (باوجود اس کے کہ وہ اپنے اعجاز کی وجہ سے نبوت کی دلالت کے لیے کافی ہوتی، مگر یہ لوگ پھر بھی) یوں کہتے ہیں کہ ہم (ان نبی پر) ہرگز ایمان نہ لائیں گے، جب تک کہ ہم کو بھی ایسی ہی چیز نہ دی جائے جو اللہ کے رسولوں کو دی جاتی ہے (یعنی ہمارے پاس بھی وحی اور کتاب آئے جس میں ہمیں آپ ﷺ پر ایمان لانے کا حکم ہو تب ایمان لائیں گے، اس قول کا جرم عظیم ہونا ظاہر ہے کہ تکذیب، عناد، تکبر اور گستاخی سب کا جامع ہے، آگے اللہ تعالیٰ اس کا رد فرماتے ہیں کہ:) اس موقع کو تو خدا ہی خوب جانتا ہے جہاں اپنا پیغام (وحی کے ذریعہ سے) بھیجتا ہے (کیا ہر کس و ناکس اس شرف کے قابل ہو گیا، "تا نبخشد خدائے بخشندہ" آگے اس جرم کی سزا کا بیان ہے کہ:) عنقریب ان لوگوں کو جنہوں نے یہ جرم کیا ہے خدا کے پاس پہنچ کر (یعنی آخرت میں) ذلت پہنچے گی (جیسا کہ انہوں نے نبی کے مقابلہ میں اپنے آپ کو عزت و نبوت کا مستحق سمجھا تھا) اور سزائے سخت (ملے گی) ان کی شرارتوں کے مقابلہ میں۔

اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ: اس سے ثابت ہوا کہ رسالت و نبوت کوئی کسبی اور اختیاری چیز نہیں جس کو علمی، عملی کمالات یا مجاہدہ و ریاضت وغیرہ کے ذریعہ حاصل کیا جا سکے، کوئی شخص مقامات ولایت میں کتنی ہی اونچی پرواز کر کے بھی نبوت حاصل نہیں کر سکتا، بلکہ وہ محض فضل خداوندی ہے جو خداوندی علم و حکمت کے ماتحت خاص بندوں کو دیا جاتا ہے، ہاں! یہ ضروری ہے کہ جس شخص کو حق تعالیٰ کے علم میں یہ مقام اور عہدہ دینا منظور ہوتا ہے اس کو شروع ہی سے اس کے قابل بنا کر پیدا کیا جاتا ہے اس کے اخلاق و اعمال کی خاص تربیت کی جاتی ہے۔

* * *

فائدہ: ان کی مکاری اور متکبرانہ حیلہ جوئی کی ایک مثال یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے صدق کا جب کوئی نشان دیکھتے تو کہتے کہ ہم ان دلائل و نشانات کو نہیں جانتے، ہم تو اس وقت یقین کر سکتے ہیں جب ہمارے اوپر فرشتے نازل ہوں اور پیغمبروں کی طرح ہم کو بھی خدا کا پیغام سنائیں یا خود حق تعالیٰ ہی ہمارے سامنے آ جائیں: وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ نَرٰى رَبَّنَا لَقَدِ اسْتَكْبَرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ وَعَتَوْ عُتُوًّا كَبِيْرًا (فرقان: ۲۱) خیر یہ تو خدا ہی جانتا ہے کہ کون شخص اس کا اہل ہے کہ منصب پیغامبری پر سرفراز کیا جائے اور اس عظیم الشان امانت الٰہیہ کا حامل بن سکے، یہ نہ کوئی کسبی چیز ہے کہ دعاء یا ریاضت یا دنیاوی جاہ و دولت وغیرہ سے حاصل ہو سکے اور نہ ہر کس و ناکس کو ایسی جلیل القدر اور نازک ذمہ داری پر فائز کیا جا سکتا ہے، ہاں! ایسے گستاخ، متکبر، حیلہ جو مکاروں کو آگاہ رہنا چاہیے کہ عنقریب اس معزز منصب کی طلب کا جواب ان کو سخت ذلت اور عذاب شدید کی صورت میں دیا جائے گا۔

فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ ۚ وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ

سو جس کو اللہ چاہتا ہے کہ ہدایت کرے تو کھول دیتا ہے اسکے سینہ کو واسطے قبول کرنے اسلام کے، اور جس کو چاہتا ہے کہ گمراہ کرے کر دیتا ہے اسکے سینہ کو

ضَيِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَآءِ ۭ كَذٰلِكَ يَجْعَلُ اللّٰهُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲۵﴾

تنگ بے نہایت تنگ گویا وہ زور سے چڑھتا ہے آسمان پر ۱ اسی طرح ڈالے گا اللہ عذاب کو ایمان نہ لانے والوں پر ۲

خلاصہ تفسیر: سو (اوپر جو مومن و کافر کا حال مذکور ہے، اس سے یہ معلوم ہوا کہ) جس شخص کو اللہ تعالیٰ (نجات کے) راستہ پر ڈالنا چاہتے ہیں اس کے سینہ (یعنی دل) کو اسلام (کے قبول کرنے) کے لئے کشادہ کر دیتے ہیں (کہ اسلام قبول کرنے میں پس و پیش نہیں کرتا اور نور

ایمان اسی کشادگی کا نام ہے) اور جس کو (تکوینی یا تقدیر طور پر) بے راہ رکھنا چاہتے ہیں اس کے سینہ (یعنی دل) کو (اسلام کے قبول کرنے سے) تنگ (اور) بہت تنگ کر دیتے ہیں (کہ اس کو اسلام لانا ایسا سخت مصیبت نظر آتا ہے) جیسے کوئی (فرض کرو) آسمان میں چڑھنا چاہتا ہو (اور چڑھا نہیں جاتا اور جی تنگ ہوتا ہے اور مصیبت کا سامنا ہوتا ہے، پس جیسا اس شخص سے چڑھا نہیں جاتا) اسی طرح اللہ تعالیٰ ایمان نہ لانے والوں پر (چونکہ ان کے کفر اور شرارت کے سبب) پھٹکار ڈالتا ہے (اس لئے ان سے ایمان نہیں لایا جاتا)۔

فائدہ: ۱؎ یعنی زور سے آسمان پر چڑھنا چاہتا ہے مگر چڑھ نہیں سکتا، اس لئے سخت تنگ دل ہوتا ہے۔

فائدہ: ۲؎ جو لوگ ایمان لانے کا ارادہ نہیں رکھتے ان پر اسی طرح عذاب اور تباہی ڈالی جاتی ہے کہ رفتہ رفتہ انکا سینہ اس قدر تنگ کر دیا جاتا ہے کہ اس میں حق کے گھسنے کی قطعاً گنجائش نہیں رہتی، پھر یہی سینہ کی تنگی عذاب ہے جو قیامت میں بشکل محسوس سامنے آجائے گا، مترجم محقق قدس اللہ روحہ نے رجس کا ترجمہ جو عذاب سے کیا ہے اس کے موافق یہ تقریر ہے، عبدالرحمن بن زید بن اسلم نے رجس کے معنی عذاب ہی کے لئے ہیں، مگر ابن عباسؓ نے یہاں رجس سے مراد شیطان لیا ہے، شاید اس لئے کہ رجس ناپاک کو کہتے ہیں اور شیطان سے بڑھ کر کون ناپاک ہوگا، بہر حال اس تفسیر پر آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ جس طرح ان پر بے ایمانیوں کی وجہ سے شیطان مسلط کر دیا جاتا ہے کہ کبھی رجوع الی الحق کی توفیق نہیں ہوتی۔

حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ: "اول فرمایا تھا کہ کافر قسمیں کھاتے ہیں کہ آیت دیکھیں تو البتہ یقین لائیں، اور اب فرمایا کہ ہم نہ دیں گے ایمان تو کیونکر لائیں گے، بیچ میں مردہ حلال کرنے کے حیلے نقل کئے، اب اس بات کا جواب فرمایا کہ جس کی عقل اس طرف چلے کہ اپنی بات نہ چھوڑے، جو دلیل دیکھے کچھ حیلہ بنالے، وہ نشان ہے گمراہی کا اور جس کی عقل چلے انصاف پر اور حکم برداری پر، وہ نشان ہدایت ہے، ان لوگوں میں نشان ہیں گمراہی کے ان پر کوئی آیت اثر نہ کرے گی"۔

باقی اللہ تعالیٰ کی طرف ارادہ ہدایت واضلال کی نسبت کرنا، اسکے متعلق متعدد مواضع میں ہم کلام کر چکے ہیں اور آئندہ بھی حسب موقع لکھا جائے گا، مگر یہ مسئلہ طویل الذیل اور معرکۃ الآراء ہے اس لئے ہمارا ارادہ ہے کہ اس پر ایک مستقل مضمون لکھ کر فوائد کے ساتھ ملحق کر دیا جائے، وباللہ التوفیق۔

وَهٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيْمًا ؕ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ ﴿۱۲۶﴾

اور یہ ہے راستہ تیرے رب کا سیدھا، ہم نے واضح کر دیا نشانیوں کو غور کرنے والوں کے واسطے

خلاصہ تفسیر: اور (اوپر جو اسلام کا ذکر ہے تو) یہی (اسلام) تیرے رب کا (بتلایا ہوا) سیدھا راستہ ہے (جس پر چلنے سے نجات ہوتی ہے، جس کا ذکر: فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ، میں ہے، اور اسی صراط مستقیم کی وضاحت کے لئے) ہم نے نصیحت حاصل کرنے والوں کے واسطے ان آیتوں کو صاف صاف بیان کر دیا ہے (تاکہ اس معجزہ قرآنی کی تصدیق کریں، پھر اس کے مضامین پر عمل کر کے نجات حاصل کریں، یہی تصدیق اور عمل کامل صراط مستقیم ہے، اور جن لوگوں کو نصیحت حاصل کرنے کی فکر ہی نہیں ان کے واسطے نہ یہ معجزہ کافی ہے نہ دوسرے دلائل کافی ہیں)۔

لَهُمْ دَارُ السَّلٰمِ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَهُوَ وَلِيُّهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۷﴾

انہی کے لئے ہے سلامتی کا گھر اپنے رب کے ہاں اور وہ ان کا مددگار ہے بسبب ان کے اعمال کے

خلاصہ تفسیر: (آگے ان ماننے والوں کی جزاء کا ذکر ہے، جیسے نہ ماننے والوں کی سزا پیچھے کئی جملوں میں مذکور ہے، پس ارشاد ہے کہ:) ان لوگوں کے واسطے ان کے رب کے پاس (پہنچ کر) سلامتی (یعنی امن وبقاء) کا گھر (یعنی جنت) ہے اور اللہ ان سے محبت رکھتا ہے، ان کے اعمال (حسنہ) کی وجہ سے۔

فائدہ: یعنی جو اسلام وفرمانبرداری کے سیدھے راستہ پر چلے گا وہ ہی سلامتی کے گھر پہنچے گا اور خدا اس کا ولی و مددگار ہوگا۔

ربط: یہ حال تو ان کا ہوا جن کا ولی خدا ہے (یعنی اولیاء الرحمن)، اب آگے ''اولیاء الشیطان'' کا حال بیان کیا جاتا ہے:

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ۚ يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ قَدِ اسْتَكْثَرْتُمْ مِّنَ الْإِنْسِ ۚ وَقَالَ أَوْلِيٰٓؤُهُمْ

اور جس دن جمع کرے گا ان سب کو فرمائے گا اے جماعت جنات کی تم نے بہت کچھ تابع کر لیے اپنے آدمیوں میں سے [1] اور کہیں گے انکے دوست دار

مِّنَ الْإِنْسِ رَبَّنَا اسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ وَّبَلَغْنَآ أَجَلَنَا الَّذِيٓ أَجَّلْتَ لَنَا ۚ

آدمیوں میں سے اے رب ہمارے کام نکالا ہم نے ایک نے دوسرے سے اور ہم پہنچے اپنے اس وعدہ کو جو تو نے ہمارے لیے مقرر کیا تھا [2]

قَالَ النَّارُ مَثْوٰىكُمْ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ إِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ۚ إِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿١٢٨﴾

فرماوے گا آگ ہے گھر تمہارا رہا کرو گے اسی میں مگر جب چاہے اللہ [3] البتہ تیرا رب حکمت والا خبردار ہے [4]

خلاصہ تفسیر: پیچھے حق ماننے اور نہ ماننے والوں کی جزا و سزا کا ذکر کیا گیا ہے، اب آگے اس کا وقت، اس کی بعض کیفیات اور بعنوان دیگر اسی کی تاکید مذکور ہے۔

اور (وہ دن یاد کرنے کے قابل ہے) جس روز اللہ تعالیٰ تمام خلائق کو جمع کریں گے (اور ان میں سے بالخصوص کفار کو حاضر کر کے ان میں جو شیاطین الجن ہیں ان سے دھمکی کے طور پر کہا جائے گا کہ) اے جماعت جنات کی! تم نے انسانوں (کو گمراہ کرنے) میں بڑا حصہ لیا (اور ان کو خوب بہکایا، اسی طرح انسانوں سے پوچھا جائے گا: الم اعهد اليكم يبني ادم ان لا تعبدوا الشيطن، کہ اے بنی آدم! کیا میں نے تم کو یہ وصیت نہ کی تھی کہ شیطان کی عبادت نہ کرنا، بلکہ میری عبادت کرنا، غرض شیاطین الجن بھی اقرار کریں گے) اور جو انسان ان (شیاطین جن) کے ساتھ تعلق رکھنے والے تھے وہ (بھی اقراراً) کہیں گے کہ اے ہمارے پروردگار! (آپ صحیح فرماتے ہیں واقعی) ہم میں ایک نے دوسرے سے (اس گمراہ ہونے اور گمراہ کرنے میں اپنا نفسانی) فائدہ حاصل کیا تھا (چنانچہ گمراہ انسانوں کو اپنے کفریہ وشرکیہ عقائد میں لذت آتی ہے اور گمراہ کرنے والے شیاطین کو اس سے مزہ آتا ہے کہ ہمارا کہنا چل گیا) اور (فی الحقیقت ہم ان شیطاطین جن کے بہکانے سے قیامت کے منکر تھے، لیکن وہ انکار غلط ثابت ہوا، چنانچہ) ہم اپنی اس معین میعاد تک آ پہنچے جو آپ نے ہمارے لئے معین فرمائی (یعنی قیامت آ گئی) اللہ تعالیٰ (سب کفار جن وانس سے) فرمائیں گے کہ تم سب کا ٹھکانا دوزخ ہے جس میں ہمیشہ ہمیشہ کو رہو گے (کوئی نکلنے کی سبیل و تدبیر نہیں) ہاں، اگر خدا ہی کو (نکالنا) منظور ہو تو دوسری بات ہے (لیکن یہ یقینی ہے کہ خدا بھی نکالنا نہ چاہے گا اس لئے ہمیشہ رہا کرو) بیشک آپ کا رب بڑی حکمت والا اور بڑا علم والا ہے (علم سے سب کے جرائم معلوم کرتا ہے اور حکمت سے مناسب سزا دیتا ہے)۔

* * *

فائدہ: [1] قَدِ اسْتَكْثَرْتُمْ مِّنَ الْإِنْسِ: یعنی اے شیاطین الجن! تم نے بہت سے بدبخت انسانوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا اور اپنی راہ پر لگا لیا۔

فائدہ: [2] وَّبَلَغْنَآ أَجَلَنَا الَّذِيٓ أَجَّلْتَ لَنَا: دنیا میں جو انسان بت وغیرہ پوجتے ہیں وہ فی الحقیقت خبیث جن (شیاطین) کی پوجا ہے، اس خیال پر کہ وہ ہمارے کام نکالیں گے ان کو نیازیں چڑھاتے ہیں اور ویسے بہت سے اہل جاہلیت تشویش و اضطراب کے وقت جنوں سے استعانت کرتے تھے جیسا کہ سورۃ جن میں اشارہ کیا گیا ہے اور ابن کثیر وغیرہ نے روایات نقل کی ہیں، جب آخرت میں وہ شیاطین الجن اور انسان برابر پکڑے جائیں گے اور حقائق کا انکشاف ہوگا تب مشرک لوگ یوں عذر کریں گے کہ اے ہمارے پروردگار! ہم نے پوجا نہیں کی لیکن آپس میں وقتی

کارروائی کرلی تھی اور موت کا وعدہ آنے سے پہلے پہلے دنیاوی کاروبار میں ہم ایک دوسرے سے کام نکالنے کی کچھ ترکیب کرلیا کرتے تھے، ان کی عبادت مقصود نہ تھی۔

فائدہ: ۳ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ: یہ جو فرمایا ''مگر جب چاہے اللہ'' اس واسطے کہ دوزخ کا عذاب دائمی ہے تو اس کے چاہنے سے ہے وہ جب چاہے موقوف کرنے پر قادر ہے، لیکن ایک چیز چاہ چکا اور اس کی خبر پیغمبروں کی زبانی دی جاچکی وہ اب ٹل نہیں سکتی۔

فائدہ: ۴ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ: یعنی مجرموں کے جرائم سے پوری طرح خبردار ہے اور حکمت بالغہ سے ہر جرم کی برمحل اور مناسب سزا دیتا ہے۔

وَكَذٰلِكَ نُوَلِّيْ بَعْضَ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضًا بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۱۲۹﴾

اور اسی طرح ہم ساتھ ملائیں گے گناہ گاروں کو ایک کو دوسرے سے ان کے اعمال کے سبب

خلاصہ تفسیر: اور (جس طرح دنیا میں گمراہی کے لحاظ سے سب میں تعلق وقرب تھا) اسی طرح (دوزخ میں) بعض کفار کو بعض کے قریب (اور اکٹھا) رکھیں گے ان کے اعمال (کفریہ) کے سبب (یہ خطاب تو انسانوں اور جنوں کو ان کے باہمی تعلق اور ان کے مجموعی احوال کے اعتبار سے تھا)۔

* * *

فائدہ: جیسے تم نے ''شیاطین الجن'' اور ان کے ''اولیاء انسی'' کا حال سنا، اسی طرح تمام ظالموں اور گنہگاروں کو ان کے ظلم اور سیہ کاریوں کے تناسب سے دوزخ میں ہم ایک دوسرے کے قریب کردیں گے اور جو جس درجہ کا ظالم و گنہگار ہوگا اس کو اسی کے طبقہ عصاۃ میں ملا دیں گے۔

يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ وَيُنْذِرُوْنَكُمْ

اے جماعت جنوں کی اور انسانوں کی کیا نہیں پہنچے تھے تمہارے پاس رسول تمہی میں سے کہ سناتے تھے تم کو میرے حکم اور ڈراتے تھے تم کو

لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ؕ قَالُوْا شَهِدْنَا عَلٰۤى اَنْفُسِنَا وَغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَشَهِدُوْا

اس دن کے پیش آنے سے ۱ کہیں گے کہ ہم نے اقرار کرلیا اپنے گناہ کا اور ان کو دھوکا دیا دنیا کی زندگی نے ۲ اور قائل ہوگئے

عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ ﴿۱۳۰﴾

اپنے اوپر اس بات کے کہ وہ کافر تھے ۳

خلاصہ تفسیر: پیچھے انسانوں اور جنوں کو ان کے باہمی تعلق اور ان کی مجموعی حالت کے اعتبار سے خطاب تھا، اب ہر ایک کو خاص اس کی ذاتی حالت کے اعتبار سے خطاب ہے کہ:

اے جماعت جنات اور انسانوں کی! (ہاں! یہ تو بتلاؤ جو تم کفر و انکار کرتے رہے تو) کیا تمہارے پاس تم ہی میں کے پیغمبر نہیں آئے تھے جو تم سے میرے احکام (عقائد و اعمال سے متعلق) بیان کیا کرتے تھے اور تم کو اس آج کے دن (کے واقع ہونے) کی خبر دیا کرتے تھے (پھر کیا وجہ ہے کہ تم کفر و انکار سے باز نہ آئے) وہ سب عرض کریں گے کہ ہم سب اپنے اوپر (جرم کا) اقرار کرتے ہیں (ہمارے پاس عذر اور براءت کی کوئی وجہ نہیں، آگے اللہ تعالیٰ ان کو اس مصیبت کے پیش آنے کا سبب بتلاتے ہیں:) اور ان کو (یہاں) دنیوی زندگانی نے بھول میں ڈال رکھا ہے (کہ دنیوی لذتوں کو بڑا مقصود سمجھ رکھا ہے آخرت کی فکر ہی نہیں) اور (اس کا ثمرہ یہ ہوا کہ وہاں) یہ لوگ مقر (اقرار کرنے والے) ہوں گے کہ وہ (یعنی ہم) کافر

تھے (اور غلطی پر تھے، مگر اس وقت کے اقرار سے کیا ہوتا ہے، اگر دنیا میں ذرا غفلت دور کردیں تو اس روز بد کا سامنا ہی کیوں ہو)۔

اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ: یہاں یہ جو فرمایا ہے کہ ''تمہارے پاس تم ہی میں کے پیغمبر'' تو اگر جنات میں بھی رسول ان ہی کی جنس سے آئے ہوں تب تو مطلب آسان ہے، اور اگر جنوں پر انسانوں ہی کے رسولوں کا اتباع واجب ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تم دونوں کے مجموعہ میں سے رسول بھیجے گئے، اور مجموعہ میں سے رسول کا آنا اس وقت بھی صادق ہے کہ فقط انسانوں ہی میں سے رسول آئے ہوں، رہا یہ سوال کہ پھر جنوں کو ان سے فیض لینا کس طرح ممکن ہوگا؟ اس کا جواب چوتھا پارہ سورہ آل عمران آیت ۱۶۴: لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ میں بھی گذر چکا ہے کہ انسان کی طبیعت فرشتے اور جنات دونوں کی جامع ہے، اس سے ہر ایک کو فیض ہوسکتا ہے، مگر خود انسان کو انسان کے علاوہ کسی دوسرے سے فیض لینا دشوار ہے، کیونکہ وہ طبیعت انسان کے جامع نہیں، اس کے متعلق مزید تفصیل وہیں ملاحظہ فرمایئے۔

* * *

فائدہ: ۱ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا: اوپر جن وانس کی شرارت اور سزا کا بیان تھا اور ''اولیاء الجن'' کی زبانی فی الجملہ معذرت بھی نقل کی گئی تھی، اب بتلایا جاتا ہے کہ انکا کوئی عذر معقول اور قابل سماعت نہیں، دنیا میں خدا کی حجت تمام ہو چکی تھی جس کا خود انہیں بھی اقرار کرنا پڑیگا۔

یہ خطاب يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ کا قیامت کے دن ہوگا اور مخاطب جن وانس کا یعنی کل مکلفین کا مجموعہ ہے، ہر جماعت الگ الگ مخاطب نہیں جو یہ اعتراض ہو کہ رسول تو ہمیشہ انسانوں میں سے آئے، قوم جن میں سے کوئی پیغمبر نہیں بھیجا گیا، پھر رُسُلٌ مِّنْكُمْ (رسول تم ہی میں کے) کہنا کیسے صحیح ہوگا؟ اصل یہ ہے کہ مجموعہ مخاطبین میں سے اگر کسی نوع میں بھی اتیان رسل متحقق ہو جائے جس کی غرض تمام مخاطبین کو بلا تخصیص فائدہ پہنچانا ہو تو مجموعہ کو خطاب کرنے میں کوئی اشکال نہیں رہتا، مثلاً کوئی یہ کہے ''اے عرب وعجم کے باشندو! اور پورب پچھم کے رہنے والو! کیا تم ہی میں سے خدا نے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جیسے کامل انسان کو پیدا نہیں کیا'' اس عبارت کا مطلب کسی کے نزدیک یہ نہیں ہوسکتا کہ ایک محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تو عرب میں پیدا کئے گئے اور دوسرے عجم میں ہونے چاہئیں، اسی طرح پورب کے علیحدہ اور پچھم کے علیحدہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہوں، تب یہ عبارت صحیح ہوگی، علیٰ ہذا القیاس یہاں سمجھ لیجئے کہ: يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ کا مدلول صرف اس قدر ہے کہ جن وانس کے مجموعہ سے پیغمبر بھیجے گئے۔

باقی یہ تحقیق کہ ہر نوع میں سے الگ الگ پیغمبر آئے، یا ہر ایک پیغمبر کل افراد جن وانس کی طرف مبعوث ہوا، یہ آیت اس کے بیان سے ساکت ہے، دوسری نصوص سے جمہور علماء نے یہ ہی قرار دیا ہے کہ نہ ہر ایک پیغمبر کی بعثت عام ہے اور نہ کسی جن کو اللہ نے مستقل رسول بنا کر بھیجا، اکثر معاشی و معادی معاملات میں ان کو حق تعالیٰ نے انسانوں کے تابع بنا کر رکھا ہے، جیسا کہ سورۂ جن کی آیات اور نصوص حدیثیہ وغیرہ اس پر دلالت کرتی ہیں، یہ کوئی ضابطہ نہیں کہ مخلوق کی ہر نوع کے لئے اسی نوع کا کوئی شخص رسول ہوا کرے۔

باقی انسانوں کی طرف فرشتہ کو رسول بنا کر بھیجنے سے جو قرآن کے متعدد مواضع میں انکار کیا گیا ہے، اس کا اصلی منشاء یہ ہے کہ عام انسان بہیئۃ الاصلیہ (فرشتوں کی اصل ہیئت کے ساتھ) اس کی رویت کا تحمل نہیں کر سکتے اور بے اندازہ خوف و ہیبت کی وجہ سے مستفید نہیں ہو سکتے اور بصورت انسان آئیں تو بے ضرورت التباس رہتا ہے، اسی پر قیاس کرلو کہ اگر قوم جن میں منصب نبوت کی اہلیت ہوتی تو وہ بھی انسانوں کے لئے مبعوث نہیں کئے جاسکتے تھے، کیونکہ وہاں بھی یہ ہی اشکال تھا، ہاں! رسول انسی کا جن کی طرف مبعوث ہونا اس لئے نہیں کہ جنوں کے حق میں انسان کی رؤیت نہ تو نا قابل تحمل ہے اور نہ انسان کا صوری خوف ورعب استفادہ سے مانع ہوسکتا ہے، ادھر پیغمبر کو حق تعالیٰ وہ قوت قلبی عطا فرما دیتا ہے کہ اس پر جن جیسی ہیبت ناک مخلوق کا کوئی رعب نہیں پڑتا۔

فائدہ: ۲ وَغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا: یعنی دنیا کی لذات وشہوات نے انہیں آخرت سے غافل بنا دیا، کبھی خیال بھی نہ آیا کہ اس احکم الحاکمین کے سامنے جانا ہے جو ذرہ ذرہ کا حساب لے گا۔

فائدہ: ۳ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ: اس سورت میں اوپر مذکور ہوا کہ اول کافر اپنے کفر کا انکار کرینگے، پھر حق تعالیٰ تدبیر سے انکو قائل کریگا۔

ذٰلِكَ اَنۡ لَّمۡ يَكُنۡ رَّبُّكَ مُهۡلِكَ الۡقُرٰى بِظُلۡمٍ وَّاَهۡلُهَا غٰفِلُوۡنَ ﴿۱۳۱﴾

یہ اس واسطے کہ تیرا رب ہلاک کرنے والا نہیں بستیوں کو ان کے ظلم پر اور وہاں کے لوگ بے خبر ہوں

خلاصہ تفسیر: (پیچھے رسولوں کے بھیجنے کا ذکر تھا، اب آگے حق تعالیٰ رسولوں کے بھیجنے میں اپنی رحمت کا اظہار فرماتے ہیں کہ:) یہ (رسولوں کا بھیجنا) اسی وجہ سے ہے کہ آپ کا رب کسی بستی والوں کو (ان کے) کفر کے سبب (دنیا میں بھی) ایسی حالت میں ہلاک نہیں کرتا کہ اس بستی کے رہنے والے (رسولوں کے نہ آنے کی وجہ سے احکام الٰہیہ سے) بے خبر ہوں (تو آخرت کا عذاب جو کہ بہت زیادہ سخت ہے بغیر رسولوں کے بھیجے کیونکر ہوسکتا ہے، اس لئے پیغمبروں کو بھیجتے ہیں تاکہ ان کو جرائم کی اطلاع ہوجائے، اس کے بعد پھر جس کو عذاب ہوگا استحقاق کی وجہ سے ہوگا)۔

اگر کسی کو شبہ ہو کہ پیغمبروں کے بھیجنے سے بڑھ کر رحمت تو یہ تھی کہ احکام کا مکلف اور پابند ہی نہ کیا جاتا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ پھر باہم جس قدر فساد ہوتا اس کے انسداد کی کوئی صورت نہ تھی، چنانچہ دنیا کے بادشاہ وسلاطین بھی قانون ہی سے نظم وانتظام چلاتے ہیں۔

وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوۡا ؕ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۳۲﴾

اور ہر ایک کے لئے درجے ہیں ان کے عمل کے، اور تیرا رب بے خبر نہیں ان کے کام سے

خلاصہ تفسیر: (چنانچہ آگے فرماتے ہیں:) اور (جب رسول آگئے اور اطلاع ہوگئی پھر جیسا جیسا کوئی کرے گا) ہر ایک کے لیے (جن ہو یا انسان، صالح ہو یا برا ہر ایک کو جزاء وسزاء کے ویسے ہی) درجے ملیں گے ان کے اعمال کے سبب، اور آپ کا رب ان کے اعمال سے بے خبر نہیں ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی خدا کی یہ عادت نہیں کہ بدون آگاہ اور خبردار کئے کسی کو اس کے ظلم وعصیان پر دنیا یا آخرت میں پکڑ کر ہلاک کردے، اسی لئے رسول اور نذیر بھیجے کہ وہ خوب کھول کر تمام جن وانس کو ان کے بھلے برے اور آغاز وانجام سے خبردار کریں، پھر جس درجہ کا کسی کا عمل ہوگا حق تعالیٰ اس کے ساتھ ویسا ہی معاملہ کرے گا۔

وَرَبُّكَ الۡغَنِىُّ ذُو الرَّحۡمَةِ ؕ اِنۡ يَّشَاۡ يُذۡهِبۡكُمۡ وَيَسۡتَخۡلِفۡ مِنۡۢ بَعۡدِكُمۡ مَّا يَشَآءُ كَمَاۤ

اور تیرا رب بے پروا ہے رحمت والا اگر چاہے تو تم کو لے جائے اور تمہارے پیچھے قائم کر دے جس کو چاہے جیسا

اَنۡشَاَكُمۡ مِّنۡ ذُرِّيَّةِ قَوۡمٍ اٰخَرِيۡنَ ﴿۱۳۳﴾ اِنَّ مَا تُوۡعَدُوۡنَ لَاٰتٍ ۙ وَّمَاۤ اَنۡتُمۡ بِمُعۡجِزِيۡنَ ﴿۱۳۴﴾

تم کو پیدا کیا اوروں کی اولاد سے، جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے وہ ضرور آنے والا ہے اور تم عاجز نہیں کرسکتے

خلاصہ تفسیر: اور آپ کا رب (رسولوں کو اس لئے نہیں بھیجتا کہ نعوذ باللہ وہ کسی کی عبادت کا محتاج ہے، وہ تو) بالکل غنی ہے (بلکہ اس لئے بھیجتا ہے کہ وہ) رحمت والا (بھی) ہے (اپنی رحمت سے رسولوں کو بھیجا تاکہ ان کے ذریعہ سے لوگوں کو فائدہ اور نقصان کی خبر ہوجائے، پھر منافع سے فائدہ اٹھائیں اور نقصان سے محفوظ رہیں، سو اس میں بندوں ہی کا فائدہ ہے، اور باقی ان کی بے نیازی تو ایسی ہے کہ) اگر وہ چاہے تو تم سب کو (دنیا سے دفعۃً) اٹھالے اور تمہارے بعد جس (مخلوق) کو چاہے تمہاری جگہ (دنیا میں) آباد کردے جیسا (اس کی نظیر پہلے سے موجود ہے کہ) تم کو (جو کہ اب موجود ہو) ایک دوسری قوم کی نسل سے پیدا کیا ہے (کہ ان کا کہیں پتہ نہیں اور تم ان کی جگہ موجود ہو، اسی طرح یہ سلسلہ چلا آرہا ہے، لیکن اگر ہم

چاہیں تو دفعۃً اس سلسلہ کو بند کردیں اور ازسر نو دوسرا سلسلہ قائم کردیں، کیونکہ کسی کے ہونے نہ ہونے سے ہمارا کوئی کام اٹکا نہیں پڑا، پس پیغمبروں کو بھیجنا ہماری ضرورت کی وجہ سے نہیں، تمہاری احتیاج کی وجہ سے ہے، تم کو چاہئے کہ ان کی تصدیق اور ان کا اتباع کر کے سعادت حاصل کرو اور کفر و انکار کے نقصان سے بچو، کیونکہ) جس چیز کا (رسولوں کی معرفت) تم سے وعدہ کیا جاتا ہے (یعنی قیامت وعذاب) وہ بیشک آنے والی چیز ہے، اور (اگر احتمال ہو کہ اگرچہ قیامت آئے گی تو ہم کہیں بھاگ جائیں گے، ہاتھ نہ آئیں گے، جیسا کہ دنیا میں حکام کے ساتھ مجرم ایسا کیا کرتے ہیں تو خوب سمجھ لو کہ) تم (خدا تعالیٰ کو) عاجز نہیں کرسکتے (کہ اس کے ہاتھ نہ آؤ)۔

وَرَبُّكَ الْغَنِيُّ ذُو الرَّحْمَةِ: اس آیت میں وَرَبُّكَ الْغَنِيُّ کے الفاظ سے رب الارباب کی بے نیازی بیان کرنے کے ساتھ ذو الرَّحْمَةِ کا اضافہ کر کے یہ بتلادیا کہ وہ اگرچہ تم سب سے بلکہ ساری کائنات سے بالکل مستغنی اور بے نیاز ہے، لیکن بے نیازی کے ساتھ وہ ذو الرحمۃ یعنی رحمت والا بھی ہے، اس جگہ ذو الرحمۃ کے بجائے اگر رحمن یا رحیم کا لفظ لایا جاتا تب بھی مقصود کلام ادا ہوجاتا، لیکن غنی ہونے کے ساتھ صفت رحمت کے جوڑ کی خاص اہمیت ظاہر کرنے کے لئے عنوان ذو الرَّحْمَةِ کا اختیار فرمایا گیا کہ وہ غنی اور مکمل بے نیاز ہونے کے باوجود صفت رحمت بھی مکمل رکھتا ہے، اور یہی صفت رسولوں اور کتابوں کے بھیجنے کا اصل سبب ہے، بعض لوگ بے نیازی کا یہ مطلب سمجھتے ہیں کہ اسے بندوں کی مصلحت کی پرواہ نہیں یہ باطل ہے، اس میں بہت سے خواص بھی مبتلا ہیں۔

* * *

فائدہ: خدا نے رسول بھیج کر اپنی حجت تمام کردی، اب اگر تم نہ مانو اور سیدھے راستہ پر نہ چلو تو وہ غنی ہے، اسے تمہاری کچھ پرواہ نہیں، وہ چاہے تو تم کو ایک دم میں لے جائے اور اپنی رحمت سے دوسری قوم کو تمہاری جگہ کھڑا کردے جو خدا کی مطیع و وفادار ہو اور تم کو لے جا کر دوسری قوم کا لے آنا خدا کے لئے کیا مشکل ہے، آج تم اپنے جن آباء واجداد کے جانشین بنے بیٹھے ہو، آخر ان کو اٹھا کر تم کو دنیا میں اسی خدا نے جگہ دی ہے، بہر حال خدا کا کام رک نہیں سکتا، تم نہ کرو گے دوسرے کھڑے کئے جائیں گے، ہاں! یہ سوچ رکھو کہ یہی بغاوت وشرارت رہی تو خدا کا عذاب اٹل ہے، تم اگر سمجھو کہ بھاگ کر یا کسی کی پناہ لے کر سزا سے بچ جاؤ گے تو یہ محض حماقت ہے، ساری مخلوق مل کر بھی خدا کو اس کی مشیت کے نفاذ سے عاجز نہیں کرسکتی۔

قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ

تو کہہ دے اے لوگوں تم کام کرتے رہو اپنی جگہ پر میں بھی کام کرتا ہوں، سو عنقریب جان لو گے تم کہ کس کو ملتا ہے عاقبت

الدَّارِ ۭ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۱۳۵﴾

کا گھر، بالیقین بھلا نہ ہوگا ظالموں کا

خلاصہ تفسیر: آگے فرماتے ہیں کہ دلائل بیان کردینے اور حق متعین ہوجانے کے باوجود اب بھی اگر کوئی کفر ہی کو اچھا سمجھے، اسلام کو برا کہے اور قیامت کا انکار کرے تو ایسے لوگوں کے جواب میں:

آپ (آخری بات) یہ فرمادیجئے کہ اے میری قوم! (تم جانو بہتر ہے) تم اپنی حالت پر عمل کرتے رہو، میں بھی (اپنے طور پر) عمل کر رہا ہوں، سو اب جلدی تم کو معلوم ہوا چاہتا ہے کہ اس عالم (کے اعمال) کا انجام کار کس کے لئے نافع ہوگا (ہمارے لئے یا تمہارے لئے، اور) یہ یقینی بات ہے کہ حق تلفی کرنے والوں کو کبھی (انجام میں) فلاح نہ ہوگی (اور سب سے بڑھ کر اللہ کی حق تلفی ہے، اور یہ بات صحیح دلائل میں تھوڑا غور کرنے سے معلوم ہوسکتی ہے کہ طریقہ اسلام حق تلفی ہے یا طریقہ کفر، اور جو دلائل میں بھی غور نہ کرے اس سے اتنا کہہ دینا بس ہے کہ: فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ یعنی عنقریب تم اس عمل بد کا انجام جان لو گے)۔

* * *

فائدہ: یعنی ہم سب نیک و بد اور نفع وضرر سے آگاہ کر چکے، اس پر بھی اگر تم اپنی جانوں پر ظلم کرنے سے باز نہیں آئے تو تم جانو، تم اپنا کام کئے جاؤ میں اپنا فرض ادا کرتا ہوں، عنقریب کھل جائے گا کہ اس دنیا کا آخری انجام کس کے ہاتھ رہتا ہے، بلاشبہ ظالموں کا انجام بھلا نہیں ہوسکتا، آگے ان کے چند اعتقادی اور عملی ظلم بیان کئے جاتے ہیں جو ان میں رائج تھے اور سب سے بڑا ظلم وہ ہی ہے جسے فرمایا: اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ (لقمان: ۱۳)

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِيْبًا فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَهٰذَا

اور ٹھہراتے ہیں اللہ کا اس کی پیدا کی ہوئی کھیتی اور مواشی میں ایک حصہ پھر کہتے ہیں یہ حصہ اللہ کا ہے اپنے خیال میں اور یہ

لِشُرَكَآئِنَا ۚ فَمَا كَانَ لِشُرَكَآئِهِمْ فَلَا يَصِلُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَمَا كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ يَصِلُ اِلٰى شُرَكَآئِهِمْ ؕ

ہمارے شریکوں کا ہے، سو جو حصہ ان کے شریکوں کا ہے وہ تو نہیں پہنچتا اللہ کی طرف، اور جو اللہ کا ہے وہ پہنچ جاتا ہے ان کے شریکوں کی طرف

سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ﴿۱۳۶﴾

کیا ہی برا انصاف کرتے ہیں

خلاصہ تفسیر: پچھلی آیتوں میں مشرکین کے عقائد باطلہ شرکیہ کفریہ کا بیان تھا، اب ان آیات میں ان کی عملی غلطیوں اور جاہلانہ رسموں کا ذکر ہے، جن رسوم جاہلیت کا ذکر ان آیات میں آیا ہے ان میں سے ① ایک یہ ہے کہ غلہ اور پھل میں سے کچھ حصہ اللہ کے نام کا نکالتے اور کچھ بتوں اور جنات کے نام کا، پھر اگر اتفاق سے اللہ کے حصہ میں سے کچھ بتوں کے حصہ میں مل جاتا تو اس کو اسی طرح ملا رہنے دیتے، اور معاملہ برعکس ہوتا تو اس کو اللہ کے حصہ میں سے نکال کر پھر بتوں کے حصہ کو پورا کر دیتے تھے اور بہانہ یہ کرتے کہ اللہ تعالیٰ تو غنی ہے اس کا حصہ کم ہو جانے سے اس کا کوئی نقصان نہیں، اور شرکاء بت وغیرہ محتاج ہیں، ان کا حصہ نہ گھٹنا چاہئے۔

اور اللہ تعالیٰ نے جو کھیتی (وغیرہ) اور مواشی پیدا کئے ہیں ان (مشرک) لوگوں نے ان میں سے کچھ حصہ اللہ (کے نام) کا مقرر کیا (اور کچھ بتوں کے نام کا مقرر کیا، حالانکہ پیدا کرنے میں کوئی شریک نہیں) اور بزعم خود کہتے ہیں کہ یہ تو اللہ کا ہے (جو کہ مہمانوں، مساکین اور مسافر وغیرہ عام مصارف میں صرف ہوتا ہے) اور یہ ہمارے معبودوں کا ہے (جس کے مصارف خاص ہیں) پھر جو چیز ان کے معبودوں (کے نام) کی ہوتی ہے وہ تو اللہ (نام کے حصہ) کی طرف نہیں پہنچتی (بلکہ اگر اتفاقاً بھی خدا کے نام کے حصہ میں مل جائے تو فوراً نکال لی جاتی ہے) اور جو چیز اللہ (کے نام) کی ہوتی ہے وہ ان کے معبودوں (کے نام کے حصہ) کی طرف پہنچ جاتی ہے، انہوں نے کیا بری تجویز نکال رکھی ہے (کیونکہ اول تو سب اللہ کا پیدا کیا ہوا ہے، پیدا کرنے میں کوئی شریک نہیں تو دوسرے کے نام کیوں جائے، دوسرے پھر جتنا اللہ کا حصہ نکالا ہے اس میں سے بھی گھٹا دیا جائے، اور یہ کہا جائے کہ اللہ تو غنی ہے اور سب محتاج ہیں تو محتاج مان کر معبود سمجھنا اور زیادہ حماقت ہے)۔

* * *

فائدہ: حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ: ''کافر اپنی کھیتی میں سے اور مواشی کے بچوں میں سے اللہ کی نیاز نکالتے اور بتوں کی بھی نیاز نکالتے، پھر بعضا جانور اللہ کے نام کا بہتر دیکھا تو بتوں کی طرف بدل دیا، مگر بتوں کی طرف کا اللہ کی طرف نہ کرتے، ان سے زیادہ ڈرتے''، اسی طرح غلہ وغیرہ میں سے اگر بتوں کے نام کا اتفاقاً اللہ کے حصہ میں مل گیا تو پھر جدا کر کے بتوں کی طرف لوٹا دیتے اور اللہ نام کا بتوں کے حصہ میں جا پڑا تو اسے نہ لوٹاتے، بہانہ یہ کرتے تھے کہ اللہ تو غنی ہے اس کا کم ہو جائے تو کیا پروا ہے، بخلاف بتوں کے کہ وہ ایسے نہیں، تماشہ یہ ہے کہ یہ کہہ کر بھی شرماتے نہ تھے کہ جو ایسے محتاج ہوں ان کو معبود و مستعان ٹھہرانا کہاں کی عقلمندی ہے، بہر حال ان آیات میں سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ سے مشرکین کی اس تقسیم کا رد کیا گیا ہے، یعنی خدا کی پیدا کی ہوئی کھیتی اور مواشی وغیرہ میں سے اول تو اس کے مقابل غیر اللہ کا حصہ لگانا، پھر بری اور ناقص چیز خدا کی طرف رکھنا کس قدر ظلم اور بے انصافی ہے۔

وَكَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ لِيُرْدُوْهُمْ وَلِيَلْبِسُوْا

اور اسی طرح مزین کر دیا بہت سے مشرکوں کی نگاہ میں ان کی اولاد کے قتل کو ان کے شریکوں نے تا کہ ان کو ہلاک کریں اور رلا ملا دیں

عَلَيْهِمْ دِيْنَهُمْ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ ﴿۱۳۷﴾

ان پر ان کے دین کو [1] اور اللہ چاہتا تو یہ کام نہ کرتے سو چھوڑ دے وہ جانیں اور ان کا جھوٹ [2]

خلاصہ تفسیر: اور (۲ ان کی دوسری رسم اپنی لڑکیوں کو قتل کر ڈالنے کی تھی) اسی طرح بہت سے مشرکین کے خیال میں ان کے معبودوں (شیاطین) نے اپنی اولاد کے قتل کرنے کو مستحسن بنا رکھا ہے (جیسا کہ جاہلیت میں لڑکیوں کو قتل یا زندہ در گور کر دینے کی رسم تھی) تا کہ (اس قبیح فعل کے ارتکاب سے) وہ (شیاطین) ان (مشرکین) کو (مستحق عذاب ہونے کی وجہ سے) برباد کریں اور تا کہ ان کے طریقہ کو مخبوط کر دیں (کہ ہمیشہ غلطی میں پھنسے رہیں، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کی ان حرکات شنیعہ سے مغموم نہ ہوں، کیونکہ) اگر اللہ تعالیٰ کو (ان کا بھلا) منظور ہوتا تو یہ ایسا کام نہ کرتے، تو آپ ان کو اور جو کچھ یہ غلط باتیں بنا رہے ہیں (کہ ہمارا یہ فعل بہت اچھا ہے) یوں ہی رہنے دیجئے (کچھ فکر نہ کیجئے ہم آپ سمجھ لیں گے)۔

❋ ❋ ❋

فائدہ: [1] یہاں شرکاء کی تفسیر مجاہد نے ''شیاطین'' سے کی ہے، مشرکین کی انتہائی جہالت اور سنگدلی کا ایک نمونہ یہ تھا کہ بعض اپنی بیٹیوں کو سسر بننے کے خوف سے اور بعض اس اندیشہ پر کہ کہاں سے کھلائیں گے حقیقی اولاد کو قتل کر دیتے تھے اور بعض اوقات منت مانتے تھے کہ اگر اتنے بیٹے ہو جائیں گے یا فلاں مراد پوری ہوگی تو ایک بیٹا فلاں بت کے نام پر ذبح کریں گے، پھر اس ظلم و بے رحمی کو بڑی عبادت اور قربت سمجھتے تھے، شاید یہ رسم شیطان نے سنت خلیل اللہ ہی کے جواب میں سجھائی ہوگی، یہود میں بھی مدت تک قتل اولاد کی رسم بطور ایک عبادت و قربت کے جاری رہی ہے جس کا انبیائے بنی اسرائیل نے بڑی شد و مد سے رد کیا، بہر حال اس آیت میں قتل اولاد کی ان تمام صورتوں کی شناعت بیان فرمائی ہے جو جاہلیت میں رائج تھیں، یعنی شیاطین قتل اولاد کی تلقین و تزیین اس لئے کرتے ہیں کہ اس طرح لوگوں کو دنیا و آخرت دونوں جگہ تباہ و برباد کر کے چھوڑیں اور ان کے دین میں گڑبڑی ڈال دیں کہ جو کام ملت ابراہیمی و اسماعیلی کے بالکل مضاد و منافی ہے، اسے ایک دینی کام اور قربت و عبادت باور کرائیں، والعیاذ باللہ! کجا سنت ابراہیمی اور کجا یہ حماقت و جہالت؟

فائدہ: [2] اسی طرح کی آیت وَلَوْ اَنَّنَا کے شروع میں گزر چکی، وہاں جو کچھ ہم نے لکھا ہے نیز اسی مضمون کی دوسری آیات کے تحت میں لکھا گیا اسے ملاحظہ کر لیا جائے۔

وَقَالُوْا هٰذِهٖٓ اَنْعَامٌ وَّحَرْثٌ حِجْرٌ ۖ لَّا يَطْعَمُهَآ اِلَّا مَنْ نَّشَآءُ بِزَعْمِهِمْ وَاَنْعَامٌ

اور کہتے ہیں کہ یہ مواشی اور کھیتی ممنوع ہے، اس کو کوئی نہ کھاوے مگر جس کو ہم چاہیں ان کے خیال کے موافق اور بعضے مواشی کی

حُرِّمَتْ ظُهُوْرُهَا وَاَنْعَامٌ لَّا يَذْكُرُوْنَ اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا افْتِرَآءً عَلَيْهِ ؕ سَيَجْزِيْهِمْ

پیٹھ پر چڑھنا حرام کیا اور بعض مواشی کے ذبح کے وقت نام نہیں لیتے اللہ کا اللہ پر بہتان باندھ کر، عنقریب وہ سزا دے گا ان کو

بِمَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۱۳۸﴾

اس جھوٹ کی

خلاصہ تفسیر: (۳ ان کی تیسری رسم یہ تھی کہ کچھ کھیت بتوں کے نام وقف کر دیتے اور کہتے کہ اس کا اصل مصرف فقط مرد ہیں، عورتوں کو

اس میں سے کچھ دینا نہ دینا ہماری مرضی پر ہے، ان کو مطالبہ کا حق نہیں، اسی طرح کا عمل مویشی جانوروں میں کرتے تھے کہ بعض کو مردوں کے لئے مخصوص قرار دیتے تھے ④ چوتھی رسم یہ تھی کہ جن چوپایہ جانوروں کو بتوں کے نام پر چھوڑ دیتے تو ان پر سواری اور بار برداری کو حرام سمجھتے تھے ⑤ پانچویں رسم یہ تھی کہ بعض چوپایہ جانور مخصوص تھے جن پر کسی موقع میں بھی اللہ کا نام نہ لیتے تھے نہ دودھ نکالنے کے وقت، نہ سوار ہوتے وقت، نہ ذبح کرنے کے وقت۔

اور وہ اپنے خیال (باطل) پر یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ (مخصوص) مواشی ہیں اور (مخصوص) کھیت ہیں، جن کا استعمال ہر شخص کو جائز نہیں، ان کو کوئی نہیں کھا سکتا سوائے ان کے جن کو ہم چاہیں، اور (یوں کہتے ہیں کہ یہ مخصوص) مواشی ہیں جن پر سواری یا بار برداری حرام کر دی گئی ہے اور (یوں کہتے ہیں کہ یہ مخصوص) مواشی ہیں جن پر (اللہ کا نام نہیں لینا چاہئے، چنانچہ اسی اعتقاد کی وجہ سے ان پر) یہ لوگ اللہ کا نام نہیں لیتے (اور یہ سب باتیں) محض اللہ پر افتراء (بہتان) باندھنے کے طور پر (کہتے ہیں، بہتان اس لئے کہ وہ ان امور کو حق تعالیٰ کی خوشنودی کا سبب سمجھتے تھے) ابھی اللہ تعالیٰ ان کو ان کے افتراء کی سزا دیتا ہے (ابھی سزا دینا اس لئے فرمایا کہ قیامت جو کہ آنے والی ہے دور نہیں اور کچھ کچھ سزا تو مرتے ہی شروع ہو جائے گی)۔

* * *

فائدہ: مثلاً مرد کھائیں عورتیں نہ کھائیں، یا صرف مہنت کھا سکیں جو بت خانوں کے مجاور تھے، یہ قیود اپنے خیال میں بعض مواشی اور کھیتوں کے متعلق عائد کر رکھی تھیں جو بتوں کے نام پر وقف کئے جاتے تھے، اسی طرح بعض جانوروں کی پیٹھ پر سواری اور بار برداری کو حرام سمجھتے تھے، بعض جانوروں کی نسبت یہ قرار دیا تھا کہ ذبح کرنے یا سواری لینے یا دودھ نکالنے کے وقت ان پر خدا کا نام نہ لیا جائے کہیں بتوں کی چیز میں خدا کی شرکت نہ ہو جائے، پھر غضب یہ تھا کہ ان خرافات اور جہالتوں کو خدا کی طرف نسبت کرتے تھے، گویا اس نے معاذ اللہ یہ احکام دیے ہیں اور ان ہی طریقوں سے اس کی خوشنودی حاصل کی جا سکتی ہے، ایسی بدعنوانیوں کے ساتھ یہ افتراء و بہتان، عنقریب ان گستاخیوں کی سزا سے ان کو دو چار ہونا پڑے گا۔

وَقَالُوا مَا فِي بُطُونِ هَٰذِهِ الْأَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُورِنَا وَمُحَرَّمٌ عَلَىٰ أَزْوَاجِنَا ۖ وَإِن يَكُن مَّيْتَةً

اور کہتے ہیں جو بچہ ان مواشی کے پیٹ میں ہے اس کو تو خاص ہمارے مرد ہی کھاویں اور وہ حرام ہے ہماری عورتوں پر، اور جو بچہ مردہ ہو

فَهُمْ فِيهِ شُرَكَاءُ ۚ سَيَجْزِيهِمْ وَصْفَهُمْ ۚ إِنَّهُ حَكِيمٌ عَلِيمٌ ﴿١٣٩﴾

تو اس کے کھانے میں سب برابر ہیں، وہ سزا دے گا ان کو ان تقریروں کی، وہ حکمت والا جاننے والا ہے

خلاصہ تفسیر: ⑥ چھٹی رسم یہ تھی کہ جن جانوروں کا نام بحیرہ یا سائبہ رکھ کر بتوں کے نام پر چھوڑتے ان کے ذبح کے وقت اگر بچہ پیٹ سے زندہ نکلتا تو اس کو بھی ذبح کر لیتے، مگر اس کو صرف مردوں کے لئے حلال اور عورتوں کے لئے حرام سمجھتے تھے اور اگر بچہ مردہ نکلا تو وہ سب کے لئے حلال ہوتا تھا ⑦ ساتویں رسم بعض جانوروں کا دودھ بھی مردوں کے لئے حلال اور عورتوں کے لئے حرام سمجھتے تھے۔

اور وہ (یوں بھی) کہتے ہیں کہ جو چیز ان مواشی کے پیٹ میں (سے نکلتی) ہے (مثلاً دودھ یا بچہ) وہ خالص ہمارے مردوں کے لیے (حلال) ہے اور ہماری عورتوں پر حرام ہے، اور اگر وہ (پیٹ کا نکلا ہوا بچہ) مردہ ہو تو اس (سے فائدہ اٹھانے کے جواز) میں (مرد و عورت) سب برابر ہیں ابھی اللہ تعالیٰ ان کو ان کی (اس) غلط بیانی کی سزا دیے دیتا ہے (اور اب تک جو سزا نہیں دی تو وجہ یہ ہے کہ) بلا شبہ وہ حکمت والا ہے (بعض حکمتوں کی وجہ سے مہلت دے رکھی ہے، اور ابھی سزا نہ دینے سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ اس کو خبر نہیں، کیونکہ) وہ بڑا علم والا ہے (اس کو سب خبر ہے)۔

* * *

فائدہ: ایک مسئلہ یہ بنا رکھا تھا کہ بحیرہ اور سائبہ کو اگر ذبح کیا اور اس کے پیٹ میں سے زندہ بچہ نکلا تو اسے مرد کھائیں اور عورتیں نہ کھائیں اور مردہ نکلے تو سب کھا سکتے ہیں، اس طرح کے بے سند مسئلے گھڑنے والوں کے جرائم سے خدا بے خبر نہیں، ہاں! وہ اپنی حکمت کے موافق مناسب وقت میں ان کو مناسب سزا دے گا۔

قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْٓا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًۢا بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّحَرَّمُوْا مَا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ افْتِرَآءً عَلَى اللّٰهِ ؕ

بے شک خراب ہوئے جنہوں نے قتل کیا اپنی اولاد کو نادانی سے بغیر سمجھے اور حرام ٹھہرالیا اس رزق کو جو اللہ نے ان کو دیا بہتان باندھ کر اللہ پر

قَدْ ضَلُّوْا وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ﴿۱۴۰﴾

بیشک وہ گمراہ ہوئے اور نہ آئے سیدھی راہ پر

خلاصہ تفسیر: (اب خلاصہ اور انجام کے طور پر ارشاد فرماتے ہیں کہ:) واقعی خرابی میں پڑ گئے وہ لوگ جنہوں نے (ان مذکورہ افعال کو طریقہ بنالیا کہ) اپنی اولاد کو محض براہ حماقت بلا کسی (معقول ومقبول) سند کے قتل کر ڈالا اور جو (حلال) چیزیں ان کو اللہ تعالیٰ نے کھانے پینے کو دی تھیں ان کو (عقیدہ یا عمل کے اعتبار سے) حرام کرلیا (جیسا کہ پیچھے رسوم میں بیان ہوا، اور یہ مجموعہ) محض اللہ پر افتراء (بہتان) باندھنے کے طور پر (ہوا) بیشک یہ لوگ گمراہی میں پڑ گئے اور (یہ گمراہی جدید نہیں بلکہ قدیم ہے، کیونکہ پہلے بھی) کبھی راہ پر چلنے والے نہیں ہوئے۔

پس اس آیت میں ان کے طریقہ کا خلاصہ بھی مذکور ہے کہ گمراہی میں پڑ گئے، اور ان کے برے انجام کا خلاصہ بھی مذکور ہے کہ خرابی میں پڑ گئے جس کے سبب عذاب بھگتیں گے۔

* * *

فائدہ: اس سے بڑی خرابی، گمراہی اور نقصان وخسران کیا ہوگا کہ بیٹھے بٹھائے بلا وجہ دنیا میں اپنی اولاد و اموال سے محروم اور سنگدلی، بد اخلاقی وجہل میں مشہور ہوئے اور آخرت کا دردناک عذاب سر پر رکھا، نہ عقل سے کام لیا نہ شرع کو پہچانا، پھر سیدھی راہ پر آتے تو کیسے آتے۔

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَ جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ وَّغَيْرَ مَعْرُوْشٰتٍ وَّالنَّخْلَ وَالزَّرْعَ مُخْتَلِفًا اُكُلُهٗ

اور اسی نے پیدا کئے باغ جو ٹٹیوں پر چڑھائے جاتے ہیں اور جو ٹٹیوں پر نہیں چڑھائے جاتے [۱] اور کھجور کے درخت اور کھیتی کہ مختلف ہیں انکے پھل

وَالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُتَشَابِهًا وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ ؕ كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَاٰتُوْا حَقَّهٗ

اور پیدا کیا زیتون کو اور انار کو ایک دوسرے کے مشابہ اور جدا جدا بھی [۲] کھاؤ انکے پھل میں سے جس وقت پھل لائیں اور ادا کرو ان کا حق

يَوْمَ حَصَادِهٖ ۖ وَلَا تُسْرِفُوْا ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿۱۴۱﴾

جس دن ان کو کاٹو، اور بے جا خرچ نہ کرو، اس کو خوش نہیں آتے بیجا خرچ کرنے والے [۳]

خلاصہ تفسیر: پچھلی آیتوں میں مشرکین مکہ کا کھیتی، زراعت اور مویشی جانوروں میں اپنی طرف سے حلال وحرام کرنے کی گمراہی اور اس کے رد کا ذکر تھا، اب آگے بھی اسی رد کی کسی قدر تفصیل بیان کی جاتی ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ یہ اشیاء اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی ہیں، سو جس طرح اللہ کے سوا کسی کو یہ حق نہیں کہ ان اشیاء کو اس کا شریک وساجھی بنا ڈالا جائے، اسی طرح حلال وحرام کرنے کا اختیار بھی اللہ کے سوا دوسروں کو حاصل نہ ہوگا اور اللہ نے ان اشیاء سے فائدہ اٹھانے کو حلال فرمایا ہے۔

اور وہی (اللہ پاک) ہے جس نے باغات پیدا کئے وہ بھی جو ٹٹیوں (یعنی بیل دار ہیں جو سہاروں) پر چڑھائے جاتے ہیں (جیسے انگور) اور وہ بھی جو ٹٹیوں پر نہیں چڑھائے جاتے (یا تو اس لئے کہ بیل دار نہیں جیسے تنہ دار درخت، یا بیل دار ہونے کے باوجود ٹٹیوں پر ان کے چڑھانے کی عادت نہیں، جیسے خربوزہ، تربوز وغیرہ) اور کھجور کے درخت اور کھیتی (بھی اس نے پیدا کئے) جن میں کھانے کی چیزیں مختلف طور کی (حاصل) ہوتی ہیں اور زیتون اور انار (بھی اس نے پیدا کیے) جو (انار انار) باہم (اور زیتون زیتون باہم رنگ ومزہ وشکل ومقدار میں سے بعض صفات میں کبھی) ایک

دوسرے کے مشابہ ہوتے ہیں اور (کبھی) ایک دوسرے کے مشابہ نہیں بھی ہوتے (اور اللہ نے ان چیزوں کو پیدا کر کے اجازت دی ہے کہ) ان سب کی پیداوار کھاؤ (خواہ اسی وقت سے کہی) جب وہ نکل آئے (اور پکنے بھی نہ پائے) اور (البتہ اس کے ساتھ اتنا ضرور ہے کہ) اس میں جو حق (شرع سے) واجب ہے (یعنی خیرات) وہ اس کے کاٹنے (توڑنے) کے دن (مسکینوں کو) یاد کرو، اور (اس دینے میں بھی) حد (شرعی اجازت) سے مت گزرو، یقیناً وہ (یعنی اللہ تعالیٰ) حد (شرعی اجازت) سے گزرنے والوں کو ناپسند کرتے ہیں۔

وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ: یہاں جس شرعی حق کا بیان ہے اس سے عشر مراد نہیں جو کہ زمین کی زکوۃ تھی، کیونکہ زکوۃ مدینہ میں فرض ہوئی ہے اور یہ آیت مکہ میں نازل ہوئی، چنانچہ یہ حق زکوۃ کے علاوہ تھا، پھر جب زکوۃ وعشر واجب ہو گئے تو یہ حق منسوخ ہو گیا۔

وَلَا تُسْرِفُوْا: یعنی مسکینوں کو دینے میں بھی شرعی اجازت سے آگے نہ بڑھو، مطلب اتنا مت دو کہ اپنے اوپر اور اہل وعیال پر تنگی اور پریشانی ہو جائے، باقی یہ مطلب نہیں کہ جس قدر واجب ہے اس سے زیادہ نہ دو، کیونکہ واجب سے زیادہ دینا جبکہ تنگی وغیرہ نہ ہو تو یہ اسراف نہیں۔

* * *

فائدہ: ۱ مَّعْرُوْشٰتٍ وَّغَيْرَ مَعْرُوْشٰتٍ: جو ٹٹیوں پر چڑھائے جاتے ہیں، مثلاً انگور وغیرہ اور جو ایسے نہیں مثلاً کھجور، آم وغیرہ تنہ دار درخت یا خربوزہ تربوز وغیرہ جن کی بیل بدون کسی سہارے کے زمین پر پھیلتی ہے۔

فائدہ: ۲ مُتَشَابِهًا وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ: یعنی صورت شکل میں ملتے جلتے، مزہ میں جدا جدا۔

فائدہ: ۳ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ: یعنی جو غلے اور پھل حق تعالیٰ نے پیدا فرمائے ہیں ان کے کھانے سے بدون سند کے مت رکو ہاں دو باتوں کا خیال رکھو، ایک یہ کہ کاٹنے اور اتارنے کے ساتھ ہی جو اللہ کا حق اس میں ہے وہ ادا کر دو، دوسرے فضول اور بے موقع خرچ مت کرو، "اللہ کے حق" سے یہاں کیا مراد ہے؟ اس میں علماء کے مختلف اقوال ہیں، ابن کثیرؒ کی رائے یہ معلوم ہوتی ہے کہ ابتداء مکہ معظمہ میں کھیتی اور باغ کی پیداوار میں سے کچھ حصہ نکالنا واجب تھا جو مساکین وفقراء پر صرف کیا جائے، مدینہ طیبہ پہنچ کر ۲ ہجری میں اس کی مقدار وغیرہ کی تعیین وتفصیل کر دی گئی، یعنی بارانی زمین کی پیداوار میں (بشرطیکہ خراجی نہ ہو) دسواں حصہ اور جس میں پانی دیا جائے بیسواں حصہ واجب ہے۔

وَمِنَ الْاَنْعَامِ حَمُوْلَةً وَّفَرْشًا ۭ كُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ

اور پیدا کئے مواشی میں بوجھ اٹھانے والے اور زمین سے لگے ہوئے ۱ کھاؤ اللہ کے رزق میں سے اور مت چلو شیطان کے قدموں پر

اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۴۲﴾

وہ تمہارا دشمن ہے صریح ۲

خلاصہ تفسیر: اور (جس طرح باغ اور کھیت اللہ نے پیدا کئے ہیں، اسی طرح حیوانات بھی، چنانچہ) مواشی میں اونچے قد کے (بھی) اور چھوٹے قد کے (بھی اسی نے پیدا کئے، اور ان کے بارے میں بھی باغ اور کھیت کی طرح تم کو اجازت دی کہ) جو کچھ اللہ تعالیٰ نے تم کو دیا ہے (اور شریعت سے حلال کیا ہے اس کو) کھاؤ اور (اپنی طرف سے حرمت کے احکام گھڑ کر) شیطان کے قدم بقدم مت چلو، بلاشک وہ تمہارا صریح دشمن ہے (کہ تم کو حق کے دلائل واضح ہونے کے باوجود گمراہ کر رہا ہے)۔

* * *

فائدہ: ۱ بوجھ اٹھانے والے جیسے اونٹ وغیرہ اور زمین سے لگے ہوئے چھوٹے قد وقامت کے جانور جیسے بھیڑ بکری۔

فائدہ: ۲ اللہ کی دی ہوئی نعمتوں سے منتفع ہونا چاہئے، شیطان کے قدموں پر چلنا یہ ہے کہ ان کو خواہی نخواہی بدون حجت شرعی کے حرام کر لیا جائے، یا شرک وبت پرستی کا ذریعہ بنا لیا جائے، شیطان کی اس سے زیادہ کھلی ہوئی دشمنی کیا ہوگی کہ ان نعمتوں سے تم کو دنیا میں محروم رکھا اور آخرت کا عذاب رہا سو الگ۔

ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ ۚ مِنَ الضَّاْنِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْمَعْزِ اثْنَيْنِ ؕ قُلْ ءٰٓالذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ

پیدا کئے آٹھ نر اور مادہ بھیڑ میں سے دو ۱؎ اور بکری میں سے دو ، پوچھ تو کہ دونوں نر اللہ نے حرام کئے ہیں یا دونوں مادہ

اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ ؕ نَبِّـُٔوْنِیْ بِعِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۴۳﴾

یا وہ بچہ کہ اس پر مشتمل ہیں بچہ دان دونوں مادہ کے، بتلاؤ مجھ کو سند اگر تم سچے ہو ۲؎

خلاصہ تفسیر: (اور یہ مواشی جنہیں تم اپنی طرف سے حلال وحرام کر رہے ہو) آٹھ نر و مادہ (پیدا کئے) یعنی بھیڑ (اور دنبہ) میں دو قسم (ایک نر ایک مادہ) اور بکری میں دو قسم (ایک نر اور ایک مادہ) آپ (ان سے) کہئے کہ (یہ تو بتلاؤ کہ) کیا اللہ تعالیٰ نے ان (دونوں جانور کے) دونوں نروں کو حرام کیا ہے یا دونوں مادہ کو (حرام کہا ہے) یا اس (بچہ) کو جس کو (بھیڑ، بکری) دونوں مادہ (اپنے) پیٹ میں لئے ہوئے ہوں (وہ بچہ نر ہو یا مادہ، یعنی تم جو مختلف صورتوں سے حرام قرار دینے کا دعویٰ کرتے ہو تو کیا حق تعالیٰ نے ان میں سے کسی کو حرام کیا ہے، اگر خدا کی طرف نسبت کرتے ہو تو) تم مجھ کو کسی دلیل سے تو بتلاؤ اگر (تم اپنے اس دعوے میں) سچے ہو (کہ ان میں سے کس کو حرام کیا ہے)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی ایک نر ایک مادہ اس طرح ہر نوع میں دو دو زوج ہوئے اور مجموعہ آٹھ ہو گیا۔

فائدہ: ۲؎ یعنی کسی چیز کو حلال وحرام کہنا صرف اللہ کے حکم سے ہو سکتا ہے، پھر ان میں سے نر کو یا مادہ کو یا بچہ کہ جو مادہ کے پیٹ میں ہے اگر تم سب آدمیوں کے یا بعض کے حق میں حرام کہتے ہو جیسا کہ پچھلی آیات میں گزرا، اس کی سند تمہارے پاس کیا ہے؟! جب خدائی حکم ہونے کی کوئی سند نہیں رکھتے تو محض آراء وہواء سے خدا کی پیدا کی ہوئی چیزوں کو حلال یا حرام کہنا اس کا مترادف ہے کہ خدائی کا منصب معاذ اللہ تم اپنے لئے تجویز کرتے ہو یا خدا پر جان بوجھ کر افتراء کر رہے ہو، دونوں صورتیں تباہ کن اور مہلک ہیں۔

وَمِنَ الْاِبِلِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْبَقَرِ اثْنَيْنِ ؕ قُلْ ءٰٓالذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ

اور پیدا کئے اونٹ میں سے دو اور گائے میں سے دو ، پوچھ تو دونوں نر حرام کئے ہیں یا دونوں مادہ یا وہ بچہ کہ اس پر مشتمل ہیں

عَلَيْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ ؕ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ وَصّٰىكُمُ اللّٰهُ بِهٰذَا ۚ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى

بچہ دان دونوں مادہ کے ، کیا تم حاضر تھے جس وقت تم کو اللہ نے یہ حکم دیا تھا، پھر اس سے زیادہ ظالم کون جو بہتان باندھے

عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا لِّيُضِلَّ النَّاسَ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۴﴾ ع

اللہ پر جھوٹا تا کہ لوگوں کو گمراہ کرے بلا تحقیق ، بیشک اللہ ہدایت نہیں کرتا ظالم لوگوں کو

خلاصہ تفسیر: (گزشتہ آیت میں چھوٹے قد والے جانوروں کے متعلق بیان ہوا کہ بھیڑ بکری میں بھی نر و مادہ پیدا کیا، اب بڑے قد والوں کا بیان ہے) اور (اسی طرح) اونٹ میں دو قسم (ایک نر اور ایک مادہ) اور گائے (اور بھینس) میں دو قسم (ایک نر اور ایک مادہ پیدا کئے) آپ (ﷺ ان سے اس بارے میں بھی) کہئے کہ (یہ تو بتلاؤ کہ) کیا اللہ تعالیٰ نے ان دونوں (جانور کے) نروں کو حرام کہا ہے یا دونوں مادہ کو (حرام کہا ہے) یا اس (بچہ) کو جس کو دونوں مادہ (اپنے) پیٹ میں لئے ہوئے ہوں (وہ بچہ نر ہو یا مادہ، اس کا بھی وہی مطلب ہے کہ تم جو مختلف صورتوں سے حرمت کا دعویٰ کرتے ہو تو کیا یہ حرمت اللہ تعالیٰ نے فرمائی ہے؟ اگر ایسا ہے تو اس پر کوئی دلیل قائم کرنی چاہئے، جس کے دو طریقے ہیں: ① ایک تو یہ کہ کسی

رسول وفرشتہ کے واسطہ سے ہو، اس شق کو تو تم اختیار کر ہی نہیں سکتے، کیونکہ تم کو مسئلہ نبوت اور وحی سے انکار ہی ہے، پس اس دعویٰ کو ثابت کرنے کی ایک دوسری ہی صورت رہ گئی ہے کہ ② خود خدا تعالیٰ نے بلا واسطہ تم کو یہ احکام بتلائے ہوں تو) کیا تم (اس وقت) حاضر تھے جس وقت اللہ تعالیٰ نے تم کو اس (حلال وحرام کرنے) کا حکم دیا (اور ظاہر ہے کہ اس کا دعویٰ بھی نہیں ہو سکتا، پس ثابت ہو گیا کہ ان کے پاس کوئی دلیل نہیں) تو (اس بات کے ثابت ہونے کے بعد کہ اس دعوے پر کوئی دلیل نہیں، یقینی بات ہے کہ) اس سے زیادہ کون ظالم (اور جھوٹا) ہوگا جو اللہ تعالیٰ پر بلا دلیل (حلال وحرام کرنے کے بارے میں) جھوٹی تہمت لگائے تاکہ لوگوں کو گمراہ کرے (یعنی یہ شخص بڑا ظالم ہوگا، اور) یقیناً اللہ تعالیٰ ظالم لوگوں کو (جنت کا) راستہ (آخرت میں) نہ دکھلائیں گے (بلکہ دوزخ میں بھیجیں گے، پس یہ لوگ بھی اس جرم کی سزا میں دوزخ میں جائیں گے)۔

حاصل جواب کا یہ ہوا کہ تمام چیزیں اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی ہیں، تو جس طرح اللہ کے سوا کسی کے لیے یہ حق نہیں کہ ان چیزوں کو عبادت کے طور پر اس کے نام زد کیا جائے جیسا کہ مشرکین بتوں کے نام پر کھیت اور جانور چھوڑتے تھے، اسی طرح ان کے حلال وحرام کرنے اختیار بھی اللہ کے سوا کسی کو نہ ہوگا، اور حق تعالیٰ نے ان سے ہر قسم کے نفع سواری لینے، کھانے پینے کو جائز کیا ہے، پس حرمت کسی طرح ممکن نہیں، کیونکہ تمہارا احرام کرنا شرعاً غیر ممکن ہے، اور خدا نے حرام کیا نہیں، اگر کیا ہے تو دلیل لاؤ، جب دلیل نہیں لا سکتے تو حرمت کا دعویٰ کرنا خدا پر بہتان باندھنا ہے۔

* * *

فائدہ: اشیاء کی تحلیل وتحریم محض خدا کے حکم سے ہو سکتی ہے، اور خدا کا حکم یا بواسطہ انبیاء پہنچے گا، یا بلا واسطہ حق تعالیٰ کسی کو مخاطب فرمائے تو اسے معلوم ہو، یہاں دونوں صورتیں منفی ہیں، پہلی شق کے انتفاء پر نَبِّـُٔوْنِيْ بِعِلْمٍ الخ میں اور دوسری کی نفی پر اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ وَصّٰىكُمُ اللّٰهُ بِهٰذَا میں متنبہ فرمایا ہے، پھر مشرکین کے دعاوی میں افتراء واضلال کے سوا اور کیا چیز باقی رہ گئی، بلاشبہ اس سے زیادہ ظالم کوئی نہیں ہو سکتا جو خدا پر بہتان باندھے اور علم وتحقیق سے تہی دست ہونے کے باوجود لوگوں کو باطل اور غلط مسائل بیان کر کے گمراہ کرتا پھرے، جس شخص نے اس قدر ڈھٹائی اختیار کر لی اور ایسے ظلم عظیم پر کمر باندھ لی اس کے ہدایت پانے کی توقع رکھنا فضول ہے۔

قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا

تو کہہ دے کہ میں نہیں پاتا اس وحی میں کہ مجھ کو پہنچی ہے کسی چیز کو حرام کھانے والے پر جو اس کو کھاوے مگر یہ کہ وہ چیز مردار ہو یا بہتا ہوا خون

اَوْ لَحْمَ خِنْزِيْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ

یا گوشت سور کا کہ وہ ناپاک ہے یا ناجائز ذبیحہ جس پر نام پکارا جاوے اللہ کے سوا کسی اور کا، پھر جو کوئی بھوک سے بے اختیار ہو جاوے

وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۴۵﴾

نہ نافرمانی کرے اور نہ زیادتی کرے تو تیرا رب بڑا معاف کرنے والا ہے نہایت مہربان

خلاصہ تفسیر: آگے بھی گذشتہ مضمون ہی کی تائید ہے کہ جن حیوانات میں کلام ہو رہا ہے ان میں حرام تو فلاں فلاں چیزیں ہیں، تم اپنی طرف سے کیوں گھڑتے ہو، نیز اس میں ان کی ایک دوسری گمراہی کی طرف بھی اشارہ ہے کہ وہ لوگ بہتے ہوئے خون اور غیر خدا کے نام پر ذبح کیے ہوئے جانور کو بھی کھاتے تھے تو پیچھے حلال کو حرام کرنے کا ذکر تھا اور آگے حرام کو حلال کرنے کا ذکر ہے۔

آپ کہہ دیجئے کہ (جن جانوروں کے بارے میں کلام ہو رہا ہے ان کے متعلق) جو کچھ احکام بذریعہ وحی میرے پاس آئے ہیں ان میں تو میں کوئی حرام غذا پاتا نہیں کسی کھانے والے کے لئے جو اس کو کھائے (خواہ مرد ہو یا عورت) مگر (ان چیزوں کو البتہ حرام پاتا ہوں وہ) یہ کہ وہ مردار (جانور) ہو (یعنی جو واجب الذبح ہونے کے باوجود ذبح شرعی کے بغیر مر جائے) یا یہ کہ بہتا ہوا خون ہو، یا خنزیر کا گوشت ہو، کیونکہ وہ (خنزیر) بالکل

ناپاک ہے (اس لئے اس کے سب اجزاء نجس اور حرام ہیں، بال بھی، کھال بھی، ہڈی بھی، گوشت بھی، ایسا ناپاک نجس العین کہلاتا ہے) یا جو (جانور وغیرہ) شرک کا ذریعہ ہو (اس طرح) کہ غیر اللہ کے (تقرب کے قصد وارادہ سے) نامزد کردیا گیا ہو (سو یہ سب حرام ہیں) پھر (بھی اس میں اتنی آسانی رکھی ہے کہ) جو شخص (بھوک سے بہت ہی) بیتاب ہوجائے بشرطیکہ نہ تو (کھانے میں) طالب لذت ہو، اور نہ (قدر ضرورت وحاجت سے) تجاوز کرنے والا ہو تو (اس حالت میں ان حرام چیزوں کے کھانے میں اس شخص کو کچھ گناہ نہیں ہوتا) واقعی آپ کا رب (اس شخص کے لئے) غفور رحیم ہے (کہ ایسے وقت میں رحمت فرمائی کہ گناہ کی چیز میں سے گناہ اٹھا دیا)۔

شبہ ہوتا ہے کہ کیا ان چار کے علاوہ اور کوئی جانور حرام نہیں حالانکہ احادیث میں تو دیگر حیوانات کی بھی حرمت آئی ہے؟ چنانچہ اسی شبہ کو دور کرنے کے لیے خلاصہ تفسیر میں اس قید کا اضافہ کیا گیا کہ ''جن جانوروں میں سے جن کے بارے میں کلام ہو رہا ہے'' یعنی ان جانوروں کے سلسلہ میں جو وحی مجھ پر آئی ہے، جن کی حلت وحرمت پر یہاں گفتگو ہو رہی ہے، یہاں جن حرام چیزوں کا حصر کیا گیا ہے، ان سے مراد یہی ہے، تم اور چیزوں کو اپنی رائے وتجویز سے کہاں سے حرام ٹھہرائے لیتے ہو، وحی الٰہی نے تو ابھی تک حرام تو بس یہی چیزیں کی ہیں، یہ مراد نہیں کہ کل محرمات کی یہ مکمل فہرست ہے، آیت مکی ہے اس سے زیادہ چیزیں تو مدنی سورۃ مائدہ ہی میں مل جائیں گی، شراب اور گردن مروڑا ہوا جانور وغیرہ اور متعدد جانوروں کی حرمت جو حدیث میں آئی ہے وہ اس کے علاوہ ہیں، ایسی ہی ایک آیت دوسرے پارہ سورہ بقرہ آیت ۱۷۲: اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيۡكُمُ الۡمَيۡتَةَ وَالدَّمَ گذری ہے بقیہ تفصیل وہاں ملاحظہ فرمایئے۔

* * *

فائدہ: حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں: ''یعنی جن جانوروں کا کھانا دستور ہے ان میں سے یہ ہی حرام ہے''۔ اس آیت میں کفار کو یہ بتلانا ہے کہ جو چیزیں اوپر مذکور ہوئیں حلال تھیں جن کو تم نے حرام بنا لیا، اب وہ چیزیں بتلائی جاتی ہیں جو واقعی حرام ہیں اور تم ان کو حلال سمجھتے ہو، باقی مضمون آیت کی تفسیر وتوضیح سورہ مائدہ کے شروع میں حُرِّمَتۡ عَلَيۡكُمُ الۡمَيۡتَةُ وَالدَّمُ وَلَحۡمُ الۡخِنۡزِيۡرِ الخ (المائدہ: ۳) کے نیچے گزر چکی ہے وہاں ملاحظہ کر لی جائے۔

وَعَلَى الَّذِيۡنَ هَادُوۡا حَرَّمۡنَا كُلَّ ذِىۡ ظُفُرٍ‌ۚ وَمِنَ الۡبَقَرِ وَالۡغَنَمِ حَرَّمۡنَا عَلَيۡهِمۡ شُحُوۡمَهُمَاۤ

اور یہود پر ہم نے حرام کیا تھا ہر ایک ناخن والا جانور، اور گائے اور بکری میں سے حرام کی تھی ان کی چربی

اِلَّا مَا حَمَلَتۡ ظُهُوۡرُهُمَاۤ اَوِ الۡحَوَايَاۤ اَوۡ مَا اخۡتَلَطَ بِعَظۡمٍ‌ؕ ذٰلِكَ جَزَيۡنٰهُمۡ بِبَغۡيِهِمۡ‌ۖ وَاِنَّا لَصٰدِقُوۡنَ ﴿۱۴۶﴾

مگر جو لگی ہو پشت پر یا انتڑیوں پر یا جو چربی کہ ملی ہو ہڈی کے ساتھ، یہ ہم نے ان کو سزا دی تھی ان کی شرارت پر، اور ہم سچ کہتے ہیں

خلاصہ تفسیر: شبہ یہ ہے کہ پیچھے چند چیزوں کے علاوہ سب کو حلال کہا گیا ہے، حالانکہ بعض اہل کتاب سے معلوم ہوا ہے کہ بعض اور حیوانات بھی حرام ہیں، جواب یہ ہے کہ وہ حرمت صرف یہود کے لیے ان کی شرارت کی وجہ سے عارضی طور پر ہوئی تھی جو بعد میں منسوخ ہوگئی۔

اور یہود پر ہم نے تمام ناخن والے جانور حرام کر دیئے تھے، اور گائے اور بکری (کے اجزاء میں سے) ان دونوں کی چربیاں ان (یہود) پر ہم نے حرام کر دی تھیں مگر وہ (چربی مستثنیٰ تھی) جو ان (دونوں) کی پشت پر یا انتڑیوں میں لگی ہو، یا جو (چربی) ہڈی سے ملی ہوئی ہو (باقی سب چربی حرام تھی، سو ان چیزوں کو فی نفسہ حرام کرنا مقصود نہ تھا، بلکہ) ان کی شرارت کے سبب ہم نے ان کو یہ سزا دی تھی، اور ہم یقیناً سچے ہیں۔

قرآن کریم کے دیگر دو مقام پر اس حرمت کا بیان سبب کے ساتھ گزر چکا ہے، ایک چوتھا پارہ سورہ آل عمران آیت ۹۳: **کل الطعام کان حلا لبنی اسرائیل** اور دوسرا چھٹا پارہ سورہ نساء آیت ۱۶۰: **فبظلم من الذین هادوا** میں، ان دو مقام پر کچھ تفصیل ملاحظہ فرمایئے، اور بنی اسرائیل پر اونٹ تورات نازل ہونے سے پہلے حرام تھا، پھر بعد میں حلال ہوگیا تھا۔

وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا (الی قولہ) ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِبَغْيِهِمْ: اس میں دلالت ہے کہ دنیوی نعمتوں سے محروم رہنے میں گناہوں کا بھی دخل ہوتا ہے (نیکیوں سے جہاں خیر و برکت آتی ہے ایسے ہی گناہوں سے ناکامی و محرومی پیدا ہوتی ہے)۔

* * *

فائدہ: یعنی اصلی حرمت تو ان چیزوں میں ہے جو اوپر مذکور ہوئیں، البتہ وقتی مصلحت سے بعض چیزیں عارضی طور پر بعض اقوام پر پہلے حرام کی جا چکی ہیں، مثلاً یہود پر ان کی شرارتوں کی سزا میں ہر ناخن (کھر) والا جانور جس کی انگلیاں پھٹی نہ ہوں جیسے اونٹ، شتر مرغ، بطخ وغیرہ حرام کیا گیا تھا، نیز گائے بکری کی جو چربی پشت یا انتڑیوں پر لگی ہوئی ہو یا ہڈی کے ساتھ نہ ملی ہو ان پر حرام کر دی گئی تھی جیسے گردہ کی چربی، بنی اسرائیل کا دعویٰ غلط ہے کہ یہ چیزیں ابراہیم نوح کے زمانہ ہی سے مستمر طور پر حرام چلی آتی ہیں، سچی بات یہ کہ ان میں سے کوئی چیز عہد ابراہیمی میں حرام نہ تھی، یہود کی نافرمانیوں اور شرارتوں کی وجہ سے یہ سب چیزیں حرام ہوئیں جو کوئی اس کے خلاف دعویٰ کرے جھوٹا ہے، جیسے پارہ لَنْ تَنَالُوْا کے شروع میں قُلْ فَأْتُوْا بِالتَّوْرٰىةِ فَاتْلُوْهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (آل عمران: ۹۳) سے ان دعویٰ کرنے والوں کو چیلنج دیا گیا ہے۔

فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ رَّبُّكُمْ ذُوْ رَحْمَةٍ وَّاسِعَةٍ ۚ وَلَا يُرَدُّ بَأْسُهٗ عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۱۴۷﴾

پھر اگر تجھ کو جھٹلائیں تو کہہ دے کہ تمہارے رب کی رحمت میں بڑی وسعت ہے، اور نہیں ٹلے گا اس کا عذاب گناہ گار لوگوں سے

خلاصہ تفسیر: آگے بھی اسی مضمون کے متعلق دوسرے شبہ کا جواب ہے، وہ شبہ یہ ہے کہ اگر مشرکین کا یہ طریقہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک باطل ہے تو باوجود قدرت الٰہیہ کے ان کو سزا کیوں نہیں ہوتی؟ اس سے تو نعوذ باللہ رسول کی جانب کذب کا شبہ ہوتا ہے۔

پھر (اس مذکورہ تحقیق کے بعد بھی) اگر یہ (مشرکین) آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو (نعوذ باللہ اس مضمون میں صرف اس وجہ سے) کاذب (جھوٹا) کہیں (کہ ان پر عذاب نہیں آتا) تو آپ (جواب میں) فرما دیجئے کہ تمہارا رب بڑی وسیع رحمت والا ہے (بعض حکمتوں سے جلدی مواخذہ نہیں فرماتا) اور (اس سے یوں نہ سمجھو کہ ہمیشہ یوں ہی بچے رہیں گے جب وہ وقت معین آجائے گا پھر اس وقت) اس کا عذاب مجرم لوگوں سے (کسی طرح) نہ ٹلے گا۔

حاصل یہ ہے کہ بیشک ان کا باطل طریقے پر اسی بات کا تقاضہ کرتا ہے کہ ان پر جلدی عذاب نازل ہو، اور قدرت خداوندی سے آ بھی سکتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کی رحمت ایک خاص وقت تک اس سے مانع ہے، اس سے یوں نہ سمجھیں کہ ہمیشہ یوں ہی بچے رہیں گے، یہ تو تحقیقی جواب ہے، اور اس کا ایک الزامی جواب بھی ظاہر ہے، وہ یہ کہ اگر جلدی عذاب نہ ہونا حق ہونے کی دلیل ہے تو اس دلیل سے تو مسلمانوں کا بھی حق پر ہونا لازم آ گیا، کیونکہ وہ کونسے عذاب میں گرفتار ہیں تو اس دلیل سے لازم آتا ہے کہ ایک بات کا حق ہونا بھی صحیح ہو اور باطل ہونا بھی صحیح ہو، اور اجتماع نقیضین محال ہے، معلوم ہوا کہ یہ دلیل بے ہودہ ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی رحمت کی سمائی سے تم اب تک بچے ہو لیکن نہ جانو کہ عذاب پھر گیا، کذا فی موضح القرآن۔

سَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ ؕ كَذٰلِكَ

اب کہیں گے مشرک اگر اللہ چاہتا تو شرک نہ کرتے ہم اور نہ ہمارے باپ دادے اور نہ ہم حرام کر لیتے کوئی چیز، اسی طرح

كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ حَتّٰى ذَاقُوْا بَأْسَنَا ؕ قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا ؕ

جھٹلایا کئے ان سے اگلے یہاں تک کہ انہوں نے چکھا ہمارا عذاب، تو کہہ کچھ علم بھی ہے تمہارے پاس کہ اس کو ہمارے آگے ظاہر کرو

إِنْ تَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ أَنْتُمْ إِلَّا تَخْرُصُونَ ﴿۱۴۸﴾ قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ ۚ فَلَوْ شَاءَ

تم تو نری اٹکل پر چلتے ہو اور صرف تخمینے ہی کرتے ہو، کہہ دے بس اللہ کا الزام پورا ہے سو اگر وہ چاہتا

لَهَدٰىكُمْ أَجْمَعِينَ ﴿۱۴۹﴾

تو ہدایت کر دیتا

خلاصہ تفسیر: اب آگے اسی مضمون کے متعلق ایک تیسرے شبہ کا جواب ہے، وہ شبہ عقلی یہ ہے کہ مشرکین اپنے طریقہ کے جائز اور مستحسن ہونے پر یوں استدلال کرتے تھے کہ ہم جو کچھ شرک وتحریم وغیرہ کر رہے ہیں، اگر یہ اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہوتا تو ہم کو اپنی مرضی کے خلاف یہ کام کیوں کرنے دیتا، معلوم ہوا کہ خدا کو یہ باتیں ناپسند نہیں۔

یہ مشرکین یوں کہنے کو ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ کو (رضا اور پسند کے طور پر یہ امر) منظور ہوتا (کہ ہم شرک اور تحریم نہ کریں) تو نہ ہم شرک کرتے اور نہ ہمارے باپ دادا (شرک کرتے) اور نہ ہم (اور نہ ہمارے بزرگ) کسی چیز کو (جن کا ذکر پیچھے آچکا ہے) حرام کہہ سکتے (اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ اس شرک وتحریم سے ناراض نہیں، اللہ تعالیٰ جواب دیتے ہیں کہ یہ دلیل باطل ہے کیونکہ اس سے تو پیغمبروں کا جھوٹا ہونا لازم آتا ہے، حالانکہ رسولوں کا سچا ہونا قطعی دلائل سے ثابت ہو چکا ہے، چنانچہ یہ لوگ رسول کی تکذیب کر رہے ہیں، اور جس طرح یہ کر رہے ہیں) اسی طرح جو (کافر) لوگ ان سے پہلے ہو چکے ہیں انہوں نے بھی (رسولوں کی) تکذیب کی تھی، یہاں تک کہ انہوں نے ہمارے عذاب کا مزہ چکھا (خواہ دنیا ہی میں، جیسا کہ اکثر کفار پر دنیا میں عذاب نازل ہوا ہے، یا مرنے کے بعد وہ تو ظاہر ہی ہے، اور اس میں اس طرف بھی اشارہ ہو گیا کہ ان لوگوں سے کفریات کے مقابلہ میں صرف قولی جواب اور مناظرہ پر اکتفاء نہ کیا جائے گا، بلکہ سابقہ کفار کی طرح ان کو عملی سزا بھی دی جائے گی، خواہ دنیا میں بھی، یا صرف آخرت میں، آگے دوسرا جواب دینے کے لئے ارشاد ہے کہ:) آپ (صلی اللہ علیہ وسلم ان سے) کہئے کہ کیا تمہارے پاس (اس مقدمہ پر کہ اللہ اس شرک وتحریم سے ناراض نہیں) کوئی دلیل ہے (اگر ہے) تو اس کو ہمارے روبرو ظاہر کرو (اصل یہ ہے کہ دلیل وغیرہ کچھ بھی نہیں) تم لوگ محض خیالی باتوں پر چلتے ہو اور تم بالکل اٹکل سے باتیں کرتے ہو (اور دونوں جواب دے کر) آپ (صلی اللہ علیہ وسلم ان سے) کہئے کہ پس (دونوں جوابوں سے معلوم ہوا کہ) پوری حجت اللہ ہی کی رہی (اور تمہاری حجت باطل ہو گئی) پھر (اس کا تقاضا تو یہ تھا کہ تم سب راہ پر آجاتے، مگر اس کی توفیق خدا ہی کی طرف سے ہے) اگر وہ چاہتا تو تم سب کو راہ (راست) پر لے آتا (مگر چونکہ تم راہ پر آنا نہیں چاہتے اس لیے خدا نے بھی توفیق نہیں دی، اور اس میں حق تعالیٰ کی بہت سے حکمتیں ہیں، کسی کو توفیق دی، کسی کو نہیں دی، البتہ حق سب کے سامنے ظاہر کر دیا اور اختیار وارادہ سب کو دے دیا ہے)۔

غرض اس جگہ حق تعالیٰ نے اس شبہ کے دو جواب بیان فرمائے ہیں: پہلا جواب: كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ میں اشارتاً مذکور ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ یہ دلیل باطل ہے، کیونکہ اس سے شرک اور من گھڑت تحریم کا حق ہونا لازم آتا ہے، حالانکہ رسول ہمیشہ اس کو باطل بتلاتے رہے، اور ان کا سچا ہونا دلائل قطعیہ سے ثابت ہے، ان کا جھوٹا ہونا محال ہے، اور اس دلیل سے ان کا جھوٹا ہونا لازم آتا ہے اور جو دلیل محال کو مستلزم ہو وہ دلیل خود محال اور غلط ہے، دوسرا جواب: هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ میں آگے آتا ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ کسی کام کے کرنے پر عذاب نہ آنے کو خدا تعالیٰ کی خوشی اور رضا کی دلیل بنانا یہ خود ایک دعویٰ ہے اس پر دلیل قائم کرنی چاہیے، اگر کوئی دلیل ہو تو بیان کرو، اور اس جواب کی وضاحت الزامی طور پر اس طرح ہو سکتی ہے کہ اگر کسی کام پر عذاب کا نہ آنا اس کے حق ہونے کی دلیل ہوا کرے تو اس سے لازم آتا ہے کہ دنیا میں جس قدر کام ہو رہے ہیں سب حق ہو جائیں، حالانکہ یہ صریح اجتماع نقیضین ہے، پھر ان دونوں جوابوں کے بعد ترقی کر کے آگے آنے والی آیت میں فرمایا ہے کہ تمہارے پاس کوئی عقلی دلیل نہ ہو تو نقلی دلیل ہی لے آؤ۔

✲ ✲ ✲

فائدہ: گذشتہ رکوع میں مشرکین سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ جن حلال وطیب چیزوں کو تم نے حرام ٹھہرالیا ہے اور اس تحریم کو خدا کی طرف نسبت کرتے ہو، اس کی سند اور دلیل لاؤ، یہاں ان کی دلیل بیان کی گئی ہے جو وہ پیش کرنے والے تھے، یعنی اگر اللہ چاہتا تو اس کو قدرت تھی کہ ہم کو اور ہمارے اسلاف کو اس تحریم سے بلکہ تمام مشرکانہ افعال واقوال سے روک دیتا، جب نہ روکا اور یوں ہی ہوتا چلا آیا تو ثابت ہوا کہ اس کے نزدیک ہماری یہ کارروائیاں پسندیدہ ہیں، ناپسند ہوتیں تو ان کے کرنے میں ہم کو اب تک کیوں آزاد چھوڑتا۔

سمجھنے کی بات یہ ہے کہ ایک نیک نام اور مدبر گورنمنٹ کسی باغیانہ تحریک میں حصہ لینے والے کو باوجود یقینی اطلاع اور کافی قدرت کے پہلے ہی دن پکڑ کر پھانسی نہیں دے دیتی، وہ اس کی حرکات کی نگرانی رکھتی ہے، کبھی رویہ درست رکھنے کی ہدایت کرتی ہے اور موقع دیتی ہے کہ آدمی ایسی حرکات کا انجام سوچ کر خود سنبھل جائے، کبھی اصلاح سے مایوس ہو کر ڈھیل چھوڑتی ہے کہ اس کی بغاوت کا ایسا باضابطہ اور مکمل مواد فراہم ہو جائے جس کے بعد اس کی انتہائی مجرمانہ غداری قانونی حیثیت سے علیٰ رؤس الاشہاد ثابت کی جاسکے، ان تمام صورتوں میں مجرم کی باگ ڈھیلی چھوڑ دینے اور فوراً سزا نہ دینے سے کیا ثابت ہوگا کہ گورنمنٹ کی نظر میں وہ کارروائی جرم وبغاوت نہیں ہے، گورنمنٹ کی نگاہ میں ان افعال کا جرم ہونا مہلت پوری ہونے پر عدالت کے کٹہرے میں لایا جائے گا اور باضابطہ اثبات واظہار جرم کے بعد پھانسی یا حبس دوام کی سزا بھگتے گا، تب برأی العین مشاہدہ ہو جائے گا کہ گورنمنٹ کی نظر میں یہ کتنا بڑا جرم ہے، بہرحال گورنمنٹ کا کسی جرم پر باوجود علم وقدرت رکھنے کے کسی مصلحت سے فوری سزا جاری نہ کرنا اس کی دلیل نہیں کہ وہ جرم کو جرم نہیں سمجھتی، اسی پر قیاس کر لیجئے کہ وہ احکم الحاکمین ابتدائے آفرینش سے آج تک بتوسط اپنے صادق القول اور پاکباز نائبین کے ہر قسم کے قوانین واحکام سے بندوں کو مطلع فرماتا رہا اور کھول کھول کر بتلا دیا کہ کونسی بات اس کے یہاں پسندیدہ اور کونسی ناپسند ہے کبھی پے در پے اور کبھی تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد ان احکام وہدایات کی یاد دہانی بھی ہوتی رہی، اس دوران میں خلاف ورزی کرنے والوں سے مسامحت کی حد تک مسامحت کی گئی، معمولی تنبیہات کی ضرورت ہوئی تو وقتاً فوقتاً انہیں بھی کام میں لایا گیا، اور جن کی شقاوت کا پیمانہ لبریز ہونے والا تھا انہیں ڈھیل دی گئی کہ وہ صاف اور اعلانیہ طور پر اپنے کو خدا کی انتہائی سزا کا مستحق ٹھہرا کر کیفر کردار کو پہنچیں، چنانچہ بہت سی قومیں اپنے جرائم کی پاداش کا دنیا میں تھوڑا تھوڑا مزا چکھ چکی ہیں، پھر ان حالات کی موجودگی میں کسی قوم کے چندروز جرائم میں مبتلا رہنے اور فوراً نہ پکڑے جانے سے کیسے استدلال کیا جاسکتا ہے کہ وہ جرائم (معاذ اللہ) خدا کے نزدیک پسندیدہ ہیں ورنہ خدا انہیں ایک گھنٹہ کی بھی مہلت نہ دیتا۔

رہا یہ سوال کہ خدا نے انسان کی ساخت ہی ابتداء سے ایسی کیوں نہ بنادی کہ وہ برائی کی طرف قطعاً نہ جاسکتا اور اس طرح فطرۃً اسے مجبور کر دیا جاتا کہ نیکی اور بھلائی کے سوا کوئی چیز اختیار نہ کرسکے؟ اگر غور کیا جائے تو اس سوال کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو ایسا کیوں نہ پیدا کر دیا گیا کہ وہ انسان ہی نہ رہتا، یا تو اینٹ پتھر بن جاتا جو ادراک وشعور اور کسب واختیار سے یکسر خالی ہو یا گدھے گھوڑے وغیرہ جانوروں کی طرح جزئی احساس و ارادہ رکھنے والا حیوان ہوتا جو ازل سے ابد تک اپنے مخصوص ومتشابہ افعال واحوال کے محدود دائرہ میں چکر لگاتا رہے اور یا بہت عزت دی جاتی تو فرشتوں کی صفوں میں بٹھلا دیا جاتا جو محض طاعت وعبادت کے اختیار کرنے پر مجبول ومفطور ہیں۔

الحاصل یہ کلی ادراکات اور عظیم الشان کسبی تصرفات رکھنے والی ترقی کن نوع ہی صفحہ ہستی پر نہ لائی جاتی، میں سمجھتا ہوں کہ کوئی انسان اپنے شرف وکرامت کا بلند بانگ دعویٰ رکھتے ہوئے ایسی جرأت نہ کرے گا کہ سرے سے اپنی نوع کے وجود ہی کا مخالف ہو جائے، پھر اگر نوع انسانی کا مع اس کی عقلی و عملی قوتوں اور کسب واختیار کی موجودہ آزادی کے پیدا کرنا نظام عالم کی تکمیل کے لئے ضروری تھا تو اس نظام تکوینی کے آثار ونتائج کا قبول کرنا بھی ضروری ہے، یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ مادی اور معاشی زندگی کے شعبوں میں تو انسانوں کی عقلی وکسبی آزادی کی بدولت بیشمار انواع واقسام کے مختلف مظاہر سامنے آئیں، لیکن معادی وروحانی میدانوں میں وہ ہی دل ودماغ اور کسب واختیار کی قوتیں رکھنے والے انسان سب کے سب ایک ہی پگڈنڈی پر چلنے کے لئے مجبور ہو جائیں اور کوئی ایک قدم ادھر ادھر ہٹانے کی قدرت نہ رکھے، پس اگر نوع انسان کا بحقیقۃ الموجودہ مجموعہ عالم میں پایا جانا ضروری ہے تو نیک وبد کا اختلاف بھی لابدی ہوگا اور یہ ہی اختلاف کا وجود بڑی دلیل اس کی ہے کہ ہر وہ فعل جو وقوع میں آئے ضروری نہیں کہ خدا کے نزدیک پسندیدہ ہو ورنہ مختلف ومتضاد افعال کی موجودگی میں ماننا پڑے گا کہ مثلاً خوش اخلاقی بھی خدا کو پسند ہو اور بداخلاقی بھی، ایمان لانا بھی پسند ہو اور نہ لانا بھی، جو صریحاً باطل ہے، بیشک خدا

اگر چاہتا تو انسان کی ساخت ایسی بنا سکتا تھا کہ سب ایک ہی راستہ پر چلنے کے لیے مجبور ہو جاتے، لیکن جب ایسا واقعہ نہیں ہوا تو یہی حجت بالغہ اور پورا الزام ان لوگوں پر ہے جو لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا کہہ کر مشیت و رضائے الٰہی میں تلازم ثابت کرنا چاہتے ہیں کیونکہ اس قدر شدید اختلافات کی موجودگی میں ان کے اصول کے موافق کہنا پڑے گا کہ مثلاً توحید خالص بھی اللہ کے نزدیک صحیح اور مرضی ہو اور اس کی نقیض شرک جلی بھی، وقس علیٰ ہذا۔

ان دلائل سے ثابت ہوا کہ مشرکین کا یہ استدلال لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا الخ محض لغو اور پادر ہوا ہے، کوئی علمی اصول ان کے پاس نہیں جسے عقلمندوں کے سامنے پیش کر سکیں، محض اٹکل کے تیر اور تخمینی باتیں ہیں جن کو خدا کی حجت بالغہ بکلی رد کرتی ہے، جس کی طرف فَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ میں اشارہ فرمایا ہے، یعنی انسان کی فطرت ایسی نہیں بنائی گئی کہ سب کے سب راہ ہدایت پر چل پڑیں، اس کو کسب واختیار کی وہ آزادی حق جل وعلا نے عطا فرمائی ہے جس کا عطا کیا جانا کسی مخلوق کے لئے ممکن تھا، اس لئے لازم ہے کہ اس آزادی کے استعمال کے وقت راہیں مختلف ہو جائیں کوئی نیکی کو اختیار کرلے کوئی بدی کو، کوئی حق تعالیٰ کی رضاء ورحمت کا مظہر بن جائے کوئی غضب کا، اس طرح وہ آخری مقصد جو خالق کائنات نے آفرینش عالم سے ارادہ کیا ہے یعنی اپنی صفات جمال وجلال کا اظہار علی الوجہ الاتم پورا ہو لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (الملک: ۲) ورنہ اگر تمام عالم ایک ہی حال پر فرض کر لیا جائے تو بعض صفات الٰہیہ کا ظہور ممکن ہوگا، اور دوسری بعض کے ظہور کے لئے کوئی محل نہ ملے گا۔

یہاں تک کہ جو کچھ ہم نے کہا وہ اس تقدیر پر تھا کہ مشرکین کے قول لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا سے یہ غرض ہو کہ وہ اپنے خرافات وکفریات کا استحسان ثابت کرنا چاہتے تھے جیسا کہ ان کے احوال سے ظاہر ہے اور اگر کلام مذکور سے ان کی غرض صرف معذرت ہو کہ جو کچھ خدا چاہتا ہے وہ ہم سے کراتا ہے، اچھا ہو یا برا، بہرحال اس کی مشیت سے ہے، پھر مشیت الٰہی کے مقابلہ میں انبیاء ورسل ہم سے کیوں مزاحمت کرتے ہیں اور عذاب الٰہی کا ڈراوا کیوں سناتے ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ جس خدا کی مشیت سے تم ان افعال شنیعہ کا کسب کرتے ہو، اسی کی مشیت سے انبیاء ورسل تمہاری مزاحمت کرتے ہیں اور وہ ہی مشیت تمہارے کسب پر مناسب عذاب بھیجتی ہے، جس طرح قدرت نے سانپ کو پیدا کیا اور وہ ہی مار گزیدہ کے حق میں ہلاکت کا اثر مرتب کرتی ہے خواہ سانپ کے کاٹنے میں مار گزیدہ کے فعل واختیار کو کچھ دخل ہو یا نہ ہو، اسی طرح تمہارے شرک وکفر میں ہلاکت دائمی کی، اور ایمان و عمل صالح میں نجات ابدی کی تاثیرات رکھ دینا بھی اسی قدرت ومشیت ایزدی کا کام ہے جس سے تمام سلسلہ اسباب ومسببات کی تخلیق ہوئی ہے، پس اگر تم اپنے مشرکانہ اطوار سے باز نہ آنے میں مشیت کے عموم سے احتجاج کر سکتے ہو تو ارسال رسل اور انزال عذاب وغیرہ امور کو بھی اسی مشیت کی کارفرمائی کا نتیجہ سمجھ کر خدا کی حجت بالغہ کو تمام سمجھو، بیشک خدا چاہتا تو تم سب کو راہ راست پر لگا دیتا لیکن اس نے تمہاری سوء استعداد کی وجہ سے ایسا نہیں چاہا، آخر تمہارے سوء اختیار سے جو افعال صادر ہوئے ان کا طبعی اثر عذاب کی صورت میں مرتب ہو کر رہا، والعیاذ باللہ۔

قُلْ هَلُمَّ شُهَدَآءَكُمُ الَّذِيْنَ يَشْهَدُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ هٰذَا ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَلَا تَشْهَدْ مَعَهُمْ ۚ

تم سب کو تو کہہ کہ لاؤ اپنے گواہ جو گواہی دیں اس بات کی کہ اللہ نے حرام کیا ہے ان چیزوں کو، پھر اگر وہ ایسی گواہی دیں بھی تو تو نہ اعتبار کر ان کا

وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَهُمْ بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ ﴿۱۵۰﴾ ع

اور نہ چل ان کی خوشی پر جنہوں نے جھٹلایا ہمارے حکموں کو اور جو یقین نہیں کرتے آخرت کا اور وہ اپنے رب کے برابر کرتے ہیں اوروں کو

خلاصہ تفسیر: (اب دلیل نقلی کے مطالبہ کے لئے ارشاد فرماتے ہیں کہ:) آپ (صلی اللہ علیہ وسلم ان سے) کہئے کہ (اپنی دلیل عقلی کا حال تو تم کو معلوم ہو گیا، اچھا اب کوئی صحیح دلیل نقلی پیش کرو مثلاً) اپنے گواہوں کو لاؤ جو اس بات پر (باقاعدہ) شہادت دیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان (مذکورہ) چیزوں کو حرام کر دیا ہے (باقاعدہ شہادت وہ ہے جو مشاہدہ پر مبنی ہو، یا ایسی قطعی دلیل جس سے مشاہدہ کے برابر یقین حاصل ہو جائے جیسا کہ آیت: اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ وَصّٰكُمْ میں ایسی ہی دلیل کی طرف اشارہ ہے) پھر اگر (اتفاق سے کسی کو فرضی جھوٹے گواہ بنا کر لے آئیں اور) وہ (گواہ اس کی) گواہی (بھی) دیدیں تو (چونکہ وہ شہادت یقیناً بے قاعدہ اور محض سخن سازی ہوگی، کیونکہ نہ ان کو مشاہدہ ہوا ہے، نہ مشاہدہ کے برابر یقین اس لیے)

آپ اس شہادت کی سماعت نہ فرمائیے، اور (جب ان کا مکذب ہونا ثابت ہوگیا تو اے مخاطب!) ایسے لوگوں کے باطل خیالات کا (جن کا باطل ہونا ابھی ثابت ہو چکا) اتباع مت کرنا جو ہماری آیتوں کی تکذیب کرتے ہیں اور جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے (اور اسی سبب سے نڈر ہو کر حق کی تلاش نہیں کرتے) اور وہ (مستحق معبود ہونے میں) اپنے رب کے برابر دوسروں کو شریک ٹھہراتے ہیں (یعنی شرک کرتے ہیں)۔

* * *

فائدہ: یعنی دلیل عقلی کا حال تو اوپر معلوم ہو چکا، اب اگر اس من گھڑت تحریم پر کوئی نقلی دلیل رکھتے ہو تو وہ لاؤ، کیا تمہارے پاس ایسے گواہ موجود ہیں جو یہ بیان کریں کہ ہاں ان کے روبرو اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کو حرام ٹھہرایا تھا؟ ظاہر ہے کہ ایسے واقعی گواہ کہاں دستیاب ہو سکتے ہیں، اگر دو چار گستاخ جھوٹے بے حیا یہ ہی گواہی دینے کو کھڑے ہو جائیں تو ایسوں کی بات پر تم کان نہ دھرو اور نہ ان کی خواہشات کی پروا کرو، یہاں تک ان چیزوں کا بیان تھا جنہیں مشرکین نے محض اپنی رائے وہوا سے حرام ٹھہرا رکھا تھا، پھر اس تحریم کے لئے حیلے اور باطل عذر پیش کرتے تھے۔

ربط: اب آگے وہ چیزیں بیان کی جاتی ہیں جنہیں خدا نے حرام کیا اور ہمیشہ سے حرام رہی ہیں لیکن یہ مشرکین ان میں مبتلا ہیں:

قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۚ

کہہ تم آؤ میں سنا دوں جو حرام کیا ہے تم پر تمہارے رب نے کہ شریک نہ کرو اس کے ساتھ کسی چیز کو اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ ۚ وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ

اور مار نہ ڈالو اپنی اولاد کو مفلسی سے، ہم رزق دیتے ہیں تم کو اور ان کو [1] اور پاس نہ جاؤ بے حیائی کے کام کے جو ظاہر ہو

مِنْهَا وَمَا بَطَنَ ۚ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ۭ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ

اس میں سے اور جو پوشیدہ ہو [2] اور مار نہ ڈالو اس جان کو جس کو حرام کیا ہے اللہ نے مگر حق پر [3] تم کو یہ حکم کیا ہے

لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۵۱﴾

تاکہ تم سمجھو [4]

خلاصہ تفسیر: گذشتہ آیات سے میں مسلسل یہ مضمون بیان ہو رہا ہے کہ جاہل انسان نے زمین و آسمان کی ساری چیزوں کے پیدا کرنے والے احکم الحاکمین کا نازل کیا ہوا قانون چھوڑ کر آبائی اور من گھڑت رسموں کو اپنا دین بنا لیا، جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے حرام کیا تھا ان کو جائز سمجھ کر استعمال کرنے لگے، اور بہت سی چیزیں جن کو اللہ تعالیٰ نے حلال قرار دیا تھا ان کو اپنے اوپر حرام کر لیا، اب یہاں سے آگے ان واقعی حرام چیزوں کو بتلایا جاتا ہے جن میں یہ مشرکین مبتلا تھے، یعنی جو امور واقع میں حرام ہیں ان میں تو مبتلا ہیں، اور جو اشیا واقع میں حلال تھیں ان میں اپنی طرف سے حرمت گھڑ لی ہے، اس طرز سے گفتگو کرنا "خطاب علی اسلوب الحکیم" کہلاتا ہے۔

آپ (صلی اللہ علیہ وسلم ان سے) کہئے کہ آؤ میں تم کو وہ چیزیں پڑھ کر سناؤں جن کو تمہارے رب نے تم پر حرام فرمایا ہے، وہ (چیزیں یہ ہیں: ① ایک) یہ کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی چیز کو شریک مت ٹھہراؤ (پس شریک ٹھہرانا حرام ہوا) اور (② دوسرے یہ کہ) ماں باپ کے ساتھ احسان کیا کرو (پس ان سے بری طرح رہنا حرام ہوا) اور (③ تیسرے یہ کہ) اپنی اولاد کو افلاس کے سبب (جیسا کہ جاہلیت میں ان کی عادت تھی) قتل مت کیا کرو (کیونکہ) ہم تم کو اور ان کو (دونوں کو) رزق (مقدر) دیں گے (وہ تمہاری قسمت کی روزی میں شریک نہیں ہیں، پھر کیوں قتل کرتے ہو، پس ان کا قتل کرنا بالکل حرام ہوا) اور (④ چوتھے یہ کہ) بے حیائی (یعنی بدکاری) کے جتنے طریقے ہیں ان کے پاس بھی مت جاؤ (پس زنا کرنا حرام ہوا) خواہ وہ علانیہ

ہوں اور خواہ پوشیدہ ہوں (وہ طریقے یہی ہیں) اور (۵ پانچویں یہ کہ) جس کا خون کرنا اللہ تعالیٰ نے حرام کر دیا ہے اس کو قتل مت کرو، ہاں مگر حق (شرعی) پر (قتل جائز ہے مثلاً قصاص یا رجم میں، پس قتل ناحق بالکل حرام ہوا) اس (سب) کا تم کو (اللہ تعالیٰ نے) تاکیدی حکم دیا ہے تا کہ تم (ان کو) سمجھو (اور سمجھ کر عمل کرو)۔

* * *

فائدہ: لے **نَحۡنُ نَرۡزُقُكُمۡ وَإِيَّاهُمۡ**: عرب مفلسی کی وجہ سے بعض اوقات اولاد کو قتل کر دیتے تھے کہ خود ہی کھانے کو نہیں اولاد کو کہاں سے کھلائیں، اسی لئے فرمایا کہ رزق دینے والا تو خدا ہے تم کو بھی اور تمہاری اولاد کو بھی، دوسری جگہ بجائے مِنۡ إِمۡلَاقٍ، خَشۡيَةَ إِمۡلَاقٍ فرمایا ہے یعنی مفلسی کے ڈر سے قتل کر ڈالتے تھے، یہاں ان کا ذکر ہوگا جو فی الحال مفلس نہیں مگر ڈرتے ہیں کہ جب عیال زیادہ ہونگے تو کہاں سے کھلائیں گے، چونکہ پہلے طبقہ کو عیال سے پہلے اپنی روٹی کی فکر ستا رہی تھی اور دوسرے کو زیادہ عیال کی فکر نے پریشان کر رکھا تھا، شاید اسی لئے یہاں من املاق کے ساتھ نَرۡزُقُكُمۡ وَإِيَّاهُمۡ اور اس آیت میں خَشۡيَةَ إِمۡلَاقٍ کے ساتھ نَرۡزُقُهُمۡ وَإِيَّاكُمۡ ارشاد فرمایا، واللہ اعلم۔

فائدہ: ۲ **وَلَا تَقۡرَبُوا الۡفَوَاحِشَ**: ''پاس نہ جاؤ'' سے شاید یہ مراد ہو کہ ایسے کاموں کے مبادی و وسائل سے بھی بچنا چاہئے، مثلاً زنا کی طرح نظر بد سے بھی اجتناب لازم ہے۔

فائدہ: ۳ **إِلَّا بِالۡحَقِّ**: کا استثناء ضروری تھا جس میں قاتل عمد، زانی محصن اور مرتد عن الاسلام کا قتل داخل ہے جیسا کہ احادیث صحیحہ میں اس کی تصریح وارد ہو چکی اور ائمہ مجتہدین اس پر اجماع کر چکے ہیں۔

فائدہ: ۴ **ذَٰلِكُمۡ وَصَّىٰكُمۡ بِهِۦ لَعَلَّكُمۡ تَعۡقِلُونَ**: اس آیت سے ان چیزوں کا حرام ہونا ثابت ہوا: ① شرک باللہ ② والدین کے ساتھ بدسلوکی ③ قتل اولاد ④ سب بے حیائی کے کام مثلاً زنا وغیرہ ⑤ کسی شخص کو ناحق قتل کرنا۔

وَلَا تَقۡرَبُوا مَالَ الۡيَتِيمِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحۡسَنُ حَتَّىٰ يَبۡلُغَ أَشُدَّهُۥ ۖ وَأَوۡفُوا الۡكَيۡلَ وَالۡمِيزَانَ

اور پاس نہ جاؤ یتیم کے مال کے مگر اس طرح سے کہ بہتر ہو یہاں تک کہ پہنچ جاوے اپنی جوانی کو ۱ اور پورا کرو ناپ اور تول کو

بِالۡقِسۡطِ ۖ لَا نُكَلِّفُ نَفۡسًا إِلَّا وُسۡعَهَا ۖ وَإِذَا قُلۡتُمۡ فَاعۡدِلُوا وَلَوۡ كَانَ ذَا قُرۡبَىٰ ۖ

انصاف سے، ہم کسی کے ذمہ وہی چیز لازم کرتے ہیں جس کی اس کو طاقت ہو ۲ اور جب بات کہو تو حق کی کہو اگرچہ وہ اپنا قریب ہی ہو ۳

وَبِعَهۡدِ اللَّهِ أَوۡفُوا ۚ ذَٰلِكُمۡ وَصَّىٰكُمۡ بِهِۦ لَعَلَّكُمۡ تَذَكَّرُونَ ﴿١٥٢﴾

اور اللہ کا عہد پورا کرو ۴ تم کو یہ حکم کر دیا ہے تا کہ تم نصیحت پکڑو

خلاصہ تفسیر: اور (۶ چھٹے یہ کہ) یتیم کے مال کے پاس نہ جاؤ (یعنی اس میں تصرف مت کرو) مگر ایسے طریقہ سے (تصرف کی اجازت ہے) جو کہ (شرعاً پسندیدہ اور) مستحسن ہے (مثلاً اس کے مال کو اسی کے کام میں لگانا، اس کی حفاظت کرنا، اور بعض اولیاء کو یتیم کے لئے اس میں تجارت کرنے کی بھی اجازت ہے جیسے دادا کو، قاضی کو یا باپ دادا کے وصی کو) یہاں تک کہ وہ اپنے سن بلوغ کو پہنچ جائے (اس وقت تک مذکورہ تصرفات کی بھی اجازت ہے، اور پھر اس کا مال اس کو دے دیا جائے گا بشرطیکہ بے وقوف اور بھولا نہ ہو، غرض یتیم کے مال میں ناجائز تصرف حرام ہے) اور (۷ ساتویں یہ کہ) ناپ اور تول پوری پوری کیا کرو انصاف کے ساتھ (کہ کسی کا حق اپنے پاس نہ رہے، اور نہ آئے، پس اس میں دغا کرنا حرام ہوا، اور یہ احکام کچھ دشوار نہیں، کیونکہ) ہم (تو) کسی شخص کو اس کے امکان سے زیادہ (احکام کی) تکلیف (بھی) نہیں دیتے (پھر ان احکام میں کوتاہی کیوں کی جائے) اور (۸ آٹھویں یہ کہ) جب تم (فیصلہ یا شہادت وغیرہ کے متعلق کوئی) بات کیا کرو تو (اس میں) انصاف (کا خیال) رکھا کرو، گو وہ

شخص (جس کے مقابلہ میں وہ بات کہہ رہے ہو تمہارا) قرابت دار ہی ہو (پس خلاف عدل حرام ہوا) اور (۹ نویں یہ کہ) اللہ تعالیٰ سے جو عہد کیا کرو (جیسے قسم یا ایسی نذر جو کہ جائز اور مشروع ہو) اس کو پورا کیا کرو (پس اس جائز قسم یا نذر کا پورا نہ کرنا حرام ہوا) ان (سب) کا اللہ تعالیٰ نے تم کو تاکیدی حکم دیا ہے تاکہ تم یاد رکھو (اور عمل کرو)۔

❊ ❊ ❊

فائدہ: ۱ھِیَ اَحۡسَنُ حَتّٰی یَبۡلُغَ اَشُدَّہٗ: یتیم کے مال میں بیجا تصرف کرنا حرام ہے۔ ہاں بہتر و مشروع طریقہ سے احتیاط کے ساتھ اس میں ولی یتیم تصرف کرسکتا ہے۔ جب یتیم جوان ہوجائے اور اپنے فرائض کو سنبھال سکے تو اس کے حوالہ کردیا جائے۔

فائدہ: ۲لَا نُکَلِّفُ نَفۡسًا اِلَّا وُسۡعَہَا: یعنی اپنی طاقت کے موافق ان احکام کی بجا آوری میں کوشش کرو اسی کے تم مکلف ہو۔ خدا کسی کو اس کی قدرت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔

فائدہ: ۳اِذَا قُلۡتُمۡ فَاعۡدِلُوۡا وَلَوۡ کَانَ ذَا قُرۡبٰی: یعنی حق و انصاف کی بات کہنے میں کسی کی قرابت و محبت مانع نہ ہونی چاہئے۔

فائدہ: ۴وَبِعَہۡدِ اللّٰہِ اَوۡفُوۡا: اس کے اوامر و نواہی پر پابندی سے عمل کرو، خدا کے لئے جو نذر مانو یا قسم کھاؤ بشرطیکہ غیر مشروع بات کی نہ ہو اُسے پورا کرنا چاہئے۔

وَاَنَّ ہٰذَا صِرَاطِیۡ مُسۡتَقِیۡمًا فَاتَّبِعُوۡہُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِکُمۡ عَنۡ سَبِیۡلِہٖ ؕ

اور حکم کیا کہ یہ راہ ہے میری سیدھی سو اس پر چلو، اور مت چلو اور راستوں پر کہ وہ تم کو جدا کردیں گے اللہ کے راستہ سے ۱

ذٰلِکُمۡ وَصّٰکُمۡ بِہٖ لَعَلَّکُمۡ تَتَّقُوۡنَ ﴿۱۵۳﴾

یہ حکم کردیا ہے تم کو تاکہ تم بچتے رہو

خلاصہ تفسیر: اور یہ (بھی کہہ دیجئے) کہ (کچھ انھیں احکام کی تخصیص نہیں، بلکہ) یہ دین (اسلام اور اس کے تمام احکام) میرا رستہ ہے (جس کی طرف میں باذن الٰہی دعوت دیتا ہوں) جو کہ (بالکل) مستقیم (اور سیدھا) ہے، سو اس راہ پر چلو اور دوسری راہوں پر مت چلو کہ وہ راہیں تم کو اللہ کی راہ سے (جن کی طرف میں دعوت کرتا ہوں) جدا (اور دور) کردیں گی، اس کا تم کو اللہ تعالیٰ نے تاکیدی حکم دیا ہے، تاکہ تم (اس راہ کے خلاف کرنے سے) احتیاط رکھو۔

❊ ❊ ❊

فائدہ: ۱یعنی احکام مذکورہ بالا کی پابندی اور خدا کے عہد کو اعتقاداً پورا کرنا یہ ہی صراط مستقیم (سیدھی راہ) ہے جس کی طلب سورۃ فاتحہ میں تلقین کی گئی تھی، یہ راہ تم کو دکھلا دی گئی اب چلنا تمہارا کام ہے، جو کوئی اس کے سوا دوسرے راستہ پر چلا وہ خدا کے راستہ سے بھٹکا۔

ثُمَّ اٰتَیۡنَا مُوۡسَی الۡکِتٰبَ تَمَامًا عَلَی الَّذِیۡۤ اَحۡسَنَ وَتَفۡصِیۡلًا لِّکُلِّ شَیۡءٍ وَّہُدًی وَّرَحۡمَۃً

پھر دی ہم نے موسیٰ کو کتاب واسطے پورا کرنے نعمت کے نیک کام والوں پر اور واسطے تفصیل ہر شے کے اور ہدایت اور رحمت کے

لَّعَلَّہُمۡ بِلِقَآءِ رَبِّہِمۡ یُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۱۵۴﴾ؑ

تاکہ وہ لوگ اپنے رب کے ملنے کا یقین کریں

خلاصہ تفسیر: اب مسئلہ نبوت پر بحث ہے کہ نبوت کوئی عجیب و غریب چیز نہیں ہے، پہلے اور انبیاء ہوئے جن میں موسیٰ علیہ السلام مشہور و معروف ہیں، اخیر میں آپ ﷺ صاحب وحی ہوگئے، اس کا انکار کیوں کیا جاتا ہے۔

پھر (شرک کو باطل کرنے کے بعد ہم مسئلہ نبوت میں کلام کرتے ہیں کہ ہم نے صرف آپ ﷺ کو اکیلا نبی نہیں بنایا، جس پر یہ لوگ اس قدر شور وغل مچا رہے ہیں، بلکہ آپ ﷺ سے قبل) ہم نے موسیٰ کو (پیغمبر بنا کر) کتاب (تورات) دی تھی، جس سے اچھی طرح عمل کرنے والوں پر (ہماری) نعمت پوری ہو (کہ عمل کر کے ثواب کامل حاصل کریں) اور سب (ضروری) احکام کی (اس کے ذریعہ سے) تفصیل ہو جائے اور (اس کے ذریعہ سے سب کو) رہنمائی ہو اور (ماننے والوں کے لیے سبب) رحمت ہو (ہم نے اس صفت کی کتاب اس لئے دی) تاکہ وہ لوگ (یعنی بنی اسرائیل) اپنے رب کے ملنے پر یقین لائیں (اور ملنے کے اعتقاد سے سب احکام کو بجا لائیں)۔

* * *

فائدہ: معلوم ہوتا ہے کہ جو احکام اوپر قُلۡ تَعَالَوۡا اَتۡلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمۡ عَلَيۡكُمۡ (الانعام:۱۵۱) سے پڑھ کر سنائے گئے، یہ ہمیشہ سے جاری تھے، تمام انبیاء اور شرائع کا ان پر اتفاق رہا کیا، بعدہ، حق تعالیٰ نے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) پر تورات اتاری جس میں احکام شرع کی مزید تفصیل درج تھی، تورات عطا فرما کر اس زمانہ کے نیک کام کرنے والوں پر خدا نے اپنی نعمت پوری کر دی، ہر ضروری چیز کو شرح و بسط سے بیان فرمادیا اور ہدایت و رحمت کے ابواب مفتوح کر دیے تاکہ اسے سمجھ کر لوگ اپنے پروردگار سے ملنے کا کامل یقین حاصل کریں۔

وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنۡزَلۡنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوۡهُ وَاتَّقُوۡا لَعَلَّكُمۡ تُرۡحَمُوۡنَ ﴿۱۵۵﴾

اور ایک یہ کتاب ہے کہ ہم نے اتاری برکت والی سو اس پر چلو اور ڈرتے رہو تاکہ تم پر رحمت ہو

خلاصہ تفسیر: اور (جب تورات کا اور اس کے تتمہ انجیل کا دور ختم ہو چکا اس کے بعد) یہ (قرآن) ایک کتاب ہے جس کو ہم نے (آپ کے پاس) بھیجا بڑی خیر و برکت والی، سو (اب) اس کا اتباع کرو، اور (اس کی مخالفت کرنے کے بارے میں خدا سے) ڈرو تاکہ تم پر (اللہ تعالیٰ کی) رحمت ہو۔

* * *

فائدہ: یعنی تورات تو تھی ہی جیسی کچھ تھی، لیکن ایک یہ کتاب ہے (قرآن کریم) جو اپنے درخشاں اور ظاہر و باہر حسن و جمال کے ساتھ تمہارے سامنے ہے اس کی خوبصورتی اور کمال کا کیا کہنا۔ آفتاب آمد دلیل آفتاب۔ اس کی ظاہری و باطنی برکات اور صوری و معنی کمالات کو دیکھ کر بے اختیار کہنا پڑتا ہے:

بہار عالم حسنش دل وجاں تازہ میدارد — برنگ اصحاب صورت را، بہ بو ارباب معنی را

اب دائیں بائیں دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ اگر خدا کی رحمت سے حظ وافر لینا چاہتے ہو تو اس آخری اور مکمل کتاب پر چل پڑو اور خدا سے ڈرتے رہو کہ اس کتاب کے کسی حصہ کی خلاف ورزی ہونے نہ پائے۔

اَنۡ تَقُوۡلُوۡۤا اِنَّمَاۤ اُنۡزِلَ الۡكِتٰبُ عَلٰى طَآئِفَتَيۡنِ مِنۡ قَبۡلِنَا ۪ وَاِنۡ كُنَّا عَنۡ دِرَاسَتِهِمۡ لَغٰفِلِيۡنَ ﴿۱۵۶﴾

اس واسطے کہ کبھی تم کہنے لگو کہ کتاب جو اتری تھی سو ان ہی فرقوں پر جو ہم سے پہلے تھے، اور ہم کو تو ان کے پڑھنے پڑھانے کی خبر نہ تھی

خلاصہ تفسیر: (اب قرآن کے نازل کرنے کی وجہ بتلاتے ہیں کہ ہم نے یہ قرآن اس لئے بھی نازل کیا کہ) کبھی تم لوگ (اگر یہ قرآن نازل نہ ہوتا اور اس صورت میں تم کو اپنے کفر و شرک پر قیامت کے دن عذاب ہوتا تو) یوں کہنے لگتے کہ (آسمانی) کتاب تو صرف ہم سے پہلے جو دو فرقے (یہودی و عیسائی) تھے ان پر نازل ہوئی تھی اور ہم ان کے پڑھنے پڑھانے سے بے خبر تھے (اس لئے ہم کو توحید کی تحقیق نہ ہوئی)۔

وَاِنۡ كُنَّا عَنۡ دِرَاسَتِهِمۡ لَغٰفِلِيۡنَ: غفلت اور بے خبری کی وجہ یہ نہیں کہ تورات و انجیل عربی زبان میں نہ تھی، کیونکہ ترجمہ کے ذریعہ سے مضامین کی اطلاع ممکن ہے، بلکہ بے خبری کی وجہ یہ ہے کہ اہل کتاب نے اہل عرب کی تعلیم و توحید کا کبھی اہتمام نہیں کیا، اور اتفاقاً کان میں کسی مضمون کا

پڑ جانا عادتاً تنبیہ میں کم مؤثر ہوتا ہے، اگر چہ اس قدر تنبیہ پر بھی طلب اور تامل واجب ہو جاتا ہے، اور اسی بناء پر توحید کے چھوڑنے پر عذاب ممکن تھا، اور اس سے حضرت موسیٰ وعیسیٰ علیہما السلام کی نبوت کے عام ہونے کا اشکال لازم نہیں آتا، کیونکہ نبوت عام ہونے کا مطلب یہ ہے کہ تمام اصول وفروع میں اتباع واجب ہو، ایسی عام نبوت صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے لیے خاص ہے، اور اصول میں تو تمام انبیاء کا اتباع ساری مخلوق پر واجب ہے، اس بنا پر عذاب صحیح ہوتا، لیکن یہ عذر ظاہر نظر میں پیش کیا جاسکتا تھا، اب اس کی بھی گنجائش باقی نہ رہی اور اللہ کی حجت تام ہوگئی۔

***

فائدہ: یعنی اس مبارک کتاب (قرآن کریم) کے نزول کے بعد عرب کے امیین کے لئے یہ کہنے کا بھی موقع نہیں چھوڑا گیا کہ پیشتر جو آسمانی کتابیں شرائع الٰہیہ کو لے کر اتریں وہ تو ہمارے علم کے موافق انہی دو فرقوں (یہود ونصاریٰ) پر اتریں بیشک وہ لوگ آپس میں اسے پڑھتے پڑھاتے تھے اور بعضے اس کا ترجمہ بھی عربی میں کرتے تھے مثلاً ورقہ بن نوفل وغیرہ اور بہت سے مدت تک اس دھن میں لگے رہے کہ عرب کو یہودی یا نصرانی بنالیں لیکن ہمیں ان کی تعلیم وتدریس سے کوئی سروکار نہیں رہا۔

اس سے بحث نہیں کہ یہود ونصاریٰ جو کچھ پڑھتے پڑھاتے تھے وہ چیز کہاں تک اپنی اصلی سماوی صورت میں محفوظ تھی، مطلب صرف اس قدر ہے کہ ان شرائع وکتب کی اصلی مخاطب فقط قوم بنی اسرائیل تھی، خواہ اس تعلیم کے بعض اجزاء مثلاً توحید اور اصول دینیہ کی دعوت کو وسعت دے کر بنی اسرائیل کے سوا دوسری اقوام کے حق میں بھی عام کر دیا گیا ہوتا ہم جو شریعت اور کتاب سماوی بہیئت مجموعی کسی خاص قوم پر اسی کے مخصوص فائدہ کے لئے اتری ہو اس کے درس وتدریس سے اگر دوسری اقوام خصوصاً عرب جیسی غیور وخوددار قوم کو دلچسپی اور لگاؤ نہ ہو تو کچھ مستبعد نہیں، بنابریں وہ کہہ سکتے تھے کہ کوئی آسمانی کتاب وشریعت ہماری طرف نہیں آئی اور جو کسی مخصوص قوم کے لئے آئی اس سے ہم نے چنداں واسطہ نہیں رکھا پھر ہم ترک شرائع پر کیوں ماخوذ ہوں گے، مگر آج ان کے لئے اس طرح کے حیلے حوالوں کا موقع نہیں رہا، خدا کی حجت اس کی روشن کتاب اور ہدایت ورحمت عامہ کی بارش خاص ان کے گھر میں اتاری گئی، تاکہ وہ اولاً اس سے مستفید ہوں، پھر اس امانت الٰہیہ کو تمام احمر واسود اور مشرق ومغرب کے باشندوں تک حفاظت واحتیاط کے ساتھ پہنچا دیں، کیونکہ یہ کتاب کسی خاص قوم وملک کے لئے نہیں اتاری گئی، اس کا مخاطب تو سارا جہان ہے، چنانچہ خدا کے فضل وتوفیق سے عرب کے ذریعہ سے خدا کا یہ عام اور آخری پیغام آج دنیا کے گوشہ گوشہ میں پہنچ گیا، والحمدللہ علیٰ ذٰلک۔

أَوْ تَقُولُوا لَوْ أَنَّا أُنزِلَ عَلَيْنَا الْكِتَابُ لَكُنَّا أَهْدَىٰ مِنْهُمْ ۚ فَقَدْ جَاءَكُم بَيِّنَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ

یا کہنے لگو کہ اگر ہم پر اترتی کتاب تو ہم تو راہ پر چلتے ان سے بہتر، سو آ چکی تمہارے پاس حجت تمہارے رب کی طرف سے

وَهُدًى وَرَحْمَةٌ ۚ فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّن كَذَّبَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَصَدَفَ عَنْهَا ۗ سَنَجْزِي الَّذِينَ

اور ہدایت اور رحمت ۔ اب اس سے زیادہ ظالم کون جو جھٹلائے اللہ کی آیتوں کو اور ان سے کترائے، ہم سزا دیں گے ان کو جو

يَصْدِفُونَ عَنْ آيَاتِنَا سُوءَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوا يَصْدِفُونَ ﴿١٥٧﴾

ہماری آیتوں سے کتراتے ہیں برا عذاب بدلے میں اس کترانے کے ۔

خلاصہ تفسیر: یا (گذشتہ مؤمنین کو ثواب ملنے کے وقت) یوں کہتے کہ اگر ہم پر کوئی کتاب نازل ہوتی تو ہم ان (گذشتہ مؤمنین) سے بھی زیادہ راہ پر ہوتے (اور عقائد واعمال میں ان سب سے زیادہ کمال حاصل کر کے ثواب کے مستحق ہوتے) سو (یاد رکھو کہ) اب (تمہارے پاس کوئی ظاہری عذر بھی نہیں، کیونکہ اب) تمہارے پاس (بھی) تمہارے رب کے پاس سے ایک کتاب (جس کے احکام) واضح (ہیں) اور (جو) رہنمائی کا ذریعہ اور (خدا کی) رحمت (ہے) آ چکی ہے، سو (ایسی کافی شافی کتاب آنے کے بعد) اس شخص سے زیادہ کون ظالم ہوگا جو ہماری

ان آیتوں کو جھوٹا بتلا دے (اور دوسروں کو بھی) اس سے روکے، ہم ابھی (آخرت میں) ان لوگوں کو جو کہ ہماری آیتوں سے روکتے ہیں ان کو اس روکنے کے سبب سخت سزا دیں گے (سزا میں سختی اس روکنے کی وجہ سے بڑھی ورنہ صرف جھٹلانا بھی موجب سزا ہے)۔

* * *

فائدہ:١ یعنی پہلی امتوں کا حال سن کر شاید تم کو ہوس ہوتی اور دل میں ولولہ اٹھتا کہ ہمارے پاس خدا کی کتاب آتی تو ہم دوسروں سے بڑھ کر عمل کر کے دکھلاتے، سوتم کو ان سے بہتر کتاب دے دی گئی، اب دیکھیں کون کیا کام کر کے دکھلاتا ہے۔

فائدہ:٢ اب ایسی بے مثال روشن کتاب آنے کے بعد اگر اس کی آیتوں کو کوئی جھٹلائے اور اس کے احکام قبول کرنے سے کترائے یا دوسروں کو روکے، اس سے بڑا ظالم کون ہوگا۔

تنبیہ: صَدَفَ عَنْهَا کے دونوں معنی سلف سے منقول ہیں: ① ''روکنا'' اور ② ''اعراض کرنا''۔ مترجم علاّم نے دوسرے معنی لے کر ''کترائے'' ترجمہ کیا ہے۔

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ يَاْتِيَ رَبُّكَ اَوْ يَاْتِيَ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ ؕ يَوْمَ يَاْتِيْ

کاہے کی راہ دیکھتے ہیں لوگ مگر یہی کہ ان پر آئیں فرشتے یا آئے تیرا رب یا آئے کوئی نشانی تیرے رب کی، جس دن آئے گی

بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ لَا يَنْفَعُ نَفْسًا اِيْمَانُهَا لَمْ تَكُنْ اٰمَنَتْ مِنْ قَبْلُ اَوْ كَسَبَتْ فِيْٓ اِيْمَانِهَا خَيْرًا ؕ

ایک نشانی تیرے رب کی کام نہ آئے گا کسی کے اس کا ایمان لانا جو کہ پہلے سے ایمان نہ لایا تھا یا اپنے ایمان میں کچھ نیکی نہ کی تھی

قُلِ انْتَظِرُوْٓا اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ﴿١٥٨﴾

تو کہہ دے تم راہ دیکھو ہم بھی راہ دیکھتے ہیں

خلاصہ تفسیر: پیچھے جھٹلانے والوں کا ظالم اور عذاب کا مستحق ہونا بیان فرمایا، اب آگے بھی ان جھٹلانے والوں کو ایمان نہ لانے پر ڈانٹ اور دھمکی ہے:

یہ لوگ (جو کہ قرآن نازل ہوجانے، کھلے معجزات دیکھ لینے اور حق واضح ہوجانے کے بعد بھی ایمان نہیں لاتے، اپنے ایمان لانے کے لئے) صرف اس امر کے منتظر (معلوم ہوتے) ہیں (یعنی ایسا توقف کر رہے ہیں جیسے کوئی کسی بڑی بات انتظار کر رہا ہو) کہ ان کے پاس فرشتے آئیں یا ان کے پاس آپ کا رب آئے (جیسا کہ قیامت میں حساب کے وقت واقع ہوگا) یا آپ کے رب کی کوئی بڑی نشانی (من جملہ قیامت کی نشانیوں کے) آئے (اس بڑی نشانی سے مراد سورج کا مغرب سے طلوع ہونا ہے، مطلب یہ ہوا کہ کیا ایمان لانے کے لیے قیامت کے قریب آنے یا قیامت کے واقع ہونے کا انتظار ہے، سو اس کے متعلق سن رکھیں کہ) جس روز آپ کے رب کی (یہ) بڑی نشانی آپہنچے گی (اس روز) کسی ایسے شخص کا ایمان اس کے کام نہ آئے گا جو پہلے سے ایمان نہیں رکھتا ہو (بلکہ اسی روز ایمان لایا ہو) یا (ایمان تو پہلے سے بھی رکھتا ہو، لیکن) اس نے اپنے ایمان میں کوئی نیک عمل نہ کیا ہو (بلکہ اعمال بد اور گناہوں میں مبتلا ہو، اور اس روز ان سے توبہ کر کے نیک اعمال شروع کرے تو اس کی بھی توبہ قبول نہ ہوگی، اور اگر اس سے پہلے گناہوں سے توبہ کرتا تو مومن ہونے کی برکت سے اس کی توبہ قبول ہوجاتی، گویا توبہ کی قبولیت ایمان کے من جملہ فوائد میں سے ہے، اس وقت ایمان نے یہ خاص نفع نہ دیا، اور جب ایمان و توبہ کی قبولیت سے علامت قیامت مانع ہوگئی تو خاص قیامت کا واقع ہونا تو بدرجہ اولی مانع ہوگا، پھر انتظار کس بات کا ہے، اور اگر اس دھمکی پر بھی ایمان نہ لائیں تو) آپ (مزید تہدید کے طور پر) فرما دیجئے کہ (خیر بہتر) تم (ان امور کے) منتظر رہو (اور مسلمان نہیں ہوتے تو مت ہو) ہم بھی (ان امور کے) منتظر ہیں (اس وقت تم پر مصیبت پڑے گی، اور ہم مومن ان شاء اللہ تعالیٰ ناجی ہوں گے)۔

اَوۡ یَاۡتِیَ بَعۡضُ اٰیٰتِ رَبِّكَ: اس بڑی نشانی آنے سے مراد سورج کا مغرب سے طلوع ہونا ہے، یہ تفسیر بہت سی صحیح احادیث میں وارد ہے اوراس کی کیفیت ایک روایت میں اس طرح آئی ہے کہ اس روز غروب کے بعد سورج حکم خداوندی سے الٹی حرکت کرے گا اس لیے مغرب سے طلوع ہوگا، اور حضرت کعبؓ سے اس طرح منقول ہے کہ قطب کی طرف گھوم کر نقطہ مغرب پر آجائے گا، الٹی حرکت سے یہ معنی بھی مراد ہوسکتے ہیں، اور ایک روایت میں ہے کہ مغرب سے طلوع ہوکر جب وسط آسمان تک پہنچے گا پھر مغرب ہی کی طرف لوٹ کر ادھر غروب ہوجائے گا، پھر بدستور مشرق سے نکلنے لگے گا، اہل ہیئت اور سائنس والے جن قواعد واصول کی بنا پر اس کو محال کہتے ہیں اب تک خود اس پر کوئی دلیل قائم نہیں کرسکے کہ یہ قواعد لازمی ہیں، بہت سے بہت یہ کہہ سکتے ہیں کہ اب تک ان قواعد کے خلاف نہیں ہوا، مگر اس سے یہ کیونکر لازم آئے گا کہ ان قواعد کے خلاف ہونا محال بھی ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی اللہ کی طرف سے ہدایت کی جو حد تھی وہ پوری ہوچکی، انبیاء تشریف لائے، شریعتیں اتریں کتابیں آئیں حتیٰ کہ اللہ کی آخری کتاب بھی آچکی، تب بھی نہیں مانتے تو شاید اب اس کے منتظر ہیں کہ اللہ آپ آئے یا فرشتے آئیں یا قدرت کا کوئی بڑا نشان (مثلاً قیامت کی کوئی بڑی علامت) ظاہر ہو تو یاد رہے کہ قیامت کے نشانوں میں سے ایک نشان وہ بھی ہے جس کے ظاہر ہونے کے بعد نہ کافر کا ایمان لانا معتبر ہوگا نہ عاصی کی توبہ، صحیحین کی احادیث بتلاتی ہیں کہ یہ نشان آفتاب کا مغرب سے طلوع کرنا ہے، یعنی جب خدا کا ارادہ ہوگا کہ دنیا کو ختم کرے اور عالم کا موجودہ نظام درہم برہم کردیا جائے تو موجودہ قوانین طبیعیہ کے خلاف بہت سے عظیم الشان خوارق وقوع میں آئیں گے ان میں سے ایک یہ ہے کہ آفتاب مشرق کے بجائے مغرب سے طلوع ہوگا، غالباً اس حرکت مقلوبی اور رجعت قہقری سے اس طرف اشارہ کرنا مقصود ہو کہ جو قوانین قدرت اور نوامیس طبیعیہ دنیا کے موجودہ نظم ونسق میں کارفرما تھے، ان کی میعاد ختم ہونے اور نظام شمسی کے الٹ پلٹ ہوجانے کا وقت آپہنچا ہے، گویا اس وقت سے عالم کبیر کے نزع اور جانکنی کے وقت کا ایمان اور توبہ مقبول نہیں کیونکہ وہ حقیقت میں اختیاری نہیں ہوتا، اسی طرح طلوع الشمس من المغرب کے بعد مجموعہ عالم کے حق میں یہ ہی حکم ہوگا کہ کسی کا ایمان وتوبہ معتبر نہ ہو۔

بعض روایات میں طلوع الشمس من مغربھا کے ساتھ چند دوسرے نشانات بھی بیان ہوئے ہیں مثلاً خروج دجال، خروج دابہ وغیرہ، ان روایات کی مراد یہ معلوم ہوتی ہے کہ جب ان سب نشانات کا مجموعہ متحقق ہوگا اور وہ جب ہی ہوسکتا ہے کہ طلوع الشمس من المغرب بھی متحقق ہو تو دروازہ توبہ کا بند کردیا جائے گا الگ الگ ہر نشان پر یہ حکم متفرع نہیں، ہمارے زمانہ کے بعض ملحدین جو ہر غیر معمولی واقعہ کو استعارہ کا رنگ دینے کے خوگر ہیں وہ طلوع الشمس من المغرب کو بھی استعارہ بنانے کی فکر میں ہیں، غالباً ان کے نزدیک قیامت کا آنا بھی ایک طرح کا استعارہ ہی ہوگا۔

تنبیہ: یہ جو کہا کہ: ''آئیں فرشتے یا آئے تیرا رب'' اس کی تفسیر سیقول کے نصف پر آیت: هَلۡ یَنۡظُرُوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡ یَّاۡتِیَهُمُ اللّٰهُ فِیۡ ظُلَلٍ مِّنَ الۡغَمَامِ (البقرۃ:۲۱۰) کے تحت میں گزر چکی وہاں دیکھ لیا جائے اور جملہ اور کَسَبَتۡ فِیۡۤ اِیۡمَانِهَا خَیۡرًا کا عطف اٰمَنَتۡ مِنۡ قَبۡلُ پر ہے اور تقدیر عبارت کی ابن المنیر وغیرہ محققین کے نزدیک یوں ہے: لَا یَنۡفَعُ نَفۡسًا اِیۡمَانُهَا اوکسبها خیرا لم تکن امنت من قبل او لم تکن کسبت فی ایمانها خیرا یعنی جو پہلے سے ایمان نہیں لایا اس وقت اس کا ایمان نافع نہ ہوگا اور جس نے پہلے سے کسب خیر نہ کیا اس کا کسب خیر نافع نہ ہوگا، (یعنی توبہ قبول نہ ہوگی)۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ فَرَّقُوۡا دِیۡنَهُمۡ وَكَانُوۡا شِیَعًا لَّسۡتَ مِنۡهُمۡ فِیۡ شَیۡءٍ ؕ اِنَّمَاۤ اَمۡرُهُمۡ اِلَی اللّٰهِ

جنہوں نے راہیں نکالیں اپنے دین میں اور ہوگئے بہت سے فرقے تجھ کو ان سے کچھ سروکار نہیں، ان کا کام اللہ ہی کے حوالے ہے

ثُمَّ یُنَبِّئُهُمۡ بِمَا كَانُوۡا یَفۡعَلُوۡنَ ﴿۱۵۹﴾

پھر وہی جتلائے گا ان کو جو کچھ وہ کرتے تھے

خلاصہ تفسیر: یہاں تک زیادہ حصہ بیان مشرکین کے بارے میں تھا، آگے ایک عام عنوان سے دوسرے گمراہوں کا حق سے دور اور مستحق وعید ہونا بیان فرماتے ہیں جس میں تمام کفار مشرکین، اہل کتاب اور اہل ہوا و بدعت سب داخل ہو گئے۔

بے شک جن لوگوں نے اپنے دین کو (جن کے وہ مکلف ہیں) جدا جدا کر دیا (یعنی دین حق کو پورا قبول نہ کیا، خواہ سب کو چھوڑ دیا یا بعض کو اور شرک و کفر و بدعت کے طریقے اختیار کر لئے) اور (مختلف) گروہ گروہ بن گئے آپ کا ان سے کوئی تعلق نہیں (یعنی آپ ﷺ ان سے بری ہیں، آپ پر کوئی الزام نہیں) بس (وہ لوگ خود اپنے نیک و بد کے ذمہ دار ہیں، اور) ان کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے (وہ دیکھ بھال رہے ہیں) پھر (قیامت میں) ان کو ان کا کیا ہوا جتلا دیں گے (اور حجت قائم کر کے ان کا مستحق عذاب ہونا ظاہر کر دیں گے)۔

اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا: ان جماعتوں سے ابن عباسؓ کے قول میں یہود و نصاریٰ کا مراد ہونا اور حضرت ابو ہریرہؓ کی مرفوع حدیث سے اہل بدعت کا مراد ہونا اور حسن سے تمام مشرکین کا مراد ہونا منقول ہے کہ ان میں بت پرست اور ستارہ پرست وغیرہ بہت سے فرقے تھے، مگر چونکہ آیت کے الفاظ عام ہیں اس لیے عام ہی مراد لینا مناسب ہے، البتہ عذاب کے مراتب میں فرق ہوگا، یعنی کفار کو دائمی عذاب ہوگا، اور اہل بدعت فاسد عقائد کی وجہ سے کچھ عذاب کے مستحق ہوں گے، پھر ایمان کی وجہ سے نجات ہو جائے گی، اور حدیث میں جو آیا ہے کہ مسلمانوں میں بہت سے فرقے ہوں گے، ان میں ایک ناجی باقی سب دوزخی ہیں، اس کا یہ مطلب نہیں کہ جو دوزخی ہیں ان کو ہمیشہ کے لیے عذاب ہوگا، کیونکہ مسلمان کے لیے دائمی عذاب نہیں، اور نہ یہ مطلب ہے کہ فرقہ ناجی میں کسی کو کچھ بھی عذاب نہ ہوگا، کیونکہ بعض اہل سنت کو بھی گناہوں کے سبب عذاب ہوگا، بلکہ مطلب یہ ہے کہ فرقہ ناجی میں کسی کو فساد عقیدہ کے سبب عذاب نہ ہوگا، اور باقی سب فرقوں کو فساد عقیدہ کا بھی عذاب ہوگا، اور عملی گناہوں کا تو سب کو ہوگا مگر عملی گناہوں کا عذاب فساد عقیدہ کے عذاب سے کم ہوگا، باقی جس طرح یہ ممکن ہے کہ حق تعالیٰ عملی گناہوں کو بغیر عذاب ہی کے معاف فرما دیں اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ فساد عقیدہ کے گناہوں کو بھی ویسے ہی معاف فرما دیں، عقیدہ کے فساد کی وجہ سے عذاب ضروری اور لازمی ہونے کی کوئی دلیل نہیں۔

فائدہ: پچھلے رکوع میں قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ (الانعام: ۱۵۱) سے بہت سے احکام بیان فرما کر ارشاد ہوا تھا: وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ (الانعام: ۱۵۳) یعنی صراط مستقیم (دین کی سیدھی راہ) ہمیشہ سے ایک رہی ہے، اس سے ہٹ کر گمراہی کے راستے بہت ہیں، تمام انبیاء و مرسلین اصولی حیثیت سے اسی ایک راہ پر چلے اور لوگوں کو بلاتے رہے شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ (الشوریٰ: ۱۳) اول دین میں ان کے باہم کوئی تفریق نہیں، زمان و مکان اور خارجی احوال کے اختلاف سے فروع شرعیہ میں جو تفاوت ہوا، وہ تفرق نہیں بلکہ ہر وقت کے مناسب رنگ میں ایک ہی مشترک مقصد کے ذرائع حصول کا تنوع ہے جو دین انبیائے سابقین لے کر آئے، موسیٰ (علیہ السلام) کی کتاب بھی اس کی مخالفت کے لئے نہیں بلکہ اس کی تکمیل و تفصیل کی غرض سے اتاری گئی، سب کے آخر میں قرآن آیا جو تمام کتب سابقہ کی تتمیم و تصدیق اور ان کے علوم و معارف کی حفاظت کرنے والا ہے، درمیان میں ان کتب و شرائع سے اعراض کرنے والوں کا حال بیان کر کے اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ سے پھر اصل مطلب کی طرف عود کیا گیا، یعنی دین الٰہی کا راستہ (صراط مستقیم) ایک ہے، جو لوگ اصل دین میں پھوٹ ڈال کر جدا جدا راہیں نکالتے اور فرقہ بندی کی لعنت میں گرفتار ہوتے ہیں خواہ وہ یہود ہوں یا نصاریٰ یا وہ مدعیان اسلام جو مستقبل میں عقائد دینیہ کی چادر کو پھاڑ کر پارہ پارہ کرنے والے تھے، ان لوگوں سے آپ کو کچھ واسطہ اور سروکار نہیں، یہ سب فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ (الانعام: ۱۵۳) میں داخل ہیں، آپ ان سے بیزاری اور برأت کا اظہار کر کے خدا کے اسی ایک راستہ (صراط مستقیم) پر جمے رہیے اور ان کا انجام اللہ کے حوالہ کیجئے، وہ ان کو دنیا اور آخرت میں جتلا دے گا جو کچھ دین میں گڑبڑی کرتے تھے، حضرت شاہ صاحبؒ فرقوا دینہم کی توضیح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''جو باتیں یقین لانے کی ہیں (اصول دین) ان میں فرق نہ چاہیے اور جو کرنے کی ہیں (فروع دین) ان کے طریقے کئی ہوں تو برا نہیں''۔

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا ۚ وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰٓى اِلَّا مِثْلَهَا وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۱۶۰﴾

جو کوئی لاتا ہے ایک نیکی تو اس کیلئے ان کا دس گناہ ہے، اور جو کوئی لاتا ہے ایک برائی سو سزا پاوے گا اسی کے برابر اور ان پر ظلم نہ ہوگا

خلاصہ تفسیر: گذشتہ آیت میں اس کا بیان تھا کہ صراط مستقیم سے منحرف ہونے والوں کو روز قیامت اللہ تعالیٰ ہی ان کے اعمال کی سزاء دیں گے، اب اس آیت میں آخرت کی جزاء وسزاء کا کریمانہ ضابطہ اور عام قانون اس طرح بیان فرمایا ہے کہ جو شخص ایک نیک کام کرے گا اس کو دس گنا بدلہ دیا جائے گا، اور جو ایک گناہ کرے گا اس کا بدلہ صرف ایک گناہ کے برابر دیا جائے گا، شاید اس بات سے کہ نیکیوں کا ثواب بہت زیادہ ملے گا کفار کو ایمان کی ترغیب دینا مقصود ہے کہ اگر کفر چھوڑ کر ایمان لے آؤ تو کسی قدر فائدہ ہو کہ تھوڑا کام کرو اور ملے بہت زیادہ۔

جو شخص نیک کام کرے گا اس کو (اقل درجہ) اس کے دس حصے ملیں گے (یعنی ایسا سمجھا جائے گا کہ گویا وہ نیکی دس بار کی اور جتنا ثواب ایک نیکی پر ملتا اب دس حصے ویسے ہی ثواب کے ملیں گے) اور جو شخص برا کام کرے گا سو اس کو اس کے برابر ہی سزا ملے گی (زیادہ نہ ملے گی) اور ان لوگوں پر (ظاہراً بھی) ظلم نہ ہوگا (کہ کوئی نیکی درج نہ ہو یا کوئی بدی زیادہ کر کے لکھ لی جائے، حقیقت میں تو کسی حال میں بھی خدا کے کسی فعل کو ظلم نہیں کہہ سکتے، وہ جو کچھ بھی کریں عین عدل ہے، وہ مالک ہیں اور مالک کو سب اختیار ہے)۔

یہاں ''اقل درجہ'' کی قید اس لیے لگائی کیونکہ دوسری نصوص سے بعض اوقات اس سے بھی زیادہ ملنے کی صراحت ہے۔

شبہ ہوتا ہے کہ جب ایمان ''حسنہ'' ہے تو کفر ''سیئہ'' ہوگا اور یہاں فرمایا کہ سیئہ پر برابر سزا ہے، تو کفر پر ہمیشہ کا عذاب ہونا بظاہر برابر سے زیادہ ہے، جواب یہ ہے کہ زیادہ جب کہتے کہ نفس کفر پر جس قدر سزا کا مستحق ہے اس سے زیادہ سزا ہو جاتی، اور یہ منفی ہے، بلکہ ممکن ہے کہ نفس کفر اگرچہ وہ مضاعف (دوگنا) نہ کیا جائے اتنی ہی سزا کا تقاضا کرتا ہو، کیونکہ کفر کی قبح وشدت انتہائی درجہ کی ہے۔

***

فائدہ: ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ (الانعام:۱۵۹) میں ان کے افعال شنیعہ کی مجازات پر متنبہ کیا گیا تھا، ساتھ ہی ہر نیک وبد کی مجازات کا عام قانون بتلا دیا کہ بھلائی کا بدلہ کم از کم دس گنا ہے اور برائی کا زائد از زائد اس کے برابر، یعنی جس نے ایک نیکی کمائی تو کم از کم ویسی دس نیکیوں کا ثواب ملے گا زائد کی حد نہیں وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ (البقرۃ:۲۶۱) اور جو ایک بدی کا مرتکب ہوا تو ویسی ایک بدی کی جس قدر سزا مقرر ہے اس سے آگے نہ بڑھیں گے، تخفیف کر دیں یا بالکل معاف فرما دیں، یہ اختیار ہے۔ پھر جہاں وفور رحمت کی یہ کیفیت ہو وہاں ظلم کا کیا امکان ہے۔

قُلْ اِنَّنِيْ هَدٰىنِيْ رَبِّيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ڬ دِيْنًا قِيَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۚ

تو کہہ دے مجھ کو سجھائی میرے رب نے راہ سیدھی، دین صحیح ملت ابراہیم کی جو ایک ہی طرف کا تھا۔[1]

وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۶۱﴾

اور نہ تھا شرک والوں میں۔[2]

خلاصہ تفسیر: پیچھے دین میں اختلاف کی مذمت تھی، اب دین حق کی تعیین ہے جس کا اختیار کرنا سب کو ضروری ہے۔

آپ کہہ دیجئے کہ مجھ کو میرے رب نے ایک سیدھا راستہ (وحی کے ذریعہ سے) بتلا دیا ہے کہ وہ ایک دین ہے (جو دلائل سے ثابت ہونے کی وجہ سے) مستحکم (ہے) جو طریقہ ہے ابراہیم کا جس میں ذرا کجی نہیں، اور وہ (ابراہیم علیہ السلام) شرک کرنے والوں میں سے نہ تھے۔

یہاں دین کے جو اوصاف بیان کیے گئے اس کے اعتبار سے وہ خاص ہو گیا اسلام اور اسلام میں سے طریقہ سنت کے ساتھ، چنانچہ ملت ابراہیمی کا اسلام ہونا پہلے پارہ کے آخر میں گذر چکا، اور وما كان من المشركين سے مشرکین، یہود ونصاری سب کا رد ہو گیا، اور ''حنیف'' کی قید

سے تمام بدعتوں کا رد ہو گیا کہ سب میں کجی ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی ایک خدا ہی کا ہو رہا تھا۔

فائدہ: ۲ یعنی تم دین میں جتنی چاہو راہیں نکالو اور جس قدر معبود چاہو ٹھہرالو۔ مجھ کو تو میرا پروردگار صراط مستقیم بتلا چکا اور وہ ہی خالص توحید اور کامل تفویض وتوکل کا راستہ ہے، جس پر موحد اعظم ابوالانبیاء ابراہیم خلیل اللہ بڑے زور شور سے چلے جن کا نام آج بھی تمام عرب اور کل ادیان سماویہ غایت عظمت واحترام سے لیتے ہیں۔

قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۶۲﴾

تو کہہ کہ میری نماز اور میری قربانی اور میرا جینا اور میرا مرنا اللہ ہی کے لئے ہے جو پالنے والا سارے جہان کا ہے

لَا شَرِيْكَ لَهٗ ۚ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۱۶۳﴾

کوئی نہیں اس کا شریک ۱ اور یہی مجھ کو حکم ہوا اور میں سب سے پہلے فرمانبردار ہوں ۲

خلاصہ تفسیر: (اور) آپ (اس مذکورہ دین میں قدرے تفصیل کے لئے) فرمادیجئے کہ (اس دین کا حاصل یہ ہے کہ) بالیقین میری نماز اور میری ساری عبادات اور میرا جینا اور مرنا یہ سب خالص اللہ ہی کے لئے ہے جو مالک ہے سارے جہان کا۔

اس کا (مستحق عبادت ہونے میں یا ربوبیت کے تصرفات میں) کوئی شریک نہیں، اور مجھ کو اسی (مذکورہ دین پر رہنے) کا حکم ہوا ہے، اور (حکم کے موافق) میں (اس دین والوں میں) سب ماننے والوں سے پہلا (ماننے والا) ہوں۔

اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ: صلوۃ ونسک (نماز وقربانی) تو امور تشریعیہ میں سے ہے اور محیا وممات (زندگی وموت) امور تکوینیہ میں سے ہے، اس آیت میں نماز اور تمام عبادات کا اللہ کے لئے ہونا تو ظاہر ہے کہ ان میں شرک یا ریاء یا کسی دنیوی مفاد کا دخل نہ ہونا مراد ہے، اور زندگی اور موت کا اللہ کے لئے ہونا، اس کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ میری موت وحیات ہی اس کے قبضہ قدرت میں ہے، تو پھر زندگی کے اعمال و عبادات بھی اسی کے لئے ہونا لازم ہے، اور یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں کہ جتنے اعمال زندگی سے وابستہ ہیں وہ بھی صرف اللہ کے لئے ہیں، جیسے نماز، روزہ اور لوگوں کے ساتھ معاملات کے حقوق وفرائض وغیرہ اور جو اعمال موت سے متعلق ہیں، یعنی وصیت اور اپنے بعد کے لئے جو ہر انسان کوئی نظام چاہتا اور سوچتا ہے وہ سب اللہ رب العالمین کے لئے اور اسی کے احکام کے تابع ہے، مجموعہ کا حاصل یہ ہوا کہ مستحق عبادت ہونے میں بھی خدا کا کوئی شریک نہیں اور تصرف میں بھی خدا کا کوئی شریک نہیں، اور یہی توحید کا مجموعہ ہے جو اسلام کی بڑی اور بنیادی تعلیم ہے، اور یہ شبہ کہ حضور ﷺ کو ملت ابراہیمی پر رہنے کا کیسے حکم ہوا؟ حالانکہ آپ خود مستقل نبی ہیں، اس کا جواب سورہ بقرہ آیت ۱۳۵ میں دیا جاچکا ہے وہاں دیکھ لیا جائے۔

اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ: یہ آیت توحید کامل کی دعوت دیتی ہے، یعنی اللہ تعالی نے جو شرعی احکام دیے ہیں اور جس طرح عالم کا نظام چلا رہے ہیں اس کی اطاعت اور فرمانبرداری ہمارے ذمہ لازم ہے، عمل سے اطاعت ہو، قول سے بھی اطاعت ہو، اور جو حالات ہم پر پیش آرہے ہیں ان پر اللہ کی ذات سے راضی رہیں، شکوہ نہ کریں تو اس وقت ہماری توحید مکمل ہوگی، یعنی اس وقت ہم وحدانیت کے صحیح اقرار کرنے والے ہوں گے، تفویض وتسلیم دین میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں، یعنی اپنی زندگی کے سارے معاملات کو اللہ کے حوالے کردیا جائے اور جو بھی فیصلہ نازل ہو اسے دل سے قبول کرلیا جائے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسباب ترک کردیے جائیں، اسباب تو بہرحال اختیار کیے جائیں گے، لیکن نتیجہ کو قلب کی گہرائیوں سے اللہ کا فیصلہ یقین کیا جائے، خواہ وہ فیصلہ اپنی خواہش کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔

وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ: اس میں دوسروں کو لطف کے ساتھ دعوت ہے کہ جب نبی تک مکلف بالایمان ہے تو دوسرے کیوں نہ ہوں گے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ اس آیت میں توحید وتفویض کے سب سے اونچے مقام کا پتہ دیا گیا ہے جس پر ہمارے سید وآقا محمد رسول اللہ ﷺ فائز ہوئے، نماز اور قربانی کا خصوصیت سے ذکر کرنے میں مشرکین پر جو بدنی عبادات اور قربانی غیر اللہ کے لئے کرتے تھے، تعریضاً رد ہو گیا۔

فائدہ: ۲؎ عموماً مفسرین وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ اس امت محمدیہ کے اعتبار سے آپ اول المسلمین ہیں لیکن جامع ترمذی کی حدیث: کنت نبیاً و أدم بین الروح والجسد کے موافق آپ اول الانبیاء ہیں تو اول المسلمین ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے، اس کے علاوہ ممکن ہے کہ یہاں اولیت زمانی مراد نہ ہو بلکہ تقدم رتبی مراد ہو، یعنی میں سارے جہان کے فرمانبرداروں کی صف میں نمبر اول اور سب سے آگے ہوں، شاید مترجم محقق قدس سرہ، نے ترجمہ میں "سب سے پہلا فرمانبردار ہوں" کی جگہ "سب سے پہلے فرمانبردار ہوں" کہہ کر اسی طرف اشارہ کیا ہو، کیونکہ محاورات کے اعتبار سے یہ تعبیر اولیت رتبی کے ادا کرنے میں زیادہ واضح ہے، واللہ اعلم۔

قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْ رَبًّا وَّهُوَ رَبُّ كُلِّ شَيْءٍ ۭ وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَيْهَا ۚ وَلَا تَزِرُ

تو کہہ کیا اب میں اللہ کے سوا تلاش کروں کوئی رب اور وہی ہے رب ہر چیز کا ۱؎ اور جو کوئی گناہ کرتا ہے سو وہ اسکے ذمہ پر ہے، اور بوجھ نہ اٹھائے گا

وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۚ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۶۴﴾

ایک شخص دوسرے کا، پھر تمہارے رب کے پاس ہی تم سب کو لوٹ کر جانا ہے سو وہ جتلائے گا جس بات میں تم جھگڑتے تھے ۲؎

خلاصہ تفسیر: (پیچھے دین حق کی تعیین کر کے اس کی طرف عام دعوت دی گئی تھی، چونکہ بعض اہل باطل یعنی مشرکین خود آپ ﷺ کو اور مسلمانوں کو اپنے باطل طریقہ کی طرف بلاتے تھے اور یہ بھی کہتے تھے کہ اگر اس میں تمہیں گناہ ہوگا تو وہ ہمارے سر پر، اب آگے ان کے اس دعویٰ کا رد ہے) آپ (ﷺ ان باطل کی طرف بلانے والوں سے) فرما دیجئے کہ کیا (توحید اور اسلام کی حقیقت واضح ہونے کے بعد تمہارے کہنے سے) میں خدا تعالیٰ کے سوا کسی اور کو رب بنانے کے لئے تلاش کروں (یعنی نعوذ باللہ شرک اختیار کرلوں) حالانکہ وہ مالک ہے ہر چیز کا (اور سب چیزیں اس کی مملوک ہیں اور مملوک مالک کا شریک نہیں ہو سکتا) اور (تم جو کہتے ہو کہ تمہارا گناہ ہمارے سر، سو یہ محض لغو بات ہے کہ گناہ کرنے والا پاک صاف رہے اور صرف دوسرا گنہگار ہو جائے، بلکہ بات یہ ہے کہ) جو شخص بھی کوئی عمل کرتا ہے وہ اسی پر رہتا ہے، اور کوئی دوسرے کا بوجھ (گناہ کا) نہ اٹھائے گا (بلکہ سب اپنی اپنی بھگتیں گے) پھر (سب کے عمل کر چکنے کے بعد) تم سب کو اپنے رب کے پاس جانا ہوگا، پھر وہ تم کو جتلا دیں گے جس جس چیز میں تم اختلاف کرتے تھے (کہ کوئی کسی دین کو حق بتاتا تھا اور کوئی کسی کو، وہاں عملی اطلاع سے فیصلہ کر دیا جائے گا کہ اہل حق کو نجات اور اہل باطل کو سزا ہوگی)۔

❊ ❊ ❊

فائدہ: ۱؎ پہلے توحید فی الالوہیت کا ذکر تھا اب توحید فی الربوبیت کی تصریح فرمائی، یعنی جس طرح معبود اس کے سوا کوئی نہیں، مستعان بھی کوئی نہیں ہو سکتا، کیونکہ استعانت ربوبیت عامہ پر متفرع ہے، اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ۔

فائدہ: ۲؎ کفار مسلمانوں سے توحید وغیرہ میں جھگڑتے اور کہتے تھے کہ تم توحید کی راہ چھوڑ کر ہمارے راستہ پر آ جاؤ، اگر اس میں کوئی گناہ ہو تو وہ ہمارے سر وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّبِعُوْا سَبِيْلَنَا وَلْنَحْمِلْ خَطٰيٰكُمْ (العنکبوت: ۱۲) یہاں اس کا جواب دے دیا کہ ہر ایک کا گناہ اسی کے سر ہے، کوئی شخص دوسرے کے گناہوں کا بار نہیں اٹھا سکتا، باقی تمہارے جھگڑے اور اختلافات خدا کے یہاں جا کر سب طے ہو جائیں گے، یہ دنیا فیصلہ کی جگہ نہیں، امتحان وآزمائش کا گھر ہے جیسا کہ اگلی آیت میں آگاہ فرمایا:

وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ

اور اسی نے تم کو نائب کیا ہے زمین میں [1] اور بلند کر دیئے تم میں درجے ایک کے ایک پر [2] تاکہ آزمائے تم کو

فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ ؕ اِنَّ رَبَّكَ سَرِيْعُ الْعِقَابِ ۖ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿١٦٥﴾

اپنے دیئے ہوئے حکموں میں، تیرا رب جلد عذاب کرنے والا ہے، اور وہی بخشنے والا مہربان ہے [3]

خلاصہ تفسیر: سورت ختم پر آئی، اس تمام سورت میں دین حق کی تحقیق تفصیل کے ساتھ ہے، اب اخیر میں اپنے دو انعام بیان فرماتے ہیں ایک میں تو سب برابر ہیں، دوسرے میں کمی بیشی بھی ہے، اس سے اپنی اطاعت کی ترغیب اور مخالفت سے ڈرانا مقصود ہے، پھر آیت کو اپنے دو وصفوں پر ختم فرماتے ہیں جو کہ ترغیب وترہیب کے مناسب ہیں، اس اعتبار سے خاتمہ کو تمام سورت سے تعلق ہو گیا، ایسے ہی خاتمہ کو حسن ختام کہتے ہیں۔

اور وہ (اللہ) ایسا ہے جس نے تم کو زمین میں صاحب اختیار بنایا (اس پہلی نعمت میں تو سب برابر ہیں) اور ایک کا دوسرے پر (مختلف چیزوں میں) رتبہ بڑھایا (اس دوسری نعمت میں تفاضل یعنی کمی بیشی ہے) تاکہ (ان نعمتوں سے) تم کو (ظاہراً) آزمائے ان چیزوں میں جو کہ (مذکورہ نعمتوں میں سے) تم کو دی ہیں (آزمانا یہ کہ کون ان نعمتوں کی قدر کر کے منعم کی اطاعت کرتا ہے اور کون بے قدری کر کے اطاعت نہیں کرتا، پس بعض مطیع ہوئے، بعض نافرمان ہوئے اور دونوں کے ساتھ مناسب معاملہ کیا جائے گا، کیونکہ) بالیقین آپ کا رب جلد سزا دینے والا (بھی) ہے، اور بالیقین وہ واقعی بڑی مغفرت کرنے والا، مہربانی کرنے والا (بھی) ہے (پس نافرمانوں کے لئے عذاب ہے اور فرمانبرداروں کے لئے رحمت ہے، اور نافرمانی سے تابع داری کی طرف آنے والوں کے لئے مغفرت ہے، پس مکلفین یعنی بندوں پر ضروری ہوا کہ دین حق کے موافق اطاعت اختیار کریں، اور باطل طریقہ اور حق کی مخالفت سے باز آئیں)۔

وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ: جن چیزوں میں عام طور پر کمی بیشی رکھی ہے وہ غیر اختیاری ہیں جیسے عقل، جاہ، رزق، حسن و جمال، صحت اور قوت وغیرہ، اس کی بیشی میں حکمت ہونا تو ظاہر ہے، اور نعمت ہونا بھی اس شخص کے لیے جس میں عمدہ اوصاف ہیں ظاہر بات ہے، اور جس میں کمتر اوصاف ہیں اس کے لیے بھی وہ نعمت ہیں، کیونکہ ہر نقصان ومصیبت میں کوئی نہ کوئی دنیاوی یا اخروی نفع ہوتا ہے جیسے کسی بڑے وبال سے بچا لینا، اور رفع درجات اور کفارہ سیئات وغیرہ، چنانچہ واقعات وآیات میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔

* * *

فائدہ: [1] **وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ:** یعنی خدا نے زمین میں تم کو اپنا نائب بنایا کہ تم اس کے دیے ہوئے اختیارات سے کام لے کر کیسے کیسے حاکمانہ تصرفات کرتے ہو، یا تم کو باہم ایک دوسرے کا نائب بنایا کہ ایک قوم جاتی ہے، تو دوسری قوم اس کی جانشین ہوتی ہے۔

فائدہ: [2] **وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ:** یعنی تمہارے آپس میں بے حد فرق مدارج رکھا، چنانچہ شکل وصورت، رنگت، لہجہ، اخلاق وملکات، محاسن ومساوی، رزق، دولت، عزت وجاہ وغیرہ میں افراد انسانی کے بیشمار درجات ہیں۔

فائدہ: [3] **وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ:** یعنی ظاہر ہو جائے کہ ان حالات میں کون شخص کہاں تک خدا کا حکم مانتا ہے، ابن کثیرؒ نے فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ سے وہ مختلف احوال و درجات مراد لئے ہیں جن میں حسب استعداد ولیاقت ان کو رکھا گیا ہے، اس تقدیر پر آزمائش کا حاصل یہ ہوگا کہ مثلاً غنی حالت غناء میں رہ کر کہاں تک شکر کرتا ہے اور فقیر حالت فقر میں کس حد تک صبر کا ثبوت دیتا ہے وقس علیٰ ہذا، بہر حال اس آزمائش میں جو بالکل نالائق ثابت ہوا حق تعالیٰ اس کے حق میں سریع العقاب اور جس سے قدرے کوتاہی رہ گئی اس کے حق میں غفور اور جو پورا اُترا اُس کے لئے رحیم ہے۔

ایاتہا ۲۰۶ ۷ سُوْرَۃُ الْاَعْرَافِ مَكِّيَّةٌ ۳۹ رکوعاتہا ۲۴

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

خلاصہ تفسیر: اس سورت کی ابتدا کو گذشتہ سورت کے اخیر سے یہ مناسبت ہے کہ اس کے اخیر میں: قُلْ اِنَّنِیْ هَدٰىنِیْ رَبِّیْٓ میں دین حق کو متعین فرمایا تھا کہ وہ اسلام ہے، اس کے بعد ثواب وعذاب کی رغبت اور خوف دلایا تھا، اور اس سورت کے شروع میں اس دین کی تبلیغ کا حکم ہے اور آخرت کے معاملات سوال اور وزن اعمال وجزاء وسزا کا بیان ہے اور ان مضامین میں باہم مناسبت ظاہر ہے، اور اس سورت کے مضامین اس میں بھی باہم متناسب ہیں، کیونکہ تمام سورت پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ مضامین آپس میں آخرت اور نبوت کے متعلق ہیں، اور پہلی ہی آیت كِتٰبٌ اُنْزِلَ میں نبوت کا اور آیت نمبر 6 فَلَنَسْـَٔلَنَّ میں معاد وآخرت کی تحقیق کا مضمون ہے، چوتھے رکوع کے نصف سے چھٹے رکوع کے ختم تک بالکل آخرت کی بحث ہے، پھر آٹھویں رکوع سے اکیسویں رکوع تک وہ معاملات مذکور ہیں جو انبیاء علیہم السلام اور ان کی امتوں سے ہوئے ہیں، یہ سب مسئلے رسالت سے متعلق ہیں، اور ان قصص میں ساتھ ساتھ منکرین رسالت کی سزاؤں کا بھی ذکر چلا آیا ہے، تاکہ موجودہ منکرین کو عبرت حاصل ہو، اور رکوع بائیس کے نصف سے تیئس کے ختم تک پھر معاد (آخرت) کی بحث ہے، صرف ساتویں اور بائیسویں رکوع کے شروع میں اور آخری رکوع چوبیس کے اکثر حصہ میں توحید پر خاص بحث ہے، باقی بہت کم حصہ سورۃ کا ایسا ہے جس میں جزوی فروعی احکام اس مقام کی مناسبت سے مذکور ہیں۔

الٓمّٓصٓ ۝۱ كِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَيْكَ فَلَا يَكُنْ فِيْ صَدْرِكَ حَرَجٌ مِّنْهُ لِتُنْذِرَ بِهٖ

ال م ص، یہ کتاب اتری ہے تجھ پر سو چاہیے کہ تیرا جی تنگ نہ ہو اس کے پہنچانے سے ۱؎ تاکہ تو ڈرائے اس سے

وَذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۝۲

اور نصیحت ہو ایمان والوں کو ۲؎

خلاصہ تفسیر: المص (اس کے معنی تو اللہ تعالیٰ ہی کے علم میں ہیں اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے درمیان ایک راز ہے، جس پر امت کو اطلاع نہیں دی گئی، بلکہ اس کی جستجو کو بھی منع کیا گیا) یہ (قرآن) ایک کتاب ہے جو (اللہ کی جانب سے) آپ (ﷺ) کے پاس اس لئے بھیجی گئی ہے کہ آپ اس کے ذریعہ (لوگوں کو نافرمانی کی سزا سے) ڈرائیں، سو آپ کے دل میں (کسی کے نہ ماننے سے) بالکل تنگی نہ ہونی چاہئے (کیونکہ کسی کے نہ ماننے سے آپ ﷺ کی بعثت کے اصل مقصد میں جو کہ حق بات پہنچانے کا ہے کوئی خلل نہیں آتا، پھر آپ کیوں دل تنگ ہوں) اور یہ (قرآن خصوصیت کے ساتھ) نصیحت ہے ایمان والوں کے لئے۔

كِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَيْكَ (الی) لِتُنْذِرَ بِهٖ: لتنذر متعلق ہے انزل کے، شیخ واستاذ کے لیے اس میں اشارہ ہے کہ مخاطب اگر اس کی بات قبول نہ کرے تو اسے غم نہیں کرنا چاہیے، اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے آپ کو مستغنی بھی نہیں سمجھنا چاہیے، اپنا کام جاری رکھے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ ابن عباسؓ نے حرج کی تفسیر شک سے کی ہے گویا: فَلَا يَكُنْ فِيْ صَدْرِكَ حَرَجٌ، فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ کے ہم معنی ہوگا، یعنی پیغمبر جس پر خدا نے اپنی کتاب نازل فرمائی اس کی شان یہ نہیں کہ ذرا سا بھی کھٹکا یا شک وشبہ کتاب کے احکام واخبار کے متعلق اس کے دل میں راہ پائے، دوسرے مفسرین نے الفاظ کو ان کے ظاہر پر رکھا، جیسا کہ مترجم محقق نے اختیار فرمایا ہے، یعنی تمام خلائق میں سے چن کر جس پر خدا نے اپنی کتاب اتاری اسے لائق نہیں کہ احمقوں اور معاندین کے طعن وتشنیع یا بیہودہ سوالات سے متاثر ہو کر اس کتاب کے کسی حصہ کی تبلیغ سے منقبض اور تنگ

دل ہو فَلَعَلَّكَ تَارِكٌ بَعْضَ مَا يُوْحٰى اِلَيْكَ وَضَآئِقٌ بِهٖ صَدْرُكَ اَنْ يَّقُوْلُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ جَآءَ مَعَهٗ مَلَكٌ (ہود: ۱۲) اگر بفرض محال خود پیغمبر کے دل میں کتاب اور اس کے مستقبل کی طرف سے نہایت کامل وثوق وانشراح حاصل نہ ہو، تو وہ اپنے فرض انذار وتذکیر کو کس طرح قوت وجرأت کے ساتھ ادا کرسکے گا۔

فائدہ: ۲ یعنی کتاب کے اتارنے سے غرض یہ ہے کہ تم ساری دنیا کو اس کے مستقبل سے آگاہ کردو اور بدی کے انجام سے ڈراؤ اور ایمان لانیوالوں کے حق میں خاص طور پر یہ ایک مؤثر پیغام نصیحت ثابت ہو۔

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ۳

چلو اسی پر جو اترا تم پر تمہارے رب کی طرف سے اور نہ چلو اس کے سوا اور رفیقوں کے پیچھے، تم بہت کم دھیان کرتے ہو

خلاصہ تفسیر: (اب عام امت کو خطاب ہے کہ جب قرآن کا منزل من اللہ ہونا ثابت ہوگیا تو) تم لوگ اس (کتاب کا) اتباع کرو جو تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے آئی ہے (کتاب کی اتباع یہ ہے کہ اس کی دل سے تصدیق بھی کرو اور اس پر عمل بھی) اور خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر (جس نے تمہاری ہدایت کے لئے قرآن نازل کیا) دوسرے رفیقوں کا اتباع مت کرو (جو تم کو گمراہ کرتے ہیں جیسے شیاطین الجن والانس مگر اس مشفقانہ فہمائش کے باوجود) تم لوگ بہت ہی کم نصیحت مانتے ہو۔

* * *

فائدہ: آدمی اگر حق تعالیٰ کی تربیت عظیم، اپنے آغاز وانجام اور طاعت ومعصیت کے نتائج پر پوری طرح دھیان کرے تو اس کو کبھی جرأت نہ ہو کہ اپنے رب کریم کی اتاری ہوئی ہدایات کو چھوڑ کر شیاطین الانس والجن کی رفاقت میں انہی کے پیچھے چلنا شروع کردے، گذشتہ اقوام میں سے جنہوں نے خدا کی کتابوں اور پیغمبروں کے مقابلہ پر ایسا رویہ اختیار کیا، ان کو جو دنیاوی سزا ملی، وہ آگے مذکور ہے۔

وَكَمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا فَجَآءَهَا بَاْسُنَا بَيَاتًا اَوْ هُمْ قَآئِلُوْنَ ۴

اور کتنی بستیاں ہم نے ہلاک کردیں کہ پہنچا ان پر ہمارا عذاب راتوں رات یا دوپہر کو سوتے ہوئے

فَمَا كَانَ دَعْوٰىهُمْ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَآ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ۵

پھر یہی تھی ان کی پکار جس وقت کہ پہنچا ان پر ہمارا عذاب کہ کہنے لگے بیشک ہمیں تھے گناہ گار

خلاصہ تفسیر: (پیچھے قرآن کا حق اور واجب الاتباع ہونا مذکور تھا، اب اس کے انکار ومخالفت پر دنیوی واخروی عذاب سے ڈراتے ہیں) اور کتنی ہی بستیاں ہیں کہ ان کو (یعنی ان کے رہنے والوں کو ان کے کفر اور جھٹلانے کی بناء پر) ہم نے تباہ وبرباد کردیا اور ان پر ہمارا عذاب (یا تو) رات کے وقت پہنچا (جو سونے اور آرام کرنے کا وقت ہے) یا ایسی حالت میں (پہنچا) کہ وہ دوپہر کے وقت آرام میں تھے (یعنی کسی کو کسی وقت، کسی کو کسی وقت) سو جس وقت ان پر ہمارا عذاب آیا اس وقت ان کے منہ سے بجز اس کے اور کوئی بات نہ نکلتی تھی کہ واقعی ہم ظالم (اور خطاوار) تھے (یعنی ایسے وقت اپنے جرم کا اقرار کیا جب کہ اقرار کا وقت گزر چکا تھا، یہ تو دنیوی عذاب ہوا)۔

* * *

فائدہ: یعنی جب ان کے ظلم وعدوان اور کفر وعصیان کی حد ہوچکی، تو دنیا کی لذات وشہوات میں منہمک اور عذاب الٰہی سے بالکل بے فکر ہوکر خواب استراحت کے مزے لینے لگے کہ یکایک ہمارے عذاب نے آدبوچا۔ پھر ہلاکت آفرینیوں کے اس دہشت ناک منظر اور ہنگامہ دار وگیر میں ساری طمطراق بھول گئے چاروں طرف سے اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ کی چیخ پکار کے سوا کچھ سنائی نہ دیتا تھا۔ گویا اس وقت انہیں واضح ہوا اور اقرار کرنا پڑا کہ

خدا کسی پر ظلم نہیں کرتا ہم خود ہی اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں۔

تنبیہ: فَجَآءَهَا بَأْسُنَا کی فاء میں مفسرین کے کئی قول ہیں، غالباً مترجم محقق قدس سرہ، نے اس کو اَهْلَكْنٰهَا کی تفسیر وتفصیل قرار دیا ہے جیسے کہا جائے: توضّأ فغسلَ وَجْهَه وذراعَيْهِ (فلاں شخص نے وضو کیا تو دھویا چہرہ اور ہاتھ وغیرہ) اس مثال میں منہ ہاتھ دھونا وضو کرنے ہی کی تفصیل وتفسیر ہے۔ اس طرح یہاں ہلاک کرنے کی تفسیر وتفصیل کیفیت عذاب کے بیان سے ہوگئی۔ واللہ اعلم۔

فَلَنَسْـَٔلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْـَٔلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ ۝

سو ہم کو ضرور پوچھنا ہے ان سے جن کے پاس رسول بھیجے گئے تھے اور ہم کو ضرور پوچھنا ہے رسولوں سے

خلاصہ تفسیر: پھر (اس کے بعد آخرت کے عذاب کا سامان ہوگا کہ قیامت میں) ہم ان لوگوں سے (بھی) ضرور پوچھیں گے جن کے پاس پیغمبر بھیجے گئے تھے (کہ تم نے پیغمبروں کا کہنا مانا یا نہیں؟ جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد ہے: ماذا اجبتم المرسلين کہ تم نے رسولوں کو کیا جواب دیا تھا) اور ہم پیغمبروں سے ضرور پوچھیں گے (کہ تمہاری امتوں نے تمہارا کہنا مانا یا نہیں؟ جیسا کہ پہلے آچکا ہے: يوم يجمع الله الرسل فيقول ماذا اجبتم، اور دونوں سوالوں سے کفار کو تنبیہ اور دھمکی مقصود ہوگی)۔

* * *

فائدہ: جن امتوں کی طرف پیغمبر مبعوث ہوئے، ان سے سوال ہوگا مَاذَآ اَجَبْتُمُ الْمُرْسَلِيْنَ (القصص: ٦٥) (تم نے ہمارے پیغمبروں کی دعوت کو کہاں تک قبول کیا تھا؟) اور خود پیغمبروں سے پوچھیں گے مَاذَآ اُجِبْتُمْ (تم کو امت کی طرف سے کیا جواب ملا تھا؟)

فَلَنَقُصَّنَّ عَلَيْهِمْ بِعِلْمٍ وَّمَا كُنَّا غَآئِبِيْنَ ۝

پھر ہم ان کو احوال سنائیں گے اپنے علم سے اور ہم کہیں غائب نہ تھے

خلاصہ تفسیر: پھر چونکہ ہم پوری خبر رکھتے ہیں خود ہی (سب کے روبرو ان کے اعمال کو) بیان کردیں گے، اور ہم (عمل کے وقت اور جگہ سے) غائب تو نہ تھے۔

* * *

فائدہ: یعنی تمہارا کوئی جلیل وحقیر اور قلیل وکثیر عمل یا ظاہری وباطنی حال ہمارے علم سے غائب نہیں، ہم بلا توسط غیرے ذرہ ذرہ سے خبردار ہیں، اپنے اس علم ازلی محیط کے موافق سب اگلے پچھلے احوال تمہارے سامنے کھول کر رکھ دیں گے، ملائکۃ اللہ کے لکھے ہوئے اعمال نامے بھی علم الٰہی کے سر مو خلاف نہیں ہو سکتے، ان کے ذریعہ سے اطلاع دینا محض ضابطہ کی مراعات اور نظام حکومت کا مظاہرہ ہے، ورنہ خدا اپنے علم میں ان ذرائع کا (معاذ اللہ) محتاج نہیں ہوسکتا۔

وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذِ ٟالْحَقُّ ۚ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝

اور تول اس دن ٹھیک ہوگی، پھر جس کی تولیں بھاری ہوئیں سو وہی ہیں نجات پانے والے

وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ بِمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَظْلِمُوْنَ ۝

اور جس کی تولیں ہلکی ہوئیں سو وہی ہیں جنہوں نے اپنا نقصان کیا اس واسطے کہ ہماری آیتوں کا انکار کرتے تھے

خلاصہ تفسیر: اور اس روز (یعنی قیامت کے دن اعمال وعقائد کا) وزن واقع ہونے والا ہے (تاکہ عام طور پر ہر ایک کی حالت

ظاہر ہوجائے) پھر (وزن کے بعد) جس شخص کا پلّہ (ایمان کا) بھاری ہوگا (یعنی وہ مؤمن ہوگا) سوایسے لوگ (تو) کامیاب ہوں گے (یعنی نجات پائیں گے) اور جس شخص کا پلّہ (ایمان کا) ہلکا ہوگا (یعنی وہ کافر ہوگا) تو یہ لوگ وہ ہوں گے جنہوں نے اپنا نقصان کرلیا بسبب اس کے کہ ہماری آیتوں کی حق تلفی کیا کرتے تھے (یعنی ان پر ایمان نہیں رکھتے تھے)۔

فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ: چونکہ قرآن کریم میں ظلم کا اطلاق اکثر کفر پر ہوتا ہے اس لیے اس اخیر آیت کو کفار کے بارہ میں سمجھا گیا ہے، اور مقابلہ کی وجہ سے پلہ بھاری ہونے کی تفسیر ''ایمان'' سے کی گئی، کیونکہ سورہ مؤمن میں ہلکے پلے والوں کے بارہ میں فرمایا ہے: **فِي جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ** کہ وہ جہنم میں ہمیشہ رہیں گے، معلوم ہوا کہ ہلکے پلے والے کافر ہیں اور بھاری پلے والے مؤمن ہیں، مگر اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ ایمان وکفر کے سوا باقی اعمال حسنہ یا سیئہ کا وزن نہ ہوگا، کیونکہ قرآن کریم کی بعض آیات اور بہت سی احادیث سے اعمال کا وزن کیا جانا معلوم ہوتا ہے، غرض اسی میزان میں ایمان وکفر کا بھی وزن کیا جائے گا۔

وزن اعمال کے متعلق جو تفصیلی بیان رسول کریم ﷺ کی احادیث میں آیا ہے اس میں ایک بات تو یہ قابل غور ہے کہ متعدد روایات حدیث میں آیا ہے کہ محشر کی میزان عدل میں سب سے بڑا وزنی کلمہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کا ہوگا، جس پلے میں یہ کلمہ ہوگا وہ سب سے بھاری رہے گا، ان روایات کا مقتضا تو یہ ہے کہ مومن کا پلہ ہمیشہ بھاری ہی رہے گا، خواہ وہ کتنے بھی گناہ کرے، لیکن قرآن مجید کی دوسری آیات اور بہت سی روایات حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان کی حسنات اور سیئات کو تولا جائے گا، کسی کی حسنات کا پلہ بھاری ہوگا، کسی کے گناہوں کا، جس کی حسنات کا پلہ بھاری رہے گا وہ نجات پائے گا، جس کی سیئات اور گناہوں کا پلہ بھاری ہوگا اس کو عذاب ہوگا۔

ان تمام آیات وروایات کا حاصل یہ ہے کہ مومن مسلمان کا پلہ کبھی بھاری کبھی ہلکا ہوگا، اس لئے بعض علماء تفسیر نے فرمایا کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ محشر میں وزن دو مرتبہ ہوگا: ① اول کفر وایمان کا وزن ہوگا، جس کے ذریعہ مؤمن، کافر کا امتیاز کیا جائے گا، اس وزن میں ایک پلہ خالی رہے گا اور ایک پلہ میں اگر وہ مؤمن ہے تو ایمان، اور اگر وہ کافر ہے تو کفر رکھا جائے گا، اس سے معلوم ہو گیا کہ کافر کا پلہ ایمان کا جو ہلکا ہوگا تو اس کی وجہ ایمان کی کمی نہیں بلکہ سرے سے ایمان کا نہ ہونا ہے، یعنی جو پلہ ایمان کے رکھنے کے واسطے مخصوص ہے وہ خالی ہوگا، اور دوسرے پلہ میں کفر ہوگا تو لامحالہ خالی پلہ بھرے پلہ کے مقابلہ میں ہلکا ہوگا، اور اس وزن میں جس کے نامہ اعمال میں صرف کلمہ ایمان بھی ہے اس کا پلہ بھاری ہوجائے گا، اور وہ کافروں کے گروہ سے الگ کردیا جائے گا، غرض اس تول سے مؤمن وکفر متمیز ہوجائیں گے ② پھر دوسرا وزن خاص مؤمنین کے لیے نیک وبد اعمال کا ہوگا، ایک پلہ میں ان کی نیکیاں اور دوسرے پلہ میں ان کی برائیاں رکھ کر اعمال کا وزن ہوگا، اور اسی کے مطابق اس کو جزاء وسزاء ملے گی، پھر اگر نیکیاں غالب ہوئیں تو جنت، اور اگر برائیاں غالب ہوئیں تو دوزخ، اور دونوں برابر ہوئے تو اعراف تجویز ہوگی، پھر سفارش کی وجہ سے خواہ سزا سے پہلے ہی یا سزا کے بعد دوزخ واعراف والے مسلمانوں کی مغفرت ہوجائے گی، اس طرح تمام آیات اور روایات کا مضمون اپنی اپنی جگہ درست اور مربوط ہوجاتا ہے۔

رہی یہ بات کہ اعمال تو اجسام نہیں ان کا وزن کیسے ہوگا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ وزن کے لیے جسم کا ہونا اس عالم دنیا کے ساتھ مخصوص ہے، عالم آخرت میں غیر اجسام کا بھی وزن ہوسکتا ہے، یا یہ کہ بعض روایات میں وارد ہے کہ نامہ اعمال کا وزن ہوگا اس پر تو اشکال ہی نہیں، پس بعض لوگوں نے جواب کی جو یہ صورت اختیار کی ہے کہ میزان ہی میں تاویل کردی اور اس سے ترازو ہی مراد نہیں لی یہ ظاہر نص کے بالکل خلاف ہے، احادیث میں اس کے لیے پلہ اور کانٹا ہونے کی صراحت ہے، پس ایسی تاویل جو بلا ضرورت ہو اور روایات کو توڑنے والی ہو ہرگز قبول نہیں اگرچہ کیسا ہی بڑا شخص کہے۔

فَمَنْ ثَقُلَتْ (الی قوله) الْمُفْلِحُوْنَ — وَمَنْ خَفَّتْ (الی قوله) خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ: اس سے یہ بھی سمجھ میں آتا ہے کہ دنیا کے اندر جو بظاہر نیک صالح دکھائی دیتا ہو اس کو صالح ہی سمجھنا چاہیے، اگرچہ اس میں کچھ برائی بھی پائی جائے، کیونکہ آخرت کے اندر جس کی نیکیاں غالب ہوں گی اس کو جنت میں بھیجا جائے گا تو دنیا میں بھی ایسا معاملہ مناسب ہے، لیکن ایسے آدمی پر یہ ضرور واجب ہے کہ جو کچھ غلطی اس میں پائی جاتی ہے اسے ختم کرنے کی فکر کرنی چاہیے۔

***

فائدہ: ۱؎ قیامت کے دن سب لوگوں کے اعمال کا وزن دیکھا جائے گا، جن کے اعمال قلبیہ و اعمال جوارح وزنی ہوں گے وہ کامیاب ہیں اور جن کا وزن ہلکا رہا وہ خسارہ میں رہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ: ''ہر شخص کے عمل وزن کے موافق لکھے جاتے ہیں، ایک ہی کام ہے، اگر اخلاص و محبت سے حکم شرعی کے موافق کیا، اور بر محل کیا، تو اس کا وزن بڑھ گیا اور دکھاوے کو، یا ریس کو کیا، یا موافق حکم نہ کیا، یا ٹھکانے پر نہ کیا تو وزن گھٹ گیا، آخرت میں وہ کاغذ تلیں گے جس کے نیک کام بھاری ہوئے تو برائیوں سے درگزر ہوا اور ہلکے ہوئے تو پکڑا گیا''۔

بعض علماء کا خیال ہے کہ اعمال جو اس وقت اعراض ہیں، وہاں اعیان کی صورت میں مجسد کر دیے جائیں گے، اور خود ان ہی اعمال کو تولا جائے گا، کہا جاتا ہے کہ ہمارے اعمال تو غیر قار الذات اعراض ہیں جن کا ہر جزء وقوع میں آنے کے ساتھ ہی ساتھ معدوم ہوتا رہتا ہے، پھر ان کا جمع ہونا تلنا کیا معنی رکھتا ہے؟ میں کہتا ہوں کہ گراموفون میں آجکل لمبی چوڑی تقریریں بند کی جاتی ہیں، کیا وہ تقریریں اعراض میں سے نہیں؟ جن کا ایک حرف ہماری زبان سے اس وقت ادا ہوسکتا ہے جب اس سے پہلا حرف نکل کر فنا ہو جائے پھر یہ تقریر کا سارا مجموعہ گراموفون میں کس طرح جمع ہو گیا؟ اسی سے سمجھ لو کہ جو خدا گراموفون کے موجد کا بھی موجد ہے اسکی قدرت سے کیا بعید ہے کہ ہمارے کل اعمال کے مکمل ریکارڈ تیار رکھے جس میں سے ایک شوشہ اور ذرہ بھی غائب نہ ہو۔

رہا ان کا وزن کیا جانا تو نصوص سے ہم کو اس قدر معلوم ہو چکا ہے کہ وزن ایسی میزان (ترازو) کے ذریعہ سے ہو گا جس میں کفتین اور لسان وغیرہ موجود ہیں، لیکن وہ میزان اور اس کے دونوں پلے کس نوعیت و کیفیت کے ہوں گے اور اس سے وزن معلوم کرنے کا کیا طریقہ ہو گا؟ ان باتوں کا احاطہ کرنا ہماری عقول و افہام کی رسائی سے باہر ہے، اسی لئے ان کے جاننے کی ہمیں تکلیف نہیں دی گئی، بلکہ ایک میزان کیا اس عالم کی جتنی چیزیں ہیں بجز اس کے کہ ان کے نام ہم سن لیں اور ان کا کچھ اجمالی سا مفہوم جو قرآن و سنت نے بیان کر دیا ہو عقیدہ میں رکھیں، اس سے زائد تفصیلات پر مطلع ہونا ہماری حد پرواز سے خارج ہے، کیونکہ جن نوامیس و قوانین کے ماتحت اس عالم کا وجود اور نظم و نسق ہو گا، ان پر ہم اس عالم میں رہتے ہوئے کچھ دسترس نہیں پاسکتے، اسی دنیا کی میزانوں کو دیکھو کتنی قسم کی ہیں، ایک میزان وہ ہے جس سے سونا چاندی یا موتی تلتے ہیں، ایک میزان سے غلہ اور سوختہ وزن کیا جاتا ہے، ایک میزان عام ریلوے اسٹیشنوں پر ہوتی ہے جس سے مسافروں کا سامان تولتے ہیں، ان کے سوا ''مقیاس الھوا'' یا ''مقیاس الحرارت'' وغیرہ بھی ایک طرح کی میزانیں ہیں جن سے ہوا اور حرارت وغیرہ کے درجات معلوم ہوتے ہیں، تھرمامیٹر ہمارے بدن کی اندرونی حرارت کو جو اعراض میں سے ہے تول کر بتلاتا ہے کہ اس وقت ہمارے جسم میں اتنے ڈگری حرارت پائی جاتی ہے، جب دنیا میں بیسیوں قسم کی جسمانی میزانیں ہم مشاہدہ کرتے ہیں جن سے اعیان و اعراض کے اوزان و درجات کا تفاوت معلوم ہوتا ہے تو اس قادر مطلق کے لئے کیا مشکل ہے کہ ایک ایسی حسی میزان قائم کر دے جس سے ہمارے اعمال کے اوزان و درجات کا تفاوت صورۃً وحساً ظاہر ہوتا ہو۔

فائدہ: ۲؎ اور آیات کا انکار کرنا ہی ان کی حق تلفی ہے جسے یظلمون سے ادا فرمایا ہے۔

وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۰﴾ ع ۸

اور ہم نے تم کو جگہ دی زمین میں اور مقرر کر دیں اس میں تمہارے لئے روزیاں، تم بہت کم شکر کرتے ہو

خلاصہ تفسیر: پیچھے عذاب کی یاددہانی کر کے انکار حق سے ڈرایا تھا، آگے اپنے احسانات اور نعمتوں کو یاد دلا کر قبول حق کی رغبت دلاتے ہیں، پہلے تربیت کی نعمت یہاں: مَكَّنّٰكُمْ میں مذکور ہے، پھر پیدا کرنے کی نعمت اگلی آیت میں: خلقنٰکم سے، اس کے ساتھ ہی قلنا للملئکۃ اسجدوا میں تیسری نعمت اکرام مذکور ہے، اور اسی تیسری نعمت کے ضمن میں ابلیس کے انکار حق کا قصہ اور اس کی محرومی اور ناکامی کا ذکر ہے تاکہ مخالفت اور نافرمانی کا برا نتیجہ معلوم ہو، اور منعم حقیقی کے مقابلہ میں ابلیس کی طرح تمرد اور سرکشی نہ کریں، جس سے اس طرف بھی اشارہ ہو گیا کہ ان منکروں کو ابلیس گمراہ کر رہا ہے۔

اور بیشک ہم نے تم کو زمین پر رہنے کی جگہ دی، اور ہم نے تمہارے لئے اس (زمین) میں سامان زندگی پیدا کیا (جس کا مقتضی یہ تھا کہ تم اس کے شکریہ میں فرمانبردار و اطاعت شعار ہوتے، لیکن) تم لوگ بہت ہی کم شکر کرتے ہو (مراد اس سے اطاعت ہے اور "کم" اس لئے فرمایا کہ تھوڑا بہت نیک کام تو اکثر لوگ کر ہی لیتے ہیں، لیکن ایمان نہ ہونے کی وجہ سے وہ قابل اعتبار نہیں)۔

وَلَقَدۡ مَكَّنّٰكُمۡ فِي الۡاَرۡضِ وَجَعَلۡنَا لَكُمۡ فِيۡهَا مَعَايِشَ: اول (تمکین فی الارض) کا حاصل جاہ ہے اور ثانی (سامان معیشت) کا حاصل مال ہے، ان دونوں کا منت و احسان کے موقع پر ذکر کرنا ان نعمتوں کے قابل شکر ہونے کی دلیل ہے، سو یہ دونوں چیزیں مذموم نہیں، ہاں! ان کے حاصل کرنے میں انہماک بیشک مذموم ہے۔

***

فائدہ: یہاں سے بعض آیات آفاقیہ وانفسیہ کا بیان شروع کیا ہے جس سے ایک طرف حق تعالیٰ کے وجود پر کارخانہ عالم کے حکیمانہ نظم ونسق سے استدلال اور احسانات وانعامات الٰہیہ کا تذکرہ فرما کر اس کی شکر گذاری کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور دوسری طرف نبوت کی ضرورت انبیاء علیہم السلام کی آمد، ان کی سیرت، ان کے متبعین ومخالفین کا انجام جو اس سورت کا اصلی موضوع معلوم ہوتا ہے، اس کے بیان کے لئے یہ آیات بطور توطیہ وتمہید کے مقدم کی گئی ہیں۔

وَلَقَدۡ خَلَقۡنٰكُمۡ ثُمَّ صَوَّرۡنٰكُمۡ ثُمَّ قُلۡنَا لِلۡمَلٰٓئِكَةِ اسۡجُدُوۡا لِاٰدَمَ ۖ فَسَجَدُوۡۤا اِلَّاۤ اِبۡلِيۡسَ ؕ

اور ہم نے تم کو پیدا کیا پھر صورتیں بنائیں تمہاری پھر حکم کیا فرشتوں کو کہ سجدہ کرو آدم کو پس سجدہ کیا سب نے مگر ابلیس

لَمۡ يَكُنۡ مِّنَ السّٰجِدِيۡنَ ۝۱۱

نہ تھا سجدہ والوں میں

خلاصہ تفسیر: اور ہم نے تم کو پیدا (کرنے کا سامان شروع) کیا (یعنی آدم علیہ السلام کا مادّہ بنایا، اسی مادّے سے تم سب لوگ ہو) پھر (مادہ بنا کر) ہم نے تمہاری صورت بنائی (یعنی اس مادّے میں آدم علیہ السلام کی صورت بنائی، پھر وہی صورت ان کی اولاد میں چلی آرہی ہے، یہ نعمت تخلیق ہوئی) پھر (جب آدم علیہ السلام بن گئے اور علوم اسماء سے مشرف ہوئے تو) ہم نے فرشتوں سے فرمایا کہ آدم کو (اب) سجدہ کرو (یہ نعمت اکرام ہوئی) تو سب فرشتوں نے سجدہ کیا، بجز ابلیس کے کہ وہ سجدہ کرنے والوں میں شامل نہ ہوا۔

سورہ بقرہ کے چوتھے رکوع میں اس کی تفصیل گذر چکی ہے وہاں ملاحظہ کرلیا جائے۔

قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسۡجُدَ اِذۡ اَمَرۡتُكَ ؕ قَالَ اَنَا خَيۡرٌ مِّنۡهُ ۚ خَلَقۡتَنِيۡ مِنۡ نَّارٍ وَّخَلَقۡتَهٗ مِنۡ طِيۡنٍ ۝۱۲

کہا تجھ کو کیا مانع تھا کہ تو نے سجدہ نہ کیا جب میں نے حکم دیا، بولا میں اس سے بہتر ہوں، مجھ کو تو نے بنایا آگ سے اور اس کو بنایا مٹی سے

خلاصہ تفسیر: حق تعالیٰ نے فرمایا تو جو سجدہ نہیں کرتا تجھ کو اس سے کونسا امر مانع ہے، جب کہ میں (خود) تجھ کو سجدہ کا حکم دے چکا، کہنے لگا (وہ مانع یہ ہے کہ) آپ نے مجھ کو آگ سے پیدا کیا اور اس (آدم) کو آپ نے خاک سے پیدا کیا ہے۔

اَنَا خَيۡرٌ مِّنۡهُ ۚ خَلَقۡتَنِيۡ مِنۡ نَّارٍ: یہ شیطانی استدلال کا پہلا مقدمہ ہے، اور ۲ دوسرا مقدمہ جس کا ذکر نہیں کیا وہ یہ ہے کہ آگ بوجہ نورانی ہونے کے خاک سے افضل ہے ۳ تیسرا مقدمہ یہ ہے کہ افضل کی فرع اور اولاد بھی غیر افضل کی فرع سے افضل ہوتی ہے ۴ چوتھا مقدمہ یہ ہے کہ افضل کا غیر افضل یعنی ادنی کو سجدہ کرنا نامناسب ہے، ان چاروں مقدمات کو ملا کر شیطان نے اپنے سجدہ نہ کرنے کی یہ دلیل بنائی کہ میں افضل ہوں، اس لئے میں

نے غیر افضل کو سجدہ نہیں کیا، مگر پہلے مقدمہ کے سوا سارے ہی مقدمات غلط ہیں، اور پہلا مقدمہ بھی عام انسانوں کے حق میں اس معنی سے صحیح ہے کہ انسان کی تخلیق میں غالب جز و مٹی کا ہے، باقی مقدمات سب غلط اور باطل ہیں، دوسرے مقدمہ میں یہ غلطی ہے کہ آگ کا خاک پر افضل ہونا ایک جزوی فضیلت تو ہو سکتی ہے، کلی طور پر اس کو افضل کہنا ایسا دعویٰ ہے جو بے دلیل ہے، کیونکہ عناصر میں کسی کو دوسرے پر کلی فضیلت نہیں، اگر ایک عنصر میں ایک فضیلت ہے تو دوسرے عنصر میں دوسری فضیلت ہے، اور جزئی فضیلت دعویٰ کے لیے مفید نہیں، تیسرا مقدمہ اس لیے غلط ہے کہ بعض اوقات مؤمن کی اولاد کافر، اور کافر کی اولاد مؤمن، شریف کی اولاد رذیل اور نالائق کی اولاد لائق ہوتی ہے تو یہ کچھ ضروری نہیں کہ آگ اگر خاک سے کسی بات میں افضل ہو تو اس سے بننے والی چیزیں بھی خاک سے بنی ہوئی چیزوں سے افضل ہوں، چوتھا مقدمہ اس لیے غلط ہے کہ ممکن ہے ادنیٰ کی تعظیم اعلیٰ سے کرانے میں کوئی حکمت ہو، مثلاً یہی کہ اعلیٰ کا نفس مہذب ہو جائے، اس میں تواضع پیدا ہو، جب سب مقدمات باطل ہیں تو نتیجہ بھی غلط ہے۔

جن لوگوں نے اس قصہ سے قیاس فقہی کو باطل کیا ہے سخت غلطی ہے، ابلیس جو کافر ہوا اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے حق تعالیٰ کے حکم پر اعتراض کیا جس کا منشا تکبر تھا اور یہ کفر ہے، ورنہ اگر تحقیق کی غرض سے کسی حکم کی حکمت کا سوال کرے تو وہ کفر نہیں، ابلیس کے مردود ہونے کی وجہ یہ ہے اس نے محض اپنی رائے سے حکم خداوندی کے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور غرور و تکبر کی وجہ سے اس کو غیر معقول اور مستحسن قرار دیا اور ایسے قیاس کا دنیا میں کوئی امام اور مجتہد قائل نہیں کہ جو صریح حکم خداوندی کے خلاف ہو، قیاس اس وقت کیا جاتا ہے کہ جب کتاب وسنت اور اجماع امت سے کوئی حکم صراحۃً ثابت نہ ہو، امور منصوصہ میں کوئی شخص بھی قیاس کا قائل نہیں، نص پر تو بے چون و چرا عمل فرض ہے، اس قصہ سے اس قیاس کی برائی ظاہر ہوتی ہے کہ جو نص صریح کے معارضہ اور مقابلہ میں کیا جائے، مطلق قیاس کی مذمت ظاہر نہیں ہوتی اور ائمہ مجتہدین کا قیاس وحی خداوندی اور ارشاد نبوی کے تابع ہوتا ہے۔

نص صریح پر اپنی رائے کو ترجیح دینے میں یعنی جو شخص اپنی رائے یا رؤیت کو خواہ کشف سے ہو یا وجدان و ذوق سے ہو شریعت پر ترجیح دیتا ہو تو ایسا شخص ابلیس کا وارث ہے۔

قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا فَاخْرُجْ اِنَّكَ مِنَ الصّٰغِرِيْنَ ⑬

کہا تو اتر یہاں سے ۱؎ تو اس لائق نہیں کہ تکبر کرے یہاں پس باہر نکل تو ذلیل ہے ۲؎

خلاصہ تفسیر: حق تعالیٰ نے فرمایا (جب تو ایسا نافرمان ہے) تو آسمان سے نیچے اتر، تجھ کو کوئی حق حاصل نہیں کہ تو تکبر کرے (خاص کر) آسمان میں رہ کر (جہاں سب فرمانبرداروں ہی کا مقام ہے) تو (یہاں سے) نکل (دور ہو) بیشک تو (اس تکبر کی وجہ سے) ذلیلوں میں شمار ہونے لگا (اور آسمان عزت والوں کے رہنے کی جگہ ہے اس لیے یہاں نکل)۔

قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا: یعنی درگاہ الٰہی سے دور ہو، کیونکہ تکبر اس درگاہ کے منافی ہے، کبر و غرور کی بنا پر جنت سے نکالا جانا اس بات کی دلیل ہے کہ کبر وصول حق سے مانع ہے (یعنی جن کے دلوں میں کبر و نخوت ہوگا انہیں رضائے الٰہی حاصل نہیں ہوتی)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی تمہاری تخلیق سے پہلے رہنے سہنے اور کھانے پینے کا سامان کیا، پھر تمہارا مادہ پیدا فرمایا، پھر اس مادہ کو ایسا دلکش نقشہ اور حسین و جمیل صورت عطا کی جو کسی دوسری مخلوق کو عطا نہ کی گئی تھی، پھر اس تصویر خاکی کو وہ روح اور حقیقت مرحمت ہوئی جس کی بدولت تمہارے باپ آدم علیہ السلام جن کا وجود تمام افراد انسانی کے وجود پر اجمالاً مشتمل تھا، ''خلیفۃ اللہ'' و ''مسجود ملائکہ'' بنے، پھر جس نے اس وقت سجود تعظیمی سے سرتابی کی وہ مردود ازلی ٹھہرا کیونکہ وہ سجود خلافت الٰہیہ کے نشان کے طور پر تھا ''ملائکۃ اللہ'' جو بحث و تمحیص اور صریح امتحان کے بعد آدم کی علمی فضیلت اور روحانی کمالات پر مطلع ہو چکے تھے حکم الٰہی سنتے ہی سجدہ میں گر پڑے اور اس طرح خلیفۃ اللہ کے روبرو اپنے پروردگار حقیقی کی کامل وفاشعاری اور اطاعت پذیری کا ثبوت دیا اور ابلیس لعین جو ناری الاصل جنی مگر کثرت عبادت وغیرہ کی وجہ سے زمرہ ملائکہ میں شامل ہو گیا تھا، آخر کار اپنی اصل کی طرف لوٹا، اس کی نظر آدم کی

مادی ساخت سے نفخت فیہ من روحی کے راز تک تجاوز نہ کرسکی، اسی لئے صریح حکم الٰہی کے مقابلہ پر انا خیر منہ خلقتنی من نار وخلقتہ من طین کا دعویٰ کرنے لگا، آخر اسی اباء واستکبار اور نص صریح قاطع کو محض رائے وہوا سے رد کردینے اور خدا سے بحث ومناظرہ ٹھان لینے کی پاداش میں ہمیشہ کے لئے مرتبہ قرب سے نیچے گرادیا اور رحمت الٰہیہ سے بہت دور پھینک دیا گیا، فی الحقیقت جس چیز پر اسے بڑا فخر تھا کہ وہ آگ سے پیدا ہوا ہے، وہ ہی اس کی ہلاکت ابدی کا سبب ہوئی، آگ کا خاصہ خفت وحدت، سرعت وطیش اور علو وافساد ہے بخلاف مٹی کے کہ اس میں مستقل مزاجی، متانت اور متواضعانہ حلم وتثبت پایا جاتا ہے، ابلیس جو ناری الاصل تھا سجدہ کا حکم سن کر آگ بگولا ہوگیا اور رائے قائم کرنے میں تیزی اور جلد بازی دکھلائی، چنانچہ ان کی استقامت وانابت نے ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰى کا نتیجہ پیدا کیا، اسی لئے کہا جاسکتا ہے کہ ابلیس لعین نے مادی وعنصری لحاظ سے بھی اپنی تفصیل کے دعوے میں ٹھوکر کھائی، چنانچہ حافظ شمس الدین ابن القیمؒ نے بدائع الفوائد میں پندرہ وجوہ سے مٹی کا آگ سے افضل ہونا ثابت کیا ہے، من شآء فلیر اجعہ۔

فائدہ: ۲ یعنی جنت میں یا آسمانوں پر خدا کی مخلوق رہ سکتی ہے جو خدا کی پوری مطیع وفرمانبردار ہو، نافرمان متکبروں کے لئے وہاں گنجائش نہیں، بہرحال ابلیس لعین عزت کے اس مقام سے جس پر کثرت عبادت وغیرہ کی وجہ سے اب تک فائز تھا، بڑا بول بولنے کی بدولت نیچے دھکیل دیا گیا۔

تنبیہ: ابلیس کے مدت دراز تک زمرہ ملائکہ میں شامل رکھنے سے متنبہ کردیا ہے کہ حق تعالیٰ نے مکلفین میں کسی کی فطرت حتیٰ کہ شیطان کی بھی ایسی نہیں بنائی کہ وہ صرف بدی کی طرف جانے کے لئے مجبور ومضطر ہوجائے، بلکہ خبیث سے خبیث ہستی بھی اصل فطرت کے اعتبار سے اس کی صلاحیت رکھتی ہے کہ اپنے کسب واختیار سے نیکی اور پرہیزگاری میں انتہائی ترقی کرکے زمرہ ملائکہ میں جا ملے۔

قَالَ اَنْظِرْنِيْٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴿۱۴﴾ قَالَ اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ﴿۱۵﴾

بولا کہ مجھے مہلت دے اس دن تک کہ لوگ قبروں سے اٹھائے جائیں، فرمایا تجھ کو مہلت دی گئی

خلاصہ تفسیر: وہ کہنے لگا مجھ کو مہلت دیجئے قیامت کے دن تک، اللہ تعالیٰ نے فرمایا تجھ کو مہلت دی گئی۔

اَنْظِرْنِيْٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ: بظاہر مہلت کا وہی وقت منظور کیا گیا جو اس نے درخواست میں عرض کیا تھا، اور دوسری آیت میں الی یوم الوقت المعلوم آیا ہے، دونوں سے ایک ہی مراد ہے، پھر شیطان کے مرنے کے وقت میں کلام ہوا ہے، کعب احبار سے خاص یوم حشر میں اس کا مرنا منقول ہے، رہا یہ اشکال کہ وہ تو زندہ ہونے کا دن ہے، بعض نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ ممکن ہے کہ اس کے اول حصہ میں مار کر پھر زندہ کیا جائے، اور حاکم نے عبداللہ مسعودؓ سے قیامت کے قریب دابۃ الارض کا اس کو قتل کرنا نقل کیا ہے اور اس آیت کو بھی اسی پر محمول کیا ہے اور یہ کہا ہے کہ شیطان کی درخواست ناتمام منظور ہوئی، اس نے قیامت تک مہلت مانگی تھی، مگر قرب قیامت تک قبول ہوئی، مجھے یہ قول بعید معلوم ہوتا ہے، کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو قرآن میں ضرور کوئی قید مذکور ہوتی جس قید کے حذف کرنے سے مقصود کے خلاف کا وہم ہوا اس کا حذف کرنا مقتضی حال کے خلاف ہے۔

قَالَ اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ: کیا کافر کی دعا بھی قبول ہوسکتی ہے؟ یہ سوال اس لئے پیدا ہوتا ہے کہ آیت قرآنی وما دُعٰٓؤا الکٰفرین الا فی ضلٰل سے بظاہر یہ سمجھا جاتا ہے کہ کافر کی دعا قبول نہیں ہوتی، مگر اس واقعہ ابلیس اور آیت مذکورہ سے قبولیت دعا کا اشکال ظاہر ہے، جواب یہ ہے کہ دنیا میں تو کافر کی دعا بھی قبول ہوسکتی ہے، یہاں تک کہ ابلیس جیسے اکفر کی دعا بھی قبول ہوگئی، مگر آخرت میں کافر کی دعا قبول نہ ہوگی، اور آیت مذکورہ وما دُعٰٓؤا الکٰفرین الا فی ضلٰل آخرت کے متعلق ہے، دنیا سے اس کا کوئی تعلق نہیں، چنانچہ یہاں اس آیت سے معلوم ہوا ہے کہ بسا اوقات دنیا میں کافر کی دعا بھی قبول ہوجاتی ہے مگر اس سے اکرام اور محبت لازم نہیں آتی، کبھی غایت کرم سے دشمن کی بات بھی پوری کردی جاتی ہے اس سے وہ دوست نہیں ہوجاتا۔

رب العزت جل شانہ کی بارگاہ قدس میں فرشتوں اور رسولوں کو بھی ہیبت وجلال کی بناء پر مجال دم زدنی نہیں تھی، ابلیس کو ایسی جرأت کیسے ہوگئی کہ بارگاہ عزت وجلال میں ایسی بیباکانہ گفتگو کی؟ علماء نے فرمایا کہ یہ قہر الٰہی کا انتہائی سخت مظہر ہے کہ ابلیس کے مردود ہوجانے کے باعث ایک ایسا حجاب حائل ہوگیا جس نے اس پر حق تعالیٰ کی عظمت وجلال کو مستور کردیا اور بے حیائی اس پر مسلط کردی۔

رہا یہ سوال کہ شیطان کو مہلت کیوں دی گئی؟ اس کا حقیقی جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حکمتوں کا احاطہ نہیں ہوسکتا، اور ظاہری حکمتیں تو ظاہر ہیں، اور جاننا چاہیے کہ یہ قصہ قرآن میں کئی جگہ مختلف الفاظ سے آیا ہے، اور ظاہر ہے کہ واقعہ کسی خاص طور پر ہوا تھا، پھر سب کی صحت کی کیا صورت ہے، اصل یہ ہے کہ واقعہ اگرچہ خاص طور پر واقع ہوا ہو، لیکن اس کی حکایت بعینہ انہی الفاظ سے ہونا ضروری نہیں، بلکہ نفس مضمون محفوظ رہنا چاہیے، لفظی تعبیر ہر مقام کے مناسب مختلف طور سے ہوسکتی ہے۔

قَالَ اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ: اس میں اس بات پر بھی دلالت ہے کہ کسی کی دعا کا قبول ہوجانا اللہ کے ہاں مقبولیت یا رضائے الٰہی کی کافی دلیل نہیں ہے، دعا تو شیطان مردود کی بھی قبول ہوگئی لیکن مردود تو مردود ہی رہا۔

* * *

فائدہ: یعنی جب تو نے یہ درخواست کی تو سمجھ لے کہ یہ پہلے سے علم الٰہی میں طے شدہ ہے کہ تجھ کو مہلت دی جائے، جب حکمت الٰہیہ مقتضی ہوئی کہ حق تعالیٰ اپنی صفات کمالیہ و شہنشاہانہ عظمت و جبروت کا مظاہرہ کرے تو اس نے عالم کو پیدا فرمایا: اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ ۭ يَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَيْنَهُنَّ لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (الطلاق: ۱۲) یعنی زمین و آسمان کی تخلیق اور ان کے کل نظم و نسق سے مقصود یہ ہے کہ خدا کی قدرت کاملہ اور علم محیط وغیرہ صفات کی معرفت لوگوں کو حاصل ہو، اسی معرفت الٰہیہ کو آیت وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ میں بعض سلف کی تفسیر کے موافق عبادت سے تعبیر فرمایا ہے اور ظاہر ہے کہ تخلیق عالم سے یہ غرض بوجہ اتم جب ہی پوری ہوسکتی ہے کہ مخلوقات میں اس کی ہر قسم کی صفات و کمالات کا اظہار ہو، اور یہ جب ہی ہوسکتا ہے کہ عالم میں مطیع و وفادار اور باغی و مجرم ہر قسم کی مخلوق موجود ہو، نیز اعداء اللہ کو پوری زور آزمائی اور ان کے پیدائشی اختیار و قوت کے تمام وسائل استعمال کرنے کی آخری حد تک مہلت و آزادی دی جائے، پھر انجام کار حکومت الٰہیہ کا لشکر غالب ہو، دشمن اپنے کیفر کردار کو پہنچیں اور بعد امتحان آخری کامیابی دوستوں کے ہاتھ رہے، اس کے بدون کل صفات کمالیہ کے ظاہر ہونے کی صورت نہیں، پس خیر و شر اور منبع خیر و شر کا پیدا کرنا، اسی حکمت سے ہے کہ جو غرض تخلیق عالم کی ہے یعنی ''صفات کمالیہ کا مظاہرہ'' وہ بغیر اس کے پوری نہ ہوسکتی تھی وَلَوْ شَاۗءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ (ہود: ۱۸۔۱۹) اسی لئے ضروری ہوا کہ عدو اکبر ابلیس لعین کو جو منبع شر ہے پوری مہلت دی جائے کہ وہ تا قیام قیامت اپنے قویٰ و وسائل کو جی کھول کر استعمال کرلے لیکن یہ چیز ظاہر ہے کہ براہ راست اس محیط کل اور قادر مطلق کے مقابلہ پر ممکن نہ تھی، اس لئے ضروری ہوا کہ خدا کی طرف سے بطور نیابت و خلافت ایک ایسی مخلوق مقابلہ پر لائی جائے جس سے ابلیس لعین کو آزادی کے ساتھ جنگ آزمائی کا موقع مل سکے وَاَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ وَشَارِكْهُمْ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ وَعِدْهُمْ (الاسراء: ۶۴) اور پھر جب تک وہ مخلوق حق نیابت اور وظیفہ خلافت ادا کرتی رہے، خاص شاہی فوج (ملائکہ) سے اس کو کمک پہنچائی جائے اور باوجود ضعف و قلت کے اپنے فضل رحمت سے انجام کار دشمنوں کے مقابلہ میں مظفر و منصور کیا جائے۔

پس خوب سمجھ لو کہ یہ زمین ابلیس اور آدم کا میدان جنگ ہے اور چونکہ پوری طرح جان توڑ مقابلہ اسی وقت ہوسکتا تھا کہ دونوں حریف ایک دوسرے سے خار کھائے ہوں، اس لئے تکویناً دو صورتیں ایسی پیش آگئیں جن سے ہر ایک کے دل میں دوسرے کی دشمنی جاگزیں ہوجائے، ابلیس آدم کو سجدہ نہ کرنے کی بناء پر نیچے گرایا گیا اور آدم کو ابلیس کی وسوسہ اندازی کی بدولت جنت سے علیحدہ ہونا پڑا، ان واقعات سے ہر ایک کے دل میں دوسرے کی عداوت کی جڑ قائم ہو کر معرکہ کارزار گرم ہوگیا، والحرب سجال وانما العبرة للخواتیم۔

قَالَ فَبِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ ﴿۱۶﴾

بولا تو جیسا تو نے مجھے گمراہ کیا ہے میں بھی ضرور بیٹھوں گا ان کی تاک میں تیری سیدھی راہ پر

خلاصہ تفسیر: وہ کہنے لگا کہ بسبب اس کے کہ آپ نے مجھ کو (تکوینی حکم سے) گمراہ کیا ہے قسم کھاتا ہوں کہ میں ان (کے یعنی آدم اور اولاد آدم کی رہزنی کرنے) کے لئے آپ کی سیدھی راہ پر (جو کہ دین حق ہے جا کر) بیٹھ جاؤں گا۔

قَالَ فَبِمَآ اَغۡوَيۡتَنِيۡ: شیطان نے جو اغواء یعنی گمراہ کرنے کی نسبت حق تعالی کی طرف کی یہ "كلمة حق أريد بها الباطل" کا مصداق ہے (یعنی بات تو حق ہے لیکن اس بات سے مقصد باطل ہے) اگرچہ یہ بات فی نفسہ صحیح ہے کہ حق تعالی ہی ہر چیز کے خالق ہیں، لیکن ابلیس کا مقصد اعتراض ہے اور یہ باطل اور محض گمراہی ہے، حضرت آدم علیہ السلام کا اپنی لغزش کو اپنی طرف منسوب کرنا اور ربنا ظلمنا کہنا (اے پروردگار !ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا) اور ابلیس کا اپنے جرم کو خدا کی طرف منسوب کرنا کہ اس طرح کہا کہ: رب بما اغويتني (اے پروردگار! تو نے مجھے گمراہ کیا) اپنے گمراہی کو خدا کی طرف منسوب کیا، پس ابلیس تو جرم کر کے جبری محض بن گیا کہ اغواء کی نسبت باری تعالی کی طرف کر دی اور خود بری الذمہ اور بے تعلق بن گیا، اور حضرت آدم نے ظلمنا انفسنا کہہ کر ظلم کو اپنی نفس کی طرف منسوب کیا، حضرت آدم کو خوب معلوم تھا کہ ہر چیز کا خالق خدا تعالیٰ ہے اور بندہ کاسب اور مرتکب ہے، مگر حضرت آدم نے اپنی تقصیر کو اپنی طرف منسوب کیا اور ادب کی وجہ سے خالق کی طرف منسوب نہیں کیا۔

اہلسنت والجماعت کا مسلک نہایت معتدل اور متوسط ہے جو جبر اور قدر کے درمیان ہے کہ افعال کا خالق تو اللہ تعالیٰ ہی ہے، مگر بندہ خداداد قدرت اور اختیار سے ان افعال کا کاسب اور مرتکب ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی رہزنوں کی طرح ان کے ایمانوں پر ڈاکہ ماروں گا جن کے سبب مجھے یہ روز بد دیکھنا پڑا۔

ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمۡ مِّنۡۢ بَيۡنِ اَيۡدِيۡهِمۡ وَمِنۡ خَلۡفِهِمۡ وَعَنۡ اَيۡمَانِهِمۡ وَعَنۡ شَمَآئِلِهِمۡ ؕ وَلَا تَجِدُ

پھر ان پر آؤں گا ان کے آگے سے اور پیچھے سے اور دائیں سے اور بائیں سے ۱؎ اور نہ پائے گا تو

اَكۡثَرَهُمۡ شٰكِرِيۡنَ ﴿۱۷﴾

اکثروں کو ان میں شکر گزار ۲؎

خلاصہ تفسیر: پھر ان پر (ہر چار طرف سے) حملہ کروں گا ان کے آگے سے بھی پیچھے سے بھی اور ان کی داہنی جانب سے بھی اور بائیں جانب سے بھی (یعنی ان کے بہکانے میں کوشش کا کوئی پہلو باقی نہ چھوڑوں گا تا کہ وہ آپ کی عبادت نہ کرنے پائیں) اور (میں اپنی کوشش میں کامیاب ہوں گا، چنانچہ) آپ ان میں سے اکثروں کو (آپ کی نعمتوں کا) احسان ماننے والا نہ پائیں گے۔

مِّنۡۢ بَيۡنِ اَيۡدِيۡهِمۡ وَمِنۡ خَلۡفِهِمۡ وَعَنۡ اَيۡمَانِهِمۡ: شیطان کا حملہ انسان پر صرف چار طرف میں محدود نہیں بلکہ عام ہے، قرآن عزیز کی مذکورہ آیت میں یہ مذکور ہے کہ ابلیس نے اولاد آدم کو گمراہ کرنے کے لئے چار جانب کو بیان کیا ہے، آگے پیچھے، دائیں بائیں، لیکن یہاں درحقیقت کوئی تحدید مقصود نہیں، بلکہ مراد یہ ہے کہ ہر سمت سے اور ہر پہلو سے، اس لئے اوپر کی جانب یا پاؤں تلے سے گمراہ کرنے کا احتمال اس کے منافی نہیں، اسی طرح حدیث میں جو یہ مذکور ہے کہ شیطان انسان کے بدن میں داخل ہو کر خون کی رگوں کے ذریعہ پورے بدن انسان پر تصرف کرتا ہے، یہ بھی اس کے منافی نہیں۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی ہر طرف سے ان پر حملہ آور ہونگا، جہات اربعہ کا ذکر تعمیم جہات کی طرف اشارہ کرنے کے لئے ہے۔

فائدہ: ۲؎ یہ ابلیس لعین کا تخمینہ تھا جو صحیح نکلا وَلَقَدۡ صَدَّقَ عَلَيۡهِمۡ اِبۡلِيۡسُ ظَنَّهٗ فَاتَّبَعُوۡهُ اِلَّا فَرِيۡقًا مِّنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ (سبا:۲۰)

قَالَ اخۡرُجۡ مِنۡهَا مَذۡءُوۡمًا مَّدۡحُوۡرًا ؕ لَمَنۡ تَبِعَكَ مِنۡهُمۡ لَاَمۡلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنۡكُمۡ اَجۡمَعِيۡنَ ﴿۱۸﴾

کہا نکل یہاں سے برے حال سے مردود ہو کر، جو کوئی ان میں سے تیری راہ پر چلے گا تو میں ضرور بھر دوں گا دوزخ کو تم سب سے

خلاصہ تفسیر: اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہاں (آسمان) سے ذلیل وخوار ہو کر نکل جا (اور تو جو اولاد آدم کو بہکانے کو کہتا ہے تو جو تیرا جی چاہے کر لے، میں سب سے بے نیاز ہوں، نہ کسی کے راہ راست پر آنے سے میرا کوئی فائدہ ہے، نہ گمراہ ہونے سے کوئی نقصان) جو شخص ان میں سے

تیرا کہنا مانے گا میں ضرور تم سے (یعنی ابلیس اور اس کی بات ماننے والوں سے) جہنم کو بھر دوں گا۔

اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُوْمًا مَّدْحُوْرًا: آیات مذکورہ میں شیطان کو آسمان سے نکل جانے کا حکم دو مرتبہ ذکر کیا گیا ہے، کچھ پہلے: فَاخْرُجْ اِنَّكَ مِنَ الصّٰغِرِيْنَ میں اور یہاں دوسرا: قال اخرج منها مذءوما مدحورا میں، غالباً پہلا حکم تجویز تھی، اور یہاں دوسرے حکم میں اس کا نفاذ ہے، اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ دوسرا حکم پہلے کی تاکید ہو، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ہم کلام ہونا بھی قبولیت کی علامات میں سے نہیں ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی اکثر آدمی ناشکرے ہوں گے تو ہمارا کیا بگاڑیں گے، انجام کار ان ہی تھوڑے وفاداروں کے لئے کامیابی اور فلاح ہوگی اور ناشکروں کی کثرت دوزخ کی نذر ہو جائے گی، گویا اس طرح واضح کر دیا جائے گا کہ جنود الشیطان کی اس قدر کثرت بھی ''خلیفۃ اللہ'' کے قلیل التعداد لشکر کو مغلوب و مقہور نہیں کر سکی۔

وَيٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ فَكُلَا مِنْ حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ

اور اے آدم رہ تو اور تیری عورت جنت میں پھر کھاؤ جہاں سے چاہو اور پاس نہ جاؤ اس درخت کے

فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿١٩﴾

پھر تم ہو جاؤ گے گناہ گار

خلاصہ تفسیر: اور (ہم نے آدم علیہ السلام کو حکم دیا کہ) اے آدم! تم اور تمہاری بیوی (حواء) جنت میں رہو پھر جس جگہ سے چاہو (اور جس چیز کو چاہو) دونوں آدمی کھاؤ اور (اتنا خیال رہے کہ) اس (خاص) درخت کے پاس (بھی) مت جاؤ (یعنی اس کا پھل نہ کھاؤ) کبھی ان لوگوں کے شمار میں آجاؤ جن سے نامناسب کام ہو جایا کرتے ہیں۔

* * *

فائدہ: آدم و حوا کو اجازت تھی کہ بلا روک ٹوک جو چاہیں کھائیں پئیں، بجز ایک معین درخت کے جس کا کھانا ان کی بہشتی زندگی اور استعداد کے مناسب نہ تھا، اسے فرمادیا کہ اس کے پاس نہ جاؤ ورنہ نقصان اٹھاؤ گے۔

میرے نزدیک یہاں فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ کا ترجمہ اگر یوں کیا جاتا تو زیادہ موزوں ہوتا ''پھر ہو جاؤ گے تم نقصان اٹھانے والوں میں سے''، ظلم کے معنی نقصان اور کمی و کوتاہی کے آتے ہیں جیسا کہ وَلَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَيْئًا (الکہف: ۳۳) میں۔

فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَا وٗرِيَ عَنْهُمَا مِنْ سَوْاٰتِهِمَا وَقَالَ مَا نَهٰكُمَا

پھر بہکایا ان کو شیطان نے تاکہ کھول دے ان پر وہ چیز کہ ان کی نظر سے پوشیدہ تھی ان کی شرمگاہوں سے اور وہ بولا کہ تم کو نہیں روکا

رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ ﴿٢٠﴾ وَقَاسَمَهُمَآ اِنِّيْ

تمہارے رب نے اس درخت سے مگر اسی لیے کہ کبھی تم ہو جاؤ فرشتے یا ہو جاؤ ہمیشہ رہنے والے، اور ان کے آگے قسم کھائی کہ میں

لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ ﴿٢١﴾

البتہ تمہارا دوست ہوں

خلاصہ تفسیر: پھر شیطان نے ان دونوں کے دل میں وسوسہ ڈالا تاکہ (ان کو وہ ممنوع درخت کھلا کر) ان کا مستور بدن جو ایک

دوسرے سے پوشیدہ تھا دونوں کے روبرو بے پردہ کر دے (کیونکہ اس درخت کے کھانے میں یہ خاصیت ہو کہ کھانے والا بے پردہ ہو جائے، یا ممانعت کی وجہ سے یہ تاثیر رکھ دی گئی ہو) اور (وہ وسوسہ یہ تھا کہ دونوں سے) کہنے لگا کہ تمہارے رب نے تم دونوں کو اس درخت (کے کھانے) سے اور کسی سبب سے منع نہیں فرمایا مگر محض اس وجہ سے کہ تم دونوں (اس کو کھا کر) کہیں فرشتے نہ بن جاؤ، یا کہیں ہمیشہ زندہ رہنے والوں میں سے نہ ہو جاؤ (حاصل وسوسہ کا یہ تھا اس درخت کے کھانے سے فرشتہ قوتی اور دائمی زندگی پیدا ہو جاتی ہے، مگر شروع میں آپ کا وجود اس طاقتور غذا کا متحمل نہ تھا، اس لئے منع کر دیا گیا تھا، اب آپ کی حالت اور قوت میں ترقی ہوگئی، اور آپ کے قویٰ میں اس کا تحمل ہو گیا تو اب وہ ممانعت باقی نہ رہی)۔

اور ان دونوں کے روبرو (اس بات پر) قسم کھالی کہ یقین جانئے میں آپ دونوں کا (دل سے) خیر خواہ ہوں۔

فَدَلّٰىهُمَا بِغُرُوْرٍ ۚ فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا

پھر مائل کر لیا ان کو فریب سے ۱ے پھر جب چکھا ان دونوں نے درخت کو تو کھل گئیں ان پر شرمگاہیں ان کی ۲ے اور لگے جوڑنے اپنے اوپر

مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ؕ وَنَادٰىهُمَا رَبُّهُمَآ اَلَمْ اَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ وَاَقُلْ لَّكُمَآ

بہشت کے پتے ۳ے اور پکارا ان کے رب نے کیا میں نے منع نہ کیا تھا تم کو اس درخت سے اور نہ کہہ دیا تھا تم کو

اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۲۲﴾

کہ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے

خلاصہ تفسیر: تو (ایسی باتیں بنا بنا کر) ان دونوں کو فریب سے نیچے لے آیا (نیچے لانا باعتبار حالت اور رائے کے بھی تھا کہ اپنی بلند رائے کو چھوڑ کر اس دشمن کی رائے پر مائل ہو گئے، اور مقام کے اعتبار سے بھی جنت سے اسفل کی طرف اتارے گئے) پس ان دونوں نے جو درخت کو چکھا (فوراً) دونوں کا مستور بدن ایک دوسرے کے سامنے کھل گیا (یعنی جنت کا لباس اتر پڑا اور دونوں شرما گئے) اور (بدن چھپانے کے لئے) دونوں اپنے (بدن کے) اوپر جنت کے (درختوں کے) پتے جوڑ جوڑ کر رکھنے لگے اور (اس وقت) ان کے رب نے ان کو پکارا، کیا میں تم دونوں کو اس درخت (کے کھانے سے) ممانعت نہ کر چکا تھا اور یہ بتلا چکا تھا کہ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے (اس کے بہکاوے سے بچتے رہنا)۔

فَدَلّٰىهُمَا بِغُرُوْرٍ: اس دھوکہ دینے کی توجیہ اور تحقیق سورہ بقرہ آیت ۳۶: فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا میں گذر چکی ہے وہاں ملاحظہ فرمایئے، وسوسہ چونکہ ایک نفسانی تصرف ہے اور نفسانی تصرف میں مکان کی دوری حائل نہیں ہوتی، اس لیے یہ ثابت کرنے کی حاجت نہیں کہ شیطان روبرو آدم وحوا سے ملا ہو اور آمنے سامنے بات کی ہو، بلکہ زمین ہی پر رہ کر وسوسہ ڈالا ہو اور آدم علیہ السلام کو اس کا وسوسہ ہونا بھی معلوم نہ ہوا ہو۔

* * *

فائدہ: ۱ے فَدَلّٰىهُمَا بِغُرُوْرٍ: آدم وحوا شیطان کی قسموں سے متاثر ہوئے کہ خدا کا نام لے کر کون جھوٹ بولنے کی جرأت کر سکتا ہے، شاید وہ یہ سمجھے کہ واقعی اس کے کھانے سے ہم فرشتے بن جائیں گے، یا پھر کبھی فنا نہ ہوں گے، اور حق تعالیٰ نے جو نہی فرمائی تھی اس کی تعلیل یا تاویل کر لی ہوگی، لیکن غالباً فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ (الاعراف: ۱۹) اور اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى (طٰہٰ: ۱۱۷) وغیرہ سے نسیان ہوا، اور یہ بھی خیال نہ رہا کہ جب وہ مسجود ملائکہ بنائے جا چکے، پھر ملک بننے کی کیا ضرورت رہی فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا (طٰہٰ: ۱۱۵)۔

واضح ہو کہ امر ونہی کبھی تو تشریعاً ہوتے ہیں اور کبھی شفقۃً، اس کو یوں سمجھو کہ مثلاً ایک تو ریل میں بدون ٹکٹ سفر کرنے کی ممانعت ہے یہ تو قانونی حیثیت رکھتی ہے جس کا اثر کمپنی کے حقوق پر پڑتا ہے اور ایک جو گاڑیوں میں لکھا ہوتا ہے کہ "مت تھوکو کہ اس سے بیماری پھیلتی ہے"، یہ نہی شفقۃً ہے جیسا کہ

بیماری پھیلنے کی تعلیل سے ظاہر ہے، اسی طرح خدا کے اوامر ونواہی بعض تشریعی ہیں جن کی خلاف ورزی کرنے والا قانونی مجرم سمجھا جاتا ہے اور جن کا ارتکاب کرنا ان حقوق کے منافی ہے جن کی حفاظت کرنا تشریع کا منشا تھا، دوسرے وہ اوامر ونواہی ہیں جن کا منشا تشریع نہیں محض شفقت ہے جیسا کہ طب نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) وغیرہ کی بہت سی احادیث میں علماء نے تصریح کی ہے، شاید آدم علیہ السلام نے اکل شجرہ کی ممانعت کو نہی شفقت سمجھا، اسی لئے شیطان کی وسوسہ اندازی کے بعد اس کی خلاف ورزی کرنے کو زیادہ بھاری خیال نہ کیا، مگر چونکہ انبیاء علیہم السلام کی چھوٹی سی لغزش بھی ان کے مرتبہ قرب کے لحاظ سے عظیم و ثقیل بن جاتی ہے، اس لئے اپنی غلطی کا ظاہری نقصان اٹھانے کے علاوہ مدت دراز تک توبہ واستغفار میں مشغول گریہ وبکا رہے، آخر کار ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰى کے نتیجہ پر پہنچ گئے:

بود آدم دیدہ نور قدیم موئے در دیدہ بود کوہ عظیم

فائدہ: ۲ بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا: یعنی عدول حکمی کرا کر لباس بہشتی ان پر سے اتروا دیا، کیونکہ جنتی لباس حقیقت میں لباس تقویٰ کی ایک محسوس صورت ہوتی ہے کسی ممنوع کے ارتکاب سے جس قدر لباس تقویٰ میں رخنہ پڑے گا اسی قدر جنتی لباس سے محرومی ہوگی، غرض شیطان نے کوشش کی عصیان کرا کر آدم کے بدن سے بطریق مجازات جنت کا خلعت فاخرہ اتروا دے، یہ میرا خیال ہے، لیکن حضرت شاہ صاحبؒ نے نزع لباس کو اکل شجرہ کے ایک طبعی اثر کے طور پر لیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ "حاجت استنجا اور حاجت شہوت جنت میں نہ تھی، ان کے بدن پر کپڑے تھے جو کبھی اترتے نہ تھے، کیونکہ حاجت اتارنے کی نہ ہوتی تھی، آدم وحوا اپنے اعضاء سے واقف نہ تھے، جب یہ گناہ ہوا تو لوازم بشری پیدا ہوئے اپنی حاجت سے خبردار ہوئے اور اپنے اعضاء دیکھے"، گویا اس درخت کے کھانے سے جو پردہ انسانی کمزوریوں پر پڑا تھا وہ اٹھ گیا، سَوْاٰۃ کے لغوی معنی میں بہت وسعت ہے قابیل ہابیل کے قصہ میں سَوْءَةَ اَخِيْهِ فرمایا اور حدیث میں ہے: "اِحْدٰى سَوْءَاتِكَ يَا مِقْدَادُ"۔

اب تک آدم کی نظر میں صرف اپنی سادگی اور معصومیت اور ابلیس کی نظر میں صرف اس کی خلقی کمزوریاں تھیں، لیکن اکل شجرہ کے بعد آدم کو اپنی کمزوریاں پیش نظر ہوگئیں اور جب اس غلطی کے بعد انہوں نے توبہ وانابت اختیار کی تو ابلیس لعین کو ان کے اعلیٰ کمال اور انتہائی نجابت اور شرافت کا مشاہدہ ہوگیا، اس نے سمجھ لیا کہ یہ مخلوق لغزش کھا کر بھی میری مار کھانے والی نہیں اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ (الاسراء: ۶۵) شاید اسی لحاظ سے تورات میں ابن قتیبہ صاحب معارف کی نقل کے موافق اس درخت کو "شجرة علم الخير والشر" سے موسوم کیا گیا ہے، واللہ اعلم۔

فائدہ: ۳ وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ: یعنی برہنہ ہو کر شرمائے اور پتوں سے بدن ڈھانپنے لگے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ آدمی پیدائش کے وقت ننگا ہوتا ہے مگر فطری حیا مانع ہے کہ ننگا رہے۔

قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا ۫ وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۲۳﴾

بولے وہ دونوں اے رب ہمارے ظلم کیا ہم نے اپنی جان پر اور اگر تو ہم کو نہ بخشے اور ہم پر رحم نہ کرے تو ہم ضرور ہوجائیں گے تباہ

قَالَ اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ﴿۲۴﴾

فرمایا تم اترو تم ایک دوسرے کے دشمن ہو گے ۱ اور تمہارے واسطے زمین میں ٹھکانا اور نفع اٹھانا ہے ایک وقت تک

خلاصہ تفسیر: دونوں کہنے لگے کہ اے ہمارے رب! ہم نے اپنا بڑا نقصان کیا (کہ پوری احتیاط اور تامل سے کام نہ لیا) اور اگر آپ ہماری مغفرت نہ کریں گے اور ہم پر رحم نہ کریں گے تو واقعی ہم بڑے خسارہ میں پڑ جائیں گے، حق تعالیٰ نے (آدم وحواء علیہما السلام سے) فرمایا کہ (جنت سے) نیچے (زمین پر) ایسی حالت میں جاؤ کہ تم (یعنی تمہاری اولاد) باہم بعضے بعض کے دشمن رہو گے، اور تمہارے واسطے زمین میں رہنے کی جگہ (تجویز کی گئی) ہے اور (اسباب معیشت سے) نفع حاصل کرنا (تجویز ہوا ہے) ایک وقت (خاص یعنی موت کے وقت) تک۔

لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ: یعنی ہم بڑے خسارہ میں پڑ جائیں گے، کیونکہ ترقی نہ ہونا بھی نقصان ہے، یا ممکن ہے کہ بطور تواضع ایسے الفاظ کہے ہوں، اور اس کی تحقیق کہ آدم علیہ السلام کا یہ فعل گناہ نہ تھا، اور گناہ نہ ہونے کے باوجود یہ عتاب ہوا جس پر انہوں نے توبہ کی، یہ سب تفصیل سورہ بقرہ آیت ۳۶: فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا میں گذر چکی ہے وہاں ملاحظہ فرمایئے۔

وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ: مطلب یہ ہے کہ عادت کے طور پر اصلی جگہ رہنے کی زمین ہے، اور اگر خلاف عادت ہو جائے جس سے کوئی آسمان پر رہنے لگے تو اس کی اس آیت سے نفی نہیں ہوتی، پس اس سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زندہ آسمان پر جانے اور رہنے کی نفی پر استدلال کرنا محض باطل ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ے مفسرین کے نزدیک یہ خطاب آدم وحوا اور ابلیس لعین سب کو ہے، کیونکہ اصل عداوت آدم اور ابلیس کی ہے اور اس عداوت کا دنگل ہماری زمین بنائی گئی جس کی خلافت آدم کو سپرد ہوئی تھی۔

قَالَ فِيْهَا تَحْيَوْنَ وَفِيْهَا تَمُوْتُوْنَ وَمِنْهَا تُخْرَجُوْنَ ﴿۲۵﴾ ع ۱۵

فرمایا اسی میں تم زندہ رہو گے اور اسی میں تم مرو گے اور اسی سے تم نکالے جاؤ گے

خلاصہ تفسیر: (اور یہ بھی) فرمایا کہ تم کو وہاں ہی زندگی بسر کرنا ہے اور وہاں ہی مرنا ہے اور اسی میں سے (قیامت کے روز) پھر زندہ ہو کر نکلنا ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام اور ابلیس کا جو واقعہ آیات مذکورہ میں آیا ہے بعینہ یہ سب واقعہ سورۃ بقرہ کے چوتھے رکوع میں پوری تفصیل کے ساتھ آچکا ہے، اور اس کے متعلق جس قدر سوالات وشبہات ہو سکتے ہیں ان سب کا تفصیلی جواب اور پوری تشریح مع دیگر فوائد کے سورۃ بقرہ کی تفسیر میں لکھ دی گئی ہے، ضرورت ہو تو وہاں دیکھ لیا جائے۔

* * *

فائدہ: یعنی عموماً تمہارا مسکن اصلی ومعتاد یہی زمین ہے، اگر خرق عادت کے طور پر کوئی شخص کسی وقت ایک معین مدت کے لئے اس سے اوپر اٹھا لیا جائے مثلاً حضرت مسیح علیہ السلام، تو وہ اس آیت کے منافی نہیں، کیا جو شخص چندروز یا چند گھنٹے کے لئے زمین سے جدا ہو کر ہوائی جہاز میں مقیم ہو یا فرض کیجئے وہیں مرجائے وہ فِيْهَا تَحْيَوْنَ وَفِيْهَا تَمُوْتُوْنَ کے خلاف ہوگا، کیونکہ وہ اس وقت زمین پر نہیں ہے، دوسری جگہ ارشاد ہے: مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ (طٰہٰ:۵۵) جو اموات زمین میں مدفون نہ ہوں ان کو فیھا نعید کم الخ میں کیسے داخل کیا جائے گا معلوم ہوا کہ اس قسم کے قضایا کلیہ کے رنگ میں استعمال نہیں ہوئے۔

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا ؕ وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ۙ

اے اولاد آدم کی ہم نے اتاری تم پر پوشاک جو ڈھانکے تمہاری شرمگاہیں اور اتارے آرائش کے کپڑے ۱ے اور لباس پرہیزگاری کا

ذٰلِكَ خَيْرٌ ؕ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ﴿۲۶﴾

وہ سب سے بہتر ہے ۲ے یہ نشانیاں ہیں اللہ کی قدرت کی تاکہ وہ لوگ غور کریں ۳ے

خلاصہ تفسیر: اس سے پہلے ایک پورے رکوع میں ابلیس کی گمراہی اور آدم اور بنی آدم سے اس کی دشمنی مذکور تھی، آگے اس سے تمام کاموں میں بچنے اور احتیاط کرنے کی تاکید ہے خاص کر بعض علمی اور عملی باتوں میں جو آگے آنے والی آیات کے سبب نزول ہیں، مثلاً قریش اور دیگر قبائل عرب گوشت نہ کھاتے تھے، بعض قبائل برہنہ طواف کرتے تھے، بقول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ عورتیں برہنہ طواف کرتیں، بعض جاہل ایام حج میں کھانا

کھاتے لیکن چکنائی چھوڑ دیتے، ان باتوں کے بیان کو اس مقام سے خاص تعلق یہ ہے کہ پیچھے شیطان کی دشمنی کا اثر آدم علیہ السلام کے ساتھ طعام ولباس میں معلوم ہو چکا ہے کہ وہ درخت کھلا کر باقی کھانوں سے محروم کر دیا، اور لباس بھی اتروادیا، یہی اثر ان کی اولاد کے ساتھ ظاہر ہوا کہ فاسد عقائد میں ان کو مبتلا کر کے لباس اور طعام سے محروم کرتا ہے، نیز پیچھے انعامات کا ذکر ہے، لباس اور طعام بھی نعمت ہیں، چنانچہ حق تعالیٰ نے تمام اولاد آدم کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا کہ تمہارا لباس قدرت کی ایک عظیم نعمت ہے اس کی قدر کرو، یہاں خطاب صرف مسلمانوں کو نہیں، بلکہ پوری اولاد آدم کو ہے، اس میں اشارہ ہے کہ ستر پوشی اور لباس انسان کی فطری خواہش اور ضرورت ہے، بغیر امتیاز کسی مذہب وملت کے سب ہی اس کے پابند ہیں، گویا اوپر کے قصہ میں ابلیس کی گمراہی اور بنی آدم سے اس کی دشمنی مذکور تھی، اب اس کے اضلال اور اس سے بچاؤ اور احتیاط کی تاکید کا بیان ہے۔

اے اولاد آدم! (ایک ہمارا انعام یہ ہے کہ) ہم نے تمہارے لئے لباس پیدا کیا جو تمہارے ستر (یعنی پردہ والے بدن) کو بھی چھپاتا ہے اور (تمہارے بدن کے لئے) موجب زینت بھی (ہوتا) ہے، اور (اس ظاہری لباس کے علاوہ ایک معنوی لباس بھی تمہارے لئے تجویز کیا ہے جو) تقویٰ (یعنی دینداری) کا لباس (ہے کہ) یہ اس (ظاہری لباس) سے بڑھ کر (ضروری) ہے (کیونکہ اس ظاہری لباس کا مطلوب شرعی ہونا اسی تقویٰ یعنی دینداری کی ایک فرع ہے، اصل مقصود جو ہر حال میں ضروری ہے وہ لباس تقویٰ ہی ہے) یہ (لباس پیدا کرنا) اللہ تعالیٰ کے (فضل وکرم) کی نشانیوں میں سے ہوتا ہے، تاکہ یہ لوگ (اس نعمت کو) یاد رکھیں (اور یاد رکھ کر اپنے منعم اور محسن کا حق اطاعت ادا کریں اور وہ حق اطاعت وہی ہے جس کو لباس تقویٰ فرمایا ہے)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا: اتارنے سے مراد اس کا مادہ وغیرہ پیدا کرنا اور اس کے تیار کرنے کی تدبیر بتلانا ہے، گو اُتارنے کا لفظ اکثر اس موقع پر بولتے ہیں جہاں ایک چیز کو اوپر سے نیچے لایا جائے، مگر بہت دفعہ اس سے مکانی فوق وتحت مراد نہیں ہوتا، بلکہ جو مرتبہ کے اعتبار سے اونچا ہو، اس کی طرف سے کوئی چیز نیچے والوں کو عطا کئے جانے پر بھی یہ لفظ اطلاق کیا جاتا ہے، جیسے فرمایا :وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ (الزمر:٦) یاوَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ (الحدید:٢٥)

فائدہ: ۲؎ وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَيْرٌ: یعنی اس ظاہری لباس کے علاوہ جس سے صرف بدن کا تستّر یا تزیّن ہوتا ہے ایک معنوی پوشاک بھی ہے جس سے انسان کی باطنی کمزوریاں جن کے ظاہر کرنے کی اس میں استعداد پائی جاتی تھی پردہ خفا میں رہتی ہیں، منصہ ظہور وفعلیت پر نہیں آنے پاتیں اور یہ ہی معنوی پوشاک جسے قرآن نے لباس التقویٰ فرمایا، باطن کی زینت وآرائش کا ذریعہ بنتی ہے، بلکہ اگر غور کیا جائے تو ظاہری بدنی لباس بھی اسی باطنی لباس کو زیب تن کرنے کے لئے شرعاً مطلوب ہوا ہے، حضرت شاہ صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ: ''دشمن نے جنت کے کپڑے تم سے اتروائے، پھر ہم نے تم کو دنیا میں تدبیر لباس کی سکھادی، اب وہ ہی لباس پہنو جس میں پرہیزگاری ہو، یعنی مرد لباس ریشمی نہ پہنے اور دامن دراز نہ رکھے اور جو منع ہوا ہے سونہ کرے اور عورت بہت باریک نہ پہنے کہ لوگوں کو بدن نظر آوے اور اپنی زینت نہ دکھاوے''۔

فائدہ: ۳؎ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ: یعنی ان نشانات میں غور کر کے حق تعالیٰ کے قادرانہ انعام واکرام کے معترف اور شکر گزار ہوں۔

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَيْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا

اے اولاد آدم کی نہ بہکائے تم کو شیطان جیسا کہ اس نے نکال دیا تمہارے ماں باپ کو بہشت سے اتروائے ان سے ان کے کپڑے ۱؎

لِيُرِيَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا ؕ اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ؕ اِنَّا جَعَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ

تاکہ دکھلائے ان کو شرمگاہیں ان کی، وہ دیکھتا ہے تم کو اور اس کی قوم جہاں سے تم ان کو نہیں دیکھتے ۲؎ ہم نے کر دیا شیطانوں کو

اَوۡلِيَآءَ لِلَّذِيۡنَ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۲۷﴾

رفیق ان لوگوں کا جو ایمان نہیں لاتے ۳؎

خلاصہ تفسیر: (جب تمہیں تقوی کا واجب ہونا اور اس سے پہلے شیطان کا دشمن ہونا معلوم ہو چکا تو اس بات کا ذرا خیال رکھنا کہ) اے اولاد آدم! شیطان تم کو کسی خرابی میں نہ ڈال دے (کہ شیطان تم سے تقوی اور دین کے خلاف کوئی کام نہ کروا دے) جیسا اس نے تمہارے دادا، دادی (یعنی آدم وحوا علیہما السلام) کو جنت سے باہر کرا دیا (یعنی ان سے ایسا کام کرا دیا کہ اس کے نتیجہ میں وہ جنت سے باہر آ گئے، اور باہر بھی) ایسی حالت سے (کرایا) کہ ان کا لباس بھی ان (کے بدن) سے اتروا دیا، تاکہ دونوں کو ایک دوسرے کے پردہ کا بدن دکھائی دینے لگے (جو شریف انسان کے لیے بڑی شرم ورسوائی ہے، غرض شیطان تمہارا قدیم دشمن ہے، اس سے بہت ہوشیار رہو اور زیادہ احتیاط اس لئے اور بھی ضروری ہے کہ) وہ اور اس کا لشکر تم کو ایسے طور پر دیکھتا ہے کہ تم ان کو (عادۃً) نہیں دیکھتے ہو (ظاہر ہے کہ ایسا دشمن بہت خطرناک ہے، اس سے بچنے کا پورا اہتمام چاہئے، اور بچنے کا طریقہ یہی ہے کہ ایمان کامل اور تقویٰ اختیار کرلو تو بچاؤ کا سامان ہو جائے گا، کیونکہ) ہم شیطانوں کو انہی کا رفیق ہونے دیتے ہیں جو ایمان نہیں لاتے (اگر بالکل ایمان نہیں تو پوری طرح شیطان اس پر مسلط ہو جاتا ہے، اور اگر ایمان تو ہے مگر کامل نہیں تو اس سے کم درجہ کا تسلط ہوتا ہے، بخلاف مومن کامل کے کہ اس پر شیطان کا بالکل قابو نہیں چلتا، جیسا کہ قرآن کریم کی ایک آیت میں ہے: **انه ليس له سلطان على الذين آمنوا وعلى ربهم يتوكلون** کہ جو لوگ خدا پر کامل ایمان اور بھروسہ رکھتے ہیں ان پر شیطان کا قابو نہیں چلتا)۔

مِنۡ حَيۡثُ لَا تَرَوۡنَهُمۡ: یہ ارشاد کہ انسان شیاطین (یا جنات) کو نہیں دیکھ سکتا، عام حالات اور عام عادت کے اعتبار سے ہے، یعنی عام طور پر نظر نہیں آتے اور ہر کسی کو بھی نظر نہیں آتے، خلاصہ تفسیر میں عادتاً کا لفظ بڑھانے سے معلوم ہو گیا کہ مطلب یہ ہے کہ انسان کا جنات یا شیطان کو دیکھنا عام عادت کے خلاف ہے، باقی قطعی طور پر دیکھنے کی نفی نہیں، اگر خلاف عادت کے طور پر کوئی انسان کبھی ان کو دیکھ لے تو یہ اس کے منافی نہیں، جیسا کہ رسول کریم ﷺ کی خدمت میں جنات کا آنا اور سوالات کرنا اور اسلام قبول کرنا وغیرہ صحیح روایات حدیث میں مذکور ہے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ يَنۡزِعُ عَنۡهُمَا لِبَاسَهُمَا: اخراج ونزاع کی اضافت ان کے سبب کی طرف کی گئی یعنی آدم وحوا کو جنت سے علیحدہ کرنے اور کپڑے اتارے جانے کا سبب وہ ہوا، اب تم اس کے فریب میں مت آؤ اور اس کی مکاریوں سے ہوشیار رہو۔

فائدہ: ۲؎ مِنۡ حَيۡثُ لَا تَرَوۡنَهُمۡ: یعنی جو دشمن ہم کو اس طرح دیکھ رہا ہو کہ ہماری نظر اس پر نہ پڑے اس کا حملہ سخت خطرناک اور مدافعت سخت دشوار ہوتی ہے، اس لئے تم کو بہت مستعد و بیدار رہنا چاہئے، ایسے دشمن کا علاج یہ ہی ہے کہ ہم کسی ایسی ہستی کی پناہ میں آ جائیں جو اسے دیکھتی ہے پر وہ اسے نہیں دیکھتا لَا تُدۡرِكُهُ الۡاَبۡصَارُ وَهُوَ يُدۡرِكُ الۡاَبۡصَارَ وَهُوَ اللَّطِيۡفُ الۡخَبِيۡرُ (الانعام: ۱۰۳) اِنَّهٗ يَرٰىكُمۡ هُوَ وَقَبِيۡلُهٗ مِنۡ حَيۡثُ لَا تَرَوۡنَهُمۡ قضیہ مطلقہ ہے دائمہ نہیں، یعنی بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ وہ ہم کو دیکھتے ہیں اور ہم ان کو نہیں دیکھتے، اس کہنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ کسی وقت بھی کوئی شخص کسی صورت میں ان کو نہ دیکھ سکے، پس آیت سے رویت جن کی بالکلیہ ہی نفی پر استدلال کرنا کوتاہ نظری ہے۔

فائدہ: ۳؎ اَوۡلِيَآءَ لِلَّذِيۡنَ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ: یعنی جب انہوں نے اپنی بے ایمانی سے خود شیاطین کی رفاقت کو اپنے لئے پسند کر لیا، جیسا کہ چند آیات کے بعد آ رہا ہے اِنَّهُمُ اتَّخَذُوا الشَّيٰطِيۡنَ اَوۡلِيَآءَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ وَيَحۡسَبُوۡنَ اَنَّهُمۡ مُّهۡتَدُوۡنَ (الاعراف: ۳۰) تو ہم نے بھی اس انتخاب میں مزاحمت نہیں کی، جس کو انہوں نے اپنا رفیق بنانا چاہا اسی کو رفیق بنا دیا گیا۔

وَإِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً قَالُوا وَجَدْنَا عَلَيْهَا آبَاءَنَا وَاللَّهُ أَمَرَنَا بِهَا ۗ

اور جب کرتے ہیں کوئی برا کام تو کہتے ہیں کہ ہم نے دیکھا اسی طرح کرتے اپنے باپ دادوں کو اور اللہ نے بھی ہم کو یہ حکم کیا ہے

قُلْ إِنَّ اللَّهَ لَا يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ ۖ أَتَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿٢٨﴾

تو کہہ دے کہ اللہ حکم نہیں کرتا برے کام کا، کیوں لگاتے ہو اللہ کے ذمہ وہ باتیں جو تم کو معلوم نہیں

خلاصہ تفسیر: اور وہ لوگ جب کوئی فحش کام کرتے ہیں (خواہ عقائد میں سے جیسے شرک جو کہ اعلیٰ درجہ کی بے حیائی ہے، خواہ اعمال میں سے جیسے ننگے ہو کر طواف کرنا اور اس سے کوئی منع کرتا ہے) تو (جواب میں) کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو اسی طریق پر پایا ہے، اور (نعوذ باللہ) اللہ تعالیٰ نے بھی ہم کو یہی بتلایا ہے (ظاہر ہے کہ اس سے بڑھ کر اور کیا قابو چلے گا کہ کفر و شرک میں مبتلا کر رکھا ہے، اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ان کے جاہلانہ استدلال کے جواب میں) آپ کہہ دیجئے کہ اللہ تعالیٰ فحش کام کی (کبھی) تعلیم نہیں دیتا، کیا (تم ایسا دعویٰ کر کے) خدا کے ذمہ ایسی باتیں لگاتے ہو جس کی تم کوئی سند نہیں رکھتے (اس سے ان کی آباء و اجداد کی تقلید کا جواب نکل آیا، کیونکہ تقلید اس مسئلہ میں جائز ہے جس میں تقلید کرنے کے لیے شرعی سند اور اجازت ہو اور اس کے لیے سب شرائط کا پایا جانا ضروری ہے، ایک شرط یہ ہے کہ وہ مسئلہ نص قطعی کے خلاف نہ ہو، اور یہاں خود حکم قطعی کی مخالفت کی وجہ سے شرائط مفقود و معدوم ہیں، پس ایسی تقلید سے حجت پکڑنا خود باطل ہے)۔

❋ ❋ ❋

فائدہ: یعنی برے اور بے حیائی کے کاموں مثلاً مرد و عورت کا برہنہ طواف کرنا، جو ان آیات کی شان نزول ہے جن سے عقل سلیم اور فطرت صحیحہ نفرت کرتی ہے، خدائے قدوس کی شان نہیں کہ ان کی تعلیم دے وہ تو پاکی اور حیا کا سرچشمہ ہے، گندے اور بے حیائی کے کاموں کا حکم کیسے دے سکتا ہے اصل میں بے حیائی اور برائی کی تعلیم دینے والے وہ شیاطین ہیں جن کو انہوں نے اپنا رفیق بنا رکھا ہے، دیکھو تمہارے سب سے پہلے ماں باپ کو شیطان نے فریب دیکر برہنہ کرایا، مگر وہ شرم و حیاء کے مارے درختوں کے پتے بدن پر لپیٹنے لگے معلوم ہوا کر برہنگی شیطان کی جانب سے اور ستر کی کوشش تمہارے باپ کی طرف سے ہوئی، پھر برہنہ طواف کرنے پر باپ دادوں کی سند لانا کیسے صحیح ہو سکتا ہے نیز بقول حضرت شاہ صاحبؒ: ''سن چکے کہ پہلے باپ نے شیطان کا فریب کھایا، پھر باپ کی کیوں سند لاتے ہو''، یہ کس قدر بے حیائی کی بات ہے کہ جو کام شیطان کے حکم سے ہو رہا ہے اسے کہا جائے کہ ہم کو خدا نے یہ حکم دیا ہے، العیاذ باللہ۔

قُلْ أَمَرَ رَبِّي بِالْقِسْطِ ۖ وَأَقِيمُوا وُجُوهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَادْعُوهُ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ ۚ

تو کہہ دے کہ میرے رب نے حکم کر دیا انصاف کا [1] اور سیدھے کرو اپنے منہ ہر نماز کے وقت اور پکارو اسکو خالص اسکے فرمانبردار ہو کر [2]

كَمَا بَدَأَكُمْ تَعُودُونَ ﴿٢٩﴾

جیسا تم کو پہلے پیدا کیا دوسری بار بھی پیدا ہو گے [3]

خلاصہ تفسیر: آپ (صلی اللہ علیہ وسلم یہ بھی) کہہ دیجئے کہ (تم نے جن فحش باتوں اور غلط کاموں کو تم خدا کی طرف منسوب کرتے ہو وہ تو غلط ٹھہریں، اب وہ باتیں سنو جن کا حکم اللہ تعالیٰ نے واقعی طور پر دیا ہے وہ یہ ہے کہ) میرے رب نے تو حکم دیا ہے انصاف کرنے کا، اور یہ (حکم دیا ہے) کہ تم ہر سجدہ (یعنی عبادت) کے وقت اپنا رخ سیدھا (اللہ کی طرف) رکھا کرو (یعنی کسی مخلوق کو اللہ کی عبادت میں شریک نہ کرو) اور اللہ کی عبادت اس طور پر کرو کہ اس عبادت کو خالص اللہ ہی کے واسطے رکھا کرو (اس مختصر جملہ میں تمام اصول شریعت اجمالاً آ گئے، قسط یعنی انصاف میں حقوق العباد،

اقیموا میں تمام اعمال وطاعت، مخلصین یعنی خالص رکھنے میں تمام عقائد، مطلب یہ کہ اللہ کے تو یہ احکام ہیں، ان کو مانو، کیونکہ صرف حکم دے کر تم کو نہیں چھوڑ دیا جائے گا، بلکہ ایک وقت حساب وکتاب کے لیے بھی آنے والا ہے، یعنی قیامت چنانچہ) تم کو اللہ تعالیٰ نے جس طرح (اپنی قدرت سے) شروع میں پیدا کیا تھا اسی طرح تم (ایک وقت پر) پھر دوبارہ پیدا ہو گے (غرض جب دوبارہ پیدا ہو گے اس وقت جزا و سزا واقع ہوگی)۔

وَاَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ (الی قوله) وَّادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ: اس میں حکم ہے ظاہر و باطن دونوں کی اصلاح کو جمع کرنے کا، اقیموا میں ظاہر اعمال کی اصلاح کی طرف اور مخلصین میں قلب و باطن کی اصلاح کی طرف اشارہ ہے، ان دونوں حکموں کو ساتھ ذکر کرنے سے بتا دیا کہ انسان پر لازم ہے کہ اپنے ظاہر و باطن دونوں کو احکام شریعت کے مطابق درست کرے، نہ صرف ظاہری اطاعت بغیر اخلاص کے کافی ہے، اور نہ محض اخلاص باطنی بغیر ظاہری اتباع شریعت کے کافی ہوسکتا ہے، بلکہ ہر شخص پر لازم ہے کہ اپنے ظاہر کو بھی شریعت کے مطابق درست کرے اور باطن کو بھی صرف اللہ تعالیٰ کے لئے خاص رکھے، اس سے ان لوگوں کی غلطی واضح ہوتی ہے جو شریعت و طریقت کو مختلف طریقے سمجھتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ طریقت کے مطابق باطن کو درست کر لینا کافی ہے گو شریعت کے خلاف کرتے رہیں، یہ کھلی گمراہی ہے۔

* * *

فائدہ: ۱۔ قُلْ اَمَرَ رَبِّيْ بِالْقِسْطِ: روح المعانی میں ہے: "اَلْقِسْطُ عَلٰى مَا قَالَ غَيْرُ وَاحِدٍ، اَلْعَدْلُ وَ هُوَ الْوَسْطُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ، اَلْمُتَجَافِيْ عَنْ طَرَفَيِ الْاِفْرَاطِ وَ التَّفْرِيْطِ" آیت کا حاصل یہ ہوا کہ حق تعالیٰ نے ہر کام میں توسط و اعتدال پر رہنے اور افراط و تفریط سے بچنے کی ہدایت کی ہے، پھر بھلا فواحش کا حکم کیسے دے سکتے ہیں۔

فائدہ: ۲۔ وَّادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ: مترجم محقق نے مسجد کو غالباً مصدر میمی بمعنی سجود لیکر تجوزاً "نماز" کا ترجمہ کیا ہے اور وجوہ کو اپنے ظاہر پر رکھا ہے یعنی نماز ادا کرنے کے وقت اپنا منہ سیدھا (کعبہ کی طرف) رکھو، مگر دوسرے بعض مفسرین اَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ سے یہ مراد لیتے ہیں کہ خدا کی عبادت کی طرف ہمیشہ استقامت کے ساتھ دل سے متوجہ رہو، ابن کثیرؒ کے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنی عبادت میں سیدھے رہو، جو راستہ پیغمبر علیہ السلام کا ہے اس سے ٹیڑھے ترچھے نہ چلو، عبادت کی مقبولیت دو ہی چیزوں پر موقوف تھی: ① خالص خدا کے لئے ہو، جس کو آگے فرما دیا: وَادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ اور ② اس مشروع طریق کے موافق ہو جو انبیاء مرسلین علیہم الصلوٰۃ والسلام نے تجویز فرمایا ہے، اس کو وَاَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ میں ادا کیا گیا، بہر حال اس آیت میں اوامر شرعیہ کی تمام انواع کی طرف اشارہ کر دیا ہے، جو بندوں کے معاملات سے متعلق ہیں وہ سب قسط میں آگئے اور جن کا تعلق خدا سے ہے اگر قالبی ہیں تو اقیموا وجوھکم میں اور قلبی ہیں تو ادعوہ مخلصین له الدین میں مندرج ہو گئے۔

فائدہ: ۳۔ كَمَا بَدَاَكُمْ تَعُوْدُوْنَ: یعنی انسان کو اعتدال، استقامت اور اخلاص کی راہوں پر چلنے کی اس لئے ضرورت ہے کہ موت کے بعد دوسری زندگی ملنے والی ہے جس میں موجودہ زندگی کے نتائج سامنے آئیں گے اسکی فکر ابھی سے ہونی چاہیے وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ۔

فَرِيْقًا هَدٰى وَفَرِيْقًا حَقَّ عَلَيْهِمُ الضَّلٰلَةُ ؕ اِنَّهُمُ اتَّخَذُوا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ

ایک فرقہ کو ہدایت کی اور ایک فرقہ پر مقرر ہوچکی گمراہی، انہوں نے بنایا شیطانوں کو رفیق اللہ کو چھوڑ کر

وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۳۰﴾

اور سمجھتے ہیں کہ وہ ہدایت پر ہیں

خلاصہ تفسیر: (اب جزا و سزا کا محل بتلاتے ہیں کہ) بعض لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے (دنیا میں) ہدایت کی ہے (ان کو قیامت میں جزاء ملے گی) اور بعض پر گمراہی کا ثبوت ہوچکا ہے (ان کو قیامت میں سزا ملے گی، اور ان لوگوں کے گمراہ ہونے کی وجہ یہ ہوئی کہ) ان لوگوں نے شیطانوں کو اپنا رفیق بنا لیا اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر (اللہ کی اطاعت نہ کی اور شیاطین کی اطاعت کی) اور (اس کے باوجود پھر اپنی نسبت) خیال رکھتے ہیں کہ وہ

راہ راست پر ہیں۔

فَرِيْقًا هَدٰى وَفَرِيْقًا حَقَّ عَلَيْهِمُ الضَّلٰلَةُ: اس آیت سے معلوم ہوا کہ احکام شرعیہ سے جہل اور ناواقفیت کوئی عذر نہیں، ایک شخص اگر غلط راستہ کو صحیح سمجھ کر پورے اخلاص کے ساتھ اختیار کرلے تو وہ اللہ کے نزدیک معذور نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کو ہوش وحواس اور عقل ودانش اسی لئے دی ہے کہ وہ اس سے کام لے کر کھرے کھوٹے اور غلط صحیح کو پہچانے، پھر اس کو صرف اس کی عقل ودانش پر نہیں چھوڑا، اپنے انبیاء بھیجے، کتابیں نازل فرمائیں، جن کے ذریعے صحیح وغلط اور حق وباطل کو خوب کھول کر واضح کردیا۔

وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ: راہ راست پر ہونے کا خیال یا تو اس لیے ہے کہ وہ بزعم خود اپنے دین کو حق سمجھتے ہیں، یا حق تو نہیں سمجھتے مگر کسی مصلحت کی وجہ سے باطل پر جمے ہوئے ہیں اور اپنے نزدیک اس مصلحت کی رعایت کو ضروری سمجھ کر باطل پر ہونے کے باوجود اپنے کو راہ پر سمجھتے ہیں، پہلی صورت میں اگر کسی کو شبہ ہو کہ ایک شخص جو واقع میں اپنے کو حق پر سمجھتا ہو اگرچہ غلطی ہی پر ہو، پھر اس پر کیا الزام ہے؟ وہ معذور ہونا چاہئے، کیونکہ اس کو اپنی غلطی کی اطلاع ہی نہیں؟ جواب یہ ہے کہ وہ معذور اس لیے نہیں کیونکہ صحیح اور قوی دلائل قائم ہونے کے باوجود اس نے تامل کیوں نہیں کیا، اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو عقل وہوش پھر انبیاء علیہم السلام کی تعلیم عطا فرمادی ہیں، جن کے ذریعے کم از کم اس کو اپنے اختیار کئے ہوئے طریقہ کے خلاف کا احتمال اور تردد ضرور ہوجانا چاہئے، اب اس کا قصور یہ ہے کہ اس نے ان چیزوں کی طرف کوئی دھیان نہ دیا، اور جس غلط طریقہ کو اختیار کرلیا تھا اس پر جما رہا، اور آیت میں جن لوگوں کی مذمت ہے وہ ایسے ہی تھے، بلکہ اکثر تو اپنے طریقہ کو باطل سمجھنے والے تھے، اس پر اگر یہ شبہ ہو کہ جب وہ حق کو حق اور باطل کو باطل سمجھتا ہے تو مؤمن ہونا چاہیے، پھر اس کو کفار میں کیوں شمار کیا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جیسے دل سے جھٹلانا کفر ہے اسی طرح زبان سے جھٹلانا اور برتاؤ سے انبیاء کی مخالفت وعداوت کرنا بھی کفر ہے، البتہ جو شخص طلب حق میں اپنی پوری کوشش خرچ کرچکا ہو اور پھر بھی اس کی نظر صحیح راستہ اور حق بات پر نہ پہنچی ہو اس کی نسبت بعض علماء کی نرم رائے ہے مگر سلامتی یہی ہے کہ خدا کے حوالہ کیا جائے۔

* * *

فائدہ: یعنی جن پر گمراہی مقرر ہوچکی، یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے خدا کو چھوڑ کر شیطانوں کو اپنا دوست اور رفیق ٹھہرالیا ہے اور تماشا یہ ہے کہ اس صریح گمراہی کے باوجود سمجھتے یہ ہیں کہ ہم خوب ٹھیک چل رہے ہیں اور مذہبی حیثیت سے جو روش اور طرز عمل ہم نے اختیار کرلیا ہے وہ ہی درست ہے جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا: اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا (الکہف: ۱۰۴)

تنبیہ: آیت کے عموم سے ظاہر ہوا کہ کافر معاند کی طرح کافر مخطی بھی جو واقعی اپنی غلط فہمی سے باطل کو حق سمجھ رہا ہو وَفَرِيْقًا حَقَّ عَلَيْهِمُ الضَّلٰلَةُ میں داخل ہے، خواہ یہ غلط فہمی پوری طرح غور وفکر نہ کرنے کی وجہ سے ہو، یا اس لئے کہ گو اس نے بظاہر پوری قوت غور وفکر میں صرف کردی، لیکن ایسے صریح اور واضح حقائق تک نہ پہنچنا خود بتلاتا ہے کہ فی الحقیقت اس سے قوت فکر واستدلال کے استعمال میں کوتاہی ہوئی ہے، گویا جن چیزوں پر ایمان لانا مدار نجات ہے وہ اس قدر روشن اور واضح ہیں کہ ان کے انکار کی بجز عناد یا قصور فکر وتامل کے اور کوئی صورت نہیں، بہرحال کفر شرعی ایک ایسا سنکھیا (زہر) ہے جو جان بوجھ کر یا غلط فہمی سے کسی طرح بھی کھایا جائے انسان کو ہلاک کرنے کے لئے کافی ہے، ''اہلسنت والجماعت'' کا مذہب یہی ہے اور ''روح المعانی'' میں جو بعض کا اختلاف اس مسئلہ میں نقل کیا ہے، اس بعض سے مراد جاحظ وعنبری ہیں جو اہل السنت والجماعت میں داخل نہیں، بلکہ باوجود ''معتزلی'' کہلائے جانے کے خود معتزلہ کو بھی ان کے اسلام میں کلام ہے، اسی لئے صاحب روح المعانی نے ان کا مذہب نقل کرنے کے بعد لکھ دیا: ''وللہ تعالیٰ الحجة البالغة والتزام ان کل کافر معاند بعد البعثة و ظهور امر الحق کفار علی علم'' الخ.

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿٣١﴾

اے اولاد آدم کی لے لو اپنی آرائش ہر نماز کے وقت اور کھاؤ اور پیو اور بیجا خرچ نہ کرو، اس کو خوش نہیں آتے بیجا خرچ کرنے والے

خلاصہ تفسیر: یہ اور اگلی آیت قریش اور دیگر قبائل عرب کے بارے میں نازل ہوئی کہ وہ گوشت نہ کھاتے تھے، نیز قریش کے

علاوہ دیگر قبائل برہنہ طواف کرتے تھے، ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ عورتیں برہنہ طواف کرتیں تھیں اس پر یہ اور اگلی آیت نازل ہوئی، بعض جاہل ایام حج میں کھانا کھاتے اور چکنائی چھوڑ دیتے تھے، بعض مسلمانوں کو بھی ایسا کرنے کا خیال ہوا تو اس پر **کلوا واشربوا** کا حکم نازل ہوا۔

اے اولادِ آدم! تم مسجد کی ہر حاضری کے وقت (نماز کے لئے ہو یا طواف کے لئے) اپنا لباس پہن لیا کرو اور (جس طرح ترک لباس گناہ تھا، ایسے ہی حلال چیزوں کے کھانے پینے کو ناجائز سمجھنا بھی بڑا گناہ ہے، اس لئے حلال چیزوں کو) خوب کھاؤ اور پیو اور (خواہ مخواہ حلال کو حرام سمجھ کر) حد (شرعی) سے مت نکلو، بیشک اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتے حد سے نکل جانے والوں کو۔

خُذُوْا زِیْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ: سترعورت تو دوسرے اوقات میں بھی واجب ہے، پھر یہاں وقت کی تخصیص کیوں کی گئی؟ جواب یہ ہے کہ یہاں مسجد کی حاضری کی قید اتفاقی ہے، وجہ اس کی یہ ہے وہ لوگ اس خاص طواف اور نماز کے وقت برہنہ جایا کرتے تھے، ورنہ ستر پوشی انسان کے لیے پہلا انسانی اور اسلامی فرض ہے جو ہر حالت میں اس پر لازم ہے، نماز اور طواف میں تو بدرجہ اولیٰ فرض ہے۔

* * *

فائدہ: یہ آیات ان لوگوں کے رد میں نازل ہوئیں جو کعبہ کا طواف برہنہ ہو کر کرتے تھے اور اسے بڑی قربت اور پرہیز گاری سمجھتے تھے، اور بعض اہل جاہلیت ایام حج میں سد رمق سے زائد کھانا اور گھی یا چکنائی وغیرہ کا استعمال چھوڑ دیتے تھے، بعضوں نے بکری کے دودھ اور گوشت سے پرہیز کر رکھا تھا، ان سب کو بتلا دیا کہ یہ کوئی نیکی اور تقویٰ کی باتیں نہیں، خدا کی دی ہوئی پوشاک جس سے تمہارے بدن کا تستر اور آرائش ہے اس کی عبادت کے وقت دوسرے اوقات سے بڑھ کر قابل استعمال ہے تاکہ بندہ اپنے پروردگار کے دربار میں اس کی نعمتوں کا اثر لے کر حاضر ہو، خدا نے جو کچھ پہننے اور کھانے پینے کو دیا ہے اس سے تمتع کرو، بس شرط یہ ہے کہ اسراف نہ ہونے پائے۔

''اسراف'' کے معنی ہیں ''حد سے تجاوز کرنا'' جس کی کئی صورتیں ہیں: ① مثلاً حلال کو حرام کر لے ② یا حلال سے گزر کر حرام سے بھی متمتع ہونے لگے ③ یا اناپ شناپ بے تمیزی اور حرص سے کھانے پر گر پڑے ④ یا بدون اشتہاء کے کھانے لگے ⑤ یا ناوقت کھائے ⑥ یا اس قدر کم کھائے جو صحت جسمانی اور قوت عمل کے باقی رکھنے کے لئے کافی نہ ہو ⑦ یا مضر صحت چیزیں استعمال کرے وغیر ذٰلک، لفظ ''اسراف'' ان سب امور کو شامل ہو سکتا ہے، بے جا خرچ کرنا بھی اس کی ایک فرد ہے، اسی تعمیم کے لحاظ سے بعض سلف نے فرمایا کہ: ''جمع الله الطب كله فى نصف أية'' (خدا نے ساری طب آدھی آیت میں اکٹھی کر دی)۔

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ؕ

تو کہہ کس نے حرام کیا اللہ کی زینت کو جو اس نے پیدا کی اپنے بندوں کے واسطے اور ستھری چیزیں کھانے کی

قُلْ هِيَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ

تو کہہ یہ نعمتیں اصل میں ایمان والوں کے واسطے ہیں دنیا کی زندگی میں خالص انہی کے واسطے ہیں قیامت کے دن

كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۳۲﴾

اسی طرح مفصل بیان کرتے ہیں ہم آیتیں ان کے لیے جو سمجھتے ہیں

خلاصہ تفسیر: (جو لوگ اللہ کی حلال کی ہوئی چیزیں یعنی لباس اور کھانے پینے کی چیزوں کو بے دلیل بلکہ خلاف دلیل حرام سمجھ رہے ہیں ان سے) آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) فرما دیجئے کہ (یہ بتلاؤ) اللہ تعالیٰ کے پیدا کئے ہوئے کپڑوں کو جو اس نے اپنے بندوں کے (استعمال کے) واسطے بنائے ہیں اور کھانے پینے کی حلال چیزوں کو (جن کو اللہ نے حلال قرار دیا ہے) کس شخص نے حرام کیا ہے (یعنی حلال و حرام قرار دینا تو خالق و مالک کائنات کا کام ہے، تم اپنی طرف سے کسی چیز کو حلال یا حرام کہنے والے کون ہو؟)۔

(مذکورہ آیات میں لباس اور کھانے پینے کی چیزوں کو انعام خداوندی قرار دیا ہے، اس سے کفار کو یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ یہ انعام تو ہمیں خوب مل رہا ہے، اگر اللہ تعالیٰ ہم سے ناراض ہوتا اور ہمارے عقائد و اعمال اس کے خلاف ہوتے تو یہ انعام ہمیں کیوں ملتا؟ اس شبہ کے جواب کے لیے فرمایا کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم!) آپ ان سے یہ کہہ دیجئے کہ (انعامات الٰہیہ کے متعلق استعمال کی اجازت مقبول ہونے کی دلیل نہیں، ہاں! جس استعمال کے بعد کوئی وبال نہ ہو وہ البتہ مقبولیت کی دلیل ہے، اور ایسا استعمال خالص اہل ایمان کا حصہ ہے، کیونکہ کافر جتنا زیادہ دنیاوی نعمتوں کو استعمال کرتے ہیں اتنا ہی ان کا وبال اور عذاب آخرت بڑھتا رہتا ہے، اس لئے فرمایا کہ:) یہ اشیاء (لباس اور کھانے پینے کی چیزیں) اس طور پر کہ قیامت کے روز (بھی کدورات سے اور عذاب سے) خالص رہیں دنیوی زندگی میں خاص اہل ایمان ہی کے لئے ہیں (بخلاف کفار کے کہ اگر چہ دنیا میں انہوں نے اللہ کی نعمتوں کو استعمال کر کے عیش وعشرت میں بسر کیا، مگر چونکہ ان نعمتوں کا شکر ایمان و اطاعات کے ذریعہ ادا نہیں کیا، اس لئے وہاں یہ نعمتیں ان کے لیے وبال اور عذاب بن جائیں گی) ہم اسی طرح تمام آیات کو سمجھداروں کے واسطے صاف صاف بیان کرتے ہیں۔

❋ ❋ ❋

فائدہ: عالم کی تمام چیزیں اسی لئے پیدا کی گئی ہیں کہ آدمی ان سے مناسب طریقہ سے منتفع ہو کر خالق جل و علیٰ کی عبادت، وفاداری اور شکر گزاری میں مشغول ہو، اس اعتبار سے دنیا کی تمام نعمتیں اصل میں مومنین و مطیعین ہی کے لئے پیدا ہوئی ہیں البتہ کافروں کو بھی ان چیزوں سے روکا نہیں گیا وہ بھی اپنے اعمال و تدابیر سے دنیاوی مفاد حاصل کر لیتے ہیں، بلکہ جب اہل ایمان قوت ایمان و تقویٰ میں کمزور ہوں، تو یہ غاصبین اپنی عملی تگ و دو میں بظاہر زیادہ کامیاب معلوم ہوتے ہیں جسے کچھ تو کفار کے اعمال فانیہ کا ثمرہ سمجھنا چاہیے اور کچھ مؤمنین کے حق میں تنبیہ و توبیخ مَنۡ کَانَ یُرِیۡدُ الۡحَیٰوةَ الدُّنۡیَا وَزِیۡنَتَهَا نُوَفِّ اِلَیۡهِمۡ اَعۡمَالَهُمۡ فِیۡهَا وَهُمۡ فِیۡهَا لَا یُبۡخَسُوۡنَ اُولٰٓئِكَ الَّذِیۡنَ لَیۡسَ لَهُمۡ فِی الۡاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوۡا فِیۡهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ (ہود: ۱۵-۱۶) رہی آخرت کی نعماء وہ خالص اہل ایمان کا حصہ ہے۔

بعض علماء نے خالصةً یوم القیامة کے معنی یہ لئے ہیں کہ دنیاوی نعمتیں خالص نہیں، کیونکہ ان کے ساتھ بہت سے غم وفکر اور تکلیفیں برداشت کرنا پڑتی ہیں، آخرت کی نعمتیں ہر قسم کی کدورات سے خالی ہوں گی اور ابن عباس رضی اللہ عنہ سے درمنثور میں آیت کے معنی یہ نقل کئے ہیں کہ دنیاوی نعمتیں اس شان سے کہ آخرت میں وبال نہ بنیں صرف مومنین کیلئے ہیں کفار کے حق میں یہاں کا تنعم ان کے کفر و حق ناشناسی کی وجہ سے عذاب و وبال بن جائے گا۔

قُلۡ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الۡفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنۡهَا وَمَا بَطَنَ وَالۡاِثۡمَ وَالۡبَغۡیَ بِغَیۡرِ الۡحَقِّ

تو کہہ دے میرے رب نے حرام کیا ہے صرف بے حیائی کی باتوں کو جو ان میں کھلی ہوئی ہیں اور جو چھپی ہوئی ہیں اور گناہ کو اور ناحق کی زیادتی کو

وَاَنۡ تُشۡرِكُوۡا بِاللّٰهِ مَا لَمۡ یُنَزِّلۡ بِهٖ سُلۡطٰنًا وَّاَنۡ تَقُوۡلُوۡا عَلَی اللّٰهِ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۳۳﴾

اور اس بات کو کہ شریک کرو اللہ کا ایسی چیز کو کہ جس کی اس نے سند نہیں اتاری اور اس بات کو کہ لگاؤ اللہ کے ذمہ وہ باتیں جو تم کو معلوم نہیں ہے

خلاصہ تفسیر: آپ (صلی اللہ علیہ وسلم ان سے یہ بھی) فرمائیے کہ (تم نے جن حلال چیزوں کو بلا وجہ حرام سمجھ کر چھوڑ رکھا ہے وہ تو اللہ نے حرام نہیں کی) البتہ میرے رب نے صرف (ان چیزوں کو جن میں سے اکثر میں تم مبتلا ہو) حرام کیا ہے (مثلاً) تمام فحش باتوں کو ان میں جو علانیہ ہیں وہ بھی (جیسے ننگے ہو کر طواف کرنا) اور ان میں جو پوشیدہ ہیں وہ بھی (جیسے بدکاری) اور ہر گناہ کی بات کو (حرام کیا ہے) اور ناحق کسی پر ظلم کرنے کو (حرام کیا ہے) اور اس بات کو (حرام کیا ہے) کہ تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی ایسی چیز کو شریک (عبادت) ٹھہراؤ جس کی اللہ نے کوئی سند (اور دلیل) نازل نہیں فرمائی (نہ کلی طور پر نہ جزئی طور پر) اور اس بات کو (حرام کیا ہے) کہ تم لوگ اللہ تعالیٰ کے ذمہ ایسی بات لگا دو جس کی تمہارے پاس کوئی سند نہ ہو (یعنی جو واقع میں حلال ہیں ان کو تو تم نے حرام سمجھا اور جو واقع میں حرام ہیں ان کو حلال سمجھا، عجیب جہالت میں گرفتار ہو)۔

قُلۡ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الۡفَوَاحِشَ: جس طرح پیچھے آیت: قل امر ربّی بالقسط میں تمام مامورات جن پر عمل کرنا مشروع ہے داخل تھے، اسی طرح یہاں: اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الۡفَوَاحِشَ میں تمام منہیات جن کی ممانعت ہے داخل ہیں، لفظ وَالۡاِثۡمَ یعنی گناہ کے تحت وہ تمام معاصی اور گناہ آگئے جن کا تعلق انسان کی اپنی ذات سے ہے، اور وَالۡبَغۡيَ بِغَيۡرِ الۡحَقِّ میں وہ گناہ جن کا تعلق دوسروں کے معاملات اور حقوق سے ہو، اور شرک اور بے سند باتوں میں تمام فاسد عقائد آگئے، اور بے حیائی کے گناہوں کو خاص طور پر اہتمام کے لیے ذکر کر دیا گیا۔

* * *

فائدہ: ۱؎ اثم سے عام گناہ مراد ہیں اور بعض مخصوص گناہوں کو مناسبت مقام یا اہمیت کی وجہ سے بیان فرما دیا، ''اثم'' وہ گناہ ہے جس کا تعلق گناہ کرنے والے کے سوا دوسرے لوگوں سے نہ ہو۔ واللہ اعلم۔

فائدہ: ۲؎ جیسا کہ فحشاء کے متعلق کہتے تھے: واللّٰہُ اَمَرَنَا بِھَا۔

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمۡ لَا يَسۡتَاۡخِرُوۡنَ سَاعَةً وَّلَا يَسۡتَقۡدِمُوۡنَ ﴿۳۴﴾

اور ہر فرقے کے واسطے ایک وعدہ ہے، پھر جب آپہنچے گا ان کا وعدہ نہ پیچھے سرک سکیں گے ایک گھڑی اور نہ آگے سرک سکیں گے

خلاصہ تفسیر: اور (اگر ان حرام کاموں کے ارتکاب کرنے والوں کو فوراً سزا نہ ہونے سے ان کے حرام ہونے میں کسی کو شبہ ہو جائے تو اس کا جواب یہ ہے کہ علم الٰہی میں) ہر گروہ (کے ہر فرد کی سزا) کے لئے (حکمت کی وجہ سے) ایک میعاد معیّن ہے سو جس وقت ان کی (وہ) میعاد معین (نزدیک) آجائے گی اس وقت ایک ساعت نہ (اس سے) پیچھے ہٹ سکیں گے اور نہ آگے بڑھ سکیں گے (بلکہ فوراً ہی سزا جاری ہو جائے گی، اس وقت سے قبل سزا نہ ہونا اس بات کی دلیل نہیں کہ ان محرمات پر سزا نہ ہوگی)۔

* * *

فائدہ: بظاہر شبہ ہوتا ہے کہ جب وعدہ کا وقت آپہنچا اور بعض کے نزدیک تو تاخیر کا امکان عقلی تھا اس لئے اس کی نفی ضروری ہوئی مگر تقدیم تو عقلاً ممکن ہی نہیں، اس کی نفی سے کیا فائدہ ہے؟ اسی شبہ کی وجہ سے بعض مفسرین نے لَا يَسۡتَقۡدِمُوۡنَ کا عطف شرطیہ اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمۡ الخ پر مانا ہے اور بعض نے جَآءَ اَجَلُهُمۡ سے قرب ودُنُوّ مراد لیا ہے، میرے نزدیک ان تکلفات کی حاجت نہیں، محاورات میں کسی ایسی چیز کو جس کے مقابل دو طرفین ہوں زور اور تاکید سے ثابت کرنے کے لئے بسا اوقات ایک طرف کی جو محتمل الثبوت ہو نفی مقصوداً کی جاتی ہے اور دوسری طرف کی جو پہلے سے غیر محتمل ہے نفی کو محض مبالغۃ تاکید اور تحسین کلام کے طور پر استطراداً ذکر کر دیتے ہیں، ایک خریدار دکاندار سے کسی چیز کی قیمت معلوم کر کے کہتا ہے کہ کچھ ''کم وبیش'' دکاندار بھی کہہ دیتا ہے کہ ''کم وبیش'' نہیں ہو سکتا، دونوں جگہ ''کم'' کا ذکر مقصود ہے، اور ''بیش'' کا لفظ محض تعیین قیمت کی تاکید ومبالغہ کے لئے استطراداً ذکر کیا گیا ہے، یہاں بھی غرض اصلی کلام سے یہ ہے کہ خدا کا وعدہ جب آپہنچے تو پھر اٹل ہے ایک منٹ کی تقدیم وتاخیر نہیں ہو سکتی، مقصود تاخیر کی نفی کرنا ہے، تقدیم جو پہلے سے ظاہر الانتفاء تھی اس کی نفی کرنا محض وعدہ کے اصل ہونے پر زور ڈالنے کا ایک پیرایہ ہے یعنی خدا پر افترا کرنے والے اور اس کی طرف نسبت کر کے حرام کو حلال بنانے والے خدا کی ڈھیل پر مغرور وبے فکر نہ ہوں، ہر امت اور ہر فرد کی خدا کے یہاں ایک معین مدت ہے، جب سزا کی گھڑی آجائے گی پھر ٹل نہ سکے گی۔

يٰبَنِيۡۤ اٰدَمَ اِمَّا يَاۡتِيَنَّكُمۡ رُسُلٌ مِّنۡكُمۡ يَقُصُّوۡنَ عَلَيۡكُمۡ اٰيٰتِيۡ ۙ فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصۡلَحَ فَلَا خَوۡفٌ

اے اولاد آدم کی اگر آئیں تمہارے پاس رسول تم میں کے کہ سنائیں تم کو آیتیں میری، تو جو کوئی ڈرے اور نیکی پکڑے تو نہ خوف ہوگا

عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ ﴿۳۵﴾ وَالَّذِيۡنَ كَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِنَا وَاسۡتَكۡبَرُوۡا عَنۡهَاۤ اُولٰۤٮِٕكَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ۚ

ان پر اور نہ وہ غمگین ہوں گے، اور جنہوں نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو اور تکبر کیا ان سے وہی ہیں دوزخ میں رہنے والے

هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۳۶﴾

وہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے لے۔

خلاصہ تفسیر: پیچھے عقائد واعمال میں شیطان کی اتباع وموافقت اور احکام الٰہیہ کی مخالفت سے روکا گیا، اب یہ بتلاتے ہیں کہ تم کو اس مضمون کا خطاب کچھ نیا نہیں، بلکہ عالم ارواح ہی میں یہ عہد لے لیا گیا تھا اور وعدہ وعید سنا دیا گیا تھا، اس سے مسئلہ رسالت اور آخرت بھی ثابت ہو گیا جو کہ اس سورت کے اہم مقاصد میں سے ہے۔

(ہم نے عالم ارواح ہی میں کہہ دیا تھا) اے اولاد آدم کی! اگر تمہارے پاس پیغمبر آئیں جو تم ہی میں سے ہوں گے جو میرے احکام تم سے بیان کریں گے، سو (انکے آنے پر) جو شخص (تم میں ان آیات کے جھٹلانے سے) پرہیز رکھے اور (اعمال کی) درستی کرے (مراد یہ کہ کامل اتباع کرے) سو ان لوگوں پر (آخرت میں) نہ کچھ اندیشہ (کی بات واقع ہونے والی) ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے، اور جو لوگ (تم میں سے) ہمارے ان احکام کو جھوٹا بتادیں گے اور ان (کے قبول کرنے) سے تکبر کریں گے وہ لوگ دوزخ (میں رہنے) والے ہوں گے (اور) وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔

❊ ❊ ❊

فائدہ: لے ابن جریرؒ نے ابو یسار سلمیؒ سے نقل کیا ہے کہ یہ خطاب یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ اِمَّا یَاْتِیَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ کل اولاد آدم کو عالم ارواح میں ہوا تھا، جیسا کہ سورۃ بقرہ کے سیاق سے ظاہر ہوتا ہے قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِیْعًا ۚ فَاِمَّا یَاْتِیَنَّكُمْ مِّنِّیْ هُدًی (البقرۃ:۳۸) اور بعض محققین کے نزدیک جو خطاب ہر زمانہ میں ہر قوم کو ہوتا رہا یہ اس کی حکایت ہے۔

میرے نزدیک دو رکوع پہلے سے جو مضمون چلا آ رہا ہے اس کی ترتیب وتنسیق خود ظاہر کرتی ہے کہ جب آدم وحوا اپنے اصلی مسکن (جنت) سے جہاں ان کو آزادی وفراخی کے ساتھ بلا روک ٹوک زندگی بسر کرنے کا حکم دیا جا چکا تھا، عارضی طور پر محروم کر دیئے گئے تو ان کی مخلصانہ توبہ وانابت پر نظر کرتے ہوئے مناسب معلوم ہوا کہ اس حرمان کی تلافی اور تمام اولاد آدم کو اپنی آبائی میراث واپس دلانے کے لئے کچھ ہدایات کی جائیں، چنانچہ ہبوط آدم کا قصہ ختم کرنے کے بعد معاً یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَیْكُمْ لِبَاسًا (الاعراف:۲۶) سے خطاب شروع فرما کر تین چار رکوع تک ان ہی ہدایات کا مسلسل بیان ہوا ہے، ان آیات میں کل اولاد آدم کو گویا یک وقت موجود تسلیم کر کے عام خطاب کیا گیا ہے کہ جنت سے نکلنے کے بعد ہم نے بہشتی لباس وطعام کی جگہ تمہارے لئے زمینی لباس وطعام کی تدبیر فرما دی گو جنت کی خوشحالی اور بے فکری یہاں میسر نہیں تاہم ہر قسم کی راحت وآسائش کے سامان سے متنفع ہونے کا تم کو موقع دیا تاکہ تم یہاں رہ کر اطمینان سے اپنا مسکن اصلی اور آبائی ترکہ واپس لینے کی تدبیر کر سکو، چاہیے کہ شیطان لعین کے مکروفریب سے ہشیار رہو، کہیں ہمیشہ کے لئے تم کو اس میراث سے محروم نہ کر دے، بے حیائی اور اثم وعدوان سے بچو، اخلاص وعبودیت کا راستہ اختیار کرو، خدا کی نعمتوں سے تمتع کرو مگر جو حدود وقیود مالک حقیقی نے عائد کر دی ہیں ان سے تجاوز نہ کرو، پھر دیکھو ہر قوم اپنی اپنی مدت موعودہ پوری کر کے کس طرح اپنے ٹھکانہ پر پہنچ جاتی ہے، اس اثناء میں اگر خدا کسی وقت تم ہی میں سے اپنے پیغمبر مبعوث فرمائے جو خدا کی آیات پڑھ کر سنائیں جن سے تم کو اپنے باپ کی اصلی میراث (جنت) حاصل کرنے کی ترغیب وتذکیر ہو اور مالک حقیقی کی خوشنودی کی راہیں معلوم ہوں، ان کی پیروی اور مدد کرو، خدا سے ڈر کر برے کاموں کو چھوڑ دو اور اعمال صالحہ اختیار کرو تو پھر تمہارا مستقبل بالکل بے خوف وخطر ہے، تم ایسے مقام پر پہنچ جاؤ گے جہاں سکھ اور امن واطمینان کے سوا کوئی دوسری چیز نہیں، ہاں اگر ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور تکبر کر کے ان پر عمل کرنے سے کترائے تو مسکن اصلی اور آبائی میراث سے دائمی محرومی اور ابدی عذاب وہلاکت کے سوا کچھ نہ ملے گا۔

بہر حال جو لوگ اس آیت سے ختم نبوت کی نصوص قطعیہ کے خلاف قیامت تک کے لئے انبیاء ورسل کی آمد کا دروازہ کھولنا چاہتے ہیں ان کے لئے اس جگہ کوئی موقع اپنی مطلب برآوری کا نہیں۔

فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ يَنَالُهُمْ نَصِيْبُهُمْ

پھر اس سے زیادہ ظالم کون جو بہتان باندھے اللہ پر جھوٹا یا جھٹلائے اس کے حکموں کو [1] وہ لوگ ہیں کہ ملے گا ان کو جو ان کا حصہ

مِّنَ الْكِتٰبِ ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا يَتَوَفَّوْنَهُمْ ۙ قَالُوْٓا اَيْنَ مَا كُنْتُمْ تَدْعُوْنَ

لکھا ہوا ہے کتاب میں [2] یہاں تک کہ جب پہنچیں انکے پاس ہمارے بھیجے ہوئے انکی جان لینے کو، تو کہیں کیا ہوئے وہ جنکو تم پکارا کرتے تھے

مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا وَشَهِدُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ ﴿۳۷﴾

سوا اللہ کے، بولیں گے وہ ہم سے کھوئے گئے اور اقرار کرلیں گے اپنے اوپر کہ بیشک کافر تھے [3]

خلاصہ تفسیر: (جب جھٹلانے والوں کا سخت وعید کا مستحق ہونا اجمالاً معلوم ہو گیا، سو اب تفصیل سنو کہ) اس شخص سے زیادہ کون ظالم ہوگا جو اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھے (یعنی جو بات خدا کی کہی ہوئی نہ ہو اس کو تو خدا کی طرف منسوب کرے) یا اس کی آیتوں کو جھوٹا بتلادے (یعنی جو بات خدا نے کہی ہو اس کو بے کہی بتلادے) ان لوگوں کے نصیب کا جو کچھ (رزق اور عمر) ہے وہ تو ان کو (دنیا میں) مل جائے گا (لیکن آخرت میں مصیبت ہی مصیبت ہے) یہاں تک کہ (برزخ میں مرنے کے وقت تو ان کی یہ حالت ہوگی کہ) جب ان کے پاس ہمارے بھیجے ہوئے فرشتے ان کی جان قبض کرنے آئیں گے تو (ان سے) کہیں گے کہ (کہو) وہ کہاں گئے جن کی تم خدا کو چھوڑ کر عبادت کیا کرتے تھے (اب اس مصیبت میں کیوں نہیں کام آتے) وہ (کفار) کہیں گے کہ ہم سے سب غائب ہو گئے (یعنی واقعی کوئی کام نہ آیا) اور (اس وقت) اپنے کافر ہونے کا اقرار کرنے لگیں گے (لیکن اس وقت کا اقرار بے کار ہوگا، اور بعض آیات میں ایسے ہی سوال و جواب کا قیامت میں ہونا بھی مذکور ہے، سو دونوں موقعوں پر ہونا ممکن ہے)۔

* * * *

فائدہ: [1] افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ: یعنی ان سچے پیغمبروں کی تصدیق کرنا ضروری ہے جو واقعی خدا کی آیات سناتے ہیں، باقی جو شخص پیغمبری کا جھوٹا دعویٰ کرکے اور جھوٹی آیات بنا کر خدا پر افتراء کرے یا کسی سچے پیغمبر کو اور اس کی لائی ہوئی آیات کو جھٹلائے ان دونوں سے زیادہ ظالم کوئی نہیں۔

فائدہ: [2] اُولٰٓئِكَ يَنَالُهُمْ نَصِيْبُهُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ: یعنی دنیا میں عمر و رزق وغیرہ جتنا مقدر ہے یا یہاں کی ذلت و رسوائی جو ان کے لئے لکھی ہے وہ پہنچے گی، پھر مرتے وقت اور مرنے کے بعد جو درگت بنے گی اس کا ذکر آگے آتا ہے، اور اگر نَصِيْبُهُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ سے دنیا کا نہیں عذاب اخروی کا حصہ مراد لیا جائے تو حتی اذا جاءتھم سے اس پر تنبیہ ہوگی کہ اس عذاب کے مبادی کا سلسلہ اسی دنیاوی زندگی کے آخری لمحات میں شروع ہو جاتا ہے۔

فائدہ: [3] وَشَهِدُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ: یعنی جب فرشتے نہایت سختی سے ان کی روح قبض کرکے برے حال سے لے جاتے ہیں تو ان سے کہتے ہیں کہ خدا کے سوا جن کو تم پکارا کرتے تھے وہ کہاں گئے جو اب تمہارے کام نہیں آتے، انہیں بلاؤ تا کہ اس مصیبت سے تمہیں چھڑائیں، اس وقت کفار کو اقرار کرنا پڑتا ہے کہ ہم سخت غلطی میں پڑے تھے کہ ایسی چیزوں کو معبود و مستعان بنا لیا جو اس کے مستحق نہ تھے، آج ہماری اس مصیبت میں ان کا کہیں پتا نہیں، لیکن یہ ناوقت کا اقرار و ندامت کیا نفع دے سکتی ہے حکم ہوگا اُدْخُلُوْا فِيْٓ اُمَمٍ الخ باقی بعض مواضع میں جو وارد ہوا ہے کہ وہ اپنے کفر و شرک سے انکار کریں گے، اس آیت کے منافی نہیں، کیونکہ قیامت میں مواقف اور احوال مختلف ہوں گے اور جماعتیں بھی بیشمار ہوں گی کہیں ایک موقف یا ایک جماعت کا ذکر ہے کہیں دوسری کا۔

قَالَ ادْخُلُوْا فِيْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ فِي النَّارِ ؕ كُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ

فرمائے گا داخل ہو جاؤ ہمراہ اور امتوں کے جو تم سے پہلے ہو چکی ہیں جن اور آدمیوں میں سے دوزخ کے اندر ۱ جب داخل ہو گی ایک امت

لَّعَنَتْ اُخْتَهَا ؕ حَتّٰٓى اِذَا ادَّارَكُوْا فِيْهَا جَمِيْعًا ۙ قَالَتْ اُخْرٰىهُمْ لِاُوْلٰىهُمْ رَبَّنَا

تو لعنت کرے گی دوسری امت کو ۲ یہاں تک کہ جب گر چکیں گے اس میں سارے تو کہیں گے ان کے پچھلے پہلوں کو اے رب ہمارے

هٰٓؤُلَآءِ اَضَلُّوْنَا فَاٰتِهِمْ عَذَابًا ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ ؕ۬ قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۸﴾

ہم کو انہی نے گمراہ کیا سو تو ان کو دے دونا عذاب آگ کا، فرمائے گا کہ دونوں کو دوگنا ہے لیکن تم نہیں جانتے ۳

خلاصہ تفسیر: (اور قیامت میں ان کا یہ حال ہوگا کہ) اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ جو فرقے (کفار کے) تم سے پہلے گزر چکے ہیں جنات میں سے بھی اور آدمیوں میں سے بھی ان کے ساتھ تم بھی دوزخ میں جاؤ (چنانچہ آگے پیچھے سب کفار اس میں داخل ہوں گے، اور داخل ہونے کی یہ کیفیت ہوگی کہ) جس وقت بھی کوئی جماعت (کفار کی دوزخ میں) داخل ہوگی اپنی جیسی دوسری جماعت کو بھی (جو انہی جیسے کافر ہوں گے اور ان سے پہلے دوزخ میں جا چکے ہوں گے) لعنت کرے گی (یعنی باہم ہمدردی نہ ہوگی، بلکہ حقائق کے منکشف ہو جانے کی وجہ سے ہر شخص دوسرے کو بری نظر سے دیکھے گا اور برا کہے گا) یہاں تک کہ جب اس (دوزخ) میں سب جمع ہو جائیں گے تو (اس وقت) پچھلے لوگ (جو بعد میں داخل ہوئے ہوں گے اور یہ وہ لوگ ہوں گے جو کفر میں دوسروں کے تابع ہوئے تھے) پہلے (داخل ہونے والے) لوگوں کی نسبت (یعنی ان لوگوں کی نسبت جو سردار اور کفر کے پیشوا ہونے کی وجہ سے دوزخ میں پہلے داخل ہو چکے ہوں گے یہ) کہیں گے کہ اے ہمارے پروردگار! ہم کو ان لوگوں نے گمراہ کیا تھا، سو ان کو دوزخ کا عذاب (ہم سے) دوگنا دیجئے (اللہ تعالیٰ) ارشاد فرمائیں گے کہ (ان کو دوگنا ہونے سے تم کو کون سی تسلی اور راحت ہو جائے گی، بلکہ چونکہ تمہارا عذاب بھی ہمیشہ آناً فاناً بڑھتا جائے گا، اس لئے تمہارا عذاب بھی ان کے دوگنے عذاب ہی جیسا ہو گیا، پس اس حساب سے) سب ہی کا (عذاب) دوگنا ہے، لیکن (ابھی) تم کو (پوری) خبر نہیں (کیونکہ ابھی تو عذاب کی ابتداء ہی ہے، اس بڑھنے کو دیکھا نہیں اس لئے ایسی باتیں بنا رہے ہو جن سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے کو دوگنا عذاب ہونا اپنے لئے باعث تسلی اور غصہ ٹھنڈا کرنے کا سبب سمجھ رہے ہو)۔

* * *

فائدہ:۱ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ فِي النَّارِ: یعنی آگے پیچھے کفار کو دوزخ ہی میں داخل ہونا ہے۔

فائدہ:۲ كُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا: یعنی اس مصیبت میں باہم ہمدردی تو کیا ہوتی، دوزخی ایک دوسرے پر لعن طعن کریں گے، شاید اتباع اپنے سرداروں سے کہیں کہ تم پر خدا کی لعنت ہو تم اپنے ساتھ ہمیں بھی لے ڈوبے اور سردار اتباع سے کہیں کہ ملعونو! اگر ہم گڑھے میں گر پڑے تھے تو تم کیوں اندھے بن گئے، وغیر ذالک

فائدہ:۳ لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ: یعنی ایک حساب سے پہلوں کا گناہ دگنا کہ خود گمراہ ہوئے اور دوسرے آنے والوں کے لئے راہ ڈالی، اور ایک طرح پچھلوں کا دگنا کہ خود بہکے اور پہلوں کا حال دیکھ سن کر عبرت حاصل نہ کی، یا چونکہ ہر دوزخی کا عذاب اپنے اپنے درجہ کے موافق وقتاً فوقتاً بڑھتا رہے گا اس لئے فرمایا کہ ہر ایک کا عذاب دگنا ہوتا چلا جائے گا، ابھی آغاز تعذیب میں تمہیں انجام کی خبر نہیں یعنی پہلوں کا عذاب دگنا کر دینے سے تم پچھلوں کو کوئی شفاء اور راحت نصیب نہیں ہوگی، یہ تقریر اس صورت میں ہے کہ لِكُلٍّ ضِعْفٌ سے دونوں فریق مراد لئے جائیں، لیکن ابن کثیر کے نزدیک اس آیت میں پچھلوں کو مطلع کیا گیا ہے کہ بیشک ہم نے پہلوں میں سے ہر ایک کے لئے اس کے درجہ کے موافق دگنا ہی عذاب رکھا ہے جیسا کہ دوسری جگہ خبر دی ہے: اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ زِدْنٰهُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ (النحل: ۸۸) وَلَيَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ

وَاَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ (العنکبوت: ۱۳) وَمِنْ اَوْزَارِ الَّذِيْنَ يُضِلُّوْنَهُمْ (النحل: 25)

وَقَالَتْ اُوْلٰىهُمْ لِاُخْرٰىهُمْ فَمَا كَانَ لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ﴿۳۹﴾ ع

اور کہیں گے ان کے پہلے پچھلوں کو پس کچھ نہ ہوئی تم کو ہم پر بڑائی اب چکھو عذاب بسبب اپنی کمائی کے

خلاصہ تفسیر: اور پہلے (داخل ہونے والے) لوگ پچھلے (بعد میں داخل ہونے والے) لوگوں سے (خدا تعالیٰ کے اس جواب کو سن کر) کہیں گے (کہ جب سب کی سزا کی یہ حالت ہے تو) پھر تم کو ہم پر (تخفیف عذاب کے بارے میں) کوئی فوقیت نہیں (کیوں کہ تخفیف نہ ہم کو نہ تم کو) سو تم بھی اپنے (برے) کردار کے مقابلے میں (متزاید دوگنا) عذاب کا مزہ چکھتے رہو۔

* * *

فائدہ: یعنی ہماری سزا میں اضافہ کی درخواست کر کے تمہیں کیا مل گیا؟ کیا تمہارے عذاب میں کچھ تخفیف ہوگئی؟ نہیں، تم کو بھی اپنی کرتوت کا مزہ چکھنا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ وَلَا يَدْخُلُوْنَ

بے شک جنہوں نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو اور انکے مقابلہ میں تکبر کیا نہ کھولے جائیں گے ان کیلئے دروازے آسمان کے ۱؎ اور نہ داخل ہوں گے

الْجَنَّةَ حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ ؕ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۴۰﴾

جنت میں یہاں تک کہ گھس جائے اونٹ سوئی کے ناکے میں ۲؎ اور ہم یوں بدلہ دیتے ہیں گناہ گاروں کو

خلاصہ تفسیر: (گذشتہ آیات میں تو کفار کے جہنم میں داخل ہونے کی حالت بیان ہوئی، اب جنت سے محرومی کی کیفیت سنو:) جو لوگ ہماری آیتوں کو جھوٹا بتلاتے ہیں اور ان (کے ماننے) سے تکبر کرتے ہیں ان (کی روح کے چڑھنے) کے لئے (مرنے کے بعد) آسمان کے دروازے نہ کھولے جائیں گے (یہ تو حالت مرنے کے بعد عالم برزخ میں ہوگی) اور (قیامت کے روز) وہ لوگ کبھی جنت میں نہ جائیں گے جب تک کہ اونٹ سوئی کے ناکہ کے اندر سے نہ چلا جائے (اور یہ محال ہے تو ایسے ہی ان کا جنت میں داخل ہونا بھی محال ہے) اور ہم ایسے مجرم لوگوں کو ایسی ہی سزا دیتے ہیں (یعنی ہم کو ان سے کوئی عداوت نہ تھی جیسا کیا ویسا بھگتا، نہ جرائم کا ارتکاب کرتے نہ یہ سزا بھگتنی پڑتی)۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا: یعنی جھٹلانے اور تکبر کرنے والوں کے لیے مرنے کے بعد آسمان کے دروازے نہ کھولے جائیں گے، روح المعانی میں ہے کہ جھٹلانے اور تکبر کرنے والوں کے لیے دنیا میں بھی کشادگی نہیں ہوتی۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی نہ زندگی میں ان کے اعمال کے لئے آسمانی قبول و رفعت حاصل ہے، نہ موت کے بعد ان کی ارواح کو آسمان پر چڑھنے کی اجازت ہے، حدیث صحیح میں ہے کہ "بعد موت کافر کی روح کو آسمان کی جانب سے سجین کی طرف دھکے دیئے جاتے ہیں اور مومن کی روح ساتویں آسمان تک صعود کرتی ہے"، مفصل احوال کتب احادیث میں ملاحظہ کرو۔

فائدہ: ۲؎ یہ تعلیق بالمحال کے طور پر فرمایا، ہر زبان کے محاورات میں ایسی امثال موجود ہے جن میں کسی چیز کے محال ہونے کو دوسری محال چیز پر معلق کر کے ظاہر کرتے ہیں، یعنی جس طرح یہ ناممکن ہے کہ اونٹ اپنی اسی کلانی اور جسامت پر رہے اور سوئی کا ناکہ ایسا ہی تنگ اور چھوٹا ہو، اس کے باوجود اونٹ سوئی کے ناکے میں داخل ہو جائے، اسی طرح ان مکذبین و متکبرین کا جنت میں داخل ہونا محال ہے کیونکہ حق تعالیٰ جہنم میں ان کے "خلود" کی خبر دے چکا ہے اور علم الٰہی میں یہی سزا ان کے لئے ٹھہر چکی ہے پھر خدا کے علم اور اخبار کے خلاف کیسے وقوع میں آسکتا ہے۔

لَهُمْ مِّنْ جَهَنَّمَ مِهَادٌ وَّمِنْ فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ ؕ وَ كَذٰلِكَ نَجْزِی الظّٰلِمِیْنَ ﴿۴۱﴾

ان کے واسطے دوزخ کا بچھونا ہے اور اوپر سے اوڑھنا ؁ اور ہم یوں بدلہ دیتے ہیں ظالموں کو

خلاصہ تفسیر: (اور اوپر جو دوزخ میں جانا بیان ہوا ہے تو وہ آگ ان کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہوگی کہ کسی طرف سے کچھ راحت نہ ملے، چناچہ یہ حال ہوگا کہ) ان کے لئے آتش دوزخ کا بچھونا ہوگا، اور ان کے اوپر اسی کا اوڑھنا ہوگا، اور ہم ایسے ظالموں کو ایسی ہی سزا دیتے ہیں (جن کا ذکر پیچھے آیت: فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی میں آیا ہے)۔

* * *

فائدہ: ؁ یعنی ہر طرف سے آگ محیط ہوگی، کسی کروٹ چین نہ ملے گا۔

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَاۤ ۫ اُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ

اور جو ایمان لائے اور کی نیکیاں ہم بوجھ نہیں رکھتے کسی پر مگر اس کی طاقت کے موافق، وہی ہیں جنت میں رہنے والے

هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۴۲﴾

وہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے

خلاصہ تفسیر: (پیچھے مکذبین کی سزا کی تفصیل تھی، اب مؤمنین کی جزا کی تفصیل ہے) اور جو لوگ (آیات الٰہیہ پر) ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کئے (اور یہ نیک کام چنداں مشکل نہیں، کیونکہ ہماری عادت ہے کہ) ہم کسی شخص کو اس قدرت سے زیادہ کوئی کام نہیں بتلاتے (یہ جملہ معترضہ کے طور پر تھا، غرض) ایسے لوگ جنت (میں جانے) والے ہیں (اور) وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے (اور ان کی حالت دوزخ والوں جیسی نہ ہوگی کہ وہاں بھی لعنت و پھٹکار اور بغض و عداوت ہی رہے)۔

* * *

فائدہ: لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَاۤ جملہ معترضہ ہے جس سے درمیان میں متنبہ فرما دیا کہ ایمان و عمل صالح جس پر اتنا عظیم الشان صلہ مرحمت ہوتا ہے کوئی ایسی مشکل چیز نہیں جو انسان کی طاقت سے باہر ہو، یا یہ مطلب ہے کہ ہر آدمی سے عمل صالح اس قدر مطلوب ہے جتنا اس کی مقدرت اور طاقت میں ہو اس سے زائد کا مطالبہ نہیں کیا جا رہا۔

وَنَزَعْنَا مَا فِیْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ ۚ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ

اور نکالیں گے ہم جو کچھ ان کے دلوں میں خفگی تھی ؁ بہتی ہوں گی ان کے نیچے نہریں، اور وہ کہیں گے شکر اللہ کا جس نے

هَدٰىنَا لِهٰذَا ۫ وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِیَ لَوْلَاۤ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ ۚ لَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ؕ

ہم کو یہاں تک پہنچا دیا، اور ہم نہ تھے راہ پانے والے اگر نہ ہدایت کرتا ہم کو اللہ، بیشک لائے تھے رسول ہمارے رب کے سچی بات ؂

وَنُوْدُوْۤا اَنْ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۴۳﴾

اور آواز آئے گی کہ یہ جنت ہے وارث ہوئے تم اس کے بدلے میں اپنے اعمال کے ؃

خلاصہ تفسیر: (بلکہ ان اہل جنت کی یہ کیفیت ہوگی کہ) جو کچھ ان کے دلوں میں (اگر کسی معاملہ میں طبعی اقتضاء کی وجہ سے دنیا

میں) غبار (اور رنج) تھا ہم اس کو (بھی) دور کر دیں گے (کہ باہم الفت ومحبت سے رہیں گے، اور) ان کے (مکانات کے) نیچے نہریں جاری ہوں گی، اور وہ لوگ (انتہائی فرح وسرور سے) کہیں گے اللہ تعالیٰ کا (لاکھ لاکھ) احسان ہے جس نے ہم کو اس مقام تک پہنچایا اور ہماری کبھی (یہاں تک) رسائی نہ ہوتی اگر اللہ تعالیٰ ہم کو نہ پہنچاتے (اس پہنچانے میں یہ بھی آ گیا کہ یہاں تک پہنچنے کا جو طریقہ تھا وہ ہم کو بتلا دیا یعنی ایمان اور اعمال صالحہ اور اس پر چلنے کی توفیق دی) واقعی ہمارے رب کے پیغمبر سچی باتیں لے کر آئے تھے (چنانچہ انہوں نے جن اعمال پر جنت کا وعدہ کیا تھا وہ سچا ثابت ہوا) اور ان سے پکار کر کہا جائے گا کہ یہ جنت تم کو دی گئی ہے تمہارے اعمال (حسنہ) کے بدلے۔

وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ: یعنی ان کے دلوں میں طبعی تقاضوں کی وجہ سے بعض دنیوی معاملات کے سبب کچھ مخفی عداوت وکینہ تھا ہم وہ نکال دیں گے، اس سے ثابت ہوا کہ جو کینہ طبعی اور غیر اختیاری ہو وہ دخول جنت میں رکاوٹ نہیں (البتہ اختیاری کینہ مذموم رہے گا اور ایسے لوگ جنت میں بھی داخل نہ ہو سکیں گے)۔

وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَآ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ: یعنی ہماری کبھی یہاں تک رسائی نہ ہوتی اگر اللہ تعالیٰ ہم کو نہ پہنچاتے، اس سے صریح معلوم ہوتا ہے کہ ہدایت اور منزل مقصود تک پہنچنا وہبی ہے، یعنی صرف اللہ تعالیٰ کی مدد سے ہوتا ہے، اس میں کوشش کا دخل نہیں، اور جس کوشش کا بظاہر کچھ دخل بھی ہے تو وہ کوشش خود وہبی ہے، یعنی ہدایت کی راہ پر چلنے کے لیے کوشش کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، پہنچاتے پھر بھی اللہ تعالیٰ ہی ہیں۔

وَنُوْدُوْٓا اَنْ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ: یہ نداء کرنے والا ایک فرشتہ ہوگا جیسا کہ حدیث میں ہے: "فيذهب الملك فيقول سلام عليكم تلك الجنة اورثتموها بما كنتم تعملون" کہ فرشتہ جا کر جنتیوں سے کہے گا کہ السلام علیکم تم اپنے صالح اعمال کے سبب اس جنت کے وارث بنائے گئے، اس آیت سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جنت میں داخل ہونے کا سبب اعمال ہیں، اور حدیث میں آیا ہے کہ اعمال کے سبب کوئی جنت میں نہ جائے گا بلکہ رحمت الٰہی کی وجہ سے جائیں گے، اصل یہ ہے کہ آیت میں ظاہری سبب مراد ہے اور جنت میں جانے کا ظاہری سبب تو اعمال ہیں، اور حدیث میں حقیقی سبب مراد ہے، اور بلاشبہ جنت میں جانے کا حقیقی سبب اعمال نہیں، بلکہ حقیقی سبب محض رحمت الٰہی ہے پس کوئی تعارض نہ رہا۔

* * *

فائدہ: ۱۔ وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ سے مراد یا تو یہ ہے کہ باہم جنتیوں میں نعمائے جنت کے متعلق کسی طرح کا حسد ورشک نہ ہوگا، ہر ایک اپنے کو اور دوسرے بھائی کو جس مقام میں ہے دیکھ کر خوش ہوگا، بخلاف دوزخیوں کے کہ وہ مصیبت کے وقت ایک دوسرے کو لعن طعن کریں گے جیسا کہ پہلے گزرا، اور یا یہ مراد ہے کہ صالحین کے درمیان جو دنیا میں کسی بات پر خفگی ہو جاتی ہے اور ایک دوسرے کی طرف سے انقباض پیش آتا ہے وہ سب جنت میں داخل ہونے سے پیشتر دلوں سے نکال دیا جائے گا، وہاں سب ایک دوسرے سے سلیم الصدر ہونگے، حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا: "مجھے امید ہے کہ میں اور عثمانؓ طلحہؓ زبیرؓ انہی لوگوں میں سے ہوں گے"، مترجم محقق قدس اللہ روحہ، نے اسی دوسرے معنی کے اعتبار سے ترجمہ کیا ہے۔

فائدہ: ۲۔ لَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ: یعنی خدا کی توفیق ودستگیری اور رسولوں کی سچی راہنمائی سے اس اعلیٰ مقام پر پہنچنا نصیب ہوا، ورنہ ہم کہاں اور یہ مرتبہ کہاں۔

فائدہ: ۳۔ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ: یہ آواز دینے والا خدا کی طرف سے کوئی فرشتہ ہوگا یعنی آج ساری عملی جدوجہد ٹھکانے لگ گئی اور تم نے کوشش کر کے خدا کے فضل سے اپنے باپ آدم کی میراث ہمیشہ کے لئے حاصل کر لی، حدیث میں ہے کہ: "کسی شخص کا عمل ہرگز اس کو جنت میں داخل نہیں کرے گا"، اس کا مطلب یہ ہے کہ عمل دخول جنت کا حقیقی سبب نہیں، فقط ظاہری سبب ہے، دخول جنت کا حقیقی سبب خدا کی رحمت کاملہ ہے، جیسا کہ اسی حدیث میں إلا أن يتغمدني الله برحمته کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے، ہاں! بندہ پر رحمت الٰہیہ کا نزول اسی قدر ہوتا ہے جس قدر عمل کی روح اس میں موجود ہو، مترجم رحمہ اللہ زبانی فرمایا کرتے تھے کہ گاڑی تو رحمت الٰہیہ کے زور سے چلتی ہے عمل وہ جھنڈی ہے جس کے اشارہ پر چلاتے اور روکتے ہیں۔

وَنَادٰٓى اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ اَصْحٰبَ النَّارِ اَنْ قَدْ وَجَدْنَا مَا وَعَدَنَا رَبُّنَا حَقًّا فَهَلْ وَجَدْتُّمْ

اور پکاریں گے جنت والے دوزخ والوں کو کہ ہم نے پایا جو ہم سے وعدہ کیا تھا ہمارے رب نے سچا سو تم نے بھی پایا

مَّا وَعَدَ رَبُّكُمْ حَقًّا ۭ قَالُوْا نَعَمْ ۚ فَاَذَّنَ مُؤَذِّنٌۢ بَيْنَهُمْ اَنْ لَّعْنَةُ اللّٰهِ عَلَي الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۴﴾

اپنے رب کے وعدہ کو سچا، وہ کہیں گے کہ ہاں، پھر پکارے گا ایک پکارنے والا ان کے بیچ میں کہ لعنت ہے اللہ کی ان ظالموں پر

الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۚ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ كٰفِرُوْنَ ﴿۴۵﴾

جو روکتے تھے اللہ کی راہ سے اور ڈھونڈتے تھے اس میں کجی، اور وہ آخرت سے منکر تھے

خلاصہ تفسیر: پیچھے اہل جنت اور اہل دوزخ کی جزا و سزا کی تفصیل تھی، آگے تتمہ کے طور پر ان میں جو باہم گفتگو ہوگی اس کا بیان ہے اور ان کے ساتھ اہل اعراف کی بھی کچھ باتیں اور حالات مذکور ہیں جن کی حالت ابتداءً بین بین ہوگی۔

اور (جب اہل جنت جنت میں جا پہنچیں گے، اس وقت وہ) اہل جنت اہل دوزخ کو (اپنی حالت پر خوشی ظاہر کرنے اور ان کی حسرت بڑھانے کو) پکاریں گے کہ ہم سے جو ہمارے رب نے وعدہ فرمایا تھا (ایمان اور اعمال صالحہ اختیار کرنے سے جنت دیں گے) ہم نے اس کو واقع کے مطابق پایا، سو (تم بتلاؤ کہ) تم سے جو تمہارے رب نے وعدہ کیا تھا (کہ کفر کے سبب دوزخ میں پڑو گے) تم نے بھی اس کو مطابق واقع کے پایا؟ (یعنی اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے ہونے کی اور اپنی گمراہی کی حقیقت تو اب معلوم ہوئی) وہ (اہل دوزخ جواب میں) کہیں گے ہاں (واقعی اللہ اور رسول کی سب باتیں ٹھیک نکلیں) پھر (ان دوزخیوں کی حسرت اور جنتیوں کی مسرت بڑھانے کو) ایک پکارنے والا (یعنی کوئی فرشتہ) دونوں (فریق) کے درمیان میں (کھڑا ہوکر) پکارے گا کہ اللہ تعالیٰ کی مار ہو ان ظالموں پر جو اللہ کی راہ (یعنی دین حق) سے اعراض کیا کرتے تھے، اور اس (دین حق) میں (ہمیشہ بزعم خود) کجی (کی باتیں) تلاش کرتے رہتے تھے (کہ اس میں عیب اور اعتراض پیدا کریں) اور وہ لوگ (اس کے ساتھ) آخرت کے بھی منکر تھے (جس کا نتیجہ آج بھگت رہے ہیں)۔

فائدہ: ان آیات میں ان مخاطبات و مکالمات کا ذکر ہے جو جنتیوں یا دوزخیوں یا ان دونوں اور اصحاب اعراف میں ہونگے، پہلی اور آخری گفتگو جو "اصحاب الجنۃ" اور "اصحاب النار" میں ادھر سے یا ادھر سے ہوگی صاف ظاہر کرتی ہے کہ یہ مخاطبات جنت یا دوزخ میں داخل ہونے کے بعد کے ہیں، اس لئے نظم کلام کا مقتضٰی یہ ہے کہ "اصحاب اعراف" کی درمیانی گفتگو کو بھی اس کے بعد ہی مانا جائے، بہر حال جنتی جنت میں پہنچ کر اپنے حال پر اظہار مسرت اور دوزخیوں کی تقریع و نکایت کے لئے کہیں گے کہ جو کچھ وعدے حق تعالیٰ نے پیغمبروں کی زبانی ہم سے فرمائے تھے کہ ایمان لانے والوں کو نعیم دائم ملے گی ہم تو انہیں سچا پا رہے ہیں اے اہل جہنم! تم بولو کہ تمہارے کفر و عصیان پر جو دھمکیاں دی گئی تھیں تم نے بھی ان کو سچا پایا؟ ظاہر ہے جواب میں بجز **نعم** کے اور کیا کہہ سکتے ہیں، اس وقت خدا کا ایک منادی دونوں کے درمیان کھڑے ہو کر پکارے گا کہ (یوں تو گنہگار بہت سے ہیں مگر) خدا کی بڑی پھٹکار ان ظالموں پر ہے جو خود گمراہ ہوئے اور آخرت کے انجام سے بالکل بےفکر ہو کر دوسروں کو بھی راہ حق سے روکتے رہے اور اپنی کج بحثیوں سے رات دن اسی فکر میں تھے کہ صاف اور سیدھے راستہ کو ٹیڑھا ثابت کریں۔

وَبَيْنَهُمَا حِجَابٌ ۚ وَعَلَى الْأَعْرَافِ رِجَالٌ يَعْرِفُونَ كُلًّا بِسِيمَاهُمْ ۚ وَنَادَوْا أَصْحَابَ الْجَنَّةِ

اور دونوں کے بیچ میں ہوگی ایک دیوار ۱ اور اعراف کے اوپر مرد ہوں گے کہ پہچان لیں گے ہر ایک کو اسکی نشانی سے، اور وہ پکاریں گے جنت والوں کو

أَنْ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ ۚ لَمْ يَدْخُلُوهَا وَهُمْ يَطْمَعُونَ ﴿٤٦﴾

کہ سلامتی ہے تم پر وہ ابھی جنت میں داخل نہیں ہوئے اور وہ امیدوار ہیں ۲۔

خلاصہ تفسیر: (گزشتہ کلام تو اہل جنت کا اور ان کی تائید میں اس سرکاری منادی اعلان کرنے والے کا بیان ہوا، اب آگے اعراف والوں کا ذکر ہے:) اور ان دونوں (فریق یعنی اہل جنت اور اہل دوزخ) کے درمیان آڑ (یعنی دیوار) ہوگی (جس کا ذکر سورۃ حدید میں ہے: فضرب بینھم بسور لہ باب الخ اس دیوار کا خاصہ یہ ہوگا کہ جنت کا اثر دوزخ تک اور دوزخ کا اثر جنت تک نہ جانے دے گی، رہا یہ کہ پھر گفتگو کیونکر ہوگی، سو ممکن ہے کہ اس دیوار میں جو دروازہ ہوگا، جیسا سورۃ حدید میں ہے: بسور لہ باب، اس دروازے میں سے یہ گفتگو ہو جائے یا ویسے ہی آواز پہنچ جائے) اور (اس دیوار کا، یا اس کے بالائی حصہ کا نام اعراف ہے اور اس پر سے جنتی اور دوزخی سب نظر آئیں گے، سو) اعراف کے اوپر بہت سے آدمی ہوں گے (جن کی حسنات اور سیئات میزان میں برابر وزن کی ہوئیں) وہ لوگ (اہل جنت اور اہل دوزخ میں سے) ہر ایک کو (جنت اور دوزخ کے اندر ہونے کی علامت کے علاوہ) ان کے قیافہ سے (بھی) پہچانیں گے (قیافہ یہ کہ اہل جنت کے چہروں پر نورانیت اور اہل دوزخ کے چہروں پر ظلمت اور کدورت ہوگی، جیسا دوسری آیت میں ہے: وجوہ یومئذ مسفرۃ ضاحکۃ مستبشرۃ الخ) اور یہ اہل اعراف اہل جنت کو پکار کر کہیں گے، السلام علیکم! ابھی یہ اہل اعراف جنت میں داخل نہیں ہوئے ہوں گے، اور اس کے امیدوار ہوں گے (چنانچہ حدیثوں میں آیا ہے کہ ان کی امید پوری کر دی جائے گی اور جنت میں جانے کا حکم ہو جائے گا)۔

جب وہ گناہ گار جن کے گناہ نیکیوں سے زیادہ ہوں گے جہنم سے نکال کر جنت میں داخل کیے جائیں گے تو اہل اعراف جن کے سیئات وحسنات برابر ہوں گے تو وہ بدرجہ اولی جنت میں جانے چاہئیں دلالۃ النص بھی اسی کا تقاضہ کرتی ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ حجاب کے معنی پردہ اور آڑ کے ہیں، یہاں پردہ کی دیوار مراد ہے جس کی تصریح سورۃ حدید میں کی گئی ہے: فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُورٍ لَّهُ بَابٌ (الحدید: ۱۳) یہ دیوار جنت کی لذتوں کو دوزخ تک اور دوزخ کی کلفتوں کو جنت تک پہنچنے سے مانع ہوگی اس کی تفصیلی کیفیت کا ہم کو علم نہیں۔

فائدہ: ۲ اسی درمیانی دیوار کی بلندی پر جو مقام ہوگا اس کو اعراف کہتے ہیں، اصحاب اعراف کون لوگ ہیں؟ قرطبی نے اس میں بارہ قول نقل کئے ہیں، ہمارے نزدیک ان میں راجح وہ ہی قول ہے جو حضرت حذیفہؓ، ابن عباسؓ، ابن مسعودؓ جیسے جلیل القدر صحابہ اور اکثر سلف وخلف سے منقول ہے، یعنی وزن اعمال کے بعد جن کے حسنات بھاری ہوں گے وہ جنتی ہیں، اور جن کے سیئات غالب ہوئے وہ دوزخی، اور جن کے حسنات و سیئات بالکل مساوی ہوں گے وہ اصحاب اعراف ہیں۔

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ انجام کار اصحاب اعراف جنت میں چلے جائیں گے اور یہ ویسے بھی ظاہر ہے کہ جب عصاۃ مومنین جن کے سیئات غالب تھے جہنم سے نکل کر آخر کار جنت میں داخل ہوں گے، تو اصحاب اعراف جن کے حسنات اور سیئات برابر ہیں وہ ان سے پہلے داخل ہونے چاہئیں، گویا اصحاب اعراف کو اصحاب الیمین کی ایک کمزور قسم سمجھنا چاہئے، جس طرح سابقین مقربین فی الحقیقت اصحاب یمین کی ایک ایسی قسم ہے جو اپنی اولوالعزمیوں کی بدولت عام اصحاب یمین سے کچھ آگے نکل گئے ہیں، اس کے بالمقابل اصحاب اعراف گری ہوئی قسم ہے جو اپنے اعمال کی کثافت کی وجہ سے عام اصحاب یمین سے کچھ پیچھے رہ گئے ہیں یہ لوگ ''اہل جہنم'' اور ''اہل جنت'' کے درمیان میں ہونے کی وجہ سے دونوں طبقے کے لوگوں کو

ان کی مخصوص نشانیوں سے پہچانتے ہوں گے، جنتیوں کو ان کے سفید اور نورانی چہروں سے اور دوزخیوں کو ان کی روسیاہی اور بدرونقی سے، بہر حال جنت والوں کو دیکھ کر سلام کریں جو بطور مبارکباد ہوگا اور چونکہ خود ابھی جنت میں داخل نہیں ہو سکے اس کی طمع اور آرزو کریں گے جو آخر کار پوری کر دی جائے گی۔

وَإِذَا صُرِفَتْ أَبْصَارُهُمْ تِلْقَاءَ أَصْحٰبِ النَّارِ ۙ قَالُوا رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِينَ ﴿٤٧﴾ ع

اور جب پھرے گی ان کی نگاہ دوزخ والوں کی طرف تو کہیں گے اے رب ہمارے مت کر ہم کو گناہ گار لوگوں کے ساتھ

خلاصہ تفسیر: اور جب ان کی نگاہیں اہل دوزخ کی طرف جا پڑیں گی (اس وقت ہول کھا کر) کہیں گے اے ہمارے رب! ہم کو ان ظالم لوگوں کے ساتھ (عذاب میں) شامل نہ کیجیے۔

* * *

فائدہ: جنت و دوزخ کے درمیان میں ہونے کی وجہ سے ان لوگوں کی حالت خوف و رجاء کے بیچ ہوگی ادھر دیکھیں گے تو امید کریں گے اور ادھر نظر پڑے گی تو خدا سے ڈر کر پناہ مانگیں گے کہ ہم کو ان دوزخیوں کے زمرہ میں شامل نہ کیجیے۔

وَنَادٰى أَصْحٰبُ الْأَعْرَافِ رِجَالًا يَعْرِفُونَهُمْ بِسِيمٰهُمْ قَالُوا مَا أَغْنٰى عَنْكُمْ جَمْعُكُمْ

اور پکاریں گے اعراف والے ان لوگوں کو کہ ان کو پہچانتے ہیں ان کی نشانی سے [1] کہیں گے نہ کام آئی تمہارے جماعت تمہاری

وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُونَ ﴿٤٨﴾ أَهٰؤُلَاءِ الَّذِينَ أَقْسَمْتُمْ لَا يَنَالُهُمُ اللّٰهُ بِرَحْمَةٍ ۭ اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ

اور جو تم تکبر کیا کرتے تھے [2] اب یہ وہی ہیں کہ تم قسم کھایا کرتے تھے کہ نہ پہنچے گی ان کو اللہ کی رحمت، چلے جاؤ جنت میں

لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمْ وَلَا أَنْتُمْ تَحْزَنُونَ ﴿٤٩﴾

نہ ڈر ہے تم پر اور نہ تم غمگین ہوگے

خلاصہ تفسیر: اور (جیسے ان اہل اعراف نے پیچھے اہل جنت سے سلام و کلام کیا، اسی طرح) اہل اعراف (دوزخیوں میں سے) بہت سے آدمیوں کو (جو کہ کافر ہوں گے اور) جن کو ان کے قیافہ (چہرہ کی ظلمت و کدورت) سے پہچانیں گے (کہ یہ کافر ہیں) پکاریں گے (اور) کہیں گے کہ تمہاری جماعت اور تمہارا اپنے کو بڑا سمجھنا (اور انبیاء کی اتباع نہ کرنا) تمہارے کچھ کام نہ آیا (اور تم اسی تکبر کی وجہ سے مسلمانوں کو حقیر سمجھ کر یہ بھی کہا کرتے تھے کہ یہ بیچارے خدا کے فضل و کرم کے کیا مستحق ہوتے، جیسا کہ اگلی آیت: اھؤلاء منّ اللہ علیھم من بیننا سے بھی یہ مضمون سمجھ میں آتا ہے، تو ان مسلمانوں کو اب تو دیکھو) کیا یہ (جو جنت میں عیش کر رہے ہیں) وہی (مسلمان) ہیں جن کی نسبت تم قسمیں کھا کھا کر کہا کرتے تھے کہ ان پر اللہ تعالیٰ اپنی رحمت نہ کرے گا (تو ان پر تو اتنی بڑی رحمت ہوئی کہ) ان کو یہ حکم ہو گیا کہ جاؤ جنت میں (جہاں) تم پر نہ کچھ اندیشہ ہے اور نہ تم مغموم ہوگے۔

وَنَادٰى أَصْحٰبُ الْأَعْرَافِ رِجَالًا: یہاں خلاصہ تفسیر میں کہا "جو کہ کافر ہوں گے" یہاں کافروں کا ذکر بطور خاص اس لیے کیا گیا کہ ابھی تک دوزخ میں گناہ گار مسلمان بھی ہوں گے، قرینہ اس کا یہ ہے کہ جب اہل اعراف جنت کی امید ہی میں ہیں اس میں داخل نہیں ہوئے تو گناہ گار مسلمان جن کے گناہ اہل اعراف کے گناہوں سے زیادہ ہیں اور اسی لیے وہ دوزخ بھیجے گئے بدرجہ اولی دوزخ سے ابھی نہ نکلے ہوں گے، اس لیے یہ قید بڑھائی گئی کہ بہت سے آدمیوں کو (یعنی کافروں کو) پکاریں گے، کیونکہ اس گفتگو کے مخاطب گناہ گار مسلمان نہ ہوں گے، واللہ اعلم۔

* * *

فائدہ: ؎۱ یعنی علاوہ دوزخ میں معذب ہونے کے ان کے چہروں سے دوزخی ہونے کی علامات ہویدا ہوں گی، یا یہ مطلب ہے کہ وہ ایسے لوگ ہوں گے جن کو اصحاب اعراف نے دنیا میں دیکھا ہوگا، اس لئے وہاں صورت دیکھ کر پہچان لیں گے۔

فائدہ: ؎۲ یعنی اس مصیبت کے وقت تمہاری وہ جماعتیں اور جتھے کہاں گئے اور دنیا میں جو بڑھ بڑھ کر شیخیاں مارتے تھے وہ اب کیا ہوئیں۔

فائدہ: ؎۳ یہ ''اہل جنت'' کی طرف اشارہ کر کے دوزخیوں سے کہیں گے کہ وہ ٹوٹے پھوٹے مساکین اور ضعیف الحال جن کو تم حقیر سمجھ کر کہا کرتے تھے کہ کیا خدا کی مہربانی سب کو چھوڑ کر ان جیسوں پر ہوسکتی ہے اَهٰۤؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا (الانعام: ۵۳) ان کو تو آج کہہ دیا گیا کہ اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمْ (چلے جاؤ جنت میں بے خوف وخطر) حالانکہ تم اس عذاب میں مبتلا ہو۔

وَنَادٰۤى اَصْحٰبُ النَّارِ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اَنْ اَفِيْضُوْا عَلَيْنَا مِنَ الْمَآءِ اَوْ مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ؕ قَالُوْۤا

اور پکاریں گے دوزخ والے جنت والوں کو کہ بہاؤ ہم پر تھوڑا سا پانی یا کچھ اس میں سے جو روزی تم کو دی اللہ نے، کہیں گے

اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَهُمَا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۝۵۰ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَهْوًا وَّلَعِبًا وَّغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۚ

اللہ نے ان دونوں کو روک دیا ہے کافروں سے، جنہوں نے ٹھہرایا اپنا دین تماشا اور کھیل اور دھوکے میں ڈالا ان کو دنیا کی زندگی نے

فَالْيَوْمَ نَنْسٰىهُمْ كَمَا نَسُوْا لِقَآءَ يَوْمِهِمْ هٰذَا ۙ وَمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ ۝۵۱

سو آج ہم ان کو بھلا دیں گے جیسا انہوں نے بھلا دیا اس دن کے ملنے کو اور جیسا کہ وہ ہماری آیتوں سے منکر تھے

خلاصہ تفسیر: اور (جس طرح اوپر جنت والوں نے دوزخ والوں سے گفتگو کی اسی طرح) دوزخ والے جنت والوں کو پکاریں گے کہ (ہم بھوک اور پیاس اور سخت گرمی کے مارے بے دم ہوئے جاتے ہیں، خدا کے واسطے) ہمارے اوپر تھوڑا پانی ہی ڈال دو (شاید کچھ تسکین ہوجائے) یا اور ہی کچھ دے دو جو اللہ تعالیٰ نے تم کو دے رکھا ہے (اس گفتگو سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ امید کر کے مانگیں گے، کیونکہ انتہائی اضطراب میں بعید از توقع باتیں بھی منہ سے نکلا کرتی ہیں) جنت والے (جواب میں) کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے دونوں چیزوں کی (یعنی جنت کے کھانے اور پینے کی) کافروں کے لئے بندش کر رکھی ہے۔

جنہوں نے دنیا میں اپنے دین کو (جس کا قبول کرنا ان کے ذمہ واجب تھا) لہو ولعب بنا رکھا تھا اور جن کو دنیوی زندگانی نے دھوکہ (اور غفلت) میں ڈال رکھا تھا (اس لئے دین کی کچھ پروا ہی نہ کی، اور یہ تو دار الجزاء ہے، جب دین ہی نہیں تو اس کا ثمرہ کہاں نصیب ہو، آگے حق تعالیٰ اہل جنت کے اس جواب کی تصدیق وتائید میں فرماتے ہیں:) سو (جب ان کی دنیا میں یہ حالت تھی تو) ہم بھی آج (قیامت) کے روز ان کا نام نہ لیں گے (اور کھانا پینا خاک نہ دیں گے) جیسا انہوں نے اس (عظیم الشان) دن کا نام نہ لیا، اور جیسا یہ ہماری آیتوں کا انکار کیا کرتے تھے۔

اَنْ اَفِيْضُوْا عَلَيْنَا مِنَ الْمَآءِ اَوْ مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ: بعض عادتیں مرنے کے بعد بھی باقی رہتی ہیں، بعض کے نزدیک چونکہ یہ کفار پیٹ کے بندے اور کھانے پینے کے حریص تھے تو اسی حالت میں مرے اور اسی حالت پر ان کا حشر ہوا کہ کھانا اور پانی ہی مانگتے رہے، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ذمائم یعنی بری خصلتوں کے اثرات مرنے کے بعد بھی باقی رہتے ہیں۔

* * *

فائدہ: دوزخی بدحواس اور مضطرب ہو کر اہل جنت کے سامنے دست سوال دراز کریں گے کہ ہم جلے جاتے ہیں، تھوڑا سا پانی ہم پر بہاؤ یا جو نعمتیں تم کو خدا نے دے رکھی ہیں کچھ ان سے ہمیں بھی فائدہ پہنچاؤ، جواب ملے گا کہ کافروں کے لئے ان چیزوں کی بندش ہے، یہ کافر وہی تو ہیں جو دین

کو کھیل تماشہ بناتے تھے اور دنیا کے تنعم پر پھولے ہوئے تھے، سو جیسا ان کو دنیا کے مزوں میں پڑ کر کبھی آخرت کا خیال نہیں آیا آج ہم بھی ان کا کچھ خیال نہ کریں گے اور جس طرح انہوں نے ہماری آیتوں کا انکار کیا تھا آج ہم بھی ان کی درخواست منظور کرنے سے انکار کرتے ہیں۔

وَلَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰى عِلْمٍ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ﴿۵۲﴾

اور ہم نے ان لوگوں کے پاس پہنچادی ہے کتاب جس کو مفصل بیان کیا ہے ہم نے خبرداری سے راہ دکھانے والی اور رحمت ہے ایمان والوں کیلئے

خلاصہ تفسیر: پیچھے جزا وسزا کی تفصیل بیان کی گئی، اب یہ فرماتے ہیں کہ اس واضح بیان کا اور نیز دیگر قرآنی مضامین کا تقاضا یہ ہے کہ کفر و مخالفت سے باز آجائیں، چنانچہ اہل ایمان اس سعادت سے مشرف ہوتے ہیں، لیکن کفار و معاندین کی سختی اور شدت اس درجہ بڑھ گئی ہے کہ یہ عذاب آنے سے پہلے نہیں مانیں گے اور عذاب واقع ہونے کے بعد ماننا کام نہ آئے گا۔

اور ہم نے ان لوگوں کے پاس ایک ایسی کتاب پہنچادی ہے (یعنی قرآن) جس کو ہم نے اپنے علم کامل سے بہت ہی واضح واضح کر کے بیان کر دیا ہے (اور یہ بیان سب کو سنانے کے لیے کیا ہے، لیکن) ذریعہ ہدایت اور رحمت ان (ہی) لوگوں کے لئے (ہوا) ہے جو (اس کو سن کر) ایمان لے آتے ہیں۔

* * *

فائدہ: قرآن جیسی کتاب کی موجودگی میں جس میں تمام ضروریات کی عالمانہ تفصیل موجود ہے اور ہر بات کو پوری آگاہی سے کھول کر بیان کر دیا گیا ہے چنانچہ ایمان لانے والے اس سے خوب منتفع ہو رہے ہیں، غضب ہے کہ ان متکبر معاندوں نے کچھ بھی اپنے انجام پر غور نہ کیا، پھر اب پچھتانے سے کیا حاصل۔

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَاْوِيْلَهٗ ؕ يَوْمَ يَاْتِيْ تَاْوِيْلُهٗ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ نَسُوْهُ مِنْ قَبْلُ

کیا اب اسی کے منتظر ہیں کہ اسکا مضمون ظاہر ہو جائے، جس دن ظاہر ہو جائے گا اسکا مضمون کہنے لگیں گے وہ لوگ جو اسکو بھول رہے تھے پہلے سے

قَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ۚ فَهَلْ لَّنَا مِنْ شُفَعَآءَ فَيَشْفَعُوْا لَنَآ اَوْ نُرَدُّ فَنَعْمَلَ

بیشک لائے تھے ہمارے رب کے رسول سچی بات، سو اب کوئی ہماری سفارش والے ہیں تو ہماری سفارش کریں یا ہم لوٹا دیے جائیں تو ہم عمل کریں

غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ ؕ قَدْ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ﴿۵۳﴾ ع ۱۴

خلاف اسکے جو ہم کر رہے تھے، بیشک تباہ کیا انہوں نے اپنے آپ کو اور گم ہو جائے گا ان سے جو وہ افترا کیا کرتے تھے

خلاصہ تفسیر: (یہ لوگ جو اتمام حجت کے باوجود ایمان نہیں لاتے تو ان کی حالت سے ایسا ظاہر ہوا ہے کہ) ان لوگوں کو اور کسی بات کا انتظار نہیں صرف اس (قرآن) کے بتلائے ہوئے اخیر نتیجہ (یعنی وعدہ سزا) کا انتظار ہے (یعنی عذاب سے پہلے وعید سے نہیں ڈرتے تو خود عذاب کا واقع ہو جانا چاہتے ہیں، سو) جس روز اس کا (بتلایا ہوا) اخیر نتیجہ پیش آئے گا (جس کی تفصیل دوزخ وغیرہ کی پیچھے بیان ہوئی) اس روز جو لوگ اس کو پہلے سے بھولے ہوئے تھے (مجبور ہو کر یوں) کہنے لگیں گے واقعی ہمارے رب کے پیغمبر (دنیا میں) سچی سچی باتیں لائے تھے (مگر ہم سے حماقت ہوئی کہ دلائل دیکھ لینے کے باوجود بھی ان کو جھٹلاتے رہے) سو اب کیا کوئی ہمارا سفارشی ہے کہ وہ ہماری سفارش کر دے، یا کیا ہم پھر (دنیا میں) واپس بھیجے جا سکتے ہیں، تا کہ ہم لوگ (پھر دنیا میں جا کر) ان اعمال (بد) کے جن کو ہم کیا کرتے تھے برخلاف دوسرے اعمال (نیک) کریں (اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اب کوئی صورت نجات کی نہیں) بیشک ان لوگوں نے اپنے کو (کفر کے) خسارے میں ڈال دیا، اور یہ جو باتیں تراشتے تھے (اس

وقت) سب گم ہو گیا (اب بجز سزا کے اور کچھ نہ ہوگا)۔

❁ ❁ ❁

فائدہ: کتاب اللہ میں جو دھمکیاں عذاب کی دی گئی ہیں کیا یہ اس کے منتظر ہیں کہ جب ان دھمکیوں کا مضمون (مصداق) سامنے آجائے تب حق کو قبول کریں، حالانکہ وہ مضمون جب سامنے آجائے گا یعنی عذاب الٰہی میں گرفتار ہونگے تو اس وقت کا قبول کرنا کچھ کام نہ دے گا، اس وقت تو سفارشیوں کی تلاش ہوگی جو خدا کی سزا سفارش کر کے معاف کرادیں اور چونکہ ایسا سفارشی کافروں کو کوئی نہ ملے گا یہ تمنا کریں گے کہ ہم کو دوبارہ دنیا میں بھیج کر امتحان کرلیا جائے کہ اس مرتبہ اپنے جرائم کے خلاف ہم کیسی نیکی اور پرہیزگاری کے کام کرتے ہیں، لیکن اب اس تمنا سے کیا حاصل؟ جبکہ پہلے خود اپنے ہاتھوں اپنے کو برباد کر چکے اور جو جھوٹے خیالات پکار کھے تھے وہ سب رفو چکر ہو گئے۔

إِنَّ رَبَّكُمُ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ

بے شک تمہارا رب اللہ ہے جس نے پیدا کئے آسمان اور زمین ۱ چھ دن میں ۲ پھر قرار پکڑا عرش پر ۳

يُغْشِي اللَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهُ حَثِيثًا وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُومَ مُسَخَّرَاتٍ بِأَمْرِهِ ۗ

اڑھاتا ہے رات پر دن کہ وہ اس کے پیچھے لگا آتا ہے دوڑتا ہوا، اور پیدا کئے سورج اور چاند اور تارے ۴ تابعدار اپنے حکم کے ۵

أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ ۗ تَبَارَكَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ ﴿٥٤﴾

سن لو اسی کا کام ہے پیدا کرنا اور حکم فرمانا، بڑی برکت والا ہے اللہ جو رب ہے سارے جہان کا ۶

خلاصہ تفسیر: پیچھے آخرت کی تفصیل تھی، چونکہ مشرکین دوبارہ زندہ ہونے کو مستبعد سمجھتے تھے، اس لیے آگے اپنی قدرت اور کامل تصرف کو بیان فرماتے ہیں جسے آسمان وزمین کی تخلیق کے ذکر سے شروع فرمایا اور بارش کے ذکر پر ختم کیا۔

بے شک تمہارا رب اللہ ہی ہے جس نے سب آسمانوں اور زمین کو چھ روز (کے برابر وقت) میں پیدا کیا، پھر عرش پر (جو تخت سلطنت کے مشابہ ہے اس طرح) قائم (اور جلوہ فرما) ہوا (جو کہ اس کی شان کے لائق ہے، یعنی تخت شاہی پر قائم ہو کر زمین وآسمان میں احکام جاری کرنے لگا، اس سے سننے والے کے دل میں عرف کے اعتبار سے دو شانیں مستحضر ہو جاتی ہیں: ① ایک رفعت وبلندی ② دوسری احکام شاہی کا صادر ہونا، کیونکہ عادتاً تخت شاہی پر جلوہ افروز ہونے کے لیے یہ دو باتیں لازم ہیں، چنانچہ دوسری شان کا آگے ذکر ہے کہ) چھپا دیتا ہے شب (کی تاریکی) سے دن (کی روشنی) کو (یعنی شب کی تاریکی سے دن کی روشنی پوشیدہ اور زائل ہو جاتی ہے) ایسے طور پر کہ وہ شب دن کو جلدی سے آلیتی ہے (یعنی دن آناً فاناً گزرتا معلوم ہوتا ہے، یہاں تک کہ ایکدم رات آجاتی ہے) اور سورج اور چاند اور دوسرے ستاروں کو پیدا کیا ایسے طور پر کہ سب (اپنی رفتا، انوار اور آثار میں) اس کے حکم (تکوینی) کے تابع ہیں (کہ جس طرح اللہ تعالیٰ ان میں تصرف کرنا چاہیں کرتے ہیں) یاد رکھو اللہ ہی کے لئے خاص ہے خالق ہونا اور حاکم ہونا، بڑے کمالات والے ہیں اللہ تعالیٰ جو تمام عالم کے پروردگار ہیں۔

ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ: اگرچہ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ کی تفسیر میں سلف کے مذاق کے موافق بہتر یہ ہے کہ سکوت کیا جائے اور یہی ہمارا بھی ذوق ہے، مگر جب متاخرین نے تاویل کا دروازہ کھول دیا تو یہ تاویل جو اس جگہ کی گئی ہے نہایت لطیف ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ محاورات میں تخت نشین ہونا تدبیر واحکامات وانتظام کے جاری کرنے کے معنی میں بولا جاتا ہے، چنانچہ کہا جاتا ہے کہ فلاں بادشاہ کے بعد فلاں شخص تخت نشین ہوا، چاہے اسے تخت پر بیٹھنے کی نوبت بھی نہ آئی ہو، مطلب یہی ہوتا ہے کہ اس کے بعد وہ حاکم ہوا، اس نے انتظام سلطنت اپنے ہاتھ میں لے لیا، یہی محاورہ قرآن میں استعمال کیا گیا ہے، جس سے مراد صرف یہی ہے کہ خدا تعالیٰ آسمان وزمین وغیرہ پیدا کرنے کے بعد ان میں احکام جاری کرنے لگے اور تدبیر

وانتظام کرنے لگے، چنانچہ ایک آیت میں اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ کے بعد یدبّر الامر بھی آیا، جسے اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ کی تفسیر کہا جائے تو اس تاویل کی اس سے تائید ہو جاتی ہے، اور یہاں اس آیت میں بھی اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ کے بعد یغشی اللیل النہار میں بھی تدبیر وانتظام کا ذکر ہے، اب یہ اشکال نہیں ہو سکتا کہ خدا تعالیٰ تو تخت پر بیٹھنے سے پاک ہے اور اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ سے تو اس کا شبہ ہوتا ہے؟ جواب یہ ہوا کہ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ محاورات کے موافق بولا گیا ہے، جس سے تدبیر وانتظام کرنا مراد ہے اور تخت نشینی کے لفظ سے یہی معنی عرفاً سمجھے جاتے ہیں، پس متاخرین نے جہاں اور تاویلیں کی ہیں وہاں اسے بھی جگہ دے دو کہ ان شاء اللہ یہ سب سے لطیف تاویل ہے، ایسی نصوص میں سلف کا مذہب حق سبحانہ وتعالیٰ کی طرف تفویض ہے، یعنی جو استواحق تعالیٰ نے مراد لیا ہے اور وہ حق تعالیٰ کی شان کے موافق ہے وہی مراد ہے، اور اکثر صوفیا کا یہی مذہب ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ے خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ: گذشتہ آیت میں جو معاد کا ذکر تھا، اس رکوع میں مبدا کی معرفت کرائی گئی ہے قَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ (الاعراف: ۵۳) سے بتلایا گیا تھا کہ جو لوگ دنیا میں انبیاء اور رسل سے منحرف رہتے تھے ان کو بھی قیامت کے دن پیغمبروں کی سچائی کی ناچار تصدیق کرنی پڑے گی، یہاں نہایت لطیف پیرایہ میں خدا کی حکومت یاد دلانے اور انبیاء ورسل کی ضرورت کی طرف اشارہ کرنے کے بعد بعض مشہور پیغمبروں کے احوال وواقعات کا تذکرہ پیش کیا جارہا ہے کہ ان کی تصدیق یا تکذیب کرنے والے کا آخرت سے پہلے دنیا ہی میں کیا انجام ہوا، گویا یہ رکوع آنے والے کئی رکوعات کی تمہید ہے۔

فائدہ: ۲ے فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ: یعنی اتنے وقت میں جو چھ دن کے برابر تھا پیدا کیا، کیونکہ یہ متعارف دن اور رات تو آفتاب کے طلوع وغروب سے وابستہ ہیں جب اس وقت آفتاب ہی پیدا نہ ہوا تھا تو دن رات کہاں سے ہوتا، یا یہ کہا جائے کہ عالم شہادت کے دن رات مراد نہیں، عالم غیب کے دن رات مراد ہیں جیسے کسی عارف نے فرمایا ہے:

غیب راابرے وآبے دیگراست　　　آسمان وآفتابے دیگراست

پہلی صورت میں پھر علماء کا اختلاف ہے کہ یہاں چھ دن سے ہمارے چھ دن کی مقدار مراد ہے، یا ہزار برس کا ایک ایک دن جسے فرمایا ہے: وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ (الحج: ۴۷) میرے نزدیک یہ آخری قول راجح ہے، بہرحال مقصود یہ ہوا کہ آسمان وزمین دفعۃً بنا کر نہیں کھڑے کئے گئے، شاید اوّل ان کا مادہ پیدا فرمایا ہو پھر اسکی استعداد کے موافق بتدریج مختلف اشکال وصورت میں منتقل کرتے رہے ہوں، حتی کے چھ دن (چھ ہزار سال) میں وہ بجمیع متعلقاتہا موجودہ مرتب شکل میں موجود ہوئے، جیسا کہ آج بھی انسان اور کل حیوانات ونباتات وغیرہ کی تولید وتخلیق کا سلسلہ تدریجی طور پر جاری ہے اور یہ اس کی شان کُنْ فَیَکُوْنُ کے منافی نہیں، کیونکہ کُنْ فَیَکُوْنُ کا مطلب تو صرف اس قدر ہے کہ خدا جس چیز کو وجود کے جس درجہ میں لانا چاہے اس کا ارادہ ہوتے ہی وہ اس درجہ میں آجاتی ہے، یہ مطلب نہیں کہ خدا کسی چیز کو وجود کے مختلف مدراج سے گزارنے کا ارادہ نہیں کرتا، بلکہ ہر شئے کو بدون توسط اسباب وعلل کے دفعۃً موجود کرتا ہے۔

فائدہ: ۳ے ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ: خدا تعالیٰ کی صفات وافعال کے متعلق یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے کہ نصوص قرآن وحدیث میں جو الفاظ حق تعالیٰ کی صفات کے بیان کے لئے اختیار کئے جاتے ہیں، ان میں اکثر وہ ہیں جن کا مخلوق کی صفات پر بھی استعمال ہوا ہے مثلاً خدا کو ''حی'' ''سمیع''، ''بصیر''، ''متکلم'' کہا گیا اور انسان پر بھی یہ الفاظ اطلاق کئے گئے، تو ان دونوں مواقع میں استعمال کی حیثیت بالکل جداگانہ ہے کسی مخلوق کو ''سمیع وبصیر'' کہنے کا یہ مطلب ہے کہ اس کے پاس دیکھنے والی آنکھ اور سننے والے کان موجود ہیں، اس میں دو چیزیں ہوئیں:

① ایک وہ آلہ جسے ''آنکھ'' کہتے ہیں اور جو دیکھنے کا مبدا اور ذریعہ بنتا ہے

② دوسرا اس کا نتیجہ اور غرض وغایت (دیکھنا) یعنی وہ خاص علم جو رویت بصری سے حاصل ہوا۔

مخلوق کو جب ''بصیر'' کہا تو یہ مبدا اور غایت دونوں چیزیں معتبر ہوئیں، اور دونوں کی کیفیات ہم نے معلوم کرلیں، لیکن یہی لفظ جب خدا کی نسبت استعمال کیا گیا تو یقیناً وہ مبادی اور کیفیات جسمانیہ مراد نہیں ہوسکتیں جو مخلوق کے خواص میں سے ہیں اور جس سے خداوند قدوس قطعاً منزہ ہے، البتہ

یہ اعتقاد رکھنا ہوگا کہ ابصار (دیکھنے) کا مبدا اسکی ذات اقدس میں موجود ہے اور اس کا نتیجہ یعنی وہ علم جو رویت بصری سے حاصل ہوسکتا ہے، اس کو بدرجہ کمال حاصل ہے، آگے یہ کہ وہ مبدا کیسا ہے؟ اور دیکھنے کی کیا کیفیت ہے؟ تو بجز اس بات کے کہ اس کا دیکھنا مخلوق کی طرح نہیں ہم اور کیا کہہ سکتے ہیں لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ (الشوریٰ:۱۱) نہ صرف سمع و بصر بلکہ اس کی تمام صفات کو اسی طرح سمجھنا چاہیے کہ صفت باعتبار اپنے اصل مبدا ٔو غایت کے ثابت ہے مگر اس کی کوئی کیفیت بیان نہیں کی جاسکتی اور نہ شرائع سماویہ نے اس کا مکلف بنایا ہے کہ آدمی اس طرح کی ماوراء عقل حقائق میں خوض کر کے پریشان ہو، اس کا کچھ خلاصہ ہم سورۂ مائدہ میں زیر فائدہ وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ (المائدہ:۶۴) بیان کر چکے ہیں۔

استواء علی العرش کو بھی اسی قاعدہ سے سمجھ لو، عرش کے معنی تخت اور بلند مقام کے ہیں، **استواء** کا ترجمہ اکثر محققین نے "استقرار و تمکن" سے کیا ہے (جسے مترجم رحمہ اللہ نے قرار پکڑنے سے تعبیر فرمایا) گویا یہ لفظ حکومت پر ایسی طرح قابض ہونے کو ظاہر کرتا ہے کہ اس کا کوئی حصہ اور گوشہ حیطۂ نفوذ و اقتدار سے باہر نہ رہے اور نہ قبضہ و تسلط میں کسی قسم کی مزاحمت اور گڑبڑ پائی جائے، سب کام اور انتظام برابر ہو، اب دنیا میں بادشاہوں کی تخت نشینی کا ایک تو مبدا اور ظاہری صورت ہوتی ہے اور ایک حقیقت یا غرض وغایت یعنی ملک پر پورا تسلط و اقتدار اور نفوذ و تصرف کی قدرت حاصل ہونا، حق تعالیٰ کے **استواء علی العرش** میں یہ حقیقت اور غرض وغایت بدرجہ کمال موجود ہے یعنی آسمان و زمین (کل علویات و سفلیات) کو پیدا کرنے کے بعد ان پر کامل قبضہ و اقتدار اور ہر قسم کے مالکانہ و شہنشاہانہ تصرفات کا حق بے روک ٹوک اسی کو حاصل ہے جیسا کہ دوسری جگہ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ کے بعد يُدَبِّرُ الْاَمْرَ وغیرہ الفاظ اور یہاں يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ الخ سے اسی مضمون پر متنبہ فرمایا ہے، رہا **استواء علی العرش** کا مبدا اور ظاہری صورت، اس کے متعلق وہ ہی عقیدہ رکھنا چاہیے جو ہم "سمع و بصر" وغیرہ صفات کے متعلق لکھ چکے ہیں کہ اس کی کوئی ایسی صورت نہیں ہوسکتی جس میں صفات مخلوقین اور سمات حدوث کا ذرا بھی شائبہ ہو، پھر کیسی ہے؟ اس کا جواب وہی ہے کہ:

اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم | وز ہر چہ گفتہ اند شنیدیم و خواندہ ایم
دفتر تمام گشت و بپایاں رسید عمر | ما ہمچناں در اوّل وصفِ تو ماندہ ایم

لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ (الشوریٰ:۱۱)

فائدہ:۴ وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ: یعنی رات کے اندھیرے کو دن کے اجالے سے یا دن کے اجالے کو رات کے اندھیرے سے ڈھانپتا ہے، اس طرح کے ایک دوسرے کا تعاقب کرتا ہوا تیزی سے چلا آتا ہے، ادھر رات ختم ہوئی ادھر دن آموجود ہوا، یا دن تمام ہوا تو فوراً رات آگئی، درمیان میں ایک منٹ کا وقفہ بھی نہیں ہوتا، شاید اس پر بھی تنبیہ فرمادی کہ اس طرح کفر و ضلالت اور ظلم و عدوان کی شب دیجور جب عالم پر محیط ہوجاتی ہے اس وقت خدا تعالیٰ ایمان و عرفان کے آفتاب سے ہر چہار طرف روشنی فرمادیتا ہے اور جب تک آفتاب عالمتاب کی روشنی نمودار نہ ہو تو نبوت کے چاند تارے رات کی تاریکی میں اجالا اور راہنمائی کرتے ہیں۔

فائدہ:۵ مُسَخَّرٰتٍۭ بِاَمْرِهٖ: کوئی سیارہ اس کے حکم کے بدون حرکت نہیں کرسکتا۔

فائدہ:۶ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ۭ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ: پیدا کرنا خلق ہے اور پیدا کرنے کے بعد تکوینی یا تشریعی احکام دینا یہ امر ہے اور دونوں اسی کے قبضہ اختیار میں ہیں، اس طرح وہ ہی ساری خوبیوں اور برکتوں کا سرچشمہ ہوا۔

اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ۭ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿۵۵﴾

پکارو اپنے رب کو گڑگڑا کر اور چپکے چپکے ۱ اس کو خوش نہیں آتے حد سے بڑھنے والے ۲

خلاصہ تفسیر: (اور جب پروردگار میں ایسی مذکورہ خوبیاں ہیں تو) تم لوگ (ہر حالت میں اور ہر حاجت میں) اپنے پروردگار سے دعا کیا کرو تذلل ظاہر کر کے بھی اور چپکے چپکے بھی (البتہ یہ بات) واقعی (ہے کہ) اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو ناپسند کرتے ہیں جو (دعاء میں) حد (ادب)

سے نکل جائیں (مثلاً جو چیزیں عقلاً یا شرعاً محال وبعید ہیں یا گناہ ہیں ان کو مانگنے لگے مثلاً نبوت یا فرشتوں پر حکومت یا اجنبی عورت سے ملاپ اور اس جیسی کوئی چیز مانگنے لگے تو یہ سب ادب کے خلاف ہے)۔

اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً: اس میں اشارہ ہے طریقہ جلوت وخلوت کی طرف، یا عبادتِ جوارح وقلب کی طرف۔

***

فائدہ: ۱۔ جب "عالم خلق وامر" کا مالک اور تمام برکات کا منبع وہ ہی ذات ہے تو دنیاوی واخروی حوائج میں اسی کو پکارنا چاہئے۔ الحاح و اخلاص اور خشوع کے ساتھ بدون ریاکاری کے ساتھ آہستہ آہستہ، اس سے معلوم ہوا کہ دعا میں اصل اخفاء ہے اور یہی سلف کا معمول تھا، بعض مواقع میں جہر واعلان کسی عارض کی وجہ سے ہوگا جس کی تفصیل روح المعانی وغیرہ میں ہے۔

فائدہ: ۲۔ یعنی ① دعاء میں حد ادب سے نہ بڑھے، مثلاً جو چیزیں عادتاً یا شرعاً محال ہیں وہ مانگنے لگے ② یا معاصی اور لغو چیزوں کی طلب کرے ③ یا ایسا سوال کرے جو اس کی شان وحیثیت کے مناسب نہیں یہ سب "اعتداء فی الدعاء" میں داخل ہے۔

وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا ۭ اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ

اور مت خرابی ڈالو زمین میں اس کی اصلاح کے بعد اور پکارو اس کو ڈر اور توقع سے، بیشک اللہ کی رحمت نزدیک ہے

مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝۵۶

نیک کام کرنے والوں سے

خلاصہ تفسیر: اور دنیا میں بعد اس کے کہ (توحید کی تعلیم اور انبیاء کی بعثت کے ذریعہ) اس کی اصلاح اور درستی کردی گئی ہے، فساد مت پھیلاؤ (یعنی توحید ونبوت کے ماننے اور احکام شرعیہ کے جاری کرنے سے عالم میں امن قائم ہوتا ہے، تم اس کو چھوڑ کر نقض امن مت کرو) اور (جیسے تم کو پیچھے خاص دعا کرنے کا حکم ہوا ہے اسی طرح بقیہ عبادات کا حکم کیا جاتا ہے کہ) تم اللہ تعالیٰ کی عبادت (جس طریقہ سے تم کو بتلا دیا ہے) کیا کرو خدا تعالیٰ سے ڈرتے ہوئے اور امیدوار رہتے ہوئے (یعنی عبادت کر کے نہ تو ناز ہو اور نہ مایوسی ہو، آگے عبادت کی ترغیب ہے کہ) بیشک اللہ تعالیٰ کی رحمت نزدیک ہے نیک کام کرنے والوں سے۔

***

فائدہ: پچھلی آیتوں میں ہر حاجت کے لئے خدا کو پکارنے کا طریقہ بتلایا گیا تھا، اس آیت میں مخلوق اور خالق دونوں کے حقوق کی رعایت سکھلائی، یعنی جب دنیا میں معاملات کی سطح درست ہو تو تم اس میں گڑبڑ نہ ڈالو، اور خوف ورجاء کے ساتھ خدا کی عبادت میں مشغول رہو، نہ اس کی رحمت سے مایوس ہو اور نہ اسکے عذاب سے مامون اور بے فکر ہو کر گناہوں پر دلیر بنو، میرے نزدیک یہ ہی راجح ہے کہ یہاں **وادعوہ** الخ میں دعاء سے عبادت مراد لی جائے جیسا کہ صلوٰۃ تہجد کے بارے میں فرمایا: تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا (السجدہ: ۱۶)

وَهُوَ الَّذِيْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًۢا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ۭ حَتّٰٓي اِذَآ اَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا

اور وہی ہے کہ چلاتا ہے ہوائیں خوشخبری لانے والی مینہ سے پہلے، یہاں تک کہ جب وہ ہوائیں اٹھا لاتی ہیں بھاری بادلوں کو

سُقْنٰهُ لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ فَاَنْزَلْنَا بِهِ الْمَاۗءَ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۭ

تو ہانک دیتے ہیں ہم اس بادل کو ایک شہر مردہ کی طرف پھر ہم اتارتے ہیں اس بادل سے پانی پھر اس سے نکالتے ہیں سب طرح کے پھل

كَذٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتٰى لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ۝۵۷ وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهٗ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ۚ

اسی طرح ہم نکالیں گے مُردوں کو تاکہ تم غور کرو، اور جو شہر پاکیزہ ہے اس کا سبزہ نکلتا ہے اس کے رب کے حکم سے

وَالَّذِيْ خَبُثَ لَا يَخْرُجُ اِلَّا نَكِدًا ؕ كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّشْكُرُوْنَ۝۵۸

اور جو خراب ہے اس میں نہیں نکلتا مگر ناقص، یوں پھیر پھیر کر بتلاتے ہیں ہم آیتیں حق ماننے والے لوگوں کو

خلاصہ تفسیر: پیچھے معلوم ہو چکا ہے کہ بت وغیرہ وہاں کام نہ آئیں گے اس سے شرک کو باطل کیا، اس مناسبت سے اب توحید وقدرت کا بیان ہے، جس کے دلائل میں سے ایک بارش بھی ہے اور چونکہ بارش سے مردہ زمین کو زندگی حاصل ہوتی ہے اسی لیے یہاں کذلك نخرج الموتى سے صراحۃً آخرت کو ثابت کر دیا کہ اسی طرح ہم مردوں کو زندہ کر دیں گے، نیز پیچھے بیان کیا تھا کہ قرآن سے صرف مؤمنین ہی فائدہ اٹھاتے ہیں اگرچہ اس کا خطاب عام ہے چنانچہ یہاں والبلد الطیب میں اس کی مثال بیان فرماتے ہیں جس کا حاصل یہ ہے کہ۔

اور وہ (اللہ) ایسا ہے کہ اپنی باران رحمت سے پہلے ہواؤں کو بھیجتا ہے کہ وہ (بارش کی امید دلا کر دل کو) خوش کر دیتی ہیں یہاں تک کہ جب وہ ہوائیں بھاری بادلوں کو اٹھا لیتی ہیں تو ہم اس بادل کو کسی خشک زمین کی طرف ہانک لے جاتے ہیں، پھر اس بادل سے پانی برساتے ہیں، پھر اس پانی سے ہر قسم کے پھل نکالتے ہیں (جس سے ان تصرفات کے علاوہ ہماری توحید بھی ثابت ہوتی ہے اور دوبارہ زندہ کرنے پر قدرت بھی معلوم ہوتی ہے، اس لئے فرمایا) یوں ہی (قیامت کے روز) ہم مردوں کو (زمین سے) نکال کھڑا کریں گے (یہ سب اس لئے سنایا) تاکہ تم سمجھو (کہ جو ان سب باتوں پر قادر ہے وہ دوبارہ زندہ کرنے پر بھی قادر ہے)۔

اور (قرآن اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت اگرچہ سب کے لئے عام ہے، مگر اس سے فائدہ اٹھانے والے کم لوگ ہوتے ہیں، اس کی مثال اسی بارش سے سمجھو کہ بارش تو ہر زمین پر برستی ہے، مگر کھیتی اور درخت ہر جگہ نہیں پیدا ہوتے، صرف ان زمینوں میں پیدا ہوتے ہیں جن میں صلاحیت ہے، اسی لئے فرمایا کہ:) جو زمین ستھری ہوتی ہے اس کی پیداوار تو خدا کے حکم سے خوب نکلتی ہے اور جو خراب ہے اس کی پیداوار (اگر نکلی بھی تو) بہت کم نکلتی ہے، اسی طرح ہم (ہمیشہ) دلائل کو طرح طرح سے بیان کرتے رہتے ہیں (مگر وہ سب) انہی لوگوں کیلئے (فائدہ مند ہوتے ہیں) جو (ان کی) قدر کرتے ہیں (اور ان کو اپنی فلاح کی چیز سمجھ کر ان میں غور کرتے ہیں اور ان پر عمل کرتے ہیں)۔

خلاصہ ان آیات کا جیسا کہ تمہید میں بھی اشارہ کیا گیا یہ ہے کہ جب حق تعالیٰ کے یہ ذاتی وصفاتی کمالات ثابت ہوئے تو عبادت اور طلب حاجت میں ان کے ساتھ کسی کو شریک مت کرو، اور ان کی قدرت کا نمونہ کو پیش نظر رکھ کر آخرت کا انکار مت کرو، اس کافی بیان سے بھی اگر کوئی فائدہ حاصل نہ کرے اور ان کو نہ مانے تو اس کی مثال خراب زمین کی سی ہے جو کسی قابل نہیں۔

يُرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًاۢ بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ: یہاں بارش سے پہلے ہوا کا آنا جو بتلایا ہے یہ اکثر اوقات کے اعتبار سے ہے، سو کبھی ایک کا دوسرے کے بغیر ہونے میں کوئی اشکال نہیں۔

حَتّٰٓى اِذَآ اَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا: ''ہوائیں بھاری بادلوں کو اٹھا لیتی ہیں'' اٹھانے کا مطلب یہ ہے کہ ہوا بادلوں کے اجزاء کو آپس میں ملا دیتی ہے، نیز ہوا کی وجہ سے بادل معلق رہتے ہیں ورنہ مرکز کی طرف مائل ہو جاتے، اسی طرح ہوا کے سبب بادل ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچتے ہیں۔

وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهٗ: اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو زمین ستھری ہوتی ہے اس کی پیداوار خوب ہوتی ہے اور جو خراب ہوتی ہے اس کی پیداوار بہت کم ہوتی ہے، یہی مثال ان دو شخصوں کی ہے کہ ایک پر وعظ ونصیحت اثر کرتا ہے، ان کی استعداد وصلاحیت زندہ اور عمدہ ہے، چنانچہ اس شخص کی مثال صاف ستھری زمین کی ہے جس میں خوب سبزہ ہوتا ہے، اور دوسرا وہ شخص ہے جس پر وعظ اثر نہیں کرتا، ان کی استعداد ناقص اور مردہ

ہو چکی ہے، چنانچہ اس کی مثال خراب زمین کی ہے کہ اس میں سبزہ نہیں ہوتا۔

❋ ❋ ❋

فائدہ: پچھلی آیات میں ''استواء علی العرش'' کے ساتھ فلکیات (چاند، سورج وغیرہ) میں جو خدائی تصرفات ہیں، ان کا بیان تھا، درمیان میں بندوں کو کچھ مناسب ہدایات کی گئیں، اب ''سفلیات'' اور'' کائنات الجو'' کے متعلق اپنے بعض تصرفات کا ذکر فرماتے ہیں تا کہ لوگ معلوم کر لیں کہ آسمان زمین اور ان دونوں کے درمیانی حصہ کی کل حکومت صرف اسی رب العالمین کے قبضہء قدرت میں ہے، ہوائیں چلانا، مینہ برسانا، قسم قسم کے پھول پھل پیدا کرنا ہر زمین کی استعداد کے موافق کھیتی اور سبزہ اگانا، یہ سب اسی کی قدرت کاملہ اور حکمت بالغہ کے نشان ہیں، اسی ذیل میں مُردوں کا موت کے بعد جی اٹھنا اور قبروں سے نکلنا بھی سمجھا دیا، حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ: ''ایک تو مردوں کا نکلنا قیامت میں ہے اور ایک دنیا میں، یعنی جاہل ادنیٰ لوگوں میں (جو جہالت وذلت کی موت سے مر چکے تھے) عظیم الشان نبی بھیجا اور انہیں علم دیا اور دنیا کا سردار کیا، پھر ستھری استعداد والے کمال کو پہنچے اور جن کی استعداد خراب تھی ان کو بھی فائدہ پہنچ رہا نا قص سا''۔

گویا اس پورے رکوع میں بتلا دیا گیا کہ جب خدا اپنی رحمت وشفقت سے رات کی تاریکی میں ستارے چاند، سورج سے روشنی کرتا ہے اور خشکی کے وقت زمین کو سرسبز وشاداب کرنے اور انسان وحیوانات کی زندگی کا سامان مہیا فرمانے کے لئے اوپر سے بارش بھیجتا ہے، یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ایسا مہربان خدا اپنی مخلوق کو جہل وظلم کی اندھیریوں سے نکالنے کے لئے کوئی چاند اور سورج پیدا نہ کرے اور بنی آدم کی روحانی غذا تیار کرنے اور قلوب کے کھیتوں کو سیراب کرنے کے لئے باران رحمت نازل نہ فرمائے۔

بلاشبہ اس نے ہر زمانہ کی ضرورت اور اپنی حکمت کے موافق پیغمبروں کو بھیجا جن کے منور سینوں سے دنیا میں روحانی روشنی پھیلی اور وحی الٰہی کی لگا تار بارشیں ہوئیں، چنانچہ آئندہ کئی رکوع میں ان ہی پیغمبروں کے بھیجنے کا ذکر کیا گیا ہے اور جیسا کہ بارش اور زمین کی مثال میں اشارہ کیا گیا کہ مختلف زمینیں اپنی اپنی استعداد کے موافق بارش کا اثر قبول کرتی ہیں، اسی طرح سمجھ لو کہ انبیاء علیہم السلام جو خیر وبرکت لے کر آتے ہیں، اس سے منتفع ہونا بھی حسن استعداد پر موقوف ہے جو لوگ ان سے انتفاع نہیں کرتے انہیں اپنی سوء استعداد پر رونا چاہیے:

باراں کہ در لطافت طبعش خلاف نیست　　در باغ لالہ روید ودر شورہ بوم خس

لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اِنِّيْۤ اَخَافُ

بے شک بھیجا ہم نے نوح کو اسکی قوم کی طرف پس اس نے کہا اے میری قوم بندگی کرو اللہ کی کوئی نہیں تمہارا معبود اسکے سوا، میں خوف کرتا ہوں

عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۵۹﴾ قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهٖۤ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۶۰﴾

تم پر ایک بڑے دن کے عذاب سے، بولے سردار اس کی قوم کے ہم دیکھتے ہیں تجھ کو صریح بہکا ہوا

خلاصہ تفسیر: سورہ اعراف کے شروع سے یہاں تک اصول اسلام توحید، رسالت، آخرت کا مختلف عنوانات اور دلائل سے اثبات اور لوگوں کو اتباع کی ترغیب اور اسکی مخالفت پر وعید اور ترہیب اور اسکے ضمن میں شیطان کے گمراہ کن مکر وفریب وغیرہ کا بیان تھا، اب یہاں سے تقریباً آخر سورت تک چند انبیاء علیہم السلام اور ان کی امتوں کا ذکر ہے، نبوت سے تو ان قصوں کی مناسبت ظاہر ہے کہ جب دیگر انبیاء بھی ہوئے ہیں تو پھر آپ کی نبوت پر کیا تعجب ہے، نیز گذشتہ قصوں کا صحیح طور پر بیان کر دینا رسالت کے دعویٰ کے لیے خود ایک معجزہ اور نبوت کی بڑی دلیل ہے، توحید سے مناسبت اس طرح ہے کہ یہ سب حضرات انبیاء توحید کی تعلیم کرتے آئے، اور پچھلی امتوں پر جو عذاب نازل ہوئے ان کے ذکر سے ترغیب وترہیب پیدا ہوگی، اگر وہ انبیاء کا اتباع کرتے تو ان عذابوں سے محفوظ رہتے، سو موجودہ اقوام کو پچھلی قوموں کے انجام سے عبرت حاصل کرنے کا موقع فراہم کیا گیا، اور ان سب قصوں میں رسول اللہ ﷺ کے لئے تسلی کا سامان بھی ہے کہ پہلے سب رسولوں کے ساتھ ایسے ہی معاملات ہوتے رہے ہیں سو آپ غم نہ کریں۔

(پہلا قصہ:) ہم نے نوح کو (پیغمبر بنا کر) ان کی قوم کی طرف بھیجا، سو انہوں نے (اس قوم سے) فرمایا کہ اے میری قوم! تم (صرف) اللہ کی عبادت کرو اس کے سوا کوئی تمہارا معبود (ہونے کے قابل) نہیں (اور بتوں کی پرستش چھوڑ دو جن کے نام سورۃ نوح میں ہیں: وَد، سواع، یغوث، یعوق اور نسر) مجھ کو تمہارے لئے (میرا کہنا نہ ماننے کی صورت میں) ایک بڑے (سخت) دن کے عذاب کا اندیشہ ہے (کہ وہ قیامت کا دن ہے یا طوفان کا دن اگر وہ کہنا نہ مانیں اور اطاعت نہ کریں) ان کی قوم کے آبرودار لوگوں نے کہا کہ ہم تم کو صریح غلطی میں (مبتلا) دیکھتے ہیں (کہ تم ہمارے طریقہ کے خلاف توحید کی تعلیم کر رہے ہو اور عذاب کا ڈراوا دکھلا رہے ہو)۔

* * *

فائدہ: آدم (علیہ السلام) کا قصہ ابتدائے سورت میں گزر چکا، ان کے بعد نوح (علیہ السلام) پہلے اولوالعزم اور مشہور رسول ہیں جو زمین والوں کی طرف مشرکین کے مقابلے میں بھیجے گئے گو باعتبار اپنی خاص شریعت کے ان کی بعثت خاص اپنی قوم کی طرف مانی جائے تاہم ان اساسی اصولوں کے اعتبار سے جو تمام انبیاء علیہم السلام کی تعلیم میں مشترک ہیں کہا جا سکتا ہے کہ تمام انسان ہر نبی کے مخاطب ہوتے ہیں مثلاً توحید اور اقرار معاد کی تعلیم پر سارے پیغمبر متفق اللسان ہیں تو ایسی چیزوں کی تکذیب کرنا فی الحقیقت تمام انبیاء کی تکذیب کرنا ہے، بہر حال نوح (علیہ السلام) نے توحید وغیرہ کی عام دعوت دی، کہتے ہیں کہ آدم (علیہ السلام) کے بعد دس قرن ایسے گزرے کہ ساری اولاد آدم کلمہ توحید پر قائم تھی بت پرستی کی ابتداء ابن عباس کے بیان کے موافق یوں ہوئی کہ بعض صالحین کا انتقال ہو گیا جن کے نام وَد، سواع، یغوث، یعوق، نسر تھے، جو سورۃ نوح میں مذکور ہیں، لوگوں نے ان کی تصویریں بنا لیں تا کہ ان کے احوال و عبادات وغیرہ کی یاد تازہ رہے کچھ مدت کے بعد ان صورتوں کے موافق مجسمے تیار کر لئے حتی کہ کچھ دنوں کے بعد ان کی عبادت ہونے لگی اور یہ بت انہی بزرگوں کے نام سے موسوم کئے گئے، جب بت پرستی کی وباء پھیل گئی تو حق تعالیٰ نے نوح کو بھیجا، انہوں نے طوفان سے پہلے اپنی قوم کو ساڑھے نو سو برس تک توحید و تقویٰ کی طرف بلایا، اور دنیا و آخرت کے عذاب سے ڈرایا مگر لوگوں نے ان کی تضلیل و تجہیل کی اور کوئی بات نہ سنی آخر طوفان کے عذاب نے سب کو گھیر لیا اور جیسا کہ نوح نے دعاء کی تھی: رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكَافِرِينَ دَيَّارًا روئے زمین پر کوئی کافر عذاب الٰہی سے نہ بچا، بستانی نے "دائرۃ المعارف" میں یورپین محققین کے اقوال طوفان اور عموم طوفان کے متعلق نقل کئے ہیں۔

قَالَ يٰقَوْمِ لَيْسَ بِيْ ضَلٰلَةٌ وَّلٰكِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٦١﴾

بولا اے میری قوم! میں ہر گز بہکا نہیں ولیکن میں بھیجا ہوا ہوں جہان کے پروردگار کا

اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَاَنْصَحُ لَكُمْ وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿٦٢﴾

پہنچاتا ہوں تم کو پیغام اپنے رب کے اور نصیحت کرتا ہوں تم کو اور جانتا ہوں اللہ کی طرف سے وہ باتیں جو تم نہیں جانتے [1]

خلاصہ تفسیر: انہوں نے (جواب میں) فرمایا کہ اے میری قوم! مجھ میں تو ذرا بھی غلطی نہیں، لیکن (چونکہ) میں پروردگار عالم کا (بھیجا ہوا) رسول ہوں (انہوں نے مجھے توحید پہنچانے کا حکم کیا ہے، اس لئے اپنا منصبی کام کرتا ہوں کہ) تم کو اپنے پروردگار کے پیغام (اور احکام) پہنچاتا ہوں (اور اس پہنچانے میں میری کوئی دنیوی غرض نہیں، بلکہ محض) تمہاری خیر خواہی کرتا ہوں (کیونکہ توحید میں تمہارا ہی نفع ہے) اور (بڑے دن کے عذاب سے جو تم کو تعجب ہوتا ہے تو تمہاری غلطی ہے، کیونکہ) میں خدا کی طرف سے ان امور کی خبر رکھتا ہوں جن کی تم کو خبر نہیں (کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مجھ کو بتلا دیا ہے کہ ایمان نہ لانے سے عذاب عظیم واقع ہوگا)۔

* * *

فائدہ: [1] یعنی میں تو ذرا بھی نہیں بہکا، ہاں تم بہک رہے ہو کہ خدا کے پیغامبر کو نہیں پہچانتے جو نہایت فصاحت سے خدائی پیغام تم کو پہنچا رہا ہے اور تمہاری بھلائی چاہتا ہے تم کو عمدہ نصیحتیں کرتا ہے، اور خدا کے پاس سے وہ علوم و ہدایت لے کر آیا ہے جن سے تم جاہل ہو۔

اَوَعَجِبۡتُمۡ اَنۡ جَآءَكُمۡ ذِكۡرٌ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ عَلٰى رَجُلٍ مِّنۡكُمۡ لِيُنۡذِرَكُمۡ

کیاتم کوتعجب ہوا کہ آئی تمہارے پاس نصیحت تمہارے رب کی طرف سے ایک مرد کی زبانی جوتم میں سے ہے تا کہ وہ تم ہی کوڈرائے

وَلِتَتَّقُوۡا وَلَعَلَّكُمۡ تُرۡحَمُوۡنَ ﴿۶۳﴾

اور تا کہ تم بچواور تا کہ تم پر رحم ہو

خلاصہ تفسیر: اور (تم کو میرے رسول ہونے پر جو میرے بشر ہونے کی وجہ سے انکار ہے جیسا سورۃ مومنون میں تصریح ہے: ما هذا الا بشر مثلکم یرید ان یتفضل علیکم ولو شاء الله لانزل ملئکة الخ تو) کیا تم اس بات سے تعجب کرتے ہو کہ تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے پاس ایک ایسے شخص کی معرفت جو تمہاری ہی جنس کا (بشر) ہے کوئی نصیحت کی بات آ گئی (وہ نصیحت کی بات یہی ہے جو پیچھے بیان ہوئی کہ: يٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمۡ مِّنۡ اِلٰهٍ غَيۡرُهٗ) تا کہ وہ شخص تم کو (بحکم خداوندی عذاب سے) ڈرائے اور تا کہ تم (اس کے ڈرانے سے) ڈر جاؤ اور تا کہ (ڈرنے کی وجہ سے مخالفت چھوڑ دو جس سے) تم پر رحم کیا جائے۔

اَوَعَجِبۡتُمۡ اَنۡ جَآءَكُمۡ ذِكۡرٌ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ عَلٰى رَجُلٍ مِّنۡكُمۡ: کفار اعتراض کرتے تھے کہ نبی بشر میں سے کیوں ہے فرشتہ کیوں نہیں؟ اسی طرح ہر زمانے میں اولیاء اللہ کے ساتھ بھی جاہلوں نے یہی طرز اختیار کیا کہ اپنے زمانے کے اولیاء اللہ سے محض معاصرت اور ہم زمانہ ہونے کی وجہ سے دور رہتے ہیں، حالانکہ اس بات سے خوش ہونا چاہیے کہ وہ دین کا کام کر رہے ہیں جس سے زیادہ سے زیادہ لوگ ہدایت پر آئیں گے۔

* * *

فائدہ: یعنی اس میں تعجب کی کیا بات ہے کہ تم ہی میں سے خدا کسی ایک فرد کو اپنی پیغام رسانی کے لئے چن لے، آخر اس نے ساری مخلوق میں سے منصب خلافت کے لئے آدم (علیہ السلام) کو کسی مخصوص استعداد کی بنا پر چن لیا تو کیوں نہیں ہوسکتا کہ اولاد آدم میں سے بعض کامل الاستعداد لوگوں کو منصب نبوت و رسالت کے لئے انتخاب کر لیا جائے، تا کہ وہ لوگ براہ راست خدا سے فیض پا کر دوسروں کو ان کے انجام سے آگاہ کریں اور یہ اس پر آگاہ ہو کر بدی سے بچ جائیں اور اس طرح خدا کے رحم و کرم کے مورد بنیں۔

فَكَذَّبُوۡهُ فَاَنۡجَيۡنٰهُ وَالَّذِيۡنَ مَعَهٗ فِى الۡفُلۡكِ وَاَغۡرَقۡنَا الَّذِيۡنَ كَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِنَا ؕ

پھر انہوں نے اس کو جھٹلایا پھر ہم نے بچا لیا اس کو اور ان کو جو اس کے ساتھ تھے کشتی میں اور غرق کر دیا ان کو جو جھٹلاتے تھے ہماری آیتوں کو

اِنَّهُمۡ كَانُوۡا قَوۡمًا عَمِيۡنَ ﴿۶۴﴾ ع ۱۵

بیشک وہ لوگ تھے اندھے

خلاصہ تفسیر: سو (اس تمام تر سمجھانے کے باوجود) وہ لوگ ان کی تکذیب ہی کرتے رہے تو ہم نے نوح کو اور جو لوگ ان کے ساتھ کشتی میں تھے (طوفان کے عذاب سے) بچا لیا اور جن لوگوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا تھا ان کو ہم نے (طوفان میں) غرق کر دیا، بیشک وہ لوگ اندھے ہو رہے تھے (حق و باطل، نفع نقصان کچھ نہ سوجھتا تھا)۔

کشتی کا قصہ اور نیز طوفان میں کشتی والوں کے سوا سب کا غرق ہو جانا سورہ ہود اور سورہ نوح میں آئے گا، واضح رہے اس سے نوح علیہ السلام کی نبوت کا عام ہونا لازم نہیں آتا اور اس کی تحقیق سورہ آل عمران آیت ۵۲: فَلَمَّآ اَحَسَّ عِيۡسٰى مِنۡهُمُ الۡكُفۡرَ میں گذر چکی ہے وہاں ملاحظہ فرمایئے، ایک قصہ کا مختلف الفاظ سے قرآن میں آنا اس کی تحقیق بھی اسی سورت کے شروع میں آیت ۱۴-۱۵: قَالَ اَنۡظِرۡنِىۡۤ اِلٰى يَوۡمِ يُبۡعَثُوۡنَ کے

تحت گذر چکی ہے، نیز یہ بھی ممکن ہے کہ انبیاء علیہم السلام نے یہ سب باتیں مختلف اوقات اور مختلف مجالس میں اپنی اقوام سے کی ہوں اور قوم میں کسی نے کچھ کہا ہو کسی نے کچھ کہا ہو۔

* * *

فائدہ: یعنی حق و باطل اور نفع ونقصان کچھ نہ سوجھا، اندھے ہو کر برابر سرکشی اور تکذیب و بغاوت پر قائم رہے اور بت پرستی وغیرہ حرکات سے باز نہ آئے، تو ہم نے معدودے چند مومنین کو بچا کر جو نوح (علیہ السلام) کے ہمراہ کشتی پر سوار ہوئے تھے، باقی سب مکذبین کا بیڑا غرق کر دیا، اب جس قدر انسان دنیا میں موجود ہیں وہ ان ہی اہل سفینہ بلکہ صرف حضرت نوح کی ذریت ہیں۔

وَاِلٰی عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ؕ قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ﴿۶۵﴾

اور قوم عاد کی طرف بھیجا ان کے بھائی ہود کو ۱؎ بولا اے میری قوم بندگی کرو اللہ کی کوئی نہیں تمہارا معبود اس کے سوا، کیا تم ڈرتے نہیں ۲؎

خلاصہ تفسیر: (دوسرا قصہ) اور ہم نے قوم عاد کی طرف ان کے (برادری یا وطن کے) بھائی ہود کو (پیغمبر بنا کر) بھیجا، انہوں نے (اپنی قوم سے) فرمایا اے میری قوم! تم (صرف) اللہ کی عبادت کرو، اسکے سوا کوئی تمہارا معبود (ہونے کے قابل) نہیں (اور بت پرستی چھوڑ دو جیسا کہ آگے وَنَذَرَ مَا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا سے معلوم ہوتا ہے) سو کیا تم (ایسے بڑے جرم عظیم یعنی شرک میں مبتلا ہو کر عذاب الٰہی سے) نہیں ڈرتے۔

وَاِلٰی عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا: عاد اصل میں ایک شخص کا نام ہے، پھر اس کی اولاد کو بھی عاد کہنے لگے، یہ لوگ بڑے قوی الجثہ ہوتے تھے، اہل نسب کے نزدیک مشہور یہی ہے کہ ہود علیہ السلام قوم عاد کے نسبی بھائی اور قوم عاد ہی میں سے ہیں، اور کچھ لوگ ان کو دوسری قوم کا بتلاتے ہیں، اور قرآن میں جو ان کو عاد کا بھائی کہا گیا ہے اس میں تاویل میں کرتے ہیں کہ وطنی شراکت داری کی وجہ سے بھائی کہہ دیا گیا، اس قوم کا مسکن ''احقاف'' ہے جو بقول اہل سیر ایک ریگستان کا نام ہے جو عمان اور حضرموت کے درمیان ہے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ ''عاد'' حضرت نوح کے پوتے ارم کی اولاد میں ہیں، یہ قوم اسی کی طرف منسوب ہے، ان کی سکونت ''احقاف'' (یمن) میں تھی، حضرت ہود علیہ السلام اسی قوم سے ہیں، اس لحاظ سے وہ ان کے قومی اور وطنی بھائی ہوئے۔

فائدہ: ۲؎ ان لوگوں میں بت پرستی پھیل گئی تھی، روزی دینے، مینہ برسانے، تندرست کرنے اور مختلف مطالب وحاجات کے لئے الگ الگ دیوتا بنا رکھے تھے، جن کی پرستش ہوتی تھی، ہود علیہ السلام نے اس سے روکا اور اس جرم عظیم کی سزا سے ان کو ڈرایا۔

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖۤ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِیْ سَفَاهَةٍ وَّاِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكٰذِبِیْنَ﴿۶۶﴾

بولے سردار جو کافر تھے اس کی قوم میں ہم تو دیکھتے ہیں تجھ کو عقل نہیں اور ہم تو تجھ کو جھوٹا گمان کرتے ہیں

خلاصہ تفسیر: ان کی قوم میں جو آبرودار لوگ کافر تھے انہوں نے (جواب میں) کہا کہ ہم تم کو کم عقلی میں (مبتلا) دیکھتے ہیں (کہ توحید کی تعلیم کر رہے ہو جو ہمارے قدیم طریقہ کے خلاف ہے اور عذاب سے ڈرا رہے ہو) اور ہم بیشک تم کو جھوٹے لوگوں میں سے سمجھتے ہیں (یعنی نعوذ باللہ نہ تو توحید صحیح مسئلہ ہے اور نہ عذاب کا آنا صحیح ہے)۔

اِنَّا لَنَرٰىكَ فِیْ سَفَاهَةٍ: یعنی قوم کے سرداروں نے پیغمبر سے کہا کہ ہم تمہیں کم عقل دیکھتے ہیں، چنانچہ نادان بے وقوفوں کا یہ طریقہ بہت پہلے سے چلا آرہا ہے کہ دین کی سمجھ رکھنے والے عقل مند لوگوں کو کم عقل یا پرانے خیالات کا مالک کہا کرتے ہیں، اس زمانہ میں بھی اس کا مشاہدہ ہو رہا ہے تو ان حضرات کو اس پر صبر کرنا چاہیے اور اپنے کام میں مگن رہنا چاہیے۔

* * *

فائدہ: یعنی معاذ اللہ! تم بے عقل ہو کہ باپ دادا کی روش چھوڑ کر ساری برادری سے الگ ہوتے ہو اور جھوٹے بھی ہو کہ اپنے اقوال کو خدا کی طرف منسوب کر کے خوامخواہ عذاب کا ڈراوا دیتے ہو۔

قَالَ يٰقَوۡمِ لَيۡسَ بِىۡ سَفَاهَةٌ وَّلٰـكِنِّىۡ رَسُوۡلٌ مِّنۡ رَّبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۶۷﴾

بولا اے میری قوم میں کچھ بے عقل نہیں لیکن میں بھیجا ہوا ہوں پروردگار عالم کا

اُبَلِّغُكُمۡ رِسٰلٰتِ رَبِّىۡ وَاَنَا لَـكُمۡ نَاصِحٌ اَمِيۡنٌ ﴿۶۸﴾

پہنچاتا ہوں تم کو پیغام اپنے رب کے اور میں تمہارا خیر خواہ ہوں اطمینان کے لائق [1]

خلاصہ تفسیر: انہوں نے فرمایا کہ اے میری قوم! مجھ میں ذرا بھی کم عقلی نہیں، لیکن (چونکہ) میں پروردگار عالم کا بھیجا ہوا پیغمبر ہوں (انہوں نے مجھ کو توحید کی تعلیم اور عذاب سے ڈرانے کا حکم کیا ہے، اس لئے اپنا منصبی کام کرتا ہوں کہ) تم کو اپنے پروردگار کے پیغام (اور احکام) پہنچاتا ہوں اور میں تمہارا خیر خواہ امانت دار ہوں (کیونکہ توحید و ایمان میں تمہارا ہی نفع ہے)۔

* * *

فائدہ: [1] یعنی میری کوئی بات بے عقلی کی نہیں، ہاں جو منصب رسالت مجھ کو خدا کی طرف سے تفویض ہوا ہے اسکا حق ادا کرتا ہوں، یہ تمہاری بے عقلی ہے کہ اپنے حقیقی خیر خواہوں کو جن کی امانت و دیانت پہلے سے لائق اطمینان ہے بے عقل کہہ کر خود اپنا نقصان کرتے ہو۔

اَوَعَجِبۡتُمۡ اَنۡ جَآءَكُمۡ ذِكۡرٌ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ عَلٰى رَجُلٍ مِّنۡكُمۡ لِيُنۡذِرَكُمۡ‌ؕ

کیا تم کو تعجب ہوا کہ آئی تمہارے پاس نصیحت تمہارے رب کی طرف سے ایک مرد کی زبانی جو تم ہی میں سے ہے تاکہ تم کو ڈرائے

وَاذۡكُرُوۡۤا اِذۡ جَعَلَـكُمۡ خُلَفَآءَ مِنۡۢ بَعۡدِ قَوۡمِ نُوۡحٍ وَّزَادَكُمۡ فِى الۡخَـلۡقِ بَصۜۡطَةً‌ۚ فَاذۡكُرُوۡۤا

اور یاد کرو جب تم کو سردار کردیا پیچھے قوم نوح کے [1] اور زیادہ کردیا تمہارے بدن کا پھیلاؤ [2] سو یاد کرو

اٰلَۤاءَ اللّٰهِ لَعَلَّكُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ ﴿۶۹﴾

اللہ کے احسان تاکہ تمہارا بھلا ہو [3]

خلاصہ تفسیر: اور (تم جو میرے بشر ہونے کی وجہ سے میری نبوت کا انکار کرتے ہو جیسا کہ سورہ ابراہیم میں ہے: قالوا ان انتم الا بشر مثلنا اور سورۃ فصلت میں ہے: قالوا لوشاء ربنا لانزل ملئکۃ الخ تو) کیا تم اس بات سے تعجب کرتے ہو کہ تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے پاس ایک ایسے شخص کی معرفت جو تمہاری ہی جنس کا (بشر) ہے کوئی نصیحت کی بات آگئی (وہ نصیحت کی بات وہی ہے جو مذکور ہوئی: يٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ مَا لَـكُمۡ مِّنۡ اِلٰهٍ غَيۡرُهٗ) تاکہ وہ شخص تم کو (عذاب الٰہی سے) ڈرائے (یعنی یہ تو کوئی تعجب کی بات نہیں، کیا بشریت و نبوت میں کوئی تضاد ہے، پیچھے افلا تتقون میں ترہیب تھی، آگے ترغیب ہے) اور (اے قوم!) تم یہ حالت یاد کرو (اور یاد کر کے احسان مانو اور اطاعت کرو) کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو قوم نوح کے بعد (روئے زمین پر) آباد کیا اور ڈیل ڈول میں تم کو پھیلاؤ (بھی) زیادہ دیا، سو خدا تعالیٰ کی (ان) نعمتوں کو یاد کرو (اور یاد کر کے خدا کا احسان مانو اور اطاعت کرو) تاکہ تم کو (ہر طرح کی) فلاح ہو۔

وَّزَادَكُمۡ فِى الۡخَـلۡقِ بَصۜۡطَةً‌ۚ فَاذۡكُرُوۡۤا اٰلَۤاءَ اللّٰهِ: یہاں اللہ تعالیٰ جسمانی قوت کو اپنے نعمتوں میں شمار فرما رہے ہیں، اس سے معلوم ہوا

کہ قوت اور جسامت بھی حق تعالیٰ کی نعمت ہے، اگر اللہ تعالیٰ کسی کو دنیاوی نعمتوں سے نوازیں تو اسے دین داری کے خلاف اور حقارت کی نگاہ سے نہیں دیکھنا چاہیے، جیسا کہ بعض متشدد صوفیاء کا مزاج ہے۔

***

فائدہ: ۱؎ وَاذْكُرُوٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ: یعنی قوم نوح کے بعد دنیا میں تمہاری حکومتیں قائم کیں اور اس کی جگہ تم کو آباد کیا، شاید یہ احسان یاد دلا کر اس پر بھی متنبہ کرنا ہے کہ بت پرستی اور تکذیب رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بدولت جو حشر ان کا ہوا وہ کہیں تمہارا نہ ہو۔

فائدہ: ۲؎ وَّزَادَكُمْ فِي الْخَلْقِ بَصْطَةً: جسمانی قوت اور ڈیل ڈول کے اعتبار سے یہ قوم مشہور تھی۔

فائدہ: ۳؎ اٰلَآءَ اللّٰهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ: جو احسانات مذکور ہوئے وہ اور ان کے علاوہ خدا کے دوسرے بیشمار احسانات یاد کر کے اس کے شکر گذار اور فرمانبردار بننا چاہیے، نہ یہ کہ منعم حقیقی سے بغاوت کرنے لگو۔

قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللّٰهَ وَحْدَهٗ وَنَذَرَ مَا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا ۚ

بولے کیا تو اس واسطے ہمارے پاس آیا کہ ہم بندگی کریں اللہ اکیلے کی اور چھوڑ دیں جن کو پوجتے رہے ہمارے باپ دادے

فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۷۰﴾

پس تو لے آ ہمارے پاس جس چیز سے تو ہم کو ڈراتا ہے اگر تو سچا ہے

خلاصہ تفسیر: وہ لوگ کہنے لگے کہ کیا (خوب) آپ ہمارے پاس اس واسطے آئے ہیں کہ ہم صرف اللہ ہی کی عبادت کیا کریں اور جن (بتوں) کو ہمارے باپ دادا پوجتے تھے ہم ان (کی عبادت) کو چھوڑ دیں (یعنی ہم ایسا نہ کریں گے) اور ہم کو (نہ ماننے پر) جس عذاب کی دھمکی دیتے ہو (جیسا کہ پیچھے افلا تتقون سے معلوم ہوتا ہے) اس (عذاب) کو ہمارے پاس منگوا دو اگر تم سچے ہو۔

***

فائدہ: یعنی جس عذاب کی ہم کو دھمکی دیتے ہیں، اگر آپ سچے ہیں تو وہ لے آیئے۔

قَالَ قَدْ وَقَعَ عَلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ رِجْسٌ وَّغَضَبٌ ؕ اَتُجَادِلُوْنَنِيْ فِيْٓ اَسْمَآءٍ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ

کہا تم پر واقع ہو چکا ہے تمہارے رب کی طرف سے عذاب اور غصہ ۱؎ کیوں جھگڑتے ہو مجھ سے ان ناموں پر کہ رکھ لئے ہیں تم نے

وَاٰبَآؤُكُمْ مَّا نَزَّلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ فَانْتَظِرُوْٓا اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ﴿۷۱﴾

اور تمہارے باپ دادوں نے نہیں اتاری اللہ نے ان کی کوئی سند، سو منتظر رہو میں بھی تمہارے ساتھ منتظر ہوں ۲؎

خلاصہ تفسیر: انہوں نے فرمایا کہ (تمہاری سرکشی کی جب یہ حالت ہے تو) بس اب تم پر خدا کی طرف سے عذاب اور غضب آیا ہی چاہتا ہے (پس عذاب کے شبہ کا جواب تو اس وقت معلوم ہو جائے گا، باقی توحید پر جو شبہ ہے کہ ان بتوں کو معبود کہتے ہو جن کا نام تو تم نے معبود رکھ لیا ہے، لیکن واقع میں ان کے معبود ہونے کی کوئی دلیل ہی نہیں تو) کیا تم مجھ سے ایسے (بے حقیقت) ناموں کے باب میں جھگڑتے ہو (یعنی ان کے محض نام ہی نام ہیں) جن کو تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے (آپ ہی) ٹھہرا لیا ہے (لیکن) ان کے معبود ہونے کی خدا تعالیٰ نے کوئی دلیل (نقلی و عقلی) نہیں بھیجی (یعنی بحث میں مدعی کے ذمہ دلیل بیان کرنا ہے اور مقابل کی دلیل کا جواب بھی دینا ہے، سو تم نہ دلیل قائم کر سکتے ہو، نہ میری دلیل کا جواب دے سکتے ہو پھر بحث کا کیا مطلب) سو تم (اب بحث ختم کرو اور عذاب الٰہی کے) منتظر رہو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کر رہا ہوں۔

***

فائدہ: ۱ یعنی جب تمہاری سرکشی اور گستاخانہ بے حیائی اس حد تک پہنچ چکی تو سمجھ لو خدا کا عذاب اور غضب تم پر نازل ہی ہو چکا اس کے آنے میں اب کچھ دیر نہیں۔

فائدہ: ۲ بتوں کو جو کہتے تھے کہ فلاں رزق دینے والا ہے اور فلاں مینہ برسانے والا اور فلاں بیٹا عطاء کرنے والا وعلیٰ ہذا القیاس، یہ محض نام ہی نام ہیں جن کے نیچے کوئی حقیقت اور واقعیت نہیں، خدائی صفات پتھروں میں کہاں سے آئیں، پھر ان نام کے معبودوں کے پیچھے جن کی معبودیت کی کوئی عقلی یا نقلی سند نہیں، بلکہ کل عقلی و نقلی دلائل جسے مردود ٹھہراتے ہیں، تم دعویٰ توحید میں مجھ سے جھگڑے اور بحثیں کرتے ہو، جب تمہارے جہل اور شقاوت وعناد کا پیمانہ اس قدر لبریز ہو چکا ہے تو انتظار کرو خدا ہمارے تمہارے ان جھگڑوں کا فیصلہ کردے، میں بھی اسی فیصلہ کا منتظر ہوں۔

فَأَنْجَيْنٰهُ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَقَطَعْنَا دَابِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَمَا كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿۷۲﴾

پھر ہم نے بچا لیا اس کو اور جو اس کے ساتھ تھے اپنی رحمت سے اور جڑ کاٹی ان کی جو جھٹلاتے تھے ہماری آیتوں کو اور نہیں مانتے تھے

خلاصہ تفسیر: غرض (عذاب آیا اور) ہم نے ان کو اور ان کے ساتھیوں کو (یعنی مؤمنین کو) اپنی رحمت (وکرم) سے (اس عذاب سے) بچا لیا اور ان لوگوں کی جڑ (تک) کاٹ دی (یعنی بالکل ہلاک کر دیا) جنہوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا تھا اور وہ (انتہائی سخت دلی کی وجہ سے) ایمان لانے والے نہ تھے (یعنی اگر وہ ہلاک نہ ہوتے تب بھی ایمان نہ لاتے، اس لئے ہم نے اس وقت کی حکمت کے تقاضہ کی وجہ سے خاتمہ ہی کر دیا)۔

وَقَطَعْنَا دَابِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا: بعض نے کہا ہے کہ ان کی نسل بالکل منقطع ہوگئی، اور بعض نے کہا ہے کہ کفار بالکل ہلاک ہو گئے اور مؤمنین باقی رہے، ممکن ہے کہ کفار کی چھوٹی اولاد بھی رہ گئی ہو، ان کی نسل آگے بڑھی ہو، ان کو ''عاد اخریٰ'' کہتے ہیں، اور پہلے ہلاک ہونے والوں کو ''عاد اولیٰ'' کہتے ہیں، بعض مفسرین نے نقل کیا ہے کہ ان عاد میں سے بعض لوگ جو اس وقت اطراف مکہ میں گئے ہوئے تھے بچ رہے تھے ان کو ''عاد اخریٰ'' کہتے ہیں، اور لفظ ''عاد ارم'' جو سورہ فجر میں آیا ہے بعض نے کہا ہے کہ ارم قوم عاد کے اجداد میں کسی کا نام ہے، اس قبیلہ کے دونوں لقب ہیں، عاد بھی اور ارم بھی، اور بعض نے کہا ہے کہ ارم قوم عاد میں سے ایک شاخ کا لقب ہے، اور مشہور یہ ہے کہ ارم کے دو بیٹے تھے ایک عوص، اس کے بیٹے کا نام عاد ہے، قوم ''عاد اولیٰ'' اسی کی اولاد ہے، اور ارم کے دوسرے بیٹے جثو اس کا بیٹا ثمود ہے، اس کی اولاد کا لقب ''عاد اخریٰ'' ہے۔

اس قوم کا عذاب سخت ہوا تھی جس سے وہ ہلاک ہوئے، اور سورہ فصلت میں جو لفظ صاعقہ آیا ہے اس سے مطلق عذاب مراد ہے، اور بعض مفسرین قائل ہوئے ہیں کہ ان پر ہوا کا عذاب بھی آیا تھا اور سخت آواز کا بھی جس سے دل پھٹ گئے، پس صاعقہ کے معنی کڑک کے ہوں گے۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی ان پر سات رات اور آٹھ دن تک مسلسل آندھی کا طوفان آیا جس سے تمام کفار ٹکرا ٹکرا کر اور پٹک پٹک کر ہلاک کر دیئے گئے، یہ تو ''عاد اولیٰ'' کا انجام ہوا، اور اسی قوم کی دوسری شاخ (ثمود) جسے ''عاد ثانیہ'' کہتے ہیں، اس کا ذکر آگے آتا ہے:

وَاِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۘ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ قَدْ جَآءَتْكُمْ

اور ثمود کی طرف بھیجا ان کے بھائی صالح کو، بولا اے میری قوم بندگی کرو اللہ کی کوئی نہیں تمہارا معبود اس کے سوا، تم کو پہنچ چکی ہے

بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوْهَا

دلیل تمہارے رب کی طرف سے ۱ یہ اونٹنی اللہ کی ہے تمہارے لیے نشانی سو اس کو چھوڑ دو کہ کھائے اللہ کی زمین میں اور اس کو ہاتھ نہ لگاؤ

بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿٧٣﴾

بری طرح پھر تم کو پکڑے گا عذاب دردناک ۲۔

خلاصہ تفسیر: (تیسرا قصہ) اور ہم نے قوم ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح کو (پیغمبر بنا کر) بھیجا، انہوں نے (اپنی قوم سے) فرمایا اے میری قوم! تم (صرف) اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اس کے سوا کوئی تمہارا معبود (ہونے کے قابل) نہیں (انہوں نے ایک خاص معجزہ کی درخواست کی کہ اس پتھر سے ایک اونٹنی پیدا ہو تو ہم ایمان لائیں، چنانچہ آپ کی دعا سے ایسا ہی ہوا کہ وہ پتھر پھٹا اور اس کے اندر سے ایک بڑی اونٹنی نکلی، آپ نے فرمایا کہ) تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے ایک واضح دلیل (میرے رسول ہونے کی) آچکی ہے (آگے اس کا بیان ہے) یہ اونٹنی ہے اللہ کی جو تمہارے لئے دلیل (بنا کر ظاہر کی گئی) ہے (چونکہ وہ قدرت الٰہی کی دلیل تھی اسی لئے اللہ کی اونٹنی کہلائی) سو (علاوہ اس کے کہ یہ میری رسالت پر دلیل ہے خود اس کے بھی کچھ حقوق ہیں، من جملہ ان کے یہ ہے کہ) اس کو چھوڑ دو کہ اللہ کی زمین میں (گھاس چارہ) کھاتی پھرا کرے (اسی طرح اپنی باری کے دن پانی پیتی رہے جیسا دوسری آیت میں ہے) اور اس کو برائی (اور تکلیف دہی) کے ساتھ ہاتھ بھی مت لگانا کبھی تم کو دردناک عذاب آ پکڑے۔

فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ: ''سو اس کو چھوڑ دو کہ اللہ کی زمین میں کھاتی پھرا کرے'' اس کا یہ مطلب نہیں کہ چاہے وہ کسی کا بھی کھیت کھاتی پھرا کرے تب بھی کچھ نہ کہا جائے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ جس گھاس چارہ کا کھانا مباح ہے اس کے چرنے میں اس سے تعرض نہ کیا جائے۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی جو دلیل تم مانگ رہے تھے وہ پہنچ گئی، صالح علیہ السلام کی قوم نے ان سے عہد و اقرار کیا تھا کہ آپ پتھر کی ایک ٹھوس چٹان میں سے حاملہ اونٹنی نکال دیں تو ہم آپ پر ایمان لے آئیں گے، خدا نے حضرت صالح علیہ السلام کی دعا سے ویسا ہی کر دیا، ان کو کہا جا رہا ہے کہ تمہارا فرمائشی معجزہ تو خدا نے دکھلا دیا، اب ایمان لانے میں کیا تامل ہے۔

فائدہ: ۲ یعنی یہ اونٹنی خدا کی قدرت اور میری صداقت کی نشانی ہے، جو میری دعا پر غیر معتاد طریقہ سے خدا نے پیدا کی، اس کے حقوق کی رعایت کرو، مثلاً خدا کی زمین میں مباح گھاس کھانے اور اس کی باری میں پانی پینے سے نہ روکو، غرض خدا کے اس نشان کے ساتھ جو تم نے خود مانگ کر حاصل کیا ہے، برائی سے پیش مت آؤ، ورنہ تمہاری بھی خیر نہیں۔

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ وَّبَوَّاَكُمْ فِى الْاَرْضِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُهُوْلِهَا

اور یاد کرو جب کہ تم کو سردار کر دیا عاد کے پیچھے اور ٹھکانا دیا تم کو زمین میں کہ بناتے ہو نرم زمین میں

قُصُوْرًا وَّتَنْحِتُوْنَ الْجِبَالَ بُيُوْتًا ۚ فَاذْكُرُوْٓا اٰلَآءَ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِى الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿٧٤﴾

محل اور تراشتے ہو پہاڑوں کے گھر، سو یاد کرو احسان اللہ کے اور مت مچاتے پھرو زمین میں فساد

خلاصہ تفسیر: اور (اے قوم!) تم یہ حالت یاد کرو (اور یاد کر کے احسان مانو اور اطاعت کرو) کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو (قوم) عاد کے بعد (روئے زمین پر) آباد کیا اور تم کو زمین پر رہنے کو (دلخواہ) ٹھکانا دیا کہ نرم زمین پر (بھی بڑے بڑے) محل بناتے ہو اور پہاڑوں کو تراش تراش کر ان میں (بھی) گھر بناتے ہو، سو خدا تعالیٰ کی (ان) نعمتوں کو (اور دوسری نعمتوں کو بھی) یاد کرو (اور کفر و شرک کے ذریعہ) زمین میں فساد مت پھیلاؤ (یعنی ایمان لے آؤ)۔

وَتَنۡحِتُوۡنَ الۡجِبَالَ بُيُوۡتًا ۚ فَاذۡكُرُوۡۤا اٰلَاۤءَ اللّٰهِ: یہاں اللہ تعالی پہاڑوں کو تراش کر گھر بنانے کو اپنی نعمتوں میں شمار فرما رہے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ کسی فن وصنعت میں مہارت بھی اللہ تعالی کی نعمت ہے، جیسا کہ پیچھے آیت: وَّزَادَكُمۡ فِى الۡخَلۡقِ بَصۜۡطَةً میں ایسا ہی مضمون گذرا ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی احسان فراموشی اور شرک وکفر کر کے زمین میں خرابی مت پھیلاؤ۔

قَالَ الۡمَلَاُ الَّذِيۡنَ اسۡتَكۡبَرُوۡا مِنۡ قَوۡمِهٖ لِلَّذِيۡنَ اسۡتُضۡعِفُوۡا لِمَنۡ اٰمَنَ مِنۡهُمۡ اَتَعۡلَمُوۡنَ

کہنے لگے سردار جو متکبر تھے اس کی قوم میں غریب لوگوں کو کہ جو ان میں ایمان لا چکے تھے کیا تم کو یقین ہے

اَنَّ صٰلِحًا مُّرۡسَلٌ مِّنۡ رَّبِّهٖ ؕ قَالُوۡۤا اِنَّا بِمَاۤ اُرۡسِلَ بِهٖ مُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۷۵﴾

کہ صالح کو بھیجا ہے اس کے رب نے، بولے ہم کو تو جو وہ لے کر آیا اس پر یقین ہے

قَالَ الَّذِيۡنَ اسۡتَكۡبَرُوۡۤا اِنَّا بِالَّذِىۡۤ اٰمَنۡتُمۡ بِهٖ كٰفِرُوۡنَ ﴿۷۶﴾

کہنے لگے وہ لوگ جو متکبر تھے جس پر تم کو یقین ہے ہم ان کو نہیں مانتے ۔ل

خلاصہ تفسیر: (مگر اس قدر سمجھانے کے باوجود کچھ غرباء ہی ایمان لائے، ان غریبوں اور رئیسوں میں یہ گفتگو ہوئی یعنی) ان کی قوم میں جو متکبر سردار تھے انہوں نے غریب لوگوں سے جو کہ ان میں سے ایمان لے آئے تھے پوچھا کہ کیا تم کو اس بات کا یقین ہے کہ صالح اپنے رب کی طرف سے (پیغمبر بنا کر) بھیجے ہوئے (آئے) ہیں، انہوں نے (جواب میں) کہا کہ بیشک ہم تو اس (حکم) پر پورا یقین رکھتے ہیں جو ان کو دے کر بھیجا گیا ہے، وہ متکبر لوگ کہنے لگے کہ تم جس چیز پر یقین لائے ہوئے ہو ہم تو اس کے منکر ہیں۔

* * *

فائدہ: ل قوم میں جو بڑے بڑے متکبر سردار اور معاندین تھے وہ غریب اور کمزور مسلمانوں سے استہزاءً کہتے تھے کہ (کیا بڑے آدمی تو آج تک نہ سمجھے؟) مگر تمہیں معلوم ہو گیا کہ صالح خدا کا بھیجا ہوا ہے؟ مسلمانوں نے جواب دیا کہ (معلوم ہونا کیا معنی، معلوم تو تم کو بھی ہے) ہاں ہم دل سے قبول کر کے اس پر ایمان لا چکے ہیں، متکبرین اس حکیمانہ جواب سے کھسیانے ہو کر بولے کہ جس چیز کو تم نے مان لیا ہے، ہم ابھی تک اسے نہیں مانتے، پھر بھلا تمہارے جیسے چند خستہ حال آدمیوں کا ایمان لے آنا کونسی بڑی کامیابی ہے۔

فَعَقَرُوا النَّاقَةَ وَعَتَوۡا عَنۡ اَمۡرِ رَبِّهِمۡ وَقَالُوۡا يٰصٰلِحُ ائۡتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ

پھر انہوں نے کاٹ ڈالا اونٹنی کو اور پھر گئے اپنے رب کے حکم سے ل اور بولے اے صالح لے آ ہم پر جس سے تو ہم کو ڈراتا تھا

اِنۡ كُنۡتَ مِنَ الۡمُرۡسَلِيۡنَ ﴿۷۷﴾

اگر تو رسول ہے ۲

خلاصہ تفسیر: غرض (نہ صالح علیہ السلام پر ایمان لائے، اور نہ اونٹنی کے حقوق ادا کئے، بلکہ) اس اونٹنی کو (بھی) مار ڈالا اور اپنے پروردگار کے حکم (ماننے) سے (بھی) سرکشی کی (وہ حکم الٰہی عقیدہ توحید اور رسالت کی تصدیق کے بارے میں تھا) اور (اس پر یہ بے باکی کہ) کہنے لگے کہ اے صالح! جس (عذاب) کی آپ ہم کو دھمکی دیتے تھے اس کو منگوایئے اگر آپ پیغمبر ہیں (کیونکہ پیغمبر کا صادق ہونا لازمی ہے)۔

فَعَقَرُوا النَّاقَةَ: جس نے اونٹنی کو قتل کیا اس کا نام ''قدار'' آیا ہے، اور یہاں آیت میں جو سب کی طرف قتل کی نسبت کی گئی یہ اس لیے کہ سب اس قتل پر راضی تھے، اس قتل کی وجہ اہل سیر نے یہ لکھی ہے کہ چونکہ اونٹنی بہت بڑی تھی اس لیے جس جنگل میں وہ چرتی تھی دوسرے جانور اس سے ڈر کر بھاگ جاتے اور جس کنویں میں پانی کی باری مقرر ہوتی تھی وہ اپنی باری میں کنویں میں گردن ڈال کر تمام پانی پی جاتی اس روز دوسرے مویشیوں کو وہاں پانی نہ ملتا، اس سے وہ لوگ تنگ دل ہوئے اور اس کو قتل کر ڈالا۔

* * *

فائدہ: لے کہتے ہیں کہ وہ اونٹنی اس قدر عظیم الجثہ اور ڈیل ڈول کی تھی کہ جس جنگل میں چرتی دوسرے مویشی ڈر کر بھاگ جاتے اور اپنی باری کے دن جس کنویں سے پانی پیتی کنواں خالی کر دیتی، گویا جیسے اس کی پیدائش غیر معمولی طریقہ سے ہوئی تو ازم وآثار حیات بھی غیر معمولی تھے، آخر لوگوں نے غیظ میں آکر اس کے قتل پر اتفاق کر لیا، اور بد بخت ''قدار'' نے اس کی کونچیں کاٹ ڈالیں، بعدہ، خود حضرت صالح کے قتل پر بھی تیار ہونے لگے اور اس طرح خدا کے احکام کو جو ''صالح'' اور ''ناقہ'' کے متعلق تھے پس پشت ڈال دیا۔

فائدہ: ۲؎ ایسے کلمات انسان کی زبان سے اس وقت نکلتے ہیں جب خدا کے قہر وغضب سے بالکل بے خوف ہو جاتا ہے، ''عاد اولیٰ'' کی طرح ''ثمود'' بھی اس مرتبہ پر پہنچ کر عذاب الٰہی کے مورد بنے جس کا ذکر آگے آتا ہے۔

فَأَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَأَصْبَحُوا فِي دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿٧٨﴾

پس آ پکڑا ان کو زلزلہ نے پھر صبح کو رہ گئے اپنے گھر میں اوندھے پڑے

خلاصہ تفسیر: پس پکڑا اُن کو زلزلہ نے سو اپنے گھر میں اوندھے کے اوندھے پڑے رہ گئے۔

فَأَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ: دوسری آیت میں ''صیحہ'' یعنی فرشتہ کے نعرہ سے ہلاک ہونا آیا ہے، بعض نے کہا ہے کہ اوپر سے صیحہ اور نیچے سے زلزلہ آیا تھا، اور بعض نے ''رجفہ'' سے دل کا ہلنا مراد لیا ہے، زمین کا ہلنا مراد نہیں لیا، فرشتے کی آواز سے ان کے دل دہل گئے تھے۔

* * *

فائدہ: دوسری آیت میں ان کا ''صیحہ'' (چیخ) سے ہلاک ہونا بیان فرمایا ہے، شاید نیچے سے زلزلہ اور اوپر سے ہولناک آواز آئی ہوگی۔

فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِيْنَ ﴿٧٩﴾

پھر صالح الٹا پھرا ان سے اور بولا اے میری قوم میں پہنچا چکا تم کو پیغام اپنے رب کا اور خیر خواہی کی تمہاری لیکن تم کو محبت نہیں خیر خواہوں سے

خلاصہ تفسیر: اس وقت صالح ان سے منہ موڑ کر چلے اور (بطور حسرت کے فرضی خطاب کر کے) فرمانے لگے کہ اے میری قوم! میں نے تو تم کو اپنے پروردگار کا حکم پہنچا دیا تھا (جس پر عمل کرنا کامیابی کا سبب تھا) اور میں نے تمہاری (بہت) خیر خواہی کی (کہ کس کس طرح شفقت سے سمجھایا) لیکن (افسوس تو یہ ہے کہ) تم لوگ (اپنے) خیر خواہوں کو پسند ہی نہیں کرتے تھے (اس لئے ایک نہ سنی اور آخر روز بد دیکھا)۔

فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰقَوْمِ: آیت کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ صالح علیہ السلام قوم کی ہلاکت کے بعد یہاں سے تشریف لے گئے، اور یہ خطاب مُردوں کو فرضی طور پر محض حسرت وافسوس ظاہر کرنے کے لیے فرمایا، اور بعض نے کہا کہ عذاب کے آثار دیکھ کر زندوں کو یہ خطاب کر کے چلے گئے تو آیت میں تقدیم وتاخیر ہوگی، پھر بعض نے شام کی طرف جانا اور بعض نے مکہ جانا نقل کیا ہے۔

وَقَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّيْ: حضرت صالح علیہ السلام نے بظاہر قوم کی ہلاکت کے بعد یہ خطاب فرمایا کہ تم خیر خواہی کو پسند نہیں کرتے تھے، اس سے مُردوں کا سننا ثابت ہوتا ہے، جب تک کوئی قوی دلیل اس کی نفی نہ کرے۔

* * *

فائدہ: کہتے ہیں کہ حضرت صالح قوم کی ہلاکت کے بعد مکہ معظمہ یا ملک شام کی طرف چلے گئے اور جاتے ہوئے ان لاشوں کے انبار دیکھ کر یہ خطاب فرمایا، یا تو اسی طرح جیسے آنحضرت ﷺ نے مقتولین بدر کو فرمایا تھا اور یا محض بطور تحسر فرضی خطاب تھا، جیسے شعراء دیار و اطلال (کھنڈرات) وغیرہ کو خطاب کرتے ہیں، اور بعض نے کہا کہ یہ خطاب ہلاکت سے پہلے تھا اس صورت میں بیان میں ترتیب واقعات مرعی نہ ہوگی، بہرحال اس خطاب میں دوسروں کو سنانا تھا کہ اپنے معتبر خیر خواہوں کی بات ماننی چاہیے، جب کوئی شخص خیر خواہوں کی قدر نہیں کرتا تو ایسا نتیجہ دیکھنا پڑتا ہے۔

وَلُوطًا إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ أَتَأْتُونَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُم بِهَا مِنْ أَحَدٍ مِّنَ الْعَالَمِينَ ﴿٨٠﴾

اور بھیجا لوط کو جب کہا اس نے اپنی قوم کو کیا تم کرتے ہو ایسی بے حیائی کہ تم سے پہلے نہیں کیا اس کو کسی نے جہان میں

خلاصہ تفسیر: (چوتھا قصہ:) اور ہم نے لوط کو (چند بستیوں کی طرف پیغمبر بنا کر) بھیجا جب کہ انہوں نے اپنی قوم (یعنی اپنی امت) سے فرمایا کیا تم ایسا فحش کام کرتے ہو جس کو تم سے پہلے کسی نے دنیا جہان والوں میں سے نہیں کیا۔

وَلُوطًا إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ: لوط علیہ السلام چند بستیوں کی طرف پیغمبر بنا کر بھیجے گئے تھے، اہل سیر نے لکھا ہے کہ لوط ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے ہیں، بابل سے ان ہی کے ساتھ ہجرت کر کے ملک شام میں تشریف لائے، ابراہیم فلسطین میں مقیم ہوئے، لوط علیہ السلام کو سدوم میں رہنے کا حکم ہوا، اس شہر اور اس کے گرد و نواح کے شہر والوں کی ہدایت کا حکم ہوا، کبھی ابراہیم علیہ السلام بھی جا کر نصیحت فرماتے تھے، وہ لوگ بدفعلی کے عادی تھے جس کا ارتکاب عمر بن دینار کے بقول ان سے پہلے کبھی کسی نے نہ کیا۔

أَتَأْتُونَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُم بِهَا: فاحشہ یعنی بدکاری کو اس قید مَا سَبَقَكُم بِهَا کے ساتھ ذکر کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ بدکاری کے اس عمل سے زیادہ شدید برائی اس عمل کا ایجاد کرنا تھا، گویا منکرات کی ایجاد زیادہ شدید ترین برائی ہے، غور و فکر کا مقام ہے کہ بدعات کی شناعت کس قدر شدید ہوگی۔

* * *

فائدہ: لوط حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے بھتیجے ہیں جو ان کے ساتھ عراق سے ہجرت کر کے ملک شام میں تشریف لائے اور خدا کی طرف سے سدوم اور ان کے گرد و نواح کی بستیوں کی طرف مبعوث ہوئے تا کہ ان کی اصلاح فرمائیں اور ان گندے خلاف فطرت اور بے حیائی کے کاموں سے باز رکھیں، جن میں وہاں کے لوگ مبتلا تھے، نہ صرف مبتلا بلکہ اس بے حیائی کے موجد تھے، ان سے پیشتر عالم میں اس بیماری سے کوئی واقف نہ تھا، اولاً یہ ملعون حرکت شیطان نے سدوم والوں کو سجھائی اور وہیں سے دوسرے مقامات میں پھیلی، حضرت لوط نے اس ملعون و شنیع حرکت کے عواقب پر متنبہ کیا، اور گندگی کو دنیا سے مٹانا چاہا موجودہ بائبل کے جمع کرنے والوں کی شرمناک جسارت پر ماتم کرنا پڑتا ہے کہ ایسے پاکباز اور معصوم پیغمبر کی نسبت جو دنیا کو بے حیائی اور گندگی سے پاک کرنے کے لیے آیا تھا، ایسی سخت ناپاک حرکات منسوب کیں جن کے سننے سے حیادار آدمی کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ ۚ إِن يَقُولُونَ إِلَّا كَذِبًا (الکہف:5)

إِنَّكُمْ لَتَأْتُونَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّن دُونِ النِّسَاءِ ۚ بَلْ أَنتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُونَ ﴿٨١﴾

تم تو دوڑتے ہو مردوں پر شہوت کے مارے عورتوں کو چھوڑ کر، بلکہ تم لوگ ہو حد سے گزرنے والے

خلاصہ تفسیر: (یعنی) تم مردوں کے ساتھ شہوت رانی کرتے ہو عورتوں کو چھوڑ کر (اور اس کام کے ارتکاب میں یہ نہیں کہ تم کو کوئی دھوکہ ہو گیا ہو جیسا کہ بعض گناہوں میں آباء و اجداد کی تقلید سے دھوکہ ہو جاتا ہے) بلکہ (اس باب میں) تم حد (انسانیت) ہی سے گزر گئے ہو۔

بَلْ أَنتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُونَ: بعض آیتوں میں جو بَلْ أَنتُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُونَ آیا ہے جس میں ان کو جاہل کہا گیا ہے، اس سے یہ شبہ نہ ہو

کہ ان کو اس برے فعل کی قباحت معلوم نہ تھی، کیونکہ وہاں جہل سے مراد یہ نہیں، بلکہ جہل سے مراد یہ ہے کہ تم کو اس کا انجام بد یعنی عذاب معلوم نہیں کہ کتنا سخت عذاب ہوگا۔

* * *

فائدہ: یعنی صرف یہ ہی نہیں کہ ایک گناہ کے تم مرتکب ہو رہے ہو، بلکہ اس خلاف فطرت فعل کا ارتکاب اس کی دلیل ہے کہ تم انسانیت کی حدود سے بھی باہر نکل چکے ہو۔

وَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ ﴿۸۲﴾

اور کچھ جواب نہ دیا اس کی قوم نے مگر یہی کہا کہ نکالو ان کو اپنے شہر سے، یہ لوگ بہت ہی پاک رہنا چاہتے ہیں

فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَهْلَهٗٓ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ۖ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿۸۳﴾

پھر بچا دیا ہم نے اسکو اور اسکے گھر والوں کو مگر اسکی عورت، کہ رہ گئی وہاں کے رہنے والوں میں [1]

خلاصہ تفسیر: اور (ان مضامین کا) ان کی قوم سے کوئی (معقول) جواب نہ بن پڑا بجز اس کے کہ (آخر میں بیہودگی کی راہ سے) آپس میں کہنے لگے کہ ان لوگوں کو (یعنی لوط اور ان کے مؤمنین ساتھی کو) تم اپنی (اس) بستی سے نکال دو (کیونکہ) یہ لوگ بڑے پاک صاف بنتے ہیں (اور ہم کو گندہ بتاتے ہیں، پھر گندوں میں پاکوں کا کیا کام، یہ بات انہوں نے آپس میں تمسخر اور بے ہودگی سے کہی تھی)۔

سو (جب یہاں تک نوبت پہنچی تو) ہم نے (اس قوم پر عذاب نازل کیا اور) لوط کو اور ان کے متعلقین کو (یعنی ان کے گھر والوں کو اور دوسرے ایمان والوں کو بھی اس عذاب سے) بچا لیا (اس طرح کہ وہاں سے نکل جانے کا پہلے ہی حکم ہو گیا) بجز ان کی بیوی کے کہ وہ (ایمان نہ لانے کی وجہ سے) ان ہی لوگوں میں رہی جو عذاب میں رہ گئے تھے۔

اِلَّا امْرَاَتَهٗ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ: کیونکہ یہ بیوی کافرہ تھی، جب لوط علیہ السلام کو عذاب سے پہلے بستی سے نکل جانے کا حکم ہوا بعض نے تو کہا ہے کہ یہ بیوی ساتھ ہی نہیں گئی، اور بعض نے کہا ہے کہ ساتھ چلی تھی، پھر لوٹنے لگی اور ہلاک کر دی گئی، اور لوط علیہ السلام پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس آ کر رہے، اگر شبہ ہو کہ عورتوں پر عذاب کیوں نازل ہوا؟ جواب یہ ہے کہ عذاب کا ایک سبب کفر بھی تھا جو سب میں مشترک تھا، اور بعض روایات میں ہے کہ آپس میں ان کی عورتیں بھی مساحقت (ہم جنس پرستی) کرتی تھیں، چنانچہ اس صورت میں یہ شبہ ہی ساقط ہو گیا۔

* * *

فائدہ: [1] یعنی آخری بات انہوں نے یہ کہی کہ جب ہم سب کو یہ گندہ سمجھتے ہیں اور آپ پاک بننا چاہتے ہیں تو گندوں میں پاکوں کا کیا کام، لہٰذا انہیں اپنی بستی ہی سے نکال دینا چاہیے کہ یہ روز روز کی رکاوٹ ختم ہو، خیر وہ ملعون تو کیا نکالتے ہاں حق تعالیٰ نے لوط اور ان کے متعلقین کو عزت و عافیت کے ساتھ صحیح و سالم ان بستیوں سے نکال لیا اور ان بستیوں پر عذاب مسلط کر دیا، جس کا ذکر آگے آتا ہے، لوط کے متعلقین میں سے صرف ان کی بیوی آپ سے علیحدہ رہی اور معذبین کے ساتھ ہلاک ہوئی کیونکہ اس کا ساز باز ان معذبین سے تھا، لوط کے یہاں جو مہمان وغیرہ آتے ان کی اطلاع یہ ہی کیا کرتی اور ان کو بدکاری کی ترغیب دیتی تھی، یا جیسا کہ بعض نے لکھا ہے مردوں کی طرح عورتوں میں بھی ''مساحقہ'' کا رواج ہو گیا، یہ عورت اس میں مبتلا تھی، بہر حال عذاب ان سب پر آیا جو اس مہلک مرض میں مبتلا تھے اور نہایت ڈھٹائی کے ساتھ نبی کا مقابلہ اور تکذیب کرتے تھے یا جو کفر و فحش کے سسٹم میں ان کے معین و مددگار تھے۔

ع ۱۲

وَاَمۡطَرۡنَا عَلَيۡهِمۡ مَّطَرًا ؕ فَانۡظُرۡ كَيۡفَ كَانَ عَاقِبَةُ الۡمُجۡرِمِيۡنَ ۝۸۴

اور برسایا ہم نے ان کے اوپر مینہ یعنی پتھروں کا۱ پھر دیکھ کیا ہوا انجام گناہ گاروں کا۲

خلاصہ تفسیر: اور (وہ عذاب جو ان پر نازل ہوا یہ تھا کہ) ہم نے ان پر ایک نئی طرح کا مینہ برسایا (کہ وہ پتھروں کی بارش تھی) سو (اے دیکھنے والے!) دیکھ تو سہی ان مجرموں کا انجام کیسا ہوا (اگر تو غور سے دیکھے گا تو تعجب کرے گا اور سمجھے گا کہ نافرمانی کا کیا انجام ہوتا ہے)۔

وَاَمۡطَرۡنَا عَلَيۡهِمۡ مَّطَرًا: دوسری آیات میں پتھروں کا برسنا آیا ہے، اور دیگر آیات میں ان بستیوں کا الٹ دینا بھی آیا ہے جس کا بیان ان آیات کی تفسیر کے ساتھ ان شاء اللہ ہوگا۔

* * *

فائدہ:۱ دوسری جگہ مذکور ہے کہ بستیاں الٹ دی گئیں اور پتھروں کا مینہ برسایا گیا بعض ائمہ کے نزدیک آج بھی لوطی کی سزا یہ ہے کہ کسی پہاڑ وغیرہ بلند مقام سے اسے گرایا جائے اور اوپر سے پتھر مارے جائیں، اور سخت بدبودار گندی جگہ میں مقید کیا جائے۔

فائدہ:۲ یعنی گناہ کرتے وقت اس کا بد انجام سامنے نہیں آتا، عاجل شہوت ولذت کے غلبہ میں وہ بات کر گزرتا ہے جو عقل وانسانیت کے خلاف ہے لیکن عقلمند کو چاہیے کہ دوسروں کے واقعات سن کر عبرت حاصل کرے اور بدی کے انجام کو ہمیشہ پیش نظر رکھے۔

وَاِلٰى مَدۡيَنَ اَخَاهُمۡ شُعَيۡبًا ؕ قَالَ يٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمۡ مِّنۡ اِلٰهٍ غَيۡرُهٗ ؕ قَدۡ جَآءَتۡكُمۡ

اور مدین کی طرف بھیجا انکے بھائی شعیب کو۱ بولا اے میری قوم بندگی کرو اللہ کی کوئی نہیں تمہارا معبود اسکے سوا، تمہارے پاس پہنچ چکی ہے

بَيِّنَةٌ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ فَاَوۡفُوا الۡكَيۡلَ وَالۡمِيۡزَانَ وَلَا تَبۡخَسُوا النَّاسَ اَشۡيَآءَهُمۡ وَلَا تُفۡسِدُوۡا

دلیل تمہارے رب کی طرف سے۲ سو پوری کرو ناپ اور تول اور مت گھٹا کر دو لوگوں کو ان کی چیزیں اور مت خرابی ڈالو

فِى الۡاَرۡضِ بَعۡدَ اِصۡلَاحِهَا ؕ ذٰلِكُمۡ خَيۡرٌ لَّكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ ۝۸۵

زمین میں اس کی اصلاح کے بعد، یہ بہتر ہے تمہارے لیے اگر تم ایمان والے ہو۳

خلاصہ تفسیر: (پانچواں قصہ:) اور ہم نے مدین (والوں) کی طرف ان کے بھائی شعیب کو (پیغمبر بنا کر) بھیجا، انہوں نے (اہل مدین سے) فرمایا کہ میری قوم تم (صرف) اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو، اس کے سوا کوئی تمہارا معبود (بننے کے قابل) نہیں، تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے (میرے نبی ہونے پر) واضح دلیل (جو کوئی معجزہ ہے) آچکی ہے (جب میری نبوت ثابت ہے) تو (احکام شرعیہ میں میرا کہنا مانو، چنانچہ میں کہتا ہوں کہ) تم ناپ اور تول پوری پوری کیا کرو اور لوگوں کا ان کی چیزوں میں نقصان مت کیا کرو (جیسا کہ تمہاری عادت ہے) اور روئے زمین میں بعد اس کے کہ (توحید کی تعلیم، بعثت انبیاء، عدل واجب کرنے اور ناپ تول کے حقوق مقرر کرنے سے) اس کی درستی (تجویز) کردی گئی فساد مت پھیلاؤ (یعنی اب ان احکام کی مخالفت اور کفر مت کرو کہ موجب فساد ہے) یہ (جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اس پر عمل کرنا) تمہارے لئے (دنیا وآخرت دونوں میں) نافع ہے اگر تم (میری) تصدیق کرو (جس پر دلیل قائم ہے اور تصدیق کر کے عمل کرو تو مذکورہ امور دونوں جہان میں نافع ہیں، آخرت میں تو ظاہر ہے کہ نجات ہوگی اور دنیا میں شریعت پر عمل کرنے سے امن وانتظام قائم رہتا ہے، خاص کر پورا ناپنے تولنے میں اعتبار بڑھنے کی وجہ سے تجارت کو ترقی ہوتی ہے)۔

وَإِلَىٰ مَدْيَنَ أَخَاهُمْ شُعَيْبًا: قرآن میں حضرت شعیب علیہ السلام کا اہل مدین اور اصحاب ایکہ کی طرف مبعوث ہونا آیا ہے، اہل مدین پر کہیں صیحہ (سخت آواز) کہیں رجفہ (زلزلہ) کا عذاب، اور اصحاب ایکہ پر ظلہ (آگ کے سائبان) کا عذاب ہونا مذکور ہے، بعض نے تو دونوں قوموں کو ایک ہی کہا ہے، اور بعض نے الگ الگ کہا ہے کہ ایک قوم یعنی اہل مدین کے ہلاک ہونے کے بعد اصحاب ایکہ کی طرف مبعوث ہوئے جو مدین ہی کے قریب رہتے تھے اور قرب کی وجہ سے ان میں بھی کم تولنے ناپنے کا مرض تھا، اکثر کا قول یہی ہے، اور دو یا تین عذابوں کا جمع ہو جانا کچھ بعید نہیں جیسا کہ ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ ان پر سخت گرمی مسلط ہوئی کہ گھر میں بھی چین نہ آتا تھا، اس میں ایک بادل کا ٹکڑا آیا جس میں سے سرد ہوا نکلی اور اس کے سایہ میں سب میدان میں جمع ہو گئے، اس وقت اس میں آگ برسی اور زمین کو بھی زلزلہ آیا، سب جل کر مر گئے، اس صورت میں لفظ ''دار'' سے جو کہ آگے آیت میں آتا ہے زمین مراد ہے، جیسے کہ دارالاسلام اور دارالحرب میں دار کا اطلاق مطلق زمین پر ہوتا ہے، اور ان کفار کے ہلاک ہونے کے بعد آپ مکہ میں آ گئے اور وہیں آپ کی وفات ہوئی، مدین اصل میں ابراہیم علیہ السلام کے ایک فرزند کا نام ہے، پھر قبیلہ اور شہر پر اطلاق ہونے لگا جو ان کی اولاد تھے یا اس اولاد کا مسکن تھا، یہ سب اہل سیر نے لکھا ہے۔

وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ: یعنی لوگوں کو ان کی چیزوں میں نقصان مت پہنچاؤ، تو اس پر ان اہل علم لوگوں کو بھی قیاس کیا جائے گا جو جاننے کے باوجود کہ دوسرا آدمی بھی صاحب علم وفضل اور رتبہ والا ہے پھر بھی اس کی عزت ویسے نہیں کرتے جو کرنی چاہیے تھی، بلکہ اس میں کمی کرتے ہیں، اس سے بچنا چاہیے، وہ بھی اس آیت کی زد میں آ جاتے ہیں۔

* * *

فائدہ: ۱ وَإِلَىٰ مَدْيَنَ أَخَاهُمْ شُعَيْبًا: قرآن میں دوسری جگہ حضرت شعیب کا ''اصحاب ایکہ'' کی طرف مبعوث ہونا مذکور ہے، اگر اہل مدین اور اصحاب ایکہ ایک ہی قوم ہے فبہا ونعمت، اور دو جداگانہ قومیں ہیں تو دونوں کی طرف مبعوث ہوئے ہوں گے اور دونوں میں کم تولنے ناپنے کا مرض مشترک ہوگا، بہر حال حضرت شعیب نے علاوہ توحید وغیرہ کی عام دعوت کے خاص معاشرتی معاملات کی اصلاح اور حقوق العباد کی حفاظت کی طرف بڑے زور سے توجہ دلائی جیسا کہ آئندہ آیات میں مذکور ہے حضرت شعیب کو کمال فصاحت کی وجہ سے ''خطیب الانبیاء'' کہا جاتا ہے۔

فائدہ: ۲ قَدْ جَاءَتْكُم بَيِّنَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ: یعنی میری صداقت کی دلیل ظاہر ہو چکی، اب جو نصیحت کی بات تم سے کہوں اسے قبول کرو اور جن خطرناک عواقب پر متنبہ کروں، ان سے ہوشیار ہو جاؤ۔

فائدہ: ۳ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ: بندوں کے حقوق کی رعایت اور معاملات باہمی کی درستی جس کی طرف ہمارے زمانے کے پرہیزگاروں کو بھی بہت کم توجہ ہوتی ہے خدا کے نزدیک اس قدر اہم چیز ہے کہ اسے ایک جلیل القدر پیغمبر ﷺ کا مخصوص وظیفہ قرار دیا گیا، جس کی مخالفت پر ایک قوم تباہ کی جا چکی، ان آیات میں حضرت شعیب کی زبانی آگاہ فرما دیا کہ لوگوں کو ادنیٰ ترین مالی نقصان پہنچانا اور ملک میں اصلاحی حالت قائم ہو چکنے کے بعد خرابی اور فساد پھیلانا خواہ کفر شرک کر کے یا ناحق قتل ونہب وغیرہ سے، یہ کسی ایماندار کا کام نہیں ہو سکتا۔

وَلَا تَقْعُدُوا بِكُلِّ صِرَاطٍ تُوعِدُونَ وَتَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ مَنْ آمَنَ بِهِ وَتَبْغُونَهَا عِوَجًا ۚ

اور مت بیٹھو راستوں پر کہ ڈراؤ اور روکو اللہ کے راستہ سے اس کو جو کہ ایمان لائے اس پر اور ڈھونڈو اس میں عیب ۱

وَاذْكُرُوا إِذْ كُنتُمْ قَلِيلًا فَكَثَّرَكُمْ ۖ وَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِينَ ﴿٨٦﴾

اور یاد کرو جب کہ تھے تم بہت تھوڑے پھر تم کو بڑھا دیا اور دیکھو کیا ہوا انجام فساد کرنے والوں کا ۲

خلاصہ تفسیر: اور تم سڑکوں پر اس غرض سے مت بیٹھا کرو کہ اللہ پر ایمان لانے والوں کو (ایمان لانے پر) دھمکیاں دو اور (ان کو) اللہ کی راہ (یعنی ایمان) سے روکو اور اس (راہ) میں کجی (اور شبہات) کی تلاش میں لگے رہو (کہ بے جا اعتراض سوچ سوچ کر لوگوں کو بہکاؤ، یہ

لوگ مذکورہ گمراہی کے ساتھ اس گمراہی میں بھی مبتلا تھے کہ سڑکوں پر بیٹھ کر آنے والوں کو بہکاتے کہ شعیب علیہ السلام پر ایمان نہ لانا نہیں تو ہم تم کو مار ڈالیں گے، آگے نعمت کی یاد دہانی سے ترغیب اور عذاب کے ذکر سے ترہیب ہے یعنی) اور اس حالت کو یاد کرو جب کہ تم (شمار میں یا مال میں) کم تھے، پھر اللہ تعالیٰ نے تم کو (شمار یا مال میں) زیادہ کر دیا (یہ تو ترغیب تھی ایمان لانے پر) اور دیکھو تو کیسا برا انجام ہوا فساد (یعنی کفر، تکذیب اور ظلم) کرنے والوں کا (جیسے قوم نوح اور عاد اور ثمود گزر چکے ہیں، اسی طرح تم پر عذاب آنے کا اندیشہ ہے یہ ترہیب ہے کفر پر)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ راستوں پر بیٹھنا دو وجہ سے تھا، راہ گیروں کو ڈرا دھمکا کر ظلماً مال وصول کریں اور مومنین کو شعیب کے پاس جانے اور خدا کا دین اختیار کرنے سے روکیں اور خدائی مذہب کے متعلق نکتہ چینی اور عیب جوئی کی فکر میں رہیں۔

فائدہ: ۲؎ یعنی تعداد اور دولت دونوں میں کم تھے خدا نے دونوں طرف تم کو بڑھایا، مردم شماری بھی بڑھ گئی اور دولت مند بھی ہو گئے، خدا کے ان احسانات کا شکر ادا کرو، اور وہ جب ہی ادا ہو سکتا ہے کہ خدا کے اور بندوں کے حقوق پہچان کر عملی درستی اور اصلاح میں مشغول رہو اور ان نعمتوں پر مغرور نہ ہو بلکہ خرابی اور فساد مچانے والوں کا جو انجام پہلے ہو چکا ہے اسے پیش نظر رکھ کر خدائی گرفت سے ڈرتے رہو۔

وَاِنْ كَانَ طَآئِفَةٌ مِّنْكُمْ اٰمَنُوْا بِالَّذِيْٓ اُرْسِلْتُ بِهٖ وَطَآئِفَةٌ لَّمْ يُؤْمِنُوْا فَاصْبِرُوْا حَتّٰى

اور اگر تم میں سے ایک فرقہ ایمان لایا اس پر جو میرے ہاتھ بھیجا گیا اور ایک فرقہ ایمان نہیں لایا تو صبر کرو جب تک

يَحْكُمَ اللّٰهُ بَيْنَنَا ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ﴿۸۷﴾

اللہ فیصلہ کرے درمیان ہمارے، اور وہ سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے

خلاصہ تفسیر: اور اگر (تم کو عذاب نہ آنے کا اس سے شبہ ہو کہ) تم میں سے بعض (تو) اس حکم پر جس کو دے کر مجھ کو بھیجا گیا ہے ایمان لائے ہیں اور بعض ایمان نہیں لائے (اور پھر بھی دونوں فریق یعنی ایمان لانے والے اور نہ لانے والے ایک ہی حالت میں ہیں، ایمان نہ لانے والوں پر ابھی تک عذاب نازل نہیں ہوا، اس سے تم سمجھتے ہو کہ عذاب سے ڈرانا بے اصل ہے) تو (اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ فوراً عذاب نہ آنے سے یہ کیسے معلوم ہوا کہ عذاب کبھی نہ آئے گا) ذرا ٹھہر جاؤ یہاں تک کہ ہمارے (یعنی دونوں فریق کے) درمیان میں اللہ تعالیٰ (عملی) فیصلہ کئے دیتے ہیں (یعنی عذاب نازل کر کے مؤمنین کو نجات دیں گے اور کفار کو ہلاک کریں گے) اور وہ سب فیصلہ کرنے والوں سے بہتر ہیں (کہ ان کا فیصلہ بالکل مناسب ہی ہوتا ہے)۔

* * *

فائدہ: یعنی جو چیز میں لے کر آیا ہوں اگر تم متفقہ طور پر قبول نہیں کرتے بلکہ اختلاف ہی کی ٹھان رکھی ہے تو تھوڑا صبر کرو یہاں تک کہ آسمان ہی سے میرے تمہارے اختلافات کا فیصلہ ہو جائے۔

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَنُخْرِجَنَّكَ يٰشُعَيْبُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ

بولے سردار جو متکبر تھے اس کی قوم میں ہم ضرور نکال دیں گے اے شعیب تجھ کو اور ان کو جو کہ ایمان لائے تیرے ساتھ

مِنْ قَرْيَتِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا ؕ قَالَ اَوَلَوْ كُنَّا كٰرِهِيْنَ ﴿۸۸﴾

اپنے شہر سے یا یہ کہ تم لوٹ آ ؤ ہمارے دین میں ۱؎ بولا کیا ہم بیزار ہوں تو بھی ۲؎

خلاصہ تفسیر: ان کی قوم کے متکبر سرداروں نے (جو یہ باتیں سنی تو انہوں نے گستاخانہ) کہا کہ اے شعیب! (یاد رکھئے) ہم آپ کو اور آپ کے ہمراہ جو ایمان والے ہیں ان کو اپنی بستی سے نکال دیں گے، یا یہ ہو کہ تم ہمارے مذہب میں پھر آ جاؤ (تو اس صورت میں البتہ ہم کچھ نہ کہیں گے) شعیب نے جواب دیا کہ کیا ہم تمہارے مذہب میں آ جائیں گے گو ہم (دلیل اور بصیرت کے ساتھ) اس کو مکروہ (اور قابل نفرت) ہی سمجھتے ہوں (یعنی جب اس کے باطل ہونے پر دلیل قائم ہے تو ہم کیسے اسے اختیار کر لیں)۔

اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا: پہلے مذہب میں پھر آ جانا مومنین کے لئے تو اس لئے کہا کہ وہ لوگ ایمان سے قبل اسی طریقہ کفر پر تھے، لیکن شعیب علیہ السلام کے حق میں باوجود اس کے کہ انبیاء سے کبھی کفر صادر نہیں ہوتا اس لئے کہا کہ نبوت سے پہلے ان کے سکوت اور خاموشی سے وہ یہی سمجھتے تھے کہ ان کا اعتقاد بھی ہم جیسا ہوگا۔

* * *

فائدہ: ۱؎ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا: "عود" کے معنی کسی چیز سے نکل کر اس کی طرف جانے کے ہیں، حضرت شعیب کے ساتھیوں کی نسبت تو یہ لفظ حقیقۃ صادق ہو سکتا ہے، کیونکہ وہ لوگ کفر سے نکل کر اسلام میں داخل ہوئے تھے، باقی خود حضرت شعیب (علیہ السلام) کی نسبت تصور نہیں ہو سکتا کہ وہ پہلے (معاذ اللہ) ملت کفار میں داخل تھے پھر مسلمان ہوئے۔ لامحالہ یا تو ان کے اعتبار سے یہ خطاب تغلیبا ہوگا، یعنی عام کے حق میں جو الفاظ استعمال ہوئے اکثریت غالبہ کو مرجح سمجھ کر حضرت شعیب کے لیے علیحدہ الفاظ اختیار نہیں کیے، اور یا یہ لفظ ان کے حق میں کفار سے زعم کے موافق کہا گیا، کیونکہ بعثت سے پہلے جب تک حضرت شعیب نے دعوت وتبلیغ شروع نہ کی تھی اہل مدین کی کفریات کے متعلق ان کی خاموشی دیکھ کر شاید وہ یہ ہی گمان کرتے ہوں کہ یہ بھی ہمارے شامل حال اور ہمارے طور طریق پر راضی ہیں، اور یا عود کو مجازاً بمعنی مطلق ضرورت کے لیا جائے "کما قالہ بعض المفسرین"۔

فائدہ: ۲؎ قَالَ اَوَلَوْ كُنَّا كٰرِهِيْنَ: یعنی دلائل و براہین کی روشنی میں تمہاری ان مہلک کفریات سے خواہ ہم کتنے ہی بیزار اور کارہ ہوں کیا تم پھر بھی یہ زہر کا پیالہ ہمیں زبردستی پلانا چاہتے ہو۔

قَدِ افْتَرَيْنَا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اِنْ عُدْنَا فِيْ مِلَّتِكُمْ بَعْدَ اِذْ نَجّٰىنَا اللّٰهُ مِنْهَا ؕ

بیشک ہم نے بہتان باندھا اللہ پر جھوٹا اگر لوٹ آئیں تمہارے دین میں ۱؎ بعد اس کے کہ نجات دے چکا ہم کو اللہ اس سے ۲؎

وَمَا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّعُوْدَ فِيْهَآ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّنَا ؕ وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ؕ

اور ہمارا کام نہیں کہ لوٹ آئیں اس میں مگر یہ کہ چاہے اللہ رب ہمارا، گھیرے ہوئے ہے ہمارا پروردگار سب چیزوں کو اپنے علم میں

عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ؕ رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَاَنْتَ خَيْرُ الْفٰتِحِيْنَ ﴿۸۹﴾

اللہ ہی پر ہم نے بھروسا کیا، اے ہمارے رب فیصلہ کر ہم میں اور ہماری قوم میں انصاف کے ساتھ اور تو سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے ۳؎

خلاصہ تفسیر: ہم تو اللہ پر بڑی جھوٹی تہمت لگانے والے ہو جائیں اگر (خدا نہ کرے) ہم تمہارے مذہب میں آ جائیں

(خصوصاً) بعد اس کے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو اس سے نجات دی ہو (کیونکہ اول تو ہر حالت میں کفر کو دین حق سمجھنا یہی اللہ پر تہمت لگانا ہے کہ معاذ اللہ خدا کو یہ دین پسند ہے، خصوصاً مومن کا مرتد ہو کر کافر ہو جانا چونکہ دلیل حق معلوم کرنے اور قبول کر لینے کے بعد ہوگا یہ اور زیادہ تہمت ہے، ایک تو وہی پہلی تہمت کہ دین کفر کو خدا کا پسندیدہ سمجھنا، دوسری یہ تہمت کہ خدا نے جو مجھ کو دلیل کا علم دیا تھا جس کو میں حق سمجھتا تھا وہ علم غلط دیا تھا) اور ہم سے ممکن نہیں کہ تمہارے مذہب میں پھر آجائیں لیکن ہاں یہ کہ اللہ ہی نے جو ہمارا مالک ہے (ہمارے) مقدر (میں) کیا ہو (جس کی مصلحت انہی کے علم میں ہے تو خیر یہ اور بات ہے) ہمارے رب کا علم ہر چیز کو محیط ہے (اس علم سے سب مقدرات کے مصالح کو جانتے ہیں مگر) ہم اللہ ہی پر بھروسہ رکھتے ہیں (اور بھروسہ کر کے یہ امید کرتے ہیں کہ وہ ہم کو دین حق پر ثابت رکھے، یہ جواب دے کر جب دیکھا کہ ان سے خطاب کرنا بالکل مؤثر نہیں اور ان کے ایمان لانے کی بالکل امید نہیں ان سے خطاب ترک کر کے حق تعالیٰ سے دعا کی کہ) اے ہمارے پروردگار! ہمارے اور ہماری (اس) قوم کے درمیان فیصلہ کر دیجئے (جو کہ ہمیشہ) حق کے موافق (ہوا کرتا ہے، کیونکہ خدائی فیصلہ کا حق ہونا لازم ہے یعنی اب عملی طور پر حق کا حق اور باطل کا باطل ہونا واضح کر دیجئے) اور آپ سب سے اچھا فیصلہ کرنے والے ہیں۔

اِنْ عُدْنَا فِیْ مِلَّتِكُمْ: یعنی اگر ہم تمہارے مذہب میں آجائے، یہاں شعیب علیہ السلام نے اپنے بارے میں جو عود (ان کے مذہب میں لوٹنے) کا لفظ استعمال کیا یا تو ان کے کلام کے مقابلہ کے طور پر فرما دیا کہ وہ عود کر آنے کو کہتے تھے، یا فرض محال کے طور پر ان کے گمان کو فرض کر کے کلام کیا، یا دوسروں کو اپنے ساتھ شامل کر کے ان کی وجہ سے لفظ عود کا اطلاق کر دیا۔

وَمَا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّعُوْدَ فِيْهَآ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ: اس سے یہ شبہ نہ کیا جائے کہ ان کو اپنے خاتمہ بالخیر کا یقین نہ تھا، انبیاء کو یہ یقین دیا جاتا ہے، بلکہ اس میں اپنے عجز وضعف کا اظہار اور اللہ تعالیٰ پر توکل وتفویض مقصود ہے جو کہ کمالات نبوت میں سے ہے کہ ہم کیا ہیں جو کسی کام کے کرنے یا اس سے بچنے کا دعویٰ کر سکیں!! اور اگر دوسرے مؤمنین کے اعتبار سے لیا جائے تو کوئی اشکال ہی نہیں، اللہ کے مقبول بندے دعویٰ اور بڑائی کے اظہار سے اپنے آپ کو ہمیشہ محفوظ رکھتے ہیں جو عام طور پر جرأت و بے باکی کی علامت سمجھی جاتی ہے، رہا انبیا کرام کا اپنی نبوت وصداقت کا اعلان کرنا تو وہ اظہار رسالت کے تحت ہوا کرتا ہے، جو فرائض نبوت کے لوازم میں شامل ہے۔

* * *

فائدہ: ۱۔ اِنْ عُدْنَا فِیْ مِلَّتِكُمْ: باطل اور جھوٹے مذہب کو سچا کہنا ہی خدا پر افتراء کرنا اور بہتان باندھنا ہے، پھر بھلا ایک جلیل القدر پیغمبر اور اس کے مخلص متبعین سے یہ کب ممکن ہے کہ وہ معاذ اللہ سچائی سے نکل کر جھوٹ کی طرف واپس جائیں اور جو سچے دعوے اپنی حقانیت یا مامور من اللہ ہونے کے کر رہے تھے ان سب کا بھی جھوٹ اور افتراء ہونا تسلیم کریں۔

فائدہ: ۲۔ بَعْدَ اِذْ نَجّٰىنَا اللّٰهُ مِنْهَا: کسی کو تو ابتداء نجات دے چکا کہ اس میں داخل ہی نہ ہونے دیا، جیسے حضرت شعیب (علیہ السلام) اور بعضوں کو داخل ہونے کے بعد اس سے نکالا جیسے عامہ مومنین۔

فائدہ: ۳۔ وَاَنْتَ خَيْرُ الْفٰتِحِيْنَ: یعنی اپنے اختیار یا تمہارے اکراہ واجبار سے ممکن نہیں کہ ہم معاذ اللہ کفر کی طرف جائیں، ہاں! اگر فرض کرو خدا ہی کی مشیت ہم میں سے کسی کی نسبت ایسی ہو جائے تو اس کے ارادہ کو کون روک سکتا ہے، اگر اس کی حکمت اسی کو مقتضی ہو تو وہاں کوئی نہیں بول سکتا، کیونکہ اسی کا علم تمام مصالح اور حکمتوں پر محیط ہے، بہر حال تمہاری دھمکیوں سے ہم کو کوئی خوف نہیں، کیونکہ ہمارا بالکلیہ اعتماد اور بھروسہ اپنے خدائے واحد پر ہے، کسی کے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا، جو ہوگا اسی کی مشیت اور علم محیط کے تحت میں ہوگا، اسی لیے ہم اپنے اور تمہارے فیصلے کے لیے بھی اس سے دعا کرتے ہیں، کیونکہ ایسے قادر اور علیم وحکیم سے بہتر کسی کا فیصلہ نہیں ہو سکتا، حضرت شعیب کے ان الفاظ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ انبیاء کے قلوب حق تعالیٰ کی عظمت وجبروت اور اپنی عبودیت وافتقار کے کس قدر عظیم وعمیق احساس سے معمور ہوتے ہیں اور کس طرح ہر آن اور ہر حال میں ان کا توکل و اعتماد تمام وسائط سے منقطع ہو کر اسی وحدہ لاشریک لہ پر پہاڑ سے زیادہ مضبوط اور غیر متزلزل ہوتا ہے۔

وَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَىِٕنِ اتَّبَعْتُمْ شُعَيْبًا اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ﴿۹۰﴾

اور بولے سردار جو کافر تھے اس کی قوم میں اگر پیروی کرو گے تم شعیب کی تو تم بیشک خراب ہو گے۔[۱]

فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ﴿۹۱﴾

پھر آ پکڑا ان کو زلزلہ نے پس صبح کو رہ گئے اپنے گھروں کے اندر اوندھے پڑے۔[۲]

خلاصہ تفسیر: اوران کی قوم کے (انہی مذکور) کافرسرداروں نے (شعیب علیہ السلام کی یہ تقریر بلیغ سن کر اندیشہ کیا کہ کہیں سامعین پر اس کا اثر نہ ہوجائے اس لیے انہوں نے بقیہ کفار سے) کہا کہ اگر تم شعیب کی راہ چلنے لگو گے تو بیشک بڑا نقصان اٹھاؤ گے (دین کا بھی، کیونکہ ہمارا مذہب حق ہے، حق کو چھوڑ نا خسارہ ہے اور دنیا کا بھی، اس لئے کہ پورا ناپنے تولنے میں بچت کم ہوگی، غرض وہ سب اپنے کفر وظلم پر جمے رہے اب عذاب کی آمد ہوئی) پس ان کو زلزلے نے پکڑا سو اپنے گھر میں اوندھے کے اوندھے پڑے رہ گئے۔

* * *

فائدہ: [۱] یعنی باپ دادا کا مذہب جھوٹا، یہ تو دین کی خرابی ہوئی اور تجارت میں ناپ تول ٹھیک رکھی، یہ دنیا کا نقصان ہوا۔

فائدہ: [۲] متعدد آیات کے جمع کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان پر ظلّہ، صیحہ، رجفہ تین طرح کے عذاب آئے یعنی اول بادل نے سایہ کرلیا، جس میں آگ کے شعلے اور چنگاریاں تھیں، پھر آسمان سے سخت ہولناک اور جگر پاش آواز ہوئی اور نیچے سے زلزلہ آیا (ابن کثیر)

الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا شُعَيْبًا كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ۚ اَلَّذِيْنَ كَذَّبُوْا شُعَيْبًا كَانُوْا هُمُ الْخٰسِرِيْنَ﴿۹۲﴾

جنہوں نے جھٹلایا شعیب کو گویا کبھی بسے ہی نہ تھے وہاں، جنہوں نے جھٹلایا شعیب کو وہی ہوئے خراب

خلاصہ تفسیر: جنہوں نے شعیب کی تکذیب کی تھی (اور مسلمانوں کو ان کے گھروں سے نکالنے کو آمادہ تھے خود) ان کی یہ حالت ہوگئی جیسے ان گھروں میں کبھی بسے ہی نہ تھے، جنہوں نے شعیب کی تکذیب کی تھی (اور ان کے اتباع کرنے والے کو خاسر ونا کام بتلاتے تھے خود) وہی خسارہ میں پڑگئے۔

* * *

فائدہ: انہوں نے شعیب اور ان کے ہمراہیوں کو بستی سے نکالنے کی دھمکی دی تھی، سو وہ ہی نہ رہے نہ ان کی بستیاں رہیں، اور وہ جو کہتے تھے کہ شعب (علیہ السلام) کے اتباع کرنے والے خراب ہوں گے، سو خود ہی خراب اور خائب وخاسر ہو کر رہے۔

فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ ۚ فَكَيْفَ اٰسٰى

پھر الٹا پھرا ان لوگوں سے اور بولا اے میری قوم میں پہنچا چکا تم کو پیغام اپنے رب کے اور خیر خواہی کر چکا تمہاری، اب کیا افسوس کروں

عَلٰى قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ﴿۹۳﴾ ع

کافروں پر

خلاصہ تفسیر: اس وقت شعیب ان سے منہ موڑ کر چلے اور (بطور حسرت کے فرضی خطاب کر کے) فرمانے لگے کہ اے میری قوم! میں نے تو تم کو اپنے پروردگار کے احکام پہنچادیئے تھے (جن پر عمل کرنا ہر طرح کی فلاح اور کامیابی کا سبب تھا) اور میں نے تمہاری (بڑی) خیر خواہی کی (کہ کس کس طرح سمجھایا گیا، مگر افسوس تم نے نہ مانا اور یہ روز بد دیکھا، اس کے بعد پھر ان کے عناد وکفر وغیرہ کو یاد کر کے فرمانے لگے کہ جب انہوں نے

اپنے ہاتھوں یہ مصیبت خریدی تو) پھر میں ان کافر لوگوں (کے ہلاک ہونے) پر کیوں رنج کروں (جیسا کیا ویسا بھگتا)۔

فَكَيْفَ اٰسٰى عَلٰى قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ: اس میں علیهم کے بجائے علی قوم کفرین کہنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ کفر کے سبب یہ لوگ افسوس کے مستحق بھی نہ رہے، اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کے غضب یافتہ لوگ رحم کے مستحق نہیں ہوتے۔

* * *

فائدہ: یعنی اب ہلاک ہوئے پیچھے ایسی قوم پر افسوس کرنے سے کیا حاصل، جس کو ہر طرح سمجھایا جا چکا، موثر نصیحتیں کی گئیں، آنے والے عواقب ونتائج سے ڈرایا گیا، مگر انہوں نے کسی کی ایک نہ سنی بلکہ مخلص خیر خواہوں سے دست وگریباں ہی رہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّبِيٍّ اِلَّآ اَخَذْنَآ اَهْلَهَا بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَضَّرَّعُوْنَ ﴿۹۴﴾

اور نہیں بھیجا ہم نے کسی بستی میں کوئی نبی کہ نہ پکڑا ہو ہم نے وہاں کے لوگوں کو سختی اور تکلیف میں تاکہ وہ گڑ گڑائیں

ثُمَّ بَدَّلْنَا مَكَانَ السَّيِّئَةِ الْحَسَنَةَ حَتّٰى عَفَوْا وَّقَالُوْا قَدْ مَسَّ اٰبَآءَنَا الضَّرَّآءُ وَالسَّرَّآءُ

پھر بدل دی ہم نے برائی کی جگہ بھلائی یہاں تک کہ وہ بڑھ گئے اور کہنے لگے کہ پہنچتی رہی ہمارے باپ دادوں کو بھی تکلیف اور خوشی

فَاَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۹۵﴾

پھر پکڑا ہم نے ان کو ناگہاں اور ان کو خبر نہ تھی ۱؎

خلاصہ تفسیر: اوپر جن قوموں کا قصہ ذکر ہوا ہے چونکہ اور قوموں کے بھی ایسے قصے واقع ہوئے ہیں، آگے عام عنوان سے اجمالا ان سب کے جرم کی حالت اور جرم پر بھی اول مہلت ملنا، اور پھر بھی نہ سمجھنے پر سزا جاری ہونا مذکور ہے۔

اور ہم نے (ان مذکورہ اور بھی دوسری بستیوں میں سے) کسی بستی میں کوئی نبی نہیں بھیجا کہ وہاں کے رہنے والوں کو (اس نبی کے نہ ماننے پر اول ہمیشہ تنبیہ کی گئی، اور تنبیہ کی غرض سے ان کو) ہم نے محتاجی اور بیماری میں نہ پکڑا ہو تاکہ وہ ڈھیلے پڑ جائیں (اور اپنے کفر وتکذیب سے توبہ کریں) پھر (جب اس سے متنبہ نہ ہوئے تو ڈھیل دینے کے لیے، یا اس غرض سے کہ مصیبت کے بعد جو نعمت ہوتی ہے اس کی زیادہ قدر ہوتی ہے اور نعمت دینے والے کی اطاعت انسان طبعا کرنے لگتا ہے) ہم نے اس بدحالی کی جگہ خوش حالی بدل دی یہاں تک کہ ان کو (صحت کے ساتھ مال واولاد میں) خوب ترقی ہوئی، اور (اس وقت براہ کج فہمی) کہنے لگے کہ (وہ پہلی مصیبت ہم پر کفر وتکذیب کے سبب نہ تھی ورنہ پھر خوش حالی کیوں ہوتی، بلکہ یہ اتفاقات زمانہ سے ہے، چنانچہ) ہمارے آباء واجداد کو بھی (یہ دو حالتیں کبھی) تنگی اور (کبھی) راحت پیش آئی تھیں (اسی طرح ہم پر یہ حالتیں گزر گئیں، جب وہ اس بھول میں پڑ گئے) تو (اس وقت) ہم نے ان کو دفعۃً (مہلک عذابمیں) پکڑ لیا اور ان کو (اس عذاب کے آنے کی) خبر بھی نہ تھی (یعنی اگرچہ ان کو انبیاء نے خبر کی تھی، مگر چونکہ وہ اس خبر کو غلط سمجھتے تھے اور عیش وآرام میں بھولے رہتے تھے اس لئے ان کو عذاب کا گمان بھی نہ تھا)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ پیغمبروں کی بعثت کے وقت جب عموماً لوگ تکذیب ومقابلہ سے پیش آتے ہیں تو خدا کی طرف سے ابتدائی تنبیہ کے طور پر بیماری، قحط اور مختلف قسم کی سختیاں اور تکلیفیں مسلط کی جاتی ہیں، تاکہ مکذبین تازیانے کھا کر شرارتوں سے باز آجائیں اور بارگاہ الہی کی طرف جھکیں، جب ان تنبیہات کا اثر قبول نہیں کرتے تو سختیوں اور مصیبتوں کو ہٹا کر ان پر فراخی اور عیش وخوشحالی وغیرہ بھیجی جاتی ہے کہ یا احسانات سے متاثر ہو کر کچھ شرمائیں اور حضرت ربوبیت کی طرف متوجہ ہوں یا عیش وثروت کے نشہ میں چور ہو کر بالکل ہی غافل وبدمست بن جائیں، گویا جہاں تک صحت، اولاد اور دولت وحکومت بڑھتی جائے اسی کے ساتھ ان کی نخوت وغفلت میں بھی ترقی ہو حتی کہ پچھلی سختیوں کو یہ کہہ کر فراموش کر دیں کہ تکلیف وراحت کا سلسلہ تو پہلے ہی سے چلا آتا ہے، ہمارے کفر وتکذیب کو اس میں کچھ دخل نہیں، ورنہ اب خوشحالی کیوں حاصل ہوتی، یہ سب زمانہ کے اتفاقات ہیں جو ہمارے

اسلاف کو بھی اسی طرح پیش آتے رہے ہیں، اس حد پر پہنچ کر ناگہاں خدا کا عذاب آدباتا ہے جس کی اپنے عیش وآرام میں انہیں خبر بھی نہیں ہوتی، حضرت شاہ صاحبؒ نے کیا خوب لکھا ہے کہ: ''بندہ کو دنیا میں گناہ کی سزا پہنچتی رہے تو امید ہے کہ توبہ کرے اور جب گناہ راست آ گیا تو یہ اللہ کا بھلاوا ہے، پھر ڈر ہے ہلاکت کا جیسے کسی نے زہر کھایا اگل دے تو امید ہے اور پچ گیا تو کام آخر ہوا''۔

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ

اور اگر بستیوں والے ایمان لاتے اور پرہیزگاری کرتے تو ہم کھول دیتے ان پر نعمتیں آسمان اور زمین سے

وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿٩٦﴾

لیکن جھٹلایا انہوں نے پس پکڑا ہم نے ان کو ان کے اعمال کے بدلے

خلاصہ تفسیر: اور (ہم نے جو ان کو عذاب مہلک میں پکڑا تو اس کا سبب صرف ان کا کفر اور مخالفت تھی ورنہ) اگر ان بستیوں کے رہنے والے (پیغمبروں پر) ایمان لے آتے اور (ان کی مخالفت سے) پرہیز کرتے تو ہم (آسمانی وزمینی آفات کے بجائے) ان پر آسمان اور زمین کی برکتیں کھول دیتے (یعنی ان کو آسمان سے بارش اور زمین سے پیداوار برکت کے ساتھ عطا فرماتے اور اگر چہ اس ہلاکت سے پہلے ان کو ایک مدت کے لئے خوش حالی ایک حکمت کی وجہ سے دی گئی، لیکن اس خوش حالی میں برکت اس لئے نہ تھی کہ آخر میں وہ وبال جان ہو گئی، بخلاف ان نعمتوں کے جو ایمان و اطاعت کے ساتھ ملتی ہیں کہ ان میں یہ خیر و برکت ہوتی ہے کہ وہ وبال کبھی نہیں ہوتیں، نہ دنیا میں نہ آخرت میں، حاصل یہ کہ اگر وہ ایمان وتقویٰ اختیار کرتے تو ان کو بھی یہ برکتیں دیتے) لیکن انہوں نے تو (پیغمبروں کی) تکذیب کی تو ہم نے (بھی) ان کے اعمال (بد) کی وجہ سے ان کو عذاب مہلک میں پکڑ لیا (جس کو پیچھے فاخذنھم بغتة سے تعبیر فرمایا ہے)۔

اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ: یہاں ایک یہ بات بھی قابل نظر ہے کہ سورہ انعام کی ایک آیت کے اندر کفار وفجار کے بارے میں آیا ہے: فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ یعنی جب ان لوگوں نے احکام خداوندی کو بھلا دیا تو ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے کھول دیے اور، اور پھر اچانک ان کو عذاب میں پکڑ لیا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں ہر چیز کے دروازے کسی پر کھل جانا کوئی حقیقی انعام نہیں، بلکہ وہ ایک طرح کا قہر الٰہی بھی ہو سکتا ہے، اور یہاں یہ بتلایا گیا ہے کہ اگر ایمان وتقویٰ اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان وزمین کی برکات کھول دیتے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ برکات آسمان وزمین اللہ تعالیٰ کے انعامات اور اس کی رضا کی علامات ہیں۔

جواب یہ ہے کہ دنیا کی نعمتیں اور برکتیں کبھی گناہوں اور سرکشی میں حد سے گزر جانے پر ان کے جرم کو اور زیادہ واضح کرنے کے لیے محض عارضی چند روزہ ہوتی ہیں وہ قہر وغضب کی علامت ہوتی ہیں، اور کبھی رحمت وعنایت سے دائمی صلاح وفلاح کے لئے ہوتی ہیں وہ ایمان وتقویٰ کا نتیجہ ہوتی ہیں، صورت کے اعتبار سے ان میں فرق کرنا مشکل ہوتا ہے، کیونکہ انجام اور عاقبت کا حال کسی کو معلوم نہیں، مگر اہل اللہ نے علامت کے ذریعہ یہ پہچان بتلائی ہے کہ جب مال و دولت اور عیش وآرام کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے شکر وعبادت کی اور زیادہ توفیق ہو تو یہ سمجھا جائے گا کہ یہ رحمت ہے، اور اگر مال و دولت اور عزت و راحت کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے اعراض اور گناہوں کی کثرت بڑھے تو یہ علامت اس کی ہے کہ یہ استدراج یعنی قہر الٰہی کی ایک صورت ہے، اعاذنا اللہ منہ۔

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا: یہ آیت اپنے بعد والی آیت سے مل کر اس پر دلالت کرتی ہے کہ دنیاوی مصیبت اور نعمت کے اندر گناہ اور نیکی کا بھی دخل ہوتا ہے، خواہ وہ نعمت اور مصیبت حسی طور پر یا معنوی طور پر، یعنی اگر نیکیاں کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو مصائب سے محفوظ رکھیں گے، اور بالفرض مصائب آ بھی گئے تو صبر عطا فرمائیں گے، اس سے وہ پریشان نہ ہوگا، لیکن اگر گناہ کرے گا تو مصیبتوں میں رہے گا اور دنیاوی نعمتیں بھی ملیں تب بھی پریشان رہے گا۔

* * *

فائدہ: یعنی ہم کو بندوں سے کوئی ضد نہیں جو لوگ عذاب الٰہی میں گرفتار ہوتے ہیں یہ انہی کی کرتوتوں کا نتیجہ ہے، اگر یہ لوگ ہمارے پیغمبروں کو مانتے اور حق کے سامنے گردن جھکاتے اور کفر و تکذیب وغیرہ سے بچ کر تقویٰ کی راہ اختیار کرتے تو ہم ان کو آسمانی و زمینی برکات سے مالا مال کر دیتے، امام رازی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ برکت کا لفظ دو معنی میں استعمال ہوتا ہے کبھی تو خیر باقی و دائم کو برکت سے تعبیر کرتے ہیں اور کبھی کثرت آثار فاضلہ پر یہ لفظ اطلاق کیا جاتا ہے، لہٰذا آیت کی مراد یہ ہوگی کہ ایمان و تقویٰ اختیار کرنے پر ان آسمانی و زمینی نعمتوں کے دروازے کھول دیئے جاتے جو دائمی اور غیر منقطع ہوں یا جن کے آثار فاضلہ بہت کثرت سے ہوں، ایسی خوشحالی نہیں، جو مکذبین کو چند روز کے لیے بطور امہال و استدراج حاصل ہوتی ہے اور انجام کار دنیا میں ورنہ آخرت میں تو ضرور ہی وبال جان بنتی ہے۔

اَفَاَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰۤى اَنْ یَّاْتِیَهُمْ بَاْسُنَا بَیَاتًا وَّ هُمْ نَآىٕمُوْنَ ﴿۹۷﴾

اب کیا بے ڈر ہیں بستیوں والے اس بات سے کہ آ پہنچے ان پر آفت ہماری راتوں رات جب سوتے ہوں

اَوَ اَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰۤى اَنْ یَّاْتِیَهُمْ بَاْسُنَا ضُحًى وَّ هُمْ یَلْعَبُوْنَ ﴿۹۸﴾

یا بے ڈرے ہیں بستیوں والے اس بات سے کہ آ پہنچے ان پر عذاب ہمارا دن چڑھے جب کھیلتے ہوں [1]

خلاصہ تفسیر: (اب موجودہ کفار کو عبرت دلاتے ہیں) کیا (ان قصص کو سن کر) پھر بھی ان (موجودہ) بستیوں کے رہنے والے (جو رسول اللہ ﷺ کے دور نبوت میں موجود ہیں) اس بات سے بے فکر ہو گئے ہیں کہ ان پر (بھی) ہمارا عذاب شب کے وقت آ پڑے جس وقت وہ پڑے سوتے ہوں، اور کیا ان (موجودہ) بستیوں کے رہنے والے (کفر و تکذیب کے باوجود جو کہ گذشتہ کفار کی ہلاکت کا سبب تھا) اس بات سے بے فکر ہو گئے ہیں کہ (انہی گذشتہ لوگوں کی طرح) ان پر ہمارا عذاب دن دو پہر آ پڑے جس وقت کہ وہ اپنے لایعنی قصوں میں مشغول ہوں (مراد اس سے دنیوی کاروبار ہیں)۔

* * *

فائدہ: [1] یعنی جب عیش و آرام میں غافل پڑے سو رہے ہوں یا دنیا کے کاروبار اور لہو و لعب میں مشغول ہوں اس وقت خدا کا عذاب ان کو دفعتاً آ گھیرے، اس بات سے یہ لوگ کیوں نڈر اور بے فکر ہو رہے ہیں، حالانکہ جن اسباب کی بنا پر گزشتہ اقوام پر عذاب آئے ہیں، وہ ان میں بھی موجود ہیں، یعنی کفر و تکذیب اور سید الانبیاء (ﷺ) کے ساتھ مقابلہ و محاربہ۔

اَفَاَمِنُوْا مَكْرَ اللّٰهِ ۚ فَلَا یَاْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۹۹﴾ ع

کیا بے ڈر ہو گئے اللہ کے داؤ سے، سو بے ڈر نہیں ہوتے اللہ کے داؤ سے مگر خرابی میں پڑنے والے

خلاصہ تفسیر: ہاں! تو کیا اللہ تعالیٰ کی اس (ناگہانی) پکڑ سے (جس کا اوپر بیان ہوا ہے) بے فکر ہو گئے، سو (سمجھ رکھو کہ) اللہ تعالیٰ کی پکڑ سے بجز ان کے جن کی شامت ہی آ گئی ہو اور کوئی بے فکر نہیں ہوتا۔

مذکورہ آیتوں سے استنباط کیا گیا ہے کہ عذاب الٰہی سے بے خوف ہونا کفر ہے، کیونکہ محاورات قرآنی میں لفظ ''خاسر'' کا اطلاق اکثر کافر ہی پر ہوتا ہے، اور سورہ یوسف کی آیت: لا ییأس من روح اللہ الا القوم الکافرون سے اس مسئلہ کا دوسرا جزو ثابت کیا گیا ہے کہ خدا کی رحمت سے مایوسی بھی کفر ہے، روح المعانی میں شافعیہ کا مذہب نقل کیا ہے کہ ان دونوں لفظوں سے عام طور پر جو معنی مراد لیے جاتے ہیں وہ گناہ کبیرہ ہیں، کفر نہیں، اس کے بعد بعض محققین کا یہ فیصلہ نقل کیا ہے کہ عذاب سے بے فکری اس معنی میں کہ اللہ تعالیٰ کو انتقام پر قادر نہ سمجھے، اور مایوسی اس معنی میں کہ اللہ تعالیٰ کو فضل و انعام پر قادر نہ جانے کفر ہے اور ''یاس'' کے جو معنی مشہور ہیں کہ گناہوں کی کثرت اور عظمت کی وجہ سے معافی کو دشوار سمجھے کہ بس اب کیا گناہ معاف

ہوں گے جس سے طاعات اور توبہ ترک ہو جائیں، نیز بے فکری کے جو معنی مشہور ہیں کہ امید کا ایسا غلبہ ہو جس سے گناہوں پر جرأت ہو جائے، اس معنی کے اعتبار سے دونوں گناہ کبیرہ ہیں، عاجز کہتا ہے کہ قطعی وعید کے بعد بے خوف ہونا جیسا کہ ان کافروں کی حالت تھی اور قطعی وعدہ کے بعد مایوس ہونا مثلاً نبی کی بشارت کے بعد ایسا امن ویاس کفر ہے، اور آیات قرآنی میں یہی معانی مراد ہوتے ہیں۔

فَلَا يَأْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ إِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ: اس میں وہ بھی داخل ہے جو اپنے صاحب نسبت ہونے پر مغرور ہو اور سلب نسبت سے خوف نہ کرے۔

* * *

فائدہ: دنیاوی خوشحالی اور عیش کے بعد جو خدا کی ناگہانی پکڑ ہے، اسی کو مکر اللہ (خدا کا داؤ) فرمایا عیش وتنعم میں پڑ کر وہ ہی لوگ خدا کی ناگہانی گرفت سے بے فکر ہوتے ہیں جن کی شامت اعمال نے انہیں دھکا دے دیا ہو، مومن کی شان یہ ہے کہ وہ کسی حال میں خدا کو نہ بھولے:

ظفر آدمی اس کو نہ جانئے گا ہو وہ کیسا ہی صاحب فہم وذکا　　جسے عیش میں یاد خدا نہ رہی، جسے طیش میں خوف خدا نہ رہا

اَوَلَمْ يَهْدِ لِلَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ اَهْلِهَآ اَنْ لَّوْ نَشَآءُ اَصَبْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ ۚ

کیا نہیں ظاہر ہوا ان لوگوں پر جو وارث ہوئے زمین کے وہاں کے لوگوں کے ہلاک ہونے کے بعد کہ اگر ہم چاہیں تو انکو پکڑ لیں انکے گناہوں پر

وَنَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ ﴿۱۰۰﴾

اور ہم نے مہر کر دی ہے ان کے دلوں پر سو وہ نہیں سنتے

خلاصہ تفسیر: اب یہاں سے گذشتہ آیات پر عبرت حاصل کرنے کی تنبیہ کی جا رہی ہے نیز اس کی علت بتلاتے ہیں کہ ان موجودہ کفار کو عذاب سے کیوں ڈرنا چاہئے؟ وجہ یہ ہے کہ یہ بھی اسی جرم میں مبتلا ہیں جس میں پہلی امتیں مبتلا تھیں یعنی کفر، جب دونوں ایک جرم میں شریک ہیں تو ان کو ڈرنا چاہیے کہ جو حال ان کا ہوا وہ ہمارا نہ ہو جائے۔

اور ان (گذشتہ) زمین پر رہنے والوں کے بعد جو لوگ (اب) زمین پر بجائے ان کے رہتے ہیں، کیا ان واقعات مذکورہ نے ان کو یہ بات (ہنوز) نہیں بتلائی کہ اگر ہم چاہتے تو ان کو (بھی گذشتہ امتوں کی طرح) ان کے جرائم (کفر وتکذیب) کے سبب ہلاک کر ڈالتے (کیونکہ گذشتہ امتیں ان ہی جرائم کے سبب ہلاک کی گئی) اور (واقعی یہ واقعات تو ایسے ہی ہیں کہ ان سے سبق لینا چاہئے تھا، لیکن اصل یہ ہے کہ) ہم ان کے دلوں پر بند لگائے ہوئے ہیں اس سے وہ (حق بات کو دل سے) سنتے (بھی) نہیں (اور ماننا تو در کنار رہا، پس اس بند لگانے سے ان کی سخت دلی اور بڑھ گئی کہ ایسے عبرت خیز واقعات سے بھی عبرت نہیں ہوتی اور اس بند لگانے کا سبب ابتداء میں انہی کا کفر کرنا ہے، چنانچہ دوسری جگہ ارشاد ہے: طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ، یعنی خدا تعالیٰ نے ان کے کفر کے سبب ان کے دلوں پر مہر کر دی)۔

* * *

فائدہ: ا۔ جیسے پہلوں کو پکڑ لیا، تمہیں بھی پکڑ سکتے ہیں۔

تِلْكَ الْقُرٰى نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآئِهَا ۚ وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۚ

یہ بستیاں ہیں کہ سناتے ہیں ہم تجھ کو ان کے کچھ حالات، اور بیشک ان کے پاس پہنچ چکے ان کے رسول نشانیاں لے کر

فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا مِنْ قَبْلُ ؕ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۰۱﴾

پھر ہرگز نہ ہوا کہ ایمان لائیں اس بات پر جس کو پہلے جھٹلا چکے تھے، یوں مہر کر دیتا ہے اللہ کافروں کے دل پر

خلاصہ تفسیر: (اب رسول اللہ ﷺ کی تسلی کے لئے سارے مضمون مذکور کا خلاصہ ہے کہ) ان (مذکورہ) بستیوں کے کچھ کچھ قصے ہم آپ سے بیان کررہے ہیں، اوران سب (بستیوں میں رہنے والوں) کے پاس ان کے پیغمبر معجزات لے کر آئے تھے (مگر) پھر (بھی ان کی ضد اور ہٹ دھرمی کی یہ کیفیت تھی کہ) جس چیز کو انہوں نے اول (وہلہ) میں (ایک بار) جھوٹا کہہ دیا یہ بات نہ ہوئی کہ پھر اس کو مان لیتے (اور جیسے یہ دل کے سخت تھے) اللہ تعالیٰ اسی طرح کافروں کے دلوں پر بند لگا دیتے ہیں۔

فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا مِنْ قَبْلُ: اس آیت سے ایک تو یہ بات معلوم ہوئی کہ معجزات تمام انبیاء ورسل کو عطا فرمائے گئے ہیں جن میں سے بعض انبیاء کے معجزات کا قرآن میں ذکر آیا ہے، بہت سوں کا نہیں آیا، اس سے یہ سمجھنا صحیح نہیں ہوسکتا کہ جن کے معجزات کا قرآن میں ذکر نہیں آیا ان سے کوئی معجزہ ثابت ہی نہیں، اور سورۂ ہود میں جو حضرت ہود علیہ السلام کی قوم کا یہ قول مذکور ہے کہ مَا جِئْتَنَا بِبَيِّنَةٍ یعنی آپ کوئی معجزہ نہیں لائے، اس آیت سے معلوم ہوا کہ ان کا یہ قول محض عناد اور ہٹ دھرمی کی بناء پر تھا، یا یہ کہ ان کے معجزات کو معمولی سمجھ کر ایسا کہا، جیسا کہ مشرکین مکہ حضور ﷺ کی نسبت معجزات کی کثرت کے باوجود یہی کہتے رہے کہ آپ کوئی معجزہ ہمارے پاس نہیں لائے، اس آیت سے تمام انبیاء کا صاحب معجزہ ہونا ثابت ہے۔

دوسری بات یہ قابل توجہ ہے کہ اس آیت میں ان لوگوں کا جو حال بتلایا گیا ہے کہ غلط بات زبان سے نکل گئی تو اس کی سخن پروری کرتے رہے، یہ خدا کی منکر اور کافر قوموں کا حال ہے جس میں آج بکثرت مسلمان بلکہ بعض علماء وخواص بھی مبتلا پائے جاتے ہیں کہ کسی چیز کو اول وہلہ میں غلط یا جھوٹ کہہ دیا تو اب اس کی سچائی کے ہزاروں دلائل بھی سامنے آجائیں تو اپنی غلط بات کی پیروی کرتے رہیں، یہ حالت قہر خداوندی اور غضب الٰہی کا موجب ہے، بلکہ حق بات جو اپنے خلاف جارہی ہو اس کو بھی مان لینا چاہیے، بلکہ دوسرا اگر حق پر ہو تو اس کی بات بھی مان لینی چاہیے، دشمنی، عداوت یا کسی بھی وجہ سے اپنی غلط بات پر ہٹ دھرمی نہیں اختیار کرنی چاہیے۔

* * *

فائدہ: یعنی جس چیز کا ایک دفعہ انکار کربیٹھے، پھر کتنے ہی نشان دیکھیں، دنیا ادھر سے ادھر ہوجائے ممکن نہیں کہ اس کا اقرار کرلیں، جب حق تعالیٰ کے مقابلہ میں کسی قوم کی ضد اور ہٹ دھرمی اس درجہ تک پہنچ جاتی ہے تب عادتاً اصلاح حال وقبول حق کا امکان باقی نہیں رہتا، یہ ہی صورت دلوں پر مہر لگ جانے کی ہوتی ہے، یہاں واضح فرمایا کہ اللہ کی طرف سے دلوں پر مہر لگا دینے کا کیا مطلب ہے۔

تنبیہ: وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ سے معلوم ہوگیا کہ جو انبیاء علیہم السلام قوم نوح، عاد، ثمود، قوم لوط، اہل مدین کی بستیوں کی طرف مبعوث ہوئے وہ سب بینات (واضح نشان) دے کر بھیجے گئے، پس ہود علیہ السلام کی قوم کا یہ کہنا: يٰهُوْدُ مَا جِئْتَنَا بِبَيِّنَةٍ (ہود: ۵۳) محض تعنت وعناد کی راہ سے تھا۔

وَمَا وَجَدْنَا لِاَكْثَرِهِمْ مِّنْ عَهْدٍ ۚ وَاِنْ وَّجَدْنَآ اَكْثَرَهُمْ لَفٰسِقِيْنَ ﴿۱۰۲﴾

اور نہ پایا ان کے اکثر لوگوں میں ہم نے عہد کا نباہ، اور اکثر ان میں پائے نافرمان

خلاصہ تفسیر: اور (ان میں سے بعض لوگ مصیبتوں میں ایمان لانے کا عہد بھی کرلیتے تھے، لیکن) اکثر لوگوں میں ہم نے وفائے عہد نہ دیکھا (یعنی مصیبت کے ختم ہونے کے بعد پھر ویسے کے ویسے ہی ہوجاتے تھے) اور ہم نے اکثر لوگوں کو (رسولوں کے آنے، معجزات کے ظاہر ہونے، دلائل وبینات نازل ہونے اور بلاؤں کے وقت پختہ عہد کرلینے کے باوجود بھی) بے حکم ہی پایا (پس کفار ہمیشہ سے ایسے ہی ہوتے رہے ہیں، آپ بھی غم نہ کیجئے)۔

وَمَا وَجَدْنَا لِاَكْثَرِهِمْ مِّنْ عَهْدٍ: یعنی اکثر لوگوں میں ہم نے وفائے عہد نہ دیکھا، یہاں ''اکثر'' کی قید اس لیے لگائی کہ بعض لوگ مسلمان بھی ہوجاتے تھے، یا یہ کہ مصیبت کے وقت سارے عہد نہ کرتے تھے اور اکثر لوگ عہد کرلیتے تھے، پھر وہ بھی اسے پورا نہ کرتے تھے،

اور بعض لوگوں نے عہد کی تفسیر ''یوم الست'' سے کی ہے کہ اکثر لوگ روز ازل کے عہد پر قائم نہ رہے، بعض مسلمان ہو گئے اور اس عہد پر مستقیم رہے۔

* * *

فائدہ: عهد سے ممکن ہے عام عہود مراد ہوں، یا خاص ''عہد الست'' کا ارادہ کیا گیا ہو، یا وہ ''عہد'' جو مصائب اور سختیوں کے وقت کرتے تھے کہ فلاں سختی اٹھالی جائے تو ہم ضرور ایمان لے آئیں گے جیسے فرعونیوں نے کہا تھا: لَئِنْ كَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ وَلَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الرِّجْزَ اِلٰٓى اَجَلٍ هُمْ بٰلِغُوْهُ اِذَا هُمْ يَنْكُثُوْنَ (الاعراف: ۱۳۴-۱۳۵)

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَظَلَمُوْا بِهَا ۚ

پھر بھیجا ہم نے انکے پیچھے [1] موسیٰ کو اپنی نشانیاں دے کر فرعون اور اسکے سرادروں کے پاس پس کفر کیا انہوں نے انکے مقابلہ میں

فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿١٠٣﴾

سو دیکھ کیا انجام ہوا مفسدوں کا [2]

خلاصہ تفسیر: یہاں تک پچھلے انبیاء علیہم السلام اور ان کی قوموں کے پانچ واقعات کا بیان کر کے موجودہ لوگوں کو ان سے عبرت و نصیحت حاصل کرنے کے لئے تنبیہات فرمائی گئی ہیں اس کے بعد چھٹا قصہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تفصیل کے ساتھ بیان ہوگا، جس میں واقعات کے ضمن میں سینکڑوں احکام ومسائل اور عبرت ونصیحت کے بیشمار مواقع ہیں، اور اسی لئے قرآن کریم میں اس واقعہ کے اجزاء بار بار دہرائے گئے ہیں۔

(چھٹا قصہ:) پھر ان (مذکورہ پیغمبروں) کے بعد ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) کو اپنے دلائل (معجزات) دے کر فرعون کے اور اس کے امراء کے پاس (ان کی ہدایت وتبلیغ کے لئے) بھیجا، سو (جب موسیٰ علیہ السلام نے وہ دلائل ظاہر کئے تو) ان لوگوں نے ان (معجزات) کا بالکل حق ادا نہ کیا (کیونکہ ان کا حق اور مقتضا یہ تھا کہ ایمان لے آتے) سو دیکھئے ان مفسدوں کا کیا (برا) انجام ہوا (جیسا کہ اور جگہ ان کا غرق اور ہلاک ہونا مذکور ہے)۔

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ: یہاں آیات سے مراد یا تو وہی دو معجزات ہیں، یعنی عصا اور ید بیضا، یہاں جمع کا صیغہ ان کی عظمت ظاہر کرنے کے لیے لایا گیا ہے کہ یہ دو معجزے گویا بہت سے معجزات کے برابر ہیں، یا وہ سب معجزات مراد ہوں جو آگے تیسرے رکوع میں آیت ۱۳۰: ولقد اخذنا آل فرعون بالسنین میں بیان ہوئے، مگر وہ سب اسی وقت واقع نہیں ہوئے، بلکہ مختلف اوقات میں ان کا ظہور ہوا، پس یہاں اجمال میں مجموعہ اوقات کا اعتبار کیا جائے گا۔

اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ: یہاں سرداروں کی تخصیص اس لیے کی گئی کہ وہ سرگروہ تھے، باقی لوگ ان کے تابع تھے، اور بنی اسرائیل کی طرف آپ کا مبعوث ہونا دوسری آیتوں میں مذکور ہے، پس موسیٰ علیہ السلام دو قوموں کی طرف بھیجے گئے تھے، مگر اس سے نبوت کا عام ہونا لازم نہیں آتا، کیونکہ تمام عالم کے آدمی دو قوموں میں منحصر نہ تھے (چنانچہ موسیٰ علیہ السلام ہی کے زمانہ میں شعیب علیہ السلام اہل مدین وغیرہ کے نبی تھے) اور دوسری آیات میں ہارون علیہ السلام کا بھی موسیٰ کے ہمراہ ہونا مذکور ہے، شاید تابع ہونے کی وجہ سے یہاں ان کا ذکر نہ کیا ہو۔

* * *

فائدہ: [1] یعنی جن انبیاء کا پہلے ذکر ہوا (نوح، ہود، صالح، لوط، شعیب علیہم السلام) ان سب کے بعد تشریف لائے، ان پیغمبروں کا ذکر فرمانے کے بعد درمیان میں ''سنت اللہ'' بیان فرمائی تھی جو مکذبین کے متعلق جاری رہی ہے جس کے ضمن میں موجودہ جماعت کفار کو متنبہ فرمادیا گیا، اس درمیانی مضمون سے فارغ ہو کر پھر سلسلہ بعثت رسل کی ایک عظیم الشان کڑی کا ذکر شروع کرتے ہیں۔

فائدہ: [2] اس سے زیادہ مفسد کون ہوگا جو خدا کے سفراء کو جھٹلائے، آیات اللہ کی تکذیب اور حق تلفی کرے، مخلوق خدا سے اپنی پرستش کرائے، آگے ضروری واقعات ذکر فرما کر اس انجام کی تفصیل بیان کی گئی ہے:

وَقَالَ مُوسٰى يٰفِرْعَوْنُ اِنِّىْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٠٤﴾ حَقِيْقٌ عَلٰٓى اَنْ لَّآ اَقُوْلَ عَلَى اللّٰهِ

اور کہا موسیٰ نے اے فرعون میں رسول اللہ ہوں پروردگار عالم کا، قائم ہوں اس بات پر کہ نہ کہوں اللہ کی طرف سے

اِلَّا الْحَقَّ ؕ قَدْ جِئْتُكُمْ بِبَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَرْسِلْ مَعِىَ بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿١٠٥﴾

مگر جو سچ ہے، لایا ہوں تمہارے پاس نشانی تمہارے رب کی ۱ سو بھیج دے میرے ساتھ بنی اسرائیل کو ۲۔

خلاصہ تفسیر: (گذشتہ آیت میں تو تمام قصہ کا اجمال تھا، اب تفصیل ہے) اور (موسیٰ علیہ السلام) نے (فرعون کے پاس بحکم الٰہی جا کر) فرمایا کہ میں رب العالمین کی طرف سے (تم لوگوں کی ہدایت کے واسطے) پیغمبر (مقرر ہوا) ہوں (جو مجھے جھوٹا بتلائے اس کی غلطی ہے، کیونکہ) میرے لئے یہی شایان ہے کہ بجز سچ کے خدا کی طرف کوئی بات منسوب نہ کروں (اور میں رسالت کا خالی دعوی ہی نہیں کرتا، بلکہ) میں تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے ایک بڑی دلیل (یعنی معجزہ) بھی لایا ہوں (جو طلب کرنے کے وقت دکھلا سکتا ہوں) سو (جب میں دلیل کے ساتھ نبی ہوں تو میں جو کہوں اس کی اطاعت کر، چنانچہ ان احکامات میں سے ایک یہ کہتا ہوں کہ) تو بنی اسرائیل کو (اپنی خدمت اور بیگار سے خلاصی دے کر) میرے ساتھ (ملک شام کو جوان کا اصلی وطن ہے) بھیج دے۔

فَاَرْسِلْ مَعِىَ بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ: اس مقام پر توحید کی طرف دعوت کا اس لیے ذکر نہیں کیا کہ دوسری آیات میں موجود ہے، چونکہ بنی اسرائیل پر ظلم کرنا حقوق العباد میں سے تھا، اس اعتبار سے اسکا اہم ہونا خاص اسے ذکر کرنے کا سبب ہوسکتا ہے، بعض مفسرین نے اَرْسِلْ کے معنیٰ "أطلق عن قيدك" لیے ہیں، یعنی اسرائیل کو خدمت کی قید سے رہا کر دے، ملک شام میں جانے کا اس میں اعتبار نہیں کیا۔

* * *

فائدہ: ۱ اکثر مفسرین نے حقیق کے معنیٰ "جدیر" (لائق) کے لیے ہیں، اسی لیے علیٰ کو بمعنیٰ "باء" لینا پڑا ہے، یعنی میری شان کے یہ ہی لائق ہے کہ خدا کی طرف سے کوئی ناحق اور غلط بات نہ کہوں، بعض نے حقیق کو بمعنیٰ "حریص" لیا ہے، لیکن مترجم محقق رحمہ اللہ نے حقیق کو "قائم و ثابت" کے معنی میں لیا، جس کا مطلب یہ ہوگا کہ میں بدون ادنیٰ تزلزل اور تذبذب کے پوری مضبوطی اور استقلال کے ساتھ اس پر قائم ہوں کہ سچ کے سوا کوئی چیز زبان سے نہ نکالوں، خدا کا پیام بلا کم و کاست تم کو پہنچا دوں اور تمہاری تکذیب وتخویف کی وجہ سے ذرا بھی نہ ڈگمگاؤں۔

فائدہ: ۲ یوں تو حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے فرعون کو کئی طرح کی نصیحتیں کیں جیسا کہ دوسری آیات میں مذکور ہیں: فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى وَاَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى (النازعات: ۱۸-۱۹) مگر ایک بڑی مہم چیز یہ تھی کہ بنی اسرائیل کو جو انبیائے کرام کی اولاد میں سے تھے اور جنہیں فرعونیوں نے ذلیل جانوروں کی طرح غلام بنا رکھا تھا، مظالم و شدائد سے نجات دلائیں، اس موقع پر فرعون کو مخاطب کرتے ہوئے اسی چیز کی طرف توجہ دلائی ہے، یعنی بنی اسرائیل کو اپنی قید و بیگار سے نجات دے تا کہ وہ آزادی کے ساتھ اپنے پروردگار کی عبادت میں مشغول ہوں اور میرے ساتھ اپنے وطن مالوف (ملک شام) میں چلے جائیں کیونکہ ان کے جداعلیٰ حضرت ابراہیم خلیل اللہ نے عراق سے ہجرت کر کے شام ہی میں قیام فرمایا تھا، بعدہ حضرت یوسف (علیہ السلام) کی وجہ سے بنی اسرائیل مصر میں آباد ہوئے، اب چونکہ یہاں کی قوم قبطیوں نے ان پر طرح طرح کے مظالم کر رکھے ہیں، ضرورت ہے کہ ان کو قبطیوں کی ذلیل غلامی سے آزادی دلا کر آبائی وطن کی طرف واپس کیا جائے۔

قَالَ اِنْ كُنْتَ جِئْتَ بِاٰيَةٍ فَاْتِ بِهَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿١٠٦﴾ فَاَلْقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِىَ

بولا اگر تو آیا ہے کوئی نشانی لے کر تو لا اس کو اگر تو سچا ہے، تب ڈال دیا اس نے اپنا عصا تو اسی وقت ہوگیا

ثُعۡبَانٌ مُّبِيۡنٌ ﴿١٠٧﴾

اژدہا صریح ۔[1]

خلاصہ تفسیر: فرعون نے کہا کہ اگر آپ (من جانب اللہ) کوئی معجزہ لے کر آئے ہیں تو اس کو اب پیش کیجئے اگر آپ (اس دعوی میں) سچے ہیں، بس آپ نے (فورا) اپنا عصا (زمین پر) ڈال دیا سو دفعۃ وہ صاف ایک اژدھا بن گیا (جس کے اژدھا ہونے میں کوئی شک وشبہ نہیں ہوسکتا تھا)۔

فَاِذَا هِيَ ثُعۡبَانٌ مُّبِيۡنٌ: اس آیت میں ثُعۡبَانٌ یعنی اژدہا فرمایا، دوسری آیتوں میں لفظ جَانٌ بمعنی پتلا سانپ فرمایا، ان میں تطبیق اس طرح ہے کہ یا تو کسی وقت اژدہا ہوتا ہوا اور کسی وقت میں پتلا سانپ، یا پہلے پتلا ہوتا ہو پھر بڑھ جاتا ہو، یا جثہ میں بڑا ہوتا ہو اور تیزی میں پتلے سانپ کی طرح ہو، یہاں لفظ مبین فرمانے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی حقیقت تبدیل ہوجاتی تھی، خیالی قصہ نہ تھا، اگر خیالی قصہ ہوتا تو خود موسیٰ علیہ السلام کو اس سے خوف پیدا نہ ہوتا، حالانکہ دوسری آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں بھی پہلے پہل اس سے خوف پیدا ہوا تھا۔

* * *

فائدہ: [1] جس کے اژدھا ہونے میں کسی طرح کی شک وشبہ کی گنجائش نہ تھی کہتے ہیں کہ وہ اژدھا منہ کھول کر فرعون کی طرف لپکا آخر فرعون نے بدحواس ہوکر موسیٰ (علیہ السلام) سے اس کے پکڑنے کی درخواست کی، موسیٰ (علیہ السلام) کا ہاتھ لگانا تھا کہ پھر عصا بن گیا۔

وَّنَزَعَ يَدَهٗ فَاِذَا هِيَ بَيۡضَآءُ لِلنّٰظِرِيۡنَ ﴿١٠٨﴾

اور نکالا اپنا ہاتھ تو اسی وقت وہ سفید نظر آنے لگا دیکھنے والوں کو

خلاصہ تفسیر: اور (دوسرا معجزہ یہ ظاہر کیا کہ) اپنا ہاتھ (گریبان کے اندر بغل میں دبا کر) باہر نکال لیا، سو وہ یکایک سب دیکھنے والوں کے روبرو بہت ہی چمکتا ہوا ہوگیا (کہ اس کو بھی سب نے دیکھا)۔

لِلنّٰظِرِيۡنَ: اس لفظ سے کوئی نظر بندی کا شبہ نہ کرے، کیونکہ یہ تاکید ہے اس کے واقعی روشن، چمکدار اور سفید ہونے کی، جیسے کہا کرتے ہیں کہ کھلی آنکھوں لوگوں نے دیکھا، اور حقیقت کے انقلاب یعنی اس کی ماہیت بدل جانے کا محال ہونا جو فلاسفہ کے ہاں مشہور ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ممکن، واجب اور ممتنع ان تینوں میں سے کسی کی حقیقت دوسرے کی طرف منقلب نہیں ہوسکتی، ورنہ عناصر کا استحالہ کون نہیں دیکھتا۔

* * *

فائدہ: یعنی ہاتھ گریبان میں ڈال کر اور بغل میں دبا کر نکالا تو لوگوں نے کھلی آنکھوں دیکھ لیا کہ غیر معمولی طور پر سفید اور چمکدار تھا، یہ روشنی اور چمک کسی مرض برص وغیرہ کی وجہ سے نہ تھی، بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قلب منور کی روشنی بطریق اعجاز ہاتھ میں سرایت کر جاتی تھی۔

قَالَ الۡمَلَاُ مِنۡ قَوۡمِ فِرۡعَوۡنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيۡمٌ ﴿١٠٩﴾

بولے سردار فرعون کی قوم کے یہ تو کوئی بڑا واقف جادوگر ہے

خلاصہ تفسیر: (حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جو یہ عظیم معجزات ظاہر ہوئے تو فرعون نے اہل دربار سے کہا کہ یہ شخص بڑا جادوگر ہے، اس کا اصل مقصد یہ ہے کہ اپنے جادو سے تم لوگوں پر غالب آکر یہاں کا رئیس ہوجائے اور تم کو یہاں آباد نہ رہنے دے، سو اس بارے میں تمہارا کیا مشورہ ہے؟ چنانچہ سورۃ شعراء میں یہ فرعون کا قول منقول ہے، اس کو سن کر جیسا کہ بادشاہوں کے مصاحبین کی عادت ہوتی ہے سب اس کی ہاں میں ہاں

ملانے لگے، فرعون کے قول کی تصدیق و موافقت کے لئے) قوم فرعون میں جو سردار (اور اہل دربار) لوگ تھے انہوں نے (ایک دوسرے سے) کہا کہ واقعی (جیسا ہمارے بادشاہ کہتے ہیں کہ) یہ شخص بڑا جادوگر ہے۔

* * *

فائدہ: معلوم ہوتا ہے کہ فرعون نے موسیٰ (علیہ السلام) کے معجزات سے ہیبت زدہ ہو کر پبلک کو جمع کیا اور پہلے اس نے بذات خود (کما فی سورۃ الشعراء) پھر اس کی طرف سے بڑے بڑے لیڈروں نے اس رائے کا اظہار کیا کہ موسیٰ علیہ السلام (معاذ اللہ) کوئی بڑے ماہر جادوگر معلوم ہوتے ہیں، کیونکہ جو خوارق موسیٰ (علیہ السلام) سے ظاہر ہوئے، ان کی حسیات کے موافق جادو سے بہتر ان کی کوئی توجیہ نہ ہو سکتی تھی۔

يُّرِيْدُ اَنْ يُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ ۚ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ ﴿۱۱۰﴾

نکالا چاہتا ہے تم کو تمہارے ملک سے، اب تمہاری کیا صلاح ہے

خلاصہ تفسیر: (ضرور) یہ (ہی) چاہتا ہے کہ (اپنے جادو کے زور سے بنی اسرائیل کے ساتھ مل کر خود رئیس ہو جائے اور) تم کو (اس وجہ سے کہ تم بنی اسرائیل کی نظر میں خار ہو) تمہاری (اس) سرزمین سے باہر کر دے، سو تم لوگ (جیسا کہ بادشاہ دریافت کر رہے ہیں) کیا مشورہ دیتے ہو۔

قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ (الی قولہ) يُّرِيْدُ اَنْ يُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ: جس طرح فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کے حق طریقہ یعنی معجزے کو جادو کہہ کر ایک پرفریب باطل کی صورت میں ظاہر کیا تاکہ قوم کو ان کے خلاف اکسایا جائے، چنانچہ اسی طرح ہر زمانے کے اہل باطل صوفیوں کا یہی حال ہے کہ وہ عوام کو اہل حق سے نفرت دلانے کے لیے ان کے صحیح اور دینی کام کو باطل رنگ دیتے ہیں اور برے برے عنوان سے ظاہر کرتے ہیں تاکہ لوگ متنفر ہو جائیں، یہ بہت غلط اور بری بات ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی عجیب و غریب ساحرانہ کرشمے دکھلا کر مخلوق کو اپنی طرف مائل کرنے اور انجام کار ملک میں اثر و اقتدار پیدا کر کے اور بنی اسرائیل کی حمایت و آزادی کا نام لے کر قبطیوں کو جو یہاں کے اصل باشندے ہیں، ان کے ملک و وطن (مصر) سے بے دخل کر دے، ان حالات کو پیش نظر رکھ کر مشورہ دو کہ کیا ہونا چاہیے۔

قَالُوْٓا اَرْجِهْ وَاَخَاهُ وَاَرْسِلْ فِي الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ ﴿۱۱۱﴾ يَاْتُوْكَ بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِيْمٍ ﴿۱۱۲﴾

بولے ڈھیل دے اس کو اور اس کے بھائی کو اور بھیج پرگنوں میں جمع کرنے والوں کو، کہ جمع کر لائیں تیرے پاس جو ہو کامل جادوگر [1]

خلاصہ تفسیر: (غرض مشورہ طے کر کرا کر) انہوں نے (فرعون سے) کہا کہ آپ ان (موسیٰ علیہ السلام کو اور ان کے بھائی کو) مہلت دیجئے اور (اپنی حدود سلطنت کے) شہروں میں (گرد آوروں کو یعنی) چپراسیوں کو (حکم نامے دے کر) بھیج دیجئے کہ وہ (سب شہروں سے) سب ماہر جادوگروں کو (جمع کر کے) آپ کے پاس لا کر حاضر کر دیں۔

* * *

فائدہ: [1] مشاورت باہمی کے بعد یہ پاس ہوا کہ فرعون سے درخواست کی جائے کہ وہ ان دونوں (موسیٰ و ہارون) کے معاملہ میں جلدی نہ کرے، ان کا بہترین توڑ اور موثر جواب یوں ہو سکتا ہے کہ چپڑاسی بھیج کر تمام قلمرو میں سے فن سحر کے جاننے والے جوان سے بھی بڑھ کر اس فن کے ماہر (سحار) ہوں جمع کر لیے جائیں، ان سے ان کا مقابلہ کرایا جائے، چنانچہ یوں ہی کیا گیا۔

وَجَآءَ السَّحَرَةُ فِرْعَوْنَ قَالُوْٓا اِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ ﴿۱۱۳﴾

اورآئے جادوگر فرعون کے پاس بولے ہمارے لیے کچھ مزدوری ہے اگر ہم غالب ہوئے

خلاصہ تفسیر: (چنانچہ ایسا ہی انتظام کیا گیا) اور وہ جادوگر فرعون کے پاس حاضر ہوئے (اور) کہنے لگے کہ اگر ہم (موسیٰ علیہ السلام پر) غالب آئے تو (کیا) ہم کو کوئی بڑا صلہ (اور انعام) ملے گا۔

❊ ❊ ❊

فائدہ: ساحرین فرعون نے اِنَّ لَنَا لَاَجْرًا کہہ کر پہلے ہی قدم پر جتلا دیا کہ انبیاء علیہم السلام جن کا پہلا لفظ فَمَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ (یونس: ۷۲) ہوتا ہے، کوئی پیشہ ور لوگ نہیں ہوتے۔

قَالَ نَعَمْ وَاِنَّكُمْ لَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿۱۱۴﴾

بولا ہاں اور بیشک تم مقرب ہو جاؤ گے

خلاصہ تفسیر: فرعون نے کہا کہ ہاں! (انعام بھی بڑا ملے گا) اور (مزید برآں یہ ہوگا کہ) تم (ہمارے) مقرب لوگوں میں داخل ہو جاؤ گے۔

❊ ❊ ❊

فائدہ: یعنی مزدوری کیا چیز ہے وہ تو ملے گی اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ تم ہمارے مقربین بارگاہ اور مصاحبین خاص میں داخل کر لیے جاؤ گے۔

قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِمَّآ اَنْ تُلْقِيَ وَاِمَّآ اَنْ نَّكُوْنَ نَحْنُ الْمُلْقِيْنَ ﴿۱۱۵﴾

بولے اے موسیٰ یا تو تو ڈال اور یا ہم ڈالتے ہیں

خلاصہ تفسیر: (غرض موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کی جانب سے اس کی طلاع دی گئی اور مقابلہ کیلئے تاریخ مقرر ہوئی اور تاریخ پر سب ایک میدان میں جمع ہوئے، اس وقت) ان ساحروں نے (موسیٰ علیہ السلام سے) عرض کیا کہ اے موسیٰ! (ہم آپ کو اختیار دیتے ہیں) خواہ آپ (اول اپنا عصا میدان میں) ڈالئے (جس کو آپ اپنا معجزہ بتلاتے ہیں) اور یا (اگر آپ کہیں تو) ہم ہی (اپنی رسیاں اور لاٹھیاں میدان میں) ڈالیں۔

❊ ❊ ❊

فائدہ: یہ شاید اس بناء پر کہا کہ پیشتر حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے روبرو عصا ڈال کر باذن اللہ اژدھا بنا چکے تھے۔

قَالَ اَلْقُوْا ۚ فَلَمَّآ اَلْقَوْا سَحَرُوْٓا اَعْيُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوْهُمْ وَجَآءُوْ بِسِحْرٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۱۶﴾

کہا ڈالو لے پھر جب انہوں نے ڈالا باندھ دیا لوگوں کی آنکھوں کو اور ان کو ڈرایا اور لائے بڑا جادو لے

خلاصہ تفسیر: موسیٰ نے فرمایا کہ تم ہی (پہلے) ڈالو، جب انہوں نے (اپنی رسیوں اور لاٹھیوں کو) ڈالا تو (جادو سے دیکھنے والے) لوگوں کی نظر بندی کر دی (جس سے وہ لاٹھیاں اور رسیاں سانپ کی شکل میں لہراتی نظر آنے لگیں) اور ان پر ہیبت غالب کر دی اور ایک طرح کا بڑا جادو دکھلایا۔

قَالَ اَلْقُوْا: یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اول تو جادو خود ہی ایک حرام فعل ہے، پھر جبکہ وہ کسی پیغمبر کو شکست دینے کے لئے استعمال کیا جائے تو بلاشبہ کفر ہے، پھر موسیٰ علیہ السلام نے کیسے ان لوگوں کو اس کی اجازت دینے کے لئے فرمایا: اَلْقُوْا یعنی تم ڈالو؟ حالانکہ کفر کی اجازت دینا بھی سے

تو کیا مؤمن سے بھی ممکن نہیں؟ حقیقت حال پر غور کرنے سے یہ سوال ختم ہوجاتا ہے، کیونکہ یہاں تو یقینی تھا کہ یہ لوگ اپنا سحر مقابلہ پر ضرور پیش کریں گے، گفتگو صرف پہلے اور بعد کی تھی، اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی اولوالعزمی کا ثبوت دینے کے لئے ان کو ہی موقعہ عطا فرمایا، اس کے علاوہ اس میں ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ پہلے جادوگر اپنی لاٹھیوں اور رسیوں کے سانپ بنالیں تو پھر عصاء موسیٰ کا معجزہ، صرف یہی نہیں کہ وہ بھی سانپ بن جائے، بلکہ اس طرح ظاہر ہو کہ وہ جادو کے سارے سانپوں کو نگل بھی جائے تاکہ جادوگری کی کھلی شکست پہلے ہی قدم پر سامنے آجائے، اگر آپ پہلے ڈالتے تب بھی عصا ان کو نگل جاتا لیکن جو اثر بعد میں ڈالنے سے ہوا کہ ان کے جادو کا جب لوگوں کے دلوں پر خوب اثر ہوگیا تو فوراً ہی اس کو ملیامیٹ کردیا، تو یہ اثر پہلے ڈالنے میں نہ ہوتا، غرض آپ نے مطلق مقابلہ کی ان کو اجازت نہیں دی، بلکہ سورہ طٰہٰ کی آیت: قال لهم موسى ويلكم لا تفتروا على الله كذباً فيسحتكم بعذاب سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے آپ نے ان کو مقابلہ سے بہت روکا، اور اس نصیحت سے ان میں اختلاف رائے بھی پیدا ہوا، مگر پھر مشورہ کر کے جب مقابلہ ہی کی ٹھہرائی اور موسیٰ علیہ السلام نے دیکھا کہ یہ بغیر مقابلہ کے باز نہ آئیں گے تب آپ نے کامل طور پر غلبہ حق ظاہر کرنے کے لیے یہ صورت اختیار کی کہ پہلے وہ اپنا زور ختم کردیں، پھر سارا کھیل بگاڑ دیا جائے گا، جس سے حق کا غلبہ بخوبی ہوجائے گا، اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کا یہ ارشاد ان کو جادوگری کرنے کی اجازت کے لئے نہیں، بلکہ ان کی رسوائی کو واضح کرنے کے لئے تھا کہ اچھا تم ڈال کر دیکھو کہ تمہارے جادو کا کیا انجام ہوتا ہے، چنانچہ علماء و شیوخ حضرات بعض مرتبہ کسی ایسے کام کا حکم فرماتے ہیں جس کا ظاہر معصیت معلوم ہوتا ہے، لیکن انجام کار اس سے کوئی دینی مصلحت مقصود ہوتی ہے اور وہی مصلحت ان کو مقصود ہوتی ہے۔

سَحَرُوٓا اَعْيُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوْهُمْ: اس آیت سے معلوم ہوا کہ ان لوگوں کا جادو ایک قسم کی نظر بندی اور تخیل تھی جس سے دیکھنے والوں کو یہ محسوس ہونے لگا کہ یہ لاٹھیاں اور رسیاں سانپ بن کر دوڑ رہے ہیں، حالانکہ وہ واقع میں اسی طرح لاٹھیاں اور رسیاں ہی تھیں سانپ نہیں بنے تھے، یہ ایک قسم کا مسمریزم تھا جس کا اثر انسانی خیال اور نظر کو مغلوب کردیتا ہے، لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ سحر یا جادو کا اثر اس سے زیادہ نہیں ہوسکتا کہ صرف اسی قسم میں منحصر ہو یا سحر کے ذریعہ انقلاب ماہیت نہیں ہوسکتا، کیونکہ کوئی شرعی یا عقلی دلیل اس کی نفی پر قائم نہیں ہے بلکہ سحر کی مختلف اقسام واقعات سے ثابت ہیں جن سے حقیقت کا بدلنا بھی ممکن ہے، کہیں تو صرف ہاتھ کی چالاکی ہوتی ہے جس کے ذریعہ دیکھنے والوں کو مغالطہ لگ جاتا ہے، کہیں صرف تخیل اور نظر بندی ہوتی ہے جیسے مسمریزم سے، اور اگر کہیں قلب ماہیت بھی ہوجاتا ہو کہ انسان کا پتھر بن جائے تو یہ بھی کسی شرعی یا عقلی دلیل کے خلاف نہیں۔

سَحَرُوٓا اَعْيُنَ النَّاسِ: ''جب انہوں نے ڈالا تو لوگوں کی نظر بندی کردی'' ان لوگوں میں موسیٰ علیہ السلام بھی داخل ہیں کیونکہ وہ بھی اس وقت وہاں موجود تھے، چنانچہ سورہ طٰہٰ میں ہے: يُخَيَّلُ اليه من سحرهم، چنانچہ اس سے کئی باتیں سمجھ میں آئی:

① خارق عادت یعنی کوئی انوکھا کام جس کو عام آدمی نہ کرسکتے ہوں اگر کوئی آدمی کر دکھائے تو اس سے دھوکا نہیں کھانا چاہیے کہ یہ بہت بڑا بزرگ ہے، بلکہ یہ کافر، مشرک اور ہندو وغیرہ سے بھی صادر ہوسکتا ہے۔

② جس طرح جادو ناجائز اور حرام ہے اسی طرح اس سے ملتے جلتے علوم جیسے کسی کے خیال میں تصرف کرکے اس کے خیالات معلوم کرلینا، مسمریزم اور ہپناٹائزم وغیرہ بھی اسی جادو کے حکم میں ہی داخل ہیں، کیونکہ جادو کی ایک قسم خیال میں تصرف کرنا بھی ہے۔

③ جادو یا مسمریزم وغیرہ سے متاثر ہوجانا باطنی کمال کے خلاف نہیں، جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام سانپوں سے ڈر گئے، یہی وجہ ہے کہ بعض بزرگوں پر جادو وغیرہ اثر کرجاتا ہے۔

④ اہل حق کا جادو وغیرہ کرنے پر یا ان کے ختم کرنے پر قادر ہونا ضروری اور لازمی نہیں ہے۔

وَجَآءُوْ بِسِحْرٍ عَظِيْمٍ: اگر یہ شبہ ہو کہ حق تعالیٰ نے اس جادو کو ''سحر عظیم'' فرمایا ہے، عظیم سے زیادہ تر کوئی چیز نہیں، معلوم ہوا کہ جادو کی دیگر قسمیں اس سے بھی کم ہیں؟ جواب یہ ہے کہ عظیم سے زیادہ اعظم ہے، پھر عظیم میں بھی تو مختلف درجے ہوسکتے ہیں، ممکن ہے کہ عظیم کا ایک درجہ وہ بھی ہو جس میں حقیقت کا تغیر و تبدل ہوجائے۔

❊ ❊ ❊

فائدہ: ۱؎ قَالَ اَلْقُوْا: یعنی جب تم کو یہ مقابلہ ہی منظور ہے اور اسی پر آخری فیصلہ کا انحصار کرتے ہو تو پہلے تم ہی ڈال کر پوری قوت آزمائی کرلو، کیونکہ باطل کی پوری نمائش اور زور آزمائی کے بعد جو حق کا غلبہ مشاہد ہوگا، وہ امید ہے کہ زیادہ موثر اور اوقع فی النفوس ہو تو فی الحقیقت یہ موسیٰ (علیہ السلام) کی طرف سے سحر کے ساتھ معجزہ کا مقابلہ کرنے کی اجازت نہ تھی بلکہ دو صورتوں میں سے ایک ایسی صورت کا انتخاب تھا جو باطل کے خمود اور حق کے غلبہ و وضوح کی موثر ترین صورت ہو سکتی تھی۔

فائدہ: ۲؎ وَجَآءُوْ بِسِحْرٍ عَظِيْمٍ: یعنی جادو کے زور سے نظر بندی کر کے مجمع پر چھا گئے اور لوگوں کو مرعوب کرلیا، دوسری آیت میں ہے کہ انہوں نے اپنی رسیاں اور لاٹھیاں زمین پر پھینک دیں جس سے زمین پر سانپ ہی سانپ دوڑتے معلوم ہونے لگے يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى (طٰہٰ:٦٦) ان آیات سے ظاہر ہوا کہ ساحرین فرعون نے اس وقت جو شعبدہ دکھلایا تھا، اس میں فی الواقع قلب ماہیت نہیں ہوا بلکہ وہ محض تخییل اور نظر بندی تھی، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ تمام اقسام سحر اسی میں منحصر ہوں، شاید انہوں نے یہ گمان کیا ہو کہ ہم اتنی ہی کارروائی سے موسیٰ (علیہ السلام) کو دبالیں گے، اور کچھ گنجائش ملتی تو ممکن تھا کہ اس سحر عظیم سے بھی بڑا کوئی سحر اعظم دکھلاتے، مگر اعجاز موسوی نے سحر کو پہلے ہی مورچہ پر مایوس کن شکست دے دی، آگے موقع ہی نہ رہا کہ مزید مقابلہ جاری رکھا جاتا۔

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنْ اَلْقِ عَصَاكَ ۚ فَاِذَا هِىَ تَلْقَفُ مَا يَاْفِكُوْنَ ﴿١١٧﴾ فَوَقَعَ الْحَقُّ وَبَطَلَ

اور ہم نے حکم بھیجا موسیٰ کو کہ ڈال دے اپنا عصا سو وہ جب ہی لگا نگلنے جو سانگ انہوں نے بنایا تھا، پس ظاہر ہوگیا حق اور غلط ہوگیا

مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿١١٨﴾ فَغُلِبُوْا هُنَالِكَ وَانْقَلَبُوْا صٰغِرِيْنَ ﴿١١٩﴾ وَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيْنَ ﴿١٢٠﴾

جو کچھ انہوں نے کیا تھا، پس ہار گئے اس جگہ اور لوٹ گئے ذلیل ہو کر، اور گر پڑے جادوگر سجدہ میں ۱؎

خلاصہ تفسیر: اور (اس وقت) ہم نے موسیٰ کو (وحی کے ذریعہ سے) حکم دیا کہ آپ اپنا عصا ڈال دیجئے (جیسا ڈالا کرتے ہیں) سو عصا کا ڈالنا تھا کہ اس نے (اژدھا بن کر) ان کے سارے بنے بنائے کھیل کو نگلنا شروع کیا، پس (اس وقت) حق (کا حق ہونا) ظاہر ہوگیا اور انہوں نے (یعنی ساحروں نے) جو کچھ بنایا دنایا تھا سب آتا جاتا رہا، پس وہ لوگ (یعنی فرعون اور اس کی قوم) اس موقع پر ہار گئے اور خوب ذلیل ہوئے (اور اپنا سامنہ لے کر رہ گئے) اور وہ جو ساحر تھے وہ سجدہ میں گر گئے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی عصائے موسیٰ سانپ بن کر ان کی تمام لاٹھیوں اور رسیوں کو نگل گیا اور سارا بنا بنایا کھیل ختم کردیا، جس سے ساحرین کو تنبہ ہوئی کہ یہ سحر سے بالاتر کوئی اور حقیقت ہے، آخر فرعون کے لوگ بھرے مجمع میں شکست کھا کر اور ذلیل ہو کر میدان مقابلہ سے لوٹے، اور ساحرین خدائی نشانی دیکھ کر بے اختیار سجدہ میں گر پڑے، کہتے ہیں کہ موسیٰ و ہارون نے ظہور حق پر سجدہ شکر ادا کیا، اسی وقت ساحرین بھی سربسجود ہوگئے۔

اُلْقِيَ السَّحَرَةُ کا لفظ بتلاتا ہے کہ کوئی ایسا قوی حال ان پر طاری ہوا جس کے بعد بجز خضوع و استسلام کوئی چارہ نہیں رہا، رحمت الٰہیہ کا کیا کہنا کہ جو لوگ ابھی ابھی پیغمبر خدا سے نبرد آزمائی کر رہے تھے سجدہ سے سر اٹھاتے ہی اولیاء اللہ اور عارف کامل بن گئے۔

قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٢١﴾ رَبِّ مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ﴿١٢٢﴾

بولے ہم ایمان لائے پروردگار عالم پر، جو رب ہے موسیٰ اور ہارون کا ۱؎

خلاصہ تفسیر: (اور پکار پکار کر) کہنے لگے کہ ہم ایمان لے آئے رب العالمین پر جو موسیٰ اور ہارون (علیہما السلام) کا بھی رب ہے۔

رَبِّ مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ: موسی اور ہارون کے رب کی قید اس لیے بڑھائی کہ فرعون اپنے آپ کو رب اعلی بتلاتا تھا، تو سننے والے رب العالمین کا مصداق کہیں فرعون کو نہ سمجھ لیں، اس لیے رب موسی وھارون بڑھا کر اپنی مراد متعین کر دی کہ وہ رب العالمین جس کو موسی وہارون رب کہتے ہیں۔

* * *

فائدہ: لے چونکہ فرعون بھی اپنی نسبت اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى کہتا تھا، شاید اس لیے رَبُّ الْعَالَمِيْنَ کے ساتھ رَبِّ مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ کہنے کی ضرورت ہوئی، اس میں یہ بھی اشارہ ہو گیا کہ بیشک جہان کا پروردگار وہ ہی ہوسکتا ہے جس نے موسیٰ وہارون کو اپنی خاص ربوبیت سے بدون توسط اسباب ظاہرہ دنیا کے متکبروں پر علیٰ رؤس الاشہاد اس طرح غالب کر کے دکھلا دیا۔

قَالَ فِرْعَوْنُ اٰمَنْتُمْ بِهٖ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۚ اِنَّ هٰذَا لَمَكْرٌ مَّكَرْتُمُوْهُ فِي الْمَدِيْنَةِ لِتُخْرِجُوْا

بولا فرعون کیا تم ایمان لے آئے اس پر میری اجازت سے پہلے، یہ تو مکر ہے جو بنایا تم سب نے اس شہر میں تاکہ نکال دو

مِنْهَآ اَهْلَهَا ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۲۳﴾

اس شہر سے اس کے رہنے والوں کو، سو اب تم کو معلوم ہو جائے گا

خلاصہ تفسیر: فرعون (بڑا گھبرایا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ساری رعایا ہی مسلمان ہو جائے تو ایک مضمون گھڑ کر ساحروں سے) کہنے لگا کہ ہاں! تم موسیٰ پر ایمان لائے ہو بدون اس کے کہ میں تم کو اجازت دوں، بیشک (معلوم ہوتا ہے کہ) یہ (جو کچھ دکھاوے کے طور پر مصنوعی جنگ ہوئی ہے) ایک کارروائی تھی جس پر تمہارا عمل درآمد ہوا ہے اس شہر میں (خفیہ سازش ہوگئی ہے کہ تم یوں کرنا، ہم یوں کریں گے، پھر اس طرح ہار جیت ظاہر کریں گے اور یہ کارروائی سب ملی بھگت اس لئے کی ہے) تاکہ تم سب (مل کر) اس شہر سے وہاں کے رہنے والوں کو باہر نکال دو (پھر فراغت اور اطمینان کے ساتھ سب مل کر یہاں ریاست کرو) سو (بہتر ہے) اب تم کو حقیقت معلوم ہوئی جاتی ہے۔

اِنَّ هٰذَا لَمَكْرٌ مَّكَرْتُمُوْهُ فِي الْمَدِيْنَةِ: فرعون کا اس طرح کہنے سے محض اپنی بات بنانا منظور تھا، جس کے لیے شبہ کی کسی بنیاد یا سبب کا ہونا ضروری نہیں، اور بعض نے ایک وجہ بھی ذکر کی ہے کہ مقابلہ سے پہلے موسی علیہ السلام اور جادوگروں کے افسر میں یہ گفتگو ہوئی کہ موسی علیہ السلام نے اس سے فرمایا کہ اگر میں غالب آ گیا تو کیا تم ایمان لے آؤ گے؟ اس نے جواب دیا کہ میرے جادو پر غلبہ ممکن نہیں، اور اگر بالفرض آپ غالب آ گئے تو میں ضرور ایمان لے آؤں گا، فرعون نے اس گفتگو کا مشاہدہ کیا تھا اس لیے اس نے کہا کہ تم نے سازش کی، حالانکہ اس گفتگو کا سازش ہونا محض لغویات ہے، مناظرہ اور مقابلہ میں ایسی گفتگو ہوا کرتی ہے جس سے دوسرا فریق اپنے غلبہ کی اور زیادہ کوشش کیا کرتا ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی یہ تم سب جادوگروں کی ملی بھگت ہے، غالباً موسیٰ تمہارا بڑا استاد ہوگا، اس کو آگے بھیج دیا پھر سب نے اپنی مغلوبیت کا اظہار کر دیا، تاکہ عام لوگ متاثر ہو جائیں، اس گہری سازش سے تمہارا مقصود یہ ہے کہ اس ملک کے اصلی باشندوں کو نکال باہر کرو اور خود مصر کی سلطنت پر قبضہ کرلو، یہ تقریر فرعون نے اپنی کھلی شکست پر پردہ ڈالنے اور لوگوں کو اُلو بنانے کی غرض سے کی تھی فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهٗ فَاَطَاعُوْهُ (الزخرف: ۵۴) مگر جس چیز سے فرعون اور فرعونی ڈر رہے تھے، آخر تقدیر الٰہی سے وہ ہی پیش آئی: وَنُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَنُرِيَ فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَحْذَرُوْنَ (القصص: ۶)

لَاُقَطِّعَنَّ اَیۡدِیَکُمۡ وَاَرۡجُلَکُمۡ مِّنۡ خِلَافٍ ثُمَّ لَاُصَلِّبَنَّکُمۡ اَجۡمَعِیۡنَ ﴿۱۲۴﴾

میں ضرور کاٹوں گا تمہارے ہاتھ اور دوسری طرف کے پاؤں پھر سولی پر چڑھاؤں گا تم سب کو

قَالُوۡۤا اِنَّاۤ اِلٰی رَبِّنَا مُنۡقَلِبُوۡنَ ﴿۱۲۵﴾

وہ بولے ہم کو تو اپنے رب کی طرف لوٹ کر جانا ہی ہے[1]۔

خلاصہ تفسیر: (اور وہ حقیقت یہ ہے کہ) میں تمہارے ایک طرف کے ہاتھ اور دوسری طرف کے پاؤں کاٹوں گا، پھر تم سب کو سولی پر ٹانگ دوں گا (تا کہ اوروں کو عبرت ہو)، انہوں نے جواب دیا کہ (کچھ پرواہ نہیں) ہم مرکر (کسی برے ٹھکانے تو نہیں جائیں گے، بلکہ) اپنے مالک ہی کے پاس جائیں گے (جہاں ہر طرح امن وراحت ہے، سو ہمارا نقصان ہی کیا ہے)۔

اس میں اختلاف ہے کہ فرعون نے ان نو مسلموں کو یہ سزا دی یا نہیں؟ بعض نے کہا ہے کہ یہ سزا دی تھی، بعض نے اس وجہ سے انکار کیا ہے کہ حق تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے وعدہ کیا تھا کہ: انتما ومن اتبعکما الغلبون یعنی تم اور تمہارے ساتھی غالب رہو گے، جب وہ ایمان لے آئے تو وہ بھی موسیٰ علیہ السلام کے ساتھی ہو گئے، ان پر فرعون کا کیسے غلبہ ہو سکتا ہے، مگر اس کا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ بعض آدمیوں کا قتل ہو جانا غلبہ کے منافی یا خلاف نہیں، چنانچہ لڑائیوں میں ایک فریق کو آخر میں غالب کہتے ہیں، حالانکہ ان میں بھی مقتول ہوتے ہیں، یا یہ کہا جائے کہ غلبہ سے مراد حجت اور دلیل کے ساتھ غالب ہونا ہے، چنانچہ وہ ہو چکا۔

* * *

فائدہ: [1] ساحرین توحید اور تمنائے لقاء اللہ کی شراب سے مخمور ہو چکے تھے، جنت و دوزخ گویا آنکھوں کے سامنے تھیں، بھلا وہ ان دھمکیوں کی کیا پرواہ کر سکتے تھے انہوں نے صاف کہہ دیا کہ کچھ مضائقہ نہیں جو کرنا ہو کر گزر پھر ہم کو اپنے خدا کے پاس جانا ہے تیرے سر ہو کر سہی، وہاں کے عذاب سے یہاں کی تکلیف آسان ہے اور اس کی رحمت وخوشنودی کے راستہ میں دنیا کی بڑی سے بڑی تکالیف ومصائب کا برداشت کر لینا بھی عاشقوں کے لیے سہل ہے۔

هنيئًا لارباب النعيم نعيمهم وللعاشق المسكين مايتجرّع

وَمَا تَنۡقِمُ مِنَّاۤ اِلَّاۤ اَنۡ اٰمَنَّا بِاٰیٰتِ رَبِّنَا لَمَّا جَآءَتۡنَا ؕ رَبَّنَاۤ اَفۡرِغۡ عَلَیۡنَا صَبۡرًا

اور تجھ کو ہم سے یہی دشمنی ہے کہ مان لیا ہم نے اپنے رب کی نشانیوں کو جب وہ ہم تک پہنچیں اے ہمارے رب دہانے کھول دے ہم پر صبر کے

وَّتَوَفَّنَا مُسۡلِمِیۡنَ ﴿۱۲۶﴾ ع ۱۴

اور ہم کو مار مسلمان

خلاصہ تفسیر: اور تو نے ہم میں کونسا عیب دیکھا ہے (جس پر اس قدر شور وغل کرتا ہے) بجز اس کے کہ ہم اپنے رب کے احکام پر ایمان لے آئے (سو یہ کوئی عیب کی بات نہیں، پھر فرعون سے اعراض کر کے حق تعالیٰ سے دعا کی کہ) اے ہمارے رب! ہمارے اوپر صبر کا فیضان فرما (یعنی ہم کو استقامت عطا فرما کہ اگر یہ سختی کرے تو مستقل رہیں) اور ہماری جان حالت اسلام پر نکالئے (کہ اس کی سختی سے پریشان ہو کر ہم سے کوئی بات ایمان کے خلاف نہ ہو جائے)۔

* * *

فائدہ: یعنی جب رب کی نشانیوں کو مان لینے سے ہم تیری نگاہ میں مجرم ٹھہرے ہیں، اسی رب سے ہماری دعا ہے کہ وہ تیری زیادتیوں اور سختیوں پر ہم کو صبر جمیل کی توفیق بخشے اور مرتے دم تک اسلام پر مستقیم رکھے، ایسا نہ ہو کہ گھبرا کر کوئی بات تسلیم ورضاء کے خلاف کر گزریں۔

وَقَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اَتَذَرُ مُوْسٰى وَقَوْمَهٗ لِيُفْسِدُوْا فِى الْاَرْضِ وَيَذَرَكَ وَاٰلِهَتَكَ ؕ

اور بولے سردار قوم فرعون کے کیوں چھوڑتا ہے تو موسیٰ کو اور اسکی قوم کو کہ دھوم مچائیں ملک میں [1] اور موقوف کر دے تجھ کو اور تیرے بتوں کو [2]

قَالَ سَنُقَتِّلُ اَبْنَآءَهُمْ وَنَسْتَحْىٖ نِسَآءَهُمْ ۚ وَاِنَّا فَوْقَهُمْ قٰهِرُوْنَ ﴿۱۲۷﴾

بولا اب ہم مار ڈالیں گے ان کے بیٹوں کو اور زندہ رکھیں گے ان کی عورتوں کو، اور ہم ان پر زور آور ہیں [3]

خلاصہ تفسیر: اور (جب موسیٰ علیہ السلام کا یہ بڑا معجزہ منظر عام پر ظاہر ہوا اور جادوگر ایمان لے آئے اور دیگر بعض لوگ بھی آپ کے تابع ہو گئے اس وقت) قوم فرعون کے سرداروں نے (جو کہ اعیان سلطنت تھے یہ دیکھ کر کہ بعض آدمی مسلمان ہو چلے فرعون سے) کہا کہ کیا آپ موسیٰ کو اور ان کی قوم (تابعین) کو یوں ہی (مطلق العنان، آزاد اور مخلی بالطبع) رہنے دیں گے کہ وہ ملک میں فساد کرتے پھریں؟ (فساد یہ کہ اپنا مجمع بڑھائیں جس کے اخیر میں بغاوت کا اندیشہ ہے) اور وہ (یعنی موسیٰ علیہ السلام) آپ کو اور آپ کے (تجویز کئے ہوئے) معبودوں کو ترک کئے رہیں (یعنی ان کے معبود ہونے کے منکر رہیں اور موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ان کی قوم بھی ایسے ہمارے معبودوں کا انکار کرتی رہے، یعنی آپ اس کا انتظام کیجئے!) فرعون نے کہا کہ (سر دست تو یہ انتظام مناسب معلوم ہوتا ہے کہ) ہم بھی ان لوگوں کے بیٹوں کو قتل کرنا شروع کر دیں (تا کہ ان کا زور نہ بڑھنے پائے) اور (چونکہ عورتوں کے بڑھنے سے کوئی اندیشہ نہیں، نیز ہم کو اپنے کام وخدمت کے لئے بھی ضرورت ہے اس لئے) عوتوں کو زندہ رہنے دیں، اور ہم کو ہر طرح کا ان پر زور ہے (اس انتظام میں کوئی دشواری نہ ہوگی)۔

* * *

فائدہ: [1] مُوْسٰى وَقَوْمَهٗ لِيُفْسِدُوْا فِى الْاَرْضِ: جب حق کے نشان دیکھ کر ساحرین سجدہ میں گر پڑے اور بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام کا ساتھ دینا شروع کر دیا بلکہ بعض قبطیوں کا میلان بھی ان کی طرف ہونے لگا تو فرعونی لیڈر گھبرائے اور فرعون کو یہ کہہ کر تشدد پر آمادہ کرنے لگے کہ موسیٰ اور اس کی قوم بنی اسرائیل کو یہ موقع نہ دینا چاہیے کہ وہ آزادہ کر ملک میں اودھم مچاتے پھریں اور عام لوگوں کو اپنی طرف مائل کر کے حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیں اور آئندہ تیری اور تیرے تجویز کئے ہوئے معبودوں کی پرستش ملک سے موقوف کرا دیں۔

فائدہ: [2] وَيَذَرَكَ وَاٰلِهَتَكَ: فرعون اپنے کو رب اعلیٰ بڑا پروردگار کہتا تھا، غالباً اسی اعلیٰ کو نباہنے کے لیے کچھ ادنیٰ پروردگار بھی تجویز کئے ہوں گے، ان کو یہاں اٰلِهَتَكَ کہا، بعض نے کہا کہ وہ گائے وغیرہ کی مجسم تصویریں تھیں، بعض نے سورج اور ستاروں کا ارادہ کیا ہے بعض کے نزدیک خود فرعون نے اپنی تصویر کے مجسمے پرستش کے لیے تقسیم کر دیئے تھے کچھ سہی بہر حال بڑا معبود اپنے ہی کو کہلواتا تھا، اور عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِىْ (القصص:۳۸) کہہ کر خدا کے وجود کی نفی کرتا تھا، العیاذ باللہ۔

فائدہ: [3] وَاِنَّا فَوْقَهُمْ قٰهِرُوْنَ: موسیٰ (علیہ السلام) کی پیدائش سے پہلے بھی فرعون نے بنی اسرائیل پر ظلم کر رکھا تھا کہ لڑکوں کو قتل کر دیتا، اس خوف سے کہ کہیں یہ وہی اسرائیلی نہ ہو جس کے ہاتھ پر اس کی سلطنت کے زوال کی خبر منجمین نے دی تھی، اور لڑکیوں کو خدمت وغیرہ کے لیے زندہ رہنے دیتا، اب موسیٰ (علیہ السلام) کا اثر دیکھ کر اندیشہ ہوا کہ کہیں اس کی تربیت واعانت سے بنی اسرائیل زور نہ پکڑ جائیں اس لیے انہیں خوفزدہ اور عاجز کرنے کے لیے اپنے زور وقوت کے نشہ میں پھر اسی پرانی اسکیم پر عمل کرنے کی ٹھہرائی، بنی اسرائیل اس سفاکانہ تجویز کو سن کر طبعی طور پر پریشان اور دہشت زدہ ہوئے ہوں گے، اس کا علاج موسیٰ (علیہ السلام) نے آئندہ آیت میں بتلایا۔

قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا ۚ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ ۙ۬ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ

موسیٰ نے کہا اپنی قوم سے مدد مانگو اللہ سے اور صبر کرو ، بیشک زمین ہے اللہ کی اس کا وارث کر دے جس کو وہ چاہے

مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۲۸﴾

اپنے بندوں میں، اور آخر میں بھلائی ہے ڈرنے والوں کے لیے

خلاصہ تفسیر: اس مجلس کی گفتگو کی خبر جو بنی اسرائیل کو پہنچی تو بڑے گھبرائے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے چارہ جوئی کی تو: موسیٰ نے اپنی قوم سے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا سہارا رکھو اور مستقل رہو (گھبراؤ مت) یہ زمین اللہ کی ہے جس کو چاہیں مالک (اور حاکم) بنائیں اپنے بندوں میں سے (سو چند روز کے لئے فرعون کو دے دی ہے) اور اخیر کامیابی ان ہی کو ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں (سو تم ایمان وتقویٰ پر قائم رہو، ان شاء اللہ تعالیٰ یہ سلطنت تم ہی کو مل جائے گی، تھوڑے دنوں انتظار کی ضرورت ہے)۔

* * *

فائدہ: یعنی گھبرانے کی کوئی بات نہیں، اللہ کے سامنے کسی کا زور نہیں چلتا، ملک اسی کا ہے جس کو مناسب جانے عطا فرمائے، لہٰذا ظالم کے مقابلہ میں اسی سے مدد مانگو اسی پر نظر رکھو، اسی سے ڈرو، صبر وتقویٰ کی راہ اختیار کرو اور یقین رکھو، کہ آخری کامیابی صرف متقین کیلئے ہے۔

قَالُوْٓا اُوْذِيْنَا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِيَنَا وَمِنْۢ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا ؕ قَالَ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ

وہ بولے ہم پر تکلیفیں رہیں تیرے آنے سے پہلے اور تیرے آنے کے بعد [1] کہا نزدیک ہے کہ رب تمہارا ہلاک کر دے

عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِى الْاَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۹﴾ ع

تمہارے دشمن کو اور خلیفہ کر دے تم کو ملک میں پھر دیکھے تم کیسے کام کرتے ہو [2]

خلاصہ تفسیر: قوم کے لوگ (انتہائی حسرت وغم سے) کہنے لگے (اور اس حالت کا طبعی تقاضہ ہوتا ہے کہ بار بار ظالم کی شکایت کی جائے) کہ (حضرت!) ہم تو ہمیشہ مصیبت ہی میں رہے آپ کی تشریف آوری کے قبل بھی (کہ فرعون خدمت بیگار لیتا تھا اور مدتوں ہمارے لڑکوں کو قتل کرتا رہا) اور آپ کی تشریف آوری کے بعد بھی (کہ طرح طرح کی تکلیفیں پہنچائی جارہی ہیں یہاں تک کہ دوبارہ پھر قتل اولاد کی تجویز ٹھہری ہے) موسیٰ نے فرمایا (گھبراؤ مت) بہت جلد اللہ تعالیٰ تمہارے دشمن کو ہلاک کردیں گے اور بجائے ان کے تم کو اس زمین کا حاکم بنادیں گے پھر تمہارا طرز عمل دیکھیں گے (کہ تم شکر، قدر اور طاعت سے پیش آتے ہو یا بے قدری اور غفلت ومعصیت سے، اس میں اطاعت کی ترغیب ہے اور معصیت سے ڈرایا گیا ہے)۔

عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ: اس میں دلالت ہے کہ کفار کا مغلوب ہونا اور ایمان والوں کا غالب ہونا اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمتوں میں سے ہے، سو دنیا ترک کردینے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جان بوجھ کر کسی مجبوری کے بغیر کفار کے ہاتھوں ذلت وخواری میں پڑا رہے، ہاں! اگر طاقت کم ہو اور کفار پر غلبہ نہ پایا جاسکتا ہو تو کوشش اور تیاری میں لگے رہنا چاہیے، جب موقع ملے ان پر غالب آجائے۔

* * *

فائدہ: [1] یعنی ہم تو ہمیشہ مصیبت ہی میں رہے، تمہاری تشریف آوری سے قبل ہم سے ذلیل بیگار لی جاتی تھی، اور ہمارے لڑکے قتل کیے جاتے تھے، تمہارے آنے کے بعد طرح طرح کی سختیاں کی جارہی ہیں اور قتل ابناء کے مشورے ہورہے ہیں، دیکھئے کب ہماری مصیبتوں کا خاتمہ ہو۔

فائدہ: ۲ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تسلی دی کہ زیادہ مت گھبراؤ، خدا کی مدد قریب آ گئی ہے، تم دیکھ لو گے کہ تمہارا دشمن ہلاک کر دیا جائے گا اور تم کو ان کے اموال کا مالک بنا دیا جائے گا تا کہ جس طرح آج سختی وغلامی میں تمہارا امتحان ہو رہا ہے، اس وقت خوشحالی اور آزادی دے کر آزمایا جائے کہ کہاں تک اس کی نعمتوں کی قدر اور احسانات کی شکر گزاری کرتے ہو، حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ یہ کلام مسلمانوں کے سنانے کو نقل فرمایا، یہ سورت مکی ہے، اس وقت مسلمان بھی ایسے ہی مظلوم تھے ''گفتہ آید در حدیث دیگراں'' کے رنگ میں یہ بشارت ان کو پہنچائی۔

وَلَقَدْ اَخَذْنَاۤ اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِیْنَ وَنَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ یَذَّكَّرُوْنَ﴿۱۳۰﴾

اور ہم نے پکڑ لیا فرعون والوں کو قحطوں میں اور میووں کے نقصان میں تا کہ وہ نصیحت مانیں

خلاصہ تفسیر: اور (جب فرعون اور اس کے تابعین نے انکار ومخالفت پر کمر باندھی تو) ہم نے فرعون والوں کو (مع فرعون کے اللہ کی عادت کے مطابق ان بلیات میں) مبتلا کیا ① قحط سالی میں اور ② پھلوں کی کم پیداواری میں تا کہ وہ (حق بات کو) سمجھ جائیں (اور سمجھ کر قبول کرلیں)۔

فَاِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَیِّئَةٌ یَّطَّیَّرُوْا بِمُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗ ؕ

پھر جب پہنچی ان کو بھلائی کہنے لگے یہ ہے ہمارے لائق، اور اگر پہنچی برائی تو نحوست بتلاتے موسیٰ کی اور اس کے ساتھ والوں کی

اَلَاۤ اِنَّمَا طٰٓىِٕرُهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ﴿۱۳۱﴾

سن لو ان کی شومی تو اللہ کے پاس ہے پر اکثر لوگ نہیں جانتے ۱؎

خلاصہ تفسیر: سو (وہ پھر بھی نہ سمجھے، بلکہ یہ کیفیت تھی کہ) جب ان پر خوشحالی (یعنی ارزانی وپیداواری) آجاتی تو کہتے کہ یہ تو ہمارے لئے ہونا ہی چاہئے (یعنی ہم مبارک طالع ہیں یہ ہماری خوش بختی کا اثر ہے، یہ نہ ہوا کہ اس کو خدا کی نعمت سمجھ کر شکر بجالاتے اور اطاعت اختیار کرتے) اور اگر ان کو کوئی بدحالی (جیسے قحط وکم پیداواری مذکور) پیش آتی تو موسیٰ اور ان کے ساتھیوں کی نحوست بتلاتے (کہ یہ ان کی نحوست سے ہوا، یہ نہ ہوا کہ اس کو اپنے اعمال بدکفر وتکذیب کی شامت اور سزا سمجھ کر تائب ہوجاتے، حالانکہ یہ سب ان کی شامت اعمال تھی، جیسا کہ فرماتے ہیں کہ) یاد رکھو کہ ان کی (اس) نحوست (کا سبب) اللہ کے علم میں ہے (یعنی ان کے اعمال کفریہ تو اللہ کو معلوم ہیں، یہ نحوست انہی کے اعمال کی سزا ہے) لیکن (اپنی بےتمیزی سے) ان میں اکثر لوگ (اس کو) نہیں جانتے تھے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ گزشتہ آیت میں فرمایا تھا: ''قریب ہے کہ خدا تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے''، یہاں سے اسی ہلاک موعود کے بعض مبادی کی تفصیل شروع کی گئی ہے، یعنی اسی سنت اللہ کے موافق جس کا بیان اسی پارہ کے شروع میں آیت وَمَاۤ اَرْسَلْنَا فِیْ قَرْیَةٍ مِّنْ نَّبِیٍّ اِلَّاۤ اَخَذْنَاۤ اَهْلَهَا بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ یَضَّرَّعُوْنَ (الاعراف: ۹۴) کے تحت میں گزر چکا، خدا تعالیٰ نے فرعونیوں کو ابتدائی تنبیہ کے طور پر قحط، خشک سالی وغیرہ معمولی تکالیف اور سختیوں میں مبتلا کیا تا کہ وہ خواب غفلت سے چونکیں اور موسیٰ (علیہ السلام) کی پیغمبرانہ نصیحتوں کو قبول کرلیں، مگر وہ ایسے کاہے کو تھے، انہوں نے ان تنبیہات کی کچھ پروانہ کی بلکہ پہلے سے زیادہ ڈھیٹ اور گستاخ ہوگئے، چنانچہ ثُمَّ بَدَّلْنَا مَكَانَ السَّیِّئَةِ الْحَسَنَةَ (الاعراف: ۹۵) کے قاعدہ سے جب قحط وغیرہ دور ہو کر ارزانی اور خوشحالی حاصل ہوتی تو کہنے لگتے کہ دیکھو ہماری خوش طالعی اور اقبال مندی کے لائق تو یہ حالات ہیں پھر اگر درمیان میں کبھی کسی ناخوشگوار اور بری حالت سے دوچار ہونا پڑ جاتا تو کہتے کہ یہ سب (معاذ اللہ) موسیٰ اور اس کے رفقاء کی شومی تقدیر اور

نحوست ہے، حق تعالیٰ نے اسی کا جواب دیا: اَلَاۤ اِنَّمَا طٰٓئِرُهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ الخ یعنی اپنی بدبختی اور نحوست کو مقبول بندوں کی طرف کیوں نسبت کرتے ہو، تمہاری اس نحوست کا واقعی سبب تو خدا کے علم میں ہے، اور وہ تمہارا ظلم وعدوان اور بغاوت وشرارت ہے، اسی سبب کی بناء پر خدا کے یہاں سے کچھ حصہ نحوست کا وقتی سزا اور تنبیہ کے طور پر تم کو پہنچ رہا ہے، باقی رہی تمہارے ظلم وکفر کی اصلی شومیٔ ونحوست یعنی پوری پوری سزا تو وہ ابھی اللہ کے پاس محفوظ ہے جو دنیا میں یا آخرت میں اپنے وقت پر تم کو پہنچ کر رہے گی، جس کی ابھی اکثر لوگوں کو خبر نہیں۔

وَقَالُوْا مَهْمَا تَاْتِنَا بِهٖ مِنْ اٰيَةٍ لِّتَسْحَرَنَا بِهَا ۙ فَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳۲﴾

اور کہنے لگے جو کچھ تو لائے گا ہمارے پاس نشانی کہ ہم پر اسکی وجہ سے جادو کرے، سو ہم ہرگز تجھ پر ایمان نہ لائیں گے

خلاصہ تفسیر: اور (بلکہ اوپر سے) یوں کہتے (کہ خواہ) کیسی ہی عجیب بات ہمارے سامنے لاؤ کہ اس کے ذریعہ سے ہم پر جادو چلاؤ جب بھی ہم تمہاری بات ہرگز نہ مانیں گے۔

* * *

فائدہ: یہ موسیٰ علیہ السلام کے معجزات ونشانات دیکھ کر کہتے تھے کہ خواہ کیسا ہی جادو آپ ہم پر چلائیں اور اپنے خیال کے موافق کتنے ہی نشان دکھلائیں، ہم کسی طرح تمہاری بات ماننے والے نہیں، جب انہوں نے یہ آخری فیصلہ سنا دیا اور قبول حق کے سب دروازے اپنے اوپر بند کر لیے، تب خدا نے ان پر چند قسم کی عظیم الشان بلائیں یکے بعد دیگرے مسلط کر دیں، جن کی تفصیل اگلی آیت میں آتی ہے:

فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الطُّوْفَانَ وَالْجَرَادَ وَالْقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ وَالدَّمَ اٰيٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ ۣ

پھر ہم نے بھیجا ان پر طوفان [۱] اور ٹڈی اور چچڑی [۲] اور مینڈک اور خون بہت سی نشانیاں جدا جدا

فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ﴿۱۳۳﴾

پھر بھی تکبر کرتے رہے اور تھے وہ لوگ گناہ گار [۳]

خلاصہ تفسیر: (جب ایسی سرکشی اختیار کی تو) پھر ہم نے (قحط سالی اور کم پیداواری کے علاوہ یہ بلائیں مسلط کیں کہ) ③ ان پر (کثرت بارش کا) طوفان بھیجا (جس سے مال وجان تلف ہونے کا اندیشہ ہو گیا) اور (اس سے گھبرائے تو موسیٰ علیہ السلام سے عہد وپیمان کیا کہ ہم سے یہ بلا دور کرا دیجئے تو ہم ایمان لائیں اور جو آپ کہیں اطاعت کریں، پھر جب وہ بلا دور ہوئی اور غلہ وغیرہ خوب نکلا پھر بے فکر ہو گئے کہ اب تو جان بھی بچ گئی مال بھی خوب پیدا ہو گا اور بدستور اپنے کفر وسرکشی پر اڑے رہے تو ہم نے ان کے کھیتوں پر) ④ ٹڈیاں (مسلط کیں) اور (جب پھر کھیتوں کو تباہ ہوتے دیکھا تو گھبرا کر پھر ویسے ہی عہد وپیمان کئے، پھر جب آپ کی دعا سے وہ بلا دور ہوئی اور غلہ وغیرہ تیار کر کے اپنے گھر لے آئے پھر بے فکر ہو گئے کہ اب تو غلہ قابو میں آ گیا اور بدستور اپنے کفر ومخالفت پر جمے رہے تو ہم نے اس غلہ میں) ⑤ گھن کا کیڑا (پیدا کر دیا) اور (گھبرا کر پھر اسی طرح عہد وپیمان کر کے دعا کرائی، وہ بلا بھی دور ہوئی اور اس سے مطمئن ہو گئے کہ اب کوٹ پیس کر کھائیں پئیں گے، پھر وہی کفر اور وہی مخالفت، تو اس وقت ہم نے ان کے کھانے کو یوں بے لطف کر دیا کہ ان پر) ⑥ مینڈک (ہجوم کر کے ان کے کھانے کے برتنوں میں گرنا شروع ہوئے جس سے سب کھانا غارت ہو اور گھر میں بیٹھنا بھی مشکل کر دیا) اور (پینا یوں بے لطف کر دیا کہ ⑦ ان کا پانی) خون (ہو جاتا، منہ میں لیا اور خون بنا، غرض ان پر یہ بلائیں مسلط ہوئیں) کہ یہ سب (موسیٰ علیہ السلام کے) کھلے کھلے معجزے تھے (کہ ان کی تکذیب ومخالفت پر یہ بلائیں ظاہر ہوئی جو شمار میں سات ہیں، عصا اور ید بیضاء ملا کر "آیات تسعہ" یعنی نو معجزات کہلاتے ہیں) سو (چاہئے تھا کہ ان معجزات وآیات قہر کو دیکھ کر ڈھیلے پڑ جاتے مگر) وہ (پھر بھی) تکبر (ہی) کرتے

رہے اور وہ لوگ کچھ تھے ہی جرائم پیشہ (کہ اتنی سختی پر بھی باز نہ آتے تھے)۔

***

فائدہ: ۱؎ عَلَيْهِمُ الطُّوفَانَ: یعنی بارش اور سیلاب کا طوفان یا طاعون کی وجہ سے موت کا طوفان علیٰ اختلاف الاقوال۔

فائدہ: ۲؎ وَالْقُمَّلَ: قمل سے مراد ''چچڑیاں'' ہیں، جیسا کہ مترجم رحمۃ اللہ نے اختیار کیا، یا جوئیں یا گیہوں وغیرہ غلہ میں جو کیڑا لگ جاتا ہے جس سے غلہ خراب ہو جاتا ہے یعنی بدن اور کپڑوں میں چچڑیاں اور جوئیں پڑ گئیں، غلہ میں گھن لگ گیا۔

فائدہ: ۳؎ وَكَانُوا قَوْمًا مُّجْرِمِينَ: یعنی تھوڑے تھوڑے وقفہ کے ساتھ یہ سب آیات دکھلائی گئیں مگر وہ کچھ ایسے متکبرانہ، جرائم پیشہ اور پرانے گنہگار تھے کہ کسی طرح مان کر نہ دیا، سعید بن جبیرؒ سے منقول ہے کہ جب فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کے مطالبہ (بنی اسرائیل کی آزادی) کو تسلیم نہ کیا تو حق تعالیٰ نے بارش کا طوفان بھیجا، جس سے کھیتیوں وغیرہ کی تباہی کا اندیشہ پیدا ہو گیا، آخر گھبرا کر حضرت موسیٰ سے درخواست کی کہ تم اپنے خدا سے کہہ کر یہ بلائے طوفان دور کرا دو تو ہم بنی سرائیل کو آزادی دے کر تمہارے ساتھ روانہ کر دیں گے، موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے بارش بند ہو گئی اور بجائے نقصان کے پیداوار بہت کثرت سے ہوئی، فرعونی عذاب سے بے فکر ہو کر اپنے عہد پر قائم نہ رہے، تب اللہ تعالیٰ نے تیار کھیتیوں پر ٹڈی دل بھیج دیا جسے دیکھ کر پھر گھبرائے کہ یہ نئی آفت کہاں سے آ گئی، پھر موسیٰ علیہ السلام سے دعا کی درخواست کی اور پختہ وعدے کئے کہ اگر یہ عذاب ٹل گیا تو ہم ضرور بنی اسرائیل کو آزاد کر دیں گے، جب یہ عذاب بھی اٹھا لیا گیا تو پھر مطمئن ہو گئے اور سب وعدے فراموش کر دیئے، آخر جس وقت غلہ اٹھا کر مکانوں میں بھر لیا تو خدا کے حکم سے غلہ میں گھن لگ گیا، پھر موسیٰ سے دعا کرائی اور بڑے پکے عہد و پیمان کیے، لیکن جہاں وہ حالت ختم ہوئی بدستور سابق سرکشی اور بدعہدی کرنے لگے تو خدا نے ان کا کھانا پینا بے لطف کر دیا، مینڈک اس قدر کثرت سے پیدا کر دیئے گئے کہ ہر کھانے اور برتن میں مینڈک نظر آتا تھا، جب بولنے یا کھانے کے لیے منہ کھولتے مینڈک جست کر کے منہ میں پہنچتا تھا اور ویسے بھی اس جانور کی کثرت نے رہنا سہنا مشکل کر دیا، ادھر پینے کے لیے جو پانی لینا چاہتے تھے وہ خدا کے حکم سے برتنوں میں یا منہ میں پہنچ کر خون بن جاتا، غرض کھانے پینے تک سے عاجز ہو رہے تھے اس پر بھی شیخی اور اکڑفوں وہ ہی تھی۔

وَلَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ قَالُوا يٰمُوسَى ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ ۚ لَئِنْ كَشَفْتَ

اور جب پڑتا ان پر کوئی عذاب تو کہتے اے موسیٰ دعا کر ہمارے واسطے اپنے رب سے جیسا کہ اس نے بتلا رکھا ہے تجھ کو ۱؎ اگر تو نے دور کر دیا

عَنَّا الرِّجْزَ لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ وَلَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ بَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ ﴿۱۳۴﴾

ہم سے یہ عذاب تو بیشک ہم ایمان لے آئیں گے تجھ پر اور جانے دیں گے تیرے ساتھ بنی اسرائیل کو

خلاصہ تفسیر: اور جب ان پر کوئی عذاب (مذکورہ بلاؤں میں سے) واقع ہوتا تو یوں کہتے، اے موسیٰ! ہمارے لئے اپنے رب سے اس بات کی دعا کر دیجئے جس کا اس نے آپ سے عہد کر رکھا ہے (یعنی ہمارے باز آ جانے پر قہر کا دور کر دینا، سو ہم اب وعدہ کرتے ہیں کہ) اگر آپ اس عذاب کو ہم سے ہٹا دیں (یعنی دعا کر کے ہٹوا دیں) تو ہم ضرور ضرور آپ کے کہنے سے ایمان لے آئیں گے اور ہم بنی اسرائیل کو بھی رہا کر کے آپ کے ہمراہ کر دیں گے۔

***

فائدہ: ۱؎ یعنی اس نے دعاء کا جو موثر طریقہ تجھ کو بتلا رکھا ہے، اسی طرح دعاء کر دیجئے، یا بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ کا مطلب یہ ہے کہ ''نبی اللہ'' ہونے کی حیثیت سے دعاء فرما دیجئے، گویا عهد کا اطلاق نبوت پر ہوا، کیونکہ خدا اور نبی کے درمیان ایک طرح کا معاہدہ ہوتا ہے کہ خدا نبی کو خلعت اکرام واعانت سے سرفراز فرمائے گا اور نبی اس کی پیغام رسانی میں کوتاہی نہ کرے گا، اور ممکن ہے بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ سے وہ عہد مراد ہو جو بتوسط انبیاء علیہم السلام، اقوام سے کیا جاتا ہے کہ اگر تم کفر و تکذیب سے باز آ جاؤ گے تو عذاب الٰہی اٹھا لیا جائے گا واللہ اعلم۔

فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الرِّجْزَ إِلَىٰ أَجَلٍ هُم بَالِغُوهُ إِذَا هُمْ يَنكُثُونَ ﴿١٣٥﴾

پھر جب ہم نے اٹھالیا ان سے عذاب ایک مدت تک کہ ان کو اس مدت تک پہنچنا تھا اسی وقت عہد توڑ ڈالتے

خلاصہ تفسیر: پھر جب (موسیٰ علیہ السلام کی دعا کی برکت سے) ان سے اس عذاب کو ایک خاص وقت تک کہ ان کو پہنچنا تھا ہٹا دیتے تو وہ فوراً ہی عہد شکنی کرنے لگتے (جیسا اوپر بیان ہوا)۔

فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الرِّجْزَ إِلَىٰ أَجَلٍ: ''خاص وقت'' سے مراد دوسری بلا کے آنے سے پہلے کا وقت ہے کہ اس وقت تک وہ بلا ٹل جاتی، پھر دوسری بلا میں مبتلا ہو جاتے، پہلے پہل ان بلاؤں کو موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کی نحوست بتلاتے تھے، کیونکہ ان کو معمولی خیال کرتے تھے، جب بار بار متواتر سخت مصیبت میں پڑنے لگے تب آکر دعا اور عہد و پیمان کرتے کراتے۔

* * *

فائدہ: اس مدت سے یا تو موت اور غرق ہونے تک کی مدت مراد ہے، یا ممکن ہے ایک بلا کے بعد دوسری بلا کے آنے تک کا وقت مراد ہو۔

فَانتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَأَغْرَقْنَاهُمْ فِي الْيَمِّ بِأَنَّهُمْ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَكَانُوا عَنْهَا غَافِلِينَ ﴿١٣٦﴾

پھر ہم نے بدلہ لیا ان سے سو ڈبو دیا ہم نے ان کو دریا میں اس وجہ سے کہ انہوں نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو اور ان سے تغافل کرتے تھے

خلاصہ تفسیر: پھر (جب ہر ہر طرح دیکھ لیا کہ وہ اپنی شرارت سے باز ہی نہیں آتے تب اس وقت) ہم نے ان سے (پورا) بدلہ لیا یعنی ان کو دریا میں غرق کر دیا (جیسا دوسری جگہ ہے) اس سبب سے کہ وہ ہماری آیتوں کو جھٹلاتے تھے اور ان سے بالکل ہی بے توجہی کرتے تھے (اور تکذیب و غفلت بھی ایسی ویسی نہیں، بلکہ اصرار و عناد کے ساتھ کہ پہلے اطاعت کا وعدہ کر لیں اور پھر توڑ دیں)۔

فَأَغْرَقْنَاهُمْ فِي الْيَمِّ بِأَنَّهُمْ كَذَّبُوا: یعنی اللہ کے احکام کو جھٹلانے کی وجہ سے ان کو دریا میں غرق کر دیا، اس سے معلوم ہوا کہ بسا اوقات گناہوں کی وجہ سے دنیا میں بھی مصیبت اور سزا مرتب ہو جاتی ہے۔

* * *

فائدہ: ''رجز'' بعض مفسرین کے نزدیک طاعون مراد ہے جیسا کہ بعض احادیث میں یہ لفظ طاعون پر اطلاق کیا گیا ہے، لیکن اکثر مفسرین ان آیات کو پچھلی آیات ہی کا بیان قرار دیتے ہیں، موضح القرآن میں ہے کہ ''یہ سب بلائیں ان پر آئیں ایک ہفتہ کے فرق سے، اول حضرت موسیٰ فرعون کو کہہ آتے کہ اللہ تم پر یہ بلا بھیجے گا، وہ ہی بلا آتی، پھر مضطر ہوتے، حضرت موسیٰ کی خوشامد کرتے، ان کی دعاء سے دفع ہوتی، پھر منکر ہو جاتے، آخر کو وبا پڑی، نصف شب کو سارے شہر میں ہر شخص کا پہلا بیٹا مر گیا، وہ لگے مردوں کے غم میں، حضرت موسیٰ اپنی قوم کو لیکر شہر سے نکل گئے پھر کئی روز کے بعد فرعون پیچھے لگا، دریائے قلزم پر جا پکڑا، وہاں یہ قوم سلامت گزر گئی اور فرعون ساری فوج سمیت غرق ہوا''۔

وَأَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِينَ كَانُوا يُسْتَضْعَفُونَ مَشَارِقَ الْأَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا ۖ

اور وارث کر دیا ہم نے ان لوگوں کو جو کمزور سمجھے جاتے تھے اس زمین کے مشرق اور مغرب کا کہ جس میں برکت رکھی ہے ہم نے

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنَىٰ عَلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ بِمَا صَبَرُوا ۖ وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ

اور پورا ہو گیا نیکی کا وعدہ تیرے رب کا بنی اسرائیل پر بسبب ان کے صبر کرنے کے، اور خراب کر دیا ہم نے جو کچھ بنایا تھا فرعون

وَقَوْمُهٗ وَمَا كَانُوْا يَعْرِشُوْنَ ﴿۱۳۷﴾

اور اس کی قوم نے اور جو اونچا کر کے چھایا تھا۔

خلاصہ تفسیر: اور (فرعون اور اہل فرعون کو غرق کر کے) ہم نے ان لوگوں کو جو کہ بالکل کمزور شمار کیے جاتے تھے (یعنی بنی اسرائیل) اس سرزمین کے پورب پچھم (مشرق ومغرب یعنی تمام حدود) کا مالک بنا دیا جس میں ہم نے برکت رکھی ہے (کثرت پیداوار سے ظاہری برکت، اور انبیاء کا مدفن ومسکن اور دیگر فضائل کی وجہ سے باطنی برکت) اور آپ کے رب کا اچھا وعدہ بنی اسرائیل کے حق میں ان کے صبر کی وجہ سے پورا ہو گیا (جس کا حکم انہیں دیا گیا تھا اصبِرُوْا) اور ہم نے فرعون اور اس کی قوم کے ساختہ پرداختہ کارخانوں کو اور جو کچھ وہ اونچی اونچی عمارتیں بنواتے تھے سب کو درہم برہم کر دیا۔

وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ: اس میں اختلاف ہوا ہے کہ اس سرزمین سے مصر مراد ہے یا شام یا دونوں؟ بعض نے اس جگہ اور پیچھے آیت: ان الارض لله میں بھی مصر مراد لیا ہے، اور ایک آیت میں اور ثنا ھا بنی اسرائیل میں تصریح ہے کہ یہ بنی اسرائیل مصر کے مالک ہوئے۔

الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا: اگر یہاں مصر مراد لیا جائے تو اس کی ظاہری برکت تو ظاہر ہے اور باطنی برکت بھی بایں معنی ہو سکتی ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا جسد مبارک وہاں مدفون تھا، اور ایک عرصہ تک آپ مصر کی سرزمین میں برسر حکومت رونق افروز رہے، اور اگر یہاں شام مراد ہو تو اس کی برکت میں کلام کیا ہے، اس کی باطنی برکت تو کھلی ہوئی ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا مسکن ومدفن رہا ہے، بغوی نے اس جگہ اور اوپر کی آیت میں شام اور مصر دونوں کا مجموعہ مراد لیا ہے اور یہ قول بہتر معلوم ہوتا ہے، پھر وارث بنانا عام رہے گا، خواہ بطور سکونت کے جیسا کہ ملک شام میں ہوا، یا بطور ملکیت کے جیسا کہ مصر میں اگر فرعون کے غرق ہونے کے بعد بنی اسرائیل کا وہاں آنا یا نہ آنا ثابت ہو جائے۔

عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ بِمَا صَبَرُوْا: ایک شبہ یہاں یہ ہوتا ہے کہ اس جگہ بنی اسرائیل کے متعلق بما صبروا فرمایا ہے، یعنی ''آپ کے رب کا اچھا وعدہ بنی اسرائیل کے حق میں ان کے صبر کی وجہ سے پورا ہو گیا'' اس آیت سے تو بنی اسرائیل کا صابر ہونا معلوم ہوتا ہے، حالانکہ تھوڑا پیچھے آیت: قالوا اُوذینا سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو صبر کی تلقین فرمائی تو خفا ہوئے اور صبر سے کام نہیں لیا، اس کا ایک جواب تو اسی جگہ اشارۃً دیا جا چکا ہے کہ بنی اسرائیل کا وہ قول بطور شکایت نہیں بلکہ رنج وغم کا اظہار تھا جو صبر کے منافی نہیں، دوسری بات یہ کہ فرعون کی ایذاؤں اور تکلیف کے مقابلہ میں ان کا صبر اور ایمان پر ثابت قدم رہنا مسلسل ثابت ہے، اگر ایک دفعہ شکایت کا لفظ نکل بھی گیا تو اس پر نظر نہیں کی گئی۔

وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهٗ: ایک شبہ یہ ہوتا ہے کہ اس جگہ فرعون کے کارخانوں اور عمارت کا درہم برہم ہونا معلوم ہوتا ہے، اور سورہ شعراء کی آیت فاخرجناھم من جنات وعیون الخ سے معلوم ہوتا ہے کہ کارخانے اور عمارتیں صحیح وسالم بنی اسرائیل کے ہاتھ لگیں؟ اس کا جواب احقر کے نزدیک یہ ہے کہ قبضہ میں تو بعینہٖ آئے، لیکن چونکہ دوسری سلطنت عادۃً ہمیشہ پہلی سلطنت کے انتظامات کو تبدیل ومتغیر کر دیتی ہے اس لیے یہاں درہم برہم کرنا فرمایا۔

* * *

فائدہ: ۱۔ وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ: یعنی بنی اسرائیل کو۔

فائدہ: ۲۔ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا: اکثر مفسرین کے نزدیک اس زمین سے مراد ملک شام ہے جس میں حق تعالیٰ نے بہت سی ظاہری وباطنی برکات ودیعت کی ہیں، ظاہری تو یہی کہ نہایت سرسبز وشاداب، سیر حاصل، خوش منظر اور زرخیز ملک ہے اور باطنی اس لیے کہ بہت سے انبیاء علیہم السلام کا مسکن ومدفن بنایا گیا ہے، بنی اسرائیل مصر سے نکل کر ایک عرصہ تک صحرائے تیہ میں سرگرداں پھرتے رہے، جیسا کہ پہلے گزر چکا، بعدہٗ حضرت یوشع کے ساتھ ہو کر ''عمالقہ'' سے جہاد کیا، اور اپنے آبائی وطن ملک شام کے وارث بنے، بعض مفسرین نے اس زمین سے مصر مراد لیا ہے، یعنی فرعونیوں کو غرق کر کے ہم نے بنی اسرائیل کو مصر کی دولت کا وارث بنا دیا کہ آزادی کے ساتھ اس سے متمتع ہوں کما قال تعالیٰ: كَمْ تَرَكُوْا مِنْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ

وَّزُرُوْعٍ وَّمَقَامٍ كَرِيْمٍ وَّنَعْمَةٍ كَانُوْا فِيْهَا فٰكِهِيْنَ كَذٰلِكَ وَاَوْرَثْنٰهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ (الدخان:۲۵-۲۸) وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِى الْاَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً وَّنَجْعَلَهُمُ الْوٰرِثِيْنَ وَنُمَكِّنَ لَهُمْ فِى الْاَرْضِ وَنُرِىَ فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَحْذَرُوْنَ (القصص:۶-۵) اس تقدیر پر مصر کی ظاہری برکات تو ظاہر ہیں، باطنی اس حیثیت سے ہوں گی کہ حضرت یوسف علیہ السلام وہیں مدفون ہوئے، حضرت یعقوب علیہ السلام وہاں تشریف لے گئے اور آخر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بچپن سے لے کر بڑی عمر تک طویل مدت اسی ملک میں گزاری، امام بغویؒ نے مفسرین کے دونوں قول جمع کر کے اس جگہ مصر و شام دونوں کا ارادہ کیا ہے، واللہ اعلم۔

فائدہ:۳ وَقَوْمُهٗ وَمَا كَانُوْا يَعْرِشُوْنَ: یعنی بنی اسرائیل نے جب فرعونیوں کے سخت تباہ کن شدائد پر صبر کیا، موسیٰ علیہ السلام کی ہدایت کے موافق خدا سے استعانت کی اور پیغمبر خدا کا ساتھ دیا خدا نے جو نیک وعدہ ان سے کیا تھا عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ (الاعراف :۱۲۹) وہ پورا کر دکھایا، فرعون اور اس کی قوم نے اپنے اپنے کبر و نخوت کے اظہار کے لیے جو ڈھونگ بنا رکھا تھا وہ سب تباہ و برباد ہو گیا، اور ان کی اونچی اونچی عمارتیں تہہ و بالا کر دی گئیں، سچ ہے: اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً (النمل:۳۴)

وَجٰوَزْنَا بِبَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْبَحْرَ فَاَتَوْا عَلٰى قَوْمٍ يَّعْكُفُوْنَ عَلٰٓى اَصْنَامٍ لَّهُمْ ۚ قَالُوْا يٰمُوْسَى

اور پار اتار دیا ہم نے بنی اسرائیل کو دریا سے تو پہنچے ایک قوم پر جو پوجنے میں لگ رہے تھے اپنے بتوں کے ۱؎ کہنے لگے اے موسیٰ

اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ ۭ قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ﴿۱۳۸﴾

بنا دے ہماری عبادت کے لیے بھی ایک بت جیسے ان کے بت ہیں، کہا تم لوگ تو جہل کرتے ہو ۲؎

خلاصہ تفسیر: اور (جس دریا میں فرعون کو غرق کیا گیا) ہم نے بنی اسرائیل کو (اس) دریا سے پار اتار دیا (جس کا قصہ سورۂ شعراء میں ہے) پھر (پار ہونے کے بعد) ان لوگوں کا ایک قوم پر گزر ہوا جو اپنے چند بتوں کو لگے بیٹھے تھے (یعنی ان کی پوجا پاٹ کر رہے تھے) کہنے لگے اے موسیٰ ہمارے لئے بھی ایک (مجسم) معبود ایسا ہی مقرر کر دیجئے جیسے ان کے یہ معبود ہیں، آپ نے فرمایا واقعی تم لوگوں میں بڑی جہالت ہے۔

اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ: دنیاوی عادات و اطوار میں بھی اہل باطل اور کفار کی مشابہت سے بچنا چاہیے، حدیث میں ہے کہ صحابہ کرام نے حضور ﷺ سے درخواست کی کہ ہمارے لیے بھی ایک ایسا درخت مقرر فرما دیجیے جس پر ہم ہتھیار لٹکایا کریں جس طرح کفار لٹکاتے ہیں، تو نبی ﷺ نے ناپسند کیا اور یہی آیت تلاوت فرمائی، حالانکہ یہ ایک دنیاوی کام تھا، اس میں نبی ﷺ نے کفار کے ساتھ تشبیہ پسند نہیں فرمائی تو دین اور عبادات کے اندر بدعات اور نئی نئی چیزیں پیدا کرنے کا تو کیا ہی پوچھنا۔

قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ: ان کی اس بیہودہ درخواست کی وجہ بغویؒ نے یہ لکھی ہے کہ ان کو توحید میں شک نہ ہوا تھا، بلکہ اپنے انتہائی جہل کی وجہ سے یہ سمجھے کہ اگر غائب معبود کی طرف متوجہ ہونے کے لیے اگر کسی شاہد و موجود کو ذریعہ بنایا جائے تو یہ ایمان و دیانت کے خلاف نہیں، بلکہ اس میں خدا کی تعظیم و تقرب زیادہ ہے، اور چونکہ یہ خیال بھی فی نفسہ نقلی و عقلی طور پر غلط ہے اس لیے اس کو ''جہل'' فرمایا گیا، پھر اس جہل کا انجام یہ ہوا کہ گوسالہ پرستی میں مبتلا ہو گئے۔

* * *

فائدہ:۱ بعض نے کہا کہ یہ قبیلہ لخم کے لوگ تھے اور بعض نے کنعانی عمالقہ کو اس کا مصداق قرار دیا ہے، کہتے ہیں کہ ان کے بت گائے کی شکل پر تھے، واللہ اعلم۔

فائدہ:۲ یعنی حق تعالیٰ کی عظمت و شان اور تنزیہ و تقدیس سے تم بالکل جاہل معلوم ہوتے ہو، واقعہ بنی اسرائیل کا میلان بار بار اس طرح کے افعال و رسوم شرکیہ کی طرف ہوتا تھا، یہ بیہودہ جاہلانہ درخواست بھی مصر کی آب و ہوا اور وہاں کے بت پرستوں کی صحبت کے تاثرات کو ظاہر کرتی ہے،

حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ: ''جاہل آدمی نرے بے صورت معبود کی عبادت سے تسکین نہیں پاتا جب تک سامنے ایک صورت نہ ہو، وہ قوم دیکھی کہ گائے کی صورت پوجتی تھی ان کو بھی یہ ہوس آئی آخر سونے کا بچھڑا بنایا اور پوجا''۔

اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِيْهِ وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳۹﴾

یہ لوگ تباہ ہونے والی ہے وہ چیز جس میں وہ لگے ہوئے ہیں، اور غلط ہے جو وہ کر رہے ہیں

خلاصہ تفسیر: یہ لوگ جس کام میں لگے ہیں (یہ اللہ کی طرف سے بھی) تباہ کیا جائے گا (جیسا کہ عادۃ اللہ ہمیشہ سے جاری ہے کہ حق کو باطل پر غالب کر کے اس کو درہم برہم کر دیتے ہیں) اور ان کا یہ کام محض بے بنیاد ہے (کیونکہ طریقہ شرک کا باطل ہونا یقینی اور بدیہی ہے)۔

***

فائدہ: یعنی ان کا بت پرستی کا مذہب میرے اور اہل حق کے ہاتھوں سے آئندہ تباہ ہونے والا ہے اور جو کچھ سوانگ یہ اب تک بناتے رہے ہیں وہ محض باطل، غلط، بیکار اور بے حقیقت ہے۔

قَالَ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْكُمْ اِلٰهًا وَّهُوَ فَضَّلَكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۴۰﴾

کہا کیا اللہ کے سوا ڈھونڈوں تمہارے واسطے کوئی اور معبود حالانکہ اس نے تم کو بڑائی دی تمام جہان پر

خلاصہ تفسیر: (اور) فرمایا کیا اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کو تمہارا معبود بنا دوں حالانکہ (دلائل توحید کے علاوہ وہ تمہارا محسن و منعم بھی ہے کہ) اس نے تم کو (بعض نعمتوں میں) تمام دنیا جہاں والوں پر فوقیت دی ہے۔

***

فائدہ: یعنی خدا کے انعامات عظیمہ کی شکر گزاری اور حق شناسی کیا یہی ہو سکتی ہے کہ غیر اللہ کی پرستش کر کے اللہ سے بغاوت کی جائے، پھر بڑی شرم کا مقام ہے کہ جس مخلوق کو خدا نے سارے جہان پر فضیلت دی وہ اپنے ہاتھ سے بنائی ہوئی مورتیوں کے سامنے سربسجود ہو جائے؟ کیا مفضول افضل کا معبود بن سکتا ہے؟

وَاِذْ اَنْجَيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ ۚ يُقَتِّلُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ

اور وہ وقت یاد کرو جب نجات دی ہم نے تم کو فرعون والوں سے کہ دیتے تھے تم کو برا عذاب، کہ مار ڈالتے تھے تمہارے بیٹوں کو اور جیتا رکھتے تھے

نِسَآءَكُمْ ۭ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ﴿۱۴۱﴾ ع ۱۶

تمہاری عورتوں کو، اور اس میں احسان ہے تمہارے رب کا بڑا

خلاصہ تفسیر: اور (اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے قول کی تائید کے لیے ارشاد فرمایا کہ) وہ وقت یاد کرو جب ہم نے تم کو فرعون والوں (کے ظلم وایذاء) سے بچا لیا جو تم کو بڑی سخت تکلیفیں پہنچاتے تھے کہ تمہارے بیٹوں کو بکثرت قتل کر ڈالتے تھے اور تمہاری عورتوں کو (اپنی بیگار اور خدمت کے لیے) زندہ چھوڑ دیتے تھے، اور اس (واقعہ) میں تمہارے پروردگار کی طرف سے بڑی بھاری آزمائش تھی (اور بھی بہت سے احسان ہیں، لیکن اگر یہی ایک یاد رکھو تو احسان ماننے کو بہت ہے، تم نے کیا اچھا احسان مانا کہ شرک پر آمادہ ہو گئے)۔

ایسی ہی ایک آیت پہلا پارہ سورہ بقرہ آیت ۴۹: وَاِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ میں گزر چکی ہے کچھ تفصیل وہاں ملاحظہ فرمایے۔

***

فائدہ: اس کی تفسیر پارہ الم کے ربع کے بعد ملاحظہ کی جائے، یہ مضمون وہاں گزر چکا ہے، یعنی جس خدا نے ابھی ابھی تم پر ایسا عظیم الشان

احسان فرمایا، کیا اسے چھوڑ کر لکڑیوں اور پتھروں کے سامنے جھکتے ہو؟

وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّاَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِيْقَاتُ رَبِّهٖٓ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ۚ وَقَالَ مُوْسٰى

اور وعدہ کیا ہم نے موسیٰ سے تیس رات کا اور پورا کیا ان کو اور دس سے پس پوری ہوگئی مدت تیرے رب کی چالیس راتیں [1] اور کہا موسیٰ نے

لِاَخِيْهِ هٰرُوْنَ اخْلُفْنِيْ فِيْ قَوْمِيْ وَاَصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ سَبِيْلَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۱۴۲﴾

اپنے بھائی ہارون سے کہ میرا خلیفہ رہ میری قوم میں اور اصلاح کرتے رہنا اور مت چلنا مفسدوں کی راہ [2]

خلاصہ تفسیر: جب بنی اسرائیل سب پریشانیوں سے مطمئن ہو گئے تو موسیٰ علیہ السلام سے درخواست کی کہ اب ہمیں کوئی شریعت ملے تو اس پر اطمینان کے ساتھ عمل کریں، موسیٰ علیہ السلام نے حق تعالیٰ سے درخواست کی، حق تعالیٰ اس کا قصہ اس طرح بیان فرماتے ہیں کہ:

اور ہم نے موسیٰ سے تیس راتوں کا وعدہ کیا (کہ طور پر آکر اعتکاف کریں تو آپ کو شریعت اور کتاب تورات دی جائے گی) اور دس راتیں مزید ان تیس راتوں کا تتمہ بنا دیا (یعنی تورات دے کر ان میں دس راتیں عبادت کے لئے اور بڑھا دیں) اس طرح ان کے پروردگار کا (مقرر کیا ہوا) وقت (سب مل کر) پوری چالیس راتیں ہو گیا اور موسیٰ (علیہ السلام کوہ طور آنے لگے تو چلتے وقت) اپنے بھائی ہارون سے کہہ دیا تھا کہ میرے بعد ان لوگوں کا انتظام رکھنا اور اصلاح کرتے رہنا اور بدنظم لوگوں کی رائے پر عمل نہ کرنا۔

وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّاَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ: جب اللہ تعالیٰ کو منظور ہی یہ تھا کہ اعتکاف چالیس راتوں کا کرایا جائے تو پہلے تیس اور بعد میں دس کا اضافہ کر کے چالیس کرنے میں کیا حکمت تھی؟ پہلے ہی چالیس راتوں کے اعتکاف کا حکم دے دیا جاتا تو کیا حرج تھا؟ سو اللہ تعالیٰ کی حکمتوں کا احاطہ تو کون کر سکتا ہے، بعض حکمتیں علماء نے بیان کی ہیں، اس میں ایک حکمت تدریج اور آہستگی کی ہے کہ کوئی کام کسی کے ذمہ لگایا جائے تو اول ہی زیادہ مقدار کام کی اس پر نہ ڈالی جائے تا کہ وہ آسانی سے برداشت کرے، پھر مزید کام دیا جائے۔

ایک حکمت یہ ہے کہ اس طرز میں حکام اور اولوالامر کو اس کی تعلیم دینا ہے کہ اگر کسی کو کوئی کام ایک معین وقت میں پورا کرنے کا حکم دیا جائے اور اس معین میعاد میں وہ پورا نہ کر سکے تو اس کو مزید مہلت دی جائے، جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ میں پیش آیا کہ تیس راتیں پوری کرنے کے بعد جس کیفیت کا حاصل ہونا مطلوب تھا وہ پوری نہ ہوئی، اس لئے مزید دس راتوں کا اضافہ کیا گیا، کیونکہ ان دس راتوں کے اضافہ کا جو واقعہ مفسرین نے ذکر کیا ہے وہ یہ ہے کہ تیس راتوں کے اعتکاف میں موسیٰ علیہ السلام نے حسب قاعدہ تیس روزے بھی مسلسل رکھے بیچ میں افطار نہیں کیا، تیسواں روزہ پورا کرنے کے بعد افطار کر کے مقررہ مقام طور پر حاضر ہوئے تو حق تعالیٰ کی طرف سے ارشاد ہوا کہ روزہ دار کے منہ سے جو ایک خاص قسم کی رائحہ معدہ کی تبخیر سے پیدا ہوجاتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کو پسند ہے، آپ نے افطار کے بعد مسواک کر کے اس رائحہ کو زائل کر دیا، اس لئے مزید دس روزے اور رکھیے تا کہ وہ رائحہ پھر پیدا ہو جائے۔

اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً: اس آیت کے اشارہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ چالیس راتوں کو باطنی حالات کی اصلاح میں کوئی خاص دخل ہے، جیسا کہ ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ جو شخص چالیس روز اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے قلب سے حکمت کے چشمے جاری فرما دیتے ہیں۔

وَقَالَ مُوْسٰى لِاَخِيْهِ هٰرُوْنَ اخْلُفْنِيْ فِيْ قَوْمِيْ: موسیٰ علیہ السلام نے ہارون علیہ السلام سے جو یہ بات فرمائی کہ میرے بعد تم میرے جانشین ہو، اس سے نبوت میں خلیفہ کرنا مراد نہ تھا، بلکہ ہارون علیہ السلام تو خود نبی تھے، لیکن وہ حاکم اور سلطان نہ تھے، اس وقت اس خاص صفت میں خلیفہ بنانا منظور تھا کہ میرے بعد حکومت و انتظام کا کام بھی تمہارے سپرد ہے۔

* * *

فائدہ: ۱۔ فَتَمَّ مِيقَاتُ رَبِّهٖٓ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً: جب بنی اسرائیل کو طرح طرح کی پریشانیوں سے اطمینان نصیب ہوا تو انہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے درخواست کی کہ اب ہمارے لیے کوئی آسمانی شریعت لایئے جس پر ہم دلجمعی کے ساتھ عمل کر کے دکھلائیں، موسیٰ علیہ السلام نے ان کا معروضہ بارگاہ الٰہی میں پیش کر دیا، خدا تعالیٰ نے ان سے کم از کم تین دن اور زائد از زائد چالیس دن کا وعدہ فرمایا کہ جب اتنی مدت تم پے بہ پے روزے رکھو گے اور کوہ طور پر معتکف رہو گے تو تم کو تورات شریف عنایت کی جائے گی، دو مدتیں (کم اور زیادہ) ٹھہرانے کا شاید یہ مطلب تھا کہ اگر اثنائے ریاضت میں وظائف عبودیت اور آداب تقرب ادا کرنے کے اعتبار سے کسی قسم کی کوتاہی اور تقصیر ظاہر نہ کی تو اقل مدت تیس دن کافی ہوں گے ورنہ اکثر الاجلین چالیس روزے پورے کرنے پڑیں گے، یا شروع سے تیس دن ضروری و لازمی میعاد کے طور پر ہوں اور چالیس دن پورے کرنا اختیاری و استحبابی حیثیت سے اصل میعاد کی تکمیل و تتمیم کے طور پر رکھے گئے ہوں، جیسے شعیب علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام کو اپنی بیٹی دیتے وقت فرمایا تھا: عَلٰٓى اَنْ تَاْجُرَنِيْ ثَمٰنِيَ حِجَجٍ ۚ فَاِنْ اَتْمَمْتَ عَشْرًا فَمِنْ عِنْدِكَ ۚ وَمَآ اُرِيْدُ اَنْ اَشُقَّ عَلَيْكَ (القصص: ۲۷) اور ہمارے زمانہ کے بعض مصنفین نے کہا ہے کہ اصل میعاد چالیس ہی دن کی تھی جیسا کہ سورۃ بقرہ میں مذکور ہے اور یہاں بھی فَتَمَّ مِيقَاتُ رَبِّهٖٓ میں اشارہ کیا گیا ہے، یہ اس چالیس دن کے بیان کا ایک پیرایہ ہے کہ ہم نے تیس دن کا وعدہ کیا تھا جن کا تتمہ دس دن اور تھے، تاکہ اشارہ ہو جائے کہ ایک مہینہ سالم (ذیقعدہ) پورا کر کے دوسرے مہینہ (ذی الحجہ) میں سے دس دن اور بڑھائے گئے، اس طرح یکم ذی القعدہ سے شروع ہو کر ۱۰ ذی الحجہ کو چلہ پورا ہوا جیسا کہ اکثر سلف سے منقول ہے، واللہ اعلم، موضح القرآن میں ہے کہ: ''حق تعالیٰ نے وعدہ دیا حضرت موسیٰ کو کہ پہاڑ پر تیس رات خلوت کرو کہ تمہاری قوم کو تورات دوں، اس مدت میں انہوں نے ایک دن مسواک کی، فرشتوں کو ان کے منہ کی بو سے خوشی تھی وہ جاتی رہی اس کے بدلے دس رات اور بڑھا کر مدت پوری کی''۔

فائدہ: ۲۔ وَلَا تَتَّبِعْ سَبِيْلَ الْمُفْسِدِيْنَ: یعنی میری غیبت میں میرے حصہ کا کام بھی تم ہی کرو، گویا حکومت و ریاست کے جو اختیارات موسیٰ (علیہ السلام) کے ساتھ مخصوص تھے، وہ ہارون علیہ السلام کو تفویض کر دیئے گئے اور چونکہ بنی اسرائیل کی تلون مزاجی اور سست اعتقادی کا پورا تجربہ رکھتے تھے، اس لیے بڑی تصریح و تاکید سے ہارون علیہ السلام کو متنبہ کر دیا کہ اگر میرے پیچھے یہ لوگ کچھ گڑبڑ مچائیں تو تم اصلاح کرنا اور میرے طریق کار پر کاربند رہنا، مفسدہ پردازوں کی راہ پر مت چلنا، خدا کی مشیت کہ موسیٰ علیہ السلام یہ وصیت کر کے ادھر گئے، ادھر بنی اسرائیل نے گوسالہ پرستی شروع کر دی مگر حضرت ہارون نے موجودہ بائبل نویسوں کے علی الرغم يٰقَوْمِ اِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهٖ ۚ وَاِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمٰنُ فَاتَّبِعُوْنِيْ وَاَطِيْعُوْٓا اَمْرِيْ (طٰہٰ: ۹۰) کہہ کر ان کی گمراہی اور اپنی بیزاری کا صاف صاف اعلان کر دیا، اور وصیت موسوی کے موافق اصلاح حال کی امکانی کوشش کی۔

وَلَمَّا جَآءَ مُوْسٰى لِمِيْقَاتِنَا وَكَلَّمَهٗ رَبُّهٗ ۙ قَالَ رَبِّ اَرِنِيْٓ اَنْظُرْ اِلَيْكَ ۭ

اور جب پہنچا موسیٰ ہمارے وعدہ پر اور کلام کیا اس سے اسکے رب نے، بولا اے میرے رب تو مجھ کو دکھا کہ میں تجھ کو دیکھوں ۱

قَالَ لَنْ تَرٰىنِيْ وَلٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِيْ ۚ فَلَمَّا تَجَلّٰى

فرمایا تو مجھ کو ہرگز نہ دیکھے گا ۲ لیکن تو دیکھتا رہ پہاڑ کی طرف اگر وہ اپنی جگہ ٹھہرا رہا تو تو مجھ کو دیکھ لے گا ۳ پھر جب تجلی کی

رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا ۚ فَلَمَّآ اَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَكَ

اسکے رب نے پہاڑ کی طرف کر دیا اسکو ڈھا کر برابر اور گر پڑا موسیٰ بیہوش ہو کر ۴ پھر جب ہوش میں آیا بولا تیری ذات پاک ہے

تُبْتُ اِلَيْكَ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۴۳﴾

میں نے توبہ کی تیری طرف اور میں سب سے پہلے یقین لایا ۵

خلاصہ تفسیر: اور جب موسیٰ (علیہ السلام اس واقعہ میں) ہمارے وقت (موعود) پر آئے (تھے جس کا قصہ بیان ہو رہا ہے) اور ان کے رب نے ان سے (بہت سی لطف وعنایت کی) باتیں کیں تو (خوشی اور محبت کی شدت سے دیدار کا اشتیاق پیدا ہوا) عرض کیا کہ اے میرے پروردگار! اپنا دیدار مجھ کو دکھلا دیجئے کہ میں آپ کو ایک نظر دیکھ لوں، ارشاد ہوا کہ تم مجھ کو (دنیا میں) ہرگز نہیں دیکھ سکتے (کیونکہ یہ آنکھیں تاب جمال نہیں لا سکتیں) لیکن (تمہاری تشفی کے لئے یہ تجویز کرتے ہیں کہ) تم اس پہاڑ کی طرف دیکھتے رہو (ہم اس پر ایک جھلک ڈالتے ہیں) سو اگر یہ اپنی جگہ برقرار رہا تو (خیر) تم بھی دیکھ سکو گے (غرض موسیٰ علیہ السلام اس کی طرف دیکھنے لگے) پس ان کے رب نے جو اس پر تجلی فرمائی تو تجلی نے اس (پہاڑ) کے پرخچے اڑا دیئے اور موسیٰ بیہوش ہو کر گر پڑے، پھر جب افاقہ میں آئے تو عرض کیا بیشک آپ کی ذات (ان آنکھوں کی برداشت سے) منزہ (اور بلند) ہے میں آپ کی جناب میں (اس مشتاقانہ درخواست سے) معذرت کرتا ہوں اور (جو کچھ حضور کا ارشاد ہے: لن ترانی کہ تم مجھے نہیں دیکھ سکتے) سب سے پہلے میں اس پر یقین کرتا ہوں۔

رَبِّ اَرِنِیۡۤ اَنۡظُرۡ اِلَیۡکَ قَالَ لَنۡ تَرٰىنِیۡ: موسی علیہ السلام کی درخواست میں اور اللہ کی طرف سے جواب میں اشارہ ہے کہ رؤیت ناممکن تو نہیں، مگر مخاطب موجودہ حالت میں اس کو برداشت نہیں کر سکتا، ورنہ اگر رؤیت ممکن ہی نہ ہوتی تو لَنۡ تَرٰىنِیۡ کے بجائے لَنۡ اُرٰی کہا جاتا کہ میری رؤیت نہیں ہو سکتی، اس سے ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا دیدار دنیا میں بھی عقلاً ممکن تو ہے مگر اس آیت سے اس کا واقع ہونا ممتنع بھی ثابت ہوگا اور جمہور اہل سنت کا یہی مذہب ہے کہ دنیا میں اللہ تعالیٰ کی رؤیت عقلاً ممکن ہے مگر شرعاً ممتنع، جیسا کہ صحیح مسلم کی حدیث میں ہے: "لن یری احد منکم ربہ حتی یموت"، یعنی تم میں سے کوئی شخص مرنے سے پہلے اپنے رب کو نہیں دیکھ سکتا۔

یہاں موسی علیہ السلام کے ساتھ جو حق تعالیٰ نے کلام فرمایا اس کی حقیقت اللہ ہی کو معلوم ہے، البتہ قرآن مجید کے الفاظ سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ اس کلام کو بہ نسبت اس کلام کے جو کہ عطائے نبوت کے وقت موسی علیہ السلام سے ہوا تھا کچھ زیادہ خصوصیت حق تعالیٰ کے ساتھ ہے، کیونکہ یہاں کلمہ ربہ فرمایا ہے کہ ان سے خدا نے کلام کیا، جبکہ وہاں یہ فرمایا تھا کہ مبارک جگہ میں درخت سے ان کو ندا ہوئی، اور غالباً یہاں اسی زیادہ خصوصیت ہی کی وجہ سے یہ کلام دیدار کے اشتیاق کا سبب بن گیا جو نہیں ہوا، واللہ اعلم۔

لَنۡ تَرٰىنِیۡ: یعنی تم مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکتے، حدیث میں ہے: "لا حرقت سبحات وجھہ ما انتھی الیہ بصرہ" کہ اگر اللہ تعالیٰ دنیا میں تجلی فرمائیں تو انوار وجہ سے جہاں تک ان کی نظر پہنچتی ہے سب جل جائیں اور ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ کی نظر تمام عالم کو محیط ہے تو سب دنیا جل جائے، باقی عالم آخرت چونکہ دنیا سے زیادہ اس میں قوت ہے اس لیے وہ نہیں جلے گا، نیز یہ نص ہے اس میں کہ دنیا میں رؤیت الٰہیہ نہیں ہوتی، جو شخص اس کا مدعی ہے یا دھوکہ میں ہے یا دھوکہ دیتا ہے البتہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا شب معراج میں دیکھنا اس سے مستثنیٰ ہے۔

فَلَمَّا تَجَلّٰی رَبُّهٗ لِلۡجَبَلِ: پہاڑ پر تجلی ہونے کے معنی واللہ اعلم یہ سمجھ میں آتے ہیں کہ حق تعالیٰ شانہ کا خاص نور بارادہ الٰہی خلائق سے محجوب ہے، اور جن واسطوں سے محجوب ہے وہ حجابات اور موانع ہیں، ان کی تعیین اللہ کو معلوم ہے، پس غالباً ان حجابات میں سے بعض حجات اٹھا دیے گئے ہوں، اور چونکہ تھوڑے سے حجاب سے اٹھائے تھے اس لیے ترمذی کی مرفوع حدیث میں مثال کے طور پر ان کی قلت کو چھوٹی انگلی کے پور سے تشبیہ دی گئی، ورنہ صفات الٰہیہ مقدار واجزاء سے پاک ہیں، اور چونکہ خدا تعالیٰ کے افعال اختیاری ہیں اس لیے ممکن ہے کہ وہ حجاب پہاڑ کے اعتبار سے اٹھ گئے ہوں لیکن موسی علیہ السلام اور دیگر مخلوق کے واسطے نہ اٹھے ہوں۔

تجلی کے واقع ہو جانے سے دیدار ہونے کا شبہ نہ کیا جائے، کیونکہ تجلی سے دیدار کا ہونا لازم نہیں آتا؛ "تجلی" کے معنی عربی لغت میں ظاہر اور منکشف ہونے کے ہیں، اگرچہ دوسرے کو اس کا ادراک نہ ہو، جیسا کہ سورج روز ظاہر ہوتا ہے مگر آشوب چشم والا اس کو نہیں دیکھ سکتا، صوفیہ کرام کے نزدیک تجلی کے معنی کسی چیز کو بالواسطہ دیکھنے کے ہیں، جیسے کوئی چیز بواسطہ آئینہ کے دیکھی جائے، اسی لئے تجلی کو رؤیت نہیں کہہ سکتے، خود اسی آیت میں اس کی شہادت موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رؤیت کی تو نفی فرمائی اور تجلی کا اثبات فرمایا۔

وَخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا: موسیٰ علیہ السلام کی بے ہوشی اس وجہ سے نہ تھی کہ خود ان پر تجلی ہوئی، کیونکہ بظاہر لِلْجَبَلِ سے معلوم ہوتا ہے کہ تجلی الٰہی خاص پہاڑ کے حق میں ہوئی، چنانچہ پہاڑ کی یہ حالت دیکھ کر اور تجلی کی جگہ کے ساتھ اتصال اور تعلق ہونے کی وجہ سے یہ بے ہوشی ہوئی۔

* * *

فائدہ: ۱۔ رَبِّ اَرِنِیْۤ اَنْظُرْ اِلَیْكَ: چالیس دن کی معیاد پوری ہو چکنے پر حق تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو کسی مخصوص وممتاز رنگ میں شرف مکالمہ بخشا، اس وقت حضرت موسیٰ کو بلا واسطہ کلام الٰہی سننے کی لذت بے پایاں حاصل ہوئی تو کمال اشتیاق سے متکلم کے دیدار کی آرزو کرنے لگے اور بے ساختہ درخواست کر دی: رَبِّ اَرِنِیْۤ اَنْظُرْ اِلَیْكَ اے پروردگار! میرے اور اپنے درمیان سے حجاب اور موانع اٹھا دیجئے اور وجہ انور بے حجاب سامنے کر دیجئے کہ ایک نظر دیکھ سکوں۔

فائدہ: ۲۔ قَالَ لَنْ تَرٰىنِیْ: یعنی دنیا میں کسی مخلوق کا یہ فانی وجود اور فانی قویٰ اس ذوالجلال والاکرام لم یزل ولا یزال کے دیدار کا تحمل نہیں کر سکتے، اس سے ثابت ہوا کہ دنیا میں کسی کو موت سے پہلے دیدار خداوندی کا شرف حاصل ہونا شرعاً ممتنع ہے گو عقلاً ممکن ہو کیونکہ اگر امکان عقلی بھی نہ مانا جائے تو موسیٰ علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر کی نسبت یہ خیال نہیں کیا جا سکتا کہ وہ ایک محال عقلی کی درخواست کرتے، اہل السنت والجماعت کا یہی مذہب ہے کہ رویت باری دنیا میں عقلاً ممکن، شرعاً ممتنع الوقوع ہے اور آخرت میں اس کا وقوع نصوص قطعیہ سے ثابت ہے، رہی رسول اللہ ﷺ کی رویت شب معراج میں، وہ اختلافی مسئلہ ہے جس کا ذکر ان شاء اللہ سورہ نجم میں آئے گا۔

فائدہ: ۳۔ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِیْ: یعنی تم پہاڑ کی طرف دیکھتے رہو، ہم اپنے جمال مبارک کی ایک ذرا سی جھلک اس پر ڈالتے ہیں، اگر پہاڑ جیسی سخت اور مضبوط چیز اس کو برداشت کر سکے تو ممکن ہے تم کو بھی اس کا تحمل کرا دیا جائے، ورنہ سمجھ لیجئے کہ جس چیز کا تحمل پہاڑ سے نہ ہو سکے، کسی انسان کی مادی ترکیب اور جسمانی آنکھیں اسے کیسے برداشت کر سکتی ہیں اگرچہ قلبی اور روحانی طاقت کے اعتبار سے زمین، آسمان، پہاڑ، سب چیزوں سے انسان فائق ہو، اور اسی لیے موسیٰ علیہ السلام جس وحی الٰہی کے حامل تھے، بلکہ دوسرے انسان بھی جس امانت عظیمہ کے حامل ہیں، پہاڑ وغیرہ اس کے اٹھانے پر قادر نہیں فَاَبَیْنَ اَنْ یَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ (احزاب: ۷۲) لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَیْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْیَةِ اللّٰهِ (الحشر: ۲۱) تاہم جس چیز کا تعلق ظاہری آنکھوں یا بدن کی مادی قوت سے ہو، اس میں انسان دوسری عظیم الخلقت چیزوں سے بہت کمزور ہوا ہے لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ (المومن: ۵۷) وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِیْفًا (نساء: ۲۸) اس جگہ موسیٰ علیہ السلام کو انسانی وجود کی اسی کمزوری کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔

فائدہ: ۴۔ وَخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا: حق تعالیٰ کی تجلیات بہت طرح کی ہیں اور یہ خدا کا ارادی فعل ہے کہ جس چیز پر جس طرح چاہے تجلی فرمائے، پہاڑ پر جو تجلی ہوئی اس نے معاً پہاڑ کے خاص حصہ کو ریزہ ریزہ کر ڈالا، اور موسیٰ علیہ السلام چونکہ محل تجلی سے قریب تھے، ان پر اس قرب محل اور پہاڑ کے ہیبت ناک منظر دیکھنے کا اثر ہوا کہ بیہوش ہو کر گر پڑے، بلا تشبیہ یوں سمجھ لیجئے کہ بجلی جس چیز پر گرتی ہے اسے جلا کر ایک آن میں کس طرح خاک سیاہ کر دیتی ہے اور جو لوگ اس مقام کے قریب ہوتے ہیں بسا اوقات انہیں بھی کم وبیش صدمہ پہنچ جاتا ہے۔

فائدہ: ۵۔ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِیْنَ: یعنی پاک ہے اس سے کہ کسی مخلوق کے مشابہ ہو اور یہ فانی آنکھیں اس کے دیدار کا تحمل کر سکیں، تیری پاکی اور برتری کا اقتضاء یہ ہے کہ کسی چیز کی طلب تیری اجازت کے بدون نہ کی جائے، میں توبہ کرتا ہوں کہ فرط اشتیاق میں بدون اجازت کے ایک نازیبا درخواست کر گزرا، میں اپنے زمانہ کے سب لوگوں سے پہلے تیری عظمت وجلال کا یقین رکھتا ہوں اور پہلا وہ شخص ہوں جسے ذوق وعیانی طریق پر منکشف ہوا کہ خداوند قدوس کی رویت دنیا میں ان ظاہری آنکھوں سے واقع نہیں ہو سکتی۔

قَالَ یٰمُوْسٰۤى اِنِّی اصْطَفَیْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِیْ وَبِكَلَامِیْ ۖ٘ فَخُذْ مَاۤ اٰتَیْتُكَ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِیْنَ ﴿۱۴۴﴾

فرمایا اے موسیٰ میں نے تجھ کو امتیاز دیا لوگوں سے اپنے پیغام بھیجنے کا اور اپنے کلام کرنے کا، سو لے جو میں نے تجھ کو دیا اور شاکر رہ

خلاصہ تفسیر: ارشاد ہوا کہ اے موسیٰ! (یہی بہت ہے کہ) میں نے (تم کو) اپنی (طرف سے) پیغمبری (کا عہدہ دے کر) اور اپنے (ساتھ) ہم کلامی (کا شرف بخش کر اس) سے اور لوگوں پر تم کو امتیاز دیا ہے تو (اب) جو کچھ تم کو میں نے عطا کیا ہے (رسالت وہم کلامی و توریت) اس کو لو اور شکر کرو۔

اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِيْ وَبِكَلَامِيْ: اتنی بات تو قرآن کے واضح الفاظ سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بلا واسطہ کلام فرمایا، پھر اس کلام میں بھی ایک تو وہ ہے جو اول عطاء نبوت کے وقت ہوا تھا، دوسرا کلام یہ ہے جو عطاء تورات کے وقت ہوا اور جس کا ذکر اس آیت میں ہے، آیت کے الفاظ سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اس دوسرے کلام کو بہ نسبت پہلے کے کچھ مزید خصوصیت حاصل تھی، لیکن حقیقت اس کلام کی کیا اور کس طرح تھی؟ اس کا علم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں ہوسکتا، اس میں جتنے احتمالات عقلیہ ایسے ہوں جو شریعت کے کسی حکم کے خلاف نہ ہوں سب کی گنجائش ضرور ہے مگر ان احتمالات میں کسی ایک کو متعین کرنا بلا دلیل درست نہیں، اور سلف صالحین صحابہ وتابعین ہی کا مسلک اس معاملہ میں اسلم ہے کہ اس معاملہ کو حوالہ خدا کیا جائے، احتمالات نکالنے کی فکر میں نہ پڑیں۔

* * *

فائدہ: یعنی دیدار نہ ہوسکا نہ سہی، یہ شرف وامتیاز کیا تھوڑا ہے کہ ہم نے تجھ کو پیغمبر بنایا اور تورات عطا کی اور بلا واسطہ کلام فرمایا، سو جس قدر بخشش ہماری طرف سے ہوئی اسے پلے باندھو اور ان بندوں میں شامل رہو جنہیں خدا نے شاکرین کے امتیازی لقب سے ملقب فرمایا ہے۔

وَكَتَبْنَا لَهٗ فِي الْاَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْعِظَةً وَّتَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ ۚ فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ

اور لکھ دی ہم نے اس کی تختیوں پر ہر قسم کی نصیحت اور تفصیل ہر چیز کی ۱؎ سو پکڑ لے ان کو زور سے

وَّاْمُرْ قَوْمَكَ يَاْخُذُوْا بِاَحْسَنِهَا ۭ سَاُورِيْكُمْ دَارَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۱۴۵﴾

اور حکم کر اپنی قوم کو کہ پکڑے رہیں اس کی بہتر باتیں عنقریب میں تم کو دکھلاؤں گا گھر نافرمانوں کا ۲؎

خلاصہ تفسیر: اور ہم نے چند تختیوں پر ہر قسم کی (ضروری) نصیحت اور (ضروری احکام کے متعلق) ہر چیز کی تفصیل ان کو لکھ کر دی (یہی تختیاں تورات ہیں، پھر حکم ہوا کہ جب کہ تختیاں ہم نے دی ہیں) تو ان کو کوشش کے ساتھ (خود بھی) عمل میں لاؤ اور اپنی قوم کو (بھی) حکم کرو کہ ان کے اچھے اچھے احکام پر (یعنی سب پر کہ سب ہی اچھے ہیں) عمل کریں میں، اب بہت جلد تم لوگوں کو (یعنی بنی اسرائیل کو) ان بے حکموں کا (یعنی فرعونیوں کا یا عمالقہ کا) مقام دکھلاتا ہوں (اس میں بشارت اور وعدہ ہے کہ مصر یا شام پر عنقریب تسلط ہوا چاہتا ہے، مقصود اس سے اطاعت کی ترغیب دینا ہے کہ احکام الہیہ کی اطاعت کے یہ برکات ہیں کہ دشمنوں کے ملک پر عنقریب تسلط ہو جائے گا)۔

اس مقام سے مراد یا مصر ہے یا شام، اور فاسقین یا فرعون کی قوم ہے یا عمالقہ جو شام پر مسلط تھے، اس احتمال کی وجہ یہ ہے کہ بنی اسرائیل کا مصر میں واپس آنا یا نہ آنا اس میں مختلف اقوال ہیں۔

* * *

فائدہ: ۱؎ بعض کہتے ہیں کہ تورات شریف ان تختیوں پر لکھی ہوئی تھی، اور بعض علماء کا خیال ہے کہ یہ تختیاں تورات کے علاوہ تھیں جو نزول تورات سے پہلے مرحمت ہوئیں، بہر حال دیدار نہ ہوسکنے سے جو شکستگی موسیٰ (علیہ السلام) کو ہوئی اس کی تلافی اور جبر مافات کے طور پر الواح عطا کی گئیں، جن میں ہر قسم کی نصیحتیں اور تمام ضروری احکام کی تفصیل تھی (ابن کثیر)

فائدہ: ۲؎ یعنی خود بھی ان الواح کو مضبوطی اور احتیاط سے پکڑے رہو کہیں ہاتھ سے چھوٹ نہ جائیں اور اپنی قوم کو سمجھاؤ کہ وہ ان الواح کی بہترین ہدایات پر پختگی سے عمل کرتے رہیں اور ایسی اچھی چیز کو ہاتھ سے نہ دیں۔

تنبیہ: لفظ احسنہا سے یا تو اس پر متنبہ فرمانا ہے کہ ان میں احسن کے سوا اور کچھ نہیں، یا یہ مطلب ہے کہ جو احکام دیئے گئے تھے یوں تو سب فی حد ذاتہ حسن ہیں، مگر بعض بعض سے ''احسن'' ہوتے ہیں مثلاً ظالم سے بدلہ لینا جائز اور ''حسن'' ہے، لیکن صبر کرنا اور معاف کردینا عزیمت اور ''احسن'' ہے، گویا بنی اسرائیل کو اس پر آمادہ کرنا تھا کہ عزائم ومندوبات کے اکتساب میں سعی کریں اور خدا کے کامل فرمانبردار بنیں، اگر نافرمانی کریں گے، تو انہیں نافرمانوں کا گھر دکھلا دیا جائے گا، یعنی آخرت میں دوزخ اور دنیا میں تباہی ورسوائی، اعاذنا اللہ منہما (ابن کثیر وبغوی) اور بعض نے نافرمانوں کے گھر سے شام یا مصر مراد لیا ہے، جو نافرمان عمالقہ یا فرعونیوں کا ملک تھا، اس صورت میں یہ آیت بنی اسرائیل کے لیے بشارت ہوگی کہ اگر پوری طرح فرمانبرداری کرو گے تو نافرمانوں کے ملک تم کو دے دیئے جائیں گے، والراجح ھوا لاول کمار جحہ ابن کثیر۔

سَاَصۡرِفُ عَنۡ اٰیٰتِیَ الَّذِیۡنَ یَتَکَبَّرُوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ بِغَیۡرِ الۡحَقِّ ؕ وَاِنۡ یَّرَوۡا کُلَّ اٰیَۃٍ لَّا یُؤۡمِنُوۡا

میں پھیر دونگا اپنی آیتوں سے ان کو جو تکبر کرتے ہیں زمین میں ناحق ،اور اگر دیکھ لیں ساری نشانیاں ایمان نہ لائیں

بِہَا ۚ وَاِنۡ یَّرَوۡا سَبِیۡلَ الرُّشۡدِ لَا یَتَّخِذُوۡہُ سَبِیۡلًا ۚ وَاِنۡ یَّرَوۡا سَبِیۡلَ الۡغَیِّ یَتَّخِذُوۡہُ

ان پر، اور اگر دیکھیں راستہ ہدایت کا تو نہ ٹھہرائیں اس کو راہ، اور اگر دیکھیں راستہ گمراہی کا تو اس کو ٹھہرا لیں

سَبِیۡلًا ؕ ذٰلِکَ بِاَنَّہُمۡ کَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَا وَکَانُوۡا عَنۡہَا غٰفِلِیۡنَ ﴿۱۴۶﴾

راہ، یہ اس لیے کہ انہوں نے جھوٹ جانا ہماری آیتوں کو اور رہے ان سے بے خبر

خلاصہ تفسیر: (اب اطاعت کی ترغیب کے بعد مخالفت پر ڈرانے کے لیے ارشاد ہے کہ:) میں لوگوں کو اپنے احکام سے برگشتہ (منحرف، سرکش) ہی رکھوں گا جو دنیا میں (احکام ماننے سے) تکبر کرتے ہیں جس کا ان کو کوئی حق حاصل نہیں (کیونکہ اپنے کو بڑا سمجھنا اس کا حق ہے جو واقع میں بڑا ہو، اور وہ ایک خدا کی ذات ہے) اور (انحراف اور سرکشی کا ان پر یہ اثر ہوگا کہ) اگر تمام (دنیا بھر کی) نشانیاں (بھی) دیکھ لیں تب بھی (انتہائی سخت دلی کی وجہ سے) ان پر ایمان نہ لائیں، اور اگر ہدایت کا راستہ دیکھیں تو اس کو اپنا طریقہ نہ بنائیں، اور اگر گمراہی کا راستہ دیکھ لیں تو اس کو اپنا طریقہ بنالیں (یعنی حق کے قبول نہ کرنے سے دل سخت ہوجاتا ہے اور سرکشی وانحراف اس حد تک پہنچ جاتی ہے) یہ (اس درجہ کی سرکشی اور انحراف) اس سبب سے ہے کہ انہوں نے ہماری آیتوں کو (تکبر کی وجہ سے) جھوٹا بتلایا اور ان (کی حقیقت میں غور کرنے) سے غافل رہے (یہ سزا تو دنیا میں ہوئی کہ ہدایت سے محروم رہے)۔

یَتَکَبَّرُوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ بِغَیۡرِ الۡحَقِّ: اس میں بِغَیۡرِ حَقِّ سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تکبر کرنے والے کے مقابلہ میں تکبر کرنا حق ہے وہ برا اور گناہ نہیں، کیونکہ یہ صرف صورت کے اعتبار سے تکبر ہوتا ہے حقیقت کے اعتبار سے نہیں ہوتا، جیسا کہ مشہور ہے: "التکبر مع المتکبرین تواضع"، جبکہ ناحق تکبر یہ ہے کہ غیر متکبر کے مقابلہ میں تکبر کرے۔

* * *

فائدہ: جو لوگ خدا اور پیغمبروں کے مقابلہ میں ناحق کا تکبر کرتے ہیں اور نخوت وغرور اجازت نہیں دیتا کہ احکام الٰہی کو قبول کریں، ہم بھی ان کے دل اپنی آیات کی طرف سے پھیر دیں گے کہ آئندہ ان سے منتفع ہونے کی توفیق نہ ہوگی، ایسے لوگوں کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ خواہ کتنے ہی نشانی دیکھیں اور کتنی ہی آیتیں سنیں ٹس سے مس نہ ہوں، ہدایت کی سڑک کیسی ہی صاف اور کشادہ ہو، اس پر نہ چلیں ہاں گمراہی کے راستہ پر نفسانی خواہشات کی پیروی میں دوڑے چلے جائیں، تکذیب کی عادت اور غفلت کی تمادی سے جب دل مسخ ہوجاتا ہے، اس وقت آدمی اس حالت کو پہنچتا ہے۔

وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَلِقَآءِ الْاٰخِرَةِ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ؕ هَلْ يُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴿۱۴۷﴾ ع

اور جنہوں نے جھوٹ جانا ہماری آیتوں کو اور آخرت کی ملاقات کو برباد ہوئیں ان کی محنتیں، وہی بدلہ پائیں گے جو کچھ عمل کرتے تھے

خلاصہ تفسیر: اور (آخرت میں یہ سزا ہوگی کہ) یہ لوگ جنہوں نے ہماری آیتوں کو اور قیامت کے پیش آنے کو جھٹلایا ان کے سب کام (جن سے ان کو نفع کی توقع تھی) غارت گئے (اور اس بربادی کا انجام جہنم ہے) ان کو وہی سزا دی جائے گی جو کچھ یہ کرتے تھے۔

* * *

فائدہ: یعنی احکام الٰہی پر چلنے کی توفیق نہ ہوگی، اور جو کچھ کام اپنی عقل سے کریں گے وہ خدا کے یہاں قبول نہ ہوگا، جیسا کریں گے ویسا بھگتیں گے، باقی ان کی بے جان اور مردہ نیکیوں کا جو بدلہ ملنا ہوگا دنیا میں مل رہے گا۔

وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوْسٰى مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ حُلِيِّهِمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ ؕ اَلَمْ يَرَوْا اَنَّهٗ

اور بنا لیا موسیٰ کی قوم نے اس کے پیچھے اپنے زیور سے بچھڑا [1] ایک بدن کہ اس میں گائے کی آواز تھی، کیا انہوں نے یہ نہ دیکھا کہ وہ

وقف لازم

لَا يُكَلِّمُهُمْ وَلَا يَهْدِيْهِمْ سَبِيْلًا ۘ اِتَّخَذُوْهُ وَكَانُوْا ظٰلِمِيْنَ﴿۱۴۸﴾

ان سے بات بھی نہیں کرتا اور نہیں بتلاتا راستہ، معبود بنا لیا اس کو اور وہ تھے ظالم [2]

خلاصہ تفسیر: اور (جب موسیٰ علیہ السلام طور پر تورات لانے تشریف لے گئے تو) موسیٰ کی قوم (یعنی بنی اسرائیل) نے ان کے (جانے کے) بعد اپنے (مقبوضہ) زیوروں کا (یعنی وہ زیور جو قبطیوں سے مصر سے نکلتے وقت شادی کے بہانہ سے مانگ لیا تھا) ایک بچھڑا (بنا کر جس کا قصہ سورۃ طٰہٰ میں ہے، اس کو معبود) ٹھہرایا جو کہ (صرف اتنی حقیقت رکھتا تھا کہ) ایک قالب (سانچہ) تھا جس میں ایک آواز تھی (اور اس میں کوئی کمال نہ تھا، جس سے کسی عاقل کو اس کے معبود ہونے کا شبہ ہو سکے) کیا انہوں نے یہ نہ دیکھا کہ (اس میں آدمی کے برابر بھی تو قدرت نہ تھی، چنانچہ) وہ ان سے بات تک نہیں کرتا تھا، اور نہ ان کو (دنیا یا دین کی) کوئی راہ بتلاتا تھا (اور خدا کی سی صفات تو اس میں کیا ہوتیں، غرض یہ کہ) اس (بچھڑے) کو انہوں نے معبود قرار دیا اور (چونکہ اس میں اصلاً کوئی شبہ کی وجہ نہ تھی اس لئے انہوں نے) بڑا بے ڈھنگا کام کیا۔

عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ: اس بچھڑے کے بارے میں سلف کے دو قول ہیں: ① ایک یہ کہ وہ سچ مچ کا بچھڑا ہو گیا تھا ② دوسرا یہ کہ وہ چاندی سونے ہی کا رہا اور بقدر آواز کرنے کے اس میں زندگی آ گئی تھی، اور یہ دونوں باتیں قدرت الٰہی میں داخل ہیں، اس لیے یہ کہنا بلا دلیل ہے کہ یہ آواز ایسی تھی جیسے مٹی کے کھلونوں میں ہوتی ہے۔

اس واقعہ سے ثابت ہوا کہ شرعی دلائل کی موجودگی میں خارق عادت سے دھوکہ نہیں کھانا چاہیے، یہ کم عقلی کی بات ہے۔

اَلَمْ يَرَوْا اَنَّهٗ: اس سے معلوم ہوا کہ شرعی دلیل اس خارق عادت پر حجت اور اس پر راجح ہے۔

* * *

فائدہ: [1] یہ زیور جسے گلا کر اور ڈھال کر بچھڑا بنایا اصل میں فرعون کی قوم قبطیوں کا تھا، ان کے پاس سے بنی اسرائیل کے قبضے میں آیا، جیسا کہ سورۃ طٰہٰ میں ہے: حُمِّلْنَآ اَوْزَارًا مِّنْ زِيْنَةِ الْقَوْمِ۔

فائدہ: [2] سورۃ طٰہٰ میں اس بچھڑے کا مفصل قصہ آئے گا، یہاں ان کی حماقت وسفاہت پر متنبہ فرمایا ہے کہ ایک خودساختہ ڈھانچہ میں سے گائے کی آواز سن لینے پر مفتون ہو گئے اور بچھڑے کو خدا سمجھ بیٹھے، حالانکہ اس کی بے معنی آواز میں نہ کوئی کلام وخطاب تھا نہ دینی یا دنیاوی راہنمائی اس سے ہوتی تھی، اس طرح کی صوت محض تو کسی چیز کو انسانیت کے درجہ تک بھی نہیں پہنچا سکتی، چہ جائیکہ خالق جل وعلا کے مرتبہ پر پہنچا دے، یہ کتنا بڑا ظلم اور

بے موقع کام ہے کہ ایک معمولی جانور کی صورت کو خدا کہہ دیا جائے، بات یہ ہے کہ اس قوم کو پہلے ہی سے ایسی بے موقع باتیں کرنے کی عادت تھی چنانچہ پیشتر اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ (الاعراف:۱۳۸) کی درخواست موسیٰ علیہ السلام سے کر چکے تھے۔

وَلَمَّا سُقِطَ فِيْٓ اَيْدِيْهِمْ وَرَاَوْا اَنَّهُمْ قَدْ ضَلُّوْا ۙ قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ يَرْحَمْنَا رَبُّنَا وَيَغْفِرْ لَنَا

اور جب پچھتائے اور سمجھے کہ ہم بیشک گمراہ ہوگئے تو کہنے لگے اگر نہ رحم کرے ہم پر ہمارا رب اور نہ بخشے ہم کو

لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿١٤٩﴾

تو بیشک ہم تباہ ہوں گے

خلاصہ تفسیر: اور (موسیٰ علیہ السلام کے لوٹنے کے بعد جس کا قصہ آگے آتا ہے ان کے تنبیہ فرمانے سے) جب (متنبہ ہوئے اور اپنی اس حرکت پر) نادم ہوئے اور معلوم ہوا کہ واقعی وہ لوگ گمراہی میں پڑ گئے تو (ندامت سے بطور معذرت) کہنے لگے کہ اگر ہمارا رب ہم پر رحم نہ کرے اور ہمارا (یہ) گناہ معاف نہ کرے تو ہم بالکل گئے گزرے (چناچہ خاص طریقہ سے ان کو تکمیل توبہ کا حکم ہوا، جس کا قصہ سورۃ بقرہ آیت ۵۴: وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ میں گزر چکا ہے وہاں ملاحظہ فرمایئے)۔

* * *

فائدہ: اپنی بدعقلی اور کج روی سے انہوں نے ایسا بے ڈھنگا اور بھونڈا کام کیا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام کی تنبیہ کے بعد جب باطل کا جوش ٹھنڈا ہوا اور عقل و ہوش کچھ ٹھکانے ہوئے تو خود بھی اپنی حرکت پر بہت شرمائے، گویا مارے ندامت کے ہاتھ کاٹنے لگے اور خوف و ہراس کی وجہ سے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے، گھبرا کر کہنے لگے اب کیسے بنے گی، اگر خدا نے ہم پر رحم فرما کر توبہ اور مغفرت کی کوئی صورت نہ نکالی تو یقیناً ہم ابدی خسران اور دائمی ہلاکت میں جا پڑیں گے۔

وَلَمَّا رَجَعَ مُوْسٰٓى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا ۙ قَالَ بِئْسَمَا خَلَفْتُمُوْنِيْ مِنْۢ بَعْدِيْ ۚ

اور جب لوٹ آیا موسیٰ اپنی قوم میں غصہ میں بھرا ہوا افسوس ناک [1] بولا کیا بری نیابت کی تم نے میری میرے بعد [2]

اَعَجِلْتُمْ اَمْرَ رَبِّكُمْ ۚ وَاَلْقَى الْاَلْوَاحَ وَاَخَذَ بِرَاْسِ اَخِيْهِ يَجُرُّهٗٓ اِلَيْهِ ۭ

کیوں جلدی کی تم نے اپنے رب کے حکم سے [3] اور ڈال دیں وہ تختیاں اور پکڑا سر اپنے بھائی کا لگا کھینچنے اس کو اپنی طرف [4]

قَالَ ابْنَ اُمَّ اِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُوْنِيْ وَكَادُوْا يَقْتُلُوْنَنِيْ ڮ فَلَا تُشْمِتْ بِيَ الْاَعْدَاۗءَ

وہ بولا کہ اے میری ماں کے جنے لوگوں نے مجھ کو کمزور سمجھا اور قریب تھا کہ مجھ کو مار ڈالیں، سو مت ہنسا مجھ پر دشمنوں کو

وَلَا تَجْعَلْنِيْ مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿١٥٠﴾

اور نہ ملا مجھ کو گناہ گار لوگوں میں [5]

خلاصہ تفسیر: اور (موسیٰ علیہ السلام کے متنبہ فرمانے کا قصہ یہ ہوا کہ) جب موسیٰ اپنی قوم کی طرف (طور سے) واپس آئے غصہ اور رنج میں بھرے ہوئے (کیونکہ ان کو وحی سے یہ معلوم ہوگیا تھا) تو (اول قوم کی طرف متوجہ ہوئے) فرمایا کہ تم نے میرے بعد یہ بڑی نامعقول

حرکت کی، کیا اپنے رب کے حکم (آنے) سے پہلے ہی تم نے (ایسی) جلد بازی کر لی (میں تو احکام ہی لینے گیا تھا اس کا انتظار تو کیا ہوتا) اور (پھر حضرت ہارون علیہ السلام کی طرف متوجہ ہوئے اور دینی حمیت کے جوش میں) جلدی سے (توریت کی) تختیاں (تو) ایک طرف رکھیں (اور جلدی میں ایسے زور سے رکھی گئیں کہ دیکھنے والے کو اگر غور نہ کرے تو شبہ ہو کہ جیسے کسی نے پٹک دی ہوں) اور (ہاتھ خالی کر کے) اپنے بھائی (ہارون علیہ السلام) کا سر (یعنی بال) پکڑ کر ان کو اپنی طرف گھسیٹنے لگے (کہ تم نے کیوں پورا انتظام نہ کیا) ہارون نے کہا کہ اے میرے ماں جائے! (بھائی میں نے اپنی کوشش بھر ان کو بہت روکا لیکن) ان لوگوں نے مجھ کو بے حقیقت سمجھا اور (انہوں نے میری نصیحت نہ مانی، بلکہ نصیحت کرنے پر) قریب تھا کہ مجھ کو قتل کر ڈالیں تو تم مجھ پر (سختی کر کے) دشمنوں کو مت ہنسواؤ اور مجھ کو (برتاؤ سے) ان ظالم لوگوں کے ذیل میں مت شمار کرو (یعنی میرے ساتھ وہ سختی کا برتاؤ نہ کرو جو ان کے ساتھ کرنا چاہیے)۔

وَاَلْقَى الْاَلْوَاحَ: ''اِلقاء'' کے لغوی معنی ڈال دینے کے ہیں، اور ''اَلواح'' لوح کی جمع ہے جس کے معنی ہیں تختی، یہاں لفظ اِلقاء سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے غصہ کی حالت میں تورات کی تختیوں کی بے ادبی کی کہ ان کو ڈال دیا لیکن یہ ظاہر ہے کہ اَلواحِ تورات کو بے ادبی کے ساتھ ڈال دینا گناہ عظیم ہے اور انبیاء علیہم السلام سب گناہوں سے معصوم ہیں، اس لئے مراد آیت کی یہی ہے کہ اصل مقصود حضرت ہارون علیہ السلام کو پکڑنے کے لئے اپنا ہاتھ خالی کرنا تھا اور غصہ کی حالت میں جلدی سے ان کو رکھا، جس سے دیکھنے والا یہ سمجھے کہ ڈال دیا، جیسے اکثر بات چیت میں یا کسی خیال کے غلبہ میں اکثر ایسے واقعات پیش آ جاتے ہیں، اور بعض نے لکھا ہے کہ القاء کے معنی یہاں ڈال دینے کے نہیں، بلکہ مجازاً جلدی سے رکھ دینے کے ہیں، چنانچہ خلاصہ تفسیر میں اسی کو اختیار کیا گیا ہے۔

وَاَلْقَى الْاَلْوَاحَ: موسیٰ علیہ السلام کو دین اور غیرت توحید کے جوش میں یہ غصہ آیا، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ایسا غصہ جو دین کی خاطر ہو بد خلقی نہیں، جیسے بعض اہل اللہ کی عادت ہے، اور یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر انسان پر کوئی حال غالب آ جائے اور اس سے کوئی ناشائستہ حرکت سرزد ہو جائے تو وہ غلبہ حال کی وجہ سے معذور ہے۔

وَاَخَذَ بِرَاْسِ اَخِيْهِ: چونکہ غصہ کے غلبہ کی وجہ سے ایک گونہ بے اختیاری ہو جاتی ہے اور غصہ بھی دین کے لئے تھا اس لئے اس بے اختیاری کو معتبر قرار دیا جائے گا اور اس اجتہادی لغزش پر اعتراض نہ کیا جائے گا، اور موسیٰ علیہ السلام کا غصہ چونکہ للہ تھا، اس کی ایسی مثال ہے جیسے کسی مباح چیز کے استعمال سے نشہ ہو گیا ہو کہ اس میں انسان مکلف نہیں رہتا، اس پر دوسرے شخص کے غصہ کو جو نفس کی خاطر ہو قیاس نہیں کر سکتے، بلکہ دوسروں کے غصہ کی مثال ایسی ہے جیسے حرام چیز کے استعمال سے نشہ ہو گیا ہو کہ اس میں وہ شرعاً مکلف رہتا ہے اور شارع نے اسے عذر قرار نہیں دیا، چنانچہ شراب کے نشہ میں اگر طلاق دے دے تو شرعاً واقع ہو جائے گی۔

روح المعانی میں ہے کہ یہ گمان ہوا کہ ہارون علیہ السلام نے روکنے میں کوتاہی کی، میں کہتا ہوں حالانکہ انہوں نے کوتاہی نہیں کی تھی، اس سے معلوم ہوا کہ جب کاملین سے اجتہادی خطا ہو سکتی ہے تو شیوخ سے بھی ممکن ہے، کیونکہ یہ معصوم بھی نہیں۔

* * *

فائدہ: ۱۔ وَلَمَّا رَجَعَ مُوْسٰٓى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا: کیونکہ حق تعالیٰ نے طور ہی پر اطلاع دی تھی کہ سامری نے تیری قوم کو گمراہ کر دیا ہے، یہ سن کر موسیٰ (علیہ السلام) سخت متاسف اور غضبناک تھے۔

فائدہ: ۲۔ قَالَ بِئْسَمَا خَلَفْتُمُوْنِيْ مِنْۢ بَعْدِيْ: یہ خطاب عبادِ عجل (گوسالہ پرستوں) کو تھا، یعنی میرے پیچھے تم نے خوب میری قائم مقامی کی، جس بات پر میں سب سے زیادہ زور دیتا تھا (خدا کی توحید و تفرید) اس کی جگہ تم نے بچھڑے کی پوجا یہ کہہ کر کھڑی کر دی کہ **هٰذَآ اِلٰـهُكُمْ وَاِلٰهُ مُوْسٰى** (طٰہٰ: ۸۰) (فی الحقیقت یہ ہی تمہارا اور موسیٰ کا معبود ہے) اور ممکن ہے خطاب ہارون علیہ السلام کو بھی ہو کہ تم نے میری نیابت کا حق جو **اُخْلُفْنِيْ فِيْ قَوْمِيْ** کہہ کر سپرد کر گئے تھے، اچھی طرح ادا نہ کیا کہ ان کو روکتے اور مضبوطی سے اس فتنہ کا مقابلہ کرتے جیسا کہ سورۂ طٰہٰ میں مفصل آئے گا۔

فائدہ: ۳؎ اَعَجِلْتُمْ اَمْرَ رَبِّكُمْ: یعنی میں پروردگار سے تمہارے لیے احکام ہی لینے تو گیا تھا اور چالیس روز کی میعاد بھی خدا نے مقرر کردی تھی تم نے خدا کی مقرر کی ہوئی مدت پوری ہونے اور اس کے احکام لے آنے کا بھی انتظار نہ کیا، کچھ بہت زمانہ تو نہیں گزر گیا تھا جو تم نے گھبرا کر اس قدر جلد خدا کے قہر وغضب کو اپنی طرف آنے کی دعوت دی اَفَطَالَ عَلَيْكُمُ الْعَهْدُ اَمْ اَرَدْتُّمْ اَنْ يَّحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَخْلَفْتُمْ مَّوْعِدِيْ (طٰہٰ:۸۶)

فائدہ: ۴؎ وَاَخَذَ بِرَاْسِ اَخِيْهِ يَجُرُّهٗٓ اِلَيْهِ: حضرت موسیٰ علیہ السلام اس مشرکانہ ڈھونگ کو دیکھ کر اور ہارون علیہ السلام کی نرمی وتساہل کا گمان کر کے اس قدر افروختہ اور دینی حمیت وغیرت کے جوش سے اس قدر بے قابو ہو رہے تھے کہ ہارون علیہ السلام کی طرف لپکے اور حرارت ایمانی کے بے اندازہ جوش میں ان کی ڈاڑھی اور سر کے بال پکڑ لئے، معاذ اللہ ہارون کی اہانت کی نیت سے نہیں، کیونکہ ہارون خود مستقل نبی اور عمر میں موسیٰ سے تین سال بڑے تھے، پھر ایک اولوالعزم پیغمبر سے یہ کیسے ممکن تھا کہ دوسرے نبی کو جو اس کا بڑا بھائی بھی ہو ذرہ برابر توہین کا ارادہ کرے، نہیں! موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے یہ معاملہ اس وقت ہوا جب کہ وہ قوم کی سخت بدعنوانی کی بنا پر بغض فی اللہ اور غصہ سے بے اختیار ہو رہے تھے، حضرت ہارون کی نسبت یہ خیال گزر رہا تھا کہ شاید انہوں نے اصلاح حال کی پوری کوشش نہیں کی، حالانکہ ان کو اصلاح کی بھی تاکید کر گئے تھے، بیشک ہارون نبی اور عمر میں بڑے تھے، مگر رتبہ میں موسیٰ علیہ السلام ان سے بڑے تھے اور سیاسی وانتظامی حیثیت سے ہارون کو ان کا وزیر اور تابع بنایا گیا تھا، اس موقع پر موسیٰ علیہ السلام کی شان سیادت وحکمت کا ظہور ہوا، گویا ان کی طرف سے یہ دار وگیر اور سخت باز پرس حضرت ہارون کی تقصیر مظنون پر ایک قسم کی فعلی ملامت تھی جس سے قوم کو بھی پوری طرح متنبہ کر دیا گیا کہ پیغمبر کا قلب نشہ توحید سے کس قدر سرشار اور دسیسہ شرک وکفر سے کس قدر نفور و بیزار ہوتا ہے کہ اس معاملہ میں ادنیٰ ترین تساہل یا خاموشی کو بھی برداشت نہیں کر سکتے حتیٰ کہ ایک نبی کی نسبت اگر ایسا وہم ہو جائے کہ اس نے شرک کے مقابلہ پر آواز بلند کرنے میں ذرا سی کوتاہی کی ہے تو اس کی بزرگی اور وجاہت عند اللہ بھی ایسی سخت باز پرس سے ان کو نہیں روک سکتی، بہر حال موسیٰ علیہ السلام اس حالت میں شرعاً معذور تھے، اسی فرط غضب اور ہنگامہ دار وگیر میں الواح (وہ تختیاں جو خدا کی طرف سے مرحمت ہوئی تھیں) ان کے ہاتھ سے چھوٹ گئیں جسے عدم تحفظ کی وجہ سے تغلیظاً القاء سے تعبیر فرمایا، کیونکہ بظاہر خذھا بقوۃ کا امتثال نہ کر سکے، یا جیسا کہ بعض مفسرین کا خیال ہے ہارون کی طرف بڑھتے وقت ہاتھ خالی کرنے کے لیے بہت تیزی اور عجلت کے ساتھ تختیاں ایک طرف رکھ دیں مگر چونکہ ان دونوں معاملات کی سطح جو ہارون یا الواح کے متعلق ظہور میں آئے صورۃً پسندیدہ نہ تھی، گو موسیٰ علیہ السلام نیۃً معذور تھے، اس لیے آئندہ رب اغفر لی کہہ کر حق تعالیٰ سے عفو کی درخواست کی، سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

فائدہ: ۵؎ وَلَا تَجْعَلْنِيْ مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ: گو ہارون علیہ السلام حضرت موسیٰ کے عینی بھائی ہیں، مگر ماں کی طرف نسبت کرنے سے ان کو نرمی اور شفقت پر آمادہ کرنا تھا، اس آیت میں ہارون کی معذرت کا بیان ہے، حاصل یہ ہے کہ میں اپنے مقدور کے موافق ان کو سمجھا چکا، لیکن انہوں نے میری کچھ حقیقت نہ سمجھی، الٹے مجھے قتل کرنے پر آمادہ ہونے لگے، اب آپ ایسا معاملہ کر کے ان کو مجھ پر ہنسنے کا موقع نہ دیجئے اور عتاب وغصہ کا اظہار کرتے وقت مجھ کو ظالموں کے ذیل میں شامل نہ کیجئے۔

قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَلِاَخِيْ وَاَدْخِلْنَا فِيْ رَحْمَتِكَ ۖ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۱۵۱﴾

بولا اے میرے رب معاف کر مجھ کو اور میرے بھائی کو اور داخل کر ہم کو اپنی رحمت میں اور تو سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے

خلاصہ تفسیر: موسیٰ (علیہ السلام) نے (اللہ تعالیٰ سے دعا کی اور) کہا کہ اے میرے رب! میری خطا (اگر چہ وہ اجتہادی ہو) معاف فرما دے اور میرے بھائی کی بھی (کوتاہی جو ان مشرکین کے ساتھ قطع تعلق اور علیحدگی اختیار کرنے میں شاید ہوگئی ہو جیسا کہ اس قول سے معلوم ہوتا ہے: مَا مَنَعَكَ اِذْ رَاَيْتَهُمْ ضَلُّوْٓا اَلَّا تَتَّبِعَنِ) اور ہم دونوں کو اپنی رحمت (خاص) میں داخل فرمائیے اور آپ سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والے ہیں (اس لئے ہم کو قبول دعا کی امید ہے)۔

❊ ❊ ❊

فائدہ: یعنی شدت غضب میں جو بے اعتدالی یا اجتہادی غلطی مجھ سے ہوئی خواہ میں اس میں کتنا ہی نیک نیت ہوں، آپ معاف فرمادیجئے اور میرے بھائی ہارون سے اگر ان کے درجہ اور شان کو ملحوظ رکھتے ہوئے کسی طرح کی کوتاہی قوم کی اصلاح میں ہوئی، اس سے بھی درگزر فرمائیے۔

إِنَّ الَّذِينَ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ سَيَنَالُهُمْ غَضَبٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَذِلَّةٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۚ

البتہ جنہوں نے بچھڑے کو معبود بنا لیا ان کو پہنچے گا غضب ان کے رب کا اور ذلت دنیا کی زندگی میں

وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُفْتَرِينَ ﴿۱۵۲﴾

اور یہی سزا دیتے ہیں ہم بہتان باندھنے والوں کو

خلاصہ تفسیر: (پھر حق تعالیٰ نے ان گوسالہ پرستوں کے متعلق موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا کہ) جن لوگوں نے گوسالہ پرستی کی ہے (اگر اب بھی توبہ نہ کریں گے تو) ان پر بہت جلد ان کے رب کی طرف سے غضب اور ذلت اس دنیاوی زندگی ہی میں پڑے گی، اور (یہ صرف انہی کے ساتھ خاص نہیں) ہم (تو) افتراء پردازوں کو ایسی ہی سزا دیا کرتے ہیں (کہ دنیا ہی میں ان پر غضب اور ذلت نازل کرتے ہیں اگرچہ کسی عارض کی وجہ سے اس ذلت کا کبھی ظہور نہ ہو یا دیر میں ہو، چنانچہ سامری نے جب توبہ نہ کی تو اس پر غضب اور ذلت کا نزول ہوا جس کا قصہ سورہ طٰہٰ میں ہے: قَالَ فَاذْهَبْ فَإِنَّ لَكَ فِي الْحَيَاةِ أَن تَقُولَ لَا مِسَاسَ)۔

وَذِلَّةٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا: اس سے معلوم ہوا کہ دنیوی ذلت و رسوائی کبھی گناہ و معصیت کے سبب سے ہوجاتی ہے۔

* * *

فائدہ: یہ غضب وہی ہے جس کا ذکر سورۃ بقرہ میں ربع پارہ الٓمٓ کے بعد گزر چکا، یعنی گوسالہ پرستوں کو وہ لوگ قتل کریں جنہوں نے یہ حرکت نہیں کی اور دوسروں کو روکنے میں حصہ نہ لیا، اس سے معلوم ہوا کہ مرتد کی سزا دنیا میں قتل ہے۔

وَالَّذِينَ عَمِلُوا السَّيِّئَاتِ ثُمَّ تَابُوا مِن بَعْدِهَا وَآمَنُوا إِنَّ رَبَّكَ مِن بَعْدِهَا لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿۱۵۳﴾

اور جنہوں نے کیے برے کام پھر توبہ کی اس کے بعد اور ایمان لائے تو بیشک تیرا رب توبہ کے پیچھے البتہ بخشنے والا مہربان ہے

خلاصہ تفسیر: اور جن لوگوں نے گناہ کے کام کئے (مثلاً گوسالہ پرستی ان سے سرزد ہوگئی مگر) پھر وہ ان (گناہوں) کے (کرنے کے) بعد توبہ کریں اور (اس کفر کو چھوڑ کر) ایمان لے آئیں، تمہارا رب اس توبہ کے بعد (ان کے) گناہ کا معاف کردینے والا (اور ان کے حال پر) رحمت کرنے والا ہے (اگرچہ تکمیل توبہ کے لئے اقْتُلُوا أَنفُسَكُمْ کا بھی حکم ہوا کہ گوسالہ پرستوں کو قتل کیا جائے، کیونکہ یہ رحمت کے خلاف نہیں، اصل رحمت آخرت کی ہے، چنانچہ توبہ کرنے والوں کی خطا اسی طرح معاف ہوئی)۔

* * *

فائدہ: یعنی برا کام حتیٰ کہ شرک و کفر کرکے پھر توبہ کرلے اور ایمان لے آئے تو "غفور رحیم" کے یہاں رحمت اور معافی کی کچھ کمی نہیں یہ معافی وغیرہ آخرت سے متعلق ہے، گویا اشارہ فرمادیا کہ گوسالہ پرستوں کو جو سزائے قتل دی گئی وہ ان کے حق میں شرط قبول توبہ سمجھی گئی تھی فَتُوبُوا إِلَىٰ بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوا أَنفُسَكُمْ (البقرۃ: ۵۴) اب ان پر اخروی مواخذہ باقی نہیں رہا، دنیاوی سزا کے بعد اخروی حالت کا بیان اس جگہ ایسا ہی ہے جیسے دوسری جگہ وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوا أَيْدِيَهُمَا جَزَاءً بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللَّهِ (المائدہ: ۳۸) کے بعد فَمَن تَابَ مِن بَعْدِ ظُلْمِهِ وَأَصْلَحَ فَإِنَّ اللَّهَ يَتُوبُ عَلَيْهِ (المائدہ: ۳۹) فرمادیا گیا۔

وَلَمَّا سَكَتَ عَنْ مُّوسَى الْغَضَبُ اَخَذَ الْاَلْوَاحَ ۖ وَفِيْ نُسْخَتِهَا هُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلَّذِيْنَ هُمْ

اور جب تھم گیا موسیٰ کا غصہ تو اس نے اٹھا لیا تختیوں کو، اور جو ان میں لکھا ہوا تھا اس میں ہدایت اور رحمت تھی ان کے واسطے

لِرَبِّهِمْ يَرْهَبُوْنَ ﴿۱۵۴﴾

جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں

خلاصہ تفسیر: اور جب (ہارون علیہ السلام کی یہ معذرت سن کر) موسیٰ کا غصہ فرو (کم) ہوا تو ان تختیوں کو اٹھا لیا اور ان (تختیوں) کے مضامین میں ان لوگوں کے لئے جو اپنے رب سے ڈرتے تھے ہدیت اور رحمت تھی (مراد وہ احکام ہیں کہ ان پر عمل کرنے سے ہدایت پاتے اور رحمت کے مستحق ہوتے)۔

وَاخْتَارَ مُوْسٰى قَوْمَهٗ سَبْعِيْنَ رَجُلًا لِّمِيْقَاتِنَا ۚ فَلَمَّآ اَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ

اور چن لیے موسیٰ نے اپنی قوم میں سے ستر مرد ہمارے وعدہ کے وقت پر لانے کو، پھر جب ان کو زلزلہ نے پکڑا

قَالَ رَبِّ لَوْ شِئْتَ اَهْلَكْتَهُمْ مِّنْ قَبْلُ وَاِيَّايَ ۖ اَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَهَآءُ مِنَّا ۚ

تو بولا اے رب میرے اگر تو چاہتا تو پہلے ہی ہلاک کر دیتا ان کو اور مجھ کو، کیا ہم کو ہلاک کرتا ہے اس کام پر جو کیا ہماری قوم کے احمقوں نے

اِنْ هِيَ اِلَّا فِتْنَتُكَ ۖ تُضِلُّ بِهَا مَنْ تَشَآءُ وَتَهْدِيْ مَنْ تَشَآءُ ۖ اَنْتَ وَلِيُّنَا فَاغْفِرْ لَنَا

یہ سب تیری آزمائش ہے، بچلا دے اس میں جس کو تو چاہے اور سیدھا رکھے جس کو چاہے، تو ہی ہے ہمارا تھامنے والا سو بخش دے ہم کو

وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الْغٰفِرِيْنَ ﴿۱۵۵﴾

اور رحمت کر ہم پر اور تو سب سے بہتر بخشنے والا ہے۔

خلاصہ تفسیر: جب گوسالہ کا قصہ تمام ہوا تو موسیٰ علیہ السلام نے اطمینان سے تورات کے احکام سنائے، ان لوگوں کی شبہات نکالنے کی عادت تھی ہی، چنانچہ اس میں بھی شبہ نکالا کہ ہم کو کیسے معلوم ہو کہ یہ اللہ تعالیٰ کے احکام ہیں؟ ہم سے اللہ تعالیٰ خود کہہ دیں تو یقین کیا جائے، آپ نے حق تعالیٰ سے عرض کیا، وہاں سے حکم ہوا کہ ان میں کے کچھ آدمی جن کو یہ لوگ معتبر سمجھتے ہوں منتخب کر کے ان کو کوہ طور پر لے آؤ ہم خود ان سے کہہ دیں گے کہ یہ ہمارے احکام ہیں اور اس لانے کے لئے ایک وقت معین کیا گیا، چنانچہ ارشاد ہے:

اور موسیٰ نے ستر آدمی اپنی قوم میں سے ہمارے وقت معین (پر لانے) کے لئے منتخب کئے (چنانچہ وہاں پہنچ کر انہوں نے اللہ تعالیٰ کا کلام سنا تو اس میں یہ شاخ نکالی کہ خدا جانے کون بول رہا ہو گا ہم تو جب یقین لائیں کہ اللہ تعالیٰ کو کھلم کھلا اپنی آنکھ سے دیکھ لیں: لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً، اللہ تعالیٰ نے اس گستاخی کی سزا دی، نیچے سے شدید زلزلہ شروع ہوا اور اوپر سے ایسی کڑک بجلی ہوئی کہ سب وہاں ہی رہ گئے) سو جب ان کو زلزلہ (وغیرہ) نے آ پکڑا تو موسیٰ (علیہ السلام ڈرے کہ بنی اسرائیل جاہل اور بدگمان تو ہیں ہی، یوں سمجھیں گے کہ کہیں لے جا کر کسی طریقہ سے ان سب کا کام تمام کر دیا ہے گھبرا کر) عرض کرنے لگے کہ اے میرے پروردگار! (یہ مجھ کو یقین ہے کہ ان لوگوں کو صرف سزا دینا منظور ہے، خاص ہلاک کرنا مقصود نہیں، کیونکہ) اگر آپ کو یہ منظور ہوتا تو آپ اس کے قبل ہی ان کو اور مجھ کو ہلاک کر دیتے (کیونکہ ان کا اس وقت ہلاک ہونا بنی اسرائیل کے ہاتھوں میرا بھی

ہلاک ہونا ہے، سو اگر آپ کو یہ مقصود ہوتا تو آپ پہلے بھی ایسا کر سکتے تھے، مگر جب ایسا نہیں کیا تو معلوم ہو گیا کہ ان کو بھی ہلاک کرنا مقصود نہیں، کیونکہ اس سے میری ہلاکت بھی ہے اور بدنامی بھی، آپ سے امید ہے کہ مجھ کو بدنام نہ کریں گے اور بھلا) کہیں آپ ہم میں کے چند بیوقوفوں کی حرکت پر سب کو ہلاک کر دیں گے (کہ بے وقوفی تو کریں یہ لوگ کہ ایسی گستاخی کی فرمائشیں کریں اور ساتھ میں بنی اسرائیل کے ہاتھ سے ہلاک ہوں میں بھی، آپ سے امید ہے کہ آپ ایسا نہ کریں گے)۔

(پس ثابت ہوا کہ) یہ واقعہ (زلزلہ وغیرہ کا) محض آپ کی طرف سے ایک امتحان ہے، ایسے امتحانات سے جس کو آپ چاہیں گمراہی میں ڈال دیں (جو ایسے امتحان سے حق تعالیٰ کی شکایت اور ناشکری کرنے لگے) اور جس کو آپ چاہیں ہدایت پر قائم رکھیں (جو اس کی حکمتوں اور مصلحتوں کو سمجھتا ہے سو میں آپ کے فضل و کرم سے آپ کے حکیم ہونے کا علم رکھتا ہوں، لہٰذا اس امتحان میں مطمئن ہوں اور) آپ ہی تو ہمارے خبر گیراں ہیں، ہم پر مغفرت اور رحمت فرمائیے اور آپ سب معافی دینے والوں سے زیادہ ہیں (سو ان کی گستاخی بھی معاف کر دیجئے، چنانچہ وہ لوگ صحیح سالم اٹھ کھڑے ہوئے)۔

اس واقعہ کے متعلق کچھ تفصیل سورۃ بقرہ آیت ۵۵: وَاِذْ قُلْتُمْ یٰمُوْسٰی لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰی نَرَی اللّٰهَ میں گذر چکی وہاں ملاحظہ فرمائیے۔

* * *

فائدہ: لہ راجح یہ ہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ میقات اس میقات کے علاوہ ہے جو موسیٰ علیہ السلام کو تورات عطا فرمانے کے لیے مقرر ہوا تھا، نیز آیات حاضرہ کی ترتیب سے بظاہر مفہوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ گوسالہ پرستی اور سزایابی کے بعد پیش آیا، لیکن سورۃ نساء کی آیت فَقَالُوْۤا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ ۚ ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ (النساء:۱۵۳) زیادہ صفائی سے بتلاتی ہے کہ گوسالہ پرستی اس واقعہ کے بعد ہوئی، واللہ اعلم بالصواب، اس واقعہ کا خلاصہ سورۃ بقرہ میں ربع پارہ الم کے بعد گزر چکا ہے بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا کہ تمہاری باتیں اس وقت تسلیم کر سکتے ہیں جب خدا تعالیٰ سے خود سن لیں، حضرت موسیٰ ان میں سے ستر آدمیوں کو جو سردار تھے منتخب کر کے طور پر لے گئے، آخر انہوں نے حق تعالیٰ کا کلام سن لیا کہنے لگے کہ جب تک ہم خدا کو اپنی آنکھوں سے بے حجاب دیکھ نہ لیں ہم کو یقین نہیں آ سکتا، اس گستاخی پر نیچے سے سخت بھونچال آیا اور اوپر سے بجلی کی کڑک ہوئی، آخر کانپ کر مر گئے، یا مردوں کی سی حالت کو پہنچ گئے، موسیٰ نے اپنے آپ کو ان کے ساتھ نتھی کر کے نہایت موثر انداز میں دعا کی جس کا حاصل یہ تھا کہ خداوند! اگر تو ہلاک کرنا ہی چاہتا تو ان سب کو بلکہ ان کے ساتھ مجھ کو بھی کہ میں ہی انہیں لے کر آیا یہاں بلانے اور کلام سنانے سے پہلے ہی ہلاک کر دیتا، کس کی مجال تھی کہ آپ کی مشیت کو روک سکتا؟ جب آپ نے ایسا نہیں چاہا، بلکہ مجھے لانے کی اور ان کو کلام الٰہی سننے کے لیے یہاں آنے کی اجازت دی، تو یہ کیسے گمان کیا جا سکتا ہے کہ اپنے یہاں بلا کر محض بعض بیوقوفوں کی حماقت کی سزا میں ہم سب کو ہلاک کر دینا چاہیں یقیناً یہ (رجفہ وصاعقہ کا) منظر سب آپ کی طرف سے ہماری آزمائش و امتحان ہے اور ایسے سخت امتحانات میں ثابت قدم رکھنا یا نہ رکھنا بھی آپ ہی کے قبضے میں ہے، اس قسم کے خطرناک اور مزلت الاقدام مواقع میں آپ ہی ہمارے تھامنے اور دستگیری کرنے والے ہیں اور صرف آپ ہی کی ذات منبع الخیرات سے یہ امید ہو سکتی ہے کہ ہم سب کی گزشتہ تقصیرات اور بے اعتدالیوں سے درگزر فرمائیں اور آئندہ اپنی رحمت سے ایسی خطاؤں اور غلطیوں کا شکار نہ ہونے دیں، حضرت موسیٰ کی اس دعاء پر وہ لوگ بخشے گئے اور خدا نے ان کو از سر نو زندگی مرحمت فرمائی ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ (البقرۃ:۵۶)

وَاكْتُبْ لَنَا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ اِنَّا هُدْنَاۤ اِلَيْكَ ؕ قَالَ عَذَابِيْۤ اُصِيْبُ بِهٖ

اور لکھ دے ہمارے لیے اس دنیا میں بھلائی اور آخرت میں ہم نے رجوع کیا تیری طرف ،فرمایا میرا عذاب ڈالتا ہوں میں اس کو

مَنْ اَشَآءُ ۚ وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ؕ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ

جس پر چاہوں ،اور میری رحمت شامل ہے ہر چیز کو، سو اس کو لکھ دوں گا ان کے لیے جو ڈر رکھتے ہیں اور دیتے ہیں زکوٰۃ

وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۵۶﴾

اور جو ہماری باتوں پر یقین رکھتے ہیں

خلاصہ تفسیر: اور (اس دعا کے ساتھ آپ نے تفصیل رحمت کے لئے یہ بھی دعا کی کہ) ہم لوگوں کے نام دنیا میں بھی نیک حالی لکھ دیجئے اور (اسی طرح) آخرت میں بھی (کیونکہ) ہم آپ کی طرف (خلوص واطاعت کے ساتھ) رجوع کرتے ہیں (اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کی دعا قبول کی اور) فرمایا کہ (اے موسیٰ! اول تو مطلقا میری رحمت میرے غضب پر سبقت رکھتی ہے چنانچہ) میں اپنا عذاب (اور غضب) تو اسی پر واقع کرتا ہوں جس پر چاہتا ہوں (اگر چہ عذاب کا مستحق ہر نافرمان ہوتا ہے، لیکن پھر بھی سب پر واقع نہیں کرتا، بلکہ ان میں سے خاص خاص لوگوں پر واقع کرتا ہوں جو انتہائی درجہ سرکش اور متمرد ہوتے ہیں) اور میری رحمت (ایسی عام ہے کہ) تمام اشیاء کو محیط ہو رہی ہے (باوجودیکہ ان میں بہت سی مخلوق جو سرکش و معاند لوگ ہیں اس کے مستحق نہیں، مگر ان پر بھی ایک گونہ رحمت ہے گو دنیا میں ہی سہی، پس جب میری رحمت غیر مستحقین کے لئے بھی عام ہے) تو وہ رحمت ان لوگوں کے نام تو (کامل طور پر) ضرور ہی لکھوں گا جو کہ (اس کے حسب وعدہ مستحق بھی ہیں اس وجہ سے کہ وہ اطاعت کرتے ہیں چنانچہ) اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں (جو کہ اعمال قلب سے ہے) اور زکوۃ دیتے ہیں (جو کہ اعمال جوارح سے ہے) اور جو کہ ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں (جو کہ عقائد کی قسم میں سے ہے، غرض جس درجہ اطاعت ہوگی اسی درجہ کی رحمت ہوگی، تو ایسے لوگ تو پہلے سے ہی مستحق رحمت ہیں، اگرچہ آپ درخواست بھی نہ کرتے اور اب تو آپ درخواست بھی کر رہے ہیں، پس ہم بشارتِ قبول دیتے ہیں کیونکہ آپ تو رحمت کے مستحق ہیں ہی، اور آپ کی قوم میں بھی جو مورد رحمت بنا چاہے وہ ایسے ہی اوصاف اختیار کرے تاکہ رحمت کی مستحق ہو جائے)۔

وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ كُلَّ شَیْءٍ: یعنی میری رحمت ہر چیز کو شامل ہے، آیت کے اس جملے سے بعض لوگوں نے استدلال کیا ہے کہ کفار بھی اخیر میں اللہ کی رحمت و مغفرت کے مستحق ہو کر جنت میں جائیں گے یہ استدلال باطل ہے، کیونکہ اس کے بعد والا جملہ: فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ الخ، ان کے استدلال کو باطل کرتا ہے جس میں ارشاد ہے کہ وہ رحمت ان لوگوں کے نام ضرور ہی لکھوں گا جو خدا سے ڈرتے ہیں، زکوۃ دیتے ہیں اور ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ رحمت خداوندی انجام کار صرف مؤمنین کے لیے ہے، کفار کے حق میں جنت کی خاص رحمت نہیں ہوگی۔

فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ: تقوی، زکوۃ، ایمان میں حصر مقصود نہیں، ہر باب کا ایک عمل نمونہ کے طور پر ذکر فرما دیا، مطلب یہ کہ احکام کی اطاعت کرتے ہیں، پھر جس درجہ کی اطاعت ہوگی اسی درجہ کی رحمت ہوگی۔

* * *

فائدہ: حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ شاید حضرت موسیٰ نے اپنی امت کے حق میں دنیا اور آخرت کی بھلائی جو مانگی، مراد یہ تھی کہ سب امتوں پر مقدم اور فائق رہیں دنیا اور آخرت میں، جواباً خدا تعالیٰ نے فرمایا کہ میرا عذاب اور رحمت کسی فرقہ پر مخصوص نہیں، سو عذاب تو اسی پر ہے جس کو اللہ چاہے اور رحمت عامہ سب مخلوق کو شامل ہے لیکن وہ رحمت خاص جو تم طلب کر رہے ہو، لکھی ہے ان کے نصیب میں جو اللہ کا ڈر رکھتے ہیں اور اموال میں زکوۃ ادا کرتے یا نفس کا تزکیہ کرتے ہیں اور خدا کی ساری باتوں پر یقین کامل رکھتے ہیں، یعنی آخری امت کہ سب کتابوں پر ایمان لائے گی، سو حضرت موسیٰ کی امت میں سے جو کوئی آخری کتاب پر یقین لائے وہ پہنچے اس نعمت کو اور حضرت موسیٰ کی دعا ان کو لگی۔

اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِیْلِ

وہ لوگ جو پیروی کرتے ہیں اس رسول کی جو نبی امی ہے [1] کہ جس کو پاتے ہیں لکھا ہوا اپنے پاس تورات اور انجیل میں [2]

یَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَیُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ وَیُحَرِّمُ عَلَیْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ

وہ حکم کرتا ہے انکو نیک کام کا اور منع کرتا ہے برے کام سے اور حلال کرتا ہے انکے لیے سب پاک چیزیں اور حرام کرتا ہے ان پر ناپاک چیزیں

وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ؕ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ

اور اتارتا ہے ان پر سے انکے بوجھ اور وہ قیدیں جو ان پر تھیں ۳ سو جو لوگ اس پر ایمان لائے اور اس کی رفاقت کی اور اس کی مدد کی

وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ؀

اور تابع ہوئے اس نور کے جو اس کے ساتھ اترا ہے ۴ وہی لوگ پہنچے اپنی مراد کو

خلاصہ تفسیر: پچھلی آیت میں موسیٰ علیہ السلام کی دعا کے جواب میں ارشاد ہوا تھا کہ یوں تو اللہ کی رحمت ہر ایک کے لئے وسیع ہے، لیکن کامل نعمت و رحمت کے مستحق وہی لوگ ہوں گے جو ایمان و تقوی اور زکوٰۃ وغیرہ کی مخصوص شرائط کو پورا کریں، اب آگے جملہ معترضہ کے طور پر جناب رسول اللہ ﷺ کے زمانہ مبارک کے اہل کتاب کو سنانے کے لیے ارشاد فرماتے ہیں کہ یہ تو معلوم ہو گیا کہ کامل رحمت کا مستحق وہی ہے جو کامل اطاعت کرے، اور اب نبوت محمدیہ کے زمانہ میں کامل اطاعت کا مصداق وہی لوگ ہیں جو آپ کی اطاعت کرتے ہیں، خاص طور پر جبکہ نبوت کے دیگر دلائل کے علاوہ تورات وانجیل میں آپ کی پیشین گوئی بھی موجود پاتے ہیں، تب تو اہل کتاب کو اطاعت نہ کرنے میں کوئی بھی عذر نہیں۔

جو لوگ ایسے رسول نبی امی کا اتباع کرتے ہیں جن کو وہ اپنے پاس تورات وانجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں (جن کی صفت یہ بھی ہے کہ) وہ ان کو نیک کاموں کا حکم فرماتے ہیں اور بری باتوں سے منع کرتے ہیں اور پاکیزہ چیزوں کو ان کے لئے حلال بتلاتے ہیں (اگرچہ وہ پہلی شریعتوں میں حرام تھیں) اور گندی چیزوں کو (بدستور) ان پر حرام فرماتے ہیں اور ان لوگوں پر جو (پہلی شریعتوں میں) بوجھ اور طوق (لدے ہوئے) تھے (یعنی سخت اور شدید احکام جن کا ان کو پابند کیا ہوا تھا) ان کو دور کرتے ہیں (یعنی ایسے سخت احکام جو پہلے تھے آپ کی شریعت میں منسوخ ہو جاتے ہیں) سو جو لوگ اس نبی پر ایمان لاتے ہیں اور ان کی حمایت کرتے ہیں اور ان کی مدد کرتے ہیں اور اس نور کا اتباع کرتے ہیں جو ان کے ساتھ بھیجا گیا ہے (یعنی قرآن) ایسے لوگ پوری فلاح پانے والے ہیں (کہ ابدی عذاب سے نجات پائیں گے)۔

اَلرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ: اُمی کے معنی یہ ہیں کہ جیسے آدمی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے کہ کسی کا شاگرد نہیں ہوتا، اسی طرح آپ نے عمر بھر پڑھنے لکھنے میں کسی کی شاگردی نہیں کی، پھر یہ علوم عالیہ اور باریک حقائق ظاہر فرمائے یہ کتنا بڑا کمال ہے۔

مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ: یہاں تورات وانجیل کو بطور خاص اس لیے ذکر کیا کہ وہ کتب شریعت سمجھی جاتی تھیں ورنہ آپ ﷺ کی بشارت تو زبور میں بھی تھی، واضح رہے کہ موجودہ تورات وانجیل محرف ہونے کے باوجود آپ ﷺ کے اوصاف اور بشارت سے خالی نہیں، اور اگر بشارتوں میں صرف اشارات اور علامتیں کافی نہیں بلکہ نام کی صراحت کی حاجت ہے تو اُس وقت کے اہل کتاب علماء کا ان آیتوں کو سن کر خاموش ہو جانا صراحت ہی کی دلیل ہے کہ اس وقت نام بھی ہوگا، ورنہ وہ لوگ اختلاف و معارضہ کرتے، اور وہ تاریخ میں منقول بھی ہوتا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تورات وانجیل کی تحریفیں بڑھتی گئیں۔

وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ: یعنی پاکیزہ چیزوں کو ان کے لیے حلال بتلاتے ہیں اگرچہ وہ پہلی شریعتوں میں حرام تھیں، حاصل یہ ہے کہ یہود پر بعض چیزیں خبیث ہونے کی وجہ سے حرام نہ تھیں، بلکہ ان کی شرارت اور سرکشی کی وجہ سے حرام ہو گئی تھیں، آپ کی شریعت میں پھر ان کے حلال وطیب ہونے کے مطابق عمل درآمد ہوا۔

* * *

فائدہ: ۱؎ اَلرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ: اُمّی یا تو "اُم" (بمعنی والدہ) کی طرف منسوب ہے، جس طرح بچہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے اور کسی کا شاگرد نہیں ہوتا، نبی کریم ﷺ نے ساری عمر کسی مخلوق کے سامنے زانوئے تلمذ تہ نہیں کیا، اس پر کمال یہ ہے کہ جن علوم و معارف اور حقائق و اسرار کا آپ نے افاضہ فرمایا، کسی مخلوق کا حوصلہ نہیں کہ اس کا عشر عشیر پیش کر سکے، پس "نبی امی" کا لقب اس حیثیت سے آپ کے لیے مایہ صد افتخار ہے،

اور یا اُمّی کی نسبت "ام القریٰ" کی طرف ہو جو مکہ معظمہ کا لقب ہے جو آپ کا مولد شریف تھا۔

فائدہ:۲ مَكْتُوبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْإِنْجِيلِ: یعنی آپ کی تشریف آوری کی بشارات اور نعوت وصفات کتب سماویہ سابقہ میں مذکور ہیں، حتیٰ کہ اس وقت سے لے کر آج تک ساڑھے تیرہ سو برس کی کاٹ چھانٹ کے بعد بھی موجودہ بائبل میں بہت سی بشارات واشارات پائے جاتے ہیں، جن کو ہر زمانہ کے علماء بحوالہ کتب دکھلاتے چلے آئے ہیں، وللہ الحمد علی ذلک۔

فائدہ:۳ وَالْأَغْلٰلَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ: یعنی یہود پر جو سخت احکام تھے اور کھانے کی چیزوں میں ان کی شرارتوں کی وجہ سے تنگی تھی فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ أُحِلَّتْ لَهُمْ (النساء:۱۶۰) اس دین میں وہ سب چیزیں آسان ہوئیں، اور جو ناپاک چیزیں مثلاً لحم خنزیر، یا گندی باتیں مثلاً سود خوری وغیرہ، انہوں نے حلال کر رکھی تھیں، ان کی حرمت اس پیغمبر نے ظاہر فرمائی، غرض ان سے بہت سے بوجھ ہلکے کر دیئے اور بہت سی قیدیں اٹھا دی گئیں، جیسا کہ حدیث میں فرمایا: "بُعِثْتُ بِالْحَنِيفِيَّةِ السَّمْحَةِ"۔

فائدہ:۴ وَاتَّبَعُوا النُّورَ الَّذِيٓ: نور سے مراد وحی ہے متلو ہو یا غیر متلو یعنی قرآن وسنت۔

قُلْ يٰٓأَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللّٰهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ

تو کہہ اے لوگوں میں رسول ہوں اللہ کا تم سب کی طرف جس کی حکومت ہے آسمانوں اور زمین میں

لَآ إِلٰهَ إِلَّا هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ فَاٰمِنُوا بِاللّٰهِ وَرَسُولِهِ النَّبِيِّ الْأُمِّيِّ الَّذِي يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ

کسی کی بندگی نہیں اس کے سوا وہی جلاتا ہے اور مارتا ہے، سو ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے بھیجے ہوئے نبی امی پر جو کہ یقین رکھتا ہے اللہ پر

وَكَلِمٰتِهِ وَاتَّبِعُوهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿۱۵۸﴾

اور اس کے سب کلاموں پر اور اس کی پیروی کرو تا کہ تم راہ پاؤ

خلاصہ تفسیر: پیچھے آنحضرت ﷺ کے چند خصوصی فضائل، کمالات اور علامتیں بیان ہوئیں، اب تمام لوگوں کو عام خطاب فرما کر سب کے اوپر آپ ﷺ کی اطاعت کا واجب ہونا بھی بتلاتے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ فلاح آخرت کے لئے ایمان کے ساتھ اتباع شریعت وسنت ضروری ہے۔

آپ کہہ دیجئے کہ اے (دنیا جہان کے) لوگو! میں تم سب کی طرف اس اللہ کا بھیجا ہوا (پیغمبر) ہوں جس کی بادشاہت ہے تمام آسمانوں اور زمین میں، اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، وہی زندگی دیتا ہے وہی موت دیتا ہے، اس لئے اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے نبی امی پر (بھی ایمان لاؤ) جو کہ (خود بھی) اللہ پر اور اس کے احکام پر ایمان رکھتے ہیں (یعنی جب اس عظیم رتبہ کے باوجود ان کو اللہ پر، سب رسولوں پر اور کتابوں پر ایمان لانے سے عار نہیں تو تم کو اللہ ورسول پر ایمان لانے سے کیوں انکار ہے) اور ان (نبی) کا اتباع کرو تا کہ تم راہ (راست) پر آ جاؤ۔

يٰٓأَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللّٰهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا: اس آیت سے آپ ﷺ کی عموم نبوت ثابت ہوئی، آپ کی نبوت کا عام ہونا قطعی دلائل سے ثابت ہے، اور لفظ يٰٓأَيُّهَا النَّاسُ میں عرف کے اعتبار سے جنات بھی اس میں داخل ہیں جیسے: فی صدور الناس من الجنة والناس میں کہا گیا ہے۔

فَاٰمِنُوا بِاللّٰهِ وَرَسُولِهِ النَّبِيِّ: رسول اور نبی میں چند فرق بیان کیے گئے ہیں، احقر قرآنی آیات سے یہ سمجھتا ہے کہ نبی صرف نوع بشر کے ساتھ خاص ہے، اور رسول فرشتوں کو بھی عام ہے، یہاں آپ ﷺ کے لیے یہ دونوں الفاظ بیان فرمانے سے تاکید مقصود ہے کہ آپ ﷺ نبی بھی ہیں اور رسول بھی ہیں۔

فائدہ: یعنی آپ کی بعثت تمام دنیا کے لوگوں کو عام ہے، عرب کے امیین یا یہود و نصاریٰ تک محدود نہیں، جس طرح خداوند تعالیٰ شہنشاہ مطلق ہے، آپ اس کے رسول مطلق ہیں، آپ ہدایت و کامیابی کی صورت بجز اس کے کچھ نہیں کہ اس جامع ترین عالمگیر صداقت کی پیروی کی جائے جو آپ لے کر آئے ہیں، یہ ہی پیغمبر ہیں، جن پر ایمان لانا تمام انبیاء و مرسلین اور تمام کتب سماویہ پر ایمان لانے کا مرادف ہے۔

وَمِنْ قَوْمِ مُوْسٰى اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ ﴿۱۵۹﴾

اور موسیٰ کی قوم میں ایک گروہ ہے جو راہ بتلاتے ہیں حق کی اور اسی کے موافق انصاف کرتے ہیں

خلاصہ تفسیر: (اب ان اہل کتاب کی تعریف ہے جو حضور ﷺ کے متبع تھے) اور (اگرچہ بعض لوگوں نے آپ کی مخالفت کی لیکن) قوم موسیٰ میں ایک جماعت ایسی بھی ہے جو دین حق (یعنی اسلام) کے موافق (لوگوں کو) ہدایت بھی کرتے ہیں اور اسی کے موافق (اپنے اور غیروں کے معاملات میں) انصاف بھی کرتے ہیں (مراد اس سے عبداللہ بن سلامؓ وغیرہ ہیں یعنی اہل کتاب کے علماء)۔

وَمِنْ قَوْمِ مُوْسٰى اُمَّةٌ: اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ آپ ﷺ کی نبوت جیسے دلائل و معجزات سے ثابت ہے اسی طرح اہل علم کی شہادتوں سے بھی اس کی تائید ہو چکی ہے۔

* * *

فائدہ: گو اکثر یہود سرکشی اور ناانصافی کی راہ اختیار کر رہے ہیں تاہم کچھ ایسی سعید روحیں بھی ہیں، جو دوسروں کو حق کی طرف دعوت دیتی ہیں اور بذات خود حق و انصاف کے راستوں پر گامزن ہیں، مثلاً عبداللہ بن سلامؓ وغیرہ۔

وَقَطَّعْنٰهُمُ اثْنَتَيْ عَشْرَةَ اَسْبَاطًا اُمَمًا ؕ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اِذِ اسْتَسْقٰىهُ قَوْمُهٗٓ

اور جدا جدا کر دیے ہم نے انکو بارہ دادوں کی اولاد بڑی بڑی جماعتیں [1] اور حکم بھیجا ہم نے موسیٰ کو جب پانی مانگا اس سے اس کی قوم نے

اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ۚ فَانْۢبَجَسَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ؕ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ

کہ مار اپنی لاٹھی اس پتھر پر، تو پھوٹ نکلے اس سے بارہ چشمے، پہچان لیا ہر قبیلہ نے

مَّشْرَبَهُمْ ؕ وَظَلَّلْنَا عَلَيْهِمُ الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا عَلَيْهِمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ؕ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ

اپنا گھاٹ، اور سایہ کیا ہم نے ان پر ابر کا اور اتارا ہم نے ان پر من اور سلویٰ، کھاؤ ستھری چیزیں

مَا رَزَقْنٰكُمْ ؕ وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۶۰﴾

جو ہم نے روزی دی تم کو، اور انہوں نے ہمارا کچھ نہ بگاڑا لیکن اپنا ہی نقصان کرتے رہے

خلاصہ تفسیر: پیچھے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ چل رہا تھا، درمیان میں ایک دوسرا ضروری مضمون مقام کی مناسبت سے آ گیا تھا، اب آگے پھر اسی قصہ کا تتمہ بیان کیا جاتا ہے۔

اور ہم نے (ایک انعام بنی اسرائیل پر یہ کیا کہ ان کی اصلاح و انتظام کے لئے) ان کو بارہ خاندانوں میں تقسیم کر کے سب کی الگ الگ جماعت مقرر کر دی (اور ہر ایک خاندان پر ایک سردار نگرانی کے لیے مقرر کر دیا، جن کا ذکر سورہ مائدہ کے تیسرے رکوع میں ہے: وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيْبًا) اور (ایک انعام یہ کہ) ہم نے موسیٰ کو حکم دیا جبکہ ان کی قوم نے ان سے پانی مانگا (اور انہوں نے حق تعالیٰ سے دعا کی، اس وقت یہ حکم

ہوا) کہ اپنے اس عصاء کو فلاں پتھر پر مارو (اس سے پانی نکل آئے گا) بس (مارنے کی دیر تھی) فوراً اس سے بارہ چشمے (ان بارہ خاندانوں کے عدد کے مطابق) پھوٹ نکلے (چنانچہ) ہر ہر شخص نے اپنے پانی پینے کا موقع معلوم کرلیا، اور (ایک انعام یہ کیا کہ) ہم نے ان پر ابر کو سایہ افگن کیا، اور (ایک انعام یہ کیا کہ) ان کو (خزانہ غیب سے) ترنجبین اور بٹیریں پہنچائیں (اور اجازت دی کہ) کھاؤ نفیس چیزوں سے جو کہ ہم نے تم کو دی ہیں (لیکن وہ لوگ اس میں بھی ایک بات خلاف حکم کر بیٹھے) اور (اس سے) انہوں نے ہمارا کوئی نقصان نہیں کیا، لیکن اپنا ہی نقصان کرتے تھے (یہ واقعات وادی تیہ کے ہیں جن کی تفصیل سورۃ بقرہ میں گزر چکی)۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی اصلاح وانتظام کے لیے ان کی بارہ جماعتیں جو بارہ دادوں کی اولاد تھی الگ الگ کردی گئیں تھیں، پھر ہر ایک جماعت کا ایک نقیب مقرر فرمادیا جو اس کی نگرانی اور اصلاح کا خیال رکھے وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيبًا (المائدہ: ۱۲)

وَإِذْ قِيلَ لَهُمُ اسْكُنُوا هَٰذِهِ الْقَرْيَةَ وَكُلُوا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ وَقُولُوا حِطَّةٌ وَادْخُلُوا

اور جب حکم ہوا ان کو کہ بسو اس شہر میں ۱ اور کھاؤ اس میں جہاں سے چاہو اور کہو ہم کو بخش دے اور داخل ہو

الْبَابَ سُجَّدًا نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطِيئَاتِكُمْ ۚ سَنَزِيدُ الْمُحْسِنِينَ ﴿١٦١﴾

دروازہ میں سجدہ کرتے ہوئے تو بخش دیں گے ہم تمہاری خطائیں، البتہ زیادہ دیں گے ہم نیکی کرنے والوں کو ۲۔

خلاصہ تفسیر: اور (وہ زمانہ یاد کرو) جب ان کو حکم دیا گیا کہ تم لوگ اس آبادی میں جا کر رہو، اور کھاؤ اس (کی چیزوں میں) سے جس جگہ تم رغبت کرو اور (یہ بھی حکم دیا گیا کہ جب اندر جانے لگو تو) زبان سے یہ کہتے جانا کہ توبہ ہے (توبہ ہے) اور (عاجزی سے) جھکے جھکے دروازے میں داخل ہونا ہم تمہاری (پچھلی) خطائیں معاف کردیں گے (یہ تو سب کے لیے ہوگا اور) جو لوگ نیک کام کریں گے ان کو مزید برآں اور دیں گے۔

* * *

فائدہ: ۱ اس شہر سے مراد اکثر نے "اریحاء" لیا ہے۔

فائدہ: ۲ یعنی ابھی ایک شہر فتح ہوا، آگے سارا ملک ملے گا کذا فی الموضح، یا یہ مطلب ہے کہ خطا معاف کر کے نیکو کاروں کے اجر وثواب بڑھائیں گے کذا فی عامۃ الکتب۔

فَبَدَّلَ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ قَوْلًا غَيْرَ الَّذِي قِيلَ لَهُمْ فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِجْزًا مِّنَ السَّمَاءِ

بدل ڈالا ظالموں نے ان میں سے دوسرا لفظ اس کے سوا جو ان سے کہہ دیا گیا تھا پھر بھیجا ہم نے ان پر عذاب آسمان سے

بِمَا كَانُوا يَظْلِمُونَ ﴿١٦٢﴾

ع ۵

بسبب ان کی شرارت کے

خلاصہ تفسیر: سو بدل ڈالا ان ظالموں نے ایک اور کلمہ جو خلاف تھا اس کلمہ کے جس (کے کہنے) کی ان سے فرمائش کی گئی تھی، اس پر ہم نے ان پر ایک آفت سماوی بھیجی، اس وجہ سے کہ وہ حکم کو ضائع کرتے تھے۔

* * *

فائدہ: یہ واقعات وادی تیہ کے ہیں جن کا بیان سورۃ بقرہ ربع پارہ الم [آیت: ۵۸] کے بعد گزر چکا، وہاں کے فوائد میں تفصیل ملاحظہ کی جائے۔

وَسۡـَٔلۡهُمۡ عَنِ الۡقَرۡيَةِ الَّتِىۡ كَانَتۡ حَاضِرَةَ الۡبَحۡرِ‌ۘ اِذۡ يَعۡدُوۡنَ فِى السَّبۡتِ اِذۡ تَاۡتِيۡهِمۡ

اور پوچھ ان سے حال اس بستی کا جو تھی دریا کے کنارے ا۔ جب حد سے بڑھنے لگے ہفتہ کے حکم میں جب آنے لگیں ان کے پاس

حِيۡتَانُهُمۡ يَوۡمَ سَبۡتِهِمۡ شُرَّعًا وَّيَوۡمَ لَا يَسۡبِتُوۡنَ‌ ۙ لَا تَاۡتِيۡهِمۡ‌ ‌ۛۚ كَذٰلِكَ‌‌ ‌ۛۚ نَبۡلُوۡهُمۡ

مچھلیاں ہفتہ کے دن پانی کے اوپر اور جس دن ہفتہ نہ ہو تو نہ آتی تھیں اس طرح ہم نے ان کو آزمایا

بِمَا كَانُوۡا يَفۡسُقُوۡنَ ﴿۱۶۳﴾

اس لیے کہ وہ نافرمان تھے ۲۔

خلاصہ تفسیر: یہاں موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کے بنی اسرائیل کے واقعات بیان ہوئے، اس رکوع کی اخیر آیت میں بھی آپ ہی کے زمانہ کا واقعہ مذکور ہے، یہاں درمیان میں بنی اسرائیل کے دوسرے اوقات کے حالات اور افعال بیان کیے جاتے ہیں۔

اور آپ ان (اپنے ہم عصر یہودی) لوگوں سے (بطور تنبیہ کے) اس بستی (والوں) کا جو کہ دریائے شور کے قریب آباد تھے (اس میں یہودی رہتے تھے جن کو ہفتہ کے روز شکار کرنا ممنوع تھا) اس وقت کا حال پوچھئے جب کہ وہ (وہاں کے بسنے والے) ہفتہ (کے متعلق جو انہیں حکم تھا اس) کے بارے میں حد (شرعی) سے نکل رہے تھے جب کہ ان کے ہفتہ کے روز تو ان (کے دریا) کی مچھلیاں (پانی سے سر نکال نکال) ظاہر ہو ہو کر (دریا کی سطح پر) ان کے سامنے آتی تھیں اور جب ہفتہ کا دن نہ ہوتا تو ان کے سامنے نہ آتی تھیں (بلکہ وہاں سے دور کہیں چلی جاتی تھیں، وجہ اس کی یہ تھی کہ) ہم ان کی اس طرح پر (شدید) آزمائش کرتے تھے (کہ کون حکم پر ثابت قدم رہتا ہے کون نہیں رہتا، اور یہ آزمائش) اس سبب سے (تھی) کہ وہ (پہلے سے) بے حکمی کیا کرتے تھے (اسی لئے ایسے سخت حکم سے ان کی آزمائش کی، ورنہ اہل اطاعت کی آزمائش میں لطف، توفیق اور تائید بھی ساتھ ساتھ ہوا کرتی ہے)۔

اِذۡ يَعۡدُوۡنَ فِى السَّبۡتِ: وہ لوگ ایک حیلہ سے شکار کرتے تھے، جو حیلہ انہوں نے اختیار کیا تھا اس میں مفسرین کے اقوال مختلف ہیں، اس کے متعلق کچھ مباحث سورہ بقرہ میں گزر چکے ہیں، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ شرعی احکام سے بچنے کے لیے حیلے بہانے کرنا بہت برا ہے، باقی بعض وہ حیلے جو فقہاء کی کتابوں میں موجود ہیں وہ شرعی احکام کے حصول کے لیے ہیں نہ کہ ان سے دور رہنے اور بچنے کے لیے۔

* * *

فائدہ: ا۔ یعنی اپنے زمانہ کے یہود سے بطور تنبیہ و توبیخ اس بستی میں رہنے والے یہود کا قصہ دریافت کیجئے جو داؤد علیہ السلام کے عہد میں پیش آیا، اکثر مفسرین کے نزدیک اس بستی سے شہر اَیلہ مراد ہے جو بحر قلزم کے کنارے مدین اور طور کے درمیان واقع تھا وہاں کے لوگ دریا کے قرب کی وجہ سے مچھلی کے شکار کی عادت رکھتے تھے۔

فائدہ: ۲۔ حق تعالیٰ نے یہود پر ہفتہ کے دن شکار کرنا حرام کیا تھا، باشندگان ایلہ کو عدول حکمی اور نافرمانی کی عادت تھی، خدا کی طرف سے سخت آزمائش ہونے لگی کہ ہفتہ کے دن دریا میں مچھلیوں کی بیحد کثرت ہوتی، جو سطح دریا کے اوپر تیرتی تھیں، باقی دنوں میں غائب رہتیں، ان لوگوں سے صبر نہ ہو سکا صریح حکم الٰہی کے خلاف حیلے کرنے لگے، دریا کا پانی کاٹ لائے، جب ہفتہ کے دن مچھلیاں ان کے بنائے ہوئے حوض میں آجاتیں تو نکلنے کا راستہ بند کر دیتے اور اگلے دن اتوار کو جا کر پکڑ لاتے تا کہ ہفتہ کے دن شکار کرنا صادق نہ آئے، گویا اس حرکت سے معاذ اللہ خدا کو دھوکا دینا چاہتے تھے، آخر دنیا ہی میں اس کی سزا بھگتی کہ مسخ کر کے ذلیل بندر بنا دیئے گئے، اس سے ظاہر ہوا کہ حیلہ سازی اور مکاری خدا کے آگے پیش نہیں جاتی۔

وَإِذْ قَالَتْ أُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُونَ قَوْمًا اللَّهُ مُهْلِكُهُمْ أَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا ط

اور جب بولا ان میں سے ایک فرقہ کیوں نصیحت کرتے ہو ان لوگوں کو جن کو اللہ چاہتا ہے کہ ہلاک کرے یا ان کو عذاب دے سخت ۱

قَالُوا مَعْذِرَةً إِلَىٰ رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ﴿۱۶۴﴾

وہ بولے الزام اتارنے کی غرض سے تمہارے رب کے آگے اور اس لیے کہ شاید وہ ڈریں ۲

خلاصہ تفسیر: اور (اس وقت کا حال پوچھئے) جب کہ ان میں سے ایک جماعت نے (جو کہ ان کو نصیحت کرتے کرتے اثر اور نفع ہونے سے مایوس ہو گئے تھے انہوں نے دوسری جماعت سے جو اب بھی نصیحت کئے چلے جا رہے تھے اور نفع سے بالکل مایوس نہ ہوئے تھے جیسا لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ سے معلوم ہوتا ہے) یوں کہا کہ تم ایسے لوگوں کو کیوں نصیحت کئے جاتے ہو جن (سے قبول کی کچھ امید نہیں اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان) کو اللہ تعالیٰ بالکل ہلاک کرنے والے ہیں یا (ہلاک نہ بھی ہوئے تو) ان کو (کوئی اور طرح کی) سخت سزا دینے والے ہیں (یعنی ایسوں کے ساتھ کیوں دماغ خالی کرتے ہو) انہوں نے جواب دیا کہ تمہارے (اور اپنے) رب کے روبرو عذر کرنے کے لئے (ان کو نصیحت کرتے ہیں کہ اللہ کے روبرو کہہ سکیں کہ اے اللہ! ہم نے تو کہا تھا مگر انہوں نے نہ سنا، ہم معذور ہیں) اور (نیز) اس لئے کہ شاید ڈر جائیں (اور عمل کرنے لگیں مگر وہ کب عمل کرتے تھے)۔

لِمَ تَعِظُونَ قَوْمًا اللَّهُ مُهْلِكُهُمْ: جب نصیحت کے اثر ہونے کی بالکل امید نہ رہے تو نصیحت کرنا واجب نہیں رہتا، اگرچہ عالی ہمتی یہی ہے کہ نصیحت جاری رکھی جائے، پس جن لوگوں نے یہ کہا تھا کہ **لم تعظون** الخ یعنی ایسے لوگوں کو کیوں نصیحت کرتے ہو، انہوں نے ناامیدی کی وجہ سے اسی پر عمل کیا کہ نصیحت کرنا واجب نہیں، اور دوسرے جو برابر نصیحت کرتے رہے ان کو یا تو ناامیدی نہیں ہوئی جیسا کہ ان کے قول **لعلهم یتقون** سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید یہ لوگ ڈر جائیں، یا عالی ہمتی کی شق کو انہوں نے اختیار کیا ہو، غرض دونوں فریق حق پر تھے، اور حضرت عکرمہؒ نے دونوں کے نجات پانے کو اس آیت سے استنباط کیا ہے اور حضرت ابن عباسؓ نے ان کی بات کو پسند کر کے ان کو انعام بھی دیا۔

خلاصہ یہ کہ جب کسی کو گناہوں سے روکنے یا نیکی کا حکم کرنے میں نفع کی امید نہ رہے تو اس وقت تبلیغ کا وجوب ساقط ہو جاتا ہے، لیکن کوئی شخص پھر بھی تبلیغ کرتا رہے کہ ہو سکتا ہے اس کو ہدایت مل جائے تو یہ بھی ٹھیک ہے، اسی طرح بعض حضرات کا یہ مزاج ہوتا ہے کہ جب نفع کی امید نہ ہو تو چپ ہو جاتے ہیں، اور بعض کوشش کرتے رہتے ہیں تو دونوں درست ہیں۔

* * *

فائدہ: ۱ معلوم ہوتا ہے کہ جب انہوں نے حکم الٰہی کے خلاف حیلہ بازی شروع کی تو شہر کے باشندے کئی قسموں پر منقسم ہو گئے جیسا کہ عموماً ایسے حالات میں ہوا کرتا ہے:

① ایک وہ لوگ جنہوں نے اس حیلہ کی آڑ لے کر صریح حکم الٰہی کی خلاف ورزی کی۔

② دوسرے نصیحت کرنے والے جو اخیر تک فہمائش اور امر بالمعروف میں مشغول رہے۔

③ تیسرے جنہوں نے ایک آدھ مرتبہ نصیحت کی پھر مایوس ہو کر اور ان کی سرکشی سے تھک کر چھوڑ دی۔

④ چوتھے وہ ہوں گے جو نہ اس عمل شنیع میں شریک ہوئے اور نہ منع کرنے کے لیے زبان کھولی، بالکل علیحدہ اور خاموش رہے۔

موخر الذکر دو جماعتوں نے انتھک نصیحت کرنے والوں سے کہا ہوگا کہ ان متمردین کے ساتھ کیوں مغز زنی کر کے دماغ کھپاتے ہو جن سے کوئی توقع قبول حق کی نہیں، ان کی نسبت تو معلوم ہوتا ہے کہ دو باتوں سے ایک بات ضرور پیش آنے والی ہے، یا خدا ان کو بالکل تباہ و ہلاک کر دے اور یا کسی سخت ترین عذاب میں مبتلا کرے، کیونکہ یہ لوگ اب کسی نصیحت پر کان دھرنے والے نہیں۔

فائدہ: ۲ یعنی شاید سمجھاتے رہنے سے کچھ ڈر جائیں اور اپنی حرکات شنیعہ سے باز آ جائیں، ورنہ کم از کم ہم پروردگار کے سامنے عذر تو

کرسکتے ہیں کہ خدایا ہم نے آخر دم نصیحت وفہمائش میں کوتاہی نہیں کی، یہ نہ مانے تو ہم پر اب کیا الزام ہے؟ گویا یہ ناصحین اول تو بالکلیہ مایوس نہ تھے، دوسرے "عزیمت" پر عمل کررہے تھے کہ مایوسی کے باوجود بھی ان کا تعاقب نہیں چھوڑتے۔

فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖٓ اَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْٓءِ وَاَخَذْنَا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا بِعَذَابٍۭ

پھر جب وہ بھول گئے اس کو جو ان کو سمجھایا تھا تو نجات دی ہم نے ان کو جو منع کرتے تھے برے کام سے اور پکڑا گنہگاروں کو برے

بَئِيْسٍۭ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۱۶۵﴾ فَلَمَّا عَتَوْا عَنْ مَّا نُهُوْا عَنْهُ قُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِئِيْنَ ﴿۱۶۶﴾

عذاب میں بسبب ان کی نافرمانی کے ۱؎ پھر جب بڑھنے لگے اس کام میں جس سے وہ روکے گئے تھے تو ہم نے حکم کیا کہ ہوجاؤ بندر ذلیل ۲؎

خلاصہ تفسیر: سو (آخر) جب وہ اس امر کے تارک ہی رہے جو ان کو سمجھایا جاتا تھا (یعنی نہ مانا) تو ہم نے ان لوگوں کو تو (عذاب سے) بچالیا جو اس بری بات سے منع کیا کرتے تھے (خواہ برابر منع کرتے رہے یا ناامید ہوکر مایوسی کی وجہ سے خاموش بیٹھ رہے دونوں کو نجات ہوئی) اور ان لوگوں کو جو کہ (مذکورہ حکم میں) زیادتی کرتے تھے ان کی (اس عدول حکمی کی وجہ سے) ایک سخت عذاب میں پکڑ لیا، یعنی جب وہ جس کام سے ان کو منع کیا گیا تھا اس میں حد سے نکل گئے (یہ تو تفسیر ہوئی حکم کے بھلا دینے کی، یعنی مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ) تو ہم نے ان کو (براہ قہر) کہہ دیا کہ تم بندر ذلیل بن جاؤ (یہ تفسیر ہوئی اس سخت عذاب کی یعنی: عذاب بئیس)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی جب ان نالائقوں نے تمام نصیحتوں کو بالکل ایسا بھلادیا گویا سنا ہی نہیں، تو ہم نے ناصحین کو بچا کر ظالمین کو سخت عذاب میں گرفتار کردیا، اَلَّذِيْنَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْٓءِ کا عموم الفاظ دلالت کرتا ہے کہ جو نصیحت سے تھک کر لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمًا الخ کہنے لگے اور جنہوں نے اخیر تک سلسلہ وعظ ونصیحت کا جاری رکھا، ان دونوں کو نجات ملی، صرف ظالم پکڑے گئے، یہ ہی عکرمہ سے منقول ہے اور ابن عباس نے ان کے فہم کی داد دی ہے۔

باقی جو لوگ اول سے آخر تک بالکل ساکت رہے، خدا نے بھی ان کے ذکر سے سکوت فرمایا، ابن کثیر نے خوب لکھا ہے: "فنص علی نجاة الناهين وَهَلَاكَ الظَّالِمِيْنَ وَسَكَتَ عن الساكتين لان الجزاء من جنس العمل فهم لا يستحقون مدحا فيمدحوا ولا ارتكبوا عظيما فيذموا" (ابن کثیر ۲ ۵۷۶) ورجع بعد ذلك قول عكرمة، والله اعلم۔

فائدہ: ۲؎ شاید پہلے اور عذاب آیا ہوگا، جب بالکل حد سے گزر گئے تب ذلیل بندر بنائے گئے، یا فَلَمَّا عَتَوْا الخ کو گزشتہ آیت فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ کی تفسیر قرار دیا جائے یعنی وہ عذاب بئیس یہ ہی بندر بنا دینا تھا، حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ: "منع کرنے والوں نے شکار والوں سے ملنا چھوڑ دیا اور بیچ میں دیوار اٹھائی، ایک دن صبح کو اٹھے تو دوسروں کی آواز نہ سنی، دیوار پر سے دیکھا، ہر گھر میں بندر تھے وہ آدمیوں کو پہچان کر اپنے قرابت والوں کے پاؤں پر سر رکھنے لگے اور رونے لگے، آخر برے حال سے تین دن میں مر گئے"۔

وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ يَّسُوْمُهُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ ط

اور اس وقت کو یاد کرو جب خبر کردی تھی تیرے رب نے کہ ضرور بھیجتا رہے گا یہود پر قیامت کے دن تک ایسے شخص کو کہ دیا کرے انکو برا عذاب ۱؎

اِنَّ رَبَّكَ لَسَرِيْعُ الْعِقَابِ ۖ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۶۷﴾

بیشک تیرا رب جلد عذاب کرنے والا ہے، اور وہ بخشنے والا مہربان ہے ۲؎

خلاصہ تفسیر: پیچھے بنی اسرائیل کے واقعات میں ان کی بہت سی قباحتوں کا ذکر بھی ہوا ہے، اب آگے ان قباحتوں کا برا انجام

مذکور ہے جو آخرت کے علاوہ دنیا میں بھی ظاہر ہوا۔

اور وہ وقت یاد کرنا چاہئے کہ جب آپ کے رب نے (بنی اسرائیل کے انبیا کی معرفت) یہ بات بتلادی کہ وہ ان یہود پر (ان کی گستاخیوں اور نافرمانیوں کی سزا میں) قیامت (کے قریب) تک ایسے (کسی نہ کسی) شخص کو ضرور مسلط کرتا رہے گا جو ان کو سزائے شدید (ذلت وخواری اور محکومیت) کی تکلیف پہنچاتا رہے گا (چنانچہ مدت سے یہودی کسی نہ کسی سلطنت کے محکوم ومقہور ہی چلے آتے ہیں) بلاشبہ آپ کا رب واقعی (جب چاہے) جلدی ہی سزا دے دیتا ہے، اور بلاشبہ وہ واقعی (اگر باز آجائے تو) بڑی مغفرت اور بڑی رحمت والا (بھی) ہے۔

یہودیوں کے ہمیشہ محکومیت کی حالت میں رہنے کے متعلق کچھ تفصیل پہلا پارہ سورہ بقرہ آیت ۶۱: وَضُرِبَتۡ عَلَيۡهِمُ الذِّلَّةُ وَالۡمَسۡكَنَةُ کی تفسیر میں گزر چکی ہے وہاں ملاحظہ فرمایئے۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی خدا کی طرف سے پختہ اعلان کر دیا گیا تھا کہ یہود اگر احکام تورات پر عمل کرنا چھوڑ دیں گے تو حق تعالیٰ قرب قیامت تک وقتاً فوقتاً ان پر ایسے لوگوں کو مسلط کرتا رہے گا جو ان کو برے عذاب میں مبتلا رکھیں گے، براعذاب یہاں محکومانہ زندگی کو فرمایا، چنانچہ قوم یہود کبھی یونانی اور کلدانی بادشاہوں کے زیر حکومت رہی، کبھی بخت نصر وغیرہ کے شدائد کا تختہ مشق بنی، آخر میں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے عہد مبارک تک مجوسیوں کی باجگذار رہی، پھر مسلمان حکمرانوں کو ان پر مسلط فرمادیا، غرض اس وقت سے آج تک ان کو من حیث القوم عزت وآزادی کی زندگی نصیب نہیں ہوئی، بلکہ جہاں کہیں رہے اکثر ملوک وحکام کی طرف سے سخت ذلت اور خطرناک تکلیفیں اٹھاتے رہے، ان کا مال و دولت وغیرہ کوئی چیز اس غلامی ومحکومیت کی لعنت سے نجات نہ دے سکی اور نہ قیامت تک دے سکے گی، آخر میں جب یہ لوگ دجال کے مددگار ہو کر تیغ کیے جائیں گے کما ورد فی الحدیث۔

فائدہ: ۲ یعنی جو شرارت سے باز نہ آئے، بعض اوقات اس پر جلدی دنیا ہی میں عذاب بھیجنا شروع کر دیتا ہے اور کیسا ہی کٹر مجرم توبہ کرلے اور نادم ہو کر خدا کی طرف رجوع ہو تو اس کی بخشش ورحمت بھی بے پایاں ہے معاف کرتے ہوئے بھی دیر نہیں لگتی۔

وَقَطَّعۡنٰهُمۡ فِی الۡاَرۡضِ اُمَمًا ۚ مِنۡهُمُ الصّٰلِحُوۡنَ وَمِنۡهُمۡ دُوۡنَ ذٰلِكَ ۫ وَبَلَوۡنٰهُمۡ بِالۡحَسَنٰتِ

اور متفرق کر دیا ہم نے ان کو ملک میں فرقے فرقے ۱ بعضے ان میں نیک اور بعضے اور طرح کے، اور ہم نے ان کی آزمائش کی خوبیوں

وَالسَّیِّاٰتِ لَعَلَّهُمۡ یَرۡجِعُوۡنَ ﴿۱۶۸﴾

اور برائیوں میں تاکہ پھر آئیں ۲

خلاصہ تفسیر: یہودیوں میں سے جو لوگ ان مذکورہ قباحتوں کے مرتکب نہ تھے اب اس آیت میں ان کا استثناء کرتے ہیں۔

اور ہم نے دنیا میں ان کی متفرق جماعتیں کر دیں (چنانچہ) بعض ان میں نیک (بھی) تھے اور بعض ان میں اور طرح کے تھے (یعنی برے تھے) اور ہم (نے ان بروں کو بھی اپنی عنایت اور تربیت واصلاح کے اسباب جمع کرنے کا ہمیشہ موقع دیا، مہمل نہیں چھوڑا، بلکہ ہمیشہ) ان کو خوش حالیوں (یعنی صحت وغنا) اور بدحالیوں (یعنی بیماری وفقر) سے آزماتے رہے کہ شاید (اسی سے) باز آجائیں (کیونکہ کبھی راحت سے نیک کاموں کی رغبت ہوجاتی ہے اور کبھی مصیبت میں برے کاموں سے خوف پیدا ہوجاتا ہے)۔

وَقَطَّعۡنٰهُمۡ فِی الۡاَرۡضِ اُمَمًا: اس سے معلوم ہوا کہ کسی قوم کا ایک جگہ اجتماع اور اکثریت اللہ تعالیٰ کا انعام واحسان ہے اور اس کا مختلف جگہوں میں منتشر ہوجانا ایک طرح کا عذاب الٰہی، مسلمانوں پر حق تعالیٰ کا یہ انعام ہمیشہ رہا ہے اور ان شاء اللہ تا قیامت رہے گا کہ وہ جس جگہ رہے ان کی ایک زبردست اجتماعی قوت وہاں پیدا ہوگئی، مدینہ طیبہ سے یہ سلسلہ شروع ہوا اور مشرق ومغرب میں اسی کیفیت کے ساتھ حیرت انگیز طریقہ پر پھیلا،

مشرق بعید میں، پاکستان، انڈونیشیا وغیرہ مستقل اسلامی حکومتیں اسی کے نتیجہ میں بنیں، اس کے بالمقابل یہودیوں کا حال ہمیشہ یہ رہا کہ مختلف ملکوں میں منتشر رہے، مالدار کتنے بھی ہوں مگر اقتدار و اختیار ان کے ہاتھ نہ آیا۔

چند سال سے فلسطین کے ایک حصہ میں یہودیوں کے اجتماع اور مصنوعی اقتدار سے دھوکہ نہ کھایا جائے، اجتماع تو ان کا اس جگہ میں آخری زمانہ میں ہونا ہی چاہئے تھا، کیونکہ صادق مصدوق رسول کریم ﷺ کی احادیث صحیحہ میں قرب قیامت کے لئے یہ خبر دی گئی ہے کہ آخر زمانہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نازل ہوں گے، نصاریٰ سب مسلمان ہو جائیں گے اور یہودیوں سے جہاد کر کے ان کو قتل کریں گے، خدا کا مجرم وارنٹ اور پولیس کے ذریعہ پکڑ کر نہیں بلایا جاتا بلکہ وہ تکوینی اسباب ایسے جمع کر دیتے ہیں کہ مجرم اپنے پاؤں چل کر ہزاروں کوششیں کر کے اپنی قتل گاہ پر پہنچتا ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول ملک شام دمشق میں ہونے والا ہے، یہودیوں کے ساتھ معرکہ بھی یہیں بننا ہے تاکہ عیسیٰ علیہ السلام کے لئے ان کا قلع قمع کر دینا سہل ہو، قدرت نے دنیا کی پوری عمر میں تو یہودیوں کو مختلف ملکوں میں منتشر رکھ کر محکومیت اور بے قدری کا عذاب چکھایا اور آخر زمانہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی آسانی کے لئے ان کو ان کے مقتل میں جمع فرما دیا اس لئے یہ اجتماع اس عذاب کے منافی نہیں۔

رہا ان کی موجودہ حکومت اور مصنوعی اقتدار کا قضیہ، سو یہاں ایک ایسا دھوکہ ہے جس پر آج کی مہذب دنیا نے اگرچہ بہت خوبصورت ملمع کا پردہ چڑھایا ہوا ہے، لیکن کوئی دنیا کی سیاست سے باخبر انسان ایک منٹ کے لئے بھی اس سے دھوکہ نہیں کھا سکتا، کیونکہ آج جس خطہ کو اسرائیل مملکت کا نام دیا جاتا ہے وہ درحقیقت روس، امریکہ اور انگلینڈ کی ایک مشترک چھاؤنی سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی، وہ محض ان حکومتوں کی امداد سے زندہ ہے اور ان کے تابع فرمان رہنے ہی میں اس کے وجود کا راز مضمر ہے، ظاہر ہے کہ اس حقیقی غلامی کو مجازی حکومت کا نام دے دینے سے اس قوم کو کوئی اقتدار حاصل نہیں ہو جاتا، قرآن کریم نے ان کے بارے میں تا قیامت رسوائی اور خواری کے جس عذاب کا ذکر کیا ہے وہ آج بھی بدستور موجود ہے جس کا ذکر اس سے پہلی آیت میں ان الفاظ کے ساتھ آیا ہے: وَاِذۡ تَاَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبۡعَثَنَّ عَلَيۡهِمۡ اِلٰى يَوۡمِ الۡقِيٰمَةِ مَنۡ يَّسُوۡمُهُمۡ سُوۡٓءَ الۡعَذَابِ، یعنی جب کہ آپ کے رب نے پختہ ارادہ کر لیا کہ ان لوگوں پر کسی ایسی طاقت کو قیامت تک مسلط کر دے گا جو ان کو برا عذاب چکھائے، جیسا کہ اول سلیمان علیہ السلام کے ہاتھ سے، پھر بخت نصر کے ذریعہ اور آخر میں رسول کریم ﷺ کے ہاتھ سے اور باقی ماندہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے ذریعہ ہر جگہ سے ذلت و خواری کے ساتھ ان کا نکالا جانا مشہور و معروف اور تاریخ کے مسلمات میں سے ہے۔

وَبَلَوۡنٰهُمۡ بِالۡحَسَنٰتِ وَالسَّيِّاٰتِ: یعنی ہم ان کو خوش حالیوں اور بدحالیوں سے آزماتے رہے، یہاں حسنات وسیئات سے ظاہری کشادگی و تنگی مراد ہے، چنانچہ جس طرح اللہ تعالیٰ ظاہری تنگی اور خوش حالی سے آزماتے ہیں اسی طرح کبھی باطنی تنگی اور خوش حالی سے بھی آزماتے ہیں، جیسے بعض لوگوں کو گناہ و معصیت کے ساتھ ساتھ بے خودی، ذوق و شوق اور اللہ کے ساتھ تعلق قائم رہتا ہے تو اس سے انسان کو دھوکہ لگ جاتا ہے کہ میں حق پر ہوں، حالانکہ وہ باطل پر ہوتا ہے، چنانچہ گناہ و غفلت کے ساتھ اگر بسط و کشادگی (ذوق و شوق) بھی جمع ہو جائیں تو یہ آزمائش اور ڈھیل ہوتی ہے جو خطرناک حالت شمار کی جاتی ہے اس سے دھوکہ نہیں کھانا چاہیے اور گناہوں کو فوراً چھوڑ دینا چاہیے، اسی طرح اگر نیکیوں کے باوجود ذوق و شوق، تعلق مع اللہ قائم نہ ہو رہا ہو اور نہ عبادت میں لطف و مزہ آ رہا ہو تو اس کے اندر بھی بندہ کو آزمایا جا رہا ہوتا ہے کہ یہ کتنا پکا ہے، کہیں چھوڑ کر بھاگ تو نہیں جائے گا۔

* * *

فائدہ: ۱ یہود کی دولت برہم ہوئی تو آپس کی مخالفت سے ہر طرف نکل گئے، کوئی اجتماعی قوت و شوکت نہ رہی اور مذہب مختلف پیدا ہوئے، یہ احوال اس امت کو عبرت کے لیے سنائے جا رہے ہیں۔

فائدہ: ۲ یعنی کچھ افراد ان میں نیک بھی تھے، مگر اکثریت کافروں اور فاسقوں کی تھی، ان اکثروں کے لیے بھی ہم رجوع و انابت الی اللہ کے موافق بہم پہنچاتے رہے، کبھی ان کو عیش و تنعم میں رکھا، کبھی سختی اور تکلیف میں مبتلا کیا کہ ممکن ہے احسان مان کر یا سختیوں سے ڈر کر توبہ کریں اور خدا کی طرف رجوع ہوں۔

فَخَلَفَ مِنۢ بَعۡدِهِمۡ خَلۡفٌ وَّرِثُوا الۡكِتٰبَ يَاۡخُذُوۡنَ عَرَضَ هٰذَا الۡاَدۡنٰى وَيَقُوۡلُوۡنَ سَيُغۡفَرُ لَنَا ۚ

پھر ان کے پیچھے آئے ناخلف جو وارث بنے کتاب کے لے لیتے ہیں اسباب اس ادنیٰ زندگانی کا اور کہتے ہیں کہ ہم کو معاف ہو جائے گا

وَاِنۡ يَّاۡتِهِمۡ عَرَضٌ مِّثۡلُهٗ يَاۡخُذُوۡهُ ؕ اَلَمۡ يُؤۡخَذۡ عَلَيۡهِمۡ مِّيۡثَاقُ الۡكِتٰبِ اَنۡ لَّا يَقُوۡلُوۡا عَلَى اللّٰهِ

اور اگر ایسا ہی اسباب ان کے سامنے پھر آئے تو اس کو لے لیویں ۱۔ کیا ان سے کتاب میں عہد نہیں لیا گیا کہ نہ بولیں اللہ پر

اِلَّا الۡحَقَّ وَدَرَسُوۡا مَا فِيۡهِ ؕ وَالدَّارُ الۡاٰخِرَةُ خَيۡرٌ لِّلَّذِيۡنَ يَتَّقُوۡنَ ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۱۶۹﴾

سوا سچ کے اور انہوں نے پڑھا ہے جو کچھ اس میں لکھا ہے، اور آخرت کا گھر بہتر ہے ڈرنے والوں کے لیے، کیا تم سمجھتے نہیں ۲۔

خلاصہ تفسیر: پیچھے گذشتہ یہودیوں کا حال بیان ہوا، اب آگے ان یہودیوں کی حالت مذکور ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں موجود تھے اور ان میں سے بھی اطاعت کرنے والوں کا اسی طرح استثناء کر دیا گیا جس طرح پچھلی آیت میں استثناء کیا تھا۔

(یہ حال تو ان کے سلف یعنی پچھلوں کا ہوا) پھر ان (سلف) کے بعد ایسے لوگ ان کے جانشین ہوئے کہ کتاب (یعنی تورات) کو (تو) ان سے حاصل کیا (لیکن اس کے ساتھ ہی حرام خور ایسے ہیں کہ احکام الٰہی کے بدلے میں) اس دنیائے دنی کا مال متاع (اگر کچھ ملے تو بے تکلف اس کو) لے لیتے ہیں (اور بے باک ایسے ہیں کہ اس گناہ کو حقیر سمجھ کر) کہتے ہیں کہ ہماری ضرور مغفرت ہو جائے گی (کیونکہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں، ہماری مقبولیت کے سامنے ایسے گناہ کیا چیز ہیں) حالانکہ (اپنی بے با کی اور گناہوں کو ہلکا سمجھنے پر جمے ہوئے ہیں حتیٰ کہ) اگر ان کے پاس (پھر) ویسا ہی (دین فروشی کے عوض) مال متاع آنے لگے تو (اسی بے با کی کے ساتھ پھر) اس کو لے لیتے ہیں (اور گناہوں کو ہلکا سمجھنا خود کفر ہے، جس پر مغفرت کا احتمال ہی نہیں، یقین تو کیا چیز ہے، چنانچہ آگے یہی ارشاد ہے کہ:) کیا ان سے اس کتاب کے اس مضمون کا عہد نہیں لیا گیا کہ خدا کی طرف بجز حق (اور واقعی) بات کے اور کسی بات کی نسبت نہ کریں (مطلب یہ ہے کہ جب کسی آسمانی کتاب کو مانا جاتا ہے تو اس کے معنی یہی ہوتے ہیں کہ ہم اس کے سب مضامین مانیں گے) اور (یہ عہد بھی کوئی اجمالی عہد نہیں لیا گیا، بلکہ تفصیلی عہد لیا گیا تھا، چنانچہ) انہوں نے اس کتاب میں جو کچھ (لکھا) تھا اس کو پڑھ (بھی) لیا (جس سے یہ احتمال بھی جاتا رہا کہ شاید ان کو اس خاص مضمون کا تورات میں ہونا معلوم نہ ہو، پھر بھی یہ ایسی بڑی بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ باوجود گناہوں کو ہلکا سمجھنے کے مغفرت کا اعتقاد کئے ہوئے ہیں جو کہ اللہ تعالیٰ پر محض تہمت ہے) اور (انہوں نے یہ سب قصہ دنیا کے لئے کیا، باقی) آخرت والا گھر ان لوگوں کے لئے (اس دنیا سے) بہتر ہے جو (ان برے اور قبیح عقائد و اعمال سے) پرہیز رکھتے ہیں، پھر کیا (اے یہود!) تم (اس بات کو) نہیں سمجھتے۔

وَاِنۡ يَّاۡتِهِمۡ عَرَضٌ مِّثۡلُهٗ يَاۡخُذُوۡهُ: یعنی اگر ان کے پاس ویسا ہی دین فروشی کے عوض مال متاع آنے لگے تو اس کو لے لیتے ہیں، روح المعانی میں ہے کہ یہی حال ہمارے زمانے کے بہت سے صوفیوں کا ہے، شہوات ولذات دنیاوی پر پروانوں کی طرح گرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارے لیے یہ بات نقصان دہ نہیں، اس لیے کہ ہم واصل باللہ ہو چکے ہیں، اور بعضوں کے بارے میں یہ بھی سنا گیا ہے کہ وہ خالص حرام کھاتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ نفی و اثبات (لا الہ الا اللہ) کا ذکر اس نقصان کو دور کر دیتا ہے، یہ صریح گمراہی ہے، اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے، آمین، چنانچہ کوئی شخص اگر سلوک کے اندر داصل بھی ہو جائے یعنی بہت آگے چلا جائے پھر بھی وہ شریعت کے خلاف نہیں چل سکتا کہ حلال و حرام کی تمیز نہ کرے اور شہوات پر عمل کرے وغیرہ۔

* * *

فائدہ: ۱۔ یعنی اگلوں میں تو کچھ صالحین بھی تھے پچھلے ایسے ناخلف ہوئے کہ جس کتاب (تورات شریف) کے وارث وحامل بنے تھے، دنیا کا تھوڑا اسامان لے کر اس کی آیات میں تحریف وکتمان کرنے لگے اور رشوتیں لے کر احکام تورات کے خلاف فیصلے دینے لگے، پھر اس پر ستم ظریفی دیکھئے کہ ایسے نالائق اور پاجیانہ حرکات کا ارتکاب کرتے ہوئے یہ عقیدہ اور دعویٰ رکھتے ہیں کہ ان باتوں سے ہم کو مضرت کا کچھ اندیشہ نہیں، ہم تو خدا کی اولاد اور اس کے محبوب ہیں، کچھ بھی کریں وہ ہماری بے اعتدالیوں سے ضرور درگزر کرے گا، اسی عقیدہ کی بناء پر تیار رہتے ہیں کہ آئندہ جب موقع ہو پھر رشوت لے کر اسی طرح کی بے ایمانی کا اعادہ کریں، گویا بجائے اس کے کہ گزشتہ حرکات پر نادم ہوتے اور آئندہ کے لیے عزم رکھتے کہ ایسی حرکات کا اعادہ نہ کریں گے، مگر اللہ سے مامون ہو کر ان ہی شرارتوں اور بے ایمانیوں کے اعادہ کا عزم رکھتے ہیں، اس سے زیادہ حماقت اور بے حیائی کیا ہوگی؟

فائدہ: ۲۔ یعنی تورات میں جو عہد لیا گیا تھا کہ: ''خدا کی طرف سچ کے سوا کسی چیز کی نسبت نہ کریں''، کیا وہ انہیں معلوم نہیں جو اس کی کتاب اور احکام میں قطع وبرید کر کے اس پر افتراء کرنے لگے، حالانکہ ''کتاب اللہ'' (تورات) کو یہ لوگ پڑھتے پڑھاتے ہیں، پھر کیسے کہا جاسکتا ہے کہ اس کا مضمون انہیں معلوم نہیں یا یاد نہیں رہا، حقیقت وہی ہے کہ دنیا کی فانی متاع کے عوض انہوں نے دین وایمان بیچ ڈالا اور آخرت کی تکلیف و راحت سے آنکھیں بند کر لیں، اتنا نہ سمجھے کہ جو لوگ خدا سے ڈرتے اور تقویٰ کی راہ اختیار کرتے ہیں ان کے لیے آخرت کا گھر اور وہاں کا عیش وتنعم دنیا کی خوشحالی سے کہیں بہتر اور فائق ہے، کاش کہ اب بھی انہیں عقل آجائے۔

وَالَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ؕ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُصْلِحِيْنَ ﴿۱۷۰﴾

اور جو لوگ خوب پکڑ رہے ہیں کتاب کو اور قائم رکھتے ہیں نماز کو، بیشک ہم ضائع نہ کریں گے ثواب نیکی والوں کا

خلاصہ تفسیر: اور (ان میں سے) جو لوگ کتاب (یعنی تورات) کے پابند ہیں (جس میں رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے کا بھی حکم ہے، پس تورات کی پابندی یہی ہے کہ مسلمان ہوگئے) اور (عقائد کے ساتھ اعمال صالحہ کے بھی پابند ہیں، چنانچہ) نماز کی پابندی کرتے ہیں، ہم ایسے لوگوں کا جو اپنی (اس طرح) اصلاح کریں ثواب ضائع نہ کریں گے۔

* * *

فائدہ: یعنی توبہ اور اصلاح حال کا دروازہ اب بھی کھلا ہے جو لوگ شریروں کی راہ چھوڑ کر تورات کی اصلی ہدایات کو تھامے رہیں اور اسی کی ہدایت وپیشین گوئی کے موافق اس وقت قرآن کریم کا دامن مضبوط پکڑے رہیں اور خدا کی بندگی (نماز وغیرہ) کا حق ٹھیک ٹھیک ادا کریں، غرض اپنی اور دوسروں کی اصلاح پر متوجہ ہوں، خدا ان کی محنت ضائع نہ کرے گا وہ بلاشبہ اپنی محنت کا میٹھا پھل چکھیں گے۔

وَاِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ وَّظَنُّوْٓا اَنَّهٗ وَاقِعٌۢ بِهِمْ ۚ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ

اور جس وقت اٹھایا ہم نے پہاڑ ان کے اوپر مثل سائبان کے اور ڈرے کہ وہ ان پر گرے گا، ہم نے کہا پکڑو جو ہم نے تم کو دیا ہے زور سے

وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۱﴾ ع

اور یاد رکھو جو اس میں ہے تاکہ تم بچتے رہو

خلاصہ تفسیر: اور وہ وقت بھی قابل ذکر ہے جب ہم نے پہاڑ کو اٹھا کر چھت کی طرح ان (بنی اسرائیل) کے اوپر (محاذات میں) معلق کر دیا اور ان کو یقین ہوا کہ اب ان پر گرا، اور (اس وقت) کہا کہ (جلدی) قبول کرو جو کتاب ہم نے تم کو دی ہے (یعنی تورات، اور) مضبوطی کے ساتھ (قبول کرو) اور یاد رکھو جو احکام اس (کتاب) میں ہیں جس سے توقع ہے کہ تم متقی بن جاؤ۔

وَإِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ: یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ قرآن کریم کا عام اعلان ہے: لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ یعنی دین میں جبر واکراہ نہیں کہ کسی کو زبردستی دین حق کے قبول کرنے پر مجبور کیا جائے، اور اس واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کو دین کے قبول کرنے پر مجبور کیا گیا؟ لیکن ذرا غور کیا جائے تو فرق کھلا ہوا ہے کہ کسی غیر مسلم کو اسلام کے قبول کرنے پر کبھی کہیں مجبور نہیں کیا گیا، لیکن جو شخص مسلمان ہو کر اسلامی عہد و میثاق کا پابند ہو گیا اس کے بعد وہ اگر احکام اسلام کی خلاف ورزی کرنے لگے تو اس پر ضرور جبر کیا جائے گا اور خلاف ورزی کی صورت میں سزا دی جائے گی، اسلامی تعزیرات میں بہت سی سزائیں ایسے لوگوں کے لئے مقرر ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ: لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ کا تعلق غیر مسلموں سے ہے کہ ان کو جبرا مسلمان نہیں بنایا جائے گا، اور بنی اسرائیل کے اس واقعہ میں کسی کو اسلام قبول کرنے کے لئے مجبور نہیں کیا گیا، بلکہ ان لوگوں نے مسلمان ہونے کے باوجود احکام تورات کی پابندی سے انکار کر دیا، اس لئے ان پر جبر واکراہ کر کے پابندی کرنا: لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ کے خلاف نہیں۔

یہاں چھت کے ساتھ تشبیہ سر کے اوپر ہونے میں دی ہے معلق ہونے میں نہیں، اور ایسی ہی ایک آیت سورہ بقرہ آیت ۶۳: وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ میں گزر چکی ہے کچھ تفصیل وہاں ملاحظہ فرمایئے۔

* * *

فائدہ: یعنی جو ”میثاق الکتاب“ (عہد واقرار) انہیں یاد دلایا جا رہا ہے، وہ ایسے اہتمام سے لیا گیا تھا کہ پہاڑ اٹھا کر ان کے سروں پر لٹکا دیا گیا اور کہا گیا کہ جو کچھ تم کو دیا جا رہا ہے (تورات وغیرہ) اسے پوری مضبوطی اور عزم سے تھامو اور جو نصیحتیں کی گئیں انہیں ہمیشہ یاد رکھو ورنہ بصورت انکار سمجھ لو کہ خدا تم پر یہ پہاڑ گرا کر ہلاک کر سکتا ہے، اس قدر اہتمام اور تخویف وتاکید سے جو قول وقرار لیا گیا تھا، افسوس ہے وہ بالکل فراموش کر دیا گیا، یہ ”رفع جبل“ کا قصہ سورۃ بقرہ [آیت: ۶۳] میں ربع پارہ الم کے بعد گزر چکا ہے، ملاحظہ فرما لیا جائے۔

وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ

اور جب نکالا تیرے رب نے بنی آدم کی پیٹھوں سے ان کی اولاد کو اور اقرار کرایا ان سے ان کی جانوں پر کیا میں نہیں ہوں

بِرَبِّكُمْ ۭ قَالُوْا بَلٰى ۚ شَهِدْنَا ۚ اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ ﴿۱۷۲﴾

تمہارا رب، بولے ہاں ہے، ہم اقرار کرتے ہیں، کبھی کہنے لگو قیامت کے دن ہم کو تو اس کی خبر نہ تھی

خلاصہ تفسیر: سورۃ اعراف کی گذشتہ آیت میں ان معاہدات کا ذکر تھا جو بنی اسرائیل سے احکام تورات کی پابندی کے سلسلے میں لئے گئے تھے، مذکورہ آیت میں اس عالمگیر معاہدہ کا بیان ہے جو تمام اولاد آدم سے اس عالم دنیا میں آنے سے بھی پہلے ازل میں لیا گیا جو عام زبانوں پر ”عہد الست“ کے نام سے معروف ومشہور ہے، اس بیان سے بڑا مقصود توحید کو ثابت کرنا ہے کہ تم سے اس کا عہد بھی لیا گیا تھا اور اس کے ضمن میں مسئلہ رسالت بھی ثابت ہے، کیونکہ اس کی خبر رسول ہی کے ذریعہ سے ہوئی اور اسی عہد میں کہہ دیا گیا تھا کہ میرے رسول تم کو یہ عہد یاد دلائیں گے۔

(ان سے اس وقت کا واقعہ ذکر کیجئے) جب کہ آپ کے رب نے (عالم ارواح میں آدم علیہ السلام کی پشت سے تو ان کی اولاد کو اور) اولاد آدم کی پشت سے ان کی اولاد کو نکالا اور (ان کو سمجھ عطا کر کے) ان سے انہی کے متعلق اقرار لیا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ سب نے (اس عقل خدا داد سے حقیقت امر کو سمجھ کر) جواب دیا کہ کیوں نہیں! (واقعی آپ ہمارے رب ہیں، حق تعالیٰ نے وہاں جتنے ملائکہ اور مخلوقات حاضر تھے سب کو گواہ کر کے سب کی طرف سے فرمایا) ہم سب (اس واقعہ کے) گواہ بنتے ہیں (اور یہ اقرار اور گواہی سب اس لئے ہوئی) تا کہ تم لوگ (یعنی جو تم میں توحید کو ترک کرنے اور شرک اختیار کرنے پر سزا پائیں) قیامت کے روز یوں نہ کہنے لگو کہ ہم تو اس (توحید) سے محض بے خبر تھے۔

وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ: امام مالک، ابوداؤد، ترمذی اور امام احمد نے بروایت مسلم بن یسار نقل کیا ہے کہ کچھ لوگوں نے حضرت فاروق اعظمؓ سے اس آیت کا مطلب پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ سے اس آیت کا مطلب پوچھا گیا تھا، آپ

صلی اللہ علیہ وسلم سے جو جواب میں نے سنا ہے وہ یہ ہے کہ: ''اللہ تعالیٰ نے پہلے آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا، پھر اپنا دست قدرت ان کی پشت پر پھیرا تو ان کی پشت سے جو نیک انسان پیدا ہونے والے تھے وہ نکل آئے تو فرمایا کہ ان کو میں نے جنت کے لئے پیدا کیا ہے اور یہ جنت ہی کے کام کریں گے، پھر دوسری مرتبہ ان کی پشت پر دست قدرت پھیرا تو جتنے گناہ گار بدکردار انسان ان کی نسل سے پیدا ہونے والے تھے ان کو نکال کھڑا کیا اور فرمایا کہ ان کو میں نے دوزخ کے لئے پیدا کیا ہے اور یہ دوزخ میں جانے ہی کے کام کریں گے، صحابہ میں سے ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ! جب پہلے ہی جنتی اور دوزخی متعین کردیئے تو پھر عمل کس مقصد کے لئے کرایا جاتا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کو جنت کے لئے پیدا فرماتے ہیں تو وہ اہل جنت ہی کے کام کرنے لگتا ہے یہاں تک کہ اس کا خاتمہ کسی ایسے ہی کام پر ہوتا ہے جو اہل جنت کا کام ہے، اور جب اللہ تعالیٰ کسی کو دوزخ کے لئے بناتے ہیں تو وہ دوزخ ہی کے کام میں لگ جاتا ہے، یہاں تک کہ اس کا خاتمہ بھی کسی ایسے ہی کام پر ہوتا ہے جو اہل جہنم کا کام ہے''، مطلب یہ ہے کہ جب انسان کو معلوم نہیں کہ وہ کس طبقہ میں داخل ہے تو اس کو اپنی توانائی اور قدرت واختیار ایسے کاموں میں خرچ کرنا چاہئے جو اہل جنت کے کام ہیں اور یہی امید رکھنا چاہئے کہ وہ انہی میں سے ہوگا۔

اور امام احمد کی روایت میں یہی مضمون بروایت حضرت ابوالدرداءؓ منقول ہے، اس میں اتنا اور اضافہ ہے کہ پہلی مرتبہ جو لوگ آدم علیہ السلام کی پشت سے نکلے وہ سفید رنگ کے تھے جن کو اہل جنت فرمایا، اور دوسری مرتبہ سیاہ رنگ کے تھے جن کو اہل جہنم قرار دیا اور ترمذی میں یہی مضمون بروایت ابوہریرہؓ منقول ہے، اس میں یہ بھی ہے کہ اس طرح قیامت تک پیدا ہونے والی اولاد آدم جو ظہور میں آئی ان میں سے ہر ایک کی پیشانی پر ایک خاص قسم کی چمک تھی۔

اب غور طلب یہ ہے کہ ان احادیث میں تو ذریت کو آدم علیہ السلام کی پشت سے لینے اور نکالنے کا ذکر ہے اور قرآن کریم کے الفاظ میں بنی آدم یعنی اولاد آدم کی پشت سے نکالنا مذکور ہے، تطبیق اس کی یہ ہے کہ آدم علیہ السلام کی پشت سے ان لوگوں کو نکالا گیا جو بلاواسطہ آدم علیہ السلام سے پیدا ہونے والے تھے، پھر ان کی نسل کی پشت سے دوسروں کو اور اسی طرح جس ترتیب سے اس دنیا میں اولاد آدم پیدا ہونے والی تھی اسی ترتیب سے ان کو پشتوں سے نکالا گیا، حدیث میں سب کو حضرت آدم علیہ السلام کی پشت سے نکالنے کا مطلب بھی یہی ہے کہ آدم علیہ السلام سے ان کی اولاد کو، پھر اس اولاد سے ان کی اولاد کو ترتیب وار پیدا کیا گیا، قرآن مجید میں اس سب ذریت آدم سے اپنی ربوبیت کا اقرار لینے میں اس کی طرف بھی اشارہ پایا جاتا ہے کہ یہ ذریت آدم جو اس وقت پشتوں سے نکالی گئی تھی صرف ارواح نہیں تھیں، بلکہ روح اور جسم کا ایسا مرکب تھا جو جسم کے لطیف ترین ذرات سے بنایا گیا تھا، کیونکہ ربوبیت اور تربیت کی ضرورت زیادہ تر وہیں ہوتی ہے جہاں جسم وروح کا مرکب ہو اور جس کو ایک حال سے دوسرے حال کی طرف ترقی کرنا ہو، ارواح کی یہ شان نہیں وہ تو اول سے آخر تک ایک ہی حال پر ہوتی ہیں، اس کے علاوہ احادیث مذکورہ میں جو ان کے رنگ سفید وسیاہ مذکور ہیں یا ان کی پیشانی کی چمک مذکور ہے اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ صرف روح بلاجسم نہیں تھی ورنہ روح کا تو کوئی رنگ نہیں ہوتا، جسم ہی کے ساتھ یہ اوصاف متعلق ہوتے ہیں۔

اَلَسۡتُ بِرَبِّكُمۡ ؕ قَالُوۡا بَلٰى ۛۚ شَهِدۡنَا: عہد ازل کے متعلق چند سوال وجواب قابل غور ہیں:

① پہلا سوال یہ کہ عہد واقرار کس جگہ اور کس وقت لیا گیا؟ اس کے متعلق مفسر قرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے جو روایت بسند قوی امام احمد، نسائی اور حاکم نے نقل کی ہے، وہ یہ ہے کہ یہ عہد واقرار اس وقت لیا گیا جب آدم علیہ السلام کو جنت سے زمین پر اتارا گیا، اور مقام اس اقرار کا وادی نعمان ہے جو میدان عرفات کے نام سے معروف ومشہور ہے۔

② دوسرا سوال یہ کہ قیامت تک پیدا ہونے والے سارے انسان ایک جگہ میں کس طرح سما گئے؟ جواب یہ ہے کہ حضرت ابوالدرداءؓ کی حدیث مذکور میں اس کی بھی تصریح ہے کہ اس وقت جو ذریت پشت آدم علیہ السلام سے نکالی گئی تھی وہ اپنے اس ڈیل ڈول کے ساتھ نہیں تھی جس میں وہ دنیا میں آئیں گے، بلکہ چھوٹی چیونٹی کے جثہ میں تھی، اور سائنس کی اس ترقی کے زمانہ میں تو کسی سمجھدار انسان کو کوئی اشکال اس میں ہونا ہی نہیں چاہئے کہ اتنے بڑے ڈیل ڈول کا انسان ایک چیونٹی کے جثہ میں کیسے ظاہر ہوا، آج تو ایٹم کے اندر تمام نظام شمسی کے موجود ہونے کا تجربہ کیا جارہا ہے، فلم کے ذریعہ بڑی

سے بڑی چیز کو ایک نقطہ کی مقدار دکھلایا جاسکتا ہے، اس لئے یہ کیا مشکل ہے کہ حق تعالیٰ نے اس عہد و میثاق کے وقت تمام بنی آدم کو بہت چھوٹے جثہ میں وجود عطا فرمایا ہو۔

③ تیسرا سوال یہ کہ جب اقرار اس حال میں لیا گیا کہ آدم علیہ السلام کے سوا کوئی دوسرا انسان پیدا بھی نہ ہوا تھا تو ان کو یہ عقل وعلم کیسے حاصل ہوا کہ وہ اللہ تعالیٰ کو پہچانیں اور اس کے رب ہونے کا اقرار کریں؟ کیونکہ ربوبیت کا اقرار وہ کرسکتا ہے جس نے شان تربیت کا مشاہدہ کیا ہو اور یہ مشاہدہ اس دنیا میں پیدا ہونے کے بعد ہی ہوسکتا ہے؟ یعنی یہ نئی مخلوق جس کو ابھی وجود عنصری بھی پوری طرح عطا نہیں ہوا وہ کیا سمجھ سکتے ہیں کہ ہمارا کوئی پیدا کرنے والا اور پروردگار ہے، ایسی حالت میں ان سے سوال کرنا بھی ایک قسم کی ناقابل برداشت تکلیف ہے، اور وہ جواب بھی کیا دے سکتے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ خالق کائنات جس کی قدرت کاملہ نے تمام انسانوں کو ایک ذرہ کی صورت میں پیدا فرمایا اس کے لئے یہ کیا مشکل ہے کہ اس نے ان کو عقل وفہم اور شعور وادراک بھی اس وقت بقدر ضرورت دے دیا ہو، اور یہی حقیقت ہے کہ اللہ جل شانہ نے اس مختصر وجود میں انسان کے تمام قویٰ کو جمع فرمادیا تھا جن میں سب سے بڑی قوت عقل وشعور کی ہے جیسے چیونٹی کو اپنی ضروریات کی سمجھ ہوتی ہے۔

④ یہاں ایک چوتھا سوال یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ ازلی عہد و پیمان کتنا ہی یقینی اور صحیح کیوں نہ ہو، مگر کم از کم یہ تو سب کو معلوم ہے کہ اس دنیا میں آنے کے بعد یہ عہد کسی کو یاد نہیں رہا تو پھر عہد کا فائدہ کیا ہوا؟ اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ ہم حق تعالیٰ کی حکمتوں کے احاطہ کا دعویٰ نہیں کرتے، کوئی حکمت یقیناً ہوگی جس کی تعیین ہمارے ذمہ ضروری نہیں ہے، دوسرے یہ بھی کہنا ممکن ہے کہ اب جو عقل کے نزدیک توحید ایک فطری امر ہے کہ ذرا انصاف سے تامل کیا جائے تو سمجھ میں آجاتی ہے، نیز ہر شخص کے دل میں حق تعالیٰ کی طرف ایک فطری میلان ہے، ممکن ہے کہ یہ اسی عہد کا اثر ہو، اگر وہ عہد نہ ہوتا تو شاید ایسی سہولت نہ ہوتی، جیسے کوئی حساب سیکھ کر بھول جائے اور دوبارہ سیکھنے میں بہت آسانی ہوتی ہے، پھر اسی عہد پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ رسولوں کے ذریعہ سے اس کی یاد دہانی ہوتی رہی، چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ میرے رسول تم کو یہ عہد یاد دلاتے رہیں گے اور اگرچہ اب وہ عہد یاد نہیں رہا مگر اس کا مضمون فطری ہوگیا ہے، پھر انبیاء نے اس کی یاد دہانی کرادی ہے، اس مجموعہ سے عذر ختم کرنے کے لیے وہ کافی حجت ہے۔

عام لوگوں کے سمجھنے کی بات یہ ہے کہ بہت سے کام ایسے ہوتے ہیں جو بالخاصہ اثر رکھتے ہیں، چاہے وہ کام کسی کو یاد رہے یا نہ رہے، بلکہ اس کی خبر بھی نہ ہو مگر وہ اپنا اثر چھوڑ جاتے ہیں، یہ عہد و اقرار بھی ایسی ہی حیثیت رکھتا ہے کہ دراصل اس اقرار نے ہر انسان کے دل میں معرفت حق کا ایک بیج ڈال دیا جو پرورش پا رہا ہے، چاہے اس کو خبر ہو یا نہ ہو، اور اسی بیج کے پھل پھول ہیں کہ ہر انسان کی فطرت میں حق تعالیٰ کی محبت وعظمت پائی جاتی ہے، وہ چند بدنصیب لوگ جن کی فطرت ہی مسخ ہو کر ان کا عقلی ذائقہ خراب ہوگیا اور میٹھے کڑوے کی پہچان جاتی رہی ان کے علاوہ باقی ساری دنیا کے اربوں انسان اللہ تعالیٰ کی دھن اور خیال اور عظمت سے خالی نہیں، رسول کریم ﷺ کا ارشاد ہے: "کلّ مولود یولد علی الفطرة"، یعنی ہر پیدا ہونے والا دین فطرت یعنی اسلام پر پیدا ہوتا ہے پھر اس کے ماں باپ اس کو دوسرے خیالات میں مبتلا کر دیتے ہیں، اور صحیح مسلم کی ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے بندوں کو حنیف یعنی ایک خدا کا ماننے والا پیدا کیا ہے پھر شیاطین ان کے پیچھے لگ گئے اور ان کو اس صحیح راستہ سے دور لے گئے۔

اسی طرح بالخاصہ اثر رکھنے والے بہت سے اعمال واقوال ہیں جو اس دنیا میں بھی انبیاء علیہم السلام کی تعلیم سے جاری ہیں جن کا اثر یہ ہے کہ ان کو کوئی سمجھے یا نہ سمجھے اور یاد رکھے یا نہ رکھے وہ بہرحال اپنا کام کرتے اور اپنا اثر دکھلاتے ہیں، مثلاً بچہ پیدا ہونے کے ساتھ ہی اس کے داہنے کان میں اذان اور بائیں کان میں اقامت وتکبیر کہنے کی جو سنت، ہر مسلمان جانتا ہے اور الحمد للہ پورے عالم اسلام میں جاری ہے، اگرچہ بچہ نہ کلمات کے معنی سمجھتا ہے نہ اس کو بڑا ہونے کے بعد یاد رہتا ہے کہ میرے کان میں کیا الفاظ کہے گئے تھے، اس کی حکمت یہی تو ہے کہ اس کے ذریعہ اس اقرار ازلی کو قوت پہنچا کر کانوں کی راہ سے دل میں ایمان کی تخم ریزی کی جاتی ہے، اور اسی کا یہ اثر مشاہدہ کیا جاتا ہے کہ بڑا ہونے کے بعد اگرچہ یہ اسلام اور اسلامیات سے کتنا ہی دور ہوجائے مگر اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے اور مسلمانوں کی فہرست سے الگ ہونے کو انتہائی برا سمجھتا ہے، اسی طرح جو لوگ قرآن کی زبان نہیں جانتے ان کو بھی تلاوت قرآن کا حکم شاید اسی حکمت پر مبنی ہے کہ اس سے بھی کم از کم یہ مخفی فائدہ ضرور پہنچ جاتا ہے کہ انسان کے قلب میں نور ایمان تازہ ہوجاتا ہے۔

اسی لئے آخر آیت میں ارشاد فرمایا: اَنْ تَقُوْلُوْا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِیْنَ یعنی یہ اقرار ہم نے اس لئے لیا ہے کہ تم قیامت کے دن یوں نہ کہنے لگو کہ ہم تو اس سے غافل تھے، اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ اس ازلی سوال وجواب سے تمہارے دلوں میں ایمان کی بنیاد ایسی قائم ہوگئی کہ ذرا بھی غور وفکر سے کام لو تو اللہ جل شانہ کی ربوبیت کے اعتراف کے سوا کوئی چارہ نہ رہے گا۔

⑤ یہاں پانچواں سوال یہ ہے کہ اس عہد میں توحید کو کیوں خاص کیا گیا؟ تو شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ توحید کا تعلق ایک غائب ذات سے ہے اس لیے اس کا فطرت کے قریب بنانا ضروری تھا، حضرت ذوالنون مصریؒ سے کسی نے سوال کہ عہد الست آپ کو یاد ہے فرمایا: "کانه الان فی اذنی" کہ یہ عہد ومیثاق مجھے ایسا یاد ہے گویا اس وقت کان میں آواز آرہی ہے، اور بعض نے تو یہاں تک کہا ہے کہ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ جس وقت یہ اقرار لیا گیا میرے آس پاس کون کون لوگ موجود تھے، ہاں! یہ ظاہر ہے کہ ایسے افراد شاذ ونادر کے درجہ میں ہیں۔

اَوْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اَشْرَكَ اٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا ذُرِّیَّةً مِّنْۢ بَعْدِهِمْ ۚ

یا کہنے لگو کہ شرک تو نکالا تھا ہمارے باپ دادوں نے ہم سے پہلے اور ہم ہوئے انکی اولاد انکے پیچھے

اَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُوْنَ ﴿۱۷۳﴾

تو کیا تو ہم کو ہلاک کرتا ہے اس کام پر جو کیا گمراہوں نے ۔[1]

خلاصہ تفسیر: یا (قیامت کے روز تم) یوں کہنے لگو کہ (اصل) شرک تو ہمارے بڑوں نے کیا تھا اور ہم تو ان کے بعد ان کے نسل میں ہوئے (اور عادۃً عقائد وخیالات میں نسل اپنی اصل کے تابع ہوتی ہے، اس لئے ہم بے قصور ہیں، پس ہمارے فعل پر تو ہم کو سزا ہو نہیں سکتی، اگر ہم کو سزا ہوگی تو لازم آتا ہے کہ ان بڑوں کی خطا میں ہم ماخوذ ہوں) سو کیا ان غلط راہ (نکالنے) والوں کے فعل پر آپ ہم کو ہلاکت میں ڈالے دیتے ہیں (سو اب اس اقرار وگواہی کے بعد تم یہ عذر نہیں پیش کر سکتے، پھر اس کے بعد ان سب سے وعدہ کیا گیا کہ یہ عہد تم کو دنیا میں پیغمبروں کے ذریعہ سے یاد دلایا جائے گا، چنانچہ ایسا ہی ہوا، جیسا یہاں بھی اول میں وَاِذْ اَخَذَ کے ترجمہ سے معلوم ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس واقعہ کے ذکر کا حکم ہوا)۔

* * *

فائدہ: [1] "میثاق خاص" کے بعد یہاں سے "میثاق عام" کا ذکر کرتے ہیں، تمام عقائد حقہ اور ادیان سماویہ کا بنیادی پتھر یہ ہے کہ انسان خدا کی ہستی اور ربوبیت عامہ پر اعتقاد رکھے، مذہب کی ساری عمارت اسی سنگ بنیاد پر کھڑی ہوتی ہے، جب تک یہ اعتقاد نہ ہو، مذہبی میدان میں عقل و فکر کی راہنمائی اور انبیاء ومرسلین کی ہدایات کچھ نفع نہیں پہنچا سکتیں، اگر پورے غور وتامل سے دیکھا جائے تو آسمانی مذہب کے تمام اصول وفروع بالآخر خدا کی "ربوبیت عامہ" کے اسی عقیدہ پر منتہی ہوتے بلکہ اسی کی تہ میں لپٹے ہوئے ہیں، عقل سلیم اور وحی والہام اسی اجمال کی شرح کرتے ہیں پس ضروری تھا کہ یہ تخم ہدایت جسے کل آسمانی تعلیمات کا مبداء ومنتہی اور تمام ہدایات ربانیہ کا وجود مجمل کہنا چاہیے، عام فیاضی کے ساتھ نوع انسانی کے تمام افراد میں بکھیر دیا جائے تا کہ ہر آدمی عقل وفہم اور وحی والہام کی آبیاری سے اس تخم کو شجر ایمان وتوحید کے درجہ تک پہنچا سکے، اگر قدرت کی طرف سے قلوب بنی آدم میں ابتداء یہ تخم ریزی نہ ہوتی اور اس کی سب سے زیادہ اساسی وجوہری عقدہ کا حل ناخن عقل وفکر کے سپرد کر دیا جاتا، تو یقیناً یہ مسئلہ بھی منطقی استدلال کی بھول بھلیاں میں پھنس کر ایک نظری مسئلہ بن کر رہ جاتا، جس پر سب تو کیا اکثر آدمی بھی متفق نہ ہو سکتے جیسا کہ تجربہ بتلاتا ہے کہ فکر واستدلال کی ہنگامہ آرائیاں اکثر اتفاق سے زیادہ اختلاف آراء پر منتج ہوتی ہیں، اس لیے قدرت نے جہاں غور وفکر کی قوت اور نور وحی والہام کے قبول کرنے کی استعداد بنی آدم میں ودیعت فرمائی، وہیں اس اساسی عقیدہ کی تعلیم سے ان کو فطرۃً بہرہ ور کیا جس کے اجمال میں کل آسمانی ہدایات کی تفصیل منطوی ومندمج تھی اور جس کے بدوں مذہب کی عمارت کا کوئی ستون کھڑا نہیں رہ سکتا، یہ اسی ازلی اور خدائی تعلیم کا اثر ہے کہ آدم کی اولاد ہر قرن اور ہر گوشہ میں حق تعالیٰ کی ربوبیت عامہ کے عقیدہ پر کسی نہ کسی حد تک متفق رہی ہے، اور جن معدود افراد نے کسی عقلی وروحی بیماری کی وجہ سے اس عام فطری احساس کے خلاف آواز

بلند کی ہے وہ انجام کار دنیا کے سامنے بلکہ خود اپنی نظر میں بھی اسی طرح جھوٹے ثابت ہوئے، جیسے ایک بخار وغیرہ کا مریض لذیذ اور خوشگوار غذاؤں کو تلخ اور بدمزہ بتلانے میں جھوٹا ثابت ہوتا ہے، بہرحال ابتدائے آفرینش سے آج تک ہر درجہ اور طبقہ کے انسانوں کا خدا کی ربوبیت کبریٰ پر عام اتفاق و اجماع اس کی زبردست دلیل ہے کہ یہ عقیدہ عقول وافکار کی دوا دوش سے پہلے ہی فاطر حقیقی کی طرف سے اولاد آدم کو بلاواسطہ تلقین فرمادیا گیا ورنہ فکرو استدلال کے راستہ سے ایسا اتفاق پیدا ہو جانا تقریباً ناممکن تھا۔

قرآن کریم کی یہ امتیازی خصوصیت ہے کہ اس نے آیات حاضرہ میں عقیدہ کی اس فطری یکسانیت کے اصلی راز پر روشنی ڈالی، بلاشبہ ہم کو یاد نہیں کہ اس بنیادی عقیدہ کی تعلیم کب اور کہاں اور کس ماحول میں دی گئی، تاہم جس طرح ایک لیکچرار اور انشاء پرداز کو یقین ہے کہ ضرور اس کو ابتدائے عمر میں کسی نے الفاظ بولنے سکھلائے، جس سے ترقی کر کے آج اس رتبہ کو پہنچا، گو پہلا لفظ سکھلانے والا اور سکھلانے کے وقت، مکان اور دیگر خصوصیات مقامی بلکہ نفس سکھلانا بھی یاد نہیں، تاہم اس کے موجودہ آثار سے یقین ہے کہ ایسا واقعہ ضرور ہوا ہے، اسی طرح بنی نوع انسان کا علیٰ اختلاف الاقوام والاجیال "عقیدہ ربوبیت الٰہی" پر متفق ہونا اس کی کھلی شہادت ہے کہ یہ چیز بدءِ فطرت میں کسی معلم کے ذریعہ سے ان تک پہنچی ہے، باقی تعلیمی خصوصیات و احوال کا محفوظ نہ رہ سکنا اس کی تسلیم میں خلل انداز نہیں ہو سکتا، اسی ازلی وفطری تعلیم نے جس کا نمایاں اثر آج تک انسانی سرشت میں موجود چلا آتا ہے، ہر انسان کو خدا کی حجت کے سامنے ملزم کر دیا ہے، جو شخص اپنے الحاد و شرک کو حق بجانب قرار دینے کے لیے غفلت، بے خبری یا آباؤ اجداد کی کورانہ تقلید کا عذر کرتا ہے، اس کے مقابلہ پر خدا کی یہی حجت قاطعہ جس میں اصل فطرت انسانی کی طرف توجہ دلائی گئی ہے، بطور فیصلہ کن جواب کے پیش کی جا سکتی ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ: "اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کی پشت سے ان کی اولاد اور ان سے ان کی اولاد نکالی، سب سے اقرار کروایا اپنی خدائی کا، پھر پشت میں داخل کیا، اس سے مدعا یہ ہے کہ خدا کے رب مطلق ماننے میں ہر کوئی آپ کفایت کرتا ہے، باپ کی تقلید نہ چاہیے، اگر باپ شرک کرے بیٹے کو چاہیے ایمان لاوے، اگر کسی کو شبہ ہو کہ وہ عہد تو یاد نہیں رہا پھر کیا حاصل؟ تو یوں سمجھے کہ اس کا نشان ہر کسی کے دل میں ہے اور ہر زبان پر مشہور ہو رہا ہے کہ سب کا خالق اللہ ہے سارا جہان قائل ہے اور جو کوئی منکر ہے یا شرک کرتا ہے سو اپنی عقل ناقص کے دخل سے، پھر آپ ہی جھوٹا ہوتا ہے"۔

وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَلَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۱۷۴﴾

اور یوں ہم کھول کر بیان کرتے ہیں باتیں تا کہ وہ پھر آئیں

خلاصہ تفسیر: اور (آخر میں پھر اس یاددہانی کو جتلاتے ہیں کہ) ہم اسی طرح (اپنی) آیات کو صاف صاف بیان کرتے ہیں (تا کہ ان کو اس عہد کا ہونا معلوم ہو جائے) اور تا کہ (معلوم ہونے کے بعد شرک وغیرہ سے) وہ باز آجائیں۔

* * *

فائدہ: موضح القرآن میں ہے کہ: "یہ قصہ یہود کو سنایا کہ وہ بھی عہد سے پھرے ہیں جیسے مشرک پھرتے ہیں"۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِيْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ﴿۱۷۵﴾

اور سنا دے ان کو حال اس شخص کا جس کو ہم نے دی تھیں اپنی آیتیں پھر وہ ان کو چھوڑ نکلا پھر اس کے پیچھے لگا شیطان تو وہ ہو گیا گمراہوں میں

خلاصہ تفسیر: اب بنی اسرائیل کے ایک بڑے عالم اور مشہور مقتدا کا ایک عبرت ناک قصہ مذکور ہے، اس واقعہ کی پچھلی آیتوں سے مناسبت یہ ہے کہ ان میں عہد و میثاق کا ذکر تھا جو ازل میں حق تعالیٰ نے تمام بنی آدم سے اور پھر خاص خاص حالات میں خاص خاص اقوام یہود و نصاریٰ وغیرہ سے لئے تھے، اور پیچھے اس کا بھی ذکر آیا تھا کہ عہد کرنے والوں میں بہت سے لوگ اس عہد پر قائم نہیں رہے، اب آگے احکام کے علم ہونے کے بعد اس کی خلاف ورزی کرنے والے کی مثال بیان فرماتے ہیں۔

اور ان لوگوں کو (عبرت کے واسطے) اس شخص کا حال پڑھ کر سنائیے کہ اس کو ہم نے اپنی آیتیں دیں (یعنی احکام کا علم دیا) پھر وہ ان

(آیتوں) سے بالکل ہی نکل گیا، پھر شیطان اس کے پیچھے لگ گیا، سو وہ گمراہ لوگوں میں داخل ہو گیا۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِيْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا: درمنثور میں اس شخص کی تعیین میں کئی اقوال لکھے ہیں، ایک یہ کہ وہ بلعم بن باعور ہے اور یہی زیادہ مشہور ہے، بعض نے امیہ بن صلت اور بعض نے ابن راہب معروف بہ ابو عامر جس کے لیے مسجد ضرار بنی تھی کہا ہے، اور قتادہ کا قول یہ ہے کہ کوئی شخص مراد نہیں، بلکہ جو دین حق کو چھوڑنے والا ہو وہی مراد ہے، اور میرے نزدیک ان اقوال میں کچھ تعارض نہیں، عام اور خاص سب کا مراد لینا صحیح ہے، اور اس مضمون میں دونوں طرح کے آدمی داخل ہیں، جنہوں نے حق قبول نہیں کیا وہ بھی اور جو حق قبول کر کے پھر گئے وہ بھی۔

فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ: یہاں تین باتیں مذکور ہیں: ① احکام سے نکل جانا ② شیطان کا پیچھے لگ جانا ③ تیسرے گمراہی، بظاہر ترتیب کا تقاضہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ شیطان کا پیچھے لگ جانا گمراہی اور احکام سے نکلنے پر مقدم ہوتا، کیونکہ پہلے شیطان پیچھے پڑتا ہے، پھر اس سے گمراہی شروع ہوتی ہے، پھر بڑھتے بڑھتے بالکل احکام سے نکل جاتا ہے، مگر یہاں فَاَتْبَعَهُ سے مطلق پیچھے پڑنا مراد نہیں، اور ظاہر ہے کہ یہ درجہ یعنی شیطان کا ہمیشہ کے لیے پیچھے لگ جانا احکام کے چھوڑنے کے بعد ہی ہوتا ہے۔

محدث طیبیؒ سے نقل کیا گیا ہے کہ جو شخص اس مثال میں غور کرے گا اسے یہ بات یقین کے ساتھ معلوم ہو جائے گی کہ علماء سوء (بدعمل عالم) اس سے زیادہ بدتر حالت میں ہیں کہ مال وجاہ اور دنیاوی لذتوں میں کھپے ہوئے ہیں، اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ جو شخص سیدھے رستے سے ہٹتا ہے اس پر وبال یہ ہوتا ہے کہ وہ پست اور سفلی طبیعت کی طرف مائل ہو جاتا ہے اور خواہشات نفسانی پر عمل کرنے لگتا ہے اور اہل اللہ کی شان میں گستاخی اور زبان درازی کرنے لگتا ہے۔

وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ ۚ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۚ

اور ہم چاہتے تو بلند کرتے اس کا رتبہ ان آیتوں کی بدولت لیکن وہ تو ہو رہا زمین کا اور پیچھے ہولیا اپنی خواہش کے، تو اس کا حال ایسا جیسے کتا

اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ

اس پر تو بوجھ لادے تو ہانپے اور چھوڑ دے تو ہانپے، یہ مثال ہے ان لوگوں کی جنہوں نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو

فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۱۷۶﴾

سو بیان کر یہ احوال تا کہ وہ دھیان کریں ؎

خلاصہ تفسیر: اور اگر ہم چاہتے تو اس کو ان آیتوں (کے مطالبہ پر عمل کرنے) کی بدولت بلند مرتبہ کر دیتے (یعنی اگر وہ ان آیتوں پر عمل کرتا جس کا قضاء وقدر سے وابستہ ہونا معلوم بات ہے تو اس ارتبہ قبول بڑھتا) لیکن وہ تو دنیا کی طرف مائل ہو گیا اور (اس میلان کے سبب) اپنی نفسانی خواہش کی پیروی کرنے لگا (اور آیات واحکام پر عمل کرنا چھوڑ دیا) سو (آیات کو چھوڑ کر جو پریشانی اور دائمی ذلت اس کو نصیب ہوئی اسکے اعتبار سے) اسکی حالت کتے کی سی ہوگئی کہ اگر تو اس پر حملہ کرے (اور مار کر نکال دے) تب بھی ہانپے، یا اسکو (اس کی حالت) پر چھوڑ دے تب بھی ہانپے (غرض کسی حالت میں اسکو راحت نہیں، اسی طرح یہ شخص ذلت میں تو کتے کے مشابہ ہو گیا اور پریشانی میں کتے کی اس صفت میں شریک ہوا، پس جیسی اس شخص کی حالت ہوئی) یہی حالت (عام طور پر) ان لوگوں کی ہے جنہوں نے ہماری آیتوں کو (جو کہ توحید ورسالت پر دلالت کرتی ہیں) جھٹلایا (کہ حق واضح ہونے کے بعد محض خواہش پرستی کے سبب حق کو ترک کرتے ہیں) سو آپ اس حال کو بیان کر دیجئے شاید وہ لوگ (اسکو سن کر) کچھ سوچیں۔

* * *

فائدہ: لے اکثر مفسرین کے نزدیک یہ آیات بلعم بن باعوراء کے حق میں نازل ہوئیں جو ایک عالم اور صاحب تصرف درویش تھا، بعدہ اللہ کی آیات اور ہدایات کو چھوڑ کر عورت کے اغواء اور دولت کے لالچ سے حضرت موسیٰ کے مقابلہ میں اپنے تصرفات چلانے اور ناپاک تدبیریں بتلانے کے لیے تیار ہو گیا، آخر موسیٰ علیہ السلام کا تو کچھ نہ بگاڑ سکا خود مردود ابدی بنا، آیات اللہ کا جو علم بلعم کو دیا گیا تھا، اگر خدا چاہتا تو اس کے ذریعہ سے بہت بلند مراتب پر اس کو فائز کر دیتا، اور یہ جب ہی ہو سکتا تھا کہ اسے اپنے علم پر چلنے اور آیات اللہ کا اتباع کرنے کی توفیق ہوتی لیکن ایسا نہ ہوا کیونکہ وہ خود آسمانی برکات و آیات سے منہ موڑ کر زمینی شہوات ولذات کی طرف جھک پڑا، وہ نفسانی خواہشات کے پیچھے چل رہا تھا اور شیطان اس کا پیچھا (تعاقب) کرتا جا رہا تھا، حتیٰ کہ پکے کجرووں اور گمراہوں کی قطار میں جا داخل ہوا، اس وقت اس کا حال کتے کی طرح ہو گیا جس کی زبان باہر لٹکی ہو اور برابر ہانپ رہا ہو اگر فرض کرو اس پر بوجھ لا دیں یا ڈانٹ بتلائیں یا کچھ نہ کہیں آزاد چھوڑ دیں، بہر صورت ہانپتا اور زبان لٹکائے رہتا ہے، کیونکہ طبعی طور پر دل کی کمزوری کی وجہ سے گرم ہوا کے باہر پھینکنے اور سرد و تازہ ہوا کے اندر کھینچنے پر بسہولت قادر نہیں ہے۔

اسی طرح سفلی خواہشات میں منہ مارنے والے کتے کا حال ہوا کہ اخلاقی کمزوری کی وجہ سے ''آیات اللہ'' کا دیا جانا اور نہ دیا جانا یا تنبیہ کرنا اور نہ کرنا دونوں حالتیں اس کے حق میں برابر ہو گئیں سَوَآءٌ عَلَيۡهِمۡ ءَاَنۡذَرۡتَهُمۡ اَمۡ لَمۡ تُنۡذِرۡهُمۡ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ (البقرۃ:٦) حرص دنیا سے اس کی زبان باہر لٹک پڑی اور ترک آیات کی نحوست سے بدحواسی اور پریشانی خاطر کا نقشہ برابر ہانپتے رہنے کی مثال میں ظاہر ہوا، ممکن ہے کہ بلعم کی باطنی و معنوی کیفیت ظاہر کرنے کے لیے صرف ایک مثال کے طور پر یہ مضمون: اِنۡ تَحۡمِلۡ عَلَيۡهِ يَلۡهَثۡ اَوۡ تَتۡرُكۡهُ يَلۡهَثۡ ذکر کیا گیا ہو اور ہو سکتا ہے کہ دنیا یا آخرت میں اس کے لیے یہ سزا تجویز کی گئی ہو کہ ظاہری و حسی طور پر کتے کی طرح زبان باہر نکل پڑے اور ہمیشہ پریشان و بدحواس اور خوف زدہ آدمی کی طرح ہانپتا رہے، العیاذ باللہ، آیات کی شان نزول کچھ ہو، بہر حال ایسے ہوا پرستوں کا انجام بتلایا گیا ہے جو حق کے قبول کرنے یا پوری طرح سمجھ لینے کے بعد محض دنیاوی طمع اور سفلی خواہشات کی پیروی میں احکام الٰہیہ کو چھوڑ کر شیطان کے اشاروں پر چلنے لگیں، اور خدا کے عہد و میثاق کی کچھ پروا نہ کریں، گویا یہود کو بھی متنبہ فرما دیا کہ صرف کتاب کا علم کچھ نافع نہیں ہو سکتا جب تک صحیح معنی میں اس کا اتباع نہ ہو مَثَلُ الَّذِيۡنَ حُمِّلُوا التَّوۡرٰىةَ ثُمَّ لَمۡ يَحۡمِلُوۡهَا كَمَثَلِ الۡحِمَارِ يَحۡمِلُ اَسۡفَارًا (الجمعہ:٥) علمائے سوء کے لیے ان آیات میں بڑا اعبرتناک سبق ہے اگر دھیان کریں۔

سَآءَ مَثَلَاۨ الۡقَوۡمُ الَّذِيۡنَ كَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِنَا وَاَنۡفُسَهُمۡ كَانُوۡا يَظۡلِمُوۡنَ ﴿١٧٧﴾

بری مثال ہے ان لوگوں کی کہ جھٹلایا انہوں نے ہماری آیتوں کو اور وہ اپنا ہی نقصان کرتے رہے

خلاصہ تفسیر: (حقیقت میں) ان لوگوں کی حالت بھی بری حالت ہے جو ہماری (توحید و رسالت پر دلالت کرنے والی) آیات کو جھٹلاتے ہیں اور (اس جھٹلانے سے) وہ اپنا (ہی) نقصان کرتے ہیں۔

* * *

فائدہ: مشرکین وغیرہم کے رد میں جا بجا قرآن نے عنکبوت، ذباب، مکڑی، مکھی وغیرہ کی مثالیں بیان فرمائی ہیں مگر ان لوگوں کی مثال ایسی بری ہے کہ کوئی غیرت مند آدمی حتی المقدور اس کو اپنے پر چسپاں نہیں ہونے دے گا، اور جو بے حیا غدار اپنے احوال پر چسپاں ہونے دیتا ہے وہ صرف اپنا ہی نقصان کرتا ہے۔

مَنۡ يَّهۡدِ اللّٰهُ فَهُوَ الۡمُهۡتَدِىۡ ۚ وَمَنۡ يُّضۡلِلۡ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡخٰسِرُوۡنَ ﴿١٧٨﴾

جس کو اللہ راستہ دے وہ ہی راستہ پاوے، اور جس کو وہ بچلا دے سو وہی ہیں ٹوٹے میں

خلاصہ تفسیر: اوپر گمراہوں کی حالت بیان فرمائی کہ ہدایت واضح ہونے کے باوجود پھر بھی عناد و خلاف کو نہیں چھوڑتے، چونکہ ان کے اس عناد و خلاف سے رسول اللہ ﷺ کو سخت غم ہوتا تھا اس لیے آگے آپ کی تسلی کا مضمون ہے۔

جس کو اللہ تعالیٰ ہدایت کرتا ہے سو ہدایت پانے والا وہی ہوتا ہے اور جس کو گمراہ کردے سو ایسے ہی لوگ (ابدی) خسارہ میں پڑ جاتے ہیں (پھر ان سے ہدایت کی توقع کرنا اور ہدایت نہ ہونے سے مغموم ہونا بیکار ہے)۔

❁ ❁ ❁

فائدہ: علم وفضل بھی انسان کو جب ہی کام دیتا ہے کہ خدا کی ہدایت و دستگیری سے علم صحیح کے موافق چلنے کی توفیق ہو، جسے وہ سیدھے راستہ پر چلنے کے لیے موافق نہ کرے تو کتنی ہی بڑی علمی فضیلت وقابلیت رکھتا ہو سمجھو کہ ٹوٹے اور خسارے کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئے گا، اس لیے انسان اپنے علم و فضل پر مغرور نہ ہو بلکہ دائما خدا سے ہدایت وتوفیق کا طلبگار رہے۔

وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۖ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۫ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ

اور ہم نے پیدا کیے دوزخ کے واسطے بہت سے جن اور آدمی[1] ان کے دل ہیں کہ ان سے سمجھتے نہیں، اور آنکھیں ہیں

لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۫ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ

کہ ان سے دیکھتے نہیں، اور کان ہیں کہ ان سے سنتے نہیں، وہ ایسے ہیں جیسے چوپائے بلکہ ان سے بھی زیادہ بے راہ

اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ﴿۱۷۹﴾

وہی لوگ ہیں غافل[2]

خلاصہ تفسیر: اور (جب وہ لوگ اپنی قوت عقلیہ سے کام ہی نہیں لیتے تو ہدایت کہاں سے ہو، ان کے نصیب میں تو دوزخ ہی ہے، چنانچہ) ہم نے ایسے بہت سے جن اور انسان دوزخ (ہی میں رہنے) کے لئے پیدا کئے ہیں جن کے (نام کو تو) دل (ہیں مگر) ایسے ہیں جن سے (حق بات کو) نہیں سمجھتے (چونکہ اس کا ارادہ ہی نہیں کرتے) اور جن کے (نام کو تو) آنکھیں (ہیں مگر) ایسی ہیں جن سے (نظر استدلال کے طور پر کسی چیز کو) نہیں دیکھتے، اور جن کے (نام کو تو) کان (ہیں مگر) ایسے ہیں جن سے (متوجہ ہو کر حق بات کو) نہیں سنتے (غرض) یہ لوگ (آخرت کی طرف متوجہ ہونے میں) چوپایوں کی طرح ہیں، بلکہ (اس حیثیت سے کہ چوپایوں کو آخرت کی طرف متوجہ ہونے کا مکلف تو نہیں بنایا گیا، سو ان کا متوجہ نہ ہونا برا نہیں، اور ان کو تو اس کا مکلف کیا گیا ہے، پھر بھی بے توجہی کرتے ہیں، سو اس اعتبار سے) یہ لوگ (ان چوپایوں سے بھی) زیادہ بے راہ ہیں (کیونکہ یہ لوگ (باوجود توجہ دلانے کے آخرت سے) غافل ہیں (بخلاف چوپایوں کے، جیسا اوپر بیان ہوا)۔

وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا: یہاں یہ شبہ نہ کیا جائے کہ ایک اور آیت قرآنی **وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون** سے تو معلوم ہوتا ہے کہ سب عبادت کے لیے پیدا ہوئے ہیں، اور یہاں آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض دوزخ کے لیے پیدا ہوئے ہیں جس کا سبب عبادت نہ کرنا ہے، جواب یہ ہے کہ تشریعی طور پر سب عبادت ہی کے لیے پیدا ہوئے ہیں، البتہ تکوینی طور پر بعض جہنم کے لیے بھی پیدا ہوئے ہیں، پس اُس مقام پر آیت میں شرعی مقصود کا بیان ہے اور یہاں تکوینی غرض کا بیان ہے، اب کچھ تعارض نہیں، مسئلہ تقدیر کی تحقیق سورہ بقرہ کے پہلے رکوع میں گذر چکی ہے وہاں ملاحظہ فرمالیں۔

اس آیت سے دو باتوں پر دلالت ہوتی ہے: ① ایک تو آیت کے لفظ دلالت کرتے ہیں کہ جو شخص اللہ سے غافل ہو دین پر عمل نہ کرتا ہو اس کے لیے دوزخ ہے ② دوسرا عقلا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے غافل ہونے کی وجہ سے دنیا کی محبت اور حرص بڑھتی ہے، اور ذکر کرنے سے اللہ تعالیٰ کی محبت بڑھتی ہے اور دل پر انوارات پڑتے ہیں اور جو ل جائے اس پر صبر وشکر کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔

❁ ❁ ❁

فائدہ: ۱ یہ آیت بظاہر آیہ: وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ (الذاریات:۵۶) کے معارض معلوم ہوتی ہے، اس لیے بعض مفسرین نے وہاں لیعبدون میں ''لام غایت'' اور یہاں لجھنم میں ''لام عاقبت'' مراد لیا ہے یعنی سب کے پیدا کرنے سے مطلوب اصلی تو عبادت ہے لیکن بہت سے جن وانس چونکہ اس مطلب کو پورا نہ کریں گے اور انجام کار دوزخ میں بھیجے جائیں گے، اس انجام کے لحاظ سے کہہ سکتے ہیں کہ گویا وہ دوزخ ہی کے لیے پیدا ہوئے کما فی قولہ تعالیٰ: فَالْتَقَطَهٗۤ اٰلُ فِرْعَوْنَ لِیَكُوْنَ لَهُمْ عَدُوًّا وَّحَزَنًا (القصص:۸) باقی محققین کے نزدیک اس تکلف کی حاجت نہیں، وہ دونوں جگہ ''لام غایت'' ہی کا ارادہ کرتے ہیں، مگر لِیَعْبُدُوْنِ میں ''غایت تشریعی'' اور یہاں لِجَهَنَّمَ میں ''غایت تکوینی'' بیان کی گئی ہے۔

فائدہ: ۲ یعنی دل، کان، آنکھ سب کچھ موجود ہیں لیکن نہ دل سے ''آیات اللہ'' میں غور کرتے ہیں نہ قدرت کے نشانات کا بنظر تعمق و اعتبار مطالعہ کرتے ہیں، اور نہ خدائی باتوں کو سمع قبول سنتے ہیں، جس طرح چوپائے جانوروں کے تمام ادراکات صرف کھانے پینے اور بہیمی جذبات کے دائرہ میں محدود رہتے ہیں، یہی حال ان کا ہے کہ دل و دماغ، ہاتھ پاؤں، کان آنکھ غرض خدا کی دی ہوئی سب قوتیں محض دنیاوی لذائذ اور مادی خواہشات کی تحصیل وتکمیل کے لیے وقف ہیں، انسانی کمالات اور ملکوتی خصائل کے اکتساب سے کوئی سروکار نہیں بلکہ غور کیا جائے تو ان کا حال ایک طرح چوپائے جانوروں سے بھی بدتر ہے، جانور مالک کے بلانے پر چلا آتا ہے، اس کے ڈانٹنے سے رک جاتا ہے، یہ کبھی مالک حقیقی کی آواز پر کان نہیں دھرتے، پھر جانور اپنے فطری قویٰ سے وہی کام لیتے ہیں جو قدرت نے ان کے لیے مقرر کر دیا ہے، زیادہ کی ان میں استعداد ہی نہیں، لیکن ان لوگوں میں روحانی وعرفانی ترقیات کی جو فطری قوت واستعداد ودیعت کی گئی تھی، اسے مہلک غفلت اور بے راہ روی سے خود اپنے ہاتھوں ضائع معطل کر دیا گیا۔

وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ۪ وَذَرُوا الَّذِیْنَ یُلْحِدُوْنَ فِیْۤ اَسْمَآىِٕهٖ ؕ سَیُجْزَوْنَ

اور اللہ کے لیے ہیں سب نام اچھے سو اس کو پکارو وہی نام کہہ کر، اور چھوڑ دو ان کو جو کج راہ چلتے ہیں اس کے ناموں میں، وہ بدلہ پا رہیں گے

مَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ﴿۱۸۰﴾

اپنے کیے کا

خلاصہ تفسیر: پیچھے کفار کی مذمت مذکور تھی ان میں ایک قسم مشرکین کی تھی جنہیں تین بڑے مسئلوں میں اختلاف تھا: ① توحید ② رسالت ③ قیامت، اب یہاں سے سورت کے اختتام تک ان ہی تین مسئلوں کی بحث ہے اور درمیان میں خاص مناسبت سے دیگر کچھ مضامین ہیں۔

اور اچھے اچھے (مخصوص) نام اللہ ہی کے لئے (خاص) ہیں سو ان ناموں سے اللہ ہی کو موسوم کیا کرو، اور (دوسروں پر ان ناموں کا اطلاق مت کیا کرو، بلکہ) ایسے لوگوں سے تعلق بھی نہ رکھو جو اس کے (مذکورہ) ناموں میں کج روی کرتے ہیں (اس طرح سے کہ خدا کے سوا دوسروں پر ان ناموں کا اطلاق کرتے ہیں جیسا کہ مشرکین بتوں کو اپنے اعتقاد سے معبود، الٰہ وغیرہ کہتے تھے) ان لوگوں کو ان کے کئے کی ضرور سزا ملے گی۔

اللہ کے مخصوص ناموں سے مراد وہ نام ہیں جن کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہونا شرعی دلیل سے ثابت ہے۔

* * *

فائدہ: غافلین کا حال ذکر کر کے مومنین کو متنبہ فرمایا ہے کہ تم غفلت اختیار نہ کرنا، غفلت دور کرنے والی چیز خدا کی یاد ہے، سو تم ہمیشہ اس کو اچھے ناموں سے پکارو اور اچھی صفات سے یاد کرو، جو لوگ اس کے اسماء وصفات کے بارے میں کج روش اختیار کرتے ہیں انہیں چھوڑ دو وہ جیسا کریں گے ویسا بھگتیں گے، خدا کے ناموں اور صفتوں کے متعلق کج روی یہ ہے کہ خدا پر ایسے نام یا صفت کا اطلاق کرے جس کی شریعت نے اجازت نہیں دی، اور جو حق تعالیٰ کی تعظیم وجلال کے لائق نہیں یا اس کے مخصوص نام اور صفت کا اطلاق غیر اللہ پر کرے، یا ان کے معانی بیان کرنے میں بے اصول تاویل اور کھینچ تان کرے یا ان کو معصیت (مثلاً سحر وغیرہ) کے مواقع میں استعمال کرنے لگے، یہ سب کج روی ہے۔

ع ۲۲ / ۱۲

وَمِمَّنْ خَلَقْنَآ اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ ﴿۱۸۱﴾

اوران لوگوں میں کہ جن کو ہم نے پیدا کیا ہے ایک جماعت ہے کہ راہ بتلاتے ہیں سچی اوراسی کے موافق انصاف کرتے ہیں

خلاصہ تفسیر: پیچھے کفار کا ذکر تھا، اب قرآن کے طرز کے مطابق استثنا کے طور پر مسلمانوں کا ذکر ہے۔

اور ہماری مخلوق جن وانس میں (سب گمراہ ہی نہیں بلکہ) ایک جماعت (ان میں) ایسی بھی ہے جو (دین) حق (یعنی اسلام) کے موافق (لوگوں کو) ہدایت (بھی) کرتے ہیں اوراسی کے موافق (اپنے اور غیروں کے معاملات میں) انصاف بھی کرتے ہیں۔

* * *

فائدہ: یہ جماعت امت محمد یہ مرحومہ ہے علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیم جس نے ہر قسم کی افراط اور تفریط اور کج روی سے علیحدہ ہو کر سچائی اور انصاف واعتدال کا طریقہ اختیار کیا، اوراسی کی طرف دوسروں کو دعوت دیتی ہے، آگے اس امت کے مخالفین اور حق کی تکذیب کرنے والوں کا ذکر ہے۔

وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۲﴾

اور جنہوں نے جھٹلایا ہماری آیتوں کو ہم ان کو آہستہ آہستہ پکڑیں گے ایسی جگہ سے جہاں سے ان کو خبر بھی نہ ہوگی

وَاُمْلِيْ لَهُمْ ۭ اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ ﴿۱۸۳﴾

اور میں ان کو ڈھیل دوں گا بیشک میرا داؤ پکا ہے۔[1]

خلاصہ تفسیر: پیچھے مشرکین کے لیے سزا کا ذکر ہوا تھا، چونکہ وہ سزا اس وقت تک واقع نہ ہوئی تھی جس سے یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ جب ترقی کا مدار حق پرستی اور حق وانصاف کی پیروی پر ہے تو دوسری غیر مسلم قومیں جو حق سے سراسر دور ہیں وہ کیوں دنیا میں پھلتی پھولتی نظر آتی ہیں، چنانچہ اب آگے سزا میں دیر ہونے کا سبب بتلا کر اس شبہ کا جواب دیتے ہیں۔

اور جو لوگ ہماری آیات کو جھٹلاتے ہیں ہم ان کو بتدریج (جہنم کی طرف) لئے جا رہے ہیں اس طور کہ ان کو خبر بھی نہیں، اور (دنیا میں عذاب نازل کرڈالنے سے) ان کو مہلت دیتا ہوں، بیشک میری تدبیر بہت مضبوط ہے۔

سَنَسْتَدْرِجُهُمْ ــ وَاُمْلِيْ لَهُمْ: حاصل یہ ہے کہ ہمیں ان کی شرارتوں پر سخت سزا دینا منظور ہے، اس لیے اس کی یہ تدبیر کی گئی کہ یہاں پورا مواخذہ نہیں کیا، ورنہ سب شرارتیں اسی حد پر ختم ہو جاتیں، اور منظور یہ ہے کہ اس حد سے زیادہ سزا دی جائے، پس ان کو ناز ونعم میں ان کے حال پر چھوڑ کر مہلت دے دی، تا کہ بتدریج شرارتیں بڑھتی جائیں، جن سے دن بدن سخت عذاب کے مستحق ہو جائیں، پس دن بدن گناہوں کا بڑھنا یہ ''استدراج'' ہے، اور مہلت دینا یہ ''امہال'' ہے، اس سے جلدی عذاب نہ آنے کی وجہ معلوم ہوگئی، **لایعلمون** کے معنی یہ ہیں کہ وہ اس مہلت سے اپنے باطل طریقہ کو حق سمجھتے ہیں، اور اپنی نسبت خدا کے مقبول ومحبوب ہونے کا گمان کرتے ہیں حالانکہ وہ جہنم تک کی مسافت قطع کر رہے ہیں۔

* * *

فائدہ:[1] جھٹلانے والے مجرموں کو بسا اوقات فوراً سزا نہیں ملتی بلکہ دنیاوی عیش اور فراخی کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں، حتیٰ کہ خدائی سزا سے بے فکر ہو کر ارتکاب جرائم پر اور زیادہ دلیر بن جاتے ہیں، اس طرح جو انتہائی سزا ان پر جاری کرنی ہے رفتہ رفتہ اپنے کو اعلانیہ اور کامل طور پر اس کا مستحق ثابت کر دیتے ہیں، یہ ہی خدا کی ڈھیل اور استدراج ہے، وہ حماقت اور بے حیائی سے سمجھتے ہیں کہ ہم پر مہربانی ہو رہی ہے اور حقیقت میں انتہائی عذاب کے لیے تیار کیا جا رہا ہے، خدا کا ''کید'' (داؤ یا خفیہ تدبیر) اسی کو کہا کہ ایسی کارروائی کی جائے جس کا ظاہر رحمت اور باطن قہر وعذاب ہو، بیشک خدا کی تدبیر بڑی مضبوط اور پختہ ہے جس کی کسی حیلہ اور تدبیر سے مدافعت نہیں ہو سکتی۔

اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا ٚ مَا بِصَاحِبِهِمْ مِّنْ جِنَّةٍ ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۸۴﴾

کیاانہوں نے دھیان نہیں کیا کہ ان کے رفیق کو کچھ بھی جنون نہیں، وہ تو ڈرانے والا ہے صاف

خلاصہ تفسیر: پیچھے آیت وللہ الاسماء الحسنی میں توحید کا بیان ہوا تھا، اب رسالت کا ذکر ہے، جس کا شان نزول یہ ہے کہ ایک بار جناب رسول اللہ ﷺ کوہ صفا پر کھڑے ہوئے اور ایک ایک قبیلہ کو پکار کر عذاب آخرت سے ڈرایا، اس پر بعض لوگوں نے کہا کہ تمہارے ان صاحب کو تو جنون ہو گیا ہے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

کیا ان لوگوں نے اس بات میں غور نہ کیا کہ ان کا جن سے سابقہ ہے ان کو ذرا بھی جنون نہیں وہ تو صرف ایک صاف صاف (عذاب سے) ڈرانے والے ہیں (جو کہ دراصل پیغمبر کا کام ہوتا ہے)۔

حاصل یہ ہے کہ اگر آپ کی مجموعی حالت میں غور کریں تو آپ کا پیغمبر ہونا سمجھ میں آجائے، کیونکہ آپ کے معجزات تو خارق عادت ہیں ہی لیکن آپ کے اخلاق و عادات بھی خود معجزہ ہیں کہ دوسرا ہرگز ان میں برابری نہیں کر سکتا۔

اَوَلَمْ يَنْظُرُوْا فِيْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ ۙ وَّاَنْ عَسٰٓى اَنْ

کیا انہوں نے نظر نہیں کی سلطنت میں آسمان اور زمین کی اور جو کچھ پیدا کیا ہے اللہ نے ہر چیز سے، اور اس میں کہ شاید

يَّكُوْنَ قَدِ اقْتَرَبَ اَجَلُهُمْ ۚ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۭ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۸۵﴾

قریب آ گیا ہو ان کا وعدہ ۱؎ سو اس کے پیچھے کس بات پر ایمان لائیں گے ۲؎

خلاصہ تفسیر: پیچھے رسالت کے مسئلے میں غور کرنے کا حکم تھا، اب توحید کے مسئلہ میں غور کرنے کو فرماتے ہیں اور ساتھ میں ان کو موت یاد دلاتے ہیں جس کے ساتھ ہی عذاب شروع ہو جائے گا۔

اور کیا ان لوگوں نے غور نہیں کیا آسمانوں اور زمین کے عالم میں اور (نیز) دوسری چیزوں میں جو اللہ تعالیٰ نے پیدا کی ہیں (تا کہ ان کو توحید کا علم دلیل سے حاصل ہو جاتا) اور اس بات میں (بھی غور نہیں کیا) کہ ممکن ہے کہ ان کی اجل قریب ہی آ پہنچی ہو (تا کہ احتمال عذاب سے ڈرتے اور اس سے بچنے کی فکر کرتے اور اس فکر سے دین حق مل جاتا اور موت کے قریب ہونے کا امکان تو ہر وقت ہے، غرض نہ دلیل کی فکر ہے جس سے دین حق ملے اور نہ موت کا خیال ہے جس سے فکر میں مدد ملے، اور جب قرآن جیسے موثر کلام سے ان کی فکر تک کو حرکت نہیں ہوتی تو) پھر قرآن کے بعد کونسی بات پر یہ لوگ ایمان لائیں گے۔

❋ ❋ ❋

فائدہ: ۱؎ یعنی آخر آیات اللہ کو جھٹلانے اور اس کے بدانجام سے غافل ہو جانے کا سبب ہے، ان آیات کا لانے والا معاذ اللہ کوئی بے عقل و مجنون نہیں، وہ ساری عمر تمہارے پاس رہا، اس کے ہر چھوٹے بڑے حال سے تم واقف ہو، اس کی عقل و دانش اور امانت و دیانت پہلے سے مسلم و معروف ہے، جس کے پاس سے لایا وہ تمام جہان کا مالک، شہنشاہ مطلق اور ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے، اس کے نہایت ہی محکم و مضبوط نظام سلطنت بلکہ ہر چھوٹی بڑی چیز میں جو اس نے پیدا کی ہے غور کرو تو یہ "آیات تکوینیہ"، "آیات تنزیلیہ" کی تصدیق کریں گی پھر آیات اللہ کی تسلیم میں کیا عذر باقی ہے، انہیں سمجھنا چاہیے کہ شاید ان کی موت و ہلاکت کا وقت قریب آ گا ہو، لہذا بعد الموت کے لیے جو تیاری کرنی ہے جلد کرنا چاہیے۔

فائدہ: ۲؎ یعنی اگر آیات قرآنیہ پر ایمان نہ لائے تو دنیا میں اور کون سی بات اور کون سا کلام ہے جس پر ایمان لانے کی امید کی جا سکتی ہے سمجھ لو کہ ان بدبختوں کے لیے دولت ایمان مقدر ہی نہیں۔

مَنۡ يُّضۡلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ ؕ وَيَذَرُهُمۡ فِيۡ طُغۡيَانِهِمۡ يَعۡمَهُوۡنَ ﴿۱۸۶﴾

جس کو اللہ بچلائے اس کو کوئی نہیں راہ دکھانے والا، اور اللہ چھوڑے رکھتا ہے ان کو ان کی شرارت میں سرگرداں

خلاصہ تفسیر: گذشتہ آیات میں کفار و منکرین کی ضد و ہٹ دھرمی اور ایمان نہ لانے کا ذکر تھا، یہ مضمون رسول اللہ ﷺ کے لیے غایت شفقت و رحمت کی بناء پر انتہائی رنج و غم کا سبب ہو سکتا تھا، اس لئے آگے آپ ﷺ کی تسلی کا مضمون ہے جو ایک بار پہلے بھی آچکا ہے، شاید زیادہ اہتمام کے لیے مکرر لایا گیا ہو۔

جس کو اللہ تعالیٰ گمراہ کرے اس کو کوئی راہ پر نہیں لا سکتا (پھر غم لا حاصل ہے) اور اللہ تعالیٰ ان کو ان کی گمراہی میں بھٹکتے ہوئے چھوڑ دیتا ہے (تا کہ ایک دفعہ ہی پوری سزا دے دے)۔

* * *

فائدہ: ہدایت و ضلالت، ہر چیز خدا کے قبضہ میں ہے، وہ نہ چاہے تو سارے سامان ہدایت کے رکھے رہ جائیں، آدمی کہیں سے بھی منتفع نہ ہو، ہاں! عادۃً وہ جب ہی ہدایت کی توفیق دیتا ہے جب بندہ خود اپنے کسب و اختیار سے اس راستہ پر چلنا چاہے، باقی جو دیدہ و دانستہ بدی اور شرارت ہی کی ٹھان لے تو خدا بھی راستہ دکھلانے کے بعد اسی حال میں اسے چھوڑ دیتا ہے۔

يَسۡـَٔلُوۡنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرۡسٰٮهَا ؕ قُلۡ اِنَّمَا عِلۡمُهَا عِنۡدَ رَبِّىۡ ۚ لَا يُجَلِّيۡهَا لِوَقۡتِهَاۤ اِلَّا هُوَ ؕ

تجھ سے پوچھتے ہیں قیامت کو کہ کب ہے اسکے قائم ہونے کا وقت، تو کہہ اسکی خبر تو میرے رب ہی کے پاس ہے، وہی کھول دکھائے گا اسکو اسکے وقت پر

ثَقُلَتۡ فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ لَا تَاۡتِيۡكُمۡ اِلَّا بَغۡتَةً ؕ يَسۡـَٔلُوۡنَكَ كَاَنَّكَ حَفِىٌّ عَنۡهَا ؕ

وہ بھاری بات ہے آسمانوں اور زمین میں، جب تم پر آئے گی تو بے خبر آئے گی ۱؎ تجھ سے پوچھنے لگتے ہیں کہ گویا تو اسکی تلاش میں لگا ہوا ہے

قُلۡ اِنَّمَا عِلۡمُهَا عِنۡدَ اللّٰهِ وَلٰـكِنَّ اَكۡثَرَ النَّاسِ لَا يَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۸۷﴾

تو کہہ دے اس کی خبر ہے خاص اللہ کے پاس لیکن اکثر لوگ نہیں سمجھتے ۲؎

خلاصہ تفسیر: گذشتہ آیات میں رسالت و توحید کے متعلق بیان ہو چکا، اب تیسرے مسئلہ قیامت کا ذکر ہے، جس کا شان نزول یہ ہے کہ قریش اور یہود نے آپ ﷺ سے قیامت کے بارے میں سوال کیا تھا۔

لوگ آپ سے قیامت کے متعلق سوال کرتے ہیں کہ اس کا وقوع کب ہوگا، آپ فرما دیجئے کہ اس کا (یہ) علم (کہ کب واقع ہوگی) صرف میرے رب ہی کے پاس ہے (دوسرے کسی کو اس کی اطلاع نہیں) اس کے وقت پر اس کو سوا اللہ کے کوئی اور ظاہر نہ کرے گا (اور وہ ظاہر کرنا یہ ہوگا کہ اس کو واقع کردے گا اس وقت سب کو پوری خبر ہو جائے گی اس سے قبل ویسے ہی کسی کو بتلانے کے طور پر بھی اس کو ظاہر نہ کیا جائے گا کیونکہ) وہ آسمانوں اور زمین میں بڑا بھاری حادثہ ہوگا (اس لئے) وہ تم پر محض اچانک (بے خبری میں) آپڑے گی (تا کہ جس طرح وہ اجسام کو پارہ پارہ کر دینے میں بھاری ہے اسی طرح دلوں پر بھی اس کا بھاری اثر ہوگا اور پہلے سے بتلا دینے میں یہ بات نہیں رہتی اور ان کا پوچھنا بھی تو معمولی طور پر نہیں بلکہ) وہ آپ سے اس طرح (اصرار و مبالغہ سے) پوچھتے ہیں جیسے گویا آپ اس کی تحقیقات کر چکے ہیں (اور تحقیقات کے بعد آپ کو اس کا پورا علم ہو گیا ہے) آپ فرما دیجئے کہ اس کا علم (مذکور) خاص اللہ ہی کے پاس ہے لیکن اکثر لوگ (اس بات کو) نہیں جانتے (کہ بعض علوم حق تعالیٰ نے اپنے خزانہ علم میں پوشیدہ رکھے ہیں انبیاء کو بھی تفصیلا اطلاع نہیں دی، پس ان کا یہ سمجھنا کہ اس کا جاننا نبی کو لازم ہے اور آپ کو اس کی خبر نہیں تو معاذ اللہ آپ کی نبوت بھی صحیح نہیں، یہ بالکل

باطل ہے، کیونکہ اس دلیل کا پہلا مقدمہ کہ نبی کو اس کا جاننا لازم ہے محض غلط ہے، یہ کیا ضروری ہے کہ نبی حق تعالیٰ کی ہر بات کو جان لیا کریں)۔

اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ: اس آیت سے اور شیخین کی اس حدیث جس میں آپ ﷺ نے جبرائیل کو یہ جواب دیا تھا: "ما المسؤول عنها بأعلم من السائل" کہ جس سے قیامت کی بابت سوال کیا جارہا ہے وہ اس کو سائل سے زیادہ نہیں جانتا، اس سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ تعیین اور تفصیل کے ساتھ قیامت کی اطلاع آپ سے بھی مخفی تھی، اور بعض روایات جو تعیین کے بارہ میں آئی ہیں کہ دنیا کی عمر سات ہزار سال کی ہے اول تو وہ قوت میں قرآن اور شیخین کی حدیث کے برابر تو کیا فی نفسہ بھی ان کی سند صحیح نہیں، دوسرے ان روایات کو ظن غالب پر محمول کر سکتے ہیں۔

* * *

فائدہ: ۱؎ پہلے عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ قَدِ اقْتَرَبَ اَجَلُهُمْ (الاعراف:۱۸۵) میں خاص اس قوم کی "اجل" (موت) کا ذکر تھا کہ انہیں کچھ معلوم نہیں کہ کب آجائے، یہاں تمام دنیا کی اجل (قیامت) کے متعلق متنبہ فرمادیا کہ جب کسی کو خاص اپنی موت کا علم نہیں کب آئے، پھر کل دنیا کی موت کو کون بتلاسکتا ہے کہ فلاں تاریخ اور فلاں سنہ میں آئے گی، اس کی تعیین کا علم بجز خدائے علام الغیوب کسی کے پاس نہیں، وہ ہی وقت معین ومقدر پر اسے واقع کر کے ظاہر کردے گا کہ خدا کے علم میں اس کا یہ وقت تھا، آسمان وزمین میں وہ بڑا بھاری واقعہ ہوگا اور اس کا علم بھی بہت بھاری ہے جو خدا کے سوا کسی کو حاصل نہیں، گو اس واقعہ کی امارات (بہت سی نشانیاں) انبیاء علیہم السلام خصوصاً ہمارے پیغمبر آخر الزمان (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بیان فرمائی ہیں، تاہم ان سب علامات کے ظہور کے بعد بھی جب قیامت کا وقوع ہوگا تو بالکل بے خبری میں اچانک اور دفعتاً ہوگا جیسا کہ بخاری وغیرہ کی احادیث میں تفصیلاً مذکور ہے۔

فائدہ: ۲؎ ان لوگوں کے طرز سوال سے ظاہر ہوتا ہے کہ گویا وہ آپ کی نسبت یوں سمجھتے ہیں کہ آپ بھی اسی مسئلہ کی تحقیق وتفتیش اور کھوج لگانے میں مشغول رہے ہیں اور تلاش کے بعد اس کے علم تک رسائی حاصل کر چکے ہیں حالانکہ یہ علم حق تعالیٰ شانہ کے ساتھ مخصوص ہے انبیاء علیہم السلام اس چیز کے پیچھے نہیں پڑا کرتے جس سے خدا نے اپنی مصلحت کی بناء پر روک دیا ہو، نہ ان کے اختیار میں ہے کہ جو چاہیں کوشش کر کے ضرور ہی معلوم کرلیا کریں، ان کا منصب یہ ہے کہ جن بیشمار علوم وکمالات کا خدا کی طرف سے افاضہ ہو، نہایت شکر گزاری اور قدر شناسی کے ساتھ قبول کرتے رہیں، مگر ان باتوں کو اکثر عوام کالانعام کیا سمجھیں۔

قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ

تو کہہ دے کہ میں مالک نہیں اپنی جان کے بھلے کا اور نہ برے کا مگر جو اللہ چاہے، اور اگر میں جان لیا کرتا غیب کی بات

لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ ۚۛ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْٓءُ ۚۛ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۱۸۸﴾

تو بہت کچھ بھلائیاں حاصل کر لیتا، اور مجھ کو برائی کبھی نہ پہنچتی ۱؎ میں تو بس ڈر اور خوشخبری سنانے والا ہوں ایمان دار لوگوں کو

خلاصہ تفسیر: پیچھے رسول اللہ ﷺ کو قیامت کی تعیین کے متعلق اپنی لاعلمی ظاہر کرنے کا حکم ہوا ہے، اب اس لاعلمی کی وجہ بیان کرنے کا حکم ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ مجھے غیب کا علم نہیں ہے، اور قیامت کی تعیین بھی غیب ہے اسی لیے مجھے اس کا علم نہیں۔

آپ کہہ دیجئے کہ میں خود اپنی ذات خاص کے لئے (بھی چہ جائیکہ دوسرے کے لئے) کسی نفع (تکوینی کے حاصل کرنے) کا اختیار نہیں رکھتا اور نہ کسی ضرر (تکوینی کے دور کرنے) کا (اختیار رکھتا ہوں) مگر اتنا ہی کہ جتنا اللہ تعالیٰ نے چاہا ہو (کہ مجھ کو اختیار دے دیں، اور جس میں اختیار نہیں دیا ان میں بعض اوقات منافع فوت ہوجاتے ہیں اور نقصان واقع ہوجاتے ہیں ایک مقدمہ تو یہ ہوا) اور (دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ) اگر میں غیب کی باتیں (امور اختیار کے متعلق) جانتا ہوتا تو میں (اپنے لئے) بہت سے منافع حاصل کرلیا کرتا اور کوئی مضرت ہی مجھ پر واقع نہ ہوتی (کیونکہ علم غیب کے سبب مجھے معلوم ہوجاتا کہ فلاں امر میرے لئے یقیناً مفید ہوگا اس کو اختیار کرلیا کرتا، اور فلاں امر میرے لئے یقیناً نقصان دہ ہوگا اس سے احتراز کرتا اور

اب چونکہ علم غیب نہیں، اس لئے بعض اوقات مفید کا علم نہیں ہوتا کہ اس کو اختیار کروں، اسی طرح نقصان دہ کا علم نہیں ہوتا کہ اس سے بچوں، بلکہ کبھی برعکس نفع کو نقصان اور نقصان کو نفع سمجھ لیا جاتا ہے، دلیل کا حاصل یہ ہوا کہ علم غیب کے لئے نفع ونقصان کا مالک ہونا ضروری ہے، اور میں نفع ونقصان کا مالک نہیں تو مجھے علم غیب بھی نہیں، غرض میں ایسے امور کا علم نہیں رکھتا) میں تو محض (احکام شرعیہ بتلا کر ثواب کی) بشارت دینے والا اور (عذاب سے) ڈرانے والا ہوں ان لوگوں کو جو ایمان رکھتے ہیں (یہاں ایمان والوں کی تخصیص اس لیے کی کہ نفع اور فائدہ اٹھانے والے یہی لوگ ہوئے، ورنہ آپ ﷺ کا بشیر ونذیر ہونا تمام مکلفین کے لیے عام ہے)۔

نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا: اس جگہ نفع ونقصان سے دنیاوی نفع ونقصان مراد ہے، اس میں گفتگو ہو رہی ہے کہ اس کا علم کلی طور پر آپ کو نہیں دیا گیا، شرعی نفع ونقصان میں کوئی کلام نہیں، کیونکہ اس کا کامل علم آپ کو عطا کیا گیا ہے، اس لیے خلاصہ تفسیر میں نفع ونقصان کے ساتھ تکوینی کی قید بڑھائی گئی، خلاصہ یہ کہ نبوت کا اصلی مقصود یہ نہیں کہ تمام عالم کی تمام ہونے والی باتوں کا نبی کو علم ہوا کرے، اس لیے ان باتوں کا علم حاصل ہونا جن میں قیامت کا خاص وقت بھی داخل ہے نبی کو ملنا ضروری نہیں، البتہ نبوت کا اصل مقصود شرعی امور کا پورا علم ہونا ہے سو وہ مجھے حاصل ہے۔

وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ: یہاں ایک شبہ ہوتا ہے وہ یہ کہ اس آیت میں کہا گیا ہے کہ اگر میں غیب کی باتیں جانتا تو بہت سے نفع حاصل کر لیا کرتا، اور کوئی نقصان مجھ پر واقع نہ ہوتا، حالانکہ منافع حاصل کرنے اور نقصان سے بچنے کے لیے محض جان لینا کافی نہیں، بلکہ قدرت کی بھی ضرورت ہے، اور علم حاصل ہو جانے سے قدرت کا حاصل ہو جانا ضروری نہیں؟ جواب یہ ہے کہ غیب کی باتوں سے مراد یہاں وہ امور ہیں جن میں اختیار دیا گیا ہے، اور اختیاری امور میں قدرت ہوتی ہے، تو مطلب یہ ہوا کہ جو امور اختیاری ہیں ان کے متعلق اگر مجھے علم غیب ہوتا تو منافع حاصل کر لیتا، اور کوئی نقصان مجھے پر واقع نہ ہو سکتا، اب کوئی اشکال نہیں۔

قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ (الی قولہ) وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ: اس میں اس بات کی صراحت ہے کہ ''قدرت و مستقل اختیار'' اور ''علم محیط'' (کل علم) اللہ کے مقبول بندوں سے بھی منفی ہے، جاہل لوگوں نے اپنے اپنے مشائخ اور پیروں سے کس کس طرح کا گمان قائم کر لیا ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ اس آیت میں بتلایا گیا ہے کہ کوئی بندہ خواہ کتنا ہی بڑا ہو، نہ اپنے اندر ''اختیار مستقل'' رکھتا ہے نہ ''علم محیط''، سید الانبیاء ﷺ جو علوم اولین وآخرین کے حامل اور خزائن ارضی کی کنجیوں کے امین بنائے گئے تھے، ان کو یہ اعلان کرنے کا حکم ہے کہ میں دوسروں کو کیا خود اپنی جان کو بھی کوئی نفع نہیں پہنچا سکتا، نہ کسی نقصان سے بچا سکتا ہوں، مگر جس قدر اللہ چاہے اتنے ہی پر میرا قابو ہے اور اگر میں غیب کی ہر بات جان لیا کرتا تو بہت سی وہ بھلائیاں اور کامیابیاں بھی حاصل کر لیتا جو علم غیب نہ ہونے کی وجہ سے کسی وقت فوت ہو جاتی ہیں، نیز کبھی کوئی ناخوشگوار حالت مجھ کو پیش نہ آیا کرتی۔

مثلاً ''افک'' کے واقعہ میں کتنے دنوں تک حضور ﷺ کو وحی نہ آنے کی وجہ سے اضطراب وقلق رہا، حجۃ الوداع میں تو صاف ہی فرما دیا: ''لو استقبلت من امری ما استدبرت لما سقت الھدی'' (اگر میں پہلے سے اس چیز کو جانتا جو بعد میں پیش آئی تو ہرگز ہدی کا جانور اپنے ساتھ نہ لاتا) اسی قسم کے بیسیوں واقعات ہیں جن کی روک تھام ''علم محیط'' رکھنے کی صورت میں نہایت آسانی سے ممکن تھی، ان سب سے بڑھ کر عجیب تر واقعہ یہ ہے کہ ''حدیث جبرائیل'' کی بعض روایات میں آپ نے تصریحاً فرمایا کہ یہ پہلا موقع ہے کہ میں نے جبرائیل کو واپسی کے وقت تک نہیں پہچانا، جب وہ اٹھ کر چلے گئے تب علم ہوا کہ جبرائیل تھے، یہ واقعہ بتصریح محدثین بالکل آخر عمر کا ہے، اس میں قیامت کے سوال پر: ''ما المسؤل عنھا باعلم من السائل'' ارشاد فرمایا، گویا بتلا دیا گیا کہ ''علم محیط'' خدا کے سوا کسی کو حاصل نہیں، اور ''علم غیب'' تو درکنار، محسوسات ومبصرات کا پورا علم بھی خدا ہی کے عطا کرنے سے حاصل ہوتا ہے، وہ کسی وقت نہ چاہے تو ہم محسوسات کا بھی ادراک نہیں کر سکتے۔

بہرحال اس آیت میں کھول کر بتلا دیا گیا کہ ''اختیار مستقل'' یا ''علم محیط'' نبوت کے لوازم میں سے نہیں، جیسا کہ بعض جہلاء سمجھتے تھے، ہاں! ''شرعیات'' کا علم جو انبیاء علیہم السلام کے منصب سے متعلق ہے کامل ہونا چاہیے، اور ''تکوینیات'' کا علم خدا تعالیٰ جس کو جس قدر مناسب جانے عطا فرماتا

ہے، اس نوع میں ہمارے حضور ﷺ تمام اولین وآخرین سے فائق ہیں، آپ کو اتنے بیشمار علوم ومعارف حق تعالیٰ نے مرحمت فرمائے ہیں، جن کا احصاء کسی مخلوق کی طاقت میں نہیں۔

هُوَ الَّذِىۡ خَلَقَكُمۡ مِّنۡ نَّفۡسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنۡهَا زَوۡجَهَا لِيَسۡكُنَ اِلَيۡهَا‌ ۚ فَلَمَّا تَغَشّٰٮهَا

وہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا ایک جان سے اور اسی سے بنایا اس کا جوڑا تا کہ اس کے پاس آرام پکڑے، پھر جب مرد نے عورت کو ڈھانکا

حَمَلَتۡ حَمۡلًا خَفِيۡفًا فَمَرَّتۡ بِهٖ‌ ۚ فَلَمَّاۤ اَثۡقَلَتۡ دَّعَوَا اللّٰهَ رَبَّهُمَا لَئِنۡ اٰتَيۡتَنَا صَالِحًا

حمل رہا ہلکا سا حمل تو چلتی پھرتی رہی اس کے ساتھ، پھر جب بوجھل ہوگئی تو دونوں نے پکارا اللہ اپنے رب کو کہ اگر تو ہم کو بخشے چنگا بھلا

لَّنَكُوۡنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيۡنَ ﴿۱۸۹﴾ فَلَمَّاۤ اٰتٰٮهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهٗ شُرَكَآءَ فِيۡمَاۤ اٰتٰٮهُمَا‌ ۚ فَتَعٰلَى اللّٰهُ

تو ہم تیرا شکر کریں، پھر جب ان کو دیا چنگا بھلا تو بنانے لگے اس کے لیے شریک اس کی بخشی ہوئی چیز میں، سو اللہ برتر ہے

عَمَّا يُشۡرِكُوۡنَ ﴿۱۹۰﴾

ان کے شریک بنانے سے۔

خلاصہ تفسیر: پیچھے توحید کا ذکر ہوا تھا، اب توحید کا ذکر اور اس کے ساتھ شرک کے باطل ہونے کو بیان کیا جاتا ہے۔

وہ اللہ ایسا (قادر اور منعم) ہے جس نے تم کو ایک تن واحد (یعنی آدم علیہ السلام) سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا بنایا (مراد حضرت حوا ہیں) تا کہ وہ اس اپنے جوڑے سے انس حاصل کرے (پس جب وہ خالق بھی ہے اور محسن بھی تو عبادت اسی کا حق ہے) پھر (آگے آدم وحوا کی اولاد بڑھی اور ان میں بھی میاں بیوی ہوئے، لیکن ان میں بعض کی یہ حالت ہوئی ہے کہ) جب میاں نے بیوی سے قربت کی تو اس کو حمل رہ گیا (جو پہلے پہلے ہلکا سا (رہا) سو وہ اس کو (پیٹ میں) لئے ہوئے (بے تکلف) چلتی پھرتی رہی، پھر جب وہ (حاملہ اس حمل کے بڑھ جانے سے) بوجھل ہوگئی (اور دونوں میاں بیوی کو یقین ہوگیا کہ حمل ہے) تو (اس وقت ان کو طرح طرح کے احتمالات وتوہمات ہونے لگے جیسا کہ بعض مرتبہ حمل میں خطرات پیش آتے ہیں اس لئے) دونوں میاں بیوی اللہ سے جو کہ ان کا مالک ہے دعا کرنے لگے کہ اگر آپ نے ہم کو صحیح سالم اولاد دے دی تو ہم خوب شکر گزاری کریں گے (جیسے عام عادت ہے کہ مصیبت کے وقت اللہ تعالیٰ سے بڑے بڑے عہد وپیمان ہوا کرتے ہیں)۔

سو جب اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو صحیح سالم اولاد دے دی تو اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی چیز میں وہ دونوں اللہ کے شریک قرار دینے لگے (مختلف طور پر، کسی نے اعتقاد سے کہ یہ اولاد فلاں زندہ یا مردہ نے دی ہے، کسی نے عمل سے کہ اس کے نام کی نذر ونیاز کرنے لگے، یا بچہ کو لے جا کر اس کے سامنے اس کا ماتھا ٹیک دیا، یا قول سے کہ اس کی بندگی پر نام رکھ دیا جیسے عبدشمس یا بندہ علی وغیرہ، یعنی یہ حق تو تھا خدا کا جو کہ منعم اور خالق اور قادر ومحسن ہے، اور صَرف کیا اس کو دوسرے معبودوں کے لئے) سو اللہ تعالیٰ پاک ہے ان کے شرک سے۔

بعض تفاسیر میں اس جگہ آدم وحوا علیہما السلام کا ایک قصہ بیان کیا ہے کہ ان کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا، اس کا نام عبدالحارث رکھا، چونکہ ترمذی نے اس حدیث کی تحسین اور حاکم نے تصحیح کی ہے اس لیے اس قصہ کا انکار دشوار ہے، لیکن اس قصہ کا اس آیت کی تفسیر ہونا حدیث سے ثابت نہیں، بعض سلف نے جو اس کو تفسیر بنایا ہے یہ ان کی ذاتی رائے ہے جو حجت نہیں، اور درمنثور میں عبداللہ بن عباسؓ کا یہ قول نقل کیا ہے: "ما أشرك آدم ان اولها شكر وآخرها مثل ضربه الله لمن بعده"۔

✻ ✻ ✻

فائدہ: ۱؎ خدا نے سب انسانوں کو آدم سے پیدا کیا، آدم کے انس اور سکون وقرار حاصل کرنے کے لیے اسی کے اندر اس کا جوڑا (حواء) بنایا، پھر دونوں سے نسل چلی، جب مرد نے عورت سے فطری خواہش پوری کی تو عورت حاملہ ہوئی، حمل کی ابتدائی حالت میں کوئی گرانی نہ تھی، عورت حسب معمول چلتی پھرتی اور اٹھتی بیٹھتی رہی، جب پیٹ بڑھ گیا، اور یہ کون جان سکتا تھا کہ اس کے اندر کیا چیز پوشیدہ ہے، تب مرد وعورت دونوں نے حق تعالیٰ کی جناب میں عرض کیا کہ اگر آپ اپنے فضل سے بھلا چنگا کارآمد بچہ عنایت فرمائیں گے تو ہم دونوں (بلکہ ہماری نسل بھی) تیرا شکر ادا کرتی رہے گی، خدا نے جب ان کی یہ تمنا پوری کر دی تو ہماری دی ہوئی چیز میں اوروں کے حصے لگانے شروع کر دیئے مثلاً کسی نے عقیدہ جمالیا کہ یہ اولاد فلاں زندہ یا مردہ مخلوق نے ہم کو دی ہے، کسی نے اس عقیدہ سے نہیں تو عملاً اس کی نذر ونیاز شروع کر دی، یا بچہ کی پیشانی اس کے سامنے ٹیک دی یا بچہ کا نام ایسا رکھا جس سے شرک کا اظہار ہوتا ہے، مثلاً عبدالعزیٰ یا عبدالشمس وغیرہ، غرض جو حق منعم حقیقی کا تھا وہ اعتقاداً یا فعلاً یا قولاً دوسروں کو دے دیا گیا، خوب سمجھ لو کہ حق تعالیٰ تمام انواع ومراتب شرک سے بالا وبرتر ہے۔

ان آیات میں حسن بصریؒ وغیرہ کی رائے کے موافق خاص آدم وحوا کا نہیں بلکہ عام انسانوں کی حالت کا نقشہ کھینچا گیا ہے، بیشک ابتداء هُوَ الَّذِیۡ خَلَقَكُمۡ مِّنۡ نَّفۡسٍ وَّاحِدَةٍ وَّجَعَلَ مِنۡهَا زَوۡجَهَا لِيَسۡكُنَ اِلَيۡهَا میں بطور تمہید آدم وحوا کا ذکر تھا، مگر اس کے بعد مطلق مرد وعورت کے ذکر کی طرف منتقل ہو گئے اور ایسا بہت جگہ ہوتا ہے کہ شخص کے ذکر سے جنس کے ذکر کی طرف منتقل ہو جاتے ہیں جیسے وَلَقَدۡ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنۡيَا بِمَصَابِيۡحَ وَجَعَلۡنٰهَا رُجُوۡمًا لِّلشَّيٰطِيۡنِ (الملک: ۵) جن سیاروں کو مصابیح فرمایا ہے وہ ٹوٹنے والے ستارے نہیں، جن سے ''رجم شیاطین'' ہوتا ہے، مگر شخص مصابیح سے جنس مصابیح کی طرف کلام کو منتقل کر دیا گیا، اس تفسیر کے موافق جَعَلَا لَهٗ شُرَكَآءَ میں کچھ اشکال نہیں، مگر اکثر سلف سے یہی منقول ہے کہ ان آیات میں صرف آدم وحوا کا قصہ بیان فرمایا ہے۔

کہتے ہیں کہ ابلیس ایک نیک مخلوق کی صورت میں حوا کے پاس آیا اور فریب دے کر ان سے وعدہ لے لیا کہ اگر لڑکا پیدا ہو تو اس کا نام عبدالحارث رکھیں حوا نے آدم کو بھی راضی کر لیا، اور جب بچہ پیدا ہوا تو دونوں نے عبدالحارث نام رکھا (حارث ابلیس کا نام تھا جس سے وہ گروہ ملائکہ میں پکارا جاتا تھا) ظاہر ہے کہ اسمائے اعلام میں لغوی معنی معتبر نہیں ہوتے اور ہوں بھی تو ''عبد'' کی اضافت ''حارث'' کی طرف اس کو مستلزم نہیں کہ ''حارث'' کو معاذ اللہ معبود سمجھ لیا جائے، ایک مہمان نواز آدمی کو عرب ''عبدالضیف'' کہہ دیتے ہیں، (یعنی مہمان کا غلام) اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ گویا میزبان مہمان کی پوجا کرتا ہے، پس اگر ''عبدالحارث'' نام رکھنے کا یہ واقعہ صحیح ہے تو نہیں کہا جا سکتا کہ آدم علیہ السلام نے معاذ اللہ حقیقۃً شرک کا ارتکاب کیا جو انبیاء کی شان عصمت کے منافی ہے، ہاں! بچہ کا ایسا غیر موزوں نام رکھنا جس سے بظاہر شرک کی بو آتی ہو نبی معصوم کی شان رفیع اور جذبہ توحید کے مناسب نہ تھا، قرآن کریم کی عادت ہے کہ انبیائے مقربین کی چھوٹی سی لغزش اور ادنیٰ ترین زلّت کو ''حسنات الابرار سیئات المقربین'' کے قاعدوں کے مطابق اکثر سخت عنوان سے تعبیر کرتا ہے جیسے یونس علیہ السلام کے قصہ میں فرمایا: فَظَنَّ اَنۡ لَّنۡ نَّقۡدِرَ عَلَيۡهِ یا فرمایا: اِذَا اسۡتَيۡـئَسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوۡۤا اَنَّهُمۡ قَدۡ كُذِبُوۡا (یوسف: ۱۱۰) علیٰ توجیہ بعض المفسرین اسی طرح یہاں بھی آدم علیہ السلام کے رتبہ کے لحاظ سے اس موہم شرک تسمیہ کو تغلیظاً ان الفاظ میں ادا فرمایا: جعلا له شركاء فيما اٰتاهما (خدا کی دی ہوئی چیز میں حصہ دار بنانے لگے) یعنی ان کی شان کے لائق نہ تھا کہ ایسا نام رکھیں جس کی سطح سے شرک کا وہم ہوتا ہے، گو حقیقۃً شرک نہیں، شاید اسی لیے فَقَدۡ اَشۡرَكَا وغیرہ مختصر عبارت چھوڑ کر یہ طویل عنوان جَعَلَا لَهٗ شُرَكَآءَ فِيۡمَاۤ اٰتٰهُمَا اختیار فرمایا واللہ اعلم۔

تنبیہ: حافظ عماد الدین ابن کثیرؒ نے بتلایا ہے کہ ''عبدالحارث'' نام رکھنے کی حدیث مرفوع جو ترمذی میں ہے، وہ تین وجہ سے معلول ہے، رہے آثار، وہ غالباً اہل کتاب کی روایت سے ماخوذ ہیں واللہ اعلم۔

اَيُشْرِكُوْنَ مَا لَا يَخْلُقُ شَيْـًٔا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ ﴿۱۹۱﴾

کیا شریک بناتے ہیں ایسوں کو جو پیدا نہ کریں ایک چیز بھی اور وہ پیدا ہوئے ہیں

خلاصہ تفسیر: (یہاں تک تو حق تعالیٰ کی صفات مذکور تھیں جو اس بات کا تقاضا کرتی ہیں کہ وہی مستحق معبود ہے، اب باطل معبودوں کے نقائص کا بیان ہے جس سے ثابت ہوا کہ وہ مستحق معبود نہیں، چنانچہ فرماتے ہیں:) کیا (اللہ تعالیٰ کے ساتھ) ایسوں کو شریک ٹھہراتے ہیں جو کسی چیز کو بنا نہ سکیں اور (بلکہ) وہ خود ہی بنائے جاتے ہوں (چنانچہ ظاہر ہے کہ بت پرست خود ان کو تراشتے تھے)۔

* * *

فائدہ: پہلے ایک طرح کے شرک کا ذکر تھا اس کی مناسبت سے ان آیات میں بت پرستی کا رد فرماتے ہیں، یعنی جو کسی کو پیدا نہ کر سکے بلکہ خود تمہارا بنایا ہوا ہو وہ تمہارا خدا یا معبود کیسے بن سکتا ہے۔

وَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ لَهُمْ نَصْرًا وَّلَآ اَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُوْنَ ﴿۱۹۲﴾ وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى

اور نہیں کر سکتے ہیں ان کی مدد اور نہ اپنی مدد کریں، اور اگر تم ان کو پکارو راستہ کی طرف

لَا يَتَّبِعُوْكُمْ ۭ سَوَآءٌ عَلَيْكُمْ اَدَعَوْتُمُوْهُمْ اَمْ اَنْتُمْ صَامِتُوْنَ ﴿۱۹۳﴾

تو نہ چلیں تمہاری پکار پر، برابر ہے تم پر کہ ان کو پکارو یا چپکے رہو

خلاصہ تفسیر: اور (کسی چیز کا بنانا تو بڑی بات ہے) وہ (تو ایسے عاجز ہیں کہ اس سے آسان کام بھی نہیں کر سکتے مثلاً) ان کو کسی قسم کی مدد (بھی) نہیں دے سکتے، اور (اس سے بھی بڑھ کر یہ ہے کہ) وہ خود اپنی بھی مدد نہیں کر سکتے (اگر کوئی حادثہ ان کو پیش آ جائے مثلاً کوئی شخص ان کو توڑنے پھوڑنے ہی لگے) اور (اس سے بھی بڑھ کر سنو کہ) اگر تم ان کو کوئی بات بتلانے کو پکارو تو تمہارے کہنے پر نہ چلیں (اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: ① ایک یہ کہ تم ان کو پکارو کہ وہ تم کو کوئی بات بتلائیں تو تمہارا کہنا نہ مانیں یعنی نہ بتلائیں ② دوسرے اس سے زیادہ یہ کہ تم ان کو پکارو کہ آؤ ہم تم کو کچھ بتلائیں تو تمہارے کہنے پر نہ چلیں، یعنی تمہاری بتلائی ہوئی بات پر عمل نہ کر سکیں بہر حال) تمہارے اعتبار سے دونوں امر برابر ہیں خواہ تم ان کو پکارو (وہ جب نہیں سنتے) اور یا تم خاموش رہو (اس وقت تو نہ سننا ظاہر ہی ہے)۔

خلاصہ یہ ہے کہ جو کام سب سے آسان ہے کہ کوئی پکارے تو سن لینا وہ اسی سے عاجز ہیں تو جو اس سے مشکل ہے کہ اپنی حفاظت کریں اور پھر جو اس سے مشکل ہے کہ دوسروں کی امداد کرنا اور پھر ان سب سے جو دشوار تر ہے کہ کسی چیز کو پیدا کرنا ان سے تو بدرجہ اولیٰ زیادہ عاجز ہوں گے، پھر ایسے عاجز محتاج کب معبودیت کے لائق ہو سکتے ہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ فَادْعُوْهُمْ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ

جن کو تم پکارتے ہو اللہ کے سوا وہ بندے ہیں تم جیسے، بھلا پکارو تو ان کو پس چاہیے کہ وہ قبول کریں تمہارے پکارنے کو اگر تم

صٰدِقِيْنَ ﴿۱۹۴﴾ اَلَهُمْ اَرْجُلٌ يَّمْشُوْنَ بِهَآ ۡ اَمْ لَهُمْ اَيْدٍ يَّبْطِشُوْنَ بِهَآ ۡ اَمْ لَهُمْ اَعْيُنٌ يُّبْصِرُوْنَ بِهَآ ۡ

سچے ہو کیا ان کے پاؤں ہیں جن سے چلتے ہیں، یا ان کے ہاتھ ہیں جن سے پکڑتے ہیں، یا ان کی آنکھیں ہیں جن سے دیکھتے ہیں

اَمْ لَهُمْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ قُلِ ادْعُوْا شُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ كِيْدُوْنِ فَلَا تُنْظِرُوْنِ ﴿۱۹۵﴾

یا ان کے کان ہیں جن سے سنتے ہیں، تو کہہ دے کہ پکارو اپنے شریکوں کو پھر برائی کرو میرے حق میں اور مجھ کو ڈھیل نہ دو لے

خلاصہ تفسیر: (غرض) واقعی تم خدا کو چھوڑ کر جن کی عبادت کرتے ہو وہ بھی تم ہی جیسے (اللہ کے مخلوق) بندے ہیں (یعنی تم سے بڑھ کر نہیں، خواہ گھٹے ہوئے ہوں) سو (ہم تو تم کو سچا جب جانیں کہ) تم (تو) ان کو پکارو (اور) پھر ان کو چاہئے کہ تمہارا کہنا کر دیں، اگر تم (ان کے خدا ہونے کے عقیدہ میں) سچے ہو (اور وہ بیچارے تمہارا کہنا تو کیا مانیں گے، کہنا ماننے کے اسباب ہی ان کے پاس نہیں)۔

(دیکھ لو) کیا ان کے پاؤں ہیں جن سے وہ چلتے ہوں، یا ان کے ہاتھ ہیں جن سے کسی چیز کو تھام سکیں، یا ان کی آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے ہوں، یا ان کے کان ہیں جن سے وہ سنتے ہوں (جب ان کے پاس اسباب و اعضاء تک نہیں تو کوئی فعل ان سے کیا صادر ہوگا اور) آپ (یہ بھی) کہہ دیجئے کہ (جس طرح وہ اپنے معتقدین کو نفع پہنچانے سے عاجز ہیں اسی طرح اپنے مخالفین کو نقصان بھی نہیں پہنچا سکتے، جیسا تم کہا کرتے ہو کہ ہمارے بتوں کی بے ادبی نہ کیا کرو ورنہ وہ تم پر کوئی آفت نازل کر دیں گے: وَيُخَوِّفُوْنَكَ بِالَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖ ، اور اگر تم سمجھتے ہو کہ وہ مجھ کو نقصان پہنچا سکتے ہیں تو) تم (اپنا ارمان نکال لو اور) اپنے سب شرکاء کو بلا لو پھر (سب مل کر) میری ضرر رسانی کی تدبیر کرو پھر (جب تدبیر بن جائے تو) مجھ کو ذرا مہلت مت دو (بلکہ فوراً اپنی تدبیر کو نافذ کر دو، دیکھوں کیا ہوتا ہے اور خاک بھی نہیں ہوگا کیونکہ بت تو مہمل محض ہیں)۔

اَلَهُمْ اَرْجُلٌ يَّمْشُوْنَ بِهَآ: بتوں کے عاجز ہونے میں جو یہ بتلایا گیا ہے کہ ان کے پاس اسباب و آلات ہی نہیں، اس سے یہ مقصود نہیں کہ معبود میں یہ اسباب اور اعضاء ہونا ضروری ہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ اس سے پاک ہے، بلکہ مراد ان سے کمالات ہیں کہ معبود میں قدرت اور تاثیر کے کمالات ہونا چاہئیں، لیکن جسم والی چیزوں میں وہ کمالات اعضاء اور اسباب پر موقوف ہیں اس لیے اس عنوان کو اختیار کیا گیا کہ جب ان میں تاثیر کرنے کے اسباب ہی نہیں تو کوئی فعل ان سے کیا صادر ہوگا، کیونکہ یہ جسم رکھتے ہیں اور جسم والا بغیر اعضاء و اسباب کے کچھ نہیں کر سکتا، اور معبود برحق میں یہ کمالات قدرت، اعضاء اور آلات کے بغیر موجود ہیں، کیونکہ وہ جسم سے پاک ہے تو اعضاء کا بھی محتاج نہیں، اور یہ نقائص بتوں میں بہت ظاہر تھے، پھر اتنا اہتمام بیان میں کیوں کیا گیا؟ جواب یہ ہے کہ تاکہ مشرکین کی پوری حماقت ظاہر ہو، ایک سوال یہ بھی ہوتا ہے کہ مشرکین بتوں کو خدا کے برابر نہ کہتے تھے، پھر اس گفتگو سے ان پر کیا الزام ہوا؟ وہ کہہ سکتے ہیں کہ ہاں ان میں یہ نقائص ہیں اس لیے ہم ان کو خدا کے برابر نہیں مانتے؟ جواب یہ ہے کہ مقصود گفتگو کا یہ ہے کہ معبود ہونا خواہ کسی درجہ میں ہو ان مذکورہ صفات کمال پر موقوف ہے، کیونکہ عبادت غایت ذلت کا نام ہے، اور غایت ذلت اسی کا حق ہے جو انتہائی درجہ عزت والا ہو، اور انتہائی درجہ عزت ان کمالات پر موقوف ہے، جب بتوں میں صفات کمال نہیں ہیں تو وہ کسی درجہ میں بھی معبود بننے کے لائق نہیں۔

* * *

فائدہ: لے جن بتوں کو تم نے معبود ٹھہرایا ہے اور خدائی کا حق دیا ہے، وہ تمہارے کام تو کیا آتے، خود اپنی حفاظت پر بھی قادر نہیں اور باوجود مخلوق ہونے کے ان کمالات سے محروم ہیں جن سے کسی مخلوق کو دوسری پر تفوق و امتیاز حاصل ہو سکتا ہے، گو ان کے ظاہری ہاتھ پاؤں، آنکھ، کان سب کچھ تم بناتے ہو، لیکن ان اعضاء میں وہ قوتیں نہیں جن سے انہیں اعضاء کہا جا سکے، نہ تمہارے پکارنے پر مصنوعی پاؤں سے چل کر آ سکتے ہیں، نہ ہاتھوں سے کوئی چیز پکڑ سکتے ہیں، نہ آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں، نہ کانوں سے کوئی بات سنتے ہیں، اگر پکارتے پکارتے تمہارا گلا پھٹ جائے گا تب بھی وہ تمہاری آواز سننے والے اور اس پر چلنے والے یا اس کا جواب دینے والے نہیں، تم ان کے سامنے چلاؤ یا خاموش رہو، دونوں حالتیں یکساں ہیں، نہ اس سے فائدہ نہ اس سے نفع، تعجب ہے کہ جو چیزیں مملوک مخلوق ہونے میں تم ہی جیسی عاجز و درماندہ بلکہ وجود و کمالات وجود میں تم سے بھی گئی گزری ہوں انہیں خدا بنا لیا جائے اور جو اس کا رد کرے اسے نقصان پہنچانے کی دھمکیاں دی جائیں، چنانچہ مشرکین مکہ نبی کریم ﷺ کو کہتے تھے کہ "آپ ہمارے بتوں کی بے ادبی کرنا چھوڑ دیں ورنہ نہ معلوم وہ کیا آفت تم پر نازل کر دیں"، وَيُخَوِّفُوْنَكَ بِالَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖ (الزمر:۳۶) اسی کا جواب قُلِ ادْعُوْا

شُرَكَآءَكُمْ الخ سے دیا، یعنی تم اپنے سب شرکاء کو پکارو اور میرے خلاف اپنے سب منصوبے اور تدبیریں پوری کرلو، پھر مجھ کو ایک منٹ کی مہلت بھی نہ دو، دیکھوں تم میرا کیا بگاڑ سکو گے۔

اِنَّ وَلِیِّۦَ اللّٰهُ الَّذِیْ نَزَّلَ الْكِتٰبَ ۖ وَهُوَ یَتَوَلَّى الصّٰلِحِیْنَ ﴿۱۹۶﴾

میرا حمایتی تو اللہ ہے جس نے اتاری کتاب اور وہ حمایت کرتا ہے نیک بندوں کی

خلاصہ تفسیر: (رہ گئے تم سو جو کچھ ہاتھ پاؤں ہلا سکتے ہو تو تم میرا اس لئے کچھ نہیں کر سکتے کہ) یقیناً میرا مددگار اللہ تعالیٰ ہے جس (کے مددگار اور رفیق ہونے کا کھلا ثبوت یہ ہے کہ اس) نے (مجھ پر) یہ کتاب (برکت والی جو دونوں جہان کی بھلائی کو جامع ہے) نازل فرمائی (اور اگر وہ میرا رفیق و معین نہ ہوتا تو اتنی بڑی نعمت کیوں عطا فرماتا) اور (اس خاص دلیل کے علاوہ ایک عام قاعدہ بھی سن لو جس سے اس کا میرے لیے معین و مددگار ہونا معلوم ہوتا ہے، وہ قاعدہ یہ ہے کہ) وہ (عموماً) نیک بندوں کی مدد کیا کرتا ہے (تو انبیاء تو ان نیک بندوں میں فرد کامل ہیں اور میں نبی ہوں تو میرا بھی ضرور مددگار رہوگا، غرض جن کے نقصان سے ڈراتے ہو وہ تو عاجز ہیں اور جو مجھ کو نقصان سے بچاتا ہے وہ میرا مددگار اور قادر، پھر اندیشہ کاہے کا)۔

* * *

فائدہ: یعنی جس نے مجھ پر کتاب نازل کی اور منصب رسالت پر فائز کیا وہ ہی ساری دنیا کے مقابلہ میں میری حمایت و حفاظت کرے گا، کیونکہ اپنے نیک بندوں کی حفاظت و اعانت وہ ہی کرتا ہے۔

وَالَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ نَصْرَكُمْ وَلَاۤ اَنْفُسَهُمْ یَنْصُرُوْنَ ﴿۱۹۷﴾

اور جن کو تم پکارتے ہو اس کے سوا وہ نہیں کرسکتے تمہاری مدد اور نہ اپنی جان بچا سکیں

وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا یَسْمَعُوْا ؕ وَتَرٰىهُمْ یَنْظُرُوْنَ اِلَیْكَ وَهُمْ لَا یُبْصِرُوْنَ ﴿۱۹۸﴾

اور اگر تم ان کو پکارو راستہ کی طرف تو کچھ نہ سنیں، اور تو دیکھتا ہے ان کو کہ تک رہے ہیں تیری طرف اور وہ کچھ نہیں دیکھتے [1]

خلاصہ تفسیر: آگے بتوں کا عاجز ہونا بطور خاص بیان فرماتے ہیں، کیونکہ پیچھے اگرچہ ان کے عجز کا بیان ہوا ہے مگر وہ ضمناً ہوا تھا، اصل مقصود وہاں یہ تھا کہ بت معبود ہونے کے لائق نہیں۔

اور تم جن لوگوں کی خدا کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہو وہ (تمہارے دشمن کے مقابلہ میں جیسا کہ میں ہوں) تمہاری کچھ مدد نہیں کر سکتے اور نہ (اپنے دشمن کے مقابلہ میں جیسا کہ میں ہوں) اپنی مدد کر سکتے ہیں، اور (مدد کرنا تو بڑی بات ہے) ان کو (تو) اگر کوئی بات بتلانے کو پکارو تو اس کو (بھی تو) نہ سنیں (اس کے بھی وہی مذکورہ دونوں معنی ہو سکتے ہیں جو پیچھے گزرے) اور (جیسے ان کے پاس سننے کا آلہ نہیں، اسی طرح دیکھنے کا آلہ بھی نہیں، اور ان کی تصویر میں جو آنکھیں بنادی جاتی ہیں وہ محض نام ہی کی ہوتی ہیں کام کی نہیں، چنانچہ) ان (بتوں) کو آپ دیکھتے ہیں کہ گویا وہ آپ کو دیکھ رہے ہیں (کیونکہ شکل تو آنکھوں کی سی بنی ہوئی ہے) اور وہ (واقع میں) کچھ بھی نہیں دیکھتے (کیونکہ حقیقت میں تو وہ آنکھیں نہیں، اسی پر دوسرے اعضاء یعنی ہاتھ پیر کو سمجھ لینا چاہئے، پس ایسے عاجز کا کیا ڈراوا دکھلاتے ہو)۔

* * *

فائدہ: [1] یعنی بظاہر آنکھیں بنی ہوئی ہیں، پر ان میں بینائی کہاں؟۔

خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ﴿۱۹۹﴾ وَ اِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ

عادت کر درگزر کی اور حکم کر نیک کام کرنے کا اور کنارہ کر جاہلوں سے، اور اگر ابھارے تجھ کو شیطان کی چھیڑ

فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ﴿۲۰۰﴾

تو پناہ مانگ اللہ سے، وہی ہے سننے والا جاننے والا۔

خلاصہ تفسیر: پیچھے جاہل مشرکین سے مباحثہ تھا، چونکہ اس کے باوجود بھی وہ لوگ انتہائی عناد کی وجہ سے اپنی جہالت پر جمے رہتے تھے جس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو غصہ آنے کا احتمال ہے اس لیے آگے آپ کو نرمی اور ملاطفت کا حکم ہے، اور کفار کا گمراہی میں مبتلا رہنے کا بیان ہے جس سے پوری ناامیدی ہوجائے تا کہ پھر غصہ ہی نہ آئے، گویا گذشتہ آیتوں میں دشمنان اسلام کی کج روی، ہٹ دھرمی اور بداخلاقیوں کا ذکر کرنے کے بعد ان آیات میں اس کے بالمقابل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اخلاق فاضلہ کی ہدایت دی جارہی ہے۔

(لوگوں سے یہ برتاؤ رکھئے کہ ان کے اعمال واخلاق میں سے) سرسری (نظر میں جو) برتاؤ (معقول ومناسب معلوم ہوں ان) کو قبول کرلیا کیجئے (ان کی تہہ اور حقیقت کی تلاش نہ کیجئے، بلکہ ظاہری نظر میں سرسری طور پر جو کام کسی سے اچھا ہوجائے اس کو بھلائی پر محمول کیجئے، باطن کا حال اللہ کے سپرد کیجئے، کیونکہ پورا اخلاص اور قبولیت کی تمام شرائط کا جمع ہونا اخص الخواص کا حصہ ہے، حاصل یہ کہ معاشرت میں سہولت رکھئے تشدد نہ کیجئے، یہ برتاؤ تو اچھے کاموں میں ہے) اور (جو کام ظاہری نظر میں بھی برا ہو اس میں یہ برتاؤ رکھئے کہ اس باب میں) نیک کام کی تعلیم کردیا کیجئے اور (جو اس تعلیم کے بعد بھی جہالت کی وجہ سے عمل نہ کرے یا نہ مانے تو ایسے) جاہلوں سے ایک کنارہ ہوجایا کیجئے (اور ان کے بہت درپے نہ ہوجائیں) اور اگر (اتفاقا ان کی جہالت پر) آپ کو کوئی وسوسہ شیطان کی طرف سے (غصہ کا) آنے لگے (جس میں احتمال ہو کہ کوئی بات مصلحت کے خلاف صادر نہ ہوجائے) تو (ایسی حالت میں فورا) اللہ کی پناہ مانگ لیا کیجئے، بلاشبہ وہ خوب سننے والا خوب جاننے والا ہے (وہ آپ کے استعاذہ کو سنتا ہے، آپ کے مقصود کو جانتا ہے وہ آپ کو اس سے پناہ دے گا)۔

خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ: اس میں عام لوگوں کے ساتھ تسامح اور شفقت ونرمی کے برتاؤ اور جاہلوں کے ساتھ حلم سے پیش آنے کی تعلیم ہے، حضرت جعفر صادق کا ارشاد ہے کہ اخلاق کی تعلیم میں یہ سب سے زیادہ جامع آیت ہے۔

وَ اِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ: وسوسہ ڈالنے کا مضمون مسئلہ عصمت انبیاء علیہم السلام کے منافی نہیں، کیونکہ عصمت کا حاصل تو یہ ہے کہ شیطان گناہ نہیں کراسکتا، یہ مطلب نہیں کہ گناہ کی رائے نہیں دے سکتا، کیونکہ جس طرح کسی کافر انسان کا کسی نبی کے سامنے کوئی کفر کی بات کہہ دینا جب کہ کچھ اثر نہ ہو شان نبوت کے خلاف نہیں، اسی طرح کافر جن کو بھی سمجھیے، البتہ چونکہ صحیح مسلم کی حدیث میں صراحت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا قرین آپ کو بری رائے بھی نہ دیتا تھا، چنانچہ فرمایا ہے: "فلا يأمرني إلا بخير"، اس لیے آیت میں شیطان سے خاص وہ برا قرین مراد نہیں ہوسکتا جو ہر شخص کے ساتھ رہ کر اس کو بری باتوں کا حکم کرتا ہے، بلکہ اس شیطان سے مشہور شیطان مراد لیا جائے گا جس کا کبھی کبھار آپ کے پاس آجانا محال نہیں، جیسا حدیث میں ہے کہ ایک بار ایک آگ کا شعلہ لے کر آپ کو تکلیف پہنچانے آیا تھا، باقی عصمت کا حاصل یہ ہے کہ شیطان نبی سے گناہ نہیں کراسکتا، یہ نہیں کہ گناہ کی رائے بھی نہیں دے سکتا، واللہ اعلم۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ وسوسہ سے انسان کے تقویٰ میں کوئی نقصان نہیں آتا، کاملین پر بھی وسوسہ اندازی کا امکان رہتا ہے، اور وسوسہ دور کرنے کا طریقہ اللہ کی پناہ طلب کرنا، خدا کی عظمت اور اس کے عذاب وثواب کو یاد کرنا ہے۔

* * *

فائدہ: لے خُذِ الْعَفْوَ کے کئی معنی کیے گئے ہیں، اکثر کا حاصل یہ ہے کہ سخت گیری اور تندخوئی سے پرہیز کیا جائے، اسی کو مترجم محقق نے ''درگزر کی عادت'' سے تعبیر فرمایا ہے۔

گزشتہ آیات میں بت پرستوں کی جو تحمیق وتجہیل کی گئی تھی بہت ممکن تھا کہ جاہل مشرکین اس پر برہم ہوکر ناشائستہ حرکت کرتے یا برالفظ زبان سے نکالتے، اس لیے ہدایت فرمادی کہ عفو ودرگزر کی عادت رکھو، نصیحت کرنے سے مت رکو، معقول بات کہتے رہو اور جاہلوں سے کنارہ کرو یعنی ان کی جہالت آمیز حرکتوں پر روز روز الجھنے کی ضرورت نہیں، جب وقت آئے گا ذراسی دیر میں ان کا سب حساب بے باق ہوجائے گا، اور اگر کسی وقت بمقتضائے بشریت ان کی کسی نالائق حرکت پر غصہ آجائے اور شیطان لعین چاہے کہ دور سے چھیڑ چھاڑ کر کے آپ کو ایسے معاملہ پر آمادہ کردے جو خلاف مصلحت ہو یا آپ کے ''خلق عظیم'' اور حلم ومتانت کے شایاں نہ ہو، تو آپ فوراً اللہ سے پناہ طلب کیجئے آپ کی عصمت ووجاہت کے سامنے اس کا کوئی کید نہیں چل سکے گا، کیونکہ خداوند قدیر جو ہر مستعیذ کی بات سننے والا اور ہر حالت کا جاننے والا ہے، اسی نے آپ کی صیانت کا تکفل فرمایا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ ﴿۲۰۱﴾

جن کے دل میں ڈر ہے جہاں پڑ گیا ان پر شیطان کا گزر چونک گئے، پھر اسی وقت ان کو سوجھ آجاتی ہے

وَاِخْوَانُهُمْ يَمُدُّوْنَهُمْ فِي الْغَيِّ ثُمَّ لَا يُقْصِرُوْنَ ﴿۲۰۲﴾

اور جو شیطانوں کے بھائی ہیں وہ ان کو کھینچتے چلے جاتے ہیں گمراہی میں پھر وہ کمی نہیں کرتے لے

خلاصہ تفسیر: (اور جس طرح استعاذہ، توجہ الی اللہ آپ کے لئے نافع ہے اسی طرح سب خدا سے ڈرنے والوں کے لئے بھی نافع ہے، چنانچہ) یقیناً (یہ بات ہے کہ) جو لوگ خدا ترس ہیں جب ان کو کوئی خطرہ شیطان کی طرف سے (غصہ کا یا اور کسی امر کا) آجاتا ہے تو وہ (فوراً خدا کی) یاد میں لگ جاتے ہیں (جیسے استعاذہ ودعا اور اللہ تعالیٰ کی عظمت وعذاب وثواب کو یاد کرنا) سو یکایک ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں (اور حقیقت امر ان پر منکشف ہوجاتی ہے جس سے وہ خطرہ اثر نہیں کرتا) اور (اس کے برخلاف) جو شیاطین کے تابع ہیں وہ (شیاطین) ان کو گمراہی میں کھینچتے چلے جاتے ہیں پس وہ (تابعین گمراہی سے) باز نہیں آتے (نہ وہ استعاذہ کریں نہ محفوظ رہیں، سو یہ مشرکین تو شیطان کے تابع ہیں، یہ کب باز آئیں گے، اس لئے ان کے غم وغصہ میں پڑنا بے کار ہے)۔

* * *

فائدہ: لے پہلے تو تنہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب تھا، گو حکم استعاذہ میں سب شامل تھے، اب عام متقین (خدا ترس پرہیزگاروں) کا حال بیان فرماتے ہیں، یعنی عام متقین کے حق میں یہ محال نہیں کہ شیطان کا گزر ان کی طرف ہو، اور کوئی چرکہ لگا جائے، البتہ متقین کی شان یہ ہوتی ہے کہ شیطان کے اغواء سے ممتد غفلت میں نہیں پڑتے بلکہ ذرا غفلت ہوئی اور خدا کو یاد کر کے چونک پڑے ٹھوکر لگی اور معاً سنبھل گئے، سنبھلتے ہی آنکھیں کھل گئیں، غفلت کا پردہ اٹھ گیا، نیکی، بدی کا انجام سامنے نظر آنے لگا اور بہت جلد نازیبا کام سے رک گئے، باقی غیر متقین (جن کے دل میں خدا کا ڈر نہ ہو، اور جنہیں شیطان کی برادری کہنا چاہیے) ان کا حال یہ ہے کہ شیاطین ہمیشہ انہیں گمراہی میں کھینچتے چلے جاتے ہیں اور رگیدنے میں ذرا کمی نہیں کرتے، ادھر یہ لوگ ان کی اقتداء وپیروی میں کوتاہی نہیں کرتے، اور اس طرح ان شیاطین کے غرور وسرکشی کو اور زیادہ بڑھاتے رہتے ہیں، بہرحال متقی کی شان یہ ہے کہ جب شیطان دق کرے، فوراً خدا سے پناہ مانگنے میں دیر نہ کرے، ورنہ غفلت میں تمادی ہوکر رجوع الی اللہ کی توفیق بھی نہ رہے گی۔

وَاِذَا لَمۡ تَاۡتِهِمۡ بِاٰيَةٍ قَالُوۡا لَوۡلَا اجۡتَبَيۡتَهَا ؕ قُلۡ اِنَّمَاۤ اَتَّبِعُ مَا يُوۡحٰۤى

اور جب تو لے کر نہ جائے انکے پاس کوئی نشانی تو کہتے ہیں کیوں نہ چھانٹ لایا تو کچھ اپنی طرف سے، تو کہہ دے میں تو چلتا ہوں اس پر جو حکم آئے

اِلَیَّ مِنۡ رَّبِّیۡ ؕ هٰذَا بَصَآئِرُ مِنۡ رَّبِّكُمۡ وَهُدًى وَّرَحۡمَةٌ لِّقَوۡمٍ يُّؤۡمِنُوۡنَ ﴿۲۰۳﴾

میری طرف میرے رب سے، یہ سوجھ کی باتیں ہیں تمہارے رب کی طرف سے اور ہدایت اور رحمت ہے ان لوگوں کو جو مومن ہیں

خلاصہ تفسیر: پیچھے رسالت کا ذکر تھا، آگے بھی دوسرے عنوان سے اسی کا ذکر ہے، وہاں رسالت کے پہچاننے کا طریقہ بتلایا تھا کہ غور وفکر سے کام لو، یہاں رسالت کے متعلق ایک شبہ کا جواب ہے، وہاں استدلال تھا اور یہاں اشکال دور کیا گیا، اور مدعا کا ثابت کرنا انہی دو باتوں پر موقوف ہے۔

اور جب آپ (ان کے فرمائشی معجزات میں سے جن کی فرمائش وہ لوگ براہ عناد کرتے تھے) کوئی معجزہ ان کے سامنے ظاہر نہیں کرتے (کیونکہ حق تعالی اس معجزہ کو کسی حکمت کی وجہ سے پیدا نہیں کرتے) تو وہ لوگ (انکار رسالت کے ارادہ سے آپ سے) کہتے ہیں کہ آپ (اگر نبی ہیں تو ہماری فرمائش کے مطابق) یہ معجزہ کیوں نہ (ظہور میں) لائے، آپ فرما دیجئے کہ (میرا کام اپنے اختیار سے معجزات لانا نہیں، بلکہ میرا اصلی کام یہ ہے کہ) میں اس کا اتباع کرتا ہوں جو مجھ پر میرے رب کی طرف سے حکم بھیجا گیا ہے (اس میں تبلیغ بھی آگئی، البتہ نبوت کے اثبات کے لئے نفس معجزہ ضروری ہے سو ان کا وقوع ہو چکا ہے، چنانچہ ان میں سب سے بڑا معجزہ یہی قرآن ہے، جس کی شان یہ ہے کہ) یہ (بجائے خود) گویا بہت سی دلیلیں ہیں تمہارے رب کی طرف سے (کیونکہ اس کی ہر مقدار سورت مثلا ایک معجزہ ہے تو اس حساب سے مجموعہ قرآن کتنی دلیلیں ہوا اور اسکا یہ دلیل ہونا تو عام ہے) اور (رہا اسکا نفع بالفعل تو وہ خاص ہے ماننے والوں کے ساتھ، چنانچہ وہ) ہدایت اور رحمت ہے ان لوگوں کے لئے جو (اس پر) ایمان رکھتے ہیں۔

قُلۡ اِنَّمَاۤ اَتَّبِعُ مَا يُوۡحٰۤى: یعنی میں اس کا اتباع کرتا ہوں جو مجھ پر میرے رب کی طرف سے حکم بھیجا گیا، اس میں اس بات کی صراحت ہے کہ غیب کی کسی بات پر اللہ تعالی کا مطلع فرما دینا غیر اختیاری ہے، بندہ کے اختیار میں نہیں، اس لیے یہ کمال کی علامت بھی نہیں ہے، کمال کی اصل علامت یہ ہے کہ اللہ تعالی کے احکام اور سنت نبویہ پر عمل کرنے والا ہو، اور اس کے ہوتے ہوئے کرامتیں تلاش کرنا جہالت ہے، اگر نظر آجائے تو ٹھیک ہے ورگرنہ کرامتوں کے پیچھے نہیں پڑنا چاہیے

* * *

فائدہ: جب کبھی وحی کے آنے میں تاخیر ہوتی، تو کفار از راہ تمسخر کہتے تھے کہ اب کوئی آیت کیوں گھڑ کر نہیں لے آتے، آخر سارا قرآن تم نے بنایا ہی ہے (العیاذ باللہ)، اسی طرح کبھی دق کرنے کے لیے بعض ایسے نشان (معجزات) طلب کرتے جن کے دکھلانے کو خدا کی حکمت مقتضی نہ تھی، جب آپ دکھلانے سے انکار کرتے تو کہتے: لَوۡلَا اجۡتَبَيۡتَهَا یعنی اپنے خدا سے کہہ کر ہمارا مانگا ہوا نشان کیوں چھانٹ کر نہ لے آئے دونوں باتوں کے جواب میں فرمایا: قُلۡ اِنَّمَاۤ اَتَّبِعُ مَا يُوۡحٰۤى اِلَیَّ مِنۡ رَّبِّیۡ یعنی ان سے کہہ دو کہ (نبی کا یہ کام نہیں کہ اپنی طرف سے خدا پر افتراء کرے، یا لوگوں کے کہنے سننے پر اقدام کر کے خدا سے وہ چیز مانگے جس کا دینا اس کی حکمت کے منافی ہے یا جس کے طلب کرنے کی اجازت نہیں ہے) اس کا وظیفہ صرف یہ ہے کہ جو کچھ خدا وحی بھیجے، قبول کرے، اس پر عمل پیرا ہو اور دوسروں کو عمل پیرا ہونے کی دعوت دے، باقی آیات تنزیلیہ یا تکوینیہ جو مجھ سے طلب کرتے ہو، تو قرآن سے بڑھ کر کون سی آیات ہوں گی اور اس سے زیادہ عظیم الشان معجزہ کون سا ہوگا جو سارے جہان کے لیے بصیرت افروز حقائق و مواعظ کا خزانہ اور ایمان لانے والوں کے لیے خاص قسم کی ہدایت و رحمت کا ذخیرہ اپنے اندر رکھتا ہے، اسی کو تم کب ماننے کے لیے تیار ہوئے، جو فرمائشی آیات کو تسلیم کرو گے۔

وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۲۰۴﴾

اور جب قرآن پڑھا جائے تو اس کی طرف کان لگائے رہو اور چپ رہو تا کہ تم پر رحم ہو

خلاصہ تفسیر: پیچھے قرآن مجید کا مؤمنین کے لیے ہدایت و رحمت ہونا مذکور ہے، مگر اس رحمت سے فائدہ حاصل کرنے کے لیے کچھ شرائط و آداب ہیں، جس کو یہاں خطاب عام کے ساتھ ذکر فرمایا۔

اور (آپ ان سے یہ بھی کہہ دیجئے کہ) جب قرآن پڑھا جایا کرے (مثلاً جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی تبلیغ فرمائیں) تو اس کی طرف کان لگا دیا کرو اور خاموش رہا کرو (تا کہ اس کا معجز ہونا اور اس کی تعلیم کی خوبی سمجھ میں آئے جس سے) امید ہے کہ تم پر رحمت ہو (جدید یا مزید، جدید رحمت یہ کہ پہلے کفر کی وجہ سے جو خاص رحمت ہوتی ہے نہ تھی، اب قبول حق سے متوجہ ہوگئی، مزید رحمت یہ کہ پہلے مومن ہونے کی وجہ سے مورد رحمت تھے اب اس میں اور ترقی ہوگئی، مجاہدؒ سے مروی ہے کہ یہ آیت نماز و خطبہ جمعہ کے بارے میں ہے)۔

* * *

فائدہ: جب قرآن ایسی دولت بے بہا اور علم و ہدایت کی کان ہے تو اس کی قرأت کا حق سامعین پر یہ ہے کہ پوری فکر و توجہ سے ادھر کان لگائیں، اس کی ہدایات کو سمع قبول سے سنیں اور ہر قسم کی بات چیت، شور و شغب اور ذکر و فکر چھوڑ کر ادب کے ساتھ خاموش رہیں تا کہ خدا کی رحمت اور مہربانی کے مستحق ہوں، اگر کافر اس طرح قرآن سنے تو کیا بعید ہے کہ خدا کی رحمت سے مشرف با یمان ہو جائے، اور پہلے سے مسلمان ہے تو ولی بن جائے یا کم از کم اس فعل کے اجر و ثواب سے نوازا جائے۔

اس آیت سے بہت سے علماء نے یہ مسئلہ بھی نکالا ہے کہ نماز میں جب امام قرأت کرے تو مقتدی کو سننا اور خاموش رہنا چاہیے جیسا کہ ابو موسیٰؓ اور ابو ہریرہؓ کی حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "و اذا قرأ فانصتوا" (جب نماز میں امام قرأت کرے تو چپ رہو) یہاں اس مسئلہ کی تفصیل کا مواقع نہیں، صحیح مسلم کی شرح میں، ہم نے نہایت شرح و بسط سے اس کے مالہ وما علیہ پر بحث کی ہے۔

وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيْفَةً وَّدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ

اور یاد کرتا رہ اپنے رب کو اپنے دل میں گڑگڑاتا ہوا اور ڈرتا ہوا اور ایسی آواز سے جو کہ پکار کر بولنے سے کم ہو، صبح کے وقت اور شام کے وقت

وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ ﴿۲۰۵﴾

اور مت رہ بے خبر

خلاصہ تفسیر: اوپر قرآن سننے کا حکم اور اس کا ادب مذکور تھا، اب مطلق ذکر اللہ کا حکم اور اس کا ادب بیان کیا جاتا ہے جس میں تلاوت قرآن بھی شامل ہے۔

اور (آپ ہر شخص سے یہ بھی کہہ دیجئے) اے شخص! اپنے رب کی یاد کیا کر (قرآن سے یا تسبیح وغیرہ سے خواہ) اپنے دل میں (یعنی آہستہ آواز سے) عاجزی کے ساتھ اور (خواہ) زور کی آواز نسبتاً کم آواز کے ساتھ (اسی عاجزی اور خوف کے ساتھ) صبح و شام (علی الدوام یعنی پابندی سے) اور (دوام کا مطلب یہ ہے کہ) اہل غفلت میں شمار مت ہونا (کہ جن اذکار کا حکم دیا گیا ہے انہیں بھی ترک کر دو)۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت سے ذکر اللہ اور تلاوت قرآن کے تین طریقے حاصل ہوئے: ① ایک یہ کہ صرف ذکر قلبی یعنی معانی قرآن اور معانی ذکر کے تصور اور تفکر پر اکتفاء کرے، زبان کو بالکل حرکت نہ ہو ② دوسرے یہ کہ اس کے ساتھ زبان کو بھی حرکت دے مگر آواز بلند نہ ہو جس کو دوسرے آدمی سن سکیں، یہ دونوں طریقے ذکر کے ارشاد ربانی: وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيْفَةً میں داخل ہیں اور ③ تیسرا طریقہ یہ ہے کہ

استحضار قلب اور دھیان کے ساتھ زبان کی حرکت بھی ہو اور آواز بھی، مگر اس طریقہ کے لئے ادب یہ ہے کہ آواز کو زیادہ بلند نہ کرے، متوسط حد سے آگے نہ بڑھائے، یہ طریقہ ارشاد قرآنی: دُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ میں تلقین فرمایا گیا ہے، قرآن کریم کی ایک دوسری آیت نے اس کی مزید وضاحت ان لفظوں میں فرمائی ہے: وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا، اس میں آنحضرت ﷺ کو حکم ہے کہ اپنی قرأت میں نہ زیادہ جہر کیا کریں اور نہ بالکل اخفاء بلکہ جہر اور اخفاء کے درمیانی کیفیت رکھا کریں۔

وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ: یعنی اہل غفلت میں مت شمار ہو، ذکر اللہ کی دو قسمیں خفی وجلی تو ثابت ہیں، یہاں ایک تیسری قسم یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ انسان پر غفلت کی کیفیت نہ ہو یعنی فکر ہو، اور فکر میں اگرچہ زبان کی حرکت نہیں ہوتی تاہم دل بیدار رہتا ہے جو ایک قسم کا ذکر ہی ہے اور اسے ذکر قلبی بھی کہا جاتا ہے (فکر سے مراد یہ ہے کہ غفلت نہ ہو یاد الٰہی برابر قائم رہے)۔

* * *

فائدہ: ۱ بڑا ذکر تو قرآن کریم ہے، اس کا ادب بیان ہو چکا ہے، اب عام ''ذکر اللہ'' کے سوا کچھ آداب بیان فرماتے ہیں، یعنی ''ذکر اللہ'' کی اصلی روح یہ ہے کہ جو زبان سے کہے دل سے اس کی طرف دھیان رکھے تا کہ ذکر کا پورا نفع ظاہر ہو اور زبان و دل دونوں عضو خدا کی یاد میں مشغول ہوں، ذکر کرتے وقت دل میں رقت ہونی چاہیے، سچی رغبت و رہبت سے خدا کو پکارے، جیسے کوئی خوشامد کرنے والا ڈرا ہوا آدمی کسی کو پکارتا ہے، ذاکر کے لہجہ میں، آواز میں ہیئت میں تضرع و خوف کا رنگ محسوس ہونا چاہیے، ذکر و مذکور کی عظمت و جلال سے آواز کا پست ہونا قدرتی چیز ہے وَخَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ فَلَا تَسْمَعُ اِلَّا هَمْسًا۔ اسی لیے زیادہ چلانے کی ممانعت آئی ہے، دھیمی آواز سے سراً یا جہراً خدا کا ذکر کرے تو خدا اس کا ذکر کرے گا، پھر اس سے زیادہ عاشق کی خوش بختی اور کیا ہو سکتی ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيُسَبِّحُوْنَهٗ وَلَهٗ يَسْجُدُوْنَ ﴿۲۰۶﴾

بیشک جو تیرے رب کے نزدیک ہیں اور تکبر نہیں کرتے اس کی بندگی سے اور یاد کرتے ہیں اس کی پاک ذات کو اور اسی کو سجدہ کرتے ہیں

خلاصہ تفسیر: اب سورت کا اختتام ہے، اس سورت کے مجموعہ میں طاعت کا حکم تھا، اکثر حصہ میں توحید، رسالت اور قیامت کے متعلق عقائد صحیح کرنے کا حکم تھا، اور کچھ حصہ میں بعض ان اعمال کا بیان تھا جو ظاہری اعضاء اور زبان کے متعلق ہیں، اب خاتمہ کی آیت میں سورت کے مکمل مضامین کی تاکید و تائید ہے کہ جب بڑے بڑے ملائکہ مقربین کو ان طاعات سے عار نہیں تو تم کو کیا انکار ہے۔

یقیناً جو (ملائکہ) تیرے رب کے نزدیک (مقرب) ہیں وہ اس کی عبادت سے (جس میں اصل عقائد ہیں) تکبر نہیں کرتے اور اس کی پاکی بیان کرتے ہیں (جو کہ اطاعت لسانی ہے) اور اس کو سجدہ کرتے ہیں (جو کہ اعمال جوارح سے ہے)۔

اِنَّ الَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ: اس آیت میں تکبر سے بری ہونے کو دوسری طاعات و عبادات پر مقدم کیا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے ''نزدیک'' جن کو فرمایا ہے ان کی پہلی صفت تکبر سے بری ہونا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ تکبر سے بری ہونا باقی اعمال کی اصلاح کے لیے گویا شرط ہے، اور یہاں تکبر نہ کرنے میں عقیدہ کی عبادت مذکور ہے، پاکی بیان کرنے میں زبان کی طاعت ہے اور سجدہ کرنے میں ظاہری اعضاء کی عبادت ہے، پس خاتمہ کا حسن اظہر من الشمس ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی رات دن خصوصاً صبح و شام کے اوقات میں اس کی یاد سے غافل مت رہ، جب مقرب فرشتوں کو اس کی بندگی سے عار نہیں، بلکہ ہمہ وقت اسی کی یاد میں لگے رہتے ہیں، اسی کو سجدہ کرتے ہیں، تو انسان کو اور بھی زیادہ ضروری ہے کہ اس کے ذکر و عبادت و سجود سے غافل نہ رہے، چنانچہ اس آیت پر بھی سجدہ کرنا چاہیے۔

آیاتھا ۷۵ ۸ سُوْرَةُ الْاَنْفَالِ مَدَنِيَّةٌ ۸۸ رکوعاتھا ۱۰

خلاصہ تفسیر: سورۃ انفال مدنی سورت ہے، اس سے پہلی سورت یعنی سورۃ اعراف میں مشرکین اور اہل کتاب کے جہل وعناد اور کسی قدر اہل کتاب کے کفر وفساد کا ذکر تھا، اب اس سورت میں اس وبال کا ذکر ہے جو بدر میں مشرکین پر اور دیگر بعض واقعات میں اہل کتاب پر نازل ہوا، چونکہ کفار کے ساتھ مقابلہ کرنے میں دنیا وآخرت کی کامیابی کا بڑا مدار اخلاص وللّٰہیت اور اتفاق پر ہے اس لیے سورت کو تقوی، صلاح اور اللہ ورسول کی اطاعت کے حکم سے شروع کیا، اور یہ اخلاص واتفاق نتیجہ ہے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی مکمل اطاعت کا اس لئے شروع سورت میں تقوی اور اطاعت حق اور ذکر اللہ اور توکل وغیرہ کی تعلیم دی گئی کہ اخلاص وللّٰہیت اور اتفاق کو ان ہی سے قوت ہوتی ہے، اور مال غنیمت کی تقسیم کے متعلق ایک خفیف بات جو اس وقت پیش آ گئی تھی وہ کامل اتفاق اور اخلاص وللّٰہیت سے بعید تھی، اس کا فیصلہ بھی سابقہ مضمون کے ضمن میں کر دیا گیا، جس کا قصہ ابن عباسؓ سے اس طرح منقول ہے کہ حضور ﷺ نے اعلان فرمادیا تھا کہ جو شخص کسی کو قتل یا قید کرے اس کو اتنا انعام ملے گا، سو بوڑھے تو جھنڈوں کے نیچے رہے اور جوان لوگ قتل وغنیمت کی طرف دوڑے، بوڑھوں نے ان جوانوں سے کہا کہ ہم کو بھی اس غنیمت میں شریک کرو، ہم تمہارے مددگار تھے، اگر تم پر کوئی حادثہ پڑتا تو تم ہماری ہی پناہ لیتے، چنانچہ آپ ﷺ تک یہ مقدمہ آیا، اس پر اس سورت کی پہلی آیت نازل ہوئی، چنانچہ آپ ﷺ نے بوڑھے اور جوانوں سب کو برابر تقسیم کر دیا، حضرت سعدؓ سے روایت ہے کہ میں بدر کے روز ایک تلوار لایا اور حضور سے عرض کیا کہ یہ تلوار مجھے ہبہ کر دیجیے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ نہ میری ہے نہ تیری ہے، مجھے رنج ہوا، پھر آپ نے بلا کر فرمایا کہ اس وقت تو میری نہ تھی، اب وہ میری ہے اور میں تجھے ہدیہ دیتا ہوں۔

* * *

فائدہ: یہ سورۃ مدنی ہے، جنگ بدر کے بعد نازل ہوئی، مکہ کی سیزدہ ۱۳ سالہ زندگی میں مشرکین نے جو دردناک اور ہوشربا مظالم مٹھی بھر مسلمانوں پر روا رکھے اور مظلوم مسلمانوں نے جس صبر واستقلال اور معجز نما استقامت وللّٰہیت سے مسلسل تیرہ برس تک ان ہولناک مصائب ونوائب کا تحمل کیا، وہ دنیا کی تاریخ کا بے مثال واقعہ ہے، قریش اور ان کے حامیوں نے کوئی صورت ظلم وستم کی اٹھا کر نہ رکھی، تاہم مسلمانوں کو حق تعالیٰ نے ان وحشی ظالموں کے مقابلہ میں ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہ دی، صبر وتحمل کے امتحان کی آخری حد یہ تھی کہ مسلمان مقدس وطن، عزیز واقارب، اہل وعیال، مال ودولت سب چیزوں کو خیر باد کہہ کر خالص خدا ورسول کی خوشنودی کا راستہ طے کرنے کے لیے گھروں سے نکل پڑے، جب مشرکین کا ظلم وتکبر اور مسلمانوں کی مظلومیت وبے کسی حد سے گزر گئی، ادھر اہل ایمان کے قلوب وطن وقوم، زن وفرزند، مال ودولت غرض ہر ایک ماسوی اللہ کے تعلق سے خالی اور پاک ہو کر محض خدا اور رسول کی محبت اور دولت توحید واخلاص سے ایسے بھرپور ہو گئے کہ گویا غیر اللہ کی ان میں گنجائش ہی نہ رہی، تب ان مظلوموں کو جو تیرہ برس سے برابر کفار کے ہر قسم کے حملے سہہ رہے تھے اور وطن چھوڑنے پر بھی امن حاصل نہ کر سکے تھے، ظالموں سے لڑنے اور بدلہ لینے کی اجازت دی گئی: اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰي نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ۙ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ (الحج:۳۹-۴۰)

مکہ کا ادب مانع تھا کہ مسلمان ابتداء وہاں چڑھ کر جائیں اس لیے ہجرت کے بعد تقریباً ڈیڑھ سال تک لائحہ عمل یہ رہا کہ مشرکین مکہ کے تجارتی سلسلوں کو جو شام ویمن وغیرہ سے قائم تھے، شکست دے کر ظالموں کی اقتصادی حالت کمزور اور مسلمانوں کی مالی پوزیشن مضبوط کی جائے، ہجرت کے پہلے سال ابواء، بواط، عشیرہ وغیرہ چھوٹے چھوٹے غزوات وسرایا جن کی تفصیل کتب احادیث وسیر میں ہے، اسی سلسلہ میں وقوع پذیر ہوئے۔

۲ ہجری میں آپ کو معلوم ہوا کہ ایک بھاری تجارتی مہم ابوسفیان کی سرکردگی میں شام کو روانہ ہوئی ہے، ابوسفیان کا یہ تجارتی قافلہ جس کے ساتھ تقریباً ساٹھ قریشی، ایک ہزار اونٹ اور پچاس ہزار دینار کا مال تھا، جب شام سے مکہ کو واپس ہوا تو نبی کریم ﷺ کو خبر پہنچی، صحیح مسلم کی ایک روایت کے موافق آپ ﷺ نے صحابہ سے مشورہ لیا کہ آیا اس جماعت سے تعرض کیا جائے، طبری کے بیان کے موافق بہت سے لوگوں نے اس مہم میں جانے سے پہلوتہی کی، کیونکہ انہیں کسی بڑی جنگ کا خطرہ نہ تھا جس کے لیے بڑا اجتماع واہتمام کیا جائے، دوسرے ''انصار'' کی نسبت عموماً یہ بھی خیال کیا جاتا تھا کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے نصرت وحمایت کا معاہدہ صرف اسی صورت میں کیا ہے کہ کوئی قوم مدینہ پر چڑھائی کرے یا آپ پر حملہ آور ہو، ابتداء

اقدام کر کے جانا خواہ کسی صورت میں ہو، ان کے معاہدہ میں شامل نہ تھا، مجمع کا یہ رنگ دیکھ کر ابوبکر وعمر اور رئیس انصار سعد بن عبادہؓ نے حوصلہ افزاء تقریریں کیں، آخر حضور تین سو سے کچھ زائد آدمیوں کی جمعیت لے کر قافلہ کی طرف روانہ ہوگئے، چونکہ کسی بڑے مسلح لشکر سے مڈبھیڑ ہونے کی توقع نہ تھی، اس لیے روایت میں حضرت کعب بن مالک فرماتے ہیں کہ: ''جو لوگ غزوہ بدر میں شریک ہوئے ان پر کوئی عتاب نہیں ہوا، کیونکہ حضور ﷺ صرف تجارتی مہم کے ارادے سے نکلے تھے، اتفاقاً خدا نے باقاعدہ جنگ کی صورت پیدا فرمادی''، ابوسفیان کو آپ کے ارادہ کا پتہ چل گیا، اس نے فوراً مکہ آدمی بھیجا، وہاں سے تقریباً ایک ہزار کا لشکر جس میں قریش کے بڑے بڑے سردار تھے، پورے ساز وسامان کے ساتھ مدینہ کی طرف روانہ ہوگیا، حضور مقام صفراء میں تھے جب معلوم ہوا کہ ابوجہل وغیرہ بڑے بڑے ائمۃ الکفر کی کمانڈ میں مشرکین کا لشکر یلغار کرتا چلا آرہا ہے اس غیر متوقع صورت کے پیش آجانے پر آپ ﷺ نے صحابہ کو اطلاع کی کہ اس وقت وہ جماعتیں تمہارے سامنے ہیں، تجارتی قافلہ اور فوجی لشکر، خدا کا وعدہ ہے کہ دونوں میں سے کسی ایک پر تم کو مسلط کرے گا، تم بتلاؤ کہ کس جماعت کی طرف بڑھنا چاہتے ہو؟ چونکہ اس لشکر کے مقابلہ میں تیاری کر کے نہ آئے تھے اس لیے اپنی تعداد اور سامان وغیرہ کی قلت کو دیکھتے ہوئے بعض لوگوں کی رائے یہ ہوئی کہ تجارتی قافلہ پر حملہ کرنا زیادہ مفید اور آسان ہے، مگر حضور ﷺ اس رائے سے خوش نہ تھے، حضرت ابوبکر وعمر اور مقداد بن الاسود نے ولولہ انگیز جوابات دیئے اور اخیر میں حضرت سعد بن معاذ کی تقریر کے بعد یہ ہی فیصلہ ہوا کہ فوجی مہم کے مقابلہ پر جوہر شجاعت دکھلائے جائیں، چنانچہ مقام بدر میں دونوں فوجیں بھڑ گئیں حق تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح عظیم عنایت فرمائی، کافروں کے ستر بڑے بڑے سردار مارے گئے اور ستر قید ہوئے، اس طرح کفر کا زور ٹوٹا اس سورۃ میں عموماً اسی واقعہ کے اجزاء ومتعلقات کا بیان ہوا ہے۔

جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ اس سفر میں حضور ﷺ شروع ہی سے فوجی لشکر کے مقابلہ میں نکلے تھے جو مدینہ پر از خود اقدام کرتا ہوا چلا آرہا تھا، تجارتی قافلہ پر حملہ کرنے کی نیت آپ نے اول سے آخر تک کسی وقت نہیں کی، وہ فی الحقیقت اپنے ایک خود ساختہ اصول پر تمام ذخیرہ حدیث وسیر اور اشارات قرآنیہ کو قربان کرنا چاہتے ہیں، یہ منطق ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ کفار محاربین جن کی دست برد سے مسلمانوں کی جان ومال کوئی چیز نہ بچی اور نہ آئندہ بچنے کی توقع تھی، ان کو جانی وبدنی نقصان پہنچانا تو جائز سمجھا جائے لیکن تجارتی اور مالی نقصان پہنچانا خلاف تہذیب وانسانیت ہو، یعنی ان کی جانیں تو ظلم وشرارت اور کفر وطغیان کی بدولت محفوظ نہیں ہیں مگر اموال بدستور محفوظ ہیں، گویا زندگی کے حق سے محروم ہوجائیں تو ہوجائیں، پر سامان زندگی سے محروم نہ ہوں اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ، باقی یہ دعویٰ کہ جو لوگ حملہ آور نہ ہوئے ہوں، ان پر مسلمانوں کو از خود حملہ کرنا جائز نہیں کیونکہ وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ (البقرۃ:۱۹۰) کے خلاف ہوگا، قطع نظر اس سے کہ یہ مسئلہ موجودہ واقعہ سے بے تعلق ہے، کیونکہ کفار مکہ پہلے ہر قسم کے مظالم اور حملے مسلمانوں پر کر چکے تھے اور آئندہ کے لیے باقاعدہ دھمکیاں دے رہے تھے بلکہ اس بارے میں ان کی سازشیں اور مراسلتیں جاری تھیں، فی نفسہ بھی صحیح نہیں، کیونکہ یہ آیت ابتدائے ہجرت میں اتری تھی جس کے بعد دوسری آیات جن میں مطلق قتال کا حکم ہے نازل ہوئیں، پھر یہ بھی قابل غور ہے کہ صرف اتنا کہنے سے کہ حملہ آوروں کی مدافعت کرو، یہ لازم نہیں آتا کہ کسی حالت میں حملہ کرنے کی اجازت نہیں، اس مسئلہ کی تفصیل میرے عزیز مولوی محمد یحییٰ سلمہ نے جو تحریر فوائد میں میرے معین ہیں اپنے رسالہ ''الجہاد الکبیر'' میں لکھی ہے اور احقر نے کچھ خلاصہ رسالہ ''الشہاب'' میں درج کیا ہے اور موقع بہ موقع فوائد میں بھی لکھا جائے گا، ان شاء اللہ!

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ ؕ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ

تجھ سے پوچھتے ہیں حکم غنیمت کا، تو کہہ دے کہ مال غنیمت اللہ کا ہے اور رسول کا، سو ڈر اللہ سے اور صلح کرو

بَيْنِكُمْ ۠ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗٓ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ①

آپس میں، اور حکم مانو اللہ کا اور اس کے رسول کا اگر ایمان رکھتے ہو

خلاصہ تفسیر: یہ لوگ آپ سے غنیمتوں کا حکم دریافت کرتے ہیں، آپ فرما دیجئے کہ یہ غنیمتیں اللہ کی ہیں (یعنی وہ اللہ کی ملک ہیں، اس کو ہی حق ہے کہ ان کے متعلق جو چاہیں حکم دے) اور رسول کی ہیں (بایں معنی کہ وہ اللہ تعالیٰ سے حکم پا کر اس کو نافذ کریں گے، حاصل یہ ہے کہ مال غنیمت کے بارے میں تمہاری رائے اور تجویز کا کوئی دخل نہیں، بلکہ اس کا فیصلہ شرعی حکم پر ہوگا) تو تم (دنیا کی حرص مت کرو، آخرت کے طالب رہو اس طرح پر کہ) اللہ سے ڈرو اور اپنے باہمی تعلقات کی اصلاح کرو (کہ آپس میں حسد اور بغض نہ رہے) اور اللہ کی اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اگر تم ایمان والے ہو۔

* * *

فائدہ: ''بدر'' میں جو مال غنیمت ہاتھ آیا اس کے متعلق صحابہ میں نزاع تھی، نوجوان جو آگے بڑھ کر لڑے تھے وہ کل مال غنیمت کو اپنا حق سمجھتے تھے، پرانے لوگ نوجوانوں کی پشت پر تھے، کا یہ کہنا تھا کہ ہمارے سہارا لگانے سے فتح ہوئی، لہٰذا غنیمت ہم کو ملنی چاہیے، ایک جماعت جو نبی اکرم ﷺ کی حفاظت کرتی رہی تھی وہ اپنے کو اس مال کا مستحق سمجھتی تھی، ان آیات میں بتلا دیا کہ فتح صرف اللہ کی مدد سے ہے کسی کا سہارا اور زور پیش نہیں جاتا سو مال کا مالک خدا ہے پیغمبر اس کے نائب ہیں، جس طرح اللہ تعالیٰ اپنے رسول کی معرفت حکم دے، اسی کے موافق غنیمت تقسیم ہونی چاہیے (اس حکم کی تفصیل آگے آئے گی) پکے مسلمانوں کا کام یہ ہے کہ ہر معاملہ میں خدا سے ڈریں، آپس میں صلح و آشتی سے رہیں، ذرا ذرا سی بات پر جھگڑے نہ ڈالیں، اپنی آراء وجذبات سے قطع نظر کر کے محض خدا اور رسول کا حکم مانیں۔

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ وَإِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ آيَاتُهُ زَادَتْهُمْ

ایمان والے وہی ہیں کہ جب نام آئے اللہ کا تو ڈر جائیں ان کے دل اور جب پڑھا جائے ان پر اس کا کلام تو زیادہ ہو جاتا ہے ان کا

إِيمَانًا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ۝٢ الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ ۝٣

ایمان اور وہ اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں، وہ لوگ جو کہ قائم رکھتے ہیں نماز کو اور ہم نے جو ان کو روزی دی ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں

أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا ۚ لَّهُمْ دَرَجَاتٌ عِندَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ ۝٤

وہی ہیں سچے ایمان والے، ان کے لیے درجے ہیں اپنے رب کے پاس اور معافی اور روزی عزت کی۔

خلاصہ تفسیر: (بس) ایمان والے تو وہی لوگ ہوتے ہیں کہ جب (ان کے سامنے) اللہ کا ذکر آتا ہے تو (اس کی عظمت کے استحضار سے) ان کے دل ڈر جاتے ہیں اور جب اللہ کی آیتیں ان کو پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو وہ آیتیں ان کے ایمان کو اور زیادہ (مضبوط) کر دیتی ہیں اور وہ لوگ اپنے رب پر توکل کرتے ہیں (اور) جو کہ نماز کی پابندی کرتے ہیں اور ہم نے ان کو جو کچھ دیا ہے وہ اس میں سے خرچ کرتے ہیں، (بس) سچے ایمان والے یہ لوگ ہیں، ان کے لئے بڑے بڑے درجے ہیں ان کے رب کے پاس، اور (ان کے لئے) مغفرت ہے اور عزت کی روزی۔

اس آیت میں سب احکام آ گئے، اس طرح سے کہ احکام کی دو قسمیں ہیں: ① حقوق اللہ ② حقوق العباد، پس باہمی تعلقات کی اصلاح میں حقوق العباد کا ذکر ہو گیا، حقوق اللہ کی دو قسمیں ہیں: ① ظاہری ② باطنی، ظاہری کی پھر دو قسمیں ہیں: ① مالی ② بدنی، نماز کی پابندی کرنا طاعت بدنی ہے، اور خرچ کرنا مالی طاعت ہے، اسی طرح باطنی کی بھی دو قسمیں ہیں: ① عقائد ② اخلاق، پس ایمان مضبوط کرنے میں عقائد آ گئے اور توکل میں اخلاق، اور ان سب کا مدار خوف الٰہی پر ہے، تقویٰ وغیرہ میں اس کا ذکر ہو گیا، اور شاید اسی وجہ سے اس کا ذکر مکرر کیا گیا، پس اللہ و رسول کی اطاعت کی سب صورتیں اس جگہ مذکور ہو گئیں۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ: یہ آیت سالکین کے اوصاف کی جامع تصویر ہے، اس میں حال (قلب کی حالت) بھی ہے جو کہ وجل (ڈر) ہے، اور عقائد بھی جو کہ ایمان ہے، باطنی عمل بھی جو کہ توکل ہے اور ظاہری عمل بھی ہے جو کہ صلوٰۃ اور انفاق ہے، اس پر نص ہے کہ کامل ایمان ان سب اوصاف کو جمع کرنا ہے، اور چونکہ صوفیہ ان سب اوصاف کے جامع ہیں اس سے ان کا کامل الایمان ہونا ثابت ہو گیا۔

* * *

فائدہ: لہ جب خدا کا نام درمیان میں آجائے ہیبت وخوف سے کانپ اٹھیں، آیات واحکام الٰہی سن کران کا ایمان ویقین زیادہ مضبوط ہوتا رہے، اس قدر مضبوط وقوی ہو جائے کہ ہر معاملہ میں ان کا اصلی بھروسہ اور اعتماد بجز خدا کے کسی پر باقی نہ رہے، اس کے سامنے سر عبودیت جھکائیں، اسی کے نام پر مال ودولت خرچ کریں۔

غرض عقیدہ، خلق، عمل اور مال ہر چیز سے خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش میں رہیں، ایسے ہی لوگوں کو سچا اور پکا ایماندار کہا جا سکتا ہے جو خدا کے یہاں اپنے اپنے درجہ کے موافق بڑے بڑے مقامات ومراتب قرب پر فائز ہوں گے، جنہیں معمولی کوتاہیوں سے درگزر کر کے عزت کی روزی سے سرفراز کیا جائے گا، رزقنا الله منه بفضله ومنه۔

كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْۢ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ ۠ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَكٰرِهُوْنَ ۝۵

جیسے نکالا تجھ کو تیرے رب نے تیرے گھر سے حق کام کے واسطے اور ایک جماعت اہل ایمان کی راضی نہ تھی

يُجَادِلُوْنَكَ فِي الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ ۝۶

وہ تجھ سے جھگڑتے تھے حق بات میں اس کے ظاہر ہو چکنے کے بعد گویا وہ ہانکے جاتے ہیں موت کی طرف آنکھوں دیکھتے لہ

خلاصہ تفسیر: پیچھے کفار کے مقابلے میں کامیاب ہونے کا جو بنیادی اور اہم مدار تھا اس کا بیان تھا، اب کامیابی کے بعض واقعات ذکر کر کے اس بارے میں اپنے انعامات یاد دلاتے ہیں، یہاں آپ ﷺ کی بدر کی طرف روانگی کا قصہ ہے، اس کا اجمالی بیان یہ ہے کہ مکہ کے تاجروں کا ایک مختصر قافلہ شام سے مکہ جارہا تھا جس کے ساتھ مال اور اسباب بہت تھا، آپ ﷺ نے بذریعہ وحی صحابہ کو خبر دی، چونکہ قافلہ میں آدمی کم اور مال بہت تھا، اس لیے صحابہ کو غنیمت کا خیال ہوا، اور اسی ارادہ سے مدینہ سے چلے، یہ خبر جو مکہ پہنچی تو ابوجہل وہاں کے سرداروں اور لشکروں سمیت قافلہ کی حفاظت کے لیے نکلا، قافلہ سمندر کے کنارے کنارے بچ کر ہولیا، ابوجہل لشکر کے ساتھ بدر میں آکر ٹھہرا، اس وقت حضور ﷺ وادی وجران میں تشریف رکھتے تھے، آپ کو وحی سے یہ سارا قصہ معلوم ہو گیا، اور آپ سے خدا کا وعدہ ہوا کہ لشکر اور قافلہ میں سے آپ کو ایک پر غلبہ ہوگا (جس کو چاہو اختیار کرلو) آپ نے صحابہ سے مشورہ کیا، چونکہ وہ لشکر کے مقابلہ کے لیے نہ آئے تھے اس لیے جنگی سامان کافی ساتھ نہ تھا، نیز افراد بھی تین سو سے کچھ اوپر تھے اور لشکر ایک ہزار کا تھا، اس لیے بعض کو طبعی طور پر پس وپیش ہوا، مشورہ کے طور پر عرض کیا کہ اس لشکر کا مقابلہ نہ کیجیے، بلکہ قافلہ کا تعاقب مناسب ہے، آپ ﷺ رنجیدہ ہوئے تو اس وقت حضرت ابوبکر، عمر، مقداد بن عمرو اور سعد بن معاذ رضی اللہ عنہم نے اطاعت کی تقریریں کیں، تب آپ بدر کی طرف روانہ ہوئے، پس حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

(جس طرح بدر میں اس لشکر کا مقابلہ بعض لوگوں کو گراں تھا، مگر اس کا انجام اچھا ہوا، اسلام غالب اور کفر مغلوب ہو گیا، اور یہ بات قافلہ لوٹنے میں کب حاصل ہوتی، اسی طرح مال غنیمت کا لوگوں کی مرضی کے موافق تقسیم نہ ہونا بلکہ من جانب اللہ اس کی تقسیم ہونا اگرچہ بعض لوگوں کو طبعاً گراں گزرا ہو مگر بہت سے مصالح کی وجہ سے یہی خیر اور بہتر ہے، اور یہ خلاف طبع معاملہ بہت سی مصلحتوں پر مشتمل ہونے میں ایسا ہی ہے) جیسا آپ کے رب نے آپ کے گھر (اور بستی) سے مصلحت کے ساتھ آپ کو (بدر کی طرف) روانہ کیا، اور مسلمانوں کی ایک جماعت (اپنی تعداد اور سامان جنگ کی کمی کی وجہ سے طبعی طور پر) اس کو گراں سمجھتی تھی، وہ اس مصلحت (کے کام) میں (یعنی جہاد اور مقابلہ لشکر کے معاملے میں) بعد اس کے کہ اس کا ظہور ہو چکا تھا

(اپنے بچاؤ کے لئے بطور مشورہ کے) آپ سے اس طرح جھگڑ رہے تھے کہ گویا کوئی ان کو موت کی طرف ہانکے لئے جاتا ہے اور وہ (موت کو گویا) دیکھ رہے ہیں (مگر آخر کار انجام اس کا بھی اچھا ہوا کہ اسلام غالب اور کفر مغلوب ہوا)۔

وَاِنَّ فَرِيۡقًا مِّنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ لَكٰرِهُوۡنَ: صحابہ کرام کو بے سروسامانی اور اندیشہ قتل کے غلبہ کی وجہ سے لشکر کے مقابلہ میں گرانی یا بوجھ طبعی تھا، عقلی یا اعتقادی نہ تھا، اس لیے کوئی اشکال نہیں، یہاں ایک جماعت اس لیے کہا کہ بعض حضرات کو تردد نہ ہوا تھا۔

يُجَادِلُوۡنَكَ فِى الۡحَـقِّ: صحابہ کرامؓ نے اگرچہ کوئی عدول حکمی نہ کی تھی، بلکہ مشورہ کے جواب میں اپنے ضعف اور پست ہمتی کا اظہار کیا تھا مگر رسول کے ساتھیوں سے ایسی رائے کا اظہار بھی ان کے بلند مقام کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک ناپسند تھا، اس لئے ناراضی کے الفاظ سے اس کو بیان فرمایا گیا۔

كَاَنَّمَا يُسَاقُوۡنَ اِلَى الۡمَوۡتِ: اس میں اشارہ کردیا گیا کہ وہ کراہت عقلی واعتقادی نہ تھی بلکہ بے سروسامانی کی وجہ سے طبعی کراہت تھی، پس اس میں کوئی اعتراض نہ رہا، اسی طرح مشورہ کے اہتمام کو مجازاً ''جدال'' فرمادیا اس میں بھی کوئی اعتراض نہیں۔

* * *

فائدہ: ل یعنی سوچو کہ اس جنگ (بدر) میں شروع سے آخر تک کس طرح حق تعالیٰ کی تحریک وتائید اور امداد اور توفیق مسلمانوں کے حق میں کارفرما رہی، خدا ہی تھا جو نصرت دین اسلام کے حق (سچے) وعدے کرکے اپنے نبی کو ایک امر حق یعنی کفار کے ساتھ جہاد کرانے کے لیے مدینہ سے باہر بدر کے میدان میں اس وقت لے آیا جبکہ ایک جماعت مسلمانوں کی لشکر قریش سے نبرد آزمائی کرنے پر راضی نہ تھی، یہ لوگ ایسی سچی اور طے شدہ چیز میں پس وپیش کر رہے اور حجتیں نکال رہے تھے جس کی نسبت بذریعہ پیغمبر انہیں ظاہر ہوچکا تھا وہ یقیناً خدا کی فرمائی ہوئی اٹل بات ہے (یعنی اسلام وپیران اسلام کا بذریعہ جہاد غالب ومنصور ہونا) ابوجہل کے لشکر سے مقابلہ کرنا ان کو اس قدر شاق اور گراں تھا جیسے کسی شخص کو آنکھوں دیکھتے موت کے منہ میں جانا مشکل ہے، تاہم خدا اپنی توفیق سے ان کو میدان جنگ میں لے گیا اور اپنی امداد سے مظفر ومنصور واپس لایا، پس جیسے خدا ہی کی مدد سے ازل اول تا آخر یہ مہم سر ہوئی، مال غنیمت بھی اس کا سمجھنا چاہیے وہ اپنے پیغمبر کے ذریعہ سے جہاں بتلائے وہاں خرچ کرو۔

تنبیہ: كَمَاۤ اَخۡرَجَكَ الخ کے ''کاف'' کو میں نے اپنی تقریر میں صرف ''تشبیہ'' کے لیے نہیں لیا، بلکہ ابوحیان کی تحقیق کے موافق معنی تعلیل پر مشتمل رکھا ہے جیسے وَاذۡكُرُوۡهُ كَمَا هَدٰٮكُمۡ میں علماء نے تصریح کی ہے اور اخرجك ربك من بيتك الى آخر الآيات کے مضمون کو میں نے اَلۡاَنۡفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوۡلِ کا ایک سبب قرار دیا ہے، ابوحیان کی طرح ''اعزك الله'' وغیرہ مقدر نہیں مانا، نیز تقریر آیت میں صاحب روح المعانی کی تصریح کے موافق اشارہ کردیا ہے کہ اَخۡرَجَكَ رَبُّكَ مِنۡۢ بَيۡتِكَ میں صرف آن خروج من البيت مراد نہیں بلکہ خروج من البيت سے دخول فی الجہاد تک کا ممتد اور وسیع زمانہ مراد ہے جس میں وَاِنَّ فَرِيۡقًا مِّنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ لَكٰرِهُوۡنَ يُجَادِلُوۡنَكَ فِى الۡحَـقِّ (الانفال: ۵-۶) وغیرہ سب احوال کا وقوع ہوا، ایک فریق کی کراہیت تو عین خروج من المدینہ ہی کے وقت ظاہر ہوگئی جسے ہم صحیح مسلم اور طبری کے حوالے سے سورۃ الانفال کے پہلے فائدہ میں بیان کرچکے ہیں اور مجادلہ کی صورت غالباً آگے چل کر لشکر کی اطلاع ملنے پر مقام صفراء میں پیش آئی، اس کے سمجھ لینے سے بعض مبطلین کے مغالطات کا استیصال ہوجائے گا۔

وَاِذۡ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحۡدَى الطَّآٮِٕفَتَيۡنِ اَنَّهَا لَـكُمۡ وَتَوَدُّوۡنَ اَنَّ غَيۡرَ ذَاتِ الشَّوۡكَةِ تَكُوۡنُ لَـكُمۡ

اور جس وقت تم سے وعدہ کیا تھا اللہ نے دو جماعتوں میں سے ایک کا کہ وہ تمہارے ہاتھ لگے گی اور تم چاہتے تھے کہ جس میں کانٹا نہ لگے وہ تم کو ملے

وَيُرِيۡدُ اللّٰهُ اَنۡ يُّحِقَّ الۡحَـقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَيَقۡطَعَ دَابِرَ الۡـكٰفِرِيۡنَۙ‏ ۝ لِيُحِقَّ الۡحَـقَّ وَيُبۡطِلَ الۡبَاطِلَ

اور اللہ چاہتا تھا کہ سچا کردے سچ کو اپنے کلاموں سے اور کاٹ ڈالے جڑ کافروں کی، تاکہ سچا کرے سچ کو اور جھوٹا کردے جھوٹ کو

وَلَوۡ كَرِهَ الۡمُجۡرِمُوۡنَ ۞

اور اگرچہ ناراض ہوں گناہ گار۔ ۱ے

خلاصہ تفسیر: پیچھے ایک انعام ذکر ہوا، اب آگے چند آیات میں مزید انعام بیان کیے جاتے ہیں۔

اور تم لوگ اس وقت کو یاد کرو جب کہ اللہ تعالیٰ تم سے ان دو جماعتوں (یعنی تجارتی قافلہ یا لشکر) میں سے ایک (جماعت) کا وعدہ کر رہے تھے کہ وہ (جماعت) تمہارے ہاتھ آجائے گی (یعنی مغلوب ہو جائے گی، یہ وعدہ مسلمانوں سے رسول اللہ ﷺ کے واسطہ سے بذریعہ وحی ہوا تھا) اور تم اس تمنا میں تھے کہ غیر مسلح جماعت (یعنی تجارتی قافلہ) تمہارے ہاتھ آجائے اور اللہ کو یہ منظور تھا کہ اپنے احکام سے حق کا حق ہونا (اس کو عملاً غلبہ دے کر) ثابت کر دے اور (یہ منظور تھا کہ) ان کافروں کی بنیاد کو قطع کر دے، تاکہ حق کا حق ہونا اور باطل کا باطل ہونا (عملاً) ثابت کر دے اگرچہ یہ مجرم لوگ (یعنی مغلوب ہونے والے کفار اس کو کتنا ہی) ناپسند کریں۔

وَاِذۡ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحۡدَى الطَّآئِفَتَيۡنِ اَنَّهَا لَـكُمۡ: پیچھے جو قصہ بیان ہوا ہے وہ اس آیت کی وضاحت کے لیے بھی کافی ہے، یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ حق تعالیٰ تو علیم خبیر اور ہر کام کے آغاز و انجام سے باخبر ہیں ان کی طرف سے اس مبہم وعدہ میں کیا مصلحت تھی کہ ان دونوں جماعتوں میں سے کسی ایک جماعت پر مسلمانوں کا غلبہ اور قبضہ ہوگا؟ وہ ان میں سے کسی ایک کو متعین کر کے بھی فرما سکتے تھے کہ فلاں جماعت پر قبضہ ہو جائے گا؟ اس ابہام کی وجہ۔ واللہ اعلم۔ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس میں صحابہ کرام کا امتحان کرنا تھا کہ آسان کام کو پسند کرتے ہیں یا مشکل کو، اور ان کی اخلاقی تربیت بھی تھی جس کے ذریعہ ان عالی ہمتی اور اعلیٰ مقاصد کی جدوجہد اور خطرات سے نہ گھبرانا سکھایا گیا۔

اَنۡ يُّحِقَّ الۡحَـقَّ بِكَلِمٰتِهٖ: یہاں ''کلمات'' کی تفسیر جو احکام سے کی گئی ہے اس سے یا تو شرعی احکام مراد ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو بدر کی طرف چلنے کے لیے فرمایا، یا تکوینی احکام مراد ہیں کہ حق تعالیٰ نے تقدیر میں اسی طرح مقدر کیا تھا کہ مسلمان بدر میں جائیں اور لڑیں، اور کفار مغلوب، قید اور ہلاک ہوں۔

وَيَقۡطَعَ دَابِرَ الۡـكٰفِرِيۡنَ: یہاں اس واقعہ کو کافروں کی جڑ کٹ جانے کا سبب بیان کیا، حالانکہ تمام کفار قریش اس میں ہلاک نہ ہوئے تھے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس واقعہ سے ان کی قوت بالکل فنا ہو گئی تھی، کیونکہ ان کے بڑے بڑے رئیس ستر قتل اور ستر قید ہوئے تھے، اس طرح وہ گویا سب ہی ختم ہو گئے۔

لِيُحِقَّ الۡحَـقَّ وَيُبۡطِلَ الۡبَاطِلَ: یہاں لِيُحِقَّ الۡحَـقَّ میں تکرار نہیں، کیونکہ اس سے پہلے بلا واسطہ حق ثابت کرنا مراد ہے، اور یہاں ان کی جڑ کاٹنے کے ذریعہ حق ثابت کرنا مقصود ہے اور اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ کسی کا ہلاک کرنا کسی خیر کی وجہ سے مقصود ہوتا ہے جیسا کہ اس جگہ کفار کی ہلاکت سے حق کا ثابت کرنا مقصود ہے۔

وَاِنَّ فَرِيۡقًا مِّنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ لَكٰرِهُوۡنَ - وَتَوَدُّوۡنَ اَنَّ غَيۡرَ ذَاتِ الشَّوۡكَةِ: پہلی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ کبھی نفع بصورت نقصان ہوتا ہے، اور دوسری آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ کبھی نقصان بصورت نفع ہوتا ہے، عارفین اس کو ہر وقت اپنے معاملات اور احوال میں مشاہدہ کرتے رہتے ہیں۔

* * *

فائدہ: ۱ے مسلمان چاہتے تھے کہ ''تجارتی قافلہ'' پر حملہ ہو کہ کانٹا نہ چبھے اور بہت سا مال ہاتھ آجائے، لیکن خدا کی مرضی یہ تھی کہ اس چھوٹی سی بے سروسامان جماعت کو کثیر التعداد اور مرتب و پرشوکت لشکر سے بھڑا کر اپنی باتوں سے سچ کو سچ کر دکھائے اور کفار مکہ کی جڑ کاٹ ڈالے، تاکہ اس طرح اس کے وعدوں کی سچائی حیرت انگیز طریقہ پر ظاہر ہو کر سچ کا سچ اور جھوٹ کا جھوٹ ہونا کفار کے علی الرغم صاف صاف آشکارا ہو جائے، چنانچہ یہ ہی ہوا، بدر میں قریش کے ستر سردار مارے گئے جن میں ابوجہل بھی تھا اور ستر ہی قید ہوئے، اس طرح کفر کی کمر ٹوٹ گئی اور مشرکین مکہ کی بنیادیں ہل گئیں فللہ الحمد والمنہ۔

إِذْ تَسْتَغِيثُونَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ أَنِّي مُمِدُّكُم بِأَلْفٍ مِّنَ الْمَلَائِكَةِ مُرْدِفِينَ ﴿٩﴾

جب تم لگے فریاد کرنے اپنے رب سے تو وہ پہنچا تمہاری فریاد کو کہ میں مدد کو بھیجوں گا تمہارے لیے ہزار فرشتے لگاتار آنے والے

وَمَا جَعَلَهُ اللَّهُ إِلَّا بُشْرَىٰ وَلِتَطْمَئِنَّ بِهِ قُلُوبُكُمْ ۚ وَمَا النَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِندِ اللَّهِ ۚ

اور یہ تو دی اللہ نے فقط خوشخبری اور تاکہ مطمئن ہوجائیں اس سے تمہارے دل، اور مدد نہیں مگر اللہ کی طرف سے

إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿١٠﴾ ع ۱۵

بیشک اللہ زورآور ہے حکمت والا۔[1]

خلاصہ تفسیر: اس وقت کو یاد کرو جب کہ تم اپنے رب سے (اپنی تعداد اور سامان جنگ کی کمی اور دشمن کی کثرت دیکھ کر) فریاد کر رہے تھے تو اللہ تعالیٰ نے تمہاری فریاد سن لی (اور وعدہ فرمایا) کہ تم کو ایک ہزار فرشتوں سے مدد دوں گا جو سلسلہ وار چلے آئیں گے۔

اور اللہ تعالیٰ نے یہ امداد صرف اس (حکمت) کے لئے کی کہ (تم کو غلبہ پانے کی) بشارت ہو (یعنی غلبہ کی توقع سے خوشی ہوجائے) اور تاکہ تمہارے دلوں کو (اضطراب سے) قرار آجائے (یعنی انسان کی تسلی طبعی طور پر اسباب سامان سے ہوتی ہے اس لئے وہ بھی جمع کر دیا گیا) اور (واقع میں تو) نصرت (اور غلبہ) صرف اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے جو زبردست حکمت والے ہیں۔

إِذْ تَسْتَغِيثُونَ رَبَّكُمْ: اس واقعہ میں رسول اللہ ﷺ کا فتح ونصرت کے لیے دعا کرنا صحاح میں مذکور ہے، اور آیت کے ظاہر سے مسلمانوں کا دعا کرنا بھی معلوم ہوتا ہے، اور بعض نے یہ کہا ہے کہ: تَسْتَغِيثُونَ میں حضور ﷺ ہی کو خطاب ہے، جمع کا صیغہ تعظیم کے طور پر لایا گیا ہے، اس صورت میں مسلمانوں کا دعا کرنا آیت سے معلوم نہ ہوگا۔

وَمَا جَعَلَهُ اللَّهُ إِلَّا بُشْرَىٰ (الی قوله) وَمَا النَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِندِ اللَّهِ: چونکہ انسان کی تسلی طبعی طور پر اسباب وسامان سے ہوتی ہے اس لیے وہ بھی جمع کر دیا گیا، اس سے معلوم ہوا کہ اسباب کے غیر مؤثر ہونے کے باوجود پھر بھی اسباب میں حکمتیں ہوا کرتی ہیں اس لیے اسباب کو اختیار کرنا ضروری ہے (اسباب اختیار کرنے میں دل کو تسلی اور تقویت ہوتی ہے جو شریعت کی نگاہ میں پسندیدہ عمل ہے)۔

* * *

فائدہ: [1] اسی طرح کی آیت آل عمران پارہ لن تنالوا کے ربع [آیت: ۱۲۵] پر گزر چکی ہے، وہاں کے فوائد ملاحظہ کیے جائیں، البتہ اس جگہ فرشتوں کی تعداد تین سے پانچ ہزار تک بیان کی گئی تھی اگر واقعہ ایک ہے تو کہا جائے گا کہ اول ایک ہزار کا دستہ آیا ہوگا، پھر اس کے پیچھے دوسرے دستے آئے ہوں، جن کی تعداد تین سے پانچ ہزار تک پہنچی، شاید لفظ مردِفین میں اسی طرف اشارہ ہو۔

إِذْ يُغَشِّيكُمُ النُّعَاسَ أَمَنَةً مِّنْهُ وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُم مِّنَ السَّمَاءِ مَاءً لِّيُطَهِّرَكُم بِهِ

جس وقت کہ ڈال دی اس نے تم پر اونگھ اپنی طرف سے تسکین کے واسطے اور اتارا تم پر آسمان سے پانی کہ اس سے تم کو پاک کر دے

وَيُذْهِبَ عَنكُمْ رِجْزَ الشَّيْطَانِ وَلِيَرْبِطَ عَلَىٰ قُلُوبِكُمْ وَيُثَبِّتَ بِهِ الْأَقْدَامَ ﴿١١﴾

اور دور کر دے تم سے شیطان کی نجاست اور مضبوط کر دے تمہارے دلوں کو اور جما دے اس سے تمہارے قدم

خلاصہ تفسیر: اس آیت میں ایک قصہ کی طرف اجمالی اشارہ ہے، بیان اس کا یہ ہے کہ بدر میں مشرکین پہلے پہنچے تھے اور پانی پر

قبضہ کرلیا، مسلمان بعد میں پہنچے اور ایک خشک ریگستان میں اترے جہاں پانی نہ ہونے سے پیاس کی بھی شدت اور نماز کے وقت وضو اور غسل سے بھی عاجز، کیونکہ تیمم کا حکم اب تک نازل نہ ہوا تھا، ادھر ریگستان میں چلنا پھرنا مصیبت کہ اس میں پاؤں دھنسے جاتے تھے، ان وجوہ سے دل بہت پریشان ہوا، اوپر سے شیطان نے وسوسہ ڈالنا شروع کیا کہ اگر تم اللہ کے نزدیک مقبول ہوتے تو اس پریشانی میں کیوں پھنستے؟ حالانکہ یہ وسوسہ محض بے بنیاد تھا، مگر پریشانی بڑھانے کے لیے کافی تھا، حق تعالیٰ نے پہلے باران رحمت نازل کی جس سے پانی کی کثرت ہوگئی، پیا بھی، وضو اور غسل بھی کیا، بارش کی وجہ سے ریت جم گئی، دھنسنا ختم ہوگئی، اس کے برعکس کفار چونکہ نرم زمین پر تھے، وہاں کیچڑ ہوگئی، چلنے پھرنے میں دقت ہونے لگی، غرض سب وسوسے اور تشویش دور ہوگئے، اس کے بعد مسلمانوں پر اونگھ کا غلبہ ہوا جس سے پوری راحت ہوگئی اور سب بے چینی جاتی رہی، اس آیت میں ان واقعات کی طرف اشارہ ہے۔

اس وقت کو یاد کرو جب کہ اللہ تعالیٰ تم پر اونگھ طاری کر رہا تھا اپنی طرف سے چین دینے کے لیے اور تم پر آسمان سے پانی برسا رہا تھا تا کہ اس پانی کے ذریعہ تم کو (بے وضو یا بے غسل ہونے کی حالت سے) پاک کردے اور (تا کہ اس کے ذریعہ) تم سے شیطانی وسوسہ کو دفع کردے اور (تا کہ) تمہارے دلوں کو مضبوط کردے اور (تا کہ) تمہارے پاؤں جمادے (یعنی تم ریت میں نہ دھنسو)۔

اِذْ يُغَشِّيْكُمُ النُّعَاسَ اَمَنَةً: قتادہؒ سے مروی ہے کہ نیند کا غلبہ دو لڑائیوں میں ہوا، ایک بدر میں جس کا ذکر یہاں ہے، دوسرا جنگ احد میں جس کا ذکر چوتھے پارہ میں گذر چکا، حضرت علیؓ سے منقول ہے کہ ہم سب پر نیند کا غلبہ ہوا مگر رسول اللہ ﷺ صبح تک نماز پڑھنے میں مشغول رہے، احقر کہتا ہے کہ یہ اونگھ کا غلبہ پریشانی کا علاج تھا، حضور ﷺ غایت توکل اور اطمینان کی وجہ سے پریشان ہی نہ ہوئے تھے اس لیے آپ پر غلبہ نہ ہوا۔

اِذْ يُغَشِّيْكُمُ النُّعَاسَ یعنی نزول سکینہ سے قویٰ بدنی وصفات نفسانی کا سکون، **اَمَنَةً مِّنْهُ** یعنی حق تعالیٰ کی طرف سے امن، **وَيُذْهِبَ عَنْكُمْ رِجْزَ الشَّيْطٰنِ** یعنی شیطان کا وسوسہ اور خوف دلانا، **وَلِيَرْبِطَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ** یعنی یقین کی قوت سے قلب کو قوی فرمادے اور تمہارے قلب کو قرار بخشے، **وَيُثَبِّتَ بِهِ الْاَقْدَامَ** وجہ یہ کہ خوفناک مواقع میں شجاعت وثابت قدمی قوت یقین کے ثمرات میں سے ہے۔

＊＊＊

فائدہ: بدر کا معرکہ فی الحقیقت مسلمانوں کے لیے بہت ہی سخت آزمائش اور عظیم الشان امتحان کا موقع تھا، وہ تعداد میں تھوڑے تھے، بے سروسامان تھے، فوجی مقابلہ کے لیے تیار ہو کر نہ نکلے تھے، مقابلہ پر ان سے تگنی تعداد کا لشکر تھا، جو پورے ساز وسامان سے کبر وغرور کے نشہ میں سرشار ہو کر نکلا تھا، مسلمانوں اور کافروں کی یہ پہلی ہی قابل ذکر ٹکر تھی، پھر صورت ایسی پیش آئی کہ کفار نے پہلے سے اچھی جگہ اور پانی وغیرہ پر قبضہ کرلیا مسلمان نشیب میں تھے، ریت بہت زیادہ تھی جس میں چلتے ہوئے پاؤں دھنستے تھے، گرد وغبار نے الگ پریشان کر رکھا تھا، پانی نہ ملنے سے ایک طرف غسل و وضوء کی تکلیف، دوسری طرف تشنگی ستا رہی تھی، یہ چیزیں دیکھ کر مسلمان ڈرے کہ بظاہر آثار شکست کے ہیں، شیطان نے دلوں میں وسوسہ ڈالا کہ اگر واقعی تم خدا کے مقبول بندے ہوتے تو ضرور تائید ایزدی تمہاری طرف ہوتی اور ایسی پریشان کن اور یاس انگیز صورت حال پیش نہ آتی، اس وقت حق تعالیٰ نے قدرت کاملہ سے زور کا مینہ برسایا جس سے میدان کی ریت جم گئی، غسل ووضوء کرنے اور پینے کے لیے پانی کی افراط ہوگئی، گرد وغبار سے نجات ملی، کفار کا لشکر جس جگہ تھا وہاں کیچڑ اور پھسلن سے چلنا پھرنا دشوار ہوگیا، جب یہ ظاہری پریشانیاں دور ہوئیں تو حق تعالیٰ نے مسلمانوں پر ایک قسم کی غنودگی طاری کردی، آنکھ کھلی تو دلوں سے سارا خوف وہراس جاتا رہا، بعض روایات میں ہے کہ حضور ﷺ اور ابوبکر صدیق رات بھر ''عریش'' میں مشغول دعا رہے، اخیر میں حضور ﷺ پر خفیف سی غنودگی طاری ہوئی، جب اس سے چونکے تو فرمایا خوش ہو جاؤ کہ جبرائیل تمہاری مدد کو آرہے ہیں، عریش سے باہر تشریف لائے تو **سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ** (القمر: ۴۵) زبان مبارک پر جاری تھا، بہر حال اس باران رحمت نے بدن کو احداث سے اور دلوں کو شیطان کے وساوس سے پاک کردیا، ادھر ریت کے جم جانے سے ظاہری طور پر قدم جم گئے اور اندر سے ڈر نکل کر دل مضبوط ہوگئے۔

إِذْ يُوحِي رَبُّكَ إِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ أَنِّي مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِينَ اٰمَنُوْا ۭ سَاُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ

جب حکم بھیجا تیرے رب نے فرشتوں کو کہ میں ساتھ ہوں تمہارے سو تم دل ثابت رکھو مسلمانوں کے، میں ڈال دوں گا دل میں

كَفَرُوا الرُّعْبَ فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ وَاضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ ﴿١٢﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَاۗقُّوا

کافروں کے دہشت، سو مارو گردنوں پر اور کاٹو ان کی پور پور، یہ اس واسطے ہے کہ وہ مخالف ہوئے

اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ وَمَنْ يُّشَاقِقِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿١٣﴾ ذٰلِكُمْ فَذُوْقُوْهُ

اللہ کے اور اس کے رسول کے، اور جو کوئی مخالف ہو اللہ کا اور اس کے رسول کا تو بیشک اللہ کا عذاب سخت ہے، یہ تو تم چکھ لو

وَاَنَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابَ النَّارِ ﴿١٤﴾

اور جان رکھو کہ کافروں کے لیے ہے عذاب دوزخ کا۔[1]

خلاصہ تفسیر: اس وقت کو یاد کرو جب کہ آپ کا رب (ان) فرشتوں کو (جو امداد کے لئے نازل ہوئے تھے) حکم دیتا تھا کہ میں تمہارا ساتھی (اور مددگار) ہوں سو (مجھ کو مددگار سمجھ کر) ایمان والوں کی ہمت بڑھاؤ میں ابھی کفار کے قلوب میں رعب ڈالے دیتا ہوں (یہ انی معکم کی تفسیر ہوئی) سو تم (کفار کی) گردنوں پر (ہتھیار) مارو اور ان کے پور پور کو مارو (یہ فثبتو اکا بیان ہوا) یہ اس بات کی سزا ہے کہ انہوں نے اللہ کی اور اس کے رسول کی مخالفت کی اور جو اللہ کی اور اس کے رسول کی مخالفت کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ (اس کو) سخت سزا دیتے ہیں (خواہ دنیا میں کسی حکمت سے یا آخرت میں یا دونوں جگہ) سو (اس مخالفت کی وجہ سے سردست تو) یہ سزا چکھو اور جان رکھو کہ کافروں کے لیے جہنم کا عذاب مقرر ہی ہے (دنیوی سزا سے وہ ٹل نہیں گیا، بلکہ اصلی وہی ہے)۔

اِذْ يُوْحِيْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ اَنِّيْ مَعَكُمْ: اس آیت کے ظاہر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فرشتوں نے بھی قتل وقتال کیا ہے، درمنثور میں اس کی مؤید روایات بھی ہیں، اور بعض نے اس آیت کی تفسیر اس طرح کی ہے کہ فرشتوں کو حکم ہوا کہ مسلمانوں کی ہمت بڑھاؤ، یعنی ان کے دلوں میں یہ بات ڈال دو کہ کفار ابھی مرعوب ہوئے جاتے ہیں تم ان کی گردنوں اور پوروں پر ہتھیار مارو، اس صورت میں فرشتوں کا لڑنا آیت سے ثابت نہ ہوگا، اور بات یہ ہے کہ اصلی مقصود فرشتوں کے آنے سے مسلمانوں کی ہمت بڑھانا اور ان کے قدم جمانا تھا، جو لڑے بغیر محض تصرف سے بھی ممکن تھا، چنانچہ زجاج کا قول روح المعانی میں نقل کیا ہے: "وللملك قوة القاء الخير في القلب" الخ کہ فرشتوں کو نیک بات کسی کے دل میں القا کرنے کی قوت ہے، اور کسی کسی کو جو فرشتوں نے قتل کیا وہ اس لیے تاکہ مسلمانوں کو فرشتوں کے نازل ہونے کا یقین ہو جائے، یہ مضمون چوتھے پارہ سورہ آل عمران آیت ۱۲۶: وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ میں گزر چکا ہے وہاں ملاحظہ فرمایے۔

* * *

فائدہ: [1] جنگ بدر کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس معرکہ میں خود ابلیس لعین کنانہ کے سردار اعظم سراقہ بن مالک مدلجی کی صورت میں متشکل ہو کر ابو جہل کے پاس آیا اور مشرکین کے خوب دل بڑھائے کہ آج تم پر کوئی غالب نہیں آ سکتا، میں اور میرا سارا قبیلہ تمہارے ساتھ ہے، ابلیس کے جھنڈے تلے بڑا بھاری لشکر شیاطین کا تھا، یہ واقعہ آگے آئے گا، اس کے جواب میں حق تعالیٰ نے مسلمانوں کی کمک پر شاہی فوج کے دستے جبرائیل و میکائیل کی کمانڈ میں یہ کہہ کر بھیجے کہ میں تمہارے ساتھ ہوں، اگر شیاطین آدمیوں کی صورت میں (ہم شکل) ہو کر کفار کے حوصلے بڑھا رہے ہیں اور ان کی طرف سے لڑنے کو تیار ہیں اور مسلمانوں کے قلوب کو وسوسے ڈال کر خوفزدہ کر رہے ہیں تو تم مظلوم وضعیف مسلمانوں کے دلوں کو مضبوط

کرو، ادھر تم ان کی ہمت بڑھاؤ گے ادھر میں کفار کے دلوں میں دہشت اور رعب ڈال دوں گا، تم مسلمانوں کے ساتھ ہو کر ان ظالموں کی گردنیں مارو اور پور پور کاٹ ڈالو، کیونکہ آج ان سب جنی وانسی کافروں نے مل کر خدا اور رسول سے مقابلہ کی ٹھہرائی ہے، سو انہیں معلوم ہو جائے کہ خدا کے مخالفوں کو کیسی سخت سزا ملتی ہے، آخرت میں جو سزا ملے گی اصل تو وہ ہی ہے لیکن دنیا میں بھی اس کا تھوڑا سا نمونہ دیکھ لیں اور عذاب الٰہی کا کچھ مزہ چکھ لیں۔

روایات میں ہے کہ بدر میں ملائکہ کو لوگ آنکھوں سے دیکھتے تھے اور ان کے مارے ہوئے کفار کو آدمیوں کے قتل کئے ہوئے کفار سے الگ شناخت کرتے تھے، خدا تعالیٰ نے یہ ایک نمونہ دکھا دیا کہ اگر کبھی شیاطین الجن والانس ایسے غیر معمولی طور پر حق کے مقابل جمع ہو جائیں تو وہ اہل حق اور مقبول بندوں کو ایسے غیر معمولی طریقہ سے فرشتوں کی کمک پہنچا سکتا ہے، باقی ویسے تو فتح وغلبہ بلکہ ہر چھوٹا بڑا کام خدا ہی کی مشیت وقدرت سے انجام پاتا ہے، اسے نہ فرشتوں کی احتیاج ہے نہ آدمیوں کی، اور اگر فرشتوں ہی سے کوئی کام لے تو ان کو وہ طاقت بخشی ہے کہ تنہا ایک فرشتہ بڑی بڑی بستیوں کو اٹھا کر پٹک سکتا ہے، یہاں تو عالم تکلیف واسباب میں ذرا سی تنبیہ کے طور پر شیاطین کی غیر معمولی دوڑ دھوپ کا جواب دینا تھا اور بس۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوهُمُ الْأَدْبَارَ ﴿١٥﴾ وَمَنْ يُوَلِّهِمْ

اے ایمان والو! جب بھڑو تم کافروں سے میدان جنگ میں تو مت پھیرو ان سے پیٹھ[1] اور جو کوئی ان سے پھیرے

يَوْمَئِذٍ دُبُرَهُ إِلَّا مُتَحَرِّفًا لِقِتَالٍ أَوْ مُتَحَيِّزًا إِلَى فِئَةٍ فَقَدْ بَاءَ بِغَضَبٍ مِنَ اللَّهِ وَمَأْوَاهُ

پیٹھ اس دن مگر یہ کہ ہنر کرتا ہو لڑائی کا یا جا ملتا ہو فوج میں سو وہ پھرا اللہ کا غضب لے کر اور اس کا ٹھکانا

جَهَنَّمُ ۖ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ﴿١٦﴾

دوزخ ہے، اور وہ کیا برا ٹھکانا ہے[2]۔

خلاصہ تفسیر: گذشتہ آیات میں ملائکہ کو مسلمانوں کے ثابت قدم کرنے کا حکم تھا، اب آگے مسلمانوں کو ثابت قدم رہنے کا حکم ہے اور چونکہ اس حکم کو ہر جہاد کے ساتھ متعلق کرنا مقصود ہے اس لیے عام عنوان سے اس کا ذکر فرمایا۔

اے ایمان والوں! جب تم کافروں سے (جہاد میں) دو بدو مقابل ہو جاؤ تو ان سے پشت مت پھیرنا (یعنی جہاد سے مت بھاگنا) اور جو شخص ان سے اس موقع پر (یعنی مقابلہ کے وقت) پشت پھیرے گا مگر ہاں جو لڑائی کے لئے پینترا بدلتا ہو یا جو اپنی جماعت کی طرف پناہ لینے آتا ہو وہ مستثنیٰ ہے باقی اور جو ایسا کرے گا وہ اللہ کے غضب میں آجائے گا اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہوگا اور وہ بہت ہی بری جگہ ہے۔

فَلَا تُوَلُّوهُمُ الْأَدْبَارَ: جہاد سے بھاگنا حرام ہے، ہاں اگر کافر دوگنے سے زیادہ ہوں تو جائز ہے جیسا کہ آگے آتا ہے، اور جب دوگنے سے زیادہ نہ ہوں تب بھی جواز کی دو صورتیں ہیں جن کو آیت میں مستثنیٰ کیا گیا ہے: ① ایک یہ کہ دھوکہ دینے کے لیے سامنے سے بھاگے تاکہ حریف غافل ہو جائے، پھر اچانک لوٹ کر اس پر حملہ کرے ② دوسرے یہ کہ اصلی مقصود بھاگنا نہ ہو، بلکہ بے سروسامانی وغیرہ کی وجہ سے اپنی جماعت میں اس غرض سے آملے کہ ان سے قوت اور مدد لے کر پھر مقابل ہوگا، اس میں بعض نے اس جماعت کے قریب ہونے کی شرط لگائی ہے، بعض نے عام کہا ہے، اور جنگ بدر میں کفار دوگنے سے زیادہ تھے اس کے باوجود پھر بھی بھاگنا جائز نہ تھا جس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس وقت تک وہ حکم جس میں دو حصہ کی قید ہے نازل نہ ہوا تھا، اسی اعتبار سے بعض نے اس آیت کو بدر کے ساتھ خاص کہا ہے اس کا یہی مطلب ہے۔

* * *

فائدہ: [1] "فرار من الزحف" (جہاد میں سے نکل کر بھاگنا اور لڑائی میں کفار کو پیٹھ دکھانا) بہت سخت گناہ اکبر الکبائر میں سے ہے اگر کافر تعداد میں مسلمانوں سے دگنے ہوں اس وقت تک فقہاء نے پیٹھ پھیرنے کی اجازت نہیں دی۔

فائدہ: ۲ یعنی اگر پسپائی کسی جنگی مصلحت سے ہو، مثلاً پیچھے ہٹ کر حملہ کرنا زیادہ موثر ہے یا ایک جماعت سپاہیوں کی مرکزی فوج سے جدا ہوگئی وہ اپنے بچاؤ کے لیے پسپا ہوکر مرکز سے ملنا چاہتی ہے، تو ایسی پسپائی جرم نہیں، گناہ اس وقت ہے جبکہ پسپائی محض لڑائی سے جان بچا کر بھاگنے کی نیت سے ہو۔

فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ ۪ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ۚ

سو تم نے ان کو نہیں مارا لیکن اللہ نے ان کو مارا، اور تو نے نہیں پھینکی مٹھی خاک کی جس وقت کہ پھینکی تھی لیکن اللہ نے پھینکی

وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِيْنَ مِنْهُ بَلَآءً حَسَنًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۷﴾

اور تا کہ کرے ایمان والوں پر اپنی طرف سے خوب احسان، بیشک اللہ ہے سننے والا جاننے والا

خلاصہ تفسیر: پیچھے غیبی امداد کا بیان تھا، اب آگے بتلاتے ہیں کہ یہ غلبہ ہماری قدرت اور مشیت کا اثر ہے، اگرچہ ظاہری طور پر ایک خاص حکمت کی وجہ سے تمہارے فعل سے ظاہر ہوا، اس میں ایک قصہ کی طرف اشارہ ہے وہ یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے روز ایک مٹھی کنکریوں کی اٹھا کر کافروں کی طرف پھینکی جس کے ریزے سب کی آنکھوں میں جا گرے اور ان کو شکست ہوئی، چنانچہ فرماتے ہیں کہ:

(جب فرشتوں کا امداد کے لیے آنا وغیرہ جیسے عجیب واقعات ہوئے جو کہ تمہارے اختیار سے بالکل خارج ہیں) سو (اس سے معلوم ہوا کہ حقیقی تاثیر کے مرتبہ میں) تم نے ان (کافروں) کو قتل نہیں کیا، لیکن (ہاں! اس مرتبہ میں) اللہ تعالیٰ نے (بیشک) ان کو قتل کیا (یعنی موثر حقیقی اللہ کی قدرت ہے) اور (اسی طرح حقیقی تاثیر کے مرتبہ میں) آپ نے خاک کی مٹھی (ان کی طرف) نہیں پھینکی، لیکن (ہاں! اس مرتبہ میں) اللہ تعالیٰ نے (واقعی) وہ پھینکی، اور (باوجود اس کے کہ موثر حقیقی حق تعالیٰ کی قدرت ہے پھر جو قتل وغیرہ کے آثار مسلمانوں کے ہاتھ سے ظاہر ہوئے تو اس میں حکمت یہ ہے کہ) تا کہ مسلمانوں کو اپنی طرف سے (ان کے عمل کا) خوب اجر دے (اور اجر کا ملنا اللہ تعالیٰ کی عادت کے مطابق اس پر موقوف ہے کہ بندہ کے ارادہ واختیار سے فعل صادر ہو) بلاشبہ اللہ تعالیٰ (ان مؤمنین کی باتوں کے) خوب سننے والے (اور ان کے افعال واحوال کے) خوب جاننے والے ہیں (ان کی فریاد، قتال اور تشویش کے احوال وغیرہ میں جو ان کو محنت پیش آئی ہم کو اس کی اطلاع ہے ان کو اس پر جزا دیں گے)۔

مٹھی خاک پھینکنے کا واقعہ کئی بار ہوا، بدر میں، احد میں، حنین میں، لیکن یہاں سیاق کلام سے بدر کا واقعہ مراد لینا غالب ہے۔

* * *

فائدہ: جب جنگ کی شدت ہوئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مٹھی کنکریاں لشکر کفار کی طرف پھینکیں اور تین مرتبہ "شاهت الوجوه" فرمایا، خدا کی قدرت سے کنکریوں کے ریزے ہر کافر کی آنکھ میں پہنچے، وہ سب آنکھیں ملنے لگے ادھر سے مسلمانوں نے فوراً دھاوا بول دیا، آخر بہت سے کفار کھیت رہے، اسی کو فرماتے ہیں کہ گو بظاہر کنکریاں تم نے اپنے ہاتھ سے، پھینکی تھیں لیکن کسی بشر کا یہ فعل عادۃً ایسا نہیں ہوسکتا کہ مٹھی بھر کنکریاں ہر سپاہی کی آنکھ میں پڑ کر ایک مسلح لشکر کی ہزیمت کا سبب بن جائیں، یہ صرف خدائی ہاتھ تھا جس نے مٹھی بھر سنگریزوں سے فوجوں کے منہ پھیر دیئے، تم بے سروسامان قلیل التعداد مسلمانوں میں اتنی قدرت کہاں تھی کہ محض تمہارے زور بازو سے کافروں کے ایسے ایسے منڈ مارے جاتے، یہ تو خدا ہی کی قدرت کا کرشمہ ہے کہ اس نے ایسے متکبر سرکشوں کو فنا کے گھاٹ اتارا، ہاں یہ ضرور ہے کہ بظاہر کام تمہارے ہاتھوں سے لیا گیا اور ان میں وہ فوق العادت قوت پیدا کردی جسے تم اپنے کسب واختیار سے حاصل نہ کرسکتے تھے، یہ اس لیے کیا گیا کہ خدا کی قدرت ظاہر ہو اور مسلمانوں پر پوری مہربانی اور خوب طرح احسان کیا جائے، بیشک خدا مومنین کی دعاء وفریاد کو سنتا اور ان کے افعال واحوال کو بخوبی جانتا ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ مقبول بندوں پر کس وقت کس عنوان سے احسان کرنا مناسب ہے۔

ذٰلِكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ مُوْهِنُ كَيْدِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۸﴾

یہ تو ہو چکا اور جان رکھو کہ اللہ سست کر دے گا تدبیر کافروں کی

خلاصہ تفسیر: ایک بات تو یہ ہوئی اور دوسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کافروں کی تدبیر کا کمزور کرنا تھا (اور زیادہ کمزوری اس وقت ظاہر ہوتی ہے جب اپنے برابر والے بلکہ اپنے سے کمزور کے ہاتھوں مغلوب ہو جائے، اور یہ بھی اس پر موقوف تھا کہ غلبہ کے آثار مسلمانوں کے ہاتھ سے ظاہر ہوں، ورنہ کفار کہہ سکتے تھے کہ تدبیر تو ہماری قوی تھی، لیکن تدبیر الٰہی کے سامنے نہ چل سکی، کیونکہ خدا کی تدبیر سب سے قوی ہے، تو اس سے آئندہ مسلمانوں کے مقابلہ میں ان کا حوصلہ پست نہ ہوتا، کیونکہ ان کو تو ضعیف ہی سمجھتے)۔

***

فائدہ: یعنی اس وقت بھی خدا نے کفار مکہ کے سب منصوبے خاک میں ملا دیئے اور آئندہ بھی ان کی تدبیروں کو سست کر دیا جائے گا۔

اِنْ تَسْتَفْتِحُوْا فَقَدْ جَآءَكُمُ الْفَتْحُ ۚ وَاِنْ تَنْتَهُوْا فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَاِنْ تَعُوْدُوْا نَعُدْ ۚ

اگر تم چاہتے ہو فیصلہ تو پہنچ چکا تمہارے پاس فیصلہ، اور اگر باز آؤ تو تمہارے لیے بہتر ہے، اور اگر پھر یہی کرو گے تو ہم بھی یہی کریں گے

وَلَنْ تُغْنِيَ عَنْكُمْ فِئَتُكُمْ شَيْئًا وَّلَوْ كَثُرَتْ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۹﴾ ع ۹ / ۱۶

اور کچھ کام نہ آئے گا تمہارا جتھا اگر چہ بہت ہوں اور جان لو کہ اللہ ایمان والوں کے ساتھ ہے

خلاصہ تفسیر: پیچھے بدر کے واقعات میں نعمتوں کی یاد دہانی کے طور پر مسلمانوں کو خطاب تھا، آگے کفار کو بطور عذاب کی یاد دہانی کے ایک خاص مضمون کا خطاب ہے جس کا قصہ یہ ہوا کہ کفار قریش ابوجہل وغیرہ نے مقابلہ کے وقت یہ دعا کی تھی کہ یا اللہ آج ہمارے اور محمد کے درمیان فیصلہ کر دیجیے جو حق پر ہو آج اس کو غالب کر دے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

اگر تم لوگ فیصلہ چاہتے ہو تو وہ فیصلہ تو تمہارے پاس آموجود ہوا (کہ جو حق پر تھا اس کو غلبہ ہو گیا) اور اگر (اب حق واضح ہو جانے کے بعد رسول اللہ ﷺ کی مخالفت سے) باز آ جاؤ تو یہ تمہارے لئے نہایت خوب ہے، اور اگر (اب بھی باز نہ آئے، بلکہ) تم پھر وہی کام کرو گے (یعنی مخالفت) تو ہم بھی پھر یہی کام کریں گے (یعنی تم کو مغلوب اور مسلمانوں کو غالب کر دیں گے) اور (اگر تم کو اپنی کثرت و جمعیت کا گھمنڈ ہو کہ اب کی بار اس سے زیادہ لشکر جمع کر لیں گے تو یاد رکھو کہ) تمہاری جمعیت تمہارے ذرا بھی کام نہ آئے گی گو کتنی زیادہ ہو اور واقعی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ (اصل میں) ایمان والوں کے ساتھ (یعنی ان کا مددگار) ہے (اگر چہ کسی عارض کی وجہ سے کسی وقت مسلمانوں کے غلبہ کا ظہور نہ ہو، لیکن در اصل غلبہ کے لائق یہی ہیں، اس لئے ایمان والوں سے مقابلہ کرنا اپنا نقصان کرنا ہے)۔

***

فائدہ: یہ خطاب کفار مکہ کو ہے، وہ ہجرت سے پہلے حضور ﷺ سے کہا کرتے تھے: مَتٰى هٰذَا الْفَتْحُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ یعنی ہمارے تمہارے درمیان یہ فیصلہ کب ہوگا؟ سو پورا فیصلہ تو قیامت کے دن ہوگا مگر ایک طرح کا فیصلہ آج میدان بدر میں بھی تم نے دیکھ لیا کہ کیسے خارق عادت طریق سے تم کو کمزور مسلمانوں کے ہاتھوں سے سزا ملی، اب اگر نبی (علیہ السلام) کی مخالفت اور کفر و شرک سے باز آ جاؤ تو تمہارے لیے دنیا و آخرت کی بہتری ہے، ورنہ اگر پھر اسی طرح لڑائی کرو گے تو ہم بھی پھر اسی طرح مسلمانوں کی مدد کریں گے اور انجام کار تم ذلیل و خوار ہو گے، جب خدا کی تائید مسلمانوں کے ساتھ ہے تو تمہارے جتھے اور جماعتیں خواہ کتنی ہی تعداد میں ہوں کچھ کام نہ آئیں گے، بعض روایات میں ہے کہ ابوجہل وغیرہ نے مکہ سے روانگی کے وقت کعبہ کے پردے پکڑ کر دعا کی تھی کہ خداوندا! دونوں فریق میں جو اعلیٰ و اکرام ہو اسے فتح دے اور فساد مچانے والے کو مغلوب کر فقط

جاءَ کم الفتح میں اس کا بھی جواب ہوگیا کہ جو واقعی "اعلیٰ وافضل" تھے، ان کو فتح مل گئی اور مفسد ذلیل ورسوا ہوئے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ ﴿۲۰﴾

اے ایمان والو! حکم مانو اللہ کا اور اس کے رسول کا اور اس سے مت پھرو سن کر

خلاصہ تفسیر: پیچھے اللہ ورسول کی مخالفت کرنے والے کفار کی مذمت تھی، آگے مؤمنین کو اللہ ورسول کی اطاعت وموافقت کا حکم ہے، نیز مخالفت کی ممانعت اور اس کی تاکید کے لیے کفار کے ساتھ مشابہت اختیار کرنے کی ممانعت اور کفار کی مذمت کا بیان ہے، اور اپنے ساتھ دوسروں کو بھی اللہ ورسول کے تابع دار بنانے کی کوشش کرنے کا حکم فرماتے ہیں۔

اے ایمان والو! اللہ کا کہنا مانو اور اس کے رسول کا، اور اس کہنا ماننے سے روگردانی مت کرو اور تم (اعتقاد سے) سن تو لیتے ہی ہو (یعنی جیسا اعتقاد سے سن لیتے ہوا یسا ہی عمل بھی کیا کرو)۔

* * *

فائدہ: پہلے فرمایا تھا کہ "اللہ ایمان والوں کے ساتھ ہے"، اب ایمان والوں کو ہدایت فرماتے ہیں کہ ان کا معاملہ خدا اور رسول کے ساتھ کیسا ہونا چاہیے؟ جس سے وہ خدا کی نصرت وحمایت کے مستحق ہوں، سو بتلا دیا کہ ایک مومن صادق کا کام یہ ہے کہ وہ ہمہ تن خدا اور رسول کا فرمانبردار ہو، احوال وحوادث خواہ کتنا ہی اس کا منہ پھیرنا چاہیں مگر خدا کی باتوں کو جب وہ سن کر سمجھ چکا اور تسلیم کر چکا، تو قولاً وفعلاً کسی حال ان سے منہ نہ پھیرے۔

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ ﴿۲۱﴾

اور ان جیسے مت ہو جنہوں نے کہا ہم نے سن لیا اور وہ سنتے نہیں

خلاصہ تفسیر: (گذشتہ مضمون کی مزید تاکید کے لئے ارشاد فرمایا کہ:) اور (تم ترک اطاعت میں) ان لوگوں کی طرح مت ہونا جو دعویٰ تو کرتے ہیں کہ ہم نے سن لیا (جیسے کفار کہ مطلق کانوں سے سننے کا اور منافقین اعتقاد کے ساتھ سننے کا دعوی تو کرتے تھے) حالانکہ وہ سنتے سناتے کچھ نہیں (کیونکہ ان میں فہم اور اعتقاد دونوں نہیں ہے، مطلب یہ کہ اعتقاد کے ساتھ سننے کا ثمرہ ونتیجہ عمل ہے، جب عمل نہ ہوا تو وہ سننا ایسا ہی ہے کہ گویا اعتقاد سے سنا ہی نہیں، جس کو تم بھی سخت برا جانتے ہو)۔

* * *

فائدہ: یعنی زبان سے کہتے ہیں کہ ہم نے سن لیا، حالانکہ وہ سننا ہی کیا جو آدمی سیدھی سی بات کو سن کر سمجھے نہیں، یا سمجھ کر قبول نہ کرے، پہلے یہودیوں نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا: سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا (ہم نے سن لیا مگر مانا نہیں) مشرکین مکہ کا قول آگے آتا ہے: قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ (الانفال: ۳۱) یعنی جو قرآن آپ سناتے ہیں بس ہم نے سن لیا، اگر ہم چاہیں تو اسی جیسا کلام بنا کر لے آئیں، مدینہ کے منافقین کا توشیوہ یہ تھا کہ پیغمبر ﷺ اور مسلمانوں کے سامنے زبانی اقرار کر گئے اور دل سے اسی طرح منکر رہے، بہر حال مومن صادق کی شان ان یہود اور مشرکین و منافقین کی طرح نہ ہونی چاہیے، اس کی شان یہ ہے کہ دل سے، زبان سے، عمل سے، حاضر وغائب احکام الٰہیہ اور فرامین نبویہ پر نثار ہوتا رہے۔

اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۲۲﴾

بیشک سب جانداروں میں بدتر اللہ کے نزدیک وہی بہرے گونگے ہیں جو نہیں سمجھتے

خلاصہ تفسیر: اب ان لوگوں کی شدید مذمت بیان کی جارہی ہے جو حق بات کو غور وتدبر سے نہیں سنتے اور اسے قبول نہیں کرتے:

بیشک (یہ بات ضرور ہے کہ اعتقاد سے سن کر عمل نہ کرنے والے، اور بغیر اعتقاد کے سننے والے۔ جو نہ سننے کے مشابہ ہے۔ برا ہونے میں

باہم فرق رکھتے ہیں، کیونکہ کافر اور گناہ گار مسلمان برابر نہیں، چنانچہ)) بدترین خلائق اللہ کے نزدیک وہ لوگ ہیں جو (حق بات کو اعتقاد کے ساتھ سننے سے) بہرے ہیں (اور حق بات کے کہنے سے) گونگے ہیں (اور) جو کہ (حق بات کو) ذرا نہیں سمجھتے (اور جن سے باوجود اعتقاد کے عمل میں کوتاہی ہوجاتی ہے وہ بدتر نہیں ہیں، اگرچہ برے ضرور ہیں، مگر انسان کو برا بھی نہیں ہونا چاہئے)۔

* * *

فائدہ: جنہیں خدا نے بولنے کو زبان سننے کو کان اور سمجھنے کو دل و دماغ دیئے تھے پھر انہوں نے یہ سب قوتیں معطل کردیں، نہ زبان سے حق بولنے اور حق کو دریافت کرنے کی کوشش کی، غرض خدا کی بخشی ہوئی قوتوں کو اس اصلی کام میں صرف نہ کیا، جس کے لیے فی الحقیقت عطا کی گئی تھیں، بلاشبہ ایسے لوگ جانوروں سے بھی بدتر ہیں۔

وَلَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِيْهِمْ خَيْرًا لَّاَسْمَعَهُمْ ؕ وَلَوْ اَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۲۳﴾

اور اگر اللہ جانتا ان میں کچھ بھلائی تو ان کو سنا دیتا، اور اگر ان کو اب سنادے تو ضرور بھاگیں منہ پھیر کر

خلاصہ تفسیر: آگے بتلاتے ہیں کہ اعتقاد سے نہ سننے کی وجہ یہ ہے کہ ان میں ایک بڑی خوبی کی کمی ہے، وہ یہ کہ ان میں حق کی طلب نہیں، کیونکہ اعتقاد کی بنیاد بھی طلب اور تلاش ہے، طلب کی برکت سے حق واضح ہوجاتا ہے، تردد ختم ہوکر اعتقاد پیدا ہوجاتا ہے اور اسی پر سننے کا فائدہ موقوف ہے، سو یہی خوبی ان میں نہیں ہے، چنانچہ ارشاد ہے:

اور اگر اللہ تعالیٰ ان میں کوئی خوبی دیکھتے (مراد یہ کہ اگر ان میں وہ خوبی موجود ہوتی، کیونکہ اس کے موجود ہونے پر خدا کو اس کا علم ضرور ہوتا، اور "کوئی خوبی" اس لئے کہا کہ جب ایسی خوبی نہیں جس پر نجات کا مدار ہے تو گویا کوئی خوبی بھی نہیں، یعنی اگر ان میں طلب حق ہوتی) تو (اللہ تعالیٰ) ان کو (اعتقاد کے ساتھ) سننے کی توفیق دیتے (جیسا پیچھے بیان ہوا کہ طلب سے اعتقاد پیدا ہوجاتا ہے) اور اگر (اللہ تعالیٰ) ان کو اب (موجودہ حالت میں کہ ان میں طلب حق تو ہے نہیں ویسے ہی) سنادیں (جیسا کہ کبھی کبھار ظاہری کانوں سے کچھ سن ہی لیتے ہیں) تو ضرور روگردانی کریں گے بے رخی کرتے ہوئے (یعنی ان کی روگردانی کا سبب یہ نہیں ہے کہ تامل اور غور کے بعد کوئی غلطی ظاہر ہونے کی وجہ سے روگردانی کی ہو، کیونکہ یہاں غلطی کا نام ونشان ہی نہیں، بلکہ غضب یہ ہے کہ ادھر توجہ ہی نہیں کرتے)۔

* * *

فائدہ: یعنی اصل یہ ہے کہ ان لوگوں میں بھلائی کی جڑ ہی نہیں، کیونکہ حقیقی بھلائی انسان کو اس وقت ملتی ہے جب اس کے دل میں طلب حق کی سچی تڑپ اور نور ہدایت قبول کرنے کی لیاقت ہو، جو قوم طلب حق کی روح سے یکسر خالی ہوچکی اور اس طرح خدا کی بخشی ہوئی قوتوں کو اپنے ہاتھوں برباد کرچکی ہو، رفتہ رفتہ اس میں قبول حق کی لیاقت واستعداد بھی نہیں رہتی، اسی کو فرمایا ہے کہ اللہ نے ان کے دلوں میں قبول خیر وہدایت کی لیاقت نہیں دیکھی، اگر ان میں کچھ بھی لیاقت دیکھتا تو اپنی عادت کے موافق ضرور ان کو اپنی آیتیں سنا کر سمجھا دیتا، باقی بحالت موجودہ اگر انہیں آیات سنا اور سمجھا دی جائیں تو یہ ضدی اور معاند لوگ سمجھ کر بھی تسلیم اور قبول کرنے والے نہیں۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ ۚ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ

اے ایمان والو! حکم مانو اللہ کا اور رسول کا جس وقت بلائے تم کو اس کام کی طرف جس میں تمہاری زندگی ہے۱ اور جان لو اللہ

يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ وَاَنَّهٗۤ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۲۴﴾

روک لیتا ہے آدمی سے اس کے دل کو اور یہ کہ اسی کے پاس تم جمع ہوگے۲

خلاصه تفسیر: اب اس آیت میں اہل ایمان کو خطاب کر کے اللہ اور رسول کے احکام کی تعمیل واطاعت کا حکم ایک خاص انداز سے دیا گیا کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ تمہیں جس چیز کی دعوت دیتے ہیں اس میں اللہ اور رسول کا اپنا کوئی فائدہ مضمر نہیں، بلکہ سب احکام تمہارے ہی فائدہ کیلئے دیئے گئے ہیں:

(اور) اے ایمان والو! (ہم نے جو پیچھے تم کو اطاعت کا حکم کیا ہے تو یاد رکھو اس میں تمہارا ہی فائدہ ہے کہ وہ حیات ابدی ہے، جب یہ بات ہے تو) تم اللہ اور رسول کے کہنے کو بجالایا کرو جب کہ رسول (جن کا ارشاد خدا ہی کا ارشاد ہے) تم کو تمہاری زندگی بخش چیز کی طرف (یعنی دین کی طرف جو ابدی حیات کا سبب ہے) بلاتے ہوں (تو اس حالت میں جب کہ ہر طرح تمہارا ہی فائدہ ہے، کوئی وجہ نہیں کہ تم عمل نہ کرو) اور (اس کے متعلق دو باتیں اور) جان رکھو (① ایک بات یہ) کہ اللہ تعالیٰ آڑ بن جایا کرتا ہے آدمی کے اور اس کے قلب کے درمیان میں (دو طریقوں سے: ا- ایک یہ کہ مومن کے قلب میں اطاعت کی برکت سے کفر ومعصیت کو نہیں آنے دیتا ۲- دوسرا یہ کہ کافر کے قلب میں مخالفت کی نحوست سے ایمان واطاعت کو نہیں آنے دیتا، اس سے معلوم ہوا کہ اطاعت کی مداومت بڑی نافع چیز ہے اور مخالفت کی مواظبت بڑی نقصان دہ چیز ہے) اور (② دوسری بات یہ جان رکھو کہ) بلاشبہ تم سب کو خدا ہی کے پاس جمع ہونا ہے (اس وقت اطاعت پر جزا اور مخالفت پر سزا ہوگی، اس سے بھی اطاعت کا مفید ہونا اور مخالفت کا نقصان دہ ہونا ثابت ہوا)۔

اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ: حضرت ابو ہریرہؓ سے منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک روز ابی بن کعبؓ کو بلایا، ابی بن کعبؓ نماز پڑھ رہے تھے، جلدی جلدی نماز پوری کر کے حاضر ہوئے، آپ نے فرمایا کہ میرے پکارنے پر آنے میں دیر کیوں لگائی؟ ابی بن کعبؓ نے عرض کیا کہ میں نماز میں تھا، آپ نے فرمایا: کیا تم نے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نہیں سنا: اِسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ ؟ ابی بن کعبؓ نے عرض کیا کہ آئندہ اس کی اطاعت کروں گا، اگر بحالت نماز بھی آپ بلائیں گے فوراً حاضر ہو جاؤں گا۔

اس حدیث کی بنا پر بعض فقہاء نے فرمایا کہ حکم رسول کی اطاعت سے نماز میں جو کام بھی کریں اس سے نماز میں خلل نہیں ہوتا، اور بعض نے فرمایا کہ اگرچہ خلاف نماز افعال سے نماز قطع ہو جائے گی اور اس کی بعد میں قضا کرنا پڑے گی لیکن کرنا یہی چاہئے کہ جب رسول کریم ﷺ کسی کو بلائیں اور وہ نماز میں بھی ہو تو نماز کو قطع کر کے تعمیل حکم کرے، یہ صورت تو صرف رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مخصوص ہے، لیکن دوسرے ایسے کام جن میں تاخیر کرنے سے کسی شدید نقصان کا خطرہ ہو اس وقت بھی نماز قطع کر دینا اور پھر قضا کر لینا چاہئے، جیسے کوئی نمازی یہ دیکھے کہ نابینا آدمی کنویں یا گڑھے کے قریب پہنچ کر گرا چاہتا ہے تو فوراً نماز توڑ کر اس کو بچانا چاہئے۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی خدا اور رسول تم کو جس کام کی طرف دعوت دیتے ہیں (مثلاً جہاد وغیرہ) اس میں از سرتا پا تمہاری بھلائی ہے، ان کا دعوتی پیغام تمہارے لیے دنیا میں عزت واطمینان کی زندگی اور آخرت میں حیات ابدی کا پیغام ہے، پس مومنین کی شان یہ ہے کہ خدا اور رسول کی پکار پر فوراً لبیک کہیں، جس وقت اور جدھر وہ بلائیں سب اشغال چھوڑ کر ادھر ہی پہنچیں۔

فائدہ: ۲ یعنی حکم بجالانے میں دیر نہ کرو، شاید تھوڑی دیر بعد دل ایسا نہ رہے، اپنے دل پر آدمی کا قبضہ نہیں، بلکہ دل خدا کے ہاتھ میں ہے، جدھر چاہے پھیر دے، بیشک وہ اپنی رحمت سے کسی کا دل ابتداءً نہیں روکتا نہ اس پر مہر کرتا ہے، ہاں جب بندہ امتثال احکام میں سستی اور کاہلی کرتا رہے تو اس کی جزاء میں روک دیتا ہے یا حق پرستی چھوڑ کر ضد وعناد کو شیوہ بنالے تو مہر کر دیتا ہے، کذا فی الموضح۔

بعض نے يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ کو بیان قرب کے لیے لیا ہے، یعنی حق تعالیٰ بندہ سے اس قدر قریب ہے کہ اس کا دل بھی اتنا قریب نہیں: وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ (ق:۱۶) تو خدا کی حکم برداری سچے دل سے کرو، خدا تم سے بڑھ کر تمہارے دلوں کے احوال وسرائر پر مطلع ہے، خیانت اس کے آگے نہیں چل سکے گی، اسی کے پاس سب کو جمع ہونا ہے، وہاں سارے مکنونات وسرائر کھول کر رکھ دیئے جائیں گے۔

وَاتَّقُوۡا فِتۡنَةً لَّا تُصِيۡبَنَّ الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا مِنۡكُمۡ خَآصَّةً ‌ۚ وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيۡدُ الۡعِقَابِ ﴿۲۵﴾

اور بچتے رہو اس فساد سے کہ نہیں پڑے گا تم میں سے خاص ظالموں ہی پر، اور جان لو کہ اللہ کا عذاب سخت ہے

خلاصہ تفسیر: پیچھے اطاعت کا حکم دیا تھا، اب ارشاد فرمار ہے ہیں کہ اپنے ساتھ دوسروں کو بھی اللہ ورسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مطیع بنانے کی کوشش کرو۔

اور (جس طرح تم پر اپنی اصلاح کے متعلق اطاعت واجب ہے، اسی طرح یہ بھی اطاعت واجبہ میں داخل ہے کہ اپنی قدرت واستطاعت کے مطابق امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے ذریعہ، میل جول کے ترک یا دلی نفرت۔ جو کہ آخری درجہ میں ہے۔ کے ذریعہ دوسروں کی اصلاح کی کوشش کرو، ورنہ مداہنت کی صورت میں ان گناہوں کا وبال جیسے ان کے کرنے والوں پر واقع ہوگا ایسے ہی کسی درجہ میں ان مداہنت کرنے والوں پر بھی واقع ہوگا، جب یہ بات ہے تو) تم ایسے وبال سے بچو کہ جو خاص ان ہی لوگوں پر واقع نہ ہوگا جو تم میں ان گناہوں میں مرتکب ہوئے ہیں (بلکہ ان گناہوں کو دیکھ کر جن لوگوں نے مداہنت کی وہ بھی اس میں شریک ہوں گے اور اس سے بچنا یہی ہے کہ مداہنت مت کرو) اور یہ جان رکھو کہ اللہ تعالیٰ سخت سزا دینے والے ہیں (ان کی سزا سے خوف کر کے مداہنت سے بچو)۔

وَاتَّقُوۡا فِتۡنَةً لَّا تُصِيۡبَنَّ الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا مِنۡكُمۡ خَآصَّةً: مراد یہاں وہ لوگ ہیں جو اصل گناہ میں ان کے ساتھ شریک نہیں مگر امر بالمعروف کے ترک کر دینے کے گناہگار وہ بھی ہیں، اس لئے یہاں یہ شبہ نہیں ہونا چاہئے کہ ایک کے گناہ کا عذاب دوسرے پر ڈالنا بے انصافی اور قرآنی فیصلہ: اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزۡرَ اُخۡرٰى کے خلاف ہے، کیونکہ یہاں گناہگار اپنے اصل گناہ کے وبال میں اور بے گناہ ترک امر بالمعروف کے گناہ میں پکڑے گئے، کسی کا گناہ دوسرے پر نہیں ڈالا گیا۔

* * *

فائدہ: یعنی فرض کیجئے ایک قوم کے اکثر افراد نے ظلم وعصیان کا وتیرہ اختیار کر لیا، کچھ لوگ جو اس سے علیحدہ رہے انہوں نے مداہنت برتی، نہ نصیحت کی نہ اظہار نفرت کیا تو یہ فتنہ ہے جس کی لپیٹ میں وہ ظالم اور یہ خاموش مداہن سب آجائیں گے، جب عذاب آئے گا تو حسب مراتب سب اس میں شامل ہوں گے کوئی نہ بچے گا، اس تفسیر کے موافق آیت سے مقصود یہ ہوگا کہ خدا اور رسول کی حکم برداری کے لیے خود تیار رہو اور نافرمانوں کو نصیحت وفہمائش کرو نہ مانیں تو بیزاری کا اظہار کرو۔

باقی حضرت شاہ صاحبؒ نے آیت کا مطلب یہ لیا ہے کہ مسلمانوں کو ایسے فساد (گناہ) سے بالخصوص بچنا چاہیے جس کا خراب اثر گناہ کرنے والے کی ذات سے متعدی ہو کر دوسروں تک پہنچتا ہے، پہلے فرمایا تھا کہ خدا اور رسول کا حکم ماننے میں ادنیٰ تاخیر اور کاہلی نہ کرے کہیں دیر کرنے کی وجہ سے دل نہ ہٹ جائے، اب تنبیہ فرماتے ہیں کہ اگر نیک لوگ کاہلی کریں گے تو عام لوگ بالکل چھوڑ دیں گے تو رسم بد پھیلے گی، اس کا وبال سب پر پڑے گا، جیسے جنگ میں دلیر سستی کریں تو نامرد بھاگ ہی جائیں، پھر شکست پڑے تو دلیر بھی نہ تھام سکیں۔

وَاذۡكُرُوۡۤا اِذۡ اَنۡتُمۡ قَلِيۡلٌ مُّسۡتَضۡعَفُوۡنَ فِى الۡاَرۡضِ تَخَافُوۡنَ اَنۡ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ

اور یاد کرو جس وقت تم تھوڑے تھے مغلوب پڑے ہوئے ملک میں ڈرتے تھے کہ اچک لیں تم کو لوگ

فَاٰوٰٮكُمۡ وَاَيَّدَكُمۡ بِنَصۡرِهٖ وَرَزَقَكُمۡ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمۡ تَشۡكُرُوۡنَ ﴿۲۶﴾

پھر اس نے تم کو ٹھکانا دیا اور قوت دی تم کو اپنی مدد سے اور روزی دی تم کو ستھری چیزیں تاکہ تم شکر کرو

خلاصہ تفسیر: اب ایمان والوں کو اطاعت کی ترغیب کے لیے اپنی بعض نعمتیں یاد دلائی جارہی ہیں۔

اور (اس غرض سے کہ نعمتوں کے یاد کرنے سے منعم یعنی اللہ کی اطاعت کا شوق ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو اور خاص کر) اس حالت کو یاد کرو جب کہ تم (ایک وقت میں یعنی ہجرت سے قبل تعداد میں بھی) قلیل تھے (اور قوت کے اعتبار سے بھی) سرزمین (مکہ) میں کمزور شمار کئے جاتے تھے (اور نہایت کمزور حالی سے) اس اندیشہ میں رہتے تھے کہ تم کو (مخالف) لوگ نوچ کھسوٹ نہ لیں، سو (ایسی حالت میں) اللہ تعالیٰ نے تم کو (مدینہ میں اطمینان سے) رہنے کو جگہ دی اور تم کو اپنی نصرت سے قوت دی (سامان سے بھی اور مردم شماری کو زیادہ کرنے سے بھی جس سے وہ کمی اور کمزوری اور دشمنوں کا خوف سب زائل ہو گیا) اور (صرف یہی نہیں کہ تمہاری مصیبت کو دور کر دیا ہو بلکہ اعلیٰ درجہ کی خوشحالی بھی عطا فرمائی کہ دشمنوں پر تم کو غلبہ دے کر فتوحات کی کثرت سے) تم کو نفیس نفیس چیزیں عطا فرمائیں تا کہ تم (ان نعمتوں کا) شکر کرو (اور بڑا شکر یہ ہے کہ اطاعت کرو)۔

* * *

فائدہ: یعنی اپنی قلت وضعف کو خیال کر کے خدا کا حکم (جہاد) ماننے میں سستی مت دکھلاؤ، دیکھو، ہجرت سے پہلے بلکہ اس کے بعد بھی تمہاری تعداد تھوڑی تھی، سامان بھی نہ تھا، تمہاری کمزوری کو دیکھ کر لوگوں کو طمع ہوئی تھی کہ تم کو ہضم کر جائیں، تمہیں ہر وقت یہ خدشہ رہتا تھا کہ دشمنان اسلام کہیں نوچ کھسوٹ کر نہ لے جائیں، مگر خدا نے تم کو مدینہ میں ٹھکانہ دیا، انصار و مہاجرین میں عدیم النظیر رشتہ مواخات قائم کر دیا، پھر معرکہ بدر میں کیسی کھلی ہوئی غیبی امداد پہنچائی، کفار کی جڑ کاٹ دی، تم کو فتح الگ دی، مال غنیمت اور فدیہ اساریٰ الگ دیا، غرض حلال طیب ستھری چیزیں اور انواع واقسام کی نعمتیں عطا فرمائیں تا کہ تم اس کے شکر گزار بندے بنے رہو۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِكُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۷﴾

اے ایمان والو! خیانت نہ کرو اللہ سے اور رسول سے اور خیانت نہ کرو آپس میں اور امانتوں میں جان کر

خلاصہ تفسیر: اب مؤمنین کو بتایا جا رہا ہے کہ اطاعت میں خلل کا واقع ہونا خیانت ہے۔

اے ایمان والوں! (ہم مخالفت اور معصیت سے اس لئے ممانعت کرتے ہیں کہ اللہ اور رسول کے تم پر کچھ حقوق ہیں جن کا فائدہ تمہاری ہی طرف لوٹتا ہے اور گناہوں سے ان حقوق میں خلل پڑتا ہے جس سے واقع میں تمہارے ہی فائدے میں خلل پڑتا ہے، جب یہ بات ہے تو) تم اللہ اور رسول کے حقوق میں خلل مت ڈالو، اور (انجام کے اعتبار سے اس مضمون کو اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ تم) اپنی قابل حفاظت چیزوں میں (کہ وہ تمہارے منافع ہیں جو اعمال سے حاصل ہوتے ہیں) خلل مت ڈالو اور تم تو (اس کا نقصان دہ ہونا) جانتے ہو۔

بعض مفسرین نے اس آیت کو حضرت ابولبابہؓ کی شان میں کہا ہے کہ یہود بنی قریظہ نے سابقہ تعلق کی بنا پر ان سے مشورہ چاہا کہ رسول اللہ ﷺ کی رائے ہمارے بارے میں کیا ہے؟ چونکہ ان کے اہل وعیال اور موال وغیرہ ان ہی لوگوں کے پاس تھے اس لیے انہوں نے خیر خواہی کے طور پر اشارہ سے راز ظاہر کر دیا کہ گلے پر ہاتھ پھیر کر بتلا دیا کہ ذبح کیے جاؤ گے، اس پر ابولبابہؓ بہت پچھتائے، توبہ کی اور وہ قبول بھی ہوئی۔

* * *

فائدہ: خدا اور سول کی خیانت یہ ہے کہ ان کے احکام کی خلاف ورزی کی جائے، زبان سے اپنے کو مسلمان کہیں اور کام کفار کے کریں یا جس کام پر خدا اور سول نے مامور کیا ہو اس میں دغل فصل کیا جائے، یا مال غنیمت میں چوری کی جائے، ونحوذالک، بہر حال ان تمام امانتوں میں جو خدا اور رسول یا بندوں کی طرف سے تمہارے سپرد کی جائیں، خیانت سے بچو، اس میں ہر قسم کے حقوق العباد آ گئے۔

روایات میں ہے کہ یہود بنی قریظہ نے جب حضور ﷺ سے صلح کی درخواست کی اور یہ کہ ان کے ساتھ وہ ہی معاملہ کیا جائے جو بنی النضیر کے ساتھ ہوا ہے، تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا، "نہیں، میں تم کو اتنا حق دیتا ہوں کہ سعد بن معاذ کو حکم بنالو، جو فیصلہ وہ تمہاری نسبت کر دیں وہ منظور ہونا چاہیے انہوں نے حضرت ابولبابہ کو حضور ﷺ سے اجازت لے کر اپنے یہاں بلایا اور دریافت کیا کہ تمہاری اس معاملہ میں کیا رائے ہے؟ ہم سعد بن

معاذ کی تحکیم منظور کریں یا نہ کریں، ابولبابہ کے اموال اور اہل وعیال بنی قریظہ کے یہاں تھے، اس لیے وہ ان کی خیر خواہی کرتے تھے، انہوں نے اپنے حلقوم کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا، یعنی اگر سعد بن معاذ کی تحکیم قبول کی تو ذبح ہو جاؤ گے، ابولبابہ اشارہ تو کر گزرے مگر معاً متنبہ ہوا کہ میں نے خدا اور سول کی خیانت کی، واپس آکر اپنے کو ایک ستون سے باندھ دیا اور عہد کیا کہ نہ کچھ کھاؤں گا نہ پیوں گا حتی کہ موت آجائے یا اللہ تعالیٰ میری توبہ قبول فرمالے، سات آٹھ دن یونہی بندھے رہے، فاقہ سے غشی طاری ہوگئی، آخر بشارت پہنچی کہ حق تعالیٰ نے تمہاری توبہ قبول کی، کہا خدا کی قسم میں اپنے کو نہ کھولوں گا جب تک خود نبی کریم ﷺ اپنے دست مبارک سے میری رسی نہ کھولیں، آپ تشریف لائے اور اپنے ہاتھ سے اپنے قیدی کو آزاد کیا، الیٰ آخر القصہ، ابن عبدالبر کا دعویٰ ہے کہ یہ واقعہ غزوہ تبوک میں شرکت نہ کرنے کی بناء پر پیش آیا تھا، واللہ اعلم۔

وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّمَاۤ اَمۡوَالُكُمۡ وَاَوۡلَادُكُمۡ فِتۡنَةٌ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ عِنۡدَهٗۤ اَجۡرٌ عَظِيۡمٌ ﴿۲۸﴾

اور جان لو کہ بیشک تمہارے مال اور اولاد خرابی میں ڈالنے والے ہیں، اور یہ کہ اللہ کے پاس بڑا ثواب ہے

خلاصہ تفسیر: بعض اوقات کچھ امور اطاعت میں مخل ہونے کا سبب بن جاتے ہیں اب ان پر متنبہ کیا جارہا ہے۔

اور (اکثر اوقات مال و اولاد کی محبت اطاعت میں مخل ہوجاتی ہے اس لئے تم کو آگاہ کیا جاتا ہے کہ) تم اس بات کو جان رکھو کہ تمہارے اموال اور تمہاری اولاد ایک امتحان کی چیز ہے (کہ دیکھیں کون ان کی محبت کو ترجیح دیتا ہے اور کون اللہ تعالیٰ کی محبت کو، سو تم ان کی محبت کو ترجیح مت دینا) اور (اگر ان کے منافع کی طرف نظر جائے تو تم) اس بات کو بھی جان رکھو کہ اللہ تعالیٰ کے پاس (ان لوگوں کے لئے جو اللہ کی محبت کو ترجیح دیتے ہیں) بڑا بھاری اجر (موجود) ہے (کہ اس اجر کے سامنے یہ فنا ہونے والے فائدے محض ہیچ ہیں)۔

* * *

فائدہ: آدمی اکثر مال و اولاد کی خاطر خدا کی اور بندوں کی چوری کرتا ہے، اس لیے متنبہ فرمایا کہ امانتداری کی جو قیمت خدا کے یہاں ہے، وہ یہاں کے مال و اولاد وغیرہ سب چیزوں سے بڑھ کر ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنۡ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجۡعَلۡ لَّـكُمۡ فُرۡقَانًا وَّيُكَفِّرۡ عَنۡكُمۡ سَيِّاٰتِكُمۡ وَيَغۡفِرۡ لَـكُمۡ ؕ

اے ایمان والو! اگر تم ڈرتے رہو گے اللہ سے تو کردے گا تم میں فیصلہ ۱؎ اور دور کردے گا تم سے تمہارے گناہ اور تم کو بخش دے گا

وَاللّٰهُ ذُو الۡفَضۡلِ الۡعَظِيۡمِ ﴿۲۹﴾

اور اللہ کا فضل بڑا ہے

خلاصہ تفسیر: اے ایمان والو! (اطاعت کی اور برکات سنو، وہ یہ کہ) اگر تم اللہ سے ڈر (کر اطاعت کر) تے رہو گے تو اللہ تعالیٰ تم کو ایک فیصلہ کی چیز دے گا (اس فیصلہ میں ہدایت اور نور قلب بھی داخل ہے، جس سے حق و باطل میں علمی فیصلہ ہوتا ہے اور دشمنوں پر غلبہ اور آخرت کی نجات بھی داخل ہے جس سے حق و باطل میں عملی فیصلہ ہوتا ہے سب آگیا) اور تم سے تمہارے گناہ دور کردے گا، اور تم کو بخش دے گا، اور اللہ بڑے فضل والا ہے (خدا جانے اپنے فضل سے اور کیا کیا دے دیں جو قیاس و گمان میں بھی نہ آتا ہو)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی اگر خدا سے ڈر کر راہ تقویٰ اختیار کرو گے تو خدا تم میں اور تمہارے مخالفوں میں فیصلہ کردے گا، دنیا میں بھی، کہ تم کو عزت دے گا اور ان کو ذلیل یا ہلاک کرے گا جیسے بدر میں کیا اور آخرت میں بھی، کہ تم نعیم دائم میں رہو گے اور ان کا ٹھکانہ دوزخ ہوگا وَامۡتَازُوا الۡيَوۡمَ اَيُّهَا الۡمُجۡرِمُوۡنَ (یس: ۵۹) هٰذَا يَوۡمُ الۡفَصۡلِ ۚ جَمَعۡنٰكُمۡ وَالۡاَوَّلِيۡنَ (المرسلات: ۳۸) دوسری بات یہ ہے کہ تقویٰ کی برکت سے حق تعالیٰ تمہارے

دل میں ایک نور ڈال دے گا جس سے تم ذوقاً و وجداناً حق و باطل اور نیک و بد کا فیصلہ کر سکو گے، اس کے علاوہ ایک بات حضرت شاہ صاحبؒ نے لکھی ہے کہ: ''شاید فتح بدر میں مسلمانوں کے دل میں آیا ہو کہ یہ فتح اتفاقی ہے حضرت ﷺ سے مخفی کافروں پر احسان کریں کہ ہمارے گھر بار اور اہل و عیال کو مکہ میں نہ ستاویں، سو پہلی آیت میں خیانت کو منع فرمایا اور دوسری آیت میں تسلی دی کہ آگے فیصلہ ہو جائے گا تمہارے گھر بار کافروں میں گرفتار نہ رہیں گے''۔

وَاِذۡ يَمۡكُرُ بِكَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا لِيُثۡبِتُوۡكَ اَوۡ يَقۡتُلُوۡكَ اَوۡ يُخۡرِجُوۡكَ‌ؕ وَيَمۡكُرُوۡنَ وَيَمۡكُرُ اللّٰهُ‌ؕ

اور جب فریب کرتے تھے کافر کہ تجھ کو قید کر دیں یا مار ڈالیں یا نکال دیں، اور وہ بھی داؤ کرتے تھے، اور اللہ بھی داؤ کرتا تھا

وَاللّٰهُ خَيۡرُ الۡمٰكِرِيۡنَ ۝۳۰

اور اللہ کا داؤ سب سے بہتر ہے

خلاصہ تفسیر: اب ہجرت نبویہ سے متعلق ایک واقعہ یاد دلایا جا رہا ہے جس کا نفع عام مؤمنین کو بھی ہوا۔

اور (اے محمد ﷺ! مسلمانوں کے سامنے نعمتوں کی یاد دہانی کے لئے) اس واقعہ کا بھی ذکر کیجئے جب کہ کافر لوگ آپ کی نسبت (بری بری) تدبیریں سوچ رہے تھے کہ (آیا) آپ کو قید کر لیں یا آپ کو قتل کر ڈالیں یا آپ کو خارج وطن کر دیں اور وہ تو اپنی تدبیریں کر رہے تھے اور اللہ اپنی تدبیر (ان تدبیروں کے دفع کرنے کے لئے) کر رہے تھے، اور سب سے زیادہ مستحکم تدبیر والا اللہ ہے (جس کے سامنے ان کی ساری تدبیریں ضائع ہو گئیں اور آپ بال بال محفوظ رہے اور صحیح سالم مدینہ آ پہنچے، چونکہ آپ کا اس طرح بچ رہنا مومنین کے حق میں بے انتہا سعادت و کامیابیوں کا سبب ہے اس لئے اس واقعہ کے ذکر کا حکم فرمایا)۔

لِيُثۡبِتُوۡكَ اَوۡ يَقۡتُلُوۡكَ اَوۡ يُخۡرِجُوۡكَ: اس میں جس قصہ کی طرف اشارہ ہے اس کا تتمہ یہ ہے کہ ان کی اخیر رائے قتل پر ٹھہری تھی، آپ ﷺ کو وحی سے معلوم ہو گیا، آپ پوشیدہ نکل کر غار ثور چلے گئے اور بال بال محفوظ رہے، اور صحیح سالم مدینہ طیبہ آ پہنچے، چونکہ آپ کا اس طرح پہنچ جانا مسلمانوں کے حق میں بہت بڑی نعمت تھی اس لیے اس واقعہ کے ذکر کا حکم فرمایا۔

* * *

فائدہ: ہجرت سے پیشتر کفار مکہ نے دار الندوہ میں جمع ہو کر مشورہ کیا، کہ محمد (ﷺ) کے متعلق کیا کیا جائے، انہوں نے ساری قوم کو پریشان کر رکھا ہے اور باہر کے کچھ لوگ ان کے دام میں پھنستے جاتے ہیں کہیں رفتہ رفتہ بڑی طاقت اکٹھی نہ کر لیں جس کا مقابلہ دشوار ہو، اس وقت رائیں مختلف تھیں، کوئی کہتا تھا، قید کیا جائے اور خوب زخمی کیے جائیں، کسی کی رائے تھی کہ انہیں وطن سے نکال دیا جائے تا کہ ہمیں ہر وقت کے خرخشہ سے نجات ملے، اخیر میں ابوجہل کی رائے پر فیصلہ ہوا کہ تمام قبائل عرب میں سے ایک ایک جوان منتخب ہو اور وہ سب مل کر آن واحد میں ان پر تلوار کا ہاتھ چھوڑیں، تا کہ بنی ہاشم سارے عرب سے لڑائی نہ کر سکیں اور دیت دینی پڑے تو تمام قبائل پر تقسیم ہو جائے، یہاں تو وہ اشقیاء یہ تدبیریں گانٹھ رہے تھے، اُدھر ان کے توڑ میں خدا کی بہترین اور لطیف تدبیر تھی، حضور ﷺ کو فرشتہ نے اطلاع کی آپ ﷺ اپنے بستر پر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو لٹا کر اسی مجمع کی آنکھوں میں جو آپ ﷺ کے قتل کے لیے جمع ہوا تھا خاک جھونکتے ہوئے باہر تشریف لے گئے، آپ ﷺ کا اور حضرت علی کا بال بیکا نہ ہوا اور دشمن خائب و خاسر رہے، پھر جنہوں نے آپ کے قتل کا مشورہ دیا تھا بدر میں وہ ہی قتل کیے گئے، اس سے بتلا دیا کہ جب خدا ساتھی ہو تو کوئی کچھ نہیں کر سکتا اور جس طرح اس نے اپنے پیغمبر کو بچا لیا، تمہارے گھر بار اور اہل و عیال کی بھی جو مکہ میں ہیں حفاظت کر سکتا ہے، دشمن اگر قوی است نگہبان قوی تر است۔

وَاِذَا تُتۡلٰى عَلَيۡهِمۡ اٰيٰتُنَا قَالُوۡا قَدۡ سَمِعۡنَا لَوۡ نَشَآءُ لَقُلۡنَا مِثۡلَ هٰذَآ ۙ اِنۡ هٰذَآ اِلَّاۤ اَسَاطِيۡرُ الۡاَوَّلِيۡنَ ﴿۳۱﴾

اور جب کوئی پڑھے ان پر ہماری آیتیں تو کہیں ہم سن چکے اگر ہم چاہیں تو ہم بھی کہہ لیں ایسا یہ تو کچھ بھی نہیں مگر احوال ہیں اگلوں کے

خلاصہ تفسیر: پیچھے اطاعت کی ترغیب کے مضامین سے قبل کفار کی مذمت اور ان کا مستحق عذاب ہونا بیان کیا گیا تھا، اب آگے پھر اسی مضمون کی کسی قدر تفصیل بیان کی جاتی ہے۔

اور (ان کفار کی یہ حالت ہے کہ) جب ان کے سامنے ہماری آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے سن (کر دیکھ) لیا (یہ تو کوئی معجزہ نہیں، کیونکہ) اگر ہم ارادہ کریں تو اس کے برابر ہم بھی کہہ لائیں (پس) یہ (قرآن) تو (کلام الٰہی و معجزہ وغیرہ) کچھ بھی نہیں صرف بے سند باتیں ہیں جو پہلوں سے منقول چلی آرہی ہیں (کہ پہلے مذہب والے بھی یہی توحید و قیامت وغیرہ کے دعوے کرتے آئے ہیں انہی کے مضامین آپ بھی نقل کر رہے ہیں، یہ نضر بن حارث کا قول تھا)۔

* * *

فائدہ: نضر بن الحارث کہا کرتا تھا کہ ہم چاہیں تو قرآن جیسا کلام بنالائیں اس میں قصے کہانیوں کے سوا کیا رکھا ہے، مگر قرآن تو سب جھگڑوں کا فیصلہ اسی بات پر رکھتا تھا، پھر چاہا کیوں نہیں؟ کسی نے کہا تھا کہ میرا گھوڑا اگر چلے تو ایک دن میں لندن پہنچے، مگر چلتا نہیں، بہر حال پچھلی قوموں کے احوال سن کر کہا کرتے تھے کہ سب قصے کہانیاں ہیں، اب بدر میں دیکھ لیا کہ محض افسانے نہ تھے، وعدہ عذاب تم پر بھی آیا جیسا پہلوں پر آیا تھا۔

وَاِذۡ قَالُوا اللّٰهُمَّ اِنۡ كَانَ هٰذَا هُوَ الۡحَـقَّ مِنۡ عِنۡدِكَ فَاَمۡطِرۡ عَلَيۡنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ

اور جب وہ کہنے لگے کہ یا اللہ اگر یہی دین حق ہے تیری طرف سے تو ہم پر برسادے پتھر آسمان سے

اَوِ ائۡتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيۡمٍ ﴿۳۲﴾

یا لا ہم پر کوئی عذاب دردناک

خلاصہ تفسیر: اور (اس سے بڑھ کر قابل ذکر وہ حالت ہے) جب کہ ان لوگوں نے (اپنے اس جہل مرکب میں انتہائی سختی و جرات ظاہر کرنے کو یہ بھی) کہا کہ اے اللہ! اگر یہ قرآن آپ کی طرف سے واقعی ہے تو ہم پر (اس کے نہ ماننے کی وجہ سے) آسمان سے پتھر برسایئے یا ہم پر کوئی (اور) دردناک عذاب واقع کر دیجئے (جو خلاف عادت یعنی غیر معمولی ہونے میں پتھروں کی بارش جیسا ہو، اور جب ایسے عذاب واقع نہ ہوئے تو اپنی حقانیت پر ناز کرنے لگے اور یہ نہ سمجھے کہ ان کے ناحق پر ہونے کے باوجود خاص موانع کی وجہ سے ایسے عذاب نازل نہیں ہوتے)۔

یہ قول نضر یا ابوجہل کا تھا، مگر چونکہ اور لوگ بھی راضی تھے اس لیے سب کی طرف نسبت کی گئی۔

* * *

فائدہ: اس آیت میں مشرکین مکہ کے انتہائی جہل اور شقاوت و عناد کا اظہار ہے یعنی وہ کہتے تھے کہ خداوندا اگر واقعی یہ ہی دین حق ہے جس کی ہم اتنی دیر اور اس قدر شد و مد سے تکذیب کر رہے ہیں تو پھر دیر کیوں ہے؟ گزشتہ اقوام کی طرح ہم پر بھی پتھروں کا مینہ کیوں نہیں برسا دیا جاتا، یا اسی طرح کے کسی دوسرے عذاب میں مبتلا کر کے ہمارا استیصال کیوں نہیں کر دیا جاتا؟ کہتے ہیں کہ یہ دعاء ابوجہل نے مکہ سے نکلتے وقت کعبہ کے سامنے کی، آخر جو کچھ مانگا تھا اس کا ایک نمونہ بدر میں دیکھ لیا، وہ خود مع ۶۹ سرداروں کے کمزور اور بے سروسامان مسلمانوں کے ہاتھوں سے مارا گیا، ستر سردار اسیری کی ذلت میں گرفتار ہوئے، اس طرح خدا نے ان کی جڑ کاٹ دی، بیشک قوم لوط کی طرح ان پر آسمان سے پتھر نہیں برسے لیکن ایک مٹھی سنگریزے جو خدا تعالیٰ نے محمد (ﷺ) کے ہاتھ سے پھینکے تھے وہ آسمانی سنگباری کا چھوٹا سا نمونہ تھا فَلَمۡ تَقۡتُلُوۡهُمۡ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمۡ ۪ وَمَا رَمَيۡتَ اِذۡ رَمَيۡتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى (الانفال: ۱۷)

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ ؕ وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ﴿۳۳﴾

اور اللہ ہرگز نہ عذاب کرتا ان پر جب تک تو رہتا ان میں ۱؎ اور اللہ ہرگز نہ عذاب کرے گا ان پر جب تک وہ معافی مانگتے رہیں گے ۲؎

خلاصہ تفسیر: وہ کفار یہ نہیں سمجھتے کہ ان کے باطل ہونے کے باوجود خاص موانع کی وجہ سے ایسے عذاب نازل نہیں ہوتے، چنانچہ اب آگے ان اسباب وموانع کو بیان فرماتے ہیں:

اور اللہ تعالیٰ ایسا نہ کریں گے کہ ان میں آپ کے ہوتے ہوئے ان کو (ایسا) عذاب دیں، اور (نیز) اللہ تعالیٰ ان کو (ایسا) عذاب نہ دیں گے جس حالت میں کہ وہ استغفار بھی کرتے رہتے ہیں (اگرچہ وہ استغفار ایمان نہ ہونے کی وجہ سے آخرت میں نافع نہ ہو، لیکن آخر عمل صالح دنیا میں تو کفار کو نافع ہو جاتا ہے)۔

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ: مطلب یہ کہ ان خلاف عادت یعنی غیر معمولی عذاب آنے سے دو باتیں مانع ہیں: ① ایک حضور ﷺ کا تشریف رکھنا مکہ میں یا دنیا میں، اور احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور کی امت میں بھی کسی کا ہونا اگرچہ وہ کافر ہی ہو اور استغفار بھی نہ کرتا ہو خلاف عادت عذاب آنے سے مانع ہے، ہاں قرب قیامت میں کسی عارضی مصلحت سے ایسے عذاب واقع ہوں گے، جیسے مسخ ہونا، پتھر برسنا، آگ آنا وغیرہ۔

② دوسرا مانع اُن لوگوں کا اپنے طواف وغیرہ میں غفرانك غفرانك استغفار کے الفاظ کہنا۔

* * *

فائدہ: ۱؎ سنت اللہ یہ ہے کہ جب کسی قوم پر تکذیب انبیاء کی وجہ سے عذاب نازل کرتے ہیں تو اپنے پیغمبر کو ان سے علیحدہ کر لیتے ہیں خدا نے جب حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کو مکہ سے علیحدہ کر لیا تب مکہ والے بدر کے عذاب میں پکڑے گئے۔

فائدہ: ۲؎ نزول عذاب سے دو چیزیں مانع ہیں: ① ایک ان کے درمیان پیغمبر کا موجود رہنا ② دوسرے استغفار، یعنی مکہ میں حضرت (ﷺ) کے قدم سے عذاب تک اٹک رہا تھا، اب ان پر عذاب آیا، اسی طرح جب تک گنہگار نادم رہے اور توبہ کرتا رہے تو پکڑا نہیں جاتا اگرچہ بڑے سے بڑا گناہ ہو، حضرت محمد (ﷺ) نے فرمایا کہ گنہگاروں کی پناہ دو چیزیں ہیں: ① ایک میرا وجود اور ② دوسرے استغفار، کذا فی الموضح۔

تنبیہ: وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ کے جو معنی مترجم محقق قدس اللہ روحہ نے کئے، بعض مفسرین کے موافق ہیں، لیکن اکثر کے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ مشرکین جس قسم کا خارق عادت عذاب طلب کر رہے تھے جو قوم کی قوم کا دفعۃً استیصال کر دے ان پر ایسا عذاب بھیجنے سے دو چیزیں مانع ہیں ایک حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا وجود باوجود کہ اس کی برکت سے اس امت پر خواہ ''امت دعوت'' ہی کیوں نہ ہو ایسا خارق عادت مستاصل عذاب نہیں آتا، یوں کسی وقت افراد وآحاد پر آ جائے وہ اس کے منافی نہیں، دوسرے استغفار کرنے والوں کی موجودگی خواہ وہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم جیسا کہ منقول ہے کہ مشرکین مکہ بھی تلبیہ وطواف وغیرہ میں ''غفرانك، غفرانك'' کہا کرتے تھے، باقی غیر خارق معمولی عذاب (مثلاً قحط یا وباء یا قتل کثیر وغیرہ) اس کا نزول پیغمبر یا بعض مستغفرین کی موجودگی میں بھی ممکن ہے آخر جب وہ لوگ شرارتیں کریں گے تو خدا کی طرف سے تنبیہ کیوں نہ کی جائے گی، آگے اسی کو بیان فرمایا ہے:

وَمَا لَهُمْ اَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللّٰهُ وَهُمْ يَصُدُّوْنَ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَمَا كَانُوْٓا اَوْلِيَآءَهٗ ؕ

اور ان میں کیا بات ہے کہ عذاب نہ کرے ان پر اللہ اور وہ تو روکتے ہیں مسجد حرام سے اور وہ اس کے اختیار والے نہیں

اِنْ اَوْلِيَآؤُهٗٓ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۴﴾

اس کے اختیار والے تو وہی ہیں جو پرہیزگار ہیں لیکن ان میں اکثروں کو اس کی خبر نہیں

خلاصہ تفسیر: کفار خلاف عادت عذاب نہ آنے سے یہ نہ سمجھیں کہ بالکل ہی عذاب نہ آئے گا، کیونکہ جس طرح یہ امور عذاب سے مانع ہیں اسی طرح ان کی حرکتیں عذاب کا تقاضہ ومطالبہ کرتی ہیں، پس ان موانع کی وجہ سے خلاف عادت عذاب تو نہ ہوگا، مگر ان کی حرکتوں کی وجہ سے کچھ عذاب تو ہوگا، اب آگے ان کی حرکتیں بیان فرماتے ہیں:

اور ان کا کیا استحقاق ہے کہ ان کو اللہ تعالیٰ (بالکل ہی معمولی) سزا (بھی) نہ دے حالانکہ (ان کی یہ حرکتیں سزا کا تقاضہ ومطالبہ کرتی ہیں مثلاً) وہ لوگ (پیغمبر ﷺ اور مسلمانوں کو) مسجد حرام (میں جانے، اس میں نماز پڑھنے اور اس میں طواف کرنے) سے روکتے ہیں (جیسا حدیبیہ کے واقعہ میں تو کھلم کھلا حقیقۃً روکا جس کا قصہ سورۃ بقرہ میں گزر چکا، اور قیام مکہ کے زمانہ میں بھی اس طرح حکماً روکا کہ اس قدر تنگ کیا کہ ہجرت کی ضرورت ہوئی) حالانکہ وہ لوگ اس مسجد کے متولی (بننے کے بھی لائق) نہیں (پھر عبادت کرنے والوں کو روکنا تو بہت دور رہا جس کا اختیار خود متولی کو بھی نہیں ہوتا) اس کے متولی (بننے کے لائق) تو سوا متقیوں کے (کہ وہ اہل ایمان ہیں) اور کوئی بھی اشخاص نہیں لیکن ان میں اکثر لوگ (اپنی نالائقی کا) علم نہیں رکھتے (خواہ ان کو علم ہی نہ ہو، یا یہ کہ جب اس علم پر عمل نہ کیا تو وہ علم نہ ہونے کے جیسا ہی ہوگیا)۔

اِنْ اَوْلِيَآؤُهٗٓ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ: متقین سے مراد اہل ایمان ہیں، اس تفسیر کے مطابق آیت سے یہ نتیجہ نکلا کہ جو لوگ شریعت وسنت کے خلاف عمل کرنے کے باوجود ولی اللہ ہونے کا دعوی کریں وہ جھوٹے ہیں اور جو ایسے لوگوں کو ولی اللہ سمجھیں وہ دھوکے میں ہیں، ولایت کی بنیادی شرط تقوی یعنی گناہوں سے بچنا ہے، جب تک یہ نہ ہو انسان ولی نہیں ہوسکتا۔

* * *

فائدہ: یعنی عذاب کا نہ آنا ان دو سبب سے ہے جو اوپر مذکور ہوئے، ورنہ تمہاری شرارتیں اور ظلم وشقاوت تو ایسی چیزیں ہیں کہ فوراً عذاب آ جانا چاہیے، اس سے زیادہ ظلم کیا ہوگا کہ موحدین کو حرم شریف میں آنے یا عبادت کرنے سے طرح طرح کے حیلے تراش کر روکا جائے، بلکہ ان کے وطن (مکہ معظمہ) سے نکال کر ہمیشہ کیلئے کوشش کی جائے کہ یہ خدا کے پاکباز اور عبادت گزار بندے یہاں نہ آنے پائیں اور ستم ظریفی یہ ہے کہ اس ظلم کے جواز کیلئے یہ سند پیش کی جاتی ہے کہ ہم حرم شریف کے متولی با اختیار ہیں، جس کو چاہیں آنے دیں جسے چاہیں روک دیں، یہ ہمارا حق ہے، حالانکہ اول تو یہ حق متولی کو بھی نہیں کہ مسجد میں لوگوں کو نماز وعبادت سے روکے، دوسرے حق تولیت ان کو پہنچتا بھی نہیں، حرم شریف کے متولی صرف متقی اور پرہیزگار بندے ہوسکتے ہیں، مشرک اور بدمعاش اس کے حقدار نہیں ہوسکتے، لیکن ان میں اکثر اپنی جہالت سے یوں سمجھ رہے ہیں کہ ہم اولاد ابراہیم ہیں اور فلاں قبیلہ سے ہیں تولیت کعبہ ہمارا موروثی حق ہے جس کیلئے کوئی خاص شرط وقید نہیں، سو بتلا دیا کہ اولاد ابراہیم میں جو پرہیزگار ہو اسی کا حق ہے، ایسے بے انصافوں کا حق نہیں کہ جس سے وہ آپ ناخوش ہوئے نہ آنے دیا۔

وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ اِلَّا مُكَآءً وَّتَصْدِيَةً ۭ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ۝۳۵

اور ان کی نماز نہیں تھی کعبہ کے پاس مگر سیٹیاں بجانی اور تالیاں، سو چکھو عذاب بدلہ اپنے کفر کا

خلاصہ تفسیر: (غرض جو نمازی تھے ان کو تو مسجد سے اس طرح روکا) اور (خود مسجد کا کیسا حق ادا کیا اور اس میں کیسی اچھی نماز پڑھی جس کا بیان یہ ہے کہ) ان کی نماز خانہ کعبہ (مسجد حرام) کے پاس صرف یہ تھی سیٹیاں بجانا اور تالیاں بجانا (یعنی بجائے نماز کے ان کی یہ نامعقول حرکتیں ہوتی تھیں) سو (ان حرکات کا ضروری تقاضہ ہے کہ ان پر کوئی نہ کوئی عذاب کیا جائے اگرچہ وہ معمولی ہی عذاب ہو، خلاف عادت نہ ہو، اور عذاب نازل کر کے ان کو خطاب کیا جائے کہ لو) اس عذاب کا مزہ چکھو اپنے کفر کے سبب (ان کے اقوال وافعال جو پیچھے بیان ہوئے وہ اسی کفر کے آثار ہیں، چنانچہ متعدد غزوات میں ان پر یہ سزا واقع ہوئی جیسا کہ اس سورت کے دوسرے رکوع میں بھی ہے)۔

فَذُوْقُوا الْعَذَابَ: خلاصہ تفسیر کی تقریر سے دونوں آیتوں میں تعارض کا شبہ نہ رہا، کیونکہ پیچھے تو کہا تھا کہ ہم ان کو عذاب نہ دیں گے،

اور اب یہاں فرمایا کہ ان کو عذاب کیوں نہ دیا جائے، سو جواب ظاہر ہے کہ پیچھے خلاف عادت عذاب کی نفی تھی، اور یہاں معمولی عذاب کی دھمکی ہے۔

فائدہ: یعنی حقیقی نمازیوں کو مسجد سے روکتے ہیں اور خود ان کی نماز کیا ہے؟ کعبہ کا برہنہ ہو کر طواف کرنا اور ذکر اللہ کی جگہ سیٹیاں اور تالیاں بجانا مسلمانوں کی عبادت میں خلل ڈالنے کے لیے ہوتا تھا یا از راہ استہزاء تمسخر ایسا کرتے تھے، واللہ اعلم۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ لِيَصُدُّوا عَن سَبِيلِ اللَّهِ ۚ فَسَيُنفِقُونَهَا ثُمَّ تَكُونُ

بے شک جو لوگ کافر ہیں وہ خرچ کرتے ہیں اپنے مال تاکہ روکیں اللہ کی راہ سے ۱؎ سو ابھی اور خرچ کریں گے پھر آخر ہو گا وہ

عَلَيْهِمْ حَسْرَةً ثُمَّ يُغْلَبُونَ ۗ وَالَّذِينَ كَفَرُوا إِلَىٰ جَهَنَّمَ يُحْشَرُونَ ﴿٣٦﴾

ان پر افسوس اور آخر مغلوب ہوں گے، اور جو کافر ہیں وہ دوزخ کی طرف ہانکے جائیں گے ۲؎

خلاصہ تفسیر: یہاں تک تو ان لوگوں کے بدنی اقوال و اعمال کا ذکر تھا، اب آگے ان کے مالی اعمال کا بیان ہے کہ:

بلاشک یہ کافر لوگ اپنے مالوں کو اس لئے خرچ کر رہے ہیں کہ اللہ کی راہ سے (یعنی دین سے لوگوں کو) روکیں (چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ اور مخالفت میں جو خرچ ہوتا ہے ظاہر ہے کہ اس میں یہی غرض تھی کہ لوگوں کو دین حق سے روکا جائے) سو یہ لوگ تو اپنے مالوں کو (اسی غرض کے لئے) خرچ کرتے ہی رہیں گے (مگر) پھر (آخر میں جب ناکامی کے آثار محسوس ہوں گے) وہ مال ان کے حق میں باعث حسرت ہو جائیں گے (کہ خواہ مخواہ خرچ کیا اور) پھر (آخر) مغلوب (ہی) ہو جائیں گے (جس سے دوہری حسرت ہوگی، مال ضائع ہونے کی الگ، اور مغلوب ہونے کی الگ) اور (یہ سزا یعنی حسرت و مغلوبیت تو ان کی دنیا میں ہے، باقی آخرت کی سزا وہ الگ ہے جس کا بیان یہ ہے کہ) کافر لوگوں کو دوزخ کی طرف (لے جانے کے لئے قیامت میں) جمع کیا جائے گا۔

اس آیت میں سب کفار مراد نہیں، بلکہ جنگ بدر میں جنہوں نے مقابلہ کیا اور مال وغیرہ خرچ کیا وہ مراد ہیں، پس اگر کسی کافر کا مال خرچ کرنا دنیا میں کارآمد ہو جائے تو اس آیت پر اشکال نہیں ہو سکتا، کیونکہ اس کا مصداق خاص مجمع تھا۔

فائدہ: ۱؎ بدر میں بارہ سرداروں نے ایک ایک دن اپنے ذمہ لیا تھا کہ ہر روز ایک شخص لشکر کو کھانا کھلائے گا، چنانچہ دس اونٹ روزانہ کسی ایک کی طرف سے ذبح کیے جاتے تھے، پھر جب شکست ہوگئی تو ہزیمت خوردہ مجمع نے مکہ پہنچ کر ابوسفیان وغیرہ سے کہا کہ جو مال تجارتی قافلہ لایا ہے، وہ سب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے انتقام لینے میں صرف کیا جائے چنانچہ سب اس پر راضی ہو گئے، اسی طرح کے خرچ کرنے کا یہاں ذکر ہے۔

فائدہ: ۲؎ جب دنیا میں مغلوب و مقہور اور آخرت میں معذب ہوں گے، تب افسوس و حسرت سے ہاتھ کاٹیں گے کہ مال بھی گیا اور کامیابی بھی نہ ہوئی، چنانچہ اول بدر میں احد وغیرہ میں سب مالی اور جسمی طاقتیں خرچ کر دیکھیں کچھ نہ کر سکے آخر ہلاک یا رسوا ہوئے یا نادم ہو کر کفر سے توبہ کی۔

لِيَمِيزَ اللَّهُ الْخَبِيثَ مِنَ الطَّيِّبِ وَيَجْعَلَ الْخَبِيثَ بَعْضَهُ عَلَىٰ بَعْضٍ فَيَرْكُمَهُ جَمِيعًا فَيَجْعَلَهُ

تاکہ جدا کر دے اللہ ناپاک کو پاک سے اور رکھے ناپاک کو ایک کو ایک پر پھر اس کو ڈھیر کر دے اکٹھا، پھر ڈال دے اس کو

فِي جَهَنَّمَ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ ﴿٣٧﴾ ع ۱۸

دوزخ میں ۱؎ وہی لوگ ہیں نقصان میں ۲؎

خلاصہ تفسیر: (کافروں کو دوزخ کی طرف جمع کیا جائے گا) تا کہ اللہ تعالیٰ ناپاک (لوگوں) کو پاک (لوگوں) سے الگ کردے (کیونکہ جب دوزخیوں کو دوزخ کی طرف لائیں گے تو ظاہر ہے کہ اہل جنت ان سے علیحدہ رہ جائیں گے) اور (ان سے الگ کر کے) ناپاکوں کو ایک دوسرے سے ملا دے یعنی ان سب کو متصل کردے پھر (متصل کر کے) ان سب کو جہنم میں ڈال دے، ایسے ہی لوگ پورے خسارہ میں ہیں (جس کا کہیں منتہی نہیں)۔

''حشر'' کے معنی جمع کرنا، اور ''رکم'' کے معنی ملا دینا، مطلب یہ ہوا کہ جہنم کی طرف کفار کو لے جانے سے دو باتیں مقصود ہوں گی: ① ایک تو ناپاکوں کو پاکوں سے الگ کرنا ② دوسرے ناپاکوں کو اکٹھا کر کے جہنم میں جھونک دینا۔

* * *

فائدہ: ۱ موضح القرآن میں ہے کہ آہستہ آہستہ اللہ تعالیٰ اسلام کو غالب کرے گا اس درمیان میں کافر اپنا جان و مال کا زور خرچ کرلیں گے، تا کہ نیک و بد جدا ہو جاوے، یعنی جن کی قسمت میں اسلام لکھا ہے وہ سب مسلمان ہو چکیں اور جن کو کفر پر مرنا ہے وہی اکٹھے دوزخ میں جائیں۔

فائدہ: ۲ یعنی دنیاوی و اخروی دونوں قسم کا نقصان اور خسارہ اٹھایا۔

قُلْ لِّلَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اِنْ یَّنْتَهُوْا یُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ ۚ وَ اِنْ یَّعُوْدُوْا فَقَدْ مَضَتْ سُنَّتُ الْاَوَّلِیْنَ ﴿۳۸﴾

تو کہہ دے کافروں کو کہ اگر وہ باز آجائیں تو معاف ہو ان کو جو کچھ ہو چکا ۱ اور اگر پھر بھی وہی کریں گے تو پڑ چکی ہے راہ اگلوں کی ۲

خلاصہ تفسیر: پیچھے کفار کے کفریہ اقوال و افعال کا بیان تھا، ان کے سننے کے بعد کفار کی دو حالتیں ہوسکتی ہیں: ① اسلام لے آنا ② کفر پر قائم رہنا، اس لیے آگے ان دونوں حالتوں کے متعلق احکام بیان فرماتے ہیں۔

(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم!) آپ ان کافروں سے کہہ دیجئے کہ اگر یہ لوگ (اپنے کفر سے) باز آجائیں گے (اور اسلام قبول کرلیں گے) تو ان کے سارے گناہ جو (اسلام سے) پہلے ہو چکے ہیں سب معاف کر دیئے جائیں گے (یہ حکم تو حالت اسلام کا ہوا) اور اگر اپنی وہی (کفر کی عادت رکھیں گے تو (ان کو سنا دیجئے کہ) کفار سابقین کے حق میں (ہمارا) قانون نافذ ہو چکا ہے (کہ دنیا میں ہلاک اور آخرت میں عذاب ہے، وہی تمہارے لئے ہوگا، چنانچہ قتل سے ہلاک بھی ہوئے اور عرب کے سوا دوسرے کفار کا ذمی ہونا بھی ہلاکت ہی ہے)۔

اِنْ یَّنْتَهُوْا یُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ: کفار سے اسلام لانے پر گذشتہ گناہوں کی مغفرت کا وعدہ ہے، خواہ وہ اصلی کافر ہوں یا مرتد، لیکن حقوق العباد، زواجر اور حدود وغیرہ کی معافی نہیں ہوتی، جس کی تفصیل کتب فقہ میں مذکور ہے، جو گناہ محض گناہ ہی ہیں ان کی مغفرت کا وعدہ ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی اگر اب بھی کفر و طغیان اور عداوت اسلام سے باز آجائیں اور پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کی حلقہ بگوشی اختیار کرلیں تو پہلے حالت کفر میں جو گناہ کر چکے، وہ سب معاف کر دیئے جائیں گے ''اَلْاِسْلَامُ یَهْدِمُ مَاكَانَ قَبْلَه'' (حقوق العباد معاف نہ ہوں گے، ان کا مسئلہ علیحدہ ہے)

فائدہ: ۲ یعنی جس طرح اگلے لوگ پیغمبروں کی تکذیب و عداوت سے تباہ ہوئے، ان پر بھی تباہی آئے گی یا یہ مطلب ہے کہ جیسے بدر میں ان کے بھائی بندوں کو سزا دی گئی انہیں بھی سزا دی جائے گی۔

وَ قَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ یَكُوْنَ الدِّیْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا یَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ﴿۳۹﴾

اور لڑتے رہو ان سے یہاں تک کہ نہ رہے فساد ۱ اور ہو جائے حکم سب اللہ کا ۲ پھر اگر وہ باز آجائیں تو اللہ ان کے کام کو دیکھتا ہے ۳

خلاصہ تفسیر: اور (پھر ان کے کافر رہنے کی صورت میں اے مسلمانو!) تم ان (کفار عرب) سے اس حد تک لڑو کہ ان میں فساد

عقیدہ (یعنی شرک) نہ رہے اور (اللہ کا) دین (خالص) اللہ ہی کا ہوجائے (اور کسی کے دین کا خالص اللہ ہی کے لئے ہوجانا اسلام قبول کرنے پر موقوف ہے، تو حاصل یہ ہوا کہ شرک چھوڑ کر اسلام اختیار کریں، خلاصہ یہ کہ اگر نہ اسلام لائیں تو ان سے لڑو جب تک کہ اسلام نہ لائیں، کیونکہ کفار عرب سے جزیہ نہیں لیا جاتا) پھر اگر یہ (کفر سے) باز آجائیں تو (ان کے ظاہری اسلام کو قبول کرو، دل کا حال مت ٹٹولو، کیونکہ اگر یہ دل سے ایمان نہ لائیں گے تو) اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کو خوب دیکھتے ہیں (وہ آپ سمجھ لیں گے، تم کو کیا!!)۔

حَتّٰی لَا تَکُوْنَ فِتْنَةٌ وَّیَکُوْنَ الدِّیْنُ: مذکورہ تفسیر امام ابوحنیفہؒ کے مذہب پر ہے، اور جن ائمہ کے نزدیک کفار عرب سے بھی جزیہ لیا جاتا ہے ان کے نزدیک ''فتنہ'' کی تفسیر فساد و جنگ ہے، اور فَاِنِ انْتَهَوْا کے یہ معنی ہیں کہ جنگ سے باز آجائیں اور رعیت بننا قبول کریں، حربی نہ رہیں، اور فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا یَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ کی تفسیر یہ ہوگی کہ ذمی بننے میں اگر یہ لوگ دھوکہ دیں گے تو حق تعالیٰ خود دیکھ لیں گے، تم کو ذمی بنانے سے انکار کرنے کا حق نہیں۔

* * *

فائدہ: ۱۔ حَتّٰی لَا تَکُوْنَ فِتْنَةٌ: یعنی کافروں کا زور نہ رہے کہ ایمان سے روک سکیں یا مذہب حق کو موت کی دھمکی دے سکیں، جیسا کہ تاریخ شاہد ہے کہ جب بھی کفار کو غلبہ ہوا، مسلمانوں کا ایمان اور مذہب خطرہ میں پڑ گیا، اسپین کی مثال دنیا کے سامنے ہے کہ کس طرح قوت اور موقع ہاتھ آنے پر مسلمانوں کو تباہ کیا گیا یا مرتد بنایا گیا، بہرحال جہاد و قتال کا اولین مقصد یہ ہے کہ اہل اسلام مامون و مطمئن ہوکر خدا کی عبادت کرسکیں اور دولت ایمان و توحید کفار کے ہاتھوں سے محفوظ ہو (چنانچہ فتنہ کی یہی تفسیر ابن عمر وغیرہ صحابہ سے کتب حدیث میں منقول ہے)۔

فائدہ: ۲۔ وَّیَکُوْنَ الدِّیْنُ کُلُّهٗ لِلّٰهِ: یہ ''جہاد'' کا آخری مقصد ہے کہ کفر کی شوکت نہ رہے، حکم اکیلے خدا کا چلے، دین حق سب ادیان پر غالب آجائے لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّهٖ (التوبہ: ۳۳) خواہ دوسرے باطل ادیان کی موجودگی میں جیسے خلفائے راشدین وغیرہم کے عہد میں ہوا، یا سب باطل مذاہب کو ختم کرکے، جیسے نزول مسیح کے وقت ہوگا، بہرحال یہ آیت اس کی واضح دلیل ہے کہ جہاد و قتال خواہ ہجومی ہو یا دفاعی، مسلمانوں کے حق میں اس وقت تک برابر مشروع ہے جب تک یہ دونوں مقصد حاصل نہ ہوجائیں، اسی لیے حدیث میں آگیا: ''اَلْجِهَادُ مَاضٍ اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَةِ'' (جہاد کے احکام و شرائط وغیرہ کی تفصیل کتب فقہ میں ملاحظہ کی جائے)۔

فائدہ: ۳۔ فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا یَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ: یعنی جو ظاہر میں اپنی شرارت اور کفر سے باز آجائیں، ان سے قتال نہیں، ان کے دلوں کا حال اور مستقبل کی کیفیات کو خدا کے سپرد کیا جائے گا، جیسا کام وہ کریں گے خدا کی آنکھ سے غائب ہوکر نہیں کرسکتے، مسلمان صرف ظاہر حال کے موافق عمل کرنے کے مکلف ہیں وفی الحدیث: ''اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰی یَقُوْلُوْا لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ فَاِذَا قَالُوْهَا عَصَمُوْا مِنِّیْ دِمَآءَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ اِلَّا بِحَقِّهَا وَحِسَابُهُمْ عَلَی اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ''۔

وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ مَوْلٰىكُمْ ؕ نِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِیْرُ ﴿۴۰﴾

اور اگر وہ نہ مانیں تو جان لو کہ اللہ تمہارا حمایتی ہے، کیا خوب حمایتی ہے اور کیا خوب مددگار ہے

خلاصہ تفسیر: اور اگر (اسلام سے) روگردانی کریں تو (اللہ کا نام لے کر ان کے مقابلہ سے مت ہٹو اور) یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ (ان کے مقابلہ میں) تمہارا رفیق ہے، وہ بہت اچھا رفیق ہے اور بہت اچھا مددگار ہے (سو وہ تمہاری رفاقت اور نصرت کرے گا)۔

* * *

فائدہ: یعنی مسلمانوں کو چاہیے کہ خدا کی مدد اور حمایت پر بھروسہ کرکے جہاد کریں، کفار کی کثرت اور ساز و سامان سے مرعوب نہ ہوں، جیسے جنگ بدر میں دیکھ چکے کہ خدا نے مسلمانوں کی کیا خوب امداد و حمایت کی۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى

اور جان رکھو کہ جو کچھ تم کو غنیمت ملے کسی چیز سے سو اللہ کے واسطے ہے اس میں سے پانچواں حصہ اور رسول کے واسطے اور اسکے قرابت والوں کے واسطے

وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا

اور یتیموں اور محتاجوں اور مسافروں کے واسطے ۱؎ اگر تم کو یقین ہے اللہ پر اور اس چیز پر جو ہم نے اتاری اپنے بندے پر

يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۴۱﴾

فیصلہ کے دن ۲؎ جس دن بھڑ گئیں دونوں فوجیں، اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے ۳؎

خلاصہ تفسیر: پیچھے ایک آیت قبل قتال کا حکم تھا، چونکہ لڑائی میں کبھی مال غنیمت بھی حاصل ہوتا ہے، اس لیے اب مال غنیمت کا حکم بیان فرماتے ہیں، اور اگر ان آیتوں کا نزول غزوہ بدر کے بارے میں ہو جیسا کہ اکثر کا قول ہے تو یہ سورت کے شروع کی آیت: قل الانفال للہ والرسول کی فی الجملہ تفسیر ہو جائے گی۔

اور اس بات کو جان لو کہ جو شئے (کفار سے) بطور غنیمت کے تم کو حاصل ہو تو اس کا حکم یہ ہے کہ (اس کے کل پانچ حصے کیے جائیں، جن میں سے چار حصے تو لڑنے والوں کا حق ہے اور ایک حصہ یعنی) اس کا پانچواں حصہ (پھر پانچ حصوں پر تقسیم ہوگا جن میں سے ایک تو) اللہ تعالیٰ کا اور اس کے رسول کا ہے (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ملے گا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دینا ایسا ہے جیسے اللہ تعالیٰ کے حضور میں پیش کر دیا) اور (ایک حصہ) آپ کے قرابت داروں کا ہے، اور (ایک حصہ) یتیموں کا ہے، اور (ایک حصہ) غریبوں کا ہے، اور (ایک حصہ) مسافروں کا ہے اگر تم اللہ پر یقین رکھتے ہو اور اس چیز پر (یقین رکھتے ہو) جس کو ہم نے اپنے بندہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پر فیصلہ کے دن (یعنی) جس دن کہ (بدر میں) دونوں جماعتیں (مؤمنین اور کفار کی) باہم مقابل ہوئی تھیں نازل فرمایا تھا (اس سے مراد وہ غیبی امداد ہے جو فرشتوں کے ذریعے آئی تھی، یعنی اگر ہم پر اور ہمارے غیبی الطاف پر یقین رکھتے ہو تو اس حکم کو جان رکھو اور عمل کرو، یہ اس لئے بڑھا دیا تا کہ خمس نکالنا گراں نہ ہوا، اور یہ سمجھ لیں کہ یہ ساری غنیمت اللہ ہی کی امداد سے تو ہاتھ آئی، پھر اگر ہم کو ایک خمس نہ ملا تو کیا ہوا، وہ چار حصے بھی تو ہماری قدرت سے خارج تھے، بلکہ محض قدرت الٰہیہ سے حاصل ہوئے) اور اللہ (ہی) ہر شئے پر پوری قدرت رکھنے والے ہیں (پھر تم تو اتنے کے بھی حق دار نہ تھے، یہ بھی بہت مل گیا)۔

وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى: چونکہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وفات فرما چکے اس لیے آپ کا حصہ نہیں رہا، اور آپ کے قرابت داروں کا حصہ اس لیے تھا کہ انہوں نے شروع سے آپ کی مدد اور حمایت کی، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد یہ سبب باقی نہ رہا اس لیے یہ حصہ بھی ساقط ہو گیا، اب یہ خمس تین حصوں پر تقسیم ہو کر ایک یتیموں کو، ایک فقراء و مساکین کو، اور ایک مسافروں کو ملے گا، واضح رہے کہ فقراء و مساکین میں حضور کی قرابت کے فقراء و مساکین مقدم ہوں گے۔

يَوْمَ الْفُرْقَانِ: فیصلہ کے دن سے مراد بدر کا دن ہے جس میں حق و باطل کا عملی فیصلہ ظاہر ہو گیا۔

* * *

فائدہ: ۱؎ وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ: آغاز سورت میں فرمایا تھا: قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ (الانفال: ۲) یہاں اس کی قدرے تفصیل بیان فرمائی ہے کہ جو مال غنیمت کافروں سے لڑ کر ہاتھ آئے اس میں پانچواں حصہ خدا کی نیاز ہے، جسے خدا کی نیابت کے طور پر پیغمبر (علیہ السلام) وصول کر کے پانچ جگہ خرچ کر سکتے ہیں، اپنی ذات پر، اپنے ان قرابت داروں (بنی ہاشم و بنی المطلب) پر جنہوں نے قدیم سے خدا کے کام میں آپ کی نصرت و امداد کی اور اسلام کی خاطر یا محض قرابت کی وجہ سے آپ کا ساتھ دیا اور مدز کوٰۃ وغیرہ سے لینا ان کے لیے حرام ہوا، یتیموں پر، حاجت

مند مسلمانوں پر، مسافروں پر، پھر غنیمت میں جو چار حصے باقی رہے، وہ لشکر پر تقسیم کئے جائیں، سوار کو دو حصے اور پیدل کو ایک۔

حضور ﷺ کی وفات کے بعد خمس کے پانچ مصارف میں سے ''حنفیہ'' کے نزدیک صرف تین اخیر کے باقی رہ گئے، کیونکہ حضور ﷺ کی رحلت کے بعد حضور ﷺ کی ذات کا خرچ نہیں رہا اور نہ اہل قرابت کا وہ حصہ رہا جو ان کو حضور ﷺ کی نصرت قدیمہ کی بناء پر ملتا تھا البتہ مساکین اور حاجت مندوں کا جو حصہ ہے اس میں حضور ﷺ کے قرابت دار مساکین اور اہل حاجت کو مقدم رکھا جانا چاہیے، بعض علماء کے نزدیک حضور ﷺ کے بعد امیر المومنین کو اپنے مصارف کے لیے خمس الخمس ملنا چاہیے، واللہ اعلم۔ بعض روایات میں ہے کہ جب ''غنیمت'' میں سے خمس (اللہ کے نام کا پانچواں حصہ) نکالا جاتا تھا تو نبی کریم ﷺ اول اس کا کچھ حصہ بیت اللہ (کعبہ) کے لیے نکالتے تھے، بعض فقہاء نے لکھا ہے کہ جہاں سے کعبہ بعید ہے، وہاں مساجد کے لیے نکالنا چاہیے۔

فائدہ: ۲ **يَوْمَ الْفُرْقَانِ:** ''فیصلہ کے دن'' سے مراد ''یوم بدر'' ہے جس میں حق و باطل کی کشمکش کا کھلا ہوا فیصلہ ہوگا، اس دن حق تعالیٰ نے اپنے کامل ترین بندے پر فتح و نصرت اتاری، فرشتوں کی امدادی کمک بھیجی، اور سکون واطمینان کی کیفیت نازل فرمائی، تو جو لوگ خدا پر اور اس کی تائید غیبی پر ایمان رکھتے ہیں، ان کو غنیمت میں سے خدا کے نام کا پانچواں حصہ نکالنا بھاری نہیں ہوسکتا۔

فائدہ: ۳ **وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ:** جیسے اس دن تم کو مظفر و منصور کیا وہ قادر ہے کہ آئندہ بھی تم کو غلبہ اور فتوحات عنایت فرمائے۔

إِذْ أَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوٰى وَالرَّكْبُ أَسْفَلَ مِنْكُمْ ۚ وَلَوْ تَوَاعَدْتُّمْ

جس وقت تم تھے ورلے کنارہ پر اور وہ پرلے کنارہ پر ۱ اور قافلہ نیچے اتر گیا تھا تم سے ۲ اور اگر تم آپس میں وعدہ کرتے

لَاخْتَلَفْتُمْ فِي الْمِيْعٰدِ ۙ وَلٰكِنْ لِّيَقْضِيَ اللّٰهُ أَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا ۙ لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ

تو نہ پہنچتے وعدہ پر ایک ساتھ ۳ لیکن اللہ کو کر ڈالنا تھا ایک کام کو جو مقرر ہو چکا تھا، تاکہ مرے جس کو مرنا ہے قیام حجت کے بعد

وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ ۗ وَإِنَّ اللّٰهَ لَسَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۴۲﴾

اور جیوے جس کو جینا ہے قیام حجت کے بعد ۴ اور بیشک اللہ سننے والا جاننے والا ہے ۵

خلاصہ تفسیر: گزشتہ آیت میں یوم بدر کا ذکر تھا، اب مخاطبین کو اس کا منظر پیش کر کے اس کے بعض واقعات کی حکمت اور اس کے ضمن میں اپنی نعمت واحسان ظاہر فرماتے ہیں۔

یہ وہ وقت تھا کہ جب تم اس میدان کے اِدھر والے کنارہ پر تھے، اور وہ لوگ (یعنی کفار) اس میدان کے اُدھر والے کنارہ پر تھے (اِدھر والے سے مراد مدینہ سے نزدیک کا موقع، اور اُدھر والے سے مراد مدینہ سے دور کا موقع ہے) اور وہ قافلہ (قریش کا) تم سے نیچے کی طرف کو (بچا ہوا) تھا (یعنی سمندر کے کنارے کنارے جا رہا تھا، حاصل یہ کہ پورے جوش کا سامان جمع تھا، ایک تو دونوں آپس میں آمنے سامنے تھے کہ ہر ایک دوسرے کو دیکھ کر جوش میں آئے، ادھر قافلہ رستہ ہی میں تھا جس کی وجہ سے کفار کو اس کے بچانے کی فکر تھی جس سے جوش اور زیادہ ہوا، غرض وہ ایسا شدید وقت تھا، پھر بھی اللہ تعالیٰ نے تم پر غیبی امداد نازل کی جیسا کہ پیچھے ارشاد ہوا ہے: أَنْزَلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا) اور (وہ تو مصلحت یہ ہوئی کہ اتفاقاً مقابلہ ہوگیا ورنہ) اگر (پہلے سے حسب معمول وعادت) تم اور وہ (لڑائی کے لئے) کوئی بات ٹھہراتے (کہ فلاں وقت لڑیں گے) تو (موجودہ حالت کا تقاضا یہ تھا کہ) ضرور اس تقرر کے بارے میں تم میں اختلاف ہوتا (یعنی کوئی بات قرار نہ پاتی، بلکہ یا تو مسلمانوں میں باہم اختلاف ہوتا کہ بے سروسامانی کی وجہ سے کوئی کچھ کہتا کوئی کچھ کہتا، یا کفار کے ساتھ اختلاف ہوتا کہ مسلمان بے سروسامانی کی وجہ سے رکتے اور کفار مسلمانوں کے رعب کی وجہ سے جرأت نہ

کرتے، بہر حال دونوں طرح اس جنگ کی نوبت نہ آتی، تو جو فائدے اس میں ظاہر ہوئے وہ ظہور میں نہ آتے جن کا بیان آگے لِّیَهْلِكَ میں آتا ہے)

لیکن (اللہ تعالیٰ نے ایسا سامان کردیا کہ اس کی نوبت نہیں آئی اچانک بلا قصد لڑائی چھڑ گئی) تا کہ جو کام اللہ کو کرنا منظور تھا اس کی تکمیل کردے، یعنی تا کہ (حق کا نشان ظاہر ہو جائے اور) جس کو برباد (یعنی گمراہ) ہونا ہے وہ نشان آئے پیچھے (آنے کے بعد) برباد ہو اور جس کو زندہ (یعنی ہدایت یافتہ) ہونا ہے وہ (بھی) نشان آئے پیچھے (آنے کے بعد) زندہ ہو (مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ کو یہ منظور تھا کہ لڑائی ہو، تا کہ ایک خاص طریق سے اسلام کا حق ہونا ظاہر ہو جائے کہ تھوڑے لوگ اور کم سامان کے باوجود مسلمان غالب آئے جو کہ خلاف عادت ہے، جس سے معلوم ہوا کہ اسلام حق ہے، پس اس سے حجت الٰہی پوری ہوگئی، اس کے بعد جو گمراہ ہوگا وہ حق واضح ہونے کے بعد ہوگا جس میں عذر کی گنجائش ہی نہیں رہی اور عذاب کا پورا مستحق ہو گیا، اسی طرح جس کے نصیب میں ہدایت ہوگی وہ دلیل دیکھ کر حق قبول کرلے گا، خلاصہ حکمت کا یہ ہوا کہ حق واضح ہو جائے) اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ خوب سننے والے خوب جاننے والے ہیں (کہ حق واضح اور ظاہر ہونے کے بعد زبان اور دل سے کون کفر کرتا ہے اور کون ایمان لاتا ہے)۔

* * *

فائدہ: ۱۔ وَهُمۡ بِالۡعُدۡوَةِ الۡقُصۡوٰی: ''ورلے کنارے'' سے مراد میدان جنگ کی وہ جانب ہے جو مدینہ طیبہ سے قریب تھی، اسی طرح ''پرلا کنارہ'' وہ ہوگا جو مدینہ سے بعید تھا۔

فائدہ: ۲۔ وَالرَّكۡبُ اَسۡفَلَ مِنۡكُمۡ: یعنی ابوسفیان کا تجارتی قافلہ نیچے کی طرف ہٹ کر سمندر کے کنارے کنارے جا رہا تھا، قافلہ اور مسلمانوں کے درمیان قریش کی فوج حائل ہو چکی تھی۔

فائدہ: ۳۔ لَاخۡتَلَفۡتُمۡ فِی الۡمِیۡعٰدِ: یعنی اگر فریقین پہلے سے لڑائی کا کوئی وقت ٹھہرا کر جانا چاہتے تو ممکن تھا اس میں اختلاف ہوتا، یا وعدہ کے وقت پہنچنے میں ایک فریق پس وپیش کرتا، کیونکہ ادھر مسلمان کفار کی تعداد اور ظاہری ساز وسامان سے خائف تھے، ادھر کفار مسلمانوں کی حقانیت، خدا پرستی اور بے جگری سے مرعوب رہتے تھے، دونوں کو جنگ کی ذمہ داری لینے یا شرکت کرنے میں تردد اور تقاعد ہو سکتا تھا۔

فائدہ: ۴۔ وَّیَحۡیٰی مَنۡ حَیَّ عَنۡۢ بَیِّنَةٍ: یعنی قریش اپنے قافلہ کی مدد کو آئے تھے اور تم قافلہ پر حملہ کرنے کو، قافلہ بچ گیا اور دو فوجیں ایک میدان کے دو کناروں پر آ پڑیں، ایک کو دوسرے کی خبر نہیں، یہ تدبیر اللہ کی تھی، اگر تم قصداً جاتے تو ایسا بروقت نہ پہنچتے، اور اس فتح کے بعد کافروں پر صدق پیغمبر کھل گیا، جو مرا وہ بھی یقین جان کر مرا اور جو جیتا رہا وہ بھی حق پہچان کر، تا کہ اللہ کا الزام پورا ہو، کذا فی الموضح، اور ممکن ہے مرنے اور جینے سے کفر وایمان مراد ہوں، یعنی اب جو ایمان لائے اور جو کفر پر جما رہے دونوں کا ایمان یا کفر وضوح حق کے بعد ہو۔

فائدہ: ۵۔ وَاِنَّ اللّٰهَ لَسَمِیۡعٌ عَلِیۡمٌ: یعنی اللہ کمزور مظلوموں کی فریاد سننے والا ہے اور جانتا ہے کہ کس طریقہ سے ان کی مدد کی جائے، دیکھو بدر میں مسلمانوں کی فریاد کیسی سنی اور کیسی مدد فرمائی۔

اِذۡ یُرِیۡكَهُمُ اللّٰهُ فِیۡ مَنَامِكَ قَلِیۡلًا ؕ وَلَوۡ اَرٰىكَهُمۡ كَثِیۡرًا لَّفَشِلۡتُمۡ وَلَتَنَازَعۡتُمۡ فِی الۡاَمۡرِ

جب اللہ نے وہ کافر دکھلائے تجھ کو تیری خواب میں تھوڑے ۱۔ اور اگر تجھ کو بہت دکھلا دیتا تو تم لوگ نامردی کرتے اور جھگڑا ڈالتے کام میں

وَلٰكِنَّ اللّٰهَ سَلَّمَ ؕ اِنَّهٗ عَلِیۡمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ ﴿۴۳﴾

لیکن اللہ نے بچا لیا، اس کو خوب معلوم ہے جو بات ہے دلوں میں ۲۔

خلاصہ تفسیر: (اور) وہ وقت بھی قابل ذکر ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے آپ کے خواب میں آپ کو وہ لوگ کم دکھلائے (چنانچہ آپ نے صحابہ کو اس خواب کی خبر کی، ان کے دل خوب قوی ہو گئے) اور اگر اللہ تعالیٰ آپ کو وہ لوگ زیادہ کر کے دکھادیتے (اور آپ صحابہ سے فرمادیتے) تو

(اے صحابہ!) تمہاری ہمتیں ہار جاتیں اور اس امر (قتال) میں تم میں باہم نزاع (اور اختلاف) ہو جاتا لیکن اللہ تعالیٰ نے (اس کم ہمتی اور اختلاف سے تم کو) بچا لیا، بیشک وہ دلوں کی باتوں کو خوب جانتا ہے (اس کو معلوم تھا کہ زیادہ دکھانے سے دلوں میں ضعف پیدا ہوگا اور کم دکھانے سے قوت، اس لیے ایسی تدبیر کی، اور اس کم دکھانے کی تحقیق سورہ آل عمران آیت ۱۳: قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ فِيْ فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا میں گذر چکی ہے وہاں ملاحظہ کیجیے۔

اِذْ يُرِيْكَهُمُ اللّٰهُ فِيْ مَنَامِكَ قَلِيْلًا: آیت سے معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ بعض اوقات بعض واقعات کو نبی ﷺ سے بھی مخفی فرما لیتے ہیں جیسے اس آیت میں ہے کہ کفار کی تعداد کو کم کر کے دکھلایا، سو آج کل جو لوگ اپنے شیخ اور پیروں کے بارے میں گمان کرتے ہیں کہ ان کو سب کچھ پتہ ہوتا ہے اور ان کے خواب اور کشف پر یقین کر لیتے ہیں کہ یہ ضروری ہوگا تو یہ درست نہیں ہے، اور یہ واقعہ تو نیند (خواب) میں تھا ایسا ہی بیداری میں بھی ممکن ہے جیسا کہ بعد والی آیت میں مذکور ہے۔

* * *

فائدہ: ۱۔ یعنی مسلمان کو چاہیے کہ خدا کی مدد اور حمایت پر بھروسہ کر کے جہاد کریں، کفار کی کثرت اور ساز و سامان سے مرعوب نہ ہوں جیسے جنگ بدر میں دیکھ چکے کہ خدا نے مسلمانوں کی کیا خوب امداد اور حمایت کی۔

فائدہ: ۲۔ یعنی انہیں زیادہ سمجھ کر کوئی لڑنے کی ہمت نہ کرتا، اس طرح اختلاف ہو کر کام میں کھنڈت پڑ جاتی لیکن خدا نے پیغمبر ﷺ کو خواب میں تھوڑی تعداد دکھلا کر اس بزدلی اور نزاع باہمی سے تم کو بچا لیا وہ خوب جانتا ہے کہ کس چیز سے دلوں میں ہمت و شجاعت پیدا ہوتی ہے اور کس بات سے جبن و نامردی۔

وَاِذْ يُرِيْكُمُوْهُمْ اِذِ الْتَقَيْتُمْ فِيْٓ اَعْيُنِكُمْ قَلِيْلًا وَّيُقَلِّلُكُمْ فِيْٓ اَعْيُنِهِمْ لِيَقْضِيَ اللّٰهُ

اور جب تم کو دکھلائی وہ فوج مقابلہ کے وقت تمہاری آنکھوں میں تھوڑی اور تم کو تھوڑا دکھلایا ان کی آنکھوں میں تاکہ کر ڈالے اللہ

اَمْرًا كَانَ مَفْعُوْلًا ۭ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۴۴﴾ ع

ایک کام جو مقرر ہو چکا تھا، اور اللہ تک پہنچتا ہے ہر کام

خلاصہ تفسیر: اور (صرف خواب ہی میں آپ کو کم دکھلانے پر اکتفاء نہیں کیا، بلکہ حکمت پوری کرنے کے لئے بیداری میں مقابلہ کے وقت مسلمانوں کی نظر میں بھی کفار کم دکھلائی دیئے اور اس کے برعکس بھی ہوا کہ کفار کی نظر میں مسلمان کم دکھلائی دیے جو کہ واقع کے مطابق بھی تھا چنانچہ فرماتے ہیں کہ:) اس وقت کو یاد کرو جبکہ اللہ تعالیٰ تمہیں جبکہ تم مقابل ہوئے ان لوگوں کو تمہاری نظر میں کم کر کے دکھلا رہے تھے اور (اسی طرح) ان کی نگاہ میں تم کو کم کر کے دکھلا رہے تھے تاکہ جو کام اللہ کو کرنا منظور تھا اس کی تکمیل کر دے (جیسا پہلے بیان ہو چکا ہے لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ الخ) اور سب مقدمے خدا ہی کی طرف رجوع کئے جائیں گے (پھر وہ ''ہالک'' یعنی گمراہ اور ''حی'' یعنی ہدایت پانے والوں کو سزا و جزا دیں گے)۔

* * *

فائدہ: پیغمبر کو خواب میں کافر تھوڑے نظر آئے اور مسلمانوں کو مقابلہ کے وقت تاکہ جرأت سے لڑیں، پیغمبر کا خواب غلط نہیں، ان میں کافر رہنے والے کم ہی تھے، اکثر وہ تھے جو پیچھے مسلمان ہوئے اور خواب کی تعبیر یہ بھی ہو سکتی ہے کہ تھوڑی تعداد سے مقصود ان کی مغلوبیت کا اظہار ہو، باقی کفار کی نظر میں جو مسلمان تھوڑے دکھلائی دیے تو وہ واقعی تھوڑے تھے، یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب دونوں فوجیں اول آمنے سامنے ہوئیں، پھر جب مسلمانوں نے دلیرانہ حملے کیے اور فرشتوں کا لشکر مدد کو پہنچا اس وقت کفار کو مسلمان دگنے نظر آنے لگے، کما فی وَاُخْرٰى كَافِرَةٌ يَّرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَاْيَ الْعَيْنِ (آل عمران: ۱۳)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿٤٥﴾

اے ایمان والوجب بھڑو کسی فوج سے تو ثابت قدم رہو اور اللہ کو بہت یاد کرو۱ تاکہ تم مراد پاؤ

خلاصہ تفسیر: پیچھے بدر کے واقعات بیان کیے، اب مسلمانوں کو قتال کے ظاہری و باطنی آداب کی تعلیم فرماتے ہیں۔
اے ایمان والو! جب تم کو (کفار کی کسی) جماعت سے (جہاد میں) مقابلہ کا اتفاق ہوا کرے تو (ان آداب کا لحاظ رکھو: ① ایک یہ کہ) ثابت قدم رہو (بھاگو مت) اور (② دوسرے یہ کہ) اللہ کا خوب کثرت سے ذکر کرو (کہ ذکر سے دل میں قوت ہوتی ہے) امید ہے تم (مقابلہ میں) کامیاب ہو (کیونکہ جب مقابلہ کے وقت ثابت قدمی اور ثابت قلبی یعنی دل کی پختگی جمع ہو جائے تو کامیابی غالب ہے)۔

* * *

فائدہ: ۱ اس میں نماز، دعا، تکبیر اور ہر قسم کا ذکر اللہ شامل ہے، ''ذکر اللہ'' کی تاثیر یہ ہے کہ ذاکر کا دل مضبوط اور مطمئن ہوتا ہے جس کی جہاد میں سب سے زیادہ ضرورت ہے صحابہ کا سب سے بڑا ہتھیار یہی تھا اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ ۭ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (الرعد:۲۸)

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ وَاصْبِرُوْا ۭ

اور حکم مانو اللہ کا اور اس کے رسول کا، اور آپس میں نہ جھگڑو، پس نامرد ہو جاؤ گے اور جاتی رہے گی تمہاری ہوا۱ اور صبر کرو

اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿٤٦﴾

بیشک اللہ ساتھ ہے صبر والوں کے ۲

خلاصہ تفسیر: اور (③ تیسرے یہ کہ جنگ سے متعلق تمام امور میں) اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت (کا لحاظ) کیا کرو (کہ کوئی کارروائی خلاف شرع نہ ہو) اور (④ چوتھے یہ کہ اپنے امام سے اور باہم بھی) نزاع مت کرو ورنہ (باہمی نااتفاقی سے) کم ہمت ہو جاؤ گے (کیونکہ قوتیں منتشر ہو جائیں گی، ایک کو دوسرے پر اعتماد و بھروسہ نہ ہوگا اور اکیلا آدمی کیا کر سکتا ہے) اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی (ہوا اکھڑنے سے مراد رعب دبدبہ کم ہو جانا ہے کیونکہ دوسروں کو جب اس نااتفاقی کی اطلاع ہوگی تو مخالف کے دل میں رعب نہ رہے گا) اور (⑤ پانچویں یہ کہ اگر کوئی ناگواری کی بات پیش آئے تو اس پر) صبر کرو، بیشک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہیں (اور خدا کا ساتھ ہونا غلبہ و نصرت کا سبب ہے)۔

* * *

فائدہ: ۱ یعنی ہوا خیزی ہو کر اقبال و رعب کم ہو جائے گا، بدرعبی کے بعد فتح و ظفر کیسے حاصل کر سکو گے۔
فائدہ: ۲ جو سختیاں اور شدائد جہاد کے وقت پیش آئیں ان کو صبر و استقامت سے برداشت کرو ہمت نہ ہارو، مثل ہے کہ ہمت کا حامی خدا ہے، اس آیت میں مسلمانوں کو بتلا دیا گیا کہ کامیابی کی کنجی کیا ہے؟ معلوم ہوا کہ دولت، لشکر اور میگزین وغیرہ سے فتح و نصرت حاصل نہیں ہوتی، ثابت قدمی، صبر و استقلال، قوت و طمانینت قلب، یاد الٰہی، خدا اور رسول اور ان کے قائم مقام سرداروں کی اطاعت و فرمانبرداری اور باہمی اتفاق و اتحاد سے حاصل ہوتی ہے، اس موقع پر بے ساختہ جی چاہتا ہے کہ صحابہ کے متعلق ابن کثیرؒ کے چند الفاظ نقل کر دوں جو اخلاص و ایمان کی انتہائی گہرائی سے نکلے ہوئے ہیں:
''وَقَدْ كَانَ لِلصَّحَابَةِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ فِيْ بَابِ الشَّجَاعَةِ وَالْاِئْتِمَارِ بِمَا اَمَرَهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ بِهٖ وَامْتِثَالِ مَا اَرْشَدَهُمْ اِلَيْهِ مَا لَمْ يَكُنْ لِاَحَدٍ مِنَ الْاُمَمِ وَالْقُرُوْنِ قَبْلَهُمْ، وَ لَا يَكُوْنُ لِاَحَدٍ مِمَّنْ بَعْدَهُمْ، فَاِنَّهُمْ بِبَرَكَةِ الرَّسُوْلِ ﷺ وَطَاعَتِهٖ فِيْمَا

اَمَرَهُمْ فتحوا الْقُلُوبَ وَالْاَقَالِيم شَرْقاً وَّغَرْباً فِى المُدَّة اليَسِيْرَةِ مَعَ قلة عددهم بالنسبة الى جيوش سائر الاقاليم من الروم والفرس والتُّرْكِ وَالصَّقَالِبَةِ وَالْبَرْبَرِ وَالْحُبُوشِ وَاصْنَاف السُّودَانِ وَالْقِبْطِ وَطَوَائِفِ بَنِى اٰدَمَ قَهَرُوا الْجَمِيْع حَتّٰى عَلَتْ كَلِمَةُ اللهِ وَظَهَرَ دِيْنُه عَلٰى سَائِرِ الْاَدْيَانِ، وَامْتَدَتْ المَمَالِكِ الإِسْلَامِيَةِ فِىْ مَشَارِقِ الْاَرْضِ وَمَغَارِبِهَا فِىْ اَقَلَّ مِنْ ثَلَاثِيْنَ سَنَةَ فَرَضِيَ اللهُ عَنْهُمْ وَاَرْضَاهُمْ اَجْمَعِيْنَ وَحَشَرْنَا فِىْ زُمْرَتِهِمْ اِنَّه كَرِيْمٌ تَوَّابٌ"۔

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَّرِئَآءَ النَّاسِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ط

اور نہ ہوجاؤ ان جیسے جو کہ نکلے اپنے گھروں سے اتراتے ہوئے اور لوگوں کے دکھانے کو اور روکتے تھے اللہ کی راہ سے

وَاللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ﴿۴۷﴾

اور اللہ کے قابو میں ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں

خلاصہ تفسیر: اور (⑨ چھٹے یہ کہ نیت خالص رکھو تفاخر اور نمائش میں) ان (کافر) لوگوں کے مشابہ مت ہونا کہ جو (اسی واقعہ بدر میں) اپنے گھروں سے اتراتے ہوئے اور لوگوں کو (اپنی شان وسامان) دکھلاتے ہوئے نکلے اور (اس فخر وریا کے ساتھ یہ بھی نیت تھی کہ) لوگوں کو اللہ کے رستہ (یعنی دین) سے روکتے تھے (کیونکہ مسلمانوں کو زک دینے چلے تھے، جس کا اثر عام طبیعتوں پر یہی ہوتا کہ دین سے دور ہوجاتے) اور اللہ تعالیٰ (ان لوگوں کو پوری سزا دے گا، چنانچہ وہ) ان کے اعمال کو (اپنے علم کے) احاطہ میں لئے ہوئے ہے۔

تفسیر درمنثور میں کفار قریش کے فخریہ اقوال واعمال منقول ہیں، لیکن آخر کو ساری شیخی خاک میں مل گئی۔

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ خَرَجُوْا: اس آیت میں مسلمانوں کو اتراہٹ اور ریاکاری میں کفار کی مشابہت سے منع کیا گیا، کیونکہ کفار جنگ کے لیے اتراتے ہوئے اور لوگوں کو اپنی قوت دکھلاتے ہوئے نکلتے ہیں، پس اس آیت سے مسلمانوں کو اللہ اور اس کے دین کے دشمنوں کی مشابہت اختیار کرنے سے ممانعت ثابت ہوئی۔

* * *

فائدہ: ابو جہل لشکر لے کر بڑی دھوم دھام اور باجے گاجے کے ساتھ نکلا تھا تاکہ مسلمان مرعوب ہوجائیں اور دوسرے قبائل عرب پر مشرکین کی دھاک بیٹھ جائے، راستہ میں اس کو ابوسفیان کا پیام پہنچا کہ قافلہ سخت خطرہ سے بچ نکلا ہے، اب تم مکہ کو لوٹ جاؤ، ابو جہل نے نہایت غرور سے کہا کہ ہم اس وقت واپس جاسکتے ہیں جبکہ بدر کے چشمہ پر پہنچ کر مجلس طرب ونشاط منعقد کرلیں، گانے والی عورتیں خوشی اور کامیابی کے گیت گائیں، شرابیں پئیں، مزے اڑائیں اور تین روز تک اونٹ ذبح کرکے قبائل عرب کی ضیافت کا انتظام کریں، تاکہ یہ دن عرب میں ہمیشہ کے لیے ہماری یادگار رہے، اور آئندہ کے لیے ان مٹھی بھر مسلمانوں کے حوصلے پست ہوجائیں کہ پھر کبھی ہمارے مقابلہ کی جرأت نہ کریں، اسے کیا خبر تھی کہ جو منصوبے باندھ رہے ہیں اور تجویزیں سوچ رہے ہیں وہ سب خدا کے قابو میں ہیں چلنے دے یا نہ چلنے دے، بلکہ چاہے تو انہی پر الٹ دے، چنانچہ یہ ہی ہوا، بدر کے پانی اور جام شراب کی جگہ انہیں موت کا پیالہ پینا پڑا، محفل سرود ونشاط تو منعقد نہ کرسکے ہاں نوحہ وماتم کی صفیں بدر سے مکہ تک بچھ گئیں جو مال تفاخر ونمائش میں خرچ کرنا چاہتے تھے وہ مسلمانوں کے لیے لقمہ غنیمت بنا، ایمان وتوحید کے دائمی غلبہ کا بنیادی پتھر بدر کے میدان میں نصب ہوگیا، گویا ایک طرح اس چھوٹے سے قطعہ زمین میں خدا تعالیٰ نے روئے زمین کو ملل واقوام کی قسمتوں کا فیصلہ فرمادیا، بہرحال اس آیت میں مسلمانوں کو آگاہ فرمایا کہ جہاد محض ہنگامہ کشت وخون کا نام نہیں، بلکہ عظیم الشان عبادت ہے، عبادت اترا وے یا دکھانے کو کرے تو قبول نہیں، لہذا تم فخر وغرور اور نمود ونمائش میں کفار کی چال مت چلو۔

وَاِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ وَقَالَ لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَاِنِّيْ جَارٌ لَّكُمْ ۚ

اور جس وقت خوش نما کر دیا شیطان نے انکی نظروں میں انکے عملوں کو اور بولا کوئی بھی غالب نہ ہوگا تم پر آج کے دن لوگوں میں سے اور میں تمہارا حمایتی ہوں

فَلَمَّا تَرَآءَتِ الْفِئَتٰنِ نَكَصَ عَلٰى عَقِبَيْهِ وَقَالَ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّنْكُمْ اِنِّيْٓ اَرٰى مَا لَا تَرَوْنَ

پھر جب سامنے ہوئیں دونوں فوجیں تو وہ الٹا پھرا اپنی ایڑیوں پر اور بولا میں تمہارے ساتھ نہیں ہوں میں دیکھتا ہوں جو تم نہیں دیکھتے

اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ ۭ وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۴۸ ع

میں ڈرتا ہوں اللہ سے، اور اللہ کا عذاب سخت ہے

خلاصہ تفسیر: پیچھے کفار کی اتراہٹ وریا کاری کا ذکر تھا، اب اس کی وجہ بتلاتے ہیں کہ یہ شیطان کی ملمع کاری اور فریب تھا، یہ قصہ اس طرح ہوا تھا کہ قریش اور بنی کنانہ میں کچھ رنج چلا آتا تھا، جب کفار قریش مکہ سے مسلمانوں کے مقابلہ کو چلنے لگے تو بنی کنانہ کی طرف سے کسی قدر اندیشہ ہوا، اور وہ جانے میں پس وپیش کرنے لگے تو اس وقت شیطان بنی کنانہ کے سردار سراقہ کی صورت میں ظاہر ہوا اور کہا کہ تم اندیشہ مت کرو، میں بنی کنانہ کی طرف سے تمہارا ذمہ دار ہوں، سب یہی سمجھے کہ یہ سراقہ ہے، سب اطمینان سے بدر میں پہنچے، جب لڑائی کا وقت آیا اور فرشتے آنا شروع ہوئے اس وقت اس کا ہاتھ حارث کے ہاتھ میں تھا، ہاتھ چھڑا کر بھاگا، حارث نے پوچھا کہ کہاں چلے؟ تو جواب دیا: اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّنْكُمْ الخ یعنی میں تم سے بالکل بے زار ہوں، غرض لوگوں میں سراقہ کی بدنامی کا چرچا ہوا، سراقہ کو جب یہ پتہ لگا تو اس نے قسم کھائی کہ مجھ کو تو کچھ بھی خبر نہیں۔

اور اس وقت کا ان سے ذکر کیجئے جب کہ شیطان نے ان (کفار) کو (وسوسہ کے ذریعہ) ان کے اعمال (کفر یہ یعنی رسول اللہ ﷺ کی مخالفت وعداوت) خوشنما کر کے دکھلائے (کہ کفار نے ان باتوں کو اچھا سمجھا) اور (وسوسہ سے بڑھ کر یہ کیا کہ ان سے زبانی) کہا کہ (تم کو وہ قوت و شوکت ہے کہ تمہارے مخالف) لوگوں میں سے آج کوئی تم پر غالب آنے والا نہیں اور میں تمہارا حامی ہوں (نہ باہر کے دشمنوں سے ڈرو، اور نہ اندرونی دشمنوں کا اندیشہ کرو) پھر جب دونوں جماعتیں (کفار اور مسلمانوں کی) ایک دوسرے کے بالمقابل ہوئیں (اور اس نے فرشتوں کو آسمان سے اترتے دیکھا) تو وہ الٹے پاؤں بھاگا اور یہ کہا کہ میرا تم سے کوئی واسطہ نہیں (میں حامی مددگار کچھ نہیں بنتا، کیونکہ) میں ان چیزوں کو دیکھ رہا ہوں جو تم کو نظر نہیں آتیں (مراد فرشتے ہیں) میں تو خدا سے ڈرتا ہوں (کبھی کسی فرشتہ سے دنیا ہی میں میری خبر لے لے) اللہ تعالیٰ سخت سزا دینے والے ہیں۔

اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ: چونکہ نرا خوف بغیر ایمان کے مقبول نہیں، اس لیے شیطان کا خدا سے ڈرنا اگر واقعی بھی ہو تب بھی کچھ محل اشکال نہیں۔

فَلَمَّا تَرَآءَتِ الْفِئَتٰنِ نَكَصَ عَلٰى عَقِبَيْهِ: اس واقعہ میں ابلیس سراقہ بن مالک کنانی کی صورت میں متمثل ہو گیا تھا، پس آیت میں کئی مسئلوں پر دلالت ہے:

① شیطان جس طرح وسوسہ ڈالتا ہے کبھی گناہ کے وسوسہ کو ترک بھی کر دیتا ہے، جیسے اس قصہ میں پہلے وسوسہ ڈالا: لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ، پھر اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّنْكُمْ کہہ کر اس کو ترک کر دیا، اور یہ ترک وسوسہ اس وقت کرتا ہے جب وہ دیکھتا ہے کہ میرے وسوسہ کے بغیر بھی انسان گناہ کرلے گا۔

② دوسرا مسئلہ اہل باطل کیلئے کشف کا ممکن ہونا، چنانچہ شیطان کو فرشتے نظر آئے جس کی خبر اس قول میں دی گئی اِنِّيْٓ اَرٰى مَا لَا تَرَوْنَ

③ تیسرا مسئلہ خدا تعالیٰ سے محض طبعی خوف ہونا کافی نہیں، جیسا شیطان کا خوف تھا اور اس نے: اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ کہا، جبکہ مطلوب وپسندیدہ ایمانی خوف ہے جو شیطان سے ممکن نہیں۔

④ چوتھا مسئلہ تمثل کے امکان کا ثبوت بھی ملتا ہے، جیسا کہ ابلیس کنانہ کی صورت میں متمثل ہوا، یعنی اللہ نے شیطان کو یہ قدرت دی ہے کہ وہ

مختلف شکلوں میں ظاہر ہوسکے (''امکان تمثل'' کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کسی مخلوق کا اپنی اصلی وفطری شکل کے علاوہ دوسری شکل میں ظاہر ہونا، یہ صورت عموماً شیاطین وجنات میں بکثرت پائی جاتی ہے، لیکن یہ وقتی وہنگامی شکل ہوا کرتی ہے)۔

* * *

فائدہ: قریش اپنی قوت وجمعیت پر مغرور تھے لیکن بنی کنانہ سے ان کی چھیڑ چھاڑ رہتی تھی، خطرہ یہ ہوا کہ کہیں بنی کنانہ کامیابی کے راستے میں آڑے نہ آجائیں، فوراً شیطان ان کی پیٹھ ٹھونکنے اور ہمت بڑھانے کے لیے کنانہ کے سردار اعظم سراقہ بن مالک کی صورت میں اپنی ذریت کی فوج لے کر نمودار ہوا اور ابوجہل وغیرہ کو اطمینان دلایا کہ ہم سب تمہاری امداد وحمایت پر ہیں، کنانہ کی طرف سے بے فکر رہو، میں تمہارے ساتھ ہوں، جب بدر میں زور کارن پڑا اور شیطان کو جبرائیل وغیرہ فرشتے نظر آئے تو ابوجہل کے ہاتھ میں سے ہاتھ چھڑا کر الٹے پاؤں بھاگا، ابوجہل نے کہا، سراقہ! عین وقت پر دغا دے کر کہاں جاتے ہو؟ کہنے لگا میں تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتا، مجھے وہ چیزیں دکھائی دے رہی ہیں، جو تم کو نظر نہیں آتیں (یعنی فرشتے) خدا کے (یعنی اس خدائی فوج کے) ڈر سے میرا دل بیٹھا جاتا ہے، اب ٹھہرنے کی ہمت نہیں، کہیں سخت عذاب آفت میں نہ پکڑا جاؤں، قتادہ کہتے ہیں کہ ملعون نے جھوٹ بولا، اس کے دل میں خدا کا ڈر نہ تھا، ہاں وہ جانتا تھا کہ اب قریش کا لشکر ہلاکت میں گھر چکا ہے کوئی قوت بچا نہیں سکتی، یہ اس کی قدیم عادت ہے کہ اپنے متبعین کو دھوکہ دے کر اور ہلاکت میں پھنسا کر عین وقت پر کھسک جایا کرتا ہے، اسی کے موافق یہاں بھی کہا يَعِدُهُمْ وَيُمَنِّيهِمْ ۖ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا (النساء: ۱۲۰) كَمَثَلِ الشَّيْطٰنِ اِذْ قَالَ لِلْاِنْسَانِ اكْفُرْ ۚ فَلَمَّا كَفَرَ قَالَ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّنْكَ اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ (الحشر: ۱۶) وَقَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الْاَمْرُ اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ ۖ وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ ۚ فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَلُوْمُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۖ مَآ اَنَا بِمُصْرِخِكُمْ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُصْرِخِيَّ ۖ اِنِّيْ كَفَرْتُ بِمَآ اَشْرَكْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ ۗ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (ابراہیم: ۲۲)

اِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ غَرَّ هٰٓؤُلَآءِ دِيْنُهُمْ ۗ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ

جب کہنے لگے منافق اور جن کے دلوں میں بیماری ہے یہ لوگ مغرور ہیں اپنے دین پر، اور جو کوئی بھروسہ کرے اللہ پر

فَاِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۴۹﴾

تو اللہ زبردست ہے حکمت والا

خلاصہ تفسیر: پیچھے اس گمان کی غلطی کا بیان تھا کہ کفار کے غالب آنے کی امید تھی لیکن وہ مغلوب ہو گئے، اب اس گمان کی غلطی کا بیان ہے کہ مسلمان مغلوب ہوتے نظر آتے تھے لیکن توکل کی برکت سے وہ غالب آ گئے۔

اور وہ وقت بھی قابل ذکر ہے کہ جب منافقین (مدینہ والوں میں سے) اور جن کے دلوں میں (شک کی) بیماری تھی (مکہ والوں میں سے، مسلمانوں کا بے سروسامانی کے ساتھ کفار کے مقابلہ میں آجانا دیکھ کر) یوں کہتے تھے کہ ان (مسلمان) لوگوں کو ان کے دین نے بھول میں ڈال رکھا ہے (کہ اپنے دین کے حق ہونے کے بھروسے پر ایسے خطرہ میں آپڑے، اللہ جواب دیتے ہیں) اور جو شخص اللہ پر بھروسہ کرتا ہے تو (وہ اکثر غالب ہی آتا ہے، کیونکہ) بلاشبہ اللہ تعالیٰ زبردست ہیں (اس لئے جو اس پر بھروسہ کرتا ہے تو اس کو اکثر غالب ہی کر دیتے ہیں اور اگر کبھی ایسا شخص مغلوب ہو جائے تو اس میں بھی کچھ مصلحت ہوتی ہے، کیونکہ) وہ حکمت والے (بھی) ہیں (غرض ظاہری سامان اور بے سامانی پر مدار نہیں، قادر کوئی اور ہی ہے)۔

غَرَّ هٰٓؤُلَآءِ دِيْنُهُمْ: مکہ والوں میں سے بعض لوگ لڑائی میں شریک ہونے سے رکتے تھے، مگر شرما شرمی میں وہ بھی بدر میں آئے تھے، یہاں آکر فریقین یعنی مسلمان اور کفار کی حالت کا موازنہ کر کے انہوں نے یہ کہا تھا۔

* * *

فائدہ: مسلمانوں کی تھوڑی جمعیت اور بے سروسامانی اور اس پر ایسی دلیری وشجاعت کو دیکھتے ہوئے منافقین اور ضعیف القلب کلمہ گو کہنے لگے تھے کہ یہ مسلمان اپنے دین اور حقانیت کے خیال پر مغرور ہیں جو اس طرح اپنے آپ کو موت کے منہ میں ڈال دیتے ہیں، حق تعالیٰ نے اس کا جواب دیا کہ یہ غرور نہیں، توکل ہے، جس کو خدا کی زبردست قدرت پر اعتماد ہو اور یقین رکھے کہ جو کچھ ادھر سے ہوگا عین حکمت وصواب ہوگا، وہ حق کے معاملہ میں ایسا ہی بے جگر اور دلیر ہو جاتا ہے۔

وَلَوْ تَرٰۤى اِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوا ۙ الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ ۚ وَذُوْقُوْا

اور اگر تو دیکھے جس وقت جان قبض کرتے ہیں کافروں کی فرشتے مارتے ہیں ان کے منہ پر اور ان کے پیچھے اور کہتے ہیں چکھو

عَذَابَ الْحَرِيْقِ ۝۵۰ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ۝۵۱

عذاب جلنے کا ۱؎ یہ بدلا ہے اسی کا جو تم نے آگے بھیجا اپنے ہاتھوں اور اس واسطے کہ اللہ ظلم نہیں کرتا بندوں پر ۲؎

خلاصہ تفسیر: پیچھے کفار پر دنیوی عذاب یعنی مغلوب اور مقتول ہونے کا بیان تھا، اب آگے آخرت اور برزخ کے عذاب کا بیان ہے اور اس کی علت بھی بتلاتے ہیں کہ وہ حق کی مخالفت ہے۔

اور اگر آپ (اس وقت کا واقعہ) دیکھیں (تو عجیب منظر نظر آئے) جب کہ فرشتے ان (موجودہ) کافروں کی جان قبض کرتے جاتے ہیں (اور) ان کے منہ پر اور ان کی پشتوں پر مارتے جاتے ہیں اور یہ کہتے جاتے ہیں کہ (ابھی کیا ہے آگے چل کر) آگ کی سزا جھیلنا (اور) یہ عذاب ان اعمال (کفریہ) کی وجہ سے ہے جو تم نے اپنے ہاتھوں سمیٹے ہیں اور یہ امر ثابت ہی ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں پر ظلم کرنے والے نہیں (سو اللہ تعالیٰ نے بے جرم سزا نہیں دی)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی مار کر کہتے ہیں کہ ابھی تو یہ لو اور عذاب جہنم کا مزہ آئندہ چکھنا، بہت سے مفسرین نے اسکو بھی بدر کے واقعہ میں داخل کیا ہے یعنی اس وقت جو کافر مارے جاتے تھے ان کے ساتھ فرشتوں کا یہ معاملہ تھا، مگر الفاظ آیت کے سب کافروں کو عام ہیں اس لیے راجح یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ عالم برزخ کا ہوا، اب بدر کے واقعات سے تعلق یہ ہوگا کہ دنیا میں ان کافروں کی یہ گت بنی، برزخ میں یہ ہوگا اور آخرت کے عذاب کا تو کہنا ہی کیا ہے۔

فائدہ: ۲؎ یعنی یہ سب تمہاری کرتوت کی سزا ہے ورنہ خدا کے یہاں ظلم کی کوئی صورت ہی نہیں، اگر معاذ اللہ ادھر سے رتی برابر ظلم کا امکان ہو تو پھر وہ اپنی عظمت شان کے لحاظ سے ظالم نہیں ظلام ہی ٹھہرے کیونکہ کامل کی ہر صفت کامل ہی ہونی چاہیے۔

كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ؕ

جیسے دستور فرعون والوں کا اور جو ان سے پہلے تھے کہ منکر ہوئے اللہ کی باتوں سے سو پکڑا ان کو اللہ نے ان کے گناہوں پر

اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝۵۲

بیشک اللہ زور آور ہے سخت عذاب کرنے والا

خلاصہ تفسیر: (پس) ان کی حالت (اس بارے میں کہ کفر کی وجہ سے سزایاب ہوئے) ایسی ہے جیسی فرعون والوں کی اور ان سے پہلے (کافر) لوگوں کی حالت تھی کہ انہوں نے آیات الہیہ کا انکار کیا، سو اللہ تعالیٰ نے ان کے (ان) گناہوں پر ان کو (عذاب میں) پکڑ لیا، بلاشبہ اللہ تعالیٰ بڑی قوت والے سخت سزا دینے والے ہیں (کہ ان کے مقابلہ میں کوئی ایسی قوت نہیں رکھتا کہ ان کے عذاب کو ہٹا سکے)۔

* * *

فائدہ: یعنی قدیم سے یہی دستور رہا ہے کہ جب لوگ آیات اللہ کی تکذیب وانکار یا انبیاء سے جنگ کرنے پر مصر ہوئے تو اللہ نے ان کو کسی نہ کسی عذاب میں پکڑ لیا۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۙ

اس کا سبب یہ ہے کہ اللہ ہرگز بدلنے والا نہیں اس نعمت کو جو دی تھی اس نے کسی قوم کو جب تک وہی نہ بدل ڈالیں اپنے جیوں کی بات

وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۵۳﴾

اور یہ کہ اللہ سننے والا جاننے والا ہے

خلاصہ تفسیر: (اور) یہ بات (کہ بغیر جرم کے ہم سزا نہیں دیتے) اس سبب سے ہے (کہ ہمارا ایک قاعدہ کلیہ مقرر ہے اور بغیر جرم کے سزا نہ دینا بھی اسی قاعدہ میں داخل ہے اور وہ قاعدہ یہ ہے کہ) اللہ تعالیٰ کسی ایسی نعمت کو جو کسی قوم کو عطا فرمائی ہو نہیں بدلتے جب تک کہ وہی لوگ اپنے ذاتی اعمال کو نہیں بدل ڈالتے، اور یہ امر ثابت ہی ہے کہ اللہ تعالیٰ بڑے سننے والے بڑے جاننے والے ہیں (پس وہ ان کے اقوال کے تغیر کو سنتے اور افعال کے تغیر کو جانتے ہیں)۔

حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ: سو ان موجودہ کفار نے اپنی یہ حالت بدلی کہ پہلے کفر کے باوجود ان میں ایمان لانے کی تھوڑی بہت قابلیت اور استعداد تھی، پھر انہوں نے انکار و مخالفت کر کر کے اس کو دور کر ڈالا، پس ہم نے بھی اپنی یہ نعمت کہ اب تک ان کو مہلت دے رکھی تھی اس مہلت کی نعمت کو پکڑ اور گرفتاری کی سزا سے بدل دیا، اور اس کی وجہ یہ ہوئی کہ پہلے انہوں نے اپنی حالت یعنی استعداد کو بدل ڈالا۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً: اس آیت کے عموم میں وہ صورت بھی داخل ہوگئی کہ جب سالک سے کوئی گناہ سرزد ہوتا ہے یا کوئی طاعت ترک ہو جاتی ہے تو اس سے وہ انوار و برکات جو سالک پر نازل ہو رہے ہوتے ہیں وہ منقطع ہو جاتے ہیں۔

* * *

فائدہ: یعنی جب لوگ اپنی بے اعتدالی اور غلط کاری سے نیکی کے فطری قویٰ اور استعداد کو بدل ڈالتے ہیں اور خدا کی بخشی ہوئی داخلی یا خارجی نعمتوں کو اس کے بتلائے ہوئے کام میں ٹھیک موقع پر خرچ نہیں کرتے بلکہ الٹے اسکی مخالفت میں صرف کرنے لگتے ہیں تو حق تعالیٰ اپنی نعمتیں ان سے چھین لیتا ہے اور شان انعام کو انتقام سے بدل دیتا ہے، وہ بندوں کی تمام باتوں کو سنتا اور تمام احوال کو جانتا ہے کوئی چیز اس سے پردہ میں نہیں، لہٰذا جس سے جو معاملہ کرے گا نہایت ٹھیک اور برمحل ہوگا، حضرت شاہ صاحب ؒ لکھتے ہیں کہ: ''نیت اور اعتقاد جب تک نہ بدلے تو اللہ کی بخشی ہوئی نعمت چھینی نہیں جاتی''، گویا مَا بِاَنْفُسِهِمْ سے خاص نیت اور اعتقاد مراد لیا ہے جیسا کہ ترجمہ سے ظاہر ہو رہا ہے، واللہ اعلم۔

كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ

جیسے دستور فرعون والوں کا اور جو ان سے پہلے تھے کہ انہوں نے جھٹلائیں باتیں اپنے رب کی پھر ہلاک کر دیا ہم نے ان کو ان کے گناہوں پر

وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ ۚ وَكُلٌّ كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ﴿۵۴﴾

اور ڈبو دیا ہم نے فرعون والوں کو، اور سارے ظالم تھے

خلاصہ تفسیر: (پس اس حالت کے بدلنے میں بھی) ان کی حالت فرعون والوں اور ان سے پہلے والوں کی سی حالت ہے کہ انہوں نے اپنے رب کی آیات کو جھٹلایا، اس پر ہم نے ان کو ان کے (ان) گناہوں کے سبب ہلاک کر دیا، اور (ان میں) فرعون والوں کو (خاص طور

پر ہلاک کیا کہ ان کو) غرق کر دیا، اور وہ (فرعون والے اور پہلے والے) سب ظالم تھے۔

كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ: ایک آیت قبل اور پھر یہاں غرض دو مرتبہ: كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ آیا ہے، دونوں کی تقریر اور خلاصہ تفسیر سے یہ شبہ دور ہو جاتا ہے کہ اس میں تکرار ہے، جواب ظاہر ہے کہ پیچھے یہ مقصود تھا کہ کفر پر سزا پانے میں یہ لوگ ان کے مشابہ ہیں، اور یہاں یہ مقصود ہے کہ اپنی حالت یعنی استعداد بدلنے میں بھی یہ ان کے مشابہ ہیں، پس مقصود بدلنے سے تکرار نہ رہا۔

* * *

فائدہ: فرعونیوں اور ان سے پہلی قوموں کو ان کے جرائم کی پاداش میں ہلاک کیا اور خصوصیت کے ساتھ فرعونیوں کا بیڑا غرق کر دیا، یہ سب اس وقت ہوا جب انہوں نے خدا سے بغاوت اور شرارت کر کے خود اپنی جانوں پر ظلم کیے، ورنہ خدا کو کسی مخلوق سے ذاتی عداوت نہیں۔

اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۵﴾

بدتر سب جانداروں میں اللہ کے ہاں وہ ہیں جو منکر ہوئے پھر وہ نہیں ایمان لاتے

اَلَّذِيْنَ عٰهَدْتَّ مِنْهُمْ ثُمَّ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَهُمْ فِيْ كُلِّ مَرَّةٍ وَّهُمْ لَا يَتَّقُوْنَ ﴿۵۶﴾

جن سے تو نے معاہدہ کیا ہے ان میں سے پھر وہ توڑتے ہیں اپنا عہد ہر بار اور وہ ڈر نہیں رکھتے[1]

خلاصہ تفسیر: اوپر کی آیات میں یہاں تک کفار مشرکین کی حالت اور ان کے ساتھ قتال کا بیان تھا، آگے کفار اہل کتاب کے حالات اور ان کے ساتھ قتال کا بیان ہے، اس کا سبب نزول یہود بنی قریظہ کی عہد شکنی ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ سے عہد کیا تھا کہ ہم آپ کے مخالفین کی مدد نہ کریں گے اور پھر بھی غزوہ احزاب میں مشرکین کی مدد کی، ایسا کئی بار ہو چکا تھا، ہر بار کہہ دیتے تھے کہ ہم بھول گئے، پھر تازہ عہد کرتے تھے، پھر عہد توڑتے تھے، اس پر ان آیتوں میں آپ ﷺ کو ان کے ساتھ قتال کا حکم ہوا۔

بلاشبہ بدترین خلائق اللہ کے نزدیک یہ کافر لوگ ہیں (جب یہ علم الٰہی میں ایسے ہیں) تو یہ ایمان نہ لائیں گے، جن کی یہ کیفیت ہے کہ آپ ان سے (کئی بار) عہد لے چکے ہیں (مگر) پھر (بھی) وہ ہر بار اپنا عہد توڑ ڈالتے ہیں، اور وہ (عہد شکنی سے) ڈرتے نہیں۔

اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ: اس سورہ انفال کے شروع میں پہلے ایک ایسی ہی آیت: اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ مشرکین کے بارہ میں آ چکی ہے، چونکہ تمام کفار پر دوسرے عام گناہ گاروں سے بدتر ہونا صادق آتا ہے اس لیے دونوں آیتوں میں کوئی تعارض نہیں، مطلب یہ ہے کہ کفار خواہ مشرک ہوں یا اہل کتاب تمام گناہ گار مخلوق سے بدتر ہیں، اور یہاں یہ جو فرمایا: فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ کہ وہ ایمان نہ لائیں گے تو یہ پیشین گوئی ان ہی کے بارے میں ہے جو علم الٰہی میں عمر بھر کافر رہنے والے تھے۔

* * *

فائدہ: [1] جو لوگ ہمیشہ کے لیے کفر اور بے ایمانی پر تل گئے اور انجام سے بالکل بے خوف ہو کر غداری اور بدعہدی کے خوگر ہو رہے ہیں، وہ خدا کے نزدیک بدترین جانور ہیں، فرعونیوں کا حال بدعہدی اور غداری میں یہی تھا وَلَمَّا وَقَعَ عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ قَالُوْا يٰمُوْسَى ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ لَئِنْ كَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ وَلَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الرِّجْزَ اِلٰٓى اَجَلٍ هُمْ بٰلِغُوْهُ اِذَا هُمْ يَنْكُثُوْنَ (الاعراف: ۱۳۴-۱۳۵) اور حضور (ﷺ) کے زمانہ میں یہود بنی قریظہ وغیرہ کی یہی خصلت تھی، آپ سے عہد کر لیتے کہ ہم مشرکین مکہ کو مدد نہ دیں گے، پھر ان کی امداد کرتے اور کہہ دیتے کہ ہم کو عہد یاد نہ رہا تھا، بار بار ایسا ہی کرتے تھے، آگے بتلایا ہے کہ ایسے غداروں کے ساتھ کیا معاملہ ہونا چاہیے۔

فَاِمَّا تَثۡقَفَنَّهُمۡ فِی الۡحَرۡبِ فَشَرِّدۡ بِهِمۡ مَّنۡ خَلۡفَهُمۡ لَعَلَّهُمۡ یَذَّکَّرُوۡنَ﴿۵۷﴾ وَاِمَّا تَخَافَنَّ

سو اگر کبھی تو پائے ان کو لڑائی میں تو ان کو ایسی سزا دے کہ دیکھ کر بھاگ جائیں ان کے پچھلے تا کہ ان کو عبرت ہو، اور اگر تجھ کو ڈر ہو

مِنۡ قَوۡمٍ خِیَانَةً فَانۡۢبِذۡ اِلَیۡهِمۡ عَلٰی سَوَآءٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الۡخَآئِنِیۡنَ﴿۵۸﴾

کسی قوم سے دغا کا تو پھینک دے ان کا عہد ان کی طرف ایسی طرح پر کہ ہو جاؤ تم اور وہ برابر، بیشک اللہ کو خوش نہیں آتے دغا باز ۱؎

خلاصہ تفسیر: سو اگر آپ لڑائی میں ان لوگوں پر قابو پائیں (اور یہ آپ کے ہاتھ آئیں) تو ان (پر حملہ کر کے اس) کے ذریعہ سے اور لوگوں کو جو کہ ان کے علاوہ ہیں منتشر کر دیجئے تا کہ وہ لوگ سمجھ جائیں (کہ عہد توڑنے کا یہ وبال ہوتا ہے، ہم ایسا نہ کریں، یہ حکم تو اس وقت ہے کہ جب ان لوگوں نے عہد علانیہ توڑ دیا ہو) اور اگر (ابھی تک علانیہ تو نہیں توڑا لیکن) آپ کو کسی قوم سے خیانت (یعنی عہد شکنی) کا اندیشہ ہو تو (اجازت ہے کہ) آپ وہ عہد ان کو اس طرح واپس کر دیجئے (یعنی اس طرح اس عہد کے باقی نہ رہنے کی اطلاع کر دیجئے) کہ آپ اور وہ (اس اطلاع میں) برابر ہو جائیں (کہ جس طرح آپ کے نزدیک عہد باقی نہیں رہا اسی طرح وہ بھی سمجھ جائیں کہ عہد نہیں رہا، کیونکہ ایسی صاف اطلاع کے بغیر لڑنا خیانت ہے اور) بلاشبہ اللہ تعالیٰ خیانت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے۔

وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنۡ قَوۡمٍ خِیَانَةً: یہاں عہد توڑنے میں جو خیانت کے خوف کی قید لگائی ہے یہ اکثر حالت کے اعتبار سے ہے کہ اکثر ایسی حالت میں عہد توڑنے کی زیادہ حاجت ہوتی ہے، ورنہ خیانت کے اندیشہ کے بغیر بھی اگر عہد توڑنے میں مصلحت ہو تو جائز ہے، اس آیت میں فَشَرِّدۡ بِهِمۡ اور فَانۡۢبِذۡ اِلَیۡهِمۡ کا خطاب خاص ہے، اسی طرح آگے صلح کے مسئلہ فاجنح لها کا خطاب بھی خاص ہے تو اس میں اشارہ ہے کہ عہد کا توڑنا یا باندھنا امام کی رائے پر ہے، عوام کو اس میں دخل نہیں دینا چاہیے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی اگر یہ دغا باز غدار معاہدوں کو اعلانیہ پس پشت ڈال کر آپ کے مقابل میدان جنگ میں آ جائیں تو ان کو ایسی سخت سزا دیجئے، جسے دیکھ کر ان کے پیچھے رہنے والے یا ان کے بعد آنے والی نسلیں بھی عبرت حاصل کریں اور عہد شکنی کی کبھی جرأت نہ کر سکیں اور اگر ایک قوم نے اعلانیہ دغا بازی نہیں کی، ہاں آثار و قرائن بتا رہے ہیں کہ عہد شکنی پر آمادہ ہے تو آپ کو اجازت ہے کہ مصلحت سمجھیں تو ان کا عہد واپس کر دیں اور معاہدہ سے دستبرداری کی اطلاع کر کے مناسب کارروائی کریں، تا کہ فریقین پچھلے معاہدات کی نسبت شک و اشتباہ میں نہ رہیں، دونوں مساویانہ طور پر آگاہ و بیدار ہو کر اپنی تیاری اور حفاظت میں مشغول ہوں، آپ کی جانب سے کوئی چوری اور خیانت نہ ہو سب معاملہ صاف صاف ہو، حق تعالیٰ خیانت کی کارروائی کو خواہ کفار کے ساتھ ہو پسند نہیں کرتا، سنن میں روایت ہے کہ امیر معاویہ اور روم میں میعادی معاہدہ تھا، میعاد کے اندر امیر معاویہ نے اپنی فوجوں کو روم کی سرحد کی طرف بڑھانا شروع کیا مقصد یہ تھا کہ رومیوں کی سرحد سے اس قدر قریب اور پہلے سے تیار رہیں کہ میعاد معاہدہ گزرتے ہی فوراً دھاوا بول دیا جائے، جس وقت یہ کارروائی جاری تھی، ایک شیخ سواری پر یہ کہتے ہوئے آئے: "الله اكبر الله اكبر وفاء لاغدرا" یعنی عہد پورا کرو عہد شکنی مت کرو، رسول اللہ (ﷺ) نے فرمایا ہے کہ جب کسی قوم سے معاہدہ ہو تو کوئی گرہ نہ کھولی جائے نہ باندھی جائے یہاں تک کہ معاہدہ کی مدت پوری ہو جائے، یا فریق ثانی کو مساویانہ حیثیت میں معاہدہ واپس کیا جائے، معاویہ کو جب یہ خبر پہنچی تو الٹے واپس آ گئے، پھر جو دیکھا تو وہ شیخ حضرت عمرو بن عنبسہ ؓ تھے۔

وَلَا یَحۡسَبَنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا سَبَقُوۡا ؕ اِنَّهُمۡ لَا یُعۡجِزُوۡنَ﴿۵۹﴾

اور یہ نہ سمجھیں کافر لوگ کہ وہ بھاگ نکلے وہ ہرگز تھکا نہ سکیں گے ہم کو

خلاصہ تفسیر: پیچھے مشرکین مکہ و یہود مدینہ کے ساتھ قتال کا ذکر تھا، چونکہ قتال میں بعض بچ بھی جاتے ہیں، اب ان کی نسبت

فرماتے ہیں کہ وہ خدا سے نہیں بچ سکیں گے، ایک نہ ایک روز عذاب میں مبتلا ہونا ہے۔

اور کافر لوگ اپنے کو یہ خیال نہ کریں کہ وہ بچ گئے، یقیناوہ لوگ (اللہ تعالیٰ کو) عاجز نہیں کر سکتے (کہ اس کے ہاتھ نہ آئیں، یا تو دنیا ہی میں عذاب میں مبتلا کردے گا ورنہ آخرت میں تو یقینی ہے)۔

* * *

فائدہ: نبذ عہد کا جو حکم اوپر مذکور ہوا، ممکن تھا کہ کفار اس کو مسلمانوں کی سادہ لوحی پر حمل کر کے خوش ہوتے کہ جب ان کے یہاں خیانت و غدر جائز نہیں تو ہم کو خبردار اور بیدار ہونے کے بعد پورا موقع اپنے بچاؤ اور مسلمانوں کے خلاف تیاری کرنے کا ملے گا، اس کا جواب دے دیا کہ کتنی ہی تیاری اور انتظامات کرلو، جب مسلمانوں کے ہاتھوں خدا تم کو مغلوب و رسوا کرنا اور دنیا یا آخرت میں سزا دینا چاہے گا، تو تم کسی تدبیر سے اس کو عاجز نہ کر سکو گے، نہ اس کے احاطہ قدرت و تسلط سے نکل کر بھاگ سکو گے، گو یا مسلمانوں کی تسلی کردی کہ وہ خدا پر بھروسہ کر کے اس کے احکام کا امتثال کریں تو سب پر غالب آئیں گے۔

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ

اور تیار کرو ان کی لڑائی کے واسطے جو کچھ جمع کر سکو قوت سے اور پلے ہوئے گھوڑوں سے ا؎ کہ اس سے دھاک پڑے اللہ کے دشمنوں پر

وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ۚ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ

اور تمہارے دشمنوں پر اور دوسروں پر ان کے سوا جن کو تم نہیں جانتے، اللہ ان کو جانتا ہے ۲؎ اور جو کچھ تم خرچ کرو گے

فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ۝۶۰

اللہ کی راہ میں وہ پورا ملے گا تم کو اور تمہارا حق نہ رہ جائے گا ۳؎

خلاصہ تفسیر: پیچھے کفار سے قتال کا ذکر تھا، اب لڑائی کا سامان تیار اور مہیا رکھنے کا حکم ہے۔

اور ان کافروں سے (مقابلہ کرنے) کے لئے جس قدر تم سے ہو سکے ہتھیار سے اور پلے ہوئے گھوڑوں سے سامان درست رکھو کہ اس (سامان) کے ذریعہ سے تم (اپنا) رعب جمائے رکھو ان پر جو کہ (کفر کی وجہ سے) اللہ کے دشمن ہیں، اور (تمہاری فکر میں رہنے کی وجہ سے) تمہارے دشمن ہیں (جن سے شب و روز تم کو سابقہ پڑتا رہتا ہے) اور ان کے علاوہ دوسرے (کافروں) پر بھی (رعب جمائے رکھو) جن کو تم (بالیقین) نہیں جانتے (بلکہ) ان کو اللہ ہی جانتا ہے (جیسے فارس اور رُوم وغیرہ کے کفار جن سے اس وقت تک سابقہ نہیں پڑا تھا، مگر صحابہ کا ساز و سامان اور فن سپہ گری سے اپنے وقت میں تیار رہنا ان کے مقابلہ میں بھی کام آیا، ان پر بھی رعب جما، بعض مقابل ہو کر مغلوب ہوئے، بعض نے جزیہ قبول کیا کہ یہ بھی رعب کا اثر ہے) اور اللہ کی راہ میں (جس میں جہاد بھی آ گیا) جو کچھ بھی خرچ کرو گے (جس میں وہ خرچ بھی آ گیا جو ساز و سامان درست کرنے میں کیا جائے) وہ (یعنی اس کا ثواب) تم کو (آخرت میں) پورا پورا دیا جائے گا اور تمہارے لئے (اس میں) کچھ کمی نہ ہوگی۔

مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ: احادیث میں تیر اندازی کی مشق اور گھوڑوں کے رکھنے اور سواری سیکھنے کی بہت فضیلت آئی ہے، اب بندوق اور توپ وغیرہ تیر کے قائم مقام ہیں، اور قوت میں یہ سب چیزیں اور ورزش وغیرہ بھی داخل ہے۔

عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ: خدا کے دشمن کفر کی وجہ سے اور تمہارے دشمن اس وجہ سے کہ دن رات تمہاری فکر میں رہتے ہیں اور ہمیشہ تم کو ان سے سابقہ پڑتا رہتا ہے۔

فَاِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِي الْحَرْبِ (الی قولہ تعالیٰ) وَاَعِدُّوْا لَهُمْ: ان آیات میں واضح دلالت ہے کہ سیاسی تدابیر اختیار کرنا باطنی کمال

اور توکل کے خلاف نہیں ہے جیسا کہ بعض غلو کرنے والے اہل رہبانیت خیال کرتے ہیں، کیونکہ خود اللہ تعالی نے کفار کے خلاف ہتھیار جمع کرنے کا حکم فرمایا ہے۔

فائدہ: ۱ یعنی خدا پر بھروسہ کرنے کے معنی یہ نہیں کہ اسباب ضروریہ مشروعہ کو ترک کر دیا جائے نہیں، مسلمانوں پر فرض ہے کہ جہاں تک ضرورت ہو سامان جہاد فراہم کریں، نبی کریم ﷺ کے عہد مبارک میں گھوڑے کی سواری، شمشیر زنی اور تیر اندازی وغیرہ کی مشق کرنا، سامان جہاد تھا، آج بندوق، توپ، ہوائی جہاز، آبدوز کشتیاں، آہن پوش کروز وغیرہ کا تیار کرنا اور استعمال میں لانا اور فنون حربیہ کا سیکھنا، بلکہ ورزش وغیرہ کرنا سب سامان جہاد ہے، اسی طرح آئندہ جو اسلحہ وآلات حرب وضرب تیار ہوں، ان شاء اللہ وہ سب آیت کے منشاء میں داخل ہیں، باقی گھوڑے کی نسبت تو آپ خود ہی فرما چکے: "اَلْخَيْلُ مَعْقُودٌ فِي نَوَاصِيهَا الْخَيْرُ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ" کہ قیامت تک کے لیے خدا نے اس کی پیشانی میں خیر رکھ دی ہے اور احادیث میں ہے کہ: "جو شخص گھوڑا جہاد کی نیت سے پالتا ہے، اس کے کھانے پینے بلکہ ہر قدم اٹھانے میں اجر ملتا ہے اور اس کی خوراک وغیرہ تک کا قیامت کے دن ترازو میں وزن کیا جائے گا"۔

فائدہ: ۲ یعنی یہ سب سامان اور تیاری دشمنوں پر رعب جمانے اور دھاک بٹھلانے کا ایک ظاہری سبب ہے، باقی فتح وظفر کا اصلی سبب تو خدا کی مدد ہے جو پہلے بیان ہو چکا، اور وہ لوگ جن کو بالیقین تم نہیں جانتے منافقین ہیں جو مسلمانی کے پردہ میں تھے یا یہود بنی قریظہ یا روم وفارس وغیرہ وہ سب قومیں جن سے آئندہ مقابلہ ہونے والا تھا۔

فائدہ: ۳ یہ مالی جہاد کی طرف اشارہ ہے، یعنی جہاد کی تیاری میں جس قدر مال خرچ کرو گے، اس کا پورا پورا بدلہ ملے گا، یعنی ایک درہم کے ساتھ دو دو درہم وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ اور بسا اوقات دنیا میں بھی اس سے کہیں زیادہ معاوضہ مل جاتا ہے۔

وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿٦١﴾

اور اگر وہ جھکیں صلح کی طرف تو تو بھی جھک اسی طرف اور بھروسہ کر اللہ پر، بیشک وہی ہے سننے والا جاننے والا

خلاصہ تفسیر: پیچھے کفار کو ڈرانے کا بیان تھا، اس کے بعد کبھی کفار کی طرف سے صلح کی درخواست ہو سکتی ہے اس لیے اب اس کا حکم بیان فرماتے ہیں، اور چونکہ صلح میں بعض اوقات یہ احتمال ہوتا ہے کہ شاید کفار نے فریب کیا ہو اس کے متعلق جناب رسول اللہ ﷺ سے آپ کی حفاظت کا وعدہ اور اس وعدہ کی تاکید کے لیے اپنی پہلی نعمتیں یاد دلاتے ہیں۔

اور اگر وہ (کفار) صلح کی طرف جھکیں تو آپ (کو) بھی (اجازت ہے کہ اگر اس میں مصلحت دیکھیں تو) اس طرف جھک جائیے اور (اگر مصلحت کے باوجود یہ احتمال ہو کہ یہ ان کی چال نہ ہو تو) تو اللہ پر بھروسہ رکھئے (ایسے احتمالوں سے اندیشہ نہ کیجئے) بلاشبہ وہ خوب سننے والا خوب جاننے والا ہے (ان کے اقوال اور احوال کو سنتا جانتا ہے ان کا خود انتظام کر دے گا)۔

وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا: مصلحت اور جواز کی قید سے اس حکم کا اختیاری ہونا معلوم ہو گیا، اس سے آیت کا منسوخ ہونا لازم نہیں آتا جیسا کہ بعض نے سمجھا ہے کہ صلح کرنا اب تو واجب نہیں ہے جبکہ اس آیت سے واجب ہونا معلوم ہوتا ہے تو یہ منسوخ ہے، جواب یہ ہے کہ آیت میں حکم وجوب کے لیے نہیں، بلکہ اختیار پر محمول ہے۔

فائدہ: مسلمانوں کی تیاری اور مجاہدانہ قربانیوں کو دیکھ کر بہت ممکن ہے کہ کفار مرعوب ہو کر صلح وآشتی کے خواستگار ہوں تو آپ کو ارشاد ہے کہ حسب صوابدید آپ بھی صلح کا ہاتھ بڑھا دیں، کیونکہ جہاد سے خونریزی نہیں، اعلائے کلمۃ اللہ اور دفع فتنہ مقصود ہے، اگر بدون خونریزی کے یہ مقصد حاصل ہو سکے تو خواہی نخواہی خون بہانے کی کیا حاجت ہے اگر یہ احتمال ہو کہ شاید کفار صلح کے پردہ میں ہم کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں تو کچھ پروانہ کیجئے اللہ پر بھروسہ رکھئے

وہ ان کی نیتوں کو جانتا اور ان کے اندرونی مشوروں کو سنتا ہے اس کی حمایت کے سامنے ان کی بدنیتی نہ چل سکے گی آپ اپنی نیت صاف رکھئے۔

وَاِنْ يُّرِيْدُوْٓا اَنْ يَّخْدَعُوْكَ فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ ۭ هُوَالَّذِيْٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۶۲﴾

اور اگر وہ چاہیں کہ تجھ کو دغا دیں تو تجھ کو کافی ہے اللہ، اسی نے تجھ کو زور دیا اپنی مدد کا اور مسلمانوں کا

خلاصہ تفسیر: گذشتہ آیت میں صلح کا ذکر تھا، چونکہ صلح میں بعض اوقات یہ احتمال ہوتا ہے کہ شاید کفار نے فریب و دھوکہ دیا ہو، اب اس کے متعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حفاظت کا وعدہ اور تاکید وغیرہ کے لیے اپنے سابقہ انعامات کی یاددہانی کراتے ہیں۔

اور اگر (واقع میں وہ احتمال صحیح ہو اور) وہ لوگ (سچ مچ صلح سے) آپ کو دھوکا دینا چاہیں تو اللہ تعالیٰ آپ (کی مدد اور حفاظت کرنے) کے لئے کافی ہیں (جیسا کہ اس سے قبل بھی آپ کی حفاظت اور کفایت فرماتے تھے، چنانچہ) وہ وہی ہے جس نے آپ کو اپنی (غیبی) امداد (یعنی فرشتوں) سے اور (ظاہری امداد یعنی) مسلمانوں سے قوت دی۔

فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ: چونکہ یہ حفاظت کا وعدہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص ہے تو اس سے یہ شبہ دور ہو گیا کہ بعض دفعہ کفار کی چال مسلمانوں کے مقابلہ میں تو چل جاتی ہے؟ جواب یہ ہے کہ اس آیت کے نزول کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں کبھی کفار کی چال کا کامیاب ہونا ثابت نہیں اگرچہ مسلمانوں کے مقابلہ میں کفار کی چال چل جائے، کیونکہ آیت میں سب کے لیے وعدہ نہیں ہے۔

* * *

فائدہ: اگر صلح کر کے وہ لوگ دغابازی اور عہد شکنی کا ارادہ کرلیں تو فکر نہ کیجئے، خدا آپ کی مدد کے لیے کافی ہے ان کے سب فریب خدا بیکار کر دے گا، اسی نے بدر میں آپ کی غیبی امداد فرمائی، اور ظاہری طور پر جاں نثار سرفروش مسلمانوں سے آپ کی تائید کی۔

وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ ۭ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ

اور الفت ڈالی ان کے دلوں میں، اگر تو خرچ کر دیتا جو کچھ زمین میں ہے سارا نہ الفت ڈال سکتا ان کے دلوں میں لیکن اللہ نے

اَلَّفَ بَيْنَهُمْ ۭ اِنَّهٗ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۶۳﴾

الفت ڈالی ان میں، بیشک وہ زور آور ہے حکمت والا

خلاصہ تفسیر: اور (مسلمانوں کو ذریعہ امداد بنانے کے لئے) ان کے قلوب میں اتفاق پیدا کر دیا (چنانچہ ظاہر ہے کہ اگر باہم اتفاق نہ ہو تو کوئی کام مل کر نہیں کر سکتے خاص کر دین کی نصرت، اور ان میں حب ریاست اور بغض و عداوت کے غلبہ کی وجہ سے اتفاق ہونا ایسا دشوار تھا کہ) اگر آپ (باوجودیکہ عقل و تدبیر میں بھی کامل ہیں اور اس کے لئے آپ کے پاس کافی سامان بھی ہوتا یہاں تک کہ) دنیا بھر کا مال (اس کام کے لئے) خرچ کرتے تب بھی ان کے قلوب میں اتفاق پیدا نہ کر سکتے، لیکن (یہ) اللہ ہی (کا کام تھا کہ اس) نے ان میں باہم اتفاق پیدا کر دیا، بیشک وہ زبردست ہیں (کہ جو چاہیں اپنی قدرت سے کر دیں اور) حکمت والے ہیں (کہ جس طریق سے مناسب جانیں اس کام کو کر دیں)۔

لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا: یعنی اگر آپ دنیا بھر کا مال خرچ کرتے تب بھی ان کے دلوں میں اتفاق پیدا نہ کر سکتے، اس سے معلوم ہوا کہ دل میں کسی قابل تعریف صفت کا پیدا کرنا کسی انسان کے اختیار میں نہیں ہے۔ الا ماشاء اللہ۔ بلکہ یہ اللہ ہی کے اختیار میں ہے جیسے سخاوت، اتفاق وغیرہ پیدا کرنا۔

* * *

فائدہ: اسلام سے پہلے عرب میں جدال و قتال اور نفاق و شقاق کا بازار گرم تھا، ادنیٰ ادنیٰ باتوں پر قبائل آپس میں ٹکراتے رہتے تھے، دو

جماعتوں میں جب لڑائی شروع ہوجاتی تو صدیوں تک اس کی آگ ٹھنڈی نہ ہوتی تھی مدینہ کے دوز بردست قبیلوں اوس وخزرج کی حریفانہ نبرد آزمائی اور دیرینہ عداوت وبغض کا سلسلہ کسی طرح ختم نہ ہوتا تھا، ایک دوسرے کے خون کے پیاسے اور عزت وآبرو کے بھوکے تھے، ان حالات میں آقائے نامدار محمد رسول اللہ ﷺ توحید ومعرفت اور اتحاد واخوت کا عالمگیر پیغام لے کر مبعوث ہوئے، لوگوں نے انہیں بھی ایک فریق ٹھہرالیا اور سب نے مل کر خلاف وشقاق کا رخ ادھر پھیر دیا، پرانے کینے اور عداوتیں چھوڑ کر ہر قسم کی دشمنی کے لیے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ذات قدسی صفات کو مطمح نظر بنالیا، وہ آپ کی پند ونصیحت سے گھبراتے تھے اور آپ کے سایہ سے بھاگتے تھے، دنیا کی کوئی طاقت نہ تھی جو درندوں کی بھیڑ اور بہائم کے گلہ میں معرفت الٰہی اور حب نبوی کی روح پھونک کر اور شراب توحید کا متوالا بنا کر سب کو ایک دم اخوت والفت باہمی کی زنجیر میں جکڑ دیتی اور اس مقدس ہستی کا درہم ناخریدہ غلام اور عاشق جاں نثار بنا دیتی جس سے زیادہ چندروز پہلے ان کے نزدیک کوئی مبغوض ہستی نہ تھی بلاشبہ روئے زمین کے خزانے خرچ کر کے بھی یہ مقصد حاصل نہ کیا جاسکتا تھا جو اللہ کی رحمت واعانت سے ایسی سہولت کے ساتھ حاصل ہوگیا، خدا نے حقیقی بھائیوں سے زیادہ ایک کی الفت دوسرے کے دل میں ڈال دی، اور پھر سب کی الفتوں کا اجتماعی مرکز حضور انور کی ذات منبع البرکات کو بنا دیا، قلوب کو دفعۃً ایسا پلٹ دینا خدا کے زور قدرت کا کرشمہ ہے اور ایسی شدید ضرورت کے وقت سب کو محبت والفت کے ایک نقطہ پر جمع کر دینا اس کے کمال حکمت کی دلیل ہے۔

یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَ مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۶۴﴾ ع

اے نبی کافی ہے تجھ کو اللہ اور جتنے تیرے ساتھ ہیں مسلمان

خلاصہ تفسیر: (جب یہ معلوم ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی غیبی امداد اور مؤمنین سے ظاہری نصرت فرمائی ہے تو) اے نبی (ﷺ! اس سے ثابت ہوگیا کہ) آپ کے لئے (حقیقت میں) اللہ کافی ہے اور جن مؤمنین نے آپ کا اتباع کیا ہے (ظاہر میں) وہ کافی ہیں۔

* * *

فائدہ: اس کے دو معنی ہوسکتے ہیں: ① اکثر سلف کے نزدیک یہ مطلب ہے کہ اے پیغمبر! خدا تجھ کو اور تیرے ساتھیوں کو کافی ہے، یعنی قلت عدد اور بے سروسامانی سے گھبرانا نہیں چاہیے ② اور بعض علماء نے یہ معنی لیے ہیں کہ اے پیغمبر! تجھ کو فی الحقیقت اکیلا خدا کافی ہے اور ظاہری اسباب کے اعتبار سے مخلص مسلمانوں کی جماعت خواہ کتنی ہی تھوڑی ہو کافی ہے، پہلے جو فرمایا تھا: هُوَ الَّذِیْٓ اَیَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِیْنَ (الانفال: ۶۲) گویا یہ اسی کا خلاصہ ہوا۔

یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِیْنَ عَلَى الْقِتَالِ ؕ اِنْ یَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ یَغْلِبُوْا

اے نبی شوق دلا مسلمانوں کو لڑائی کا، اگر ہوں تم میں بیس شخص ثابت قدم رہنے والے تو غالب ہوں

مِائَتَیْنِ ۚ وَ اِنْ یَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ یَّغْلِبُوْٓا اَلْفًا مِّنَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا یَفْقَهُوْنَ ﴿۶۵﴾

دو سو پر، اور اگر ہوں تم میں سو شخص تو غالب ہوں ہزار کافروں پر اس واسطے کہ وہ لوگ سمجھ نہیں رکھتے

خلاصہ تفسیر: پیچھے صلح کے متعلق مضمون تھا، اب قتال کے متعلق ایک قانون بیان فرماتے ہیں۔

اے پیغمبر (ﷺ!) آپ مؤمنین کو جہاد کی ترغیب دیجئے (اور اس کے متعلق یہ قانون سنا دیجئے کہ) اگر تم میں کے بیس آدمی ثابت قدم رہنے والے ہوں گے تو (اپنے سے دس گنا عدد پر یعنی) دو سو پر غالب آجائیں گے اور (اسی طرح) اگر تم میں کے سو آدمی ہوں گے تو ہزار کفار پر غالب آجائیں گے اس وجہ سے کہ وہ ایسے لوگ ہیں جو (دین کو) کچھ نہیں سمجھتے (اور اس وجہ سے کفر پر جمے ہوئے ہیں اس لیے ان کو غیبی امداد نہیں پہنچتی تو وہ مغلوب ہوجاتے ہیں، پس تم پر واجب ہے کہ اپنے سے دس گنا کے مقابلہ سے بھی پیچھے نہ ہٹو)۔

اول یہ حکم نازل ہوا تھا، بعض سلف سے منقول ہے کہ غزوہ بدر کے بارے میں یہ حکم تھا، پھر جب صحابہ کرام پر شاق ہوا تو حضور ﷺ سے عرض کیا، پھر ایک مدت بعد دوسری آیت جس سے یہ حکم منسوخ ہو گیا نازل ہوئی، وہ اگلی آیت ہے۔

* * *

فائدہ: یہ مسلمانوں کو جہاد کی ترغیب دی کہ تھوڑے بھی ہوں تو جی نہ چھوڑیں، خدا کی رحمت سے دس گنے دشمنوں پر غالب آئیں گے ،سبب یہ ہے کہ مسلمان کی لڑائی محض خدا کے لیے ہے، وہ خدا کو اور اس کی مرضی کو پہچان کر اور یہ سمجھ کر میدان جنگ میں قدم رکھتا ہے کہ خدا کے راستہ میں مرنا اصلی زندگی ہے، اس کو یقین ہے کہ میری تمام قربانیوں کا ثمرہ آخرت میں ضرور ملنے والا ہے خواہ میں غالب ہوں یا مغلوب، اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے جو تکلیف میں اٹھاتا ہوں وہ فی الحقیقت مجھ کو دائمی خوشی اور ابدی مسرت سے ہمکنار کرنے والی ہے، مسلمان جب یہ سمجھ کر جنگ کرتا ہے تو تائید ایزدی مددگار ہوتی ہے اور موت سے وحشت نہیں رہتی، اسی لیے پوری دلیری اور بے جگری سے لڑتا ہے، کافر چونکہ اس حقیقت کو نہیں سمجھ سکتا، اس لیے محض حقیر اور فانی اغراض کے لیے بہائم کی طرح لڑتا ہے اور قوت قلبی اور امداد غیبی سے محروم رہتا ہے، بناء علیہ خبر اور بشارت کے رنگ میں حکم دیا گیا کہ مومنین کو اپنے سے دس گنے دشمنوں کے مقابلہ میں ثابت قدمی سے لڑنا چاہیے، اگر مسلمان بیس ہوں تو دو سو کے مقابلہ سے نہ ہٹیں اور سو ہوں تو ہزار کو پیٹھ نہ دکھلائیں۔

تنبیہ: بیس اور سو، دو عدد شاید اس لیے بیان فرمائے کہ اس وقت مسلمانوں کی تعداد کے لحاظ سے ''سریہ'' میں کم از کم بیس اور ''جیش'' میں ایک سو سپاہی ہوتے ہوں گے، اس لیے سریہ کم از کم ایک سو کا اور جیش ایک ہزار کا ہوگا، دونوں آیتوں میں بیان نسبت کے وقت اعداد کا یہ تفاوت ظاہر کرتا ہے کہ اگلی آیت کے نزول کے وقت مسلمانوں کی مردم شماری بڑھ گئی تھی۔

اَلْـٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا ۭ فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا

اب بوجھ ہلکا کر دیا اللہ نے تم پر سے اور جانا کہ تم میں سستی ہے، سو اگر ہوں تم میں سو شخص ثابت قدم رہنے والے تو غالب ہوں

مِائَتَيْنِ ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ اَلْفٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفَيْنِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۶۶﴾

دو سو پر، اور اگر ہوں تم میں ہزار تو غالب ہوں دو ہزار پر اللہ کے حکم سے، اور اللہ ساتھ ہے ثابت قدم رہنے والوں کے

خلاصہ تفسیر: (گذشتہ آیت میں جو حکم نازل ہوا جب وہ صحابہ کرام پر شاق ہوا تو پیغمبر ﷺ سے عرض کیا، ایک مدت کے بعد یہ دوسری آیت جس سے وہ پہلا حکم منسوخ ہو گیا نازل ہوئی یعنی) اب اللہ تعالیٰ نے تم پر تخفیف کر دی اور معلوم کر لیا کہ تم میں ہمت کی کمی ہے، سو (یہ حکم دیا جاتا ہے کہ) اگر تم میں کے سو آدمی ثابت قدم رہنے والے ہوں گے تو (اپنے سے دو گنا عدد پر یعنی) دو سو پر غالب آجائیں گے، اور (اسی طرح) اگر تم میں کے ہزار ہوں گے تو دو ہزار پر اللہ کے حکم سے غالب آجائیں گے، اور (ہم نے جو صابر کی قید لگائی تو اس لئے کہ) اللہ تعالیٰ صابرین (یعنی جو دل اور قدم سے ثابت رہیں ان) کے ساتھ ہیں (یعنی ان کی مدد کرتے ہیں)۔

وَعَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا: اس ضعف اور کمزوری کی وجہ احقر کے نزدیک یہ ہے کہ یہ طبعی قاعدہ ہے کہ جب کام کرنے والے کم ہوتے ہیں اور کام ضروری سمجھا جاتا ہے تو اس وقت ہمت زیادہ ہوتی ہے، ہر شخص یہ جانتا ہے کہ میرے ہی کرنے سے ہوگا، اور جب کام کرنے والے بڑھ جاتے ہیں تو ہر ایک کو یہ خیال ہوتا ہے کہ کیا مجھ ہی پر کام اٹکا ہوا ہے، اور لوگ بھی تو کرنے والے ہیں، سب مل کر کیوں نہیں کرتے، اس لیے سرگرمی اور جوش میں کمی ہو جاتی ہے، اس لیے شروع اسلام میں ہمت کی اور حالت تھی، جب ماشاء اللہ مردم شماری بڑھی تو طبیعت اور ہمت کا رنگ بدل گیا، یہ ایک طبعی امر ہے اس لیے صحابہ پر شبہ نہیں ہو سکتا کہ ان کی باطنی قوتیں تو روزانہ ترقی پر تھیں، پھر یہ تنزل کیسے ہو گیا؟ جواب یہ ہے کہ دینی قوتیں ترقی پر تھیں اور یہ کمی ایک طبعی قوت میں تھی۔

وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ اَلْفٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفَيْنِ بِاِذْنِ اللّٰهِ: یہاں اگرچہ الفاظ بظاہر خبر کے ہیں کہ ہزار مسلمان دو ہزار کافروں پر غالب

آجائیں گے، لیکن مقصود خبر دینا نہیں، بلکہ مقصد یہ حکم دینا ہے کہ سو مسلمانوں کو دو سو کافروں کے مقابلہ سے بھاگنا جائز نہیں، یعنی اپنے سے دگنوں کے مقابلہ میں جمنا واجب اور بھاگنا حرام ہے، پس یہ شبہ نہیں ہوسکتا کہ اگرچہ بعض اوقات ہم مسلمانوں کا غلبہ نہیں دیکھتے تو اس خبر کا غلط ہونا لازم آتا ہے؟ جواب ظاہر ہے کہ یہاں خبر مقصود ہی نہیں، بلکہ یہ تو ایک حکم ہے، دوسرے ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اگر یہ خبر بھی ہو تب بھی کسی وقت غلبہ نہ ہونے سے اس خبر کا جھوٹا ہونا لازم نہیں آتا، کیونکہ یہاں بِاِذْنِ اللّٰهِ یعنی اللہ کے حکم کی قید بھی تو ہے، پس اگر کبھی کسی حکمت سے خدا کا اذن ہی نہ ہو تو غلبہ بھی نہ ہوگا، تیسرے یہاں صبر کی بھی قید ہے، اور اکثر جب مسلمان مغلوب ہوتے ہیں تو صبر، استقلال اور توکل میں ضرور کمی ہوتی ہے، نیز خبر کا عنوان رکھنے میں بظاہر یہ مصلحت ہے کہ مسلمانوں کے دل اس خوشخبری سے مضبوط ہوجائیں کہ اللہ کا وعدہ ہماری حفاظت اور غلبہ کا ہے، اگر حکم کو بصیغہ امر قانون کی صورت میں پیش کیا جاتا تو فطری طور پر وہ بھاری معلوم ہوتا۔

* * *

فائدہ: بخاری میں ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ گذشتہ آیت جس میں مسلمانوں کو دس گنا کافروں کے مقابلہ پر ثابت قدم رہنے کا حکم تھا، جب لوگوں کو بھاری معلوم ہوئی تو اس کے بعد یہ آیت اتری: اَلْـٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ یعنی خدا نے تمہاری ایک قسم کی کمزوری اور سستی کو دیکھ کر پہلا حکم اٹھالیا، اب صرف اپنے سے دوگنی تعداد کے مقابلہ میں ثابت قدم رہنا ضروری اور بھاگنا حرام ہے۔

یہ کمزوری یا سستی جس کی وجہ سے حکم میں تخفیف ہوئی، کئی وجوہ سے ہوسکتی ہے، ابتدائے ہجرت میں گنے چنے مسلمان تھے جن کی قوت و جلادت معلوم تھی، کچھ مدت کے بعد ان میں سے بہت افراد بوڑھے اور کمزور ہوگئے اور جو نئی پود آئی ان میں پرانے مہاجرین و انصار جیسی بصیرت، استقامت اور تسلیم و تفویض نہ تھی، اور تعداد بڑھ جانے سے کسی درجہ میں اپنی کثرت پر نظر اور ''توکل علی اللہ'' میں قدرے کمی ہوئی ہوگی، اور ویسے بھی طبیعت انسانی کا خاصہ ہے کہ جو سخت کام تھوڑے آدمیوں پر پڑ جائے تو کرنے والوں میں جوش عمل زیادہ ہوتا ہے اور ہر شخص اپنی بساط سے بڑھ کر ہمت کرتا ہے لیکن وہی کام جب بڑے مجمع پر ڈال دیا جائے تو ہر ایک دوسرے کا منتظر رہتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ آخر کچھ میں ہی تنہا تو اس کا ذمہ دار نہیں، اسی قدر جوش، حرارت اور ہمت میں کمی ہوجاتی ہے، حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ: ''اول کے مسلمان یقین میں کامل تھے، ان پر حکم ہوا تھا کہ اپنے سے دس گنے کافروں پر جہاد کریں، پچھلے مسلمان ایک قدم کم تھے، تب یہی حکم ہوا کہ دوگنوں پر جہاد کریں، یہی حکم اب بھی باقی ہے، لیکن اگر دگنے سے زیادہ پر حملہ کریں تو بڑا اجر ہے، حضرت عمر کے وقت میں ہزار مسلمان اسی (۸۰) ہزار سے لڑے ہیں''، غزوہ موتہ میں تین ہزار مسلمان دو لاکھ کفار کے مقابلہ میں ڈٹے رہے، اس طرح کے واقعات سے اسلام کی تاریخ بحمد اللہ بھری پڑی ہے۔

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗٓ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ ۭ تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا ڰ

نبی کو نہیں چاہیے کہ اپنے ہاں رکھے قیدیوں کو جب تک خوب خونریزی نہ کرلے ملک میں، تم چاہتے ہو اسباب دنیا کا

وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۶۷﴾

اور اللہ کے ہاں چاہیے آخرت، اور اللہ زور آور ہے حکمت والا

خلاصہ تفسیر: پیچھے جہاد یعنی قتال کا حکم تھا، چونکہ اس میں کبھی کفار قید ہو کر بھی آتے ہیں اس لیے بدر کے قیدیوں کے ضمن میں اس کا حکم ہے، اور ان آیات کا سبب نزول یہ ہے کہ بدر میں ستر کافر پکڑے گئے تو حضور ﷺ نے صحابہ سے ان کے بارے میں مشورہ کیا، بعض نے رائے دی کہ ان کو قتل کردینا چاہیے، بعض نے کہا کہ ان سے کچھ مال لے کر چھوڑ دینا چاہیے، آپ ﷺ پر وحی نازل ہوئی کہ صحابہ سے فرمادیجیے کہ تم کو اختیار دیا جاتا ہے خواہ ان کو قتل کردو یا فدیہ لے کر چھوڑ دو، مگر اس صورت میں اگلے سال ستر آدمی تمہارے میں سے شہید ہوں گے، غرض اکثر صحابہ کی یہی رائے ہوئی کہ خیر ہم شہید ہوجائیں گے، اس وقت ان کو فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے، شاید یہ مسلمان ہوجائیں، آپ ﷺ نے بھی رحم دلی کی وجہ سے اس رائے کو

پسند فرمایا اور بعض کے سوا سب کو فدیہ لے کر چھوڑ دیا، چنانچہ ان قیدیوں میں سے بعض کو قتل کیے گئے جیسے عقبہ نضر اور طعمہ، باقی سب قیدیوں کو فدیہ لے کر چھوڑ دیا گیا، صرف حضرت ابوالعاص کو کہ وہ بھی اس وقت ان میں تھے صحابہ کی مرضی سے بغیر کچھ لیے چھوڑ دیا، اس کو اصطلاح شرع میں ''من'' کہتے ہیں ،الغرض اس واقعہ پر یہ آیتیں بطور عتاب نازل ہوئیں۔

(اے مسلمانو! تم نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جو ان قیدیوں سے کچھ لے کر چھوڑ دینے کا مشورہ دیا یہ بے جا تھا، کیونکہ) نبی کی شان کے لائق نہیں کہ ان کے قیدی باقی رہیں (بلکہ قتل کر دیئے جائیں) جب تک کہ وہ زمین میں اچھی طرح (کفار کی) خونریزی نہ کرلیں (کیونکہ جہاد کے مشروع ہونے کی اصلی غرض فساد دُور کرنا ہے اور کفار کی شان وشوکت کو توڑے بغیر فساد دُور کرنا ممکن نہیں، پس اس نوبت سے پہلے قیدیوں کا زندہ چھوڑ دینا آپ کی شان اصلاح کے مناسب نہیں ،البتہ جب ایسی قوت ہوجائے پھر قتل ضروری نہیں ، بلکہ اور صورتیں بھی مشروع ہیں ،پس ایسی نامناسب رائے تم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کیوں دی) تم تو دنیا کا مال واسباب چاہتے ہو (اس لئے فدیہ کی رائے دی) اور اللہ تعالیٰ آخرت (کی مصلحت) کو چاہتے ہیں (اور وہ اس میں ہے کہ کفار خوف سے مغلوب ہوجائیں جس میں آزادی سے اسلام کا نور وہدایت پھیلے اور بے روک ٹوک لوگ بکثرت مسلمان ہوں اور نجات پائیں) اور اللہ تعالیٰ بڑے زبردست بڑی حکمت والے ہیں (وہ تم کو کفار پر غالب کرتے اور فتوحات کی کثرت سے تم کو مالدار کر دیتے)۔

تُرِيدُونَ عَرَضَ الدُّنْيَا: یعنی تم لوگ دنیا کو چاہتے ہو، حالانکہ اللہ تعالیٰ تم سے یہ چاہتا ہے کہ تم آخرت کے طالب بنو، یہاں بطور عتاب کے ان کے صرف اس فعل کا ذکر کیا گیا جو وجہ ناراضی تھا، دوسرا سبب یعنی قیدیوں کے مسلمان ہوجانے کی امید اس کا یہاں ذکر نہیں فرمایا، جس میں اس طرف اشارہ ہے کہ صحابہ کرام جیسی پاکباز مخلص جماعت کے لئے ایسی مشترک نیت جس میں کچھ دین کا جز ہو کچھ اپنے دنیوی نفع کا، یہ بھی قابل قبول نہیں۔

صحابہ کی لغزش کی تحقیق اس واقعہ میں یہ ہے کہ صحابہ کی رائے کی بنیاد ایک دنیاوی مصلحت بھی تھی، یعنی مال لینا جس کا منشاء حب دنیا تھا، اور اس کا برا ہونا پہلے سے معلوم تھا، اور اگرچہ اس میں ایک دینی مصلحت بھی مل گئی تھی، یعنی قیدیوں کے اسلام لانے کا احتمال، اور صحابہ یہ سمجھے کہ جس معاملہ میں صرف دنیا کی خواہش ہی مطلوب ہو وہ تو برا ہے اور جس میں دینی اور دنیاوی دونوں مصلحتیں ہوں اس میں حرج نہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ دین میں دنیا مل جانے سے اخلاص اور ثواب فوت ہوجاتا ہے تو جس کام میں دین ودنیا دونوں ملے ہوئے ہوں وہ مجموعہ اچھا نہیں ہوتا، اس لیے ان پر عتاب ہوا۔

رہا یہ شبہ کہ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رائے میں ان کی موافقت کیوں کی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جو منشا صحابہ کے لیے مذموم اور برا تھا وہ آپ کے لیے پسندیدہ اور محمود تھا، کیونکہ صحابہ کا مقصود مال لینے سے اپنے آپ کو نفع پہنچانا تھا جو کہ حرص ہے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصود دوسروں کو یعنی صحابہ کو نفع پہنچانا تھا یہ مذموم اور برا نہیں بلکہ پسندیدہ تھا، کیونکہ یہ شفقت اور جود وکرم ہے، نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عمل خالص آپ کے رحمۃ للعالمین ہونے کا مظہر تھا کہ صحابہ میں اختلاف رائے ہونے کی صورت میں اس صورت کو اختیار فرمالیا جو قیدیوں کے حق میں سہولت وشفقت کی تھی، دوسری وجہ عتاب کی یہ ہے کہ صحابہ کو جو اختیار دیا گیا تھا کہ یا قیدیوں کو قتل کرو، یا فدیہ لے کر چھوڑ دو یہ حقیقت میں ان کا امتحان تھا، اختیار دینا منظور نہ تھا، کیونکہ اختیار دو جائز کاموں میں ہوا کرتا ہے، اور یہاں فدیہ لینے کی صورت ناجائز تھی، کیونکہ اس کا غالب منشا دنیا کی خواہش تھی، نیز اس صورت میں ستر صحابہ کا مارا جانا وحی سے بتلادیا گیا تھا لیکن صحابہ ظاہری الفاظ سے یہی سمجھے کہ ہمیں اختیار دیا گیا ہے، تامل سے کام نہ لیا، اگر تامل سے کام لیتے تو فدیہ لینے کی صورت میں جو فدیہ بتلایا گیا تھا اس سے کچھ سمجھ سکتے تھے کہ یہ صورت خدا کو پسندیدہ نہیں، پس اگرچہ ظاہر میں ہمیں دونوں صورتوں میں اختیار دیا گیا ہے مگر واقع میں امتحان مقصود ہے۔

حنفیہ کے نزدیک فدیہ لے کر قیدیوں کو چھوڑنا یا ویسے ہی بطور احسان کے چھوڑنا جس کو ''من'' کہتے ہیں دونوں جائز ہیں، مگر اس آیت کی وجہ سے نہیں، کیونکہ سورہ انفال کے بعد سورہ محمد نازل ہوئی ہے، اس میں ان دونوں کی اجازت ہے، پھر اس کے بعد سورہ براءت نازل ہوئی جس میں **فاقتلوا المشرکین** موجود ہے اس آیت نے من وفداء کو منسوخ کردیا، پس اب یا تو قتل کیا جائے یا غلام بنالیا جائے، یا ذمی اور رعایا بنا کر رکھا جائے، اور دوسرے ائمہ کے نزدیک نسخ نہیں ہوا بلکہ امام کو اختیار ہے۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ یہاں دو معاملے تھے: ① ایک مال غنیمت ② دوسرے قیدیوں کو فدیہ لے کر چھوڑنا، پہلے معاملے کے متعلق تو اس آیت نے بات صاف کردی مگر دوسرا معاملہ ابھی تک صاف نہیں ہوا، اس کے متعلق سورۃ محمد میں یہ آیت نازل ہوئی: فَإِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا فَضَرْبَ الرِّقَابِ حَتَّىٰ إِذَا أَثْخَنتُمُوهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ فَإِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَاءً حَتَّىٰ تَضَعَ الْحَرْبُ أَوْزَارَهَا (یعنی جب جنگ میں کافروں سے تمہارا مقابلہ ہو تو ان کی گردنیں مار دو یہاں تک کہ جب تم خوں ریزی کے ذریعہ ان کی قوت شوکت توڑ چکو تو پھر ان کو قید کر کے مضبوط باندھو، اس کے بعد یا تو ان پر احسان کر کے بغیر کسی معاوضہ کے آزاد کر دو یا فدیہ لے کر چھوڑ دو یہاں تک کہ جنگ اپنے ہتھیار ڈال دے) حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ غزوہ بدر میں قیدیوں کو فدیہ لے کر آزاد کرنے پر عتاب نازل ہوا، یہ اسلام کا پہلا جہاد تھا اس وقت تک کافروں کی قوت وشوکت ٹوٹ نہیں چکی تھی اتفاقاً ان پر ایک مصیبت پڑ گئی تھی پھر جب اسلام اور مسلمانوں کا مکمل غلبہ حاصل ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے وہ حکم منسوخ کرنے کے لئے سورۃ محمد کی آیت مذکورہ نازل فرمادی، جس میں نبی کریم اور مسلمانوں کو قیدیوں کے بارے میں چار اختیار دے دیئے گئے وہ یہ ہیں: ① چاہیں تو سب کو قتل کر دیں ② یا چاہیں تو غلام بنالیں ③ یا چاہیں تو فدیہ لے کر چھوڑ دیں ④ یا چاہیں تو بغیر فدیہ کے آزاد کر دیں، مذکورہ چار اختیارات میں سے پہلے دو پر تو پوری امت کا اتفاق اور اجماع ہے کہ امیر مسلمین کے لئے قیدیوں کو قتل کر دینے کا بھی اختیار ہے اور غلام بنالینے کا بھی، لیکن ان کو بلا معاوضہ چھوڑ دینے یا معاوضہ لے کر چھوڑ دینے میں فقہاء امت کا اختلاف ہے۔

امام مالک، شافعی، احمد بن حنبل، ثوری، اسحاق اور تابعین میں سے حضرت حسن بصری اور عطاء رحمہم اللہ کا قول یہ ہے کہ یہ دونوں صورتیں بھی امیر مسلمین کے لئے جائز ہیں کہ قیدیوں کو معاوضہ لے کر چھوڑ دے یا بلا معاوضہ آزاد کر دے یا مسلمان قیدیوں سے تبادلہ کرے۔

امام ابوحنیفہ، ابو یوسف، محمد، اوزاعی اور قتادہ اور ضحاک اور سدی اور ابن جریج رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ بلا معاوضہ چھوڑنا تو بالکل جائز نہیں، فدیہ لے کر چھوڑنا بھی امام ابوحنیفہ کے مشہور مذہب میں جائز نہیں، البتہ سیر کبیر کی روایت یہ ہے کہ اگر مسلمانوں کو مال کی ضرورت ہو تو فدیہ لے کر چھوڑ سکتے ہیں، البتہ مسلمان قیدیوں کے تبادلہ میں ان کو چھوڑ دینا امام ابوحنیفہ اور صاحبین کے نزدیک جائز ہے۔

جن حضرات نے فدیہ لے کر یا بلا فدیہ چھوڑ دینے کی اجازت دی ہے وہ حضرت ابن عباسؓ کے قول کے مطابق سورۃ محمد کی آیت کو انفال کی آیت کا ناسخ اور آیت انفال کو منسوخ قرار دیتے ہیں، فقہاء حنفیہ نے آیت سورۃ محمد کو منسوخ قرار دیا ہے اور سورۃ انفال کی آیت: فَشَرِّدْ بِهِم مَّنْ خَلْفَهُمْ اور آیت: فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدتُّمُوهُمْ کو اس کا ناسخ قرار دیا ہے، اس لئے قیدیوں کو آزاد کر دینا خواہ فدیہ لے کر ہو یا بلا فدیہ ان کے نزدیک جائز نہیں۔

لیکن اگر سورۃ انفال کی آیت کے الفاظ اور سورۃ محمد کے الفاظ میں غور کیا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں میں کوئی ناسخ ومنسوخ نہیں، بلکہ دو مختلف حالتوں کے دو حکم ہیں، سورۃ انفال کی آیت میں بھی اصل حکم اثخان فی الارض یعنی قتل کے ذریعہ کافروں کی قوت توڑ دینا اور سورۃ محمد کی آیت میں بھی جو من وفداء (یعنی قیدیوں کو بلا معاوضہ یا معاوضہ لے کر آزاد کرنے) کا اختیار دیا گیا ہے ان سے پہلے اثخان فی الارض کا بیان ہو چکا ہے، یعنی خون ریزی کے ذریعہ کفر کی قوت ٹوٹ جانے کے بعد یہ بھی اختیار ہے کہ قیدیوں کو فدیہ پر یا بلا فدیہ آزاد کر دیا جائے۔

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَن يَكُونَ لَهُ أَسْرَىٰ: جب اجتہادی خطا نبی معصوم ﷺ تک سے ممکن ہے تو پھر علماء ومشائخ کے بارے میں خطا نہ ہونے کا اعتقاد رکھنا کس قدر غلو، شدت اور بد اعتقادی ہوگا۔

* * *

فائدہ: بدر کی لڑائی سے ستر کافر مسلمانوں کے ہاتھ میں قید ہو کر آئے حق تعالیٰ نے ان کے متعلق دو صورتیں مسلمانوں کے سامنے پیش کیں، قتل کر دینا، یا فدیہ لے کر چھوڑ دینا اس شرط پر کہ آئندہ سال اسی تعداد میں تمہارے آدمی قتل کیے جائیں گے، حقیقت میں خدا کی طرف سے ان دو صورتوں کا انتخاب کے لیے پیش کرنا، امتحان وآزمائش کے طریقہ پر تھا کہ ظاہر ہو جائے کہ مسلمان اپنی رائے اور طبیعت سے کس طرف جھکتے ہیں، جیسے ازواج مطہرات کو دو صورتوں میں تخییر دی گئی تھی: إِن كُنتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَزِينَتَهَا فَتَعَالَيْنَ أُمَتِّعْكُنَّ وَأُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا

جَمِيْلًا (الاحزاب:۲۸) یا معراج میں آپ کے سامنے خمر ولبن (دودھ اور شراب) کے دو برتن پیش کیے گئے تھے، آپ ﷺ نے دودھ کو اختیار فرمایا، جبرائیل نے کہا کہ اگر بالفرض آپ شراب کو اختیار فرماتے تو آپ (ﷺ) کی امت بہک جاتی۔

بہر حال آپ نے صحابہ سے اس معاملہ میں رائے طلب کی، ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا کہ یا رسول اللہ یہ سب قیدی اپنے خویش واقارب اور بھائی بند ہیں، بہتر ہے کہ فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے اس نرم سلوک اور احسان کے بعد ممکن ہے کچھ لوگ مسلمان ہو کر وہ خود اور ان کی اولاد واتباع ہمارے دست و بازو بنیں اور جو مال بالفعل ہاتھ آئے اس سے جہاد وغیرہ دینی کاموں میں سہارا لگے، باقی آئندہ سال ہمارے ستر آدمی شہید ہو جائیں تو مضائقہ نہیں درجہ شہادت ملے گا، نبی کریم ﷺ کا میلان بھی فطری رحم دلی اور شفقت وصلہ رحمی کی بنا پر اسی رائے کی طرف تھا، بلکہ صحابہ کی عام رائے اسی جانب تھی، بہت سے تو ان ہی وجوہ کی بنا پر جو ابوبکر نے بیان فرمائیں اور بعض محض مالی فائدہ کو دیکھتے ہوئے اس رائے سے متفق تھے کما یظھر من قولہ: تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا (صرح بہ الحافظ ابن حجر و ابن القیم رحمھما اللہ) حضرت عمر اور سعد بن معاذ نے اس سے اختلاف کیا۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ یا رسول اللہ! یہ قیدی کفر کے امام اور مشرکین کے سردار ہیں ان کو ختم کر دیا جائے تو کفر وشرک کا سر ٹوٹ جائے گا، تمام مشرکین پر ہیبت طاری ہو جائے گی، آئندہ مسلمانوں کو ستانے اور خدا کے راستہ سے روکنے کا حوصلہ نہ رہے گا، اور خدا کے آگے مشرکین سے ہماری انتہائی نفرت وبغض اور کامل بیزاری کا اظہار ہو جائے گا کہ ہم نے خدا کے معاملہ میں اپنی قرابتوں اور مالی فوائد کی کچھ پروا نہیں کی اس لیے مناسب ہے کہ ان قیدیوں میں جو کوئی ہم میں سے کسی کا عزیز وقریب ہو، وہ اسے اپنے ہاتھ سے قتل کرے۔

الغرض بحث وتمحیص کے بعد حضرت ابوبکر کے مشورہ پر عمل ہوا، کیونکہ کثرت رائے ادھر تھی اور خود نبی کریم ﷺ طبعی رافت ورحمت کی بناء پر اسی طرف مائل تھے اور ویسے بھی اخلاقی اور کلی حیثیت سے عام حالات میں وہ ہی رائے قرین صواب معلوم ہوتی ہے لیکن اسلام اس وقت جن حالات میں سے گزر رہا تھا، ان پر نظر کرتے ہوئے وقتی مصالح کا تقاضا یہ تھا کہ کفار کے مقابلہ میں سخت کمر شکن کارروائی کی جائے، تیرہ سال کے ستم کشوں کو طاغوت کے پرستاروں پر یہ ثابت کر دینے کا پہلا موقع ملا تھا کہ تمہارے تعلقات قرابت اموال جتھے اور طاقتیں اب کوئی چیز تم کو خدا کی شمشیر انتقام سے پناہ نہیں دے سکتی ابتداء ایک مرتبہ ظالم مشرکین پر رعب وہیبت بٹھلا دینے کے بعد نرم خوئی اور صلہ رحمی کے استعمال کے لیے آئندہ بہتیرے مواقع باقی رہتے تھے، ادھر ستر مسلمانوں کے آئندہ قتل پر راضی ہو جانا معمولی بات نہ تھی، اسی لیے اس رائے کو اختیار فرمانا وقتی مصالح اور ہنگامی حیثیت سے حق تعالیٰ کے یہاں پسندیدہ نہ ہوا مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗٓ اَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْاَرْضِ میں اسی ناپسندیدگی کی طرف اشارہ ہے، صحابہ کی یہ ایک سخت خطرناک اجتہادی غلطی قرار دی گئی، اور جن بعض لوگوں نے زیادہ تر مالی فوائد پر نظر کر کے اس سے اتفاق کیا تھا ان کو صاف طور پر تریدون عرض الدنیا سے خطاب کیا گیا، یعنی تم دنیا کے فانی اسباب پر نظر کر رہے ہو، حالانکہ مومن کی نظر انجام پر ہونی چاہیے، خدا کی حکمت مقتضی ہو تو وہ تمہارا کام اپنے زور قدرت سے ظاہری سامان کے بدون بھی کر سکتا ہے، بہر حال فدیہ لے کر چھوڑ دینا اس وقت کے حالات کے اعتبار سے بڑی بھاری غلطی قرار دی گئی۔

اتنا یاد رکھنا چاہیے کہ روایات سے حضور ﷺ کی نسبت صرف اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ محض صلہ رحمی اور رحم دلی کی بناء پر آپ کا رجحان اس رائے کی طرف تھا، البتہ صحابہ میں بعض صرف مالی فوائد کو پیش نظر رکھ کر اور اکثر حضرات دوسری مصالح دینیہ اور اخلاقی داعیہ کے ساتھ مالی ضروریات کو بھی ملحوظ رکھتے ہوئے یہ رائے پیش کر رہے تھے، گویا صحابہ کے مشورہ میں کلاً یا جزءً مالی حیثیت ضرور زیر نظر تھی کسی درجہ میں مالی فوائد کے خیال سے "بغض فی اللہ" میں کوتاہی کرنا اور اصل مقصد "جہاد" سے غفلت برتنا اور ستر مسلمانوں کے قتل کیے جانے پر اپنے اختیار سے رضامند ہو جانا صحابہ جیسے مقربین کی شان عالی اور منصب جلیل کے منافی سمجھا گیا، اسی لیے ان آیات میں سخت عتاب آمیز لہجہ اختیار کیا گیا ہے، حدیث میں ہے کہ لڑائی میں ایک شخص کے سر پر زخم آیا، اسے غسل کی حاجت ہوئی، پانی سر پر استعمال کرنا سخت مہلک تھا، ساتھیوں سے مسئلہ پوچھا، انہوں نے کہا کہ پانی کی موجودگی میں ہم تیرے لیے کوئی گنجائش نہیں پاتے، اس نے غسل کر لیا اور فوت ہو گیا، حضور ﷺ کو جب اس واقعہ کی اطلاع ہوئی فرمایا: "قَتَلُوْهُ قَتَلَهُمُ اللّٰهُ" الحدیث، اس سے ظاہر ہوا کہ اجتہادی غلطی اگر زیادہ واضح اور خطرناک ہو تو اس پر عتاب ہو سکتا ہے، گویا یہ سمجھا جاتا ہے کہ مجتہد نے پوری قوت اجتہاد صرف کرنے میں کوتاہی کی۔

لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿٦٨﴾

اگر نہ ہوتی ایک بات جس کو لکھ چکا اللہ پہلے سے تو تم کو پہنچتا اس لینے میں بڑا عذاب

خلاصہ تفسیر: (اگر کسی حکمت کے سبب فتح یا مال غنیمت میں دیر ہوتی تو جو فعل تم سے واقع ہوا وہ ایسا ناپسندیدہ ہے کہ:) اگر اللہ تعالیٰ کا ایک نوشتہ مقدر نہ ہو چکتا (وہ یہ کہ ان قیدیوں میں بعض لوگ مسلمان ہو جائیں گے جس سے فساد کا اندیشہ واقع نہ ہوگا، اگر یہ نہ ہوتا) تو جو امر تم نے اختیار کیا ہے اس کے بارے میں تم پر کوئی بڑی سزا واقع ہوتی (لیکن چونکہ اتفاق سے تمہارا مشورہ صائب نکل آیا اور کوئی فساد نہ ہوا، اس لئے تم سزا سے بچ گئے، یعنی ہم نے اس فدیہ کو مباح کر دیا)۔

قصہ کا تتمہ یہ ہے کہ اس کے بعد بعض صحابہ نے حضور ﷺ کو روتے ہوئے دیکھا، پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ عذاب کے آثار قریب آگئے تھے، مگر اللہ تعالیٰ کا فضل ہوا کہ نازل نہیں ہوا، اور آپ ﷺ کا رونا انتہائی ہیبت کی وجہ سے تھا یا صحابہ کی محبت کی وجہ سے کہ ان کو نقصان پہنچتا، بعض روایات میں جو آیا ہے کہ اگر عذاب نازل ہوتا تو کوئی نہ بچتا تو اس سے مراد یہ ہے کہ صحابہ میں کوئی نہ بچتا، یہ مراد نہیں کہ میں بھی نہ بچتا، اہل بدر کا مغفور ہونا حدیث میں اس سے زیادہ صریح الفاظ میں آیا ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی یہ غلطی تو فی حد ذاتہ ایسی تھی کہ سخت سزا اُن لوگوں کو دی جاتی جنہوں نے دنیاوی سامان کا خیال کر کے ایسا مشورہ دیا مگر سزا دہی سے وہ چیز مانع ہے جو خدا پہلے سے لکھ چکا اور طے کر چکا ہے، اور وہ کئی باتیں ہو سکتی ہیں:

① مجتہد کو اس قسم کی اجتہادی خطاء پر عذاب نہیں ہوگا۔

② جب تک خدا امراً و نہیاً کسی چیز کا صاف حکم بیان نہ فرمائے اس وقت تک اس کے مرتکب کو عذاب نہیں دیتا۔

③ اہل بدر کی خطاؤں کو خدا معاف فرما چکا ہے۔

④ غلطی سے جو رویہ قبل از وقت اختیار کر لیا گیا یعنی فدیہ لے کر قیدیوں کو چھوڑ دینا خدا کے علم میں طے شدہ تھا کہ آئندہ اس کی اجازت ہو جائے گی: فاما منا بعد و اما فداء۔

⑤ یہ بھی طے شدہ ہے کہ جب تک پیغمبر ﷺ ان میں موجود ہیں یا لوگ صدق دل سے استغفار کرتے ہیں، عذاب نہ آئے گا۔

⑥ ان قیدیوں میں سے بہت کی قسمت میں اسلام لانا لکھا گیا تھا۔

الغرض اس قسم کے موانع اگر نہ ہوتے تو یہ غلطی اتنی عظیم و ثقیل تھی کہ سخت عذاب نازل ہو جانا چاہیے تھا، ایک روایت میں ہے کہ اس قولی تنبیہ کے بعد وہ عذاب جو اس طرح کی خوفناک غلطی پر آ سکتا تھا آپ کے سامنے نہایت قریب کر کے پیش کیا گیا، گویا یہ قولی تنبیہ کو زیادہ موثر بنانے کی ایک صورت تھی آپ ﷺ اس منظر کو دیکھ کر وقف گریہ و بکا ہو گئے، حضرت عمرؓ نے سبب پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ میرے سامنے ان کا عذاب پیش کیا گیا ہے، یعنی جس کا آنا ان پر ممکن تھا اگر موانع مذکورہ بالا نہ ہوتے، یاد رکھنا چاہیے کہ آپ کے سامنے یہ پیش کرنا اسی قسم کا تھا جیسے صلوٰۃ کسوف ادا کرتے وقت آپ کے سامنے جنت و دوزخ دیوار قبلہ میں متمثل کر دی گئی تھی، یعنی اس متوقع عذاب کا نظارا کرانا تھا اور بس۔

فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٦٩﴾

سو کھاؤ جو تم کو غنیمت میں ملا حلال ستھرا، اور ڈرتے رہو اللہ سے، بیشک اللہ ہے بخشنے والا مہربان

خلاصہ تفسیر: گذشتہ آیتوں میں عتاب کی وجہ سے صحابہ کرام کو اس فدیہ کے حلال و حرام ہونے کا شبہ ہو گیا تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی، چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں:

سو جو کچھ تم نے (ان سے فدیہ میں) لیا ہے اس کو حلال پاک سمجھ کر کھاؤ اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو (کہ آئندہ ہر طرح کی احتیاط رکھو)
بیشک اللہ تعالیٰ بڑے بخشنے والے بڑی رحمت والے ہیں (کہ تمہارا گناہ بھی معاف کر دیا یہ ''مغفرت'' ہے، اور فدیہ بھی حلال کر دیا یہ ''رحمت'' ہے)۔

* * *

فائدہ: پچھلے عتاب وتہدید سے مسلمان ڈر گئے کہ مال غنیمت کو جس میں فدیہ اساری بھی شامل ہے، اب ہاتھ نہیں لگانا چاہیے، اس آیت میں تسلی فرمادی کہ وہ اللہ کی عطاء ہے خوشی سے کھاؤ، ہاں جہاد کے سلسلہ میں مال غنیمت وغیرہ کو مطمح نظر بنانا یا اس قدر اہمیت دینا نہیں چاہیے کہ مقاصد عالیہ اور مصالح کلیہ سے اغماض ہونے لگے، بیشک وقتی حالات ومصالح کے اعتبار سے تم نے ایک غلط طریقہ کار اختیار کیا، مگر نفس مال میں کوئی خبث نہیں، خدا سے ڈرتے رہو گے تو وہ اپنی رحمت سے غلطیوں کو معاف فرمادے گا۔

يَاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّمَنْ فِيْٓ اَيْدِيْكُمْ مِّنَ الْاَسْرٰٓى ۙ اِنْ يَّعْلَمِ اللّٰهُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ خَيْرًا يُّؤْتِكُمْ خَيْرًا

اے نبی کہہ دے ان سے جو تمہارے ہاتھ میں ہیں قیدی اگر جانے گا اللہ تمہارے دلوں میں کچھ نیکی تو دے گا تم کو بہتر

مِّمَّآ اُخِذَ مِنْكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝70

اس سے جو تم سے چھن گیا اور تم کو بخشے گا، اور اللہ ہے بخشنے والا مہربان

خلاصہ تفسیر: (چونکہ بعض قیدی فدیہ دینے کے بعد مسلمان ہو گئے تھے جیسے حضرت عباسؓ وغیرہ اور انہوں نے فدیہ دینے کی وجہ سے آپ ﷺ سے اپنے مفلس ہو جانے کی شکایت کی تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی:) اے پیغمبر (ﷺ!) آپ کے قبضہ میں جو قیدی ہیں (ان میں جو مسلمان ہو گئے ہیں) آپ ان سے فرمادیجئے کہ اگر اللہ تعالیٰ کو تمہارے قلب میں ایمان معلوم ہوگا (یعنی تم دل سے مسلمان ہوئے ہوگے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا علم تو واقع کے مطابق ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ مسلمان اسی کو جانیں گے جو واقع میں مسلمان ہوگا اور جو شخص غیر مسلم ہوگا اس کو غیر مسلم ہی جانیں گے، پس اگر تم دل سے مسلمان ہو گے) تو جو کچھ تم سے (فدیہ میں) لیا گیا ہے (دنیا میں) اس سے بہتر تم کو دے دے گا اور (آخرت میں) تم کو بخش دے گا اور اللہ تعالیٰ بڑی مغفرت والے ہیں (اس لئے تم کو بخش دیں گے اور) بڑی رحمت والے ہیں (اس لئے تم کو نعم البدل دیں گے)۔

خَيْرًا يُّؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّآ اُخِذَ مِنْكُمْ: یعنی جو کچھ تم سے لیا گیا اس سے بہتر تم کو دے گا اور تم کو بخش دے گا، حضرت عباسؓ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ مجھے فدیہ میں بیس اوقیہ دینے پڑے تھے، ہر اوقیہ چالیس درہم کا ہوتا ہے، بیس اوقیہ تقریباً آٹھ سو درہم ہوئے، اور آج میرے پاس بیس غلام ہیں اور ہر ایک کے پاس بکثرت مال ہے، اور ایک بار ان کو رسول اللہ ﷺ نے اتنا مال دیا تھا جتنا یہ اٹھا سکے، اور فرماتے ہیں کہ اس دنیا میں پہلے وعدۂ الٰہی کا ظہور تو یوں نمایاں طور پر ہو گیا، دوسرے وعدہ یعنی مغفرت کا مجھے انتظار اور امید ہے۔

اِنْ يَّعْلَمِ اللّٰهُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ خَيْرًا يُّؤْتِكُمْ: اس میں اس پر دلالت ہے کہ طاعت سے دنیا وآخرت دونوں کی برکتیں حاصل ہوتی ہیں، خواہ مال کی صورت میں ہو یا باطنی احوال ومقامات کی صورت میں۔

وَاِنْ يُّرِيْدُوْا خِيَانَتَكَ فَقَدْ خَانُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ فَاَمْكَنَ مِنْهُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝71

اور اگر چاہیں گے تجھ سے دغا کرنی سو وہ دغا کر چکے ہیں اللہ سے اس سے پہلے پھر اس نے انکو پکڑوا دیا اور اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے

خلاصہ تفسیر: اور اگر (بالفرض) یہ لوگ (صدق دل سے مسلمان نہ ہوئے ہوں، بلکہ اسلام کے اظہار سے محض آپ کو دھوکا ہی دینا چاہیں اور دل میں) آپ کے ساتھ خیانت کرنے کا (یعنی عہد توڑ کر مخالفت ومقابلہ کا) ارادہ رکھتے ہوں تو (کچھ فکر نہ کیجئے، اللہ تعالیٰ ان کو پھر آپ کے ہاتھوں میں گرفتار کرا دے گا جیسا) اس سے پہلے انہوں نے اللہ کے ساتھ خیانت کی تھی (اور آپ کی مخالفت اور مقابلہ کیا) پھر اللہ نے ان کو (آپ

کے ہاتھوں میں) گرفتار کرادیا اور اللہ تعالیٰ خوب جاننے والے ہیں (کہ کون خائن ہے اور) بڑی حکمت والے ہیں (ایسی صورتیں پیدا کردیتا ہے جس سے خائن مغلوب ہوجائے)۔

وَاِنۡ يُّرِيۡدُوۡا خِيَانَتَكَ: اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ ان قیدیوں میں جو ایمان لائے ان کا ایمان مشکوک تھا یا۔نعوذ باللہ۔خدا تعالیٰ کو دونوں احتمال تھے، اصل یہ ہے کہ یہاں مشروط کلام کے ذریعہ خیانت پر ان کی گرفتاری کو مرتب کرنا ہے کہ یہ اس کے لوازم میں سے ہے تا کہ آپ ﷺ کو تسلی ہوجائے اور اخلاص کے شرط ہونے کی مزید تاکید ہوجائے، خلاصہ یہ کہ اگر یہ بالفرض خیانت کریں گے تو اللہ تعالیٰ کے قبضہ سے باہر کہاں چلے جائیں گے وہ پھر ان کو اسی طرح پکڑ لے گا۔

❋ ❋ ❋

فائدہ: لہ بعض قیدیوں نے اپنے اسلام کا اظہار کیا تھا (مثلاً حضرت عباسؓ وغیرہ) ان سے کہا گیا کہ اللہ دیکھے گا کہ واقعی تمہارے دل میں ایمان وتصدیق موجود ہے تو جو کچھ زر فدیہ اس وقت تم سے وصول کیا گیا ہے اس سے کہیں زیادہ اور کہیں بہتر تم کو مرحمت فرمائے گا، اور پچھلی خطاؤں سے درگزر کرے گا، اور اگر اظہار اسلام سے صرف پیغمبر کو فریب دینا مقصود ہے یا دغابازی کرنے کا ارادہ ہے تو پیشتر خدا سے جو دغابازی کرچکے ہیں، یعنی فطری عہد الست کے خلاف کفر وشرک اختیار کیا یا بعض بنی ہاشم جو ابوطالب کی زندگی میں عہد کر کے آنحضرت (ﷺ) کی حمایت پر متفق ہوئے تھے، اب کافروں کے ساتھ ہوکر آئے اس کا انجام آنکھوں سے دیکھ لیا کہ آج کس طرح مسلمانوں کی قید اور قابو میں ہیں، آئندہ بھی دغابازی کی ایسی ہی سزا مل سکتی ہے، خدا تعالیٰ سے اپنے دلوں اور نیتوں کو چھپا نہیں سکتے اور نہ اس کے حکیمانہ انتظامات کو روک سکتے ہیں، حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں: ''خدا کا وعدہ پورا ہوا، ان میں جو مسلمان ہوئے حق تعالیٰ نے بیشمار دولت بخشی، جو نہ ہوئے وہ خراب ہو کر تباہ ہو گئے''۔

اِنَّ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَهَاجَرُوۡا وَجٰهَدُوۡا بِاَمۡوَالِهِمۡ وَاَنۡفُسِهِمۡ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ وَالَّذِيۡنَ اٰوَوْا

جو لوگ ایمان لائے اور گھر چھوڑا اور لڑے اپنے مال اور جان سے اللہ کی راہ میں اور جن لوگوں نے جگہ دی

وَّنَصَرُوۡۤا اُولٰٓـئِكَ بَعۡضُهُمۡ اَوۡلِيَآءُ بَعۡضٍ‌ؕ وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَلَمۡ يُهَاجِرُوۡا

اور مدد کی وہ ایک دوسرے کے رفیق ہیں، اور جو ایمان لائے اور گھر نہیں چھوڑا

مَا لَـكُمۡ مِّنۡ وَّلَايَتِهِمۡ مِّنۡ شَىۡءٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوۡا‌ ۚ وَاِنِ اسۡتَـنۡصَرُوۡكُمۡ فِى الدِّيۡنِ فَعَلَيۡكُمُ

تم کو ان کی رفاقت سے کچھ کام نہیں جب تک وہ گھر نہ چھوڑ آئیں، اور اگر وہ تم سے مدد چاہیں دین میں تو تم کو لازم ہے

النَّصۡرُ اِلَّا عَلٰى قَوۡمٍۢ بَيۡنَكُمۡ وَبَيۡنَهُمۡ مِّيۡثَاقٌ‌ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِيۡرٌ ﴿۷۲﴾

ان کی مدد کرنی مگر مقابلہ میں ان لوگوں کے کہ ان میں اور تم میں عہد ہو، اور اللہ جو تم کرتے ہو اس کو دیکھتا ہے

خلاصہ تفسیر: پیچھے کفار کے ساتھ قتل وقتال، صلح ومصالحت کے احکام اور ان کو قید کرنے کا ذکر تھا، اور یہ تینوں مسلمانوں کے غلبہ اور شوکت کے وقت واقع ہوتے ہیں، لیکن بسا اوقات مسلمان مغلوب ہوتے ہیں، کیونکہ کفار کے ساتھ مقابلہ میں کبھی ایسے حالات بھی پیش آسکتے ہیں کہ نہ مسلمانوں کو ان کے مقابلہ میں قتال اور قید کی طاقت ہو اور نہ کفار صلح پر راضی ہوں، ایسی کمزوری کی حالت میں اسلام اور مسلمانوں کو ہجرت کی ضرورت واقع ہوتی ہے کہ اس شہر اور ملک کو چھوڑ کر کسی دوسری زمین میں جاکر قیام کریں جہاں اسلامی احکام پر آزادانہ عمل ہوسکے، چنانچہ اب آگے آخر سورت تک ہجرت کے بعض احکام کا بیان ہے، ان میں اصل مقصود ہجرت کے وہ احکام ہیں جن کا تعلق مہاجر مسلمانوں کی وراثت سے ہے، اس کے بالمقابل غیر مہاجر مسلمان اور غیر مسلموں کی وراثت کا بھی ذکر آیا ہے، ان احکام کا خلاصہ اور تقسیم آیت کے ترجمہ کے بعد ملاحظہ فرمایئے۔

بیشک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے ہجرت بھی کی اور اپنے مال اور جان سے اللہ کے راستہ میں جہاد بھی کیا (جہاد کا ذکر اس وجہ سے کیا کہ ہجرت کے بعد اس کا واقع ہونا عادتاً لازم ہے، اگرچہ حکم کا مدار میراث نہیں، اس جماعت کو ''مہاجرین'' کہتے ہیں) اور جن لوگوں نے (ان مہاجرین کو) رہنے کو جگہ دی اور (ان کی) مدد کی (اور اس جماعت کو ''انصار'' کہتے ہیں) یہ (دونوں قسم کے) لوگ باہم ایک دوسرے کے وارث ہوں گے، اور جو لوگ ایمان تو لائے اور ہجرت نہیں کی تمہارا (یعنی مہاجرین کا) ان سے میراث کا کوئی تعلق نہیں (نہ یہ ان کے وارث، نہ وہ ان کے) جب تک کہ وہ ہجرت نہ کریں (اور جب ہجرت کرلیں پھر وہ بھی اسی حکم میں داخل ہوجائیں گے) اور (اگرچہ ان سے تمہارا میراث کا تعلق نہ ہو، لیکن) اگر وہ تم سے دین کے کام (یعنی کفار کے ساتھ قتال) میں مدد چاہیں تو تمہارے ذمے (ان کی) مدد کرنا واجب ہے مگر اس قوم کے مقابلہ میں نہیں کہ تم میں اور ان میں باہم عہد (صلح کا) ہو، اور اللہ تعالیٰ تمہارے سب کاموں کو دیکھتے ہیں (پس ان کے مقررہ احکام میں خلل ڈال کر ناراضی کے مستحق نہ ہونا)۔

حاصل تقسیم اور احکام کا یہ ہے کہ جن لوگوں پر شرعی احکام عائد ہوتے ہیں دو حال سے خالی نہیں: یا مؤمن ہے یا کافر، کافر کا حکم یہ ہے کہ وہ باہم ایک دوسرے کے وارث ہوں گے، مسلمان ان کا وارث نہ ہوگا، نہ وہ مسلمان کے وارث ہوں گے، اور یہ حکم اب بھی باقی ہے۔

پھر مؤمن دو قسم کے ہیں: ① ایک مہاجر جنہوں نے فتح مکہ سے پہلے مدینہ کی طرف ہجرت کی، کیونکہ فتح مکہ کے بعد تو عرب دار الاسلام ہوگیا تھا، پھر سب جگہ رہنا برابر تھا ② دوسری قسم غیر مہاجر، مہاجر کا یہ حکم تھا کہ ان میں اور انصار میں جنہوں نے ان کو رکھا ٹھکانہ دیا اور خدمت وغیرہ کی، کیونکہ مہاجرین کے اکثر اعزہ اسلام سے اس وقت تک مشرف نہ ہوئے تھے تو مہاجرین وانصار میں اقارب کی طرح میراث جاری ہوتی تھی، اور اس حکم میں سب مہاجرین وانصار برابر تھے، خواہ مہاجرین سابقین ہوں، جنہوں نے حضور کے ہجرت کے زمانہ میں ہجرت کی تھی یا بعد والے ہوں، البتہ ان میں فضیلت کے اعتبار سے باہم فرق ہوگا، اور یہ حکم فتح مکہ کے بعد منسوخ ہوگیا، اور غیر مہاجر کا یہ حکم تھا کہ اس میں اور اس کے رشتہ دار میں باہم میراث نہ ہوتی تھی، اور یہ حکم بھی اب منسوخ ہے، اب دار الاسلام اور دار الحرب میں رہنے سے اہل اسلام کی میراث پر کوئی اثر نہیں ہوتا، اور وارث نہ ہونے کے باوجود اس غیر مہاجر کا یہ حکم بھی تھا کہ اگر وہ کفار کے مقابلہ میں مہاجر سے کسی مذہبی لڑائی میں امداد کا طالب ہو تو اس کی امداد واجب ہے، لیکن اگر ایسی قوم کے مقابلہ میں امداد کا طالب ہو جن سے مہاجرین کا عہد و پیمان ہے تو عہد باقی رہنے تک اس کو مدد نہ جائے، ہاں! اگر عہد توڑ دیا جائے تو پھر مدد جائز ہے، بلکہ اب بشرط قدرت وہ عہد توڑ دینا اور اپنے مسلمان بھائیوں کی مدد کرنا واجب ہے۔

* * *

فائدہ: قیدیوں میں بعض ایسے تھے جو دل سے مسلمان تھے، مگر حضرت ﷺ کے ساتھ مکہ سے ہجرت نہ کرسکے اور بادل نخواستہ کفار کے ساتھ ہو کر بدر میں آئے، ان آیات میں یہ بتلانا ہے کہ ایسے مسلمانوں کا حکم کیا ہے؟ حضرت شاہ صاحب ؒ لکھتے ہیں کہ حضرت کے اصحاب دو فرقے تھے ''مہاجرین'' اور ''انصار'' ① مہاجرین کنبہ اور گھر چھوڑنے والے اور ② انصار جگہ دینے والے اور مدد کرنے والے، ان دونوں میں آنحضرت ﷺ نے مواخاۃ (بھائی چارہ) قائم کردیا تھا، آیت کا مضمون یہ ہوا کہ جتنے مسلمان حضرت کے ساتھ حاضر ہیں ان سب کی صلح و جنگ ایک ہے، ایک کا موافق سب کا موافق، ایک کا مخالف سب کا مخالف، بلکہ آغاز ہجرت میں رشتہ مواخاۃ کے لحاظ سے ایک دوسرے کے ترکہ کا وارث بھی ہوتا تھا۔

اور جو مسلمان اپنے ملک میں رہے جہاں کافروں کا زور اور تسلط ہو، یعنی ''دار الحرب'' سے ہجرت نہ کی ان کی صلح و جنگ میں ''دار الاسلام'' کے رہنے والے مسلمان (مہاجرین وانصار) شریک نہیں، اگر دار الحرب کے مسلمانوں نے صلح و معاہدہ کسی جماعت کفار سے کرلیا تو دار الاسلام کے آزاد مسلمان اس معاہدہ کے پابند نہیں ہوسکتے، بلکہ ان سے حسب مصلحت جنگ کرسکتے ہیں، ہاں یہ ضرور ہے کہ دار الحرب کے مسلمان جس وقت دینی معاملہ میں آزاد مسلمانوں سے مدد طلب کریں تو ان کو اپنے مقدور کے موافق مدد کرنا چاہیے، مگر جس جماعت سے ان آزاد مسلمانوں کا معاہدہ ہوچکا اس کے مقابلہ میں تابقائے عہد دار الحرب کے مسلمانوں کی امداد نہیں کی جاسکتی، نیز توریث باہمی کا سلسلہ جو مہاجرین وانصار میں قائم کیا گیا تھا، اس میں بھی دار الحرب کے مسلمان شامل نہیں تھے۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ؕ اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِى الْاَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيْرٌ ﴿۷۳﴾

اور جو لوگ کافر ہیں وہ ایک دوسرے کے رفیق ہیں، اگر تم یوں نہ کرو گے تو فتنہ پھیلے گا ملک میں اور بڑی خرابی ہوگی

خلاصہ تفسیر: اور (جس طرح تم میں باہم میراث کا تعلق ہے اسی طرح) جو لوگ کافر ہیں وہ باہم ایک دوسرے کے وارث ہیں (نہ تم ان کے وارث، نہ وہ تمہارے وارث) اگر اس (مذکورہ حکم) پر عمل نہ کرو گے (بلکہ دین میں اختلاف کے باوجود محض قرابت کی وجہ سے مومن و کافر میں میراث کا تعلق قائم رکھو گے) تو دنیا میں بڑا فتنہ اور بڑا فساد پھیلے گا (کیونکہ میراث کے تعلق سے سب ایک جماعت سمجھی جائے گی اور کفار کی جماعت سے جدا ہوئے بغیر اسلام کو قوت و شوکت حاصل نہیں ہو سکتی اور اسلام کی کمزوری تمام تر فتنہ و فساد عالم کا سبب ہے جیسا کہ ظاہر ہے)۔

* * *

فائدہ: یعنی کافر و مسلم میں نہ حقیقی رفاقت ہے نہ ایک دوسرے کا وارث بن سکتا ہے، ہاں کافر، کافر کا رفیق و وارث ہے بلکہ سب کفار تم سے دشمنی کرنے کو آپس میں ایک ہیں، جہاں پائیں گے ضعیف مسلمانوں کو ستائیں گے، اس کے بالمقابل اگر مسلمان ایک دوسرے کے رفیق اور مددگار نہ ہوں گے یا کمزور مسلمان اپنے کو آزاد مسلمانوں کی معیت و رفاقت میں لانے کی کوشش نہ کریں گے تو سخت خرابی اور فتنہ برپا ہو جائے گا، یعنی ضعیف مسلمان مامون نہ رہ سکیں گے ان کا ایمان تک خطرہ میں ہوگا۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ هُمُ

اور جو لوگ ایمان لائے اور اپنے گھر چھوڑے اور لڑے اللہ کی راہ میں اور جن لوگوں نے ان کو جگہ دی اور ان کی مدد کی وہی ہیں

الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ؕ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ﴿۷۴﴾

سچے مسلمان، ان کے لیے بخشش ہے اور روزی عزت کی

خلاصہ تفسیر: اور (اس مہاجرین و انصار کے درمیان میراث جاری ہونے کا حکم میں اگرچہ سب مہاجرین کے لیے برابر ہے خواہ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہجرت کی ہو یا بعد میں، لیکن فضیلت و مرتبہ میں باہم مختلف ہیں، چنانچہ) جو لوگ (پہلے) مسلمان ہوئے اور انہوں نے (ہجرت نبویہ کے زمانہ میں) ہجرت کی اور (اول ہی سے) اللہ کی راہ میں جہاد کرتے رہے اور جن لوگوں نے (ان مہاجرین کو) اپنے یہاں ٹھہرایا اور ان کی مدد کی یہ لوگ (تو) ایمان کا پورا حق ادا کرنے والے ہیں (کیونکہ اس کا حق یہی ہے کہ اس کے قبول کرنے میں جلدی کرے) ان کے لئے (آخرت میں) بڑی مغفرت اور (جنت میں) بڑی معزز روزی (مقرر) ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی سردار کے ساتھ والے مسلمان اعلیٰ ہیں گھر بیٹھنے والوں سے، آخرت میں ان کے لیے بڑی بھاری بخشش ہے اور دنیا میں عزت کی روزی یعنی غنیمت اور دوسرے فائق حقوق۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا مَعَكُمْ فَاُولٰٓئِكَ مِنْكُمْ ؕ وَاُولُوا الْاَرْحَامِ

اور جو ایمان لائے اس کے بعد اور گھر چھوڑ آئے اور لڑے تمہارے ساتھ ہو کر سو وہ لوگ بھی تمہی میں ہیں، اور رشتہ دار

بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِىْ كِتٰبِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَىْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۷۵﴾ ع

آپس میں حق دار زیادہ ہیں ایک دوسرے کے اللہ کے حکم میں، تحقیق اللہ ہر چیز سے خبردار ہے۔

خلاصہ تفسیر: اور جو لوگ (ہجرت نبویہ کے) بعد کے زمانہ میں ایمان لائے اور ہجرت کی اور تمہارے ساتھ جہاد کیا (یعنی کام تو سب کئے مگر بعد میں) سو یہ لوگ (اگر چہ فضیلت میں تمہارے برابر نہیں لیکن تاہم) تمہارے ہی شمار میں ہیں (کیونکہ اعمال کے کم وبیش ہونے سے شرعی احکام میں فرق نہیں پڑتا، اس لیے ان کے ساتھ بھی میراث جاری ہوگی) اور (ان بعد والے مہاجرین میں) جو لوگ (آپس میں یا مہاجرین سابقین کے) رشتہ دار ہیں (اگر چہ یہ لوگ فضل ورتبہ میں کم ہوں لیکن میراث کے اعتبار سے) کتاب اللہ (یعنی حکم شرعی یا آیت میراث) میں ایک دوسرے (کی میراث) کے (بہ نسبت ان لوگوں کے جو قرابت کا رشتہ نہیں رکھتے) زیادہ حقدار ہیں (اگر چہ غیر رشتہ دار فضل ورتبہ میں زیادہ ہوں) بیشک اللہ تعالٰی ہر چیز کو خوب جانتے ہیں (اس لئے ہر وقت کی مصلحت کے مناسب حکم مقرر فرماتے ہیں)۔

وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ: سورۃ انفال کی اس آخری آیت کے آخری جملہ نے اسلامی وراثت کا وہ قانون منسوخ کر دیا جو اس سے پہلے آیات میں مذکور ہے جن کی رو سے مہاجرین وانصار میں باہمی وراثت جاری ہوتی تھی اگر چہ ان کے درمیان کوئی رشتہ داری نہ ہو، کیونکہ یہ حکم ایک ہنگامی حکم تھا جو اوائل ہجرت کے وقت دیا گیا تھا۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی مہاجرین میں جتنے بعد کو شامل ہوتے جائیں وہ سب باعتبار احکام ''مہاجرین اولین'' کی برادری میں منسلک ہیں ہجرت کے تقدم وتاخر کی وجہ سے صلح وجنگ یا توریث وغیرہ کے احکام پر کوئی اثر نہیں پڑتا، ہاں اگر قدیم مہاجرین کا کوئی رشتہ دار پیچھے مسلمان ہو یا بعد میں ہجرت کر کے آیا تو وہ اس قدیم مہاجر کی میراث کا زیادہ حق دار ہے اگر چہ رفاقت قدیم اوروں سے ہے۔

فائدہ: ۲؎ وہی جانتا ہے کہ کس کا کس قدر حق ہونا چاہیے لہذا اس کے احکام سراسر علم وحکمت پر مبنی ہیں۔

ایاتها ۱۲۹ • ۹ سُوْرَةُ التَّوْبَةِ مَدَنِيَّةٌ ۱۱۳ • رکوعاتها ۱۶

خلاصہ تفسیر: گذشتہ سورت میں زیادہ تر غزوہ بدر کے اور کچھ قریظہ کے واقعات مذکور تھے، اور اس سورت میں بھی چند غزوات اور چند واقعات مذکور ہیں اور یہ واقعات بھی غزوات کے حکم میں ہیں: ① قبائل عرب کے ساتھ عہد ٹوٹ جانے کا اعلان ② فتح مکہ ③ غزوہ حنین ④ حرم سے کفار کو نکال دینے کا حکم ⑤ غزوہ تبوک اور ان ہی آیتوں کے ضمن میں ہجرت کا واقعہ مذکور ہے، پس دونوں سورتوں میں مناسبت ظاہر ہے، سورۃ توبہ کی ابتدائی آیات کو پورے طور پر سمجھنے کے لئے چند واقعات کا جاننا ضروری ہے جن کے سبب سے یہ آیات نازل ہوئی ہیں اس لئے پہلے ان واقعات کی مختصر تفصیل لکھی جاتی ہے:

فائدہ اول: ان مذکورہ واقعات میں فتح مکہ سن ۸ ہجری میں واقع ہوا، غزوہ حنین بھی سن ۸ ھ میں ہوا، پھر غزوہ تبوک رجب سن ۹ ھ میں ہوا، پھر معاہدہ توڑنے کا اور کفار کو حرم سے نکال دینے کا اعلان ذی الحجہ سن ۹ ھ میں ہوا، اور آیات کے نازل ہونے کی ترتیب یہ ہے کہ پہلے فتح مکہ کے متعلق آیتیں فتح مکہ سے پہلے نازل ہوئیں، پھر غزوہ حنین کے متعلق آیتیں، حنین کے بعد پھر غزوہ تبوک کی ترغیب دینے والی آیتیں تبوک سے پہلے، پھر غزوہ تبوک سے پیچھے رہ جانے والوں پر ملامت کی آیتیں غزوہ تبوک کے بعد، پھر شروع کی آیتیں جن میں معاہدہ توڑنے کا اعلان ہے جو کہ شوال سن ۹ ھ میں نازل ہوئیں، اور یہ جو بعض روایات میں آیا ہے کہ یہ سورت پوری ایک دفعہ نازل ہوئی اس کا مطلب یہ ہے کہ زیادہ حصہ ایک دفعہ میں نازل ہوا۔

فائدہ دوم: معاہدہ اور نقض معاہدہ یعنی معاہدات ختم کر دینے کے متعلق جو مضامین ان آیات میں مذکور ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ ۶ ہجری میں رسول اللہ ﷺ نے عمرہ کا قصد فرمایا اور قریش مکہ نے آپ کو مکہ میں داخل نہ ہونے دیا اور مقام حدیبیہ میں ان سے صلح ہوئی، اس صلح کی مدت روح المعانی کی نقل کے مطابق دس سال تھی، مکہ میں قریش کے علاوہ دوسرے قبائل بھی تھے، معاہدہ صلح کی ایک دفعہ یہ بھی رکھی گئی کہ قریش کے علاوہ دوسرے قبائل میں جس کا جی چاہے وہ قریش کا حلیف اور ساتھی بن جائے اور جس کا جی چاہے وہ رسول اللہ ﷺ کا حلیف ہو کر آپ کے ساتھ ہو جائے، چنانچہ قبیلہ خزاعہ نے آنحضرت ﷺ کا حلیف بننا پسند کیا اور آپ کے ساتھ ہو گئے، اور قبیلہ بنی بکر نے قریش کے ساتھ ہونا اختیار کر لیا، اس معاہدہ کی رو

سے یہ لازمی تھا کہ دس سال کے اندر نہ باہمی جنگ ہوگی نہ کسی جنگ کرنے والے کو کسی جانب سے کوئی مدد دی جائے گی اور جو قبیلہ کسی فریق کا حلیف ہے وہ بھی اسی کے حکم میں سمجھا جائے گا کہ اس پر حملہ کرنا یا حملہ آور کو مدد دینا معاہدہ کی خلاف ورزی سمجھا جائے گا۔

یہ معاہدہ ٦ ہجری میں ہوا، ٧ ہجری میں معاہدہ کے مطابق رسول اللہ کریم ﷺ مع صحابہ کرام کے فوت شدہ عمرہ کی قضاء کرنے کے لئے مکہ معظمہ تشریف لے گئے اور تین روز قیام کر کے حسب معاہدہ واپس تشریف لے آئے، اس وقت تک کسی فریق کی طرف سے معاہدہ صلح کی کوئی خلاف ورزی نہ تھی، اس کے بعد پانچ چھ ماہ گزرے تھے کہ قبیلہ بنی بکر نے قبیلہ خزاعہ پر رات کے وقت اچانک حملہ کر دیا اور قریش نے بھی یہ سمجھ کر کہ رسول کریم ﷺ بہت دور ہیں، آپ کو کیا خبر ہوگی، پھر رات کے وقت کون دیکھتا ہے اس حملہ میں بنی بکر کو ہتھیاروں اور اپنے جوانوں سے امداد دی، ان واقعات اور حالات کے مطابق جن کو بالآخر قریش نے بھی تسلیم کر لیا وہ معاہدہ صلح ٹوٹ گیا جو حدیبیہ میں دس سال کے التواء جنگ کا ہوا تھا، قبیلہ خزاعہ جو رسول اللہ ﷺ کے حلیف تھے انہوں نے اس واقعہ کی اطلاع آپ کو دے دی، آنحضرت ﷺ نے قریش کی عہد شکنی کی خبر پا کر قریش کے خلاف جنگ کی خفیہ تیاری شروع کر دی، چنانچہ لشکر کی تیاری کر کے سن ٨ ہجری میں ان پر چڑھائی کی اور مکہ فتح کر لیا، اور قریش کے بہت سے سردار اس میں مسلمان بھی ہو گئے۔

پس جن جماعتوں کا سورت کے شروع میں ذکر ہے وہ چار طرح کی ہیں: ① ان میں سے ایک جماعت یہی قریش ہیں جنہوں نے خود عہد توڑا ② دوسری جماعت بنی کنانہ کے دو قبیلے بنی ضمرہ اور بنی مدلج تھے جن سے صلح کا معاہدہ کسی خاص میعاد کے لئے کیا گیا اور وہ اس معاہدہ پر قائم رہے، ان سے ایک مدت کے لئے صلح ہوئی تھی اور سورۃ براءت نازل ہونے کے وقت بقول خازن ان کی میعاد صلح کے نو مہینے باقی تھے ③ تیسری جماعت عام قبائل عرب کے کچھ ایسے لوگ بھی تھے جن سے صلح کا معاہدہ مدت کی تعیین کے بغیر ہوا تھا ④ چوتھی جماعت وہ لوگ تھے جن سے کسی قسم کا معاہدہ نہ تھا، چنانچہ سورۃ براءت کے شروع میں ان چاروں قسم کی غیر مسلم جماعتوں کے الگ الگ احکام نازل ہوئے۔

قریش یعنی پہلی جماعت کا حکم فتح مکہ سے پہلے یہ فرمایا کہ جب تک یہ عہد پر قائم رہیں تم بھی قائم رہو، جب یہ عہد توڑ دیں تم بھی لڑائی کرو، سورت کے دوسرے اور تیسرے رکوع میں انہی کا ذکر ہے، اور سورہ براءت نازل ہونے کے بعد چونکہ انہوں نے خود عہد توڑ دیا تھا اس لیے وہ کسی مہلت کے مستحق نہیں رہے تھے اور اس کا تقاضہ یہ تھا کہ ان سے فوراً اعلان جنگ کر دیا جاتا، لیکن وہ زمانہ اشہر حرم کا تھا جن میں یا تو لڑائی حرام تھی یا اس مصلحت کی بنا پر جو تفسیر میں آگے مذکور ہے لڑائی سے منع کیا گیا، اور یہ حکم فرمایا کہ حرمت کے مہینے گزر جائیں تو ان سے لڑنے کی اجازت ہے، چنانچہ آگے آیت: **فاذا انسلخ الاشهر الحرم** میں یہی مضمون ہے، جس کا حاصل یہ تھا کہ ان لوگوں نے عہد شکنی کر کے اپنا کوئی حق باقی نہیں چھوڑا مگر اشہر حرم کا احترام بہر حال ضروری ہے اس لئے اشہر حرم ختم ہوتے ہی یا وہ جزیرۃ العرب سے نکل جائیں یا مسلمان ہو جائیں ورنہ ان سے جنگ کی جائے۔

دوسری جماعت جن سے کسی خاص میعاد کے لئے معاہدہ صلح کیا گیا اور وہ اس پر قائم رہے، انہوں نے عہد کو نہیں توڑا اس لیے ان کی مدت پوری کر دو، سورۃ توبہ کی چوتھی آیت میں انہی کا ذکر ہے: **إِلَّا الَّذِينَ عَاهَدتُّم مِّنَ الْمُشْرِكِينَ ثُمَّ لَمْ يَنقُصُوكُمْ شَيْئًا** الخ، یعنی وہ مشرک لوگ جن سے تم نے معاہدہ صلح کر لیا پھر انہوں نے معاہدہ پر قائم رہنے میں کوئی کمی نہیں کی اور نہ تمہارے مقابلہ میں تمہارے کسی دشمن کی مدد کی تو تم ان کے معاہدہ کو اس کی مدت تک پورا کر دو، یہ حکم بنو ضمرہ اور بنو مدلج کا تھا جس کی رو سے ان کو نو مہینے کی مہلت مل گئی۔

تیسری اور چوتھی دونوں جماعتوں کا ایک ہی حکم ہے کہ اعلان کے وقت سے چار ماہ کی مہلت ہے، جہاں چاہیں چلے جائیں، پھر اس کے بعد قتل کے مستحق ہوں گے، سورۃ توبہ کی پہلی اور دوسری آیت میں انہی کا ذکر ہے: **بَرَاءَةٌ مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ إِلَى الَّذِينَ عَاهَدتُّم مِّنَ الْمُشْرِكِينَ فَسِيحُوا فِي الْأَرْضِ** الخ، یعنی اعلان دست برداری اللہ تعالیٰ کی طرف سے اور اس کے رسول کی طرف سے ہے ان مشرکین کے لئے جن سے تم نے معاہدہ کیا تھا سو تم لوگ اس سرزمین میں چار مہینے چل پھر لو اور یہ جان رکھو کہ تم اللہ تعالیٰ کو عاجز نہیں کر سکتے اور یہ کہ بیشک اللہ تعالیٰ کافروں کو رسوا کریں گے، یہاں یہ واضح رہے کہ دوسری جماعت کا حکم بھی نو ماہ گزرنے کے بعد اسی تیسری چوتھی جماعت کا سا ہو جائے گا کہ ان کے لیے امان ختم ہو جائے گا۔

غرض پہلی دوسری آیتوں کی رو سے ان سب لوگوں کو جن سے مدت کی تعیین کے بغیر کوئی معاہدہ تھا یا جن کے ساتھ کوئی معاہدہ نہ تھا چار مہینے کی مہلت مل گئی، اور چوتھی آیت کی رو سے ان لوگوں کو معاہدہ کے اختتام تک مہلت مل گئی جن کے ساتھ کسی خاص میعاد کا معاہدہ تھا، اور پانچویں آیت سے

مشرکین مکہ کو اشہر حرم ختم ہونے تک مہلت مل گئی۔

یہ سب احکامات اس بات کا سامان ہیں کہ سال بھر کے اندر یہ ارض مقدس ومطہر کفار سے پاک ہوجائے، چنانچہ ان احکام کا نفاذ اور مہلت کا شروع اس وقت سے تجویز ہوا جبکہ ان احکام کا اعلان تمام عرب میں ہوجائے، اس اعلان عام کے لئے یہ انتظام کیا گیا کہ ۹ ہجری کے ایام حج میں منیٰ و عرفات کے عام اجتماعات میں اس کا اعلان کیا جائے جس کا ذکر سورۃ توبہ کی تیسری آیت میں اس طرح آیا: وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖۤ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِیْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ وَرَسُوْلُهٗ ، یعنی اعلان عام ہے عام لوگوں کے سامنے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے بڑے حج کی تاریخوں میں اس بات کا کہ اللہ اور اس کا رسول دونوں دست بردار ہوتے ہیں ان مشرکین سے پھر اگر تم توبہ کرلو تو تمہارے لئے بہتر ہے، اور اگر تم نے اعراض کیا تو یہ سمجھ رکھو کہ تم خدا کو عاجز نہیں کرسکو گے اور ان کافروں کو ایک دردناک عذاب کی خبر سنا دیجئے۔

چنانچہ اس حکم ربانی کی تعمیل کے لئے رسول کریم ﷺ نے ۹ ہجری کے حج میں حضرت صدیق اکبرؓ اور علی مرتضیٰؓ کو مکہ مکرمہ بھیج کر میدان عرفات اور منیٰ میں جہاں تمام قبائل عرب کا اجتماع تھا یہ اعلان کرادیا اور یہ بھی ظاہر تھا کہ اس عظیم الشان مجمع کی معرفت پورے عرب میں اس حکم کا مشتہر ہوجانا لازمی تھا، پھر احتیاطاً حضرت علیؓ کی معرفت یمن میں بطور خاص اس کا اعلان کرادیا، اس اعلان عام کے بعد صورت حال یہ ہوگئی کہ پہلی جماعت یعنی قریش اور مشرکین مکہ کو اشہر حرم کے خاتمہ یعنی محرم ۱۰ ہجری کے ختم تک، اور دوسری جماعت کو رمضان ۱۰ ہجری تک اور تیسری چوتھی جماعتوں کو ربیع الثانی ۱۰ ہجری تک حدود سے خارج ہوجانا چاہئے اور جو اس کی خلاف ورزی کرے وہ مستحق قتال ہے، اس طرح اگلے سال کے زمانہ حج تک کوئی کافر داخل حدود نہ رہنے پائے گا جس کا ذکر سورۃ توبہ کی اٹھائیسویں آیت میں آئے گا جس میں ارشاد ہے: فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا ، یعنی یہ لوگ اس سال کے بعد مسجد حرام کے پاس نہ جاسکیں گے، اور حدیث میں رسول کریم ﷺ کے ارشاد: "لا يحجن بعد العام مشرك" کا یہی مطلب ہے۔

چونکہ تجارت زیادہ تر انہی لوگوں کے ہاتھ میں تھی جنہیں نکالا گیا اس لیے سورت میں آگے آیت: وان خفتم عيلة سے مسلمانوں کے تردد کو دور کیا گیا، پس اگلے سال یعنی ذی الحجہ ۱۰ ھ میں جناب رسول اللہ بنفس نفیس حج کو تشریف لے گئے اور کسی مخالف کا شور وغل باقی نہ رہا، اور یہی معنی ہیں ان روایات کے کہ ان آیات والوں سے قتال نہیں ہوا، کیونکہ جن کو مسلمان نہ ہونا تھا وہ چلے گئے، اور یہ بھی آیا ہے کہ آپ نے اس کے بعد کسی مشرک سے معاہدہ نہیں کیا، بلکہ جزیرہ عرب سے کفار کو خارج کرنے کا آپ نے عزم فرمالیا، لیکن چونکہ قریب ہی زمانہ یعنی ربیع الاول ۱۱ ھ میں آپ نے وفات فرمائی اس وجہ سے یہ عزم پورا نہیں ہوا، مگر صحابہ کرام نے آپ ﷺ کی وصیت پر اس کی تکمیل کردی۔

فائدہ سوم: اس سورت کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ مصاحف قرآن میں اس سورت کے شروع میں بسم اللہ نہیں لکھی جاتی اس کے سوا تمام قرآنی سورتوں کے شروع میں بسم اللہ لکھی جاتی ہے، اس کی وجہ معلوم کرنے سے پہلے یہ جان لینا چاہئے کہ قرآن مجید تیئس سال کے عرصہ میں تھوڑا تھوڑا نازل ہوا ہے ایک ہی سورت کی آیتیں مختلف اوقات میں نازل ہوئیں، جبریل امین جب وحی لے کر آتے تو ساتھ ہی بحکم الٰہی یہ بھی بتلاتے تھے کہ یہ آیت فلاں سورت میں فلاں آیت کے بعد رکھی جائے، اسی کے مطابق رسول کریم ﷺ کاتبین وحی کو ہدایت فرما کر لکھوا دیتے تھے، اور جب ایک سورت ختم ہو کر دوسری سورت شروع ہوتی تھی تو سورت شروع ہونے سے پہلے بسم اللہ الرحمن الرحیم نازل ہوتی تھی جس سے یہ سمجھ لیا جاتا تھا کہ پہلی سورت ختم ہوگئی اب دوسری سورت شروع ہو رہی ہے، قرآن مجید کی تمام سورتوں میں ایسا ہی ہوا، سورۃ توبہ نزول کے اعتبار سے بالکل آخری سورتوں میں سے ہے، اس کے شروع میں عام دستور کے مطابق نہ بسم اللہ نازل ہوئی اور نہ رسول کریم ﷺ نے کاتب وحی کو اس کی ہدایت فرمائی، اسی حال میں رسول کریم ﷺ کی وفات ہوگئی۔

جامع قرآن حضرت عثمان غنیؓ نے اپنی خلافت کے عہد میں جب قرآن مجید کو کتابی صورت میں ترتیب دیا تو سب سورتوں کے خلاف سورۃ توبہ کے شروع میں بسم اللہ نہ تھی اس لئے یہ شبہ ہوگیا کہ شاید یہ کوئی مستقل سورت نہ ہو بلکہ کسی دوسری سورت کا جز ہو، اب اس کی فکر ہوئی کہ اگر یہ کسی دوسری سورت کا جز ہو تا وہ کونسی سورت ہوسکتی ہے، مضامین کے اعتبار سے سورۃ انفال اس کے مناسب معلوم ہوئی، اور حضرت عثمانؓ سے ایک روایت میں یہ بھی منقول ہے کہ آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں ان دونوں سورتوں کو "قرینتین" یعنی ملی ہوئی کہا جاتا تھا، اس لئے سورۃ انفال کے بعد اس کو رکھ دیا

گیا یہ احتیاط تو اس لئے کی گئی کہ دوسری سورت کا جز ہو تو اس کے ساتھ رہنا چاہئے مگر احتمال یہ بھی تھا کہ علیحدہ مستقل سورت ہو اس لئے لکھنے میں یہ سورت اختیار کی گئی کہ سورۃ انفال کے ختم پر سورۃ توبہ کے شروع سے پہلے کچھ جگہ خالی چھوڑ دی گئی جیسے عام سورتوں میں بسم اللہ کی جگہ ہوتی ہے۔

سورۃ براءت یا توبہ کے شروع میں بسم اللہ نہ لکھے جانے کی یہ تحقیق خود جامع قرآن حضرت عثمانؓ سے ابوداؤد، نسائی، مسند امام احمد، ترمذی میں مفسر القرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے ایک سوال کے جواب میں منقول ہے، اس سوال میں حضرت ابن عباسؓ نے حضرت عثمان غنیؓ سے یہ بھی استفسار کیا تھا کہ قرآن کی سورتوں کی جو ترتیب قائم کی گئی ہے کہ سب سے پہلے بڑی سورتیں رکھی گئیں جن میں سو آیتوں سے زیادہ ہوں جن کو اصطلاح میں ''مِئین'' کہا جاتا ہے اس کے بعد وہ بڑی سورتیں رکھی گئی ہیں جن میں سو سے کم آیات ہیں جن کو ''مثانی'' کہا جاتا ہے، اس کے بعد چھوٹی سورتیں رکھی گئی ہیں جن کو ''مفصلات'' کہا جاتا ہے، اس ترتیب کا بھی تقاضا یہ ہے کہ سورۃ توبہ کو سورۃ انفال سے پہلے رکھا جائے، کیونکہ سورۃ توبہ کی آیتیں سو سے زائد اور انفال کی سو سے کم ہیں، شروع کی سات طویل سورتیں جن کو ''سبع طوال'' کہا جاتا ہے اس میں بھی بجائے انفال کے سورۃ توبہ ہی زیادہ مناسب ہے، اس کے خلاف کرنے میں کیا مصلحت ہے، حضرت عثمان غنیؓ نے فرمایا کہ یہ سب باتیں صحیح ہیں، لیکن قرآن کے معاملہ میں احتیاط کا مقتضی وہی ہے جو اختیار کیا گیا، کیونکہ اگر سورۃ توبہ مستقل سورت نہ ہو بلکہ سورۃ انفال کا جز ہو تو یہ ظاہر ہے کہ سورۃ انفال کی آیات پہلے نازل ہوئی ہیں اور توبہ کی اس کے بعد، اس لئے ان کو انفال کی آیات پر مقدم کرنا بغیر وحی کے جائز نہیں اور وحی میں ہمیں کوئی ایسی ہدایت نہیں ملی اس لئے انفال کو مقدم اور توبہ کو موخر کیا گیا۔

فائدہ چہارم: اس تحقیق سے یہ معلوم ہو گیا کہ سورۃ توبہ کے شروع میں بسم اللہ نہ لکھنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کا احتمال ہے کہ سورۃ توبہ علیحدہ سورت نہ ہو بلکہ انفال کا جز ہو اس احتمال پر یہاں بسم اللہ لکھنا ایسا نادرست ہوگا جیسے کوئی شخص کسی سورت کے درمیان بسم اللہ لکھ دے، اسی بنا پر حضرات فقہاء نے فرمایا ہے کہ جو شخص اوپر سے سورۃ انفال کی تلاوت کرتا آیا ہو اور سورۃ توبہ شروع کر رہا ہو وہ بسم اللہ نہ پڑھے، لیکن جو شخص اسی سورت کے شروع یا درمیان سے اپنی تلاوت شروع کر رہا ہے اس کو چاہئے کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھ کر شروع کرے، بعض ناواقف یہ سمجھتے ہیں کہ سورۃ توبہ کی تلاوت میں کسی حال بسم اللہ پڑھنا جائز نہیں یہ غلط ہے اور اس پر دوسری غلطی یہ ہے کہ بجائے بسم اللہ کے یہ لوگ اس کے شروع میں ''اعوذ باللہ من النار'' پڑھتے ہیں جس کا کوئی ثبوت آنحضرت ﷺ اور صحابہ کرام سے نہیں ہے، اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے جو بروایت ابن عباسؓ یہ منقول ہے کہ سورۃ براءت کے شروع میں بسم اللہ نہ لکھنے کی وجہ یہ ہے کہ بسم اللہ الرحمن الرحیم امان ہے اور سورۃ براءت میں کفار کے امان اور عہد و پیمان کو ختم کیا گیا ہے، سو یہ ایک نکتہ اور لطیفہ ہے جو اصلی سبب کے منافی نہیں، یعنی اصلی سبب تو یہی ہے کہ سورۃ انفال اور توبہ کے ایک ہونے کے احتمال کی بنا پر بسم اللہ نہیں لکھی گئی پھر اس نہ لکھے جانے کا ایک لطیفہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس سورت میں کفار سے براءت اور رفع امان مذکور ہے جو بسم اللہ کے مناسب نہیں اس لئے تکوینی طور پر یہاں ایسے اسباب پیدا کر دیئے گئے کہ بسم اللہ یہاں نہ لکھی جائے۔

* * *

فائدہ: سورۃ انفال اوائل ہجرت میں اور یہ سورۃ براءۃ اواخر ہجرت میں نازل ہوئی، آنحضرت ﷺ کی عادت یہ تھی کہ جو آیات قرآنی نازل ہوتیں، فرما دیتے کہ ان کو فلاں سورت میں فلاں موقع پر رکھو، ان آیات کے متعلق (جنہیں اب سورۃ ''توبہ'' یا ''براءۃ'' کہا جاتا ہے) آپ نے کوئی تصریح نہیں فرمائی کہ کس سورت میں درج کی جائیں، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مستقل سورت ہے، کسی دوسری سورت کا جز نہیں، لیکن عام قاعدہ یہ تھا کہ جب نئی سورت نازل ہوتی تو پہلی سورت سے جدا کرنے کے لیے **بسم اللہ** آتی تھی، سورۃ توبہ کے شروع میں **بسم اللہ** نہ آئی، جو مشعر ہے کہ یہ جداگانہ سورت نہیں، ان وجوہ پر نظر کر کے مصاحف عثمانیہ میں اس کے شروع میں **بسم اللہ** نہیں لکھی گئی، لیکن کتابت میں اس کے اور انفال کے درمیان فصل کر دیا گیا کہ نہ پوری طرح اس کا استقلال ظاہر ہو اور نہ دوسری سورت کا جز ہونا۔

باقی ''انفال'' کے بعد متصل رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ مضامین باہم اس قدر مرتبط و متسق واقع ہوئے ہیں کہ گویا ''براءۃ'' کو ''انفال'' کا تتمہ اور تکملہ کہا جاسکتا ہے، سورۃ انفال تمام تر غزوہ بدر اور اس کے متعلقات پر مشتمل ہے، یوم بدر کو قرآن نے ''یوم الفرقان'' کہا، کیونکہ اس نے حق و باطل، اسلام و کفر اور موحدین و مشرکین کی پوزیشن کو بالکل جدا جدا کر کے دکھلا دیا، بدر کا معرکہ فی الحقیقت خالص اسلام کی عالمگیر اور طاقتور برادری کی تعمیر کا سنگ بنیاد

اورحکومت الٰہی کی تاسیس کا دیباچہ تھا وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ (الانفال:۷۳) کے مقابلہ میں جس خالص اسلامی برادری کے قیام کی طرف انفال کے خاتمہ پر تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْاَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيْرٌ (الانفال:۷۳) کہہ کر توجہ دلائی ہے اس کا صریح اقتضاء ہے کہ اس عالمگیر برادری کا کوئی طاقتور اور زبردست مرکز حسی طور پر دنیا میں قائم ہو، جو ظاہر ہے کہ جزیرۃ العرب کے سوا نہیں ہوسکتا جس کا صدر مقام مکہ معظمہ ہے۔

''انفال'' کے اخیر میں یہ بھی جتلا دیا گیا تھا کہ جو مسلمان مکہ وغیرہ سے ہجرت کر کے نہیں آئے اور کافروں کے زیر سایہ زندگی بسر کر رہے ہیں، دارالاسلام کے آزاد مسلمانوں پر ان کی ولایت و رفاقت کی کوئی ذمہ داری نہیں مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا (الانفال:۷۲) ہاں حسب استطاعت ان کے لیے دینی مدد بہم پہنچانی چاہیے، اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مرکز اسلام میں موالاۃ واخوت اسلامی کی کڑیوں کو پوری مضبوطی کے ساتھ جوڑنے کے لیے دو باتوں میں سے ایک ہونی چاہیے: ① یا تمام عرب کے مسلمان ترک وطن کر کے مدینہ آ جائیں اور اسلامی برادری میں بے روک ٹوک شامل ہوں اور ② یا آزاد مسلمان مجاہدانہ قربانیوں سے کفر کی قوت کو توڑ کر جزیرۃ العرب کی سطح ایسی ہموار کر دیں کہ کسی مسلمان کو ہجرت کی ضرورت ہی باقی نہ رہے، یعنی تقریباً سارا جزیرۃ العرب خالص اسلامی برادری کا ایسا ٹھوس مرکز اور غیر مخلوط مستقر بن جائے جس کے دامن سے عالمگیر اسلامی برادری کا نہایت محکم اور شاندار مستقبل وابستہ ہو سکے، یہ دوسری صورت ہی ایسی تھی جس سے روز روز کے فتنہ فساد کی بیخ کنی ہوسکتی تھی، اور مرکز اسلام کفار کے اندرونی فتنوں سے بالکل پاک وصاف اور آئے دن کی بدعہدیوں اور ستم رانیوں سے پورا مامون ومطمئن ہو کر تمام دنیا کو اپنی عالمگیر برادری میں داخل ہونے کی دعوت دے سکتا تھا، اسی اعلیٰ اور پاک مقصد کے لیے مسلمانوں نے ۲ ہجری میں پہلا قدم میدان بدر کی طرف اٹھایا تھا، جو آخر کار ۸ ہجری میں مکہ معظمہ کی فتح عظیم پر منتہی ہوا جو فتنے اشاعت یا حفاظت اسلام کی راہ میں مزاحم ہوتے رہتے تھے فتح مکہ نے ان کی جڑوں پر تیشہ لگایا، لیکن ضرورت تھی کہ وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ (الانفال:۳۹) کے امتثال میں اسلامی برادری کے مرکز اور حکومت الٰہیہ کے مستقر (جزیرۃ العرب) کو فتنہ کے جرائم سے بالکلیہ صاف کر دیا جائے، تاکہ وہاں سے تمام دنیا کو اسلامی دیانت اور حقیقی تہذیب کی دعوت دیتے وقت تقریباً سارا جزیرۃ العرب یک جان و یک زبان ہو اور کوئی اندرونی کمزوری یا خلفشار بیرونی مزاحمتوں کے ساتھ مل کر اس مقدس مشن کو نقصان نہ پہنچا سکے، پس جزیرۃ العرب کو ہر قسم کی کمزوریوں اور فتنوں سے پاک کرنے اور عالمگیر دعوت اسلامی کے بلندترین مقام پر کھڑا کرنے کے لیے لازم ہوا کہ دعوت اسلام کا مرکز خالص اسلامیت کے رنگ میں رنگین ہو، اس کے قلب وجگر سے صدائے حق کے سوا کوئی دوسری آواز نکل کر دنیا کے کانوں میں نہ پہنچے، پورا جزیرہ سارے جہان کا معلم اور ہادی بنے اور ایمان وکفر کی کشمکش کا ہمیشہ کے لیے یہاں سے خاتمہ ہو جائے، سورۃ براءۃ کے مضامین کا یہی حاصل ہے، چنانچہ چندروز میں خدا کی رحمت اور سچائی کی طاقت سے مرکز اسلام ہر طرح کے وسائس کفر وشرک سے پاک ہو گیا اور سارا عرب متحد ہو کر شخص واحد کی طرح تمام عالم میں نور ہدایت اور عالمگیر اسلامی اخوت پھیلانے کا کفیل وضامن بنا، فللہ الحمد علی ذلك۔

الغرض سورۃ انفال میں جس چیز کی ابتداء تھی سورۃ توبہ (براءۃ) میں اس کی انتہاء ہے، اسی لیے ''اول بآخر نسبتے دارد'' کے موافق ''براءۃ'' کو ''انفال'' کے ساتھ بطور تکملہ ملحق کر دیا گیا، اور بھی مناسبات ہیں جن کو علماء نے تفاسیر میں بیان کیا ہے۔

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ① فَسِيْحُوْا فِي الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ

صاف جواب ہے اللہ کی طرف سے اور اس کے رسول کی، ان مشرکوں کو جن سے تمہارا عہد ہوا تھا، سو پھر لو اس ملک میں چار

اَشْهُرٍ وَّاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ مُخْزِي الْكٰفِرِيْنَ ②

مہینے اور جان لو کہ تم نہ تھکا سکو گے اللہ کو، اور یہ کہ اللہ رسوا کرنے والا ہے کافروں کو۔

خلاصہ تفسیر: اللہ کی طرف سے اور اس کے رسول کی طرف سے ان مشرکین (کے عہد) سے دست برداری ہے جن سے تم نے (مدت کی تعیین کے بغیر) عہد کر رکھا تھا (یہ تیسری جماعت کا حکم ہے، ان جماعتوں کی تفصیل آگے آ رہی ہے اور چوتھی جماعت یعنی جن سے کچھ بھی عہد نہ

تھا ان کا حکم بھی اس سے بدرجہ اولیٰ سمجھ میں آ گیا کہ جب معاہدین سے امان ختم کر دیا تو غیر معاہدین میں تو کوئی امن کا احتمال پہلے سے بھی نہیں ہے)۔

سو (ان دونوں جماعتوں کو اطلاع کر دو کہ) تم لوگ اس سرزمین میں چار مہینے چل پھر لو (اجازت ہے تاکہ اپنا موقع اور پناہ ڈھونڈھ لو) اور (اس کے ساتھ) یہ (بھی) جان رکھو کہ (اس مہلت کی بدولت صرف مسلمانوں کی دست برد سے بچ سکتے ہو لیکن) تم اللہ تعالیٰ کو عاجز نہیں کر سکتے (کہ اس کے قبضہ سے نکل سکو) اور یہ (بھی جان رکھو) کہ بیشک اللہ تعالیٰ (آخرت میں) کافروں کو رسوا کریں گے (یعنی عذاب دیں گے، تمہاری چلت پھرت اس سے نہیں بچا سکتی اور قتل کا احتمال دنیا میں الگ رہا، گویا اس میں توبہ کی ترغیب ہے)۔

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖۤ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ: مکہ پر مسلمانوں کا مکمل قبضہ ہو گیا مکہ اور اطراف مکہ میں رہنے والے غیر مسلموں کو جان و مال کا امان دے دیا گیا، لیکن اس وقت ان غیر مسلموں کے مختلف احوال کے اعتبار سے مختلف جماعتیں تھیں:

① ایک قسم تو وہ لوگ تھے جن سے حدیبیہ میں صلح کا معاہدہ ہوا یعنی قریش، انہوں نے خود اس کو توڑ دیا اور وہی فتح مکہ کا سبب ہوا۔

② دوسرے کچھ ایسے لوگ بھی تھے جن سے صلح کا معاہدہ کسی خاص میعاد کے لئے کیا گیا اور وہ اس معاہدہ پر قائم رہے، جیسے بنی کنانہ کے دو قبیلے بنی ضمرہ اور بنی مدلج جن سے ایک مدت کے لئے صلح ہوئی تھی اور سورۃ براءت نازل ہونے کے وقت ان کی میعاد صلح کے نو مہینے باقی تھے۔

③ تیسرے کچھ ایسے لوگ بھی تھے جن سے صلح کا معاہدہ مدت کی تعیین کے بغیر ہوا تھا۔

④ چوتھے وہ لوگ تھے جن سے کسی قسم کا معاہدہ نہ تھا۔

تیسری اور چوتھی دونوں جماعتوں کا ایک ہی حکم آیا جو سورۃ توبہ کی اس پہلی اور دوسری آیت میں مذکور ہے، یعنی اعلان دست برداری اللہ تعالیٰ کی طرف سے اور اس کے رسول کی طرف سے ہے ان مشرکین کے لئے جن سے تم نے معاہدہ کیا تھا، سو تم لوگ اس سرزمین میں چار مہینے چل پھر لو، اور یہ جان رکھو کہ تم اللہ تعالیٰ کو عاجز نہیں کر سکتے اور یہ کہ بیشک اللہ تعالیٰ کافروں کو رسوا کریں گے، غرض پہلی دوسری آیتوں کی رو سے ان سب لوگوں کو جن سے بلا تعیین مدت کوئی معاہدہ تھا یا جن کے ساتھ کوئی معاہدہ نہ تھا چار مہینے کی مہلت مل گئی۔

* * * *

فائدہ: ۶ھ ہجری میں بمقام "حدیبیہ" جب نبی کریم ﷺ اور قریش کے درمیان معاہدہ صلح ہو چکا تو بنی خزاعہ مسلمانوں کے اور بنی بکر قریش کے حلیف بنے، بنی بکر نے معاہدہ کی پرواہ نہ کر کے خزاعہ پر حملہ کر دیا اور قریش نے اسلحہ وغیرہ سے ظالم حملہ آوروں کی مدد کی، اس طرح قریش اور ان کے حلیف دونوں معاہدہ حدیبیہ پر قائم نہ رہے جس کے جواب میں ۸ ہجری میں نبی کریم ﷺ نے اچانک حملہ کر کے مکہ معظمہ بڑی آسانی سے فتح کر لیا، ان قبائل کے سوا دوسرے قبائل عرب سے مسلمانوں کا میعادی یا غیر میعادی معاہدہ تھا، جن میں سے بعض اپنے معاہدہ پر قائم رہے، بہت سے قبائل وہ تھے جن سے کسی قسم کا معاہدہ نہیں ہوا تھا، اس سورت کی مختلف آیات قبائل کے متعلق نازل ہوئیں ہیں، شروع کی آیات میں غالباً ان مشرکین کا ذکر ہے جن سے معاہدہ تھا مگر میعادی نہ تھا، ان کو اطلاع کر دی گئی کہ ہم آئندہ معاہدہ رکھنا نہیں چاہتے، چار ماہ کی مہلت تم کو دی جاتی ہے کہ اس مدت کے اندر اسلامی برادری میں شامل ہو جاؤ یا وطن چھوڑ کر مرکز ایمان و توحید کو اپنے وجود سے خالی کر دو اور یا جنگی مقابلہ کے لیے تیار ہو جاؤ، لیکن یہ خوب سمجھ لینا کہ تم خدا کی مشیت کو روک نہیں سکتے، اگر اسلام نہ لائے وہ تم کو دنیا و آخرت میں رسوا کرنے والا ہے، تم اپنی تدبیروں اور حیلہ بازیوں سے اسے عاجز نہ کر سکو گے، باقی جن قبائل سے کوئی معاہدہ ہی نہ تھا، ممکن ہے انہیں بھی چار ماہ کی مہلت دی گئی ہو، یہ اور اس کے بعد کی آیتوں کا اعلان عام ۹ ہجری میں حج کے موقع پر تمام قبائل عرب کے سامنے حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے کیا۔

وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖۤ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِيْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ

اور سنا دینا ہے اللہ کی طرف سے اور اس کے رسول کی لوگوں کو دن بڑے حج کے ۱؎ کہ اللہ الگ ہے مشرکوں سے

وَرَسُوْلُهٗ ؕ فَاِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِى اللّٰهِ ؕ

اور اس کا رسول، سو اگر تم توبہ کرو تو تمہارے لیے بہتر ہے، اور اگر نہ مانو تو جان لو کہ تم ہرگز نہ تھکا سکو گے اللہ کو

وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۙ﴿۳﴾

اور خوشخبری سنادے کافروں کو عذاب دردناک کی ۲؎

خلاصہ تفسیر: اور (پہلی دوسری جماعت کا حکم یہ ہے کہ) اللہ اور رسول کی طرف سے بڑے حج کی تاریخوں میں عام لوگوں کے سامنے اعلان کیا جاتا ہے کہ اللہ اور اس کا رسول دونوں (بغیر کسی میعاد مقرر کیے ابھی) دست بردار ہوتے ہیں ان مشرکین (کو امن دینے) سے (جنہوں نے خود عہد توڑا، مراد پہلی جماعت ہے مگر) پھر (بھی ان سے کہا جاتا ہے کہ) اگر تم (کفر سے) توبہ کرلو تو تمہارے لئے (دونوں جہان میں) بہتر ہے (دنیا میں تو اس لئے کہ تمہاری عہد شکنی معاف ہوجائے گی اور قتل سے بچ جاؤ گے اور آخرت میں ظاہر ہے کہ نجات ہوگی) اور اگر تم نے (اسلام سے) اعراض کیا تو یہ سمجھ رکھو کہ تم خدا کو عاجز نہیں کرسکو گے (کہ کہیں نکل کر بھاگ جاؤ) اور (خدا کو عاجز نہ کرسکنے کی تفسیر ہے کہ) ان کافروں کو ایک دردناک سزا کی خبر سنادیجئے (جو آخرت میں واقع ہوگی، یہ تو یقینی ہے اور دنیا کی سزا کا احتمال الگ، مطلب یہ ہوا کہ اگر اعراض کرو گے تو سزا بھگتو گے)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ حج کو اکبر اس لیے کہا کہ ''عمرہ'' حج اصغر ہے اور یوم الحج الاکبر سے دسویں تاریخ ''عیدالاضحیٰ'' کا دن، یا نویں تاریخ ''عرفہ'' کا دن مراد ہے۔

فائدہ: ۲؎ یہ اعلان غالباً ان قبائل کے حق میں تھا جنہوں نے میعادی معاہدہ کیا، پھر خود ہی عہد شکنی کی (مثلاً بنی بکر یا قریش وغیرہم) یعنی ایسے لوگوں سے کوئی معاہدہ اب باقی نہیں رہا، اگر یہ سب لوگ شرک و کفر سے توبہ کرلیں تو ان کی دنیا و آخرت دونوں سنور جائیں گی، نہیں تو خدا کا جو کچھ ارادہ ہے (تطہیر جزیرۃ العرب کا) وہ پورا ہو کر رہے گا، کوئی طاقت اور تدبیر اسے مغلوب نہیں کرسکتی اور کافروں کو کفر بدعہدی کی سزا مل کر رہے گی۔

تنبیہ: ان قبائل کی عہد شکنی اگرچہ فتح مکہ ۸ ہجری سے پہلے ہوچکی تھی، بلکہ اسی کے جواب میں مکہ فتح کیا گیا، تاہم ۹ ہجری کے حج کے موقع پر اس کا بھی اعلان عام کرایا گیا تاکہ واضح ہوجائے کہ اس قسم کے جتنے لوگ ہیں ان سے کسی قسم کا معاہدہ باقی نہیں رہا۔

اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْـًٔا وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا

مگر جن مشرکوں سے تم نے عہد کیا تھا پھر انہوں نے کچھ قصور نہ کیا تمہارے ساتھ اور مدد نہ کی تمہارے مقابلہ میں کسی کی

فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۴﴾

سو ان سے پورا کردو ان کا عہد ان کے وعدہ تک، بیشک اللہ کو پسند ہیں احتیاط والے

خلاصہ تفسیر: ہاں! مگر وہ مشرکین (اس امان کے ختم کرنے و دست برداری سے) مستثنیٰ ہیں جن سے تم نے عہد لیا، پھر انہوں نے (عہد پورا کرنے میں) تمہارے ساتھ ذرا کمی نہیں کی اور نہ تمہارے مقابلہ میں (تمہارے) کسی (دشمن) کی مدد کی (اس سے دوسری جماعت مراد ہے) سو ان کے معاہدہ کو ان کی مدت (مقررہ) تک پورا کردو (اور بدعہدی نہ کرو، کیونکہ) واقعی اللہ تعالیٰ (بدعہدی سے) احتیاط رکھنے والوں کو پسند کرتے ہیں (پس تم احتیاط رکھو گے تو تم بھی پسندیدۂ حق ہوجاؤ گے)۔

اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ: دوسری جماعت جن سے کسی خاص میعاد کے لئے معاہدہ صلح کیا گیا اور وہ اس پر قائم رہے، ان کا

حکم سورۃ توبہ کی اس چوتھی آیت میں آیا، یعنی وہ مشرک لوگ جن سے تم نے معاہدہ صلح کرلیا، پھرانہوں نے معاہدہ پر قائم رہنے میں کوئی کمی نہیں کی اور نہ تمہارے مقابلہ میں تمہارے کسی دشمن کی مدد کی توتم ان کے معاہدہ کواس کی مدت تک پورا کردو، کیونکہ اللہ تعالیٰ احتیاط رکھنے والوں کو پسند کرتے ہیں، یہ حکم بنوضمرہ اور بنومدلج کا تھا جس کی رو سے ان کو نو مہینے کی مہلت مل گئی۔

****

فائدہ: یہ استثناء ان قبائل کیلئے ہے جن کا معاہدہ میعادی تھا، پھر وہ اس پر برابر قائم رہے، کچھ کوتاہی ایفائے عہد میں نہیں کی، نہ بذات خود کوئی کارروائی خلاف عہد کی اور نہ دوسرے بدعہدوں کو مدد پہنچائی (مثلاً بنی ضمرہ و بنی مدلج) ان کے متعلق اعلان کردیا گیا کہ میعاد معاہدہ منقضی ہونے تک مسلمان بھی برابر معاہدہ کا احترام کریں گے، میعاد ختم ہونے کے بعد کوئی جدید معاہدہ نہیں، اس وقت ان کیلئے بھی وہ ہی راستہ ہے جو اوروں کیلئے تھا۔

فَإِذَا انسَلَخَ الْأَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدتُّمُوهُمْ وَخُذُوهُمْ

پھر جب گزر جائیں مہینے پناہ کے تو مارو مشرکوں کو جہاں پاؤ اور پکڑو

وَاحْصُرُوهُمْ وَاقْعُدُوا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ۚ فَإِن تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ

اور گھیرو اور بیٹھو ہر جگہ ان کی تاک میں، پھر اگر وہ توبہ کریں اور قائم رکھیں نماز اور دیا کریں زکوۃ

فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٥﴾

تو چھوڑ دو ان کا راستہ، بیشک اللہ ہے بخشنے والا مہربان

خلاصہ تفسیر: (اب پہلی جماعت کے حکم کا تتمہ ہے کہ جب ان کو کوئی مہلت نہیں تو اگرچہ ان سے ابھی قتال کی گنجائش ہوسکتی تھی، لیکن ابھی محرم کے ختم تک اشہر حرم یعنی حرمت کے مہینے مانع قتال ہیں) سو (ان کے گزرنے کا انتظار کرلو اور) جب اشہر حرم گزر جائیں تو (اس وقت) ان مشرکین (پہلی جماعت) کو جہاں پاؤ مارو پکڑو باندھو اور داؤ گھات کے موقعوں میں ان کی تاک میں بیٹھو (یعنی لڑائی میں جو جو ہوتا ہے سب کی اجازت ہے) پھر اگر (کفر سے) توبہ کرلیں اور (اسلام کے کام کرنے لگیں یعنی مثلاً) نماز پڑھنے لگیں، زکوۃ دینے لگیں تو ان کا رستہ چھوڑ دو (یعنی قتل و قید مت کرو کیونکہ) واقعی اللہ تعالیٰ بڑی مغفرت کرنے والے بڑی رحمت کرنے والے ہیں (اس واسطے ایسے شخص کا کفر بخش دیا اور اس کی جان بچالی اور یہی حکم بقیہ جماعتوں کا بھی ہوگا ان کی میعادیں گزرنے کے بعد)۔

فَإِذَا انسَلَخَ الْأَشْهُرُ الْحُرُمُ: پہلی جماعت جو قریش مکہ کی تھی جنہوں نے میثاق حدیبیہ کو خود توڑ دیا تھا، اب یہ کسی مزید مہلت کے مستحق نہ تھے، مگر چونکہ یہ زمانہ اشہر حرم کا زمانہ تھا، جن میں جنگ و قتال اللہ کی طرف سے ممنوع تھا، اس لئے ان کے متعلق تو وہ حکم آیا جو سورۃ توبہ کی اس پانچویں آیت میں مذکور ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ ان لوگوں نے عہد شکنی کرکے اپنا کوئی حق باقی نہیں چھوڑا مگر اشہر حرم کا احترام بہرحال ضروری ہے، اس لئے اشہر حرم ختم ہوتے ہی یا وہ جزیرۃ العرب سے نکل جائیں یا مسلمان ہوجائیں ورنہ ان سے جنگ کی جائے۔

پیچھے پہلی جماعت کے ذکر میں دست برداری یا قطع تعلق کے اعلان کے ساتھ چار مہینے کی مدت ذکر نہ کرنا اس کا قرینہ ہے کہ ان کے لیے مہلت کی کوئی مدت نہیں، پھر یہاں اس آیت میں یہ بتلادیا کہ ان لوگوں کے واسطے امن کی کوئی میعاد نہیں، مگر حرمت کے مہینوں کی وجہ سے ابھی لڑائی کی اجازت نہیں، یا تو اس لیے کہ اس وقت تک ان مہینوں میں لڑائی حرام تھی، پھر یہ حرمت منسوخ ہوگئی اگرچہ معین طور پر ہمیں ناسخ معلوم نہ ہو، لیکن نسخ پر اجماع ہونا اس کی دلیل ہے کہ کوئی ناسخ ضرور ہوگا، جس کی وجہ سے سب کا اجماع منعقد ہوگیا، کیونکہ غلط بات پر اجماع ہوجانا شرعاً محال ہے، یا یہ کہ ان مہینوں کی حرمت اس وقت بھی باقی نہ ہو مگر اس مصلحت سے کہ قریش بلکہ تمام عرب میں ان کی حرمت پہلے سے مشہور تھی اور عنقریب کفار کا حدود حرم سے نکال دیا جانا تجویز ہو ہی چکا تھا تو تھوڑے دنوں کے لیے مسلمان کیوں بدنام کیے جائیں؟ اس لیے ان مہینوں کے ختم ہونے کا انتظار کیا گیا۔

وَخُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ: یہاں جزیہ کا ذکر اس لیے نہیں کیا گیا کہ کفارعرب سے جزیہ نہیں لیا جاتا، وہ اگر اسلام نہ لائیں تو ان کے لیے صرف قتل کا حکم ہے، پس اس جگہ پکڑنے اور باندھنے سے غلام بنانا مراد نہیں، کیونکہ کفار عرب کو غلام بھی نہیں بنایا جاتا۔

وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ: اگرچہ زکوۃ دینا اور نماز پڑھنا قبولیت اسلام کی شرط نہیں، لیکن اس سے مراد اسلام کو ظاہر کرنا ہے، کیونکہ دنیا میں اسی پر احکام کا مدار ہے، یہاں خاص طور پر نماز وروزہ کو ذکر کرنا مثال کے لیے۔

فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ: اس مانع یعنی حرمت کے مہینوں کے دور ہونے کے بعد جو دو حکم اس جماعت کے لیے بیان کیے گئے ہیں کہ ان کا قید کرنا اور قتل کرنا جائز ہے اور اسلام لے آئیں تو ان کا راستہ چھوڑ دینا واجب ہے، یہ حکم بقیہ جماعتوں میں بھی مشترک ہے جیسا کہ دوسری اور تیسری آیت میں **غیر معجزی الله** سے اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ تم خدا کو عاجز نہیں کر سکتے، مدت ختم ہوجانے کے بعد وہ تم کو سزا دے سکتا ہے۔

* * *

فائدہ: استثناء سے فارغ ہوکر پھر مستثنیٰ منہ کا حکم بیان فرماتے ہیں، یعنی ان عہد شکنی کرنے والوں سے اگرچہ اب کوئی معاہدہ باقی نہ رہا اور اس لیے علی الفور جنگ کی جاسکتی ہے تاہم ''اشہر حرم'' کی رعایت مانع ہے کہ فوراً ان پر حملہ کیا جائے خواہ اس لیے کہ اس وقت تک اشہر حرم میں ابتداء قتال کرنا ممنوع ہوگا یا مصلحتاً کہ تھوڑی سی بات کے لیے عام لوگوں میں کیوں تشویش پیدا کی جائے، کیونکہ ان مہینوں میں قتال کی حرمت ان کے یہاں معروف ومسلم چلی آتی تھی، بہر حال ماہ محرم کے ختم تک ان کو مہلت دی گئی کہ جو چاہیں اپنا بندوبست کرلیں، اس کے بعد تطہیر جزیرۃ العرب کی خاطر جنگ سے چارہ نہیں، جو کچھ برتاؤ جنگ میں ہوتا ہے (مارنا، پکڑنا، گھیرنا، داؤ لگانا، گھات میں رہنا) وہ سب ہوگا، البتہ اگر بظاہر کفر سے توبہ کرکے اسلامی برادری میں داخل ہوجائیں جس کی بڑی علامت نماز ادا کرنا اور زکوۃ دینا ہے تو پھر مسلمانوں کو ان سے تعرض کرنے اور ان کا راستہ روکنے کی اجازت نہیں، رہا باطن کا معاملہ وہ خدا کے سپرد ہے مسلمانوں کا معاملہ اس کے ظاہر کو دیکھ کر ہوگا۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص کلمہ اسلام پڑھ کر نماز ادا نہ کرے یا زکوۃ نہ دے تو مسلمان اس کا راستہ روک سکتے ہیں، امام احمد، امام شافعی، امام مالک کے نزدیک اسلامی حکومت کا فرض ہے کہ تارک صلوۃ اگر توبہ نہ کرے تو اسے قتل کردے، (امام احمد کے نزدیک ردۃً اور مالک وشافعی کے نزدیک حداً وتعزیراً) امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ اسے خوب زدوکوب کرے اور قید میں رکھے: حَتّٰی یَمُوْتُ اَوْ یَتُوْبُ (حتی کہ مرجائے یا توبہ کرے) بہر حال تخلیہ سبیل کسی کے نزدیک نہیں، رہے مانعین زکوۃ ان کے اموال میں سے حکومت جبراً زکوۃ وصول کرے اور اگر وہ لوگ مل کر حکومت سے آمادہ پیکار ہوں تو راہ راست پر لانے کیلئے جنگ کی جائے، حضرت ابوبکر صدیق نے مانعین زکوۃ پر جو جہاد کیا تھا اسکا واقعہ کتب حدیث وتاریخ میں مشہور ومعروف ہے۔

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ۭ

اور اگر کوئی مشرک تجھ سے پناہ مانگے تو اس کو پناہ دے دے یہاں تک کہ وہ سن لے کلام اللہ کا پھر پہنچا دے اس کو اس کی امن کی جگہ

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ ۝ ۶ ع

یہ اس واسطے کہ وہ لوگ علم نہیں رکھتے

خلاصہ تفسیر: اور اگر کوئی شخص مشرکین میں سے (امن کی مدت ختم ہونے کے بعد جب مشرکین کا قتل جائز ہو اس وقت اگر کوئی شخص توبہ واسلام کے فوائد وبرکات سن کر اس طرف راغب ہو اور اسلام کی حقیقت وحقانیت معلوم کرنے کی غرض سے آپ کے پاس آکر) آپ سے پناہ کا طالب ہو (تاکہ اطمینان سے سن سکے اور سمجھ سکے) تو (ایسی حالت میں) آپ اس کو پناہ دیجئے تاکہ وہ کلام الٰہی (مراد دین حق کے مطلق دلائل ہیں) سن لے، پھر (اس کے بعد) اس کو اس کی امن کی جگہ میں پہنچا دیجئے (یعنی پہنچنے دیجئے تاکہ وہ سوچ سمجھ کر اپنی رائے قائم کرلے) یہ حکم (اتنی پناہ دینے کا) اس سبب سے (دیا جاتا) ہے کہ وہ ایسے لوگ ہیں کہ پوری خبر نہیں رکھتے (اس لئے قدرے مہلت دینا ضروری ہے)۔

فَأَجِرْهُ (الی قوله) ثُمَّ أَبْلِغْهُ مَأْمَنَهُ: یہ حکم کہ ''ان کو پناہ دو اور امن کی جگہ پہنچنے دو'' علماء کے نزدیک اب منسوخ ہے، جیسا کہ روح المعانی میں سعید بن ابی عروبہ کا یہی قول منقول ہے، احقر کہتا ہے کہ اس کی تائید یہاں حق تعالی کے ارشاد: ذلك بأنهم قوم لا يعلمون سے ہوتی ہے، کیونکہ اس میں امن دینے کی وجہ یہ بتلائی ہے کہ یہ لوگ اسلام سے بے خبر ہیں، اور اب مضامین اسلام کی خبر عام ہوگئی ہے، اس لیے مہلت دینے کی ضرورت نہیں، مگر مہلت دینا مستحب ہے اور اس کی مقدار امام کی رائے پر ہے۔

* * *

فائدہ: پہلے فرمایا تھا کہ اگر اپنی کفریات سے توبہ کر کے اسلام میں داخل ہو جائیں تو مامون ہیں، ممکن تھا کہ کسی شخص کو اصول اسلام سے آگاہی نہ ہو وہ تحقیق ورفع شکوک کی غرض سے مسلمانوں کے پاس آنا چاہے، اس کی نسبت فرما دیا کہ اپنی پناہ اور حفاظت میں لے کر خدا کا کلام اور اسلام کے حقائق ودلائل سناؤ، اگر قبول نہ کرے تو اس کو قتل مت کرو، بلکہ کہیں ٹھکانے پر امن کی جگہ پہنچا دو، جہاں پہنچ کر وہ مامون ومطمئن ہو جائے، اس کے بعد وہ سب کافروں کے برابر ہے، یہ امن دینے کا حکم اس لیے ہے کہ اسلامی اصول وحقائق سے ان لوگوں کو آگاہی نہیں ہے، لہذا ان کے سامنے حق خوب طرح واضح کر دینا چاہیے، اگر اس کے بعد بھی عناد برتے تو تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ کے بعد دین میں کوئی اکراہ نہیں۔

كَيْفَ يَكُونُ لِلْمُشْرِكِينَ عَهْدٌ عِنْدَ اللَّهِ وَعِنْدَ رَسُولِهِ إِلَّا الَّذِينَ عَاهَدْتُمْ

کیونکر ہوئے مشرکوں کے لیے عہد اللہ کے نزدیک اور اس کے رسول کے نزدیک مگر جن لوگوں سے تم نے عہد کیا تھا

عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۖ فَمَا اسْتَقَامُوا لَكُمْ فَاسْتَقِيمُوا لَهُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ ﴿٧﴾

مسجد حرام کے پاس، سو جب تک وہ تم سے سیدھے رہیں تم ان سے سیدھے رہو، بیشک اللہ کو پسند ہیں احتیاط والے

خلاصہ تفسیر: پہلی جماعت یعنی قریش نے جو عہد توڑا تھا حق تعالی نے پہلے ہی سے ان کے عہد توڑنے کے متعلق بطور پیشین گوئی کے اس آیت میں خبر دے دی، چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں:

ان مشرکین (قریش) کا عہد اللہ کے نزدیک اور اس کے رسول کے نزدیک کیسے (قابل رعایت) رہے گا (کیونکہ رعایت تو اس عہد کی ہوتی ہے جسے دوسرا شخص خود نہ توڑے، اور اگر وہی توڑ دے تو رعایت باقی نہیں رہتی، مطلب یہ کہ یہ لوگ عہد کو توڑ دیں گے، اس وقت اس طرف سے بھی رعایت نہ ہوگی) مگر جن لوگوں سے تم نے مسجد حرام (یعنی حرم) کے نزدیک عہد لیا ہے (مراد دوسری جماعت ہے جن کا استثناء پیچھے بھی: إِلَّا الَّذِينَ عَاهَدْتُمْ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوكُمْ الخ میں آچکا ہے، یعنی ان سے امید ہے کہ یہ عہد کو قائم رکھیں گے) سو جب تک یہ لوگ تم سے سیدھی طرح رہیں (یعنی عہد نہ توڑیں) تم بھی ان سے سیدھی طرح رہو (اور ان سے عہد کی مدت پوری کر دو، چنانچہ اس سورت کے نازل ہونے کے وقت اس مدت میں نو مہینے باقی تھے، اور عہد شکنی نہ کرنے کی وجہ سے ان کی یہ مدت پوری کی گئی) بلا شبہ اللہ تعالی (بدعہدی سے) احتیاط رکھنے والوں کو پسند کرتے ہیں (پس تم بھی احتیاط رکھنے سے خدا کے پسندیدہ اور مقبول ہو جاؤ گے)۔

كَيْفَ وَإِنْ يَظْهَرُوا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوا فِيكُمْ إِلًّا وَلَا ذِمَّةً ۚ يُرْضُونَكُمْ بِأَفْوَاهِهِمْ

کیونکر رہے صلح اور اگر وہ تم پر قابو پائیں تو نہ لحاظ کریں تمہاری قرابت کا اور نہ عہد کا، تم کو راضی کر دیتے ہیں اپنے منہ کی بات سے

وَتَأْبَىٰ قُلُوبُهُمْ وَأَكْثَرُهُمْ فَاسِقُونَ ﴿٨﴾

اور ان کے دل نہیں مانتے، اور اکثر ان میں بدعہد ہیں۔

خلاصہ تفسیر: گذشتہ آیت میں دوسری جماعت کا استثناء کیا تھا، اب پھر پہلی جماعت کے متعلق مضمون ارشاد ہوتا ہے:
کیسے (ان کا عہد قابل رعایت رہے گا یعنی وہ لوگ عہد پر کب قائم رہیں گے) حالانکہ ان کی یہ حالت ہے کہ اگر وہ تم پر کہیں غلبہ پا جائیں تو تمہارے بارے میں نہ قرابت کا پاس کریں اور نہ قول وقرار کا (کیونکہ ان کی یہ صلح مجبوری اور جہاد کے خوف سے ہے، دل سے نہیں، پس) یہ لوگ تم کو (صرف) اپنی زبانی باتوں سے راضی کر رہے ہیں اور ان کے دل (ان باتوں کو) نہیں مانتے (پس جب دل سے اس عہد کے پورا کرنے کا عزم نہیں ہے تو کیا خاک پورا ہوگا) اور ان میں زیادہ آدمی شریر ہیں (کہ عہد پورا کرنا نہیں چاہتے، اور اگر ایک آدھ پورا کرنا بھی چاہتا ہو تو زیادہ کے سامنے ایک دو کی کب چلتی ہے)۔

* * *

فائدہ: پچھلی آیات میں جو براءۃ کا اعلان کیا گیا تھا، یہاں اس کی حکمت بیان فرماتے ہیں، یعنی ان مشرکین عرب سے کیا عہد قائم رہ سکتا ہے اور آئندہ کیا صلح ہوسکتی ہے جن کا حال تم مسلمانوں کے ساتھ یہ ہے کہ اگر کسی وقت ذرا قابو تم پر حاصل کر لیں تو ستانے اور نقصان پہنچانے میں نہ قرابت کا مطلق لحاظ کریں اور نہ قول وقرار کا، چونکہ اتفاق سے تم پر غلبہ اور قابو حاصل نہیں ہے، اس لیے محض زبانی عہد و پیمان کر کے تم کو خوش رکھنا چاہتے ہیں، ورنہ ان کے دل ایک منٹ کے لیے بھی اس عہد پر راضی نہیں، ہر وقت عہد شکنی کا موقع تلاش کرتے رہتے ہیں، چونکہ ان میں اکثر لوگ غدار اور بدعہد ہیں، اگر کوئی اکا دکا وفائے عہد کا خیال بھی کرتا ہے تو کثرت کے مقابلہ میں ان کی کچھ پیش نہیں جاتی، بہر حال ایسی دغاباز بدعہد قوم سے خدا اور رسول کا کیا عہد ہوسکتا ہے، البتہ جن قبائل سے تم بالخصوص مسجد حرام کے پاس معاہدہ کر چکے ہو، سو تم ابتداء کر کے نہ توڑو، جب تک وہ وفاداری کے راستہ پر سیدھے چلیں، تم بھی ان سے سیدھے رہو اور بڑی احتیاط رکھو کوئی حقیر سے حقیر بات ایسی نہ ہونے پائے جس سے تمہارا دامن عہد شکنی کی گندگی سے داغدار ہو، خدا کو وہ ہی لوگ محبوب ہیں جو پوری احتیاط کرتے ہیں، چنانچہ بنوکنانہ وغیرہ نے مسلمانوں سے بدعہدی نہ کی تھی، مسلمانوں نے نہایت دیانت داری اور احتیاط کے ساتھ اپنا عہد پورا کیا، اعلان براءۃ کے وقت ان کے معاہدہ کی میعاد منقضی ہونے میں نو مہینے باقی تھے، ان میں معاہدہ کی کامل پابندی کی گئی۔

اِشۡتَرَوۡا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيۡلًا فَصَدُّوۡا عَنۡ سَبِيۡلِهٖ ؕ اِنَّهُمۡ سَآءَ مَا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ ۝۹

بیچ ڈالے انہوں نے اللہ کے حکم تھوڑی قیمت پر پھر روکا اس کے راستہ سے، برے کام ہیں جو وہ لوگ کر رہے ہیں

خلاصہ تفسیر: (اور ان کے شریر ہونے کی وجہ یہ ہے کہ) انہوں نے احکام الٰہیہ کے عوض (دنیا کی) متاع ناپائیدار کو اختیار کر رکھا ہے (جیسا کہ کفار کی حالت ہوتی ہے کہ دین کو چھوڑ کر دنیا کو اس پر ترجیح دیتے ہیں، جب دنیا زیادہ محبوب ہوگی تو اگر کسی عہد توڑنے میں دنیوی غرض حاصل ہوتی نظر آئے گی تو اس میں کچھ باک نہ ہوگا، اس کے برخلاف جو شخص دین کو دنیا پر ترجیح دیتا ہے وہ احکام الٰہیہ اور وفائے عہد وغیرہ کا پابند ہوگا) سو (دین پر دنیا کی ترجیح کی وجہ سے) یہ لوگ اللہ کے (سیدھے) راستہ سے (جس میں وفائے عہد بھی داخل ہے) ہٹے ہوئے ہیں (اور) یقیناً یہ ان کا عمل بہت ہی برا ہے۔

وَاَكۡثَرُهُمۡ فٰسِقُوۡنَ (الی قولہ) اِشۡتَرَوۡا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ: یہ جملہ مستانفہ ہے اور گذشتہ آیت کی علت کے طور پر ہے، پس اس میں دلالت ہے کہ خواہشات اور شہوات کی اتباع اور لذتوں کی طرف مائل ہونا یہ فسق وسرکشی کا سبب ہوتا ہے، اس لیے خواہشات اور لذات میں کم پڑنا چاہیے۔

* * *

فائدہ: یعنی یہ مشرکین وہ لوگ ہیں جنہوں نے دنیا کی تھوڑی سی طمع اور اپنی اغراض و ہوا کی خاطر خدا کے احکام و آیات کو رد کر دیا، اس طرح خود بھی خدا کے راستہ پر نہ چلے اور دوسروں کو بھی چلنے سے روکا، جو ایسے بدترین اور نالائق کاموں میں پھنسے ہوں اور خدا سے نہ ڈریں وہ عہد شکنی کے وبال سے کیا ڈریں گے اور اپنے قول وقرار پر کیا قائم رہیں گے۔

لَا يَرْقُبُوْنَ فِيْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُعْتَدُوْنَ ⑩

نہیں لحاظ کرتے کسی مسلمان کے حق میں قرابت کا اور نہ عہد کا، اور وہی ہیں زیادتی پر

خلاصہ تفسیر: (اور ہم نے جو پیچھے: لَا يَرْقُبُوْا فِيْكُمْ کہا کہ اگر یہ لوگ تم پر قابو پائیں تو قرابت وغیرہ کا ذرا پاس نہ کریں اس میں کچھ تمہاری خصوصیت نہیں، بلکہ ان کی تو یہ حالت ہے کہ:) یہ لوگ کسی مسلمان کے بارے میں (بھی) نہ قرابت کا پاس کریں اور نہ قول وقرار کا (یعنی ہر مسلمان کے ساتھ ان کی یہی حالت ہے) اور یہ لوگ (خصوصاً اس باب میں) بہت ہی زیادتی کر رہے ہیں۔

* * *

فائدہ: یعنی کچھ تمہارے ہی ساتھ نہیں بلکہ مسلمان نام سے ان کو بیر ہے، کوئی مسلمان ہو موقع پانے پر اس کو نقصان پہنچانے کے لیے سب تعلقات قرابت اور قول وقرار اٹھا کر رکھ دیتے ہیں، اس بارے میں ان کی ظلم وزیادتی حد سے بڑھی ہوئی ہے۔

فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ ؕ وَنُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ

سو اگر توبہ کریں اور قائم کریں نماز اور دیتے رہیں زکوٰۃ تو تمہارے بھائی ہیں حکم شریعت میں[1] اور ہم کھول کر بیان کرتے ہیں حکموں کو

لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ⑪

جاننے والے لوگوں کے واسطے

خلاصہ تفسیر: سو (جب ان کے عہد پر اعتماد واطمینان نہیں، بلکہ عہد توڑنے کا بھی احتمال ہے اور عہد پورا کرنے کا بھی احتمال ہے، اس لئے ہم ان کے بارے میں مفصل حکم سناتے ہیں کہ) اگر یہ لوگ (کفر سے) توبہ کرلیں (یعنی مسلمان ہوجائیں) اور (اس اسلام کو ظاہر بھی کردیں مثلاً) نماز پڑھنے لگیں اور زکوٰۃ دینے لگیں تو (پھر ان کے عہد توڑنے وغیرہ پر بالکل نظر نہ ہوگی، خواہ انہوں نے کچھ ہی کیا ہو، اسلام لانے سے) وہ تمہارے دینی بھائی ہوجائیں گے (اور پچھلا کیا ہوا سب معاف ہوجائے گا) اور ہم سمجھدار لوگوں (کو بتلانے) کے لئے احکام کو خوب تفصیل سے بیان کرتے ہیں (چنانچہ اس مقام پر بھی ایسا ہی کیا گیا)۔

* * *

فائدہ: [1] یعنی اب بھی اگر کفر سے توبہ کر کے احکام دینیہ (نماز زکوٰۃ وغیرہ) پر عمل پیرا ہوں تو نہ صرف یہ کہ آئندہ کے لیے محفوظ ومامون ہوجائیں گے بلکہ اسلامی برادری میں شامل ہو کر ان حقوق کے مستحق ہوں گے، جن کے دوسرے مسلمان مستحق ہیں، جو کچھ بدعہدیاں اور شرارتیں پہلے کرچکے ہیں سب معاف کردی جائیں گی، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ: ''یہ جو فرمایا کہ بھائی ہیں حکم شریعت میں، اس سے سمجھ لیں کہ جو شخص قرآن سے معلوم ہو کہ ظاہر میں مسلمان ہے اور دل سے یقین نہیں رکھتا اس کو حکم ظاہری میں مسلمان گنیں، مگر معتمد اور دوست نہ بنائیں''۔

وَاِنْ نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَطَعَنُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ فَقَاتِلُوْٓا اَئِمَّةَ الْكُفْرِ ۙ

اور اگر وہ توڑدیں اپنی قسمیں عہد کرنے کے بعد اور عیب لگائیں تمہارے دین میں تو لڑو کفر کے سرداروں سے

اِنَّهُمْ لَآ اَيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُوْنَ ⑫

بیشک ان کی قسمیں کچھ نہیں تاکہ وہ باز آئیں

خلاصہ تفسیر: اور اگر وہ لوگ عہد کرنے کے بعد اپنی قسموں (عہدوں) کو توڑ ڈالیں (جیسا کہ ان کی حالت سے غالب احتمال

یہی ہے) اور (عہد توڑ کر ایمان بھی نہ لائیں، بلکہ اپنے کفر پر قائم رہیں جس کا ایک اثر یہ ہے کہ) تمہارے دین (اسلام) پر طعن (واعتراض) کریں تو (اس حالت میں) تم لوگ اس قصد سے کہ یہ (اپنے کفر سے) باز آجائیں، ان پیشوایان (سرداران) کفر سے (خوب) لڑو (کیونکہ اس صوت میں) ان کی قسمیں (باقی) نہیں رہیں۔

یہاں جزیہ کا ذکر اس لیے نہیں فرمایا کہ یہ کلام کفار عرب کے بارے میں ہے، اور ان کے لیے جزیہ کا حکم نہیں، بلکہ صرف دو ہی صورتیں ہیں: یا اسلام لائیں، یا قتل کیے جائیں۔

* * *

فائدہ: یعنی اگر عہد و پیمان توڑ ڈالا (جیسے بنی بکر نے خلاف عہد خزاعہ پر حملہ کر دیا اور قریش نے حملہ آوروں کی مدد کی) اور کفر سے باز نہ آئے بلکہ دین حق کے متعلق طعنہ زنی اور گستاخانہ عیب جوئی کرتے رہے تو سمجھ لو کہ اس طرح کے لوگ ائمة الکفر (کفر کے سردار اور امام) ہیں، کیونکہ ان کی حرکات دیکھ کر اور باتیں سن کر بہت سے کج رو اور بیوقوف پیچھے ہو لیتے ہیں، ایسے سرغنوں سے پورا مقابلہ کرو، کیونکہ ان کا کوئی قول وقسم اور عہد و پیمان باقی نہیں رہا، ممکن ہے تمہارے ہاتھوں سے کچھ سزا پا کر اپنی شرارت وسرکشی سے باز آجائیں۔

أَلَا تُقَاتِلُونَ قَوْمًا نَّكَثُوٓا أَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوا بِإِخْرَاجِ الرَّسُولِ وَهُم بَدَءُوكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ ۚ

کیا نہیں لڑتے ایسے لوگوں سے جو توڑیں اپنی قسمیں اور فکر میں رہیں کہ رسول کو نکال دیں اور انہوں نے پہلے چھیڑ کی تم سے

أَتَخْشَوْنَهُمْ ۚ فَاللَّهُ أَحَقُّ أَن تَخْشَوْهُ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ⑬

کیا ان سے ڈرتے ہو، سو اللہ کا ڈر چاہیے تم کو زیادہ اگر تم ایمان رکھتے ہو

خلاصہ تفسیر: یہاں تک عہد توڑنے سے پہلے کی پیشین گوئی تھی، اب عہد کے توڑنے کے بعد قتال و جہاد کی ترغیب ہے:

تم ایسے لوگوں سے کیوں نہیں لڑتے جنہوں نے اپنی قسموں کو توڑ ڈالا (یعنی خزاعہ کے مقابلہ میں قریش نے بنی بکر کی مدد کی) اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے جلاوطن کر دینے کی تجویز کی، اور انہوں نے تم سے خود پہلے چھیڑ نکالی (کہ تمہاری طرف سے وفائے عہد میں کوئی کمی نہیں ہوئی، انہوں نے بیٹھے بٹھائے خود ایک شوشہ چھوڑا، پس ایسے لوگوں سے کیوں نہ لڑو) کیا ان سے (لڑنے میں) ڈرتے ہو (کہ ان کے پاس سامان اور لوگ زیادہ ہیں) سو (اگر یہ بات ہے تو ہرگز ان سے مت ڈرو، کیونکہ) اللہ تعالیٰ اس بات کے زیادہ مستحق ہیں کہ تم ان سے ڈرو اگر تم ایمان رکھتے ہو (اور اللہ سے ڈرنے کا تقاضا یہ ہے کہ ان کے حکم کے خلاف مت کرو، پس تم ضرور قتال کرو)۔

وَهَمُّوا بِإِخْرَاجِ الرَّسُولِ: کفار قریش نے صرف جلاوطن کرنے ہی کی تجویز نہ کی تھی، بلکہ اخیر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کرنے پر رائے قرار پائی تھی، مگر ان باتوں کو اس لیے ذکر نہیں کیا کہ جلاوطن کرنا سب سے ہلکی بات تھی، جب یہ بھی خدا تعالیٰ کو ناگوار ہے تو جو اس سے زیادہ سخت بات ہے وہ تو زیادہ ناگوار ہوگی۔

* * *

فائدہ: قریش نے قسمیں اور معاہدے توڑ دیے تھے، کیونکہ خلاف عہد خزاعہ کے مقابلہ میں بنو بکر کی مدد کی اور ہجرت سے پہلے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو وطن مقدس (مکہ معظمہ) سے نکالنے کی تجاویز سوچیں اور وہ ہی نکلنے کا سبب بنے إِذْ أَخْرَجَهُ الَّذِينَ كَفَرُوا ثَانِيَ اثْنَيْنِ (التوبہ: ۴۰) مکہ میں بے قصور مسلمانوں پر بیٹھے بٹھائے مظالم کی ابتداء کی، جب ابوسفیان کا تجارتی قافلہ بچ نکلا تو از راہ نخوت و رعونت بدر کے میدان میں مسلمانوں سے جنگ کی چھیڑ کرنے کے لیے گئے اور صلح حدیبیہ کے بعد بھی اپنی جانب سے عہد شکنی کی ابتداء کی کہ مسلمانوں کے حلیف خزاعہ کے مقابلہ پر بنو بکر کی پیٹھ ٹھونکتے رہے اور اسلحہ وغیرہ سے ان کی امداد کرتے رہے، آخر کار مسلمان ان سے لڑے اور مکہ معظمہ کو مشرکین کے قبضہ سے پاک کیا آلا

تُقَاتِلُوْنَ قَوْمًا سے غرض یہ معلوم ہوتی ہے کہ جو کوئی قوم اس طرح کے احوال رکھتی ہو، اس سے جنگ کرنے میں مسلمانوں کو کسی وقت کچھ تامل نہیں ہونا چاہیے، اگر ان کی طاقت و جمعیت اور ساز و سامان کا خوف ہو تو مومنین کو سب سے بڑھ کر خدا کا خوف ہونا چاہیے، خدا کا ڈر جب دل میں آجائے پھر سب ڈر نکل جاتے ہیں، ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ بندہ خدا کی نافرمانی سے ڈرے اور اس کے قہر و غضب سے لرزاں و ترساں رہے، کیونکہ نفع و ضرر سب اسی کے ہاتھ میں ہے کوئی مخلوق ادنیٰ سے ادنیٰ نفع و ضرر پہنچانے پر بدون اس کی مشیت کے قادر نہیں۔

قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ وَيُخْزِهِمْ وَيَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَيَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۴﴾

لڑو ان سے تا عذاب دے اللہ ان کو تمہارے ہاتھوں اور رسوا کرے اور تم کو ان پر غالب کرے اور ٹھنڈے کرے دل مسلمان لوگوں کے

وَيُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوْبِهِمْ ؕ وَيَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۱۵﴾

اور نکالے ان کے دل کی جلن اور اللہ توبہ نصیب کرے گا جس کو چاہے گا [1] اور اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے [2]۔

خلاصہ تفسیر: (اور اللہ تعالیٰ حکم دیتے ہیں قتال کا، پس) ان سے لڑو اللہ تعالیٰ (کا وعدہ ہے کہ) ان کو تمہارے ہاتھوں سزا دے گا، اور ان کو ذلیل (و خوار) کرے گا، اور تم کو ان پر غالب کرے گا، اور (ان کو اس عذاب دینے اور تمہاری نصرت سے) بہت سے (ایسے) مسلمانوں کے قلوب کو شفاء دے گا، اور ان کے قلوب کے غیظ (و غضب) دور کردے گا (جو خود مقابلہ کی تاب نہیں رکھتے، اور کفار کی حرکتوں کو دیکھ کر دل ہی دل میں گھٹتے ہیں خوش ہو جائیں گے) اور (ان ہی کفار میں سے) جس پر (توجہ و فضل کرنا) منظور ہوگا اللہ تعالیٰ توجہ (بھی) فرمائے گا (یعنی مسلمان ہونے کی توفیق دے گا، چنانچہ فتح مکہ میں بعض لڑے اور ذلیل و مقتول ہوئے اور بعض مسلمان ہو گئے) اور اللہ تعالیٰ بڑے علم والے بڑی حکمت والے ہیں (کہ اپنے علم سے ہر ایک کا انجام جانتے ہیں کہ کون اسلام لائے گا اور کون کافر رہے گا اور اسی لئے اپنی حکمت سے مناسب احکام مقرر فرماتے ہیں)۔

وَيَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ وَيُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوْبِهِمْ: اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کاملین میں بھی طبعی امور ہوتے ہیں مثلاً غصہ وغیرہ، کیونکہ ان کے ان طبعی اوصاف سے کچھ آثار اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہوتے ہیں جس سے لوگوں کو فائدہ ہوتا ہے ورنہ صحابہ کرام میں غیظ و غضب وغیرہ نہ ہوتا، اس لیے ان کے اندر یہ طبعی امور باقی رکھے جاتے ہیں لیکن وہ دین کے تابع ہوتے ہیں، اپنی اغراض و خواہشات کے نہیں۔

* * *

فائدہ: [1] اس آیت میں مشروعیت جہاد کی اصل حکمت پر متنبہ فرمایا ہے، قرآن کریم میں اقوام ماضیہ کے جو قصے بیان فرمائے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب کوئی قوم کفر و شرارت اور انبیاء علیہم السلام کی تکذیب و عداوت میں حد سے بڑھ جاتی تھی تو قدرت کی طرف سے کوئی تباہ کن آسمانی عذاب ان پر نازل کیا جاتا تھا جس سے ان کے سارے مظالم اور کفریات کا دفعۃً خاتمہ ہو جاتا تھا فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ الْاَرْضَ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَغْرَقْنَا ۚ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ (العنکبوت: ۴۰) کوئی شبہ نہیں کہ عذاب کی یہ اقسام بہت سخت مہلک اور آئندہ نسلوں کے لیے عبرتناک تھیں لیکن ان صورتوں میں معذبین کو دنیا میں رہ کر اپنی ذلت و رسوائی کا نظارہ نہیں کرنا پڑتا تھا اور نہ آئندہ کے لیے توبہ و رجوع کا کوئی امکان باقی رہتا تھا، مشروعیت جہاد کی اصلی غرض و غایت یہ ہے کہ مکذبین و متعنتین کو حق تعالیٰ بجائے بلا واسطہ عذاب دینے کے لیے اپنے مخلص وفادار بندوں کے ہاتھ سے سزا دلوائے، سزا دہی کی اس صورت میں مجرمین کی رسوائی اور مخلصین کی قدر افزائی زیادہ ہے، وفادار بندوں کا نصرت و غلبہ اعلانیہ ظاہر ہوتا ہے، ان کے دل یہ دیکھ کر ٹھنڈے ہوتے ہیں کہ جو لوگ کل تک انہیں حقیر و ناتواں سمجھ کر ظلم و ستم اور استہزاء و تمسخر کا تختۂ مشق بنائے ہوئے تھے، آج خدا کی تائید و رحمت سے انہی کے رحم و کرم یا عدل و انصاف پر چھوڑ دیے گئے ہیں، کفر و باطل کی شوکت و نمائش کو دیکھ کر جو اہل حق گھٹتے رہتے تھے یا جو ضعیف و مظلوم مسلمان کفار کے مظالم کا انتقام نہ لے سکنے کی وجہ سے دل ہی دل میں غیظ کھا کر چپ ہو رہتے تھے جہاد فی سبیل اللہ کے ذریعہ سے ان کے قلوب تسکین پاتے تھے اور

آخری بات یہ ہے کہ خود مجرمین کے حق میں بھی سزا دہی کا یہ طریقہ نسبۃً زیادہ نافع ہے، کیونکہ سزا پانے کے بعد بھی رجوع وتوبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے، بہت ممکن ہے کہ حالات سے عبرت حاصل کر کے بہت سے مجرموں کو توبہ نصیب ہو جائے، چنانچہ حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایسا ہی ہوا کہ تھوڑے دنوں میں سارا عرب صدق دل سے دین الٰہی کا حلقہ بگوش بن گیا۔

فائدہ: ۲۔ یعنی ہر ایک کی حالت کو جان کر حکمت کا معاملہ کرتا ہے اور ہر زمانہ میں اسکے مناسب احکام بھیجتا ہے۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تُتْرَكُوْا وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَلَمْ يَتَّخِذُوْا

کیا تم یہ گمان کرتے ہو کہ چھوٹ جاؤ گے اور حالانکہ ابھی معلوم نہیں کیا اللہ نے تم میں سے ان لوگوں کو جنہوں نے جہاد کیا ہے اور نہیں پکڑا انہوں نے

مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلَا رَسُوْلِهٖ وَلَا الْمُؤْمِنِيْنَ وَلِيْجَةً ؕ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶﴾

سوائے اللہ کے اور اس کے رسول کے اور مسلمانوں کے کسی کو بھیدی، اور اللہ کو خبر ہے جو تم کر رہے ہو

خلاصہ تفسیر: (اور تم جولڑنے سے جی چراتے ہو اگرچہ بعض ہی سہی تو) کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ تم یوں ہی (اسی حالت پر) چھوڑ دیئے جاؤ گے حالانکہ ہنوز اللہ تعالیٰ نے (ظاہری طور پر) ان لوگوں کو تو دیکھا ہی نہیں جنہوں نے تم میں سے (ایسے موقع پر) جہاد کیا ہو اور اللہ و رسول اور مؤمنین کے سوا کسی کو خصوصیت کا دوست نہ بنایا ہو (جس کے ظاہر ہونے کا اچھا ذریعہ یہ ہے کہ ایسے موقع پر جہاد کرنے کا حکم دیا جائے جہاں اپنے اعزہ اور اقارب سے مقابلہ ہو کہ اس سے پورا امتحان ہو جاتا ہے کہ کون اللہ کو چاہتا ہے اور کون برادری کو) اور اللہ تعالیٰ کو سب خبر ہے تمہارے سب کاموں کی (پس اگر جہاد میں چستی کرو گے یا سستی کرو گے اسی کے موافق تم کو جزا دے گا)۔

گذشتہ دو رکوع کی تفسیر میں کئی کئی سال گذرے کہ مجھے پریشانی اور خلجان رہتا تھا، اور جس قدر میں نے لکھا ہے یہ میری کوشش کا منتہا ہے، اگر کسی کی نظر یا ذہن میں اس سے بہتر اور آسان تفسیر گزرے تو وہ اسی کو اختیار کر کے مجھے معذور سمجھے اور میری لغزش کی معافی کی دعا کرے۔

وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ: اس میں اس پر دلالت ہے کہ عادت الٰہیہ یہ ہے کہ مجاہدات کے بعد ثمرات عطا کرتے ہیں۔

* * *

فائدہ: مشروعیت جہاد کی یہاں ایک اور حکمت بیان فرمائی، یعنی ایمان اور بندگی کے زبانی دعوے کرنے والے تو بہت ہیں لیکن امتحان کی کسوٹی پر جب تک کسا نہ جائے کھرا اور کھوٹا ظاہر نہیں ہوتا، جہاد کے ذریعہ سے خدا دیکھنا چاہتا ہے کہ کتنے مسلمان ہیں جو اس کی راہ میں جان و مال نثار کرنے کو تیار ہیں اور خدا اور رسول اور مسلمانوں کے سوا کسی کو اپنا راز دار یا خصوصی دوست بنانا نہیں چاہتے، خواہ وہ ان کا کتنا ہی قریبی رشتہ دار کیوں نہ ہو، یہ معیار ہے جس پر مومنین کا ایمان پرکھا جاتا ہے، جب تک عملی جہاد نہ ہو صرف زبانی جمع خرچ سے کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی، پھر عمل بھی جو کچھ کیا جائے اس کی خبر خدا کو ہے کہ صدق واخلاص سے کیا یا نمود وریاء سے جیسا عمل ہوگا ادھر سے اسی کے موافق پھل ملے گا۔

مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِيْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ ؕ اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ

مشرکوں کا کام نہیں کہ آباد کریں اللہ کی مسجدیں اور تسلیم کر رہے ہوں اپنے اوپر کفر کو، وہ لوگ خراب گئے

اَعْمَالُهُمْ ۚۖ وَفِي النَّارِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ﴿۱۷﴾

ان کے عمل، اور آگ میں رہیں گے وہ ہمیشہ

خلاصہ تفسیر: پیچھے مشرکین کی برائیاں مذکور تھیں، چونکہ ان کو اپنے بعض کاموں پر ناز و افتخار بھی تھا جیسے مسجد حرام اور کعبہ کی

خدمت اور حجاج کو پانی پلانا وغیرہ، اس لیے اب گذشتہ مضمون کی تکمیل کے لیے ان کے ناز وفخر کا چند آیتوں میں جواب دیتے ہیں اور اسی کے ضمن میں مسلمانوں کے ایک اختلافی مسئلہ کا جواب بھی دیتے ہیں۔

مشرکین کی یہ لیاقت ہی نہیں کہ وہ اللہ کی مسجدوں کو (جن میں مسجد حرام بھی آ گئی) آباد کریں جس حالت میں کہ وہ خود اپنے اوپر کفر (کی باتوں) کا اقرار کر رہے ہیں (چنانچہ وہ خود اپنا مذہب بیان کرتے ہوئے ایسے عقائد کا اقرار کرتے تھے جو واقع میں کفر ہیں، مطلب یہ ہے کہ مساجد کی خدمت کرنا اگرچہ پسندیدہ عمل ہے لیکن شرک وکفر کے ساتھ ان میں اس عمل کی قابلیت ہی نہیں اس لیے ان کے یہ سب اعمال بیکار ہیں اور کسی شمار میں ہی نہیں، پھر فخر کی کیا گنجائش ہے) ان لوگوں کے (جو مشرک ہیں) سب اعمال (نیک جیسے تعمیر مسجد وغیرہ) اکارت (اور ضائع) ہیں (اس وجہ سے کہ ان کے مقبول ہونے کی شرط نہیں پائی جاتی اور بیکار عمل پر فخر ہی کیا) اور دوزخ میں وہ لوگ ہمیشہ رہیں گے (کیونکہ وہ عمل جو کہ نجات کا سبب تھا وہ تو ضائع ہی ہو گیا تھا)۔

مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ: اس تفسیر پر آیت کا حاصل صرف یہ ہے کہ ان کے یہ اعمال مقبول نہیں، رہی یہ بات کہ اگر کوئی کافر مسجد بنائے یا اس کی خدمت وغیرہ کرے تو اس کو اجازت دی جائے گی یا نہیں؟ اس مسئلہ سے آیت میں تعرض نہ ہوگا، باقی دوسرے دلائل سے اس مسئلہ کی تحقیق یہ ہے کہ اگر وہ کافر اپنے مذہب کی رو سے اس کو ثواب سمجھے تو اجازت دے دی جائے گی ورنہ نہیں، البتہ اس صورت میں بھی اگر اجازت دینا کسی اسلامی مصلحت کے خلاف ہو تو اجازت نہ ہوگی۔

اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ

وہی آباد کرتا ہے مسجدیں اللہ کی جو یقین لایا اللہ پر اور آخرت کے دن پر اور قائم کیا نماز کو اور دیتا رہا زکوٰۃ اور نہ ڈرا

اِلَّا اللّٰهَ فَعَسٰٓى اُولٰٓئِكَ اَنْ يَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ ﴿۱۸﴾

سوائے اللہ کے کسی سے، سو امیدوار ہیں وہ لوگ کہ ہوویں ہدایت والوں میں ۱۔

خلاصہ تفسیر: ہاں! اللہ کی مسجدوں کو آباد کرنا ان لوگوں کا کام ہے (یعنی کامل طور پر یہ عمل ان لوگوں سے مقبول ہوتا ہے) جو اللہ پر اور قیامت کے دن پر (دل سے) ایمان لائیں (اور اپنے اعضاء سے ایمان کا اظہار بھی کریں، مثلاً اس طرح کہ) نماز کی پابندی کریں اور زکوٰۃ دیں، اور (اللہ پر ایسا بھروسہ رکھتے ہوں کہ) بجز اللہ کے کسی سے نہ ڈریں، سو ایسے لوگوں کی نسبت توقع (یعنی وعدہ) ہے کہ اپنے مقصود (یعنی جنت ونجات) تک پہنچ جائیں گے (کیونکہ ان کے اعمال ایمان کی وجہ سے مقبول ہوں گے، اس لئے آخرت میں ان کو نفع ہوگا، اور مشرکین اس شرط سے محروم ہیں، پس ثواب سے بھی محروم ہیں، اور جس عمل کا کوئی نتیجہ نہ ہو اس پر فخر کرنا لا حاصل ہے)۔

* * *

فائدہ: ۱۔ پہلے فرمایا تھا کہ مسلمان بدون امتحان کے یونہی نہیں چھوڑے جا سکتے، بلکہ بڑے بڑے عزائم اعمال (مثلاً جہاد وغیرہ) میں ان کی ثابت قدمی دیکھی جائے گی اور یہ کہ تمام دنیا کے تعلقات پر کس طرح خدا اور رسول کی جانب کو ترجیح دیتے ہیں، اس رکوع میں یہ بتلایا کہ خدا کی مساجد (عبادت گاہیں) حقیقۃً ایسے ہی اولوالعزم مسلمانوں کے دم سے آباد رہ سکتی ہیں، مساجد کی حقیقی آبادی یہ ہے کہ ان میں خدائے واحد کی عبادت اس کی شان کے لائق ہو، ذکر اللہ کرنے والے کثرت سے موجود ہوں جو بے روک ٹوک خدا کو یاد کریں، لغویات وخرافات سے ان پاک مقامات کو محفوظ رکھا جائے۔ یہ مقصد کفار ومشرکین سے کب حاصل ہو سکتا ہے؟ دیکھئے مشرکین مکہ بڑے فخر سے اپنے کو مسجد حرام کا متولی اور خادم کہتے تھے، مگر ان کی بڑی خدمت گزاری یہ تھی کہ پتھر کی سینکڑوں مورتیاں کعبہ میں رکھ چھوڑی تھی ان ہی کی نذر ونیاز کرتے اور منتیں مانتے تھے، بہت سے لوگ ننگے

طواف کرتے تھے، ذکر اللہ کی جگہ سیٹیاں اور تالیاں بجاتے تھے اور خدائے واحد کے سچے پرستاروں کو وہاں تک پہنچنے کی اجازت نہ دیتے تھے، لے دے کران کی بڑی عبادت یہ تھی کہ حاجیوں کے لیے پانی کی سبیل لگادی یا حرم شریف میں چراغ جلا دیا، یا کعبہ پر غلاف چڑھایا، یا کبھی ضرورت ہوئی توشکست وریخت کی مرمت کرادی، مگر یہ اعمال محض بے جان اور بے روح تھے، کیونکہ مشرک کو جب خدا کی صحیح معرفت حاصل نہیں تو کسی عمل میں اس کا قبلہ توجہ اور مرکز اخلاص خدائے وحدہ لاشریک لہ کی ذات منبع الکمالات نہیں ہوسکتی، اسی لیے کافر کا کوئی عمل خدا کے نزدیک زندہ اور معتد بہ عمل نہیں ہے (اسی کو حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ سے تعبیر فرمایا)۔

الغرض کفار ومشرکین جو اپنے حال وقال سے اپنے کفر وشرک پر ہر وقت شہادت دیتے رہتے ہیں، اس لائق نہیں کہ ان سے مساجد اللہ خصوصاً مسجد حرام کی حقیقی تعمیر (آبادی) ہوسکے، یہ کام صرف ان لوگوں کا ہے جو دل سے خدائے واحد اور آخری دن پر ایمان لا چکے ہیں، جوارح سے نمازوں کی اقامت میں مشغول رہتے ہیں، اموال میں سے باقاعدہ زکوۃ ادا کرتے ہیں اور خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے، اسی لیے مساجد کی صیانت وتطہیر کی خاطر جہاد کے لیے تیار رہتے ہیں، ایسے مومنین جو دل، زبان، ہاتھ پاؤں، مال ودولت، ہر چیز سے خدا کے مطیع وفرمانبردار ہیں ان کا فرض منصبی ہے کہ مساجد کو آباد رکھیں اور تعمیر مساجد کے جھوٹے دعوے رکھنے والے مشرکین کو خواہ اہل قرابت ہی کیوں نہ ہوں وہاں سے نکال باہر کریں کیونکہ ان کے وجود سے مساجد اللہ کی آبادی نہیں بربادی ہے۔

اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَآجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَجٰهَدَ

کیا تم نے کر دیا حاجیوں کا پانی پلانا اور مسجد الحرام کا بسانا برابر اس کے جو یقین لایا اللہ پر اور آخرت کے دن پر اور لڑا

فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ⑲

اللہ کی راہ میں، یہ برابر نہیں ہیں اللہ کے نزدیک، اور اللہ راستہ نہیں دیتا ظالم لوگوں کو

خلاصہ تفسیر: گزشتہ مضمون کے ضمن میں ایک اختلافی مسئلہ کا جواب بھی دیتے ہیں جس میں اُس وقت گفتگو ہوئی تھی، وہ مسئلہ یہ تھا کہ ایمان کے بعد تمام اعمال میں افضل کونسا عمل ہے مسجد حرام کی خدمت کرنا افضل ہے یا حاجیوں کو پانی پلانا یا جہاد کرنا۔

کیا تم لوگوں نے حجاج کے پانی پلانے کو اور مسجد حرام کے آباد رکھنے کو اس شخص (کے عمل) کے برابر قرار دے لیا جو کہ اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان لایا ہو، اور اس نے اللہ کی راہ میں جہاد کیا ہو (وہ عمل ایمان اور جہاد ہے، یعنی یہ اعمال ایمان اور جہاد کے برابر نہیں اور جب اعمال برابر نہیں تو) یہ (عامل) لوگ (بھی باہم) برابر نہیں اللہ کے نزدیک (مقصود یہ ہے کہ ایمان اور جہاد ہر ایک افضل ہے مسجدوں کی خدمت سے بھی اور حجاج کو پانی پلانے سے بھی، یعنی ایمان بھی ان دونوں سے افضل ہے، اس سے مشرکین کا جواب ہوگیا کیونکہ ان میں ایمان ہی نہ تھا، اور جہاد بھی دونوں سے افضل ہے، اس سے ان مسلمانوں کا جواب ہوگیا جو ایمان کے بعد مسجد کی خدمت اور حجاج کے پانی پلانے کو جہاد پر فضیلت دیتے تھے) اور (یہ بات بہت ہی ظاہر ہے لیکن) جو لوگ بے انصاف ہیں (مراد مشرک ہیں) اللہ تعالیٰ ان کو سمجھ نہیں دیتا (اس لئے وہ نہیں مانتے بخلاف اہل ایمان کے کہ وہ اس تحقیق کو فوراً مان گئے)۔

* * *

فائدہ: مشرکین مکہ کو اس پر بڑا فخر وناز تھا کہ ہم حاجیوں کی خدمت کرتے، انہیں پانی پلاتے، کھانا کپڑا دیتے اور مسجد حرام کی مرمت یا کسوۃ کعبہ یا تیل بتی وغیرہ کا انتظام کرتے ہیں، اگر مسلمان اپنے جہاد وہجرت وغیرہ پر نازاں ہیں تو ہمارے پاس عبادات کا یہ ذخیرہ موجود ہے، ایک زمانہ میں حضرت عباسؓ نے بھی حضرت علیؓ کے مقابلہ میں اسی طرح کی بحث کی تھی، بلکہ صحیح مسلم میں ہے کہ ایک دفعہ چند مسلمان آپس میں جھگڑ رہے تھے، کوئی کہتا تھا کہ میرے نزدیک اسلام لانے کے بعد حاجیوں کو پانی پلانے سے زیادہ کوئی عبادت نہیں، دوسرے نے کہا میرے خیال میں اسلام کے بعد بہترین عمل مسجد حرام کی خدمت ہے، (مثلاً جھاڑو دینا یا روشنی وغیرہ کرنا) تیسرا بولا کہا جہاد فی سبیل اللہ تمام عبادات واعمال سے افضل واشرف ہے، حضرت عمرؓ نے ان

کوڈانٹا کہ تم جمعہ کے وقت منبر رسول ﷺ کے پاس بیٹھ کر اس طرح بحثیں کر رہے ہو، ذرا صبر کرو، جب حضور جمعہ سے فارغ ہو جائیں گے تو آپ سے یہ چیز دریافت کر لی جائے گی، چنانچہ جمعہ کے بعد حضور سے سوال کیا تو یہ آیات نازل ہوئیں: اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَاۗجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَجٰهَدَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ (یعنی حاجیوں کو پانی پلانا اور مسجد حرام کا ظاہری طور پر بسانا، ایمان باللہ اور جہاد فی سبیل اللہ میں سے کسی ایک کے برابر بھی نہیں ہو سکتا (افضل ہونا تو کجا؟)۔

یہاں جہاد کے ساتھ ایمان باللہ کا ذکر یا تو اس لیے کیا کہ مشرکین کے فخر وغرور کا جواب بھی ہو جائے کہ تمام عبادات کی روح ایمان باللہ ہے، اس روح کے بدون پانی پلانا یا مسجد حرام کی خدمت کرنا محض مردہ عمل ہے تو یہ بے جان اور مردہ عمل ایک زندہ جاوید عمل کی برابری کیسے کر سکتا ہے: وَمَا يَسْتَوِي الْاَحْيَاۗءُ وَلَا الْاَمْوَاتُ (فاطر: ۲۲) اور اگر صرف مومنین کے اعمال کا باہمی موازنہ کرنا ہے تو ایمان باللہ کا ذکر جہاد فی سبیل اللہ کی تمہید کے طور پر ہوگا، اصل مقصود جہاد وغیرہ عزائم اعمال کی افضلیت کو بیان فرمانا ہے، ایمان کے ذکر سے تنبیہ فرما دی کہ جہاد فی سبیل اللہ ہو یا کوئی عمل: ایمان کے بغیر ہیچ اور لاشئے محض ہے، ان عزائم اعمال (جہاد وہجرت وغیرہ) کا تقوّم بھی ایمان باللہ سے ہوتا ہے اور اس نکتہ کو وہ ہی لوگ سمجھتے ہیں جو فہم سلیم رکھتے ہوں، ظالمین (بے موقع کام کرنے والوں) کی ان حقائق تک رسائی نہیں ہوتی۔

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۙ اَعْظَمُ دَرَجَةً

جو ایمان لائے اور گھر چھوڑ آئے اور لڑے اللہ کی راہ میں اپنے مال اور جان سے ان کے لیے بڑا درجہ ہے

عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفَاۗىِٕزُوْنَ ۝۲۰

اللہ کے ہاں، اور وہی مراد کو پہنچنے والے ہیں

خلاصہ تفسیر: (اب آگے ان مذکورہ اعمال کے برابر نہ ہونے کو وضاحت سے بیان فرماتے ہیں:) جو لوگ ایمان لائے اور (اللہ کے واسطے) انہوں نے ترک وطن کیا اور اللہ کی راہ میں اپنے مال اور جان سے جہاد کیا وہ درجہ میں اللہ کے نزدیک (حجاج کو پانی پلانے اور مسجد کی خدمت کے مقابلہ میں) بہت بڑے ہیں (کیونکہ اگر پانی پلانے اور مسجد کی خدمت کرنے والوں میں ایمان نہ ہو تب تو ان کے واسطے کچھ بھی بڑائی نہیں، اور اگر ان میں ایمان ہو تو اگر چہ یہ دونوں عمل بھی بڑے ہیں مگر جہاد اور ہجرت کرنے والے ان سے زیادہ بڑے ہیں) اور یہی لوگ پورے کامیاب ہیں (کیونکہ ان مہاجر و مجاہد کے مقابل لوگوں میں اگر ایمان نہ ہو تب تو ان کے واسطے کچھ بھی کامیابی نہیں، اور کامیابی انہی دو میں منحصر ہے، اور اگر ایمان ہو تو کامیاب سب ہیں، مگر مہاجر و مجاہد کی کامیابی، پانی پلانے اور مسجد کی خدمت کرنے والوں سے اعلیٰ ہے)۔

يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ ۝۲۱ۙ

خوشخبری دیتا ہے ان کو پروردگار ان کا اپنی طرف سے مہربانی کی اور رضامندی کی اور باغوں کی کہ جن میں ان کو آرام ہے ہمیشہ کا

خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝۲۲

رہا کریں ان میں مدام، بیشک اللہ کے پاس بڑا ثواب ہے۔

خلاصہ تفسیر: (آگے اس درجہ اور کامیابی کا بیان ہے کہ) ان کا رب ان کو بشارت دیتا ہے اپنی طرف سے بڑی رحمت اور بڑی رضامندی اور (جنت کے) ایسے باغوں کی ان کے لئے کہ ان (باغوں) میں دائمی نعمت ہوگی (اور) ان میں یہ ہمیشہ ہمیشہ کو رہیں گے، بلاشبہ اللہ کے

پاس بڑا اَجر ہے (اس میں سے ان کو دیا جائے گا)۔

* * * *

فائدہ: ⚐ یعنی اس کے یہاں ثواب اور درجات کی کیا کمی ہے جس کو جتنا چاہے مرحمت فرمائے، پہلی آیت میں تین چیزوں کا ذکر تھا: ① ایمان ② جہاد ③ ہجرت، ان تین پر بشارت بھی تین چیزوں کی دی: ① رحمت ② رضوان ③ خلود فی الجنۃ۔

ابوحیان نے لکھا ہے کہ ''رحمت'' ایمان پر مرتب ہے، ایمان نہ ہوتو آخرت میں خدا کی رحمت و مہربانی سے کوئی حصہ نہیں مل سکتا اور ''رضوان'' (جو بہت ہی اعلیٰ مقام ہے) جہاد فی سبیل اللہ کا صلہ ہے، مجاہد فی سبیل اللہ تمام نفسانی حظوظ و تعلقات ترک کر کے خدا کے راستہ میں جان و مال نثار کرتا اور خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے انتہائی قربانی پیش کرتا ہے، لہذا اس کا صلہ بھی انتہائی ہونا چاہیے اور وہ حق تعالیٰ شانہ کی رضاء کا مقام ہے، باقی ''ہجرت'' وہ خدا کے لیے وطن مالوف اور گھر بار چھوڑنے کا نام ہے، اس لیے مہاجر کو خوشخبری دی گئی کہ تیرے وطن سے بہتر وطن اور تیرے گھر سے بہتر گھر تجھ کو ملے گا، جس میں ہمیشہ اعلیٰ درجہ کی آسائش و راحت سے رہنا ہوگا جس سے ہجرت کرنے کی کبھی نوبت نہ آئے گی۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْۤا اٰبَآءَكُمْ وَاِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ

اے ایمان والو مت پکڑو اپنے باپوں کو اور بھائیوں کو رفیق اگر وہ عزیز رکھیں کفر کو

عَلَى الْاِيْمَانِ ؕ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۳﴾

ایمان سے، اور جو تم میں ان کی رفاقت کرے سو وہی لوگ ہیں گناہ گار

خلاصہ تفسیر: پیچھے ہجرت کا ذکر تھا جس میں وطن، عزیز و اقارب اور مال و جائیداد وغیرہ سے قطع تعلق کرنا پڑتا ہے جو کہ طبعی طور پر گراں معلوم ہوتا ہے، اور کسی وقت ہجرت نہ کرنے کا سبب ہو سکتا ہے، اس لیے اب آگے ان تعلقات کے غلبہ کی مذمت بیان فرماتے ہیں۔

اے ایمان والو! اپنے باپوں کو اور اپنے بھائیوں کو (اپنا) رفیق مت بناؤ اگر وہ لوگ کفر کو بمقابلہ ایمان کے (ایسا) عزیز رکھیں (کہ ان کے ایمان لانے کی امید نہ رہے) اور جو شخص تم میں سے ان کے ساتھ رفاقت رکھے گا سو ایسے لوگ بڑے نافرمان ہیں (مطلب یہ کہ ہجرت کرنے میں بڑا مانع ان لوگوں کا تعلق ہے اور خود ہی جائز نہیں پھر ہجرت میں کیا دشواری ہے)۔

لَا تَتَّخِذُوْۤا اٰبَآءَكُمْ وَاِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَآءَ: رشتہ داری اور دوستی کے سارے تعلقات پر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کا تعلق مقدم ہے، جو تعلق اس سے ٹکرائے وہ توڑنے کے قابل ہے، صحابہ کرام کا وہ عمل جس کی وجہ سے وہ ساری امت سے افضل و اعلیٰ قرار پائے یہی چیز تھی کہ انہوں نے رسول کریم ﷺ پر اپنی جان و مال اور ہر رشتہ و تعلق کو قربان کر دیا تھا۔

اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ: اسْتَحَبُّوا کی جو تفسیر کی گئی ہے اس سے ایک مسئلہ مستنبط ہوا کہ جس کافر کے اسلام کی امید ہو، اور اسی مصلحت کی وجہ سے اس سے تعلق رکھے تو یہ جائز ہے۔

* * *

فائدہ: پچھلی آیات میں بتلایا تھا کہ جہاد و ہجرت اعظم و افضل ترین اعمال ہیں، بسا اوقات ان دونوں اعمال میں خویش و اقارب، کنبہ اور برادری کے تعلقات خلل انداز ہوتے ہیں، اس لیے فرمادیا کہ جن لوگوں کو ایمان سے زیادہ کفر عزیز ہے، ایک مومن انہیں کیسے عزیز رکھ سکتا ہے، مسلمان کی شان نہیں کہ ان سے رفاقت اور دوستی کا دم بھرے حتی کہ یہ تعلقات اس کو جہاد و ہجرت سے مانع ہو جائیں، ایسا کرنے والے گنہگار بن کر اپنی جانوں پر ظلم کر رہے ہیں۔

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ اقْتَرَفْتُمُوْهَا

تو کہہ دے اگر تمہارے باپ اور بیٹے اور بھائی اور عورتیں اور برادری اور مال جو تم نے کمائے ہیں

وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ

اور سوداگری جس کے بند ہونے سے تم ڈرتے ہو اور حویلیاں جن کو پسند کرتے ہو تم کو زیادہ پیاری ہیں اللہ سے اور اسکے رسول سے اور لڑنے سے

فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۴﴾ ع

اس کی راہ میں تو انتظار کرو یہاں تک کہ بھیجے اللہ اپنا حکم، اور اللہ راستہ نہیں دیتا نافرمان لوگوں کو

خلاصہ تفسیر: (اب اسی گذشتہ مضمون کی زیادہ تفصیل ہے کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم!) آپ (ان سے) کہہ دیجئے کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارا کنبہ اور وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور وہ تجارت جس میں نکاسی نہ ہونے کا تم کو اندیشہ ہو اور وہ گھر جن میں (رہنے) کو تم پسند کرتے ہو (اگر یہ چیزیں) تم کو اللہ سے اور اس کے رسول سے (یعنی خدا اور رسول کے احکام سے جن میں ہجرت بھی داخل ہے) اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ پیاری ہوں تو تم منتظر رہو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا حکم (ہجرت چھوڑنے کی سزا کا) بھیج دیں (جیسا دوسری آیت میں ہے: ان الذین توفّٰھم الملٰئکۃ الی قولہ فاولئک ماوٰھم جھنم) اور اللہ تعالیٰ بے حکمی کرنے والے لوگوں کو ان کے مقصود تک نہیں پہنچاتا (یعنی ان کا مقصود تھا ان چیزوں سے فائدہ اٹھانا، وہ بہت جلد ان کی توقع کے خلاف موت سے منقطع ہو جاتا ہے)۔

ہجرت کرنے سے یہی اندیشے ہوتے تھے کہ عزیز چھوٹ جائیں گے، مال و جائیداد وغیرہ پریشان اور تلف ہو جائیں گے، تجارت کا انتظام اور سلسلہ بگڑ جائے گا، یہ آرام کے گھر جن میں رہتے ہیں چھوٹ جائیں گے۔

اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ: ان اشیاء کا زیادہ پیارا ہونا جو برا ہے تو اس سے مراد وہ محبت ہے جو احکام الٰہی و نبوی پر عمل کرنے سے باز رکھے، طبعی میلان مراد نہیں ہے۔

وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ: یہاں جہاد کو صراحت کے ساتھ بیان فرمانے سے مبالغہ مقصود ہے کہ ہجرت تو پھر بھی آسان ہے، شریعت کا مطلوب تو یہ ہے کہ جہاد کو بھی ان چیزوں پر ترجیح دی جائے جس میں کبھی اپنی جانوں اور کبھی اپنے عزیزوں کی جانوں کو بے قدر اور ہیچ سمجھنا پڑتا ہے اگر کسی وقت عزیزوں سے مقابلہ ہو جائے۔

* * *

فائدہ: یعنی اگر خدا اور رسول کے احکام کا امتثال اور ہجرت یا جہاد کرنے سے یہ خیال مانع ہو کہ کنبہ برادری چھوٹ جائے گی، اموال تلف ہوں گے، تجارت مندی پڑ جائے گی، یا بند ہو جائے گی، آرام کے مکانوں سے نکل کر بے آرام ہونا پڑے گا، تو پھر خدا کی طرف سے حکم سزا کا انتظار کرو، جو اس تن آسانی اور دنیا طلبی پر آنے والا ہے، جو لوگ مشرکین کی موالات یا دنیاوی خواہشات میں پھنس کر احکام الٰہیہ کی تعمیل نہ کریں ان کو حقیقی کامیابی کا راستہ نہیں مل سکتا، حدیث میں ہے کہ جب تم بیلوں کی دم پکڑ کر کھیتی باڑی پر راضی ہو جاؤ گے اور جہاد چھوڑ بیٹھو گے تو خدا تم پر ایسی ذلت مسلط کر دے گا جس سے کبھی نکل نہ سکو گے یہاں تک کہ پھر اپنے دین (جہاد فی سبیل اللہ) کی طرف واپس آؤ۔

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِیْ مَوَاطِنَ كَثِیْرَةٍ ۙ وَّیَوْمَ حُنَیْنٍ ۙ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ

مدد کرچکا ہے اللہ تمہاری بہت میدانوں میں اور حنین کے دن جب خوش ہوئے تم اپنی کثرت پر

فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَیْـًٔا وَّضَاقَتْ عَلَیْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّیْتُمْ مُّدْبِرِیْنَ ﴿۲۵﴾

پھر وہ کچھ کام نہ آئی تمہارے اور تنگ ہوگئی تم پر زمین باوجود اپنی فراخی کے پھر ہٹ گئے تم پیٹھ دے کر

خلاصہ تفسیر: پیچھے براءت اور فتح مکہ کا ذکر تھا، اب غزوہ حنین کا ذکر ہے اور ان کے درمیان مناسبت ظاہر ہے، نیز پیچھے خدا کے سوا تعلقات کو منقطع کرنے کا بیان تھا اور قصہ حنین سے اس کی تائید بھی ہوتی ہے کہ غیر اللہ پر نظر کرنے سے نقصان ہوا، جبکہ اللہ سے تعلق کافی اور نافع ہوا۔

تم کو خدا تعالیٰ نے (لڑائی کے) بہت موقعوں میں (کفار پر) غلبہ دیا (جیسے بدر وغیرہ میں) اور حنین کے دن بھی (تم کو غلبہ دیا جس کا قصہ عجیب وغریب ہے) جبکہ (یہ واقعہ ہوا تھا کہ) تم کو اپنے مجمع کی کثرت سے غرہ (عجب وغرور پیدا) ہوگیا تھا، پھر وہ کثرت تمہارے کچھ کارآمد نہ ہوئی اور (کفار کے تیر برسانے سے تمہیں ایسی پریشانی ہوئی کہ) تم پر زمین باوجود اپنی (اس) فراخی کے تنگی کرنے لگی، پھر (آخر) تم پیٹھ دے کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ: اس پر یہ شبہ نہ کیا جائے کہ عجب وغرور ہونے سے تو مغلوبیت ہوئی، پھر غلبہ کا تعلق اس کے ساتھ کیونکر ہوا؟ جواب یہ ہے کہ غلبہ کا تعلق صرف اسی مضمون کے ساتھ نہیں ہے، بلکہ پورے قصہ سے اس کا تعلق ہے اور قصہ میں مجموعی طور پر غلبہ کا ہونا یقینی ہے۔

اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَیْـًٔا: اس میں دلالت ہے کہ بندہ کو غیر اللہ کی طرف نظر اور اس پر عجب وغرور نہیں کرنا چاہیے۔

غزوہ حنین کا قصہ: حنین مکہ اور طائف کے درمیان میں ایک مقام ہے، یہاں قبیلہ ہوازن اور ثقیف سے فتح مکہ کے دو ہفتہ بعد لڑائی ہوئی تھی، مسلمان بارہ ہزار اور مشرکین چار ہزار تھے، بعض مسلمان اپنا مجمع دیکھ کر ایسے طور پر کہ اس سے عجب اور پندار ٹپکتا تھا کہنے لگے کہ ہم آج کسی طرح مغلوب نہیں ہو سکتے، چنانچہ پہلے مقابلہ میں کفار کو شکست ہوئی، اس وقت بعض مسلمان غنیمت جمع کرنے لگے تو پھر کفار نے دوبارہ حملہ کیا، اور وہ بڑے تیرانداز تھے، مسلمانوں پر تیر برسانے شروع کیے، اس گھبراہٹ میں مسلمانوں کے پاؤں اکھڑ گئے، صرف رسول اللہ ﷺ چند صحابہ کے ساتھ میدان میں رہ گئے، آپ نے حضرت عباسؓ سے مسلمانوں کو آواز دلوائی، پھر سب لوٹ کر ان سے دوبارہ مقابل ہوئے اور آسمان سے فرشتوں کی مدد آئی، آخر کفار بھاگے اور بہت سے قتل اور بہت سے قید ہوئے، پھر ان قبیلوں کے بہت آدمی آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام سے مشرف ہوئے، اور آپ نے ان کے اہل وعیال جو پکڑے تھے سب ان کو واپس کر دیے۔

❋ ❋ ❋

فائدہ: پچھلی آیت میں تنبیہ کی گئی تھی کہ جہاد فی سبیل اللہ کے وقت مومنین کو کنبہ، برداری، اموال واملاک وغیرہ کسی چیز پر نظر نہ ہونی چاہیے، یہاں آگاہ فرمایا ہے کہ مجاہدین کو خود اپنی فوجی جمعیت وکثرت پر گھمنڈ نہ کرنا چاہیے، نصرت وکامیابی اکیلے خدا کی مدد سے ہے، جس کا تجربہ پیشتر بھی بہت سے میدانوں میں تم کر چکے ہو، بدر، قریظہ ونضیر اور حدیبیہ وغیرہ میں جو کچھ نتائج رونما ہوئے، وہ محض امداد الٰہی وتائید غیبی کا کرشمہ تھا، اور اب اخیر میں غزوہ حنین کا واقعہ تو ایسا صریح اور عجیب وغریب نشان آسمانی نصرت وامداد کا ہے جس کا اقرار سخت معاند دشمنوں تک کو کرنا پڑا ہے۔

ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ

پھر اتاری اللہ نے اپنی طرف سے تسکین اپنے رسول پر اور ایمان والوں پر اور اتاریں فوجیں کہ جن کو تم نے نہیں دیکھا اور عذاب دیا

الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ وَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۶﴾

کافروں کو، اور یہی سزا ہے منکروں کی [۱]

خلاصہ تفسیر: اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول (کے دل) پر اور دوسرے مومنین (کے دلوں) پر اپنی (طرف سے) تسلی نازل فرمائی، اور (مدد کے لئے) ایسے لشکر (آسمان سے) نازل فرمائے جن کو تم نے نہیں دیکھا (مراد فرشتے ہیں، جس کے بعد تم پھر قتال پر مستعد ہو گئے اور غالب آئے) اور (اللہ تعالیٰ نے) کافروں کو سزا دی (کہ ان پر قتل وقید اور شکست کی مصیبت پڑی، مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ کفار کے لیے اسی سزا کا واقع ہونا ضروری ہے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ مصیبت کہیں ان پر واقع ہو تو وہ سزا کے طور پر ہے) اور یہ کافروں کی (دنیا میں) سزا ہے۔

اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ: رسول اللہ ﷺ کی تسلی اور صحابہ کی تسلی میں فرق ہے، حضور پر خاص قسم کی تسلی نازل ہوئی جس سے غلبہ کی امید قریب ہو گئی، اور جو صحابہ آپ کے ساتھ ثابت قدم رہے ان پر تسلی نازل ہونے کے معنی یہ ہیں کہ وہ آپ کے ساتھ جمے رہے، اور جو ہٹ گئے تھے ان پر تسلی نازل ہونے کے معنی یہ ہیں کہ وہ پھر میدان میں آ گئے۔

وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا: یہ جو فرمایا کہ تم نے فرشتوں کو دیکھا نہیں، پس اگر اتفاقاً ایک آدھ کا دیکھنا ثابت ہو جائے تو کچھ اشکال نہیں۔

ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ: اس پر دلالت ہے کہ عجب وغرور کا نہ ہونا سکینہ وتسلی کے نزول کا سبب ہوتا ہے (جیسا کہ عجب وغرور کرنا شکست وہزیمت کا باعث ہوتا ہے) سکینہ کی تفاسیر کا حاصل یہ ہے کہ قلب کا قرار پانا، احکام قضا پر راضی رہنا اور لذات وخواہشات کے خاتمہ کے ساتھ حق تعالیٰ کی معیت کا حاصل ہو جانا۔

* * *

فائدہ: [۱] فتح مکہ کے بعد فوراً آپ کو اطلاع ملی کہ ہوازن وثقیف وغیرہ بہت سے قبائل عرب نے ایک لشکر جرار تیار کر کے بڑے ساز و سامان سے مسلمانوں پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا ہے، یہ خبر پاتے ہی آپ نے دس ہزار مہاجرین وانصار کی فوج گراں لے کر جو مکہ فتح کرنے کے لیے مدینہ سے ہمراہ آئی تھی طائف کی طرف کوچ کر دیا، دو ہزار طلقاء بھی جو فتح مکہ کے وقت مسلمان ہوئے تھے، آپ کے ہمراہ تھے، یہ پہلا موقع تھا کہ بارہ ہزار کی عظیم الشان جمعیت کیل کانٹے سے لیس ہو کر میدان میں نکلی، یہ منظر دیکھ کر بعض صحابہ سے نہ رہا گیا اور بے ساختہ بول اٹھے کہ (جب ہم بہت تھوڑے تھے اس وقت ہمیشہ غالب رہے تو) آج ہماری اتنی بڑی تعداد کسی سے مغلوب ہونے والی نہیں، یہ جملہ مردان توحید کی زبان سے نکلنا بارگاہ احدیت میں ناپسند ہوا، ابھی مکہ سے تھوڑی دور نکلے تھے کہ دونوں لشکر مقابل ہو گئے۔

فریق مخالف کی جمعیت چار ہزار تھی جو سر کو کفن باندھ کر اور سب عورتوں، بچوں کو ساتھ لے کر ایک فیصلہ کن جنگ کے لیے پوری تیاری سے نکلے تھے، اونٹ گھوڑے، مواشی اور گھروں کا کل اندوختہ کوڑی کوڑی کر کے اپنے ہمراہ لے آئے تھے، ہوازن کا قبیلہ تیر اندازی کے فن میں سارے عرب میں شہرت رکھتا تھا، اس کے بڑے ماہر تیر اندازوں کا دستہ وادی حنین کی پہاڑیوں میں گھات لگائے بیٹھا تھا، صحیحین میں براء بن عازب کی روایت ہے کہ پہلے معرکہ میں کفار کو ہزیمت ہوئی، وہ بہت سامال چھوڑ کر پسپا ہو گئے، یہ دیکھ کر مسلمان سپاہی غنیمت کی طرف جھک پڑے، اس وقت ہوازن کے تیر اندازوں نے گھات سے نکل کر ایک دم دھاوا بول دیا، آن واحد میں چاروں طرف سے اس قدر تیر برسائے کہ مسلمانوں کو قدم جمانا مشکل ہو گیا، اول طلقاء میں بھاگڑ پڑی، آخر سب کے پاؤں اکھڑ گئے، زمین باوجود فراخی کے تنگ ہو گئی کہ کہیں پناہ کی جگہ نہ ملتی تھی، حضور پر نور ﷺ مع چند رفقاء کے دشمنوں کے نرغہ میں تھے، ابو بکرؓ، عمرؓ، عباسؓ، علیؓ، عبداللہ بن مسعودؓ وغیرہ تقریباً سو یا اسی صحابہ بلکہ بعض اہل سیر کی تصریح کے موافق کل دس نفوس قدسیہ (عشرہ کاملہ) میدان جنگ میں باقی رہ گئے جو پہاڑ سے زیادہ مستقیم نظر آتے تھے۔

یہ خاص موقع تھا جبکہ دنیا نے پیغمبرانہ صداقت وتوکل اور معجزانہ شجاعت کا ایک محیر العقول نظارہ ان ظاہری آنکھوں سے دیکھا، آپ ﷺ سفید خچر پر سوار ہیں، عباس ایک رکاب اور ابوسفیان بن الحارث دوسری رکاب تھامے ہوئے ہیں، چار ہزار کا مسلح لشکر پورے جوش انتقام میں ٹوٹا پڑتا ہے، ہر چہار طرف سے تیروں کا مینہ برس رہا ہے، ساتھی منتشر ہوچکے ہیں، مگر رفیق اعلیٰ آپ کے ساتھ ہے، ربانی تائید اور آسمانی سکینہ کی غیر مرئی بارش آپ ﷺ کے گنے چنے رفیقوں پر ہورہی ہے، جس کا اثر آخر کار بھاگنے والوں تک پہنچتا ہے، جدھر سے ہوازن وثقیف کا سیلاب بڑھ رہا ہے، آپ کی سواری کا منہ اس وقت بھی اسی طرف ہے، اور ادھر ہی آگے بڑھنے کے لیے خچر کو مہیز کر رہے ہیں، دل سے خدا کی طرف لو لگی ہے، اور زبان پر نہایت استغناء و اطمینان کے ساتھ "أنا النبی لا کذب انا ابن عبدالمطلب" جاری ہے، یعنی بیشک میں سچا پیغمبر ہوں اور عبدالمطلب کی اولاد ہوں، اسی حالت میں آپ ﷺ نے صحابہ کو آواز دی: "إلیّ عباد اللہ إلیّ أنا رسول اللہ" خدا کے بندو! ادھر آؤ، یہاں آؤ کہ میں خدا کا رسول ہوں، پھر آپ ﷺ کی ہدایت کے موافق حضرت عباس نے (جو نہایت جیر الصوت تھے) اصحاب سمرہ کو پکارا جنہوں نے درخت کے نیچے حضور کے ہاتھ پر بیعت جہاد کی تھی، آواز کا کانوں میں پہنچنا تھا کہ بھاگنے والوں نے سواریوں کا رخ میدان جنگ کی طرف پھیر دیا، جس کے اونٹ نے رخ بدلنے میں دیر کی وہ گلے میں زرہ ڈال کر اونٹ سے کود پڑا اور سواری چھوڑ کر حضور ﷺ کی طرف لوٹا، اسی اثناء میں حضور ﷺ نے تھوڑی سی مٹی اور کنکریاں اٹھا کر لشکر پر پھینکیں جو خدا کی قدرت سے ہر کافر کے چہرے اور آنکھوں پر پڑی، ادھر حق تعالیٰ نے آسمان سے فرشتوں کی فوجیں بھیج دیں جن کا نزول غیر مرئی طور پر مسلمانوں کی تقویت وہمت افزائی اور کفار کی مرعوبیت کا سبب ہوا، پھر کیا تھا، کفار کنکریوں کے اثر سے آنکھیں ملتے رہے، جو مسلمان قریب تھے انہوں نے پلٹ کر حملہ کردیا آناً فاناً میں مطلع صاف ہوگیا، بہت سے بھاگے ہوئے مسلمان لوٹ کر حضور ﷺ کی خدمت میں پہنچے تو دیکھا لڑائی ختم ہوچکی، ہزاروں قیدی آپ کے سامنے بندھے کھڑے ہیں اور مال غنیمت کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں فَسُبۡحَانَ مَنۡ بِیَدِہٖ مَلَکُوۡتُ کُلِّ شَیۡءٍ اس طرح کافروں کو دنیا میں سزا دی گئی۔

ثُمَّ یَتُوۡبُ اللّٰہُ مِنۡۢ بَعۡدِ ذٰلِکَ عَلٰی مَنۡ یَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰہُ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۲۷﴾

پھر توبہ نصیب کرے گا اللہ اس کے بعد جس کو چاہے، اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے

خلاصہ تفسیر: پھر اللہ تعالیٰ (ان کافروں میں سے) جس کو چاہیں توبہ نصیب کردیں (چنانچہ بہت سے مسلمان ہوگئے) اور اللہ تعالیٰ بڑی مغفرت کرنے والے بڑی رحمت کرنے والے ہیں (کہ جو شخص ان میں مسلمان ہوا اُس کے سب پچھلے گناہ معاف کرکے اسے جنت کا مستحق بنادیا)۔

* * *

فائدہ: چنانچہ ہوازن وغیرہ کو اس کے بعد توبہ نصیب ہوئی، اور اکثر مسلمان ہوگئے۔

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنَّمَا الۡمُشۡرِکُوۡنَ نَجَسٌ فَلَا یَقۡرَبُوا الۡمَسۡجِدَ الۡحَرَامَ بَعۡدَ عَامِہِمۡ ہٰذَا ۚ

اے ایمان والو مشرک جو ہیں سو پلید ہیں سو نزدیک نہ آنے پائیں مسجد الحرام کے اس برس کے بعد ۱؎

وَ اِنۡ خِفۡتُمۡ عَیۡلَۃً فَسَوۡفَ یُغۡنِیۡکُمُ اللّٰہُ مِنۡ فَضۡلِہٖۤ اِنۡ شَآءَ ؕ اِنَّ اللّٰہَ عَلِیۡمٌ حَکِیۡمٌ ﴿۲۸﴾

اور اگر تم ڈرتے ہو فقر سے تو آئندہ غنی کردے گا تم کو اللہ اپنے فضل سے اگر چاہے بیشک اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے ۲؎

خلاصہ تفسیر: سورۃ کے شروع میں کفار ومشرکین سے براءت کا اعلان کیا تھا، اب اس سے متعلق احکام کا ذکر ہے، جس کا حاصل یہ تھا کہ سال بھر کے عرصہ میں تمام کفار کے معاہدات ختم یا پورے کردیئے جائیں، اور اعلان کے ایک سال بعد کوئی مشرک حدود حرم میں نہ رہنے پائے، اس اخراج کے حکم سے جو مسلمانوں کو تردد ہوا تھا کہ مال کی آمد بند ہوجائے گی ساتھ ہی اس بارہ میں بھی تسلی ہے۔

اے ایمان والو! مشرک لوگ (خبیث عقائد کی وجہ سے) نرے ناپاک ہیں، سو (اس ناپاکی پر جو احکام متفرع ہوئے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ) یہ لوگ اس سال کے بعد مسجد حرام (یعنی حرم) کے پاس (بھی) نہ آنے پائیں (یعنی حرم کے اندر داخل نہ ہوں) اور اگر تم کو (اس حکم کے جاری کرنے کی وجہ سے) مفلسی کا اندیشہ ہو (کہ لین دین زیادہ تر انہی سے متعلق ہے جب یہ نہ رہیں گے تو کام کیسے چلے گا) تو (تم خدا پر توکل رکھو) خدا تم کو اپنے فضل سے اگر چاہے گا (ان کا) محتاج نہ رکھے گا (چنانچہ یہ وعدہ اللہ تعالی نے اس طرح پورا کر دیا کہ تاجر قوموں کو مسلمان کر دیا، وہ ہر طرح کا مال مکہ میں لانے لگے) بیشک اللہ تعالی (احکام کی مصلحتوں کو) خوب جاننے والا ہے (اور ان مصلحتوں کی تکمیل کے باب میں) بڑا حکمت والا ہے (اس لئے یہ حکم مقرر کیا اور تمہارے افلاس کو ختم کرنے کا سامان بھی کر دے گا)۔

اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ: اصل مقصود یہاں اسی حکم کا بیان کرنا ہے اور: اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ یعنی مشرک لوگ ناپاک ہیں میں اس کی ایک حکمت بتلادی کہ ایسے مقدس مقام میں ایسے ایسے ناپاک دل والوں کا کیا کام، اور در منثور میں مؤطا سے منقول ہے کہ "مسجد حرام" سے سارا حرم مراد ہے، اور احادیث سے ثابت ہے کہ تمام جزیرہ عرب کا یہی حکم ہے مشرکین کے لیے بھی اور یہود و نصاری کے لیے بھی، چنانچہ حضور ﷺ کی وصیت کے مطابق حضرت عمرؓ کے زمانہ میں تمام جزیرہ عرب میں یہ قانون نافذ ہوگیا اور کفار وہاں سے نکال دیے گئے، اور فقہ حنفی کی رو سے اس کا مطلب یہ ہے کہ کفار جزیرہ عرب میں بطور سکونت یا غلبہ کے داخل نہ ہوں، اور نہ رہ سکیں گے کہ یہ ناجائز ہے، اور مسافرانہ طور پر امام کی اجازت سے آنا اگر امام کے نزدیک خلاف مصلحت نہ ہو تو جائز ہے، اور جب حرم کے اندر آنے کی اجازت دینا جائز ہے تو مسجد حرام بھی اسی حکم میں ہے، البتہ حج اور عمرہ کی کفار کو اجازت نہیں اس لیے کہ حدیث میں حکم آچکا ہے: "الا لا يحجن بعد العام مشرك"۔

مشرک لوگ ناپاک ہیں سو مسجد حرام کے نزدیک نہ آئیں، اسی پر قیاس کر کے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ جس شخص میں غیر اللہ کی طرف میلان کی گندگی ہوگی وہ حضرت باری تعالی کے لائق نہیں، اور آیت میں جیسے مشرکین کے ساتھ میل جول سے ممانعت ہے اسی پر قیاس کیا جاتا ہے کہ دنیاداروں اور اہل اللہ کو برا کہنے والوں کی صحبت سخت نقصان دہ ہے اس سے بھی بچنا چاہیے۔

فَسَوْفَ يُغْنِيْكُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ: مطلب یہ کہ اگر تم خدا پر بھروسہ رکھو تو وہ اپنے فضل سے اگر چاہے گا تو ان کا محتاج نہ رکھے گا، اس سے معلوم ہوا کہ دنیاوی مصلحت کو پورا کرنے کی خاطر دینی مصلحت میں رکاوٹ نہیں ہونی چاہیے، یعنی اگر دینی مصلحت کے راستے میں دنیاوی مصلحت رکاوٹ بن جائے تو دنیاوی مصلحت کو چھوڑنا ہوگا، اور اگر ان دونوں میں تصادم ہو تو اللہ پر توکل کے ذریعے علاج کرنا چاہیے۔

مِنْ فَضْلِهٖٓ اِنْ شَآءَ: یہاں "اگر چاہیں گے" کی قید لگانے کا مطلب یہ نہیں کہ اس وعدہ پورا ہونے میں کوئی شک یا تردد ہے، بلکہ اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ صرف مادی اسباب پر نظر رکھنے والوں کے لئے اگرچہ یہ بات بہت بعید اور مشکل نظر آتی ہے کہ ظاہری ذریعہ معاش یہی غیر مسلم تھے، ان کا داخلہ ممنوع کرنا اپنے لئے اسباب معاش منقطع کرنے کے مترادف ہے، مگر ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ تعالی ان مادی اسباب کا محتاج نہیں، جب ان کا ارادہ کسی کام سے متعلق ہو جائے تو سب اسباب مطابق ہوتے چلے جاتے ہیں، بس چاہنے کی دیر ہے اور کچھ نہیں، اس لئے اِنْ شَآءَ فرما کر اس کی طرف اشارہ کر دیا۔

* * *

فائدہ: ۱؎ جب حق تعالی نے شرک کی قوت کو توڑ کر جزیرۃ العرب کا صدر مقام (مکہ معظمہ) فتح کرا دیا اور قبائل عرب جوق جوق دائرہ اسلام میں داخل ہونے لگے تب ۹ ہجری میں یہ اعلان کرایا گیا کہ آئندہ کوئی مشرک (یا کافر) مسجد حرام میں داخل نہ ہو بلکہ اس کے نزدیک یعنی حدود حرم میں بھی نہ آنے پائے، کیونکہ ان کے قلوب شرک و کفر کی نجاست سے اس قدر پلید اور گندے ہیں کہ اس سب سے بڑے مقدس مقام اور مرکز توحید و ایمان میں داخل ہونے کے لائق نہیں، اس کے بعد صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ حضور ﷺ نے جزیرۃ العرب سے مشرکین اور یہود و نصاریٰ سب کے نکال دینے کا حکم دیا، چنانچہ حضور کی آخری وصیت کے موافق حضرت عمرؓ کے زمانہ میں یہ حکم عملاً نافذ ہوا، اب بطور استیلاء کفار کے وہاں رہنے پر مسلمانوں

کو رضامند ہونا جائز نہیں، بلکہ تطہیر جزیرۃ العرب بقدر استطاعت ان کا فریضہ ہے، ہاں حنفیہ کے نزدیک کوئی کافر مسافرانہ عارضی طور پر امام کی اجازت سے وہاں جاسکتا ہے بشرطیکہ امام اتنی اجازت دینا خلاف مصلحت نہ سمجھے، باقی حج وعمرہ کی غرض سے داخل ہونے کی کسی کافر کو اجازت نہیں، کما ورد فی الحدیث: "الا لا یحجن بعد العام مشرك"

فائدہ: ۲ حرم میں مشرکین کی آمد ورفت بند کردینے سے مسلمانوں کو اندیشہ ہوا کہ تجارت وغیرہ کو بڑا نقصان پہنچے گا، اور جو سامان تجارت یہ لوگ لاتے تھے، وہ نہیں آئے گا، اس لیے تسلی کردی کہ اس سے مت گھبراؤ تم کو غنا عطا فرمانا محض اس کی مشیت پر موقوف ہے، وہ چاہے گا تو کچھ دیر نہ لگے گی، چنانچہ یہ ہی ہوا، خدا نے سارا ملک مسلمان کردیا، مختلف بلاد وامصار سے تجارتی سامان آنے لگا، بارشیں خوب ہوئیں جس سے پیداوار بڑھ گئی، فتوحات وغنائم کے دروازے کھل گئے اہل کتاب وغیرہ سے جزیہ کی رقوم وصول ہونے لگیں، غرض مختلف طرح سے حق تعالیٰ نے اسباب غناء جمع کردیئے، بیشک خدا کا کوئی حکم حکمت سے خالی نہیں۔

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ

لڑو ان لوگوں سے جو ایمان نہیں لاتے اللہ پر اور نہ آخرت کے دن پر اور نہ حرام جانتے ہیں اس کو جس کو حرام کیا اللہ نے اور اس کے رسول نے

وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ﴿۲۹﴾

اور نہ قبول کرتے ہیں دین سچا ان لوگوں میں سے جو کہ اہل کتاب ہیں یہاں تک کہ وہ جزیہ دیں اپنے ہاتھ سے ذلیل ہو کر

خلاصہ تفسیر: پیچھے مشرکین سے قتال کا بیان تھا، اب آگے اہل کتاب سے قتال کا بیان ہے، گویا یہ غزوہ تبوک کی تمہید ہے جو اہل کتاب کے مقابلہ میں پیش آیا تھا۔

اہل کتاب جو کہ نہ خدا پر (پورا پورا) ایمان رکھتے ہیں، اور نہ قیامت کے دن پر (پورا ایمان رکھتے ہیں) اور نہ ان چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں جن کو خدا تعالیٰ نے اور اس کے رسول (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) نے حرام بتلایا ہے، اور نہ سچے دین (اسلام) کو قبول کرتے ہیں ان سے یہاں تک لڑو کہ وہ ماتحت ہو کر اور رعیت بن کر جزیہ دینا منظور کریں۔

مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ: یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اہل کتاب یہود ونصاریٰ تو بظاہر خدا تعالیٰ پر بھی ایمان رکھتے ہیں، اور آخرت و قیامت کے بھی قائل ہیں، پھر ان کے ایمان کی نفی کیوں کی گئی؟ وجہ یہ ہے کہ محض ایمان لانے کے الفاظ تو کافی نہیں، جس طرح کا ایمان اللہ تعالیٰ کے نزدیک مطلوب ہے، جب اس طرح کا ایمان نہ ہوا تو وہ نہ ہونے کے حکم میں ہے، یہود ونصاری نے اگر چہ علانیہ طور پر توحید کا انکار نہیں کیا، مگر جیسا کہ اگلی آیت میں آرہا ہے کہ یہود نے حضرت عزیر علیہ السلام کو نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہہ کر اس کی خدائی میں شریک ٹھہرا دیا، اس لئے ان کا اقرار توحید لغو اور ایمان کا دعوی غلط ہوگیا، اسی طرح آخرت پر جس طرح کا ایمان مطلوب ہے وہ بھی اکثر اہل کتاب میں نہیں رہا تھا، ان میں سے بہت سے لوگ یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ قیامت میں حشر اجساد یعنی مادی اجسام کی دوبارہ زندگی نہ ہوگی، بلکہ ایک قسم کی روحانی زندگی ہوگی، اور جنت ودوزخ بھی کوئی خاص مقامات نہیں، روح کی خوشی کا نام جنت اور رنج کا نام جہنم ہے، جو ارشادات ربانی کے سراسر خلاف ہے، اس لئے یوم آخرت پر بھی ان کا ایمان درحقیقت ایمان نہ ہوا۔

حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ: جزیہ کے لفظی معنی بدلے اور جزاء کے ہیں، اصطلاح شرع میں اس سے مراد وہ رقم ہے جو کفار سے قتل کے بدلہ میں لی جاتی ہے، وجہ یہ ہے کہ کفر وشرک اللہ اور رسول کی بغاوت ہے جس کی اصلی سزا قتل ہے، مگر اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کاملہ سے ان کی سزا میں یہ تخفیف کردی کہ اگر وہ اسلامی حکومت کی رعیت بن کر عام اسلامی قانون کے ماتحت رہنا منظور کریں تو ان سے ایک معمولی رقم جزیہ کی لے کر چھوڑ دیا جائے، اس

اسلامی ملک کا باشندہ ہونے کی حیثیت سے ان کی جان و مال، آبرو کی حفاظت اسلامی حکومت کے ذمہ ہوگی، ان کی مذہبی رسوم میں کوئی مزاحمت نہ کی جائے، اسی رقم کو ''جزیہ'' کہا جاتا ہے، جزیہ کا تعین اگر باہمی مصالحت اور رضامندی سے ہو تو شرعاً اس کی کوئی تحدید نہیں، جتنی مقدار اور جس چیز پر باہمی معاہدہ صلح کا ہو جائے وہی ان سے لیا جائے گا۔

یہاں جزیہ کے حکم میں اہل کتاب کا خاص طور پر ذکر تمام کفار کے مقابلہ میں نہیں، بلکہ ان مشرکین عرب کے مقابلہ میں ہے جن کا پیچھے ذکر تھا، کیونکہ ان سے جزیہ نہیں لیا جاتا، ان سے اسلام ہے یا تلوار، البتہ جن کے قتل کی اجازت نہیں جیسے عورتیں اور بچے وہ لونڈی غلام بنا کر رکھے جائیں، اور احادیث سے ثابت ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے مجوس سے بھی جزیہ لیا ہے، اور عجم کے مشرکین مجوس کی طرح ہیں، بلکہ آیت میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرکین سے بدرجہ اولی جزیہ لیا جائے گا، کیونکہ جزیہ لینے کی وجہ آیت میں لا یؤمنون مذکور ہے، پس جزیہ کا مدار ایمان نہ لانا ٹھہرا، اور ظاہر ہے کہ یہ صفت مشرکین میں اہل کتاب سے زیادہ پائی جاتی ہے، کیونکہ اہل کتاب توحید اور قیامت کا اعتقاد تو رکھتے ہیں اگرچہ اس میں بھی وہ غلطیوں کا ارتکاب کرتے ہیں، اور مشرکین تو خود ان عقائد کے اصل ہی میں مخالف ہیں، پس ان پر جزیہ بدرجہ اولی ہوگا، البتہ مشرکین عرب خاص دلیل کی وجہ سے اس حکم سے مستثنیٰ ہیں۔

واضح رہے کہ جزیہ کفار سے قتل کی سزا دور کرنے کا معاوضہ ہے، اسلام کا بدلہ نہیں، اس لئے یہ شبہ نہیں ہو سکتا کہ تھوڑے سے دام لے کر اسلام نہ لانے اور کفر پر قائم رہنے کی اجازت کیسے دے دی گئی؟ یہ تو اسلام کی عظمت کے خلاف ہے، سو یہ اعتراض غلط گمان کی بنا پر ہے، درحقیقت جزیہ قتل کا معاوضہ ہے کہ اس کی وجہ سے ان کی جان بچ گئی، اور اس میں اسلام کی انتہائی درجہ عزت وعظمت ہے کہ اس نے جان کی اس قدر رعایت کی اور یہی وجہ ہے کہ جو لوگ جہاد میں قتل نہیں کیے جاتے جیسے عورتیں، بچے، بوڑھے، اپاہج اور تارک الدنیا راہب ان پر جزیہ نہیں، پس اگر جزیہ کفر پر قائم رہنے کا معاوضہ ہوتا تو ان پر بھی ضرور ہوتا، کیونکہ کفر میں تو یہ سب لوگ بھی شریک ہیں، غرض یہ کہ اسلامی حکومت میں رہنے کی اجازت بہت سے ان لوگوں کو بھی ملتی ہے جن سے جزیہ نہیں لیا جاتا، مثلاً عورتیں، بچے، بوڑھے، مذہبی پیشوا، اپاہج معذور، اگر جزیہ اسلام کا بدلہ ہوتا تو ان سے بھی لیا جانا چاہئے تھا۔

عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ: آیت مذکورہ میں عطاء جزیہ کے ساتھ جو عَنْ يَّدٍ فرمایا ہے اس میں حرف عَنْ بمعنی سبب اور يَدٌ بمعنی قوت و غلبہ ہے اور معنی یہ ہیں کہ یہ جزیہ کا دینا بطور اختیاری چندہ یا خیرات کے نہ ہو، بلکہ اسلامی غلبہ کو تسلیم کرنے اور اس کے ماتحت رہنے کی حیثیت سے ہو، یعنی ان کی شان وشوکت نہ رہے، اور وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ کے معنی امام شافعیؒ کی تفسیر کے مطابق یہ ہیں کہ وہ لوگ اسلام کے عام (جنرل) قانون کی اطاعت کو اپنے ذمہ لازم قرار دیں۔

* * *

فائدہ: جب مشرکین کا قصہ پاک ہو گیا اور ملکی سطح ذرا ہموار ہوئی تو حکم ہوا کہ اہل کتاب (یہود ونصاریٰ) کی قوت وشوکت کو توڑو، مشرکین کے وجود سے تو بالکل عرب کو پاک کر دینا مقصود تھا لیکن یہود ونصاریٰ کے متعلق اس وقت صرف اسی قدر مطمح نظر تھا کہ وہ اسلام کے مقابلہ میں زور نہ پکڑیں اور اس کی اشاعت وترقی کے راستہ میں حائل نہ ہوں، اس لیے اجازت دی گئی کہ اگر یہ لوگ ماتحت رعیت بن کر جزیہ دینا منظور کریں تو کچھ مضائقہ نہیں، قبول کرلو، پھر حکومت اسلامیہ ان کے جان ومال کی محافظ ہوگی، ورنہ ان کا اعلان بھی وہ ہی ہے جو مشرکین کا تھا (یعنی مجاہدانہ قتال) کیونکہ یہ بھی اللہ اور یوم آخرت پر جیسا چاہیے ایمان نہیں رکھتے نہ خدا اور رسول کے احکام کی کچھ پروا کرتے ہیں، رسول کریم ﷺ کی تو کجا، اپنے تسلیم کردہ نبی حضرت مسیح (علیہ السلام) کی سچی پیروی نہیں کرتے محض اہوا، وآراء کا اتباع کرتے ہیں، جو سچا دین پہلے آیا یعنی حضرت مسیح وغیرہ کے زمانہ میں، اور جواب نبی آخر الزماں ﷺ لے کر آئے، کسی کے قائل نہیں، بلکہ جیسا کہ عنقریب آتا ہے، اس کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ خدا کا روشن کیا ہوا چراغ اپنی پھونکوں سے گل کر دیں، ایسے بدباطن نالائقوں کو اگر یوں ہی چھوڑ دیا جائے تو ملک میں فتنہ وفساد اور کفر وتمرد کے شعلے برابر بھڑکتے رہیں گے۔

وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرُ ابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ

اور یہود نے کہا کہ عزیز اللہ کا بیٹا ہے ۱ے اور نصاریٰ نے کہا کہ مسیح اللہ کا بیٹا ہے یہ باتیں کہتے ہیں

بِاَفْوَاهِهِمْ ۚ يُضَاهِـُٔوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ ۭ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ ۚ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۝

اپنے منہ سے، ریس کرنے لگے اگلے کافروں کی بات کی ۲ے ہلاک کرے ان کو اللہ، کہاں سے پھرے جاتے ہیں ۳ے

خلاصہ تفسیر: گذشتہ آیت میں اہل کتاب کے متعلق فرمایا کہ وہ خدا اور قیامت کے دن پر پورا پورا ایمان نہیں رکھتے، چنانچہ اب آگے ان کے بے ایمان ہونے کی تفصیل بتاتے ہیں۔

اور یہود (میں سے بعض) نے کہا کہ (نعوذ باللہ) عزیر (علیہ السلام) خدا کے بیٹے ہیں، اور نصاریٰ (میں سے اکثر) نے کہا کہ مسیح (علیہ السلام) خدا کے بیٹے ہیں، یہ ان کا قول ہے ان کے منہ سے کہنے کا (جس کا واقع میں کہیں نام و نشان نہیں) یہ بھی ان لوگوں کی سی باتیں کرنے لگے جو ان سے پہلے کافر ہو چکے ہیں (مراد مشرکین عرب ہیں جو فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے، مطلب یہ کہ مشرکین کو تو اہل کتاب بھی کافر سمجھتے ہیں، پھر انہی کی سی کفریات بکتے ہیں، اور مشرکین کا پہلے ہونا اس وجہ سے ہے کہ ان کی گمراہی قدیم تھی) خدا اُن کو غارت کرے یہ کدھر الٹے جا رہے ہیں (کہ خدا پر ایسے بہتان باندھتے ہیں)۔

قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ: یعنی خدا ان کو غارت کرے، یہ ہلاکت کی بد دعا ہے، اس میں دلالت ہے کہ جو شخص ایسا کام کرے جس سے بد دعا کا مستحق ہوتا ہو تو اس کو بد دعا دینا حسن اخلاق کے خلاف نہیں ہے۔

* * *

فائدہ: ۱ے روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت بعض یہود کا یہ عقیدہ تھا کہ حضرت عزیر خدا کے بیٹے ہیں، لیکن یہ عقیدہ عام یہود کا نہ تھا اور نہ زمانہ مابعد میں تو بعض علماء نے لکھا ہے کہ اب کوئی یہودی اس عقیدے کا باقی نہیں رہا، اگر عہد نبوی ﷺ میں یہود کا کوئی فرقہ اس کا قائل نہ ہوتا تو ضرور تھا کہ اس وقت یہود قرآن کی حکایت کی تغلیط کرتے، جیسا کہ اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (التوبہ: ۳۱) کو سن کر عدی بن حاتم نے اعتراض کیا تھا کہ احبار و رہبان کو رب تو کوئی نہیں مانتا اس کا جواب نبی کریم ﷺ نے دیا جو آگے آتا ہے، پس ابنیت عزیر کے عقیدہ کو ان کی طرف نسبت کرنا، اور ان کا اعتراض و انکار کہیں منقول نہ ہونا اس کی دلیل ہے کہ ضرور اس وقت اس خیال کے لوگ موجود تھے، ہاں جیسے مرور دہور سے بہت سے مذاہب اور فرقے مٹ مٹا گئے، وہ بھی نابود ہو گیا ہو تو کچھ مستبعد نہیں، باقی ہم سے ایک نہایت ثقہ بزرگ (حاجی امیر شاہ خاں مرحوم) نے بیان کیا کہ سیاحت فلسطین وغیرہ کے دوران میں مجھے بعض یہود اس خیال کے ملے جن کو اسی عقیدہ کی نسبت سے "عزیری" کہا جاتا ہے، واللہ اعلم۔

فائدہ: ۲ے یعنی "ابنیت" یا "الوہیت" مسیح وغیرہ کا عقیدہ پرانے مشرکین کے عقیدہ کے مشابہ ہے، بلکہ ان ہی کی تقلید میں یہ اختیار کیا ہے، جیسا کہ سورۃ مائدہ کے فوائد میں ہم نقل کر چکے ہیں۔

فائدہ: ۳ے یعنی خدا ان کو غارت کرے توحید کی صاف اور تیز روشنی پہنچنے کے بعد کدھر اندھیرے میں چلے جا رہے ہیں۔

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ ۚ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا

ٹھہرا لیا اپنے عالموں اور درویشوں کو خدا اللہ کو چھوڑ کر ۱ے اور مسیح مریم کے بیٹے کو بھی، اور ان کو حکم یہی ہوا تھا

لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝

کہ بندگی کریں ایک معبود کی، کسی کی بندگی نہیں اس کے سوا، وہ پاک ہے ان کے شریک بتلانے سے

خلاصہ تفسیر: گذشتہ آیت میں اہل کتاب کے کفریہ اقوال کا بیان تھا، اب ان کے افعال کفریہ کا بیان ہے کہ:

انہوں نے (یعنی یہود ونصاریٰ نے) خدا (کی توحید اطاعت) کو چھوڑ کر اپنے علماء اور مشائخ کو (اطاعت کے اعتبار سے) رب بنا رکھا ہے (کہ حلال اور حرام قرار دینے میں ان کی اطاعت خدا کی اطاعت کی طرح کرتے ہیں کہ خدا کے صریح حکم پر بھی ان کے قول کو ترجیح دیتے ہیں اور ایسی اطاعت بالکل عبادت ہے، پس اس اعتبار سے وہ گویا ان کی عبادت کرتے ہیں) اور مسیح بن مریم کو بھی (ایک اعتبار سے خدا بنا رکھا ہے کہ ان کو اللہ کا بیٹا کہتے ہیں جس سے ان کا خدا ہونا لازم آتا ہے) حالانکہ ان کو (کتب الٰہیہ میں) صرف یہ حکم کیا گیا ہے کہ فقط ایک معبود (برحق) کی عبادت کریں جس کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں وہ ان کے شرک سے پاک ہے۔

اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ: اپنے علماء ومشائخ کو معبود بنانے کا جو الزام اہل کتاب پر عائد کیا گیا ہے اگرچہ وہ صراحۃً ان کو اپنا رب نہ کہتے تھے، اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اطاعت مطلقہ جو خالص اللہ جل شانہ کا حق ہے اس حق کو ان کے حوالے کر دیا تھا، کہ ہر حال میں ان کے کہنے کی پیروی کرتے تھے، اگرچہ ان کا قول اللہ اور رسول کے خلاف ہی کیوں نہ ہو، تو یہ ظاہر ہے کہ کسی کی ایسی اطاعت کرنا کہ اللہ ورسول کے فرمان کے خلاف بھی کہے تو اس کی اطاعت نہ چھوڑے یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی کو اپنا رب اور معبود کہے، جو کھلا ہوا کفر ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ مسائل دین سے ناواقف عوام کے لئے علماء کے فتوی کا اتباع درحقیقت خدا اور رسول ہی کے احکام کا اتباع ہوتا ہے، اہل علم و نظر براہ راست اللہ ورسول کے کلام کو دیکھ کر اس پر عمل کرتے ہیں، اور ناواقف عوام اہل علم سے پوچھ کر انہی احکام پر عمل کرتے ہیں، اور اہل علم جو درجہ اجتہاد کا نہیں رکھتے وہ بھی اجتہادی مسائل میں ائمہ مجتہدین کا اتباع کرتے ہیں، یہ اتباع خود قرآن کریم کے حکم کے مطابق ہے اور حق تعالیٰ ہی کی اطاعت ہے جیسا کہ ارشاد ہے: فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ، یعنی اگر تم خود احکام خدا اور رسول سے واقف نہیں تو اہل علم سے پوچھ کر عمل کیا کرو۔

اس میں نصوص کے مقابلہ میں تقلید کرنے کی مذمت ہے، جیسے جاہلوں کی عادت ہے کہ جب رسوم وبدعات سے منع کیا جائے تو اپنے مشائخ سے استدلال کرتے ہیں۔

* * *

فائدہ: لے ان کے علماء ومشائخ جو کچھ اپنی طرف سے مسئلہ بنا دیتے خواہ حلال کو حرام یا حرام کو حلال کہہ دیتے اسی کو سند سمجھتے کہ بس خدا کے ہاں ہم کو چھٹکارا ہو گیا، کتب سماویہ سے کچھ سروکار نہ رکھا تھا، محض احبار ورہبان کے احکام پر چلتے تھے، اور ان کا یہ حال تھا کہ جہاں تھوڑا سا مال یا جاہی فائدہ دیکھا حکم شریعت کو بدل ڈالا، جیسا کہ دو تین آیتوں کے بعد مذکور ہے، پس جو منصب خدا کا تھا (یعنی حلال وحرام کی تشریع) وہ علماء ومشائخ کو دے دیا گیا تھا، اس لحاظ سے فرمایا کہ انہوں نے عالموں اور درویشوں کو خدا ٹھہرا لیا، نبی کریم ﷺ نے عدی بن حاتم کو اعتراض کا جواب دیتے ہوئے اسی طرح کی تشریح فرمائی ہے اور حضرت حذیفہؓ سے بھی ایسا ہی منقول ہے، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: ''عالم کا قول عوام کو سند ہے جب تک وہ شرع سے سمجھ کر کہے، جب معلوم ہو کہ خود اپنی طرف سے کہا، یا طمع وغیرہ سے کہا پھر سند نہیں''۔

يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَيَاْبَى اللّٰهُ اِلَّآ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۳۲﴾

چاہتے ہیں کہ بجھا دیں روشنی اللہ کی اپنے منہ سے اور اللہ نہ رہے گا بدون پورا کیے اپنی روشنی کے اور پڑے برا مانیں کافر

خلاصہ تفسیر: پیچھے اس کا بیان تھا کہ یہ لوگ باطل اور غلط رستہ پر ہیں، اب یہ بتلاتے ہیں کہ وہ لوگ دین حق کو رد کرتے ہیں اور یہی کفر ہے، یعنی:

وہ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور (یعنی دین اسلام) کو اپنے منہ سے (پھونک مار مار کر) بجھا دیں (یعنی اپنے منہ سے تردید واعتراض کی باتیں اس غرض سے کرتے ہیں کہ دین حق کو فروغ نہ ہو) حالانکہ اللہ تعالیٰ بدون اس کے کہ اپنے نور (مذکور) کو کمال تک پہنچا دے مانے گا نہیں، اگرچہ کافر لوگ (جن میں یہ بھی آگئے) کیسے ہی ناخوش ہوں۔

اِلَّآ اَنۡ يُّتِمَّ نُوۡرَهٗ: دین اسلام کو کمال تک پہنچانے کی کئی صورتیں ہیں: ① ایک تو دلائل سے اس کو ثابت اور قوی کرنا یہ تو اسلام کے لیے ہر زمانہ میں عام ہے ② اور ایک یہ کہ اس کے ساتھ سلطنت بھی ہو، اس کے لیے یہ شرط ہے کہ اہل اسلام میں دین اور صلاحیت غالب ہو ③ اور ایک صورت یہ ہے کہ دوسرے مذاہب بالکل مٹ جائیں اور اسلام ہی اسلام رہے، اس کا ظہور حضرت عیسی علیہ السلام کے زمانہ میں ہوگا۔

يُرِيۡدُوۡنَ اَنۡ يُّطۡفِــُٔوۡا نُوۡرَ اللّٰهِ۔ اسمیں دلالت ہے کہ مخالفین کی زیادہ پرواہ نہ کرے اور خدائے کارساز پر نظر رکھے کہ وہ کافی ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی توحید خالص اور اسلام کا آفتاب جب چمک اٹھا، پھر یہ دوغلی باتیں اور مشرکانہ دعاوی کہاں فروغ پاسکتے ہیں یہ کوشش کہ بے حقیقت اور بے مغز باتیں بنا کر اور فضول بحث وجدل کر کے نور حق کو مدھم کر دیں، ایسی ہے کہ کوئی بیوقوف منہ سے پھونکیں مار کر چاند یا سورج کی روشنی کو بجھانا اور ماند کرنا چاہے، یاد رکھو خواہ یہ کتنے ہی جلیں مگر خدا نور اسلام کو پوری طرح پھیلا کر رہے گا۔

هُوَ الَّذِىۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰى وَدِيۡنِ الۡحَـقِّ لِيُظۡهِرَهٗ عَلَى الدِّيۡنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوۡ كَرِهَ الۡمُشۡرِكُوۡنَ ﴿۳۳﴾

اسی نے بھیجا اپنے رسول کو ہدایت اور سچا دین دے کر تاکہ اس کو غلبہ دے ہر دین پر، اور پڑے برا مانیں مشرک

خلاصہ تفسیر: (چنانچہ) وہ اللہ ایسا ہے کہ (اسی نور کے غلبہ واتمام کے لئے) اس نے اپنے رسول (ﷺ) کو ہدایت (کا سامان یعنی قرآن) اور سچا دین (یعنی اسلام) دے کر (دنیا میں) بھیجا ہے تاکہ اس (دین) کو (جو کہ نور ہے) تمام (بقیہ) دینوں پر غالب کر دے (کہ یہی اتمام ہے) اگرچہ مشرک (جن میں یہ بھی داخل ہو گئے) کیسے ہی ناخوش ہوں۔

* * *

فائدہ: اسلام کا غلبہ باقی ادیان پر معقولیت اور حجت ودلیل کے اعتبار سے، یہ تو ہر زمانہ میں بحمد اللہ نمایاں طور پر حاصل رہا، باقی حکومت و سلطنت کے اعتبار سے وہ اس وقت حاصل ہوا ہے اور ہوگا، اور جبکہ مسلمان اصول اسلام کے پوری طرح پابند اور ایمان وتقویٰ کی راہوں میں مضبوط اور جہاد فی سبیل اللہ میں ثابت قدم تھے یا آئندہ ہوں گے، اور دین حق کا ایسا غلبہ کہ باطل ادیان کو مغلوب کر کے بالکل صفحہ ہستی سے محو کر دے، یہ نزول مسیح علیہ السلام کے بعد قیامت کے قریب ہونے والا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنَّ كَثِيۡرًا مِّنَ الۡاَحۡبَارِ وَالرُّهۡبَانِ لَيَاۡكُلُوۡنَ اَمۡوَالَ النَّاسِ بِالۡبَاطِلِ

اے ایمان والو بہت سے عالم اور درویش اہل کتاب کے کھاتے ہیں مال لوگوں کے ناحق

وَيَصُدُّوۡنَ عَنۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ‌ؕ وَالَّذِيۡنَ يَكۡنِزُوۡنَ الذَّهَبَ وَالۡفِضَّةَ وَلَا يُنۡفِقُوۡنَهَا

اور روکتے ہیں اللہ کی راہ سے فائدہ: ۱ؔ اور جو لوگ گاڑھ کر رکھتے ہیں سونا اور چاندی اور اس کو خرچ نہیں کرتے

فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرۡهُمۡ بِعَذَابٍ اَلِيۡمٍ ﴿۳۴﴾

اللہ کی راہ میں، سو ان کو خوشخبری سنا دے عذاب دردناک کی ۲ؔ

خلاصہ تفسیر: پیچھے یہود ونصاریٰ کی کفریات میں ان کے علماء اور راہبوں کا ذکر تھا، اب مسلمانوں کو مخاطب بنا کر یہود ونصاریٰ کے علماء وراہبوں کے ایسے حالات کا ذکر ہے جن کی وجہ سے عوام میں گمراہی پھیلی، اس مضمون کا مخاطب مسلمانوں کو شاید اس لیے بنایا ہے کہ اگرچہ یہ حالات یہود ونصاریٰ کے علماء ومشائخ کے بیان ہو رہے ہیں، لیکن مسلمانوں کو بھی اس سے متنبہ رہنا چاہئے کہ ایسے کام نہ کریں۔

اے ایمان والو! اکثر احبار ورہبان (یعنی یہود ونصاری کے علماء ومشائخ) لوگوں کے مال نامشروع طریقہ سے کھاتے (اڑاتے) ہیں

(یعنی حق احکام کو چھپا کر عوام کی مرضی کے موافق فتوے دے کر ان سے نذرانے لیتے ہیں) اور (اس کی وجہ سے وہ) اللہ کی راہ (یعنی دین اسلام) سے (لوگوں کو) باز رکھتے ہیں (کیونکہ ان کے جھوٹے فتووں کے دھوکہ میں آکر وہ گمراہی میں پھنسے رہتے ہیں اور حق کو قبول تو کیا بلکہ طلب بھی نہیں کرتے) اور (انتہائی حرص کی وجہ سے اہل کتاب کے علماء مال بھی جمع کرتے ہیں جس کی نسبت یہ وعید ہے کہ) جو لوگ سونا چاندی جمع کر کر رکھتے ہیں اور ان کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے (یعنی زکوٰۃ نہیں نکالتے) سو آپ ان کو ایک بڑی دردناک سزا کی خبر سنا دیجئے۔

اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ: یعنی یہود و نصاریٰ کے پیشوا لوگوں کے مال ناجائز طریقہ سے کھاتے ہیں، حق کو چھپا کر اور عوام کی مرضی کے مطابق احکام بتا کر ان سے منافع حاصل کرتے ہیں، اسی پر قیاس کر کے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہی اس شخص کا حال ہے جو اپنے جاہل معتقدین سے نذرانے لیتا ہے اور منافع کے ختم ہونے کے اندیشہ سے حق بات کو ظاہر نہیں کرتا، بلکہ معتقدین سے حق بات کو چھپاتا ہے۔

***

فائدہ: ۱۔ یعنی روپیہ لے کر احکام شریعہ اور اخبار الٰہیہ کو بدل ڈالتے ہیں، ادھر عوام الناس نے انہیں جیسے پہلے گزرا خدائی کا مرتبہ دے رکھا ہے جو کچھ غلط سلط کہہ دیں وہی ان کے نزدیک حجت ہے، اس طرح یہ علماء و مشائخ نذرانے وصول کرنے، ٹکے بٹورنے اور اپنی سیاست اور ریاست قائم رکھنے کے لیے عوام کو مکر و فریب کے جال میں پھنسا کر راہ حق سے روکتے رہتے ہیں، کیونکہ عوام اگر ان کے جال سے نکل جائیں اور دین حق اختیار کرلیں تو ساری آمدنی بند ہوجائے، یہ حال مسلمانوں کو سنایا تاکہ متنبہ ہوجائیں کہ امتوں کی خرابی اور تباہی کا بڑا سبب تین جماعتوں کا خراب و بے راہ ہونا اور اپنے فرائض کو چھوڑ دینا ہے، علماء و مشائخ اور اغنیاء و روسا، ان میں سے دو کا ذکر تو ہوچکا، تیسری جماعت (روساء) کا آگے آتا ہے، ابن المبارکؒ نے خوب فرمایا: "وَهَلْ اَفْسَدَ الدِّيْنَ اِلَّا الْمُلُوْكُ وَاَحْبَارُ سُوْءٍ وَّرُهْبَانُهَا"۔

فائدہ: ۲۔ جو لوگ دولت اکٹھی کریں خواہ حلال طریقہ سے ہو مگر خدا کے راستہ میں خرچ نہ کریں (مثلاً زکوٰۃ نہ دیں اور حقوق واجبہ نہ نکالیں) ان کی یہ سزا ہے تو اسی سے ان احبار و رہبان کا انجام معلوم کرلو جو حق کو چھپا کر یا بدل کر روپیہ بٹورتے ہیں، اور ریاست قائم رکھنے کی حرص میں عوام کو خدا کے راستہ سے روکتے پھرتے ہیں، بہرحال دولت وہ اچھی ہے جو آخرت میں وبال نہ بنے۔

يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ ؕ

جس دن کہ آگ دہکائیں گے اس مال پر دوزخ کی پھر داغیں گے اس سے ان کے ماتھے اور کروٹیں اور پیٹھیں

هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ﴿۳۵﴾

(کہا جائے گا) یہ ہے جو تم نے گاڑھ کر رکھا تھا اپنے واسطے اب مزہ چکھو اپنے گاڑھنے کا

خلاصہ تفسیر: جو کہ اس روز واقع ہوگی کہ ان کو دوزخ کی آگ میں (اول) تپایا جائے گا، پھر ان سے لوگوں کی پیشانیوں اور ان کی کروٹوں اور ان کی پشتوں کو داغ دیا جائے گا (اور یہ جتلایا جائیگا کہ) یہ وہ ہے جس کو تم نے اپنے واسطے جمع کر کر کے رکھا تھا، سو اب اپنے جمع کرنے کا مزہ چکھو۔

فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ: اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ جس شخص کے پاس لاکھوں کروڑوں روپیہ ہوگا اس کے بدن کو کس طرح داغا جائے گا کیونکہ دو حال سے خالی نہیں: یا تو ایک دم سے سب داغ دیا جائے گا، اس صورت میں اس کے جسم پر اتنی جگہ نہیں کہ لاکھوں کروڑوں کا داغ ایک ساتھ دیا جاسکے، یا آگے پیچھے دیا جائے گا، اس صورت میں تھوڑے روپے والا اور زیادہ روپے والا برابر ہوجائے گا، کیونکہ نئے روپے کا داغ دینا اور پہلے روپے کا بار بار داغ دینا برابر ہے، جواب یہ ہے کہ پہلی صورت میں ممکن ہے کہ اس کا جسم وسیع کردیا جائے اور دوسری صورت میں یہ ممکن ہے کہ ہر روپیہ کا داغ ایک بار ہو، پس تھوڑے مال والے کا داغنا جلدی ختم ہوجائے گا اور زیادہ مال والے کا دیر تک رہے گا۔

***

فائدہ: بخیل دولت مند سے جب خدا کے راستہ میں خرچ کرنے کو کہا جائے تو اس کی پیشانی پر بل پڑ جاتے ہیں، زیادہ کہو تو اعراض کر کے ادھر سے پہلو بدل لیتا ہے، اگر اس پر بھی جان نہ بچے تو پیٹھ پھیر کر چل دیتا ہے، اس لیے سونا چاندی تپا کر ان ہی تین موقعوں (پیشانی، پہلو، پیٹھ) پر داغ دیئے جائیں گے تا کہ اس کی جمع کرنے اور گاڑھنے کا مزہ چکھ لے۔

إِنَّ عِدَّةَ الشُّهُورِ عِندَ اللَّهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِي كِتَابِ اللَّهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ

مہینوں کی گنتی اللہ کے نزدیک بارہ مہینے ہیں اللہ کے حکم میں جس دن اس نے پیدا کیے تھے آسمان اور زمین

مِنْهَا أَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ۚ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ ۚ فَلَا تَظْلِمُوا فِيهِنَّ أَنفُسَكُمْ ۚ وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِينَ كَافَّةً

ان میں چار مہینے ہیں ادب کے، یہی ہے سیدھا دین [1] سو ان میں ظلم مت کرو اپنے اوپر اور لڑو سب مشرکوں سے ہر حال میں

كَمَا يُقَاتِلُونَكُمْ كَافَّةً ۚ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ ﴿٣٦﴾

جیسے وہ لڑتے ہیں تم سب سے ہر حال میں، اور جان لو کہ اللہ ساتھ ہے ڈرنے والوں کے [2]

خلاصہ تفسیر: پچھلی آیات میں کفار و مشرکین کے کفر و شرک، گمراہی اور بداعمالیوں کا ذکر تھا، ان دو آیتوں میں بھی اسی سلسلہ کا ایک مضمون اور عرب جاہلیت کی ایک جاہلانہ بری رسم کا بیان اور مسلمانوں کو اس سے اجتناب کی ہدایت بیان کی جاتی ہے۔

یقیناً شمار مہینوں کا (جو کہ) کتاب الٰہی (یعنی احکام شرعیہ) میں اللہ کے نزدیک (معتبر ہیں) بارہ مہینے (قمری یعنی چاند کے حساب سے) ہیں (اور یہ بات کچھ آج سے نہیں بلکہ) جس روز اللہ تعالیٰ نے آسمان اور زمین پیدا کئے تھے (اسی روز سے یعنی ہمیشہ سے ہے، اور) ان میں چار خاص مہینے ادب کے ہیں (ذی قعدہ، ذی الحجہ، محرم، رجب) یہی (مذکورہ امر) دین مستقیم ہے (یعنی مہینوں کا بارہ ہونا اور خاص طور پر چار مہینوں کا ان میں حرمت والا ہونا، جاہلیت کی عادت کے خلاف کہ وہ کبھی سال کے مہینوں کا عدد بڑھا دیتے، اور کبھی حرمت کے مہینوں کی دوسرے مہینوں کو کر دیتے تھے کہ یہ بددینی ہے) سو تم ان سب مہینوں کے بارے میں (دین کے خلاف کر کے جو کہ گناہ کا سبب ہے) اپنا نقصان مت کرنا (یعنی اس جاہلیت کی عادت کے موافق مت کرنا) اور ان مشرکین سے (جبکہ وہ اپنی کفریات کو نہ چھوڑیں جن میں یہ خاص عادت بھی داخل ہے) سب سے لڑنا جیسا کہ وہ تم سب (مسلمانوں) سے لڑ (نے کو ہر وقت تیار رہا کر) تے ہیں، اور (اگر ان کی کثرت اور سامان سے اندیشہ ہو تو) یہ جان رکھو کہ اللہ تعالیٰ متقیوں کا ساتھی ہے (پس ایمان و تقویٰ کو اپنا شعار رکھو اور کسی سے مت ڈرو)۔

إِنَّ عِدَّةَ الشُّهُورِ عِندَ اللَّهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا: یہ بری رسم ایک واقعہ سے متعلق ہے، جس کی تفصیل یہ ہے کہ عہد قدیم سے تمام انبیاء سابقین کی شریعتوں میں سال کے بارہ مہینے مانے جاتے تھے اور ان میں سے چار مہینے بڑے متبرک اور ادب واحترام کے مہینے سمجھے جاتے تھے تین مہینے مسلسل ذیقعدہ، ذی الحجہ محرم اور ایک رجب کا، تمام انبیاء علیہم السلام کی شریعتیں اس پر متفق ہیں کہ ان چار مہینوں میں ہر عبادت کا ثواب زیادہ ہوتا ہے، اور ان میں کوئی گناہ کرے تو اس کا وبال اور عذاب بھی زیادہ ہے، سابق شریعتوں میں ان مہینوں کے اندر قتل وقتال بھی ممنوع تھا۔

مکہ مکرمہ کے عرب چونکہ اسماعیل علیہ السلام کے واسطہ سے حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اولاد ہیں، اس لئے یہ سب لوگ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نبوت و رسالت کے قائل اور ان کی شریعت کو ماننے کا دعویٰ کرتے تھے، اور چونکہ ملت ابراہیم میں بھی ان چار مہینوں (یعنی اشہر حرم) میں قتل وقتال اور شکار ممنوع تھا، عرب جاہلیت پر اس حکم کی تعمیل اس لئے سخت دشوار تھی کہ دور جاہلیت میں قتل وقتال ہی ان کا پیشہ بن کر رہ گیا تھا، اس لئے اس میں آسانی پیدا کرنے کے لئے انہوں نے اپنی نفسانی اغراض کے لئے طرح طرح کے حیلے نکالے کبھی اشہر حرم کے کسی مہینہ میں جنگ کی ضرورت پیش آئی یا لڑتے لڑتے شہر حرام آ جاتا تو کہہ دیتے کہ اب کے سال یہ مہینہ حرام نہیں ہوا، اگلا مہینہ حرام ہوگا، مثلاً محرم آ گیا تو کہتے کہ اس سال محرم

کا مہینہ حرام نہیں بلکہ صفر کا مہینہ حرام ہوگا، اور مزید ضرورت پڑتی تو کہتے کہ ربیع الاول حرام ہوگا، یا یہ کہتے کہ اس سال صفر کا مہینہ پہلے آ گیا، محرم بعد میں آئے گا اس طرح محرم کو صفر بنا دیا، غرض سال بھر میں چار مہینے تو پورے کر لیتے تھے لیکن اللہ کی متعین کردہ ترتیب اور تعیین کا لحاظ نہ کرتے تھے، جس مہینہ کو چاہیں ذی الحجہ کہہ دیں اور جس کو چاہیں رمضان کہہ دیں جس کو چاہیں مقدم کر دیں جس کو چاہیں موخر کر دیں، اور کبھی زیادہ ضرورت پڑتی مثلاً لڑتے لڑتے دس مہینے گذر گئے اور سال کے صرف دو ہی مہینے باقی رہ گئے تو ایسے موقع پر سال کے مہینوں کی تعداد بڑھا دیتے، اور کہتے کہ اب کے برس سال چودہ مہینوں کا ہوگا، اسی طرح باقی ماندہ چار مہینوں کو اشہر حرم بنا لیتے تھے، غرض دین ابراہیمی کا اتنا تو احترام کرتے تھے کہ سال میں چار مہینوں کا احترام کرتے اور ان میں قتل وقتال سے باز رہتے تھے، مگر اللہ تعالیٰ نے جو ترتیب مہینوں کی متعین فرمائی اور اسی ترتیب سے چار مہینوں کو اشہر حرم قرار دیا، اس میں طرح طرح کی تاویلیں کر کے اپنی اغراض نفسانی کو پورا کرتے تھے، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اس زمانہ میں اس کا امتیاز ہی دشوار ہو گیا تھا کہ کونسا مہینہ رمضان یا شوال کا ہے؟ اور کونسا ذی القعدہ ذی الحجہ یا رجب کا ہے؟ ہجرت کے آٹھویں سال جب مکہ مکرمہ فتح ہوا، اور نویں سال میں آنحضرت ﷺ نے صدیق اکبرؓ کو موسم حج میں تمام کفار ومشرکین سے براءت کا اعلان کرنے کے لئے بھیجا تو یہ مہینہ حقیقی حساب سے اگرچہ ذی الحجہ کا مہینہ تھا، مگر جاہلیت کے اسی پرانے دستور کے مطابق یہ مہینہ ذی القعدہ کا قرار پایا تھا، اور اس سال ان کے نزدیک حج کا مہینہ بجائے ذی الحجہ کے ذی القعدہ مقرر تھا، پھر ۱۰ھ میں جب رسول کریم ﷺ نے اپنے منیٰ کے خطبہ میں ارشاد فرمایا: ”ان الزمان قد استدار کھیئتہ یوم خلق اللہ السموت والارض“، یعنی زمانہ پھر پھرا کر پھر اپنی اسی ہیئت پر آ گیا جس پر اس کو اللہ تعالیٰ نے زمین وآسمان کی پیدائش کے وقت رکھا تھا، یعنی جو مہینہ اصلی ذی الحجہ کا تھا جاہلیت والوں کے نزدیک بھی اس سال وہی مہینہ ذی الحجہ کا مہینہ قرار پایا۔

یہ تھی وہ رسم جاہلیت جو مہینوں کی تعداد اور ترتیب اور تعیین میں کمی بیشی اور ردوبدل کر کے کی جاتی تھی، جس کے نتیجہ میں ان تمام احکام شرعیہ میں خلل آتا تھا جو کسی خاص مہینہ یا اس کی کسی خاص تاریخ سے متعلق ہیں، یا جو سال کے شروع یا ختم سے متعلق ہیں، مثلاً عشرہ ذی الحجہ میں احکام حج اور عشرہ محرم کے روزے اور ختم سال پر زکوۃ وغیرہ کے احکام، بات تو مختصر سی تھی کہ مہینہ کا نام بدل کر مقدم وموخر کر دیا کہ محرم کو صفر اور صفر کو محرم بنا دیا لیکن اس کے نتیجہ میں سینکڑوں احکام شرعیہ کی تحریف ہو کر عمل برباد ہوا، قرآن مجید کی ان دو آیتوں میں اس رسم جاہلیت کی خرابی اور مسلمانوں کو اس سے بچنے کی ہدایت کی گئی، اور آیت کے شروع میں مہینوں کا عدد بتلا دیا کہ وہ بارہ ہیں، اس سے کم یا زائد نہیں ہو سکتے اور آگے یہ بتلا دیا کہ کوئی مہینہ مقدم یا موخر نہیں ہو سکتا، نہ ایک مہینہ کا حکم دوسرے مہینہ کے لیے ثابت ہو سکتا ہے جس سے ان سب باطل صورتوں کی نفی ہو گئی۔

واضح رہے کہ حرمت والے مہینوں کا فضیلت وبرکت کے اعتبار سے محترم ہونا اب بھی باقی ہے، البتہ ان میں لڑائی کی حرمت اب نہیں ہے۔

فَلَا تَظۡلِمُوۡا فِيۡهِنَّ اَنۡفُسَكُمۡ : اس سے معلوم ہوا کہ متبرک اوقات میں گناہ کی برائی شدید تر ہو جاتی ہے، پھر اس پر متبرک مقامات کو بھی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ان مقامات میں عبادت ونیکی نیک تر ہو جاتی ہے، لیکن ان لوگوں پر افسوس ہے جو متبرک مقامات پر بدعات ومنکرات کی محفلیں سجاتے ہیں۔

* * *

فائدہ: لے میرے نزدیک اوپر سے سلسلہ مضمون کا یوں ہے کہ گذشتہ رکوع میں مشرکین کے بعد اہل کتاب (یہود ونصاریٰ) سے جہاد کرنے کا حکم دیا، پھر رکوع حاضر کے شروع میں بتلایا کہ ان کے عقائد اور طور وطریق بھی مشرکین سے ملتے جلتے ہیں، ان کا عزیر ومسیح کو خدا کا بیٹا کہنا ایسا ہی ہے جیسے مشرکین ملائکۃ اللہ کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے، بلکہ نصاریٰ میں ”ابنیت مسیح“ کا عقیدہ مشرکین کی تقلید سے آیا ہے، وہ بتوں کو خدائی کا درجہ دیتے ہیں انہوں نے مسیح کو روح القدس کو خدا ٹھہرا لیا، باوجود دعوائے کتاب کے احبار ورہبان کے احکام کو شریعت الٰہیہ کا بدل تجویز کر لیا یعنی احبار ورہبان رشوتیں لے کر اور حرام مال کھا کر جس چیز کو حلال یا حرام کر دیتے، احکام سماوی کی جگہ ان ہی کو قبول کر لیا جاتا، ان کا یہ طریقہ ٹھیک مشرکین کے طریقہ سے مشابہ ہے، ان کے سرکردہ بھی جس چیز کو چاہتے حلال وحرام ٹھہرا کر خدا کی طرف نسبت کر دیتے تھے جس کا ذکر سورہ انعام میں مفصل گزر چکا، اور یہاں بھی اس کی ایک مثال بیان کی جاتی ہے۔

عرب میں قدیم سے معمول چلا آتا تھا کہ سال کے بارہ مہینوں میں سے چار مہینے ''اشہر حرم'' (خاص ادب و احترام کے مہینے) ہیں: ① ذوالقعدہ ② ذوالحجہ ③ محرم ④ رجب، ان میں خونریزی اور جدال وقتال قطعاً بند کردیا جاتا تھا، حج و عمرہ اور تجارتی کاروبار کے لیے امن وامان کے ساتھ آزادی سے سفر کرسکتے تھے، کوئی شخص ان ایام میں اپنے باپ کے قاتل سے بھی تعرض نہ کرتا تھا، بلکہ بعض علماء نے لکھا ہے کہ اصل ملت ابراہیمی میں یہ چار ماہ ''اشہر حرم'' قرار دیے گئے تھے۔

اسلام سے ایک مدت پہلے جب عرب کی وحشت و جہالت حد سے بڑھ گئی اور باہمی جدال وقتال میں بعض بعض قبائل کی درندگی اور انتقام کا جذبہ کسی آسمانی یا زمینی قانون کا پابند نہ رہا، تو ''نسی ء'' کی رسم نکالی یعنی جب کسی زور آور قبیلہ کا ارادہ ماہ محرم میں جنگ کرنے کا ہوتو ایک سردار نے اعلان کردیا کہ امسال ہم نے محرم کو اشہر حرم سے نکال کر اس کی جگہ صفر کو حرام کردیا، پھر اگلے سال کہہ دیا کہ اس مرتبہ حسب دستور قدیم محرم حرام اور صفر حلال رہے گا، اس طرح سال میں چار مہینوں کی گنتی تو پوری کرلیتے تھے لیکن ان کی تعیین میں حسب خواہش ردوبدل کرتے رہتے تھے، ابن کثیرؒ کی تحقیق کے موافق ''نسی ء'' (مہینہ آگے پیچھے کرنے) کی رسم صرف محرم وصفر میں ہوتی تھی، اور اس کی وہ ہی صورت تھی جو اوپر مذکور ہوئی، امام مغازی محمد ابن اسحاق نے لکھا ہے کہ پہلا شخص جس نے یہ رسم جاری کی ''قلمس'' کنانی تھا، پھر اس کی اولاد در اولاد یوں ہی ہوتا چلا آیا، آخر میں اسی کی نسل سے ابوثمامہ جنادہ بن عوف کنانی کا معمول تھا کہ ہر سال موسم حج میں اعلان کیا کرتا کہ امسال محرم اشہر حرم میں داخل رہے گا یا صفر، اسی طرح محرم وصفر میں سے ہر مہینہ کبھی حلال اور کبھی حرام کیا جاتا تھا، اور عام طور پر لوگ اسی کو قبول کرلیتے تھے، گویا عہد جاہلیت میں کافروں کے کفر وگمراہی کو بڑھانے والی ایک چیز یہ بھی تھی کہ خدا کے حلال یا حرام کیے ہوئے مہینہ کو بدل ڈالنے کا حق کنانہ کے ایک سردار کو سونپ دیا گیا تھا، ٹھیک اسی طرح یہود ونصاریٰ کا حال تھا کہ انہوں نے تحلیل و تحریم کی باگ طامع اور غرض پرست احبار ورہبان کے ہاتھ میں دے دی تھی، دونوں جماعتوں کی مشابہت ظاہر کرنے کے لیے ''نسی ء'' کی رسم کا یہاں ذکر کیا گیا اور اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اس کے رد کی تمہید ہے، یعنی آج سے نہیں جب سے آسمان وزمین پیدا کیے خدا کے نزدیک بہت سے احکام شرعیہ جاری کرنے کے لیے سال کے بارہ مہینے رکھے گئے ہیں جن میں سے چار اشہر حرم (ادب کے مہینے) ہیں جن میں گناہ وظلم سے بچنے کا اور زیادہ اہتمام کرنا چاہیے، یہ ہی سیدھا دین (ابراہیم علیہ السلام کا) ہے۔

فائدہ: ۲ حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ: ''اس آیت سے نکلتا ہے کہ کافروں سے لڑنا ہمیشہ روا ہے (چنانچہ غزوہ تبوک جس کا آگے ذکر آتا ہے، ماہ رجب میں ہوا) اور آپس میں ظلم کرنا ہمیشہ گناہ ہے، ان مہینوں میں زیادہ، اکثر علماء کی رائے یہی ہے لیکن بہتر ہے کہ اگر کوئی کافر ان مہینوں کا ادب کرے تو ہم بھی اس سے لڑائی کی ابتداء نہ کریں''۔

إِنَّمَا النَّسِيٓءُ زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ يُضَلُّ بِهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُحِلُّوْنَهٗ عَامًا وَّيُحَرِّمُوْنَهٗ

یہ جو مہینہ ہٹادینا ہے سو بڑھائی ہوئی بات ہے کفر کے عہد میں گمراہی میں پڑتے ہیں اس سے کافر حلال کرلیتے ہیں اس مہینہ کو ایک برس اور حرام رکھتے ہیں

عَامًا لِّيُوَاطِـُٔوْا عِدَّةَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ فَيُحِلُّوْا مَا حَرَّمَ اللّٰهُ ؕ

دوسرے برس تاکہ پوری کرلیں گنتی ان مہینوں کی جو اللہ نے ادب کے لیے رکھے ہیں، پھر حلال کرلیتے ہیں جو مہینہ اللہ نے حرام کیا

زُيِّنَ لَهُمْ سُوْٓءُ اَعْمَالِهِمْ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۷﴾ ع

بھلے کردیے گئے ان کی نظر میں ان کے برے کام، اور اللہ راستہ نہیں دیتا کافر لوگوں کو

خلاصہ تفسیر: (اب مشرکین کی جاہلیت کی عادت کا بیان ہے کہ) یہ (مہینوں کا یا ان کی حرمت کا آگے کو) ہٹا دینا کفر میں اور ترقی ہے (کیونکہ اس سے حلال مہینے کا حرام کرنا اور حرام کا حلال بنانا لازم آتا ہے اور تحریم حلال کفر ہے) جس سے (اور عام) کفار گمراہ کیے جاتے ہیں

(اس طور پر) کہ وہ اس حرام مہینہ کو کسی سال (نفسانی غرض سے) حلال کر لیتے ہیں اور کسی سال (جب کوئی غرض نہ ہو) حرام سمجھتے ہیں تا کہ اللہ تعالیٰ نے جو مہینے حرام کئے ہیں (صرف) ان کی گنتی (کسی تخصیص وتعیین کا لحاظ کیے بغیر) پوری کرلیں، پھر اللہ کے حرام کئے ہوئے مہینہ کو حلال کر لیتے ہیں (تخصیص وتعیین کا لحاظ نہیں کرتے کہ جس مہینے کو خدا نے حرام کیا ہے اسی کو حرام سمجھیں، دوسرے کو اس کی جگہ حرام نہ سمجھیں، مطلب یہ ہے کہ محض گنتی پوری کر لینے سے حکم کی تعمیل نہیں ہوتی) ان کی بداعمالیاں ان کو مستحسن معلوم ہوتی ہیں، اور (ان کے کفر کے اصرار پر غم کرنا بے سود ہے کیونکہ) اللہ تعالیٰ ایسے کافروں کو ہدایت (کی توفیق) نہیں دیتا (کیونکہ یہ خود راہ پر آنا نہیں چاہتے)۔

مذکورہ آیتوں سے ثابت ہوا کہ مہینوں کی جو ترتیب اور ان مہینوں کے جو نام اسلام میں معروف ہیں وہ انسانوں کی بنائی ہوئی اصطلاح نہیں، بلکہ رب العالمین نے جس دن آسمان وزمین پیدا کئے اسی دن یہ ترتیب اور یہ نام اور ان کے ساتھ خاص خاص مہینوں کے خاص خاص احکام متعین فرما دیئے تھے، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک احکام شرعیہ میں قمری مہینوں کا اعتبار ہے، اسی قمری حساب پر تمام احکام شرعیہ روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ دائر ہیں، لیکن قرآن حکیم نے تاریخ وسال معلوم کرنے کے لئے جیسے قمر کو علامت قرار دیا ہے اسی طرح آفتاب کو بھی اس کی علامت فرمایا ہے: لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ ، اس لئے تاریخ وسال کا حساب چاند اور سورج دونوں سے جائز ہے، یعنی قمری حساب کے علاوہ دوسرے حسابوں کی اس آیت میں نفی نہیں جیسا کہ بعض لوگوں نے سمجھا ہے، کیونکہ ان حسابوں سے احکام شرعیہ میں خلل اور فرق نہیں پڑتا، اور اس آیت میں اس حساب کو باطل کرنا مقصود ہے جس سے شرعی احکام میں خلل اور نقصان یا غلطی ہونے لگے جیسا کہ جہلاء مشرکین کی عادت کا بیان کیا گیا، لیکن اللہ تعالیٰ نے شرعی احکام کے لئے چاند کے حساب کو پسند فرمایا، اور احکام شرعیہ اس پر دائر فرمائے، اس لئے قمری حساب کا محفوظ رکھنا فرض کفایہ ہے، پس اگر سارے مسلمان دوسرے حساب کو استعمال کرنے لگیں جس سے قمری حساب ضائع ہوجائے تو سب گناہ گار ہوں گے اور اگر قمری حساب محفوظ رہے تو دوسرے حساب کا استعمال بھی جائز ہے، لیکن سنت اللہ اور سنت سلف کے خلاف ضرور ہے اس لئے بلا ضرورت اس کو اختیار کرنا اچھا نہیں۔

* * *

فائدہ: یعنی برے کام کو اچھا سمجھ رہے ہیں، جب سمجھ الٹ جائے تو بھلائی کا راستہ کہاں ملے، اس آیت میں جو رسم "نسی" کا ذکر فرمایا ہے، اس کی تفصیل گذشتہ آیت کے فوائد زیر آیت ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ میں گزر چکی۔

تنبیہ: بعض اقوام جو اپنے مہینوں کا حساب درست رکھنے کے لیے لوند کا مہینہ ہر تیسرے سال بڑھاتی ہیں وہ نسی میں داخل نہیں۔ اور بعض اکابر سلف سے جو نسی کے تحت میں یہ منقول ہے کہ عرب جاہلیت میں سال کے مہینوں کے عدد بدل ڈالتے تھے، مثلاً بارہ کے چودہ مہینے بنالیے، یا حساب میں ایسی گڑبڑ کی کہ جو ذوالقعدہ تھا وہ ذوالحجہ بن گیا حتیٰ کہ ۹ ہجری میں ابوبکرؓ کا حج بھی ان کے حساب سے ذیقعدہ میں ہوا، اور حدیث "اِنَّ الزَّمَانَ قَدِ اسْتَدَارَ كَهَيْئَتِهٖ" الخ کی تقریر بھی اسی اصول کے موافق کی گئی، ان سب چیزوں پر حافظ ابن کثیرؒ نے تعقب کیا ہے من شاء فلیراجعہ، یہاں اس پر مفصل بحث کی گنجائش نہیں، اگر مستقل تفسیر قرآن لکھنے کی توفیق ہوئی جیسا کہ ارادہ ہے تو وہاں تفصیل سے کلام کیا جائے گا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَا لَكُمْ اِذَا قِيْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ ۭ

اے ایمان والو تم کو کیا ہوا جب تم سے کہا جاتا ہے کہ کوچ کرو اللہ کی راہ میں تو گرے جاتے ہو زمین پر

اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ ۚ فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ ۝۳۸

کیا خوش ہوگئے دنیا کی زندگی پر آخرت کو چھوڑ کر، سو کچھ نہیں نفع اٹھانا دنیا کی زندگی کا آخرت کے مقابلہ میں مگر بہت تھوڑا

خلاصہ تفسیر: پیچھے غزوات اور اس سے متعلق دیگر امور کا بیان ہوا تھا، اب غزوہ تبوک کا بیان ہے، پہلے اس غزوہ کی ترغیب دلاتے ہیں، کاہلی پر ملامت اور غزوہ میں نہ جانے پر سخت وعید بیان فرماتے ہیں، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی غیبی امداد اور خدائی نصرت کا کسی کے جہاد

میں جانے یانہ جانے پر موقوف نہ ہونا بتلاتے ہیں، پھر غزوہ کا حکم اور اس کی فضیلت بتلاتے ہوئے وعدہ اور ترغیب ہے۔

اے ایمان والو! تم لوگوں کو کیا ہوا کہ جب تم سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی راہ میں (یعنی جہاد کے لئے) نکلو تو تم زمین کو لگے جاتے ہو (یعنی اٹھتے اور چلتے نہیں) کیا تم نے آخرت کے عوض دنیاوی زندگی پر قناعت کرلی، سو دنیوی زندگی کی تمتع تو کچھ بھی نہیں، بہت قلیل ہے۔

غزوہ تبوک کا قصہ: تبوک ملک شام میں ایک مقام ہے، جناب رسول اللہ ﷺ جب فتح مکہ اور غزوہ حنین وغیرہ سے فارغ ہوئے آپ کو معلوم ہوا کہ روم کا نصرانی بادشاہ مدینہ پر فوج بھیجنا چاہتا ہے اور وہ فوج تبوک میں جو کہ اس کی عملداری کے اندر ہے جمع کی جائے گی، آپ نے خود ہی مقابلہ کے لیے سفر کا قصد فرمایا اور مسلمانوں میں اس کا عام اعلان کردیا، چونکہ وہ زمانہ گرمی کی شدت کا تھا اور مسلمانوں کے پاس سامان بہت کم تھا اور سفر بھی دور دراز کا تھا، اس لیے اس غزوہ میں جانا بڑی ہمت کا کام تھا، پس ان آیتوں میں اس کی بہت ترغیب دی گئی اور چونکہ منافقین نے ایمان وخلوص نہ ہونے کی وجہ سے اس میں طرح طرح کے بہانے نکالے اور ان کی بہت خباثتیں ظاہر ہوئیں اس لیے ان آیتوں میں ان پر بھی بہت طعن وتشنیع ہوئی ہے، غرض آپ تبوک تک تشریف لے جاکر ایک عرصہ تک نصرانی لشکر کے منتظر رہے، مگر وہ ایسے مرعوب ہوئے کہ ان کا حوصلہ نہ پڑا اور حضور بخیر وعافیت مدینہ منورہ تشریف لے آئے، یہ واقعہ رجب ۹ ھ میں ہوا۔

* * *

فائدہ: یہاں سے غزوہ تبوک کے لیے مومنین کو ابھارا گیا ہے، گذشتہ رکوع سے پہلے رکوع میں قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (التوبہ:۲۹) سے اہل کتاب کے مقابلہ میں جہاد کرنے کی ترغیب دی گئی تھی، درمیان میں جو ذیلی مضامین آئے ان کا ربط موقع بہ موقع ظاہر ہوتا رہا ہے گویا وہ سب رکوع حاضر کی تمہید تھی، اور رکوع حاضر غزوہ تبوک کے بیان کی تمہید ہے۔

فتح مکہ وغزوہ حنین کے بعد ۹ ہجری میں نبی کریم ﷺ کو معلوم ہوا کہ شام کا نصرانی بادشاہ (ملک غسان) قیصر روم کی مدد سے مدینہ پر چڑھائی کرنے والا ہے، حضور نے مناسب سمجھا کہ ہم خود حدود شام پر اقدام کرکے اس کا جواب دیں، اس لیے کے آپ ﷺ نے عام طور پر مسلمانوں کو حکم دیا کہ جہاد کے لیے تیار ہوجائیں، گرمی سخت تھی، قحط سالی کا زمانہ تھا کھجور کی فصل پک رہی تھی سایہ خوشگوار تھا، پھر اس قدر بعید مسافت طے کرکے جانا، اور نہ صرف ملک غسان بلکہ قیصر روم کی باقاعدہ اور سروسامان سے آراستہ افواج سے نبرد آزما ہونا، کوئی کھیل تماشہ نہ تھا، ایسی مہم میں مومنین مخلصین کے سوا کس کا حوصلہ تھا کہ جانبازانہ قدم اٹھا سکتا، چنانچہ منافقین جھوٹے حیلے بہانے تراش کر کھسکنے لگے، بعض مسلمان بھی ایسے سخت وقت میں اس طویل وصعب سفر سے کتراراہے تھے، جن میں بہت سے تو آخر کار ساتھ ہولیے اور گنے چنے آدمی رہ گئے، جن کو کسل وتقاعد نے اس شرف عظیم کی شرکت سے محروم رکھا، نبی کریم ﷺ تقریباً تیس ہزار سرفروش مجاہدین کا لشکر جرار لے کر حدود شام کی طرف روانہ ہوگئے اور مقام تبوک میں ڈیرے ڈال دیے، ادھر قیصر روم کے نام نامہ مبارک لکھا جس میں اسلام کی طرف دعوت دی گئی تھی، حضور ﷺ کی صداقت اس کے دل میں گھر کرگئی، مگر قوم نے موافقت نہ کی، اس لیے قبول اسلام سے محروم رہا، شام والوں کو جب حضور ﷺ کے ارادے کی اطلاع ہوئی تو قیصر روم سے ظاہر کیا، اس نے مدد نہ کی، ان لوگوں نے اطاعت کی مگر اسلام نہ لائے، تھوڑی مدت کے بعد حضور ﷺ کی وفات ہوئی اور فاروق اعظم کے عہد خلافت میں تمام ملک شام فتح ہوا، جب حضور ﷺ تبوک سے غالب ومنصور واپس تشریف لائے اور خدا نے بڑی بڑی سلطنتوں پر اسلام کی دھاک بٹھلادی تو منافقین مدینہ بہت فضیحت ہوئے، نیز چند سچے مسلمان جو محض سستی اور کسل کی بنا پر نہ گئے تھے بے حد نادم ومتحسر تھے، اس رکوع کے شروع سے بہت دور تک ان ہی واقعات کا ذکر ہے مگر زیادہ منافقین کی حرکات بیان ہوئی ہیں کہیں کہیں مسلمانوں کو خطاب اور ان کے احوال سے تعرض کیا گیا ہے۔

آیت حاضرہ میں مسلمانوں کو خطاب اور ان کے احوال سے تعرض کیا گیا ہے، آیت حاضرہ میں مسلمانوں کو بڑی شدت سے جہاد کی طرف ابھارا اور بتلایا ہے کہ تھوڑے سے عیش وآرام میں پھنس کر جہاد کو چھوڑنا گویا بلندی سے پستی کی طرف گرجانے کا مرادف ہے، مومن صادق کی نظر میں دنیا کے عیش وآرام کی آخرت کے مقابلہ میں کوئی وقعت نہ ہونی چاہیے، حدیث میں ہے کہ اگر خدا کے نزدیک دنیا کی وقعت پر پشہ کی برابر ہوتی تو کسی کافر کو ایک گھونٹ پانی کا نہ دیتا۔

إِلَّا تَنفِرُوا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا أَلِيمًا وَيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوهُ شَيْئًا ط

اگر تم نہ نکلو گے تو دے گا تم کو عذاب دردناک اور بدلے میں لائے گا اور لوگ تمہارے سوا اور کچھ نہ بگاڑ سکو گے تم اس کا

وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٣٩﴾

اور اللہ سب چیز پر قادر ہے

خلاصہ تفسیر: اگر تم (اس جہاد کے لئے) نہ نکلو گے تو اللہ تعالیٰ تم کو سخت سزا دے گا (یعنی تم کو ہلاک کر دے گا) اور تمہارے بدلے دوسری قوم پیدا کر دے گا (اور ان سے اپنا کام لے گا) اور تم اللہ (کے دین) کو کچھ ضرر نہ پہنچا سکو گے، اور اللہ کو ہر چیز پر پوری قدرت ہے۔

رسول کریم ﷺ نے مدینہ طیبہ کے پورے مسلمانوں کو اس جہاد کے لئے نکلنے کا حکم دے دیا، اور کچھ آس پاس کے دوسرے قبائل کو بھی شرکت جہاد کے لئے دعوت دی تھی، یہ اعلان عام اسلام کے فداکاروں کا ایک سخت امتحان تھا، اور منافق دعویداروں کا امتیاز بھی، اس کے علاوہ لازمی نتیجہ کے طور پر اسلام کا کلمہ پڑھنے والوں کے مختلف حالات ہو گئے، قرآن کریم نے ان میں سے ہر حالت کے متعلق جدا جدا ارشادات فرمائے ہیں:

① ایک حالت ان کامل مکمل حضرات کی تھی جو بلا تردد جہاد کے لئے تیار ہو گئے۔

② دوسرے وہ لوگ جو ابتداءً کچھ تردد کے بعد ساتھ ہو گئے، ان دونوں طبقوں کے متعلق قرآن کریم نے فرمایا: الَّذِينَ اتَّبَعُوهُ فِي سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْ بَعْدِ الخ، یعنی وہ لوگ قابل مدح ہیں جنہوں نے سخت تنگی کے وقت رسول کریم ﷺ کا اتباع کیا، بعد اس کے کہ ان میں سے ایک فریق کے قلوب لغزش کرنے لگے تھے۔

③ تیسری حالت ان لوگوں کی تھی جو کسی صحیح عذر کی بنا پر اس جہاد میں نہ جا سکے، اس کے متعلق قرآن کریم نے آیت: لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَاءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضَىٰ، میں ان کے عذر کی قبولیت کا اظہار فرما دیا۔

④ چوتھی قسم ان لوگوں کی تھی جو باوجود کوئی عذر نہ ہونے کے کاہلی کے سبب جہاد میں شریک نہیں ہوئے ان کے متعلق کئی آیتیں نازل ہوئیں: وَآخَرُونَ اعْتَرَفُوا بِذُنُوبِهِمْ اور وَآخَرُونَ مُرْجَوْنَ لِأَمْرِ اللَّهِ اور وَعَلَى الثَّلَاثَةِ الَّذِينَ خُلِّفُوا، تینوں آیتیں ایسے ہی حضرات کے بارے میں نازل ہوئیں، جن میں ان کی کاہلی پر زجر و تنبیہ بھی ہے اور بالآخر ان کی توبہ کے قبول ہونے کی بشارت بھی۔

⑤ پانچواں طبقہ منافقین کا تھا جو اپنے نفاق کی وجہ سے اس سخت امتحان میں اپنے نفاق کو چھپا نہ سکا اور شرکت جہاد سے الگ رہا، اس طبقہ کا ذکر بہت سی آیات میں آیا ہے۔

⑥ چھٹا طبقہ ان منافقین کا تھا جو جاسوسی اور شرارت کے لئے مسلمانوں کے ساتھ ہو لیا تھا ان کی حالت کا ذکر قرآن کریم کی ان آیات میں ہے: وَفِيكُمْ سَمَّاعُونَ لَهُمْ، وَلَئِن سَأَلْتَهُمْ لَيَقُولُنَّ، وَهَمُّوا بِمَا لَمْ يَنَالُوا۔

لیکن اس ساری سختی اور تکلیف کے باوجود شرکت جہاد سے باز رہنے والوں کی مجموعی تعداد پھر بھی برائے نام تھی، بھاری اکثریت انہی مسلمانوں کی تھی جو اپنے سارے منافع اور راحت کو قربان کر کے اللہ کی راہ میں ہر طرح کی مشقت برداشت کرنے کے لئے تیار ہو گئے، اسی لئے اس جہاد میں نکلنے والے اسلامی لشکر کی تعداد تیس ہزار تھی، جو اس سے پہلے کسی جہاد میں نظر نہیں آئی، جو آیتیں اوپر لکھی گئی ہیں بظاہر ان کا تعلق اس چوتھی جماعت سے ہے جو بغیر کسی صحیح عذر کے اپنی سستی اور کاہلی کی بنا پر شریک جہاد نہیں ہوئے، پہلی آیت میں ان کو اس کاہلی اور غفلت پر تنبیہ کی گئی اور اس کے ساتھ ان کے اس مرض غفلت و کاہلی کا سبب اور پھر اس کا علاج بھی ارشاد فرمایا گیا۔

❊ ❊ ❊

فائدہ: یعنی خدا کا کام تم پر موقوف نہیں، تم اگر سستی کرو گے وہ اپنی قدرت کاملہ سے کسی دوسری قوم کو دین حق کی خدمت کے لیے کھڑا کر

دے گا، تم اس سعادت سے محروم رہو گے جو تمہارے ہی نقصان کا موجب ہے:

منت منہ کہ خدمت سلطاں ہمی کنی منت شناس ازو کہ بخدمت گزاشتت

إِلَّا تَنصُرُوهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللَّهُ إِذْ أَخْرَجَهُ الَّذِينَ كَفَرُوا ثَانِيَ اثْنَيْنِ إِذْ هُمَا فِي الْغَارِ إِذْ يَقُولُ

اگر تم نہ مدد کرو گے رسول کی تو اسکی مدد کی ہے اللہ نے جس وقت اسکو نکالا تھا کافروں نے کہ وہ دوسرا تھا دو میں کا جب وہ دونوں تھے غار میں جب وہ کہہ رہا تھا

لِصَاحِبِهِ لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا ۖ فَأَنزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَيْهِ وَأَيَّدَهُ بِجُنُودٍ لَّمْ تَرَوْهَا

اپنے رفیق سے تو غم نہ کھا بیشک اللہ ہمارے ساتھ ہے، پھر اللہ نے اتاری اپنی طرف سے اس پر تسکین اور اسکی مدد کو وہ فوجیں بھیجیں کہ تم نے نہیں دیکھیں

وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِينَ كَفَرُوا السُّفْلَىٰ ۗ وَكَلِمَةُ اللَّهِ هِيَ الْعُلْيَا ۗ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿٤٠﴾

اور نیچے ڈالی بات کافروں کی، اور اللہ کی بات ہمیشہ اوپر ہے، اور اللہ زبردست ہے حکمت والا

خلاصہ تفسیر: اگر تم لوگ رسول (اللہ ﷺ) کی مدد نہ کرو گے تو (اللہ آپ کی مدد کرے گا، جیسا کہ) اللہ تعالیٰ آپ کی مدد اس وقت کر چکا ہے جبکہ (اس وقت سے زیادہ مصیبت و پریشانی کا وقت تھا جبکہ) آپ کو کافروں نے (تنگ کر کر کے مکہ سے) جلا وطن کر دیا تھا جبکہ دو آدمیوں میں ایک آپ تھے (اور دوسرے حضرت ابوبکر صدیقؓ آپ کے ہمراہ تھے) جس وقت کہ دونوں (صاحب) غار (ثور) میں (موجود) تھے جبکہ آپ اپنے ہمراہی سے فرما رہے تھے کہ تم (کچھ) غم نہ کرو یقیناً اللہ تعالیٰ (کی مدد) ہمارے ہمراہ ہے، سو (وہ مدد یہ ہوئی کہ) اللہ تعالیٰ نے آپ (ﷺ کے قلب) پر اپنی (طرف سے) تسلی نازل فرمائی اور آپ کو (فرشتوں کے) ایسے لشکروں سے قوت دی جن کو تم لوگوں نے نہیں دیکھا، اور اللہ تعالیٰ نے کافروں کی بات (اور تدبیر) نیچی کر دی (کہ وہ ناکام رہے) اور اللہ ہی کا بول بالا رہا (کہ ان کی تدبیر اور حفاظت غالب رہی) اور اللہ زبردست حکمت والا ہے (اسی لئے اس کی بات اور حکمت غالب رہی)۔

إِذْ هُمَا فِي الْغَارِ إِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ: اس قصہ میں ہجرت کی طرف اشارہ ہے اور یہ غار مکہ معظمہ سے قریب ہے جس کا نام غار ثور ہے، اس میں آپ ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ تین روز تک چھپے رہے، کفار آپ کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے ایک قیافہ شناس کے بتلانے سے جو کہ نشان قدم دیکھ کر پتہ بتلا دیتا تھا اس غار تک پہنچے، اس وقت حضرت ابوبکر صدیقؓ کو حضور ﷺ کی وجہ سے فکر ہوئی، آپ نے ان کی تسلی فرمائی کہ: لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا چونکہ اس غار میں مکڑی نے جالا بنا لیا تھا، اس لیے کفار کو شبہ نہیں ہوا، سب لوٹ گئے اور اس قیافہ شناس کو بے وقوف بنایا، پھر وہاں سے آپ نکل کر مدینہ منورہ روانہ ہوئے اور صحیح سالم پہنچ گئے۔

* * *

فائدہ: یعنی بالفرض اگر تم نبی کریم ﷺ کی مدد نہ کرو گے نہ سہی، ان کا منصور و کامیاب ہونا کچھ تم پر موقوف نہیں، ایک وقت پہلے ایسا آ چکا ہے جب ایک یار غار کے سوا کوئی آپ کے ساتھ نہ تھا، معدودے چند مسلمان مکہ والوں کے مظالم سے تنگ آ کر ہجرت کر گئے تھے اور آپ ﷺ کو بھی ہجرت کا حکم ہوا، مشرکین کا آخری مشورہ یہ قرار پایا تھا کہ ہر قبیلہ کا ایک ایک نوجوان منتخب ہو اور وہ سب مل کر بیک وقت آپ ﷺ پر تلواروں کی ضرب لگائیں تاکہ خون بہا دینا پڑے تو سب قبائل پر تقسیم ہو جائے اور بنی ہاشم کی یہ ہمت نہ ہو کہ خون کے انتقام میں سارے عرب سے لڑائی مول لیں۔

جس شب میں اس ناپاک کارروائی کو عملی جامہ پہنچانے کی تجویز تھی، حضور ﷺ نے اپنے بستر پر حضرت علیؓ کو لٹایا، تاکہ لوگوں کی امانتیں احتیاط سے آپ ﷺ کے بعد مالکوں کے حوالہ کر دیں اور حضرت علیؓ کی تسلی فرمائی کہ تمہارا بال بیکا نہ ہوگا، پھر خود بہ نفس نفیس ظالموں کے ہجوم میں

سے "شاھت الوجوہ" فرماتے ہوئے اور ان آنکھوں میں خاک جھونکتے ہوئے صاف نکل آئے، حضرت ابوبکر صدیقؓ کو ساتھ لیا اور مکہ سے چند میل ہٹ کر غار ثور میں قیام فرمایا، یہ غار پہاڑ کی بلندی پر ایک بھاری مجوف چٹان ہے، جس میں داخل ہونے کا صرف ایک راستہ تھا وہ بھی ایسا تنگ کہ انسان کھڑے ہوکر یا بیٹھ کر اس میں گھس نہیں سکتا، صرف لیٹ کر داخل ہونا ممکن تھا، اول حضرت ابوبکرؓ نے اندر جا کر اسے صاف کیا، سب سوراخ کپڑے سے بند کیے، کہ کوئی کیڑا کانٹا گزند نہ پہنچا سکے، ایک سوراخ باقی تھا، اس میں اپنا پاؤں اڑا دیا، سب انتظام کر کے حضور ﷺ سے اندر تشریف لانے کو کہا، آپ ﷺ صدیقؓ کے زانو پر سر مبارک رکھ کر استراحت فرما رہے تھے کہ سانپ نے ابوبکر کا پاؤں ڈس لیا، پاؤں کو حرکت نہ دیتے تھے مبادا حضور ﷺ کی استراحت میں خلل پڑے، جب آپ ﷺ کی آنکھ کھلی اور قصہ معلوم ہوا تو آپ ﷺ نے لعاب مبارک صدیق کے پاؤں کو لگا دیا جس سے فوراً شفا ہوگئی، ادھر کفار "قائف" کو ہمراہ لے کر جو نشان ہائے قدم کی شناخت میں ماہر تھا، حضور ﷺ کی تلاش میں نکلے، اس نے غار ثور تک نشان قدم کی شناخت کی، مگر خدا کی قدرت کہ غار کے دروازہ پر مکڑی نے جالا تن لیا اور جنگلی کبوتر نے انڈے دے دیئے، یہ دیکھ کر سب نے قائف کو جھٹلایا اور کہنے لگے کہ یہ مکڑی کا جالا تو محمد ﷺ کی ولادت سے بھی پہلے کا معلوم ہوتا ہے، اگر اندر کوئی داخل ہوتا تو یہ جالا اور انڈے کیسے صحیح وسالم رہ سکتے تھے، ابوبکر صدیق کو اندر سے کفار کے پاؤں نظر پڑے تھے، انہیں فکر تھی کہ جان سے زیادہ محبوب جس کے لیے سب کچھ فدا کر چکے ہیں دشمنوں کو نظر نہ پڑ جائیں، گھبرا کر کہنے لگے یا رسول اللہ! اگر ان لوگوں نے ذرا جھک کر اپنے قدموں کی طرف نظر کی تو ہم کو دیکھ پائیں گے، حضور ﷺ نے فرمایا کہ ابو بکر تیرا کیا خیال ہے ان دو کی نسبت جن کا تیسرا اللہ ہے، یعنی جب اللہ ہمارے ساتھ ہے تو پھر کس کا ڈر ہے، اس وقت حق تعالیٰ نے ایک خاص قسم کی کیفیت سکون و اطمینان حضور ﷺ کے قلب مبارک پر اور آپ ﷺ کی برکت سے ابوبکر کے قلب مقدس پر نازل فرمائی اور فرشتوں کی فوج سے حفاظت و تائید کی، یہ اسی تائید غیبی کا کرشمہ تھا کہ مکڑی کا جالا جسے "اوھن البیوت" بتلایا ہے، بڑے بڑے مضبوط و مستحکم قلعوں سے بڑھ کر ذریعہ تحفظ بن گیا، اسی طرح خدا نے کافروں کی بات نیچی کی اور ان کی تدابیر خاک میں ملا دیں، آپ ﷺ تین روز غار میں قیام فرما کر بعافیت تمام مدینہ پہنچ گئے، بیشک انجام کار خدا ہی کا بول بالا رہتا ہے، وہ ہر چیز پر غالب ہے اور اس کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں۔

تنبیہ: بعض نے وَاَیَّدَہٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْھَا سے بدر و حنین وغیرہ میں جو نزول ملائکہ ہوا وہ مراد لیا ہے مگر ظاہر سیاق سے وہ ہی ہے جو ہم نے بیان کیا، واللہ اعلم۔

اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا وَّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ

نکلو ہلکے اور بوجھل ۱؎ اور لڑو اپنے مال سے اور جان سے اللہ کی راہ میں، یہ بہتر ہے تمہارے حق میں

اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۴۱﴾

اگر تم کو سمجھ ہے ۲؎

خلاصہ تفسیر: (جہاد کیلئے) نکل پڑو (خواہ) تھوڑے سے سامان سے (ہو) اور (خواہ) زیادہ سامان سے (ہو) اور اللہ ہی کی راہ میں اپنے مال اور جان سے جہاد کرو یہ تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم یقین رکھتے ہو (تو دیر مت کرو)۔

آخرت کی بہترین یعنی ثواب و قرب یہ تو یقینی ہے، اور کبھی دنیا کی بہتری بھی ہوتی یعنی فتح غنیمت اور عزت وغیرہ۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی پیادہ اور سوار، فقیر اور غنی جوان اور بوڑھے جس حالت میں ہوں نکل کھڑے ہوں "نفیر عام" کے وقت کوئی عذر پیش نہ لائیں۔

فائدہ: ۲؎ یعنی دنیاوی اور اخروی ہر حیثیت سے۔

لَوۡ كَانَ عَرَضًا قَرِيۡبًا وَّسَفَرًا قَاصِدًا لَّاتَّبَعُوۡكَ وَلٰكِنۡۢ بَعُدَتۡ عَلَيۡهِمُ الشُّقَّةُ ؕ

اگر مال ہوتا نزدیک اور سفر ہلکا تو وہ لوگ ضرور تیرے ساتھ ہو لیتے لیکن لمبی نظر آئی ان کو مسافت لے

وَسَيَحۡلِفُوۡنَ بِاللّٰهِ لَوِ اسۡتَطَعۡنَا لَخَرَجۡنَا مَعَكُمۡ ۚ يُهۡلِكُوۡنَ اَنۡفُسَهُمۡ ۚ وَاللّٰهُ يَعۡلَمُ

اور اب قسمیں کھائیں گے اللہ کی کہ اگر ہم سے ہوسکتا تو ہم ضرور چلتے تمہارے ساتھ، وبال میں ڈالتے ہیں اپنی جانوں کو، اور اللہ جانتا ہے

اِنَّهُمۡ لَكٰذِبُوۡنَ ﴿۴۲﴾

کہ وہ جھوٹے ہیں ۲ے

خلاصہ تفسیر: پیچھے اس غزوہ کے متعلق مؤمنین سے خطاب تھا، اب آخر سورت تک منافقین کے احوال اور اقوال مذکور ہیں جو باوجود عذر نہ ہونے کے صرف نفاق کی وجہ سے غزوہ میں شریک نہیں ہوئے، درمیان میں اسی مناسبت سے دیگر مضامین بھی آ گئے ہیں۔

اگر کچھ لگتے ہاتھ ملنے والا ہوتا اور سفر بھی معمولی ہوتا تو یہ (منافق) لوگ ضرور آپ کے ساتھ ہو لیتے لیکن ان کو تو مسافت ہی دور دراز معلوم ہونے لگی (اس لئے یہاں ہی رہ گئے) اور ابھی (جب تم لوگ واپس آؤ گے تو) خدا کی قسمیں کھا جائیں گے کہ اگر ہمارے بس کی بات ہوتی تو ہم ضرور تمہارے ساتھ چلتے، یہ لوگ (جھوٹ بول بول کر) اپنے آپ کو تباہ (یعنی مستحق عذاب) کر رہے ہیں، اور اللہ جانتا ہے کہ یہ لوگ یقینا جھوٹے ہیں (بلا شبہ ان کو کوئی عذر نہ تھا، ساتھ جانے پر قادر تھے اور پھر بھی نہیں گئے اس لیے یہ عذاب کے مستحق ہیں)۔

لَوۡ كَانَ عَرَضًا قَرِيۡبًا وَّسَفَرًا قَاصِدًا: اس آیت میں اپنے نفس کے لیے امتحان کا طریقہ ہے کہ آیا وہ اللہ تعالی سے محبت کرنے والا ہے یا نہیں؟ اور وہ طریقہ یہ ہے کہ جس دینی کام میں کوئی دنیوی فائدہ نہ ہو بلکہ مشقت ہی مشقت ہو، اس میں دیکھنا چاہیے کہ نفس کا کیا رنگ ہوتا ہے، اگر اس کے باوجود بھی انسان اس کو کرتا ہے تو یہ اللہ کی محبت کی دلیل ہے، کیونکہ جس دینی عمل کے ضمن میں دنیوی فائدہ ہو تو وہ محبت کی دلیل نہیں (اگر دنیاوی نفع کی خاطر ہی عمل کرنا چاہتا ہو تو یہ اخلاص کی علامت نہیں)۔

وَلٰكِنۡۢ بَعُدَتۡ عَلَيۡهِمُ الشُّقَّةُ: یعنی ان کو تو مسافت ہی دور دراز معلوم ہونے لگی اس لیے یہاں ہی رہ گئے، کیونکہ ان کا ساتھ چلنا دو باتوں پر موقوف تھا: ① سفر کے معمولی ہونے پر ② لگے ہاتھ کچھ مال و متاع مل جانے پر، اور مسافت دور دراز ہونے کی صورت میں ظاہر ہے کہ سفر معمولی نہ رہا، اور مال غنیمت بھی جلدی ملنے کی توقع نہ رہی، اور اگر مال و متاع ملنے کی جلدی توقع ہوتی بھی جب بھی وہ ساتھ نہ چلتے، کیونکہ سفر تو ہر حالت میں معمولی نہ تھا اور ان کا ساتھ چلنا اس پر بھی موقوف تھا کہ سفر نزدیک ہو۔

وَسَيَحۡلِفُوۡنَ بِاللّٰهِ لَوِ اسۡتَطَعۡنَا لَخَرَجۡنَا مَعَكُمۡ: جس طرح منافقین مسلمانوں کو دھوکہ دیتے تھے اسی طرح سالک کو اس کا نفع جھوٹے دعووں سے دھوکہ دیتا ہے اور طاعات میں باطل عذر پیش کرتا ہے، پس اس نفس کو یہی جواب دو جو خدا تعالی نے ارشاد فرمایا: يُهۡلِكُوۡنَ اَنۡفُسَهُمۡ، اسی طرح بہت سے صلاح و تقوی کے دعوے دار اپنے دعووں میں ملمع سازیاں کر کے لوگوں کو دھوکہ میں ڈالتے ہیں، کبھی صریحا، کبھی دوسری باتوں کے ضمن میں، ان سب پر واجب ہے کہ اس آیت کے مضمون میں غور کریں۔

* * *

فائدہ: لے یہ منافقین کو فرمایا کہ اگر سفر ہلکا ہوتا اور بے محنت مال غنیمت ہاتھ آنے کی توقع ہوتی تو جلدی سے ساتھ ہو لیتے، لیکن ایسی کٹھن منزلوں کا طے کرنا ان سے کہاں ممکن ہے؟

فائدہ: ۲ے یا تو نکلنے سے پہلے قسمیں کھا کر طرح طرح کے حیلے حوالے کریں گے کہ آپ ان کو مدینہ میں ٹھہرے رہنے کی اجازت دے

دیں اور یا آپ کی واپسی کے بعد جھوٹی قسمیں کھا کر باتیں بنائیں گے تا کہ اپنے نفاق پر پردہ ڈالیں، حالانکہ خدا سے ان کا جھوٹ اور نفاق پوشیدہ نہیں رہ سکتا، یہ نفاق وفریب دہی اور جھوٹی قسمیں کھانا انجام کار انہی کے حق میں وبال جان ہوگا۔

عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ۚ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۴۳﴾

اللہ بخشے تجھ کو، کیوں رخصت دے دی تو نے ان کو یہاں تک کہ ظاہر ہوجاتے تجھ پر سچ کہنے والے اور جان لیتا تو جھوٹوں کو

خلاصہ تفسیر: پیچھے جن منافقین کا ذکر ہے انہوں نے روانگی کے وقت جھوٹے عذر تراش کر سفر میں ساتھ نہ جانے کی آپ ﷺ سے اجازت حاصل کر لی تھی، آپ ﷺ نے اجازت دے دی تھی، اب آگے اللہ تعالیٰ اس اجازت کا نامناسب ہونا اور ان کی اجازت کا نفاق پر مبنی ہونا بیان فرماتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کو معاف (تو) کر دیا (لیکن) آپ نے ان کو (ایسی جلدی) اجازت کیوں دے دی تھی جب تک کہ آپ کے سامنے سچے لوگ ظاہر نہ ہو جاتے (اس کا یہ مطلب نہیں کہ منافقوں میں سچے لوگ بھی تھے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ جو سچے مسلمان درحقیقت معذور تھے ان سے ان کی حالت ممتاز ہو جاتی) اور (جب تک کہ) جھوٹوں کو معلوم نہ کر لیتے (پس جو سچے تھے ان کو اجازت دی جاتی، اور جھوٹوں کو اجازت نہ دی جاتی تا کہ وہ خوش تو نہ ہونے پاتے کہ ہم نے آپ کو دھوکہ دے دیا)۔

عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ: ایک لطیف انداز سے رسالت مآب ﷺ سے اس بات کی شکایت ہے کہ ان منافقین نے جھوٹ بول کر اپنے آپ کو معذور ظاہر کیا اور آپ نے قبل اس کے کہ ان کے حال کی تحقیق کر کے جھوٹ سچ کا پتہ لگاتے ان کو رخصت دے دی، جس کی بنا پر یہ لوگ خوشیاں مناتے اور یہ کہتے پھرتے کہ ہم نے رسول کو خوب دھوکہ دیا، اگرچہ اگلی آیتوں میں حق تعالیٰ نے اس کا بھی اظہار فرمایا کہ یہ لوگ محض حیلہ جوئی کے لئے عذر پیش کر رہے تھے، لیکن منشاء یہ ہے کہ ان کو اگر اجازت نہ دی جاتی تو پھر بھی یہ جانے والے تو نہ تھے، مگر ان کا نفاق کھل جاتا، اور ان کو مسلمانوں پر یہ طعنے کسنے کا موقع نہ ملتا کہ ہم نے ان کو خوب بیوقوف بنایا، یعنی اجازت مل جانے سے جو ان کو بے فکری سی ہوگئی ہے یہ نہ ہوتی، اور اگر اجازت نہ دی جاتی تب بھی یہ نہ جاتے تو ان کی خباثت تو کھلم کھلا ظاہر ہو جاتی، اور یہاں مقصد درحقیقت عتاب نہیں ہے، بلکہ مقصود یہ بات ہے کہ آئندہ ان لوگوں کی چالوں سے باخبر رہیں۔

یہاں لفظ معافی سے یہ شبہ نہ کیا جائے کہ معافی تو جرم وگناہ کی ہوا کرتی ہے، اور رسول اللہ ﷺ گناہ سے معصوم ہیں تو پھر معافی کے یہاں کیا معنی ہو سکتے ہیں؟ وجہ یہ ہے کہ معافی جیسے گناہ کی ہوتی ہے ایسی ہی خلاف اولیٰ، ناپسندیدہ اور نامناسب چیز کے لئے بھی معافی کا استعمال کیا جا سکتا ہے، اور وہ عصمت کے منافی نہیں، خلاصہ یہ ہے کہ ان کو اجازت دینا نامناسب ہوا۔

یہاں صورتاً جو ایک قسم کا عتاب بھی ہے تو کس لطف عنایت کے ساتھ کہ عتاب کی بات جو لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ سے شروع ہوئی ہے، یعنی آپ نے ان لوگوں کو کیوں اجازت دے دی اس کے ذکر کرنے سے پہلے ہی عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ذکر فرما دیا، جس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو معاف فرما دیا، رسول کریم ﷺ کے منصب ومقام اور آپ کے تعلق مع اللہ پر نظر رکھنے والے حضرات نے فرمایا ہے کہ آنحضرت ﷺ کو جو غایت تعلق حضرت حق جل شانہ کے ساتھ تھا اس کے پیش نظر آپ کا قلب مبارک اس کا تحمل ہی نہ کر سکتا تھا کہ حق تعالیٰ کی طرف سے کسی معاملہ میں آپ سے جواب طلب کیا جائے، اگر شروع میں لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ کے الفاظ ذکر فرما دیئے جاتے جن میں صورۃً جواب طلبی کا عنوان ہے تو آنحضرت ﷺ کا قلب مبارک اس کا تحمل نہ کر سکتا، اس لئے اس سے پہلے عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ فرما کر ایک طرف تو اس پر مطلع کر دیا کہ کوئی ایسا کام ہوگیا ہے جو اللہ کے نزدیک پسندیدہ نہ تھا، دوسری طرف اس کی معافی کی اطلاع پہلے دے دی تا کہ اگلا کلام قلب مبارک پر زیادہ شاق نہ ہو۔

لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ: یعنی اللہ تعالیٰ نے آپ کو معاف تو کر دیا لیکن آپ نے ان کو ایسی جلدی اجازت کیوں دے دی تھی جب

تک کہ آپ کے سامنے سچے لوگ ظاہر نہ ہوجاتے، اس میں بڑوں کو تعلیم ہے کہ اپنے ماتحتوں کا عذر قبول کرنے میں احتیاط و بیداری سے کام لینا چاہیے کہ آیا وہ عذر سچ مچ واقع کے مطابق بھی ہے یا نہیں؟ یا اس میں کچھ فساد کی آمیزش ہے؟ کیونکہ بہت سے ماتحت دھوکہ بھی دیتے ہیں، پھر اس کا انجام ان ماتحتوں کے دین کی بے انتظامی ہے کہ ان کی دنیا و عاقبت برباد نہ ہوجائے۔

* * *

فائدہ: منافقین جھوٹے عذر کر کے جب مدینہ میں ٹھہرے رہنے کی اجازت طلب کرتے تو آپ ان کے کید و نفاق سے اغماض کر کے اور یہ سمجھ کر کہ ان کے ساتھ چلنے میں فساد کے سوا کوئی بہتری نہیں اجازت دیتے تھے اس کو فرمایا کہ اگر آپ اجازت نہ دیتے تو زیادہ بہتر ہوتا، کیونکہ اس وقت ظاہر ہوجاتا کہ انہوں نے اپنے نہ جانے کو کچھ آپ کی اجازت پر موقوف نہیں رکھا ہے، جانے کی توفیق تو انہیں کسی حال نہ ہوتی، البتہ آپ کے روبرو ان کا جھوٹ سچ کھل جاتا، پس اجازت دینا کوئی گناہ نہ تھا، البتہ نہ دینا مصالح حاضرہ کے اعتبار سے زیادہ موزوں ہوتا، اس اعلیٰ و اکمل صورت کے ترک کی وجہ سے خطاب کو عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ سے شروع فرمایا، عفو کا لفظ ضروری نہیں کہ گناہ ہی کے مقابلہ میں ہو، بعض محققین نے عفا اللہ عنك اس جملہ کو صدر کلام میں محض دعا و تعظیم کے طور پر لیا ہے جیسا کہ عرب کے محاورات میں شائع تھا، مگر سلف سے وہ ہی منقول ہے جو ہم نے پہلے بیان کیا، اور لفظ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ اس کی تائید کرتا ہے، واللہ اعلم۔

لَا يَسْتَأْذِنُكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ط

نہیں رخصت مانگتے تجھ سے وہ لوگ جو ایمان لائے اللہ پر اور آخرت کے دن پر اس سے کہ لڑیں اپنے مال اور جان سے

وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۴﴾ اِنَّمَا يَسْتَأْذِنُكَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَارْتَابَتْ

اور اللہ خوب جانتا ہے ڈر والوں کو، رخصت وہی مانگتے ہیں تجھ سے جو نہیں ایمان لائے اللہ پر اور آخرت کے دن پر اور شک میں پڑے ہیں

قُلُوْبُهُمْ فَهُمْ فِيْ رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُوْنَ ﴿۴۵﴾

دل ان کے سو وہ اپنے شک ہی میں بھٹک رہے ہیں [1]

خلاصہ تفسیر: (اور) جو لوگ اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں وہ اپنے مال اور جان سے جہاد کرنے کے بارے میں (اس میں شریک نہ ہونے کی کبھی) آپ سے رخصت نہ مانگیں گے (بلکہ وہ حکم کے ساتھ دوڑ پڑیں گے) اور اللہ تعالیٰ ان متقیوں کو خوب جانتا ہے (ان کو اجر و ثواب دے گا) البتہ وہ لوگ (جہاد میں نہ جانے کی) آپ سے رخصت مانگتے ہیں جو اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان نہیں رکھتے اور ان کے دل (اسلام سے) شک میں پڑے ہیں، سو وہ اپنے شکوک میں پڑے ہوئے حیران ہیں (کبھی موافقت کا خیال ہوتا ہے کبھی مخالفت کا)۔

لَا يَسْتَأْذِنُكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ: یہاں یہ شبہ نہ کیا جائے کہ سورہ نور کے اخیر میں آیت: لم یذهبوا حتی یستاذنوہ میں تو مسلمانوں کی صفت یہ بتلائی گئی ہے کہ وہ اجازت مانگا کرتے ہیں، اور یہاں یہ فرمایا ہے کہ سچے مسلمان اجازت نہیں مانگتے؟ جواب یہ ہے کہ وہاں عذر کی وجہ سے اجازت مانگنا مذکور ہے، اور یہاں یہ مراد ہے کہ بغیر کسی عذر کے اجازت نہیں مانگتے، پس دونوں میں کوئی تعارض نہیں۔

لَا يَسْتَأْذِنُكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ: روح المعانی میں ہے کہ اس میں اشارہ ہے کہ مومن جب خیر کی بات کو سنتا ہے تو فوراً اس کی طرف دوڑتا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ حالت شوق سے پیدا ہوتی ہے تو اس میں ذوق و شوق کا اثبات ہے۔

* * *

فائدہ: [1] یعنی جن کے دلوں میں ایمان و تقویٰ کا نور ہے، ان کی یہ شان نہیں کہ جہاد سے الگ رہنے کی اس طرح بڑھ بڑھ کر اجازت

حاصل کریں، ان کا حال تو وہ ہے جو اس پارہ کے آخر میں بیان ہوا ہے تَوَلَّوْا وَّاَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا (التوبہ:۹۲) یعنی بے سروسامانی وغیرہ کے عذر سے اگر جہاد فی سبیل اللہ کے شرف سے محروم رہ جائیں تو اس فضل کے فوت ہو جانے پر ان کی آنکھیں اشکبار ہوتی ہیں، بے حیا بن کر جہاد سے علیحدہ رہنے کی اجازت لینا انہی کا شیوہ ہے جن کو خدا کے وعدوں پر یقین نہیں، نہ آخرت کی زندگی کو سمجھتے ہیں، حق تعالیٰ نے اسلام و مسلمین کے غالب و منصور ہونے کی جو خبریں دی ہیں ان کے متعلق ہمیشہ شک وشبہ میں گرفتار رہتے ہیں۔

وَلَوْ اَرَادُوا الْخُرُوْجَ لَاَعَدُّوْا لَهٗ عُدَّةً وَّلٰكِنْ كَرِهَ اللّٰهُ انْۢبِعَاثَهُمْ فَثَبَّطَهُمْ وَقِيْلَ اقْعُدُوْا

اور اگر وہ چاہتے نکلنا تو ضرور تیار کرتے کچھ سامان اس کا لیکن پسند نہ کیا اللہ نے ان کا اٹھنا سو روک دیا ان کو اور حکم ہوا کہ بیٹھے رہو

مَعَ الْقٰعِدِيْنَ ﴿۴۶﴾

ساتھ بیٹھنے والوں کے

خلاصہ تفسیر: اوپر منافقین کا پیچھے رہ جانا اور جھوٹا عذر کرنا بیان ہوا، اب آگے اس عذر کے جھوٹ ہونے کا قرینہ بیان فرماتے ہیں اور منافقین کے پیچھے رہنے پر غم نہ کرنے کے لیے اس کی حکمت بتلاتے ہیں کہ ان کا ساتھ نہ جانا ہی بہتر تھا، اگر یہ ساتھ جاتے تو فتنہ فساد ہی کرتے اور اس کی تائید گزشتہ واقعات سے بیان کرتے ہیں۔

اور اگر وہ لوگ (غزوہ میں) چلنے کا ارادہ کرتے (جیسا کہ وہ اپنے عذر کے وقت ظاہر کرتے ہیں کہ چلنے کا تو ارادہ تھا، لیکن کیا کیا جائے فلاں ضرورت پیش آ گئی، سو اگر ایسا ہوتا) تو اس (چلنے) کا کچھ سامان تو درست کرتے (جیسا کہ سفر کی لازمی عادتوں میں سے ہے) لیکن (انہوں نے تو شروع سے ارادہ ہی نہیں کیا اور اسی میں خیر ہوئی جیسا آگے آتا ہے: لَوْ خَرَجُوْا فِيْكُمْ اور اس کے خیر ہونے کی وجہ سے) اللہ تعالیٰ نے ان کے جانے کو پسند نہیں کیا اس لئے ان کو توفیق نہیں دی اور (بحکم تکوینی) یوں کہہ دیا گیا کہ اپاہج لوگوں کے ساتھ تم بھی یہاں ہی دھرے رہو۔

وَلَوْ اَرَادُوا الْخُرُوْجَ لَاَعَدُّوْا: اس میں دلیل ہے کہ تعطل (عمل نہ کرنا) علامت ہے ارادہ نہ ہونے کی، جیسے بہت سے لوگ اپنے نفس کے دھوکہ میں پڑے ہوئے ہیں کہ ہمیں طاعت وعبادت کی رغبت ہے لیکن ان کا یہ خیال جھوٹا ہے، وسوسہ ہے، چنانچہ کہا گیا ہے: ''اگر عشق ہوتا تو تدبیر کرتا''، اس آیت سے ایک اہم اصول مستفاد ہوا، جس سے معقول اور نامعقول عذر میں امتیاز کیا جا سکتا ہے وہ یہ کہ عذر انہی لوگوں کا قابل قبول ہو سکتا ہے جو حکم کی تعمیل کے لئے تیار ہوں، پھر کسی اتفاقی حادثہ کے سبب معذور ہو گئے، معذوروں کے تمام معاملات کا یہی حکم ہے، اور جس نے تعمیل حکم کے لئے کوئی تیاری ہی نہیں کی اور ارادہ ہی نہیں کیا، پھر کوئی عذر بھی پیش آ گیا تو یہ عذر گناہ بدتر از گناہ کی ایک مثال ہوگی، صحیح عذر نہ سمجھا جائے گا۔

* * *

فائدہ: ان کا ارادہ ہی گھر سے نکلنے کا نہیں، ورنہ اسکا کچھ تو سامان کرتے حکم جہاد سنتے ہی جھوٹے عذر نہ لے دوڑتے، واقعہ یہ ہے کہ خدا نے ان کی شرکت کو پسند ہی نہیں کیا، یہ جاتے تو وہاں فتنے اٹھاتے، نہ جانے کی صورت میں انہیں پتہ لگ جائے گا کہ مومنین کو خدا کے فضل سے ایک تنکے کے برابر ان کی پروا نہیں، اسی لیے خدا نے صفوف مجاہدین میں شامل ہونے سے روک دیا اس طرح کہ رکنے کا وبال انہی کے سر پر رہے، گویا ان کو تکوینا کہہ دیا گیا کہ جاؤ، عورتوں بچوں اور اپاہج آدمیوں کے ساتھ گھر میں گھس کر بیٹھ رہو، اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اعذار کاذبہ کے جواب میں جو گھر بیٹھ رہنے کی اجازت دے دی، یہ بھی ایک طرح خدا ہی کا فرما دینا ہے، اس لیے تکوینا کی قید بھی ضروری نہیں۔

لَوْ خَرَجُوْا فِيْكُمْ مَّا زَادُوْكُمْ اِلَّا خَبَالًا وَّلَاَاوْضَعُوْا خِلٰلَكُمْ يَبْغُوْنَكُمُ الْفِتْنَةَ ۚ

اگر نکلتے تم میں تو کچھ نہ بڑھاتے تمہارے لیے مگر خرابی اور گھوڑے دوڑاتے تمہارے اندر بگاڑ کروانے کی تلاش میں ۔

وَفِيكُمْ سَمّٰعُونَ لَهُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيمٌۢ بِالظّٰلِمِينَ ﴿٤٧﴾

اورتم میں بعضے جاسوس ہیں ان کے، اور اللہ خوب جانتا ہے ظالموں کو ۲۔

خلاصہ تفسیر: (اور منافقین کے نہ جانے میں خیر ہونے کی وجہ یہ ہے کہ) اگر یہ لوگ تمہارے ساتھ شامل ہو جاتے تو سوا اس کے کہ اور دونا فساد کرتے اور کیا ہوتا (وہ فساد یہ ہوتا کہ) تمہارے درمیان فتنہ پردازی کی فکر میں دوڑے دوڑے پھرتے (یعنی لگائی بجھائی کر کے آپس میں تفریق ڈلواتے، اور جھوٹی خبریں اڑا کر پریشان کرتے، دشمن کا رعب تمہارے دلوں میں ڈالنے کی کوشش کرتے، اس لئے ان کا نہ جانا ہی اچھا ہوا) اور (اب بھی) تم میں ان کے کچھ جاسوس موجود ہیں (جن کو فساد کی تدبیر میں مہارت نہیں) اور ان ظالموں کو اللہ خوب سمجھے گا۔

وَفِيكُمْ سَمّٰعُونَ لَهُمْ: بعض مفسرین نے ان کو منافق کہا ہے، مگر چونکہ یہ لوگ اہل الرائے نہ تھے اس لیے ان سے جاسوسی کے سوا اور کسی فساد کا خوف نہ تھا، بلکہ اس میں بعض مصلحتیں پوشیدہ تھیں کہ مسلمانوں کا غلبہ اور استقلال اور کفار کا ضعیف اور مرعوب ہونا دیکھ کر اپنے سرداروں کو خبر دیں تو وہ اور زیادہ جلیں مریں اور ان کے حوصلے ہمیشہ کو پست ہو جائیں اس لیے ان کا ساتھ جانا حکمت کے خلاف نہ تھا۔

* * *

فائدہ: ۱۔ یعنی اگر تمہارے ساتھ نکلتے تو اپنے جبن و نامردی کی وجہ سے دوسروں کی ہمتیں بھی سست کر دیتے اور آپس میں لگا بجھا کر مسلمانوں میں تفریق ڈالنے کی کوشش کرتے اور جھوٹی افواہیں اڑا کر ان کو دشمنوں سے ہیبت زدہ کرنا چاہتے، غرض ان کے وجود سے بھلائی میں تو کوئی اضافہ نہ ہوتا ہاں برائی بڑھ جاتی اور فتنہ انگیزی کا زور ہوتا، ان ہی وجوہ سے خدا نے ان کو جانے کی توفیق نہ بخشی۔

فائدہ: ۲۔ یعنی اب بھی ان کے جاسوس یا بعض ایسے سادہ لوح افراد تم میں موجود ہیں جو ان کی بات سنتے اور تھوڑا بہت متاثر ہوتے ہیں (ابن کثیر) گو ویسا فتنہ فساد برپا نہیں کر سکتے جو ان شریروں کے وجود سے ہو سکتا تھا، بلکہ ایک حیثیت سے ایسے جواسیس کا ہمراہ جانا مفید ہے کہ وہ بچشم خود مسلمانوں کی اولوالعزمی، بے جگری وغیرہ دیکھ کر ان سے نقل کریں گے تو ان کے دلوں پر بھی مسلمانوں کی ہیبت قائم ہو گی۔

لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلُ وَقَلَّبُوْا لَكَ الْاُمُوْرَ حَتّٰى جَآءَ الْحَقُّ وَظَهَرَ اَمْرُ اللّٰهِ وَهُمْ كٰرِهُوْنَ ﴿٤٨﴾

وہ تلاش کرتے رہے ہیں بگاڑ کی پہلے سے اور الٹتے رہے تیرے کام یہاں تک کہ آپہنچا سچا وعدہ اور غالب ہوا حکم اللہ کا اور وہ ناخوش ہی رہے

خلاصہ تفسیر: (اور ان لوگوں کی فتنہ پردازی کچھ آج نئی نہیں) انہوں نے تو پہلے (جنگ احد وغیرہ میں) بھی فتنہ پردازی کی فکر کی تھی (کہ لڑائی میں ساتھ ہو کر عین وقت پر الگ ہو گئے تا کہ مسلمان ہمت ہار دیں) اور (اس کے علاوہ بھی) آپ کی (ضرر رسانی کے) لئے کارروائیوں کی الٹ پھیر کرتے ہی رہے، یہاں تک کہ سچا وعدہ آ گیا اور (اس کا آنا یہ ہے کہ) اللہ کا حکم غالب رہا اور ان کو ناگوار ہی گذرتا رہا (اسی طرح آئندہ بھی ان کی تدبیریں ناکام رہیں گی، بالکل تسلی رکھئے کچھ فکر نہ کیجئے)۔

* * *

فائدہ: جس وقت حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) مدینہ تشریف لائے، یہود اور منافقین مدینہ آپ کے خلاف طرح طرح کی فتنہ انگیزیاں کرتے رہے اور اسلام کی روز افزوں ترقیات کا تختہ الٹنے کے لیے بہت کچھ الٹ پھیر کی، مگر بدر میں جب کفر و شرک کے بڑے بڑے ستون گر گئے اور حیرت انگیز طریقہ پر اسلام کا غلبہ ظاہر ہوا تو عبد اللہ بن ابی اور اس کے ساتھیوں نے کہا: "اِنَّ هٰذَا اَمْرٌ قَدْ تَوَجَّهَ" کہ یہ چیز تو اب رکنے والی معلوم نہیں ہوتی، چنانچہ بہت سے لوگ خوف کھا کر محض زبان سے کلمہ پڑھنے لگے مگر چونکہ دل میں کفر چھپا ہوا تھا اس لئے جوں جوں اسلام و مسلمین کی کامیابی اور غلبہ دیکھتے، دل ہی دل میں جلتے اور غیظ کھاتے تھے، غرض ان کی فتنہ پردازی اور مکاری کوئی نئی چیز نہیں، شروع سے ان کا یہی وطیرہ رہا ہے جنگ احد میں یہ لوگ اپنی جماعت کو لے کر راستہ سے لوٹ آئے تھے، مگر آخر دیکھ لیا کہ حق کس طرح غالب ہو کر رہتا ہے اور باطل کیسے ذلیل و رسوا کیا جاتا ہے۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ ائْذَنْ لِّيْ وَلَا تَفْتِنِّيْ ؕ اَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا ؕ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ﴿۴۹﴾

اور بعضے ان میں کہتے ہیں مجھ کو رخصت دے اور گمراہی میں نہ ڈال، سنتا ہے وہ تو گمراہی میں پڑ چکے ہیں، اور بیشک دوزخ گھیر رہی ہے کافروں کو

خلاصہ تفسیر: پیچھے منافقین کی عام حالت مذکور تھی، اب آگے کئی آیتوں میں جن کے شروع میں لفظ مِنْهُمْ ہے بعض خاص لوگوں کے احوال واقوال مذکور ہیں اور درمیان میں عام حالات کا بھی بیان ہے۔

اور ان (پیچھے رہ جانے والے منافقین) میں بعض شخص وہ ہے جو (آپ سے) کہتا ہے کہ مجھ کو (غزوہ میں نہ جانے کی اور گھر رہنے کی) اجازت دیدیجئے، اور مجھ کو خرابی میں نہ ڈالئے، خوب سمجھ لو کہ یہ لوگ خرابی میں تو پڑ ہی چکے ہیں (کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی اور کفر سے بڑھ کر اور کونسی خرابی ہوگی) اور یقیناً دوزخ (آخرت میں) ان کافروں کو گھیرے گی۔

اس شخص کا نام جد بن قیس تھا، اس نے یہ بہانہ تراشا کہ میں عورتوں پر مفتون ہو جاتا ہوں، اور رومی عورتیں بہت حسین ہوتی ہیں، پس تبوک جانے میں میرا دینی نقصان ہے اس لیے رخصت کا خواستگار ہوں۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ ائْذَنْ لِّيْ وَلَا تَفْتِنِّيْ: یعنی روم کی عورتوں کے فتنہ میں مجھے مت ڈالیے، اور یہی نفس کی حالت ہے کہ کبھی نفس طاعات کی پابندی سے بہانہ کر کے عذر کرتا ہے کہ طاعت میں فلاں فلاں برائی ہے جس کا شر اس کی بھلائی سے بڑھا ہوا ہے، لہذا عمل میں کوتاہی کر جاتا ہے (یہ ایک خفیہ شیطانی مکر ہے جو انسان کو خیر سے محروم کر دیتا ہے)۔

* * *

فائدہ: ایک بڑے منافق جد بن قیس نے کہا کہ حضرت مجھے تو یہیں رہنے دیجئے، روم کی عورتیں بہت حسین ہوتی ہیں، میں انہیں دیکھ کر دل قابو میں نہ رکھ سکوں گا، تو مجھے وہاں لے جا کر گمراہی میں نہ ڈالیے، فرمایا کہ یہ لفظ کہہ کر اور اپنے جبن وکفر پر جھوٹی پرہیزگاری کا پردہ ڈال کر وہ گمراہی کے گڑھے میں گر چکا، اور آگے چل کر کفر ونفاق کی بدولت دوزخ کے گڑھے میں گرنے والا ہے بعض نے آیت کو عام منافقین کے حق میں رکھا ہے اور لَا تَفْتِنِّيْ کا مطلب یہ لیا ہے کہ ہم کو ساتھ لے جا کر اموال وغیرہ کے نقصان میں مبتلا نہ کیجئے اس کا جواب اَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا سے دیا۔

اِنْ تُصِبْكَ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۚ وَاِنْ تُصِبْكَ مُصِيْبَةٌ يَّقُوْلُوْا قَدْ اَخَذْنَاۤ اَمْرَنَا مِنْ قَبْلُ

اگر تجھ کو پہنچے کوئی خوبی تو وہ بری لگتی ہے ان کو، اور اگر پہنچے کوئی سختی تو کہتے ہیں ہم نے تو سنبھال لیا تھا اپنا کام پہلے ہی

وَيَتَوَلَّوْا وَّهُمْ فَرِحُوْنَ ﴿۵۰﴾

اور پھر کر جائیں خوشیاں کرتے

خلاصہ تفسیر: اگر آپ کو کوئی اچھی حالت پیش آتی ہے تو وہ ان کے لئے موجب غم ہوتی ہے، اور اگر آپ پر کوئی حادثہ آپڑتا ہے تو (خوش ہو کر) کہتے ہیں کہ ہم نے تو (اسی واسطے) پہلے سے اپنا احتیاط کا پہلو اختیار کر لیا تھا (کہ ان کے ساتھ لڑائی وغیرہ میں نہیں گئے تھے) اور (یہ کہہ کر) وہ خوش ہوتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔

* * *

فائدہ: منافقین کی عادت تھی، جب مسلمانوں کو غلبہ وکامیابی نصیب ہوتی تو جلتے اور کڑھتے تھے، اور اگر کبھی کوئی سختی کی بات پیش آگئی مثلاً کچھ مسلمان شہید یا مجروح ہو گئے، تو فخر یہ کہتے کہ ہم نے از راہ دور اندیشی پہلے ہی اپنے بچاؤ کا انتظام کر لیا تھا، ہم سمجھتے تھے کہ یہی حشر ہونے والا ہے لہذا ان کے ساتھ گئے ہی نہیں، غرض ڈینگیں مارتے ہوئے اور خوشی سے بغلیں بجاتے ہوئے اپنی مجلسوں سے گھروں کو واپس جاتے ہیں۔

قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا ۚ هُوَ مَوْلٰنَا ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۱﴾

تو کہہ دے ہم کو ہرگز نہ پہنچے گا مگر وہی جو لکھ دیا اللہ نے ہمارے لیے وہی ہے کارساز ہمارا، اور اللہ ہی پر چاہیے کہ بھروسہ کریں مسلمان

خلاصہ تفسیر: آپ (جواب میں ان سے دو باتیں) فرما دیجئے (ایک تو یہ کہ) ہم پر کوئی حادثہ نہیں پڑ سکتا مگر وہی جو اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے مقدر فرمایا ہے وہ ہمارا مالک ہے (پس مالک حقیقی کو ہر طرح تصرف کا اختیار ہے وہ جو تجویز کرے غلام کو اس پر راضی رہنا چاہیے) اور (خاص ہم ہی کیا) اللہ کے تو سب مسلمانوں کو اپنے سب کام سپرد رکھنے چاہئیں۔

پہلے جواب کا حاصل یہ ہے کہ اللہ مالک اور حاکم ہیں، حاکم ہونے کی حیثیت سے ان کو ہر تصرف کا اختیار ہے، اس لیے ہم راضی ہیں، یعنی جو خیر اور شر پہنچے فوراً اپنے دل میں سوچنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے یہی مقدر فرمایا تھا تو اس پر صبر کرنا آسان ہوگا۔

اس آیت نے مسئلہ توکل کی اصل حقیقت بھی واضح کردی، کہ تقدیر و توکل پر یقین رکھنے کا یہ حاصل نہ ہونا چاہئے کہ آدمی ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائے، اور یہ کہے کہ جو کچھ قسمت میں ہوگا وہ ہو جائے گا، بلکہ ہونا یہ چاہئے کہ اسباب اختیار یہ کے لئے اپنی پوری توانائی اور ہمت صرف کی جائے اور بعد قدرت اسباب جمع کرنے کے بعد معاملہ کو تقدیر و توکل کے حوالہ کریں، نظر صرف اللہ تعالیٰ پر رکھیں کہ نتائج ہر کام کے اسی کے قبضہ قدرت میں ہیں۔

مسئلہ تقدیر و توکل میں عام دنیا کے لوگ بڑی افراتفری میں پائے جاتے ہیں، کچھ بے دین لوگ تو وہ ہیں جو سرے سے تقدیر و توکل کے قائل ہی نہیں، انہوں نے مادی اسباب ہی کو خدا بنایا ہوا ہے، اور کچھ ناواقف ایسے بھی ہیں جنھوں نے تقدیر و توکل کو اپنی کم ہمتی اور بیکاری کا بہانہ بنالیا ہے، رسول کریم ﷺ کی جہاد کیلئے پوری پوری تیاری اور اسکے بعد اس آیت کے نزول نے اس افراط و تفریط کو ختم کر کے صحیح راہ دکھلا دی "بر توکل زانوئے اشتر بہ بند"، یعنی اسباب اختیار یہ بھی اللہ تعالیٰ ہی کی دی ہوئی نعمت ہیں، ان سے فائدہ نہ اٹھانا ناشکری اور بیوقوفی ہے، البتہ اسباب کو اسباب کے درجہ سے آگے نہ بڑھاؤ اور عقیدہ یہ رکھو کہ نتائج و ثمرات ان اسباب کے تابع نہیں، بلکہ فرمان حق جل شانہ کے تابع ہیں۔

قُلْ هَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَآ اِلَّآ اِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ ۭ وَنَحْنُ نَتَرَبَّصُ بِكُمْ اَنْ يُّصِيْبَكُمُ اللّٰهُ

تو کہہ دے تم کیا امید کرو گے ہمارے حق میں مگر دو خوبیوں میں سے ایک کی، اور ہم امیدوار ہیں تمہارے حق میں کہ ڈالے تم پر اللہ

بِعَذَابٍ مِّنْ عِنْدِهٖٓ اَوْ بِاَيْدِيْنَا ڮ فَتَرَبَّصُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ مُّتَرَبِّصُوْنَ ﴿۵۲﴾

کوئی عذاب اپنے پاس سے یا ہمارے ہاتھوں، سو منتظر رہو ہم بھی تمہارے ساتھ منتظر ہیں۔

خلاصہ تفسیر: (دوسری بات یہ) فرما دیجئے کہ (ہمارے لئے جس طرح خوش حالی بہتر ہے ویسے ہی حوادث اور مصائب بھی انجام کے اعتبار سے بہتر ہیں کہ ان میں بھی درجات کی بلندی اور گناہوں کی معافی ہوتی ہے، پس) تم تو ہمارے حق میں دو بہتریوں میں سے ایک بہتری کے منتظر رہتے ہو (یعنی تم جو ہماری حالت کے منتظر رہتے ہو کہ دیکھئے کیا ہو تو خواہ وہ حسنہ ہو یا مصیبت ہمارے لئے دونوں ہی میں بہتری ہے) اور ہم تمہارے حق میں اس کے منتظر رہا کرتے ہیں کہ خدا تعالیٰ تم پر کوئی عذاب واقع کرے گا (خواہ) اپنی طرف سے (دنیا میں یا آخرت میں) یا ہمارے ہاتھوں سے (جب کہ تم اپنے کفر کو کھلم کھلا ظاہر کردو، تو تم بھی دوسرے کفار کی طرح قتل کئے جاؤ) سو تم (اپنے طور پر) انتظار کرو (اور) ہم تمہارے ساتھ (اپنے طور پر) انتظار میں ہیں۔

دوسرے جواب کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ حکیم ہیں، اس مصیبت میں بھی ہمارے فائدے کی رعایت کرتے ہیں، اس لیے ہم ہر حال میں فائدے میں ہیں، بخلاف تمہارے کہ تمہاری خوش حالی کا انجام بھی وبال اور عذاب ہے اگر دنیا میں نہیں تو آخرت میں ضرور ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی سختی یا نرمی جو جس وقت کے لیے مقدر ہے وہ ٹل نہیں سکتی، نہ دنیا میں اس سے چارہ ہے، مگر ہم چونکہ ظاہر و باطن سے خدا کو اپنا حقیقی مولا اور پروردگار سمجھتے ہیں، لہٰذا ہماری گردنیں اس کے فیصلے اور حکم کے سامنے پست ہیں، کوئی سختی اس کی فرمانبرداری سے باز نہیں رکھتی، اور اسی پر ہم کو بھروسہ ہے کہ وہ عارضی سختی کو آخرت میں بالیقین اور بسا اوقات دنیا میں بھی راحت وخوشی سے تبدیل کر دے گا، اندریں صورت تم ہماری نسبت دو بھلائیوں میں سے کسی ایک کی ضرور امید کر سکتے ہو، اگر خدا کے راستہ میں مارے گئے تو شہادت و جنت، اور واپس آئے تو اجر یا غنیمت ضرور مل کر رہے گی، جیسا کہ حدیث صحیح میں حق تعالیٰ نے مجاہد کی نسبت ان چیزوں کا تکفل فرمایا ہے، برخلاف اس کے تمہاری نسبت ہم منتظر ہیں کہ دو برائیوں میں سے ایک برائی ضرور پہنچ کر رہے گی یا نفاق و شرارت کی بدولت بلا واسطہ قدرت کی طرف سے کوئی عذاب تم پر مسلط ہوگا، یا ہمارے ہاتھوں سے خدا تم کو سخت سزا دلوائے گا جو رسوا کر کے تمہارے نفاق کا پردہ فاش کر دے گی، بہرحال تم اور ہم دونوں کو ایک دوسرے کا انجام دیکھنے کے لیے منتظر رہنا چاہیے، آخر معلوم ہو جائے گا کہ دونوں میں زیادہ انجام بین اور دور اندیش کون تھا۔

قُلۡ اَنۡفِقُوۡا طَوۡعًا اَوۡ كَرۡهًا لَّنۡ يُّتَقَبَّلَ مِنۡكُمۡ‌ؕ اِنَّكُمۡ كُنۡتُمۡ قَوۡمًا فٰسِقِيۡنَ ﴿۵۳﴾

کہہ دے کہ مال خرچ کرو خوشی سے یا ناخوشی سے ہرگز قبول نہ ہوگا تم سے بیشک تم نافرمان لوگ ہو

خلاصہ تفسیر: پیچھے جس منافق کا یہ قول بیان ہوا کہ: لا تفتنی یعنی مجھے خرابی میں نہ ڈالیے، اس نے یہ بھی کہا تھا کہ میں خود تو نہ جاؤں گا، لیکن مال سے آپ کی اعانت کروں گا، اب آگے حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ایمان نہ ہونے کی وجہ سے یہ مالی امداد مقبول نہیں، کیونکہ طاعات کے قبول ہونے کے لیے ایمان شرط ہے۔

آپ (ان منافقین سے) فرما دیجئے کہ تم (جہاد وغیرہ میں) خواہ خوشی سے خرچ کرو یا ناخوشی سے، تم سے کسی طرح (خدا کے نزدیک) مقبول نہیں (کیونکہ) بلاشبہ تم نافرمانی کرنے والے لوگ ہو (مراد اس سے کفر ہے جیسا کہ آگے آتا ہے)۔

قُلۡ اَنۡفِقُوۡا طَوۡعًا اَوۡ كَرۡهًا: یعنی تم خوشی سے خرچ کرو یا ناخوشی سے، اس پر یہ شبہ نہ کیا جائے کہ اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ منافقین خوشی سے بھی خرچ کرتے تھے، اور اگلی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ ناگواری کے ساتھ خرچ کرتے تھے، پس دونوں آیتوں میں تعارض ہوا، جواب یہ ہے کہ اس جگہ خوشی اور ناخوشی دونوں کا ذکر بطور فرض کے ہے کہ اگر بالفرض تم خوشی سے خرچ کرو تب بھی ایمان نہ ہونے کی وجہ سے مقبول نہیں، اور اگلی آیت میں ان کی اصلی حالت کا بیان ہے کہ وہ خوشی سے کب خرچ کرتے ہیں، بلکہ ہمیشہ ناگواری سے خرچ کرتے ہیں، اور ناگواری کے ساتھ مسلمان کا خرچ کرنا بھی قبول نہیں تو کافر کا خرچ کرنا کیسے قبول ہو سکتا ہے۔

* * *

فائدہ: جد بن قیس نے رومی عورتوں کے فتنہ کا بہانہ کر کے یہ بھی کہا تھا کہ حضرت میں بذات خود نہیں جا سکتا، لیکن مالی اعانت کر سکتا ہوں، اس کا جواب دیا کہ بے اعتقاد کا مال قبول نہیں خواہ خوشی سے خرچ کرے یا ناخوشی سے، یعنی خوشی سے خدا کے راستہ میں خرچ کرنے کی ان کو توفیق کہاں وَلَا يُنۡفِقُوۡنَ اِلَّا وَهُمۡ كٰرِهُوۡنَ (التوبہ: ۵۴) تاہم اگر بالفرض خوشی سے بھی خرچ کریں تو خدا قبول نہ کرے گا، اس کا سبب اگلی آیت میں بتایا ہے:

وَمَا مَنَعَهُمۡ اَنۡ تُقۡبَلَ مِنۡهُمۡ نَفَقٰتُهُمۡ اِلَّاۤ اَنَّهُمۡ كَفَرُوۡا بِاللّٰهِ وَبِرَسُوۡلِهٖ وَلَا يَاۡتُوۡنَ الصَّلٰوةَ

اور موقوف نہیں ہوا قبول ہونا ان کے خرچ کا مگر اسی بات پر کہ وہ منکر ہوئے اللہ سے اور اس کے رسول سے، اور نہیں آتے نماز کو

اِلَّا وَهُمۡ كُسَالٰى وَلَا يُنۡفِقُوۡنَ اِلَّا وَهُمۡ كٰرِهُوۡنَ ﴿۵۴﴾

مگر ہارے جی سے اور خرچ نہیں کرتے مگر برے دل سے

خلاصہ تفسیر: اور ان کی خیرات قبول ہونے سے اس کے سوا کوئی مانع نہیں کہ انہوں نے اللہ کے ساتھ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کیا (اسی کو پیچھے نافرمان کہا تھا اور کافر کا کوئی عمل مقبول نہیں) اور (اس باطنی کفر کی علامت ظاہر میں یہ ہے کہ) وہ لوگ نماز نہیں پڑھتے مگر ہارے جی سے اور (نیک کام میں) خرچ نہیں کرتے مگر ناگواری کے ساتھ (کیونکہ دل میں ایمان تو ہے نہیں جس سے ثواب کی امید ہو، اور اس امید سے نیک کاموں کی رغبت ہو، بلکہ جو کچھ کرتے ہیں محض بدنامی سے بچنے کے لیے ہی کرتے ہیں)۔

وَلَا يَأْتُوْنَ الصَّلٰوةَ اِلَّا وَهُمْ كُسَالٰى: یعنی منافقین نماز نہیں پڑھتے مگر ہارے جی سے اور نیک کام میں خرچ نہیں کرتے مگر ناگواری کے ساتھ، اس میں منافقین کی دو علامتیں بتلائی گئی ہیں: ① ایک یہ کہ نماز کو آئیں تو سستی کاہلی اور ہارے جی سے آئیں ② دوسرے اللہ کی راہ میں خرچ کریں تو ناگواری کے ساتھ خرچ کریں، اس میں مسلمانوں کو بھی اس پر تنبیہ ہے کہ نماز میں سستی کاہلی اور زکوٰۃ صدقات سے دلی ناگواری پیدا ہونا علامت نفاق ہے، مسلمانوں کو کوشش کر کے ان علامات سے بچنا چاہئے، اس میں اشارہ ہے کہ ایسے لوگ بندگی کی لذت سے محروم اور جمال معبود کے مشاہدہ سے محروم ہیں، محمد بن فضل کا قول ہے کہ جس شخص کو آمر (اللہ) کی معرفت نہ ہوگی وہ حکم کی طرف سستی کے ساتھ اٹھتا ہے اور جس شخص کو آمر کی معرفت ہوگی وہ حکم کی طرف اس کو غنیمت اور راحت سمجھ کر اٹھے گا۔

* * *

فائدہ: عدم قبول کا اصل سبب تو ان کا کفر ہے جیسا کہ ہم پہلے متعدد مواقع میں اشارہ کر چکے کہ کافر کا ہر عمل مردہ اور بے جان ہوتا ہے، باقی نماز میں ہارے جی سے آنا، یا برے دل سے خرچ کرنا، یہ سب کفر کے ظاہری آثار ہیں۔

فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ ؕ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا

سو تو تعجب نہ کر ان کے مال اور اولاد سے، یہی چاہتا ہے اللہ کہ ان کو عذاب میں رکھے ان چیزوں کی وجہ سے دنیا کی زندگی میں

وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۵۵﴾

اور نکلے ان کی جان اور وہ اس وقت تک کافر ہی رہیں

خلاصہ تفسیر: (اور جب وہ ایسے مردود ہیں) تو ان کے اموال اور اولاد آپ کو (اس) تعجب میں نہ ڈالیں (کہ ایسے غیر مقبول مردود لوگوں کو اتنے انعامات کس طرح عطا ہوئے، کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ نعمت نہیں بلکہ ایک قسم کا عذاب ہی ہے) کیونکہ اللہ کو صرف یہ منظور ہے کہ ان چیزوں کی وجہ سے دنیوی زندگی میں (بھی) ان کو گرفتار عذاب رکھے اور ان کی جان کفر ہی کی حالت میں نکل جائے (جس سے آخرت میں بھی گرفتار عذاب ہوں تو جس مال و اولاد کا یہ انجام ہو اس کو انعام سمجھنا ہی غلطی ہے)۔

فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ: یعنی کفار و منافقین کے مال و اولاد کی کثرت آپ کو تعجب میں ڈالے، اس میں اہل ایمان کو اس پر تنبیہ ہے کہ وہ اہل دنیا کے مال، دولت اور زینت کو اچھا نہ سمجھیں اور کہیں اس کی وجہ سے آخرت کے عمل اور اس پر نظر کرنے سے غافل نہ ہو جائیں، یعنی اعمال پر سے نظر اٹھ جائے اور دنیا پر نظر جم جائے۔

اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا: دنیا میں مال و اولاد کا عذاب ہونا جب دنیا کے لیے لازم ہے اول تو اس کے حصول اور تمنا میں کیسی کیسی جسمانی اور روحانی کوفت اٹھانا پڑتی ہے، پھر حاصل ہونے کے بعد ذرا نقصان ہو گیا، یا ذرا بیماری ہو گئی تو بس غم کا ایک پہاڑ سر پر سوار ہے، اور اگر سب حالتیں مرضی کے موافق بھی ہوں تو اس بات کا اندیشہ کہ کوئی ناگوار بات پیش نہ آ جائے، پھر جدائی اور مفارقت کے وقت کس بلا کی حسرت اور صدمہ کہ خدا کی پناہ، اور ظاہر ہے کہ کافر پر جتنی دنیاوی نعمتیں زیادہ ہوں گی اس کا کفر دونا بڑھے گا جس پر عذاب بھی دونا ہوگا، پس جس مال و اولاد کا یہ انجام ہو وہ انعام کہاں، پھر اس پر تعجب کیوں ہو۔

نیز اس میں تنبیہ ہے کہ اہل دنیا جس سامان کو عیش و راحت کے لیے جمع کرتے ہیں اس میں انہیں راحت نہیں، اس کے جمع کرنے اور حفاظت کرنے میں محض مصیبتیں ہی جھیلتے ہیں، پھر انہیں اس میں ثواب کا اعتقاد اور تعلق مع اللہ بھی نہیں جس سے ان کی یہ مشقت سہل ہو جائے (قناعت اور بے فکری تو اہل ایمان کا حصہ ہے)۔

* * *

فائدہ: شبہ گزر سکتا تھا کہ جب یہ ایسے مردود ہیں تو ان کو مال و اولاد وغیرہ نعمتوں سے کیوں نوازا گیا ہے؟ اس کا جواب دیا کہ یہ نعمتیں ان کے حق میں بڑا عذاب ہیں، جس طرح ایک لذیذ اور خوشگوار غذا تندرست آدمی کی صحت و قوت کو بڑھاتی ہے اور فاسد الاخلاط مریض کو ہلاکت سے قریب تر کر دیتی ہے، یہ ہی حال ان دنیاوی نعمتوں (مال و اولاد وغیرہ) کا سمجھو، ایک کافر کے حق میں یہ چیزیں سوئے مزاج کی وجہ سے زہر ہلاہل ہیں، چونکہ کفار دنیا کی حرص و محبت میں غریق ہوتے ہیں، اس لیے اول اس کے جمع کرنے میں بیحد کوفت اٹھاتے ہیں، پھر ذرا نقصان یا صدمہ پہنچ گیا تو جس قدر محبت ان چیزوں سے ہے، اسی قدر غم سوار ہوتا ہے اور کوئی وقت اس کے فکر و اندیشہ اور ادھیڑ بن سے خالی نہیں جاتا، پھر جب موت ان محبوب چیزوں سے جدا کرتی ہے اس وقت کے صدمے اور حسرت کا تو اندازہ کرنا مشکل ہے، غرض دنیا کے عاشق اور حریص کو کسی وقت حقیقی چین اور اطمینان میسر نہیں، چنانچہ یورپ و امریکہ وغیرہ کے بڑے بڑے سرمایہ داروں کے اقوال اس پر شاہد ہیں۔

باقی مومنین جو دولت اور اولاد کو معبود اور زندگی کا اصلی نصب العین نہیں سمجھتے، چونکہ ان کے دل میں حب دنیا کا مرض نہیں ہوتا اس لیے یہ ہی چیزیں ان کے حق میں نعمت اور دین کی اعانت کا ذریعہ بنتی ہیں، اس کے علاوہ اکثر کفار کثرت مال و اولاد پر مغرور ہو کر کفر و طغیان میں اور زیادہ شدید ہو جاتے ہیں جو اس کا سبب بنتا ہے کہ اخیر دم تک کافر ہی رہیں، نیز منافقین مدینہ جن کے حق میں یہ آیات نازل ہوئیں، ان کا حال یہ تھا کہ بادل نخواستہ جہاد وغیرہ کے مواقع پر ریاء و نفاق سے مال خرچ کرتے تھے اور ان کی اولاد میں بعض لوگ مخلص مسلمان ہو کر نبی کریم ﷺ کے ہمراہ جہاد میں شریک ہوتے تھے، یہ دونوں چیزیں منافقین کے منشائے قلبی کے بالکلیہ خلاف تھیں، اس طرح اموال و اولاد ان کے لیے دنیا میں عذاب بن گئے تھے، حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں: ''یعنی یہ تعجب نہ کرے کہ بے دین کو اللہ نے نعمت کیوں دی، بے دین کے حق میں اولاد اور مال وبال ہے کہ ان کے پیچھے دل پریشان رہے اور ان کی فکر سے چھوٹنے نہ پائے مرتے دم تک، تا کہ توبہ کرے یا نیکی اختیار کرے''۔

وَيَحْلِفُونَ بِاللّٰهِ اِنَّهُمْ لَمِنْكُمْ ؕ وَمَا هُمْ مِّنْكُمْ وَلٰكِنَّهُمْ قَوْمٌ يَّفْرَقُوْنَ ﴿۵۶﴾

اور قسمیں کھاتے ہیں اللہ کی کہ وہ بیشک تم میں ہیں، اور وہ تم میں نہیں ولیکن وہ لوگ ڈرتے ہیں تم سے

لَوْ يَجِدُوْنَ مَلْجَاً اَوْ مَغٰرٰتٍ اَوْ مُدَّخَلًا لَّوَلَّوْا اِلَيْهِ وَهُمْ يَجْمَحُوْنَ ﴿۵۷﴾

اگر وہ پائیں کوئی پناہ کی جگہ یا غار یا سر گھسانے کو جگہ تو الٹے بھاگیں اسی طرف رسیاں تڑاتے۔

خلاصہ تفسیر: پیچھے منافقین کے کافر ہونے کا ذکر تھا، اب بتاتے ہیں کہ یہ لوگ نفاق اور تقیہ کی وجہ سے ایمان کا دعوی کرتے ہیں:

اور یہ (منافق) لوگ اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں کہ وہ تم میں سے ہیں (یعنی مسلمان ہیں) حالانکہ (واقع میں) وہ تم میں سے نہیں، لیکن (بات یہ ہے کہ) وہ ڈرپوک لوگ ہیں (اس وجہ سے ڈر کے مارے جھوٹی قسمیں کھا کر اپنے کفر کو چھپاتے ہیں کہ کہیں ہمارے ساتھ مسلمانوں کی طرف سے دوسرے کفار کا سا معاملہ نہ ہونے لگے، اور کسی دوسری جگہ ان کا ٹھکانا نہیں جہاں جا کر آزادی سے رہیں ورنہ) ان لوگوں کو اگر کوئی پناہ کی جگہ مل جاتی یا (کہیں پہاڑ وغیرہ میں) غار (مل جاتے) یا کوئی گھس بیٹھنے کی ذرا جگہ (مل جاتی) تو یہ ضرور منہ اٹھا کر ادھر ہی چل دیتے (اور ایمان کا اظہار نہ کرتے، مگر یہ صورت ہی نہیں اس لئے جھوٹی قسمیں کھا کر اپنے آپ کو مسلمان بتاتے ہیں)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی محض اس خوف سے کہ کفر ظاہر کریں تو کفار کا سا معاملہ ان کے ساتھ بھی ہونے لگے گا، قسمیں کھاتے ہیں کہ ہم تو تمہاری ہی جماعت (مسلمین) میں شامل ہیں، حالانکہ یہ بالکل غلط ہے اگر آج ان کو کوئی پناہ کی جگہ مل جائے یا کسی غار میں چھپ کر زندگی بسر کر سکیں یا کم از کم ذرا سر گھسانے کی جگہ ہاتھ آجائے، غرض حکومت اسلامی کا خوف نہ رہے، تو سب دعوے چھوڑ کر بے تحاشا اسی طرف بھاگنے لگیں، چونکہ نہ اسلامی حکومت کے مقابلہ کی طاقت ہے نہ کوئی پناہ کی جگہ ملتی ہے اس لیے قسمیں کھا کھا کر جھوٹی باتیں بناتے ہیں۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِي الصَّدَقٰتِ ۚ فَاِنْ اُعْطُوْا مِنْهَا رَضُوْا وَاِنْ لَّمْ يُعْطَوْا مِنْهَآ

اور بعضے ان میں وہ ہیں کہ تجھ کو طعن دیتے ہیں خیرات بانٹنے میں، سو اگر ان کو ملے اس میں سے تو راضی ہوں اور اگر نہ ملے

اِذَا هُمْ يَسْخَطُوْنَ ﴿۵۸﴾

تو جبھی وہ ناخوش ہو جائیں

خلاصہ تفسیر: اور ان میں بعض لوگ وہ ہیں جو صدقات (تقسیم کرنے) کے بارے میں آپ پر طعن کرتے ہیں (کہ اس تقسیم میں نعوذ باللہ انصاف نہیں کیا گیا) تو اگر صدقات میں سے ان کو (ان کی خواہش کے مطابق) مل جاتا ہے تو وہ راضی ہو جاتے ہیں، اور اگر ان صدقات میں سے ان کو (اپنی خواہش کے مطابق) نہیں ملتا تو وہ ناراض ہو جاتے ہیں (جس سے معلوم ہوا کہ ان کے اعتراض کا منشاء دراصل کوئی اصول نہیں، بلکہ دنیا کی حرص اور خود غرضی ہے، سو ایسے اعتراض کا باطل ہونا ظاہر ہے)۔

فَاِنْ اُعْطُوْا مِنْهَا رَضُوْا: اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اموال صدقات میں سے منافقین کو بھی حصہ ملا کرتا تھا، مگر وہ خواہش کے مطابق نہ ملنے پر ناراض ہو جاتے اور طعن و تشنیع کرنے لگتے تھے، یہاں اگر صدقات سے مراد عام معنی لئے جائیں جس میں صدقات واجبہ اور نافلہ سب شامل ہیں تو کوئی اشکال ہی نہیں کیونکہ نفلی صدقات میں سے غیر مسلموں کو دینا باتفاق امت جائز اور سنت سے ثابت ہے، اور اگر صدقات سے مراد اس جگہ صدقات فرض، زکوٰۃ عشر وغیرہ ہی ہوں، تو منافقین کو اس میں سے حصہ دینا اس بناء پر تھا کہ وہ اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرتے تھے، اور ظاہری کوئی حجت ان کے کفر پر قائم نہ ہوئی تھی، اور اللہ تعالیٰ نے مصلحت کی وجہ سے حکم یہی دے رکھا تھا کہ منافقین کے ساتھ وہی معاملہ کیا جائے جو مسلمانوں کے ساتھ کیا جاتا تھا۔

* * *

فائدہ: بعض منافقین اور بعض اعراب (بدو) صدقات و غنائم کی تقسیم کے وقت دنیاوی حرص اور خود غرضی کی راہ سے حضور ﷺ کی نسبت زبان طعن کھولتے تھے کہ تقسیم میں انصاف کا پہلو ملحوظ نہیں رکھا گیا، مگر یہ اعتراض اسی وقت تک تھا جب تک ان کی خواہش کے موافق صدقات وغیرہ میں سے حصہ نہ دیا جائے، اگر انہیں خوب جی بھر کر خواہش و حرص کے موافق دے دیا گیا تو خوش ہو جاتے اور کچھ اعتراض نہیں رہتا تھا گویا ہر طرح مال و دولت کو قبلہ مقصود ٹھہرا رکھا تھا، آگے بتلاتے ہیں کہ ایک مدعی ایمان کا مطمح نظر یہ نہیں ہونا چاہیے۔

وَلَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۙ وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ سَيُؤْتِيْنَا اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ

اور کیا اچھا ہوتا اگر وہ راضی ہو جاتے اسی پر جو دیا انکو اللہ نے اور اسکے رسول نے، اور کہتے کافی ہے ہم کو اللہ وہ دے گا ہم کو اپنے فضل سے

وَرَسُوْلُهٗٓ ۙ اِنَّآ اِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوْنَ ﴿۵۹﴾ ع

اور اس کا رسول، ہم کو تو اللہ ہی چاہیے

خلاصہ تفسیر: اور ان کے لئے بہتر ہوتا اگر وہ لوگ اس پر راضی رہتے جو کچھ اللہ نے ان کو (دلوایا تھا) اور اس کے رسول نے دیا

تھا اور (اس کے متعلق) یوں کہتے کہ ہم کو اللہ (کا دیا) کافی ہے (یعنی جس قدر ان کو دیا گیا تھا اس کو مناسب سمجھتے اور یوں خیال کرتے کہ ہمارے لیے اسی میں خیر و برکت ہوگی، اور اگر پھر حاجت پیش آئے گی اور مصلحت ہوگی تو) آئندہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ہم کو اور دے گا، اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) دیں گے، ہم (دل سے) اللہ ہی کی طرف راغب ہیں (اسی سے سب امیدیں رکھتے ہیں)۔

وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ سَيُؤْتِيْنَا اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ: اگر کسی کو شبہ ہو کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ صدقات میں سے منافقین کو بھی ملا کرتا تھا حالانکہ وہ تو کافر تھے، جواب یہ ہے کہ اگر یہ صدقہ نفل تھا تب تو کوئی اشکال ہی نہیں، کیونکہ نفلی صدقہ کافر کو بھی دے سکتے ہیں، اور اگر فرض صدقہ تھا تو اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ اس وقت منافقین کے ساتھ تمام احکام میں مسلمانوں کا سا برتاؤ کیا جاتا اس میں بھی ایسا ہی کیا گیا۔

وَلَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ: اہل رضا و اہل توکل کی علامت یہی ہے کہ انہیں جو کچھ اللہ کی طرف سے پیش آجائے اس پر خوش و خرم رہتے ہیں حتیٰ کہ مصیبتوں میں بھی لذت حاصل کرتے ہیں۔

* * *

فائدہ: یعنی بہترین طریقہ یہ ہے کہ جو کچھ خدا پیغمبر کے ہاتھ سے دلوائے اس پر آدمی راضی و قانع ہو اور صرف خدا پر توکل کرے اور سمجھے کہ وہ چاہے گا تو آئندہ اپنے فضل سے بہت کچھ مرحمت فرمائے گا، غرض دنیا کی متاع فانی کو نصب العین نہ بنائے، صرف خداوند رب العزت کے قرب و رضا کا طالب ہو اور جو ظاہری و باطنی دولت خدا اور رسول کی سرکار سے ملے اسی پر مسرور و مطمئن ہو۔

اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ

زکوٰۃ جو ہے وہ حق ہے مفلسوں کا اور محتاجوں کا اور زکوٰۃ کے کام پر جانے والوں کا اور جن کا دل پرچانا منظور ہے اور گردنوں کے چھڑانے میں

وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ؕ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿٦٠﴾

اور جو تاوان بھریں اور اللہ کے راستہ میں اور راہ کے مسافر کو، ٹھہرایا ہوا ہے اللہ کا، اور اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے

خلاصہ تفسیر: اس سے پہلی آیتوں میں صدقات کے بارے میں رسول کریم کا ذکر تھا، جس میں منافقین نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ الزام لگایا تھا آپ (معاذ اللہ) صدقات کی تقسیم میں انصاف نہیں کرتے، جس کو چاہتے ہیں جو چاہتے ہیں دے دیتے ہیں، اس آیت میں حق تعالیٰ نے مصارف صدقات کو متعین فرما کر ان کی اس غلط فہمی کو دور کر دیا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ بات خود متعین فرما دی ہے کہ صدقات کن لوگوں کو دینے چاہئیں، اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تقسیم صدقات میں اسی ارشاد ربانی کی تعمیل فرماتے ہیں، اپنی رائے سے کچھ نہیں کرتے، اگرچہ یہاں آیت میں فرض صدقات کا بیان ہے اور پیچھے آیات میں صدقات کا فرض ہونا ثابت نہیں، لیکن اس سے نفلی صدقات کا حال بھی معلوم ہوسکتا ہے کہ جس طرح فرض صدقات کا مدار خاص اوصاف اور مصالح پر ہے اسی طرح نفلی صدقات میں بھی بعض خاص مصلحتوں کی رعایت کی جاتی ہے، قاسم امین صلی اللہ علیہ وسلم ان کو پیش نظر رکھتے ہیں، اس صورت میں یہاں فرض صدقات کو خاص طور پر ذکر کرنا بطور مثال کے ہوگا۔

(فرض) صدقات تو صرف حق ہے غریبوں کا، اور محتاجوں کا، اور جو کارکن ان صدقات (کی تحصیل وصول کرنے) پر متعین ہیں، اور جن کی دلجوئی کرنا (منظور) ہے، اور غلاموں کی گردن چھڑانے میں (صرف کیا جائے) اور قرض داروں کے قرضہ (ادا کرنے) میں، اور جہاد کرنے (والوں کے سامان) میں اور مسافروں کی (امداد) میں، یہ حکم اللہ کی طرف سے مقرر ہے، اور اللہ تعالیٰ بڑے علم والے بڑی حکمت والے ہیں (مناسب نامناسب کو جانتے ہیں اور مناسب احکام مقرر کرتے ہیں)۔

لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ: "فقیر" اور "مسکین" کی تفسیر میں اگرچہ اختلاف کیا گیا ہے کہ ایک کے معنی یہ ہیں کہ جس کے پاس کچھ نہ ہو، اور ایک کے معنی یہ ہیں کہ جس کے پاس نصاب سے کم ہو، لیکن زکوٰۃ کے حکم میں کچھ اختلاف نہیں، اور زکوٰۃ و صدقات وصول کرنے والوں کے سوا باقی جس قدر

اقسام یہاں مذکور ہیں ان سب میں زکوۃ دینے کے لیے یہ بھی شرط ہے کہ ضرورت سے زیادہ مقدار نصاب مال کے وہ مالک اور قابض نہ ہوں، اور اس بنا پر صرف فقراء کہہ دینا کافی معلوم ہوتا ہے، لیکن دوسرے عنوانات کے لانے سے یہ مقصود ہے کہ ان میں فقر ومسکنت کے علاوہ دوسرے اسباب بھی ایسے موجود ہیں جن کی وجہ سے وہ دست گیری اور امداد کے مستحق ہیں اور مسلمان ہونا سب کے لیے شرط ہے۔

وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا : جو کہ سلطان اسلام کی طرف سے صدقات اور زکوۃ وصول کرنے پر مقرر ہیں کہ ان کو غنی ہونے کے باوجود بھی اسی زکوۃ میں سے اجرت اور تنخواہ کے طور پر دینا جائز ہے۔

وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ : جناب رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں بعض کافروں کو زکوۃ دی جاتی تھی اگر چہ وہ مسلمان نہ تھے، مگر اسلام کی امید تھی، یا محض ان کے فتنہ وشرارت سے بچنے کے لیے کچھ زکوۃ میں سے دے دیا جاتا تھا، اور بعض نومسلموں کو بھی اگر چہ وہ غریب نہ ہوں، محض اسلام سے محبت پیدا کرنے کے لیے زکوۃ دی جاتی تھی اور ان لوگوں کو ''مؤلفۃ القلوب'' کہا جاتا تھا، مگر صحابہ کے وقت میں اجماع ہو گیا کہ اب ان کا زکوۃ میں کوئی حق نہیں ہے، جس سے معلوم ہو گیا کہ اب وہ پہلا حکم منسوخ ہے، البتہ اگر کوئی نومسلم غریب ہو اور دل جوئی کی ضرورت ہو تو اس کو غریبوں میں داخل کر کے زکوۃ دی جائے گی۔

وَفِي الرِّقَابِ : گردن چھڑانے کا مطلب یہ ہے کہ کسی غلام کو اس کے آقا نے یہ کہہ دیا ہو کہ تو اتنا روپیہ مجھے دے دے پھر تو آزاد ہے، اس غلام کو زکوۃ دی جائے تاکہ وہ اپنے آقا کو روپیہ دے کر آزاد ہو جائے۔

وَالْغٰرِمِيْنَ : اگر کسی کے پاس دس ہزار موجود ہو اور اس سے زیادہ کا مثلاً گیارہ ہزار کا قرض دار ہو تو اس کو زکوۃ دینا درست ہے۔

وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ : مجاہد اپنے گھر میں تو مال اور سامان رکھتا ہے مگر گھر سے جدا ہے اور یہاں سامان نہیں اس کو زکوۃ دینا درست ہے اور یہی حکم ہر مسافر کا ہے، یہ سب احکام فرض صدقہ کے ہیں، نفلی صدقہ میں یہ قید نہیں۔

* * *

فائدہ: چونکہ تقسیم صدقات کے معاملہ میں پیغمبر پر طعن کیا گیا تھا، اس لیے متنبہ فرماتے ہیں کہ صدقات کی تقسیم کا طریقہ خدا کا مقرر کیا ہوا ہے، اس نے صدقات وغیرہ کے مصارف متعین فرما کر فہرست نبی کریم ﷺ کے ہاتھ میں دے دی ہے، آپ ﷺ اسی کے موافق تقسیم کرتے ہیں اور کریں گے کسی کی خواہش کے تابع نہیں ہو سکتے، حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ خدا نے صدقات (زکوٰۃ) کی تقسیم کو نبی یا غیر نبی کسی کی مرضی پر نہیں چھوڑا، بلکہ بذات خود اس کے مصارف متعین کر دیے ہیں جو آٹھ ہیں:

① فقراء (جن کے پاس کچھ نہ ہو)۔ ② مساکین (جن کو بقدر حاجت میسر نہ ہو)۔

③ عاملین (جو اسلامی حکومت کی طرف سے تحصیل صدقات وغیرہ کے کاموں پر مامور ہوں)۔

④ مؤلفۃ القلوب (جن کے اسلام لانے کی امید ہو یا اسلام میں کمزور ہوں وغیر ذلک من الانواع، اکثر علماء کے نزدیک حضور ﷺ کی وفات کے بعد یہ مد نہیں رہی)۔

⑤ رقاب (یعنی غلاموں کا بدل کتابت ادا کر کے آزادی دلائی جائے یا خرید کر آزاد کیے جائیں یا اسیروں کا فدیہ دے کر رہا کرائے جائیں)۔

⑥ غارمین (جن پر کوئی حادثہ پڑا اور مقروض ہو گئے، یا کسی کی ضمانت وغیرہ کے بارے میں دب گئے)۔

⑦ سبیل اللہ (جہاد وغیرہ میں جانے والوں کی اعانت کی جائے)۔

⑧ ابن السبیل (مسافر جو حالت سفر میں مالک نصاب نہ ہو، گو مکان پر دولت رکھتا ہو)۔

حنفیہ کے یہاں تملیک ہر صورت میں ضروری ہے اور فقر شرط ہے، تفصیل فقہ میں ملاحظہ کی جائے۔

وَمِنۡهُمُ الَّذِيۡنَ يُؤۡذُوۡنَ النَّبِىَّ وَيَقُوۡلُوۡنَ هُوَ اُذُنٌ ‌ؕ قُلۡ اُذُنُ خَيۡرٍ لَّكُمۡ يُؤۡمِنُ بِاللّٰهِ

اور بعضے ان میں بدگوئی کرتے ہیں نبی کی اور کہتے ہیں کہ یہ شخص تو کان ہے، تو کہہ کان ہے تمہارے بھلے کے واسطے یقین رکھتا ہے اللہ پر

وَيُؤۡمِنُ لِلۡمُؤۡمِنِيۡنَ وَرَحۡمَةٌ لِّلَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡكُمۡ‌ ؕ وَالَّذِيۡنَ يُؤۡذُوۡنَ رَسُوۡلَ اللّٰهِ لَهُمۡ

اور یقین کرتا ہے مسلمانوں کی بات کا اور رحمت ہے ایمان والوں کے حق میں تم میں سے، اور جو لوگ بدگوئی کرتے ہیں اللہ کے رسول کی ان کے لیے

عَذَابٌ اَلِيۡمٌ ﴿۶۱﴾

عذاب ہے دردناک

خلاصہ تفسیر: اس کا شان نزول یہ ہے کہ بعض منافقین نے جناب رسول اللہ ﷺ کی شان میں کوئی نازیبا بات کہی، کسی دوسرے منافق نے کہا کہ ایسا مت کرو، کہیں آپ کو خبر نہ ہو جائے پھر ہماری خبر لیں، وہ شخص بولا کہ نہیں کچھ فکر نہیں، آپ ہر بات کان دے کر سن لیتے ہیں اور ہر ایک کے دھوکہ میں آجاتے ہیں، کچھ تحقیق نہیں کرتے، اگر ایسا ہوا ہم جا کر باتیں بنادیں گے اور دھوکہ دے کر بری ہو جائیں گے۔

اور ان (منافقین) میں بعض ایسے ہیں کہ نبی (ﷺ) کو ایذائیں پہنچاتے ہیں (یعنی آپ کی شان میں ایسی باتیں کہتے ہیں کہ سن کر آپ کو ایذاء ہو) اور (جب کوئی روکتا ہے تو) کہتے ہیں کہ آپ ہر بات کان دے کر سن لیتے ہیں (آپ کو جھوٹ بول کر دھوکہ دینا آسان ہے اس لئے کچھ فکر نہیں) آپ (جواب میں) فرما دیجئے کہ (تمہیں خود دھوکہ ہوا، سو) وہ نبی کان دے کر تو وہی بات سنتے ہیں جو تمہارے حق میں خیر (ہی خیر) ہے (اور جن باتوں میں خیر نہیں ہوتی ان کو کان دے کر نہیں سنتے، ہاں! اپنی طبعی خوش اخلاقی اور کرم کی بنا پر ان کو ٹال دیتے ہیں کہ باتیں بنانے والے کا مواخذہ یا پکڑ نہیں کرتے کہ اس کو کھلم کھلا جھٹلاتے جس سے تم کو یہ دھوکہ ہوا کہ رسول اللہ ﷺ ہر شخص کی بات کو سچا سمجھ لیتے ہیں، آگے ان اچھی باتوں کا بیان ہے جن کو آپ کان دے کر سنتے ہیں:) وہ اللہ (کی باتیں وحی سے معلوم کر کے ان) پر ایمان لاتے ہیں (جن کی تصدیق کا تمام عالم کے لیے خیر ہونا ظاہر ہے، کیونکہ تعلیم اور عدل کا پورا مدار ان کے سچا سمجھنے ہی پر ہے) اور مومنین (مخلصین کی باتوں) کا (بشرطیکہ وہ ایمان اور اخلاص کے ساتھ بیان کریں، یہ شرط اس لیے بڑھائی گئی کہ ہر مؤمن کی ہر بات کا سچا سمجھنا ضروری نہیں جب تک کہ وہ شرعی قاعدہ کے مطابق ایمان اور اخلاص کے ساتھ بیان نہ کرے، چنانچہ مؤمنین مخلصین کی باتوں کا) یقین کرتے ہیں (اس کا خیر ہونا بھی ظاہر ہے، کیونکہ عدل وانصاف اس پر موقوف ہے کہ حالات کی صحیح اطلاع ہو، اور اس کا ذریعہ سچے مخلص مسلمان ہی ہیں، غرض کان دے کر اور سچا سمجھ کر تو آپ صرف اللہ کی اور سچے مخلص مسلمانوں کی باتیں سنتے ہیں) اور (باقی تمہاری شرارت آمیز باتیں جو سن لیتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ) آپ ان لوگوں کے حال پر مہربانی فرماتے ہیں جو تم میں ایمان کا اظہار کرتے ہیں (اگرچہ ان کے دل میں ایمان نہ ہو، پس منافقین کی باتیں مہربانی اور خوش اخلاقی کی وجہ سے سن لیتے ہیں اور باوجود حقیقت سمجھ جانے کے درگذر اور خاموشی برتتے ہیں، خلاصہ یہ کہ تم یہ سمجھتے ہو کہ حضرت حقیقت کو نہیں سمجھتے جبکہ واقع میں حقیقت کو تم ہی نہیں سمجھتے، کیونکہ کسی بات کو سن لینا کبھی تصدیق کے طور پر ہوتا ہے کہ دل سے بھی اس کو صحیح سمجھیں اور کبھی مہربانی اخلاق کی وجہ سے ہوتا ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ منافقین کی مکاری کبھی آپ سے مخفی نہیں رہی، بلکہ مطلب یہ ہے کہ آپ کے سن لینے اور خاموش ہو جانے کی وجہ ہمیشہ یہی نہیں) اور جو لوگ رسول اللہ (ﷺ) کو ایذائیں پہنچاتے ہیں (کیونکہ ان کا آپ کو اُذُنٌ کہنا آپ کی تنقیص کے لئے تھا کہ معاذ اللہ آپ کو سمجھ نہیں اور جو کچھ سن لیتے ہیں اس کو مان لیتے ہیں) ان لوگوں کے لئے دردناک سزا ہوگی۔

قُلۡ اُذُنُ خَيۡرٍ لَّكُمۡ يُؤۡمِنُ بِاللّٰهِ: "اذن" سے ان منافقین کی مراد یہ تھی کہ آپ ﷺ ہر جا بے جا بات کو قبول کر لیتے ہیں، واقعی اور غیر واقعی میں فرق نہیں کرتے، حق تعالیٰ نے اس کا رد فرمایا کہ آپ ﷺ صرف حق بات کو قبول کرتے ہیں، جو غیر حق ہوتا ہے اسے متکلم کے منہ پر رد

نہیں فرماتے تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ آپ فرق نہیں کرتے، بلکہ وجہ یہ ہے کہ آپ ﷺ کی شان رحمت کی ہے، کسی کو رسوا نہیں کرتے، پس اس میں حضور ﷺ کی شان کرم کا بیان ہے کہ آپ لوگوں کی بات دھیان سے سنتے ہیں۔

***

فائدہ: منافقین آپس میں بیٹھ کر اسلام کے متعلق بدگوئی کرتے، جب کوئی کہتا کہ ہماری یہ باتیں پیغمبر ﷺ تک پہنچ جائیں گی تو کہتے کیا پرواہ ہے، ان کے سامنے ہم جھوٹی تاویلیں کر کے اپنی برأت کا یقین دلا دیں گے، کیونکہ وہ تو کان ہی کان ہیں جو سنتے ہیں فوراً تسلیم کر لیتے ہیں، ان کو باتوں میں لے کر آنا کچھ مشکل نہیں، بات یہ تھی کہ حضرت اپنے حیاء و وقار اور کریم النفسی سے جھوٹے کا جھوٹ پہچانتے، تب بھی نہ پکڑتے، خلق عظیم کی بناء پر مسامحت اور تغافل برتتے، وہ بیوقوف جانتے کہ آپ نے سمجھا ہی نہیں، حق تعالیٰ نے اس کا جواب دیا کہ اگر وہ کان ہی ہیں تو تمہارے بھلے کے واسطے ہیں، نبی کی یہ خوبی تمہارے حق میں بہتر ہے، نہیں تو اول تم پکڑے جاؤ گے اور یہ بھی ممکن ہے کہ حضور ﷺ کی اس چشم پوشی اور خلق عظیم پر کسی وقت مطلع ہو کر تمہیں ہدایت ہو جائے، تمہاری جھوٹی باتوں پر نبی (علیہ السلام) کا سکوت اس لیے نہیں کہ انہیں واقعی تمہارا یقین آ جاتا ہے، یقین تو ان کو اللہ پر ہے اور ایمانداروں کی بات پر ہاں تم میں سے جو دعوائے ایمان رکھتے ہیں، ان کے حق میں آپ کی خاموشی واغماض ایک طرح کی رحمت ہے کہ فی الحال منہ توڑ تکذیب کر کے ان کو رسوا نہیں کیا جاتا، باقی منافقین کی حرکات شنیعہ خدا سے پوشیدہ نہیں، رسول کی پیٹھ پیچھے جو بدگوئی کرتے ہیں یا هُوَ اُذُنٌ کہہ کر آپ ﷺ کو ایذا پہنچاتے ہیں، ان پر سزائے سخت کے منتظر رہیں۔

يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ لِيُرْضُوْكُمْ ۚ وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ اِنْ كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿۶۲﴾

قسمیں کھاتے ہیں اللہ کی تمہارے آگے تا کہ تم کو راضی کریں، اور اللہ کو اور اسکے رسول کو بہت ضرور ہے راضی کرنا اگر وہ ایمان رکھتے ہیں

خلاصہ تفسیر: پیچھے منافقین کے بعض خاص احوال واقوال کا بیان تھا، اب آگے پھر بقیہ مشترک حالتوں کا بیان ہے جن میں سے ایک یہ ہے کہ وہ اپنی فاسد اغراض کی وجہ سے جھوٹی قسمیں کھاتے تھے۔

یہ لوگ تمہارے (مسلمانوں کے) سامنے (جھوٹی) قسمیں کھاتے ہیں (کہ ہم نے فلاں بات نہیں کہی، یا ہم غزوہ میں فلاں عذر سے نہ جاسکے) تا کہ تم کو راضی کر لیں (جس سے ان کا جان و مال محفوظ رہے) حالانکہ اللہ اور اس کا رسول زیادہ حق رکھتے ہیں کہ اگر یہ لوگ سچے مسلمان ہیں تو اس کو راضی کریں (جو کہ موقوف ہے اخلاص اور ایمان پر)۔

يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ لِيُرْضُوْكُمْ: یہاں یہ شبہ نہ کیا جائے کہ روایات سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ منافقین جھوٹی قسمیں اس لیے کھایا کرتے تھے تا کہ رسول اللہ ﷺ ان سے راضی رہیں، اور اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مقصود مسلمانوں کو راضی کرنا تھا، حضور کو راضی کرنا نہ تھا، سو جواب یہ ہے کہ آپ کا راضی ہونا ایک تو اس طرح سے ہے کہ آپ ان کے جان و مال سے کچھ تعرض نہ کریں، اس اعتبار سے تو آپ کی رضامندی اور دوسرے مسلمانوں کی رضامندی یکساں ہے اور دوسرے دل سے راضی ہونا ہے، اس اعتبار سے آپ کا راضی ہونا گویا اللہ تعالیٰ کا راضی ہونا ہے، سو ان کا مقصود آپ کو دل سے راضی کرنا نہ تھا تا کہ خدا تعالیٰ بھی راضی ہوتے جو کہ اصل مطلوب ہے، بلکہ محض جان و مال بچانے کے لیے ظاہری طور پر آپ کو اور سب مسلمانوں کو راضی رکھنا چاہتے ہیں۔

***

فائدہ: حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ: ''کسی وقت حضرت ﷺ ان کی دغابازی پکڑتے تو مسلمانوں کے روبرو قسمیں کھاتے کہ ہمارے دل میں بری نیت نہ تھی، تا کہ ان کو راضی کر کے اپنی طرف کر لیں، نہ سمجھے کہ یہ فریب بازی خدا اور رسول ﷺ کے ساتھ کام نہیں آتی''، اگر دعوائے ایمان میں واقعی سچے ہیں تو دوسروں کو چھوڑ کر خدا اور رسول ﷺ کو راضی کرنے کی فکر کریں۔

اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّهٗ مَنْ يُّحَادِدِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاَنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدًا فِيْهَا ؕ

کیا وہ جان نہیں چکے کہ جو کوئی مقابلہ کرے اللہ سے اور اسکے رسول سے تو اسکے واسطے ہے دوزخ کی آگ سدا رہے اس میں

ذٰلِكَ الْخِزْيُ الْعَظِيْمُ ﴿٦٣﴾

یہی ہے بڑی رسوائی

خلاصہ تفسیر: کیا ان کو خبر نہیں کہ جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرے گا (جیسا یہ لوگ کر رہے ہیں) تو یہ بات طے ہو چکی ہے کہ ایسے شخص کو دوزخ کی آگ اس طور پر نصیب ہوگی کہ وہ اس میں ہمیشہ رہے گا (اور) یہ بڑی رسوائی (کی بات) ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی جس رسوائی سے بچنے کے لیے نفاق اختیار کیا ہے اس سے بڑی رسوائی یہ ہے۔

يَحْذَرُ الْمُنٰفِقُوْنَ اَنْ تُنَزَّلَ عَلَيْهِمْ سُوْرَةٌ تُنَبِّئُهُمْ بِمَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ ؕ قُلِ اسْتَهْزِءُوْا ۚ

ڈرا کرتے ہیں منافق اس بات سے کہ نازل ہو مسلمانوں پر ایسی سورت کہ جتا دے ان کو جو ان کے دل میں ہے، تو کہہ دے ٹھٹھے کرتے رہو

اِنَّ اللّٰهَ مُخْرِجٌ مَّا تَحْذَرُوْنَ ﴿٦٤﴾

اللہ کھول کر رہے گا اس چیز کو جس کا تم کو ڈر ہے

خلاصہ تفسیر: پیچھے منافقین کی بعض مشترک حالتوں کا بیان تھا، ایک ان میں سے یہ ہے کہ وہ خدا اور سول کے ساتھ استہزا کرتے تھے، پھر اس کی بیہودہ تاویل بھی کرتے تھے، آگے اسی کا بیان ہے جس کا قصہ یہ ہے کہ انہوں نے آپس میں بعض ایسی باتیں کیں جس میں دین کے ساتھ استہزاء اور دل لگی تھی، پھر اس وجہ سے کہ ان کی بہت سی راز کی باتوں کی اطلاع حضور ﷺ کو وحی کے ذریعہ سے ہو جاتی تھی ان کو یہ خیال ہوا کہ کہیں یہ بھی ظاہر نہ ہو جائے، چنانچہ وہ ظاہر ہو گئی اور آپ نے بلا کر پوچھا تو انہوں نے یہ بات بنائی کہ ہم تو محض مشغلہ اور خوش طبعی کر رہے تھے۔

منافق لوگ (طبعاً) اس سے اندیشہ کرتے ہیں کہ مسلمانوں پر (بذریعہ وحی پیغمبر ﷺ) کوئی ایسی سورت (مثلاً یا آیت) نازل نہ ہو جائے جو ان کو ان منافقین کے مافی الضمیر (دل کی پوشیدہ باتوں) پر اطلاع دیدے (یعنی انہوں نے جو استہزاء اور دل لگی کی باتیں چھپا کر کی ہیں جو مسلمانوں کے اعتبار سے ان اسرار کی طرح ہیں جیسے دل میں راز پوشیدہ ہوتا ہے کہیں مسلمانوں کو ان کی خبر نہ ہو جائے) آپ فرما دیجئے کہ اچھا تم استہزاء کرتے رہو (اس میں یہ جتلا دیا کہ ہمیں تمہارے استہزاء کی اطلاع ہے، چنانچہ آگے خود ارشاد ہے کہ:) بیشک اللہ تعالیٰ اس چیز کو ظاہر کر کے رہے گا جس کے (اظہار) سے تم اندیشہ کرتے تھے (چنانچہ اسْتَهْزِءُوْا میں ظاہر کر دیا کہ تم دل لگی اور استہزاء کر رہے تھے)۔

* * *

فائدہ: منافقین اپنی مجلسوں میں اسلام و پیغمبر اسلام کی بدگوئی کرتے، مومنین صادقین پر آوازے کستے، مہمات دین کا مذاق اڑاتے، پھر جب خیال آتا کہ ممکن ہے یہ باتیں حضور ﷺ تک پہنچ جائیں، تو کہتے کیا مضائقہ ہے وہ تو کان ہی کان ہیں، ہم ان کے سامنے جو تاویل و تلمیع کر دیں گے، سن کر اسے قبول کر لیں گے، مگر چونکہ بسا اوقات وحی الٰہی کے ذریعہ سے ان کے نفاق و بد باطنی کی قلعی کھلتی رہتی تھی، اس لیے یہ ڈر بھی لگا رہتا تھا کہ کوئی سورت قرآن میں ایسی نازل نہ ہو جائے جو ہمارے مخاطبات سریہ و نیات خفیہ کا پردہ فاش کر دے، اصل یہ ہے کہ منافقین کا قلب جبن و کمزوری سے کسی ایک طرف قائم نہ ہوتا تھا، ان کے دل ہر وقت دگدا میں رہتے تھے، کبھی آنحضرت ﷺ کی شان اغماض و کریم النفسی کو دیکھ کر کچھ تسلی حاصل کرتے مگر صاعقہ قرآنی کی گرج سے پھر دہلنے لگتے تھے، اسی لیے فرمایا کہ بہتر ہے، تم ٹھٹھے کرتے رہو اور استہزاء و تمسخر کا عمل جاری رکھو اور پیغمبر کی نسبت **هو اذن**

کہہ کر تسلی کرلو، لیکن خدا اس چیز کو ضرور کھول کر رہے گا جس کا تم کو ڈر لگا ہوا ہے وہ تمہارے مکر و خداع کا تار تار بکھیر کر رکھ دے گا۔

وَلَئِنۡ سَاَلۡتَهُمۡ لَيَقُوۡلُنَّ اِنَّمَا كُنَّا نَخُوۡضُ وَنَلۡعَبُ ؕ قُلۡ اَبِاللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ وَرَسُوۡلِهٖ

اور اگر تو ان سے پوچھے تو وہ کہیں گے ہم تو بات چیت کرتے تھے اور دل لگی ۱ے تو کہہ کیا اللہ سے اور اس کے حکموں سے اس کے رسول سے

كُنۡتُمۡ تَسۡتَهۡزِءُوۡنَ ﴿۶۵﴾

تم ٹھٹھے کرتے تھے ۲ے

خلاصہ تفسیر: اور (استہزاء ظاہر ہوجانے کے بعد) اگر آپ ان سے (اس استہزاء کی وجہ) پوچھیں تو کہہ دیں گے کہ ہم تو محض ہنسی اور خوش طبعی کر رہے تھے (یعنی محض جی خوش کرنے کو جس سے سفر آسانی سے کٹ جائے ایسی باتیں صرف زبانی کر رہے تھے اور اس کلام کے حقیقی معنی مراد نہ تھے) آپ (ان سے) کہہ دیجئے کہ کیا اللہ کے ساتھ اور اس کی آیتوں کے ساتھ اور اس کے رسول کے ساتھ تم ہنسی کرتے تھے (یعنی خواہ کچھ بھی غرض ہو مگر یہ تو دیکھو کہ تم جس کے ساتھ دل لگی اور استہزا کرتے ہو وہ کیسی چیزیں ہیں کہ ان کے ساتھ استہزا کرنا کسی غرض سے جائز نہیں)۔

مسئلہ: دین کے ساتھ قصداً استہزا کرنا خواہ بداعتقادی سے ہو یا بغیر بداعتقادی کے ہو کفر ہے، اسی طرح کلمہ کفر خواہ ارادے و سنجیدگی سے ادا کیا جائے یا محض خوش طبعی و لطیفہ کے طور پر ادا کیا جائے حکم کے اعتبار سے دونوں برابر ہیں۔

* * *

فائدہ: ۱ے تبوک میں جاتے ہوئے بعض منافقین نے از راہ تمسخر کہا، اس شخص (محمد ﷺ) کو دیکھو کہ شام کے محلات اور روم کے شہروں کو فتح کر لینے کا خواب دیکھتا ہے، انہوں نے رومیوں کی جنگ کو عربوں کی باہمی جنگ پر قیاس کر رکھا ہے، میں یقین کرتا ہوں کہ کل ہم سب رومیوں کے سامنے رسیوں میں بندھے ہوئے کھڑے ہوں گے، یہ ہمارے قراء (صحابہ) پیٹو، جھوٹے اور نامردے کیا روم کی باقاعدہ فوجوں سے جنگ کریں گے وغیر ذالک من الھفوات، اس قسم کے مقولے جو مسلمانوں کو روم سے مرعوب و ہیبت زدہ کرنے اور شکستہ خاطر بنانے کے لیے کہہ رہے تھے، نبی کریم ﷺ کی خدمت میں نقل ہوئے، آپ ﷺ نے بلا کر باز پرس کی تو کہنے لگے کہ حضرت! ہم کہیں سچ مچ ایسا اعتقاد تھوڑا ہی رکھتے ہیں محض خوش وقتی و دل لگی کے طور پر کچھ کہہ رہے تھے کہ باتوں میں باآسانی سفر کٹ جائے۔

فائدہ: ۲ے یعنی کیا دل لگی اور خوش وقتی کا موقع و محل یہ ہے کہ اللہ، رسول اور ان کے احکام کے ساتھ ٹھٹھا کیا جائے؟ خدا اور رسول کا استہزاء اور احکام الٰہیہ کا استخفاف تو وہ چیز ہے کہ اگر محض زبان سے دل لگی کے طور پر کیا جائے، وہ بھی کفر عظیم ہے، چہ جائیکہ منافقین کی طرح از راہ شرارت و بد باطنی ایسی حرکت سرزد ہو۔

لَا تَعۡتَذِرُوۡا قَدۡ كَفَرۡتُمۡ بَعۡدَ اِيۡمَانِكُمۡ ؕ اِنۡ نَّعۡفُ عَنۡ طَآئِفَةٍ مِّنۡكُمۡ نُعَذِّبۡ طَآئِفَةً ۢ

بہانے مت بناؤ تم تو کافر ہو گئے اظہار ایمان کے پیچھے، اگر ہم معاف کر دیں گے تم میں سے بعضوں کو تو البتہ عذاب بھی دیں گے بعضوں کو

بِاَنَّهُمۡ كَانُوۡا مُجۡرِمِيۡنَ ﴿۶۶﴾ ع

اس سبب سے کہ وہ گناہ گار تھے

خلاصہ تفسیر: تم اب (یہ بیہودہ) عذر مت کرو (مطلب یہ ہے کہ عذر مقبول نہیں، اور اس عذر سے دین کے ساتھ استہزاء جائز نہیں ہو جاتا) تم تو اپنے کو مؤمن کہہ کر کفر کرنے لگے (کیونکہ دین کے ساتھ استہزاء مطلقاً کفر ہے، اگرچہ ان کے دل میں تو پہلے بھی ایمان نہ تھا، البتہ اگر کوئی دل سے توبہ کرلے اور مومن مخلص بن جائے تو وہ کفر اور عذاب کفر سے چھوٹ جائے گا، لیکن اس کی توفیق بھی سب کو نہ ہوگی، ہاں! بعض مسلمان

ہو جائیں گے، اور وہ معاف کر دیئے جائیں گے، پس حاصل یہ ٹھہرا کہ) اگر ہم تم میں سے بعض کو چھوڑ بھی دیں (اس لئے کہ وہ سچے مسلمان ہو گئے) تو ہم بعض کو (ضرور ہی) سزا دیں گے بسبب اس کے کہ وہ (علم ازلی میں) مجرم تھے (یعنی وہ مسلمان نہیں ہوئے)۔

قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ: دین کے ساتھ قصداً استہزاء خواہ بداعتقادی سے ہو یا بغیر بداعتقادی کے ہو کفر ہے اور **استهزاء بالله وآياته ورسوله** باہم تینوں متلازم ہیں۔

اِنْ نَّعْفُ عَنْ طَآىِٕفَةٍ مِّنْكُمْ: یعنی "اگر ہم تم میں سے بعض کو معاف کر دیں" روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے مصداق مخشی بن حمیر ہیں جو بعد میں دل سے مسلمان ہو گئے، اور لفظ "طائفہ" کا اطلاق واحد پر بھی ہوتا ہے اس لیے کوئی اشکال نہیں۔

* * *

فائدہ: یعنی جھوٹے عذر تراشنے اور حیلے حوالوں سے کچھ فائدہ نہیں جن کو نفاق و استہزاء کی سزا ملنی ہے مل کر رہے گی، ہاں! جو اب بھی صدق دل سے توبہ کر کے اپنے جرائم سے باز آجائیں گے، انہیں خدا معاف کر دے گا، یا جو پہلے ہی سے باوجود کفر و نفاق کے اس طرح کی فتنہ انگیزی اور استہزاء سے علیحدہ رہے ہیں، انہیں استہزاء و تمسخر کی سزا یہاں نہ ملے گی۔

اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ

منافق مرد اور منافق عورتوں سب کی ایک چال ہے، سکھائیں بات بری اور چھڑائیں بات بھلی

وَيَقْبِضُوْنَ اَيْدِيَهُمْ ؕ نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ ؕ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۶۷﴾

اور بند رکھیں اپنی مٹھی، بھول گئے اللہ کو سو وہ بھول گیا ان کو، تحقیق منافق وہی ہیں نافرمان

خلاصہ تفسیر: پیچھے منافقین کی چند قباحتیں بری عادات ذکر ہوئیں، آگے فرماتے ہیں کہ یہ سب آپس میں اور پہلے کفار کے ساتھ بھی ان باتوں میں مشابہ ہیں، پھر ان قباحتوں پر وعید اور پہلی امتوں کے قصوں کی طرف اشارہ کر کے اس وعید کی تاکید کرتے ہیں۔

منافق مرد اور منافق عورتیں سب ایک طرح کے ہیں کہ بری بات کی (یعنی کفر اور اسلام کی مخالفت کی) تعلیم دیتے ہیں اور اچھی بات سے (یعنی ایمان اور اتباع نبوی سے) منع کرتے ہیں اور (خدا کی راہ میں خرچ کرنے سے) اپنے ہاتھوں کو بند رکھتے ہیں، انھوں نے خدا کا خیال نہ کیا (یعنی اطاعت نہ کی) پس خدا نے ان کا خیال نہ کیا (یعنی ان پر خاص رحمت نہ کی) بلاشبہ یہ منافق بڑے ہی سرکش ہیں۔

* * *

فائدہ: یعنی سب سے بڑے نافرمان یہی بدباطن منافق ہیں جن کے مرد و عورت زبانی اقرار و اظہار اسلام کے باوجود شب و روز اسی تگ و دو میں لگے رہتے ہیں کہ ہر قسم کے حیلے اور فریب کر کے لوگوں کو اچھی باتوں سے بیزار اور برے کاموں پر آمادہ کریں، خرچ کرنے کے اصلی موقعوں پر مٹھی بند رکھیں، غرض کلمہ پڑھتے رہیں، لیکن نہ ان کی زبان سے کسی کو بھلائی پہنچے نہ مال سے، جب یہ خدا کو ایسا چھوڑ بیٹھے تو خدا نے بھی ان کو چھوڑ دیا، چھوڑ کر کہاں گرایا؟ اس کا ذکر اگلی آیت میں ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْكُفَّارَ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ هِيَ حَسْبُهُمْ ۚ

وعدہ دیا ہے اللہ نے منافق مرد اور منافق عورتوں کو اور کافروں کو دوزخ کی آگ کا پڑے رہیں گے اس میں وہی بس ہے ان کو،

وَلَعَنَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ﴿۶۸﴾

اور اللہ نے ان کو پھٹکار دیا، اور ان کے لیے عذاب ہے برقرار رہنے والا،

خلاصہ تفسیر: اللہ تعالیٰ نے منافق مردوں عورتوں اور (اعلانیہ) کفر کرنے والوں سے دوزخ کی آگ کا عہد کر رکھا ہے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے، وہ ان کے لئے (سزا میں) کافی ہے، اور اللہ تعالیٰ ان کو اپنی رحمت سے دور کر دے گا، اور ان کو (حسب وعدہ مذکور) عذاب دائمی ہوگا۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی یہ ایسی کافی سزا ہے جس کے بعد دوسری سزا کی ضرورت نہیں رہتی۔

فائدہ: ۲؎ شاید یہ مطلب ہو کہ دنیا میں بھی خدا کی پھٹکار (لعنت) کا اثر برابر پہنچتا رہے گا، یا پہلے جملہ کی تاکید ہے، واللہ اعلم۔

كَالَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ كَانُوٓا أَشَدَّ مِنكُمْ قُوَّةً وَأَكْثَرَ أَمْوَٰلًا وَأَوْلَٰدًا فَٱسْتَمْتَعُوا بِخَلَٰقِهِمْ

جس طرح تم سے اگلے لوگ زیادہ تھے تم سے زور میں اور زیادہ رکھتے تھے مال اور اولاد، پھر فائدہ اٹھا گئے اپنے حصہ سے ۱؎

فَٱسْتَمْتَعْتُم بِخَلَٰقِكُمْ كَمَا ٱسْتَمْتَعَ ٱلَّذِينَ مِن قَبْلِكُم بِخَلَٰقِهِمْ وَخُضْتُمْ كَٱلَّذِى

پھر فائدہ اٹھایا تم نے اپنے حصہ سے جیسے فائدہ اٹھا گئے تم سے اگلے اپنے حصہ سے اور تم بھی چلتے ہو انہی کی سی

خَاضُوٓا أُولَٰٓئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَٰلُهُمْ فِى ٱلدُّنْيَا وَٱلْءَاخِرَةِ وَأُولَٰٓئِكَ هُمُ ٱلْخَٰسِرُونَ ﴿٦٩﴾

چال ۲؎ وہ لوگ مٹ گئے ان کے عمل دنیا میں اور آخرت میں، اور وہی لوگ پڑے نقصان میں ۳؎

خلاصہ تفسیر: (اے منافقو!) تمہاری حالت (کفر اور عذاب کے مستحق ہونے میں) ان لوگوں کی سی ہے جو تم سے پہلے (زمانہ میں) ہو چکے ہیں جو شدت قوت میں اور کثرت اولاد و اموال میں تم سے بھی زیادہ تھے تو انہوں نے اپنے (دنیوی) حصے سے خوب فائدہ حاصل کیا سو تم نے بھی اپنے (دنیوی) حصہ سے خوب فائدہ حاصل کیا، جیسا تم سے پہلے لوگوں نے اپنے (دنیوی) حصہ سے فائدہ حاصل کیا تھا، اور تم بھی (بری باتوں میں) ایسے ہی گھسے جیسے وہ لوگ (بری باتوں میں) گھسے تھے، ان لوگوں کے اعمال (حسنہ) دنیا اور آخرت (سب) میں ضائع ہو گئے (کہ دنیا میں ان اعمال پر ثواب کی بشارت نہیں، اور آخرت میں ثواب نہیں) اور (اسی ضیاع کی وجہ سے) وہ لوگ بڑے نقصان میں ہیں (کہ دونوں جہان میں خوشی اور راحت سے محروم ہیں، پس اسی طرح تم بھی کفر کرتے ہو تو انہی کی طرح ناکام ہوگے، اور جیسا ان کے مال و اولاد ان کے کام نہ آئے تم تو ان چیزوں میں ان سے کم ہو، تمہارے بدرجہ اولیٰ کام نہ آئیں گے، یہ تو اخروی نقصان کی وعید ہوئی)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی دنیاوی لذائذ کا جو حصہ ان کے لیے مقدر تھا، اس سے فائدہ اٹھا گئے اور آخری انجام کا خیال نہ کیا۔

فائدہ: ۲؎ یعنی تم بھی ان کی طرح آخری انجام کے تصور سے غافل ہو کر دنیا کی متاع فانی سے جتنا مقدر ہے حصہ پا رہے ہو اور ساری چال ڈھال انہی کی سی رکھتے ہو، تو سمجھ لو جو حشر ان کا ہوا وہ ہی تمہارا بھی ہو سکتا ہے ان کے پاس مال و اولاد اور جسمانی قوتیں تم سے زائد تھیں پھر انتقام الٰہی کی گرفت سے نہ بچ سکے تو تم کو کاہے پر بھروسہ ہے جو خدائی سزا سے اس قدر بے فکر ہو بیٹھے ہو۔

فائدہ: ۳؎ یعنی کوئی دنیاوی و اخروی برکت و کرامت انہیں نصیب نہ ہوئی، باقی دنیاوی لذائذ کا جو حصہ بظاہر ملا وہ فی الحقیقت ان کے حق میں استدراج اور عذاب تھا، جیسا کہ دو رکوع پہلے فَلَا تُعْجِبْكَ أَمْوَٰلُهُمْ وَلَآ أَوْلَٰدُهُمْ (التوبہ:۵۵) کے فوائد میں گزر چکا اور اس سے پیشتر بھی کئی مواقع میں لکھا جا چکا ہے۔

اَلَمۡ يَاۡتِهِمۡ نَبَاُ الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ قَوۡمِ نُوۡحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوۡدَ ۙ وَقَوۡمِ اِبۡرٰهِيۡمَ وَاَصۡحٰبِ مَدۡيَنَ

کیا پہنچی نہیں ان کو خبر ان لوگوں کی جو ان سے پہلے تھے قوم نوح کی اور عاد کی اور ثمود کی ،اور قوم ابراہیم کی اور مدین والوں کی

وَالۡمُؤۡتَفِكٰتِ ؕ اَتَتۡهُمۡ رُسُلُهُمۡ بِالۡبَيِّنٰتِ ۚ فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظۡلِمَهُمۡ وَلٰـكِنۡ

اور ان بستیوں کی خبر جو الٹ دی گئی تھیں ۱ پہنچے ان کے پاس ان کے رسول صاف حکم لے کر، سو اللہ تو ایسا نہ تھا کہ ان پر ظلم کرتا لیکن

كَانُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ يَظۡلِمُوۡنَ ﴿۷۰﴾

وہ اپنے اوپر آپ ظلم کرتے تھے ۲

خلاصہ تفسیر: (اب دنیوی نقصان کے احتمال سے بھی متنبہ فرماتے ہیں کہ:) کیا ان لوگوں کو ان (کے عذاب و ہلاک) کی خبر نہیں پہنچی جو ان سے پہلے ہوئے ہیں، جیسے قوم نوح اور عاد اور ثمود اور قوم ابراہیم اور اہل مدین اور الٹی ہوئی بستیاں (یعنی قوم لوط کی بستی) کہ ان کے پاس ان کے پیغمبر صاف نشانیاں (حق کی) لے کر آئے (لیکن نہ ماننے سے برباد ہوئے) سو (اس بربادی میں) اللہ تعالیٰ نے تو ان پر ظلم نہیں کیا لیکن وہ خود ہی اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے (اسی طرح ان منافقین کو بھی ڈرنا چاہئے)۔

* * *

فائدہ: ۱ قوم نوح طوفان سے، ''عاد'' آندھی سے، ''ثمود'' صیحہ (چیخ) سے ہلاک ہوئے۔

ابراہیم علیہ السلام کی حق تعالیٰ نے عجیب وغریب خارق عادت طریقہ سے تائید فرمائی جنہیں دیکھ کر ان کی قوم ذلیل و ناکام ہوئی، ان کا بادشاہ نمرود نہایت بدحالی کی موت مارا گیا، ''اصحاب مدین'' صیحہ (چیخ) رجفہ (زلزلہ) وغیرہ سے تباہ ہوئے، قوم لوط کی بستیاں الٹ دی گئیں اور اوپر سے پتھروں کی بارش ہوئی، ان سب اقوام کا قصہ (بجز قوم ابراہیم کے) سورۃ اعراف میں گزر چکا۔

فائدہ: ۲ یعنی خدا کسی کو بلاوجہ اور بے موقع سزا نہیں دیتا، لوگ خود ایسے جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں جن کے بعد عذاب الٰہی کا آنا ناگزیر ہے۔

وَالۡمُؤۡمِنُوۡنَ وَالۡمُؤۡمِنٰتُ بَعۡضُهُمۡ اَوۡلِيَآءُ بَعۡضٍ ۘ يَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَيَنۡهَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡكَرِ

اور ایمان والے مرد اور ایمان والی عورتیں ایک دوسرے کی مددگار ہیں، سکھلاتے ہیں نیک بات اور منع کرتے ہیں بری بات سے

وَيُقِيۡمُوۡنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤۡتُوۡنَ الزَّكٰوةَ وَيُطِيۡعُوۡنَ اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ ؕ اُولٰٓـئِكَ سَيَرۡحَمُهُمُ اللّٰهُ ؕ

اور قائم رکھتے ہیں نماز اور دیتے ہیں زکوۃ اور حکم پر چلتے ہیں اللہ کے اور اس کے رسول کے، وہی لوگ ہیں جن پر رحم کرے گا اللہ

اِنَّ اللّٰهَ عَزِيۡزٌ حَكِيۡمٌ ﴿۷۱﴾

بیشک اللہ زبردست ہے حکمت والا

خلاصہ تفسیر: گذشتہ آیات میں منافقین کی قباحتیں مذکور تھیں، آگے اس مضمون کو زیادہ واضح کرنے کے لیے قرآنی اسلوب کے مطابق مسلمانوں کی بعض خوبیاں اور ان کے لیے بشارت بیان فرماتے ہیں، کیونکہ ''تعرف الاشیاء بأضدادھا'' یعنی ہر چیز اس کی ضد کے بیان کرنے سے واضح ہوتی ہے۔

اور مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں آپس میں ایک دوسرے کے (دینی) رفیق ہیں، نیک باتوں کی تعلیم دیتے ہیں، اور بری باتوں سے روکتے

ہیں، اور نماز کی پابندی رکھتے ہیں، اور زکوٰۃ دیتے ہیں، اور اللہ اور اس کے رسول کا کہنا مانتے ہیں، ان لوگوں پر ضرور اللہ تعالیٰ رحمت کرے گا (جس کی تفصیل آگے وَعَدَ اللّٰهُ میں عنقریب آتی ہے) بلاشبہ اللہ تعالیٰ قادر (مطلق) ہے (کہ پوری جزا دے سکتا ہے) حکمت والا ہے (کہ مناسب جزا دیتا ہے)۔

* * *

فائدہ: ابتدائے رکوع میں منافقین کے اوصاف بیان ہوئے تھے، یہاں بطور مقابلہ مومنین کی صفات ذکر کی گئیں، یعنی جبکہ منافقین لوگوں کو بھلائی سے روک کر برائی کی ترغیب دیتے ہیں، مومنین بدی کو چھڑا کر نیکی کی طرف آمادہ کرتے ہیں، منافقین کی مٹھی بند ہے مومنین کا ہاتھ کھلا ہوا ہے، وہ بخل کی وجہ سے خرچ کرنا نہیں جانتے، یہ اموال میں سے باقاعدہ حقوق (زکوٰۃ وغیرہ) ادا کرتے ہیں، انہوں نے خدا کو بالکل بھلا دیا، یہ پانچ وقت خدا کو یاد کرتے اور تمام معاملات میں خدا اور رسول کے احکام پر چلتے ہیں اسی لیے وہ مستحق لعنت ہوئے اور یہ رحمت خصوصی کے امیدوار ٹھہرے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا

وعدہ دیا ہے اللہ نے ایمان والے مردوں اور ایمان والی عورتوں کو باغوں کا کہ بہتی ہیں نیچے ان کے نہریں رہا کریں انہی میں

وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ؕ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۷۲﴾ ع ۱۵

اور ستھرے مکانوں کا رہنے کے باغوں میں، اور رضامندی اللہ کی ان سب سے بڑی ہے، یہی ہے بڑی کامیابی

خلاصہ تفسیر: (اب اس کی جزا یعنی رحمت کا بیان ہوتا ہے کہ) اللہ تعالیٰ نے مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں سے ایسے باغوں کا وعدہ کر رکھا ہے جن کے نیچے سے نہریں چلتی ہوں گی، جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور نفیس مکانوں کا (وعدہ کر رکھا ہے) جو کہ ان ہمیشگی کے باغوں میں ہوں گے اور (ان سب نعمتوں کے ساتھ) اللہ تعالیٰ کی رضامندی (جو اہل جنت سے ہمیشہ ہمیشہ رہے گی، ان) سب (نعمتوں) سے بڑی چیز ہے، یہ (مذکورہ جزا) بڑی کامیابی ہے۔

وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ: یعنی اللہ کی رضامندی سب سے بڑی چیز ہے، روح المعانی میں اس کی دلیل یہ بیان کی ہے کہ خود جنت میں جانے اور ہر قسم کی سعادت، اعزاز و اکرام پانے کی بنیاد یہی رضائے الٰہی ہے، نیز عشاق کا انتہائی مقصود یہی رضا ہوتی ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی تمام نعمائے دنیاوی و اخروی سے بڑھ کر حق تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی ہے، جنت بھی اسی لیے مطلوب ہے کہ وہ رضائے الٰہی کا مقام ہے، حق تعالیٰ مومنین کو جنت میں ہر قسم کی جسمانی و روحانی نعمتیں اور مسرتیں عطا فرمائے گا، مگر سب سے بڑی نعمت محبوب حقیقی کی دائمی رضا ہوگی، حدیث صحیح میں ہے کہ حق تعالیٰ اہل جنت کو پکارے گا، جنتی "لبیک" کہیں گے، دریافت فرمائے گا: "رَضِيْتُمْ" یعنی اب تم خوش ہو گئے، جواب دیں گے کہ پروردگار! خوش نہ ہونے کی وجہ؟ جبکہ آپ نے ہم پر انتہائی انعام فرمایا ہے، ارشاد ہوگا: "هَلْ اُعْطِيْكُمْ اَفْضَلَ مِنْ ذٰلِكَ" یعنی جو کچھ اب تک دیا گیا ہے کیا اس سے بڑھ کر ایک چیز لینا چاہتے ہو، جنتی سوال کریں گے کہ اے پروردگار! اس سے افضل اور کیا چیز ہوگی؟ اس وقت فرمائیں گے: "احل عَلَيْكُمْ رِضْوَانِي فَلَا اَسْخَطُ عَلَيْكُمْ بَعْدَهٗ ابدا" اپنی دائمی رضا اور خوشنودی تم پر اتارتا ہوں، جس کے بعد کبھی خفگی اور ناخوشی نہ ہوگی، رَزَقَنَا اللّٰهُ وَسَائِرَ الْمُؤْمِنِيْنَ هذه الكرامة الْعَظِيْمَة الْبَاهِرَة۔

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ؕ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۷۳﴾

اے نبی لڑائی کر کافروں سے اور منافقوں سے اور تند خوئی کر ان پر، اور ان کا ٹھکانا دوزخ ہے، اور وہ برا ٹھکانا ہے

خلاصہ تفسیر: پیچھے مؤمنین کے ذکر سے پہلے منافقین کا ذکر تھا، آگے پھر منافقین ہی کا خاص طور پر ذکر ہے اور ان حرکتوں کی بنا پر یہ حکم ہے کہ منافقین کے ساتھ زبانی جہاد اور دوسرے کفار سے تلوار کا جہاد کیجیے اور ان کے جہنمی ہونے کی بھی خبر دی گئی ہے اور مضامین کی تائید کے طور پر

دوسرے مضامین بھی مذکور ہیں۔

اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم!) کفار (سے تلوار کے ذریعے) اور منافقین سے (زبان کے ذریعے) جہاد کیجئے اور ان پر سختی کیجئے (دنیا میں تو یہ اس کے مستحق ہیں) اور (آخرت میں) ان کا ٹھکانا دوزخ ہے، اور وہ بری جگہ ہے۔

جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ: اس آیت کے خلاصہ تفسیر سے یہ اشکال دور ہوگیا کہ آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ منافقین سے بھی جہاد یعنی قتل وقتال کرو، حالانکہ یہ بات خلاف واقع ہے، کیونکہ منافقین ظاہری اسلام کی وجہ سے قتل نہ کیے جاتے تھے، جواب ظاہر ہے کہ منافقین کے ساتھ جہاد کرنے سے زبانی بحث ومباحثہ مراد ہے۔

* * *

فائدہ: ''جہاد'' کے معنی ہیں کسی ناپسندیدہ چیز کے دفع کرنے میں انتہائی کوشش کرنا، یہ کوشش کبھی ہتھیار سے ہوتی ہے، کبھی زبان سے، کبھی قلم سے، کبھی کسی اور طریق سے، منافقین جو زبان سے اسلام کا اظہار کریں اور دل سے مسلمان نہ ہوں، ان کے مقابلہ میں جہاد بالسیف جمہور امت کے نزدیک مشروع نہیں، نہ عہد نبوت میں ایسا واقع ہوا، اسی لیے جہاد کا لفظ اس آیت میں عام رکھا گیا ہے یعنی تلوار سے، زبان سے، قلم سے، جس وقت جس کے مقابلہ میں جس طرح مصلحت ہو جہاد کیا جائے۔

بعض علماء کی یہ رائے ہے کہ اگر منافقین کا نفاق بالکل عیاں ہوجائے تو ان پر بھی جہاد بالسیف کیا جاسکتا ہے بہرحال غزوہ تبوک نے چونکہ منافقین کا نفاق بہت آشکارا کردیا تھا، اس لیے اس آیت میں ان کی نسبت ذرا سخت رویہ اختیار کرنے کی ہدایت کی گئی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فطری طور پر نہایت نرم خو واقع ہوئے تھے: فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ (آل عمران: ۱۵۹) پھر حق تعالیٰ کی طرف سے حکم تھا: وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (الشعراء: ۲۱۵) چونکہ منافقین بھی بظاہر مومنین کے زمرہ میں شامل رہتے تھے، اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ساتھ بھی درگزر، چشم پوشی اور نرم خوئی کا معاملہ فرماتے تھے، تبوک کے موقع پر جب منافقین نے کھلم کھلا بے حیائی، عناد اور دشمنی کا اندازہ اختیار کرلیا تو حکم ہوا کہ اب ان کے معاملہ میں سختی اختیار کیجئے، یہ شریر خوش اخلاقی اور نرمی سے ماننے والے نہیں ہیں۔

يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ مَا قَالُوْا ؕ وَلَقَدْ قَالُوْا كَلِمَةَ الْكُفْرِ وَكَفَرُوْا بَعْدَ اِسْلَامِهِمْ وَهَمُّوْا بِمَا

قسمیں کھاتے ہیں اللہ کی کہ ہم نے نہیں کہا، اور بیشک کہا ہے انہوں نے لفظ کفر کا اور منکر ہوگئے مسلمان ہو کر ۱ اور قصد کیا تھا اس چیز کا جو

لَمْ يَنَالُوْا ۚ وَمَا نَقَمُوْٓا اِلَّآ اَنْ اَغْنٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَاِنْ يَّتُوْبُوْا يَكُ خَيْرًا

ان کو نہ ملی ۲ اور یہ سب کچھ اسی کا بدلہ تھا کہ دولت مند کردیا ان کو اللہ نے اور اس کے رسول نے اپنے فضل سے، سو اگر توبہ کرلیں تو بھلا ہے

لَّهُمْ ۚ وَاِنْ يَّتَوَلَّوْا يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَمَا لَهُمْ فِي الْاَرْضِ

ان کے حق میں، اور اگر نہ مانیں گے تو عذاب دے گا ان کو اللہ عذاب دردناک دنیا اور آخرت میں، اور نہیں ان کا روئے زمین پر

مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۷۴﴾

کوئی حمایتی اور نہ مددگار ۳

خلاصہ تفسیر: اس آیت کے متعلق مختصر اقصہ یہ ہے کہ تبوک سے واپسی میں چند منافقین نے جن کی تعداد بارہ تک منقول ہے ایک رات یہ مشورہ کیا کہ فلاں گھاٹی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری گزرے گی، سب مل کر آپ کو دھکیل دیں، پھر قتل کردیں، غرض وہ سب اپنا منہ لپیٹ کر جمع ہوکر اچانک اس مقام پر آپہنچے، مگر آپ نے ان کو دیکھ کر ڈانٹا اور حضرت حذیفہؓ و حضرت عمارؓ آپ کے ساتھ تھے، انہوں نے ان کو ہٹایا، مگر اس وقت

پہچانے نہیں گئے کہ کون کون لوگ تھے، بعد میں آپ کو وحی سے ان کے نام معلوم ہوئے تو آپ نے منزل پر پہنچ کر ان لوگوں کو بلا کر پوچھا کہ تم نے ایسا مشورہ اور ایسا ارادہ کیا تھا، وہ سب قسمیں کھا گئے کہ نہ ایسا مشورہ ہوا، نہ ارادہ ہوا، اور یہ وہ لوگ تھے کہ جن میں سے بعضوں کے ساتھ آپ نے خاص طور پر مالی امداد بھی فرمائی تھی، چنانچہ جلاسؓ نامی ایک شخص کا کہ وہ بھی ان میں شریک تھا حضور ﷺ نے ایک بہت بڑا قرضہ ادا کیا تھا، اور ویسے بھی آپ کی تشریف آوری سے پہلے یہ لوگ اکثر محتاج تھے، پھر مال غنیمت کی کثرت ہوئی تو ان کو بھی ظاہری میل جول کی وجہ سے کچھ نہ کچھ ملتا ہی تھا، اس قصہ کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی اور اس کے نازل ہونے کے بعد جلاسؓ نے صدق دل اور اخلاص سے اسلام قبول کیا۔

وہ لوگ قسمیں کھا جاتے ہیں کہ ہم نے فلانی بات (مثلاً یہ کہ رسول اللہ ﷺ کو قتل کر دیں) نہیں کہی، حالانکہ یقیناً انہوں نے کفر کی بات کہی تھی (کیونکہ آپ کے قتل کے بارے میں گفتگو کرنا کھلا ہوا کفر ہے) اور (وہ بات کہہ کر) اپنے اسلام (ظاہری) کے بعد (ظاہر میں بھی) کافر ہو گئے (کیونکہ اگر چہ انہوں نے یہ مشورہ اپنے ہی مجمع میں کیا مگر اس کی خبر مسلمانوں کو بھی ہو گئی اور اس سے عام طور پر ان کا کفر ظاہر ہو گیا) اور انہوں نے ایسی بات کا ارادہ کیا تھا جو ان کے ہاتھ نہ لگی (کہ رسول اللہ ﷺ کے قتل کا ارادہ کیا مگر ناکام رہے) اور یہ انہوں نے صرف اس بات کا بدلہ دیا ہے کہ ان کو اللہ نے اور اس کے رسول نے رزق خداوندی سے مال دار کر دیا (اس احسان کا بدلہ ان کے نزدیک یہی ہو گا کہ برائی کریں) سو اگر (اس کے بعد بھی) توبہ کریں تو ان کے لئے (دونوں جہان میں) بہتر (اور نافع) ہو گا (چنانچہ جلاسؓ کو توبہ کی توفیق ہو گئی) اور اگر (توبہ سے) روگردانی کی (اور کفر ونفاق ہی پر جمے رہے) تو اللہ تعالیٰ ان کو دنیا اور آخرت (دونوں جگہ) میں دردناک سزا دے گا (چنانچہ عمر بھر بدنام، پریشان اور ڈرتے رہنا اور مرتے وقت مصیبت دیکھنا یہ دنیا کا عذاب ہے اور آخرت میں دوزخ میں جانا ظاہر ہی ہے) اور ان کا دنیا میں نہ کوئی یار ہے اور نہ مددگار (جو کہ عذاب سے بچالے، اور جب دنیا ہی میں کوئی یار و مددگار نہیں جہاں اکثر مدد ہو جاتی ہے تو آخرت میں تو بدرجہ اولیٰ کوئی نہ ہو گا)۔

* * *

فائدہ: ۱۔ وَكَفَرُوا بَعْدَ إِسْلَامِهِمْ: منافقین پیچھے بیٹھ کر پیغمبر ﷺ کی اور دین اسلام کی اہانت کرتے، جیسا کہ سورۃ منافقون میں آئے گا، جب کوئی مسلمان حضور ﷺ تک ان کی باتیں پہنچا دیتا تو اس کی تکذیب کرتے اور قسمیں کھا لیتے کہ ہم نے فلاں بات نہیں کی، حق تعالیٰ نے مسلمان راویوں کی تصدیق فرمائی کہ بیشک انہوں نے وہی باتیں زبان سے نکالی ہیں، اور دعوائے اسلام کے بعد مذہب اسلام اور پیغمبر اسلام کی نسبت وہ کلمات کہے ہیں جو صرف منکرین کی زبان سے نکل سکتے ہیں۔

فائدہ: ۲۔ وَهَمُّوا بِمَا لَمْ يَنَالُوا: غزوہ تبوک سے واپسی میں آنحضرت ﷺ لشکر سے علیحدہ ہو کر ایک پہاڑی راستہ کو تشریف لے جا رہے تھے، تقریباً بارہ منافقین نے چہرے چھپا کر رات کی تاریکی میں چاہا کہ آپ پر ہاتھ چلائیں اور معاذ اللہ پہاڑی سے گرا دیں، حضور ﷺ کے ساتھ حذیفہ اور عمار تھے، عمار کو انہوں نے گھیر لیا تھا، مگر حذیفہ نے مار مار کر ان کی اونٹنیوں کے منہ پھیر دیے، چونکہ چہرے چھپائے ہوئے تھے، حذیفہ وغیرہ نے ان کو نہیں پہچانا، بعدہ آنحضرت ﷺ نے حذیفہؓ و عمارؓ کو نام بنام ان کے پتے بتا دیے، مگر منع فرما دیا کہ کسی پر ظاہر نہ کریں، اسی واقعہ کی طرف **وَهَمُّوا بِمَا لَمْ يَنَالُوا** میں اشارہ ہے کہ جو ناپاک قصد انہوں نے کیا خدا کے فضل سے پورا نہ ہوا، بعض علماء نے لکھا ہے کہ کسی موقع پر لشکر اسلام میں کچھ خانہ جنگی ہو گئی تھی، منافقین نے اغوا کر کے مہاجرین و انصار میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش کی مگر ناکام رہے، حضرت ﷺ نے اصلاح فرما دی جیسا کہ سورۃ منافقون میں آئیگا۔

فائدہ: ۳۔ وَمَا لَهُمْ فِي الْأَرْضِ مِن وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ: یعنی حضور ﷺ کی دعا سے خدا نے انہیں دولت مند کر دیا، قرضوں کے بارے سے سبکدوش ہوئے، مسلمانوں کے ساتھ ملے جلے رہنے کی وجہ سے غنائم میں حصہ ملتا رہا، حضور ﷺ کی برکت سے پیداوار اچھی ہوئی، ان احسانات کا بدلہ یہ دیا کہ خدا اور رسول ﷺ کے ساتھ دغابازی کرنے لگے اور ہر طرح پیغمبر ﷺ اور مسلمانوں کو ستانے پر کمر باندھ لی، اب بھی اگر توبہ کر کے شرارتوں اور احسان فراموشیوں سے باز آ جائیں تو ان کے حق میں بہتر ہے، ورنہ خدا دنیا و آخرت میں وہ سزا دے گا جس سے بچانے والا روئے زمین پر کوئی نہ ملے گا، بعض روایات میں ہے کہ "جلاس" نامی ایک شخص یہ آیات سن کر صدق دل سے تائب ہوا، اور آئندہ اپنی زندگی خدمت

اسلام میں قربان کردی۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ اٰتٰنَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۷۵﴾

اور بعضے ان میں وہ ہیں کہ عہد کیا تھا اللہ سے اگر دیوے ہم کو اپنے فضل سے تو ہم ضرور خیرات کریں اور ہو رہیں ہم نیکی والوں میں

فَلَمَّآ اٰتٰهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ بَخِلُوْا بِهٖ وَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۷۶﴾

پھر جب دیا ان کو اپنے فضل سے تو اس میں بخل کیا اور پھر گئے ٹلا کر۔ا

خلاصہ تفسیر: اگلی آیتوں کا مختصر قصہ یہ ہے کہ ثعلبہ بن حاطب نامی ایک شخص نے حضور ﷺ سے مال زیادہ ہونے کی دعا کرائی، آپ ﷺ نے سمجھایا کہ اس میں مصلحت نہیں، اس نے کہا کہ میں نیک کاموں میں صرف کروں گا، غرض آپ کی دعا سے وہ مال دار ہو گیا، جب زکوۃ کا وقت آیا تو کہنے لگا کہ اس میں اور جزیہ میں کیا فرق ہے اور زکوۃ نہ دی، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

اور ان (منافقین) میں بعض آدمی ایسے ہیں کہ خدا تعالیٰ سے عہد کرتے ہیں (کیونکہ رسول اللہ ﷺ سے عہد کرنا اور خدا سے عہد کرنا برابر ہے، اور وہ عہد یہ تھا کہ) اگر اللہ تعالیٰ ہم کو اپنے فضل سے (بہت سا مال) عطا فرما دے تو ہم (اس میں سے) خوب خیرات کریں، اور ہم (اس کے ذریعہ سے) خوب نیک نیک کام کیا کریں، سو جب اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے فضل سے (بہت سا) دے دیا تو اس میں بخل کرنے لگے (کہ زکوۃ نہ دی) اور (اطاعت سے) روگردانی کرنے لگے اور وہ تو روگردانی کے (پہلے ہی سے) عادی ہیں۔

لَئِنْ اٰتٰنَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ: روح المعانی میں ہے کہ یہ اشارہ ہے ان لوگوں کی حالت کی طرف جن میں ذوق وشوق محبت تو ہے نہیں، لیکن اپنے نفوس کے لیے بعض اونچے مقامات کو حاصل سمجھ جاتے ہیں، پھر امتحان کے موقع میں پورا نہیں اترتے۔

فَلَمَّآ اٰتٰهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ: اگرچہ یہ قصہ ایک شخص سے متعلق ہے، پھر فَلَمَّآ اٰتٰهُمْ وغیرہ میں جمع کی ضمیر اس لیے لائی گئی کہ دوسرے منافقین بھی کسی قدر اس میں شریک تھے کہ وہ اس کے احوال واقوال کو پسند کرتے تھے اور یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ ایک شخص کے مالدار ہونے سے اس کے ہم خیال وہم مشرب لوگوں کو بھی نفع پہنچتا ہے۔

* * *

فائدہ: ا ایک شخص ثعلبہ بن حاطب انصاری نے حضور ﷺ سے عرض کیا کہ میرے حق میں دولت مند ہو جانے کی دعا فرما دیجیے، آپ نے فرمایا کہ: "ثعلبہ! تھوڑی چیز جس پر تو خدا کا شکر ادا کرے، اس بہت چیز سے اچھی ہے جس کے حقوق ادا نہ کر سکے"، اس نے پھر وہی درخواست کی، آپ نے فرمایا کہ اے ثعلبہ! کیا تجھے پسند نہیں کہ میرے نقش قدم پر چلے، آپ کے انکار پر اس کا اصرار بڑھتا رہا، اس نے وعدہ کیا کہ اگر خدا مجھ کو مال دے گا، میں پوری طرح حقوق ادا کروں گا، آخر حضور ﷺ نے دعا فرمائی، اس کی بکریوں میں اس قدر برکت ہوئی کہ مدینہ سے باہر ایک گاؤں میں رہنے کی ضرورت پڑی اور اتنا پھیلاوا ہوا کہ ان میں مشغول ہو کر رفتہ رفتہ جمعہ و جماعات بھی ترک کرنے لگا، کچھ دنوں بعد حضور ﷺ کی طرف سے زکوۃ وصول کرنے والے "محصل" پہنچے تو کہنے لگا کہ زکوۃ تو جزیہ کی بہن معلوم ہوتی ہے، وہ ایک دفعہ ٹلا کر آخر زکوۃ دینے سے صاف انکار کر دیا، حضور ﷺ نے تین مرتبہ فرمایا: "ویح ثعلبہ" اور یہ آیات نازل ہوئیں جب اس کے بعد اقارب نے اس کی خبر پہنچائی تو بادل نخواستہ زکوۃ لے کر حاضر ہوا، حضور ﷺ نے فرمایا کہ خدا نے مجھ کو تیری زکوۃ قبول کرنے سے منع فرما دیا ہے، یہ سن کر اس نے بہت ہائے واویلا کی کیونکہ حضور ﷺ کا زکوۃ قبول نہ کرنا اس کے لیے بڑی عار کی بات تھی، بدنامی کے تصور سے سر پر خاک ڈالتا تھا، مگر دل میں نفاق چھپا ہوا تھا، پھر حضور ﷺ کے بعد ابوبکر صدیق کی خدمت میں زکوۃ لے کر حاضر ہوا، انہوں نے بھی قبول کرنے سے انکار فرمایا، پھر حضرت عمر اور ان کے بعد حضرت عثمان کی خدمت میں زکوۃ پیش کی، دونوں نے انکار فرمایا، ہر ایک یہی کہتے تھے کہ جو چیز نبی کریم ﷺ نے رد کر دی، ہم اس کو قبول نہیں کر سکتے، آخر اسی حالت نفاق پر حضرت عثمان کے عہد میں اس کا خاتمہ ہوا۔

فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِىْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰى يَوْمِ يَلْقَوْنَهٗ بِمَآ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ

پھر اسکا اثر رکھ دیا نفاق انکے دلوں میں جس دن تک کہ وہ اس سے ملیں گے اس وجہ سے کہ انہوں نے خلاف کیا اللہ سے جو وعدہ اس سے کیا تھا

وَبِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ﴿۷۷﴾

اور اس وجہ سے کہ بولتے تھے جھوٹ

خلاصہ تفسیر: سو اللہ تعالیٰ نے ان (کے اس فعل) کی سزا میں ان کے دلوں میں نفاق (قائم) کر دیا، جو خدا کے پاس جانے کے دن تک (یعنی مرتے دم تک) رہے گا اس سبب سے کہ انہوں نے خدا تعالیٰ سے اپنے وعدہ میں خلاف کیا اور اس سبب سے کہ وہ (اس وعدہ میں شروع ہی میں) جھوٹ بولتے تھے (یعنی وعدہ پورا کرنے کی نیت اس وقت بھی نہ تھی، پس نفاق تو اس وقت بھی دل میں تھا، اس جھوٹ بولنے اور وعدہ خلافی کرنے سے زیادہ غضب کا مستحق ہوا کہ وہ پہلا نفاق پختہ ہو گیا کہ توبہ بھی نصیب نہ ہوگی، اسی حالت پر مر کر ہمیشہ کے لیے جہنم میں رہنا نصیب ہوگا)۔

فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِىْ قُلُوْبِهِمْ: اس جگہ یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ فاعقبهم نفاقا میں تو جمع کی ضمیر ہے جس کا بظاہر تقاضہ یہ ہے کہ اور منافقین کے ساتھ بھی یہی معاملہ کیا جائے، جواب یہ ہے کہ شاید اوروں کی تعیین معلوم نہ ہوئی ہو کہ کون کون منافق ہیں اس لیے ان سے ایسا برتاؤ نہ کیا گیا ہو، یا یہ حکم اس شخص کے لیے مخصوص ہو، کیونکہ وہ اس قصہ کا بانی تھا، چنانچہ بعض احکام مخصوص ہو جایا کرتے ہیں۔

فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِىْ قُلُوْبِهِمْ: اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح طاعات سے ایمان کی نورانیت بڑھتی ہے اسی طرح گناہوں سے کفر کی ظلمت بھی بڑھتی ہے، اس کے جھوٹ بولنے اور وعدہ خلافی کرنے سے کفر میں اس قدر زیادتی ہوگئی کہ مرتے وقت تک باقی رہا، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بعض اعمال بد کی نحوست ایسی ہوتی ہے کہ توبہ کی توفیق سلب ہو جاتی ہے، نعوذ باللہ منہ۔

* * *

فائدہ: یعنی خدا سے صریح وعدہ خلافی کرنے اور جھوٹ بولتے رہنے کی سزا میں ان کے بخل و اعراض کا اثر یہ ہوا کہ ہمیشہ کے لیے نفاق کی جڑ ان کے دلوں میں قائم ہوگئی جو قیامت تک نکلنے والی نہیں، اور یہی سنت اللہ ہے کہ جب کوئی شخص اچھی یا بری خصلت خود اختیار کر لیتا ہے تو کثرت سے مزاولت و ممارست سے وہ دائمی بن جاتی ہے، بری خصلت کے اسی دوام و استحکام کو کبھی کبھی ختم و طبع (مہر لگانے) سے تعبیر کر دیتے ہیں۔

اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ سِرَّهُمْ وَنَجْوٰىهُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ﴿۷۸﴾

کیا وہ جان نہیں چکے کہ اللہ جانتا ہے ان کا بھید اور ان کا مشورہ اور یہ کہ اللہ خوب جانتا ہے سب چھپی باتوں کو

خلاصہ تفسیر: (یہ لوگ جو دل میں کفر چھپانے کے باوجود اسلام اور اطاعت کا ظاہر کرتے ہیں تو) کیا ان (منافقین) کو یہ خبر نہیں کہ اللہ تعالیٰ کو ان کے دل کا راز اور ان کی سرگوشی سب معلوم ہے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ تمام غیب کی باتوں کو خوب جانتے ہیں (اور اس لئے وہ ظاہری اسلام اور اطاعت تو ان کے کام نہیں آ سکتا بالخصوص آخرت میں تو کچھ کام نہ آئے گا، پس جہنم کی سزا ضروری ہے)۔

باقی قصہ یہ ہے کہ اپنے بارے میں ان آیتوں کے نازل ہونے کی خبر سن کر وہ شخص زکوۃ لے کر حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ کو تیری زکوۃ لینے سے منع فرما دیا ہے، اس نے بہت ہائے واویلا کی، مگر آپ نے قبول نہ کیا، یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب ثعلبہ تائب ہو کر حاضر ہو گیا تو اس کی توبہ کیوں قبول نہ کی گئی؟ احقر کہتا ہے کہ اس کا زکوۃ لانا اور نہ لینے پر واویلا کرنا خلوص سے نہ تھا، بلکہ عار اور بدنامی دفع کرنے کے لیے تھا، کیونکہ اعقبهم نفاقا سے اس کا مرتے دم تک کافر رہنا معلوم ہو چکا ہے، پھر خلوص کا احتمال کب ہے، اور عجب نہیں کہ

یہاں آیت: الم یعلموا میں اسی کا اشارہ ہو کہ یہ شخص جو زکوۃ لایا ہے تو کیا اس کو یہ معلوم نہیں کہ اللہ تعالی دل کا حال خوب جانتا ہے، جب دل میں ایمان نہیں تو اس کا صدقہ کیسے قبول کیا جائے گا؟ کیونکہ قبول صدقہ کے لیے ایمان شرط ہے، دوسرے اگر اس میں خلوص ہوتا تو خود بھی تو مساکین کو دے سکتا تھا، مگر کسی جگہ یہ منقول نہیں کہ اس نے خود مساکین کو زکوۃ دے دی ہو، جس سے ظاہر یہی ہے کہ نہیں دی، سو یہ بھی خلوص نہ ہونے کا ایک قرینہ ہے۔

پھر وہ حضور کے وصال کے بعد حضرت صدیق اکبرؓ کے زمانہ خلافت میں زکوۃ لایا، آپ نے بھی قبول نہ کی، اسی طرح حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ نے بھی قبول نہ کی، یہاں تک کہ حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں وہ مر گیا، اور حضرات خلفاء راشدین کا قبول نہ کرنا حضور ﷺ کے قبول نہ فرمانے کی وجہ سے تھا، البتہ رسول اللہ ﷺ کے بعد چونکہ کسی شخص کے دل کا نفاق قطعی طور پر کسی کو معلوم نہیں ہو سکتا، اس لئے آئندہ کا حکم یہی ہے کہ جو شخص توبہ کر لے اور ظاہر میں اسلام و ایمان کا اعتراف کر لے اس کے ساتھ مسلمانوں کا سا معاملہ کیا جائے خواہ اس کے دل میں کچھ بھی ہو۔

* * *

فائدہ: یعنی خواہ کیسے ہی وعدے کریں، باتیں بنائیں، یا مجبور ہو کر مال پیش کریں، خدا ان کے ارادوں اور نیتوں کو خوب جانتا ہے اور اپنے ہم مشوروں کے ساتھ بیٹھ کر جو مشورے کرتے ہیں، ان سے پوری طرح آگاہ ہے، وہ جانتا ہے کہ: لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُونَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ (التوبہ:۷۵) کا وعدہ اور گھبرا کر زکوۃ حاضر کرنا کس دل اور کیسی نیت سے تھا۔

اَلَّذِيْنَ يَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِيْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ فِي الصَّدَقٰتِ وَالَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ اِلَّا جُهْدَهُمْ

وہ لوگ جو طعن کرتے ہیں ان مسلمانوں پر جو دل کھول کر خیرات کرتے ہیں اور ان پر جو نہیں رکھتے مگر اپنی محنت کا

فَيَسْخَرُوْنَ مِنْهُمْ ۭ سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ ۡ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۷۹﴾

پھر ان پر ٹھٹھے کرتے ہیں، اللہ نے ان سے ٹھٹھا کیا ہے اور ان کے لیے عذاب دردناک ہے

خلاصہ تفسیر: پیچھے منافقین کے بعض حالات کا ذکر تھا، آگے پھر بعض مشترک حالات کا بیان ہے جیسا کہ پہلے سے اسی طرح چلا آ رہا ہے، اور اس آیت کے متعلق قصہ کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک بار آپ ﷺ نے صدقہ کی ترغیب دی تو ایک صحابی بہت سا مال لے آئے، منافقین نے کہا کہ یہ ریاکار ہے، ایک صحابی غریب تھے بہت کم لائے، منافقین نے کہا کہ یہ اس لیے لائے ہیں کہ میرا بھی نام ہو جائے اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

یہ (منافقین) ایسے ہیں کہ نفل صدقہ دینے والے مسلمانوں پر صدقات کے بارے میں (تھوڑا ہونے پر) طعن کرتے ہیں اور (بالخصوص) ان لوگوں پر (اور زیادہ) جن کو بجز محنت مزدوری (کی آمدنی) کے اور کچھ میسر نہیں ہوتا (اور وہ بیچارے اسی مزدوری میں سے ہمت کر کے کچھ صدقہ نکال دیتے ہیں ان پر زیادہ طعن کرتے ہیں) یعنی ان سے تمسخر کرتے ہیں (یعنی مطلق طعن تو سب ہی پر کرتے ہیں کہ کیا تھوڑی سی چیز صدقہ میں لائے!!! اور ان محنت کش غریبوں سے تمسخر بھی کرتے ہیں کہ لو یہ بھی صدقہ دینے کے قابل ہو گئے) اللہ تعالی ان کو تمسخر کا (تو خاص) بدلہ دے گا اور (ویسے مطلق طعن کا یہ بدلہ ملے گا کہ) ان کے لئے (آخرت میں) دردناک سزا ہوگی۔

اَلَّذِيْنَ يَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِيْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ: یعنی منافقین صدقہ دینے والے مسلمانوں پر صدقات کے بارے میں طعن کرتے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح منافقین مسلمانوں کے صدقات پر طعن کرتے تھے اور مذاق اڑاتے تھے خصوصاً غریب مسلمانوں کا زیادہ مذاق اڑاتے تھے، اسی طرح موجودہ دور میں بھی اہل اللہ کے منکرین کا یہی حال ہے کہ چھوٹے بڑے ہر ولی کا مذاق اڑاتے ہیں، ان کے ہر عمل اور ہر حال پر عیب گیری کرتے رہتے ہیں۔

فِي الصَّدَقٰتِ: یہاں بطور خاص نفلی صدقہ کا صدقہ کا ذکر اس واقعہ کے اعتبار سے ہے، ورنہ طعن اور تمسخر اگر فرض صدقہ میں بھی ہو تب بھی یہی سزا ہے، بلکہ بدرجہ اولی سزا ہے، کیونکہ فرض صدقہ، نفلی سے افضل ہے۔

* * *

فائدہ: ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ نے مسلمانوں کو صدقہ کرنے کی ترغیب دی، حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ نے چار ہزار (دینار یا درہم) حاضر کر دیے، عاصم بن عدیؓ نے ایک سو وسق کھجوریں (جن کی قیمت چار ہزار درہم ہوتی تھی) پیش کیں، منافقین کہنے لگے کہ ان دونوں نے دکھلاوے اور نام ونمود کو اتنا دیا ہے، ایک غریب صحابی ابوعقیل حجابؓ نے جو محنت و مشقت سے تھوڑا سا کما کر لائے، اس میں سے ایک صاع ثمر صدقہ کیا تو مذاق اڑانے لگے کہ یہ خواہ مخواہ زور آوری سے لہو لگا کر شہیدوں میں داخل ہونا چاہتا ہے، بھلا اس کی ایک صاع کھجوریں کیا پکار کریں گی، غرض تھوڑا دینے والا اور بہت خرچ کرنے والا کوئی ان کی زبان سے بچتا نہ تھا، کسی پر طعن، کسی سے ٹھٹھا کرتے تھے، حق تعالیٰ نے فرمایا: سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ (اللہ نے ان سے ٹھٹھا کیا ہے) یعنی ان کے طعن و تمسخر کا بدلہ دیا، بظاہر تو وہ چند روز کے لیے مسخرا پن کرنے کے لیے آزاد چھوڑ دیئے گئے ہیں، لیکن فی الحقیقت اندر ہی اندر سکھ کی جڑیں کٹتی چلی جارہی ہیں، اور عذاب الیم ان کے لیے تیار ہے۔

اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ۭ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ۭ

تو ان کے لیے بخشش مانگ یا نہ مانگ، اگر ان کے لیے ستر بار بخشش مانگے تو بھی ہرگز نہ بخشے گا ان کو اللہ

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿٨٠﴾ ع

یہ اس واسطے کہ وہ منکر ہوئے اللہ سے اور اس کے رسول سے، اور اللہ راستہ نہیں دیتا نافرمان لوگوں کو

خلاصہ تفسیر: پیچھے منافقین کے لیے دردناک عذاب کی دھمکی ہے، آگے اسی کی تاکید ہے کہ یہ عذاب نبی ﷺ کی دعا و استغفار سے بھی نہیں ٹل سکتا باوجودیکہ آپ نجات کا بڑا وسیلہ ہیں، کیونکہ ان میں نجات کی اصل شرط یعنی ایمان نہیں ہے۔

آپ خواہ ان منافقین کے لئے استغفار کریں، یا ان کے لئے استغفار نہ کریں (نفع نہ ہونے میں دونوں حال برابر ہیں، ان کی مغفرت نہیں کی جائے گی) اگر آپ ان کے لئے ستر مرتبہ (یعنی بکثرت) بھی استغفار کریں گے تب بھی اللہ تعالیٰ ان کو نہ بخشے گا، یہ اس وجہ سے ہے کہ انہوں نے اللہ اور رسول کے ساتھ کفر کیا اور اللہ تعالیٰ ایسے سرکش لوگوں کو (جو کبھی ایمان اور حق کی طلب ہی نہ کریں) ہدایت نہیں کیا کرتا (اس وجہ سے یہ عمر بھر کفر ہی پر قائم رہے اور اسی پر مر گئے)۔

اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً: اس کا یہ مطلب نہیں کہ اگر آپ ﷺ ستر سے زیادہ بار استغفار کریں گے تو وہ بخش دیے جائیں گے، بلکہ اس سے مراد کثرت ہے کہ آپ جس قدر بھی استغفار کریں سب ان کے لیے بے فائدہ ہے۔

عبداللہ بن ابی منافق کے قصہ میں جو یہ آیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضور ﷺ کو اس کی نماز جنازہ پڑھانے سے روکا اور دلیل کے طور پر یہ آیت پڑھی کہ اس میں منافقین کے لیے دعا و استغفار سے آپ کو منع کیا گیا ہے اور نماز جنازہ بھی استغفار میں داخل ہے، پھر آپ کس لیے اس کی نماز پڑھاتے ہیں؟ حضور ﷺ نے ان کو یہ جواب دیا کہ خدا تعالیٰ نے مجھے استغفار سے منع نہیں فرمایا، بلکہ اختیار ہے کہ خواہ آپ استغفار کریں یا نہ کریں، اگر ستر بار بھی استغفار کریں تب بھی خدا ان کو نہ بخشے گا تو میں ستر بار سے زیادہ استغفار کروں گا، اس سے یہ شبہ نہ کیا جائے کہ آپ نے ستر کے لفظ سے اسی عدد کو مقصود سمجھا، بلکہ اصل میں آپ کا مطلب یہ تھا کہ اگر مجھ کو یہ معلوم ہو جائے کہ ستر سے زیادہ بار استغفار کرنے سے اس کی مغفرت ہو جائے گی تو میں زیادہ استغفار کر لیتا، مگر آپ جانتے تھے کہ ستر کا عدد مقصود نہیں، اس لیے آپ نے زیادہ استغفار نہیں کیا، چنانچہ درمنثور میں بخاری کی روایت سے آپ ﷺ کا یہ قول مروی ہے: "فلو اعلم انی ان زدت علی السبعین غفر له لزدت علیها" تو اس جملہ شرطیہ کو بعض روایتوں میں جملہ خبریہ کی صورت میں بیان کر دیا، اور عبداللہ بن ابی کی نماز جنازہ آپ نے اس لیے پڑھا دی، حالانکہ اس میں استغفار کی صورت تھی کہ آیت میں آپ کو استغفار سے منع نہیں کیا گیا تھا، صرف اس کا آخرت میں بے سود ہونا بتلایا گیا تھا، اور اس میں آپ کو کچھ اسلامی مصلحتیں مدنظر تھیں کہ اس بات کو دیکھ کر کہ اپنے بدخواہوں اور دشمنوں کے ساتھ بھی ایسی مہربانی اور شفقت کا برتاؤ کیا جاتا ہے ایک ہزار سے زیادہ آدمی مسلمان ہو جائیں گے، چنانچہ ابوالشیخ کی روایت

میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مروی ہے: "وما یغنی عنه قمیصی واللہ انی لارجوا ان یسلم به اکثر من الف من بنی الخزرج" اس حکمت پر نظر فرما کر آپ نے یہ سمجھا کہ میرا استغفار کرنا اور جنازہ کی نماز پڑھنا اس منافق کے لیے آخرت میں اگرچہ بے فائدہ ہے مگر دنیا میں بے فائدہ نہیں۔

اس تقریر سے یہ اشکال ختم ہو گیا کہ اس آیت میں اگر استغفار کی ممانعت مراد تھی جیسا کہ حضرت عمرؓ سمجھے تھے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس مراد کو کیوں نہ سمجھے، اور اگر اختیار دیا گیا تھا جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سمجھے تھے تو حضرت عمرؓ صاحب زبان ہو کر اس سے ممانعت کیونکر سمجھ گئے؟ جواب ظاہر ہے کہ دراصل آیت میں استغفار کی ممانعت نہ تھی، بلکہ اس کا نافع نہ ہونا بتلایا گیا تھا، حضرت عمرؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جیسے حکم کی شان کے لحاظ سے فضول کام کو بھی ممنوع سمجھا اور اس مصلحت پر ان کی نظر نہ گئی جس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر تھی، اس لیے نہ حضرت عمرؓ پر اشکال ہے اور نہ حضور پر یہ اشکال ہو سکتا ہے کہ آپ نے فضول کام کیوں کیا، اس لیے کہ آپ کو چند مصلحتیں اس میں معلوم ہوتی تھیں۔

* * *

فائدہ: یعنی منافقین کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کتنی ہی مرتبہ استغفار کیجئے ان کے حق میں بالکل بیکار اور بے فائدہ ہے، خدا ان بدبخت کافروں اور نافرمانوں کو کبھی معاف نہ کرے گا، واقعہ یہ پیش آیا کہ مدینہ میں رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی کا انتقال ہوا، آپ نے قمیص مبارک کفن میں دیا، لعاب مبارک اس کے منہ میں ڈالا، نماز جنازہ پڑھی اور دعائے مغفرت کی، حضرت عمر اس معاملہ میں آڑے آتے تھے اور کہتے تھے کہ یا رسول اللہ! یہ وہی خبیث تو ہے جس نے فلاں فلاں وقت ایسی ایسی نالائق حرکات کیں، ہمیشہ کفر و نفاق کا علمبردار رہا، کیا حق تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا: اِسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ اَوۡ لَا تَسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ ؕ اِنۡ تَسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ سَبۡعِيۡنَ مَرَّةً فَلَنۡ يَّغۡفِرَ اللّٰهُ لَهُمۡ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اے عمر! مجھ کو استغفار سے منع نہیں کیا گیا، بلکہ آزاد رکھا گیا ہے کہ استغفار کروں یا نہ کروں، یہ خدا کا فعل ہے کہ ان کو معاف نہ کرے، یعنی ان کے حق میں میرا استغفار نافع نہ ہو (سو ان کے حق میں نہ سہی ممکن ہے دوسروں کے حق میں میرا یہ طرز عمل نافع ہو جائے دوسرے لوگ سب سے بڑے موذی دشمن کے حق میں نبی کے اس وسعت اخلاق اور وفور رحمت و شفقت کو دیکھ کر اسلام و پیغمبر اسلام کے گرویدہ ہو جائیں، چنانچہ ایسا ہی ہوا) صحیح بخاری کی ایک روایت میں آپ نے فرمایا کہ: "اگر میں جانتا کہ ستر مرتبہ سے زیادہ استغفار کرنے سے اس کی مغفرت ہو سکتی ہے تو میں ستر مرتبہ سے زائد استغفار کرتا"، گویا اس جملہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے متنبہ فرما دیا کہ حضرت عمر کی طرح آپ بھی اس کے حق میں استغفار کو غیر مفید تصور فرما رہے تھے، فرق اس قدر ہے کہ حضرت عمر کی نظر بغض فی اللہ کے جوش میں صرف اسی نقطہ پر مقصور تھی، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میت کے فائدہ سے قطع نظر فرما کر عام پیغمبرانہ شفقت کا اظہار، اور احیاء کے فائدہ کا خیال فرما رہے تھے، لیکن آخر کار وحی الٰہی وَلَا تُصَلِّ عَلٰۤى اَحَدٍ مِّنۡهُمۡ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمۡ عَلٰى قَبۡرِهٖ نے صریح طور پر منافقین کا جنازہ پڑھنے یا ان کے اہتمام دفن و کفن وغیرہ میں حصہ لینے کی ممانعت کر دی، کیونکہ اس طرز عمل سے منافقین کی ہمت افزائی اور مومنین کی دل شکستگی کا احتمال تھا، اس وقت سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی منافق کے جنازہ کی نماز نہیں پڑھی۔

فَرِحَ الۡمُخَلَّفُوۡنَ بِمَقۡعَدِهِمۡ خِلٰفَ رَسُوۡلِ اللّٰهِ وَكَرِهُوۡۤا اَنۡ يُّجَاهِدُوۡا بِاَمۡوَالِهِمۡ وَاَنۡفُسِهِمۡ

خوش ہو گئے پیچھے رہنے والے اپنے بیٹھ رہنے سے جدا ہو کر رسول اللہ سے اور گھبرائے اس سے کہ لڑیں اپنے مال سے اور جان سے

فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ وَقَالُوۡا لَا تَنۡفِرُوۡا فِى الۡحَـرِّ ؕ قُلۡ نَارُ جَهَـنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا ؕ لَوۡ كَانُوۡا يَفۡقَهُوۡنَ ۝۸۱

اللہ کی راہ میں ۱ اور بولے کہ مت کوچ کرو گرمی میں ۲ تو کہہ دوزخ کی آگ سخت گرم ہے، اگر ان کو سمجھ ہوتی ۳

خلاصہ تفسیر: آگے منافقین میں سے خاص ان لوگوں کے متعلق بعض مضامین مذکور ہیں جو غزوہ تبوک میں نہیں گئے۔

یہ پیچھے رہ جانے والے خوش ہو گئے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے (جانے کے) بعد اپنے بیٹھے رہنے پر اور ان کو اللہ کی راہ میں اپنے مال اور جان کے ساتھ جہاد کرنا ناگوار ہوا (دو وجہ سے: ① ایک کفر ② دوسرے آرام طلبی کی وجہ سے) اور (دوسروں کو بھی) کہنے لگے کہ تم (ایسی تیز) گرمی میں (گھر سے) مت نکلو، آپ (جواب میں) کہہ دیجئے کہ جہنم کی آگ (اس سے بھی) زیادہ (تیز اور) گرم ہے (سو تعجب ہے کہ اس دنیا کی گرمی

سے تو بچتے ہو اور جہنم میں جانے کا خود سامان کر رہے ہو، کہ کفر و مخالفت کو نہیں چھوڑتے) کیا خوب ہوتا اگر وہ سمجھتے۔

وَقَالُوْا لَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ: یعنی منافقین مسلمانوں سے کہنے لگے کہ تم ایسی تیز گرمی میں گھر سے مت نکلو، جس طرح منافقین لوگوں کو جہاد سے روکتے تھے اور کہتے تھے گرمی میں مت نکلو، اسی طرح ان لوگوں کا حال ہے جو لوگوں کو اصلاح نفس اور تربیت اخلاق کے مجاہدے اور ریاضت سے روکتے ہیں اور دنیاوی لذتوں کے چھوٹنے سے ڈراتے ہیں (کہ میاں! کیوں مصیبت میں پڑے ہو، دنیا کے مزے لو، اپنے اوپر ظلم نہ کرو وغیرہ) حالانکہ جو اللہ کی رضا و محبت حاصل کرنا چاہتے ہیں ان کو آزمائشیں برداشت کرنا پڑیں گی۔

* * *

فائدہ: ۱ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ: یہ ان منافقین کے متعلق ہے جو غزوہ تبوک کی شرکت سے علیحدہ رہے، یعنی منافقین کا حال یہ ہے کہ برائی اور عیب کا کام کر کے خوش ہوتے ہیں، نیکی سے گھبرا کر دور بھاگتے ہیں، اور جیسا کہ پہلے گزرا نیکی کرنے والوں پر طعن کرتے اور آوازے کستے ہیں، ایسی قوم کو نبی کے استغفار سے کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے، یہاں سے گنہگار اور بداعتقاد کا فرق نکلتا ہے، گناہ ایسا کونسا ہے جو پیغمبر کے بخشوانے سے نہ بخشا جائے وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا (النساء: ۶۴) لیکن بداعتقاد کو پیغمبر کا ستر مرتبہ استغفار فائدہ نہ دے۔

فائدہ: ۲ وَقَالُوْا لَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ: یا تو منافقین آپس میں ایک دوسرے کو کہتے تھے اور یا بعض مومنین سے کہتے ہوں گے کہ ان کی ہمتیں سست ہو جائیں۔

فائدہ: ۳ لَوْ كَانُوْا يَفْقَهُوْنَ: یعنی اگر سمجھ ہوتی تو خیال کرتے کہ یہاں کی گرمی سے بچ کر جس گرمی کی طرف جا رہے ہو وہ کہیں زیادہ سخت ہے، یہ تو وہی مثال ہوئی کہ دھوپ سے بھاگ کر آگ کی پناہ لی جائے، حدیث میں ہے کہ جہنم کی آگ دنیا کی آگ سے انہتر درجہ زیادہ تیز ہے، نعوذ باللہ منہا۔

فَلْيَضْحَكُوْا قَلِيْلًا وَّلْيَبْكُوْا كَثِيْرًا ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۸۲﴾

سو وہ ہنس لیویں تھوڑا اور روویں بہت سا، بدلہ اس کا جو وہ کماتے تھے

خلاصہ تفسیر: سو (ان امور مذکورہ کا نتیجہ یہ ہے کہ دنیا میں) تھوڑے دنوں ہنس (کھیل) لیں، اور (پھر آخرت میں) بہت دنوں (یعنی ہمیشہ) روتے رہیں (یعنی ہنسا کھیلنا تھوڑے دنوں کا ہے، پھر رونا ہمیشہ ہمیشہ کا) ان کاموں کے بدلہ میں جو کچھ (کفر، نفاق اور مخالفت وغیرہ) کیا کرتے تھے۔

فَلْيَضْحَكُوْا قَلِيْلًا: یہ لفظ اگرچہ بصیغہ امر لایا گیا، مگر حضرات مفسرین نے اس کو خبر کے معنی میں قرار دیا ہے، اور بصیغہ امر ذکر کرنے کی یہ حکمت بیان کی ہے کہ ایسا ہونا حتمی اور یقینی ہے، یعنی یہ بات یقینی طور پر ہونے والی ہے کہ ان لوگوں کی یہ خوشی و ہنسی صرف چند روز کی ہے، اس کے بعد آخرت میں ہمیشہ کے لئے رونا ہی رونا ہوگا، بعض لوگوں نے اس سے یہ سمجھا کہ شریعت میں ہنسنے کی ممانعت ہے، یا رونا افضل ہے ہنسنے سے، یہ استدلال غلط ہے، یہ آیت منافقین کے بارے میں ہے، انہی کے متعلق پہلے سے بیان چلا آرہا ہے، فلیضحکوا میں ضمیر منافقین کی طرف راجع ہے اور خبر بصورت انشاء ہے، حاصل ترجمہ یہ ہے کہ وہ دنیا میں تھوڑے دنوں ہنستے رہیں پھر قیامت میں زیادہ روئیں گے، اس آیت میں منافقین کی اخروی حالت بیان کی گئی ہے کہ یہ لوگ دنیا میں کچھ دنوں کو ہنس لیں پھر آخرت میں رونا ہی رونا ہے، آیت کا یہ مطلب تھا، نہ یہ کہ رونے کی فضیلت اور ہنسنے کی مذمت، جیسا آج کل کے مدعی سمجھتے ہیں، قلیلاً سے دنیا کی زندگی مراد ہے اور کثیراً سے آخرت کی زندگی مراد ہے، مطلب یہ ہے کہ آخرت میں خوب دل کھول کر روؤ گے اور ہنسنا کبھی نصیب نہ ہوگا، جزآء بما کانوا یکسبون اس کا قرینہ ہے، غرض یہ آیت آخرت کے متعلق ہے۔

علاوہ ازیں یہ کہ دوسری نصوص بھی اس معنی کی نفی کر رہی ہیں جو ان لوگوں نے اس آیت سے سمجھے ہیں کیونکہ احادیث سے ثابت ہے کہ

حضرات صحابہ کرام اپنی مجالس میں ہنستے بھی تھے، مگر اس کے ساتھ یہ بھی تھا کہ رات کو خلوت میں رویا کرتے تھے، اس تفصیل سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ کے خوف یا اس کی محبت میں رونا اچھا ہے، لیکن اس وجہ سے ہر حال میں رونا آئے یہ ضروری نہیں، کیونکہ رونا غیر اختیاری امر ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی چند روز اپنی حرکات پر خوش ہولو اور ہنس لو، پھر ان کرتوتوں کی سزا میں ہمیشہ کو رونا ہے۔

فَاِنۡ رَّجَعَكَ اللّٰهُ اِلٰى طَآٮِٕفَةٍ مِّنۡهُمۡ فَاسۡتَاۡذَنُوۡكَ لِلۡخُرُوۡجِ فَقُلْ لَّنۡ تَخۡرُجُوۡا مَعِىَ اَبَدًا

سو اگر پھر لے جائے تجھ کو اللہ کسی فرقہ کی طرف ان میں سے ۱؎ پھر اجازت چاہیں تجھ سے نکلنے کی تو تو کہہ دینا کہ تم ہرگز نہ نکلو گے میرے ساتھ کبھی

وَّلَنۡ تُقَاتِلُوۡا مَعِىَ عَدُوًّا ؕ اِنَّكُمۡ رَضِيۡتُمۡ بِالۡقُعُوۡدِ اَوَّلَ مَرَّةٍ فَاقۡعُدُوۡا مَعَ الۡخٰلِفِيۡنَ ﴿۸۳﴾

اور نہ لڑو گے میرے ساتھ ہو کر کسی دشمن سے، تم کو پسند آیا بیٹھ رہنا پہلی بار سو بیٹھے رہو پیچھے رہنے والوں کے ساتھ ۲؎

خلاصہ تفسیر: (جب ان کا حال معلوم ہو گیا) تو اگر خدا تعالیٰ آپ کو (اس سفر سے مدینہ کو صحیح وسالم) ان کے کسی گروہ کی طرف واپس لائے (گروہ اس لئے کہا کہ ممکن ہے کہ بعض اس وقت تک مرجائیں، یا کوئی کہیں چلا جائے، اور) پھر یہ لوگ (براہ خوشامد اور پچھلا الزام دور کرنے کی غرض سے کسی جہاد میں آپ کے ساتھ) چلنے کی اجازت مانگیں (اور دل میں اس وقت بھی یہی ہوگا کہ عین وقت پر کچھ بہانہ کر دیں گے) تو آپ یوں کہہ دیجئے کہ (اگرچہ تم اس وقت دنیا سازی کے طور پر باتیں بنا رہے ہو، لیکن اللہ تعالیٰ نے تمہارے دل کی بات بتلا دی ہے، اس لئے نہایت وثوق سے کہتا ہوں کہ) تم کبھی بھی میرے ساتھ (جہاد میں) نہ چلو گے، اور نہ میرے ہمراہ ہو کر کسی دشمن (دین) سے لڑو گے (جو کہ اصلی مقصود ہے چلنے سے، کیونکہ) تم نے پہلے بھی بیٹھے رہنے کو پسند کیا تھا (اور اب بھی تمہارا وہی عزم ہے) تو (خواہ مخواہ جھوٹی باتیں کیوں بناتے ہو، بلکہ پہلے کی طرح اب بھی) ان لوگوں کے ساتھ بیٹھے رہو (جو واقعی) پیچھے رہ جانے کے لائق ہی ہیں (عذر کی وجہ سے جیسے بوڑھے، بچے اور عورتیں)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تبوک میں تھے اور منافقین مدینہ میں ممکن تھا کہ بعض منافقین آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی واپسی سے قبل مرجائیں، اس لیے اِلٰی طَآئِفَةٍ مِّنۡهُمۡ فرمایا۔

فائدہ: ۲؎ یعنی اب اگر یہ لوگ کسی دوسرے غزوہ میں ساتھ چلنے کی اجازت مانگیں تو فرما دیجئے کہ بس! تمہاری ہمت وشجاعت کا بھانڈا پھوٹ چکا اور تمہارے دلوں کا حال پہلی مرتبہ کھل چکا، نہ تم کبھی ہمارے ساتھ نکل سکتے ہو اور نہ دشمنان اسلام کے مقابلہ میں بہادری دکھا سکتے ہو، لہذا اب تم کو تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں، عورتوں، بچوں، اپاہج اور ناتوان بڈھوں کے ساتھ گھر میں گھسے بیٹھے رہو اور جس چیز کو پہلی دفعہ تم نے اپنے لیے پسند کر لیا ہے مناسب ہے کہ اسی حالت پر مرو، تاکہ اچھی طرح عذاب الٰہی کا مزہ چکھو۔

وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنۡهُمۡ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمۡ عَلٰى قَبۡرِهٖ ؕ اِنَّهُمۡ كَفَرُوۡا بِاللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ

اور نماز نہ پڑھ ان میں سے کسی پر جو مر جائے اور کبھی نہ کھڑا ہو اس کی قبر پر ۱؎ وہ منکر ہوئے اللہ سے اور اس کے رسول سے

وَمَاتُوۡا وَهُمۡ فٰسِقُوۡنَ ﴿۸۴﴾

اور وہ مر گئے نافرمان ۲؎

خلاصہ تفسیر: پیچھے منافقین کے ساتھ ان کی زندگی کی حالت میں برتاؤ کا ذکر تھا، آگے بتلاتے ہیں کہ ان کے مرنے کے بعد ان سے کیا برتاؤ کیا جائے، اس کا شان نزول یہ ہے کہ صحیحین میں ابن عمرؓ سے منقول ہے کہ جب عبد اللہ بن ابی منافق مر گیا تو اس کے بیٹے نے جو کہ صحابی

تھے رسول اللہ ﷺ سے درخواست کی کہ اپنا کرتا دے دیجیے کہ اس میں اس کو کفنایا جائے، آپ نے دے دیا، پھر درخواست کی کہ اس کی نماز جنازہ بھی پڑھ دیجیے، آپ پڑھنے کے لیے کھڑے ہوئے تو حضرت عمرؓ نے آپ کا کپڑا پکڑ لیا اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آپ اس کی نماز پڑھتے ہیں، حالانکہ اللہ تعالی نے آپ کو منافقین کی نماز پڑھنے سے منع فرمایا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالی نے مجھے اختیار دیا ہے منع نہیں فرمایا تو میں ستر بار سے زیادہ استغفار کروں گا، غرض آپ نے نماز پڑھی اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

(پیچھے منافقین کے ساتھ ان کی حالت زندگی میں برتاؤ کا ذکر تھا، اب ان کے مرنے کے بعد ان کے ساتھ برتاؤ کا بیان ہے) اور ان میں کوئی مرجائے تو اس (کے جنازہ) پر کبھی نماز نہ پڑھئے، اور نہ (دفن وغیرہ کے واسطے) اس کی قبر پر کھڑے ہوجئے (کیونکہ) انھوں نے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ کفر کیا ہے، اور وہ حالت کفر ہی میں مرے ہیں۔

پھر اس کے بعد کبھی آپ نے کسی منافق کی نماز جنازہ نہیں پڑھی، یہ واقعہ تفصیل کے ساتھ پیچھے گزر چکا ہے اور وہاں یہ بھی بتلادیا گیا کہ آپ نے بعض مصلحتوں کی وجہ سے اس کی نماز پڑھی تھی، لیکن ممانعت کی وجہ یہ ہوئی کہ اگرچہ اس میں وہ مصلحتیں ضرور تھیں مگر آئندہ فتنہ وفساد پیدا ہوتا، مثلاً یہ کہ مخالفین کو تنبیہ نہ ہوتی اور منافقین کا دل نہ بڑھتا کہ یہاں سب کے ساتھ ایک ہی برتاؤ کیا جاتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

یہاں ایک سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ عبداللہ بن ابی ایک ایسا منافق تھا جس کا نفاق مختلف اوقات میں ظاہر بھی ہو چکا تھا اور سب منافقوں کا سردار مانا جاتا تھا، اس کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کا یہ امتیازی سلوک کیسے ہوا کہ اس کے کفن کے لئے اپنا قمیص مبارک عطا فرمایا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس کے دو سبب ہو سکتے ہیں: ① اول اس کے صاحبزادے جو مخلص صحابی تھے ان کی درخواست کہ محض ان کی دلجوئی کے لئے ایسا کیا گیا ② دوسرا سبب ایک اور بھی ہوسکتا ہے جو بخاری کی حدیث میں بروایت حضرت جابر منقول ہے کہ غزوہ بدر کے موقع پر جب کچھ قریشی سردار گرفتار کئے گئے، تو ان میں آنحضرت ﷺ کے چچا عباسؓ بھی تھے، آپ نے دیکھا کہ ان کے بدن پر کرتہ نہیں، تو صحابہ سے ارشاد فرمایا کہ ان کو قمیص پہنا دیا جائے، حضرت عباسؓ دراز قد تھے، عبداللہ بن ابی کے سوا کسی کا قمیص ان کے بدن پر درست نہ آیا، تو عبداللہ بن ابی کا قمیص لے کر رسول اللہ ﷺ نے اپنے چچا عباسؓ کو پہنا دیا تھا، اس کے اسی احسان کا بدلہ ادا کرنے کے لئے آنحضرت ﷺ نے اپنا قمیص ان کو عطا فرما دیا۔

دوسرا سوال یہاں یہ ہے کہ فاروق اعظمؓ نے جو آنحضرت ﷺ سے یہ عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو منافق کے جنازہ کی نماز سے منع فرمایا ہے، یہ کس بناء پر کہا؟ کیونکہ اس سے پہلے کسی آیت میں صراحتاً آپ کو منافق کی نماز جنازہ سے منع نہیں فرمایا گیا، اس سے ظاہر یہی ہے کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے ممانعت کا مضمون اسی سورۃ توبہ کی سابقہ آیت اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ الایۃ سے سمجھا ہوگا، تو اب سوال یہ ہوتا ہے کہ اگر یہ آیت ممانعت نماز جنازہ پر دلالت کرتی ہے تو آنحضرت ﷺ نے اس سے ممانعت کیوں نہ قرار دی، بلکہ یہ فرمایا کہ اس آیت میں مجھے اختیار دیا گیا ہے۔

جواب یہ ہے کہ درحقیقت الفاظ آیت کا ظاہری مفہوم اختیار ہی دینا ہے، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ستر مرتبہ کا ذکر بھی اس جگہ تحدید کے لیے نہیں، بلکہ کثرت بیان کرنے کے لئے ہے، تو اس آیت کا حاصل اس کے ظاہری مفہوم کے اعتبار سے یہ ہوگیا کہ منافق کی مغفرت تو نہ ہوگی، خواہ آپ کتنی ہی مرتبہ استغفار کرلیں، لیکن اس میں صراحۃً آپ کو استغفار کرنے سے روکا بھی نہیں گیا، اور قرآن کریم میں سورۃ یٰس کی ایک آیت اس کی نظیر ہے جس میں فرمایا گیا کہ: وَسَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ، جیسا اس آیت نے آپ کو انذار اور تبلیغ سے منع نہیں کیا، بلکہ دوسری آیات سے تبلیغ ودعوت کا سلسلہ ان کے لئے بھی جاری رکھنا ثابت ہے: بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ، اور اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ، وغیرہ حاصل یہ ہے کہ آیت ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ سے تو آپ کو اختیار ہی دینا ثابت ہوا تھا، پھر مستقل دلیل سے انذار کو جاری رکھنا ثابت ہوگیا، آنحضرت ﷺ نے آیت مذکورہ سے بھی یہ تو سمجھ لیا تھا کہ اس کی مغفرت نہیں ہوگی، مگر کسی دوسری آیت کے ذریعہ اب تک آپ کو استغفار کرنے سے روکا بھی نہیں گیا تھا، اور آنحضرت ﷺ جانتے تھے کہ میرے قمیص سے یا نماز پڑھانے سے اس کی تو مغفرت نہیں ہوگی، مگر اس سے دوسری مصالح اسلامیہ حاصل ہونے کی توقع تھی کہ اس کے خاندان کے لوگ اور دوسرے کفار جب آنحضرت ﷺ کا یہ معاملہ اس کے ساتھ دیکھیں گے تو وہ اسلام کے

قریب آجائیں گے اور مسلمان ہوجائیں گے، اور ممانعت صریح نماز پڑھنے کی اس وقت تک موجود نہ تھی، اس لئے آپ نے نماز پڑھ لی۔

خلاصہ یہ ہے کہ آیت سابقہ سے خود رسول اللہ ﷺ کو بھی یہ تو یقین ہوگیا تھا کہ ہمارے کسی عمل سے اس منافق کی مغفرت نہیں ہوگی، مگر چونکہ ظاہر الفاظ آیت میں اختیار دیا گیا تھا، اور کسی دوسری آیت سے بھی اس کی ممانعت اب تک نہیں آئی تھی، دوسری طرف ایک کافر کے احسان سے دنیا میں نجات حاصل کرنے کا فائدہ بھی تھا، اور اس معاملہ میں دوسرے کافروں کے مسلمان ہونے کی توقع بھی، اس لئے آپ نے نماز پڑھنے کو ترجیح دی، اور فاروق اعظم نے یہ سمجھا کہ جب اس آیت سے یہ ثابت ہوگیا کہ مغفرت نہیں ہوگی تو اس کیلئے نماز جنازہ پڑھ کر دعا مغفرت کرنا ایک فعل عبث اور بے کار ہے، جو شان نبوت کے خلاف ہے اسی کو انہوں نے ممانعت سے تعبیر فرمایا، اور رسول اللہ ﷺ اگر چہ اس فعل کو فی نفسہ مفید نہ سمجھتے تھے مگر دوسروں کے اسلام لانے کا فائدہ پیش نظر تھا، اس لئے فعل عبث نہ رہا، اس طرح نہ رسول اللہ ﷺ کے عمل پر کوئی اشکال رہتا ہے نہ فاروق اعظم کے قول پر۔

البتہ جب صراحۃً یہ آیت نازل ہوگئی لَا تُصَلِّ تو معلوم ہوا کہ اگر چہ نماز پڑھنے میں ایک دینی مصلحت آپ کے پیش نظر تھی، مگر اس میں ایک خرابی اور مفسدہ بھی تھا، جس کی طرف آنحضرت ﷺ کا دھیان نہیں ہوا، وہ یہ کہ خود مخلص مسلمانوں میں اس عمل سے ایک بے دلی پیدا ہونے کا خطرہ تھا کہ ان کے یہاں مخلص مسلمان اور منافق سب ایک پلے میں تولے جاتے ہیں، اس خطرہ کے پیش نظر قرآن میں یہ ممانعت نازل ہوگئی، اور پھر کبھی آپ نے کسی منافق کی نماز جنازہ نہیں پڑھی۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی دعاء و استغفار کے لیے یا اہتمام دفن کے لیے۔

فائدہ: ۲؎ یہ آیت عبداللہ بن ابی کے واقعہ کے بعد نازل ہوئی، جیسا کہ چند آیات پہلے ہم مفصل بیان کر چکے ہیں اس آیت کے نزول کے بعد منافقین کا جنازہ پڑھنا قطعاً ممنوع ہوگیا، امیر المومنین حضرت عمر فاروق ؓ احتیاطاً ایسے شخص کا جنازہ نہ پڑھتے تھے جس کی نماز میں حضرت حذیفہ شریک نہ ہوں کیونکہ ان کو آنحضرت ﷺ نے بہت سے منافقین کا نام بنام علم کرادیا تھا، اسی لیے ان کا لقب ''صاحب سرّ رسول اللہ'' ہوا۔

وَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَاَوْلَادُهُمْ ط اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ

اور تعجب نہ کر ان کے مال اور اولاد سے، اللہ تو یہی چاہتا ہے کہ عذاب میں رکھے ان کو ان چیزوں کے باعث دنیا میں اور نکلے

اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۸۵﴾

ان کی جان اور وہ اس وقت تک کافر ہی رہیں

خلاصہ تفسیر: پیچھے منافقین کا خدا کے نزدیک مردود ہونا معلوم ہوا، آگے بتلاتے ہیں کہ ان کے پاس جو مال واولاد ہے یہ ان کے محبوب ہونے کی دلیل نہیں، بلکہ سبب عذاب ہونے کی وجہ سے یہ بھی ان کے مردود ہونے کا ثمرہ اور نتیجہ ہے۔

اور ان کے اموال اور اولاد آپ کو (اس) تعجب میں نہ ڈالیں (کہ ایسے مردودوں پر یہ نعمتیں کیسے ہوئیں، سو واقع میں یہ ان کے لئے نعمتیں نہیں، بلکہ عذاب کا ذریعہ ہیں، کیونکہ) اللہ کو صرف یہ منظور ہے کہ ان (مذکورہ) چیزوں کی وجہ سے دنیا میں (بھی) ان کو گرفتار عذاب رکھے اور ان کا دم حالت کفر ہی میں نکل جائے (جس سے آخرت میں بھی عذاب میں مبتلا رہیں)۔

وَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَاَوْلَادُهُمْ: ایسی ہی ایک آیت چار رکوع پہلے بھی آچکی ہے، لیکن وہاں اس کا تعلق زندگی کی ایک حالت سے تھا کہ ان کے صدقات مقبول نہیں، جبکہ یہاں موت کی ایک حالت سے اس کا تعلق ہے کہ ان چیزوں کے سبب ان کو نجات نہیں ہوسکتی، پس تکرار نہ رہا۔

* * *

فائدہ: چار رکوع پہلے اسی مضمون کی آیت گزر چکی، اس کا فائدہ ملاحظہ کر لیا جائے۔

وَإِذَآ أُنزِلَتۡ سُورَةٌ أَنۡ ءَامِنُواْ بِٱللَّهِ وَجَٰهِدُواْ مَعَ رَسُولِهِ ٱسۡتَـٔۡذَنَكَ أُوْلُواْ ٱلطَّوۡلِ مِنۡهُمۡ

اور جب نازل ہوتی ہے کوئی سورت کہ ایمان لاؤ اللہ پر اور لڑائی کرو اسکے رسول کے ساتھ ہوکر جو تجھ سے رخصت مانگتے ہیں مقدور والے انکے

وَقَالُواْ ذَرۡنَا نَكُن مَّعَ ٱلۡقَٰعِدِينَ ﴿٨٦﴾ رَضُواْ بِأَن يَكُونُواْ مَعَ ٱلۡخَوَالِفِ وَطُبِعَ

اور کہتے ہیں ہم کو چھوڑ دے کہ رہ جائیں ساتھ بیٹھنے والوں کے، خوش ہوئے کہ رہ جائیں پیچھے رہنے والی عورتوں کے ساتھ ۱؎ اور مہر کر دی گئی

عَلَىٰ قُلُوبِهِمۡ فَهُمۡ لَا يَفۡقَهُونَ ﴿٨٧﴾

انکے دل پر سو وہ نہیں سمجھتے ۲؎

خلاصہ تفسیر: پیچھے غزوہ تبوک کے متعلق منافقین کا پیچھے رہ جانا اور جھوٹے بہانے کر کے اجازت مانگنا مذکور تھا، آگے بتلاتے ہیں کہ یہ حالت ان کی دائمی ہے، ہر غزوہ میں ایسا ہی کرتے ہیں اور ان کے مقابلہ میں مسلمانوں کی جانبازی اور ان کی فضیلت کا بیان ہے۔

اور جب کبھی کوئی ٹکڑا قرآن کا اس مضمون میں نازل کیا جاتا ہے کہ تم (خلوص دل سے) اللہ پر ایمان لاؤ اور اسکے رسول کے ہمراہ ہو کر جہاد کرو تو ان میں کے مقدور والے آپ سے رخصت مانگتے ہیں اور (رخصت کا مضمون یہ ہوتا ہے کہ) کہتے ہیں کہ ہم کو اجازت دیجئے کہ ہم بھی یہاں ٹھہرنے والوں کے ساتھ رہ جائیں (البتہ ایمان واخلاص کے دعوے میں چونکہ کچھ کرنا نہیں پڑتا اس لیے اسکے بہت لمبے چوڑے دعوی کرتے تھے کہ ہم تو مخلص ہیں) وہ لوگ (انتہائی بے حمیتی سے) خانہ نشین عورتوں کے ساتھ رہنے پر راضی ہو گئے، اور انکے دلوں پر مہر لگ گئی جس سے وہ (حمیت اور بے حمیتی کو) سمجھتے ہی نہیں۔

أُولُوا الطَّوْلِ: یہاں مقدور یعنی استطاعت والوں کی خصوصیت مقصود نہیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ جب استطاعت والوں کا یہ حال ہے تو اس سے استطاعت نہ رکھنے والوں کا حال تو بدرجہ اولی معلوم ہو گیا کہ ان کے پاس تو پھر ایک ظاہری عذر بھی تھا۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی قرآن کی کسی سورت میں جب تنبیہ کی جاتی ہے کہ پوری طرح خلوص وپختگی سے ایمان لاؤ، جس کا بڑا اثر یہ ظاہر ہونا چاہیے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہو کر خدا کے راستہ میں جہاد کریں، تو یہ منافقین جان چرانے لگتے ہیں اور ان میں کے استطاعت ومقدور والے بھی جھوٹے عذر تراش کر اجازت طلب کرنے آتے ہیں کہ حضرت! ہمیں تو یہیں مدینہ میں رہنے دیجئے، گویا کمال بے غیرتی اور نامردی سے اس پر راضی ہیں کہ لڑائی یا خطرہ کا نام سنتے ہی خانہ نشین عورتوں کے ساتھ گھروں میں گھس کر بیٹھ رہیں، ہاں جس وقت جنگ وغیرہ کا خطرہ نہ رہے اور امن واطمینان کا زمانہ ہو تو باتیں بنانے اور قینچی کی طرح زبان چلانے میں سب سے پیش پیش ہوتے ہیں فَإِذَا جَآءَ ٱلۡخَوۡفُ رَأَيۡتَهُمۡ يَنظُرُونَ إِلَيۡكَ تَدُورُ أَعۡيُنُهُمۡ كَٱلَّذِي يُغۡشَىٰ عَلَيۡهِ مِنَ ٱلۡمَوۡتِۖ فَإِذَا ذَهَبَ ٱلۡخَوۡفُ سَلَقُوكُم بِأَلۡسِنَةٍ حِدَادٍ (الاحزاب: ۱۹)

فائدہ: ۲؎ یعنی کذب ونفاق نکول عن الجہاد، اور تخلف عن الرسول کی شامت سے ان کے دلوں پر مہر کر دی گئی کہ اب موٹے موٹے عیب بھی ان کو عیب نظر نہیں آتے اور انتہائی بے غیرتی وبزدلی پر بجائے شرمانے کے نازاں وفرحاں ہوتے ہیں۔

لَٰكِنِ ٱلرَّسُولُ وَٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ مَعَهُۥ جَٰهَدُواْ بِأَمۡوَٰلِهِمۡ وَأَنفُسِهِمۡۚ وَأُوْلَٰٓئِكَ لَهُمُ

لیکن رسول اور جو لوگ ایمان لائے ہیں ساتھ اس کے وہ لڑے ہیں اپنے مال اور جان سے، اور انہی کے لیے ہیں

ٱلۡخَيۡرَٰتُۖ وَأُوْلَٰٓئِكَ هُمُ ٱلۡمُفۡلِحُونَ ﴿٨٨﴾ أَعَدَّ ٱللَّهُ لَهُمۡ جَنَّٰتٖ تَجۡرِي مِن تَحۡتِهَا ٱلۡأَنۡهَٰرُ خَٰلِدِينَ

خوبیاں، اور وہی ہیں مراد کو پہنچنے والے، تیار کر رکھے ہیں اللہ نے ان کے واسطے باغ کہ بہتی ہیں نیچے ان کے نہریں رہا کریں

فِيهَا ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿٨٩﴾

ان میں، یہی ہے بڑی کامیابی ۱؎

خلاصہ تفسیر: ہاں! لیکن رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) اور آپ کی ہمراہی میں جو مسلمان ہیں انہوں نے (البتہ اس حکم کو مانا اور) اپنے مالوں سے اور اپنی جانوں سے جہاد کیا، اور انہی کے لئے ساری خوبیاں ہیں، اور یہی لوگ کامیاب ہیں (اور وہ خوبی اور کامیابی یہ ہے کہ) اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے ایسے باغ مہیا کر رکھے ہیں جن کے نیچے سے نہریں جاری ہیں (اور) وہ ان میں ہمیشہ کو رہیں گے اور یہ بڑی کامیابی ہے۔

لٰكِنِ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر کی یہاں کوئی حاجت نہیں تھی، لیکن اس سے مقصود مسلمانوں کی مدح ہے کہ جہاد میں ان کا خلوص بھی کامل ہے جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خلوص بہت زیادہ کامل ہے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ منافقین کے بالمقابل مومنین مخلصین کا بیان فرمایا کہ دیکھو! یہ ہیں خدا کے وفادار بندے، جو اس کے راستہ میں نہ جان سے ہٹتے ہیں نہ مال سے، کیسا ہی خطرہ کا موقع ہو، اسلام کی حمایت اور پیغمبر اسلام کی معیت میں ہر قربانی کے لیے تیار رہتے ہیں، پھر ایسوں کے لیے فلاح و کامیابی نہ ہوگی تو اور کس کے لیے ہوگی۔

وَجَآءَ الْمُعَذِّرُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ لِيُؤْذَنَ لَهُمْ وَقَعَدَ الَّذِيْنَ كَذَبُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۭ سَيُصِيْبُ

اور آئے بہانے کرنے والے گنوار تا کہ انکو رخصت مل جائے اور بیٹھ رہے جنہوں نے جھوٹ بولا تھا اللہ سے اور اسکے رسول سے، اب پہنچے گا

الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿٩٠﴾

ان کو جو کافر ہیں ان میں عذاب دردناک

خلاصہ تفسیر: پیچھے مدینہ کے منافقوں کا ذکر تھا، اب دیہات کے منافقوں کا بیان ہے۔

اور کچھ بہانہ باز لوگ دیہاتیوں میں سے آئے تا کہ ان کو (گھر رہنے کی) اجازت مل جائے اور (ان دیہاتیوں میں سے) جنہوں نے خدا سے اور اس کے رسول سے (ایمان کے دعوئ میں) بالکل ہی جھوٹ بولا تھا وہ بالکل ہی بیٹھ رہے (جھوٹے عذر کرنے بھی نہ آئے) ان میں جو (آخر تک) کافر رہیں گے ان کو (آخرت میں) دردناک عذاب ہوگا (اور جو توبہ کرلیں تو عذاب سے بچ جائیں گے)۔

وَجَآءَ الْمُعَذِّرُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ: یوں تو ایمان کے دعوی میں سب ہی منافق جھوٹے تھے، مگر اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ ان دیہاتی منافقوں میں دو قسم کے لوگ تھے: ① ایک تو وہ جنہوں نے ظاہر داری میں اپنے دعوی کو کچھ نبھایا، یعنی جو حیلے بہانے پیش کرنے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ ان کو جہاد میں چلنے سے رخصت دے دی جائے ② کچھ ایسے مغرور اور سرکش بھی تھے جنہوں نے ظاہر داری بھی نہ برتی تو وہ جیسے دل میں جھوٹے تھے ظاہر میں بھی ان کا جھوٹ کھل گیا، "بالکل جھوٹ" بولنے کا یہی مطلب ہے، یعنی انہوں نے اس کی بھی پروانہیں کی کہ رخصت لے لیں، وہ از خود ہی اپنے گھروں میں بیٹھ رہے، اس طرح ان دیہاتی منافقوں کی دو قسمیں ہوگئیں۔

* * *

فائدہ: یعنی جس طرح مدینہ کے رہنے والوں میں منافقین بھی ہیں اور مخلصین بھی، اسی طرح دیہاتی گنواروں میں ہر قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں ان میں سے یہاں دو قسموں کا ذکر فرمایا، مخلص دیہاتیوں کا ذکر اس رکوع کے خاتمہ پر وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ میں آئیگا۔

یہاں دیہاتیوں کی جن دو جماعتوں کا ذکر ہے (مُعَذِّرُوْن اور قَاعِدُوْن) ان میں سے پہلی جماعت (مُعَذِّرُوْن) کے مصداق میں مفسرین سلف کا اختلاف ہے کہ آیا اس سے مراد جھوٹے بہانے بنانے والے منافق ہیں (جیسا کہ ترجمہ سے ظاہر ہوتا ہے) یا سچے عذر کرنے والے مسلمان جو واقعی

جہاد کی شرکت سے معذور تھے، اگر پہلی شق اختیار کی جائے تو آیت میں منافقین کی دو قسموں کا بیان ہوگا، مُعَذِّرُوْن تو وہ ہوئے جو باوجود نفاق کے محض رسم ظاہرداری نباہنے کے لیے جھوٹے حیلے بنا کر حضور ﷺ سے اجازت طلب کرتے تھے، اور قاعِدُوْن سے وہ منافقین مراد ہوں گے جنہوں نے اول دعوائے ایمان میں جھوٹ بولا، پھر ظاہرداری کی بھی پروا نہیں کی، جہاد کا نام سن کر گھروں میں بیٹھ رہے، بالکل بے باک و بے حیا ہو کر عذر کرنے بھی نہ آئے، اس تقدیر پر سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ دونوں جماعتوں کو شامل ہوگا اور معنی یہ ہوں گے کہ جو لوگ دونوں جماعتوں میں سے اپنے کفر پر اخیر تک قائم رہیں گے ان کیلئے عذاب دردناک ہے، جن کو توبہ کی توفیق ہو جائے گی وہ اس وعید کے نیچے داخل نہیں، اور اگر مُعَذِّرُوْن سے مراد منافقین ہوں گے اور سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ کی وعید صرف ان ہی کے حق میں ہوگی، پہلی جماعت کا ذکر گویا قبول عذر کے طور پر ہوگا۔

لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَآءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضٰى وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ مَا يُنْفِقُوْنَ حَرَجٌ

نہیں ہے ضعیفوں پر اور نہ مریضوں پر اور نہ ان لوگوں پر جن کے پاس نہیں ہے خرچ کرنے کو کچھ گناہ

اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۭ مَا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ مِنْ سَبِيْلٍ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿91﴾

جب کہ دل سے صاف ہوں اللہ اور اسکے رسول کے ساتھ، نہیں ہے نیکی والوں پر الزام کی کوئی راہ ۱؎ اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے ۲؎

خلاصہ تفسیر: پیچھے جھوٹے عذر والوں کا اور ان کے عذر کے غیر مقبول ہونے کا بیان تھا، اب آگے سچے عذر والوں کا اور ان کے عذر کا مقبول ہونا بیان فرماتے ہیں۔

کم طاقت لوگوں پر کوئی گناہ نہیں اور نہ بیماروں پر اور نہ ان لوگوں پر جن کو (سامان جہاد کی تیاری میں) خرچ کرنے کو میسر نہیں جبکہ یہ لوگ اللہ اور رسول کے ساتھ (اور احکام میں) خلوص رکھیں (اور دل سے اطاعت کرتے رہیں تو) ان نکوکاروں پر کسی قسم کا الزام (عائد) نہیں (کیونکہ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا) اور اللہ تعالیٰ بڑی مغفرت والے بڑی رحمت والے ہیں (کہ اگر یہ لوگ اپنے علم میں معذور ہوں اور اپنی طرف سے خلوص و اطاعت میں کوشش کریں اور واقع میں کچھ کمی رہ جائے تو معاف کر دیں گے)۔

لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَآءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضٰى: یعنی ضعیفوں اور بیماروں پر کوئی حرج اور گناہ نہیں، اس میں اس بات پر دلیل ہے کہ جو شخص کسی شرعی عذر کے سبب کسی عمل سے قاصر ہو مگر اس کی نیت یہ ہو کہ اگر مجھے قدرت حاصل ہوتی تو یہ عمل ضرور کرتا تو ایسا شخص عمل نہ کرسکنے کے باوجود اس عمل کی برکتوں سے محروم نہیں رہتا۔

* * *

فائدہ: ۱؎ جھوٹے عذر کرنے والوں کے بعد سچے معذورین کا بیان فرماتے ہیں، حاصل یہ ہے کہ عذر کبھی تو شخصی طور پر لازم ذات ہوتا ہے مثلاً بڑھاپے کی کمزوری جو عادۃً کسی طرح آدمی سے جدا نہیں ہوسکتی، اور کبھی عارضی ہوتا ہے، پھر عارضی یا بدنی ہے جیسے بیماری وغیرہ، یا مالی، جیسے افلاس و فقدان اسباب سفر، چونکہ غزوہ تبوک میں مجاہدین کو بہت دور دراز مسافت طے کر کے پہنچنا تھا، اس لیے سواری نہ ہونے کا عذر بھی معتبر و مقبول سمجھا گیا، جیسے آگے آتا ہے۔

فائدہ: ۲؎ یعنی جو لوگ واقعی معذور ہیں، اگر ان کے دل صاف ہوں اور خدا اور رسول کے ساتھ ٹھیک ٹھیک معاملہ رکھیں، مثلاً (خود نہ جاسکتے ہوں تو جانے والوں کی ہمتیں پست نہ کریں) بلکہ اپنے مقدور کے موافق نیکی کرنے اور اخلاص کا ثبوت دینے کے لیے مستعد رہیں، ان پر جہاد کی عدم شرکت سے کچھ الزام نہیں، ایسے مخلصین سے اگر بمقتضائے بشریت کوئی کوتاہی ہو جائے تو حق تعالیٰ کی بخشش و مہربانی سے توقع ہے کہ وہ درگزر فرمائے گا۔

وَّلَا عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا مَآ اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَآ اَجِدُ مَآ اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ

اور نہ ان لوگوں پر کہ جب تیرے پاس آئے تو انکو تو سواری دے تو نے کہا میرے پاس کوئی چیز نہیں کہ تم کو اس پر سوار کر دوں

تَوَلَّوْا وَّاَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا اَلَّا يَجِدُوْا مَا يُنْفِقُوْنَ ﴿۹۲﴾

تو الٹے پھرے اور ان کی آنکھوں سے بہتے تھے آنسو اس غم میں کہ نہیں پاتے وہ چیز جو خرچ کریں

خلاصہ تفسیر: اور نہ ان لوگوں پر (کوئی گناہ اور الزام ہے) کہ جس وقت وہ آپ کے پاس اس واسطے آتے ہیں کہ آپ ان کو کوئی سواری دے دیں اور آپ (ان سے) کہہ دیتے ہیں کہ میرے پاس تو کوئی چیز نہیں جس پر میں تم کو سوار کردوں تو وہ (ناکام) اس حالت سے واپس چلے جاتے ہیں کہ ان کی آنکھوں سے آنسو رواں ہوتے ہیں اس غم میں کہ (افسوس) ان کو (سامان جہاد کی تیاری میں) خرچ کرنے کو کچھ میسر نہیں (نہ خود کچھ پاس ہے اور نہ دوسری جگہ سے ملا، غرض ان مذکورہ معذور لوگوں پر کوئی مواخذہ نہیں)۔

* * *

فائدہ: سبحان اللہ! نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت نے صحابہ کے دلوں میں عشق الٰہی کا وہ نشہ پیدا کیا تھا جس کی مثال کسی قوم وملت کی تاریخ میں موجود نہیں، مستطیع اور مقدور والے صحابہ کو دیکھو تو جان ومال سب کچھ خدا کے راستہ میں لٹانے کو تیار ہیں اور سخت سے سخت قربانی کے وقت بڑے ولولہ اور اشتیاق سے آگے بڑھتے ہیں، جن کو مقدور نہیں وہ اس غم میں رو رو کر جان کھوئے لیتے ہیں کہ ہم میں اتنی استطاعت کیوں نہ ہوئی کہ اس محبوب حقیقی کی راہ میں قربان ہونے کے لیے اپنے کو پیش کرسکتے، حدیث صحیح میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجاہدین کو خطاب کرکے فرمایا کہ تم مدینہ میں ایک ایسی قوم کو اپنے پیچھے چھوڑ آئے ہو جو ہر قدم پر تمہارے اجر میں شریک ہے تم جو قدم خدا کے راستہ میں اٹھاتے ہو یا کوئی جنگل قطع کرتے ہو یا کسی پگڈنڈی پر چلتے ہو، وہ قوم برابر ہر موقع پر تمہارے ساتھ ساتھ ہے، یہ وہ لوگ ہیں جنہیں واقعی مجبوریوں نے تمہارے ہمراہ چلنے سے روکا، حسن کے "مرسل" میں ہے کہ یہ مضمون بیان فرما کر آپ نے یہی آیت: وَّلَا عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا مَاۤ اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَاۤ اَجِدُ (التوبہ:۹۲) تلاوت فرمائی۔

اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ وَهُمْ اَغْنِيَآءُ ۚ رَضُوْا بِاَنْ يَّكُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ ۙ

راہ الزام کی تو ان پر ہے جو رخصت مانگتے ہیں تجھ سے، اور وہ مال دار ہیں، خوش ہوئے اس بات سے کہ رہ جائیں ساتھ پیچھے رہنے والیوں کے

وَطَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۹۳﴾

اور مہر کردی اللہ نے ان کے دلوں پر سو وہ نہیں جانتے

خلاصہ تفسیر: بس الزام (اور مواخذہ) تو صرف ان لوگوں پر ہے جو باوجود اہل سامان (قوت) ہونے کے (گھر پر رہنے کی) اجازت چاہتے ہیں وہ لوگ (انتہائی بے حمیتی سے) خانہ نشیں عورتوں کے ساتھ رہنے پر راضی ہوگئے، اور اللہ نے ان کے دلوں پر مہر کردی جس سے وہ (گناہ وثواب کو) جانتے ہی نہیں۔

رَضُوْا بِاَنْ يَّكُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ: یہ مضمون پیچھے بھی آیا ہے، مگر وہاں مطلق جہاد کے متعلق ان کی اس حالت کا بیان تھا اور یہاں خاص غزوہ تبوک کی بابت ذکر ہے، پس تکرار نہ رہا۔

* * *

فائدہ: یعنی باوجود قدرت واستطاعت جہاد سے پہلو تہی کرتے ہیں اور نہایت بے حمیتی سے یہ عار گوارا کرتے ہیں کہ عورتوں کی طرح گھر میں چوڑیاں پہن کر بیٹھ جائیں، گناہ کی ممارست (پریکٹس) سے آدمی کا قلب ایسا مسخ اور سیاہ ہوجاتا ہے کہ اسے بھلے برے اور عیب وہنر کی تمیز بھی باقی نہیں رہتی، جب بے غیرتی کرتے کرتے کوئی شخص اس قدر پاگل ہوجائے کہ نادم ومتاسف ہونے کی جگہ پر الٹا نازاں اور خوش ہو تو سمجھ لو کہ اس کے دل پر خدائی مہر لگ چکی ہے، العیاذ باللہ!

يَعۡتَذِرُوۡنَ اِلَيۡكُمۡ اِذَا رَجَعۡتُمۡ اِلَيۡهِمۡ ؕ قُلۡ لَّا تَعۡتَذِرُوۡا لَنۡ نُّؤۡمِنَ لَكُمۡ قَدۡ نَبَّاَنَا اللّٰهُ

بہانے لائیں گے تمہارے پاس جب تم پھر کر جاؤ گے ان کی طرف، تو کہہ بہانے مت بناؤ ہم ہرگز نہ مانیں گے تمہاری بات ہم کو بتا چکا ہے اللہ

مِنۡ اَخۡبَارِكُمۡ ؕ وَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمۡ وَرَسُوۡلُهٗ ثُمَّ تُرَدُّوۡنَ اِلٰى عٰلِمِ الۡغَيۡبِ وَالشَّهَادَةِ

تمہارے احوال، اور ابھی دیکھے گا اللہ تمہارے کام اور اس کا رسول پھر تم لوٹائے جاؤ گے طرف اس جاننے والے چھپے اور کھلے کی

فَيُنَبِّئُكُمۡ بِمَا كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۹۴﴾

سو وہ بتائے گا تم کو جو تم کر رہے تھے

خلاصہ تفسیر: پیچھے ان منافقین کا ذکر تھا جنہوں نے تبوک روانگی کے وقت عذر تراشتے تھے، اب آگے ان کا ذکر ہے جنہوں نے واپسی کے وقت بہانے بنائے کہ ہم برابر ارادہ کرتے رہے مگر فلاں عوارض مانع ہو گئے، یہ اگلی آیات واپسی سے پہلے نازل ہوئیں جن میں ان کی بہانہ بازی کے متعلق پیشین گوئی ہے کہ یہ لوگ محض دنیاوی اغراض اور مخلوق کو راضی کرنے کے لیے بہانے بنائیں گے، خدا کو راضی کرنا انہیں مقصود نہیں۔

یہ لوگ تمہارے (سب کے) سامنے عذر پیش کریں گے جب تم ان کے پاس واپس جاؤ گے (سوائے محمد صلی اللہ علیہ وسلم!) آپ (سب کی طرف سے صاف) کہہ دیجئے کہ (بس رہنے دو) یہ عذر پیش مت کرو، ہم کبھی تم کو سچا نہ سمجھیں گے (کیونکہ) اللہ تعالیٰ ہم کو تمہاری (واقعی حالت کی) خبر دے چکے ہیں (کہ تم کو کوئی صحیح عذر نہ تھا) اور (خیر) آئندہ بھی اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول تمہاری کارگزاری دیکھ لیں گے (معلوم ہو جائے گا کہ تم اپنے دعویٰ کے مطابق کتنے مطیع اور مخلص ہو) پھر ایسے کے پاس لوٹائے جاؤ گے جو پوشیدہ اور ظاہر سب کا جاننے والا ہے (جس سے تمہارا کوئی اعتقاد کوئی عمل پوشیدہ نہیں) پھر وہ تم کو بتا دے گا جو کچھ تم کرتے تھے (اور اس کا بدلہ دے گا)۔

* * *

فائدہ: یعنی جیسے تبوک کی طرف روانہ ہونے کے وقت منافقین نے طرح طرح کے حیلے بنائے، جب تم مدینہ واپس آؤ گے، اس وقت بھی یہ لوگ اعذار باطلہ پیش کر کے تم کو مطمئن بنانا چاہیں گے اور قسمیں کھائیں گے کہ حضرت ہمارا قصد مصمم تھا کہ آپ کے ساتھ چلیں، مگر فلاں فلاں موانع و عوائق پیش آ جانے کی وجہ سے مجبور رہے، آپ کہہ دیجئے کہ جھوٹی باتیں بنانے سے کچھ فائدہ نہیں، تمہارے سب اعذار لغو اور بیکار ہیں، ہم کو حق تعالیٰ تمہارے کذب و نفاق پر مطلع کر چکا، پھر کس طرح ہم تمہاری لغو بات کو باور کر سکتے ہیں، اب پچھلے قصہ کو چھوڑو، آئندہ تمہارا طرز عمل دیکھا جائے گا کہ اپنے دعوے کو کہاں تک نباہتے ہو، سب جھوٹ سچ ظاہر ہو کر رہے گا اور بہرحال اس "عالم الغیب والشہادۃ" سے تو کوئی راز اور عمل یا نیت پوشیدہ نہیں رہ سکتی اس کے یہاں سب کو جانا ہے، وہ جزاء دینے کے وقت تمہارا ہر چھوٹا بڑا، ظاہری و باطنی عمل کھول کر رکھ دے گا اور اسی کے موافق بدلہ دیا جائے گا۔

سَيَحۡلِفُوۡنَ بِاللّٰهِ لَكُمۡ اِذَا انۡقَلَبۡتُمۡ اِلَيۡهِمۡ لِتُعۡرِضُوۡا عَنۡهُمۡ ؕ فَاَعۡرِضُوۡا عَنۡهُمۡ ؕ

اب قسمیں کھائیں گے اللہ کی تمہارے سامنے جب تم پھر کر جاؤ گے ان کی طرف تا کہ تم ان سے درگزر کرو، تو سو تم درگزر کرو ان سے

اِنَّهُمۡ رِجۡسٌ ۡ وَّمَاۡوٰىهُمۡ جَهَنَّمُ ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوۡا يَكۡسِبُوۡنَ ﴿۹۵﴾

بیشک وہ لوگ پلید ہیں اور ان کا ٹھکانا دوزخ ہے، بدلہ ان کے کاموں کا

خلاصہ تفسیر: ہاں! وہ اب تمہارے سامنے اللہ کی قسمیں کھا جائیں گے (کہ ہم معذور تھے) جب تم ان کے پاس واپس جاؤ گے تا کہ تم ان کو ان کی حالت پر چھوڑ دو (اور ملامت وغیرہ کرو) سو تم (ان کا مطلب پورا کر دو اور) ان کو ان کی حالت پر چھوڑ دو (اس فانی غرض کے

حاصل ہونے سے ان کا کچھ بھلا نہ ہوگا، کیونکہ) وہ لوگ بالکل گندے ہیں اور (اخیر میں) ان کا ٹھکانا دوزخ ہے ان کاموں کے بدلہ میں جو کچھ وہ (نفاق ومخالفت وغیرہ) کیا کرتے تھے (اس کا بھی یہی تقاضا ہے کہ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے، کیونکہ باز پرس سے اصلاح مقصود ہوتی ہے اور ان کی خباثت کی وجہ سے اس کی امید نہیں)۔

* * *

فائدہ: تبوک سے واپسی کے بعد منافقین جھوٹی قسمیں کھا کر جو عذر پیش کرتے تھے اس کی غرض یہ تھی کہ پیغمبر ﷺ اور مسلمانوں کو اپنی قسموں اور ملمع سازیوں سے راضی ومطمئن کردیں تاکہ بارگاہ رسالت سے ان پر کوئی عتاب وملامت اور داروگیر نہ ہو، سابق کی طرح یوں ہی معاملہ ابہام میں رہے، مسلمان ان سے کچھ تعرض نہ کریں، حق تعالیٰ نے فرمایا کہ بہتر ہے تم ان سے تعرض مت کرو، لیکن یہ اغماض وتغافل (تعرض نہ کرنا) راضی و مطمئن ہونے کی بناء پر نہیں، بلکہ ان کے نہایت پلید اور شریر ہونے کی وجہ سے ہے، یہ لوگ اس قدر گندے واقع ہوئے ہیں کہ ان کے پاک وصاف ہونے کی کوئی توقع نہیں رہی، لہٰذا اس غلاظت کی پوٹ کو دور پھینک دینا اور اس سے علیحدہ رہنا ہی بہتر ہے خدا خود ان کو ٹھکانے لگا دے گا۔

يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ لِتَرْضَوْا عَنْهُمْ ۚ فَاِنْ تَرْضَوْا عَنْهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَرْضٰى عَنِ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ﴿٩٦﴾

وہ لوگ قسمیں کھائیں گے تمہارے سامنے تاکہ تم ان سے راضی ہو جاؤ، سو اگر تم راضی ہو گئے ان سے تو اللہ راضی نہیں ہوتا نافرمان لوگوں سے

خلاصہ تفسیر: (اور نیز) یہ اس لئے قسمیں کھائیں گے کہ تم ان سے راضی ہو جاؤ، سو (اول تو تم دشمنان خدا سے راضی ہی کیوں ہونے لگے، لیکن بالفرض) اگر تم ان سے راضی بھی ہو جاؤ تو (ان کو کیا نفع، کیونکہ) اللہ تعالیٰ تو ایسے شریر لوگوں سے راضی نہیں ہوتا (اور خالق کی رضا کے بغیر مخلوق کی رضا بے فائدہ ہے)۔

مذکورہ دو آیتوں میں عذر پیش کرنے اور قسم کھانے میں منافقین کی دو غرضیں بیان فرمائیں: ① وہ یہ چاہتے ہیں کہ ان سے اعراض کیا جائے، انہیں ان کی پہلی حالت پر چھوڑ دیا جائے ② رضا یعنی مسلمان ان سے خوش ہو جائیں، سو ان کے جمع ہونے کی صورت یہ ہے کہ بعض کی غرض اعراض ہوگی اور بعض کی رضا، یا سب کی غرض یہ ہو کہ ظاہر میں ہی پہلی حالت پر چھوڑ دیا جائے اور دل سے راضی ہو جائیں، یا اصلی غرض رضامندی ہوگی اور اخیر درجہ یہ کہ ان سے اعراض ہی کیا جائے اور بات ختم ہو جائے، چنانچہ مسلمانوں کو ان کے متعلق تین حکم ہوئے: ① ایک **لا تعتذروا** یعنی ان سے صاف کہہ دیا جائے کہ بہانے مت کرو ② دوسرا **اعرضوا** کہ ان کو پہلی حالت ہی پر چھوڑ دو ③ تیسرا راضی نہ ہونا جو کہ **فان ترضوا** سے سمجھ میں آتا ہے، ان تینوں احکام کے جمع ہونے کی صورت یہ ہے کہ دل سے تو راضی نہ ہو، اور زبان سے پہلے یہ کہہ دو کہ تم بہانے مت کرو، ہم تم کو سچا نہ سمجھیں گے اور اس کے بعد اعراض کیا جائے، اور یہی مطلب ہو سکتا اس حدیث کا: "قبل علانيتهم وكل سرائرهم إلى الله" کہ حضور ﷺ نے ان کی ظاہری باتیں قبول کرلیں اور باطن کا حال خدا پر چھوڑ دیا، کہ آپ نے اول یہ کہہ دیا کہ تم بہانے مت کرو، پھر ایسا کیا جو کہ اعراض کا حاصل ہے۔

* * *

فائدہ: بڑی کوشش یہ ہے کہ مکروفریب اور کذب ودروغ سے مسلمانوں کو خوش کرلیں، فرض کیجئے اگر چکنی چپڑی باتوں سے مخلوق راضی ہو جائے تو کیا نفع پہنچ سکتا ہے جب کہ خدا ان سے راضی نہ ہو، خدا کے آگے تو کوئی چالاکی اور دغابازی نہیں چل سکتی، گویا متنبہ فرمادیا کہ جس قوم سے خدا راضی نہ ہو، کوئی مومن قانت کیسے راضی ہو سکتا ہے، لہٰذا جھوٹی باتوں سے پیغمبر اور ان کے ساتھیوں کو خوش کر لینے کا خبط انہیں دماغوں سے نکال دینا چاہیے، اگر ان کے ساتھ تغافل واعراض کا معاملہ کیا گیا ہے تو یہ اس کی دلیل نہیں کہ مسلمان ان سے خوش اور مطمئن ہیں، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں: "جس شخص کا حال معلوم ہو کہ منافق ہے اس کی طرف سے تغافل روا ہے لیکن دوستی اور محبت ویگانگت روا نہیں"۔

ٱلۡأَعۡرَابُ أَشَدُّ كُفۡرًا وَنِفَاقًا وَأَجۡدَرُ أَلَّا يَعۡلَمُواْ حُدُودَ مَآ أَنزَلَ ٱللَّهُ عَلَىٰ رَسُولِهِۦۗ

گنوار (دیہاتی) بہت سخت ہیں کفر میں اور نفاق میں اور اسی لائق ہیں کہ نہ سیکھیں وہ قاعدے جو نازل کیے اللہ نے اپنے رسول پر لے

وَٱللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿٩٧﴾

اور اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے ۲۔

خلاصہ تفسیر: پیچھے رکوع کے شروع میں دیہاتی منافقین کا ذکر تھا، اب آگے بھی ان کی مذمت بیان کی جاتی ہے اور ان کے ساتھ اہل دیہات میں جو سچے مخلص مؤمن تھے ان کی مدح ہے۔

(ان منافقین میں جو) دیہاتی (ہیں وہ) لوگ (سخت مزاجی کی وجہ سے) کفر اور نفاق میں بہت ہی سخت ہیں اور (علماء وعقلاء سے دور ہونے کی وجہ سے) ان کو ایسا ہونا ہی چاہئے کہ ان کو ان احکام کا علم نہ ہو جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول پر نازل فرمائے ہیں (کیونکہ جب جاننے والوں سے دور دور رہیں گے تو ان کا جاہل رہنا تو اس کا لازمی نتیجہ ہے، اور اسی وجہ سے ان کے مزاج میں سختی ہے اور ان تمام باتوں سے کفر ونفاق میں شدت ہوگی) اور اللہ تعالیٰ بڑے علم والے بڑی حکمت والے ہیں (وہ ان سب امور پر اطلاع رکھتے ہیں اور حکمت سے مناسب سزا دیں گے)۔

ٱلۡأَعۡرَابُ أَشَدُّ كُفۡرًا وَنِفَاقًا: اس میں اشارہ ہے کہ صالحین اور نیک لوگوں کی صحبت سے دور ہونے کی وجہ سے خیر کے ساتھ مناسبت میں کمی ہو جاتی ہے، اسی لیے اللہ والے نیک صحبت کا بہت اہتمام کرتے ہیں۔

یہاں یہ شبہ ہوتا ہے کہ علماء سے دور رہنا اور سخت مزاج ہونا یہ صفات تو مسلمان دیہاتیوں میں بھی ہوں گی؟ خلاصہ تفسیر کی تقریر سے ظاہر ہو گیا کہ مسلمان دیہاتی خود علماء کے پاس آتے رہتے ہیں اس سے علم حاصل ہوتا ہے اور علم سے خشوع اور عاجزی پیدا ہو کر ایمان کامل ہو جاتا ہے۔

* * *

فائدہ: لے یہاں تک مدینہ کے منافقین اور مومنین مخلصین کے احوال بیان ہوئے تھے، اب کچھ حال دیہاتی بدوؤں کا ذکر کرتے ہیں کہ ان میں بھی کئی طرح کے آدمی ہیں، کفار، منافقین اور مخلص مسلمان چونکہ دیہاتی لوگ قدرتی طور پر عموماً تندخو اور سخت مزاج ہوتے ہیں (جیسا کہ حدیث میں ہے: من سكن البادية جفا) اور مجالس علم وحکمت سے دور رہنے کی وجہ سے تہذیب وشائستگی کا اثر اور علم وعرفان کی روشنی بہت کم قبول کرتے ہیں، ان کا کفر ونفاق شہری کفار ومنافقین سے زیادہ سخت ہوتا ہے، ان کو ایسے مواقع دستیاب نہیں ہوتے کہ اہل علم وصلاح کی صحبت میں رہ کر دیانت و تہذیب کے وہ قانون اور قاعدے معلوم کریں جو خدا تعالیٰ نے پیغمبر ﷺ پر نازل کیے، علم ومعرفت ہی وہ چیز ہے جو انسان کے دل کو نرم کرتی اور مہذب بناتی ہے، جو لوگ اس قدر جہالت میں غرق ہیں، ضرور ہے کہ ان کے دل سخت ہوں اور کفر ونفاق کے جس راستہ پر پڑ جائیں، بہائم اور درندوں کی طرح اندھا دھند بڑھے چلے جائیں، اعراب کی سنگدلی کا ذکر متعدد احادیث میں ہے، ایک حدیث میں ہے کہ کسی اعرابی نے حضور سے عرض کیا کہ آپ لوگ اپنے بچوں کا پیار لیتے ہیں، خدا کی قسم میں نے کبھی اپنی اولاد کا پیار نہیں لیا، حضور ﷺ نے فرمایا کہ میں کیا کروں اگر خدا نے تیرے دل میں سے اپنی رحمت کو نکال لیا ہے۔

فائدہ: ۲ یعنی اس کا علم بنی آدم کے تمام طبقات پر محیط ہے، وہ اپنی حکمت سے ہر ایک طبقہ کے ساتھ اس کی استعداد وقابلیت کے موافق معاملہ کرتا ہے، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ: ''اعراب کی طبیعت میں بے حکمی، غرض پرستی، اور جہالت شدید ہوتی ہے، سو اللہ حکمت والا ہے ان سے وہ مشکل کام بھی نہیں چاہتا اور درجے بلند بھی نہیں دیتا''۔

وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يَّتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ مَغْرَمًا وَّيَتَرَبَّصُ بِكُمُ الدَّوَآئِرَ ؕ عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ

اور بعضے گنوار ایسے ہیں کہ شمار کرتے ہیں اپنے خرچ کرنے کو تاوان اور انتظار کرتے ہیں تم پر زمانہ کی گردشوں کا، ان ہی پر آئے گردش

السَّوْءِ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۹۸﴾

بری، اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے

خلاصہ تفسیر: اور ان (مذکورہ منافقین) دیہاتیوں میں سے بعض ایسا ہے کہ (کفر، نفاق اور جہل کے علاوہ بخل و عداوت کے ساتھ بھی موصوف ہے، حتی کہ) جو کچھ (جہاد و زکوۃ وغیرہ کے مواقع میں مسلمانوں کی شرما شرمی) خرچ کرتا ہے اس کو (مثل) جرمانہ سمجھتا ہے (یہ تو بخل ہوا) اور (عداوت یہ ہے کہ) تم مسلمانوں کے واسطے (زمانہ کی) گردشوں کا منتظر رہتا ہے (کہ کہیں ان پر کوئی حادثہ پڑ جائے تو ان کا خاتمہ ہو، سو) برا وقت انہی (منافقین) پر پڑنے والا ہے (چنانچہ فتوحات کی کثرت ہوئی، کفار ذلیل ہوئے، منافقوں کی ساری حسرتیں دل ہی میں رہ گئیں، اور تمام عمر رنج اور خوف میں کٹی) اور اللہ تعالیٰ (ان کے کفر و نفاق کی باتیں) سنتے ہیں (اور ان کے دلی خیالات یعنی انفاق کو جرمانہ سمجھنا اور مسلمانوں کے حق میں گردش زمانہ کا منتظر رہنا کو) جانتے ہیں (پس ان سب کی سزا دیں گے)۔

مَنْ يَّتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ مَغْرَمًا: یعنی جو کچھ خرچ کرتا ہے اس کو جرمانہ سمجھتا ہے، اس پر یہ شبہ نہ کیا جائے کہ دلی رضامندی کے بغیر کسی کا مال لینا حلال نہیں اور جرمانہ سمجھنا تو دلی رضامندی کے خلاف ہے، پھر منافقوں کا ایسا مال کیوں لیا جاتا تھا؟ جواب یہ ہے کہ اول تو یہ تسلیم نہیں کہ ایسا مال لیا جاتا تھا، چنانچہ روح المعانی میں آیت: انفقوا طوعا او کرھا لن یتقبل منکم کی تفسیر میں ایک قول نقل کیا ہے کہ قبول نہ کرنے سے مراد یہ ہے کہ ان کے صدقہ کا مال نہیں لیا جائے گا، دوسرے وہ لوگ تقیہ کے طور پر مصلحت کی وجہ سے ایسے مواقع میں خرچ کیا کرتے تھے جس کے منافع طبعی طور پر ان کو مطلوب و مرغوب تھے اگرچہ اس کو جرمانہ سمجھتے تھے کیونکہ وہ ثواب کا عقیدہ تو نہ رکھتے تھے، پس ان کا خرچ کرنا طبعی اور دلی رضامندی سے تھا جیسا کہ بعض لوگ زیادہ فخر کے لیے خوشی سے خرچ کرتے ہیں اور ثواب کی نیت نہیں ہوتی تو اس صورت میں دینے والے کی ریاکاری سے لینے والے کو اس مال کا لینا حرام نہیں ہوتا، تیسرے یہ بھی ممکن ہے کہ منافقین اپنے طور پر خرچ کرتے ہوں اور لینے والے کو ان کی کراہت اور ناگواری کی خبر نہ ہوتی ہو۔

وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يَّتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ مَغْرَمًا: یعنی دیہاتیوں میں ایسا بھی ہے کہ جو کچھ خرچ کرتا ہے اس کو جرمانہ سمجھتا ہے، روح المعانی میں ہے کہ جو شخص اپنی دولت کا خود کو مالک خیال کرتا ہے اسے خرچ کرنا یقیناً گراں ہوگا، اور جو کوئی اللہ کو مالک سمجھے گا اور اپنے پاس چیزوں کو عاریت سمجھے گا اسے اللہ کی راہ میں خرچ کرنا غنیمت معلوم ہوتا ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی اعراب منافقین میں وہ لوگ بھی ہیں جنہیں اگر کسی وقت خدا کے راستہ میں کچھ خرچ کرنا پڑ جاتا ہے تو ایسی کراہیت سے خرچ کرتے ہیں جیسے کوئی جرمانہ اور تاوان ادا کرتا ہو، وہ ابھی تک اس کے منتظر ہیں کہ مسلمان حوادث دہر سے کسی گردش اور آفت میں پھنس جائیں تو ہم خوب شادیانے بجائیں، یہ خبر نہیں کہ انہیں کی قسمت گردش میں آرہی ہے، اسلام تو غالب و فائق ہو کر رہے گا اور یہ منافقین سخت ذلیل و رسوا ہوں گے، خدا ہر ایک کی باتیں اور دعائیں سنتا ہے اور جانتا ہے کہ کون عزت و کامیابی کا اہل ہے اور کون لوگ ذلت اور رسوائی کے مستحق ہیں۔

وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ قُرُبٰتٍ عِنْدَ اللّٰهِ وَصَلَوٰتِ

اور بعضے گنوار وہ ہیں کہ ایمان لاتے ہیں اللہ پر اور قیامت کے دن پر اور شمار کرتے ہیں اپنے خرچ کرنے کو نزدیک ہونا اللہ سے اور دعا لینی

الرَّسُوْلِ ؕ اَلَاۤ اِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ ؕ سَيُدْخِلُهُمُ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۹۹﴾ ع

رسول کی، سنتا ہے وہ ان کے حق میں نزدیکی ہے، داخل کرے گا ان کو اللہ اپنی رحمت میں، بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ہے

خلاصہ تفسیر: اور بعضے اہل دیہات میں ایسے بھی ہیں جو اللہ پر اور قیامت کے دن پر (پورا پورا) ایمان رکھتے ہیں، اور جو کچھ (نیک کاموں میں) خرچ کرتے ہیں اس کو عند اللہ قرب حاصل ہونے کا ذریعہ اور رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی دعا (لینے) کا ذریعہ بناتے ہیں (کیونکہ آپ کی عادت شریفہ تھی کہ ایسے موقع پر خرچ کرنے والے کو دعا دیتے تھے جیسا کہ احادیث میں ہے) یاد رکھو! کہ ان کا یہ خرچ کرنا بیشک ان لوگوں کے لئے موجب قربت (عند اللہ) ہے (اور دعا کا ہونا تو یہ خود دیکھ سن لیتے ہیں، اس کی خبر دینے کی ضرورت نہ تھی اور وہ قرب یہ ہے کہ) ضرور ان کو اللہ تعالیٰ اپنی (خاص) رحمت میں داخل کرلیں گے (کیونکہ) اللہ تعالیٰ بڑی مغفرت والے رحمت والے ہیں (پس ان کی لغزشیں معاف کر کے اپنی رحمت میں لے لیں گے)۔

* * *

فائدہ: یہاں قرآن کریم کی معجزانہ تاثیر اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کا حیرت انگیز کرشمہ دکھلایا ہے کہ ان ہی درشت مزاج، سنگدل، تندخو گنواروں میں جو کفر و نفاق اور جہل وطغیان کی وجہ سے اس لائق ہی نہ تھے کہ خدا کے بتلائے ہوئے ادب اور قاعدے سمجھ سکیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم اور قرآن کریم کی آواز نے ایسے عارف اور مخلص افراد پیدا کر دیے جو مبداومعاد سب چیزوں پر ایمان رکھتے ہیں اور خدا کی راہ میں جو کچھ خرچ کرتے ہیں، خالص قرب الٰہی حاصل کرنے اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا لینے کی غرض سے کرتے ہیں، حق تعالیٰ نے ان کو بشارت دی کہ بیشک وہ اپنی امیدوں میں حق بجانب ہیں، یقیناً ان کو وہ چیز مل کر رہے گی جس کی نیت کی ہے (یعنی قرب الٰہی) اور خدا ضرور ان کو اپنی رحمت میں جگہ دے گا رہی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا اسے تو وہ اپنے کانوں سے سنتے اور آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ جب کوئی شخص صدقہ وغیرہ لے کر حاضر ہوتا ہے تو حضور اس کو دعائیں دیتے ہیں حضور کی اس دعا کا ثمرہ بھی وہ ہی رحمت و قرب الٰہی ہے جس کا وعدہ پہلے ہو چکا۔

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ ۙ

اور جو لوگ قدیم ہیں سب سے پہلی ہجرت کرنے والے اور مدد کرنے والے اور جو ان کے پیرو ہوئے نیکی کے ساتھ

رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَاۤ اَبَدًا ؕ

اللہ راضی ہوا اُن سے اور وہ راضی ہوئے اس سے اور تیار کر رکھے ہیں واسطے انکے باغ کہ بہتی ہیں نیچے انکے نہریں رہا کریں انہی میں ہمیشہ

ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۰۰﴾

یہی ہے بڑی کامیابی

خلاصہ تفسیر: پیچھے دیہاتی مخلص مسلمانوں کا ذکر تھا، آگے تمام مسلمانوں کا ذکر ہے اور ان کے درجات فضیلت کا بیان ہے جن میں بڑے درجہ والوں کو چھوٹے درجہ والوں سے مقدم کیا گیا ہے۔

اور جو مہاجرین اور انصار (ایمان لانے میں سب امت سے) سابق اور مقدم ہیں، اور (بقیہ امت میں) جتنے لوگ اخلاص کے ساتھ (ایمان لانے میں) ان کے پیرو ہیں اللہ ان سب سے راضی ہوا (کہ ان کا ایمان قبول فرمایا جس پر ان کو ثواب ملے گا) اور وہ سب اللہ سے راضی ہوئے (کہ اس کی اطاعت اختیار کی، جس کے ثواب سے یہ رضامندی اور زیادہ ہوگی) اور اللہ نے ان کے لئے ایسے باغ تیار کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، جن میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے (اور) یہ بڑی کامیابی ہے۔

والسابقون الاولون: اس میں سب مہاجر وانصار آ گئے اور **الذین اتبعوهم** میں بقیہ تمام مومنین جن میں اول درجہ تو ان کا ہے جو صحابہ ہیں اگرچہ مہاجر وانصار نہیں، کیونکہ اخیر میں ہجرت فرض نہ رہی تھی، مسلمان ہو کر اپنے اپنے وطن میں رہنے کی اجازت تھی، دوسرا درجہ ان لوگوں کا ہے جنہوں نے صحابہ کو دیکھا، انہیں "تابعین" کہتے ہیں، اس کے بعد ان لوگوں کا درجہ ہے جو صحابی اور تابعی نہیں ہیں، مگر ان میں بھی تبع تابعین کو دوسروں پر فضیلت حاصل ہے، جیسا کہ صحابہ میں مہاجر اور انصار کو دوسرے صحابہ پر فضیلت ہے، کیونکہ باقی لوگ قدرت کے باوجود مہاجرین اور انصار سے پیچھے رہے، اور صحابہ کی فضیلت تمام امت پر اس لیے ہے کہ انہوں نے حضور ﷺ کو دیکھا ہے اور سب سے پہلے اسلام قبول کیا اور اس کی اشاعت کر کے: "من سنة حسنة فله اجرها" الخ اور "الدال على الخير كفاعله" کے مصداق بنے ہیں کہ جو کوئی اچھا طریقہ اختیار کرے تو اس کو خود اپنے فعل کا ثواب ملتا ہے اور اس کی وجہ سے جتنے لوگ اس طریقہ کو اختیار کریں گے ان کے اعمال کا بھی ثواب ملتا ہے۔

محمد بن کعب قرظی سے کسی نے دریافت کیا کہ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں؟ انہوں نے کہا کہ صحابہ کرام سب کے سب جنت میں ہیں اگرچہ وہ لوگ ہوں جن سے دنیا میں غلطیاں اور گناہ بھی ہوئے ہیں، اس شخص نے دریافت کیا کہ یہ بات آپ نے کہاں سے کہی؟ (اس کی کیا دلیل ہے؟) انہوں نے فرمایا کہ قرآن کریم کی یہ آیت پڑھو: السّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ اس میں تمام صحابہ کرام کے متعلق بلا کسی شرط کے **رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ** ارشاد فرمایا ہے، البتہ تابعین کے معاملہ میں اتباع باحسان کی شرط لگائی گئی ہے، جس سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرام بلا کسی قید وشرط کے سب کے سب بلا استثناء رضوان الٰہی سے سرفراز ہیں۔

* * *

فائدہ: "اعراب مومنین" کے بعد مناسب معلوم ہوا کہ زعماء واعیان مومنین کا کچھ ذکر کیا جائے یعنی جن مہاجرین نے ہجرت میں سبقت و اولیت کا شرف حاصل کیا، اور جن انصار نے نصرت واعانت میں پہل کی، غرض جن لوگوں نے قبول حق اور خدمت اسلام میں جس قدر آگے بڑھ بڑھ کر حصے لیے، پھر جو لوگ نیکوکاری اور حسن نیت سے ان پیش روان اسلام کی پیروی کرتے رہے، ان سب کو درجہ بدرجہ خدا کی خوشنودی اور حقیقی کامیابی حاصل ہو چکی، جیسے انہوں نے پوری خوش دلی اور انشراح قلب کے ساتھ حق تعالیٰ کے احکام تشریعی اور قضاء تکوینی کے سامنے گردنیں جھکا دیں، اسی طرح خدا نے ان کو اپنی رضا وخوشنودی کا پروانہ دے کر غیر محدود انعام واکرام سے سرفراز فرمایا۔

تنبیہ: مفسرین سلف کے اقوال اَلسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ کی تعیین میں مختلف ہیں:

① بعض نے کہا ہے کہ وہ مہاجرین وانصار مراد ہیں جو ہجرت سے پہلے مشرف بااسلام ہوئے۔

② بعض کے نزدیک وہ مراد ہیں جنہوں نے دونوں قبلوں (کعبہ وبیت المقدس) کی طرف نماز پڑھی۔

③ بعض کہتے ہیں کہ جنگ بدر تک کے مسلمان "سابقین اولین" ہیں۔

④ بعض حدیبیہ تک اسلام لانے والوں کو اس کا مصداق قرار دیتے ہیں۔

⑤ بعض مفسرین کی رائے ہے کہ تمام مہاجرین وانصار اطراف کے مسلمانوں اور پیچھے آنے والی نسلوں کے اعتبار سے "سابقین اولین" ہیں۔

ہمارے نزدیک ان اقوال میں چنداں تعارض نہیں "سبقت" و "اولیت" اضافی چیزیں ہیں، ایک ہی شخص یا جماعت کسی کے اعتبار سے سابق اور دوسرے کی نسبت سے لاحق بن سکتی ہے، جیسا کہ ہم نے "فائدہ" میں اشارہ کیا ہے جو شخص یا جماعت جس درجہ میں سابق واول ہوگی اسی قدر رضائے الٰہی اور حقیقی کامیابی سے حصہ پائے گی، کیونکہ سبقت واولیت کی طرح رضاء وکامیابی کے بھی مدارج بہت سے ہو سکتے ہیں، واللہ اعلم۔

وَمِمَّنْ حَوْلَكُمْ مِّنَ الْأَعْرَابِ مُنٰفِقُوْنَ ۛ وَمِنْ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ ۛ مَرَدُوْا عَلَى النِّفَاقِ

اور بعضے تمہارے گرد کے گنوار منافق ہیں، اور بعضے لوگ مدینہ والے اڑ رہے ہیں نفاق پر

لَا تَعْلَمُهُمْ ۭ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ ۭ سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ ثُمَّ يُرَدُّوْنَ اِلٰى عَذَابٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۰۱﴾

تو ان کو نہیں جانتا، ہم کو وہ معلوم ہیں ۱؎ ان کو ہم عذاب دیں گے دوبارہ پھر وہ لوٹائے جائیں گے بڑے عذاب کی طرف ۲؎

خلاصہ تفسیر: پیچھے بہت سی آیتوں میں ان منافقین کا ذکر آیا تھا جن کا منافق ہونا ان کے افعال واقوال سے معلوم ہوگیا تھا، اب آگے ان منافقوں کا ذکر ہے جن کا منافق ہونا خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی معلوم نہ تھا۔

اور کچھ تمہارے گردو پیش والوں میں اور کچھ مدینہ والوں میں ایسے منافق ہیں کہ نفاق کی حد کمال پر (ایسے) پہنچے ہوئے ہیں (کہ) آپ (بھی) ان کو نہیں جانتے (کہ یہ منافق ہیں، بس) ان کو ہم ہی جانتے ہیں، ہم ان کو (دوسرے منافقین کی نسبت آخرت سے پہلے بھی دنیا میں) دوہری سزا دیں گے (ایک نفاق کی دوسرے کمال نفاق کی اور) پھر (آخرت میں بھی) وہ بڑے بھاری عذاب (یعنی دائمی خلود کے ساتھ جہنم) کی طرف بھیجے جائیں گے۔

لَا تَعْلَمُهُمْ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ: یعنی آپ ان کو نہیں جانتے، ان کو ہم جانتے ہیں، اس آیت سے اس پر استدلال کیا گیا ہے کہ مخفی یعنی چھپے ہوئے امور مثلاً دل کے احوال وغیرہ پر مطلع ہونے کا دعویٰ کرنا غلط ہے، مخلوق میں سے کوئی بھی علم غیب کے ساتھ متصف نہیں ہوسکتا، کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی صفت ہے، جس کی دلیل یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ذکاوت وفطانت میں تمام جہاں سے اکمل ہیں، مگر ان کو بھی بعض منافقین کا پتہ نہ چل سکا، جس پر مذکورہ آیت دلالت کررہی ہے، چنانچہ اس قسم کی آیتیں ان لوگوں کے خلاف قوی دلیل ہیں جو کشف وغیرہ کے ذریعے دل کے احوال جاننے کا دعویٰ کرتے ہیں، یہ دعویٰ انتہائی نامناسب ہے، نیز اس آیت سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عالم الغیب نہ ہونے کی صریح وضاحت ملتی ہے۔

سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ: ان کو دوہری سزا اس لیے ہے کہ یہ نفاق کی صفت میں ایسے بڑھے ہوئے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو کہ ذکاوت اور فطانت میں تمام جہاں سے زیادہ ہیں مگر اس کے باوجود انہوں نے آپ کو بھی پتہ نہ ہونے دیا، اور آخرت سے پہلے دنیا میں تو ان کو دوسرے منافقوں سے دوگنا عذاب اس طرح ہوسکتا ہے کہ ان کو اپنے نفاق کے چھپانے کی فکر ان لوگوں سے زیادہ تھی جن کا پتہ لگ چکا تھا اور قبر میں بھی ان کو دوسروں سے دوگنا عذاب ہے اور قبر بھی آخرت سے پہلے ہے۔

* * *

فائدہ: ۱؎ پہلے سے دیہاتی عربوں کا ذکر چلا آرہا تھا، درمیان میں اعراب مومنین کے تذکرہ سے مہاجرین وانصار کی طرف کلام منتقل ہوگیا، اب اس آیت میں خاص مدینہ اور اس کے آس پاس رہنے والوں کا بیان ہے، یعنی بعض اہل مدینہ اور گردو پیش کے رہنے والے نفاق کے خوگر ہوچکے اور اسی پر اڑے ہوئے ہیں، لیکن یہ نفاق اس قدر عریق وعمیق ہے کہ ان کے قرب مکانی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کمال فطانت وفراست کے باوجود آپ بھی بالتعیین اور قطعی طور پر محض علامات وقرائن سے ان کے نفاق پر مطلع نہیں ہوسکے ان کا ٹھیک ٹھیک تعین صرف خدا کے علم میں ہے، جس طرح عام منافقین کا پتہ چہرہ لب ولہجہ اور بات چیت سے لگ جاتا تھا: وَلَوْ نَشَآءُ لَاَرَيْنٰكَهُمْ فَلَعَرَفْتَهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ۭ وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِيْ لَحْنِ الْقَوْلِ (محمد: ۳۰) ان کا نفاق اتنا گہرا ہے کہ اس قسم کی ظاہری علامات ان کا پردہ فاش نہیں کرتیں۔

فائدہ: ۲؎ بڑا عذاب دوزخ کا ہے: اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ (النساء: ۱۴۵) اس سے قبل کم از کم دوبار ضرور عذاب میں مبتلا کیے جائیں گے، ایک عذاب قبر اور دوسرا وہ عذاب جو اس دنیاوی زندگی میں پہنچ کررہے گا، مثلاً ابن عباس کی ایک روایت کے موافق حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جمعہ کے روز منبر پر کھڑے ہوکر تقریباً چھتیس آدمیوں کو نام بنام پکار کر فرمایا: "اُخرج فانك منافق" یعنی تو منافق ہے مسجد سے نکل

جا، یہ رسوائی ایک قسم عذاب کی تھی، یا پہلے اس سورت میں گزرا کہ ان کے اموال و اولاد کو حق تعالیٰ نے ان کے حق میں عذاب بنا دیا: فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ ۭ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ (التوبہ: ۵۵) یا ان میں کے بعض بھوک وغیرہ آفات ارضی وسماوی میں مبتلا ہو کر ذلت کی موت مرے یا اسلام کی ترقی وعروج کو دیکھ کر غیظ کھانا اور دانت پیسنا، یہ بھی ان کے حق میں سوہان روح تھا، میرے نزدیک یہ سب قسم کے عذاب مَّرَّتَيْنِ کے احاطہ میں داخل ہیں، اور دو کا عدد یا تو مطلق تعدد کے لیے ہے جیسے ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ میں اور یا دو بار سے مراد نوعی اثنینیت ہے، یعنی ''عذاب قبر'' اور ''عذاب قبل الموت''، واللہ اعلم۔

وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا ۭ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ

اور بعضے لوگ ہیں اقرار کیا انہوں نے اپنے گناہوں کا ملایا انہوں نے ایک کام نیک اور دوسرا بد، قریب ہے کہ اللہ معاف کرے

عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۰۲﴾

ان کو، بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ہے

خلاصہ تفسیر: گزشتہ پارہ واعلموا میں نصف کے نزدیک غزوہ تبوک کے متعلق لوگوں کا کئی جماعتوں کی طرف تقسیم ہونا بیان کیا تھا، جن میں پیچھے اکثر آیات میں پانچویں جماعت یعنی منافقین کا زیادہ ذکر ہوا، اب آگے چوتھی جماعت یعنی ان مؤمنین کا ذکر ہے جو سستی سے پیچھے رہ گئے تھے، مگر بہانے نہیں تراشے، پھر ان میں بھی دو قسمیں ہوگئی تھیں، پہلی قسم وہ لوگ جنہوں نے جس وقت سنا کہ آپ ﷺ تشریف لے آئے تو اپنے آپ کو مسجد کے ستونوں سے باندھ لیا کہ اگر آپ کھولیں گے تو خیر ورنہ یوں ہی ختم ہو جائیں گے، یہاں انہی کا ذکر ہے، دوسری قسم کا ذکر آگے آئے گا۔

اور کچھ اور لوگ ہیں جو اپنی خطا کے مقر (معترف) ہو گئے جنہوں نے ملے جلے عمل کئے تھے کچھ بھلے (جیسے اپنے قصور کا اعتراف کیا جس کا منشا ندامت ہے اور یہی توبہ ہے، اور پہلے غزوات میں بھی یہ لوگ شریک ہو چکے تھے، غرض یہ کام تو اچھے کیے) اور کچھ برے (عمل کئے، جیسے بلا عذر غزوہ تبوک میں پیچھے رہ جانا، سو) اللہ سے امید (یعنی ان کا وعدہ) ہے کہ ان (کے حال) پر (رحمت کے ساتھ) توجہ فرمائیں (یعنی توبہ قبول کرلیں) بلا شبہ اللہ تعالیٰ بڑی مغفرت والے بڑی رحمت والے ہیں۔

وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ: یہ وہ لوگ تھے جن میں گناہ کا ملکہ راسخ نہ تھا اور ان میں نور استعداد باقی تھا، اسی وجہ سے ان کی طبیعتیں نرم ہوگئیں، اور ان کی شان یہ تھی کہ: خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا جس کی وجہ یہ تھی کہ یہ لوگ نفس لوامہ کے مرتبہ میں تھے جو کبھی نفس مطمئنہ کا پابند ہو کر نیک اعمال کرنے لگتا ہے اور کبھی اس سے بھاگنے لگتا ہے۔

قرآن حکیم نے نفس انسانی کی تین قسمیں بیان کی ہیں: ① نفس امارہ یعنی برائی کا تقاضا کرنے والا نفس، یہ نفس سرکشوں، باغیوں اور مجرموں کا ہوا کرتا ہے ② نفس لوامہ یعنی ملامت وندامت کا تقاضا کرنے والا نفس، غفلت یا شامت سے کوئی لغزش ہوگئی تو توبہ وندامت کا تقاضا کرتا ہے، یہ نفس مؤمنین صالحین کا ہوا کرتا ہے ③ نفس مطمئنہ یعنی محفوظ اور پرسکون نفس، یہ نہ وسوسوں سے متزلزل ہوتا ہے، نہ نفسانی تحریکات سے منتشر ہوتا ہے، ایسا نفس انبیاء کرام اور خاصان خدا کے ساتھ مخصوص ہے، واضح رہے کہ آخری دو یعنی نفس لوامہ اور نفس مطمئنہ اللہ کی بڑی نعمتوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔

دوسری بات یہ کہ جب جہاد فرض کفایہ ہے تو جو لوگ سستی سے نہ گئے ان کو گناہ کیوں ہوا؟ کیونکہ فرض کفایہ تو بعض کے بجالانے سے سب کے اوپر سے اتر جاتا ہے؟ جواب یہ ہے کہ جہاد فی نفسہ فرض کفایہ ہے، مگر جب آپ نے سب کو چلنے کا حکم فرمایا تو اب فرض عین ہو گیا تھا جس کا بجالانا ہر شخص کو ضروری ہوتا ہے، اسی طرح جب کوئی خلیفہ اسلام عام حکم دے دے تو یہی حکم ہوگا۔

* * *

فائدہ: اہل مدینہ میں اگر ایک طرف یہ منافقین متمردین ہیں جو اپنی شرارتوں اور جرموں کو پردہ نفاق میں چھپاتے اور ان پر سختی سے

اڑے رہتے ہیں تو دوسری جانب بعض وہ مسلمان ہیں جن سے بمقتضائے بشریت کوئی خطا وقصور سرزد ہوجائے تو نادم ہوکر بے تامل اپنے گناہوں کا اقرار کرتے ہیں، ان کی بھلائی اور برائی مخلوط (رلی ملی) ہے، برائی تو مثلاً یہ کہ نفیر عام کے باوجود نبی کریم ﷺ کی دعوت پر ''غزوہ تبوک'' میں حاضر نہ ہوئے، بعدہٗ اس غیر حاضری پر دل سے پشیمان ومتاسف ہونا اور ظاہراً وباطناً توبہ کرنا اور دوسرے اعمال صالحہ (نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج یا دوسرے غزوات کی شرکت وغیرہ) بجالانا، یہ سب ان کی بھلائیوں کی فہرست میں داخل ہیں، ایسے حضرات کوحق تعالیٰ نے معافی کی امید دلائی ہے، مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ آیت حضرت ابولبابہ اور ان کے چند ہمراہیوں کے حق میں نازل ہوئی، جو محض کسل اور تن آسانی کی وجہ سے تبوک میں حاضر نہ ہوئے، لیکن جب تبوک سے حضرت ﷺ کی واپسی معلوم ہوئی تو غایت ندامت سے ان سب نے اپنے آپ کو مسجد کے ستونوں سے باندھ دیا اور قسم کھائی کہ جب تک نبی کریم ﷺ اپنے ان مجرموں اور قیدیوں کو معاف کر کے اپنے ہاتھ سے نہ کھولیں گے، اسی طرح بندھے کھڑے رہیں گے، آپ ﷺ نے یہ حال دیکھ کر فرمایا، واللہ جب تک خدا ان کے کھولنے کا حکم نہ دے میں ان کو نہیں کھول سکتا، آخر یہ آیات نازل ہوئیں تب آپ نے کھولا اور قبول توبہ کی بشارت دی، کہتے ہیں کہ یہ لوگ کھلنے کے بعد تکمیل توبہ کے طور پر کچھ مال لے کر حاضر ہوئے کہ خدا کی راہ میں تصدق کریں اس پر اگلی آیت نازل ہوئی:

خُذۡ مِنۡ اَمۡوَالِهِمۡ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمۡ وَتُزَكِّيۡهِمۡ بِهَا وَصَلِّ عَلَيۡهِمۡ ؕ اِنَّ صَلٰوتَكَ

لے ان کے مال میں سے زکوٰۃ لے کہ پاک کرے تو ان کو اور بابرکت کرے تو ان کو اس کی وجہ سے اور دعا دے ان کو، بیشک تیری دعا

سَكَنٌ لَّهُمۡ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيۡعٌ عَلِيۡمٌ ﴿۱۰۳﴾

ان کے لیے تسکین ہے، اور اللہ سب کچھ سنتا جانتا ہے ۲۔

خلاصہ تفسیر: (جب گذشتہ آیت سے توبہ قبول ہوچکی اور وہ حضرات ستونوں سے کھل چکے تو اپنا مال آپ ﷺ کی خدمت میں لے کر آئے اور درخواست کی کہ اس کو اللہ کی راہ میں صرف کیا جائے تو ارشاد ہوا کہ) آپ ان کے مالوں میں سے صدقہ (جس کو یہ لائے ہیں) لے لیجئے جس کے (لینے کے) ذریعہ سے آپ ان کو (گناہ کے آثار سے) پاک صاف کردیں گے، اور (جب آپ لیں تو) ان کے لئے دعا کیجئے، بلاشبہ آپ کی دعا ان کے لئے موجب اطمینان (قلب) ہے اور اللہ تعالیٰ (ان کے اعتراف کو) خوب سنتے ہیں (اور ان کی ندامت کو) خوب جانتے ہیں (اس لئے ان کے اخلاص کو دیکھ کر آپ ﷺ کو یہ احکام دیئے گئے)۔

خُذۡ مِنۡ اَمۡوَالِهِمۡ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمۡ: یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مذکورہ واقعہ میں جب ان حضرات کی توبہ قبول کر لی گئی تو گناہ کی معافی اور تطہیر توبہ ہی کے ذریعہ ہوچکی، تو پھر صدقہ کے ذریعہ پاک صاف کرنے کے کیا معنی ہوں گے؟ جواب یہ ہے کہ اگرچہ توبہ سے گناہ تو معاف ہوجاتے ہیں، مگر گناہ معاف ہونے کے بعد اس کی ظلمت وکدورت کا کچھ اثر باقی رہ جاتا ہے اور اگرچہ اس پر مواخذہ نہیں، لیکن اس سے آئندہ دوسرے گناہوں کے پیدا ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے، پس توبہ کے بعد نیک اعمال سے عموماً اور صدقہ سے خصوصاً یہ ظلمت اور کدورت دور ہوجاتی ہے، کیونکہ حدیث میں ہے: ''الصدقة تطفیٔ غضب الرب'' کہ صدقہ خدا تعالیٰ کے غصہ کو بجھا دیتا ہے۔

وَصَلِّ عَلَيۡهِمۡ: اس میں لفظ ''صلوٰۃ'' سے مراد ان کے لئے دعائے رحمت کرنا ہے، اور رسول اللہ ﷺ سے منقول ہے کہ بعض لوگوں کے لئے آپ نے لفظ صلوٰۃ ہی سے دعا فرمائی جیسے اللهم صل علی آل ابی اوفی حدیث میں آیا ہے، تو یہ لغوی معنی کے اعتبار سے ہے، اس وقت تک عرف میں یہ لفظ انبیاء کے لیے مخصوص نہ ہوا تھا، لیکن بعد میں لفظ صلوٰۃ انبیاء علیہم السلام کی مخصوص علامت بن گئی، اس لئے اکثر فقہاء رحمہم اللہ کا یہ قول ہے کہ اب کسی شخص کے لئے دعا لفظ ''صلوٰۃ'' سے نہ کی جائے، بلکہ اس لفظ کو صرف انبیاء علیہم السلام کے لئے مخصوص رکھا جائے تاکہ تلبیس اور اشتباہ نہ ہو۔

اس آیت سے متعدد مسائل اخذ کیے گئے ہیں:

① توبہ کرنے سے گناہ معاف ہو گیا لیکن مال کا صدقہ کروا کر گناہ کی ظلمت و کدورت دور کر دی گئی جو گناہ سے پیدا ہوتی ہے۔

② انفاق مال سے مال کی خواہش کمزور ہو جاتی ہے اور مادہ شہوت کی اصلاح ہوتی ہے۔

③ آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ صدقہ جس کو دیا جاتا ہے اسی طرح وہ امام یا امیر جسے تقسیم کرنے کیلئے صدقہ پیش کیا جاتا ہے انہیں صدقہ دینے والوں کو دعا دینا مستحب ہے، لہذا مسکین و محتاج جنہیں صدقہ دیا جا رہا ہے بدرجہ اولی دعا و شکریہ ادا کرنے کے پابند ہوں گے۔

④ اس آیت سے یہ بھی اخذ کیا گیا ہے کہ رسول کی دعا امت کے حق میں، امام کی دعا رعایا کے حق میں، مشائخ کی دعا مریدوں کے حق میں، اساتذہ کی دعا شاگردوں کے حق میں، بڑوں کی دعا چھوٹوں کے حق میں، نیکوں کی دعا گناہ گاروں کے حق میں، والدین کے دعا اولاد کے حق میں مقبول ہوتی ہے۔

* * *

فائدہ: ۱۔ صدقة کا ترجمہ مترجم محقق نے "زکوٰۃ" کیا ہے، لیکن اگر لفظ صدقة کو عام رکھا جاتا جو زکوٰۃ و صدقات نافلہ سب کو شامل ہو تو بہتر تھا، کیونکہ اکثر روایات کے موافق یہ آیت ان ہی لوگوں کے حق میں نازل ہوئی ہے جو بعد معافی تکمیل توبہ کے طور پر صدقہ لے کر حاضر ہوئے تھے، جیسا کہ ابھی پیچھے فائدہ میں نقل کیا جا چکا ہے، ہاں عموم الفاظ کو دیکھتے ہوئے حکم کو مورد نص پر مقصور رکھنے کی ضرورت نہیں، اسی لیے سلف رضی اللہ عنہم مسئلہ زکوٰۃ میں بھی اس آیت کو پیش کرتے رہے ہیں۔

فائدہ: ۲۔ توبہ سے گناہ معاف ہو جاتا ہے، یعنی اس پر مواخذہ باقی نہیں رہتا، لیکن ایک قسم کی روحانی کدورت و ظلمت وغیرہ جو گناہ کا طبعی اثر ہے وہ ممکن ہے باقی رہ جاتی ہو جو بالخصوص صدقہ اور عموماً حسنات کی مباشرت سے زائل ہوتی ہے، بایں لحاظ کہہ سکتے ہیں کہ صدقہ گناہوں کے اثرات سے پاک و صاف کرتا اور اموال کی برکت بڑھاتا ہے "زکوٰۃ" (کے لغوی معنی نماء یعنی بڑھنے کے ہیں) اور ایک بڑا فائدہ صدقہ کرنے میں یہ تھا کہ صدقہ کرنے والوں کو حضور ﷺ دعائیں دیتے تھے، جن سے دینے والے کا دل بڑھتا اور سکون حاصل کرتا تھا، بلکہ آپ کی دعاء کی برکت دینے والے کی اولاد در اولاد تک پہنچتی تھی، اب بھی ائمہ کے نزدیک مشروع ہے کہ جو شخص صدقہ لائے امام مسلمین بحیثیت وارث نبی ہونے کے اس کے لیے دعاء کرے، البتہ جمہور کے نزدیک لفظ "صلوٰۃ" کا استعمال نہ کرے جو حضور ﷺ کا مخصوص حق تھا۔

أَلَمْ يَعْلَمُوٓا أَنَّ ٱللَّهَ هُوَ يَقْبَلُ ٱلتَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهِۦ وَيَأْخُذُ ٱلصَّدَقَٰتِ وَأَنَّ ٱللَّهَ

کیا وہ جان نہیں چکے کہ اللہ آپ قبول کرتا ہے توبہ اپنے بندوں سے اور لیتا ہے زکوٰتیں اور یہ کہ اللہ

هُوَ ٱلتَّوَّابُ ٱلرَّحِيمُ ﴿١٠٤﴾

ہی توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے

خلاصہ تفسیر: (آگے اعمال صالحہ یعنی توبہ، ندامت اور انفاق فی الخیر کی ترغیب، اور اعمال سیئہ جیسے جہاد سے پیچھے ہٹ جانا وغیرہ سے آئندہ کے لئے ترہیب ہے، پس پہلے ترغیب ہے، یعنی) کیا ان کو یہ خبر نہیں کہ اللہ ہی اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور وہی صدقات کو قبول فرماتا ہے اور (کیا ان کو) یہ (خبر نہیں) کہ اللہ ہی (اس) توبہ قبول کرنے (کی صفت) میں اور رحمت کرنے (کی صفت) میں کامل ہے (اسی لئے ان کی توبہ قبول کی، اور اپنی رحمت سے مال قبول کرنے اور ان کے لئے دعا کرنے کا حکم فرمایا، پس آئندہ بھی خطا و قصور ہو جانے پر توبہ کر لیا کریں، اور اگر توفیق ہو تو خیر خیرات بھی کیا کریں)۔

* * *

فائدہ: یعنی توبہ اور صدقات کا قبول کرنا صرف خدا کے اختیار میں ہے، کیونکہ وہ ہی جانتا ہے کہ کس نے اخلاص قلب اور شرائط قبول کی

رعایت کے ساتھ توبہ کی یا صدقہ دیا، چنانچہ پہلے بعضوں پر عتاب ہو چکا کہ ہمیشہ کے لیے ان کی زکوۃ لینی موقوف ہوئی اور منافقین کے صدقات کو مردود ٹھہرایا گیا اور ان کے حق میں دعاء واستغفار کو بھی بے سود بتلایا، بلکہ جنازہ پڑھنے کی ممانعت کر دی، جن لوگوں کا یہاں ذکر ہے ان کی توبہ قبول کی اور صدقات قبول کرنے کا حکم دیا اور یہ بھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے حق میں (حیاً ومیتاً) دعاء کریں۔

وَقُلِ اعْمَلُوْا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ وَسَتُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ

اور کہہ کہ عمل کیے جاؤ پھر آگے دیکھ لے گا اللہ تمہارے کام کو اور اس کا رسول اور مسلمان، اور تم جلد لوٹائے جاؤ گے اس کے پاس جو تمام چھپی

وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۰۵﴾

اور کھلی چیزوں سے واقف ہے پھر وہ جتادے گا تم کو جو کچھ تم کرتے تھے

خلاصہ تفسیر: اور (ترغیب کے بعد آگے ترہیب یعنی گناہوں سے ڈرانے کا مضمون ہے یعنی) آپ (ان سے یہ بھی) کہہ دیجئے کہ (جو چاہو) عمل کئے جاؤ، سو (اول تو دنیا ہی میں) ابھی دیکھے لیتا ہے تمہارے عمل کو اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول اور اہل ایمان (پس برے عمل پر دنیا ہی میں ذلت اور رسوائی ہو جاتی ہے) اور (پھر آخرت میں) ضرور تم کو ایسے (اللہ) کے پاس جانا ہے جو تمام چھپی اور کھلی چیزوں کا جاننے والا ہے، سو وہ تم کو تمہارا سب کیا ہوا بتلا دے گا (پس برے عمل سے جیسے جہاد سے پیچھے ہٹ جانا وغیرہ سے آئندہ کے لیے احتیاط رکھو، یہاں تک پہلی قسم کا بیان تھا)۔

❋ ❋ ❋

فائدہ: یعنی توبہ وغیرہ سے گزشتہ تقصیرات معاف ہو گئیں، لیکن آگے دیکھا جائے گا کہ تم کہاں تک صدق واستقامت کا عملی ثبوت پیش کرتے ہو، اس جہاد میں قصور ہوا تو آئندہ اور جہاد ہوں گے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے یا خلفاء کے روبرو ان میں امتحان ہوگا کہ کیسا عمل کرتے ہو، پھر خدا کے یہاں جا کر ہر عمل کو پورا بدلہ مل جائے گا کیونکہ وہ ہی تمام کھلی چھپی چیزوں اور ظاہری عمل اور باطنی نیتوں پر مطلع ہے ہر ایک کے ساتھ اس کی واقعی حالت کے موافق معاملہ کرے گا (آیت کی یہ تقریر حضرت شاہ صاحبؒ کے مذاق پر کی گئی ہے کیونکہ اوفق بالسیاق ہے، واللہ اعلم)

وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ اِمَّا يُعَذِّبُهُمْ وَاِمَّا يَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۱۰۶﴾

اور بعضے اور لوگ ہیں کہ انکا کام ڈھیل میں ہے حکم پر اللہ کے یا وہ انکو عذاب دے اور یا انکو معاف کرے، اور اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے

خلاصہ تفسیر: اب دوسری قسم کا ذکر ہے، یہ وہ مؤمنین ہیں جنہوں نے نہ عذر تراشا اور نہ اپنے آپ کو باندھا، بلکہ حاضر ہو کر سچ سچ بات عرض کر دی، اور ان کی توبہ کی قبولیت کا ذکر آئندہ رکوع آیت: لقد تاب اللہ علی النبی الخ میں آئے گا۔

اور کچھ اور لوگ ہیں جن کا معاملہ خدا کے حکم آنے تک ملتوی ہے کہ (توبہ میں اخلاص نہ ہونے کی وجہ سے) ان کو سزا دے گا یا (اخلاص ہونے کی وجہ سے) ان کی توبہ قبول کرے گا اور اللہ تعالیٰ (خلوص وعدم خلوص کا حال) خوب جاننے والا ہے (اور) بڑا حکمت والا ہے (پس حکمت کا تقاضا ہے کہ خلوص کے ساتھ توبہ کو قبول کرتا ہے، اور بغیر خلوص کے قبول نہیں کرتا، اور اگر کبھی بلا توبہ معاف کرنے میں حکمت ہو تو ایسا بھی کر دیتا ہے، اس سے یہ شبہ دور ہو گیا کہ بغیر توبہ کے معافی نہیں ہوتی، کیونکہ کبھی بغیر توبہ کے معاف کر دینا بھی حکمت کے موافق ہوتا ہے)۔

وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ: اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بسا اوقات چھوٹوں اور ماتحتوں کے معاملہ کو خوف وامید کے درمیان معلق چھوڑ دیا جاتا ہے، اس کے عذر کو نہ صراحۃً قبول کیا جاتا ہے کہ اس سے نصیحت کا اثر کمزور پڑ جاتا ہے اور نہ اس کے عذر کو صراحۃً رد کیا جاتا ہے کہ اس سے پہلے تو وحشت، پھر مایوسی اور پھر دوری پیدا ہو جاتی ہے یہ بھی نقصان دہ ہوتی ہے، اور اس طرح سے معلق رکھنا قرین مصلحت ہوتا ہے، اس میں بہت سی مصلحتیں ہوتی ہیں۔

اِمَّا یُعَذِّبُهُمْ وَاِمَّا یَتُوْبُ عَلَیْهِمْ: توبہ قبول کرنے والوں میں یہ دو احتمال یعنی قبول توبہ یا عذاب کے اس لیے ہیں کہ توبہ کبھی شرائط کے موافق نہیں ہوتی، پس جن آیات میں ہر توبہ کے قبول ہونے کا ذکر ہے ان سے کوئی تعارض نہ رہا، کیونکہ ان کا بھی یہی مطلب ہے کہ جب وہ شرائط کے موافق ہو اس وقت ضرور قبول ہوگی۔

* * *

فائدہ: اہل مدینہ میں سے یہاں ایک چھوٹی سی جماعت کا ذکر فرمایا ہے، اصل یہ ہے کہ متخلفین عن تبوک (یعنی تبوک میں نہ شریک ہونے والے) تین قسم کے تھے، ایک منافقین جو از راہ شک ونفاق علیحدہ رہے، دوسرے بعض مومنین جو محض سستی اور تن آسانی کی بدولت شریک جہاد نہ ہوئے، پھر ان میں دو قسمیں تھیں، اکثر وہ تھے جنہوں نے واپسی کی اطلاع پا کر اپنے کو مسجد کے ستونوں سے باندھ دیا ان کا ذکر پچھلی آیات میں گزر چکا، صرف تین شخصوں کی جماعت وہ تھی جنہوں نے نہ اپنے کو ستونوں سے بندھوایا، نہ کوئی عذر تراشا، بس جو واقعہ تھا اور جو قصور ہوا تھا صاف صاف بلا کم وکاست آنحضرت ﷺ کے سامنے عرض کر دیا، ان کے بارہ میں آیت: وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ (التوبہ:۱۰۹) نازل ہوئی، یعنی ان کا معاملہ ابھی ڈھیل میں ہے، چندروز خدا کے حکم کا انتظار کرو، خواہ ان کو سزا دے یا معاف کرے، جو اس کے علم وحکمت کا اقتضاء ہوگا کیا جائے گا، نبی کریم ﷺ نے تا نزول حکم الٰہی ادب دینے کے لیے مسلمانوں کے تعلقات ان تینوں سے منقطع کر دیے، پچاس دن تک یہ ہی معاملہ رہا، پھر معافی ہوئی، ان واقعات کی اور تینوں کے ناموں کی تفصیل اگلے رکوع کے خاتمہ پر بیان ہوگی۔

وَالَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّ كُفْرًا وَّ تَفْرِیْقًۢا بَیْنَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَ اِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ

اور جنہوں نے بنائی ہے ایک مسجد ضد پر اور کفر پر اور پھوٹ ڈالنے کو مسلمانوں میں اور گھات لگانے کو اس شخص کی جو لڑ رہا ہے اللہ سے

وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ ؕ وَلَیَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَاۤ اِلَّا الْحُسْنٰی ؕ وَاللّٰهُ یَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۱۰۷﴾

اور اس کے رسول سے پہلے سے، اور وہ قسمیں کھائیں گے کہ ہم نے تو بھلائی ہی چاہی تھی، اور اللہ گواہ ہے کہ وہ جھوٹے ہیں

خلاصہ تفسیر: پیچھے بار بار منافقین کا ذکر ہوا، اب ان آیات میں منافقین کی بنائی ہوئی مسجد ضرار اور اس کے مقابلہ میں ایمان والوں کی مسجد قبا کا ذکر ہے، قصہ کا خلاصہ یہ ہے کہ مدینہ کے قریب ایک محلہ قبا ہے، جب رسول اللہ ﷺ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو پہلے اسی محلہ میں قیام فرمایا تھا، پھر شہر میں تشریف لائے تو آپ نے اس وقت جس جگہ پر قبا میں نماز پڑھی وہاں اس محلہ کے سچے مسلمانوں نے ایک مسجد بنالی، اور اس میں نماز پڑھا کرتے، اس کا نام مسجد قبا مشہور ہے، منافقین ایک شخص ابو عامر نامی سے میل رکھتے تھے جو اسلام کا سخت دشمن تھا، ان میں باہم یہ مشورہ ٹھہرا کہ ایک مکان مسجد کے نام سے الگ بنایا جائے، اس میں سب جمع ہو کر اسلام کو نقصان پہنچانے کے لیے مشورے کیا کریں اور سارے مجمع کا سردار ابو عامر ہو، جب وہ مدینہ آیا کرتے تو اسی مکان میں ٹھہرا کرتے، ابو عامر نے یہ بھی کہا تھا کہ میں ہرقل شاہ روم سے مل کر اسلام کے مقابلہ کے لیے لشکر لاؤں گا جس سے اسلام مٹ جائے گا، جب وہ مکان مسجد کی شکل پر تیار ہوا تو منافقین نے حضور ﷺ سے درخواست کی کہ آپ وہاں چل کر نماز پڑھ لیجیے پھر وہاں جماعت ہونے لگے گی، آپ نے ایک الگ مسجد بنانے کی وجہ سے پوچھی تو کہنے لگے کہ ہماری نیت بالکل نیک ہے، محض مسلمانوں کی راحت وآسائش کی غرض سے بنائی ہے، اور کچھ مصلحتیں جھوٹ موٹ بیان کر دیں، آپ نے حسن ظن کی بنا پر ان کو سچا سمجھا اور وعدہ کر لیا کہ تبوک سے واپس آکر اس میں نماز پڑھوں گا، اللہ تعالیٰ نے اگلی آیتوں میں آپ کو حقیقت حال کی اطلاع کر دی اور وہاں نماز پڑھنے سے منع فرما دیا، چنانچہ آپ نے صحابہ کو بھیج کر اس میں آگ لگوا دی اور منہدم کرا دیا، کیونکہ وہ مسجد کی نیت سے نہ بنائی گئی تھی، اور اس سے بہت مفاسد پیدا ہونے کا خطرہ تھا، اس مسجد کا لقب مسجد ضرار مشہور ہے، ان آیات میں اس مسجد کا اور اس کے مقابلہ میں ایمان والوں کی مسجد قبا کا بیان ہے۔

اور بعض ایسے ہیں جنہوں نے ان اغراض کے لئے مسجد بنائی ہے کہ (اسلام کو) ضرر پہنچائیں اور (اس میں بیٹھ بیٹھ کر) کفر (یعنی عداوت

رسول) کی باتیں کریں اور (اس کی وجہ سے) ایمانداروں (کے مجمع) میں تفریق ڈالیں (کیونکہ جب دوسری مسجد بنائی جائے اور یہ ظاہر کیا جائے کہ اچھی نیت سے بنائی گئی ہے تو پہلی مسجد کا مجمع کچھ نہ کچھ منتشر ہو ہی جاتا ہے) اور (یہ بھی غرض ہے کہ) اس شخص کے قیام کا سامان کریں جو اس (مسجد بنانے) کے قبل سے خدا اور رسول کا مخالف ہے (مراد ابو عامر راہب ہے) اور (پوچھو تو) قسمیں کھائیں گے (جیسا ایک دفعہ پہلے بھی پوچھنے پر قسمیں کھا چکے ہیں) کہ بجز بھلائی کے اور ہماری کچھ نیت نہیں (بھلائی سے مراد آسائش اور گنجائش ہے کہ دو مسجدیں بن جانے سے مسلمانوں کو آسانی ہو جائے گی) اور اللہ گواہ ہے کہ وہ (اس دعوے میں) بالکل جھوٹے ہیں۔

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا: اس سے اس شخص کے عمل کی قباحت اور برائی بھی سمجھ آتی ہے جو دین کو اپنے فاسد اغراض و مقاصد کی تکمیل کے لیے آلہ کار بنالے۔

* * *

فائدہ: پہلے ان لوگوں کا ذکر تھا جن سے بظاہر ایک برا کام ہوگیا (تخلف عن الجہاد) مگر صحت اعتقاد اور اعتراف خطا کی بدولت معافی مل گئی، یہاں ایسی جماعت کا بیان ہے جنہوں نے بظاہر اچھا کام کیا (تعمیر مسجد) لیکن بد اعتقادی کی وجہ سے وبال بن گیا۔

واقعہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ مکہ سے ہجرت کر کے آئے تو اول مدینہ سے باہر "بنی عمرو بن عوف" کے محلہ میں فروکش ہوئے، پھر چند روز بعد شہر مدینہ میں تشریف لے گئے اور مسجد نبوت تعمیر کی، اس محلہ میں جہاں آپ بیشتر نماز پڑھتے تھے وہاں کے لوگوں نے مسجد تیار کر لی جو مسجد قباء کے نام سے مشہور ہے، اکثر ہفتہ کے روز وہاں جا کر دو رکعت نماز پڑھتے اور بڑی فضیلت اس کی بیان فرماتے تھے، بعض منافقین نے چاہا کہ پہلوں کی ضد پر اسی کے قریب ایک اور مکان مسجد کے نام سے تعمیر کریں، اپنی جماعت جدا ٹھہرائیں اور بعض سادہ دل مسلمانوں کو مسجد قبا سے ہٹا کر ادھر لے آئیں، فی الحقیقت اس ناپاک تجویز کا محرک اصلی ایک شخص ابو عامر راہب خزرجی تھا، ہجرت سے پہلے اس شخص نے نصرانی بن کر راہبانہ زندگی اختیار کر لی تھی، مدینہ اور آس پاس کے لوگ خصوصاً قبیلہ خزرج اس کے زہد و درویشی کے معتقد تھے اور بڑی تعظیم کرتے تھے حضور ﷺ کے قدوم میمنت لزوم سے جب مدینہ میں ایمان و عرفان کا آفتاب چمکا تو اس طرح کے درویشوں کا بھرم کھلنے لگا، بھلا نور آفتاب کے سامنے چراغ مردہ کو کون پوچھتا، ابو عامر یہ دیکھ کر چراغ پا ہو گیا حضور ﷺ نے اس کو اسلام کی دعوت دی اور فرمایا کہ میں ٹھیک ملت ابراہیمی لے کر آیا ہوں، کہنے لگا کہ میں پہلے سے اس پر قائم ہوں لیکن تم نے اپنی طرف سے ملت ابراہیمی میں اس کے خلاف چیزیں داخل کر دی ہیں، حضور ﷺ نے بہت زور سے اس کی تردید فرمائی، آخر اس کی زبان سے نکلا کہ "جو ہم میں سے جھوٹا ہو خدا اس کو وطن سے دور تنہا غربت و بے کسی کی موت مارے"، آپ ﷺ نے فرمایا "آمین" خدا ایسا ہی کرے۔

جنگ بدر کے بعد جب اسلام کی جڑیں مضبوط ہو گئیں اور مسلمانوں کا عروج و فروغ حاسدوں کی نگاہوں کو خیرہ کرنے لگا، ابو عامر کو تاب نہ رہی، بھاگ کر مکہ پہنچا، تاکہ کفار مکہ کو حضور ﷺ کے مقابلہ میں چڑھا کر لائے، چنانچہ معرکہ احد میں قریش کے ساتھ خود آیا، مبارزہ شروع ہونے سے پہلے آگے بڑھ کر انصار مدینہ کو جو عہد جاہلیت میں اس کے بڑے معتقد تھے خطاب کر کے اپنی طرف مائل کرنا چاہا، احمق یہ نہ سمجھا کہ پیغمبرانہ تصرف کے سامنے اب وہ پرانا جادو کہاں چل سکتا ہے، آخر انصار نے جو اسے پہلے راہب کہہ کر پکارتے تھے جواب دیا کہ او فاسق دشمن خدا! تری آنکھ خدا کبھی ٹھنڈی نہ کرے، کیا رسول خدا کے مقابلہ میں ہم تیرا ساتھ دیں گے؟ انصار کا مایوس کن جواب سن کر کچھ حواس درست ہوئے اور غیظ میں آکر کہنے لگا کہ اے محمد! ﷺ آئندہ جو قوم بھی تیرے مقابلہ کے لیے اٹھے گی میں برابر اس کے ساتھ رہوں گا، چنانچہ جنگ حنین تک ہر معرکہ میں کفار کے ساتھ ہو کر مسلمانوں سے لڑتا رہا۔

احد میں اسی کی شرارت سے حضور ﷺ کو چشم زخم پہنچا، دونوں صفوں کے درمیان اس نے پوشیدہ طور پر کچھ گڑھے کھدوا دیے تھے، وہیں چہرہ مبارک کے زخمی ہونے اور دندان مبارک شہید ہونے کا واقعہ پیش آیا حنین کے بعد جب ابو عامر نے محسوس کر لیا کہ اب عرب کی کوئی طاقت اسلام کو کچلنے میں کامیاب نہیں ہو سکتی تو بھاگ کر ملک شام پہنچا، اور منافقین مدینہ کو خط لکھا کہ میں قیصر روم سے مل کر ایک لشکر جرار محمد ﷺ کے مقابلہ میں لانے والا ہوں جو چشم زدن میں ان کے سارے منصوبے خاک میں ملا دے گا اور مسلمانوں کو بالکل پامال کر کے چھوڑے گا، (العیاذ باللہ) تم فی الحال ایک

عمارت مسجد کے نام سے بنالو، جہاں نماز کے بہانے سے جمع ہو کر اسلام کے خلاف ہر قسم کے سازشی مشورے ہو سکیں، اور قاصد تم کو وہیں میرے خطوط وغیرہ پہنچا دیا کرے اور میں بذات خود آؤں تو ایک موزوں جگہ ٹھہرنے اور ملنے کی ہو، یہ خبیث مقاصد تھے جن کے لیے مسجد ضرار تعمیر ہوئی اور حضور ﷺ کے روبرو بہانہ یہ کیا کہ یا رسول اللہ! خدا کی قسم ہماری نیت بری نہیں بلکہ بارش اور سردی وغیرہ میں بالخصوص بیماروں، ناتوانوں اور ارباب حوائج کو مسجد قبا تک جانا دشوار ہوتا ہے، اس لیے یہ مسجد بنائی گئی ہے تاکہ نمازیوں کو سہولت ہو اور مسجد قبا میں تنگی مکان کی شکایت نہ رہے حضور ﷺ ایک مرتبہ وہاں چل کر نماز پڑھ لیں تو ہمارے لیے موجب برکت وسعادت ہو، یہ اس لیے کہ حضور ﷺ کا طرز عمل دیکھ کر بعض سادہ دل مسلمان حسن ظن کی بنا پر ان کے جال میں پھنس جائیں، آپ اس وقت تبوک جانے کے لیے پابرکاب تھے، فرمایا کہ اللہ نے چاہا تو واپسی پر ایسا ہو سکے گا، جب حضور ﷺ تبوک سے واپس ہو کر بالکل مدینہ کے نزدیک پہنچ گئے، تب جبرائیل یہ آیات لے کر آئے جن میں منافقین کی ناپاک اغراض پر مطلع کر کے مسجد ضرار کا پول کھول دیا، آپ ﷺ نے مالک بن خشم اور معن بن عدی کو حکم دیا کہ اس مکان کو (جس کا نام از راہ خداع وفریب مسجد رکھا تھا) گرا کر پیوند زمین بنا دو، انہوں نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور جلا کر خاک سیاہ کر دیا اس طرح منافقین اور ابو عامر فاسق کے سب ارمان دل کے دل میں رہ گئے اور ابو عامر اپنی دعا اور حضور ﷺ کی آمین کے موافق قنسرین) ملک شام (میں تنہا سخت بے کسی کی موت مرا، فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۭ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (الانعام: ۴۵) سے یہ ہی ابو عامر فاسق مراد ہے۔

لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا ۭ لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَي التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ ۭ

تو نہ کھڑا ہو اس میں کبھی، البتہ وہ مسجد جس کی بنیاد دھری گئی پرہیز گاری پر اول دن سے وہ لائق ہے کہ تو کھڑا ہو اس میں

فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ ﴿١٠٨﴾

اس میں ایسے لوگ ہیں جو دوست رکھتے ہیں پاک رہنے کو، اور اللہ دوست رکھتا ہے پاک رہنے والوں کو

خلاصہ تفسیر: (جب اس مسجد کی یہ حالت ہے کہ وہ واقع میں مسجد ہی نہیں بلکہ اسلام کے نقصان دہ ہے تو) آپ اس میں کبھی (نماز کے لئے) کھڑے نہ ہوں، البتہ جس مسجد کی بنیاد اول دن سے (یعنی روز تجویز سے) تقویٰ (اور اخلاص) پر رکھی گئی ہے (مراد مسجد قبا ہے) وہ (واقعی) اس لائق ہے کہ آپ اس میں (نماز کے لئے) کھڑے ہوں (چنانچہ آپ کبھی کبھی وہاں تشریف لے جاتے اور نماز پڑھتے) اس (مسجد قبا) میں ایسے (اچھے) آدمی ہیں کہ وہ خوب پاک ہونے کو پسند کرتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ خوب پاک ہونے والوں کو پسند کرتا ہے۔

لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا: کیونکہ آپ کا مسجد ضرار میں نماز پڑھ لینا اس مسجد کی ترویج وتقویت کا سبب ہو جائے گا، اس میں دلیل ہے کہ جو نیک کام حرام یا مکروہ بننے کا سبب ہو جائے تو ایسے نیک کام سے بچنا بھی ضروری ہے (کیونکہ وہ مسجد مسلمانوں کے درمیان تخریف وتفریق پھیلانے کے لیے بنائی گئی تھی)۔

لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَي التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ: مسجد قبا جس کی بنیاد اخلاص وتقوی پر رکھی گئی تھی اسے دوام وبقا نصیب ہوا جو آج تک قائم ہے، لہذا جس کام کی ابتدا اللہ کی رضا اور خوشنودی اور اخلاص نیت سے کی جاتی ہے اسے دوام وپائیداری ملتی ہے اور اس میں برکت ہوتی ہے، بخلاف اس کام کے جس میں تقوی نہ ہو، اس میں کدورت، تفرقہ اور نفس میں تنگی کا اثر پیدا ہوتا ہے۔

فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا: اس میں اشارہ ہے کہ صالحین کی صحبت بھی بہت بڑا اثر رکھتی ہے کہ اس مسجد میں قیام کی ترجیح کی علت کے موقع پر اسے بیان فرمایا، اور مجموعہ سے یہ بات سمجھ میں آئی کہ سکون قلب واطمینان کے حصول میں مکان، زمان اور اخوان (حلقہ احباب) کی رعایت کو بھی دخل ہے۔

وَاللّٰهُ یُحِبُّ الْمُطَّهِّرِیْنَ: جب یہ آیت نازل ہوئی تو آپ ﷺ نے مسجد قبا والوں سے پوچھا کہ تم کیا پاکی کرتے ہو جس پر تمہاری تعریف کی گئی؟ انہوں نے کہا کہ ہم ڈھیلے سے استنجا کر کے پھر پانی بھی استعمال کرتے ہیں، آپ نے فرمایا یہی بات ہے، اس حدیث سے اور نیز سیاق کے قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سے مراد قبا کی مسجد ہے، اس پر یہ شبہ ہوگا کہ پھر اس حدیث کے کیا معنی کہ دو صحابیوں کی اس میں گفتگو ہوئی کہ یہ تعریف کس مسجد کی ہے؟ ایک نے کہا مسجد قبا کی، دوسرے نے کہا مسجد نبوی کی، اس پر آپ نے فرمایا کہ اس سے مراد میری یہ مسجد یعنی مسجد نبوی ہے، جواب یہ ہے کہ حدیث کا یہ مطلب نہیں کہ مسجد قبا اس سے مراد نہیں، بلکہ یہ مطلب ہے کہ مسجد نبوی بھی مراد ہے، اور مقصود اس جواب سے یہ ہے کہ مسجد قبا ہی کے ساتھ اس تعریف کو خاص کرنا صحیح نہیں، کیونکہ جب صحابہ کے بنانے سے وہ مسجد قابل تعریف ہوگئی تو جس مسجد کے بانی خود جناب رسول اللہ ﷺ ہوں گے وہ ظاہر ہے کہ بدرجہ اولی اس کی مستحق ہوگی، پس آیت کا شان نزول اگر چہ قبا کی مسجد مگر دلالۃ النص سے مسجد نبوی بھی اس میں داخل ہے۔

* * *

فائدہ: یعنی اس مسجد میں جس کی بنیاد محض ضد، کفر و نفاق، عداوت اسلام اور مخالفت خدا اور رسول پر رکھی گئی، آپ کبھی نماز کے لیے کھڑے نہ ہوں، آپ کی نماز کے لائق وہ مسجد ہے جس کی بنیاد اول دن سے تقویٰ اور پرہیزگاری پر قائم ہوئی (خواہ مسجد نبوی ہو یا مسجد قبا) اس کے نمازی گناہوں اور شرارتوں اور ہر قسم کی نجاستوں سے اپنا ظاہر و باطن پاک وصاف رکھنے کا اہتمام کرتے ہیں، اسی لیے خدائے پاک ان کو محبوب رکھتا ہے، حدیث میں ہے کہ حضور ﷺ نے اہل قبا سے دریافت کیا کہ تم طہارت و پاکیزگی کا کیا خاص اہتمام کرتے ہو، جو حق تعالیٰ نے تمہاری تطہیر کی مدح فرمائی، انہوں نے کہا کہ ڈھیلے کے بعد پانی سے استنجا کرتے ہیں، یعنی عام طہارت ظاہری و باطنی کے علاوہ وہ لوگ اس چیز کا معتاد سے زائد اہتمام رکھتے ہیں، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آیت میں مسجد قبا کا ذکر ہے، لیکن بعض روایات صریح میں ہے کہ لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰی سے مسجد نبوی ﷺ سے مراد ہے، علماء نے اس پر بہت کچھ کلام کیا ہے، ہم نے شرح صحیح مسلم میں اس کے متعلق اپنا ناقص خیال ظاہر کر کے روایات میں تطبیق دی ہے یہاں اس کے بیان کا موقع نہیں۔

اَفَمَنْ اَسَّسَ بُنْیَانَهٗ عَلٰى تَقْوٰى مِنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٍ خَیْرٌ اَمْ مَّنْ اَسَّسَ بُنْیَانَهٗ عَلٰى شَفَا

بھلا جس نے بنیاد رکھی اپنی عمارت کی اللہ سے ڈرنے پر اور اس کی رضامندی پر وہ بہتر یا جس نے بنیاد رکھی اپنی عمارت کی کنارہ پر

جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ بِهٖ فِیْ نَارِ جَهَنَّمَ ؕ وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۱۰۹﴾

ایک کھائی کے جو گرنے کو ہے پھر اس کو لے کر ڈھے پڑا دوزخ کی آگ میں [۱] اور اللہ راہ نہیں دیتا ظالم لوگوں کو [۲]

خلاصہ تفسیر: (جب دونوں مسجدوں کے بنانے والوں کا حال معلوم ہوگیا تو) پھر (سمجھ لو) آیا ایسا شخص (بہتر ہوگا) جس نے اپنی عمارت (یعنی مسجد) کی بنیاد کسی گھاٹی (یعنی غار) کے کنارہ پر جو کہ گرنے ہی کو (ہو) رکھی ہو (اس کنارہ سے باطل کفریہ اغراض مراد ہیں، ناپائیداری میں اس کے ساتھ تشبیہ دی گئی) پھر وہ (عمارت) اس (بنانے والے) کو لے کر آتش دوزخ میں گر پڑے (یعنی وہ عمارت تو اس وجہ سے گری کہ کنارہ پر ہے، جب وہ کنارہ پانی سے کٹ کر گرے گا وہ عمارت بھی گرے گی، اور بنانے والا چونکہ اس میں رہتا تھا وہ بھی گرے گا، اور چونکہ اس کنارہ سے مراد کفریہ اغراض ہیں جو جہنم لے جانے والے ہیں، اس لئے یہ فرمایا کہ وہ اس کو لے کر جہنم میں جا گری) اور اللہ تعالیٰ ایسے ظالموں کو (دین کی) سمجھ ہی نہیں دیتا (کہ مکان تو بنایا مسجد کے نام سے جو کہ دین کے شعائر میں سے ہے، اور اس میں اغراض کیسی فاسد پیدا کرلیں)۔

* * *

فائدہ: [۱] یعنی جس کام کی بنیاد تقویٰ، یقین و اخلاص اور خدا کی رضا جوئی پر ہو وہ نہایت مستحکم اور پائیدار ہوتا ہے، برخلاف اس کے جس کام کی بناء شک و نفاق اور مکر و خداع پر ہو، وہ اپنی ناپائیداری، بودے پن اور انجام بد کے لحاظ سے ایسا ہے جیسے کوئی عمارت ایک کھائی کے کنارہ پر

کھڑی کی جائے کہ ذرا زمین سرکی یا پانی کی تھپیڑ کنارہ کو لگی، ساری عمارت دھڑام سے نیچے آ رہی اور آخر کار دوزخ کے گڑھے میں جا پہنچی۔

فائدہ: ؎ یعنی بظاہر کوئی نیک عمل بھی کریں (جیسے مسجد بنانا) ظلم و ناانصافی کی شامت سے بن نہیں پڑتا۔

لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمُ الَّذِي بَنَوْا رِيبَةً فِي قُلُوبِهِمْ إِلَّا أَنْ تَقَطَّعَ قُلُوبُهُمْ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿١١٠﴾

ہمیشہ رہے گا اس عمارت سے جو انہوں نے بنائی تھی شبہ انکے دلوں میں مگر جب ٹکڑے ہو جائیں انکے دل کے، اور اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے

خلاصہ تفسیر: ان کی یہ عمارت (یعنی مسجد) جو انہوں نے بنائی ہے ہمیشہ ان کے دلوں میں (کانٹا سا) کھٹکتی رہے گی (کیونکہ جس غرض سے بنائی تھی وہ پوری نہ ہوئی اور قلعی کھل گئی سوا لگ، اور پھر اوپر سے منہدم کر دی گئی، غرض کوئی ارمان نہ نکلا، اس لئے ساری عمر اس کا افسوس اور ارمان باقی رہے گا) ہاں! مگر ان کے (وہ) دل ہی (جن میں وہ ارمان ہے) فنا ہو جائیں تو خیر (وہ ارمان بھی اس وقت ختم ہو جائے گا) اور اللہ تعالیٰ بڑے علم والے بڑی حکمت والے ہیں (ان کی حالت کو جانتے ہیں اور اسی کے مناسب سزا دیں گے)۔

إِلَّا أَنْ تَقَطَّعَ قُلُوبُهُمْ: یعنی مگر ان کے دل ہی فنا ہو جائیں، اس کا یہ مطلب نہیں کہ موت کے بعد راحت ہو جائے گی، بلکہ محاورات میں ایسے کلام کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہمیشہ حسرت ہی رہے گی، اور یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اصل میں جس چیز کا نام دل (روح) ہے اس کو موت نہیں آتی تو مطلب یہ ہوا کہ نہ ان کے دل فنا ہوں گے نہ یہ ارمان ختم ہوگا۔

اس قصہ سے بعض علماء نے یہ سمجھا ہے کہ جو مسجد فخر وریا کے واسطے بنائی جائے وہ مسجد ہی نہیں، مجھے اس میں کلام ہے، کیونکہ منافقین نے تو مسجد بنانے کی نیت ہی نہ کی تھی، اس لیے ان کے اعتقاد میں مسجد بنانا ثواب کا کام نہیں تھا، بخلاف اس صورت کے کہ ایک مسلمان مسجد بنائے اور اس میں نیت فاسد ہو، مثلاً ریاء نمود وغیرہ، کیونکہ وہ اپنے اعتقاد میں اس کو ثواب کا کام سمجھتا ہے، پس نیت کی خرابی کو عقیدہ کی خرابی پر قیاس کرنا صحیح نہیں، اس لیے وہ ظاہری احکام میں مسجد ہے اگر چہ عند اللہ مقبول نہ ہو، ایسی مسجد میں نماز پڑھنا بہتر نہیں اگر چہ نماز ہو جاتی ہے۔

* * *

فائدہ: رِيبَةً کا ترجمہ کیا ہے "شبہ" جس سے مراد نفاق ہے، یعنی اس عمل بد کا اثر یہ ہوا کہ ہمیشہ ان کے دلوں میں (جب تک موت انہیں پارہ پارہ نہ کر ڈالے) نفاق قائم رہے گا، جیسے اسی سورہ میں پہلے گزر چکا: فَأَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِي قُلُوبِهِمْ إِلَىٰ يَوْمِ يَلْقَوْنَهُ بِمَا أَخْلَفُوا اللَّهَ مَا وَعَدُوهُ وَبِمَا كَانُوا يَكْذِبُونَ (التوبہ: ۷۷) بعض مترجمین نے رِيبَةً کے معنی کیے ہیں "کھٹکنا" یعنی جو عمارت انہوں نے ناپاک مقاصد کے لیے بنائی تھی، مگر حق تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو مطلع کر کے ان کے تمام پلید مقاصد کا خاتمہ کر دیا، اس کا خیال ہمیشہ ان کے دلوں میں کانٹا سا کھٹکتا رہے گا، والراجح عندالسلف هو الأول كما حكى ابن كثير۔

إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ۚ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ

اللہ نے خرید لی مسلمانوں سے ان کی جان اور ان کا مال اس قیمت پر کہ ان کے لیے جنت ہے، لڑتے ہیں اللہ کی راہ میں

فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ ۖ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنْجِيلِ وَالْقُرْآنِ ۚ وَمَنْ أَوْفَىٰ بِعَهْدِهِ

پھر مارتے ہیں اور مرتے ہیں، وعدہ ہو چکا اس کے ذمہ پر سچا تورات اور انجیل اور قرآن میں، اور کون ہے قول کا پورا

مِنَ اللَّهِ ۚ فَاسْتَبْشِرُوا بِبَيْعِكُمُ الَّذِي بَايَعْتُمْ بِهِ ۚ وَذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿١١١﴾

اللہ سے زیادہ سو خوشیاں کرو اس معاملہ پر جو تم نے کیا ہے اس سے، اور یہی ہے بڑی کامیابی

خلاصہ تفسیر: اوپر جہاد سے پیچھے ہٹنے والوں کی مذمت تھی، آگے مجاہدین کی فضیلت ہے، پھران میں سے خاص کاملین کی جن میں جہاد کے علاوہ دوسرے ایمانی اوصاف بھی پائے جاتے ہیں ان کی تعریف ومنقبت مذکور ہے:

بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے ان کی جانوں کواور ان کے مالوں کواس بات کے عوض میں خرید لیا ہے کہ ان کو جنت ملے گی (اور خدا کے ہاتھ مال وجان بیچنے کا مطلب یہ ہے کہ) وہ لوگ اللہ کی راہ میں (یعنی جہاد میں) لڑتے ہیں جس میں (کبھی) قتل کرتے ہیں اور (کبھی) قتل کئے جاتے ہیں (یعنی وہ بیع جہاد کرنا ہے، خواہ اس میں قاتل ہونے کی نوبت آئے یا مقتول ہونے کی) اس (قتال) پر (ان سے جنت کا) سچا وعدہ کیا گیا ہے توریت میں (بھی) اور انجیل میں (بھی) اور قرآن میں (بھی) اور (یہ مسلم ہے کہ) اللہ سے زیادہ اپنے عہد کو کون پورا کرنے والا ہے (اور اس نے اس بیع پر جنت کا وعدہ کیا ہے) تو (اس حالت میں) تم لوگ (جو کہ جہاد کررہے ہو) اپنی اس بیع (مذکور) پر جس کا تم نے (اللہ تعالیٰ سے) معاملہ ٹھہرایا ہے خوشی مناؤ (کیونکہ اس بیع پر تم کو حسب وعدہ جنت ملے گی) اور یہ (جنت ملنا) بڑی کامیابی ہے (توضرور تم کو یہ سودا کرنا چاہئے)۔

يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ: جان بیچنے سے مراد جہاد کرنا ہے، خواہ اس میں قاتل ہونے کی نوبت آئے یا مقتول ہونے کی، پس یہ شبہ جاتا رہا کہ جان تو مرنے کے بعد بھی باقی رہتی ہے، پھر جان دینے کا کیا مطلب ہوا؟ جواب ظاہر ہے کہ جان دینے سے مراد لڑائی کرنا ہے۔

وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ: مشہور ہے کہ انجیل میں جہاد کا حکم نہیں ہے، پھر انجیل میں اس وعدہ کے ہونے کا کیا مطلب؟ سوممکن ہے کہ اس میں امت محمدیہ کا ذکر ہو کہ وہ جہاد کریں گے اور ان سے یہ وعدہ ہے، یا مطلق جان ومال خرچ کرنے کا ثواب مذکور ہو جس میں جہاد بھی داخل ہے، اور اب اگر انجیل میں یہ مضامین نہ ہوں تو شبہ نہ کیا جائے کیونکہ پہلی کتابیں اصلی گم ہوگئی ہیں۔

* * *

فائدہ: اس سے زیادہ سودمند تجارت اور عظیم الشان کامیابی کیا ہوگی کہ ہماری حقیر سی جانوں اور فانی اموال کا خداوند قدوس خریدار بنا، ہماری جان ومال جو فی الحقیقت اسی کی مملوک ومخلوق ہے محض ادنیٰ ملابست سے ہماری طرف نسبت کرکے ''مبیع'' قرار دیا جو ''عقد بیع'' میں مقصود بالذات ہوتی ہے، اور جنت جیسے اعلیٰ ترین مقام کواس کا ''ثمن'' بتلایا جو مبیع تک پہنچنے کا وسیلہ ہے، حدیث میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ''جنت'' میں وہ نعمتیں ہوں گی جن کو نہ آنکھوں نے دیکھا نہ کانوں نے سنا اور نہ کسی بشر کے قلب پر ان کی کیفیات کا خطور ہوا اب خیال کرو کہ جان ومال جو برائے نام ہمارے کہلاتے ہیں، انہیں جنت کا ثمن نہیں بنایا نہ یہ کہا کہ حق تعالیٰ ''بائع'' اور ہم ''مشتری'' ہوتے، تلطف ونوازش کی حد ہوگئی کہ اس ذرا سی چیز کے (حالانکہ وہ بھی فی الحقیقت اسی کی ہے) معاوضہ میں جنت جیسی لازوال اور قیمتی چیز کو ہمارے لیے مخصوص کر دیا، جیسا کہ بالجنۃ کی جگہ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ فرمانے سے ظاہر ہوتا ہے:

نیم جاں بستاند وصد جاں دہد   آنچہ در ہمت نیاید آں دہد

پھر یہ نہیں کہ ہمارے جان ومال خرید لیے گئے تو فوراً ہمارے قبضہ سے نکال لئے جائیں صرف اس قدر مطلوب ہے کہ جب موقع پیش آئے جان ومال خدا کے راستہ میں پیش کرنے کے لیے تیار رہیں، دینے سے بخل نہ کریں خواہ وہ لیں یا نہ لیں، اسی کے پاس چھوڑے رکھیں، اسی لیے فرمایا: يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ یعنی مقصود خدا کی راہ میں جان ومال حاضر کر دینا ہے، بعدہ ماریں یا مارے جائیں، دونوں صورتوں میں ''عقد مبیع'' پورا ہو گیا اور یقینی طور پر ''ثمن'' کے مستحق ٹھہر گئے ممکن ہے کسی کو وسوسہ گزرتا کہ معاملہ تو بیشک بہت سودمند اور فائدہ بخش ہے لیکن ثمن نقد نہیں ملتا، اس کا جواب دیا: وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ یعنی ''زرثمن'' کے مارے جانے کا کوئی خطرہ نہیں، خدا تعالیٰ نے بہت تاکید واہتمام سے پختہ دستاویز لکھ دی ہے جس کا خلاف ناممکن ہے، کیا خدا سے بڑھ کر صادق القول، راست باز اور وعدہ کا پکا کوئی دوسرا ہوسکتا ہے؟ ہرگز نہیں، لہٰذا اس کا ادھار بھی دوسروں کے نقد سے ہزاروں درجہ پختہ اور بہتر ہوگا پھر مومنین کے لیے خوش ہونے اور اپنی قسمت پر نازاں ہونے کا اس سے بہتر کون سا موقع ہوگا کہ خود رب العزت ان کا خریدار بنے، اور اس شان سے بنے، سچ فرمایا عبداللہ بن رواحہ نے کہ یہ وہ ''بیع'' ہے جس کے بعد ''اقالت'' کی کوئی صورت ہم باقی رکھنا نہیں چاہتے، حق تعالیٰ اپنے فضل سے ہم ناتوانوں کوان مومنین کے زمرہ میں محشور فرمائے آمین۔

اَلتَّآىِٕبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآىِٕحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ

وہ توبہ کرنے والے ہیں بندگی کرنے والے شکر کرنے والے بے تعلق رہنے والے ۱؎ رکوع کرنے والے سجدہ کرنے والے حکم کرنے والے نیک بات کا

وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۲﴾

اور منع کرنے والے بری بات سے ۲؎ اور حفاظت کرنے والے ان حدود کے جو باندھی اللہ نے، اور خوشخبری سنادے ایمان والوں کو ۳؎

خلاصہ تفسیر: وہ (مجاہدین ایسے ہیں جو جہاد کے علاوہ دوسرے کمال کے ساتھ بھی موصوف ہیں کہ گناہوں سے) توبہ کرنے والے ہیں (اور اللہ کی) عبادت کرنے والے (ہیں، اور اللہ کی) حمد کرنے والے (ہیں، اور) روزہ رکھنے والے (ہیں، اور) رکوع اور سجدہ کرنے والے (ہیں، یعنی نماز پڑھتے ہیں، اور) نیک باتوں کی تعلیم کرنے والے (ہیں) اور بری باتوں سے باز رکھنے والے (ہیں) اور اللہ کی حدود کا (یعنی احکام کا) خیال رکھنے والے (ہیں) اور ایسے مؤمنین کو (جن میں جہاد اور یہ صفات ہوں) آپ خوش خبری سنا دیجئے (کہ ان سے جنت کا وعدہ ہے)۔

اَلتَّآىِٕبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ: ان صفات کی قید لگانے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان صفات کے بغیر جہاد کا ثواب نہیں ملتا، کیونکہ بہت سی نصوص میں صرف جہاد پر بھی بشارتیں وارد ہیں، البتہ ایمان کی شرط ضروری ہے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ ان سب صفات کے جمع ہونے پر ثواب اور فضیلت بڑھ جاتی ہے تاکہ محض جہاد پر ہی بھروسہ کر کے نہ بیٹھ جائیں، بلکہ ان عبادات کو بھی ہمیشہ بجالاتے رہیں۔

* * *

فائدہ: ۱؎ الْحٰمِدُوْنَ السَّآىِٕحُوْنَ: ① بعض نے سائحون سے مراد روزہ دار لیے ہیں، کیونکہ روزہ دار کھانے پینے وغیرہ لذائذ و مرغوبات سے بے تعلق ہو کر روحانی مدارج اور ملکوتی مقامات کی سیر کرتا ہے۔

② بعض کے نزدیک اس لفظ کا مصداق ''مہاجرین'' ہیں جو گھر بار سے بے تعلق ہو کر ''دار السلام'' میں سکونت پذیر ہوتے ہیں۔

③ بعض نے ''مجاہدین'' کا ارادہ کیا ہے کہ مجاہد اپنی جان تک سے بے تعلق ہو کر خدا کے راستہ میں قربان ہونے کے لیے نکلتا ہے۔

④ بعض کی رائے میں یہ لفظ طلبہ علوم کے لیے ہے جو وطن، کنبہ، راحت و آسائش وغیرہ سب کو خیر باد کہہ کر طلب علم کے لیے نکل کھڑے ہوتے ہیں، بہر حال مترجم محقق نے جو ترجمہ کیا، اس میں ان سب اقوال کی گنجائش ہے مگر اکثر سلف کے نزدیک پہلی تفسیر مختار ہے، واللہ اعلم۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ شاید بے تعلق رہنے سے مراد یہ ہو کہ دنیا میں دل نہ لگائے۔

فائدہ: ۲؎ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ: یعنی خود درست ہونے کے ساتھ دوسروں کو بھی درست کرتے ہیں، گویا ان کا کام ہے عبادت حق اور خیر خواہی خلق۔

فائدہ: ۳؎ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ: یعنی نیکی بدی کی جو حدود حق تعالیٰ نے معین فرما دی ہیں، ان سے تجاوز نہ کرے، خلاصہ یہ ہے کہ بے حکم شرح کوئی قدم نہ اٹھائے، یہ سب صفات ان مومنین کی ہوئیں، جو جان و مال سے خدا کے ہاتھ پر بک چکے ہیں۔

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَلَوْ كَانُوْٓا اُولِيْ قُرْبٰى مِنْۢ بَعْدِ

لائق نہیں نبی کو اور مسلمانوں کو کہ بخشش چاہیں مشرکوں کی اور اگرچہ وہ ہوں قرابت والے جب کہ

مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ﴿۱۱۳﴾

کھل چکا ان پر کہ وہ ہیں دوزخ والے

خلاصہ تفسیر: سورۃ توبہ کا زیادہ حصہ کفار ومشرکین سے براءت اور بیزاری کے احکام پر مشتمل ہے، اسی لئے اس کا ایک نام سورۃ براءت بھی معروف ہے، اوپر جس قدر احکام آئے وہ دنیوی زندگی میں کفار ومشرکین سے براءت اور قطع تعلق کے متعلق ہیں، اس آیت میں یہی حکم براءت اور قطع تعلق کا اخروی زندگی کے لئے آیا ہے کہ مرنے کے بعد کافر ومشرک کے لئے دعاء مغفرت کرنا بھی جائز نہیں، جیسا کہ پہلے ایک آیت میں منافقین کی نماز جنازہ پڑھنے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو منع کیا گیا ہے، وجہ اس کی یہ ہوئی کہ ابوطالب کی وفات کے بعد آپ نے فرمایا کہ جب تک مجھ کو ممانعت نہ ہوگی ان کے لیے استغفار کروں گا، اس پر اور مسلمانوں نے بھی اپنے مشرک مردوں کے لیے استغفار شروع کیا تو اس آیت میں اس کی ممانعت آئی، بعض کو شبہ ہوا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی تو اپنے باپ کے لیے استغفار فرمایا تھا اس پر اگلی آیت میں جواب نازل ہوا۔

پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اور دوسرے مسلمانوں کو جائز نہیں کہ مشرکین کے لئے مغفرت کی دعا مانگیں اگر چہ وہ رشتہ دار ہی (کیوں نہ) ہوں اس امر کے ظاہر ہو جانے کے بعد کہ یہ لوگ دوزخی ہیں (اس وجہ سے کہ کافر ہو کر مرے ہیں)۔

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ: اس آیت میں صراحت ہے کہ ایمان کے بغیر محض برکات کام نہیں آتیں، دیکھو! حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت سے بڑھ کر کون سی برکت ہوگی، پھر بھی یہ حکم دیا جارہا ہے کہ پیغمبر اور دوسرے مسلمانوں جائز نہیں کہ مشرکین کے لیے مغفرت کی دعا مانگیں اگر چہ وہ رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو (کسی نسبت، رشتے ناطے کا کیا مقام ہوگا جبکہ وہ ایمان اور عمل صالح سے خالی ہو!!!)۔

* * *

فائدہ: مومنین جب جان و مال سے خدا کے ہاتھوں بیع ہو چکے تو ضروری ہے کہ تنہا اسی کے ہو کر رہیں، اعداءُ اللہ سے جن کا دشمن خدا اور جہنمی ہونا معلوم ہو چکا ہو، محبت و مہربانی کا واسطہ نہ رکھیں، خواہ دشمنان خدا ان کے ماں باپ، چچا، تایا اور خاص بھائی بند ہی کیوں نہ ہوں، جو خدا کا باغی اور دشمن ہے وہ ان کا دوست کیسے ہوسکتا ہے، پس جس شخص کی بابت پتہ چل جائے کہ وہ بالیقین دوزخی ہے، خواہ وحی الٰہی کے ذریعہ سے یا اس طرح کے اعلانیہ کفر وشرک پر اس کو موت آچکی ہو، اس کے حق میں استغفار کرنا اور بخشش مانگنا ممنوع ہے، بعض روایات میں ہے کہ یہ آیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ حضرت آمنہ کے بارہ میں نازل ہوئی، بعض احادیث میں مذکورہ ہے کہ آپ کے چچا ابو طالب کے حق میں اتری، اور بعض نے نقل کیا ہے کہ مسلمانوں نے چاہا کہ اپنے آباؤ مشرکین کے لیے جو مر چکے تھے استغفار کریں، اس آیت میں ان کو منع کیا گیا، بہر حال شان نزول کچھ ہو، حکم یہ ہے کہ کفار ومشرکین کے حق میں جن کا خاتمہ کفر وشرک پر معلوم ہو جائے، استغفار جائز نہیں۔

تنبیہ: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین کے بارہ میں علمائے اسلام کے اقوال بہت مختلف ہیں، بعض نے ان کو مومن وناجی ثابت کرنے کے لیے مستقل رسائل لکھے ہیں، اور شراح حدیث نے محدثانہ ومتکلمانہ بحثیں کی ہیں، احتیاط وسلامت روی کا طریقہ اس مسئلہ میں یہ ہے کہ زبان بند رکھی جائے، اور ایسے نازک مباحث میں خوض کرنے سے احتراز کیا جائے حقیقت حال کو خدا ہی جانتا ہے اور وہ ہی تمام مسائل کا ٹھیک ٹھیک فیصلہ کرنے والا ہے۔

وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ

اور بخشش مانگنا ابراہیم کا اپنے باپ کے واسطے سو نہ تھا مگر وعدہ کے سبب کہ وعدہ کر چکا تھا اس سے، پھر جب کھل گیا ابراہیم پر کہ وہ دشمن ہے اللہ کا

تَبَرَّاَ مِنْهُ ۭ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۱۴﴾

تو اس سے بیزار ہو گیا، بیشک ابراہیم بڑا نرم دل تھا تحمل کرنے والا

خلاصہ تفسیر: اور (اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصہ سے یہ شبہ ہو کہ انہوں نے اپنے باپ کے لئے دعائے مغفرت کی تھی تو اس کا جواب یہ ہے کہ) ابراہیم کا اپنے باپ کے لئے دعائے مغفرت مانگنا (وہ اس سے قبل تھا کہ والد کا دوزخی ہونا ظاہر ہو جائے، اور) وہ (بھی) صرف

وعدہ کے سبب سے تھا جوانہوں نے اس سے وعدہ کرلیا تھا (ابراہیم نے اپنے والد سے اس قول: سَاَسۡتَغۡفِرُ لَكَ رَبِّيۡ کے ذریعہ وعدہ کرلیا تھا، غرض ان کا استغفار جائز تو اس لئے تھا کہ اس کا دوزخی ہونا ظاہر نہ ہوا تھا، اور استغفار اس لیے کیا کہ اس سے وعدہ کرلیا تھا، اگر وعدہ نہ کیا ہوتا تو باوجود جائز ہونے کے پھر بھی نہ کرتے، اور) پھر جب ان پر یہ بات ظاہر ہوگئی کہ وہ خدا کا دشمن (یعنی کافر ہو کر مرا) ہے تو وہ اس سے محض بے تعلق ہو گئے (کہ استغفار بھی چھوڑ دیا، کیونکہ اس وقت دعائے مغفرت کرنا بے معنی ہے، کیونکہ کافر میں مغفرت کا احتمال ہے ہی نہیں، بخلاف زندگی کی حالت میں کافر کے لیے دعاء مغفرت کے یہ معنی ہو سکتے ہیں کہ اس کو ہدایت کی توفیق ہو جائے، کیونکہ توفیق ہدایت کے لئے مغفرت لازم ہے، اور رہا یہ کہ وعدہ کیوں کرلیا تھا؟ وجہ اس کی یہ ہے کہ) واقعی ابراہیم بڑے رحیم المزاج حلیم الطبع تھے (کہ باوجود یکہ باپ نے ان کو کیسی کیسی سخت باتیں کہیں، مگر تحمل سے کام لیا، اور اس سے بڑھ کر یہ کہ شفقت کے جوش میں استغفار کا وعدہ کرلیا اور جب تک نفع کا احتمال رہا اس وعدہ کو پورا فرمایا، جب ناامیدی ہوگئی ہار کر چھوڑ دیا، بخلاف تمہارے کہ تم مشرکین کے مرنے کے بعد استغفار کر رہے ہو، جن کا کفر کی حالت پر مرنا مشاہدہ سے معلوم ہو چکا ہے اور احکام شرعیہ میں ایسا مشاہدہ کافی ہے، پھر تم اپنے استغفار کو ان کے استغفار پر کیسے قیاس کر سکتے ہو)۔

وَمَا كَانَ اسۡتِغۡفَارُ اِبۡرٰهِيۡمَ لِاَبِيۡهِ: اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کریم میں جو ابراہیم علیہ السلام کی دعا آئی ہے: **واغفر لابی** کہ میرے باپ کی مغفرت کر دیجیے اس کے معنی یہ ہیں کہ: "واهد أبي" یعنی میرے باپ کو ہدایت دے دیں، اور اسی دعا کے اگلے جملہ میں **انه کان من الضالین** اس کے بہت ہی مناسب ہے، قرآن مجید کے مختلف مواقع میں جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اپنے والد کے لیے دعا مغفرت کرنا منقول ہے وہ سب اسی پر محمول ہونا چاہیے، جیسے ایک اور آیت میں ہے: رَبَّنَا اغۡفِرۡلِيۡ وَلِوَالِدَيَّ وَلِلۡمُؤۡمِنِيۡنَ يَوۡمَ يَقُوۡمُ الۡحِسَابُ کہ قیامت کے دن میرے والدین کو بخش دیجیے، اس کا مطلب بھی یہ ہوگا کہ ان کو ایمان واسلام کی ہدایت وتوفیق دے تاکہ قیامت کے دن ان کی مغفرت ہو سکے۔

بخاری کی حدیث میں جو آیا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام قیامت میں حق تعالیٰ سے عرض کریں گے کہ آپ نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ قیامت میں مجھے رسوا نہ کیا جائے گا تو اس سے زیادہ کیا رسوائی ہے کہ میرا باپ جہنمی ہے، تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس وقت آپ والد کی مغفرت چاہیں گے، بلکہ مطلب یہ ہوگا کہ کسی طرح مجھ کو رسوائی سے بچایے، کیونکہ اس میں بھی ایک گونا رسوائی ہے کہ میرا باپ اس حالت میں ہو، اور حق تعالیٰ کے جواب کا حاصل یہ ہوگا کہ رسوائی سے بچانے کا یہ طریقہ تو نہیں ہو سکتا کہ اس کی مغفرت کر دی جائے، ہم دوسری صورت تجویز کرتے ہیں کہ اس کی صورت بدل دیتے ہیں تاکہ کوئی اس کو پہچانے نہیں اور تم کو شرمندگی نہ ہو، چنانچہ وہ پھر الد کی شکل کو بدل دیا جائے گا۔

اس میں اس بات پر بھی دلیل ہے کہ بڑا جس فعل سے اپنے چھوٹوں کو منع کرے اور پھر خود کسی ضرورت کے تحت وہی فعل کرنا پڑے تو چاہیے کہ چھوٹوں کے سامنے اسے کھول کر بیان کر دے تاکہ چھوٹے اس کی تقلید میں مبتلا نہ ہو جائیں۔

* * *

فائدہ: سورہ مریم میں ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے باپ نے قبول حق سے اعراض کیا اور ضد وعناد سے حضرت ابراہیم کو قتل کی دھمکیاں دینے لگا، تو آپ نے والدین کا ادب ملحوظ رکھتے ہوئے فرمایا: سَلٰمٌ عَلَيۡكَ‌ ۚ سَاَسۡتَغۡفِرُ لَكَ رَبِّيۡ (مریم: ۴۷) یعنی میں خدا سے تیرے لیے استغفار کروں گا، اس وعدہ کے موافق آپ برابر استغفار کرتے رہے چنانچہ دوسری جگہ وَاغۡفِرۡ لِاَبِيۡۤ فرمانے کی تصریح ہے، اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ ابراہیم علیہ السلام ایک مشرک کی حالت شرک پر قائم رہتے ہوئے مغفرت چاہتے تھے، نہیں غرض یہ تھی کہ اللہ اس کو توفیق دے کہ حالت شرک سے نکل کر آغوش اسلام میں آجائے اور قبول اسلام اس کی خطاؤں کے معاف ہونے کا سبب بنے، "اِنَّ الۡاِسۡلَامَ يَهۡدِمُ مَا كَانَ قَبۡلَه"، ابراہیم علیہ السلام کے استغفار کو قرآن میں پڑھ کر بعض صحابہ کے دلوں میں خیال آیا کہ ہم بھی اپنے مشرک والدین کے حق میں استغفار کریں، اس کا جواب حق تعالیٰ نے دیا کہ ابراہیم نے وعدہ کی بنا پر صرف اس وقت تک اپنے باپ کے لیے استغفار کیا، جب تک یقینی طور سے یہ واضح نہیں ہوا تھا کہ اسے کفر وشرک اور خدا کی دشمنی پر مرنا ہے، کیونکہ مرنے سے پہلے احتمال تھا کہ توبہ کر کے مسلمان ہو جائے اور بخشا جائے پھر جب کفر وشرک پر خاتمہ ہونے سے صاف کھل گیا

کہ وہ حق کی دشمنی سے باز آنے والا نہ تھا، تو ابراہیم علیہ السلام اس سے بالکلیہ بیزار ہو گئے، اور دعاء واستغفار وغیرہ ترک کر دیا، پہلے نرم دلی اور شفقت سے دعاء کرتے تھے، جب توبہ ورجوع کے احتمالات منقطع ہو گئے، تو آپ نے اس کی خیر خواہی سے ہاتھ اٹھالیا، اور اس حادثہ کو پیغمبرانہ صبر وتحمل سے برداشت کیا، حدیث میں ہے کہ محشر میں ابراہیم علیہ السلام عرض کریں گے کہ خداوندا! تیرا وعدہ ہے کہ مجھے رسوا نہ کرے گا، مگر اس سے زیادہ کیا رسوائی ہوگی کہ آج میرا باپ سب کے سامنے دوزخ میں پھینکا جائے، اسی وقت ان کے باپ کی صورت مسخ ہو کر ضبع (کفتار) کی سی ہو جائے گی اور فرشتے گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دیں گے، شاید یہ اس لیے ہو کہ لوگ اسے پہچان نہ سکیں، کیونکہ رسوائی کا دارومدار شناخت پر ہے جب شناخت نہ رہے گی کہ کیا چیز دوزخ میں پھینکی گئی، پھر بیٹے کی رسوائی کا کچھ مطلب نہیں۔

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِلَّ قَوْمًۢا بَعْدَ اِذْ هَدٰىهُمْ حَتّٰى يُبَيِّنَ لَهُمْ مَّا يَتَّقُوْنَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۱۱۵﴾

اور اللہ ایسا نہیں کہ گمراہ کرے کسی قوم کو جب کہ انکو راہ پر لا چکا جب تک کھول نہ دے ان پر جس سے انکو بچنا چاہیے، بیشک اللہ ہر چیز سے واقف ہے

خلاصہ تفسیر: اوپر مشرکین کے لیے دعائے مغفرت کرنے کو ناجائز فرمایا تھا، چونکہ برے افعال کا خاصہ یہ ہے کہ ان کے کرنے سے دل سیاہ ہو جاتا ہے اور بار بار کرنے سے وہ سیاہی بڑھ جاتی ہے اس لیے مسلمانوں کو وہم ہو سکتا تھا کہ اس ناجائز استغفار سے کہیں یہ نقصان ہمیں نہ پہنچ جائے، اس کے متعلق اب آگے تسلی فرماتے ہیں کہ یہ اثر کسی فعل سے اس وقت ہوتا ہے جبکہ منع کرنے کے بعد اس کو کیا جائے، کیونکہ ممانعت کے بعد ہی وہ ناجائز ہوتا ہے، اس سے پہلے جائز رہتا ہے تو یہ نقصان بھی اس سے نہیں ہوتا اور تسلی کے بعد تاکید کے لیے اپنی صفات کمال بیان فرماتے ہیں۔

اور اللہ ایسا نہیں کرتا کہ کسی قوم کو ہدایت کئے پیچھے (کے بعد) گمراہ کر دے جب تک کہ ان چیزوں کو صاف صاف نہ بتلا دے جن سے وہ بچتے رہیں (پس جب ہم نے تم مسلمانوں کو ہدایت کی اور اس سے پہلے مشرکین کے لیے استغفار کی ممانعت نہ بتلائی تھی تو اس کے کرنے سے تم کو یہ سزا نہیں دی جائے گی کہ تم میں گمراہی کا مادہ پیدا کر دیا جائے) بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز کو خوب جانتے ہیں (سو وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ بغیر ہمارے بتلائے ہوئے ایسے احکام کو کوئی نہیں جان سکتا، اس لئے ان افعال سے نقصان بھی نہیں پہنچنے دیتے)۔

باقی کفار کو جو ہدایت سے پہلے گمراہی ہوتی ہے وہ بھی حق واضح کر دینے کے بعد ہوتی ہے جیسا کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں: **وما کنا معذبین حتی نبعث رسولا** کہ ہم کسی (قوم) کو رسول بھیجنے سے پہلے عذاب نہیں کرتے، پس یہ حکم مسلمانوں ہی کے لیے خاص نہیں۔

* * *

فائدہ: یعنی اتمام حجت اور اظہار حق سے پہلے خدا کسی کو گمراہ نہیں کرتا، گمراہی یہ ہے کہ جب خدا اپنے احکام صاف کھول کر بیان کر چکا، پھر امتثال نہ کیا جائے، گویا اشارہ کر دیا کہ جو لوگ ممانعت سے قبل مشرکین کے لیے استغفار کر چکے ہیں ان پر مواخذہ نہیں، لیکن اب اطلاع پانے کے بعد ایسا کرنا گمراہی ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ؕ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۱۱۶﴾

اللہ ہی کی سلطنت ہے آسمانوں اور زمین میں، جلاتا ہے اور مارتا ہے، اور تمہارا کوئی نہیں اللہ کے سوا حمایتی اور نہ مددگار

خلاصہ تفسیر: (اور) بلاشبہ اللہ ہی کی سلطنت ہے آسمانوں اور زمین میں وہی جلاتا اور مارتا ہے (یعنی ہر طرح کی حکومت اور قدرت اسی کے لئے خاص ہے، اس لئے جو چاہے حکم دے سکتا ہے، اور جس نقصان سے چاہے بچا سکتا ہے) اور تمہارا اللہ کے سوا نہ کوئی یار ہے نہ مددگار ہے (بلکہ وہی یار و مددگار ہے، اس لئے ممانعت سے پہلے وہ تم کو نقصان سے بچاتا ہے، اور اگر تم نے ممانعت کے بعد اطاعت نہ کی تو اور کوئی بچانے والا نہیں، خوب سمجھ لو)۔

* * *

فائدہ: جب اس کی سلطنت ہے تو اسی کا حکم چلنا چاہیے، وہ علم محیط اور قدرت کاملہ سے جو احکام نافذ کرے بندوں کا کام ہے کہ بے خوف و خطر تعمیل کریں، کسی کی رو رعایت کو دخل نہ دیں، کیونکہ خدا کے سوا کوئی کام آنے والا نہیں۔

لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا

اللہ مہربان ہوا نبی پر اور مہاجرین اور انصار پر جو ساتھ رہے نبی کے مشکل کی گھڑی میں[1] بعد اس کے

كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۱۷﴾

کہ قریب تھا کہ دل پھر جائیں بعضوں کے ان میں سے پھر مہربان ہوا اُن پر، بیشک وہ ان پر مہربان ہے رحم کرنے والا[2]

خلاصہ تفسیر: پیچھے بہت سی آیتیں غزوہ تبوک کے متعلق تھیں، اب آگے بھی اسی کے متعلق غزوہ میں شریک ہونے والوں اور شریک نہ ہونے والوں میں سچ بولنے والوں اور توبہ کرنے والوں کی تعریف اور ان کا مقبول ہونا بیان فرماتے ہیں، پیچھے آیت: وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ میں جن حضرات کا معاملہ دوسرا حکم آنے تک ملتوی کیا گیا تھا اب آگے ان کی توبہ قبول ہونے کی بشارت دی گئی ہے، جیسا کہ پیچھے گزر چکا کہ غزوہ تبوک کیلئے سب مسلمانوں کو نکلنے کا عام حکم ہونے کے وقت اہل مدینہ کے لوگوں کی پانچ قسمیں ہوگئی تھیں، دو قسمیں بغیر عذر پیچھے ہٹ جانے والوں کی تھیں جن کا بیان گذشتہ آیات میں تفصیل کے ساتھ آچکا ہے، اب آگے مؤمنین مخلصین کی تین قسموں کا ذکر ہے: ① اول وہ لوگ جو حکم جہاد پاتے ہی فوراً تیار ہوگئے، ان کا بیان آیت مذکورہ کے ابتدائی جملے: الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ میں ہوا ② دوسرے وہ لوگ جو ابتداءً کچھ تردد میں رہے، مگر پھر سنبھل گئے اور جہاد کیلئے سب کے ساتھ ہوگئے ان کا بیان اسی آیت کے اس جملے: مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ میں ہے۔

اللہ تعالیٰ نے پیغمبر (ﷺ) کے حال پر توجہ فرمائی (کہ آپ کو نبوت، امامت جہاد اور تمام خوبیاں عطا فرمائیں) اور مہاجرین اور انصار کے حال پر بھی (توجہ فرمائی کہ ان کو ایسی مشقت کے جہاد میں مستقیم رکھا) جنہوں نے ایسی تنگی کے وقت میں پیغمبر کا ساتھ دیا، بعد اس کے کہ ان میں سے ایک گروہ کے دلوں میں تزلزل ہو چلا تھا (اور جہاد میں جانے سے ہمت ہارنے کو تھے مگر) پھر اللہ نے ان (گروہ) کے حال پر توجہ فرمائی (کہ ان کو سنبھال لیا اور آخر ساتھ ہو ہی لئے، پس) بلاشبہ اللہ تعالیٰ سب پر بہت ہی شفیق مہربان ہے (کہ اپنی مہربانی سے ہر ایک کے حال پر کس کس طرح توجہ فرمائی)۔

لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ: اس مقام پر جناب رسول اللہ ﷺ کا ذکر تبرکا ہے، نیز صحابہ کا جی خوش کرنے کے لیے کہ وہ یہ سمجھ کر خوش ہوں کہ ہم بھی اس خاص عنایت سے محروم نہ رہیں گے جو آپ کی مقدس ذات کے ساتھ ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ توبہ تو گناہ و معصیت کی وجہ سے ہوتی ہے، رسول اللہ ﷺ اس سے معصوم ہیں، ان کی توبہ قبول کرنے کا کیا مطلب ہے؟ اس کے علاوہ جو صحابہ مہاجرین و انصار اول ہی جہاد کے لیے تیار ہو گئے، انہوں نے بھی کوئی قصور نہیں کیا تھا، ان کی توبہ کس جرم کی تھی جو قبول ہوگئی؟ جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان سب کو گناہ سے بچا دیا، اسی کو توبہ کے نام سے تعبیر کیا گیا، یا یہ کہ ان سب حضرات کو حق تعالیٰ نے توّاب بنا دیا، اس میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ توبہ کی حاجت و ضرورت سے کوئی شخص مستغنی نہیں، یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے مخصوص صحابہ بھی، جیسا کہ ایک دوسری آیت میں ہے: وَتُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا، یعنی توبہ کرو اللہ سے سب کے سب، وجہ یہ ہے کہ تقرب الی اللہ کے درجات غیر متناہی ہیں، جو شخص جس مقام پر پہنچا ہے اس سے آگے بھی اس سے بلند مقام ہے، جس کے مقابلہ میں موجودہ مقام پر رک جانا ایک نقص و کوتاہی ہے، مولانا رومی نے اسی مضمون کو ایک شعر میں اس طرح بیان فرمایا ہے:

اے برادر بے نہایت درگہی ست　　ہر چہ بروے می رسی بروے مایست

اس لحاظ سے موجودہ مقام پر ہونے سے توبہ کی ضرورت ہے، تاکہ اگلا مقام حاصل ہو۔

فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ: تنگی اور مصیبت کا وقت اس لیے فرمایا کہ وہ زمانہ سخت گرمی کا تھا، سفر لمبا تھا، اور مقابلہ ماہر لشکر سے تھا، سواری کی بہت کمی تھی، کھانے پینے کا سامان رسد بھی اس درجہ کم تھا کہ بعض دفعہ ایک چھوارے کو آگے پیچھے کئی کئی آدمی شریک ہو کر کھاتے، سواری کے اونٹ ذبح کرنے پڑے، ان کی آلائش کو نچوڑ کر پینا پڑا۔

* * *

فائدہ: ۱۔ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ: مشکل کی گھڑی سے مراد "غزوہ تبوک" کا زمانہ ہے جس میں کئی طرح کی مشکلات جمع تھیں، سخت گرمی، طویل مسافت، کھجور کا موسم، اس زمانہ کی عظیم الشان سلطنت کے مقابلہ پر فوج کشی، پھر ظاہری بے سروسامانی ایسے کہ ایک ایک کھجور روزانہ دو دو سپاہیوں پر تقسیم ہوتی تھی، اخیر میں یہ نوبت پہنچ گئی کہ بہت سے مجاہدین ایک ہی کھجور کو یکے بعد دیگرے چوس کر پانی پی لیتے تھے، پھر پانی کے فقدان سے اونٹوں کی آلائش نچوڑ کر پینے کی نوبت آگئی، سواری کا اتنا قحط تھا کہ دس دس آدمی ایک ایک اونٹ پر اترتے چڑھتے چلے جا رہے تھے، یہ ہی وہ جذبہ ایثار و فداکاری تھا جس نے مٹھی بھر جماعت کو تمام دنیا کی قوموں پر غالب کر دیا، فللہ الحمد والمنہ۔

فائدہ: ۲۔ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ: خدا کی مہربانیاں پیغمبر ﷺ پر بیشمار ہیں، اور آپ کی برکت سے مہاجرین وانصار پر بھی حق تعالیٰ کی مخصوص توجہ اور مہربانی رہی ہے کہ ان کو ایمان وعرفان سے مشرف فرمایا، اتباع نبوی، جہاد فی سبیل اللہ اور عزائم امور کے سرانجام دینے کی ہمت و توفیق بخشی، پھر ایسے مشکل وقت میں جبکہ بعض مومنین کے قلوب بھی مشکلات اور صعوبتوں کا ہجوم دیکھ کر ڈگمگانے لگے تھے اور قریب تھا کہ رفاقت نبوی ﷺ سے پیچھے ہٹ جائیں، حق تعالیٰ نے دوبارہ مہربانی اور دستگیری فرمائی کہ ان کو اس قسم کے خطرات ووساوس پر عمل کرنے سے محفوظ رکھا اور مومنین کی ہمتوں کو مضبوط اور ارادوں کو بلند کیا۔

وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا ؕ حَتّٰۤى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ

اور ان تین شخصوں پر جن کو پیچھے رکھا تھا۱ یہاں تک کہ جب تنگ ہوگئی ان پر زمین باوجود کشادہ ہونے کے اور تنگ ہوگئیں

عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوْۤا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّاۤ اِلَيْهِ ؕ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا ؕ

ان پر ان کی جانیں اور سمجھ گئے کہ کہیں پناہ نہیں اللہ سے مگر اسی کی طرف، پھر مہربان ہوا اُن پر تاکہ وہ پھر آئیں

اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۱۸﴾

بیشک اللہ ہی ہے مہربان رحم والا۲

خلاصہ تفسیر: تیسری قسم وہ مومنین مخلصین تھے جو اگرچہ وقتی کاہلی وسستی کی وجہ سے جہاد میں نہ گئے، مگر بعد میں نادم اور تائب ہوئے، اور بالآخر ان سب کی توبہ قبول ہوگئی، مگر ان میں پھر دو قسم ہوگئی تھیں، یہ کل دس آدمی تھے، پہلی قسم جن میں سے سات آدمیوں نے تو رسول اللہ ﷺ کی واپسی کے بعد فوراً اپنی ندامت وتوبہ کا اظہار اس شان سے کیا کہ اپنے آپ کو مسجد نبوی کے ستونوں سے باندھ لیا کہ جب تک ہماری توبہ قبول نہ ہوگی بندھے رہیں گے، ان کی آیت توبہ تو اسی وقت نازل ہوگئی جس کا بیان پہلے گذر چکا ہے، اب یہاں دوسری قسم کا ذکر ہے، تین آدمی وہ تھے جنہوں نے یہ عمل نہیں کیا، وہ تین بزرگ یہ تھے: ① کعب بن مالک ② مرارۃ بن ربیع ③ ہلال بن امیہ، ان کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام کو مقاطعہ (بائیکاٹ) کا حکم دے دیا کہ کوئی ان کے ساتھ سلام کلام نہ کرے، اسی حالت میں ان پر پچاس دن گزر گئے، جس سے یہ حضرات سخت پریشان ہوگئے، آخر یہ آیت نازل ہوئی، جس میں بالآخران کی توبہ کے قبول ہونے کا بیان ہے، اور اس کے ساتھ ہی ان سے مقاطعہ (بائیکاٹ) کا حکم ختم کر دیا گیا۔

اور ان تین شخصوں کے حال پر بھی (توجہ فرمائی) جن کا معاملہ ملتوی چھوڑ دیا گیا تھا، یہاں تک کہ جب (ان کی پریشانی کی یہ نوبت پہنچی کہ)

زمین باوجود اپنی (اتنی بڑی) فراخی کے ان پر تنگی کرنے لگی اور وہ خود اپنی جان سے تنگ آ گئے اور انہوں نے سمجھ لیا کہ خدا (کی گرفت) سے کہیں پناہ نہیں مل سکتی بجز اس کے کہ اسی کی طرف رجوع کیا جائے (اس وقت وہ خاص توجہ کے قابل ہوئے) پھر ان کے حال پر (بھی خاص) توجہ فرمائی تا کہ وہ آئندہ بھی (ایسے مصیبت ومعصیت کے موقع پر اللہ کی طرف) رجوع رہا کریں بیشک اللہ تعالیٰ بہت توجہ فرمانے والے بڑے رحم کرنے والے ہیں۔

کسی شخص کو خلاف شرع کام کرنے پر سزا دینا کہ اس سے سلام وکلام ترک کر دیا جائے جائز ہے، حدیث میں جو ممانعت آئی کہ تین دن سے زیادہ بات چیت بند نہ کرے اس سے مراد وہ صورت ہے جس کا سبب کوئی دنیاوی رنج ہو، واللہ اعلم۔

ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوبُوا: پھر اللہ نے ان کے حال پر توجہ فرمائی تا کہ وہ آئندہ بھی اللہ کی طرف رجوع رہا کریں، چنانچہ حق تعالیٰ کی اپنے خاص بندوں کے ساتھ یہ عادت جاری ہے کہ جب ان خاصان خدا سے ان کے مقام ومرتبے کے خلاف کوئی کام سرزد ہو جاتا ہے تو ایک قسم کے حجاب سے ان کی تادیب کی جاتی ہے، جب وہ اس کی تلخی چکھ لیتے ہیں تو ان پر کرم کی بارش فرمائی جاتی ہے۔

* * *

فائدہ: ۱۔ یہ تین شخص ① کعب بن مالک ② ہلال بن امیہ اور ③ مرارہ بن الربیع ہیں، جو باوجود مومن مخلص ہونے کے محض تن آسانی اور سہل انگاری کی بناء پر بدون عذر شرعی کے تبوک کی شرکت سے محروم رہے، جب حضور ﷺ واپس تشریف لائے تو نہ انہوں نے منافقین کی طرح جھوٹے عذر پیش کئے اور نہ بعض صحابہ کی طرح اپنے آپ کو ستونوں سے باندھا، جو واقعہ تھا صاف صاف عرض کر دیا، اور اپنی کوتاہی اور تقصیر کا اعلانیہ اعتراف کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ منافقین کی طرف سے بظاہر اغماض کر کے ان کے بواطن کو خدا کے سپرد کیا گیا، ''اصحاب سواری'' کی (یعنی جو مسجد کے ستونوں سے بندھے ہوئے تھے) توبہ قبول کر لی گئی، اور ان تینوں کا فیصلہ تادیباً کچھ مدت کے لیے ملتوی رکھا گیا، پچاس دن گزرنے کے بعد ان کی توبہ قبول ہوئی پیچھے رکھے جانے کا یہ ہی مطلب ہے جیسا کہ بخاری میں خود کعب بن مالک سے نقل کیا ہے۔

فائدہ: ۲۔ ان تین میں سے حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ نے اپنا واقعہ نہایت شرح وبسط سے عجیب موثر طرز میں بیان فرمایا ہے، صحیح بخاری وغیرہ میں ملاحظہ کیا جائے، یہاں اس کے بعض اجزاء نقل کیے جاتے ہیں، کعب بن مالک فرماتے ہیں کہ تبوک کی مہم چونکہ بہت سخت اور دشوار گزار تھی، حضور ﷺ نے صحابہ کو عام حکم تیاری کا دیا، لوگ مقدور واستطاعت کے موافق سامان سفر درست کرنے میں مشغول تھے مگر میں بے فکر تھا کہ جب چاہوں گا فوراً تیار ہو کر ساتھ چلا جاؤں گا، کیونکہ بفضل ایزدی اس وقت ہر طرح کا سامان مجھ کو میسر تھا، ایک چھوڑ دو سواریاں میرے پاس موجود تھیں میں اسی غفلت کے نشہ میں رہا، ادھر نبی کریم ﷺ نے تیس ہزار مجاہدین اسلام کو کوچ کا حکم دے دیا، مجھے اب بھی یہ خیال تھا کہ حضور ﷺ روانہ ہو گئے تو کیا ہے، اگلی منزل پر آپ ﷺ سے جا ملوں گا، آج چلوں کل چلوں اس امروز وفردا میں وقت نکل گیا، حضور ﷺ نے تبوک پہنچ کر فرمایا: ''مافعل کعب بن مالك'' (کعب بن مالک کو کیا ہوا) بنی سلمہ کا ایک شخص بولا کہ یارسول اللہ! اس کی عیش پسندی اور اعجاب وغرور نے نکلنے کی اجازت نہ دی، معاذ بن جبل نے کہا کہ تو نے بری بات کہی، خدا کی قسم ہم نے اس میں بھلائی کے سوا کچھ نہیں دیکھا حضور ﷺ یہ گفتگو سن کر خاموش رہے، کعب کہتے ہیں کہ آپ ﷺ کی تشریف آوری کے بعد بہت زیادہ وحشت اس سے ہوتی تھی کہ سارے مدینہ میں پکے منافق یا معذور مسلمان کے سوا مجھے کوئی مرد نظر نہ پڑتا تھا، بہر حال اب دل میں طرح طرح کے جھوٹے منصوبے گانٹھنے شروع کیے کہ آپ کی واپسی پر فلاں عذر کر کے جان بچا لوں گا، مگر جس وقت معلوم ہوا کہ حضور ﷺ خیر وعافیت سے واپس تشریف لے آئے، دل سے سارے جھوٹ فریب محو ہو گئے اور طے کر لیا کہ سچ کے سوا کوئی چیز اس بارگاہ میں نجات دلانے والی نہیں، حضور ﷺ مسجد میں رونق افروز تھے، اصحاب کا مجمع تھا، منافقین جھوٹے حیلے بہانے بنا کر ظاہری گرفت سے چھوٹ رہے تھے کہ میں حضور ﷺ کے سامنے آیا، میرے سلام کرنے پر آپ نے غضب آمیز تبسم فرمایا اور غیر حاضری کی وجہ دریافت کی میں نے عرض کیا، یارسول اللہ! اگر اس وقت میں دنیا والوں میں سے کسی دوسرے کے سامنے ہوتا تو آپ دیکھتے کہ کس طرح زبان زوری اور چرب لسانی سے جھوٹے حیلے حوالے کر کے اپنے آپ کو صاف بچا لیتا، مگر یہاں تو معاملہ ایک ایسی ذات مقدس سے ہے جسے جھوٹ بول کر اگر میں راضی بھی کر لوں تو تھوڑی دیر کے بعد خدا اس کو

سچی بات پر مطلع کر کے مجھ سے ناراض کر دے گا، برخلاف اس کے سچ بولنے میں گو تھوڑی دیر کے لیے آپ کی خفگی برداشت کرنی پڑے گی لیکن امید کرتا ہوں کہ خدا کی طرف سے اس کا انجام بہتر ہوگا، اور آخر کار سچ بولنا ہی مجھے خدا اور رسول کے غصہ سے نجات دلائے گا، یا رسول اللہ واقعہ یہ ہے کہ میرے پاس غیر حاضری کا کوئی عذر نہیں، جس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہم رکابی کے شرف سے محروم ہوا، اس وقت سے زیادہ فراخی اور مقدرت کبھی مجھ کو حاصل نہ ہوئی تھی، میں مجرم ہوں، آپ کو اختیار ہے جو فیصلہ چاہیں میرے حق میں دیں، آپ نے فرمایا کہ یہ شخص ہے جس نے سچی بات کہی، اچھا جاؤ اور خدائی فیصلے کا انتظار کرو، میں اٹھا اور تحقیق سے معلوم ہوا کہ (ہلال بن امیہ اور مرارہ بن الربیع) یہ دو شخص میرے ہی جیسے ہیں۔

ہم تینوں کے متعلق آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دے دیا کہ کوئی ہم سے بات نہ کرے، سب علیحدہ رہیں، چنانچہ کوئی مسلمان ہم سے بات نہ کرتا تھا، نہ سلام کا جواب دیتا تھا، وہ دونوں تو خانہ نشین ہو گئے، شب و روز گھر میں وقف گریہ و بکا رہتے تھے میں ذرا سخت اور قوی تھا، مسجد میں نماز کے لیے حاضر ہوتا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کر کے دیکھتا تھا کہ جواب میں لب مبارک کو حرکت ہوئی یا نہیں، جب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف دیکھتا، آپ میری طرف سے منہ پھیر لیتے تھے مخصوص اقارب اور محبوب ترین اعزہ بھی مجھ سے بیگانہ ہو گئے تھے، اس اثناء میں ایک روز ایک شخص نے بادشاہ "غسان" کا خط مجھے دیا، جس میں میری مصیبت پر اظہار ہمدردی کرنے کے بعد دعوت دی تھی کہ میں اس کے ملک میں آ جاؤں وہاں میری بہت آؤ بھگت ہوگی میں نے پڑھ کر کہا کہ یہ بھی ایک مستقل امتحان ہے، آخر وہ خط میں نے نذر آتش کر دیا، چالیس دن گزرنے کے بعد بارگاہ رسالت سے جدید حکم پہنچا کہ میں اپنی عورت سے بھی علیحدہ رہوں، چنانچہ اپنی بیوی کو کہہ دیا کہ اپنے میکے چلی جائے اور جب تک خدا کے یہاں سے میرا کوئی فیصلہ ہو وہیں ٹھہری رہے، سب سے بڑی فکر یہ تھی کہ اگر اسی حالت میں موت آ گئی تو حضور میرا جنازہ نہ پڑھیں گے، اور فرض کیجئے ان دنوں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو گئی تو مسلمان ہمیشہ یہ ہی معاملہ مجھ سے رکھیں گے، میری میت کے قریب بھی کوئی نہ آئے گا غرض پچاس دن اسی حالت میں گزرے کہ خدا کی زمین مجھ پر باوجود فراخی کے تنگ تھی بلکہ عرصہ حیات تنگ ہو گیا تھا، زندگی موت سے زیادہ سخت معلوم ہوتی تھی کہ یکایک جبل سلع سے آواز آئی: "یاکعب بن مالك ! ابشر" (اے کعب بن مالک خوش ہو جا) میں سنتے ہی سجدہ میں گر پڑا، معلوم ہوا کہ اخیر شب میں حق تعالیٰ کی طرف سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دی گئی کہ ہماری توبہ مقبول ہے، آپ نے بعد نماز فجر صحابہ کو مطلع فرمایا، ایک سوار میری طرف دوڑا کہ بشارت سنائے، مگر دوسرے شخص نے پہاڑ پر زور سے للکارا، اس کی آواز سوار سے پہلے پہنچی اور میں نے اپنے بدن کے کپڑے اتار کر آواز لگانے والے کو دیے، پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، لوگ جوق جوق آتے اور مجھے مبارک باد دیتے تھے، مہاجرین میں سے حضرت طلحہ نے کھڑے ہو کر مصافحہ کیا حضور کا چہرہ خوشی سے چادر کی طرح چمک رہا تھا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، خدا نے تیری توبہ قبول فرمائی، میں نے عرض کیا کہ اس توبہ کا تتمہ یہ ہے کہ اپنا کل مال و جائداد خدا کی راہ میں صدقہ کرتا ہوں، آپ نے فرمایا کہ سب نہیں، کچھ اپنے لیے روکنا چاہیے، چنانچہ میں نے خیبر کا حصہ الگ کر کے باقی مال صدقہ کر دیا، چونکہ محض سچ بولنے سے مجھ کو نجات ملی تھی، اس لیے عہد کیا کہ خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو، آئندہ کبھی جھوٹ نہ بولوں گا، اس عہد کے بعد بڑے سخت امتحانات پیش آئے، مگر الحمدللہ میں سچ کہنے سے کبھی نہیں ہٹا اور نہ انشاءاللہ تا زیست ہٹوں گا، یہ واقعہ ہے جس کی طرف ان آیات میں اشارہ کیا گیا ہے، گویا ان تینوں پر خدا کی پہلی مہربانی تو یہ ہی تھی کہ ایمان و اخلاص بخشا نفاق سے بچایا، اب نئی مہربانی یہ ہوئی کہ توبہ نصوح کی توفیق دے کر پھر اپنی طرف کھینچ لیا اور کوتاہیوں کو معاف فرما دیا۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ ٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ وَكُونُوا۟ مَعَ ٱلصَّٰدِقِينَ ﴿١١٩﴾

اے ایمان والو ڈرتے رہو اللہ سے اور رہو ساتھ سچوں کے

خلاصہ تفسیر: (پیچھے مجاہدین و تائبین کی مدح اور مقبولیت ذکر تھی، چونکہ یہ مقبولیت تقوی، صدق و اخلاص کی بدولت ہے اس لیے اب عام مؤمنین کو اسکا حکم دیا جاتا ہے، یہ بھی بتا دیا کہ مذکورہ صفات حاصل ہونے کا طریقہ صالحین و صادقین کی صحبت اور عمل میں ان کی پیروی اور موافقت ہے، چنانچہ ارشاد ہے:) اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور (عمل میں) سچوں کے ساتھ رہو (یعنی جو لوگ نیت اور بات میں سچے ہیں ان کی راہ

پر چلو کہ تم بھی سچائی اختیار کرو)۔

وَكُونُوا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ: اس میں شاید یہ اشارہ بھی ہو کہ جن حضرات سے یہ لغزش ہوئی اس میں منافقین کی صحبت مجالست اور ان کے مشورہ کو بھی دخل تھا، اللہ کے نافرمانوں کی صحبت سے بچنا چاہئے اور صادقین کی صحبت اختیار کرنا چاہئے، اس جگہ قرآن حکیم نے علماء صلحاء کے بجائے ''صادقین'' کا لفظ اختیار فرما کر عالم وصالح کی پہچان بھی بتلادی ہے کہ صالح صرف وہی شخص ہوسکتا ہے جس کا ظاہر و باطن یکساں ہو، نیت وارادے کا بھی سچا ہو قول کا بھی سچا ہو، عمل کا بھی سچا ہو۔

* * *

فائدہ: یعنی سچوں کی صحبت رکھو اور انہی جیسے کام کرو، دیکھ لو یہ تین شخص سچ کی بدولت بخشے گئے اور مقبول ٹھہرے، منافقین نے جھوٹ بولا اور خدا کا ڈر دل سے نکال دیا تو ''درک اسفل'' کے مستحق بنے۔

مَا كَانَ لِأَهْلِ الْمَدِيْنَةِ وَمَنْ حَوْلَهُمْ مِّنَ الْأَعْرَابِ أَنْ يَّتَخَلَّفُوْا عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ

نہ چاہیے مدینہ والوں کو اور ان کے گرد کے گنواروں کو کہ پیچھے رہ جائیں رسول اللہ کے ساتھ سے

وَلَا يَرْغَبُوْا بِأَنْفُسِهِمْ عَنْ نَّفْسِهٖ ؕ ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ لَا يُصِيْبُهُمْ ظَمَأٌ وَّلَا نَصَبٌ وَّلَا مَخْمَصَةٌ

اور نہ یہ کہ اپنی جان کو چاہیں زیادہ رسول کی جان سے لے یہ اس واسطے کہ جہاد کرنے والے نہیں پہنچتی ان کو پیاس اور نہ محنت اور نہ بھوک

فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَطَـُٔوْنَ مَوْطِئًا يَّغِيْظُ الْكُفَّارَ وَلَا يَنَالُوْنَ مِنْ عَدُوٍّ نَّيْلًا إِلَّا كُتِبَ لَهُمْ

اللہ کی راہ میں اور نہیں قدم رکھتے کہیں جس سے کہ خفا ہوں کافر اور نہ چھینتے ہیں دشمن سے کوئی چیز مگر لکھا جاتا ہے ان کے

بِهٖ عَمَلٌ صَالِحٌ ؕ إِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿١٢٠﴾

بدلے نیک عمل، بیشک اللہ نہیں ضائع کرتا حق نیکی کرنے والوں کا ۲

خلاصہ تفسیر: گذشتہ آیات میں جہاد سے پیچھے ہٹ جانے والوں کو ملامت اور مجاہدین کی فضیلت الگ الگ بیان کی گئی تھی، اب آگے دونوں کو ملا کر ایک ساتھ اس طرح بیان فرماتے ہیں کہ جہاد سے پیچھے رہنے کی برائی پر استدلال ہو جائے۔

مدینہ کے رہنے والوں کو اور جو دیہاتی ان کے گردو پیش میں (رہتے) ہیں ان کو یہ زیبا نہ تھا کہ رسول اللہ (ﷺ) کا ساتھ نہ دیں، اور نہ یہ (زیبا تھا) کہ اپنی جان کو ان کی جان سے عزیز سمجھیں (کہ آپ ﷺ تو تکلیفیں سہیں اور یہ آرام سے بیٹھے رہیں، بلکہ آپ کے ہمراہ جانا ضروری تھا اور) یہ (ساتھ جانے کا ضروری ہونا) اس سبب سے ہے کہ (رسول اللہ ﷺ کی محبت کے حق کی ادائیگی کے علاوہ ان مجاہدین کو بات بات پر ثواب حاصل ہوا ہے، اگر خلاص کے ساتھ جاتے ان کو بھی یہ ملتا، چنانچہ) ان کو اللہ کی راہ (یعنی جہاد) میں جو پیاس لگی، اور جو ماندگی (تھکن) پہنچی، اور جو بھوک لگی، اور جو چلنا چلے جو کفار کے لئے موجب غیظ ہوا ہو، اور دشمنوں کی جو کچھ خبر لی، ان سب پر ان کے نام ایک ایک نیک کام لکھا گیا (حالانکہ ان میں بعض امور ایسے بھی ہیں جو اختیار سے باہر ہیں، مگر یہ مقبولیت اور محبوبیت کا تقاضہ ہے کہ غیر اختیاری امور بھی اختیاری اعمال کی طرح ثواب کا سبب قرار دیے گئے، اور اس وعدہ میں خلاف ورزی کا احتمال نہیں، کیونکہ) یقیناً اللہ تعالیٰ مخلصین کا اجر ضائع نہیں کرتے (پس وعدہ کر لیا تو ضائع نہ ہوگا)۔

''محسنین''، یعنی مخلصین کی قید اس لیے بڑھائی کہ اخلاص کے بغیر تو ثواب ملتا ہی نہیں۔

* * *

فائدہ: ۱؎ یعنی رسول اللہ ﷺ تو تکلیفیں اٹھائیں اور ہم آرام سے بیٹھے رہیں، ایسا نہیں چاہیے، حدیث میں ہے کہ ابوخیثمہ رضی اللہ عنہ بھی غزوہ تبوک میں پیچھے رہ گئے تھے، حضور ﷺ کی روانگی کے بعد باغ میں گئے وہاں خوشگوار سایہ تھا، حسین وجمیل بیوی سامنے تھے اس نے پانی چھڑک کر زمین کو خوب ٹھنڈا کردیا، چٹائی کا فرش کیا، تازہ کھجور کے خوشے سامنے رکھے اور سرد وشیریں پانی حاضر کیا، یہ سامان عیش دیکھ کر دفعتاً ابوخیثمہ کے دل میں ایک بجلی سی دوڑ گئی، بولے تف ہے اس زندگی پر کہ میں تو خوشگوار سائے، ٹھنڈے پانی اور باغ و بہار کے مزے لوٹ رہا ہوں، اور خدا کا محبوب پیغمبر ایسی سخت لو اور گرمی وتشنگی کے عالم میں کوہ وبیاباں طے کر رہا ہے، یہ خیال آتے ہی سواری منگائی تلوار حمائل کی نیزہ سنبھالا اور حضور ﷺ کے نقش قدم پر چل نکلے، اونٹنی تیز ہوا کی طرح چل رہی تھی، آخر لشکر کو جا پکڑا، حضور ﷺ نے دور سے دیکھ کر کہ کوئی اونٹنی سوار ریت کے ٹیلے قطع کرتا چلا آرہا ہے، فرمایا: "کن اباخیثمه" (ہو جا ابوخیثمہ) تھوڑی دیر میں سب نے دیکھ لیا کہ وہ ابوخیثمہ ہی تھے، رضی الله عنه وعن سائر الصحابة ورضوا عنه۔

فائدہ: ۲؎ یعنی باوجودیکہ ان میں سے اکثر چیزیں (مثلاً بھوک، پیاس لگنا، یا تکلیف پہنچنا) اختیاری کام نہیں ہیں، تاہم نیت جہاد کی برکت سے ان غیر اختیاری چیزوں کے مقابلہ میں اعمال صالحہ ان کی فرد حسنات میں درج کردیے جائیں گے جن پر خدا اجر نیک مرحمت فرمائے گا۔

وَلَا يُنْفِقُوْنَ نَفَقَةً صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً وَّلَا يَقْطَعُوْنَ وَادِيًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ

اور نہ خرچ کرتے ہیں کوئی خرچ چھوٹا اور نہ بڑا اور نہ طے کرتے ہیں کوئی میدان مگر لکھ لیا جاتا ہے ان کے واسطے ۱؎ تاکہ بدلا دے ان کو اللہ

اَحْسَنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۱﴾

بہتر اس کام کا جو کرتے تھے ۲؎

خلاصہ تفسیر: اور (نیز) جو کچھ چھوٹا یا بڑا انہوں نے خرچ کیا اور جتنے میدان ان کو طے کرنے پڑے، یہ سب بھی ان کے نام (نیکیوں میں) لکھا گیا تاکہ اللہ تعالیٰ ان کو ان کے (ان سب) کاموں کا اچھے سے اچھا بدلہ دے (کیونکہ جب ثواب لکھا گیا تو بدلہ ملے گا)۔

* * *

فائدہ: ۱؎ خرچ کرنا یا میدان طے کرنا، خود عمل صالح اور اختیاری افعال ہیں، اسی لیے یہاں اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ فرمایا، گذشتہ آیت کی طرح اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ بِهٖ عَمَلٌ صَالِحٌ نہیں ارشاد ہوا، نبه عليه ابن كثير۔

فائدہ: ۲؎ یعنی بہترین عمل کی بہترین جزاء دے گا۔

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً ؕ فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا

اور ایسے تو نہیں مسلمان کہ کوچ کریں سارے سو کیوں نہ نکلا ہر فرقہ میں سے ان کا ایک حصہ تاکہ سمجھ پیدا کریں

فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ ﴿۱۲۲﴾ ع

دین میں اور تاکہ خبر پہنچائیں اپنی قوم کو جب کہ لوٹ کر آئیں ان کی طرف تاکہ وہ بچتے رہیں

خلاصہ تفسیر: اوپر جہاد سے پیچھے رہ جانے والوں کے بارے میں جو ملامت کے مضامین نازل ہوئے اس سے آئندہ کے لیے شبہ ہو سکتا تھا کہ ہمیشہ سب کے ذمہ جہاد میں جانا ضروری ہے، اس لیے آگے بتلاتے ہیں کہ ہمیشہ ہر شخص کا جانا ضروری نہیں، اور تبوک میں جو سب حاضرین کے ذمہ جانا فرض تھا اس کی وجہ پیچھے گزر چکی ہے کہ حضور ﷺ نے سب کو حکم عام دیا تھا، پس دونوں آیتوں کا خلاصہ یہ ہوا کہ جہاد فی نفسہ تو

فرض کفایہ ہے، مگر امام کے حکم سے ہر مخاطب پر فرض عین ہو جائے گا (جن کو وہ حکم کردے)۔

اور (ہمیشہ کیلئے) مسلمانوں کو یہ (بھی) نہ چاہئے کہ (جہاد کے واسطے) سب کے سب (ہی) نکل کھڑے ہوں (کہ اس میں دوسری اسلامی ضروریات معطل ہوتی ہیں) سو ایسا کیوں نہ کیا جائے کہ ان کی ہر ہر بڑی جماعت میں سے ایک ایک چھوٹی جماعت (جہاد میں) جایا کرے (اور کچھ اپنے وطن میں رہ جایا کریں) تاکہ باقی ماندہ لوگ (اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شہر میں ہوں تو آپ سے، اور آپ کے پیچھے شہر کے دوسرے علماء سے) دین کی سمجھ بوجھ حاصل کرتے رہیں، اور تاکہ یہ لوگ اپنی قوم کو (جو کہ جہاد میں گئے ہوئے ہیں) جبکہ وہ ان کے پاس آئیں (دین کی باتیں سنا کر خدا کی نافرمانی سے) ڈرائیں، تاکہ وہ (ان سے دین کی باتیں سن کر برے کاموں سے) احتیاط رکھیں۔

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنْفِرُوا كَافَّةً: اس میں دلیل ہے کہ دینی مہم کا انتظام ایسے کرنا چاہیے کہ دوسری ضروریات میں خلل واقع نہ ہو، جن میں تحصیل معاش (روزگار کا حصول) بھی داخل ہے۔

طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّيْنِ: باقی ماندہ لوگوں کے رہ جانے میں جو مصلحتیں ہیں ان میں سے ایک بڑی مصلحت جو کہ دینی مصلحت ہے اسے بیان فرمادیا کہ وہ دین کی سمجھ بوجھ حاصل کرتے رہیں، اس کے علاوہ دنیا کی بھی مصلحتیں ہیں جو ظاہر ہونے کی وجہ سے بیان کی محتاج نہ تھیں، مثلاً سب کے چلے جانے سے خود دارالاسلام کا قبضہ سے نکل جانا بعید نہیں۔

قرآن حکیم نے اس جگہ علم دین کی حقیقت اور اس کا نصاب بھی ایک ہی لفظ میں بتلا دیا ہے، وہ ہے: لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّيْنِ، یہ موقع بظاہر اس کا تھا کہ یہاں یتعلمون الدین کہا جاتا، یعنی علم دین حاصل کریں، مگر قرآن نے اس جگہ "تعلم" کا لفظ چھوڑ کر "تفقہ" کا لفظ اختیار فرما کر اس طرف اشارہ کردیا کہ علم دین کا محض پڑھ لینا کافی نہیں، وہ تو بہت سے کافر یہودی نصرانی بھی پڑھتے ہیں، اور شیطان کو سب سے زیادہ حاصل ہے، بلکہ علم دین سے مراد دین کی سمجھ پیدا کرنا ہے، یہی لفظ تفقہ کا ترجمہ ہے، اور یہ فقہ سے مشتق ہے، فقہ کے معنی سمجھ بوجھ ہی کے ہیں، یہاں یہ بات بھی قابل نظر ہے کہ قرآن کریم نے اس جگہ مجرد کے صیغے سے لیفقھوا الدین، یعنی تاکہ دین کو سمجھ لیں، نہیں فرمایا بلکہ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّيْنِ فرمایا، جو باب تفعل سے ہے، اس کے معنی میں محنت ومشقت کا مفہوم شامل ہے، مراد یہ ہے کہ دین کی سمجھ بوجھ پیدا کرنے میں پوری محنت ومشقت اٹھا کر مہارت حاصل کریں، یہ بھی ظاہر ہے کہ دین کی سمجھ بوجھ صرف اتنی بات سے پیدا نہیں ہوتی کہ طہارت، نجاست یا نماز، روزے، زکوۃ، حج کے مسائل معلوم کرے، بلکہ دین کی سمجھ بوجھ یہ ہے کہ وہ یہ سمجھے کہ اس کے ہر قول وفعل اور حرکت وسکون کا آخرت میں اس سے حساب لیا جائے گا، اس کو اس دنیا میں کس طرح رہنا چاہئے، دراصل اسی فکر کا نام دین کی سمجھ بوجھ ہے، اس سے معلوم ہو گیا کہ علم دین حاصل کرنے کا مفہوم قرآن کی اصطلاح میں دین کی سمجھ بوجھ پیدا کرنا ہے، وہ جن ذرائع سے حاصل ہو وہ ذرائع خواہ کتابیں ہوں یا اساتذہ کی صحبت، سب اس نصاب کے اجزاء ہیں۔

وَلِيُنْذِرُوا قَوْمَهُمْ: علم دین حاصل کرنے کے بعد عالم کے فرائض کیا ہیں؟ اس جگہ قرآن کریم نے اس کو بھی ایک ہی جملہ میں پورا بیان فرمادیا ہے، وہ ہے: لِيُنْذِرُوا قَوْمَهُمْ یعنی تاکہ وہ اپنی قوم کو اللہ کی نافرمانی سے ڈرائیں، یہاں بھی یہ بات قابل نظر ہے کہ اس جملہ میں عالم کا فرض انذار قوم بتلایا ہے، انذار کا لفظی ترجمہ ہم اردو میں ڈرانے سے کرتے ہیں، مگر یہ اس کا پورا ترجمہ نہیں، اردو زبان کی تنگی کی وجہ سے کوئی ایک لفظ اس کے پورے ترجمہ کو ادا نہیں کرتا، حقیقت یہ ہے کہ ڈرانا کئی طرح کا ہوتا ہے، ایک ڈرانا دشمن، چور ڈاکو یا کسی درندے زہریلے جانور سے ہے، ایک ڈرانا وہ ہے جو باپ اپنی شفقت سے اولاد کو تکلیف دہ چیزوں جیسے آگ، زہریلے جانور مضر غذاء سے ڈراتا ہے، جس کا منشاء شفقت ومحبت ہوتی ہے، اس کا لب ولہجہ بھی کچھ اور ہی ہوتا ہے، انذار اسی قسم کے ڈرانے کا نام ہے اسی لئے پیغمبروں اور رسولوں کو "نذیر" کا لقب دیا گیا ہے اور عالم کا یہ فریضہ انذار درحقیقت وراثت نبوت ہی کا جز ہے جو بنص حدیث عالم کو حاصل ہوتی ہے۔

مگر یہاں قابل غور یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے دو لقب ہیں، بشیر اور نذیر، نذیر کے معنی تو ابھی آپ معلوم کر چکے ہیں، بشیر کے معنی ہیں بشارت اور خوشخبری سنانے والا، انبیاء علیہم السلام کا ایک کام یہ بھی ہے کہ نیک عمل کرنے والوں کو بشارت سنائیں، اس جگہ بھی اگر چہ صراحۃ ذکر انذار کا کیا گیا ہے، مگر دوسری نصوص سے معلوم ہوتا ہے کہ عالم کا فرض یہ بھی ہے کہ نیک کام کرنے والوں کو بشارت بھی سنائے، لیکن اس جگہ صرف انذار کے ذکر پر اکتفاء کرنا اس طرف اشارہ ہے کہ انسان کے ذمے دو کام ہیں: ① ایک یہ کہ جو عمل اس کے لئے دنیا و آخرت میں مفید ہیں ان کو اختیار کرے ② دوسرے یہ کہ جو عمل اس کیلئے مضر ہیں ان سے بچے، باتفاق علماء و عقلاء ان دونوں کاموں میں سے دوسرا کام سب سے مقدم اور اہم ہے، اسی کو فقہاء کی اصطلاح میں جلب منفعت اور دفع مضرت کے دو لفظوں سے تعبیر کر کے دفع مضرت کو جلب منفعت سے مقدم قرار دیا ہے، اس کے علاوہ دفع مضرت میں ایک حیثیت سے جلب منفعت کا مقصد بھی پورا ہو جاتا ہے، کیونکہ جو کام انسان کیلئے مفید اور ضروری ہیں ان کا ترک بڑی مضرت ہے تو جو شخص مضرت اعمال سے بچنے کا اہتمام کرے گا وہ اعمال ضروریہ کے ترک سے بچنے کا بھی اہتمام کرے گا۔

یہاں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ آجکل جو عموماً وعظ و تبلیغ بہت کم مؤثر ہوتی ہے اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اس میں انذار کے آداب نہیں ہوتے، جس کے طرز بیان اور لب و لہجے سے شفقت و رحمت اور خیر خواہی مترشح ہو، مخاطب کو یقین ہو کہ اس کے کلام کا مقصد نہ مجھے رسوا کرنا ہے، نہ بدنام کرنا، نہ اپنے دل کا غبار نکالنا، بلکہ یہ جس چیز کو میرے لئے مفید اور ضروری سمجھتا ہے وہ محبت کی وجہ سے مجھے بتلا رہا ہے، اگر آج ہماری تبلیغ اور خلاف شرع امور کے مرتکب لوگوں کو اصلاح کی دعوت کا یہ طرز ہو جائے تو اس کا ایک نتیجہ تو قطعاً لازم ہی ہے کہ مخاطب کو ہماری گفتگو سے ضد پیدا نہیں ہوگی، وہ جواب دہی کی فکر میں پڑنے کے بجائے اپنے اعمال کا جائزہ لینے اور انجام سوچنے کی طرف متوجہ ہو جائے گا اور اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو کبھی نہ اس کو قبول کرے گا اور دوسرا نتیجہ یہ لازمی ہے کہ کم از کم اس سے باہمی منافرت اور لڑائی جھگڑا پیدا نہیں ہوگا، جس میں آجکل ہماری پوری قوم مبتلا ہے۔

لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ: آخر میں لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُونَ فرما کر اس طرف بھی اشارہ کر دیا کہ عالم کا کام اتنا ہی نہیں کہ عذاب سے ڈرا دیا، بلکہ اس پر نظر رکھنا بھی ہے کہ اس کی تبلیغ و دعوت کا اثر کتنا اور کیا ہوا، ایک دفعہ مؤثر نہیں ہوئی تو بار بار کرتا رہے، تاکہ اس کا نتیجہ يَحْذَرُونَ برآمد ہو سکے، یعنی قوم کا گناہوں سے بچنا، واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

* * *

فائدہ: گذشتہ رکوعات میں ''جہاد'' میں نکلنے کی فضیلت اور نہ نکلنے پر ملامت تھی، ممکن تھا کوئی یہ سمجھ بیٹھے کہ ہمیشہ ہر جہاد میں تمام مسلمانوں پر نکلنا فرض عین ہے، اس آیت میں فرمایا کہ نہ ہمیشہ یہ ضروری ہے، نہ مصلحت ہے کہ سب مسلمان ایک دم جہاد کے لیے نکل کھڑے ہوں، مناسب یہ ہے کہ ہر قبیلہ اور قوم میں سے ایک جماعت نکلے، باقی لوگ دوسری ضروریات میں مشغول ہوں، اب اگر نبی کریم ﷺ بنفس نفیس جہاد کے لیے تشریف لے جا رہے ہوں تو ہر قوم میں سے جو جماعت آپ کے ہمراہ نکلے گی وہ حضور ﷺ کی صحبت میں رہ کر اور سینکڑوں حوادث و واقعات میں سے گزر کر دین اور احکام دینیہ کی سمجھ حاصل کرے گی اور واپس آ کر اپنی باقی ماندہ قوم کو مزید علم و تجربہ کی بناء پر بھلے برے سے آگاہ کرے گی اور فرض کیجئے اگر حضور ﷺ خود مدینہ میں رونق افروز رہے تو باقی ماندہ لوگ جو جہاد میں نہیں گئے حضور ﷺ کی خدمت سے مستفید ہو کر دین کی باتیں سیکھیں گے، اور مجاہدین کی غیبت میں جو وحی و معرفت کی باتیں سنیں گے ان سے واپسی کے بعد مجاہدین کو خبردار کریں گے، آیت کے الفاظ میں عربی ترکیب کے اعتبار سے دونوں احتمال ہیں، کما فی روح المعانی وغیرہ، حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ ہر قوم میں سے چاہیے بعض لوگ پیغمبر کی صحبت میں رہیں تاکہ علم دین سیکھیں اور پچھلوں کو سکھائیں، اب پیغمبر اس دنیا میں موجود نہیں لیکن علم دین اور علماء موجود ہیں، طلب علم فرض کفایہ ہے اور جہاد بھی فرض کفایہ ہے، البتہ اگر کسی وقت امام کیطرف سے نفیر عام ہو جائے تو ''فرض عین'' ہو جاتا ہے، تبوک میں یہ ہی صورت تھی اس لیے پیچھے رہنے والوں سے باز پرس ہوئی، واللہ اعلم، ابو حیان کے نزدیک یہ آیت جہاد کے لیے نہیں، طلب علم کے بارہ میں ہے، جہاد اور طلب کی آیات میں مناسبت یہ ہے کہ دونوں میں خروج فی سبیل اللہ ہے اور دونوں کی غرض احیاء و اعلائے دین ہے، ایک میں تلوار سے دوسرے میں زبان وغیرہ سے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً ؕ

اے ایمان والو لڑتے جاؤ اپنے نزدیک کے کافروں سے [1] اور چاہیے کہ ان پر معلوم ہو تمہارے اندر سختی [2]

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۲۳﴾

اور جانو کہ اللہ ساتھ ہے ڈر والوں کے [3]

خلاصہ تفسیر: گذشتہ آیات میں جہاد کی ترغیب تھی، چونکہ کفار تو ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں، اب ان سے جہاد وقتال میں ترتیب کیا ہونی چاہیے اسے بیان کرتے ہیں کہ پہلے کن لوگوں پر جہاد کرنا چاہیے۔

اے ایمان والو! ان کفار سے لڑو جو تمہارے آس پاس (رہتے) ہیں اور ان کو تمہارے اندر سختی پانا چاہئے (یعنی جہاد کے وقت بھی مضبوط رہنا چاہئے اور ویسے بھی جس وقت صلح نہ ہو ان سے ڈھیلا پن نہ برتنا چاہیے) اور یہ یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ (کی امداد) متقی لوگوں کے ساتھ ہے (پس ان سے ڈرو یا دبو مت)۔

اس ترتیب کا حاصل ظاہر ہے کہ اول پاس والوں سے نمٹنا چاہیے، پھر باقی لوگوں میں جو سب سے پاس کے ہوں، اسی طرح تمام کفار سے قریب اور دوری کا لحاظ کر کے لڑنا چاہیے، اور اس ترتیب کے خلاف کرنے میں جو مفاسد ہیں وہ ظاہر ہیں، چنانچہ حضور ﷺ نے جو غزوات اپنے اختیار سے خود کیے اور صحابہ نے بھی سب میں اسی ترتیب کا لحاظ رکھا گیا۔

یٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ: اس سے مستنبط ہوتا ہے کہ چونکہ سب سے قریب تر انسان کا اپنا نفس ہے، سو اپنے نفس کے مجاہدہ سے ابتدا کرے۔

* * *

فائدہ: [1] قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ: جہاد فرض کفایہ ہے جو ترتیب طبعی کے موافق اول ان کفار سے ہونا چاہیے جو مسلمانوں سے قریب تر ہوں بعدہ، ان کے قریب رہنے والوں سے، اسی طرح درجہ بدرجہ حلقہ جہاد کو وسیع کرنا چاہیے، نبی کریم ﷺ اور خلفائے راشدین کے جہاد اسی ترتیب سے ہوئے "دفاعی جہاد" میں بھی فقہاء نے یہ ہی ترتیب رکھی ہے کہ جس اسلامی ملک پر کفار حملہ آور ہوں، وہاں کے مسلمانوں پر دفاع واجب ہے اگر وہ کافی نہ ہوں یا سستی کریں تو ان کے متصل رہنے والوں پر وہ کافی نہ ہوں تو پھر جو ان سے متصل ہیں، اسی طرح اگر ضرورت پڑے تو درجہ بدرجہ مشرق سے مغرب تک جہاد فرض ہوتا چلا جائے گا۔

فائدہ: [2] وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً: مومن کی شان یہ ہے کہ اپنے بھائی کے حق میں نرم اور دشمنان خدا اور رسول کے معاملہ میں سخت و شدید ہو، تا کہ اس کی نرمی اور ڈھیلا پن دیکھ کر دشمن جری نہ ہو جائے اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ (المائدہ:۵۴) وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ (الفتح:۲۹) جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ (التوبہ:۷۳) وفی الحدیث انه ﷺ قال "انا الضحوك القتال".

فائدہ: [3] وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ: یعنی خدا سے ڈرنے والے کو کسی کافر قوم سے ڈرنے اور دبنے کی کوئی وجہ نہیں، جب تک اور جس قدر مسلمان خدا سے ڈرتے رہے اسی وقت تک اور اسی قدر انکو کفار پر غلبہ حاصل ہوتا رہا، حق تعالیٰ ہمارے دلوں میں اپنا ڈر پیدا کر دے۔

وَإِذَا مَآ أُنزِلَتْ سُورَةٌ فَمِنْهُم مَّن يَقُولُ أَيُّكُمْ زَادَتْهُ هَٰذِهِۦٓ إِيمَٰنًا ۚ فَأَمَّا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟

اور جب نازل ہوتی ہے کوئی سورت تو بعضے ان میں کہتے ہیں کس کا تم میں سے زیادہ کر دیا اس سورت نے ایمان، سو جو لوگ ایمان رکھتے ہیں

فَزَادَتْهُمْ إِيمَٰنًا وَهُمْ يَسْتَبْشِرُونَ ﴿١٢٤﴾ وَأَمَّا ٱلَّذِينَ فِى قُلُوبِهِم مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا

ان کا زیادہ کر دیا اس سورت نے ایمان، اور وہ خوش وقت ہوتے ہیں، اور جن کے دل میں مرض ہے سو ان کے لیے بڑھا دی گندگی

إِلَىٰ رِجْسِهِمْ وَمَاتُوا۟ وَهُمْ كَٰفِرُونَ ﴿١٢٥﴾

پر گندگی اور وہ مرنے تک کافر ہی رہے

خلاصہ تفسیر: پیچھے بہت سی آیتوں میں منافقین کی شرارتیں مذکور ہوئی ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ قرآن کی آیتوں سے تمسخر اور تنفر کرتے تھے، اب آگے جواب اور عتاب کے ساتھ اسی کا بیان ہے۔

اور جب کوئی (نئی) سورت نازل کی جاتی ہے تو بعض منافقین (غریب مسلمانوں سے بطور تمسخر) کہتے ہیں کہ (کہو) اس سورت نے تم میں سے کس کے ایمان میں ترقی دی؟ (آگے حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ تم جواب چاہتے ہو) سو (سنو) جو لوگ ایماندار ہیں اس سورت نے ان کے (تو) ایمان میں ترقی دی ہے، اور وہ (اس ترقی کے ادراک سے) خوش ہو رہے ہیں (مگر چونکہ وہ خوشی قلبی امر ہے اور تم کو نصیب نہیں، اس لئے تم کو اس کا ادراک بھی نصیب نہیں اور بے سمجھے ہی تمسخر کرتے ہو) اور جن لوگوں کے دلوں میں (نفاق کا) آزار (مرض) ہے اس سورت نے ان میں ان کی (پہلی) گندگی کے ساتھ اور (نئی) گندگی بڑھا دی (کیونکہ پہلے قرآن کے جتنے حصہ کا انکار کیا تھا، اب اس نئی سورت کا انکار اس پر زیادہ ہو گیا) اور وہ حالت کفر ہی میں مر گئے (یعنی جو ان میں مر چکے ہیں وہ کافر مرے اور جو اسی نفاق پر جمے رہیں گے وہ کافر مریں گے، حاصل جواب کا یہ ہوا کہ قرآن میں ایمان کو ترقی دینے کی بیشک خاصیت ہے، لیکن محل یعنی دل میں قابلیت بھی تو ہو، اور اگر کسی میں پہلے سے خباثت پختہ و مضبوط ہے تو اس کی خباثت اور بھی مستحکم ہو جائے گی "در باغ لالہ روید و در شورہ بوم خس")۔

* * *

فائدہ: جب کوئی سورت قرآنی نازل ہوتی تو منافقین آپس میں ایک دوسرے یا بعض سادہ دل مسلمانوں سے از راہِ استہزاء و تمسخر کہتے کہ کیوں صاحب تم میں سے کس کس کا ایمان اس سورت نے بڑھایا، مطلب یہ تھا کہ (معاذ اللہ) اس سورت میں رکھا ہی کیا ہے، کون سے حقائق و معارف ہیں جو ایمان و یقین کی ترقی کا موجب ہوں حق تعالیٰ نے جواب دیا کہ بیشک کلام الٰہی سن کر مومنین کے ایمان میں تازگی اور ترقی ہوتی ہے اور قلوب مسرور و منشرح ہوتے ہیں، ہاں جن کے دلوں میں کفر و نفاق کی بیماری اور گندگی ہے ان کی بیماری و گندگی میں اضافہ ہو جاتا ہے، حتی کہ یہ بیماری ان کی جان ہی لے کر چھوڑتی ہے:

باراں کہ در لطافت طبعش خلاف نیست — در باغ لالہ روید و در شورہ بوم خس

حضرت شاہ صاحبؒ نے دوسری طرح آیت کی تقریر کی ہے، یعنی کلام الٰہی جس مسلمان کے دل کے خطرہ سے موافق پڑتا وہ خوش ہو کر بول اٹھتا کہ سبحان اللہ، اس آیت نے میرا ایمان و یقین اور زیادہ کر دیا، اسی طرح جب کسی سورت میں منافقین کے پوشیدہ عیوب ظاہر کیے جاتے تو وہ بھی شرمندگی سے کھسیانے ہو کر کہتے کہ بیشک اس کلام نے ہمارے یقین و ایمان کو بڑھا دیا، لیکن یہ کہنا چونکہ خوشی اور انشراح سے نہ تھا، محض رفع خجالت کے لیے کہہ دیتے تھے اس لیے یہ توفیق نہ ہوتی تھی کہ آئندہ توبہ کر کے سچے دل سے حق کی پیروی کریں، بلکہ پہلے سے زیادہ اپنے عیب چھپانے کی فکر و تدبیر کرتے تھے، یہ ہی ہے گندگی پر گندگی، عیب دار کو لازم ہے کہ نصیحت سن کر اپنی اصلاح کرے نہ یہ کہ الٹا ناصح سے چھپانے لگے۔

اَوَلَا يَرَوْنَ اَنَّهُمْ يُفْتَنُوْنَ فِيْ كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً اَوْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ لَا يَتُوْبُوْنَ وَلَا هُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ﴿۱۲۶﴾

کیا نہیں دیکھتے کہ وہ آزمائے جاتے ہیں ہر برس میں ایک بار یا دو بار پھر بھی توبہ نہیں کرتے اور نہ وہ نصیحت پکڑتے ہیں

خلاصہ تفسیر: اور کیا ان کو نہیں دکھائی دیتا کہ یہ لوگ ہر سال میں ایک بار یا دو بار کسی نہ کسی آفت میں پھنستے رہتے ہیں (مگر) پھر بھی (اپنی بری حرکات سے) باز نہیں آتے اور نہ وہ کچھ سمجھتے ہیں (جس سے باز آنے کی آئندہ امید ہو، یعنی ان حوادث سے عبرت حاصل کر کے ان کو اپنی اصلاح کر لینا چاہئے تھی)۔

يُفْتَنُوْنَ فِيْ كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً اَوْ مَرَّتَيْنِ: اس میں منافقین کو اس پر تنبیہ کی گئی ہے کہ وہ اپنے نفاق اور عہد شکنی وغیرہ جیسے گناہوں کی وجہ سے ہر سال مختلف قسم کی مصیبتوں میں کبھی ایک بار کبھی دو بار مبتلا ہوتے رہتے ہیں، کبھی ان کے دوست کفار مکہ مغلوب ہو گئے، کبھی ان کے نفاق کی باتیں کھل گئیں، اس سے پریشانی میں مبتلا رہے، اس میں بلاؤں اور مصیبتوں کی حکمت معلوم ہوتی ہے کہ اس سے انسان کو عبرت و نصیحت لینی چاہیے، یہاں ایک دو کا عدد خاص مراد نہیں، بلکہ یہ بتلانا ہے کہ اس کا سلسلہ چلتا رہتا ہے، کبھی ایک بار کبھی متعدد بار، کیا ان چیزوں کو دیکھ کر بھی انہیں عبرت نہیں ہوتی۔

* * *

فائدہ: یعنی ہر سال کم از کم ایک دو مرتبہ ان منافقین کو فتنہ اور آزمائش میں ڈالا جاتا ہے مثلاً قحط، بیماری وغیرہ کسی آفت ارضی وسماوی میں مبتلا ہوتے ہیں یا پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی ان کا نفاق اعلانیہ ظاہر کر کے رسوا کیا جاتا ہے یا جنگ و جہاد کے وقت ان کی بزدلی اور تیرہ باطنی بے نقاب کر دی جاتی ہے مگر وہ ایسے بے حیا اور بد باطن واقع ہوئے ہیں کہ تازیانے کھا کر بھی ٹس سے مس نہیں ہوتے نہ پچھلی خطاؤں سے توبہ کرتے ہیں نہ آئندہ کو نصیحت پکڑتے ہیں۔

وَاِذَا مَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ نَّظَرَ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ ؕ هَلْ يَرٰىكُمْ مِّنْ اَحَدٍ ثُمَّ انْصَرَفُوْا ؕ

اور جب نازل ہوتی ہے کوئی سورت تو دیکھنے لگتا ہے ان میں ایک دوسرے کی طرف، کہ کیا دیکھتا ہے تم کو کوئی مسلمان؟ پھر چل دیتے ہیں [1]

صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ﴿۱۲۷﴾

پھیر دیے ہیں اللہ نے دل ان کے اس واسطے کہ وہ لوگ ہیں کہ سمجھ نہیں رکھتے [2]

خلاصہ تفسیر: (پیچھے ان کے تمسخر کا بیان ہوا جو وہ اپنی مجلسوں میں کرتے تھے، آگے قرآن سے نفرت کرنے کا بیان ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں ان سے ظاہر ہوتی تھی، چنانچہ ارشاد ہے) اور جب کوئی (نئی) سورت نازل کی جاتی ہے تو ایک دوسرے کو دیکھنے لگتے ہیں (اور اشارہ سے باتیں کرتے ہیں) کہ تم کو کوئی (مسلمان) دیکھتا تو نہیں (کہ ہم کو اٹھتا ہوا دیکھ لے اور حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جا لگائے) پھر (اشاروں ہی اشاروں میں باتیں کر کے وہاں سے اٹھ کر) چل دیتے ہیں (یہ لوگ مسجد نبوی سے کیا پھرے) خدا تعالیٰ نے ان کا دل (ہی ایمان سے) پھیر دیا ہے اس وجہ سے کہ وہ محض بے سمجھ لوگ ہیں (کہ اپنے نفع سے بھاگتے ہیں)۔

* * *

فائدہ: [1] جس وقت وحی نازل ہوتی اور منافقین مجلس میں موجود ہوتے تو کلام الٰہی کا سننا ان پر بہت شاق گزرتا خصوصاً وہ آیات جن میں ان کے عیوب کھولے جاتے تھے، اس وقت ایک دوسرے کی طرف کن انکھیوں سے اشارہ کرتے اور اِدھر اُدھر دیکھتے کہ مجلس میں کسی مسلمان نے ہم کو پرکھا نہ ہو، پھر نظر بچا کر شتاب مجلس سے کھسک جاتے تھے۔

فائدہ: ؎ یعنی مجلس نبوی سے کیا پھرے، خدا نے ان کے دلوں کو پھیر دیا کہ وہ اپنی جہل وحماقت سے ایمان وعرفان کی باتوں کو سمجھنا اور قبول کرنا نہیں چاہتے۔

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ

آیا ہے تمہارے پاس رسول تم میں کا ؎ بھاری ہے اس پر جو تم کو تکلیف پہنچے ؎ حریص ہے تمہاری بھلائی پر ؎

بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲۸﴾

ایمان والوں پر نہایت شفیق مہربان ہے ؎

خلاصہ تفسیر: چونکہ یہ سورت قرآن کی آخری سورتوں میں سے ہے، اس لیے اس کے اختتام پر حجت قائم کرنے اور دعوت تمام کرنے کے لیے آپ ﷺ کی رسالت اور بعض خاص کمالات کا واضح طور پر بیان کر دینا مناسب ہوا، اور نہ ماننے کی صورت میں حضور ﷺ کے توکل اور توحید کو ظاہر کر کے آپ کی قوت کا بتلانا بہت ہی عمدہ ہوا، بالخصوص اس سورت کے ساتھ یہ مضمون اس وجہ سے زیادہ چسپاں ہے کہ اس میں کفار سے برات اور بے زاری ظاہر کر کے بھی حجت تمام کر دی گئی ہے۔

(اے لوگو!) تمہارے پاس ایک ایسے پیغمبر تشریف لائے ہیں جو تمہاری جنس (بشر) سے ہیں (کہ تم کو نفع حاصل کرنا آسان ہو) جن کو تمہاری مضرت کی بات نہایت گراں گذرتی ہے (چاہتے ہیں کہ تم کو کوئی نقصان نہ پہنچے) جو تمہاری منفعت کے بڑے خواہش مند رہتے ہیں (یہ حالت تو سب کے ساتھ ہے، پھر بالخصوص) ایمانداروں کے ساتھ (تو) بڑے ہی شفیق (اور) مہربان ہیں (ایسے رسول سے مستفید نہ ہونا بڑی محرومی ہے)۔

حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ: یہ رسول اللہ ﷺ کی صفات ہیں، اور چونکہ عالم دین استاذ اور شیخ بھی رسول اللہ ﷺ کا نائب ہوتا ہے اس لیے یہ صفات شفقت ان میں بھی ہونا ضروری ہیں (ورنہ تعلیم وتربیت کا اہل نہیں ہوگا)۔

❊ ❊ ❊

فائدہ: ؎ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ: جس کے حسب ونسب، اخلاق واطوار اور دیانت وامانت سے تم خوب واقف ہو۔

فائدہ: ؎ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ: جس چیز سے تم کو تکلیف یا سختی پہنچے وہ ان پر بہت بھاری ہے، ہر ممکن طریقہ سے آپ یہ ہی چاہتے ہیں کہ امت پر آسانی ہو اور دنیاوی واخروی عذاب سے محفوظ رہے، اس لیے جو دین آپ لائے وہ بھی سہل اور نرم ہے، اور عمال کو آپ یہ ہی نصیحت فرماتے تھے يَسِّرُوْا وَلَا تُعَسِّرُوْا (آسانی کرو سختی مت کرو)

فائدہ: ؎ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ: یعنی تمہاری خیر خواہی اور نفع رسانی کی خاص تڑپ ان کے دل میں ہے، لوگ دوزخ کی طرف بھاگتے ہیں، آپ ان کی کمریں پکڑ پکڑ کر ادھر سے ہٹاتے ہیں، آپ کی بڑی کوشش اور آرزو یہ ہے کہ خدا کے بندے اصلی بھلائی اور حقیقی کامیابی سے ہمکنار ہوں، جہاد وغیرہ کا مقصد بھی خونریزی نہیں بلکہ بحالت مجبوری سخت آپریشن کے ذریعہ سے بنی نوع انسان کے فاسد ومسموم اعضاء کو کاٹ کر اور خراب جراثیم کو تباہ کر کے امت کے مزاج عمومی کو صحت واعتدال پر رکھنا ہے۔

فائدہ: ؎ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ: جب آپ تمام جہان کے اس قدر خیر خواہ ہیں تو خاص ایمانداروں کے حال پر ظاہر ہے کس قدر شفیق ومہربان ہوں گے۔

فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ لَآ إِلٰهَ إِلَّا هُوَ ۖ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ﴿١٢٩﴾

پھر بھی اگر منہ پھیریں تو کہہ دے کہ کافی ہے مجھ کو اللہ کسی کی بندگی نہیں اس کے سوا، اسی پر میں نے بھروسہ کیا اور وہی مالک ہے عرش عظیم کا

خلاصہ تفسیر: پھر اگر (اس پر بھی آپ کو رسول ماننے سے اور آپ کی اتباع کرنے سے) روگردانی کریں تو آپ کہہ دیجئے (میرا کیا نقصان ہے) میرے لئے (تو) اللہ تعالیٰ (حافظ وناصر) کافی ہے، اس کے سوا کوئی معبود ہونے کے لائق نہیں (پس جب معبود ہونے کی صفت اس کے لیے خاص ہے تو لامحالہ سارے کمالات علم وقدرت وغیرہ اس میں بے مثل ہوں گے، پھر مجھے کسی کی مخالفت سے کیا اندیشہ) میں نے اسی پر بھروسہ کرلیا اور وہ بڑے بھاری عرش کا مالک ہے (غرض جو خدا عرش کا مالک ہے تو دوسری چیزوں کا وہ بدرجہ اولی مالک ہوگا، پس اس پر بھروسہ کرنے کے بعد مجھ کو کوئی اندیشہ نہیں، البتہ تم اپنی فکر کرلو کہ حق کا انکار کر کے کہاں رہو گے)۔

وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ: عرش کا بڑا ہونا اس سے ظاہر ہے کہ سورج زمین سے ڈیڑھ سو گنا زیادہ بڑا ہے، اور وہ آسمان میں کتنی ذرا سی جگہ میں موجود ہے تو وہ آسمان کتنا بڑا ہوا، پھر یہ آسمان دوسرے آسمان کے اندر ہے وہ کتنا بڑا ہوگا، پھر تیسرا آسمان کس قدر بڑا ہوگا علی ہذا القیاس، پھر ساتوں آسمان کرسی کے سامنے ایسے ہیں جیسے بہت بڑے تھال میں سات درہم ڈال دیے جائیں، پھر کرسی عرش کے سامنے ایسی ہی چھوٹی ہے، اس سے اندازہ کرلیا جائے کہ اہل رصد جس کو فلک الافلاک کہتے ہیں زمین سے اس کی اندرونی سطح تک دس کروڑ پانچ لاکھ تہتر ہزار آٹھ سو ستائیس کوس کا فاصلہ بتاتے ہیں، اور اوپر کی سطح تک کا فاصلہ ان کو معلوم نہیں، اور نہ وہ یہ ثابت کر سکے کہ فلک الافلاک سے اوپر کچھ نہیں، احادیث سے ثابت ہے کہ عرش سے اوپر کچھ نہیں، پس اگر فلک الافلاک عرش کے علاوہ کوئی چیز ہے تو عرش اس سے بھی اوپر ہوگا، اس کی عظمت کا کیا حساب ہوسکتا ہے۔

* * *

فائدہ: اگر آپ کی عظیم الشان شفقت، خیر خواہی اور دل سوزی کی لوگ قدر نہ کریں تو کچھ پروا نہیں، اگر فرض کیجئے ساری دنیا آپ سے منہ پھیر لے تو تنہا خدا آپ کو کافی ہے جس کے سوا نہ کسی کی بندگی ہے نہ کسی پر بھروسہ ہوسکتا ہے، کیونکہ زمین وآسمان کی سلطنت اور ''عرش عظیم'' (تخت شہنشاہی) کا مالک وہی ہے، سب نفع وضرر، ہدایت وضلالت اس کے ہاتھ میں ہے۔

فائدہ: ابوداؤد میں ابو الدرداء سے روایت کی ہے کہ جو شخص صبح وشام سات سات مرتبہ حَسْبِيَ اللّٰهُ لَآ إِلٰهَ إِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ (التوبہ:۱۲۹) پڑھا کرے، خدا اس کے تمام ہموم وغموم کو کافی ہوجائے گا، باقی عرش کی عظمت کے متعلق اگر تفصیل دیکھنا ہو تو ''روح المعانی'' میں زیر آیت حاضرہ ملاحظہ کیجئے۔

(الحمد للہ! ''آسان بیان القرآن مع تفسیر عثمانی'' کی پہلی جلد سورہ توبہ کے اختتام پر مکمل ہوئی، دوسری جلد کا آغاز سورہ یونس سے ہے)